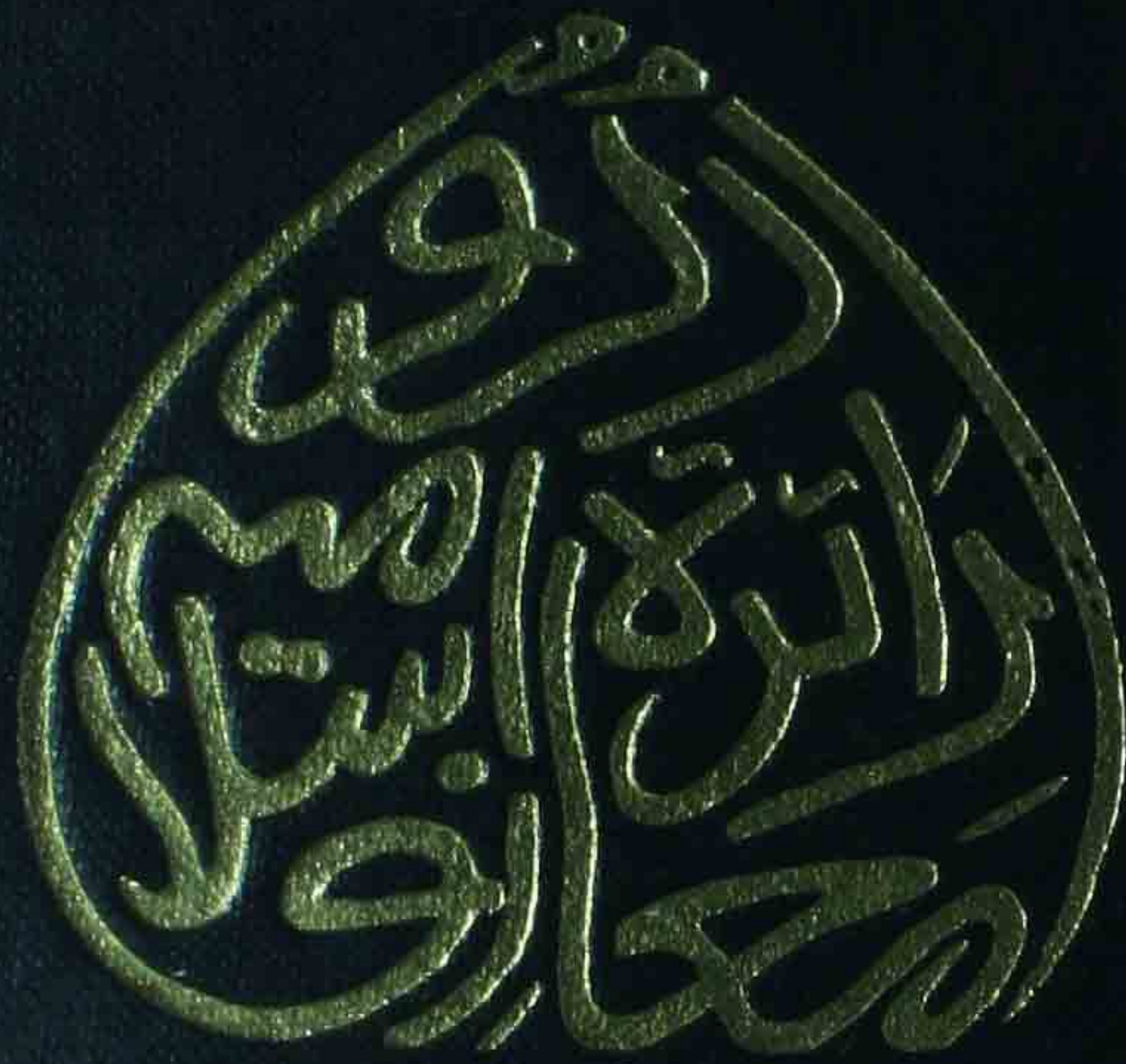


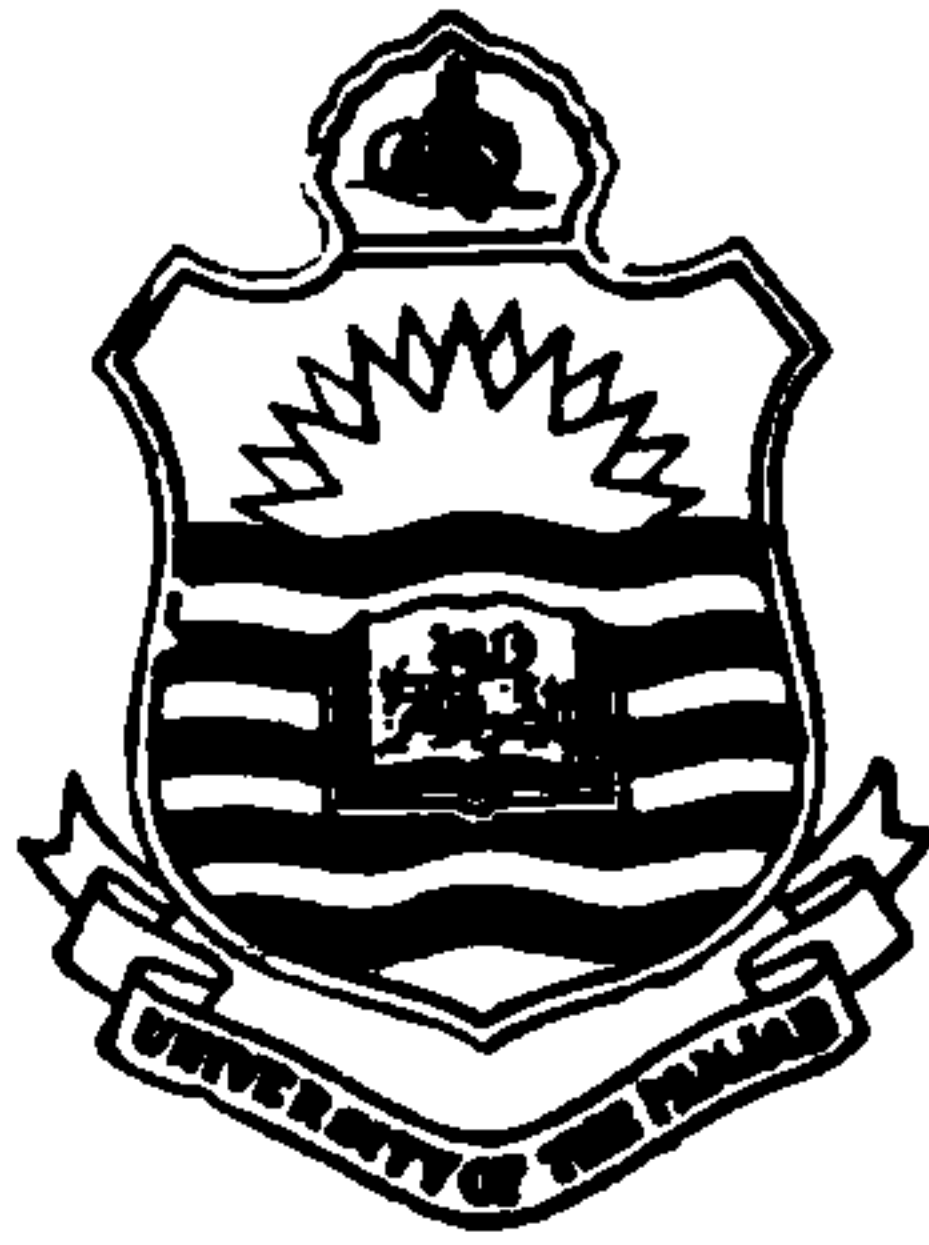
# Urdu Daira Maraf-e-Islamia





# اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ

زیرِ اہتمام  
دانش گاہِ پنجاب، لاہور



جلد ۲

(بای — بوزنطی)

۵۱۳۸۹/۵۱۹۶۹

طبع اول

marfat.com

Marfat.com



## ادارہ تحریر

رئیس ادارہ . . . . .	ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ
معاون ادارہ . . . . .	ڈاکٹر محمد نصر اللہ احسان الہی رانا، ایم اے، پی ایچ ڈی (پنجاب)، پی ایچ ڈی (نیشنل)
مدیر . . . . .	سید محمد امجد الطاف، ایم اے (پنجاب)
مدیر . . . . .	عبدالمنان عمر، ایم اے (علیگ)
مدیر . . . . .	پروفیسر عبدالقیوم، ایم اے (پنجاب)
مدیر . . . . .	ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ایم اے (پنجاب)
معتد ادارہ . . . . .	

## مجلس انتظامیہ

- ۱ - پروفیسر محمد علاء الدین، ایم اے، ایل ایل بی، ستارہ امتیاز، وائس چانسلر، دانش گاہ پنجاب (صدر مجلس)
- ۲ - جسٹس ڈاکٹر ایس - اے - رحمن، ہلال پاکستان، سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ، پاکستان، لاہور
- ۳ - لفٹننٹ جنرل ناصر علی خان، سابق صدر پبلک سروس کمیشن، مغربی پاکستان، لاہور
- ۴ - جناب معزالدین احمد، سی - ایس - پی (ریٹائرڈ)، ۲۴۳ - شارع طفیل، لاہور چھاؤنی
- ۵ - جناب الطاف گوہر، سی - ایس - پی، تمغہ پاکستان، ستارہ قائد اعظم، ستارہ پاکستان، ہلال قائد اعظم، ڈائرکٹر فنانس سروسز اکیڈمی، لاہور
- ۶ - معتمد مالیات، حکومت مغربی پاکستان، لاہور
- ۷ - سید یعقوب شاہ، ایم اے، سابق آڈیٹر جنرل، پاکستان و سابق وزیر مالیات، حکومت مغربی پاکستان، لاہور
- ۸ - مسٹر عبدالرشید خان، سابق کنٹرولر پرنٹنگ اینڈ سٹیشنری، مغربی پاکستان، لاہور
- ۹ - ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، ایم اے، ڈی لٹ، پروفیسر ایمریطس، سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور
- ۱۰ - پروفیسر ڈاکٹر محمد باقر، ایم اے، پی ایچ ڈی، پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور
- ۱۱ - پروفیسر محمد علاء الدین صدیقی، ایم اے، ایل ایل بی، ستارہ امتیاز، صدر شعبہ علوم اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب، لاہور
- ۱۲ - سید شمشاد حیدر، ایم اے، مسجّل، دانش گاہ پنجاب، لاہور
- ۱۳ - جناب ایم - اے - شہید، بی کام، ایس اے ایس، خازن، دانش گاہ پنجاب، لاہور



# اختصارات و رموز وغیرہ

## اختصارات

(۱)

کتاب عربی و فارسی و ترکی وغیرہ اور ان کے تراجم اور بعض مخطوطات جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

ابن بطوطہ = تعفة النظائر الخ، مع ترجمہ از C. Defrémery اور B. R. Sanguinetti، ۴ جلد، پیرس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۸ء.

ابن تغری بریدی = النجوم الزاهرة فی ملوک مصر والقاهرة، W. Popper، برکلے ولانڈن ۱۹۰۸ تا ۱۹۳۶ء. ابن تغری بریدی، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۳۸ھ بعد.

ابن حوقل = کتاب صورة الأرض، طبع J. H. Kramers، لانڈن ۱۹۳۸ تا ۱۹۳۹ء (BGA, II)، بار دوم. ابن خردادبہ = المسالك و الممالک، طبع ڈخویہ M. J. de Goeje، لانڈن ۱۸۸۹ء (BGA, VI).

ابن خلدون: عبر (یا العبر) = کتاب العبر و دیوان المبتدأ و الخبر الخ، بولاق ۱۲۸۳ھ.

ابن خلدون: مقدمة = Prolégomènes d'Ebn Khaldoun، طبع E. Quatremère، پیرس ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۸ء (Notices et Extraits, XVI-XVIII).

ابن خلدون: مقدمة، ترجمہ دیسلان = Prolégomènes d'Ibn Khaldoun، ترجمہ و حواشی از دیسلان M. de Slane، پیرس ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۸ء (بار دوم ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۸ء).

ابن خلدون: مقدمة، ترجمہ روزنتھال = The Muqaddimah، ترجمہ از Franz Rosenthal، ۳ جلد، لنڈن ۱۹۵۸ء. ابن خلدون = وقیات الأعیان و انباء آباء الزمان، طبع Wüstenfeld، گوننگن ۱۸۳۵ تا ۱۸۵۰ء (حوالے شمار تراجم کے اعتبار سے دیے گئے ہیں).

وو، لانڈن ۱ یا ۲ = انسائیکلوپدیا او اسلام، انگریزی، بار اول یا دوم، لانڈن.

وو، ت = انسائیکلوپدیا او اسلام، ترکی.

وو، ع = دائرة المعارف الاسلامیة (= انسائیکلوپدیا او اسلام، عربی).

ابن الأبار = کتاب تکملة الصیلة، طبع کودیرا F. Codera، میڈرڈ ۱۸۸۷ تا ۱۸۸۹ء (BAH, V - VI).

ابن الأبار: تکملة = M. Alarcóny - C. A. González، Apéndice a la adición Codera de : Palencia، در Tecmila، در Misc. de estudios y textos árabes، میڈرڈ ۱۹۱۵ء.

ابن الأبار، جلد اول = ابن الأبار: تکملة الصیلة، Texte arabe d'après un ms. de Fés, tome I, complétant les deux vol. édités par F. Codera، تصحیح A. Bel، محمد بن شب، الجزائر ۱۹۱۸ء.

ابن الأثیر ۱ یا ۲ یا ۳ = بار اول، کتاب الکامل، طبع ٹورنبرگ C. J. Tornberg، لانڈن ۱۸۵۱ تا ۱۸۷۶ء؛ بار دوم، کتاب الکامل، قاہرہ ۱۳۰۱ھ؛ بار سوم، کتاب الکامل، قاہرہ، ۱۳۰۳ھ؛ بار چہارم، کتاب الکامل، قاہرہ ۱۳۳۸ھ، ۹ جلد.

ابن الأثیر، ترجمہ فاینان = Annales du Maghreb et de l'Espagne، ترجمہ از فاینان E. Fagnan، الجزائر ۱۹۰۱ء.

ابن بشکوال = کتاب الصیلة فی اخبار ائمة الأندلس، طبع کودیرا F. Codera، میڈرڈ ۱۸۸۳ء (BAH, II).



- l'Espagne*، طبع ڈوزی R. Dozy و ڈ خویہ، لائنن  
۱۸۶۶ء۔
- الادریسی، ترجمہ جوبار = *Géographie d'Édrisi*، ترجمہ  
از P. A. Jaubert، ۲ جلد، پیرس ۱۸۳۶ تا ۱۸۴۰ء۔
- الاستیعاب = ابن عبد البر: الاستیعاب، ۲ جلد، حیدرآباد  
۱۳۱۸ تا ۱۳۱۹ء۔
- الاشتیاق = ابن درید: الاشتقاق، طبع ویشٹفلٹ، گوٹنگن  
۱۸۵۴ء (اناستاتیک)۔
- الاصابة = ابن حجر العسقلانی: الاصابة، ۳ جلد، کلکتہ  
۱۸۵۶ تا ۱۸۵۷ء۔
- الاصطخري = المسالك و الممالک، طبع ڈ خویہ، لائنن  
۱۸۷۰ء (BGA, I) اور بار دوم (نقل بار اول) ۱۹۲۷ء۔
- الأغاني ۱، ۲ یا ۳ = ابوالفرج الاصفهانی: الأغاني،  
بار اول، بولاق ۱۲۸۵ھ، بار دوم، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، بار  
سوم، قاہرہ ۱۳۳۵ھ بعد۔
- الأغاني، بروٹو = کتاب الأغاني کی اکیسویں جلد، طبع  
بروٹو R. E. Brünnow، لائنن ۱۸۸۸ء/۱۳۰۶ء۔
- الأنباری: نزهة = نزهة الألباء فی طبقات الأدباء، قاہرہ  
۱۲۹۳ء۔
- البغدادی: الفرق = الفرق بین الفرق، طبع محمد بدر،  
قاہرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء۔
- البلادری: انساب = انساب الأشراف، ج ۳ و ۵، طبع  
M. Schlössinger و S. D. F. Goitein، بیت المقدس  
(یروشلم) ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء۔
- البلادری: انساب، ج ۱ = انساب الأشراف، ج ۱، طبع محمد  
حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء۔
- البلادری: فتوح = فتوح البلدان، طبع ڈ خویہ، لائنن  
۱۸۶۶ء۔
- یہقی: تاریخ یسہق = ابوالحسن علی بن زید البیہقی:  
تاریخ یسہق، طبع احمد بہمنیار، تہران ۱۳۱۷ھ۔
- یسہقی: تتمہ = ابوالحسن علی بن زید البیہقی: تتمہ  
صوان الحکمة، طبع محمد شفیق، لاہور ۱۹۳۵ء۔

- ابن خلکان، بولاق = وہی کتاب، بولاق ۱۲۷۵ء۔
- ابن خلکان، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۳۱۰ء۔
- ابن خلکان، ترجمہ دیسلان = *Biographical Dictionary*،  
ترجمہ از دیسلان M. de Slane، ۳ جلد، پیرس ۱۸۳۳  
تا ۱۸۷۱ء۔
- ابن رستہ = الأعلام النفیسة، طبع ڈ خویہ، لائنن ۱۸۹۱ تا  
۱۸۹۲ء (BGA, VII)۔
- ابن رستہ، ویت = *Les Atours précieux = Wiet*، ترجمہ  
از G. Wiet، قاہرہ ۱۹۵۵ء۔
- ابن سعد = کتاب الطبقات الكبير، طبع زخاؤ Sachau  
وغیرہ، لائنن ۱۹۰۳ تا ۱۹۳۰ء۔
- ابن عذاری = کتاب البیان المغرب، طبع کولن G. S. Colin  
و لیوی پرووانسال E. Lévi-Provençal، لائنن ۱۹۳۸ تا  
۱۹۵۱ء؛ جلد سوم، طبع لیوی پرووانسال، پیرس  
۱۹۳۰ء۔
- ابن العیاد: شذارت = شذارت الذهب فی أخبار من ذهب،  
قاہرہ ۱۳۵۰ تا ۱۳۵۱ھ (نین و فیات کے اعتبار سے  
حوالے دیے گئے ہیں)۔
- ابن الفقیہ = مختصر کتاب البلدان، طبع ڈ خویہ، لائنن  
۱۸۸۶ء (BGA, V)۔
- ابن قتیبة: شعر (یا الشعر) = کتاب الشعر والشعراء، طبع  
ڈ خویہ، لائنن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۳ء۔
- ابن قتیبة: معارف (یا المعارف) = کتاب المعارف، طبع ویشٹفلٹ،  
گوٹنگن ۱۸۵۰ء۔
- ابن ہشام = کتاب سیرة رسول اللہ، طبع ویشٹفلٹ، گوٹنگن  
۱۸۵۸ تا ۱۸۶۰ء۔
- ابوالفداء: تقویم = تقویم البلدان، طبع رینو J.-T. Reinaud  
و دیسلان M. de Slane، پیرس ۱۸۴۰ء۔
- ابوالفداء: تقویم، ترجمہ = *Géographie d'Aboulféda*  
*traduite de l'arabe en francais*، ج ۱ و ۲ / ۱ از  
رینو، پیرس ۱۸۴۸ء، ج ۲/۲ از St. Guyard، ۱۸۸۳ء۔
- الادریسی: المغرب = *Description de l'Afrique et de*



بہتی، ابوالفضل = ابوالفضل بہتی: تاریخ مسعودی،  
Bibl. Indica  
تاج العروس = محمد مرتضیٰ بن محمد الزیدی: تاج  
العروس.  
تاریخ بغداد = الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۳  
جلد، قاہرہ ۱۳۳۹/۱۹۳۱ء.  
تاریخ دمشق = ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۷ جلد،  
دمشق ۱۳۲۹/۱۹۱۱ء تا ۱۳۵۱/۱۹۳۱ء.  
تہذیب = ابن حجر العسقلانی: تہذیب التہذیب، ۱۲  
جلد، حیدرآباد ۱۳۲۵/۱۹۰۷ء تا ۱۳۲۷/۱۹۰۹ء.  
التعالی: یتیمہ = یتیمۃ الدھر فی محاسن اہل العصر،  
دمشق ۱۳۰۳ء.  
التعالی: یتیمہ، قاہرہ = وہی کتاب، قاہرہ ۱۹۳۳ء.  
حاجی خلیفہ: جہان نما = استانبول ۱۱۳۵/۱۷۲۲ء.  
حاجی خلیفہ = کشف الظنون، طبع محمد شرف الدین یالتقیا  
S. Yaltkaya و محمد رفعت یلگہ الکیسلی  
Rifat Bilge Kilisi، استانبول ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۳ء.  
حاجی خلیفہ، طبع فلورگل = کشف الظنون، طبع فلورگل  
Gustav Flügel، لائب زگ ۱۸۳۵ء تا ۱۸۵۸ء.  
حاجی خلیفہ: کشف = کشف الظنون، ۲ جلد، استانبول  
۱۳۱۰ء تا ۱۳۱۱ء.  
حدود العالم = *The Regions of the World*، ترجمہ از  
مینورسکی V. Minorsky، لندن ۱۹۳۷ء (GMS, XI)  
سلسلہ جدید).  
حمد اللہ مستوفی: نزہۃ = نزہۃ القلوب، طبع لیسٹرنج،  
لندن ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۹ء (GMS, XXII).  
خواند امیر = حبیب السیر، (۱) تہران ۱۳۷۱ء؛ (۲) بہتی  
۱۳۷۳/۱۸۵۷ء.  
الدرر الكامنة = ابن حجر العسقلانی: الدرر الكامنة،  
حیدرآباد ۱۳۳۸ء تا ۱۳۵۰ء.  
النہیری = حیوۃ الحيوان (کتاب کے مقالات کے عنوانوں

کے مطابق حوالے دیے گئے ہیں).  
دولت شاہ = تذکرۃ الشعراء، طبع ہراؤن، لندن و لائن  
۱۹۰۱ء.  
ذہبی: حفاظ = الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۳ جلد، حیدرآباد  
۱۳۱۵ء.  
رحمن علی = تذکرۃ علمائے ہند، لکھنؤ ۱۹۱۳ء.  
روضات الجنات = محمد باقر خوانساری: روضات الجنات،  
طہران ۱۳۰۶ء.  
زامبور، عربی = عربی ترجمہ از محمد حسن و حسن احمد  
محمود، ۲ جلد، قاہرہ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۲ء.  
السبکی = طبقات الشافعیۃ، ۶ جلد، قاہرہ ۱۳۲۳ء.  
سبجی عثمانی = محمد ثریا: سبجی عثمانی، استانبول ۱۳۰۸  
تا ۱۳۱۶ء.  
سریس = سریس: معجم المطبوعات العربیۃ، قاہرہ  
۱۹۲۸ء تا ۱۹۳۱ء.  
السعمانی = السعمانی: الانساب، طبع عکسی باعتناء  
مرجلیوٹ D. S. Margoliouth، لائن ۱۹۱۲ء  
(GMS, XX).  
السیوطی: بغیۃ = بغیۃ الوعایۃ، قاہرہ ۱۳۲۶ء.  
الشہرستانی = الملل و النحل، طبع کیورٹن W. Cureton،  
لندن ۱۸۳۶ء.  
الضبی = بغیۃ الملتبس فی تاریخ رجال اہل الأندلس، طبع  
کودیرا Codera و ریبیرہ J. Ribera، میڈرڈ ۱۸۸۳ء تا  
۱۸۸۵ء (BAH, III).  
الضوء اللامع = السخاوی: الضوء اللامع، ۱۲ جلد، قاہرہ  
۱۳۵۳ء تا ۱۳۵۵ء.  
الطبری = تاریخ الرسل و الملوک، طبع ذخیرہ وغیرہ،  
لائن ۱۸۷۹ء تا ۱۹۰۱ء.  
عثمان لی مؤلف لری = بروسہ لی محمد طاہر: عثمانلی  
مؤلف لری، استانبول ۱۳۳۳ء.  
العقد الفريد = ابن عبد ربہ: العقد الفريد، قاہرہ ۱۳۲۱ء.  
علی جواد = ممالک عثمانین تاریخ و جغرافیہ لغاتی،

مسعود کیهان = جغرافیای مفصل ایران، ۲ جلد، تهران ۱۳۱۰ و ۱۳۱۱ هـ.ش.

المسعودی: مروج = مروج الذهب، طبع باریه د مینار و پاوه د کورتی، پیرس ۱۸۶۱ تا ۱۸۷۷.

المسعودی: التبیہ = کتاب التبیہ و الاشراف، طبع ڈ خویہ، لائڈن ۱۸۹۳ (BGA, VIII).

المقلسی = احسن التقاسیم فی معرفة الأقالیم، طبع ڈ خویہ، لائڈن ۱۸۷۷ (BGA, III).

المقری: *Analectes* = نفع الطیب فی غصن الأندلس الرطیب، *Analectes sur l'histoire et la littérature des Arabes de l'Espagne*، لائڈن ۱۸۵۵ تا ۱۸۶۱.

المقری، بولاق = وہی کتاب، بولاق ۱۲۷۹/۱۸۶۲.

منجم باشی = صحائف الأخبار، استانبول ۱۲۸۵.

میر خواند = روضة الصفاء، بمبئی ۱۲۶۶/۱۸۴۹.

نزهة الخواطر = حکیم عبدالحی: نزهة الخواطر، حیدرآباد ۱۹۳۷.

نسب = مصعب الزبیری: نسب قریش، طبع لیوی پروانسال، قاہرہ ۱۹۵۳.

الوافی = الصفدی: الوافی بالوفیات، ج ۱، طبع رٹر Ritter، استانبول ۱۹۳۱؛ ج ۲ و ۳، طبع ڈیڈرننگ Dederling، استانبول ۱۹۴۹ و ۱۹۵۳.

الہمدانی = صفة جزيرة العرب، طبع مٹر Müller D. H.، لائڈن ۱۸۸۳ تا ۱۸۹۱.

یاقوت = معجم البلدان، طبع ویسٹفلٹ، لائپ زگ ۱۸۶۶ تا ۱۸۷۳ (طبع اناسٹاتیک، ۱۹۲۴).

یاقوت: ارشاد (یا ادب) = ارشاد الأریب الی معرفة الأديب، طبع مرجلیوٹ، لائڈن ۱۹۰۷ تا ۱۹۲۷ (GMS, VI).

معجم الادب (طبع اناسٹاتیک، قاہرہ ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸).

یعقوبی (یا یعقوبی) = تاریخ، طبع هوتسا M. Th. Houtsma، لائڈن ۱۸۸۳؛ تاریخ یعقوبی، ۳ جلد، نجف ۱۳۵۸؛ ۲ جلد، بیروت ۱۳۷۹/۱۹۶۰.

یعقوبی: بلدان (یا البلدان) = طبع ڈ خویہ، لائڈن ۱۸۹۲ (BGA, VII).

یعقوبی، Wiet ویت = *Ya'qūbi. Les pays*، ترجمہ از G. Wiet، قاہرہ ۱۹۳۷.

استانبول ۱۳۱۳ / ۱۸۹۵ تا ۱۳۱۷ / ۱۸۹۹.

عوفی: لباب = لباب الالباب، طبع براؤن، لئڈن و لائڈن ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۶.

عیون الأنبياء = طبع مٹر Müller A.، قاہرہ ۱۲۹۹ / ۱۸۸۲.

غلام سرور، مفتی: خزینہ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۳.

غوثی ماندوی: گلزار ابرار، ترجمہ اردو موسوم بہ اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶.

فرشتہ = محمد قاسم فرشتہ: گلشن ابراہیمی، طبع سنگی، بمبئی ۱۸۳۲.

فرہنگ = فرہنگ جغرافیای ایران، از انتشارات دایرہ جغرافیائی ستاد ارتش، ۱۳۲۸ تا ۱۳۲۹ هـ.ش.

فرہنگ آندراج = منشی محمد بادشاہ: فرہنگ آندراج، ۳ جلد، لکھنؤ ۱۸۸۹ تا ۱۸۹۳.

فقیر محمد: حدائق الحنفیہ، لکھنؤ ۱۹۰۶.

فلٹن و لنگز = Alexander S. Fulton and Matrin = *Second Supplementary Catalogue of Arabic: Lings Printed Books in the British Museum*، لئڈن ۱۹۵۹.

فہرست (یا الفہرست) = ابن الندیم: کتاب الفہرست، طبع فلوگل، لائپ زگ ۱۸۷۱ تا ۱۸۷۲.

ابن القفطی = تاریخ حکماء، طبع لپرت J. Lippert، لائپ زگ ۱۹۰۳.

الکتبی: قوت = ابن شاکر الکتبی: قوت الوقیات، بولاق ۱۲۹۹.

لسان العرب = ابن منظور: لسان العرب، ۲ جلد، قاہرہ ۱۳۰۰ تا ۱۳۰۸.

مآثر الأمراء = شاہ نواز خان: مآثر الأمراء، *Bibl. Indica*.

مجالس المؤمنین = نور اللہ شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ هـ.ش.

مرآة الجنان = الیافعی: مرآة الجنان، ۴ جلد، حیدرآباد ۱۳۳۹.

مرآة الزمان = سبط ابن الجوزی: مرآة الزمان، حیدرآباد ۱۹۵۱.



کتب انگریزی، فرانسیسی، جرمن، جدید ترکی وغیرہ کے اختصارات جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

Al-Aghānī : *Tables = Tables Alphabétiques du Kitāb al-aghānī, rédigées par I. Guidi, Leiden 1900.*

Babinger = F. Babinger : *Die Geschichtschreiber der Osmanen und ihre Werke, 1st ed., Leiden 1927.*

Barkan : *Kanunlar = Ömar Lûtfî Barkan : XV ve XVI inci Asırlarda Osmanlı. İmparat orluğunda Ziraat Ekonominin Hukukî ve Mali Esasları, I. Kanunlar, Istanbul 1943.*

Blachère : *Litt. = R. Blachère : Histoire de la Littérature arabe, i, Paris 1952.*

Brockelmann, I, II = C. Brockelmann : *Geschichte der Arabischen Litteratur, Zweite den Supplement-bänden angepasste Auflage, Leiden 1943-1949.*

Brockelmann, SI, II, III = G. d. A.L., *Erster (Zweiter, Dritter). Supplementband, Leiden 1937-42.*

Browne, i = E.G. Browne : *A Literary History of Persia, from the earliest times until Firdawsi, London 1902.*

Browne, ii = *A Literary History of Persia, from Firdawsi to Sa'di, London 1908.*

Browne, iii = *A History of Persian Literature under Tartar Dominion, Cambridge 1920.*

Browne, iv = *A History of Persian Literature in Modern Times, Cambridge 1924.*

Caetani : *Annali = L. Caetani : Annali dell' Islam, Milano 1905-26.*

Chauvin : *Bibliographie = V. Chauvin : Bibliographie des ouvrages arabes et relatifs aux Arabes, Lille 1892.*

Dorn : *Quellen = B. Dorn : Muhammedanische Quellen zur Geschichte der südlichen Küstenländer des Kaspischen Meeres, St. Petersburg 1850-58.*

Dozy : *Notices = R. Dozy : Notices sur quelques manuscrits arabes, Leiden 1847-51.*

Dozy : *Recherches = R. Dozy : Recherches sur*

*l'histoire et la littérature de l'Espagne Pendant le moyen-âge, 3rd ed., Paris-Leiden 1881.*

Dozy, *Suppl. = R. Dozy : Supplément aux dictionnaires arabes, 2nd ed., Leiden-Paris 1927.*

Fagnan : *Extraits = E. Fagnan : Extraits inédits relatifs au Maghreb, Alger 1924.*

*Gesch. des Qor. = Th. Nöldeke : Geschichte des Qorāns, new edition by F. Schwally, G. Bergsträsser and O. Pretzl, 3 vols., Leipzig 1909-38.*

Gibb : *Ottoman Poetry = E.J.W. Gibb : A History of Ottoman Poetry, London 1900-09.*

Gibb-Bowen = H.A.R. Gibb and Harold Bowen : *Islamic Society and the West, London 1950-57.*

Goldziher : *Muh. St. = I. Goldziher : Muhammedanische Studien, 2 Vols., Halle 1888-90.*

Goldziher : *Vorlesungen = I. Goldziher : Vorlesungen über den Islam, Heidelberg 1910.*

Goldziher : *Vorlesungen<sup>2</sup> = 2nd ed., Heidelberg 1925.*

Goldziher : *Dogme = Le dogme et la loi de l'islam, trad. J. Arin, Paris 1920.*

Hammer-Purgstall : *GOR = J. von Hammer (-Purgstall) : Geschichte des Osmanischen Reiches, Pest 1828-35.*

Hammer-Purgstall : *GOR<sup>2</sup> = the same, 2nd ed., Pest 1840.*

Hammer-Purgstall : *Histoire, the same, trans. by J.J. Hellert, 18 vol., Bellizard (etc.), Paris (etc.), 1835-43.*

Hammer-Purgstall : *Staatsverfassung = J. von Hammer : Des Osmanischen Reiches Staatsverfassung und Staatsverwaltung, 2 vols., Vienna 1815.*

Houtsma : *Recueil = M.Th. Houtsma : Recueil des textes relatifs a l'histoire des Seldjoudides, Leiden 1886-1902.*

Juynboll : *Handbuch = Th. W. Juynboll : Handbuch des islamischen Gesetzes, Leiden 1910.*

- Juynboll : *Handleiding = Handleiding tot de kennis der mohammedaansche wet*, 3rd ed., Leiden 1925.
- Lane = E.W. Lane : *An Arabic-English Lexicon*, London 1863-93 (reprint New York 1955-56).
- Lane-Poole : *Cat.* = S. Lane-Poole : *Catalogue of Oriental Coins in the British Museum*, 1877-90.
- Lavoix : *Cat.* = H. Lavoix : *Catalogue des Monnaies Musulmanes de la Bibliothèque Nationale*, Paris 1887-96.
- Le Strange = G. Le Strange : *The Lands of the Eastern Caliphate*, 2nd ed. Cambridge 1930 (reprint, 1966).
- Le Strange : *Baghdad* = G. Le Strange : *Baghdad during the Abbasid Caliphate*, Oxford 1924.
- Le Strange : *Palestine* = G. Le Strange : *Palestine under the Moslems*, London 1890 (reprint 1965).
- Lévi-Provençal : *Hist. Esp. Mus.* = E. Lévi-Provençal : *Histoire de l'Espagne musulmane*, nouv. éd., Leiden-Paris 1950-53, 3 vols.
- Lévi-Provençal : *Hist. Chorfa* = D. Lévi-Provençal : *Les Historiens des Chorfa*, Paris 1922.
- Maspero-Wiet : *Matériaux* = J. Maspéro et G. Wiet : *Matériaux pour servir à la Géographie de l'Égypte*, Le Caire 1914 (MIFAO, XXXVI).
- Mayer : *Architects* = L.A. Mayer : *Islamic Architects and their Works*, Geneva 1956.
- Mayer : *Astrolabists* = L.A. Mayer : *Islamic Astrolabists and their Works*, Geneva 1958.
- Mayer : *Metalworkers* = L.A. Mayer : *Islamic Metalworkers and their Works*, Geneva 1959.
- Mayer : *Woodcarvers* = L.A. Mayer : *Islamic Woodcarvers and their Works*, Geneva 1958.
- Mez : *Renaissance* = A. Mez : *Die Renaissance des Islams*, Heidelberg 1922; Spanish translation by S. Vila, Madrid-Granada 1936.
- Mez : *Renaissance*, Eng. tr. = A. Mez : *The Renaissance of Islam*, Translated into English by Salahuddin Khuda Bukhsh and D.S. Margoliouth, London 1937.
- Nallino : *Scritti* = C.A. Nallino : *Raccolta di Scritti editi e inediti*, Roma 1939-48.
- Pakalın = Mehmet Zeki Pakalın : *Osmanlı Tarih seyimleri ve Terimleri Sözlüğü*, 3 vols., Istanbul 1946 ff.
- Pauly-Wissowan = *Realenzklopaedie des klassischen Altertums*.
- Pearson = J.D. Pearson : *Index Islamicus*, Cambridge 1958.
- Pons Boigues = *Ensayo bio-bibliográfico sobre los historiadores y geógrafos arábigo-españoles*, Madrid 1898.
- Santillana : *Istituzioni* = D. Santillana : *Istituzioni di diritto musulmano malichita*, Roma 1926-38.
- Schlimmer = John L. Schlimmer : *Terminologie medico-Pharmaceutique et Anthropologique*, Tehran 1874.
- Schwarz : *Iran* = P. Schwarz : *Iran im Mittelalter nach den arabischen Geographen*, Leipzig 1896.
- Smith = W. Smith : *A Classical Dictionary of Biography, Mythology and Geography*, London 1853.
- Snouck Hurgronje : *Verspr. Geschr.* = C. Snouck Hurgronje : *Verspreide Geschriften*, Bonn-Leipzig-Leiden 1923-27.
- Sources inéd.* = Henri de Castries : *Sources inédites de l'histoire du Maroc*, Paris 1905 f ; 2nd. Series, Paris 1922 f.
- Spuler : *Horde* = B. Spuler : *Die Goldene Horde*, Leipzig 1943.
- Spuler : *Iran* = B. Spuler : *Iran in früh-islamischer Zeit*, Wiesbaden 1952.
- Spuler : *Mongolen*<sup>2</sup> = B. Spuler : *Die Mongolen in Iran*, 2nd. ed., Berlin 1955.
- SNR = Stephan and Naudy Ronart : *Concise Encyclopaedia of Arabic Civilization*, Djambatan-Amsterdam 1959.
- Storey = C.A. Storey : *Persian Literature : a biobibliographical survey*, London 1927.
- Survey of Persian Art* = ed. by A. U. Pope, Oxford



1938.

Suter = H. Suter : *Die Mathematiker und Astronomen der Araber und ihre Werke*, Leipzig 1900.

Taeschner : *Wegenetz* = F. Taeschner : *Die Verkehrslage und das Wegenetz Anatoliens im Wandel der Zeiten*, Gotha 1926.

Tomaschek = W. Tomaschek : *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*, Vienna 1891.

Weil : *Chalifen* = G. Weil : *Geschichte der Chalifen*, Mannheim-Stuttgart 1846-82.

Wensinck : *Handbook* = A.J. Wensinck : *A Hand-*

*book of Early Muhammadan Tradition*, Leiden 1927.

Zambaur = E. de Zambaur : *Manuel de généalogie et de chronologie pour l'histoire de l'Islam*, Hanover 1927 (anastatic reprint Bad Pymont 1955).

Zinkeisen = J. Zinkeisen : *Geschichte des Osmanischen Reiches in Europa*, Gotha 1840-83.

Zubaid Ahmad = *The Contribution of India to Arabic Literature*, Allahabad 1946 (reprint Lahore 1968).

(ج)

مجلات، سلسلہ ہائے کتب (۱) وغیرہ جن کے حوالے اس کتاب میں بکثرت آئے ہیں

**AB** = Archives Berbères.  
**Abh. G.W. Gött.** = Abhandlungen der Gesellschaft der Wissenschaften zu Göttingen.  
**Abh. K. M.** = Abhandlungen f. d. Kunde des Morgenlandes.  
**Abh. Pr. Ak. W.** = Abhandlungen d. preuss. Akad. d. Wiss.  
**Afr. Fr.** = Bulletin du Comité de l'Afrique française.  
**Afr. Fr. RC** = Bulletin du Com. de l'Afr. franç., Renseignements Coloniaux.  
**AIÉO Alger** = Annales de l'Institute d' Études Orientales de l'Université d'Alger.  
**AIUON** = Annali dell' Istituto Univ. Orient, di Napoli.  
**AM** = Archives Marocaines.  
**And.** = Al-Andalus.  
**Anth.** = Anthropos.  
**Anz. Wien** = Anzeiger der philos.-histor. Kl. d. Ak. der Wiss. Wien.  
**AO** = Acta Orientalia.  
**Arab.** = Arabica.  
**ArO** = Archiv Orientalni.  
**ARW** = Archiv für Religionswissenschaft.  
**ASI** = Archaeological Survey of India.  
**ASI, NIS** = the same, New Imperial Series.  
**ASI, AR** = the same, Annual Reports.  
**AÜDTCFD** = Ankara Üniversitesi Dil ve Tarih-Coğrafia Fakültesi Dergisi.  
**As. Fr. B.** = Bulletin du Comité de l'Asie Française.  
**BAH** = Bibliotheca Arabico-Hispana.  
**BASOR** = Bulletin of the American School of Oriental Research.  
**Bell.** = Türk Tarih Kurumu Belleten.  
**BFac. Ar.** = Bulletin of the Faculty of Arts of the Egyptian University.  
**BÉt. Or** = Bulletin d'Études Orientales de l'Institut Français de Damas.

**BGA** = Bibliotheca geographorum arabicorum.  
**BIE** = Bulletin de l'Institut Egyptien.  
**BIFAO** = Bulletin de l'Institut Français d'Archéologie Orientale du Caire.  
**BIS** = Bibliotheca Indica series.  
**BRAH** = Boletín de la Real Academia de la Historia de España.  
**BSE** = Bol'shaya Sovetskaya Éntsiklopediya (Large Soviet Encyclopaedia) 1st ed.  
**BSE<sup>2</sup>** = the same, 2nd ed.  
**BSL(P)** = Bulletin de la Société de Linguistique (de Paris).  
**BSO(A)S** = Bulletin of the School of Oriental (and African) Studies.  
**BTLV** = Bijdragen tot de Taal-, Land-en Volkenkunde (van Ned.-Indië).  
**BZ** = Byzantinische Zeitschrift.  
**COC** = Cahiers de l'Orient Contemporain.  
**CT** = Cahiers de Tunisie.  
**EI<sup>1</sup>** = Encyclopaedia of Islam, 1st edition.  
**EI<sup>2</sup>** = Encyclopaedia of Islam, 2nd edition.  
**EIM** = Epigraphia Indo-Moslemica  
**ERE** = Encyclopaedia of Religion and Ethics.  
**GGA** = Göttinger Gelehrte Anzeigen.  
**GJ** = Geographical Journal.  
**GMS** = Gibb Memorial Series.  
**Gr. I. Ph.** = Grundriss der Iranischen Philologie.  
**GSAI** = Giornale della Soc. Asiatica Italiana.  
**Hesp.** = Hespéris.  
**IA** = Islâm Ansiklopedisi (Turkish).  
**IBLA** = Revue de l'Institut des Belles Lettres Arabes, Tunis.  
**IC** = Islamic Culture.  
**IFD** = İlahiyat Fakültesi Dergisi.  
**IG** = Indische Gids.  
**IHQ** = Indian Historical Quarterly.

(۱) انہیں رومن حروف میں لکھا گیا ہے۔



**IQ** = *The Islamic Quarterly*.  
**IRM** = *International Review of Missions*.  
**Isl.** = *Der Islam*.  
**JA** = *Journal Asiatique*.  
**JAfr. S.** = *Journal of the African Society*.  
**JAOS** = *Journal of the American Oriental Society*.  
**JAnthr. I** = *Journal of the Anthropological Institute*.  
**JBBRAS** = *Journal of the Bombay Branch of the Royal Asiatic Society*.  
**JE** = *Jewish Encyclopaedia*.  
**JESHO** = *Journal of the Economic and Social History of the Orient*.  
**JNES** = *Journal of Near Eastern Studies*.  
**JPak.HS** = *Journal of the Pakistan Historical Society*.  
**JPHS** = *Journal of the Panjab Historical Society*.  
**JQR** = *Jewish Quarterly Review*.  
**JRAS** = *Journal of the Royal Asiatic Society*.  
**J(R)ASB** = *Journal and Proceedings of the (Royal) Asiatic Society of Bengal*.  
**J(R) Num.S** = *Journal of the (Royal) Numismatic Society*.  
**JRGeog.S** = *Journal of the Royal Geographical Society*.  
**JSFO** = *Journal de la Société Finno-ougrienne*.  
**JSS** = *Journal of Semitic Studies*.  
**KCA** = *Körösi Csoma Archivum*.  
**KS** = *Keleti Szemle (Revue Orientale)*.  
**KSIE** = *Kratkie Soobshcheniya Instituta Étnografii* (Short Communications of the Institute of Ethnography).  
**LE** = *Literaturnaya Éntsiklopediya* (Literary Encyclopaedia).  
**Mash.** = *Al-Mashrik*.  
**MDOG** = *Mitteilungen der Deutschen Oriental-Gesellschaft*.  
**MDPV** = *Mitteilungen und Nachr. des Deutschen Palästina-Vereins*.  
**MEA** = *Middle Eastern Affairs*.  
**MEJ** = *Middle East Journal*.

**MFOB** = *Mélanges de la Faculté Orientale de Beyrouth*.  
**MGG Wien** = *Mitteilungen der geographischen Gesellschaft in Wien*.  
**MGMN** = *Mitt. z. Geschichte der Medizin und der Naturwissenschaften*.  
**MGWJ** = *Monatsschrift f. d. Geschichte u. Wissenschaft des Judentums*.  
**MI** = *Mir Islama*.  
**MIDEO** = *Mélanges de l'Institut Dominicain d'Études Orientales du Caire*.  
**MIE** = *Mémoires de l'Institut d'Égyptien*.  
**MIFAO** = *Mémoires publiés par les membres de l'Inst. Franç. d'Archéologie Orientale du Caire*.  
**MMAF** = *Mémoires de la Mission Archéologique Franç. au Caire*.  
**MMIA** = *Madjallat al-Madjma' al-'ilmi al' Arabi, Damascus*.  
**MO** = *Le Monde oriental*.  
**MOG** = *Mitteilungen zur osmanischen Geschichte*.  
**MSE** = *Malaya Sovetskaya Éntsiklopediya*—(Small Soviet Encyclopaedia).  
**MSFO** = *Mémoires de la Société Finno-ougrienne*.  
**MSL** = *Mémoires de la Société Linguistique de Paris*.  
**MSOS Afr.** = *Mitteilungen des Sem. für Oriental. Sprachen, Afr. Studien*.  
**MSOS As.** = *Mitteilungen des Sem. für Oriental. Sprachen, Westasiatische Studien*.  
**MTM** = *Mitt Tettebbü'ler Medjmü'asi*.  
**MVAG** = *Mitteilungen der Vorderasiatisch-ägyptischen Gesellschaft*.  
**MW** = *The Muslim World*.  
**NC** = *Numismatic Chronicle*.  
**NGW Gött.** = *Nachrichten von d. Gesellschaft d. Wiss. zu Göttingen*.  
**OA** = *Orientalisches Archiv*.  
**OC** = *Oriens Christianus*.  
**OCM** = *Oriental College Magazine, Lahore*.  
**OCMD** = *Oriental College Magazine, Damima, Lahore*.

- OLZ** = *Orientalistische Literaturzeitung*.  
**OM** = *Oriente Moderno*.  
**Or.** = *Oriens*.  
**PEFQS** = *Palestine Exploration Fund Quarterly Statement*.  
**PELOV** = *Publications de l'École des langues orientales vivantes*.  
**Pet. Mitt.** = *Petermanns Mitteilungen*.  
**PRGS** = *Proceedings of the R. Geographical Society*.  
**QDAP** = *Quarterly Statement of the Department of Antiquities of Palestine*.  
**RAfr.** = *Revue Africaine*.  
**RCEA** = *Répertoire Chronologique d'Épigraphie arabe*.  
**REI** = *Revue des Études Islamiques*.  
**REJ** = *Revue des Études Juives*.  
**Rend. Lin.** = *Rendiconti della Reale Accad. dei Lincei, Cl. di sc. mor., stor. e filol.*  
**RHR** = *Revue de l'Histoire des Religions*.  
**RI** = *Revue Indigène*.  
**RIMA** = *Revue de l'Institut des manuscrits Arabes*.  
**RMM** = *Revue du Monde Musulman*.  
**RO** = *Rocznik Orientalistyczny*.  
**ROC** = *Revue de l'Orient Chrétien*.  
**ROL** = *Revue de l'Orient Latin*.  
**RAAH** = *Rev. de la R. Academia de la Historia, Madrid*.  
**RSO** = *Rivista degli Studi Orientali*.  
**RT** = *Revue Tunisienne*.  
**SBAK. Heid.** = *Sitzungsberichte der Ak. der Wiss. zu Heidelberg*.  
**SBAK. Wien** = *Sitzungsberichte der Ak. der Wiss. zu Wien*.  
**SBBayr. Ak.** = *Sitzungsberichte der Bayrischen Akademie der Wissenschaften*.  
**SBPMS Erlg.** = *Sitzungsberichte d. Phys.-medizin. Sozietät in Erlangen*.  
**SBPr. Ak. W.** = *Sitzungsberichte der preuss. Ak. der Wiss. zu Berlin*.  
**SE** = *Sovetskoe Yazıkoznaniye* (Soviet Ethnography).  
**SI** = *Studia Islamica*.  
**SO** = *Sovetskoe Vostokovedenie* (Soviet Orientalism).  
**Stud. Isl.** = *Studia Islamica*.  
**S. Ya.** = *Sovetskoe Yazıkoznaniye* (Soviet Linguistics).  
**SYB** = *The Statesman's Year Book*.  
**TBG** = *Tijdschrift van het Bataviaasch Genootschap van Kunsten en Wetenschappen*.  
**TD** = *Tarih Dergisi*.  
**TIE** = *Trudi instituta Étnografıy* (Works of the Institute of Ethnography).  
**TM** = *Türkiyat Mecmuası*.  
**TOEM** = *Ta'rikh-i 'Othmāni* (Türk Ta'rikhi) *Endjümeni medjmū'ası*.  
**TTLV** = *Tijdschrift. v. Indische Taal-, Land- en Volkenkunde*.  
**Verh. Ak. Amst.** = *Verhandelingen der Koninklijke Akademie van Wetenschappen te Amsterdam*.  
**Versl. Med. AK. Amst.** = *Verslagen en Mededeelingen der Koninklijke Akademie van Wetenschappen te Amsterdam*.  
**VI** = *Voprosi Istoriy* (Historical problems).  
**WI** = *Die Welt des Islams*.  
**WI, NS** = the same, New Series.  
**Wiss. Veröff. DOG** = *Wissenschaftliche Veröffentlichungen der Deutschen Orient-Gesellschaft*.  
**WMG** = *World Muslim Gazetteer, Karachi*.  
**WZKM** = *Wiener Zeitschrift für die Kunde des Morgenlandes*.  
**ZA** = *Zeitschrift für Assyriologie*.  
**Zap.** = *Zapiski*.  
**ZATW** = *Zeitschrift für die alttestamentliche Wissenschaft*.  
**ZDMG** = *Zeitschrift der Deutschen Morgenländischen Gesellschaft*.  
**ZDPV** = *Zeitschrift des Deutschen Palästinavereins*.  
**ZGERdk. Berl.** = *Zeitschrift der Gesellschaft für Erdkunde in Berlin*.  
**ZK** = *Zeitschrift für Kolonialsprachen*.  
**ZOEG** = *Zeitschrift f. Osteuropäische Geschichte*.  
**ZS** = *Zeitschrift für Semitistik*.



## رموز

op. cit. =	کتاب مذکور	f., ff., sq., sqq. =	بعد
cf. =	قَب (قارب یا قابل)	s. v. =	بذیل مادہ (یا کلمہ) فلاں
B. C. =	ق م (قبل مسیح)	see ; s. =	دیکھیے (کسی کتاب کے حوالے کے لیے)
متوفی =	م	q. v. =	رَک بان (رجوع کنید بان؛
loc. cit. =	محل مذکور		اور کے کسی مقالے کے حوالے کے لیے)
ibid. =	وہی کتاب		
A. H. =	ہ (ہجری)		
A. D. =	ء (عیسوی)		سند ھ/سندء = (سند ہجری مطابق سند عیسوی)

## اعراب

(Sair : سیر) ai =	اے	(ا)	
(ج)		Vowels	
e =	ی کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (پن : pen)	a =	فتحة (-)
o =	ی کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (مول : mole)	i =	کسره (-)
ü =	ی کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (تورکیہ : Türkiya)	u =	ضمه (-)
ö =	ی کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (کوال : Kö)	(ب)	
ä =	یا i = ä کی آواز کو ظاہر کرتی ہے (ارجب : ärädjäh)	Long Vowels	
(rädjäh : رجب)		(ā j kal : آج کل)	آ
ء =	علامت سکون یا جزم (بسمیل : bismil)	(Sīm : سیم)	ی
		(Hārūn al-Rashid : ہارون الرشید)	و

## متبادل حروف

g =	گ	d =	د، ڈ	q =	ق	b =	ب
l =	ل	dh =	ذ	d =	ض	p =	پ
m =	م	r =	ر	t =	ط	t =	ت
n =	ن	ṛ =	ر	z =	ظ	ṭ =	ٹ
w =	و	z =	ز	' =	ع	th =	ث
h =	ہ	ž, zh =	ژ	gh =	غ	dj =	ج
' =	ء	s =	س	r =	ف	ç =	چ
y =	ی	sh, ch =	ش، چ	k =	ق	h =	ح
				k =	ک	kh =	خ

ہای: (Bay) سے ایک لقب، جو تونس کے حکمرانوں کے لیے ۲۶ جولائی [لیکن World Muslim Gazetteer، ص ۳۳۸، میں ۲۵ جولائی] ۱۹۰۷ء تک استعمال ہوتا رہا، جب کہ خاندانِ حسینہ کے انیسویں حکمران الامین ہای کو معزول کر کے ملک میں جمہوریہ کے قیام کا اعلان کر دیا گیا۔ اس لقب کی اصل معلوم کرنے کے لیے سولہویں صدی کے اواخر کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اسی زمانے میں عثمان ہای نے باب عالی کے مشورے کے بغیر، جس کا وہ بحکوم تھا، منصب ہای (ترکی میں بیگ) کی طرح ڈالی۔ اس نے اس منصب کے حامل کو قبائل کی سرداری سونپی اور امن عامہ قائم رکھنے اور محصولات وصول کرنے کا مجاز کیا؛ چنانچہ ان وسیع اختیارات کے باعث ہای ملک کی اہم ترین شخصیت بن گیا۔ اسکے بعد یہی لقب میر سپاہ حسین بن علی، بانی سلطنتِ حسینہ، نے ۱۰ جولائی ۱۷۰۰ء کو تونس میں اپنی رسمِ مسند نشینی پر اختیار کر لیا۔

ورثائے تخت کی ترتیب اس کے بعد ایک منشور کے ذریعے مقرر کی گئی، جو تونس کے آئینِ مجریہ ۲۶ اپریل ۱۸۶۱ء میں شامل تھا۔ اس کی دفعہ ۱ کی رو سے ”تخت نشینی کا حق حسینی خاندان کے شہزادوں میں بلحاظ عمر ملک میں نافذ الوقت قواعد کے بموجب موروثی قرار پایا۔“ یہ دراصل ایک قدیم دستور کی باخاطہ شکل تھی، جس پر بجز دو صورتوں کے حاکمانِ تونس کی تخت نشینی کے سلسلے میں سلطنت کی ابتدا سے پابندی ہوتی چلی آئی تھی۔

حکمران کی تخت نشینی ایک دوگوندہ رسم کے ساتھ عمل میں آتی تھی: پہلا مرحلہ خاص ہوتا تھا، جو اکابرِ سلطنت اور مصاحبین کے لیے مخصوص تھا اور دوسرا عام، جس میں تمام

رہا یا فریک ہو سکتی تھی۔ یہ المہار واداری کی قدیم رسم دوگانہ (الہیمة الخاصة اور الہیمة العامة) کی تجدید تھی۔ تونس میں ”حکومتِ ابراہامیہ“ (= محمیہ Protectorate) قائم ہونے سے پہلے میں ہای کی رسم سربر آرائی وہاں فرانس نے نماندے سے وابستہ ہو گئی، جس نے ہاہوں محافظ (= ”حامی“) سلطنت کی جانب سے نئے ہای کی تشریفات عمل میں آنے لگیں۔

۲۶ اپریل ۱۸۶۱ء کے منشور کی دفعہ ۳ اور ۴ میں درج تھا: ”ہای صدرِ مملکت ہوگا اور ساتھ ہی شاہی خاندان کا سردار بھی۔ اسے اپنے خاندان کے شہزادوں اور شہزادیوں پر پورا پورا اختیار حاصل ہوگا۔ ہای کی رضامندی کے بغیر ان میں سے کوئی بھی اپنے حقوق ذات یا ملکیت منتقل نہ کر سکے گا۔ ان پر ہای کو پدرانہ اختیار ہے۔ اسے لازم ہے کہ وہ اپنی اس حیثیت سے انہیں مستفید کرے اور افرادِ خاندان کا فرض ہے کہ اس کی فرزندانہ اطاعت کریں۔“

ہای کو جو خطابات حاصل تھے ان میں کئی ایک ایسے الفاظ شامل تھے جن سے اس کے منصبِ شاہی کی صراحت ہوتی تھی۔ سرکاری دستاویزات میں اسکے القاب یہ تھے: ”سیدنا و مولانا . . . . . باشا ہای، صاحب المملکۃ التونسیہ“۔ قدیم طرز کے ان القاب میں، جو جزء بنو حفص کی یادگار تھے اور جزء اٹھارہویں صدی کے وسط سے چلے آ رہے تھے، ایک نئے لقب یعنی ”شیر“ (Marshall) کا اضافہ ہوا، جو باب عالی کی جانب سے تقریباً ۱۸۳۹ء میں عطا ہوا تھا، لیکن یہ لقب صرف تین حکمرانوں تک محدود رہا۔ حفصی خطابات کے برعکس ان کے ہاں شخصی نوعیت کے القاب نہیں ملتے۔

حکومت و سلطنت کی خاص نشانیوں میں



فرمانروا بایزید اول ۵۲۹۱/۵۳۸۹ء تا ۵۸۰۰ء کے نام پر رکھا گیا تھا۔ اس نظریے کے مطابق سلطان موصوف نے اس مقام کو تیمور بیگ سے مقابلے کے وقت بطور ایک دیدبان چوکی کے مستحکم کر دیا تھا۔ زیادہ قریب زمانے کی توجیہ یہ ہے کہ یہ نام جلایری خاندان کے ایک شاہزادے یعنی سلطان احمد (۵۲۸۴/۵۳۸۲ء تا ۵۸۱۳/۵۸۱۰ء) کے بھائی کے نام سے ماخوذ ہے۔ آل عثمان نے اس قصبے کو ۵۹۲۰/۱۵۱۴ء میں فتح کر لیا تھا، لیکن وہ سلطان سلیمان کی ایران سے معرکہ آرائیوں ۵۹۴۰/۱۵۳۳ء تا ۵۹۴۲/۱۵۳۶ء، ۵۹۵۰/۱۵۵۳ء تا ۵۹۵۶/۱۵۵۹ء اور ۵۹۶۰/۱۵۵۳ء تا ۵۹۶۲/۱۵۵۵ء سے پہلے اس علاقے پر قطعی قبضہ حاصل نہیں کر سکے۔ بایزید اور اس سے ملحقہ علاقے سلطنت عثمانیہ کے دور حکومت میں ایک سنجاق بنا دیے گئے تھے، جو بعض اوقات تووان کی ایالت (= صوبے) لیکن زیادہ تر ارزروم کی ایالت کے ماتحت رہے۔ روسیوں نے ترکوں کے خلاف اپنی لڑائیوں میں ۱۸۲۸ء، ۱۸۵۴ء، ۱۸۷۷ء میں اور پھر ۱۹۱۴ء میں اس قصبے پر قبضہ کر لیا تھا۔ بایزید اب ترکی صوبہ آغری Agri میں شامل ہے۔ ۱۸۳۵ء میں اس کی آبادی ۱۸۶۰ نفوس پر مشتمل تھی۔ اس کے مقابل پوری قضا کی آبادی بیس ہزار نفوس سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ ان میں سے بیشتر ترکی یا کردی نسل کے ہیں۔ اس علاقے کے خاص خاص معاشی مشاغل بھیڑ بکری پالنا، اون، کھال اور چمڑے کی مصنوعات تیار کرنا اور قالین بافی ہیں۔

مآخذ: (۱) حاجی خلیفہ: جہاں نما، استانبول ۵۱۱۴۰/۱۷۳۲ء، ص ۴۱۷ بعد؛ (۲) اولیا جلیبی: سیاحت نامہ، استانبول ۵۱۳۱۴، ص ۱۷۷؛ (۳) سامی: قاموس الأعلام، استانبول ۱۸۸۹-۱۸۹۸ء، ص ۱۲۳۴؛

تخت شاہی کے علاوہ اس رسمی ہوشاک کا ذکر ضروری ہے جو اہم تقریبات پر بای پہنتا تھا۔ جاہ و جلال کے ان ظاہری لوازمات پر حکمران کے ہاتھ کا بوسہ، جو تونس کی رعیت پر واجب تھا، چند دوسری شاہی علامات مستزاد تھیں۔ بای کا شاہی وظیفہ مقرر تھا اور اس کا ایک حفاظتی دستہ اور ایک پرچم ہوا کرتا تھا۔ وہ امتیازی نشانات (مثلاً نشان الدّم، عہد الامان اور نشان الافتخار) کے علاوہ اعزازی فوجی عہدے عطا کرتا تھا۔ آخر میں سہر لگانے کی وہ رسم بھی قابل ذکر ہے جو ہر جمعرات کو ادا کی جاتی تھی۔ اس موقع پر بای فرمان کی صورت میں حکومت کے فیصلوں پر اپنی سہر ثبت کرتا تھا اور اس طرح انہیں عملی جواز مل جاتا تھا۔ ولیعہد کا لقب 'بای الامحال' تھا۔ اس لقب کی ابتدا اس کے اس فرض منصبی سے ہوئی جس کی تکمیل کے لیے اسے سال میں دو مرتبہ فوجی مہم پر ملک کے جنوب و شمال میں جانا پڑتا تھا تاکہ وہ ایک تو مرکزی حکومت کا اقتدار قائم رکھے اور دوسرے ان قبائل کو مرعوب کرے جن کے خراج ادا کرنے سے انکار کا احتمال ہو۔ بای الامحال اپنے تقریر کی بنا پر فوج کا سردار ہوا کرتا تھا، لیکن 'حمایۃ' (Protectorate) قائم ہوئی تو اس کا یہ عہدہ ختم ہو گیا۔

[مآخذ: نیز دیکھیے، 'World Muslim Gazetteer'

مرتبہ مؤتمر عالم اسلامی، کراچی ۱۹۶۴ء، ص ۴۹ بعد؛ (۲) ع، بذیل مادہ "بای" نیز مقالہ تونس، (۱) اردو]۔

(CH. SAMARAN)

بایزید: (طوغو بایزید Doğu-Bayazit)

جمہوریہ ترکیہ کا ایک چھوٹا سا قصبہ، جو کوہ ارارات (آغری طاغ) (Ağrı-Dağh) سے کسی قدر جنوبی جانب ایران کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اس کا نام سلطنت عثمانیہ کے

تا ۱۳۸۸/۵۷۹ء اور احمد کے خلاف، جو امیر اماسیہ تھا، مدد کی۔ اس امیر نے قاضی برہان الدین کے مقابلے میں عثمانی ترکوں کی حفاظت میں آنا قبول کر لیا تھا (بزم و رزم، ص ۳۰۲، ۳۰۸)۔

جب ۱۵ جون ۱۳۸۹ء کو قوسوہ Kosovo [رک باں] کے میدان میں مراد اول کے کاری زخم آیا تو اس نے اپنے پاشاؤں سے کہا کہ وہ اس کے سب سے بڑے اور نامور بیٹے بایزید کو سلطان تسلیم کر لیں (دستور نامہ، ص ۸۷: کسی گمنام مصنف کی تواریخ، ص ۲۷)؛ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور اس کا ایک ہی بھائی، جو اس وقت زندہ تھا (دو اور بھائی یعنی ساوجی Savdji اور ابراہیم پہلے ہی وفات پا چکے تھے)، قتل کر دیا گیا تاکہ خانہ جنگی نہ ہونے پائے۔ سربیا کا رئیس لازار Lazar بھی میدان جنگ میں قتل کر دیا گیا۔

نئے سلطان نے فوراً اپنے دارالحکومت بروسہ کی طرف کوچ کر دیا (Stanojevic، ص ۳۱۷)، کیونکہ اناطولیا کے باج گزار رئیسوں نے بغاوت کر دی تھی؛ چنانچہ قرمان اوغلو علاؤالدین علی، جو ان کا سرگروہ تھا، بے شہری Beysheri کو فتح کر کے اسکی شہر تک بڑھ آیا، گرمیان اوغلو یعقوب ثانی نے اپنی موروثی ریاست واپس لے لی اور قاضی برہان الدین نے قیرشہری Kir-Shehri فتح کر لیا (بزم و رزم، ص ۳۸۷)۔ بایزید نے سربیا والوں سے صلح و مصالحت کر لی اور انہوں نے لازار کی بیٹی اولیورا (Despina) کو اس کے عقد میں دینے اور سٹیفن لازارویچ Stephen Lazarevič کے زیر قیادت ایک امدادی فوج بھیجنے کا وعدہ کر لیا۔ ہنگری کے مسلسل دباؤ کے باوجود سٹیفن بایزید کا وفادار رہا اور اس کی مہموں میں اس کا ساتھ دیتا رہا۔ لیکن بالائی سربیا (Prishtina, Skoplje وغیرہ) میں Yuk Branković نے ترکوں کی مزاحمت کی۔

(۵) علی جواد: تاریخ و جغرافیہ لغتی، استانبول ۱۳۲۳ء، ص ۱۰۳؛ (۶) La Turquie d'Asie: V. Cuinet، ۱۸۹۰ء، ص ۲۲۷ تا ۲۳۳؛ (۷) W. E. D. Allen، ۱۹۰۰ء، ص ۲۲۷ تا ۲۳۳؛ (۸) البستانی: دائرة المعارف، ۱۹۶۶ء، ص ۱۱۸۸؛ (۹) [۱۰]، ت، بذیل مادہ بایزید (از بسیم دارکوت Besim Darkot)۔ مغرب کے زیادہ جدید سفر ناموں میں بایزید کے شہر اور قضا سے متعلق متفرق حوالے ملتے ہیں۔ بطور ایک عام ہدایت نامے کے قب ماخذ سے متعلق اشارات در [۱۱]، بذیل مادہ ارمینیا و ارز روم۔

(V. J. PARRY)

\* بایزید: (بایزید) اول، الملقب بہ یلدرم (بجلی کا کڑکا)، عثمانی سلطان (مدت حکومت ۱۹ جمادی الآخرہ ۱۳۹۱/۵۷۹ء جون ۱۳۸۹ء تا ۱۳ شعبان ۸۰۵/۵۸۰ء مارچ ۱۳۰۳ء)۔ یہ ۱۳۵۳/۵۷۵ء میں مراد اول کے ہاں گل چچک خاتون کے بطن سے پیدا ہوا۔ ۱۳۸۳/۵۷۸ء میں اس صوبے کا گورنر مقرر ہوا جو خاندان گرمیانہ (Germeyanids) سے اس کی بیوی سلطان خاتون کے جہیز کے نام سے حاصل کیا گیا تھا۔ کوتاہیہ Kütahya میں سکونت اختیار کرنے کے بعد مشرق میں عثمانی مفادات کی دیکھ بھال اس کے سپرد ہو گئی۔ اس نے ۱۳۸۶/۵۷۸ء میں قرمانیوں (قرمان اوغلو Karaman-Oghlu) کے خلاف افرینک یازیس (Efrenk-Yazisi) کی لڑائی میں اپنے سپاہیانہ تہور کی بدولت ناموری حاصل کی (اور اسی وجہ سے اس نے یلدرم کا لقب پایا)۔ اس مفروضے کی کہ وہ اماسیہ کا بھی پہلا والی مقرر ہوا تھا (کمال پاشا زادہ) اصل یہ ہے کہ اماسیہ کے مغرب کا کچھ علاقہ اُس زمانے میں عثمانی ترکوں کے زیر نگین ہو گیا جب انہوں نے قسطنونی [رک باں] کے جان دار خاندان کے سلیمان کی اس کے باپ (۱۳۸۳/۵۷۸ء



schmidt، ص ۷۷) - یہ مہم سلیمان کے سارے علاقے (بجز اسنوب) کے الحاق اور اس کی موت پر ختم ہوئی۔ اس کے بعد برہان الدین کی دھمکیوں اور احتجاجات کے باوجود بایزید نے عثمان جق Osmandjik پر قبضہ کر لیا، لیکن آخر کار برہان الدین نے چوروسلو Corumlu (= چورم) کے قریب بایزید پر حملہ کر کے اسے پسپائی پر مجبور کر دیا۔ برہان الدین کے حملہ آور دستے انقرہ اور سیوری حصار Sivri-hisar تک جا پہنچے۔ برہان الدین کی افواج کے محاصرے سے مجبور ہو کر امیر اماسیہ نے یہ قلعہ ترکوں کے حوالے کر دیا (۵۹۳ھ / ۱۳۹۲ء)۔ اگلے سال بایزید آیا اور شہر میں داخل ہو گیا۔ مقامی خاندانوں مثلاً تاج الدین اوغلری (رود چارشنبه کی وادی میں) تاشان اوغلری (مرزیفون کے علاقے میں) اور بفرہ کے حاکم نے بایزید کی سیادت تسلیم کر لی؛ لیکن برہان الدین نے واپس جاتے ہوئے عثمانی افواج کو بہت پریشان کیا (بزم و رزم، ص ۴۱۸ تا ۴۲۰)۔

پھر بایزید نے مغرب میں حالات کو فوری توجہ کے قابل پایا۔ قوصوہ Kossovo فتح کرنے کے بعد اس نے بوزنطہ (Byzantium) پر اپنا اقتدار اور بڑھا لیا تھا۔ اسی کی تائید سے پہلے تو جان ہفتم کو تخت ملا (۲۷ ربيع الثانی ۵۹۲ھ / ۱۴ اپریل ۱۳۹۰ء) اور پھر جان پنجم اور اس کے بیٹے اور شریک سلطنت مینوئل Manuel کو (۱۶ شوال ۵۹۳ھ / ۱۷ ستمبر ۱۳۹۱ء)، جس نے سلطان کے ساتھ اناطولیہ کی مہم میں شریک ہو کر اپنی وفاداری کا ثبوت دیا تھا (Johannes : Fr. Dölger، ص ۷۷ : ۲۷ تا ۲۸)۔ جب بایزید مشرق میں اناطولیہ کے معاملات سلجھانے میں مصروف تھا تو اس کے اُج بے (اوزبے؟ Udj-beyis) دشمنوں پر چھاپے مارتے رہے اور انہوں نے مغربی سرحدوں کو قابو میں

پاشا یگت Pasha-Yigit نے اس کے خلاف فوجی کارروائیاں برابر جاری رکھیں اور بعد میں اُسقب (Skoplje) فتح کر لیا (۵۹۳ھ / ۱۳۹۱ء) اور اسے بوسنیا اور البانیا پر حملوں کے لیے اپنا فوجی مستقر بنا لیا۔

بایزید نے ۵۹۲ھ / ۱۳۸۹ - ۱۳۹۰ء کا موسم سرما فیلاڈلفیا (آلاشہر Alashehir) کے فتح کرنے اور ترکی ریاستوں کا اناطولیا سے الحاق کرنے میں صرف کیا، جن کے نام یہ ہیں : آیدین Aydin، صاروخان Sarukhan، منتشا Mentеше، حمید اور گرمیان۔ اس مہم میں خاندان جانداریہ کا سلیمان اور Manuel Palaeologus اس کے ساتھ تھے۔ جہادی الآخرہ ۵۹۲ھ / مئی ۱۳۹۰ء میں وہ قرہ حصار (= آفیون) میں قرہمان اوغلو کے خلاف فوج کشی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اس نے بے شہری Beyshehri پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور قونیہ کو محاصرے میں لے لیا۔ اس وقت سلیمان نے قسطنطنیہ واپس پہنچ کر قرہمان اوغلو کو امداد دینے کے لیے بایزید کے خلاف قاضی برہان الدین سے اتحاد کر لیا۔ بظاہر اسی خطرے کے پیش نظر بایزید نے قونیہ کا محاصرہ اٹھا لیا اور قرہمان اوغلو سے ایک معاہدہ کر لیا جس کی رو سے وہ دریائے چارشنبه Carshanba کے پورے مغربی علاقے سے دست بردار ہو گیا۔ آئندہ سال (۵۹۳ھ / ۱۳۹۱ء) بایزید نے سلیمان پر حملہ کر دیا، لیکن برہان الدین نے اپنے حلیف کی طرفداری میں سلطان کا مقابلہ کیا۔ ۵۹۳ھ / ۱۳۹۱ء کے موسم بہار میں بایزید نے سلیمان کے خلاف بڑی تیاریاں کیں۔ وینس کی ۱۲ جمادی الاولیٰ ۵۹۳ھ / ۶ اپریل ۱۳۹۲ء کی ایک اطلاع یہ تھی کہ بایزید کے باج گزار کی حیثیت سے Manuel Palaeologus بھی اسنوب (Sinop) کی بحری مہم میں شریک ہونے کو تھا (Silber)۔

Thessalonica دوبارہ فتح کر لیا (نشری، ص ۸۸ اس کی تاریخ ۱۹ جمادی الآخرہ ۵۷۹۶ / ۲۱ اپریل ۱۳۹۳ء بتاتا ہے۔ شہر مذکور ایک مرتبہ ۵۷۸۹ / ۱۳۸۷ء میں بھی مسخر کیا گیا تھا اور غالباً ۵۷۹۱ / ۱۳۸۹ء میں وہ ہاتھ سے نکل گیا تھا)۔ بایزید نے تھسلی کو بھی فتح کیا، جو Salone, Neopatrai کا علاقہ تھا۔ اورنوس Evrenuz موریا میں داخل ہو گیا لیکن تھیوڈور وینس والوں کو آرگوس Argos دے چکا تھا (۲۷ مئی ۱۳۹۳ء) (J. Loenertz، در REB، ۱: ۱۷۱ تا ۱۸۵)۔ ایک دوسرے ترکی لشکر نے جنوبی البانیا کو براہ راست ترکی حکومت کے ماتحت کر دیا اور شاہین نے وینس والوں کے البانوی ساحلوں کے مقبوضات پر دباؤ ڈالا (رکبہ آرنائوڈلوق Arnawutluk)۔ بایزید نے قسطنطنیہ کی بھی ناکہ بندی شروع کی (۵۷۹۶ / موسم بہار ۱۳۹۳ء)، جو سات سال تک جاری رہی۔ ۵۷۹۷ / ۱۳۹۵ء میں اس نے ہنگری پر حملہ کیا اور راستے میں Slankamen، ٹیٹل Titel، بکسکرک Beckserek، تمشور Temeshvar، کراشووا Carashova، کرنسییش Caransebesh، مہدیہ Mehedia کے قلعوں پر یورش کی (دیکھیے Actes du X. Congrès Int. d'Et. Byz، ص ۲۰۰)۔ ۲۶ رجب ۵۷۹۷ / ۱۷ مئی ۱۳۹۵ء کو اس نے مرسیا Mircea کو ولاشیا میں دریائے ارجیش Argesh پر شکست دے کر ولاشیا کے تخت پر ولاڈ Vlad کو بٹھا دیا۔ پھر دریائے ڈینیوب عبور کر کے نکوپولس پہنچا اور ۱۳ شعبان ۵۷۹۷ / ۳ جون ۱۳۹۵ء کو ششمن Shishman کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔

ان دلیرانہ فتوحات نے ہنگری اور وینس کو ۵۷۹۶ / ۱۳۹۳ء میں معاہدہ اتحاد کرنے اور یورپ میں ترکوں کے خلاف ایک مذہبی جنگ کرنے پر آمادہ کر دیا، چنانچہ ۵۷۹۹ / ۱۳۹۶ء میں جب

رکھا۔ پاشا یگت نے وک Vuk کو مطیع و منقاد کیا؛ اورنوس [رک بان] Evrenus (Ewrenoz) نے چتروس (Kitros) اور وودینہ کو مسخر کیا اور تھسلی Thessaly میں پیش قدمی کی؛ فیروز یگت نے ولاشیا Wallachia میں چھاپے مارے اور شاہین البانیا میں سرگرم عمل رہا۔ لیکن Miraca cel Batran نے سیلستر Silstre کو کسی نہ کسی طرح واپس لے لیا۔ اور اس نے جب بایزید اناطولیا میں تھا تو قارن اووسی (Karnobat) میں اس کے آتجیوں [حملہ آور دستوں] پر کامیاب حملہ کیا۔ ایک طرف موریا، البانیا اور بوزنطہ میں وینس والوں کی سرگرمیوں سے اور دوسری جانب ولاشیا اور ڈینیوبی بلغاریا کے علاقے میں ہنگری کی اپنا اثر و اقتدار بڑھانے کی مساعی کے باعث بایزید نے فیصلہ کیا کہ اپنی کوششوں کو بلقان میں مرتکز کر دے۔ اس نے پہلے (۷ رمضان المبارک ۵۷۹۵ / ۱۷ جولائی ۱۳۹۳ء) کو ترنوو Trnovo پر قبضہ کر لیا، جو ۵۷۹۰ / ۱۳۸۸ء سے آل عثمان کے زیر اقتدار رہا تھا، اور زارشمن Czar shishman کو ترکوں کے باج گزار کی حیثیت سے نکوپولس Nicopolis کی طرف منتقل ہونا پڑا۔ ۵۷۹۶ / ۱۳۹۳-۱۳۹۴ء کے زمستان میں بایزید نے بلقان کے تمام حکمرانوں اور ہیلولوگیس بھائیوں (Palacologi) کو سرس Serres میں طلب کیا اور یہاں ان کی باج گزاری کی بندشیں زیادہ مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ اس کی بالخصوص یہ کوشش تھی کہ تھیوڈور ہیلولوگیس موریا میں اپنے بڑے بڑے شہر وینس کے مقابلے کے لیے سلطان کے حوالے کر دے۔ عالم مایوسی میں ہیلولوگی یعنی تھیوڈور اور اس کا بھائی مینوئل بایزید کے خلاف ہو گئے اور مغرب میں، بالخصوص وینس میں، اعانت کے خواہاں ہوئے؛ تب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بایزید نے تسالونیکہ



بایزید قسطنطنیہ فتح کرنے کی کوشش میں مصروف تھا تو صلیبیوں نے Sigismund کے ماتحت نکوپولس کا محاصرہ کر لیا۔ بایزید سرعت تمام ادھر پہنچا اور ۲۱ ذوالحجہ ۸۹۸ھ / ۲۵ ستمبر ۱۳۹۶ء کو انہیں ایک تباہ کن شکست دی اور آخری خود مختار بلغاری حکمران Stratsimir سے ویدن Vidin چھین لیا۔ اب ممالک بلقان اور قسطنطنیہ کی قسمت بایزید کے ہاتھوں میں تھی۔ اس شہنشاہی دارالسلطنت میں قیصر مینوئل کو یہ قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ بایزید ایک ترکی نوآبادی مع ایک قاضی کے وہاں قائم کرے۔ ادھر اس کے سپہ سالار اورنوس Evrenuz نے آرگوس اور ایتھنز لے لیے (۸۹۹ھ / ۱۳۹۷ء)۔ اس کے بعد سلطان نے قرہمان اوغلو کی معاندانہ سرگرمیوں کے باعث، جو اس سے نکوپولس کی پر خطر معرکہ آرائی کے زمانے میں سرزد ہوئی تھیں، اناطولیہ کو مراجعت کی۔ اس نے آق چای کے میدان میں قرہمان اوغلو کو شکست دے کر قتل کر دیا اور اس کے علاقے کو قونیہ میں ضم کر لیا (۸۰۰ھ / موسم خزاں ۱۳۹۷ء)۔ آئندہ سال اس نے جانیک Djanik کا خطہ اور برہان الدین [رک باں] کے علاقے کا بھی الحاق کر لیا اور تیمور [رک باں] (Tamerlane) کے خلاف مصر سے اپنے اتحاد کو نظر انداز کر کے البستان، ملطیہ Malatya، بیہسنی Behisni، کتہہ Kahta اور دیورگی Divrigi فتح کر لیے۔ مارشل Boucicaut کا ترکی ساحلی علاقوں پر حملہ اور وہ فوجی جمعیت جو وہ اپنے ہمراہ قسطنطنیہ لایا تھا اس شہر پر دباؤ کم کرنے کے لیے کافی نہ تھی (۸۰۰ھ / گرما ۱۳۹۹ء [کذا؟ ۱۳۹۸ء])، لہذا مینوئل ثانی مزید اعانت حاصل کرنے کے لیے یورپ گیا (۱۰ ربیع الثانی ۸۰۲ھ / ۱۰ دسمبر ۱۳۹۹ء)۔

مشرقی اناطولیا میں نمودار ہوا اور اس کے (۸۹۶ھ / ۱۳۹۴ء میں) ایشیائے کوچک پر پہلے حملے کی طرح اس موقع پر بھی مغرب (یعنی یورپ) والوں کو بڑی بڑی امیدیں پیدا ہو گئیں۔ ۱۳۹۹ء سے تیمور چنگیزخانیوں کے نمائندے کی حیثیت سے اناطولیہ کے تمام فرمانرواؤں پر اپنے حاکمانہ اقتدار کا دعوے دار رہا تھا، جبکہ بایزید ان علاقوں میں سلجوقیوں کا وارث ہونے کا دعویٰ رکھتا تھا۔ تیمور کو پہلے سلطان پر حملہ کرنے میں تامل رہا، مگر اس نے ان تمام اناطولی حاکموں کو جنہیں بایزید نے نکال دیا تھا اپنے ہاں پناہ دے دی، جس کے جواب میں بایزید نے قرہ یوسف اور احمد جلائر کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ اس نے تیمور کو مضطرب کر دیا اور اس نے (۸۰۲ھ / ۱۴۰۰ء) کو سیواس پر قبضہ کر کے اسے تاراج کر ڈالا۔ بایزید نے اس کے انتقام میں امیر ارزنجان مطہرتن نامی کو قید کر لیا، جو تیمور کے زیر حمایت تھا۔ بالآخر ۲۷ ذی الحجہ ۸۰۴ھ / ۲۸ جولائی ۱۴۰۲ء کو انقرہ کے قریب چوبوق اووسی Chbuk-Ovasi کے مقام پر تیمور اور بایزید ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ تیمور نے بایزید کو شکست دے کر گرفتار کر لیا اور اس نے آق شہر کے مقام پر قید کی حالت ہی میں وفات پائی (۱۳ شعبان ۸۰۵ھ / ۸ مارچ ۱۴۰۳ء)۔ اس طرح بایزید کی بعجلت قائم کردہ سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اناطولی والیان ریاست نے، کہ انہوں نے اپنے علاقے دوبارہ حاصل کر لیے تھے (۸۰۴ھ - ۱۴۰۲ء)، نیز عثمانی سلاطین نے، جنہوں نے باقی ماندہ ملک کو باہم تقسیم کر لیا تھا، تیمور کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد محمد ثانی کے عہد حکومت تک آل عثمان نے مشرق میں کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا۔

مرکزی عثمانی حکومت کی بنیاد رکھنے کا

۵۸۵۶ / ۱۳۵۲ء یا ۵۸۵۷ / ۱۳۵۳ء بتلاتے ہیں)۔ اپنے والد محمد ثانی کی زندگی میں وہ صوبہ اماسیہ کا والی تھا۔ وہ آق قویونلو ترکمانوں کے سردار اوزون حسن کے خلاف جنگ میں شریک رہا اور ۵۸۷۸ / ۱۳۷۳ء کی اوتلوق بلی کی لڑائی میں موجود تھا۔ ۵۸۸۶ / ۱۳۸۱ء میں محمد ثانی کی وفات کے بعد اس میں اور اس کے چھوٹے بھائی چیم کے درمیان، جو اس وقت قرہمان کا والی اور قونیہ میں سکونت رکھتا تھا، تخت کے لیے کشمکش شروع ہوئی۔ بینی چری فوج اور باب عالی کے اعلیٰ عہدہ داروں کی ایک طاقتور جماعت کی اعانت سے تخت بایزید کو مل گیا۔ چیم نے بینی شہر Yeni-Shehir کے نزدیک ربیع الثانی ۵۶۸۶ / جون ۱۳۸۱ء میں شکست کھائی اور پہلے شام اور پھر مصر چلا گیا۔ وہاں اس نے مملوک سلطان قایت بای کی رضامندی سے نئی فوج جمع کی لیکن انقرہ اور قونیہ کے خلاف بے نتیجہ معرکہ آرائی کے بعد کامیابی سے مایوس ہو کر اس نے جمادی الآخرہ ۵۸۸۷ / جولائی ۱۳۸۲ء کو رودس Rodes میں سینٹ جان کے صلیبی جنگ آزماؤں (Knights) کے ہاں پناہ لی، جنہوں نے اسی سال ستمبر میں اسے فرانس بھجوا دیا۔ اس وقت سے اس بد نصیب شاہزادے کی موت (فروری ۱۳۹۵ء) تک ترکوں کو برابر یہ خدشہ دامن گیر رہا کہ مسیحی حکومتوں کا کوئی وفاق چیم کو اپنا آئڈ کار بنا کر ان کی سلطنت پر حملہ کر دے گا۔ جب تک چیم زندہ رہا بایزید اپنی فوجوں کو مشرق یا مغرب کی کسی بڑی مہم میں اس طرح الجھانے کا خطرہ مول نہ لے سکا کہ جہاں سے انہیں واپس لانا دشوار ہو۔

ہرزے گوینا Herzegovina ۵۸۸۸ / ۱۳۸۳ء میں پوری طرح سے عثمانی اقتدار کے ماتحت آ گیا۔ درہائے ڈینیوب کے دہانے پر قلعہ کلیہ اور درہائے نیستر Dniester کے دہانے کا قلعہ آق کرمان ۵۸۸۹ /

سہرا بایزید ہی کے سر ہے۔ یہ نظام "قول" اور نظم و نسق کے ان روایتی طریقوں پر مبنی تھا جن کی تکمیل مشرق وسطیٰ میں مسلم ترکوں کے ہاتھوں ہوئی۔

مآخذ: (۱) عثمانی مؤرخین (احمدی، شکر اللہ، اورج، انوری، عاشق پاشازادہ، روحی، نشری، گننام مصنف: تواریخ، ہشت بہشت، کمال پاشازادہ) کے لیے دیکھیے: Fr. Babinger، در GOW: (۲) ابن حجر العسقلانی: انباء الأئمرا، اقتباسات در AUDTC، فاکولتہ سی درگیسی Fakultesi Dergisi، جلد ششم، عدد ۳ تا ۵: (۳) تاریخی تقویملر Tarihi Takvimler، طبع O. Turan، انقرہ ۱۹۵۴ء: (۴) عزیز استر آبادی: بزم و رزم (طبع کواپرونلو F. Köprülü)، استانبول ۱۹۲۸ء: (۵) The Bondage and Travels: J. Schiltberger ترجمہ Telfer، لندن ۱۸۷۹ء: (۶) S. Stanojević: Die Biographie Stefan Lazarevic's von Konstantin Archivf. Slav. Phil. ۱۸: ۹: ۱ تا ۲۲۸: (۷) P. Wittek: Das Fürstentum Mentesehe، استانبول ۱۹۳۴ء: (۸) M. Silberschmidt: Das orientalische Problem ... لائپزگ۔ برلن ۱۹۲۳ء: (۹) F. Dölger: Johannes VII: در BZ، ۱: ۲۱ تا ۳۶: (۱۰) R. J. Loenertz: Pour l'histoire du Peloponèse au XIV siècle، در REB، ۱: ۱۵۲ تا ۱۹۶: (۱۱) A. S. Atiya: The Crusade of Nicopolis، لندن ۱۹۳۸ء: (۱۲) M. M. Alex.: La campagne de Timur en Anatolie، بخارست ۱۹۴۲ء: (۱۳) خلیل ینانچ M. Halil Yinanç، در ژوا، ت (بذیل مادہ)۔

(HALIL INALCIK)

بایزید ثانی: عثمانی سلطان (۵۸۸۶ / ۱۳۸۱ء تا ۵۹۱۸ / ۱۵۱۲ء)، غالباً سوال یا ذوالقعدہ ۵۸۵۱ / دسمبر ۱۳۴۷ء یا جنوری ۱۳۴۸ء میں پیدا ہوا (مگر بعض مآخذ اس کی تاریخ پیدائش



۱۳۸۳ء کے موسم گرما کی مولداویہ Moldavia کی مہم کے دوران میں بایزید نے لے لیا اور یہ کامیابی اس کے لیے خاصی اہمیت رکھتی تھی، کیونکہ اس سے کریمیا (قرم) کو جانے والی خشکی کی راہ پر، جہاں تاتار خاں سلطان کے باج گزار کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا، عثمانی اقتدار مضبوط ہو گیا۔ لیکن ترکوں کے لیے ان کی ۱۳۸۵ء تا ۱۳۹۶ء کی مصر اور شام کے مملوکوں کے خلاف جنگ میں جو واقعات پیش آئے ان کا نتیجہ اتنا خوش گوار نہ نکلا۔ یہ جنگ اس امر کا فیصلہ چکانے کے لیے لڑی گئی تھی کہ حریف حکومتوں میں سے کون سلیشیا اور اس کے متصل کوهستان طارس کے سرحدی اقطاع پر اپنا اقتدار قائم رکھے۔ میدان جنگ میں آل عثمان کو بہت سی ہزیمتیں اٹھانا پڑیں۔ ان میں سب سے زیادہ سخت رمضان ۱۳۸۸ء / اگست ۱۳۸۸ء میں آدنبہ کے قریب اغا چائری کی شکست تھی۔ ۱۳۹۱ء / ۱۳۹۶ء میں ایک صلح نامہ لکھا گیا، جو درحقیقت اس بات کی علامت تھی کہ سلیشیا پر مؤثر اقتدار حاصل کرنے میں عثمانی ناکام رہے۔ بائیں ہمہ یہ امر پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس وقت تک جم زندہ تھا اور عیسائیوں کے ہاتھوں میں اسیر، اس لیے بایزید اس جنگ میں اپنے تمام وسائل کے استعمال میں آزاد نہ تھا اور اسی لیے اس نے یہ لڑائی صرف چند محدود مقاصد کے پیش نظر شروع کی تھی۔ مزید برآں ۱۳۹۶ء / ۱۳۹۱ء میں بعض فتوحات کے حاصل کر لینے کے باوجود مملوکوں کے لیے بھی سرحد طارس کے حالات کسی طرح بھی اس سے زیادہ سازگار نہیں ہوئے جتنے کہ چھ سال پہلے تھے۔ دریاے ڈینیوب کے کنارے اور بوسنیا کی سرحدوں پر اس مسلم جنگجو کی عیسائی سرحدی حکمران کے ساتھ غیر مختتم آویزش آخر کار

۱۳۹۲ء / ۱۳۹۵ء میں پوری شدت کے ساتھ بھڑک اٹھی۔ عثمانی مجاہدوں نے دریاے ڈینیوب اور ساوا Sava کے پار آسٹریا کے اندر سٹی ریا Styria، کارنیالا Carniola اور کارنتھیا Carinthia کی ریاستوں پر کثیر فوجوں سے تاختیں کیں۔ ۱۳۹۲ء میں وِلاچ Villach کے مقام پر انہیں شکست ہوئی لیکن اس کے برعکس ۱۳۹۳ء / ۱۳۹۸ء میں ادبنہ Adbina کے مقام پر کروٹیا افواج کا انہوں نے قریب قریب صفایا کر دیا۔ ہنگری والوں کے ساتھ تین سال کے لیے عارضی صلح سے ۱۳۹۵ء / ۱۳۹۰ء میں ان آویزشوں کا خاتمہ ہوا، لیکن اب سلطنت عثمانیہ اور پولینڈ میں لڑائی شروع ہو گئی۔ عثمانی ترک اور قرم تاتاری گویا ایک ایسی سد سکندری بن گئے تھے جس نے اہل پولینڈ پر بحیرہ اسود تک پہنچنے کی راہ مسدود کر رکھی تھی۔ پولینڈ نے ۱۳۹۲ء / ۱۳۹۰ء میں ایک مہم کا آغاز کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ کلیا Kilia اور آق کرمان پر قبضہ کر کے اور مولداویا کو پولینڈ کی ایک باج گزار ریاست بنا کر اس سد کو توڑ دیا جائے؛ مگر مولداوی فوجوں نے عثمانی بیگوں کی مدد سے نشیبی ڈینیوب کے کنارے کنارے کامیاب مزاحمت کی۔ اہل پولینڈ قلعہ سکیوا Suceava کے سامنے پسپا ہوئے اور اس پسپائی کے دوران میں انہوں نے بکووینا Bukovina کے صوبے میں Kozmin کے مقام پر شکست فاش کھائی (اکتوبر ۱۳۹۷ء)۔ دریاے ڈینیوب کے علاقے کے عثمانی غازیوں نے اب ۱۳۹۸ء کے موسم گرما میں مولداوی اور تاتاری رسالوں کی کمک سے پوڈولیا Podolia اور گالیشیا Galicia کے بہت سے علاقوں کو بالکل تاراج کر دیا، لیکن اسی سال کے موسم خزاں کے اواخر میں گالیشیا کے خلاف ایک یورش کاڑپیتھیا کے پہاڑوں پر شدید برف باری کے دوران میں تباہی پر منتج ہوئی۔

Zanto میں اپنے توپ خانے کی پناہ لینی پڑی تھی، تو محرم ۵۹۰۰ / اگست ۱۳۹۹ء میں اس نے ترکوں کے آگے ہتیار ڈال دیے۔ اسی اثنا میں بوسنیا کے سرحدی مجاہدین نے فری اولی Friuli کے علاقے میں ایک عظیم یلغار شروع کر دی اور جب لیپانٹو کی تسخیر کے بعد انہیں مزید کمک مل گئی تو انہوں نے وینس کے علاقے میں Vicenza تک تاخت و تاراج کی۔ موریا میں موڈن Modon، کورن Coren اور نیورنیو Navarino نے ۵۹۰۶ / ۱۵۰۰ء میں ترکوں کے سامنے ہتیار ڈال دیے۔ نیز دورازو Durazzo نے، جو بحر ایڈریاٹک کے ساحل پر ہے، ۵۹۰۷ / ۱۵۰۱ء میں اطاعت قبول کر لی۔ اہل وینس نے جب جنگ کے اخراجات بہت بڑھتے دیکھے تو انہوں نے ۵۹۰۸ / ۱۵۰۲ء میں صلح کی خواہش کی اور آخری معاہدے میں، جو ۵۹۰۹ / ۱۵۰۳ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا، وہ لیپانٹو، موڈن، کورن، نیورنو Navorno اور ڈرازو Durazzo سے بالکل دست بردار ہو گئے۔ اس جنگ کے نتائج سے بایزید بجاطور پر نہایت مطمئن ہو سکتا تھا، کیونکہ اسے موریا میں اور بحیرہ ایڈریاٹک کے ساحلوں پر خاصے وسیع علاقے مل گئے اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ اس جنگ سے یہ حقیقت اور بھی واضح ہو گئی کہ اب ترک سمندر پر بھی ایک زبردست قوت کے مالک ہو گئے ہیں۔

۵۹۰۹ / ۱۵۰۳ء تا ۵۹۱۸ / ۱۵۱۲ء کے برسوں میں مشرق میں ایک عظیم بحران رونما ہوا۔ اسمعیل نے، جو صفویہ نام کے مذہبی فرقے کا پیشوا تھا، ۹۰۳ - ۵۹۰۵ / ۱۳۹۹ء میں فتوحات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا، جس سے وہ بہت جلد تمام ایران کا مالک ہو گیا۔ صفوی ایک عرصے سے ایشیائے کوچک کے ترکمان قبائل میں شیعیت کی زبردست تبلیغ کر رہے تھے اور یہ تبلیغ اس حد تک

بہر حال پولینڈ نے اپریل ۱۳۹۹ء میں مولداویا کے ساتھ صلح کر لی۔ اس معاہدے کے تھوڑے دن بعد ہی ترکوں اور پولینڈ والوں کے مابین بھی ان کے سابقہ معاہدہ صلح کی تجدید ہو گئی۔ مملوکوں کے خلاف جنگ میں ناکامیوں سے دوچار ہونے کے بعد بایزید نے اپنی افواج کو زیادہ مفید و کارآمد اور ان اسلحہ سے جو اب تک میسر تھے مسلح کرنے کا فیصلہ کیا، اس کے ساتھ ہی زیادہ مستعد اور قابل سپاہیوں کا زیادہ سریع حرکت توپ خانہ تیار کرنے کی کوشش کی۔ مزید برآں ترکی بیڑے کی قوت اور تعداد بڑھانے کی مساعی بھی کی گئیں، چنانچہ بحیرہ ایجین اور بحیرہ ایڈریاٹک کی بندرگاہوں میں بہت سے جنگی جہازوں کی تعمیر شروع کر دی گئی۔ دراصل ایک نئی جنگ سروں پر منڈلا رہی تھی، جس میں ان اسلحہ کی افادیت اور سلطان کی بحری افواج میں کثیر افزائش کی بھی آزمائش ہونے والی تھی۔ موریا، البانیا اور ڈالمیشیا Dalmatia کے ساحلوں پر مقبوضات غیر میں گھرے ہوئے وینس کے بعض علاقے تھے۔ ان علاقوں کی سرحدوں پر یونانی، کریٹی اور البانی اجیر سپاہیوں کے ساتھ، جو سائنوریا Signoria کی ملازمت میں تھے، ترک غازیوں کی چپقلش ہوتی رہتی تھی۔ لڈھر آئے دن سمندروں میں بعض ناگوار واقعات بار بار پیش آ جاتے تھے۔ ان سب امور نے بایزید کو ۵۹۰۳ / ۱۳۹۹ء میں وینس کے خلاف اعلان جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔ اس فیصلے کا محرک یہ امر بھی ہوا کہ ۱۳۹۵ء میں جم کی موت کے بعد سے باب عالی کے بڑے بڑے عہدہ دار عیسائیوں کے خلاف زیادہ جارحانہ روش اختیار کرنے کے لیے بایزید پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ شہر لیپانٹو Lepanto کو جب سمندر کی طرف سے کسی کمک کی امید نہ رہی، کیونکہ وینس کے بیڑے کو ہسپا ہو کر زانطا



تیغ کر دینا چاہیے، ایک سن رسیدہ سلطان کے فرزندوں پر یہ الم ناک مجبوری عائد ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے باپ کی وفات پر یا اس سے پیشتر ہی جنگ کے لیے تیار ہو جائیں۔ ۵۸۸۶ء / ۱۳۸۱ء تا ۵۸۸۷ء / ۱۳۸۲ء میں بایزید اور جم میں باقاعدہ جنگ رہی۔ اب اسی قسم کے نزاع کا فیصلہ والی اماسیہ احمد اور دور افتادہ صوبہ طرابزون کے حاکم سلیم کے درمیان ہونا تھا (قورقود کو، جو بایزید کے تین باقی ماندہ بیٹوں میں سے بڑا تھا، باب عالی میں بہت کم مقبولیت حاصل تھی اور آئندہ پیش آنے والے واقعات میں اس کا حصہ بہت غیر اہم سا تھا)۔ سلیم طرابزون سے ۵۹۱۶ء / ۱۵۱۱ء میں بحری راستے سے کریمیا میں کفہ کے مقام پر آیا اور تاتار خاں کی تائید حاصل کر کے اپنی فوجوں کو دریائے ڈینیوب سے پار لے آیا۔ پھر اس نے اپنے والد سے بلقان کے ایک صوبے کی حکومت کا مطالبہ کیا۔ بایزید نہیں چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کے خلاف میدان جنگ میں اترے، نیز وہ ایشیائے کوچک میں شاہ قلی کی بغاوت سے پریشان تھا، لہذا اس نے اپنے بیٹے کی خواہش کو بادل ناخواستہ قبول کر لیا اور ایک باضابطہ عہد نامے کے ذریعے سے سمندریہ کے بڑے سرحدی صوبے کی حکومت اسے عطا کر دی۔ اس اطلاع سے کہ وزیر اعظم علی پاشا کو، جو احمد کے دعویٰ تخت کا حامی تھا، بنی چری فوج کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ بغاوت فرو کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، سلیم کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو گیا کہ اگر شاہ قلی شکست کھا گیا تو ممکن ہے علی پاشا احمد کو تخت نشین کرنے کی دلیرانہ کوشش کرے۔ سلیم نے اب ادرنہ کی طرف کوچ کیا، جہاں اس وقت اس کا باپ مقیم تھا۔ بایزید نے استانبول کی طرف مراجعت کی مگر پھر چورلی Çorlu کے قریب

کامیاب ہوئی کہ ایران کی جدید حکومت کی فوجوں میں بکثرت سپاہی انہیں قبائل میں سے لیے گئے تھے۔ اس سے انہیں یہ سنگین سیاسی خطرہ پیدا ہوا کہ اگر صفویوں کو اپنے اثر و نفوذ کو مزید بڑھانے کا موقع دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا تھا کہ ایشیائے کوچک کے بڑے بڑے علاقے ترکوں کی اطاعت سے نکل کر ایرانیوں کے زیر نگیں ہو جائیں گے۔

بایزید نے اس خطرے کو بھانپ کر ۹۰۷ - ۵۹۰۸ / ۱۵۰۲ء میں بہت سے عناصر کو ایشیائے کوچک سے موریا کے جدید فتح کردہ علاقوں میں منتقل کر دینے کا حکم دے دیا۔ جب ۵۹۱۳ / ۱۵۰۷ - ۱۵۰۸ء میں شاہ اسمعیل نے، جو اس وقت علاء الدولہ والی البستان سے برسریکار تھا، دیار بکر اور کردستان کے بڑے بڑے علاقوں پر قبضہ کر لیا تو بایزید نے اپنی مشرقی سرحد پر بھی بڑی تعداد میں فوجیں متعین کر دیں۔ اس وقت کی صورت حال کی نزاکت کا کچھ اندازہ ۵۹۱۷ / ۱۵۱۱ء کی اس عظیم بغاوت سے ہو سکتا ہے جو تکہ Tekke میں برپا ہوئی۔ تکہ ایشیائے کوچک کا علاقہ اور ایک عرصے سے مخالفانہ عقاید کا مرکز مشہور تھا۔ باغی کوتاہیہ کو لوٹنے کے بعد بروسہ کی طرف بڑھے، لیکن اپنے سے اعلیٰ فوجی طاقت کے مقابل پسپا ہوئے اور قیصری اور سیواس کے درمیان ۵۹۱۷ / ۱۵۱۱ء کے موسم گرما میں شکست فاش کھائی۔ اسی لڑائی میں ترکی کا وزیر اعظم علی پاشا اور باغیوں کا سردار شاہ قلی دونوں کھیت رہے۔

ادھر اسی زمانے میں خود سلطنت عثمانیہ خانہ جنگی کے کنارے پہنچ گئی۔ اس معمول کی بدولت کہ نئے سلطان کو سریر آراء سلطنت ہوتے ہی اپنے سب بھائیوں اور ان کی اولاد نرینہ کو تہہ

پسند کیا تھا، لیکن وہ اپنی منزل مقصود کی طرف جا رہا تھا کہ راستے ہی میں ۱۰ ربیع الاول ۹۱۸ھ / ۲۶ مئی ۱۵۱۲ء کو وفات پا گیا۔

مآخذ: (۱) عثمانلی تاریخی دستاویزات، مثلاً

(۱) *Die altosmanischen anonymen Chroniken*

طبع F. Giese، Breslau ۱۹۲۲ء (قب نیز

Abb. K. M.، جلد ۱۷، عدد ۱، لائپزگ ۱۹۲۵ء؛

(۲) عاشق پاشا زادہ: تاریخ، طبع F. Giese،

لائپزگ ۱۹۲۹ء؛ (۳) نشری Neshri: جہان نما،

طبع R. Unat و M. A. Köymen، انقرہ ۱۹۳۹ء،

طبع F. Taeschner Bde، جلد ۱ و ۲ لائپزگ

۱۹۵۱ء، ۱۹۵۵ء؛ (۴) ادریس بتلیسی: ہشت بہشت؛

(۵) ابن کمال (یعنی کمال پاشا زادہ): تاریخ آل

عثمان، دفتر ۲، طبع شرف الدین توران، انقرہ ۱۹۵۳ء

(Transkripsiyon) [لاطینی حروف میں] طبع شرف الدین

توران، انقرہ ۱۹۵۷ء، قب وہی کتاب، جز ۲۲ و اشاریہ

بذیل مادہ بایزید؛ (۶) علی: گنہ الاخبار؛ (۷)

سعد الدین: تاج التواریخ، استانبول ۱۲۷۹-۱۲۸۰ء

قب عمومی طور پر ان مؤرخین کو جنہوں نے بایزید ثانی

کی حکومت کا تذکرہ کیا ہے: (۸) F. Babinger: Die

*Geschichtsschreiber der Osmanen und ihre*

*Werke*، لائپزگ ۱۹۲۷ء۔

(ب) سولہویں اور سترہویں صدی کے مغربی مآخذ،

مثلاً (۹) *Historia Turchesca*: Donado da Lezze

(۱۳۰۰ تا ۱۵۱۳ء)، طبع I. Ursu، Bucharest ۱۹۰۹ء؛

(۱۰) *I Cinque Libri della Legge*: G. A. Menavino

*Religione, et Vita de, Turchi*، وینس ۱۵۳۸ء، فلورنس

*Historiarum Sui Tem-*: P. Giovio (۱۱)؛ ۱۵۵۱ء

*poris Libri*، جلد ۳۵، فلورنس ۱۵۵۰-۱۵۵۲ء، پیرس

*Petit Traicté*: T. Spandugino (۱۲)؛ ۱۵۵۸-۱۵۶۰ء

*de l'Origine des Turcqz*، طبع C. Schefer، پیرس ۱۸۹۶ء

(قب نیز *Documents Inédits Relatifs*: C. Sathas

المراش یرسی Ughrāsh deresi کے مقام پر ڈٹ گیا۔

ینی چری اگرچہ سلیم کی طرف مائل تھے لیکن وہ

بوڑھے سلطان کے وفادار رہے۔ یہاں ۸ جمادی الاولیٰ

۹۱۷ھ / ۳ اگست ۱۵۱۱ء کو ان کا فین سپہگری

اور نظم و ضبط سلیم کے تاتاری سواروں کو شکست

دینے میں کامیاب ہوا اور خود شاہزادہ (سلیم)

میدان سے فرار ہو کر کریمیا میں پناہ گزین

ہو گیا۔

ادھر شاہ قلی کی ہزیمت کے بعد احمد اس امید

کے ساتھ استانبول کی طرف بڑھا کہ وہ آبنائے (باسفورس)

کو عبور کر کے اپنی تخت نشینی کو یقینی بنا لے گا،

مگر جمادی الاولیٰ ۹۱۷ھ / اگست ۱۵۱۱ء میں

دارالسلطنت میں یینی چری فوج کے فسادات نے

باب عالی میں احمد کے حامیوں کو ڈرا دیا۔ احمد

نے یہ دیکھ کر کہ یینی چری نے اس طرح سلیم کی

طرفداری کا اور احمد کو اپنا سلطان نہ تسلیم

کرنے کا اعلان کر دیا ہے ایشیائے کوچک کا بڑا

حصہ اپنے زیر نگین کرنے کے لیے فوجی قوت

استعمال کی، اور اس کا یہ طرز عمل اپنے والد کے خلاف

کھلم کھلا بغاوت کے مترادف تھا۔ اس کا

نتیجہ یہ نکلا کہ سلطان، سلیم کو کفہ سے واپس

بلانے اور سمندریہ کا صوبہ دوبارہ اس کے حوالے کر

دینے پر رضامند ہو گیا۔ پھر بھی باب عالی میں یہ

خدشہ بڑھتا رہا کہ احمد ایزان کی حکومت سے

سمجھوتا کر لے گا۔ اس خوف اور اس کے ساتھ

ینی چری فوج کے اس مطالبے نے کہ احمد کے

خلاف مہم میں، جواب ناگزیر ہو گئی تھی، سلیم

ان کی قیادت کرے واقعات کا فیصلہ اور بھی جلد

رونا ہو گیا۔ صفر ۹۱۸ھ / اپریل ۱۵۱۲ء میں

بایزید، سلیم کے حق میں تخت سے دست برداری

کے لیے مجبور ہو گیا۔ بوڑھے سلطان نے اپنے مولد

دستو تکہ Demotika میں عزت نشین ہو جانا



: A. Bombaci (قب نیز ۱۰۸ تا ۵۸ : ۱۹۵۲ :  
 Il "Liber Graccus," un cartolario veneziano  
 comprendente inediti documenti ottomanni in Greco  
 (1481-1504) ، در Westöstliche Abhandlungen ، طبع  
 Wiesbaden ، F. Meier (۱۹۵۳ ، ص ۲۸۸ تا ۳۰۳) -  
 مزید معلومات کے لیے دیکھیے : (۲۳) H. A. von Burski  
 Kemāl Re'is: ein Beitrag zur Geschichte der türkischen  
 Flotte ، Bonn ، V. Čorović (۱۹۲۸ : ۲۵)  
 Der Friedensvertrag zwischen dem Sultan Bayazid  
 II und dem König Ladislaus II ، در ZDMG ، ۹۰ ،  
 (= Neue Folge) ، جلد ۱۵ : لانیزگ (۱۹۳۶) : ۵۲  
 تا ۵۹ : (۲۶) S. N. Fisher Civil Strife in the  
 Ottoman Empire 1481-1503 ، در The Journal of  
 Modern History ، ۱۳ ، شکاگو ، ۱۹۴۱ : ۴۴۸  
 تا ۴۶۶ ، نیز The Foreign Relations of  
 Turkey 1481-1512 ، در Illinois Studies in the Social  
 Sciences ، جلد ۳ ، عدد ۱ ، Illinois (Urbana) ، ۱۹۴۸ :  
 (۲۷) G. Vajda Un Bulletin de Victoire de  
 Bajazet II ، در JA ، ۲۳۶ ، پیرس ، ۱۹۴۸ :  
 تا ۸۷ : (۲۸) F. Babinger Vier Bauvorschläge  
 Leonardo da Vinci's an Sultan Bajezid II (1502-  
 1503) ، در Nachr. Akad. Wiss. Göttingen, Phil.-Hist.  
 Kl. ، ۱۹۵۲ ، ص ۱ تا ۲ ، نیز Zwei diplomatische  
 Zwischenspiele im deutsch-osmanischen Staatsverkehr  
 unter Bajezid II (1497 und 1504) ، در Westöstliche  
 Abhandlungen ، طبع Wiesbaden ، F. Meier ، ۱۹۵۳ ،  
 ص ۳۱۵ تا ۳۳۰ : (۲۹) The New Cambridge  
 Modern History ، ج ۱ (The Renaissance) ، ۱۹۹۳ ،  
 تا ۱۵۲۰ ، کیمرج ، ۱۹۵۷ ، باب ۱۳ : ۳۹۵ تا  
 ۴۱۰ : (۳۰) O. Górka Nieznany Zywoł Bajezida  
 II ... (Une biographie inconnue de Bayezid II  
 comme source historique pour l'expédition vers la

à l'Histoire de la Grèce au Moyen Âge  
 جلد ۹ ،  
 Annales : J. Leunclavius (۱۳) : (۱۸۹۰)  
 ، فرنکفورٹ ، Sultanorum Othmanidarum  
 Historiae Musuimanae Turcorum و ۱۵۹۶  
 فرنکفورٹ ، E. Alberi (۱۴) : ۱۵۹۱ :  
 degli Ambasciatori veneti al Senato  
 Relazione de Andrea Gritti : ۱۸۵۵ :  
 ، فلورنس ، I. Diarii : M. Sanuto (۱۵) :  
 ، طبع Barozzi ،  
 Berchet ، Fulin ، Stefani ، وینس ، ۱۸۷۹-۱۹۰۳ :  
 دیکھیے : (۱۶) Γ. Θ. ΖΩΡΑΣ, ΧΡΟΝΙΚΟΙ ΠΕΡΙ  
 ΤΩΝ ΤΟΥΡΚΩΝ ΣΟΥΛΤΑΝΩΝ (Κατὰ τὸν  
 βαρβερινὸν ἑλληνικὸν Κώδικα iii  
 ص ۱۲۳ تا ۱۳۰ .

(ج) سلطنت عثمانیہ کی جدید مستند تاریخیں :  
 (۱۷) Hammer-Purgstall ، ۲ ، Pest ، ۱۸۲۸ :  
 تا ۲۵۰ : (۱۸) J. W. Zinkeisen ، ۲ ،  
 Gotha ، ۱۸۵۳ ، ۴۷۳ تا ۵۶۶ : (۱۹) N. Lorga  
 ، ۲ ، Gotha ، ۱۹۰۹ : ۲۳۱ تا ۳۱۳ : (۲۰)  
 اوزون چارشیلی I. H. Uzunçarşılı : عثمانی تاریخ  
 Osmanli Tarihi ، ۲ ، انقرہ ، ۱۹۴۹ : ۱۵۵ تا  
 ۲۴۲ - بایزید ثانی کے عہد حکومت کی دستاویزات ان  
 میں دستیاب ہیں : (۲۱) F. Kraelitz Osmanische  
 Urkunden in türkischer Sprache aus der zweiten des  
 15. Jahrhunderts ، در SBAk Wien, Phil.—Hist. Kl. ،  
 Bd. ۱۹۷ ، ۳ ، وی انا ، ۱۹۲۱ : (۲۲) P. Lemerle  
 و P. Wittek Recherches sur l'histoire et le statut  
 des monastères athonites sous la domination  
 turque ، در Archives d'Histoire du Droit Oriental  
 Wetteren ، ۱۹۴۸ ، ۳ : ۴۲۰ تا ۴۳۲ : (۲۳)  
 Srpska Akademija Turshi Spomenici : G. Elezović  
 سلسلہ اول ، ۱/۱ ، بلگراد ، ۱۹۳۰ : ۱۸۷  
 تا ۵۵۵ (اعداد ۵۶ تا ۱۵۱) ، و ۱/۲ ، بلگراد

چلے گئے۔ مغلوں کی سیادت کے قیام سے خوف زدہ ہو کر بایزید کے خاندان کے لوگ (تقریباً ۱۵۳۶ء / ۱۵۲۹ء میں) نواح بہار کی جانب فرار ہو گئے اور وہاں سے ایک فافلے کے ہمراہ کانی گورم (گرم) وزیرستان چلے گئے۔ عبداللہ، جن کی ایک دوسری بیوی سے بھی اولاد تھی، اب اپنی بیوی ایمنہ سے کچھ بیزار سے ہو گئے اور اسے طلاق دے دی۔ اس وقت بایزید کی عمر کوئی سات برس کی تھی۔ انہیں اب گھر کی زندگی وبال معلوم ہونے لگی اور رفتہ رفتہ ان کے تعلقات اپنے والدین اور سوتیلے بھائی سے عمر بھر کے لیے کشیدہ ہو گئے۔ گھر بار کے کام کاج کی دیکھ بھال اور تجارت وغیرہ کی مصروفیت کی وجہ سے ان کی ابتدائی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ تاہم جب کبھی بھی انہیں موقع ملتا وہ تھوڑا بہت مطالعہ کر لیتے تھے، اگرچہ یہ مطالعہ ہمیشہ ان علوم تک محدود رہتا جن کا تعلق عبادت الہی کے مسائل سے تھا۔ اب وہ صوفیانہ ریاضتوں اور دوسرے مذہبی فرائض کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے اور انہیں پابندی سے بجا لانے میں منہمک رہنے لگے، لیکن انہیں ہر طرف سے اپنے راستے میں رکاوٹ اور مزاحمت نظر آئی، کیونکہ ان کے والد نہ تو انہیں حج کرنے کی اجازت دیتے نہ کہیں اور جا کر مزید تعلیم حاصل کرنے کی اور نہ اس بات پر رضامند ہوتے کہ وہ کسی پیر کی بیعت کر لیں۔ جب ان کی عمر کوئی سولہ برس کی ہوئی تو ان کے والد انہیں اپنے ہمراہ کسی کارویاری سفر پر لے گئے۔ اس کے بعد بایزید نے کئی اور سفر کیے۔ انہیں سفروں کے دوران میں غالباً ان کی ملاقات اسمعیلی سلیمان سے ہوئی (تذکرہ، ورق ۸۲ ب)، کیونکہ اس کی تعلیم کے اثرات دوسری چیزوں کے علاوہ عقیدہ پیر کامل پر ضرورت سے زیادہ زور دینے اور تاویل کے

*Mer Noire et pour les invasions turques aux temps de Jean Albert*، در *Kwartalnik Historyczny*، ۵۲/۳، Lwów، ۱۹۳۸ء : ۳۵۰ تا ۳۲۷ : (۳۱)  
*Korvin Mathias (Mátyás) in : Tayyib Gökbilgin Bayzid II. e Mektuplari Tercümelere ve 1503 (909)*  
*Osmanle—Macar Muahedesinin Türkce Metni* در *Bellekten*، ۲۲، انقرہ، ۱۹۵۸ء : ۳۵۹ تا ۳۹۱۔  
 قب نیز (۱)، ت، بذیل مادہ بایزید ثانی (اوزون چریشلی (I. H. Uzunçarsili)؛ مزید برآں وہ ماخذ جن کی فہرست (۱)، باردوم، میں بذیل مادہ جم و سلیم اول میں دی گئی ہے (۱۵۱۲ء تک)۔

(V. J. PARRY)

بایزید انصاری : (= بایزید جیسا کہ ان کی مہر پر کندہ ہے، تذکرۃ الأبرار، ورق ۸۸ الف) پیر روشن (یا روشن) بن عبداللہ قاضی بن شیخ محمد، افغانوں کی ایک مذہبی اور قومی تحریک کے بانی، جنہیں بعض مغل مؤرخین حاجی ملا محمد کے تتبع میں، پیر تاریک لکھتے ہیں (تذکرہ، ورق ۹۲)۔ حاجی ملا محمد مذکور ملا زنگی کے نام سے مشہور اور پیر روشن کے سب سے بڑے مخالف اُخوند درویشہ کے استاد تھے، انہوں نے ہی سب سے پہلے انہیں یہ لقب دیا تھا۔ بایزید اپنے پانچویں جد سراج الدین کے واسطے سے اپنے آپ کو [مشہور صحابی] حضرت ابو ایوب انصاریؓ [رک بان] کی اولاد میں سے بتاتے تھے (ان کے اکیسویں جد امجد)۔ پیر روشن کی والدہ ایمنہ (دوسرے نام بہین، بین، مائر الامراء، ۲ : ۲۳۳)، ان کے والد کی یک جدی عمزاد بہن، الحاج ابوبکر جالندھری کی بیٹی تھیں۔ بایزید جالندھر میں ۱۵۳۱ء / ۱۵۲۵ء کے قریب بابر کی سلطنت کے قیام سے ایک سال قبل پیدا ہوئے۔ ابھی وہ چالیس دن کے بھی نہ تھے کہ ان کے والد اپنے آبائی شہر کانی گورم (گرم) (وزیرستان)



برس میں لگے تو انہیں ہاتھ نے ندا دی کہ اب انہیں طہارتِ شرعی کو ترک کر دینا چاہیے، اور مسلمانوں کی نماز کی جگہ انبیا کی نماز پڑھنا چاہیے (حال، ص ۹۴)۔ [حال نامہ میں ہمیں یہ بات اس طرح نہیں ملتی، اس کے برعکس بایزید نے مقصود المؤمنین میں لکھا ہے کہ شریعتِ درخت کی چھال کی مانند ہے اور درخت کی بقا چھال کے بغیر ناممکن ہے، ص ۱۴۴، نسخہ کتب خانہ جامعہ پنجاب (میر ولی مسعود)۔]

اب وہ اور سب کو مشرک و منافق سمجھنے لگے اور چلہ کشی شروع کر دی، نیز اب اور لوگوں میں تبلیغ کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ وہ ایک قافلے کے ساتھ ہندوستان جا رہے تھے لیکن قندھار ہی سے اپنے گھر واپس آ گئے۔ یہاں انہوں نے زمین دوز ایک حجرہ تعمیر کرایا، جس میں انہوں نے شروع میں اپنی بیوی اور چند دوسرے افراد سے چلہ کشی کرائی۔ اس کے بعد انہیں علانیہ طور پر تبلیغ کرنے کا حکم ملا۔ ان کے اپنے اور چند دیگر افراد کے خوابوں کی بنا پر لوگ انہیں ”میاں روشن“ کہنے لگے۔ انہیں بہت کچھ مقامی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، جس میں ان کے والد اور والد کے شاگردوں نے نمایاں حصہ لیا؛ وہ کہتے تھے کہ ناقص علم کے ساتھ کلامِ الہی کی تفسیر و تاویل کا انہیں کوئی حق نہ تھا، اگرچہ وہ ان کی غیر معمولی ذہانت، اور مباحثوں میں زور دار منطق کے معترف و مداح تھے۔ اسی طرح وہ ان کے دعوائے مہدویت و الہام ربّانی پر بھی معترض تھے [بایزید نے خود اس بات کی تردید کی ہے کہ وہ مہدی ہیں اور یہ تردید اس مباحثے کی سرگزشت میں موجود ہے جو ان کے اور کابل کے قاضی خاں کے درمیان ہوا تھا (میر ولی مسعود)] اور دوسرے مسلمانوں کو کافر یا منافق کہنے پر بھی ان کی مذمت کرتے تھے، لیکن وہ ان کے

بکثرت استعمال میں، مثلاً ارکانِ خمسہ، غسل وغیرہ کی بحث میں، جو بعض حروفی عقائد میں پایا جاتا ہے، دیکھے جاسکتے ہیں (دیکھیے حال، ص ۲۱۶، بعد، ۹۱، بعد، ۲۵۷)۔ تذکرہ میں بایزید کے جوگیوں کی صحبت میں رہنے کا بھی ذکر ہے، جن سے انہوں نے تناسخِ ارواح (آواگون) اور حلول (اوتار) کے عقائد سیکھے۔ حال نامہ میں تو اس کا کوئی واضح ذکر نہیں ہے لیکن اگر جالندھر کے انصاریوں کی بات پر یقین کیا جائے کہ بایزید خود وہ وحید ہیں جس نے شلوک مرتب کیے تھے (دیکھیے اونکارناتہ: ”وحید جی دے شلوک“ لاہور، بدون تاریخ) تو انہیں ہندوؤں کے لوک گیتوں کا اچھا خاصا علم تھا اور حال کے مؤلف کے بعض اشعار (ص ۵۰۲، بعد) یا تو براہ راست شلوکوں کے اثرات کا نتیجہ ہیں اور یا خیرالبیان کے توسط سے۔ [اخوند درویش کا یہ قول کہ بایزید ہندوستان گئے اور وہاں سلیمان اسمعیلی سے ملاقات کی، جس نے انہیں کافر مطلق بنایا اور یہ کہ وہ جوگیوں کی صحبت میں رہے، جنہوں نے ان کے دل میں عقیدہ تناسخِ الارواح بٹھایا درست نہیں ہوتا (میر ولی مسعود)۔]

مذکورہ بالا سرگرمیوں کے ساتھ ہی ساتھ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ خود ہی ”پیر کامل“ ہیں۔ اور انہیں خواب نظر آنے لگے جن میں سے ایک خواب میں انہوں نے حضرت خضرؑ سے ملاقات کی اور ان سے آبِ حیات لے کر پیا (حال، ص ۵۴)۔ بعد میں ان کے سرید اس واقعے کو اس دن روزہ رکھ کر منانے لگے۔ انہیں عالمِ غیب سے آوازیں سنائی دینے لگیں، اس طرح انہوں نے روحانی ترقی کے آٹھوں مدارج قدم بقدم طے کیے (رک بہ روشنیہ)۔ وہ ذکرِ خفی (اسمائے الہیہ کو دل میں یاد کرنے) میں منہمک ہو گئے اور کچھ عرصے کے بعد ”اسم اعظم“ کے ورد میں بھی۔ جب وہ اکتالیسویں

اپنی روحانی معراج کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں تو قیاس یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو شریعت کی عائد کردہ جملہ پابندیوں سے آزاد سمجھنے لگتے ہیں (قب تذکرہ، ص ۸۸ الف) [لیکن بایزید کی تالیفات سے اس کی تائید نہیں ہوتی (میر ولی مسعود)۔]

دبستان، ص ۲۵۱ (نظر، ص ۲)، میں بایزید کے جو اصول و عقائد بیان کیے گئے ہیں وہ غالباً ان کے ضوابطِ جنگ ہیں جو اس زمانے سے متعلق ہیں جب وہ مغلوں اور اپنے مخالف افغان قبائل سے برسریکار تھے۔

اپنے آبائی شہر سے باہر تبلیغی کام: اپنے تبلیغی کام کی ابتدا انہوں نے ایک گاؤں سے کی، جو کانی گورم (گرم) سے ایک دن کی مسافت پر تھا۔ یہاں ان کی شدید مخالفت ہوئی اور وہ اپنے آبائی شہر میں واپس بھاگ آئے۔ یہاں بھی ان کے خلاف شدید رد عمل ہوا اور انہیں برادری سے تقریباً خارج کر دیا گیا، لیکن انہوں نے رواداری کا طرز عمل اختیار کیا اور اس طرح کچھ عرصے تک صورت حال کو بدتر ہونے سے بچا لیا۔ ان کے ایک داعی نے شمالی وزیرستان میں وادی ٹوچی کے داوریوں (یا داوری) میں زمین ہموار کر لی تو وہ وہاں چلے گئے اور وہاں جا کر انہوں نے کچھ کراہتیں بھی دکھائیں۔ پھر ان کے ایک اور ہشیار کارندے نے آگے بڑھ کر ان کے لیے میدان ہموار کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد ان کی رسائی قبائل بنگش تک ہو گئی، بعد ازاں انہوں نے مزید کامیابی حاصل کی اور اورک زئیوں، تیراہیوں اور آفریدیوں کو بھی اپنا جانب دار بنا لیا۔ وہاں سے پشاور کے علاقے میں سر زمین سٹریٹس سے گزرتے ہوئے انہوں نے بے شمار قبائلیوں یعنی خلیل، مہمند، داؤدزئی، گکیانی، یوسف زئی، توئی اور صافی قبائل کے لوگوں کو مرید بنا لیا۔ جب ان

اعتراضوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے رہے، اگرچہ بعض موقعوں پر ان کا رویہ قدرے مصالحانہ بھی ہو جاتا تھا۔ ان کے مریدوں کی تعداد میں روز افزوں ترقی ہونے لگی اور انہوں نے بعض کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا تاکہ وہ تبلیغ کے کام کو اور زیادہ وسیع کریں۔ وہ جہاں کہیں جاتے مقامی پیروں سے ان کا تصادم ہو جاتا، جو ہر جگہ اس نئے طریقے کے خلاف عوام کے جذبات ابھارتے رہتے تھے۔

تعلیم: بایزید کے مرکزی عقیدے کو مختصر طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے (دیکھیے صراط، جلد ۱) اللہ کی حقانیت کا ماننا فرضِ عین ہے؛ یہ معرفت، جس کے بغیر طاعت، عبادت، خیرات اور اعمالِ صالحہ خدا کی نظروں میں غیر مقبول ہیں، پیر کامل کے توسط کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ پیر کامل وہ ہے جو صاحبِ شریعت، صاحبِ طریقت، صاحبِ حقیقت، صاحبِ معرفت، صاحبِ قربت، صاحبِ وصلت، صاحبِ وحدت، صاحبِ سکونت (سکینہ، درصراط، ص ۱۱۰) ہو۔ وہ کاشف اسرار الہی اور تخلیق باخلاق اللہ کا مظہر ہے۔ اس کی روح صفاتِ الہیہ حاصل کر لیتی ہے (قب وہی کتاب، ص ۲۵)۔ ہر انسان پر اس کی تلاش اور اطاعت فرض ہے۔ اس کی اطاعت، اطاعتِ رسولِ خدا ہے، اور اس طرح اطاعتِ خدا۔ ان کا عقیدہ ہے کہ ایسا ایک پیر کامل خود بایزید ہے، جسے یہ بات عالمِ رؤیا اور عالمِ بیداری دونوں میں بتائی گئی ہے اور جو لوگ دل سے اس کا اتباع کریں گے انہیں وہ مذکورہ بالا مدارج سے گزار کر توحید تک پہنچا دے گا (قب صراط، ص ۲۴ بعد)۔

نوآموز سالکوں کے لیے توبہ، عزلت گزینی (یعنی حجرہ نشینی یا اعتکاف)، سال بھر میں ایک دفعہ چلہ کشی، ذکرِ خفی، مراقبے اور اسی طرح کی دیگر ریاضتوں پر خاص زور دیا گیا ہے۔ جب وہ



کے خلاف دربار کابل میں شکایتیں پہنچیں تو شہنشاہ اکبر کے چھوٹے بھائی میرزا محمد حکیم (پیدائش ۵۹۶ / ۱۵۵۴ء، وفات ۵۹۹ / ۱۵۸۳ء) نے، جو وہاں کا نوجوان صوبیدار تھا، ان سے سخت باز پرس کی اور بایزید کو قاضی کابل قاضی خاں کی عدالت میں پیش ہونا پڑا، بایزید نے سب سوالوں کے جواب ہشیاری سے دیے اور انہیں پشاور واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ اب انہوں نے مہمند زئیوں میں اپنا تبلیغی کام شروع کیا اور وہ ان کے خلوص اور عقیدت مندی سے اتنے متاثر ہوئے کہ خود انہوں نے، ان کے بیٹوں نے اور ایک بیٹی نے انہیں میں شادی کر لی۔ ان کے ایک داعی نے قندہار کے علاقے کے کاسیوں اور بالخصوص قندہار کے شنواریوں اور مہمندوں اور کچھ بڑیچوں اور صافیوں کو شامل سلسلہ کر لیا۔ ان لوگوں میں چند سال کام کرنے کے بعد یہ داعی سندھیوں اور بلوچیوں میں آیا اور حیدر آباد سندھ کے نزدیک سید پور کے مقام پر اس نے اپنا تبلیغی مرکز قائم کیا۔ پیر اور اس کے داعیوں کو (جنہیں صرف پیر کے نام پر ہی کلمہ کام کرنا پڑتا تھا اور وہ اپنے نام پر کچھ نہ کر سکتے تھے) ابتدا میں ہر جگہ مد مقابل پیروں اور علما کی انتہائی مخالفت کے باوجود حیرت انگیز کامیابی ہوئی، تیراہ میں بھی، جہاں بظاہر اس قسم کے حریف موجود نہ تھے۔ اس مرحلے پر بایزید نے اپنے داعی اور مبلغ (کلہ ڈھیر واقع ہشت نگر سے، مخزن، ورق ۱۵۴ ب) ہمسایہ ممالک کے حکمرانوں، امرا اور علما کے پاس اس غرض سے بھیجے کہ وہ انہیں اس کے دعاوی کے مان لینے کی دعوت دیں۔ ان میں سے ایک داعی شہنشاہ اکبر کے دربار میں بھی بھیجا گیا؛ دوسرا میرزا سلیمان والی بدخشان کے پاس پہنچا۔ کچھ داعی ہندوستان، بلخ اور بخارا کو بھی روانہ کیے گئے اور اخوند صاحب کے مرشد

سید علی ترمذی کے پاس بھی ایک داعی حاضر ہوا (تذکرہ، ورق ۹۱ - ب) [اخوند درویش کی اس کتاب میں ہمیں اس بات کا ذکر نہیں ملتا (میر ولی سعود)۔] مغلوں سے جنگ: اس زمانے کے بعض دور اندیش لوگوں نے ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کا اندازہ لگا کر یہ بھانپ لیا کہ اب بایزید شمشیر بکف ہو کر خونریزی کرنے پر آمادہ ہیں (حال، ص ۲۲۳، ۲۲۶، ۲۳۷)۔ ان کی جنگی کارروائیوں کا فوری سبب حال، ص ۲۷۱ میں یوں بیان ہوا ہے: ایک قافلہ جو ہندوستان سے لوٹتے ہوئے کابل کی طرف جا رہا تھا ایک ایسے گاؤں کے قریب رکا جہاں ان کے مریدوں میں سے غالی متعصب قسم کے لوگ رہتے تھے۔ یہ لوگ اس خیال سے کہ اہل قافلہ امور عقبی کے بارے میں مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں بے حد غضبناک ہو گئے اور انہوں نے اہل قافلہ کو لوٹ لیا اور ان کے مال و اسباب کو تباہ کر دیا۔ اس پر حکام کابل ان پر بے حد غضبناک ہوئے اور وہ اس گاؤں کے باشندوں کو تہ تیغ کر کے ان کے بچوں کو قید کر کے لے گئے۔ جب بایزید نے اس واقعے کے متعلق احتجاج کیا تو معصوم خاں حاکم پشاور کو حکم ہوا کہ وہ بایزید کو گرفتار کر لے، لیکن وہ بچ کر یوسف زئی کے علاقے کی ایک پہاڑی میں چلے گئے اور جب وہاں ان کا محاصرہ کر لیا گیا تو وہ کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے خیر اور تیراہ کے علاقے میں جا پہنچے۔ اس پہلے میدان جنگ کا نام انہوں نے آغاز پور رکھا۔ جنگ ان کی بقایا زندگی میں کوئی اڑھائی سال کے قریب جاری رہی، یہاں تک کہ ۵۹۸ / ۱۵۷۲ - ۱۵۷۳ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس جنگ کی تفصیلات حال نامہ میں تو نہیں ملتیں لیکن ملا درویش نے بتائی ہیں۔ اس کا بیان ہے کہ بایزید کو آخر کار محسن خاں غازی نے تراغہ (توراغہ) کے مقام پر شکست دی، جو

وہ ان چیزوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو آسمانی آوازوں نے ان سے عربی یا فارسی زبان میں کہی تھیں (دیکھیے مثلاً حال، ص ۸۸، ۱۱۳، ۱۱۷، ۱۲۵)۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے بھی کہ ان کی تصانیف کے جو مخطوطات ہم تک پہنچے ہیں وہ بہت بعد کے زمانے کے نقل شدہ ہیں، وہ عربی زبان اور اس کی صرف و نحو میں، کمزور نظر آتے ہیں۔ ان کے سب سے بڑے حریف اور ہم عصر ملا درویشہ (تذکرہ، ورق ۸۹ ب) نے لکھا ہے کہ ان کی تصنیف خیرالبیان میں بعض عربی الفاظ کو بلا ادراک ترکیب ایک دوسرے سے جوڑ دیا گیا ہے۔ ان تصانیف کو وہ اپنے خاندان کے لوگوں (حال، ص ۶۸۹) اور دوسرے مریدوں کو خود پڑھ کر سناتے اور ان کی تشریح کرتے تھے۔ ان میں سے خیرالبیان اور مقصود المؤمنین بالخصوص ان لوگوں کے نزدیک نیم مقدس کتابوں کا حکم رکھتی تھیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ خیرالبیان ان پر بذریعہ الہام نازل ہوئی تھی۔ ایک دفعہ رات کے وقت جب یوسف زئی پٹھان ان کا بڑی سختی سے تعاقب کر رہے تھے تو ان کے بیٹے شیخ عمر نے فوراً اپنی فوج کو رک جانے کا حکم دیا اور اس وقت تک رکا رہا جب تک کہ یہ کتاب جو وہ راستے میں کہیں بھول آیا تھا واپس دوبارہ نہ مل گئی (حال، ص ۴۹۸)۔ مقصود المؤمنین کے متعلق روایت ہے کہ اس کے طفیل بازید کے ایک اور بیٹے (جلال الدین) کی جان بچی، کیونکہ جب وہ اسے لیے جا رہا تھا تو دشمنوں کے خنجروں اور تلواروں کے وار کے خلاف اسی کتاب نے ڈھال کا کام دیا۔ ایک درویش کو ہاتھ غیبی نے ندا دی کہ وہ اپنے گھر میں گوشہ نشین ہو کر ان دونوں کتابوں کا مطالعہ کرے (حال، ص ۴۹۰) اور اسی طرح کی کئی دوسری روایتیں ان کے متعلق مشہور ہیں۔ ان کی

ان کے خلاف جلال آباد سے ایک مہم لے کر چلا تھا۔ پیر پا پیادہ پہاڑوں کی طرف بھاگ نکلے، ٹھکان اور بھوک پیاس کی سخت تکلیفیں اٹھانے کے بعد وہ آخر کار کالا پانی کے مقام پر فوت ہو گئے، لیکن دفن ہشت نگر میں ہوئے (تذکرہ، ورق ۹۳ ب)۔ چند گوجروں کو دیکھا گیا کہ وہ رات کے وقت ان کے مزار کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ اس پر بازید کے بیٹے اور جانشین شیخ عمر نے ان کے تابوت کو وہاں سے نکلوا لیا اور کوچ کے وقت وہ اسے ہمیشہ اپنے سامنے رکھا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک جنگ (۵۹۸۹ / ۶۱۵۸۱) کی گڑبڑ میں وہ دریائے سندھ میں گر پڑا۔ کہتے ہیں کہ بعد میں یہ تابوت دستیاب ہو گیا اور اسے بھٹہ پور میں دفن کیا گیا (حال، ص ۴۸۳ بعد؛ ۴۹۳ تا ۵۲۵ بعد)۔ یہ مقام بظاہر کانی گرم سے کوئی تین دن کی مسافت پر واقع تھا (حال، ص ۱۵۶)۔

ادبی اور دیگر ثقافتی سرگرمیاں : بازید نے اپنے سوانح حیات اور اپنی تبلیغی تحریک پر ایک کتاب اور متعدد رسالے لکھے، جن میں انہوں نے اپنے بنا کردہ فرقے کے اصول و عقائد کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا تھا۔ ان رسالوں میں سے صرف دو [بلکہ تین، دیکھیے مخزن الاسلام، ۱۰۰] موجود ہیں۔ ان رسالوں میں ان کا طریق یہ ہے کہ وہ ایک یا چند آیات قرآنی نقل کر کے ان سے متعلق کچھ مواد حدیث (جس کی صحت یا عدم صحت میں وہ کوئی امتیاز نہیں کرتے) سے لے کر اضافہ کرتے ہیں اور جہاں کہیں ممکن ہو ان کی تائید میں بزرگوں کے اقوال بھی بیان کرتے جاتے ہیں۔ یہ سب باتیں اکثر ایک کے بعد دوسری تصنیف میں دہرائی گئی ہیں۔ منقولہ احادیث میں بعض اہسی بھی شامل ہیں جنہیں وہ احادیث قدسی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں (مثلاً دیکھیے حال، ص ۸۷، ۱۶۰)۔



۲۔ مقصود المؤمنین : (عربی) صرف دو نسخوں کا پتا چلتا ہے۔ ایک راقم مقالہ کے پاس ہے، جس میں بین السطور فارسی ترجمہ بھی ہے؛ یہ نسخہ ۱۲۲۳ھ/ ۱۸۰۹ء میں نقل ہوا تھا۔ دوسرا آصفیہ میں ہے؛ جو کوئی ایک سال بعد نقل ہوا (دیکھیے فہرست، ۱: ۳۹۰/۸۶؛ براکلمان: تکملہ، ۲: ۹۹۱)۔ سلسلہ روشنیہ کے اصول و عقائد پر مشتمل یہ کتاب بایزید نے اپنے سب سے بڑے بیٹے عمر کی درخواست پر (جسے وہ بعض اوقات اس کتاب میں ”اے میرے پیارے بیٹے“ کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں) اپنے مخلص مریدوں کے فائدے کے لیے لکھی تا کہ وہ اسے پڑھیں، یاد رکھیں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ اس کے اکیس ابواب یا حصے ہیں۔ پہلے تیرہ بابوں میں جو تقریباً کتاب کا نصف حصہ ہیں، وعظ و نصیحت، عقل و ایمان، خوف و امید، نفس و شیطان، دل و روح، دنیا و عقبی، توکل علی اللہ اور توبہ کے موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ آخری آٹھ فصول میں آٹھوں منازل یا مدارج کا ذکر ہے (دیکھیے اوپر)، یعنی شریعہ سے سکونہ تک [یہ کتاب اب میر ولی مسعود خاں نے ایڈٹ کر لی ہے، دیکھیے نسخہ موجود کتب خانہ جامعہ پنجاب]۔

۳۔ صراط التوحید (عربی: فارسی): یہ رسالہ، جس کا ایک حصہ خود نوشت سوانح پر مشتمل ہے، مصنف کے ارتقائے روحانی کی ان مختلف منازل کے بیان سے شروع ہوتا ہے جن سے گزرنے کے بعد اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ خود ہی پیر کامل ہے۔ یہ کتابچہ ایک رسالہ [مکتوب] پر ختم ہوتا ہے، جس میں خاص طور پر ملوک و امرا سے خطاب کیا گیا ہے۔ اس میں سلاطین کو تنبیہ کی گئی ہے اور ریاضت کے مختلف مدارج کا ذکر ہے، جو روح انسانی کی معراج کے لیے ضروری ہیں۔ یہ معراج، صرف پیر کامل کی ہدایت ہی سے ممکن ہو سکتا ہے، لہذا وہ ان

افغانی (پشتو) نثر میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے فارسی اور عربی زبانوں کے نمونے پر مسجع نثر لکھنے کی کوشش کی ہے، خواہ بعض اوقات وہ پشتو زبان کے محاورے سے الگ ہو۔ انہوں نے جن مضامین (یعنی مذہب، تصوف و اخلاق) پر بحث کی ہے ان کی نوعیت کی وجہ سے انہیں پشتو کی یوسف زئی اور قندھاری بولیوں کے ساتھ ساتھ عربی اور فارسی کی مانوس و متداول اصطلاحات کثرت سے استعمال کرنا پڑیں ان کی مندرجہ ذیل تصانیف کا پتا چلتا ہے:-

خیر البیان : جو چالیس ابواب (بیانات) پر مشتمل ہے (حال، ص ۳۳۱)۔ از روی تذکرہ اس کی بعض عبارتیں عربی اور فارسی میں تھیں اور کچھ افغانی اور ہندی میں (لیکن قب دبستان، ص ۲۵۱، س ۱۲)، گو ”اس کے تمام بیان ناموزوں اور ناموافق تھے“۔ اخوند کا تو یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس کتاب کا ایک حصہ ملا ارزانی خویشگی قصوری نے لکھا تھا، جو پیر روشن کا خلیفہ تھا۔ جب وہ بستر مرگ پر تھے تو ان کے مریدوں نے ان سے درخواست کی کہ وہ کوئی آخری وصیت کریں۔ اس پر انہوں نے انہیں خیرالبیان کی طرف رجوع کرنے کو کہا، جس میں انہوں نے ہر بات صاف صاف لکھ دی ہے (حال، ص ۳۸۳)۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب میں عقیدہ وحدت وجود کی توثیق و تصدیق کرنے کی کوشش کی گئی ہے (مآثر الامراء، ۲: ۲۴۳)۔ اس کے صرف ایک نسخے کا علم تھا جو (۱۰۶۱ھ/ ۱۶۵۱ء میں نقل ہوا، اوراق ۱۶۷)۔ یہ نسخہ کسی نے سر ڈینیسن راس Sir Denison Ross کو مستعار دیا تھا اور جس کا اب کچھ پتا نہیں چلتا Morgenstierne، اوسلو Oslo نے اس کے کچھ اقتباسات انگریزی ترجمے سمیت شائع کیے تھے [اب یہ کتاب طبع ہو چکی ہے]۔

(Annelle، 8، ترجمہ اے۔ ایس بیورج A.S. Beveridge، ۲: ۱۳۸) اس کے چند اجزا کے وجود کا ذکر کرتا ہے۔

علی محمد کے باپ ابابکر نے لڑکپن کے زمانے میں جلال الدین کی خدمت کی تھی اور اس کے بعد احد داد کے ماتحت فوج کی کمان بھی کرتا رہا۔ پھر اس کے بعد وہ بایزید کے خاندان کے چند افراد کے ہمراہ، جو ہندوستان میں منتقل ہو گئے تھے، ہندوستان بھی آیا۔ علی محمد بایزید کے پوتے رشید خاں کے پاس دکن میں ملازم رہا اور پھر آگرے کے قریب شمس آباد مٹو کے گاؤں رشید آباد (Gazet. of Jullunder District، ص ۹۹) میں سکونت پذیر ہو گیا (حال، ص ۲۱۳؛ مآثر الامراء، ۲: ۲۵۰)۔

علی محمد اپنے دیباچے میں کہتا ہے کہ مرور زمانہ سے حالنامہ بایزید کا متن مسخ ہو گیا تھا اور علاوہ ازیں ان کے بیٹوں اور پوتوں کے فوجی کارناموں کے ذکر کا اضافہ بھی ضروری تھا، لہذا اپنے چند دوستوں کی درخواست پر [اور رشید خاں کی ہدایات کے مطابق جو اس نے اپنی وفات کے بعد خواب میں] دیں (حال، ص ۶۱۳)، اس نے تحریری اور زبانی مآخذ سے استفادہ کرتے ہوئے یہ ضروری اضافہ کر دیا۔ واقعات کا یہ بیان، جو اورنگ زیب کی تخت نشینی (۵۱۰۶۹ / ۱۶۵۹ء) (حال، ص ۲۲۹) تک پہنچتا ہے، معتدبہ ادبی قدر و قیمت کا حامل ہے، اگرچہ اس میں طول طویل مشور اور منظوم دور از کار عبارتیں (اکثر اس کی خود تصنیف) موجود ہیں، جن میں اس فرقے کے اصول و عقائد اور مریدوں کے متعلق بعض غیر اہم واقعات کا ذکر ہے۔ کتاب کے ابتدائی حصے میں، جس میں بایزید کی زندگی کے مفصل حالات بیان کیے گئے ہیں، تاریخیں کم ہیں اور ان میں سے بعض میں، بمقابلہ ان کے جو بعد کے حصے میں درج ہیں، شک

پر زور دیتے ہیں کہ وہ کسی ایسے ہی پیر کامل کے ہاتھ پر توبہ کر لیں (صراط، ص ۷۱ بعد، ص ۱۸۴ بعد)۔ جن لوگوں نے ان کی یا ان کے خلفا کی نگرانی میں ریاضت و مجاہدہ کیا انہیں بایزید یقین دلاتے ہیں کہ انہوں نے بقدر اپنے ظرف کے قرب الہی حاصل کر لیا، کیونکہ ظرف و استطاعت اور خلوص معراج روحانی کے لیے لابدی ہیں۔ خاتمہ کتاب میں کہا گیا ہے کہ یہ کتاب ۱۵۷۸ / ۱۵۷۰ء میں لکھی گئی تھی "اور جو اسے پڑھ کر اس پر کاربند ہوگا وہ علم التوحید سے آگاہ ہو جائے گا"۔ اس کتاب کی ایک جلد مصنف نے ایک خاص قاصد کے ہاتھ شہنشاہ اکبر کو بھیجی تھی، جو اسے وصول کر کے خوش ہوا (حال، ص ۴۶۸)۔ اس کتاب کو ایم۔ اے۔ شکور نے پشاور سے ۱۹۵۲ء میں طبع کروایا۔ اس کا متن اصل نسخے پر مبنی ہے جو ابتدا میں قدرے ناقص ہے۔ (۴) فخر (مخطوطے میں نجر یا نحر ہے) الطالبین (حال، ص ۴۶۸ بعد): ایک رسالہ جو بایزید نے اُس زمانے میں جب انہوں نے اپنی تصانیف کئی سلاطین کو بھیجیں شہزادہ سلیمان والی بدخشان کو ارسال کیا تھا۔ اس کے کسی نسخے کے وجود کا علم نہیں۔ (۵) حال نامہ (فارسی): بایزید کے خود نوشت سوانح حیات، جنہیں علی محمد 'مخلص' بن ابابکر قندھاری، اولاد بایزید کے خانہ زاد اور خلیفہ سلسلہ نے اضافے کے ساتھ دوبارہ طبع کیا۔ اس کتاب کا ایک نسخہ (۵۲۶ ورق)، جس پر کوئی تاریخ درج نہیں، علی گڑھ میں موجود ہے (سبحان اللہ اورینٹل لائبریری، شمارہ ۹۲۰ - ۹۳۷)۔ پنجاب یونیورسٹی کا نسخہ اسی نسخے سے نقل کرایا گیا تھا (اوراق ۷۳۵، ۲، ۲۰) اور جو حوالے اس مقالے میں دیے گئے ہیں وہ اس نقل شدہ نسخے کے ہیں۔ اس کتاب کے کسی اور نسخے کے موجود ہونے کا علم نہیں، اگرچہ کاؤنٹ نوٹر Count Noer



(ترانہ تصوف، ایک قسم کا مناجاتی نغمہ) اور دیگر خوش آئند دھنیں بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ مندرجہ ذیل چھے راگنیاں (Modes) بھی معرض وجود میں آئیں:-

ن، آ، س، ا، ر، ی (دھناسری؟)، پنج پردہ؛

چہار پردہ؛ سد پردہ؛ فوجی ترانے یا نغمے (میدان

جنگ کے لیے) اور ”مقام شہادت“۔ بایزید لڑکپن ہی

سے موسیقی سے بہت متاثر ہوتے تھے اور جب گیت

گائے جاتے تو مسرت سے رقص کرنے لگتے تھے (حال،

ص ۲۳ بعد)۔ ان کے متعدد بیٹے اور پوتے مشاق

موسیقار ثابت ہوئے۔ ان میں سے ایک بیٹے احد داد

کی تو یہ کیفیت تھی کہ اس نے موسیقاروں کو

ملازم رکھا ہوا تھا، جو اس کی تفریح کے لیے رات

دن باری باری سے گاتے اور بجاتے رہتے تھے (حال،

ص ۵۸۱ بعد؛ نیز دیکھیے ص ۶۷۲، ۶۸۰ وغیرہ)۔

افغانی رسم الخط کو مقبول بنانے کا سہرا بھی

پیر روشن کے سر ہے۔

اندرونی اور بیرونی جنگوں کی وجہ سے خستہ حال

ہو کر نیز علما کی شدید مخالفت کے باعث اور

اس لیے بھی کہ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں

تتر بتر ہو گئے اس فرقے کے افراد کم ہوتے ہوتے

بالآخر تقریباً ناپید ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس

فرقے کے عقائد کے ماننے والے اب صرف ”بانی فرقہ

کے صلیبی اخلاف جو تیراہ اور کوھاٹ میں رہتے

ہیں اور بعض بنگش اور اورک زئی پٹھان“ وہ

گئے ہیں (Gazetteer of the Peshawar District،

۱۸۹۷-۱۸۹۸ء، ص ۶۰، قَب J. Leyden:

Asiatic Researches، ۱۱: ۳۶۳)۔

مآخذ: مغل زمانے کی مستند تاریخی تصانیف

بالخصوص مآثر الامراء، ۲: ۲۳۲ (Bibl. Ind.) کے

علاوہ مندرجہ ذیل اہم ہیں:-

(۱) علی محمد بن ابابکر قندھاری: حال نامہ

و شبہہ کی گنجائش بھی موجود ہے؛ علاوہ ازیں بایزید کی زندگی سے متعلق بیان میں ان کی مغلوں سے ان جنگوں کی تفصیلات مفقود ہیں جو انہوں نے اپنی زندگی کے آخری اڑھائی سال میں لڑی تھیں اور یہ بیان یک لخت ختم ہو جاتا ہے، لیکن مؤلف نے پیر روشن کی اولاد کا حال اپنے زمانے تک تفصیل سے لکھا ہے اور ان کے نسب نامے بھی دیے ہیں۔

حال نامہ (ص ۴۵۳ بعد) کا دعویٰ ہے کہ

بایزید نے افغانوں کی ثقافتی ترقی کے لیے بڑا کام کیا

ہے۔ اس تصنیف کے مطابق وہ پہلے شخص تھے

جنہوں نے پشتو میں قصائد، غزلیات، رباعیات، قطعات

اور مثنویاں لکھیں، بحالیکہ اس سے پہلے لوگ صرف

ایک یا دو شعر کہنے پر اکتفا کیا کرتے تھے۔

تاہم یہ بیان مبالغہ آمیز ہے، کیونکہ ان کے زمانے

سے کہیں پہلے پشتو قصیدوں کا وجود ملتا ہے۔

البتہ یہ بات درست ہو سکتی ہے کہ بایزید کے

نقش قدم پر چلتے ہوئے اس کے بیٹوں اور مریدوں

نے متعدد پشتو دیوان مرتب کیے، جو بلند حقائق

اور عمدہ خیالات سے پر ہیں۔ دوسرے افغانوں نے

بھی، جو اس فرقے سے باہر تھے، انہیں نمونوں کی

تقلید کی اور اس طرح ایک ادبی زبان کی حیثیت سے

پشتو کا استعمال زیادہ عام ہو گیا۔

پیر روشن نے اس علاقے کی موسیقی کی اصلاح

کے لیے بھی بڑا کام کیا۔ حاجی محمد، خلیفہ میر

فضل اللہ ولی (حروفی؟ م ۵۷۹۶/۱۳۹۳ء) نے

رباب میں کچھ تاروں کا اضافہ کیا تھا اور اسی کی

ہدایات کے تحت افغان مغنیوں نے نئی دھنیں، عموماً

رقص کی دھنیں، وضع کیں۔ لیکن سازندے چونکہ

انہیں صحیح سر تال کے ساتھ نہیں بجا سکتے تھے،

لہذا بایزید نے ان کی سر تال کی اصلاح کی اور اسی

کی رہنمائی میں افغان موسیقار ”سرود سلوک“

بایسنغر: غیاث الدین، شاہ رخ کا بیٹا اور امیر تیمور کا پوتا [۲۱ ذوالحجہ ۸۷۷ھ / ۲۵ ستمبر ۱۳۹۳ء کو ہرات میں پیدا ہوا]، جسے اس کے والد نے ۸۲۰ھ / ۱۴۱۷ء میں دربار کے قاضی القضاة [وزیر] ت [میر دیوان عالی] کے عہدے پر مامور کیا۔ ۸۲۳ھ / ۱۴۲۰ء میں قرہ یوسف کی وفات پر اس نے تبریز پر قبضہ کر لیا اور صفر ۸۳۵ھ / اکتوبر ۱۴۳۱ء میں اسے آستراآباد کا حاکم مقرر کیا گیا۔ لیکن وہ کبھی تخت پر نہیں بیٹھا۔ چونکہ نجومیوں نے اس کے متعلق پیش گوئی کی تھی کہ وہ چالیس برس سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا اس لیے اس نے عیش و عشرت کی زندگی اختیار کر لی اور چھتیس برس کی عمر میں شنبہ ۷ جمادی الاولیٰ ۸۳۷ھ / ۱۹ دسمبر ۱۴۳۳ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔ اسے گوہر شاد کے مقبرے میں دفن کیا گیا۔ وہ خود فن کار اور فنکاروں کا مربی تھا۔ وہ ترسیم کاری اور تذهیب میں مہارت رکھتا تھا اور اس کے بنا کردہ کتب خانے میں چالیس خطاط، جو میر علی کے شاگرد تھے، مخطوطات کی نقل کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ اس کی مثال سے تیموری عہد کے ایران میں فن نقاشی کی ترقی پر بہت اثر پڑا۔ ۸۲۹ھ / ۱۴۲۵-۱۴۲۶ء میں اس نے شاہنامہ فردوسی کا ایک نسخہ بڑے اہتمام سے تیار کرانا شروع کیا اور اس کا ایک دیباچہ بھی لکھوایا، جو شاہنامے کے ان دو دیباچوں میں سے جو ہمارے پاس موجود ہیں طویل تر ہے۔

مآخذ: (۱) مطلع بعدین، طبع محمد شفیع لاہوری،

۲: ۶۵۲؛ (۲) Cl. Huart: *Calligraphes et miniatures*،

۳: ۲۳۶، ۳۲۳، ۲۰۸، ۹۷؛ (۳) J. Mohl

در فردوسی: *(Shah-nāma) Livre des Rois*، جلد ۱

و ۱۰، حاشیہ ۱؛ (۴) میر خواند: *روضۃ الصفا*،

۶: ۲۱۲، ۲۱۳؛ (۵) خواند امیر: *حیب السیر*، ج ۳

پیر دستگیر (مخطوطہ، کتب خانہ جامعہ پنجاب)؛ (۲) بایزید انصاری: مقصود المؤمنین، مملوکہ راقم مقالہ [میر ولی مسعود نے اس نسخے کی تدوین کی اور اب یہ کتب خانہ جامعہ پنجاب میں ہے]؛ (۳) وہی مصنف: *صراط التوحید*، طبع محمد عبدالشکور، پشاور ۱۹۵۲ء؛ (۴) اخوند درویش: *مخزن الاسلام*، نسخہ مملوکہ راقم مقالہ، ورق ۸ ب، ۱۵۱ ب، نیز *The Cat. of Persian Mss. in the Library of the India Office* اعداد ۲۶۳۲ تا ۲۶۳۸؛ (۶) وہی لمصنف: تذکرۃ الابرار و الاشرار (فارسی)، مخطوطہ کتب خانہ جامعہ پنجاب، ورق ۸۲ بعد، مرقومہ تقریباً ۵۱۰۲؛ (نیز دیکھیے *Cat. Rieu: ۱، ۲۲۲ Or-۲۸*)؛ (۷) J. Leyden: *On the Roshenian Sect and its Founder, Bāyazīd* (*Ansāri Asiatic Researches*، ۱۱: ۳۶۳ بعد)؛ (۸) *Kaiser Akbar: Graf Noer*، ۲: ۱۸۰ بعد (انگریزی ترجمہ از A. S. Beveridge، کلکتہ ۱۸۹۰ء، ۲: ۱۴۸)؛ (۹) *Notes on an old Pashto: G. Morgenstierne* (*Manuscript containing the khair-ul-Bayān of Bāyazīd Ansāri*، در *New Indian Antiquary* (بمبئی)، ج ۴، شماره ۸ (نومبر ۱۹۳۹ء): ص ۵۶۶ بعد)؛ (۱۰) معارف (اعظم گڑھ)، ج ۹، شماره ۶ (۱۹۲۷ء): ص ۳۳۰؛ (۱۱) سید عبدالجبار شاہ ستھانوی: *عبرۃ لأولی الابصار* (اردو)، ص ۴۵ بعد (مصنف کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ) نیز دیکھیے مادہ روشنیہ - [میر ولی مسعود کے اضافات متن میں]۔

(محمد شفیع)

بایزید البسطامی: رک بہ ابو یزید البسطامی۔  
بایسنغر: ایک سلطان کا نام، جس کا تعلق ایران کے خانوادہ آق قویونلو سے تھا۔ یہ سلطان یعقوب کا بیٹا اور جانشین تھا۔ اس نے ایک مختصر سی مدت (۸۹۶-۸۹۷/۱۳۹۰-۱۳۹۲ء) تک حکومت کی، پھر اس کے چچا زاد بھائی رستم نے اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

(W. BARTHOLD)



کا ایک شہزادہ اور بانی خاندان کا پوتا۔ اپنے دادا تیمور کی وفات (شعبان ۵۸۰ھ / فروری ۱۴۰۵ء) کے وقت اس کی عمر بارہ سال تھی۔ اس حساب سے اس کا سال پیدائش تقریباً ۵۷۹ھ / ۱۳۹۲-۱۳۹۳ء ہونا چاہیے۔ اس کا باپ عمر شیخ، تیمور کی زندگی ہی میں فوت ہو گیا تھا۔ بایقرا کو دولت شاہ (طبع براؤن Browne، ص ۳۷۴) نے حسن و جمال میں یوسف ثانی اور شجاعت و بسالت میں رستم ثانی کہا ہے، وہ عرصہ دراز تک بلخ پر حکمران رہا۔ ۵۸۱ھ / ۱۴۱۴ء میں اسے شاہ رخ کی طرف سے لرستان، ہمدان، نہاوند اور بروجرد [قب مطلق، وروجرد] کی ولایت عطا ہوئی؛ اگلے سال اس نے اپنے بھائی اسکندر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور شیراز پر قبضہ کر لیا، لیکن بعد میں اسے شاہ رخ نے مغلوب کر لیا اور اس کا قصور معاف کر کے شاہزادہ قیدو کے پاس قندہار اور گرمسیر جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے وہاں پہنچ کر بھی بغاوت کی آگ بھڑکائی اور قیدو نے اسے ۵۸۱ھ / ۱۴۱۶ء میں گرفتار کر لیا۔ شاہ رخ نے اس مرتبہ بھی اسے معاف کر دیا اور ہندوستان بھیج دیا؛ اس کے بعد اس کے متعلق تاریخوں میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ یہ بیان، جس کا ماخذ حافظ آبرو ہے، دولت شاہ کے بیان سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مؤخر الذکر کے بیان کے مطابق (حوالہ مذکور) وہ اپنی مرضی سے سکران سے شاہ رخ کے پاس گیا، شاہ رخ نے اسے سمرقند بھیج دیا اور وہاں آنگ ملک کے اشارے سے وہ قتل کر دیا گیا۔ دوسری روایات کے مطابق اسے خود شاہ رخ نے ہرات میں سردار قتل کرایا تھا۔ اس کی وفات کا سال دوسرے راویوں نے بھی ۵۸۱ھ ہی بتایا ہے۔ بابر کے بیان کے مطابق (طبع بیورج Beveridge، ورق ۱۶۳ ب) اس شاہزادے کے ایک پوتے کا نام بھی بایقرا تھا [رک بہ حسین میرزا

جزو ۳: ص ۱۱۶، ۱۲۳، ۱۳۰؛ [۶] برای ذکر هنر پروری میرزا دیکھیے دولت شاہ: تذکرہ، ص ۳۰، لطائف نامہ فخری، در اورینٹل کالج میگزین، ص ۲۰۷؛ دوست محمد: حالات ہنروران، طبع عبداللہ چغتائی، لاہور، ص ۱۳۔ (CL. HUART)

\* بایسنغر: سلطان ابوسعید [رک بان] [بن محمد بن میراں شاہ بن تیمور] کا پوتا اور سمرقند کے سلطان محمود کا دوسرا بیٹا، جو ۵۸۸ھ / ۱۳۷۷-۱۳۷۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۰ محرم ۵۹۰ھ / ۱۷ اگست ۱۴۹۳ء کو مارا گیا۔ اپنے والد کی زندگی میں وہ بخارا کا حاکم تھا، لیکن ربیع الثانی ۵۹۰ھ / ۳۰ دسمبر ۱۴۹۴ء (یا ۲۷ جنوری ۱۴۹۵ء) میں جب اس کے والد کا انتقال ہوا تو اسے سمرقند بلوایا گیا۔ ۵۹۰ھ / ۱۳۹۵-۱۳۹۶ء میں اس کے بھائی سلطان علی نے اسے ایک مختصر عرصے کے لیے معزول کر دیا اور اواخر ربیع الاول ۵۹۳ھ / نومبر ۱۴۹۷ء میں اس کے چچا زاد بھائی بابر نے اسے ہمیشہ کے لیے تخت سے محروم کر دیا۔ بایسنغر نے اب حصار کا رخ کیا، جہاں کے بیگ خسرو شاہ کی مدد سے، جو اس کا حمایتی بن گیا تھا، وہ اپنے بھائی مسعود کو شکست دینے اور اس علاقے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد اسی بیگ نے اس کے ساتھ دغا کی اور اسے قتل کروا ڈالا۔ بایسنغر کے متعلق اس کا حریف بابر لکھتا ہے کہ وہ ایک بہادر اور انصاف پسند سلطان تھا۔ وہ ایک فارسی شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور تھا اور عادی تخلص کرتا تھا؛ اس کی غزلیں سمرقند میں اتنی ہر دل عزیز تھیں کہ قریب قریب ہر گھر میں موجود تھیں (بابر نامہ، طبع بیورج Beveridge، ورق ۶۸ ب)۔

(W. BARTHLOD بارٹلوڈ)

\* بایقرا (= بای قرا، بایقرا، بایقرا)، خاندان تیموری

جاتا ہے جو بنیادی طور پر اسپانوی ہیں۔ مثلاً Provençal میں Papagai، اسپانوی میں Papagayo اور قدیم فرانسیسی میں Papagai (۱۱) Roman de la Rose کا papagan) - تیسری صدی نوں صدی میں عراق طوطوں کی صرف انہیں اسام سے شناسا تھا جو مجمع الجزائر ہند چینی میں پائے جاتے تھے۔ الدیمیڑی سبز اور سرخ طوطوں کے علاوہ سفید تاجدار طوطوں کی ایک قسم کا ذکر کرتا ہے۔ مشرق میں شعرا بعض اوقات اس شاندار پرندے کا ذکر کرتے ہیں، مگر اسپانوی مصنفوں کے یہاں کم از کم پانچویں/گیارہویں صدی تک ان کا ذکر نہیں ملتا۔

مآخذ: (۱) الجاحظ، کتاب الحيوان، ج ۲ و ۳: ۵۱۶ و ۵۱۷ و ۱۲۰: (۲) الدمیری: حیوة الحيوان، قاہرہ بدون تاریخ، ۱: ۱۶۶: (۳) H. Pérès: La Poésie andalouse, en arabe Classique، بار دوہ، پیرس ۱۹۵۳ء، ص ۲۳۲ تا ۲۳۶۔

(R. BLACHERÉ)

- البیغا: (لغوی معنی طوطا)، یہ مشہور عرب شاعر اور انشا پرداز (= مترسل) (Letter-writer) ابو الفرج عبدالواحد بن نصر [بن محمد المخزومی] کا لقب ہے [ایک روایت کے مطابق اس کا نام عبدالملک بھی ہے: قبّ برا کلمان]۔ وہ ۵۳۱۳/۶۹۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۵۳۹۷/۱۰۰۶-۱۰۰۷ء میں وفات پائی۔ المخزومی کی نسبت سے اس کا عربی نسب جعلی معلوم ہوتا ہے۔ البیغا نصیبین کا باشندہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ امیر سیف الدولہ حمدانی کے دربار سے اس وقت منسلک ہو گیا تھا جب مؤخر الذکر کے قدم اچھی طرح سے حلب میں جم گئے تھے، یعنی ۵۳۳۳/۶۹۴۴ء کے بعد۔ اس نے امیر کی شان میں قصیدے کہے اور اس وقت شہر میں جو ادبی حلقہ موجود تھا اس میں نمایاں شہرت حاصل کر لی۔ وہ المصنّفی [رکّ بان] کا ہر جوش

بن منصور بن بایقرا] جو سلطان حسین کا بڑا بھائی تھا۔ بایقرا ثانی کئی سال تک بلخ کا والی رہا [یہاں مقالہ نگار کو سہو ہوا ہے، یہ بایقرا ثانی، سلطان حسین خود تھا۔ اس کا بڑا بھائی نہ تھا، پورا نام، ابوالغازی سلطان حسین میرزا بن غیاث الدین منصور بن بایقرا (اول)، دیکھیے زامباور و لین ہول: Muhammadan Dynasties، بمدد اشاریہ]۔

مآخذ: (۱) نویں صدی/پندرہویں صدی کے ابتدائی زمانے کے واقعات کی تاریخ کے لیے عبدالرزاق سمرقندی [رکّ بان] کی کتاب مطّح سعدین دیکھیے، جو حافظ ابرو (زبدۃ التواریخ) کے بعد کی تصنیف ہے [وطبع محمد شفیق لاہوری ۱۹۴۹ء]، سنین ۵۸۰۷ تا ۵۸۲۰ کے لیے قبّ اقتبلاً در Notices et Extraits، جلد ۱۳، حصہ ۲ - حافظ ابرو کے اصل متن کے لیے، جو بوڈلین Bodleian کتب خانے میں بصورت مخطوطہ محفوظ ہے (ایلیٹ Elliot، ص ۳۲۲)، قبّ بارٹولڈ W. Barthold، در المظفریہ (Sbornik statei učenikov bar. Rozena، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۷ء)، ص ۲۵ تا ۲۶: (۲) L. Bouvat: L'empire mongol (باردوم)، پیرس ۱۹۲۷ء [Histoire du Monde از Cavaignac]، ص ۱۶۲ تا ۱۸۰۔

(W. BARTHOLD [و ادارہ])

- ⊗ بایقرا: (ثانی) رکّ بہ حسین میرزا بن منصور بن بایقرا۔
- ⊗ بایقرا: (ثالث) بن عمر شیخ بن پیر محمد بن عمر شیخ بن تیمور حکمران ہمدان ۸۱۷-۸۱۸ء کے لیے دیکھیے زامباور بمدد اشاریہ۔
- بیغاء: (نیز بیغا)، طوطا، نرو مادہ اور مفرد و جمع سب کے لیے یہی ایک صورت مستعمل ہے۔ صرفی (اشتقاقی) لحاظ سے جاحظ کے نزدیک یہ لفظ پرندے کی صوت سے مشتق ہے۔ یہ یا اس سے ملتا جلتا لفظ ان تمام زبانوں میں پایا



الجزائر۔ پیرس ۱۹۳۴ء، ص ۳۰۰ تا ۳۰۱، عدد ۱؛  
 [(۱۲) المنتظم، ۷: ۲۳۱؛ (۱۳) نزہة الجلیس، ۲:  
 ۳۱۹؛ (۱۴) محمد صدر الدین: Saifud Daulah and  
 His Times، (بمدد اشاریہ) لاہور ۱۹۳۰ء.]

(R. BLACHÈRE)

بَدَشْتَر رَکْ بہ بریشتر .

بُت : رَکْ بہ بد .

\* البتّانی : اس کا پورا نام ابو عبد اللہ محمد بن جابر  
 بن سنان البتّانی الحرّانی الصّابی ہے۔ اسے ازمنہ وسطیٰ  
 کے مغربی مصنفین نے Albategni یا Albatenus لکھا  
 ہے۔ اس کا شمار بڑے بڑے عرب ہیئت دانوں میں  
 ہوتا ہے۔ وہ ۵۲۳۴ / ۶۸۵۸ سے پہلے غالباً حرّان  
 یا اس کے قرب و جوار میں پیدا ہوا۔ البتّانی کی وجہ  
 تسمیہ بہت ہی غیر یقینی ہے۔ اگرچہ یہ مصنف  
 مسلمان تھا لیکن اس کے خاندان کا مذہب پہلے  
 صابی تھا، جس کی وجہ سے اسے بھی الصابی کہا جاتا  
 ہے۔ اس نے تقریباً اپنی ساری زندگی الرّقہ ہی میں  
 بسر کر دی، جو دریائے فرات کے بائیں کنارے پر  
 واقع ہے اور جہاں کئی خاندان حرّان سے آ کر آباد  
 ہو گئے تھے۔ ۵۲۶۳ / ۶۸۷۷ سے وہ اجرام سماوی  
 کے مشاہدے میں مشغول ہو گیا اور بقیہ ساری  
 عمر باقاعدگی کے ساتھ اسی مطالعے میں مصروف  
 رہا۔ اسے کسی کام کی غرض سے بغداد جانے کا  
 اتفاق ہوا، مگر واپسی میں قصر الجصّ کے مقام پر،  
 جو دجلے کے ذرا مشرق میں اور سامرا سے زیادہ دور  
 نہیں ہے، ۵۳۱۷ / ۶۹۲۹ میں فوت ہو گیا۔

اس کی تصنیفات یہ ہیں: (۱) کتاب معرفة  
 مطالع البروج فی ما بین ارباع الفلک، یہ کتاب  
 کترہ فلکی کے ربع دائروں کی درمیانی فضاؤں میں  
 بروج کے ارتفاع کے بارے میں ہے؛ یعنی یہ منطقہ  
 البروج کے ان نقطوں کے ارتفاع کے متعلق ایک  
 کتاب ہے جو کسی مفروضہ موقع پر چہار اوتاد میں

مدّاح تھا اور وہ اس سے بغداد میں دوبارہ ملا۔  
 موصل میں تھوڑا عرصہ قیام کرنے کے بعد وہ بغداد  
 میں مستقل طور پر اقامت پذیر ہو گیا اور وہیں  
 اس کا انتقال ہوا۔

ابن الندیم کے بیان کے مطابق چوتھی /  
 دسویں صدی کے اختتام پر البیغا کے اشعار تین سو  
 صفحات پر مشتمل تھے۔ ان نظموں کا وہ انتخاب  
 جو الثعالبی نے کیا ہم تک پہنچا ہے۔ اسی انتخاب  
 کنندہ نے البیغا کے خطوط میں سے بعض بلیغ اور  
 طویل اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔ بطور قصیدہ نگار  
 البیغا اسی دبستان سے تعلق رکھتا ہے جس کی  
 نمائندگی البحتری یا المتنبی کرتے ہیں۔ اس کے  
 برعکس اس کے مراثی اور خمریات ایک مخصوص  
 قسم کی جاذبیت رکھتے ہیں۔ لیکن مسجع اور  
 مترنم نثر میں اس کے لکھے ہوئے خطوط پاکیزگی،  
 ذوق صحیح اور پرمایگی کے لیے ممتاز ہیں اور وہ  
 اپنے انداز خاص میں ایک استاد کی حیثیت رکھتا  
 ہے۔ خصوصاً اپنے دور میں اس کی اہمیت مسلم ہے۔

مأخذ: (۱) الفہرست، ص ۱۶۹؛ (۲) الخطیب  
 البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۱: ۱۱۱؛ (۳) ابن خلیکان، قاہرہ  
 ۱۶۳۱، ۱: ۲۹۸؛ (۴) السمعانی: الانساب، ۶۴؛  
 (۵) بدیع: الصبح المنبئ عن حیثیة المتنبی، قاہرہ ۱۳۰۸  
 (عکبری، کی شرح دیوان متنبی کے حاشیے پر)، ص ۷۳  
 بعد؛ (۶) الثعالبی: یتیمۃ الدھر، دمشق ۱۹۰۳، ۱:  
 ۱۱ بعد، ۱۷۳ تا ۲۰۴، ۲۲۰ و ۲۲۱؛ (۷) ۲۹۱، (۷)  
 'Un Poète arabe due IV<sup>e</sup>/X<sup>e</sup> S. : R. Blachère  
 al- Motanabbi، پیرس ۱۹۳۵ء، ص ۱۳۴، ۱۳۱، ۱۵۵؛  
 (۸) زکی مبارک: La Prose arabe au IV<sup>e</sup> s. H.، پیرس  
 ۱۹۳۱ء، ص ۱۲۹ بعد؛ (۹) وہی مصنف: النثر الفنی، قاہرہ  
 ۱۹۳۳ء، ۱: ۲۸۶ تا ۲۹۶ و ۲: ۲۲۶ تا ۲۳۲؛ بقیہ  
 مأخذ کے لیے دیکھیے: (۱۰) براکلمان Brockelmann  
 ۱: ۹۰ و تکملہ، ص ۱۴۵؛ (۱۱) M. Canard  
 'Receuil de textes relatifs à l' émir Sayf al-Daula

سے البتانی سے منسوب کر دیے گئے ہیں۔ البتانی نے بڑی صحت کے ساتھ منطقة البروج کے اعوجاج (obliquity of the ecliptic)، منطقة حارہ کے سال اور موسموں کے طول، سورج کے صحیح اور وسطی مدار (mean orbit) کی تعیین کی ہے۔ اس نے عملاً یہ دکھا کر کہ شمسی اوج حرکت رجعیہ اعتدالیہ (precession of the equinoxes) کا پابند ہے اور نتیجہً وقت کی تعدیل بھی دورانی انحرافات کی پابند ہے بلاشبہ شمسی اوج کی بے حرکتی (immobility of the solar apogee) کے بطلمیوسی عقیدے کی دھجیاں اڑا دیں۔ اس نے بطلمیوس کے نظریے کے برعکس سورج کے ظاہرہ زاویہ دار قطر (apparent angular diameter) کے انحراف اور سالانہ گرہنوں کے امکان کو ثابت کر دیا۔ اس نے چاند اور سیاروں کے کئی مداروں کی تصحیح کی اور رؤیت ہلال کی شرائط کا ایک نیا اور بڑا ہی نادر نظریہ پیش کیا۔ اس نے حرکت رجعیہ اعتدالیہ کی بطلمیوسی قدر کی بھی تصحیح کر دی۔ چاند گرہن اور سورج گرہن کے متعلق اس کے بلند پایہ مشاہدات سے ۱۷۴۹ء میں Dunthorne نے استفادہ کیا ہے، تاکہ چاند کی تدریجی حرکت کا مطالعہ کیا جاسکے۔ آخر میں اس نے املاتی تسطیح (orthographic projection) کے ذریعے کرووی علم المثلث کے بعض مسائل کے نہایت عمدہ حل پیش کیے، جن سے Regiomontanus (۱۴۳۶ تا ۱۴۷۶ء) واقف تھا اور جن کی اس نے جزوی طور پر تقلید بھی کی ہے۔

مآخذ: (۱) *Opus : al-Battāni sive Albatēni astronomicum . . . . Arabice editum, Latine versum, Mediolani adnotationibus instructum a C.A. Nallino Insubrum ۱۸۹۹ تا ۱۹۰۷ء، ۳ جلد - البتانی کے متن کی جو غلط تشریحات ہوئی ہیں (۱: ۳۱ تا ۳۲ از C.A. Nallino) ان کے متعلق دیکھیے وہ تصحیحات جو*

سے نہیں ہوتے۔ [رک بہ علم نجوم] - اس میں وقت کے حکمران سیارے کی سمت کے ہیئت مسئلے کے ہندسی حل کے متعلق بحث ہے۔ (۲) رسالہ فی تحقیق اقدار الاتصالات: ہیئت تطبیقات کی کمیتوں کے صحیح تعین پر ایک رسالہ، یعنی مطرح الشعاع *proiectio radiorum* کے ہیئت مسئلے کا علم مثلث کی رو سے باضابطہ حل [رک بہ علم نجوم]، جب مذکورہ ستارے عرض سماوی رکھتے ہیں (یعنی جب منطقة البروج سے باہر ہوتے ہیں)۔ (۳) شرح المقالات الاربع لبطلمیوس: یہ بطلمیوس کی *Tetrabylon* کی شرح ہے۔ (۴) الزیج: علم ہیئت کا رسالہ اور جداول، البتانی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ہے اور یہی اس کی تنہا تالیف ہے جو ہم تک پہنچی ہے۔ اس میں اس کے مشاہدات کے نتائج درج ہیں۔ اس کتاب نے نہ صرف عربی علم ہیئت پر بلکہ یورپ میں بھی ازمندہ وسطی اور تحریک احیائے علم کے شروع میں علم ہیئت اور کرووی علم المثلثات کی ترقی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ لاطینی میں *Robertus Retinensis* یا *Ketenensis* نے کیا (جو ہسپانیہ میں بمبلونہ کے مقام پر ۱۱۴۳ء کے بعد فوت ہوا، یہ ترجمہ ضائع ہو چکا ہے)، پھر *Plato Tibastinus* نے بارہویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں اس کا ترجمہ کیا (اس کے متن کی ہندسی جدولوں کے بغیر ایک طباعت تورسبرگ *Nuremburg* میں ۱۵۳۷ء میں اور بولونیا میں ۱۶۴۵ء میں شائع ہوئی)۔ الفونسو دہم شاہ قشتالہ (*Alphonso X of Castile*) (۱۲۵۲ تا ۱۲۸۲ء) نے اس کا ترجمہ براہ راست عربی سے ہسپانوی زبان میں کروایا تھا (جس کا نامکمل قلمی نسخہ پیرس میں محفوظ ہے)۔ علم ہیئت پر تین غیر اہم رسالے، جن کا لاطینی ترجمہ کئی مسودوں میں ملتا ہے اور جن پر *Bereni, Bootem, Bethem* اور *Bareni* کے نام بطور مصنف کے درج ہیں، غلطی



عیسائیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی خوش حالی اس واقعے کی مرہون منت ہے کہ امیر بشیر شہاب ثانی [رک بان] (۱۷۸۸ تا ۱۸۳۰ء) نے ۱۸۰۷ء میں اسے اپنا مقام سکونت بنایا اور ۱۸۱۲ء اور ۱۸۱۵ء کے درمیان ایک پختہ نہر کے ذریعے سفہ Safa کا پانی یہاں پہنچایا۔ اسی باعث اس گاؤں میں کچھ سرکاری دفاتر کی عمارتیں بن گئیں اور ساتھ ہی ایک محل تعمیر ہو گیا۔ بنانے والا معمار اطالوی اور کام کرنے والے مزدور شامی تھے اور عمارت مختلف اسالیب کا عجیب مشرقی امتزاج ہے۔ محل بہت گہرے پہاڑی نالے کے اوپر سلامی دار چٹانوں پر تعمیر کیا گیا تھا اور ۱۸۱۳ء سے شاعروں کا ملجا و ماوی رہا ہے (نکولس ترک Nicholas the Turk)۔ لامارٹین Lamartine ۱۸۳۲ء میں یہاں آیا اور اس کی طولانی کیفیت ہمارے لیے لکھ گیا۔

۱۸۳۰ء میں مصری قبضے کے اختتام کے قریب یہ محل ویران ہو گیا تھا اور اس ویران عمارت کو ۱۹۱۲ء میں سخت آتشزدگی نے اور بھی خراب کر دیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں اس کی جزوی مرمت کی گئی۔ ۱۹۳۸ء میں امیر بشیر اعظم کی راکھ کو استانبول سے یہاں منتقل کر دیا گیا۔ آج کل بتدین جمہوریہ لبنان کے صدر کا گرمائی مقام ہے۔

مأخذ: (۱) قریحة: أسماء المدن والقری

اللبنانية، ۱۹۵۶ء، ص ۲۰؛ (۲) Voyage: Lamartine

en Orient، طبع Hachette، ۱۹۰۳ء، ۱: ۱۹۱

بعد؛ (۳) Topographie Historique de—: Dussaud

la Syria، ص ۵۰۷؛ (۴) Une histoire: M. Chebli

du Liban au temps des émirs، بحد اشارہ.

(N. ELISSÉEFF)

البتّر: بربر قبائل کے ان دو گروہوں میں سے ایک کا نام، جن سے مل کر بربر [رک بان] قوم بنتی ہے۔ دوسرے گروہ کا نام البرانس [رک بان] ہے۔

J. J. de Orus و J. Vernet نے پیش کی ہیں، در Transformación de coordenadas astronómicas entre los árabes، در Gaceta Matemática، سلسلہ اول، ج ۲، عدد ۳، میڈرڈ، ۱۹۵۰ء، نیز J. M. Millás و Una nueva obra astronómica alfonsi: El Tratado del cuadrante "sennero"، در al-And.، ۲۱: ۶۵ (۱۹۵۶ء)۔ البتانی کی تصنیفات نے جو اثرات برشلونہ کے یہودی ابراہیم برحیہ Abraham bar Hiyya (پانچویں - چھٹی صدی ہجری / گیارہویں - بارہویں عیسوی) پر ڈالے ان کے لیے دیکھیے: J. M. Millás، در Actes du Congrès intern. des Orient.، لائڈن، ۱۹۳۱ء اور La obra "forma de la tierra" de R. Abraham bar Hiyya ha-Bargelont، مجریط - برشلونہ، ۱۹۵۶ء۔

(C. A. NALLINO)

بتجن: انڈونیشیا [رک بان] میں خط استوا کے قریب طول بلد ۱۲۷ مشرق میں ایک چھوٹا سا جزیرہ؛ شروع کی سلطنتوں اور اسلامی تبلیغ کے مرکزوں میں سے ایک۔ بطور ایک گرم مسالے کے جزیرے کے اس کی اہمیت ۱۹۵۰ء کے قریب ختم ہو گئی، جب یہاں کے سلطان اور ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مابین ایک معاہدے کے نتیجے میں یہاں کے درخت برباد کر دیے گئے [دیکھیے ۱۹۷۱ء بذیل مادہ بتجان]۔

(C. C. BERG)

بتدین: مقامی بولی میں بیت الدین کی مخفف صورت، سریانی میں بیت دینا Bēth - Dinā ایک مقام، جس کی آبادی آٹھ سو نفوس ہے اور جو سطح سمندر سے آٹھ سو میٹر کی بلندی پر بیروت سے پینتالیس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے گرد طبق بر طبق اراضی میں زیادہ تر انگور کی بیلوں اور زیتون کی کاشت ہوتی ہے۔ بتدین اور دیار القمر دونوں مل کر شوف کے دروزی علاقے میں گھرا ہوا ہرگتہ بن گئے ہیں، جس کا نظم و نسق مارونی فرقے کے

البترا اسم صفت الالبتر کی جمع ہے، جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ مادغیس Madghis کا لقب تھا، جسے یہ لوگ اپنا مشترک جد اعلیٰ مانتے تھے۔ الالبتر کے معنی ہیں ”دم کٹا، یا جس کا کوئی عضو کٹا ہوا ہو یا جس کی کوئی اولاد نہ ہو“۔ اس آخری مفہوم کے اعتبار سے یہ ایسے شخص کا لقب نہیں ہو سکتا جسے بہت سے قبیلے اپنا جد اعلیٰ مانتے ہوں۔ لفظ کے پہلے دو مفہوم غیر مانوس ہیں۔ البتہ دوسرے گروہ کے قبائل کے جد اعلیٰ برنس کا نام ایسا ہے جو ایک عربی لفظ سے مطابقت رکھتا ہے (جو زمانہ قدیم ہی میں یونانی لفظ birros سے مستعار لیا گیا تھا) اور وہ اس لمبے لباس یا چنے کا نام ہے جسے یورپ میں برنوس burnous کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے برانس کے معنی برنوس یا لمبے چنے پہننے والے کے ہو سکتے ہیں اور پھر اس کے مقابلے میں بترا ان لوگوں کو کہا جا سکتا ہے ”جو اونچے اور چھوٹے کپڑے پہنتے ہوں“۔ درحقیقت شمالی مغربی مراکش کی عربی بولی میں ایک اسم صفت قرطبط ہے (جو مادہ قرط کی چہار حرفی توسیع ہے) جس کے معنی ہیں ”وہ شخص جس نے اپنے لباس کا نیچے کا حصہ کاٹ کر چھوٹا کر لیا ہو“ اور اس کا اطلاق خصوصیت سے کوہستانوں کی چلاباس jellabas پر ہوتا ہے، جو بہت ہی چھوٹی سی ہوتی ہے (قب W. Marçais Textes de Tanger، ص ۳۹)۔

دوسرے نسلی القاب جو لباس کی خصوصیات کی بنا پر لوگوں کو دیے گئے ہیں، ان میں سے پہلے بربر (لوگ باد) کا لقب قابل توجہ ہے، جو السلتون کہلاتے ہیں، یعنی وہ لوگ جو اپنے منہ پر نقاب ڈالنے رہتے ہیں، اس طرح مسعودی (لوگ باد) بربروں کا لقب بھی قابل توجہ ہے۔ چلاباس، کتا جاتا ہے (قب Mélanges Galléjroy-Demonbrynes،

البترا کے گروہ میں جو قبیلے شامل ہیں ان میں سے بڑے بڑے یہ ہیں: لواتہ، نفوسہ، نفزاوہ، بنو فاتن اور مکناسہ۔ ان کا قدیم ترین مقام سکونت وہ کف دست میدان اور سطح مرتفع کا وہ علاقہ ہے جو دریائے نیل سے لے کر تونس تک پھیلا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے وہ دراصل قدیم لیبیا کے بربر ہیں، مگر بہت قدیم زمانے میں ان کے چند قبیلے (مکناسہ، بنو فاتن اور لواتہ کا کچھ حصہ) مغرب کی طرف نقل مکانی کر کے الجزائر (وہ علاقہ جو اوراس Auras تیارت Tiaret اور تلمسان (Tlemcen) کے گرد و نواح میں واقع ہے) اور مراکش (طاس مولویہ (Moulouya basin)، سجدماسہ Sidjilmasa، فیکیک Figig اور توات Twat کے درمیان کے صحرائی علاقے اور طاس سیاؤ (Sebou basin) چلے گئے تھے اور پھر مغربی مغرب سے ان کے بہت سے عناصر ہسپانیہ میں داخل ہو گئے۔ البترا کو خانہ بدوش اور اعلیٰ درجے کے ساریبان، بربروں کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ شاید ابتدا میں ان کا طرز زندگی ایسا ہی ہو اور بلا شبہ یہی وجہ ہے کہ عرب مؤرخوں نے ان لوگوں کو، جن کا طرز زندگی خانہ بدوشوں کا تھا، اسی گروہ میں شامل کر لیا ہے، مثلاً ہوارہ اور زناثہ۔ تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نفوسہ، نفزاوہ اور لواتہ کا ایک حصہ قدیم زمانے ہی میں مستقل طور پر لیبیا کے پہاڑوں میں آباد ہو گیا تھا، غالباً عرب فتوحات کے وقت ایسا ہوا۔ رہے وہ لوگ جو الجزائر اور مراکش چلے گئے تھے تو وہ بہت جلد وہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے اور انہوں نے کچھ چھوٹے چھوٹے شہر بھی بسائے۔

اس گروہ کے قبائل کی ایک بڑی تعداد کے اپنے اپنے نام ابھی تک باقی چلے آئے ہیں، لیکن سارے گروہ کا قدیم نام البترا اب باقی نہیں ہے۔



تھیں۔ یہاں ایک عرصے تک پروانس Provence کے خاندان ڈاگو d'Agout کی حکومت رہی۔ ۱۲۱۱ء میں بترون کا دارالامارت فرنگیوں (Franks) کی باہمی لڑائی کے باعث ہیکلین (Templers) کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔ ۱۲۸۹ء میں سلطان قلاؤن نے اسے باسانی فتح کر لیا۔ مالیہ مصر کے عہد میں بترون طرابلس کی نیابت سے ملحق تھا۔ انیسویں صدی عیسوی میں اسے اسفنج کی تجارت کی بدولت قدرے خوشحالی بھی حاصل ہو گئی۔ لیکن اب اسفنج یابی چند کشتیوں تک محدود رہ گئی ہے۔ اس وقت بترون کی آبادی تقریباً تین ہزار نفوس پر مشتمل ہے، جن میں اکثریت مارونی (Maronite) فرقے کے عیسائیوں کی ہے۔

مآخذ: (۱) یاقوت، مطبوعہ لائپزگ، ۱: ۴۹۳ (مطبوعہ بیروت، ۱: ۳۲۸)؛ (۲) الادریسی: (۳) Gilde-Syrie (meister)؛ ص ۱۷؛ Jaubert؛ ۱: ۳۰۶؛ (۴) Du Cagne؛ (۵) Les Familles d'Outre-Mer؛ ص ۲۵۷ - ۲۵۹؛ (۶) Palestine under the Moslems: Le Strange؛ ص ۲۵۱ تا ۲۵۲؛ (۷) W. Heyd؛ (۸) Histoire du Commerce au Levant؛ ۱: ۳۲۱؛ (۹) Lammens؛ (۱۰) La Syrie Topographie: Dusaud؛ ۲: ۳۸؛ (۱۱) Historique de la Syrie؛ ص ۷۱؛ (۱۲) Grousset؛ (۱۳) des Croisades؛ ۳: ۶۸۸، ۷۳۵؛ (۱۴) عادل اسمعیل؛ (۱۵) Histoire du Liban du XVII<sup>e</sup> siècle à nos jours؛ ۱: ۳۳؛ (۱۶) [۱۰] (۱۱) ع بذیل مادہ]۔

(N. ELISEEFF)

بتک، بتکچی: (ت) 'بتی' مصدر بمعنی لکھنا سے مشتق ہے، بتک حاصل مصدر بمعنی الكتابة، (لیکن اورخون کے کتبات اور ترقان کے ترکی متون میں بتک بھی آیا ہے، بطور اسم مفعول، بمعنی ہوا (مجموعۂ دستاویزات، نیز دیکھیے Redhouse، بذیل مادہ، بتک Bitik بمعنی written documents)۔

قاہرہ ۱۹۳۹ء، ص ۳۰۵)۔

مآخذ: (۱) ابن خلدون [کتاب العبر]؛ (۲) Histoire des Berbères؛ بار دوم، ۱: ۱۷۰، ۲۲۶؛ (۳) Les siècles obscurs du Maghreb: E. F. Gautier؛ پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۲۰۴ تا ۲۱۱۔ (G. S. COLIN)

\* بترون: (یا بترون، قب یاقوت، ۱: ۴۹۳) اسے یونانی اور رومی مصنفین نے Bostrys لکھا ہے اور صلیبی جنگجوؤں نے Boutron - یہ لبنان کے ساحل پر بیروت سے شمالی جانب، چھپن کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا شہر ہے جس سے ہر فاتح لشکر کا گزر ہوتا رہا؛ اس لیے کہ اس شقہ (Theouprosôpon) کے جنوب میں جو سڑک بیروت سے طرابلس گئی ہے اس کی زد میں ہے۔ یوسفوس (Antiq) Josephus (ص ۸، ۳، ۵۲) کی روایت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد صور (Tyre) کے بادشاہ اثوبال (Ithobaal) نے رکھی تھی لیکن حقیقت میں یہ شہر بہت پرانا ہے، کیونکہ تل العمرنہ کے مکتوبات (پندرہویں صدی عیسوی) میں اس کا ذکر بائبلوس Byblos (جبل) کے مقبوضات میں آیا ہے۔ ایک زمانے میں یہ مقام بحری قزاقوں کا اڈا تھا، جن کا قلع قمع Antiochus III Megas نے کیا۔ بترون کی ایک وسیع بیضوی تماشا گاہ کے آثار کو دیکھیے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ شہر، جو انگور کے باغات کے لیے پہلے ہی سے مشہور تھا، رومیوں کے عہد میں بھی خاصا اہم ہوگا۔ ۱۶ جولائی ۶۵۱ء کے زلزلے اور سمندر میں جوار بھانے کی ایک لہر سے جملہ ساحلی شہروں کی طرح یہ شہر بھی برباد ہو گیا۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں بترون طرابلس کے انتظامی ضلع (کاؤنٹی County) کے ماتحت ایک اسقفیہ کا صدر مقام تھا، جہاں بحیثیت ایک بندرگاہ کے اہل پسا Pisa کو کئی ایک مراعات حاصل

اور بچیچی اور اوردوس Ordos میں بچک اور بچیچی۔  
 تنگز میں قدیم ترین شکل جو-چن بتگہ (ی)  
 bitge (i) بمعنی ”کتاب“ ہے۔ منجو کا بتھ bithe  
 بمعنی ”تحریری دستاویز“ بطور ”کتاب، دستاویز،  
 خط“ غالباً مستعار لفظ ہے؛ اس لیے کہ اس کے  
 اشتقاق کی تشریح و توضیح منجو زبان کے حقائق سے  
 نہیں ہوتی۔ دوسری طرف بتھ سی bithesi بمعنی  
 کاتب و دبیر، منجو زبان کا ایک باضابطہ اسم فاعل  
 ہے۔ اونکی Evenki زبان میں بچی bīci بمعنی ”لکھنا“  
 اور بچیگا biciga ”تحریری دستاویز“ مغولی زبان  
 سے مستعار ہیں، بحالیکہ اورخ Oroch کا بتیہو bitihö  
 اور اولچہ Oltcha کا بتیہو bithö بمعنی ”تحریری  
 دستاویز، خط“ براہ راست منجو شکلوں سے تعلق  
 رکھتے ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا قرین عقل ہے کہ وہ ترکی  
 الفاظ جنہیں اویغور کاتبوں نے مغولی زبان میں داخل  
 کر دیا تھا اس زبان میں مغول فتوحات کے بعد آئے  
 اور اسی لیے وہ نظم و نسق کی مخصوص اصطلاحات  
 کے طور پر استعمال ہونے لگے۔ یہ الفاظ پوچن اور  
 منجو کی نہایت ترقی یافتہ ریاستوں میں بھی فوراً  
 رائج ہو گئے (نیز رک بہ پرات - [ترکوں کی  
 تاریخ کے مختلف ادوار میں بتکچی کا منصب  
 خاصا اہم رہا ہے، چنانچہ اولوغ بتکچی  
 بمعنی باش کاتب ایلخانیوں اور قرہ خانیوں کے ہاں  
 تقریباً وزیر کا ہم پلہ سمجھا جاتا تھا اور بڑی شاہی  
 مہر (یوک تمغا) کے صندوقچے کی چابی اسی کے  
 پاس رہتی تھی؛ وہ اپنی مرضی سے اپنے ماتحت  
 بتکچی اور بخشی منتخب کر سکتا تھا۔ سلجوق  
 سلاطین کے زمانے میں بتکچی کو اکثر صاحب طغرا،  
 طغرانی، شانچی اور پروانچی بھی کہتے تھے۔  
 لفظ بتک سے مرکب بعض اصطلاحات یہ تھیں:  
 بتکلک بمعنی تحریر کردہ، صاحب سند؛ بتکلک

بتکچی اسم فاعل ہے، جس میں جی علامت فاعل  
 ہے (بمعنی لکھنے والا، ناقل، کاتب، دبیر)، جو  
 قندیو بلک میں بتکچی کی شکل میں ملتا ہے۔  
 چنانچہ درمیانے دور کی ترکی بالخصوص چغتائی  
 وغیرہ شاخوں سے ان شکلوں (بتک، بتکچی وغیرہ) کی  
 بخوبی تصدیق ہو جاتی ہے۔

بتی کی ترکیب صرفی معلوم نہیں ہے۔ اسے  
 اکثر چینی زبان کے لفظ 筆 (پی = pi > \*piet)  
 بمعنی ”لکھنے کا برش“ سے مشتق بتایا جاتا ہے،  
 لیکن یہ محل نظر ہے [قب (ا، ت)۔]۔ ایسے بعض  
 انڈو یورپی شکلوں، مثلاً خوتانی (Khotanese)  
 پڈاکہ Pidaka بمعنی ”محررہ، دستاویز“، سنسکرت  
 پٹاکا pitaka بمعنی ”دھرم شاستروں کا مجموعہ“  
 یا یونانی πικτάριον بمعنی ”خط“، سے مماثل سمجھنے  
 کی طرف میلان ضرور ہوتا ہے، لیکن ان لفظوں کی  
 صوتی تاریخ اس قیاس کی تائید نہیں کرتی۔

تحریری مغول زبان میں فعل لکھنا کے لیے  
 لفظ ”بچی“ مستعمل ہے اور یہ شکل ترکی زبان  
 کے بتی سے ملتی جلتی ہے۔ حاصل مصدر بچک بمعنی  
 ”تحریری دستاویز، تحریر، خط، سرکاری مراسلہ“  
 کے وجود کا سراغ ”مغول کی خفیہ تاریخ“  
 کے وقت سے ملتا ہے اور اس کا اسم فاعل بچیچی  
 بمعنی محرر، کاتب، نقل نویس، ایلخانی حکمرانوں  
 کی سرکاری دستاویزات میں موجود ہے۔ اسی اثنا  
 میں بظاہر مغول کے زیر حکومت ایران میں  
 ترکی شکل بتکچی کو اس لفظ کی مغولی صورت پر  
 ترجیح دی جاتی تھی۔ اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا  
 ہے کہ مغول نظم و نسق حکومت میں اویغور  
 [= اتالیق] کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ جدید  
 بولیسوں میں ادبی مغول زبان کے یہ دو لفظ نمایاں  
 طور پر نظر آتے ہیں؛ مثلاً جدید خلمغا میں بچک، اور  
 بچیچی، بریت میں basag اور basag قلموق میں بچک



بمعنی کتابوں کی الماری یا لوازماتِ کتابت؛  
بتک دلی بمعنی تحریری یا ادبی زبان اور بتک اوستہ  
سی بمعنی معلم مکتب؛ دیکھیے [لا، ت، زیر مادہ]۔  
(D. SINOR) و [ادارہ]

\* بتلیس : رتک بہ بتلیس۔

\* بتمن : رتک بہ وزن۔

\* بتمی : (Bataumi) (بتم) [= باطوم Bataum

قَبَّ الْمُنَجِد] شورائید روس کے ماورائے قفقاز میں  
بحر اسود کی ایک بندرگاہ، آجرتان کی باختیار  
اشترائی شورائیدہ کا دارالحکومت۔ یہ شہر  
ہیڈرین Hadrian کے عہدِ حکومت میں ایک  
ہرانی روسی بندرگاہ Bathys کے مقام پر تعمیر  
ہوا لیکن آگے چل کر اسے پٹرا Petra کے بوزنطی  
قلعے کی خاطر ترک کر دیا گیا۔ پٹرا Petra کی بنیاد  
جسٹینین Justinian کے عہدِ حکومت میں بتمی کے  
شمال میں موجودہ Tzikhis Tziri کی جگہ رکھی گئی۔

خطۂ بتمی (ضلع اجر) پر، جو پہلے مملکتِ لاز  
کا مقبوضہ تھا، عربوں کا قبضہ رہا۔ لیکن وہ اسے  
دیر تک اپنے قبضے میں نہ رکھ سکے۔ نویں صدی  
عیسوی میں تو یہ توکلر جتی Tuoklardjeti کی قلمرو  
اور دسویں صدی کے اواخر میں اس کی جانشین  
گرجستان کی مملکت متحدہ میں شامل ہو گیا۔  
۱۰۱۰ء سے اس پر شاہ گرجستان اریستاف Erstav  
حکمرانی کرتا رہا۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں  
صدی عیسوی میں جب گرجستان کی مملکت متحدہ  
کا شیرازہ بکھر گیا تو بتمی گوربا Guria کے  
شہزادہ (متور Mtavar) کے قبضے میں آ گیا۔

نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی  
میں عثمانی ترکوں نے جب یہاں متور کخبیر گوربلی  
Kakhaber Gureili حکومت کر رہا تھا اگرچہ بتمی  
کا شہر اور ضلع فتح کر لیا گیا تھا لیکن وہ اس پر  
قابض نہ رہ سکے البتہ اس سے ایک صدی کے بعد وہ پھر

ایک لشکر کے ساتھ واپس آئے اور سوخوستہ Sokhoista  
کے مقام پر گرجی اور امریٹی (Immeretian) عسا کر  
کو فیصلہ کن شکست دی۔ باین ہمہ بتمی کو دوبارہ  
ان سے چھین لیا گیا۔ پہلے تو (متور) روستما گرائلی  
Rostma Gurieli ۱۵۶۳ء میں اس پر پھر سے قابض  
ہو گیا لیکن یہ جلد ہی اس کے ہاتھ سے نکل گیا،  
مگر پھر ۱۶۰۹ء میں میبا گرائلی نے اسے فتح  
کر لیا۔ ۱۶۲۷ء کے بعد سے البتہ بتمی عثمانی  
سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

ترکی فتح کے ساتھ ہی آجر میں، جو ابھی تک  
ایک عیسائی علاقہ تھا، اسلام پھیلنا شروع ہو گیا۔  
چنانچہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر تک  
یہ سارا علاقہ اسلام قبول کر چکا تھا۔

ترکوں کے زیرِ حکومت بتمی جو ایک وسیع  
قلعہ بند شہر تھا (آبادی ۱۸۰۷ء میں دو ہزار اور  
۱۸۷۷ء میں پانچ ہزار سے زائد) بڑی سرگرم  
بندرگاہ اور ماورائے قفقاز میں... تجارت کا سب سے  
بڑا مرکز بن گیا۔

یہ شہر، جسے سان سٹیفانو San Stefano کے  
معاهدے کی رو سے روس کے حوالے کر دیا گیا تھا اور  
جس پر ۲۸ اگست ۱۸۷۸ء کو روسیوں نے اپنا  
قبضہ جمایا تھا، ۱۸۸۶ء تک بطور ایک آزاد بندرگاہ  
رہا۔ خطۂ اجر کو اول اول تو ایک خود اختیار  
انتظامی وحدت کا درجہ حاصل تھا لیکن ۱۲ جون  
۱۸۸۳ء کو اس کا الحاق گتیس Kutais کی  
حکومت سے کر دیا گیا اور آخر الامر یکم جون  
۱۹۰۳ء کو ارتوین Artvin کے آکرگ Okrug  
سمیت خطۂ بتمی میں شامل کر کے براہِ راست  
گرجستان کی حکومت عمومی کے ماتحت کر  
دیا گیا۔

۱۸۸۳ء میں بتمی - تفلیس (تفلس) - باکو  
ریلوے کی تعمیر کے ساتھ بتمی کی توسیع بھی شروع

تھی۔ سب (حنفی سنی) مسلمان تھے اور گوری بولی بولتے تھے، جس پر ترکی اور عربی زبانوں کا بہت زیادہ اثر ہے۔ مادی اعتبار سے ان کی ثقافت (مثلاً ”چدرا“ (چادر) جو عورتیں اوڑھتی ہیں) ترکوں سے ملتی جلتی ہے اور اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اجر وسیع پیمانے پر دو زبانیں (گوری بولی اور ترکی) بولتے ہیں۔

۱۹۳۹ء کی سرشماری کی رو سے اجروں کو نسلًا گرجستانی قوم ہی کا ایک حصہ سمجھ کر گرجستانی قرار دیا گیا۔

آج کل بتمی تیل کی ایک بڑی بندرگاہ، باکو ہائپ لائن (تیل صاف کرنے کے کارخانوں) کا مخرج اور بڑا اہم صنعتی مرکز ہے جس میں اشیائے خوردنی کو محفوظ کرنے اور مشینی آلات بنانے کے کارخانے قائم ہیں۔ ۱۹۵۶ء کے شروع میں اس کی آبادی ۷۷۰۰۰ تھی جس میں مسلمانوں کی حیثیت ایک اقلیت سے زیادہ نہیں۔

۱۹۵۶ء میں خود مختار جمہوریہ اجر (رقبہ ۳۰۱۷ مربع کیلومیٹر) کی آبادی ۲۳۸۰۰۰ تھی اور اس میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ چرخ Coruch کی وادی میں اجر اور لاز (تقریباً دو ہزار) کرد (اجر اور تزکلی کی بلند وادی میں ۱۹۲۴ء میں تین ہزار خانہ بدوش) اور بتمی کے قریب ابخزوں Akhaz کی ایک نوآبادی (۱۹۲۶ء میں پانچ ہزار)۔

مآخذ: (۱) P-ce Massal'skiy Očerki

‘Izv. Ross. Imp. Geogr. obshche’ Batumskoy Oblasti

۱۸۸۶ء؛ (۲) Sbornik Svedeniy o Kutaiskoy

Gubernii ج ۳، Kutais ۱۸۸۶ء؛ (۳) Bol'shaya

Sovetskaya Entsiklopediya، بار دوم، ص ۳۰۹ تا

۳۱۳ (بتمی)؛ نیز: ۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۶ء Adjaraskaya Avto-

nomnaya Respublika؛ (۴) Moeddin Surmanidze

Sovetskiy Adjaristan، در Novly Vostok، عدد ۲، تا

ہو گئی اور ۱۹۰۰ء تک باکو، بتمی ہائپ لائن کی تکمیل کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ یوں بتمی بحر اسود پر روس کی بہت بڑی تیل کی بندرگاہ بن گیا، چنانچہ شہر بھی غیر معمولی حد تک پھیل گیا اور اس کی آبادی میں بھی بڑی تیزی سے اضافہ ہوا: ۱۸۸۲ء میں ۸۶۷۱، ۱۸۸۹ء میں ۱۲۰۰۰ اور ۱۹۲۶ء میں ۳۵۳۸۲۔

شہر کی آبادی میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں اور اس کی حیثیت بین العلیٰ ہے۔ مسلمان (اجر، لاز اور ترک) بمقابلہ روسیوں، یونانیوں، ارمنوں اور گرجستانیوں کے اقلیت میں ہیں۔ تاہم یہ خطہ سر تا سر اسلامی ہے۔ ۱۹۱۱ء میں اس کی کل آبادی ۱۷۰۳۷۷ تھی، جن میں سے ۷۰۹۱۸ اجر تھے اور باقی ۵۸۹۱۲ مسلمان (لاز، ترک اور کرد وغیرہ) تھے۔

اپریل ۱۹۱۸ء میں پھر ترکوں نے بتمی پر قبضہ کر لیا لیکن اگلے موسم بہار میں اس پر انگریز قابض ہو گئے اور جون ۱۹۱۹ء میں اسے خالی کر کے چلے گئے۔ جمہوریہ گرجستان کی شکست کے بعد آر۔ ایس۔ ایف۔ ایس۔ آر اور ترکی کے درمیان ۶ مارچ ۱۹۲۱ء کے معاہدے کی رو سے قارص Kars اور آردگان Ardgan کے خطے ترکی کو واپس مل گئے۔ لیکن بتمی روسیوں ہی کے پاس رہا۔ شورائی (روسی) حکمرانی کا اعلان ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء کو ہوا۔ اسی سال ۱۶ جون کو اس علاقے میں اجرستان کی شورائی اشتراکی جمہوریہ قائم ہو گئی اور گرجستان کی شورائی اشتراکی جمہوریہ کے ماتحت بتمی اس کا مرکز حکومت قرار پایا۔

بتمی میں اکثریت اجروں کی ہے۔ ۱۹۲۶ء تک انہیں گرجیوں سے الگ ایک جداگانہ قوم تصور کیا جاتا تھا۔ ان کی سرشماری بھی علیحدہ ہی کی جاتی تھی۔ اس وقت ان کی تعداد ۷۱۳۹۰



ثبوت ہیں۔ زمانہ قدیم ہی سے اس علاقے کو شام کا اناج گھر سمجھا جاتا رہا اور اب بھی ہے۔ عرب جغرافیہ دانوں کا کہنا ہے کہ ازمنہ متوسطہ میں یہ سارا علاقہ دیہات سے پٹا پڑا تھا۔ یوں بھی یہ سلسلہ رسل و رسائل کی اس شاہراہ پر واقع تھا جو دمشق کو اُردن سے ملاتی ہے۔ اس شاہراہ کا وجود مملوک حکمرانوں کے ڈاک کے محکمے (برید) اور شام کے قافلہ ہائے حجاج کا مرہون منت تھا۔

عربوں نے البشئیہ کو ۶۳۵/۵۱۳ء میں فتح کیا اور حوران کی طرح اسے بھی ارض خراج قرار دیا۔ بعد میں اس کا الحاق جند دمشق سے ہو گیا، گو بالمعموم اس کا تعلق حوران ہی سے قائم رہا۔ صلیبی جنگوں میں اس خطے کو فرنگیوں کی تاخت و تاراج سے بڑا نقصان پہنچا۔ آگے چل کر عثمانی عہد حکومت میں دو اہم واقعات اس علاقے پر اثر انداز ہوئے۔ اول عنازہ اور روالہ کے خانہ بدوش قبائل کی یورش، جس سے بد نظمی اور بد امنی کا جو دور دورہ شروع ہوا وہ انیسویں صدی کے آخر تک قائم رہا۔ دوسرے حوران کے ان کوہستانیوں کا یہاں آ کر آباد ہونا جنہیں دروزیوں نے ان کے وطن سے نکال دیا تھا، دروزی سترھویں صدی عیسوی ہی سے حوران میں داخل ہو رہے تھے حتیٰ کہ ۱۸۶۱ء میں لبنان کے بعض عناصر بھی ان میں شامل ہوتے گئے۔

البشئیہ کو اس چھوٹے سے میدانی خطے سے ممیز کرنا ضروری ہے جو جبل الدروز کے شمال مشرق میں واقع ہے اور جسے قدیم زمانے میں Saccia اور عربوں کے عہد میں ارض البشئیہ کہا جاتا تھا۔ یہ ایک اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے ”بشئیہ کی سرحد“ لیکن اس کا ایک علاقائی نام بشئیہ بھی ہے، جس کی بنا پر بہت ممکن ہے کسی کو خیال ہو کہ اس رقبے کو ”بشئیہ کوچک“ کہا جاتا تھا۔

*Histoire du : I. Djavakhishvili (۵) : ۱۹۲۸/۲۱*  
*peuple Georgien*، ج ۱ تا ۳، تفلس ۱۹۲۸ تا  
 ۱۹۳۳ء : (۶) *XX let Adjarskoy ASSR*، بشمی  
 ۱۹۳۱ء : (۷) *Očerki po : V. D. Čanturija*  
 ۱۹۳۰ء : (۸) *istorii prosveshčeniya v Adjarii*  
*Kratkiy očerk Gurii, Čürük-su i : D. Bakradze*  
*Adjarii*، در *Izvestiya Kavkazskogo Otdela Imp.*  
*Russk. Geogr. Obshč.*، تفلس ۱۸۷۳ء، ج ۲، شماره ۵ :  
*Osmanli Idaresi ve Gürcüler : Şinasi Altundağ*  
 در *AÜDTC. Fak. Derg.*، ۱۹۵۲ء، ص ۷۸ تا ۹۰۔  
 (CH. QUELQUEJAY)

\* **بَتُول** : رَکْ بہ (حضرت) مریم (علیہا السلام)  
 [اور (حضرت) فاطمۃ الزہرا (علیہا السلام)]۔

\* **بَتُولِجہ** : رَکْ بہ مناسِتر۔

\* **بَتْرُون** : رَکْ بہ بَتْرُون۔

\* **البَشِئِيَّة** : ملک شام کا ایک ضلع (کورہ)،

جس کا صدر مقام اذرعات ہے اور جس کے مشرق میں جبل الدروز، شمال میں لَجَعہ کا میدان اور جیدور، مغرب میں جولان اور جنوب میں الجمل کی پہاڑیاں واقع ہیں، لیکن یہاں اس کی حدود کسی قدر غیر واضح ہو جاتی ہیں۔ اس علاقے کا، جسے النقرہ (کھوکھلا) بھی کہا جاتا ہے، محل وقوع قدیم **بَتْنِيَّة** Batanaea کے عین مطابق ہے، جس کا ذکر عہد نامہ عتیق میں تراخونتس Trachontes، اورونیتس Auronites اور گولانیتس Gaulanites کے ساتھ بشن کی قدیم پادشاہت کے ایک حصے کے طور پر آیا ہے۔ البشئیہ سرسبز علاقہ ہے، جیسا کہ اس کے نام ہی سے، جو لفظ بشنہ (بمعنی ہموار اور غیر سنگلاخ) سے مشتق ہے، معلوم ہوتا ہے۔ اس کی آبادی قدیم ایام ہی سے بڑی گنجان تھی؛ چنانچہ کس قدر کتبے اور قبروں کے ڈھیر کے ڈھیر ہیں جو اب بھی یہاں پائے جاتے ہیں اور اس امر کا

پھر آگے چل کر ۱۸۰۲ء / ۱۸۰۰ء کے قریب شہزادہ (Voyvode) بغداد [رک بان] کے قبضے میں چلا گیا۔ مگر پھر جب آل عثمان اور کریمیا کے تاتاروں نے باہم مل کر فوج کشی کی تو اول ۱۸۸۹ء / ۱۸۸۳ء میں آق کرمان Ak-Kirmān اور کلی Kili [= کیلیا] اور پھر ۱۸۴۵ء / ۱۸۳۸ء میں پورا بجاق براہ راست دولت عثمانیہ کے ماتحت آ گیا [رک بہ بغداد]۔

دولت عثمانیہ میں بجاق کا علاقہ آق کرمان [رک بان] کی سنجاق میں شامل تھا۔ اس کی حدود سولکچہ Solkuča سے لے کر، جو دریائے بوٹنہ Botna کے کنارے واقع ہے، گرادشتہ Gradishte سے ہوتی ہوئی کلی Kili تک جاتی تھیں۔ خان کریمیا (= قرم، جس نے ۱۸۴۵ء / ۱۸۳۸ء کی مہم کے دوران میں سلیمان اول کے دوش بدوش حصہ لیا تھا، بجاق میں نغائی قبائل (منصور، اوراق، قسائے، مامے (محمد)، تتموز، یدیسک، جمبویلق) (قب السبع السیار، ص ۱۰۶) کو آباد کیا اور یوں ان مغول باشندوں کے لیے تقویت کا باعث ہوئے جو پہلے سے یہاں آباد تھے۔ اولیا چلبی نے ۱۸۰۶ء / ۱۸۰۷ء میں بیان کیا ہے (۵: ۱۰۶) کہ ان تاتاری باشندوں کے دوسو گاؤں تھے اور وہ بہت مال دار تھے۔ بندر Bender کی جانب کے دیہات میں مغول کی تعداد البتہ بہت کم تھی۔ پھر ان کی آبادی تمامتر ولاشیا والوں پر مشتمل تھی۔ اسماعیل کے گاؤں کاملاً مغول تھے۔ ۱۸۷۸ء / ۱۸۷۰ء میں بندر اور آق کرمان اوزیو Oziو کے یگلریگی کی ماتحت سنجاقوں کے مراکز تھے لیکن صوبہ دار کا صدر مقام آق کرمان یا سیلسترہ Silistre میں ہوتا تھا۔ بجاق کے مغول ایک یلی آغاسی کے ماتحت تھے، جس کا تقرر خان کریمیا سے ہوتا تھا۔ آگے چل کر اس منصب پر خان کے وارث ثانی (الملقب بہ نورالدین) کا تقرر ہونے لگا، جو بندر کے جنوب میں خان قیشلسی

مآخذ: (۱) یعقوبی: البلدان، ص ۳۲۶ (ترجمہ ص ۱۷۴)؛ (۲) البلاذری: فتوح، ص ۱۲۶؛ (۳) الطبری، بعد اشاریہ، BGA؛ (۴) الہروی: کتاب الزیارة (طبع Sourdél-Thomine، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۱۷) (ترجمہ دمشق ۱۹۵۷ء، ص ۴۴ اور تعلقہ ۴)؛ (۵) یاقوت، ۱: ۴۹۳؛ (۶) Palestine: Le Strange؛ (۷) under the Moslems، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۳۴؛ (۸) Textes géographiques arabes: A. S. Marmardji، پیرس ۱۹۵۱ء، خصوصاً ص ۱۵؛ (۹) La Syrie à: M. Gaudetfroy - Demombynes؛ (۱۰) l'époque des Mamelouks، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۶۶؛ (۱۱) Géographie de la Palestine: F. M. Abel؛ (۱۲) Topographie historique de la Syrie: R. Dussaud؛ (۱۳) پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۲۳۲ تا ۳۲۷؛ (۱۴) J. Cantineau؛ (۱۵) Les parlers arabes du Hōrān، پیرس ۱۹۳۶ء، ص ۵؛ (۱۶) بعد؛ (۱۷) Les cultes du Hauran: D. Sourdel؛ (۱۸) à l'époque romaine، پیرس ۱۹۵۲ء، ص ۲؛ (۱۹) Histoire des Croisades: R. Grousset؛ (۲۰) پیرس ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۶ء (بعد اشاریہ بذیل کلمہ Der'āt)؛ (۲۱) البستانی: دائرة المعارف، ۵: ۱۹۴ تا ۱۹۵؛ (۲۲) [۱۶] لآع بذیل مادہ]۔

(D. SOURDEL)

بشیرہ: جمیل [رک بان] کی محبوبہ۔

بجاق: جنوبی پس سربیا Bessarabia (قبل ازیں پس سربیا سے صرف بجاق ہی مراد لیا جاتا تھا)۔ ترکی لفظ بجاق (کومن ترکوں کی زبان میں، جو زمانہ قدیم میں یہاں سکونت پذیر ہو گئے تھے، بجق) کے معنی ہیں: کونا، گوشہ۔

۱۲۳۱ء / ۱۲۳۸ء سے یہ علاقہ خوانین اردوئے مطلقاً [رک بہ باتو (خانوادہ)] کی سلطنت کا حصہ رہا ہے۔ جب انہیں زوال ہوا تو یہ علاقہ (۱۲۳۹ء / ۱۳۴۵ء کے لگ بھگ) ولاشیا Wallachia اور



ہسپانوی شہر، جس کی حیثیت اب ایک چھوٹے سے قصبے کی رہ گئی ہے۔ وادی ہجاق (Rio Andara) جو سیرانوادا کے جنوبی فاصلے سے اتر کر ہجاق کے درمیان بہتے ہوئے ذرا اور نشیب میں سوا ساٹھ میٹر (دس کلومیٹر) کے فاصلے پر دیدبان (ماریہ ہجاق) کے پاس سمندر میں جا گرتا ہے؛ چنانچہ یہی وہ مقام ہے جہاں الماریہ [= الماریہ قب عنايت الله: جغرافیہ] (ہسپانوی Almeria) کے واحد نام سے اندلس میں بحر متوسط کی سب سے زیادہ پر رونق اور خوشحال بندرگاہ بن گیا۔ وہ ملاح جو لئنت (Alicante) اور آقلہ (Aguilas) کے درمیان آباد تھے ان کا قاعدہ تھا کہ موسم خزاں میں سواحل افریقہ کا رخ کرتے اور سردیاں جاتیں تو موسم بہار میں بہت سا مال تجارت ساتھ لے کر اندلس واپس آجاتے۔ ان میں سے بعض نے شمالی افریقہ کی بندرگاہوں میں سکونت اختیار کر لی اور علاوہ دوسرے شہروں کے ۸۷۵/۵۲۶۲ میں تینیس جدید Ténà کی بنیاد رکھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہجاق کے علاقے میں یمنی عرب آباد تھے اور جنہیں عبدالرحمن الثانی نے اس خیال سے کہ المجوس (نارمنوں) [رک بہ المجوس] کے حملوں سے ساحل کو جو خطرہ ہے اس کے سدباب کے لیے انہیں ایک چھاؤنی (رباط) قائم رکھنے کی ذمہ داری کے عوض اندراش (Andarax) کی زرخیز اور شاداب وادی عطا کر دی۔ یوں جو اندلسی ملاح تینیس سے واپس آئے انہوں نے ان عربوں سے روابط پیدا کیے تاکہ ساحل سمندر پر ایک طرح کی جمہوریہ قائم ہو جائے۔ اس ریاست کا صدر مقام ہجاق تھا، جہاں عربوں کے ہاتھوں ایک وسیع مسجد اور ملاحوں کے تعمیر کردہ دمدموں پر مشتمل ایک ایسا شہر قائم ہو گیا جس کی وسعت اور خوشحالی میں اس کے تجارتی بیڑے کی وجہ سے، جو الماریہ

Kishlasi کے مقام پر رہا کرتا تھا۔ ۱۶۲۰ء کے عشرے میں قازاقوں (Kazaks) اور پولینڈ کے خلاف جنگوں میں نغائیوں کے بیگ قن تیمور نے بڑا امتیاز حاصل کیا۔ چنانچہ خان کریمیا کے مقابلے میں آل عثمان نے اس کی حمایت کی اور اس خیال سے کہ خان کے ہاتھوں نغائی مغول کی سربراہی چھین لی جائے اسے اوزیو کا بیگلر بیگی بنا دیا۔ ۱۱۱۱/۵۱۶۹۹ سے ۱۱۱۳/۵۱۷۰۱ء تک ہجاق کے نغائیوں (چھ ہزار کنبوں) نے خان کی اطاعت کا جوا اتار پھینکا اور درخواست کی کہ انہیں سلطنت عثمانیہ کی رعایا بنا لیا جائے۔ اس موقع پر باب عالی نے ان کی قطعاً حوصلہ افزائی نہیں کی۔ لہذا دولت گرائے (Giray و Gerey) نے سات سے آٹھ سو تک کنبے زبردستی کریمیا میں منتقل کر دیے (السبع السیار، ص ۲۶۲ تا ۲۶۶)۔

۱۱۸۳/۵۱۷۷۰ء میں ہجاق پر روسیوں کا چند روزہ حملہ ہوا اور اس کے بعد آرتھوڈکس عیسائی کاگوز ترکوں اور بلغروں نے دوہرہ Dobrudja [رک باں] سے ہجاق میں نقل مکانی شروع کر دی۔ معاہدہ بخارست (۲۸ مئی ۱۸۱۲ء) کی رو سے باب عالی نے ہجاق کا روس سے الحاق قبول کر لیا؛ چنانچہ تاتاریوں کی اکثریت دبرجہ، بلغاریہ اور اناطولیہ میں نقل مکانی کر گئی۔

مآخذ: (۱) *Hist. des Roumains*: N. Jorga  
دس جلدیں، بخارست ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۹ء؛ (۲) وہی مصنف: *Studii istorice asupra chiliei și Cetatii-Albe*.  
بخارست ۱۸۹۹ء؛ (۳) س۔ محمد رضا: *السبع السیار فی اخبار ملوک التاتار، طبع کاظم بک، قازان ۱۸۳۲ء؛ (۴) (ترکی، بذیل مادہ ہجاق) (Aurel Decei)۔*

(HALIL INALCIK)

ہجاق = (ہسپانوی Pechina) ایک قدیم

بجایہ : (Bougie) سمندر کے قریب الجزائر کا ایک شہر، جو شہر الجزائر سے مشرق کی جانب تقریباً ایک سو پچھتر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ شہر جبل جورایہ Guraya کی سب سے نیچی ڈھلانوں پر اس طرح تعمیر ہوا کہ ایک وسیع اور غیر معمولی طور پر محفوظ خلیج اس کے نیچے واقع ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ روما اور کارتھیج کے جہاز سالدی Saldae (ایک قدیم شہر) میں لنگر انداز ہوا کرتے تھے۔ سنہ عیسوی کے شروع میں یہ جوہہ Juba شاہ شرشل Cherchel کی عملداری میں داخل تھا۔ [آگے چل کر] قیصر اگسٹس نے یہاں ایک نوآبادی قائم کی اور اپنے آزمودہ کار سپاہیوں کو وہاں بسا دیا۔ دوسری صدی عیسوی کے ایک کتبے میں سالدی Saldae کی تعریف ”شہر پرشوکت“ (Civitas splended issima) کہہ کر کی گئی ہے۔ بایں ہمہ اسلامی عہد سے پہلے اس شہر کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ البکری نے اس کا ذکر پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ایک بہت پرانا شہر اور خوشگوار سرمائی مقام ہے، جہاں اہل اندلس آباد ہیں۔ یہی زمانہ تھا جب مسلمانوں یعنی قبیلہ بجایہ (جس کے نام پر اس شہر کا نام بجایہ رکھا گیا) کے پہلو بہ پہلو ہسپانوی نمایاں طور پر ابھر رہے تھے لیکن وہ خاص واقعہ جس سے بجایہ کو تاریخ میں شہرت ہوئی۔ ۸۶۰ء میں پیش آیا۔ عملاً اس کی کیفیت یہ ہے کہ پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں قیروان کے زیری اور مصر کے فاطمی خلفا میں ناچاقی پیدا ہوئی تو اس علاقے کو ان کارروائیوں کا سامنا کرنا پڑا جو قادیان یہاں کی گئیں؛ یعنی ہلالیوں کا حملہ اور اس باغی مملکت پر قبضہ کرنے کے لیے مصر سے بدوی عربوں کا آنا۔ یہ انتقامی

Almeria میں لنگر انداز ہوتا، تیزی سے ترقی ہوتی گئی۔ لیکن سینتیس سالہ نیم خود مختاری کی مدت میں اسے الیرہ Elvira کے عرب مخالف سے خطرہ پیدا ہو گیا اور اس لیے ۵۳۱ / ۹۲۲ء میں اسے اموی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے نصف اول کے دوران میں بجانہ کی شادابی اور خوش حالی برقرار رہی؛ تا آنکہ عبدالرحمن الثالث نے ۵۳۴ / ۹۵۵ء میں المریہ Almeria کو اس علاقے کا صدر مقام قرار دیا اور قصبہ بندی کے نئے نئے منصوبے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ الحکم الثانی کے عہد حکومت میں بجانہ کی اہمیت اور بھی گھٹ گئی اور پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں اس کی حیثیت ایک معمولی سے گاؤں کی رہ گئی۔ ادھر المریہ Almeria ملوک الطوائف کی ایک ریاست کا صدر مقام بن گیا۔

مآخذ: (۱) البکری: *Descr. de l'Afr. sept.*؛ متن ص ۸۱، فرانسیسی ترجمہ ص ۱۶۳؛ [۲] ابوالفداء: *تقویم البلدان*، طبع رینو و دیسلان، ۲: ۱۷۷-۲۰۳؛ (۳) الاذریسی، متن ص ۲۰۰، فرانسیسی ترجمہ ص ۲۴۵ سطر ۵؛ (۴) یاقوت، طبع و سٹنفلٹ، ۱: ۳۹۳ تا ۳۹۵؛ (۵) ابن عبدالمنعم الحیثیری، *الروض المعطار*، طبع اسپانیا، رقم ۳۷؛ (۶) Simonet: *Descripción del reino de Granada*، ص ۱۳۶ تا ۱۳۷؛ [۷] E. Lévi Provençal: *Péninsule ibérique: vençal*، ص ۳۵ تا ۳۸؛ (۸) وہی مصنف: *Hist. Esp. mus.*؛ ۱: ۳۳۸ بسعد؛ (۹) E. Lévi Provençal اور E. García Gómez: *Una Cronica anónima de Abd al-Rahmān III al-Nāsir* میڈرد، غرناطہ، ۱۹۰۵ء، فصل ۳۰۔ (A. HUICI MIRANDA)

بجایہ: رَکْ بَہ بیجہ۔



کارروائیاں بڑی خوفناک تھیں۔ بدوی عربوں نے ولایت افریقیہ کے دیہات کو تاخت و تاراج کر دیا۔ اندرون ملک کے تاراج شدہ قصبے بھی ایک حد تک خالی کر دیے گئے۔ اس افراتفری سے جن لوگوں نے سب سے پہلے فائدہ اٹھایا وہ بنوحماد تھے۔ چنانچہ گیارہویں صدی کا آخری زمانہ ان کے دارالحکومت قلعہ کا عہدِ عروج ہے۔ لیکن بدوی عربوں نے بھی مغرب کی جانب پھیلنے میں کمی نہیں کی تھی۔ لہذا یہ لوگ قلعہ بنوحماد کے لیے حد درجہ خطرے کا سبب بن رہے تھے۔ اس پر بنوحماد نے فیصلہ کیا کہ ان کا دارالحکومت کسی ایسی جگہ ہونا چاہیے جو اتنا غیر محفوظ نہ ہو۔ لہذا جس طرح زبیریوں نے قیروان کو چھوڑ کر ساحلی شہر سہدیہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا اسی طرح قلعہ کے حاکم بھی ساحل کی طرف منتقل ہو گئے۔ ۱۰۶۷ء میں الناصر حمادی نے بجایہ کی سر زمین پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنا صدر مقام بناتے ہوئے چاہا کہ اس کا نام الناصریہ رکھ دے۔ ہر چند کہ وہ اپنے وقت کا کچھ حصہ پہلے کی طرح قلعے میں بھی گزارتا تھا۔ تاہم نئے صدر مقام کی توسیع کو مقدم سمجھتا اور پوری کوشش کرتا رہا کہ لوگ یہاں آئیں اور آباد ہوں۔ چنانچہ اس نے بجایہ میں ایک محل (قصر اللؤلؤ) تعمیر کیا۔ اس کے بیٹے المنصور (۵۴۶۳/۵۴۹۸ء تا ۵۴۹۸/۵۵۰۴ء) نے تو سابقہ دارالحکومت (قلعہ) کو بالکل خیر باد کہہ دی (گو اس کے حسن و زیبائش کے لیے بعض نئی عمارتیں بھی تیار کروائیں) اور مستقلاً نقل مکانی کرتا ہوا اپنی فوجوں اور درباریوں سمیت بجایہ میں آ گیا۔ یہاں اس نے ایک جامع مسجد کی بنا رکھی، باغ لگائے اور اپنے لیے دو محل اسیمون اور قصرالکوکب کے نام سے تعمیر کیے۔ علاوہ ازیں شہر میں پانی پہنچانے کا بندوبست کیا۔ جو جبل

توجہ Tudja سے بذریعہ نہر آتا تھا۔ مشہور ہے کہ اس شہر میں اکیس محلے اور بہتر مسجدیں تھیں۔ بلاشبہ اس میں کچھ مبالغہ ہے مگر اتنی بات یقینی ہے کہ چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی کا پہلا نصف بجایہ کا سنہری زمانہ تھا۔ حمادیوں کے اس دوسرے صدر مقام کو بہت سی چیزیں پہلے صدر مقام سے میراث میں ملیں۔ اس نے زوال یافتہ قلعہ کے چیدہ چیدہ علماء، دولت مند شہریوں، ارباب دانش و حکمت اور اہل فن کو بڑے تپاک سے اپنے ہاں جگہ دی۔ شہری زندگی بڑے آرام اور خوشحالی میں گزرتی تھی، کسی قسم کی سختی اور تنگی نہیں تھی۔ چنانچہ اس پر تکلف لباس سے جو بجایہ کے شہری پہنتے تھے یعنی عماموں کی باہتمام زیبائش سے لے کر سنہری فیتوں سے بندھی ہوئی جوتیوں تک کو دیکھ کر ابن تومرت کو بہت دکھ ہوا۔ ۱۱۱۸ء کے قریب اس نے اپنا کچھ وقت بجایہ ہی میں گزارا تھا اور کوشش بھی کی تھی کہ اس شہر کے رسم و رواج کی اصلاح کرے۔ ابن تومرت کے قیام کی طرح اندلسی صوفی سیدی بومدین کا یہاں آ کر ٹھہرنا اور دوران قیام میں یہاں کے لوگوں کو تعلیم دینا اس بات کی کافی شہادت ہے کہ یہ شہر مذہبی تعلیم کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔

یہ بجایہ کی بندرگاہ ہی تھی جس کے ذریعے سمندر پار کے ممالک سے تجارتی اور ثقافتی روابط قائم ہوئے، لہذا بجایہ نے ایک ایسے مرکز کی حیثیت اختیار کی جس سے مشرقی بربر کی تہذیب اور علم و ہنر کی شعاعیں مسیحی یورپ بالخصوص صقلیہ اور ایتالیہ میں پھیلیں۔

جغرافیہ نویس الادریسی کی رائے میں بجایہ ریاست حمادیہ کا مرکزی شہر تھا اور اس کے لیے بمنزلہ چشم۔ پھر یہ باور کرنے کے لیے بھی معقول وجوہ ہیں کہ پلرمو Palermo کی شاہی

موجودہ فوکا گیٹ (Fouka Gate) کے مقام پر؛ باب اللوز al-Lawz اسی جگہ لیکن باب البنود سے زبیریں جانب - شہر کے باہر رود سمم Soummam کے دونوں کناروں پر وہ مشہور باغات پھیلے ہوئے تھے جو بارہویں صدی میں لگائے گئے اور تیرہویں صدی عیسوی میں انہیں پھر سے درست کیا گیا، مغربی کنارے پر البدیع اور مشرقی پر الرفیع۔

۵۵۴۶/۱۱۵۲ء میں بجایہ پر عبدالؤمن نے قبضہ کر لیا اور حمادیہ خاندان کا آخری فرمان روا جہاز میں بیٹھ کر صقلیہ چلا گیا۔ اس طرح یہ قدیم ہائے تخت الموحدون کے ایک صوبے کا، جو مراکش کے تحت تھا، صدر مقام بن گیا۔ اس کا زوال اس کے لیے بھی المناک ثابت ہوا، اس لیے کہ الموحدون ان کی تالیف قلب نہیں کر سکے۔ نئے فرمانرواؤں کی یہی عدم مقبولیت شاید اس امر کا باعث ہوئی کہ بنو غانیہ نے بجایہ کو اپنا مرکز توجہ بنایا اور دولت مرابطون کو بحال کرنے کی کوشش میں جہازوں کے ذریعے اپنی فوج وہاں اتار دی۔

مگر بنو غانیہ کے لیے بجایہ کی حیثیت محض ایک جنگی مستقر کی تھی، جسے الموحدون نے جلد ہی دوبارہ فتح کر لیا اور پھر جب تک خاندان مؤمنیہ [موحدون] کا خاتمہ نہیں ہوا اسی کے زیر حکومت رہا۔ مؤمنیہ [عبدالؤمن بانی دولت الموحدون کی اولاد] کے بعد بجایہ اور اس کے اطراف و جوانب کا علاقہ تونس کے خاندان حفصیہ کی مملکت کا ایک حصہ بن گیا۔ یہ صوبہ ایک دور دراز خطے میں واقع تھا، اس لیے تیرہویں صدی سے لے کر پندرہویں صدی عیسوی تک ممالک بربر کی تاریخ میں اس نے جو حصہ لیا اس کی وجہ بھی بظاہر یہی دوری تھی۔ بجایہ کی صوبہ داری بھی دارالحکومت سے دور اور عام رواج کے مطابق ولیعهد سلطنت کو مل جاتی تھی اور پھر فاصلہ دراز کے باوجود کئی بار ایسا بھی ہوا

ہام گاہوں بجایہ ہی کے ان ایوانات شاہی کے زیر اثر بنی تھیں جن کا صقلیہ کے شاعر ابن حمدیس نے دلی جوش و ولوے سے نقشہ کھینچا ہے۔ اس امر کی مزید شہادت اس مکتوب سے ملتی ہے جو پوپ گریگوری ہفتم نے شنقیط (Mauritanea) اور صوبہ سَطِيف کے بادشاہ الناصر کو محبت بھرے الفاظ میں لکھا تھا (Traité de paix et de commerce : Mas Latrie)۔ (۲۲ : ۲۳)۔

بجایہ میں، ماضی کے دارالملک کی حیثیت سے، بہت کم نشان رہ گئے ہیں جن سے اس کی عظمت کا پتا چلے۔ بایں ہمہ حمادیوں کے تعمیر کردہ قلعوں کی بہ تیقن نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ قصر امیمون یقیناً سیدی تواتی Tuati کے مقبرے کے قریب بنا ہوگا۔ قلعہ برل (Fort Barral) نے قصر الکوکب کی جگہ لے لی ہے۔ قصر اللؤلؤ (Castle of Pearls) وہاں تھا جہاں اب برجیہ کے فوجی حجرے بن گئے ہیں۔ بعض تالابوں اور شہر کی فصیلوں کے ایک حصے (مشرقی رخ جہاں دیوار شہر، چار میٹر موٹی ہے اور بازوؤں پر اونچے نیچے برج رہ گئے ہیں) کو بارہویں صدی کے انہیں فرمانرواؤں سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ ایسے ہی وہ دروازہ بھی جو باب العرب (Saracen Gate) کہلاتا اور اس وسیع محراب پر مشتمل ہے جس سے جہاز اندرونی بندرگاہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔

حمادی عہد کا یہ شہر یقیناً اس سے کہیں زیادہ وسیع ہوگا جتنا اب ہے۔ خصوصاً اس پہاڑی حصے کی طرف جہاں اب ”کھنڈروں کا ٹیلا“ (Plateau of the ruins) واقع ہے۔ ہمیں اس کے سات آٹھ دروازوں کے نام معلوم ہیں؛ ان میں بعض کا محل بھی متعین کیا جا سکتا ہے۔ باب امسیوان Amsiwan مشرق کی طرف اس شترک پر جو وادی القرود (= بندروں کی وادی) کی طرف جاتی ہے؛ باب البنود



کہ بجایہ کی فوج نے تونس پر چڑھائی کر دی تاکہ ولی عہد کا دعویٰ منوایا جائے، جسے آرزو ہوتی تھی کہ بلا تاخیر تخت پر متمکن ہو جائے۔ سرحدی صوبہ ہونے کی وجہ سے تلمسان کے سلطان عبدالواد بھی اسے للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اس نے کئی بار کوشش کی کہ اسے فتح کر لے مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ ان سب باتوں کے باوجود بجایہ کی حیثیت ایک دولت مند تجارتی شہر کی رہی، جہاں وینس، اہل پیسا، اہل جنوا، مارسیلز اور قطلونیہ کے سوداگر یورپ کی مصنوعات لے کر آتے اور مقامی پیداوار خصوصاً قشیر ترنج کا مربا، موم، پھٹکری، سیسہ اور کشمش اپنے ہاں لا کر دوسرے ممالک میں بھیجتے۔ اس تجارتی منافع کے علاوہ انہیں زیادہ لوٹ کے قیمتی مال کا بھی لالچ رہتا تھا جو فرنگی تاجروں کے جہاز کبھی کبھی بحری قزاقی سے حاصل کر لیتے۔ ابن خلدون کی مشہور تصنیف *Hist des Berberes* (۱: ۶۱۹، ترجمہ ۳: ۱۱۷)، کے مطابق ۱۳۶۰/۵۷۶۱ء سے بحری قزاقی نے ایک بخوبی آزمودہ طریقے کی شکل اختیار کر لی تھی اور اس میں جو کامیابی ہوئی تعجب انگیز ہے۔

چنانچہ پیڈرونواری (Pedro of Navarre) کا ۱۵۱۰/۵۹۱۶ء میں اس شہر پر حملہ اور اس پر قبضہ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ بجایہ اب ایک ہسپانوی شہر تھا اور ۱۵۶۲/۱۵۵۵ء تک ہسپانوی ہی رہا۔ لیکن یہ پینتالیس سالہ مدت اس کے نئے مالکوں کے لیے بڑی مصیبت سے گزری۔ ایک طرف ان کا 'سرزمین کفار' کے ساحلی علاقے پر پڑاؤ ڈال کر بیٹھے رہنا اور اندرونی علاقے سے جیسے روابط ہوا کرتے ہیں ان کا انقطاع، دوسری جانب کوہستانی بربر قبیلوں کے حملوں کا ہر وقت خطرہ اور اسی کے ساتھ ساتھ ساحل بربر کے بحری قزاقوں کا ڈر، جو ساحل کو گھیرے

رہتے تھے، یہ سب مصیبتیں ان کے سر آ پڑی تھیں؛ چنانچہ ایک بہادرانہ مقاومت کے بعد Don Luis de Peralta کو یہ سارا علاقہ واپس کرنا پڑا مگر اس وقت جب یہ علاقہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ پھر جب بجایہ الجزائر کے ترکوں کے زیر اقتدار آیا تو اس سے بھی اس کی خستہ حالی میں کوئی فرق نہیں آیا، اس لیے کہ دشمن جہازوں کی لوٹ مار سے فائدہ اٹھانے کا حق وہ اپنے لیے محفوظ رکھتے تھے۔ البتہ اس علاقے کی تھوڑی بہت اہمیت "کرستہ" Karasta یعنی جہاز سازی کے لیے جنگل سے لکڑی کی فراہمی کے باعث قائم رہی۔ جہاز سازی کا یہ کام نائبان حکومت نے اپنی نگرانی میں لے رکھا تھا۔ اس کا انتظام اموکران خاندان کے ایک مقامی مذہبی پیشوا کے ذمے تھا۔ بایں ہمہ شہر کو اس کاروبار سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ پسونل سیاح لکھتا ہے "ہر چیز کھنڈر بنتی چلی جا رہی ہے"۔ ۱۸۳۳ء میں جب فرانسیسی فوج جنرل ٹریزل کی زیر قیادت بجایہ میں داخل ہوئی تو وہ ایک بڑی گھٹیا اور صرف دو ہزار نفوس کی بستی بن چکا تھا، جس کی حفاظت پچاس بینی چری سپاہی کرتے تھے۔

مآخذ: (۱) ابن حوقل، طبع ڈخویہ، در BGA، ۵۱: ۲، ترجمہ از Slane، در JA، ۱۸۳۲ء، ۱: ۱۸۲؛ (۲) البکری: [المغرب] *Description of North Africa*، الجزائر ۱۹۱۱ء، ص ۲۲، ترجمہ از Slane، ۱۹۱۳ء، ص ۱۶۶؛ (۳) ابن الأثیر، ۱: ۳۱ و ۱۱۰: ۱۰۳، ترجمہ از Fagnan، ص ۳۷۶، ۵۷۲؛ (۴) ابن خلدون: [العبر] *Histoire de Berberes*، ۲۲۶-۲۳۱، ترجمہ ۲: ۵۱-۵۸؛ (۵) الادریسی: المغرب، ۹۰ تا ۹۱؛ ترجمہ ۱۰۵؛ (۶) الزرکشی: تاریخ الدولتین، تونس ۱۲۸۶ھ، ترجمہ از Fagnan؛ (۷) الحسن بن محمد الوزان الزیاتی *Leo Africanus*، طبع Schefer، ۱: ۱۶۲، طبع Epaulard، ۲: ۳۶۰؛ (۸) [احمد] الغبرینی:

اسلامی مصر سے تعلقات: عبداللہ بن سعد نوبیہ سے واپس لوٹ رہا تھا کہ اس کی بجہ کے کچھ لوگوں سے مڈبھیڑ ہوئی (۵۳۱ / ۶۵۱ - ۶۵۲ء)، لیکن اس نے سیاسی اعتبار سے انہیں کوئی اہمیت نہیں دی۔ عرب اور بجہ کا پہلا معاہدہ ہشام کے عہد حکومت میں عبیداللہ بن حبّاب سے ہوا۔ اس کی رو سے بجہ اور مصر کے درمیان باقاعدہ تجارت قائم ہو گئی اور مسلمانوں کو ان کی تاخت و تاراج سے تحفظ مل گیا۔ عرب بجہ میں سونے اور زمرّد کی تلاش میں داخل ہوئے تھے۔ زمرّد تو صحراے قفط سے نکالا جاتا تھا اور سونا وادی العَلّاقی [رک باں] میں ملتا تھا۔ شمالی بجہ کا سب سے طاقتور قبیلہ حدارب تھا، جو ازروے روایات ان لوگوں کے اخلاف تھے جو ظہور اسلام سے پہلے حضر موت سے ترک وطن کر کے آئے تھے۔ ان میں اگرچہ باہم ناچاقی رہتی مگر کبھی کبھی اس امر کے شواہد بھی ملتے ہیں کہ ان کا ایک سردار اعلیٰ بھی ہوتا، جس کا قیام حجر نامی گاؤں میں رہتا۔ اس سے زیادہ کثیر التعداد مگر غلامانہ ذہنیت رکھنے والا ایک اور قبیلہ زَنَافِجِ گَلہ بانی کرتا تھا۔ مسلمانوں کے وہاں جا کر بسنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حدارب مسلمان ہو گئے اور عرب اور بجہ آپس میں شادیاں کرنے لگے۔ بجہ نے جب بالائی مصر پر حملے شروع کیے تو مسلمانوں کی ایک فوج ان کو دبانے کے لیے بھیجی گئی، جس نے ان کے سردار کُنُون کو شکست دی اور انہیں معاہدہ صلح پر مجبور کر دیا (۵۲۱۶ / ۶۸۳۱ء)، جس کی رو سے انہوں نے خلیفہ کو اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کر لیا اور اس امر کا ذمہ لیا کہ بجہ کے علاقے میں مسجدوں کا احترام ملحوظ رکھا جائے گا، مسلمان سوداگر اور سیاح صحیح و سلامت تمام علاقے میں آ جا سکیں گے اور محصلین زکوٰۃ نو مسلموں سے زکوٰۃ

عنوان الدرایہ، طبع محمد بن شیب، الجزائر ۱۹۱۰ء؛  
'Traité de paix et de commerce : Mas Latrie (۸)  
جاہجا: (۹) Kalaa de Béni Hammad : de Beylié، پیرس  
۱۵۱۹۰۹، ص ۶۴؛ (۱۰) La Berbérie : Brunschvig  
orientale sous les Hafydes، جلدیں، پیرس ۱۹۴۰  
تا ۱۹۴۷ء، ۱ : ۳۷۷ و جا بجہ؛ (۱۱) Féraud  
Hist. : Féraud، در Recueil 'des villes de la province de Constantine  
'de la Société archéol. de Constantine 1869 ج ۱۳؛  
'Les poteries et faïences de Bougie : G. Marçais (۱۲)  
Constantine ۱۹۱۸ء؛ (۱۳) وہی مصنف : Les  
Arabes en Berbérie، جا بجہ [۱۴] (۱۴) ع، بذیل مادہ؛  
(۱۵) البستانی: دائرة المعارف، بیروت ۱۸۸۱ء، بذیل مادہ۔

(G. MARÇAIS)

\* بَجَّة: [= بجاء، بجاة]، (عام عربی صورت بَجَّہ)  
خانہ بدوش قبائل، جو دریائے نیل اور بحر احمر کے  
درمیان قنہ قصیر کی سڑک سے لے کر اس زاویے تک  
جو عَطْبَرہ اور ایرٹریا اور سوڈان کی سرحدی پہاڑیوں  
کے ملنے سے بنتا ہے بود و باش رکھتے ہیں۔ اس زمانے  
میں ان کے بڑے قبیلے یہ ہیں: عَبَابَہ [رک باں]،  
بِشَارِین [رک باں]، اَمْرَار، هَدَنْدَوہ اور بنو عامر۔  
عبابہ اب عربی بولتے ہیں، باقی قبائل (سوا  
بنو عامر کے اس حصے کے جہاں تجری Tigre  
بولی جاتی ہے) تو بَضَوِیہ Tu-Bedawiya بولتے ہیں،  
جو ایک حامی زبان ہے۔ بجہ کی گزران زیادہ تر  
اونٹوں، مویشیوں، بھیڑ اور بکریوں کے گلوں پر ہے۔  
چونکہ چراگاہیں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں اس لیے  
وہ عموماً چھوٹے چھوٹے گروہ بنا کر ایک جگہ سے  
دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ بجہ کے ابتدائی  
حالات معرضِ خفا میں ہیں، لیکن حامی زبان بولنے  
والا گروہ قدیم زمانے سے یہیں رہتا چلا آیا ہے۔  
یہ امر کہ انہیں قبل اسلام کے بَلْمِیہ (Blemmies)  
قرار دیا جائے بیکر Becker نے تسلیم نہیں کیا  
[رک بہ بجہ، در [۱]، لائن، بار اول]۔



وصول کرنے کے لیے بلا روک ٹوک یہاں آسکیں گے۔ منجملہ دوسری شرائط کے بجہ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ عیسائی نوییہ سے کوئی تعلق قائم نہیں کریں گے۔ بعد ازاں جب بجہ نے دوبارہ حملے شروع کر دیے اور سونے کی کانوں کا خراج دینا بند کر دیا تو سواروں کا ایک دستہ سمندر کے راستے روانہ کیا گیا، جس نے بجہ شتر سواروں کو شکست دی؛ چنانچہ ۵۲۳۱/۸۵۵ - ۶۸۵۶ء میں ان کا سردار اظہارِ اطاعت کے لیے [خلیفہ] المتوکل کے دربار میں حاضر ہوا۔ بایں ہمہ تھوڑی ہی مدت گزری تھی کہ بجہ نے خود الفسطاط پر حملے شروع کر دیے۔ اس قسم کے ایک انتہائی شدید حملے کے بعد عبدالرحمن العمری نے ایک لشکر جمع کیا اور ایک حملہ آور گروہ کو راستے ہی میں جا لیا۔ سردار لشکر مارا گیا اور [بنو] ربیعہ اور جہینہ کی مدد سے العمری نے معدنی اضلاع پر اپنا تسلط جما لیا (تقریباً ۵۲۵۵/۸۶۸-۸۶۹ء)۔ العمری کی وفات کے بعد [بنو] ربیعہ نے، جس کے حدارب کے ساتھ شادی بیاہ ہونے لگے تھے، اس علاقے پر غلبہ حاصل کر لیا۔ المسعودی لکھتا ہے کہ ۵۳۳۲/۹۴۳ - ۶۹۴۴ء میں بنو ربیعہ کا سردار معدنوں کا مالک تھا اور تین ہزار عرب اور تین ہزار بجہ شتر سوار اس کے ماتحت تھے۔ عربوں اور بجہ شتر سواروں کا یہ تناسب ان کی تعداد کے مقابلے میں زیادہ معنی خیز ہے۔ پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کے وسط میں عیذاب [ارک باں] کے عروج سے حدارب کی اہمیت اور بڑھ گئی، کیونکہ وادی النيل سے بندرگاہ کا راستہ انہیں کے علاقے سے گزرتا تھا۔ ان کا ایک سردار، جسے ابن بطوطہ نے الحدربی کہا ہے، عیذاب کے محصول جنگی میں حصہ دار تھا۔ جنوبی بجہ کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ الیعقوبی نے بجہ کی چھ "سلطنتوں" کی فہرست دی۔

ہے۔ الاسوانی کہتا ہے بجہ کے اقصائے ملک کا حصہ، چھوٹے چھوٹے بت پرست گروہوں میں بٹا ہوا ہے، جن میں سے ہر ایک کا اپنا کاہن ہے، جو چراگاہوں، اور حملوں کے معاملے میں ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ حدارب کا زوال اور قبائل کی تشکیل: آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں سونے کی کانیں متروک ہو گئیں تھیں اور عیذاب کی حالت بھی گرنے لگی تھی۔ یہی وہ اقتصادی حالات تھے جن سے مجبور ہو کر حدارب نے یہ علاقہ چھوڑ دیا اور بظاہر جنوب کی سمت نقل مکانی کر گئے اور وہاں بلاو Balaw کی ایک حکمران جماعت کی حیثیت سے ان بجہ قبائل پر مستولی ہو گئے جو سواکن Suakin اور مصوع Massawa کے عقبی علاقوں میں آباد تھے۔ جب بالائی نیل کے علاقوں میں عرب قبائل پھیل گئے اور فنج کی اسلامی سلطنت قائم ہوئی (تقریباً ۵۹۱۰/۱۵۰۴ء) تو بجہ قبائل بالعموم کم از کم ظاہری طور پر مسلمان ہو گئے، چنانچہ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنا سلسلہ نسب عربوں سے ملانا شروع کر دیا۔ کچھ نسب نامے تو واضح طور پر جعلی ہیں (مثلاً بشارین، امرار، اور عبابہ کا سلسلہ نسب خالد بن الولید یا زبیر بن العوام سے ملانا)۔ بعض قبائل مثلاً ہندوہ کا دعویٰ ہے کہ وہ کسی غیر معروف حجازی پناہ گزیں کی اولاد ہیں، جو عثمانیوں کے علاقے سے بھاگ آیا تھا۔ ممکن ہے یہ دعویٰ اس قبیلے کے نشوونما کے بارے میں کسی قدیم روایت پر مبنی ہو۔ موجودہ قبائل فنج کے عہد میں نمودار ہوئے اور ادھر ادھر پھیل گئے۔ فنج کا اقتدار انتہائی جنوبی گروہ، یعنی بنو عامر نے بھی تسلیم کر لیا تھا۔ بنو عامر میں بجائے خود مختلف قسم کے لوگ شامل تھے، جن میں سوڈانی عرب نسل کے افراد یعنی نبتاب کا غلبہ تھا، جنہوں نے تقریباً

کی جائے۔ لیکن تحریک مہدیہ کے باعث امن و امان اور خوش حالی کی بڑھتی ہوئی رفتار رک گئی۔ بجہ نے اس تحریک کی حمایت صرف اس وقت کی جب ۱۸۸۳ء میں عثمان بن ابی بکر دقنہ ان میں آ ملا۔ اسے جو کامیابی ہوئی اس میں اس امر کا حصہ تو بہت کم تھا کہ اس کے آبا و اجداد کسی حد تک بجہ قبائل کے ہم نسب تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس علاقے کے ایک ”طریقے“ کا پیشوا اس کا طرفدار بن گیا، کیوں کہ وہ طریقہ ختمیہ کو، جسے حکومت کی حمایت حاصل تھی، اپنا حریف سمجھتا تھا۔ عثمان دقنہ نے سواکن اور بربر کا درمیانی تجارتی راستہ منقطع کر دیا اور بجہ کے علاقے کی تمام سرکاری چوکیوں پر قابض ہو گیا۔ اس صورت حال نے سواکن کے لیے بھی خطرہ پیدا کر دیا۔ اس کے پیرو زیادہ تر ہندو اور امرار قبیلوں کے افراد پر مشتمل تھے، جنہوں نے اس کی امداد میں تذبذب سے کام لیا؛ چنانچہ ۱۸۹۱ء میں جب ایک مصری اور انگریزی فوج نے توکر Tūkar میں اس کے صدر مقام پر قبضہ کر لیا تو بجہ میں مہدویت کا زوال شروع ہو گیا۔ انگریزی مصری مشترک حکومت (۱۸۹۹ تا ۱۹۰۶ء) کے تحت یہاں پھر امن و امان اور ترقی کا دور دورہ شروع ہوا۔ قبائلی تنظیم کی پھر سے طرح ڈالی گئی۔ امن و امان مؤثر طریقے پر قائم ہوا۔ شہروں میں مدرسے اور شفا خانے کھولے گئے۔ اقتصادی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجہ اور بیرونی دنیا کے درمیان راہ و رسم بڑھ گئی۔ بندر سوڈان کا معرض وجود میں آنا، وادی نیل کو کسالہ اور ساحلی علاقے سے ملانے کے لیے ریل کا جاری ہونا، قاش اور برکہ کے ڈیلٹوں میں تجارتی پیمانے پر روٹی کی پیداوار، یہ سب ترقی کے سامان تھے جو مہیا ہوتے گئے۔ بہر حال پرانا طریقہ زندگی آہستہ آہستہ بدلا کرتا

سولہویں صدی کے اواخر میں بلاو Balaw پر لوہیت حاصل کر لی تھی۔ اٹھارہویں صدی میں امرار قبائل نے مغرب کی جانب پھیلنا شروع کیا اور ہندوہ کو قاش اور عطبرا کی طرف دھکیل دیا۔ (نیز رگ بہ عبادہ اور بشارین)۔ سواکن نے اس دوران میں اس علاقے کی سب سے بڑی بندرگاہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جو علاقہ بجہ سے گزرنے والی متعدد سڑکوں کے ذریعے سوڈانی نیل سے ملا ہوا تھا۔ ۱۵۱۷ء میں سواکن پر عثمانیوں کا قبضہ ہو گیا، مگر انیسویں صدی کے اوائل میں یہ بندرگاہ بجہ کے ایک گروہ حدارب کے تصرف میں آ گئی۔ یہ گروہ، جو غالباً ان حدارب سے الگ تھا جو قرون وسطیٰ میں برسراقتدار تھے تاہم انہیں کی طرح یہ لوگ بھی اہل حضرموت سے اپنا سلسلہ نسب ملاتے تھے۔ ان پر پانچ آرتیقی خاندانوں نے حکومت کی۔

مصری فتوحات سے موجودہ زمانے تک: اہل مصر نے نیل کے متصل سوڈان کے علاقے فتح کر لیے (۱۸۲۱-۱۸۲۲ء) تو اس سے بجہ پر کوئی اثر نہ پڑا۔ التاکہ (علاقہ قاش) پر خراج کی وصولی کے لیے حملے ہوئے۔ مگر ہندوہ کو ہمیشہ کے لیے نہ دبایا جا سکا۔ بہر حال کسالہ میں ایک انتظامی مرکز قائم کر دیا گیا (۱۸۳۰ء)، جو ایک تجارتی مقام اور ختمیہ ایسے عظیم ”طریقے“ کا مرکز بھی تھا۔ امرار قبیلہ سواکن اور بربر کے درمیانی تجارتی راستے کا محصول لینے لگا۔ وہ بھی ہندوہ کی طرح ادھر ادھر مال لے جاتے۔ باوجودیکہ انتظامی امور نامکمل تھے۔ یہ زمانہ امن و امان اور اقتصادی ترقی کا تھا۔ برکہ میں آرتیقیوں نے زراعت کو سب سے زیادہ ترقی دی۔ یہاں ان سے پہلے بنو عامر معمولی کاشت کرتے تھے۔ یہ کوشش بھی کی گئی کہ قاش اور برکہ کے ڈیلٹوں میں تجارتی پیمانے پر کھاس پیدا



ملکیت ہیں؛ [ (۱۱) علی مبارک : الخطط الجدیدہ، بلاق  
۱۳۰۵ء، ۹ : ۸ بعد بذیل البجاوہ؛ (۱۲) البستانی :  
دائرة المعارف، بذیل بجاہ ] .

(P. M. Holt)

- \* بَجَہ : رَکْ بہ باجہ .
  - \* بجٹ : رَکْ بہ میزانہ .
  - \* بَجْکَم : [بَجْکَم قَبْ لَآع]، (ابوالحسین)،  
اصلاً ”باج کام“ (Bäckäm) (ایک ایرانی لفظ، جو  
ترکی زبان میں داخل ہوا، اس کے معنی گھوڑے  
یا پہاڑی بیل (Yak) کی ”دم“ کے ہیں، دیکھیے  
Benveniste، در JA، ۱۹۴۸ء، ص ۱۸۳)، ایک ترکی  
امیر کا نام جو اصلاً ایک غلام تھا۔ یہ ابتدا میں  
ماکان کا ملازم تھا لیکن آگے چل کر ایک اور دیلمی  
[سردار] مرداویج کی، جو گیلان، طبرستان اور جبال  
کا حاکم تھا، ملازمت اختیار کر لی۔ مرداویج کے  
ترکی غلاموں نے جب اس کی دھمکیوں سے تنگ آ کر  
۵۳۲۳ / ۹۳۵ء میں مرداویج کو قتل کر دیا تو  
بجکم ان کا سردار بنا اور انہیں کے ساتھ فرار ہو گیا۔  
پہلے تو اس نے اپنی خدمات حسن بن ہارون کے  
حضور پیش کیں، جسے وزیر ابن مقلہ نے چند روز  
کے لیے جبال کا والی مقرر کر دیا تھا، اس امید پر  
کہ اسے خلیفہ کی فوج میں لے لیا جائے گا پھر بغداد  
کا رخ کیا۔ مگر خلیفہ کے حجری پھرہ داروں کے  
حسد کی وجہ سے اسے وہاں سے بھی کورا جواب مل  
گیا۔ بعد ازیں ابن رائق نے، جو ان دنوں واسط اور  
بصرے کا والی تھا، اسے مع اس کے ترک ساتھیوں کے  
اپنی ملازمت میں لے لیا۔ اور یہی زمانہ ہے جب اس کا  
نام بجکم رائق ہو گیا۔ اب وہ ایک جتھے کا سردار  
تھا، جس میں اس کے غلام اور دوسرے ترک  
اور دیلمی جنہیں اس نے جبال سے بلا لیا تھا،  
شامل تھے۔
- ۵۳۲۳ / آغاز نومبر ۹۳۶ء میں جب خلیفہ

ہے، چنانچہ جدید جمہوریہ سوڈان کو یہ مسئلہ  
بھی درپیش ہے کہ بجہ کو سوڈانی ریاست میں  
پورے طور پر کیسے شامل کیا جائے۔  
مآخذ: صرف اہم حوالے دیے جاتے ہیں :  
قرون وسطیٰ کا سب سے بڑا ماخذ ہے: (۱) المقریزی:  
الخطط، طبع G. Wiet، قاہرہ ۱۹۲۲ء، ۳ : ۲۶۷ تا  
۲۸۰، جس میں دسویں صدی کے وہ حالات و معلومات  
درج ہیں جو ابن سلیم الأسوانی اور دوسرے مؤرخین  
سے حاصل ہوئی ہیں۔ Wiet نے اپنے حواشی میں کتابیات  
کے قابل قدر حوالے دیے ہیں، ۱۹۳۷ء تک کے جدید یورپی  
مآخذ کے لیے دیکھیے: (۲) Bibliography : R.L. Hill  
of the Anglo-Egyptian Sudan، لندن ۱۹۳۹ء؛ نیز  
The Fung Kingdom of : O. G. S. Crawford (۳)  
Gloucester، ۱۹۵۱ء؛ (۴) A. Paul :  
A History of the Beja Tribes، کیمبرج ۱۹۵۴ء؛ نیز  
Sudan Notes and Records میں ذیل کے مقالات:  
A History of Kassala and : D.C. Cumming (۵)  
the Province of Taka، ۱ / ۲۰ (۱۹۳۷ء) : ۱ تا ۴۶  
و ۱ / ۲۳ (۱۹۴۰ء) : ۱ تا ۵۴ و ۲ / ۲۳ : ۲۲۵ تا ۲۷۱؛  
Manners, Customs and Beliefs : W. T. Clark (۶)  
of the Northern Beja، ۱ / ۲۱ (۱۹۳۸ء) : ۱ تا ۳۰؛  
Notes on Beni Amer Society : S. F. Nadel (۷)  
۱ / ۲۶ (۱۹۴۵ء) : ۵۱ تا ۹۴؛ (۸) A. Paul :  
Notes on the Beni Amer، ۲ / ۳۱ (۱۹۵۰ء) : ۲۲۳ تا  
۲۴۵؛ (۹) Sir Douglas Newbolt نے جو مجموعہ  
تیار کیا ہے اور جس کا نام History and Archeology  
of the Beja Tribes of the Eastern Sudan  
آج کل آکسفورڈ کے Griffith Institute Ashmolean  
Museum میں محفوظ ہے، اس میں قبائل اور دوسرے  
امور کے متعلق اطلاعات شامل ہیں؛ (۱۰) مہدیہ کے  
زمانے کے بجہ کے حالات مہدیوں کے دفاتر وقائع  
میں بکثرت موجود ہیں، جو وزارت داخلہ، خرطوم کی

شرط پر کہ اسے خوزستان کا بااختیار حاکم تسلیم کر لیا جائے۔ لیکن اس مرتبہ قسمت نے اس کی باوری نہ کی اور بویہی کے مقابلے میں ہسپا ہو کر وہ واسط لوٹ آنے پر مجبور ہو گیا۔ اور ابن الرائق نے ہجکم کے اس مطالبے پر کہ فوج کی تنخواہ واجب الادا ہے بغداد کا رخ کیا تاکہ روپیہ فراہم کر سکے (۵۳۲۶/آغاز ۴۸۳۸ء)۔ گو ہجکم اس اثنا میں واسط ہی میں بیٹھا رہا اور اس نے بویہی سے خوزستان واپس لینے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا، جیسا کہ ابن الرائق کی خواہش تھی۔

ہجکم کے دماغ میں اب یہ خیال جاگزیں ہو چکا تھا کہ ابن الرائق کے خلاف اٹھے اور اس کی جگہ خود حاصل کر لے۔ ادھر واقعات کی رفتار ایسی تشویش انگیز تھی کہ ابن الرائق نے البریدی سے مصالحت کر لی۔ اس پر ہجکم نے کچھ تو البریدی کو ابن الرائق سے توڑنے اور کچھ اس لیے کہ اس کی اطاعت کا یقین ہو جائے البریدی سے وعدہ کیا کہ اگر دارالخلافت کا اقتدار اس کے ہاتھ آ گیا تو واسط کی ولایت البریدی کو دے دی جائے گی، جسے چند ہی دن پہلے وہ ہجکم سے بہ زور لینے کی کوشش میں ناکام ہو چکا تھا۔ چنانچہ دونوں (ہجکم اور البریدی) کا اس بات پر معاہدہ ہو گیا۔ علاوہ ازیں سابق وزیر ابن مقلہ نے بھی ابن الرائق سے بدلہ لینے کی خاطر، جس نے اس کی املاک ضبط کر لی تھیں، ہجکم سے مراسلت شروع کر دی اور اسے ہمت دلائی کہ اپنے ارادے پر قائم رہے، حتیٰ کہ خلیفہ الراضی سے یہ سفارش بھی کر دی کہ ہجکم کو ابن الرائق کا جانشین بنایا جائے۔ الراضی نے ابن مقلہ کی رائے مان لی اور خفیہ طور پر ہجکم کا حوصلہ بڑھایا، جیسا کہ مؤرخ الصولی (جو کہ خلیفہ اور ہجکم دونوں معتمد علیہ اور رازدار تھا) کے بیان سے ظاہر ہے (ص ۴۲ بعد؛ ترجمہ، ۱: ۸۹-۹۰) لیکن اس

الراضی نے ابن الرائق کو امیر الامرا کے عہدے پر فائز کیا تو ہجکم خلیفہ کی بے قاعدہ ناتربیت یافتہ محافظ دستے کے ساجی اور حجری سپاہیوں اور الاہواز (خوزستان) کے جاہ طلب والی ابو عبد اللہ البریدی کے خلاف جد و جہد میں ابن الرائق کا دست راست بن گیا۔ چنانچہ ابن الرائق بغداد پہنچا تو اس نے فوراً ساجیوں کے خلاف سخت تدابیر اختیار کیں۔ آغاز ۵۳۲۵ / آخر نومبر ۹۳۶ء میں وہ خلیفہ کے ساتھ واسط پہنچا اور یہاں ہجکم کی مؤثر امداد کی بدولت اس نے حجریوں سے، جو خلیفہ کے ہمراہ گئے تھے، گلو خلاصی کرائی۔ خلیفہ اور ہجکم بغداد واپس آئے تو وہ صاحب الشرطہ اور مشرقی صوبوں کا والی مقرر ہوا (فروری ۹۳۷ء)۔ ابن الرائق چونکہ البریدی سے، جس کا مقصد زبیرین عراق پر قبضہ جمانا اور اس کے بعد امیر الامرا کی جگہ سنبھالنا تھا، کوئی سمجھوتا نہیں کر سکا تھا لہذا فیصلہ ہوا کہ اس کے خلاف جنگی کارروائی کی جائے، لیکن ابن الرائق نے شکست کھائی اور البریدی کو بصرے میں داخل ہونے سے روک نہ سکا۔ ہجکم کو البتہ اس سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی۔ اس نے البریدی کی فوج کو، جو اس کی اپنی فوج سے تعداد میں زیادہ تھی، دو مرتبہ شکست دی اور سارا خوزستان اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس پر البریدی مجبور ہو گیا کہ بھاگ کر بصرے میں پناہ لے۔ اس کامیابی کے بعد ابن الرائق نے ہجکم کو واپس بلا لیا۔ چنانچہ بصرے کے معاذ پر وہ ابن الرائق سے آملا، جہاں دونوں کے دونوں قید ہوتے ہوتے بچے۔ البریدی ان دنوں فارس میں تھا، تاکہ علی بویہی (عماد الدولہ) سے امداد طلب کر سکے۔ اس پر علی نے اپنے بھائی احمد (معز الدولہ) کو اس کے ساتھ کر دیا۔ مطلب یہ تھا کہ خوزستان واپس لے لیا جائے۔ ابن الرائق کی استدعا پر ہجکم بھی دوبارہ وہاں جانے پر راضی ہو گیا۔ مگر اس



باوجود بجکم نے ابن مقلہ کو ابن الرائق کے حوالے کر دیا۔ ذوالقعدہ ۵۳۲۶ / ستمبر ۹۳۸ء میں فوجوں کی تنخواہ وصول کرنے کے بہانے بجکم نے دارالخلافت کی طرف پیش قدمی کی اور بغداد میں داخل ہو گیا؛ گو ابن الرائق نے نہر دیالہ میں نہروان کی نہر کا پانی چھوڑ کر اور ایک پل کے انہدام سے اسے روکنے کی ناکام کوشش بھی کی، ابن الرائق نے جان بچانے کے لیے بغداد سے راہ فرار اختیار کی تو خلیفہ نے بجکم کو بلا تاخیر امیر الامرا مقرر کر دیا۔ امیر الامرا بجکم کو موصل کے حمدانی گورنر حسن بن عبداللہ سے بھی مقابلہ کرنا پڑا؛ کیونکہ وہ اپنے مالی واجبات ادا نہیں کر رہا تھا۔ ۵۳۲۷ء کے آغاز / اکتوبر۔ نومبر ۹۳۸ء میں بجکم نے خلیفہ کو ساتھ لے کر اس پر چڑھائی کر دی اور شہر کے نیچے حمدانی مزاحمت کا خاتمہ کرنے کے بعد وہ موصل میں داخل ہو گیا؛ گو حسن کو، جس نے بھاگ کر جزیرے میں پناہ لی تھی، گرفتار نہ کر سکا اور اس کا تعاقب بھی بے سود رہا، لیکن بجکم کی فوجوں کو چونکہ موصل میں برابر پریشان کیا جا رہا تھا لہذا ابن الرائق نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور ایک فوج لے کر یکایک بغداد میں داخل ہو گیا۔ ناچار بجکم نے حمدانیوں اور ابن الرائق دونوں سے نامہ و پیام شروع کر دیا۔ چنانچہ ۹۳۸ء کے اواخر میں حمدانیوں سے صلح کا معاہدہ ہو گیا اور وہ واجب الادا خراج کا کچھ اور حصہ بطور ابتدا کے ادا کرنے پر راضی ہو گئے۔ ابن الرائق بھی، اس شرط پر کہ طریق الفرات، دیار سضر، جند قسیرین اور عواصم [رک بان] کی حکومت اسے دی جائے، بغداد چھوڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ اس سمجھوتے کے بعد ۲۸ جنوری ۹۳۹ء کو ابن الرائق بغداد سے چلا گیا اور فروری ۹۳۹ء کے شروع میں خلیفہ اور بجکم پھر دارالخلافت

میں واپس آ گئے۔ بجکم کے لیے اب اس بویہی خطرے کا دفعیہ بھی ضروری ہو گیا تھا جو عراق زیرین پر چھا رہا تھا۔ لہذا اس کے اور البریدی کے درمیان چند روزہ مفاہمت ہو گئی۔ البریدی کو واسط کی حکومت مل گئی اور وہ سوس کے علاقے (خوزستان) میں بویہیوں کے خلاف معرکہ آرائی میں بھی کامیاب رہا۔ البریدی نے اس کے بعد اگرچہ وزیر کا عہدہ حاصل کر لیا تھا لیکن خود واسط ہی میں مقیم رہا اور بغداد میں فرائض وزارت اپنے ایک وکیل کے ذریعے سرانجام دیتا رہا۔ ۵۳۲۸ / ۹۳۹ - ۹۴۰ء میں بجکم نے اس کی ایک لڑکی سے شادی بھی کر لی۔ ادھر بویہی (علی عماد الدولہ) کو، جس کی جاہ طلبی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، اپنے ایک بھائی حسن (رکن الدولہ) حاکم جبال کی اعانت حاصل ہو گئی۔ لہذا رکن الدولہ نے واسط پر چڑھائی کر دی اور دجلے کے بائیں کنارے پر شہر کے بالمقابل پڑاؤ ڈال دیا۔ لیکن بجکم اور خلیفہ کی آمد کا سن کر واپس ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ دوسری جانب بجکم نے جو لشکر اسی حسن [رکن الدولہ] کے مقابلے میں جبال بھیجا تھا اسے وہاں شکست ہو گئی۔ کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ بجکم اور البریدی کے درمیان پھر نزاع پیدا ہو گئی۔ البریدی نے اپنے اس ارادے کو کبھی مخفی نہیں رکھا تھا کہ وہ امیر الامرا بن جائے؛ چنانچہ اس نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ بجکم کا جو لشکر جبال میں ہے اس کی مدد نہ کرے۔ ۵۳۲۸ء کے اواخر / اگست ۹۳۹ء میں بجکم نے البریدی کو وزارت کے عہدے سے الگ کر دیا اور فیصلہ کیا کہ واسط کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے۔ بات یہ ہے کہ البریدی کا رویہ کچھ دنوں سے بجکم کے لیے پریشانی کا باعث ہو رہا تھا۔ وہ جبال میں بویہیوں

کی حرص تھی؛ چنانچہ وہ اپنے مقاصد کے حصول میں دھوکے اور فریب، رشوت ستانی اور سخت گیری سے دریغ نہ کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس سے قساوت قلبی کا اظہار بھی ہوا لیکن اس کی شجاعت کی کہانیاں زبان زد ہو چکی تھیں اور کردار میں بھی وہ ابن رائق سے زیادہ دیانت دار اور بہتر تھا؛ یہی وجہ تھی کہ خلیفہ الراضی اسے ابن رائق پر ترجیح دیتا۔ بجکم رعایا کی خوش حالی کا خیال رکھتا؛ چنانچہ اہل واسط بھی اسے عزیز رکھتے تھے گواہل بغداد کے یہاں اس کی کوئی زیادہ قدر نہ تھی۔ اس نے قحط کے دنوں میں واسط میں ایک مہمان خانہ (دارالضیافت) قائم کیا اور بغداد میں ایک شفاخانہ تعمیر کروایا۔ اس نے قرامطہ کو بڑی بڑی رقمیں پیش کیں کہ حجر اسود خانہ کعبہ میں واپس کر دیں مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ایران سے قدیم روابط کی بنا پر اس نے ایرانیوں کے تہوار سذک *Sadhak* اور نوروز بدستور رهنے دیے۔ ان سذکوں کی بابت جن پر اس کی تصویر ہے دیکھیے المسعودی: مروج، ۸: ۳۴۱۔

مآخذ: (۱) المسعودی: مروج، ۸: ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۵، ۳۴۳ و ۹: ۲۹ تا ۳۱؛ (۲) الصولی: اخبار الراضی و المتقی، بمدد اشاریہ؛ ترجمہ M. Canard، ۲ جلد، ۱۹۴۶ تا ۱۹۵۰؛ (۳) ابن مسکویہ: تجارب الأمم، طبع Amedroz و Margoliouth، ۱: ۳۳۱ تا ۳۳۲، ۳۵۱، ۳۵۶ تا ۳۵۷، ۳۶۱، ۳۶۵، ۳۷۰ تا ۳۷۳، ۳۷۵، ۳۷۸ تا ۳۷۹، ۳۸۲ تا ۳۸۶، ۳۹۱، ۳۹۳ تا ۳۹۶، ۳۹۷ تا ۳۹۸، ۳۹۸، ۴۰۰، ۴۱۰، ۴۱۱ تا ۴۱۶، ۴۱۷ تا ۴۲۰ و ۲: ۱۲ تا ۱۴؛ (۴) التتوخی: الفرج بعد الشدة، ۲: ۱۳۱، ۱۳۳، ۱۳۶؛ (۵) ابن الأثیر، ۸: ۲۲۵، ۲۲۶؛ (۶) ۵۱۳.۳ / ۱۸۸۵-۱۸۸۶، ۸: ۱۰۳، ۱۰۴؛ (۷) یاقوت، ۱: ۵۳۲ و ۲: ۲۱۳ و ۴: ۸۴۹؛

کے خلاف جو فوجی کارروائی کرنا چاہتا تھا جولائی میں اسے ملتوی کرتے ہوئے بعجلت بغداد لوٹ آیا۔ پھر واسط پر فوج کشی کی اور شہر پر، جسے البریدی چھوڑ کر بھاگ گیا تھا، قابض ہو گیا۔ مرتے دم تک اس کا قیام یہیں رہا؛ چنانچہ ربیع الاول ۵۳۲۹ / دسمبر ۹۴۰ء میں جب الراضی کی وفات ہوئی ہے تو بجکم واسط ہی میں تھا۔ خلیفہ المتقی نے اسے امیر الامرا کے عہدے پر بدستور قائم رکھا۔ اپریل ۹۴۱ء میں بجکم نے واسط سے کوچ کیا، کیونکہ اس کے نائبوں نے، جو واسط کے جنوب مشرقی علاقے مذار *Madhār* میں البریدی کی فوجوں سے برسریکار تھے اور شکست انہیں ہو گئی تھی، درخواست کی تھی کہ وہ ان کی مدد کو پہنچے؛ چنانچہ وہ اسی ارادے سے گھر سے نکلا تھا مگر جب باذین *Bādhbin* پہنچا تو خبر ملی کہ البریدی نے شکست کھائی ہے۔ لہذا اس نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ لیکن راستے میں شکار کھیل رہا تھا کہ کرد قزاقوں کی ایک ٹولی سے اس کی مڈ بھیڑ ہو گئی، جن سے لڑائی کے دوران میں ایک کرد کے ہاتھوں عقب سے نیزہ لگا اور اسی زخم سے ۲۱ رجب ۵۳۲۹ / ۲۱ اپریل ۹۴۱ء اس کی وفات ہو گئی۔

یہ ترکی غلام بجکم، ماکان کا تربیت یافتہ تھا جس کا وہ ہمیشہ بے حد شکر گزار رہا۔ بجکم عربی زبان سمجھتا تھا مگر اسے بولتے ہوئے جھجکتا تھا کہ کہیں غلطی نہ کر بیٹھے۔ اس لیے وہ ترجمان سے کام لیتا۔ تاہم فاضل علما اس کا ادب کرتے۔ اس کو الصولی اور طبیب سنان ابن ثابت جیسے لوگوں کی صحبت نصیب تھی۔ یہ دونوں اس کے بیش بہا تذکرے ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ اس نے ان کے فیاضانہ وظائف مقرر کیے۔ بجکم کو حصول اقتدار اور مال و زر



۱۸۳ : (۲) البکری : *Description de l'Afrique Sep-*  
*trionale* (ترجمہ de Slane)، ص ۱۶۱ : (۳)  
Friedländer، در JAOS، ۲۹ : ۲۵۰  
(ادارہ)

بجمنزی : یا بگمزا [یا بگمزه] خلفائے عباسیہ کے  
عہد میں بغداد سے شمال مشرق کی جانب اور  
بعقوبا سے کوئی آٹھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں  
تھا۔ یہاں خلیفہ المقتدی لامرالله [م ۵۵۵،  
رک بان] نے سلجوق سلطان محمد ثانی کی افواج کو،  
جو آلپ تاشکون خر کے زیر قیادت تھیں، ۵۴۹ /  
۱۱۵۴ء میں شکست دے کر بھگا دیا تھا۔

مآخذ : (۱) یاقوت، ۱ : ۳۹۷، ۷۰۶ : (۲)

ابن الأثیر، ۱۱ : ۱۲۹ : (۳) Houtsma : *Recueil*  
: ۲۳۷ بعد۔

(ادارہ)

بجنور : ہندوستان کے صوبہ اترپردیش میں

قسمت رھیلکھنڈ کے ایک شہر اور ضلع کا نام، جس کا  
کل رقبہ ۱۸۶۷ مربع میل اور آبادی ۹۸۳۱۹۶  
ہے۔ اس میں چھتیس فی صد مسلمان ہیں۔ خود شہر  
کی آبادی (سرشماری ۱۹۵۱ء کے مطابق) ۳۰۶۳۶  
ہے۔ ضلع کی قدیم تاریخ کی بابت معلومات  
برائے نام ہیں۔ ۱۳۹۹ء میں اسے تیمور نے تاراج  
کیا۔ اکبر کے زمانے میں یہ صوبہ دہلی میں  
سنہل کی ”سرکار“ کا ایک حصہ تھا۔ جب  
مغلوں کی سلطنت کو زوال آیا تو روہیلوں نے  
علی محمد کے تحت اس پر تاخت کی۔ اس ضلع میں  
شہر نجیب آباد بھی ہے، جو تقریباً ۱۷۵۰ء میں  
نجیب الدولہ نے بسایا تھا، جس نے آگے چل کر  
دہلی میں وزارت کا عہدہ حاصل کر لیا تھا۔  
اس کا بیٹا ضابطہ خاں روہیلوں کا سردار تھا۔ ۱۷۷۳ء  
میں جب روہیلوں کو شکست ہوئی تو بجنور کا  
الحاق اودھ سے ہو گیا۔ ۱۸۰۱ء میں اسے

(۷) ابن خلدون : العبر، ۳ : ۳۳۲ بعد؛ (۸) ابوالفداء،  
طبع Reiske، ۲ : ۳۰۰ بعد؛ (۹) ابن تغری بردی :  
النجوم الزاهرة، قاہرہ، ۳ : ۶۲۲ تا ۶۶۶، ۲۵۰، ۲۷۲،  
۳۰۱ : (۱۰) *Mémoire sur les Emirs* : Défremery  
: *Al-Omera*، ص ۱۲۹، ۱۳۳ تا ۱۵۵ : (۱۱) Weil :  
*Chalifen*، ۲ : ۶۶۳ بعد؛ (۱۲) Müller : *Der Islam*  
: *im Morgen und abendland*، ۱ : ۵۶۶ : (۱۳) Mez :  
*Renaissance*، ۲۵ تا ۲۶، نیز بمدد اشاریہ : (۱۴)  
*The Life and Times of 'Alī ibn Isa* : H. Bowen  
کیمبرج ۱۹۲۸ء : (۱۵) M. Canard : *Histoire de la*  
*dynastie des Hamdanides*، ۱ : ۳۱۶ تا ۳۲۱ : (۱۶)  
حسن ابراہیم حسن : تاریخ الاسلام السياسي، قاہرہ  
۱۹۳۹ء، ۳ : ۳۳، ۳۶، ۳۷ تا ۳۸، ۲۷۵، ۳۳۱ :  
[۱۷] (ع، بذیل مادہ : (۱۸) البستانی : دائرة المعارف،  
بیروت ۱۹۸۱ء، ۵ : ۲۰۰ تا ۲۰۲]۔

(M. CANARD)

\* البجلی : الحسن بن علی بن ورسند، مراکش  
کے بربروں کے ایک فرقے کا پیشوا، جس کے معتقدین  
بجلیہ کے نام سے معروف ہیں۔ البکری لکھتا ہے کہ  
وہ ابو عبداللہ الشیعی [رک بان] کے (قبل از ۵۲۸ /  
۸۹۳ء) افریقیہ میں آنے سے پہلے وہ اپنی زندگی کی  
ابتدا کر چکا تھا۔ البجلی اہل نطفہ سے تھا۔ اسے  
بنولماس میں سے بکثرت معتقد مل گئے۔ اس کی تعلیم  
غالی شیعویوں سے ملتی جلتی تھی۔ لیکن وہ اس بات پر  
زور دیتا تھا کہ امامت صرف [امام] حسن رضی کی اولاد  
کا حق ہے۔ یہی البکری اور ابن حزم کا بیان ہے،  
ابن حوقل (طبع De Goeje، ص ۶۵) کے برعکس  
جس نے لکھا ہے کہ وہ موسوی تھا یعنی امام موسیٰ  
کاظم بن جعفر الصادق رضی کی امامت کا قائل تھا،  
جو امام حسین رضی کی نسل سے ہیں۔ بجلیہ کو بالآخر  
عبداللہ بن یاسین نے مغلوب کر کے فنا کر دیا۔

مآخذ : (۱) ابن حزم : الملل و النحل، ۳ :

بجیلہ: ایک عرب قبیلہ، جسے خثعم کی طرح انمار کی ایک شاخ تسلیم کیا گیا ہے۔ بجلی اس کی طرف منسوب ہے۔ اس کے متعلق بعض اوقات کہا گیا ہے یہ کوئی عورت تھی۔ نسب ناموں سے اس کی صحیح حیثیت کا پتا نہیں چلتا (قب F. Wüsten-Register zu den genealogischen Tabellen: feld ۱۰۱ تا ۱۰۳، نیز Die Chroniken der Stadt Mecca، لائپزگ ۱۸۵۸ء، ۲: ۱۳۳)۔ بعض علمائے انساب کی رائے ہے کہ بجیلہ ایک یمنی قبیلہ تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ انمار، نزار بن معد بن عدنان کا بیٹا تھا (ابن حجر: اسد الغابۃ، ۱: ۲۷۹ بذیل جریر بن عبداللہ؛ ابن درید، طبع و سٹینفلٹ، ص ۱۰۱ بعد)۔ اس قبیلے کو کبھی کبھی اس بات پر چڑایا جاتا تھا کہ ان کا نسب مشکوک ہے (المسعودی: مروج، ۴: ۱۳۳)۔ قبائل خثعم، تمیم، بکر اور عبدالقیس کے ساتھ مل کر بجیلہ نے بھی عراق پر حملہ کر دیا، جو شاپور دوم (تقریباً ۳۱۰ تا ۵۳۹ء) کے زیر حکومت تھا، لیکن جب اس نے پلٹ کر حملہ کیا تو اس قبیلے نے سخت نقصان اٹھایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں وہ السراة کے سلسلہ کوہ کے ایک حصے میں موجود تھے، جو مکے سے جنوب میں کسی قدر فاصلے پر ہے۔

بجیلہ کی برادریوں (جیسے آخس، قسر، زید ابن الغوث، عرینہ) میں خانہ جنگی اور ہمسایہ قبائل سے جنگ و جدل رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجیلہ لوگ تتربتتر ہو گئے اور اس کے بہت سے حصوں کو زیادہ قوی قبیلوں کی حمایت (جوار) ڈھونڈنی پڑی (قب المفضلیات، طبع C. J. Lyall، ۱: ۱۱۵ بعد)۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے آخری زمانے میں جریر بن عبداللہ البجلی ایک سو پچاس آدمیوں کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا تھا۔ آپؐ نے انہیں

انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ضابطہ خاں کا پوتا محمود خاں بھی انگریزوں کا ایک قوی دشمن تھا۔ [سر سید احمد خاں نے تاریخ سرکشی بجنور لکھی تھی، جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں ضائع ہو گئی۔ اردو کے چند نامور ادیب بجنور ہی کے تھے، مثلاً نذیر احمد، عبدالرحمن (محاسن کلام غالب کا مصنف) وغیرہ]۔

مآخذ: H. R. Nevill: Bijnor Gazetteer، الہ آباد ۱۹۰۸ء۔

(C. COLLEN DAVIES)

بجنورد: (بوجنورد) (۱) خراسان کا ایک شہر، جو کوہ الاطاغ کے شمالی دامن میں ۵۷ درجہ ۱۷ دقیقہ طول بلد (گرین وچ) اور ۳۷ درجہ ۲۹ دقیقہ عرض بلد پر سطح سمندر سے چھ سو اٹھانوے میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔

ہمیں اس شہر کے بارے میں ایسی معلومات حاصل نہیں جن کا تعلق صفویوں سے پہلے کے زمانے سے ہو۔ صفوی عہد میں شاہ عباس اول نے کردوں کے ایک قبیلے۔ شدلو۔ کو اس علاقے میں آباد کیا تھا۔ یہ امر بھی یقینی نہیں کہ اس زمانے سے پہلے بجنورد، بوزنجر کے نام سے مشہور تھا لیکن ایک قدیم قلعے (ارگ) اور دوسری عمارتوں کے کھنڈر اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ ایک پرانا شہر ہے۔

(۲) اس نام کا ضلع، جس کا صدر مقام بجنورد ہے۔ شہرستان کی آبادی تخمیناً ڈیڑھ لاکھ (۱۹۵۰ء) ہے، جو ترکمانوں، کردوں اور ایرانیوں پر مشتمل ہے۔

مآخذ: (۱) P. Sykes: Ten Thousand Miles in Persia، لندن ۱۹۰۲ء، ص ۲۱؛ (۲) رزم آراء: فرہنگ جغرافیائی ایران، تہران ۱۹۵۱ء، ص ۴۹؛ (۳) مسعود کیہان: جغرافیای مفصل ایران، تہران ۱۹۳۳ء، ص ۱۸۔

(R. N. FRYE)



ابن حزم: جمہور انساب العرب وغیرہ.

(W. MONTGOMERY WATT)

\* بیچق: رگ بہ بجاق.

\* البحتری: ابو عباده الولید بن عبید (اللہ) عرب

شاعر اور تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی (۵۲۰۶ / ۵۸۲۱ تا ۵۲۸۳ / ۸۹۷ - ۵۸۹۸) کا ایک ادیب، جس نے منتخب اشعار کا ایک مجموعہ الحماسة تیار کیا۔ وہ سنج میں پیدا ہوا (بعض کے نزدیک اس کی ولادت موضع حردفہ کے نواح میں ہوئی)۔ وہ بحتر خاندان سے تھا، جو طی کی ایک شاخ ہے۔ اس نے اپنے وطن مالوف سے کبھی قطع تعلق نہیں کیا اور اس دولت سے جو مدت دراز تک درباری شاعر کی حیثیت سے اس نے کمائی جائداد بھی وہیں پیدا کی۔ یہی نہیں بلکہ اپنے قبائلی رشتے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مفید مطلب تعلقات بھی قائم کیے۔

شعر و شاعری کے میدان میں اس نے ابتدائی کوششیں اپنے قبیلے کی مدح کے لیے وقف کر رکھی تھیں (۵۲۲۳ / ۵۸۳۸ تا ۵۲۲۶ / ۵۸۳۱)۔ لیکن جب اسے کسی مرثیہ کی تلاش ہوئی تو ایک طائی سپہ سالار ابو سعید یوسف بن محمد، جو الثغری [رک باں] کے لقب سے مشہور تھا، سر پرستی کے لیے مل گیا۔ ابو سعید ہی کے گھر پر اس کی ملاقات ابوتمام سے ہوئی، جسے خود بھی طائی ہونے کا دعویٰ تھا، نوجوان بحتری کی ابھرتی ہوئی قابلیت دیکھ کر ابوتمام نے اس کی خداداد صلاحیتوں کو اجاگر کرنے پر توجہ دینا شروع کر دی اور معلوم ہوتا ہے کہ ابوتمام ہی نے معرۃ النعمان کے مشاہیر سے اس کی سفارش کی کہ وہ اسے اپنے ثنا خواں کی حیثیت سے اپنا لیں، چنانچہ البحتری کے لیے انہوں نے چار ہزار درہم وظیفہ مقرر کر دیا مگر اس دوران میں اس نے جو اشعار کہے ان میں سے کچھ باقی نہیں رہا۔

موضع تبالہ کے بت ذوالخلصة کے تباہ کرنے کو بھیجا، جس کی بجیلہ اور خثعم پوجا کیا کرتے تھے۔ جریر نے اور بھی مختلف کام جو ان کے ذمے کیے گئے بڑی مستعدی سے سر انجام دیے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں وہ ایک ممتاز عسکری قائد تھے۔ معلوم ہوتا ہے جریر اور ان کے زیر قیادت بجیلہ کے اور لوگوں کی حیثیت کچھ عرصے تک خلیفۃ المسلمین کے آزاد حلیفوں کی سی تھی، جنہیں حضرت عمرؓ سے از روئے معاہدہ مفتوحہ علاقے [کی آمدنی] کا چوتھائی حصہ ملتا تھا اور جس سے بظاہر سواد کی اراضی مراد ہے (البلاذری: فتوح، ۲۵۳، ۲۶۷)، تین سال کے بعد انہیں اس بات پر راضی کر لیا گیا کہ زمینوں سے دست بردار ہو جائیں اور ان کے بدلے نقد وظیفے لینے منظور کریں۔ حضرت عمرؓ نے اس قبیلے کے ان گروہوں کو جو دوسرے قبائل کے زیر حمایت (جوار) تھے یہ بھی حکم دیا تھا کہ جریر کے ساتھ ملحق ہو جائیں (المفضلیات، موضع مذکور؛ نیز اسد الغابۃ موضع مذکور)۔ بیان کیا گیا ہے کہ اس زمانے میں قبیلہ بارق (جو آزد کا ایک حصہ تھا) کا عرفجہ بن ہرثمہ، بجیلہ کا سردار بنا ہوا تھا حالانکہ وہ صرف ان کا حلیف تھا۔ بنو اسبیہ کے متأخر زمانے کا شہرہ آفاق خالد بن عبداللہ القسری، بجیلہ ہی کے قبیلے سے تھا۔ گو اس کے مخالفین اس بارے میں اکثر جرح کرتے تھے (قب: I.G. Goldziher: Muhammedanische Studien، ۱: ۲۰۵)۔

مآخذ: متن میں جن مآخذ کا ذکر ہو چکا ہے ان کے علاوہ: (۱) Essai: A.P. Caussin de Perceval (۱) sur l'Histoire des Arabes avant l'Islamisme پیرس ۱۸۳۷ء؛ (۲) الاغانی، بار اول، ۱۳: ۴ بعد؛ (۳) ZDMG، ۱۲: ۶۶۷؛ (۴) الفرزدق: دیوان (طبع Hell و Boucher) عدد ۸۲، ۲۵۶، ۲۷۹، ۶۳۴؛ (۵)

رسائی خلیفہ المتوکل کے دربار میں ہوئی اور ہوں درباری شاعر کی حیثیت سے اس کی زندگی کا درخشندہ دور شروع ہوا۔

[وزیر] الفتح اور البحتری کے تعلقات میں اگرچہ کبھی کبھی سرد مہری بھی پیدا ہو جاتی تھی لیکن اس کے باوجود الفتح کی سرپرستی اسے مستقلاً حاصل رہی۔ چنانچہ اس نے اپنی کتاب الحماسة اسی کے نام سے معنون کی اور اس کے علاوہ اس کے لیے کئی مدحیہ قصیدے بھی لکھے۔ پھر اگرچہ اس نے کئی ایک مشاہیر و عمائد سلطنت کی مدح سرائی بھی کی لیکن اس کی شاعری کا زیادہ حصہ خلیفہ ہی کے لیے وقف رہا۔ یوں بھی خلیفہ سے اس کے تعلقات بے تکلفانہ تھے اور اسے اس کا اعتماد بھی حاصل تھا۔ وہ بھی سرکاری حکمت عملی کی تائید کرتا تھا، حتیٰ کہ ان صورتوں میں بھی جہاں اس کے ذاتی خیالات اس سے متصادم تھے؛ چنانچہ اس کا اپنا رجحان شیعیت کی طرف تھا مگر وہ عباسیوں کے فضائل اور حقوق کا اعلان کرتا رہا۔ اس زمانے کے قصائد میں سیاسی حوادث کی طرف بھی بہ کثرت اشارات ملتے ہیں، مثلاً دمشق کی بغاوت (۵۲۳۶/۴۸۵۰)، ارسینیہ میں شورش اور فساد (۵۲۳۷/۴۸۵۱)، حمص کی بغاوت (۵۲۳۸/۴۸۵۳)، خلیفہ کا سفر دمشق (۵۲۳۸/۴۸۵۸)، المتوکلیہ کی تعمیر (۲۳۵-۵۲۳۶/۸۵۹-۴۸۶) وغیرہ۔

اس وقت تک البحتری کے قصائد کی تشیب محض ایک رسمی محبوبہ ہند کے نام سے ہوتی رہی، مگر اب ان میں ایک حقیقی اور زندہ عورت علوہ بنت زریقہ جلوہ گر ہونے لگی، جو رہتی تو حلب میں تھی مگر اس کا اس ضلع کے موضع بطیاس میں ایک دیہاتی مکان بھی تھا۔ البحتری جب شام کا سفر کرتا تو اس سے ضرور ملتا، کیونکہ عراق میں اس کا قیام کبھی مسلسل اور غیر متقطع

کاہم البحتری کی مستعدی میں کوئی فرق نہیں آیا اور چند ہی دنوں میں وہ ابوتمام کے ساتھ اس کے سرپرست مالک بن طوق، والی عراق کے مصاحبوں میں شامل ہو گیا اور پھر ابوتمام کے ہمراہ بغداد پہنچا، جہاں اس نے ناسور فضلا (خصوصاً ابن الاعرابی) کے حلقہ تدریس میں شرکت کی۔ اس کے علاوہ وہ دارالخلافة کے آداب سے آگاہی حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتا رہا، تاکہ بلند پایہ اشخاص کی مدح سرائی کر کے بالآخر خلیفہ کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کے قابل ہو جائے۔

بایں ہمہ ابن الزیات کے یہاں اسے بہت زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ لہذا ابن الزیات کو چھوڑ کر اس نے اپنے ہی قبیلے کے ایک خاندان بنو حمید سے رشتہ قائم کر لیا، جس کے کچھ افراد بغداد میں بس گئے تھے۔ البحتری نے ان کے سردار ابونہشل کی مدح میں چند قصیدے لکھے۔ اس کے بعد ۵۲۳/۴۸۴۴ء، یعنی اسی زمانے میں جب ابوتمام بغداد سے روانہ ہوا البحتری بھی عراق چھوڑ کر دوبارہ الثغری کے یہاں چلا آیا، جو اس وقت موصل میں مقیم تھا۔

ابوتمام کی وفات ۵۲۳/۴۸۴۵ء میں ہوئی۔ لیکن خلاف توقع البحتری کو اس کی موت پر مطلق غم نہیں ہوا؛ حالانکہ یہ ابوتمام ہی تھا جس نے سب سے پہلے اس کی ہمت افزائی کی اور جس سے شعر گوئی میں بھی اس نے کچھ نہ کچھ تربیت حاصل کی تھی۔ چنانچہ یہ اس کی ناشکری اور موقع پرستی کی پہلی مثال تھی جس کا آگے چل کر اس نے خاصا ثبوت پیش کر دیا۔

[خلیفہ] المتوکل کے تخت نشین ہوتے ہی بحتری بغداد چلا آیا اور ابن المنجم کی سفارش سے اسے الفتح بن خاقان [وزیر] کی نظر عنایت حاصل ہو گئی۔ جس کے ذریعے غالباً ۵۲۳/۴۸۴۸ء میں اس کی



نہیں رہا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے دل میں واقعی علوہ کا شدید جذبہ محبت موجزن ہو، تاہم اس نے اپنی ایک مبتذل سی نظم میں علوہ کا استہزا بھی کیا ہے۔

المسعودی کے بیان کے مطابق المتوکل اور الفتح کے قتل (۵۲۴/۵۲۵ء) میں البحتری کا بھی کچھ ہاتھ تھا۔ اس کے بعد اس نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ منبج میں جا کر گوشہ نشین ہو جائے۔ لیکن زیادہ دن گزرنے نہ پائے تھے کہ اس نے المستنصر کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھا اور بغداد آ گیا۔ بعد ازاں اس نے احمد بن الخصب وزیر سلطنت کی مدح میں بھی کچھ قصیدے لکھے لیکن ضمنی طور پر۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہو گی کہ آگے چل کر اس نے المستنصر کو اس کے قتل پر بھی ابھارنے میں تامل نہ کیا۔ المعتز کے عہد میں اسے ایک بار پھر شہرت نصیب ہوئی جس کی مدح میں اس نے متعدد قصیدے لکھے۔ البحتری کے ان قصائد میں اس اضطراب اور بدامنی کا عکس جھلکتا ہوا نظر آتا ہے جس کے باعث اس وقت سلطنت کا ہر گوشہ خون ریزی سے دوچار تھا۔ لیکن وہ خلیفہ المہدی کا اس انداز میں خیر مقدم کرتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ چنانچہ نئے خلیفہ کی خوش نودی مزاج کی خاطر اس نے اپنی شاعری میں تقویٰ کی تلقین بھی کی ہے۔ المعتمد کے زمانے میں اس کی شہرت ماند پڑ گئی، حتیٰ کہ خلیفہ کی مالی حکمت عملی کے باعث اسے مال و دولت کے بارے میں کچھ پریشانی بھی ہونے لگی۔ آخری قصیدہ، جو اس نے کسی خلیفہ کی شان میں لکھا، المعتضد کے لیے تھا (۵۲۹/۵۳۰ء)۔ اس کے بعد البحتری نے عراق سے ترک وطن کیا اور ایک بار پھر خمازویہ بن طولون کا درباری شاعر بن گیا۔ بالآخر اس نے وطن کی راہ لی اور وہیں ایک طویل بیماری کے بعد ۵۲۸/

۵۲۹ء میں وفات پائی۔  
اپنی شاعری کی ابتدا میں البحتری صرف فخریہ نظمیں لکھتا یا ان میں اپنی صحرا نوردی کا حال بیان کرتا تھا۔ اس کی نمایاں مثال گیدڑ سے متعلق مشہور نظم (طبع قدیم، ۲ : ۱۱۰) ہے۔ لیکن جونہیں وہ دربار سے منسلک ہوا اس کی شاعری صرف قصیدہ خوانی تک محدود رہ گئی، جس میں اس نے اس صنف کے وہی تین حصے قائم رکھے جو ابتدا سے چلے آ رہے تھے؛ گو اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس نے شاید یہ طرز بدل دیا تھا۔ وہ قصائد میں اپنے مختلف ممدوحوں کی رسمی تصویریں کھینچتا ہے لیکن اس کے قصائد میں جو کیفیات (خصوصاً محل شاہی کی) بیان کی گئی ہیں ان سے قصیدے میں بڑا زور آ گیا ہے اور اس کا سبب شاعرانہ تصویر کشی اور جزئیات نگاری کا وہ نفیس شعور ہے جس میں البحتری کا کوئی حریف پیدا نہیں ہوا۔ پھر بھی اس امر کی نوبت ایک عرصے کے بعد آئی کہ وہ ایک پورا قصیدہ ایک محل کی تعریف میں لکھے، یعنی ایوان خسروان کے بیان میں (عبدالقادر المغربي، در MMIA، ۶۱۹۵۶، ص ۸۷ تا ۸۸، ۲۴۱ تا ۲۵۲، ۴۲۷ تا ۴۳۶، ۵۷۷ تا ۵۸۵)۔ اگرچہ ان خیالات میں جنہیں وہ اس میں بیان کرتا ہے کوئی جدت نہیں لیکن اس کے اسلوب کا خاص وصف یہ ہے کہ سادہ اور سہل الفاظ کے باوجود اشعار میں ایسا ترنم اور صوتی رنگ پیدا ہو گیا ہے کہ دوسرے درباری شاعروں کے کلام کی نسبت، جن سے اسے پہلے پہل مقابلہ کرنا پڑا، اس کی اس نظم کا مرتبہ بلند ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مرثیے کے میدان میں بھی وہ اپنے معاصر شعرا پر سبقت لے گیا ہے لیکن ہجو کے میدان میں اسے کامیابی نہیں ہو سکی، کیونکہ ہجو اس کے ہاں مدح کا ایک ضمنی حصہ ہی تھا۔ ہجویہ نظمیں اس نے زیادہ تر ان لوگوں کے

کرتے۔ منفعت ذات، حرص اور طمع کا یہی جذبہ ہے جس نے اس کے اخلاقی کردار میں پختگی کے بجائے اسے ریاکاری کے راستے پر ڈال دیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے سرپرست خلفا کی بدلتی ہوئی مذہبی روش میں غلاموں کی طرح ان کا ساتھ دیتا رہا۔

درباری شاعر بننے کا اعزاز حاصل کرنے کے بدلے اسے لازمی طور پر اس منصب کے دوسرے خواہشمندوں کی دشمنی سول لینی پڑی، گو معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ شاعر دُعبَل [رک باں] سے اس کے مراسم اچھے تھے۔ دربار خلافت میں رسائی کی وجہ سے اسے اعیان سلطنت، وزیروں، سپہ سالاروں والیان صوبہ، اہل دربار، شاہی کاتبوں اور علما و فضلا سے ارتباط کا موقع مل گیا۔ ان روابط کی بدولت اس نے کئی ایک سیاسی حقائق کے متعلق معلومات بھی حاصل کیں، جن کی صدائے بازگشت اس کے 'دیوان' سے سنی جا سکتی ہے اور جس کی ادبی قدر و قیمت کے علاوہ اس کی حیثیت بجائے خود ایک ناقابل انکار تاریخی دستاویز کی ہے (قب M. Canard:

*Les allusions à la guerre byzantine chez les poètes*  
: A. A. Vassiliev، در *Abū Tanmām et Buhturī*  
: *Byzance et les Arabes*، ۱، برسلسز ۱۹۳۵ء :  
۳۹۷ تا ۴۰۳)۔ دراصل یہ دیوان اس زمانے کے وقائع کا ایک مفید تکملہ ہے، جس میں بعض ایسی تفصیلات بھی ملیں گی جن کا مؤرخوں نے کوئی ذکر نہیں کیا؛ مثلاً مشاہیر کے پورے پورے نام، یادگار عمارتوں کا ذکر اور ان کی کیفیت یا بعض حوادث کا تذکرہ۔

البحتری کا دیوان ۱۸۸۲ء میں قسطنطنیہ میں طبع ہوا۔ پھر بیروت اور قاہرہ میں ۱۹۱۱ء میں۔ لیکن یہ نسخے ایک حد تک ناقص اور نامکمل ہیں، لہذا اگر اس کے متفرق مخطوطوں کو (بالخصوص اس مخطوطے کو جو

خلاف لکھیں جن سے کبھی اسے امداد اور قدر دانی کی توقع تھی لیکن پوری نہیں ہو سکی۔ مزید برآں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بستر مرگ پر اس نے بیٹے کو وصیت کی تھی کہ "میرے ہجو یہ اشعار ضائع کر دیے جائیں"۔ البحتری کے دیوان میں خاص خاص موقعوں کے بارے میں بہت کم نظمیں ملتی ہیں۔ عشقیہ اشعار بھی قصیدوں کی تشبیہ کے سوا اور کہیں نہیں ملتے۔ اور محض اس زمانے کے مذاق کی رعایت سے اس نے چند نوجوان شہریوں کی مدح سرائی بھی کی ہے۔

مغربی نقاد، جہنوں نے مجموعی طور پر البحتری کی طرف کم توجہ کی ہے، اس کا شمار متأخر معیاری شعرا کے زمرے میں کرتے ہیں اور یہ درجہ فی الواقع اس کے مناسب حال ہے۔ مشرقی اہل نظر اسے ابو تمام اور المتنبی کے ساتھ شامل کرتے اور عہد عباسی کے ممتاز ترین شعرا میں جگہ دیتے ہیں۔ استاد ابوتمام سے اس کا موازنہ ایک دلچسپ موضوع بحث ہے، جو البحتری کی زندگی ہی میں ایک متنازع فیہ مسئلہ بن گیا تھا۔ خود البحتری کی اپنی رائے یہ تھی کہ اس کا بہترین کلام ابوتمام کے بہترین کلام سے کم درجے کا ہے لیکن اس کے معمولی سے معمولی اشعار بھی ابو تمام کے ادنیٰ سے ادنیٰ کلام سے بہتر ہیں۔ اس سلسلے میں دو کتابوں میں میر حاصل بحث کی گئی ہے ان میں سے ایک میں ابوتمام کو اور دوسرے میں البحتری کو بہتر قرار دیا گیا ہے۔ یعنی ایک الصولی کی اخبار ابی تمام، قاہرہ ۱۳۵۶ھ / ۱۹۳۷ء اور دوسری الامدی کی الموازنة بین [شعرا] ابی تمام و البحتری (قاہرہ ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء [طبع احمد صقر ۱۳۸۰ھ / ۱۹۶۱ء]) میں۔

البحتری اور اس کے اکثر رفقا میں یہ امر مشترک ہے کہ انہیں ہمیشہ حصول زر کی خواہش رہی۔ چنانچہ وہ اس کے لیے جو بھی ذریعہ ہوتا اختیار



أو حياة البحتری، قاهرہ ۱۹۳۷ء؛ (۱۶) سید العقلم: عبقریة البحتری، بیروت ۱۹۵۳ء؛ (۱۷) براکلمان: تکلمہ، ۱: ۱۲۵؛ (۱۸) اسی موضوع پر ایک نفیس مقالہ *Un poète arabe du III<sup>e</sup> siècle de l'hégire (IX<sup>e</sup> s. Buhture de. J.-C)* پر S. Achtar نے ۱۹۵۳ء میں Sorbonne میں ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے پیش کیا تھا۔

(CH. PELLAT)

بَحْث: (ع) مادہ بحث کا اسم مصدر، لغوی معنی: کریدنا، کھودنا، مٹی کو اوپر تلے کرنا (کسی چیز کی تلاش کے لیے)، [سوال و جواب کرنا، قب لسان]۔ اسی سے آگے چل کر فکری اور ذہنی باتوں میں تجسس، تفحص اور تعقیق کا مفہوم نکل آیا، حتیٰ کہ یہ لفظ تقریباً نظر [رک بان] کا مرادف ہو گیا، چنانچہ 'بحث' اور 'نظر' دونوں الفاظ اکثر یکجا ملتے ہیں (مثلاً المسعودی: مروج، ۶: ۳۶۸: اهل البحث و النظر [رک بہ اهل النظر]، یعنی فلسفیانہ تفحص اور مباحثے کی ماہرین)۔ ایک تصنیف کتاب البحث جابر بن حیان سے منسوب ہے، جس کا زمانہ تیسری/نویں صدی ہے (قب براکلمان: تکلمہ، ۱: ۳۲۹)۔ اس وقت سے لفظ 'بحث' جس کی جمع 'ابحاث' ہے، بے شمار تصنیفات کے ناموں میں آ رہا ہے، بمعنی 'مطالعہ و موازنہ و تحقیق و تفتیش' (نیز مَبْحَث (جمع: مباحث) کی شکل میں بھی، جس کا مفہوم 'موضوع و مقصود تحقیق'، بلکہ خود 'تحقیق'، بھی ہے)۔ امام رازی کی کتاب المباحث المشرقیہ معروف ہے۔ جدید عربی میں بھی مَبْحَث کا لفظ تحقیق کے معنوں میں استعمال ہو رہا ہے، مثلاً بشر فارس: مباحث عربیہ، قاهرہ ۱۹۳۹ء۔

[مآخذ: متن میں درج ہیں]۔

(F. GABRIELI)

Bibliothèque Nationale ملی کتب خانہ ملی پیرس کے کتب خانہ میں موجود ہے) سامنے رکھتے ہوئے ایک جدید نسخہ ترتیب دیا جائے تو اس کا سب خیر مقدم کریں گے۔ ابوالعلاء المعری کی ایک شرح (دیوان البحتری) بعنوان عبث الولید دمشق (۵۱۳۵۵/۵۱۹۳۶) میں چھپی تھی۔ البتہ اس کی الحماسة کا صرف ایک مخطوطہ (لائڈن یونیورسٹی) میں دستیاب ہوا ہے اور یہ بات اس کی غماز ہے کہ البحتری کی کتاب الحماسة کو مقبول عام ہونے کا شرف نصیب نہ ہو سکا۔ اس میں اشعار کی ترتیب مطالب کے اعتبار سے کی گئی ہے نہ کہ باعتبار اصناف جیسا کہ ابوتمام کے الحماسة میں ہے۔ البحتری کی الحماسة تین بار طبع ہوئی (لائڈن ۱۹۰۹ء، بیروت ۱۹۱۰ء، قاهرہ ۱۹۲۹ء)۔ [مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے براکلمان: (تعریب عبدالحلیم النجار) ۱: ۸۱] ایک تیسری تصنیف، جو البحتری سے منسوب کی جاتی ہے، معانی الشعر (یا الشعراء) ہے، جو ضائع ہو چکی ہے۔ مآخذ: (۱) الاغانی، ۱۸: ۱۶۷ تا ۱۷۵؛ (۲) ابن المعتز: طبقات الشعراء، لندن ۱۹۳۹ء، ص ۱۸۶ تا ۱۸۷؛ (۳) المسعودی: مروج، بمدد اشاریہ؛ (۴) ابن خلکان: ترجمہ de Slane، ۳: ۶۵۷ تا ۶۶۶؛ (۵) باقوت: معجم الادباء، ۱۹: ۲۳۸ تا ۲۵۸؛ (۶) ابوالعلاء المعری: رسالة الغفران، مقامات متفرقة؛ (۷) Margoliouth: The Letters of Abul-'Alá، اوکسفورڈ ۱۸۹۸ء، مقامات متفرقة؛ (۸) زہر الاداب، بمدد اشاریہ؛ (۹) الفہرست، مطبوعہ قاهرہ، ص ۲۳۵؛ (۱۰) ابن رشیق: العمدۃ، مقامات متفرقة؛ (۱۱) ZDMG، ۱۸۹۳ء، ص ۴۱۸ تا ۴۳۹، ۷۱۵ تا ۷۱۷؛ (۱۲) جرجی کنعان: البحتری، حماہ [۱۹۳۷ء]؛ (۱۳) طہ حسین: من حدیث الشعر و النثر، قاهرہ بلا تاریخ [۱۹۳۲ء]؛ (۱۴) محمد صبری: ابو عبادة البحتری، قاهرہ ۱۹۳۶ء؛ (۱۵) عبدالسلام رستم: طیف الولید

العقد ۲: ۳۰۵: (۵) الذہوری (طبع Quirgass)، ص ۱۸۳،  
۲۷۵: (۶) المسعودی: التنبیہ، ص ۳۰۵.

(H. LAMMENS)

بَحر: رَکَ بہ عَرُوض.

- \* بَحر: (ع) سمندر، نیز مستقل طور پر بہنے والا
- \* ہر بڑا دریا۔ اگلے مقالات ان بڑے بڑے سمندروں سے متعلق ہیں جن کا عربوں کو علم تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کوہ قاف، جس نے ریب مسکون کا احاطہ کر رکھا ہے، بجائے خود سات ہم مرکز اور باہمدگر مربوط سمندروں سے گھرا ہوا ہے، جن کے نام یہ ہیں: (۱) نِیْطُس (یا بَیْطُس)؛ (۲) قَیْنِس (یا قَیْس)؛ (۳) الْأَصْم؛ (۴) السَّاكِن؛ (۵) المَغْلِب (یا المَظْلِم)؛ (۶) المَوْنِس (یا المَرْماس) اور آخر الامر (۷) الباقی۔ قیاس ہے کہ ان ناموں کی کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہوگی۔ در حقیقت نِیْطُس (یا اس کی متبادل صورت) بَنْطُس [= بَنْتُس] (= πόντος = بحیرہ اسود) کی مسخ شدہ حرفی شکل ہے اور قَیْنِس (اور اس کی متبادل صورت) اَوْقیانوس = ωκεανός = البحر سے مشتق ہے۔ دوسرے ناموں کی امتیازی تشخیص کے لیے دیکھیے P. Anastase و Marie de St. Elie کی نشوونگہ العربیة، قاہرہ ۱۹۳۸ء، ص ۸۳ تا ۸۴ اور الجاحظ: تَرْبِیع (طبع Pellat)، بذیل مادہ بحر بَنْتُس Buntus.

مآخذ: (۱) القزوبی: [عجائب المخلوقات]

Cosmog. ص ۱۰۳؛ (۲) الکسانی: قصص الانبیاء،

لائڈن ۱۹۲۲-۱۹۲۳ء، ص ۹؛ نیز دیکھیے مآخذ

بذیل مادہ قاف (کوہ).

(ادارہ)

\* بَحر آبیض: رَکَ بہ بَحر الرُّوم.

\* بَحر آدریاس: بحر ایڈریانک کا عربی نام.

\* بَحر اسود: دیکھیے بحر بَنْتُس و قرہ دینز

. Kara Deniz

بَحر بن آلیف بن زُلجہ: [دَیْبَعَة دیکھیے

جمہرۃ (انساب العرب، ص ۴۵۷) بن قنافة کا تعلق قبیلہ بنو حارثہ بن جناب سے تھا، جن کا شمار البیت یا کلب کے اشراف میں ہوتا ہے۔ اپنے قبیلے کی بھاری اکثریت کی طرح بَحدل بھی عیسائی تھا۔ اس کی شہرت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ یزید اول کی ماں میسون کا باپ تھا۔ اس کا بدوی قبیلہ تَدَمِر (Palmyra) کے قدیم شہر کے جنوب میں بود و باش رکھتا تھا۔ میسون نے یزید کی زمانہ طفلی میں پرورش یہیں کی۔ مِیْرَج راہط کی لڑائی اور جابیہ کے اجتماع کے بعد بنو امیہ یہیں از سر نو متحد ہوئے تھے۔ بنو کلب کو امویوں کے سارے دور میں جو خوشحالی حاصل رہی اس کا باعث یہی بَحدل تھا، البتہ اس نے خود سیاست میں عملی طور پر کوئی حصہ نہیں لیا۔ یزید اول کے زمانہ خلافت میں بَحدل کے بیٹے [ابان] پر عیسائی ہونے کا الزام لگا تھا۔ خاصی بڑی عمر پا کر بَحدل غالباً جنگ صفین سے پہلے فوت ہوا۔ اس جنگ میں اس کے ایک بیٹے نے دمشق کے بنو قضاعہ کے سالار کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ اس کے بیٹوں نے اس کی جگہ سنبھالی اور حکومت میں اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ بنی امیہ کے طرفداروں کو بَحدلیہ کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اس کا پوتا حسان، جو یزید اول کے بیٹوں کا ولی اور اتالیق تھا، معاویہ ثانی کے بعد اس کی جانشینی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ بَحدلیہ اور بنو کلب کا نہیں بے جا اقتدار بڑی حد تک مِیْرَج راہط کی لڑائی کے بعد عربوں کو دو فریقوں یعنی قیس اہل بطنی عربوں میں تقسیم کرنے کا سبب بنا [بَحدل کے پوتوں وغیرہ کے لیے دیکھیے: ابن حزم: جمہرۃ انساب العرب، ص ۴۵۷].

مآخذ: (۱) الطبری، ۲: ۲۰۳، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹؛

(۲) ابن درید (طبع وینٹفٹ)، ص ۳۱۶؛ (۳) العنسی (طبع

فریناخ)، ص ۲۶۱، ۲۱۸ تا ۲۱۹، ۲۰۹؛ (۴) ابن عبد ربہ



طول گیارہ سو میل بتاتا ہے اور دریائے ڈان کا طول تین سو فرسخ۔ اسی طرح کا عام ذکر ابن رستہ (ص ۸۵ تا ۸۶، تقریباً ۵۲۹/۵۳۰ء میں) کے ہاں بھی ملتا ہے۔ بعض لوگوں، مثلاً ابن خردادبہ (ص ۱۰۳) کا خیال ہے کہ بحر ہنس بحر الخزر (کیسپین) سے نکلتا ہے۔ المسعودی اس سے انکار کرتا ہے (مروج، ۱: ۲۷۳) اور صرف یہ کہتا ہے کہ دونوں سمندر آپس میں ملے ہوئے ہیں (التنبیہ، ص ۶۷)۔ مروج (۲: ۱۸) بعد کے مطابق بحر ہنس سے بحر الخزر کا راستہ خلیج نیطس (آبنائے کرج Kertch) سے ہو کر جاتا ہے۔ دریائے ڈان اور دریائے والکا "ڈان۔ والکا گزرگاہ" اختیار کرتے ہیں، یعنی وہ راستہ جسے کسی دوسری جگہ "خزری گزرگاہ" کہا گیا ہے۔ المسعودی نے ان جغرافیہ دانوں کی بہ نسبت جن کا تعلق البلخی اور الاضطخری دبستان سے ہے، بحر ہنس میں زیادہ دلچسپی لی اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ بحر اسود اور بحر اوقیانوس کے مابین براہ راست تعلق ہے۔ آگے چل کر البیرونی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے (القزوینی: عجائب، ص ۱۰۴)۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا بحر ہنس کے شہروں کے نئے نئے نام سامنے آتے گئے، مثلاً ایشیائے کوچک کی سلجوقی تسخیر کے بعد وہ شہر جو پہلے یونانی تھے، جیسے سینوب (Sinope) اور ساسون (Amisus)، جن کا ذکر ابوالفداء نے کیا ہے۔ اسی طرح النوبیری قہچاق کے شہروں سوداق اور قریم کا ذکر کرتا ہے، جن میں اول الذکر ساتویں/تیرھویں صدی میں تعمیر ہوا اور جس کے نام پر اس سمندر کو بحر سوداق کہا گیا۔ عثمانی دور کے لیے ریک بہ قرہ دینز Kara Deniz۔

مآخذ: ان حوالوں کے علاوہ جو مقالے میں آگئے ہیں دیکھیے: (۱) باقوت، ۱: ۳۰۶ تا ۳۰۷، ۳۰۱، ۳۹۹، ۴۰۶؛ (۲) ابوالفداء: تقویم، ص ۱۳، ۳۹۲ تا

\* بَحْرُ الْبَنَاتِ : عرب اس مجمع الجزائر کو اس نام سے پکارتے تھے جو خلیج فارس کے مغربی ساحل سے پرے واقع ہے۔ الادریسی اسے بحر الکثر کہتا ہے۔

مآخذ: Ritter : Erdkunde، ۱۲ : ۳۹۰

۵۸۹ بعد

\* بحر بَنْطُس : = بَنْطُس (Pontus Euxinus) یا بحیرۃ اَسود [البحر الأسود (لا، ع)]، جسے غلطی سے بحر نیطس (نیطس) لکھا جاتا رہا ہے۔ ملحقہ قوموں یا شہروں کی نسبت سے اسے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا رہا ہے؛ مثلاً بحر الخزر یا خزروں کا سمندر (ابن خردادبہ، ص ۱۰۵، شاید کیسپین سے التباس کی بنا پر [رک بہ بحر الخزر]) بحر الروس (روسیوں کا سمندر)، بحر البرغز یا بحر البرغز (بلغاروں کا سمندر)، بحر طرابزندہ (بحیرۃ طرابزندہ)، بحر نیطس الارمنی (ارمن Pontus)، بحر القسطنطینیہ (Constantinople) اور بحیرۃ گریزیان یا گرجیوں کا سمندر (صرف حدود العالم میں)۔ بحر الاسود کا نام بہت بعد میں دیکھنے میں آیا ہے۔

المسعودی کے نزدیک، جس کا بیان ۵۳۴۵/۵۳۴۶ء کا ہے (التنبیہ، ص ۶۶ تا ۶۷)، یہ مشرق میں لازقہ (یونانی Lizikē) سے قسطنطینیہ تک تیرہ سو میل تک پھیلا ہوا ہے اور اس کا عرض تین سو میل ہے۔ یہ مایوطس نامی جھیل یا سمندر (بحیرۃ آزوف (Sea of Azov) [رک بہ بحر مایوطس]) سے ملا ہوا ہے۔ جو دریا اس میں آکر گرتے ہیں ان میں دریائے طنائس (ڈان Don) اور ڈنیوب بھی شامل ہیں۔ خلیج قسطنطینیہ (یا آبنائے قسطنطینیہ) بحر ہنس ہی سے نکلی ہے، یعنی باسفورس، بحیرۃ مار مورا اور دردانیال سے، جو بحیرۃ روم (یا یونانیوں کے سمندر) سے جا ملتی ہے۔ آبنائے مذکور کی لمبائی تین سو پچاس میل ہے۔ ایک اور بیان میں، جو اس سے قبل کا لکھا ہوا ہے (مروج، ۱: ۲۶۰ تا ۲۶۲)، المسعودی بحر ہنس کا

۳۹۳: (۳) الخزر: نهاية الأرب، ۱: ۲۳۶ تا ۲۳۷؛

(۴) حدود العالم، ص ۱۸۱، ۱۸۲ تا ۱۸۳۔

(D.M. DUNLOP)

بحر الخزر: "خزروں کا سمندر"، بحیرہ کیسپین

(Caspian) کا ایک عام عربی نام - اسے بحر الخزری بھی کہتے تھے - ان کے علاوہ اس کے اور بھی کئی نام ہیں: البحر الخراسانی، بحر جرجان، البحر طبرستان وغیرہ - یہ سب مقامی نام ہیں، جو پورے سمندر کے لیے استعمال ہوتے تھے (قَب المسمودی؛ مروج، ۱: ۲۶۳) - الدمشقی (طبع Mehren، ص ۱۳۷) کہتا ہے کہ اس کے زمانے (۵۷۲۳/۱۳۲۰ء) میں ترک اسے بحیرہ قززم کہتے تھے - حمد اللہ مستوفی (نزہة، ص ۲۳۹؛ ترجمہ، ص ۲۳) کا بیان ہے کہ بعض لوگ غلطی سے کیسپین کو بحر قززم کہہ دیتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں یہ نام بحیرہ احمر (Red Sea) کا ہے - المقدسی کیسپین کو محض البحیرہ (=جھیل) کہنے پر اکتفا کرتا ہے (BGA، ۳: ۳۵۳، ۳۶۱) - شاید اس نے اسے اور بحیرہ آرال [رک بان] (بحیرہ خوارزم) کو ایک ہی سمجھ کر ایسا کیا ہے - مروجہ نام بحر الخزر غالباً خزروں کی حکومت کی یادگار ہے، جو قرون وسطیٰ کے ابتدائی دور میں قفقاز کے شمال میں ساحل سمندر سے اتل (والکا) تک ہلکے اور زیادہ شمالی اور مغربی حصے پر قابض تھے - البلخی کے دبستان کے جغرافیہ نویس بحر الخزر پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کے بیانات کا بیشتر حصہ خزری سلطنت کے احوال پر مشتمل ہوتا ہے۔

دورِ خلافت میں بحر الخزر پر مسلمانوں کا

قبضہ، مغرب میں قفقاز اور مشرق میں جرجان سے آگے کبھی نہیں بڑھا اور اگر باب الابواب [رک بان] سے کوئی شخص پہلے جنوب اور پھر مشرق کی طرف سفر کرتا تو وہ شیروان، آذربائیجان کے

علاوہ مقان، جیلان (جیل)، طبرستان (جسے بعد میں مازندران کہنے لگے) اور جرجان سے گزرتا - آترک کے شمال میں، جو مؤخر الذکر صوبے کی حد تھی، غز ترکوں کا صحرا واقع تھا اور اس کے پرے با آست آرت Ust Urst کی سطح مرتفع کی دوسری جانب پھر خزروں کی زمینیں واقع تھیں۔

بحرالخزر میں گزرنے والے خاص خاص دریا یہ تھے: شمال میں دریائے جم (جم، اُنبہ) اور جیح (آرال)، شمال مغرب میں اتل (والکا): مغرب میں گر (Cyrus) اور آرس [= آراس: سیحون] (Araxes) باہم مل کر اور جنوبی مشرقی کونے میں جرجان اور آترک - یہ ایک نہایت ہی عجیب اور بظاہر مسلم واقعہ ہے (قَب Le Strange، ص ۳۵۵ تا ۳۵۸) کہ خوارزم پر مغول کے حملے (۱۲۱۷ء/۱۲۲۰ء) کے وقت سے کئی صدیوں تک دریائے جیحون (آمو دریا [رک بان] Oxus)، جو اس وقت تک بحیرہ آرال میں گرتا تھا، بحر کیسپین میں گرنے لگا - یوں گویا دریا نے پھر اپنا وہی اصلی رخ اختیار کر لیا جس کا ذکر سکندر اعظم کے حملوں کے حالات میں ملتا ہے - سولہویں صدی میں کسی وقت اس نے اپنا رخ پھر بدلا اور اب وہ پہلے کی طرح بحیرہ آرال ہی میں گرتا ہے۔

بڑے بڑے جزیرے، جن کے نام ابن حوقل اور حدود العالم میں ملتے ہیں، یہ ہیں: سیاہ کوہ یا سیاہ گویا، جس کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ وہی جزیرہ ہے جسے آج کل منگش لک Mangishlak کہتے ہیں اور جزیرہ باب الابواب، جس کی تعیین اب ممکن نہیں، (قَب حدود العالم، ص ۱۹۳) - جنوبی اور مغربی ساحلوں کے کچھ حصے کو چھوڑ کر بحر الخزر کا مغربی ساحل عام طور سے نشیب میں ہے - بلخان کلان اور کرسنووڈسک Krasnovodsk کے مشرق میں واقع بلخان



(۶) زکی ولیدی طوغان : *Ibn Fadlān's Reisebericht*، در *AKM*، ۱۳ : ۳، لائپزگ ۱۹۳۹ء (چوتھی/دسویں صدی میں کیسپین کے مشرق میں واقع علاقوں کے کوائف و احوال)؛ (۷) *History of : D.M. Dunlop*، *the Jewish Khazars*، پرنسٹن ۱۹۵۳ء، ہمدد اشاریہ۔ کیسپین ساحل پر روسی حملوں کے لیے: (۸) ابن یسکویہ: *تجارب الأمم* (در *H. F. Amedroz* و *The Eclipse of the Abbasid : D. S. Margoliouth*، *Caliphate*، عربی متن، ۲ : ۶۲ تا ۶۷، ترجمہ، ۵ : ۶۷، بعد)؛ (۹) *Studies in Caucasian : V. Minorsky*، *History*، لندن ۱۹۵۳ء، ہمدد اشاریہ؛ (۱۰) وہی مصنف: *A History of Sharvan and Darband*، کیمبرج ۱۹۵۸ء، ہمدد اشاریہ۔

(D.M. DUNLOP)

- \* بحر خوارزم: [بحر یورال یا بحیرہ آرال] رُک بہ آرال۔
- \* بحر روم: یا البحر الرومی، یعنی بحر متوسط (Mediterranean)۔ مذکورہ بالا دونوں نام زمانہ قدیم ہی سے مستعمل تھے، بالخصوص مشرقی بحر متوسط (Mediterranean) کے لیے، جہاں بوزنطی بیڑے سے مقابلے کا امکان رہتا تھا۔ جوں جوں اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوتا گیا اس نام کا اطلاق پورے بحر متوسط پر کیا جانے لگا اور آج تک وہ بحر روم ہی کہلاتا ہے۔ بحر متوسط کو البحر الشامی یا بحر الشام اور بحر المغرب بھی کہتے تھے۔
- عربی جغرافیہ نگاروں کی رائے کے مطابق یہ سمندر، جس کے مذکورہ بالا مختلف نام رکھے گئے، آبنائے جبل الطارق (Gibraltar) (الزقاق) سے خاصی دور مغرب سے شروع ہوتا تھا اور یہ (البحر المحيط یا البحر المغربی Western Ocean کی ایک خلیج تھا۔ بحر روم کے بارے میں افسانوی روایات یہ ہیں: آج کل جہاں یہ واقع ہے وہاں

کے پہاڑی سلسلے اگرچہ بہت زیادہ اونچے نہیں لیکن زمین کی جانب سے دیکھے تو بہت نمایاں نظر آئیں گے۔ کیسپین کے طول کا موجودہ اندازہ سات سو ساٹھ میل ہے۔ المسعودی نے اس کا طول آٹھ سو میل اور عرض چھ سو پچاس میل یا کچھ زیادہ بتایا ہے (التنبیہ، ص ۶۰)، لیکن مؤخر الذکر اندازہ انتہائی مبالغہ آمیز ہے۔ المسعودی اس بات سے پوری طرح باخبر ہے کہ بحر الخزر بحر مایوطس (= بحیرہ آزوف Sea of Azov) سے اور بحر ہنس (= بحیرہ اسود) سے ملا ہوا نہیں ہے (سروج، ۱ : ۲۷۳ تا ۲۷۴)۔

بڑی مدت تک شمالی علاقوں اور اسلامی ملکوں کے باشندوں کے درمیان خزروں کو ثالث کی حیثیت حاصل رہی۔ اس بات کی وافر شہادت موجود ہے کہ دونوں علاقوں کے درمیان خاصی تجارتی سرگرمی موجود تھی۔ یہ تجارت آتل (والگا) اور بحر خزر کے راستے ہوتی تھی۔ آگے چل کر روسی جنگی جہاز آتل سے اتر کر اور خزروں کے علاقے سے ہو کر کیسپین میں آنے جانے لگے۔ ۶۰۰ء سے پہلے عرصہ دراز تک ان قزاقوں کی موجودگی دنیا کے اس حصے کی تاریخ کا ایک نہایت نمایاں پہلو رہی ہے۔ مغولی حملوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کیسپین کے شمال اور جنوب دونوں اطراف میں نئے مسلمان خاندانوں کا عروج ہوا۔ مدتیں گزریں کہ روسی پیش قدمی نے ان لبق و دق صحراؤں کے خوانین کی قوت کا خاتمہ کر دیا ہے اور اب سمندری ساحل پر روس کا اقتدار خزروں کے دور عروج کے اقتدار سے کہیں زیادہ ہے۔

مآخذ: (۱) الاضطحری، ص ۲۱۷ تا ۲۲؛ (۲) ابن حوقل، طبع ڈخویہ، ص ۲۷۶ تا ۲۸۷ و طبع Kramers، ص ۲۸۶ تا ۲۹۸؛ (۳) المسعودی: التنبیہ، ۶۰ تا ۶۶؛ (۴) الادریسی، ترجمہ Jaubert، ۲ : ۲۳۲ تا ۲۳۳؛ (۵) حدود العالم، ہمدد اشاریہ؛

ہے کہ اگر کوئی شخص پورے بحر روم کا چکر لگائے تو بالآخر وہ ساحل ہسپانیہ پر ایک ایسے مقام پر پہنچ جائے گا جو اس کے مقام روانگی کے عین مقابل واقع ہوگا۔ دوسرے اس کیفیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس سمندر کے جنوب کی جانب تو مسلمانوں کے ملک تھے اور شمال کی جانب عیسائیوں کے۔ بحر روم کا عرض و طول بھی مختلف طور پر دیا گیا ہے۔ المسعودی کے ایک اندازے کے مطابق اس کا طول کم و بیش پانچ ہزار میل اور عرض چھ سو سے آٹھ سو میل تک ہے، مگر اسے ایک اور تخمینے کا بھی علم ہے، جو مشہور و معروف فاضل الکندی اور اس کے تلمیذ السرخسی کا بتایا جاتا ہے، یعنی طول چھ ہزار میل اور عرض چار سو میل (التنبیہ، ص ۵۶، قب مروج، ۱: ۲۵۹)۔ ابن الفقیہ (ص ۷) نے البحر الرومی کی لمبائی انطاکیہ سے جزائر السعاده (The Fortunate Isles = Canaries) تک اڑھائی ہزار فرسخ جانچی ہے اور چوڑائی پانسو فرسخ؛ المقدسی (ص ۱۴) نے بھی یہی لکھا ہے اور شہادت میں ابن الفقیہ کے قول کا حوالہ دیا ہے۔ ایک مقام پر المسعودی لکھتا ہے کہ ملاح اپنے عملی تجربے کی بنا پر فلاسفہ سے متفق نہیں ہیں اور انہوں نے البحر الرومی کا طول و عرض زیادہ بتایا ہے (مروج، ۱: ۲۸۲)۔ (فی الواقع اس کا طول تقریباً دو ہزار چار سو میل ہے اور عرض زیادہ سے زیادہ تقریباً ایک ہزار میل)۔ اس سمندر کے طول کا قریب قریب بالکل صحیح اندازہ ہیئت دان العراکشی نے ساتویں/تیرھویں صدی میں لگایا تھا (ابوالفداء: تقویم، دیباچہ، ص cclxxvii)۔

بحر روم کا شمار ہمیشہ سے کرۂ ارض کے بڑے سمندروں میں ہوتا رہا ہے۔ المقدسی کہتا ہے کہ اسے کل دو بڑے سمندروں کا علم ہے: ایک مشرقی، یعنی البحر المتوسط اور دوسرا مغربی، یعنی بحر ہند، جسے وہ البحر الصینی (چینی سمندر)

پہلے خشکی تھی اور بنو دلوکہ نے اپنے رومی بادشاہ کے درمیان ایک روک حائل کر دینے کے لیے اپنے جبل الطارق کو کاٹ دیا تھا (القزوی: جانب، ص ۱۲۳)۔ یہ بنو دلوکہ اس ملکہ دلوکہ کی اولاد تھے جس کے بارے میں فرض کیا جاتا ہے کہ وہ عہد خروج کے فرعون کے بعد مصر کی فرمانروا ہوئی تھی (المسعودی: مروج، ۲: ۳۹۸)۔ دوسری روایت یہ ہے کہ ہسپانیہ کے اصلی باشندوں (ایشبان) کی درخواست پر، جو بربروں سے علیحدہ ہونا چاہتے تھے، سکندر اعظم نے البحر الرومی اور البحر المحيط کو باہم ملا دینے کے لیے اپنے جبل الطارق کھدوائی (الثویری: نہایۃ الأرب، ۱: ۲۳۱ تا ۲۳۲)۔ اس موقع پر سکندر نے جو افسانوی پہل تعمیر کرایا تھا اس کا نقشوں سمیت تفصیلی بیان الدمشقی نے درج کر دیا ہے (Cosmographie، طبع Mehren، ص ۱۳۷)۔

بحر روم کی کیفیت: یہ باقاعدہ طور پر مغرب سے شروع ہو کر مشرق کی طرف بڑھتا ہے اور معمولاً جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ سلا بلکہ السوس الاقصیٰ سے شروع ہو کر طنجہ اور سبتہ سے گزرتا ہوا طرابلس اور اسکندریہ تک پہنچتا ہے اور پھر نیل کے دہانوں سے گزرتا ہوا شامی ساحل کے ساتھ شمال کی جانب ہلتا اور انطاکیہ اور اس کی بندرگاہ السویدیہ سے الثفور (= سرحدوں) کی طرف بڑھتا ہے اور پھر مغرب کی جانب ساحل بلاد الروم (ایشیائے کوچک) سے گزرتا ہوا قسطنطنیہ، الارض الصغیرہ (the Little Land" یعنی یونان خاص)، پلبونس (the Peloponnese)، قلوبریہ (Calabria) الانگورڈہ (Lombardy) اور الرنجہ (فرانس) جاتا ہے اور پھر دوبارہ جنوب کی جانب الاندلس (ہسپانیہ) آجاتا ہے (مثلاً دیکھیے ابن حوقل، طبع کرامرز Kramers، ص ۱۹۰ تا ۱۹۱)۔ کم از کم نظری طور پر یہ طے



سمندر شمار کرتے ہیں (مروج، ۱ : ۲۷۱)؛ اس میں بحر اسود اور بحر خزر کو بظاہر ایک ہی سمندر شمار کیا ہے (مگر قب ابن الفقیہ، ص ۴ تا ۸)۔ بہر حال سمندروں کا شمار چاہے کچھ ہو عام رائے یہی ہے کہ قرآنی اصطلاح ”مجمع البحرين“ (= دو سمندروں کا ملنا، ۱۸ [الکہف] : ۶۰) خاکناے سویز پر واقع تھا اگرچہ بعض نے اس سلسلے میں الزقاق (آبنائے جبرالٹر) کا نام بھی لیا ہے [تفصیل کے لیے رک بہ البحرین]۔

بحر روم کے مختلف حصے مخصوص ناموں سے موسوم کیے جاتے تھے، مثلاً بحر تیران (= The Tyrrhenian Sea) (الرازی)، جون البنادیقین (= The Gulf of the Venetians) (ابن حوقل) یا الخلیج البنادیقی (= The Venetian Gulf) (الادریسی)، جس سے درحقیقت سارا بحر ایڈریاتک (Adriatic Ocean) مراد ہے، خلیج القسطنطنینیہ (= Gulf of Constantinople)، بحر اسود میں داخلے کے راستے۔ خود بحر اسود نیطس کہلاتا تھا، جسے بحر بنتس Pontus کی صدیوں سے بگڑی ہوئی شکل سمجھنا چاہیے، جو شاید بعض مخطوطات میں باقی رہ گئی۔ بحر آروف (The sea of Azov) کو مایطس Maeotis لکھتے تھے۔ مؤخر الذکر دونوں سمندروں کے بارے میں یہ بجا طور پر سمجھ لیا گیا تھا کہ یہ ایک دوسرے سے نیز بحر الروم سے ملے ہوئے تھے، مگر کچھ تو عدم یقین اور کچھ غلطی کے باعث بحر اسود اور بحر الخزر [رک باں] کا باہمی نسبت کے اعتبار سے محل وقوع متعین نہیں ہو سکا اور اسی سبب سے بحر اسود اور بالٹک (بحر الورنگ = Sea of Wangians) یا بحر منجمد (Arctic) کا بھی، کیونکہ آخر الذکر کی بابت تو عربوں کی براہ راست معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ مؤخر الذکر سمندروں کے بحر الروم سے ملے ہوئے ہونے کے نظریے کی طرف رجحان کی مثال ابن حوقل کے دیے ہوئے نقشوں سے عیاں ہے۔

کہتا ہے۔ پھر وہ ذکر کرتا ہے کہ البلیخی نے ان پر البحر المحيط کا اضافہ کیا ہے اور الجیہانی نے چوتھے اور پانچویں، یعنی بحر الخزر (Caspian) اور خلیج قسطنطنینیہ، یعنی بحر اسود میں داخلے کے سمندر کا۔ پھر المقدسی نے کہا ہے کہ اس کی اپنی رائے قرآن مجید کے مطابق: [سرج البحرین یلتقین ۰ بینہما برزخ لا یبغین = چلائے دو سمندر مل کر چلنے والے۔ ان دونوں میں ہے ایک پردہ، جو ایک دوسرے پر زیادتی نہ کرے] [۵۵ [الرحمن]: ۱۹ تا ۲۰]۔ المقدسی (ص ۱۶) یہاں برزخ سے مراد وہ خاکناے لیتا ہے جو الفرماء (Pelusium) اور القلزم (Clyasma) (موجودہ سویز Suez) کے درمیان واقع ہے اور یہ بحر الروم کو البحر الصینی سے جدا کرتی ہے۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ بعض علما نے قرآن مجید کی ایک اور آیت [وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمْدُهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَا نَفَدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ ۗ (۳۱ [لقمن]: ۲۷)] = اور اگر جتنے درخت ہیں زمین میں قلم بن جائیں اور سمندر ہو اس کی سیاہی، اس کے پیچھے ہوں سات سمندر، نہ تمام ہوں باتیں اللہ کی۔ قب ترجمان القرآن (باقیات)، ص ۳۱] کی تاویل کرتے ہوئے سابق الذکر پانچ سمندروں میں المقلوبہ (= الثابحیرہ، یعنی بحیرہ مردار Dead Sea [بحر لوط]) اور الخوارزمیہ (= بحیرہ خوارزم یا بحر آرال Aral Sea) شامل کے ہیں۔ سات سمندروں کی اس سے زیادہ قرین عقل فہرست یہ ہے: بحر اخضر (مشرقی سمندر)، مغربی سمندر، بحر عظیم یا بحر ہند، بحر متوسط، بحر خزر، بحر اسود اور بحر آرال (حدود العالم، ص ۵۱ تا ۵۳)۔ المسعودی ایک جگہ تو الجیہانی کے تتبع میں پانچ سمندر گنواتا ہے: بحر ہند، بحر متوسط، بحر خزر، بحر اسود اور بحر محیط (التنبیہ، ص ۵۰ تا ۲۴۱) اور ایک جگہ کہتا ہے کہ بہت سے لوگ چار ہی

رہون Rhône ہے (اسی نقشے میں جینوا Genoa کو بھی ایک جزیرہ دکھایا گیا ہے)۔ اس سمندر کے دوسرے جزیروں کا ذکر القزویٰ (عجائب، ص ۱۲۳ تا ۱۲۵) نے کیا ہے۔ ان کا بہترین بیان الادریسی کے [جغرافیے] اور [اس کے] نقشوں میں ملتا ہے (دیکھیے ماخذ)۔

بحر روم کی وہ خصوصیات جو [عربوں کے لیے] جاذب توجہ ہوئیں یہ تھیں کہ اس میں اور سمندروں کے مقابلے میں مد و جزر بہت کم آتا تھا اور اس کے ساحل پیچھے کی طرف ڈھلواں نہ تھے۔ المسعودی نے ان دونوں باتوں کو درج کیا ہے (التبئیہ، ص ۱۳۲، ۷۰)۔ مؤخر الذکر کیفیت کا مشاہدہ اس نے شہر افسوس [قَب یاقوت] Ephesus میں کیا تھا (جس کی تصدیق نہیں ہوئی)۔ المسعودی نے کوہ ائنا Etna (جبل البرکان، اطمۃ صقلیۃ، مروج، ۲: ۲۶؛ التبئیہ، ص ۵۹) کی آتش فشانی کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ہارون الرشید بحر روم کو بحر قلزم (Red Sea) سے ملانا چاہتا تھا مگر یحییٰ بن خالد البرمکی نے اسے اس اقدام سے یہ گزارش کر کے باز رکھا کہ اگر آپ نے ایسا کیا تو رومی اس میں سے گزر کر آجائیں گے اور حج بیت اللہ میں رکاوٹ ڈالیں گے (مروج، ۳: ۹۸ تا ۹۹)۔

پہلے پہل یونانیوں کا اس سمندر (بحر روم) پر غلبہ قائم رہا اگرچہ خشکی میں وہ شکست کھا چکے تھے، لیکن جلد ہی یہ غلبہ بھی ان کے ہاتھ سے نکل گیا، کیونکہ مسلمانوں کو بحری لڑائیوں میں فتح پر فتح نصیب ہوتی چلی گئی، جن میں ذات الصواری (= "مستولوں کی" لڑائی) سب سے زیادہ مشہور ہے (جو ساحل لکیا Lycia پر ۵۳۳ء/۶۵۰ء میں لڑی گئی)۔ معلوم ہوتا ہے کہ شام اور مصر میں واقع ہوزنطی بحری آڈوں اور ان کے

بحر روم کے مختلف جزائر کا علم قدیم زمانے ہی میں ہو گیا تھا۔ جن دو جزیروں پر سب سے پہلے امیر معاویہؓ کے عہد میں قبضہ ہوا وہ قبرص (Cyprus) اور ساحل شام کے بالمقابل ایک چھوٹا سا جزیرہ آرواد (Aradus) تھے۔ حضرت امیر معاویہؓ کی وفات (۵۶۰ / ۶۸۰ء) سے قبل رودس Rhodes افریقش (Crete) بلکہ صقلیہ (Cicily) بھی حملوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ بحر متوسط کے چند اور جزائر کا ذکر ابن خردادبہ (ص ۱۱۲) نے کیا ہے۔ البلخی کی روایت پر چلنے والے جغرافیہ نویس بحر روم میں معدومے چند جزیروں کا ذکر کرتے ہیں۔ المقدسی (ص ۱۵) نے ۵۳۷۵ / ۶۸۵ء میں صرف تین بڑے جزیروں، یعنی صقلیہ، افریقش اور قبرص کا نام لیا ہے۔ ان تینوں کا ذکر اس سے قبل الاصطخری (ص ۷۰) کے ہاں بھی آچکا ہے، لیکن اس نے ان میں ایک چوتھے جزیرے، جبل القلال (قَب یاقوت، ۱: ۳۹۲) کا بھی اضافہ کیا ہے، جسے Reinaud (مرامد الاطلاع، طبع Juynboll، ۵: ۲۷) نے فراکسی نیٹم Fraxinatum ٹھہرایا ہے، جو آج کل Garde-Freinet کہلاتا ہے اور سرزمین فرانس میں مارسیلز Marseilles کے مشرق کی طرف واقع ہے۔ یہیں سے تقریباً ۸۹۳ اور ۶۹۷ء کے درمیان عربوں نے سوئٹزرلینڈ Switzerland تک لشکر کشی کی تھی (قَب Hist. Esp. Mus. : Lévi Provençal، باب ۵)۔ اس شناخت کی ابن حوقل (طبع Kramers، ص ۲۰۴) سے تصدیق ہوتی ہے، جو اس مقام کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ فرانس کے نواح میں اور مجاہدین کے قبضے میں ہے ("بنو احنی افرنجہ بایدی المجاہدین")۔ ابن حوقل کے نقشے میں اسے ایک جزیرہ دکھایا گیا ہے (طبع دوم میں ہر جگہ اسے جبل القلال لکھا ہے، قَب نیز مرامد، ۱: ۹۹)، جو ایک بڑے دریا کے مقابل واقع ہے؛ دریا صریحاً



بحر روم کے مغرب میں ۵۹۲/۵۱۱ء میں ہسپانیہ پر حملے کے خاصے عرصے بعد مسلمانوں نے بعض انتہائی شاندار کارنامے دکھائے۔ جبل القلال (Fraxinetum) پر مدت دراز تک مسلمانوں کے قبضے کا تذکرہ اوپر آچکا ہے۔ ۵۲۲۶-۸۳۰/۵۸۳۱ء میں شمالی افریقہ کے اعلیٰ فرمانرواؤں کے ایک آزاد شدہ غلام نے جنوبی اطالیہ میں باری (Bari) پر قبضہ کر لیا۔ اگالبہ اس زمانے میں بہت سرگرم عمل تھے۔ باری برسوں تک عملاً خود مختار علاقہ رہا (البلاذری: فتوح، ص ۲۳۴ تا ۲۳۵، جس کا ابن الاثیر نے تتبع کیا ہے، دیکھیے بذیل واقعات سال مذکور)۔ ۵۲۲۸/۵۸۳۲ء میں جب ایک اعلیٰ سپہ سالار نے مسینی (Messina) کا محاصرہ کر رکھا تھا تو نابل یا نابل (Naples) کے لوگوں نے درخواست کی کہ انہیں زیر حمایت لے لیا جائے اور اپنی فوجیں مسلمانوں کے ساتھ شامل کر دیں (ابن الاثیر، بذیل واقعات سال مذکور)۔ تھوڑے ہی عرصے بعد روما اور وینس حملے کی زد میں آ گئے اور روما کو تو یہ خطرہ متعدد بار پیش آیا۔ ۵۲۵۵/۵۸۶۹ء میں مالٹا مسخر ہو گیا (ابن خلدون، ص ۲۰۱)۔ ایک عرصے کے بعد ۵۲۲۳/۹۳۴-۹۳۵ء میں صقلیہ کے ایک جنگی دستے نے جینوا (Genoa) پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا؛ اس وقت صقلیہ پر فاطمی قابض تھے (الذہبی: دول الاسلام، بذیل سال مذکور)۔ اس کے بعد اطالیہ پر مسلمانوں کے حملے کا خطرہ دھیمہ پڑ گیا۔

بحر روم پر شارلمان (Charlemagne) کے زمانے سے عیسائیوں کے بحری اقدامات کی شہادتیں ملنے لگتی ہیں۔ جون جون صدیاں گزرتی گئیں ان اقدامات کی اہمیت میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا، باوجودیکہ بوزنٹی سلطنت پر زوال آ گیا اور مسلمانوں نے نئے سرے

تربیت یافتہ عملے کو اب انہیں کے خلاف استعمال کیا گیا تاکہ مشرقی بحر روم کو عربوں کے زیر اقتدار لایا جا سکے۔ ان کا یہ اقتدار بڑی حد تک بنو امیہ کے پورے عہد میں اور بنو عباس کے ابتدائی دور میں قائم رہا اور اس زمانے میں قسطنطینیہ پر بار بار حملے کیے گئے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ ہارون الرشید (قب سطور بالا) کے ایام خلافت میں یونانی بحری طاقت میں دوبارہ کچھ جان پڑ گئی تھی اور یونانی جنگی جہازوں نے، جو مسلمان قیدیوں کو ان کا زیر فدیہ وصول کرنے کے لیے ۵۱۸۹/۸۰۵ء میں اللامس (Lamus) (Cilicia) لائے تھے، خاصا رعب ڈالا (المسعودی: التنبیہ، ص ۱۸۹)۔ ۵۳۱۱/۵۹۲۳ء یا ۵۳۱۲/۵۹۲۴ء میں ایک مسلم جنگی بیڑا، جس میں بصرے اور شام کے دستے شامل تھے، ایک امیر البحر (متولی الغزوفی البحر) کی سرکردگی میں طرسوس روانہ ہوا اور بحر الروم کے شمالی حصے میں بڑی کامیابی سے جنگی کارروائیاں سرانجام دینے کے بعد وینس کے مقبوضہ علاقوں تک جا پہنچا، جہاں اس نے بلغاروں کے ایک فوجی دستے سے رابطہ پیدا کیا، جس کے کچھ افراد ان کے ساتھ طرسوس لوٹ آئے (المسعودی: مروج، ص ۲: ۱۶ تا ۱۷؛ ابن الاثیر، بذیل ۵۳۱۱)۔ کچھ اور آگے چل کر مقتدر کے عہد خلافت (۵۲۹۵/۵۹۰۸ء تا ۵۳۲۰/۵۹۳۲ء) میں یونانی جہاز وسیع پیمانے پر باقاعدہ ساحل شام پر چھاپے مارتے رہتے تھے، چنانچہ اسی کی خلافت میں مشرقی بحر روم کا اقتدار ہاتھ سے نکل گیا (ابن حوقل، طبع ڈخویہ، ص ۱۳۱ تا ۱۳۲؛ طبع Kramers، ص ۱۹۷)۔ بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ ۵۳۴۵/۵۹۵۶ء تک (المسعودی: التنبیہ، ص ۱۴۱) ان حصوں میں مسلمانوں کا کوئی بیڑا باقی نہیں رہا تھا۔

اصل کے بارے میں تیقن سے کچھ نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ قبل ازیں یونانی، بوزنطی یا اسلامی دور میں ایسا کوئی لفظ نہیں ملتا جسے اس کی اصل قرار دے سکیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نام قرہ دنز (بحر اسود) کے مقابلے میں اختراع کر لیا گیا ہو، جو استانبول کے دوسری سمت واقع ہے۔ بحر الروم کی مکمل تفصیل (نقشوں کے ذریعے) اس اٹلس میں ملے گی جو ۱۸۹۳/۵۳۳ء میں پیری [محمی الدین] رئیس [رک باں] نے سلطان سلیمان کی نذر کی تھی نیز اولیا چلبی کے سفر نامے (سیاحت نامہ، ۱: ۳۰۰) میں بعد و ۸: بمواضع کثیرہ، حاجی خلیفہ کی تاریخ سیاحت های بحری (تحفة الکبار، ص ۳) بعد، انگریزی ترجمہ از مچل J. Mitchell، ص ۳) بعد اور اسی کی ایک اور تصنیف جہاں نما (ص ۷۶) میں ملے گی۔

(ادارہ، [۱]، لائڈن، طبع دوم)

\* بحر الزنج: عرب بحر الزنج سے بحر الہند

[رک باں] کا مغربی حصہ مراد لیتے ہیں، جو خلیج عدن (خلیج بربری) سے لے کر سفالہ اور مدغاسکر تک، جو اُس وقت عرب کے جغرافیائی علم کا سنتھا تھا، افریقہ کے مشرقی ساحل سے ٹکراتا ہے۔ یہ نام بلاد الزنج یا زنجبار (= زنج کا ملک) کے اس ساحل کے نام پر رکھا گیا ہے جو اس سے ملحق ہے۔ عربوں کے ہاں سیاہ فام بنتو حبشیوں کو زنج کہا جاتا تھا، جو بربروں یا اہل سینیا سے بالکل مختلف ہیں۔ زنج کا لفظ بہت پرانا ہے، یہاں تک کہ بطلمیوس (Ptolemy) بھی Zγγις (Zήγγισα) اور αρα اور τὸ καλούμενον ἐκεῖ Zγγιον کی Cosmas Indicopleustes کے نام سے واقف تھا، مگر Herzfeld نے نرسی ساسانی کے ایک کتبے میں جو ژند افریک شاہ Zhandafrik shah پڑھا ہے (Paikuli، ۱، برلن ۱۹۲۳ء: ۱۱۹) اسے آج کل صحیح تسلیم نہیں کیا جاتا (قب W. B. Henning، در Studies presented to Vladimir Minorsky، ۱۹۵۲ء،

سے پیش لکھی کی اور وہ یوں کہ دسویں صدی ہجری/ سولہویں صدی عیسوی میں ترکان آل عثمان نے سواحل بحر روم پر، جسے وہ بحر ایض (آق دینز) کہتے تھے، جنوبی یونان (Peloponnese) سے الجزائر تک قبضہ کر لیا۔

مآخذ: (۱) الاصطغری، ص ۶۸ تا ۷۱؛ (۲) ابن حوقل، طبع ڈخویہ، ص ۱۲۸ تا ۱۳۷ و طبع Kramers، ص ۱۹۰ تا ۲۰۵ اور متعلقہ نقشے، بالمقابل ص ۸ و ۶۶، نیز ص ۱۹۳؛ (۳) المقدسی، ص ۱۳ تا ۱۹؛ (۴) یاقوت، ۱: ۵۰۴ تا ۵۰۵؛ (۵) القزوینی: عجائب المخلوقات، ص ۱۲۳ تا ۱۲۷؛ (۶) التویری: نہایة الأرب: ۱: ۲۳۱ تا ۲۳۶؛ (۷) الادریسی، مترجمہ Jaubert، ۱: ۵ تا ۶ و ۲: ۱ تا ۱۳، ۱۶ تا ۱۹، ۳۵ تا ۳۸، ۶۸ تا ۱۳۵، ۲۲۶ تا ۳۰۴، وغیرہ (سب سے زیادہ تفصیلی بیان لیکن ابتدائی زمانے کے لیے کم کار آمد)؛ الادریسی کے نقشوں کے لیے دیکھیے: (۸) K. Miller: Mappae Arabicae، شٹٹ گارٹ ۱۹۲۶ء بعد؛ (۹) ۱۹۲۶ء اور اس کے بعد صقلیہ کے واقعات پر ایک گمنام مصنف کے وقائع، در Biblioteca: Amari Arabo-Sicula، متن ص ۱۶۵ تا ۱۷۶ و ترجمہ ص ۷۰ تا ۷۴؛ (۱۰) P. K. Hitti: History of the Arabs، بار ششم، پرنسٹن ۱۹۵۶ء، بمدد اشاریہ۔

(D. M. DUNLOP)

سلطنت عثمانیہ کے دور میں بحر متوسط [یا بحر روم] آق دینز، یعنی بحر ایض، کے نام سے مشہور تھا اور اسی بنا پر یہ فارسی میں بحر سفید یا دریائے سفید کہلاتا ہے اور غالباً اسی لیے یونان کی عوامی بولی میں η ασπρη θάλασσα کے نام سے موسوم ہے۔ عثمانی اصطلاح میں اس کے اندر بحیرہ ایجین (Aegean Sea) شامل تھا، بلکہ بعض اوقات تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام محض اسی کے لیے مستعمل تھا، چنانچہ اس میں جو جزیرے واقع تھے وہ جزائر بحر سفید کہلاتے تھے۔ اس نام کی



حدود العالم، ص ۴۷۱ بعد اور T.A. Shumovsky :  
*Tri neizvestnie Lotsii Akhmada ibn Mādzhida, Arab-  
 skogo Lotsmana Vasko da Gamii*، ماسکو ۱۹۵۷ء -  
 بحر ہند کے اس حصے میں جہازوں کی آمد و رفت کا  
 انحصار مقررہ اوقات پر چلنے والی موسمی ہواؤں پر  
 ہے اور جنوبی عرب، شمال مغربی ہندوستان اور  
 افریقہ کے مشرقی ساحل کے درمیان دیرینہ تعلقات  
 کا سبب بھی یہی ہے۔ مزید معلومات کے لیے رک بہ  
 بحر ہند؛ بحر الزنج۔

(C.H. BECKER [و D.M. DUNLOP])

- بحر ظلمات : رک بہ بحر محیط .
- بحر العلوم : (علوم کا سمندر)، ایک اعزازی  
 لقب (صبح وطن، ص ۳۳)، جو ملا عبدالعلی محمد  
 بن نظام الدین محمد بن قطب الدین الانصاری  
 لکھنوی کو دیا گیا۔ وہ انیسویں صدی کے ہندوستان  
 میں بڑے پائے کے عالم گزرے ہیں۔ ان کا نسب  
 مشہور و معروف خواجہ عبداللہ انصاری ہروی  
 [رک بہ انصاری ہروی] سے ملتا ہے، جن کے  
 اخلاف میں سے شیخ علاء الدین (عبدالعلی کے  
 دسویں جد) ہرات سے ہندوستان چلے آئے تھے اور اب  
 ان کا مزار متھرا اور دہلی کے درمیان ایک موضع  
 برناوہ میں ہے۔ ان کے بعد ان کے اخلاف سہالی میں،  
 جو لکھنؤ کے نزدیک ایک قصبہ ہے، آئے [اور ایک  
 صدی تک وہیں مقیم رہے]۔ عہد اورنگ زیب میں  
 اس خاندان نے "فرنگی محل"، لکھنؤ میں سکونت  
 اختیار کی (دیکھیے رحمن علی : تذکرہ، بار  
 دوم، ص ۱۶۸، قَبّ الندوہ)۔ عبدالعلی کے دادا ملا  
 قطب الدین (م ۱۱۰۳ھ / ۱۶۹۱-۱۶۹۲ء) اور ان  
 کے والد ملا نظام الدین (م ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء) اپنے  
 علم و فضل کی وجہ سے بہت مشہور تھے (آزاد  
 [بلگرامی]، جو لکھنؤ میں ملا نظام الدین سے  
 ۱۱۴۸ھ / ۱۷۳۶ء میں ملے ان کے بہت مداح ہیں،

اس لفظ کی تشریح میں  
 کہا گیا ہے کہ یہ فارسی لفظ زنگ "زنگی"  
 (زردشتی پہلوی: زنگیک=جشی) سے نکلا ہے،  
 لیکن غالباً اس کی اصل مقامی ہی ہے۔ آج  
 کل یہ نام جزیرہ زنجبار Zanzibar اور دریائے  
 زمبسی Zambesi کے ایک معاون کے لیے،  
 جس کا نام زنگو Zangue ہے، استعمال کیا جاتا  
 ہے۔ عربوں نے بحر الزنج اور اس کے ساحل  
 کا خاصا ذکر کیا ہے اور یہ بیانات کسی حد تک  
 باہم متناقض ہیں۔ عرب اس سمندر سے ڈرتے اور  
 دور رہتے تھے۔ عرب سیاحوں میں سے صرف  
 المسعودی اور ابن بطوطہ نے اسے پار کیا، لیکن یہ  
 دونوں سمندر کے متعلق کچھ لکھنے کے بجائے  
 اس کے ساحل اور باشندوں کا ذکر زیادہ کرتے ہیں۔  
 کبھی کبھی وہیل مچھلی اور اس کے شکار کا ذکر  
 بھی آ جاتا ہے، لیکن یہ بات قابل توجہ ہے کہ  
 وہیل کے لیے جو لفظ (وال، اوال) انہوں نے  
 استعمال کیا ہے وہ شکل میں اس نام سے ملتا ہے  
 جو شمالی یورپ کی زبانوں میں اس مچھلی کے لیے  
 استعمال ہوتا ہے (سلیمان تاجر، عربی متن، طبع  
 Langles، ص ۴، ۱۳۸ تا ۱۴۱، در Relation: Reinaud  
 'des voyages faits par les Arabes et les Persans etc.  
 پیرس ۱۸۴۵ء، مترجمہ Voyage du : G. Ferrand  
 marchand arabe Sulaymân، پیرس ۱۹۲۲ء، ص  
 ۳، ۱۳۲ تا ۱۳۳؛ قَبّ المسعودی : مروج، ۱ :  
 ۲۳۴، ۳۳۴) W. Tomaschek نے اپنی کتاب  
 Die topographischen Capitel des indischen Seespiegels  
 (وی انا ۱۸۹۹ء) میں عربوں کے جغرافیائی  
 تصورات پر مبنی ایک نقشہ تیار کر کے درج کیا ہے۔  
 بحر زنج اور سر زمین زنج کے بارے میں اور اس کے  
 ساحل کے متعلق عرب جغرافیہ نویسوں کے ملاحظیات  
 L. Marcel Devic نے Le Pays des Zendjs، پیرس  
 ۱۸۸۳ء میں جمع کر دیے ہیں۔ علاوہ ازیں دیکھیے

اس زمانے میں بھی ان کے اور ان کے مدرسے کے دیگر معلمین و متعلمین کے ماہانہ وظائف اور عطیے بدستور جاری رہے۔ عبدالعلی مدراس سے پھر لکھنؤ نہیں لوٹے اور مدراس ہی میں بتاریخ ۱۲ رجب ۱۲۲۵ھ/ ۱۳ اگست ۱۸۱۰ء ان کا انتقال ہو گیا [حدیقة المرام میں لفظوں میں "الثالث عشر من رجب" لکھا ہے؛ کتابخانہ سعیدیہ، حیدر آباد میں تواریخ اکابر اسلام ایک قلمی کتاب ہے، جس میں "از جہان عین علم و عقل برفت" (= ۱۲۲۵) سے ان کی تاریخ وفات نکالی ہے] اور وہیں شہر کی مسجد والا جاہی کے پہلو میں مدفون ہوئے۔ (ان کی اولاد کے حالات کے لیے دیکھیے الطاف الرحمن: احوال، ص ۶۴، بعد اور ان کے ممتاز تلامذہ کے لیے حدایق الحنفیہ و حدیقة المرام)۔ ان کا لقب بحرالعلوم والا جاہی کا عطا کیا ہوا تھا (عام طور پر یہی بیان کیا جاتا ہے، تاہم قبّ الطاف الرحمن: احوال، ص ۶۵، جہاں یہ لکھا ہے کہ یہ خطاب ان کو شاہ ولی اللہ دہلوی [رک بان] نے بخشا تھا۔ علاوہ ازیں نواب نے انہیں ملک العلماء کا خطاب بھی دیا تھا۔ پہلا لقب شمالی ہند میں زیادہ مشہور ہے اور دوسرا جنوبی ہند میں [قبّ محمد غوث خان: تذکرہ صبح وطن، مدراس ۱۲۵۹ھ، ص ۳۴، ۳۶ و ۳۸؛ واقعات اظفری، مدراس ۱۹۳۷ء، ص ۱۷۶؛ اظفری اور ملک العلماء رمضان ۱۲۱۹ھ/ دسمبر ۱۸۰۴ء میں ایک ہی مجلس میں جمع تھے]۔

علوم دینی کی تعلیم دینے کے علاوہ ان کے والد نے انہیں علوم باطنیہ سے بھی آشنا کر دیا تھا (الطاف الرحمن)۔ وہ ابن العربی کے صوفی مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور شیخ کے ارشادات پر، جو ان کی نصوص اور الفتوحات میں درج ہیں، انہیں پورا پورا یقین تھا۔ ان کی شرح مثنوی مولوی روم

دیکھیے سبحة المرجان، بمبئی ۱۳۰۳ھ، ص ۹۴)۔ ملا نظام الدین ہی اس خاندان کی ہندوستان میں شہرت کی بنا ڈالنے والے ہیں۔ یہ خاندان صدیوں تک نسلاً بعد نسل علم و فضل میں شہرہ آفاق رہا۔ ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۳۱-۱۷۳۲ء میں عبدالعلی فرنگی محل میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد سے تحصیل علم میں مصروف ہوئے اور انہیں کی زیر نگرانی سترہ برس کی عمر میں علوم اسلامی کا متداول نصاب مکمل کر لیا۔ والد کی وفات کے بعد انہوں نے ملا کمال الدین سہالوی فتحپوری (م ۱۱۷۵ھ/ ۱۷۶۱ء) کی شاگردی اختیار کی، جو ان کے والد کے تلامذہ میں سے تھے (دیکھیے براکمان: تکملہ، ۲: ۶۲۴)۔ اس کے بعد انہوں نے لکھنؤ میں ایک مدرس اور مصنف کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا، لیکن ایک سنی شیعہ تنازعے سے بیزار ہو کر لکھنؤ چھوڑ دیا اور پہلے شاہ جہان پور گئے جہاں انہوں نے بیس سال تک قیام کیا اور پھر رام پور چلے گئے (قبّ نجم الغنی: اخبار الصنادید، لکھنؤ ۱۹۱۸ء، ۱: ۶۰۰، ۵۹۶)، جہاں وہ چار سال ٹھہرے۔ یہاں سے وہ بہار (بردوان، بنکال میں) پہنچے اور آخر کار نواب کرنائک (نواب والا جاہ محمد علی خان، م ۱۲۱۰ھ/ ۱۷۹۵ء، جو اصلاً لکھنؤ کے قریب ایک قصبے گوہامو کے تھے) کے بلانے پر مدراس چلے گئے۔ مدراس جاتے وقت ان کے ہمراہ چھ سو فاضل (رجال العلم) تھے، والا جاہ نے ان کی بہت آؤ بھگت کی اور ان پر اور ان کے رفقا پر انعام و اکرام کی بارش کر دی؛ ان کے لیے ایک عالی شان مدرسہ تعمیر کیا اور ان کے اصحاب و تلامذہ کے لیے، جو وہاں دور و نزدیک سے آ کر جمع ہوئے تھے، نقد وظائف مقرر کر دیے۔ نواب کے جانشین بھی ان سے بدستور اسی لطف و کرم سے پیش آتے رہے، تاآنکہ والا جاہیوں کا دور ختم ہوا اور مدراس پر انگریزی حکومت مسلط ہو گئی، تاہم



- میں ہے، دیکھیے شماره ۲۲۰۵]؛ (۲) التعليقات (یا منہیة) علی شرح سلم العلوم (زید احمد، ص ۳۶۵)؛
- (۳) الحاشیة علی الحاشیة الزاہدیة الجلالیة، لکھنؤ ۱۸۷۲ء (JSAB، ۷ : ۶۹۵)؛ (۴) الحاشیة علی الحاشیة الزاہدیة القطبیة، دہلی ۱۲۹۲ھ / ۱۸۷۵ء (براکمان : تکملہ، ۲ : ۲۹۳)؛ (۵) الحاشیة علی الصدرا (صدر الشیرازی الابہری : ہدایة الحکمة کی شرح از صدرا الشیرازی پر حاشیہ)، لکھنؤ ۱۸۴۶ء (براکمان : تکملہ، ۱ : ۸۳۰ : JSAB، محل مذکور؛ (۶) التعليقات علی الأفق المبین، (براکمان : تکملہ، ۲ : ۵۸۰)؛ (۷) العجالة النافعة (براکمان : تکملہ، ۲ : ۶۲۵، ص ۳، جہاں ۳۹۹ کے بجائے ۳۹۹ پڑھنا چاہیے)۔
- (ب) علم العقائد و الکلام : (۱) الحاشیة الزاہدیة علی الامور العامة (زید احمد، ص ۳۳۸)؛ (۲) الحاشیة علی شرح العقائد الدوانی (حوالہ سابق)؛ (۳) شرح مقامات المبادی (حوالہ سابق)؛ (۴) الحاشیة علی شرح المواقف (حوالہ سابق، براکمان : تکملہ، ۲ : ۲۹۰)، لکھنؤ ۱۸۷۶ء۔
- (ج) اصول الفقہ : (۱) فواتح الرحموت (شرح مسلم الثبوت، از محب اللہ بہاری (م ۱۱۱۹ھ / ۱۷۰۷ء، براکمان : تکملہ، ۲ : ۶۲۴)؛ (۲) رسالة الارکان الاربعة (فقہ) (براکمان : تکملہ، ۲ : ۶۲۵) [مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۲۸ھ]؛ (۳) تنویر المنار شرح المنار (فارسی میں) (براکمان : تکملہ، ۲ : ۲۶۴)؛ (۴) تکملة شرح التحرير (اپنے والد کی شرح التحرير فی اصول الدین لا بن ہمام کا تکملہ (زید احمد، ص ۲۸۳ : JASB، ۷ : ۶۹۵)۔ شرح فقہ اکبر (رحمن علی، ص ۱۲۳)۔
- (د) حدیث : رسالة تقسیم الحدیث (زید احمد، ص ۲۶۲)۔
- (ه) ریاضی : شرح المجسطی (زید احمد، ص ۳۸۲)۔
- (و) اخلاق : رسالة التوحید الکافیة لصفوی المتقی

(لکھنؤ ۱۸۷۳ء، ۳ جلدیں) کی اصل غایت ہی یہ تھی کہ شیخ کی مذکورہ بالا دونوں تصانیف کی روشنی میں مثنوی کے اسرار معنوی کی وضاحت کی جائے (دیکھیے ملا صاحب کا اس شرح کا عربی مقدمہ)۔ انہوں نے فصوص کی ایک فصل (الفص النوحی، براکمان، ۱ : ۷۹۳) کی شرح بھی لکھی ہے [یہ کتاب حیدرآباد دکن میں چھپ چکی ہے]۔ انہوں نے بستر مرگ پر بھی جو بیان دیا وہ یہ تھا کہ مجھے شیخ کے عقائد ("اغصان") کی صداقت کا ادراک ہو رہا ہے۔

لوگ ان کی جرأت، سخاوت، ترک لذات اور زاہدانہ منش کے بہت مداح ہیں [وہ عالم ربانی اور عارف حقانی اور اہل وجد و حال میں سے تھے (حدیقہ المرام)]۔ اپنی عمر دراز کا بڑا حصہ انہوں نے تدریس و تعلیم اور تصنیف و تالیف میں صرف کیا۔ ہندوستان میں ان کا اپنے ہم عصروں پر بہت گہرا اثر تھا اور ان سب پر وہ تبحر علمی اور نقد و فراست کے لحاظ سے فوقیت رکھتے تھے۔ "ہندوستان کے اندر آئندہ زمانے میں ان کا ثانی پیدا ہونا مجال ہے" (نزہة الخواطر)۔ آپ کے مطالعے کا خاص موضوع ایک طرف توفیقہ و اصول فقہ تھے اور دوسری طرف علوم فلسفہ [مگر صاحب التاج المکمل (ص ۳۲۶)، کو اس سے اختلاف ہے]۔ آپ نے بہت سی کتابیں عربی اور غیر معمولی طور پر اعلیٰ پائے کی کلاسیکی عربی اور فارسی میں لکھیں۔ زمانے کے دستور کے مطابق یہ سب تصنیفات دراصل مروجہ کتب نصاب کے متنوں پر شروح، حواشی یا حواشی پر حواشی ہیں۔ آپ کی دیگر اہم تصنیفات یہ ہیں :-

(الف) فلسفہ : (۱) شرح سلم العلوم (منطق پر محب اللہ بہاری، م ۱۱۱۰ھ / ۱۷۰۷ء، کی مشہور تصنیف سلم کی شرح)، دہلی ۱۸۹۱ء [اس کا خطی نسخہ کتاب خانہ دانش گاہ پنجاب کے مجموعہ شیرانی

بحر غزال اور بحرالعرب کے پانی سے بنی ہیں، جو خانہ بدوشوں کے علاقہ بقارہ [رک باں] کی جنوبی حد ہے۔ بحر غزال کی کھاڑی مشرع الریبک (اس نام کے مختلف ہجے اور مصادر بتائے جاتے ہیں) سے ایک سو چوالیس میل تک پھیلی ہوئی ہے، جہاں یہ جھیل نو (Lake No) پر بحرالجبیل سے جا ملتا ہے، جس میں یہ عرض بلد ۹ درجہ ۲۹ دقیقہ شمالی پر جا گرتا ہے۔

(۲) وہ خطہ جو ان ندیوں کی گزرگاہوں سے بنا ہے، جو بالآخر بحر غزال میں جا گرتی ہیں۔ یہ ایک بے قاعدہ سی مثلث ہے، جس کے شمال میں بحر عرب ہے، جنوب مغرب میں نیل اور کانگو کا درمیانی علاقہ اور جنوب مشرق میں دریائے نعام یا رھل Rohl ہے۔ ان ندیوں کے زیریں حصوں میں مستقل طور پر دلدل (عربی: سد) رہتی ہے (جیسے کہ بحر غزال اور بحرالجبیل میں)، جس نے، جیسا کہ اس عربی لفظ (سد) کے لغوی مفہوم سے ظاہر ہے، ایک عرضہ دراز سے دریائے نیل کی راہ سے اس خطے پر آمد و رفت کا دروازہ بند کر رکھا ہے۔ اس خطہ کا مغربی حصہ سنگ آہن کی سطح مرتفع پر مشتمل ہے۔ اس سطح مرتفع اور سد کے درمیان ایک میدان ہے، جس میں سیلاب کا پانی جمع ہوتا ہے۔ شمال اور مشرق میں یہاں کے قدیم سیاہ فام مشرک باشندے آباد ہیں، جو زیادہ تر نیم خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے ہیں، مویشی چراتے ہیں اور ڈنکے کھلاتے ہیں۔ اس سطح مرتفع کے شمالی حصے [دار فرتیت] میں فروقی اور کریش قبیلے آباد ہیں اور انتہائی جنوب کے علاقے میں، جسے بلجین کانگو کی سرحد تقسیم کرتی تھی، آرنڈہ (نیم نیم Niam-Niam، عربی: نمانیم) رہتے ہیں۔

(۳) جمہوریہ سوڈان کا ایک صوبہ، جو مذکورہ بالا خطے سے ملا ہوا ہے، اس کا رقبہ

(فارسی میں) (رحمن علی، ص ۱۲۳)؛ قاموس المشاہیر، بدیل مادۃ عبدالعلی (۳۸۲)۔

(ز) قواعد عربی: ہدایۃ الصرف۔

مآخذ: (۱) ولی اللہ فرنکی محلی: الأخصان الأزمنة

لشجرة الطيبة در احوال علماء فرنکی محل کمالاً ونسباً وعلماً، مخطوطہ [کتاب خانہ] ندوہ، (در لکھنؤ ورق ۵۰ تا ۵۳)، کتاب کا نسخہ مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۹۸/۱۸۸۱ء

راقم مقالہ کو دستیاب نہیں ہوا؛ (۲) صدیق حسن خاں: ابجد العلوم، بھوپال ۱۲۹۵/۱۸۷۸ء، ص ۹۲۷؛ (۳) فقیر محمد جہلمی: حدائق التحف، لکھنؤ ۱۸۹۱ء، ص ۳۶۷؛ (۴) الطاف الرحمن: احوال علماء فرنکی محل، [لکھنؤ] ۱۹۰۷ء، ص ۶۳ پیعد؛ (۵) عبدالباری: آثار الأول، ص ۲۳ (راقم مقالہ کو نہیں ملی)؛ (۶) عبد الاول جونپوری: مفید المفتی، لکھنؤ ۱۳۲۶/۱۹۰۸ء، ص ۱۳۵ پیعد؛ (۷) محمد سہلی واصف مدرسی: حدیقة المرام (تصنیف ۱۲۷۹ھ)، مدراس ۱۲۷۹ء، ص ۲۵؛ (۸) رحمن علی: تذکرۃ علماء ہند، بار دوم، لکھنؤ ۱۳۳۷/۱۹۳۴ء، ص ۱۲۲؛ (۹) عبدالحی لکھنوی (حکیم): نزہۃ الخواطر؛ (۱۰) الندوة (جریڈہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ، اپریل تا جون ۱۹۰۷ء)؛ (۱۱) محمد ہدایت حسین: The Life and Works of Bahr-ul-Ulum، در JASB، سلسلہ جدید، ۱۹۱۱ء؛ (۱۲) ۶۹۳ تا ۶۹۵؛ (۱۳) براکلمان: تکلمہ، ۲: ۶۲۳ (و ہمد اشاریہ)؛ (۱۴) زید احمد: The Contribution of India to Arabic Literature، الہ آباد ۱۹۴۶ء [ولہور، ۱۹۶۸ء، ہمد اشاریہ]۔

(محمد شفیع)

بحر غزال: (۱) بحر الجبل (بالائی نیل ایضاً) کا ایک معاون، جو ایک نہایت وسیع دلدلی رقبے کے پانی کے نکاس کے لیے کھاڑی کا کام دیتا ہے۔ یہ دلدلیں نیل اور کانگو کے درمیانی علاقے سے نکلنے والے کئی دریاؤں (مثلاً تونج Tondj



آغاز کیا اور مغرب میں اس علاقے کی سمت بڑھتا ہوا جس کی طرف اب تک توجہ نہیں کی گئی تھی وہ آخر کار نیم نیم Niam-Niam تک جا پہنچا، جہاں اس نے اپنی ایک نجی فوج تیار کر لی۔ وہاں سے نکالے جانے پر اس نے ۱۸۶۵ء میں دارفرتیت میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ ۱۸۶۶ء میں اس نے شمال میں رزینقات بقارہ کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور اس طرح شکا کی راہ سے دارفور تک تجارت کا راستہ کھل گیا۔ ان دنوں خدیو اسمعیل بردہ فروشی کے استیصال اور بحرالجبیل اور بحر غزال دونوں کو حکومت مصر کے ماتحت لانے کی تدبیر کر رہا تھا۔ ۱۸۶۹ء میں حکومت خرطوم نے دارفور کے ایک قسمت آزما محمد البلالی (یا الہلالی) کے ماتحت ایک فوجی مہم روانہ کرنے کی اجازت دے دی، لیکن اسے الزبیر کے ہاتھوں شکست نصیب ہوئی۔ اس سے الزبیر کا اقتدار بڑھ گیا۔ آگے چل کر سرسیموئل بیکر Sir Samuel Baker کی بحرالجبیل کی مہم (۱۸۶۹ تا ۱۸۷۳ء) کے باعث اس شمال مغربی گزرگاہ کی اہمیت میں جو اس کے زیر تسلط تھی اور بھی اضافہ ہو گیا۔ بہر حال جن دنوں الزبیر نیم نیم Niam-Niam سے مصروف جنگ تھا (۱۸۷۲ء) رزینقات نے شکا کے راستے پر آنے جانے والے تاجروں پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد رزینقات کے ساتھ الزبیر کی لڑائیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی ان کے فرماں روا، یعنی دارفور کے سلطان ابراہیم سے ٹھن گئی۔ اب الزبیر نے مصری ارباب حکومت کے ساتھ مل کر دارفور پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا، چنانچہ اسے بحر غزال اور شکا کا حاکم مقرر کر دیا گیا اور ۱۸۷۴ء میں دارفور فتح ہو گیا۔

اس سے اگلے سال الزبیر قاہرہ چلا گیا، جہاں اسے خدیو نے نظر بند کر لیا۔ اس کا بیٹا سلیمان

۸۲۵۳ مربع میل اور آبادی ۹۹۱۰۲۲ ہے۔ اس صوبے کے چار ضلع ہیں اور اس کا صدر مقام واؤ Wau ہے۔

علاقے کی تاریخ: Burckhardt (۱۸۱۴ء) بیان کرتا ہے کہ دارفرتیت وہ علاقہ ہے جو دارفور کو تجارت کے لیے غلام مہیا کرتا ہے۔ بحر غزال میں نیل کی راہ سے نفوذ سلیم قہودان کی بحرالجبیل کی طرف مہمات (۱۸۳۹ تا ۱۸۴۲ء) کے بعد سے شروع ہوا۔ ۱۸۵۰ء کے عشرے میں متعدد تاجر، جن میں یورپی بھی شامل تھے، ہاتھی دانت کی تلاش میں نیل کی راہ سے بحر غزال میں داخل ہونا شروع ہوئے، لیکن چونکہ اس کے حصول میں دشواریاں پیش آئیں اس لیے انہوں نے بردہ فروشی کا پیشہ اختیار کر لیا اور یہ تجارت بڑی نفع بخش ثابت ہوئی۔ دارفرتیت میں ہاتھی دانت کے تاجروں کی آمد گرد دُفان اور دارفور کے بردہ فروشوں (جلاہ) کے لیے مدد و معاون ثابت ہوئی۔ ۱۸۶۰ء کے بعد سے جب یورپ کے لوگوں نے اپنے مرکز اپنے عرب نائبین کے ہاتھ فروخت کر دیے تو بردہ فروشی میں بہت ترقی ہوئی۔ یہ لوگ سعیدیوں، قبطیوں اور دریائے نیل (البحر) کی راہ سے آنے والے دوسرے لوگوں پر مشتمل تھے اور بچارہ کے نام سے موسوم تھے۔ ان کے پاس مسلح محافظ ہوتے تھے، جو بالعموم شمالی علاقے کے قبیلہ دناقلہ سے بھرتی کیے جاتے تھے یا پھر غلاموں ہی کے فوجی دستے (بازنقر) ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ مستحکم گڑھیاں (زرینقات) بنا کر رہتے تھے۔ یہ لوگ اپنے علاقوں میں مطلق فرمانروا کی حیثیت رکھتے تھے اور وہاں کی تجارت پر ان کا اجارہ ہوتا تھا۔

مغربی بحر غزال میں ممتاز ترین شخصیت الزبیر رحمت منصور کی نظر آتی ہے۔ ۱۸۵۸ء میں اس نے ایک خود مختار تاجر کی حیثیت سے اپنی زندگی کا

معاهدے کی رو سے بحر غزال فرانسیسی استعمار میں آ چکا تھا۔ ایک فرانسیسی مہم نے J. B. Marchand کے زیر کمان اس علاقے کو عبور کر لیا اور جولائی ۱۸۹۸ء میں نیل ایض کے کنارے فشودہ Fashoda کے مقام پر پہنچ گئی، جہاں سے وہ دسمبر میں واپس آ گئی، کیونکہ انگریزی۔ مصری حکومت نے سوڈان کو دوبارہ فتح کر لیا تھا۔ ۲۱ مارچ ۱۸۹۹ء کو انگریزی۔ فرانسیسی معاہدے کی رو سے فرانسیسی بحر غزال پر اپنے حقوق سے دست بردار ہو گئے اور دونوں کے علاقوں کے درمیان کانگو۔ نیل فاصل آب سرحد قرار پایا۔ سرحد کا قطعی تعین ۱۹۲۴ء میں ہوا۔

صوبے کا نظم و نسق از سر نو اس وقت شروع ہوا جب دسمبر ۱۹۰۰ء میں سپارکس W.S. Sparkes کی سرکردگی میں ایک مہم مشرع الریک پہنچی۔ اگلے چند سال کے دوران میں مواصلات کا سلسلہ شروع ہو گیا، کیونکہ سد کو صاف کر کے سڑکیں بنا دی گئی تھیں۔ قیام امن اور تفتیشی بلاد کے لیے گشتی دستے روانہ کیے گئے اور سرکاری چوکیاں قائم کی گئیں۔ ۱۹۰۰ء میں رومن کیتھولک مشن کی سرگرمیاں مغربی بحر غزال میں شروع ہوئیں اور اینگلیکن چرچ کے مبلغین نے ۱۹۰۰ء سے مشرقی علاقے میں اپنے کام کا آغاز کیا۔ ان مشنری جماعتوں نے ایک ایسے نظام تعلیم کی بنیاد رکھی جو ۱۹۲۵ء سے برابر حکومت کے زیر اختیار آتا جا رہا ہے۔ اس کے بعد کئی سال تک وقتاً فوقتاً قبیلوں کی شورشیں جاری رہیں، تاہم ان سے قطع نظر بحر غزال کی حالیہ تاریخ ہنگامے سے خالی ہے۔

ماخذ: دیکھئے ۱۹۳۷ء تک کے مواد کے لیے: (۱)

A Bibliography of the Anglo - Egyptian: R. L. Hill

Sudan، مطبوعہ لندن؛ وہاں کے ممتاز اتراد کے

بحر غزال میں رہا، جہاں مصری حکومت برائے نام تھی۔ ۱۸۷۷ء میں گورڈن C. G. Gordon، گورنر جنرل، نے سلیمان کو بحر غزال کا گورنر مقرر کر دیا۔ اپنے ایک حریف سے اس کی لڑائی ہو گئی، جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ سلیمان نے بغاوت کر دی۔ ۱۸۷۹ء میں وہ گورڈن کے اطالوی نائب [جسی باشا] R. Gessi کے ہاتھوں شکست کھا کر مارا گیا، جسے اس کی جگہ وہاں کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس نے ۱۸۸۰ء تک، جب کہ اسے واپس بلا لیا گیا، صوبے میں امن و امان قائم کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ اس کا جانشین ایک انگریز [لبتون بک] F. M. Lupton ہوا، جسے مہدی کی بغاوت کے مخالف اثرات سے دوچار ہونا پڑا۔ جب مہدی نے الایض کی تسخیر کے بعد شیکان میں فتح پائی (۱۸۸۳ء) تو لپٹن کے پاس کمک پہنچنے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس کے بہت سے افسر شمالی سوڈان کے باشندے تھے، جن کی ہمدردیاں مہدی کے ساتھ تھیں۔ اپریل ۱۸۸۴ء میں لپٹن نے صوبائی صدر مقام ڈیم الزبیر ایک مہدوی فوجی دستے کے حوالے کر دیا، جو کرم اللہ گرقوساوی کے زیر کمان تھا؛ لیکن یہاں مہدوی حکومت مؤثر طور پر قائم نہ ہو سکی اور ۱۸۸۶ء میں کرم اللہ اپنی فوج کو دارفور کی طرف واپس لے گیا۔

اب بحر غزال یورپی شہنشاہی استعمار کی آماجگاہ بن گیا۔ ۱۸۹۴ء میں کانگو فری سٹیٹ کی دو فوجی مہمیں دار فرتیت میں داخل ہو گئیں اور قبیلہ فروقی کے سردار نے حکومت کانگو کی حمایت میں آنا قبول کر لیا۔ اس پر دارفور کے مہدوی گورنر محمود احمد نے الختیم موسیٰ کو بھیجا کہ وہ تمام یورپی باشندوں کو وہاں سے نکال دے، تاہم وہ اس کی آمد سے قبل ہی وہاں سے جا چکے تھے، کیونکہ اگست ۱۸۹۴ء میں فرانس اور کانگو کے مابین ایک



جو آج کل بحرین کہلاتے ہیں۔ اسی طرح یہ جغرافیہ نویس ہندرابی کو ابرون، کشم کو لافت، جزیرہ بنی کاوان یا برگوان اور شیخ شعیب کو لاوان، لان یا لار کے نام سے موسوم کرتے تھے۔

المسعودی کا بیان ہے کہ عبدالمسیح ناسی ایک شخص نے، جس کی عمر ساڑھے تین سو برس تھی، حضرت خالد بن ولید کو بتایا تھا (کہ اس نے اپنی زندگی میں) نجف کو سمندر میں ڈوبا ہوا اور جہازوں کو الحیرہ کے جنوب میں دریائے فرات تک آتے جاتے دیکھا ہے۔ المسعودی خواہ اس داستان کو سچ نہ سمجھتا ہو لیکن اس کی جغرافیائی حقیقت کو ضرور تسلیم کرتا ہے۔ بہت سے علمائے [جغرافیہ] یہ بات تسلیم کر چکے ہیں کہ جو مٹی دریاؤں کے ساتھ بہہ بہہ کر آتی رہی اس سے بحر فارس بتدریج بھرتا رہا ہے۔ عبادان کی تاریخ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے۔ المقدسی اور [صاحب] حدود العالم کے بیان سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ساحل پر واقع ہے۔ اس کے برخلاف ناصر خسرو کے نزدیک وہ جوار کے زمانے میں سمندر سے تقریباً دو کوس ہوتا ہے۔ ابن بطوطہ نے اس کا فاصلہ سمندر سے تین میل بتایا ہے۔ اب یہ سمندر سے تیس میل سے کچھ زیادہ فاصلے پر واقع ہے۔ بایں ہمہ یہ دعویٰ کیا گیا ہے (G.M. Lees و N. Falcon : 'The Geological History of the Mesopotamian Plains' در GJ، ۱۹۵۲ء) کہ اگرچہ سطح زمین مقامی طور پر بلند ہو گئی ہے اور دریاؤں نے بھی اپنے رخ بدل دیے ہیں (رک بہ دجلہ؛ فرات؛ کارون) تاہم عرب کے سلسلہ ہائے کوہ اور ایرانی پہاڑوں کے درمیانی رقبے کی زمین طبقات الارض کی تبدیلیوں کے باعث بیٹھ گئی ہے۔ دریا کی مٹی کے جمع ہو جانے سے جو رد عمل ہونا چاہیے تھا اس کے بجائے زمین کی سطح اور نیچی ہو گئی ہے۔

بارے میں مختصر شذرات کے لیے: (۲) *A Biographical Dictionary of the Anglo-Egyptian Sudan*، اؤکسفرڈ، ۱۹۵۱ء؛ (۳) *Sudan Notes and Records*، خرطوم، ۱۹۱۸ء، میں متعدد مقالات، بالخصوص قبائل کے بارے میں موجود ہیں۔ ۱۹۳۸ء سے اس مجلے میں سالانہ کتابیات شائع ہو رہی ہیں؛ الزبیر کے حالات زندگی کے لیے دیکھیے: (۴) *تَعْمُومُ شَقِیر: تاریخ السودان*، قاہرہ ۱۹۰۳ء، ۳: ۶۰ تا ۸۸، ترجمہ و حواشی از M. Thilo، بعنوان *Ez - Zibēr Rahmet Paschas Autobiographie, ein Beitrag zur Geschichte des Sudan*، بون و لائپزگ ۱۹۲۱ء؛ بلجی نفوذ پر دیکھیے: (۵) *"La Grande Chronique de Bomu"*: L. Lotar، *Momaires, Section des Sciences Morales et Politiques, Institut Royal Colonial Belge*، مطبوعہ برسلز و (۶) *A. Abel Traduction de documents : Bull. de. I' arabes concernant le Bahr-el-Ghazal*، در *Acad. royale des Sci. coloniales*، ۲۵ (۱۹۵۴ء) : ۱۳۸۵ تا ۱۴۰۹؛ (۷) *M. F. Shukry The Khedive Ismail and Slavery in the Sudan*، قاہرہ ۱۹۳۸ء عام مطالعے کے لیے ایک مفید کتاب ہے۔ (P.M. HOLT.)

\* بحر فارس: خلیج فارس، جس میں المسعودی نے خلیج عمان کو بھی شامل کیا ہے۔ الاصطخری اور ابن حوقل اس نام کا اطلاق پورے بحر ہند پر کرتے ہیں۔ حدود العالم میں خلیج عراق (= خلیج فارس) کو خلیج پارس (= خلیج عمان) اور بحیرہ عرب سے متمیز کیا گیا ہے۔ المسعودی تنگ ترین مقام پر اس کا عرض ڈیڑھ سو میل بتاتا ہے [حالانکہ] آبنائے ہرمز کا پاٹ در حقیقت تقریباً انتیس میل ہے۔ مسلمان جغرافیہ نویسوں کے یہاں موجودہ الأحماء کو بحرین کہا گیا ہے اور اوال کا نام ان جزیروں میں سے ایک کے لیے استعمال ہوا ہے

کینٹن Canton کے تباہ و برباد ہو جانے سے تجارت کا سلسلہ درہم برہم ہو گیا۔ اور بظاہر چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں ایران سے چین کی جانب بحری سفروں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اس بات کی کوئی موثق شہادت موجود نہیں ہے کہ نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے اوائل میں منگ Ming بحری سفروں سے پہلے بھی چینی جہاز بحیرہ فارس میں آتے جاتے تھے۔ ابتدائی اسلامی عہد میں سب سے بڑی تجارتی بندرگاہ سیراف تھی، جو طاہری کے نواح میں واقع تھی۔ آل بویہ کے متاخر فرمانرواؤں کے عہد میں اس پر زوال آ گیا اور اس کی حکومت عرب قبیلہ بنو قیصر کے ہاتھوں میں چلی گئی، جو بنی قیس (در اصل کیش، کیس) کی ایک شاخ تھے۔ آگے چل کر فارس کے سفیری اتابکوں نے اسے اپنے زیر نگیں کر لیا۔ ۵۶۲۶ / ۱۲۲۹ء میں والی ہرمز نے، جو کرمان کا باجگزار تھا، قیس کو مستخر کر لیا۔ بنو قیصر کا خاتمہ ہو گیا اور اگلی صدی میں ہرمز کا اقتدار مسلم ہو گیا۔ ۵۶۹۹ / ۱۳۰۰ء میں چغتائی دستوں کے ایک حملے کے بعد دارالسلطنت کو اصل سرزمین سے جزیرہ جرون Djirun میں منتقل کر دیا گیا۔ یوں جب عراق کی تجارتی اہمیت کم ہوئی تو بحر فارس کا تجارتی مرکز جنوب کی طرف منتقل ہو گیا۔

قرون وسطیٰ کا یورپ ہرمز کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھا، چنانچہ دوسرے بہت سے سیاحوں کے علاوہ اودورک، متوطن پوردی نون Odoric of Pordenone اور مارکو پولو Marco Polo نے بھی یہاں کا سفر کیا۔ اور یہ بات ان کی تحریروں سے ثابت ہے۔ ۸۹۳ - ۸۹۴ / ۱۳۸۸ - ۱۳۸۹ء میں شاہ پرتگال کا نمائندہ Covilha یہاں آیا تھا۔ ایشیا کی جانب تجارتی راستوں کے متعلق معلومات

دجلہ اور فرات اپنی مٹی بیشتر القرنہ کے اوپر دلدلوں میں پھینکتے ہیں اور بحر فارس پر زیادہ تر اس مٹی کا اثر پڑتا ہے۔ جو دویاے کارون اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس بات کی کوئی ارضیاتی شہادت نہیں کہ طبقات الارض میں جدید ترین تبدیلیوں کے بعد سے بحر فارس کے دھانے کا جو محل وقوع چلا آ رہا ہے وہ قبل ازیں نسبتاً شمال مغرب میں تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تاریخی ادوار میں یہ زیادہ جنوب مشرق میں واقع رہا ہو (دیکھیے مراسلات، در (GJ، ۱۹۵۴ء)۔

بحر فارس کو اپنے محل وقوع کے باعث بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، گو اس کی نوعیت ہمیشہ بدلتی رہی ہے۔ اس کی تاریخ کے متعلق ہمارا علم بالکل ادھورا ہے۔ متعدد مقامی وقائع ہنوز مخطوطات کی صورت میں ملتے ہیں اور بحیرہ قلم اور وسط ایشیا میں متبادل تجارتی راستوں کے باہمی مقابلے کی داستان کا تحقیقی مطالعہ ابھی باقی ہے۔ یہاں صرف بہت نمایاں واقعات درج کیے گئے ہیں۔ مزید تفصیلات کے لیے ان مقالات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے جو مختلف بندرگاہوں کے متعلق لکھے گئے ہیں۔ عربوں کی فتوحات سے پہلے بھی تجارت خوب رونق پر تھی اور ایران کے تجارتی تعلقات چین سے قائم تھے۔ چینی دستاویزات میں جس "پوسو" Po ssu کا ذکر ہے اسے اہل فارس یا ایرانی سمجھنے میں تامل کیا گیا ہے، اس لیے کہ اس لفظ سے اہل ملایا کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے، لیکن ایک حوالے (Chou T'ang Shu، ۸: ۱۹) سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس میں ۱۰۰۳-۱۰۰۴ / ۱۰۰۳-۱۰۰۴ء کی ایک Po ssu سفارت کا ذکر کیا گیا ہے جو ہدیہ شیر بر لائی تھی اور ملایا میں شیر بر نہیں ہوتے۔ ہوانگ چاؤ Huang Ch'ao کی بغاوت اور ۲۶۴-۲۶۵ / ۵۲۶۵-۵۲۶۸ء میں اس کے ہاتھوں



تو بحر فارس عملی طور پر ان کے وجود سے خالی ہو گیا۔ اسی زمانے میں ولندیزیوں کو اس علاقے میں تجارتی تفوق حاصل تھا، لیکن صفویوں کے آخری عہد میں یہ تفوق آہستہ آہستہ انگریزوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ حسین کے عہد کی طوائف الملوک کی دوران میں اہل عمان نے بحرین اور کیشم پر قبضہ کر لیا، جہاں سے نادر شاہ نے انہیں نکالا، لیکن جب اس نے خود عمان میں مداخلت کی تو مکمل تباہی کا سامنا کرنا پڑا (۱۱۵۷/۱۷۴۴ء)۔ ۱۱۷۹/۱۷۶۶ء میں بندر ریگ کے بحری قزاقوں کے سردار نے بحر فارس میں ولندیزیوں کا آخری قلعہ خارک فتح کر لیا۔ اس صدی کے اواخر میں آل خلیفہ اور آل صباح نامی عرب خاندانوں نے علی الترتیب بحرین اور کویت میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ مؤخر الذکر نے بصرہ پر ایران کا قبضہ ہو جانے سے (۱۱۹۰/۱۷۷۶ء تا ۱۱۹۳/۱۷۷۹ء) خوب تجارتی منفعت حاصل کی۔ فرانسیسی اب انگریزوں کے واحد حریف رہ گئے تھے، لیکن جب ۱۲۲۵/۱۸۱۰ء میں ماریشیس Mauritius ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو ان کے اثر و رسوخ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

بحر فارس کی سیاسیات میں انگریزوں کی مداخلت کا مقصد اپنی توسیع سلطنت اور زیادہ سے زیادہ نوآبادیاں قائم کر کے سیم و زر سمیٹنے کے علاوہ ایک حد تک یہ بھی تھا کہ بردہ فروشی اور قزاقی کا استیصال کیا جائے۔ . . . . سمندر میں تاخت و تاراج کرنے والوں میں کویت کے بنی رحمة بن جابر اور قواسم (جواسم) کے بنی سلطان بن صقر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر قبیلہ اس علاقے پر قابض تھا، جسے ساحل قزاقین (Pirate Coast) کہتے تھے۔ ان کا بیڑہ تریسٹھ بڑے جہازوں پر مشتمل تھا اور یہ بوشہر کے لیے مستقل خطرے

فراہم کر رہا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کی رپورٹ لیزب Lisbon پہنچی یا نہیں (رک بہ بحر القلزم)۔ پرتگالی بحر قلزم کی بہ نسبت بحر فارس میں زیادہ کامیاب رہے، اول تو اس لیے کہ یہ ہندوستان میں ان کے صدر مقام سے زیادہ قریب تھا اور دوسرے اس لیے کہ ایران اور حکومت عثمانیہ میں سے کسی کا اقتدار اس کے ساحلوں پر مؤثر اور مضبوط نہیں تھا، حتیٰ کہ بصرہ بھی اکثر منتفق شیوخ کے ماتحت نیم خود مختار ہو جاتا تھا۔ البوقرق Albuquerque نے ۱۵۱۳/۱۵۰۷ء میں ہرمز کو زیر کر لیا تھا، لیکن اپنے سپہ سالاروں کی بے وفائی کی وجہ سے اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ ۱۵۱۵/۱۵۲۱ء میں اس نے یہاں کے بااثر وزیر رئیس حامد کو قتل کر کے اس پر پوری طرح قابض ہو گیا اور یہاں ایک مستحکم قلعہ تعمیر کیا۔ پرتگالی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بحرین پر قابض ہو کر بصرے کے معاملات میں مداخلت کرتے رہے۔ ۱۵۳۴/۱۵۴۱ء میں بغداد پر آل عثمان کے قبضے کے بعد سے الأحساء اور بالخصوص القطیف پر ترکی اثرات نمایاں طور پر نظر آنے لگے۔ عباس اول نے پرتگالیوں کے قدیم حریفوں کی حوصلہ افزائی کی، چنانچہ اس کے عہد میں وہاں انگریزی اور ولندیزی کارخانے قائم ہو گئے۔ ۱۶۲۲/۱۶۰۳ء میں اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بیڑے کو مجبور کیا کہ وہ ہرمز واپس لینے میں اس کی مدد کرے۔ شاہ نے بندر عباس کی بنیاد رکھی، جو اہل یورپ میں گمبرون Gombroon کے نام سے مشہور ہے اور اس کے بعد ہرمز بہت جلد ختم ہو گیا۔ پرتگالی ابھی تک بصرے آتے جاتے تھے اور کچھ عرصے تک جلفہ (رأس الخیمة) میں ایک قلعے پر بھی ان کا قبضہ رہا، لیکن اسی صدی کے وسط میں جب عمان سے ان کے قدم اکھڑ گئے

کی موجودگی یا اس کی موجودگی کے امکان کے باعث کچھ عرصے سے ان [ساحلوں کی] سرحدوں کو، جو پہلے کبھی معین نہیں تھیں، اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

مآخذ: بحر فارس کے مآخذ کی فہرست بہت طویل ہے اور تفصیل کے ساتھ نہیں دی جا سکتی۔ مسلم جغرافیہ نویسوں میں، جن کے بیانات کا خلاصہ Le-Strange اور Schwarz : Iran نے دیا ہے، (۱) حدود العالم کا اضافہ کر لینا چاہیے۔

قرون وسطیٰ میں بحر فارس کی تاریخ کے مآخذ کے لیے دیکھیے (۲) W. Hinz : Quellenstudien

zur Geschichte der Timuriden، در ZDMG، ص ۳۶۱ تا ۳۶۳، ۳۷۹ تا ۳۸۱، ۱۹۳۶ء

(۳) J. Aubin : Les Princes d'Ormuz au XV<sup>e</sup> siècle، در JA، ۱۹۵۳ء، جس میں مزید حوالے اور

(۴) محمد شبان الکارتھی: مجمع الانساب کے متعدد اقتباسات درج ہیں: بڑے بڑے سیاحوں کے تذکرے کے لیے دیکھیے

(۵) A.T. Wilson : The Persian Gulf، اوکسفورڈ ۱۹۲۸ء، جس میں خطہ مذکور کی جدید تاریخ کا خلاصہ دیا گیا ہے،

لیکن خاصا غلط اور غیر صحیح؛ تجارت اور بحری جہاز رانی پر دیکھیے (۶) G. Ferrand : L'élément persan dans les

textes nautiques arabes، در JA، ۱۹۲۳ء؛ (۷) Instruc-tions nautiques et routiers arabes et portugais

(۸) ہادی حسن : History of Persian Navigation

(۹) G.F. Hourani : Arab Seafaring، (۱۰) بڑے بڑے پرتگالی مآخذ یہ ہیں: Barros، Couto، Castanheda،

Correa، Barbosa، البوقرق کے خطوط، البوقرق خورد کی تشریحات (Comentarios)، Tome Pires اور (بزرگان

ہسپانوی) Teixeira اور Faria y Souza؛ (۱۱) ولندیزیوں پر : H. Terpstra : De Opkomst der Westerk-

wartieren van de Oost-Indische Compagnie؛ (۱۲) Bronnen tot de Geschiedenis der

کا واقعہ بیان کیا تھا، جو اب بندر عباس کی جگہ بحر فارس کی بندرگاہ بن چکی تھی۔ ۱۸۰۹ء/۱۲۲۳ھ میں حکومت ہند نے ایک فوجی جمعیت بھیجی جس نے رأس الخیمہ پر گولہ باری کر کے قواسم کو اندرون ملک کی طرف بھٹا دیا۔ تقریباً ایک سال کے بعد وہ پھر لوٹے اور از سر نو غارت گری شروع کر دی۔ ۱۸۱۹ء/۱۲۳۵ھ میں بمبئی سے ایک زبردست فوج روانہ کی گئی، جس کے ساتھ عمانی فوج کے دستے بھی آ کر مل گئے۔ اس جمعیت نے رأس الخیمہ کو دوبارہ فتح کر لیا اور ساحل کے سارے قلعوں اور جہازی اڈوں کو تباہ کر دیا۔ اس کے بعد ۱۸۲۰ء/۱۲۳۵ھ میں وہاں کے سرداروں اور شیخ بحرین نے ایک معاہدے پر دستخط کیے اور غلاموں کی تجارت اور بحری قزاقی ترک کرنے کا عہد کیا۔ اس کے بعد بعض اور ضمنی معاہدے ہوئے اور بالآخر ۱۸۵۳ء/۱۲۶۹ھ میں انہوں نے حکومت برطانیہ کی زیر سرپرستی سمندر میں ہمیشہ امن و امان قائم رکھنے کی شرط قبول کر لی۔ ابتدا میں رأس الخیمہ کی قواسمی ریاست سب سے زیادہ اہم تھی، جس کے ساتھ الشارقه (شرجہ) کا بڑا گہرا رابطہ تھا بلکہ بعض اوقات پوری طرح متحد ہو جاتا تھا۔ اس مستقل معاہدے کے نصف صدی بعد اس تمام ساحل پر سب سے زیادہ بااقتدار شخصیت ابو ظبی کے بنو یاس کے شیخ زاید [الزید] بن خلیفہ کی تھی۔ تجارتی طور پر دبی سب سے زیادہ بارونق اور خوش حال بندرگاہ بن گئی جو اسی کے ہم قوم آل بوقنسہ کے قبضے میں تھی۔ دوسری ریاستیں عجمان، ام الکویں اور (۱۸۶۸ء/۱۲۸۵ھ کے بعد) قطر تھیں۔ خلیج عمان کے ساحل پر کلبا اور فجیرہ کی جداگانہ حیثیت کو ایک قلیل مدت کے لیے تسلیم کر لیا گیا، لیکن ۱۹۵۱ء میں اول الذکر الشارقه میں شامل کر لی گئی۔ خشکی پر یا سمندر کی تہ میں تیل



بھی کہلاتا تھا اور یہی نام عام طور پر موجودہ زمانے تک رائج رہا۔ اس کے علاوہ اسے الخلیج العربی اور ترکی زبان میں شاب دینیزی (Shāb denizi = Şap denizi = مونگوں کا سمندر) بھی کہتے ہیں۔ خلیج ایلہ Ayla، جو فی الحقیقت خلیج عقبہ ہے اور بحریمز، جس کا اطلاق صرف بحر احمر کے جنوبی حصے ہی پر ہو سکتا ہے، دو ایسے نام ہیں جنہیں کبھی کبھی پورے سمندر کے لیے استعمال کر لیتے تھے۔ ایک زمانے میں سمجھا جاتا تھا کہ یہ سمندر باب المندب کی تنگ نالے پر ختم ہوتا ہے اور کسی زمانے میں، جیسا کہ یاقوت کا خیال ہے، اس میں خلیج عدن کو بھی شامل سمجھا جاتا تھا، جو خلیج بربرا یا الخلیج البربرا کے نام سے موسوم تھی۔ یورپی اثر کے تحت اب اسے کم و بیش ہمیشہ بحر احمر یا اس کے کسی ہم معنی نام (مثلاً قزیل دینیزی Kızıl Deniz وغیرہ) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

بحر قلزم میں مخالف ہواؤں اور لہروں، نیز زیر آب چھپے ہوئے پتھریلے ساحل کی وجہ سے جہاز رانوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔ اس لحاظ سے شمالی حصے کو جنوبی حصے کے مقابلے میں زیادہ خطرناک سمجھا جاتا تھا، اور لوگ راس محمد کے ملحقہ علاقے، یعنی جزیرہ نما سینائی کے جنوبی سرے، سے بالخصوص خائف رہتے تھے کیونکہ یہاں خلیج سویز اور خلیج عقبہ کی ہواؤں کا اتصال ہوتا تھا۔ مقامی کشتی بانوں کے ہاں ہمیشہ سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ وہ کشتی یا جہاز کو ساحل کے برابر برابر لے جاتے ہیں اور لنگر انداز صرف رات کے وقت ہوتے ہیں۔ ان دشواریوں کی بنا پر اور اس خوف سے کہ کہیں وہ وطن واپس لے جانے والی موسمی ہواؤں سے محروم نہ ہو جائیں، ہندوستان کے جہاز شاذ ہی شمال میں سویز تک جانے کی ہمت

*Oostindische Compagnie in Perzië*؛ موتیوں کی تجارت اور جہاز رانی کی موجودہ کیفیت پر (۱۳) A. Villiers : *Sons of Sinbad*؛ عہد حاضر کے عام حالات کے لیے (۱۴) S. B. Miles : *Countries and Tribes of the Persian Gulf*؛ نیز ولسن Wilson : کتاب مذکور؛ اولیں انگریزی تاجروں پر (۱۵) Sir W. Foster : *England's Quest of Eastern Trade* اور اس سے بھی کہیں زیادہ مواد کے لیے (۱۶) *The English Factories in India*؛ انگریزی دور اقتدار پر دو نہایت قیمتی مآخذ ہیں، جنہیں کسی حد تک نظر انداز کیا گیا ہے، یعنی (۱۷) *Selections from the Records of the Bombay Government* جدید، عدد ۲۴ و (۱۸) *The Annual Report in the Administration of the Persian Gulf Political Residency and Muscat Political Agency*۔ یہ مطبوعہ رپورٹیں ۱۸۷۴-۱۸۷۵ء تا ۱۹۰۳-۱۹۰۵ء پر مشتمل ہیں۔ اس کے بعد کی رپورٹیں عوام سے مخفی رکھی گئیں؛ قوانین اور معاہدات کے لیے (۱۹) C.U. Aitchison : *A Collection of Treaties, Engagements and Sanads relating to India and Neighbouring Countries*؛ ۱۲ : ۱۳۷ تا ۱۸۶ : *Persian Gazette*؛ ج ۱، شماره ۱، ضمیمہ ۱، بابت اکتوبر ۱۹۵۳ء؛ [(۲۱) محمد حسن خان : *مرآة البلدان*، ۱ : ۱۷۶ تا ۱۹۱؛ (۲۲) ابو الفداء : *تقویم البلدان*، ص ۲۲، ۳۶۹، ۳۷۳؛ نیز رک بہ العرب، جزیرة (قَب مَادہ ہای راس الخیمة؛ الشارقة؛ دی؛ ابوظہبی)۔ (C.F. BECKINGHAM)

\* **بحر قلزم** : قدیم ایام میں بحیرة احمر کا سب سے زیادہ عام اور معروف عربی نام، جو قلزم [رک باں]، یعنی قدیم کلیسما Clysma، سے مأخوذ ہے اور سویز کے قریب واقع ہے۔ جب خالی شہر کا نام لکھا جائے تو عموماً حرف تعریف کو حذف کر دیا جاتا ہے، لیکن جب سمندر کا ذکر مقصود ہو تو حرف تعریف قائم رکھا جاتا ہے۔ یہ بحر حجاز

جا سکتا تھا۔ یہ داستان شاید اس حقیقت کی ایک خیالی توضیح کے طور پر وضع کی گئی کہ بحر قلزم اور بحر ہند کے مغربی حصے کی کشتیاں چوٹی تختوں سے بنائی جاتی تھیں، جنہیں کیلوں کے ذریعے جوڑنے کے بجائے آپس میں باندھ دیا جاتا تھا۔ کشتی سازی کا یہ طریقہ اب فقط بہت دور افتادہ مقامات میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بحر قلزم کے متعلق ایک عام خیال یہ بھی ہے کہ اس میں ایک جزیرہ ہے جہاں الجساسہ (جاسوس) رہتے ہیں اور وہ ایک ایسی مخلوق ہے جو دجال کے لیے معلومات اور اطلاعات فراہم کرتی ہے۔ فرعون اور اس کا لشکر جس سمندر میں غرق ہوا تھا اس کے متعلق بھی یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ بحر قلزم ہی کا کوئی حصہ تھا۔ یاقوت کے خیال میں یہ واقعہ قلزم کے مقام پر پیش آیا اور دوسروں کے نزدیک، جن میں القلقشندی بھی شامل ہے، یہ واقعہ برکۃ الغرندل میں پیش آیا جو قلزم اور الطور کے درمیانی ساحل پر واقع ہے؛ مؤخر الذکر کو قرون وسطیٰ کے سیچی زائرین سرندلہ Surandala یا ارندہ Arandara کے نام سے جانتے تھے۔

جہاز رانی کی مشکلات، اچھی بندرگاہوں کی قلت اور ساحلی علاقے کے بنجرین کے باوجود بحر قلزم کی تجارتی اہمیت ہمیشہ ستم رہی۔ لازم ہے کہ شمالی حبشہ کے ماسی حملہ آوروں نے اسے جنوب کی طرف سے عبور کیا ہوگا اور پھر چند صدی بعد اہل حبشہ نے اس کی مخالف سمت سے جنوب مغربی عرب پر حملہ کیا ہوگا۔ ابتدائی اسلامی زمانے میں اس علاقے میں بحری قزاقوں کا بڑا زور تھا۔ السعودی کے بیان کے مطابق زید کے بنو زیاد کے عہد میں عربی اور افریقی سواحل کے درمیان مسلسل تجارت ہوتی تھی اور افریقہ میں بعض مسلمان نو آبادیاں تھیں، جو وہاں کے مقامی

کرتے تھے اور اپنا مال عموماً عدن یا جدے کی، پھر گیارہویں / سترہویں صدی میں مغا کی بندرگاہوں پر اتار دیتے تھے۔ جدے کے ساتھ قافلوں کی تجارت ہی کی بدولت نویں / پندرہویں صدی میں مکہ مکرمہ کو تجارتی اہمیت حاصل ہوئی تھی، تاہم بیشتر سامان صرف چھوٹے جہازوں یا کشتیوں کے ذریعے منتقل کر دیا جاتا تھا۔ ابو زید کے بیان کے مطابق جو مقامی کشتیاں اس غرض کے لیے جدے میں استعمال ہوتی تھیں قلمی کشتیاں کہلاتی تھیں۔ اس طرح عرب جہاز رانوں کو بحر قلزم کے متعلق نہایت وسیع تجربہ حاصل تھا اور جہاز رانی کے موضوع پر ان کے رسائل سے ان کے گہرے عملی علم کا ثبوت ملتا ہے۔ Ferrand کا خیال ہے کہ ابن ماجد نے اپنی تصنیف کتاب الفوائد میں مختلف بحری سفروں کی جو مناسب سمتیں بتائی ہیں وہ عرض بلد کی بعض اغلاط سے قطع نظر ایسی ہیں کہ اس علاقے کی جہاز رانی کے متعلق اہل یورپ کی بتائی ہوئی سمتوں کو ان کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان جغرافیہ نویس بحر قلزم کا طول تیس دن کے جہازی سفر کے برابر یا چودہ سو سے پندرہ سو میل کے درمیان قرار دیتے ہیں اور یہ اندازہ خاصی حد تک صحیح ہے، لیکن اس کے عرض کے متعلق ان کا سات سو میل کا تخمینہ اصل عرض سے تین گنے سے بھی زیادہ ہے۔

آبنائے باب المندب کے اندر کا پورا رقبہ کسی زمانے میں ایک زرخیز علاقہ سمجھا جاتا تھا تاآنکہ ایک بادشاہ نے اس میں ایک نہر کاٹ دی تاکہ سمندر کے پانی سے دشمن کا علاقہ تباہ کیا جاسکے۔ بحر قلزم کے متعلق ایک اور داستان یہ مشہور ہے کہ قلزم کے جنوب میں ایک مقناطیسی پہاڑ ہے جس کی وجہ سے مقامی طور پر بنائے جانے والے جہازوں کے کسی حصے میں بھی لوہا نہیں لگایا



ایک اہم سبب بن گئی - ۵۷۸-۵۷۹ء / ۱۱۸۲ - ۱۱۸۳ء میں Renaud de Châtillon نے پہلے سے تیار کردہ جہاز بحر روم کے ساحل سے ایلہ بھیجے۔ وہاں انہیں جوڑ کر اس تجارت کو تباہ و برباد کرنے کی غرض سے استعمال کیا گیا۔ فرانکوں (Franks) نے عیذاب [رک بان] پر حملہ کیا، لیکن سمندر پر حسام الدین لؤلؤ کے ہاتھوں شکست کھائی اور جن لوگوں نے حجاز میں اترنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ بعد ازاں یورپ میں وہاں کی بندرگاہوں میں غیر ملکی جہازوں کے داخلے پر پابندی لگا کر اس تجارت کو تباہ کرنے کی کوششیں کی گئیں؛ لیکن پوپ کے احکام امتناعی کے باوصف اس پر مؤثر طریق سے عمل درآمد نہ ہو سکا۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں آدم Guillaume Adam نے تحریک کی کہ ایک مسیحی بحری بیڑے کو سقوطی [رک بان] پر قبضہ کر کے بحر قلزم میں داخلے کا راستہ بند کر دینا چاہیے۔ ۱۴۸۸ء / ۱۴۸۹ء کے قریب Pero da Covilhã سمندر کے راستے سے الطور سے عدن گیا۔ بعد میں وہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ بھی گیا اور تجارتی راستے سے متعلق شاہ پرتگال کے لیے معلومات فراہم کیں۔ خود اسے حبشہ میں نظر بند کر دیا گیا اور اس بات کا پتا نہیں چل سکا کہ اس کی رپورٹ کبھی لزبن Lisbon پہنچی یا نہیں۔ ۱۴۹۰ء / ۱۴۹۸ء میں ہندوستان پہنچ کر پرتگالیوں نے بحر قلزم اور خلیج فارس کے راستے ہونے والی ملک پار کی ساری تجارت خود اپنے نفع کی خاطر راس [امید] کے راستے کی طرف زبردستی منتقل کر دینے کی کوشش کی۔ اس کوشش کے نتیجے میں انہیں جو جنگ پہلے مصریوں اور پھر عثمانی ترکوں کے خلاف لڑنا پڑی اس سے انہیں بحر ہند میں بحری تفوق حاصل

فرمانرواؤں کو خراج ادا کرتی تھیں۔ ایک نہر کے بن جانے کی وجہ سے ایک زمانے میں بحر قلزم، وادی نیل اور بحیرہ روم کے درمیان آمد و رفت آسان ہو گئی تھی۔ اس نہر کو بعض اوقات فراغنه (یا ٹراجن Trajan) کی نہر کہا گیا ہے۔ عربوں میں یہ خلیج امیر المؤمنین کے نام سے مشہور تھی اور قلزم کے مقام پر سمندر میں جا گرتی تھی۔ اس نہر کا ایک حصہ، یعنی وادی طومیلات، ایک وقت میں دریائے نیل کی ایک قدرتی شاخ تھا اور جھیل تمساح تک جاتا تھا، لیکن زمین کی سطح بلند ہو جانے سے اس میں جہازرانی ممکن نہیں رہی۔ قدیم الايام میں اسے کئی مرتبہ صاف کرایا گیا۔ اس کے بعد اس کی صفائی کا حضرت عمرو بن العاصؓ نے اہتمام کرایا۔ وہ [حضرت] عمرو بن الخطاب کے عہد خلافت میں غلے کے جہاز الجار تک بھیجا کرتے تھے، جو اس وقت مدینہ منورہ کی بندرگاہ تھی۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفۃ المسلمینؓ نے عمرو بن العاصؓ کو جھیل تمساح سے بحر روم تک نہر کھودنے سے منع فرما دیا تھا کہ کہیں اسی طرح بوزنطیوں کو بحر قلزم میں داخل ہونے کا موقع نہ مل جائے۔ عمروؓ [ابن العاص] کی نہر صرف اس وقت جہاز رانی کے قابل ہوتی تھی جب دریائے نیل میں پانی زیادہ ہوتا تھا۔ اس نہر کو المہدی نے ایک بار پھر صاف کرایا، لیکن کچھ عرصے بعد وہ پھر بیکار ہو گئی، اگرچہ جب کبھی غیر معمولی طوفان آتا تو یہ بھی جاری ہو جاتی تھی۔

فاطمیوں کے عہد میں مصر کی قوت کے بڑھ جانے اور اس کے ساتھ ہی عراق پر زوال آ جانے کے باعث بحر قلزم کی تجارت کو بہت فائدہ پہنچا۔ صلیبی جنگوں نے یورپ میں مشرقی مصنوعات کی مانگ بہت بڑھا دی اور یہ ”ملک پار“ کی تجارت (transit trade) منجملہ اور اسباب کے مصر کی خوشحالی کا

اہمیت کا عام احساس نیپولین کے مصر پر حملے کے وقت سے شروع ہوا اور نہر سویز کے افتتاح (۱۸۶۹ء) سے اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گیا۔

مآخذ: (۱) ابن خردادبہ، ص ۱۵۳؛ (۲) المقدسی، ص ۱۱؛ (۳) المسعودی: مروج، ۱: ۲۳۷ و ۲۳۸؛ (۴) حدود العالم، ص ۵۲؛ (۵) الادریسی، ص ۱۶۳؛ (۶) یاقوت، ۱: ۵۰۳ و ۵۰۸؛ (۷) القلقشنندی: ضوء الصباح، ص ۲۲۳؛ (۸) المقریزی: الخطط، قاہرہ ۱۳۲۳ تا ۱۳۲۶ء، ص ۱؛ (۹) ابن الوردی: خريدة العجائب، قاہرہ ۱۳۱۶ء، ص ۹۶ بعد؛ (۱۰) ابوزید: اخبار الصين والهند، طبع و مترجمہ J. Sauvaget، پیرس ۱۹۳۸ء؛ (۱۱) Instructions nautiques et routiers: G. Ferrand arabes et portugais بمواضع کثیرہ؛ (۱۲) Heyd: Histoire du commerce du Levant au Moyen-Age La Mer Rouge, l'Abyssinie et: A. Kammerer (۱۳) O.G.S. Arab Seafaring: G.F. Hourani (۱۴) The Fung Kingdom of Sennar: Crawford گلوستر ۱۹۵۱ء میں سوڈانی ساحل کی تاریخ پر مواد ملتا ہے۔ مشرقی تجارت کے متعلق فاطمیوں کی روش پر دیکھیے: (۱۵) B. Lewis: The Fatimids and the Route to India، در استانبول اقتصاد فیکلتسی مجموعہ سی، ۱۹۵۰ء؛ Renaud de Chatillon پر دیکھیے: (۱۶) Sir D. Newbold: The Crusaders in the Red Sea and the Sudan، در Sudan Notes and Records، ۱۹۳۵ء بار دوم در Antiquity، ۱۸: ۶۱۹۳۶؛ (۱۷) E. Cerulli: Etiopi in Palestina، ۱: ۲۰ تا ۲۶؛ (۱۸) G. Adam: De modo Sarracenos extirpandi، در historiens des Croisades Documents arméniens، ج ۲، ۱۹۰۶ء؛ (۱۹) پرتگالی بیانات اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا احصاء ممکن نہیں۔ اہم حوالے حسب ذیل افراد کی تحریروں میں ملتے ہیں: Castanhada، Couto، Barros، Osorio، Góis، Correia، البوقرق کے خطوط، البوقرق خورد

۱۸۶۹ء میں البوقرق نے، جو ابی سینیا کے بل کر مکہ معظمہ پر حملہ کرنے کے منصوبے بنا رہا تھا، عدن کا محاصرہ کیا، مگر ناکام رہا اور بحر قلزم میں داخل ہو گیا۔ اس کا بیڑہ کامران میں روک لیا گیا اور اسے سخت جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے جانشین کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی اور اگرچہ ۹۳۷ - ۹۳۸/۱۵۳۱ء میں D. Estevão da Gama [اپنا بیڑہ] لے کر سویز کے بالمقابل پہنچ گیا اور سومالی مسلم حملہ آور احمد گران کے خلاف اہل ابی سینیا کی مدد کی غرض سے اپنی کچھ فوج بھی مصوع Massawa میں اتار دی لیکن پرتگالیوں نے آبنائے باب المندب میں ترکی تفوق کو کبھی نہیں لکارا۔ دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے وسط کے بعد پرتگالی جہاز بحر قلزم میں کبھی کبھار ہی آتے تھے اور پرتگالی مسافر، جو عام طور پر مسیحی مشنری ہوتے تھے، بھیس بدل کر ملکی جہازوں میں سفر کرتے تھے۔ گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں انگریزی (۱۸۰۱۸ء/۱۶۰۹ء) اور ولندیزی (۱۸۰۲۵ء/۱۶۱۶ء) جہازوں نے مغا میں تجارت شروع کر دی۔ وہ عموماً زیادہ شمال کی طرف نہیں جاتے تھے۔ اگرچہ مغا [رک بان] کو یمن کی کافی (رک بہ قہوہ) کی برآمد کے لیے عارضی اہمیت حاصل ہو گئی، لیکن ہندوستان اور مشرق اقصیٰ کی تجارت اب بیشتر راس [امپد] ہی کے راستے سے ہوتی تھی۔ اٹھارہویں صدی میں لنڈن اور پیرس کے مابین سریع مواصلات کی ضرورت، نیز ہندوستان میں انگریزی مقبوضات کی روز افزوں توسیع کی بنا پر بحر قلزم کے راستے پر ایک بار پھر تجارت کی گرم بازاری نظر آنے لگی، جس کی بالکل ابتدائی مثال دانیال Danial کا سفر تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی جنگی اور تجارتی



ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ناصر خسرو (پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی) پہلا ایرانی جغرافیہ نویس ہے جسے "بحیرۃ لوط" کے نام کا علم ہوا۔

بحر لوط کے نام کا اشارہ بائبل کتاب پیدائش (باب ۱۹) کی اس کہانی کی طرف ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں بھی متعدد بار آیا ہے، گوسمندر کا نام نہیں لیا گیا۔

اس وقت تک بھی بحیرۃ مردار کے گرد و نواح کے بعض ناموں سے مثلاً جبل سدوم (اسدم) اور مقامی طور پر زبان زد حکایات سے اس سانحے کی یاد تازہ ہوتی ہے جس کا ذکر کتاب پیدائش (باب ۱۹) میں آیا ہے، لیکن ان حکایتوں کی بنیاد علمی روایت کے بجائے عموماً عام مروجہ روایت پر ہے۔

جغرافیہ: "صحرائے یہوذا Judah" کے ڈھلوان اور بنجر نشیبوں اور موآب کی پہاڑی سر زمین کے درمیان بحیرۃ مردار ایک نیلگوں آئینے کی طرح سمندر کی سطح سے ۱۱۵۰ فٹ نیچے شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے۔ اس کا طول تقریباً پچاس میل اور درمیانی عرض تقریباً آٹھ میل ہے اور اس کا کوئی مخرج نہیں ہے۔

اس کا عمیق ترین حصہ سطح سمندر سے ۲۶۰۰ فٹ نیچے ہے۔ ایک خاکناے، جو اس سے مشرقی جانب (زبان کی طرح) باہر نکلتی ہے، اس کے جنوبی حصے کو، جو بالکل پایاب ہے، شمالی حصے سے جدا کرتی ہے۔ اس کے مشرقی اور مغربی ساحلوں پر پہاڑ ہیں، جو تین ہزار فٹ تک کی بلندی تک چلے گئے ہیں، لیکن شمال میں دریائے اردن Jordan کے دہانے پر زمین بالکل نشیب میں ہے اور جنوب میں، جہاں سبخہ کے مشرقی کنارے پر بنتبول (Pentapolis) [سدوم؟] (کتاب پیدائش،

کے حواشی (Comentarios)، نیز ہبشہ پر F. Alvares اور Castanhoso کی تصانیف، D. João de Castro : Roteiro اور Beccari کے مجموعے Rerum 'aethiopuarum scriptores Occidentales inediti' روما ۱۹۰۵ تا ۱۹۱۷ء میں؛ البوقر کی Comentarios اور Alvares اور Castanhoso کے انگریزی میں محشی تراجم Hakluyt سوسائٹی نے شائع کر دیے ہیں۔ ۱۶ویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے نصف اول کی معلومات کے لیے دیکھیے: (۲۱) R. S. Whiteway : The Rise of Portuguese Power in India ؛ ولندیوں پر دیکھیے: (۲۲) P. van. den Broecke : Korte Historiael : ende Journaelsche Aenteykeninghe, etc. ہارلم ۱۶۳۳ء (ترجمہ و مزید حوالجات، در JRAS ۱۹۵۱ء ص ۶۳ تا ۸۱، ۱۷۰ تا ۱۸۱) و (۲۳) H. Terpstra : De Opkomst der Westerkwartieren van de Oost-Indische Compagnie ؛ ابتدائی انگریزی روابط کے لیے دیکھیے: (۲۴) Sir W. Foster : England's Quest of Eastern Trade ؛ جس میں بہت سے مزید حوالے موجود ہیں؛ Daniel کے سفر پر دیکھیے: (۲۵) A Journal or Account of William Daniel ؛ لندن ۱۷۰۲ء و باردوم، مع حواشی، در Sir W. Foster : The Red Sea and adjacent countries at the close of the seventeenth century ؛ Hakluyt سوسائٹی نے شائع کر دیے ہیں، ۱۹۴۹ء۔ (C.F. BECKINGHAM و C.H. BECKER)

\* بحر لوط : بحیرۃ مردار (Dead Sea) کا جدید عربی نام، جسے عرب جغرافیہ نویس عموماً البحیرۃ المیتة (= بحیرۃ مردار)، البحیرۃ الممتنة (= بدبودار سمندر)، البحیرۃ المقلوبة (= اوندھا سمندر، اس لیے کہ یہ الارض المقلوبة، یعنی وہ حصہ زمین جس کا تختہ الٹ دیا گیا ہو، یا ارض قوم لوط میں واقع ہے)، بحیرۃ الصوغر Zoghar، نیز بحیرۃ سدوم اور کمرۃ Gomorra کہتے رہے

ایک اچھا کاروبار رہا ہے۔ یہ ”رال“ انگور کے باغوں میں کیڑے مکوڑے مارنے کے کام آتی تھی اور اسے بہت سی دواؤں میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ بجائے خود سمندر کے پانی میں بھی صحت بخش عناصر بتائے جاتے تھے۔

زغر (موجودہ غور الصافیہ کے قریب) کے نخلستان کی قیمتی پیداوار بحیرہ مردار کے راستے دساور کو جاتی تھی۔ فرانسیسی صلیبی جنگجو بھی اس سمندر میں سفر کرتے تھے۔

مآخذ: (۱) *Das Tote Meer*: Meusburger

Programme, Brixen ۱۹۰۷ تا ۱۹۰۹ء، میں تمام قدیم مواد جمع کر کے اس سے استفادہ کیا گیا ہے؛ عربوں کے بیانات: (۲) الاصطخری، ۱: ۶۴؛ (۳) ابن حوقل، ص ۱۲۳ بعد؛ (۴) المقسسی، ص ۱۷۸، ۱۸۳ بعد؛ (۵) ابن الفقیہ، ص ۱۱۸؛ (۶) ابن خردادبہ، ص ۷۹؛ (۷) الیعقوبی، ص ۳۲۹؛ (۸) المسعودی: التنبیہ، ص ۷۳ بعد؛ (۹) المسعودی: مروج، ۱: ۹۶؛ (۱۰) الادریسی، در ZDPV، ۸: ۳؛ (۱۱) یاقوت، ۱: ۵۱۶ و ۲: ۹۳۳؛ (۱۲) الدمشقی (طبع Mehren)، ص ۱۰۸؛ (۱۳) ابوالفداء: تقویم، ص ۲۲۸؛ (۱۴) ابن بیطار (مترجمہ Sontheimer)، Stuttgart ۱۸۳۲ء، ۲: ۳۰۹ بعد؛ نیز قب فارسی میں: (۱۵) ناصر خسرو (طبع Schefer)، ص ۱۷ بعد اور ترکی میں: (۱۶) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ۹: ۵۱۶، ۵۱۹ و (۱۷) حاجی خلیفہ: جہاں نما، ص ۵۵۵؛ حسب ذیل کتابوں میں مسلم مآخذ کو اکٹھا کر کے ان کا ترجمہ کر دیا گیا ہے: (۱۸) *Palastine under*: G. Le Strange، *the Moslems*، ص ۶۳ تا ۶۷، ۲۸۶ تا ۲۹۲؛ (۱۹) *Textes géographiques arabes sur*: A.S. Marmardji، *la Palestine*، پیرس ۱۹۰۱ء، ص ۱۵ تا ۱۸۔

(R. HARTMANN)

بحر مایوطس: یا بحیرہ مایوطس، قدیم جہیل

میوطس (Mucotis)، موجودہ بحیرہ ازوف (Sea of Azov)؛

اب (۱) کا محل وقوع تلاش کیا جا سکتا ہے، یہ صرف الغور اور العربہ میں کہیں کہیں تھوڑی سی بلند ہو جاتی ہے۔ اس کے پانی کی کیمیائی ترکیب، جس میں نمک کی انتہائی کثرت ہے، جاندار مخلوق کے لیے قطعی ناموزوں اور جہاز رانی کے ناقابل ہے۔ ساحل پر صرف چند ایک مقامات ہی اسے ہیں جو آبا۔ ہیں اور ان کی حیثیت بھی کم و بیش استوائی نخلستانوں کی سی ہے۔

طبقات الارضی کیفیت: بحیرہ مردار سوربائی نظام کے ان نشیبوں کے سب سے گہرے نشیب و بھرتا ہے جو عہد ثالث (Tertiary Period) کے خاتمے پر پیدا ہو گیا تھا۔ عہد طوفان میں خشک سالی اور بارش کے جو زمانے یکے بعد دیگرے آئے ان میں بڑی بڑی طغیانیوں نے وادی اردن کے بیشتر حصوں اور عرب کے ایک حصے کو پر کر کے ایک جھیل بنا دی، جس کا کسی دور میں بھی بحرالقلزم سے اتصال نہیں ہوا۔ چونکہ اس نشیبی زمین کے پانی کا کوئی مخرج نہیں اور اس کا ایک منبع وہ چشمے تھے جن میں معدنیات کی کثرت تھی، اس لیے عمل تبخیر سے اس میں ایک خاص کیمیائی نوعیت کے نمک کا تناسب بہت زیادہ ہو گیا۔ ادوار تاریخ کے خشک سالی کے دنوں میں سمندر سمٹ کر اس رقبے میں محصور ہو کر رہ گیا جہاں یہ آج کل واقع ہے۔ یہ بات اب تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ گزشتہ صدی میں سمندر کی سطح بتدریج اونچی ہوتی رہی ہے۔ طبقاتی تبدیلیاں گرد و نواح کے تمام علاقے کو اس وقت تک برابر متاثر کرتی رہی ہیں۔ جنوبی طاس کی تشکیل اس طرح کی تازہ ترین تبدیلی کی ایک مثال ہے۔

بحیرہ مردار سے ”رال“ (قیر معدنی asphalt) کا نکالنا قدیم زمانے کی طرح (قب نام بحیرہ الاسفلت [یا اسفالت] lacus Asphaltitis) قرون وسطیٰ میں بھی



ورنک "Warang Sea" لکھا ہے (A. Mingana) نے حدود العالم، ص ۱۸۲، کا حوالہ دیا ہے، قب عالی: کتہ الاخبار، ۱: ۱۰۰)۔

البلخی [رک باں] کے دبستان کے جغرافیہ نویسوں کی بہ نسبت المسعودی بحر مایوطس اور بحر بنتس میں زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی یہ رائے ہے کہ درحقیقت یہ دونوں مل کر ایک سمندر بنتے ہیں۔ اس سمندر میں سفر کرنے والے تاجروں کی سند پر وہ ان لوگوں کی تردید بھی کرتا ہے جو کہتے ہیں کہ بحر الخضر، یعنی کیسپین، براہ راست بحر مایوطس سے ملا ہوا ہے (مروج، ۱: ۲۷۳)۔ دریائی راستہ صرف ایک ہے جو آبنائے کرچ، ڈون اور اتل (والگا) سے ہو کر جاتا ہے، یعنی اس میں ڈون-والگا راہ، جو عام طور سے "خضری راہ" بھی کہلاتی ہے (قب مروج، ۲: ۱۸) بعد اختیار کی جاتی ہے۔ بحر مایوطس کے متعلق اس کا اپنا بیان کسی طرح بھی غلطی سے خالی نہیں قرار دیا جاسکتا (قب متذکرۃ الصدر)۔ بظاہر اس کا خیال یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پھیلاؤ اور گہرائی دونوں اعتبار سے یہ بحر نیطس یا بحیرۃ اسود سے زیادہ ہے (مروج، ۱: ۲۷۳)، حالانکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہ الجہن اس بات سے بھی پیدا ہو گئی ہے کہ المسعودی کبھی کبھی عام خیال کے مطابق بحر مایوطس کا ذکر بالکل اس طرح کرتا ہے، جیسے وہ بحر الخضر ہو (مثلاً التنبیہ، ص ۱۳۸)۔

زمانہ مابعد میں بحر مایوطس کو بحر آزاق اور عثمانلی ترکی میں ازق دنیزی بھی کہنے لگے۔ مآخذ: ان حوالوں کے علاوہ جن کا ذکر متن مقالہ میں آچکا ہے، دیکھیے حدود العالم، ص ۱۸۰ تا ۱۸۳ و اشاریہ۔

(D. M. DUNLOP)

البحر المحيط: جسے بحر اوقیانوس المحيط

اس نام کی دوسری اشکال ماوطیس اور ماوطیش ہیں۔ بحر مایوطس کا ذکر ہمیشہ بحر نیطس یعنی بحر بنتس [رک باں] کے ساتھ ساتھ آتا ہے، جس کے ساتھ یہ خلیج نیطس (آبنائے کرچ Kertch) کے ذریعے ملا ہوا ہے۔

المسعودی (التنبیہ، ص ۶۶) کے بیان کے مطابق بحیرۃ مایوطس تین سو میل لمبا اور ایک سو میل چوڑا ہے۔ یہ طول و عرض، جو خاصے مبالغہ آمیز ہیں، قبل ازین ابن رستہ (ص ۸۶) نے دیے تھے۔ المسعودی کا بیان یہ بھی ہے کہ یہ مسکونہ دنیا کے بالکل سرے پر شمال کی جانب تولیۃ (Thule) کے نواح میں واقع ہے۔ اس بات میں کہ تولیۃ بحر ازوف کے شمال میں واقع ہے، ابن الفقیہ (ص ۸) بھی اس کا ہم خیال ہے۔ ابن الفقیہ کی رائے میں چار بڑے سمندروں (قب مقالۃ بحر الروم، چوتھا پیرا) میں سے ایک وہ ہے جو روم اور خوارزم کے درمیان جزیرۃ تولیہ تک واقع ہے اور اس سمندر میں کبھی کوئی جہاز نہیں چلایا گیا (ابن الفقیہ بحر الخضری یا کیسپین کو اس سے الگ سمجھتا ہے)۔ کسی دوسرے مقام پر المسعودی لکھتا ہے کہ دریائے طنائس Tanāis (ڈون Don)، جو شمال میں واقع ایک بڑی جھیل (نام نہیں بتایا گیا) سے نکلتا ہے، تقریباً تین سو فرسخ تک مزروعہ علاقے میں گزر کر بحر مایوطس میں جا گرتا ہے (مروج، ۱: ۲۶۱)۔ شمال میں جو بڑی جھیل واقع ہے اور جسے بظاہر بحر مایوطس کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا ہے، اس کا ذکر اس سے پہلے الکندی، اس کے شاگرد السرخسی اور دوسرے لوگ کر چکے تھے (مروج، ۱: ۲۷۵)۔ آگے چل کر اسے اور بحر الورنک یا زیادہ صحیح طور پر بحیرۃ بالٹک۔ کو ایک ہی سمندر ٹھہرایا گیا، چنانچہ تقریباً ۱۱۵۰ء کے ایک سوریائی نقشے میں بحیرۃ ازوف کو بحیرۃ

اگرچہ نظری طور پر البحر المحيط "محیط الکل سمندر" تھا، لیکن اس سے عام طور پر محض اوقیانوس ہی مراد لیتے ہیں۔ ایک دوسرے نقطہ نظر کے مطابق اوقیانوس کا وہ حصہ جو ہسپانیہ اور شمالی افریقہ سے متصل ہے، بحر المغرب کا حصہ ہے (القزوینی: عجائب المخلوقات، ۱: ۱۲۳)۔ بطور اوقیانوس البحر المحيط کو البحر المظلم یا بحر الظلمة یا بحر الظلمات (= تاریکی کا سمندر) کا مترادف سمجھا جاتا ہے اور اس کا اطلاق شمالی اوقیانوس پر موسم کی خرابی اور خطر حالت کی بنا پر ہوتا ہے (Géog. d'Edrisi: Jaubert، ۲: ۳۵۵ تا ۳۵۶؛ قَب الدمشقی، طبع Mehren، ص ۱۲۴)۔ Thule کو چھوڑ کر (جس سے عموماً شٹ لینڈ Shetlands مراد لی جاتی ہے) البحر المحيط کے جن جزیروں کا علم عربوں کو بطلمیوس کے ترجموں سے ہوا، ان میں سب سے نمایاں اور ممتاز جزائر السعادة (Canaries) اور برطانیہ (مختلف ہجوں کے ساتھ) ہیں۔ ایک متواتر روایت کے مطابق، جو قدیم عہد سے مأخوذ معلوم ہوتی ہے، جزائر برطانیہ کی تعداد بارہ ہے (Al-Battani: Nallino، متن: ص ۲۶؛ قَب المسعودی: التبیہ، ص ۶۸)۔

عرب مصنفین اس بات پر متفق ہیں کہ البحر المحيط جہازوں کے لیے ناقابل عبور ہے (مثلاً الکندی، بحوالہ یاقوت، ۱: ۵۰۰، بظاہر بحر منجمد کا ذکر کرتا ہے؛ قَب المسعودی: مروج، ۱: ۲۷۵؛ البتانی، موضع مذکور؛ یاقوت، ۱: ۵۰۴؛ ابن خلدون: Berberes، پیرس ۱۹۲۵ء، ص ۱۸۷ تا ۱۸۸) اس بیان کے متعلق شاید اصولاً یہی سمجھنا ٹھیک ہے کہ اس کا تعلق افسانوی بحر محیط الکل سے ہے۔ بہر صورت یہ ایک یقینی امر ہے کہ مسلمانوں کے جہاز بحر اوقیانوس میں آتے جاتے تھے۔ ۵۲۲۹/۵۸۴۴

یونانیوں کا بحر الکل سمندر (Ωκεανός) - بعض نے اسے البحر الأخضر (= سبز سمندر) سے بھی موسوم کیا ہے۔ اس سمندر کے متعلق ایک خیال یہ بھی تھا کہ اس نے چاروں طرف سے یا کم از کم تین سمتوں یعنی مغرب، شمال اور شرق سے ریح مسکون کو گھیر رکھا ہے (المسعودی: التبیہ، ص ۲۶)، اس لیے کہ آباد دنیا کی جنوبی حد خط استوا تھا۔ کتب الأخبار [رک با] کے بیان کے مطابق، جس کا راوی قزوینی ہے (عجائب المخلوقات، طبع وسٹنفلٹ، ۱: ۱۰۴) سات سمندر زمین کو گھیرے ہوئے ہیں اور ان میں سے آخری نے باقی سب کو اپنے گھیر میں لے رکھا ہے۔

اس پر عام طور سے اتفاق رائے تھا کہ بڑے بڑے سمندر براہ راست البحر المحيط سے ملے ہوئے ہیں، البتہ اس میں چند مستثنیات بھی ہیں جن میں خاص طور پر قابل ذکر بحر العزیر ہے؛ لیکن [ان مستثنی سمندروں میں] بحر اسود (بحر بنتس یا زیادہ مروج نام بحر نیطس [رک با]) کو شامل نہیں کیا جا سکتا، جو حسب ذیل سمندروں کی طرح البحر المحيط کی شاخ یا خلیج سمجھا جاتا تھا: بحر المغرب، بحر الروم، بحر ورنک (بالشک)، بحر الزنج، بحر فارس، بحر الہند اور بحر الصين (ان میں سے آخری چار بحر ہند اور بحر الکامل کے ایک حصے میں آجاتے ہیں)۔ عام طور سے ان شاخوں یا خلیجوں کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ وہ مشرقی اور مغربی دو نظام ہیں (یاقوت، ۱: ۵۰۴)، جو خاکناے سویز پر ملتے یا کم از کم ایک دوسرے کے قریب پہنچ جاتے ہیں، البتہ شبہہ تھا تو اس بات میں کہ یہ خلیجیں بحر محیط سے نکلتی ہیں (غالب رائے) یا اس کے بالکل برعکس دنیا کے تقریباً تمام دریا اس میں گرتے ہیں۔



نام پر ان کے آبائی شہر میں ایک کوچے کا نام بھی رکھا گیا ہے (Géog. d'Edrisi : Jaubert، ۲ : ۲۶ تا ۲۷، قَب ۱ : ۲۰۰)۔ آئر لینڈ کے نواح میں وہیل مچھلی کے شکار کے متعلق ایک بیان بھی قابل ذکر ہے (قزوینی : عجائب المخلوقات ۲ : ۳۸۸، جس نے گیارھویں صدی کے اندلسی جغرافید نویس العذری کا حوالہ دیا ہے)۔

(D.M. DUNLOP)

- بحر المغرب : رَکْ بہ بحر الروم۔
- بحر الہند : عربوں کے ہاں Indian Ocean کے لیے عام طور پر یہی نام مروج ہے۔ اسے اپنے مغربی سواحل کی رعایت سے بحر الزنج بھی کہتے ہیں اور جزو کوئل پر منطبق کرتے ہوئے البحر الحبشی بھی۔ بحر فارس کی اصطلاح کا اطلاق بھی بعض اوقات پورے بحر [ہند] پر کر لیا جاتا ہے۔ ابن رستہ (ص ۸۷) کے نزدیک تیز مکران سے اس کے مشرقی اور عدن سے مغربی سواحل شروع ہوتے ہیں۔ ابوالفداء (تقویم، ترجمہ، ۲ : ۲۷ = متن، ص ۲۲) بحر الصین کو اس کی مشرقی حد بیان کرتا ہے، الہند کو شمالی اور ایمن کو مغربی، لیکن جنوبی حد سے وہ لاعلم ہے۔

مختلف ساحلی علاقوں اور جزیروں کے ناموں پر اس سمندر کے مختلف حصوں کے خاص خاص نام پڑ گئے ہیں۔ اگر ہم شمالی اطراف یعنی محدود مفہوم میں بحر القنزم اور بحر فارس کو نظر انداز کر دیں، جن کا ذکر علیحدہ مقالات میں آچکا ہے، تو سب سے پہلے بحر الیمن آتا ہے، جو عرب کے مغربی ساحل پر جزائر خریان مریان (Karia Muria) اور سقظری تک پھیلا ہوا ہے۔ افریقی ساحل پر آبنائے باب المندب سے شروع ہونے والے بحر زین بربرا ہے، یعنی شمالی لینڈ سے بندرگاہ مرکہ [سنکہ؟] تک، پھر بحر زین زنج (دیکھیے بحر الزنج)

میں اہل ناروے (Norsemen) کے ہسپانیہ میں وردو کے بعد اسوی لشکر کے دستے بحر اوقیانوس کے ساحل پر خلیج بسکے Biscay تک گشت کرتے رہتے تھے۔ ۵۳۵۵ / ۹۶۶ء میں ڈنمارک کے وائکنگ Vikings لڑیں اور قصر ابی دانس (Alcacer do Sal) پر حملہ آور ہوئے۔ شلب (Silves) کے مقام پر اسوی بیڑے نے ان کا مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی۔ ۵۳۸۷ / ۹۹۷ء میں اسی بیڑے نے اوقیانوس کی مذکورہ بالا بندرگاہ قصر ابی دانس سے المنصور [رَکْ ہاں] کی پیادہ فوج کو بحری راستے سے برتقال (Oporto) پہنچایا (ان واقعات کے لیے دیکھیے Hist. Esp. Mus : Lévi-Provençal، قاہرہ ۱۹۳۳ء، ۱ : ۱۵۷، ۲۱۸، ۲۲۳، ۳۹۳، ۴۴۱)۔

جن واقعات کا ذکر کیا گیا ان میں قیاس ہے نہ محض ساحلی نقل و حرکت مقصود تھی۔ بحر اوقیانوس میں بعض بحری سفروں کا بھی سراغ ملتا ہے۔ ۸۴۴ء کے بعد شاہ ناروے کے دربار تک بحی العزال کے سفر کے علاوہ، جسے محض جٹلینڈ Jutland یا آئر لینڈ Ireland کے مختلف مقامات تک محدود سمجھا گیا ہے (حوالوں کے لیے دیکھیے براکمان : مکملہ، ۱ : ۱۳۸، نیز H. Munis :

Contribution à l'étude des invasions des Normands en Espagne، در Bulletin de la Société Royale d'Etudes Historiques, Egyptic، ج ۲، تراجم، ۱ : ۱۹۵ء)، قرطبہ کے اشخاص کا ذکر بھی پڑھنے میں آتا ہے جو البحر المحيط میں جہازوں میں سوار ہوتے تھے اور بے شمار مال غنیمت لے کر واپس آئے تھے (المسعودی : مروج، ۱ : ۲۵۸، قَب Lévi-Provençal : Hist. Esp. Mus.، ۳ : ۳۴۲ حاشیہ) اور سزین کے مہم جوؤں (المفررون) اسی طرح برعجا جانا ہے کہ بھی، جو کئی کئی دن تک اوقیانوس میں مغرب اور جنوب کی سمت جہاز رانی کرتے تھے اور جن کے

Malacca ہے۔ چین کو جانے والے بحری مسافر شمالی سمت کچھ فاصلے پر سے گزرتے ہوں گے کیونکہ وہ جزائر لنچبالوس یا لنچبالوس (جزائر نکوبار) سے ہوتے ہوئے جاتے تھے، جس کے شمال میں جزائر انڈمان واقع ہیں اور وہاں سے وہ کلاہ بار (Kedah) پہنچ جاتے تھے، جو جزیرہ نماے ملایا پر واقع ہے۔ آبنائے مالوکا کو اسی لیے بحر کلاہ (کلاہ بار) کہتے ہیں اور بحر شلاہیط کو جب بحر کلاہ سے سمیز کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ سمندر ہے جو اس کے ساتھ جنوب میں ملا ہوا ہے۔ اب ہم بلاد مہراج میں پہنچ گئے ہیں جس کے مرکز میں الزابج کی سر زمین ہے۔ ابتداءً اس نام کا اطلاق وسطی اور جنوبی سمائرا پر ہوتا تھا، جہاں سربوزہ Sribuza (Ferrand کا تلفظ) یا پالمبانگ Palembang واقع تھا، اس لیے کہ اس زمانے میں اس کا استعمال وسیع تر مفہوم میں ہوتا تھا اور اس میں جاوا (جاوا) بھی شامل سمجھا جاتا تھا اور اگر سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس میں چھوٹے چھوٹے جزیروں کا ایک سلسلہ اور ساحل مالوکا بھی شامل تھا۔ ان جزیروں سے پرے بحیرہ کردانج یا کڈرنج، خلیج سیام (جو بحر صنف (چمپا) میں ساحل قمار (خمر = کمبوڈیا) تک چلی گئی ہے)، بحر انام اور وہ سمندر واقع ہیں جو جنوب کی سمت اس سے ملحق ہیں جزیرہ سنڈر فولات (؟ ہینان Hai-nan) سے گزر کر ہم بحر صنف Sankhay [صنچی ؟] (بحر چین) میں پہنچ جاتے ہیں، جہاں مغرب کے ساتھ تجارت کی عظیم الشان منڈی خانفو Khānfu (هانگ چو Hang-chu، کیٹشن) واقع ہے۔ الشیلا، الشیلا (کوریا) اور جزائر واق واق (؟ جاہان) کے متعلق عربوں کا علم بہت محدود اور مبہم تھا۔ ہم جوں جوں مشرق اور جنوب کی طرف بڑھتے جاتے ہیں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ بحر الہند سے

جس کو بحر الہند اور امینیکہ کے شہر اور جزیرہ زنجبار اور ہینا یعنی قریب قریب کینیا اور لانگانیل کے علاقے سے لے کر جزیرہ قنیلو تک۔ سفالہ قنیلو سے ملا ہوا ہے سب سے آخر میں الواق واق (مدغاسکر) واقع ہے، جس کا فاصلہ تحقیق طلب ہے۔

اگر کوئی شخص بحر فارس سے تیز مکران کے مقام سے چلے تو وہ السنند [سنندھ] کے ساحل پر پہنچے گا، جس میں دریائے سنندھ (سہران) کا ڈیلٹا اور الدیل کا تجارتی شہر واقع ہے۔ بحر لاروی (= بحیرہ لار یا بحیرہ گجرات، ہندوستان کے مغربی ساحل پر) کے کنارے کھمبایت (Cambay) سوہارہ، صیمور اور سنندا بورہ (گوا) کے شہر واقع ہیں۔ مجمع الجزائر "الدیبجات" (لکا دیو و مالدیو) بحیرہ لاروی کو بحیرہ ہرکنڈ (خلیج بنگالہ، مع ان پانیوں کے جو جنوب میں ہیں) سے جدا کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عربی میں تمر لپتی (Reinaud) یا ہری کل (Marquart) Harikel، قب حدود العالم، ص ۲۴) کو غلطی سے ہرکنڈ لکھ دیا گیا ہے۔ الادریسی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ یہ نام ہندی ہے (Jaubert، ۱: ۶۳)۔

ساحل مالابار پر آخری بندرگاہ کوٹم مالی (Quilon) اور اس کا سب سے آخری بیرونی جزیرہ سراندیب (لنکا، سیلون) ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جزائر شرق الہند کو جانے کے لیے بحیرہ ہرکنڈ سے گزر کر جزیرہ الرامنی جانا پڑتا ہے، جس سے بحیرہ ہرکنڈ اور بحیرہ شلاہیط دونوں کے پانی نکراتے ہیں۔ الرامنی (الرامی، الرامین = اللامری جس کے نام پر وہاں کے سمندر کو بحر لامری کہتے ہیں) سمائرا کا دوسرا نام ہے یا زیادہ صحیح یہ کہ شمال مغربی سمائرا کا (قب Relation de la : J. Sauvaget Chine et de l'Inde، ص ۲۴) اور شلاہیط جنوبی مالوکا



ہو گئی (ابو زید الحسن السیرافی، در G. Ferrand : Voyage du marchand arabe Sulaymân، ص ۷۵ بعد؛ قب المسعودی: مروج، ۱: ۳۰۲ تا ۳۰۸)، لیکن ابن بطوطہ کے سفر نامے سے معلوم ہوتا ہے کہ منگولوں کے عہد میں یہ تجارتی تعلقات کسی قدر بحال ہو گئے تھے۔

مآخذ: (۱) BGA، ۱: ۲۸ تا ۳۶ و ۲ (بار اول): ۳۵ تا ۴۱ و ۲ (بار دوم): ۴۱ تا ۵۹ و ۳: ۱۰ تا ۱۹ و ۵: ۷ تا ۹ و ۱۶ و ۶: ۶۰ تا ۷۲ (ترجمہ، ص ۴ تا ۵۳) و ۷: ۸۳ بعد، ۸۶ بعد و ۸: ۵۱ تا ۵۶؛ (۲) الیعقوبی، ۱: ۲۰۷ بعد؛ (۳) المسعودی: مروج، ۱: ۲۳۰ تا ۲۴۴ ۳۲۵ تا ۳۹۵؛ (۴) بزرگ بن شہر یار: عجائب الہند (طبع Van der Lith، مع فرانسیسی ترجمہ از M. Devic، لائنڈن ۱۸۸۳ تا ۱۸۸۶ء)؛ (۵) القزوی، طبع Wüstenfeld، ۱: ۱۰۶ تا ۱۲۳؛ (۶) Reinaud: Introduction، در ابوالفداء: تقویم، ترجمہ، ص ccclxxvii تا cdxlv؛ (۷) G. Ferrand: Relations de voyages et textes géographiques arabes, persans et turks 'relatifs à l'Extreme-Orient du viii<sup>e</sup> au xviii<sup>e</sup> siècles ج ۱ و ۲، پیرس ۱۹۱۳ تا ۱۹۱۴ (مکمل مطبوعہ)؛ (۸) وہی مصنف: Voyage du marchand arabe Sulaymân en Inde et en Chine, rédigé en 851, 'suivi de remarques par Abû Zayd Hasan (vers 916) Relation: J. Sauvaget (مترجمہ و طبع ۱۹۲۲ء)؛ (۹) وہی مصنف: Le Tuhfat al-Albâb de Abû Hâmid al-Andalusî al-Gharnâti، در JA، ۱۹۲۵ء، ص ۹۱ تا ۱۱۱، ۲۵۷ تا ۲۶۸؛ (۱۰) وہی مصنف: Instructions nautiques et routiers arabes et portugais des XV<sup>e</sup> et XVI<sup>e</sup> siècles، ج ۱ تا ۳، پیرس ۱۹۱۸ تا ۱۹۲۱ء؛ (۱۱) ہادی حسن: Persian Navigation، لائنڈن ۱۹۲۸ء، ص ۹۵ تا ۱۶۴؛ (۱۲) حدود العالم،

متعلق دسویں صدی کے عربوں کے تصورات زیادہ مبہم اور ان کے بیانات کی تاویل زیادہ غیر یقینی ہوتی چلی گئی ہے۔ کئی ایک مقامات پر انہوں نے محض اپنے یونانی پیشروؤں کی تقلید کی ہے۔ مزید برآں انہوں نے خود اپنے بحری سفروں کے احوال سے استفادہ کیا ہے۔ مختلف مآخذ سے حاصل کی ہوئی معلومات کو پوری طرح سمجھنے اور ان کی بنا پر یہاں کی ایک واضح تصویر پیش کرنے سے وہ قاصر رہے ہیں۔ بعض اوقات ان کے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے گویا بحر الہند، بحر ظلمات میں مدغم ہو گیا ہے، جس کے بارے میں روایت ہے کہ راہ گم کردہ ملاح ہمیشہ یہاں بھٹکتے رہتے ہیں۔ بعض مصنفین کی رائے یہ ہے کہ بحر ہند بحیرہ اسود (یا البحر الزفتی) سے ملا ہوا ہے اور اسی طرح بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی ایشیا اور جنوبی افریقہ آپس میں ملے ہوئے ہیں، جس کا ثبوت یہ ہے کہ الواق واق کے نام کا اطلاق جاپان (یا سمائرا، قب حدود العالم، ص ۲۲۸) پر بھی ہوتا ہے اور مدغا سکر پر بھی۔ الادریسی بھی اس خیال کی تائید کرتا ہے اور اس کے نزدیک جزائر زاہج سر زمین زنج کے بالمقابل واقع ہیں۔

ایرانی اور عرب موسمی ہواؤں سے فائدہ اٹھاتے تھے اور اپنے بحری سفر کا آغاز خلیج فارس سے کیا کرتے تھے۔ وہاں کی اہم بندرگاہیں سیراف اور صحار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہم ترین تجارتی مراکز میں ایک تو سر زمین زنج تھی، جہاں تاجر الزاہج تک سے بحری سفر کر کے آتے تھے (چنانچہ مدغاسکر جزائر ملایا ہی کے لوگوں کی نوآبادی بنا) اور دوسرے خود الزاہج، جس کے روابط چین سے قائم تھے۔ ایک بغاوت (۵۲۶م / ۶۸۷ء) کے دوران میں کینٹن کے تباہ و برباد ہو جانے کے بعد چین سے مسلمانوں کی تجارت بالکل ختم

۱ : ۳۰۳ : (۶) ابن القیم : زاد المعاد، ۲ : ۹۱ : (۷)  
 ابن کثیر : البداية و النہایة، ۳ : ۳ : (۸) ابن خلدون : تاریخ  
 (اردو ترجمہ، از شیخ عنایت اللہ، مطبوعہ لاہور، ۱ : ۳۳)؛  
 (۹) ابن ہشام : السیرة، ۳ : ۵۰ : (۱۰) البلاذری :  
 انساب الاشراف، ۱ : ۳۱۱، ۳۷۳، (۱۱) الدیار البکری :  
 تاریخ الخمیس، ۱ : ۳۱۶ : (۱۲) المقریزی : امتاع الاسماع،  
 ص ۱۱۱ : (۱۳) الواقدی : المغازی، ص ۱۹۲ : (۱۴)  
 یاقوت : معجم البلدان (مادہ بحران)۔

(عبد القیوم)

\* بحرق : جمال الدین محمد بن عمر بن مبارک  
 بن عبداللہ بن علی الحیمیری الحضرمی الشافعی، جنوبی  
 عرب کے عالم اور صوفی ۵۸۶۹/۶۱۳۶۵ء میں بمقام  
 سیون پیدا ہوئے اور انہوں نے ۵۹۳۰/۶۱۵۲۳ء میں  
 ہندوستان میں وفات پائی۔ عدن اور زید میں  
 تحصیل علم کرنے کے بعد کچھ دن کے لیے وہ شجر  
 کے قاضی ہوئے، پھر عدن میں آباد ہو گئے اور وہاں  
 کے عامل امیر مرجان کے مقربین میں داخل ہو گئے۔  
 ۵۹۲۷/۶۱۵۲۱ء میں اپنے مرئی کے انتقال  
 کے بعد وہ ہندوستان چلے گئے اور وہاں انہیں گجرات  
 کے سلطان مظفر شاہ کی سرپرستی حاصل ہو گئی،  
 لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد دربار کو خیرباد  
 کہنا پڑا اور احمدآباد میں وفات پائی۔ شاید  
 انہیں زہر دیا گیا۔

اپنی گراں قدر ادبی تصنیفات میں انہوں  
 نے دینی اور دنیوی دونوں طرح کے مسائل پر قلم اٹھایا  
 ہے۔ بظاہر ان کی طبع زاد تصانیف حسب ذیل ہیں:

(۱) مواہب القدوس فی مناقب ابن العیدروس  
 (قب Serjeant : Materials، ص ۵۸۶ : ان کے  
 اس استاد کے متعلق رکن بہ عیدروس و عدد ۲)؛  
 (۲) حلیۃ البنات و البنین فیما یحتاج الیہ من امر  
الدین؛ (۳) عقد الدرر فی الأیمان بالقضاء و القدر؛ (۴)  
العقد الثمین فی ابطال القول بالتجیح و التحسین؛

بالقدوس اشاریہ الفیہ (۲) Arab : G. F. Hourani  
 Seafaring in the Indian Ocean in Ancient and  
 Early Medieval Times، (Princeton Oriental Studies)  
 ہرنسٹن ۱۹۵۱ء، ص ۵۱ تا ۱۰۲ : (۱۳) T. A. Shumovsky  
 Tri neizvestnie lotsii Akhmada ibn Mādzhida,  
 arabskogo lotsmana Vasko da Gamii، ماسکو ۱۹۵۷ء۔  
 (D. M. DUNLOP و R. HATMANN)

⊗ بحران : (بعض کے نزدیک بحران)  
 مدینہ منورہ سے کچھ فاصلے پر موضع الفرع کی جانب  
 بنو سلیم کے علاقے میں حجاز کا ایک مشہور مقام،  
 جہاں سونے کی کان (معدن) تھی جو ایک معزز  
 صحابی حضرت الحجاج بن علاط بن خالد البہزیؓ کی  
 ملکیت تھی۔ اسی مقام پر حضرت عبداللہ بن جحشؓ  
 کے سریہ میں ان کے دو ساتھیوں، حضرت سعد بن  
 ابی وقاصؓ اور حضرت عتبہ بن غزوانؓ، کا ایک اونٹ  
 گم ہو گیا تھا اور وہ اس کے تعاقب میں ساتھیوں سے  
 پیچھے رہ گئے تھے۔ اس مقام کی اہمیت اسلامی  
 تاریخ میں اس لیے ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ  
 وسلم ربیع الاول ۵۳ کے آخر میں قریش کے ارادے  
 سے نکلے، اور مدینہ منورہ میں حضرت ابن ام مکتومؓ  
 کو اپنا نائب مقرر کیا۔ آپ بحران کے مقام تک  
 پہنچے، لیکن جنگ کی نوبت نہ آئی۔ آپ وہاں دو  
 ماہ (ربیع الآخر اور جمادی الاولیٰ) قیام فرمانے کے  
 بعد مدینے واپس تشریف لے آئے۔ البلاذری اور بعض  
 دیگر مؤرخین نے غزوہ بنو سلیم اور غزوہ بحران میں  
 المتباس پیدا کر دیا ہے (انساب الاشراف، ۱ : ۳۱۱)۔  
 بعض نے مدینے سے روانگی کی تاریخ میں بھی  
 اختلاف کیا ہے (المعبر، ص ۱۱۲)۔

مآخذ: (۱) ابن حبیب : المعبر، ص ۱۱۲ : (۲)

ابن حزم : جوامع السیرة، ص ۱۰۵، ۱۵۳، ۱۵۶ : (۳)

وہی مصنف : جمہرة انساب العرب، ص ۲۶۲ : (۴) ابن سعد :

الطبقات، ۱/۲ : ۲۳ : (۵) ابن سعد الناس : عیون الأثر،



(۵) التَّبَصُّرَةُ الْأَحْمَدِيَّةُ فِي السِّيَرَةِ النَّبَوِيَّةِ؛ (۶) تَرْتِيبُ السُّلُوكِ إِلَى مَلِكِ الْمُلُوكِ (قَبِّ بَرَاكَلْمَان، ۱ : ۴۴۴)؛ (۷) الْعُرُوَّةُ الْوَثْقَى، مَعَ شَرْحِ الْحَدِيثِ الْأَيْقَةِ (بَرَاكَلْمَان : تَكْمَلَهُ، ۲ : ۵۵۵)؛ تَلْخِصَاتُ : (۱) الْأَسْرَارُ النَّبَوِيَّةُ، إِخْتِصَارُ الْأَذْكَارِ النَّبَوِيَّةِ، يَعْنِي حَلِيَّةَ الْأَبْرَارِ (بَرَاكَلْمَان، ۱ : ۳۹۷)؛ (۲) ذَخِيرَةُ الْأَخْوَانِ، إِخْتِصَارُ كِتَابِ الْأِسْتِفْنَاءِ بِالْقُرْآنِ، (۹)؛ (۳) مَتَعَةُ الْأَسْمَاعِ، إِخْتِصَارُ الْأِمْتَاعِ فِي أَحْكَامِ السَّمَاعِ لِلْأَدْفَوَى : (بَرَاكَلْمَان : تَكْمَلَهُ، ۲ : ۲۷)؛ علاوہ ازیں انہوں نے العسکری کی کتاب الأوائل (بَرَاكَلْمَان : تَكْمَلَهُ، ۱ : ۱۹۴)، السَّخَاوَى كِي الْمَقَاصِدُ الْحَسَنَةُ (بَرَاكَلْمَان، ۲ : ۳۲) اور الْمُنْذِرَى كِي التَّرْغِيبُ وَالتَّرْهِيْبُ (بَرَاكَلْمَان، ۱ : ۶۲۷) كِي بھي تَلْخِص كِي : شُرُوحُ : (۱) الْعَقِيدَةُ الشَّافِعِيَّةُ، الْيَافَعِي كِي مَشْهُورِ قَصِيدِي كِي شَرْحُ (بَرَاكَلْمَان، ۲ : ۲۲۸)؛ (۲) تَحْفَةُ الْأَحْبَابِ وَطُرْفَةُ الْأَصْحَابِ، الْحَرِيرِي كِي مَلْحَةُ الْأَعْرَابِ كِي شَرْحُ (بَرَاكَلْمَان : تَكْمَلَهُ، ۱ : ۴۸۸)؛ (۳) نَشْرُ الْعَلَمِ فِي شَرْحِ لَامِيَّةِ الْعَجْمِ (سَرَكِيس، ص ۵۳۳) جو در حقیقت الصَّفَدِي كِي شَرْحُ كِي تَلْخِصُ هِيَ)؛ ابن مالک كِي لَامِيَّةِ الْأَفْعَالِ كِي شَرْحُ (وہی كِتَابُ : قَبِّ بَرَاكَلْمَان، ۱ : ۳۰۰ و تَكْمَلَهُ، ۱ : ۵۲۶)۔ مَزِيدُ بَرَاانِ انہوں نے حساب، علم ہیئت اور طب پر چھوٹے چھوٹے رسالے بھی لکھے ہیں۔ ان کا نمونہ کلام العیدروس اور السَّقَافِ نے دیا ہے (دیکھیے نیچے)۔

مَأْخُذُ : (۱) بَرَاكَلْمَان Brockelmann : تَكْمَلَهُ، ۲ : ۵۵۴ بَعْدُ؛ (۲) الْعِيدْرُوسُ : النُّورُ السَّافِرُ، ص ۱۴۳ تا ۱۵۱؛ (۳) السَّقَافُ : تَارِيخُ الشُّعْرَاءِ الْحَضْرِيَّةِ، ۱ : ۱۲۱ بَعْدُ؛ (۴) سَرَكِيسُ، عُمُودُ ۵۳۲ بَعْدُ.

(O. LÖFGREN)

\* بَحْرَيْنُ : رَكٌّ بِهَ الْبَحْرَيْنِ .

\* ۵ بَحْرَيْنُ : (= دوسمندر [دودریا])، کائنات اور

اس کی ترکیب سے متعلق ایک تصور، جو قرآن مجید میں پانچ جگہ آیا ہے (ایک جگہ حالت رفعی میں [ : وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَيْنِ ..... ]، ۳۵ [الفاطر] : ۱۲)۔ [ ان دو سمندروں کے متعلق قرآن مجید میں کہا گیا ہے : ( وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شْرَابُهُ وَ هَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ( ۳۵ [الفاطر] : ۱۲ ) = اور دونوں دریا برابر نہیں، ایک تو شیریں خوش ذائقہ ہے اور ایک کھاری تلخ ؛ وَ هُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَ هَذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ وَ جَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَ حِجْرًا مَهْجُورًا ( ۲۵ [الفرقان] : ۵۳ ) = اور وہی قادر مطلق ہے جس نے دو سمندروں (یا دریاؤں) کو آپس میں ملا دیا، ایک کا پانی شیریں اور خوش ذائقہ ہے اور ایک کا کھاری کڑوا، پھر دونوں کے درمیان ایک ایسی حد فاصل اور روک رکھ دی کہ دونوں باوجود ملنے کے الگ رہتے ہیں؛ اور ہر ایک سمندر سے تازہ گوشت اور زیور نکالا جاتا ہے اور ان کی سطح پر جہاز نظر آتے ہیں۔ وَ مَنْ كَلَّ تَاكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَ تَسْتَخْرِجُونَ حَلِيَّةً تَلْبَسُونَهَا وَ تَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَآخِرٌ لِيَتَّبِعُوا مِنْ فَضْلِهِ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ( ۳۵ [الفاطر] : ۱۲ ) = اور تم ہر ایک میں سے تازہ گوشت کھاتے ہو اور زیور نکالتے ہو، جسے تم پہنتے ہو اور تم کشتیوں کو اس میں دیکھتے ہو کہ وہ پانی کو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم روزی ڈھونڈو اور تاکہ تم شکر کرو۔ اسی طرح سورۃ الرحمن ( ۵۵ : ۱۹ تا ۲۲ ) میں دو سمندروں کا ذکر کر کے فرمایا کہ ان سے موتی اور مونگا نکلتا ہے۔ الْبَطْرِي نے ۲۵ [الفرقان] : ۵۵ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ تازہ اور شیریں پانی سے بارش اور دریاؤں کا پانی مراد ہے اور کھاری اور تلخ پانی سمندر کا ہے۔ دونوں بحروں کے درمیان ایک حد فاصل ہے جسے بَرْزَخُ ( ۲۵ [الفرقان] : ۵۳ ؛ ۵۵ [الرحمن] : ۲۰ )

نیچے آب شیریں کے چشمے ہیں اور جن سے وہ خود اپنے بیڑے کے لیے پینے کا پانی حاصل کرتا رہا تھا۔ موجودہ زمانے میں جب امریکن کمپنی نے سعودی عرب میں تیل نکالنے کا کام شروع کیا تو ابتدا میں وہ بھی خلیج فارس کے انہیں چشموں سے پانی حاصل کرتی تھی۔ بعد میں ظہران میں کنویں کھود کر پانی حاصل کیا گیا (تفہیم القرآن، ۳ : ۴۵۸)۔

مآخذ : بذیل آیات مذکورہ دیکھیے (۱) مختلف تفاسیر [مثلاً الطبری، البیضاوی، الزمخشری، الرازی؛ الشوکانی؛ الطنطاوی؛ امیر علی؛ مواہب الرحمن؛ اشرف علی تھانوی؛ بیان القرآن؛ ابوالاعلیٰ مودودی؛ تفہیم القرآن؛ عبدالماجد دریا آبادی؛ تفسیر ماجدی]؛ (۲) J.H. Kramers : مادۃ جغرافیہ، در (۱)، تکملہ (طبع اول)؛ (۳) وہی مصنف : Geography and Commerce، در The Legacy of Islam، اوکسفورڈ ۱۹۳۷ء؛ (۴) وہی مصنف : L'influence de la tradition iraniene dans la géographie arabe اور (۴) La littérature géographique classique des Musulmans، در Analecta Orientalia، لائڈن ۱۹۵۴ء؛ (۵) The Ocean in the Literature of the Western Semites، ایسٹرڈم ۱۹۱۸ء۔

W.E. MULLIGAN [و ادارہ]

الْبَحْرَيْنِ : (= بَحْرَيْنِ) خلیج فارس میں ایک

ریاست، جو جزیرہ نما قطر اور سعودی عرب کے درمیان واقع اسی نام کے ایک مجمع الجزائر پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں اس میں جزیروں کا ایک اور مجموعہ بھی شامل ہے جو قطر کے پُغری ساحل پر واقع ہے اور جس کا سب سے بڑا جزیرہ حواری ہے۔ البحرین اور قطر کے فرمانرواؤں کے درمیان ایک چھوٹے سے قطعہ زمین کی ملکیت پر اختلاف چلا آتا ہے جو شمال مغربی قطر میں الزبارة کے گرد واقع ہے۔

اور ماجد (ص) [النمل] ۶۱) کہا گیا ہے۔ علما نے اس تصور یا اصطلاح (البحرین) کی کئی طرح تشریح کی ہے۔ منجملہ ان کے ایک رائے یہ ہے کہ ایک بحر آسمان پر ہے اور ایک زمین پر اور ان دونوں کے درمیان ایک روک حائل ہے (الطبری : تفسیر، ۲۷ [النمل] : ۶۲)، مگر زیادہ راہیں جغرافیائی تصور سے قریب تر ہیں اور ان میں بھی غالب رائے یہ ہے کہ ایک بحر سے بحر متوسط اور دوسرے سے بحر ہند مراد ہے جس میں بحر احمر بھی شامل ہے.....

دو بحروں کے مقام اتصال، مجمع البحرین کا ذکر قرآن مجید میں صرف ایک جگہ آیا ہے (۱۸ [الکہف] : ۶۰)۔ بعض مفسرین نے اس سے بحر فارس اور بحر روم [یا بحر اردن اور بحر قلزم] کے اتصال کا مقام مراد لیا ہے (البیضاوی، الطبری، النسفی، الزمخشری وغیرہ)۔ دوسروں نے بحرین سے دو بحر مراد لیے ہیں، جو باب المندب [رک باں] پر بحر اردن اور بحر احمر کے مقام اتصال پر یا آبنائے جبل الطارق پر ملتے ہیں (مثلاً القرطبی)۔ جیسا کہ وینسک Wensinck نے لکھا ہے (مادۃ الخضر، در (۱) : "ایک دور از کار توجیہ یہ ہے کہ البحرین سے مراد حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کی ملاقات ہے، کیونکہ یہ دونوں بحر حکمت تھے"؛ [نیز دیکھیے الشوکانی : فتح القدر، ۳ : ۲۸۷؛ ابوالاعلیٰ مودودی : تفہیم القرآن، بذیل آیت مذکورہ بالا]۔

فتح قسطنطنیہ کے بعد محمد ثانی نے "سلطان البحرین و البحرین" کا لقب اختیار کیا اور یہ ان القاب میں بھی شامل ہے جو بعد کے سلاطین آل عثمان نے استعمال کیے۔

[ترکی امیر البحر سیدی علی رشیدی اپنی کتاب مرآة الممالک میں ایسے مقامات کی خلیج فارس میں نشان دہی کرتا ہے جہاں آب شور کے



ہوئے قطعے کی آب پاشی ہوتی ہے۔ اس قطعے میں مقابلہ زیادہ وسیع پیمانے پر زراعت کی جاتی ہے۔ کئی دوسرے جزائر کی بھی یہی کیفیت ہے۔ خلیج فارس کے کھاری پانی کے درمیان ساحل کے قریب ہی میٹھا پانی بھی چشموں (کواکب) سے پھوٹتا ہے۔ کھجور، برسیم (alfalfa = فِصْفِصہ) اور سبز ترکاریاں یہاں کی خاص پیداوار ہیں۔ دودھ کے لیے کچھ گائیں بھی پالی جاتی ہیں۔

ارضیاتی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو جزیرہ البحرین کی شکل ایک لمبوترے کوہانی قبیے کی سی ہے، جو تہ نشستہ چٹانوں سے بنا ہے۔ جزیرے کے وسط میں ایک بارہ میل لمبا، چار میل چوڑا طاس ہے، جس میں سے الدخان کی پہاڑی ابھر کر کوئی ساڑھے چار سو فٹ کی بلندی تک جا پہنچی ہے۔ تیل نکالنے کا کام بحرین پیٹرولیم کمپنی (Bapco) کے ہاتھ میں ہے جو امریکی سرمایہ داروں کی ملک ہے۔ ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء سے تیل کی اوسط پیداوار تین ہزار پیپے، روزانہ ہے مگر ”بپکو“ کے تیل صاف کرنے کے کارخانے میں دو لاکھ پیپے تیل روزانہ صاف کیا جاتا ہے۔ اس میں زیادہ حصہ خام تیل کا ہے، جو سعودی عرب سے سمندر کے زیر آب نلوں کے ذریعے جہازوں میں بھر کر بھیجا جاتا ہے۔ ”بپکو“ کے دفاتر اور غیر ملکی عملے کے سکونت مکان العوالی میں ہیں۔

قبل ازیں بحرین کی سب سے بڑی صنعت صدف گیری تھی، لیکن اب اس کی جگہ تیل نے لے لی ہے۔ پہلے یہاں موتی نکالنے والی تقریباً پانچ سو کشتیاں اسی کام میں مصروف رہتی تھیں، لیکن ۱۳۴۸ھ / ۱۹۲۹ء کی بین الاقوامی کساد بازاری اور جاپانی مصنوعی موتیوں کے روز افزوں رواج کے باعث ان موتیوں کی قیمت بہت گر گئی، چنانچہ اب گنتی کی چند کشتیاں موتی نکالنے کا کام کرتی ہیں،

[البحرین کا مجموعی رقبہ ۲۳۱ مربع میل ہے۔] البحرین کے نام کے بارے میں عربی مآخذ میں مختلف توجیہات ملتی ہیں، جن میں سے کوئی بھی قابل قبول نہیں۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ اس کی اصل اب تک نامعلوم ہے۔ زمانہ قبل اسلام اور ابتداء اسلام میں اس نام کا اطلاق مشرقی عرب پر ہوتا تھا، جس میں القطیف اور الحجّر (موجودہ الحساء؛ رِکَبہ الاحساء) کے نخلستان شامل ہیں۔ آگے چل کر یہ نام محض اس مجمع الجزائر کے لیے مخصوص ہو گیا جو ساحل سے کچھ فاصلے پر واقع ہے (قَب حصّہ تاریخ، جو ذیل میں درج ہے)۔

سب سے بڑا جزیرہ (جو عربی کے قدیم مآخذ میں آوال یا آوال [قَب یاقوت، ۱: ۳۹۵] اور آج کل البحرین کہلاتا ہے) تقریباً تیس میل لمبا اور زیادہ سے زیادہ بارہ میل چوڑا ہے۔ اس کا دارالحکومت المنامة، جو شمال مشرقی ساحل پر واقع ہے، ڈیڑھ میل لمبے ایک سنگ بستہ راستے کے ذریعے شمال مشرقی جانب المَحْرَق کے جزیرے اور شہر سے ملا ہوا ہے۔ دوسرے جزیرے یہ ہیں: (۱) سِتْرَة [البحرین کے مشرق میں؛ تین میل لمبا، ایک میل چوڑا]، جہاں سے تیل لادنے کا ایک پختہ گھاٹ سمندر کے اندر تک چلا گیا ہے؛ (۲) النَّبِیْہ صالح [= النَّبِی صالح، قَب [ع - ع]؛ (۳) اُم الصَّبَان؛ (۴) جِدَا (جہاں پہلے پتھر کی کان تھی اور اب مجرموں کی اصلاح کے لیے قید خانہ ہے) اور (۵) ام نَعْسَان، جسے اب النَّعْسَان بھی کہتے ہیں۔ [یہ البحرین کے مغرب میں واقع ہے اور ساڑھے تین میل لمبا، اڑھائی میل چوڑا ہے۔] یہاں کی آب و ہوا گرم مرطوب ہے حالانکہ یہاں اوسطاً صرف سات سینٹی میٹر سالانہ بارش ہوتی ہے۔ یہاں کئی بہنے والے چشمے (عیون) ہیں، جن سے بڑے جزیرے کے نصف شمالی ساحل کے ساتھ ساتھ زَلّاق سے جو تک ایک قوس کی شکل میں پھیلے

کے مقامات اللطیف اور الحساء میں آباد شیعوں کی طرح یہاں کے شیعہ بھی بقرانہ (واحد : بقرانی) کہلاتے ہیں۔ التباس سے بچنے کے لیے البحرین کے سنی عموماً اپنے لیے اب بحرینی کی نسبت استعمال کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ اس علاقے کے قدیم باشندوں کی اولاد ہیں اور اس مفروضے کو تسلیم کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا کہ وہ ایرانی النسل ہیں۔ البحرین کے سنی یا تو عرب ہیں یا ان عربوں کی اولاد جو کبھی ساحل ایران پر سیکونت پذیر تھے۔ مؤخرالذکر حوالہ *Huwala* کہلاتے ہیں۔

تاریخ : تقریباً نصف صدی سے محققین البحرین کی ابتدائی تاریخ کا سراغ لگانے کے لیے مدفنوں کے ان تودوں کو کرید رہے ہیں جو بڑے جزیرے کے نصف شمالی حصے میں بکھرے پڑے ہیں اور تعداد میں غالباً ایک لاکھ ہیں۔ ۱۲۹۶/۱۸۷۹ء میں کیپٹن ڈیورنڈ E. Durand نے ایک بڑے تودے کو اور چند چھوٹے چھوٹے تودوں کو کھودا۔ اس کے بعد دوسرے تودے مسٹر اور مسز بنت T. Bent، پریڈپو F. Prideaux اور کارنوال P. Cornwall نے کھودے۔ میکے E. Mackay نے کھدائی کے بعد مختلف نمونوں کے ایک سلسلہ مقابر کے بارے میں معلومات فراہم کیں۔ متعدد تودے، جن میں سے ایک غالباً کسی قسم کا مندر رہا ہوگا، آثارِ قدیمہ کی اس مہم کے ارکان کے زیر مشاہدہ و مطالعہ رہے جو ڈنمارک سے آئی تھی۔ اس جماعت نے ۱۳۷۳/۱۹۵۳ء میں گلوب P. Glob اور بی بی T. Bibby کی قیادت میں اپنا کام شروع کیا۔ قدیم کھدائی کرنے والوں کا خیال تھا کہ یہ مقبرے فینیقیوں کے وقت سے چلے آ رہے ہیں، لیکن اب عام طور پر یہ نظریہ قابل قبول نہیں رہا۔ جو چیزیں ان تودوں سے برآمد ہوئی ہیں یا ڈنمارک کے اہل مہم کو دوسرے

بہر حال ماہی نگری آج بھی بہت سے لوگوں کی روزی کا ذریعہ ہے۔ بیشتر مچھلیاں جوار پھانے کے وقت بندر میں پاڑ لگا کر پکڑی جاتی ہیں۔ کشتی سازی، کشتیوں کی مرمت، بادبان سازی اور جال پھانے کا شمار اب بھی یہاں کی چھوٹی صنعتوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں مٹی کے برتنوں، سفیدی اور پلاستر کی صنعت بھی ہے۔

تجارت درآمد و برآمد کو مزید فروغ دینے کے لیے ۱۳۷۷/۱۹۵۷-۱۹۵۸ء میں یہاں ایک آزاد بندرگاہ کھول دی گئی۔ سامانِ تعیش کے سوا ہر مال پر بحساب قیمت پانچ فی صد محصول عائد کیا گیا۔ ۱۳۷۰/۱۹۵۰ء میں خورالقلیغہ کے گہرے پانی سے بندر تک ایک نہر کھود کر ایک بہترین قدرتی بندرگاہ تیار کی گئی۔ المعرق میں ایک ہوائی اڈا بھی ہے، جہاں مقررہ نظام کے مطابق تمام بین الاقوامی فضائی کمپنیوں کے طیارے اترتے ہیں۔ Gulf Aviation Co. کا صدر دفتر یہیں واقع ہے۔ اس کمپنی میں گورنمنٹ بھی حصہ دار ہے اور اس کے جہاز خلیج فارس کے بہت سے مقامات پر آتے جاتے ہیں۔

[بحرین کی کل آبادی ۱۵۱۰۰۰ ہے]، جس میں سے اکٹھو فی صد لوگ المنامہ [آبادی ۶۲۰۰۰]، المعرق اور الحد کے شہروں میں آباد ہیں۔ یہاں کی آبادی میں ایرانی، ہندوستانی اور پاکستانی نیز (تین ہزار کے قریب) یورپین اور امریکی شامل ہیں۔ سلطان یہاں کی کل آبادی کا ۹۹ فی صد ہیں، جن میں سے تقریباً آدھے شیعہ (بیشتر جعفری اثنا عشری اور کچھ شیخی) ہیں اور باقی، جن میں حکمران خاندان بھی شامل ہے، سنی (زیادہ تر مالکی اور کچھ حنبلی) ہیں۔ سنی آبادی بڑے بڑے شہروں میں ہے اور شیعہ زیادہ تر ایسے دیہات میں آباد ہیں جہاں زراعت ہوتی ہے۔ سعودی عرب



کچھ گم شدہ عرب قبائل کا نشان ملتا ہے۔ قدیم تاریخی قبائل میں سے بنی قحطان کے قبیلہ الازد کا ذکر آتا ہے، جن کے بہت سے افراد عمان میں منتقل ہو گئے۔ اس کے دیگر افراد تنوخ کے قبائل وفاق میں شامل ہو گئے، جسے کہا جاتا ہے کہ البحرین میں تشکیل دی گئی تھی۔ بعد کے تارکانِ وطن تمیم، بکر اور تغلب جیسے عدنانی قبائل کے متوسلین میں سے تھے، جن میں سے بکر اور تغلب نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں یہاں کی آبادی میں زیادہ تعداد بنو عدنان کے قبیلہ عبدالقیس [رک باں] کی تھی۔

اردشیر اول کے زمانے سے البحرین میں ساسانیوں کے عمل دخل کا آغاز ہوا، چنانچہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے العلاء بن الحضرمی کو مشرق کی طرف مہم پر بھیجا تو البحرین ایک ایرانی مرزبان کے ماتحت تھا۔ زمانہ ردۃ [رک باں] میں جب کہ البحرین کے لخمی حکمران نے خلافت کی اطاعت سے سرتابی کی تو بنو عبدالقیس کے بہت سے افراد الجارود (جو عیسائی سے مسلمان ہوئے تھے) کی زیر قیادت اسلام پر ثابت قدم رہے۔ العلاء نے باغیوں کو الحساء میں جواٹا کے مقام پر شکست دی اور اسلامی فوجیں سمندر پار کر کے جزیرہ دارین، جو القطیف کے مقابل ہے، جا پہنچیں، بلکہ غالباً اوال میں بھی داخل ہو گئیں۔

پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی میں خارجیوں نے نجدۃ بن عامر [رک باں] اور ابوہدیکہ [رک باں] کی زیر قیادت البحرین میں اپنے اقتدار کا ایک مرکز قائم کیا۔ عیسائیت اور یہودیت ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی اور نسٹوری عیسائی بھی ابھی تک خاصے سرگرم عمل تھے، چنانچہ ۶۷۶ء میں انہوں نے دارین میں ایک مذہبی مجلس منعقد کی۔ آئندہ صدی میں یہاں عباسی حکومت قائم

مقامات، مثلاً برباد شدہ پرتگالی قلعے - قلعة عجاج - کے قریب سے اور بار بار سے ملی ہیں ان میں کانسی اور لوہے کی بنی ہوئی اشیاء، سہر لگانے کے پتھر، سنگ جراحی کے برتن، ہاتھی دانت کے ٹکڑے اور ایسے گلی تابوت شامل ہیں جن پر رال کی تہ چڑھائی ہوئی ہے۔ ایسے ہی مقبرے وسطی نجد میں اور ساحلِ عرب کے ساتھ ساتھ واقع ہیں، چنانچہ القطیف کے شمال میں جاوان کے مقام پر ایک بہت بڑے مقبرے کی کھدائی ۵۱۳۷۱ / ۱۹۵۲ء میں وڈال F. Vidal نے کی تھی، اور اس کا زمانہ ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ متعین کیا گیا ہے۔ ایسے علاقوں میں تودوں کی پھیلی ہوئی کثیر تعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ تودے بنانے کی رسم ایک مدت دراز سے چلی آتی ہے۔ بہت سے تودے یقیناً جاوان کے تودوں کے مقابلے میں بہت پرانے ہیں۔

کئی ایک فضلا اس بات میں رائسن H. Rawlinson (در JRAS، ۱۸۸۰ء) کے ہم نوا ہیں کہ البحرین وہی مقام ہے جسے عراق کی سیخی دستاویزات میں دلمن Dilmun بتایا گیا ہے، لیکن ان دونوں کا ایک ہونا یقینی طور پر ثابت نہیں ہوا، مثلاً S. Kramer (در BASOR، ۱۹۳۳ء) کے خیال میں دلمن Dilmun کا جنوب مغربی ایران میں ہونا سب سے زیادہ قرین قیاس ہے۔ یونانی اور لاطینی ماخذ میں قدیم ساحل البحرین کے متعلق بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ اتنا پتا چلتا ہے کہ وہاں بندرگاہ گرہا Gerrha واقع تھی، لیکن اس کی بھی صحیح جائے وقوع معین نہیں کی جا سکی۔ جنوبی عرب کے جو چند ایک کتبات اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان سے بھی اس علاقے کی تاریخ قبل اسلام کے بارے میں ہماری معلومات میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوتا۔

البتہ عرب کی عوامی روایات میں البحرین کے

مجمع الجزائر کے لیے کب استعمال ہونا شروع ہوا جو اس کے قریب ہی واقع تھا، لیکن سہولت اسی میں رہے گی کہ البحرین کی تاریخ کو ان جزیروں تک محدود رکھیں جن پر آج کل اس نام کا اطلاق ہوتا ہے۔

جزائر البحرین پر اپنے اوائل عہد ہی میں بنی عیون کی حکومت قائم ہو گئی، جنہوں نے مختلف ادوار میں القطیف کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ جب عامر ربیعہ کی سرکشی کے باعث بنی عیون کے اقتدار کو ضعف پہنچا تو البحرین مشرقی خلیج فارس کے جزیرہ قیس کے بنی قیصر کا باج گزار ہو گیا۔ ۵۶۳۳/۱۲۳۵ء میں البحرین اور القطیف پر فارس کے سفیری اتابک ابوبکر بن سعد کی فوج نے قبضہ کر لیا، لیکن ۵۶۵۱/۱۲۵۳ء میں عامر ربیعہ کی ایک شاخ بنی عصفور کے تحت البحرین آزاد اور خود مختار ہو گیا۔

طیبیہ، یعنی جزیرہ قیس کے سر بر آوردہ تاجر، البحرین کو دوبارہ اپنے جزیرے کے حلقہ اقتدار میں لے آئے، لیکن جب مزید مشرق کی جانب هرمز جدید کو عروج ہوا تو ان کی سیادت پر زوال آ گیا۔ تقریباً ۵۷۳۰/۱۲۳۰ء کے قریب هرمز کے حکمران تہم تم [کذا، تہمتن؟] ثانی نے جزیرہ قیس اور البحرین دونوں کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ اس کے کوئی پندرہ سال بعد هرمز کا فرمانروا توران شاہ خود البحرین آیا۔ موجودہ دارالحکومت المنامہ کا ذکر پہلی مرتبہ اسی زمانے میں ملتا ہے۔

نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں عامر ربیعہ میں ایک نیا فرمانروا خاندان جبرہ [رک بان] پیدا ہوا۔ اجود بن زامل اس کا ممتاز ترین شیخ تھا۔ اس نے البحرین کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور مالکیوں کو شیعوں پر غلبہ حاصل کرنے میں مدد دی۔ اس بدوی فرمانروا کے شاندار دور

ہوئی، لیکن یہ مأخذ یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اس علاقے میں اس کی حدود اور اقتدار کی کیا کیفیت تھی۔

فتنہ زنج [رک بان] کے بانی علی بن محمد نے، جو غالباً عبدالقیس کی نسل سے تھا، عراق جانے سے پہلے البحرین میں شورش برپا کی۔ ۵۲۸۱/۸۹۴-۸۹۵ء میں البحرین کے عباسی عامل محمد ابن نور نے عمان کی اباضی امامت کے خلاف فوج کشی کی۔

قرامطہ [رک بہ قرمطی] کو البحرین کی بدوی اور شہری دونوں طرح کی آبادی میں جان نثار پیرو مل گئے۔ ۵۳۱۷/۹۳۰ء میں حجر اسود مکہ معظمہ سے البحرین لایا گیا، جہاں وہ بیس سال تک پڑا رہا۔ ۵۳۷۸/۹۸۸-۹۸۹ء میں المنتفق کی فتح سے اگرچہ قرامطہ کی کمزوری ظاہر ہو گئی، لیکن اس کے پینسٹھ سال بعد جب ناصر خسرو سیاحت کرتا ہوا البحرین پہنچا تو وہاں کا نظم و نسق ابھی تک انہیں کے ہاتھوں میں تھا۔ ۵۴۵۰/۱۰۵۸-۱۰۵۹ء میں ابو البہلول العوام بن الزجاج نے، جو بنو عبدالقیس میں سے تھا، اوائل میں عباسی خلیفہ کے نام پر دوبارہ صحیح العقیدہ اسلامی حکومت قائم کر کے قرامطہ کو دعوت مبارزت دی۔ بنو عقیل [رک بان] کے قبیلہ عامر ربیعہ کو جو قرامطہ کی طرف سے اس جزیرے کا نگہبان تھا، القطیف کے بالمقابل واقع جزیرہ کسکوس کے قریب ایک بحری لڑائی میں شکست ہوئی۔ اس کے بعد چند سال کے اندر اندر قرامطہ پر ہمیشہ کے لیے زوال آ گیا۔ یہ زوال الحساء کے ایک نئے شاہی فرمان روا خاندان یعنی عبدالقیس کے بنی عیون [رک بان] کا مرہون منت تھا، جنہیں سلاجقہ عراق کی اعانت بھی حاصل تھی۔ گو اس کی کوئی صحیح تاریخ نہیں بتائی جا سکتی کہ البحرین کا نام "برعظیم" کے بجائے اس



حکومت میں البحرین کی شہرت مصر اور پرتگال جیسے دور دراز علاقوں تک پہنچ گئی۔

پرتگالی ۱۵۱۳/۵۹۲ء ہی میں بحر ہند سے البحرین پہنچ گئے تھے، لیکن اس پر ان کا قبضہ چند سال بعد اس وقت ہوا جب انہوں نے ہرمز سے رشتہ اتحاد قائم کر کے آجود کے چچا مکرم کو شکست دی۔ ان کی حکومت وقفوں کے ساتھ تقریباً اسی سال تک قائم رہی اور اس دوران میں ان کا انحصار زیادہ تر ان ایرانی سنیوں پر رہا جنہیں وہاں کا گورنر مقرر کیا جاتا تھا۔ دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں عثمانی ترکوں نے خلیج فارس میں پرتگالی قیادت کو للکارا، لیکن ان کے امیر البحر، جو نظم و نسق سے کہیں زیادہ بحری جنگوں کے ماہر تھے، البحرین میں کسی جگہ مستقل قبضہ برقرار نہ رکھ سکے۔

۱۶۰۲/۵۱۰۱۱ء میں شاہ عباس اول کے عہد میں ایرانیوں نے البحرین لے لیا اور چند وقفوں سے قطع نظر اس پر ڈیڑھ سو سال سے زیادہ قابض رہے۔ ایرانی قبضے کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس دوران میں ایرانی اثرات بھی پوری شدت کے ساتھ کار فرما رہے ہوں گے اس لیے کہ وہاں کے انتظامی امور اکثر ہوالہ Huwala یا ان عربوں کے ہاتھ میں رہتے تھے جو ساحل ایران پر آباد تھے، جیسے بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی میں طاہری کے جبارہ اور بوشہر کے ناصر اور نصر آل مذکور۔

۱۷۸۳/۵۱۱۹۷ء میں احمد بن خلیفہ نے، جو بنو عتبہ (العتوب) یعنی ان عربوں میں سے تھا جو ترک وطن کر کے پہلے نجد سے کویٹ اور پھر قطر میں الزبارہ کو نقل مکانی کر گئے تھے، نصر آل مذکور کو البحرین سے نکال دیا اور خاندان خلیفہ کی سلطنت وہاں قائم کی، جو آج تک قائم ہے۔

البحرین کے مستعد تاجروں نے، جن کے ہاتھ میں موتیوں کی قیمتی تجارت تھی، خلیج فارس کے اس تجارتی اقتدار کے لیے جو حال ہی میں مسقط کے قبضے میں آیا تھا، اس کا مقابلہ شروع کیا، جس سے برافروختہ ہو کر آئندہ پینتالیس برس تک مسقط کے اباضی فرمانروا برابر البحرین پر حملے کرتے رہے۔ پہلا حملہ ۱۸۰۱/۵۱۲۱۶ء میں ہوا۔ اس میں نجد کے آل سعود نے آل خلیفہ کی مدد کی، لیکن آل سعود کا سیاسی اقتدار وہاں زیادہ عرصے قائم نہ رہا، اس لیے کہ البحرین کے مالکی رجحان رکھنے والے سنی کسی طرح بھی محمد بن عبدالوہاب کی حنبلیت کے حامی نہیں ہو سکتے تھے۔

۱۸۲۰/۵۱۲۳۵ء میں آل خلیفہ نے حکومت برطانیہ سے معاہدات کا ایک سلسلہ شروع کیا، جن کی بدولت ۱۹۱۳/۵۱۳۳۲ء تک البحرین پوری طرح برطانیہ کے زیر حمایت آ گیا اور ایک طرف تو اس کے خارجی معاملات پر پورا اختیار برطانیہ کے ہاتھ میں آ گیا اور دوسری طرف اس کے قدرتی وسائل کی ترقی کے جملہ حقوق اسے حاصل ہو گئے۔ ایران کی طرف سے برطانیہ کے اس روز افزوں اثر و اقتدار کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہونے کو آیا ہے اور آج بھی حکومت ایران البحرین کی سیادت کا پورے زور سے دعویٰ کر رہی ہے۔ اگرچہ عثمانی ترکوں نے ساحل عرب اور قطر پر تیرہویں صدی ہجری / انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں قبضہ کر لیا تھا اور اس طرح پہلی جنگ عظیم تک البحرین کو اپنے گھیرے میں لیے رکھا، تاہم وہاں برطانوی اقتدار کی موجودگی کے باعث وہ ان جزیروں کو اپنی سلطنت میں شامل نہ کر سکے۔

ایک ہزار سال سے زیادہ غائب رہنے کے بعد ۱۸۹۳/۵۱۳۱۰ء میں عیسائیت اپنی رسمی شکل

مآخذ: (الف) عربی، فارسی اور ترکی: (۱) البلاذری: فتوح؛ (۲) الہمدانی؛ (۳) حمید بن رزق: الفتح المبین، مترجمہ G. Badger، لندن ۱۸۷۱ء؛ (۴) ابن بطوطہ: سفرنامہ؛ (۵) ابن حوقل؛ (۶) السعودی: مروج الذهب؛ (۷) ناصر خسرو: سفرنامہ، طبع Schefer، پیرس ۱۸۸۱ء؛ (۸) الطبری: تذکرۃ الملوک، طبع V. Minorsky، ۱۹۳۳ء؛ (۹) یاقوت: معجم البلدان، بامداد اشاریہ؛ (۱۰) ابن الریحانی: ملوک العرب، بار دوم، بیروت ۱۹۲۹ء؛ (۱۱) حافظ وہبہ: جزیرۃ العرب، قاہرہ ۱۳۵۴ھ؛ (۱۲) محمد بن بلیہد: صحیح الاخبار، قاہرہ ۱۳۷۰ تا ۱۳۷۳ھ؛ (۱۳) محمد التنبہانی: التحفة النہانیة، قاہرہ ۱۳۳۲ھ؛ (۱۴) وزارت خارجہ سلطنت عثمانیہ: بحرین مسئلہ سی، استانبول ۱۳۳۴ھ۔

(ب) آثار قدیمہ: (۱۵) Southern: J. and M. Bent، London، ۱۹۰۰ء؛ (۱۶) Arabia، G. Globe و T. Bibby، London، ۱۹۰۰ء؛ (۱۷) در Århus، ۱۹۵۴ء وما بعد؛ (۱۸) P. Cornwall، BASOR، ۱۹۳۶ء؛ (۱۹) وہی مصنف، در GJ، ۱۹۳۶ء؛ (۲۰) وہی مصنف، در Jour. of Cuneiform Studies، ۱۹۵۲ء؛ (۲۱) H. Rawlinson و E. Durand، JRAS، ۱۸۸۰ء؛ (۲۲) S. Kramer، BASOR، ۱۹۳۳ء؛ (۲۳) E. Mackay، در Bahrein and Hemamieh، لندن ۱۹۲۹ء؛ (۲۴) A. Oppenheim، The Seafaring Merchants of Ur، در JAOS، ۱۹۵۳ء؛ (۲۵) F. Vidal، در مجلۃ النہل، مگہ ۱۳۷۵ھ۔

(ج) انیسویں صدی کی تاریخ: (۲۶) R. Aigrain، Arabie، در Dict. d'hist. et de géog. ecclés.، ۱۹۵۳ء؛ (۲۷) J. Aubin، Les princes d'Ormuz، در JA، ۱۹۵۳ء؛ (۲۸) C. Belgrave، در JRCAS، ۱۹۳۵ء؛ (۲۹) وہی مصنف: Chronographia Islamica، پیرس ۱۹۱۲ء؛ (۳۰) W. Caskel، Eine 'Unbekannte'، در Oriens، ۱۹۴۹ء؛ (۳۱) M. de Goeja،

میں بحرین میں نمودار ہوئی جب کہ American Dutch Reformed کے مبلغوں نے وہاں اپنا ایک اڈا قائم کیا۔ ۱۹۳۲ء / ۱۳۵۱ھ میں مرکزی جزیرے میں تیل دریافت کیا گیا۔ خلیج فارس کے عربی ساحل پر واقع ان علاقوں کا یہ پہلا کنواں تھا جہاں تیل کے ذخائر بکثرت پائے جاتے ہیں۔

۱۹۳۵ء / ۱۳۵۴ھ سے ۱۹۵۸ء / ۱۳۷۷ھ تک البحرین خلیج فارس کا سب سے بڑا بحری اڈا تھا۔ ۱۹۳۶ء / ۱۳۶۵ھ میں خلیج فارس میں برطانیہ کے پولیٹیکل ریڈیڈنٹ کا صدر دفتر بھی بوشہر سے البحرین منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۴۲ء / ۱۳۶۱ھ میں شیخ سلمان نے یہاں کی حکومت سنبھالی اور ۱۹۵۸ء / ۱۳۷۷ھ میں اس نے سعودی عرب کے شاہ سعود کے ساتھ ایک دوستانہ معاہدہ کیا، جس کی رو سے دونوں ملکوں کے درمیان سمندری حد معین کر دی گئی۔ اس کی رو سے جزیرہ نما عرب کے سواحل سے ٹکرانے والے سمندروں کی پہلی بار واضح حد بندی عمل میں آئی۔

[البحرین کا موجودہ حکمران شیخ عیسیٰ بن سلمان الخلیفہ (ولادت: ۱۹۳۳ء؛ مسند نشینی: ۲ نومبر ۱۹۶۱ء) اپنے خاندان کا گیارہواں فرمانروا ہے۔ انتظامیہ کا سربراہ میکرٹری ہے۔ حکومت کے مختلف اہلکار مشاورتی مجالس کی مدد سے یہاں کا نظم و نسق چلاتے ہیں۔ چار شہروں اور دو جزیروں میں بلدیاتی ادارے قائم ہیں، جن کے نصف ارکان منتخب اور نصف نامزد کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں چونتیس لڑکوں کے اور سولہ لڑکیوں کے مدرسے موجود تھے۔ رعایا کا علاج مفت کیا جاتا ہے۔ بیشتر آمدنی تیل اور درآمدی محصول سے ہوتی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں کل آمدنی تقریباً ساڑھے سات کروڑ ہونڈ تھی]۔



*Eastern* : H. Hazard (۵۵)؛ ۱۹۵۵ء؛ *MEJ* در  
 : H. Hoskins (۵۶)؛ ۱۹۵۶ء؛ *Arabia*  
 : *British Routes to India* نیویارک ۱۹۲۸ء؛ (۵۷) وہی  
 مصنف، در *MEJ*، ۱۹۳۷ء، (۵۸) H. Liebesny، در  
 : S. Longrigg (۵۹)؛ ۱۹۵۶ء و ۱۹۳۷ء؛ *MEJ*  
 (۶۰)؛ ۱۹۵۳ء؛ *Oil in the Middle East*  
*Gazetteer of the Persian Gulf, Omân* : J. Lorimer  
 and *Central Arabia*، کلکتہ ۱۹۰۸ تا ۱۹۱۵ء؛ (۶۱)  
 : *History of the Indian Navy* : C. Low  
 : L. Pelly (۶۲)؛ ۱۸۷۷ء؛ *Remarks on the Tribes, Trade and*  
*Resources Around the Shore Line of the Persian Gulf*  
 در *Transactions of the Bombay Geog. Soc.*؛ ۱۸۶۳ء؛  
 : A. Ribani (۶۳)؛ ۱۹۵۵ء؛ *MEJ*، در F. Qubain (۶۳)  
 : *Around the Coasts of Ar.* بوسٹن ۱۹۳۰ء؛ (۶۵)  
*tions from the Records of the Bombay Govt.*  
 ج ۲۳، بمبئی ۱۹۰۶ء؛ (۶۶) A. Toynbee  
 : G. Kirk، وغیرہ؛ *Survey of Int'l. Affairs*، لندن ۱۹۲۷ء  
 و ما بعد؛ (۶۷) U. S. Hydrographic Office  
 : *Directions for the Persian Gulf*، بار چہارم، واشنگٹن  
 : R. Whish (۶۸)؛ ۱۹۵۲ء؛ *Transactions of Bombay*  
 : S. Zwemer (۶۹)؛ ۱۸۶۲ تا ۱۸۶۰ء؛ *Geog. Soc.*  
 : *Arabia*، نیویارک ۱۹۰۰ء۔  
 (۵) ایرانی دعویٰ : F. Adamiyat (۷۰)؛ *Bahrein*  
 : *Islands*، نیویارک ۱۹۵۵ء؛ (۷۱) J. Kelly، در  
 : *Int'l. Affairs*، لندن ۱۹۵۷ء؛ (۷۲) M. Khadduri، در  
 : *Amer. Jour. of Int'l. Law*، ۱۹۵۱ء؛ (۷۳) سعید نفیسی :  
 بحرین، تہران ۱۳۳۳ھ؛ (۷۴) G. Scarcia، در *OM*،  
 : *The Statesman's Year-Book* (۷۵)؛ ۱۹۵۸ء-  
 : *World Muslim*؛ (۷۶) مؤتمر العالم الاسلامی :  
 : *Gazetteer*، کراچی ۱۹۶۳ء۔  
 W.E. MULLIGNAN و G. RENTZ [و ادارہ]

*Mémoire sur les Carmathes du Bahraïn*، بار دوم،  
 لائن ۱۸۸۶ء؛ (۳۲) وہی مصنف، در *JA*،  
 : L. Lockhart (۳۳)؛ ۱۸۹۵ء؛ *Nadir Shah*، لندن  
 : وہی مصنف، در *BSOS*، ۱۹۳۵ تا  
 : C. Matthews (۳۵)؛ ۱۹۵۴ء؛ *MW*، (۳۶)  
 : *Beschreibung v. Arabien* : C. Niebuhr، کوپن ہیگن  
 : A. Stiffe (۳۷)؛ ۱۹۰۱ء؛ *GJ*، در (۳۸)  
 : *The Persian Gulf* : A. Wilson، لندن ۱۹۲۸ء؛  
 : F. Wüstenfeld (۳۹) *Bahrein u. Jemâma*، در  
 : *Abh. d. K. Ges. d. Wiss. zu Gött.*، ۱۸۷۴ء۔

(د) البحرین کی موجودہ کیفیت : (۳۹)  
 برطانوی بحریہ : *A Handbook of Arabia*، لندن  
 : *Iraq and the Persian Gulf*، ۱۹۱۶-۱۹۱۷ء؛ (۴۰) وہی ادارہ :  
 : *A Collection of Treaties*، لندن ۱۹۳۳ء؛ (۴۱)  
 : C. Aitchison، طبع ۱۱، ج ۱۱، کلکتہ ۱۹۳۳ء؛ (۴۲)  
 : *of Treaties*، بار پنجم، ج ۱۱، طبع  
 : *C. Belgrave*، حکومت بحرین اور بحرین  
 : *C. Belgrave*، پٹرولیم کمپنی کی سالانہ رپورٹیں؛ (۴۳)  
 : *JCAS*، ۱۹۲۸ء؛ (۴۴) J. Belgrave  
 : *Welcome to Bahrain*، بار سوم، بحرین ۱۹۵۷ء؛  
 : *Revue Egyptienne de*، در J. Brinton (۴۵)  
 : *Droit International*، ۱۹۳۷ء؛ (۴۶) O. Careo  
 : *Wells of Power*، لندن ۱۹۵۱ء؛ (۴۷) V. Chirol  
 : *Fifty Years in a Changing World*، لندن ۱۹۲۷ء؛  
 : *Parsia* : G. Curzon (۴۸)؛ لندن ۱۸۹۲ء؛  
 : *La golfe persique et les* : M. Esmaili (۴۹)  
 : *iles de Bahrein*، پیرس ۱۹۳۶ء؛ (۵۰) فروغی : A. Farougy  
 : *The Bahrein Islands*، نیویارک ۱۹۵۱ء؛ (۵۱) برطانوی  
 : *Handbook on the Persian Gulf*، محکمہ خارجہ  
 : *L. Fraser* (۵۲)؛ لندن ۱۹۵۳ء؛ در *JCAS*،  
 : *British Documents on the Origins of* (۵۳)؛ ۱۹۰۸ء  
 : *the War*، ج ۱، حصہ ۲، طبع G. Gooch  
 : *H. Temperley*، لندن ۱۹۳۸ء؛ (۵۴) R. Hay

کرنی پڑی .

ایک کی وفات کے بعد البحرہ کے جلاوطن مملوک چھوٹے چھوٹے گروہوں میں مصر واپس آگئے، لیکن چونکہ یہ لوگ اب عمر رسیدہ ہو چکے تھے اور ان کی تعداد بھی کم ہو گئی تھی، لہذا انہیں پہلے سی وقت پھر کبھی حاصل نہ ہو سکی۔ ان کے آخری فرد نے ۱۳۰۷ء / ۱۳۰۷ء میں وفات پائی۔ بہر حال بحرہ کا نام نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی تک چلتا رہا، کیونکہ اس کا اطلاق شام کے مختلف محافظ دستوں پر کیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں اور بالخصوص سلطان قلاؤن کے عہد میں ان قلعوں کی حفاظت کے فرائض اصلی بحرہ کے سپاہی انجام دیا کرتے تھے۔

البحریہ کی اہمیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اس کی تشکیل بالآخر مملوک سلطنت کے قیام پر منتج ہوئی۔ مگر مملوک بادشاہی کے ابتدائی عہد (۱۲۵۰ء / ۱۲۵۰ء تا ۱۳۸۲ء / ۱۳۸۲ء) کو، جس میں قہجاقی عنصر کا غلبہ تھا، ”عہد بحرہ“ سے موسوم کرنا صحیح نہیں۔ مملوکی مآخذ میں اس عہد کو عام طور پر ”دولة الترك“ لکھا ہے تاکہ اسے چرکسی عہد (۱۳۸۲ء / ۱۳۸۲ء تا ۱۵۱۷ء / ۱۵۱۷ء) سے، جسے وہ ”دولة الجركس“ (رک بہ چرکس) کہتے ہیں، ممیز رکھا جائے۔

مآخذ: (۱) D. Ayalon : *Le régiment*

*Bahriya dans l'Armée Mamelouke*، در REI، ۱۹۵۲ء،

ص ۱۳۳ تا ۱۴۱؛ [نیز دیکھیے (۲) و (۳) (ع)، بذیل مادہ]۔

(D. AYALON)

- بحرہ : صحرائے لیبیا میں نخلستانوں کا ایک مجموعہ۔ بحرہ صحرائے لیبیا کا انتہائی شمالی علاقہ ہے۔ واحات بحرہ (نیز صیفہ واحد یعنی شمالی نخلستانوں کو واحات قبلیہ، یعنی

البحریہ : مصر میں مملوکوں کا ایک فوجی دستہ۔ یوں تو ایوبی سلاطین میں سے بیشتر کے ہاں مملوک ملازم تھے، لیکن انہیں کثیر تعداد میں سلطان الصالح نجم الدین ایوب (۵۶۳۷ / ۱۲۴۰ء تا ۵۶۴۷ / ۱۲۴۹ء) ہی نے بھرتی کیا۔ اس نے دشت قہجاق اور اس کے نواحی علاقوں کے ترک غلاموں کے مسلم منڈیوں میں امنڈ آنے سے فائدہ اٹھایا اور ان کی ایک منتخب ’فوج رکاب‘ بھرتی کر لی، جس میں آٹھ سو سے ایک ہزار تک اسپ سوار ہوتے تھے۔ یہ وہ خانہ برباد ترک تھے جنہیں (چنگیزی) مغول کی پیش قدمی نے اپنے آبائی وطنوں سے نکال باہر پھینکا تھا۔ ایوبی سلطان نے مذکورہ بالا دستے کا نام البحرہ رکھا، کیونکہ اس نے ان فوجیوں کی چھاؤنی دریائے نیل (بحر النيل) کے کنارے جزیرۃ الروضة میں قائم کی تھی۔

البحریہ نے اپنے قیام کے بالکل ابتدائی زمانے ہی سے مالیک کے ایک عسکری معاشرے کی تمام ایجابی اور سلبی خصوصیات کا مظاہرہ شروع کر دیا، یعنی ایک طرف تو بیرونی حملوں اور دوسری طرف اندرونی خلفشار کے مقابلے میں غیر معمولی فوجی استعداد، شجاعت اور اتحاد کا مظاہرہ۔ المنصورہ (۵۶۴۷ / ۱۲۴۹ء) اور عین جالوت (۵۶۵۸ / ۱۲۶۰ء) کی جنگوں میں فتح کا سہرا انہیں کے سر ہے، لیکن مؤخر الذکر لڑائی سے چھ سال قبل ان کی صفوں میں ایسا انتشار پیدا ہوا تھا کہ ان کی ہستی تک معرض خطر میں پڑ گئی تھی۔ جب انہیں میں سے ایک شخص ایک سلطان ہو گیا تو چند ہی دنوں بعد انہوں نے اسے معزول کرنا چاہا، مگر ناکام رہے۔ اس کشمکش میں ان کا سردار اقطای مارا گیا اور ان کے تقریباً سات سو افراد کو مصر سے فرار ہو کر شام کے متعدد ایوبی فرمانرواؤں اور ایشیائے کوچک کے سلجوق حکمرانوں کے ہاں ملازمت اختیار



ابن مروان کے زیر نگیں آزاد و خود مختار تھے۔ فاطمی دور حکومت میں ایک مصری عامل ابو صالح کا نام سترے میں آتا ہے۔ المقریزی اور القلقشنندی کے زمانے میں، یا یوں کہیے کہ مملوکوں کے عہد میں، یہاں کا نظم و نسق براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت نہ تھا بلکہ جاگیرداروں کی وساطت سے چلایا جاتا تھا۔ ان نخلستانوں کو تقریباً ہر دور میں عرب اور بربر بدوؤں کے قزاقانہ حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض اوقات زیادہ جنوب کے نخلستان (اور غالباً بحریہ بھی؟) شاہانِ نوبیہ کی تاختوں کے ہدف بنے۔ صرف ادوارِ حاضرہ میں ان نخلستانوں کے مصری حکومت سے گہرے روابط قائم ہوئے ہیں۔ گزشتہ صدی کے ساتویں عشرے میں Schweinfurth وہاں گیا اور اس کے بعد سے یورپی سیاحوں کا وہاں اکثر جانا ہوا ہے۔

قدیم زبانوں میں ان نخلستانوں کی اہمیت آج کل کے مقابلے میں یقیناً بہت زیادہ ہوگی، چنانچہ اہلِ روما کے تعمیر کردہ کئی قدیم مندروں اور چھٹی صدی عیسوی کے ایک کلیسا کے کھنڈر اس کی گواہی دیتے ہیں۔ قبطی گرجا سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زمانہ مابعد میں بھی خاصی مدت تک نہایت آباد رہا۔ سنا جاتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کے ایک حواری کا جنازہ بیلوں کی جوڑیوں پر تابوت میں رکھ کر ایک باوقار جلوس کی صورت میں شہر کے بازاروں میں نکالا جاتا تھا۔ بلاشبہ یہاں حواری سے یا تو سینٹ بارٹلمی St. Bartholomew مراد ہیں (چنانچہ البکری، ص ۱۴، کی روایت کی اسی کے مطابق اصلاح کرنا) ہوگی یا غالباً سینٹ جارج St. George یا دونوں۔

مآخذ: (۱) البکری: المغرب، طبع de Slane،

ص ۱۴ ببعہ؛ (۲) الادریسی: المغرب،

ص ۴۴؛ (۳) ابوصالح، طبع Evetts، ورق ۹۳ الف،

۵ الف؛ (۴) المقریزی: الخطط، ۱: ۲۳۴ ببعہ؛

جنوبی نخلستانوں۔ داخلہ [رک باں] اور خارجہ [رک باں]۔ سے متمیز کیا جاتا ہے۔ ان دونوں مجموعوں کے درمیان ایک چھوٹا سا نخلستان فرقرۃ یا الفرافرہ واقع ہے (جسے بعض لوگ داخلہ ہی میں شامل کرتے ہیں)۔ البکری اور الیعقوبی نے اسے الفرقرۃ لکھا ہے۔ مذکورہ بالا تین بڑے نخلستانوں میں امتیاز قائم رکھنے کے لیے انہیں واح اولیٰ، واح وسطیٰ اور واح قصویٰ بھی کہا جاتا ہے۔ واح اولیٰ بحریہ ہے، جسے واح صغریٰ بھی کہتے ہیں۔ اسے بعض اوقات البہنسیۃ بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہاں اہلِ بہنسا کی آمد و رفت رہتی تھی۔ بہنسا الصعید اور بہنسا الواحات میں بہت پہلے، یعنی البکری (المغرب، ص ۱۴) کے زمانے سے فرق کیا جاتا ہے۔ Dictionnaire : Boinet Bey - Gèographique کے مطابق بحریہ صوبۃ المینیا کا ایک ضلع ہے۔ اس کی آبادی چھے ہزار ہے اور یہ مندرجہ ذیل چار قصبوں پر مشتمل ہے: الباویط، القصر، مندیشۃ اور الذبو۔

دوسرے نخلستانوں کی طرح بحریہ بھی انتہائی زرخیز ہونے کی وجہ سے مشہور ہے۔ قرون وسطیٰ میں یہاں کی کھجور اور منقہ کی بڑی شہرت تھی۔ علاوہ ازیں یہاں اناج، چاول، نیشکر اور بالخصوص نیل کی کاشت ہوتی تھی اور پھٹکری اور سبز توتیا بھی یہاں پایا جاتا تھا، اگرچہ مؤخرالذکر کے خاص بحریہ سے دستیاب ہونے کا ذکر نہیں آتا کیونکہ اس قسم کی معلومات میں سبھی نخلستانوں کا مجموعی طور پر حوالہ ملتا ہے۔ اس نخلستان کی شادابی اور زرخیزی کا باعث وہ گرم چشمے ہیں جن میں مختلف کیمیائی اجزا پائے جاتے ہیں۔

بحریہ کی تاریخ کے متعلق ہماری معلومات بہت قلیل ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ۹۴۳ھ/۹۴۳ء میں یہ نخلستان ایک بربری امیر عبدالملک

حوالے کتابیات میں دیے جائیں گے۔

بایں ہمہ مملوکی ماخذ میں بحریہ سے متعلق فنی معلومات فراہم کرنے میں جو کمی رہ گئی ہے اس کی تلافی بڑی حد تک یوں ہو جاتی ہے کہ ان کے ذریعے ہمیں ان معاشرتی اور نفسیاتی اسباب سے گہری آگاہی حاصل ہوتی ہے جو بحریہ کے بارے میں ممالیک کی روش کے ذمے دار تھے۔ چونکہ یہ اسباب کسی طرح بھی صرف مملوک معاشرے تک محدود نہ تھے، لہذا ان کا مطالعہ قرون وسطیٰ کی عام اسلامی تاریخ کے مطالعے میں بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

یہاں مندرجہ ذیل دو موضوعوں پر مختصر بحث کی جائے گی جو ایک دوسرے سے بہت مربوط بھی ہیں: (الف) بحریہ سے متعلق مملوکوں کا طرز عمل اور اس کے نتائج؛ (ب) اپنی بندرگاہوں اور ساحلی استحکامات سے متعلق ان کی حکمت عملی۔

(الف) جیسا کہ ایک اسپ سوار عسکری جماعت سے توقع ہو سکتی ہے، سمندر کے متعلق مملوکوں کی روش نہایت منفیانہ قسم کی تھی۔ بیبرس اول تک اس کلمے سے مستثنیٰ نہ تھا حالانکہ اچھے عام حربی مسائل پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی اور دوسرے مملوک سلاطین کی بہ نسبت اس نے بحریہ پر کہیں زیادہ توجہ دی: چنانچہ اس کے عہد میں مملوکوں کی بحری قوت اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ ۱۲۷۰ء میں اللیسون (Limasol) کے ساحل کے سامنے جب اس کا بیڑہ تباہی سے دو چار ہوا تو اس نے شاہ قبرص کو ایک خط لکھا جس میں اس نے خشکی پر حاصل ہونے والی سواروں کی فتح کی برتری اور فضیلت کشتی رانوں کی بحری کامیابی پر جتائی تھی۔ پھر مسلمانوں کی قوت اور یورپی مسیحیوں کی بحری طاقت کے درمیان اصلی فرق کو ان مختصر

حوالے کتابیات میں دیے جائیں گے: (۱) Wustenfeld، ص ۱۰۲؛ (۲) علی مبارک: ۱۱۳۳ بعد؛ (۳) Egypt: Baedeker (۸)؛ بار (۹) Géographie de l' Egypte: Amélineau (۹)؛ ۲۰۷؛ (۱۰) Prof. Dr. Ascher-Schweinfurth (۱۰)؛ ۲۹۰؛ (۱۱) Georg. Mittel، sons Reise nach der kleinen Osee، ۲۶۳؛ Guides Bleus (۱۱)؛ ۲۶۳؛ Egypt، برس ۱۹۵۶ء، ص ۵۰۷ تا ۵۰۸۔ (C.H. BECKER)

بحریہ: [بحری بیڑہ یا بحری فوج]۔

(۱) عہدِ بنی فاطمہ تک عرب بحریہ [دیکھیے تکملہ (۱)؛ لائڈن، طبع دوم]۔

(۲) ممالیک کا بحریہ: بحیرہ روم میں مسیحی یورپ کا بحری تفوق مسلمہ طور پر قائم ہو جانے کے بہت عرصہ بعد مملوک سلطنت وجود میں آئی، لیکن اس سلطنت کے سارے دور میں یہ تفوق اور بھی مستحکم ہوتا گیا۔ ان حالات میں مملوک سلاطین کو اس امر کا کچھ زیادہ موقع نہ مل سکا کہ وہ اپنی ہستی کا ثبوت پیش کر سکیں۔ ہمارے ماخذ میں ان بحری سرگرمیوں کا ذکر صرف اس وقت نمایاں طور پر ملتا ہے جب ہم ۱۲۷۰/۵۶۶۹ء میں قبرص پر سلطان الظاہر بیبرس کے ناکام حملے، یا ۱۳۲۳/۵۸۲۳ء تا ۱۳۲۶/۵۸۲۹ء اور ۱۳۳۳/۵۸۳۳ء میں قبرص اور جزیرہ ردوس Rhodes پر سلطان یزید کی مہمات، نیز ۱۵۰۷/۵۹۱۳ء اور ۱۵۱۵/۵۹۲۱ء میں پرتگالیوں کے خلاف بحری معرکہ آرائیوں کا تذکرہ پڑھتے ہیں۔ ان سے قطع نظر ایسی سرگرمیوں کا حال شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے؛ لہذا موجودہ معلومات کی بنا پر مملوکی بحری بیڑے جیسے بھی تھے، ان کی تاریخ یا ان کی ہیئت اور فرائض کے متعلق کچھ لکھنا محال ہے۔ مملوک بحریہ کے بعض فنی پہلوؤں کے ماخذ کے



مگر جامع الفاظ میں واضح کیا تھا کہ تم گھوڑوں کا کام جہازوں سے لیتے ہو اور ہم جہازوں کا کام گھوڑوں سے لیتے ہیں (سلوک، ۱: ۵۹۳، حاشیہ ۳)۔ اسی بحری شکست کی خبر ملنے پر اس کا فوری رد عمل بھی کچھ کم بصیرت افروز نہ تھا۔ اس نے خدائے عزوجل کا شکر ادا کیا کہ اس ذات پاک نے اتنی کثیر فتوحات دینے کے بعد نظر بد کو صرف اسی قدر اجازت دی کہ ایسا ہٹکا سا چشم زخم اسے پہنچائے! کیونکہ اپنی تمام بری فوج کو نظر بد سے بچانے کے لیے اسے صرف چند جہاز اور ان کا عملہ بھیٹ چڑھانا پڑا اور یہ جہازی بھی فقط فلاحین اور عوام پر مشتمل تھے (الخطط، ۲: ۱۹۴؛ سلوک، ۱: ۵۹۴؛ النہج السدید، در Patrologia Orientalis، ۱۲: ۵۴۲)۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ متذکرۃ الصدر لوگوں سے بلند تر طبقے اور حیثیت کے افراد بھی بحریہ میں ملازم تھے، لیکن اغلب یہ ہے کہ ان میں مملوک شامل نہ تھے، جنہیں بلند ترین معاشرتی طبقے میں شمار کیا جاتا تھا۔ جب اللمسون Limasol کے ساحل پر مملوکی بیڑہ برباد ہوا تو مملوکوں کے سب بحری سردار بھی فرینکوں (Franks) نے اسیر کر لیے۔ ان میں تینوں بندرگاہوں۔ سکندریہ، دمیاط اور روزیتہ کے رئیس (یا کپتان) بھی شامل تھے۔ قیدیوں کے ناموں کی ایک طویل فہرست ابن شداد الحلبي کی مشہور سوانح بیبرس میں محفوظ ہے (کتاب خانہ سلیمیہ، ادرنہ، عدد ۱۵۵۷، وقائع ۵۶۷۳: قب ترکی ترجمہ، از شرف الدین یلتقایا، استانبول ۱۹۴۱ء، ص ۴۶، جس میں ناموں کی فہرست حذف کر دی گئی ہے)۔ اس فہرست میں کسی ایک مملوک کا بھی نام نہیں ہے اور ان تمام قیدیوں میں سے کوئی شخص بھی اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ اس کے حالات

زندگی تحریر کیے جاتے۔ صرف یہی نہیں، مملوک عہد کے تاریخی ادب میں سوانح عمریاں اور تذکرے ہزاروں کی تعداد میں ملتے ہیں، لیکن ان میں سے ایک بھی کسی بحری کماندار کے نام سے معنون نہیں۔ المقریزی کا قول کہ ”اسطولی“ (بحریہ کا آدمی) کا لقب سلطان صلاح الدین کے بعد ایوبی عہد حکومت میں باعث توہین سمجھا جاتا تھا (خطط، ۲: ۱۹۷) مملوکی عہد پر بھی صادق آتا ہے۔

لکڑی اور دھاتوں کی قلت و کم یابی بھی مملوکوں کی بحری قوت کے ضعف کا بڑا باعث ہوئی۔ مصر کے ”جنگلات“، جو ہمیشہ سے نہایت تھوڑے رقبے پر محدود تھے، مملوکوں کے عہد میں غفلت و بے پروائی کے باعث عملاً ختم ہو گئے۔ شام کے شمال مغربی حصے اور بیروت کے نواح میں کچھ چھوٹے چھوٹے جنگلات تھے، جہاں سے جہاز بنانے کی لکڑی مل جاتی تھی۔ نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں مملوک سلاطین العجون سے بڑی مقدار میں عمارتی لکڑی منگواتے تھے، جو کہ جنوب مشرقی اناطولیہ میں واقع ہے۔ یہ لکڑی ان کے اپنے جہازوں میں بھاری فوج کے زیر حفاظت درآمد ہوتی تھی۔ معاصر مؤرخین یورپ سے عمارتی لکڑی کی درآمد کا ذکر شاذ و نادر ہی کرتے ہیں حالانکہ اس کی مقدار یقیناً معقول ہوگی۔ مملوکوں کی ساری سلطنت میں خام لوہے کا واحد مخزن بیروت کے قرب و جوار میں ایک چھوٹی سی کان تھی، جس کی ساری پیداوار مقامی کارخانہ جہاز سازی ہی میں صرف ہو جاتی تھی۔ دوسری دھاتیں سلطنت بھر میں ناپید تھیں۔

جہاز سازی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خام مسالے کا یہ فقدان یا قلت تھی، تاہم یہ بھی اس نفرت و اعراض کے مقابلے میں جو مملوکوں

آ رہا تھا، چنانچہ اسی سے مجبور ہو کر انہوں نے بعد تامل شامی و فلسطینی بندرگاہوں اور ساحلی استحکامات کو تباہ کر ڈالا۔ صلیبی جنگوں سے وہ رفتہ رفتہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کے بچاؤ کی صرف یہی ایک صورت رہ گئی ہے۔ ان استحکامات کی تباہی کا آغاز ایویوں کے ہاتھوں ہوا، مگر اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کا کام زیادہ تر مملوکوں نے سر انجام دیا۔ جنگ حطین (۵۸۳/۶۱۱۸۷) اور اس کے چند سال بعد رونما ہونے والے واقعات نے مسلمانوں کے رویے میں ایک انقلاب پیدا کر دیا کیونکہ اب ان پر یہ ثابت ہو گیا کہ فرینک خشکی پر ان کے ہاتھوں کامل شکست کھا جانے کے باوجود اپنی بحری فوقیت کی بدولت جنگ کا پانسہ پلٹ دینے پر قادر ہیں، چنانچہ ایویوں کی اس حکمت عملی کا آغاز یوں ہوا کہ ۵۸۷/۱۱۹۱ء میں سلطان صلاح الدین کے حکم سے عسقلان کو منہدم کر دیا گیا اور اس کے بعد ایک بے مثال عزم کے ساتھ [حفاظتی تدابیر اختیار کی جاتی رہیں]۔

مملوکوں نے برسرِ اقتدار آ جانے کے بعد شامی فلسطین کے ساحل پر بنے ہوئے تمام استحکامات یکے بعد دیگرے منہدم کرا دیے۔ یہ اقدامات تیرھویں صدی عیسوی کے وسط سے ۵۷۲/۱۳۲۲ء تک کیے گئے اور اسی دوران میں انہوں نے الاسکندرون کے حوالی میں ایاس بھی فتح کر لیا۔ کثیر التعداد ساحلی قلعوں میں سے ایک بھی باقی نہ بچا۔ ان میں سے چند ایک کے کھنڈروں پر بروج (مفرد: برج) تعمیر کر دیے گئے، جن کی غرض و غایت زیادہ تر یہ تھی کہ سمندر پر نظر رکھی جائے اور فرینکوں کی کسی امکانی یورش کے اولین حملے کی مزاحمت کی جائے۔

مزید برآں مملوکوں نے اپنا ساحلی دفاع محکم کرنے کے لیے یہ کوشش بھی کی کہ ساحل کے

کو سمندر سے بھی بالکل ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مملوکوں کا کوئی مستقل بحری بیڑہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ جب کبھی ان کے ہاں کوئی چھوٹا سا بیڑہ تیار کیا جاتا تو اس کا مقصد محض یہ ہوتا کہ فرینک بحری ڈاکوؤں کے نقصان رساں اور ذلت آمیز حملوں کے جواب میں قرار واقعی انتقامی کارروائی کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ نئے بیڑے کے تیار ہونے تک پہلا بیڑا مدتوں پہلے معدوم ہو چکا تھا۔ اندریں حالات صحیح معنی میں کسی بحری فوج کو ملازمت میں رکھنا ناممکن تھا، لہذا یہ امر ہرگز لائق تعجب نہیں کہ فرینک (Franks) جب چاہتے مسلمانوں کے سواحل پر ڈاکے ڈالتے اور پھر بغیر نقصان اٹھائے واپس چلے جاتے تھے۔ یہ حملے مسلمانوں پر عموماً بے خبری میں کیے جاتے تھے اور جب کبھی وہ اپنے حملے کا اعلان بھی کرتے تھے تو عموماً اس سے فریب دینا مقصود ہوتا تھا۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مملوکوں کی بحری قوت اور بھی بے حقیقت ہوتی گئی، نہ صرف اس لیے کہ سلطنت میں عام زوال آ گیا تھا بلکہ اس لیے بھی (اور بڑی وجہ یہی تھی) کہ بحری جنگ میں آتشیں اسلحہ کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ بحیرہ روم میں فرینکوں کا مسلم سواحل پر دباؤ شدید تر ہو گیا۔ ادھر بحر ہند میں جدید قسم کے بحری جہازوں کے چھوٹے چھوٹے پرتگالی بیڑے، جو اعلیٰ درجے کے توپ خانے سے مسلح ہوتے تھے، ان مملوک جہازوں کو بلاذقت تباہ کر ڈالتے جو ان کے مقابلے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ اس طرح انہوں نے ہندوستان اور مشرق اقصیٰ کے بحری راستوں پر کئی صدیوں کے لیے اقوامِ یورپ کے تسلط کا راستہ ہموار کیا۔

(ب) مسلمانوں کی بحری قوت پر مسلسل زوال



کے استحکامات کے متعلق ہمیں اتنی معلومات حاصل ہیں کہ شام و فلسطین کی اور کسی بندرگاہ کی نسبت میسر نہیں۔ اس دفاعی نظام کی جو کمزوریاں اس نے بیان کی ہیں وہ فی الواقع نہایت یاس انگیز ہیں (تاریخ بیروت، ص ۲۸ تا ۴۲، ۴۵، ۶۷ تا ۶۹، ۹۰ تا ۹۴، ۱۰۰ تا ۱۱۲، ۱۳۴، ۱۶۸، وغیرہ)۔

اس کے برعکس مصری ساحل کو بجنسہ سلامت رہنے دیا گیا تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی کے نصف اول میں تینیس کو مستقلاً برباد کر دیا گیا، لیکن دیماط کو منہدم کرنے کے بعد جلد ہی اسے ازسرنو تعمیر کر دیا گیا۔ مصری بندرگاہوں اور ساحلی استحکامات کو محفوظ رکھنے کے اسباب یہ تھے: (۱) مصر پر صلیبی جنگجوؤں نے بہت تھوڑے تھوڑے اوقات کے لیے حملے کیے؛ (۲) بیرونی ملکوں سے تجارت بحال رکھنا ملک کے وجود کے لیے انتہائی ضروری تھا (بیروت اور طرابلس کے احیا میں بھی اقتصادی مصالح کا بلاشبہ فیصلہ کن دخل تھا)؛ (۳) مملوک فوج کے تمام چیدہ دستے مصر میں (بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ قاہرہ میں) جمع کر دیے گئے تھے اور دارالحکومت سے وہ مصری ساحل پر کہیں بھی ضرورت محسوس ہونے پر فوراً پہنچائے جا سکتے تھے۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ مملوکوں کی توجہ مصری ساحل پر مبذول رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسکندریہ اور دوسری مصری بندرگاہوں میں بھی ادنیٰ درجے کی فوجیں متعین تھیں، جو ”حلقہ“ کہلانے والی روہہ تنزل غیر مملوک جمعیت اور قرب و جوار کے بدویوں پر مشتمل نہایت پرانی وضع کے اسلحہ سے مسلح تھیں۔ کسی شدید خطرے کے موقع پر مملوک سلاطین کو ان بندرگاہوں میں حفاظتی فوجیں متعین کرنا پڑتی تھیں تو وہ محض تھوڑے عرصے کے لیے وہاں ٹھہرتیں،

آس پاس ان کردوں، خوارزمیوں، ترکمانوں اور یورتوں (Oirats) وغیرہ کو آباد کر دیا جنہوں نے ان کے ملک میں پناہ لی تھی اور وافیہ کہلاتے تھے۔ مگر یہ کوشش عمومی طور پر ناکام رہی کیونکہ وافیہ جلد ہی مقامی آبادی میں گھل مل گئے اور ان کی جداگانہ حیثیت ختم ہو گئی، البتہ خاصی بڑی مدت تک صرف ترکمانوں کا ساحل کے محافظوں کے طور پر ذکر آتا ہے۔

شامی فلسطینی سواحل کے کئی شہر نہایت زوال کی حالت میں رہے۔ ان میں سے بعض تو بالکل نابود ہو گئے اور بعض ماہی گیری کی چھوٹی چھوٹی بندرگاہیں بن کر رہ گئے، البتہ معدودے چند ایسے تھے جن کی رونق بہت جلد بحال ہو گئی۔ ساحل کا مکمل طور پر تباہ شدہ اور انتہائی ویران حصہ وہ تھا جو صیدا کے جنوب سے شروع ہو کر العریش تک، یعنی اگر سرسری طور پر دیکھا جائے تو فلسطین کے ساحل پر پھیلا ہوا ہے۔ عسقلان، آرسوف، قیساریہ اور عثلیث کی بستیاں زمانہ قریب تک ویران رہیں۔ حیفا کے احیا کا آغاز سلطنت مملوک کے کئی سال بعد ہوا۔ اسی طرح یافا اور عکا مملوکوں کے عہد اور ابتدائی عثمانی دور حکومت تک صرف معمولی سے گاؤں تھے۔ اس تمام علاقے کی مکمل بربادی کا بڑا سبب بلاشبہ یہ تھا کہ ساحل کا یہ حصہ بیت المقدس کے قریب واقع تھا اور اس سے ملحقہ میدان ہموار اور مقابلہ وسیع و عریض تھا اور اس لیے یہ سمندر سے فوجیں اتارنے کے لیے ایک مثالی جگہ بن گئی تھی۔

اس تخریب کے بعد بیروت اور طرابلس ہی ایسے شہر تھے جو تقریباً جلد ہی دوبارہ آباد ہو گئے، لیکن پھر بھی ان کے دفاعی استحکامات پہلے کی طرح مستحکم نہ بن سکے۔ مؤرخ صالح ابن یحییٰ لائق تشکر ہے کہ اس کی بدولت بیروت

مذکورہ بالا مقالے میں اس کے ملاحظیات کے علاوہ دیکھیے  
 (۲) ابن تغری بردی: النجوم (طبع Popper) ۶۰: ۵۹۰  
 بعد و ۷: ۱۲۲ بعد؛ (۳) السخاوی: التبر، ص ۶۱ بعد،  
 ۸۷ بعد؛ (۴) ابن حجر، مخطوطہ سورہ بریطانیہ، عدد Add.  
 ۲۳۲۱، ورق ۳۶۱ ب تا ۳۶۶ ب؛ بحریہ، عملہ جہاز،  
 جہاز سازی اور جہازوں کی تعداد وغیرہ پر: (۵) ابن مساتی:  
 قوانین الدواوین، ص ۳۳۹ تا ۳۴۰: (۶) Beiträge zur  
 Geschichte der Mamlukensultane، طبع Zetterstéen،  
 ص ۵۶ س ۱۲ تا ۲۴؛ (۷) المفضل بن ابی الفضائل:  
 النہج السدید، در Patrologia Orientalis، ص ۱۳:  
 ۶۲۸ س ۶، ۶۲۹ س ۴؛ (۸) ایوالفنداء: کتاب  
 المختصر، ص ۶: ۶ س ۲۶ تا ۲۹؛ (۹) ابن کثیر:  
 البدایہ، ص ۱۳: ۳۲۰ س ۱۲ تا ۱۹؛ (۱۰) المقریزی:  
 السلوک، ص ۱: ۵۶ س ۶ تا ۱۳، ۷۷ س ۱۶ تا ۱۷، ۸۰  
 س ۹ تا ۱۰، ۱۰۲ س ۱۴ تا ۱۵، ۲۰۳ س ۱۲ تا ۱۳،  
 ۳۵۴ س ۱۲ تا ۱۴، ۴۵۱ س ۱۱ تا ۱۳، ۵۹۴ س ۲ تا  
 ۶۱۵، ۶۱۵ س ۴ تا ۱۰، ۸۷۵ س ۶ تا ۱۰، ۹۲۸ س ۱۱  
 س ۸، ۱۷ س ۲ و ۳: ۳۳ س ۴ تا ۵؛ (۱۱) ابن تغری بردی:  
 النجوم، قاہرہ، ص ۶: ۳۸ س ۶ تا ۷؛ ۳۶۹ س ۱۰ تا  
 ۱۱ و ۷: ۱۵۷ س ۸ تا ۱۰، ۲۲۶ س ۸، وہی کتاب (طبع  
 Popper)، ص ۵: ۱۹۹ س ۱۸ تا ۶۹۲: ۴۰۲، ۵۹۰ س ۲۰  
 تا ۲۸، ۵۹۱ س ۹، ۶۰۷ س ۱۸، ۶۰۸ س ۱، ۶۱۵ س  
 ۱۸ و ۷: ۱۳۴ س ۱۲ تا ۱۳، ۲۰۸ س ۱۲، ۲۱۰ س ۱۳،  
 ۵۴۸ س ۴ تا ۷، ۷۲۵ (حواشی)؛ (۱۲) ابن تغری بردی:  
 المنہل [الصابی]، ص ۲: ورق ۵۶ الف؛ (۱۳) وہی مصنف:  
 حوادث، ص ۳۴۱ س ۴ تا ۱۵، ۳۴۶ س ۱۱، ۳۴۷  
 س ۱۵؛ (۱۴) وہی مصنف: التبر، ص ۴۷ س ۱۵ تا ۱۶؛ (۱۵)  
 ابن الفرات: تاریخ الدول والملوک، ص ۹: ۲۶۵ س ۱۶؛  
 (۱۶) ابن ایاس: بدائع الزهور، طبع Kahle، ص ۴: ۱۰۳ س  
 ۱ تا ۶، ۲۱۲ س ۲ تا ۴، ۲۱۵ س ۱۹، ۲۱۶ س ۱،  
 ۲۳۸ س ۸ تا ۹، ۲۴۳ س ۱۸ تا ۱۹، ۲۴۶ س ۱۰ تا  
 ۲۵۶، ۲۵۶ س ۱۶، ۳۶۶ س ۹ تا ۱۰، ۳۶۶ س ۱۸ تا ۲۱

حتیٰ کم ۳۵۵ رومیوں جب اسکندریہ کو فرینکوں  
 کے خوفناک ترین حملے کا سامنا کرنا پڑا تو اس  
 کے بعد بھی وہاں کے دفاعی نظام میں کوئی مؤثر  
 تبدیلی لانے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔  
 اپنی مملکت کے اندرونی حصوں میں، جن  
 سے میری مراد زیادہ تر شام اور شام و فلسطین کے  
 کوہستانی اقطاع ہیں، مملوک سلاطین ایک بالکل  
 مختلف حکمت عملی سے کام لیتے رہے۔ وہاں  
 انہوں نے ان تمام قلعوں کو پورے نظم و ترتیب کے  
 ساتھ از سر نو تعمیر کیا جنہیں منگولوں کے ہاتھوں  
 یا صلیبی جنگجوؤں سے لڑائیوں کے دوران میں  
 نقصان پہنچا تھا یا منہدم ہو گئے تھے، چنانچہ  
 ”قلعہ“ کی اصطلاح، جو ساحلی علاقوں پر سننے  
 میں بھی نہیں آتی تھی، اندرونی علاقے میں  
 بہت دور دراز اور غیر معروف مقامات تک کے لیے  
 اکثر استعمال ہوتی رہی ہے۔

مآخذ: (الف) (۱) اوزون چرشیلی:

عثمانی دولتی تشکیلاتہ مدخل *Osmanli Devleti*  
*Teşkilatına Medhal*: استانبول ۱۹۴۱ء، ص  
 ۴۶۳ تا ۴۶۵؛ (۲) زیادة *The M. M. Ziada*  
*Mamluk Conquest of Cyprus in the Fifteenth*  
*Century* در *Bulletin of the Faculty of Arts* جامعہ  
 مصر، ۱ (۱۹۳۳ء): ۹۰ تا ۱۰۳ و ۲ (۱۹۳۴ء): ۳۷ تا  
 ۵۷، قب اس مقالے میں کتابیات سے متعلق مفصل حواشی؛  
 (۳) *The Wāfidiya in the Mamluk Kingdoms*: D. Ayalon (۲)  
 در *Islamic Culture*، ۲۵ (۱۹۵۱ء): ۸۹  
 تا ۱۰۴؛ (۴) وہی مصنف: *Gunpowder and Firearms*  
*in the Mamluk Kingdom*، لندن ۱۹۵۶ء، ص ۷۷ تا ۸۲  
 (مملوکوں اور پرتگالیوں کے درمیان بحری جنگ و جدل)۔

(ب) مصری (بشمول مملوک) بحریہ اور جہاز سازی  
 کے کارخانوں کے بارے میں: (۱) المقریزی: الخطط، ۲: ۱۸۹  
 تا ۱۹۷؛ قبرص اور رودس پر مہموں کے متعلق زیادة کے



روم ایلی پہنچنے کے لیے امارت قرسی کے بار بردار جہازوں سے کام لیا جاتا تھا، جن کا اڈا جزیرہ نماے قیوطاغی Kapidaghi کے ساحل پر تھا۔ بحری بیڑے کی ضرورت کا احساس پہلی مرتبہ بایزید کے عہد سلطنت کے ابتدائی سنین میں ہوا جب وہ صارو خان، آیدین اور منتشا کی امارتوں پر، جو مغربی ایشیائے کوچک کے ساحلی اقطاع میں پھیلی ہوئی تھیں قبضہ کرنے کے بعد بحیرہ روم تک پہنچ گیا۔ مقبوضہ ریاستوں کے بیڑوں سے کام لیا گیا اور اس کے ساتھ ہی گلیپولی (Gallipoli) میں ایک اسلحہ خانہ بنایا گیا اور بحیرہ ایجہ میں بحری سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ گلیپولی کو ایک سنجق (ضلع) قرار دیا گیا اور وہ عثمانی امارت بحریہ (Admiralty) کا مرکز بن گیا۔ آگے چل کر چند اور سنجاق بھی اس کے ساتھ ملا دیے گئے اور اس طرح قپتان (قپودان) پاشا کی ایالت (صوبہ) تشکیل پائی۔ جہاز سازی صرف گلیپولی تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ بحیرہ مارمورا اور بحیرہ ایجہ کے سواحل پر نیز بحیرہ اسود کے ساحل کے بعض مقامات پر بھی ہوتی تھی؛ لہذا بحری سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔

پہلی عثمانی بحری جنگ اہل وینس کے خلاف ۱۵۱۹ء / ۱۴۱۶ء میں ہوئی، جس میں عثمانی قپتان پاشا گلیپولی کی سنجق کا حاکم چالی بے تھا۔ یہ لڑائی جزیرہ مرمرہ اور گلیپولی کے درمیان کسی مقام پر ہوئی۔ عثمانی بیڑے کو شکست ہوئی اور چالی بے مارا گیا۔ وینس کا امیر البحر پیٹرو لوریدانو Pietro Loredano نے آنکھ پر زخم کھایا۔ دوسرے سال بوزنطی شہنشاہ کی ثالثی سے صلح ہو گئی۔

اس کے بعد عثمانی بیڑہ برابر ترقی کرتا گیا پہلے تو اس نے سواحل بحیرہ ایجہ کے سامنے کے ان

و ۵ : ۸۱ س ۱۹ تا ۲۳؛ (۱۷) صالح بن یحییٰ : تاریخ بیروت، ص ۳۱ س ۳۳، ۱۶ س ۳۳، ۱۵ تا ۳۳، ۱۵ س ۳۳، ۱۶ س ۳۵، ۸ س ۳۶، ۲ س ۳۶، ۳ تا ۳۶، ۳ س ۳۶، ۳۸ س ۳۸، ۱۲ س ۳۸، ۱۶ تا ۱۹، ۱۰۱ س ۱۰۱، ۱۰۲ س ۱۰۱، ۱۸۱، ۲۳۸؛ (۱۸) ابن حجر : الدرر الكامنة، ص ۳۳۸ س ۳۳۹، ۱۸ س ۳۳۹؛ (۱۹) القلقشنندی : صبح الاعشی، ص ۶۳ س ۱۸؛ (۲۰) المقریزی : الخطط، ص ۲۶ س ۱ تا ۱۸ و ۲ : ۱۸۹ س ۱۲ تا ۱۵، ۱۹۵ س ۶ تا ۸؛ (۲۱) الظاہری : زبده، ص ۱۳۹ تا ۱۴۰، ۱۴۲ س ۲ تا ۷؛ (۲۲) ابن حجر العسقلانی : انباء، مخطوطہ موزة بریطانیہ، عدد Add. ۲۳۲۱، ورق ۳۶۲ س ۸ تا ۱۰۔

(ج) مصادر کے لیے، جہاں سے جہاز سازی کے لیے عمارتی لکڑی آتی تھی، دیکھیے (۱) الخطط، ص ۱۱۰ س ۱۱۰، ۳۷ س ۱۱۱، ۲ س ۲۰۳، ۲۰۳ س ۲۷۲ تا ۲۷۹ و ۲ : ۱۸۵ س ۵ تا ۸، ۱۹۳ س ۱۰ تا ۱۳؛ (۲) النجوم، طبع Popper، ص ۲۸۶ س ۲، ۳۸۷ س ۲، ۳۸۷ س ۳، ۳۹۲ س ۱۳ تا ۱۶؛ (۳) حوادث، ص ۹۶ س ۱۱، ۹۷ س ۱۱۵، ۱۱۵ س ۱۰ تا ۱۱، ۱۲۹ س ۸ تا ۱۱، ۲۵۵ س ۳ تا ۵، ۳۰۱ س ۳ تا ۵، ۳۷۰ س ۲ تا ۹؛ (۴) ابن کثیر، ص ۱۳ : ۳۱۵ س ۲۳ تا ۲۵، ۳۲۰ س ۱۲ تا ۱۹؛ (۵) ابن ایاس، ص ۲ : ۵۳ س ۱۹ تا ۲۰، ۵۹ س ۱۱ تا ۱۲، ۶۳ س ۱۷ تا ۲۶ و ۳ (طبع Kahle) : ۱۳۱ و ۱۳۲ : ۱۶۳، ۱۶۳، ۱۸۳ س ۲۱، ۱۸۳ س ۱، ۱۸۵، ۱۹۱؛ (۶) ضوء الصبح، ص ۲۹۵؛ (۷) صبح الاعشی، ص ۱۲۳ س ۳ تا ۷ و ۸ : ۲۲۶ و ۱۲ : ۱۲۲ و ۱۳ : ۶۸؛ (۸) السیوطی : حسن المحاضرة، ص ۲۳۳ س ۲۰ تا ۲۱۔

(D. AYALON)

۳۔ عثمانی بحریہ : سلطنت عثمانیہ کے قیام سے بایزید اول (۱۳۸۹ تا ۱۴۰۲ء) کے زمانے تک بحیرہ مارمورا (Marmara) اور سواحل بحر ایجہ (Aegean) کا ایک حصہ اس کی حدود میں شامل رہا ہے۔ سمندر کے اُس پار صوبہ

کرنے پڑے جو ان کے لیے نہایت شرمناک تھا۔ سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں قپتان پاشا، یعنی بحری افواج کی قیادت، پر ایسے لوگوں کے بے تکیہ تقررات سے عثمانی بیڑہ کمزور ہو گیا جنہیں بحریہ کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ سترہویں صدی عیسوی کے آغاز سے اہل وینس نے چپو سے چلنے والی کشتیوں کے بجائے باد بانی جہازوں کا بیڑہ تیار کر لیا، مگر عثمانی بحریہ کو چپوؤں کے استعمال ہی پر اصرار رہا۔ کچھ تو اس بنا پر اور کچھ اس لیے کہ جہاز کا عملہ ایسے افراد پر مشتمل تھا جو بعبیر بھرتی کیے گئے تھے اور جنہیں جہاز رانی سے کوئی وابستگی نہ تھی، وہ کچھ کامیاب نہ رہ سکا، حتیٰ کہ تینی دوس (تیندوس Tenedos) اور لمنوس Lemnos کے جزیرے دشمنوں کے قبضے میں چلے گئے۔

بالآخر ۱۶۸۲ء میں قرہ مصطفیٰ پاشا مرزینوفی کی وزارت عظمیٰ کے دور (۱۶۷۶ تا ۱۶۸۳ء) میں یہ اصول تسلیم کر لیا گیا کہ بحریہ بادبانی جہازوں ہی پر مبنی ہوگا (اور یہ وہ اصول تھا جو بہت عرصے سے سلطنت عثمانیہ کی باجگزار ولایت الجزائر کے بحری بیڑے میں اختیار کیا جا چکا تھا)۔ اس طرح بحیرہ روم میں اہل وینس والوں کے مقابلے میں طاقت کا توازن قائم رکھنے کی صورت نکلی اور ۱۱۰۶ھ/۱۶۹۵ء میں ان سے جزیرہ خیو (Chios) واپس لے لیا گیا۔ ۱۷۰۱ء میں ایک قانونِ ہمایونی بادبانی جہازوں، ان کے کپتانوں اور عملے کے متعلق جاری کیا گیا۔

اٹھارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اہل وینس سے، جن کی بحری طاقت کمزور ہو چکی تھی، کوئی لڑائی نہیں ہوئی، البتہ مغربی بحیرہ روم میں بحری سرگرمی زیادہ تر انگریزی اور فرانسیسی بیڑوں کی طرف منتقل ہو گئی۔ روس و ترکیہ کی جنگ کے دوران میں، جو ۱۱۸۲ھ/۱۷۶۸ء میں شروع

جزائر کو اپنے زیر اثر کیا، اہل وینس نے اپنی نو آبادیاں قائم کر سکی تھیں، پھر ۱۸۶۰ء/۱۸۵۶ء میں اس نے بندرگاہ انیز اور جزائر ایمبروس Imbros، طاشو یا ٹاسوس Thasos، ساموتراس Samo-thrace اور لمنی (= لمنوس Lemnos) کو اور ۱۸۶۶ء/۱۸۶۲ء میں لسبوس Lesbos پر قبضہ کیا۔ اس تاریخ کے تھوڑے ہی دن بعد وینس سے سخت لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جزیرہ یوبیہ Euboea، جو وینس والوں کا نہایت اہم فوجی اڈا تھا، ترکوں نے فتح کر لیا اور محمد ثانی کے عہدِ حکومت کے آخری دنوں میں جزائر ایونیہ (Ionian Islands) بھی فتح ہو گئے۔

سلطنت عثمانیہ کے بیڑے کی دھاک پہلے سے بیٹھ چلی تھی جب کہ خیرالدین ("باربروسہ")، والی الجزائر، اس کی ملازمت میں منسلک ہوا۔ اس کی خدا داد قابلیت نے سلطنت عثمانیہ کی بحری طاقت کو اعلیٰ ترین مقام پر پہنچا دیا اور پرویزہ Preveza کی جنگ (۱۱ جمادی الاولیٰ [۱۵۹۰ء] / ۲ ستمبر ۱۵۳۸ء) سے وہ بحیرہ روم پر کاملاً مسلط ہو گئی۔ لیپانتو Lepanto کی شکست (۱۱۵۲۱ / ۱۵۷۱ء) میں سلطنت عثمانیہ کا بیڑہ تلف ہو گیا تھا، لیکن آئین اُجقلق odjaklik کی بدولت انتہائی قلیل مدت، یعنی صرف پانچ مہینے میں ایک بیڑہ وجود میں آ گیا (آئین مذکور کی رو سے ہر مقررہ علاقہ اسلحہ کے ذخیرے کے علاوہ جہاز سازی کے لیے کوئی خاص جنس مہیا کرنے کا ضامن ہوتا تھا، مثلاً جزیرہ ٹاسوس Thasos کے ذمے لمنوس کے کارخانہ جہاز سازی کے لیے صنوبر کی لکڑی کا فراہم کرنا تھا: دیکھیے اوزون چرشیلی: عثمانی دولتیں مرکز و بحریہ تشکیل داتی، انقرہ ۱۹۳۸ء، بالخصوص حاشیہ ص ۴۴۹)۔ اس نئے بیڑے نے اہل وینس کو صلح کرنے پر مجبور کر دیا اور انہیں ایک ایسے معاہدے پر دستخط ثبت



قدر جوش و خروش سے بنایا گیا تھا، اس تساہل کے باعث جو ان دنوں عام تھا، تغافل کا شکار ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سلطنت عثمانیہ کو، جو تین براعظموں کے طویل ساحلوں پر قابض تھی، شدید علاقائی نقصانات کا سامنا کرنا پڑا۔

چیپوں سے چلنے والے جہازوں کے دور میں عثمانی جہازوں کی بڑی بڑی اقسام قادرغہ (galley)، قالیتہ (galliot) اور فرقتہ (frigate) تھیں۔ ایک ایک جنگی جہاز کا کماندار رئیس، چھوٹے بیڑے کا کماندار قپتان (Kaptan) اور پورے بیڑے کا سالار قپودان دریا کہلاتا تھا۔ قپودان دریا یا قپتان پاشا کے بڑے جنگی جہاز کو بشاردہ کہتے تھے۔ قادرغہ دو قسم کے ہوتے تھے: خاصہ قادر غلری اور بے قادر غلری۔ اول الذکر کو حکومت بنواتی تھی اور مؤخر الذکر کی تعمیر کا کام ایالت قپتان پاشا کے حاکمان سنجاق کے ذمے تھا۔

بادبانی جہازوں کو بیڑے کی اساس قرار دینے کے بعد اسے قپودان دریا کے ماتحت تین امرائے بحر کے سپرد کیا گیا، جو حسب مراتب بالترتیب قپودانہ (امیر البحر)، پترونیہ (نائب امیر البحر) اور ریالہ ("عقبی" امیر البحر) کہلاتے تھے۔ بڑے بادبانی جہاز بہ اعتبار جسامت مختلف ناموں سے موسوم تھے: نسبتاً بڑے جہاز قروت کہلاتے تھے اور چھوٹے فرقتین۔ اسی طرح دو قسم کے بادبانی جہاز اقی امبرلی قیق (iki ambarli kapak) اور اچ امبرلی (Üç ambarli) کے نام سے معروف تھے۔ آخر الذکر جہازوں کے عملے کو قلیون جو (Kalyondju) کہتے تھے اور اس میں عارضی ملاح (ایلق جی ayalkdjis)، جہازران (marinars؛ جو اسیران جنگ ہوتے تھے)، بادبانوں کی دیکھ بھال کرنے والے (ghabyars)، صنعت کار (رنگساز، بڑھئی، لہار، درزدوز) اور توپچی (sudaghabos) شامل ہوتے تھے۔

ہوئی، روسی بیڑہ، جسے انگریزوں نے بحیرہ بالٹک میں تیار کیا تھا، بحیرہ روم میں داخل ہو گیا اور ۱۱۸۳ھ / ۱۷۷۰ء میں چشمہ کی بندرگاہ میں عثمانی بیڑے کو عملاً ختم کر دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۳ء میں معاہدہ کوچک قینارجہ کے بعد امور بحریہ کو نمایاں اہمیت دی گئی اور دارالصنائع حربی (Arsenal) میں ایک مدرسہ مہندسی (engineering) کھولا گیا، جس کے عملے کے لیے یورپ سے ماہرین بلائے گئے۔ سلیم ثالث کے عہد حکومت (۱۷۸۹ء تا ۱۸۰۷ء) میں کوچک حسین پاشا کی پر جوش مساعی کی بدولت عثمانی بیڑے کو جدید ترین طریقوں سے مسلح کرنے کے مسئلے کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی۔ مدرسہ مہندسیہ بحریہ کو وسعت دی گئی اور ایک نیا مدرسہ مہندسیہ حریمیہ جاری کیا گیا۔ محمود ثانی کے دور حکومت میں بیڑے کی طرف سے تغافل تو نہیں برتا گیا، مگر گونا گوں داخلی و خارجی اسباب کے باعث اس کی ترقی رک گئی۔ بایں ہمہ مدرسہ مہندسیہ بحریہ میں بحری کمانداروں اور جہاز سازوں کی تربیت جاری رہی۔ ۱۲۳۳ھ / ۱۸۲۷ء میں مورہ (Peloponnese) کی بغاوت اور اس مدد کی بنا پر جو اسے برطانیہ، فرانس اور روس کی طرف سے ملی، عثمانی بیڑہ خلیج ناوارین (Navarino) میں تباہ کر دیا گیا۔ اس عظیم نقصان کے باوجود بحری سرگرمی موقوف نہیں ہوئی اور ۱۲۳۳ھ / ۱۸۲۸ء میں Heybeliada [؟] میں ایک بحری تعلیم گاہ (اکادمی) کا افتتاح کر دیا گیا۔ سلطان عبدالعزیز کے عہد حکومت (۱۸۶۱ تا ۱۸۷۶ء) میں سلطان نے فوج اور بحری بیڑے کو بہت اہمیت دی، چنانچہ عثمانی بحریہ میں ایک بار قوت اور استحکام پیدا ہو گیا۔ مگر سلطان عبدالحمید ثانی کے عہد (۱۸۷۶ تا ۱۹۰۹ء) میں یہ بیڑہ بھی، جو اس

ماخذ: (۱) فوزی کورت اوغلی Fevzi Kurtoglu :  
 قورک لرن دینز محاربه لری، استانبول ۱۹۳۰ تا  
 ۱۹۳۰ء؛ (۲) اوزون چرشیلی : عثمانی دولتمن  
 مرکز و بحریہ تشکیلاتی، انقرہ ۱۹۳۸ء؛ (۳) وہی مصنف:  
 عثمانلی قاریخی، ج ۱ و ۲، انقرہ ۱۹۳۹ تا ۱۹۵۳ء؛ (۴)  
 کاتب چلبی: تحفة الکبار فی أسفار البحار، استانبول ۱۷۲۸ء  
 و ۱۹۱۳ء (ابواب ۱ تا ۳ کا انگریزی ترجمہ، از  
 J. Mitchell، بعنوان: *History of the Maritime Wars of  
 the Turks*، لندن ۱۸۳۱ء؛ (۵) محمد شگری:  
 اسفار البحریة عثمانیہ، استانبول ۱۳۰۶ھ؛ (۶) سلیمان نطقی:  
 قاموس البحری، استانبول ۱۹۱۷ء؛ (۷) میر میراوغلی:  
 فاتحن دونمہ سی و دنز سواشلیری، استانبول  
 ۱۹۳۶ء؛ (۸) علی حیدروف - گرد اوغلی: *Türklerin  
 deniz harp sanatına hizmeti*، استانبول ۱۹۳۳ء؛ (۹)  
 باش وکالت آرشیوی: مہمہ دفتری، عدد ۱۱۲، ۱۲۰،  
 ۱۲۱، ۶؛ (۱۰) دستاویزات بحریہ، در معلّم جودت:  
 تصنیف؛ (۱۱) [مختلف] خطّ عمایوں؛ (۱۲) دنز مکتبی  
 تاریخچہ سی؛ (۱۳) *Records of: Sir Adolphus Slade*  
*Travel in Turkey, Greece, etc.*، لندن ۱۸۳۳ء؛  
 (۱۴) *Naval Wars in the Levant: R. C. Anderson*  
 پرنسٹن ۱۹۵۲ء؛ (۱۵) *Kemal-Re'is: H.A. von Burski*  
*ein Beitrag zur Geschichte der türkischen Flotte*  
 بون ۱۹۲۸ء؛ (۱۶) *Das Fürstentum: P. Wittek*  
*Mentesche*، استانبول ۱۹۳۳ء، بمدد اشاریہ (بذیل مادہ  
 Korsaren)؛ (۱۷) *Riyāla: J. Deny*، در ۱۹۱۷ء، طبع اول؛  
 (۱۸) *Lettres sur la Turquie: Ubicini*، مکتوب  
 عدد ۲۰.

(I. H. UZUNÇARŞILI)

بحشل: [ابوالحسن] اسلم بن سہل [بن اسلم] \*  
 بن زیاد بن حبیب الرزازی الواسطی، محدث، حافظ،  
 مؤرخ اور واسط کی ایک تاریخ کا مؤلف۔ اس کی  
 زندگی کے متعلق کچھ معلوم نہیں، البتہ اس کے

استانبول کے دارالصنائع بحریہ میں قہان پاشا  
 کے تحت ترسانہ کتخداسی اور ترسانہ امینی کے عہدے  
 تھے اور ان کے بعد دوشرے اور تیسرے درجے کے  
 عہدیدار آتے تھے۔ دارالصنائع کے محاسب کا لقب  
 جانب افندی تھا۔ بادبانوں کا استعمال شروع ہونے  
 تک ترسانہ کتخداسی کا درجہ نائب امیر البحر کا  
 ہوتا اور دارالصنائع میں نظم و ضبط قائم رکھنا  
 اس کا فرض تھا۔ ترسانہ امینی کو باب عالی میں  
 تربیت دی جاتی تھی اور وہ بیڑے اور دارالصنائع  
 کے سامان کی بہم رسانی اور آمد و خرچ کا ذمے دار  
 تھا۔ یہ عہدہ ۱۸۳۰ء میں ختم کر دیا گیا اور اس  
 کے فرائض قہان پاشا کو تفویض کر دیے گئے۔

۱۸۳۱ء میں بری اور بحری افواج دونوں میں  
 نئے عہدے نکالے گئے۔ ۱۸۵۱ء میں وزات بحریہ  
 (بحریہ نظارتی) کا قیام عمل میں آیا اور اس کی تحویل  
 میں وہ تمام مالی اور انتظامی امور دیے گئے جو اس  
 سے قبل ترسانہ امینی کے ذمے تھے۔ قہودان دریا کا  
 خطاب بھی منسوخ کر دیا گیا اور اس کی جگہ  
 بیڑے کی ایک مجلس حاکمہ بنا دی گئی۔ جون  
 ۱۸۷۶ء میں قہودان دریا کا خطاب پھر بحال کر دیا  
 گیا۔ بالآخر ۱۸۸۱ء وزیر بحریہ اور سپہ سالار اعظم  
 بحریہ کے منصب یکجا کر کے ایک ہی شخص کے  
 سپرد کر دیے گئے، جسے "مشیر" کا رتبہ حاصل  
 تھا۔ سلطنت عثمانیہ کے اختتام تک یہ انتظام برابر  
 جاری رہا۔

۱۹۲۲ء میں انقرہ میں مجلس ملی کبیر کے  
 قیام کے بعد وزات بحریہ (بحریہ وکالتی) بنا دی گئی۔  
 ۱۹۲۷ء میں جب اس وزات کو ختم کر دیا گیا تو  
 امور بحریہ وزارت دفاع ملی کی تحویل میں آگئے۔  
 اس وقت سے ان کا انصرام ایک محکمے کے سپرد ہے  
 جس کا سربراہ ایک مستقل مستشار (انڈر سیکرٹری)  
 ہوتا ہے۔



مرحلے سے ضرور ہے۔

مآخذ: یاقوت: ارشاد، ۲: ۲۵۶؛ (۲) الذہبی، میزان، قاہرہ ۱۳۲۵ھ، ۱: ۹۸؛ [(۳) وہی مصنف: تذکرۃ الحفاظ، ۲: ۲۱۲؛ (۴) الصفدی: الوافی؛ (۵) ابن حجر: لسان المیزان، ۱: ۳۸۸؛ یعد؛ قب (۶) وہی مصنف: معجم المفہرس مخطوطہ قاہرہ، "مصطلحات الحدیث"، عدد ۸۲، ۱۰۲؛ (۷) براکلیمان: تکملہ، ۱: ۲۱۰؛ (۸) F. Rosenthal: A History of Muslim Historiography، لائنڈن ۱۹۵۲، ص ۸۳، ۱۳۴؛ یعد، ۴۰۶؛ [(۹) عمر رضا کچالہ: معجم المؤلفین، دمشق ۱۹۵۷، ۲: ۲۵۳].

(F. ROSENTHAL [و ادارہ])

البَحْرُوث: قرآن مجید کی نویں سورۃ [التوبہ] کا ایک اور نام [رکبہ البراءة]۔  
 بحیرا: بعض کے نزدیک بحیری (ابن کثیر)؛  
 ایک عیسائی راہب، تورات و انجیل کا بڑا عالم؛  
 شام کے شہر بصری کے اس مشہور گرجا کا پادری جو عیسائی علما کا بڑا تبلیغی اور دینی مرکز تھا (ابن سعد)۔ دیگر یہودی اور عیسائی علما کی طرح بحیرا نے بھی نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بابت بہت سی بشارات اور علامات اپنی کتابوں میں پڑھی تھیں اور اسی وجہ سے اہل کتاب کے باخبر حلقے ایک نبی موعود کے منتظر تھے (دیکھیے ابن سعد، ۱/۱: ۱۰۳؛ یعد؛ البخاری، کتاب ۱، باب ۶؛ الترمذی، ابواب المناقب، باب ۱؛ الدارسی، مقدمہ، باب ۱)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بارہ برس کی عمر میں اپنے چچا ابو طالب کے ہمراہ ملک شام کو گئے۔ ان کا قافلہ بصری میں فروکش ہوا۔ ان کی منزل کے قریب بحیرا راہب کا گرجا تھا۔ بحیرا اکثر وہاں سے گزرنے والے قافلوں سے بات چیت کا روا دار نہ تھا، مگر اس مرتبہ خلاف معمول یہ

چند رواۃ کے نام ملتے ہیں، جن میں سے وہب بن بقیۃ (۵۱۵۵/۵۷۷ تا ۵۲۳۹/۵۸۵۳) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اس کا نانا تھا (لیکن قب الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۱۳: ۳۸۸ س ۳ تا ۴) اور یہ کہ اس کی وفات کی تخمینی تاریخ ۵۲۸۸/۵۹۰۱ اور ۵۲۹۲/۵۹۰۵ کے درمیان معلوم ہوتی ہے۔

واسط کی مذکورہ بالا تاریخ ہمیں ایک نامکمل مخطوطے کی شکل میں دستیاب ہوئی ہے جو قاہرہ میں موجود ہے (تیمور: تاریخ، عدد ۱۳۸۳)۔ اس مخطوطے کی اپنی تاریخ بہت دلچسپ ہے اور اس کا جن لوگوں سے تعلق رہا ہے ان کی بدولت یہ اچھی خاصی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ ہمارے پاس یہ قدیم ترین تاریخ ہے جو رواۃ کی ثقافت جانچنے کے سلسلے میں علمائے حدیث کی رہنمائی کے لیے لکھی گئی۔ واسط اور اس کے گرد و پیش کی مختصر سی ابتدائی تاریخ بیان کرنے کے بعد اس کتاب میں ان علمائے دین کا تذکرہ ملتا ہے جن کا واسط کے ساتھ کوئی تعلق رہا ہے اور جو مصنف کے ساتھ رواۃ کے ایک غیر منقطع سلسلے میں منسلک بھی ہیں۔ یہ سوانح علمائے حدیث کی "قرون" کے مطابق بہ ترتیب زمانی مرتب کی گئی ہیں (کتاب میں زیادہ عام لفظ "طبقہ" کے بجائے "قرن" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے)۔ ان رواۃ کی ذات کے متعلق معلومات بہت ہی کم دی گئی ہیں اور تذکرے کو اصولاً محدث کے نام، اس کے رواۃ و تلامذہ اور ان سے مروی ایک (کبھی کبھار ایک سے زیادہ) حدیث تک محدود رکھا گیا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد دنیائے اسلام میں تاریخی و سوانحی ادب کی جس مخصوص صنف پر نہایت شرح و بسط سے قلم اٹھایا گیا اس کتاب کا تعلق اگر اس کے آغاز کار سے نہیں تو اس کے سادہ اور ابتدائی

کیا تو اس نے اللہ کا واسطہ دے کر بہت سی باتیں دریافت کیں، حتیٰ کہ نیند تک کا حال پوچھ لیا اور آپؐ کے جوابات کو اپنی معلومات کے مطابق پایا۔ پھر دونوں آنکھوں کے درمیان دیکھا، نیز کپڑا اٹھا کر پشت مبارک پر دونوں کندھوں کے درمیان مہر نبوت دیکھی اور اپنے ہاں کی پیش گوئیوں کے مطابق پا کر اس کو بوسہ دیا۔ قریش یہ دیکھ کر چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ ابوطالب نے بھی خدشہ سا محسوس کیا۔ پھر راہب کے سوال پر ابوطالب نے بتایا کہ یہ لڑکا میرا بیٹا ہے۔ اس نے کہا: ”یہ تمہارا بیٹا نہیں ہو سکتا۔ اس کا باپ تو زندہ نہیں ہونا چاہیے“۔ اس پر ابوطالب نے بتایا کہ اس کی ماں حاملہ تھی جب کہ اس کا باپ فوت ہوا، پھر چند برس بعد اس کی ماں نے بھی وفات پائی۔ یہ سن کر بحیرا نے انہیں وطن واپس جانے اور یہودیوں سے محتاط رہنے کا مشورہ دیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ یہ لڑکا بڑا بلند اقبال اور عظیم الشان انسان ہوگا، اس کے حالات و علامات ہماری کتابوں میں موجود ہیں، یہودیوں کے حسد سے اسے بچائیے۔ ابوطالب آپ کو واپس لے آئے اور پھر کبھی سفر میں ساتھ نہ لے گئے (ابن سعد، ۱/۱: ۹۹ تا ۱۰۱)۔

ابن سعد کی یہ روایت باختلاف الفاظ و تفصیلات الطبری، ابن الاثیر، ابن ہشام، السہیلی، ابن خلدون، جامع الترمذی، مستدرک حاکم، میزان الاعتدال، زاد المعاد، اصابة، اور حجة الله البالغة میں موجود ہے۔ امام ترمذی نے روایت درج کرنے کے بعد اسے ”حسن غریب“ کہا ہے۔ ان کی روایت میں آنحضرتؐ کی بصری سے واپسی کے سلسلے میں حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ کا نام آیا ہے جو بقول ابن القیم غلط ہے، باقی حصہ درست ہے۔ مسند بزاز کی روایت میں حضرت ابوبکرؓ و بلالؓ کی جگہ رجل (ایک آدمی) آیا ہے (زاد المعاد، ۱: ۱۷)۔

قافلہ اس کی توجہ کا رخ کوزین گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بحیرا نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یاد دل سایہ افکن ہیں۔ جب قافلہ ایک ایک درخت کے نیچے فروکش ہوا تو بادل اس درخت پر بھی سایہ کیے تھا اور درخت کی ٹہنیاں بھی سرسبز و شاداب ہو کر آنحضرتؐ پر جھک گئیں۔ یہ حیرتناک بات دیکھ کر بحیرا نے ان کی دعوت کا انتظام کیا۔ کھانا تیار کرا، قافلے والوں سے جا درخواست کی کہ چھوٹے بڑے، آزاد غلام سب میرے ہاں تشریف لا کر عزت افزائی کریں۔ ایک آدمی نے پوچھ ہی لیا: ”اے بحیرا! پہلے تو تم نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا، آج کیا وجہ ہے؟“ بحیرا نے جواب دیا: ”میں تمہاری عزت و تکریم کے پیش نظر ایسا کر رہا ہوں۔ تم اس عزت و تعظیم کے حقدار ہو“؛ چنانچہ قریش اس کے ہاں جمع ہوئے، اور آنحضرتؐ کو کم سنی کی وجہ سے پیچھے چھوڑ گئے کیونکہ سارے قافلے میں آپ سے کم عمر اور کوئی نہ تھا۔ جب بحیرا نے نگاہ دوڑائی تو ان علامات میں سے کوئی علامت نہ پائی جس کے لیے وہ سب کچھ کر رہا تھا؛ پوچھا: ”کون غیر حاضر ہے؟“ قریش نے کہا: ”صرف ایک لڑکا یہاں موجود نہیں ہے۔ وہ سب سے چھوٹا ہے اور سامان کی حفاظت کر رہا ہے“، بحیرا نے آپ کو بلانے پر زور دیتے ہوئے کہا: ”کتی بری بات ہے کہ تم میں سے ایک آدمی پیچھے رہ جائے“؛ چنانچہ آپؐ کو بلا کر دسترخوان پر بٹھا دیا گیا۔ بادل بھی آپؐ کے ساتھ چلا آیا۔ بحیرا آپؐ کو بغور دیکھتا رہا۔ اس نے آپؐ کے جسم اطہر پر بھی نگاہ ڈالی اور وہ سب علامات و صفات موجود پائیں جن سے وہ آگاہ تھا۔ جب لوگ کھانا کھا کر چل دیے تو بحیرا آپؐ کے پاس آیا اور لات و عزی کا واسطہ دے کر پوچھنے لگا۔ آپؐ نے لات و عزی سے بیزاری کا اظہار



مآخذ: (۱) ابن سعد: طبقات ۱/۱: ۶۳، ۱۰۳ تا ۱۰۴؛ (۲) الترمذی: الجامع (ابواب المناقب، باب ۳: ما جاء فی بدء نبوة النبی)، اردو ترجمہ از بدیع الزمان: جائزة الشعوذي بترجمة جامع الترمذی، طبع مرتضوی، دہلی ۱۸۰؛ (۳) ابن ہشام: السیرة، مصر ۱۹۵۵ء، ۱: ۱۸۰ تا ۱۸۲؛ (۴) ابن حجر: اصابة، ۱: ۳۵۱؛ (۵) ابن القیم: زاد المعاد، مصر ۱۹۲۸ء، ۱: ۱۷؛ (۶) ابن الاثیر: الكامل، بیروت ۱۹۶۵ء، ۲: ۳۷؛ (۷) ابن کثیر: البداية والنهاية، مطبعة السعادة، مصر ۱۹۳۲ء، ۲: ۲۸۳ تا ۲۸۶؛ (۸) السهيلي، روض الانف؛ (۹) الذہبی: میزان الاعتدال، ۲: ۱۰۳؛ (۱۰) وعی مصنف: تلخیص المستدرک ۲: ۵۱۶؛ (۱۱) شبلي: سيرة النبی، ۱: ۱۳۱؛ (۱۲) محمد ابراہیم میر: سیرت المصطفیٰ، بار دوم، ۱: ۲۰۲ تا ۲۰۶؛ (۱۳) شاہ ولی اللہ: حجة اللہ البالغة، طبعة المنيرية، مصر ۱۳۵۵ھ، ۲: ۲۰۵؛ (۱۴) محمد خضریٰ: نورالیقین، مصر ۱۹۳۰ء، ص ۱۰؛ (۱۵) ابن خلدون: تاریخ، ۱: ۲۹۱، اردو ترجمہ از شیخ عنایت اللہ، لاہور ۱۹۶۰ء؛ (۱۶) الطبری: تاریخ، ۱: ۱۱۲۳ بعد؛ (۱۷) الواقدي: فتوح الشام، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ۱: ۹ تا ۱۲؛ (۱۸) امین دويدار: صور من حياة الرسول، مطبوعة دارالمعارف، مصر ۱۹۵۸ء، ص ۷۳ تا ۷۴؛ (۱۹) ابن الجوزي: صفة الصفوة، مطبعة دائر المعارف العثمانية، حيدرآباد (دکن) ۱۳۵۵ھ، ۱: ۲۲ تا ۲۳.

(عبدالقیوم)

بحیرة: چرے ہوئے کانوں والی اونٹنی یا بھیڑ \*

اور بکری۔ [یہ لفظ بحر سے مشتق ہے، جس کے معنی ہیں کانوں کو چیر دینا۔ ابن سیدہ کا قول ہے کہ بحر کا مطلب ہے اونٹنی یا بھیڑ بکری کا کان درمیان سے چیر دینا۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ لمبائی میں دو برابر حصوں میں چیر دینا؛ چنانچہ البحرۃ اس اونٹنی یا بھیڑ بکری کو کہتے تھے

حافظ ابن حجر کے نزدیک ترمذی کی اس روایت کے سب راوی ثقہ ہیں، البتہ کسی راوی کی غلطی سے حضرت ابوبکرؓ اور بلالؓ کے نام اس روایت میں درج ہو گئے ہیں حالانکہ وہ دوسری روایت کے الفاظ ہیں، جس کے مطابق آپ نے بیس برس کی عمر میں حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ شام کی طرف تجارتی سفر کیا۔ اس سفر میں بھی بحیرا راہب سے ملاقات اور علامات و آثار نبوت کا ذکر آتا ہے (اصابة، ۱: ۳۵۱)۔ امام ذہبی نے امام ترمذی کی روایت کو موضوع خیال کیا ہے اور بعض حصوں کو باطل ٹھہرایا ہے (تلخیص المستدرک، ۲: ۵۱۶)۔ شبلي نعمانی کے نزدیک بھی یہ روایت مرسل ہونے کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں (سیرة النبی، ۱: ۱۳۱) حالانکہ حافظ عراقی ایسے ماهر علمائے اصول حدیث کے نزدیک ”مراسیل صحابہ صحیح مذهب کی رو سے موصول کے حکم میں ہیں“۔ امام ترمذی کی روایت میں بحیرا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ”سیدالعالمین“، ”رسول رب العالمین“ اور ”رحمة للعالمین“ کے القاب استعمال کیے ہیں، نیز پتھروں اور درختوں کا سجدے کرنا علامت نبوت بتایا ہے۔ مزید برآں حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ کا قصہ بھی اس پر روشنی ڈالتا ہے کہ وہ سوق بصریٰ میں شریک ہوئے تو راہب نے ان سے آنحضرتؐ کی نبوت کے اعلان کے بارے میں استفسار کیا، جس کے باعث وہ مکے واپس آ کر حضرت ابوبکرؓ کی وساطت سے اسلام لے آئے (ابن سعد، ۱/۳: ۱۵۳)۔

مؤرخین و محدثین کی کثرت کے پیش نظر بحیرا راہب سے ملاقات کا واقعہ تو درست ہے البتہ بعض تفصیلات غلط فہمی کی وجہ سے شامل ہو گئی ہیں جن کی علمائے کرام نے وضاحت اور تنقیح کر دی ہے۔

محروم ہیں“ (۵ [المائدہ]: ۳۰)؛ [وقالوا هذه اَنْعَامٌ  
وَحَرِّثُ حَجْرًا لَا يَطْعَمُهَا إِلَّا مَنْ نَشَاءُ بِرِزْقِهِمْ وَأَنْعَامٌ  
حَرِّمَتْ ظُهُورُهَا وَأَنْعَامٌ لَا يَذْكُرُونَ اسْمَ اللَّهِ عَلَيْهَا  
إِفْتِرَاءً عَلَيْهِ سِيَجْزِيهِمْ بِمَا كَانُوا يَفْتُرُونَ وَقَالُوا مَانِي  
بَطُونُ هَذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمَحْرَمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا  
وَإِنْ يَكُنْ مِثْقَلُهُمْ فِيهِ شُرْكَاءٌ سِيَجْزِيهِمْ وَصَفِهِمْ أَنَّهُ  
حَكِيمٌ عَلِيمٌ] ”اور کہا کہ یہ کھیت اور چارپائے  
منوع ہیں۔ انہیں اس آدمی کے سوا کوئی نہیں کھا  
سکتا جسے ہم اپنے خیال کے مطابق کھلانا چاہیں اور  
اسی طرح کچھ جانور ہیں کہ (ان کے خیال میں) ان کی  
پیشہ (پر سوار ہونا یا سامان لادنا) حرام ہے اور کچھ  
جانور ایسے ہیں کہ (ذبح کرتے ہوئے) ان پر خدا کا  
نام نہیں لیتے کیونکہ خدا پر افترا کر کے انہوں  
نے یہ طریقہ نکال لیا ہے۔ وہ جیسی کچھ افترا پردازیاں  
کرتے رہتے ہیں، قریب ہے کہ خدا انہیں اس کی  
سزا دے۔ اور کہتے ہیں کہ ان چارپایوں کے پیٹ  
میں سے جو زندہ بچہ نکلے وہ صرف ہمارے  
مردوں کے لیے ہے، ہماری عورتوں کے لیے  
حلال نہیں۔ لیکن اگر وہ مردہ پیدا ہو تو اس کے  
کھانے میں (مرد و عورت) سب شریک ہیں۔ قریب  
ہے کہ خدا انہیں ان کی غلط بیانی کی سزا دے گا۔  
بلاشبہ وہ حکمت والا اور جاننے والا ہے“

(۶ [الانعام]: ۱۳۸ و ۱۳۹)۔

مآخذ: (۱) قرآن مجید کی متذکرۃ الصدر آیات

مبارکہ کی تفاسیر: (۲) لسان العرب، بذیل مادۃ بحر: (۳)

Einleitung i.d. Studium d arab. Sprache : Freitag

ص ۲۳۸ بعد: (۴) Wellhausen : Reste arab.

Heidentums، طبع ثانی، ص ۱۱۲ بعد: (۵) Rasmussen:

Additamenta، عربی متن: ص ۶۶ و ترجمہ: ص ۶۰۔

(A. J. WENSINCK) [واداوی]

بَحَيْرَة: (ع) بمعنی جھول، یہ بحر (سندس) کی

نہیں بلکہ بحرۃ کی غالباً تصغیر ہے۔ اس کا اطلاق ایک

جنس کے جانوروں کے لیے کیا گیا ہے (قَب تاج، بذیل  
مادۃ بحر)۔ بطورِ نکتہ یہ بھی کہا ہے کہ بحیرہ سائبہ  
کی بھی کو کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک بحیرہ صرف  
بھیڑ بکری (مادۃ) کے لیے خاص ہے، اونٹنی اس میں شامل  
نہیں (قَب تاج و لسان، بذیل مادۃ بحر): نیز دیکھیے  
مفردات: المعجستانى: غریب القرآن۔

قرآن مجید اور قدیم شاعری (اشعار  
جاہلیت، قَب ابن ہشام) سے پتا چلتا ہے کہ  
ایام جاہلیت میں عربوں کے ہاں مویشیوں  
سے متعلق بعض مذہبی رسوم کا رواج تھا، جن  
میں سے ایک تو یہ تھی کہ جانور کو بالکل  
آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا اور اس سے کچھ کام نہیں  
لیا جاتا تھا اور دوسری یہ کہ (جانور کے مرجانے پر)  
اس کا گوشت کھانے کے مجاز صرف مرد ہوتے  
تھے۔ مختلف صورتوں میں جانوروں کے مختلف نام  
ہوتے تھے (بحیرۃ، سائبہ، وصیلۃ، حامی: ان ناموں  
کے سلسلے میں دیکھیے ولہاؤزن Wellhausen کا حوالہ،  
درمآخذ)۔ اہل لغت میں اس بات پر اختلاف رائے  
ہے کہ اونٹنی یا بھیڑ بکری کے کان کن حالات  
میں چیرے جاتے تھے۔ بعض کے نزدیک کان اس  
وقت چیرے جاتے تھے جب مادہ دس بجے جن  
چمکتی تھی۔ دوسروں کے نزدیک کان اس صورت میں  
چیرے جاتے تھے جب اس کا پٹانچواں بچہ  
مادہ ہوتا تھا وغیرہ وغیرہ [دیکھیے لسان]۔  
قرآن مجید نے ان رسوم کو ختم کر دیا اور انہیں بدعت  
قرار دیا: [مَا جَعَلَ اللَّهُ مِنْ بَحَيْرَةٍ وَلَا سَائِبَةٍ وَلَا وَحِيلَةٍ وَلَا  
حَامٍ وَلَا لَكِنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا يَفْتُرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذِبَ  
وَكَثُرُهُمْ لَا يَطْلُونُ] ”بحیرۃ اور سائبہ اور وصیلۃ اور  
حامی میں سے کوئی چیز بھی خدا نے نہیں ٹھیرائی  
ہے، لیکن جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی وہ اللہ  
پر جھوٹ کہہ کر افترا کرتے ہیں اور ان میں  
زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو سچے بوجھ سے



اس کی رعایا نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو اس نے تخت و تاج سے محروم ہونے اور مر جانے سے تھوڑی دیر پہلے اپنی بہن کے دو بچوں کو اسی جھیل میں ڈبو دیا تھا۔ جب بلنسیہ کے حصے بخرے ہو گئے تو جیمز اول (الفاتح، ۱۲۷۶ء) نے البحیرہ (Albufera) کی جاگیر اپنے لیے مخصوص کر لی۔ انیسویں صدی کے شروع میں شاہ ہسپانیہ نے اپنی یہ نفیس جاگیر گوڈائے Godoy کو دے دی اور نپولین نے اسے مارشل سیوشے Suchet کو پیش کیا۔ آگے چل کر یہ ایک دفعہ پھر قومی ملکیت قرار دے دی گئی۔

الموحدون کے زمانے میں لفظ بحیرہ ایک نہری باغ کے معنی میں آتا تھا۔ ۱۱۳۰ء میں المرابطون نے الموحدون کو جس جنگ میں شکست فاش دی وہ جنگ ”بحیرہ مراکش“ کہلاتی ہے۔ بحیرہ اشبیلیہ کی، جسے آگے چل کر Huerto del Rey کہنے لگے، یوسف اول خلف عبد المؤمن نے درستی کرائی تھی۔

(A. HUICI MIRANDA)

• بحیرہ: (بحیرہ)، مصری ”ڈیلٹا“ کے مغربی صوبے [مدیریت] کا نام۔ پہلے یہ ایک گورہ (pagarchy) پر گنہ تھا، جس کا رقبہ مختصر اور مضافات اسکندریہ کے محض شمال مشرقی حصے تک محدود تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا نام جھیل ابوقیر کی نسبت سے پڑا ہو، جس کو بحیرہ الاسکندریہ بھی کہتے ہیں؛ چنانچہ یاقوت اس امر سے باخبر تھا کہ مؤخر الذکر نام کا اطلاق شہر کے متعدد نواحی پر گنوں پر ہوتا تھا۔ فاطمیوں کے زمانے میں جب صوبوں کی تقسیم ہوئی تو بحیرہ ایک وسیع علاقہ اور [دریائے نیل کی ایک شاخ] فرع رشید (Rosseta) کے مغربی جانب واقع تھا اور مثلثی دہانے کے سرے سے شروع ہو کر خاص اسکندریہ تک پہنچتا تھا، مگر اسکندریہ اس میں شامل نہ تھا۔ نظم و نسق کے اعتبار سے

ایسے نشیب پر ہوتا ہے جس میں پانی جمع ہو سکتا ہو؛ چنانچہ شمالی افریقہ میں مشرقی الجزائر، شمالی تونس اور جنوبی مراکش کے ایک حصے میں بحیرہ (جمع: بحائر) ایک پست میدان کو کہتے ہیں۔ لیکن اس کے سب سے عام معنی ہیں ”سبزی ترکاری کے باغ، منڈی کے لیے ترکاری بونے کے کھیت“ یا ”وہ کھیت جس میں خیارات (بالخصوص خربوزے) بوئے جائیں“ (دیکھیے Textes arabes de : W. Marçais، Tanger، پیرس ۱۹۱۱ء، ص ۲۲۷)۔

(ادارہ، ۱۱)

بحیرہ (جھیل) مقامات کے ناموں کے طور پر ہسپانیہ اور پرتگال کے اکثر اسما کے ساتھ نظر آتا ہے، جیسے مندرجہ ذیل شکلوں میں: (۱) Albufera (=البحیرہ، یعنی [اضلاع] بلنسیہ Valencia، القنت Alicante، میورقہ Majorca میں)؛ (۲) Albuferas (المریہ Almería میں)؛ (۳) Albuera (قاصرش Cáceres و بطلیوس Badajoz میں)؛ (۴) Albojaira (المریہ Almería میں) اور (۵) Albufeira، جو الغرب (پرتگال) میں ایک ساحلی قصبہ ہے۔ اس اسم کی تصغیر التصغیر (۶) Albufereta (القنت Alicante) میں بھی ملتی ہے۔ مذکورہ بالا جھیلوں میں سب سے اہم بلنسیہ [رک باں] کی جھیل ہے، جو اس شہر سے ۹ کیلومیٹر کے فاصلے پر خشکی سے گھرے ہوئے سمندر کا باقی ماندہ حصہ ہے (رقبہ: تقریباً ۳ مربع کیلومیٹر)۔ یہ پانی زمانہ قبل تاریخ میں ”توریہ“ Turia اور شقر Jucar کی گہری وادیوں پر محیط ہو جاتا تھا۔ یہ سپین کی سب سے بڑی جھیلوں میں سے تھی، مگر ازمندہ قریب میں اس کا پھیلاؤ کم کر دیا گیا ہے تاکہ شمال مغربی اور جنوبی ساحلوں پر چاول کی کاشت کے لیے زیادہ زمین مہیا ہو جائے۔ آج کل اس کا قطر فقط ۶ کیلومیٹر ہے۔

جب ابن مردنیش [رک باں] نے یہ دیکھا کہ





(بذیل بخاری): نُمُو جَکْث، نُمُو جَکْث (المقدس):  
 نیز دیکھیے *The Lands of the Eastern : Le Strange*  
*Caliphate* کے قریب میں ایک ”وہارا“ موجود  
 تھا اور بظاہر یہی شہر بخارا کا پیشرو تھا، جو آگے  
 چل کر اس میں مدغم ہو گیا (قب: Frye، حواشی،  
 در *HJAS*، ذیل میں)۔

اسلامی مآخذ میں بخارا کے مقامی حکمران  
 خاندان کو بخار خدات (یا بخارا خداه) کے نام سے  
 موسوم کیا گیا ہے۔ سکوں پر *𐰽𐰺𐰍𐰏𐰤* مرقوم  
 ہے۔ صغدی زبان میں اس سے مراد شاہ بخارا ہے۔  
 اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بخارا کی مقامی  
 زبان کم از کم صغدی زبان کی کوئی شکل تھی۔  
 اگرچہ قبل از اسلام کے متعدد حکمرانوں کے نام کتبوں  
 اور بعد کے مآخذ (قب: Frye، در مجلہ مذکور) میں  
 ملتے ہیں، لیکن اس شہر کی تاریخ عربوں کی فتوحات  
 کے بعد ہی سے مرتب کی جا سکتی ہے۔

ماوراءالنہر پر عربوں کے اولین حملوں کے بارے  
 میں مختلف بیانات ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ  
 بخارا میں عربوں کا پہلا لشکر ۵۰۴/۶۷۴ء میں  
 عبید اللہ بن زیاد کی قیادت میں نمودار ہوا۔ اس وقت  
 بخارا میں سابق فرمانروا پیدون یا بندون کی بیوہ  
 حکومت کرتی تھی (لیکن الطبری، ۲: ۱۶۹ء میں  
 اس کے بجائے قبج خاتون کا نام درج ہے، جو اس  
 زمانے میں ترکوں کے بادشاہ کی بیوی تھی۔ شاید اس  
 نام کو بطور ترکی قبائلی نام کے قیغ یا قیغ (قایغ؟)  
 پڑھنا چاہیے)۔ النرشخی (طبع Schefer، ص ۷، ترجمہ  
 از Frye، ص ۹) کا بیان ہے کہ اس ملکہ نے ہندو  
 سال تک اپنے کہسن بیٹے طغشادہ کی طرف سے قائم  
 مقام کی حیثیت سے حکومت کی (الطبری، ۲: ۱۶۹ء،  
 نے اس کا نام ”طوق سیادة“ لکھا ہے؛ قب بحث  
 از *K. imenii sogdiyskogo ikhshida : O. I. Smirnova*  
 در *Turdi Akad. Nauk Tadzhikskoy*

۵۲۰ء [۶۳۸ تا ۶۳۹ء]؛ (۱۶) ابن الفرات، ۹: ۳۸۴؛  
 (۱۷) *Alexandrie musulmane : Combe*، اقتباس از  
*Bulletin de la Société royale de Géographie d'*  
*Égypte*، ص ۴۳؛ (۱۸) *Le Caire : Dopp*، در مجلہ  
 مذکور، ۲۴: ۱۳۴۔

(J. WIET)

\* البَحْرِة المَبِيَّة : (يا المُنْتِنَة) رَكَ به بحر لوط.  
 \* بخارا: [بخاری؛ عالم اسلام اور وسط ایشیا  
 میں بالخصوص اسلامی تہذیب و تمدن کا عظیم الشان  
 مرکز] جو دریائے زرافشاں کی زیریں گزر گاہ پر ایک  
 بڑے نخلستان میں واقع [اور آج کل ازبکستان میں  
 شامل] ہے۔ سطح سمندر سے اس کی بلندی ۷۲۲  
 فٹ (۲۲۲۰ میٹر) ہے اور یہ طول البلد مشرقی ۶۴  
 درجہ ۳۸ دقیقہ (گرین وچ) اور عرض البلد شمالی ۳۹  
 درجہ ۴۳ دقیقہ پر واقع ہے۔

اسلام سے پہلے کے بخارا کا ذکر شاذ و نادر  
 ہی کہیں ملتا ہے۔ اسکندر اعظم کے زمانے میں  
 مراکنده Marakanda (سمرقند) کے علاوہ بلاد صغد  
 میں دریائے زرافشاں کی زیریں گزر گاہ پر ایک  
 اور شہر بھی آباد تھا، لیکن اس کی موجودہ بخارا سے  
 تطبیق نہیں ہوتی۔ مذکورہ نخلستان بہت قدیم  
 زمانے سے آباد چلا آتا تھا اور یقیناً یہاں کئی ایک  
 شہر آباد ہوں گے۔

بخارا کا قدیم ترین ذکر ساتویں صدی عیسوی  
 کے چینی مآخذ میں ملتا ہے لیکن شہر کے مقامی  
 نام ”پوہو“ (پوہر؟) سے، جو سکوں پر  
 ثبت ہے، قدیم تحریروں کے پڑھنے کے فن کے  
 پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ نام اس سے بھی  
 صدیوں پہلے مستعمل تھا۔ پھر باوجود لسانی  
 مشکلات کے سنسکرت لفظ ”وہارا“ (= خانقاہ)  
 سے اس لفظ کا اشتقاق غیر اغلب نہیں، کیونکہ  
 شہر نومیج کٹ Numidjath [بقول یاقوت بوبجکٹ

کا ملک کی حکومت میں کوئی دخل نہیں رہا، لیکن ان کی بڑی بڑی جاگیروں کے باعث ان کا رسوخ قائم رہا؛ چنانچہ اسمعیل سامانی کے عہد حکومت میں ایک بخارخدا کا ذکر آتا ہے جسے اس کی زمینوں سے تو محروم کر دیا گیا تھا، مگر سرکاری خزانے سے اس کے لیے اتنی رقم (بیس ہزار درہم) معین کر دی گئی تھی جتنی اس سے پہلے وہ اپنی جاگیروں سے حاصل کر رہا تھا، البتہ یہ معلوم نہیں کہ حکومت نے اس ذمے داری کو کتنی مدت تک پورا کیا۔

قتیبہ بن مسلم کے عہد سے یہ دستور ہو گیا کہ بخارا کے ملکی حکمران کے علاوہ وہاں ایک عرب امیر یا عامل بھی رہنے لگا، جو امیر خراسان کے ماتحت ہوتا تھا۔ امیر خراسان کا صدر مقام ان دنوں مرو تھا۔ محل وقوع کے لحاظ سے بخارا کا تعلق سمرقند کی نسبت مرو سے زیادہ تھا؛ یہاں تک کہ بخارخدا نے مرو میں بھی اپنے لیے ایک محل بنا رکھا تھا (الطبری ۲: ۱۸۸۸ س ۱۴، ۱۹۸۷ س ۷، ۱۹۹۲ س ۱۶)۔ جب تیسری صدی ہجری/ نویں صدی عیسوی میں امرائے خراسان نے اپنا مستقر نیشاپور منتقل کر دیا تو بخارا کا نظم و نسق ماوراء النہر کے باقی حصوں سے الگ رہا۔ ۸۷۰/ ۸۷۳ء تک بخارا سامانی علاقے میں شامل نہیں ہوا، بلکہ ایک الگ والی کی تحویل میں رہا، جو براہ راست طاہریوں کو جواب دہ تھا۔ طاہریوں کے زوال (۸۵۹/۸۷۳ء) کے بعد بخارا میں یعقوب بن لیث کو صرف ایک مختصر عرصے کے لیے خراسان کا امیر تسلیم کیا گیا، چنانچہ نصر بن احمد سامانی نے، جو اس وقت سمرقند میں حکومت کر رہا تھا علما اور عوام کی درخواست پر اپنے چھوٹے بھائی اسمعیل کو بخارا کا والی مقرر کر دیا؛ لہذا اس وقت سے لے کر ان کے زوال تک بخارا سامانیوں کے ماتحت

رہا۔ بخارخدا کا نام (۲۰۰) - الطبری میں بھی بخارخدا کی حیثیت ایک نوجوان کے مذکور ہے، جسے ۸۹۱ء میں قتیبہ بن مسلم نے اپنے دشمنوں کو شکست دے کر شاہ بخارا کی حیثیت سے مسند نشین کیا۔ یہ قتیبہ بن مسلم ہی تھا جس نے بخارا میں اسلامی حکومت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا تھا۔ رمضان ۱۲۱ھ / اگست - ستمبر ۷۳۹ء میں طغشادہ خراسان کے والی نصر بن سیار کی لشکر گاہ میں قتل ہو گیا۔ اس کے طویل عہد حکومت میں عربی سیادت کے خلاف کئی بغاوتیں ہوئیں اور کئی مرتبہ ترکوں نے ملک پر فوج کشی کی، حتیٰ کہ ۸۱۰ھ / ۷۲۸-۷۲۹ء میں بخارا کا شہر عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور انہیں اس کا محاصرہ کرنا پڑا، تاہم دوسرے سال وہ اسے دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

طغشادہ کا بیٹا اور جانشین، جو فاتح بخارا کے اعزاز میں قتیبہ کے نام سے موسوم تھا، شروع شروع میں ایک اچھے مسلمان کی طرح زندگی بسر کرتا رہا۔ ۸۳۳ھ / ۷۵۰ء میں جب ایک عرب سردار شریک بن شیخ نے نوزائیدہ دولت عباسیہ کے خلاف بخارا میں بغاوت کی تو ابو مسلم کے نائب زیاد بن صالح نے بخارخدا کی مدد سے اسے فرو کر دیا؛ لیکن کچھ عرصے کے بعد مؤخر الذکر پر اسلام سے ارتداد کا الزام عائد ہوا اور وہ ابو مسلم کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بھائی اور جانشین بنیات کا بھی (اگرچہ ممکن ہے اس اثنا میں اس کے ایک اور بھائی مکان نے بھی جس کے نام کے بارے میں شبہ ہے چند سال حکومت کی ہو) خلیفہ المہدی کے زمانے میں بھی حشر ہوا (غالباً ۱۶۶ھ / ۷۸۲ء میں)، کیونکہ خلیفہ نے اس الزام میں کہ وہ المقنع ایسے ملحد کا پیرو ہے قتل کرا دیا تھا۔ اس زمانے کے بعد معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ بخارخدا خاندان



تھے۔ قلعہ قدیم ترین زمانے سے اسی جگہ واقع تھا جہاں آج کل ہے، یعنی اس چوک کے مشرق میں جسے ابھی تک ”ریگستان“ کہا جاتا ہے۔ قلعے کی چار دیواری کا گھیرا تقریباً ایک میل ہے اور اس کا اندرونی رقبہ تقریباً ۲۳ ایکڑ۔ بخارخدا کا محل یہیں واقع تھا اور جیسا کہ الاضطخری (۵۳۰۶) نے بیان کیا ہے شروع کے سامانی حکمران اسی میں رہتے تھے۔ المقدسی (۵۲۸۰) کے بیان کے مطابق بعد کے سامانیوں کے صرف خزانے اور قیدخانے یہاں ہوا کرتے تھے۔ محل کے علاوہ قلعے میں قدیم ترین جامع مسجد بھی تھی [اور بقول یاقوت یہ جامع مسجد قلعہ القہندز کے دروازے پر واقع تھی]۔ یہ قلعہ چھٹی اور ساتویں صدی ہجری/بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں کئی مرتبہ تباہ ہو کر دوبارہ تعمیر ہوتا رہا۔

دوسرے بہت سے شہروں کے برعکس بخارا کا قلعہ شہرستان کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر واقع تھا۔ ان دونوں کے درمیان، قلعے کے مشرقی جانب ایک کشادہ میدان تھا، جہاں چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی تک بعد کی بنی ہوئی جامع مسجد قائم رہی۔ اس امر کا اندازہ ممکن ہے کہ موجودہ شہر کا کونسا حصہ کبھی شہرستان تھا، کیونکہ بقول الاضطخری (۵۳۰۷) قلعے اور شہرستان میں کہیں پانی نہیں بہتا تھا اس لیے کہ دونوں اونچی جگہ واقع تھے۔ Khanikov کے پیش کردہ نقشے کے مطابق شہر کا بلند حصہ قلعے سے دو چند بڑا تھا۔ اس کے گرد ایک فصیل تھی، جس میں سات دروازے تھے۔ ان دروازوں کے نام النرشخی اور عرب جغرافیہ نگاروں نے قلمبند کیے ہیں۔ النرشخی کے بیان کے مطابق (متن: ص ۲۹، ترجمہ: ص ۳۰) عربوں کی فتح کے وقت پورا شہر صرف شہرستان پر مشتمل تھا، اگرچہ اس سے باہر بعض

رہا۔ اسمعیل اپنے بھائی نصر کی وفات (۵۲۷/۵۸۹۲) تک بدستور بخارا میں مقیم رہا حتیٰ کہ سارا ماوراء النہر اس کے زیر نگیں ہو گیا۔ ۵۲۸۷/۶۰۰ء میں وہ عمرو بن لیث پر بھی فتح حاصل کر چکا تھا، اس لیے خلیفہ نے امیر خراسان کے منصب کی توثیق اس کے حق میں کر دی تھی۔ یوں بخارا ایک بہت بڑی سلطنت کا ہاے تخت بن گیا، اگرچہ وسعت اور دولت و ثروت کے اعتبار سے وہ اس دور میں کبھی سمرقند کا ہم پلہ نہیں ہوا۔ جدید فارسی کے ادبی احیا نے بخارا ہی میں فروغ پایا۔

سامانی عہد کے بخارا کی کیفیت عرب جغرافیہ نویسوں نے تفصیل سے بیان کی ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں النرشخی اور اس کی تصنیف کے متاخر مرتبین سے اس بارے میں کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے بیانات کا مقابلہ موجودہ شہر کی کیفیت (جس کا خاص طور پر بالتفصیل بیان Opisanie : N. Khanikov Bukharskago Khanstva، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۴۳ء، ص ۷۷، بعد میں ملتا ہے) سے کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مرو، سمرقند اور دوسرے شہروں کے برعکس بخارا کے شہری رقبے میں توسیع تو ہوتی رہی مگر یہ نہیں ہوا کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا رہے۔ بخارا جب بھی نئے سرے سے تعمیر ہوا اسی قدیم محل وقوع پر ہوا اور اسی طرز پر جس کا وہ تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی میں حامل تھا۔

ایران کے بیشتر شہروں کی طرح جغرافیہ نویسوں نے بخارا کے بھی تین بڑے حصوں میں امتیاز کیا ہے: (۱) قلعہ (قہندز؛ فارسی میں گہن دز)؛ ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی سے معروف بہ ارگ؛ (۲) خاص شہر (عربی: مدینہ؛ فارسی: شہرستان) اور (۳) مضافات شہر (عربی: ریض)، جو قدیم شہر اور اسلامی عہد میں تعمیر شدہ فصیل کے درمیان واقع

ایک نئی عیدگاہ (= مُصلیٰ) تعمیر کی گئی کیونکہ [عیدگاہ] ریگستان نمازیوں کے عظیم اجتماع کے لیے ناکافی تھی۔ یہ نئی عیدگاہ ۵۳۶/۶۸۱ء میں سمیتین کے گاؤں کو جانے والی سڑک پر قلعے سے نصف فرسخ (تقریباً دو میل) کے فاصلے پر تعمیر ہوئی تھی۔

چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں یہ شہر بڑا گنجان تھا اور خراب پانی اور دیگر نقائص کے باعث یہاں کی فضا مضر صحت تھی۔ المقدسی اور بعض شعرا (الثعالبی: یتیمۃ الدھر، ۴: ۸) شہر کی کیفیت انتہائی مذمت کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔

النرشخی اور عرب جغرافیہ نویسوں نے بخارا کے نواحی علاقوں اور قریوں کے بارے میں کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ الاضطحری (ص ۳) نے ان نہروں کے نام بتائے ہیں جو دریائے زرافشاں سے کھیتوں میں پانی دینے کے لیے نکالی گئی تھیں۔ النرشخی کے قول کے مطابق ان میں سے بعض نہروں کا تعلق زمانہ قبل از اسلام سے ہے۔ ان میں بہت سے نام اب بھی باقی ہیں۔ علاوہ ازیں ان لمبی لمبی فصیلوں کے آثار بھی موجود ہیں جو شہر اور گرد و پیش کے دیہات کو ترکوں کی تاخت و تاراج سے بچانے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ النرشخی کے بیان کے مطابق (متن: ص ۲۹، ترجمہ: ص ۳۳) ان فصیلوں کی تعمیر ۵۱۶۶/۶۸۲ء میں شروع ہوئی اور ۵۲۱۵/۶۸۳ء میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔ خود شہر بھی مرکز میں نہیں بلکہ فصیل کے اندر گہرے ہوئے رقبے کے مغربی نصف حصے میں واقع تھا۔ اسمعیل بن احمد کے بعد ان دیواروں کی مرمت اور درستی کا کام موقوف کر دیا گیا۔ آگے چل کر یہ دیواریں ”کنہرک“ کے نام سے موسوم ہو گئیں، چنانچہ ”کنہر ڈوال“ (= بڑھیا کی دیوار) کے نام سے ان کے

مشرق بستیوں بھی موجود تھیں جن کو بعد ازاں شہر میں ملا لیا گیا۔ النرشخی نے شہرستان کے جغرافیائی کوائف و حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ۵۱۵/۱۱۲۱ء میں ارسلان خان محمد ابن سلیمان نے شہرستان میں ایک نئی جامع مسجد غالباً اس کے جنوبی حصے میں بنوائی جہاں مدرسہ میر عرب، جو دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوا، اور ایک بڑا مینار اب تک باقی ہیں۔

بقول النرشخی ۵۲۳۵/۸۳۹ء میں شہرستان اور اس کے مضافات کو ملا کر ایک شہر بنا دیا گیا اور اس کے ارد گرد ایک فصیل تعمیر کی گئی۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں ایک اور دیوار تعمیر کی گئی جس کی بدولت اور زیادہ وسیع رقبہ اس میں شامل ہو گیا۔ اس فصیل میں گیارہ دروازے تھے، جن کے نام النرشخی اور عرب جغرافیہ نویسوں نے محفوظ کیے ہیں۔

اس محل کے علاوہ جو قلعے کے اندر تھا ایک محل زمانہ قبل از اسلام سے ریگستان میں موجود تھا۔ سامانی فرمانروا نصر ثانی (۵۳۰/۵۹۱ء تا ۵۳۳/۶۴۳ء) نے بھی وہاں ایک محل بنوایا تھا، جس میں حکومت کے دس دفتروں (دواوین) کے لیے جگہ تھی۔ النرشخی نے ان کے نام بھی ضبط کیے ہیں (متن: ص ۲۴، ترجمہ: ص ۲۶)۔ کہا جاتا ہے کہ منصور بن نوح (۵۳۵/۶۶۱ء تا ۵۳۶/۶۹۷ء) کے عہد حکومت میں یہ محل آگ کی نذر ہو گیا، لیکن المقدسی کے قول کے مطابق ریگستان میں یہ دارالملک بدستور موجود تھا اور وہ اس کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سامانی عہد میں قلعے کے شمال کی طرف جوئے سولیاں نامی نہر پر ایک اور محل بھی تھا۔

منصور بن نوح کے عہد حکومت میں



آثار بخارا اور کرْمینا [= کرْمینہ] کے مزروعہ علاقوں کے مابین لُق و دق صحراؤں کی سرحد پر موجود ہیں۔ سامانیوں کے زوال پر (۵۳۸۹ / ۶۹۹۹ء) اس شہر کی قدیم سیاسی اہمیت بڑی حد تک ضائع ہو گئی۔ اب یہاں ایلک خانی یا قراخانی فرمانراؤں کے نائب حکومت کرتے تھے۔ پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں شمس الملک نصر بن ابراہیم نے شہر کے جنوب میں اپنے لیے ایک محل تعمیر کیا اور ایک شکار گاہ بھی تیار کی، جسے شمس آباد کہا جاتا تھا اور جو اس کے جانشین خضر خاں کی وفات کے بعد ویران ہو گئی۔ ۱۱۱۹ / ۵۱۳ء میں شکار گاہ کی جگہ ایک عید گاہ بنا دی گئی۔

انحطاط کے زمانے میں بھی بخارا اسلامی علم و دانش کا مرکز رہا اور اس حیثیت سے اس کی شہرت اور ناموری قائم رہی۔ چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں علما کا ایک سر برآوردہ خاندان، یعنی آل برہان (رک بہ برہان)، بخارا میں ایک قسم کی دینی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا اور یہ علاقہ کچھ عرصے کے لیے آزاد ہو گیا۔ قَطْوَان کی جنگ (۵ صفر ۵۳۶ / ستمبر ۱۱۳۱ء) کے بعد قراختای فرمانروا بخارا پر صدر (جمع: صدرو)، یعنی سربراہ خاندان، کے ذریعے حکومت کرتے رہے۔ ان کے تعلقات ان غیر مسلم آقاؤں سے نہایت اچھے تھے۔ ۱۲۰۷ء میں جب ایک عوامی (شیعی؟) بغاوت کی وجہ سے انہیں شہر سے نکلنا پڑا تو وہ انہیں کے ہاں پناہ گزیں ہوئے (عوفی: لباب، ۲: ۳۸۵)۔ اسی سال یہ شہر محمد بن تکش خوارزم شاہ کے زیر حکومت آ گیا۔ اس نے قلعے کی از سر نو مرمت کرائی اور دوسری عمارتیں بنوائیں۔

ابن الاثیر ۱۲: ۲۳۹ کے بیان کے مطابق بخارا نے ۳ ذوالحجہ ۵۶۱۶ / ۱۰ فروری

۱۲۲۰ء کو چنگیز خاں کے لشکر کی اطاعت قبول کی۔ قلعے پر قبضہ بارہ دن کے بعد جا کر ہوا۔ شہر کو تاراج کیا گیا اور جامع مسجد اور چند محلات کو چھوڑ کر اسے پورے طور پر نذر آتش کر دیا گیا۔ لیکن بخارا جلد ہی پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا، چنانچہ چنگیز خاں کے جانشین کے عہد میں اس کا ذکر ایک گنجان آباد شہر اور علم و دانش کے مرکز کے طور پر آتا ہے۔

۵۶۳۶ / ۱۲۳۸ء میں ایک شخص محمود طربی کی قیادت میں، جسے ایک مذہبی رہنما ہونے کا دعویٰ تھا، کسانوں نے بغاوت کی۔ چند ابتدائی کامیابیوں کے بعد، جو زیادہ تر امرا کے طبقے کے خلاف حاصل کی گئیں، اس بغاوت کو مغولوں نے فرو کر دیا (قَب جونی ۱: ۸۶، ترجمہ J.A. Boyle، ص ۱۰۹) بخارا میں مغولوں کی ابتدائی حکومت کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ دوسرے مذاہب کے علما کی طرح ملا اور سید ہر قسم کے ٹیکس سے مستثنیٰ تھے یہاں تک کہ ایک عیسائی مغول شہزادی نے بخارا میں اپنے خرچ سے ایک مدرسہ بنوایا، جو خانہ کہلاتا تھا (قَب جونی ۳: ۹، ترجمہ از Boyle، ۲: ۵۵۲)۔

۷ رجب ۵۶۷۱ / جنوری ۱۲۷۳ء کو ایران کے مغول ایلخان آباقا نے بخارا پر قبضہ کیا تو شہر تباہ و برباد ہو گیا اور آبادی بھی بہت کم باقی رہ گئی۔ بخارا پھر تعمیر ہوا، مگر رجب ۵۷۱۶ / ۱۹ ستمبر یا ۱۹ اکتوبر ۱۳۱۶ء میں ایران کے مغولوں اور ان کے معاون چغتائی شہزادے بسااور نے اسے دوبارہ تاخت و تاراج کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ چغتائی خاندان یا آگے چل کر تیموری حکمرانوں کے ماتحت ماوراء النہر کی سیاسی زندگی میں بخارا کو کوئی اہمیت حاصل نہ رہی تھی۔ معین الفقراء کی تصنیف کتاب ملا زادہ سے، جو نویں صدی ہجری /

واضحی : بدائع الوقائع؛ امیر ولی : بحر الاسرار  
فی مناقب الاخیار (ان تصانیف پر دیکھیے Storey،  
ص ۳۸۱ بعد) - سیمینوف A. A. Semenov نے  
ازبک تاریخ پر دو اہم تصنیفوں کا ترجمہ روسی  
زبان میں کیا ہے، جو بخارا کے سلسلے میں بالخصوص  
پیش قیمت ہیں، یعنی میر محمد امین بخاری :  
عبید اللہ نامہ، تاشقند ۱۹۵۷ء اور محمد یوسف منشی :  
Mukimkhanova Istoria، تاشقند ۱۹۵۷ء۔

دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی  
سے روس اور ازبک ریاستوں کے درمیان تجارتی تعلقات  
قائم ہو گئے۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدیوں میں  
وسط ایشیا سے آنے والے سب تاجر اور تارکین وطن،  
جن کی آبادیاں ٹوبولسک Tobolsk تک پائی جاتی  
تھیں، روسیوں میں بخارتسی Bukhartisi کے نام  
سے معروف تھے۔ اس نام کو وسعت دے کر اس  
میں چینی ترکستان کے باشندوں کو بھی شامل کر  
لیا جاتا تھا جو بخاریہ کوچک (Little Bukharia)  
کہلاتا تھا۔

خان عبد العزیز کے عہد حکومت (۱۰۵۵ھ/  
۱۶۳۵ء تا ۱۰۹۱ھ/۱۶۸۰ء) کو اس ملک کے  
مؤرخین اپنی تاریخ کا عظیم الشان دور تصور کرتے  
ہیں۔ اس کے بعد متفرق حکمرانوں نے خود مختاری  
حاصل کر لی اور بخارا میں خان اپنی سابق سلطنت کے  
صرف ایک چھوٹے سے حصے پر حکمران رہ گیا اور  
وہاں بھی دراصل اقتدار ایک اتالیق کے ہاتھ میں  
تھا جو اس کے نام سے حکومت کر رہا تھا۔

۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں نادر شاہ نے بخارا فتح  
کر لیا، لیکن اس کی وفات کے بعد اس شہر نے ایک  
نئے خاندان کے ماتحت دوبارہ آزادی حاصل کر لی،  
کیونکہ اتالیق محمد رحیم نے، جو منقبت قبیلے سے  
تھا، اپنے خان ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کی زندگی  
کے حالات محمد وفا کریمنگی نے تحفة الخانی کے

بخارا کے متعلق مخطوطات میں کی (قب Frye، در  
Avicenna Commemoration Volume، ایران سوسائٹی،  
کلکتہ ۱۹۵۵ء)۔ بہاء الدین نقشبندی (م ۱۱۹۱ھ/  
۱۳۸۹ء) اور ان کے درویشوں کے حلقے [رک بہ  
قشبندیہ] کو بخارا میں فروغ حاصل ہوا۔ الخ بیگ  
(م ۱۳۳۹ھ/۱۸۵۳ء) نے شہر بخارا کے عین وسط میں  
ایک مدرسہ تعمیر کیا۔

۱۱۹۰ھ/موسم گرما ۱۵۰۰ء کے اختتام کے  
قریب بخارا پر شیانی خاں کی سرکردگی میں  
ازبکوں کا قبضہ ہو گیا اور دو مختصر زمانوں کے  
سوا (یعنی ایک تو ۱۱۶۶ھ/۱۵۱۰ء کے بعد جب  
شیانی قتل ہوا اور دوسرے ۱۱۵۳ھ/۱۷۴۰ء میں)  
روس کے انقلاب تک وہ انہیں کے زیر نگیں رہا۔  
ازبکوں کے مقبوضہ علاقے سارے حکمران خاندان کی  
ملکیت سمجھے جاتے تھے اور متعدد چھوٹی چھوٹی  
ریاستوں میں منقسم تھے۔ خان کا (جو عام طور پر  
حکمران خاندان کا سب سے زیادہ معمر رکن ہوتا  
تھا) پائے تخت سمرقند تھا۔ جس امیر کو خان منتخب  
کیا جاتا وہ اپنی آبائی ریاست بھی بدستور اپنے تصرف  
میں رکھتا اور اکثر وہیں اقامت رکھتا۔ شیانی  
خاندان کے دو حکمرانوں، عبید اللہ بن محمود (۱۱۸ھ/  
۱۵۱۲ء تا ۱۱۳۶ھ/۱۵۳۹ء) اور عبد اللہ بن اسکندر  
[رک باں] (۱۱۶۳ھ/۱۵۵۷ء تا ۱۱۰۶ھ/۱۵۹۸ء) کا  
دارالسلطنت بخارا تھا۔ ان کی بدولت بخارا دوبارہ  
سیاسی و فکری زندگی کا مرکز بن گیا۔ اس کے بعد  
آنے والے حکمرانوں کے امراء، یعنی جانی یا اشتراخانی  
فرمانروا بھی بخارا ہی سے حکومت کرتے تھے۔ اس  
طرح سمرقند کی اہمیت ختم ہو گئی۔

ازبک عہد حکومت میں تاریخ بخارا کے بیشتر  
مصادر و مآخذ مخطوطات کی شکل میں ہیں، مثلاً  
تاریخ میر سید شریف راقم (از ۱۱۱۳ھ/۱۷۰۱ء)؛



تاہم ۱۸۷۳ء میں بخارا نے مغرب کی طرف خیوا کی سلطنت کے کچھ حصے پر قبضہ جما کر اپنے علاقے میں اضافہ کر لیا۔ عبدالاحد کے عہد (۱۸۸۵ تا ۱۹۱۰ء) میں بخارا اور افغانستان کے درمیان سرحد کی تعیین کی گئی اور انگلستان اور روس نے دریائے پنج کو سرحد تسلیم کر لیا۔

بخارا اور روس کے باہمی تعلق کی وضاحت بھی۔ اس عہد میں کی گئی۔ ۱۸۸۷ء میں ایک ریلوے لائن کی ابتدا کی گئی، جو امیر کی مملکت میں سے گزرتی تھی۔ بخارا کے لیے جو سٹیشن دس میل کے فاصلے پر بنایا گیا تھا وہ بجائے خود ایک شہر بن گیا ہے اور کاغان Kagan کے نام سے موسوم ہے۔ میر عالم سینٹ پیٹرزبرگ [کے مدرسہ حریہ] میں زیرِ تعلیم رہنے کے بعد ۱۹۱۰ء میں اپنے والد کا جانشین ہو کر حکومت کرنے لگا، یہاں تک کہ انقلابِ روس کی وجہ سے اسے افغانستان میں پناہ لینی پڑی اور وہ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے تک کابل ہی میں بقیہ رہا۔ زمانہ انقلاب کے بعد بخارا جمہوریہ شورائیہ اشتراکیہ ازبکستان کا ایک جز بن چکا ہے، جس کا صدر مقام تاشقند ہے۔ اس علاقے میں روٹی بہت پیدا ہوتی ہے اور روٹی کی پیداوار میں وہ فرغانہ اور وسط ایشیا کے دوسرے حصوں کا حریف بن گیا ہے۔

بخارا کے آثارِ قدیمہ اور مقامی جغرافیے کے بارے میں سلسلہ تحقیقات کو ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی زمانے میں بہت ترقی ہوئی اور *Shishkin*، *Pugačenkova*، *Sukhareva* اور دوسرے محققین کی تحقیقات نے ہماری معلومات میں بڑا اضافہ کیا ہے۔ بخارا کے آثارِ قدیمہ میں سے مندرجہ ذیل تاریخی عمارتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں: (۱) چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کی ایک عمارت، جسے اسمعیل سامانی کا مقبرہ بتایا جاتا ہے؛ (۲) مینارہ۔

عنوان سے قلم بند کیے ہیں۔ اس کے جانشین دانیار بیگ نے اتالیق کے لقب پر قناعت کی اور چنگیز خان کے خاندان کے ایک فرد کو شاہی لقب سونپ دیا، تاہم اس کے بیٹے مراد [= میر معصوم] نے ۱۱۹۹ھ / ۱۷۸۵ء میں اپنے لیے شاہی لقب کا دعویٰ کر کے امیر کہلوانا شروع کیا۔

[مراد اور] اس کے جانشین [امیر] حیدر کے عہد حکومت (۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء تا ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء) میں مذہبی احکام کی پابندی اس کے پیشرو حکمرانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ سختی سے کی گئی۔ بخارا کے امرا میں سے وہ آخری حکمران تھا جس نے سگوں پر اپنا نام ثبت کرایا۔ اس کا جانشین نصر اللہ (۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۷ء تا ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء) امرا و شرفاء کے مقابلے پر شاہی تخت کے اقتدار کو مستحکم کرنے اور اپنی سلطنت کو وسعت دینے میں کامیاب ہو گیا۔ ملکی وقائع نویس اور یورپین سیاح اس پر متفق ہیں کہ نصر اللہ ایک خون آشام اور جابر حکمران تھا۔ اس نے قبائلی لشکروں کے بجائے، جنہیں عارضی طور پر طلب کر لیا جاتا تھا، ایک مستقل فوج تیار کر لی۔

۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں خوقند کی مدد مقابل خانی سلطنت کے پائے تخت پر قبضہ کر لیا گیا، لیکن یہ کامیابی دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ جب نصر اللہ کا جانشین مظفر الدین (۱۸۶۰ تا ۱۸۸۵ء) مسندِ سلطنت پر بیٹھا تو اس وقت تک روسی ماوراء النہر میں اپنے قدم مضبوطی سے جما چکے تھے۔ بار بار شکست کھانے کے بعد امیر بخارا کو روسیوں کی اطاعت قبول کرنی پڑی اور وہ سیر دریا [= دریائے سیحوں] کی وادی پر، جسے روسیوں نے فتح کر لیا تھا، اپنے تمام دعاوی ترک کر دینے پر مجبور ہو گیا۔ اسے اپنی سلطنت کا ایک حصہ روسیوں کے حوالے کرنا پڑا، جس میں جزق، اورہ توبہ، سمرقند اور کتہ قرغان کے شہر واقع تھے؛

۱۹۵۸ء، ابتدائی عہد کے سگنوں کے لیے دیکھیے (۱۶) Frye *Notes on the Early Coinage of Transoxiana*، نیویارک ۱۹۴۹ء، مع مزید حواشی در *American Numismatics Society Notes*، عدد ۴ و ۷؛ تسمیہ اور تاریخ قبل از اسلام کے لیے دیکھیے (۱۷) Frye: *Notes on the History of Transoxiana*، در *Journal of Asiatic Studies*، ۱۹ (۱۹۵۶ء): ۱۰۶؛ بعد؛ ازبکوں کی تاریخ کے بارے میں دیکھیے (۱۸) Storey، ص ۳۷۱ تا ۳۸۲؛ تاریخی عمارتوں کے لیے دیکھیے (۱۹) G. Pugačenkova و 'Bukhara: L. Rempel'، ماسکو ۱۹۴۹ء، ۶۷ صفحات اور ۳۹ الواح؛ موجودہ شہر کے نقشے اور سیاحوں کی رہنمائی کے لیے دیکھیے (۲۰) *Bukhara, kratkiy Spravochnik*: Yu. S. Ashurov، تاشقند ۱۹۵۶ء۔

R.N. FRYE و W. BARTHOLD [و ادارہ] .

بخارست: [Bucharest] ترکی میں \*  
 بکیش [ولاشیا Wallachia] = ترکی: افلاق (رک  
 باں)] کا ایک شہر، جو دریائے ڈینیوب سے تقریباً  
 پچاس کلومیٹر شمال میں ڈیمبویچہ (Dambovita)  
 ندی پر واقع ہے۔ اس کا ذکر سب سے پہلے  
 ۵۷۶۹ / ۱۳۶۸ء میں Cetatea Dambovitei کے  
 نام سے آتا ہے۔ بخارست کے ساتھ ساتھ یہ نام بھی  
 پندرہویں صدی عیسوی تک مستعمل رہا تاآنکہ یہ  
 شہر فرمانروایانِ وِلاشیا کا پایہ تخت بن گیا۔ ولاد  
 (Vlad the Impaler) نے وہاں سے ۵۸۶۳ / ۱۴۵۹ء  
 اور ۵۸۶۵ / ۱۴۶۱ء میں دستاویزات جاری  
 کیں اور رادو (Radu the Handsome) نے، جسے  
 سلطان محمد ثانی نے ۵۸۶۶ / ۱۴۶۲ء میں گدی  
 پر بٹھایا تھا، اس شہر میں اپنے آپ کو جورجیا  
 Giurgiu سے آئی ہوئی قلعہ نشین ترکی فوج کی  
 حفاظت میں متمکن کر لیا۔ دو صدی سے زیادہ  
 عرصے تک بخارست کی تاریخ رومانوی حکمرانوں کے

۱۵۸ فٹ (۴۸.۳ میٹر) بلند (تعمیر: چھٹی  
 صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی): (۳) مسجد مگاک  
 عطار (جو آخری بار ۱۵۴۷ء میں تعمیر ہوئی):  
 (۴) مسجد عیدگاہ (مصلیٰ)، تعمیر شدہ ۱۱۱۹ء؛ (۵)  
 سیف الدین بخاری (م ۱۲۶۱ء) کا مقبرہ؛ (۶)  
 مقبرہ چشمہ ایوب (چودھویں صدی عیسوی کے آخر  
 کا تعمیر شدہ): (۷) آغ بیگ کا مدرسہ، جو ۱۵۸۵ء  
 میں از سر نو تعمیر ہوا؛ (۸) مسجد کلان، جو  
 سولہویں صدی کی تعمیر ہے اور اس کے قریب ایک  
 قدیم ترمینار بھی ہے؛ (۹) مدرسہ میر عرب (۱۵۳۵ء  
 کا)؛ (۱۰) مسجد خواجہ زین الدین، جو بہت دفعہ  
 از سر نو تعمیر کی گئی ہے۔ دوسری تاریخی  
 عمارتیں بڑی تعداد میں شہر کے باہر واقع ہیں  
 اور ان میں سے زیادہ تر شکستہ حالت میں ہیں۔

مآخذ: (۱) النرخشی: تاریخ بخارا، طبع Schefer،  
 ۱۸۹۲ء؛ (۲) یاقوت: معجم البلدان، بذیل مادہ؛  
 (۳) المقدسی: احسن التقاسیم، طبع ڈخویہ، ص ۲۶۶؛ بعد؛  
 (۴) الاصلطخری: المسالک و الممالک، قاہرہ ۱۹۶۱ء، ص  
 ۱۷۱ تا ۱۷۷؛ (۵) الیعقوبی، البلدان، طبع ڈخویہ، ص ۲۹۲،  
 ۲۹۳؛ (۶) البلاذری: فتوح البلدان، بحد اشاریہ؛ (۷)  
 الطبری، بامداد اشاریہ؛ (۸) بطرس البستانی: دائرة المعارف،  
 بیروت ۱۸۸۱ء، ۵: ۲۲۳ تا ۲۲۹؛ (۹) و (۱۰) ع،  
 ۳: ۴۰۱ تا ۴۱۹؛ (۱۰) ابن الاثیر: الكامل، بمواضع  
 کثیرہ؛ (۱۱) *History of Bukhara: Arminius Vambery*،  
 لندن ۱۸۷۳ء؛ (۱۲) وہی مصنف: تاریخ بخارا (اردو  
 ترجمہ از نفیس الدین احمد)، لاہور ۱۹۵۹ء؛ (۱۳) عوفی:  
 لباب، بامداد اشاریہ؛ [مغولوں کے حملے تک بخارا کے ذکر  
 اور لہرست مآخذ کثیرہ کے لیے دیکھیے (۱۴) R.N. Frye:  
*The History of Bukhara*، کیمبرج (میساجوشس)  
 ۱۹۴۵ء (النرخشی [تاریخ بخارا] کا ترجمہ)؛ بخارا  
 پر روسی مآخذ کے لیے دیکھیے (۱۵) O. A. Sukhareva:  
*K. istorii gorodov bukharskogo khanstva*، تاشقند



پچاس ہزار اور ایک لاکھ کے درمیان گھٹی بڑھتی رہی۔

تین صدی تک ترکی سلطنت میں مدغم رہنے کی وجہ سے بخارست نے ایک ایشیائی رنگ اختیار کر لیا تھا، جو اٹھارہویں صدی عیسوی کے دوران میں اور زیادہ پختہ ہو گیا جبکہ فناری حکمرانوں کے ماتحت یہ شہر یونانی زبان کی تعلیم کے لیے ایک اہم مرکز بن گیا۔ ان حکمرانوں نے سلطنت ترکیہ کے عیسائیوں کے لیے مذہبی کتابوں کی اشاعت کا آغاز کیا اور آتوس Athos، قسطنطنیہ، طربزون اور ارض مقدس (فلسطین) کی خانقاہوں کے لیے آمدنی کا انتظام کیا۔ آسٹریا اور روس کے قبضے سے یہاں مغربی اثرات پھیلنے لگے اور فرانسیسی زبان سے واقفیت کی ابتدا ہوئی، جس نے انیسویں صدی کے نصف اول میں یونانی کی جگہ لے لی تھی۔

انقلاب فرانس نے جن تصورات کو جنم دیا تھا ان کے زیر اثر یہ شہر رومانیہ کے سیاسی اتحاد کے لیے جدوجہد کا مرکز بن گیا جس کی بدولت مولداویا Moldavia اور وولاشیا Wallachia کا وفاق ظہور میں آیا۔

[۱۸۶۱ء میں بخارست رومانیہ کی نئی سلطنت کا دارالحکومت قرار پایا تھا۔ شہزادہ چارلس کی تخت نشینی (۱۸۶۶ء) کے بعد شہر میں تعمیرات کا کام وسیع پیمانے پر شروع ہوا اور بہت جلد اسے یورپ کے صدر مقامات میں ممتاز حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کی فصیل (محیط : ۴۸ میل) گیارہ برس (۱۸۸۵ تا ۱۸۹۶ء) میں تیار ہوئی تھی اور اس کا نقشہ ایک بلجی انجینئر جنرل برائلمونٹ Brialmont نے تیار کیا تھا۔ اسے یورپ کی مضبوط ترین فصیل خیال کیا جاتا تھا، لیکن ۱۹۱۶ء میں یہ جرمن حملے کی تاب نہ لا سکی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں بھی بخارست پر جرمنوں نے قبضہ کر لیا تھا، تاہم رومانیہ نے محوری طاقتوں کی صف میں

باب عالی سے تعلقات کے ساتھ وابستہ رہی۔ ترکی سیادت کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے حکمران شہر ترغویست Târgoviște کو ترجیح دیتے تھے، جو ترکی حملوں سے نسبتاً محفوظ تھا۔ سولہویں صدی کے خاتمے پر بخارست نے میخائیل (Michael the Brave) کے قرض خواہوں کے قتل عام اور سنان پاشا کے تسلط کا منظر دیکھا۔ ترکوں کے خلاف بغاوتوں اور ان کے علاوہ وباؤں اور آتش زدگیوں کے مصائب سہنے کی وجہ سے اس شہر کی تاریخ پر آشوب رہی ہے۔ معاہدہ برلن (۱۸۷۷ء) پر دستخط ثبت ہونے پر ترکی سیادت کے آخری آثار غائب ہو گئے۔ ۱۹۱۳ء میں بخارست میں جو صلح کی کانفرنس منعقد ہوئی اس نے ترکی کو اس کے بیشتر یورپی مقبوضات سے محروم کر دیا۔

ابتدائی ادوار کے دوران میں یہاں کی آبادی کے بارے میں معلومات مفقود ہیں۔ متعلقہ ماخذ میں یونانی، آرمین اور مقامی تاجروں کی موجودگی کا ذکر ملتا ہے۔ ۱۶۳۰/۵۱۰۰ء کے قریب بخارست میں بارہ ہزار مکان تھے، لیکن پندرہ سال بعد صرف چھ ہزار مکانوں کا ذکر ملتا ہے۔ اولیا چلبی نے بارہ ہزار مکانوں اور ایک ہزار دکانوں کا ذکر کیا ہے۔ سترہویں صدی عیسوی میں بلقانی اصل کی آبادی میں اضافہ ہو گیا اور اٹھارہویں صدی میں اس نے نمایاں اہمیت حاصل کر لی۔ [اس دور میں جو] عوامی بغاوتیں رونما ہوئیں ان کے محرک تجارتی انجمنوں کے ارکان تھے۔ ان کی ناخوشی کا باعث یہ تھا کہ ان کے مقابلے میں ایسے غیر ملکی تاجر آگئے تھے جنہیں فناری (Phanariot) حاکموں کی حمایت حاصل تھی۔ سترہویں صدی کے اختتام پر شہر کی آبادی پچاس ہزار ہو گئی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں یہ تعداد بیس ہزار اور ساٹھ ہزار کے درمیان اور انیسویں صدی کے نصف اول میں

*Istoria Bucureștiului* : Ionescu Gion بخارلک  
*Istoria Bucure-* : N. Iorgo (۶)؛ ۸۱۸ ص ۱۸۹۹ء  
 P. P. (۷)؛ ۳۹۷ ص ۱۹۳۰ء بخارلک  
*Documentele Țării Românești* : Panaitescu  
 بخارلک ۱۹۳۸ء؛ ۱ : ۲۳۰ تا ۲۳۸، ۲۵۳ تا ۲۵۵  
 ۲۶۰ تا ۲۶۱؛ [۸] *Whitaker's Almanack 1967*  
 لندن ۱۹۶۶ء؛ (۹) *The World Almanac 1967*  
 نیویارک ۱۹۶۶ء؛ (۹) *The Statesman's Year-Book*  
 1967-68، لندن ۱۹۶۷ء؛ (۱۰) *Encyclopaedia Bri-*  
*tannica*، مطبوعہ ۱۹۵۰ء، ۳ : ۳۱۲ بعد؛ (۱۱)  
 ساسی بک : قاموس الاعلام، ۲ : ۱۳۳۳، تحت مادہ  
 بکرش]۔

(N. BELDICEANU [و ادارہ])

بخارلک : (یا سائبیریا کے بخاری)، ایک  
 چھوٹا سا مسلمان قبیلہ جو ان تاجروں اور ساریانوں کے  
 اخلاف پر مشتمل ہے جو شروع میں ترکستان سے  
 آئے تھے اور سولہویں صدی میں، جب بخارا کی  
 امارت اور سائبیریا کے مابین تجارتی تعلقات فروغ پر  
 تھے، مغربی سائبیریا میں مقیم ہو گئے تھے۔

بخارلک سائبیریا کے تاتاریوں سے قریبی مراسم  
 رکھتے ہیں جو ان کے ذریعے مسلمان ہوئے اور جن  
 میں وہ بتدریج مخلص ملتے جلتے جا رہے ہیں۔ وہ زیادہ تر  
 ٹوبولسک *Tobol'sk*، ٹومن *Tümen* اور تارا *Tara* کے  
 قریب آباد ہیں۔ بخارلک کا ایک گروہ، جو دوسروں  
 سے الگ ہے، ٹومسک *Tomsk* کے قریب پایا  
 جاتا ہے۔

۱۹۲۶ء میں سوویت روس کی مردم شماری  
 کے مطابق ان کی تعداد بارہ ہزار بارہ نفوس تھی۔  
 بخارلک مقامی تاتاری زبانیں بولتے ہیں، لیکن فرق  
 یہ ہے کہ ان کی اپنی بولی میں فارسی کے بہت سے  
 الفاظ اب تک باقی ہیں۔ قازان کی تاتاری کو وہ  
 ادبی زبان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

(A. BENNIGSEN)

آزادی بقرار رکھی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۷ء کو شاہ  
 مائیکل Michael عوام کے دھاؤ کے تحت تخت سے  
 دستبردار ہو گیا اور اسی روز رومانیہ کی عوامی  
 جمہوریہ وجود میں آ گئی۔ ملک کی ساری اراضی،  
 بینک اور کارخانے وغیرہ قومی ملکیت میں لے لیے  
 گئے۔ ۱۹۶۰ء میں رومانیہ کو عوامی جمہوریہ کے  
 بجائے اشتراکی جمہوریہ قرار دیا گیا۔

بخارلک آجکل جمہوریہ اشتراکیہ رومانیہ  
 کا دارالحکومت ہے۔ اس کا رقبہ ۹۷۰ مربع میل  
 ہے اور آبادی تیرہ لاکھ بہتر ہزار (یکم جولائی  
 ۱۹۶۳ء) ہے۔ یہ تعلیم، تجارت اور صنعت کا مرکز  
 ہے۔ بخارلک یونیورسٹی ۱۸۶۳ء میں قائم ہوئی  
 تھی۔ قومی کتاب خانہ، جو مشرقی علوم کی کتابوں  
 کے لیے مشہور ہے، یونیورسٹی کی عمارت میں واقع  
 ہے۔ بخارلک پٹرول، عمارتی لکڑی اور زرعی پیداوار  
 بالخصوص گندم اور مکئی کی منڈی ہے اور یہاں  
 شراب کشید کرنے، پٹرول صاف کرنے، چمڑا رنگنے،  
 قیل نکالنے، کپڑا بننے اور مختلف مشینیں تیار کرنے  
 کے یسیوں کارخانے ہیں۔ ہوائی اڈا شہر سے تقریباً  
 چار میل دور بانیسا *Băncasa* کے مقام پر واقع ہے۔  
 یہاں کئی گرجا گھر ہیں جو عموماً چھوٹے چھوٹے  
 اور بوزنطی طرز پر بنے ہوئے ہیں۔ سب سے مشہور  
 گرجا میٹرو پولیٹن ہے، جو ۱۶۶۵ء میں تعمیر  
 ہوا تھا۔ بخارلک میں ہر سال سات روز تک  
 ایک بڑا میل لگتا ہے۔

... مآخذ: (۱) *The Travels of* : F. C. Belfour

*Atacarias*، لندن ۱۸۳۶ء، ۲ : ۳۷۰؛ (۲) I. Bogdan

*Cronice inedite antigatoare de istoria românilor*

بخارلک ۱۸۹۰ء، ص ۳۹؛ (۳) تاریخ پچوی، استانبول

۱۲۸۳ء، ۲ : ۱۵۹ تا ۱۲۲؛ (۴) اولیا چلبی: سیاحت نامہ،

استانبول ۱۹۲۸ء، ۷ : ۳۷۶ تا ۳۸۰؛ (۵) G. I.



کیا اور بصرے کا چار مرتبہ - حجاز میں چھ سال مقیم رہے۔ کوفے اور بغداد میں تو آمد و رفت بکثرت رہی۔ امام بخاری کو ایک لاکھ صحیح حدیثیں ازبر تھیں اور دو لاکھ غیر صحیح (طبقات الحنابلہ، ۱: ۲۷۵)۔ امام بخاری نے ایک ہزار سے زائد اساتذہ و شیوخ سے حدیث لکھی۔ اپنے سے بڑے، اپنے برابر اور اپنے سے کمتر راویوں سے حدیث کی روایت و کتابت کی ہے۔ اس اعتبار سے ان کے شیوخ پانچ طبقات میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں: (۱) وہ جو تابعین سے روایت کرتے ہیں؛ (۲) وہ جو ان کے زمانے میں تھے، لیکن ثقات تابعین سے نہیں ملے؛ (۳) وہ جو کبار تبع تابعین سے روایت کرتے ہیں؛ (۴) امام بخاری کے رفیق اور ان سے ذرا بڑے؛ (۵) وہ جو سن و اسناد میں امام بخاری کے شاگردوں کے برابر ہیں، لیکن ان سے فائدے کے لیے سنا، اگرچہ اس طبقے سے بہت کم روایات ہیں۔

علوم و فنون حدیث کے شیوخ و ماہرین نے امام بخاری کی ذہانت، فقاہت اور حافظے کا اعتراف کیا ہے۔ السبکی نے انہیں شافعی مسلک سے اور ابن ابی یعلیٰ نے حنبلی مسلک سے منسلک کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ نسبتیں محض رسمی ہیں۔ امام بخاری امام مجتہد کے بلند مقام پر فائز ہیں۔ بقول ابن حجر وہ فقہ حدیث میں دنیا کے امام ہیں (تقریب)، علی حدیث میں انہیں بڑی دستگاہ اور مہارت تھی اور اہل الحدیث (رک بان) کی امامت کا بلند مقام حاصل تھا۔ امام بخاری کی زیادہ تر شہرت ان کی کتاب الجامع الصحیح کی وجہ سے ہے۔

صحیح بخاری: جب امام بخاری نے اپنے پیشرو محدثین کے مجموعوں کو پڑھا اور روایت کیا تو محسوس کیا کہ ان کتابوں میں صحیح، حسن اور ضعیف سب قسم کی احادیث موجود ہیں؛

⊗ البخاری: امام ابو عبد اللہ محمد بن اسمعیل ابن المغیرہ بن بردزبہ البخاری فارسی الاصل نامور محدث تھے۔ ان کا خاندان یمان الجعفی کے ہاتھ پر ایمان لایا تھا، چنانچہ اس نسبت ولاء سے وہ بھی الجعفی کہلائے۔ بقول بعض ان کے جد امجد بردزبہ کے معنی بزبان اہل بخارا "کسان" تھے، لیکن دوسروں کے نزدیک یہ لفظ قدیم فارسی میں "باغبان" کے معنی میں آتا ہے اور مؤخرالاً: کرمعنی کو ترجیح دی گئی ہے (تاریخ الادب العربی، ۳: ۱۶۳)۔ امام بخاری کی پیدائش بخارا میں بعد از نماز جمعہ، ۱۳ شوال ۵۱۹ھ/۸۰۹ء کو اور وفات خرتنک میں جمعہ و ہفتہ کی درمیانی شب، یکم شوال ۲۵۶ھ (۳۱ اگست، ۸۷۰ء) کو بعمر تیرہ دن کم باسٹھ برس ہوئی اور تدفین عید الفطر کے روز ہوئی۔ ان کے والد اسمعیل بن ابراہیم حدیث کے ثقہ راوی تھے۔ والد بچپن میں فوت ہو گئے۔ ماں کے زیر نگرانی تربیت پائی۔ ایک بہن تھی، ایک بھائی بھی تھا جس کا نام احمد تھا۔ بچپن میں امام بخاری کی آنکھیں جاتی رہی تھیں، لیکن ماں کی دعا اور گریہ و زاری کی بدولت بصارت پھر لوٹ آئی۔ حافظہ بلا کا پایا تھا اور ذہانت میں ضرب المثل تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں علامہ داخلی ایسے متبحر عالم اور محدث کو ایک سند پر ٹوک دیا اور تصحیح کرا دی۔ ابتدائی تعلیم بخارا کے جلیل القدر شیوخ، مثلاً محمد بن سلام بیکندی، محمد بن یوسف بیکندی، عبد اللہ بن محمد مسندی اور ابراہیم بن الأشعث سے حاصل کی۔ سولہ برس کی عمر میں عبد اللہ بن المبارک (م ۱۸۱ھ) اور وکیع بن الجراح (م ۱۹۷ھ) کی کتابوں کو حفظ کر لیا۔ طالب علمی کے زمانے میں سولہ روز تک بغداد میں قیام کیا اور اس دوران میں پندرہ ہزار سے زائد احادیث حفظ کر لیں (طبقات الحنابلہ، ۱: ۲۷۶)۔ امام بخاری نے شام، بصر اور جزیرہ کا دو مرتبہ سفر

اللہ علیہ وسلم و سننہ و ایامہ“ رکھا۔ کتاب کو ہر طرف سے حسن قبول حاصل ہوا۔ نوے ہزار آدمیوں نے امام بخاری سے اس کتاب کو سنا (طبقات الحنابلہ، ۱: ۲۷۴)۔

صحیح بخاری میں فقہی فوائد اور حکیمانہ نکات بکثرت موجود ہیں۔ امام بخاری صرف صحیح حدیث ہی بیان نہیں کرتے بلکہ بقول امام نووی ان کا مقصد احادیث سے استنباط مسائل ہے؛ وہ ان سے قائم کردہ ابواب کی تائید و تشریح کا کام لیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ایک متن حدیث سے کئی مطالب اور مسائل نکال کر کتاب کے مختلف ابواب میں ان کو جدا جدا کر دیتے ہیں اور ان آیات پر بھی توجہ دیتے ہیں جو احکام بیان کرتی ہیں۔ چونکہ استخراج مسائل فقہ امام بخاری کا اہم مقصد ہے، اس لیے بہت سے ابواب میں صرف ”فِيهِ عَنْ فُلَانٍ“ سے اس حدیث کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں جو پہلے گزر چکی ہے۔ کبھی کسی باب کے تحت متن حدیث مذکور ہے، لیکن اسناد محذوف اور کبھی حدیث معلق روایت کرتے ہیں، کیونکہ ان کی غرض تو ابواب کے مقصود مسائل پر دلیل قائم کرنا ہے۔

بعض ابواب میں بہت سی صحیح احادیث مندرج ہیں اور بعض میں صرف ایک ہی حدیث۔ بعض میں آیت قرآن مجید اور بعض میں کچھ بھی نہیں ہے۔ امام بخاری نے یہ اسلوب قصداً اختیار کیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ اس باب میں کوئی حدیث بخاری کی شرط پر نہیں ملی۔

امام بخاری ایسی صحیح حدیث بیان کرتے ہیں جس کو ثقہ راوی نے ثقہ راوی سے روایت کیا ہو اور اس کا سلسلہ مشہور صحابی تک پہنچایا ہو اور قابل اعتماد و ممتاز ثقہ راویان حدیث اس حدیث میں اختلاف نہ کرتے ہوں۔ اس کا اسناد متصل ہو اور

چنانچہ انہوں نے ایک ایسی کتاب جمع کرنے کا ارادہ کیا جس میں سب حدیثیں صحیح ہوں۔ یہ ارادہ اور بھی قوی تب ہوا جب امام بخاری نے ایک مجلس میں اپنے شیخ الحدیث اسحق بن راہویہ (۱۶۱ تا ۲۳۸ھ؛ دیکھیے الأعلام، ۱: ۲۸۴) سے سنا کہ تم ایک ایسی مختصر کتاب جمع کرو جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صرف صحیح احادیث ہوں۔ یہ بات امام بخاری کے دل میں گھر کر گئی۔ اس عزم صمیم کو اور تقویت یوں مل گئی کہ امام بخاری نے خواب میں دیکھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں کھڑے ہیں اور ہاتھ میں پنکھا لیے آپ سے مکھیاں اڑا رہے ہیں۔ معبرین نے اس خواب کی یہ تعبیر بتائی کہ تم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب جھوٹی حدیثوں کو مکھیوں کی طرح ہٹا دو گے اور ان کو رد کر دو گے۔ اس خواب نے امام بخاری کے شوق حدیث کو تیز تر کر دیا اور وہ الجامع الصحیح کی تالیف و تدوین میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔

امام بخاری سفر و حضر میں ہر جگہ برابر اپنی کتاب الجامع الصحیح کی تالیف کرتے رہے، البتہ تراجم ابواب کی ترتیب و تہذیب، ہر باب کے تحت احادیث کے اندراج کا کام ایک مرتبہ تو حرم پاک میں انجام دیا اور دوسری مرتبہ مسجد نبوی میں منبر و محراب کے درمیان، اور یہ وہ جگہ ہے جسے رَوْضٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ (= جنت کے باغات کا ایک حصہ) کہتے ہیں۔ سولہ برس کی مسلسل محنت کے بعد کتاب تیار کی جس میں صرف صحیح احادیث درج کیں اور امام احمد بن حنبل، علی بن مدینی اور یحییٰ بن معین ایسے مشہور و مسلم شیوخ حدیث کے سامنے پیش کی۔ سب نے بنظر استعجاب دیکھا اور کتاب کی صحت کی گواہی دی۔ کتاب کا نام ”الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ صلی



لے کر آج تک صحیح بخاری پر علمائے اسلام کی توجہ مرکوز رہی؛ تفصیلات کے لیے دیکھیے کشف الظنون، استانبول ۱۹۴۱ء، ۱: ۵۴۵ تا ۵۵۵؛ تسهیل القاری، ۱: ۳۰ تا ۳۲؛ سیرت البخاری، ص ۲۰۶ تا ۲۴۸؛ تاریخ الادب العربی (تعریب براکلمان)، ۳: ۱۶۷ تا ۱۷۸، کے علاوہ بھی کتب سیر و تراجم میں شروح و حواشی کا ذکر آتا ہے، جن کی کل تعداد دوسو سے زائد ہے۔ ابن خلدون کی تمنا تھی کہ صحیح بخاری کی ایک ایسی ہی عمدہ شرح لکھی جائے جس میں اس کا پورا حق ادا کیا جائے، کیونکہ اس نے اپنے اکثر اساتذہ سے سن رکھا تھا کہ ایسی شرح بخاری امت کے ذمے قرض ہے (مقدمہ، ص ۴۴۳)۔ حافظ ابن حجر العسقلانی کی شرح فتح الباری کے بعد یہ قرض ادا ہو گیا، کیونکہ علمائے حدیث نے اس شرح کو بہترین قرار دیا ہے (صبحی الصالح: علوم الحدیث، ص ۳۹۷)۔

مختلف زبانوں میں صحیح بخاری کے ترجمے کیے گئے۔ اردو تراجم اور شروح میں مولوی وحید الزمان (رک بان) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس نے مکمل ترجمہ شائع کرنے کے علاوہ ایک ضخیم شرح تسهیل القاری کے نام سے شروع کی، لیکن صرف پانچ جلدیں شائع ہو سکیں۔ برصغیر پاک و ہند کے علما کی عربی، فارسی اور اردو شروح کے لیے دیکھیے الثقافة الاسلامیة فی الہند، ص ۱۵۰ تا ۱۵۱، نیز محمد اسحق: *India's Contribution to Hadith Literature*، لاہور ۱۹۵۵ء۔

صحیح بخاری کی افادی حیثیت کے پیش نظر کئی علما نے اس کی مفتاح مرتب کی، مثلاً الشریف محمد بن مصطفی التوقادی (آستانہ ۱۳۱۳ھ)، شکری ابن حسن (استانبول ۱۳۱۳ھ) اور محمد فؤاد عبدالباقی (القاهرہ ۱۹۳۵ء)۔ مؤخر الذکر مصنف نے مفتاح کنوز السنة میں دیگر کتب حدیث کے ساتھ صحیح بخاری

غیر مقطوع۔ اگر صحابی سے دو شخص راوی ہوں، تو بہتر، ورنہ ایک ہی معتبر (ثقة، عادل اور ضابط) راوی کافی ہے۔ امام بخاری نے حدیث صحیح کے ضمن میں اتصال سند، اتقان رجال اور عدم علل کا بڑا خیال رکھا ہے۔

صحیح بخاری کی ایک خصوصیت اس کے تراجم ابواب ہیں، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فقہ البخاری فی تراجم ابوابہ، یعنی امام بخاری کی فقاہت ان کے ابواب کے عنوانوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ عظیم المرتبت شارحین نے اپنی شروح بخاری میں اور جلیل القدر محدثین نے مستقل تصانیف میں تراجم کے مقاصد و مطالب کی تشریحات قلمبند کی ہیں۔ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ دہلوی (رک بان) کا اہم، مفید اور جامع رسالہ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری (طبع دائرۃ المعارف، حیدرآباد، دکن) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

علمائے امت نے صحیح بخاری کو اصح الکتاب بعد کتاب اللہ، یعنی قرآن مجید کے بعد شریعت اسلامیہ میں صحیح ترین کتاب کا معزز لقب دیا (طبقات الحنابلہ)۔ موطا امام مالک، صحیح مسلم اور صحیح بخاری کے موازنے کے لیے ابن الصلاح کی کتاب علوم الحدیث دیکھیے۔

صحیح بخاری کی قبولیت و اہمیت کا اندازہ اس کی شروح، تعلیقات اور حواشی کی کثرت سے باسانی لگایا جا سکتا ہے۔ اس مجموعہ احادیث کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ہر دور کے علما مساعی جمیلہ کو بروئے کار لاتے رہے۔ کسی نے مختصر شرح لکھی اور کسی نے مطول و مفصل، کسی نے رجال پر بحث کی اور کسی نے تراجم ابواب پر، کسی نے اس کی تجرید کی اور کسی نے انتخاب و اختصار، کسی نے اس کی تعلیقات کو موصول کیا اور کسی نے مشکل و غریب الفاظ کے لغات لکھے۔ تیسری صدی ہجری سے

قیمتی اور مستند ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کی گئی ہے۔ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد، دکن (۱۳۶۱ھ تا ۱۳۶۲ھ) میں آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی۔ امام بخاری نے اس کتاب کو مسجد نبوی میں روضۃ نبوی کے پاس بیٹھ کر چاندنی راتوں میں لکھا (الرسالة المستطرفة، ص ۱۰۶ تا ۱۰۷؛ السنة قبل التدوین، ۳۶۵)؛ (۲) التاريخ الصغير، اسماء الرجال پر مختصر مگر مستند کتاب ہے۔ سنین کے تحت حالات قلمبند کیے گئے ہیں (طبع الہ آباد ۱۳۲۵ھ)؛ (۳) کتاب الضعفاء الصغير (طبع الہ آباد ۱۳۲۵ھ)؛ (۴) کتاب الکنی میں ایک ہزار راویان حدیث کی کنیتوں سے بحث کی گئی ہے (طبع حیدرآباد، دکن ۱۳۶۰ھ)؛ (۵) کتاب خلق افعال العباد میں فرقہ جہمیدہ وغیرہ کا رد کیا ہے۔ آیات و احادیث کے ساتھ آثار صحابہ اور اقوال تابعین بھی درج کیے ہیں (طبع شمس الحق عظیم آبادی، دہلی ۱۳۰۶)؛ (۶) کتاب الأدب المفرد (آگرہ ۱۹۰۶ء؛ بعد میں بھی کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے؛ اردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے)؛ (۷) قضايا الصحابة و التابعين، اٹھارہ برس کی عمر میں لکھی، لیکن اب ناپید معلوم ہوتی ہے۔

مآخذ: (۱) ابن الندیم: الفہرست، ص ۲۳۰؛ (۲)

ابن ابی یعلیٰ: طبقات الحنابلة، طبع محمد حامد الفقی، مطبعة السنة الحمديّة ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۲ء، ۱: ۲۷۱ تا ۲۷۹؛

(۳) ابن خلدون: مقسّم (الباب السادس: الفصل السادس

فی علوم الحدیث) المكتبة التجارية الكبرى، مصر، ص ۴۴۲

تا ۴۴۳؛ (۴) ابن حجر المفلّح: ہدی الساری (مفسمہ

فتح الباری)، ادارة الطباعة المنيرية، مصر ۱۳۶۷ھ؛

(۵) الیاقی: مرآة الجنان، ۲: ۱۶۷ تا ۱۶۹؛ (۶)

ابن الصلاح: علوم الحدیث (المعروف بہ مفسمہ ابن الصلاح)؛

(۷) السيوطی: ذیل طبقات الحفاظ، ۲: (۹) وہی مصنف:

تدريب الراوی: (۱۰) السبکی: طبقات الشافعية: (۱۱)

کے مضامین کی تفصیلی فہرست باعتبار حروف تہجی درج کی ہے، جو بڑی کارآمد ہے۔

عصر حاضر میں بھی صحیح بخاری کے کئی اختصارات شائع ہو چکے ہیں، جن میں عمر ضیاء الدین کی زیدة البخاری (القاهرہ ۱۳۳۰ھ)، محمد مصطفیٰ عمارہ کی جواهر البخاری (القاهرہ ۱۳۴۱ھ)، جن میں سات سو منتخب احادیث مع مختصر شرح درج ہیں اور عبدالسلام محمد ہارون کی الالف المختارة من صحیح البخاری (قاهرہ ۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۵ء)، دس مختصر اجزا میں مع مختصر شرح و تخریجات، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

عہد مسالیک میں صحیح بخاری کی قراءت اور ختام کو خاص اہمیت دی جانے لگی۔ دسویں صدی ہجری کے آغاز میں ماہ رمضان میں قاہرہ کی عام محفلوں میں پڑھی جاتی اور ختم بخاری پر بڑا اجتماع ہوتا تھا۔ اسی صدی کے آخر میں شہر زید میں یہی رسم مروج تھی۔ الجزائر میں لوگ صحیح بخاری کی قسمیں کھایا کرتے تھے اور جھوٹی قسم کھانے والے کے لیے عذاب اور ہلاکت یقینی ہوتی تھی۔ الصعيد میں صحیح بخاری کو باعث شفا سمجھا جاتا تھا۔ مغرب میں ایک فوجی جماعت "البخاریة" کہلاتی تھی اور اس جماعت کے سپاہی فوجی خدمات کے لیے صحیح بخاری پر حلف اٹھاتے تھے (براکلمان، تعریب، ۳: ۱۶۵)۔

امام بخاری کی تصانیف میں بیس پچیس کتابوں کے نام ملتے ہیں (دیکھیے سیرۃ البخاری، ص ۱۶۶ تا ۱۷۳)، جن میں کچھ تو ناپید ہیں، کچھ مخطوطات کی شکل میں مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں اور کچھ طبع ہو چکی ہیں: (۱) التاريخ الكبير میں امام بخاری نے صحابہ سے لے کر اپنے عہد تک کے چالیس ہزار راویان حدیث کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ علمی اور فنی لحاظ سے کتب بڑی



(م ۱۱۶۲/۵۱۷۳۸) نے لکھی، دوسری کتاب ترجمہ البخاری عقیف الدین علی بن عبدالمحسن ابن الدوالیبی (م ۸۵۸/۵۱۴۰۴) نے اور تیسری رسالہ فی مناقب البخاری عبدالقادر بن عبدالله العیدروس (م ۱۰۳۸/۵۱۶۲۸) نے لکھی۔

(عبد القيوم)

\* البخاری: ابوالمعالی علاء الدین محمد بن عبدالباقی المکی، [خطیب مدینہ منورہ اور] عربی مصنف، جس نے ۱۵۸۳/۵۹۹۱ء میں اہل حبش کے مناقب میں (بطرز السیوطی وغیرہ) ایک رسالہ بعنوان الطراز المنقوش فی محاسن الحبوش [الموسوم بہ نزہة الناظر وسلوة الخاطر] لکھا، جس کے متعدد مخطوطات محفوظ ہیں۔ اس رسالے کا ترجمہ M. Weisweiler نے *Buntes Prachtgewand...* کے عنوان سے کیا (Hanover ۱۹۲۴ء)۔ متن کے اقتباسات کے لیے دیکھیے: *Bibliothecae Bodleianae cod. mss. or. cat.*، ۱۳۶۳ - نور الدین الحلبي (م ۱۰۴۴/۵۱۶۳۵ء)؛ رآك به الحلبي نور الدين) نے ایک اقتباس قاہرہ میں ۱۳۰۷ء میں طبع کرایا۔

مآخذ: (۱) Flügel، در ZDMG، ۵: ۱۶۹۸۱؛

۶۰۶ تا ۷۰۹؛ (۲) براکمان، ۲: ۵۰۴ و تکملہ ۲؛

۵۱۹؛ [(۳) الزرکالی: الاعلام، بذیل محمد بن عبدالباقی]۔

(C. BROCKELMANN)

بخت خان: محمد بخش، المعروف بہ \*

بخت خان، ہندوستان کی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں آزاد فوجوں کا سپہ سالار اعظم، جسے بہادر شاہ ظفر نے بخت بلند خان کا خطاب بخشا، سلطان پور (اودھ) میں تخمیناً ۱۲۱۲/۵۱۷۹۷ء میں پیدا ہوا۔ ماں کی طرف سے وہ نواب شجاع الدولہ اور باپ کی طرف سے غلام قادر روہیلہ کے خاندان سے تھا۔ حافظ رحمت خان کی موت پر روہیلہ افواج کے انتشار کے بعد اس کے باپ عبداللہ خان نے لکھنؤ میں اقامت

احمد امین: ضحی الاسلام، قاہرہ ۱۹۳۸ء، ۲: ۱۱۰ تا ۱۱۹؛ (۱۲) سرکین: معجم المطبوعات العربیة، عمود ۵۳۴؛ (۱۳) دائرة المعارف الاسلامیة، ۳: ۴۱۹ تا ۴۲۶؛ (۱۴) ترجمہ جامع صحیح البخاری، ادارة الطباعة المنیریة، مصر ۱۳۴۸ھ؛ (۱۵) وحید الزمان: تسهیل القاری (اردو ترجمہ و شرح صحیح بخاری)، مطبع صدیقی، لاہور ۱۳۰۷ھ، ۱: ۳ تا ۴؛ (۱۶) محمد بن جعفر الکتانی: الرسالة المستطرفة، کراچی ۱۹۶۰ء، ص ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۰۶، ۱۱۸؛ (۱۷) صبحی الصالح: علوم الحدیث، بیروت ۱۹۶۵ء (بامداد اشاریہ)؛ (۱۸) جمال الدین القاسمی: حیاة البخاری، صیدا ۱۳۳۰ھ؛ (۱۹) صدیق حسن خان: اتحاف النبلاء، مطبع نظامی، کانپور ۱۲۸۸ھ؛ (۲۰) وہی مصنف: الحطّة فی ذکر الصحاح الستّة، مطبع نظامی، کانپور ۱۲۸۳ھ؛ (۲۱) السخاوی: فتح المغیث بشرح الفیة الحدیث، مطبع انوار محمدی ۱۳۰۱ھ؛ (۲۲) عبدالحمی الحسنی: الثقافة الاسلامیة فی الہند (معارف العوارف فی انواع العاوم و المعارف)، دمشق ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۸ء؛ (۲۳) شاہ عبدالعزیز: بستان المحدثین (اردو ترجمہ از عبدالسمیع، مطبوعہ کراچی، ص ۱۷۰ تا ۱۷۶)؛ (۲۴) القسطلانی: ارشاد الساری (شرح البخاری، مقدمہ)، بولاق ۱۳۰۵ھ؛ (۲۵) حاجی خلیفہ: کشف الظنون، مطبعة البهية، استانبول ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء، ۱: ۵۴۱ تا ۵۵۵ و بمواضع کثیرہ؛ (۲۶) عبدالسلام مبارکپوری: سیرة البخاری (بزبان اردو)، بار دوم، الہ آباد ۱۳۶۷ھ؛ (۲۷) براکمان: تاریخ الادب العربی (تعریب عبد الحلیم النجار)، دارالمعارف، مصر ۱۹۶۲ء، ۳: ۱۶۳ تا ۱۷۹؛ (۲۸) کل ما فی البخاری صحیح (جمعیة الاصلاح الاجتماعی)، الكويت ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء؛ (۲۹) محمد اسحق: *India's Contribution to Hadith Literature*، لاہور ۱۹۵۵ء؛ (۳۰) النرشخی: تاریخ بخارا (طبع شیفر)، پیرس ۱۸۹۲ء ص ۲۵۳ - امام بخاری کے حالات زندگی پر ایک کتاب الدراری اسمعیل بن محمد بن عبدالہادی المعجلونی

اختیار کر لی۔ اپنی عمر کے بیسویں سال (تخمیناً ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء) میں وہ ”آٹھویں پیدل توپ خانہ“ میں، جو بریلی بریگیڈ کے نام سے مشہور ہے، بطور صوبیدار بھرتی ہوا۔ اس حیثیت میں وہ جنگ آزادی کے آغاز تک چالیس سال ملازم رہا۔ یورپین مؤرخین نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ اور چھاتی ۴۴ انچ تھی اور وہ نہایت ذہین اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ بعض مصنفین کا کہنا ہے کہ مولوی سرفراز علی نے اس کے خیالات میں انقلاب پیدا کیا اور اسے انگریزوں سے بیزار کر دیا۔ مولوی سرفراز علی وہابی عقائد رکھتے تھے اور اسی بنا پر حکیم احسن اللہ نے اپنے بیان میں بخت خان کو بھی ”وہابی العقیدہ“ بتایا تھا۔

میدانی توپ خانے نے، جس کا وہ سردار تھا، پہلی جنگ افغانستان (۱۸۳۸ تا ۱۸۴۲ء) میں جلال آباد کے مقام پر کارہائے نمایاں انجام دیے تھے۔ اس میں بخت خان نے اپنی شاندار خدمات کے صلے میں بہت سے امتیازات اور تمغے حاصل کیے تھے۔

۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کو بریلی میں دیسی فوجوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی آزادی کا اعلان کیا تو بخت خان فوراً بریلی آ گیا اور نمایاں کردار ادا کیا۔ اس نے بریلی کو برطانوی تسلط سے آزاد کر کے حافظ رحمت خان کے ایک ہوتے خان بہادر خان کو ”نواب ناظم“ بنایا۔ اس صلے میں بخت خان کو بریگیڈیر کا رتبہ ملا۔ بعد ازاں وہ براستہ رام پور، مراد آباد اور رجب پور دو جولائی کو دہلی پہنچا، جہاں مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے اسے مرزا مغل کی جگہ شاہی فوجوں کا کمانڈر انچیف بنایا اور فرزند کے خطاب سے نوازا اور مرزا مغل کو Adjutant General کا عہدہ دیا گیا۔ جنرل بخت خان نے شاہی فوجوں کو از سر نو منظم کر کے ۹ جولائی کو دس ہزار فوج کی معیت میں انگریزوں کو ایک

شکست فاش دی۔ اگر وہ حالات پر قابو نہ پا لیتا تو انگریز جولائی کے شروع ہی میں، جب پنجاب سے ان کو مستقل کمک آئی شروع ہو گئی تھی، سارا ملک فتح کر لیتے۔ اسی کے ایما سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ شائع کیا گیا، جس پر دارالحکومت کے مقتدر اور سربرآوردہ علماء و مشائخ کے دستخط تھے۔ ان میں صدرالدین آزرده [رک بان] اور فضل حق خیرآبادی بھی شامل تھے۔ بعض خود غرض افراد اور شہزادے، جو اس سے حسد رکھتے تھے اور خفیہ طور پر انگریزوں سے مل گئے تھے، ہر کام میں اس کی مخالفت کرتے تھے، چنانچہ دربار میں اسے انتہائی نامساعد حالات میں کام کرنا پڑتا تھا؛ نتیجہً شاہی فوجوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ فتح دہلی کے بعد بخت خان نے بادشاہ کو پیشکش کی کہ وہ اس کی پانچ ہزار فوج کی معیت میں اگر چاہے تو روہیل کھنڈ روانہ ہو جائے، مگر بادشاہ چونکہ الہی بخش اور حکیم احسن اللہ (جو انگریزوں سے در پردہ ملے ہوئے تھے) کے زیر اثر تھا اس لیے اس نے ان کے اصرار پر بخت خان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ بخت خان نے ۱۹ ستمبر کو دہلی چھوڑی اور لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد حالات صحت کے ساتھ تحریر میں نہیں آئے۔ اس سلسلے میں مختلف روایتیں ملتی ہیں، مثلاً ایک روایت یہ ہے کہ وہ اودھ کے قصبہ نواب گنج کی جنگ میں ۱۸۵۹ء میں مارا گیا۔ بعض کہتے ہیں کہ اس نے اولاً جلال آباد (ضلع ہردوئی) میں پڑاؤ ڈالا، پھر بلگرام (رک بان) اور مرزا گھاٹ میں۔ بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ وہ فقیر کے بھس میں نیپال کی طرف نکل گیا جہاں اس جنگ آزادی کے چند اور رہنما بھی پناہ گزیں تھے۔

مآخذ: (۱) Charles Ball : History of the

Indian Mutiny، لندن، بدون تاریخ، ص ۵۰۸؛ (۲)



despatches, and other state papers preserved in the  
 'Military Department of the Govt. of India (1857-58)  
 'City of Delhi during the Siege (۲۲)؛ ۱۹۱۲ء؛ کلکتہ  
 G. F. (۲۳) ؛ I. O. L. MSS. European B-188  
 'The Campaign in India, 1857-58 : Atkinson  
 'Oudh in 1857 : Bonham James (۲۴)؛ ۱۸۵۸ء؛ لنڈن  
 My : William Howard Russell (۲۵)؛ ۱۹۲۸ء؛ لنڈن  
 'Indian Mutiny Diary، بار اول ۱۸۶۰ء و بار دوم،  
 طبع Michael Edwards، لنڈن ۱۹۵۷ء؛ (۲۶)  
 'The Sepoy Mutiny and Revolt : R. C. Majumdar  
 of 1857، کلکتہ ۱۹۵۷ء، ص ۵۲، ۷۳، ۱۲۶، ۱۷۷؛  
 Bahadur Shah II : Mahdi Husain حسین مہدی (۲۷)  
 and the War of 1857 in Delhi، دہلی ۱۹۵۸ء،  
 ص ۲۳۰ تا ۲۷۰، ۲۹۱، ۲۹۳، ۲۹۷؛ (۲۸) عبداللطیف :  
 روزنامچہ (فارسی)، اردو ترجمہ از خلیق احمد نظامی،  
 بعنوان تاریخی روزنامچہ، دہلی ۱۹۵۸ء؛ (۲۹)  
 مجلہ العلم، کراچی، جنگ آزادی نمبر، ص ۹ تا ۱۸؛  
 (۳۰) میان محمد شفیع : ۱۸۵۷ء - پہلی جنگ آزادی،  
 لاہور ۱۹۵۷ء؛ (۳۱) C. T. Metcalfe : Two Narra-  
 tives of the Mutiny in Delhi، لنڈن ۱۸۹۸ء۔

(بزمی انصاری [و یار محمد خان])

بختاور خان : اورنگ زیب (رک بہ عالمگیر) ❊

کا منظور نظر خواجہ سرا، معتمد علیہ اور خدمت گار  
 خاص، جس نے اس کے عہد شاہزادگی ہی میں اس  
 کی ملازمت اختیار کر لی تھی (۱۰۶۵/۱۶۵۳ء)۔  
 اورنگ زیب کی تخت نشینی کے وقت اسے خان کا  
 خطاب ملا۔ ۱۰۸۰/۱۶۶۹ء میں داروغہ خواہاں  
 مقرر کیا گیا اور ایک ہزاری کا منصب عطا ہوا۔  
 اورنگ زیب کی تیس سال تک وفاداری سے خدمت  
 کرنے کے بعد ۱۰۹۶/۱۶۸۵ء کو  
 بختاور خان نے صرف چند روز علیل رہ کر احمد نگر  
 میں وفات پائی۔ اس کی موت پر بادشاہ خود سوگوار

'A History of the Indian Mutiny : T. Rice Holmes  
 : J. W. Kaye (۳) : ۳۵۲ تا ۳۵۳، ص ۱۸۹۸ء، لنڈن  
 'History of the Sepoy War in India  
 Punjab Government Record Office : (۴)؛ ۶۳۳ : ۳  
 Parliamentary (۵) ؛ Publications Monograph No 15  
 Insurrection (۶) ؛ ۲۲ : ۱۸، ۱۸۵۹ء، لنڈن  
 'Papers in the East Indies presented to both Houses of  
 Parliament، لنڈن ۱۸۵۸ء، ص ۱۰۳؛ (۷) نجم الغنی  
 رامپوری : اخبار الصنادید، لکھنؤ ۱۹۰۳ء، ج ۲ :  
 (۸) سیدہ انیس فاطمہ بریلوی : ۱۸۵۷ء کے ہیرو، علی گڑھ  
 ۱۹۳۹ء، ص ۶۵؛ (۹) ساورکر V.D. Savarkar  
 'The War of Independence 1857  
 Eighteen : سریندر ناتھ سین : (۱۰) اشاریہ؛  
 ۲۹۵ و اشاریہ؛ (۱۰) سریندر ناتھ سین :  
 Fifty - seven، دہلی ۱۹۵۷ء، ص ۸۳ تا ۸۴، ۱۰۱  
 تا ۱۰۲، ۳۷۱ و اشاریہ؛ (۱۱) غلام رسول بہر :  
 ۱۸۵۷ء کے مجاہد، لاہور ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۳ تا ۱۲۰؛  
 (۱۲) انتظام اللہ شہابی : مشاہیر جنگ آزادی، کراچی  
 ۱۹۵۷ء، ص ۲۳۲ تا ۲۳۵؛ (۱۳) ظہیر دہلوی :  
 داستان غدر، طبع ثانی، لاہور ۱۹۵۵ء، ص ۱۳۵،  
 ۱۴۰ تا ۱۴۳؛ (۱۴) شمس العلماء منشی ذکاء اللہ :  
 عروج عہد سلطنت انگلشیہ، دہلی ۱۹۰۳ء، ص ۶۷۶،  
 ۶۸۶، ۶۹۶؛ (۱۵) حسن نظامی : دہلی کی جانکنی، دہلی  
 ۱۹۲۵ء؛ (۱۶) F. Cooper : 'The Crisis in the Punjab :  
 لنڈن ۱۸۵۸ء، ص ۲۰۱؛ (۱۷) G. Bouchier : Eight  
 months' Campaign against the Bengal Sepoy  
 Army.....، لنڈن ۱۸۵۸ء، ص ۳۳؛ (۱۸) کمال الدین  
 حیدر : قیصر التواریخ، لکھنؤ ۱۸۹۶ء، ۳۱۲ : ۲؛ (۱۹)  
 رئیس احمد جعفری : بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، لاہور،  
 بدون تاریخ، ص ۸۳۵ تا ۸۵۳؛ (۲۰) Sir William  
 Intelligence Records of the Indian Mutiny : Muir  
 of 1857، طبع Goldstream، ایڈنبرا ۱۹۰۲ء، ۳۱۱ : ۲؛  
 Selections from letters, : G. W. Forrest (۲۱)]

۱۹۲۷ء تا ۱۹۸۳ء (۵۱۰۹۳/۱۶۸۳ء) نے اپنے دوست بختاور خان کے نام پر لکھ کر اسے پیش کیا۔ خاتمہ کتاب پر بختاور خان اپنے کارناموں کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ اسے مندرجہ ذیل کتابوں کی تصنیف کا دعویٰ ہے: (۱) چار آئینہ یا آئینہ بخت (۵۱۰۶۸/۱۶۵۷ء)، جس میں ان چار لڑائیوں کا ذکر ہے جو اورنگ زیب عالمگیر نے لڑ کر تخت شاہی حاصل کیا (Browne، تکملہ، ص ۱۳۵)؛ (۲) ”ریاض الاولیاء“ (۵۱۰۹۰/۱۶۷۹ء)، مسلم اولیا اور مشاہیر کے سوانح حیات، چار ”چمنوں“ میں (Rieu، ۳ : ۹۸۵ الف؛ (بہ تصحیح) آصفیہ، ۱ : ۳۲۰، عدد ۱۱۵؛ Browne، تکملہ، ص ۷۲۸ Corpus (۱۲۶)؛ (۳) انتخابات از : حدیقہ سنائی، منطق الطیر عطار و مثنوی مولانا روم تاریخ الفی و اخبار الاخیار و دیوان صائب۔ اس کی ”ریاض“ (”تذکرۃ الشعراء“)، جو نامور شعرا کے منتخب کلام مع حالات زندگی کے علاوہ مشاہیر اولیا و صوفیہ کی تصنیفات و تالیفات کے اقتباسات پر مشتمل ہے، قلعہ دہلی کے آثار قدیمہ کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔ بختاور خان ”تاریخ ہندی“ کا بھی مؤلف تھا۔ یہ بابر سے اورنگ زیب کے عہد تک کی تاریخ ہندوستان ہے (Princeton، ص ۴۶۸ و Storey، ص ۵۱۷)۔ مختلف مصنفین نے اس کے لیے ایک کتاب فتاویٰ، بعنوان ہمد بخت، مرتب کی تھی، جو فقہ حنفی کا خلاصہ ہے اور ایک ادبی کثکول کی حیثیت رکھتی ہے۔

بختاور خان نے ان تعمیرات کا ذکر بھی کیا ہے جن کی اس نے رفاہ عامہ کے سلسلے میں بنیاد رکھی یا انہیں پایہ تکمیل تک پہنچایا، مثلاً قصبہ بختاور پورہ، متعدد مساجد، کارواں سرائیں (جن میں بختاور نگر بھی شامل ہے جو فرید آباد جانے والی سڑک پر واقع تھا)، بعض ہل اور طلبہ کی

ہول پش فیلی اس کی نماز جنازہ پڑھائی اور اس کی میت کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر چند قدم چلا۔ اس کی میت دہلی لائی گئی اور ایک قصبے میں، جس کا نام اس کے نام پر بختاور پورہ تھا اور جو اب ہستی نبی کریم کہلاتی ہے، خود اسی کی تعمیر کردہ قبر میں دفن کی گئی۔

بختاور خان نہایت علم دوست، فنون لطیفہ کا سرپرست اور شاعر تھا۔ محمد اسلم نے اپنی تصنیف فرحت الناظرین میں اس کے شاعرانہ محاسن کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کی حسن سعی سے شیخ رضی الدین بھاگلپوری کو، جو ”فتاویٰ عالمگیری“ (رک باں) کے مؤلفین میں سے ایک مؤلف ہیں، دربار شاہی میں بار ملا۔

عنوان شباب ہی سے بختاور خان تاریخ کا بڑا سرگرم طالب علم تھا اور اس نے شستہ اسلوب تحریر کی مشق بہم پہنچائی تھی۔ محمد ساقی مستعد خان، مؤلف مآثر عالمگیری، بختاور خان کے ہاں اس کے کاتب خاص اور محاسب کے طور پر ملازم تھا۔ بختاور خان ہی کو ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں یہ کام تفویض کیا گیا کہ احکام شرعی کی رو سے شاہی منجین کو آئندہ کے لیے جنم پتیاں اور جنتریاں تیار کرنے کی ممانعت کر دی جائے۔ اس کی تالیف مرآة العالم (جو ۱۰۷۸ھ/۱۸۶۷ء میں لکھی گئی، مگر بعض جگہ ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۳ء تک واقعات کا تذکرہ بھی ملتا ہے) ایک عمومی تاریخ ہے، لیکن اورنگ زیب کے عادات و خصائل اور اس کے عہد کے پہلے دس سال کے واقعات پر مستند کتاب سمجھی جاتی ہے (مرآة العالم کے مصنف پر رائے زنی کرتے ہوئے سٹوری Storey، ریو Rieu اور ایلیٹ Elliot و ڈاؤسن Dowson لکھتے ہیں کہ گو بظاہر اس کتاب کا مصنف بختاور خان ہی ہے، لیکن درحقیقت اسے محمد بقا (۱۰۳۷ھ/



اقامت گاہیں۔ اس نے دو باغ بھی لگوائے: ایک لاہور میں شالامار کے نزدیک اور دوسرا اغر آباد میں، جو شاہ جہاں آباد (دہلی) سے تین میل کے فاصلے پر واقع تھا۔

مآخذ: مآثر عالمگیری، Bib. Ind.، ص ۲۵۳ و اشاریہ؛ (۲) مرآة العالم، آخری "افزائش" (جو OCM (S) فروری تا مئی ۱۹۵۴ء میں منقول ہے)؛ (۳) نزہة الخواطر، ۵ : ۸۹؛ (۴) ستوری Storey، ص ۱۳۲ تا ۱۳۳؛ (۵) بندراین داس: تذکرۃ الامراء، بذیل مادہ؛ (۶) Rieu، ۱ : ۱۲۵ تا ۱۲۶؛ (۷) "فہرست کتاب خانہ بانکی پور"، ۶ : ۳۷۷؛ (۸) Dowson و Elliot، ۷ : ۱۵۰ تا ۱۵۳؛ (۹) OCM، نومبر ۱۹۳۸ء؛ (۱۰) H. Morley، A Descriptive Catalogue of the Historical Manuscripts، لندن، ۱۸۵۴ء، ص ۵۲ تا ۵۶؛ (۱۱) N. Lees، در JRAS، سلسلہ جدید، ۳ : ۳۶۵۔

(بزمی انصاری [و یار محمد خاں])

\* بختگان: ایران کے صوبہ فارس میں کھاری

پانی کی سب سے بڑی جھیل، جو شیراز کے مشرق میں تقریباً پچاس کیلومیٹر کے فاصلے پر اور [سطح سمندر سے] تقریباً ایک سو میٹر بلند واقع ہے۔ اس کا طول و عرض باعتبار موسم بدلتا رہتا ہے، لیکن شمالاً جنوباً زیادہ سے زیادہ ایک سو کیلومیٹر اور شرقاً غرباً تیس کیلومیٹر ہوتا ہے۔ پانی حد سے زیادہ کھاری ہے اور جھیل بھی بڑی اتھلی ہے۔ یہ جھیل دراصل دریائے کر یا بند امیر کا طاس ہے۔

قرون وسطیٰ کی عربی کتب جغرافیہ میں جھیل بختگان کا ذکر بہت کم آتا ہے۔ ابن خردادبہ (ص ۵۳) نے اس کا ذکر جھیل جوبانان کے نام سے کیا ہے۔ الاصطخری (ص ۱۲۲) کے نزدیک اس کا نام بجکان ہے۔ اس نے اس کا ایک اور نام بجفوز بھی دیا ہے۔ ابن حوقل (طبع Kramers، ص ۲۷۷) نے اسے

البختگان لکھا ہے۔ الاصطخری، ابن حوقل اور المقدسی (ص ۴۴۶) نے صوبہ فارس کی پانچ جھیلوں (بحیرات) کی جو فہرست دی ہے وہ حسب ذیل ہے: (۱) بختگان، ضلع (= کورہ) اصطخر میں؛ (۲) دشت آرز، ضلع ساہور میں؛ (۳) توز، بمقام کازرون (ضلع ساہور)؛ (۴) جنکان، شیراز کے قریب، جسے ابن حوقل نے جھیل مور لکھا ہے؛ (۵) باسفویہ (المقدسی: باسفویہ؛ ابن حوقل: البسفریہ)، ضلع اصطخر میں۔

آج کل جھیل بختگان کو نیریز کہتے ہیں۔ دوسری جھیلوں کے نام Herzfeld نے یوں متعین کیے ہیں: (۲) جھیل دشت آرجان، (۳) جھیل قمور یا شیرین یا کازرون، (۴) جھیل شیراز یا سہارلو۔ باسفویہ غالباً جھیل بختگان کے ایک حصے کا نام ہے اور شاید بجفوز اور یہ ایک ہی جھیل ہیں۔ جھیل بختگان ہمیشہ سے متعدد حصوں میں منقسم رہی ہے جو پانی کی تنگ شاخوں سے باہم دگر ملے ہوئے ہیں۔ اس کا شمالی حصہ باسفویہ یا جبانان [= جوبانان] کہلاتا تھا اور جنوبی حصہ صحیح طور پر بختگان یا نیریز۔ اس کی مساحت کپتان ولز Capt. H.L. Wells نے کی تھی۔

مآخذ: مذکورہ بالا جغرافیہ نگاروں کے علاوہ تب

(۱) یاقوت، طبع Wüstenfeld، ۳ : ۸۳۸؛ (۲) H.L. Wells،

Proceedings، Surveying Tours in Southern Persia،

RGS، ۵ (۱۸۸۳) : ۱۳۸؛ (۳) Le Strange، ص ۲۷۷

تا ۲۷۹؛ (۴) مسعود کیہان: جغرافیای مفصل ایران،

تہران ۱۹۳۲ء، ۱ : ۸۹ تا ۹۲۔

(R.N. FRYE)

بخت نصر: [= بخت نصر] فارسی کے بخترشہ [نیز \*]

بخت نرسی (الاخبار الطوال)، بائبل کے نبوکد نصر

[نبو شاد نصر] Nebuchadnezzar اور یونانی کے

Na βουκοδρόσος کی عربی شکل۔ خط میخی میں

اس کی املا کچھ اس طرح سے ہے: Nabu-Kudurri-usur،

الجہی ہوئی شخصیت ہے [دیکھیے الطبری ۱: ۶۴۹؛  
الخبار الطوال]۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بارے  
میں بیشتر معلومات اسرائیلیات سے تعلق رکھتی ہیں  
اور اس ادب میں اس کی تقریباً وہ سب ممتاز خصوصیات  
برقرار ہیں جو بائبل میں بیان ہوئی ہیں، خصوصاً  
وہ بیانات جو کتاب یرمیاں اور دانیال میں موجود  
ہیں۔ بائبل میں یہ نام کوئی ایک سو مرتبہ  
استعمال ہوا ہے۔

بخت نصر کے باپ کا نام Nobopolassar بتایا  
جاتا ہے، جس کی وفات کے بعد ۶۰۴ قبل مسیح  
میں بخت نصر بابل کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے تقریباً  
تینتالیس برس حکومت کی اس کا سال وفات ۵۶۱ قبل  
مسیح ہے۔

بخت نصر کلدانی نسل سے تعلق رکھتا ہے  
بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ یہ حضرت سلیمان<sup>۳</sup>  
اور ہلقیس کی نسل سے تھا (Jewish Encyclopedia)  
۹: ۲۰۱)۔ بخت نصر کی شادی ماد (الجبال) (Media)  
کی ایک شہزادی سے ہوئی۔

بخت نصر سے ایک سنہ کا آغاز بھی ہوتا ہے  
اور البیرونی اور المسعودی نے اس سنہ کی وجہ سے  
تاریخ میں ترتیب زمانی کی بعض مشکلات کو  
سلجھانے کی کوشش بھی کی ہے (مثلاً تَب التَّيْبِه  
والاشراف، ص ۱۲۹ بعد)۔ المسعودی نے ذیل کی  
تقویموں کی تطبیق دی ہے: ۵۳۴۰ = [۵۹۰۶] =  
۱۲۰۲ بخت نصری = ۱۲۶۸ اسکندری = ۶۷۳  
اردشیری = ۴۴۴ یزد جردی (التَّيْبِه والاشراف، ص  
۴۰۱)۔ بعض کا قول ہے کہ حضرت آدم<sup>۴</sup> سے لے کر  
بخت نصر کے سربر آراء سلطنت ہونے تک ۴۸۰۰ سال  
کا عرصہ ہے، یہی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی  
پیدائش بخت نصر کے آغاز حکومت سے ۱۳۱۷ سال  
بعد ہوئی (کتاب مذکور، ص ۲۲۸) اور بخت نبوی  
۱۳۵۷ سال بعد (کتاب مذکور، ص ۲۳۰)۔

جس کے معنی ہیں: "نبو! میری حدودا مملکت کی  
مطلبت کرو"۔ اس نے ۵۸۶ قبل مسیح میں یروشلیم پر  
حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا۔ علامہ آلوسی نے لکھا  
ہے کہ آیت قرآنی: أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ  
خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا (۲ [البقرة]: ۲۵۹) میں جس  
شہر کا ذکر ہے وہ عکرمہ، ریح اور وہب کے  
نزدیک یروشلیم [= بیت المقدس] ہے جسے بخت نصر  
نے برباد کر دیا تھا (روح المعانی، بذیل تفسیر آیت  
بالا) اور جسے بخت نصر کے بعد پشتاسب (گشتاسب)  
ابن لہراسپ نے آباد کیا (الطبری: تاریخ، ۱: ۶۴۷)۔  
یروشلیم کو برباد کرتے وقت بخت نصر نے بہت سے  
یہودیوں کو قتل کروا دیا؛ ایک بڑی تعداد کو،  
جس کا شمار ایک روایت میں ۳۰۲۳ اور دوسری میں  
اٹھارہ ہزار ہے، قید کر کے بابل لے گیا اور تورات اور  
یہودی کتب ایک کنویں میں پھنکوا دیں۔ یروشلیم  
کو برباد کرنے کے بعد بخت نصر نے مصر پر حملہ  
کیا اور وہاں کے فرعون الاعرج کو قتل کر دیا۔  
ایک عرصے کے بعد جب بنی اسرائیل کو پھر سے  
پشتاسب نے آباد کیا تو انہوں نے پھر سے تورات کی  
تدوین کی۔ سامریوں کا دعویٰ ہے کہ یہ جدید تورات  
وہ تھی جو حضرت موسیٰ<sup>۴</sup> نے اپنی قوم کو  
دی تھی، بلکہ اس کا ایک محرف و تبدل نسخہ ہے  
[نیز رآہ تورات]۔ اس سلسلے میں المسعودی لکھتا  
ہے: سامریوں کا دعویٰ ہے کہ آج کل جو یہود کے  
ہاتھ میں تورات ہے یہ وہ نہیں جو حضرت موسیٰ<sup>۴</sup>  
نے بنی اسرائیل کو دی تھی۔ وہ اصل نسخہ تو جبل  
گیا تھا اور بعد والوں نے اسے بدل ڈالا تھا اور اس  
میں تغیر و تبدل کر دیا تھا اور یہ جدید نسخہ اس  
مذکورہ بادشاہ نے بنی اسرائیل کے ان لوگوں کی زبانی  
بادداشتوں سے تیار کروایا تھا جنہیں تورات یاد تھی  
[سراج الذهب، بعد اشارہ]۔

مسلمانوں کی کتابوں میں بخت نصر ایک بہت



فاطمیوں کا اثر پھیلنے سے نئے مسائل پیدا ہوئے تو وہ قرامطہ کی طرف مائل ہو گیا، جو اس وقت فاطمیوں کی مزاحمت کر رہے تھے۔ بختیار میں یہ نقص تھا کہ وہ اپنے عساکر میں ضبط و نظم قائم نہیں رکھ سکتا تھا حالانکہ یہ چیز کسی حکومت کے استحکام کے لیے لازمی شرط ہے۔ دیلمیوں اور ترکوں کی ناچاقی نے بڑھتے بڑھتے تلخی کی صورت اختیار کی تو بختیار اور ترک کھلم کھلا ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے۔ اس میں بغداد کی سنی شعیہ آویزشوں نے جن میں عیارون (رک باں) بھی کود پڑے تھے اور زیادہ پیچیدگی پیدا کر دی، چنانچہ وہ اپنے عم زاد بھائی عضدالدولہ، والی فارس، سے استعانت کے لیے مجبور ہو گیا۔ عضدالدولہ نے اسے بچا تو لیا، مگر اس کی نا اہلی کو دیکھتے ہوئے خود اس کی جگہ لینے کی فکر کرنے لگا۔ اگرچہ عضدالدولہ اپنے باپ رکن الدولہ کی مخالفت کے باعث، جو اس وقت خاندان بویہ کا سردار تھا، عارضی طور پر رک گیا، لیکن رکن الدولہ کی وفات کے بعد وہ اپنی تجویز کو بروئے کار لانے میں کامیاب ہو گیا۔ بختیار ابوتغلب اور شاہین کے ہمراہ اس کے خلاف صف آرا ہوا اور شکست کھا کر مارا گیا (۵۳۶۶/۹۷۶-۹۷۷ء)۔ اس لڑائی کی تفصیل کے لیے رک بہ عضدالدولہ۔ یہ جنگ ہو رہی تھی جب خلیفہ المطیع کی جگہ الطائع نے لی۔ وہ ترکوں کا آوردہ تھا اور اسی لیے اس نے بختیار کی مخلصانہ حمایت نہیں کی۔

مآخذ: مقالات ”(آل) بویہ“ و ”عضدالدولہ“ کے علاوہ اہم ترین مآخذ: (۱) ابن مسکویہ: تجارب الأمم، جو ہلال الصابی کی نایاب تاریخ پر مبنی ہے۔ دوسرے درجے کے وقائع میں (۲) یحییٰ الانطاکی (Patrol. Or. xxiii)، بالخصوص ورق ۳۵۴ (بعد) خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ہمارے دستاویزی مآخذ میں (۳) الصابی (ابواسحق) کے مکاتیب (جزوی طور پر طبع شکیب ارسلان، خلافت کے

مآخذ: (۱) الطبری: تاریخ، ۱/۲: ۶۴۳؛ (۲) المسعودی: التنبیہ والاشراف، بمدد اشاریہ: (۳) وہی مصنف: مروج الذهب، بمدد اشاریہ؛ (۴) ابن قتیبہ: کتاب المعارف، ص ۲۳ بعد؛ (۵) الثعالبی: عرائس المجالس، ص ۱۹۲ بعد؛ (۶) البیرونی: الآثار، ص ۲۵، ۲۷، ۳۰؛ (۷) البدہ والتاریخ، جو البلخی کی طرف منسوب ہے، ۲: ۱۳۰ بعد؛ (۸) ساسی: قاموس الاعلام، ص ۱۲۵؛ (۹) Jewish Encyclopedia؛ (۱۰) Encyclopaedia Britannica، ۱۹۰۰ء، ۲۰۰: ۹؛ (۱۱) (لاڈن)، طبع اول، بذیل ۱۶: ۱۸۴ بعد؛ (۱۲) الدینوری: الاخبار الطوال؛ بامداد اشاریہ۔

G. VAJDA [و ادارہ]

\* بختی: سلطان احمد اول کا تخلص [قاموس الاعلام، استانبول ۱۳۰۶ھ، ص ۷۸۵]، قَب Gibb: Ottoman Poetry، ۳: ۲۰۸۔

\* بختیار: شاہزادہ، [عراق، اہواز اور کرمان کے بویہی فرمانروا] معزالدولہ [رک باں]: ۵۳۲/۹۳۲ء تا ۵۳۵۶/۹۶۷ء کا بیٹا، جو ۵۳۴۴/۹۵۵ء میں ولی عہد مقرر ہوا اور ۵۳۵۶/۹۶۷ء میں عزالدولہ کا لقب اختیار کر کے ایران میں اپنے باپ کا جانشین قرار پایا۔ معلوم ہوتا ہے اس میں حکمرانی کی صلاحیت بہت کم تھی، چنانچہ اپنے باپ کے برعکس اس نے حکومت کا سارا کام اپنے وزرا کے سپرد کر رکھا تھا (جن کے انتخاب میں اس نے کبھی بصیرت سے کام نہیں لیا) تاکہ خود بے فکری کی زندگی بسر کرے؛ تاہم وہ اپنی جلد بازی اور تند خوئی کے باعث زبانی یا عملاً کاروبار سلطنت میں رکاوٹ ڈالتا رہتا تھا۔ ابتداءً حکومت میں وہ موصل کے امیر ابو تغلب الحمدانی اور بطیحہ کے خود مختار رئیس عمران بن شاہین کے ساتھ مخاصمت میں اپنے باپ کی حکمت عملی پر قائم رہا۔ پھر جب شام میں

کر سہلت حاصل کر لیتا ہے۔ گیارہویں روز، جب کہ اسے قتل ہونا ہے، دربار میں راہزنوں کا وہ سردار حاضر ہو جاتا ہے جس نے بختیار کو ہالا ہوسا تھا اور بادشاہ کو بتاتا ہے کہ بختیار اس کا بیٹا ہے۔ وزیرا قتل کر دیے جاتے ہیں، بادشاہ تخت سے دست بردار ہو جاتا ہے اور بختیار اس کی جگہ بادشاہ بن جاتا ہے۔

یہ کتاب اصلاً فارسی میں لکھی گئی تھی۔ نوالڈ کہ Nöldeke (دیکھیے مآخذ) نے اس کے مختلف نسخوں اور ان کی ترتیب زمانی (جسے قبل ازیں Basset متعین کر چکا تھا) کی چھان بین کے دوران میں قدیم ترین فارسی نسخے (مخطوطہ، ۵۶۹۵/۱۲۹۶ء) کے اقتباسات مع ترجمہ شائع کیے۔ اس کتاب کا اسلوب نہایت اعلیٰ درجے کا ہے، چنانچہ اس کی دھوم مچ گئی۔ مصنف کا بیان ہے کہ اس نے یہ داستان سمرقند کے کسی امیر کے لیے لکھی تھی۔ اس امیر کی شخصیت متعین نہیں ہو سکی، تاہم نوالڈ کہ کی تحقیق کے مطابق وہ چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں زندہ تھیں۔ متاخر نسخے خواہ عربی میں ہوں (جن میں سے ایک نسخے کو *الف لیلة و لیلة* میں داخل کر لیا گیا ہے)، خواہ فارسی میں، باعتبار اسلوب زیادہ سلیس کر دیے گئے ہیں، لیکن جہاں تک کہانیوں کی نظم و ترتیب کا تعلق ہے ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یہی کیفیت اویغوری نسخے (مخطوطہ، ۵۸۳۸/۱۳۳۵ء) اور پناہی (نویں صدی ہجری/ پندرہویں صدی عیسوی؛ دیکھیے *Bertels*، در مآخذ) کی ہے۔ ملبائی زبان کا نسخہ اور کتخدا مرزبان کا فارسی منظوم نسخہ (۵۱۲۱/۱۷۹۵ء، *Cat. Persiam: Élibé*، *Ms. India Office*، عدد ۱۷۲۶) نسبتاً قریب زمانے کے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کہانیوں کا مقصد یہ ہے کہ عاجلانہ فیصلوں کے قصانوں اور خطروں کو واضح

نقطہ نظر سے) اور (۴) عبدالعزیز بن یوسف کے مکاتیب (تجزیہ از Cl. Cahen، در *Studi Orientalistici della Vita*، ۱ : ۸۳ تا ۹۸، عبدالدولہ کے نقطہ نظر سے) بہت ممتاز ہیں۔ نیز دیکھیے (۵) ابن عباد کے مکاتیب، طبع عبدالوہاب عزام و شوقی ضیف، ۱۹۳۷ء، ج ۱، عدد ۷۔

(CL. CAHEN)

• بختیار خلجی : رک بہ محمد بختیار خلجی۔

• بختیار کاکی : رک بہ قطب الدین۔

• بختیار نامہ : جو دس وزیروں کی تاریخ کے نام

سے بھی مشہور ہے اور *سند باد [رک بہ سند باد نامہ]* یا سات وزیروں کی ہندی داستان کا اسلامی چربہ ہے۔ *سند باد نامہ* کی طرح یہ کتاب بھی ایک ایسی داستان پر مشتمل ہے جس کے اندر کئی ایک دوسری کہانیاں داخل کر دی گئی ہیں، لیکن یہ کہانیاں اصل داستان سے بخوبی مربوط ہیں۔ موضوع نہایت مختصر ہے : بادشاہ آزاد بخت کے بیٹے کو پیدا ہونے چند دن ہی گزرنے پاتے ہیں کہ اس کے والدین اٹانے فرار میں اسے راستے ہی میں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ راہزنوں کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور وہی اس کی پرورش کرتے ہیں۔ انجام کار بادشاہ کے سپاہی اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ بادشاہ اسے پسند کرتا ہے اور بختیار کے نام سے اپنے ہاں ملازم رکھ لیتا ہے۔ آخر الامر بادشاہ اسے ایک اونچے منصب پر فائز کرتا ہے تو اس کے وزراء، جو بختیار سے جلتے ہیں، ایک اتفاقی واقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بادشاہ کے حضور اس پر بہت لگاتے ہیں، جس پر بختیار اور ملکہ دونوں قید کر دیے جاتے ہیں۔ ملکہ اپنی جان بچانے کے لیے کہتی ہے کہ بختیار اس پر مجرمانہ حملہ کرنا چاہتا تھا۔ دس دن تک دسوں وزیر باری باری بادشاہ کو بختیار کے قتل کر دینے کی ترغیب دیتے ہیں اور بختیار ہر بار ایک مناسب حال کہانی سنا





جو دسویں صدی عیسوی میں شام سے ترک وطن کر کے ایران آیا اور جہاں وہ پندرہویں صدی عیسوی تک ”بزرگ لُر“ کے نام سے معروف رہا۔ بختیاریوں کا دعویٰ ہے کہ وہ ایرانی الاصل نہیں۔ اگرچہ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ان کے آبا و اجداد بلخ (Bactria) سے ترک وطن کر کے آئے تھے اور اسی لیے ان کا نام بختیاری ہوا، لیکن یہ مفروضہ ابھی تک محتاج ثبوت ہے۔ بختیاری غالباً کردی الاصل ہیں۔

عقیدے کے اعتبار سے وہ شیعی مسلمان ہیں اور ان کی زبان ایرانی الاصل ہے، مگر ان کی ایک اپنی عوامی بولی بھی ہے۔ آبادی تقریباً چار لاکھ ہے۔

وہ جس خطے میں رہتے ہیں اسے بختیاری علاقہ کہتے ہیں اور یہ اصفہان سے لے کر خوزستان میں مدائنِ نفتون تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ سارا خطہ کوہستانی ہے اور اس میں تیل کے بڑے بڑے قدرتی ذخائر موجود ہیں۔

بختیاری قوم دو بڑے بڑے گروہوں میں منقسم ہے: (۱) ہفت لنگ اور (۲) چہار لنگ۔ ان میں اہم تر گروہ ہفت لنگ ہے، جو پچپن ذیلی قبیلوں میں بٹا ہوا ہے۔ چہار لنگ گروہ کے ذیلی قبیلے چوبیس ہیں۔ بختیاریوں میں تھوڑے بہت لُر اور عرب بھی شامل ہیں، مثلاً موری، تلکی، بودی، گندلی، چربری، میرزاوند، لوسی اور کتکی وغیرہ۔ بختیاری مل جل کر رہنے کے عادی ہیں اور کھلی فضا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ گھاس اور چارے کی تلاش میں انہیں سال میں دو بار دور دور کی مسافت طے کرنا پڑتی ہے۔ اسی لیے انہیں اہل گیاه بھی کہتے ہیں۔

ان کے دولت مند خوانین یا سرداروں کے گھر شہروں میں ہوتے ہیں۔ وہ نسبتاً سرد مقامات میں

کیا جائے۔ سحر و ساحری اور مافوق الفطرت عناصر ان میں تقریباً مفقود ہیں اور نثر بھی عام طور پر لفاظی اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔

مآخذ: (۱) *Bibliographie : Chauvin*، ۸: ۱۳ تا ۱۷ (مختلف طبعات و تراجم) و ۸: ۷۸ تا ۸۹ (کہانیوں کی تلخیصات)؛ (۲) *Notice : A. Jaubert et extrait de la version turque du Bakhtyar Nāme, 'JA d'après le ms. en caractères ouïgours*، ۱۸۷۲ء؛ (۳) *Gr. Ir. Ph. : Éthé*، ۲: ۳۲۳ تا ۳۲۵؛ (۴) نوالڈکہ *Nöldeke*، در *ZDMG*، ۳۵: ۹۷ تا ۱۳۳؛ (۵) *G. Knoes Historia decem Vezirorum et filii regis Azad Bacht Bākhtiār*؛ (۶) *Histoire des dix vizirs : R. Basset*، ۱۸۸۳ء، فرانسیسی ترجمہ، مع اہم مقدمہ: ”... یہ تصحیح شدہ نسخہ اس اضافے کے عین مطابق ہے جو *Habicht* نے الف لیلۃ و لیلۃ (۶: ۱۹۱ تا ۳۳۳) میں کیا تھا؛ (۸) *The Bakhtiyar : Ouseley*؛ (۹) *Bakhtyar Nameh ou le favori de la fortune*، ترجمہ از فارسی، ۱۸۰۵ء (جو متن کے لحاظ سے زیادہ جامع اور ادبی اعتبار سے بلند تر حیثیت کا حامل ہے۔ ترجمہ نہایت دلاویز ہے)؛ (۱۰) *Bakhtiār-Nāme persidskij teksti : J. E. Bertels*، *Slovar*، لینن کراڈ ۱۹۲۶ء (ایک مقبول عام نسخہ، مع فرہنگ)؛ (۱۱) وہی مصنف: *Novaja versija 'Bakhtiar Nāme*، در *Izvestija Akademii Nauk SSSR*، ۱۹۲۹ء، ص ۲۳۹ تا ۲۷۶؛ (۱۱) فواد کوپرولو *M. Fuad Köprülü*، در *ت (بذیل مادہ)*۔

([H. MASSE] J. HOROVITZ)

\* بختیاری: مختلف النسل افراد کا ایک گروہ،



بختیشوع: بختیشوع، مشہور و معروف عیسائی خاندان، جو ابتدا میں جندیساہور میں مقیم تھا اور جس کے متعدد اطبا اس نام سے موسوم تھے۔ انہیں میں سے جرجیس بن جبریل بن بختیشوع گزرا ہے، جو اس شہر کے شفاخانے کا سہتم تھا اور اپنی علمی تصانیف کی وجہ سے مشہور ہوا۔ ۵۱۴۸ء/ ۲۶۵ء میں اسے خلیفہ المنصور کے علاج کے لیے بغداد طلب کیا گیا، جو معدے کی کسی شکایت میں مبتلا تھا۔ علاج کامیاب رہا اور یوں اسے خلیفہ کا اعتماد حاصل ہو گیا، جس کی فرمائش سے اس نے دارالسلطنت ہی میں اقامت اختیار کر لی، لیکن ۵۱۵۲ء/ ۲۶۹ء میں اس کے دل میں ایک بار پھر وطن جانے کی خواہش پیدا ہوئی۔

اس کے بعد بختیشوع بن جرجیس کو، جسے اس کے باپ نے بغداد جاتے وقت جندیساہور کے شفاخانے کا انتظام سونپا تھا، اس وقت بغداد بلایا گیا جب الہادی، جسے آگے چل کر خلیفہ بنا تھا، خطرناک طور پر بیمار ہو گیا۔ خیزران کی مخالفت کے باعث، جو ایک اور طبیب ابو قریش پر مہربان تھی، بختیشوع مستقل طور پر وہاں سکونت اختیار نہ کر سکا؛ تاہم ۵۱۷۱ء/ ۲۸۷ء میں ہارون الرشید نے، جو کسی شدید درد میں مبتلا تھا، اسے بغداد واپس بلا لیا اور طبیب اعلیٰ کے عہدے پر مامور کر دیا؛ چنانچہ ۵۱۸۵ء/ ۲۸۰ء میں جب اس کی وفات ہوئی تو یہ عہدہ اسی کی تحویل میں تھا۔

آگے چل کر جبریل بن بختیشوع نے، جس کی سفارش ۵۱۷۵ء/ ۲۹۱ء میں اس کے باپ نے جعفر برمکی سے کی تھی، ۵۱۹۰ء/ ۲۸۰ء میں خلیفہ کے ایک غلام کا کامیابی سے علاج کرنے کی بدولت خلیفہ کا اعتماد حاصل کر لیا؛ لیکن جب ہارون آخری مرتبہ طوس میں بیمار ہوا تو جبریل پر عتاب نازل ہوا۔ ایک عیسائی اسق کے الزامات کی بنا پر خلیفہ نے اس کے قتل کا حکم

دیا۔ ان کے تین بیٹے ہیں اور موسوم کرما گزارنے کے لیے وہاں چلے جاتے ہیں۔ بختیاری خود تو لکھنے پڑھنے سے علوی ہوتے ہیں لیکن اپنے ہاں میرزا یا منشی ملازم رکھتے ہیں۔ اب کچھ دنوں سے ان میں یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ تعلیم بھی ایک اہم چیز ہے؛ چنانچہ انہوں نے اپنے بچوں کو حصول تعلیم کے لیے یورپ بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ تعلیم کی طرف ان کا رجحان روز بروز بڑھ رہا ہے۔

بختیاری عورتیں پردہ نہیں کرتیں اور قبائلی علاقے میں آزادانہ گھومتی پھرتی ہیں۔ بحیثیت خان کی بیوی کے بختیاری عورت خان کی عدم موجودگی میں قبائلی مقدمات کی سماعت کرتی ہے۔ مقدمات میں اس کی تجاوز اور فیصلے قانوناً جائز اور واجب النفاذ ہوتے ہیں۔

قبائلی عورتیں اپنے خیمے اور گلیم بھی بنتی ہیں۔ لیکن وہ مخصوص انداز کے جوتے جنہیں گیوہ کہتے ہیں ان کے مرد بناتے ہیں۔ قبائلی علاقے میں ان کا اپنا ایک برائے نام معالج ہوتا ہے، جو بعض جڑی بوٹیوں سے ان کا علاج کرتا ہے اور بعض موقعوں پر جھاڑ پھونک یا تعویذ گنڈے سے بھی کام لیتا ہے۔

ولادت، شادی، بیاہ اور موت سے متعلق بختیاریوں کی اپنی جداگانہ رسوم ہیں۔ طلاق سے وہ عملاً نا آشنا ہیں۔ ان کے ہاں ان کی اپنی مخصوص نظمی، غزلیں اور مرثیے موجود ہیں۔ اسی طرح بعض دلچسپ، کھیل اور طرح طرح کی مزیدار عوامی کہانیاں بھی ان سے مخصوص ہیں۔

مآخذ: (۱) *The Bakhtiari: V. Melkonian*

بار دوم، بصرہ ۱۹۵۳ء؛ (۲) *D.L.R. Lorimer*

*The Popular Verse of the Bakhtiari of S.W. Persia*

در *BSOAS*، ۱۶ (۱۹۵۳ء) : ۵۳۲ تا ۵۵۵

(۱۹۵۵ء) : ۹۲ تا ۱۲۰

(V. MELKONIAN)

شادی کی - اس کا بیٹا بھی اپنے اجداد کے نقش قدم پر چلتا رہا، لیکن اس کی تعلیم و تربیت بغداد تک ہی محدود رہی، جہاں اپنی ماں کے انتقال کے بعد وہ مفلس و قلاش رہ گیا، البتہ جب اس نے کرمان سے آئے ہوئے ایک سفیر کا علاج کاسیابی سے کیا تو بویہی تاجدار عضدالدولہ نے اسے شیراز بلالیا؛ لیکن وہ پھر بغداد واپس آ گیا اور جب کبھی طبی مشورے کی ضرورت ہوتی تو تھوڑے دنوں کے لیے باہر چلا جاتا۔ اگرچہ اس نے قاہرہ میں اقامت اختیار کر لینے کے بارے میں فاطمی خلیفہ العزیز کی دعوت بھی رد کر دی تھی۔ تاہم مروانی فرمانروا مہمدالدولہ ابو منصور نے اسے میافارقین میں اپنے پاس روک لیا اور یہیں ۸ رمضان ۵۳۹۶ / ۵ جون ۱۰۰۶ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

ابو سعید عبید اللہ بن جبریل، جو ابن بطلان [رک باں] کا دوست تھا، میافارقین ہی میں رہتا تھا۔ اس کی وفات پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی میں ہوئی۔ بعض معروف تصانیف اس کی یادگار ہیں، بالخصوص فلسفے اور طب کی مشترکہ اصطلاحات کی ایک لغت اور عشق و محبت پر ایک رسالہ۔ اس خاندان کا ایک اور رکن بختیشوع بن بھئی خلیفہ الراضی کا طبیب تھا۔ ۵۳۲۴ / ۱۰۳۶ء میں اسے شہزادہ ہارون کی موت کا ذمے دار ٹھہرایا گیا۔

مآخذ: (۱) الفہرست، ص ۲۶۶؛ (۲) ابن ابی اصیبعہ، طب Müller، ص ۱۲۳ تا ۱۳۸؛ (۳) [ابن] القطبی، طب Lippert، ص ۱۰۰ تا ۱۰۳، ۱۳۲ تا ۱۵۱، ۱۵۸ تا ۱۶۰؛ (۴) الجحشیری: کتاب الوزراء، قاہرہ ۱۹۳۸ء، ص ۲۲۵ تا ۲۲۶؛ (۵) التتوخی: الفرج، قاہرہ ۱۹۳۸ء، ص ۱۱، ۱۱۳ تا ۱۱۴؛ (۶) الصولی: اخبار الراضی، مترجمہ Canard، الجزائر ۱۹۴۶ء، ۱: ۲۰، حاشیہ ۱، ۱۳۰؛ (۷) Histoire de la médecine arabe: Leclerc، پیرس ۱۸۷۶ء، ۱: ۳۷۰ تا ۳۷۴؛ (۸) Arabian: E.G. Browne

صادر کر دیا، لیکن الفضل بن الربیع نے اس حکم کی تعمیل نہ ہونے دی اور اس کی جان بچ گئی۔ جبریل بعد ازاں الامین کا طبیب خاص بن گیا۔ المأمون کی فتحیابی پر اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا، جہاں سے وہ کہیں ۵۲۰۲ / ۸۱۷ء میں جا کر اس وقت رہا ہوا جب الحسن بن سہل کو اس کی خدمات کی ضرورت پیش آئی۔ تین سال گزرنے کے بعد وہ پھر معتوب ہوا اور اس کی جگہ اس کے داماد میخائیل کو دے دی گئی، لیکن ۵۲۱۲ / ۸۲۷ء میں جبریل کو دوبارہ طلب کیا گیا، کیونکہ خلیفہ کو جو شکایت تھی اسے میخائیل رفع کرنے سے قاصر رہا تھا۔ جبریل کو اس کی جگہ پر بحال کر دیا گیا اور اس کی املاک بھی، جو اس کی معزولی کے بعد ضبط کر لی گئی تھیں، اسے پھر واپس مل گئیں؛ بائیں ہمہ اسے خسروانہ عنایات سے بہرہ اندوز ہونے کی زیادہ مہلت نہ ملی، کیونکہ اس نے اسی سال وفات پائی اور اسے سرجیس Sergius کی خانقاہ، واقع المدائن، میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

اس کا بیٹا بختیشوع اس کا جانشین ہوا اور ایشیائے کوچک میں المأمون کی مہمات میں برابر اس کے ساتھ رہا۔ الواثق کی خلافت کا زمانہ آیا تو اسے جندیسابور بھیج دیا گیا۔ جب خلیفہ کی آخری علالت میں اسے دوبارہ طلب کیا گیا تو اگرچہ وہ بروقت بغداد نہ پہنچ سکا، تاہم المتوکل کے عہد میں بارہ سال تک وہیں مقیم رہا اور اس کی بڑی قدر و منزلت ہوتی رہی، تاآنکہ اپنی موت سے پہلے، جو ۵۲۵۶ / ۸۷۰ء میں ہوئی، اسے بحرین جلا وطن کر دیا گیا۔

بختیشوع کا ایک اور بیٹا عبید اللہ تھا، جو خلیفہ المتقدر کے عہد میں صیغہ مالیات میں ملازم تھا، لیکن اس کی وفات کے بعد اس کا مال و متاع ضبط کر لیا گیا۔ عبید اللہ کی بیوہ نے ایک طبیب سے



اموی محل بن گیا؛ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس جگہ کو ترک کر دیا گیا؛ لہذا قرون وسطیٰ کے مصنفین بھی، جو البخراء کے قلعے (حصن) کی موجودگی کا ذکر کرتے ہیں، اس کی اصل جگہ متعین کرنے سے قاصر رہے۔

مآخذ: (۱) A. Musil، *Palmyrena*، نیو یارک ۱۹۲۸ء، ص ۸۸، ۱۳۱ تا ۱۳۳، ۲۳۳، ۲۸۶ تا ۲۸۷، ۲۹۰ تا ۲۹۶، نقشہ ۳۸ (خاکہ)؛ (۲) A. Poidebard، *La trace de Rome dans le désert de Syrie*، پیرس ۱۹۳۳ء، ص ۵۲، ۵۹، ۶۶ تا ۶۷؛ (۳) L. Caetani، *Chronographia islamica*، ص ۱۰۹۰؛ (۴) الطبری: تاریخ، بحد اشارہ؛ (۵) الأغانی، بحد اشارہ؛ (۶) المسعودی: التنبیہ، ص ۳۲۳؛ (۷) وہی مصنف: مروج، ۶: ۲؛ (۸) یاقوت، ۱: ۵۲۳؛ (۹) البکری، *Das geographische Wörterbuch*، طبع Wüstenfeld.

(J. SOURDEL - THOMINE)

بخشی: یہ لفظ عہدِ مغل (تیرھویں صدی عیسوی) سے ایرانی اور ترکی ادبیات بالخصوص کتبِ تاریخ میں ملتا ہے۔ اپنے اصل اویغوری لفظ کی طرح اس کے معنی بھی شروع میں بدھ پرہت یا راہب [= بھکشو] (تبتی: لاما) کے تھے، چنانچہ جن دنوں خاندانِ ایلخانیہ [رک باں] کے فرمانروا بدھ مت پر ملتفت تھے ایران میں بخشوں کی تعداد اور ان کا اثر بہت خاصا تھا۔ ایران میں بدھ مت کے سدباب (۵۶۹۳/۱۲۹۵ء) کے بعد ایران، وسط ایشیا، ہندوستان اور کریمیا میں بخشی کا لفظ صرف منشی کے معنی میں استعمال ہوتا تھا اور اس کا کام ترکی اور مغولی میں وقائع قلم بند کرنا تھے۔ یہ وقائع ابتداءً اویغوری رسم خط میں لکھے جاتے تھے، جسے عموماً یٹکیجی کہتے تھے۔ سولہویں صدی عیسوی میں طیب (جراح) کو بخشی کہا جاتا تھا۔ جہاں کہیں لاما موجود ہیں — یعنی قلماق [رک بتا]

*Medicine*، کیموج (۱۵۹۲) ص ۲۳، ۵۷؛ (۹) براکلمان، ۱: ۶۳۶ و تکلمہ، ۱: ۸۸۵ تا ۸۸۶۔

(D. SOURDEL)

البخراء: بالمربینہ *Palmyrena* کا قدیم محل وقوع، جو بنو امیہ کے عہد میں بخوی معروف تھا، چنانچہ ولید ثانی اکثر وہاں قیام کرتا تھا اور ۵۱۲۶ / ۷۳۳ء میں اس نے وہیں وفات پائی۔ فوجی چھاؤنی (فسطاط) کا، جسے کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں ایرانیوں نے آباد کیا تھا اور اندرونی قلعے (قصر) کا، جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت نعمان بن بشیرؓ اقامت گزیں ہوئے اور جہاں خلیفہ نے باغیوں سے گھر کر بناہ لی تھی، عربی مآخذ میں ذکر ملتا ہے۔ بالمائرا [= تلمر] سے پچیس کلومیٹر جنوب میں یہی وہ مقام ہے جس کا حال A. Musil نے بیان کیا ہے۔ A. Musil کا ۱۹۰۸ء میں یہاں سے گزر ہوا تھا۔ اس کے نزدیک البخراء کے کھنڈروں کا محل وقوع یہی ہے۔ عربی متون میں اگرچہ یہ نام اکثر مسخ کر دیا گیا ہے (بالخصوص بشکل البخراء یا النجراہ) تاہم البخراء کے تلفظ میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں، کیونکہ ”وقائع نویسوں کے اشتقاقی قیاسات سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ وہ اسے مادہ بخر سے مشتق قرار دیتے ہیں“ (H. Lammens)۔ یہ دیواروں سے گھرے ہوئے ایک وسیع احاطے کے آثار ہیں، جس میں برج (۱۰۵ × ۱۰۹ میٹر) بنے ہوئے ہیں اور اس کے شمالی اور جنوبی سمت کئی ایک کنوؤں کے ارد گرد سکونتی عمارتوں کے کھنڈر ملتے ہیں۔ یہ سب آثار زبان حال سے شہادت دے رہے ہیں کہ رومیوں کے زمانے سے یہاں اگر بقول H. Lammens ”ایک سرحدی قلعہ“ نہیں تو کم از کم بصری سے تلمر جانے والی صحرائی گزرگاہ پر ایک ”قلعہ بند آب کہ“ ضرور موجود تھی، جہاں آگے چل کر ایک

نہیں بلکہ ترکی اور [عباسی عہد کے بعد کی] عربی میں بھی مستعمل ہے۔ اس کا مفہوم ہے کسی اعلیٰ کا اپنے سے ادنیٰ کو انعام یا عطیہ دینا اور کسی سودے میں رعایت کر دینا۔ اگرچہ یہ استعمال صحیح نہیں مگر اسے رشوت کے معنی میں بھی بولتے ہیں، بالخصوص وہ رشوت جو عدالت کے حکام یا سرکاری عہدیداروں کو پیش کی جائے۔ اس لفظ کا ایک لائق ذکر اطلاق عثمانی حکومت میں اس عطیے پر ہوتا تھا جو سلطان اپنی تخت نشینی کے وقت عمائد سلطنت اور پنی چری سپاہ، نیز مستقل فوج کی دوسری جمعیتوں کو مرحمت کرتا تھا اور اسے "جلوس بخشیشی" کہتے تھے۔ یہ عطیہ عثمانی خزانہ عامرہ کے لیے بڑا بار بن گیا، جسے عہد انحطاط میں یہ سلطنت مشکل ہی سے برداشت کر سکتی تھی۔

مآخذ: (۱) سید مصطفیٰ نوری: نتائج الوقعات،

۲: ۹۸؛ (۲) احمد راسم: عثمانی تاریخی، ۱: ۳۰۹ تا

۳۶۱، حواشی: [(۳) ج ۱، بذیل مادہ]۔

(H. BOWEN)

- ⊗ **بخل**: اپنے حاصل کردہ ذخائر کو وہاں سے روکنا جہاں انہیں روکنا نہیں چاہیے (امام راغب: المفردات، تحت مادہ)۔ اس کی دو صورتیں ہیں: اول یہ کہ انسان خود اپنی چیزوں کو روک لے اور انہیں ضرورت کی جگہ پر صرف نہ کرے؛ دوم یہ کہ دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی تلقین کرے (دیکھیے م [النساء]: ۳۷)۔ اسلام کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسان اپنی محنت کی کمائی میں سے اپنی جائز ضروریات پر صرف کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہے اسے رفاہ عامہ کے لیے کھلا رکھے (دیکھیے ۲ [البقرة]: ۲۱۹)۔ بخل اس تعلیم کی ضد ہے۔ بخیل کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی دولت حتی الوسع صرف نہ ہو اور اگر ہو تو محض اس کی ضروریات پر۔ اسے دوسروں کی ضروریات اور تکالیف کا کوئی احساس

(Kalmucks)، مغول اور مانشو (Mandjurs) وغیرہ کے یہاں — بخشی کا لفظ بیسویں صدی تک اپنے اصلی یعنی بدہ مت کے پروت کے معنوں ہی میں استعمال ہوتا رہا۔ ترکمانوں میں، نیز ہندروہوں اور سولہویں صدی عیسوی میں اناطولی ترکوں میں بھی بخشی کے معنی آوارہ گرد مطرب کے ہو گئے۔ قیرغیز [رک باں] زبان میں اس کے معنی شعبدہ گر (= شمن) کے تھے اور عوامی بولیوں میں بھی یہی لفظ ان معنوں میں بقسی اور بقسہ کی شکل میں بولا جاتا تھا۔

اس لفظ کا اشتقاق محل نزاع ہے۔ قبل ازیں تقریباً سبھی (E. Blochet و W. Barthold) تسلیم کرتے تھے کہ یہ سنسکرت لفظ بھکشو سے مشتق ہے، لیکن اس رائے سے P. Pelliot اور بعض دوسروں نے اختلاف کیا ہے اور انہیں بڑی حد تک یقین ہے کہ یہ چینی لفظ ہو۔ چہ po-chi (پو-شی Po-Shi بمعنی عاقل، اچھا پڑھا لکھا) سے مشتق ہے۔

مآخذ: تکمیلی مباحث کے لیے قب (۱) رشید الدین:

[جامع التواریخ = Histoire des Mongols de la Perse]

طبع M. E. Quatermère، ۱ (۱۸۳۶) : ۱۸۳ تا

۱۹۹؛ (۲) فواد کواہرولو M.F. Köprülü، در ج ۱

(ت)، ۲ (۱۹۳۳ تا ۱۹۳۹) : ۲۳۳ تا ۲۳۸ (مع مآخذ)؛

(۳) Die Mongolen in Iran : B. Spuler، بار دوم،

برلن ۱۹۰۰ء، ص ۱۸۳، ۵ (مآخذ در بارہ اشتقاقیات)،

Proben der Volksliteratur der : W. Radloff (۴)

türkischen Stämme Südsibiriens، متن : ۳۶ بعد:

Unter Kirgisen und Turkmenen : R. Karutz (۵)

برلن، بدون تاریخ (۱۹۲۸) : [(۶) ج ۱، بذیل مادہ]۔

(B. SPULER)

بخشیش: یا بخشش، فارسی مصدر بخشیدن (= عطا کرنا) سے حاصل مصدر اور فارسی ہی میں



۱ تا ۳): نیز دیکھیے ۷۰ [العنکبوت]: ۲۳: ۷۳  
[المدثر]: ۳۳: ۸۹ [الفجر]: ۱۵ تا ۲۶: ۹۰ [البلد]  
۱۲ تا ۲۰ .

بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے اور اس سے دلوں میں نفاق پیدا ہو جاتا ہے؛ چنانچہ ارشاد ربّانی ہے: ”جب انہیں اللہ نے اپنے فضل سے عطا فرمایا تو اس میں بخل سے کام لیا اور اعراض کرتے ہوئے پھر گئے۔ سو اللہ نے انہیں بدلہ دیا کہ ان کے دلوں میں نفاق پیدا کر دیا (۹ [التوبة]: ۷۶، ۷۷)۔ اللہ تعالیٰ کا دائمی قانون یہ ہے کہ دنیا میں بقا اسی کے لیے ہے جو نوع انسانی کے لیے منفعت بخش ہے (۱۳ [الرعد]: ۱۷)؛ لہذا جو قوم بخل سے کام لیتی ہے اسے بساط زندگی سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ کوئی اور قوم لے لیتی ہے (۴۷ [محمد]: ۳۸)۔

بخل کی سب سے بڑی مثال قرآن مجید میں قارون (رک بان) کی ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے ۲۸ [القصاص]: ۲۶، ۲۹؛ ۲۹ [العنکبوت]: ۳۹؛ ۳۰ [المؤمن]: ۲۳)۔

حدیث نبویؐ ہے کہ دو خصلتیں سچے مومن میں جمع نہیں ہو سکتیں: بخل اور بد خلقی (الترمذی، کتاب البر، باب ۳۱)۔ ایک حدیث میں بخل کو سب سے بری بیماری قرار دیا گیا (البخاری، کتاب المغازی، باب ۷۳؛ احمد: المسند، ۳: ۲۰۸)۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ بخیل جنت کا وارث نہیں ہو سکتا (احمد: المسند، ۱: ۴)۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ بخیل عابد سے اللہ تعالیٰ کو سخی جاہل زیادہ پسند ہے (الترمذی، کتاب البر، باب ۴)۔ آپؐ سے جو دعائیں منقول ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اٰلہی! مجھے بخیل ہونے سے بچا (البخاری، کتاب الجہاد، باب ۷۳؛ المسند، ۱: ۲۲)۔

بخل کی مذمت عربی شاعری کی روایت میں شامل

نہیں ہونا؛ چنانچہ دنیا کی دولت کا بہت بڑا حصہ بخیلوں کی وجہ سے بے کار پڑا رہتا ہے اور یہ دولت ایک خوشگوار اور خوشحال معاشرے کی تشکیل میں مدد و معاون بننے کے بجائے ایک رکاوٹ ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو دردناک عذاب کی خبر دی ہے جو سونے اور چاندی کو سینت سینت کر رکھتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (۹ [التوبة]: ۳۴)؛ ”جو لوگ اس چیز پر بخل کرتے ہیں جو اللہ نے انہیں اپنے فضل سے دی ہے، یہ نہ سمجھیں کہ یہ بخل ان کے حق میں بہتر ہے، بلکہ ان کے حق میں بہت برا ہے۔ وہ مال جس میں انہوں نے بخل کیا تھا قیامت کے دن ان کے گلوں میں طوق بنا کر ڈالا جائے گا“ (۳ [ال عمران]: ۱۸۰)۔

بھوکوں کو کھلانا، ننگوں کو پہنانا، یتیموں اور مسکینوں کو پالنا، محتاجوں کی مدد کرنا، مقروضوں کا بوجھ ہلکا کرنا، یہ وہ نیکیاں ہیں جن پر اسلام نے بڑا زور دیا ہے۔ لیکن جنہیں ایک بخیل ہمیشہ نظر انداز کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بخل ایک اساسی بد اخلاقی ہے، جس سے کئی اور برائیاں جنم لیتی ہیں، مثلاً دناقت، خیانت، بے مروتی، بے رحمی، بدسلوکی، خود غرضی، تنگ نظری، کم ہمتی، حرص، طمع وغیرہ۔ اس طرح بخل شریعت کے ایک بڑے حصے کی عدم تعمیل کا باعث بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں بخل اور بخیل کی بڑے سخت الفاظ میں مذمت کی گئی ہے: ”جو شخص یتیم کو دھتکارتا اور مسکین کو کھانا کھلانے کی تلقین نہیں کرتا وہ دین کو جھٹلاتا ہے“ (۷۰ [الماعون]: ۱ تا ۳)؛ ”جو مال جمع کرتا ہے اور اسے شمار میں لاتا ہے، وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ رکھے گا۔ ہرگز نہیں، وہ ضرور حطّمہ میں ڈالا جائے گا (۱ [الہمزہ]:

پیدا ہوتی رہتی ہیں، جن میں سے کچھ تو وہ مسترد کر دیتا ہے اور کچھ منتخب کر لیتا ہے (تاج العروس، بذیل مادہ)۔

فارسی کتب لغت میں بداء کی تشریح بھی قابل غور ہے: بداء (بفتح با) ظاہر اور ہویدا ہونا، یا کسی رائے کا پیدا ہونا، یا کسی معاملے میں دوسری رائے یا نئے خیال کا ظہور پذیر ہونا (فرہنگ عمید، بذیل مادہ)، کسی معاملے میں دوسری رائے کا پیدا ہونا، یا کسی ایسی بات کا دل میں آنا جو اس سے پہلے کبھی نہ آئی تھی۔ الہیات کی بحث میں باری تعالیٰ کا ایسا ارادہ یا ایسی رائے ظاہر ہونا جو پہلے والی رائے اور ارادے سے مختلف ہو (فرہنگ فارسی بذیل مادہ)۔

قرآن کریم میں بھی یہ لفظ کئی مقامات پر استعمال ہوا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے متعلق نہیں، مثلاً ثُمَّ بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا آيَاتِ (۱۲) [یوسف: ۳۵] یعنی پھر نشانیاں دیکھ لینے کے بعد ان کی رائے ظاہر ہوئی۔ اس آیت کی تشریح کے ضمن میں مفسرین و علمائے لغت (مثلاً تاج العروس، بذیل مادہ بداء) نے سپیویہ کا جو قول نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بداء بمعنی ”رائے تبدیل کرنا“ استعمال ہوا ہے (نیز دیکھیے الشہرستانی: الملل والنحل، ص ۶۷ و ۶۸)۔ شیعہ علم کلام اور عقائد کی رو سے بداء سے مراد افعال باری تعالیٰ میں ایسے افعال کا ظہور پذیر ہونا جو کسی مصلحت سے پہلے پوشیدہ تھے (اصول الکافی، تہران، ص ۱۴۶ حاشیہ)۔ صاحب صافی شرح اصول الکافی کے نزدیک بداء بفتح با و الف ممدودہ باب نصر ینصر سے مصدر ہے اور کئی ایک معنوں میں استعمال ہوتا ہے: (۱) بداء جب اللہ کی طرف منسوب ہو تو اس کے معنی ہیں کسی چیز کا صادر ہونا اور جب اللہ کی جانب سے ہو بایں طور کہ

رہی ہے۔ ایک بار حضرت علیؑ نے یہ شعر پڑھا تھا:  
لَا تَبْخُلَنَّ بَدَنِيَا فَهِيَ مُقْبِلَةٌ  
فَلَيْسَ يَنْفِقُهَا التَّبْدِيلُ وَالسَّرْفُ  
(احیاء)

اسلامی عہد میں بغل کی مذمت اور بخیلوں کی حکایات پر مشتمل مستقل کتابیں بھی تصنیف ہوئیں، جن میں سے الجاحظ (م ۵۲۵۵): کتاب البخل (مطبوعہ لائڈن ۱۹۰۰ء) اور الخطیب البغدادی (م ۵۴۶۳): کتاب البخل (مخطوطہ موزہ بریطانیہ، عدد ۱۱۳۲ و تتمہ ۱۵۹۲) بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ ابن عبد ربہ: العقد الفرید: الابشیہ: المستطرف اور الغزالی: احیاء میں بخیلوں کے متعلق قرآنی آیات، احادیث اور حکایات و اشعار نقل کئے گئے ہیں۔

ماخذ: متن میں دی ہوئی کتابوں کے علاوہ دیکھیے (۱) المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث، ۱: ۱۳۶ و ۳: ۲۱؛ (۲) مفتاح کنوز السنۃ، بذیل مادہ بغل و غنی و تصدق؛ (۳) سلیمان ندوی: سیرۃ النبی، (بار دوم) ۶: ۶۶۳۔

(ادارہ)

\* بداء: (عربی)، بروزن سماء، مصدر ہے، بمعنی ظاہر ہونا یا وجود میں آنا؛ حمزہ کے ساتھ (بداء) اور حمزہ کے بغیر (بدا) دونوں طرح لکھا جاتا ہے۔ اصطلاحاً کسی امر کے سلسلے میں نئی یا دوسری رائے یا خیال پیدا ہونا۔ بقول الجوهری بداء کا مطلب ہے پہلی رائے کو بدل کر نئی رائے قائم کرنا، الفراء کے نزدیک پہلی رائے یا ارادے سے مختلف دوسری رائے یا ارادہ ظاہر ہونا، (تاج العروس و لسان العرب، بذیل مادہ)۔ بداء کی جمع بدوات آتی ہے۔ عرب کثیر الآراء شخص کو ”ذو بدوات“ کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایسا آدمی محتاط اور دور اندیش ہوتا ہے کیونکہ اس کے دماغ میں بہت سی آرا



(۴) کسی شخص کے لیے ایسی شے کا ظہور پذیر ہونا جو پہلے اس سے پوشیدہ تھی، اس ظاہر ہونے والی شے میں کسی امر کی مصلحت ہو یا فساد (حوالہ سابق)۔

شیعہ عقائد میں بداء کی بڑی اہمیت ہے (دیکھیے الکلینی: الکافی، ص ۶۸)، مثلاً امام ابو عبد اللہؑ سے روایت ہے کہ اس وقت تک کوئی نبی نہیں بھیجا گیا جب تک اس نے اللہ کے لیے ان پانچ باتوں کا اقرار نہ کر لیا: بداء، مشیت، سجود، عبودیت اور اطاعت (الکافی، ص ۶۸)۔ امام رضاؑ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی ایسا نبی مبعوث نہیں کیا جسے شراب کی حرمت کا حکم نہ دیا اور اس سے بداء کا اقرار نہ لیا ہو (حوالہ سابق)۔ شیعہ نقطہ نظر سے عقیدہ بداء کی توضیح و تشریح کے لیے الکافی کی دو روایات کافی ہیں: (۱) امام جعفرؑ نے فرمایا کہ علم کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ علم ہے جو اللہ کے پاس محفوظ ہے، جس پر اس نے اپنی مخلوق میں کسی کو مطلع نہیں کیا، اور دوسرا علم وہ ہے جو اس نے اپنے فرشتوں اور رسولوں کو عطا کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ علم جو اس نے فرشتوں اور رسولوں کو سکھا دیا ہے وہ اسی طرح ہو کر رہے گا جس طرح اس نے سکھایا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے آپ کو، اپنے فرشتوں کو اور اپنے رسولوں کو جہونا ہرگز نہیں ہونے دے گا، اور جو علم اللہ کے اپنے خزانے میں محفوظ ہے سو اس میں وہ جس طرح چاہے تقدیم و تاخیر اور محو و اثبات کرتا رہتا ہے (الکافی، ص ۶۸): (۲) جب امام حسن عسکریؑ سے اللہ کے علم کی کیفیت دریافت کی گئی تو انہوں نے فرمایا: علم (اے علم ہوا)، و شاء (اس نے چاہا)، و اراد (ارادہ کیا) و قدر (اندازہ مقرر کیا)، و قضی (فیصلہ کیا) و انضی (اور پھر نافذ کیا)۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ فرمایا اے نافذ کیا اور جس چیز کا اندازہ فرمایا اس کا

پہلے جس کے ظہور پذیر ہونے کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہ تھا۔ اس صورت میں بداء کا مقصد امام زمان کے ظن (گمان) کو زائل کرنا یا علم کو پختہ کرنا ہے (صافی، ص ۲۲۷)۔ بداء کے ان معنی کی تائید حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ مخلوق کا ارادہ یہ ہے کہ دل میں ایک خیال ابھرے اور پھر اس کے بعد فعل کا ظہور ہو، لیکن اللہ کے ارادے سے مراد صرف فعل کا ظاہر ہونا ہے (بحوالہ سابق، ص ۱۱۰)۔ شیعہ علما کے نزدیک اللہ کے ارادے میں بداء کے اثبات سے ایک تو یہود کے اس قول کی تردید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام امور قضا و قدر سے فارغ ہو چکا ہے اور اب اس کے پاس کچھ نہیں (بد اللہ مغلولۃ = اللہ کا ہاتھ تو اب بیڑیوں میں جکڑ چکا ہے) (المائدۃ: ۶۴)، اور دوسرے اس سے اسلام کے بنیادی اصولوں کی تائید بھی ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ اللہ کی قدرت بے پناہ اور غالب ہے اور یہ کہ یہ کائنات حادث و نو پیدا کردہ ہے اور اس کا بتانا اور مٹانا خدا کے قبضہ قدرت میں ہے (صافی، ص ۲۲۷): (۲) کسی شخص کو ایسا معاملہ پیش آ جائے جس کا علم پہلے سے امام زمان کو بھی نہ تھا۔ بداء کی اس صورت کے اثبات سے بعض صوفیہ کے اس قول کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ جب انسان کامل ہو جائے تو اسے تمام معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اور اسے اکتساب و سماع اور استنباط کی حاجت نہیں رہتی (بحوالہ سابق، ص ۲۲۷): (۳) کسی شخص کے لیے کوئی ایسا عجیب و غریب امر ظہور پذیر ہو جو اس سے پہلے اکثر لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اس کی ایک مثال یہ روایت ہے: بداء فی نبی ابی محمد بعد ابی جعفر ماتم یکن یعرف لہ (= ابو محمد کے بارے میں ابو جعفر کے بعد اللہ نے ایک ایسی صورت نکالی جو پہلے کسی کو معلوم نہ تھی: بحوالہ سابق، ص ۲۲۸):

فیصلہ کیا اور جس کا ارادہ فرمایا اس کا اندازہ بھی مقرر کیا۔ سو اللہ کے علم سے مشیت ظاہر ہوئی، مشیت سے ارادہ ظاہر ہوا، ارادے سے تقدیر ظاہر ہوئی، تقدیر سے قضا ظاہر ہوئی اور قضا کے نتیجے میں نفاذ (امضاء) کا ظہور ہوا۔ علم مشیت پر مقدم ہے، مشیت کا دوسرا درجہ ہے اور ارادے کا تیسرا۔ قضا پر امضاء کی شکل میں تقدیر واقع ہوتی ہے۔ جو کچھ اللہ کے علم اور ارادے میں ہے اس میں بداء ہے مگر جب امضاء کے ذریعے قضا واقع ہو جائے تب بداء نہیں ہے۔ معلوم شے کے وجود سے پہلے ہی خدا کو اس کا علم ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر چیز کے وجود حقیقی میں آنے سے پہلے ہی اس کے متعلق اللہ کی مشیت اور ارادہ موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح تمام امور کی تقدیر بھی تفصیل و تکمیل سے قبل طے ہوتی ہے اور قضاء بالامضاء تو سبم اور قطعی ہوتی ہے۔ جب تک کوئی چیز عین حقیقت نہ بنی ہو اس وقت تک اللہ کے لیے بداء ہے، مگر جب عین حقیقت بن جائے تو پھر بداء نہیں ہے (حوالہ سابق)۔ یہی بات ذرا تفصیل سے امام ابوالحسن اشعری نے بیان کی ہے (دیکھیے مقالات الاسلامیین، ص ۳۹)۔ انہوں نے ایک ایسے گروہ کو بھی ذکر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے بداء کو جائز قرار نہیں دیتا (حوالہ سابق)۔

بعض مستشرقین نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ بداء کو بطور عقیدہ سب سے پہلے مختار [رک باں] نے پیش کیا، جو بعد میں اس کے پیروکاروں یعنی شیعہ کیسانہ کا دینی عقیدہ بن گیا۔ اگرچہ بعد میں وہ کئی فرقوں میں بٹ گئے مگر دو بنیادی عقیدے سب میں مشترک رہے: ایک امام محمد بن الحنفیہ کی امامت اور دوسرا اللہ تعالیٰ کے لیے بداء کا جواز۔ اس عقیدے میں وہ حد سے اس قدر تجاوز کر گئے کہ

اسی کی بنیاد پر بداء کو جائز نہ سمجھنے والے تمام لوگوں نے کیسانہ کو کافر قرار دیا (الفرق، ص ۲۷)۔ مختار نے عقیدہ بداء کو اپنی سیاسی اغراض کے لیے استعمال کیا، وہ کہانت اور وحی کا دعویٰ کرنے لگا، جس کے باعث اس کا ایک طاقتور حاسی ابراہیم بن الاشراس سے برگشتہ ہو گیا۔ مصعب بن الزبیر نے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے مختار پر کاری ضرب لگانے کا فیصلہ کیا۔ مختار نے فتح و نصرت کی بشارت دے کر لشکر ارسال کیا مگر عبرتناک شکست ہوئی۔ سالار لشکر احمد بن شمیٹ اور دوسرے قائدین مارے گئے اور بچے کھچے سپاہی جب مختار کے پاس پہنچے اور کہا کہ آپ کی وہ بشارت کیا ہوئی؟ تو اس پر مختار نے کہا کہ بیشک اللہ نے مجھ سے اس کا وعدہ کیا تھا مگر بعد میں اس نے اپنا یہ فیصلہ بدل دیا (بدآلہ)، اور قرآن کی اس آیت سے استدلال کیا: **يَمْحُوا اللَّهُ مَا يَشَاءُ وَيُثَبِّتُ** (۳۱ [الرعد]: ۳۹) = اللہ جو چاہے مٹا دیتا ہے اور جو چاہے قائم رکھتا ہے۔ یہیں سے عقیدہ بداء کیسانہ فرقے کے عقائد میں شامل ہو گیا (الفرق، ص ۳۶؛ الشہرستانی، ص ۶۸)، مزید بحث کے لیے رک بہ قدر۔

بداء کے مسئلے میں ایک شیعہ عالم ہشام ابن الحکم [رک باں] اور اس کے پیروکاروں نے کچھ غلو سے کام لیا۔ ہشام بن سالم الجوالیقی نے بھی اپنے ہم نام کی طرح اس مسئلے میں حد سے تجاوز کیا۔ یہ دونوں ہشام کئی باتوں میں مشترک تھے، مثلاً ان دونوں سے الگ الگ فرقے منسوب ہیں (الفرق، ص ۷۰)، اللہ کے علم و ارادے کے بارے میں دونوں کا عقیدہ بھی ایک تھا (حوالہ سابق، ص ۱۵)، وغیرہ۔ ہشام بن الحکم کو، جس کے پیرو ہاشمیہ کہلاتے تھے، علم الہی کے بارے میں فاسد عقائد رکھنے کی بنا پر شیعہ امامیہ اور ابن حزم نے کافر گردانا ہے



الفرق، قاہرہ، ۱۹۱۰ء؛ (۱۰) ابن حزم: کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل، قاہرہ، ۱۳۱۷ء؛ (۱۱) الشہرستانی: الملل والنحل، بمبئی، ۱۳۱۳ء؛ (۱۲) المسعودی: کتاب التنبیہ والاشراف؛ (۱۳) الکافی: اصول الکافی، ایران، ۱۲۸۱ء؛ (۱۴) ملا شیرازی: صفی شرح اصول الکافی، بمبئی؛ (۱۵) دلداری علی: مرآة العقول فی علم الاصول، لکھنؤ، ۱۳۱۸-۱۳۱۹ء.

(ظہور اظہر [و ادارہ])

- **بداؤں:** (بداؤں یا ہداؤں) ایک قدیم شہر، جو دریائے سوت سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے اور بھارت [اُتر پردیش] میں اسی نام کے ایک ضلع کا صدر مقام ہے۔ محل وقوع ۲۸ درجے ۲ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۷ درجے ۷ دقیقے طول بلد مشرقی ہے۔ مقامی مؤرخین نے اسے ہیدائشوں، ہداؤں اور بداؤں بھی لکھا ہے۔ ۱۹۵۱ء میں آبادی ۵۳۵۲۱ تھی۔

بداؤں کے سلسلے میں سلطان اینک [رک بان] کے حملے اور فتح (۵۹۳/۱۱۹۷-۱۱۹۸ء) سے پہلے کے مستند حالات بہت کم ملتے ہیں۔ روایت ہے کہ بداؤں ۵۳۲۱/۱۰۳۰ء میں مسعود سالار غازی [رک بہ غازی میاں] کے ہاتھوں فتح ہوا، جو ایک نیم تاریخی شخصیت ہے اور جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ محمود غزنوی کا بھتیجا یا بھانجا تھا۔ پھر حال ۶۱۲/۱۲۱۵ء میں جب الشمس [رک بان] نے تاج الدین یلدوز (= یلدز = ایلدوز) کو لاہور کے قریب شکست دی تو گرفتاری کے بعد اسے بداؤں بھیج دیا گیا، جہاں ۶۲۸/۱۲۳۰ء میں اس نے وفات پائی۔ خلجیوں کا زمانہ آیا تو بداؤں ایک چھاؤنی بن چکا تھا۔ ۶۹۰/۱۲۹۱ء میں جلال الدین خلجی ایک لشکر جرار لے کر بداؤں پہنچا تاکہ ملک چھجوں کی بغاوت فرو کرے۔ محمد تغلق بداؤں کو فوجی چھاؤنی بنانے کے حق میں نہیں

(الفرق، ص ۵۰: الفصل، ۱۳۲)۔

عقیدہ بداء کی شدید ترین مخالفت یہود نے کی۔ یہود چونکہ نسخ شرائع کے قائل نہیں تھے اور ان کا خیال تھا کہ بداء کے اثبات و اقرار سے نسخ شرائع کا اثبات لازم آتا ہے اس لیے یہودی علما نے اس سلسلے میں مسلمان علما سے مناظرے بھی کیے، جس کی ایک مثال یہودی عالم یحییٰ بن زکریا الکاتب الطبرانی اور مشہور مؤرخ المسعودی کا مناظرہ ہے (دیکھیے کتاب التنبیہ والاشراف، ص ۱۱۳)۔

مسئلہ بداء کا تعلق مسئلہ تقدیر سے بہت گہرا ہے۔ تقدیر کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں: مجرم اور معلق، پہلی قسم اٹل ہے اور اس میں تبدیلی نہیں، دوسری قسم اٹل نہیں بلکہ مشروط ہے اور اس میں تبدیلی ممکن ہے۔ بداء بھی تقدیر معلق کی ایک قسم ہے اور اس کے مؤیدین میں علمائے اہل سنت بھی شامل ہیں اور ان کے پاس اس کے بہت قوی دلائل ہیں، مثلاً اس شر سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پناہ مانگنا جو خدا کی طرف سے مقدر ہو یا آپ کا شدید طوفانی راتوں میں یہ فرمانا کہ مجھے ڈر ہے کہ قیامت نہ آجائے، حالانکہ اس کے لیے شرائط ظاہر نہیں ہوتی تھیں۔ اس طرح اگر تقدیر میں تبدیلی ممکن نہ ہو تو دعا کا بھی کوئی فائدہ نہیں رہتا (دیکھیے روح المعانی، ۱۳: ۱۷۰ تا ۱۷۲: ابن القیم: کتاب التقدير؛ اشرف علی تہانوی: مسئلہ تقدیر)۔

مآخذ: (۱) ابن منظور: لسان العرب، (بذیل مادہ)؛ (۲) الزیلعی: تاج العروس، (بذیل مادہ)؛ (۳) فرہنگ عمید، طهران، ۱۳۳۷ ش؛ (۴) فرہنگ فارسی، طهران، ۱۳۳۲ ش؛ (۵) الرازی: مفاتیح الغیب (= تفسیر کبیر)، ج ۵: (۶) الألوسی: روح المعانی، ج ۱۳: (۷) شاہ عبدالقادر: موضع القرآن، کراچی، ۱۹۵۹ء؛ (۸) ابوالحسن الاشمعی: مقالات الاسلامیین؛ (۹) عبدالقادر البغدادی: الفرق بین

یہ امر تحقیق طلب ہے۔ پرانے شہر میں تاریخی اہمیت کی چند عمارتیں موجود ہیں، مثلاً پرانا قلعہ، جو اب کھنڈر بن چکا ہے، مسجد قطبی، جامع مسجد شمسی، جسے التتمش نے ۵۶۲۰/۱۲۲۳ء میں تعمیر کیا۔ ان کے علاوہ بھی کئی ایک مسجدیں اور مقبرے ہیں، جن میں مذکورہ بالا علاء الدین، شاہ دہلی، کا مقبرہ بالخصوص قابل ذکر ہے۔

- مآخذ: (۱) طبقاتِ ناصری، طبع عبد العی حیبی، ج ۱، کوئٹہ ۱۹۴۹ء و ج ۲، لاہور ۱۹۵۳ء؛ (۲) بداؤنی: منتخبات التواریخ، طبع کلکتہ، Bibl. Ind. (انگریزی ترجمہ، کلکتہ ۱۸۹۸ء، ۱۹۲۳ء، ۱۹۲۵ء؛ (۳) آئین اکبری، کلکتہ ۱۸۷۲ء، ۱: ۲۷، ۳۶۹، ۵۱۳، ۵۲۰ (انگریزی ترجمہ، کلکتہ ۱۹۲۷ء، ص ۳۲)؛ (۴) حسن نظامی: تاج المآثر (مخطوطہ)، بموضع کثیرہ؛ (۵) Gaz. of the Budā'un District، ۱۹۰۷ء؛ (۶) Imp. Gaz. of Ind.، ۹ (طبع جدید): ۳۳ تا ۳۶، ۳۱ تا ۳۳؛ (۷) Epigraphia Indica، ص ۱۶۳؛ (۸) JASB (روداد)، ۳۱ (۱۸۷۲ء): ۱۹۹؛ (۹) تاج العروس، بذیل مادۃ بدن؛ (۱۰) امر حسن بجزی: فوائد الفوائد، بار سوم، لکھنؤ ۱۳۱۲/۱۸۹۳ء، ص ۱۰۳ تا ۱۰۴؛ (۱۱) اکرام اللہ معشر: روضۃ الصفا (مخطوطہ)؛ (۱۲) عبد الولی: باقیات الصالحات (مخطوطہ)؛ (۱۳) عبد الکریم: تاریخ بدایوں (مخطوطہ)، تین جلدیں؛ (۱۴) عبد العی صفا: عمدۃ التواریخ، مراد آباد ۱۲۹۷/۱۸۷۹ء؛ (۱۵) رضی الدین بسل: کنز التاریخ، بدایوں ۱۹۱۷ء؛ (۱۶) وہی مصنف: تذکرۃ الواصلین، بدایوں ۱۳۳۷/۱۸۹۹ء و بار دوم ۱۹۳۵ء، (۱۷) وہی مصنف: انساب فرشوری (مخطوطہ)؛ (۱۸) محمد یعقوب حسن ضیا: اکمل التاریخ، ۲ جلد، بدایوں ۱۳۳۳/۱۹۱۳ء؛ (۱۹) وہی مصنف: مجموعۃ ہفت احمد، بدایوں ۱۳۶۳/۱۹۴۳ء؛ (۲۰) نظام الدین حسین: بدایوں قدیم و جدید،

تھا، لہذا ارد گرد کے سرکش قبائل بغاوت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ۱۳۸۵/۵۷۸۷ء میں لیروز تغلق نے بداؤں کی طرف کوچ کیا اور بغاوت فرو کرنے کے بعد قبول خان شروانی کو اس کا فوجی گورنر مقرر کر دیا اور واپس آ گیا۔ خاندانِ سادات کا آخری بادشاہ علاء الدین جب ۵۸۵۵/۱۳۵۱ء میں تخت شاہی سے دست بردار ہوا (احمد یادگار: تاریخ شاہی، Bibl. Ind.، ص ۲۵۷، س ۱۰) تو اس نے اپنی باقی عمر بداؤں میں گزاری اور وہیں ۱۳۷۸/۵۸۸۳ء میں وفات پائی۔

اکبر کے عہد میں بداؤں کو صوبہ دہلی کی ایک سرکار بنا دیا گیا (۱۵۵۶/۵۶۹۳ء)۔ یہاں ایک دارالضرب بھی قائم کیا گیا، جس میں صرف تانبے کے سکے مضروب ہوتے تھے۔ ۱۵۷۱/۵۹۷۹ء میں بداؤں میں ایک زبردست آگ لگی، جس سے سارا شہر جل گیا اور باشندوں کی ایک بڑی تعداد ہلاک ہو گئی۔

شاہجہاں کے عہد میں بداؤں کی اہمیت جاتی رہی۔ بداؤں اور سنبھل دونوں سرکاری ملا کر ٹھہر Katchr نام رکھا گیا اور بریلی اس کا صدر مقام قرار پایا۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد بداؤں پر روہیلوں کا قبضہ ہو گیا۔ پھر جب علی محمد خاں نے روہیلوں کو شکست دی تو ۱۱۹۲/۱۷۷۸ء میں یہ شہر نوابانِ اودھ کے قبضے میں چلا گیا، جن سے ۱۲۱۶/۱۸۰۱ء میں انگریزوں نے چھین لیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اس شہر میں بڑی گڑ بڑ مچی، مرکزی جیل خانے پر حملہ کیا گیا اور انگریزوں کے گھر جلا دیے گئے۔

بداؤں مشہور مؤرخ عبدالقادر بداؤنی [رک بہ بداؤنی] کا مولد ہے۔ حضرت نظام الدین اولیا [رک بان] بھی یہیں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ رضی الدین حسن الصفانی کی ولادت بھی یہیں ہوئی تھی، لیکن



میں شیخ نظام الدین امبیٹھوی، شیخ ابن امرہوی، شیخ اللہ بخش گڈہ مکتسیری اور سکندرہ کے شیخ محمد حسین جیسے بزرگوں کی خدمت میں حاضری دی۔

۱۵۷۳/۸۹۸۱ء میں جلال الدین قورچی پنج صدی منصب دار اور حکیم عین الملک شاہی طیب کی مہربانی اور مساعی سے بداؤنی کو اکہر کے حضور پیش کیا گیا، جس نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اسے بحث و جدال میں بڑی قابلیت حاصل ہے اور حکم دیا کہ بحیثیت بست سواری منصب دار گھوڑوں کو داغ دیا کرے۔ اسی زمانے میں ابوالفضل کو بھی دربار اکبری میں بار حاصل ہوا، جس کے سامنے بداؤنی کی لچھ نہ چلی۔ ا نبر کا تقرب حاصل کرنے میں ابوالفضل بازی لے گیا اور بداؤنی شکستہ خاطر ہو کر دربار سے الگ ہو گیا۔ اس نے بطور مدد معاش ایک ہزار بیگہ زمین قبول کر لی (جو ابتدا میں بساور میں ملی تھی، لیکن ۱۵۹۷ء/۱۵۸۸-۱۵۸۹ء میں اسے بداؤں میں منتقل کر دیا گیا)۔ یہ ایک غلطی تھی جو بداؤنی سے سرزد ہوئی، چنانچہ جب اس نے دربار میں اپنا سابقہ تقدم حاصل کرنے کی دوبارہ کوشش کی، جس کا وہ اپنے آپ کو ہر اعتبار سے مستحق سمجھتا تھا تو اسے مایوسی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ [مزید برآں ابوالفضل کے زیر اثر اکبر کا ذہن جس طرح بدلا اور دربار اکبری میں جو نیا رنگ پیدا ہوا اسے بداؤنی کا اسلامی ذہن قبول کرنے سے قاصر تھا۔] دربار میں پیش آمدہ واقعات اور ابوالفضل کی مذہبی سرگرمیوں کے بارے میں بداؤنی کے جو خیالات و افکار ملتے ہیں ان کے پیچھے یقیناً یہ امور بھی کارفرما تھے۔ دربار سے غیر حاضری کے باعث قریب تھا کہ اس کی زمین ضبط ہو جائے، مگر خواجہ نظام الدین، مصنف طبقات اکبری، کی سعی و سفارش سے بداؤنی کی جائداد

بداؤنی ۱۵۳۸/۱۹۲۰ء: (۲۱) بختاور سنگھ: تاریخ  
بداؤنی، بریل ۱۸۶۸/۱۸۶۸ء: (۲۲) محمد فضل اکرم:  
آثار بداؤنی، بداؤنی ۱۹۱۵ء: (۲۳) انوار الحق عثمانی:  
طوائف الانوار، سیتا پور ۱۸۸۰ء: (۲۴) ابرار حسین  
قادری: حیات شیخ شاہی، بداؤنی ۱۳۳۹/۱۹۳۰ء:  
(۲۵) شاہ عبدالقادر: تاریخ بداؤنی (مخطوطہ): (۲۶)  
سلطان حیدر جوش: نواب فرید، بداؤنی ۱۹۱۷ء: (۲۷)  
علی احمد خاں اسیر: حیات عبدالقادر، بداؤنی  
(مخطوطہ): (۲۸) ہفت روزہ اردو مجلہ ذوالقرنین،  
شمارہ خصوصی، اپریل ۱۹۵۶ء۔

(بزمی انصاری)

بداؤنی: (بداؤنی) عبدالقادر، عہد اکبری  
[۱۵۵۶/۸۹۶۳ء تا ۱۶۰۵/۸۱۰۱۳ء] کا مشہور  
عالم اور مؤرخ، قصبہ ٹوڈا (قدیم ریاست جے پور) میں  
۱۵۴۰/۸۹۳۷ء میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی زندگی  
بساور میں بسر ہوئی، جو ٹوڈا سے شمال مشرق کی  
جانب اٹھارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۱۵۶۰/۸۹۶۰  
۱۵۵۳ء [کذا، ۱۵۵۲ء؟] میں اسے شیخ حاتم سنہلی  
اور شیخ ابوالفتح کی شاگردی میں تحصیل علم کے لیے  
سنہل بھیجا گیا۔ ۱۵۵۸-۱۵۵۹ء میں  
بداؤنی اپنے والد ملوک شاہ کے ہمراہ آگرے چلا گیا  
اور وہاں ابوالفضل اور فیضی کے والد شیخ  
مبارک ناگوری سے تحصیل علم کی۔ حنفی فقہ اس  
نے قاضی ابوالمعالی سے پڑھی۔ ۱۵۶۹/۱۵۶۱-  
۱۵۶۲ء میں وہ باپ کے انتقال پر بداؤں چلا آیا اور  
پھر ۱۵۶۵-۱۵۶۶ء میں پٹیالہ، جہاں  
بحیثیت صدر نو برس اس نے حسین خاں کی ملازمت  
میں گزارے۔ اسی کے ہمراہ اس نے کلفت و گولا کا  
سفر بھی کیا۔ ۱۵۷۳/۸۹۸۱-۱۵۷۴ء میں دونوں  
آہس میں لڑ پڑے اور بداؤنی اس سے الگ ہو گیا۔  
یہی زمانہ تھا جب فرصت کی گھڑیوں میں اس نے  
علوم دینیہ کی تحصیل جاری رکھی اور اس سلسلے

اس سے پہلے کشمیر کے سلطان زین العابدین کے لیے شروع کیا گیا تھا اور جس کی تکمیل کا حکم اکبر نے ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۳-۱۵۹۵ء میں دیا؛ (۱) منتخب التواریخ: ہندوستان میں مسلمانوں کی عام تاریخ، عہد سبکتگین سے ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵-۱۵۹۶ء تک۔ یہ کتاب ۱۵۹۹ھ/۱۵۹۰ء میں شروع کی گئی اور اس کے آخر میں علماء، فضلا، اطباء، شعرا اور شیوخ کے حالات زندگی بھی شامل ہیں۔ جہاں تک ۱۰۰۲ھ/۱۵۹۳ء تک کے حالات و واقعات کا تعلق ہے منتخب التواریخ کی بنیاد بڑی حد تک [تاریخ مبارک شاہی اور خواجہ نظام الدین احمد کی طبقات اکبری پر ہے، لیکن اس میں بداؤنی کے اپنے ملاحظیات بھی شامل ہیں۔ اس تصنیف کا مخصوص پہلو یہ ہے کہ اس میں اکبر کی دینی سرگرمیوں پر نہایت کڑی اور مخالفانہ نکتہ چینی کی گئی ہے۔ یہ بھی خیال ہے کہ اس کتاب کو کم سے کم عہد جہانگیری کے دسویں سال تک مخفی رکھا گیا۔ ملا عبدالباقی نہاوندی نے جب ۱۰۲۵ھ/۱۶۱۶ء میں مآثر رحیمی تصنیف کی تو اسے اس کا مطلق علم نہ تھا۔ شیخ محمد بقا سہارنپوری نے مرآة العالم میں، جو ۱۰۸۷ھ/۱۶۶۷ء میں تصنیف ہوئی تھی، لکھا ہے کہ بداؤنی کے بچوں نے جہانگیر سے کہا تھا کہ انہیں اس تصنیف کے وجود کا کوئی علم نہیں ("فہرست مخطوطات فارسی، موزة بریطانیہ"، عدد ۷۶۵، ورق ۴۵۲ الف - ب)۔

مآخذ: (۱) مفصل فہرست کے لیے دیکھیے: Storey،

۱/۱: ۳۴۵ تا ۳۴۰ و ۱/۱: ۱۳۰۹؛ (۲) رزم نامہ

کے ایک اور نسخے کے لیے دیکھیے British Museum

Quarterly، ۲۰: ۲، ۳، ۶۲ تا ۶۳؛ (۳) محمد حسن آزاد:

دربار اکبری، لاہور ۱۹۳۹ء، ص ۱۲ تا ۱۶۔

(P. HARDY)

بدجوڑ: (Badajoz) رلك به بَطْلِيوس۔

محفوظ رہی۔ خواجہ نظام الدین سے اس کی ملاقات ۱۵۹۶ھ/۱۵۵۹ء میں آگرے میں ہوئی تھی۔ پھر حال ۱۵۸۲ھ/۱۵۷۳ء کے بعد سے اکبر برابر بداؤنی سے علمی خدمات لیتا رہا۔ بداؤنی کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے (دیکھیے Storey، ۱/۱: ۳۳۷)، لیکن جیسا کہ سٹوری Storey نے لکھا ہے ۱۰۲۳ھ/۱۶۱۵ء قرین صحت ہے (۱/۱: ۱۳۰۹)۔

بداؤنی کی علمی تصنیفات حسب ذیل ہیں:

(۱) کتاب الحدیث: ضائع ہو چکی ہے۔ فضیلت جہاد کے موضوع پر چالیس احادیث کا یہ مجموعہ ۱۵۸۶ھ/۱۵۷۸-۱۵۷۹ء میں اکبر کے حضور پیش کیا گیا تھا؛ (۲) نامہ خرد افزا: سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ، جس میں مالوے کے راجا ہکرماجیت کے متعلق بتیس کہانیاں شامل ہیں۔ اس کے ترجمے کا حکم اکبر نے ۱۵۸۲ھ/۱۵۷۳ء میں دیا تھا؛ (۳) رزم نامہ: مہابھارت کا ترجمہ، جو اکبر کی فرمائش پر ۱۵۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں شروع کیا گیا؛ (۴) ترجمہ رامائن: اس کی ابتدا ۱۵۹۲ھ/۱۵۸۳ء میں اکبر کے حکم سے ہوئی اور اسے ۱۵۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں اس کی خدمت میں پیش کیا گیا؛ (۵) تاریخ الفی: اسلام کی ہر سالہ تاریخ، جس کی تصنیف کی فرمائش اکبر نے ۱۵۹۳ھ/۱۸۸۵ء میں کی۔ اس کی پہلی دو جلدوں پر بداؤنی نے ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱-۱۵۹۲ء میں نظر ثانی کی؛ (۶) نجات الرشید: تصوف، اخلاق اور بداؤنی کے زمانے کی مہدوی تحریک کے متعلق ایک کتاب؛ (۷) ملا شاہ محمد شاہ آبادی کے ترجمہ تاریخ کشمیر (غالباً راج ترنگتی) کی اصلاح اور اختصار؛ (۸) باقوت کی معجم البلدان کے فارسی ترجمے کا ایک حصہ؛ (۹) رشید الدین کی جامع التواریخ کا ملخص ترجمہ، جس کی فرمائش اکبر نے ۱۰۰۰ھ/۱۵۹۱-۱۵۹۲ء میں کی؛ (۱۰) ہر الاسماء کی تکمیل۔ یہ سنسکرت کی ایک کہانی (بظاہر کتھا ساگر) کا ترجمہ ہے، جو





شاخ کے زیر حکومت آ گیا تھا۔ یہ شاخ بامیان میں مقیم تھی اور اس خاندان کی دیگر شاخوں کی طرح ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں اس کا خاتمہ بھی محمد خوارزم شاہ نے کیا۔

بدخشان البتہ مغول تاخت و تاراج سے بچ گیا اور نویں صدی ہجری/پندرھویں صدی عیسوی تک مقامی شاہی خاندان کے زیر حکومت رہا۔ رہا وہ افسانہ جو اس خاندان کا سلسلہ سکندر اعظم سے ملتا ہے سو اسے پہلی دفعہ مارکو پولو نے نقل کیا اور اس کے بعد مسلمان مؤرخوں نے بھی بہ کثرت اس کا ذکر کیا ہے۔ محمد حیدر [میرزا دوغلات] تاریخ رشیدی، ترجمہ E. D. Ross، ص ۲۰۳) اس روایت کو اس خاندان کے آخری فرمان روا کی بیٹی سے منسوب کرتا ہے کہ اس کے آبا و اجداد تین ہزار سال تک بدخشان پر حکمران رہے؛ چنانچہ تیمور اور اس کے جانشین بھی نہایت شدید لڑائیوں کے بعد صرف اتنا کر سکتے کہ وہاں اپنا اقتدار منوالیں۔ تیموری مملکت کے ساتھ اس کا الحاق تیمور کے پرپوتے ابوسعید کے عہد میں ہوا۔ یہاں کے آخری فرمانروا سلطان محمد بدخشی نے پہلے ہی سکندر اعظم کے وضع کردہ دستور العمل سے انحراف کر لیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ لالی کا تخلص اختیار کر کے اپنے فارسی کلام کا دیوان مرتب کرے (تاریخ رشیدی، ص ۱۳۷)؛ چنانچہ اس نے ابوسعید کی بھیجی ہوئی فوج کی بلامزاحمت اطاعت اختیار کر لی اور خود ہرات چلا گیا۔ اس کا لڑکا بہاگ کر کاشغر پہنچا۔ ابوسعید کے بیٹے میرزا ابوبکر کا نام شاہزادہ بدخشان رکھا گیا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد لالی کے فرزند نے کاشغر سے واپس آ کر ابوبکر کو نکال باہر کیا۔ اب بدخشان کا دوبارہ فتح کرنا لازمی ہو گیا۔ اس مقصد کے تحت ابوسعید نے ۱۳۶۶/۸۷۱ء میں شاہ سلطان محمد کو قتل کروا دیا (دولت شاہ: ۴۵۳)۔

کے وقت تخارستان (زیادہ وسیع مفہوم میں) کے فرمانروا کا ترکی لقب یبغو (عربی: جبغویہ) تھا اور دوسرے ممالک کے بادشاہ جن میں شاہ بدخشان بھی شامل تھا، اس کے باجگزار تھے۔ اس سلسلے میں کہ عربوں نے کب بدخشان فتح کیا اور وہاں اسلام کی اشاعت کیسے ہوئی، ہمیں پوری معلومات حاصل نہیں۔ الطبری کے ہاں بدخشان کا نام صرف ایک بار آیا ہے۔ ۱۱۸/۵۱۱۸ء کے واقعات میں اس نے صرف اتنا لکھا ہے کہ جبغویہ کی مملکت میں کشم اور اس سے بھی زیادہ دور دراز کے مقامات میں جنگیں ہوئیں۔ الیعقوبی (البلدان، ص ۲۸۸) کے نزدیک بدخشان کا شہر جرم اسلامی سرحد پر تبت (براستہ و خان) کی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ اسی عبارت میں اس نے ایک غیر معروف مغل شاہزادے خمار بیگ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ شقان و بدخشان کا بادشاہ تھا۔ الاضطحری (ص ۲۷۸) کہتا ہے کہ بدخشان "ابوالفتح کی مملکت" میں تھا۔ یہاں اشارہ بلاشبہ شاہزادہ ابوالفتح الیفتلی کی طرف ہے، جس کے بیٹے ابونصر نے، بقول السمعانی (Turkestan: W. Barthold، ۱: ۶۹) و یاقوت (۴: ۱۰۲۳) سامانیوں کے عامل قرہ تگین (م ۵۳۴/۹۵۱-۹۵۲ء، قب ابن الاثیر، ۸: ۱۵۷ تا ۳۷۰) سے جنگ کی۔ ان واقعات کے علاوہ ہمیں اس زمانے کے بدخشان کے سیاسی حالات کا کوئی علم نہیں۔ پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی میں مشہو شاعر ناصر خسرو اسمعیلی عقائد لے کر بدخشان پہنچا اور کامیابی سے ان کی تلقین کرتا رہا۔ اس کی قبر کو کچھ کے بالائی میدان میں آج بھی موجود ہے اور تعلیمات بھی آج تک بدخشان اور سرحدی علاقے میں محفوظ ہیں۔ چھٹی صدی ہجری/بارھویں صدی عیسوی میں تخارستان (جس میں بدخشان شامل ہے) خاندان غور کی ایک دور کی



اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتبے کی عبارت پڑھنے میں سبوتا ہوا ہے جو ۱۸۸۵ء میں انگریزوں نے دریافت کیا تھا اور جس کو رو سے بتایا جاتا ہے کہ سلطان محمد مذکور نے ۱۳۷۹/۱۳۸۰ء میں پتھروں کا ایک ہل بنوایا تھا (تاریخ رشیدی، ص ۲۲۱)۔ آگے چل کر ابوبکر کو اس کے بھائی سلطان محمد، فرمانرواے حصار نے ہندوستان سے نکال دیا۔ حصار کو ازبکوں نے سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں فتح کیا اور اس وقت تک ہندوستان حصار ہی کی حدود میں شامل رہا۔ ہندوستان میں ازبک فاتحین کے خلاف ایک مقامی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کے سرغنہ مبارک شاہ اور زیر راغی تھے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنا صدر مقام ایک قلعے کو قرار دیا تھا، جو کوچہ کے بائیں کنارے پر واقع تھا اور جس کا نام اب تک "قلعہ ظفر" ہے۔ یہ نام مبارک شاہ نے رکھا تھا۔ ازبک نکال دینے گئے اور باہر کے بھائی میرزا تیموری کو، جس سے باغیوں نے مدد حاصل کی تھی، ہندوستان کا حاکم مقرر کیا گیا (رمضان) ۹۱۰ھ/ فروری ۱۵۰۵ء؛ مگر بغاوت کے قائدین سے اس کا کوئی سہجہوتا نہ ہو سکا، چنانچہ دو سال بعد اسے بھی وہاں سے نکلنا پڑا۔ ۹۱۳ھ/ ۱۵۰۷-۱۵۰۸ء میں باہر کی مجازت سے محمود میرزا کا بیٹا سلطان وٹس میرزا ہندوستان گیا اور قلعہ ظفر میں اس کا استقبال کیا گیا۔ اس سے تھوڑے ہی دن پہلے مبارک شاہ کو اس کے ساتھی زیر نے قتل کر ڈالا تھا۔ زیر نئے حاکم (وٹس میرزا) کے پہنچنے کے بعد بھی اقتدار حکومت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا، لیکن اسے موت کے گھاٹ اتار کر جھگڑا ختم کر دیا گیا۔ تھوڑے ہی دن بعد کوہستان کے اسمعیلیوں کا قائد شاہ رکن الدین ہندوستان میں نمودار ہوا اور اپنے گرد اسمعیلیوں کو جمع کر کے ملک کا کچھ حصہ

بھی فتح کر لیا لیکن [۸۹۱۵/۱۵۰۹ء کے موسم بہار میں اسے قتل کر دیا گیا اور اس کا سر قلعہ ظفر لے جا کر میرزا خاں کے آگے پیش کر دیا گیا۔ ۸۹۲۶ھ/ ۱۵۲۰ء میں میرزا خاں ہندوستان کے تخت شاہی پر جان بحق ہوا۔ باہر نے میرزا خاں کے بیٹے سلیمان کو، جو ابھی خوردسال تھا، اپنے پاس بلا لیا اور ہندوستان میں اپنے لڑکے ہمایوں کو تخت پر بٹھا دیا۔ ۸۹۳۵ھ/ ۱۵۲۸-۱۵۲۹ء میں ہمایوں کو اس کے باپ نے واپس بلا کر ہندوستان بھیج دیا۔ اس کے بعد کاشغر کے حاکم سعید خاں نے کوشش کی کہ ہندوستان کے علاقے پر قبضہ کر لے، لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور سلیمان کو باہر اور سعید خاں دونوں نے شاہ ہندوستان تسلیم کر لیا (۹۳۶-۹۳۷ھ/ ۱۵۳۰ء)۔ سلیمان نے وہاں ۹۸۳ھ/ ۱۵۷۵ء تک حکومت کی۔ اسی سال کے نصف آخر میں اس کے پوتے شاہرخ نے اسے نکال باہر کیا اور وہ گوشہ گیری کے لیے ہندوستان اور پھر وہاں سے مکہ معظمہ چلا گیا، لیکن اس کے بعد وہ پھر اپنے ملک میں واپس آ گیا۔ [۸۹۹۲/ ۱۵۸۳ء میں ہندوستان کو ازبکوں نے عبداللہ خاں کی سرکردگی میں فتح کر لیا۔ سلیمان اور شاہرخ دونوں ناچار ہندوستان بھاگ گئے، لیکن کچھ دن بعد واپس آئے اور فاتحین کو اپنے ملک سے باہر نکالنے کی کئی بار کوشش کی۔ سترہویں صدی کے آغاز میں وہاں ایک اور شورش برپا ہوئی، جس کا بانی شاہرخ کا بیٹا بدیع الزمان تھا۔ [۱۰۷۶ھ/ ۱۶۶۵ء میں تیموریوں نے بلخ اور ہندوستان دونوں پر قبضہ کر لیا، لیکن [۱۰۸۰ھ/ ۱۶۶۹ء کے موسم خزاں میں ان دونوں ملکوں کو ازبکوں نے آخری بار فتح کر لیا۔

سترہویں صدی عیسوی کی ازبک سلطنت اس وقت تک چند خود مختار ریاستوں میں منقسم تھی۔ ہندوستان میں ایک فرمانروا خاندان کی بنیاد پاریک

نے رکھی اور فیض آباد بسایا۔ اس خاندان کے افراد بھی سکندر اعظم کی اولاد ہونے کے مدعی تھے۔ یہ دعویٰ انیسویں صدی عیسوی میں بھی قائم تھا۔ ازبک شاہزادے میر کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، جو امیر کا مخفف ہے۔ ۱۸۲۲ء میں میر محمد شاہ کو مراد بیگ فرمانرواے قندز نے تخت سے اتار دیا اور مراد بیگ کے ایک متوسل میرزا کلاں کو شاہ بدخشان مقرر کر کے وہاں بھیج دیا گیا۔ اپنے سرپرست بادشاہ کی وفات کے بعد میرزا کلاں خود مختار بن بیٹھا اور کچھ دن کے لیے قندز کا مالک بھی ہو گیا۔ اس کا فرزند اور جانشین میر شاہ نظام الدین ۱۸۶۲ء میں وفات پا گیا اور اس کے بیٹے جہاندار شاہ کو ۱۸۶۷ء کے بعد ایک مدت تک تخت حاصل کرنے کے لیے اپنے ہی خاندان کے ایک شاہزادے محمد شاہ سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ۱۸۶۹ء میں جہاندار کو قطعی طور پر ہسپا کر دیا گیا۔ ۱۸۷۲ء میں آخری مقابلے کے بعد وہ روس کی عملداری میں پناہ گزیں ہو گیا۔ فرغانہ میں موضع آچکراگان اسے رہنے کے لیے دے دیا گیا اور ۱۵۰۰ روپل اس کی پنشن مقرر کر دی گئی، لیکن ۱۸۷۸ء میں چند نامعلوم حملہ آوروں نے اسے قتل کر دیا۔ ۱۸۷۳ء میں حکومت افغان نے محمود شاہ کو معزول کر دیا۔ اسے کابل بھیج دیا گیا اور وہ مرتے دم تک وہیں رہا۔ اس کی مملکت کو افغانستان میں شامل کر کے صوبہ ترکستان کا ایک حصہ بنا دیا گیا۔

۱۷۰۵ء کے بعد سے روس میں بدخشان کے رکن اور لاجورد کی اطلاعات ملتی ہیں۔ اسی طرح سونے چاندی کی متوقع کانوں کی خبریں بھی پہنچتی ہیں۔ ۱۷۳۵ء میں وسط ایشیا سے متعلق روسی منصوبے میں یہ تجویز شامل تھی کہ "بدخشان کے دولت مند ملک کو فتح کیا جائے"، لیکن عملاً روس کا عمل دخل وہاں ۱۸۷۶ء میں شروع ہوا۔ ۱۸۸۵ء

میں دریائے مرغاب کے کنارے ہامیرسکی کی فوجی چوکی (Post Pamirskii) قائم کی گئی اور ۱۸۹۱ء - ۱۸۹۲ء میں پشیل کول (Yeshil-kol) پر ایک فوجی جھڑپ کے بعد روس نے تمام مشرقی ہامیر پر قبضہ کر لیا جو فرغانہ کے علاقے (Oblast) کا "ضلع ہامیر" قرار پایا اور اس کا نظم و نسق ہامیر میں متعینہ روسی فوجی دستے کے کماندار کے سپرد کر دیا گیا۔

۱۱ مارچ ۱۸۹۵ء کو برطانیہ اور روس کے درمیان لندن میں یہ طے پایا کہ افغانستان اور حکومت روس کی زیر حفاظت ریاست بخارا کے درمیان ہامیر کی سرحد کو از سر نو متعین کیا جائے۔ خاص بدخشان شاہان افغانستان کے قبضے میں چھوڑ دیا گیا اور ہامیر کے علاقے کا مغربی حصہ، جو پنج کے شمال اور مشرق میں واقع ہے، بخارا کو واپس کر دیا گیا۔ ۱۹۱۸ء کے انقلاب روس نے ریاست بخارا کو توڑ دیا، لیکن سوویت اقتدار ہامیر میں مضبوطی کے ساتھ کہیں ۱۹۲۵ء میں جا کر قائم ہوا اور وہ بھی بسمجی (Basmacis) [رک بہ بسمجی] اور گوری نسل کے درمیان چار سال تک جنگ رہنے کے بعد۔ سوویت گورنو۔ بدخشان کا خود مختار علاقہ ۲ جنوری ۱۹۲۵ء کو ہامیر کے دونوں حصوں (شرقی اور غربی) کو ملا کر "علاقہ خاص ہامیر" کی شکل دی گئی اور انتظامی حیثیت سے اسے سوویت جمہوریہ اشتراکیہ ترکستان کی مرکزی مجلس عاملہ کے ماتحت کر دیا (جس کی بنیاد ۱۷ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو رکھی گئی)۔ اسی سال دسمبر میں اس کا نام بدل کر "خود مختار علاقہ گورنو بدخشان" رکھا گیا اور اسے "تاجکستان کی خود مختار سوویت جمہوریہ اشتراکیہ تاجکستان" (جس کا یہ نام ۵ دسمبر ۱۹۲۹ء کو قرار پایا تھا) کا حصہ بنا دیا گیا۔ اس کا صدر مقام خاروغ (Khawog) ہے۔ گورنو۔ بدخشان میں سوویت ہامیر کا تمام



چنانچہ ۱۹۳۶ء کی سرشماری میں یہاں کی آبادی ۲۸۹۲۳: ۱۹۳۹ء کی سرشماری میں ۳۱۷۶۹ اور ۱۹۵۶ء کی سرشماری میں تقریباً ۶۲۰۰۰ تھی۔

نسلی اعتبار سے گورنو (= بدخشان) دو بالکل جدا جدا علاقوں پر مشتمل ہے: (۱) مشرقی پامیر کے بلند میدانوں میں ٹھوڑے سے کمرغز خانہ بدوش آباد ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں دو ہزار چھ سو ساٹھ نفوس اچ کلک قبائل سے تعلق رکھتے تھے، جو مندرجہ ذیل خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے: کیسک: ۱۳۰۰۰؛ تی ات Tiet: ۸۰۰؛ قہچاق: ۳۰۰؛ نے مان: ۱۰۰۰۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی تعداد تقریباً ۵۰۰۰۰ یا اس علاقے کی کل آبادی کی تقریباً گیارہ فی صد تھی۔ یہ کمرغز برائے نام حنفی سنی عقائد کے پیرو ہیں: (۲) غربی پامیر کی وادیوں میں ایرانی لوگ رہتے ہیں، جنہیں ان کے تاجیک ہمسائے غلجہ کہتے ہیں اور روسیوں نے ان کا نام گورنیہ تاجیکی Gornyje Tadjiki (یہ نام درست نہیں۔ اس سے درواز، قرہ تگیں اور زرافشاں کے گورستانی علاقوں میں رہنے والے تاجیک کے ساتھ التباس پیدا ہوتا ہے) یا پامیرسکو نرودی (Pamirsku Narody = باشندگان پامیر) رکھ چھوڑا ہے۔ خود یہ لوگ اپنے آپ کو تاجیک کہتے ہیں (یہ نام بھی باعث التباس ہے) اور درواز کے رہنے والے ہمسایوں کو (ہر چند کہ وہ تاجیکی بولتے ہیں) پارس گوی (= فارسی بولنے والے) کہتے ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد پچاس ہزار سے زیادہ یعنی خود مختار علاقے کی کل آبادی کا پچاس فی صد ہے۔ برتنگ کے ٹھوڑے سے باشندوں، نیز یازغلامی کی اکثریت اور ونج کے سب باشندوں کو چھوڑ کر، جو حنفی سنی ہیں، اسی علاقے کی بیشتر آبادی نزاری اسمعیل [رنگ بہ نزاری] ہے۔

باشندگان پامیر چند گروہوں پر مشتمل ہیں:

علاقہ شامل ہے۔ اس کا حدود اربعہ یہ ہے: شمال میں Trans-alai کا سلسلہ کوہ؛ مشرق میں چینی سنکیانگ؛ جنوب میں افغانستان کے مقبوضات اور مغرب میں پنج، درواز اکادمی Academy کا سلسلہ کوہ۔ [اس کا موجودہ رقبہ ۶۴۷۰۰ مربع کلومیٹر (۲۳۵۹۰ مربع میل) ہے اور آبادی جنوری ۱۹۶۵ء میں چھبائی ہزار تھی (تراسی فی صد تاجیک اور گیارہ فی صد کمرغز)۔ صدر مقام خاروغ کی آبادی دس ہزار ہے۔] ۱۹۵۱ء میں یہ خود مختار علاقہ سات اضلاع (تین = خطہ) میں منقسم تھا: (۱) شغنان (انتظامی مرکز: خاروغ)، جس میں وادی غند شامل ہے: (۲) اشکشم (انتظامی مرکز: اشکشم)، جس میں پنج کی بالائی وادی اور وخان اشکشم اور غاران، یعنی پنج اور شاخدرہ کے سنگم سے اوپر کی طرف کے علاقے شامل ہیں: (۳) روشنت قلعہ (انتظامی مرکز: روشنت قلعہ)، شاخدرہ کے طاس میں: (۴) روشان (انتظامی مرکز: روشان)، وادی پنج میں خاروغ سے نیچے کی طرف: (۵) برتنگ، جس میں دریائے برتنگ اور اس کے معاون گذرہ Kudara کا طاس جہیل ساریز تک شامل ہے: (۶) مرغاب (انتظامی مرکز: مرغاب یعنی سابق پامیرسکی کی فوجیں بچوگ)، جس میں پورا مشرقی پامیر شامل ہے: (۷) ونج (انتظامی مرکز: ونج)، جس میں ونج اور یازغلام کی وادیاں شامل ہیں۔

۱۹۵۳ء میں برتنگ کا ضلع ختم کر دیا گیا اور اس کے علاقے کو روشان اور ونج کے اضلاع میں ملا دیا گیا۔

بیسویں صدی کے شروع میں پامیر کی مجموعی آبادی (روسی اور بخاری حصوں کو ملا کر) بیس ہزار سے زیادہ نہیں تھی، لیکن ۱۹۲۵ء کے بعد سے ذرائع آمد و رفت کی ترقی اور زراعت کے جدید طریقوں کے رواج کی بدولت اس میں اضافہ ہو گیا،

عرصہ گزر چکا ہے۔

پامیر کے باشندے مشرقی ایران کے لسانی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان زبانوں میں سے کوئی زبان کتابت کے ذریعے متعین نہیں ہوئی ہے، اگرچہ سوویت حکام نے ۱۹۲۱ء میں کوشش بھی کی کہ شغنی میں لاطینی ابجد مستعمل ہو اور وہ ایک ادبی زبان بن جائے۔ ۱۹۳۱ء میں بچوں کے لیے سٹالن آباد میں ایک قاعدہ شائع کیا گیا (A. Djakov : Xugnoni alifba kudaken Cat، روسی میں) اور ۱۹۳۶ء میں حکومت تاجکستان کے شعبہ مطبوعات نے شغنی میں اپنی پہلی تصنیفات شائع کیں (دیکھیے *Revolutsia i Natswnal nosti*، شماره ۳، ۱۹۳۶ء)۔

ص ۹۲)، لیکن یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ تاجیکی تہذیبی (یعنی انتظامیہ، عدلیہ، مدارس اور صحافت کی) زبان ہے۔ اس علاقے میں دو زبانوں کا استعمال عام ہے (مقامی بولی اور تاجیکی)۔ بعض زبانیں، مثلاً اشکاشمی، تیزی کے ساتھ مٹ رہی ہیں اور محض ”گھریلو زبان“ کی حیثیت سے باقی رہ گئی ہیں۔ کچھ اور زبانیں (برتنگی، روشانی . . .) تاجیکی کے اثرات بڑی شدت سے قبول کر رہی ہیں۔ ان کے مقابلے میں یازغلامی، جو بالکل الگ تھلک زبان ہے، اور وخی [دونوں] ان اثرات کا بڑے مؤثر طریقے سے مقابلہ کر رہی ہیں۔

۱۹۵۴ء میں گورنو۔ بدخشان میں سات اخبار موجود تھے۔ ان میں سے دو اخبار علاقائی تھے اور خاروغ سے نکلتے تھے۔ *Kramyj Badakhshan* (روسی زبان میں) اور بدخشان سرخ (تاجیکی زبان میں)۔ چار اخبار مقامی تھے، جو تاجیکی میں شائع ہوتے تھے۔ روشانی سرخ (روشان سے)، حقیقت و نچ (ونچ سے)، بیرق سرخ اور ایک اخبار کیرغز مرغاب سے۔

تاجیکی اثر تعلیم کے ذریعے بھی ہے۔

(۱) شغنان : روشن گروہ : یہ اپنی تعداد کے لحاظ سے بہت اہم ہے (پینتیس ہزار سے چالیس ہزار تک)۔ اس میں یہ لوگ شامل ہیں : (ا) اضلاع شغنان [رک بان] و روشنت قلعه (غند پنج اور شاخدرہ کی وادیاں) کے شغنی (ھگنی)، جن کی تعداد بیس ہزار اور تیس ہزار کے درمیان ہے؛ (ب) ضلع روشن کے رہنے والے روشانی (تقریباً آٹھ ہزار)؛ (ج) ضلع برتنگ (وادی دریاے برتنگ) کے رہنے والے برتنگ (تقریباً دو ہزار) اور (د) اوروشور Oroghor (جو ۱۹۲۵ء میں تین ہزار تھے)۔ یہ چاروں گروہ ایسی بولیاں بولتے ہیں جو ایک دوسری سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہیں۔

(۲) وخی Wakhi (وخی Wakhgad, Wukh [رک بہ و خان] : ان کی تعداد چھ اور سات ہزار کے درمیان ہے اور یہ لوگ ضلع اشکاشم میں رہتے ہیں، جو روسی پامیر کے جنوبی حصے، یعنی پنج اور و خان دریا کی وادیوں میں واقع ہے (وخیوں کی اتنی ہی تعداد افغانستان میں آباد ہے)۔

(۳) یازغلامی (یزدم Zgamik, Yuzdom) : ان کی تعداد دو ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ لوگ دریاے یازغلام کی وادی (ضلع ونچ) کے تیرہ دیات میں پھیلے ہوئے ہیں۔

(۴) اشکاشمی (اشکاشمی) : روسی بدخشان میں ان کی تعداد چار سو ہے (افغانستان میں اس برادری کے ڈیڑھ دو ہزار افراد رہتے ہیں اور زیبائی اور سنگلیچی زبانیں بولتے ہیں)۔ یہ لوگ [روسی بدخشان میں] صرف ایک گاؤں ریم Rym میں آباد ہیں، جو پنج کے بالائی حصے (ضلع اشکاشم) میں واقع ہے۔

(۵) ونچی : یہ لوگ خود مختار علاقے کے انتہائی شمال میں دریاے ونچ کی وادی میں رہتے ہیں اور پورے طور پر تاجیک ہو گئے ہیں۔ ان کی زبان کا رواج ختم ہوئے ایک صدی سے بھی زیادہ کا



آمودریا کے بالائی میدانوں میں واقع تھے ان کے حالات بہت احتیاط سے (۵) J. Minajew (Swjedenija o stranach po verchovjam Amu Darzi) سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۴۹ء میں جمع کر دیے گئے ہیں اور یہ انگریز سیاحوں کے بیانات پر مبنی ہیں۔ مزید برآں بارٹولڈ Barthold کو ۱۸۴۸ء میں یہاں کا سفر کرنے والے دو روسی سیاحوں کے بیانات سے استفادہ کرنے کا موقع ملا، جو عام طور پر دستاویز نہیں ہوتے۔ ان علاقوں کے انقلاب روس سے ذرا قبل کے حالات کے لیے دیکھیے بالخصوص: (۶) Count A. Bobrinskoj : Gorksky verkhov'ev Pondja Masکو ۱۹۰۹ء جو جزوی طور پر R. Leitner : Dardistan in 1866, (1889 and 1893) اور صنف مذکور : Dardistan in 1845 پر مبنی ہے۔ ۱۹۰۴ء میں جمہوریہ اشتراکیہ تاجیکستان کی سائنس اکادمی نے ایک بہت اچھی کتاب شائع کی، یعنی (۷) A. M. Mandel'stam : Materjal k istoriko-geograficeskomi obzoru Pamira i Priprmirskitch oblastec، مثال آباد ۱۹۰۴ء (ج ۵۳ : روداد ادارہ تاریخ، آثار قدیمہ و نسلیات، جمہوریہ تاجیکستان)۔ اس میں یونانی، چینی اور عرب مؤرخوں اور جغرافیہ دانوں کے ناموں کی بہت سی مدی تک کے بیانات شامل ہیں۔

گورنو۔ بدخشان پر عام تعارف کے لیے دیکھیے

(۸) [W. W.] لائل، ہارڈوم، مائیک ہڈیل مادہ بدخشان۔

زبانوں کے لیے بھی حوالے مفید ہوں گے۔ بدخشان اور

بخارا کے لیے دیکھیے: (۹) Storey : Ancient Literature

(Histories of Central Asia) ص ۲۸۱ [مجلد]

[W. Barthold] و A. H. H. H.

[H. Carné d'Encourge] و

بد: (ج: جمع: بدتہ، قاپسی 'ت' [کامبریس])

تین مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یعنی مندرجہ

ہنگوڈا یا [گوتام] بدہ یا کسی بھی 'ت' کے لیے

(جو ضروری نہیں کہ [گوتام] بدہ ہی کا ہو۔

اسان میں ہے: الہ بیت قبہ اعظم و نکلون... یعنی

۱۹۵۴ء میں اس علاقے میں تقریباً دو سو مدرسے تھے، جن میں سے گیارہ ثانوی (دس سالہ نصاب کے) مدرسے تھے، اور ایک معلموں کی درسگاہ خاروغ میں؛ ان میں کل پانچ ہزار طلبہ زیر تعلیم تھے۔

گورنو۔ بدخشان، جو بیشتر ازیں باقی ملک سے بالکل منقطع علاقہ تھا، ۱۹۳۳ء سے وادی فرغانہ سے ایک موٹر کی سڑک (اوش - مرغاب - خاروغ؛ طول: ۳۰۰ کلومیٹر) کے ذریعے ملا دیا گیا ہے۔ اسے ۱۹۳۰ء میں خاروغ - مثال آباد سڑک کے ذریعے، جو وادی پنج کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، مکمل کر دیا گیا ہے۔ یہیں ہمہ اس علاقے کا اقتصادی ڈھانچا اب تک قدیم طرز کا ہے اور بدوی انداز سے جانوروں (بھیڑ، بکری) کی پرورش، ڈھلوان زمینوں پر طبقہ در طبقہ باغ لگانے اور علاقے کے مغربی حصے میں ریشم کی پیداوار پر مشتمل ہے۔ یہ سرزمین معدنی دولت سے مالا مال ہے، چنانچہ بعض معدنیات سے بڑی مدت سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے، مثلاً وادی شاخندہ میں نیلم اور فیروزہ اور پورشینف Porsheiv کے نواح میں قیمتی جواہر، سونا اور تانبا۔

اس علاقے کا دارالحکومت خاروغ ہے (آبادی ۱۹۲۶ء میں نو سو ستائیس اور ۱۹۵۴ء میں دو ہزار اور تین ہزار کے درمیان) یہاں چند چھوٹے چھوٹے چینی کارخانے بھی قائم ہیں۔

مآخذ: خاص طور پر دیکھیے: (۱) تاریخ وینی، ترجمہ E. D. Ross، طبع N. Elias، لندن ۱۸۹۰ء اور (۲) ہارٹولڈ، بدخشان، درپلے ہلا گریگ، ج ۱، لندن و لائل، ۱۹۰۰ء۔ جن مکتوبات پر بدخشان کا ذکر ہے ان کی تشتملی اشارہ میں موجود ہے؛ علاوہ آئیو (۳) عبد الیزو سرتسی: مکتب تعلیم خاص خوزومنیہ ہے۔ غری بیلت کے بارے میں دیکھیے: (۴) سہج - سہج جاتی: طقت قلمریہ لندن ۱۹۰۴ء و دیگر نون۔ ایسوی صبی عیسوی میں جو علاقے

راہِ حق کی تلاش میں دس نیکیوں پر عمل کرتے اور دس برائیوں سے احتراز کرتے ہیں اور یوں اپنے لیے ایک اعلیٰ و ارفع مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ یہی مصنف لکھتا ہے کہ بدھ مت کے پیروں کا عقیدہ ہے کہ دنیا کو دوام حاصل ہے اور انسان اپنے اعمال کی سزا و جزا دوسری زندگی میں حاصل کرتا ہے۔ پھر وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ہندوستان کے راجاؤں کے محلوں میں بدھ کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے۔ وہ اس کا موازنہ مسلمانوں کے تصورِ خضر [رَلَّہُ بِہِ الخضر] سے کرتا ہے۔ مسلمانوں کی معلومات بدھ مت کے بارے میں اگرچہ بالکل ابتدائی تھیں بائیں ہمہ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ کوہِ آدم [آرک بہ سرنڈیب] کے بارے میں بدھ مت کی اس روایت کو اپنا لیا گیا ہے جس کی رو سے اس چوٹی کا تعلق [گوتم] بدھ سے بتایا جاتا ہے (دیکھیے اخبار الصین والہند، طبع و ترجمہ Sauvaget، ص ۳۶)۔

جیسا کہ پہلے ذکر آیا ہے لفظ بدھ بسا اوقات بت کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ الجاحظ (الترییح، ص ۴۰) کے ہاں 'بدھ گویر' سے غالباً گویر Kuvra کا بت ہی مراد ہے۔ صاحب اخبار الصین والہند (ص ۲۴) بدھ کو بت بتاتا ہے، جس کی ہندوستان میں پوجا کی جاتی ہے اور اس پر سیموئیل بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔ ٹومناٹ کا بت مسلمانوں میں بخوبی معروف تھا (دیکھیے سعدی: بتومنان، طبع Platts، ص ۲۳۸ بعد؛ انگریزی ترجمہ از R. Levy، لنڈن ۱۹۱۸ء، ص ۶۷ بعد، فرانسیسی ترجمہ از Barbier de Meynard، ص ۳۳۴)۔ اللمشقی ((نخبۃ الدھر فی عجائب البر و البحر =)) Cosmographie، طبع Mehren، ص ۱۷۰-۱۷۱) نے اس کا حال بڑی صحت کے ساتھ قلمبند کیا اور خاص پرستش کی جانے والی شے ہی کو بدھ کہا ہے، جو دو پتھروں پر مشتمل مردانہ اور زنانہ

بت خانہ؛ بقول ابن درید: البَدُّ الصَّنَمُ تَفْسَهُ ...))۔ پگوڈا کے معنوں میں اس کے استعمال کی سب سے نمایاں مثال [عجائب الہند] (Merveilles de l'Inde، ترجمہ و طبع M. Devic، ص ۵؛ Memorial J. Sauvaget، ۱۹۲) میں ملتی ہے، لیکن ان معنوں میں اس کا استعمال شاذ ہے، گو لسان العرب میں یہی اس کے اصل معنی بیان کیے گئے ہیں۔

الجاحظ (کتاب الترییح، طبع Pellat، ص ۷۶)؛ المسعودی، البیرونی اور الشہرستانی جیسے مصنفین کے ہاں بد کے معنی [گوتم] بدھ کے ہیں۔ ملتان میں جو مندر "سونے کا گھر" [= فرج بیت الذهب، دیکھیے البلاذری: فتوح] کے نام سے مشہور تھا، اس کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے المسعودی (التنییہ، ص ۲۰۱؛ قب البیرونی: کتاب الہند، طبع Sachau، ۱: ۳۶۸ و ۲: ۱۸؛ Reinaud، در JA، ۱۸۳۳-۱۸۳۵) لکھتا ہے کہ ہندیوں کے ہاں بدھ کا ظہور تینتیس [۱۹] بار اول، میں چھتیس [۶۶] ہزار سال کے بارہ ہزارویں بار (یعنی ۳۳۰۰۰ [۱۲۰۰۰x] کے سال [یعنی کڑوروں برس پہلے]) ہوا تھا۔ البیرونی کو برعزمت کے بارے میں تو بڑی اچھی معلومات تھیں لیکن بدھ مت کے متعلق وہ کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ الشہرستانی (طبع Cureton، ص ۴۱۶، مطبوعہ برحاشیۃ ابن حزم، ۳: ۲۴۰) کا معاملہ البتہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ بدھ کی تعریف یوں کرتا ہے: بدھ اس دنیا ہی کا ایک فرد ہے، جو نہ تو پیدا ہوتا ہے، نہ شادی کرتا ہے، نہ کھاتا پیتا ہے، نہ بوڑھا ہوتا ہے، نہ مرتا ہے۔ پہلا بدھ، جو ہجرت نبوی سے پانچ ہزار پہلے ظاہر ہوا، شاکین (= چاکہ منی) (= ساکیہ منی) کہلایا۔ الشہرستانی بدھ استوا Budhisattava کو بوڈیسیتیہ کہتا ہے۔ اسے علم تھا کہ ان کا درجہ بدھوں سے کم ہے اور یہ کہ ان سے وہ لوگ مراد ہیں جو



کہتے ہیں، یہاں کی جامع مسجد ہے۔ اس میں جمعے کی نماز ہوتی ہے، اور یہ اسی مقام پر تعمیر ہوئی ہے جہاں غزوہ بدر کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے ایک سائبان (عریش) بنایا گیا تھا۔ یہ ایک ٹیلے پر ہے، جہاں سے میدان کارزار صاف نظر آتا ہوگا، اگرچہ اب نئے باغ حائل ہو گئے ہیں۔ بدر بیضوی شکل کا ساڑھے پانچ میل لمبا اور ساڑھے چار میل چوڑا وسیع میدان ہے۔ میدان کے ارد گرد اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ مکہ، شام اور مدینے جانے کے راستے جنوب، شمال اور مشرق کی وادیوں سے آ کر بدر پر ملتے ہیں۔ ترکی دور کے ایک سابق والی حجاز شریف عبدالمطلب کا بنایا ہوا قلعہ اب کھنڈر ہو گیا ہے۔ Burckhardt کا بیان ہے کہ یہاں کچی مٹی کی ایک نکمی سی فصیل تھی، مگر اب اس کے آثار نظر نہیں آتے۔ بدر ریتلا اور سنگلاخ ہے؛ مگر جنوب مغربی حصے کی زمین پولی ہے، اسی جگہ قریش مکہ کا پڑاؤ تھا، جو غزوہ بدر کے دن بارش میں دلدل ہو گئی تھی۔ یہ آج کل سرسبز نخلستان ہے۔ یہاں آپاشی ایک چشمے اور کاریز سے ہوتی ہے، جس کا بہاؤ شمال مشرق (مدینے کے راستے) سے جنوب مغرب (مکہ کے راستے) کی طرف ہے۔ اسی لیے اسے کاٹ کر لشکر قریش کو پانی سے محروم کر دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ممکن تھا۔ بدر وادی بیلل [قب یاقوت] میں واقع ہے۔ اس کے دونوں سروں (شمال مغرب اور جنوب مشرق) پر ریت اڑا کر جمع ہوتی رہتی تھی حتیٰ کہ خاصے بلند ٹیکرے بن گئے۔ ان کے قرآنی نام العُدْوَةُ الدُّنْيَا اور العُدْوَةُ الْقُصْوَى [إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَى: (۸) [الانفال]: (۳۲)] اب بھی برقرار ہیں۔ ان دونوں کے درمیان جنوب مغرب میں ایک خاصا بلند پہاڑ ہے، جو اب 'جبل اسفل' کہلاتا ہے اور یہاں سے سمندر

اعضائے قحط کی مورتیاں تھیں۔ صابیوں (Sabaeans) کے مذہب کے مبینہ بانی بوذاسف / یوداسف = بودہ استوا کے بارے میں رک بہ بلوہر و یود آسف۔  
مآخذ: متن مقالہ میں درج ہیں۔

(B. CARRA DE VAUX)

بدر: [مکہ اور مدینے کے درمیان حجاز کا مشہور چشمہ اور] مقام جہاں عہد نبویؐ کا پہلا اہم غزوہ پیش آیا، مدینہ منورہ کے جنوب مغرب میں بندرگاہ الجار سے ایک شبانہ منزل پر واقع ہے [شبلی نے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ سے تقریباً ۸۰ میل کے فاصلے پر ہے (دیکھیے سیرۃ النبی، ۱: ۳۱۵)]۔ زمانہ جاہلیت میں بھی اس کی یہ اہمیت تھی کہ یکم ذوالقعدہ سے آٹھ دن تک یہاں ہر سال ایک بڑا میل لگتا تھا۔ آج کل بھی یہاں ہر جمعے کو ایک میل لگتا ہے۔ گنہی، کھالیں، روغن بلسان، اونٹ، بکریاں، اونٹنی عباہیں وغیرہ فروخت کے لیے آتی ہیں۔ [یاقوت نے لکھا ہے کہ یہ بدر بن یخلد بن النضر بن کنانہ کی طرف منسوب ہے، نیز دیکھیے ابن حزم: جمہرۃ، ص ۱۱ و ۱۲۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ بدر بنو ضمرہ کا ایک فرد تھا، جس نے یہاں سکونت اختیار کی تھی]۔ بدر بلند پہاڑیوں سے گھرا ہوا ایک دشوار گزار مقام ہے لیکن محل وقوع اور پانی کی موجودگی کے باعث شام کو جانے والے قافلوں کی منزل رہا ہے [بدر ماہ مشہور بین مکہ و المدینہ، دیکھیے یاقوت]۔ آغاز اسلام میں یہاں بنو ضمرہ آباد تھے۔ ان کی ایک شاخ بنو غفار تھی، جس کی اصلاح کے لیے حضرت ابوذر غفاریؓ مامور کیے گئے تھے۔

راقم مقالہ نے ۱۹۳۹ء میں یہاں ایک گاؤں دیکھا، جہاں عموماً ایک منزلہ پتھر کے کئی سو مکن (قصر جمع تصور) تھے۔ بستی میں دو مسجدیں تھیں: ایک صرف نماز پنجگانہ کے لیے، جس میں ایک ماڈرن ہے، دوسری، جسے مسجد عریش نیز مسجد غمامہ

مسلمانوں کو ختم کر دینے کے منصوبے بنانا] ایک طرف، اور دوسری طرف قریش کے جارحانہ ارادوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مدینے سے مسلمانوں کا قریش پر معاشی دباؤ ڈالنا اور قریش کے تجارتی قافلوں کی آمدورفت کو اپنے زیرِ اثر علاقے میں روک دینا، یہی بدر کی لڑائی کے موجبات ہو سکتے ہیں... [نیز دیکھیے شبلی: سیرۃ النبی، ۱: ۳۱۵ بعد؛ مودودی: تفہیم القرآن، ۲: ۱۱۸ بعد].

[آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش مکہ کے ناہاک عزائم سے باخبر تھے۔ آپ ان کی نقل و حرکت پر کڑی نگاہ رکھنے کے لیے کئی مرتبہ اپنے صحابہؓ کو مختلف ٹولیوں میں بھیجتے رہتے تھے تاکہ کہیں مدینۃ النبی دشمنوں کے اچانک حملے کا شکار نہ ہو جائے۔ اسی دیکھ بھال کے سلسلے میں عمرو بن الحضرمی کے قتل کا واقعہ رجب ۲ھ میں پیش آیا۔ اس سے قریش مکہ بڑے مشتعل ہوئے اور بقول ابن خلدون عمرو بن الحضرمی کے قتل سے جنگ بدر کی تمہید پڑی (تاریخ)۔ مزید برآں ماہ شعبان میں قریش کا ایک تجارتی قافلہ مال و دولت سے لدا ہوا شام سے آ رہا تھا اور کسی طرح یہ غلط خبر بھی مشہور ہو گئی کہ مسلمان شام سے واپس آنے والے قافلے پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ سردار قافلہ ابوسفیان نے پیش قدمی کے طور پر شام ہی سے مکے کو قاصد دوڑا دیے تھے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے قریش مکہ بڑی جمعیت کے ساتھ مدینے کی طرف بڑھنے لگے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و سلم کو جب ان واقعات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے صحابہؓ کو جمع کیا اور واقعے کا اظہار فرمایا۔ صحابہ کرامؓ سے مشورے کے بعد ۸ (بقول دیگر ۱۲ رمضان) ۲ھ کو آپ تین سو سے کچھ زائد جاں نثاروں کے ساتھ مدینے سے نکلے۔ اور منزل بہ منزل ۱۷ رمضان کو بدر کے قریب پہنچے۔

صاف نظر آتا ہے۔ البکری اور المقدسی کی کتب جغرافیہ میں یہاں کی زرخیزی اور عمدہ کھجور کا ذکر ہے۔ المقدسی نے لکھا ہے: ”یہاں چند مسجدیں ہیں جو مصر کے بادشاہوں نے تعمیر کی ہیں“۔ ۱۹۳۹ء میں راقم مقالہ نے مسجد عریش میں تین کتبے دیکھے۔ ایک ٹوٹ چکا ہے، جسے تعمیر جدید میں محراب کے پاس ڈال دیا گیا ہے۔ اس میں ”کان الفراغ“ کا لفظ صاف پڑھا جاتا ہے۔ دوسرا محراب کے اوپر نصب ہے اور خط طغرا میں ہے اور پڑھا نہیں گیا۔ تیسرا منبر کے اوپر نصب ہے۔ [یہ مملوک ترکوں نے کندہ کرایا تھا۔ اس میں املا کی غلطیاں بھی ہیں وہ کتبہ یہ ہے:-

سطر اول: بسم اللہ الرحمن الرحیم

سطر ۲: أنشأ حصر هذا المكان المبارك

سطر ۳: حشد امیر عسره (?) بدیار المصریة

شیدة العمارة السلطانية

سطر ۴: وكانل (= کان) الفراغ من هذا البنية

المبارک ربیع الؤل احد و عشرین

فی سنة ستة و تسعمایة

(ترجمہ: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اس مبارک

مقام پر حصار تعمیر کرنے کا آغاز حشد امیر نے کیا جو

سلطنت مصر میں امیر عشرہ (?) اور سرکاری میر عمارت

تھا اس مبارک عمارت کی تعمیر سے ۲۱ ربیع الاول،

۶۰ھ میں فراغت ہوئی)۔

غزوۂ بدر: مکے میں بعثت نبوی اور تبلیغ اسلام

پر قریش کی روز افزوں تعدی، آنحضرت صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کے قتل کی تیاریاں، جن کی وجہ سے

آپؐ ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، مہاجر مسلمانوں

کی جائدادوں کو ضبط کر لینا اور حبشہ کے

حکمران کو، پھر مدینے کے با اثر لوگوں کو ان

مہاجرین کو پناہ نہ دینے کی ترغیب دینا [غرض

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اسلام اور



نوکروں اور غلاموں) پر ہتھیار اٹھانے کی سختی سے معافیت کی۔ آپ کی ہدایت پر مسلمانوں نے امتیاز کے لیے اونی کفیاں لگائیں اور مزید اطمینان کے لیے ہر انفرادی مقابلے میں اپنا نعرہ مقرر کیا۔ پھر آپؐ ایک ٹیلے پر چڑھ گئے اور سائبان میں سے معرکے کی نگرانی کرنے لگے۔ شروع میں حسب معمول انفرادی مقابلے ہوئے، جن میں مسلمان کامیاب رہے، پھر عام لڑائی ہوئی۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔ اس جنگ میں قریش مکہ کے ستر آدمی کھیت رہے اور اتنے ہی زندہ گرفتار ہوئے۔ اس کے مقابلے میں بارہ مسلمان شہید ہوئے۔ بہت سے اونٹ اور تیس گھوڑے مال غنیمت میں ہاتھ آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً فتح کے بشارت مدینہ منورہ بھیجے۔ مسلمان شہدا اور دشمن کی لاشوں کو دفن کیا۔ قیدیوں سے عمدہ برتاؤ کی تاکید فرماتے ہوئے انہیں حفاظت کے پیش نظر اپنے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا۔ دو قیدیوں کو، جو مکہ میں مسلمانوں کی ایذا رسانی میں پیش پیش تھے اور اس سلسلے میں بظاہر قتل کے مرتکب ہو چکے تھے، سزا میں قتل کر دیا گیا، باقی کے لیے ایک مجلس شوریٰ کر کے فدیے پر رہائی کا فیصلہ کیا۔ بڑے لکھے قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا کہ ہر ایک دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھائے۔ چند ایک کو تو آئندہ نہ لڑنے کے اقرار پر مفت بھی رہا کیا گیا۔

اس جنگ کا قرآن مجید میں بالصراحت ذکر ہے [دیکھیے سورۃ الانفال]۔ یہ جنگ نہ صرف فی حرب کا ایک لاثانی کارنامہ ہے بلکہ تاریخ عالم میں ایک عہد آفرین واقعہ بھی ہے۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا میں یہ فرمایا تھا کہ ”اے خداے واحد! اگر یہ چھوٹی سی جماعت ہلاک ہو گئی تو پھر روئے زمین پر تیری عبادت نہ ہو گی“

ادھر صورت یہ پیش آئی کہ شام کا قافلہ صحیح و سلامت واپس مکے پہنچ گیا تھا۔ اس وجہ سے قریش کے سرداروں نے کہا کہ اب لڑائی ضروری نہیں رہی؛ مگر ابوجہل نے لڑائی پر اصرار کیا۔ قریش کو آمادہ جنگ دیکھ کر مسلمانوں کے لیے اب لڑائی ناگزیر ہو گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی دانشمندی سے میدان بدر میں ڈیرے ڈالے۔ ہانی کے چشمے پر قبضہ کر لیا۔ قلت تعداد و اسلحہ کے باوجود آپؐ نے اپنے بہادر ساتھیوں میں اعتماد و یقین فتح پیدا کر دیا۔ میدان جنگ میں گھوم پھر کر صفیں درست کیں اور نشان دہی فرمائی کہ کون کون دشمن کہاں کہاں قتل ہو کر گرے گا۔ لڑائی کا آغاز یوں ہوا کہ کفار میں سے پہلے عامر الحضرمی (عمرو بن الحضرمی مقتول کا بھائی) آگے بڑھا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک اکیلے اکیلے آدمی کے درمیان جنگ آزمائی ہوتی رہی اس کے بعد عام لڑائی شروع ہو گئی۔ لیکن جب عتبہ اور ابوجہل مارے گئے تو قریش کے ہاؤں اکھڑ گئے اور مسلمانوں کو قلیل تعداد اور کمتر ساز و سامان کے باوجود فتح نصیب ہوئی۔

اس میں تائید ایزدی کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدبیر بھی کارفرما ہوئی، مثلاً جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صفت بندی کی تو شوج کو پشت پر رکھا اور عداوت کی کہ بلا اجازت حملے کے لیے آگے نہ بڑھیں۔ دشمن دور ہو تو تیر خانع نہ کریں بلکہ زد پر آئے تو تیر چلائیں، اور قریب آئے تو پتھر ماریں، اور قریب آئے تو نیزے سے کام لیں، پھر تلوار چلائیں۔ ”ہر کام کو خوبی سے انجام دینا فرض ہے حتیٰ کہ کسی کو قتل بھی کرو تو اچھے طور سے قتل کرو“۔ خواہ مخواہ ایذا رسانی سے اجتناب کرنے کا حکم فرمایا اور مقابلے کے ناقابل لوگوں (زخمیوں، عورتوں، بچوں اور لڑائی میں حصہ نہ لینے والے

خدایا! تو نے مجھ سے جو وعدہ فرمایا تھا اسے پورا کر، [فضائل اصحاب بدر اور ان کی تعداد کے بارے میں معلومات کے لیے رک بہ اصحاب بدر؛ ان کے اسما کے لیے دیکھیے جوامع السیرة، ص ۱۱۳ تا ۱۳۷]۔

[جنگ بدر اس اعتبار سے بڑی فیصلہ کن ثابت ہوئی کہ کفر و اسلام کو میدان جنگ میں پہلی مرتبہ قوت آزمائی کا موقع ملا اور کثرتِ تعداد و اسلحہ کے باوجود کفر کو ذلت آمیز اور عبرتناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کفار مکہ کا زور ٹوٹ گیا، حوصلے پست ہو گئے، مسلمانوں کی ہمتیں بڑھ گئیں اور عزم بلند ہو گئے۔ جزیرۃ العرب کے قبائل کو مسلمانوں کی قوت، سر بلندی اور سچائی و حقانیت کا یقین آ گیا۔ ساتھ ہی یہ راز بھی منکشف ہو گیا کہ حق کے مقابلے پر تعداد اور ساز و سامانِ جنگ کی کثرت کام نہیں آ سکتی، فتح و کامرانی صرف حق کو ہوا کرتی ہے۔ اگر مسلمان اس معرکے سے بچنے کی کوشش کرتے تو ایک طرف یہودِ مدینہ ان کے لیے جینا محال کر دیتے اور دوسری طرف قریشِ مکہ ان کے لیے ہر روز مصیبت بنے رہتے۔ پھر ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کو امدادِ غیبی اور اپنی قوتِ ایمانی پر یقین محکم ہو گیا۔ غرض کہ معرکہ بدر نے ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کی دھاک بٹھا دی اور کفر کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوا.]

مآخذ: (۱) ابن ہشام: سیرة، طبع وِسٹنفلٹ، ۱۸۵۸ تا ۱۸۶۰ء؛ (۲) ابن سعد: طبقات، طبع زخاؤ، ۶ تا ۱۸، لائڈن ۱۹۰۰ء؛ (۳) الطبری: تاریخ، طبع ڈ خویہ، ۱: ۱۲۳۱، بعد؛ (۴) الیعقوبی: تاریخ، طبع ہوتسما، ۲: ۳۵ تا ۳۶، لائڈن ۱۸۸۳ء؛ (۵) البلاذری: انساب الاشراف، ۱: ۲۸۸، بعد، طبع محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء؛ (۶) المقریزی: امتاع الاسماع؛ (۷) السہیلی:

الروض الأنف (۱۹۱۳ء)، ج ۲: (۸) المسعودی: التنبیہ، طبع ڈ خویہ، لائڈن ۱۸۹۳ء؛ (۹) یاقوت: معجم البلدان، بذیل بدر؛ (۱۰) المقدسی، طبع ڈ خویہ، لائڈن ۱۸۷۷ء (بذیل بدر)؛ (۱۱) البکری، بذیل بدر؛ (۱۲) محمد حمید اللہ: عہد نبوی کے میدانِ جنگ (باتصویر)؛ (۱۳) شبلی: سیرۃ النبی، جلد اول؛ (۱۴) محمد سلیمان: رحمة للعالمین، جلد اول و دوم، لاہور؛ (۱۵) F. Buhl: Orientalische Studien (Nöldeke jubile vol.)؛ (۱۶) Burckhardt: Reise in Arabien؛ (۱۷) Ch. Doughty: ۶۱۳ تا ۶۱۹؛ (۱۸) Caetani: Travels in Arabia؛ (۱۹) Annali Dell' Islam؛ (۲۰) ابوالکلام آزاد: ترجمان القرآن، ج ۲، بذیل سورة الانفال؛ (۲۱) سودودی: تفہیم القرآن، بذیل سورة الانفال؛ (۲۲) اکبر خان: حدیثِ دفاع، ص ۱۳۲، بعد، لاہور ۱۹۵۳ء؛ (۲۳) مفتاح کنوز السنۃ، بذیل مادہ؛ (۲۴) دائرۃ المعارف الاسلامیہ، بذیل مادہ؛ (۲۵) ابن حزم: جمہرۃ انساب العرب، ص ۱۱، ۱۲، و مواضع کثیرہ؛ (۲۶) وہی مصنف: جوامع السیرة، ۱۰۷ تا ۱۵۲؛ (۲۷) ابن کثیر: البدایۃ و النہایۃ، ۳: ۲۵۶؛ (۲۸) ابن سید الناس: عیون الأثر، ۱: ۲۳۱؛ (۲۹) ابن القیم: زاد المعاد، ۲: ۸۵، بعد، مصر ۱۹۲۸ء؛ (۳۰) القسطلانی: المواہب اللدنیۃ؛ (۳۱) الزرقانی: شرح المواہب؛ (۳۲) الدیار بکری: تاریخ الخیس، ۱: ۳۶۸؛ (۳۳) ابن خلدون: تاریخ (اردو ترجمہ از عنایت اللہ) ۱: ۳۲۳ تا ۳۲۹، لاہور ۱۹۶۰ء؛ (۳۴) محمد عبدالفتاح ابراہیم: محمد القائد، ص ۲۱ تا ۳۷، مصر ۱۹۳۵ء؛ (۳۵) محمد جمال الدین سرور: قیام الدولۃ العربیۃ الاسلامیۃ، مصر؛ (۳۶) امین دویدار: صور من حیۃ الرسول، ص ۲۹۵ تا ۳۳۱، مصر ۱۹۵۸ء؛ (۳۷) بطرس البستانی: دائرۃ المعارف، ۵: ۲۳۷ تا ۲۳۹]۔

(محمد حمید اللہ [و ادارہ])



بدر (پیر): شیخ بدرالدین بدر عالم، سلسلہ جنیدیہ کے ایک ولی، جن سے بہار و بنگال کے باشندوں کو بہت عقیدت ہے۔ بنگال میں ان کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ سنار گاؤں کے پانچ پیر [رک بہ پنج پیر] کے ساتھ مل کر پانی پر حکومت کرتے ہیں، چنانچہ بنگالی ملاح سمندر میں کشتی ڈالنے سے پہلے یہ نعرہ لگاتے ہیں: "اللہ، نبی، پانچ پیر، بدر، بدر"۔ پیر بدر کا اصلی وطن میرٹھ (موجودہ اتر پردیش، بھارت) میں تھا، جہاں ان کے پردادا شیخ فخر الدین زاہد (م ۱۷۰۳/۱۳۰۴ء) نے ایک بہت بڑی خانقاہ قائم کر رکھی تھی۔ ان کے دادا شیخ شہاب الدین حق گو کو محمد بن تغلق (۱۷۲۵/۱۳۲۴ء تا ۱۷۵۲/۱۳۵۱ء) نے مروا ڈالا تھا، کیونکہ انہوں نے بادشاہ کے مذہبی عقائد پر اعتراضات کیے تھے۔ پیر بدر نے روحانی تربیت اپنے والد فخر الدین ثانی، نیز سلسلہ سہروردیہ کے ایک بزرگ سید جلال الدین بخاری سے حاصل کی۔ شیخ شرف الدین یحییٰ نے انہیں بہار آنے کی دعوت دی، لیکن وہ اس وقت وہاں پہنچے جب شیخ کا انتقال ہو چکا تھا (۱۷۸۲/۱۳۸۰ء)۔ انہوں نے پہلی شادی بہار کے ایک ہندو گھرانے میں کی اور بعد ازاں جونپور کے حکمران خاندان کے ساتھ سلسلہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ مشرقی بنگال میں اپنی سیر و سیاحت کے دوران میں انہوں نے ہندو ماحول کی ایک بڑی تعداد کو مشرف بہ اسلام کیا اور سنار گاؤں میں مسلمانوں کا اقتدار قائم کرنے میں بھی مدد دی۔ انہوں نے کچھ عرصہ چٹاگانگ میں بھی قیام کیا، جہاں بخشی بازار کے مغربی علاقے میں ان کا چلہ شہر کی حفاظت اور سلامتی کا ضامن سمجھا جاتا تھا اور ہندو اور مسلمان یکساں طور پر یہاں زیارت کے لیے حاضر ہوتے تھے۔ سمندروں اور دریاؤں پر حکمرانی ان کے خاندان کی خاص روحانی صفت مانی جاتی ہے۔ روایت ہے کہ

فخر الدین زاہد نے ایک جماعت کو دریائے جمنامیں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ پیر بدر "ایک چٹان پر تیرتے ہوئے" چٹاگانگ پہنچے تھے۔ انہوں نے بتاریخ ۲۷ رجب ۱۱۸۴ھ / ۲۲ دسمبر ۱۷۷۰ء بہار میں وفات پائی، جہاں ان کا مقبرہ چھوٹی درگاہ کے نام سے مشہور ہے (بڑی درگاہ شرف الدین یحییٰ سنیری کے مقبرے کو کہتے ہیں)۔

مآخذ: (۱) عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدرآباد ۱۹۵۱ء، ۳: ۳۶؛ (۲) عبدالحق: تذکرہ اولیائے بنگالہ، نواکھلی ۱۹۳۱ء، ص ۶۴ تا ۷۲؛ (۳) JASB، حصہ ۱، شماره ۳، ۱۸۷۳ء: ص ۳۰۲ تا ۳۰۳؛ پیر بدر کے اسلاف کے لیے: (۴) محمد غوثی: گلزار ابرار (ایشیائیک سوسائٹی بنگال، مرتبہ Ivanow، ۹۷ ورق، ۱۴)؛ (۵) عبدالحق دہلوی: اخبار الاخیار، دہلی ۱۸۹۱ء، ص ۱۲۹؛ (۶) غلام معین الدین: معارج الولاية (مقالہ نگار کے ذاتی کتاب خانے میں)، ۲: ۵۳۶۔

(کے۔ اے۔ نظامی)

- \* بدر بن حسنویہ: رک بہ حسنویہ، بنو۔
- \* بدر الجمالی: فاطمیوں [رک بہ فاطمہ، بنو] کے عہد کا سپہ سالار اور وزیر۔ سلطنت بنو فاطمہ، جسے کسی زمانے میں بڑا شکوہ حاصل تھا، خلیفہ المستنصر (۱۱۲۷/۱۱۰۳ء تا ۱۱۶۱/۱۱۵۹ء) کے دور حکومت میں تباہی کے کنارے پہنچ چکی تھی۔ شام میں آل سلجوق پیش قدمی کرنے لگے تھے۔ مصر میں ترک غلاموں کی فوج حبشیوں کے لشکر سے برسر پیکار تھی۔ ہفت سالہ قحط نے ملک کے وسائل کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اس عام کسادکشی میں حکومت تمام اختیارات کھو چکی تھی۔ بھوک اور بیماری سے عوام موت کا شکار ہو رہے تھے۔ مطلق العنانی اور تشدد نے خوشحالی کا خاتمہ کر دیا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ فاطمی سلطنت اب ختم ہو کر رہے گی اور بد عملی اور فتنہ و فساد کا دور دورہ شروع ہو جائے گا۔

اس موقع پر خلیفہ کی دعوت پر شامی سپہ سالار بدر الجمالی نے فوج کے ساتھ ساتھ حکومت کی باگ ڈور بھی سنبھالی اور بڑی ہمت اور کوشش سے، جس میں تشدد کا عنصر بھی شامل تھا، تمام بگڑے ہوئے حالات سنوارے، جس کی بدولت صحیح معنوں میں سلطنت فاطمیہ کی شان و شوکت کا دوسرا دور شروع ہوا۔

بدر ایک شامی امیر جمال الدولہ ابن عمار کا ایک ارمن غلام تھا اور اسی کی نسبت سے وہ جمالی کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ پانچویں صدی ہجری/ گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں پیدا ہوا، کیونکہ ۵۴۸ھ / ۱۰۹۴ء میں وفات کے وقت اس کی عمر اسی برس سے متجاوز تھی۔ وزیر بننے سے بہت پہلے وہ شام میں بڑا نام پیدا کر چکا تھا۔ چنانچہ اسے دو بار دمشق کا عامل مقرر کیا گیا، لیکن یہاں ہر بار اسے بگڑے ہوئے فوجی دستوں کے خلاف کڑے اقدامات کے باعث مشکلات سے دو چار ہونا پڑا۔ اس کے بعد اسے عکا میں سپہ سالار مقرر کیا گیا اور اسی حیثیت سے اس نے ملک شاہ کی فوجوں سے تیغ آزمائی کی۔ اس کا ایک ذاتی حفاظتی دستہ بھی تھا، جو ارمینوں پر مشتمل تھا۔ اس کی سپاہ بڑی قابل اعتماد تھی۔ ۵۴۶ھ / ۱۰۷۳ء میں جب خلیفہ نے اسے جابر و مستبد ترک اہلکاروں سے نجات دلوانے کے لیے طلب کیا تھا تو وہ انہیں سپاہیوں کو اپنے ساتھ لے کر گیا تھا اور چونکہ ترکوں کے دل میں اس کے متعلق کوئی شک و شبہ نہیں تھا لہذا وہ اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئے اور ایک رات سب کے سب لقمہ اجل بن گئے۔ اس کے بعد بدر سپاہ و سفید کا مالک بن گیا۔ اب اسے یکے بعد دیگرے کئی عہدے تفویض ہوئے، یعنی سپہ سالار افواج یا امیر الجیوش (عوامی زبان میں سرگوش)، قاضی القضاة، داعی الدعاة اور

وزیر سلطنت۔ ان میں مشہور ترین لقب امیر الجیوش تھا۔ مقطم کو، جس کی بلندی سے پورے قاہرہ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے، عوام اب تک جبل الجیوشی کہتے ہیں۔ اسی کے ایک کنارے پر بدر نے ایک مشہد تعمیر کرایا، جس میں ایک عام روایت کے مطابق سیدی الجیوشی مدفون ہیں۔ دارالحکومت کی شورش ختم کرنے کے بعد اس نے پہلے تو ڈیلٹا کے مشرقی اور پھر مغرب تک کے علاقے میں از سر نو امن و امان قائم کیا۔ سکندریہ پر جنگ و جدال کے بعد قبضہ کر لیا۔ بالائی مصر کی فتح میں بھی کچھ دشواریاں پیش آئیں، کیونکہ وہاں عرب قبائل نے اپنی خود مختاری قائم کر رکھی تھی۔ شام میں خوش بختی اور کامیابی نے اس کا اس قدر ساتھ نہیں دیا، کیونکہ یہاں بدنظمی اور بے تدبیری کے باعث ۵۴۸ھ / ۱۰۷۶ء میں دمشق آل سلجوق کے قبضے میں چلا گیا اور بنو فاطمہ اسے پھر کبھی جاصل نہ کر سکے۔ اگلے سال سلجوقی سپہ سالار اتیسز خود قاہرہ تک پہنچ گیا، لیکن اس عرصے میں بدر کو اپنی فوجیں جمع کرنے کی سہلت مل گئی تھی؛ چنانچہ اس نے سلجوقی لشکر کو پسپا کر دیا۔ بدر نے ۵۴۱ھ / ۱۰۷۸-۱۰۷۹ء، ۵۴۸ھ / ۱۰۸۵-۱۰۸۶ء اور پھر ۵۴۲ھ / ۱۰۸۹-۱۰۹۰ء میں یکے بعد دیگرے کئی مرتبہ لشکر کشی کی، لیکن وہ دمشق اور شام پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا؛ چنانچہ اس کی وفات کے وقت جنوبی شام میں صرف چند ایک قصبے فاطمی سلطنت کے زیر نگیں رہ گئے تھے۔ مصر میں اس کے ایک بیٹے کی تحریک سے مسلسل شورش رونما ہوتی رہتی تھی، اس لیے شام میں اس کا اقتدار جاتا رہا۔

ایک عامل اور منتظم کی حیثیت سے اس کی سرگرمیوں کے بارے میں ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کی سبھی لوگوں نے تعریف کی ہے۔ بالیانہ کے ذریعے مصر کی



K. M. Setton، ہنسلوینیا ۱۹۰۰ء، ج ۱، ہمدد اشاریہ؛  
 (۱۰) G. Hanotaux) *L'Egypte arabe* : G. Wiet :  
*Histoire de la Nation égyptienne*، ج ۳، پیرس (بدون  
 تاریخ)، ص ۲۳۵ تا ۲۵۰؛ (۱۶) وہی مصنف: *Matériaux*  
*pour un Corpus inscriptionum arabicarum, Egypte*  
 در *MIFAO*، ۵۲ : ۱۳۲ تا ۱۵۸؛ (۱۷) وہی مصنف :  
*Précis d'Histoire d'Égypte*، ۲ : ۱۸۶ تا ۱۸۸؛  
 (۱۸) حسن ابراہیم حسن : *الفاطمیون فی مصر، قاہرہ*  
 ۱۹۳۲ء، ہمدد اشاریہ؛ (۱۹) ابن میسر : [تاریخ مصر]،  
 ۱۹۲۳ء؛ (۲۰) سبط ابن الجوزی : *مرآة الزمان*۔

(C. H. BECKER)

بدرچاچ : سلطان محمد بن تغلق [رک باں] ⊗

(۵۷۲۶ / ۱۳۲۵ء تا ۵۷۵۲ / ۱۳۵۱ء) کے عہد کا  
 قصیدہ گو شاعر، جو تاشقند (چاچ یا شاش) کا  
 رہنے والا تھا، شوق سیاحت میں وطن چھوڑ کر  
 ایران آیا۔ بالآخر ہلاکو کے جانشینوں کے زمانے  
 میں ایران کو خیرباد کہہ کر ہند کا رخ کیا  
 اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ قصیدہ گوئی  
 کی بدولت سلطان محمد بن تغلق کے دربار سے وابستہ  
 ہوا اور جیسا کہ اس کے بعض اشعار سے پتا چلتا ہے  
 بادشاہ وقت نے اسے ”فخر الزمان“ کے لقب سے سرفراز  
 کیا [قصائد، ص ۱۰]۔

بدرچاچ کی یادگار اس کے قصائد کا مجموعہ  
 ہے، جسے محمد ہادی علی المتخلص بہ اشک نے  
 قصائد بدرچاچ کے نام سے مرتب کیا اور منشی  
 نولکشور نے اپنے مطبع کانپور میں طبع کرایا۔ اشک  
 نے چاپ اول کی تاریخ ”طبع نو شاہد معنی آراستہ“  
 (۱۲۷۹ / ۱۸۵۲ء) سے نکالی ہے۔ دوسری مرتبہ یہ  
 قصائد ۱۲۸۶ / اکتوبر ۱۸۶۹ء میں اسی مطبع سے  
 شائع ہوئے۔ ان میں حمد و نعت کے بعد چھتیس  
 قصیدے سلطان محمد بن تغلق کی مدح میں کہے  
 گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بہاریہ اور منظریہ قصائد میں

آمدنی اس کے دور میں بیس سے تیس لاکھ دینار  
 تک بڑھ گئی تھی۔ اس نے آل سلجوق کے حملے سے  
 جو سبق سیکھے تھے ان پر وہ لمبی کثیر آمدنی کی  
 بدولت عمل درآمد کر سکا۔ قاہرہ کی دوسری تحصیل  
 اسی کی تعمیر کردہ ہے۔ اسی طرح شہر کے تین  
 مضبوط دروازے، یعنی باب زویلہ (زویلۃ)، باب النصر  
 اور باب الفتوح بھی، جن کی آج بھی تعریف کی  
 جاتی ہے، اسی نے بنوائے تھے۔ ربیع الاول ۵۳۸ھ /  
 مارچ۔ اپریل ۱۰۹۳ء میں جب اس کی سرگرم اور  
 کامیاب زندگی کا خاتمہ ہوا تو وہ اس بات کا انتظام  
 کر چکا تھا کہ اس کے بعد اس کے تمام عہدوں پر  
 اس کا جانشین اس کا بیٹا افضل شاہنشاہ [رک باں]  
 ہو گا۔ اس کے چند ماہ بعد خلیفہ المستنصر بھی،  
 جو اس وقت ساٹھ برس تک حکومت کر چکا تھا،  
 فوت ہو گیا۔

مآخذ : (۱) ابن القلانسی [ذیل تاریخ دمشق]؛

- (۲) ابن تغری بردی : *النجوم الزاہرۃ*، (مطبوعہ قاہرہ) ج ۵،  
 ہمدد اشاریہ؛ (۳) ابن الصیرفی : *الإشارة إلى من نال الوزارة*،  
 قاہرہ ۱۹۲۳ء؛ (۴) المقریزی : *الخطط*، ۱ : ۳۸۰ بعد؛  
 (۵) ابن خلدون : *العبر*، بلاق ۱۲۸۳ء، ۳ : ۶۳؛  
 (۶) ابن الأثیر، مترجمہ Fagnan، الجزائر ۱۹۰۱ء،  
 ص ۱۹، ۳۰، ۶۰، ۶۸ بعد، ۱۵۱، ۱۶۰ بعد؛  
 (۷) *Corpus Inscript. Arab.* : M. van Berchem (۸)  
*l'Égypte*، شمارہ ۱۱ : ص ۳۲، ۳۳، ۳۶ تا ۳۹،  
 ۵۱۶، ۵۱۸ بعد، نیز جو مآخذ وہاں درج ہیں؛  
 (۹) جمال الدین الشیال : *مجموعۃ الوثائق الفاطمیۃ*، ج ۱،  
 قاہرہ ۱۹۵۸ء، ہمدد اشاریہ؛ (۱۰) F. Wüstenfeld :  
*Geschichte des Fatimiden-Chalifen*، ص ۲۶۳ بعد؛  
 (۱۱) *History of Egypt* : S. Lane-Poole، ص ۱۰۰ بعد؛  
 (۱۲) *Histoire de l'Égypte* : Marcel، عہد مستنصر؛  
 (۱۳) *Memoires sur l'Égypte* : Quatremère، ج ۲،  
 ہمدد اشاریہ؛ (۱۴) *A History of the Crusades*، مرتبہ

قصیدہ ”در کیفیت رفتن بقلعہ دیوگیر (دیو گڑھ) و اہل ساختن پادشاہ آن بقعہ“ (ص ۶۴) سے پتا چلتا ہے کہ بدر چاچ کو یکم شعبان ۵۲۴۵ھ/۱۳۴۴ء کو دیو گڑھ جانے کا حکم ہوا تھا۔ قصیدے میں قلعہ دیو گڑھ کی تعریف و توصیف کی گئی ہے جو ملک عنبر نے ایک پہاڑی پر بنوایا تھا۔ بعض قصائد میں خلیفۃ المسلمین کے ساتھ بادشاہ کی عقیدت کا ذکر آیا ہے۔ خلافت بغداد تو ہلاکو کے ہاتھوں ختم ہو چکی تھی (۵۶۵۵ھ/۱۲۵۷ء)، لیکن ہنگامی حالات میں اب خلافت عباسیہ مصر میں قائم ہوئی تھی (۵۶۵۹ھ/۱۲۶۱ء تا ۵۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء)۔ سلطان محمد بن تغلق نے بھی دوسرے سلاطین کی طرح بوجہ خلافت سے ربط قائم رکھنا ضروری سمجھا اور خلیفہ مصر الحاکم بامر اللہ ثانی (۵۷۴۱ھ/۱۳۴۰ء تا ۵۷۴۸ھ/۱۳۴۷ء) کی خدمت میں سفیر بھیج کر بیعت ہونے اور منشور سلطنت حاصل کرنے کی خواہش کی۔ خلیفۃ المسلمین نے بادشاہ ہند کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ایلچی کے ذریعے منشور سلطنت، عباسی خلعت اور علم ارسال کیا۔ بدر چاچ نے اس تقریب پر قصیدہ ”در تہنیت رسیدن خلعت و فرمان خلیفہ عباسیان بشاہ ہند“ لکھا (ص ۱۵)۔

سلطان محمد بن تغلق ۵۷۵۰ھ/۱۳۴۹ء میں علیل ہوا تو بدر چاچ نے ایک قصیدہ (ص ۵۴) بار دوم) میں اس کی بیماری اور ضعف کی کیفیت بیان کی۔ سلطان کی وفات ۵۷۵۲ھ/۱۳۵۱ء میں ہوتی ہے لیکن قصائد بدر چاچ میں اس کے مدوح کی وفات کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان کی وفات سے پہلے وہ خود راہی ملک بقا ہو چکا تھا۔ مؤلف جامع اللغات نے بدر چاچ کا سال وفات ۵۷۴۵ھ/۱۳۴۴ء لکھا ہے، لیکن یہ درست نہیں، کیونکہ ۵۷۴۶ھ/۱۳۴۵ء میں اس نے خلیفۃ المسلمین کی طرف سے منشور حکومت اور خلعت

بھی مدوح کی تعریف و توصیف کی ہے۔ چار قصیدے خلیفۃ المسلمین (مصر) کی شان میں ہیں۔ بعض قصائد دارالسلطنت دہلی کی تعریف میں کہے ہیں۔ قصائد کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ قصیدہ نگار نے بادشاہ وقت اور خلیفۃ المسلمین کے علاوہ اور کسی صاحب اقتدار کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ بدر چاچ فلسفہ و فلکیات سے بہت شغف رکھتا تھا؛ چنانچہ قصائد میں ان علوم کی اصطلاحیں کثرت سے استعمال کی ہیں۔ اس انداز بیان کی یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدوح سلطان محمد تغلق طب، فلسفہ اور فلکیات میں مہارت رکھتا تھا اور شعرو سخن کا یہی انداز اسے پسند تھا۔ قصائد بدر چاچ میں اس دور کے تاریخی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر درج ذیل ہے: خرم آباد میں بادشاہ کے حکم سے ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر ہوا تو بدر چاچ نے قصیدہ ”در تعریف عمارت قلعہ خرم آباد و تاریخ او“ لکھا (بار دوم، ص ۸۹)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قلعے کی تکمیل ۵۷۴۳ھ/۱۳۴۳ء میں ہوئی۔ ایک اور قصیدے سے پتا چلتا ہے کہ قلعہ تعمیر کرنے والے معمار کا نام ظہیر الدین تھا (بار دوم، ص ۹۰)۔ قصائد میں بادشاہ کی اکثر مہموں کا ذکر آیا ہے، جو اسے مختلف بغاوتوں کو فرو کرنے کے سلسلے میں پیش آئیں۔ نگر کوٹ کی مہم پر بدر چاچ نے جو قصیدہ لکھا (بار دوم، ص ۲۸) خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ بہاء الدین گشتاسپ کی بغاوت فرو ہوئی تو سلطان محمد بن تغلق کو خیال آیا کہ ملک کا دارالحکومت ایسے مقام کو بنایا جائے جو مملکت کے درمیان واقع ہو تاکہ شورشیں فرو کرنے اور نظم و نسق قائم رکھنے میں آسانی ہو؛ چنانچہ دیو گڑھ (دولت آباد) کو مرکزی دارالسلطنت بنانے کا فرمان صادر ہوا اور انتقال آبادی کا کام شروع ہو گیا۔



جلاوطنی کی حالت میں اڑھائی سال بسر کیے۔ جب نوجوان ترکوں نے انقلاب برپا کیا تو وہ قسطنطنیہ لوٹ آیا اور کردی اور ترکی زبان میں اپنا روزنامہ کردستان جاری کیا۔ ۱۹۰۹ء میں اس روزنامے کی اشاعت معطل کر دی گئی اور اسے ایک بار پھر جیل میں ڈال دیا گیا اور ایک فوجی بغاوت کی تیاری میں حصہ لینے کے الزام میں سزائے موت سنا دی گئی۔ بعد ازاں اسے معافی مل گئی اور ۱۹۱۰ء میں اسے جلا وطن کر دیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں وہ پھر دارالحکومت میں واپس آ گیا، جہاں اس نے ایک خفیہ گروہ انقلابی انجمن بنائی، جس پر اسے سزائے موت ملی اور یوں تیسری بار اس نے قیدخانے کا منہ دیکھا۔ یہاں سے وہ فرار ہو گیا اور بالآخر ۱۹۱۳ء میں سرزمین ترکی کو خیر باد کہہ گیا۔ ۱۹۱۳ء کی جنگ میں ثریا نے قاہرہ سے اپنا اخبار دوبارہ جاری کیا۔ یہاں اس نے کردوں کی آزادی کی ایک انجمن بھی قائم کی، جس نے معاہدہ سیورے Sèvres (۱۹۱۹-۱۹۲۰ء) کی تیاری میں بڑا حصہ لیا۔ چونکہ اس سرکاری دستاویز کی حیثیت، جس میں ایک بین الاقوامی کردی آئین کی تجویز پیش کی گئی تھی، ایک بے جان کاغذ سے بڑھنے نہ پائی، اس لیے ثریا نے معاہدہ لوزان (۱۹۲۳ء) پر دستخط ہو جانے کے بعد اپنی انقلابی سرگرمیوں کو دوبارہ جاری کر دیا اور ۱۹۲۷ء میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کردوں کی قومی جماعت 'خوی بون' Khoybun میں شامل ہو گیا، جو انہیں دنوں وجود میں آئی تھی۔ ۱۹۲۹ء میں وہ واپس شام پہنچا، لیکن ۱۹۳۰ء میں (یعنی جس سال ترکیہ میں کردوں کی عظیم بغاوت رونما ہوئی) اسے ایک امتناعی حکم کے ذریعے فرانسیسی انتداب کے ماتحت علاقوں میں رہنے سے روک دیا گیا اور وہ حقوق شہریت سے دست بردار ہو کر پیرس جانے پر مجبور ہو گیا، جہاں اس نے خوی بون کی

آئی کی تقریب میں قصیدہ لکھا تھا، جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔

مآخذ: (۱) آغا مہدی حسین: سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق؛ (۲) قسائد بدر چاچ، مطبوعہ نول کشور، اکتوبر ۱۸۶۹ء؛ (۳) ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی؛ (۴) سفرنامہ ابن بطوطہ؛ (۵) محمد قاسم فرشتہ: تاریخ فرشتہ؛ (۶) تغلق نامہ؛ (۷) عبدالقادر بدایونی: منتخب التواریخ؛ (۸) H. Sharp: Buildings of the Tughlaqs؛ (۹) شمس سراج غفیف: مناقب سلطان محمد؛ (۱۰) وہی مصنف: تاریخ فیروز شاہی؛ (۱۱) عبدالمجید: جامع اللغات۔

(مقبول بیگ بدخشانی)

بدر خانی: ثریا (۱۸۸۳ تا ۱۹۳۸ء) اور جلادت (۱۸۹۳ء تا ۱۹۵۱ء) امیر امین علی کے بیٹے تھے۔ یہ امین علی (جزیرہ ابن عمر) کے خاندان "عزیزان" کے فرما بڑا بدر خاں (م ۱۸۶۸ء) کا سب سے بڑا بیٹا تھا، جس نے کردستان کی آزادی کی خاطر ترکوں سے جنگ کی (۱۸۳۶ تا ۱۸۴۵ء)۔ یہ دونوں بھائی مقتلہ (شام) میں پیدا ہوئے تھے۔ ان میں سے بڑے نے پیرس میں وفات پائی اور چھوٹا دمشق میں ایک حادثے کا شکار ہو گیا۔ دونوں بھائیوں نے اپنی زندگیاں کرد قوم کی آزادی کے لیے وقف کر دی تھیں۔ ثریا کی سرگرمیاں تنظیم اور سیاسی پروپیگنڈے میں اور جلادت کی زیادہ تر ثقافت کے میدان میں نظر آتی ہیں۔

ثریا نے قسطنطنیہ کی یونیورسٹی سے زرعی انجینئرنگ کی سند حاصل کرنے کے بعد ایک ایسی پر آشوب زندگی کا آغاز کیا جسے اس کے ہم وطنوں کی قومی تحریک آزادی کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں اس پر حکومت ترکیہ کے خلاف سازش کا الزام ثابت ہوا اور وہ جیل میں بھیج دیا گیا۔ اس نے جیل میں اور

گزشتہ جنگ کے دوران میں بھی جلادت نے ایک رسالہ رناہی (=روشنی) شائع کیا تھا۔  
مآخذ: (۱) امیر ثریا کے خود نوشت حالات زندگی؛

(۲) *The Emir Jaladet Aali* : W. G. Elphinston

*Bedr Khan*، در *RCAS*، ۱۹۵۱ء، ص ۹۱ تا ۹۳؛ (۳)

شَلِيطَةُ وَمَلِك: ذِکْرُ الْأَمِيرِ جَلَادَتِ بَدْرِ خَانَ (۱۸۹۷ تا

۱۹۵۱ء)، مقام و تاریخ طبع ندارد؛ (۴) R. Rondot

*Les Kurdes de Syrie*، در *France Méditerranéenne et*

*Africaine*، ج ۱، ۱۹۳۹ء؛ (۵) شرف نامہ، مطبوعہ قاہرہ،

ص ۱۵۶ تا ۱۹۱؛ (۶) محمد امین زکی: تاریخ الدول

و الامارات الکردیة، قاہرہ ۱۹۳۵ء، ص ۳۶۳ تا ۳۶۶؛

(۷) *Les Kurdes* : B. Nikitine، بذیل مادہ .

(B. NIKITINE)

بَدْرِ الْخَرَشَنِی: ایک امیر، جو غالباً کَبْدُوقِیہ

Cappadocia کے مقام خرشنہ کا رہنے والا تھا۔ اسے

بعض اوقات (ایک جعلی نسب نامے کی بنا پر) بدر بن

عَمَّارِ الْأَسَدِی کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔

وہ خلیفہ القاہر [باللہ ابو منصور، ۵۳۲/۹۳۲ء تا

۵۳۲/۹۳۳ء] کا حاجب تھا اور الراضی کے عہد

حکومت [۵۳۲/۹۳۳ء تا ۵۳۲/۹۳۴ء] میں وہ

شاہی عنایات کا مورد رہا۔ جب امیر الامراء ابن رائق

[رک بآن] (*Histoire de la dynastie des* : Canard)

*Hamdānides*، الجزائر ۱۹۵۱ء، ص ۳۱۱ تا

۳۲۳) کو الجزیرہ اور شامی فلسطین کی حکومت

سپرد کی گئی تو وہ ابن رائق کا جانشین مقرر ہوا۔

ابن رائق کے نائب کی حیثیت سے بدر کو اردن کے

جند کی حکومت تفویض ہوئی اور وہ طَبْرِیہ (Tiberias)

میں رہنے لگا (اوائل ۵۳۲/۹۳۲ء تا اواخر ۹۳۹ء)۔

اسی زمانے میں المتنبی [رک بآن] نے اس کی مدح

میں قصائد لکھے۔ ابن رائق اور موصل کے حمدانی

امیر ناصر الدولہ کی باہمی چپقلش کے دوران میں بدر

بھی عراق لوٹ آیا، جہاں ایک قلیل عرصے کے

نمائندگی کے فرائض سرانجام دیے۔ دوسری باتوں کے علاوہ کردوں اور ارمنوں کی ازسرنو مفاہمت کا آغاز بھی اسی زمانے سے ہوتا ہے، جس کے سلسلے میں اسے ایک قابل اور ہوشیار قائد تسلیم کیا گیا۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ امیر ثریا کردوں میں سے پہلا محب وطن تھا جس نے ایک لائحہ عمل کے مطابق اور جدید سیاسی دلائل سے مسلح ہو کر زبان اور قلم دونوں ذریعوں سے ایک مہم چلائی۔ مختلف زبانوں میں اس کے لکھے ہوئے متعدد رسالے ملتے ہیں۔

جلادت کی زندگی ثریا کے مقابلے میں اس قدر پر آشوب نہ تھی۔ اس نے قسطنطنیہ سے قانون کی اعلیٰ ترین سند حاصل کر کے میونخ میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ ۱۹۲۷ء میں وہ خوی بون کا پہلا صدر منتخب ہوا۔ ۱۹۳۰ء میں اس نے کردوں کی ایک بغاوت میں حصہ لیا، جسے ترکیہ میں برپا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہاں وہ حاجو آغا کی معیت میں داخل ہوا تھا۔ اس مہم کی ناکامی کے بعد اس نے دمشق میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں اس نے اپنا وقت ادبی مشاغل کے لیے وقف کر دیا اور ۱۵ مئی ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک اور پھر ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۳ء تک اس نے فرانسیسی اور کردی زبانوں میں اپنا رسالہ ہوار شائع کیا (جلادت نے لاطینی رسم الخط میں ایک کردی ابجد بھی پیش کی تھی، جس سے گرمانجی کردی وحدت کا کام شروع ہوا)۔ علاوہ ازیں اس رسالے کے باعث ایک بار پھر عوامی ادب نے زندگی پائی۔ قبائلی سرداروں اور ادیبوں کے درمیان، جنہیں اول الذکر شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مفاہمت کی راہیں استوار ہوئیں اور تعلیمی سرمایہ تیار ہوا۔ اس سلسلے میں کچھ کتابچے بھی شائع کیے گئے (کتب الہجاء، درسی کتب اور مذہبی تصانیف، کل بارہ کتابیں)۔



میں بروسہ لے گیا، جو زیادہ تر قاضی زادہ روسی کے نام سے مشہور اور ریاضی اور علم ہیئت کا نامور عالم تھا۔ [۵۸۳ھ/۱۳۸۱ء تک اس نے قونیہ میں ایک شخص فیض اللہ سے منطق اور علم ہیئت پڑھا۔ اس کے بعد بدرالدین بیت المقدس چلا گیا۔ وہاں اس نے ابن العسقلانی کی نگرانی میں کام کیا، جو (مشہور [محدث و فقیہ] ابن حجر العسقلانی [رک بان] سے الگ ہے اور) زیادہ مشہور نہیں۔ یہاں سے بدرالدین کو مبارک شاہ المنطقی، حاجی پاشا طیب، علی بن محمد السید الشریف الجرجانی [رک بان] فلسفی و فقیہ اور عبداللطیف جیسے مشہور علماء و فضلاء کی شہرت قاہرہ کھینچ لائی۔ [۵۸۵ھ/۱۳۸۳ء کے قریب بدرالدین حج کے لیے مکہ معظمہ گیا۔ وہاں سے واپس آیا تو مملوک سلطان برقوق [رک بان]؛ ۵۸۴ھ/۱۳۸۲ء تا ۵۸۰ھ/۱۳۹۸ء نے اسے اپنے بیٹے فرج [رک بان]؛ فرج، قب قاموس الاعلام، ص ۱۲۵۴ و ۱۲۵۵، ت، بذیل بدرالدین سماوی] کا، جو آگے چل کر اس کا جانشین ہونے والا تھا، اتالیق مقرر کر دیا۔ اتفاق سے مملوک سلطان کے دربار میں بدرالدین کی ملاقات صوفی شیخ حسین اخلاطی سے ہو گئی، جس کے اثر سے اس نے تصوف کا مسلک اختیار کر لیا (حالانکہ اس سے پہلے وہ اس کا سخت مخالف تھا)۔ قاہرہ میں چند سال تک خانقاہی زندگی بسر کرنے کے بعد بدرالدین نے [۵۸۰ھ/۱۴۰۲ء] میں تبریز کا سفر اختیار کیا۔ ممکن ہے کہ آردبیل کے سلسلہ صوفیہ کی شہرت اسے وہاں کھینچ لے گئی ہو۔ تبریز میں وہ تیمور کی نظروں میں آ گیا، جو اسی زمانے میں اناطولیہ سے لوٹا تھا۔ تیمور نے اسے اپنے ساتھ وسط ایشیا لے جانے کی کوشش کی مگر اس نے وہاں سے بھاگ کر جان بچائی۔ وہ اپنی خانقلہ کا شیخ اور حسین اخلاطی کا (جس کا اس دوران میں انتقال ہو گیا تھا) جانشین

لے اس پر خلیفہ المصطفیٰ [۵۳۲۹ھ/۹۴۰ء تا ۵۳۳۳ھ/۹۴۴ء] کی نظر عنایت رہی، لیکن پھر سازشیوں کے سبب سے اسے بھاگ کر مصر میں قسطنطین کے مقام پر محمد الاخشیدی [رک بہ اخشیدیہ] کے ہاں پناہ لینی پڑی۔ [۵۳۳۰ھ/۹۴۱-۹۴۲ء کے اواخر میں اس نے وفات پائی۔

مآخذ : (۱) ابن الأثیر: الكامل، قاہرہ ۱۳۰۱ھ، ۸ : ۱۱۹، ۱۳۹؛ (۲) ابن مسکویہ: تجارب الامم، GMS، ۵ : ۸۴، ۳۰۰، ۵۰۹؛ (۳) R. Blachère : Un Poète arabe du IV<sup>e</sup>/X<sup>e</sup> siècle, Abou t-Tayyib al-Motanabbi، پیرس ۱۹۳۰ء، ص ۹۵ تا ۱۰۰۔ (R. BLACHÈRE)

\* بَدْرُ الدَّوْلَةِ : رَكَ بِه اَرْقِيَه .

\* بَدْرُ الدِّينِ : رَكَ بِه لَوْلُو .

\* بَدْرُ الدِّينِ بن قاضی سماونہ : عہد عثمانیہ کا ایک مشہور فقیہ اور صوفی، جس نے بالآخر حکومت کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا۔ بدرالدین محمد بن قاضی سماونہ کی ولادت [یکم محرم] ۵۶۰ھ/۳ دسمبر ۱۳۵۸ء کو سماونہ [= سماونہ، قب قاموس الاعلام، ص ۱۲۵۴ تا ۱۲۵۵] میں ہوئی (جو ادرنہ کے قریب وہی مقام ہے جسے یونانی میں sic 'Aμμοβουvon لکھا گیا ہے)۔ وہ قاضی غازی اسرائیل کا سب سے بڑا بیٹا تھا، قاضی موصوف کا شمار اپنے زمانے کے بزرگ ترین مجاہدین میں ہوتا تھا، اسے آل سلجوق میں سے ہونے کا دعویٰ تھا۔ بدرالدین کی ماں یونانی تھی، جس نے مسلمان ہونے کے بعد اپنا نام میلک رکھ لیا تھا۔ بدرالدین نے اپنی جوانی کے دن ادرنہ میں بسر کیے (جو [۵۶۲ھ/۱۳۶۱ء کے موسم بہار میں فتح ہوا تھا)۔ اس نے دین و فقہ اسلامی کی مبادیات کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور پھر یوسف اور شاہدی دو فقیہوں کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا۔ تکمیل علم کا شوق اسے اپنے دوست موسیٰ چلبی [رک بان] کی معیت

Bürklüdje مصطفیٰ اور ایک اور شخص تورلق ہو کمال کی خفیہ اشتراکی تحریک سے بھی ہوا (مگر کس طریقے سے، اس کی وضاحت ابھی تک نہیں ہو سکی)۔ اسی تحریک کی بدولت ۱۴۱۶ء میں وہ وسیع بغاوت رونما ہوئی جس کا نظریاتی اعتبار سے سربراہ بدرالدین بتایا جاتا ہے۔ جہاں ایک طرف بدرالدین کی سوانح عمری میں (جو اس کے پوتے خلیل کی تصنیف ہے) اسے ان تمام واقعات سے مکمل طور پر بری الذمہ قرار دیا جاتا ہے وہاں عہد عثمانی کے سرکاری مؤرخ اس پر اس بغاوت میں عملاً حصہ لینے بلکہ اس کی قیادت کرنے کا الزام لگاتے ہیں۔ جس وقت بؤر کلوجہ مصطفیٰ اور تورلق ہو کمال نے مغربی ایشیائے کوچک میں اپنے حملے کا آغاز کیا (جہاں شروع شروع میں انہیں خاصی کامیابی بھی ہوئی) تو بدرالدین ازنیق سے نکل کر سنوپ Sinope کے غیر مطمئن فرمانروا کی خفیہ مدد سے روم ایللی پہنچ گیا۔ بؤر کلوجہ مصطفیٰ اور تورلق ہو کمال کی بغاوت انتہائی سختی سے دبا دی گئی تو روم ایللی میں بھی بغاوت فرو ہو گئی۔ شاہی فوج نے بدرالدین کو گرفتار کر لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے سیرس (Serres) لے گئے، جو مقدونہ میں واقع ہے۔ وہاں سلطان محمد الاول ”مصطفیٰ کاذب“ (دوڑمہ مصطفیٰ [رک باں]) سے برس پیکار تھا۔ بدرالدین پر مقدمہ چلا (جس کی کارروائی کسی حد تک قابل اعتراض ہے) اور اسے غداری کے جرم میں [شوال ۵۸۱۹ھ/ ۱۸ دسمبر ۱۴۱۶ء کو سیرس میں برس عام دار پر لٹکا دیا گیا۔ ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ اس بغاوت میں بدرالدین کا کیا حصہ تھا؟ بہر حال یہ امر یقینی ہے کہ یہ بغاوت اس کے فلسفے کے عین مطابق تھی اور اس کے عقائد کے اثرات دیرپا ثابت ہوئے۔ اس بات کی دستاویزی شہادت موجود ہے کہ سلیمان عالیشان کے عہد [۵۹۲۶ھ/ ۱۵۲۰ء تا

تسلیم کیا گیا، لیکن اپنے پیر بھائیوں کے ساتھ اختلافات کے باعث اس نے قاہرہ چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور ایشیائے کوچک اور روم ایللی کی جانب تبلیغی دورے پر روانہ ہو گیا۔ قونیہ اور گرمیان کے فرمانرواؤں کو اس کے ساتھ بہت ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اسی طرح حامد بن موسیٰ القیصری نے، جو سلسلہ صفویہ کا رکن تھا اور آگے چل کر حاجی بیرام ولی [رک بہ بیرامیہ] کا مرشد ہوا، اس پر توجہ کی۔ اپنے صوفیانہ عقائد میں کامیاب ہونے کے بعد بدرالدین علانیہ طور پر مسلمہ عقائد سے بتدریج دور ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ اس نے مشترکہ ملکیت کے نظریے کی تبلیغ کی اور بڑے زور اور تسلسل کے ساتھ مشہور صوفی محی الدین ابن العربی [رک باں] کے تصورات کو ترقی دینے لگا۔ ایشیائے کوچک میں اس نے جن مفلوک الحال لوگوں کو متاثر کیا ان کی تعداد اچھی خاصی ہو گئی۔ اسی طرح مسیحی بھی اس کے حلقہ اثر میں شامل ہو گئے، بلکہ کہا جاتا تھا کہ اس نے کیوس Chios کے حکمران سے بھی رابطہ قائم کر رکھا تھا، جو اہل جینوا سے تھا۔ بالآخر بدرالدین ایک بار پھر ادرنہ پہنچ گیا اور یہاں سات سال تک اس نے اپنی زندگی تنہائی اور مطالعے میں بسر کی۔ ۱۴۱۰ء کے قریب اس کی مرضی کے خلاف مدعی سلطنت موسیٰ نے اسے قاضی عسکر مقرر کر دیا؛ لیکن جب سلطان محمد الاول نے چمرلو Camurlu کے قریب فتح پائی (۱۴۱۳ء) تو اسے اس عہدے سے برخاست کر کے خاصی ذلت کے ساتھ ازنیق میں جلاوطن کر دیا گیا۔ یہاں وہ تصنیف و تدریس میں مشغول ہو گیا اور کہا جاتا ہے کہ آق شمس الدین [رک باں]، جس نے بعد ازاں شیخ بیرامیہ کی حیثیت سے شہرت پائی، کچھ عرصے کے لیے بدرالدین کے شاگردوں میں شامل رہا۔ غالباً یہیں اس کا تعلق ایک شخص بؤر کلوجہ



(بدرالدین اور صفویہ، خلوتیہ و پیرامیہ کے باہمی روابط کے متعلق) . . . .

(H. J. KISSLING)

بدرہ: [= بادرایا، قب یاقوت، ۱: ۳۵۹] ایک چھوٹا سا قصبہ، جو وسط عراق کے مشرقی حصے میں (۳۳ درجہ، ۵۳ دقیقہ طول بلد مشرقی، ۳۳ درجہ، ۷ دقیقہ عرض بلد شمالی) ایران کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ اس کی آبادی چھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے، جو تقریباً سب کے سب شیعی مسلمان ہیں اور ان کی رگوں میں عرب اور لر خون کی آمیزش ہے۔ یہ لوہے گوت العمارۃ کی ایک قضاہ کا صدر مقام ہے (جس میں زرباطیۃ کی ناحیہ شامل ہے)۔ سرکاری دفاتر کی ایک نئی عمارت سے قطع نظر کرتے ہوئے بدرہ میں عصر جدید کی ترقی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ اس کی گلیاں تنگ ہیں، مکان معمولی ہیں اور پانی کھاری ہے۔ یہاں اناج کی کاشت ہوتی ہے اور پھل اور کھجور کے باغ بکثرت ہیں اور 'بیدرایا' کھجور بہت مشہور ہے۔ آب پاشی ایک ندی گلال سے ہوتی ہے، جو ایران سے نکلتی ہے۔

[تاریخی اعتبار سے] اس قصبے کا سلسلہ قرون وسطیٰ کے بادرایا (یعنی بیت درایا، ایک قبیلے کا نام) سے جا ملتا ہے، جس کا ذکر سریانی تصانیف میں اور عرب جغرافیہ نویسوں کے ہاں بکثرت آیا ہے۔ یہ باکسایا کے ساتھ ضلع بندنیچین میں شامل تھا۔ [بندنیچین کا نام اب نقشے پر نظر نہیں آتا، لیکن باکسایا کا گاؤں ابھی تک موجود ہے۔ قصبہ بندنیچین غالباً اسی گاؤں کے آس پاس کہیں واقع ہوگا۔ بقول یاقوت اسے فارسی میں وندنیگان کہتے تھے۔ المستوفی کے زمانے میں اس کا تلفظ بندنیگان تھا، لیسٹرینج، ص ۶۳]۔ یہ ضلع نہروان [رک بان] کے نظام انہار کے [شمال] مشرق میں صوبہ

بدرالدین کی تحریک کے پیر و روم اہلی میں موجود تھے۔ اپنے بطل جلیل کی وفات کے بعد ان میں سے کئی ایک تو سلسلہ صفویہ میں شامل ہو گئے، جو سیاسی اعتبار سے اب سرگرمی دکھانے لگا تھا اور باقی متفرق فرقوں، بالخصوص پکتاشیہ کے ساتھ منسلک ہو گئے۔ بدرالدین کے تین بیٹوں یعنی احمد، اسمعیل اور مصطفیٰ کے علاوہ اس کے اخلاف میں سے مشہور ترین اس کا پوتا خلیل (ابن اسمعیل) ہے، جس نے بدرالدین کے حالات زندگی لکھے ہیں۔

اگر ایک ادیب کی حیثیت سے دیکھا جائے تو بدرالدین ایک کثیر التصانیف مصنف تھا۔ اس نے کم و بیش پچاس جامع کتابیں لکھی ہیں، جن میں سے بیشتر فقہ پر ہیں۔ علم تصوف میں اس کی اہم ترین کتابیں واردات اور نورالقلوب ہیں۔

مآخذ: (۱) Schejch Bedr ed-: F. Babinger

'Der Islam', *Din der Sohn der Richters von simāw*

۱۱ (۱۹۲۱ء): ۱ بعد اور تکملہ جات *Der Islam*

۱۷ (۱۹۲۸ء): ۱۰۰ بعد و *Beiträge zur Frühges-*

*chichte der Türkenherrschaft in Rumelien (14th-*

*15th century), Südosteuropäische Arbeiten*, شمارہ

۳۳، برن - میونخ - وی انا ۱۹۳۳ء، ص ۸۰ بعد؛ [(۲)

سامی ہک: قاموس الاعلام، بذیل مادہ بدرالدین صمانوی؛]

(۳) محمد شرف الدین یلتقیا: صمانوہ قاضی اوغلی شیخ

بدرالدین، استانبول ۱۹۲۵ء؛ (۴) وہی مصنف: مقالہ

*Bedreddin* در *در*، ت (مع تفصیلات، متعلقہ عقائد بدرالدین)؛

*Das Menāqybnāme Scheich Bedr*: H.J. Kissling (۵)

*ed- Din's, des Sohnes des Richters von Samāvnā*

در *ZDMG*، حدود ۱۹۰۰ء، ص ۱۱۲ بعد (مبنی بر خلیل:

مناقب نامہ، طبع F. Babinger، ۱۹۳۳ء)؛ (۶) وہی مصنف:

*Zur Geschichte des Derwischordens der Bajrāmijje*

در *Südostforschungen*، ۱۰ (۱۹۰۶ء): ۲۳۷ بعد

ہوا نمونہ گل لالہ کا ہے۔ اس صنعت کے بڑے بڑے مرکز بیدرز، پورینہ، لکھنؤ، ڈھاکا اور مرشد آباد ہیں۔ آخری تین شہروں میں اس کی تجارت تقریباً ساری کی ساری مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔

مآخذ : (۱) Benjamin Heyne : *An account*

of the Bidderly Ware in India، در *Asiatic Journal*

۳ : ۲۲۰، بعد، لندن ۱۸۱۷ء؛ (۲) George Smith

در *Description of the manufacture of Bidderly ware*

، *Madras Journal of Literature and Science*، ۱۹۰۷ء،

۱۷ : ۸۱ تا ۸۳؛ (۳) Sir George Birdwood

در *Industrial Arts of India*؛ (۴) T.N. Mukharji : *Bidri-*

*Ware*، در *Journal of Indian Art*، شماره ۶، ۱۸۸۵ء؛

(۵) Sir George Watt : *Indian Art of Delhi. 1903*، ص

۴۶ تا ۴۹، لندن ۱۹۰۴ء۔

(ادارہ [۱]، لندن، بار اول)

بدعہ : (ع)، لغوی معنی : ہر نئی بات، (لسان

میں ہے، البدع : الشئ الذي يكون اولاً)۔ ابن السکیت کا قول ہے، البدعہ کل محدثہ۔ اسماء حسنہ

میں ایک نام البدیع بھی ہے، اس سے مراد ہے

الخالق المَخْتَرِع لا عن مثال سابق [النهاية]۔

المفردات میں ہے: ایجاد الشئ بغیر آلة ولا زمان و

لا مکان؛ نئی بات، کوئی نیا عقیدہ یا معمول جو

دین میں نیا داخل کیا گیا ہو، یعنی جس کی سند

قرآن و سنت سے نہ مل سکتی ہو۔ زیادہ خاص

معنوں میں بدعہ کا لفظ سنت کی ضد ہے۔ دین میں

بعد "الاکمال" کوئی نیا عقیدہ یا عمل داخل کر

دینا، جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔ یہ محدثہ کی

ہم معنی ہے۔ النہایۃ میں حضرت عمرؓ کے

ایک قول کی بنا پر بدعت کی دو قسمیں بیان کی گئی

ہیں : (۱) بدعہ ہدی؛ (۲) بدعہ ضلال۔ اس بنا

پر بدعت کی قسموں میں امتیاز کیا گیا ہے۔

بدعہ حسنة یا قابل تحسین (محمودہ) اور بدعہ

جبال کی سرحد پر واقع تھا۔ اس قصبے نے جو ترقی پائی عصر حاضر سے کہیں زیادہ قرون وسطیٰ کی مرہون منت ہے۔ اسے ایک علمی مرکز سمجھا جاتا تھا اور یہاں خسرو اول انوشروان نے شمالی شام سے پکڑے ہوئے قیدیوں کی ایک بستی بسائی تھی۔

موجودہ بدرہ اور اس کے گرد و نواح میں جو ٹیلے

واقع ہیں ان سے قدیم شہر کا سراغ ملتا ہے، جو

سیلاب، طاعون یا جنگ سے تباہ ہو گیا تھا۔

مآخذ : (۱) *Bibl. Geogr. Arab*، طبع ڈخوبہ

بمواضع کثیرہ؛ (۲) یاقوت، ۱ : ۴۵۹؛ (۳) G. Hoffmann

در *Auszüge aus syr. Akten pers. Märtyrer*، لائپزگ

۱۸۸۰ء، ص ۶۹؛ (۴) Nöldeke، در *ZDMG*،

۱۸۷۹ء، ص ۱۰۱؛ (۵) وہی مصنف : *Gesch. d. Araber*،

۱۸۷۹ء، *und Perser zur Zeit der Sasaniden*،

ص ۲۳۹؛ (۶) Le Strange، ص ۶۳، بعد، ۸۰؛ (۷)

E. Herzfeld، در *Memnon*، ۱۹۰۷ء، ص ۱۲۶،

۱۳۰؛ (۸) عبدالرزاق الحسنی : العراق قديماً و حديثاً،

صیدا ۱۹۳۸ء۔

(S. H. LONGRIGG)

\* بڈری ظروف : دھات کی مرصع کاری، جو

بیدر [رک باں] سے منسوب ہے، جہاں، بیان کیا جاتا ہے

کہ یہ ظروف سب سے پہلے تیار کیے گئے تھے۔

اس مرصع کاری میں تانبے اور جست سے مرکب

بھرت استعمال ہوتی ہے (جس میں ان دھاتوں کا

باہمی تناسب مختلف مقامات پر بدلتا رہتا ہے)۔

اس میں کبھی کبھی قلعی، سیسے یا فولاد کا برادہ بھی

ملا دیا جاتا ہے۔ ظروف کی سطح پر مرصع کاری چاندی

یا سونے سے کی جاتی ہے اور آخر میں صیقل کر کے،

اس پر نوشادر، شورے اور دیگر اجزا کے مرکب

سے سیاہی مائل سبز یا سیاہ رنگ کر دیا جاتا

ہے۔ اس کے نمونے عموماً گل بوٹوں پر مشتمل ہوتے

ہیں۔ اس کا ایک قدیم ترین اور سب سے زیادہ چلتا



۲۲ بعد؛ (۹) D. B. Macdonald : Muslim  
 'Theology' 'Bid'a and muftadi' بحد اشاریہ؛ (۱۰)  
 Some observations on the significance : B. Lewis  
 of heresy in the history of Islam در Studia  
 Islamica، ۱۹۵۳ء، ۱ : ۵۲ بعد.

(J. ROBSON) [واادارہ]

- بدل : (ترکی : بدل، جمع : بدلات Bedelât)
- نیز ابدال، قَب (Redhouse) ایک اصطلاح جس سے عثمانی عہد حکومت میں وہ رقم مراد لی جاتی تھی جو کوئی محصول گزار حکومت کی کوئی خدمت بجا لانے یا اس کے لیے کوئی سامان مہیا کرنے کے بجائے ادا کرتا تھا۔ سلطان کی رعایا کے بعض طبقے واجبات اور ٹیکس سے اس شرط پر مستثنیٰ کیے جاتے تھے کہ وہ حکومت کی کچھ خدمات انجام دیں۔ لیکن اگر وہ مفوضہ فرائض انجام دینے میں ناکام رہتے یا حکومت انہیں فرائض یا خدمات سے معاف کر دیتی تو اس صورت میں عام محصولات کے بجائے ان پر مخصوص مبادل رقوم کی ادائیگی واجب ہوتی تھی۔ ممکن ہے کہ بدل کا لفظ پہلے پہل انہیں مبادل رقوم کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔

سولہویں صدی عیسوی کے آخر سے حکومت عثمانیہ کے مرکزی خزانے میں اکثر کمی ہو جایا کرتی تھی، اور اس سلسلے میں دور بینی سے کام لینے کے بجائے ایسی تدابیر اختیار کی جاتی تھیں جن سے یہ مسئلہ وقتی طور پر حل ہو جائے، چنانچہ اکثر اوقات یہ ہوتا تھا کہ پریشان اور بدحواس دفتردار لوگوں کو سرکاری خدمات یا فراہمی سامان کی شرط سے مستثنیٰ کر کے ان سے زر نقد وصول کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے اور اس امر کا خیال نہیں کرتے تھے کہ آگے چل کر ان خدمات اور سامان پر اتنا ہی روپیہ مزید صرف کرنا پڑے گا۔ سترہویں صدی کے وسط تک یہ نوبت آ پہنچی تھی کہ "میری" میں

سینہ یا قابل ملامت (مذمومہ)۔ اس بارے میں عام اصول یہ ہے کہ جو نئی بات قرآن، سنہ، اجماع یا اثر (وہ روایت جو کسی صحابی یا تابعی سے منسوب کی جا سکے) کے خلاف ہو وہ بدعتِ سینہ ہے اور جو اچھی بات رائج ہو جائے اور چار ماخذ مذکورہ کے خلاف نہ ہو بدعتِ حسنة ہے۔ بعض نئی چیزیں جو قرآن و سنت کے عین مطابق ہیں، مثلاً علوم وغیرہ، ان میں اضافہ و جدت، بدعتِ سینہ نہیں بلکہ اگر بدعت ہے بھی تو اسے بدعتِ حسنة کہنا چاہیے۔ بدعاتِ محرمہ میں وہ عقاید شامل ہیں جو سنہ [اور قرآن] کے خلاف ہیں۔ بدعاتِ مندوبہ (پسندیدہ) میں محتاج خانوں اور مدارس جیسے اداروں کا قیام شامل ہے۔ بدعاتِ مکروہہ (ناپسندیدہ) میں وہ باتیں شامل ہیں جو قرآن و سنت کی رو سے حرام تو نہیں مگر مکروہ ہیں۔ مبتدعین کو اہل البدع اور اہل الہواء کہا گیا ہے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ مبتدع وہ ہے جو کوئی چیز اپنی ذاتی رائے کی بنا پر جاری کرے اور اس کی بنیاد اسلام کے مسلمہ اصولوں پر نہ ہو۔ بہر حال بدعتِ حسنة اور بدعتِ سینہ کا امتیاز ضروری ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ والی مذکورہ بالا حدیث سے ظاہر ہوتا ہے۔ زندگی کے نئے تنوعات کو جو قرآن و سنت کے خلاف نہ ہوں بدعت نہیں کہا جا سکتا (نیز رک بہ سنت، اہل الہواء)۔

مآخذ: (۱) التہانوی: الکشاف: بذیل مادہ، کلکتہ ۱۸۵۳ تا ۱۸۶۲ء، ص ۱۳۳ بعد؛ (۲) ابن الأثیر: النہایۃ، بذیل مادہ؛ (۳) الراغب: المفردات، بذیل مادہ؛ (۴) ابویکر الطرطوشی: کتاب الحدودات و البدعت، طبع M. Talbi، تونس ۱۹۵۹ء؛ (۵) الشاطبی: الاعتصام، بذیل البدعت؛ (۶) التعریفات، بذیل مادہ؛ (۷) Handbook : Wensinck، بذیل مادہ؛ (۸) Goldziher : Muhammedanische Studien، Halle، ۱۸۹۰ء، ۲ :

بدستور عاید تھا۔ جاگیرداروں پر ایک اور محصول اس کے کچھ دن بعد لگایا گیا، جو مدت دراز تک جاری رہا۔ اس کا نام 'بدل جیلی' تھا، اور جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے اسے وہ لوگ ادا کرتے تھے جن کی مالی آمدنی ایک مقررہ رقم سے تجاوز کر جاتی تھی۔ اس رقم کی حد شروع شروع میں چالیس ہزار آچھے سالانہ تھی۔ اور یہ ان لوگوں سے وصول کی جاتی تھی جن پر لازم تھا کہ میدان جنگ میں اپنے ساتھ ایک یا ایک سے زیادہ مسلح سوار لے کر حاضر ہوں۔ یہ بدل اسی کے عوض تھا۔

گو محمود ثانی اور اس کے اخلاف کے 'نئے دور' میں بہت سے قدیم رواج ترک کر دیے گئے تھے تاہم انیسویں صدی کے نصف آخر تک بھی بدلات کی طرف کئی لحاظ سے رجوع کرنا پڑتا تھا؛ چنانچہ ۱۸۵۶/۵۱۲۷ میں 'اعانہ عسکری' کے نام سے ایک خاص محصول عائد کیا گیا، جس کا ذکر بعد میں عموماً 'بدل عسکری' کے نام سے ملتا ہے۔ اسی سال کے مشہور و معروف 'خط ہمایوں' کے ذریعے [رک بہ عبدالمجید] عثمانی اصلاح پسندوں نے سلطان کی مسلمان اور ذمی رعایا کے درمیان تمام قانونی امتیازات منسوخ کرانے کی کوشش کی؛ چنانچہ اس طرح ایک طرف تو ذمیوں سے جزیہ وصول کرنا موقوف کر دیا گیا اور دوسری طرف انہیں پہلی بار فوجی خدمت کا اہل قرار دیا گیا۔ بایں ہمہ اس سے عملی طور پر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، کیونکہ جہاں عملاً باب عالی کو یہ پسند نہ تھا کہ ذمیوں کو فوج میں بھرتی کیا جائے وہاں ذمیوں کو بھی بھرتی ہونے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ لہذا فیصلہ کیا گیا کہ ذمی اس کے عوض 'بدل' ادا کریں اور یوں بدل تمام اغراض کے لیے جزیے کا متبادل قرار پایا۔ ابتدا میں بدل ہر شخص سے سرکاری اہلکار وصول کرتے تھے، لیکن بعد میں اس کی وصولی ہر فرقے کے

وصول ہونے والے نقد محاصل کا کٹم و پیش نصف حصہ 'بدلات' کی بہت سی صورتوں میں حاصل ہونے لگا (دیکھیے 'میزانیہ' از طرخونجی احمد پاشا در عبدالرحمن و فیک : تکالیف قواعدی، ۱ : ۳۲۷ : بعد و احمد راسم : عثمانی تاریخ، ۲ : ۲۱۳ : بعد، حواشی)۔ ان بدلات میں سے سب سے زیادہ مشہور 'بدل نزول' تھا، جو سارے ملک میں ہر جگہ جاری تھا، اور سکونت گاہ اور سامان رسد کی فراہمی کے بجائے مقامی باشندوں سے لیا جاتا تھا، جو قدیم قاعدے کی رو سے اس بات کے پابند تھے کہ اپنے علاقے میں دورہ کرنے والے سرکاری افسروں اور ملازموں کو یہ سب چیزیں بلا معاوضہ مہیا کریں۔ زر نقد کی وصولی کا یہ رواج اس قدر عام ہو گیا تھا کہ بعض دفاتر حساب میں اسے عوارض [رک باں] کی مد میں درج کیا گیا ہے۔ یہاں 'قدیم دور حکومت' کے دو یا تین ایسے بدلات کا ذکر کیا جاتا ہے جو خاص طور پر اہم ہیں۔ ان میں سے ایک 'بدل جزیہ' تھا، جو ڈینیوب کی ریاستوں کے رئیسوں (Hospodars) اور رغوصہ Ragusa کی جمہوریہ سے وصول کیا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسی رقم تھی جو کسی مقررہ خدمت کے بجائے نہیں بلکہ جزیے کے بدل میں وصول کی جاتی تھی، جس کی ادائیگی ان علاقوں میں بسنے والے ہر ذمی [رک بہ ذمہ] پر واجب تھی۔ دوسرے بدل کا نام 'بدل تیر' تھا۔ پہلے پہل یہ بدل ۱۰۶۹/۱۶۵۹ء میں بظاہر ان تمرداروں (جاگیرداروں) سے وصول کیا گیا جنہیں فوجی خدمت کے عوض جاگیریں عطا ہوئی تھیں اور جو اب یہ خدمت انجام نہیں دیتے تھے۔ اس بدل کی مقدار ان کی جاگیر کی نصف آمدنی تک ہوتی تھی۔ ممکن ہے کہ اس محصول نے ایک مستقل حیثیت اختیار نہ کی ہو، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ پانچ سال بعد بھی یہ



بذیل بدلِ عسکری و بدلِ نقدی (ہردو از S.S. Onar):  
(۸) Bowen و Gibb، *Islamic Society and The West*،  
جلد ۱ (حصہ دوم)، بمدد اشاریہ.

(H. BOWEN)

- \* بدل : رَکْ بہ ابدال [یہ نحو کی ایک اصطلاح بھی ہے].
- \* بدلِ عسکری : رَکْ بہ بدل.
- \* بدلِ نقدی : رَکْ بہ بدل.
- \* بدلِ لاء : (ع) بدیل کی جمع، رَکْ بہ ابدال.
- \* بدلیس : (Bitlis) [بتلیس، قَب قاسوس  
الاعلام، ص ۱۲۳۹]، مشرقی اناطولیہ میں اسی نام  
کی ولایت کا مرکزی شہر، جو دریائے بتلیس کے  
کنارے اور جھیل وان (۳۸ درجے ۲ دقیقہ عرض  
بلد شمالی اور ۴۲ درجے ۵ دقیقہ طول بلد مشرقی)  
کے انتہائی مغربی گوشے کے جنوب مغرب میں جھیل  
سے پچیس کیلومیٹر کے فاصلے پر سطح سمندر سے  
چودہ سو میٹر اور بعض کے نزدیک ایک ہزار  
پانچسو پچاسی میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ اہل ارمینیہ  
اسے بگش (بگش) کہتے تھے، عرب بدلیس [قَب  
یاقوت و البلاذری] اور قدیم ترکی تصانیف میں اسے  
بیدلیس لکھا ہے۔ یہ شہر اس عمیق اور تنگ وادی  
کے نسبتاً عریض حصے میں واقع ہے جو دریائے بتلیس  
نے الجزیرۃ کے بالائی حصے میں داخل ہونے سے قبل  
جبل طاوروس شرقی کو کاٹ کر بنا دی ہے۔ اس شہر  
کے گلی کوچے تنگ اور بے ترتیب ہیں۔ گھروں کی  
دیواریں پتھر اور چھتیں کچی مٹی سے بنی ہیں۔ وادی  
کی زبیریں سطح بید اور سیوہ دار اشجار سے ڈھکی ہوئی  
ہے اور گلی کوچے اور گھر بہاں سے طبق بر طبق بلند  
ہوتے ہوئے پہاڑیوں کی ننگی ڈھلانوں تک پھیلتے چلے  
گئے ہیں۔ شہر کے اندر دریا اور اس کی شاخیں ایک  
دوسرے کو قطع کرتی ہوئی بہتی ہیں جنہیں پلوں کے  
ذریعے عبور کیا جاتا ہے۔ ان ندیوں کی بدولت شہر کے

مذہبی پیشوا کو سونپ دی گئی، تاآنکہ ۱۹۰۷ء میں  
اسے منسوخ کر دیا گیا۔  
اسی قسم کے دو اور مخطوطات، جو بعد کے زمانے  
میں وصول کیے جانے لگے، 'بدلِ نقدی' کے نام سے  
موسوم ہوئے۔ ان میں سے پہلا ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۶ء  
کے فرمانِ ہمایونی کی رو سے مقرر کیا گیا۔ اس تاریخ  
سے ہر وہ شخص جس کا نام جبریہ فوجی بھرتی کے لیے قرعہ  
میں نکل آئے بدلِ نقدی ادا کر کے پوری مدت ملازمت  
کے لیے یا کچھ عرصہ خدمات انجام دینے کے بعد باقی  
مدت کے لیے اس سے معافی حاصل کر سکتا تھا۔ پوری  
مدت کی معافی کے لیے سونے کی پچاس عثمانی اشرفیاں  
واجب الادا ہوتی تھیں۔ ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۳ء کے سرکاری  
فرمان کی رو سے بطور بدل یہ پچاس اشرفیاں ادا کرنے  
والوں کو چھ ماہ تک لازماً فوجی خدمت انجام دینا  
پڑتی تھی۔ اس کے بعد انہیں چھٹی دے دی جاتی  
تھی اور وہ 'سپاہ محفوظ' میں شمار کیے جاتے تھے۔  
معافی نامے کی یہ خرید و فروخت جمہوریہ کے قیام کے  
بعد بھی جاری رہی۔ ۱۳۳۶ھ / ۱۹۲۷ء کے سرکاری  
فرمان نے مدتِ خدمت کی تخفیف کے لیے چھ سو لیرہ  
معاوضہ مقرر کر دیا۔

'بدلِ نقدی' کی دوسری صورت یہ تھی کہ کسی  
علاقے کے وہ لوگ جن پر قانون کی رو سے اپنے اپنے  
علاقے کی سڑکوں کی نگہداشت کرنا ضروری تھا نقد  
معاوضہ ادا کر کے اس خدمت سے سبکدوش ہو سکتے تھے۔

مآخذ : (۱) سری محمد : نتائج الوزراء،

مترجمہ و طبع Wright، بعنوان *Ottoman Statecraft*

بمدد اشاریہ؛ (۲) *Tableau : D'Ohsson*، ۷ : ۲۵۸؛

(۳) سلیمان سودی : دفتر مقتصد، ۱ : ۱۲۳ تا ۱۳۲؛

(۴) عبدالرحمن و فیق : تکالیف قواعدی، ۱ : ۳۳۲؛ (۵)

مصطفیٰ ثوری : نتائج الوقوعات، ۲ : ۱۰۱؛ (۶) احمد راسم :

عثمانی تاریخی، ۱ : ۳۸۰ (حاشیہ) و ۲ : ۲۱۳ (حاشیہ)

و ۳ : ۱۱۵۶ (حاشیہ)، ۱۱۵۸ (حاشیہ)؛ (۷) اور ت،

محلے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اگرچہ سیاحوں نے ہمیشہ اس شہر کے خوش منظر ہونے کی تعریف کی ہے مگر محل وقوع کے باعث اس کی آب و ہوا ناخوشگوار ہے۔ موسم گرما میں سخت گرمی ہوتی ہے۔ موسم سرما طویل ہوتا ہے، جس میں شدید سردی اور سخت برفباری ہوتی ہے۔ بارش بھی بہت ہوتی ہے (سالانہ ایک میٹر کے قریب)، خصوصاً موسم بہار میں، بحالیکہ موسم گرما میں عموماً اساک باراں رہتا ہے۔

جس وادی میں بدلیس واقع ہے وہ جھیل وان کے طاس سے جبل طاوروس عبور کرنے کی واحد گزرگاہ ہے، جس سے گزر کر دیار بکر کی سطح مرتفع اور الجزیرہ کے میدانوں میں پہنچتے ہیں۔ زمانہ قبل تاریخ ہی سے جنوب کی سمت سے ارز روم اور وہاں سے بحر اسود تک جانے والے کارواں اسی راستے سے گزرا کرتے تھے اور یہی وہ راستہ ہے جسے زینوفن Xenophon اور اس کے دس ہزار یونانیوں نے اختیار کیا تھا۔ تاریخی زمانے میں بدلیس کے حاکموں نے ہمیشہ یہاں سے گزرنے والے مسافروں سے محصول راہداری وصول کیا اور بڑے اہتمام سے موش کے میدانی علاقے پر اپنا قبضہ جمائے رکھا۔ یہاں سے انہیں غذائی اجناس ملتی تھیں، جو ان کے اپنے چٹیل پہاڑوں میں میسر نہ آ سکتی تھیں۔

یہ شہر کس نے اور کب بسایا؟ اس کا ہمیں علم نہیں۔ ایک قدیم حکایت میں آتا ہے کہ سکندر اعظم نے اپنے ایک سپہ سالار کو، جس کا نام لیس Lis تھا، اس مقام پر ایک ناقابل تسخیر قلعہ تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ جب قلعے کی عمارت مکمل ہو گئی تو لیس Lis نے سکندر کو اس میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ سکندر نے قلعے کا محاصرہ کر لیا، لیکن اس کے اندر بزور شمشیر

گھسنے میں ناکام رہا۔ اب لیس نے اسے بتایا کہ میں نے آپ کے حکم کی کیسے حرف بہ حرف تعمیل کی ہے۔ اس پر اسے معافی دے دی گئی اور شہر کا نام اسی کی یادگار رہا۔ یہ شہر ارمینیہ کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتا ہے اور وہاں کے قدیم تاریخی ماخذ میں اس کا ذکر بکثرت آیا ہے (Geogr. Cypr. : Gelzer، لائپزگ، ۱۸۹۰ء، ص ۱۶۸)، لیکن ان سے یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ مسلمانوں نے اسے کب فتح کیا؟ ہاں اتنا پتا ضرور چلتا ہے کہ انہوں نے ۶۴۱ء میں موش (Daron) کا خطہ فتح کیا۔ Streck (11، لائڈن، بار اول، بذیل مادہ بدلیس) نے قلعے کی دیواروں پر عربی کتبات کا ذکر کیا ہے مگر Lynch کے قول کے مطابق وہ ضائع ہو چکے ہیں اور ان کی نقل کبھی نہیں لی گئی۔ مسلمان مؤرخین بیان کرتے ہیں کہ عیاض بن غنم، جو حضرت عمرؓ کی طرف سے الجزیرہ کے سپہ سالار تھے، ارزن کو تسخیر کرنے کے بعد بدلیس اور پھر وہاں سے اخلاط ((رك باں))، یا خلاط، فتوح، طبع ڈخویہ، ص ۱۷۶] کی طرف بڑھے۔ اخلاط کے بطریق نے شرائط صلح قبول کیں اور جب عیاضؓ وہاں سے لوٹے تو بدلیس کے بطریق نے بھی اخلاط والی شرح پر خراج ادا کرنا منظور کر لیا (البلاذری : فتوح، قاہرہ ۱۹۰۱ء، ص ۱۸۳؛ الواقدی : کتاب الفتوح، قاہرہ ۱۳۰۲ھ، ۲ : ۱۵۲ تا ۱۵۴)۔ ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ یہ علاقہ پھر بوزنطی حکومت کے ہاتھ میں چلا گیا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے اسے دوبارہ مطیع کیا، لیکن ان کی وفات کے بعد پھر مسلمانوں کے قبضے سے نکل گیا، یہاں تک کہ عبدالملک کا دور آیا اور اس کے بھائی محمد نے اس کا الحاق صوبہ الجزیرہ کے ساتھ کر لیا۔ عہد عباسیہ میں یہ یکے بعد دیگرے دیار بکر کے مختلف فرمانروا خاندانوں،



جب ایلخانیوں پر زوال آ گیا تو کردوں کے ایک قبیلے رُژکی (Ruzhki) نے بدلیس میں ایک حکمران خاندان کی بنا ڈالی، جو متعدد حوادث اور انقلابات کے باوجود انیسویں صدی کے وسط تک کسی نہ کسی طرح قائم رہا، گو اپنے عہد میں وہ نوبت بہ نوبت تیموریوں، قراقویونلو، آق قویونلو، صفویوں اور عثمانیوں کی سیادت تسلیم کرتا رہا۔ سولہویں صدی میں اس خاندان کے ایک فرد شرف خاں نے (جس کا شرف نامہ ۱۵۹۶ء میں مکمل ہوا اور جو کردوں کی تاریخ کا عظیم ماخذ ہے) دعویٰ کیا کہ وہ ایویوں کی اولاد سے ہے؛ لیکن اس کے پوتے عبدال (عبداللہ) خاں نے اولیا چلبی کو بتایا کہ وہ عباسیوں کی اولاد میں سے ہے۔ اولیا چلبی وہاں ۱۶۵۵ء میں گیا تھا۔ اس کے مشاہدات میں مندرجہ ذیل امور شامل ہیں:

اس شہر میں گزرنے والے کاروانوں سے وصول ہونے والا باج (محصول راہ داری) خان کو پہنچ جاتا تھا۔ مراد چہارم نے موش کے میدانی علاقے کا خراج (مالیہ) خان کو حین حیات دیے جانے کا فرمان جاری کر دیا تھا۔ خان اسی میں سے محافظ فوج اور قلعہ دار کی تنخواہیں ادا کرتا تھا۔ دوسری جانب یعقوبی فرقے کی عیسائی اور عرب رعایاے شہر جو جزیہ ادا کرتی تھی اسے وان کی 'قول' (انتظامی قسمت) کے لیے محفوظ رکھا جاتا۔ یہ جزیہ ایک آغا وصول کیا کرتا تھا، جو ہر سال کے شروع میں وان سے اسی کام کے لیے آتا تھا۔ کم و بیش ستر قبیلے خان کے زیر نگیں تھے۔ قلعے کے اندر تین سو گھر تھے، مگر آدھا رقبہ خان کے محل نے گھیر رکھا تھا۔ شہر کے سترہ محلے اور ان میں پانچ ہزار گھر تھے۔ مضافات شہر میں میوے کے ہزار ہا باغ تھے اور ہر ایک میں چھوٹے چھوٹے بنگلے بنے تھے۔ مساجد کی کل تعداد ایک سو دس تھی۔

یعنی شیخہ، عثمانیہ اور مروانیہ کے زیر حکومت رہا۔ مؤخر الذکر دو خاندانوں کے عہد میں جب ہوزنٹیوں نے دریائے فرات کے طاس پر قبضہ کر لیا تو بسفرجن (Vasporakan) یعنی وان کے طاس کے ارمن بادشاہ نے مسلمانوں کی سیادت سر سے اتار پھینکی اور حکومت قسطنطنیہ کی اطاعت قبول کر لی۔ اس رد و بدل سے اخلاط کی طرح بدلیس بھی ایک سرحدی شہر ہو گیا۔ مسلمانوں کی یورش اپنے ساتھ بکر بن وائل اور تغلب قبائل کی بعض شاخوں کو اس علاقے میں لے آئی اور مروان کے زمانہ حکومت میں مختلف کرد قبیلے اس خطے میں پھیل گئے، خصوصاً حمیدی، جن سے مروانی تعلق رکھتے تھے۔ ناصر خسرو نے، ۱۰۳۶ء میں، یعنی ترکوں کے بڑے حملے سے ایک سال پہلے، یہاں کی سیاحت کی۔ وہ لکھتا ہے (سفر نامہ، برلن ۱۸۳۱ء، ورق ۸) کہ اخلاط میں عربی، فارسی اور ارمن زبانیں بولی جاتی تھیں؛ لہذا ہم فرض کر سکتے ہیں کہ بدلیس میں بھی یہی حال ہوگا۔ فخرالدولہ محمد بن جہیر نے، جسے سلجوقیوں نے ۱۰۸۳ء میں دیار بکر کا حاکم مقرر کیا، مروانیوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور ان کی اراضی اور قلعوں کو ترکوں میں تقسیم کر دیا۔ بدلیس محمد بن دلمج یا دلمج کو ملا، اور اس کی اولاد وہاں ۱۱۹۲/۵۵۸۸ء تک حکومت کرتی رہی، اس کے بعد اس پر اخلاط کے امیر نے قبضہ کر لیا۔ ۱۲۰۷ء میں یہ دونوں شہر ایویوں کے قبضے میں آ گئے اور انہوں نے اس علاقے میں کردوں کی ایک بڑی تعداد لا کر آباد کر دی۔ اگرچہ ۱۲۲۹ء میں جلال الدین خوارزم شاہ نے اخلاط کو برباد کر دیا، لیکن وان اور بدلیس میں خوشحالی کا دور آ گیا۔ بدلیس خاص طور پر علم و فضل کا ایک اہم مرکز بن گیا اور مغول کی یورش تک برابر بنا رہا۔

سب سے زیادہ اہم مسجد شرفیہ تھی، جسے شرفاں نے بنایا تھا۔ ٹیورنیر Tavernier جس نے اسی زمانے میں یہاں کی سیاحت کی، لکھتا ہے کہ بدلیس کا ”بے“ کسی شاہ یا پادشاہ کو تسلیم نہیں کرتا تھا اور بیس پچیس ہزار سوار فوج میدان جنگ میں لا سکتا تھا۔ اس زمانے میں آبادی زیادہ تر کردوں اور ارمنوں پر مشتمل تھی۔ جہاں نما میں لکھا ہے کہ ارمن اکثریت میں تھے۔ ۱۶۸۳ء میں جن یسوعی (Jesuits) پادریوں نے اس شہر کی سیاحت کی وہ لکھتے ہیں کہ بے کی طرف سے عثمانیوں کی برائے نام اطاعت محض اسی قدر رہ گئی تھی کہ وہ اپنی مسند نشینی کے وقت انہیں خراج بھیجا کرتا تھا (Estat présent : Fleurian de l'Arménie، پیرس ۱۶۹۴ء)۔ گورد فرمانرواؤں کی قوت کو ترک ۱۸۴۷ء تک نہ توڑ سکے۔ اس کے بعد انیسویں صدی کی شورشوں میں بھی یہ شہر گوردوں کا سیاسی اور مذہبی (نقشبندی) مرکز رہا۔

ترکوں کا مکمل اقتدار قائم ہو جانے کے بعد بدلیس [بتلیس] کو ارز روم کی وسیع ولایت کی سنجاق موش کی قضاہ بنا دیا گیا، لیکن ۱۸۷۷ء کی جنگ روس و ترکیہ کے بعد اسے ایک ’ولایت‘ قرار دیا گیا، تاکہ یہ نمایاں ہو جائے کہ یہ علاقہ مرکزی حکومت کے تحت ہے۔ یہ ولایت چار سنجاقوں، یعنی بتلیس، موش، سعرد اور کنج (= گنچ) پر مشتمل تھی [قب قاموس الاعلام، بذیل مادہ]۔ اس کا کل رقبہ تقریباً تیس ہزار مربع کیلومیٹر تھا اور آبادی کم و بیش چار لاکھ۔ Cuinet کے بیان کے مطابق مرکزی سنجاق کا رقبہ پانچ ہزار پانسو مربع کیلومیٹر تھا۔ اور اس کی آبادی ایک لاکھ آٹھ ہزار تھی، جس میں ستر ہزار مسلمان، تینتیس ہزار ارمن، چار ہزار شام کے یعقوبی عیسائی اور ایک ہزار یزیدی

تھے۔ سائنامہ، بابت ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲-۱۸۹۳ء میں اس سنجاق کی آبادی ستر ہزار درج کی گئی ہے، جس میں چھیالیس ہزار مسلمان اور باقی ارمن تھے۔ Lynch، جس نے یہ تعداد نقل کی ہے، کہتا ہے کہ اس میں تیرہ فی صد کا اضافہ کر لینا چاہیے تاکہ وہ کمی پوری ہو جائے جو دفتری اندراجات میں رہ گئی ہے۔ انیسویں صدی میں اس شہر کی آبادی کے بارے میں مستند اعداد و شمار دستیاب نہیں ہوئے۔ Lynch نے اپنی سیاحت کے وقت (۱۸۹۸ء) اس کا اندازہ تیس ہزار کیا ہے، جس میں دس ہزار ارمن، دو سو شامی اور باقی گورد ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز کا ایک روسی ساخذ اس شہر کے گھروں کی تعداد پانچ ہزار ایک سو بتاتا ہے، جن میں پانسو پچاس گھر ترکوں کی تین ہزار کردوں کی اور پندرہ سو ارمنوں کی ملکیت تھے۔

انیسویں صدی میں بدلیس کی، خاص صنعت پارچہ بافی اور اس سے متعلقہ صنعت رنگائی تھی۔ شہر اور نواح کی دیگر اشیائے برآمد ماجو پھل، چھپائی اور دواسازی کا گوند (gum tragacanth)، مچھٹھ، تمباکو، شہد اور مویشی تھے۔ انیسویں صدی کے ہنگاموں سے پہلے ترک، گورد، ارمن اور یعقوبی عیسائی بدلیس میں پہلو بہ پہلو رہتے چلے آئے تھے۔ ۱۸۶۳ء میں یسوعیوں (Jesuits) نے وہاں اپنا تبلیغی ادارہ قائم کیا تو بدلیس کے بے نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اٹھارہویں صدی میں اطالوی پادری Maurizio Garzoni گوردوں کے درمیان اٹھارہ سال تک کام کرتا رہا۔ ایک امریکی پروٹسٹنٹ مشن ۱۸۵۸ء میں وہاں قائم ہوا۔ ارمنوں کی شورش اور اسے فرو کرنے کی تدابیر، نیز پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں روس کا قبضہ، ان سب اسباب کی بنا پر یہاں کی آبادی میں بے حد کمی آ گئی اور صنعت کا تو خاتمہ ہی ہو گیا



۱۳۹۰ء کی طرف سے بایزید ثانی [۵۸۸۶ / ۱۳۸۱ء تا ۱۵۱۲ء] کے نام ایک تہنیت نامہ لکھا، جسے بہت پسند کیا گیا (Hammer-Purgstall، ۲: ۲۹۰)۔ جب شاہ اسمعیل [۵۹۰۷ / ۱۵۰۲ء تا ۵۹۳۰ / ۱۵۲۳ء] کی قوت بڑھنے لگی تو ۵۹۰۷ / ۱۵۰۱ء - ۱۵۰۲ء میں ادریس بھاگ کر ترکیہ چلا آیا، جہاں بایزید نے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے فارسی زبان میں آل عثمان کی تاریخ لکھنے پر مامور کر دیا۔ اس کی کتاب اس بنا پر ہدف تنقید بنی کہ ایرانیوں کے بارے میں اس کا انداز ضرورت سے زیادہ روادارانہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اس پر موعودہ صلہ نہ مل سکا۔ اس نے حج بیت اللہ پر جانے کی اجازت چاہی، لیکن یہ اجازت بھی اسے ربیع الآخر ۱۰۱۷ / جولائی ۱۵۱۱ء میں وزیر اعظم خادم علی کی وفات کے بعد ہی مل سکی (معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کا سب سے بڑا دشمن تھا)۔ مکہ معظمہ سے اس نے باب عالی کو ایک خط لکھا، جس میں دھمکی دی کہ اس کے ساتھ جو بے انصافی ہوئی ہے اگر اس کی تلافی نہ کی گئی تو وہ اپنی تاریخ کے دیباچے اور خاتمے میں (جو اس وقت تک لکھے نہیں گئے تھے) اس ناشکرگزاری کا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ سلیم اول نے اپنی تخت نشینی [۵۹۱۸ / ۱۵۱۲ء] کے تھوڑے دن بعد اسے واپس بلا لیا اور یہ تاریخ مکمل صورت میں سلطان کے حضور میں پیش کر دی گئی۔ چالدران کی مہم (۵۹۲۰ / ۱۵۱۳ء) میں ادریس سلطان سلیم کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد اس نے عثمانیوں کی ایک پیش ہنہا خدمت یہ انجام دی کہ سنی گورد حکمرانوں کو ان کا طرفدار بنا دیا۔ سعدالدین (۲: ۳۲۲) نے جو فرمان نقل کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے گوردوں کے علاقے کی تنظیم کا پورا اختیار دے دیا گیا تھا۔ وہ سلطان

۱۹۲۷ء میں اس شہر کی آبادی نو ہزار پچاس اور ۱۹۰۰ء میں گیارہ ہزار ایک سو باون تھی۔ [ترکیہ میں] جمہوریت قائم ہوئی تو ابتدا میں ولایت بتلیس کے چاروں سنجاق الگ الگ چار ولایتیں (صوبے) ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء میں بتلیس کو ایک 'قضاء' بنا کر ولایت موش میں شامل کر دیا گیا۔ ۱۹۳۵ء کی مردم شماری کی رو سے موش کی ستر فی صد آبادی گورد تھی۔ ۱۹۳۶ء میں بتلیس کو دوبارہ ولایت بنا دیا گیا اور آج کل یہ پانچ قضاؤں میں منقسم ہے: بتلیس، تاتوان، اخلاط، موطنکی اور خیزان۔ اس کا رقبہ پانچ ہزار چار سو بیاسی مربع کیلومیٹر ہے۔ آبادی (۱۹۵۰ء میں) اٹھاسی ہزار چار سو بائیس تھی۔

مآخذ: (۱) *Armenia, Travels*: H. F. B. Lynch

(1898) *and Studies*، لندن ۱۹۰۱ء، ۲: ۱۳۵ تا ۱۵۹؛

(۲) اولیا چلبی: سیاحت نامہ (طبع احمد چوڈت)، ۳: ۸۵

بعد؛ (۳) *Les six voyages*: Tavernier، پیرس ۱۶۷۶ء،

۱: ۳، ۳: ۳۰۳؛ (۴) حاجی خلیفہ: جہاں نما (طبع ابراہیم

مترقبہ)، ص ۱۳۳؛ (۵) ساسی بک: قاموس الاعلام، بذیل

مادہ بتلیس؛ (۶) *La Turquie d'Asie*: V. Cuinet

پیرس ۱۸۹۲ء، ۲: ۵۲۱ بعد؛ (۷) سالنامہ ولایت

بتلیس، ص ۱۳۱ (شمارہ اول)؛ (۸) *Genel nüfus Sayimi*,

20. 92، ۱۹۳۵ء، ج ۳۳: 'ولایت موش'؛ نیز دیکھیے

(۹) *Bitlis*، بذیل مادہ *Bitlis*، دو مقالے از Besim Darkot

و *Mükrimin Halil Yinaç*۔ یہ مقالہ انہیں دونوں کی

تلخیص ہے۔ [(۱۰) *Bitlis*، بذیل مادہ]۔

(G. L. LEWIS)

بدلیسی: ادریس، مولانا حکیم الدین ادریس

بن مولانا حسام الدین ہلی البدلیسی، عثمانی ترکوں

کا مؤرخ، غالباً کردی نسل کا تھا۔ دربار آق قویونلو

میں اسے نشانچی کا عہدہ ملا اور ۵۸۹۰ / ۱۳۸۵ء

میں اس نے یعقوب بیگ [۵۸۸۳ / ۱۳۷۹ء تا ۵۸۹۶ /

شکایت نامہ پر ہوتا ہے جس میں ادریس نے اپنے مصائب کا حال بیان کیا ہے۔

[ہشت بہشت کا تکملہ ذیل ہشت بہشت یا

سلیمان نامہ ہے، جسے ادریس کے بیٹے ابوالفضل

(دیکھیے Babinger، ص ۹۵ بعد) نے ۵۹۷۳/۱۰۶۶ء

میں مکمل کیا۔ اس میں سلطان سلیم اول کے عہد

[۵۹۱۸/۱۵۱۲ء تا ۵۹۲۶/۱۵۲۰ء] کے واقعات

بیان کیے گئے ہیں (دیکھیے Persian Literature: Storey،

ص ۴۱۶)۔ ایک شخص عبدالباقی سعدی نے ۵۱۱۳۶/

۱۷۳۳-۱۷۳۴ء میں محمود اول کے حکم سے

ہشت بہشت کا ترکی میں ترجمہ کیا۔ اسے پورے طور

پر قابل اعتماد نہیں کہا جا سکتا (قُب M. Şükrü، در

Isl.، ۱۹، (۱۹۳۱ء) : ۱۳۸)۔ کمال پاشا زادہ [رک بان]

کی تاریخ، جسے بعض اوقات ہشت بہشت کا ترجمہ

کہا گیا ہے، اس کے 'نظیرہ' کے طور پر لکھی گئی ہے،

تاہم وہ ایک بالکل علیحدہ اور مستقل تصنیف ہے۔

ادریس نے سلیم نامہ بھی لکھا ہے، جو نثر

اور نظم دونوں میں ہے، لیکن وہ مصنف کی وفات

کے وقت ادھورا رہ گیا تھا اور بعد میں ابوالفضل

نے اس کی تدوین کی (یہ ابوالفضل کی ذیل سے بالکل

الگ تصنیف ہے، قُب F. Tauer در ArO، ص ۴ : (۱۹۳۲ء)،

ص ۱۰۳ : [سلیم نامہ کے بارے میں تفصیلات کے لیے

دیکھیے Rieu، ص ۱ : (۲۱۸ و ۲۱۹)۔

[ادریس بدلیسی] شاعر اور خطاط بھی تھا (قُب

مستقیم زادہ : تحفة الخطاطین، استانبول ۱۹۲۸ء،

ص ۱۱۰)۔ اس نے مختلف موضوعات پر متعدد رسائل

لکھے، جن میں سے بعض حسب ذیل ہیں : (۱) الاباء عن

مواقع الوباء (حاجی خلیفہ، عدد ۵۹۳، (۱ اور ۲) ۶۲۱۸)،

براکلمان، ص ۲ : ۳۰۲ و قُب تکملہ، ص ۲ : (۳۲۵) : (۲)

'اربعین' (چہل حدیث) کے دو فارسی ترجمے (حاجی

خلیفہ، عدد ۷۰۰ اور قُب Islam-Türk : A. Karahan

Edbiyatında Kirk Hadis، استانبول ۱۹۵۳ء، ص ۱۱۱

سلیم کے ساتھ مصر بھی گیا اور کہا گیا ہے کہ وہاں اس نے عثمانی عمال کی غلط کاریوں کے خلاف

صدائے احتجاج بلند کی (Hammer-Purgstall، ص ۲ :

۵۱۸)۔ سلطان سلیم کے تھوڑے ہی عرصے بعد

ادریس نے بھی استانبول میں وفات پائی (ذوالحجہ

۵۹۲۶ / نومبر ۱۵۲۰ء [قُب قاموس الاعلام :

۵۹۲۱]) اور جوار ایوب رض میں اس مسجد کے پہلو

میں دفن کیا گیا جو اس کی زوجہ زینب خاتون نے

بنوائی تھی۔

اس کی عظیم تاریخ ہشت بہشت [یا کتاب

الصفات الثمانية فی اخبار القیاصرة العثمانية]

(حاجی خلیفہ، طبع فلوگل Flügel، عدد ۲۱۳۱،

نیز قُب عدد ۲۱۵۲ اور ۱۳۴۰۶) عثمان سے لے کر

بایزید دوم تک آٹھ سلاطین کے عہد کے وقائع پر

مستعمل ہے۔ فارسی انشاء کے سب سے دقیق اور

پر تکلف اسلوب نگارش میں اور بین طور پر جوینی،

وصاف، معین الدین یزدی اور شرف الدین یزدی

کی تواریخ کے نمونے پر لکھی گئی ہے۔

اگرچہ سعدالدین (جو بار بار اس کا حوالہ دیتا ہے،

قُب خصوصاً ۱ : ۱۵۹) اور Hammer-Purgstall

(قُب ۱ : XXXIV) دونوں اسے انتہائی قدر کی

نگاہ سے دیکھتے ہیں، تاہم ابھی تک یہ شائع

نہیں ہو سکی۔ اس کی تالیف کا آغاز ۵۹۰۸/

۱۵۰۲-۱۵۰۳ء میں ہوا اور تیس ماہ میں مکمل

ہوئی۔ آخری سیاسی واقعہ، جسے اس میں تفصیل

کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، میدیلی Midilli کو

۵۹۰۸ء میں محاصرے سے چھڑانا ہے، اگرچہ آخری

تاریخ جو درج کی گئی ہے وہ ۵۹۰۲ء ہے۔ اس

تاریخ کا طویل 'خاتمہ'، جو تمار منظوم ہے، اس نے

مکہ معظمہ میں لکھا (قُب CPM : Rieu، ص ۲۰۱۹ الف)۔

اس میں اس خانہ جنگی کا ذکر ہے جو بایزید کے

عہد سلطنت کے اواخر میں ہوئی۔ اس کا اختتام ایک



آخری اور سب سے مکمل جائزہ مخطوطات): (۶) عبدالباقی کے ترجمے سے کچھ عبارت F. Babinger نے نقل کی ہے، در *Islam*، ۱۱ (۱۹۲۱ء): ۳۲ بعد اور (۷) فارسی متن سے متعدد عبارتیں F. Giese نے نقل کی ہیں، در *Die Verschiedenen Text-rezensionen des Āsiqpašāzāde*، در *Abh. Pr. Ak. W.*، ۱۹۳۶ء، فلسفہ و تاریخ، جلد ۴: (۸) سلیم نامہ کے کچھ اقتباسات ترجمے کی شکل میں H. Massé نے دیے ہیں، در *Sélim Mélanges*، در *1<sup>re</sup> en Syrie, d'après le Sélim-namé*، *Syriens offerts à M. René Dussaud*، پیرس ۱۹۳۹ء، ۲: ۷۷۹ تا ۷۸۲ - طوط قہوسرای کے قدیم محافظ خانے میں وہ خط محفوظ ہے جو ادریس نے حج کی اجازت مانگنے کے لیے لکھا تھا (عدد E. 3156) اور وہ بھی جو اس نے مکہ معظمہ پہنچ کر وہاں سے لکھا تھا (عدد E. 5675، جسے F.R. Unat نے *Bell.*، ۷ (۱۹۳۳ء): ۱۹۸ میں نقل کیا ہے اور ساتھ ہی ترکی میں اس کا ملخص بھی دیا ہے: (۹) ادریس نے ایک خط سلیمان اول کو لکھا تھا، وہ اور ادریس کی سہر دونوں کی شبیہ *Osmanli Tarihi*: I. H. Uzunçarşılı، ج ۲، انقرہ ۱۹۴۹ء، لوحہ ۲۱، میں دی گئی ہے: [(۱۰) (۱۰) ع، بذیل مادہ].

V. L. MÉNAGE [و ادارہ]

بدلیسی: شرف الدین خاں، جو عام طور پر شرف خاں کے نام سے مشہور ہے: ایک کردی الاصل فارسی مؤرخ، بدلیس (بتلیس) کے امیر شمس الدین خاں کا بڑا بیٹا (و: بھائی)، دیکھیے شرف نامہ، ۱: [۶]، ۲ ذوالعقدہ ۵۹۴۹ھ / [۲۰] فروری ۱۵۴۳ء کو اپنے والد کی جلاوطنی کے زمانے میں قم کے نزدیک کرہرود کے مقام پر پیدا ہوا۔ اس کے خاندان کو شاہ طہماسپ صفوی (۵۹۳۰ھ / ۱۵۲۳ء تا ۵۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء) نے اپنی کفالت میں لے لیا تھا اور اسی بادشاہ کے دربار میں بدلیسی

تا (۱۱۳): (۳) *فصوص الحکم* کی شرح (حاجی خلیفہ عدد ۹۰۷۳): (۴) شبستری کی *گلشن راز* کی شرح (حاجی خلیفہ، عدد ۱۰۸۳۹): (۵) شبستری کی *حق الیقین* کی ایک شرح، موسوم بہ *حق المبین*: (۶) ابن الفارض کے *الخمیریۃ* کی شرح (براکلمان: تکملہ، ۱: ۳۶۴): (۷) *رسالة فی النفس* (براکلمان: تکملہ، ۲: ۳۲۵): (۸) *تفسیر البیضاوی* کا حاشیہ (ق: Rieu، ص ۲۱۶ ب): (۹) *الدبیری کی حیوة الحیوان* کا فارسی ترجمہ (ق: Hammer-Purgstall، ۲: ۵۱۸ و عثمانی مؤلفی، ۳: ۷۷، جس میں مصنف کے ایک خودنوشت نسخے کا اندراج ہے)۔ برسلی محمد طاہر نے پانچ مزید تالیفات کا ذکر کیا ہے۔ قیاس ہے کہ یہ کتابیں اس کی نظر سے گزری ہونگی۔

مآخذ: (۱) Babinger، ص ۴۵ بعد اور وہ حوالے جو وہاں دیے ہوئے ہیں، خصوصاً Rieu [Catalogue: of Persian Manuscripts in the British Museum] ص ۲۱۶ تا ۲۱۹: (۲) Hammer-Purgstall، ۲: ۳۳۲ بعد، کردستان میں ادریس کی سرگرمیوں کے لیے (جن میں اکثر ابوالفضل کے ذیل کا تتبع کیا گیا ہے): (۳) [شرف خان بدلیسی: شرف نامہ، طبع ولیامینوف - زرنوف Vellaminof-Zernof، ص ۳۳۲ بعد، ترجمہ فرانسیسی از Charmoy، ۱/۲: ۲۰۸ بعد (جس میں ہشت بہشت کو غالباً سلیم نامہ کے ساتھ التباس کی وجہ سے اسی ہزار اشعار کی ایک منظوم کتاب لکھا ہے۔ اسی غلطی کا C. Huart نے اپنے مقالہ بدلیسی (و: لائلن، بار اول، مقالہ ادریس بتلیسی، در و: ت) میں اعادہ کیا ہے: (۴) *Das Hešt Bihšt des Idrīs Birtsi*: M. Şükrü، ۱۹ (۱۹۳۱ء): ۱۳۱ تا ۱۵۷ (استانبول میں مخطوطات کا جائزہ، بشمول مصنف کی قلمی تحریریں، مؤرخہ ۵۹۱۹ھ، نیز اورخان کی وفات تک کے مندرجات کا تجزیہ): (۵) Storey، ۲/۲: ۴۱۲ تا ۴۱۶ [و: ۱۳۰۶] (سب سے

اس کے بچوں کے ساتھ پلا اور تعلیم حاصل کی - بارہ سال کی عمر میں اسے کردوں کا امیر مقرر کیا گیا - تین سال تک اس عہدے پر فائز رہا [اس کے بعد مزید تربیت کے لیے اسے محمدی بیگ حاکم ہمدان کے سپرد کر دیا گیا، جس کی بیٹی سے اس کا عقد ہو گیا، شرف نامہ، ۱: ۴۵۱]۔ جمادی الآخرہ ۵۹۷۰ / جنوری ۱۵۶۸ء میں اس نے گیلان کی اس فوجی مہم میں حصہ لیا جو کییائی خاندان کے آخری حکمران خان احمد خان (۵۹۴۳ / ۱۵۳۶ء تا ۵۱۰۲ / ۱۶۱۱ء) کے خلاف بھیجی گئی تھی۔ خان احمد خان اس سے پہلے بھی کئی بار صفویوں سے بغاوت کر چکا تھا۔ یہ مہم خان کی گرفتاری پر منتج ہوئی اور شرف خان پھر دربار میں واپس آ گیا۔ شاہ اسمعیل دوم نے اپنی تخت نشینی (۵۹۸۴ / ۱۵۷۶ء) کے موقع پر اسے صوبہ نخچوان و شیروان کی حکومت عطا کی اور کردوں کے امیر الامرا کے خطاب سے سرفراز فرمایا۔ جب ترکوں نے مراد سوم کے زیر قیادت ۵۹۸۶ / ۱۵۷۸ء میں اس علاقے پر حملہ کیا تو شرف خان فتح مند خسرو پاشا کی فوج میں شامل ہو گیا اور یوں اسے بدلیس کی آبائی گدی پھر مل گئی۔

۵۱۰۰ / ۱۵۹۶ - ۱۵۹۷ء میں وہ اپنے فرزند شمس الدین خان کے حق میں دستبردار ہو گیا اور فارسی زبان میں شرف نامہ کے نام سے کردوں کی تاریخ لکھنا شروع کی۔ [لیکن یہاں مقالہ نگار کو تاریخ تصنیف کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے جس کی بنا غالباً شرف نامہ کا وہ نسخہ ہے جو سر جان میلکم کی ملکیت تھا (شمارہ ۲۷۴۶ add، موزہ بریطانیہ) اور جس کے آخر میں تکمیل تصنیف کی تاریخ محرم ۵۱۰۰ء درج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصنیف ذوالحجہ ۵۱۰۰ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ علاوہ ازین شرف الدین ۵۱۰۰ء میں

حکومت سے اپنے بیٹے کے حق میں دست بردار نہیں ہوا تھا بلکہ اس سے بہت قبل کاروبار حکومت اسے سونپ چکا تھا۔ خاتمہ کتاب (۱: ۴۵۶) پر اس کا اپنا بیان یہ ہے: ”امروز کہ تاریخ ہجری در سلخ شہر ذی الحجہ سنہ خمس و الفست، بیمن دولت خاقان عالی شان ابوالمظفر سلطان محمد خان حفظہ اللہ تعالیٰ عن الآفات حکومت موروثی در تصرف فقیر است اگرچہ بالطبع ازین امر خطیر اجتناب نموده اشغال آن را در عہدہ ولد ارشد و فرزند امجد موفق باخلاق نیک ابوالمعالی شمس الدین بیگ . . . کردہ بنا بر شفقت پدر فرزندی چنانچہ داب مؤلفانست چند بیت در نصیحت فرزند از خردنامہ مولانا جامی علیہ الرحمۃ درین مقام ثبت افتادہ . . .“۔ سلطان محمد خان سوم کا عہد ۵۱۰۰ / ۱۵۹۵ء سے ۵۱۰۱۲ / ۱۶۰۳ء تک ہے اور اسی کی مدح و دعا پر اس کتاب کا خاتمہ ہوتا ہے (۲: ۳۰۷)۔ یہی وجہ ہے کہ ريو Rieu (۱: ۲۰۹) نے نسخہ میلکم میں مندرجہ تاریخ کو کاتب کی غلطی قرار دیا ہے۔

شرف نامہ کی دو جلدیں ہیں۔ جلد اول ایک مقدمے، چار صحیفوں اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے:-

مقدمہ: گرد قبائل کی ابتدا اور ان کے رسوم و رواج؛ صحیفہ اول: ان گرد امرا کی تاریخ جو سلاطین تھے (پانچ فصلوں میں)؛ صحیفہ دوم: ان گرد امرا کی تاریخ جو فرمانروا تو تھے مگر انہیں سلطان کا لقب حاصل نہیں تھا (پانچ فصلوں میں)؛ صحیفہ سوم: دیگر گرد امرا کی تاریخ (تین فرقوں میں)؛ صحیفہ چہارم: فرمانروایان بدلیس، یعنی اسلاف مصنف کی تاریخ اور آخر میں ذیل در بیان احوال مصنف۔ جلد دوم میں سلاطین آل عثمان (از ابتدا تا محمد خان سوم) اور ان کے ہم عصر



وی انا ۱۸۵۹ء، ۲۲ : ۱۴۵ تا ۲۰۰ : (۹) Morley :  
*A descriptive catalogue of historical manuscripts in  
the Asiatic and Persian Languages preserved in the  
Library of the Royal Asiatic Society . . .*  
۱۸۵۳ء، ص ۱۳۶ تا ۱۵۰ : (۱۰) C. Rieu :  
*the Persian MSS. in the British Museum*  
۱۸۷۹ء، ۱ : ۲۰۸ تا ۲۰۹ : (۱۱) Storey :  
تا ۳۶۹ : (۱۲) سعید نفیسی : تاریخ مختصر ادبیات  
ایران، در سالنامہ پارس، ۱۳۲۸ ش / ۱۹۴۹ء،  
ص ۳۶ .

(سعید نفیسی [و ادارہ])

- \* بدن : رَکْ بہ جسم .
- \* بدن : رَکْ بہ بودین .
- \* بدن بابا : ایک ولی، جس کے نام سے بابا  
بدن کے پہاڑ موسوم ہیں۔ ان پہاڑوں کو، جو  
۱۳ درجہ ۲۳ دقیقہ و ۱۳ درجہ ۳۵ دقیقہ عرض بلد  
شمالی اور ۷۵ درجہ ۳۷ دقیقہ و ۷۵ درجہ ۵۲ دقیقہ  
طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہیں، سطح مرتفع  
میسور کا بلند ترین سلسلہ کوہ قرار دیا جا سکتا  
ہے۔ روایت ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں  
بابا بدن ہی نے حج بیت اللہ سے واپس آ کر  
اہل ہند کو پہلی بار قہوے کی کاشت سے آشنا  
کیا تھا۔ مسلمان بابا بدن کا مقبرہ ایک غار میں  
بتاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوؤں کے نزدیک اس  
غار میں رشی دتاتریہ غائب ہو گئے تھے اور یہیں  
سے وہ ایک بار پھر وشنو کے آخری اوتار کی آمد کی  
خبر دینے کے لیے برآمد ہونگے۔ یہی وجہ ہے کہ  
یہ غار ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے  
زیارت گاہ ہے۔

مأخذ : L. Rice : *Gazetteer of Mysore and*

Coorg، بنگلور ۱۸۷۹ء : ۲ : ۴۲۹ .

(B. CARA DE VAUX)

بادشاہان ایران و توران کے حالات و وقائع بیان کیے  
گئے ہیں۔ اس کا متن ولید میر ملقب بہ ولیامینوف  
زرنوف V. Veliaminof-Zernof نے مرتب کر کے  
سینٹ پیٹرزبرگ سے شائع کیا (جلد اول ۱۲۷۶ /  
۱۸۶۰ء؛ جلد دوم ۱۲۷۸ / ۱۸۶۲ء)۔ پہلی جلد  
دوسری بار قاہرہ میں ۱۹۳۱ء میں طبع ہوئی۔  
اس کتاب کا ترکی ترجمہ سب سے پہلے  
۱۰۷۸ / ۱۶۶۸-۱۶۶۷ء میں محمد بے بن احمد بے میرزا  
نے کیا، پھر ۱۰۹۵ / ۱۶۸۳ء میں شمعی نے (شمعی  
کا خود نوشت نسخہ کتابخانہ بودلین Bodleian میں  
محفوظ ہے) - F. B. Charmoy نے اس کا فرانسیسی میں  
ترجمہ کیا (شرف نامہ یا تاریخ اکراد، ترجمہ مع  
حواشی وغیرہ، ۲ جلدیں (۴ کتب) سینٹ پیٹرزبرگ  
۱۸۶۸ تا ۱۸۷۵ء)۔

مأخذ : (۱) Wolkow : *Notice sur l'ouvrage*

*persan intitulé scheref Namé*، در JA، ۸ (۱۸۲۶ء) :

۲۹۱ تا ۲۹۸ : (۲) Scheref-Namé: Véliaminof-Zernof

۱ : ۳ بعد : (۳) H.A. Barb : *Geschichtliche Skizze*

ج ۴، در *SBAk. Wien* = *Geschichte der Kurdischen*

*Fürsteherrschaft*، ص ۹۶ بعد : (۴) وہی مصنف :

*Über die unter dem Namen "Tarich el Akrad"*

*bekannte Kurden-Chronik von Sheréf,* در *SBAk. Wien*

وی انا ۱۸۵۳ء، ۱۰ : ۲۵۸ تا ۲۷۶ :

(۵) وہی مصنف : *Geschichtliche skizze der 33 verschie-*

*denen Kurdischen Fürstengeschlechter*، در *SBAk.*

Wien، وی انا ۱۸۵۷ء، ۲۲ : ۳۲۸ : (۶) وہی مصنف :

*Geschichte fünf Kurden-Dynastien*، در *SBAk-Wien*

وی انا ۱۸۵۸ء، ۲۸ : ۳ تا ۵۴ : (۷) وہی مصنف :

*Geschichte von Weitern Kurden-Dynastien*، در *SBAk.*

Wien، وی انا ۱۸۵۹ء، ۱/۳۰ : (۸) وہی مصنف :

*Geschichte der Kurdischen Fürsteherrschaft in*

*Bidlis. Aus dem Scherefname*، در *SBAk. Wien*

\* بَدُو: رَكَ بِهِ بَدُوِي.  
\* بَدُوْح: [(ع) البَدُوْح كى جمع = الفضاء الواسع:  
الارض اللينة الواسعة، ديكھيے لسان] ايک مصنوعى  
طلسماتى لفظ، جو حسب ذيل سادہ سہ سطرى طلسمى  
مربع [المربع الوقى] کے اجزاء سے بنایا گیا ہے :-

۴	۹	۲
۳	۵	۷
۸	۱	۶

اسے حروف ابجد میں یوں لکھا جائے گا :-

ب	ط	د
ز	۵	ج
و	ا	ح

اس مربع کے حروف کے دیگر مجموعے بھی اسی طرح  
مستعمل ہیں، لیکن اتنے عام طور پر نہیں، مثلاً  
بدط، زہج، واح اور ان سب کو ملا کر بھی،  
یعنی بظد، زہج، واح۔ بعض حروف کے اضافے سے بڑے  
مربع بھی بنائے گئے ہیں، جیسے چہار سطرى مبنى  
بر 'ب دوح' اور شش سطرى مبنى بر 'ب ط د واح'۔  
سحر و طلسمات کی قدیم عربى کتابوں (مثلاً  
البونى (م ۵۶۲۲) : شمس المعارف) میں اس نقش  
کی اہمیت نسبتاً کم ہے، لیکن جب سے الغزالیؒ  
نے اسے اپنا کر المنقذ (قاہرہ ۵۱۳۰۳، ص ۴۶ و  
۵) میں نقل کیا اور اس کی بابت کہا کہ ولادت  
کی مشکل صورتوں میں اس سے مدد ملنا یقینی ہے،  
گو اس کی وجہ نہیں بتائی جا سکتی، اس وقت سے دنیا  
بھر میں یہ الغزالیؒ کے سہ سطرى طلسم یا مہر یا  
'نقش' (الوقف، الخاتم، الجدول، المثلث  
للغزالی) کے نام سے مشہور ہو گیا اور بالآخر سارے  
علم [اسرار] الحروف کی بنیاد اور نقطہ آغاز بن گیا۔  
کہا جاتا ہے کہ الغزالیؒ نے اس نقش کو الہام غیبی

کے تحت کتھیےص اور حم عسق کے حروف سے  
مرتب کیا تھا، جن سے قرآن مجید کی انیسویں  
سورۃ [مریم] اور بیالیسویں سورۃ [الشوری]  
شروع ہوتی ہیں اور یہ حروف بجائے خود نقوش  
تعویذی کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں (Reinaud :  
*Monuments musulmans*، ۲ : ۲۳۶)۔ اس نقش کی عملی  
ترتیب و ترکیب کے لیے دیکھیے مفتاح الغیب  
(قاہرہ ۱۳۲۷ھ، ص ۱۷۰ بعد)، مصنفہ احمد موسی  
الزرقاوی، جو عصر حاضر کا ایک مصرى عامل  
ہے اور اس موضوع پر عمومی بحث کے لیے اسی  
کتاب کا چھٹا اور ساتواں رسالہ۔ بعض دوسرے  
لوگوں نے اس نقش کا موجد حضرت آدم علیہ السلام  
کو قرار دیا ہے، جن سے یہ الغزالیؒ تک پہنچا  
(العناية الربانية، ص ۴۴ اور الاسرار الربانية، ص ۱۶)۔  
یہ دونوں کتابیں یوسف محمد الہندی کی تصنیف  
ہیں، جو اس زمانے کا ایک مصرى مصنف نیرنجات  
ہے۔ اس کا ایک خاص رسالہ اس وفق [نقش] پر بھی  
ہے، لیکن یہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ معلوم ہوتا  
ہے ان تمام روایات میں ماہر علوم روحانیات کی  
حیثیت سے الغزالیؒ کی شہرت اور بالخصوص ان کی  
کتاب الجفر کا بھی حصہ ہے (*Journ. Am. Or. Soc.*،  
۲ : ۱۱۳ : *Ibn Tounert : Goldziher*، ص ۱۵ بعد)۔  
اس نقش کی ابتدا کے متعلق یہ خیال بھی ظاہر کیا  
گیا ہے کہ یہ مشہور سیارے اور دیوی زہرہ (Venus)  
کے آرامی الاصل ایرانی نام بیدخت سے مأخوذ ہے  
(*Auszuge aus syrischen Akten persischer : G. Hoffmann*)  
*Martyrer*، ص ۱۲۸ بعد)، اگرچہ الفہرست (۳۱۱ : ۱)  
میں اس نام بیدخت اور اس کے سحرى جناتى خصائص  
کا ذکر موجود ہے اور کہیں کہیں زہرہ کے  
سلسلے میں بھی اس کا حوالہ آتا ہے (مثلاً المقریزی :  
الخطط، قاہرہ ۱۳۲۴ھ، ۱ : ۸ : الثعلبی : قصص،  
مطبوعہ ۱۳۱۴ھ، ص ۲۹ : دونوں میں طباعت کی



نام ہے: Klunzinger : *Upper Egypt*، ص ۳۸۷)۔ اس لفظ کا استعمال انتہائی مختلف صورتوں میں کیا جاتا ہے اور اس سے سعد اور نحس دونوں قسم کے اثرات مرتب کرنے کے لیے کام لیا جاتا ہے؛ چنانچہ Douthe (کتاب مذکور) لکھتا ہے کہ اس سے کثرتِ حیض (ص ۲۳۳)، دردِ معدہ (ص ۲۲۹)، اور عارضی نامردی (ص ۲۹۵) کو دور کرنے اور اپنے آپ کو لوگوں کی نظر سے غائب کرنے (ص ۲۷۵) کا کام لیا جاتا ہے۔ لین Lane نے جس مصری عامل کا ذکر کیا ہے وہ بھی اپنے 'سیاہی کے آئینے' کے ساتھ اس کا استعمال کرتا تھا (*Modern Egyptians*، باب ۱۲)۔ متعدد رسائلِ سحر و طلسمات میں بھی اس کے استعمال کا ذکر ملتا ہے۔ اس کلمے کو نگینوں، دھات کی تختیوں اور انگوٹھیوں پر کھدوا کر ہمیشہ اپنے پاس رکھا جاتا ہے۔ کتابوں کی حفاظت کے لیے اسے ان کے شروع میں لکھ دیا جاتا ہے (جیسے کپیٹج کا لفظ)، مثلاً فتح الجلیل، تونس ۱۲۹۰ھ، میں؛ لیکن اس کا عام استعمال خطوط اور مرسلہ اشیا کے بہ حفاظت پہنچ جانے کے لیے کیا جاتا ہے۔ مذکورہ حوالوں کے علاوہ نیز دیکھیے *Monuments musulmans* : Reinaud، ۲ : ۲۳۳، بعد، ۲۵۱ بعد و ۲۵۶۔

(D. B. MACDONLD)

[دائرة المعارف الاسلامیہ (عربی) کے تعلقہ نگار نے علامہ شرف الدین ابی عبداللہ بن بنت ابی سعید : مستوجبة المحامد فی شرح خاتم ابی حامد کے حوالے سے لکھا ہے کہ بعض مسلمان حصولِ مقصد اور دفعِ ضرر کے لیے انگوٹھیوں اور 'طلسمات' کا سہارا لیتے رہے ہیں؛ چنانچہ وہ اکثر اپنی انگوٹھیوں پر خاتم ابی سعید کندہ کرا لیتے تھے اور کاغذ یا جہلی پر ایک ہرن کی تصویر بناتے، جس کی گردن میں ایک ورقِ آویزاں ہوتا اور اس پر مذکورہ بالا نقش کے ہند سے دوج

غلطیاں ہیں) تاہم سحر اور جنات سے متعلق کتابوں میں اس کا ذکر قطعاً نہیں ملتا۔ بہر حال اتنا ظاہر ہے کہ یہ کلمہ ابتدائی زمانے ہی میں جنوبی عرب میں پہنچ گیا تھا اور عورتوں کے نام اور لقب کے طور پر مستعمل تھا، جسے عربی مادہ (ب ذ خ) کے ساتھ ملتیس کر دیا گیا (لسان، ۳ : ۳۸۳ و تاج العروس، ۲ : ۲۵۲، بذیل مادہ بدخ و بدخ)۔ علاوہ ازیں بدوح کوجب بھی کسی سیارے سے مخصوص کیا جاتا ہے تو وہ زحل ہے اور اس کی دھات سیسا ہے نہ کہ تانبا، جو کہ زہرہ کی صورت میں ہونا چاہیے (مفاتیح، اوپر، ص ۱۷۰)۔ فان ہامر Von Hammer کا یہ خیال کہ 'بدوح' اللہ تعالیٰ کا ایک نام ہے (*Journ. As.*، ۱۸۳۰ء، ص ۷۲) قابلِ لحاظ نہیں، اگرچہ ممکن ہے کہ یہ ترکی الاصل ہو (دیکھیے نیز د ساسی de Sacy، سطورِ ذیل)۔ ایسا ہی ناقابلِ توجہ اس کا بیان کردہ اشتقاق ہے اور وہ کہانی بھی جو میخائیل صباغ Michel Sabbagh نے د ساسی de Sacy کو سنائی تھی (*Chrest. ar.* [= المنتخبات العربیة]، ۳ : ۳۶۳، بعد) کہ بدوح ایک متقی سوداگر کا نام تھا، جس کا مال و اسباب اور خطوط کبھی گم نہ ہوتے تھے، اگرچہ ہو سکتا ہے کہ شام میں عام طور پر اس کی توجیہ یونہی کی جاتی ہو۔ سحر و طلسمات کی کتابوں میں کہیں کہیں اس کلمے کو شخصی نام کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے (مثلاً "یا بدوح"، در الحاج سعدون : الفتح الرحمانی، ص ۲۱)، مگر عوام کے ذہن میں یہ سما گیا ہے کہ بدوح ایک جن ہے اور اس کا نام اعداد میں یا حروف میں لکھ کر اسے تابع فرمان بنایا جا سکتا ہے (*Journ. As.*) سلسلہ چہارم، ۱۲ : ۵۲۱، بعد؛ Spiro : *Vocabulary of Colloq. Egyptian*، ص ۳۶ : Douthe : *Magie et Religion* [= کتاب السحر والدين]، ص ۲۹۶، جہاں وہ "قیوم" کے ساتھ مذکور ہے، گویا یہ بھی اللہ کا

ہوتے تھے۔ اگر مقصود حصول خیر ہوتا تو صرف جفت اعداد لکھے جاتے:

د	ب	۳	۲
	یعنی		
ح	و	۸	۶

اور اگر دفع شر مقصود ہوتا تو صرف طاق اعداد:

ط	۹		
ج	۵	۳	۷
		۱	

چنانچہ جب جفت اعداد جمع کیے جاتے تو لفظ 'بدوح' برآمد ہوتا اور جب طاق جمع کیے جاتے تو 'اجہزط'۔

اگر کوئی شخص کلمہ بدوح لکھ کر اپنے پاس رکھتا تو اسے تھکن کا احساس نہ ہوتا اور اگر کسی مرسلہ شے پر لکھتا تو وہ صحیح و سلامت مرسل الیہ کے پاس پہنچ جاتی۔ اس طرح تاجروں کے ہاں اسے اشیائے تجارت پر اعداد کی شکل میں لکھنے کی ابتدا ہوئی، یعنی ۸۶۴۲۔

مزید برآں حب کے لیے حسب ذیل کلمات کسی خوشبودار کاغذ پر تحریر کر کے ان کی تلاوت کی جاتی:

یا بدوح یا بدوح یا بدوح  
 اَلْفُ بَيْنَ الرُّوحِ وَ الرُّوحِ  
 بِحَقِّ القَلَمِ وَ اللُّوحِ  
 وَ اَدَمَ وَ حَوَّاءَ وَ نوحَ

(ماخوذ از محمد مسعود: تعلیقہ بذیل مادۃ بدوح، در [۱]، عربی)

\* بَدْوَلَت: کاشغر [رک باں] کے امیر یعقوب بیگ کا ایک لقب۔

\* بَدْوِی: خانہ بدوش، گلہ بان یا چرواہے جو نسل، زبان اور ثقافت کے لحاظ سے عرب ہیں،

خاص جزیرہ نماے عرب کے علاوہ ایران، روسی ترکستان، شمالی افریقہ اور بلاد سوڈان کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ مقالہ زیر نظر میں اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ اپنے وطن مالوف میں ان کی طرز زندگی کیسی ہے۔ قدیم زمانے میں خانہ بدوش شکار کرتے اور گری پڑی چیزیں جمع کرتے تھے۔ اس کے برعکس آج کل چرواہوں کی گلہ بانی ایک ایسا دانشمندانہ نظام ہے جس میں ناقابل کاشت اراضی سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ گلہ بانی زراعت کے بعد وجود میں آئی، جس میں سات قسم کے پالتو جانوروں سے کام لیا جاتا ہے، یعنی بھیڑ، بکری اور بیل (جو عہد متأخر حجری کے آخری دور میں مغربی ایشیا میں گلہ بانی اور کھیتی باڑی کا جزو قرار پائے)، گدھا (جسے نقل و حمل کے لیے دھات کے زمانے میں استعمال کیا جاتا تھا) اور اونٹ، گھوڑا اور بھینس (جو پہلے پہل تاریخی زمانے میں استعمال میں آئے)۔

شکار پر گزارا کرنے والے لوگ، جن کی ہرن، بارہ سنگھا، پہاڑی بکرا، شتر مرغ، تغدار (bustard) اور بٹیر وغیرہ پر بسر اوقات تھی، تقریباً ۵۰۰۰ ق م تک غالباً صحراؤں کے واحد باشندے تھے۔ جب عہد متأخر حجری کے کاشتکاروں نے غیر مزروعہ اراضی کے کنارے بستیاں بسانا شروع کیں تو بھیڑ بکریاں پالنے والوں کی توجہ موسمی گھاس پات کی طرف ہوئی اور وہ موسم سرما اور بہار میں اپنے گلے خاصی دور تک لے جانے لگے۔ جب ۱۱۰۰ ق م کے قریب اونٹ سے کام لیا جانے لگا تو ہمہ وقتی خانہ بدوش تقریباً پورا سال صحراؤں میں بسر کرنے کے قابل ہو گئے، تاہم گرمیوں کا زمانہ وہ کنووں، نخلستانوں اور دوامی ندیوں کے آس پاس بسر کرتے تھے۔ جب ۵۰۰ ق م کے بعد بلکہ شاید حضرت عیسیٰ کے عہد میں گھوڑا استعمال میں آیا تو



بائس اور چٹائی سے بنائے ہوئے نیم اسطوانی شکل کے گھروں میں رہتے ہیں، جنہیں وہ موسم بدلنے پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر منتقل کر لیتے ہیں؛ (۳) صحرا کے کنارے کے علاقوں اور خصوصاً کویت کے نواح میں چرواہوں کے قبیلے اور خاندان، جو گدھوں پر سوار ہو کر اپنی بھیڑ بکریوں کو ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ تک لے جاتے رہتے ہیں؛ (۴) خالص بدو، جو صحراے عرب میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ اونٹ پالتے ہیں اور موسم سرما اور بہار میں ایسے علاقوں کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جہاں تازہ تازہ بارش ہوئی ہو اور گرمیاں ایسے مقامات پر گزارتے ہیں جہاں پانی قریب ہو اور مستقل طور پر مل سکے۔

اہلِ بادیه کی یہ چاروں قسمیں ان کے پالتو جانوروں کی جسمانی ضرورتوں اور صلاحیتوں پر موقوف ہیں۔ کوہان دار جانور کو سبز گھاس اور روزانہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بھینسیں کیچڑ میں لوٹنے کے لیے ندیوں یا آبِ پاشی کے نالوں کی ضرورت محسوس کرتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں بھیڑ بکریاں سال کا ایک حصہ سوکھی نباتات پر گزار لیتی ہیں۔ وہ آہستہ رو ہیں اور انہیں ایک دو روز سے زیادہ پانی سے دور نہیں رکھا جا سکتا۔ جن دنوں درجہ حرارت ۱۰۰ فارن ہائٹ ہوتا ہے، اونٹ سترہ روز تک بغیر پانی کے رہ سکتا ہے اور ایک وقت تیس گیلن پانی پی سکتا ہے۔ صحرا کی صعوبتیں برداشت کرنے کی صلاحیت اونٹ میں محض اس لیے نہیں کہ وہ اتنا پانی پی لیتا ہے بلکہ اس لیے بھی ہے کہ وہ یہ پانی اپنے اندر محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اونٹ اپنے طبیعی درجہ حرارت سے ۱۱ فارن ہائٹ زیادہ حرارت برداشت کر سکتا ہے اور پسینے کے ذریعے کچھ زیادہ پانی ضائع نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ اونٹ اپنے کوہانوں

بادیہ عرب کے شتربانوں کے ہاتھ ایک ایسا جانور آگیا جس پر سوار ہو کر اپنے دشمنوں سے کاسیابی سے جنگ کر سکتے تھے اور یوں صحرا میں بدوی زندگی کے عہد زریں کا آغاز ہو سکا۔

صحراے عرب کے بہت سے آثار ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے۔ علاوہ ازیں اونٹ کے استعمال میں آنے کے زمانے سے ملک کی بڑھتی ہوئی خشکی اور قبل از اسلام کے ادبی ماخذ کے تاریخی حوالوں سے پتا چلتا ہے کہ عرب خانہ بدوشوں میں سے اکثر ان کاشتکاروں، تاجروں اور قافلے والوں کی اولاد میں سے تھے جنہوں نے اس زمانے کی ابتدائی صدیوں میں، جب تجارت اور کاشتکاری دونوں پر زوال آیا، بھیڑ بکریوں کے ریوڑ پالنے شروع کر دیے تھے۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے ریاست ہائے متحدہ امریکہ، کینیڈا اور اسٹریلیا کے گوالے (Cowboys) اور چرواہے ان زراعت پیشہ اور شہری لوگوں کی نسل سے ہیں جنہوں نے نئے دریافت شدہ علاقوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ عربوں کی بدوی زندگی نے جس زمانے میں ترقی پائی اور ایک معین صورت اختیار کی وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا درمیانی زمانہ ہے۔

عرب کے اہلِ بادیه کی چار قسمیں ہیں :  
(۱) جبال القارہ اور ظفار کے لوگ، جو بحر ہند کے کنارے آباد ہیں اور "سہری۔سقطری" قسم (Mahri Socotran) کی ساسی زبانیں بولتے ہیں اور کوہان والے جانور چراتے ہیں۔ وہاں موسم گرما میں مون سون کے باعث بارش کثرت سے ہوتی ہے، جس سے جانوروں کے لیے گھاس مہیا ہو جاتی ہے؛  
(۲) جنوبی عراق کے جن علاقوں میں کاشت ہوتی ہے وہاں چرواہوں کے بعض خاندان بھینسیں پالتے ہیں جہاں سے فصل کاٹی جا چکی ہو۔ یہ لوگ

اونٹوں کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ نقل مکانی کے وقت انہیں ہانک کر یا ان پر سوار ہو کر سفر کرتے ہیں اور جب اونٹ چرتے چگتے ہیں تو ان کی دیکھ بھال اور حفاظت کرتے ہیں۔ موسم گرما میں وہ بعض اوقات نخلستانوں میں کھجوریں چتے ہیں یا موتی نکالنے کے لیے ساحل سمندر پر چلے جاتے ہیں۔

ان قبائل کے ہاں لہار بھی ملازم ہوتے ہیں، جو بیشتر حبشی ہوتے ہیں اور آباد علاقوں سے آتے ہیں۔ بعض اوقات شہروں سے دکاندار آتے ہیں، جو بدویوں کے پڑاؤ میں اپنے خاص خیمے نصب کر لیتے ہیں اور اپنی چیزیں فروخت کرتے ہیں۔ اسی طرح اونٹ خریدنے والی بڑی بڑی کمپنیوں کے سفری ایجنٹ کم عمر اونٹوں کا سودا کر لیتے ہیں اور جوان ہونے پر انہیں یہاں سے لے جاتے ہیں۔ اس قسم کا لین دین زیادہ تر بریدہ (واقع نجد) جیسی اونٹوں کی منڈیوں میں ہوتا ہے۔ معزز قبیلوں کے ارکان اکثر سعودی عرب، اردن، شام، عراق اور کویت کے شہروں میں آتے جاتے رہتے ہیں، جہاں ان میں سے بعض کے ذاتی مکانات بھی ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے شہری زندگی اختیار کر لی ہے اور چند ایک مختلف عرب ملکوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

مادی اعتبار سے بدوی ثقافت کا محور ان کی دائمی نقل و حرکت ہے۔ بکری کے بالوں کا سیاہ خیمہ ڈھیلا ڈھالا بنایا جاتا ہے تاکہ ہوا کی آمد و رفت ہوتی رہے۔ اس کے تار گیلے ہونے پر پھول جاتے ہیں جس کے باعث بارش سے بچاؤ رہتا ہے۔ گرمیوں میں یہ سایہ سپہا کرتا ہے جس کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ خیمہ دونوں طرف سے کھلا رہتا ہے تاکہ ہوا آتی رہے۔ سردیوں میں جب اطراف اور عقبی حصہ بند کر دیا جاتا ہے تو یہ گرم رہتا ہے۔ مخصوص خیموں کے علاوہ،

کے اندر چربی کی صورت میں قوت بھی محفوظ رکھتے ہیں۔ عربی گھوڑا جب صحرا میں پالا جاتا ہے تو اس کے لیے پانی باہر سے لایا جاتا ہے۔ اسے دانہ کھلایا جاتا ہے اور بالکل انسانوں کی طرح اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ بھیڑ بکریاں، گائیں، بھینسیں اور اونٹ سب دودھ دینے والے جانور ہیں۔ بکری کے بالوں سے خیمے اور بھیڑ اور اونٹ کی اون سے کپڑے تیار کیے جاتے ہیں۔ ان تمام جانوروں کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔ گھوڑا حمل و نقل کے کام آتا ہے اور میدان جنگ میں بہترین سواری ثابت ہونے کے علاوہ مالک کے وقار اور شان و شوکت میں اضافے کا باعث بھی ہے۔ چونکہ ایک بادیہ نشین عرب کے لیے معاشرے میں باعزت مقام اور آزادی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس لیے گھوڑے کو بھی مناسب احترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔

صحرائشینوں میں قدیم ترین صلیب [رکے بان] ہیں جو غالباً قدیم شکاریوں کی نسل سے ہیں۔ یہ ہم نسل لوگ کالے رنگ کے ہیں ان میں بحیرہ روم کی نسل کی آمیزش ہے اور انہوں نے اپنے آپ کو صحرائی زندگی کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ وہ شمالی عرب کے معزز بدویوں کے درمیان رہتے ہیں اور رہنماؤں، ٹھٹھیروں اور لکڑھاروں کی حیثیت سے ان کی خدمت کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ شکار بھی کھیلتے ہیں۔ ان کی عورتیں سامانِ تفریح سپہا کرتی ہیں۔ قدامت کے اعتبار سے دوسرا درجہ ان قبائل کا ہے جو بھیڑ بکری پالتے ہیں، مثلاً شرارات اور منتفق قبائل۔ یہ لوگ زیادہ تر شتربان قبائل کے زیرنگین ہیں، کیونکہ وہ نسبتاً ادھر ادھر گھومنے کی صلاحیت کم رکھتے ہیں اور اسی لیے مقاومت کے قابل بھی نہیں۔ ان قبائل کے افراد شتربان بدویوں کے ہاں چرواہوں کی حیثیت سے اجرت پر کام کرتے ہیں۔ معزز قبائل کے ارکان



اوقات بے نقاب رہتی ہیں اور بسا اوقات [طلاق یا بیوگی کی وجہ سے] ایک سے زیادہ بار شادی بھی کرتی ہیں۔ شہروں اور نخلستانوں کی عورتوں کے مقابلے میں انہیں زیادہ آزادی حاصل ہے۔ اپنے گھر کے لوگوں کے علاوہ ان کا ایک خاندان قریبی رشتہ داروں پر مشتمل ہوتا ہے اور یہ سب مل کر چراگاہ میں جاتے ہیں۔ اس قسم کے کئی خاندان موسم گرما اکھٹے گزارتے ہیں۔ مقتول کا بدلہ لینے کی ذمہ داری بھی انہیں رشتے داروں پر عائد ہوتی ہے۔ خاندان کے بعد قبیلہ آتا ہے اور اس کے بعد قبائل کا جتھا۔ خالص بدویوں کے ہاں، جنہیں اعراب بھی کہتے ہیں، دو نسلیں تسلیم کی جاتی ہیں،۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو قحطان کی نسل سے ہیں جس کا زمانہ حضرت ابراہیمؑ سے پہلے کا ہے اور دوسرے عرب مستعربہ ہیں، جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ہاجرہؑ کے فرزند حضرت اسمعیلؑ کی اولاد میں سے ہیں۔ حضرت ہاجرہؑ حجاز [مصر] کے ایک بادشاہ کی بیٹی تھیں۔ خالص بدویوں میں عنزہ کے قبائل شامل ہیں، جن میں روئلہ سب سے مشہور قبیلہ ہے۔ شمر اور مرۃ الربع الخالی میں اور اس کی سرحدوں پر آباد ہیں۔ ان کے علاوہ عجمان اور بنو خالد ہیں۔ یہ تمام قبائل باہمی جنگ و جدال کے وقت شجاعت کے ایک نہایت سخت ضابطے کی پابندی کرتے ہیں۔

صحرا کے یہ معزین اونٹ پالتے ہیں اور ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکان کرتے رہتے ہیں۔ ان کو زیادہ تر ایسی چراگاہوں سے سروکار رہتا ہے جو سرما اور بہار میں انہیں میسر آسکیں۔ ان چراگاہوں کا محل وقوع ہر سال بدلتا رہتا ہے، کیونکہ جہاں بارش زیادہ ہوتی ہے وہاں چراگاہیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ان کے پڑاؤ میں زیادہ تر وہ لوگ کام کرتے ہیں جن کی زندگی کا وہ سہارا

جو صرف ڈیوانوں یا استقبالیہ کمروں کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں، ہر خیمہ پردے کے ذریعے دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ایک کو 'زان خانہ' یا 'اندرون خانہ' کہا جاسکتا ہے، جس میں عورتیں اور بچے رہتے ہیں اور دوسرے کو 'سہمان خانہ' کہا جاسکتا ہے، جہاں گھر کا سربراہ اپنے دوستوں کو بٹھاتا ہے۔ باورچی خانے کے برتن دھات اور لکڑی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن ہر گھر میں اکثر قہوہ پینے کے لیے چینی کے پیالوں کا ایک سٹ بھی ہوتا ہے، جسے بڑی احتیاط سے ایک خانے دار چوبی صندوق میں سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ عربوں کا لباس ڈھیلا ڈھالا اور کشادہ ہوتا ہے، جو سردیوں میں گرم اور گرمیوں میں سرد رہتا ہے، کیونکہ یہ سرد اوو گرم خشک دونوں طرح کی ہوا سے محفوظ رکھتا ہے۔ مردوں کے سر کا لباس اور عورتوں کے سر کی پوشش اور نقاب بھی آنکھوں، ناک اور کانوں کو گرد اور ریت سے بچاتا ہے۔ بدویوں کو تمام اشیائے ضرورت باہر سے خریدنا پڑتی ہیں اور ان میں زیر جامے، اوزار اور برتن بھی شامل ہیں۔ یہی حال ان کی اکثر اشیائے خوردنی کا ہے، مثلاً گیہوں، چاول، کھجوریں، قہوہ؛ صرف دودھ اور گوشت اپنے ہاں سے حاصل ہوتا ہے۔

دوسری سامی اقوام کی طرح بدوی بھی شجرہ نسب کے لحاظ سے بہت سے قبائل میں اور اٹالوں کے باہمی روابط میں خونی رشتے کو سب سے بلند درجہ دیتے ہیں۔ چچا زاد بیٹی کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرنے کو ترجیح دی جاتی ہے اور نسل باپ کی طرف سے شمار ہوتی ہے۔ طلاق آسانی سے دی جا سکتی ہے۔ کثرت ازدواج کا رواج ہے اور ایک سے زیادہ بیویاں بیک وقت بھی ہوتی ہیں اور بچے بعد دیگرے بھی۔ بدوی عورتیں اکثر

جذبہ آج بھی ان کی رسوم میں شامل ہے۔ بدویوں کی سیاسی حیثیت مختلف زمانوں میں بدلتی رہی ہے۔ جب مرکزی حکومتیں، جن کے ساتھ قبائلی علاقے ملحق ہوتے ہیں، کمزور ہو جاتی ہیں تو اعلیٰ مرتبے کے شیوخ عملاً بادشاہ بن جاتے ہیں، حتیٰ کہ شہری بھی انہیں خراج ادا کرتے ہیں۔ جب کبھی مرکزی حکومتیں مستحکم ہوتی ہیں تو ان شیوخ کا اختیار اور اقتدار اپنے اپنے علاقے تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ بدوی آج کل حسب ذیل حکومتوں کی حدود میں آباد ہیں: سعودی عرب، یمن، عدن، مسقط، عمان، کویت، عراق، شام، لبنان، اردن، فلسطین، مصر اور شمالی افریقہ کے ممالک۔ یہ حکومتیں اکثر کوشاں رہتی ہیں کہ ان کے علاقے کے بدوی اپنے مقام پر ٹھہرے رہیں۔ چند ایک ملکوں میں بعض بدویوں کو تازہ مزروعہ اراضی پر آباد کرنے کے منصوبے بھی بنائے گئے ہیں۔ زیر زمین پوتوں کے ساتھ ساتھ نئے پانی کے تالابوں کو متعدد قبیلے استعمال کرتے ہیں جن میں رویلہ بھی شامل ہیں۔

قبیلہ دواسر کا اصلی وطن نجد تھا۔ اس کا ایک حصہ خلیج فارس اور وہاں سے جزیرہ بحرین میں منتقل ہو گیا۔ ۱۹۲۳ء میں یہ لوگ اپنے اصل ملک میں لوٹ آئے اور الخبر اور دمام میں آباد ہو گئے۔ گزشتہ تیس سال میں بعض دواسر نے عربین امریکن آئل کمپنی (Arabian American Oil Company) میں کام کرنے کے بعد اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا ہے، جن میں تعمیرات اور حمل و نقل کا کاروبار بھی شامل ہے۔

آج کل بدوی ایک انقلابی دور سے گزر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اب تک گوشت، کھال اور اون کی فروخت کے لیے اونٹ پالتے ہیں؛ باقی ٹھہرے ہیں، کاریگر ہیں؛ تیل نکالنے والی مشینوں کو چلانے والے ناہر ہیں اور اپنے بچوں

ہیں، مثلاً غلام، صلیب، اجرت پر کام کرنے والے چرواہے اور لہار۔ ان سب لوگوں کو غیر متحارب سمجھا جاتا ہے۔ ایک بدوی شیخ اپنے وسیع خیمے میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر خاطر و مدارت کرتا ہے، جہاں اس کے قبیلے کے لوگوں کو مہمانوں کے لیے بڑی کثیر مقدار میں کھانے پینے کی چیزیں مہیا کرنی پڑتی ہیں۔ قہوہ نوشی کی رسم انتہائی وضعداری کے ساتھ نباھی جاتی ہے اور تقریباً ہر وقت جاری رہتی ہے۔ دوسرے قبائل کے لوگ [دشمن کے] انتقام سے بچنے کے لیے اس کے پاس پناہ لیتے ہیں۔ مسافر اس کے ماتحت علاقے میں اس کے محافظوں کی حفاظت میں سفر کرتے ہیں۔ قبائل کی باہمی لڑائی کے دوران میں، جو عموماً کسی چراگاہ کے حقوق کی خاطر لڑی جاتی ہے، وہ میدان جنگ میں اپنے قبیلے کی خود قیادت کرتا ہے۔ شجاعت، سخاوت اور صائب الرائے ہونا شیخ کی روایتی صفات سمجھی جاتی ہیں۔ شیخ کا رتبہ ورثے میں نہیں ملتا بلکہ اس کا انتخاب اعلیٰ ترین گھرانے میں سے اور اکثر شدید مقابلے کے بعد کیا جاتا ہے۔ ٹرکوں، بسوں، ریل اور ہوائی جہازوں کے استعمال میں آنے سے پہلے جہاں تک صحرائی تجارت کا تعلق ہے بدوی رہبری کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔ وہ بعض قافلوں کی حفاظت کرتے تھے اور بعض کو لوٹتے تھے، جن میں حاجیوں کے بڑے بڑے قافلے بھی شامل ہوتے تھے۔ بدوی مسلمان ہیں اور عقائد کے اعتبار سے سنی۔ بہت سے (خصوصاً مشرقی عرب میں) مالکی عقیدہ رکھتے ہیں، لیکن وہابی سب کے سب حنبلی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شہریوں کے مقابلے میں بدوی مذہبی فرائض کی ادائیگی میں نسبتاً کم وقت اور ہمت صرف کرتے ہیں، لیکن بعض اوقات ہم اس سے بالکل برعکس صورت سے بھی دو چار ہوتے ہیں۔ اسلاف کی عزت اور احترام کا



۱۹۳۷ء: (۱۷) A. Musil, *Arabia Deserta*, نیویارک  
 ۱۹۲۷ء: (۱۸) وہی مصنف: *Manners and customs of the Rwala Bedouins*  
 (۱۹): ج ۶, *Am. Geog. Mem.* در  
 ۱۹۲۷ء: (۲۰) D. L. O'Leary, *Arabia before Muhammad*, لنڈن  
 ۱۹۰۰-۱۸۹۹ء: *zum Persischen Golf*, برلن  
 مصنف: *Die Beduinen*, جلد ۲، لائپزگ ۱۹۳۹ء و  
 ۱۹۳۳ء: (۲۲) C.R. Raswan, *Tribal areas of the north Arabian Bedouins*  
 در *Am. Geog. Rev.*  
 ۱۹۳۰ء: (۲۳) وہی مصنف: *Drinkers of the wind*  
 لنڈن ۱۹۳۰ء: (۲۴) *Black tents of Arabia*, نیویارک  
 ۱۹۳۷ء  
 عمومی تصنیفات: (۱) *The Arabian peninsula*  
 انگریزی میں رسائل، کتب اور مقالات کی منتخب محشی  
 فہرست، لائبریری آؤ کانگریس، واشنگٹن ۱۹۵۱ء: (۲)  
 ۱۹۳۲ء: *Arabia Felix*: Thos. Bertram  
 (۳) Sir R. Burton, *Personal narrative of a pilgrim- age to al-Madinah and Meccah*  
 لنڈن ۱۸۹۸ء:  
 (۴) R. E. Cheesman, *In unknown Arabia*, لنڈن  
 ۱۹۲۶ء: (۵) C.S. Coon, *Southern Arabia, a problem for the future*  
 Peabody Museum papers, ۱۸۷۰ء تا  
 ۲۲، مخطوطات کیمرج (امریکہ) ۱۹۳۳ء: (۶) وہی مصنف:  
*Caravan, the story of the middle east Arabian journey and other desert travels*  
 لنڈن ۱۹۵۰ء: (۸) V. H. W.  
 (۹) Dowson, *The Date and the Arab*: در *J.R. Cent. A.S.*  
 ۱۹۳۹ء: ج ۳ تا ۳۱: (۹) J. Heyworth - Dunne  
*Bibliography and reading Guide to Arabia*, قاہرہ  
 ۱۹۵۲ء: (۱۰) D. G. Hogarth, *The Penetration of Arabia*  
 نیویارک ۱۹۰۳ء: (۱۱) وہی  
 مصنف: *Arabia*, اوکسفورڈ ۱۹۲۲ء: (۱۲)  
*Report on the social economic and*: H. Ingrams

کو سکولوں اور کالجوں میں تعلیم دلوا رہے ہیں۔  
 آج وہ مشینی دور میں بھی اپنے آپ کو نئے  
 سانچوں میں اسی طرح ڈھال رہے ہیں جس طرح  
 گزشتہ زمانے میں موقع ملنے پر انہوں نے اپنے آپ  
 کو صحرائی زندگی کے مطابق ڈھال لیا تھا۔  
 مآخذ: بالخصوص بدویوں کے بارے میں  
 تصنیفات: (۱) *Bedouin love, law and legend*: Aref el Aref  
 بیت المقدس ۱۹۳۳ء: (۲) وہی مصنف:  
*القضاء بين البدو*: (۳) T. Ashkenazi, *Tribus semi-nomades de la Palestine du Nord*  
 بیروت ۱۹۳۸ء:  
 (۴) Lady A. Blunt, *Bedouin tribes of the Euphrates*  
 لنڈن ۱۸۹۷ء: (۵) J. C. Burckhardt, *Notes on the Bedouins and Wahabys*  
 لنڈن ۱۸۳۱ء: (۶) W. Caskel, *The Bedouinization of Arabia*  
 Amer. Anthro-  
 pologist, ۱۹۵۳ء: ص ۳۶ تا ۴۶: (۷)  
 H. Charles, *Les tribus moutonnières du Moyen Euphrate*  
 بیروت ۱۹۳۹ء: (۸) L. F. Clauss, *Als Beduine unter Beduinen*  
 Freiburg i. B. ۱۹۵۳ء:  
 (۹) G. Levi Della Vida, *Pre-Islamic Arabia*  
 در *The Arab Heritage*, پرنسٹن ۱۹۳۳ء، ص ۲۵ تا  
 ۵۷: (۱۰) H.R.P. Dickson, *The Arab of the Desert*  
 لنڈن ۱۹۳۹ء: (۱۱) R. P. Dougherty, *The Sealand of Ancient Arabia*  
 تحقیقات، جلد  
 ۱۹، نیو ہون: (۱۲) Chas. M. Doughty, *Travels in Arabia Deserta*  
 La tente: C. G. Feilberg, (۱۳) *Etnografisk noire, Nationalmuseets Skrifser*  
 در *Rekke*, ج ۲، کوپن ہیگن ۱۹۳۳ء: (۱۴) H. Fjeld, *The Yezidis, Salubba, and other tribes*: J.B. Glubb  
 سلسلہ عمومی، در *Anthrop.* شمارہ ۱۰، ۱۱،  
 ۱۹۳۳ء: (۱۵) T. E. Lawrence, *The seven pillars of wisdom*: R. Montagne, (۱۶) *La civilisation du désert: nomades d'Orient et d'Afrique*

(۱) بھیڑ بکری والے خانہ بدوش :  
 'خانہ بدوش' (Nomad) اور 'خانہ بدوشی'  
 (Nomadism) کی اصطلاحوں کو اگر ان کے مخصوص  
 مفہوم، یعنی 'چراگہ کی تلاش میں ایک مقام  
 سے دوسرے مقام کو منتقل ہونا' (Concise Oxford  
 Dictionary)، میں استعمال نہ کیا جائے تو علمی  
 اعتبار سے ان کا اطلاق مشکل ہو جاتا ہے۔  
 خانہ بدوشی کا مطلب ہے غیر مستقل سکونت کی زندگی  
 اور جا بجا اپنے پالتو مویشیوں کے ریوڑوں کو چراتے  
 پھرنا : لہذا گری پڑی چیزیں جمع کرنے والے  
 خانہ بدوشوں، شکار پر بسر اوقات کرنے والوں اور  
 جا بجا نقل مکانی کر کے کاشت کرنے والی اقوام (لدنگ  
 ladang، بلپہ milpa، دیکھیے Gourou) کو  
 خانہ بدوش کہنا درست نہیں۔ اگر ہم ساور (C. O.)  
 کے نظریے کے مطابق (۱۹۵۲ء) پرانی دنیا میں  
 زراعت کی ابتدا کے سلسلے میں غور کریں، جس پر  
 مصنفین نے اپنے مقالوں (۱۹۵۶ء و ۱۹۵۷ء) میں مفصل  
 بحث کی ہے، تو معلوم ہوگا کہ اپنے محدود  
 مفہوم کے اعتبار سے بدویت درخت لگانے اور  
 گھریلو جانور، مثلاً کتے، سور اور مرغیاں وغیرہ،  
 پالنے کے بہت بعد ظہور میں آئی (ساور Sauer  
 نے گھریلو جانوروں اور ریوڑ والے جانوروں کے  
 درمیان امتیاز کیا ہے)۔

ساور کی تشریح کے مطابق کاشتکاری اور  
 جانوروں کے پالنے کے مراکز (جن کا تسلسل تاحال  
 ایک مفروضہ ہے) دریاؤں کے کناروں اور خلیج  
 بنگال کے ارد گرد مرطوب جنگلوں کے کناروں پر  
 شروع ہوئے جو خط استوا پر واقع ہیں اور جہاں  
 ماہی گیر آباد تھے۔ ان ماہی گیروں نے شکار  
 کھیلنے اور پودے اور سیپیاں جمع کرنے کے علاوہ  
 گھریلو جانور (مثلاً کتے، سور اور مرغیاں) پالنے اور  
 کھمبیاں اور پھل دار جھاڑیاں اور پیڑ لگانے شروع

مطبوعہ 'political conditions of the Hadhramaut  
 H. M. Stationery Office، لندن ۱۹۳۶ء؛ (۱۳) وہی  
 مصنف، 'A Journey in the Yemen'، در J.R. Cent. A.S.،  
 ۱۹۳۶ء، ص ۵۸ تا ۶۹؛ (۱۴) A. Jaussen، 'Coutumes  
 des Arabes au pays de Moab'، پیرس ۱۹۰۸ء؛ (۱۵)  
 M. Steineke و G. Rentz و R. Lebkicher، 'Saudi  
 Arabia'، نیویارک ۱۹۵۲ء؛ (۱۶) L. Lockhart،  
 'Outline of the History of Kuwait'، در J. R. Cent. A. S.  
 ۱۹۳۷ء؛ (۱۷) D. van der Meulen، 'Aden to the Hadramaut,  
 a journey in South Arabia'، لندن ۱۹۳۷ء؛ (۱۸)  
 S.B. Miles، 'Countries and tribes of the Persian Gulf'،  
 لندن ۱۹۱۹ء؛ (۱۹) H. St J. Philby، 'Heart of Arabia'،  
 لندن ۱۹۲۳ء؛ (۲۰) وہی مصنف، 'The Empty Quarter'،  
 لندن ۱۹۳۳ء؛ (۲۱) وہی مصنف، 'Arabian Highlands'،  
 نیویارک ۱۹۵۲ء؛ (۲۲) G. Rentz، 'Literature on the  
 Kingdom of Saudi Arabia'، در Middle East Journal،  
 ۱۹۵۰ء؛ (۲۳) وہی مصنف، 'Recent literature on Hadramaut'،  
 در مجلہ مذکور، ۱۹۵۱ء، ص ۳۷۱ تا ۳۷۷؛ (۲۴)  
 R. H. Sanger، 'The Arabian Peninsula'، اتھاکا  
 (نیویارک) ۱۹۵۴ء؛ (۲۵) K. S. Twitchell، 'Saudi  
 Arabia, etc.'، بار دوم، پرنسٹن ۱۹۵۳ء؛ (۲۶) F. S. Vidal،  
 'Date culture in the Oasis of al-Hasa'، در Middle  
 East Journal، ۱۹۵۴ء؛ (۲۷) A. J. Villiers، 'Sons  
 of Sinbad'، نیویارک ۱۹۴۹ء۔

(CARLETON S. COON)

۲۔ جغرافیائی اعتبار سے

خانہ بدوشی کی ابتدائی تاریخ

(۱) بھیڑ بکری والے خانہ بدوش۔

(ب) اسپ سوار خانہ بدوش۔

(ج) عرب کے بدویوں کی خانہ بدوشی۔

(د) شمالی افریقہ میں شتر سوار بدویوں کا

ظہور۔



کا تعلق ہے۔ گلگت میں شن (شنا) قوم کی دور افتادہ وادیوں میں مار خور، یعنی بیج دار سینگوں والے جنگلی بکرے اور پہاڑی بکرے کو (غیر مسلم باشندوں میں) مقدس سمجھا جاتا ہے، جنہیں ان کے خیال میں ”دیویاں پالتی ہیں“۔ پالتو بکری بھی، جو اس علاقے کے جنگلی بکرے کی نسل سے ہے، قابل تعظیم ٹھہرتی ہے۔ شن (شنا) کی معیشت ان چیزوں پر مشتمل ہے: کہیں کہیں باجرے کی معمولی کاشت، بڑے پیمانے پر بکریاں پالنا اور مار خور اور پہاڑی بکرے کا شکار۔ جٹمر Jettmar نے اس دعوے کی تائید میں بہت سے شواہد پیش کیے ہیں کہ بکریاں پالنے کا آغاز انہیں علاقوں سے ہوا۔

بڑے بیج والے غلے ("Halmgetreide") کی حیثیت سے 'دورویہ جو' (Hordeum spontaneum) کی کاشت اس علاقے میں اس سے پہلے ہی ترقی کے مراحل سے گزر چکی ہوگی۔ اگر اس سے پہلے نہیں تو کم از کم اسی مرحلے پر چھوٹے پیمانے پر آب پاشی کا سلسلہ بھی غالباً جاری ہو گیا تھا۔ لیکن آثار قدیمہ کی رو سے ترقی کے حسب ذیل مرحلے کے بارے میں، جس نے زندگی کے معاشرتی و معاشی انداز میں ایک بوقلمونی پیدا کر دی تھی، اب ثبوت مہیا ہو چکے ہیں۔ مغربی ایشیا کے کوهستانی علاقوں اور پہاڑوں میں، مغربی ایران اور شام کے درمیان کسی جگہ مویشی پالے جاتے تھے اور یہاں بھیڑ بکریاں پالنے کی بنیادی فلاحت میں یہ اضافہ ہوا کہ قدیم گندم (Triticum dicoccum, emmer) و T. monococcum و einkorn اور جس کی املا T. spelta کی صورت میں بھی ممکن ہے) کی کاشت ہونے لگی۔ اس سے ایک مکمل نظام کاشتکاری کی بنیاد پڑی، جو آگے چل کر عراق اور مصر کی قدیم تہذیب کی اساس ثابت ہوا۔

کیوڈے (قہ نیز Werth, Menghin, Hettner, E. Hahn (۱۹۰۰ء، ۱۹۰۳ء، Smolla, Dittmer)۔ بعد ازاں تخم دار ہودوں ('باجرو'۔ یہ اصطلاح چھوٹے چھوٹے بیج والے غلے کی مختلف اقسام، نیز دالوں اور ایسے ہودوں کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے جن سے تیل نکالا جاتا ہے) کی کاشت بھی سب سے پہلے ہندوستان کے ایسے جنگلوں اور گیاہستانوں میں ہونے لگی جو سردیوں میں خشک ہو جاتے ہیں اور جن میں آسانی سے آگ لگ سکتی ہے۔ ان ہودوں میں پروٹین اور روغن ہوتا ہے، جس سے انسان جانوروں کے گوشت اور بالخصوص مچھلی سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔

معیشت کی اس مسلسل ترقی نے انسان کو 'کائنات کا سردار' بنا دیا اور اب اگلا قدم یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بکریاں اور (پھر) بھیڑیں ان علاقوں میں پالتا تھا جو ہندوستان کے شمال مغرب میں کوہ ہندوکش کے گرد و نواح میں واقع ہیں۔ اس کی تحریک غالباً اس امر سے بھی ہوئی کہ تخم دار ہودوں کی کاشت کرنے والوں اور پہاڑی شکاریوں کے درمیان قریبی رابطہ موجود تھا، جن کی نظروں میں جنگلی بکری یا بھیڑ کو مقدس جانور کا درجہ حاصل تھا۔ اس طرح ایک ایسی ثقافت ظہور میں آئی جس سے کاشتکاروں اور شکاریوں کے ساتھ رہوڑ پالنے والوں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ اگر فلاحت میں ہمارے نزدیک کہتی ہاڑی اور جانوروں کی پرورش دونوں شامل ہیں تو اسے 'بھیڑ بکری پالنے والی معیشت' ("Kleinvieh-Bauerntum") کی ابتدائی منزل سمجھنا چاہیے۔

انسانی نسلوں کی تحقیق کے لیے فریڈریش (A. Friedrich) جس سہم پر گیا تھا اس کے نتائج (Jettmar) ص ۱۹۰۷ ب) سے اس مفروضے کی تائید ہوتی ہے، خصوصاً جہاں تک بکری

طبقة کا سراغ سات ہزار سال ق م پرانا ملتا ہے، ہنوز ہمیں Kenyon اور Zeuner نے (بکری کے سوا) وہاں کے پالتو جانوروں اور کاشت شدہ تخم دار پودوں کے بارے میں کسی قسم کی معلومات سپہا نہیں کیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اریحا کے قدیم ترین طبقے سے بھی زیادہ قدیم اور غالباً فلسطین کی ناتوفی (Natufian) ثقافت ہے۔ ساور Sauer اور البرائٹ Albright (۱۹۳۹ء، ص ۱۲۹) کی طرح ہم بھی فرض کر سکتے ہیں کہ تخم دار پودوں کی زراعت (غالباً باجرے کی بعض اقسام کی کاشت) ناتوفی مرحلے میں پہلے ہی سے جاری ہو چکی تھی (قب Clark، Narr ۱۹۵۶ء)۔

دوسری طرف ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مسیح<sup>۳</sup> سے نو ہزار سال پہلے کا زمانہ دنیا بھر میں بے حد سردی کا زمانہ تھا (برف کے تودے glaciers آگے بڑھ رہے تھے، مثلاً شمالی یورپ میں سلپوسلکی 'Salpuusselkue' کے، ایلپس میں شلورن 'Schlern' کے اور شمالی امریکہ میں 'بڑی جھیلوں' (Great lakes) تک منکائو 'Mankato' کے تودے؛ اسی طرح مشرقی پیگونیا Patagonia میں پیڈمونٹ Piedmont جھیلوں کے گرد برف کے چشمے کے ساتھ بہ کر آئے ہوئے چٹانوں کے ٹکڑے)۔ اُس وقت آج کل کے مقابلے میں خط یخ ۸۰۰ میٹر بلکہ اس سے بھی زیادہ نیچے واقع تھا (Firbas، Caldenius، Butzer، Rathjens، Gross، Deevey) لیکن تقریباً ۵۵۰۰ ق م سے ۲۵۰۰ ق م تک درجہ حرارت زمانہ حال کے مقابلے میں ساری دنیا میں زیادہ تھا؛ چنانچہ خط یخ، عمارتی لکڑی کا خط (timber line) اور قوت بخش غلے (potential cereal) کا خط موجودہ زمانے کے خطوط کی نسبت تقریباً چار چار سو میٹر بلند واقع تھے (Mittlere Wärmezeit : Thermal Maximum)۔ یہ بات مجھے بعید از قیاس نظر آتی ہے کہ برف کے تودوں (glaciers) کی پیش قدمی یا سخت یخ بستگی

یہ چار بڑی ثقافتیں، جن میں جانور پالے اور پودے لگائے جاتے تھے، ایک دوسرے پر مبنی تھیں۔ انہیں محض ایک متحرک مرکز سمجھنا چاہیے، جو خلیج بنگال کے قریب ظہور پذیر ہوا اور بڑھتے بڑھتے بالآخر عراق کے اطراف کوہستانی علاقوں اور پہاڑوں تک پہنچ گیا۔ ان چاروں مرحلوں سے (ثقافتی) دھارے نکل کر دنیا کے بڑے بڑے وسیع علاقوں تک پھیلے۔ ان تخلیقی مراکز کے مقابلے میں دوسرے تمام علاقے کم و بیش ساکن و جامد دکھائی دیتے ہیں۔ وہاں اپنے اپنے ثقافتی یا موسمی حالات کے مطابق ان اثرات کو بعینہ یا بہ ترمیم قبول کیا گیا یا رد کر دیا گیا۔ معیشت کے مذکورہ بالا مراحل کی ترتیب زمانی کے لیے ہمیں جو اولیٰ مواد ملتا ہے وہ مٹی کے برتن بنانے کے زمانے سے پہلے کی بستیوں کا ریڈیو کاربن مواد ہے۔ ان میں سے بعض بستیوں میں کاشتکاری کا مکمل نظام موجود تھا؛ مثلاً ۴۵۰۰ ق م کے قریب ایک بستی قلعة جرمو کے نزدیک پہاڑیوں میں کرٹوک کے مشرقی جانب واقع تھی، جس میں آب پاشی کا کوئی نظام رائج نہ تھا (Braidwood)، یا اریحا (Jericho) کی بستی، جو حضرت مسیح<sup>۳</sup> سے تقریباً سات ہزار سال پہلے تھی۔ یہ بستی قلعة بند تھی اور یہاں آب پاشی کا انتظام تھا۔ البرائٹ W. F. Albright کے نزدیک مؤخر الذکر تاریخ مشکوک ہے (زبانی اطلاع)۔ قلعة جرمو میں جو قدیم گندم (emmer) اگائی گئی وہ بعد کے زمانے کی کاشت شدہ گندم (emmer) کے مقابلے میں جنگلی قسم کے قریب تر تھی (Helbaek و Schieman، بذریعہ مراسلہ)۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت قدیم گندم (emmer) کی کاشت کے آغاز پر کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔ اریحا میں دریافت شدہ نخلستانی بستی کے قدیم ارضی



و تمدن کی اشاعت کے لحاظ سے، نیز قبائل (Pocch) کے انتشار کے اعتبار سے بہت ہی اہم رہا ہے، خصوصاً ان زمانوں میں جب کاشتکاری اور بھیڑ بکریوں کی پرورش کا رواج بڑھا۔ عرب اور حبشہ میں جنگلی بکریاں قطعاً موجود نہیں تھیں، لیکن ان ملکوں میں بھی پہاڑی بکروں کی تقدیس اور مذہبی رسوم کے لیے ان کے شکار کا تصور پھیل گیا تھا۔ آخری عہد ہزار سالہ قم میں جنوبی عرب میں پہاڑی بکرے کی ہوجا ہوتی تھی اور پہاڑی بکرے کی شکل کا دیوتا 'ثعلب' بھیڑ بکریوں کا محافظ سمجھا جاتا تھا (Höfner, Beeston)۔

حضرموت میں آج تک پہاڑی بکرے کا شکار مذہبی رسوم میں شمار ہوتا ہے (van der Meulen و von Wissmann، ص ۱۷۷ بعد)۔ معلوم ہوتا ہے کہ بدری (Badarian) ثقافت میں نیز ۴۰۰۰ قم کے بعد بالائی مصر کی نقادہ ثقافت میں بیل کے ساتھ پہاڑی بکرے کو یہی حیثیت حاصل تھی (Brunton، جدولیں)۔ یہاں اس امر کا ذکر بھی ضروری ہے کہ Agatharchides (نواح ۱۳، قم: Geogr. Graec. Min.: C. Müller، ۱: ۱۵۳) نے بخیرہ قلزم کے مغربی ساحل کے نزدیک غاروں میں رہنے والوں (Troglydytes) کا ذکر کرتے ہوئے (جو بلیمیہ Blemmyes اور بجا کے نام سے مشہور ہیں) لکھا ہے کہ وہ بیلوں اور سینڈھوں کو اپنا باپ اور گایوں اور بھیڑوں کو اپنی ماں کہتے تھے۔

بھیڑ بکریاں ہالنے اور باجرے کی کاشت کرنے والی ثقافت، نیز مویشی ہالنے کے مکمل نظام معیشت اور بڑے بیج والے اناج کی کاشت کاری کی ثقافت کی ابتدا کم و بیش ایسی آب و ہوا اور نباتات تک محدود تھی جن کا تعلق چھدرے جنگلات سے ڈھکے ہوئے میدانوں اور نیم صحرائی علاقوں، نیز طبعی اور مصنوعی نخلستانوں سے تھا۔ ان تمام علاقوں کی زمین ہلکی

کے دور میں ہندوستان کے شمال مغرب کے پہاڑوں میں بھیڑ بکریوں کے ریوڑ ہالنے والی ثقافت ظہور میں آئی ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ چیز تودوں کی رجعت کے دور میں اور غالباً اس دور کے نصف اول میں واقع ہوئی ہوگی۔ یہ رجعت ۸۱۰۰ قم سے ۵۵۰۰ قم تک برابر جاری رہی۔ درجہ حرارت یک لغت بڑھ گیا اور عمارتی لکڑی اور قوت بخش غلے کے خطوط ان بلندیوں تک پہنچ گئے جن کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ انتہائی درجہ حرارت (Thermal Maximum) کے دور کے قریب اور اس کے دوران میں بھیڑیں ہالنے کی معیشت تبت بھر میں پھیل گئی، کیونکہ اس زمانے میں وہاں کا موسم اس کام کے لیے کہیں زیادہ موزوں تھا۔ یہ ثقافت خالص بدوی نہ تھی (قَب Kussmaul, Hermanns)۔ غالباً یہاں 'شش رویہ جو' (Hordeum vulgare، یعنی hexastichum) کی کاشت شروع ہوئی، جس کی جنگلی قسم غالباً *Hordeum agriocriton* ہے، جو ہمیں لاسا کے گرد و نواح اور مشرقی تبت میں دستیاب ہوئی ہے (Schiemann 'Freisleben' ۱۹۳۸، ۱۹۵۱ء)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شش رویہ جو کی تمام کاشت شدہ اقسام اسی قسم سے نکلی ہیں۔ یہ اقسام چین اور ہندوستان میں پھیل گئیں اور غالباً ہندوستان سے جنوبی عرب اور حبشہ (جو انحراف انواع کے اعتبار سے ثانوی مرکز بن گیا) اور وہاں سے بالائی مصر میں پہنچیں، جہاں کاشت شدہ قدیم گندم (emmer) شام سے پہنچی اور حضرت مسیحؑ سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے شش رویہ جو کے ساتھ ہوئی جاتی تھی (Gardner و Caton Thompson، Kees, Arnold, Libby, Brunton)۔

معلوم ہوتا ہے کہ جو راستہ ہندوکش اور مشرقی ایران سے جنوبی عرب اور پھر وہاں سے الریقہ کو جاتا تھا وہ ایک مدت دراز تک تہذیب

آب پاشی شروع کی تو ان کے سامی ہمسائے اسی قسم کے گلہ بان قبائل تھے اور نیم بدوی زندگی بسر کرتے تھے۔ مغربی سامی (آسوری) بیشتر ۲۱۰۰ ق م سے ۱۹۰۰ ق م تک اہل بابل کو دہاتے رہے۔ یہ قدیم بدوی لوگ عرب معاشرے کی جدید صنف سے، خواہ وہ بدوی ہوں یا نیم بدوی یا صلیب (صلبہ)، مختلف تھے۔ ان کے پاس بھیڑ بکریاں اور گدھے تھے۔ شکار کرنا اور فصلیں لوٹنا ان کے اہم مشاغل تھے۔ وہ پیدل چلتے تھے اور پیدل ہی جنگ کرتے تھے۔ اسی وجہ سے موسم بہار کے علاوہ پورے صحرا کو طے کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ پانی والی جگہ سے ایک روز کی مسافت سے زیادہ فاصلے تک جانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے (یعنی تیس کیلومیٹر تک)۔ گرمیوں میں انہیں یا تو نخلستانوں یا دوسرے مستقل آباد علاقوں پر انحصار کرنا پڑتا تھا یا وہ ان قابل کاشت خطوں میں ریوڑ پالتے تھے جنہیں اہل یورپ نے 'Fertile Crescent' [ 'ہلال زرخیز' ] کا نام دیا ہے۔ اس خانہ بدوش آبادی کے لیے، نیز مشرق میں ان کے سرحدی نظم و نسق کے بارے میں مصری رویے کے لیے قب Kees، ص ۶۴، بعد، ۱۰۶ بعد؛ بالخصوص [مخطوطہ] پیپیرس (papyrus) پیٹرزبرگ، ورق ۱۱۱۶ الف، سطر ۱۵ بعد: "وہ (ایشیائی) کبھی ایک جگہ رہ کر زندگی نہیں گزارتا بلکہ ہورس Horus کے زمانے سے وہ سیلانی خصوصیت رکھتا ہے، دوسروں سے ہر سر پیکار رہتا ہے، مگر اسے نہ کبھی مکمل فتح حاصل ہوتی ہے اور نہ وہ پورے طور پر مغلوب ہی ہوتا ہے"۔ بدویوں، نیم بدویوں اور جزوی بدویوں، میدانی فلاحوں اور چھوٹے نخلستانی فلاحوں کے درمیان بہت تھوڑا فرق تھا اور بعد کے زمانوں کی بہ نسبت اس زمانے میں ایک طرز معیشت کا دوسری طرز معیشت کے ساتھ خلط ملط ہو جانا عام تھا (رک بہ W.F. Albright، ۱۹۳۶ء، ص ۱۸۱

اور زرخیز ہوتی ہے جہاں کاشت کاری میں آسانی رہتی ہے۔ جنگلات والے میدان زراعت اور چراگاہی دونوں اعتبار سے اچھے ہوتے ہیں اور خشک میدان اچھی چراگاہیں ثابت ہوتے ہیں۔ یہ قابل زراعت ہوتے ہیں، لیکن چونکہ زراعت کا انحصار بارش پر ہوتا ہے اس لیے خشک سالی خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ صحرائی میدان اور نیم صحرائی علاقے اتنے خشک ہوتے ہیں کہ یہاں اس قسم کی زراعت ممکن نہیں۔ بہر حال یہ علاقے بھیڑ بکریوں کے لیے معمولی چراگاہوں کا کام دے جاتے ہیں، لیکن گائے بیل ان سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ غلے کے خط کے اوپر کوہستانی علاقوں میں بھی اچھی چراگاہیں ملتی ہیں۔

صحرائی میدانوں کے علاقوں میں جہاں نخلستان موجود نہیں ہوتے یا آکا دکا نظر آتے ہیں وہاں مویشی نہیں بلکہ بھیڑ بکریاں پالنے والے چرواہے میدانی علاقے کے زراعت پیشہ قبائل سے کٹ کر خود مختار بدوی بن جاتے ہیں؛ تاہم ایسے بدوی لوگ جو نیم صحرائی علاقوں میں بھیڑ بکریاں پالتے ہیں مرطوب علاقوں یا نخلستانوں والے خطوں کے قبائل کے مقابلے میں ہمیشہ مفلسی کا شکار رہے ہیں۔ ان مؤخر الذکر خطوں کے قبائل میں بعض لوگ زراعت پیشہ رہے اور بعض چرواہے (جو بدویت ہی کی ایک جزوی صورت ہے)۔ اس طرح سے میدانی فلاحوں حتیٰ کہ نخلستانی فلاحوں کی ایک شاخ نے ایک خالص بدویت کو پیدا کیا (یہ طرز معیشت کسی حد تک جنوبی یورپ کی transhumance سے مشابہ تھی)۔ البرائٹ W. F. Albright (۱۹۳۶ء الف و ب، ۱۹۳۹ء، ص ۱۳۷، ۱۵۳، ۱۶۲، بعد، ۲۵۷) کا خیال ہے کہ جب سمیریوں نے اپنی تہذیب کی ابتدا میں زہریں، عراق کے علاقے میں



بکریاں چرانے والے اپنے خاندان اور قبائل سے بالکل کٹ گئے ہوں اور زراعت کو انہوں نے قطعی طور پر ترک کر دیا ہو۔

جب کوئی نخلستان وسیع ہو جاتا اور بستی پھیلتی تو اس کی آبادی روز بروز خانہ نشین ہوتی چلی جاتی۔ اریحا کی نئی کھدائیوں سے پتا چلتا ہے کہ مٹی کے برتن والے دور سے پہلے اریحا میں اس قسم کے آب پاشی والے گاؤں شہروں کی طرح بہت قدیم زمانے، یعنی سات ہزار سال قبل مسیح میں (Zeuner-Kenyon)، مورچہ بند ہوا کرتے تھے۔ یہ معیشت غالباً چار ہزار سال قبل مسیح کی اس تہذیب کا اولیٰ نقش تھا جو عراق کے زبیریں علاقوں کے نخلستانوں میں ظہور پذیر ہوئی، جہاں آب پاشی کی بڑی بڑی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے باہمی تعاون، مرکزیت اور ریاستوں کی تشکیل ضروری تھی، جہاں بڑے پیمانے پر عام مزدوروں کی اور پھر اس سلسلے میں تقسیم کار، تخصیص کار اور شدت کار کی حاجت تھی اور جہاں تکنیکی ایجادات ظہور میں آئیں (پہیا، چھکڑا، هل)۔ اس ترقی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میدانی کاشتکاری اور نخلستانی تہذیب کے مابین امتیاز بڑھتا گیا اور ان دونوں کی مشترکہ میراث 'مہا ماتا دیوی' (Magna Mater) اور بیلوں کے بتوں کی پرستش کی صورت میں ہمارے سامنے آئی، جو دونوں کے ہاں رائج تھی۔

اس دوران میں میدانی کاشتکاری اپنے تمام شبانی خصائص کے ساتھ ایشیائے کوچک کے راستے جنوب مشرقی یورپ اور پھر وسطی یورپ کے دیودار کے چھدرے جنگلات تک پھیل گئی تھی (دریائے ڈینیوب کی تہذیب ریڈیو کاربن مواد کی رو سے ...م ق م سے ہے)۔ تیسرے عہد ہزار سالہ ق م سے یہ ٹریپولائی Tripolye (دریائے ڈینیوب کے مغرب میں) ثقافت سے گزر کر روس اور سائبیریا

پہنچے؛ بالخصوص ۱۹۳۹ء، ص ۲۳۹ بعد، صحرا کے بنی اسرائیل، انبیا اور عبرانیوں یا خبرو کے بارے میں)۔ ان میں سے بیشتر کو بدویوں کی بہ نسبت گلہ بان کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایشیا کے کسی حصے میں بھی ایسی طرز معیشت کبھی نہیں پھیلی جس کا مدار پورے طور پر گلے بیل پر ہو، جیسی کہ صحراے اعظم کے جنوب میں افریقہ کے بعض حصوں میں پھیلی، البتہ پاک پالنے والے خانہ بدوش عمارتی لکڑی کے خط (timber-line) کے اوپر ان کوہستانی علاقوں میں موجود تھے جو تین شن Tien-Shan اور تبت میں واقع ہیں۔ دراصل نیم صحرائی علاقے مویشی چرانے کے لیے موزوں نہیں۔ اسی طرح موسم سرما میں مغربی سائبیریا جیسے لق و دق میدانوں میں بھی، جہاں برف کی تہ جمی رہتی ہے، مویشی چر نہیں سکتے (قب Potapov و Hančar ص ۳۹۰)۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ گلہ بانی ابتدا ہی سے کاشتکاروں کی معیشت کا لازمی جزو رہی ہے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ مویشیوں کے ریوڑ پالنے اور انہیں چرانے کی ابتدا سب سے پہلے غالباً ان تخمدار ہودوں کی کاشت کرنے والوں نے کی جو کوہ ہندو کش کے علاقے میں پہاڑی بکروں، جنگلی بکریوں (اور غالباً بھیڑوں) کا شکار کرنے والوں میں گہرے ہوئے تھے۔ اس جدت کا تعلق گہرے مذہبی احساس سے تھا اور اسی جدت کے باعث تخمدار ہودوں کی کاشت کرنے والے میدانی فلاح بنے۔ اپنے قبائل کی گلہ بان شاخوں کی وجہ سے یہ میدانی فلاح تخمدار ہودوں کی کاشت کرنے والوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ نقل و حرکت کے قابل ہوں گے۔ مکمل بدویت کا وجود ہم صرف انہیں مقامات پر قرار دے سکتے ہیں جہاں بھیڑ

جو مناظر دیکھنے میں آتے ہیں وہ دوسرے عہد ہزار سالہ قم سے متعلق نہیں، جیسا کہ Hančar نے قیاس کیا تھا، بلکہ ۷۰۰ قم سے ۵۰۰ قم کے زمانے کے ہیں (نیچے ملاحظہ کیجیے)۔

مآخذ: (۱) W. F. Albright: *From the Stone*

*Age to Christianity*، بالٹی مور ۱۹۳۶ء، الف: (۲) وہی

مصنف: *Archaeology and the religion of Israel*

بالٹی مور ۱۹۳۶ء، ب: (۳) وہی مصنف: *Von der Stein-*

*zeit zum Christentum*، برن ۱۹۳۹ء: (۴) O. Antonius:

*Grundzüge einer Stammesgeschichte der Haustiere*

Jena ۱۹۲۲ء: (۵) W. F. و J. A. Arnold

*Science 117 • Radiocarbon • Dates II*: Libby

*The fossil*: D. M. A. Bate (۶): ۲۹۱ ص ۱۹۵۱ء

*antelopes of Palestine in Natufian times with*

*description of new species*، در *Geolog. Mag.* ۷۷

(۱۹۳۰ء): ص ۱۸ تا ۳۳: (۷) A.F.L. Beeston

*The Ritual Hunt*، در *Muséon*، ۶۱ (۱۹۳۸ء):

۱۸۹ پیعد: (۸) وہی مصنف: *The "Ta'lab Lord of*

*Pastures"* Texts، در *BSOAS*، ج ۱۷ (۱۹۵۵ء):

۱۵۳ تا ۱۵۶: (۹) R. J. Braidwood: *The Near East*

*and the Foundation of Civilization*، بسلسلہ Condon

*Lectures*، عدد ۵، یوجین (Oregon) ۱۹۵۲ء: (۱۰)

*The Achievement*: Ch. A. Reed و R. J. Braidwood

*and Early Consequences of Food Production*، در

*Cold Spring Harbour Symposium on Quantitative*

*Biology*، ۲۲ (۱۹۵۷ء): ۱۹ تا ۳۱: (۱۱) G. Brunton

*Mostagedda and the Tusian Culture*، مشرق وسطیٰ

میں برٹش میوزیم کی مہم، لنڈن ۱۹۳۷ء: (۱۲)

*Late Glacial and Postglacial Climatic*: K. W. Butzer

*Variation in the Near East*، در *Erdkunde*، ۱۱

(۱۹۵۷ء): ۲۱ تا ۳۵: (۱۳) C. C. Caldenius

*Las glaciaciones cuaternarias en la Patagonia y*

کے ان جنگلات سے ڈھکے ہوئے میدانوں میں سرایت کرنے لگی جن پر اس زمانے میں ترقی یافتہ شکاری آبادی کا قبضہ تھا (Hančar)۔ یہ تمام خطے نخلستانی زندگی کے لیے موزوں نہیں تھے، کیونکہ یہاں سردی بہت تھی اور گرمیوں کا موسم بہت مختصر ہوتا تھا۔

انسان نے جن تخلیقی مراکز میں دوسرے حیوانات پر تدریجی طور پر غلبہ حاصل کیا ان کی مفروضہ ترتیب کا یہ ایک خاصہ ہے کہ اسے ثقافتوں کے اس تسلسل کے ساتھ بخوبی مطابقت حاصل ہے جسے انسانی نسلوں کے ماہرین (مثلاً Dittmer) نے پیش کیا ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس سے مختلف ایجادوں کا بیک وقت ظہور میں آنا غیر ضروری ٹھہرتا ہے (Sauer)۔

ہم یہاں اس مفروضے پر بحث نہیں کرنا چاہتے جو بعض علما (مثلاً W. Schmidt، Pohlhausen وغیرہ) نے پیش کیا ہے کہ پالتو جانوروں کے ریورٹوں میں سب سے پہلا نام رینڈیر کا آتا ہے، چنانچہ بدویت کا آغاز ان شکاریوں سے ہوا جو یوریشیا کے شمالی صنوبر کے جنگلات (muskeg taiga) میں کتے پالتے تھے اور پھر وہاں سے جنوب کی طرف پھیل گئی؛ مگر جب سے Jettmar (۱۹۵۲-۱۹۵۳ء) اور دوسرے محققین نے بتایا ہے کہ رینڈیر پالنے کی تحریک آپ پروری سے ہوئی، جس کا تعلق زمانہ سا بعد سے ہے، اس وقت سے اس نظریے کے مؤیدین کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ Hančar کی یہ رائے بھی بے وقعت ہو چکی ہے کہ رینڈیر کو ۵۰۰ قم کے قریب سواری اور ہاڑی یا بوجھ کھینچنے کے لیے استعمال لیا جاتا تھا (ص ۷۵ و جدول ۶۳)۔ وجہ یہ ہے کہ Jettmar (الف ۱۹۵۷ء) اور Okladnikov نے بتایا ہے کہ خطہ لینا Lena کی دریاہوں میں رینڈیر پر سواری کے



Archaeol., Ann. Report. ۹ (۱۹۵۳): ۳۳ تا ۵۹؛  
 Die Nomaden von Tibet : M. Hermanns (۲۸)  
 وی انا ۱۹۴۹ء: (۲۹) A. Hettner  
 Der Gang der : A. Hettner (۲۹)  
 Kultur über die Erde, Geograph. Schriften  
 ج ۱،  
 Ta'lab als : M. Höfner (۳۰)  
 Patron der Kleinviehhirten, Serta Cantabrigiensia  
 Wiesbaden ۱۹۵۴ء: (۳۱) K. Jettmar  
 Zu den Anfängen: K. Jettmar (۳۱)  
 der Rentierzucht، در Anthropos، ج ۷ (۱۹۵۲) و  
 Review of: F. Hančar (۳۲)؛ وهی مصنف:  
 (۳۲)؛ (۳۲)؛ (۳۲)؛ (۳۲)؛ (۳۲)؛ (۳۲)؛  
 (دیکھیے سطور بالا)، در Central Asiatic Journal، ۳،  
 ۱۹۵۷ء، الف، ص ۱۵۵ تا ۱۶۰؛ (۳۳)؛ وهی مصنف:  
 Heidnische Religionsreste im Hindukusch und Kara-  
 korum، در Wissenschaft und Weltbild، وی انا  
 ۱۹۵۷ء، ب (جون)، ص ۱۲۶ تا ۱۳۱؛ (۳۴)؛ H. Kees  
 Das alte Ägypten, eine kleine Landeskunde، ۱۹۵۶ء؛  
 Excavations at Jericho : K. M. Kenyon (۳۵)  
 در،  
 Palestine Exploration Quarterly، ۱۹۵۶ء، الف،  
 ص ۶۷ تا ۸۲، ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۱ تا ۱۰۷؛ (۳۶)؛ وهی  
 مصنف: Jericho and its Setting in Near Eastern  
 History، در Antiquity، ۳۰، ۱۹۵۶ء، ص ۱۸۳  
 تا ۱۹۵؛ (۳۷)؛ F. Kussmaul  
 Fröhe Nomadenkultur : F. Kussmaul (۳۷)  
 in Innerasien، در Tribus, Jahrb. des Linden-  
 Museums، شیک کارٹ ۱۹۵۲-۱۹۵۳ء، ص ۳۰۵ تا  
 ۳۶۰؛ (۳۸)؛ W. F. Libby  
 Radiocarbon dates II : W. F. Libby (۳۸)  
 در Science، ۱۱۷ (۱۹۵۱)؛ ص ۲۹۱؛ (۳۹)  
 Weltgeschichte der Steinzeit : O. Menghin  
 وی انا  
 H. von D. van der Meulen (۴۰)؛ ۱۹۳۱ء  
 Hadramaut : Wissmann  
 لائنن ۱۹۳۲ء؛ (۴۱)  
 Hirten, Pflanzler, Bauern : K. J. Narr  
 در Historia  
 Mundi، طبع F. Valjavec، ج ۲، ۱۹۵۳ء، ص ۶۶ تا  
 ۱۰۰؛ (۴۲)؛ وهی مصنف:  
 Archäologische Hinweise : H. Helback (۴۲)؛  
 در Paldeum، zur Frage des ältesten Getreidebaues

Geograph. Annaler، در Tierra del Fuego  
 ۱۹۳۲ء، ص ۱ تا ۱۶۳؛ (۱۳)؛ G. Caton-Thompson  
 The Desert Fayum : E. W. Gardner و  
 جلد ۲،  
 Die Mittlere : J. G. D. Clark (۱۵)؛ ۱۹۳۳ء  
 Steintzeit، در Historia Mundi، طبع F. Valjavec  
 ۱۹۵۷ء، ص ۳۱۸ تا ۳۴۵؛ (۱۶)؛ E. S. Deevey  
 Palaeolimnology and Climate، در Climatic Change  
 طبع H. Shapley، هارڈ Harvard، ۱۹۵۳ء، ص ۲۷۳  
 تا ۳۱۸؛ (۱۷)؛ K. Dittmer  
 Allgemeine Völkerkunde : K. Dittmer (۱۷)؛  
 H. Field (۱۸)؛ ۱۹۵۴ء؛  
 Ancient and Modern Man in Southwestern Asia  
 مطبوعہ میامی پریس ۱۹۵۶ء؛ (۱۹)؛ F. Firbas  
 Spät-und nacheiszeitliche Waldgeschichte Mittel-  
 europas nördlich der Alpen I  
 Jena، ۱۹۴۹ء؛ (۲۰)؛  
 Haustiere und Hirtenkulturen, Wiener : F. Flor  
 Beiträge zur Kulturgeschichte، ج ۱، وی انا ۱۹۳۰ء؛  
 Die phylogenetische Bedeutung asiatischer Gersten  
 در Züchter، ۱۲ (۱۹۳۰)؛  
 D. M. A. و D. A. E. Garrod (۲۲)؛ ۲۷۲ تا ۲۵۷  
 The Stone Age of Mount Carmel : Bate  
 ج ۱،  
 Das Alleröd- : H. Gross (۲۳)؛ ۱۹۳۷ء؛  
 Interstadial als Leithorizont der letzten Vereisung  
 in Europa und Amerika، در  
 Eiszeitalter und Gegenwart، ۱۸۹ ص ۲۰۹؛ (۲۴)؛  
 P. Gourou : Les pays tropicaux، پریس ۱۹۳۷ء؛  
 Das Alter der wirtschaftlichen : E. Hahn (۲۵)  
 Kultur der Menschheit، هانڈل برگ ۱۹۰۰ء؛ (۲۶)  
 Das Pferd in prähistorischer und historischer Zeit  
 در Wiener Beiträge zur Kultur-  
 geschichte und Linguistik، ج ۹، وی انا و میونخ  
 Archaeology and : H. Helback (۲۷)؛ ۱۹۵۶ء  
 Univ. of London Institute of Agricultural Botany

the Latest Investigations, Address to 2nd Internat. Congr. of Hist., Sc. and Techn. لندن ۱۹۳۱ء؛ (۵۶) *Angewandte* در *Zur Geographie der Hirsen*: E. Werth *Botanik* ۱۹ (۱۹۳۷ء)؛ ۲۲ تا ۸۸؛ (۵۷) وہی مصنف؛ *Südasiens als Wiege des Landbaus* Grabstock, Hacke und Pflug؛ (۵۸) وہی مصنف؛ *Versuch einer Entstehungsgeschichte des Landbaus* Ludwigsburg لڈوگسبرگ ۱۹۵۳ء؛ (۵۹) *Die Klima-und Vegetationsgebiete*: H. v. Wissmann *Eurasiens Arabien und seine kolonialen Lebensraumfragen europäischer Völker II* O. Schmieder طبع لائپزگ ۱۹۳۱ء، *Ursprungsherde und Ausbreitungswege von Pflanzen-und Tierzucht und ihre Abhängigkeit von der Klimageschichte* در *Erdkunde* ۲ (۱۹۵۷ء)؛ ۸۱ تا ۹۳، ۱۷۵ تا ۱۹۳ (۶۲)؛ *Wissmann-Höfner* دیکھیے آخرالذکر؛ (۶۳) *G. Smolla, H. Pöch, H. v. Wissmann* *On the Role of Nature and Man in Changing the Face of the Dry Belt of Asia* در *Man's Role in Changing the face of the Earth* طبع W. L. Thomas، شکاگو ۱۹۵۶ء، ص ۲۷۸ تا ۳۰۳؛ (۶۴) *F. E. Zeuner* *The Goats of Early Jericho* در *Palestine Exploration Quarterly* اپریل ۱۹۵۰ء؛ (۶۵) وہی مصنف؛ *The Radiocarbon Age of Jericho* در *Antiquity* ۳۰ (۱۹۵۶ء)؛ ص ۱۹۵ بعد۔

(ب) اسپ سوار بدوی  
اسپی حیوانات میں سے افریقی گدھا (Equus)  
زیر جنس (Asinus) اور جنوب مغربی و وسطی ایشیا  
کا گورخر (Equus) زیر جنس (Hemionus) قدیم  
زمانے سے حمل و نقل کے لیے استعمال ہوتے تھے۔

۶ (۱۹۵۶ء)؛ ص ۲۳۳ تا ۲۵۰؛ (۴۳) H. Pöch  
*Über die äthiopide und gondide Rasse und ihre Verbreitung*، در *Anthropologischer Anzeiger*؛ (۴۴) H. Pohlhausen  
*Das Wanderhirtentum und seine Vorstufen*، *Kulturgeschichte* 4، Brunswick ۱۹۵۴ء؛ (۴۵)  
*Das Schlernstadium und der Klima-: C. Rathjens jr.*  
*ablauf der Spüteiszeit, Eiszeitalter und Gegenwart*  
*Agricultural: C. O. Sauer*؛ (۴۶) ۱۸۸ تا ۱۸۱  
*Origins and Dispersals, Bowman Memorial Lectures*  
سلسلہ ۲، نیویارک ۱۹۵۲ء؛ (۴۷) E. Schieman  
*Entstehung der Kulturpflanzen*، در *Ergebnisse der Biologie* 19  
۱۹۴۳ء، ص ۴۰۹ تا ۵۵۲؛ (۴۸) وہی مصنف؛  
*Weizen, Roggen, Gerste, Systematik, Geschichte und Verwendung*  
*Neue Gerstenfunde aus Ost-Tibet und ein weiterer Fund von Hordeum agriocrithon*  
Aberg، در *Berichte der Deutschen Botanischen Gesellschaft* ۶۳ (۱۹۵۱ء)؛ ۵۷ تا ۶۹؛ (۵۰)  
*Rassen und Völker in Vorgeschichte*: W. Schmidt  
*und Geschichte des Abendlandes*، جلد ۳، Lucerne  
۱۹۴۶ء؛ (۵۱) وہی مصنف؛ *Zu den Anfängen der Herdentierzucht*  
در *Ztschr. f. Ethnologie* ۷۶ (۱۹۵۱ء)؛ ۱ تا ۳۱، ۲۰۱ بعد؛ ۷۷ / ۱۹۵۲ء؛ (۵۲)  
*Völker und Kulturen*: W. Koppers و W. Schmidt  
Regensburg ۱۹۴۱ء؛ (۵۳) G. Smolla  
*Bemerkungen zur Frage der Herausbildung neolithischer Kulturer-*  
*scheinungen*، مخطوطہ ۱۹۵۰ء؛ (۵۴) M. Sorre  
*Les céréales alimentaires du groupe des Sorghos et des milléts* *Annales de Geogr.*  
۸۱ تا ۹۹؛ (۵۵) N. I. Vavilov  
*The Problem of the Origin of the World's Agriculture in the Light of*



تھی) اور بعد اروپائی اقوام نے بڑا اہم حصہ لیا۔ اس عمل میں ہرن کے تقدس کے بجائے، جسے شمالی شکاریوں کے اساطیر اور مذہبی عقائد میں مرکزی مقام حاصل تھا، گھوڑے کو مقدس ماننے لگے اور پھر اس کے ڈانڈے جنوب مغربی ایشیائی Chthonic بارآوری اور بیل (bucranion) کی پرستش کے ساتھ بھی مل گئے (Kussmaul، ۱۹۵۳ء، ب)۔

اگر ہم اس وسیع ثقافتی عمل کو مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کے باعث اکثر اوقات تہذیب کو نخلستانی عزلت سے رہائی ملی، جہاں اس کے جامد، ساکن اور بے ثمر ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ یہیں ہم دونوں شاخوں یعنی میدانی فلاحت اور نخلستانی فلاحت کے مابین خط امتیاز کھینچ سکتے ہیں۔ جب شانگ Shang نے، جو اسی ثقافتی اختلاط و امتزاج کی پیداوار تھے (Kussmaul، ۱۹۵۳ء، الف)، ۱۰۰۰ ق م کے لگ بھگ وسط ایشیا سے اٹھ کر چین پر قبضہ کیا اور وہاں کے حکمران بن گئے تو اس وقت وہ زیادہ تر نخلستانی فلاح ہی تھے (Eberhard، ۱۹۵۶ء، Bishop، Franke، Wissmann اور Kussmaul، ۱۹۵۶ء)۔ تاہم تقریباً اسی زمانے میں آریا نے دریائے سندھ کی تہذیب تباہ و برباد کر دی تھی اور وہ میدانی فلاح ہو گئے تھے۔ بہر حال انہیں بدوی نہیں کہا جا سکتا۔

آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے پتا چلتا ہے کہ ذریعہ حمل و نقل کے طور پر باختری اونٹ کی پرورش کی ابتدا توران میں تیسرے ہزار سالہ دور قبل مسیح کے نصف آخر یا ربع آخر میں ہوئی تھی (Walz اور بالخصوص Hančar)۔ جس زمانے میں ہمیں اسی علاقے میں گھوڑے پالنے کا سراغ ملتا ہے اس سے یہ چند صدیاں قبل کی بات ہے، حتیٰ کہ عراق میں گھوڑے پالنے کے قابل اعتماد ثبوت ہمیں ۲۰۰۰ ق م کے قریب

ہنچر Hančar کی رائے ہے کہ قلعہ جرمنو میں ایک گورخر کی جو ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں (تقریباً ۴۷۰۰ ق م) وہ اس ضمن میں اہمیت رکھتی ہیں۔ ہنچر Hančar کے بیان کی رو سے گھوڑے کی ایک ادنیٰ قسم (Equus زیر جنس Caballus) لق و دق میدانوں میں اور شمال کے کم گنجان جنگلات میں جنگلی حالت میں پائی جاتی تھی اور اس کا سراغ تیسرے عہد ہزار سالہ قبل از مسیح کے اوائل میں طرابلس (Tripolye) کے کاشتکاروں کے ہاں مل سکتا ہے، جو کارپیتھی (Carpathians) اور دریائے ڈنیپر Dnieper کے درمیان جنگلاتی میدانوں میں رہتے تھے۔

جب ۲۴۰۰ ق م کے قریب درجہ حرارت میں کمی ہوئی اور بارش میں غالباً اضافہ ہوا (قبّ Butzer و Tolstow کے مختلف نظریے) تو وسطی ایشیا میں برفستان کی حد جنوب کی طرف بڑھ آئی اور اس طرح توران کے نخلستانی علاقے کی حدود خاصی وسیع ہو گئیں، جس کے باعث اس علاقے میں (جو قبل ازیں صحرا تھا اور اس کی زمین بے حد بنجر تھی) کاشتکاری، گلہ بانی اور نخلستانی تہذیب نے ترقی پائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحرا کم از کم چند صدیوں تک ایک حد قاصل کے طور پر حائل نہیں ہو سکا (Wissmann، ۱۹۵۷ء)۔ چنانچہ شمال کے شکاریوں اور جنوب کے کاشتکاروں اور نخلستانی تہذیب کے درمیان ایک طویل سرحد پر باہمی رابطہ پیدا ہونے لگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میل جول سے دونوں آپس میں مخلوط ہونے لگے اور ایک نئی جاندار اور طاقتور ثقافت ظہور میں آنے لگی، جس میں دوسرے عہد ہزار سالہ قبل از مسیح کے اوائل سے گھوڑے، جنگی رتھ (جس کی ایجاد غالباً ارمینیہ [رک ہاں] کے گرد جنوب مغربی ایشیائی کوہستانی علاقوں میں کسی مقام پر ہوئی

کی ابتدا ہوئی (ص ۳۹۷) - لیکن Jettmar (۱۹۵۷ء) نے بڑی وضاحت سے ثابت کیا ہے کہ اس مسئلے میں ہنچر کی بنیادی دلیل بے بنیاد ہے (رک بہ سطور بالا) - رینڈیر کی سواری اسپ سواری سے کہیں بعد میں جا کر شروع ہوئی - اکثر دوسرے مسائل میں ہنچر کی بنیادی تصنیف اعتراضات سے بچی رہتی ہے۔

جب اسپ سواری شمال کے کھلے میدانوں

میں پھیلی تو اس وقت وہ سریع الاثر انقلاب رونما ہوا

جسے ہم اسپ سوار بدویت کہہ سکتے ہیں - اس

امر کا پتا چلنے پر کہ گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ

کرنے کو دوسرے پرانے طریقہ ہائے جنگ خصوصاً

جنگی رتھوں میں سوار ہو کر لڑنے پر فوقیت حاصل

ہے، 'شمال کے ایرانی' قبائل نے، جو غالباً دریائے

والکا اور دریائے اِرتیش کے درمیانی علاقے میں آباد

تھے، یعنی سیٹھی اور ان کی ہمسایہ ساکا اقوام

نے میدانی کاشتکاری قطعاً ترک کر کے ریوڑوں والے

جانور اور بالخصوص گھوڑے پالنے کو اپنا خصوصی

شعار بنا لیا - غالباً ۹۰۰ ق م یا ۸۰۰ ق م میں وہ

اولین اسپ سوار بدویوں اور اولین اسپ سوار

تیر اندازوں کی حیثیت سے ظاہر ہوئے (Hančar،

ص ۳۹۰ بعد) - یہ پہلے لوگ تھے جنہوں نے

ہمسایہ ملکوں پر لشکر کشی کی اور مقیم آبادیوں

میں خوف و ہراس پھیلا دیا - جب ہم بدوی کا

لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہمارے پیش نظر بدویوں

کی یہی اسپ سوار قسم ہوتی ہے - اس تباہ کن

انقلاب نے نہ صرف کھلے میدانوں کو بلکہ فلاحوں

کی گنجان آبادیوں والے شجردار میدانوں کو بھی

متاثر کیا بلکہ اس سے تیگا Taiga کے جنگل کے

شکاری قبائل کو بھی تحریک ہوئی اور انہوں نے

بھی اس نئے طرز زندگی کو اختیار کر لیا - میدانی

کاشتکار معاشرت کے لحاظ سے مختلف طبقات میں

یا اس سے کچھ پہلے ملتے ہیں (Hančar 'Boessnek)۔

شمال کے شجردار میدانوں اور ان کے کنارے

کنارے کے کم گنجان جنگل میں (جہاں کی مٹی

سیاہ (chernosem) اور زرخیز ہے اور جو روس سے

سائبیریا تک پھیلے ہوئے ہیں) شکار اور گلہ بانی

کے ساتھ ساتھ زراعت بھی بتدریج اہمیت حاصل

کرنے لگی - دوسرے عہد ہزار سالہ کے وسط میں

مغربی سائبیریا تک کا علاقہ فلاحت پیشہ لوگوں

(Andronovo culture) سے پہلے کی بہ نسبت کہیں

زیادہ آباد ہو چکا تھا - ایسے خطے میں جہاں

نخلستان نہ ہوں اور وسیع پیمانے پر گلہ بانی نیز

خالص میدانی فلاحت موجود ہو وہاں معاشرتی

طبقہ بندی کے علاوہ قبائل، جنگ جو امرا کی

جماعتوں اور خاندانی و سوروئی قیادت کی تشکیل کے

لیے سازگار حالات پیدا ہو جاتے ہیں (Kussmaul) -

سیاہ مٹی کے خطے کی یہ فلاحت اس کے بعد زیادہ

سے زیادہ کھلے میدانوں میں قدم جمائے لگی، جہاں

ناگزیر طور پر شبانی اور نقل مکانی کرنے والی شاخ

پہلنے پھولنے لگی (Hančar)۔

بہر حال جن لوگوں کو سب سے پہلے یہ

معلوم ہوا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر لڑنا بہت

فائدہ مند ثابت ہوتا ہے وہ غالباً فلاح قبیلے کی کسی

مضبوط شبانی شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور

کوہستانی علاقوں اور پہاڑوں کے دامن میں رہتے

تھے جہاں جنگی رتھوں کا استعمال بہت کم ہوتا

ہوگا - یہ بات شاید ماورائے قفقاز یا کارپیتھیوں

(Carpathians) کے علاقوں میں پیش آئی ہوگی

(Jettmar و Kassmaul) - غالباً ان قبائل کی

حیثیت وہی رہی جسے ہم نے میدانی کاشتکاروں

کا نام دیا ہے - ہنچر Hančar کے خیال میں

تین سن اور آلتای [رک ہاں] کے پہاڑوں کے شمالی سرحدی

علاقے ہی وہ خطے تھے جہاں پہلے پہل اسپ سواری



مشرقی جانب کوہ آلتای [آرک باں] کے دامن میں  
 زنگاریہ Dzungaria کے تنگ راستے کے ذریعے بدویت  
 ایک قوم سے دوسری قوم میں پھیلتی گئی۔ "شمالی  
 ایرانیوں" بالخصوص سیٹھی قوم کے بعد ووسن  
 Wu-sun آئے، جو غالباً وسطی اور مشرقی تیان شان  
 Tien-shan میں رہتے تھے۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں  
 کہ منگولیا کے ارد گرد پھیلے ہوئے کھلے یا جنگلاتی  
 میدانوں کے گروہ شکاری اور فلاحی بدویت کی زندگی  
 اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ یہ بھی ممکن  
 ہے کہ کانسو Kan-su کے نخلستان کی آبادی پر ووسن  
 Wu-sun کا جو دباؤ پڑا وہی چین پر ایک فلاحت  
 پیشہ قوم یعنی زھنگ Zhung کی آخری لشکر کشی کا  
 سبب بنا ہو، جس سے مغربی چاؤ Chou کا شاہی  
 خاندان تباہ ہو گیا (۷۷۰ ق م)۔ چینی روایات میں  
 بدویت کا سب سے پہلا سراغ سیونگ نو Hsiung-nu  
 کے ہاں تقریباً پانچویں صدی قبل مسیح میں ملتا  
 ہے۔ یہ لوگ نہ تو ایرانی تھے اور نہ قدیم ترک،  
 لگیتی Ligeti کے قول کے مطابق ان کی زبان  
 بالکل الگ تھلگ معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے  
 کہ ہنسی اوسٹیاک (Yenissei-Ostyaks) قوم نے  
 سیونگ نو Hsiung-nu کی زبان کی خصوصیات  
 اس زمانے میں اختیار کر لی ہوں جب دونوں ایک  
 دوسرے کے پڑوسی تھے۔ سیونگ نو کی زاد بوم  
 قدیم چین اور صحرائے گوبی کے مابین تھی اور وہاں  
 انہوں نے شمالی ایرانی بدویوں کی ثقافت کے خاصے  
 عناصر مجموعی طور پر اپنا لیے تھے۔ سیونگ نو کی  
 زندگی کے بعض پہلوؤں سے ثابت ہوتا ہے کہ  
 پیش ازیں ان کا دار و مدار چین پر تھا۔ دوسرے یہ  
 بتا چلتا ہے کہ مانچوریا کے قدیم غیر بدوی قبائل  
 سے ان کے ثقافتی تعلقات قائم تھے (Kussmaul)۔  
 کئی صدیاں خونریز جنگوں میں بسر ہوئیں اور اس  
 سلسلے میں میڈیا کے ان قدیم باشندوں (Medes)  
 کا ذکر ممکن ہے جنہوں نے اس زمانے میں ایران کے  
 کوہستانی فلاحوں کو زیر کر لیا تھا (von der  
 Osten)۔ حتیٰ کہ ہخامنشیوں (Achaemenids) نے بھی  
 بہادرانہ تصورات یعنی اسب سواری، تیر اندازی اور  
 حل گولی ترک نہیں کی تھی۔

منقسم ہو گئے اور یہ معاشرتی تقسیم ایسے قائدین کے  
 ظہور کے لیے سبب بن گئی جو اعلیٰ سیاسی اور حربی  
 صلاحیتوں کے مالک ہونے کی وجہ سے روز افزوں  
 قائم ہونے والے گروہوں کو مجتمع کرنے کی صلاحیت  
 رکھتے تھے۔ جو کاشتکار اور شکاری نسبتاً غریب  
 تھے وہ گھوڑے پالنے والے طبقہ امرا کے ساتھ  
 شامل ہونے پر مجبور ہو گئے؛ چنانچہ ایک ایسی  
 گروہ بندی منظر عام پر آئی جو اس سے پہلے کبھی  
 موجود نہیں تھی اور جو مار دھاڑ، قتل و غارت،  
 دوسرے لوگوں کو غلام بنانے اور ترغیب و ترہیب  
 کے ذریعے دوسرے امرا بالخصوص دوسرے  
 اسب سواروں کے گروہوں کو زیر سیادت لانے کے  
 باعث روز بروز ترقی کرنے لگی۔ جنوب کی گرم  
 آب و ہوا اور وہاں کی شستہ تہذیب، جس کا پتا  
 ان لوگوں سے چلا جو وہاں تنخواہ دار سپاہیوں کی  
 حیثیت سے ملازمت کر کے واپس آئے تھے، نیز مغرب  
 کی معتدل آب و ہوا اور رومانیہ اور ہنگری کے کھلے  
 میدانوں نے انہیں ان علاقوں پر لشکر کشی کی  
 ترغیب دی۔

یہ بات بعید از قیاس ہے کہ جنوبی روس  
 میں سیٹھی قوم کے پیش رو سومیری (Cimmerians)  
 اس وقت مکمل طور پر بدویت اختیار کر چکے تھے۔  
 معلوم ہوتا ہے کہ وہ میدانی فلاح تھے، ان کی ایک  
 مضبوط شہانی شاخ تھی اور ان میں خطرناک حد  
 تک جنگجو اسب سواروں کے جتھے تھے (Kussmaul،  
 ۱۹۵۳ء، الف، ۲ : ۳۰۲، Hančar، ص ۱۰۱)۔  
 اس سلسلے میں میڈیا کے ان قدیم باشندوں (Medes)  
 کا ذکر ممکن ہے جنہوں نے اس زمانے میں ایران کے  
 کوہستانی فلاحوں کو زیر کر لیا تھا (von der  
 Osten)۔ حتیٰ کہ ہخامنشیوں (Achaemenids) نے بھی  
 بہادرانہ تصورات یعنی اسب سواری، تیر اندازی اور  
 حل گولی ترک نہیں کی تھی۔

قرون وسطیٰ کے وسطی اور مغربی یورپ میں پہنچے، جب کہ وہاں جنگلی تہذیب کا آغاز ہو رہا تھا اور جہاں وہ دیگر اقوام کی ہجرت کا ایک سبب بنے (Spuler :Grousset).

کھلے یا شجردار میدانوں میں کاشتکاری کے جو بچے کھچے آثار رہ گئے تھے انہیں ان تحریکوں نے تمام و کمال برباد کر کے رکھ دیا۔ شمال میں منگولیا کے گرد و نواح کے پہاڑی اور کوهستانی خطے، جن میں میدان، مرغزار اور جنگل شامل تھے، ملجا و ماوی بن گئے، جہاں ایسی قوم کی از سر نو تخلیق ہوئی جو شکار، مویشیوں کی پرورش نیز کاشتکاری پر گزراوقات کرتی تھی (فب Lattimore)۔ دریائے گان Gan اور ارگون Argun کے قریب منگولیا کے میدانوں کے شمال مشرقی گوشے کو کاٹتی ہوئی ایک دفاعی دیوار کے کھنڈروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں اسی قسم کے زراعت پیشہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد یہاں آباد ہوگی (Plaetschke)۔ تاریخی اعداد و شمار سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے پہاڑی سرحدی علاقے جہاں جنگل ہوں کس طرح بار بار ایسے لوگوں میں گروہوں اور جتھوں کی تشکیل کی بنیاد بنتے رہے جو شکار، مویشیوں کی پرورش اور کاشتکاری پر بسر اوقات کرتے اور بڑے ناماز کار حالات میں زندگی گزارتے تھے۔ ان لوگوں میں ہمیں بعض صلاحیتوں کے حامل افراد بھی نظر آتے ہیں جنہیں سرداری کی قابلیت ودیعت ہوئی تھی اور وہ مار دھاڑ، لوٹ مار اور امرا کو باجگزار بنا کر مختلف قسم کے گروہ منظم کر لیتے تھے۔ کبھی کبھی کسی گروہ یا قبیلے کے نام پر ایک ترقی پذیر حکومت بلکہ ایک وسیع و عریض سلطنت کا نام بھی رکھ دیا جاتا تھا۔ خوش قسمتی سے مغول کی ایک خفیہ تاریخ Secret History of the

دیوارِ عظیم تعمیر کی۔ علاوہ ازیں اہل چین نے چند ثقافتی عناصر شمالی ایرانیوں سے اخذ کیے، مثلاً لوہا، اسپ سوار فوج، پاجامہ، خیمے کی صورت میں آسمان کا تصور۔ ایک پرانی چینی ضرب المثل ہے کہ ”گھوڑے کی پشت سے ریاست و حکومت قائم ہوتی ہے“۔

سلطنت سیونگ نو کے زمانے میں اور اس کے بعد چین کے شمال مشرق میں صحرا اور جنگل کے درمیان پھیلے ہوئے سرحدی علاقے کے ساتھ ساتھ بدویت کے شعلے نے تیزی سے مختلف قبیلوں کو یکے بعد دیگرے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چین خود ایک ایسا ملک ہے جس کی اکثر اراضی پر دریاؤں کی لائی ہوئی زرد مٹی کی تہ جمی ہوئی ہے اور وسیع لق و دق میدان ہیں۔ اس کے زرعی اور دیہی علاقے نے اس دباؤ کا مقابلہ کیا یا اسے برداشت کیا یا باجگزار بن گئے یا جزوی طور پر مطیع ہو گئے یا کنارے کنارے کے علاقے چراگاہوں میں تبدیل کر دیے اور یہ سب کچھ ان طویل ادوار میں پیش آیا جب وہ یکے بعد دیگرے دفاع، پسپائی یا زراعت کے لیے اراضی کی بازیافت میں مصروف تھے۔ چونکہ اس مقالے کا مقصد بدویت کی ابتدا کی تاریخ کا ایک خاکہ پیش کرنا ہے اس لیے ہم ایسی کم و بیش مختصر العمر بدوی حکومتوں اور سلطنتوں کے عروج کا ذکر نہیں کر سکتے جن کے ہاں یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ سلطنت چین کے عالمگیر اور کائناتی نظریہ ریاست کو نمونہ سمجھیں۔ اسی طرح ہم مغرب کی جانب وسیع پیمانے پر متعدد بار ہونے والی اس نقل مکانی اور لشکر کشی کا ذکر بھی نہیں کر سکتے جس کے دوران میں ”خشک منطقے“ نے ایک ایسی گلیاری (Corridor) کا کام دیا جس میں سے گزر کر حملہ آور جنوب مغربی ایشیا کے ان ممالک میں جو قدیم نخلستانی تہذیب کے حامل تھے یا



تیزی سے پھیل جانے والی بدویت کا گہوارہ بنا ہو اور پھر اس نے مکمل طور پر بدویت قبول کر لی ہو یا جہاں بار بار بدوی جماعت کی تشکیل ہوتی رہی ہو۔

اسپ سوار بدویوں کے تباہ کن حملوں اور ان کی نقل مکانی سے خشک منطقے کے خالی حصوں میں زبردست توسیع ہوئی۔ اگر ہم میدانی کاشتکاری کی اصطلاح کا اطلاق شمالی چین اور ہندوستان کے بعض حصوں پر نہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوہستانی علاقوں کو چھوڑ کر یوریشیا Eurasia میں ہر جگہ اس کا خاتمہ ہو گیا۔ نخلستانی تہذیب بربادی کی حد تک کمزور اور محدود ہو کر رہ گئی۔ یہ درست ہے کہ بڑی بڑی بدوی ریاستوں نے براعظم کے مختلف علاقوں میں تبادلہ اشیا اور تبادلہ خیالات کے سلسلے میں بڑا کام کیا۔ لیکن اگر ان کی نشوونما دور امن و امان میں ہوتی تو یہ تبادلہ کہیں زیادہ مستحکم بنیادوں پر استوار ہوتا۔ تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ انسان کے دل و دماغ میں جو اچھی اور جاندار باتیں ہیں انہیں زوال اور بربادی سے بچانے کے لیے آزمائشیں اور مصائب کسی حد تک ضروری ہیں۔

مآخذ: (۱) A. Alföldy: Die geistigen Grund-

Forschungen des hochasiatischen Tierstils

gen u. Fortschr. ۱۹۳۱ء، ص ۲۷۸ بعد: (۲)

Weltgeschichte Asiens im griechischen: F. Altheim

Zeitalter، ۲ جلد، Halle، ۱۹۳۷-۱۹۳۸ء: (۳) وہی

مصنف: Die Nomaden und die griechische

Staatenbildung in Ostiran und in Indien

Historia Mundi (طبع F. Valjavec)، ۱۹۵۶ء، Berne

Types: E. E. Bacon (۴) ۲۲۳ تا ۲۳۲

of Pastoral nomadism in Central and South - West

Asia، در South - Western Journal of Anthropol

Mongols محفوظ رہ گئی ہے (Haenisch)۔ یہ چنگیز خاں

اور اس کے قبیلے کی داستان ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے

کہ اس نے کس طرح مغولی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

اس سرگزشت کو ۱۲۴۰ء میں ایک مغل نے ایک

سادہ اور براہ راست روداد کی صورت میں لکھا تھا۔

یہ نیم حضری قبیلہ اپنے اسلاف کے زمانے میں کنتشی

Kentei کے پہاڑوں میں رہتا تھا اور اس کے پاس لپند

گھوڑے، مویشی اور بھیڑیں تھیں۔ کہیں کہیں

کاشتکاری بھی ہوتی تھی اور جنگلی نباتات جمع کر لی

جاتی تھیں۔ گھوڑے پر سوار ہو کر جنگ کرنے کو

بڑی اہمیت حاصل تھی۔ تاہم پہاڑوں کے باہر

کھلے میدانوں میں رہنے والے ان کے پڑوسی صحیح

معنوں میں اسپ سوار بدوی تھے اور ان کے بڑے

بڑے ریوڑ اور گروہ تھے۔ بعض کا دل مار دھاڑ سے

سیر ہو چکا تھا اور وہ ان آسائشوں کے غمادی

ہو گئے تھے جو تمدن کا لازمہ ہیں۔ اس تمدن سے

وہ اپنی مار دھاڑ کے دوران میں آشنا ہوئے تھے۔

چنگیز خاں کا نوخیز قبیلہ کنتشی کی پہاڑیوں اور

جنگلوں کی کمین گاہوں سے نکل کر میدانوں کے

دولت مند بدویوں کے درمیان لوٹ مار کرتا تھا۔

مال غنیمت میں گھوڑے، مویشی، بھیڑیں، غوزتیں،

بچے اور غلام شامل ہوتے تھے۔ اس طرح اس قبیلے

نے مکمل طور پر بدویت اختیار کر لی اور خوب

فروغ پانے لگا۔ اس کے نئے نئے باجگزار پیدا ہو گئے۔

سردار کے نام سے قبیلہ مشہور ہو گیا اور اس کی

لوٹ مار کی صلاحیت کے مطابق اس میں موٹائی

گئی۔ بالآخر مشہور و معروف قبائل و اقوام کی

خود مختاری کے ساتھ ان کا نام بھی نیست و نابود

ہو گیا اور سب مل کر عظیم "مغول" قوم میں

مدغم ہو گئے۔

منگولیا کے خشک خطے کے کنارے عملاً

ایسا کوئی علاقہ نہیں جو کسی زمانے میں اس

*Das Pferd in Prähistorischer und früher historischer Zeit, Wiener Beitr. z. Kultur- u. Sprachwiss.* : F. Hančar (۱۹) : ج ۹، ویانا و میونخ ۱۹۵۶ء  
 مع مفصل ماخذ: (۲۱) H. W. Haussig : *Indo-germanische und altaische Nomadenvölker im Grenzgebiet Irans* (طبع F. Valjavec)، ۵۰، Berne برن ۱۹۵۶ء : ۲۳۳ تا ۲۵۰ : (۲۲) K. Jettmar : *Entstehung des Reiternomadentums* : (۲۳) وهی مصنف : *Handb. d. Weltgeschichte* (طبع A. Randa)، ۱ : ۳۳۲ تا ۳۳۸، Olten و Freiburg ۱۹۵۴ء : (۲۴) وهی مصنف : *Review of Harčar* (دیکھیے سطور بالا)، در *Central Asiatic Journal*، ج ۳، شماره ۲، ۱۹۵۷ء : ص ۱۵۵ تا ۱۶۰ : (۲۵) F. Kussmaul، قب سطور بالا : (۲۶) وهی مصنف : *Zur Frühgeschichte des innerasiatischen Reiternomadentums*، تحقیقی مقالہ Tübingen، ۲ جلد، نقشہ، ۱۹۵۳ء الف (ثائب کیا ہوا) : (۲۷) وهی مصنف : *Das Pferd in der Geschichte*، در *Aus der Heimat*، ۶۱، ۱۹۵۳ء ب، ۱۱۳/۲۳ : (۲۸) وهی مصنف : *Bemerkungen zur Geheimen Geschichte der Mongolen*، در *Göttinger Völkerkundliche Studien* : (۲۹) O. Lattimore : ۱۲۹ تا ۱۴۲ : (۳۰) O. Lattimore : *The Geographical Factor in Mongol History*، در *Geograph. Journal*، ۹۱، ۱۹۳۸ء : ۱ تا ۲۰ : (۳۱) L. Ligeti : *Mots de civilisation de Haute Asie en transcription chinoise*، در *Acta Orientalia Academiae Scientiarum Hungaricae*، ۱ : ۱۳۱ تا ۱۸۸ : (۳۲) B. Lundholm : *Abstammung und Domestikation des Hauspferdes*، در *Zoologiska Bidrag fran Uppsala*، ۱۹۵۷ء : (۳۳) A. P. Okladnikov : *Histoire de la Yakoutie* (روسی میں) : H. H. von der Osten : ۱۹۵۰ء : (۳۴) H. H. von der Osten : *Die Welt*، ۱۹۵۰ء : (۳۵) H. H. von der Osten : *Die Welt*، ۱۹۵۰ء : (۳۶) H. H. von der Osten : *Die Welt*، ۱۹۵۰ء : (۳۷) H. H. von der Osten : *Die Welt*، ۱۹۵۰ء : (۳۸) H. H. von der Osten : *Die Welt*، ۱۹۵۰ء : (۳۹) H. H. von der Osten : *Die Welt*، ۱۹۵۰ء : (۴۰) H. H. von der Osten : *Die Welt*، ۱۹۵۰ء

*The Rise of Civilization in China with Reference to its Geographical Aspects* : C. W. Bishop (۵) : ج ۳ تا ۶۸ : ۱۹۵۴ء : (۶) J. Boessnek : *36 Bericht d. Röm.-German. Kommission 1955*، برلن ۱۹۵۶ء، ص ۸ : (۷) V. G. Childe : *The Aryans, a Study of Indo-European Origins*، لندن ۱۹۲۶ء : (۸) W. Eberhard : *Kultur und Siedlung der Randvölker Chinas*، تکلمہ T'oung Pao، ج ۳۶، لائڈن ۱۹۳۲ء، الف : (۹) وهی مصنف : *Lokalkulturen im alten China*، حصہ ۱، تکلمہ T'oung Pao، ج ۳۷، لائڈن ۱۹۳۲ء، ب : (۱۰) وهی مصنف : *Monumenta Serica, Monograph 3*، در پکنگ ۱۹۳۲ء، لائڈن : (۱۱) وهی مصنف : *Geschichte Chinas bis zum Ende der Han-Zeit*، در *Historia Mundi*، ۲، ۱۹۵۳ء : ۵۶۵ تا ۶۰۶ : (۱۲) M. de Fernandy : *Die nordeurasische Reitervölker und der Westen*، در *Historia Mundi* (طبع F. Valjavec)، ۵۰، Berne ۱۹۵۶ء : ۱۷۵ تا ۲۲۳ : (۱۳) O. Franke : *Geschichte des Chinesischen Reiches*، برلن و لائپزگ، ج ۱، ۱۹۳۰ء : ج ۳، ۱۹۳۷ء : (۱۴) A. Gallus : *The Horse Riding Nomads in Human Development. An Essay in Human Destiny*، Buenos Aires، *Ann. de Hist. Antigua y Medieval*، ۱۹۵۳ء : (۱۵) R. Ghirshman : *Iran*، Harmondsworth، ۱۹۵۳ء : (۱۶) R. Grousset : *L' Empire des steppes* : (۱۷) R. Grousset : *L' Empire des steppes* : (۱۸) وهی مصنف : *Die Steppenreiche*، در *Hdb. d. Weltgeschichte*، طبع Freiburg و Olten، ۳۹۰ تا ۳۵۹ : (۱۹) A. Randa : *Orient und Okzident im geistigen Austausch*، شٹٹ گارٹ Stuttgart، ۱۹۵۰ء : (۲۰) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۲۱) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۲۲) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۲۳) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۲۴) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۲۵) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۲۶) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۲۷) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۲۸) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۲۹) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۳۰) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۳۱) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۳۲) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۳۳) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۳۴) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۳۵) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۳۶) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۳۷) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۳۸) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۳۹) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم) : (۴۰) R. Haenisch : *Die geheime Geschichte der Mongolen*، لائپزگ، ۱۹۳۸ء، (بار دوم)



تیسرے عہد ہزار سالہ قبل از مسیح تک شمالی افریقہ اور مشرق قریب میں ایک کوهان والا جنگلی اونٹ ملتا تھا، جو آگے چل کر عرب کے سوا ہر جگہ ناپید ہو گیا۔ معلوم نہیں کہ شمالی افریقہ میں یہ جانور کب معدوم ہوا۔

مصر میں تیسرے شاہی خاندان کے عہد کی ایک ڈوری ملی ہے جو اونٹ کے بالوں سے بنی ہوئی ہے۔ جیمز James نے مصری منبت کاری کا ایک نمونہ شائع کیا ہے (۱۹۰۰ء)، جس میں دوسرے جنگلی جانوروں کے ساتھ سانڈنی بھی نظر آتی ہے۔ اس کے اسلوب کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ”نئی بادشاہت“ کے دور کی ہے۔ اونٹ کو پالتو جانور کی حیثیت سے نہ تو وادی نیل میں پالا گیا، جہاں آب و ہوا اس کی صحت کے لیے مضر ہے اور نہ شمالی افریقہ کے صحرائی خطے میں۔ والز Walz نے اس مسئلے پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے (۱۹۰۱ء)۔

عرب کے اس علاقے کے بارے میں جو بحیرہ روم کے کنارے واقع ہے آغا ثرخیدس Agatharchides (دو روایتوں میں، قبّ Geogr. Graec. : C. Müller Minor، ۱: ۱۷۹) اور ارتیمیڈورس Artemidorus نے معلومات بہم پہنچائی ہیں، جو قابل اعتماد ہیں۔ ان بیانات میں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ موجودہ زمانے کے شمالی حجاز کے ساتھ ساحل کے اندرونی علاقے میں جنگلی جانوروں، مویشیوں، گورخروں (αλλων) اور جنگلی اونٹوں (χαμηλων αγριων)، ہرنوں اور غزالوں کے اریوڑ نیز متعدد شیر، چیتے اور بھڑیے پائے جاتے ہیں۔ ان بیانات کا مأخذ غالباً ایک ہی ہے اور وہ شاید ارسطون d'Ariston کا بیان ہے، جس کا زمانہ تقریباً ۲۸۰ ق م ہے (قبّ Tom، حوالہ مذکور، ما بعد کی رپورٹ، ص ۱۴)۔ میوبل

'Grosse Kulturen der Frühzeit' در 'der Perser' (طبع) H. T. Bossert، Stuttgart، ۱۹۰۶ء؛ (۳۴)  
Landschaftliche Wesenszüge der : B. Plaetschke  
Wissensch. Veröff d. Deutschen، در 'östlichen Gobi  
Museums f. Länderkunde، لائپزگ، ۱۹۳۹ء، سلسلہ  
جدید، ۲: ۱۰۳ تا ۱۳۸؛ (۳۵) Scythien: M. Rostowzew  
'und der Bosporus'، ج ۹، برلن، ۱۹۳۱ء؛ (۳۶) B. Spuler  
'Geschichte Asiens'، در 'Geschichte Mittelasiens'  
طبع E. Waldschmidt، Munich، ۱۹۰۰ء؛ (۳۷) S. P.  
Auf den Spuren der altchoresmischen : Tolstow  
'Beiheft zu "Sowjetwissenschaft"، ۱۳،  
The Mongols: G. Vernadsky، ۱۹۰۳ء؛ (۳۸) مشرقی برلن  
and Russia، نیل یونیورسٹی پریس، New Haven  
Le régime social : G. Vladimirtsov، ۱۹۳۳ء؛ (۳۹)  
'des Mongols' le féodalisme nomade، مترجمہ  
'M. Carsov'، در 'Bibliothèque d' Études'، ج ۵۲، پیرس  
'R. Walz'، قبّ Sطور ذیل؛ (۴۰) ۱۹۳۸ء؛ (۴۱)  
Südwest Kiangsu, der Wuhu- : H. v. Wissmann  
'Taihu-Kanal und das Problem des Yangtse-Deltas'  
در 'Wissensch. Veröff. d. Deutschen Museums f. Länd  
erkunde'، لائپزگ، ۱۹۳۰ء، سلسلہ جدید، ۸: ۶۱  
تا ۱۳۱؛ (۴۲) وہی مصنف: Die Entwicklungsräume  
'des Menschen'، ج ۲، در 'Universitas'، ۱، ۱۹۳۶ء؛  
۴۴۰ تا ۴۶۳؛ (۴۳) H. Poech، H. v. Wissmann  
On the Rôle of Nature : F. Kussmaul، G. Smolla  
and Man in Changing the Face of the Dry Belt  
of Asia، در 'of the Earth'، طبع W. L. Thomas، شکاگو، ۱۹۰۶ء  
ص ۲۷۸ تا ۳۰۳۔

(F. KUSSMAUL و H. SON WISSMANN)

(ج) عرب کے بدوی

ہمیں اس امر کے اشارے ملتے ہیں کہ

Musil (۱۹۲۶ء، ص ۳۰۲ بعد) کی رائے میں یہ اونٹ غالباً جنگلی نہیں تھے (اس نئے غلطی سے گورخر کو خچر سمجھا ہے اور درست کہا ہے کہ خچر جنگلی نہیں ہو سکتے) - Littman (۱۹۳۰ء، ص ۳) نے بتایا ہے کہ ثمود کے نقوش دیوار کے مظاہر (قب سطور ذیل) کے سلسلے میں چٹانوں پر بنی ہوئی جو تصویریں منظر عام پر آئی ہیں ان میں پالتو جانوروں (اونٹوں، گھوڑوں اور کتوں) کے علاوہ بڑی تعداد میں شکاری جانور مثلاً غزال، بقرالوحش (نیل گائے)، پہاڑی بکرے، جنگلی سور، خرگوش، شتر مرغ، شیر ببر، بھیڑیے اور لگڑ بگڑ بھی دکھائے گئے ہیں۔ ان میں صرف ایک جگہ بکری کی تصویر ملتی ہے۔ لیکن بھیڑ یا کسی اور پالتو جانور کی تصویر کھینچنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ مدین (Midian) اور حوران کے درمیانی علاقے میں رہنے والے خانہ بدوش بہت گرم جوش ہوں گے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی بھیڑ بکریوں (غنم) کی تصویریں کھینچنے کا زیادہ شوق نہ تھا۔ اسی طرح زینوفن (Xenophon : Anabasis، ۱/۵ : بعد) نے گورخروں، نیل گائے، شتر مرغوں اور تغداروں کے بارے میں بھی بتایا ہے۔ اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر گورخر کے شکار کرنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ لہذا تیسری صدی قبل مسیح تک صحراے عرب میں جنگلی اونٹنیاں بھی موجود تھیں۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایک کوہان والا اونٹ عرب کے کس مقام پر سب سے پہلے سدھایا گیا۔ البرائٹ Albright کا خیال ہے کہ وسیع جنوبی صحرا کے قریب جنوبی عرب میں کسی جگہ کو یہ شرف حاصل ہوا ہوگا (۱۹۵۸ء، حاشیہ ۵)۔ گیارہویں صدی قبل مسیح سے پہلے ہمیں جنگلی ناقہ کا ذکر پالتو جانور کے طور پر نہیں

ملتا (البرائٹ Albright، والز Walz، ۱۹۵۱ء، ۱۹۵۶ء، بخلاف Dussaud، ص ۲۰۷) بائبل کے سفر القضاة (Judges، ۶ تا ۸) میں لکھا ہے کہ اہل مدین، عمالقہ اور اہل مشرق اونٹ پر سوار ہو کر دریائے اردن کے پار فلسطین میں داخل ہوئے تھے۔ یہ واقعہ گیارہویں صدی قبل مسیح کے تقریباً وسط میں پیش آیا تھا اور البرائٹ اور والز کے خیال کے مطابق یہی وہ زمانہ ہے جس میں پہلی بار پالتو ناقہ کا ذکر ملتا ہے۔ اسی زمانے میں فلسطین پہلی بار لوہے سے آشنا ہوا تھا۔ البرائٹ (Arch.، ۱۹۵۳ء، ص ۲۲۷، حاشیہ ۳۱) کی رائے یہ ہے کہ ناقہ کو صحیح معنوں میں سولہویں و پندرہویں اور تیرہویں و بارہویں صدی قبل مسیح کے مابین عرب میں سدھایا گیا۔ جنوبی عرب تک سامیوں کا پھیلنا غالباً اس سے بھی کہیں پہلے زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ منبت کاری کے جو نمونے ہتھپست Hatshepsut کی پونت Punt کی مہم (تقریباً ۱۴۹۵ ق م) میں ملے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ بحیرہ روم کے خطے کی نسلوں کی مشرقی شاخ (خالص بحیرہ رومی - مشرقی - ایرانی - ہندی - گونڈی؛ قب von Eickstedt، Biasutti، Coon، Field، ۱۹۵۶ء، Pösch)، جو شمالی عرب کے سامیوں میں بقول موسکاتی Moscati بہت پرانی نسل شمار ہوتی ہوگی، کی نمائندگی اس زمانے میں بھی جنوبی عرب یا کم از کم وہاں کے حکمران طبقے میں نظر آتی ہے (Dr. Hella Poech کا زبانی تبصرہ)۔ یہ رائے کوئی روسینی Conti Rossini (ص ۱۰۱، قب ص ۴۷) کے قیاس کے مطابق ہے کہ پونت Punt کے جن سرداروں کا ذکر ہتھپست اور رمسیس دوم (Ramses II) کے ہاں ملتا ہے ان کے نام سامی تھے (پر یہو = فریح، نہس = نہاس، قب Brunner - Traut، ص ۳۰۷، Wissmann



پہاڑی علاقوں میں گھوڑوں کی افزائش نسل پر ضرور اہم اثر ہوا ہوگا (ص ۳۹۷)۔ اسی طرح عرب میں ایک کوہان والے اونٹ کی پرورش کے سلسلے میں جو سرگرمیاں پیدا ہوئیں اس کی وجہ یہ تھی کہ جنوبی عرب اور بحیرہ روم کے خطے کے علاقوں، نیز عراق کے درمیان ذرائع حمل و نقل کی مانگ بڑھ گئی تھی، کیونکہ مغربی عرب میں لوبان، کالی مرچ، قیمتی پتھر اور سونا جنوب کے علاقے سے ہند اور مشرقی افریقہ کا سامان اور شمال کے علاقے سے کپڑا، آرائشی سامان، فنون لطیفہ کے نمونے (Segall، ۱۹۵۷ء) اور غالباً لوہے کا سامان دوسرے مقامات تک لے جانا پڑتا تھا۔ جنوبی عرب میں آب پاشی کی نالیوں اور حوضوں کی تعمیر میں پانی روکنے والے پلاستر کے استعمال کے آغاز سے، جو قبل ازیں ملک شام میں ۱۲۰۰ ق م سے مروج ہو چکا تھا، زرعی ترقی میں بڑی مدد ملی۔ لیکن یہ واقعہ غالباً دسویں صدی ق م سے پہلے پیش نہ آیا ہوگا (البرائٹ Albright، ۱۹۵۸ء)۔

جہاں گلوٹک (N. Glueck) کے زیرِ اہتمام ازیون گبر Ezion-Geber، کی کھدائیوں (Smithson، ۱۹۴۱ Inst., Ann. Rep.، ۳۶۵۱ Publ.، ۱۹۴۲ء) سے ثابت ہوتا ہے کہ اوفیر Ofir کی سونے کی سر زمین کے بارے میں حضرت سلیمان<sup>۳</sup> اور حیرام Hiram کی بحری مہمات کی روداد کا تعلق تاریخی امور سے ہے۔ کتاب الملوک باب ۹ تا ۱۰ میں اوفیر کی مہمات کے سلسلے میں ملکہ سبأ کی جو کہانی بیان کی گئی ہے وہ بھی لازمی طور پر تاریخی پس منظر رکھتی ہے (قَب البرائٹ Albright، ۱۹۵۸ء، ص ۳)۔ کم از کم اس سے اتنا تو پتا چلتا ہے کہ دسویں صدی قبل مسیح میں جنوبی عرب اور فلسطین کے درمیان اونٹوں کے قافلے چلا کرتے تھے۔ کتاب پیدائش، باب ۱۰، ۱۱ (نویں یا آٹھویں صدی قَب Albright :

۱۹۵۷ء)۔ میرا خیال ہے کہ جب ہم پانچویں خاندان (سہورے، قَب Kees، ص ۵۹) کے عہد کی مصری منبت کاری کے نمونوں میں ہونت کے باشندوں کے جسمانی خط و خال دیکھتے ہیں تو یہ کہنا کچھ غلط معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کم از کم جزوی طور پر سمندر کے عربی ساحل والے علاقے میں آباد ہوگا۔ اہل ہونت کے خط و خال مصریوں کے خط و خال سے مشابہ ہیں (قَب Pösch، ۱۹۵۷ء)۔

البرائٹ (W. F. Albright) کا اندازہ ہے کہ یمن کے کوہستانی علاقوں کے اندرونی دامن کے ساتھ ساتھ صحرائی آب و ہوا میں پندرہویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ تہذیب کا آغاز ہو رہا تھا۔ اس کا قیاس ہے کہ اس کا باعث شمال کی طرف سے لوگوں کی نقل مکانی تھی۔ اس نے زمانے کی جو تعیین کی ہے وہ اس امر پر مبنی ہے کہ [علاقہ] حَجْر بن حَمِيد (قَب سطور ذیل) کی کھدائی سے ظاہر ہوا ہے کہ بستی کی بنیاد سے پہلے چار پانچ میٹر زراعتی (سیراب شدہ) مٹی کی تہ موجود ہے۔ یہ بنیاد ۱۰۰۰ ق م کے قریب رکھی گئی ہوگی، جہاں ۸ میٹر مٹی کی تہ تقریباً ۱۰۰۰ ق م اور تقریباً ۷۰۰ ق م کے مابین بستی کی موجودگی کے دوران میں جمی ہوگی۔ وہاں نیچے کی چار پانچ میٹر کی تہ تقریباً ۵۰۰ سال کے زمانے کو ظاہر کرتی ہے (R. Le Baron، Bowen، ص ۶۷، ۱۱۷: البرائٹ Albright، ۱۹۵۸ء)۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ شتر سواری اور اس سواری دونوں کے رواج کا آغاز دوسرے عہد ہزار سالہ قبل مسیح کے نصف آخر میں نظر آتا ہے۔ شتر سواری کی ابتدا عرب سے ہوئی اور اس سواری کی غالباً ماوراء قفقاز کے پہاڑوں سے۔ ہنچر Hančar اس سلسلے میں یہ رائے ظاہر کرتا ہے کہ دھات کے حمل و نقل کے لیے حمل بردار ٹھوں کی مانگ میں جو اضافہ ہوا اس سے غالباً

کانوں کے باعث غالباً . . . قبل مسیح کے لگ بھگ یونان میں بہت مشہور تھا اور آگائرخیدس Agatharchides نے اس کا بالوضاحت ذکر کیا ہے (Geogr. Graec. Minor. : C Müller، ص ۱۸۴ بعد؛ Wissmann، ۱۹۵۷ء، بالخصوص ۱۹۵۹ء)۔

بائبل کی کتاب پیدائش میں جو انساب مذکور ہیں ان میں جنوبی عرب کے باشندوں کو گوش اور عابر دونوں کی نسل سے بتایا گیا ہے۔ عابر اور اس کے بیٹے یقطن کی اولاد ”شرقی جانب کے ایک پہاڑ“ ”سفار“ تک آباد ہو گئی تھی۔ عام طور پر اس سفار کو ظفار سمجھا جاتا ہے، جو یمن میں حمیر کا دارالحکومت تھا۔ لیکن اس شہر کی بنیاد غالباً ۱۰۹۰ ق م میں رکھی گئی تھی (قب سطور ذیل)، جب حمیر اس علاقے پر قابض ہوئے تھے۔ یہ جنوب مغربی یمن کے کوہستانی علاقے میں ایک پہاڑی پر واقع ہے اور ”شرقی جانب کا ایک پہاڑ“ نہیں۔ Fresnel، C. Ritter، Rödiger، Tkač اور دوسرے مصنفین کا قیاس ہے (اور میرے خیال میں ان کا یہ قیاس صحیح ہے) کہ سفار سے مراد ظفار کا شہر اور علاقہ ہے، جو حضر موت اور سرزمین مہرہ کے مشرق میں واقع ہے، لیکن اس کا ذکر قبل از اسلام کے کتبات اور ادب میں نہیں آیا، بلکہ صرف ابتدائی عہد کے عرب جغرافیہ نویسوں کے زمانے ہی سے ملتا ہے۔ لوبان (بُخُور) کی پیداوار کے اعتبار سے یہ جنوبی عرب کا بہترین علاقہ ہے۔ اس کے مشرق میں جو پہاڑی حصہ سمندر کے اندر تک چلا گیا ہے اور اس علاقے کی زاس در حقیقت خشکی کا وہ آخری ٹکڑا ہے جہاں قدیم زمانے میں ہندوستان کو جانے والے جہاز مون سون کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ساحل سے لنگر اٹھاتے تھے (Frisk، Schoff، آخری محل مذکور)۔ اسی طرح یہ جنوبی عرب کا مشرق کی جانب وہ آخری علاقہ ہے جہاں ہمیں غیر بدوی حضری آبادی ملتی ہے۔

Arch.، ۱۹۵۳ء، ص ۳۲۷) سبأ، اوفیر اور حویلہ کے نام یکے بعد دیگرے بھائیوں کے طور پر آئے ہیں۔ علاوہ ازیں حضرموت کا نام یقطن [یقطن؟] بن عابر کے بیٹوں میں نظر آتا ہے۔ میں اس مفروضے کی تائید میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اوفیر کی سونے کی سرزمین (الملوک اول، ۹: ۲۸ و ۱۰: ۱۱: ۲۲: ۳۹: تواریخ اول، ۲۹: ۳: تواریخ دوم، ۸: ۱۸: ۱۰: ۱۰: ایوب، ۲۲: ۲۳ و ۲۸: ۱۶: مزامیر ۳۵: ۱۰: یسعیا، ۱۳: ۱۲) جنوب مغربی عرب میں بحیرہ قلم کے کنارے ذہبان کے گرد عسیر میں واقع تھی (Delbrueck، Moritz، Sprenger، ص ۱۲: Wissmann، ۱۹۵۷ء، ۱۹۵۹ء: قب Glaser، ص ۳۵۷ تا ۳۸۴: Arch. : Albright، ۱۹۵۳ء، ص ۲۱۲، حاشیہ ۱۴)۔ شمالی لینڈ میں، جہاں چند ایک مصنفین اوفیر کا محل وقوع بتاتے ہیں، صاف شفاف چٹانوں اور ان کے شکافوں میں ابھری ہوئی دھات کی پرت اور ان ٹکڑوں کا جن میں سونا پایا جاتا ہے اگر عسیر کی چٹانوں سے مقابلہ کیا جائے تو اول الذکر کے پرت حجم کے اعتبار سے نسبتاً بہت چھوٹے نظر آتے ہیں (قب Carte Géol Afr.، ۱۹۵۲ء)۔ سبأ کے سونا بھیجنے کے بارے میں (قب الملوک اول، باب ۱۰: یسعیا، ۶: ۶: حزقی ایل، ۲۷: ۲۲: مزامیر، ۲۲: ۱۵: (لیکن قب J. Ryckmans، ۱۹۵۸ء)۔

پیدائش، ۲: ۱۱: ۱۰: ۱۰: ۱۰: ۲۹: ۲۵: اور سموئل اول، ۱۵: ۷: میں جو حویلہ کے سونے کی سرزمین کا ذکر آیا ہے اس کی سب سے زیادہ قرین قیاس مطابقت میرے خیال میں نیز Niebuhr، C. Ritter، Moritz، Sprenger اور دوسروں کی رائے میں خولان سے ہوتی ہے۔ اس نام کا پتا الہمدانی کے ہاں نیز کتبات سے بھی چلتا ہے اور یہ نام آج بھی رائج ہے۔ شمالی خولان اوفیر کی سرحد پر واقع تھا۔ جنوبی خولان سبأ سے جا ملتا تھا۔ شمالی خولان اپنی اعلیٰ درجے کی سونے کی



اسی کی بدولت بدوی اس قابل ہوتا ہے کہ محض اپنے اونٹوں کے ریوڑ کے سہارے زندگی بسر کر سکے۔ وہ ان کا دودھ پیتا ہے، ان کا دہی اور گوشت کھاتا ہے، ایسے علاقوں میں جہاں صرف اونٹ ہی زندہ رہ سکتا ہے گھومتا پھرتا ہے اور بے آب و گیاه صحراؤں میں کئی کئی روز تک بڑی تیزی سے سفر کر سکتا ہے۔ اونٹ ایسی ایسی صحرائی جڑی بوٹیاں اور جھاڑیاں کھا لیتا ہے جنہیں بھیڑ بکریاں چھونا بھی پسند نہیں کرتیں۔ طویل مسافتوں میں سواری کے اونٹ کی رفتار گھوڑے سے تگنی ہوتی ہے۔ یہ تین سو کیلو میٹر کا فاصلہ ایک روز میں طے کر لیتا ہے۔ قافلے کے ایک اونٹ پر دو سو کیلوگرام بوجھ لادا جا سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں گھوڑا ایک سو پچاس کیلوگرام تک بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ عرب میں صرف نشیبی علاقے کے باربردار یا سواری کے اونٹوں ہی کی پالتو نسلیں موجود نہیں بلکہ پہاڑی اونٹوں کی نسلیں بھی پائی جاتی ہیں، جو عسیر (Tamisier، ۲ : ۳۱، ۳۷، ۱۹۷) یا علاقہ عوالق اور حضر موت جیسے خطوں میں خاصے سیدھے ڈھلوان راستوں پر سفر کر سکتے ہیں۔ جب میدانی علاقے سے سفر کرتے ہوئے پہاڑوں کے کسی درے (عقبہ) کے پاس پہنچیں تو اس درے کے دامن میں قافلے والوں کے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ پہلے اونٹوں کی جگہ دوسری نسل کے اونٹ بدل لیں۔ عرب میں صرف یمن کے کوہستانی علاقے کی مغربی ڈھلان ہی ایک ایسا خطہ ہے جہاں کی آب و ہوا ضرورت سے زیادہ مرطوب ہے اور اس وجہ سے وہاں اونٹ نہیں پالے جا سکتے۔ ہمیں یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ اونٹ سدھانے سے پہلے کے زمانے میں صرف گدھا (اور شاید گورخر) ہی ایک ایسا جانور تھا جس سے بلاد عرب میں حمل و نقل کا کام لیا جاتا تھا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ

اس کے مشرقی جانب صحراے اعظم عمان تک سمندر کو چھوتا ہے (قب Lagarde، ص ۶۱، حاشیہ) - Vollers : Ztschr. f. Assyr، ص ۲۲، ۲۳ بعد کی رائے میں پیدائش، باب ۱۰ میں مذکورہ سفار کو سفار سمجھنا چاہیے جو بحرین میں ہے۔ لیکن یہ ”بلد“ (یاقوت، ۳ : ۹۶ بحوالہ ابن الفقیہ) نہ تو سرحدی مقام تھا اور نہ پہاڑ۔

میرے خیال میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ”شجرۃ اقوام“ (یہوست دوم) میں ”فرزندان یقطان“ سے مراد جنوبی عرب کے زراعت پیشہ لوگ ہیں اور میرا خیال ہے کہ پیدائش، ۲۵ : ۱۸ میں وسطی اور شمال مغربی عرب کے شتربان بدویوں کو ”فرزندان اسمعیل“ میں شمار کیا گیا ہے اور پیدائش، ۲۵ : ۲۸ اور القضاة، ۸ : ۲۳ میں ان کا ذکر اسمعیلیوں کے نام سے آیا ہے۔ پیدائش ۲۵ : ۱۸ ”اور وہ (فرزندان اسمعیل) حویلہ سے لے کر آشور تک آباد تھے جو مصر کے مشرق میں آشور کی راہ پر واقع ہے۔“ ”معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مثلث نما لق و دق صحرا میں آباد تھے جو جنوبی عرب (خولان)، مصر اور شام کے زرعی ملکوں کے درمیان واقع ہے“ (قب Skinner :

(Kautzsch-Bertholet و Internat. Crit. Comment.

اونٹ صحرا کے حالات سے بے حد مناسبت اور مطابقت رکھتا ہے۔ اس میں پیاس کو بحسن و خوبی برداشت کرنے کی بڑی صلاحیت ہے اور وہ طویل مسافت کو بہت تیزی سے طے کر سکتا ہے۔ یہ یقینی امر ہے کہ جنگ کے موقع پر اونٹ جیسے جانور پر سوار ہو کر لڑنے والے دستے گھوڑوں والی جنگی رتھوں میں سوار فوجوں پر بہت زیادہ فوقیت رکھتے ہوں گے۔ البرائٹ Albright لکھتا ہے (Stone Age، ۱۹۳۶ء، ص ۱۲۰، Arch.، ۱۹۵۳ء، ص ۹۷) : ”عربوں کی بدوی زندگی اونٹ پالنے پر مشتمل ہے۔“

عرب میں نسبتاً خاموش طبع ناقہ کے سدھانے جانے سے تقریباً ایک ہزار سال قبل باختری اونٹ توران میں سدھایا جا چکا تھا، لیکن اسے سواری کے اونٹ کی حیثیت سے کبھی اہمیت حاصل نہ ہو سکی اور یہ جانور لدو ہی رہا۔

یوں نظر آتا ہے جیسے ناقہ کے سدھانے کا عمل اور بطور سواری اس کا استعمال ساتھ ساتھ جاری رہا یہ بات کسی اور جانور کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ چونکہ عرب میں جو کھدائیاں ہوئی ہیں وہ ابتدائی ادوار کی تھیں یہیں پہنچیں اس لیے ہماری معلومات صرف تاریخی مواد ہی پر مبنی ہیں۔ ابھی تک ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ اونٹوں کو سدھانے کے جذبے کا محرک کیا تھا۔ والز (Walz) (۱۹۵۶ء) نے وائسنر (Weisner)

(۱۹۵۵ء) سے اختلاف کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ ایک کوہان والے اونٹ کی تربیت باختری اونٹ اور گھوڑے کے سدھانے سے بالکل الگ تھلگ ہوئی۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ متوازی اختراعات کی مثال تاریخ اور زمانہ قبل از تاریخ میں نادر ہے (Sauer، محل مذکور، ص ۲)۔ گھوڑا کم از کم ۲۰۰۰ ق م کے لگ بھگ سے عراق میں زیر استعمال تھا، لیکن ۱۱۳۰ ق م سے پہلے فوجوں کے گھوڑوں پر سوار ہونے کا ذکر نہیں ملتا (بخت نصر اول، شاہ بابل؛ Thomson، در Pauly-Wissowa، ۷: ۱۰۹ بعد)۔ چونکہ باختری اونٹ کم از کم تقریباً ۲۱۰۰ ق م سے جنوبی توران میں پالا جا رہا تھا اس لیے یہ بات بعید از قیاس ہے کہ دوسرے عہد ہزار سالہ ق م کے ابتدائی اور وسطی پر آشوب ادوار میں اسے وقتاً فوقتاً عراق عرب بلکہ اس سے بھی جنوب کے علاقوں میں نہ لایا گیا ہو۔ غالباً اسی سے ایک کوہان والے اونٹ کو پالنے اور سدھانے کا خیال پیدا ہوا ہوگا۔ جنوبی عرب میں بیخان

(قدیم قتبان) کے مقام پر حجر بن حمید کی کھدائی کے دوران میں البرائٹ (W. F. Albright) کو ایک اونٹ کا سر ملا ہے جو مٹی کے ایک مرتبان کا حصہ ہے۔ اس نے اس کی تاریخ تخمیناً آٹھویں (یا نویں) صدی قبل مسیح متعین کی ہے (van Beek، ۱۹۵۲ء، ص ۱۷؛ Walz، ۱۹۵۶ء، حاشیہ ص ۵۴؛ البرائٹ Albright، مکتوب ۱۹۵۷ء)۔ حجر بن حمید کے ایک زیرین پرت کے لیے ایک ریڈیو کاربن تاریخ کی اشاعت سے پتا چلتا ہے (van Beek، ۱۹۵۶ء) کہ اس کھدائی سے برآمد شدہ ایک طغریٰ کی ابتدائی کتبہ خوانی سے البرائٹ نے جو تاریخ متعین کی ہے وہ اتنی قدیم نہیں بلکہ شاید تقریباً ایک صدی بعد کی ہے۔

تل حلاف میں ایک ناقہ سوار کی تصویر منبت کاری میں ملی ہے، جو نویں صدی کی ہے (والز Walz)۔ خط میخی میں شتر سوار خانہ بدوشوں کا جو حال ملتا ہے وہ آرامی بدویوں کا معلوم ہوتا ہے جو آشور نصر پال کے ایک جاگیردار کے خلاف ۸۸۰ ق م میں جنگ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس سے کچھ عرصے کے بعد ۸۵۴ ق م میں جندب (Gindibu) العربی، جو عرب کے ایک علاقے کا رہنے والا تھا، ایک ہزار شتر سواروں کے دستے کی قیادت کرتا ہوا سلمانسر Salmanassar سوم کے ساتھ نبرد آزما ہوا۔ مقالہ العرب (۱) میں گرومن (A. Grohmann) نے نویں سے ساتویں صدی قبل مسیح تک دیار عرب اور اہل عرب کے حالات کا خلاصہ دیا ہے جو خط میخی سے ماخوذ ہے۔ اس زمانے میں عرب کا انتہائی شمالی حصہ جو شام اور عراق (میسوپوٹیمیا) کے درمیان واقع ہے عربی کہلاتا تھا اور اس میں تدمر (Palmyrene) کا علاقہ اور وادی سرحان بھی شامل تھے۔ عرب اس علاقے کے بدوی اور نخلستانی باشندے تھے۔ گرومن (Grohmann) اور



۱۰: وہی مصنف، ۱۹۵۸: Wissmann، ۱۹۵۷ء)۔  
اس دور میں شامی بادشاہوں نے عرب کے شمالی  
نصف حصے کے بادشاہوں اور شہزادیوں سے جو خراج  
وصول کیے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ طویل مسافت  
طے کرنے والے قافلوں کی تعداد خاصی تھی۔ اور  
مویشی، سونا، چاندی، جست، لوہا، ہاتھی کی کھالیں،  
ہاتھی دانت، اور کپڑا وغیرہ سب چیزوں کی  
حمل و نقل ہوتی تھی (Caskel، ۱۹۵۳ء)۔

یہاں اس امر پر زور دینا ضروری ہے کہ  
جنوبی عرب، جس کا ذکر کم از کم دسویں صدی سے  
سبأ کے نام سے ہوتا آیا ہے (قَب البرائٹ Albright،  
در BASOR، ۱۹۵۲ء، حاشیہ ۲۶، ۱۹۵۸ء)، ایک  
ایسا ملک تھا جس کی آبادی کثیر التعداد اور  
زراعت پیشہ تھی، جہاں بدویت کا نشان بہت کم  
تھا اور اسے کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ یہ  
خوشبودار مسالے خصوصاً لوبان پیدا کرنے والا ملک  
تھا (خروج، ۳۰: ۳۴؛ الملوک، ۱: ۱۰؛ یسعیاہ، ۶: ۶،  
یرمیاہ، ۶: ۲۰؛ قَب J. Ryckmans، ۱۹۵۸ء)۔ یہ بات  
یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جنوبی عرب  
اپنی بندرگاہوں میں ہندوستان اور مشرقی افریقہ کی  
مصنوعات درآمد کرتا تھا اور ضروری ہے کہ اس  
زمانے میں اس نے کسی حد تک شمال مغرب کو  
اور وسط عرب سے ہوتے ہوئے شمال مشرق  
کو جانے والے ”بخورات لانے والے راستوں“ کی  
اجارہ داری حاصل کر لی ہوگی (آٹھویں سے  
چھٹی صدی تک سبأ کے استحکام کے بارے میں  
قَب von Wissmann، ۱۹۵۷ء)۔ غالباً ان ادوار میں  
کلدانی عمان میں رہتے تھے اور عراق پر قابض ہونے  
سے پہلے، جہاں کلدانی بادشاہوں کی حکومت کا  
۶۲۵ ق م میں آغاز ہوا تھا، وہ سبأ اور عراق (اور  
ہندوستان؟) کے درمیان مصالحت کراتے تھے (دیکھیے

Albright، در BASOR، ۱۹۵۲ء)۔

میوسل Musil (۱۹۲۷ء، ص ۵۳۱ بعد) کی رائے  
میں مرکزی نخلستان اَدُمْتُو Adummatu دُوْمَةُ الْجَنْدَل  
ہے جو جوف میں واقع ہے۔ جن بادشاہوں  
کا ذکر آیا ہے وہ کچھ تو نخلستانی آبادیوں کے  
شیوخ ہیں اور کچھ بدوی قبائل کے۔ یرمیاہ، ۲۵:  
۲۴ میں بھی اسی صورتِ حال کا ذکر آیا ہے۔  
”عرب کے بادشاہ اور عربوں کے تمام بادشاہ جو  
صحرا میں رہتے تھے“ (بائبل میں اعراب کا  
پہلی بار ذکر کتاب اِشْعِیَآء میں آٹھویں صدی  
کے اواخر میں آیا ہے)۔ بازو، جس پر اَصْرَحَدُون  
Assarhaddon نے ۶۷۶ ق م میں ایک طویل لشکر کشی  
کی تھی، واڈنر Weidner کی تازہ ترین تحقیقات کے  
مطابق مشرقی عرب میں دلمون (بحرین) کے ساحل  
کے عقبی علاقے میں واقع ہے، اور میوسل Musil (۱۹۲۷ء،  
ص ۴۸۳ بعد) کا یہ قیاس درست نہیں کہ یہ وادی  
سرحان میں تھا (Albright، مکتوب)۔

یہ ظاہر ہے کہ قافلوں کے راستے سیاسی اعتبار  
سے بڑی اہمیت کے حامل تھے، بالخصوص غَزَه (Ghazzet)  
سے جو بحیرہ روم پر واقع تھا آنے والا ”بخورات کے  
لانے کا راستہ“ اور دمشق سے آنے والا وہ راستہ جو  
مَعَان (میوسل Musil، ۱۹۲۶ء، ص ۲۴۳) دَیْدَان (العلاء)  
اور یَثْرَب (المدینہ) سے ہوتا ہوا رَجْمَت (نَجْرَان)، مَعِیْن  
اور سبأ تک جاتا تھا (قَب البرائٹ Albright، ۱۹۵۳ء؛  
Wissmann، ۱۹۵۷ء؛ Segall، ۱۹۵۷ء)، مثلاً جب  
۳۲ ق م تکلیت پِلِسَر Tiglath-Pileser سوم کے خلاف  
ریاست سبأ شاہ دمشق تیماء کے اہم نخلستان اور  
تیماء کے آس پاس کے قبائل اور دَیْدَان کے عظیم الشان  
اتحاد میں عرب کی ملکہ سَمْسِی شامل ہوئی۔ خط میخی  
کے کتبات میں سبأ کے جس بادشاہ کا نام پہلے پہل آتا  
ہے وہ غالباً ایک مُکْرَب (راہب بادشاہ) تھا، جو ۱۰۵ ق م  
میں سارگون Sargon دوم کے پاس خراج لے کر آیا تھا  
(قَب البرائٹ Albright، در BASOR، ۱۹۵۶ء؛

جو بائیں طرف سے دائیں طرف اور پھر دائیں سے بائیں طرف لکھا ہوا ہے (Caquot and Drewes، ص ۳۰ تا ۳۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ”دَعْمَت“ (زمانہ ما بعد کے اَکْسُوم کے قریب ایک مقام) اور سَبَا کے ایک مُکْرَب نے (قربان گاہ) کو المَقَّہ کے نام سے معنون کیا تھا، جو جنوبی عرب میں سَبَا کا سرکاری طور پر بڑا دیوتا تھا۔ رکمن J. Ryckmans نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مَارِب اور صِرُوح میں اولین دریافت شدہ کتبات (جن کی تاریخ غالباً آٹھویں صدی قبل مسیح ہے؛ Wissmann، ۱۹۵۷ء) سے پہلے کے دور میں سَبَا کا مرکز موجودہ جنوبی یمن کے پہاڑوں اور کوہستانی علاقوں میں جبل بَعْدَان اور جبل حَمِيم (ذات بَعْدَان اور ذات حَمِيم سَبَا کی اہم ترین سورج دیویاں تھیں) کے قریب واقع تھا اور جنوب مشرق میں مَارِب کا علاقہ اور مغرب میں شمالی حبشہ دونوں کے دونوں اسی خطے کے لوگوں نے آباد کیے تھے (J. Ryckmans، ۱۹۵۸ء؛ قَب Albright، ۱۹۵۸ء)۔

گلازر Glaser (ص ۳۸۷ بجعد) اور von Wissmann-Höfner کا خیال ہے کہ بحر ہند پر جنوبی عرب کی دو بہترین قدرتی بندگاہیں قَنَا اور عدن حزقی ایل، ۲۷: ۲۳ (چھٹی صدی قبل مسیح کے اوائل میں) میں کَنَہ اور عِیدِن کے ناموں سے مذکور ہیں۔ حزقی ایل نے کہا ہے ”حاران [= حَران] اور کَنَہ اور عدن“ (م) ”تاجرانِ شِيبَا“ یا (ترجمہ سبعینہ کے مطابق) ”وہ تیرے تاجر“ تھے۔ بیشتر اوقات میں تینوں مقامات کی شمالی عراق میں تلاش کی جاتی ہے، جہاں قدیم زمانے میں ایک مقام حاران مشہور ہے (قَب Cooke، Int. Crit. Comment. - یسعیا، ۳۷: ۱۲ اور الملوک ثانی، ۱۹: ۱۲ میں اسی شمالی حاران کا ذکر بنی عدن کے ساتھ آیا ہے۔ ”جوزان، حاران، رَصَف (تَدْمَر میں) اور

البرائٹ Albright نے یہ خیال ظاہر کیا ہے (قَب van Beek، ۱۹۵۲ء) کہ مغرب کی جانب حبشہ تک اپنی تجارت وسیع کرنے کے لیے دسویں صدی ق م کے لگ بھگ سے بہتر زمانہ کبھی سَبَا کو میسر نہیں آیا۔ ”مصر کو قبل ازیں حبشہ اور پونت Punt میں بحری اور بری تجارت کے کئی حقوق حاصل تھے، مگر نئی سلطنت کے زوال کے بعد وہ جنوب کے ملکوں کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم نہ رکھ سکا“۔ البرائٹ Albright کے بیان کے مطابق اَکْسُوم کے مشرق میں شمالی حبشہ کی سطح مرتفع پر آوَم ’Awam کے مندریا موجودہ زمانے کے یحَا میں جو سبائی کتبات پائے گئے ہیں (Littmann، ۱۹۱۳ء، شماره ۲۷ تا ۳۲ و D.H. Müller: Epigraph. Denkmäler, Yeha 5)، وہ اپنی کتابت کی رو سے پانچویں صدی ق م سے تعلق رکھتے ہیں (مکتوب منجانب W. F. Albright، مارچ ۱۹۵۷ء، قَب Conti Rossini، ص ۱۰۲)۔ حال ہی میں ایک خاصا پرانا بُت مَقَلّی Makallē میں ملا ہے (Drewes و Caquot)، جس کی بنا پر لکھا ہوا کتبہ کسی حد تک قدیم تر زمانے کا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بیسٹن A. F. L. Beeston (در BSOAS، ۱۹۵۴ء) اور Pirenne (۱۹۵۶ء، ب) جو جنوبی عرب کی قدیم واقعہ نگاری کی تجدید پر زور دیتے ہیں، ان کی نئی تاریخوں میں بھی پانچویں صدی قبل مسیح کچھ زیادہ قدیم نظر نہیں آتی۔ اس زمانے میں سبائی استعمار نے پورے استحکام کے ساتھ اس علاقے میں پاؤں جما لیے تھے۔ یحَا کی موجودہ عبادت گاہ کا قرین قیاس نام آوَم سَبَا کے سرکاری دیوتا کے اس عظیم الشان بیضوی مندر کا نام بھی تھا جو مَارِب کے قریب واقع تھا۔ حبشہ میں مَقَلّی کی قربان گاہ پر خوشبو جلانے والے چبوترے پر ایک قابل ذکر boustrophedon کتبہ ملا ہے،



کا پتا چلتا ہے (دندان وہی مقام ہے جسے جنوبی عرب کے کتبات میں دَیدان لکھا ہے)۔

اس زمانے میں جنوبی عرب کے محل وقوع کی اس اہمیت اور بحری آمد و رفت والے قدیم ترین علاقے یعنی بحر ہند میں اس کی مرکزی حیثیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شمالی اور وسطی عرب، جو شتربان بدویت کا گھر تھا، چاروں طرف سے تہذیب یافتہ مزروعہ ممالک سے گھرا ہوا تھا، جسے سمندر کی موجیں نہیں چھوسکتی تھیں۔

جن مقامات پر پانی دستیاب ہو سکتا تھا وہ ایک دوسرے سے طویل فاصلے پر واقع تھے۔ صحرا میں ان طویل فاصلوں کو طے کرنے کی دشواری پر صرف تربیت یافتہ اونٹوں کے ذریعے ہی قابو پایا جا سکتا تھا۔ آمد و رفت کے اعتبار سے اہم ترین صحرائی راستے وہ تھے جو عراق عرب کو شام سے ملاتے تھے۔ لیکن ان کے علاوہ عرب سے عراق اور بحیرہ روم کے سواحل سے جنوبی عرب کے زرخیز کوہستانی علاقوں تک سفر کرنے میں جو مشکلات پیش آتی تھیں ان پر بھی اونٹوں کے قافلوں کے ذریعے باسانی غالب آیا جا سکتا تھا۔ عرب کے شمالی حصے میں جہاں چشمے اور کنویں واقع تھے ان مقامات کو قافلوں کے سستانے کی جگہ اور تجارتی اور سیاسی مراکز بن جانے کے باعث بڑی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ چونکہ بدوی قافلوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اونٹ ہالتے تھے اس لیے ان کے قبائل کا فائدہ اسی میں تھا کہ آمد و رفت امن و امان سے ہوتی رہے۔ چنانچہ وہ اسی مصلحت کے پیش نظر آپس میں وفاق کرتے تھے اور ان نخلستانی قصبوں کی ریاستوں کے ساتھ بھی اتحاد کر لیتے تھے جو شاہراہوں پر واقع تھے۔

ممال مغربی عرب، جس میں دَیدان سے غزہ

ہی عدن تل آسار میں“۔ لیکن الاذریسی نے حاران القرین کو جنوبی عرب میں شمالی حوران اور ”پیشت [= پیٹہ؟] بطنان“ (یہ نام پیش کی غلط صورت ہے: Grohmann، ۲، ۱۹۳۳ء : ۱۳۱) کے درمیان بتایا ہے۔ اس کا محل وقوع تہامہ کے نشینی علاقے میں، جو یمن کی موجودہ شمالی سرحد کے شمال میں واقع ہے، موجودہ زمانے کے ابو عریش کے قریب کسی جگہ ہے۔ ریٹر Arabien : Ritter، ۱ : ۱۸۹، ۱۹۳ اور Büsching کا قیاس تھا کہ یہ وہی حاران ہے جس کا ذکر حزقی ایل میں آیا ہے۔ دشواری یہ ہے کہ قدامہ اور خرداذبہ نے اس راستے پر اس نام کے کسی مقام کا ذکر نہیں کیا بلکہ اس کے بجائے العرش (ابو عریش) کا ذکر کیا ہے۔ مجھے الاذریسی کے متن میں غلطی کا شبہ ہوتا ہے لیکن جنوبی عرب کے قدیم کتبات میں مختلف مقامات ملتے ہیں جن کے نام میں ح ر ن کے حروف آتے ہیں، جیسے حران قعطبہ کے نزدیک عدن کے شمال میں، حران معین کے جنوب مغرب میں اور حران دمار کے شمال میں (آخر الذکر کے لیے قَب W.B. Harris، ص ۲۷۲ بعد)۔ غالباً سبعینیہ (Septuagint) کے مترجمین نے متن میں ترمیم کر کے ”تاجران شیبا“ کی جگہ ”وہ تیرے تاجر تھے“ لکھ دیا، کیونکہ وہ صرف شمالی حاران سے واقف تھے اور انہیں جنوبی حاران اور عدن کا کوئی علم نہ تھا؛ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے معنی نہ سمجھ سکے۔ ”تاجران شیبا“ کے سلسلے میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ سبأ (شیبا) ایک ریاست تھی، شہر نہ تھا اور ہو سکتا ہے کہ مذکورہ بالا تینوں مقامات اس ریاست میں شامل ہوں۔

حزقی ایل، ۳۸ : ۱۳ میں ”شباودندان [= دندان] اور تاجران ترشیش“ (Sardinia یا Tartessos) حزقی ایل کے خطہ معلومہ کی بالمقابل سرحدی چوکیوں





نے بھی اعراب کا لفظ صرف بدویوں کے لیے استعمال کیا ہے (قَب ۹ [التوبة] : ۹۷ : ۹۰ : [الحجرات] : ۱۴)۔ یہ یونانی تھے جنہوں نے غالباً دارا (Scylax) کی مہمات کے بعد ہی اس لفظ کا اطلاق پورے جزیرہ نما پر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ثیوفرستوس Theophrastus (۳۷۲ تا ۲۸۷ ق م) نے عرب کو τῶν Ἀράβων χερρόνησος لکھا ہے (Hist. Plant.، ج ۹، باب ۲ : ص ۲)۔ Eratosthenes (تیسری صدی قبل مسیح کا اواخر؛ Strabo، ۱۵ : ۴، ۲) نے عرب کو عرب یوڈیمون (Arabia Eudaimon) اور عرب اریموس (Arabia Eremos) میں تقسیم کیا ہے۔ یہ اصطلاحات رومیوں کے عہد کے Arabia Felix اور Arabia Deserta کے مترادف ہیں۔ لیکن اس سے پہلے بھی Euripides نے اپنی تصنیف Bacchae (۱۶ تا ۱۸) میں عرب یوڈیمون کا اور Aristophanes (Aves، ۱۴۴ بعد) نے شہر یوڈیمون کا ذکر کیا ہے۔ جو بحیرہ اری تھرین پر واقع تھا "Polis eudaimōn on the Erythraean Sea" اور یہ دونوں مصنف پانچویں صدی قبل مسیح کے ہیں۔ جنوبی عرب کے باشندوں نے اپنے آپ کو کبھی اعراب نہیں کہا۔

ہمیں زمانہ قبل از اسلام کے ان بدوی قبائل کی تاریخ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں جو ربع الخالی کے جنوب، حضرموت کے شمال اور مشرق اور عمان کے مغرب میں آباد تھے۔ موجودہ زمانے میں یہ لوگ شمالی قبائل کی طرح خالص شتریان بدوی ہیں، جن کے پاس کچھ بھیڑ بکریاں بھی ہیں۔ آج بھی ان کی مقدس چٹانیں ہیں اور کنوؤں کے قریب مقدس مقامات ہیں، جہاں وہ اپنے مردے دفن کرتے ہیں (van der Meulen، ذاتی تجربہ؛ Thesiger)۔ لیکن یہ خیموں میں نہیں رہتے۔ ان کا لباس گرمائی ہے اور وہ جنوب کی سامی بولیاں

رسم خط کے نمونے جنوبی عرب میں بھی اور بالخصوص صحرا کے ساتھ ساتھ کے علاقے میں پائے جاتے ہیں (قَب Höfner اور Jamme، ۱۹۵۵ء)۔ اس امر سے کہ تمام "نمودی" کتبات بدویوں کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں یہ پتا چلتا ہے کہ بدوی قبائل ایک دوسرے کا سہارا لینے کے تصور سے روشناس تھے۔ اور ان میں ایک خاص حد تک تنظیم و استحکام کا تصور بھی موجود تھا اور ان کی زندگی نخلستانوں کی قصباتی ریاستوں سے الگ تھلگ اور ان سے آزاد رہ کر بسر ہوتی تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ عرب کے شتر سوار بدویوں کی یہ طرز زندگی یوریشیا کے میدانوں کے اسپ سوار خانہ بدوشوں سے بہت مختلف تھی۔ اس شدید اختلاف کی ایک بڑی وجہ تو یقیناً یہ ہے کہ شمالی عرب میں سردی کا موسم طویل اور شدید ہوتا ہے اور نسبتاً رطوبت زیادہ ہونے کے باوجود بھی ایک سے زیادہ فصلوں اور نخلستانوں کی ترقی میں ممانع ہے۔ جہاں کہیں نیم گرم صحرا میں محدود رقبے کے نخلستان پائے جاتے ہیں، جیسا کہ عرب میں وادی یش سے نجران تک اور ربع الخالی کے شمالی علاقوں کا حال ہے، وہاں معلوم ہوتا ہے کہ بدوی قبائل اور قصباتی ریاستوں کے تاجروں کے درمیان اقتدار کا توازن قائم ہو سکتا ہے۔ دوسری طرف غالباً نخلستانی کاشتکاروں کو اکثر اوقات شہریوں یا بدویوں کی اطاعت اختیار کرنی پڑتی تھی۔

عرب میں تاریخ بدویت کا لفظ اعراب سے بڑا قریبی تعلق ہے۔ سامی زبانوں میں اور زمانہ قبل از اسلام میں یہ لفظ صرف ان بدویوں اور نخلستانوں کے باشندوں کے لیے استعمال ہوتا تھا جو ربع الخالی کے شمال میں آباد تھے۔ اس کے مخصوص معنی تھے 'شتر بان بدوی' لیکن اس کے مفہوم میں نخلستانی باشندے بھی شامل کر لیے جاتے تھے۔ قرآن کریم

بولتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں وہ غاروں میں پناہ لیتے ہیں۔ ان کے پاس گھوڑے نہیں ہوتے۔ شمالی بدویوں کے برعکس یہ لوگ ہر قسم کے روابط اتحاد سے ہمیشہ دور رہے ہیں۔

عرب میں شتربان بدویوں کی قسمت قافلوں کی تجارت سے وابستہ تھی اس لیے اس تجارت کا زوال ان کے لیے بڑی اہمیت کا حامل رہا ہوگا۔ یہ زوال آہستہ آہستہ چوتھی یا تیسری صدی قبل مسیح سے شروع ہوا جب جنوبی عرب مختلف ریاستوں میں سیاسی طور پر بٹ گیا اور اس وجہ سے شاہراہوں پر آمد و رفت کے ٹیکس میں مسلسل اضافہ ہونے لگا (Pliny، ۱۲ : ۱۴، ۶۵)۔ اس زوال کی رفتار میں اس وقت تیزی آ گئی جب تقریباً ۱۱۵ ق م سے آبنائے باب المندب کے کھل جانے سے مصر اور ہندوستان کے درمیان براہ راست آمد و رفت ہونے لگی۔ جب ۴۸ ق م سے رومی سلطنت اور ہندوستان کے درمیان بحری آمد و رفت کا راستہ اہمیت اختیار کر گیا تو خشکی کے ذریعے بخورات کی تجارت تقریباً مفقود ہو گئی (Strabo، ۲ : ۱۲۵؛ کتاب مذکور، ۱۷ : ۱ : ۱۳، Pliny ۶ : ۲۳، ۱۰۴)۔ یہ ایک کاری ضرب تھی جو جنوبی عرب کی بادشاہت اور اس سے بھی زیادہ ان بدویوں کو سہنی پڑی جو خشکی کے راستے آمد و رفت میں حصہ لیتے اور اس غرض کے لیے اونٹ فروخت کرتے تھے۔

اعراب یعنی (شمالی عرب کے) بدویوں نے دوسری صدی عیسوی کے قریب جنوبی عرب کے جھگڑوں میں دخل انداز ہونا شروع کر دیا تھا (J. Ryckmans، ۱۹۵۱ء، ص ۲۱۵ بعد، ۱۹۵۶ء)۔ کتبہ نامی ۷۱ تا ۷۳ میں اعراب اور خ م ی س کئی مقامات پر اکھٹے آئے ہیں۔ شاید خ م ی س (خمیس؟ غالباً خمس سے مشتق) کا مطلب باقاعدہ فوج ہے (M. Höfner، مکتوب) اس کے

مقابلے میں اعراب کا مطلب ہے شمالی بدویوں کے شتر سوار یا اسپ سوار دستے۔ کتبہ نامی ۷۱ تا ۷۳ تیسری صدی عیسوی کا ہے (شاہ الہان نہقان، قب Mordtmann-Mittwoch، ص ۲۱۸ تا ۲۲۰)۔ ایک کتبہ جسے کتبہ "Ryckmans 535" کا نام دیا جاتا ہے اور جو اسی زمانے کا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ جنوبی عرب کی فوجوں میں گھوڑے اور اونٹ استعمال ہوتے تھے (G. Ryckmans، در Muséon، ۱۹۳۶ء، ص ۱۵۴ بعد؛ اس دور کے تاریخ وار واقعات کے لیے قب v. Wissmann، ۱۹۵۷ء)۔ یہ امر بھی تحقیق طلب ہے کہ آیا قدیم زمانے میں بھی جنوبی عرب میں شتر سوار دستوں کی موجودگی کے مستحکم دلائل ملتے ہیں (قب v. Wissmann-Höfner، ص ۱۰، ۴۶)۔ ایک کتبہ جسے کتبہ "Ingrams I" کا نام دیا گیا ہے اس سے ان حالات کا پتا نہیں چلتا۔ ہم نے v. Wissmann-Höfner، ص ۳۳۳ میں جو ابتدائی ترجمہ پیش کیا تھا وہ غلط تھا (قب Drewes)۔

۳۲۸ء کے کتبہ النمارہ سے جو صحراے شام میں جبل حوران کے مشرق میں ہے (RES، ص ۴۸۳) پتا چلتا ہے "یہ امرؤالقیس (مراقیس) ابن عمرو تمام اعراب کے بادشاہ کی قبر ہے جس نے . . . شمر کے دارالحکومت نجران کے محاصرے کے لیے کامیابی (?) سے پیشقدمی کی تھی" (Lidzbarski)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے امرؤالقیس اپنے آپ کو تمام اعراب کا بادشاہ کہلاتا تھا حالانکہ نجران اس کے قبضے میں نہیں تھا، جو جنوبی عرب کے مزروعہ علاقے کی شمال مشرقی سرحد پر واقع تھا۔ البتہ وہ غالباً خیمہ نشین بدویوں کا بادشاہ تھا۔ دوسرے الفاظ میں ان دنوں نجران شمر کا ایک شہر تھا۔ شمر غالباً شمر بہر عیش [= یرعش] ہے (قب Pirene، ۱۹۵۶ء؛ Jamme، ۱۹۵۷ء؛ J. Ryckmans



حالت بگڑ گئی یا انہیں کلیۃً چھوڑ دیا گیا جیسا کہ خاص طور پر جنوبی عرب میں صحرا کے کنارے کنارے اور حضر موت میں ہوا (قب v. Wissmann-Höfner، ص ۱۲۱، بعد: Le Baron Bowen)۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں شتر سوار بدویت شمالی جانب سے حملوں یا بتدریج داخلے کے ذریعے رواج پذیر ہوئی۔ سب سے قدیم دارالحکومت مارب کے بند کے بارے میں بے پروائی، اس کا پھٹنا اور مسمار ہو جانا نیز اس شہر اور اس کے نخلستان کی مکمل بربادی اس کی واضح مثال ہے۔ یمن اور عمان میں کوهستانی فلاحوں کی مستحکم جاگیرداری اور قبائل کی اپنے مورچہ بند قلعہ نما مکانوں میں سکونت کے باعث ان کی قوت زائل ہو گئی بلکہ طوائف الملوکی پھیل گئی اور اس قسم کی قبائلی تنظیمیں اور جاگیریں وجود میں آ گئیں جو وحشیانہ خصائل والے شتر سوار بدویوں سے مماثل تھیں۔ آہستہ آہستہ بدوی آبادی ایسے مقامات کی طرف نقل مکانی کرنے لگی جو جزیرہ نماے عرب میں ایک دوسرے سے طویل فاصلوں پر واقع تھے۔ پورے کے پورے قبائل کی اس نوعیت کی نقل مکانی زیادہ تر جنوب سے شمال کی طرف ہوئی۔ جنوب میں زراعت پیشہ آبادی کا ایک حصہ بدوی بن گیا اور شمال میں غالباً روم و ایران کی جنگوں نے ان بدویوں کو کھینچ بلایا جو قافلوں کی رو بہ زوال تجارت کے باعث اپنے اونٹ فروخت نہیں کر سکتے تھے لیکن شمال میں دونوں متحارب فریقوں میں سے کسی کے شتر سوار دستوں میں ملازم ہو سکتے تھے۔ ایک عربی ضرب المثل ہے ”یمن عربوں کا مہد ہے اور عراق عربوں کی لحد“۔ اور اس کا اطلاق اس زمانے پر ہو سکتا ہے، تاہم اس کے مخالف سمت بھی نقل مکانی ہوئی؛ مثلاً چھٹی صدی عیسوی میں بنو کنتہ حضر موت میں پہنچے، جن کی تعداد بقول الہمدانی

۱۹۵۷ء، ص ۲۲، حاشیہ: Birene، ۱۹۵۷ء، ص ۵۹، حاشیہ (م)، جس نے ”شاہ سبأ و ذوریدان و حضر موت و یمنت“ کا لقب اختیار کر لیا تھا (یہاں ذوریدان سے مراد حمیر ہے۔ یمنت غالباً حضر موت کے جنوب میں ساحلی علاقے کا نام ہے (Wissmann، ۱۹۵۹ء)۔ اس لقب کا مطلب یہ ہے کہ شمر جنوبی عرب کے تمام زرعی علاقے کا واقعی بادشاہ تھا یا اسے بادشاہ ہونے کا دعویٰ تھا۔

پانچویں صدی کے اوائل میں شمالی عرب کے بیشتر حصے جنوبی عرب کے بادشاہ ابو کرب اسعد کے زیر نگیں تھے، جس نے روایت کے مطابق ایرانی علاقے میں فوج کشی کی تھی۔ پھر اس کے لقب میں توسیع پیدا ہوئی اور اب اسے یوں کہا جانے لگا: شاہ سبأ و ذوریدان و حضر موت و یمنت اور ان کے تمام (جمع تفخیم Pluralis majestatis) اعراب جو کوهستانی علاقوں (وسطی عرب) اور تہامہ (حجاز اور عسیر کے نشیبی علاقے) میں ہیں۔ یہاں بھی اعراب سے مراد صرف صحراے عرب کے باشندے ہیں۔

روم و ایران اور حبشہ و سبأ کی باہمی مسلسل جنگوں، بحیرہ روم کے علاقوں کی اقتصادی بد حالی، خشکی کے راستے آمد و رفت اور تجارت کے ساتھ بحری آمد و رفت (جس میں جنوبی عرب کا کوئی حصہ نہ رہا تھا) کی روز افزوں مسابقت، جنوبی عرب کے جاگیردارانہ نظام کے زوال اور وہاں کی جاگیردارانہ اور مذہبی جنگوں کی وجہ سے جو، تیسری سے چھٹی صدی تک جاری رہیں، عرب میں انتہائی بدامنی پیدا ہو گئی (قب Boston، ۱۹۵۴ء؛ Sidney Smith، I. Ryckmans، ۱۹۵۶ء، ب)۔ زرخیز ہلال کے جن علاقوں میں میدانوں کی سی آب و ہوا پائی جاتی ہے وہاں کے بدوی قبائل ان علاقوں میں جا گھسے جہاں بارش کی وجہ سے زراعت ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ نخلستانی علاقوں کی

معلوم ہوتا ہے کہ گھوڑے کو جنوبی عرب میں شمالی عرب کی بہ نسبت ہمیشہ کم اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ ۱۵ء ق م میں سبّا کے یثاعمر و Yith 'a 'amar [ = یاسر عمرو یا یثیع عمرو؟ ] نے سارگون Sargon کے پاس جو تحائف بھیجے تھے ان میں گھوڑے بھی شامل تھے۔ The Periplus Maris Erythraei (۶۸۰ء تک) سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی تاجر مصر سے سمندر کے راستے مؤزہ (موشج) میں گھوڑے لائے تھے (قب Wissmann، ۱۹۵۹ء)۔ سترابو Strabo (۱۶: ۲/۳، ۲۶) نے جہاں جنوبی عرب کی زراعت کا مختصر لیکن بہت اچھا حال قلمبند کیا ہے وہاں وہ لکھتا ہے کہ گھوڑے نایاب تھے اور ان کا کام اونٹوں سے لیا جاتا تھا۔ جنوبی عرب میں گھوڑے کو غالباً اسی زمانے سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی جب فوج میں بدویوں کا استعمال شروع ہوا، یعنی کم از کم تیسری صدی عیسوی سے۔ کتبہ جی رکمنس ۵۳۵ء (در Muséon، ۱۹۵۶ء، ص ۱۴۰) سے، جو تیسری صدی عیسوی کا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی عرب کی فوجوں میں گھوڑے اور اونٹ استعمال کیے جاتے تھے اور باقاعدہ فوجی دستوں کے علاوہ اسپ سوار بھی ہوا کرتے تھے۔

مآخذ: (۱) Dedān: W.F. Albright، در Albrecht، 'Alt Festschrift, Geschichte und Altes Testament 16 From the Stone Age'، ص ۱۹۵۳، بعد: (۲) وہی مصنف: 'to Christianity'، بالٹی مور ۱۹۴۶ء: (۳) وہی مصنف: 'Zur Zähmung des Kamels' و Zeitschr. f. alttestamentl. Wissensch.، ۶۲: ۱۹۴۹ تا ۱۹۵۰ء، ص ۳۱۵: (۴) وہی مصنف: 'The Chaldaean Inscriptions in Bull. Amer. School Orient.'، در 'Proto-Arabic Script Research'، شماره ۱۲۸، ۱۹۵۲ء، ص ۳۹ تا ۴۵: (۵)

تیس ہزار افراد سے زیادہ تھی (Forrer، ص ۱۳۴ بعد)۔ جب گرد و نواح کی ان ریاستوں پر زوال آیا جن کا انحصار زراعت پر تھا اور جہاں کی آبادی کہیں زیادہ گنجان تھی تو بدوی اثر و رسوخ میں اضافہ ہونے لگا۔ Caskel (۱۹۵۳ء) نے بیان کیا ہے کہ کس طرح اس دور بربریت سے قبل وہ معاشرتی اور اقتصادی طرز زندگی جسے ہم بدویانہ زندگی کہتے ہیں پوری طرح ان خصائص کے ساتھ منظر عام پر نہیں آئی تھی جن سے ہم Doughty، v. Oppenheim اور Lawrence کے بیانات کی بدولت واقف ہوئے ہیں۔ اب بدویوں کے ہاں لکھنے کا فن مفقود ہو گیا تھا، البتہ زبانی روایات ترقی پر رہیں۔ یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ جنگ کے دوران میں طویل مسافت طے کرنے کے لیے اونٹوں سے اور آخری حملہ کرتے وقت گھوڑوں سے مشترکہ طور پر پہلی بار کب کام لیا گیا۔ یہ ایک بڑا ماہرانہ عمل تھا، جس کو عصر حاضر میں [سلطان] عبدالعزیز بن سعود نے بھی استعمال کیا ہے۔ الانباط (Nabataeans) کے بادشاہ مالک (Malchus) دوم نے تقریباً ۶۷ء میں بیت المقدس پر طیطس Titus کے حملے کے وقت اس کی مدد کے لیے ایک ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادے بھیجے تھے (حتی Hitti، ص ۶۸)۔ ان صفائی (Safaitic) کتبوں سے جو دمشق کے جنوب مشرق میں حرّہ کے مقام پر ملے ہیں اور جو دوسری سے چوتھی صدی عیسوی تک بلکہ اس سے بھی پرانے ہیں (قب Littmann، ۱۹۴۰ء) اور چٹانوں پر بنی ہوئی تصویروں سے پتا چلتا ہے کہ یہ خالص بدوی گھوڑے اور اونٹ دونوں سے مشترکہ طور پر جنگ کے وقت کام لیتے تھے۔ ہمیں Ammianus Marcellinus (چوتھی صدی عیسوی) سے بھی پتا چلتا ہے کہ بلمیہ Blemmyes قوم کے لوگ اپنے حملوں میں یہی طریق اختیار کرتے تھے (۱۴: ۳/۴)۔



تا ۱۹۵۲ء (جس میں عرب بھی شامل ہے)؛  
 Die Bedeutung der Beduinen in : W. Caskel (۱۹)  
 Arbeitsgemeinschaft. 'der Geschichteder Araber  
 f. Forschung d. Landes Nordrhein - Westfalen  
 ج ۸، Cologne ۱۹۵۳ء؛ (۲۰) وہی مصنف؛  
 'Die Beduinen III : M.v. Oppenheim، در  
 :H. Charles (۲۱)؛ ۳۶ تا ۵۰، ۱۹۵۲ء  
 Processus de la sédentarisation des nomades  
 Actes du 16<sup>e</sup> Congrès 'en steppe syrienne  
 Internat. de Sociologie 1954، کراسہ ۳: ص ۷۰  
 تا ۸۱؛ (۲۲) C. S. Coon 'The Races of Europe :  
 نیویارک ۱۹۳۸ء، بالخصوص ص ۳۰۰ تا ۵۰۹؛  
 Milano 'Storia d' Etiopia I : C. Conti Rossini (۲۳)  
 Südasiatische Seefahrt: R. Delbrueck (۲۴)؛ ۱۹۲۸ء  
 'im Altertum، در 'Bonner Jahrbücher، ص ۱۰۰  
 ۱۵۶، ۱۹۵۰-۱۹۵۶ء؛ (۲۵) C.M. Doughty 'Travels:  
 'in Arabia Deserta، لندن ۱۹۲۸ء؛ (۲۶) A.J. Drewes  
 Biblioth. Orient. [در]، 'Some Hadrami Inscriptions  
 : R. Dussaud (۲۷)؛ ۹۳ بعد؛ (۲۸) R. Dussaud  
 'La pénétration des Arabes en Syrie avant l' Islam  
 Rassenkunde: E. von Eickstedt (۲۸)؛ ۱۹۵۰ء  
 'und Rassengeschichte der Menschheit  
 Camel Brands and Graffiti: H. Field (۲۹)؛ ۱۹۳۳ء  
 Suppl.، در 'from Iraq, Syria, Jordan, Iran and Arabia  
 :10 Journ. Amer. Orient. Society، شماره ۱۰، ۱۹۵۲ء؛  
 (۳۰) وہی مصنف: 'Ancient and Modern Man in South-  
 : L. Forrer (۳۱)؛ ۱۹۵۶ء؛ (۳۲) L. Forrer  
 'Südarabien nach al-Hamdāni's "Beschreibung  
 Deutsche Morgenl.، در 'der Arabischen Halbinsel'  
 '، جلد ۲۷، 'Ges., Abh. z. Kunde d. Morgenl.  
 شماره ۳، ۱۹۳۲ء؛ (۳۳) N. George 'The Camel in  
 '، ۱۰۶، 'Britt. Veterin. Journ.، در 'Ancient Egypt

وہی مصنف: 'Archaeology and the Religion of Israel  
 بالٹی مور ۱۹۵۳ء (بار سوم)؛ (۶) وہی مصنف:  
 'Zur Chronologie des vorislamischen Arabien  
 Festschrift für Otto، 'Von Ugarit nach Gumran  
 Die: F. Altheim (۷)؛ ۸ تا ۱۸، ۱۹۵۸ء، ص  
 'Krise der Alten Welt im 3 Jh. n. Ztw.، برلن ۱۹۴۳ء؛  
 Irrigation in Ancient : R. Le Baron Bowen jr. (۸)  
 'Qatabān (Beihān) Archaeological discoveries، در  
 Amer. Foundation f. th. شائع کردہ، 'in South Arabia  
 Study of Man (طبع W. F. Albright)، ج ۲،  
 بالٹی مور، Johns Hopkins، ۱۹۵۸ء؛ ص ۳ تا ۱۳۱؛  
 'Recovering the Ancient : G. W. van Beek (۹)  
 'Civilization of Arabia، در 'Bibl. Archaeologist، ۱۰،  
 'A Radio-carbon، وہی مصنف؛ (۱۰)؛ ۲ تا ۳، ۱۹۵۲ء  
 Bull. Amer.، در 'Date for Early South Arabia  
 'School Orient. Research، شماره ۱۳۳، ۱۹۵۶ء؛  
 ۶ تا ۹؛ (۱۱) A. F. L. Beeston 'Problems of  
 'Sabaeen Chronology، در 'BSOAS، ۱۶، ۱۹۵۳ء؛  
 ۳ تا ۵۶؛ (۱۲) R. Biasutti 'Le Razze e i  
 'Popoli de la Terra، جلد، نیورن ۱۹۳۱ء؛  
 'Der Orient als sozialer Lebensraum: H. Bobek (۱۳)  
 'Les: A. van den Branden (۱۴)؛ ۱۹۳۳ء؛  
 'Inscriptions thamoudéennes، Louvain، ۱۹۵۰ء؛ (۱۵)  
 'Der Gesellschaftsaufbau der Bedu- : E. Bräunlich  
 'inen، در 'Islamica، ۶: ۶۸ تا ۱۱۱، ۱۸۲ تا ۲۲۹؛  
 'Die Krankheit der fürstin : E. Brunner-Traut (۱۶)  
 'von Punt، در 'Die Welt des Orients، کوئٹن ۱۹۵۷ء،  
 ص ۳۰۷ بعد؛ (۱۷) J. Drewes و A. Caquot 'Les  
 'Annales d'Ethio-، 'Monuments recueillis à Maqallé  
 '، ۱۷ تا ۳۲؛ (۱۸) Carte Géolog.، ۱۷  
 Bureau d'، ۱: ۵، 'Internation. de l'Afrique  
 'Études Géol. et. Min. Coloniales، پاریس

Map of the Arabian Peninsula، پیمانه ۱:۲۰۰۰۰۰،  
 Misc. Geolog.، U.S. Geolog. Survey، ۱۹۰۸ء،  
 Invest. 1-270 B-1 اسماء منقول از عربین امیریکن کمپنی  
 (ARAMCO)؛ (۵۱)؛ C. D. Mathews، Non-Arabic  
 Internat.، Place Names in Central South Arabia  
 Orientalist Congr.، میونخ، Munich، ۱۹۰۷ء، زیر ترتیب؛  
 (۵۲)؛ D. van der Meullen، Aden to the Hadhramaut  
 لندن، ۱۹۴۷ء؛ (۵۳)؛ A. Moortgat، Geschichte  
 Vorderasiens bis zum Hellenismus، در A. Scharff  
 Ägypten und Vorderasien : A. Moortgat و  
 im Altertum، میونخ، Munich، ۱۹۰۰ء؛ (۵۴)  
 Hanover، Arabien : B. Moritz، ۱۹۲۳ء؛ (۵۵)  
 T. S. Moscati، The Semites : a Linguistic،  
 در Catholic Biblical، Ethnic and Racial Problem  
 Quarterly، ۱۹، ۱۹۰۷ء؛ ۴۲۱ تا ۴۳۴؛ (۵۶)  
 A. Musil، The Northern Heğāz، در Amer. Geog.  
 Soc.، Orient. Expl. and Studies، ج ۱، نیویارک  
 Arabia Deserta، وھی مصنف، وھی مجله، ۱۹۲۶ء؛ (۵۷)  
 (۵۸)؛ وھی مصنف، Northern Neğed، ج ۲،  
 وھی مجله، ج ۵، ۱۹۲۸ء؛ (۵۹)؛ وھی مصنف،  
 Northern Arabia، پیمانه ۱:۱۰۰۰۰۰، وھی مجله؛ (۶۰)  
 Die Beduinen : M. v. Oppenheim، ج ۱ و ۲،  
 Wiesbaden، ۱۹۳۹ء، ۱۹۴۳ء، ج ۳، حصه ۱ و ۲،  
 ۱۹۰۲ء؛ (۶۱)؛ J. Pirenne، La Grèce et Saba، در  
 Mém. prés. à l' Akad. des Inscriptions et Belles  
 Lettres، ج ۱۵، پیرس، ۱۹۰۰ء؛ (۶۲)؛ وھی مصنف؛  
 L' inscription "Ryckmans 535" et la chronologie  
 Sud-Arabe، در Muséon، ۱۹۰۶ء، الف، ۵۹؛ ۱۶۵ تا  
 ۱۸۱؛ (۶۳)؛ وھی مصنف، Paléographie des Inscriptions  
 sud-arabes, I.، در Verhandl. Vlaamse Acad. d. Wet.  
 Cl. d. Lett.، v. Blegie، عدد ۲۶، برسلز، Brussels  
 وھی مصنف، Chronique d'archéologie؛ (۶۴)؛ ۱۹۵۶ء؛

Skizze der : E. Glaser (۳۳)؛ ۸۱ تا ۷۶؛ ۱۹۰۰ء  
 Geschichte und Geographie Arabiens، ج ۲، برلن  
 Südarabien als : A. Grohmann (۳۴)؛ ۱۸۹۱ء  
 Wirtschaftsgebiet II (Schr. Phil. Fak. Dtsch. Univ.  
 Prag. vol. 13)؛ (۳۵)؛ وھی مصنف؛  
 Al-Arab, the Arabs (I) The ancient history  
 of the Arabs [رک به عرب]؛ (۳۶)؛ Hančar، کتاب  
 مذکور؛ (۳۷)؛ P. K. Hitti، History of the Arabs  
 لندن، ۱۹۰۳ء؛ (۳۸)؛ M. Höfner، Magische Zeichen  
 aus Südarabien Archiv f. Orientforschung  
 ۲: ۱۶، ۲: ۲۷۱ تا ۲۸۶؛ (۳۹)؛ W.B. Harris، A  
 Journey through the Yemen، لندن، ۱۸۹۳ء؛ (۴۰)  
 James، در Brit. Mus. Quarterly، ۱۹۰۰ء، لوحه ۷؛  
 An Archaic South-Arabian : A. Jemme (۴۱)  
 Inscription in Vertical Columns، در BASOR، ج  
 ۱۳۷، ۱۳۷ ص ۳۲ تا ۳۸؛ (۴۲)؛ وھی مصنف؛  
 On a Drastic etc.، در BASOR، ۱۳۵، ۱۹۰۷ء؛  
 ۲۵ تا ۳۱؛ (۴۳)؛ A. Bertholet و E. Kautzsch  
 Tubingen، Die Heilige Schrift des Alten Testaments  
 The Arabs in the Peace : L. Kawar (۴۴)؛ ۱۹۲۲ء  
 Treaty of A.D. 561، در Arabica، ۳، ۱۹۰۶ء؛  
 Seven : T. E. Lawrence (۴۵)؛ ۲۱۳ تا ۱۸۱  
 Pillars of Wisdom، لندن، ۱۹۳۰ء؛ (۴۶)  
 M. Lidzbarski، Ephemeris für semitische Epi-  
 graphik II، Giessen، ۱۹۰۸ء، ص ۳۳، ۳۶-  
 Inschrift : E. Littmann (۴۷)؛  
 Aksums، در Dtsch. Aksum - Expedition، ۱: ۳۵ تا  
 ۶۰، برلن، ۱۹۱۳ء؛ (۴۸)؛ وھی مصنف؛  
 griechische und altabessinische Inschriften، در  
 Dtsch. Aksum Expedition، ج ۳، برلن، ۱۹۱۳ء؛  
 (۴۹)؛ وھی مصنف؛ Thamūd und Safā، در Abh. f. d.  
 Kunde d. Morgenl.، ج ۱۵، شماره ۱، ۱۹۳۰ء؛ (۵۰)



Empty Quarter، در Geogr. Journal، ۱۱۱، ۱۹۳۸ء؛  
 تا ۲۱؛ (۸۰) Zafār : J. Tkač، ت، طبع اول؛ (۸۱)  
 Zum Problem des Zeitpunktes der : R. Walz  
 Domestikation der altweltlichen Cameliden، در  
 ZDMG، ۱۰۱، ۱۹۵۱ء؛ ۲۹ تا ۵۱ و ۱۰۳، ۱۹۵۳ء؛  
 تا ۸۷؛ (۸۲) وہی مصنف : Beiträge zur ältesten  
 Geschichte der altweltlichen Cameliden unter  
 besonderer Berücksichtigung des Problems des  
 Actes du 4<sup>e</sup> Congrès، در Domestikationspunktes  
 Internat. des Sciences Anthropologiques et  
 Ethnologiques، ویانا ۱۹۵۲ء، ج ۳  
 (۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی)؛ (۸۳) J. Wiesner  
 Fahren und Reiten in Alteuropa und im Alten  
 Orient، در Der Alte Orient، ج ۳۸، شماره ۲، ۱۹۳۹ء؛  
 (۸۴) وہی مصنف : Probleme der Frühzeitlichen  
 Actes، در Domestikation im Lichte neuer Forschung  
 4<sup>e</sup> Congrès Internat. des Sciences Anthropologiques  
 et Ethnologiques، ویانا ۱۹۵۲ء، ج ۲ (۱۹۵۵ء)  
 میں شائع ہوئی)؛ (۸۵) H. v. Wissmann  
 Erythraeo، در Lautensach - Festschrift، Stutt-  
 garter Geographische Studien، جلد ۶۹، ۱۹۵۷ء؛  
 ۲۸۹ تا ۳۳۲؛ (۸۶) وہی مصنف و H. Gätje  
 nach Ptolemäus، زیر ترتیب برائے اکادمی، در  
 Mainz، ۱۹۵۹ء؛ (۸۷) H. v. Wissmann و M. Höfner  
 Beiträge zur historischen Geographie des vorislamischen  
 Sudarabien، Akad. d. Wiss. u. d. Literatur،  
 Mainz، Abh. d. Geistes-und Sozialwiss Kl., Jg.  
 ۱۹۵۲ء، شماره ۳؛ (۸۸) H. v. Wissmann و R. B. Serjeant  
 Map of Southern Arabia from Shuqrā to al-Shihr  
 and Baihān to Hadramaut، ایمانہ ۱ : .....  
 ۲ اوراق، Roy. Geogr. Soc.، لندن ۱۹۵۸ء، مع مقالات  
 از دو مصنفین، در Geograph. Journal، ۱۲۳،

Annales d'Éthiopie، ۱۹۵۰-۱۹۵۶ء، در  
 Über die : H. Pösch (۶۵)؛ ۳۷ تا ۶۸؛  
 'äthiopide und gondide Russe und ihre Verbreitung  
 در Anthropologischer Anzeiger، ۲۱، ۱۹۵۷ء؛ ۱۳۷ تا  
 ۱۵۱؛ (۶۶) C. Ritter، Vergleichende Erdkunde Von :  
 Arabien، جلد ۲، برلن ۱۸۳۷ء، بالخصوص  
 geographische Verbreitung des Kamels in der Alten  
 Welt، ۲ : ۶۰۹ تا ۷۰۹؛ (۶۷) G. Ryckmans  
 Inscriptions sud-arabes، 2<sup>ème</sup> à 14<sup>ème</sup> série  
 در Muséon، ج ۴۵، ۱۹۳۲ تا ج ۵۹، ۱۹۵۶ء؛ (۶۸)  
 L'institution monarchique en : J. Ryckmans  
 Louvain، Arabie Méridionale avant l'Islam  
 (۱۹۵۱ء)؛ (۶۹) Bibl. du Muséon، ج ۲۸؛ (۷۰)  
 وہی مصنف : Aspects nouveaux du problème  
 Thamoudéen، در Stud. Isl.، ۵، پیرس ۱۹۵۶ء الف : ۵ تا  
 ۱۷؛ (۷۱) وہی مصنف : La persecution des Chrétiens  
 Himyarites au sixième siècle، در Nederl. Hist.-  
 Archaeol. Irst.، استانبول ۱۹۵۶ء، ب؛ (۷۲) وہی مصنف :  
 Petits royaumes Sub-Arabes d'après les auteurs  
 classiques، در Muséon، ۷۰، ۱۹۵۷ء : ۷۰ تا ۹۶؛  
 (۷۳) وہی مصنف : Zuidarabische Kolonisatie، در  
 Jaarbericht، شماره ۱۵، Ex Oriente Lux، ۱۹۵۸ء،  
 ص ۲۳۹ تا ۲۴۸؛ (۷۴) C. O. Sauer : وہی کتاب؛  
 (۷۵) The Arts and Kings Nabonidus : B. Segall  
 در Amer. Journ. of Archaeol.، ۵۹، ۱۹۵۵ء؛  
 ۳۱۵ تا ۳۱۸؛ (۷۶) وہی مصنف : Sculpture  
 from Arabia Felix : The Earliest Phase  
 در Orientalis، ۲، ۱۹۵۷ء : ۳۵ تا ۴۲، الواح؛  
 (۷۷) Events in Arabia in the 6th : Sidney Smith  
 Century A. D.، در BSOAS، ۱۶، ۱۹۵۴ء : ۳۲۵  
 تا ۳۶۸؛ (۷۸) Voyage en Arabie : M. Tamisier  
 جلد ۲، پیرس ۱۸۳۹ء؛ (۷۹) Across the : W. Thesiger

۶۱۹۵۸: ۱۶۳ تا ۱۷۱ .

(د) شمالی افریقہ میں شتر سوار بدویوں کا ظہور

یہ بات تعجب خیز ہے کہ مصر کے عظیم دریائی نخلستان کی تہذیب اور اس کی سلطنت نے اتنے طویل عرصے تک اونٹ پالنے اور شتر سوار بدویوں کے پھیلنے کو روک رکھا۔ یہاں سرحدوں پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی اور ایشیائی بدوی زندگی کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اونٹ کے لیے ہمیں کوئی مخصوص مصری زبان کا لفظ نہیں ملتا (Albright، ۱۹۵۰ء، قب Præaux)۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب آخری عہد ہزار سالہ قبل مسیح کے تقریباً آغاز میں کسی وقت اہل سبأ نے حبشہ کو اپنی نوآبادی بنایا اور وہاں اپنے ساتھ ہل، ڈھلوان زمین کو مسطح کرنے اور مصنوعی آب پاشی کے طریقے لائے تو انہوں نے شمالی حبشہ کے نشیبی علاقوں کو اونٹ سے آشنا کرایا۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں یہ نوآبادی پوری طرح قائم بلکہ غالباً بہت قدیم ہو چکی تھی۔ حتیٰ کہ روسینی (Conti Rossini) کا بھی خیال ہے کہ یہاں اونٹ اسی قدیم زمانے میں لایا گیا ہوگا (ص ۱۰۳، ۱۰۶)۔ تاہم اسے اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں مل سکا۔ حبشہ کے سبائی کتبات (رک بہ سطور بالا) میں اونٹ کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ لیکن اسے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ کیونکہ ان کتبات کی تعداد بہت کم ہے۔ بہر حال ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آج بھی حبشہ کے کوہستانی علاقے اونٹ سے آشنا نہیں۔ اور اس کا استعمال صرف نشیبی علاقوں اور نیچے کی ڈھلانوں میں عام ہو سکا ہے۔ مغربی یمن کی طرح یہ علاقہ بھی ایک تنگ حصے پر مشتمل ہے۔

ہمیں اس سلسلے میں تھوڑی سی معلومات اور لسانی ثبوت ایسا ملا ہے جس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اہل سبأ نے بحیرہ قلزم کے افریقی ساحل والے علاقے کو اونٹ سے آشنا نہیں کیا تھا۔ آگاترخینڈس Agatharchides (غالباً ۱۳۰ ق م کے لگ بھگ) نے بدوی غار نشینوں (Troglodytes) کا ایک بہت اچھا اور مفصل حال قلم بند کیا ہے، جو بحیرہ قلزم کے افریقی ساحل کے عقب میں اور حبشہ کے شمال میں رہتے تھے (یہ لوگ آگے چل کر بلمیہ یا بیجا کہلائے)۔ یہاں اس نے اونٹوں کے نہیں بلکہ صرف مویشیوں اور بکریوں کے پالنے کا ذکر کیا ہے (Diodor، قب Geogr. Graec. Minor. : C. Muller، ۱: ۱۵۳)۔ آگاترخینڈس Agatharchides نے یہ حال غالباً کسی قدیم تذکرے سے اخذ کیا ہوگا (قب von Wissmann، ۱۹۵۷ء)۔

لسانی ثبوت یہ ہے کہ اونٹ کا نام شمالی سامی زبانوں اور مصر کی طرح جعزی زبان نیز حبشہ کی تمام سامی زبانوں میں جمل (تلفظ گمل) ہے اور اس کے برعکس قدیم زمانے میں اس کے لیے جنوبی عرب میں صرف لفظ "اہل" استعمال ہوتا تھا (Höfner، بذریعہ مکتوب)۔ صرف تیسری صدی عیسوی کے ایک کتبے میں (G. Ryckmans، عدد ۵۳۵) اور پھر چھٹی صدی عیسوی میں (یوسف ذونواس، G. Ryckmans، عدد ۵۰۷) میں لفظ "جمل" [= اونٹ] جنوبی عرب کے کتبات میں مستعمل ہوا ہے۔ حبشی زبان میں اونٹ کا ذکر پہلی بار چوتھی صدی عیسوی میں ملتا ہے (رک بہ Littmann، Aksum، ۱۹۱۳ء)۔

ہمیں اونٹ کا ذکر نہ تو مصر کے تصویری خط (ہیروغلیفی) میں ملتا ہے اور نہ یونانی اور رومی مصنفین کے ہاں اور نہ مصر یا شمالی افریقہ



استوار کر کے شمالی حجاز کے اس ساحل پر اپنا اثر و اقتدار قائم کیا تھا اور اس طرح اس نے بخورات کی تجارت کا راستہ بدل دیا تھا۔ اس وقت تک اس کا راستہ سباً اور معین سے بحیرہ روم پر غزہ تک تھا اور یہ چیزیں دیدان سے بحیرہ قلزم کی ایک نئی بندرگاہ (تشتیت؟) تک اور وہاں سے کشتی کے ذریعے مصر تک جانے لگیں (قب Tarn، ضمیمہ از Sidney Smith؛ Delbrueck)۔ چونکہ دیدان سلطنت معین کی نو آبادی تھا، جو سباً کے شمال میں قائم ہوئی تھی، اس لیے غالباً ۲۶۴ ق م میں ممفس میں مقیم معین کے ایک تاجر بخورات کے سنگین تابوت پر لکھی ہوئی عبارت سے اس کی توثیق ہوتی ہے (Albright، ۱۹۵۳ء، حاشیہ ۱۲)۔ یہ تاجر اپنے جہازوں پر مصر میں سیاہ مرج اور دوسرا سامان لاتا تھا اور عرب میں ریشمی کپڑے وغیرہ لے جاتا تھا (Rhodokanakis و Korten-beutel)۔ چونکہ بطلمیوس (Ptolemy) ثانی اور اس کے جانشین بحیرہ قلزم کے راستے بڑی بڑی کشتیوں پر ہاتھی لانے کے قابل تھے اس لیے وہ بڑی آسانی کے ساتھ اونٹ بھی لاسکتے تھے۔ مصر میں جو عرب اپنے اونٹوں کے ساتھ لائے گئے تھے وہ غالباً شمالی حجاز کا وہ رسم خط جانتے تھے جسے ثمودی کہتے ہیں۔ متعدد ثمودی کتبات مصر کے مشرقی صحرا میں بالخصوص سڑکوں کے اطراف میں ملے ہیں (Littmann، ۱۹۴۰ء، ۳؛ Green و J. Pirenne بذریعہ مکتوب)۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اونٹ حبشہ میں کیسے لایا گیا تھا۔ میرے خیال میں اس کے دو قیاس پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اسے یا تو بطلمیوس (Ptolemy) ثانی یا اس کے جانشین اور یا پھر حبشات کے شاہان اکسوم دوسری صدی عیسوی کے قریب یہاں لائے ہوں گے۔

کے کسی حصے میں عہد یونانی کے مجسموں یا چٹانی تصویروں میں۔ اس سلسلے میں ہمیں صرف ایک استثنا کا پتا چلتا ہے: جب بطلمیوس ثانی (Ptolemy II Philadelphus، ۲۸۵ تا ۲۴۶ ق م) نے دریائے نیل سے قبطوس Koptos کے مقام سے بحیرہ قلزم کو جانے والی سڑکوں (۱۷۳ کیلومیٹر) کی مرمت کرائی اور اسی مقام سے اپنی نئی بندرگاہ کے شہر Berenikē Troglodytikē تک ایک زیادہ طویل سڑک (۳۸۰ کیلومیٹر) تعمیر کرائی اور اس پر گیارہ پڑاؤ بنوائے۔ یہ سڑک صرف پیدل چلنے والے مسافروں ہی کے لیے نہیں بلکہ شتر سوار تاجروں کے لیے بھی بنوائی گئی تھی (Strabo، ۱۶: ۴، ۱۷۹: ۱، Pliny، ۶۵: ۶ h.n.، ۱۰۲: ۱۶۸: ۱)۔ برنکی تروگلوڈیتکی Berenikē Troglodytikē خلیج سخت بندر الکبیر میں ۲۳' ۵۱ پر واقع ہے۔ سترابو Strabo کا بیان ہے کہ قبطوس Koptos ایسا شہر تھا جو عربوں اور مصریوں دونوں کے زیر تصرف تھا اور عرب قبطوس اور Myos Hormos کی درمیانی کانوں میں کام کرتے تھے۔ پلینی Pliny نے برنکی Berenike کے علاقے کے عرب قبیلوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ فیلاڈلفوس Philadelphus نے دریائے نیل اور بحیرہ قلزم کے درمیان نہر کو دوبارہ کھلوا دیا تھا۔ اس نے بحیرہ قلزم کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ بحری اڈے تعمیر کرائے (رک بہ سطور ذیل)۔ عین ممکن ہے کہ فیلاڈلفوس ہی قافلے کے اونٹوں اور ان کے عرب مالکوں کو یہاں لایا ہو اور وہ شمالی حجاز کے ساحل سے Berenikē، Myos Hormos اور Philotera Troglodytikē میں سمندر کے راستے لائے گئے ہوں (Ritter، ۲: ۷۰۳)۔ معلوم ہوتا ہے کہ بطلمیوس (Ptolemy) دوم نے دیدان کے ساتھ، جو بخورات کی شاہراہ پر واقع تھا، دوستانہ تعلقات

کے جنوب میں ایک Sabaitikon Stōma تھا (Artemidorus، بروے Strabo) - جزیرہ مصوع کے بالمقابل سبت (سبت؟) نام کا ایک مقام تھا (Strabo و Pliny و Cl. Ptolemy) اور غالباً موجودہ خلیج عیذاب Assab، میں سبائی Sabai کا دولت مند شہر آباد تھا (Strabo، ۱۶ : ۴، ۸ تا ۱۰؛ قَب Conti Rossini، نقشہ لوحہ ۱۶)۔ جنوبی عرب کی ہلاکت آفریں جنگوں کے باعث بطلمیوسی بادشاہوں کو ساحل حبشہ کے علاقے میں دخل اندازی کرنے کا موقع باسانی مل گیا ہو گا۔ چونکہ یہ لوگ اس ساحل سے بڑی بڑی کشتیوں کے ذریعے ہاتھی مصر میں لے آئے تھے، اس لیے ممکن ہے کہ وہ اس ساحل کے باشندوں کے لیے اونٹ بھی شمالی حجاز سے لے آئے ہوں۔ تقریباً ۱۱۵ ق م سے پہلے عدن کی بندرگاہ قتبان جہازوں کا مال اتارنے چڑھانے کے لیے ایک اہم جگہ تسلیم کی جاتی تھی۔ یہاں مصر اور ہندوستان سے سامان آتا تھا (قَب Wissmann، ۱۹۵۷ء)۔ جب عدن میں قتبان کی جگہ حمیر کی نئی ریاست کی حکومت قائم ہوئی اور عدن برباد ہو گیا تو اس زمانے میں بطلمیوسی جہاز ہندوستان تک براہ راست سفر کرنے میں روز افزوں کامیابی حاصل کر رہے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مملکت اگسوم (حبشہ)، جس کا ذکر Periplus of the Erythraean Sea (تقریباً ۸۲ تا ۶۹ء) میں ملتا ہے، اس زمانے میں ایک طاقتور ریاست بن چکی تھی اور اس نے بحیرہ قلزم میں یونانیوں اور روسیوں کی جہاز رانی سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔ پھر اکسوم کے ایک بادشاہ نے، جو غالباً دوسری صدی عیسوی کے وسط میں موجود تھا (Winstedt، Mommsen، Römische Geschichte، ۵ : ۵۹۹؛ Mordtmann-Mittwoch، ۶)، اپنی تعمیر کردہ یادگار (Monumentum

بطلمیوس (Ptolemy) ثانی نے ساحل حبشہ کے انتہائی شمالی حصے میں بطلمیائس ٹیرون (Ptolemais Theron) کا قلعہ بند شہر بسایا تھا (قَب مصر میں Pithom کا کتبہ)۔ موجودہ زمانے کے جزیرہ مصوع کے جنوب میں Adulis کے مقام پر جو کتبے Cosmas Indicopleustes نے دریافت کیے ہیں (Winstedt) ان میں سے ایک کتبے سے پتا چلتا ہے کہ اس علاقے میں بطلمیوس ثالث (Ptolemy III Euergetes، ۲۴۶ تا ۲۲۱ ق م) اور اس کے باپ نے ہاتھیوں کا شکار کھیلا تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ”برنکی ہی کتہ سبس“ Berenikē hē kata Sabas کا شہر (Strabo، ۱۶ : ۴، ۱۰؛ Pliny، ۶ : ۲۹، ۱۷۰ میں Berenikē Epidirēs، Conti Rossini بخلاف Kortenbeutal) موجودہ عیذاب Assab کے قریب کب بسایا گیا تھا اور اس جنوبی برنکی کی جگہ ارسنوئی Arsinoë نامی نوآبادی نے کب لی تھی (Conti Rossini، ص ۶۰ بعد؛ نقشہ Strabo، ۱۶ : ۴، ۱۴؛ Pitschmann و Arsinoë و Pauly-Wissowa)۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ بطلمیوسی بادشاہ بحیرہ قلزم کے سارے افریقی ساحل کو زیادہ سے زیادہ اپنے بحری اقتدار میں لاتے گئے۔ بطالمہ کے عہد میں جہاز رانی اور تجارت مکمل طور پر سرکاری نظم و نسق کے تحت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اس زمانے سے پہلے سباً کو حبشہ کی پرانی نوآبادی میں اور خصوصاً ساحلی علاقے میں اثر و رسوخ حاصل ہو۔ اگرچہ اسے اپنے محل وقوع کی بنا پر بہت سی مشکلات کا سامنا تھا، کیونکہ یہ جنوبی عرب میں شمال کی جانب معین اور جنوب کی جانب قتبان کی دو نئی اور مستحکم ریاستوں کے درمیان گھرا ہوا تھا اور قتبان کی حدود تو عدن اور آبنائے باب المندب تک پہنچتی تھیں۔ بطلمیائس ٹیرون Ptolemais Theron



(Pauly-Wissowa: Blemmyes از Sethe) تھے۔ Strabo، ۱۷: ۷۸۶، ۸۱۹ اور حبشہ کے کتبات کی رو سے یہ لوگ دریائے نیل اور بحیرہ قلزم کے مابین سینی Syene کے جنوب مشرق میں رہتے تھے۔ سترابو Strabo کے زمانے میں یہ لوگ ”نہ تو کثیر التعداد ہی تھے اور نہ جنگجو“ (۱۷: ۱، ۵۳) اور بھیڑیں، بکریاں اور مویشی پالتے تھے۔ اس زمانے میں یہ لوگ سلطنت کے لیے اس قدر خطرے کا باعث نہ تھے۔ آنے والی صدیوں میں وہ لازماً اپنے عرب ہمسایوں سے اس حد تک شتربانی سیکھ گئے ہوں گے کہ وہ صحیح معنوں میں ”بہترین“ شتر سوار بدوی بن گئے۔ دیکیوس Decius کے عہد (۲۴۹ تا ۲۵۱ء) میں ان شتر سواروں کے دھاوے رومی سلطنت کے لیے درد سر بن گئے۔ بیس برس بعد وہ دریائے نیل اور بحیرہ قلزم کے درمیانی راستوں کے مکمل طور پر مالک بن چکے تھے۔ مصر سے ہندوستان تک کی تجارت کلیۃً بلمیہ Blemmyes کے رحم و کرم پر موقوف ہو کر رہ گئی تھی (قَب Bensch، ص ۲۶۴ بعد)۔ پروبس Probus کے عہد (۲۷۶ تا ۲۸۳ء) میں Koptos اور Ptolemais پر بیجا کا عارضی قبضہ ہو گیا۔ ۲۹۶ء میں سینی Syene کی سرحد پر دیوقلیطین Diocletian کو انہیں خراج دینا پڑا۔ اس شہنشاہ نے بیجا کے مقابلے کے لیے نبطیوں (Nobatae) نویدیوں (Nobades) یعنی نویوں (Nubians) کو طلب کیا تھا اور ان کی نو آبادی قائم کرنے کے لیے دودیکاشیوں (Dodekaschoinos) کو ان کے حوالے کر دیا تھا۔

چوتھی صدی عیسوی میں بلمیہ اور مصر کے عرب قبیلے، جن کے پاس اونٹ اور اب گھوڑے بھی آچکے تھے، اپنے حملوں کی وجہ سے سلطنت

Adulitanum کے مطابق ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی تھی، جو مصر سے شمالی لینڈ تک پھیلی ہوئی تھی (قَب Dittenberger، ص ۲۸۷ تا ۲۹۶؛ Littmann، ۱۹۱۳ء، ۱: ۴۲ بعد)۔ وہ بتاتا ہے کہ اس نے اس فتح کے سلسلے میں اپنی بحریہ سے کام لیا تھا۔ اس کا نام معلوم نہیں۔ یادگار مذکور سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں اکسوم کا شمار بحری طاقتوں میں ہوتا تھا، جسے غالباً روم کا تعاون حاصل تھا۔ یہ یادگار یونانی زبان اور رسم خط میں لکھی ہوئی تھی۔ پہلی صدی عیسوی ہی میں (Periplus) اکسوم میں یونانی زبان کی طرف توجہ شروع ہو گئی تھی، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہی Monumentum Adulitanum والا بادشاہ ہی اپنی شمالی عرب سے پہلے پہل اونٹ حبشہ میں لایا ہو گا۔ غالباً یہ وہی زمانہ ہو گا جب حبشہ میں قومیت کا شعور بڑی تیزی سے پیدا ہو رہا تھا، جس کے دوران میں غالباً ایک سرکاری رسم خط ظہور میں آیا، جو یادگاری اور شکستہ سبائی رسم خط پر مبنی تھا اور یونانی (بائیں سے دائیں، اعداد) اور ثمودی رسم خط سے متاثر تھا (قَب J. Ryckmans، ۱۹۵۵ء؛ Ullendorff؛ Drewes)۔ معلوم ہوتا ہے کہ تیسری صدی میں بحیرہ قلزم کا جنوبی حصہ حبشہ کے زیر اقتدار تھا اور رومی سلطنت اور ہندوستان کے درمیان براہ راست تجارت میں کمی آ گئی تھی (Sir M. Wheeler؛ Wissmann، ۱۹۵۷ء)۔

بطلمیوس ثانی (Ptolemy II) جن عربی قبائل کو غالباً Berenikē Troglodytikē اور Myos Hormos میں لایا تھا ان کے بعد جن افریقی باشندوں نے سب سے پہلے شتربانی شروع کی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیجا یا بلمیہ Blemmyes

بلکہ صحرائے اعظم کے علاقوں میں بھی اس سے پہلے مویشی پالنے والوں کا ایک قدیم دور ہو گا۔ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ اس قسم کے دور وہاں آتے رہے ہیں اور موجودہ زمانے کی بہ نسبت وہاں کی آب و ہوا کچھ مرطوب ہوگی، تاہم یہ امر مشکوک رہتا ہے کہ ان صحرائی علاقوں میں سینگوں والے جانور پالے جاتے ہوں گے، کیونکہ وہاں کی آب و ہوا ان کے لیے موزوں نہیں ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہاں بھیڑ بکریوں سے پہلے گائے اور بیل لائے گئے ہوں۔ یہ بات قرین قیاس نظر آتی ہے کہ وہاں بدوی زندگی مکمل طور پر قائم ہو چکی تھی۔ چٹانوں کی تصویروں میں گائے اور بیل کو متبرک جانور کے طور پر پیش کیا گیا ہے، حالانکہ بدویوں کی اقتصادی حالت کے اعتبار سے انہیں بھیڑ بکریوں کے مقابلے میں ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں ہمیں یہ امر یاد رکھنا چاہیے کہ ثمود کی بنائی ہوئی چٹانی تصویروں میں، جو مغربی عرب میں ملی ہیں، شکار شدہ جانور اور اونٹ تو نظر آتے ہیں لیکن بھیڑ بکریاں بہت کم دکھائی دیتی ہیں۔ حالانکہ ہمیں یقین ہے کہ ان علاقوں کے بدوی ان جانوروں کے ریوڑ کے ریوڑ رکھتے تھے۔

بقول لوٹے Lhote (۱۹۵۳ء) غدامیس (غداس) - باقوت، فران، تسیلی اور آہجر کے علاقے میں جو چٹانی تصویریں برآمد ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں گھوڑا اور جنگی رتھ بہت قدیم زمانے سے رواج پذیر ہو چکے تھے۔ اور لوٹے Lhote کے مفروضے کے مطابق اس کا رواج دینے والے ۱۲۰۰ ق م کے لگ بھگ علاقہ ایچیہ کے ”بحری باشندے“ تھے۔ ان جنگی رتھوں میں لوگوں کے سوار ہونے کا رواج، جس میں لگام اور دبانے کا استعمال نہیں ہوتا تھا، کسی قدر بعد کے زمانے میں ہوا اور یہ وہی طریقہ تھا جو قدیم مصنفوں نے اپنے زمانے میں شمالی افریقہ کے

کے لیے ایک دائمی خطرہ بن گئے تھے (Ammian Marcellin، ۱۴ : ۴، ۳)۔ سلطنت کو ان کی سرکوبی کے لیے شتر سوار دستے بھرتی کرنا پڑے۔ شہنشاہ فالینس Valens (عہد حکومت ۳۶۰ء) کے زمانے میں عربوں کے نئے قبائل خاکناے سویز کو عبور کر کے غالباً ٹیپس Thebes کے خطے تک نیل کے مشرق میں صحرائے عرب کے شمالی حصے پر قابض ہو چکے تھے۔ ان لوگوں نے لازماً مصر کے گرد و نواح کے علاقوں میں شتر سوار بدویت اور اونٹ پر سوار ہو کر جنگ کرنے کے طریق عمل کو تقویت پہنچائی ہوگی۔

ونکالر H.A. Winkler کو دریائے نیل کے مشرق میں صحرائے عرب میں جو چٹانوں پر بنی ہوئی تصویریں ملی ہیں ان میں اس نے بلمیہ کا ایک ایسا گروہ دریافت کیا ہے جو شتربانی اور اسلام کے درمیانی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ بات بالکل یقینی نظر آتی ہے کہ یہ گروہ اسی دور سے تعلق رکھتا ہوگا (یونانی اور قبطی حروف، یونانی اثر، مخصوص نشانات)۔ ان تصاویر میں زیادہ تر (کمان، نیزہ، تلوار اور مثلث شکل کی ڈھال سے) مسلح لوگ اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار پیش کیے گئے ہیں۔ یہاں اونٹ اہم ترین پالتو جانور کے طور پر گھوڑے، گدھے اور مویشیوں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ ونکالر Winkler (۱۹۳۸ء، ص ۴۱) کہتا ہے: ”چٹانوں پر بنی ہوئی تمام تصویروں میں امن و امان کا دور دورہ ہے اور شتربانوں کی تصاویر میں ہر جگہ جنگ کا نقشہ نظر آتا ہے۔ وہ جہاں بھی گئے اپنے ساتھ جنگ کی تباہ کاریاں لے گئے“۔

... جب ہم چٹانوں پر بنی ہوئی تصویریں دیکھتے ہیں تو خیال گزرتا ہے کہ نہ صرف سوڈان اور مشرقی افریقہ کے لقی و دق میدانوں میں



باشندوں سے، جو سرتیہ Syrte میں واقع تھا، باربرداری کے چار ہزار اونٹوں کا مطالبہ کرتا ہے (Ammian. Marcellin، ج ۲۸، شماره ۶ : ص ۵۰؛ ج ۲۹، شماره ۵ : ص ۵۵)۔ ۶۴۰۰ کے قریب Synesius کا ایک بیان ملتا ہے کہ اونٹوں اور گھوڑوں کے ریوڑ اس زمانے میں سیرینیکا کے باشندوں کی دولت تھے۔ پانچویں صدی میں پتا چلتا ہے کہ شمالی افریقہ اور زیادہ تر سرتیہ Syrtes کے علاقوں میں اونٹ ہمیشہ سے بڑی کثرت سے پالے جاتے رہے ہیں۔

بہت سے مصنف بالخصوص گوتیے Gautier (ص ۱۹۰ بعد)، گسیل Gsell اور دوسروں نے ان تھوڑے سے ماخذ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اونٹ بحیرہ روم کے اس پار سے شمالی افریقہ میں لایا گیا ہوگا۔ اس کے برعکس تیسری صدی عیسوی میں بالائی مصر میں بلمیہ کی حیثیت کو دیکھتے ہوئے (قب سطور بالا) ہمارا خیال یہ ہے کہ مصر کے مغرب میں نخلستانوں کا جو سلسلہ چلا گیا تھا وہ بھی ایک قرین قیاس راستہ نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ صحرائے لیبیا کے جنوب میں جو راستے پائے جاتے ہیں وہ ایسے علاقے ہیں جو تاریخ کے صفحات میں جگہ نہیں پا سکتے۔

غالباً آئندہ ہونے والی لسانی تحقیقات اور کھدائیاں ان مسائل کا حل پیش کرنے میں ہماری مدد کر سکیں گی۔ بیجا (بلمیہ) کی زبان میں اونٹ کے لیے جو لفظ عام طور پر مستعمل ہے وہ قام (کیم kam) ہے۔ اور شمالی نوبہ (Nubia) میں کم (کمتی) (بحوالہ Professor Dr. O. Rossler، بذریعہ مکتوب)۔ تبو اونٹ کو گونی کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام ان لوگوں کے باعث سوڈان کے مشرقی حصے تک پھیل چکا تھا جہاں روایت کے مطابق تبو (Leptis Magna) بدولت اونٹ پہنچا تھا

صحرا نشینوں کی اسپ سوازی کا بتایا ہے (Strabo، Silius Italicus، Polybius)۔ شمالی افریقہ کی جنگوں میں تیسری صدی قبل مسیح تک گھوڑے نے پوری طرح جنگی رتھوں کی جگہ لے لی تھی۔ بدوی، گھوڑے پر سوار ہو کر چھاپے مارا کرتے تھے۔

یہ عجیب سی بات ہے کہ ہمیں ابھی تک اس بارے میں کچھ پتا نہیں چلا کہ شمال مغربی افریقہ اور صحرائے اعظم میں اونٹ کیسے پہنچا تھا۔ ادبی تصنیفات میں اونٹ کا ذکر پہلی بار ۴۶ ق م میں قیصر Caesar : *De bello Africano* (باب ۴۳ : ۴) میں ملتا ہے جب شاہ جوہہ Juba سے وصول کیے ہوئے مال غنیمت میں بائیس اونٹوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ لیکن جوہہ ایک ایسا شخص تھا جسے سائنس اور بالخصوص جغرافیہ کے میدان میں بہت سی مختلف باتوں سے دلچسپی تھی اور یونانیوں کی طرح نوادر جمع کرنے کا شوق تھا۔ یہ بات قرین قیاس نظر آتی ہے کہ اس نے یہ دیکھنے کے لیے ان جانوروں کو درآمد کیا ہوگا کہ یہ کس حد تک شمالی افریقہ میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس زمانے میں صرف سیرینیکا Cyrenaica ہی ایسی جگہ تھی جہاں اونٹ بڑی تعداد میں پالے جاتے ہوں گے۔ L. Lollius کی نکسال کے سکیوں پر پومپئی Pompey کے تحت سیرینیکا Cyrenaica میں ایک کمانڈر دکھایا گیا ہے۔ اس کے بعد تاریخ کی کڑیاں گم ہیں۔ ہیدرومیٹم Hadrometum (سوسہ Sousse، تونس) کے گورستان میں دوسری یا شاید تیسری صدی کے ایک شتر سوار کا بت اور منبت کاری کا ایک نمونہ ملا ہے، جس میں ایک میدان میں اونٹوں سے کھینچے جانے والی رتھوں کی دوڑ دکھائی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ادب میں دوسرا اشارہ ۶۳ء کا ملتا ہے۔ صوبہ افریقہ کا رومی گورنر (comes =) لیپٹی مجنہ (Leptis Magna)

Notes on some : F. W. Green (۱۱)؛ ۱۹۳۷ء؛  
 : ۳۱، 'PRAS'، 'inscriptions in the Etbai District'  
 : S. Gsell (۱۲)؛ ۳۶، ۳۲، لوح، ۲۵۴ تا ۲۴۷  
 'Histoire ancienne de l'Afrique du Nord'، پیرس  
 Chart of South : A. Jamme (۱۳)؛ بعد؛ ۱۹۲۳ء  
 Qataban and : W. Phillips، 'Arabian Letters'  
 : H. Kortenbeutel (۱۴)؛ ۵۵ ص، ۱۹۵۵ء، لندن  
 'Der ägyptische Süd-und Osthandel in der Politik'  
 Diss. Berlin، 'der Ptolemäer und römischen Kaiser'  
 Le cheval et le chamcau : H. Lhote (۱۵)؛ ۱۹۳۱ء؛  
 'dans les peintures et gravures du Sahara'  
 'Bull. de l'Institut Français d'Afrique Noire'  
 : ۱۰، ۳، 'Dakar'، 'IFAN'، ۱۹۵۳ء؛ ص ۱۱۳۸ تا ۱۲۲۸؛  
 : R. Mauny (۱۷)؛ محل مذکور؛ (۱۷)؛  
 'Pré-histoire saharienne'، در 'Bull. de Corresp.'  
 J. H. Mordt- (۱۸)؛ ۱۹۳۸ء؛ 'Dakar'، ج ۱،  
 'Saharien'، و 'Sabäische Inschriften' : E. Mittwoch، در  
 'Rathjens-v. Wissmann'sche Südarabienreise'، ج ۱،  
 'Abh. a.d. Gebiet d. Ausland'، ہمبرگ یونیورسٹی،  
 skunde : C. Préaux (۱۹)؛ ۱۹۳۱ء؛ ۳۶،  
 'raisons de l'originalité de l'Égypte'، در 'Mus. helvet'  
 ج ۱۰، کراسہ ۳ تا ۴، ۱۹۵۳ء؛ (۲۰)؛ C. Rathjens و  
 'Landeskundliche Ergebnisse' : H. v. Wissmann  
 در 'R.-v. W'sche Südarabienreise'، ج ۳، ہمبرگ  
 یونیورسٹی، 'Abh. a.d. Gebiet d. Auslandskunde'، ج ۴۰،  
 Die Sarko- : N. Rhodokanakis (۲۱)؛ ۱۹۳۳ء؛  
 'phaginschrift von Gizeh'، در 'Zeitschr. f. Semitistik'  
 : C. Ritter (۲۲)؛ ۱۱۳ تا ۱۳۳؛ (۲۲)؛  
 محل مذکور؛ (۲۳)؛ G. Ryckmans : محل مذکور؛ (۲۴)؛  
 'Inscriptions historiques sabéennes' : J. Ryckmans  
 'de l'Arabie centrale'، در 'Muséon'، ۶۶، ۱۹۵۳ء؛  
 'L'origine et' : (۲۵)؛ وہی مصنف؛

(Bensch، ص ۱۷۱، بقول Barth) - اسی طرح کوهستان  
 منڈارہ (شمالی کیمرون) میں اونٹ کو "گومہ"  
 کہتے ہیں اور نر اونٹ "الدہ گومہ" کہلاتا ہے  
 (Barth، ۲ : ۵۳۳ حاشیہ) - حتی کہ مسائی Masai  
 بھی اونٹ کو انٹومس en-tomes کہتے ہیں -  
 (ندی : توبیس) - بربری زبانوں میں، جن میں طوارق  
 بھی شامل ہے، اونٹ کے لیے عام لفظ الغم alghem  
 یا آلم alem ہے۔ یقیناً الغم ہی سے ہوسہ کا لفظ  
 رگومی rakumi اور نوبی زبان (Nupe) کا رگوم  
 نکلا ہے (O. Rössler)۔ یہ تمام اسما عربی اسما سے  
 نکلے ہوئے نظر نہیں آتے لیکن کچھ اور نام ایسے  
 موجود ہیں جو اس زبان سے اشتقاق کو ظاہر  
 کرتے ہیں۔

ماخذ : (۱) W. F. Albright : محل مذکور؛  
 (۲) وہی مصنف : 'Minaean Kings'، در 'BASOR'  
 ص ۱۲۹، ۱۹۵۳ء؛ (۳) H. Barth : 'Reisen und'  
 'Entdeckungen in Nord-und Central Afrika'، ۱۸۵۷ء  
 بعد؛ (۴) R. Basset : 'Le nom du chameau chez les'  
 'berbères'، در 'Actes du XIV<sup>e</sup>. Congrès des Orientalis-  
 tes'، ۱۹۰۵ء، سیکشن ۷ : ۶۹ تا ۸۲؛ (۵) P. Bensch :  
 'Die Entwicklung des Nomadentums in Afrika'  
 ڈاکٹری کے لیے مقالہ ٹائپ میں لکھا ہوا، گوٹنگن ۱۹۴۹ء  
 (اہم ہے)؛ (۶) A. Caquot و A. J. Drewes :  
 'monuments recueillis à Maqallé (Tigré)'، در 'Ann.'  
 'd'Éthiopie'، ۱۹۵۵ء، ۱ : ۱۶ تا ۳۱؛ (۷)  
 'Storia d'Etiofia' : C. Conti Rossini، ج ۱،  
 'Südasiatische' : R. Delbrueck (۸)؛ ۱۹۲۸ء، Milano  
 'Seefahrt im Altertum'، در 'Bonner Jahrbücher'، ۱۰۵۰/  
 ۱۰۶، ۱۹۵۰ - ۱۹۵۶ء؛ (۹) A. J. Drewes :  
 'Problèmes de Paléographie Éthiopiennes'، در 'Ann.'  
 'd'Éthiopie'، ۱۹۵۰ء، ۱ : ۱۲۱ تا ۱۲۶؛ (۱۰)  
 'Le passé de l'Afrique du Nord' : E. F. Gautier



*La population du Sahara anté- : L. G. A. Zöhrer*  
*Bull. Soc. rieuse à l'apparition du chameau*  
*Neuchâtoise de Géographie*، ۱۹۵۲، ۱۹۵۳-۱۹۵۴.  
 (H. VON WISSMANN)

۳ - عرب قبل از اسلام

(۱) مآخذ

(ب) تاریخ

(ج) سیاسی روابط

(د) اخلاقی نظریہ

(ه) مذہب

(۱) مآخذ: عرب قبل از اسلام کے بدوؤں کے

بارے میں ہماری معلومات زیادہ تر دو مآخذ پر مبنی ہیں۔ پہلا مآخذ تو قبل از اسلام کی شاعری ہے، جس کا کچھ ذخیرہ محفوظ رہ گیا ہے۔ دوسرا مآخذ وہ تشریحات و حواشی اور تبصرے ہیں جو ظہور اسلام سے ایک صدی بلکہ اس کے بعد بھی اس شاعری اور قدیم عربی ضرب الامثال پر لکھے گئے اور جن میں زمانہ قبل از اسلام کے واقعات کے بارے میں روایات کا اچھا خاصا مواد شامل ہے۔ اس مواد کو دوسرے علما نے بھی اپنی خصوصی تصنیفات میں جمع کیا ہے۔ عہد قبل از اسلام کی شاعری کے معتبر و مستند ہونے سے عصر حاضر کے [چند] علما نے، جن میں مارگولیتھ Margoliouth اور طہ حسین کے نام قابل ذکر ہیں، انکار کیا ہے لیکن ان کے نظریات کو اکثر علما نے قبول نہیں کیا۔ اگرچہ وہ اس سلسلے میں تحریفات کے قائل ہیں لیکن ان کی رائے میں بحیثیت مجموعی قبل از اسلام کی شاعری ہم تک صحت کے ساتھ پہنچی ہے (قب) *The Seven Odes : A. J. Arberry*، لندن ۱۹۵۷ء، ص ۲۲۸ تا ۲۴۵)۔ اسی طرح تاریخی روایات کے بارے میں بھی، جنہیں مستشرقین بالکل بیکار سمجھتے تھے، اب یہ کہا جاتا ہے کہ

*l'ordre des lettres de l'alphabet éthiopien* در *Bibl. Orient.*، ۱۲، ۱۹۵۵ء: ۲ تا ۲۴؛ (۲۶) وہی *La persécution des chrétiens himyarites*: مصنف *Nederl. Histor. Arshaecol.*، *au sixième siècle* (۲۷) *Inst. in het nabije Oosten*، استانبول ۱۹۵۶ء؛ (۲۷) *The Periplus of the Erythraean Sea : W.H. Schoff* نیویارک ۱۹۱۲ء؛ (۲۸) *Zur Frage der Herkunft des Kamels in Afrika* در *Zeitschr. f. Tierzüchtung und Züchtungsbiologie*، ۱۹۴۰ء؛ (۲۹) *Ptolemy II and Arabia*، *Journ. of Egypt. Archaeology*، ۱۵، ۱۹۲۹ء؛ (۳۰) *Eudoxus van Cyzicus* در *Mededel. Nederl. Akad. Afd. Letter- kunde N. R.*، ۲، ۱۹۳۹ء؛ (۳۱) *The Origin of the Ethiopic Alphabet*، *Bibl. Orient.*، ۱۲، ۱۹۵۵ء: ۲۱۷ تا ۲۱۹؛ (۳۲) *Rome beyond the Imperial Frontiers : Wheeler* لندن ۱۹۵۴ء؛ (۳۳) *Rock Drawings of Southern Upper Egypt*، لندن ۱۹۳۸ء؛ (۳۴) وہی *Völker und Völkerbewegungen im vorgeschichtlichen Oberägypten im Lichte neuer Felsbilderfunde*، *Stuttgart* ۱۹۳۷ء؛ (۳۵) *The Christian Topography of Cosmas Indicopleustes Arabien*، *H. v. Wissmann*، ۱۹۰۹ء؛ (۳۶) *und seine kolonialen Ausstrahlungen*، *raumfragen europäischer Völker*، لائپزگ ۱۹۴۱ء: ۳۷۳ تا ۳۸۸؛ (۳۷) *H. v. Wissmann* و *M. Höfner*، محل مذکور؛ (۳۸) *De Mari Erythraeo Lautensach - Festschrift*، *Stuttgrater Geograph. Studien*، ۶۹، شٹٹگارٹ ۱۹۵۷ء: ۲۸۹ تا ۳۲۴؛ (۳۹) *Nord- und Weissafrika*، *H. A. Bernatzik* در *Die Grasse Völkerkunde*، ۱، لائپزگ ۱۹۳۹ء؛ (۴۰)

ان کے پس منظر میں حقیقی واقعات ہیں اور صحیح تاریخ مرتب کرنے کے لیے اگرچہ ناکافی ہیں پھر بھی ان سے زمانہ جاہلیت کی معاشرتی زندگی پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض صورتوں میں ان روایات کی توثیق آیات قرآنی اور ان سے اخذ کردہ نتائج سے ہوتی ہے اور موجودہ زمانے کے ماہرین آثارِ قدیمہ نے جو متعدد کتبات عرب میں دریافت کیے ہیں وہ ان کے لیے تکمیل و تائید کا کام دیتے ہیں۔

(ب) تاریخ : تاریخ کے آغاز ہی سے عرب کے لُق و دق میدانوں میں رہنے والے بدوی گرد و نواح کے مہذب ملکوں پر اپنا دباؤ ڈالتے رہے ہیں۔ بعض ادوار میں تو یہ دباؤ بڑی شدت اختیار کرتا رہا۔ حضری علاقوں میں بدویوں کا داخلہ قوت پکڑتا رہا اور بعض روایات کے مطابق بدویوں کے ”ریلے“ وہاں پہنچتے رہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام سے پہلے عبرانی، آرامی، عرب اور نبطی شام اور عراق میں داخل ہوئے اور ہجرت سے چھ صدی پیشتر عربوں اور اہل تدمر (Palmyrenes) کا دباؤ اور بھی بڑھ گیا تھا۔ آغاز کار میں تو بدوی محض غارتگری کرنے کے لیے آتے تھے لیکن اکثر اوقات وہ یہاں مقیم بھی ہو جاتے تھے (جیسے ۶۲۵ء کے لگ بھگ عراق میں بنو تنوخ نے سکونت اختیار کی)۔ حضری بدویوں اور حسب سابق صحرائی زندگی بسر کرنے والے بدویوں کے مابین روابط کے باعث تجارت میں بڑی آسانیاں پیدا ہو جاتی تھیں۔ کیونکہ صرف بدوی ہی سامان تجارت کے قافلوں کو صحرا عبور کرا سکتے تھے اور صرف بدویوں ہی کی مضبوط اور طاقتور جماعت ان قافلوں کی بحفاظت آمد و رفت کی ضامن ہو سکتی تھی۔ اسی طرح بوزنطی اور ساسانی سلطنتوں کی تاریخ میں بدوی دو حیثیتوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ حملہ آور اور تاجر۔

ان دونوں سلطنتوں نے بدویوں کے جارحانہ

اور سفاکانہ حملوں سے بچنے کے لیے بہت سے طریقے اختیار کیے۔ ان طریقوں میں سب سے زیادہ مفید طریقہ یہ ثابت ہوا کہ حدود سلطنت پر رہنے والے نیم بدوی سرحدی فرمانرواؤں کا تقرر عمل میں لایا جائے تا کہ ریگستانی میدانوں کے اندر سے آنے والی حملہ آور جماعتوں سے شہری علاقوں کو محفوظ رکھا جا سکے۔ عراق کی سرحد پر یہ کام تقریباً ۶۳۰ء سے الحیرہ کے لخمی بادشاہوں سے اس خاندان کے اختتام یعنی ۶۰۲ء تک لیا جاتا رہا۔ بوزنطیوں کی سرحد پر یہ کام غسانی بادشاہوں نے سر انجام دیا، لیکن انہیں یہ اہمیت ذرا دیر کے بعد حاصل ہو سکی (۵۲۹ء میں قسطنطین نے غسانی بادشاہ کو بعض خطابات عطا کیے تھے) ورنہ ان کا دارالحکومت بظاہر محض ایک منزل یعنی کیمپ پر مبنی تھا اور ان کے پاس کوئی ایسا شہر نہیں تھا جس کا موازنہ الحیرہ سے کیا جا سکے۔ دفاع کا یہ طریقہ اسلامی فتوحات کے آغاز سے تھوڑی دیر پہلے تک قائم رہا۔ الحیرہ میں ایک ایرانی شاہی گماشتہ اس عرب فرمانروا کی نگرانی کے لیے مقیم رہتا تھا جس نے لخمی بادشاہوں کی جگہ لے لی تھی۔ دوسری طرف بوزنطیوں نے غسانیوں کو جو جاگیریں عطا کر رکھی تھیں وہ ایرانی حملے (۶۱۳ء تا ۶۳۹ء) کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں جو بعد میں کبھی بحال نہ ہو سکیں۔

ہر چند کہ ہمیں اس بات کا علم ہے کہ عرب بدویوں نے تجارت میں بڑے پیمانے پر حصہ لیا تھا تاہم اس تجارتی لین دین کی تفصیلات پر ابھی تک کوئی کام نہیں کیا جا سکا۔ بدویوں کا صرف بوزنطی اور ایرانی سلطنتوں سے ہی تعلق نہ تھا بلکہ جنوبی عرب کی حمیری بادشاہت سے بھی رابطہ قائم تھا (یہ سلسلہ ۵۲۵ء کے قریب اہل حبشہ کے ہاتھوں اس بادشاہت کا تختہ الٹنے



تاریخ العرب قبل الاسلام]۔

(ج) سیاسی روابط: معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے دیکھا جائے تو عرب کے بدویوں کی وحدتیں تعداد کے اعتبار سے چھوٹی بڑی تھیں۔ مغربی مصنفین انہیں اکثر اوقات ”قبائل“ کہتے ہیں اور اگر گروہ چھوٹا ہو تو اسے ”ذیلی قبیلہ“ (sub-tribe) یا ”بطن“ (clan) کہتے ہیں۔ لیکن یہ اصطلاحات عربی کے مستعملہ الفاظ کے معنی پوری طرح ادا نہیں کرتیں۔ عربی میں ان معاشرتی اور سیاسی وحدتوں کے لیے متعدد الفاظ موجود ہیں لیکن جو لفظ سب سے زیادہ مستعمل ہے وہ یہ کہ کسی قبیلے یا بطن کو محض بنو فلان (= فلان کے بیٹے) کہہ کر پکارا جائے۔

علم الانسان کے معاشرتی شعبے نے زمانہ حال میں جو ترقی کی ہے اس کی روشنی میں ابھی تک زمانہ قبل از اسلام کے قبائل کے ڈھانچوں کا مطالعہ پوری طرح نہیں کیا جا سکا۔ عربوں کا دستور یہ ہے کہ باپ کی طرف سے رشتہ جوڑا جائے، البتہ اس سلسلے میں کہیں کہیں استثنا بھی پایا جاتا ہے۔ ایک شخص جس کا قبیلے کے ساتھ خونی رشتہ نہیں ہوتا تھا (جو صحیح یا صمیم نہیں) وہ بعض ایسی مراعات سے مستفید ہو سکتا تھا جو صرف ارکان قبیلہ کو حاصل تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے حفاظت کی ضمانت دے دی جاتی تھی۔ یہ مراعات اسے بحیثیت حلیف (اتحادی) یا جار (زیر حفاظت ہمسایہ) یا مولیٰ (مؤکل) حاصل ہوتی تھیں۔ حلیف کے پابند گروہ حیثیت کے اعتبار سے مساوی سمجھے جاتے تھے لیکن جب محض ایک فرد کسی قبیلے یا بطن میں حلیف کے طور پر رہتا تھا تو اس کی حیثیت کمتر اور ماتحت کی سمجھی جاتی تھی۔ اس کے برعکس جوار (زیر حفاظت ہمسایگی) میں کسی چلے تک اس شخص کے لیے برتری کا مفہوم

نک جازی رہا)۔ جنوبی عرب کے تمدن کی ترقی کا انحصار تجارت پر تھا اور تجارت پر زوال کے ساتھ ہی (جس کا باعث یہ تھا کہ بحیرہ قلمز پر ان کا اثر باقی نہ رہا تھا) اس پر بھی زوال آ گیا۔ عربی روایت میں سد مارب کے ٹوٹنے کو جنوبی عرب کے تمدن کا شیرازہ بکھر جانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن آثار قدیمہ کے اکتشافات سے پتا چلتا ہے کہ اب پاشی کے نظام کا خاتمہ ایک سلسلہ واقعات کے باعث ہوا اور قیاس یہ ہے کہ یہ جنوبی عرب کے زوال کی علامات تھیں اس کی وجوہات نہ تھیں۔ پھر عربی روایت مارب کے بند ٹوٹنے کا رشتہ بہت سے بدوی قبائل کی شمال کی جانب حرکت سے بھی ملاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ حضری زندگی کو بکثرت ترک کر رہے تھے۔ اسی زمانے میں یمن، شام اور عراق کے درمیان خشکی کے راستے اونٹوں کے قافلوں کے ذریعے تجارت پھلنے پھولنے لگی اور ۶۰۰ء تک یہ زیادہ تر قریش مکہ کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ خود قریش کے پاس مکہ کا شہر بطور ان کے صدر مقام کے تھا۔ اور اس اعتبار سے وہ اب بدوی نہیں رہے تھے لیکن ان کے تجارتی مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ وہ متعدد بدوی قبائل کے حلیف بنے رہیں اور ان کے ساتھ دیگر روابط قائم رکھیں۔ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت اور پر امن راستوں کی ضمانت سے بدویوں کی معیشت کو بہت فائدہ پہنچا۔ سیلوں ٹھیلوں (اسواق) کے باعث، جہاں یہ قافلے سامان تجارت لے کر آتے تھے اور خرید و فروخت ہوتی تھی، بدوی ایسی بہت سی چیزیں حاصل کر لیتے تھے جن کا لقی و دق میدانوں میں پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔ بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کی اقتصادی حالت زیادہ خراب اور حقیر نہ تھی [قب جواد علی:

اسی کی بنا پر زمانہ ما بعد کے ماہرین انساب نے ان گروہوں کے ناموں کو اسی نام کے بانی سے منسوب کر دیا ہوگا۔ لیکن اگر ہم تمام نسبی شجروں کی توضیح اسی بنا پر کرنا شروع کر دیں تو یہ بات خطرناک ہوگی۔ صرف اسی بات کو یقینی سمجھنا چاہیے کہ صحرائی قبائل کا ڈھانچہ مسلسل بدلتا رہتا تھا۔ بعض قبائل خوشحال ہو جاتے تھے اور تعداد بڑھ جانے کے باعث جب ایک وحدت کی صورت میں کام چلانا دشوار ہو جاتا تو وہ دو یا زیادہ فریقوں میں بٹ جاتے تھے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ عہد رسالت<sup>۳</sup> میں عرب بعض گروہوں کو ایسے ناموں سے پکارتے تھے جو متعدد قبائل پر مشتمل ہوتے تھے (قب Nallino : کتاب مذکور، ص ۷۶)۔ دوسری طرف جب ایک قبیلے کو خوشحالی نصیب نہ ہوتی تو اس کی تعداد میں کمی واقع ہو جاتی۔ اس صورت میں یا تو وہ کسی طاقتور قبیلے کا سہارا ڈھونڈتا، یا دوسرے کمزور قبائل کا حلیف بننے کی کوشش کرتا، یا پھر قطعی طور پر معدوم ہو جاتا۔ اسی لیے مکے کے قریب چند کمزور قبائل زیادہ تر قریش کے دست نگر ہو کر رہ گئے تھے۔ چند قبائل جو اور بھی زیادہ کمزور تھے آپس میں مدغم ہو گئے تھے اور ان کا نام احابیش [رک باں] پڑ گیا تھا، جس کا مطلب غالباً ایک مخلوط گروہ ہے (Lammens کا یہ نظریہ کہ احابیش حبشی غلام تھے، ابن ہشام (ص ۲۴۵) اور ابن سعد (۱ / ۱ : ۸۱) کے بیانات کے منافی ہے۔ اس لیے اس کے حق میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، قب Muḥammad at Medina : Montgomery Watt، ص ۸۱ و M. Hamidullah، در Studi Orientalistici in Onore di Giorgio Levi della Vida، ۱ : ۲۳۴ تا ۲۳۷)۔ قبیلے کے معاملات تمام ارکان کی مجلس یا اجتماع میں طے ہوتے تھے۔ یوں تو سبھی اپنی

شامل ہوتا تھا، جو حفاظت کرتا تھا اور اس کی نوعیت کم از کم عارضی تو ضرور ہوتی تھی۔ یہ حفاظت عارضی بھی ہو سکتی تھی اور مستقل بھی۔ غلام کو "سوی" کا درجہ آزاد ہو جانے پر ملتا تھا۔ قبیلے کے کچھ غلام بھی ہوتے تھے۔ کوئی عرب صرف اسی صورت میں غلام بن سکتا تھا جب وہ بچپن ہی میں کسی حملے کے دوران میں پکڑ لیا گیا ہوتا۔ ان کے علاوہ حبشی غلام بھی ہوا کرتے تھے۔ کسی شخص کو اپنے قبیلے کے کسی فرد کے قتل یا قبیلے کے مفاد کو نقصان پہنچانے کے جرم میں قبیلے سے خارج کیا جا سکتا تھا۔ وہ یا تو تنہا (بحیثیت ایک صعلوک کے) بھٹکتا پھرتا تھا یا کسی اور قبیلے سے جار یعنی ہمسائے کے طور پر منسلک ہو جاتا تھا۔

اس قیاس کی تائید میں مستحکم دلائل موجود ہیں کہ یہ روایتی نظریہ پوری طرح درست نہیں بیٹھتا کہ کسی قبیلے کے سارے ارکان باپ کی طرف سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوتے تھے البتہ چند ایک قبائل کی تشکیل اسی بنیاد پر ہوئی تھی۔ اول یہ کہ عہد رسالت<sup>۳</sup> میں اس امر کی متعدد شہادتیں ملتی ہیں کہ بعض عرب قبائل کی تشکیل مادری رشتہ داری پر مبنی ہوتی تھی اور چند واقعات سے پتا چلتا ہے کہ پدری رشتے نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ اگرچہ اس بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مادری رشتے کی حدود کہاں تک وسیع تھیں اور عملاً اس کا کیا درجہ تھا [رک بہ باہلہ]۔

دوم یہ کہا جاتا ہے کہ بعض قبائل کے نام دراصل مقامی یا سیاسی بنا پر رکھے گئے تھے جن سے مشترکہ جد کا پتا نہیں چلتا (قب Nallino : Raccolta di Scritti، ۳ : ۲۲ تا ۲۹)۔ یہ بات غالباً چند صورتوں میں ضرور پیش آئی ہوگی اور



حیثیت حاصل تھی۔ کبھی کبھی کسی طاقتور قبیلے کا سید اپنی شخصیت کے زور یا فوجی طاقت کے بل بوتے پر دوسرے متعدد قبائل پر اپنی سیادت قائم کر لیتا تھا اور اس طرح وہ تمام قبائل اس کے حلیف بن کر اس کے احکام کی تعمیل کرتے تھے لیکن اس بات پر اکثر ناراضی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ چنانچہ طاقتور شخصیت کے گزر جانے کے بعد یہ اتحاد بھی پارہ پارہ ہو جاتا تھا۔

(د) اخلاقی نظریہ: ایک بدوی کی زندگی ایسے طبعی حالات میں بسر ہوتی تھی جنہیں بے حد نامساعد کہا جا سکتا ہے۔ اکثر اوقات خوراک کے ذرائع و وسائل آبادی کے اعتبار سے کافی نہیں ہوتے تھے؛ چنانچہ ہر طاقتور کے ہاں یہ رجحان پایا جاتا تھا کہ کمزور کے پاس اس قسم کے جو ذرائع و وسائل اور بالخصوص اونٹ ہیں انہیں ہتھیا لیا جائے۔ اسی چیز نے بدویوں کو ایسے قبائل اور بطون کی شکل میں منظم ہونے پر مجبور کیا جن کی جماعتی تنظیم استحکام کے اعتبار سے بہت اعلیٰ درجے کی ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ بڑے گروہ زیادہ طاقتور ہوں گے لیکن مشکل یہ تھی کہ بعض اوقات اونٹوں کی چراگاہیں تلاش کرنے کے لیے انہیں بکھر جانے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اسی لیے بطور ایک وحدت کے کوئی گروہ اسی وقت تک درست طریقے سے کام کر سکتا تھا جب تک اس کے ارکان کی تعداد ایک خاص حد سے متجاوز نہ ہوتی؛ چنانچہ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے بڑے اور خوشحال قبیلوں میں مختلف قسمتوں میں بٹ جانے کے رجحان کی یہی وجہ تھی۔ اونٹوں کے لیے چھابہ مارنا بدویوں کے لیے ایک کھیل تھا لیکن خون بہانے سے اجتناب کیا جاتا تھا۔ تاہم جب دشمنی کی جڑیں گہری ہو جاتیں تو چھابہ مارنے کی نوعیت بھی بدل جاتی؛

راے دے سکتے تھے لیکن سب سے زیادہ وزن ان اشخاص کی راے کو دیا جاتا تھا جن کا اثر و اختیار مسلم ہوتا تھا۔ قبیلے کے سردار یا شیخ یعنی سید کا تقرر مجلس میں باواز بلند اعلان سے ہوتا تھا۔ عام طور پر وہ ایسے خاندان سے ہوتا تھا جسے سب سے زیادہ قابل احترام سمجھا جاتا تھا، لیکن ایسا کوئی قانون موجود نہ تھا جس کی رو سے صرف خلف اکبر (بڑے بیٹے) کو یہ حق پہنچتا ہو۔ صحرائی زندگی کے نامساعد حالات کے پیش نظر یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ شیخ قبیلہ اعلیٰ قیادت کا اہل ہو اور ظاہر ہے کہ ایک نابالغ بچہ اس قابل نہیں ہوتا۔ سید پر بعض فرائض عائد ہوتے تھے، جن میں وہ تعلقات خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو اس قبیلے یا بطن کے دوسرے قبائل یا بطون کے ساتھ ہوتے تھے۔ وہ معاہدے کر سکتا تھا، جن کا پورا قبیلہ پابند ہوتا تھا۔ قیدیوں کے فدیے اور قصاص کی ادائیگی اسی کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔ عموماً اجنبیوں کی خاطر و مدارت اسی کا حق تھا اور اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنے قبیلے کے نادار لوگوں کی مدد کرے۔ ان تمام فرائض کے بدلے میں اسے لوٹ مار میں آئے ہوئے مالِ غنیمت کا چوتھا حصہ لینے کی رعایت حاصل تھی۔ قبیلے کے ارکان کے باہمی جھگڑے طے کرانے کے لیے سید ہی سے رجوع کیا جاتا تھا لیکن بعض اوقات اس کے لیے حکم (ٹالٹ) بھی مقرر ہو جاتا تھا۔ عرب کے مختلف حصوں میں عموماً ایک دو آدمی اپنی حکمت و دانش اور غیر جانب داری کے باعث شہرت رکھتے تھے اور ٹالٹ بننے کے لیے اکثر اوقات انہیں سے درخواست کی جاتی تھی۔ ٹالٹ کے فیصلوں کے سامنے اپنی مرضی سے سر تسلیم خم کرنے اور معاہدے میں شامل حلیف قبائل کے اتحاد کی رکنیت کے علاوہ ہر قبیلے کو ایک خود مختار سیاسی وحدت کی

شعرا نے اہم کردار ادا کیا۔ قصیدہ عموماً قابل فخر کارناموں (مفاخر) یعنی شجاعت و حماست اور دیگر معاسن کی بنا پر اپنے قبیلے کی مدح یا معائب و مثالب کو سامنے رکھ کر اپنے مخالف قبائل کی ہجو پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ بات مسلم تھی کہ اعلیٰ درجے کی انسانی صفات کی موجودگی یا ان کا فقدان بہت حد تک اجداد کی میراث پر موقوف ہے۔ ایک بطل جلیل کے کارنامے اس کے خاندان، بطن اور قبیلے کے اعلیٰ درجے کی صفات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس طرح کسی قبیلے کی عام شہرت کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ شاعر کی قوت کو اس اعتبار سے بہت بڑا سمجھا جاتا تھا کہ وہ اپنے قبیلے کے اندر اس کی قدر و قیمت کا احساس و شعور بیدار کرتا اور اپنے دشمن کے اندر جذبہ خود اعتمادی اور اس کی اخلاقی حالت کو برباد کردیتا تھا۔ موجودہ زمانے کے مقابلے میں زمانہ قبل از اسلام میں غالباً شعرا کو بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل تھا۔ عربوں کا خیال تھا کہ ان کے اندر کوئی مافوق الفطرت یا ساحرانہ قوت مضمحل ہے۔

اگرچہ حسب و نسب کو بہت اہمیت حاصل تھی لیکن (جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں) یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ اس سلسلے میں کس حد تک پدری نسب اور کس حد تک مادری نسب کی قدر و قیمت سمجھی جاتی تھی۔ البخاری (۶۷، ۳۷، ۱ ترجمہ، در *Muhammad : Montgomery Watt at Medina*، ص ۳۷۸) نے عہد قبل از اسلام کی شادیوں کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے دو میں البخاری کے بیان کی رو سے نسب پدری ہی پر زور دیا جاتا تھا۔۔۔

مذہب: عہد قبل از اسلام کی شاعری سے پتا چلتا ہے کہ بدوی قبائل میں اپنے قبیلے کی اعلیٰ انسانی صفات پر ایمان رکھنے کی وجہ سے

بالغ مرد موت کے گھاٹ اتار دیے جاتے، عورتیں اور بچے پکڑ لیے جاتے اور فدیہ وصول ہونے تک پاس رکھے جاتے، ورنہ غلام بنا کر فروخت کر دیے جاتے تھے۔ آنکھ کے بدلے آنکھ کا قانون ہر جگہ رائج تھا اور اس سے خواہ مخواہ اور غیر ذمے دارانہ قتل کی وارداتیں روکنے میں مدد ملتی تھی۔ کیونکہ قبیلے کے افراد یا اس سے منسلک اشخاص کی حفاظت کرنا اور ان کا انتقام لینا قبیلے کی عزت و ناموس کا سوال تھا۔ قدیم زمانے میں جان کا بدلہ جان ہی ہو سکتا تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے اپنے عہد میں ایک اور رجحان کو ترقی دینے کی کوشش فرمائی اور وہ یہ تھا کہ جان کے بدلے قصاص (دیت یا خون بہا) وصول کر لیا جائے اور قصاص کی مقدار عام طور پر ایک بالغ مرد کے لیے سو اونٹ تھی۔ بہر حال بعض اوقات اس احساس کا اظہار کیا جاتا تھا کہ ”خون کے بدلے دودھ لینا“ مردانگی کے خلاف ہے۔

بدوی کی نظر میں وہ صفات قابل تحسین و تعریف ہوتی تھیں جن کے سہارے لقمہ و دق میدانوں کی سخت اور جفا کشی والی زندگی میں کامیابی حاصل کی جا سکے۔ اپنے قبیلے کے ساتھ وفاداری کو بہت بلند مرتبہ حاصل تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ اجنبی کے مقابلے میں اپنے قبیلے کے آدمی کی ہر موقع پر مدد کرنے کے لیے تیار رہا جائے۔ اس کے ساتھ ہی استقلال اور مردانگی (حماسہ) کی صفات بھی لازمی تھیں۔ حماسہ کا مطلب یہ تھا کہ میدان جنگ میں شجاعت دکھانا، مصیبت کے وقت صبر کرنا، انتقام کے لیے مستقل مزاج رہنا، کمزور کی حفاظت اور طاقتور کا مقابلہ کرنا (*A Literary History of the Arabs : R. A. Nicholson*) کیمرج ۱۹۳۰ء، ص ۷۹)۔

عہد قبل از اسلام کے عربوں کی زندگی میں



مآخذ: (متن میں مندرجہ تصنیفات کے علاوہ)

[ (۱) سید سلیمان ندوی: تاریخ ارض القرآن، ۳ جلد، اعظم گڑھ؛ (۲) ڈاکٹر جواد علی: تاریخ العرب قبل الاسلام، ۸ جلد، بغداد ۱۹۵۷ء؛ (۳) محمود شکر الوسی: بلوغ العرب، قاہرہ ۱۹۳۶ء؛ (۴) عارف العارف: القضاء بین البدو، قاہرہ؛ (۵) الاصمعی: تاریخ العرب قبل الاسلام، قاہرہ ۱۹۰۹ء؛ (۶) جرجی زیدان: العرب قبل الاسلام، قاہرہ ۱۹۰۸ء؛ (۷) الہمدانی: صفة جزيرة العرب؛ (۸) وہی مصنف: الأکلیل، بغداد ۱۹۳۱ء؛ (۹) عمر فروخ: تاریخ الجاهلیة، بیروت ۱۹۶۳ء؛ (۱۰) حافظہ ونبہ: جزيرة العرب فی القرن العشرين، ۱۹۳۵ء؛ (۱۱) الطبری: تاریخ؛ (۱۲) ابن الأثیر: الكامل فی التاریخ، بیروت ۱۹۶۶ء؛ (۱۳) H. Lammens: *L'Arabie Occidentale avant l'Hégire*، بیروت ۱۹۲۸ء، بالخصوص ص ۱۰۰ تا ۲۹۴؛ (۱۴) وہی مصنف: *Le Berceau de L' Islam*، روم ۱۹۱۳ء؛ (۱۵) F. Buhl: *Das Leben Muhammeds*، لائپزگ ۱۹۳۰ء، بالخصوص ۲۱ تا ۱۰۰؛ (۱۶) M. Guidi: *Storia e Cultura degli Arabi*، فلورنس ۱۹۵۱ء، بالخصوص ص ۱۲۲ تا ۱۳۳؛ (۱۷) W. Robertson: *Kinship and Marriage in Early Arabia*؛ (۱۸) B. Farès: *L' Honneur chez les Arabes avant l'Islam*، پیرس ۱۹۳۲ء؛ (۱۹) De Lacy O' Leary: *Arabia before Muhammad*؛ (۲۰) G. Levi della Vida: *Pre-Islamic Arabia*، در *The Arab Heritage*، طبع N.A. Faris، پرنسٹن ۱۹۳۳ء؛ (۲۱) I. Goldziher: *Muhammadanische Studien*، ۱: ۱ تا ۱۰۰؛ (۲۲) وہی مصنف: *Abhandlungen zur arabischen Philologie*، لائڈن ۱۸۹۶ء، ۱: ۱ تا ۱۲۱؛ (۲۳) J. Sauvaget: *Introduction a l'Histoire de l'Orient Musulman*، ص ۱۰۳ تا ۱۱۰ میں مزید حوالے ملیں گے؛ [نیز رک بہ عرب].

(W. MONTGOMERY WATT)

ایک نیم مذہبی تحریک پیدا ہوتی تھی۔ ان کے افعال کے لیے پابن عزت و شہرت (حسب) قوت محرکہ کا کام دیتا تھا۔ اس اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ بدوی کا حقیقی مذہب قبائلی انسانیت تھا۔ تقدیر پر ایمان عربوں کے ہاں عام تھا۔ لیکن اس عقیدے کی بنیاد مذہب سے کہیں زیادہ حالات و واقعات پر تھی، یعنی یہ کہ دنیا کی کچھ اس طرح تشکیل ہوئی ہے کہ تقدیر کی لائی ہوئی مصیبت کو کوئی انسانی تدبیر نہیں ٹال سکتی۔ مگر تقدیر کو دیوتا بنا کر پوجا نہیں جاتا تھا۔

اس کے علاوہ عرب میں متعدد مذاہب رائج تھے اور ان میں سے ہر ایک کا مرکز ایک مخصوص زیارت گاہ ہوتی تھی (رک بہ الملات، منات وغیرہ)۔ ان میں سے چند ایک کی معاشرتی اہمیت تھی کیونکہ ہر زیارت گاہ کے ارد گرد کا علاقہ مقدس (حرم) سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح مکے میں مقدس مہینے کا احترام فرض سمجھا جاتا تھا۔ ایسے مقدس اوقات و مقامات سے جہاں خونریز جھگڑے عارضی طور پر بند ہو جاتے تھے بدویوں کے لیے تجارت یا دوسرے اغراض کی خاطر مل بیٹھنے کے امکانات پیدا ہو جاتے تھے۔ بہر حال اگر غور سے دیکھا جائے تو بدوی کی زندگی میں اس قسم کی رسومات کو کوئی مذہبی اہمیت حاصل نہ تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے وقت کچھ بدوی قبائل کم از کم برائے نام مسیحی ہو چکے تھے۔ یہودیت بھی وہاں پائی جاتی تھی اور جن لوگوں کا ذکر کتابوں میں یہودی کے نام سے آیا ہے ان میں سے چند ایک غالباً عرب ہی تھے، جنہوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا، لیکن بدویوں سے قریبی تعلقات رکھنے کے باوجود ان میں سے کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا جسے بدوی کہا جاسکے۔

البدوی: رَكَ بِهِ أَحْمَدُ الْبَدَوِيُّ.

الْبَدَوِيَّةُ: رَكَ بِهِ بَدَوِي.

بَدِيْعٌ: (ع) [ب د ع مَادَّةٌ سِي، بَدَعٌ يَبْدَعُ  
بَدْعًا يَعْنِي ابْتِدَاءَ شَيْءٍ، نَثِي بَاتٍ پيدا كِي وَغَيْرِهِ، لِسَانِ  
مِي هِي، الْبَدِيْعُ وَ الْبَدْعُ الشَّيْءُ الَّذِي يَكُونُ اَوَّلًا =  
يعني وه شے جو سب سے پہلے ہوئی هو (اس سے  
پہلے كچھ نه هو)۔ بَدِيْعٌ كے معني الْمَحْدَثُ الْعَجِيبُ  
كے بهي هين۔ بَدِيْعٌ بمعني مُبْدِعٌ بهي آتا هے جيسا  
كه قرآن مجيد مي هے بَدِيْعُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ  
۲ [البقرة] ۱۱۷ يعني خَالِقَهَا وَمُبْدِعُهَا فَهُوَ سُبْحَانَهُ  
الخالق المَخْتَرَعُ لا عن مثالِ سابق.

بَدِيْعٌ بر وزن فَعِيلٍ بمعني فاعل مثل قَدِيرٌ  
بمعني قادر بهي هے۔ يه خدائے تعالیٰ كِي صفات مي  
سے ايک صفت هے (قَبَّ لِسَانًا، بِذِيلِ مَادَّةٍ وَ  
مفردات، بِذِيلِ مَادَّةٍ)۔ مفعولي معنوں مي بَدِيْعٌ نثي  
معلوم كِي هوئی يا نثي ايجاد كِي هوئی چيز كو بهي  
كہتے هين۔ اسي بنا پر عباسي عهد مي نثي نثي  
ادبي تشبيہوں، استعاروں، اور صنعتوں كو 'بَدِيْعٌ'  
كہنے لگے اور آگے چل كر يه اصطلاح اپنے وسيع تر  
مفهوم مي هر ادبي حسن كے ليے استعمال ہونے  
لگی؛ چنانچہ علم البَدِيْعِ علم البلاغۃ كِي اس شاخ  
يا شعبے كا نام قرار پايا جس كا تعلق ادبي اسلوب  
مي حسن پيدا كرنے سے هے۔ دوسري صدي هجري/  
آنھويں صدي عيسوي مي عهد عباسي كے بعض  
شعرا جيسے بَشَّارٌ، مُسْلِمُ بن الوليد اور العتَّابي نے  
بعض كلاسيكي اساليب كلام سے (خاص كر استعاره  
و تشبيہ كے استعمال مي) انحراف كر كے اپنے  
اساليب كو اس قدر وسعت دي كه اس كِي نظير قبل  
اسلام كِي شاعري مي كہيں نہيں ملتي۔ يہيں سے  
عهد عباسي كے بعض نقادوں كو خيال هوا كه يه  
نيا اسلوب ايک جدت اور اختراع هے، اس كے ليے  
انھوں نے لفظ 'بَدِيْعٌ' استعمال كيا؛ چنانچہ يه

لفظ اپنے عام مفہوم مي تيسري صدي هجري/  
نويں صدي عيسوي سے تنقيدي تحريروں مي استعمال  
ہونے لگا۔ الجاحظ كِي تحريروں مي يه كئي جگہ  
ملا هے۔ ايک مقام پر وه ايک شعر نقل كرتا هے،  
جس مي ايک نثي صنعت لائي گئي هے اور كہتا  
هے كه اسي كو راوي (ناقلان شعر) 'بَدِيْعٌ'  
كہتے هين (البيان و التبيين، قاهره ۱۹۳۸ء، ۱:  
۵۱ و ۵۵)۔ بَدِيْعٌ كو پہلي بار جس مصنف نے  
ايک ادبي فن كِي حيثيت دي اور اس كے انواع مقرر  
كر كے هر نوع كِي تعريف و تحديد كِي وه ابن المعتز  
عباسي (۵۲۳۷ / ۸۶۱ تا ۵۲۹۶ / ۸۰۸ء) تها۔  
اس نے اپني كتاب الْبَدِيْعِ مي يه ثابت كرنے كِي  
كوشش كِي هے كه جس چيز كا نام نثي نقادوں نے  
بَدِيْعٌ ركھا هے وه بَشَّارٌ اور اس كے هم عصروں كِي  
اختراع نہيں۔ اس نے اپنے دعوے كِي تائيد مي  
قرآن مجيد، حديث، اهل البدو كِي بول چال اور  
جاهليت كِي شاعري سے بكثر مثالين نقل كِي  
هين۔ بَشَّارٌ وغيره كا كارنامہ محض يه هے كه  
انھوں نے شعري صنعت گري كے اس فن كو جو  
پہلے سے موجود تها وسعت دي؛ چنانچہ صنائع كا  
استعمال وسيع پيمانے پر ہونے لگا اور لوگوں نے  
اسے ايجاد و اختراع خيال كر كے اس كا نام بَدِيْعٌ  
ركھ ديا۔ اس كے بعد ابو تمام (م ۵۲۳۱ / ۸۵۰ء)  
[كذا؟ صحيح ۸۴۵ء] آيا جو صنعت گري كا بہت شائق  
تھا۔ اس نے صنائع كے استعمال مي بہت افراط سے  
كام ليا، جس سے مختلف نتائج و اثرات مترتب ہوئے۔  
ابن المعتز نے 'بَدِيْعٌ' كو پانچ بڑي انواع  
مي تقسيم كيا هے: (۱) استعاره؛ (۲) تجنيس؛ (۳)  
طباق و تضاد؛ (۴) رَدَّ الْعَجْزِ عَلَي الصِّدْرِ؛ (۵) لف و  
نشر۔ وه پہلے ان سب كِي تشریح كرتا هے اور فني  
اعتبار سے اچھي اور بري دونوں طرح كِي مثالين  
دے كر ان كِي وضاحت كرتا هے۔ اس نے لکھا هے



ہے۔ اس کے برعکس الباقلائی (م ۳۰۳/۵۱۰۱۳) نے اپنی کتاب اعجاز القرآن کے طویل باب میں 'بدیع' کے بارے میں بتفصیل لکھا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ بدیع سے اعجاز قرآن کا صحیح اندازہ لگانے میں تو مدد ملتی ہے لیکن یہ بذات خود وجوہ اعجاز میں سے کوئی مستقل وجہ نہیں ہے۔ ابن رشیق اپنی کتاب العمدۃ میں "المخترع و البدیع" کے عنوان کے تحت ساٹھ سے زیادہ انواع کی توضیح کرتا ہے۔ ابن خلدون کہتا ہے کہ مغرب (یعنی ممالک اسلامیہ)، شمالی افریقہ اور اندلس میں ابن رشیق کی العمدۃ بہت مقبول ہوئی؛ چنانچہ وہاں علم بدیع کی بڑی قدر دانی اور ترویج ہوئی۔ السکاکی (۵۵۵/۱۱۶۰ تا ۵۶۲۶/۱۲۲۸) کی بدولت علم بلاغت کی تاریخ کا عموماً اور ایک جداگانہ شاخ کی حیثیت سے علم بدیع کی تاریخ کا خصوصاً ایک نیا دور شروع ہوا۔ السکاکی نے اپنی کتاب مفتاح العلوم میں ادب کے جملہ معاون علوم (علوم آلیہ) کی تقسیم کے لیے ایک منطقی نظام مرتب کیا اور علم بلاغت کے شعبے میں ان ٹھوس فلسفیانہ اصولوں سے کام لیا جنہیں قبل ازیں عبدالقاهر الجرجانی (م ۵۴۱/۱۰۷۸) نے مقرر کیا تھا۔ السکاکی کے زمانے سے آج تک عربی علم بلاغت پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا دار و مدار مفتاح العلوم کے متن، اس کے ملخصات اور ان سب کی طویل و مفصل شروح پر ہے۔ مفتاح کے خلاصہ نویسوں اور شرح نگاروں میں الخطیب القزوی (۵۶۶/۱۲۶۷ تا ۵۳۹/۱۳۳۸) اور التفتازانی (۵۲۲/۱۳۲۲ تا ۵۹۳/۱۳۹۰) خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ عبارت کو فصاحت اور بلاغت کے نئے نئے طریقوں سے آراستہ کرنا اور فن بدیع سے شغف رکھنا ادب عربی کے اس عہد کی خصوصیت ہے۔ اس عہد کے

کہ "بدیع" کی اصطلاح سے شعرا اور ناقدین تو روشناس ہیں لیکن ماہرین لغت اور شعر جاہلیہ کے علما کے ہاں اس کا استعمال نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد وہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس سے پہلے کسی نے بھی فن بدیع سے بحث نہیں کی اور نہ اس کی تصنیف (۵۲۴/۸۶۱) سے پہلے کسی نے اس فن پر قلم اٹھایا۔

فن بدیع کو پانچ انواع میں تقسیم کرنے کے باوجود اسے اس کا احساس ہے کہ یہ تعداد کم یا زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ اسی احساس کی بنا پر اس نے بارہ محاسن کا اضافہ کیا۔

قدامہ بن جعفر (۵۲۵/۸۸۸ تا ۵۳۳/۹۶۸) [کذا؟ ۹۳۸] ابن المعتز کا ہم عصر ہے اور تنقید شعر عربی میں پہلی کتاب نقد الشعر کا مصنف۔ اس کتاب میں اس نے فن شعر کے بیس محاسن سے بحث کی ہے، جن میں ابن المعتز کے بیان کردہ بعض صنائع بھی شامل ہیں لیکن وہ اصطلاحاً لفظ بدیع استعمال نہیں کرتا۔ اس کے ایک صدی بعد ایک اور نقاد ابو ہلال العسکری (م ۵۴۹/۱۰۰۳) نے بدیع کے فن کو ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اس کی انواع چھتیس تک پہنچا دیں، جن میں سے سترہ وہی ہیں جو ابن المعتز نے مقرر کی تھیں۔ العسکری نے کتاب الفصاحتین (= دو فنون، نثر و نظم) کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ یہ علم بلاغت عربیہ کے تمام شعبوں پر مشتمل شاید سب سے پہلی منظم اور مرتب کتاب ہے۔ العسکری نے 'بدیع' کی تصریح اور اس کے ابواب و انواع سے ایک طویل فصل میں بحث کی ہے۔ ایک ماہر بلاغت الرمانی المعتزلی (۵۲۹/۹۰۸ تا ۵۳۸۶/۹۹۶) کہتا ہے کہ بلاغۃ [رک بان] سات وجوہ اعجاز قرآنی میں سے ایک ہے۔ وہ بدیع کا نام لیے بغیر بعض صنائع کو اقسام بلاغت میں شامل کرتا

(۱۱) قدامہ بن جعفر : نقد الشعر، طبع S. A. Bone-  
 bakker، لائنڈن ۱۹۵۶ء؛ (۱۲) ابن خلدون : مقدمة،  
 کتاب ۶، فصل ۲۳۱، مشتمل بر علم البيان؛ (۱۳)  
 Die Rhetorik der Araber : A. F. Mehren  
 کوپن ہیگن، وی انا ۱۸۵۳ء؛ (۱۴) ابن رشيق القيرواني :  
 العمدة، قاہرہ، ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۳ء؛ (۱۵) امجد الطرابلسی :  
 La critique poétique des Arabes، دمشق ۱۹۵۶ء۔  
 (محمد خلف اللہ)

### البدیع الاسطرلابی : ابوالقاسم، ہبۃ اللہ بن

الحسین بن احمد (= یوسف)، نامور عرب فاضل،  
 طبیب، فلسفی، ہیئت دان اور شاعر، جس کی امتیازی  
 خصوصیت یہ تھی کہ وہ اصطرلاب اور دیگر آلات  
 فلکی سے پوری واقفیت رکھتا تھا اور انہیں تیار  
 بھی کرتا تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں،  
 البتہ اتنا پتا چلتا ہے کہ ۵۰۱ھ / ۱۱۱۶ء۔  
 ۱۱۱۷ء میں وہ اصفہان میں تھا اور عیسائی طبیب  
 امین الدولة ابن التلمیذ سے اس کے بڑے گہرے  
 روابط تھے۔ اس کے بعد وہ بغداد میں رہا اور کہا  
 جاتا ہے کہ وہاں اس نے خلیفہ المسترشد کے زمانے  
 میں اپنے فن کے مظاہرے سے خاصی دولت کمائی۔  
 ابوالفداء کا قول ہے کہ سلجوقی سلاطین کے عہد  
 میں ان کے بغداد کے محل میں اس کے زیر ہدایت  
 ۵۲۳ھ / ۱۱۳۰ء میں ستاروں کے بعض مشاہدات  
 کیے گئے تھے۔ گمان غالب ہے کہ اس کی مرتبہ [زیچ]  
 (= جداول محمودی)، جو سلطان ابوالقاسم محمود بن  
 محمد (۱۱۱۸ تا ۱۱۳۱ء) کے نام سے معنون کی  
 گئیں، انہیں مشاہدات فلکی کی مرہون منت  
 تھیں۔ اس نے ۵۳۳ھ / ۱۱۳۹ء - ۱۱۴۰ء میں  
 بغداد میں وفات پائی۔ روایت ہے (اور اس روایت  
 کا واحد راوی ابوالفرج ہے) کہ اسے دیکھا گیا  
 تھا اور اسی حالت میں اسے دفن کر دیا گیا۔  
 اس کی منظوم تصانیف کے بارے میں ابن القفطی

بعض شعرا ایک ہی قصیدے میں ہر طرح کے  
 صنائع و بدائع استعمال کرنے کو کمال فنی سمجھتے  
 تھے۔ یہ قصائد 'بدیعیہ' کہلاتے تھے اور ان کے لکھنے  
 والے صفی الدین الحلّی وغیرہ تھے۔ اسی زمانے میں  
 علوم بلاغت [مثلاً علم معانی، علم بیان اور علم بدیع]  
 کو نہایت صحت اور دقت کے ساتھ بیان کیا گیا۔ وہ علم  
 جو کسی امر کو مقتضائے حال کے موافق کرنا سکھاتا اور  
 ایسی غلطیاں کرنے سے بچاتا ہے جس سے دلالت مطابقی  
 کے موافق کلام کا مفہوم سمجھنے میں دوسرے شخص  
 کو دقت ہو علم معانی کہلاتا ہے۔ تشبیہ و استعارہ  
 سے بحث علم بیان (طریق ادا) کا موضوع ہے [کیونکہ  
 بیان اس علم کا نام ہے جو ایک ہی بات کو مختلف  
 پیرایوں میں بیان کرنے کے طریقوں سے بحث کرتا  
 ہے]۔ علم بدیع میں کلام کی آرائش و زیبائش کے  
 مختلف طریقوں کی بحث ہے [اس کے دو حصے ہیں:  
 (۱) صنائع و بدائع لفظی؛ (۲) صنائع و بدائع معنوی]۔  
 مأخذ : (۱) ابو ہلال العسكري : کتاب الصنائع،  
 ۵۱۳۲ء؛ (۲) ابو بکر الباقلائی : اعجاز القرآن، قاہرہ  
 ۵۱۳۴ھ (ابواب متعلقہ شعر سے بحث اور ان کا [انگریزی]  
 ترجمہ، از G. E. von Grunebaum : A Tenth  
 Century Document of Arab literary Theory and  
 Criticism، شکاگو ۱۹۵۰ء)؛ (۳) الجاحظ : البيان و  
 التبيين، قاہرہ ۱۹۴۸ء؛ (۴) عبدالقاهر الجرجانی :  
 اسرار البلاغة، طبع رٹر H. Ritter، استانبول ۱۹۵۴ء، قاہرہ  
 ۵۱۳۲ھ / ۱۹۵۴ء؛ (۵) احمد مصطفی المراغی :  
 تاریخ علوم البلاغة، قاہرہ بلا تاریخ؛ (۶) الخطیب  
 القزوينی : تلخیص المفتاح و کتاب الايضاح (مع التفتازانی :  
 مختصر المعانی) قاہرہ ۵۱۳۴ھ / ۱۹۲۳ء؛ (۷) ابو يعقوب  
 السکاکی : مفتاح العلوم، قاہرہ بدون تاریخ؛ (۸) التفتازانی :  
 الشرح الكبير، استانبول بدون تاریخ؛ (۹) وہی مصنف :  
 الشرح الصغير، مطبوعہ قاہرہ و کلکتہ؛ (۱۰) عبداللہ ابن المعتز :  
 کتاب البدیع، طبع I. Kratchkovsky، لنڈن ۱۹۳۵ء؛



(۸) *Abhandlungen zur Gesch. der* : H. Suter  
 : Sarton (۹) : ۱۱۷ : ۱۰ : *Mathem. Wissensch.*  
 : ۲۰۳ : ۲ : *Introduction to the History of Science*  
 Al-Asturlābi and as- : F. Rosenthal (۱۰)  
 : *Samaw'al on Scientific progress*, در *Osiris*, ۱۹۵۰ء،  
 ص ۵۵۵ تا ۵۶۳ : [(۱۱) الزرکلی : الاعلام، ۹ : ۵۸].

(H. SUTER)

بدیع الدین : الملقب بہ قُطْبُ الْمَدَارِ، جو  
 عوام میں شاہ مدار کے نام سے معروف ہیں۔  
 ہندوستان میں اولیا کے حالات و کرامات پر  
 مشتمل تذکروں میں انہیں متوشالح (Methuselah)  
 [ابن اخنوخ، جد نوح علیہ السلام] کی حیثیت دی  
 گئی ہے [غالباً طویل العمری کے باعث]، ان کا  
 شمار ہندوستان کے مشہور ترین اولیاء اللہ میں ہوتا  
 ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ حلب میں ۵۲۵/  
 ۶۸۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اور نبی کریم صلی  
 اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی  
 [رک بان] کی اولاد میں سے تھے۔ مرآة مدار  
 کی اس روایت کی دیگر ماخذ سے تائید نہیں ہوتی  
 کہ وہ اصلاً یہودی تھے اور انہوں نے مدینہ منورہ  
 میں اسلام قبول کیا تھا۔ ان کے نسب کی طرح  
 ان کی تاریخ پیدائش میں بھی اختلاف ہے،  
 چنانچہ تذکرۃ المتقین میں یہ تاریخ یکم شوال  
 ۵۴۲/۱۶ فروری ۱۰۵۱ء دی گئی ہے اور مرآة  
 مدار میں ۵۱۵/۱۳۱۵ء اور یہی [دوسری]  
 تاریخ قرین قیاس ہے۔ کتاب الأعراس اور مہر  
 جہاں تاب کے بیانات کے مطابق ان کے والد، جن کا  
 نام سید علی تھا، حضرت امام محمد باقر [رک بان]  
 کی نسل سے تھے۔

ان کے متعدد مرشدوں میں شام کے ایک  
 صوفی طیفور الدین بھی تھے۔ بدیع الدین نے اچھی  
 تعلیم پائی تھی۔ لیکن وہ نیرنجات، اور الکیمیا

کی رائے ہے کہ وہ حسین اور بہترین ہیں،  
 لیکن ابن خلیکان کہتا ہے کہ وہ عربانی اور  
 فحش گوئی کی حد تک جا پہنچی ہیں۔ ابن خلیکان  
 اور ابن ابی اصیبعہ نے اس کے بہترین کلام کے  
 نمونے پیش کیے ہیں۔ اپنے کلام پر مشتمل ایک  
 دیوان کے علاوہ البدیع الاسطرلابی نے ابن الحجاج  
 کے منتخب اشعار کا ایک مجموعہ بھی درة التاج  
 من شعر ابن الحجاج کے عنوان سے ایک جلد میں  
 مرتب کیا تھا، جس کے ایک سواکتالیس ابواب  
 ہیں (برا کلمان : تکلمہ، ۱ : ۱۳۰)۔ عرب سیرت نگار  
 البدیع الاسطرلابی کی بے حد مدح و ثنا کرتے  
 ہیں، لیکن محض اسی بنا پر اسے البیرونی وغیرہ کے  
 مقابلے میں بہت اونچا مقام نہیں دیا جا سکتا۔ ساتویں  
 صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے عام مؤرخوں  
 اور سیرت نگاروں کے بارے میں یہ دیکھا گیا ہے کہ  
 وہ اپنے قریب تر زمانے کے علما کے کام کی تعریف  
 میں مبالغے کے مرتکب ہو جاتے تھے، جس سے ان  
 علما کی قدر و منزلت کو نقصان پہنچتا تھا جو  
 عرب علوم کے آسمان پر ان سے پہلے مہر نیم روز  
 بن کر چمکے۔ البدیع الاسطرلابی کی تحسین و  
 آفرین جس فصاحت و بلاغت سے کی گئی ہے وہ  
 البتائی، ابوالوفاء اور البیرونی کے سلسلے میں کہیں  
 نظر نہیں آتی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ  
 لوگ فضیلت و علم میں البدیع الاسطرلابی سے  
 کہیں زیادہ ممتاز ہیں۔

مآخذ: (۱) ابن القتی، ص ۳۳۹ : (۲) ابن خلیکان،  
 قاہرہ ۱۵۱۳۱۰، ۲ : ۱۸۶ (مترجمہ دیسلان de Slane)،  
 ۳ : ۵۸۰ : (۳) ابن ابی اصیبعہ، ۱ : ۲۸۰ : (۴)  
 ابوالفرج (طبع صلغانی)، ص ۳۶۶ : (۵) ابوالفداء :  
 Annales (طبع Adler و Reiske)، ۳ : ۳۴۱ تا ۳۸۳ :  
 (۶) ہاتوت : ارشاد، ۷ : ۲۴۱ تا ۲۴۲ : (۷)  
 Literatargesch. d. Araber : Hammer، ۶ : ۳۳۱ :

اپنے شعبے دکھاتے نظر آتے ہیں، بلکہ عرف عام میں مدار کی کوچوں میں تماشاً دکھانے والے ہی کا ہو گیا ہے۔

- مآخذ: (۱) عبدالحق محدث دہلوی: آخبار الآخيار، دہلی ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۳ء، ص ۱۶۳؛ (۲) محمد غوثی: گلزارِ آبرار، شماره ۶۰؛ (۳) داراشکوہ: سَفِينَةُ الْأَوْلِيَاءِ، ص ۱۸۷ تا ۱۸۸؛ (۴) غلام سرور لاہوری: خزينة الأصفياء، لکھنؤ ۱۹۱۳ء، ص ۲: ۳۱۰ تا ۳۱۲؛ (۵) ابوالفضل: آئین اکبری (ترجمہ انگریزی، از جیرٹ Jarrett)، ص ۳۷۰؛ (۶) امیر حسن مداری قنصوری: تذكرة المتقين، کان پور، جلد ۱، ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء و جلد ۲، ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۵ء؛ (۷) دبستان مذہب (انگریزی ترجمہ)، نیویارک ۱۹۳۷ء، ص ۳۰۷؛ (۸) ظہیر احمد ظہیری: سیرالمدار (اردو)، ج ۱، لکھنؤ ۱۹۰۰ء و ج ۲، بداول ۱۹۲۰ء؛ (۹) عبدالرحمن عباسی: مِرآة مَدَارِي (فارسی مخطوطہ)، اردو ترجمہ از عبدالرشید ظہور الاسلام: ثَوَابُ الْأَنْوَارِ بِمَطَالِحِ الْقُطْبِ الْمَدَارِ، فرخ آباد، ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء؛ (۱۰) محمد نجیب ناگوری: کتاب آعراس، آگرہ ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء؛ (۱۱) عبدالحی ندوی: نَزْهَةُ الْخَوَاطِرِ، حیدرآباد (دکن) ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۱ء، ص ۳: ۳۶ تا ۴۲؛ (۱۲) گارساں دتاسی Mémoire sur....la religion: Garcin de Tassy، Musulmane dans l'Inde، پیرس ۱۸۶۹ء، ص ۵۲ تا ۵۹؛ (۱۳) غوث محمد خاں: سیرالمحتشم، جاوہر ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء، ص ۲۸۸ تا ۲۹۲؛ (۱۴) شعیب فردوسی: مَنَاقِبُ الْأَصْفِيَاءِ، کلکتہ ۱۸۹۵ء؛ (۱۵) آفتاب مرزا: تَحْقِيقُ الْأَبْرَارِ، دہلی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء، ص ۶: ۲۸؛ (۱۶) ضیاء الدین: مِرآة الْأَنْسَابِ، جے پور ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۶ء، ص ۱۵۷؛ (۱۷) Cawnpore District Gazetteer، الہ آباد ۱۹۰۹ء، ص ۳۰۹ تا ۳۱۰؛ (۱۸) H. A. Rose: A Glossary of the Tribes and Castes of the Panjab and North-West Frontier Province، ج ۱ (لاہور ۱۹۱۱ء)، بامداد اشاریہ و ج ۳ (لاہور ۱۹۲۶ء)۔

وغیرہ میں خاص طور سے ماہر تھے۔ شاہ مدار بڑے جہاں گرد تھے۔ وہ کئی بار حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ ایک حج انہوں نے اشرف جہاں گیر السمنانی [رکابہ اشرف جہانگیر] کی بیعت میں کیا۔ عازم ہند ہونے سے قبل انہوں نے اپنی سیاحت کے دوران میں مدینہ منورہ، بغداد، نجف اور کاظمین کی زیارت کی۔ جب وہ سمندر کے راستے ہندوستان جا رہے تھے ان کا جہاز تباہ ہو گیا۔ ہندوستان میں انہوں نے جابجا سفر کیے اور بالآخر مکن پور میں سکونت اختیار کر لی، جو کانپور سے چالیس میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ ۱ جمادی الاولیٰ ۸۳۳ھ/۷ اکتوبر ۱۴۳۰ء کو انہوں نے یہیں وفات پائی۔

اس کے باوجود کہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی [رکاباں] اور شاہ مدار کے مابین تلخ و تند مناظرہ ہوتا رہا جون پور کا سلطان ابراہیم شاہ، جو قاضی مذکور کا سر پرست اور مرہبی تھا، شاہ مدار کی بہت تعظیم و تکریم کرتا تھا۔

شاہ مدار بہت خوبصورت شخص تھے اور اس اندیشے سے کہ لوگ ان کے حسن سے مسحور ہو کر کہیں انہیں سجدہ نہ کر بیٹھیں ہمیشہ اپنے چہرے پر نقاب ڈالے رکھتے تھے۔ ان کا شاندار مزار، جو ابراہیم شرقی نے تعمیر کرایا تھا، آج تک مرجع عوام ہے اور وہاں عرس کے موقع پر عقیدت مند کثیر تعداد میں ہندوستان کے ہر حصے سے پیادہ چل کر آتے ہیں اور لمبے لمبے بانسوں پر رنگا رنگ کے کپڑے اور پھیرے باندھ کر ساتھ لاتے ہیں، جنہیں "شاہ مدار کی چھڑیاں" کہتے ہیں۔

شاہ مدار اور ان کے پیرووں سے عجیب و غریب کرامات منسوب کی جاتی ہیں۔ ان کے پیرو مداری کہلاتے ہیں اور عموماً بھارت اور پاکستان کے دیہات و قصبہ کے گلی کوچوں میں



آئے ہیں اور اس کے بعد لوٹ جائیں گے۔ بہتر ہے کہ قریش ایک معینہ مدت کے لیے صلح کا عہد و پیمانہ کر لیں، لیکن اگر وہ اس پر رضا مند نہیں تو میں یہاں تک لڑوں گا کہ میری گردن الگ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ ہی کی مشیت پوری ہو۔“ بدیل نے یہ پیغام قریش کو پہنچا دیا۔ پھر چند سفارتوں کے تبادلے کے بعد صلح حدیبیہ کا معاہدہ طے پا گیا۔ اس معاہدے کی رو سے قریش اور ان کے حلیف قبیلہ بنو خزاعہ پر، جو مسلمانوں کے حلیف ہو گئے تھے، کوئی زیادتی نہیں کر سکتے تھے لیکن اس کی خلاف ورزی ہوئی۔ بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کیا اور قریش نے بنو بکر کو علانیہ مدد دی، حتیٰ کہ حدود حرم میں بھی خزاعہ کا خون بہانے سے احتراز نہ کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اطلاع پہنچی تو آپ نے قریش کے پاس قاصد بھیجا کہ یا تو مقتولوں کا خون بھا ادا کیا جائے یا قریش بنو بکر کی حمایت سے دست بردار ہو جائیں یا اعلان کر دیں کہ معاہدہ حدیبیہ کالعدم ہو چکا ہے۔ قریش نے تیسری شرط منظور کر لی، لیکن قاصد کے رخصت ہوتے ہی اپنے اس فیصلے پر پچھتانے لگے اور تجدید معاہدہ کے لیے ابو سفیان کو مدینہ منورہ روانہ کر دیا۔ راستے میں اس کی ملاقات بدیل سے ہوئی اور انہیں یقین ہو گیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پاس شکایت لے کر گئے تھے وہ بعجلت مدینہ پہنچا اور حضرت ابوبکر رض، عمر رض، علی رض، فاطمہ رض کو بیچ میں ڈال کر تصفیہ کرنا چاہا مگر ان بزرگوں نے کسی قسم کی سفارش کرنے سے انکار کر دیا اور ابو سفیان کو خاکام لوٹنا پڑا۔

فتح مکہ (۵۸ھ) کے بعد بدیل مشرف باسلام ہوئے۔ رجال کی بعض کتابوں میں مذکور ہے کہ وہ فتح مکہ سے بہت پہلے اسلام لے آئے تھے لیکن

بدیل مادۃ مداری؛ (۱۹) محمد صادق کشمیری ہمدانی: کلمات صادقین (مخطوطہ بانکی پور)، عدد ۲۱؛ (۲۰) عبدالباسط قنوجی: دارالاسرار فی خوارق شاہ بدیع الزمان مدار (مخطوطہ، پشاور عدد [۹]، ۱۹۵۷ء)۔

(بزمی انصاری)

• بدیع الزمان: رک بہ الہمدانی [بدیع الزمان]۔

• بدیل: رک بہ ابدال۔

⊗ بدیل رض بن ورقاء [الخزاعی]: رسول اللہ

صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے اصحاب کے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جو فتح مکہ سے پہلے یا بعد مشرف باسلام ہوا لیکن شرف ہجرت سے محروم رہا، یا عہد رسالت میں صغیر السن تھا۔ اس طبقے کے حالات حدیث بلکہ طبقات کی کتابوں میں بھی بہت کم ملتے ہیں۔

بدیل بن ورقاء بن عمرو بن ربیعہ بن عبدالعزیٰ ابن ربیعہ بن جزئی بن عامر بن مازن، بنو خزاعہ کے رئیس تھے۔ یہ قبیلہ مکہ معظمہ کے قریب رہتا تھا؛ اگرچہ اس نے اسلام قبول نہیں کیا تھا تاہم وہ ان مخالفانہ منصوبوں سے مسلمانوں کو مطلع کرتا رہتا تھا جو کفار بالخصوص قریش تیار کرتے تھے۔ ۵۶ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عمرے کے قصد سے عازم مکہ ہوئے تو قریش نے احایش [رک بان] کے اجتماع میں اعلان کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مکے میں داخل نہیں ہو سکتے اور آپ کو روکنے کے لیے ایک لشکر تیار کر لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بھی اس کی اطلاع مل گئی اور آپ نے مکہ معظمہ سے ایک منزل کے فاصلے پر حدیبیہ میں قیام فرمایا۔ یہاں بدیل بن ورقاء اپنے چند رفقا کے ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے، کفار کے ارادوں اور تیاریوں کی تفصیل عرض کی۔ آپ نے فرمایا: ”قریش سے جا کر کہہ دو کہ ہم کسی سے لڑنے نہیں آئے، محض عمرہ کرنے

کی رفاقت میں جنگ صفین میں لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔ دوسرا بیٹا نافع رضی بن بدیل بھی صحابی تھا، جو بثر معونہ [رکب بآن] میں شہید ہوا، تیسرا بیٹا حضرت عثمان رضی کے محاصرین میں سے تھا (جمہرۃ)۔ بدیل رضی سے تین حدیثیں مروی ہیں (جوامع السیرۃ، ص ۲۹۱)۔

مآخذ: (۱) الطبری، ۱: ۱۳۳۵، ۱۶۲۱ تا ۱۶۲۸؛ (۲) ابن سعد: طبقات، ۱/۲: ۷۰؛ (۳) الأغانی، ۶: ۹۷؛ (۴) البلاذری: فتوح، ص ۳۵ بعد؛ (۵) ابن ہشام: سیرۃ، ۲: ۲۲۷ تا ۲۲۹؛ (۶) ابن حجر: الاصابۃ، ۱: ۱۴۶؛ (۷) ابن الاثیر: اسد الغابۃ، ۱: ۱۷۰، ۱۸۱؛ (۸) شبلی نعمانی: سیرۃ النبی، ۱: ۴۴۷، ۵۰۹ بعد؛ (۹) شاہ معین الدین احمد ندوی: سیرۃ الصحابۃ، ۷: ۱۴، بذیل مادۃ حضرت بدیل بن ورقاء؛ [(۱۰) ابن حزم: جوامع السیرۃ، ص ۲۲۳، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۹۱؛ (۱۱) وہی مصنف: جمہرۃ انساب العرب، ص ۲۳۹؛ (۱۲) امین دویدار: صور من حیاة الرسول، مصر ۱۹۵۸ء، ص ۴۵۵ تا ۴۵۶؛ (۱۳) البلاذری: انساب الاشراف، ۱: ۲۱۵، ۳۶۵؛ (۱۴) الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ۳: ۳۲]۔  
(سید امجد الطاف [و ادارہ])

بدین: رکب بہ پاکستان۔

بدین: بودین [بدون، بدون، بدیم] شہر بودا کا وہ نام ہے جو ترکان عثمانی نے اپنے قبضے (۱۵۴۱ سے ۱۶۸۶ء) کے دوران میں اسے دیا تھا، لیکن اس کی تاریخ اس سے کہیں زیادہ پرانی ہے۔ یہ جگہ، جہاں زمانہ ما بعد کی بستیاں آباد ہوئیں، قلتی (Celtic) قبائل کے زیر تصرف تھی۔ انہوں نے اس مقام کو 'آک - انک' Ak-Ink کے نام سے موسوم کیا، جس کا مطلب ہے 'فراوان پانی' اور حقیقتاً اس کے سارے گرد و نواح میں جا بجا معدنیاتی چشمے موجود ہیں اور عظیم الشان دریا

یہ روایت مستند نہیں؛ غالباً راوی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں بدیل کی آمد و رفت سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ دراصل بدیل مسلمان ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ایک حلیف کی حیثیت سے آئے جاتے تھے۔ قبول اسلام کے وقت بدیل بہت بوڑھے ہو چکے تھے لیکن بال سیاہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر پوچھی تو عرض کیا ستانوے برس۔ فرمایا: خدا تمہارے جمال اور بالوں کی سیاہی میں اور ترقی دے۔ [بدیل رضی بڑے مدبر اور سیاستدان تھے (جمہرۃ، ص ۲۳۹)۔ ابتدا سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیف تھے۔ فتح مکہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ جو شخص ابو سفیان، حکیم بن حزام اور بدیل بن ورقاء کے گھروں میں داخل ہو جائے گا اسے امن مل جائے گا، یہ تینوں حضرات اسلام لائے اور انہوں نے آپ کی بیعت کی۔ آپ نے ان تینوں کو اہل مکہ کی طرف مبلغ اسلام بنا کر بھیجا (سیر اعلام النبلاء، ۳: ۳۲)۔

فتح مکہ کے بعد حضرت بدیل رضی نے چند غزوات میں بھی شرکت کی، چنانچہ غزوہ حنین (۵۸ھ) میں بنو ہوازن کی شکست کے بعد مال غنیمت اور مشرک قیدیوں کی نگرانی انہیں کے سپرد کی گئی تھی۔ حجۃ الوداع (۱۰ھ) میں بھی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب تھے اور حضور کے ارشاد کے مطابق منی میں اعلان کرتے پھرتے تھے کہ آج روزہ نہ رکھا جائے۔

حضرت بدیل رضی نے وصال نبوی (۱۱ھ) سے قبل (۱۰ یا ۱۱ھ میں) وفات پائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایک مکتوب تحریر فرمایا تھا جسے وہ بہت عزیز رکھتے اور باعث خیر و برکت سمجھتے تھے۔

[حضرت بدیل رضی کا ایک بیٹا عبد اللہ رضی حضرت علی رضی



ہوتے گئے اور اپنی بستیوں کو جرمانی (Germanic) نسل کی اقوام، مثلاً قوطی (Goths)، ونڈال (Vandals)، سوابستانی (Suavians)، آلانی (Alanians) اور لمبارڈ قوم (Longobords) کے وحشی گروہوں کے حوالے کر گئے۔ انہیں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہن [سپہ سالار] اٹیلا [یورپ میں] داخل ہوا تھا۔ اپنے قوطی قسم کے نام کے باوجود اس نے اپنے علم کے نیچے مختلف اقوام پر مشتمل ہنوں کا ایک بھاری فاتح لشکر مجتمع کر لیا تھا۔ اٹیلا کا مرکزی مقام غالباً موجودہ ہنگری کا وسیع میدان تھا، جہاں بوزنطی سفیر پرسکوس ریٹر Priscos Rhaetor اس کے پاس حاضر ہوا تھا، لیکن اٹیلا کے غارتگرانہ دھاوے اطالیہ کے اکوئیلیا Aquilia اور فرانس تک جا پہنچے تھے، تا آنکہ قتلونہ (Catalaunum) کے علاقے میں شالون (Chalons sur Marne) کی خونریز جنگ نے اس کی مزید پیش قدمی کا سدّ باب کر دیا۔ ہنوں نے اکوئن کم کے موزوں محل وقوع سے بھی فائدہ اٹھایا۔ اسی طرح آگے چل کر اوار (Avars) نے بھی، جو ترکی بولنے والی اور ترکوں کی سی عادات رکھنے والی قوم تھی اور سابقہ رومی صوبہ پانونیا کے بیشتر حصے پر قابض ہو گئی تھی، اپنی بستیوں کے گرد فصیلیں بنائیں، جن میں سے چند ایک کے آثار ابھی تک ملتے ہیں۔ بہر حال یہ جنگجو لوگ بطور مجموعی خانہ بدوش اور تاخت و تاراج پر بسر اوقات کرنے والے تھے، جن کی تاختیں روکنے کے لیے بوزنطیوں نے شمالی سلافی (Slavonic) قوم کے لوگوں کو ریاست ہای بلقان میں آباد کیا تھا۔ سلافی بلقان میں سے ہوتے ہوئے دریائے ڈینیوب کے مرکزی حصوں تک جا پہنچے۔ اسی دریا کی نشیبی دھاریں ایسٹر (Ister) کہلاتی ہیں۔ یہ دونوں ہی نام

ڈینیوب ان پر مستزاد، جو یہاں کے آبادکاروں کو ماہی گیری اور زراعت کی صورت میں ذرائع معاش مہیا کرتے تھے۔

۱۶ء کے قریب اہل روما نے پانونیا Pannonia، یعنی مغربی ہنگری، پر اپنا قبضہ مکمل کر لیا، آک۔ انک کی قدیم قلتی بستیوں تک جنگی ضرورت کی سڑکیں بنوائیں اور دریائے ڈینیوب کے کنارے فوجی استحکامات تعمیر کیے۔ دریائے ڈینیوب اور دریائے Tissa کے درمیان کی سیلابی زمین میں، جہاں نیم وحشی لوگ بستے تھے، یہ رومی بستی ان کے حملوں کے خلاف ایک قلعے کا کام دیتی تھی اور تھوڑی ہی مدت میں ترقی کر کے ایک شاندار شہر کی صورت اختیار کر گئی، کیونکہ چشموں کو کام میں لا کر اور زرخیز نواحی علاقے کی تجارتی سہولتوں سے اس نے فائدہ اٹھایا۔ رومیوں نے بستی کے اصل نام آک۔ انک کو رہنے دیا اور اسے لاطینی لفظ اکوئن کم Acquincum بنا لیا، جس کے عوامی زبان میں معنی ہیں: پانچ چشمے (Acquae Quinque)۔ اس بستی کے جو کھنڈر ابھی باقی ہیں ان میں مکانات، حمام (جن میں بعض بہت پر تکلف ہیں) اور تماشا گاہ کے آثار ملتے ہیں، جہاں چالیس ہزار تماشا گاہی بیٹھ سکتے تھے۔ اسی طرح یہاں دو رومی لشکروں کا مقیم ہونا شہر کی تجارتی اور سیاسی اہمیت کا ثبوت ہے۔ چونکہ یہ ایک سرحدی شہر تھا اس لیے ناظم شہر کو اس اندیشے سے کہ بداندیش عناصر نہ گھس آئیں بہت محتاط رہنا پڑتا تھا؛ چنانچہ غیر ملکی تاجروں کو حکم تھا کہ رات کے وقت شہر سے نکل کر دریا کے پار اتر جائیں اور بائیں کنارے پر رات بسر کریں۔

چوتھی صدی عیسوی کے بعد سلطنت روما کے عام زوال کا اثر دور افتادہ اضلاع پر بھی پڑے بغیر نہ رہ سکا۔ آک۔ انک کے باشندے بتدریج

ریاست تھی۔ اس کے لیے اپنی خود مختاری سلامت رکھنا ضروری تھا، لہذا اس نے اپنی قوم میں بہت سی اقوام، یعنی سلاوی (Slavs)، المانوی (Germans) اور کمانی (Cumanians) مدغم کر لیں۔ تیرھویں صدی کے وسط میں مغول کی یلغار نے ہنگری کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور پست کو تاراج اور ڈینیوب کو عبور کر کے بودا کو تباہ و برباد کر دیا۔ شاہ بیلا Bela چہارم نے اپنی پناہ گاہ سے واپس آ کر بودا کی پہاڑی پر ایک قلعہ تعمیر کیا، کیونکہ جنگی تدابیر کے تجربے سے اسے معلوم ہو چکا تھا کہ مغول مورچہ بند شہروں کا محاصرہ نہیں کر سکتے۔ نو تعمیر بودا کا بیشتر عمارتی نسلا اکوٹن گم کی قدیم رومی بستی سے لیا گیا ہے۔ بودا ایک قلعہ بند پہاڑی ہونے کی وجہ سے پست کے باشندوں کے لیے جائے پناہ بن گیا اور شہر کے ان دونوں حصوں کے درمیان رابطے کا کام جزیرہ مارگریٹ نے دیا۔ یہ نام شاہ بیلا چہارم کی بیٹی کے نام پر اس جزیرے کا ہو گیا تھا، کیونکہ اس نے وہاں ننوں کی ایک خانقاہ تعمیر کی تھی۔ دریائے ڈینیوب کے کناروں پر آباد بودا اور پست نے رفتہ رفتہ اقتصادی اعتبار سے بڑی اہمیت حاصل کر لی اور تجارتی سرگرمی نے یہاں کے باشندوں کو خوشحال بنا دیا۔ شاہان ہنگری اس شہر کے نواحی میدان میں اپنے امرا کے ساتھ مشاورتی جلسے کیا کرتے تھے۔ پہلے یہ جلسے میدانوں میں گھوڑوں کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے ہوتے تھے، لیکن آگے چل کر یہاں شاہی خاندان کے افراد کی اقامت کے لیے محل بھی تعمیر ہوئے۔ شاہ سگسمنڈ Sigismund (۱۳۸۷ تا ۱۴۳۷ء) شہنشاہ روم منتخب ہو گیا تھا اور اپنی اس حیثیت سے اس نے ہنگری کی بادشاہی اور قوم کے سیاسی وقار میں بڑا اضافہ کیا۔ یہ لوگ اب آہستہ آہستہ اپنی

کارپیتھی (Carpathian) پہاڑیوں [جبالِ کارپات] کے درمیان گھرے ہوئے وسیع میدان میں سلاویوں کی بستیاں ہر طرف بکھری پڑی تھیں، کیونکہ یہاں انہیں چراگاہیں میسر تھیں اور وہ اپنی اقامت گاہیں بھی بنا سکتے تھے۔ بہت سے دیہات کے نام، جو آگے چل کر اہم شہروں کی صورت اختیار کر گئے، سلاوی زبان کے ہیں، جیسے دریائے ڈینیوب کے دائیں کنارے پر بودا اور بائیں پر پست (Pest) اول الذکر کا مطلب ہے پانی اور مؤخر الذکر کا اینٹوں کی بھٹی یا پزاوہ۔

۱۸۹۶ء کے قریب ایک اور ترک نما قوم، جو ساسانی ایرانی طرز کے ہتھیاروں اور دیگر فوجی ساز و سامان سے مسلح تھی، کارپیتھی پہاڑیوں کے درمیان مشرقی میدانوں میں نمودار ہوئی۔ یہ لوگ مجار (Magyarz) تھے، یعنی ہنگروی (ترک قبائل موسوم بہ ”ہن۔ اگروی“ (Hon-Ugrian) سے ہنگروی (Hungarians) بنا ہے)۔ یہ متعدد قبائل پر مشتمل تھے اور اپنے پیش رو ہنوں اور اواروں (Avars) کی طرح انہوں نے غارت گری سے اپنی بسر اوقات جاری رکھی، حتیٰ کہ جرمانی شہنشاہ نے انہیں شکست دی، جبراً عیسائی بنایا اور میدانی علاقے میں پر امن طریق سے بسنے پر مجبور کیا۔ شاہ سٹیفن Stephen (م ۱۰۳۸ء) نے مجار قبائل کو ایک قوم کی صورت میں منظم کیا اور فرینک (Frankonion) شہنشاہ چارلس اعظم کا بنایا ہوا آئین، جسے اس زمانے میں مثالی تصور کیا جاتا تھا، اختیار کیا۔

بودا اور پست گمنامی کے پزدے سے رفتہ رفتہ نکلے ہیں اور اکثر اوقات ان کی حیثیت نئی مملکت کے دارالحکومت کی سی رہی ہے۔ مجار مملکت عیسائیوں کے رومن کیتھولک اور کلیسائے یونان مشرقی کے درمیان ایک فاصل (buffer)



(Adrianople) میں اپنے قدم جما کر بالآخر قسطنطنیہ فتح کر لیا تھا (۱۴۵۳ء) اور اپنی مملکت میں بلغاریا اور سربیا کو شامل کر لیا تھا۔ شاہانِ ہنگری اور سلاطین عثمانیہ کے درمیان کئی لڑائیاں لڑی گئیں تاآنکہ سلیمان اعظم شاہ لوئی (Louis) دوم کو موہاک (Mohacs) کے میدان میں شکست دے کر (۱۵۲۶ء) شہر بودا میں داخل ہوا اور ہنگری کے مرکزی حصے پر قابض ہو گیا۔ شہر میں بڑی زبردست آگ لگی اور عثمانی وزیر اعظم ابراہیم پاشا کی ہزار کوشش کے باوجود شہر کا بڑا حصہ اس کی نذر ہو گیا۔ قصر شاہی اور مسیحی کلیساؤں سے بہت سا مالِ غنیمت اور بیش بہا خزانہ عثمانی فاتحین کے ہاتھ آیا۔ سلطان محمد ثانی الفاتح نے قسطنطنیہ کا محاصرہ بہت بڑی بڑی توپوں کے ساتھ کیا تھا۔ ان کا دہانہ ۴۵ سٹی میٹر تک تھا اور یہ ایک ہنگری کاریگر اوربن Orban نامی کے ہنر کا نمونہ تھیں۔ بعد ازاں یہی توپیں محاصرہ بلغراد (۱۴۵۶ء) میں استعمال ہوئی تھیں، جہاں جان ہنیادی John Hunyadi نے سلطان کو محاصرہ اٹھا لینے اور دو بڑی توپیں چھوڑ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان توپوں کو بدین (شہر مذکور کا سرکاری طور پر ترکی نام) میں لا کر بطور یادگار فتح نصب کر دیا گیا تھا۔ اب سلطان سلیمان کے حکم سے یہ توپیں، نیز شاہ متھاس کے بنا کردہ کتب خانے کی اطالوی کتابیں، یونانی دیوی دیوتاؤں۔ ڈیانا Diana، اپالو Apollo۔ اور ہرقل (Hercules) کے برنجی مجسمے، دو بلند و بالا لاکھ کے بنے ہوئے جھاڑ اور دوسرے نوادرفن قسطنطنیہ لے جائے گئے، جو اس زمانے سے اپنے اصل نام استانبول ("eisten polin") سے معروف ہوا۔ لاکھ کے بنے ہوئے جھاڑ مسجد آیا صوفیا کی محراب کے قریب لگا دیے گئے اور

خانہ بدوشانہ عادات ترک کر چکے تھے اور ان کی بہت بڑی تعداد قلعہ بند شہروں میں بس گئی تھی۔ اس مستقل سکونت گزینی کو غیر ملکی عناصر، یعنی بویریا Bavaria اور اوسٹمارک Ostmark سے آنے والے المانیوں اور اطالیہ سے آنے والے اطالویوں کی آمد سے بڑی مدد ملی، کیونکہ ان نوواردوں نے (جو صنعتی پیشوں سے تعلق رکھتے تھے) شہر بسائے۔ ہنگری کے شاہ سجمنڈ نے حکومت کو استحکام بخشا۔ زرعی پیداوار اور بلادِ مغرب و ریاستہائے بلقان کے ساتھ تجارتی لین دین سے اسے بھاری آمدنی ہوتی تھی، چنانچہ اس نے بودا کی پہاڑی پر ایک پرشکوہ شاہی محل تعمیر کرایا، جو اس زمانے کے مروجہ قوطی طرزِ تعمیر میں تھا۔ آگے چل کر شاہ متھاس Mathias (۱۴۵۸ تا ۱۴۹۰ء) کے عہد میں اس محل میں اضافے ہوئے اور اسے دور احیا کے معیاری طرزِ تعمیر کے موافق کر دیا گیا۔ علما اور ادبا اس شہر میں آئے اور اس عظیم الشان محل کے نواح میں آباد ہو گئے۔ اس محل نے یہ پہاڑی پوری طرح اپنے احاطے میں لے لی، جو "بودا کی محل والی پہاڑی" کہلانے لگی۔ نو ایجاد چھاپے خانے کی مطبوعہ کتابوں کی ایک بہت بڑی لائبریری یہاں قائم ہوئی، جس نے اس شہر کو عالمگیر شہرت دے دی۔

شاہ متھاس Mathias کی وفات کے بعد جب زمام حکومت ہول نسل کے بادشاہوں کے ہاتھ میں آئی تو بودا کی سیاسی اور ثقافتی شان و شوکت آہستہ آہستہ مٹنے لگی۔ ہنگری میں ایک عام سیاسی انحطاط کا دور شروع ہو گیا۔ امرا مرکزی حکومت سے برسرِ پیکار ہونے لگے۔ قوم منقسم ہو گئی اور ترکانِ عثمانی کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ رہی۔ ترکوں نے ادرنہ

چھ ہفتے تک جاری رہا، جس کے دوران میں ترکوں نے کئی ہنگروی قلعے، جو ابھی تک ہسبرگ Hapsburg خاندان کے بادشاہ فرڈیننڈ کی اطاعت کا دم بھرتے تھے، اپنے قبضے میں کر لیے۔ ۱۵۴۱ء تک کئی برس لڑائیوں اور محاصروں میں گزرے۔ کبھی کوئی جیتا، کبھی کوئی، تا آنکہ سلیمان اعظم نے بدین پر حتمی طور پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سلطان اپنے دو بیٹوں اور رستم پاشا کی معیت میں شہر میں داخل ہوا اور اعلان کیا کہ بدین اور اس کا سارا نواحی علاقہ سلطنت عثمانیہ کا حصہ ہے۔ بینی چری اعتقاداً فرقہ بکتاشی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے مذہبی پیشوا گل بابا شہر پر قبضے کے ایک ہفتے بعد وفات پا گئے اور ان کا جسد فانی فاتح سلطان کی موجودگی میں پہاڑی کی چوٹی پر دفن کیا گیا۔ یہ پہاڑی اب تک (گل تپہ) 'گلاب کی پہاڑی' کے نام سے مشہور ہے۔

اس وقت سے بدین ایک ترکی۔ اسلامی شہر بن گیا۔ آل عثمان نے احکام شریعت کے مطابق غیر مسلم باشندوں کے ساتھ انتہائی عمدہ سلوک روا رکھا اور انہیں مذہبی اور شہری آزادی کی ضمانت دی۔ یہاں کا پہلا گورنر سلیمان پاشا خود ایک ہنگروی نو مسلم تھا۔ ہنگری کی عدالت عالیہ کا صدر مشہور و معروف وربوکیزی Werböczy ہی رہا، جس نے اہم قانونی فیصلے کیے۔ وہ ہنگری کے مجموعہ قوانین کا مصنف تھا۔

کثیر ترکی سپاہیوں کی تعیناتی کے باوجود بدین میں امن و امان برقرار نہ رہ سکا۔ فتح کے ایک ہی سال بعد پوپ پال Paul سوم نے اسے فتح کرنے کے لیے ایک مذہبی جنگ کا آغاز کر دیا اور اس کی فسیلوں کے سامنے ایک بہت بڑا لشکر نمودار ہوا، لیکن یہ محاصرہ قطعی طور پر ناکام رہا۔

مذکورہ بالا مجسمے ابراہیم پاشا کے محل کے بالمقابل چوک الميدان (اصلاً hyppodrome = گھڑ دوڑ کا میدان) میں نصب کیے گئے۔

بدین کی عیسائی آبادی کو جزوی طور پر وہاں سے لا کر استانبول کے محلہ یدی گلہ میں بسایا گیا اور یہودی سالونیکا میں آباد کیے گئے۔ سلطان سلیمان بدین میں بینی چریوں کے چند دستے متعین کر کے وطن لوٹ گیا۔ ہنگری دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مغربی حصے شہنشاہ چارلس پنجم کے بھائی فرڈیننڈ (Arch-Duke Ferdinand) کے مطیع تھے اور وسطی اور مشرقی اقطاع جان زیفولیا John Szapolya کے، جس نے سلطان سے درخواست کی کہ اسے اپنی حفاظت میں لے کر اس کی حکومت کو تسلیم کر لیا جائے۔ فرڈیننڈ Ferdinand نے بدین کی طرف ایک فوج روانہ کی (اگست ۱۵۲۷ء)، جس نے شہر کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ سلطان سلیمان نے بدین سے محرومی کو اپنے نو مفتوحہ مقبوضات کے لیے خطرناک سمجھتے ہوئے ۱۵۲۹ء میں ایک مہم کا آغاز کیا۔ وہ بدین تک جا پہنچا اور مختصر سی لڑائی کے بعد شہر میں فاتحانہ داخل ہو کر اس کے قلعے پر قابض ہو گیا۔ سلیمان نے زیفولیا کو ہنگری کا جائز بادشاہ تسلیم کیا، بدین پر قبضہ کرنے کے لیے کچھ دستے اس کی تحویل میں دیے اور خود وی انا کی طرف کوچ کیا۔ شہر گوسزگ Koszeg کے محافظ کپتان Yurisich کی بدولت یہ مہم ناکام رہی اور فرڈیننڈ نے، جو اپنے آپ کو ہنگری کا جائز بادشاہ تصور کرتا تھا، روجن ڈورف Rogendorf کی قیادت میں ایک امدادی فوج بدین کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے روانہ کی۔ اہل ہنگری اور ترکوں نے، جن کی مدد ایک اطالوی انجینئر گرتی Gritti کر رہا تھا، بڑی دلیری سے شہر کا دفاع کیا۔ محاصرہ



پھر ایک آسٹروی فوج دریائے ڈینیوب کے بائیں کنارے پر ہست میں داخل ہوئی اور بدین کا محاصرہ کر لیا، تا آنکہ آل عثمان کے ایک باجگذار حلیف ملک ٹرانسلوانیا Transylvania سے پیمشچی حسن پاشا نے آ کر بالآخر حریف کو بدین کے نواح سے نکال باہر کیا۔ ان تمام جنگوں کے دوران میں ترکوں نے بڑی بڑی توپوں سے چہرے دار گولے چلائے جو آل عثمان کی ایک انوکھی ایجاد تھی۔ مسلسل لڑائیوں نے عثمانی ترکوں کو ٹرانسلوانیا کی خود مختار ریاست کا حلیف بن جانے پر مجبور کر دیا، جس کے فرمانروا استوان بوکسکے István Bocskay کی شاہ ہنگری کی حیثیت سے ترکوں نے اس شرط پر تاجپوشی کی کہ جب بھی آسٹروی بدین کو دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کریں گے تو وہ اس کے دفاع میں ترکوں کی مدد کرے گا۔ بوکسکے کی وفات کے بعد عثمانیوں نے امیر تھوگولی Imre Thokoly کو ہنگری کا بادشاہ تسلیم کیا، جس نے پروٹسٹنٹوں پر جبر و تشدد اور محروم الارض ہنگروی کسانوں پر حد سے بڑھے ہوئے محاصل کا مداوا کرنے کے لیے شاہان ہسبرگ کے خلاف خود انہیں کی حدود مملکت میں بغاوت کا آغاز کیا تھا۔ اس کی ان مساعی میں اعانت کرنے کے لیے باب عالی سے قرہ مصطفیٰ پاشا کو بھیجا گیا۔ یہ لشکر جرار پیش قدمی کرتا ہوا وی انا کی شہر پناہ تک جا پہنچا اور شہر کا بڑا خطرناک محاصرہ کر لیا۔ ۱۶۸۳ء میں شہر پر ترکوں کا قبضہ ہونے ہی والا تھا کہ شاہ پولینڈ جان سویاسکی Jan Sobieski کی غیر متوقع آمد سے پانسہ پلٹ گیا اور نہ صرف یہ کہ محاصرہ ختم ہو گیا بلکہ ترکوں کو تباہ کن شکست برداشت کرنا پڑی۔ یہ شکست وادی ڈینیوب میں ترکوں کی حکومت کے انجام کا آغاز ثابت ہوئی۔

ہنگری کے زرخیز علاقوں کو جو خطرہ مستقلاً لاحق رہتا تھا اس کے پیش نظر سلطان سلیمان نے مجبور ہو کر کئی قلعے اپنے تصرف میں لے لیے، جن سے مرکز کی طرف راستے جاتے تھے۔ قلعہ جات ایسٹریگوم Estergom، فہیروار Fehérvár، وسیگراڈ Visegárd، ہتوان Hatvan، نوگراڈ Nograd، سزگد Szeged، سزولنووک Szolnok، فولک Füllek اور دیگر مقامات کی فتح سے بدین کے ارد گرد ایک دفاعی فصیل تیار ہو گئی، حتیٰ کہ محاصرہ سزگتوار (۱۵۶۶ء) نے ہنگری کی اس عظیم فاتحانہ مہم کو پوری طرح مکمل کر دیا۔ سلطان سلیمان نے قلعہ سزگتوار کے آخری سقوط سے چند ہی روز قبل اس کے سامنے داعی اجل کو لیک کہا تھا۔

بدین ایک وسیع صوبے کا صدر مقام بن گیا اور اس کی سیاسی اہمیت برقرار رہی، حالانکہ شاہان ہسبرگ Hapsburg اور ان کی حکومت کو جائز سمجھنے والے ہنگرویوں کے ہاتھوں مختلف قلعے بار بار ہاتھ سے نکلتے اور دوبارہ فتح کیے جاتے اور دور کے اضلاع میں مسلسل جنگیں اور انقلابات برپا ہوتے رہے۔ بدین کے قلعے میں مدافعت کے جملہ انتظامات کیے گئے۔ باوجودیکہ وسطی میدان اور اس سے ہرے دور دور تک ہنگری کے بیشتر علاقے میں حکومت عثمانیہ تسلیم کر لی گئی تھی، بدین کو ایک سرحدی شہر کا سا کام کرنا پڑا۔ ۱۵۹۸ء میں اسے ایک بہت سخت محاصرے کا سامنا کرنا پڑا جب آرج ڈیوک متھیاس کی قیادت میں ایک آسٹروی فوج بڑھتے بڑھتے خود بدین کے بالمقابل گورز الیاس تپہ (Gellert-hill) تک آ پہنچی۔ وہاں سے اس نے فصیل پر گولہ باری شروع کر دی اور پھٹنے والے بموں سے ملحقہ مکانوں میں آگ لگ گئی۔ ۱۶۰۲ء میں ایک بار

مدافین تھے۔ محاصرہ کرنے والی فوج میں اس بار بھی یورپ کی ہر ایک قوم کے لوگ شامل تھے۔ اس کے ساتھ پوپ نے اپنا ایک خصوصی نمائندہ مارکو د ایویانو Marco d'Aviano بھی بھیجا تھا تاکہ اس محاصرے کو صلیبی جنگ کا رنگ دیا جا سکے۔ مدافین کے سپہ سالار عبدالرحمن پاشا کا حرم جزیرہ مارگرٹ میں تھا۔ اسے بلغراد لے جانے کے لیے جہازوں پر سوار کیا گیا، لیکن بد قسمتی سے ہنگروی کپتان Batthanyi نے بیڑے پر قبضہ کر کے حرم کو گرفتار کر لیا اور ترک عورتوں کو سپاہیوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ محاصرہ یکساں شدت سے جاری رہا۔ صدر اعظم سلیمان پاشا بڑھتے بڑھتے قلعے کے نواح تک آ پہنچا، لیکن قلعے کے اندر صرف پانچ سو ترک سپاہی بھیج سکا اور قلعے کو محاصرہ سے نکالنے کے سلسلے میں کوئی قابل ذکر کوشش کیے بغیر پیچھے ہٹ گیا۔ عبدالرحمن پاشا نے اپنے سے کئی گنا زیادہ غنیم کی مزاحمت کرتے ہوئے ایک شہید کی موت پائی۔ اس کی شہادت کے ساتھ نہ صرف بدین بلکہ سارے مشرقی یورپ میں مسلمان ترکوں کی حکومت کے تدریجی زوال کا بھی آغاز ہو گیا۔

ترکوں کے قبضے کے دوران میں بدین میں مسلمانوں کی کئی اور بستیاں نظر آ سکتی تھیں۔ اس کا مرکزی حصہ ”محل کی پہاڑی“ پر واقع تھا، جہاں سے مغربی جانب پہاڑیوں کا بہت عمدہ منظر دکھائی دیتا تھا۔ یہ پہاڑیاں ایک میدان میں واقع تھیں، جو دریائے ڈینیوب کے بائیں کنارے پر پھیلتا چلا گیا تھا۔ مسیحی آبادی کا بیشتر حصہ شہر چھوڑ چکا تھا۔ نئے آباد ہونے والے زیادہ تر ترک سپاہی اور اہلکار تھے، جن میں سے اکثر بوسنیا کے اور باقی سلافی الاصل نو مسلم تھے۔ رفتہ رفتہ تاجر اور دستکار بھی بدین میں آباد ہونے

آل عثمان کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے پورا یورپ اٹھ کھڑا ہوا۔ آل عثمان اپنی مقابلہ بہتر عسکری تنظیم اور مستقل فوج کے باعث مشرقی یورپ کے وسطی حصے میں اپنی حکومت قائم رکھ سکتے تھے۔ ان کے برعکس مغربی ممالک اپنے بادشاہوں کی باہمی رقابتوں کی بنا پر بٹے ہوئے تھے اور اصلاح مذہب (Reformation) کی جنگ کے باعث ایک یکساں منظم فوج تیار کرنے پر سترہویں صدی کے آخر تک قادر نہ ہو سکے۔ وی انا کے ناکام محاصرے اور نتیجہ ترکوں کی ہزیمت کے بعد آسٹریویوں، المانویوں اور فرانسیسیوں پر مشتمل مغربی ممالک کی ایک متحدہ فوج چارلس آف لورین Charles of Lorrain کی سپہ سالاری میں بدین کی طرف بڑھی، جس نے ۱۶۸۳ء میں تمام دور دراز کے دیہات اور قلعہ بند شہروں کو فتح کر لیا۔ محافظ قلعہ قرہ محمد پاشا نے دریائے [ڈینیوب] کے بائیں کنارے پر واقع پست سے ہاتھ اٹھا لیا اور اس کے دفاعی استحکامات برباد کر دیے تاکہ دشمن ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ بہر حال دول مغرب کی فوج پست میں داخل ہو گئی، گو قلعہ بدین سے اس پر شدید گولہ باری ہوتی رہی۔ اس دو سالہ مہم کے دوران میں کوئی فیصلہ کن نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ باب عالی نے قلعے میں کئی امدادی افواج بھیجیں اور اس کے نواح میں کئی شہروں اور قلعوں کو تباہی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۸۶۵ء میں افواج مغرب کو عارضی طور پر پسپا ہونا پڑا، جو مدافین کے لیے بے حد مسرت کا باعث ہوا۔ اب سلطان نے معمر اور تجربہ کار البانوی عبدالرحمن پاشا کو ترکی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا۔ ۱۶۸۶ء میں نوے ہزار سپاہیوں کے کثیر لشکر نے بدین کا از سر نو محاصرہ شروع کیا، جبکہ قلعے کے اندر صرف سولہ ہزار ترک



ہر روز بلکہ جمعے کو بھی خرید سکتی تھی۔ بعض ماخذ کی رو سے (بدین میں) مساجد کی تعداد چالیس تھی۔ کئی نفیس محل ("کونک" [کذا؟ [کوشک]) پہاڑی قلعے کی زینت بڑھاتے تھے۔ صوقلی مصطفیٰ پاشا، والی بدین (۱۵۶۶ تا ۱۵۷۸ء) نے خاص طور پر شہر کو، جو آتش زنی کی وقتاً فوقتاً زبردست وارداتوں اور ایک زلزلے (۱۵۷۸ء) سے تباہ و برباد ہوتا رہا تھا، از سر نو بنانے اور مزین کرنے میں خدمات عظیم سرانجام دیں۔ اولیا چلبی [رک باں]، جو سترھویں صدی کے نصف آخر میں اپنی طویل سیر و سیاحت کے دوران میں بدین پہنچا تھا، لکھتا ہے کہ شہر اور جزیروں کے ارد گرد پھلوں کے بے شمار باغات لگائے گئے ہیں اور نواحی علاقے میں بلادِ مشرق کے کئی پھلوں کی کاشت کی جاتی ہے۔ ان میں بعض کے آثار آج بھی گورز الیاس تپہ کی جنوبی ڈھلان پر ملتے ہیں۔

بدین میں روحانیت اور مذہبی سرگرمیوں کا بھی زور تھا، حالانکہ یہ اسلامی ثقافت کے مراکز سے بہت دور واقع تھا، مگر یہاں کی اکثر عمارتیں قدیم نمونوں کا محض چربہ تھیں۔ بایں ہمہ مساجد میں مخطوطات کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔ بدین کی فتح کے فوراً بعد کاؤنٹ مارسگلی Count Marsigli نے ان پر قبضہ کر کے بہت سی کتابیں بولونا Bologna کے کتب خانے میں بھیج دیں۔ ترک حکام اور مقامی ہنگرویوں کے درمیان اچھے روابط قائم تھے اور بدین میں مقیم بہت سے ترک پاشاؤں نے اس حد تک ہنگروی زبان سیکھ لی تھی کہ وہ اس میں خط و کتابت کر سکتے تھے۔ دوسری طرف بہت سے ہنگرویوں نے ترکی زبان کی تحصیل کر لی تھی۔ علاوہ ازیں ازدواج باہمی کے ذریعے بھی دونوں قومیں آپس میں خلط ملط ہو گئی تھیں۔ ترکی قہرہ خانوں میں مغنی ایسی رزمیہ نظمی

لکھے۔ یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات نے ان ترک نو آبادکاروں کی ثقافتی زندگی پر کئی طرح سے اثر ڈالا۔ یہ لوگ رہنے کے لیے ہمیشہ ایسے مقامات کو ترجیح دیتے تھے جہاں معدنیاتی چشموں کی کثرت ہو۔ بدین کے معدنیاتی چشموں کو بڑے وسیع پیمانے پر استعمال کیا گیا اور ڈینیوب کے کنارے ایسے پر تکلف حمام تعمیر کیے گئے جنہیں عرفِ عام میں ترکی حمام کہا جاتا ہے اور جہاں بھاپ سے غسل دیتے ہیں۔ یہ آج بھی اسلامی طہارت کی عظمت کے شاہد ہیں۔ بطور ایک اہم سرحدی شہر کے بدین نیز ڈینیوب کے بالمقابل کنارے پر پست کے گرد فصیلیں تھیں اور ان شہروں میں مورچہ بند دروازوں کے ذریعے داخلہ ہوتا تھا۔ خود قلعے میں اور اس کے باہر کم بلند نواحی پہاڑیوں پر درویشوں کے متعدد تکیے (تکے) بنے ہوئے تھے، جہاں لوگ پناہ لیتے تھے اور "بابا" (یعنی درویش) جمعے کے روز آنے والے زائرین کو تسکین اور تسلی دیتے تھے۔ بکتاشی لوگ اپنے مرحوم پیر گل بابا کے مزار (تربت) کی بہت عزت و حرمت کرتے تھے۔ چند قدم آگے گلرٹ کی پہاڑی (Gellert-hill) پر، جسے ترکی میں گورز الیاس تپہ کہا جاتا ہے، مفتاح بابا کا احاطہ ایک اور بکتاشی درویش گورز الیاس کی شہادت کی یادگار ہے۔ جامع مسجد کے نواح میں غازی احمد بے کی قبر ایک زیارت گاہ ہے۔ اس سے آگے مختار بابا کا مقبرہ ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی ایک بزرگوں کے مزار ہیں، جنہوں نے محاصرے کی لڑائیوں میں جام شہادت نوش کیا تھا۔

ایک اہم معاشی مرکز کی حیثیت سے بدین میں مشرقی فن پر مبنی صنعت اور تجارت نے ترقی پائی۔ ہفت روزہ ہاٹ کی جگہ ترکی شہروں کے "چرشی" نے لے لی تھی اور وہاں کی آبادی اپنی اشیائے ضرورت

ہو گئی؛ فوجی دستے ان کے علاوہ تھے، جن کے افراد کی تعداد وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھی۔ بدین کے سقوط کے بعد ترک آبادی مہاجرت کر کے جنوب کی جانب منتقل ہو گئی اور نئے آباد ہونے والے ہچکچاتے اور ڈرتے ہوئے شہر کی برباد شدہ فصیل اور مکانات تک آ پہنچے۔ ۱۷۱۰ء میں ایک خوفناک وبا کی وجہ سے یہاں کی آبادی گھٹ کر صرف ایک ہزار تک رہ گئی۔ اٹھارہویں صدی کے نصف ثانی میں شاہانِ ہسبرگ کی نظروں میں ہنگری کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور میریا تھریسا Maria Tharisa کے عہد میں شاہی محلات اور امرا کے مکانات تعمیر ہوئے۔

شہنشاہ جوزف دوم نے ہنگری کے بادشاہ کی حیثیت سے اپنی تاجپوشی کرانے سے انکار کیا اور خاندانِ ہسبرگ کی تمام مقبوضہ مملکتوں کو جرمن رنگ میں رنگنے کی حکمت عملی شروع کر دی۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ بویریا Bavaria اور ورٹمبرگ Wurtemberg کے جرمن آباد کاروں کو ہنگری کے متعدد حصوں میں، جو ترکوں نے خالی کر دیے تھے، بسانے لگا۔ اس طرح بدین اور پست المانوی شہر بن کر رہ گئے، جو موسمِ گرما میں کشتیوں کے ایک پل کے ذریعے باہم مربوط تھے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں ایک ثقافتی اور سیاسی انقلاب رونما ہوا، جو زیادہ تر انقلابِ فرانس اور مابعد کی جنگ ہائے نپولین کے زیر اثر تھا۔ ہنگروی قومیت بیدار ہوئی اور کچھ جد و جہد کے بعد ہنگری کی پارلیمنٹ نے ۱۸۲۵ء میں مروجہ لاطینی کے بجائے ہنگروی زبان کو تمام کاروبار کا ذریعہ اظہار قرار دیا۔ ہنگروی طبقہ امرا نے اپنی اقامت کے لیے بدین کا انتخاب کیا اور ترکی مکانات کی جگہ نئے طرز کے چھوٹے چھوٹے محل تعمیر ہو گئے۔ طبقہ امرا کی بدولت [بدین] ہنگروی زبان کا

گاتے تھے جن میں جنگوں اور فتوحات کا تذکرہ ہوتا تھا۔ اس کے برعکس مقامی شعرا اپنی تک بندیاں کرتے تھے۔ بہر حال ترکی اور ہنگروی عوامی شاعری اور عوامی گیتوں کے موضوعات میں جو ادل بدل ہوا اس نے ہنگروی عوامی ادب پر آن مٹ اثرات چھوڑے ہیں اور وہاں کی میدانی آبادی کے مشرقی خط و خال آج بھی ازدواجِ باہمی کے غماز ہیں۔ ہنگروی زبان بھی ترکوں کے طویل دورِ حکومت کی شہادتیں پیش کرتی ہے۔ علاوہ ازیں ہنگری کے شہرہ آفاق باورچی خانے کی شہرت بھی انہیں کھانوں کی مرہونِ منت ہے جن سے ترکوں نے یورپ کو آشنا کیا۔ بدین کے مصنفوں میں سے پچوی، جس نے مقامی دفترِ خانہ (یعنی محصول خانے) میں ملازم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک تاریخ تالیف کی تھی، منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ترکی حکومت کے دور میں جن سیاحوں نے بدین کی سیر کی ہے وہ یہاں کے گلی کوچوں میں زندگی کی گہما گہمی کا ایک دوسرے سے بڑھ کر تذکرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ شادی بیاہ کی ہنگروی کارچوبی پوشاکوں میں خاص مشرقی لباس، پگڑیاں، گھیردار شلواریں اور چرمی زیر پائیاں تنوع کی کیفیت پیش کرتی ہیں۔ مسلم خواتین نقاب پہنے، سڑک کی پٹری پر حیا کے ساتھ دیواروں سے لگی لگی چلا کرتی تھیں۔ دوسری طرف ہنگری کی عیسائی عورتیں اونچی ٹوپیاں پہنتی تھیں، جن میں ریشمی پھندنے لگے ہوتے تھے۔ چمڑے اور سوتی کپڑے کی صنعتوں نے بدین میں خاص فروغ پایا اور یہاں کے مشہور دباغ خانوں کی یاد ہنگروی لفظ "tabacos" (= رنگے چمڑے کا کاریگر) کی صورت میں باقی ہے۔ ہنگروی کفش ساز "czimadia" اپنے نام کے لیے ترکی۔ فارسی۔ عربی لفظ چزمہ کا مرہونِ منت ہے۔ بدین کے باشندوں کی تعداد بڑھ کر ساٹھ ہزار کے قریب



L. Fekete؛ (۲) اور (ترکی)، بذیل مادہ بودین، از جاوید یسون، جس میں تمام ترکی اور دیگر ماخذ دیے گئے ہیں۔ (عبدالکریم جولیس جرمانوس)

بڈ شاہ: کشمیر کے "شاہ بیڑی سلاطین" ⓧ (۱۳۳۹ - ۱۵۵۶ء) کا آٹھواں بادشاہ، سلطان زین العابدین، جس نے ۱۵۲۳ء/۱۳۲۱ء سے ۱۵۷۷ء/۱۳۷۲ء تک (فرشتہ) کشمیر پر حکومت کی۔ اسے غیر معمولی کارناموں اور قابلیت کی بنا پر کشمیری میں بڈ شاہ یعنی بڑا بادشاہ اور ہندی میں بٹہ شاہ یعنی ہندوؤں کا بادشاہ بھی کہتے ہیں۔

سلطان سکندر کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا سلطان علی شاہ تخت نشین ہوا (۱۵۱۹ء/۱۳۱۷ء)، جس نے اپنے منجھلے بھائی شاہی خان، شاہ رخ مرزا المعروف بڈ شاہ کو وزیر اعظم بنایا۔ بقول ابوالفضل (آئین اکبری) علی شاہ ۱۳۱۹ء میں عنان حکومت شاہی خان کو سونپ کر عازم حج ہوا اور جموں کے راجا سے، جو اس کا خسر بھی تھا، ملنے گیا۔ جس نے ترک حکومت پر علی شاہ کو سمجھایا اور کشمیر پر دوبارہ قبضہ کرنے کی ترغیب دی۔ چنانچہ علی شاہ اپنے خسر اور راجوری کے راجہ کی معیت میں آگے بڑھا۔ اوڑی کے مقام پر شاہی خان کو شکست دی۔ جو کشمیر چھوڑ کر جسرت گکھڑ کے پاس سیالکوٹ بھاگ گیا۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق علی شاہ ایک بڑی فوج کے ساتھ آگے بڑھا، لیکن جلد ہی جسرت گکھڑ اور شاہی خان کی مشترکہ کوششوں نے علی شاہ کو شکست دی (جون ۱۳۲۰ء)۔ تخت نشینی کے وقت زین العابدین کی عمر انیس برس تھی۔ اس نے ہاون سال حکومت کر کے تقریباً ستر سال کی عمر میں ۱۳۷۰ء میں وفات پائی۔ اس کی قبر، جسے مقبرہ بڈ شاہ کہتے ہیں، مزار سلاطین سرینگر

مرکز بن گیا۔ اس کے برعکس پست عرصے تک المانوی ہی رہا۔

۱۸۳۹ء کی جنگ آزادی کے دوران میں فاتح ہنگروی فوج نے قلعہ بودا کا محاصرہ کر کے اس پر دھاوا بول دیا (۲۱ مئی)، لیکن ہنگروی فوج کی آخری شکست کے بعد ہنگری کی حیثیت کم ہو کر آسٹریا کے ایک صوبے کی سی رہ گئی۔ گورزالیاس تپہ پر ایک بہت بڑا قلعہ ہر قسم کی تحریک آزادی کو خوفزدہ کرنے کے لیے بنایا گیا اور بودا کے عسکری دفاتر میں نظم و نسق کا نظام مرکز کے تحت رہا تا آنکہ مفاہمت کی رو سے ہنگرویوں کو آسٹریا کی ایک حلیف ریاست کی حیثیت سے آزادی عطا کر دی گئی۔ بودا شہنشاہ جوزف Joseph اول کا صدر مقام قرار پایا، جس کی بحیثیت شاہ ہنگری تاج پوشی ہوئی۔ جو محل ابتداً میریا تھریسا نے بنوایا تھا اسے وسعت دے کر صحیح معنوں میں شاہی اقامت گاہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ بودا اور پست کو آپس میں ملانے کے لیے کئی نئے پل تعمیر ہوئے اور اس شہر نے اقتصادی خوشحالی کے ساتھ ساتھ معاشرتی طور پر بھی بہت ترقی پائی۔

دوسری عالمی جنگ کے دوران میں بودا پر نازیوں کا قبضہ ہو گیا اور کئی ماہ تک اس کا محاصرہ جاری رہا، جس سے اس کے محل، مکانات اور صنعتی نوادر کو بے انتہا نقصان پہنچا۔ آزادی کے بعد ۱۹۴۵ء سے یہاں نئی عمارتیں تعمیر ہو گئی ہیں اور تاریخی یادگاروں کی تجدید و حفاظت کا کام ان تھک سرگرمی سے ہو رہا ہے۔ آج کل کے بودا اور اس کے ہمسائے پست کو ایک بار پھر "ڈینیوب کی ملکہ" کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے [نیز دیکھیے بوڈا پست]۔

لکھتے ہیں کہ دریائے سندھ کے اس پار تک کا علاقہ بڈ شاہ کے زیرِ اثر تھا۔

نظام حکومت: انتظامی لحاظ سے تمام ملک مختلف صوبوں میں منقسم تھا، جن پر ناظم مقرر کیے جاتے تھے۔ کوہستانی دروں پر پولیس چوکیاں بنوائیں، جو موجودہ محکمہ کسٹمز کے فرائض بھی ادا کرتی تھیں۔ بڈ شاہ نے مقامی ذمے داری کا طریق جاری کیا، جس سے چوری اور ڈاکہ زنی بند ہو گئی۔ بڈ شاہ کشمیر کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے ایک ضابطہ قانون بنایا اور اس کے چیدہ چیدہ قوانین پیتل کی بڑی بڑی پتھیوں پر کندہ کروا کر شہروں اور دیہات میں نصب کرائے۔ زونہ راج لکھتا ہے کہ گوبادشاہ نرم دل تھا لیکن قانون کے معاملے میں وہ اپنے بیٹے یا بھائی سے بھی رعایت نہ برتتا تھا۔ قیدیوں کو داغنے کا طریق بند کر دیا گیا اور ان سے کوزہ گری کا کام لیا جانے لگا۔ جریب اور گز کی لمبائی میں اضافہ کیا۔ زمین کی پیمائش از سر نو کرا کے مالیہ مقرر کیا۔ ضروریات زندگی کی قیمتیں سرکاری طور پر مقرر کی جاتی تھیں اور ہر ماہ ان کی پڑتال کی جاتی تھی۔ ذرائع آمد میں تانبے کی کان، لداخ کے دریاؤں میں سونا ملی ریت اور نہروں سے آمدنی کا ذکر ملتا ہے۔

ہندوؤں کے ساتھ برتاؤ: بڈ شاہ لااکراہ فی الدین کا قائل تھا۔ اپنے باپ اور بھائی کے عہد کے تمام قوانین جو غیر مسلموں خاص طور پر ہندوؤں کے خلاف تھے یکسر موقوف کر دیے۔ شروع شروع میں ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا مگر بعد میں موقوف کر دیا گیا۔ ملک سیف الدین وزیر مملکت کی متعصبانہ پالیسی کی وجہ سے جو ہندو کشمیر چھوڑ کر چلے گئے تھے بڈ شاہ نے ایک عام اعلان کے ذریعے انہیں واپس آنے کی دعوت دی۔

بچپن میں مولانا کبیر شاہی خاں اس کے استاد مقرر ہوئے۔ جنہوں نے اسے علم تفسیر و حدیث پڑھایا۔ بعد میں بڈ شاہ کے عہد میں مولانا کبیر شیخ الاسلام بنائے گئے۔ ۱۳۹۹ء میں تیمور کے ہندوستان پر حملے کے بعد شاہی خاں اپنے باپ کی طرف سے تحائف لیکر تیمور کی خدمت میں دہلی میں حاضر ہوا اور تیمور کے ساتھ ہی سمرقند چلا گیا۔ جہاں سات سال کے قیام کے بعد واپس کشمیر آیا۔

بادشاہ بننے کے بعد بڈ شاہ نے اپنے چھوٹے بھائی محمد خاں کو وزیر اعظم بنایا، ہلمت رائنا اور احمد رائنا فوج کے کمانڈر بنائے گئے۔ مرزا احسن کو وزیر خزانہ (Treasurer General) کا رتبہ ملا۔ محمد خاں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا حیدر خاں، بڈ شاہ کا وزیر اعظم بنا۔

زیر نگین علاقے: سلطان بڈ شاہ کی فوج ایک لاکھ پیدل اور تیس ہزار سوار پر مشتمل تھی۔ پشاور سے سر ہند تک کا علاقہ بڈ شاہ کے تحت تھا۔ جسرت گکھڑ کی مدد سے بڈ شاہ دہلی کی طرف بڑھا مگر اسے فتح نہ کر سکا۔ بقول مولوی ذکاء اللہ مصنف تاریخ ہند بہت سی خونریز لڑائیوں کے بعد دہلی کے بادشاہ سلطان بہلول لودھی (۱۴۵۱ - ۱۴۸۹ء) سے یہ طے پایا کہ سلطان فیروز شاہ (۱۳۵۱ - ۱۳۸۸ء) کے زمانے کے ”عہد نامہ ۱۳۷۵/۱۳۷۳ء“ کے مطابق سر ہند سے کشمیر تک کا علاقہ بڈ شاہ کے تحت رہے گا۔ بڈ شاہ فتح پنجاب کے دوران میں امرتسر ٹھہرا، جس کا ثبوت وہ کنواں ہے جسے ”بڈ کھوہ“ یا ”بٹ کھوہ“ کہتے ہیں (Islamic Culture in Kashmir)۔ کاشغر، لداخ، سکردو اور گٹو کے علاقے ۱۴۶۰ اور ۱۴۷۰ء کے درمیان فتح کر لیے گئے۔ ابوالفضل اور نظام الدین احمد



سرایشو (جو تھی و منجم)، پنڈت گوہال کول (صدر قانون گو)، پنڈت مادھو کول (قانون گو، کامراج)، سوم پنڈت (مصاحب، شاعر و مترجم)۔

تعمیرات: ہڈ شاہ کو عمارتیں، باغ اور پل بنانے کا بہت شوق تھا۔ مذہبی عمارتوں میں سے جامع مسجد بارہ مولا، جامع مسجد سری نگر، مسجد کاڈہ یار، جامع مسجد نوشہرہ، خانقاہ چرار شریف، خانقاہ برخوردار سرینگر، خانقاہ شیخ العالم، خانقاہ سید مدنی مشہور ہیں۔ باغوں میں سے باغ زینہ گر، باغ نوشہرہ، باغ زینہ پور، باغ زینہ کوٹ کا ذکر ملتا ہے۔ پلوں میں سے زینہ کدل، ہڈ شاہی ہفت پل، پل نالہ مار قابل ذکر ہیں۔ نہروں میں سے نہر زین گنگا (مگر فتوحیات کبریہ میں اسے نالہ مار ہی لکھا ہے) اس کی یادگار ہے۔

شاہی عمارات: (۱) ویری ناگ پر ایک نہایت خوبصورت عمارت تعمیر کرائی، جسے زینہ لنکا کہتے ہیں اس کے اردگرد مساجد اور باغات تھے؛ (۲) زینہ کوٹ - راج ترنگنی میں اسے جیٹی کوٹ لکھا گیا ہے؛ (۳) زینہ دب یا نوشہرہ؛ دب یا دیپ کے معنی محل یا منزل کے ہیں۔ کشمیری نوشہرہ کو راجدھانی بھی کہتے ہیں۔ نوشہرہ میں بارہ منزلہ عمارت کا دربار عام بنوایا۔ ہر منزل میں پچاس کمرے اور ہر کمرے میں پانچ سو آدمی سما سکتے تھے۔ تمام عمارت لکڑی کی ہے۔ پتھر اور چونا بالکل استعمال نہیں ہوا۔ تاریخ رشیدی کے مصنف نے اس کی بہت تعریف کی ہے اور کشمیری صنعت کاری کا بے مثل نمونہ قرار دیا ہے۔ دیگر عمارتوں میں زینہ پٹن، زینہ کندل، زینہ ماتھ، زینہ پور، زینہ تلک، زینہ گیر اور زینہ گام کے نام آتے ہیں۔

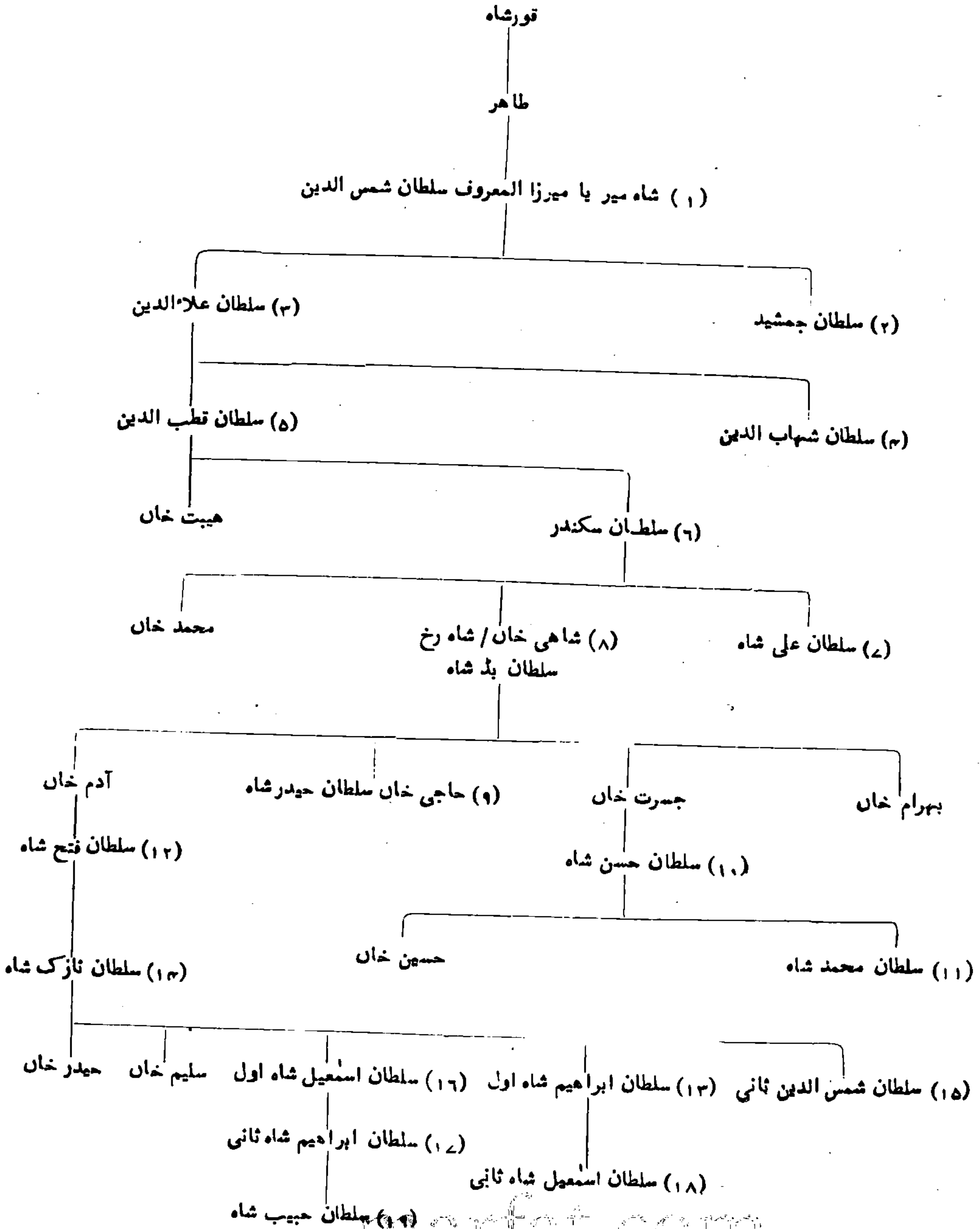
علمی سرگرمیاں: کشمیری زبان کے علاوہ

ہڈ شاہ فارسی، تہی، سنسکرت اور ہندی بھی جانتا

اور ہندو پنڈتوں کے وظائف مقرر تھے۔ اس کی رواداری کی وجہ سے ملک میں مکمل مذہبی آزادی تھی۔ اپنی ہندو رعایا کی خوشنودی کی خاطر گاوکشی بند کر دی اور بعض اور اقدامات بھی کیے۔ طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ ہڈ شاہ نے ہندوؤں سے یہ عہد لیا تھا کہ وہ اپنی مذہبی کتابوں میں لکھے ہوئے قوانین کے خلاف کچھ نہ کریں گے۔ سدھ پور کے پرانے مندروں کے علاوہ کئی اور مندروں، مثلاً شنکر اچارج، چترا تما کیشو، شیشہ شائی کیشو اور امرت کیشو کی مرمت کروائی۔ پائٹھ شالے بنائے گئے، جہاں ہندوؤں کو تعلیم دی جاتی تھی۔ سنسکرت کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ہندوؤں کو ذکن اور کاشی (بنارس) سرکاری وظائف پر بھیجا گیا۔ خود ہڈ شاہ ہندوؤں کے مقدس تیرتھ یعنی امر ناتھ اور شاردہ (ضلع مظفر آباد) گیا۔ بقول راج ترنگنی ہندوؤں کے لیے ہندو عدالتیں مقرر کی گئیں۔ برہمنوں کو فارسی پڑھوائی۔ کشمیری پنڈت، جنہوں نے فارسی پڑھی، ”کارکن“ کہلائے۔ ان کے نواسے، جنہوں نے مذہبی زندگی اختیار کی، ”باچہ بٹ“ کہلائے۔ بہت سی سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ مہابھارت اور پورانوں کا فارسی میں ترجمہ سب سے پہلے ہڈ شاہ کے عہد میں ہوا۔ ملاً احمد نے کلہن پنڈت کی راج ترنگنی کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ فارسی ترجمہ غالباً مکمل نہ تھا کیونکہ بداؤنی نے اکبر کی درخواست پر دوبارہ مکمل ترجمہ کیا۔ اس کے عہد کے حالات پر دو مشہور سنسکرت کتابیں لکھی گئیں۔ زونہ راج نے زینہ ترنگنی اور سوم پنڈت نے زینہ چرت لکھیں۔ محمد دین فوق نے ہڈ شاہ کے درباری پنڈتوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں چند ایک کے نام دیے جاتے ہیں: پنڈت شری بٹ (شاہی حکیم)، پنڈت بودی بٹ (مترجم)، پنڈت

## کشمیر کے شاہ میرو سلاطین

(۱۳۳۹ تا ۱۵۵۶ء)





تبدیل کر کے باہر نکل جاتا تھا۔ بادشاہ کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی سید تاج الدین کی بیٹی تاج خاتون تھی، جسے بیہتی بیگم بھی کہتے ہیں۔ اس کی صرف دو بیٹیاں تھیں۔ چونکہ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اس لیے بڈ شاہ نے دوسری شادی کی، جس سے چار بیٹے پیدا ہوئے، یعنی ادھم خان، حاجی خان، جسرت خان اور بہرام خان۔ بادشاہ رمضان میں گوشت نہ کھاتا تھا۔ اور چوری کی سزا پر سخت تعزیر کرتا تھا۔ اس کے عہد کے آخری ایام میں اس کے بیٹوں میں تخت نشینی کے لیے جنگ ہوئی اور بالآخر حاجی خان کو ولی عہد قرار دیا گیا، جو بعد میں سلطان حیدر شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔

مآخذ: (۱) مرزا حیدر بیگ دوغلات:

تاریخ رشیدی؛ (۲) نظام الدین احمد بخشی: طبقات اکبری؛

(۳) ابوالفضل: آئین اکبری؛ (۴) وہی مصنف:

اکبر نامہ؛ (۵) عزیزالدین مفتی: احسن التواریخ،

۱۳۰۰ھ؛ (۶) عبدالباقی: مآثر رحیمی؛ (۷) محمد دین

فوق: مکمل تاریخ کشمیر، لاہور ۱۹۱۰ء؛ (۸)

وہی مصنف: شباب کشمیر، لاہور ۱۹۲۸ء؛ (۹)

ہندت ہرگوہال کول: گلستہ کشمیر، ۱۸۸۳ء؛

(۱۰) ذکاء اللہ: تاریخ ہند، دہلی؛ (۱۱) محمد اعظم:

واقعات کشمیر (قلمی)؛ (۱۲) بیربیل کاجر:

مجمع التواریخ (قلمی)، کتب خانہ جامعہ پنجاب؛

(۱۳) نرائن کول عاجز: تاریخ کشمیر (قلمی)؛

کتب خانہ جامعہ پنجاب؛ (۱۴) غلام معی الدین صوفی

G. M. D. Sufi: Kashir، ج ۱، لاہور ۱۹۳۸ء؛

(۱۵) وہی مصنف: Islamic Culture in Kashmir،

Short: Pandit Gawasha Lal (۱۶)؛ ۱۹۲۵ء؛

History of Kashmir: Kalhen (۱۷)؛

انگریزی ترجمہ از Mark Aurel، ج ۱ و ۲، ۱۹۰۰ء؛

(۱۸) البرونی: کتاب الہند، انگریزی ترجمہ از

تھا۔ فارسی کا شاعر تھا۔ اس نے ایک کتاب فوائد پر مبنی کتاب سوال و جواب لکھی۔ اس کے ذاتی کتب خانے میں کتابوں کا ایک ذخیرہ جمع تھا۔ یہ کتب خانہ فتح شاہ کے دور (۱۵۱۵-۱۵۱۶ء) تک یعنی بڈ شاہ کی وفات کے ایک سو سال بعد تک قائم رہا۔ دارالحکومت میں ایک دارالعلوم تھا۔ مولانا کبیر اس کے صدر تھے۔ طلبہ کے لیے ایک دارالاقامت تھا۔ اس دارالعلوم کے مشہور اساتذہ میں پارسا، ملا احمد، مولانا نادری، ملا مدیحی، ملا ضیائی اور تاریخ کشمیر کے مصنف حمیدالدین کے نام آتے ہیں۔ ملا بہاء الدین تحریر کرتے ہیں کہ بادشاہ علما و مشائخ کو اپنے اخراجات پر غیر ممالک سے بلواتا رہتا تھا۔ مولانا محمد باقر رومی اور مولانا احمد رومی بادشاہ کی درخواست پر کشمیر آئے۔ دربار کے دیگر علما میں قاضی القضاة جمال الدین، سید حسین رضوی، حافظ بغدادی اور بابا حاجی ادھم کے نام آتے ہیں۔

خارجہ پالیسی: بڈ شاہ کے غیر ممالک، مثلاً خراسان، ترکستان، آذربایجان، گیلان، سیستان، ترکی، مصر، دکن، مالوہ، خاندیش، گجرات اور سندھ کے حکمرانوں سے دوستانہ مراسم تھے۔ تبت کے بادشاہ نے ہنس کا ایک ایسا جوڑا بھیجا کہ اگر دودھ میں پانی ملا دیا جائے تو وہ دودھ ہی جاتا تھا اور پانی باقی رہ جاتا تھا۔

کردار: توزک جہانگیری کے مطابق بڈ شاہ نے زینہ لنکا میں کئی بار چلہ کشی کی، اور معجزات دکھائے، لوگ اسے ولی سمجھتے تھے۔ نظام الدین احمد بخشی لکھتا ہے کہ بڈ شاہ کی نگاہ کبھی نا محرم عورت پر نہ پڑی۔ شاہی خزانے پر کبھی وہ بار نہ بنا۔ سونے کی کلن سے، جو اس نے خود دریافت کی تھی، اپنے اخراجات پورے کرتا تھا۔ عوام کے حالات معلوم کرنے کے لیے رات کو لباس

(۱۵۸۱ء) نے ان سے ذکر کا طریقہ سیکھا۔ خویشگی نے شیخ بڈھن کو ”مردے بزرگ و متبرک“ لکھا ہے۔ انہوں نے پانی پت میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہیں۔ شیخ ولی شطاری (م ۹۵۶ھ/۱۵۴۹ء) ان کے خلیفہ تھے اور انہوں نے قصبہ بدولی میں ان کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان کے اپنے بھی متعدد خلفا ہوئے۔

مآخذ: عبدالحق: اخبار الاخیار، دہلی ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱-۱۸۹۲ء، ص ۱۹۴ (بعد) = علی اکبر آردستانی: مجمع الاولیاء، جامعہ پنجاب، مخطوطہ، ورق ۴۰۰ (ب)؛ (۲) مانڈوی: اذکار الابرار، اردو ترجمہ گلزار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۲۸۷-۲۰۸ (کذا ۳۰۸؟)؛ (۳) عبیداللہ خویشگی: معارج الولاية (مخطوطہ جامعہ پنجاب)، ورق ۵۴۸ (بعد)؛ (۴) Medieval India, Quarterly، اکتوبر ۱۹۵۰ء (ج ۱، شماره ۲)، ص ۵۸۔

(محمد شفیع)

البذندون: بزنتی (پوزنتی) (Pozanti)

چکت چای Cakitcay پر واقع ہے (جو اپنی بالائی گزرگاہوں میں پوزنتی سویو Pozanti suyu کہلاتا ہے)۔ یہ اس مشہور درے سے جو سلسلہ کوہ طورس Tourus کے درمیان واقع ہے شمال شمال مشرق کی جانب تیرہ کلومیٹر کے فاصلے پر گزرتا ہے۔ یہ درے سلیشیا کے پھانک (Pylae Cilicae) کہلاتے ہیں، ابن خردادبہ نے اسے درب السلامیہ لکھا ہے اور آج کل ترکی میں گلک بو غازی Kulak Bogazi کہلاتا ہے۔ روما والے اور بوزنتی سے پوڈینڈوس Podandos کہتے تھے (Podandos, Ποδανδός) اور عرب جغرافیہ دانوں نے البذندون (بذندون، بذندون) لکھا ہے۔ قرون وسطیٰ کے مغربی مآخذ اس نام کو بہت سی مختلف صورتوں میں پیش کرتے ہیں، مثلاً Opodando, Poduando, Podando،

(۱۹)؛ ۱۹۱۰ء؛ (۱۹)؛ History of Kashmir : Anand Kol Pandit، در JASB، سلسلہ جدید، ج ۶، اپریل ۱۹۱۰ء؛ ص ۱۹۵ تا ۲۱۹؛ ج ۹، شماره ۵، ۱۹۱۳ء؛ (۲۰)؛ Archaeological : T. W. Haig (۲۱)؛ Survey of India — Reports The Chronology and Geneology of the Muhammadan Kings of Kashmir، در JRAS، ص ۴۵۱ تا ۴۶۸ (۱۹۱۸ء)؛ (۲۲)؛ C.J. Rodgers؛ The Copper Coins of the Sultans of Kashmir، در JASB، ج ۳۸، حصہ اول، شماره ۴، ص ۱۸۷۹۔

(یار محمد)

\* بڈھن: شیخ جونپوری، سلطان سکندر لودھی کے زمانے کے ایک بزرگ، جن کا مشرب شطاری [رک بہ شطاریہ] تھا (اخبار الاخیار، ص ۱۹۳؛ نیز اذکار الابرار، ص ۲۸۴ (بعد)۔ وہ شیخ عبیداللہ شطاری (م ۸۹۰ھ/۱۴۸۵ء، بمقام مانڈو) کی اولاد میں سے تھے، جن کا نسب چھے واسطوں سے شیخ شہاب الدین عمر بن محمد السہروردی تک پہنچتا ہے، اور جو نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں ایران سے ہندوستان آئے تھے (دیکھیے اخبار الاخیار، ص ۱۷۱؛ اذکار، محل مذکور؛ عبیداللہ خویشگی: معارج الولاية، ورق ۵۳۸؛ عبدالحق: نزہة الخواطر، حیدرآباد دکن، ۱۹۵۱ء، ۳: ۹۵ (بعد)؛ مفتی غلام سرور: خزینة الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۳ھ، ص ۹۴)۔ ہندوستان میں سب سے پہلے عبیداللہ نے شطاری مشرب کو متعارف کیا۔ شیخ بڈھن نے شیخ حافظ جونپوری سے رسمی علوم حاصل کیے اور سلسلہ شطاریہ میں ان سے بیعت کی، یہ بزرگ شیخ عبیداللہ کے خلیفہ تھے اور انہیں اس سلسلے کی تعلیم دینے اور بیعت لینے کی اجازت تھی۔ شیخ عبدالحق: محدث دہلوی کے عم بزرگ شیخ رزق اللہ مشتاقی (م ۹۸۹ھ/



۵۳۰ بعد؛ (۴) الطبری، ۳ : ۱۱۳۳ بعد؛ (۵) حاجی خلیفہ: جہاں نما، ص ۶۰۱؛ (۶) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، استانبول، ۱۳۱۳ھ، ۳ : ۳۹؛ (۷) Constantinus (۷) : ۱۹ : ۱۹۰ Bonn، *De Thematibus : Porphyrogenitus*، *Reise in den cilicischen* : Th. Kotschy (۸) : ۱۹ : ۱۹۰ Gotha، *Taurus*، *Voyage dans la Cilicie et dans les* : V. Langlois، *Montagnes du Taurus*، پیرس ۱۸۶۱ء، ص ۳۷۷ بعد؛ (۱۰) F. X. Schaffer، *Cilicia petermanns* : *Mitteilungen*، (در *Ergänzungsheft*، عدد ۱۳۱)، *Mitteilungen*، Gotha ۱۹۰۳ء، ص ۸۰؛ (۱۱) Weil، *Chalifen*، ۲ : ۲۹۳؛ (۱۲) W. M. Ramsay، *The Historical Geography of Asia Minor*، لنڈن، ۱۸۹۰ء، ص ۳۳۸ بعد؛ (۱۳) W. Tomaschek، *Zur historischen Topographie von Kleinasien im Mittelalter*، (در *SBWJk Wien, Phil.-Hist., Cl.*، ج ۱۲۴) وی انا ۱۸۹۱ء، ص ۸۳؛ (۱۴) E. W. Brooks، *The Arabs in Asia Minor (641 - 750) from Arabic sources*، لنڈن، ۱۸۹۸ء، ۱۸ : ۱۹۳؛ (۱۵) Le Strange، ص ۱۳۳ بعد؛ (۱۶) K. Miller، *Itineraria Romana* : J. Laurent، ۱۹۱۶ء، ص ۶۶۳؛ (۱۷) J. Laurent، *L'Arménie entre Byzance et l'Islam depuis la conquête arabe jusqu'en 886*، پیرس ۱۹۱۹ء، ص ۲۳۲؛ (۱۸) F. Taeschner، *Das anatolische* : *Wegenetz nach osmanischen Quellen*، (در *Bibliothek*، ج ۲۳، لائپزگ ۱۹۲۶ء)، ۱ : ۱۳۶ بعد؛ (۱۹) J. Karst و C. F. Lehmann Harpt، *Buzanta*، (در *Klio (Beiträge zur alten Geschichte)*، ج ۲۶ (= سلسلہ جدید، ج ۸)، لائپزگ ۱۹۳۳ء، ص ۳۶۳ تا ۳۶۷؛ (۲۰) E. Hunigmann، *Die Ostgrenze des byzantinischen Reiches von 363 bis 1071*

Bothentrot، Botantron - ظہور اسلام کے بعد جب مسلمان سلیشیا کے دروں سے گزر کر ایشیائے کوچک پر بار بار تاخت کرنے لگے تو یہ بوزنٹیوں کا نہایت اہم مورچہ ہو گیا۔ اس وقت یہ کبدوقیہ کے ضلع میں شامل تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آگے چل کر اسے مستقل ضلع بنا دیا گیا۔ الہندون (بزنٹی) ہی وہ مقام تھا جہاں ۵۲۱۸/۵۸۳۳ میں عباسی خلیفہ المأمون کی وفات ہوئی، جب کہ وہ بوزنٹیوں سے معرکہ آرائی کرنے گیا تھا۔ بوزنٹی سلطنت کے زوال اور ترکوں کے مغرب کی طرف ایشیائے کوچک میں پیش قدمی سے الہندون کی اہمیت زائل ہونی شروع ہو گئی۔ رفتار زمانہ کے ساتھ پہلے وہ سلجوق سلاطین روم کے اور آگے چل کر عثمانی ترکوں کے زیر حکومت آ گیا۔ جب عثمانیوں نے شام اور مصر میں مملوکوں پر فتح حاصل کر لی (۵۹۲۲/۱۵۱۶ء تا ۵۹۲۳/۱۵۱۷ء) تو نتیجہ یہ ہوا کہ سلسلہ کوہ طورس کوئی بڑی اہم سیاسی سرحد نہ رہا اور پھر الہندون کی بھی اہمیت، جو اسے سلیشیا کے شمالی دروازے کے نگہبان سرحدی شہر ہونے کی حیثیت سے حاصل تھی، جاتی رہی۔ اولیا چلبی ایک منزل گاہ کی، جو "سلطان خانہ" کہلاتی تھی، مختصر سی کیفیت بیان کرتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ منزل گاہ دراصل الہندون ہی تھی مگر وہ اس کا اس نام سے ذکر نہیں کرتا۔ انیسویں صدی کے وسط میں الہندون میں ایک 'خان' (= سرائے)، ایک ڈاک چوکی اور ایک چنگی خانہ تھا۔ اس وقت یہ ایک معمولی سا گاؤں رہ گیا تھا، جو آٹنہ کی سنجاق اور ولایت میں طرسوس کی 'قضا' میں واقع تھا۔ آج کل یہ جمہوریہ ترکی کے صوبہ آٹنہ میں شامل ہے۔

مآخذ: (۱) ابن خردادبہ، ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۱۰؛

(۲) المسعودی: مروج، ۷ : ۱، ۹۶؛ (۳) یاقوت، ۱ :

Brussels ۱۹۳۵ء، ص ۲۵۳ (بمقدد اشاریہ بذیل مادہ  
 Histoire de la : M. Canard (۲۱)؛ (Ποδανός  
 'Dynastie des H'amdaniides de Jazira et de Syrie  
 پیرس ۱۹۵۳ء، ۱ : ۲۸۲ تا ۲۸۵، ۲۳۰ : (۲۲)  
 'La Turquie d'Asie : V. Cuinet، پیرس ۱۸۹۱ء :  
 Pauly - Wissowa (۲۳)؛ ج ۲۱ / ۱ (۱۹۵۱ء)،  
 بذیل مادہ Podandos : عمود ۱۱۳۶ تا ۱۱۳۹ : (۲۴)  
 [۲۵]؛ (۲۰)؛ [۲۱]، ع، بذیل مادہ].  
 (V. J. PARRY)

البراء بن عازب : بن الحارث الاوسی الانصاری،  
 حضرت ابو عمارہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے  
 صحابی، غزوہ بدر [اور احد] میں خرد سالی کی وجہ  
 سے شریک نہ ہو سکے، لیکن دوسرے [پندرہ] غزوات  
 میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔  
 بعد ازاں انہوں نے اسلامی جنگوں میں بھی حصہ  
 لیا، رتے اور قزوين [قوس] انہوں ہی نے اسلامی  
 مملکت میں شامل کیے تھے۔ آگے چل کر وہ حضرت  
 علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حامی رہے اور  
 جنگ جمل [رک بہ الجمل] نیز صفین [رک باں]  
 اور نہروان [رک باں] میں بھی آپ ہی کے جھنڈے  
 کے نیچے لڑے۔ تین سو پانچ حدیثیں ان سے مروی  
 ہیں، جن میں سے بائیس صحیحین میں ہیں۔  
 غدیر الخم [رک باں] کی مشہور حدیث انہیں  
 سے مروی ہے [ان کا شمار مفتی صحابہ میں ہوتا  
 ہے]۔ کوفے میں عزلت گزیر ہونے کے بعد آخری  
 عمر میں ان کی بصارت جاتی رہی تھی۔ [اسی برس  
 سے اوپر عمر پا کر] ۵۷۲ / ۶۹۱ - ۶۹۲ء میں  
 وفات پائی [ان کے والد قدیم انصاری تھے؛ اور چار  
 بیٹے کوفے کے محدثین میں شمار ہوتے ہیں]۔

مآخذ : (۱) البلاذری : فتوح، ص ۳۱۷ بعد؛ (۲)  
 ابن سعد، ۲ / ۸۰ : بعد؛ (۳) الطبری، ۱ : ۱۳۵۸،  
 ۱۳۷۱ تا ۱۳۷۲ : (۴) ابن الأثیر : الکامل، ۲ : ۱۰۶۔

۱۱۷ : ۳۹ : ۱۷ : ۲۷۸ : (۵) وہی مصنف : أسد الغابة،  
 ۱ : ۱۷۱ تا ۱۷۲ : (۶) النووی : تہذیب، ص ۱۷۲ تا  
 ۱۷۳ : (۷) الصفدی : [نکت الہمیان فی نکت العمیان، ص  
 ۱۲۴ : (۸) ابن حجر : الاصابة، عدد ۶۱۸ : (۹) I. Goldzihr :  
 Muh. St.، ۲ : ۱۱۶ : (۱۰) Annali : Caetani،  
 بمقدد اشاریہ : [۱۱] ابن حبیب : المحبر، ص ۲۹۸،  
 ۳۱۲ : (۱۲) ابن عبدالبر : الاستیعاب، ۱ : ۸۵ : (۱۳)  
 ابن حزم : جمہورہ انساب العرب، ص ۳۴۱ : (۱۴) وہی  
 مصنف : جوامع السیرة، ص ۲۷۶، ۳۲۱، ۳۴۶ : (۱۵)  
 ابن القیسرانی : الجمع بین رجال الصحیحین، ۱ : ۶۱ :  
 (۱۶) الذہبی : سیر اعلام النبلاء، ۳ : ۱۲۹ تا ۱۳۰ :  
 (۱۷) الذہبی : تاریخ الاسلام، ۳ : ۱۳۹ : (۱۸)  
 البلاذری : انساب الأشراف، جلد اول (بامداد اشاریہ)۔

(K.V. ZETTERSTÉEN)

البراء بن مالک : بن النضر بن ضمضم،  
 الانصاری، النجاری، المدنی، نامور صحابی، بڑے  
 بہادر، نڈر، خطروں میں کود جانے والے مجاہد، بطل  
 کرار، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم حضرت  
 انس رضی اللہ عنہ کے بھائی، غزوہ احد میں شریک ہوئے، اور  
 حدیبیہ میں درخت تلے بیعت کی۔ مسیلمہ کذاب  
 سے جنگ کے دوران میں حضرت براء رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں  
 سے کہا کہ اپنے نیزوں کی نوکوں پر ڈھال رکھ کر  
 مجھے اس پر بٹھا کر دشمن کے باغ (الحدیقة) میں  
 پھینک دو۔ چنانچہ وہ دشمنوں میں جا گھسے،  
 سخت حملہ کیا اور بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے  
 باغ کے دروازے پر قبضہ کر لیا۔ اس دن انہیں  
 اسی سے اوپر زخم آئے اور حضرت خالد بن الولید  
 سپینا بھر ان کی مرہم پٹی میں مصروف رہے۔ جب  
 حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی  
 اللہ عنہ کو لشکر دے کر بصرے کے محاذ پر روانہ  
 کیا تو اس میں حضرت براء رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔  
 ۲۰ ہجری میں محاصرہ تستر کے دوران میں اسلامی



چاہتے ہیں کہ وہ آپؐ کی حفاظت اسی طرح کریں گے جیسے اپنی ازواج و اولاد کی تو البراء نے آپؐ کا ہاتھ تھام لیا۔ سب کی طرف سے آپؐ کی حفاظت کا وعدہ کر کے معاہدے پر مہر ثبت کر دی۔ اسی مجلس میں، جو عقبہ ثانیہ کہلاتی ہے، یثرب کی نئی آبادی کے بارہ سردار (نقیب) منتخب ہوئے اور اس موقع پر البراءؓ کو بنو سلمہ کا سردار مقرر کیا گیا۔ تاریخ اسلام میں ان کی شہرت اس واسطے بھی ہے کہ وہ تحویل قبلہ سے پہلے ہی مکہ معظمہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں روکا اور فرمایا کہ بیت المقدس ہی صحیح قبلہ ہے تو انہوں نے آپؐ کا کہا مان لیا لیکن بایں ہمہ بستر مرگ پر وصیت کی کہ ان کی میت کا رخ مکہ معظمہ کی طرف رکھا جائے۔ ان کی وفات ماہ صفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت مدینہ سے ایک ماہ قبل مدینہ منورہ ہی میں ہوئی۔ وہ قبلہ رخ مرے اور پہلے شخص تھے جو قبلہ رخ دفن کیے گئے۔ [جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینے میں تشریف فرما ہوئے تو آپؐ نے ان کی قبر پر جا کر دعائے مغفرت کی]۔ وفات سے پہلے انہوں نے اپنی جائداد کا تیسرا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام وصیت کر دیا تھا [لیکن آپؐ نے ان کے وارثوں کو واپس کر دیا۔ ان کے بیٹے حضرت بشرؓ بدری صحابی تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں بنو سلمہ کا سردار نامزد فرمایا۔ حضرت بشرؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ زہریلی بکری کا گوشت کھا لیا، جس کے باعث ان کی وفات ہو گئی تھی۔ البراء کے بھائی قیس بن معرور بھی صحابی تھے، جو حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے۔ ان کی بیٹی ام بشر بھی صحابیہ ہیں اور دو حدیثیں ان سے مروی ہیں]۔

مآخذ: (۱) ابن سعد، ۲/۳: ۱۳۶ بعد؛ (۲)

لشکر کا میمنہ (دایاں بازو) حضرت براءؓ کی قیادت میں تھا۔ جب مسلمانوں نے ایک زمین دوز نالی (سرنگ) کے ذریعے شہر میں داخل ہونے کی تدبیر کی تو حضرت براءؓ حضرت مجزاةؓ بن ثور کو ساتھ لیے اس سرنگ میں داخل ہو کر شہر کے وسط میں جا نکلے۔ حضرت مجزاةؓ کو تو سرنگ سے باہر نکلتے ہی دشمنوں نے ایک بڑا پتھر مار کر شہید کر دیا، لیکن حضرت براءؓ نے باہر نکل کر بڑی بے جگری سے لڑنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ بالآخر مسلمانوں نے شہر فتح کر لیا۔ حضرت براءؓ نے گھمسان کے معرکوں میں بہت سے دشمنوں کو قتل کرنے کے علاوہ صرف مبارزت میں ایک سو بہادروں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا، ان میں مرزبان الزارة بھی تھا۔ حضرت براءؓ مجیب الدعوات بھی تھے۔

مآخذ: (۱) ابن سعد: الطبقات، ۲/۱: ۹؛ (۲) ابو حنیفہ الذینوری: الاخبار الطوال، ص ۱۱۸، ۱۳۰ (طبع عبدالمنعم عامر)، قاہرہ، ۱۹۶۰ء؛ (۳) ابن الاثیر: اسد الغابۃ، ۱: ۱۷۲؛ (۴) ابن حزم: جمہرۃ انساب العرب، ص ۳۵۱؛ (۵) الذہبی: تاریخ الاسلام، ۲: ۳۳؛ (۶) وہی مصنف: سیر اعلام النبلاء، ۱: ۱۳۲ تا ۱۳۳؛ (۷) ابن حجر: الاصابۃ، ۱: ۱۳۷۔

(عبدالقیوم)

\* ⑧ البراء بن معرور: [بن صخر، حضرت ابوشر، الانصاری، الخزرجی، السلی، العقبی، النقیب] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، [متقی، فاضل اور فقیہ]، ۶۲۲ء کے موسم گرما میں حج کے موقع پر بہ مقام عقبہ جو پچھتر انصار بارگاہ نبوت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرنے آئے تھے ان میں معمر شیخ البراء بن معرور الخزرجی کو خاص اہمیت حاصل تھی اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ آپؐ ان لوگوں سے یہ بیعت لینا





تیقن حاصل ہو جائے [لسان، بذیل مادہ: واء، اردو، بذیل ام و ولد].

استنجاہ کے ضمن میں بھی استبراء کا ذکر آتا ہے، جس سے مراد یہ ہے کہ رفع حاجت کے بعد کلی طہارت حاصل کی جائے (لسان، ۱: ۲۵ و کتب فقہ، بذیل کتاب الطہارت)۔ بیع البراءة اس بیع کو کہتے ہیں جس سے کوئی ذمے داری عائد نہ ہوتی ہو۔ مثلاً اگر کسی فروخت کردہ چیز میں کوئی ایسا نقص نکل آئے جس کی وجہ سے عام حالات میں بیع فسخ ہو سکتی ہے اور اس کے بارے میں بوقت معاہدہ یہ کہا جائے کہ یہ بیع برآء ہے اور فروخت شدہ شے کی کوئی ذمے داری بیچنے والے پر نہیں تو اس صورت میں بیچنے والا اس کا ذمے دار نہیں ہوگا۔ اختلف العلماء فی جواز هذا البیع یعنی بیع البراءة جائز ہے یا ناجائز اس بارے میں علماء میں اختلاف ہے (ابن رشد: بدایة المجتہد، ۲: ۱۵۳، قاہرہ ۱۳۳۳ھ)۔

یمین البراءة اس حلف کو کہتے ہیں جس میں یہ کہا جائے کہ اگر فلاں بات میرے قول کے برعکس ہوئی تو میں اسلام سے الگ ہو جاؤں گا۔ ایسی قسم کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے (ابوداؤد: سنن، عدد ۳۲۵۸؛ النسائی، کتاب الایمان و النذور)۔

تبریہ کا مطلب ہے مختلف صورتوں میں عدالتوں کے ذریعے قرار دیے جانے والے دستوری نوعیت کے وہ کل قوانین جن کا مقصد پابندی سے سبکدوش کر دینا ہو؛ مثلاً مراکش کے بدویوں کا تبریہ۔ یہ ایک تاوان ہے جو قاتل کے والدین مقتول کے والدین کو ادا کرتے ہیں تاکہ وہ قبیلے میں شامل رہ سکیں (Taxtes arabes des Zaer : Loubignac، ص ۳۵۹، پیرس ۱۹۵۲ء)۔ بیت لحم کے علاقے میں برآء (جو بگڑ کر برا بن گیا ہے) کا اسی قسم کا

بناہی طور پر کسی ذمے داری سے سبکدوشی ہے۔ زین العابدین کی کتاب الأشباه و النظائر میں برآء کو اصول مان کر وہ صورتیں شمار کی گئی ہیں جن میں کوئی مسئول ذمے داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے، مثلاً کسی فعل میں شک سے مسئول کو فائدہ پہنچتا ہے اور اس سے ذمے داری ساقط ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں نیز ملاحظہ ہو السیوطی: کتاب الأشباه و النظائر، ص ۳۹، قاہرہ ۱۹۳۶ء۔

فقہانے 'الأصل براءة الذمّة' کے بارے میں طویل بحثیں کی ہیں۔ امام غزالی المستصفی (۱: ۶۳، بولاق ۱۳۲۲ھ) میں شرع کے نفاذ سے پہلے کے افعال کے بارے میں افعال کی ذمے داری کو زیر بحث لائے ہیں اور مختلف آرا نقل کی ہیں: بعض کے نزدیک ایسے اعمال مباح ہیں، بعض کے خیال میں محظور اور بعض کے نزدیک موقوف۔ اسی سلسلے میں معتزلہ کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ انسانی اعمال کی قانونی اساس عقل انسانی ہے اور شرع سے پہلے کے اعمال، جن کی عقل انسانی سے تائید نہیں ہوتی، ممنوع ہیں، لیکن امام غزالی نے معتزلہ کے ان خیالات کی تردید کی ہے۔ الأمدی کی کتاب الأحكام فی اصول الأحكام میں اس کی مزید تشریح ملتی ہے (۱: ۱۳۰، مصر ۱۹۱۴ء)۔

برآء کا مادہ کئی اور مشتقات میں بھی اصطلاح کی حیثیت میں موجود ہے؛ مثلاً مبارآء و بریة یعنی باہمی رضامندی سے طلاق، جس کی رو سے زوجین آپس کے تمام حقوق سے برضا و رغبت دستبردار ہو جاتے ہیں (لسان: جرجانی: التعریفات، بذیل مادہ؛ نیز دیکھیے الشافعی: کتاب الام، ۷: ۱۳۵ و ۲۳۷، بولاق ۱۳۲۵ھ؛ ابن رشد: بدایة المجتہد، ۲: ۶۶، قاہرہ ۱۹۳۵ء)۔ الاستبراء یعنی لونڈی کے نکاح کے وقت یہ تیقن حاصل کرنا کہ وہ حاملہ تو نہیں، یا اتنا وقفہ دینا کہ عدم حمل کا

Albalá؛ Portuguese میں Alvará، جن کے یہی معنی ہیں۔

جدید عربی میں اصطلاح 'براءة التنفيذ' سفراء کے اعتمادی اسناد (exequatur) کے معنوں میں اور 'براءة الثقة' سیاسی اسناد اعتماد کے لیے مروج ہیں (دیکھیے Bercher اور Wehr کی کتب لغات)۔

شمالی افریقہ کے روزمرہ میں لفظ براءة (جو بگڑ کر برا brā ہو گیا ہے) بہ کثرت استعمال ہوتا ہے، بیشتر بصورت تصغیر بریہ Breyya، جس کے معنی معمولی چٹھی، مراسلہ یا رقعہ کے ہیں (اور اسی سے بربری لفظ برات ہے، جو اسی معنی میں مستعمل ہے)۔ مقام فاس میں معنوی تغیرات کے زیر اثر بریہ عربی میں ایک قسم کی مٹھائی کا نام ہو گیا ہے، جسے چٹھی کی طرح لپیٹ کر ڈبوں میں بند کیا جاتا ہے (Textes arabes de Rabat : Brunot)۔

۲، ۴، بمدد فرہنگ، پیرس ۱۹۵۲ء)۔ عثمانی ترکوں کے عہد میں اس لفظ کا دفتری استعمال بہ شکل برت (= برات) رائج ہوا [تفصیل کے لیے رک بہ برات، (۱)، اردو]۔

مآخذ: مقالے کے متن ہی میں موجود ہیں۔

R. BRUNSCHVIG (و ادارہ)

براءة (۲): (ع، مصدر)، براء سے مشتق، براء، بیرا، برءا بمعنی پیدا کرنا، عدم سے وجود میں لانا، اسی سے اسم فاعل الباری (۹۰ [العشر]: ۲۴) بمعنی پیدا کرنے والا؛ (۲) بری، بیرا، برءا بمعنی مرض سے صحت یاب ہونا، بری، بیرا، براءة بمعنی آزاد ہونا، بیزاری کا اظہار کرنا، بری ہونا، کسی شے سے نکل جانا اور الگ ہو جانا، ذمے داری اور پابندی سے سبکدوش ہو جانا (لسان العرب: مفردات؛ غریب القرآن، بذیل مادہ؛ نیز رک بہ براءة)۔ براءة کا لفظ قرآن مجید میں دو جگہ آیا ہے: سورة التوبہ (۹: ۱) کا آغاز کرتے ہوئے اور سورة القمر

استعمال پایا جاتا ہے (ہداد، در ZDPV، ص ۲۳۳، ۱۹۱۷ء)۔

براءة سے مراد مختلف اقسام کے وثائق بھی ہیں (جمع براءات)۔ اس کے معنی ہیں = 'سبکدوشی' یا 'مالی نظام میں سبکدوشی' (الخوارزمی: مفاتیح العلوم، ص ۳۷، قاہرہ ۱۹۳۰ء؛ Islamic Taxation: Lokkegaard، ص ۱۵۹، کوپن ہیگن ۱۹۵۰ء؛ Iran in : Spuler، Wiesbaden : Frühislam, Zeit، ص ۳۳۸، ۳۵۸)۔ اس کا ابتدائی استعمال محصول چنگی کے ان معاہدوں میں ملے گا جو عیسائی حکومتوں کے ساتھ قرون وسطیٰ، خاص کر حفصیوں کے عہد (چودھویں و پندرھویں صدی عیسوی) سے ہونے شروع ہوئے۔ لاطینی یا روسی میں اس کے لیے Albara یا Arbara کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں (Traité de Paix et de commerce : Mas-Latrie، پیرس ۱۸۶۶ - ۱۸۷۲ء، بمدد اشاریہ)، ساتھ ہی اس میں سرکاری اجازت نامے کا مفہوم بھی شامل ہے، جو اس لفظ نے اختیار کر لیا تھا۔ اس وقت بلا تامل یہ لفظ ان متعدد تحریری دستاویزوں کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا جنہیں ہم آج کل کی اصطلاح میں 'لائسنس، سرٹیفیکیٹ، ڈپلوما' کہتے ہیں اور اس میں وہ سب تحریریں شامل ہیں جو افسرانِ ادارہ کی طرف سے جاری ہوں یا انہیں بھیجی جائیں، مثلاً ادائے رقم یا اجراءے حکم کا مطالبہ، پروانہ راہ داری (Suppl. : Dozy، ۱: ۶۳)، امین (تحويل دار سرکاری) کی چٹ، جو وہ مال تجارت کی کسی گانٹھ پر لگائے (سقطی: Manuel de Hisba، طبع Colin و Lévi Provençal، ص ۶۱، پیرس ۱۹۳۱ء)، درخواست یا عرضداشت، جو کسی بادشاہ کے سامنے پیش کی جائے (Brunschvig: Berberie Orientale، ۲: ۱۴۴، حاشیہ ۳)۔

جزیرہ نماے آیبیریا Iberia کی لغات میں اسی قسم کے الفاظ ملتے ہیں: Catalian میں Albará؛ Castalian



(۵۴ : ۴۳) میں۔

براءة قرآن مجید کی نویں سورۃ التوبة کا دوسرا مشہور نام ہے، جو اس کے لفظ آغاز سے مأخوذ ہے۔ اسے سورۃ التوبة اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں توبہ کا ذکر بکثرت آیا ہے، مثلاً اَلَمْ يَعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ . . . . .

الآیة (آیت ۴۰ : ۱) = کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ خدا ہی اپنے بندوں سے توبہ قبول فرماتا اور صدقات و خیرات قبول کرتا ہے اور بے شک خدا ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے (نیز دیکھیے : ۹ : ۳، ۵، ۱۱، ۲۷، ۷۳، ۱۰۲، ۱۱۲، ۱۱۷، ۱۱۸)۔

اس سورت کے اور بھی بہت سے نام ہیں، مثلاً اَلْفَاضِحَةُ، اَلْعَذَابُ، اَلْبَحُوثُ، اَلْمُقَشَّقَةُ، اَلْمُنْقَرَةُ، اَلْحَافِرَةُ، اَلْمُثِيرَةُ، اَلْمُدْمِدْمَةُ، اَلْمُخْزِيَّةُ، اَلْمُنْكَلَةُ، اَلْمُشْرَدَةُ، اَلْمُبْعَثَةُ۔ سورۃ الفاتحة کی طرح یہ سورت بھی کثرت اسماء کے لحاظ سے منفرد ہے۔ دو چار آیتوں کے سوا اس کے مدنی ہونے پر اجماع ہے، اس میں ایک سو اسی آیات ہیں۔ اور یہی تنہا سورت ہے جس کا آغاز بسم اللہ سے نہیں کیا گیا۔ بقول حضرت علی کرم اللہ وجہہ سورۃ براءۃ کے آغاز میں بسم اللہ اس لیے نہیں آئی کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم تو امان اور سلامتی کا اعلان ہے اور سورۃ براءۃ تلوار چلانے اور جہاد کرنے کا حکم لے کر آئی ہے، اور عربوں میں دستور بھی تھا کہ جب معاہدہ ختم کرنے اور اس کی ذمے داریوں سے سبکدوش ہونے کا اعلان کرتے تو نہ بسم اللہ لکھتے اور نہ امان اور سلامتی کے الفاظ سے آغاز کرتے (القرطبی: الجامع لاحکام القرآن، ۸ : ۶۱، مصر ۱۹۳۹ء)۔ جمہور مفسرین کا یہی مذہب ہے کہ سورۃ براءۃ مستقل سورت ہے اور اس کے ناموں کی کثرت بھی اسی بات پر دلالت کرتی ہے (نیز رک بہ الانفال)۔ براءۃ آنحضرتؐ کی زندگی کے آخری بسوں میں نازل

ہونے والی سورتوں میں سے ہے، کچھ حصہ غزوة تبوک (رک بان) میں اور کچھ بعد میں نازل ہوا۔ اس سورت کا آغاز براءۃ مِن اللّٰهِ وَرَسُولِهِ اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ سے ہوتا ہے یعنی اللہ اور اس کا رسول ان مشرکوں کے معاہدات سے بری الذمہ ہیں جن سے تم (مسلمانوں) نے معاہدہ کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ مسلمانوں نے عہد نبوی میں مشرکین مکہ اور دوسرے مشرکین سے مختلف معاہدے کیے تھے، بعض معاہدوں میں مدت کا بیان تھا اور بعض مطلق، یعنی بغیر کسی بیان مدت کے تھے۔ اس آیت میں ان عہد والوں سے براءت یعنی ذمے داری سے دست برداری کا اعلان کیا گیا ہے جن کا عہد مطلق بدون قید مدت تھا، یا جن سے چار مہینے سے کم مدت تک عہد تھا۔ ایسے مشرکوں کے لیے چار ماہ کی ميعاد دی گئی ہے۔ البتہ جن کے ساتھ اس سے زائد کسی مدت معلومہ تک عہد تھا ان کا عہد اسی مدت تک باقی رہا، جیسا کہ ارشاد فرمایا: فَاتِمُوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مَدَّتِهِمْ (۹ [التوبة] : ۴) = جس مدت تک ان سے عہد کیا ہے اسے پورا کرو۔ البتہ جن کا عہد چار ماہ سے زائد مدت معلومہ تک تھا اور انہوں نے کسی شرط کو توڑ کر بد عہدی کی تو ان کا عہد بھی باطل ہو گیا۔ اصحاب عہد کو اجازت دی گئی کہ وہ چار مہینے امن سے چلیں پھر اس سے چاروں مہینے مسلسل تھے یعنی گیارہویں ذوالحجہ سے لے کر ربیع الآخر کی دسویں تاریخ تک۔ یہ مدت اس لیے دی گئی تھی کہ مشرکین اپنے بارے میں فیصلہ کر سکیں کہ انہیں اپنے مشرکانہ عقائد پر قائم رہنا ہے یا توحید کی نعمت سے بہرہ مند ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہونا ہے۔ چونکہ بیت اللہ اسلام کا مرکز اور دارالسلام تھا اس لیے

کی کوئی وجہ نہ تھی اور یہ چار ماہ کی مدت اپنے معاملات سے فارغ ہونے کے لیے بہت کافی تھی۔  
 نو ہجری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بیت اللہ کو روانہ کیا، بعد میں مشرکوں پر اتمام حجت کی خاطر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو بھی سورۃ براءۃ کے اعلان کے لیے روانہ فرما دیا، کیونکہ عربوں کا یہ دستور تھا کہ عہد کی تسیخ کا پیغام سردار قبیلہ خود سنائے یا اس کے گھر کا کوئی فرد۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ نے منیٰ میں قربانی کے دن (یوم النحر) یہ اعلان کر دیا کہ کوئی کافر جنت میں داخل نہیں ہوگا، کوئی مشرک اس سال کے بعد حج نہیں کرے گا، کوئی شخص عربیاں حالت میں خانہ کعبہ کا طواف نہیں کرے گا، اور جس کسی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد تھا اس کا عہد اس کی مدت تک قائم رہے گا۔ اس اعلان میں کسی قسم کی بد عہدی یا عہد شکنی کا شائبہ تک نہیں ہے کیونکہ یہ اعلان ہزار ہا مسلمانوں اور مشرکوں کے اجتماع میں کھلے بندوں کیا گیا تا کہ ہمیشہ کے لیے ان دشمنان اسلام کی شرارتوں کا سد باب کر دیا جائے۔ پھر اسے فوری طور پر نافذ العمل قرار نہیں دیا بلکہ چار ماہ کی مدت مقرر کر دی گئی، تا کہ ہر آدمی بسہولت اپنی راہ متعین کر کے اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے انتظامات بھی کر سکے، چنانچہ آئندہ سال دس ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر کوئی مشرک شامل حج نہ تھا۔ یہ بھی مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براءۃ کے بعد کسی مشرک سے معاہدہ نہیں کیا۔

اس سورت میں یہ بھی فرمایا کہ حاجی لوگوں کی مہمان نوازی اور مسجدوں کی تعمیر کوئی اتنی بڑی بات نہیں؛ اصل چیز اللہ کی راہ میں جانی و

مالی قربانی پیش کرنا ہے۔ اسلام کے خلاف اہل کتاب کی سازشوں اور شرارتوں کے ذکر کے بعد غلبۃ اسلام کی پیش گوئی فرمائی۔ اسی سورت میں منافقوں کا کردار طشت از بام کیا گیا ہے اور ان کی ایک ایک حرکت منافقانہ کا ذکر کیا ہے، مسجد ضرار کی وضاحت فرمائی ہے۔ جہاد کے احکام کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے تاکید فرمائی ہے کہ جب کفار، مشرکوں، منافقوں اور دیگر بد عہدی کرنے والے قبائل سے جنگ چھڑ جائے تو خوب ڈٹ کر مقابلہ کرو اور دشمنوں پر کاری ضرب لگاؤ۔ نیز فرمایا کہ خدمت دین قرب الہی کا ذریعہ ہے اور سورت ختم کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حقیقی منصب بتایا کہ آپؐ تو تمہارے بڑے خیر خواہ ہیں، تمہاری تکلیف آپؐ پر شاق گذرتی ہے، آپؐ اتنے شفیق و مہربان ہیں کہ چاہتے ہیں کہ تم لوگوں کو ہلاکت و بربادی سے نجات دلائیں۔

وَأَخَذَ: بِذِيْلِ سُوْرَةِ بَرَاءَةِ: (۱) الطَّبْرِي: تَفْسِيْر: (۲)  
 ابْنِ كَثِيْر: تَفْسِيْر: (۳) الزَّمَخْشَرِي: الكَشَاف: (۴) تَفْسِيْر  
 المِرَاغِي: (۵) القَاسِمِي: تَفْسِيْر القَاسِمِي، ۸: ۳۰۶۰  
 بَعْد، مِصر: (۶) السِّيُوْطِي: لِبَابِ النُّقُوْلِ: (۷) امِيْر عَلِي:  
 مَوَاهِبِ الرِّحْمَنِ، ۱۰: ۴۹: بَعْد: (۸) لِسَانِ الْعَرَبِ: (۹)  
 مَفْرَدَات: (۱۰) السَّجِسْتَانِي: غَرِيْبِ الْقُرْآنِ، بِذِيْلِ مَادَّةِ  
 ب ر ه: (۱۱) امِيْن دُوِيْدَار: صُوْرٌ مِّنْ حَيَاةِ الرِّسُوْلِ،  
 ۵۷۶ تا ۵۸۴، مِصر ۱۹۵۸ء: (۱۲) ابْنِ هِشَام، ۴: ۱۸۸:  
 (۱۳) ابْنِ سَعْد، ۱/۲: ۱۲۱: (۱۴) الطَّبْرِي: تَارِيْخ، ۳:  
 ۱۵۴: (۱۵) ابْنِ كَثِيْر: البَدَايَةِ وَالنِّهَايَةِ، ۵: ۳۶: (۱۶)  
 ابْنِ الْقِيَمِ: زَادُ الْمَعَادِ، ۳: ۲۵: مِصر ۱۳۴۷ھ: (۱۷)  
 المَقْرِيْزِي: اَمْتَاعُ الْأَسْمَاعِ، ص ۴۹۸: (۱۸) تَارِيْخ  
 الخَمِيْسِ، ۲: ۱۴۱: (۱۹) البَغَارِي، كِتَابُ التَّفْسِيْرِ،  
 تَفْسِيْر سُوْرَةِ بَرَاءَةِ: (۲۰) التَّرْمِذِي، ابْوَابُ تَفْسِيْرِ الْقُرْآنِ،  
 بَابُ سُوْرَةِ التَّوْبَةِ.

(عبدالقيوم)



اور ان میں باہمی ازدواج کا سلسلہ شروع ہوا اور عیسائیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی آبادی بڑھ گئی۔ پھر جب سلیم اول نے مصر فتح کیا اور بوسنیائی Bosnia پلٹنوں (جنہیں مقامی لوگ غز کہتے ہیں) کے فوجی اڈے اسوان، ابریم اور سائی میں قائم ہو گئے اور برابرہ کا علاقہ ایک "کاشف" کے تحت کر دیا گیا تو پھر بھی ایک دوسرے سے باہمی مناکحت اور نوبی زبان اختیار کر لینے کے باوجود انیسویں صدی تک غز کا جداگانہ وجود قائم رہا۔ اٹھارہویں صدی میں شمال کے برابرہ ہوارہ کے طاقتور شیخ حمام ابو یوسف کے زیر اقتدار تھے۔ محمد علی پاشا کے سوڈان پر حملے کی تیاری کے وقت برابرہ کا علاقہ (برابرہ "کاشف لک") تین بھائیوں کے قبضے میں تھا اور ان کا صدر مقام درتھا، اسوان، ابریم اور سائی کی غز آبادیاں اپنے اپنے آغا کے ماتحت تھیں۔ محمد عثمان المیرغنی نے، جو سلسلہ ختمیہ کا بانی ہے، محمد علی پاشا کی فتح سے چند سال پہلے اسوان سے دنقلہ کا سفر کیا، جہاں بہت سے لوگ ان کے مرید ہو گئے۔ برابرہ جس علاقے میں بستے ہیں وہاں کی مفلوک الحالی انہیں گھر بار چھوڑ کر باہر جانے پر برابر ابھارتی رہی ہے؛ چنانچہ سولہویں صدی کے اندر نیل ازرق (Blue Nile) پر محسی نوآبادیاں قائم ہو چکی تھیں، یہ لوگ اپنی دینداری کے لیے مشہور تھے اور انہوں نے قرآنی مدارس قائم کر رکھے تھے۔ اکثر بربری سیاحوں کی یادداشتوں سے پتا چلتا ہے کہ اٹھارہویں صدی سے بربری ملازم قاہرہ میں موجود تھے۔

مآخذ (۱) H.A. MacMichael: *A History of*

*the Arabs in the Sudan*، کیمبرج ۱۹۲۲ء: ۱۲ تا ۳۳،

۱۰۰ تا ۱۹۰، اور بمدد اشاریہ؛ (۲) J.S. Trimingham:

*Islam in the Sudan*، لندن ۱۹۴۹ء، ان دونوں

برابرہ: (جو اصل میں برابرہ ہے، مفرد بربری) نوبی زبان بولنے والے مسلمان، جو دریائے نیل کے کناروں پر پہلی اور تیسری آبشار کے درمیان بستے ہیں۔ برابرہ میں کنوز، سکوت اور محس بھی شامل ہیں، لیکن عام طور پر یہ لوگ خود اپنے لیے برابرہ کا نام استعمال نہیں کرتے؛ چنانچہ لین Lane (۱: ۱۷۷، عمود ۲) کا خیال ہے کہ اس لفظ کا اطلاق، جسے شروع کے مصنفین مغرب کے بربر قبائل کے لیے کرتے تھے، بہت آگے چل کر بلکہ حال ہی میں ان لوگوں پر ہونے لگا اور اب تک ہو رہا ہے، دنقلہ [رک باں]، جو تیسری آبشار کے بالائی علاقے میں رہتے ہیں، زبان اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے کنوز سے ملتے جلتے ہیں لیکن اپنے آپ کو برابرہ میں شمار نہیں کرتے۔ آج کل جس علاقے میں برابرہ آباد ہیں پہلے یہ مقررہ [= مقررہ] کی نوبی عیسائی سلطنت کا شمالی حصہ تھا، جس کا ۵۳۱ / ۶۵۲ء میں عبداللہ بن سعد سے ایک عہد نامہ ہو گیا تھا۔ عربوں کی نوآبادی یہاں ۸۶۹ء میں اس وقت شروع ہوئی جب بنو ربیعہ ترک وطن کر کے یہاں آئے اور اسوان کے علاقے میں بس گئے۔ ۱۰۰۶ء میں جب ابورکوحہ کو شکست ہوئی تو کہتے ہیں کہ فاطمی خلیفہ الحاکم نے اسوان میں بنو ربیعہ کے شیخ کو کنزالدولہ کا خطاب دیا

(المقریزی: البیان والإعراب عما بارض مصر من الأعراب، طبع و ترجمہ از El. Macrizi's: *Wüstenfeld Abhandlung über die in Aegypten eingewanderten arabischen Stämme*، در *Göttinger Studien*، ۲ / ۷: ۳۳۳ - ۳۳۵، ۳۷۵، *Göttingen* ۱۸۳۷ء)۔ یہی وجہ ہے کہ اس علاقے کے آس پاس کے برابرہ جو عربوں اور نوبیوں کی اولاد ہیں بنو کنز یا کنوز کہلانے لگے۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی میں مقررہ کی سلطنت کا عربوں کے دباؤ کے باعث خاتمہ ہو گیا

مخصوص فرمان بھی جس کی رو سے اجراء برات کا حکم دیا جاتا تھا۔ اسی بنا پر ہمیں تمہیدات برات میں ایک اصطلاح "الی امر لکو" [اولو الامر] ملتی ہے یعنی وہ جس کے ہاتھ میں اجراء برات سے متعلق حکم ہو۔ لفظ حکم (حکم) ہمیشہ عمومی قسم کے فرمان کے معنوں میں آتا ہے، لیکن اس سے مخصوص قسم کا فرمان بھی مراد لیا جاتا تھا، جس کی دستاویزات پر حکومت علیحدہ ذرروائی لرتی تھی اور جن کا اندراج آج کل ترکی محافظ خانوں (archives) میں ایک علیحدہ شق کے طور پر ہوتا ہے (احکام دفتر لری)۔ نشان سے بلا قید موضوع ایسے تمام احکام مراد لیے جاتے تھے جن میں طغری (نشان) بنا ہوا ہو۔ لیکن دسویں / سولہویں صدی سے وہ احکام خاص طور پر اس نام سے موسوم ہوئے جو سلطنت کا اعلیٰ ترین محکمہ مالیات (دفتر خانہ) مرتب کرتا تھا اور جو مالی معاملات سے متعلق ہوتے تھے۔ نشان کی مترادف اصطلاح توقیع (= توقیع) تھی۔ یہ بلا کسی مزید قید کے ایسی دستاویزات کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی جو توقیع کے ساتھ جاری کی گئی ہوں (ان کے ہم معنی ہونے کا ثبوت ان دونوں لفظوں سے بنے ہوئے لفظ توقیعی اور نشانچی سے ملتا ہے، جو ہم معنی ہیں)۔ کسی زیادہ اونچے درجے کے حکم کے لیے نادر استعمال الفاظ مشور، مثال اور ارادہ (صرف انیسویں صدی سے) مستعمل تھے۔ برات کا ایک محدود مفہوم بھی تھا، یعنی "عطیے کی دستاویز" یا "کسی عہدے پر تقرر کا فرمان"۔ حکومت کے اداروں میں اس قسم کے فرامین پر کزروائی بھی علیحدہ ہوتی تھی۔ بعض مرکزی دستاویزات کے ناموں میں اس کی یاد باقی ہے، مثلاً "روہ بن برات دفتر لری" یعنی "پن براتوں کا دفتر"۔ جنہوں نے جو بیانیہ کیا سے متعلق مسائل کے

تصانیف میں ماخذ کا بہ کثرت ذکر ہے۔ انیسویں صدی کے اوائل کے برابرہ کے لیے دیکھیے: J.L. Burckhardt (۳): *Travels in Nubia*, لندن ۱۸۱۹ء۔

(P.M. HOLT)

\* برات: [بعض علما کے نزدیک یہ لفظ عربی کے لفظ براءۃ کی بگڑی ہوئی شکل ہے (دیکھیے فرہنگ اندراج بذیل مادہ برات و براءت)۔ خوارزمی نے مفاتیح العلوم میں لکھا ہے البراءۃ حجتہ بیدلہا الجہیز و الخازن للمؤدی بما نؤتید الیہ (دیکھیے بذیل مادہ) لیکن یہ امر تحقیق طلب ہے اور ممکن ہے کہ فارسی الاصل ہو]۔ فارسی میں اس کے معنی حکم اعطای روزینہ نیز حکم یا اجازت نامہ ہے، اردو میں بمعنی عہدہ، بخرہ، قسمت، نصیب، بھاجی ہے (فرہنگ آصفیہ، بذیل مادہ)۔ ترکی یا غیر زبانوں کے کئی اور الفاظ بھی اس مفہوم میں مستعمل تھے، مثلاً ترکی الفاظ: پتی، بزیغ، بیورولدو، عربی الفاظ: امر، حکم، توقیع، مشور، مثال، ارادہ اور فارسی الفاظ: فرمان، نشان۔ ان میں سے بعض الفاظ آل عثمان کے عہدے میں استعمال ہوتے رہے اور بعض صرف جز خاص ادوار میں۔ اسی طرح ان میں سے بعض ایک عام مفہوم میں اور بعض صرف کسی مخصوص و محدود مفہوم میں مستعمل رہے۔ ایک ہی دستاویز میں "فرمان سطانی" کے لیے کسی الفاظ استعمال کیے جا سکتے تھے اور ان سے وسیع مفہوم میں کوئی فرمان بھی مراد لیا جا سکتا تھا اور مخصوص و محدود مفہوم میں بھی کوئی خاص فرمان۔

فرمان سطانی کے معنوں میں پتی کا لفظ ۱۵۰۰ء کے بعد زیادہ مستعمل نہیں رہا۔ امر [امر] = امر سے جو چاروں تک مستعمل رہا صرف سلطان کے نام سے جاری شدہ ایک عام فرمان ہی مراد نہیں لیا جاتا تھا بلکہ ایک خاص



تیمار کی جاگیروں کے انتظامات کے سلسلے میں استعمال ہونے والی بہت سی تعبیرات کا لفظ برات خاص طور پر ایک جزو بن گیا، مثلاً ”برات عالی شان ایچوں تذکرہ ویرلدی“ یعنی حکم (سند) المعروف بہ تذکرہ جو کسی اعلیٰ برات کے اجرا کے لیے دیا گیا، ”برات شریفم ویرلمک فرمانیم اولمغین“ یعنی از انجا کہ ایک اعلیٰ برات کے اجرا کے لیے میں نے اپنا شاہی فرمان جاری کر دیا ہے، ”تذکرہ برات اترمک“ یعنی دستاویز المعروف بہ تذکرہ کا تبادلہ برات سے کرنا، ”تجدید برات اولنمق بابتہ خط ہمایوں صادر اولمغین“ یعنی چونکہ تجدید برات کے لیے فرمان سلطانی صادر ہو گیا ہے (ایسی کارروائی کا حکم عموماً سلطان کی تخت نشینی کے بعد جاری کیا جاتا تھا [یعنی ہر سلطان تخت نشینی کے بعد از سر نو براتوں کی تقسیم یا تجدید کرتا تھا، دیکھیے اول، ترکی، بذیل مادہ])، ”الی براتلی“ یعنی برات کا ہاتھ میں ہونا (یہ ترکیب مذکورہ بالا الی امرلو کے ہم معنی ہے)، ”اہل برات“ یعنی جس کے پاس کوئی برات ہو۔ سرکاری دستاویزات میں اکثر اجرا شدہ برات کے حوالے بھی ملتے ہیں۔ تاہم اکثر اوقات عطایا کی دستاویزات میں لفظ برات استعمال نہیں ہوتا تھا اور اس کے مضمون ہی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ یہ بیک وقت برات ہے بھی یا نہیں۔

عطیے کے چھوٹے یا بڑے ہونے کے مطابق برات کی دستاویز سادہ یا زیادہ پر تکلف ہوتی تھی لیکن یہ ہمیشہ دیوان کی طرز میں لکھی جاتی تھی اور اس کے اجزائے ترکیبی اور ان کی ترتیب بھی عموماً وہی ہوتی تھی۔ دعائیہ کلمات اور طغری کے بعد، جو عبارت متن سے خارج ہوتے تھے، متن کا آغاز دو طریقوں سے ہوتا: ایک میں رسمی آداب

بارے میں جاری ہوئے۔ ”کتولک برات دقتری“ وغیرہ (مدحت سرت اوغلو: محتوی باقمندن باش وکالت ارشیوی *Muhteva bakimindan Başvkâlet Arşivi*، ص ۲۹، ۳۲)۔

چونکہ سلطنت عثمانیہ میں تمام عطیات کا مصدر سلطان تھا اس لیے برات ہمیشہ سلطان کے نام سے جاری ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ”شریف“ یا ”ہمایوں“ کی صفت بھی ہمیشہ استعمال کی جاتی تھی۔

سلطنت عثمانیہ کے تمام تقررات ”عطیے“ کے ذریعے ہی ہوتے تھے، خواہ ان کا مشاہرہ وقتی طور پر کسی جاگیر کی ملکیت سے ہو یا نقد روپے کی صورت میں ادا کیا جاتا ہو۔ چنانچہ غیر فوجی ملازمتوں میں تمام تقررات خواہ وہ پاشا ایسے اعلیٰ منصب کے لیے ہوں یا مسجد کے کسی ادنیٰ درجے کے خادم کے لیے، برات ہی کے ذریعے عمل میں آتے تھے۔ شام کے اسقفوں کو بھی بارگاہ سلطانی سے اجازت نامے برات کی صورت ہی میں ملتے تھے (اول، طبع اول، ص ۶۷۸، بذیل مادہ براءۃ)، حتیٰ کہ سلطنت کے باجگذار، مثلاً ٹرانسلوینیا کے فرمانروا، اپنی ریاست میں برات ہی کے ذریعے تسلیم کیے جاتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے نام جاری ہونے والی سند کے مضمون میں اس قسم کی عبارت کا اضافہ کر دیا جاتا تھا ”بو برات ہمایوں و عہدنامہ صدیق مشحون ویردم“ یعنی میں نے یہ شاہی برات اور عہد نامہ صدق جاری کیا۔ اس طرح برات کے نام سے بہت بڑی تعداد میں احکام جاری ہوتے تھے جن کی تقسیم ان کے مضمون کے اعتبار سے کی جا سکتی تھی: وزیر لک براتی، تیمار براتی، مالکانہ براتی، التزام براتی اور اگر برات کسی جماعت کے فائدے کے لیے جاری ہوتی تو اوجاق لبق براتی وغیرہ۔

دفتر کے کسی آدمی کا۔ دستاویز کے آخر میں کاغذ کے بائیں کونے پر مقام اجرا درج ہوتا تھا (بمقام، یا اگر سلطان میدان جنگ میں ہوتا تو بیورت)۔

برات کی تحریر کے لیے کچھ رقم ادا کرنا پڑتی تھی (رسم برات)۔ ہمیں جو معلومات میسر ہیں ان سے یہ پتا نہیں چلتا کہ اس کی سرکاری شرح کیا تھی، لیکن جو متعدد نظیریں ملتی ہیں ان کی رو سے نسبتاً کم قیمت عطیات کی صورت میں یہ رقم ایک اور تین فی صد کے مابین گھٹی بڑھتی رہتی تھی (دیکھیے Laszlo Velics و A magyarországi török kincstári : Ernó Kammerer defterek، ج ۱ و ۲، بوڈا پست ۱۸۸۶ و ۱۸۹۳ء)۔

فارسی کی دستاویزات عطیات کی بنا پر، جن کی تعداد اور بھی کم ہے (Makar Khubča : Persidskoe firiaki i ukazi Muzeya Gruzii، ج ۱، تفلس ۱۹۴۹ء؛ Gruzinopersidskie istoričeskie : B. S. Puturidze dokumenti، تفلس ۱۹۵۵ء؛ A. D. Papasiyak : Persidskie dokumenti Matekadaraka، ج ۱، Erivan ۱۹۵۶ء)۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے اجزائے ترکیبی اور بیشتر جملے بھی ایسے ہوتے تھے جیسے ترکی برات میں۔ لیکن ان میں لفظ برات استعمال نہیں ہوتا کیونکہ جب یہ لفظ فارسی میں استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنی وہ نہیں رہتے جو ترکی میں ہیں۔

مآخذ : برات کے بارے میں معلومات کے لیے دیکھیے :

- (۱) Einführung in die osmanisch-türkische : L. Fekete  
 'Diplomatik der türkischen Botmässigkeit in Ungarn'  
 بوڈا پست ۱۹۲۸ء، ص ۴۶ تا ۴۷؛ (۲) اسمعیل حتی  
 اوزن چارشیلی : طغری و پنچہ لر 'Tugra ve pençeler'  
 Belleten، شماره ۱۷/۱۸، انقرہ ۱۹۴۱ء؛ (۳) وہی  
 مصنف : عثمانلی دولتک سرای تشکیلاتی، انقرہ ۱۹۴۵ء،  
 ص ۲۸۴؛ (۴) اول، ترکی، ۲ : ۵۲۳ تا ۵۲۴؛ (۵) مدحت

سے زیادہ کام لیا جاتا، "نشان شریف عالی شان سلطانی . . . حکمی اولدر کہ" یعنی اعلیٰ حضرت سلطان والا شان کا نشان . . . جس کا حکم یہ ہے کہ؛ دوسرا انداز نسبتاً سادہ ہوتا تھا، "سبب تحریر حروف اولدر کہ" یعنی اس دستاویز کے لکھنے کا سبب یہ ہے کہ۔ رسمی انداز کی دستاویز میں سلطان مخصوص ایرانی طرز کی تعبیرات استعمال کرتا تھا، یعنی یہ کہ "اس اختیار کی بنا پر جو ذات باری کی طرف سے اسے ملا ہے وہ اپنی وفادار رعایا کو نوازنا اپنا فرض تصور کرتا ہے، لہذا اس معینہ تاریخ سے وہ اپنی رعایا کے ایک فرد (یہاں اس کا نام مذکور ہوتا تھا) کو فلاں عہدہ یا ملازمت یا ملکیت عطا کرتا ہے"۔ اگر کسی عہدے یا ملازمت کے ساتھ بعض جاگیریں بھی وابستہ ہوتی تھیں (اور بسا اوقات صورت یہی ہوتی تھی) تو یہاں ان کی تشریح کر دی جاتی تھی (ذکر و شرح و بیان اور)۔ یہ شرح و بیان خارجی اعتبار سے متن کا سب سے نمایاں حصہ ہوتا تھا، اس کے لیے دفتری خط (خط سیاقت) استعمال ہوتا تھا، جس میں معمولی عربی ہندسے لکھے جاتے تھے اور وہ دستاویز کا الگ جزو بن جاتے تھے۔ اس کے بعد متعلقہ عام باشندوں کے لیے مناسب تنبیہ کے کلمات ہوتے کہ وہ "نامبرده" کو صوباشی یا سنجاق بیگی وغیرہ کی حیثیت سے تسلیم کریں؛ پھر خاتمے پر سلطان کے احکام کی یہ عام عبارت لکھی جاتی تھی کہ "ہر شخص یہ احکام تسلیم کرے اور نشان سلطانی یعنی طغری پر اعتبار کرے"۔ بعض صورتوں میں دستاویز برات پر تاریخ کا اندراج نہ ہوتا اور بعض میں ہوتا تھا تو متن سے مختلف لکھائی میں کسی اور شخص کے ہاتھ کا لکھا ہوتا، یعنی تاریخچی قلمی (شعبہ اندراج تاریخ) نامی



کرنے کا حق اور اہم قانونی، مالی اور تجارتی مراعات مل جاتی تھیں اور برات لی کئی پابندیوں سے مستثنیٰ قرار پاتے تھے۔ ان عطیات سے عثمانی ذمیوں کو غیر ملکی (مستامن) تاجروں کے ساتھ، کم و بیش مساوی سطح پر، مقابلہ کرنے کا موقع مل گیا اور اس سے ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جسے مراعات حاصل تھیں اور جو اور وہ تجارتی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس طبقے میں یونانیوں نے خاص امتیاز حاصل کر لیا کیونکہ انہیں بحری سفر کی مہارت تھی اور دیگر مواقع حاصل تھے۔ مزید برآں نپولین کی جنگوں کے زمانے میں ایک مدت تک وہ اپنے جہازوں پر غیر جانبدار سلطنت عثمانیہ کا جھنڈا استعمال کر کے بھی فائدے میں رہتے تھے۔ انیسویں صدی کے شروع شروع میں مسلمان سوداگروں کے لیے بھی مراعات کی توسیع کر دی گئی؛ چنانچہ وہ بارہ سو پیاسٹر رقم ادا کرنے پر تاجروں کی ایک اسی قسم کی انجمن خیریتہ تجارتی کے رکن بن سکتے تھے۔ مگر جن لوگوں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھایا ان کی تعداد بہت کم تھی۔ تنظیمات کے نفاذ کے بعد یہ انجمن اور مذکورہ نام دونوں متروک ہو گئے۔

مآخذ: (۱) جودت: تاریخ، ۶: ۱۲۹ تا ۱۳۰؛  
(۲) عثمان نوری: مجلہ امور بلدیہ، ۱، استانبول ۱۹۲۲ء؛  
۶۷۵ تا ۶۸۹؛ (۳) M.Z. Pakalm: عثمانی تاریخ دیملری و ترملری سوز لوغو Osmanli Tarih Deyimleri ve Terimleri Sözlüğü، استانبول ۱۹۳۶ء، بعد ۱۱۰: ۱۱۵ تا ۱۱۷، ۷۸۰ تا ۷۸۳؛ (۴) Bowen و Gibb، ۱/۴: ص ۳۱۰ تا ۳۱۱۔

(B. LEWIS)

- براتا: بغداد قدیم کے ایک محلے کا نام، جو شہر کے مغربی حصے میں محلہ باب مغول کے جنوب میں واقع تھا اور ابتدا میں بغداد قدیم سے

سرت اوغلو: محتوی باقمدن ہاش وکالت ارشیوی، انقرہ ۱۹۰۰ء؛ (۶) متون برات (کتب انشاء کے متون پر مبنی) احمد فریدوں نے منشآت السلاطین میں شائع کیے؛ (۷) Friedrich Kraelitz، در TOEM، ۰: ۲۳۶؛ (۸) Le Monde Oriental: Franz Babinger (چربی)، ۱۳ (۱۹۲۰ء): ۱۱۰؛ (۹) L. Fekete: کتاب مذکور؛ (۱۰) L. Kulisch: Mitteilungen der Ausland-Hochs-، ۲ Abt.، ۳۱ Jg، chule an der Universität Berlin، Westasiatische Studien، ص ۱۲۰؛ (۱۱) Gibb و Bowen، ج ۱ و ۲، ۱۹۰۰ تا ۱۹۰۷ء، بمدد اشارہ؛ (۱۲) فرهنگ اند راج، بذیل مادہ؛ (۱۳) فرهنگ آصفیہ، بذیل مادہ: [

(L. FEKETE)

برات لی: بمعنی صاحب برات، جسے برات دی گئی ہو۔ اٹھارہویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں یہ لفظ سلطنت عثمانیہ کی ایسی غیر مسلم رعایا کے لیے استعمال ہوتا تھا جن کے پاس معقول تجارتی اور مالی مراعات کی برات ہوتی تھی۔ یہ براتیں یورپ کے سفارت خانے اپنے امتیازی حقوق (Capitulations) سے ناجائز فائدہ اٹھا کر تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ ابتدا میں یہ مقامی طور پر بھرتی کیے ہوئے قنصل خانوں کے عمال اور گماشتوں کے لیے ہوتی تھیں، لیکن بعد ازاں یہ مقامی سوداگروں کے ہاتھ، جن کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی، فروخت یا عطا کی جانے لگی، اور اس طرح انہیں امتیازی اور زیر حفاظت جماعت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ عثمانی حکام نے یہ کاروبار ختم کرنے کی سعی کی؛ چنانچہ اس صدی کے آخر میں سلیم ثالث نے یورپی قنصل خانوں کے مقابلے میں مقامی عیسائی اور یہودی تاجروں کو براتیں خود جاری کرنا شروع کر دیں۔ پندرہ سو پیاسٹر ادا کرنے پر ان براتوں کے ذریعے یورپ سے تجارت

کوئی تین کیلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔

بغداد کی تعمیر سے پہلے براٹا ایک گاؤں تھا۔

بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علی رضی

ابن ابی طالب اس گاؤں سے گزرے تھے اور آپ نے

اسی جگہ جہاں بعد میں مسجد بنائی گئی نماز

پڑھی تھی۔ براٹا ایک سریانی لفظ *Baraytha*

سے مشتق ہے، جس کے معنی "بیرونی" کے ہیں۔ کئی

اہل علم و فضل البرائی کی نسبت سے مشہور ہیں۔

مآخذ: (۱) یاقوت، ۱: ۵۳۲ تا ۵۳۳؛ (۲)

مرصد، قاہرہ ۱۹۵۴ء، ۱: ۱۷۴؛ (۳) الصولی: أخبار

الراضی والتمقی (طبع Dunne)، قاہرہ ۱۹۳۵ء، ص ۱۳۶،

۱۹۲، ۱۹۸، ۲۸۵ (فرانسیسی ترجمہ از M. Canard،

الجزائر ۱۹۴۶ تا ۱۹۵۰ء، بمدد اشاریہ)؛ (۴) الخطیب

البغدادی: تاریخ بغداد (مقدمہ مشتمل بر ذکر مقامات)

(طبع Salmon)، پیرس ۱۹۰۴ء، ص ۱۱۶ تا ۱۱۷، ۱۳۸

تا ۱۵۱، ۱۶۸؛ (۵) ابن حوقل، ص ۲۴۱؛ (۶)

الیعقوبی: البلدان، ص ۲۴۴؛ (۷) ابن الجوزی: مناقب

بغداد (طبع الاثری)، بغداد ۱۳۴۲ھ، ص ۲۱، ۲۲؛ (۸)

احمد حامد الصراف: الشبک، بغداد ۱۹۵۴ء، ص ۲۷۰

تا ۲۸۱؛ (۹) علی بن الحسن الاصبہانی: تاریخ

مسجد براٹا، بغداد ۱۹۵۴ء، ص ۲۱؛ (۱۰) G. LeStrange:

*Baghdad during the Abbasid Caliphate*

اوکسفرڈ ۱۹۰۰ء، ص ۱۵۳ تا ۱۵۶، ۳۲۰؛ (۱۱)

*Babylonien nach den Arab. Geographen: Streck*

۱: ۵۲، ۷۱، ۹۰، ۹۴ تا ۹۵، ۱۵۲ تا ۱۵۳؛ (۱۲)

*Die Aram Fremdwörter in Arab: Fränkel*

ص xx.

(G. AWAD)

\* **برادوست:** (برادوست) کردوں کے دو ضلعوں

کا نام، ان میں سے ایک جنوب کی جانب آشنو،

رایت اور رواندوز کے درمیان ہے، جس کا بڑا شہر

کانی رش ہے۔ یہ شہر ایک چٹان کی چوٹی پر

واقع ہے، جس کی بلندی ۴۳۷۲ فٹ ہے۔ اس ضلع

کی شمالی سرحد گردی (شمڈینان)، مغربی سرحد شروان

اور مشرقی سرحد بلباس سے جا ملتی ہے۔ قندیل کا

پہاڑی سلسلہ (C.J. Edmonds، ص ۲۴۴، حاشیہ)

اس ضلع کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

زاب خرد (لاون، اس کے بعد ایرانی علاقے میں کلو)

کے سرچشمے اس علاقے میں واقع ہیں۔ کلی شین

کی مشہور آرٹو (لاٹ) بھی یہیں ہے اور اس نام

کے درے پر واقع ہے۔ اس کے علاوہ ایک برا دوست

اور بھی ہے، جو صومای برادوست کہلاتا ہے،

یہ شمال کی جانب ترگور اور قوتور کے درمیان

واقع ہے اور اس کا صدر مقام چہریک قلعہ ہے

(B. Nikitine، ص ۷۹، ۲۶۳)۔ یہی وہ مقام

ہے جہاں [علی محمد] باب کو تبریز میں قتل

کیے جانے سے پہلے محبوس کیا گیا تھا۔ برادوست

کی ابتدائی تاریخ ہمیں اچھی طرح معلوم نہیں۔

زکی M. E. Zaki (تاریخ، ص ۳۸۸، ۳۸۹) کے

بیان کے مطابق اس ریاست کے بانی آل حسن ذیہ

(۳۳۸ھ / ۹۵۹ء تا ۴۰۶ھ / ۱۰۱۵ء) یعنی

ناصر الدولہ بدر اور اس کے تین بیٹے تھے۔ اس خاندان کا

سب سے زیادہ مشہور امیر غازی قران بن سلطان احمد

تھا۔ شروع میں اس نے شاہ اسمعیل [صفوی]

کی مخالفت کی، لیکن آگے چل کر دونوں کے

تعلقات درست ہو گئے؛ چنانچہ شاہ نے اسے

غازی قران کا لقب عطا کیا اور ترگور صومای اور دول

کے اضلاع بطور اقطاع دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ

بہادر امیر جنگ چالڈیران (۵۹۲ھ / ۱۵۱۴ء) تک

اپنے داخلی امور میں خود مختار رہا اور اس کے بعد

دوسرے کرد امیروں کی طرح وہ بھی عثمانی سلطان

کے ساتھ مل گیا۔ سلطان نے اس کی قدر دانی کی اور

اسے اربل، بغداد اور دیار بکر کی ولایتوں میں

بہت سے اضلاع عطا کیے۔ امارت صومای کی بنیاد



قتل کروا دیا۔ کچھ عرصے کے لیے صیقلو جہیل اربہ کے مغرب میں واقع تمام علاقے کا مالک رہا، لیکن ۱۹۲۲ء میں ایرانی حکومت نے ایک نادیبی مہم بھیج کر اسے اس علاقے سے نکال دیا۔ اس نے رواندوز کے قریب پناہ لی اور کچھ دن بعد ایران واپس آئے اور اپنا اقتدار دوبارہ قائم کرنے کی سوس کی، مگر اشنو کے قریب قتل کر دیا گیا (C. J. Edmonds، ص ۲۵۲، ۳۰۵، ۳۱۳، ۳۱۵، ۱۳۶۷)۔ برادوست کے بڑے بڑے قبیلوں میں اس نام کا قبیلہ اپنی اہمیت کھو بیٹھا ہے۔ آج کل قبیلہ بالکی جنوب میں سب سے زیادہ طاقتور ہے، جس کے تقریباً دس ہزار گھرانے ہیں۔ ان کا علاقہ، جو تینوں کے پہاڑی سلسلے کے اندر ہے، دشوار گزار ہے۔ اس کا مرکز سہر زایت ہے۔ پہلے یہاں امیر سہران کو غلبہ حاصل تھا؛ اس کا معمول تھا کہ ہر گھرانے میں سے ایک آدمی کو اپنی فوج میں بھرتی کر لیتا تھا۔ جب سہران کا خاندان ختم ہو گیا تو اس قبیلے نے دوبارہ اپنی خود مختاری حاصل کر لی، جو آج تک (۱۹۵۶ء) برقرار ہے۔ اس کا موجودہ سردار عزیز بک ہے (ایم۔ ای۔ زکی: خلاصہ، ص ۳۹۲)۔ شمال میں شقاق سب سے بڑا قبیلہ ہے، جس کے گھرانوں کا شمار دو ہزار کے قریب ہے (ایم۔ ای۔ زکی: خلاصہ، ص ۳۱۳)۔ بقول تاریخ جودت، جس کا زکی نے حوالہ دیا ہے (کتاب مذکور، ص ۲۳۸) یہ قبیلہ اور حیدرانلو دونوں ایک ہی نسل سے ہیں۔ ان کا اصل وطن میا فارقین کے قرب و جوار میں تھا۔

مآخذ: (۱) H. C. Rawlinson، Notes on a

journey through Persian Kurdistan، JRGS، ۱۰: ۲۰۰

(۲) Layard، Niniveh and Babylon، لندن ۱۸۵۳ء

ص ۲۷۳ تا ۲۷۴: (۳) Binder، Voyage au Kurdistan،

۱۸۸۷ء، ص ۱۰۳: (۴) F. Millingen، Wild Life among

شاہ محمد بک بن غازی قران نے رکھی اور وہاں اس خاندان کے خاتمے تک اسی کی اولاد حکومت کرتی رہی۔ ۳۹۵ھ/۱۰۰۵ء میں صومای کا امیر اولیا بک تھا۔ ترگور کے امیر بھی اسی طرح برادوست قبیلے کے افراد تھے۔ شرف خاں نے لکھا ہے کہ اس کے زمانے (دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی) میں اس خطے کا امیر ناصر بک بن خازن بک بن شیخ حسن تھا۔ خان یگدس قبیلے کی اس شاخ کا سب سے زیادہ مشہور شخص تھا۔ اس نے فلعہ دیمہ میں اپنی حفاظت کی تھی اور یہ واقعہ سرد خواسی کینوں اور کہانیوں کا ایک بڑا موضوع بن گیا۔ وہ شاہ عباس اول کے عہد کے آغاز میں اپنے علاقے کا امیر تھا اور اس کے خلاف بغاوت کر کے وہ قلعہ دیمہ میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ یہ واقعات ۱۰۱۱ء میں ظہور پذیر ہوئے۔ برادوست کے دیگر سرد سرداروں میں قابل ذکر یہ ہیں: جنوبی علاقے میں فیض اللہ بے، جس کا Layard (ص ۳۷۳، ۳۷۴) نے ذکر کیا ہے، اور یوسف بک، جس نے شمدینان کے امیر محمد سے جنگ کر کے نام پیدا کیا۔ یہ دونوں ایک باہمی معاہدے کے پابند تھے، لیکن پھر بھی یوسف نے غداری کر کے اسے قتل کر ڈالا اور اسی بنا پر یہ کہاوت مشہور ہو گئی کہ برادوست پر آئی دوست (= برادوست ایک مہینے کا دوست)۔ شمال کی طرف صادق خاں تھا، جس نے خاندان قاجار کے ہر سردار آنے میں نمایاں حصہ لیا۔ آگے چل کر یہ فتح علی شاہ کے خلاف ہو گیا (۱۲۱۱ھ/۱۷۹۶ء)۔ ہمارے زمانے سے قریب تر اسمعیل آغا صیقلو عبدوی کا نام قابل ذکر ہے، جس نے پہلی عالمی جنگ کے زمانے میں اور اس کے فوراً بعد روسی ترکی محاذ اور عراق میں خاصا نام پیدا کیا۔ فروری ۱۹۱۸ء میں صیقلو نے نستوری بطریق بنیامین مارشعون کو ایک پھندے میں پھنسا کر

ایک صوبہ بنا رہا تا آنکہ آصف جاہ نظام الملک حیدرآباد میں خود مختار ہو گیا۔ جب تک ۱۸۰۳ء میں آرتھروولزی نے اسٹی Assaye کے مقام پر مرہٹوں کو شکست نہیں دی یہ مرہٹہ فوجوں کی تاخت کا بارہا نشانہ بنتا رہا (دیکھیے ناگ پور)۔ ۱۸۰۳ء میں برار کے علاقے، جن پر ناگ پور کے بھونسلا راجا کا قبضہ ہو چکا تھا، نظام کے حوالے کر دیے گئے۔ لارڈ ہیسٹنگز کے دورِ حکومت میں کچھ مدت تک برار کا نظم و نسق پامر اینڈ کمپنی کے ساہوکار تاجروں کے سپرد رہا (بروے Preliminary Report on the Russel Correspondence The Indian : C. Collin Davies 'relating to Hyderabad Archives'، ج ۸، شماره ۱، ۱۹۵۴ء ببعده)۔ ۱۸۵۳ء میں برار ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا گیا اور اس کی آمدنی کچھ تو نظام کے قرضوں کی ادائیگی میں اور کچھ حیدرآباد کی امدادی فوج (Contingent) پر صرف ہونے لگی۔ ۱۹۰۲ء میں ایک عہدنامے کی رو سے لارڈ کرزن نے برار پر نظام کے استحقاق کی تو دوبارہ توثیق کی لیکن صوبے کا پچیس لاکھ روپیہ سالانہ مالیے پر حکومت ہند کو استمراری پٹا یعنی دوامی ٹھیکا دے دیا گیا۔ لارڈ ریڈنگ وائسرائے کے عہد میں برار کی بحالی کے بارے میں نظام کا مطالبہ ناکام رہا۔ بعد ازاں لارڈ ولننگڈن اور لنتھگو کے عہد میں اگرچہ نظام کے حق میں بعض اقدامات کیے گئے لیکن آزادی ہند کے بعد ۱۹۵۶ء تک برار کا نظم و نسق بدستور صوبجات متوسط کے ماتحت ہی رہا۔

مآخذ: (۱) Pecuniary Transactions of Messrs

Court of Proprietors) William Palmer and Co.

E.I.C.، لندن ۱۸۲۴ء؛ (۲) R. G. Burton History :

of the Hyderabad Contingent، کلکتہ ۱۹۰۵ء؛ (۳)

Imperial Gazetteer of India، بذیل مادہ برار، اوکسفورڈ

: O. Mann (۵) 'the Kurds'، ص ۳۴۵ ببعده؛ (۶) Die Mundart der Mukri Kurden، ص ۲ تا ۱۹؛ (۷) (دبیدم)، ص ۲۴ حاشیہ ۱۷ (کانی ریش)؛ (۸) Unter Halbmond n. Sonne : Westarp، ص ۲۱۱ تا ۲۲۵؛ (۹) ای۔ ایم۔ ای۔ زی : تاریخ الدول . . . الکرڈیہ، قاہرہ ۱۹۴۵ء؛ (۱۰) خلاصہ تاریخ الکرد، بغداد ۱۹۳۶ء، ص ۲۰۶ تا ۲۰۷ (دبیدم)؛ (۱۱) C.J. Edmonds (۹)؛ (۱۲) Kurds, Turks, Arabs، در OUP، ص ۶۱۹۵۷؛ (۱۳) Kyrmanca، اریوان ۱۹۳۶ء، ص ۵۶ تا ۵۸ (دبیدم)؛ (۱۴) اریوان، ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۶ تا ۱۲۵ (دبیدم)؛ (۱۵) Les Kurdes : B. Nikitire، ص ۲۶۳، ۸۰، ۷۹، ۱۹۵۶ء، ص ۲۶۳، ۸۰، ۷۹ (چہرین قلعه)۔

(B. NIKITINE)

برار: پہلے ہی برطانوی ہند کا ایک صوبہ تھا۔ یہ چار اضلاع یعنی امراتنی، آگولا، بلدانہ اور بوت مال (= ایوت محل) پر مشتمل تھا۔ رقبہ ۱۷۸۰۹ مربع میل۔ آبادی ۳۶۰۴۸۶۶ جس میں ۳۳۵۱۶۹ مسلمان تھے (مردم شماری ۱۹۳۱ء)۔ برطانوی حکومت میں اس کا نظم و نسق صوبجات متوسط کے حصے کے طور پر کیا جاتا تھا۔ حال میں اسے ریاست بمبئی میں شامل کر دیا گیا ہے۔ خاندان گپتا کے ہم عصر واکاتک راجاؤں کا علاقہ کم و بیش موجودہ برار کے مطابق تھا۔ مسلمان پہلے پہل اس پر ۱۲۹۴ء میں حملہ آور ہوئے لیکن ۱۳۱۸ء تک وہ مستقل قبضہ نہیں کر سکے۔ دکن کی بھمنی سلطنت کا یہ انتہائی شمالی صوبہ (طرف) بنا لیکن نویں / پندرہویں صدی کے اواخر میں یہاں عماد شاہی خاندان کی خود مختار سلطنت قائم ہو گئی، جس کا الحاق ۱۵۷۴ء میں احمد نگر کے نظام شاہی بادشاہوں نے اپنی سلطنت سے کر لیا۔ اکبر نے اپنے دورِ حکومت کے آخری ایام میں اسے فتح کیا اور ۱۷۲۴ء تک یہ سلطنت مغلیہ کا



۱۹۰۸ء؛ (۴) Parliamentary Papers، برار ۱۹۲۰ء،  
Cmd. ۲۳۲۹، ۱۹۲۶ء، Cmd. ۱۶۲۱.

(C. COLLIN DAVIES)

الْبَرَّاقُ : [(ع) ب ر ق سے مشتق ہے، وہ سواری جس پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شبِ اسراء (رک بہ اسراء و معراج، رک بان) تشریف لے گئے تھے۔ سفید بے عیب، رنگ اور چمک دمک نیز اپنی برق رفتاری کے باعث اسے البراق کہا گیا ہے (لسان العرب؛ نیز النہایۃ، بذیل مادہ)۔ قرآن مجید کی آیت ذیل کے ضمن میں مفسرین نے البراق کا ذکر کیا ہے : سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلٰی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بَرَكْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیْہٖ مِنْ اٰیٰتِنَا (۱۷ [بنی اسرائیل] : ۱)۔ وہ پاک ذات ہے جو اپنے بندے (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو راتوں رات مسجد حرام (یعنی مسجد کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گردا گرد ہم نے برکتیں کر رکھی ہیں لے گیا تاکہ ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھلائیں.]

الطبری نے اپنی تفسیر قرآن میں اسراء کے بارے میں بہت سی احادیث نقل کی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری کا جانور محض ایک گھوڑا بیان کیا گیا ہے (۱۵ : ۶ بعد)؛ تاہم ابتدائی دور کی اکثر احادیث میں اسے البراق کہا گیا ہے اور اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ خچر اور گدھے کے بین بین جسامت کا ایک جانور تھا، بعض اوقات اس کی مزید تفصیل یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کا رنگ سفید تھا۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ یہ لمبا تھا (مسلم، کتاب الایمان، حدیث ۲۵۹)، اس کی کمر اور کان لمبے تھے (ابن سعد، ۱ / ۱ : ۱۴۳)، اس کے کان ہلتے تھے (الطبری : تفسیر، ۱۵ : ۱۰) اور یہ زین اور لکام سے مزین تھا (وہی کتاب، ص ۱۲)۔ رجز گو

شاعر العجاج نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلے میں ”لکام والی“ البراق کا ذکر کیا ہے (طبع Ahlwardt، ۳۵ : ۴۹ - ۵۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل دوسرے انبیاء کی بھی اس طرح کی سواری کا ذکر آتا ہے (الطبری : تفسیر، ۱۵ : ۱۰؛ ابن ہشام، ص ۲۶۳)۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی معمولی رفتار یہ تھی کہ ”اس کا ہر قدم اس کی حد نظر تک کا فاصلہ طے کرتا تھا“ (ابن کثیر : تفسیر، ۵ : ۱۰۹؛ ابن ہشام، ص ۲۶۳؛ ابن سعد، ۱ / ۱ : ۱۴۳)۔ الطبری : تفسیر ۱۵ : ۳ میں یہ بھی درج ہے کہ البراق کی ”پنڈلیوں پر پر تھے جن کے ذریعے وہ اپنی ٹانگیں آگے بڑھاتا تھا (نیز دیکھیے امیر علی : مواہب الرحمن، ۱۵ : ۱۰ تا ۳۰)۔ ان الفاظ کا مطلب درحقیقت یہ ہے کہ البراق اپنی ٹانگیں بہت سرعت سے چلا سکتا تھا۔ صرف متاخر زمانے میں اسے حقیقی پروں سے مزین بتایا گیا ہے، قلمی تصویروں (یا مرقعوں) میں اسے بالعموم پردار حیوان کی صورت میں پیش کیا گیا ہے، نحوی اعتبار سے البراق کے لیے صیغہ تذکیر اور صیغہ تانیث دونوں مستعمل ہیں۔

بعض احادیث میں آیا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر سوار ہونے لگے تو اس نے منہ زوری میں دم ہلائی، اس پر حضرت جبرائیلؑ نے کہا کہ اے براق بخدا، ایسا بلند مرتبت انسان تم پر کبھی سوار نہیں ہوا (ابن ہشام، ص ۲۶۳؛ ابن کثیر : تفسیر، ۵ : ۱۱۲)۔ کہا جاتا ہے کہ بیت المقدس پہنچ کر رسول اللہ اس سے اترے اور اسے ایک چٹان (”صخرۃ“، الطبری : تفسیر، ۱۵ : ۷) یا اس ”کنڈنے“ سے باللہ دیا جس سے انبیاء اسے باندھا کرتے تھے (مسلم، کتاب الایمان، حدیث ۲۵۹؛ الترمذی، ابواب تفسیر القرآن، سورۃ بنی اسرائیل)؛

الطبری: تفسیر، ۱۵: ۱۰؛ ابن سعد ۱/ ۱: ۱۳۳ (بعد)۔ بخاری اور مسلم سے مروی بعض احادیث کی رو سے سفر معراج میں البراق ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری تھا۔ قدیم زمانے ہی میں اسراء اور معراج دونوں کے بارے میں روایات باہم مختلط ہو گئی تھیں۔ روایات کے اس اختلاط کا اثر "البراق" کے تصور پر بھی پڑا جو آہستہ آہستہ ایک "اڑنے والا گھوڑا" بن کر رہ گیا۔ . . . .

براق کے تصور نے آگے چل کر جو ارتقائی مراحل طے کیے ان کا پتا ادبی تصنیفات سے زیادہ اس کی تصویروں میں ملتا ہے۔ البراق کی جو قدیم ترین تصویر ہمیں مل سکی ہے وہ ۵۱۳۱۴ کی ہے (یہ رشیدالدین کی جامع التواریخ کے ایک مخطوطے میں ہے)۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ اس تصور میں جو تبدیلی پیدا ہوئی وہ ان فنون کی مرہون منت ہے جن کا تعلق بصریات سے ہے۔ فارسی منظومات بالخصوص نظامی کی مثنویات کی تصویروں میں البراق اپنے سوار اور رہنما جبرائیل کے ساتھ نہایت مقبول موضوع بن گیا تھا۔ نظامی کے قلمی مخطوطے (Or. ۲۲۶۵، موزہ بریطانیہ) میں جو شاندار تصویر تیار کی گئی ہے اسے کمال فن سمجھا جا سکتا ہے۔

مآخذ: (۱) ابن ہشام، ص ۲۶۳ تا ۲۶۵؛ (۲) ابن سعد، ۱/۱: ۱۳۳ بعد؛ (۳) البخاری، بدء الخلق، ص ۶؛ مناقب الانصار، ص ۴۲؛ (۴) مسلم، کتاب الایمان، ص ۲۵۹، ۲۶۴؛ (۵) النسائی، کتاب الصلوٰۃ؛ (۶) احمد بن حنبل: المسند، ۳: ۱۳۸ و ۳: ۲۰۷، ۲۰۸؛ (۷) الطبری: تفسیر، قاہرہ ۱۳۲۱ھ، ۱۵: ۳ تا ۱۳؛ (۸) ابن کثیر: تفسیر، بذیل ۱۷ [بنی اسرائیل]: ۱؛ (۹) امیر علی: تفسیر مواہب الرحمن، ۱۵: ۱ تا ۳؛ (۱۰) البلاذری: انساب الاشراف، ۱: ۲۵۵؛ (۱۱) ابن القیم: زاد المعاد، ۲: ۴۰۷، مصر ۱۳۳۷ھ؛ (۱۲) المقریزی:

الامتاع، ص ۲۹؛ (۱۳) الترمذی، ابواب تفسیر القرآن، باب سورة بنی اسرائیل؛ (۱۴) النووی: شرح مسلم، قاہرہ ۱۲۸۳ھ، ۱: ۲۳۴ بعد؛ (۱۵) ابن البلخی: فارس نامہ، طبع G. Le Strange و R. A. Nicholson، لندن ۱۹۲۱ء (سلسلہ یادگار گب، ۱: ۱۲۶)، ترجمہ لیستریج، در JRAS، ۱۹۱۲ء، ص ۲۶ بعد؛ (۱۶) الدمیری: حیوة الحیوان، بلاق ۱۲۸۳ھ، ۱: ۱۳۶ بعد؛ (۱۷) Muhammdanische Eschatologie: M. Wolff (۱۷) لائپزگ ۱۸۷۳ء، ص ۱۰۱ بعد (عربی متن، ص ۵۷)؛ (۱۸) E. Blochet، در RHR، ۴۰، ۱۸۹۹ء: ۲۰۳-۲۳۶؛ (۱۹) B. Schrieke، در JAW، لائڈن، بار اول، بذیل مادۃ اسراء؛ (۲۰) A.A. Bevan، Mohammed's Beihefte zur, Ascension to Heaven، در ZATW، ج ۲۷، Giessen ۱۹۱۳ء، ص ۴۹-۶۱؛ (۲۱) J. Horovitz، Muhammuds Himmel fahrt، در Isl.، ۹، ۱۹۱۹ء؛ (۲۲) M. Asin Palacios، Laescatolo- gia musulmana en la Divina Comedia، بار دوم، میڈرڈ۔ غرناطہ ۱۹۳۳ء؛ (۲۳) E. Cerulli، "Libra della Scala"، وٹیکن ۱۹۳۹ء (= Studie Testi، ص ۱۰۰)؛ (۲۴) A. Guillaume، Where was al-Masyid al-Aqsa، در الاندلس، ۱۸، ۱۹۵۳ء: ۳۲۳-۳۲۶؛ (۲۵) R. Paret، Die "ferne Gebetsstätte" in Sure 17، در Isl.، ۳۴، ۱۹۵۹ء: ۱۰۰ تا ۱۰۲؛ (۲۶) W. Arnold، Painting in Islam، اوکسفورڈ ۱۹۲۸ء، ص ۱۱۷-۱۲۲؛ (۲۷) R. Ettinghausen، در Ars Orientalis (۱۹۵۷ء)، ۲: ۵۵۸-۵۵۰؛ (۲۸) وہی مصنف: Persian ascension miniatures of the fourteenth century، Accademia Nazionale dei Lincei، XII Convegno "volta" Promosso della classe di Scienze Morali, Storiche e Filologiche، روما ۱۹۵۷ء، ص ۳۶۰-۳۸۳)۔

(R. PARET)



اس کے دل میں اس کی طرف سے کچھ بدگمانیاں بھی تھیں۔ ۱۲۲۶ء میں جب وہ تفتاز میں سرگرم پیکار تھا اسے خبر ملی کہ براق نے بغاوت کر دی ہے۔ جوینی کہتا ہے کہ اس باغی کی عاجلانہ سرکوبی کے لیے سلطان فوراً تپلس سے کرمان روانہ ہوا اور سترہ دن میں سرحد کرمان پر آ پہنچا۔ مگر پھر اس لیے واپس چلا گیا کہ براق نے صلح پسندانہ رویہ اختیار کیا یا اس وجہ سے کہ براق نے مدافعت کے زبردست انتظام کر لیے تھے۔ ۱۲۲۸ء میں غیاث الدین اپنے بھائی سے جھگڑا کرنے کے بعد کرمان میں پناہ گزیں کی حیثیت سے پہنچا۔ یہاں اس کی ماں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف براق سے شادی کر لے۔ اس کے بعد اس پر الزام لگایا گیا کہ وہ اور اس کا بیٹا (غیاث الدین) ایک سازش میں شریک تھے جو براق کے قتل کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ اس الزام کی بنا پر ماں اور بیٹے دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ قتل کی تفصیل میں جوینی اور نسوی کا اختلاف ہے۔ جوینی لکھتا ہے کہ پہلے غیاث الدین کو قتل کیا گیا، نسوی کہتا ہے کہ وہ ماں کے قتل کے بعد کچھ دن قید میں رہا اور یہ بھی افواہ تھی کہ وہ (بیچ کر) اصفہان بھاگ گیا تھا۔ جوینی بیان کرتا ہے کہ اس کے بعد براق خلیفہ کے پاس پہنچا اور اپنے مسلمان ہو جانے کا اعلان کرتے ہوئے خلیفہ سے درخواست کی کہ اسے خود مختار سلطان تسلیم کر لیا جائے۔ خلیفہ نے اس کی درخواست منظور کی اور اسے ”قتلغ سلطان“ (خوش نصیب سلطان) کا خطاب دیا۔ ۱۲۳۰/۱۲۳۲ - ۱۲۳۳ء میں مغول سپہ سالاروں نے، جو سیستان کے علاقے میں سرگرم کار تھے، براق کو پیغام بھیجا کہ وہ خان اعظم کا مطیع و منقاد ہو جائے۔ براق نے بذات خود منگولیا جانے سے عذر کیا لیکن اسے بدلے اپنے لڑکے

براق حاجب : (صحیح تر: براق)، کرمان کے قتلغ خانوں کا پہلا خان۔ اصل میں قرہ ختائی تھا اور جوینی کے کہنے کے مطابق قرہ خطائیوں کی۔ ۱۲۲۱ء میں تپلس پر شکست کے بعد وہ سلطان محمد خوارزم شاہ کے سامنے لایا گیا اور اس سلطان کی ملازمت میں داخل کر لیا گیا اور ہوتے ہوتے وہ ”حاجب“ (Chamberlain) کے درجے پر پہنچ گیا۔ نسوی کا کہنا ہے کہ گورخان فرمانرواے قرہ ختای کے دربار میں بھی وہ اسی عہدے پر سرفراز تھا۔ اسے سلطان محمد کے پاس بطور قاصد بھیجا گیا تو سلطان نے اسے زبردستی اپنے پاس روک لیا اور قرہ ختای حکومت کے قطعی خاتمے کے بعد اسے اپنی ملازمت میں لے لیا۔ جب سلطان خوارزم شاہ نے تاتاری فوجوں کے مقابلے میں فرار کی حالت میں وفات پائی تو اس کے لڑکے جلال الدین خوارزم شاہ [رکبہ جلال الدین منکو برتی] نے ہندوستان میں پناہ لی لیکن اس کے ایک اور لڑکے غیاث الدین پیر شاہ نے عراق عجم پر اپنا قبضہ جما لیا (زمستان ۱۲۲۱ - ۱۲۲۲ء)۔ یہیں براق بھی اس سے آ ملا اور غیاث الدین نے اسے اصفہان کا گورنر بنا دیا۔ اس کے بعد براق کا غیاث الدین کے وزیر سے جھگڑا ہو گیا اور اس نے ہندوستان جانے کی اجازت حاصل کر لی تا کہ وہاں سلطان جلال الدین کی ملازمت میں داخل ہو جائے۔ راستے میں کرمان کے گورنر نے اس پر حملہ کر دیا مگر براق نے حملہ آور کو شکست دی اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے علاقے پر قبضہ جما کر بیٹھ گیا اور پھر ہندوستان جانے کا ارادہ فسخ کر دیا (۱۲۲۲ - ۱۲۲۳ء)۔ یہ جوینی کا بیان ہے، نسوی براق کی بابت کہتا ہے کہ وہ شروع ہی سے کرمان کا گورنر مقرر کر دیا گیا تھا۔ جب ۱۲۲۳ء میں سلطان جلال الدین کرمان میں نمودار ہوا تو اس نے براق کے منصب کی توثیق کر دی، اگرچہ

رکن الدین کو بھیج دیا۔ رکن الدین ابھی راستے ہی میں تھا کہ اسے باپ کے انتقال کی خبر ملی۔ اس کی وفات ۱۲۳۵ء کے اواخر گرما یا اوائل خزان میں واقع ہوئی۔

مآخذ: (۱) جوبنی، ترجمہ از J.A. Boyle :  
*The History of the World Conquerer*، جلد ۲، مانچسٹر : O. Houdas، نسوی، طبع اور ترجمہ ۱۹۵۸ء :  
*Historoy du Sultan Djelal ad-Din Mankobirti*، جلد ۲، پیرس ۱۸۹۱ء - ۱۸۹۵ء : B. Spüler (۳)  
*Die Mongolen in Iran*، برلن ۱۹۵۵ء۔

([J.A. BOYLE] W. BARTHOLD)

\* براق خاں: (یا صحیح تر براق خان)، چغتائی

ریاست کا ایک فرمان روا۔ یہ Mö'etuken کا پوتا تھا، جو بامیان پر لڑتے ہوئے مارا گیا۔ اس کے باپ یسوں تووا Yesün-To'a کو جلا وطن کر کے چین بھیج دیا، کیونکہ وہ اس سازش میں جو خان اعظم منگو (Mongke) کے قتل کرنے کے لیے کی گئی تھی شریک تھا۔ براق نے اپنی عملی زندگی منگو کے جانشین قبلائی خان (۱۲۶۰ تا ۱۲۹۴ء) کے دربار میں شروع کی۔ جب مارچ ۱۲۶۶ء میں قرہ ہلاگو Kara-Hülagu کا بیٹا مبارک شاہ چغتائی ریاست کا خان منتخب ہوا تو قبلائی نے براق کو ایک فرمان ("یرلیغ") دے کر ماوراء النہر بھیجا کہ وہ بھی قبلائی کے بھتیجے نائب السلطان (= مبارک شاہ) کے ساتھ شریک حکومت رہے۔ براق نے پہلے تو فرمان ("یرلیغ") کو چھپائے رکھا اور اس کے بعد جب فوج اس کی مدد گار ہو گئی تو مبارک شاہ پر حملہ کر دیا اور اسے شکست دے کر ستمبر ۱۲۶۶ء میں خجند کے مقام پر گرفتار کر لیا۔

اگرچہ براق تخت حاصل کرنے میں قبلائی کا مرہون منت تھا مگر بہت جلد وہ خان اعظم

سے برس پیکار ہو گیا۔ اس نے خان اعظم کے صوبے دار کو چینی ترکستان سے نکال باہر کیا اور قبلائی کی فوج کو، جو اس نے اپنے صوبے دار کو بحال کرنے کے لیے روانہ کی تھی، شکست دی۔ قبلائی کے بڑے حریف قیدو کے ساتھ، جو خاندان اوکتای (Ogedei) کا سردار تھا اور Semircöye پر اپنا قبضہ جمائے بیٹھا تھا، جنگ کرنے میں براق کو زیادہ کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ابتدا میں تو اسے فتح ہوئی مگر پھر قیدو نے التون اردو (= اردوے مطلقاً) [Golden Horde] کی مدد حاصل کر کے براق کو سیر دریا (سیحون) پر شکست دی اور وہ ہٹ کر ماوراء النہر کے اندرونی حصے میں چلا گیا، جہاں اس نے جان توڑ کر لڑنے کی تیاری کی لیکن دونوں حکمرانوں میں مصالحت ہو گئی اور ۱۲۶۹ء کے موسم بہار میں تلس میں ایک 'قورلتای' (= مجلس شوری) کا انعقاد ہوا، جس میں قیدو کے زیر اقتدار ایک سلطنت مرتب کی گئی، جو خان اعظم کے اقتدار سے بالکل آزاد تھی۔ قیدو اور براق دونوں نے آپس میں ایک دوسرے کو "آندا" یا آندہ (یعنی حقیقی بھائی) کے نام سے پکارا اور سمجھوتا ہو گیا کہ دونوں حکمران پہاڑوں اور نیم صحرائی علاقوں میں رہیں گے اور اپنے گھوڑوں کے گلوں کو مزروعہ اراضی سے باہر رکھیں گے اور رعایا سے کوئی چیز بجز جائز مالگزاری کے وصول نہ کریں گے۔ ماوراء النہر کا دو تہائی حصہ براق کے لیے چھوڑ دیا گیا لیکن مزروعہ علاقوں کی حکومت مسعود بیگ کے سپرد کی گئی، جو قیدو کا مقرر کیا ہوا تھا۔

مجلس شوری کے موقع پر براق نے اپنا ارادہ ایران کے ایل خان اباقا خان کے علاقے پر یورش کرنے کا ظاہر کیا تھا اور قیدو نے اس کی تائید کی تھی اس امید پر کہ اس طرح ایک خطرناک حریف دور ہو جائے گا۔ مسعود بیگ کو ایران بہ ظاہر



کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ دوسرے دن صبح کو جب قیدو کی افواج پڑاؤ میں داخل ہوئیں تو انہیں معلوم ہوا کہ براق رات ہی کو اور جیسا کہ کہا گیا ہے خوف کے مارے چل بسا۔ جمال القرشی کے بیان کے مطابق اس کی وفات ۵۶۷ء کے آغاز میں یعنی ۹ اگست ۱۲۷۱ء کو یا اس کے بعد ہوئی۔ قیدو کے حکم سے اس کو ایک بلند پہاڑ پر مغول طریقے کے مطابق دفن کیا گیا۔ اسلامی طریقے سے تدفین نہیں کی گئی۔

مآخذ: (۱) تاریخ و صاف، طبع Hammer، ص ۱۳۳، بیعد، ترجمہ ص ۱۲۸، بیعد؛ (۲) رشید الدین: جامع التواریخ، طبع Blochet، ۲: ۱۶۸، بیعد اور ۱۷۷، بیعد؛ (۳) Histoire des Mongols: d'Ohsson، ۳: ۴۲۷، بیعد؛ (۴) L'Empire des steppes: Grousset، پیرس ۱۹۳۹ء؛ (۵) Die Mongolen in Iran: B. Spuler، بارن ۱۹۵۵ء؛ (۶) Four Studies: W. Barthold، برلن ۱۹۵۵ء؛ (۷) on the History of Central Asia، ترجمہ V. Minorsky، لانڈن ۱۹۵۶ء۔

([J. A. BOYLE و] W. BARTHOLD)

- برا کلمان: [= بروکلمن] Carl Brockelmann
- مشہور جرمن مستشرق، ۱۸۶۸ء میں بمقام روستوک پیدا ہوا اور ۱۹۵۶ء میں وفات پائی۔ اس کی شہرت کی نقیب اس کی کتاب *Geschichte Der Arabischen Litteratur* (تاریخ الادب العربی، عربی ترجمہ از عبدالعلیم النجار مصری، الناشر الادارة الثقافية بجامعة الدول العربیة، دارالمعارف، مصر ۱۹۵۹ء۔ ۱۹۶۲ء) ہے، جو مع اپنے ضمیموں کے پانچ جلد میں شائع ہو چکی ہے (طبع اول، ۱۹۰۱-۱۹۳۶ء، طبع دوم، جلد اول ۱۹۴۳ء، جلد دوم ۱۹۴۹ء، تکملہ اول، ۱۹۳۷ء، تکملہ دوم ۱۹۳۸ء، تکملہ سوم، ۱۹۴۲ء)۔ برا کلمان کا دوسرا کارنامہ ابن سعد کی مشہور کتاب الطبقات الکبیر کی طباعت کا آغاز ہے۔

اس لیے بھیجا گیا کہ وہ براق اور قیدو کے لیے زمین کا لگان وصول کرے لیکن درحقیقت وہ اس ملک کی خفیہ نگرانی کرنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ براق نے واپس آتے ہی آمو دریا (جیحون) کو پار کر کے خراسان اور افغانستان کے کچھ حصے قبضہ کر لیا۔ لیکن قیدو کی بھیجی ہوئی فوج نے اس کی برائے نام مدد کی اور تھوڑے ہی دن میں براق کو مشکلات میں پھنسا ہوا چھوڑ دیا۔ یکم ذوالحجہ ۵۶۸/۲۲ جولائی ۱۲۷۰ء کو اباقا نے اپنے مد مقابل کو شکست فاش دی اور براق فقط پانچ ہزار سپاہیوں کے ساتھ جیحون عبور کر کے پسا ہوا۔

براق نے اپنی زندگی کا آخری سال کیسے گزارا اس کے بارے میں مختلف بیانات ہیں۔ و صاف کہتا ہے کہ اس نے زمستان بخارا میں گزارا جہاں اس نے اسلام اختیار کیا اور اپنا لقب سلطان غیاث الدین رکھا۔ دوسرے سال اس نے سیستان پر حملہ کیا لیکن بعض والیان ریاست کے منحرف ہو جانے کی وجہ سے اس کی تدبیروں پر پانی پھر گیا اور اس نے مجبور ہو کر اپنے آپ کو قیدو کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور قیدو نے اسے زہر دلوا دیا۔ رشید الدین، جس کا بیان زیادہ مشرح، ہے کہتا ہے کہ روسا کا انحراف اسی وقت ظاہر ہو گیا تھا جب براق پسا ہوا اور جیحون عبور کر کے ادھر آیا تھا۔ اس نے قیدو سے مدد کی التجا کی۔ قیدو ایک لشکر جرار کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس کا خیال یہ نہ تھا کہ براق کی مدد کرے بلکہ یہ تھا کہ اس موقع سے خود فائدہ اٹھائے۔ اس درمیان میں براق بغاوت فرو کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس نے اپنے بھائی (اندا) سے درخواست کی کہ وہ واپس چلا جائے لیکن قیدو بڑھتا ہی چلا آیا۔ آخر کار اس کی فوجوں نے براق کے فوجی پڑاؤ

رسم خط میں لکھنا؛ (۲۷) البلاذری کی انساب الاشراف پر ملاحظیات؛ (۲۸) تاریخ الشعوب والدول الاسلامیہ (پانچ جلد) اس کتاب کے انگریزی، فرانسیسی، عربی اور ترکی میں بھی تراجم ہو چکے ہیں؛ (۲۹) کنعانی زبان پر چند ملاحظیات؛ (۳۰) دائرۃ معارف اسلامیہ لائڈن میں ایک سو سے زائد مقالات - جرجی زیدان نے تاریخ آداب اللغة العربیة اور سرکیس نے اپنی معجم المطبوعات کی تالیف میں برا کلمان کی نگارشات سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ برا کلمان نے متعدد یونیورسٹیوں میں کام کیا ہے، مثلاً برسلاؤ، برلن، کونسبرگ، ہالہ۔

مآخذ: (۱) ابوالفاسم سحاب: فرہنگ خاورشاسان، تہران، ۱۳۱۳ ش، ص ۷۱ بعد؛ (۲) سرکیس: معجم المطبوعات، عدد ۵۵۳؛ (۳) المستشرقون، ص ۷۷ بعد؛ (۴) فردینان توتل: المنجد (معجم الاعلام الشرق والغرب)، ۱۹۵۶ء، ص ۷۳۔

(عبدالمنان عمر)

البرامکہ: یا آل برمک، خلافت عباسیہ کے ابتدائی دور میں ایک ایرانی خاندان گزرا ہے جس کے افراد خلفا کے کاتب اور وزیر رہے ہیں۔

۱۔ نسب نامہ

برمک، جو روایت کی رو سے خاندان کے مورث اعلیٰ کا نام ہے، بعض عرب مصنفین کی رائے میں کسی خاص شخص کا نام نہیں بلکہ ایک لقب ہے جو بلخ کے نزدیک نو بہار کی پرستش گاہ کے پجاریوں کے رئیس کو، جس کا عہدہ موروثی تھا، اعزازاً دیا جاتا تھا۔ اس تشریح کی تائید لفظ کے اشتقاق سے بھی ہوتی ہے، جسے آج کل سب نے مان لیا ہے، بنا بریں لفظ برمک سنسکرت کے لفظ برمک سے نکلا ہے، جس کے معنی "اعلیٰ و افضل، سردار" کے ہیں۔ مزید برآں خود لفظ نو بہار بھی سنسکرت کے نوا و ہار (nova vihara) سے نکلا ہے، جس کے معنی

اس نے کتاب کی تین جلدیں ۱۹۰۳ تا ۱۹۱۷ء میں شائع کیں۔ اس کی شائع کردہ بعض دیگر کتب درج ذیل ہیں: (۱) کتاب لبید شاعر؛ (۲) حکایات مصر جدید و مصر میسلا میس Miscellamies (۱۹۳۷ء)؛ (۳) زکریا رازی کے پچانوے رسائل جو طب، نجوم، طبیعیات، ماورائے طبیعیات اور حکمت الہی وغیرہ پر مشتمل ہیں؛ (۴) ابن قتیبہ الدینوری (۵۲۷۶ھ) کی عیون الاخبار؛ یہ کتاب برا کلمان نے استانبول اور پیٹرو گراڈ کے کتب خانوں کے دو مخطوطوں کی مدد سے ترتیب دی ہے؛ (۵) کتاب خانۃ ایاصوفیہ کی فہرست؛ (۶) ابو المظفر ایوردی اور (۷) ابن حجر العسقلانی پر ایک ایک تحقیقاتی رسالہ؛ (۸) عربی زبان کے لیے لاطینی رسم خط؛ (۹) کتب خانۃ برسلاؤ کے عربی، فارسی، ترکی اور عبرانی مخطوطات کی فہرست؛ (۱۰) ہمبرگ کے کتب خانے کے مشرقی مخطوطات کی فہرست (ما سوائے عبرانی مخطوطات)؛ (۱۱) ابن الاثیر کی کتاب الکامل اور الطبری کی تاریخ الرسل والملوک میں باہم کیا تعلق ہے اس پر تحقیقی مقالہ؛ (۱۲) ان لوگوں کے حالات جن سے محمد بن اسحاق نے اپنی کتاب المغازی میں روایت کی ہے؛ (۱۳) دیوان لبید کے حواشی؛ (۱۴) ابن الجوزی کی کتاب تلیح فہوم اهل الاثر کی طباعت؛ (۱۵) ارسنی زبان میں یونانی کے دخل الفاظ؛ (۱۶) سریانی لغت؛ (۱۷) ابن الجوزی کے کتاب الوفاء کی طباعت؛ (۱۸) علم الاصوات و الصرف پر ایک رسالہ؛ (۱۹) الجہشیری کی کتاب الوزراء والکتب کی طباعت؛ (۲۰) ابن جنی کی کتاب سیر الصناعة کی طباعت؛ (۲۱) حبشی زبان کے بولنے پر چند ملاحظیات؛ (۲۲) عبرانی زبان میں مفعول مالم یسم فاعله کی بحث؛ (۲۳) ابن حزم کی طوق الحمامة کی طباعت؛ (۲۴) کیا حامی زبانوں کی اصل موجود ہے؛ (۲۵) سامی اور قدیم مصری زبانوں کے مشتقات؛ (۲۶) عربی کا لاطینی



اور جس کا رقبہ تقریباً پندرہ ہزار مربع کیلومیٹر ہو گا اسی خاندان کی ملکیت رہی اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے یا کم سے کم اس کے ایک حصے کے مسلسل مالک رہے۔ اس میں موضع روان، جو بلخ کے قریب تھا، یعنی بن خالد کی ذاتی ملکیت میں تھا (یاقوت، ۲: ۷۳۲)۔

البلاذری کے قول کے مطابق (فتوح، ص ۹۰) نوبہار پر، جو مقامی مرکز مدافعت تھا، امیر معاویہؓ کے زمانے میں حملہ کیا گیا اور اس سے اسے بہت نقصان پہنچا۔ یہ حملہ غالباً ۵۴۲/۶۶۲-۶۶۳ء کے بعد ہوا۔ الطبری (۲: ۱۲۰۵) کا کہنا ہے کہ مقامی امیر نیزک Nizak اس کے زمانے تک (۵۹۰/۷۰۸-۷۰۹ء) وہاں عبادت کیا کرتا تھا۔ اموی خلیفہ ہشام کے زمانے میں ۵۱۰ء/۷۲۵-۷۲۶ء میں الطبری کے قول کے مطابق، بلخ کو برمک کی کوشش اور اسد اللہ بن عبداللہ (عامل بلخ) کے حکم سے دو بارہ بسایا گیا۔ برمک کے آخری نمائندے خالد کے باپ کی بابت جو اطلاعات ہمارے پاس ہیں وہ بڑی حد تک افسانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

انہیں میں ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ وہ علم الادویہ سے واقف تھا اور دیگر مریضوں کے علاوہ اس نے اموی شاہزادہ مسلمہ بن عبدالملک کا علاج بھی کیا (الطبری، ۲: ۱۱۸۱)۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد کا باپ برمک نہیں عبداللہ بن مسلم تھا، جس نے اپنے بھائی قتیبہ کے ہمراہ ۵۸۶/۷۰۵ء میں بلخ کی بغاوت فرو کرنے میں حصہ لیا تھا۔ شاید اس روایت کی بنا اس امر پر ہو کہ عبداللہ بن مسلم کے بیٹوں کو فائدہ پہنچ جانے (الطبری، محل مذکور)۔ اس کے علاوہ ہمیں اس کا علم نہیں کہ برمک، جو ۵۱۰ء/۷۲۵-۷۲۶ء میں بلخ میں دوبارہ پہنچا وہاں

”نی خانقاہ“ کے ہیں۔ یہ نام اس مشہور بدھ مندر کی یاد دلاتا ہے جس کی پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی میں چینی سیاح ہیون سانگ Hiuan Ts'ang نے پو۔ ہو po-Ho میں، جو بلخ کا دوسرا نام ہے، زیارت کی (Hiouen Thsang، مترجمہ Memoires : St. Julien، پیرس ۱۸۵۷ء، ۱: ۳۰-۳۲)۔ اس کے علاوہ بعض عرب جغرافیہ دان بھی لکھتے ہیں کہ نوبہار بتوں کی ہوجا (عبادۃ الاوثان) کے لیے وقف تھا۔ ابن الفقیہ (ص ۳۲۲-۳۲۵) کے بیان سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں بدھوں کا ایک شوبہا Stupa ہوتا، کیونکہ اس کی خصوصیات سے بھی پتا چلتا ہے۔ اگرچہ اس کے نام کو بگاڑ دیا گیا ہے۔ بعد کے مصنفین (یاقوت، ۴: ۸۱۹، ابن خلکان، قاہرہ ۱۹۳۸ء، ۳: ۱۹۸)، جنہوں نے اسے زرتشتی آتش کدہ کہا ہے، بلا شبہ اس روایت سے متاثر ہوئے ہیں جس میں خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ برامکہ سلطنت سامان کے وزرا کی اولاد ہیں (دیکھیے نظام الملک: سیاست نامہ، ترجمہ Schefer، ص ۲۲۴)۔ اس امر کی تحقیق مشکل ہے کہ وہ خیالی تعبیرات کس زمانے میں پیدا ہوئیں جو بعد کی تمام ادبی تصنیفات میں پائی جاتی ہیں (خصوصاً مقامی ادب میں، دیکھیے فضائل بلخ، در Ch. Schefer: *Chrestomathie persane*، پیرس ۱۸۸۳ء، ۱: ۷۱) اور جنہیں زمان حال کے علما نے بھی ملت دراز تک اختیار کیے رکھا۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ برامکہ کا ظہور منصور کے عہد میں ہوا تاہم زیادہ صحیح شاید یہ ہے کہ وہ منصور کے زمانے کے بہت بعد نمایاں ہوئے۔

اسلام کی پہلی صدی میں نوبہار اور اس کے شے ہجاریوں کی بابت ہمارے پاس صحیح معلومات بہت ہی کم ہیں۔ جو زمین اس مندر کے نام تھی

کم سے کم ایک سال تک محکمہ خراج کا مہتمم اعدا رہا، تاہم ابو ایوب کی دخل اندازی کی وجہ سے اسے جلد مرکزی حکومت سے بے دخل کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ فارس کا گورنر مقرر کر دیا گیا، جہاں وہ دو سال تک مقیم رہا۔ کچھ عرصے بعد وہ بغداد پہنچ گیا۔ یہ روایت بہت مشہور ہے کہ وہاں اس نے خلیفہ کو اس امر پر آمادہ کیا کہ ایوان کسری برباد نہ کیا جائے۔ ۱۴۷ھ / ۷۶۳-۷۶۵ء میں اس نے ان مساعی میں حصہ لیا جن کا انجام عیسیٰ بن موسیٰ کے حق خلافت سے دست بردار ہونے پر ہوا۔ اور علاوہ ازیں اسی زمانے میں اس نے ابو عبید اللہ معاویہ کو اپنے مشوروں سے مستفید کیا جو الرے سے واپس آ رہا تھا۔ آگے چل کر اسے طبرستان کا والی مقرر کیا گیا اور وہ وہاں تقریباً سات سال رہا (۱۵۰ھ / ۷۶۷ء اور ۱۵۴ھ / ۷۷۱ء کے اس کے نام کے ڈھلے ہوئے سکتے محفوظ ہیں)۔ اس نے قلعہ آستونا وند پر، جو دماوند کے قریب ہے، قبضہ کر لیا اور اس علاقے کے باشندوں میں اسے بڑی ہر دل عزیز حاصل ہوئی۔ اس نے وہاں ایک نیا شہر المنصورہ بسایا۔ غالباً انہیں دنوں میں اس کا پوتا الفضل بن یحییٰ مہدی کے فرزند ہارون کا رضاعی بھائی بنا۔ یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ۱۵۸ھ / ۷۷۵ء میں منصور کی وفات سے کچھ دن پہلے خالد پر ایک بھاری جرمانہ عائد کیا گیا لیکن بعد میں وہ معاف کر دیا گیا اور اسے موصل کے صوبے کا والی بنا دیا گیا جہاں گردوں نے بغاوت کر رکھی تھی۔ مہدی کے عہد خلافت کا آغاز ہوا تو وہ فارس میں تھا چنانچہ ۱۶۳ھ / ۷۷۹-۷۸۰ء میں اس نے او اس کے فرزند یحییٰ نے سالو کے محاصرے میں، جو بوزنطی علاقے میں واقع تھا، بڑا نام پیدا کیا؛ تاہم اس کے تھوڑے ہی دن بعد ۱۶۵ھ / ۷۸۱-۷۸۲ء

پہنچنے سے پہلے خلفا کے دربار میں باریاب ہو چکا تھا، جیسے بعض کا خیال ہے، اور وہاں اسلام قبول کر چکا تھا۔ بہر حال اس کے بیٹے خراسان چھوڑ کر عراق چلے آئے اور بصرے میں سکونت پذیر ہوئے اور وہاں قبیلہ آزد کے موالی بن گئے (Wiesb- 'Westostliche Abh. Tschudi : L. Massignon) ۱۹۵۴ء، ص ۱۵۹ اور ۱۶۸)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی جگہ پہلے خالد نے اور پھر اس کے بھائی سلیمان اور الحسن نے اسلام قبول کیا۔

مآخذ : (۱) 'Les Barmecides : L. Bouvat (۱) پیرس ۱۹۱۲ء، ص ۲۵-۳۶؛ (۱) S. Nadvi، در Isl. 'Culture'، ۱۹۳۲ء، ۶ : ۱۹ تا ۲۸؛ (۳) H. W. Bailey، در BSOS، ۱۹۴۳ء، ۱۱ : ۳ (لنظ برمک پر بحث)، اور وہ حوالے جو اوپر دیے گئے ہیں۔

([D. SOURDEL و] W. BARTHOLD)

۲۔ خالد بن برمک : خالد کی ابتدائی سرگرمیوں کا حال ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ تاریخ میں اس کا نام پہلے پہل بنو اسید کے عہد آخر میں ہاشمی تحریک کے سلسلے میں آتا ہے۔ اس وقت اسے یہ کام سپرد ہوا کہ وہ قحطہ کے لشکر میں مال غنیمت کی تقسیم کا ذمہ لے۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد نئے خلیفہ السفاح نے اسے دیوان الجند و الخراج کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا۔ بعد ازاں سلطنت کے تمام اداروں کا انتظام اس کے سپرد کر دیا، یہاں تک کہ ایک مؤرخ کے قول کے مطابق اسے وزیر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ خلیفہ کے عملہ خاص سے متعلق ہونے کے باعث اسے یہ اعزاز حاصل ہو گیا کہ اس کی بیٹی کو السفاح کی بیوی نے اور اس کی بیوی نے السفاح کی بیٹی کو دودھ پلایا۔ المنصور کے زمانے میں بھی وہ نمایاں خدمت سر انجام دیتا رہا، لیکن جیسا کہ مؤرخین نے بیان کیا ہے وہ خلیفہ کا دست راست نہیں بنا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ



ہو۔ اس عناد کے باعث یحییٰ تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا، لیکن کہتے ہیں کہ اسی رات جب یحییٰ کو، جسے قید کر لیا گیا تھا، سزائے موت ملنے والی تھی الہادی اپنے محل میں مردہ پایا گیا۔

بہر حال جونہیں ہارون کو خلیفہ ہونے کی مبارک باد دی گئی اس نے فوراً یحییٰ کو بلا بھیجا اور امور سلطنت کا انتظام اس کے سپرد کر دیا اور بعض روایتوں میں آتا ہے کہ خلیفہ نے اس بارے میں اسے عام اختیارات دے دیے۔ اس ماہر کار پرداز کو وزیر کا لقب عطا ہوا۔ اس نے شروع ہی سے اپنے دو بیٹوں الفضل اور جعفر کو اپنے انتظامی اور سرکاری فرائض کی ادائیگی میں اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ وہ اس کے ساتھ اثر صدارت کی کرسی پر بیٹھتے اور ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں بھی وزیر کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ یحییٰ اپنے اس عہدے پر سترہ سال، یعنی ۵۱۷/۵۱۶ء سے ۵۸۶/۵۸۵ء تک فائز رہا۔ اس مدت کا ذکر بعض مصنفین نے دور آل برمک (سلطان آل برمک) کے نام سے کیا ہے۔ خلیفہ کے مدارالمہام کی حیثیت سے اس کا فرض تھا کہ بدعنوانیوں کی اصلاح کرے؛ چنانچہ ایسے معتمدین کا انتخاب اس کے اپنے اختیار میں تھا جو اس کے نائب کی حیثیت سے کام کریں، اس لیے حقیقت میں حکومت کے سارے اداروں کا سر براہ وہی تھا، گو سرکاری مہر بردار کا عہدہ اسے ابتدا میں نہیں دیا گیا تھا لیکن بہت جلد یہ بھی اسے مل گیا۔ روایتوں میں یہاں تک آیا ہے کہ رشید نے اپنی ذاتی بھی اس کے حوالے کر دی اور یہ وزیر ہوئے اختیارات عطا کیے جانے کی علامت تھی۔ یہ مہر جو جعفر کے سپرد کی گئی تھی، آخر کار یحییٰ کو واپس دے دی۔ اور یحییٰ نے اس کا قبضہ اس وقت چھوڑا جب وہ ۵۱۸۱/۵۱۸۰ء میں مکہ معظمہ

میں اس کا انتقال ہو گیا۔ وفات کے وقت اس کی عمر تقریباً پچھتر سال تھی۔

مآخذ: (۱) *Les Barmécides* : L. Bouvat، ص ۳۷ تا ۴۳؛ (۲) الطبری، بمدد اشاریہ؛ (۳) الجہشیاری: کتاب الوزراء بمدد اشاریہ؛ (۴) المسعودی: مروج، ۵: ۴۴۴؛ (۵) ابن النقیذ، ص ۳۱۴؛ (۶) یاقوت، ۱: ۲۲۴؛ (۷) ابن خلکان، قاہرہ ۱۹۴۸ء، ۱: ۲۹۵ تا ۲۹۶؛ (۸) J. Walker، *Arab. Sassanian Coins*، لندن ۱۹۴۶ء، ص LXXVI۔

۳۔ برامکہ کی وزارت اور ان کا زوال: ہارون الرشید نے جب وزارت کے لیے یحییٰ بن خالد کا انتخاب کیا تو وہ عرصہ دراز سے حکومت کی خدمات جلیلہ انجام دیتا چلا آ رہا تھا۔ شروع شروع میں وہ اپنے والد کی متعدد عہدوں میں اعانت کرتا رہا۔ پھر ۵۱۵۸/۵۱۵۷ء میں وہ آذربيجان کا والی مقرر ہوا۔ خلافت المہدی کے آغاز تک وہ اپنے والد خالد ہی کے ساتھ علاقہ فارس میں تھا۔ ۵۱۶۱/۵۱۶۰ء میں وہ ابان بن صدقہ کی جگہ ہارون کے زمانہ شہزادگی میں اس کا اتالیق مقرر ہوا۔ وہ شہزادے کے ساتھ سمالو کے حملے میں شامل ہوا، جہاں اسے خاص طور پر لشکر کے سامان رسد کا انتظام سپرد ہوا۔ کچھ مدت بعد جب اس کے شاگرد ہارون کو دوسرے درجے میں وارث خلافت تسلیم کر کے مغربی ممالک آذربيجان اور آرمینیا کا والی مقرر کیا گیا تو یحییٰ نے سلطنت کے اس حصے کا ضبط و نظم اپنے ہاتھ میں لیا۔ اگرچہ المہدی کی وفات کے بعد وہ اپنے عہدے پر بحال رہا تاہم اس نے محسوس کیا کہ نئے خلیفہ الہادی کی نظر التقات اس کی طرف نہیں۔ الہادی نے یحییٰ پر الزام لگایا کہ وہ اس کے مقابلے میں ہارون کی حمایت کرتا ہے اور اسے اکساتا رہا ہے کہ مسند خلافت پر اپنے دعوے سے دست بردار نہ

ذکر مصنفین بڑے ذوق و شوق سے کرتے چلے آئے ہیں۔ ۵۱۷۶ / ۷۹۲ء میں اسے مغربی صوبوں کا والی بنایا گیا، لیکن اس پر بھی وہ دربار ہی میں رہا اور وہاں سے فقط ۵۱۸۰ / ۷۹۶ء میں باہر گیا تا کہ شام میں جو بغاوت ہو گئی تھی اسے فرو کرے۔ اس کے بعد اسے عارضی طور پر خراسان کا گورنر مقرر کیا گیا اور خلیفہ کے ذاتی محافظ دستے کا سردار بنایا گیا، نیز ڈاک اور ٹکسال کے محکمے بھی اس کے سپرد کیے گئے (فی الواقع ۵۱۷۶ / ۷۹۲ء سے اس کا نام مشرقی سکوں پر پایا جاتا ہے اور بعد میں مغربی سکوں پر بھی ملتا ہے)۔ اس کے علاوہ وہ شہزادہ عبداللہ المامون کا اتالیق بھی تھا، جو ۵۱۸۲ / ۷۹۸ء میں ولی عہد ثانی مقرر ہوا۔ ان سب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ اگر اسے خلیفہ کا ساتی خاص نہ بھی مانا جائے (حالانکہ اکثر روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے) تو بھی وہ خلیفہ کا منظور نظر تھا اور اس کی محفلوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ بات اس کے بھائی کو پسند نہیں تھی۔ یحییٰ کے دو بیٹے دونوں ولی عہدوں کے اتالیق تھے اور عام خیال یہی تھا کہ بالآخر۔۔۔ اکت انہیں دونوں میں تقسیم ہوگی۔ اس صورت میں اگر ہارون الرشید کی رضا ہوتی تو زمام حکومت ایک طویل مدت تک بڑی آسانی سے آلِ برمک کے ہاتھ میں رہ سکتی تھی، مگر ۵۱۸۶ / ۸۰۲ء میں جب خلیفہ مع خدم و حشم فریضہ حج ادا کر کے واپس آیا تو اس نے یکایک فیصلہ کر لیا کہ برمکہ کے رسوخ و اقتدار کو ختم کیا جائے۔ یکم صفر ۵۱۸۷ / ۲۸-۲۹ جنوری ۸۰۳ء کی رات کو اس نے جعفر کو قتل کرا دیا، الفضل اور اس کے بھائی قید کر لیے گئے، یحییٰ کی نگرانی ہونے لگی اور باسٹنایے محمد بن خالد سب برمکہ کی

میں کچھ روز قیام کرنے کے لیے گیا۔ اب یہ سہر الفضل کے قبضے میں آئی اور اس کے بعد اس کا محافظ جعفر قرار پایا اور اس سے یحییٰ نے مکہ معظمہ سے واپس آنے پر ارے لی۔

یحییٰ کے دونوں بیٹے الفضل اور جعفر محض اپنے والد کا ہاتھ بٹانے پر قانع نہیں رہے، بلکہ انہیں بھی بڑی اہم ذمے داریاں سونپی گئیں۔ شروع شروع میں یحییٰ کا بڑا بیٹا الفضل، جو ہارون کا رضاعی بھائی بھی تھا، کاروبار سلطنت میں پیش پیش رہا۔ ۵۱۷۶ / ۷۹۲ء میں یا شاید اس سے بھی پہلے اسے ایران کے مغربی صوبوں کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ خلیفہ نے اسے یحییٰ بن عبداللہ علوی کے مقابلے کے لیے بھیجا، جس نے علم بغاوت بلند کیا تھا۔ یحییٰ کو اس نے گفت و شنید کے ذریعے ہتھیار ڈالنے پر راضی کر لیا۔ اس سے اگلے سال اسے خراسان کا والی مقرر کیا گیا، جہاں اس نے لوگوں کے کئی جھگڑے چکائے اور تعمیرِ ملک میں حصہ لیا۔ اس نے کابل کے علاقے میں امن و امان قائم کیا اور وہاں ایک مقامی لشکر بھرتی کیا۔ روایت ہے کہ اس لشکر کا ایک حصہ بغداد بھیجا گیا۔ جب وہ دربار بغداد میں واپس آیا تو اس نے اپنے صوبے میں اپنا ایک قائم مقام مقرر کیا اور اسے ۵۱۸۰ / ۷۹۶ء تک قائم رکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے والد کی عدم موجودگی، یعنی ۵۱۸۱ / ۷۹۷ء میں سلطنت کا انتظام سنبھالا، بایں ہمہ سب سے پہلے وہی خلیفہ کے التفات سے محروم ہوا۔ اس نے ہارون کو خطرناک طور پر ناراض کر دیا، چنانچہ اس سے تمام عہدے چھین لیے گئے، لیکن وہ بدستور شہزادہ محمد الامین کا معلم رہا، جسے اس نے ۵۱۷۸ / ۷۹۴ء میں ولی عہد تسلیم کروا لیا تھا۔

جعفر کی خوش بیانی اور قانونی موشگافیوں کا



میں بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن اس کے باوجود خلیفہ اور اس کے سابق اتالیق [یحییٰ] میں اختلاف رائے کے اسباب موجود تھے جن کی وجہ سے اسے حکومت کرنے کی کامل آزادی کبھی نصیب نہ ہو سکی۔ جیسا کہ بارٹولڈ نے لکھا ہے اپنی وزارت کے ابتدائی دور میں اسے الخیزران کے روبرو اپنی تمام کارروائیوں کی وضاحت پیش کرنا پڑتی تھی، لیکن وہ بہر حال عمر بھر اس کی مدد و معاون رہی۔ اس کے بعد اسے اثر خلیفہ کی خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اور اپنی اس فطانت سے کام لینا پڑتا تھا جس کے لیے وہ اس قدر مشہور ہے۔ بعض صورتوں میں اسے اپنی بات منوانے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، مثلاً ۵۱۸۰ / ۷۹۶ء میں اس کی مرضی اور شورے کے خلاف خراسان میں الفضل کی جگہ ایک اور شخص مقرر کیا گیا۔ کئی بار اسے مفاہمت کی خاطر اپنے اصولوں کی قربانی بھی دینا پڑتی تھی؛ مثلاً ۵۱۸۳ / ۷۹۹ء میں الفضل کے سر سے خلیفہ کا غضب ٹالنے کے لیے اسے بڑی برق رفتاری کے ساتھ بغداد سے الرقہ جانا پڑا اور صرف اس وقت کامیاب ہو سکی جب اس نے اپنے فرزند کے طرز عمل کی سخت مذمت کی۔ اس سے بھی بہت پہلے اس کے مرتبے کے گھٹانے کے لیے ریشہ دونیاں شروع ہو چکی تھیں۔ خلیفہ کی نظر التفات ایک مدت سے الفضل بن ربیع پر تھی جو فن دربار داری میں کمال رکھتا تھا۔ اپنی والدہ کے انتقال کے بعد خلیفہ نے اس پر نوازشات کی بارش کر دی۔ ۵۱۷۹ / ۷۹۵ء میں اسے محمد بن خالد برمکی کی جگہ حاجب مقرر کر دیا گیا۔ اس نئے حاجب کا اثر و رسوخ دربار میں روز بروز بڑھتا گیا اور وہ اپنے دشمنوں کی کمزوریوں کا پردہ چاک کر کے خلیفہ کی آتش غضب کو بھڑکانے لگا۔

اسی طرح یحییٰ کے بیٹوں کے ساتھ بھی خلیفہ

جانداد ضبط کر لی گئی۔ جعفر کی لاش بغداد میں خاصے عرصے تک منظر عام پر لٹکتی رہی۔ الفضل اور خود یحییٰ کو، جس نے اپنے لڑکوں کے شریک حال رہنے کی خواہش ظاہر کی، قیدیوں کی حیثیت سے الرقہ روانہ کر دیا گیا، جہاں محرم ۵۱۹۰ / نومبر ۷۸۰ء میں یحییٰ کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر ستر سال تھی۔ اس کے بعد محرم ۵۱۹۳ / اکتوبر۔ نومبر ۷۸۰ء میں الفضل نے بھی پینتالیس سال کی عمر میں وہیں وفات پائی۔

برامکہ کا جس طور پر خاتمہ ہوا وہ ان کے ہوا خواہوں کے لیے باعث حیرت تھا۔ انہیں ایسی کوئی اطمینان بخش وجہ نظر نہیں آتی تھی جس کی بنا پر ان کے ساتھ یہ سلوک روا رکھا جاتا؛ چنانچہ انہوں نے طرح طرح کے افسانے تراش لیے؛ مثلاً عباسہ [رک بان] کا قصہ، اور ایک مدت تک انہیں معتبر سمجھا جاتا رہا۔ برامکہ کے زوال کا اصل سبب کسی حد تک زمانہ حال کے مؤرخوں کے لیے بھی صیغہ راز ہی میں ہے۔ یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہے کہ خلیفہ کو فوری طور پر ایک خیال آیا اور اسے عملی جامہ پہنا دیا گیا۔ بارٹولڈ W. Barthold کی رائے میں یہ تجویز خوب سوچ سمجھ کر پہلے ہی تیار کر لی گئی تھی۔ اگر یہ بات نہ بھی مانی جائے تب بھی اتنا تو کہنا پڑے گا کہ یہ خیال ایک ایسے عظیم الشان بادشاہ کے دماغ میں بہت پہلے سے نشوونما پا رہا ہوگا، جس کا پیمانہ صبر ایک مدت تک اپنے وزیروں کی حکومت برداشت کرتے کرتے لبریز ہو چکا ہو اور جو وقتاً فوقتاً ان پر یہ الزام بھی عائد کرتا رہا ہو کہ ان کی حکمت عملی اس کے مفاد کے منافی ہے۔

برامکہ کا دور وزارت جیسا کہ اسے بعد کی کہانیوں اور افسانوں میں پیش کیا گیا ہے کامل اتفاق اور اتحاد کا زمانہ نہ تھا۔ اس مسئلے

مستزاد ان کی شہرہ آفاق فیاضی تھی، جس کے باعث ان کی دولت و ثروت برابر توجہ کا مرکز بنتی جا رہی تھی۔ برامکہ کے زوال کے خواہ کتنے ہی مختلف اسباب بیان کیے جائیں، یہ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ خلیفہ نے جعفر کو جن پیہم نوازشات کا مورد ٹھہرا رکھا تھا ان کا تاوان اس سلوک ہی کی صورت میں ادا کیا جا سکتا تھا، کیونکہ اس کے بغیر غالباً برامکہ کا آخری انجام یونہی ٹلتا رہتا۔

دوسری جانب یہ درست ہے کہ ان ایرانی النسل وزرا کو ایران و ہندوستان کے ادبی شاہکاروں نیز مختلف دینی عقائد اور فلسفیانہ نظریات سے گہری دلچسپی تھی اور انہیں شوق تھا کہ ان پر بحث و تمحیص کی جائے، لیکن یہ ذوق اس زمانے میں بغداد کے معاشرے میں عام تھا اور اس سے یہ ہرگز لازم نہ آتا تھا کہ ایسے با ذوق لوگوں کے خیالات بھی ملحدانہ ہوں۔ علاوہ بریں برمکیوں نے اپنے آپ کو دربار بغداد کی رسوم و آداب کے عین مطابق ڈھال لیا تھا۔ ان کے دل میں عربی شعرا اور مصنفین کی بڑی وقعت تھی اور دیگر کثیر التعداد موالی کے مانند وہ بھی عربوں کی بدوی روایات سے متاثر ہو کر انتہائی سخاوت کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔ اگرچہ [غیر عربی] صوبوں کے باشندوں اور بعض باجگزار ریاستوں کے ساتھ ان کا سلوک مراعات اور خاطر داری کا تھا لیکن یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انہوں نے الماسون کی، جو ایک ایرانی خاتون کے بطن سے تھا، اس کے بھائی کے مقابلے میں حمایت کرنے کی کوشش کی ہو۔ بنیادی طور پر ان کے سامنے ہمیشہ یہی بات رہی کہ خلافت کی خدمات مستعدی اور وفاداری کے ساتھ انجام دی جائیں اور اسی کے پیش نظر انہوں نے مشرقی ایران میں امن و امان قائم کیا، شام بلکہ افریقہ تک میں شورشیں فرو کیں،

کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار نہیں تھے۔ علویوں کے حق میں الفضل کا رجحان الرشید کو پسند نہیں تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ الفضل کے مزاج میں وہ لچک موجود نہیں تھی جس سے اس کا باپ بہرہ ور تھا۔ ۵۱۸۳/۷۹۹ء میں، یعنی اپنے خاندان کی آخری ذلت و رسوائی سے چار سال قبل، اسے سرکاری منصب سے برطرف کر دیا گیا تھا۔ جعفر بظاہر خلیفہ کا پورا معتمد علیہ نظر آتا تھا اور خلیفہ پر اس کا اثر بھی (اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے مقابلے میں) زیادہ مدت تک رہا، لیکن وہ بھی اپنے برگشتہ مزاج آفا کے شکوک و شبہات سے محفوظ نہ تھا اور وہ موقع بہ موقع اپنے اختیارات کو بیجا کام میں لانے پر جھڑکیاں سنتا رہتا تھا۔

درحقیقت یہ ایک طبعی بات تھی کہ برامکہ کے سترہ سالہ دور اقتدار میں الرشید کا رویہ ان کے بارے میں بدلتا چلا گیا۔ اپنی تخت نشینی کے وقت خلیفہ کی عمر صرف تیس برس تھی۔ اس وقت وہ بخوشی اس کے لیے تیار ہو گیا تھا کہ اپنی والدہ کی ہدایات پر چلے اور اپنی بعض ذمے داریاں یحییٰ کے کندھوں پر ڈال کر خود سبکدوشی حاصل کر لے۔ لیکن آگے چل کر یہ ذلت آمیز صورت حال اس پر گراں گزرنے لگی اور عمر کے ساتھ اس کی یہ خواہش بھی ترقی کرتی گئی کہ سب کام اس کی مرضی کے مطابق طے ہوں۔ دوسری طرف یہ کیفیت تھی کہ برامکہ نے سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر اپنے رشتے داروں اور حامیوں کو فائز کر رکھا تھا اور وہ یہ منصوبہ گنٹھ رہے تھے کہ وزارت کے عہدے پر ایک طرح کی اپنی خاندانی وراثت قائم کر لیں۔ اس طرح انہوں نے سلطنت کے اندر گویا اپنی الگ سلطنت بنا رکھی تھی۔ مزید برآں انہوں نے اپنے پاس دولت کے انبار اکھٹے کر لیے تھے، جن پر خلیفہ کی اپنی نظر تھی۔ ان سب پر



عمارتیں بنانے کا انہیں بے حد شوق تھا، چنانچہ انہوں نے بغداد میں بہت سے محلات تعمیر کرائے جن میں سے مشہورترین قصر جعفر تھا، جو بالآخر خلفا کا مستقر بنا۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ برامکہ کا اثر ان کے زوال کے بعد بالکل معدوم ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اثر آئندہ کئی برس تک ان وزیروں اور دیروں کی معرفت جاری رہا جو المامون کے عہد میں ان عہدوں پر فائز تھے اور جن میں سے زیادہ تر برامکہ کے ماتحت اور متوسل رہ چکے تھے۔ اس کی نمایاں مثال مشہور و معروف الفضل بن سہل ہے۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ الرشید کے [برمکی] وزرا نے اپنے دور اقتدار میں باکمال ”کتاب“ کا ایک گروہ اپنے گرد جمع کر لیا تھا اور انہیں اپنی مرضی کے مطابق تربیت دی تھی، اور ان لوگوں سے پورے طور پر اپنا پیچھا چھڑانا بعد کے خلفا کے لیے ممکن نہ تھا۔

آخر میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ادبی تصنیفات کو برامکہ نے بے حد متاثر کیا، چنانچہ مصنفین ان کے خوب گن گاتے تھے اور ان کے محاسن کا ذکر کرنے سے کبھی نہیں تنہکتے تھے اور بسا اوقات اس میں مبالغے کا بھی دخل ہو جاتا تھا (یعنی کا فہم و ذکا اور اس کا ملکہ پیشین گوئی، الفضل کی خود داری اور قابل فخر فیاضی، جعفر کی طلاقت لسانی اور خوش بیانی)۔ علاوہ بریں بعض حکایات کے ذریعے بھی جعفر کی شخصیت کو قبول عام حاصل ہوا۔ مثال کے طور پر ان کہانیوں کا نام لیا جا سکتا ہے جو آگے چل کر الف لیلة میں شامل کر لی گئیں اور جن میں جعفر کو ہارون الرشید کے وزیر اور بے تکلف ندیم کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

مآخذ: (۱) Les Barmécides : L. Bouvat (۲)

باغیوں کو، جن میں علوی بھی شامل تھے، اطاعت پر مجبور کیا، انتظام مملکت میں ایک باقاعدگی اور نظم و ترتیب پیدا کی، سرکاری آمدنی کے اہم ذرائع کو استقلال اور استحکام بخشا، رفاہ عام کے کاموں کو ترقی دی (نہر قاطول اور سیحان تعمیر کی)، اسلامی شریعت کی روشنی میں عدل و انصاف کے ساتھ بدعنوانیوں کی اصلاح کی اور قاضی القضاة کا عہدہ قائم کر کے عدلیہ کو مستحکم بنایا۔ عہد عباسیہ کے آغاز ہی سے ایرانیت کا رنگ غالب آنے لگا تھا اور اس میں شک نہیں کہ ان کے طرز عمل سے یہ عمل تیز تر ہو گیا۔ انہوں نے عہدہ وزارت کو وہ اہمیت اور وقار بخشا کہ بعد میں آنے والے متاثر ہو کر ان کی تقالی پر مجبور ہو گئے۔ ان کے امتیازی اختیارات اور شان و شوکت کے با وصف ان کا اثر و رسوخ خالص شخصی اور انفرادی حیثیت رکھتا تھا اور یہی بات اس المیے کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جس نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ یہ بھی کہا نہیں جا سکتا کہ وہ وزارت کو اس نمونے پر ڈھالنا چاہتے تھے جو ساسانیوں سے منسوب کیا جاتا ہے۔

برامکہ کی کارگزاریاں محض سیاسی اور انتظامی شعبوں تک محدود نہیں تھیں بلکہ ایک اہم ثقافتی اور فنی کارنامہ بھی انہیں کا مرہون منت ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شعرا کی سرپرستی ان کا شعار تھا، جنہیں ان کے قصائد مدحیہ کے صلے میں انعامات ایک خصوصی محکمے کے ذریعے تقسیم کیے جاتے تھے، جو ”دیوان الشعر“ کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ انہوں نے علما و فضلا کی قدر دانی کی اور اپنے محلات میں علمائے دین اور فلسفیوں کو جمع کر کے وقتاً فوقتاً ایسی مجالس منعقد کیں جن کی شہرت اب تک چلی آ رہی ہے۔ انہوں نے فنون کی سرپرستی کی۔

[رک بآن] سے ہے۔ وہ موسیٰ بن یحییٰ کا پوتا تھا اور خلیفہ المقتدر کا مقرب رہا۔

مأخذ: (۱) *Les Barmécides*: L. Bouvat، ص ۱۰۱ بعد؛ (۲) الجہشیاری: کتاب الوزراء، قاہرہ، ص ۲۹۷ تا ۲۹۸؛ (۳) الزرکلی؛ (۴) محمد عبدالرزاق: البرامکہ۔

۵۔ البرمکی کی نسبت: بعض ایسے افراد کی نسبت بھی البرمکی تھی جن کا البرامکہ سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ ان میں ایک طبقہ تو ان کے متوسلین، موالی اور ان کی اولاد کا ہے۔ دوسرا طبقہ بغداد کے اس محلے کے باشندوں کا ہے، جس کا نام ہی البرامکہ پڑ گیا تھا۔ اس طبقے میں مشہور مغنی ذنابیر اور ممتاز ہئیت دان اور مصنف محمد ابن جہم ہو گزرے ہیں۔ مؤخر الذکر سمآلو کے محاصرے میں موجود تھا اور سامانیوں کا وزیر اور غزنویوں کا سفیر ہوا۔

آگے چل کر ایران اور شمالی افریقہ میں متعدد خاندانوں نے دعویٰ کیا کہ وہ آل برمک کے اخلاف ہیں (خراسان میں سربداران اور توات Touat میں بورامیک) علاوہ ازیں آخر میں ایک اور قبیلے کو بھی ان کی نسل سے ہونے کا دعویٰ تھا۔ ابھی تھوڑے دن پہلے تک مصر میں اس قبیلے سے رقاصائیں بھرتی کی جاتی تھیں، جنہیں غوازی کہا جاتا تھا۔ ان رقاصہ لڑکیوں کی شہرت نے موجودہ مصری زبان میں بعض اوقات لفظ برمکی سے جو تحقیر آمیز معنی وابستہ کیے جاتے ہیں وہ بلاشبہ ان رقاصوں کی بدولت ہے۔

مأخذ: *Les Barmécides*: L. Bouvat، ص ۱۰۵ بعد [نیز رک بہ غوازی]۔

(D. SOURDEL)

البرانس: قبائل کے ان دو گروہوں میں سے ایک کا نام جو باہم مل کر [رک بآن] قوم کہلاتے ہیں۔ دوسرے گروہ کا نام بٹر ہے۔

*Les vizirat 'abbāside*: D. Sourdal (مقالے کی تحریر کے وقت زیر طبع)؛ (۳) الجہشیاری: کتاب الوزراء، بمدد اشاریہ؛ (۴) ابن عبدربہ: العقد، قاہرہ ۱۹۴۵ تا ۱۹۵۲ء، ۳: ۲۶ تا ۳۴؛ نیز دیکھیے بمدد اشاریہ؛ (۵) الطبری؛ (۶) الیعقوبی؛ (۷) المسعودی، اور (۸) ابن خلکان، بذیل مادہ۔

۴۔ برمکی خاندان کے دیگر افراد: یحییٰ کا ایک بھائی محمد بن خالد تھا، جو ۵۱۷۲/۵۱۷۹ء سے ۵۱۷۹/۵۱۸۸ء تک حاجب کے عہدے پر سرفراز رہا اور خاندان کے زوال کے وقت یہی ایک فرد تھا جو خلیفہ کے ہاتھ سے بچا۔ الفضل اور جعفر کے علاوہ یحییٰ کے دو اور بیٹے محمد اور موسیٰ بھی تھے، جو ذکاوت میں تو اپنے بھائیوں کے ہم سر نہ تھے تاہم دربار خلافت میں ان کا بھی ایک مقام تھا۔ ان میں موسیٰ عسکری قابلیت اور شجاعت میں مشہور تھا اور ۵۱۷۶/۵۱۹۲ء میں شام کا والی رہا۔ ان دونوں کو بھی ان کے باپ اور بھائیوں کے ساتھ ۵۱۸۷/۵۲۰۳ء میں قید خانے میں ڈال دیا گیا تھا، لیکن الامین نے ازراہ کرم انہیں رہا کر دیا۔ موسیٰ عراق ہی میں رہا اور خلیفہ کی فوج میں شامل ہو کر لڑائیوں میں حصہ لیتا رہا۔ بعد ازاں وہ المامون سے جا ملا، جس نے آگے چل کر اسے سندھ کا والی مقرر کر دیا۔ ۵۲۲۱/۵۸۳۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے ایک لڑکا عمران چھوڑا، جو اس کا جانشین ہوا اور جس نے چند معرکوں میں نام پیدا کیا۔ دوسری جانب محمد مرو میں المامون کے دربار سے وابستہ ہو گیا، جس سے قبل ازیں اس کا بیٹا احمد اور اس کا بھتیجا العباس بن الفضل منسلک ہو چکے تھے۔

برمکیوں کے کثیر التعداد اخلاف میں سے ایک فرد خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس نے ایک مغنی اور ایک مصنف کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ ہماری مراد احمد بن جعفر الملقب بہ حنظلہ



البرانس ان دونوں گروہوں کے مشترک جد امجد کے نام برنس کی جمع ہے، جس کے نام سے اس کی اولاد مشہور ہوئی۔ اس نام کی اصل کیا ہو سکتی ہے، اس کے لیے رَکْ بہ البتر۔

ابن خلدون کے مطابق البرانس میں پانچ قومیں شامل ہیں: اُوربہ، عَجِيسَه، اَزْدَاچہ، مَصْمُودَہ، غَمَارَہ، کُتَامَہ زَوَاوہ، صِنہَاچہ، ہَوَارہ۔ لیکن آخری تین قوموں کی بابت اختلاف ہے کہ آیا یہ اس گروہ میں شامل ہیں یا نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ حمیر کی اولاد ہیں اس لیے بربر نہیں ہیں۔ ان سے اور مَصْمُودَہ سے یہاں بحث نہیں کی جائے گی۔

صحیح معنوں میں برانس کا قدیم ترین مسکن اُوراس کی پہاڑیوں کا سلسلہ، صوبہ قُسْنَطِینَہ کا شمالی حصہ اور بلادالقبائل (= قبائلیہ) ہیں، جہاں وہ عزلت گزین پہاڑی لوگوں کی طرح رہتے تھے۔ پہلی صدی ہجری/ساتویں صدی عیسوی کے ربع اول میں عرب کے پہلے حملے کے وقت مشہور و معروف کُسیلَہ Kusayla الاوربی [رَکْ بَاں] کو جب شکست ہو گئی اور ان کا سردار مارا گیا تو انہیں اُوراس چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور وہ شمالی مراکش میں چلے گئے اور وہاں زُرہون کی پہاڑیوں سے لے کر دریائے وِزغہ تک آباد ہو گئے۔ ان کے بعض قدیم قبیلوں کے نام آج بھی اس دریا کے کناروں کے ساتھ ساتھ کی آبادیوں میں پائے جاتے ہیں۔ لُجَایہ Ludjaya، مَزِیَات (= مزیاتہ)، رَغِیوہ Raghiva نے ادریس اول [رَکْ بَاں] کے ساتھ معاملات میں جو کارگزاری دکھائی وہ سب کو معلوم ہے۔

ان حالات کا ہمیں کچھ علم نہیں جن کے تحت تازا [رَکْ بَاں] کے شمال میں کچھ برانس آ کر بسے۔ پھر حال البکری برانس اور اُوربہ کا سلطنت نَکُور [رَکْ بَاں] سے متعلق ہونا ظاہر کرتا ہے۔ اس

نام کے موجودہ قبیلے میں (جو مقامی بولی میں البرانص I-Baranis کہلاتا ہے اور جس کا اسم منسوب البرنوصی I-Barnosi ہے) ایک ضمنی قبیلہ وِزبہ Warba نام بھی شامل ہے۔ اُوربہ کے اس شہزادے کی جس نے ادریس اول کا استقبال کیا تھا (ولیلی میں) یادگار قائم ہے نیز اس کے محل کے کھنڈر وہاں دکھائے جاتے ہیں۔

برانس اور اُوربہ نے اس مہم میں حصہ لیا جو مراکش کی طرف سے جزیرہ نماے ایبیریا پر کی گئی۔ بعض ان میں سے وہیں رہ پڑے اور انہیں کے نام پر قرطبہ کے شمال کے پہاڑ کا نام جبل البرانس رکھا گیا، جو اب Sierra de Almadén کہلاتا ہے۔ اور قرطبہ کے شمال میں واقع ہے۔

تازا Taza کے شمال کے بعض برانس ریف کے اس دستہ فوج میں شامل تھے جس نے طنجہ پر قبضہ کیا (۶۸۳ء)۔ طنجہ کے علاقے میں فتح کا گاؤں انہیں کے نام سے مشہور ہے۔

اَزْدَاچہ (اور مِیْسَطَاہ Missittasa) برانس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ انہوں نے اُورن Oran کے علاقے میں بود و باش کن اسباب کے تحت اختیار کی۔ کچھ مِیْسَطَاہ بادیس [رَکْ بَاں] کے علاقے میں اب تک رہتے ہیں۔ اسی طرح مراکش کے کتامہ کی بابت بھی پوری طرح معلومات حاصل نہیں۔

مآخذ: (۱) ابن خلدون: *Histoire des Berbères*، طبع دوم، ۱: ۱۶۹ تا ۱۷۰، اور ۲: ۲۷۲ تا ۲۹۹؛ (۲) *Les Siècles obscurs du Maghreb*: E. F. Gautier، ۱۹۲۷ء، ص ۲۱۱ تا ۲۱۴؛ (۳) گم نام مصنف: *Fragments historiques sur les Berbères au Moyen-Age*، ترجمہ از لیوی پرووانسال E. Levi Provençal، ص ۶۳، ۸۰؛ (۴) Leo Africanus [الحسن بن محمد الوزان الزیاتی]: ترجمہ از Épaulard، ص ۳۰۰؛ (۵) *Les Branès*: Trenga

زمانے میں بعض اور کتابیں بھی لکھیں، مثلاً *A year Amongst the Persians* ("ایک سال ایرانیوں کے ساتھ")۔ یہ ان کی ایک سالہ سیاحت ایران کی سرگذشت ہے (طبع ۱۸۹۳ء)۔ اس میں بعض تحقیقی مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں۔ مقدمہ بصورت سوانح سرای۔ ڈینی سن راس نے لکھا ہے۔ *Persian Revolution* (انقلاب ایران) ایران کے دور مشروطیت (۱۹۰۵ تا ۱۹۰۹ء) کی یادگار ہے۔ اس میں قاچاری بادشاہوں کے استبداد کے خلاف آزادی پسند عالموں، شاعروں، ادیبوں، اخبار نویسوں اور عوام کی جد و جہد آزادی پر سیر حاصل بحث کی ہے (سال طباعت ۱۹۱۰ء)۔ *Press & Poetry of Modern Persia* (ایران جدید کا پریس اور شاعری) ایران کے دور مشروطیت کے آزادی پسند شعرا کے کلام پر مشتمل ہے، جو سیاسی بیداری اور حب وطن کے جذبات سے معمور ہے (سال طباعت ۱۹۱۳ء)۔ براؤن نے بابی مذہب [رک بہ بایت] کا گہری دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ اس سلسلے میں جو کتابیں تالیف و ترجمہ کیں ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: ترجمہ مقالہ سیاح (سال طباعت ۱۸۹۱ء)، متن مقالہ سیاح (سال طباعت ۱۸۹۱ء)۔ ترجمہ تاریخ جدید، مؤلفہ میرزا حسین ہمدانی مع حواشی (سال طباعت ۱۸۹۳ء)، متن نقطۃ الکاف، مؤلفہ حاجی میرزا جانی کاشانی (سال طباعت ۱۹۱۰ء)۔ اس کتاب کے شروع میں براؤن کا عالمانہ مقالہ بھی ہے، جو بابی مذہب پر بذات خود ایک مستقل تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ *Materials for the Study of the Babi Religion* (سال طباعت ۱۹۱۸ء)۔ ان کے علاوہ تذکرۃ الشعراء، مؤلفہ دولت شاہ (سال طباعت ۱۹۰۵ء)، تاریخ طبرستان، مؤلفہ محمد بن الحسن بن اسفندیار کا ملخص (سال طباعت ۱۹۰۵ء) اور تذکرہ لباب الالباب مؤلفہ محمد عوفی، حصہ اول و دوم (سال طباعت ۱۹۰۳ء،

در AM، ۱: ۳ اور ۴: ۶)؛ *Le parler arabe du Nord de la région de Taza*، در BIFAO، ۱۸ (۱۹۲۰ء)؛ ۳۳: ۷) وہی مصنف: *Sayyidi Ahmad*، در *Rivista della Tripolitania*، ۱۹۲۰ء۔

(G. S. COLIN)

⊗ براؤن: ای۔ جی۔ براؤن Edward Granville Browne (ولادت ۷ فروری ۱۸۶۲ء، وفات ۵ جون ۱۹۲۶ء) نے والدین کی خواہش کے مطابق طب کی اعلیٰ تعلیم پائی۔ اسی اثنا میں ادبیات السنۃ اسلامی، بالخصوص ادبیات فارسی سے قدرتی مناسبت ہونے کی وجہ سے فارغ اوقات میں فارسی، عربی اور ترکی زبان کی تحصیل میں بھی مصروف رہے۔ ۱۸۸۲ء میں طب اور علوم طبیعیہ میں اور ۱۸۸۳ء میں السنۃ شرقیہ میں اعلیٰ سند حاصل کی، فارغ التحصیل ہونے کے بعد سینٹ بارتھولوموز St. Bartholomews کے ہسپتال میں طب کی آخری تربیت بھی حاصل کی، لیکن اس سے کوئی لگاؤ نہ تھا، اس لیے جب کیمبرج یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے استاد مقرر ہوئے تو طب کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ اب ان کی تمنا ایران دیکھنے کی تھی جس نے سعدی و حافظ کو جنم دیا تھا۔ یہ تمنا ۱۸۸۷ء میں پوری ہوئی۔ ایران میں ایک سال تک قیام رہا۔

براؤن کا نام مستشرقین کی صف اول میں آتا ہے۔ انہوں نے فارسی زبان و ادبیات کو موضوع تحقیق بنایا اور گراں قدر کتاب *A Literary History of Persia* (تاریخ ادبیات ایران) چار جلدوں میں لکھ کر فارسی کے طلبہ اور اہل تحقیق کی رہنمائی کی۔ اس کتاب کی تالیف کے دوران میں فارسی، عربی، انگریزی، فرانسیسی، روسی اور جرمن زبانوں کے اکثر ماخذ ان کے پیش نظر تھے۔ اس



وہ سَمْنِیہ کہتے تھے (قب لفظ Samanaici، جو یونانی متأخرین نے بدھوں کے لیے استعمال کیا، مثلاً Alexander Polyhistor نے)، براہ راست زیادہ واقف تھے، کیونکہ وہ ایران اور مشرقی عراق تک پھیل گئے تھے۔ مسلمانوں کی کتابوں میں جو اعتقاد برہمنوں کی طرف بہ تواتر منسوب کیا گیا ہے، ابن حزم سے لے کر تھانوی (کشاف اصطلاحات الفنون) تک، وہ انکار رسالت ہے۔ ابن حزم اور الشہرستانی نے اس کی بابت جو کچھ کہا ہے وہ غالباً ایک ہی بیان کی مختلف شکلیں ہیں۔ ابن حزم کے مطابق برہمن یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ خدا نے انسانوں کو اگر رسولوں کی معرفت ہدایت کی تھی تو اس کے ساتھ ایسا کیوں نہ کیا کہ ہر شخص کی عقل کو سچ کے پہچان لینے پر بھی مجبور کر کر دیتا؟ الشہرستانی کہتا ہے کہ ان کے انکار رسالت کی بنیاد اس پر ہے کہ عقل انسانی خود ہر بات کو سمجھ سکتی ہے۔ البیرونی (طبع زخاؤ، ص ۵۱-۵۲) کہتا ہے کہ ہندو، رسولوں کا انکار صرف قانون اور شعائر دینیہ کے سلسلے میں کرتے ہیں، کیونکہ ان کے رشی، جو ان کے نزدیک عقلمند اور مقدس ہستیاں ہیں، قانون ہمیشہ کے لیے اور ایک ہی دفعہ مقرر کر چکے ہیں۔ لیکن وہ رسولوں کی ضرورت ان خاص اوقات کے لیے تسلیم کرتے ہیں جب کہ پرائی ہر جگہ سر اٹھا لے اور نوع انسانی کی روحانی حالت کے درست کرنے کی حاجت ہو۔

لفظ برہمن کے اشتقاق کی بابت ابن حزم کہتا ہے کہ برہمن اپنے آپ کو ایک پرانے بادشاہ کی اولاد بتاتے ہیں، جس کا نام برہمی (یا برہمی) تھا۔ المسعودی کا خیال ہے کہ وہ برہمن کی نسل سے ہیں اور وہ ایک بادشاہ تھا جو علما و فضلا کی مدد کرتا تھا، جس نے اپنے دور کی مقدس ہستیوں کی مدد سے ہندو مذہب، علم نجوم اور دیگر علوم کی بنیاد

۱۹۰۶ء) کا متن صحیح کر کے شائع کیا۔ چہار مقالہ مؤلفہ نظامی عروضی سمرقندی کا ترجمہ ۱۹۱۹ء میں شائع کرایا۔ اسی سال عربوں کے علم الادویہ پر چار لیکچر دیے، جو ۱۹۲۱ء میں کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ *A Persian Anthology* (بیاض فارسی) میں براؤن نے فارسی کے بعض نامور شعرا کے منتخب کلام کا ترجمہ کیا۔ اس سے ان شعرا کے فکر و اسلوب کا پتا چلتا ہے (سال طباعت ۱۹۲۷ء)۔ آخری عمر میں براؤن اپنے مملوکہ گران قدر مخطوطات کی فہرست مرتب کرنے میں مصروف رہا۔ ادبی سرگرمیوں کے علاوہ اس نے بہت سا وقت کیمبرج یونیورسٹی میں علوم شرقیہ کی ترویج و ترقی میں صرف کیا۔ ۱۹۰۴ء میں اپنے ایک دوست ای۔ جی۔ ڈبلیو۔ گب کی یاد میں، گب کی بیوہ اور دوسرے پانچ علما کے ساتھ مل کر گب میموریل ٹرسٹ قائم کیا، جس کے زیر اہتمام متعدد ضخیم کتابیں اور تراجم شائع ہوئے۔ براؤن کی گران قدر علمی خدمات نے متمدن دنیا کے ہر حصے سے خراج تحسین وصول کیا۔ ان کا اعتراف اس طرح بھی ہوا کہ گیارہ مختلف اقوام کے مستشرقین نے مل کر محققانہ مضامین کا مجموعہ عجب نامہ (E. G. B. کی نسبت سے) مرتب کر کے ان کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر ۱ فروری ۱۹۲۲ء کو بطور ارمغان عقیدت پیش کیا۔

مآخذ: (۱) *A year Amongst* : E.G. Browne

*Persians*؛ (۲) وہی مصنف: *A Persian Anthology*؛

(۳) فہرست مخطوطات، مرتبہ براؤن؛ (۴) دولت شاہ؛

تذکرۃ الشعراء، طبع براؤن؛ (۵) عجب نامہ۔

(مقبول بیگ بدخشانی)

براہمہ: برہمن کی جمع، عربی مصنفوں میں سے البیرونی کو برہمن اور برہمن مت سے خصوصی واقفیت حاصل تھی لیکن عرب بدھوں سے، جنہیں

وہ مشکلات بیان کرتا ہے جو ایک باہر کے طالب علم کو اس بارے میں پیش آتی ہیں: اول تو سنسکرت کے رسم خط اور اس کی پیچیدگی کی مشکل، دوسرے ہندومت اور اسلام میں زمین آسمان کا فرق اور اس پر مزید یہ کہ ہندو جاتی کی طرف سے باہر والوں کو اپنی زبان اور علوم سکھانے کی کلی ممانعت۔ تمہید کے بعد کتاب کے چھ باب ہیں، جن میں ہندو مذہب، الہیات وغیرہ کا بیان ہے۔ مصنف برہمنوں کی عادات و خصائل اور ان کے طریقہ زندگی وغیرہ کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔

براہمہ کے حالات و کوائف ہندوستان میں آنے والے دیگر سیاحوں کی تصانیف میں ملتے ہیں۔ عموماً جوگیوں، ان کی ریاضتوں اور طرز زندگی کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ان میں ہندو فلسفہ اور برہمنوں کا ذکر محض برائے نام ہے۔ جوگ (یوگا) کی ریاضتیں، جو روحانی لذت یا علم حاصل کرنے کے لیے مقرر ہیں، ایک زمانے میں جاذب توجہ رہی ہیں، لیکن عموماً انہیں اگر بالکل قابل نفرت نہیں تو مورد شک و شبہ ضرور سمجھا گیا ہے۔

[مآخذ: متن میں آگئے ہیں۔]

(R. F. AN)

براہوئی: (= براہوئی، بروہی) ۱۔ یہ مغربی پاکستان کے قلات ڈویژن کے ضلع قلات کے باشندے ہیں اور ان کی مخصوص زبان بھی انہیں کے نام سے موسوم ہے۔ ضلع قلات کے شمال میں کوئٹہ ڈویژن، جنوب میں مکران اور لس بیلہ، مشرق میں کوہ کیرتھر Kirthar اور سندھ اور مغرب میں مکران اور خاران واقع ہیں۔ یہ ضلع ایک مستطیل ہے، جو شمالاً جنوباً زیادہ سے زیادہ ۳۴۰ میل لمبا اور شرقاً غرباً زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ میل چوڑا ہے اور اس کا مجموعی رقبہ ۲۹۸۰۲ مربع میل ہے۔ یہ صدیوں سے دو حصوں میں منقسم چلا آ رہا ہے۔

ڈالی۔ البرونی ایک ہندو افسانوی روایت کا ذکر کرتا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ برہمن برہم (یا براہم) کے سر سے پیدا ہوئے۔ جس سے ان کی مراد فطرت (نیچر) ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنے آپ کو نوع انسان کا بہترین حصہ سمجھتے ہیں۔ تنہا نوی (کتاب مذکور) نے بیان کیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ابرہیم پیغمبر کی اولاد بتاتے ہیں [نیز دیکھیے نعمت اللہ گوہر: تحفہ ہند و یورپ، ۱۹۲۸ء، (وانگریزی ترجمہ)]۔ اس نظریے میں ہندوؤں کی اس رائے کی جھلک نظر آتی ہے جو قدیم زمانے کے بہت بعد کی معلوم ہوتی ہے، جس کا مدعا یہ ہے کہ اس برگزیدہ ہستی کو جو یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں وقیع مرتبہ رکھتی ہے اپنا بنا کر رکھا جائے۔

براہمہ کے بارے میں مستند مآخذ بلا شک و شبہ البرونی ہے، جس نے اپنی کتاب اگرچہ غزنہ میں لکھی (تقریباً ۱۰۳۰ء میں) لیکن اس سے پہلے وہ برصغیر پاک و ہند میں رہ چکا تھا۔ اس نے سنسکرت زبان سیکھ لی تھی اور اس کی بہت سی کتابوں کا ترجمہ کر چکا تھا اور ہندوؤں کے فلسفے، مذہب، قانون، ادب، معاشرت کے حالات اور دیگر علوم مثلاً علم نجوم وغیرہ کا خوب مطالعہ کیا تھا۔ اپنی کتاب کے دیباچے میں وہ اس کی شکایت کرتا ہے کہ اس برصغیر کے ہندوؤں کی بابت کوئی قابل اعتماد تصنیف موجود نہیں۔ یہاں تک کہ ابوالعباس الایرائشہری تک بھی، جس نے یہودیت اور عیسائیت کی بابت صحیح واقعات قلم بند کیے ہیں، ہندوؤں کی بابت کچھ لکھنے میں ناکام رہا۔ اب میں اپنی یہ کتاب ہندوؤں کے حالات کی بابت اپنے آقا ابوسہل عبدالمنعم بن علی بن نوح کی فرمائش سے لکھ رہا ہوں (المسعودی، ابوالقاسم البلخی اور الحسن بن موسیٰ النوبختی کی تصانیف کا ذکر کرتا ہے)۔ البرونی ابتدا میں



جو تین سو اڑتالیس گز لمبا تھا، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ما قبل تاریخ دور میں یہاں بارش زیادہ ہوتی تھی۔ ان کے علاوہ کھدائی کے اکتشافات نے یہ ثابت کیا ہے کہ وادی نال میں ایک خود لفیل زرعی معاشرہ پیدا ہوا، جو وادی سندھ کے وسیع تر اور مرکزیت پسند تمدن کا پیشرو اور ہم عصر تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ما قبل تاریخ دور میں ضلع قلات میں خاصی بارش ہوتی تھی۔ بعد میں بارش کی کمی اور آب و ہوا کی تبدیلی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ جنوب مغربی مون سون ہواؤں کا رخ ذرا مشرق کی طرف پھر گیا اور ضلع قلات پر کم و بیش سوا دو ہزار سال سے موجودہ آب و ہوا مسلط ہو گئی۔

۲۔ براہوئیوں کا حسب و نسب

اگر براہوئیوں کا نسلیاتی تجزیہ کیا جائے تو وہ بڑا حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ براہوئی تیس بتیس قبائل پر مشتمل ہیں، جو اکثر و بیشتر مختلف النسل ہیں اور ہر بڑا قبیلہ اپنی اپنی جگہ مختلف اور متنوع نسل پاروں سے مرکب ہے۔ لیکن کسی قبیلے اور ان قبائل کے کسی جزو کا ذاتی نام براہوئی نہیں مگر مجموعی طور پر یہ سب قبائل اور ان قبائل کے افراد اپنے آپ کو براہوئی کہتے ہیں۔ لفظ براہوئی کے ماخذ و ابتدا کی تاریخ معلوم نہیں۔ براہوئی کی مختلف وجوہ تسمیہ بیان کی گئی ہیں، مثلاً (۱) براہوئی بروہو سے بگڑا ہے، جو ابراہیم کا مخفف ہے۔ ممکن ہے یہ اشارہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف ہو یا کسی اور ابراہیم کی طرف، جو براہوئیوں کا حقیقی یا روایتی مورث اعلیٰ ہو؛ (۲) کرد قبیلہ براہوئی کا نام بگڑ کر براہوئی بن گیا؛ (۳) براہوئی گوجرا قبائل کے ایک حصے بروہ یا براہ سے ماخوذ ہونے کی وجہ سے براہوئی کہلائے؛ (۴) براہوئی کے لفظی معنی مرد کہستانی ہیں اور چونکہ براہوئی پہاڑی

شمالی حصے کو سراوان کہتے ہیں اور جنوبی کو جہلاوان۔ سراوان سراسر پہاڑی علاقہ ہے، جس کے پہاڑ سطح سمندر سے گیارہ ہزار فٹ تک بلند ہیں، جن میں ساڑھے پانچ ہزار فٹ سے لے کر ساڑھے چھ ہزار فٹ تک بڑی بڑی وادیاں، جیسے قلات، ستونگ وغیرہ اور چھوٹی چھوٹی وادیاں، جیسے جوهان، مرو، زرخو، نرمک وغیرہ پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ کشان، رویدار وغیرہ میں کاریزیں موجود ہیں، جہاں گلہ بانی کے علاوہ کاشتکاری اور باغبانی بھی ممکن ہے۔ کوہ براہوئی وسطی پورے ضلع میں کھڑا ہے اور اسی کی شاخیں ناکاؤ، بنگلزئی، کرد، ساتکزئی، ہربوئی، سیاہ ماران، میلی اور زبرا سراوان میں شرقاً غرباً واقع ہیں۔ جہلاوان کے پہاڑ شمالاً جنوباً ہیں۔ ہربوئی کے علاوہ چارپر کی پہاڑیاں ہیں، جو زیادہ سے زیادہ ڈھائی ہزار فٹ تک بلند ہیں اور جنوب کی طرف جاتے جاتے صرف پانچ سو فٹ اونچی رہ جاتی ہیں۔ ان میں بھی وادیاں موجود ہیں۔ بیشتر آبادی خانہ بدوشی، گلہ بانی اور خیمہ برداری پر مجبور ہے، لیکن براہوئی قبائل کا حکمران طبقہ وادیوں اور کاریزوں کی وجہ سے بہت متمول ہے۔ متوسط طبقے کا وجود ہی نہیں، اقلیت نہایت امیر اور اکثریت انتہائی غریب ہے۔

یہ جغرافیائی ماحول کم از کم سکندر کے حملے کے وقت سے ایسا ہی ہے، لیکن اس سے پیشتر اس علاقے میں بکثرت بارش ہونے کے شواہد دریافت ہوئے ہیں۔ جہلاوان میں ما قبل تاریخ دور کے سنگین بند پائے گئے ہیں، جنہیں براہوئی گبر بند کہتے ہیں۔ وادی مشکے میں دو بند ملے ہیں، جو پہاڑوں کا برساتی پانی جمع کر کے کھیتوں تک پہنچاتے تھے، درہ لاکورین Lakorian کے پاس تو ایک باقاعدہ بند کے نشانات ملے ہیں

زبانوں سے خاصی مشابہت رکھتی ہے؛ لہذا براہوئی دراوڑوں ہی کے اخلاف ہیں، جنہوں نے تین ہزار سال قبل مسیح میں وادی سندھ کی تہذیب کے علاوہ دوسرے چھوٹے چھوٹے زرعی معاشرے نال، کٹی، کوئٹہ اور ژوب وغیرہ میں قائم کیے تھے اور جو ۱۵۰۰ قبل مسیح کے قریب آریوں سے شکست کھا کر ان کے مطیع ہو گئے۔ ان میں سے جو مطیع نہ ہونا چاہتے تھے وہ ضلع قلات کے پہاڑوں میں پناہ گزین ہوئے لیکن اکثر و بیشتر ایک طویل سفر کے بعد جنوبی بھارت میں اقامت پذیر ہوئے، جہاں وہ آج تک اپنے مخصوص تمدن اور زبانوں کے مالک ہیں۔ ان کے برعکس براہوئی چونکہ گذرگاہ پر آباد تھے اس لیے ان میں وسطی اور مغربی ایشیا کے مختلف نسل پارے مخلوط ہو گئے اور ان کی زبان و ثقافت اور وضع و معاشرت پر نو واردوں کے گہرے اثرات مرتسم ہو گئے۔ لیکن ان اثرات کے باوجود ان کی زبان سے ان کی دراوڑ اصلیت کا اب بھی صاف صاف پتا چل رہا ہے۔

### ۳۔ براہوئی معاشرتی و سیاسی تنظیم

براہوئیوں کی معاشرتی تنظیم ان کے سیاسی و اقتصادی نظام سے ناگزیر ربط و ضبط رکھتی ہے۔ قلات کی میری یا خانی کے ظہور (پندرہویں صدی عیسوی) سے قبل ان کی قدیم اور اصل معاشرتی تنظیم قبیلے کے گرد گھومتی تھی۔ یہ امر معنی خیز ہے کہ براہوئی اصطلاح میں قبیلہ اور قوم ہم معنی الفاظ ہیں، لہذا ان کے قبیلے کی تشکیل و تنظیم کو سمجھنا از بس ضروری ہے۔

قدیم براہوئیوں نے اپنے قبیلے کو مختلف مدارج میں منظم کیا تھا۔ اس کی قدرتی بنیادی اکائی خاندان تھا، جسے براہوئی اصطلاح میں پرا کہتے ہیں۔ پرا کا سردار اس کا معمر ترین فرد ہوتا تھا، جو اپنے پرا کی معاشی ضروریات کا

علاقے کے رہنے والے ہیں اس لیے براہوئی کہلائے؛ (۵) براہوئی کوہ البرز کے باشندے ہونے کی وجہ سے پہلے پہل برز کوہی اور پھر براہوئی کہلائے؛ (۶) مختلف النسل اور مختلف الخیال لیکن ایک ہی ماہول میں رہنے والے قبائل کو باہم مربوط کرنے اور رکھنے کے لیے غالباً یہ عمومی اصطلاح وضع کی گئی۔ زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ لفظ براہوئی سیاسی اور جغرافیائی بنا ہی پر وضع کیا گیا ہو یا ہو گیا ہو۔

براہوئیوں کے حسب و نسب کے متعلق بھی مختلف اور متضاد نظریات پیش کیے گئے ہیں۔ خود براہوئی خوانین کی روایات انہیں حضرت حمزہؑ کی اولاد بتاتی ہیں، مؤرخین اور محققین نے انہیں عرب، کرد، ایرانی، گوجر، ترک، مغول اور بلوچ بتایا ہے، لیکن یہ سب مذکورہ لوگ کرہ ارض کے اس افریشیائی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جو فاصلوں کے باوجود تھوڑے سے تغیر کے ساتھ ایک ہی قسم کے طبعی ماحول کا مالک لہذا بہت سی مشترکہ خصوصیات کا حامل ہے اس لیے ان میں سے کسی راے کو بھی قطعی نہیں سمجھا جا سکتا۔ ثانیاً یہ تمام مذکورہ نسل پارے براہوئی جمعیت میں واقعی گھلے ملے ہیں اس لیے ان میں سے کسی ایک نسل پارے کے ساتھ انہیں مخصوص و محدود کرنے کا جواز نہیں ہے۔

ان کی منفرد اور جداگانہ ہستی کو سمجھنے کے لیے ہمیں دراصل ان کے نسلی عناصر سے زیادہ ان کی زبان پر توجہ دینی چاہیے جو منفرد اور جداگانہ ہے۔ لسن Lassen، ارنسٹ ٹرمپ، گرٹیرسن، جان آیوری Avery، سر ڈینس برے وغیرہ نے انہیں اسی نظریے سے جانچا ہے اور براہوئی زبان کو اصلی و اساسی طور پر دراوڑی زبان ثابت کیا ہے، جو جنوبی بھارت کی دراوڑی



ایک قبیلہ ٹھکروں، شلواریوں اور پروں میں منظم ہو کر تشکیل پا گیا۔

براہوئیوں کے متعلق عموماً یہ کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ وہ سردار پرست ہیں اور اپنے سرداروں کے اندھا دُھند مقلد، لیکن مذکورہ تنظیم سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ براہوئی معاشرہ ایسے نہیں ہیں؛ اسی لیے وہ سماجی اور سیاسی اقتدار کو افراد کے بجائے خاندانوں میں مرکوز رکھتے ہیں، لیکن کسی حد تک خانی قلات کے زیر اثر اور بہت حد تک انگریزی دور میں سردار ان پر مسلط ہو گئے۔

اختلاف کو نمٹانے کے لیے بھی کماش، ٹھکری اور سردار خود مختار نہ تھے بلکہ اپنے اپنے حلقے میں جرگوں کے ذریعے فیصلے کرتے تھے۔ کماش کا جرگہ خاندانی قائدین پر، ٹھکری کا جرگہ کماشوں پر اور سردار کا جرگہ ٹھکریوں پر مشتمل ہوتا تھا اور جرگے صرف روایتی قانون کو نافذ کرتے تھے جو صدیوں سے ہر قبائلی کا جانا پہچانا ہوتا تھا اور ان کا مقصد سزا دینا نہ تھا بلکہ اسباب جرائم کا سدّ پاب کرنا اور فریقین کی باہمی منافرت کو دور کرنا تھا۔

ایک اور امر جو اس سلسلے میں پیش نظر رہنا چاہیے یہ ہے کہ براہوئی قبیلہ ایک نسلی تنظیم نہیں بلکہ ایک ما فوق النسلی تنظیم ہے۔ یہ بنیادی اکائی، یعنی خاندان، نسلیت پر ضرور مبنی ہے اور کسی حد تک شلواری بھی، لیکن ٹھکری اور قبیلے میں وہ تمام مختلف النسل لوگ شامل ہو سکتے تھے جو اسی علاقے میں سکونت پذیر ہوں اور شمولیت کے خواہاں ہوں۔ اس کے علاوہ قبیلے کے دروازے نوواردوں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔ نووارد اگر باہمی خوشی و غم اور جنگ و امن میں شریک ہوتا تھا تو اسے قبائلی زمین میں سے حصہ تفویض کر دیا جاتا تھا اور کچھ عرصہ بعد اس کی شادی بھی

کفیل بھی تھا اور ان کی سماجی تقریبات کا رہنما بھی۔ ہر دور کا قانون اس کی اس حیثیت کو بلا چون و چرا تسلیم کرتا تھا، لہذا آئے دن کے حملوں اور تغیرات کے باوجود اپنے اس اٹل بنیادی خاندانی استحکام کی وجہ سے براہوئی معاشرہ شکست و ریخت سے بچا رہتا تھا۔ لیکن جب بہت سے خاندان ایک دوسرے کی قربت اور ہمسائیگی میں رہتے ہوں تو ان کے داخلی توازن کے باوجود ان میں اختلافات ہو سکتے ہیں، یا انہیں مشترکہ مسائل تحفظ و بقا پیش آ سکتے ہیں، لہذا براہوئیوں نے 'پرا' سے اوپر 'شلوار'، یعنی برادری، کی تنظیم کی، جو مختلف خاندانوں کا مجموعہ تھی۔ 'پرا' کے برعکس 'شلوار' کا کوئی قدرتی قائد نہ ہو سکتا تھا، اس لیے انہوں نے بالواسطہ اصول انتخاب سے کام لیا۔ تمام 'پروں' کے قائدین نے اپنے میں سے افضل ترین قائد کو اس بنا پر 'شلوار' کا قائد چن لیا کہ اس کا خاندان شجاعت و سخاوت اور پابندی دستور میں ممتاز ترین تھا۔ یہ قائد معتبر یا کماش کہلایا۔ اگر کماش دستور کی پابندی نہ کرے یا روز جنگ بھاگ جائے تو اسے معزول کر کے اسی کے خاندان کے کسی اور فرد کو کماش منتخب کیا جا سکتا تھا، گویا یہ عہدہ کسی فرد کے بجائے ایک خاندان میں موروثی طور پر مستقل کر دیا گیا۔

مختلف 'شلواریوں' یا برادریوں کے باہمی اختلافات کو نمٹانے کے لیے انہوں نے ٹھکری کی تنظیم کی، جو چند برادریوں کا مجموعہ تھا۔ ٹھکری یا طائفے کا قائد کماشوں میں سے منتخب ہوا اور اسے اصطلاحاً ٹھکری یا میر کہتے ہیں۔ ٹھکروں کے مشترکہ مسائل اور باہمی اختلافات کو نمٹانے کے لیے انہوں نے قبیلہ منظم کیا اور افضل ترین ٹھکری کو کماش کے اصول و شرائط پر قبیلے کا قائد چن لیا اور اسے اصطلاحاً سردار پکارنے لگے۔ اس طرح

قبیلے کی کسی لڑکی کے ساتھ کر دی جاتی تھی اور اس طرح اس کی شمولیت پر سہرِ دوام ثبت ہو جاتی تھی۔ گویا براہوئی قبائلی معاشرتی تنظیم جامد نہ تھی بلکہ اس میں لچک، وسعت پذیری اور تنوع کے اوصاف موجود تھے؛ اسی لیے مختلف نسل پارے اس میں جذب ہوتے گئے۔

لیکن اگر خاندانوں، شلواریوں اور ٹھکروں میں اختلاف ہو سکتے تھے یا بعض مشترکہ مسائل انہیں باہم مربوط کرنے کے متقاضی تھے تو قبیلوں میں ایک دوسرے کے درمیان بھی اختلافات ہو سکتے تھے اور مشترکہ مسائل انہیں اتحاد و اشتراک پر اکسا سکتے تھے، لہذا مرورِ زمان کے ساتھ ساتھ براہوئیوں میں ایک مافوق القبیلہ نظام کا احساس پیدا ہوا۔

اس کی پہلی کڑی کو اصطلاحاً ”پلو شریک“ یا ”پلوی“ کہتے ہیں، یعنی وہ قبائل جو اپنی مخصوص ساخت یا روایات یا سرداروں کے باوجود ایک ہی علاقے میں رہنے کی وجہ سے دوسرے کے دامن گیر یا ہم پلہ و ہم پیالہ ہیں۔ یہ قبائل اپنے سے قوی قبیلے کو اپنا قبیلہ اول مان لیتے تھے اور جنگ و امن اور شادی و غم میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ سراوان کے پانچ پلوی مندرجہ ذیل تھے: (۱) رئیسانی: گرد، لانگو، ساتکڑی؛ (۲) شاہوانی: محمد شہی، سرپرہ؛ (۳) لہڑی اور بنگلڑی؛ (۴) رند اور ڈومبکی؛ (۵) مری، بگٹی، نوشیروانی، سنجرانی اور جمال دینی۔ جہلاوان کے پانچ پلوی درج ذیل تھے: (۱) زہری، زرک زئی، نیچاری، پندرانی، چیک؛ (۲) شاہی زئی، مینگل، بزنجو، خدرانی، ساجدی، محمد حسنی؛ (۳) مگسی، دیناری، لاشاری؛ (۴) میر واڑی، قمبراڑی، ایلتاڑی، ڈگر مینگل؛ (۵) گرگناڑی، قلندراڑی، سمالاڑی، رودینی۔ براہوئیوں کا یہ اقدام یقیناً ان کی مرکز پذیری کی

نشان دہی کرتا ہے، لیکن حالات جس مرکزیت کے متقاضی تھے پلوی اسے پورا نہ کر سکتے تھے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ پندرہویں صدی عیسوی میں بلوچ مکران میں تازہ دم اور منظم ہونے کے بعد پیش قدمی کے لیے تیار ہو رہے تھے اور وسط ایشیا سے مغول کا سیلاب بڑھا چلا آ رہا تھا، لہذا قبائل کے سرداروں نے اپنے میں سے ممتاز ترین خاندان کے ممتاز ترین سردار کو اپنے پرانے اصول و شرائط انتخاب پر اپنا قائد منتخب کر لیا، جسے انہوں نے پہلے میر اور بعد میں خان کہا۔ پہلا میر یا خان میرو قمبرانی تھا اور اس نے نہ صرف قبائلی تنظیم اور دستور برقرار رکھا اور اسے مستحکم کیا بلکہ جدگالوں (جاٹوں) سے جنگیں لڑ کر ان کے بہت سے علاقے قبائل میں تقسیم کر دیے۔ یہاں سے بعض مؤرخوں کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ براہوئیوں کا قبائلی و جرگائی نظام قمبرانی قانون پر مرتب ہوا، حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ قمبرانیوں نے دستور و روایات قدیم ہی کو اپنا قانون بنا کر انہیں مستقل حیثیت دے دی۔ بعد میں میر نصیر خان اول (۱۷۴۹ - ۱۷۹۴ء) نے سراوان اور جہلاوان کے لیے الگ الگ سرداروں کا عہدہ قائم کر کے پلوی اور خان کے درمیان ایک اور کڑی قائم کی تا کہ بصورتِ جنگ خان کو کم سے کم لیکن طاقتور ترین سرداروں ہی سے سروکار یا رابطہ رکھنا پڑے۔ بہر حال خانی کے قیام سے براہوئیوں کی معاشرتی اور سیاسی تنظیم بیک وقت پایہ تکمیل کو پہنچ گئی۔ خان سردار خیلوں (حکمران خاندانوں) کے مقدمات کے علاوہ ایسے اہم داخلی مقدمات سنا تھا جن سے وسیع نقض امن کا خدشہ ہو سکتا تھا، لیکن اس کے فیصلے اکثر و بیشتر انفرادی یا آمرانہ بلکہ جرگائی ہوتے تھے۔ خان کا جرگہ سرداران قبائل پر مشتمل



میر محمود خان دوم کے زمانے میں چلتی رہی، حتیٰ کہ ۱۹۱۷ء میں سر شمس شاہ اس کا وزیر اعظم بنا۔

۱۹۱۷ء میں براہوئی ریاست کا دور حاضرہ شروع ہوا۔ سر شمس شاہ کے خلاف سردار محمد خان زرک زئی، سردار نورالدین مینگل، سردار شہباز خان گرگناڑی اور سردار سلطان محمد نے سر اٹھایا۔ نورا مینگل اس تحریک کا سالارِ اعلیٰ تھا۔ یہ تحریک دسمبر ۱۹۱۷ء میں نورا مینگل کو انگریزوں کے حوالے کرنے سے دب گئی، لیکن آگ سلگتی رہی۔ دوسری مذہبی تحریک عراق کے مقدس مقامات کی بے حرمتی کے خلاف چلی۔ ٹکراؤ میں سینتالیس مخالف مارے گئے اور اکانوے گرفتار ہوئے، لیکن انگریزوں کو سردار نور الدین مینگل اور سردار شہباز خان گرگناڑی کو بچال کرتے ہی بنی۔ تیسری وسیع تر تحریک آزادی نواب زادہ یوسف علی عزیزمگسی خان کی زیر قیادت کبھی خفیہ، کبھی بر ملا، لیکن مسلسل چلتی رہی۔ ۱۹۳۳ء سے میر احمد یار خان ریاست کے خان ہوئے اور انہوں نے تحریک پاکستان کی حمایت میں پرجوش حصہ لیا۔

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان سے یہ ریاست ہمارے ملک کی ترقیاتی سرگرمیوں میں برابر کی حصہ دار ہے۔ سکول اور شفاخانے وسیع تعداد میں کھولے گئے ہیں۔ کراچی سے کوئٹے تک براستہ خضدار شاہراہ زیر تعمیر ہے۔ مستونگ میں انٹر کالج اور خضدار میں ڈگری کالج قائم کیے گئے ہیں۔ ۱۹۵۸ء کے بعد سے اس علاقے پر خصوصی توجہ کی گئی ہے۔

براہوئیوں کی سیاسی تنظیم عموماً چند اصولوں پر کام کرتی رہی ہے: (۱) عام قبائلیوں نے سیاسی اقتدار مستقلاً حکمران خاندانوں میں مرکوز کر کے کسب معاش کے لیے فراغت پائی۔ اس حکمران

ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ تمام خارجی امور کا نگہبان تھا اور تمام خارجی جنگیں اسی کے زیر قیادت ہوئیں۔

اپنے قیام سے لے کر ۱۶۶۶ء تک ریاست قلات کا ابتدائی تشکیلی دور تھا، جس میں اس کی تاریخ بہت الجھی ہوئی اور تاریکی میں ہے۔ کم و بیش چار میر۔ میرو، میر عمر، میر بچار اور میر حسن۔ اس عرصے میں حکمران رہے۔ داخلی طور پر ریاست جدگالوں سے مسلسل نبرد آزما رہی، حتیٰ کہ یہ سب سیاسی و عسکری طور پر شکست کھا کر پلٹ گئے یا براہوئی ہیئت اجتماعیہ میں مدغم ہوتے گئے۔

دوسرا دور ۱۶۶۶ء میں میر احمد خان اول سے شروع ہوا اور اقتدار مستقلاً قہرانی قبیلے کی شاخ احمد زئی کے پاس آ گیا۔ اس کی معراج میر نصیر خان اول (۱۷۴۹-۱۷۹۳ء) کا دور تھا، جس نے براہوئیوں اور بلوچوں کو متحد کرنے کی پوری کوشش کی اور اپنی قوت و عظمت کا سگہ نہ صرف بلوچستان بلکہ ایران و افغانستان اور سندھ و پنجاب پر بھی بٹھا دیا اور اپنی رعایا میں اتنا ہر دل عزیز ہوا کہ آج تک اسے ولی اور نوری سمجھا جاتا ہے۔

میر معراب خان دوم (۱۸۱۷-۱۸۳۹ء) سے ریاست کا تیسرا دور شروع ہوا، جب انگریزی اقتدار پہلی جنگ افغانستان کی وجہ سے بلوچستان کو بھی اپنے شکنجے میں لے آیا اور میر معراب براہوئیوں کا پہلا شہید بنا۔ انگریز میر شاہنواز خان کو برسر اقتدار لائے، لیکن قبائل نے میر نصیر خان کا ساتھ دیا اور اس نے قلات پر قبضہ کر لیا اور انگریزوں نے چار و ناچار تسلیم کر لیا۔ اس کے باوجود انگریزی اقتدار روز افزوں رہا۔ میر خداداد خان کے وقت مستقل بناوٹیں ہوئیں اور انگریزوں کو مزید مداخلت کے مواقع ملتے گئے۔ یہی صورت حال

خاندان کے افراد براہوئیوں کے امیر ترین لوگ ہیں۔ انہیں حکمرانی کے علاوہ بیگار، نذرانے وغیرہ کی مراعات حاصل ہیں، لیکن حکمران طبقے عموماً اپنے قبائلیوں کے نبض شناس رہے؛ (۲) خواہن قلات نے اقتدار کے بے ضرورت اظہار سے حتی الوسع گریز کیا اور تمام اختیارات اپنی ذات یا دربار میں مرکوز کرنے سے احتراز کرتے رہے۔ انہوں نے اپنی ریاست کو ایک نوع کا وفاق سمجھا۔ ان کی دیکھا دیکھی سردار، ٹھکری اور کماش بھی اپنے اپنے دائروں میں کام کرتے رہے؛ (۳) اپنے قبائل کی اقتصادی خوشحالی کے لیے ہر اچھے خان نے توسیع سلطنت کے ذریعے مزید اراضی حاصل کی اور اس طرح براہوئیوں کا اجتماعی کردار بھی پختہ کیا؛ (۴) خان کی کامیابی اس میں مضمحل رہی کہ وہ کس حد تک اپنے گرد و پیش کی زیادہ طاقتور سلطنتوں کے مقابلے پر اپنی داخلی آزادی بچاتا ہے اور کس حد تک ان کے سامنے جھک کر اپنی اور اپنے قبائلیوں کی بہتری کر سکتا ہے۔

کیا براہوئی معاشرے میں ذات پات کی تمیز ہے؟ شعوری طور پر ایسی کسی تمیز کا پتا نہیں چلتا لیکن اقتصادی لحاظ سے براہوئی معاشرہ چند طبقوں میں بٹا ہوا ہے: اولاً بالائی حکمران اور امیر طبقہ، جس کا اختیار و اقتدار گو قبائلیوں ہی کا مرہون منت ہے تاہم صدیوں سے اپنے حلقے میں بست و کشاد کا مرکز و محور ہونے کی وجہ سے بہت طاقتور ہو گیا ہے۔ اس طبقے کی طاقت اس وقت بڑھنے کے اور امکانات ہوتے ہیں جب خان کمزور ہو یا حکومت بالا اسے کمزور کر دے۔ یہ طبقہ براہوئی علاقے کی بہترین زمینوں کا مالک ہے۔ وادیاں، کاریز، چشمے، باغات، اور جنگلات عموماً اسی کے تصرف میں ہیں۔ ان کے علاوہ اسے بیگار اور نذرانے وغیرہ کی مراعات حاصل ہیں، لیکن

غالباً اس کی قوت و شوکت کا جزو اعظم اس کے قبائلیوں کی عملاً غیر مشروط حمایت و اطاعت ہے۔ دوسرا طبقہ زیریں، محکوم اور غریب طبقہ ہے، جو عام قبائلیوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ براہوئی معاشرے کی اکثریت ہیں۔ یہ لوگ سارا سال محنتِ شاقہ سے کام لیتے ہیں، لیکن پھر بھی نادار، خانہ بدوش، خیمہ بردار اور گلہ بان ہی رہتے ہیں۔ عام قبائلیوں ہی میں سے لیکن سماجی لحاظ سے کمتر درجے کے لوگ بھی ہیں، جنہیں لوڑی کہتے ہیں۔ یہ نہ صرف شجرہ بے نسب کے حافظ ہیں بلکہ قومی تاریخ و تمدن کے داستان سرا ہیں۔ انہیں کی وجہ سے قدیم قبائلی اور خارجی جنگیں، مہمات، ہر دل عزیز سرداروں کے کارنامے، اولیائے اسلاف کے قصے، لوک ادب خصوصاً لوک گیت، عظیم سرداروں کے نوحے اور مذہبی و اخلاقی منظومات غرض کہ انسانی اور قبائلی زندگی کے اہم واقعات زندہ و پائندہ ہیں۔ وہ اس علاقے کے نشیب و فراز میں گھومتے پھرتے ہیں اور ان کے گیت امیر و غریب کو یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ آج تک ان لوڑیوں کے سینوں میں محفوظ شعر و ادب کو تحریر میں لانے کی کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی۔ بہر حال انہیں تیسرا طبقہ کہا جاسکتا ہے۔ براہوئی معاشرے کا چوتھا طبقہ علما پر مشتمل ہے، جو فلاکت زدہ اور جہالت زدہ قبائلیوں میں علم و ادب کا شوق پیدا کرنے کے لیے براہوئی زبان میں مصروف تصنیف و تخلیق رہے ہیں۔ ان میں سر فہرست ملا ملک داد بن آدین غرشین قندھاری ثم قلاتی ہیں، جنہوں نے ۱۷۵۹ء میں میر نصیر خان اول کے دور حکومت میں اپنی شہرہ آفاق کتاب تحفة العجائب لکھی۔ ملا موصوف کا مقصد یہ تھا کہ وہ براہوئیوں کو اسلام کے اعتقادی و اخلاقی نظام سے روشناس کرائیں اور



نہیں آتی۔ یہ صرف چیدہ چیدہ اصول ہیں۔ دستور اصل میں مہد سے لحد تک براہوئیوں پر کارگر اور کارفرما ہے اور اس کے دیگر اصول جنگ میں پامردی و جانبازی، اپنے سرداروں کی حتی الوسع تقلید، جرگے کے فیصلے کا احترام، ہمسائے کی حفاظت اور بصورت جنگ اسے اپنے قبیلے کے پاس جانے اور اس کی طرف سے لڑنے کی ضمانت، شادی بیاہ کی رسموں میں سادگی، مذہبی روا داری اور ایک حیرت انگیز اخلاقی و جنسی ضبط وغیرہ ہیں۔

براہوئی معاشرے میں عورت کا کیا مقام ہے؟ مذکورہ بالا دستور سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ براہوئی نظام عورت کی توقیر کا قائل تھا۔ براہوئی حتی الوسع اس پر ہاتھ نہیں اٹھاتے اور اس کی مداخلت پر عموماً جرم معاف کر دیتے تھے، حتی کہ اگر وہ قرآن مجید سر پر رکھ کر آ جائے تو لڑائی بھی فوراً بند کر دیتے تھے۔ براہوئیوں کے یہاں زمین انفرادی ملکیت کی بجائے قبائلی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ چونکہ لڑکیوں کو جہیز کے طور پر زمینوں کی پیداوار کا حصہ بخشنے سے قبائلی اور اقتصادی توازن بگڑ جاتا تھا، لہذا میر نصیر خان اول نے اپنے دور حکومت میں لڑکیوں کو زمینی پیداوار کا حصہ دینا بند کر دیا۔ انگریزی دور میں جب یہ قبائلی نظام خود کار رہنے کے بجائے انگریزوں کی منشاء کے مطابق چلنے لگا تو عورتوں کو دیگر حقوق و مراعات سے بھی محروم کر دیا گیا۔ لیکن براہوئی تاریخ اور اصلی نظام میں ان کا بہت اہم حصہ بھی ہے اور بہت عزت و احترام بھی۔ براہوئی عورتیں خود جنگوں میں حصہ لیتی تھیں، جس سے مردوں کے حوصلے بڑھتے تھے اور وہ جان توڑ کر لڑتے تھے۔

براہوئیوں کا قدیم مذہب غالباً وادی سندھ کی تہذیب کا مذہب ہی تھا، جسے وادی نال کے ما قبل تاریخ زرعی معاشرے کے مطابق ڈھال لیا

ان کی زندگیوں کو شریعت کے مطابق ڈھالیں۔ اس زمرے میں دوسرا بڑا نام شیخ بلوچستان مولانا محمد فاضل کا ہے، جن کی روحانی تحریک نے براہوئیوں کو عیسائیت سے بچا لیا اور جن کے تلامذہ راشدہ نے براہوئی زبان کو مذہبی و اخلاقی علم و ادب اور نثر و نظم سے مالا مال کر دیا۔ ان علما کا اثر بھی علاقے کے نشیب و فراز اور امیر و غریب پر یکساں ہوا ہے۔

انگریز مصنفوں نے بہت محنت و جانفشانی سے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ براہوئیوں کو کون سے اصول عزیز از جان تھے، جنہیں وہ کبھی اپنا دستور یا ضابطہ حیات کہتے ہیں اور کبھی 'میار' (معیار)؛ چنانچہ انہوں نے براہ راست مشاہدات سے آٹھ نو اصول دریافت کیے، مثلاً: (۱) پیر، یعنی انتقام لینا؛ (۲) باہوٹ، یعنی پناہ گزین کی آخری دم تک حفاظت؛ (۳) امانت (امانت)، یعنی دوسرے کی امانت کی مرتے دم تک حفاظت؛ (۴) مہمان نوازی، جسے غریب سے غریب براہوئی بھی اپنا فرض سمجھتا ہے اور ہر گاؤں میں مستقل مہمان داری کے لیے خیمے لگے رہتے ہیں؛ (۵) عورت یا کمین یا کمن بچی یا ہندو کو مارنے سے اجتناب؛ (۶) مجرم یا قاتل قبیلے کی کسی عورت کی مداخلت پر جرم معاف کر دینا یا کم از کم اسے پوشاک دے کر عزت سے لوٹا دینا، سیاہ کاری جیسے جرائم کے سوا؛ (۷) زیارت، یعنی کسی بزرگ کے مزار پر کسی کو نہ مارنا؛ (۸) ملا یا سید یا کوئی عورت قرآن مجید سر پر رکھ کر آ جائے یا ہاتھ میں ننگی تلوار لے آئے تو لڑائی فوراً بند کر دینا؛ (۹) سیاہ کار مرد اور سیاہ کار عورت کو قتل کر دینا۔ گواہ نئی تعلیم کے زیر اثر ایسے جرائم میں بھی جرمانے اور جلا وطنی کی سزائیں تجویز کر دی جاتی ہیں۔ ان اصولوں سے براہوئی دستور کی مکمل تصویر سامنے

حسن و عشق کے قصے صرف خال خال ہی ہیں۔ لیکن ان اثرات کے باوجود عام قبائلیوں میں قدیم توہمات موجود ہیں، گوملا ملک داد کی تبلیغ، میر نصیر خان نوری کی شرعی اصلاحات اور درخانی تحریک نے ان کے توہمات کو معقول حد تک کمزور کر دیا ہے۔

۴ - براہوئی زبان

براہوئی یوں تو اپنے قبیلے کی درجہ بدرجہ تنظیم، مافوق القبیلہ نظام، خانی قلات میں ریاستہائے متحدہ کے تخیل، اپنے معیار و دستور اور اپنے جرگائی نظام انصاف میں بھی متعدد و منفرد خصوصیات کے حامل ہیں لیکن انکا ممتاز ترین نقش ان کی زبان ہے اور اسی کی بنا پر وہ نہ صرف مغربی پاکستان کے دیگر نسلی عناصر سے ممیز کیے جا سکتے ہیں بلکہ وادی سندھ کی تہذیب اور اس کے ہم عصر و ماقبل زرعی تمدنوں کے ساتھ ہمارا بلا واسطہ رشتہ استوار کرتے ہیں۔

براہوئی زبان نہ تو ہند و اروپائی قدیم و جدید السنہ، از قسم سنسکرت، قدیم فارسی، یونانی، لاطینی اور انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، روسی، فارسی اور ہندی وغیرہ کی طرح تصریفی زبان، جو اپنے قواعدی رشتوں کو ظاہر کرنے کے لیے لاحقوں، سابقوں یا میانوں کے ذریعے الفاظ کی انتہا یا ان کی صورت تک کو بدل ڈالتی ہے اور یہ لاحقے، سابقے اور میانے اسما کے ساتھ مل کر اپنے معانی اور اپنی انفرادیت ہی کھوپیٹھتے ہیں تا کہ ایک نیا معنی پیدا کر سکیں اور نہ براہوئی زبان چینی اور تبتی کی طرح ہی یک لفظی یا یک رکنی زبان ہے کہ ہر لفظ بلا اضافہ ایک بنیادی خیال کا مظہر ہو بلکہ یہ التصاقی یا امتزاجی یا غیر تصریفی زمرے کی زبان ہے۔ اس زمرے میں قدیم و جدید سامی و حامی زبانیں از قسم بابلی، آشوری، کنعانی یا آرامی یا

گیا تھا، یعنی ایک ایسے دیوتا کی پوجا کی جاتی تھی جو حکمران بھی ہو۔ ایک دیوی غالباً دھرتی دیوی کا تصور موجود تھا، جو انہیں سامان خور و نوش مہیا کرتی تھی۔ بیل، درخت، ناگ، دریا اور ندی وغیرہ کی پرستش بھی کی جاتی تھی۔ یہ عقائد خاصے راسخ تھے اور ویدک آریہ مذہب خود بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ویدک آریہ مذہب کی مظاہر پرستی کا اثر بھی ان لوگوں پر ہونا لازمی تھا۔ اس کے کمزور ہونے کے بعد بدھ مت یہاں برسرِ اقتدار رہا، لیکن بدھ مت کو بھی یہاں کے ماحول اور لوگوں کے مزاج کے مطابق ڈھلنا پڑا۔ آتش پرستی کے آثار بھی اس علاقے میں پائے گئے ہیں۔ ماقبل تاریخ کے بند آج بھی جھلاوان میں گبر بند کہلاتے ہیں، جو غالباً آتش پرستی اور آتش پرستوں کے اثر کے غماز ہیں۔ براہوئی کب مسلمان ہوئے؟ غالباً وہ عربوں کے قبضہ مکران کے بعد نور اسلام سے مشرف ہوئے۔ اسلام نے براہوئی حیاتِ اجتماعیہ پر سنی اثرات مرتسم کیے، مثلاً: (۱) کئی مسلمان نسل پارے براہوئی جمعیت میں داخل ہوئے، جیسے بلوچ، افغان وغیرہ؛ (۲) اسلام نے انہیں پہلی دفعہ رشتہ وحدت میں پرویا اور وہ قبائل سے ماورا ہو کر ایک مرکز کی طرف مائل ہوئے؛ (۳) وہ قرآن مجید کی اتنی عزت کرنے لگے کہ قبائلی لڑائی تک بند کر دیتے جب کوئی خاتون اسے سر پر اٹھا کر آ جاتی۔ آج بھی قرآن مجید ہی پختہ عہد و پیمان کا ذریعہ ہے؛ (۴) اسلام کی تعلیمات پھیلانے کے لیے علما کا طبقہ وجود میں آیا، جس نے براہوئی زبان و ادب کی بھی گراں قدر خدمات انجام دیں؛ (۵) اسلامی تعلیمات کے زیر اثر ہی ان میں ایک بے نظیر اور حیرت انگیز جنسی و اخلاقی ضبط پیدا ہوا اور وہ عربی، نعاشی اور جنسی بے راہ روی کو بدترین گناہ سمجھنے لگے؛ چنانچہ براہوئی زبان و ادب میں



ہی صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔

۵۔ ضمائر و اعداد میں یہ زبانیں حتی الوسع  
دخیل الفاظ سے مبرا ہیں۔

۶۔ صفاتِ مقابلہ میں لاحقے کا فقدان ہے  
لیکن تفضیل ظاہر ضرور کی جاتی ہے۔

یہ خصوصیات براہوئی زبان میں یوں ظاہر  
ہوتی ہیں :-

۱۔ براہوئی میں بھی دارومدار زیادہ تر  
مرکبات پر ہے، مثلاً جان ہشوکا، یعنی جان سوز،  
جان لینے والا، جان لیوا، و سہ تروکا یعنی زندگی  
دینے والا یا جان بخش۔ بادل لانے والی ہوا کو  
جھمر بروکا، یعنی ابر آور کہتے ہیں۔ ہرن کی آنکھوں  
والی حسینہ کو خزم خنی یا آہو خنی کہتے ہیں۔  
لمبی گردن والی محبوبہ کو کونج لخی کہتے ہیں۔  
چاند کو شرمانے والے چہرے یا حسن کو ماہ لچ کہہ  
دیتے ہیں۔ چاند کو ماند کر دینے بلکہ بجھا دینے  
والے حسن کو ماہ تھوس کہتے ہیں۔ دل میں بیٹھ  
جانے والی یعنی دل نشیں بات کو آست ناتھٹی ہنو کا  
یعنی دل کے اندر جانے والی کہہ دیتے ہیں۔  
انگریزی زبان میں بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں،  
لیکن اُس پر مشتقات بہت غالب ہیں۔

۲۔ بعض آریائی زبانوں کا قاعدہ ہے کہ  
سابقے، میانے اور لاحقے اسما کے ساتھ مل کر اپنے  
معنی اور اپنی انفرادیت کھو بیٹھتے ہیں اور کاملاً  
انہیں میں ضم ہو کر نئے معانی دے دیتے ہیں، لیکن  
براہوئی میں سابقے، میانے اور لاحقے اسما کے ساتھ  
مل کر نئے معنی تو پیدا کر دیتے ہیں تاہم  
اپنا وجود اور اپنے ذاتی معنی بھی برقرار رکھتے  
ہیں، جیسے :-

تذکیر و تانیث ظاہر کرنے کے لیے 'نرنکا'  
اور 'ماداغا' سابقوں کے طور پر لگا دیتے ہیں، جیسے  
نرنکا چک (= نر پرندہ) اور مادا غاچک (= مادہ پرندہ)،

لہتی، عبرانی، کلدانی، عربی، مصری، قبطی اور  
یورالی الطائی زبانیں از قسم ترکی، منگولی، ہنگروی  
شامل ہیں۔ دراوڑی زمرہ السنہ کو بھی اسی زمرے  
میں شامل کیا جاتا ہے۔ ان تمام السنہ کا  
اصول مشترک یہ ہے کہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ  
کو ایسے جوڑ دیتی ہیں کہ وہ تصریفی السنہ کے  
لاحقوں کی طرح ایک دوسرے میں کاملاً جذب نہیں  
ہوتے، لیکن اپنے اپنے معانی قائم رکھنے کے باوجود  
نئے معنی ضرور پیدا کر دیتی ہیں اور اس طرح  
تصریفی السنہ کے مقصد کو پا لیتی ہیں۔ گویا  
براہوئی اور دیگر دراوڑ السنہ کا قدیم ساسی و  
حاسی السنہ سے رشتہ نہ صرف قریبی بلکہ قدیم ہے اور  
قیاس غالب ہے کہ مزید تحقیقات کے بعد محققین کو یہ  
تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ دراوڑ نسل بنو سام و  
بنو حام سے متعلق ضرور تھی۔

دراوڑ زمرہ السنہ میں جو اہم مشترکہ  
عناصر پائے جاتے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ ان زبانوں میں مشتقات بہت کم اور  
سیدھے مادے ہوتے ہیں اور مرکبات ہی پر ان کا  
زیادہ تر دارومدار ہے۔ یہ مرکبات دو یا دو سے  
زیادہ اسما کو ملا کر بنتے ہیں۔

۲۔ یہ تمام زبانیں واضح طور پر التصاتی  
نوعیت کی ہیں۔ ان کی گرامر کے تعلقات ان کے  
مادوں سے لاحقے، سابقے اور میانے چسپاں کرنے سے  
ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ زائد پارے ان کے مادوں میں  
یوں جذب نہیں ہوتے جیسے باہم سوڑ توڑ سے پیدا  
ہونے والی تصریفی زبانوں میں ہوتے ہیں۔

۳۔ اسمائے صفت غیر تصرف پذیر ہوتے  
ہیں اور اسما کے ساتھ سابقوں کے طور پر لگا دیے  
جاتے ہیں۔

۴۔ ان زبانوں میں اسمائے موصولہ نہیں  
ہوتے۔ اس کے برعکس افعال مثبت اور منفی دونوں

خاخو(=سیاہ کوا)، پیونو پرک(=سفید تلی)، چنکو ریش(=چھدری داڑھی)، زیوزائفہ(=حسین عورت)، ہنے نو دیر(=میٹھا پانی)، پوسکنوسو(=تازہ گوشت)، منگنو گدھ(=بوسیدہ کپڑے)، بھلو پر(=موسلا دھار بارش)، جوا ننگا اخلاق(=نیک اخلاق) وغیرہ۔

۴ - براہوئی میں مصادر مثبت اور منفی دونوں ہی صورتوں میں ملتے ہیں۔ براہوئی مثبت مصادر کی عمومی نشانی صوتی لحاظ سے انگ اور تحریری لحاظ سے ننگ ہے اور منفی مصادر کی پنگ یا صرف پنگ ہے۔ ذیل کی مثالوں سے یہ واضح ہو جائیگا:-

مثبت معنی	منفی معنی
ہینگ	ہپنگ
جانا	نہ جانا
پارنگ	پائپنگ
بولنا	نہ بولنا
ہوگنگ	ہوغپنگ
رونا	نہ رونا
جاگنگ	جاگپنگ
جاگنا	نہ جاگنا
خاچنگ	خاچپنگ
سونا	نہ سونا

۵ - براہوئی پر فارسی کی اتنی دیز تہہ جم گئی ہے کہ اس کے صرف پہلے تین اعداد ہی دراوڑی رہ گئے ہیں۔ ایک کو اسٹ، دو کو آرٹ اور تین کو مسٹ کہتے ہیں۔ اس کے بعد فارسی کی گنتی ہے، یعنی چہار، پنج، شش وغیرہ؛ لیکن ہر دس کے پہلے تین اعداد کو خالص فارسی گنتی میں بھی ظاہر کرتے ہیں اور فارسی دراوڑی گنتی میں بھی، مثلاً گیارہ، بارہ اور تیرہ کو یازدہ، دوازدہ، سینزدہ بھی کہتے ہیں اور دہ اسٹ، دہ آرٹ اور دہ مسٹ بھی کہتے ہیں۔ توصیفی و ترتیبی اعداد میں پہلا = اولیکو، دوسرا = ارٹمیکو، تیسرا = مسٹ میکو اور اس کے بعد عموماً فارسی عدد کے بعد میکو کا لاحقہ لگا کر ادا کرتے چلے جاتے ہیں۔

لیکن براہوئی ضمائر اپنی دراوڑی اصلیت کا ایک بین ثبوت ہیں اور یہاں فارسی ضمائر وغیرہ

اسی طرح زیادہ تعداد ظاہر کرنے کے لیے بز، بمعنی بہت، بطور سابقہ لگاتے ہیں، جیسے بزہلی (=بہت سے گھوڑے)، تفضیل بعض اور تفضیل دل ظاہر کرنے کے لیے زیاستی (=زیادہ سے) اور کھلان (=کل سے) بطور سابقہ لگاتے ہیں، جیسے بہتر کو ظاہر کرنے کے لیے زیاستی جوان (=زیادہ سے اچھا) اور بہترین کو ظاہر کرنے کے لیے کھلان جوان (=کل سے اچھا) کہتے ہیں۔ اسما میں اضافت یا انتساب، تفریق اور عطیے کی حالتیں ظاہر کرنے کے لیے ان کے درمیان نا، آن، ات، نے اے کے میانے چسپاں کر دیتے ہیں، جیسے برائے انتساب یا اضافت: ہلی ناگرا (=گھوڑے کا بچہ)، باوانا مسر (=باپ کی بیٹی)، خنک نالر زیرا (=آنکھوں کی لرزش)؛ برائے تفریق: ہلی آن دتر (=گھوڑے سے خون)، اُست دعا (=دل سے دعا) اور برائے عطیہ ننے دیرایتے (=مجھے پانی دیدو)، ددے ایتے (=اسے دیدو) کہتے ہیں۔

اسما میں آلہ، حال، ذوالحال، شمولیت، انداز، سمت، بالائی حالت، رفاقت وغیرہ کی حالتیں ظاہر کرنے کے لیے ان کے آخر میں اینے، آن، ٹی، ات،، آ وغیرہ لاحقوں کے طور پر لگا دیتے ہیں، جیسے اسم کو آلہ بنانے کے لیے زغم اینے یا زغمینے (=تلوار سے یا تلوار کے ساتھ)؛ اسم کو کسی حالت کی وجہ بنانے کے لیے ٹھپ آن یا ٹھپان (=زخم سے یا زخم کی وجہ سے)؛ شمولیت ظاہر کرنے کے لیے اسم کے آخر میں لاحقہ ٹی لگا کر شہرٹی (=شہر میں)، اوراٹی (=گھر میں)؛ سمت ظاہر کرنے کے لیے ای حیدر آباد، کوا (=میں حیدرآباد کو جاؤنگا)؛ بالائی حالت کو ظاہر کرنے کے لیے ہلی آ (=گھوڑے پر)، کٹا (=کھاٹ پر) مشا (=پھاڑ پر) بولتے اور لکھتے ہیں۔

۳ - براہوئی میں اسمائے صفت سابقوں کے طور پر ہی چسپاں کیے جاتے ہیں، مثلاً شرنکا نرینہ (=اچھا آدمی)، جوانو پوشاک (=عمدہ پوشاک)، مونو



دور میں، جب کہ ان باہم متخالف و متضاد سلطنتوں میں ایک ناگزیر لسانی و تمدنی یگانگت پائی جاتی تھی، براہوئی میں عربی اور فارسی کے بے شمار الفاظ داخل ہو گئے۔ ان کے علاوہ خانہ بدوشی اور میل ملاپ کی وجہ سے بلوچی، پشتو اور سندھی کے متعدد الفاظ بھی اس کا جزو بنتے رہے۔ پھر ریاست قلات کی سرکاری، درباری اور دفتری زبان فارسی تھی لہذا براہوئی صرف بول چال کی زبان رہ گئی اور تامل وغیرہ کی طرح کوئی ادب پیدا نہ کر سکی۔ لیکن عربی فارسی الفاظ کی بہرمار کے باوجود براہوئی کی اساسی لغت اب بھی دراوڑی ہے، جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ لغت میں بھی براہوئی اور دراوڑی کے ناقابل انکار مشابہت اور یک مخرجی نمایاں ہے، جیسا کہ ذیل کے الفاظ سے ظاہر ہو گا :-

(الف)

براہوئی	تامل	اردو	براہوئی	تامل	اردو
دیر	نیر، تھنیر	پانی	خل	شکل	پتھر
آدنیک	گناہدی	آئینہ	گرا گندرو	کدرای	بچھڑا
خاخو	کاہکے	کوا	لمان	اماں	ماں
خن	کن	آنکھ	ٹپک	تپکی	بندوق
ای (نن - ہم)	نن	میں	پورا	پورنم	مکمل

(ب)

براہوئی	دراوڑی السنہ	اردو
سنگ	سنگم (چنگم)	چونگی
پھڈ	پوٹا	پیٹ
باوا (ابا)	ابا (بابن)	باپ
درکان	تکان	ترکھان
کاڑی	گڈیا	گاڑی
ہلہ	الہ	حملہ (ہلہ)
پرا	پرہوارم	خاندان
خن	کن (کنو، کنھن)	آنکھ
لمان	اماں (امبو، اماں)	ماں

اثر برائے نام ہے۔ استنبیاسیہ ضمائر، مثلاً در (== کون؟) دتا (== کسی کا؟) درے (== کیسے؟) درآن (== کس سے؟)، آنت (== کیا؟) اور آرا (== کس کا؟) خالص دراوڑی ہیں۔ اسمائے ضمائر کے تقابلی مطالعے سے یہ بات اور بھی واضح ہو جائیگی۔

دراوڑی زمرہ

براہوئی	ملیالم	تامل	کناری	ٹوڈا	اردو
ای	نا	نان	نانو	آن	میں
کنا	اینٹر	اینڈر	ناندو	نیدو	میرا
نی	نی	نی	نینو	نی	تو
نا	نیندا	اونادو	نینادو	ندو	تیرا
نم	نینن	نیرو	نیود	نیو	تم
نما	نیناندا	امادو	نماندو	نمدو	تمہارا
اویاود	اوان	اوان	اوانو	او	وہ
اونا	اوانرے	اوانڈو	اوان	اوان	اس کا

۶۔ براہوئی میں دیگر دراوڑی السنہ کی طرح صفات مقابلہ نہیں ہیں گو تفخیل سابقے لگا کر ظاہر کی جا سکتی ہے، مثلاً :-

تفخیل نفسی - دا جوان اے (== وہ اچھا ہے)۔  
تفخیل بعض - دا زیاستی جوان اے (== وہ بہتر ہے)۔  
تفخیل کل - دا کھلان جوان اے (== وہ بہترین ہے)۔

براہوئی زبان چونکہ ضلع قلات کے جغرافیائی ماحول میں محدود و مقید رہی، جہاں صرف خانہ بدوشانہ اور قبائلی طرز حیات ہی ممکن تھا، اس لیے وہ جنوبی بھارت کے مختلف ماحول میں پروان چڑھنے والی دیگر دراوڑی السنہ سے مختلف ہو گئی اور اپنی وہ ماہیت بھی پوری طرح برقرار تہ رکھ سکی جو وادی سندھ میں اس کے لیے مخصوص تھی۔ زبان لازماً جغرافیائی ماحول اور سماجی نظام کا پرتو ہوتی ہے اور براہوئی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ثانیاً پاک و ہند اور ایران میں قائم ہونے والی طاقتور سلطنتوں کے زیر اثر خصوصاً ما بعد اسلام

نہیں ہے اور عربی عبرانی لفظ عین براہوئی میں اس لیے خن بنا کہ براہوئی کے حروف تہجی میں ع نہیں ہے۔ براہوئی کے لسانیاتی مطالعے میں اب تک سامی السنہ سے متذکرہ بالا خطوط پر تقابلی مطالعے کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے، اس لیے مستقبل میں اس مطالعے کی سمت بڑھنا نہ صرف نتیجہ خیز بلکہ ضروری ہے تاکہ پچھلے چار سو سال سے آریوں کے عالمی غلبے کی وجہ سے ما قبل آریائیت کو دبا کر آریائیت کو جو فروغ حاصل ہوا ہے وہ ماند پڑ سکے اور تہذیب اور تمدن کے جائز خالق سامنے آسکیں۔

موجودہ براہوئی کی لغت زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہزار الفاظ پر مشتمل معلوم ہوتی ہے۔ تخمیناً ایک عام انسان کو اپنی زندگی میں دو تین ہزار الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے۔ براہوئی کی لغت متمول تو نہیں، لیکن وہ ضلع قلات، مکران، خاران، چاغی، کوئٹہ، کچھی، کراچی، سندھ، جنوبی افغانستان اور مشرقی ایران میں بسنے والے تقریباً بیس لاکھ انسانوں کی بول چال کا ذریعہ ہے اور ان کے علم و ادب، سماجی تقریبات، معاشی نظام اور ان کے کائناتی مشاہدات و نظریات کی مظہر ہے۔ علاوہ ازیں اس میں وسعت پذیری اور ترکیب سازی کے جوہر حیرت انگیز طور پر موجود ہیں اور اب اس میں متواتر اردو اور انگریزی کے الفاظ داخل ہو رہے ہیں تاکہ اس کی تشنگی اظہار پوری ہو سکے اور قوتِ ابلاغ بڑھ سکے۔

• - براہوئی علم و ادب

موضوعاتی اعتبار سے براہوئی زبان و ادب کے چار مکاتب ہیں، جو کبھی علیحدہ علیحدہ اور کبھی مل جل کر کام کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ یہ چار سکول تحقیقی، کلاسیکی، علمی اور حالیہ ہیں اور ہم ان کا مختصر سا جائزہ یہاں پیش کرتے ہیں:-

اردو	تامل	براہوئی
پانی	نیر (نیل)	دیر
غذا	آپہ	ہپہ
پروانہ	پروکو (مچھر)	پرک (تلی)
کھوکھلا	پل لو	پولو

اس تقابلی مطالعے کو اور آگے بڑھایا جائے اور التصاقی زمرے کی قدیم و جدید سامی السنہ سے براہوئی کا مقابلہ کیا جائے تو اور بھی پر امکان اور انقلاب انگیز نتائج برآمد ہوتے ہیں، جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشوں سے ظاہر ہو گا:-

(الف)

اردو	براہوئی	دیگردراوڑی السنہ
آبا	آبا، باوا	آپا، بابن
ماں	آمان	امان، اماں، امبو
عربی	عبرانی	دیگرسامی السنہ
آب	آب	آبو، آبا، آبون
آم، ایم	ایم	آمو، ایما، آموں

(ب)

اردو	براہوئی	عبرانی و فینیقی	عربی
کان	خف	قاف	قوف (=کان کا بالائی حصہ)
منہ	با	بے	فو، فوہ
شہر	آورا،	آر	دار
راستہ	دریچہ،	دریچ	طریق
آنکھ	خن	عین	عین
میں	ٹی	بی	فی
بولنا، زبان دوی	دوی	دوور	—
سے	آن	—	عن، مین

عبرانی و فینیقی لفظ قاف براہوئی میں اس لیے

خف بنا ہے کہ براہوئی حروف تہجی میں ق



شاہی خاندانی دستاویزات اور اپنے ذاتی مشاہدات پر مبنی کیا۔ جلد ہفتم کے مقالے (مطبوعہ ۱۸۳۸ء) میں اس نے انگریزی گرامر کی روشنی میں براہوئی گرامر لکھی، جو جزوی طور پر غلط ہو گئی، لیکن دو کہانیاں، دو گیت اور بول چال کے کچھ فقرات انہوں نے براہ راست براہوئیوں سے اخذ کیے اور یہی ہمارے پاس براہوئی لوک ادب کا اب تک قدیم ترین سرمایہ ہیں۔ لیچ کے بعد چارلس میسن Charles Masson نے ۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۳ء میں اپنے دو سفرنامے چھپوائے اور دوسرے سفرنامے میں براہوئی فرہنگ بھی پیش کی۔ میسن کے بعد ایک جرمن عالم لسن Lassen نے اپنی کتاب مطبوعہ ۱۸۳۳ء کی جلد پنجم میں ”براہوئی اور اس کی بول چال“ پر تفصیلی نظر ڈالی اور تقابلی مطالعے کے بعد یہ فیصلہ پہلی دفعہ صادر کیا کہ براہوئی اور دیگر دراوڑ السنہ اساسی طور پر ایک ہیں۔ میسن کے بعد ریورینڈ رابرٹ کالڈویل Rev. Robert Caldwell نے ۱۸۵۶ء میں اپنی کتاب ”دراوڑی یا جنوبی ہند کی السنہ کی تقابلی گرامر“ شائع کروائی، جس سے لسن کے مذکورہ نظریے کو مزید تقویت ملی۔

ان کے بعد ایک اطالوی عالم فنزی فیلس Finzi Felice نے براہوئی زبان و نسل پر کام کیا لیکن اس کے کام کی بنیاد لیچ کی تحریریں تھیں۔

۱۸۷۳ء میں ڈاٹر بیلو Dr. Bellow نے اپنی کتاب ”دریائے سندھ سے دجلہ تک“ کے ایک ضمیمے میں براہوئی گرامر اور فرہنگ درج کی۔ اسی سال ایک اور کتاب ”ہندوستان کی زبانوں کے نمونے“ مصنفہ سر جارج کیمبل Sir George Campbell شائع ہوئی، جس میں براہوئی زبان کا ذکر بھی تھا۔

۱۸۷۷ء میں اللہ بخش زہری براہوئی کی

تحقیقی سکول: اس سکول کا آغاز انگریز سیاح سر ہنری پوٹنگر Sir Henry Pottinger کی کتاب *Travels in Baluchistan and Sind* سے ہوا، جو ۱۸۱۶ء میں لندن سے چھپی۔ اس وقت تک (سابق) پنجاب، بہاولپور، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد انگریزوں کے زیر نگیں نہ تھے، لیکن کچھ تو وسعت پذیر انگریزی سامراج کے تقاضوں کے تحت اور کچھ مشرق شناسی اور علم اندوزی کے جذبے کے تحت پوٹنگر ان علاقوں میں مصروف سیاحت رہا تھا۔ اس سفرنامے میں اس نے براہوئی قبائل کا سرسری سا مطالعہ پیش کیا، براہوئی زبان کی طرف اشارہ کیا اور اہم قبائل سے رابطے کے بعد بلوچوں اور افغانوں سے موازنہ کرتے ہوئے براہوئیوں پر من حیث القوم تبصرہ کیا۔ اس کے خیال میں مستعدی، جسمانی قوت، دلیری، جرأت، کوہ پیمائی، نشانہ بازی، وعدہ وفائی، حلیم الطبعی، سپہان نوازی، جفاکشی اور جنگ جوئی براہوئیوں کی نمایاں خصوصیات ہیں؛ وہ سردی اور گرمی دونوں کی شدت برداشت کر سکتے ہیں؛ قد و قامت میں افغانوں سے کچھ ہی کم ہیں، لیکن بہادر انہیں جیسے ہیں اور جرأت و تحمل میں ان سے بڑھ کر ہیں۔

پوٹنگر چونکہ ایک سیاح تھا، اس لیے اس کی بعض معلومات سطحی بھی ہو سکتی ہیں، لیکن براہوئیوں کے متعلق اس کا تبصرہ اتنا دلاویز تھا کہ یورپی علما و فضلا نے نہایت اشتیاق سے یکے بعد دیگرے براہوئیوں کو محور توجہ بنا لیا۔ پہلی جنگ افغانستان سے پیشتر لیفٹیننٹ آر۔ لیچ Lt. R. Leach نے پہلی دفعہ براہوئی زبان و ادب کی طرف توجہ کی اور اپنے مطالعات *Journal of the Royal Asiatic Society of Bengal*، ج ۷ و ۱۲، میں پیش کیے۔ جلد دوازدہم میں انہوں نے ”قلات کی مختصر تاریخ“ قلمبند کی اور اسے قلات کی

اپنی کتاب *Linguistic Survey of India* ۶۱۹:۴ تا ۶۳۶، میں براہوئی گرامر کا ذکر کیا اور قلات و کراچی کی براہوئی کے تین نمونے رومن حروف میں انگریزی ترجمہ کے ساتھ پیش کئے۔

Rev. T. J. L. میں رپورینڈ میٹر ۱۹۰۶-۱۹۰۷ء

Mayer نے *A Brahoi Reading Book* تین حصوں میں لدھیانے سے شائع کی۔ حصہ اول ۳۲، حصہ دوم ۳۸، اور حصہ سوم ۱۶ صفحات پر مشتمل تھے۔ حصہ اول و دوم میں اٹھارہ کہانیاں، آٹھ مضامین اور نظمیں درج تھیں اور حصہ سوم ایک مختصر ناول تھا۔ لیج کے بعد براہوئیوں سے براہ راست استفادے کی یہ دوسری کوشش تھی اور گو اس کا بیشتر حصہ الجھا ہوا ہے تاہم اس کی اہمیت و افادیت سے انکار ناممکن ہے۔

۱۹۰۷ء میں برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی نے انجیل کا ترجمہ براہوئی زبان میں شائع کیا۔ اور اسی سال رے صاحب لالہ جمعیت رے نے *Notes on the Study of Brahoi Language* شائع کی۔

۱۹۰۹ء میں سر ڈینس برے Sir Denys Bray

نے اپنی مشہور و معروف کتاب ”براہوئی زبان“ کا حصہ اول کلکتے سے شائع کیا اور براہوئی کی دراوڑ اصلیت پر زور دیا۔ انہوں نے براہوئیوں کے نسلی و لسانی مسائل پر مفصل بحث کی اور براہوئی گرامر اور فرہنگ بھی دی۔ ان کی کتاب کی دوسری جلد ۱۹۳۳ء میں دلی سے شائع ہوئی اور ۱۹۳۸ء میں انہوں نے براہوئی ٹوک کہانیاں انگریزی ترجمے کے ساتھ پیش کیں۔

۱۹۲۳ء میں پادری ڈنکن ڈکسی Duncan

Dixy نے سو اوراق پر مشتمل انگریزی - براہوئی لغت لکھی، جس کا مسودہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

۱۹۳۱ء میں میر رحیم داد مولائی شیدائی

کتاب *Handbook of the Brahoi Language* کراچی سے چھپی۔ اس میں اس نے براہوئی فرہنگ اور براہوئی گرامر کو بطرز احسن بیان کیا ہے اور پچاسی صفحے کی نثر بھی لکھی ہے۔ یہ کتاب سند سمجھی جاتی ہے۔

۱۸۷۷ء ہی میں اللہ بخش زہری کے ایک ہم عصر اور رفیق کار کپتان نکلسن Captain Nicholson نے کراچی سے اپنی تین تصنیفات شائع کروائیں، یعنی ”براہوئی ریڈر“ سرچارلس نیپٹر کی کتاب ”فتح سندھ“ کا براہوئی ترجمہ اور گرانٹ ڈف کی کتاب ”مرہٹہ تاریخ“ کا براہوئی ترجمہ۔

۱۸۸۰ء میں میونخ یونیورسٹی کے مشہور

مستشرق ڈاکٹر ارنسٹ ٹریمپ Dr. Ernest Trumpp نے ”براہوئی گرامر“ تالیف کی، جس کا ترجمہ ڈاکٹر تھیوڈور ڈوکا نے ۱۸۸۷ء میں انگریزی میں کیا۔ اس میں ڈاکٹر موصوف نے لیسن کی تائید کی اور براہوئی کی دراوڑی اصلیت پر زور دیا۔

۱۸۸۲ء میں پادری جی۔ شرٹ Rev. G. Shirt

نے *Indian Antiquary* ج ۱۱، میں ایک براہوئی نغمہ شائع کیا اور اسی سال لنڈن سے میک گریگر McGregor کی کتاب ”بلوچستان کی سیاحت“ منظر عام پر آئی۔

۱۸۸۷ء میں امریکی پروفیسر جان ایوری

John Avery نے *The American Antiquarian and Oriental Journal* ج ۹، میں اپنا مقالہ ”براہوئی زبان“ شائع کروایا اور براہوئی اور دراوڑی السنہ کی مشترک خصوصیات سے بحث کی۔

۱۹۰۲ء میں ایف۔ ودر بک F. Wither Bigg

نے الہ آباد سے ”براہوئی کے مطالعے کی گائڈ“ شائع کی۔ ۱۹۰۶ء میں ڈاکٹر جی۔ اے۔ گریٹرسن

Dr. G. A. Grierson نے کلکتے سے چھپنے والی



ہیں براہوئی لغت پر ابتدائی کام کیا۔ اور اسی سال راوریشنل کالج میگزین میں ان کے دو مقالے براہوئی زبان و ادب اور براہوئی اور اردو شائع ہوئے۔ مارچ ۱۹۵۹ء میں براہوئی نور محمد پروانہ نے اپنا مضمون وادی سندھ کی تہذیب اور اس کے وارث روزنامہ امروز، لاہور، میں شائع کروایا اور پھر ۲۴ فروری ۱۹۶۰ء کو مستونگ سے براہوئی کا پہلا اور واحد عنایت نامہ ایلم جاری کیا۔

۱۹۶۲ء میں ڈا ٹراہمی نیو M. B. Emeneau

نے نیلی فورنیا سے "براہوئی اور دراوڑی کی تقابلی قواعد" شائع کی۔

تحقیقی سکول کی یہ روایت اب بھی جاری و ساری ہے۔ میک گل یونیورسٹی کینیڈا کے ڈا ٹرا عبدالرحمن بار لرنے سر ڈینس برنے نو بیاد بنا کر کام شروع کیا تھا اور وہ سر ڈینس برنے کی فرہنگ کے علاوہ آٹھ سو مزید مشترک الفاظ مابین براہوئی و دیگر دراوڑی السنہ دریافت کر چکے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں لونٹے ہی سے ایک کتاب ثقافت و ادب وادی بولان میں شائع ہوئی ہے، جس میں عبدالرحمن آرد اور نور محمد پروانہ کے مقالے براہوئی ادب اور براہوئی ثقافت چھپے ہیں۔ ان کے علاوہ تراب براہوئی، عین الحق فرید ٹوٹی، عبدالرحمن براہوئی، میر عبدالقادر شاہدانی، سردار غوث بخش رئیسانی، جورک جھالاوانی وغیرہ بھی کام کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف براہوئی اور دیگر دراوڑی السنہ کا تقابلی مطالعہ جاری رہا جائے بلکہ دراوڑی السنہ اور قدیم سامی السنہ کے تقابلی مطالعے کی طرف فوراً اور زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے۔

کلاسیکی سکول : براہوئی زبان و ادب کا کلاسیکی سکول براہوئی لوٹ ادب پر مشتمل ہے۔ اسے غیر تحریر ادب بھی کہا جاتا ہے۔

بعض *A Short History of Balochistan* سکھر سے طبع کروائی۔ ۱۹۵۲ء میں فرانسیسی کتاب "لے لینگو ہومونڈے" کا نیا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کے صفحات ۴۸۸ سے ۵۰۳ تک براہوئی زبان و کلام پر مفید معلومات شامل کی گئیں۔ ۱۹۵۲ء میں میر گل خان نصیر زگر مینگل نے تاریخ بلوچستان کا پہلا حصہ لونٹے سے چھپوایا اور براہوئی خانی قلات پر اچھی خاصی روشنی ڈالی۔ ۱۹۵۵ء میں ملک صالح محمد خان لہڑی نے اپنی کتاب بلوچستان لونٹے سے چھپوائی، جس کا مواد زیادہ تر *Gazetteers* سے ماخوذ تھا۔ اس میں ریاست قلات کی تاریخ اور براہوئی قبائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں راقم مقالہ کا مقالہ مغربی پاکستان کی بنیادی وحدت چھٹی آل پاکستان ہسٹری کانفرنس منعقدہ ۱۹۵۶ء کی درروائی میں چھپا، جس میں اس نے براہوئیوں کو تہذیب و تمدن کے اولین بانی سامیوں کا وارث قرار دیا ہے۔ ۱۹۵۸ء میں اس نے لیچ Leech کی دی ہوئی دونوں براہوئی لوٹ نہانیوں کے آزاد ترجمے امروز (لاہور) کے دہ سالہ نمبر اور استقلال نمبر میں شائع کروائے۔ ۱۹۶۰ء میں پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی راجپی نے اس کا ایک طویل مقالہ *The Brahois of Quetta - Kalat Region* کتابچے کی صورت میں شائع کیا، جس میں ان کے سماجی اور سیاسی نظام، زبان، آہادی، تاریخ وغیرہ پر تبصرہ شامل تھا۔ ۱۹۶۵ء میں براہوئی کی لوٹ نہانیاں شائع ہوئی۔

۱۹۵۷ء میں سید کامل قادری نے اپنا مقالہ براہوئی قبیلہ اور اس کی زبان روزنامہ امروز میں شائع کروایا، جس میں انہوں نے براہوئی کی دراوڑی اصلیت اور اس پر آریائی زبانوں کی یلغار اور اس کی سخت جانی کا ذکر کیا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں انہوں نے براہوئی ضرب الامثال پر کام کیا۔ ۱۹۶۲ء

اس لیے کہ اس کا عَشْرِ عَشْرِ بھی ابھی تک تحریر میں نہیں لایا جا سکا۔ اس کی نشان دہی یورپی علما و فضلا نے کی ہے، جن میں سر فہرست لیفٹیننٹ آر۔ لیچ ہے، جس نے اپنے مقالہ مطبوعہ ۱۸۳۸ء میں دو کہانیاں اور دو گیت رومن حروف میں مع انگریزی ترجمہ دیے۔ اس کے بعد ریورینڈ میٹر Rev T. J. L. Mayer نے ۱۹۰۶ - ۱۹۰۷ء میں اس ادب کی طرف پوری توجہ دی اور سترہ کہانیاں، آٹھ منظومات اور آٹھ متفرقات جمع کیے اور ان کے علاوہ ایک مختصر ناول بھی قلمبند کیا۔ ان دونوں کے کام میں صریح نقص یہ ہے کہ انہوں نے ان کہانیوں اور گیتوں کے مصنفوں کے نام نہیں دیے۔ اگر مصنفوں کے نام معلوم نہ تھے تو بھی علمی اخلاق کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان کے راویوں اور مطربوں کے نام ضرور دیتے۔ دونوں کے کام کا موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ لیچ کا مطالعہ بہت حد تک باقاعدہ اور سائنسی تھا۔ اس کی دونوں کہانیاں اور دونوں گیت اپنی اپنی جگہ مکمل ہیں، لیکن میٹر نے رطب و یابس کو بلا تخصیص و امتیاز الٹا کر دیا ہے۔ اثر کہانیاں اور گیت نامکمل ہیں اور ان کا نقطہ نظر علمی و سائنسی سے زیادہ عیسائیت نواز ہے۔ بہر حال اب تک براہوئی لوگ ادب کا جو تھوڑا سا حصہ منظر عام پر آیا ہے اس میں رزمیہ اور رومانی نظمیں سرے سے مفقود ہیں۔ غالباً اس زمرے کا ادب ابھی تک لوڑیوں کے مینوں ہی میں مقید ہے۔ براہوئی لوگ کہانیوں کا بیشتر حصہ مغربی پاکستان کی دیگر زبانوں کے ساتھ مشترک معلوم ہوتا ہے۔ اس کی خالص براہوئی اصناف مندرجہ ذیل ہیں :-

۱۔ براہوئی لوگ گیت، جن کے بہت سے سر ہیں۔ ان میں سے لیلی مور، برنازنا اور بھلوٹرا یا نھلوٹرا بہت مشہور ہیں، خصوصاً لیلی مور مقبول ترین ہے۔

- ۲۔ 'لیء کو'، یعنی فراقیہ اشعار یا گیت، جو خواتین اپنے عزیز و اقارب کی جدائی میں گاتی ہیں؛
- ۳۔ 'مودہ' یعنی مرثیہ یا نوحہ یا بین، جو خواتین اپنے کسی عزیز کی موت پر گاتی ہیں۔ سردار کی موت کا نوحہ بھی اسی میں شامل ہے؛
- ۴۔ 'شزہینگ' یا 'لولی' یعنی لوری؛
- ۵۔ 'چاچا'، یعنی پہیلیاں یا بچھارتیں؛
- ۶۔ 'وسانت'، یعنی ایسی ضرب المثل جس کے ساتھ واقعے کا تذکرہ بطور تمثیل ضروری ہوتا ہے؛
- ۷۔ 'متل'، یعنی ضرب المثل؛
- ۸۔ 'ہالو'، یعنی خوشی کا گیت، جو عورتیں ہالہ بنا کر فی البدیہہ یا کسی قدیم ہالو کو مشترکہ طور پر گاتی ہیں؛
- ۹۔ 'مورو' طویل ترین اور مقبول ترین صنف ہے اور اس میں ہر قسم کے مضامین اخلاقیہ و عشقیہ اور طریبہ و حزنیہ گائے جاتے ہیں۔

براہوئی لوگ گیت: لیچ کے مقالے میں سے ایک گیت 'لیلی مور' درج ذیل ہے:

او زیو! نئے ڈیر ایتے  
نادیک ہنے نو، نئے ڈیر ایتے  
گودی گدان نا، نئے ڈیر ایتے  
نادیک پھدے نو، نئے ڈیر ایتے

ترجمہ

اے حسینہ ہمیں پانی دیدو

تیرے ہاتھوں کا پانی شیریں ہے، ہمیں پانی دیدو

اے خیمے کی ملکہ ہمیں پانی دیدو

تیرے ہاتھوں کا پانی خنک ہے، ہمیں پانی دیدو

اس مختصر سے گیت میں براہوئیوں کی سماجی اور

وجدانی زندگی کی نئی جھنکیاں ہمارے سامنے

آجاتی ہیں، مثلاً یہ گیت ان کی شبانی بلکہ

خانہ بدوشانہ زندگی کا مظہر ہے اور اس کا باسلیقہ

انہماہر عشق ظاہر کرنا ہے نہ اس کے ظہور کے وقت



یعنی فراق زدہ بہن اپنے میکے (زہری) کے راستے کو دیکھتی ہے اور اس پر ایک تیز رفتار، گرد اڑاتی ہوئی اونٹنی کو دیکھتی ہے تو بے اختیار اسے اپنا بھائی یاد آتا ہے اور وہ راستے میں آنکھیں بچھا دیتی ہے۔

’مودہ‘ کا نمونہ یہ ہے :-

لنا ایلم نے ایس آرائگی آھناس نی  
ھمیڑے دیر کنے آن دوست خناس نی

یعنی اے میرے بھائی مجھے یوں چھوڑ کر تو کہاں چلا گیا؟ وہاں وہ کون ہے جسے تو نے مجھ سے بھی عزیز تر قرار دے دیا۔

’شہینگ‘ کا ایک بول ہے :-

نا پیری ام کنے دوستے، بنک نی  
ولے دشمن ناسونان ام سلک نی

یعنی اگرچہ میں تمہارا بڑھاپا بھی چاہتی ہوں، تاہم کان کھول کر سن لو کہ یہ بھی ضروری ہے کہ دشمنوں کے مقابلے پر سینہ سپر ہو جاؤ۔

’چاچا‘ کی ایک دو مثالیں درج ذیل ہیں :-

اتی پتی آسکن نئی چھوٹی، میٹھی، پاؤں کی پتلی،  
یعنی مورنک یا چیونٹی۔

شپنک مشے ٹی ایک چرواھا پہاڑوں میں، یعنی  
دوشا یا سانپ

مردہ بش مرک مردہ اٹھتا ہے زندہ نو پکرتا ہے،  
زندہ ہلک یعنی کمک یا لڑکی یا بھندا

گڑا سے نئے ڈغارٹی ایک چیز ایسی ہے جو نہ زمین  
نئے آسمان ٹی، پر ہے اور نہ آسمان پر مگر اس کی

خوراک دترے خوراک لہو ہے، یعنی نکر  
انسانی۔

’وسانت‘ کا ایک نمونہ یہ ہے :-

اے باکہ ہیت کرینے خان تو  
داسا امر ہیت کے شوان تو

یعنی جس منہ نے خان جیسے عظیم المرتبت

ان میں خاصی شائستگی آگئی تھی اور ان کی زبان اور انداز بیان کئی ارتقائی مراحل طے کر چکے تھے۔ براہوئی زبان نہ صرف شبانیت اور خانہ بدوشی بلکہ قلب انسان کے لطیف ترین جذبات کے اظہار پر قادر ہے، براہوئیوں کا سب سے بڑا دکھ ان کے علاقے میں پانی کی کمیابی بلکہ نایابی ہے اور یہ گمبھیر دکھ اس گیت میں بھی ابھر آیا ہے اور اس سے بخوبی آشکار ہو جاتا ہے کہ براہوئی غیر تحریری ادب میں عظیم شعری تخلیقات منتظر شہود ہیں۔

’برنازنا‘ کا ایک نمونہ درج ذیل ہے :-

برنازنا، برنازنا اے میرے محبوب تو آجا۔

آتے دینے بازنا تو نے بہت سوں کا دل موہ لیا ہے

ہیتس کرک نی رازنا میرے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کر

برنازنا، برنازنا اے میرے محبوب تو آجا۔

زبا گچنیس چاومای میں جانتا ہوں کہ تیرا ثانی نہیں

گٹنا مثالٹ سازنا اور تیری آواز ساز کی مانند ہے

برنازنا، برنازنا اے میرے محبوب تو آجا

کھیلوٹڑا کا نمونہ حسب ذیل ہے :-

ہر کنا کھیلو جان کھیلاک ناہارہ کنے

بھی آہیتاک کاریمان شارہ کنے

یعنی آ میرے کھیلو جان کہ تمہارے انداز ہی مجھے کچھ کہہ سکتے ہیں اور تمہاری ہر محل باتیں ہی مجھے گرفتار دام کر سکتی ہیں۔ گویا محبوبہ اپنے محبوب کو اس کے محبوبانہ انداز و گفتار کا سہارا لیکر اپنے پاس بلانے کی ترغیب دے رہی ہے۔

’لیہ کو‘ کا ایک نمونہ یہ ہے :-

کسرے زہری نا میکے (زہری) کی شرک ہے

او ایلم جان اے بھائی جان

دھنزے نامہری نا آہکی مہری (اونٹنی) کی گرد اڑتی نظر آ رہی ہے۔

انسان سے گفتگو کی ہو وہ اب چرواہے سے کیسے بات کرے، گویا بزبان فغانی :

مرغے کردارد از چمن آسمان نصیب

گردانہ نیافت از زمین چہ باک

واقعہ یوں ہے کہ ایک قبائلی براہوئی خان سے ہم کلام ہوا تو شام کو گھر میں کسی سے نہ بولا کیونکہ اس میں اس کی اپنی اور خان کی بے حرمتی تھی۔ اہل خانہ سے بہت اصرار ہوا تو اس نے مذکورہ بالا شعر پڑھا۔ جب انسان ایک دفعہ بلندی کو چھولے تو پھر پستی کہاں بھاتی ہے؟

'مثل' کے دو چار نمونے درج ذیل ہیں :-

ھیچ نادزی گھوکلانی آٹ مفک، یعنی اونٹ

کی چوری گھٹنوں کے بل چلنے سے نہیں ہوتی۔ مفہوم یہ ہے کہ عظیم مقاصد کے لیے عظیم دل و دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔

پہڈ باسان شیفے، یعنی پیٹ ناک سے نیچے

ہے۔ مفہوم ہے کہ لالچ میں آ کر اپنی عزت نہ گنواؤ۔

کونتے ہمیزے ایتہ۔ ہراڑے کہ پدان آم

نولنگ کیس لی ات، یعنی اونٹی دری اس جگہ دے جہاں بعد میں تو خود بھی اس پر بیٹھ سکے۔

مفہوم یہ ہوا کہ رشتہ اپنے برابر کو دو جہاں باسانی نباہ ہو سکے۔ یہ یاد رہے کہ اونٹی دری

براہوئی خواتین خود بنتی ہیں اور یہاں اونٹی دری کا استعمال بمنزلہ بیٹی کے ہے۔

لشکر نا خلوک آباد مرک، پڈنا خلوک آباد

مفک، یعنی فوج کے مارے ہوئے تو آباد ہو سکتے ہیں لیکن پیٹ کے مارے ہوئے آباد نہیں ہوتے؛

گویا حملے کے باوجود قومیں پنپ سکتی ہیں لیکن پیٹ پوجا کرنے والی قوم کبھی نہیں پنپ سکتی۔

خشکا وہ گورنا شکاراے، یعنی بارانی زمین

کی کاشت اتنی ہی مشکل ہے جتنا گورخر کا شکار۔ بادشاہ تہ خن آف، خف آے، یعنی بادشاہ کی آنکھیں نہیں ہیں البتہ کان ہیں: گویا وہ رعایا کی نگہداشت تو نہیں کر سکتا لیکن ان کے حالات سے باخبر رہتا ہے یا بادشاہ کے ذاتی مشاہدہ تو ہے ہی نہیں، سنی سنائی پر چلتا ہے۔

غرض براہوئیوں میں سینکڑوں ضرب الامثال زبان زد خاص و عام ہیں جو ستر حیات کے ہر قدم پر انہیں درس عبرت دیتی ہیں اور نہ صرف ان کے طبعی و جغرافیائی ماحول کی مظہر ہیں بلکہ دانش مشرق کے بہترین نمونے بھی ہیں۔

براہوئی لوگ ادب کے مذکورہ نمونوں کے

مصنف کون ہیں؟ کوئی نہیں جانتا۔ یہ چیزیں

صدیوں سے ان کے یہاں سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں

اور ان سے ہر خاص و عام اپنی روزمرہ زندگی میں

اپنی ضروریات کے مطابق استفادہ کرتا ہے۔ لوڑی

خاص طور پر ان کے حافظ ہیں۔ ضرورت اس بات کی

ہے کہ ان تمام پارہے فکر و دانش کو اٹھٹا

کیا جائے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب اس ادب

کی تخلیق بند ہے۔ کلاسیکی روایت جاری و ساری

ہے۔ ریگی نوشکوی براہوئی زبان کا بہت عظیم

کلاسیکی شاعر تھا، جس کی کلام کا تھوڑا سا

حصہ ہی ابھی تک سنک تحریر میں پرویا گیا ہے۔

اس کے یہ اشعار بہت مشہور ہیں :-

وختے نصیر خان ولی ہلی نام ان ترہ کرے

آینو نئے دے دیکرے پگہ نئے و ارس برے

اے نصیر خان ولی گھوڑا بے قابو ہو گیا ہے،

آج ہمارے لیے شام ہے، کل ہماری باری بھی

آئے گی: گویا رھوارِ وقت پر ہمارا قابو نہیں رہا،

ہماری قوت و شوکت ختم ہو گئی ہے۔ آج ہمارے

لیے تاریکی ہی تاریکی اور شکست ہی شکست ہے



صحیح شدہ نسخہ دونوں مخطوطے ناپید ہیں۔ آثار و قرائن سے پتا چلتا ہے کہ دونوں کا رسم خط فارسی تھا اور املا کی طرز پشتو کی تھی۔ کتاب کی زبان سے پتا چلتا ہے کہ یہ ہمارے پاس براہوئی زبان و ادب کی قدیم ترین کتاب ہے، کیونکہ اس کے بہت سے الفاظ اب متروک ہو چکے ہیں۔ ملا ملک داد براہوئی کے علاوہ پشتو، بلوچی اور فارسی میں بھی لکھتے تھے؛ لیکن ان کا باقی سارا کلام ضائع ہو چکا ہے۔ تحفة العجائب میں دو سو پچھتر اشعار ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ ملا موصوف راسخ العقیدہ سنی مسلمان تھے اور اپنی طبع رسا کو دینی درس و تدریس کے لیے وقف کیے ہوئے تھے۔ کتاب بیالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ حمد، نعت اور منقبت کے بعد بہشت، دوزخ، وجہ تصنیف کتاب اور فوائد حصول علم دین کا بیان ہے۔ پھر پانچ ابواب میں تارک نماز، نماز با جماعت، صفت ایمان، ایمان مفصل اور ایمان مجمل بیان ہوئے ہیں۔ بارہویں باب سے اکتالیسویں باب تک فقہ حنفی کے مسائل بیان کیے گئے ہیں اور آخری باب دعا پر مشتمل ہے۔ حمد کے چند اشعار درج ذیل ہیں:-  
 اے حمد ثنا کئی خدانا روزی تیک او شاہ گدانا  
 ساری حمد و ثنا خدا کے لیے ہے کہ وہی شاہ و گدا  
 کا روزی رساں ہے

عجب رحمان رحیم پرورد گارے

وہ عجب رحمان و رحیم اور پالنہار ہے

کہ خرن کیک او بارن ڈغارے

کہ بنجر زمینوں کو سرسبز کر دیتا ہے

مشان پیدا کرینے چشمہ و کاریز

اسی نے پہاڑ سے چشمے اور کاریز پیدا کیے

کہ آبادی مرک بستان و ہالیز

تاکہ بوستان کشت زار و ہالیز آباد ہوں۔

آخری دو شعر ہیں:-

لیکن مستقبل قریب میں بہت جلد، بلکہ کل ہی ہم بھر بھر اقتدار آجائیں گے۔ ریکی کی ملہمانہ رجائیت کی بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے۔ تاج محمد مستونگی بینگل زئی المعروف بہ تاجل (۱۸۳۴ - ۱۹۴۵ء) بھی براہوئی کے کلاسیکی شاعر تھے۔ وہ استمانی یعنی ہوامی شاعر کہلاتے ہیں۔ ان کا شعر ہے:-

تاجل ہارے توبہ او زاری کرنی پیر پیخیر تن یاری  
 یعنی تاجل کہتا ہے کہ گڑ گڑا کر توبہ کرو  
 اور پیر و فقیر سے رابطہ بڑھاؤ تا کہ دل کی  
 کدورت دور ہو۔ افسوس ہے کہ ان کا بیشتر کلام  
 بھی ابھی تک لوگوں کے سینوں ہی میں محفوظ  
 ہے۔ بہر حال کلاسیکی ادب کی روایت اب بھی  
 رواں دواں ہے۔

علمی سکول: قدرت نے علم و ادب ازردانش  
 و حکمت کے دروازے کسی قوم پر بند نہیں کیے  
 اور براہوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، لیکن ان کے  
 فکر رسا کے اکثر شاہ پارے ابھی تک خود ناشناس  
 براہوئیوں میں ہی چھپے پڑے ہیں۔ ۱۹۱۵ء  
 میں ایک عظیم براہوئی عالم حق مولانا نبو جان نے  
 لاہور سے ایک کتاب تحفة العجائب چھپوائی  
 تھی۔ چونکہ لیچ اور میٹر کے برعکس وہ صادق المشرب  
 تھے، لہذا انہوں نے اس کتاب کے منبع یا اصل کو  
 من و عن پیش کر دیا۔ یہ کتاب ملا ملک داد بن  
 آدین غرشین قندھاری ثم قلاتی کی تصنیف تھی،  
 جو ۱۱۱۴ھ/۱۷۰۹ء میں شائع کی گئی تھی۔  
 اس وقت براہوئیوں کے عظیم ترین خان میر نصیر  
 خان نوری کا دور حکومت تھا، جو ہر لحاظ سے براہوئی  
 ہیبت اجتماعیہ کا نقطہ معراج تھا۔ یہ کتاب ایک  
 قلمی نسخے کی صورت میں ملا موصوف کے خاندان  
 میں محفوظ رہی حتیٰ کہ اس کا مسودہ نبو جان کے  
 ہاتھ لگ گیا۔ موصوف نے اصل نسخے میں کچھ  
 اصلاح کر کے اسے چھپوا دیا، لیکن اب اصل اور

کے آخر میں درخان سے اٹھنے والی تحریک نشاۃ ثانیہ  
ملا موصوف کی روایت کی علمبردار بن کر اٹھی۔  
براہوئی زبان کا موجودہ فارسی رسم خط بھی  
ملا موصوف کا مرہون منت معلوم ہوتا ہے۔

ملا ملک داد کے بعد براہوئیوں نے جو کچھ  
لکھا وہ ہنوز پردہ خفا میں ہے۔ یہ تو نا ممکن ہے  
ہے کہ براہوئیوں کا چشمہ ذہن و تخیل خشک  
ہو گیا ہو، لیکن افسوس ہے کہ کوئی اور تحریر  
دستیاب نہیں ہو سکی۔

انیسویں صدی میں انگریز سامراج بلوچستان  
کو اپنے شکنجے میں لایا تو عیسائی مبلغ جوق در جوق  
اس علاقے میں وارد ہوئے۔ انہیں یقین تھا کہ  
وہ : مانند، غریب اور جاہل براہوئیوں کو اپنے دام  
میں پھنسا لیں گے، لیکن اس چیلنج پر براہوئیوں میں  
محمد فاضل رئیسانی پیدا ہوئے جو بلا مبالغہ  
شیخ بلوچستان کہلا سکتے ہیں۔ ان کی پیدائش  
۱۸۳۰ء کے قریب ہوئی اور وفات ۱۸۹۶ء میں۔  
نوجوانی کی عمر میں وہ انگریزوں اور ان کے  
حواریوں کو اپنی تاخت و تاراج کا نشانہ بناتے رہے۔  
پھر وہ سندھ میں ہمایوں کے دینی مدر سے اور  
اس کے مؤسس عبدالغفور ہمایونی سے فیض یاب ہو کر  
اپنے آبائی گاؤں درخان پہنچے، مسجد بنوائی، سرائے  
تعمیر کروائی، لنگر جاری کیا اور درس و تدریس کے  
علاوہ روحانی فیوض کا سلسلہ شروع کیا۔ مناظروں  
کے علاوہ تبلیغ حق کے لیے وہ ایک گدھے پر سوار،  
ستو اور گولے کر، اپنے شاگردوں کی معیت میں براہوئی  
علاقہ کے اطراف و اکناف میں غیر اسلامی رسوم و  
شعائر اور بدعات کے خلاف جہاد کرتے رہے؛ لیکن  
ان کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے ارشد، تلامذہ، جیسے  
محمد عبداللہ، نبو جان، عبدالحی، وغیرہ تھے  
افسوس ہے کہ ان کی سب تصانیف اب ناپید ہیں  
لیکن ان کے ارشد تلامذہ اور ان کے متبعین نے براہوئی

ملک داد عالما تا خاکپائے  
ملک داد عالموں کی خاک پا ہے  
خداغان خواہک ایمان نا عطائے  
اور اللہ تعالیٰ سے ایمان کی سلامتی چاہنا ہے  
ہرا مومن کہ خوانا دا کتابے  
جو مومن میری یہ کتاب پڑھے

دعا دا عاجز کن ہم ثوابے  
وہ اس عاجز کے لیے بھی دعا کرے جو ثواب ہے۔  
چھٹے باب میں انہوں نے صاف لکھا ہے کہ  
وہ جاہل براہوئیوں کو شریعت شناس بنانا چاہتے  
ہیں :-

براہوئی تیان باز جاہلا کو  
کہ دینے تپسہ نا قابلا کو  
براہوئی بہت جاہل ہیں اور دین کو سمجھنے کے  
قابل نہیں ہیں

ارے تحفہ عجائب پن کتاب نا  
براہوئی دوی ات محض ثواب نا  
تحفہ عجائب نامی کتاب (میں نے) محض ثواب  
کے لیے براہوئی زبان میں لکھی ہے۔

کتاب کے سنہ تصنیف اور اپنے متعلق لکھا ہے :-

ارے دا بندہ ساکن فی القلاتے  
کہ ابن آدین ناغر شین ذاتے  
ہزار و یک صد و ہفتاد و سہ سال  
رسول نا ہجرتان اے نیکو اعمال  
ملا ملک داد نے پہلی دفعہ براہوئی  
زبان کو علم و ادب اور شریعت اسلام کے اظہار  
کا ذریعہ بنایا۔ اس کی تصنیف کا اتنا اثر ہوا  
کہ نصیر خان نوری نے ۱۷۷۶ء میں جہلاوان  
کے براہوئیوں کی جہالت دور کرنے کے لیے  
متعدد اخلاقی و شرعی اصلاحات نافذ کیں۔  
نہ صرف یہ بلکہ ملا موصوف کا اثر اتنا ہمہ گیر  
اور جاوداں ثابت ہوا کہ انیسویں صدی



تصنیفات و تالیفات کے انبار لگا دیے۔

محمد عبداللہ (۱۲۹۸ھ / ۱۸۸۱ء تا ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۳ء) ان کے جانشین ہوئے اور انہوں نے افازۃ المصلیٰ، شمائل شریف، معجزات شریفہ، سفر حجاز درخانی (فارسی میں)، تحفة اسعوام، راہ نامہ وغیرہ کتب تصنیف کیں۔ ان کی کتاب کنز الاخبار کا مخطوطہ اب بھی ان کے صاحب زادے و جانشین عبدالباقی درخانی کے پاس محفوظ ہے۔ نبو جان بھی فاضل درخانی کے تلمیذ رشید تھے۔ انہوں ہی نے ملا منک داد کی کتاب تحفة العجائب تلاش کر کے چھپوائی۔ وہ خود ایک جید عالم اور جلیل القدر مصنف تھے۔ ان کی مشہور ترین تصانیف ناصح البلوچ اور تحفة الغرائب ہیں، جو براہوئی شاعری کا بہترین نمونہ بھی ہیں۔ مولانا کی تاریخ پیدائش کا علم نہیں، البتہ وفات ۱۳۴۵ھ / ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔

مولانا فاضل کے تیسرے مایہ ناز شاگرد عبداللہ تھے، جنہوں نے محمد عمر دین پوری کی تربیت کی۔ محمد عمر نے پچاس کے قریب براہوئی کتب لکھیں، جن میں سے پچیس تیس تو چھپ چکی ہیں اور بقیہ مسودات کی صورت میں موجود ہیں یا ضائع ہو چکی ہیں۔ براہوئی زبان کے سب سے بڑے مصنف وہی ہیں۔ ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۵ء میں انہوں نے قرآن مجید کا براہوئی ترجمہ چھپوایا۔ ان کی شعری تخلیقات کا مجموعہ سودائے خام کے نام سے چھپا۔ ان کی کتب مفتاح القرآن اور میشاق المدینة کے نسخے انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہیں۔ ان کی عظیم ترین نثری تخلیق آئینہ قیامت ہے، جو ۱۹۳۵ء کے کوئٹے کے زلزلے پر واحد کتاب ہے۔ موصوف ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۸ء میں فوت ہوئے۔

مولانا فاضل کے چوتھے شاگرد

جتوئی بن نبو جان تھے، جو بیک وقت مولانا موصوف اور اپنے والد ماجد سے فیض یاب ہوئے۔ ان کی دو کتب مفرح القلوب اور گلشن راغبین و غزلیات بہت مشہور ہیں۔

محمد عمر دین پوری کی صاحبزادی تاج بانو ہیں، جو اردو، فارسی اور عربی کی عالم ہیں۔ انہوں نے براہوئی خواتین کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔ ان کی مشہور ترین تصنیف تسویع النساء ہے، جو ۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء میں چھپی اور اس میں انہوں نے عورتوں کے مسائل پر فاضلانہ بحث کی ہے۔ وہ حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، اخلاقی غزل اور دینی لوری کے میدانوں کی شہسوار ہیں۔

عبداللہ کے صاحبزادے عبدالباقی درخانی ہیں، جو خطبات درخانی، عملیات درخانی (مسودہ)، مغربیات درخانی، ریذات درخانی (نثر)، ناصر البلوچ، کشف الصدور، کشف الخصائل، کاغذات درخانی، خاکسار نا غلط مذہب (نثر)، ترقی نا رفتار، آخری منزل (مسودہ نثر) وغیرہ کے مصنف ہیں۔

عبداللہ کے صاحبزادے ابوبکر تھے، جن کے صاحبزادے عبدالغفور درخانی ہیں اور مکمل سوانح عمری حضرت غوث پاک، محمد بن قاسم، غزوات مقدس اور سید الشهداء (ہنوز مسودات) کے مصنف ہیں۔

غرض درخانی تحریک نے براہوئی زبان کو مذہبی و اخلاقی ادب سے مالا مال کر دیا اور یقیناً یہ اسی کا فیض تھا کہ عیسائی مبلغین کروڑوں روپے خرچ کرنے، ایڑی چوٹی کا زور لگانے اور حکومت کی سرپرستی کے باوجود ایک براہوئی کو بھی عیسائی نہ بنا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مذہبی و اخلاقی تحریک کی وجہ سے براہوئیوں کا اپنے قدیم ترین ماضی سے رشتہ ٹوٹ گیا اور وہیں تکلف شاعری اور اسلوب

دب کر رہ گئے، لیکن جو تقاضے اس تحریک کی پیدائش کے ذمے دار تھے وہ سب اس نے پورے کر دیے اور اس کا اثر اتنا ہمہ رس تھا کہ موجودہ براہوئی معاشرہ اس رنگ سے بہت متاثر ہے۔ درخانی تحریک کی روایت اب بھی جاری و ساری ہے اور بیسیوں قلمکار اس سے بالواسطہ متاثر ہیں۔ ان میں حاجی عبدالحکیم بھی تھے، جنہوں نے ۱۳۱۶ھ میں نصیحت نامہ کتاب لکھی، جو ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۵ء میں چھپی۔ حاجی عبدالکریم مینگل بھی متاثر تھے۔ افسوس ہے کہ ان کی صرف دس غزلیات ہی دستبرد زمانہ سے بچ سکی ہیں۔ ان کے علاوہ محمد اسمعیل ذگر مینگل ”شاعر بلوچستان“، محمد یعقوب شروڈی، عبدالحکیم خادسی فقیر زئی وغیرہ اسی تحریک سے غیر شعوری طور پر متاثر ہیں۔

حالیہ دور: ہم اوپر اشارہ کہہ آئے ہیں کہ مذکورہ تینوں سکول دورِ حاضرہ میں بھی براہوئی علم و ادب کے سلسلے میں مصروف کار ہیں۔ تحقیقی سکول کی نمائندگی اس وقت کیلی فورنیا یونیورسٹی کے ڈاکٹر ایم۔ بی۔ ایمی نیو، مانٹریال (کینیڈا) کی میک گل یونیورسٹی کے ڈاکٹر عبدالرحمن بارکر، پروفیسر انور رومان، سید کامل القادری، عین الحق فرید کوٹی اور خود براہوئیوں میں سے تراب براہوئی لاڑکانوی، میر عبدالقادر شاہوانی، سردار غوث بخش رئیسانی، عبدالرحمن گرد، نور محمد پروانہ اور عبدالرحمن براہوئی وغیرہ کر رہے ہیں۔ ان کے سامنے نہ صرف براہوئی اور دیگر دراوڑ السنہ کا تقابلی مطالعہ ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ وسیع، روح پرور اور انقلاب خیز مسئلہ دراوڑ اور قدیم سامی السنہ کا تقابلی معائنہ ہے۔ کلاسیکی سکول کے جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے نمائندے براہوئی خطے کے ہزاروں لوڑی ہیں، جو صدیوں سے براہوئی لوک ادب خصوصاً لوک شاعری کو اپنے سینوں

میں لیے پھر رہے ہیں اور اسے شمالاً جنوباً کوٹنے سے لے کر مکران و لسبیلہ تک اور شرقاً غرباً کوہ کیرتھر سے لے کر کوہ براہوئی وسطی تک گنگناتے ہوئے اس علاقے کی اٹل وحدت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس ادب کو ان سے سن کر محفوظ کر لیا جائے۔ علمی روایت عبدالباقی درخانی، عبدالغفور درخانی، عبدالحکیم خادسی فقیر زئی نوشکوی وغیرہ میں زندہ و تابندہ ہے۔ گویا یہ تینوں سکول موجودہ دور میں بھی رواں دواں ہیں۔ ظہور پاکستان کے بعد علاقائی زبانوں کی جو سرپرستی کی گئی ہے اس کے نتیجے کے طور پر براہوئی کا پہلا اور واحد ہفت روزہ اخبار ایلم ۲۴ فروری ۱۹۶۰ء سے مستونگ سے نکل رہا ہے۔ یہ اخبار بذات خود براہوئی زبان کی ترویج و توسیع اور براہوئی ادب کی تخلیق و بقا کے لیے ایک سنگ میل کا درجہ رکھتا ہے۔ براہوئی کا جدید رسم خط، جو اردو رسم خط سے مشابہ ہے، اسی اخبار کا آوردہ و پروردہ ہے اور نور محمد پروانہ جیسا صاحبِ قلم اس کا مدیر ہے۔ ریڈیو پاکستان کوئٹہ کے قیام نے براہوئی زبان و ادب کو مزید تقویت دی ہے اور ۱۹۶۵ء سے محکمہ قبائلی نشر و اشاعت کے بلوچی ماہنامہ اُس میں براہوئی حصے کا اضافہ سمند شوق کے لیے ایک تازیانہ ہے۔

اس وقت مذکورہ تینوں سکولوں کی روایات کے علاوہ براہوئی نظم و نثر میں خالص ادبی اور تخلیقی کام بھی ہو رہا ہے اور قومی شاعری بھی وجود میں آ رہی ہے۔ ان میں نور محمد پروانہ، اسمعیل ذگر مینگل، تراب لاڑکانوی، پیرل زبیرانی، محمد اسحق سوز، ظفر میرزا، رستم مینگل، حکیم حاجی خدایہ رحم، امیرالملك مینگل، حضور بخش مستانہ، فیض اللہ مینگل، محترمہ تاج بانو، محترمہ حیات النساء، بہر دل پندراڑی، نبی داد خان لانگو رئیس



عبدالغفور خارانہ قلیل، عبدالقادر شاہوانی، عبدالرحمن محمد شہی، عبدالعلیم خادمی، حاجی فیض احمد فیض، موسیٰ طور، حاجی گل محمد نوشکوی، واحد بخش جمال پادینی، فتح محمد سملاڑی، محمد عارف جگر مینگل، نادر قمبرانی، میرا کرم مینگل، عسکر بلوچ، گل محمد نوشکوی وغیرہ کارپرداز ہیں۔ ذیل میں ہم موجودہ شاعری کے چند نمونے پیش کرتے ہیں :-

(۱)

او کنا محبوب! ای تحفہ اس آمو تروٹ  
اے محبوب! میں تجھے کونسا تحفہ پیش کروں؟  
سینگان ای خاخرس یا تینا فکر اتا سہار  
اپنے سینے (سینہ غان) کی آگ یا اپنے تفکرات کا انبار؟  
یا منہ قصہ کہ غرقو سازنا آواز ٹی  
یا چند قصے جو ساز کی آواز میں پوشیدہ ہوں؟  
یا کہ پاوای شیر ٹی پنوکا یا استاتا توار  
یا ٹوٹے ہوئے دلوں کی آواز؟ (محمد موسیٰ طور)

(۲)

عمر گد رینکا ہنا بس انتظاری ٹی فقط  
ساری عمر فقط تیرے انتظار ہی میں گذرتی گئی  
صدنگر مس است غمتان، زوبرک دلدارینی  
ترے غم سے دل صد پارہ ہے، اے محبوب! تو  
جلدی آ۔ (محمد اسحق سوز)

(۳)

وطن ننا پاکستان ہمارا وطن پاکستان  
گلاں ارے ننکن جوان سب ملکوں سے اچھا ہے  
وطن ک نن قربان ہم وطن کے قربان  
وطن ننا پاکستان ہمارا وطن پاکستان  
(رستم مینگل)

(۴)

ہر صوب سلام ہر شام سلام  
شہید اک سلام اے شہید اک سلام

تینا کاتم تسورے تم وطن کن  
تینا قوم و ملت ناٹم امن کن  
شہید مسورے بلبلاک تم چمن کن  
اینو صیاد ہم پانک نامسلام  
شہید اک سلام اے شہید اک سلام

(حضور بخش مستانہ، ۱۹۶۵ء کی جنگ پر)

ہر صبح سلام، ہر شام سلام

شہید و سلام، اے شہیدو! سلام

اپنا سر اپنے وطن کے لیے کٹا

اپنی قوم و ملت کے امن کے لیے

اے بلبلو! تم چمن کے لیے شہید ہوے

آج صیاد بھی تمہیں سلام کہتے ہیں

شہید و سلام، اے شہید و سلام

نئے شعرا میں سے پیر محمد زبیرانی معروف بہ

”پیرل“ غالباً سب سے سربرآوردہ اور منفرد ہے۔

وہ نہایت لطیف اور انتہائی دقیق مضامین کو بھی

خالص براہوئی زبان میں نہایت سلیقے اور روانی سے

ادا کرنے پر قادر ہے۔

ہتم مخفے پھلنا غٹی؛ فصل بہار نے پھول کی

کلی کو ہنسا دیا

کرے چیڑ چوٹی تھے گٹی؛ اسے بنایا سنوارا اور

چوٹی باندھ دی

ملا باہ گوارخ کرے گل لالہ اس پر مسکرایا

مخوٹی اور لب کشا ہوا

کہ مخنگٹی پھلنا کھٹی؛ کہ ہنسی میں تو پھول کا

زوال ہے۔

غرض موجودہ براہوئی ادب ہر قسم کے

مضامین و خیالات اور جذبات و احساسات کو اپنے

اندر سموئے ہوئے ہے۔ مذہبی تعلقات، اخلاقی

اقدار، عشقیہ جذبات، واردات قلبی، عسکری رجحانات،

وطنی جذبات اور تجربات عیات سب کی آئینہ داری

کر رہا ہے اور اس سلسلے میں اردو فارسی کے

یے شمار الفاظ اس میں جذب ہوتے جا رہے ہیں -  
ضرورت اس امر کی ہے کہ براہوئی زبان و ادب  
براہوئیوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے بیان پر  
یکساں قادر ہو سکے۔

مآخذ: (۱) *Baluchistan District : Minchen*  
*Gazetteer*، ج ۶ (سراوان) و ج ۶ ب (جاہلاوان)،  
ٹائمز پریس، بمبئی ۱۹۰۷ء؛ (۲) *Piggett Prehistoric*  
*India*، مطبوعہ پینگوئن بکس، ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۲ء؛  
(۳) رشید اختر ندوی: مغربی پاکستان کی تاریخ،  
ج ۱، مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۶۶ء؛ (۴)  
میر گل خان نصیر: تاریخ بلوچستان، ج ۱، کوئٹہ  
۱۹۵۲ء؛ (۵) رائے بہادر ہتو رام، سی آئی ای:  
تاریخ بلوچستان، لاہور ۱۹۰۷ء؛ (۶) ملک صالح محمد  
خان لہڑی: بلوچستان، کوئٹہ ۱۹۵۵ء؛ (۷) استقلال نمبر  
ہفتہ وار براہوئی اخبار ایلم، مستونگ، اگست ۱۹۶۶ء؛  
(۸) *The Barahuis of Queta-Kallat*: پروفیسر انور رومان  
*Region*، مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی،  
کراچی ۱۹۲۰ء؛ (۹) *The American Peoples Encyclo-*  
*paedia*، مطبوعہ سپنسر پریس، شکاگو ۱۹۴۸ء،  
۱۹۵۹ء؛ (۱۰) سید کامل قادری: براہوئی زبان و ادب؛  
(۱۱) وہی مصنف: براہوئی اور اردو، در اوریشنل کالج  
میگزین، لاہور، نومبر ۱۹۶۲ء؛ (۱۲) اللہ بخش زہری:  
*A Handbook of the Barouhi Language*، مطبوعہ  
کمشنرز پریس، کراچی ۱۸۷۷ء؛ (۱۳) Lt. R. Leach  
*Epitome of the Grammers of the Brahoiki, the*  
*Balochiky and the Punjabi Languages*، در GRAB،  
شمارہ ۷۸، جون ۱۸۳۸ء، و مطبوعہ مفید عام  
پریس، لاہور ۱۹۰۰ء؛ (۱۴) عین الحق فرید کوٹی:  
وادی سندھ میں دراوڑی زبان کی باقیات، در  
ایلم، مستونگ (آٹھ قسطوں میں)، ۲۶ اکتوبر تا  
۱۷ دسمبر ۱۹۶۵ء؛ (۱۵) Don M. De Zilva و  
*Tamil Self Taught*: Karam Singh، لندن ۱۹۰۶ء؛

(۱۶) عبدالرحمن براہوئی: براہوئی زبان اور ادب،  
در سالنامہ ماہ نو، کراچی، مارچ ۱۹۶۶ء؛ (۱۷)  
ثقافت اور ادب وادی بولان میں، مطبوعہ بزم ثقافت  
کوئٹہ، ۱۹۶۶ء؛ (۱۸) جورک جہالوانی: براہوئی متل،  
در ایلم، مستونگ، ۱۰ جون، ۲۶ اکتوبر، ۱۰ نومبر، ۱۷  
نومبر و ۲۶ نومبر ۱۹۶۶ء؛ (۱۹) ملا ملک داد قلاتی  
ابن آدین غرشین: تحفة العجائب، ۵۱۱۷۳ /  
۱۷۵۹ء، لاہور ۱۹۱۵ء، ۱۹۵۸ء؛ (۲۰) عبدالرحمن  
غور: علامہ محمد فاضل درخانی، در ماہنامہ  
بلوچی دنیا، ملتان مارچ ۱۹۵۹ء؛ (۲۱) Sir Denys  
*The Brahui Language*: Bray، ج ۱، کلکتہ ۱۹۰۹ء،  
ج ۲، دہلی ۱۹۳۴ء؛ (۲۲) ہفتہ وار ایلم، مستونگ  
(از ۱۹۶۰ء)؛ (۲۳) ماہنامہ آس، کوئٹہ (از  
جنوری ۱۹۶۵ء)؛ (۲۴) *Imperial : R. H. Buller*  
*Gazetteer of India*، ج ۶، آؤکسفورڈ ۱۹۰۸ء؛ (۲۵)  
*The Baloches*: Mir Khuda Bakhsh Bajanani Mani  
*Through Centuries*، کوئٹہ ۱۹۶۴ء؛ (۲۶) R.B. Dewan  
*The Frontier Regulations*: Jamiat Rai، کوئٹہ ۱۹۱۹ء؛  
*The glory that was Gujarat Desa*: K.M. Munshi (۲۷)  
بمبئی ۱۹۴۳ء؛ (۲۸) R. E. M. Wheeler *Fiv*  
*Thousand Years of Pakistan*، لندن ۱۹۵۰ء؛  
*Culture*: F. B. Kniffen و R. J. Russell (۲۸)  
*Worlds*، نیو یارک ۱۹۵۵ء؛ (۲۹) M. S. Khan  
*History of Baloch Race and Balochistan*: Baloch  
کراچی ۱۹۵۸ء؛ (۳۰) *Life History*: Sir Denys Bray  
*of a Brahvi*، مطبوعہ Royal Asiatic Society،  
۱۹۱۳ء۔

(انور رومان)

برہا: مصریوں نے تمام عبادت گاہوں اور قدیم  
یادگار عمارتوں کا یہی نام رکھ چھوڑا تھا۔ یہ  
ابن جبیر کا بیان ہے اور یاقوت سے اس کی تصدیق ہوتی



کہ پوشیدہ خزانوں کے دریافت کرنے کے لیے ان طلسمات سے مدد لی جاتی تھی۔ پھر ان خزانوں کو بڑے مزے لے کر بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ صرف ایک مندر آخیم کی بابت ابن جبر کا دیا ہوا حال موجود ہے، جس میں مقابلہ منجیدگی پائی جاتی ہے، لیکن اس کا اب نام و نشان بھی موجود نہیں۔

مآخذ: (۱) الفہرست، ۱: ۳۵۳ و ۲: ۱۸۸؛  
 (۲) صاعد: طبقات الامم، مترجمہ Blachère، ص ۸۵؛  
 (۳) ابن جبر، ص ۶۱، مترجمہ Broadhurst، ص ۵۳ بعد؛  
 (۴) عبداللطیف، ص ۱۸۲؛ (۵) یاقوت، ۱: ۱۶۵، ۵۳۱؛  
 (۶) Leo Africanus [الحسن بن محمد الوزانی الزیاتی]،  
 طبع Épaulard، ۲: ۵۳۷؛ (۷) المقریزی: طبع IFAO،  
 ۱: ۱۶۲؛ (۸) S. de Sacy: Observation sur  
 le nom des Pyramides، در Bib. des arabisants  
 Français، ۱: ۲۳۳ تا ۲۵۰؛ (۹) Quatremère  
 Recherches sur la langue et la littérature de  
 l'Égypte، ص ۲۷۸ تا ۲۸۰، (۱۰) Murtadi،  
 مقدمہ از G. Wiet، ص ۹۸ تا ۱۱۳۔

(G. WIET)

بربر: (بربر)، (۱) قبائلی علاقہ: یہ نام ابتدا میں میرقاب کے علاقے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہ ایک عربی بولنے والا قبیلہ تھا، جسے جعلین کے ہم نسب ہونے کا دعویٰ تھا۔ یہ دریائے نیل کے دونوں کناروں پر پانچویں آبشار (عرض بلد ۱۸ درجہ ۲۳ دقیقہ شمالی) سے لے کر دریائے عطبرہ تک پھیلا ہوا تھا۔ میرقاب میں دریائی مزارع اور نیم بدوی دونوں شامل تھے۔ اس علاقے کا حاکم (مگ) سنار کے فنج سلطان کا باج گزار تھا۔ مگ کی وفات پر اس کا جانشین فنج سلطان ہی وہاں کے فرمانروا تمساح خاندان سے نام زد کرتا تھا۔ وہی ہر چار یا پانچ سال کے وقفے کے بعد سونے

ہے۔ یاقوت کہتا ہے کہ بربا، جو ایک قبلی لفظ ہے، ان پختہ مضبوط عمارتوں کو کہتے تھے جو صنم پرستوں کے زمانے میں تعمیر کی گئی تھیں اور جو جادو کے معلموں اور کارگاہوں کی حیثیت سے کام میں لائی جاتی تھیں۔ یہ حیرت انگیز عمارتیں تھیں، جو نقش و نگار اور سنگ تراشی کے کام سے پر تھیں۔ عبداللطیف اپنے زمانے میں ان معابد کی ساخت کی نفاست کا ذکر کرتا ہے، ان کی بناوٹ کے تناسب کی طرف توجہ دلاتا ہے، ان کے بنانے کے لیے جو بافراط سامان مہیا کیا اور کام میں لایا گیا اس پر اظہار تعجب کرتا ہے۔ اور ان کے کتبات، تصاویر اور کھدے ہوئے اور ابھروان نقش و نگار کی کثرت پر حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ بعض عرب مصنفین کی نگاہ میں ان عمارتوں کی تعمیر کا ایک مفید مطلب نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مختلف صنعتوں کے مخصوص طریقہ نامے کار اور آلات ایک جگہ اکٹھے مل گئے، جنہوں نے سائنس کی کارگزاریوں کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔

اسکندریہ کے بطارقہ کا عیسائی مؤرخ سویروس Severus، سکھ آشمونین، بربا کا لفظ صنم پرستوں کے مندروں ہی کے درست معنی میں استعمال کرتا ہے، جو عیسائیوں کی بنائی ہوئی عمارات سے بالکل ایک علیحدہ چیز ہو جاتی ہے۔ عربی لفظ بربا درحقیقت قبلی لفظ پیرپے (مندر) کی بدلی ہوئی شکل ہے اور عام زبان میں اس کی جمع بھی ”برابی“ عربی زبان کے قاعدے کے مطابق استعمال ہونے لگی۔ لفظ ”بربا“ کا استعمال [الحسن بن محمد الوزان الزیاتی] (Leo Africanus) نے بھی کیا ہے۔

بہت سے مصنفوں نے ان مندروں سے متعلق نا ممکن الوقوع حکایات لکھی ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ملک کو بیرونی دشمنوں کے حملوں سے ان طلسمات کے ذریعے بچایا جاتا تھا۔ بعض کہتے ہیں

درخواست کی تھی اور یہ تو واقعہ ہے کہ جب ۵ مارچ ۱۸۲۱ء کو ترکی و مصری فوجیں وہاں پہنچیں تو اس نے ان کا خیر مقدم کیا۔

(۲) صوبہ بربر: ترکی۔ مصری عہد حکومت

میں علاقہ میرقاب صوبہ بربر میں شامل تھا۔ یہ

حجر العسل (عرض بلد ۱۶ درجہ ۲۴ دقیقہ شمالی) سے

شمالی جانب دائیں کنارے پر ابو حمد تک اور بائیں

کنارے پر گرتی تک پھیلا ہوا تھا اور اس میں

گرد و نواح کے صحرا اور ان کے خانہ بدوش قبائلی

شامل تھے۔ بچہ پر محمد علی کی حکومت کی

توسیع سے سواکن کی طرف جانے والا ایک مستقل

تجارتی راستہ کھل گیا، جس سے صوبائی دارالحکومت

کی خوش حالی میں اضافہ ہوا۔ خدیو کا آخری

والی ایک عبادی سردار حسین پاشا خلیفہ تھا، جو

فروری ۱۸۸۴ء میں گورڈن Gordon کی بحیثیت

گورنر جنرل آمد کے وقت مہدی کے حامیوں کی

سرگرمیوں کے سدباب میں مصروف تھا۔ مہدی کے

ساتھ بظاہر دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے سلسلے میں

گورڈن کی کوششوں، نیز عاقبت نا اندیشی سے

تخلیہ سوڈان کا ارادہ ظاہر کر دینے کے باعث اس کے

انسدادی اقدامات کو ضعف پہنچا۔ اپریل ۱۸۸۴ء

میں مہدی نے محمد الخیر عبداللہ خوجلی کو

بربر میں جہاد کی قیادت پر مقرر کیا اور مٹی میں

صوبائی دارالحکومت پر قبضہ ہو گیا، جس سے گورڈن

خرطوم میں تن تنہا کٹ کر رہ گیا۔

مہدی کے زیر حکومت علاقہ بربر کا نظم و

نسق ایک فوجی حاکم کے سپرد تھا اور یہاں ایک

صوبائی نوج متعین تھی اور خزانہ تھا۔ تجارت میں

کمی آ جانے سے باشندوں میں ناراضی کی لہر دوڑ

گئی۔ لیکن بالائی مصر اور سواکن کے ساتھ متزلزل

سی تجارت جاری رہی۔ اس سلسلے میں جو محصول

راہ داری وصول ہوتا تھا وہ صوبائی خزانے کی آمد کا

گھوڑوں اور اونٹوں کا خراج لیتا تھا۔ Burckhardt (۱۸۱۳ء) نے علاقہ میرقاب کے انتہائی جنوبی حصے کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہاں ایک علیحدہ چھوٹی سی ریاست راس الوادی کے نام سے مشہور تھی اور اس پر بھی خاندان تمساح کا کوئی فرد حکمران تھا۔ بربر کا یہ علاقہ ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ بالائی مصر سے آنے والی ایک شاہراہ صحرائے نوبیہ سے گزر کر یہاں دریائے نیل تک پہنچتی تھی اور سنار اور شنیدی سے مصر کو جانے والے قافلے بربر سے گزرا کرتے تھے۔ دنقلہ Dongola کی تجارت کے نکاس کا راستہ بھی بربر سے نکل آیا تھا۔ لیکن انیسویں صدی کے اوائل تک دنقلہ سے بربر جانے والا راستہ، جو صحرائے بیوضہ سے گزرتا تھا، خطرناک تھا اور اس پر بہت ہی کم آمد و رفت ہوتی تھی۔ سواکن Suakin اور التاكة (موجودہ کسلہ Kasala کا نواحی علاقہ) سے تجارت بچہ اور بشارین کی وجہ سے، جو غارت گر قبائل تھے، بہت کم جاری تھی۔ ملک کی آمد کا بیشتر حصہ ایک محصول پر مشتمل ہوتا تھا جو مصری قافلوں کے وہاں سے گزرنے کے سلسلے میں وصول کیا جاتا تھا۔ قبیلہ میرقاب مگ کو زمین یا پیداوار پر کسی قسم کا لگان نہیں دیتے تھے، حالانکہ وہ سنار کی طرف سے عائد کردہ خراج ادا کیا کرتے تھے۔ جو قافلے جنوب (یعنی علاقہ فنج) سے آتے وہ کسی طرح کے ”رسوم“ ادا نہیں کرتے تھے، البتہ مگ کو کچھ تعائف پیش کر دیتے تھے۔ بربر سے تجارتی روابط کے باعث دنقلہ، عبادہ اور دوسرے باہر والوں کی نو آبادیاں قائم ہوئیں۔ عبادہ صحرائے نوبیہ سے گزرنے والے قافلوں کے لیے رہنماؤں اور محافظوں کا کام دیتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ نصیر الدین نے، جو آخری مگ تھا، تخت دوبارہ حاصل کرنے کے لیے محمد علی پاشا سے مدد کی



'The Fung Kingdom of Sennar : O. G. S. Crawford  
Gloucester ۱۹۰۱ء، ص ۵۳ تا ۵۶، ۲۶۷ تا ۲۷۰ (مع  
حوالہ جات مآخذ)؛ (۳) سقوط بربر کے بارے میں حسین پاشا  
خلیفہ کی ایک غیر مطبوعہ قیمتی رپورٹ خرطوم کے  
سوڈانی محافظ خانے 'Cairint'، ۸/۱: ۳۶ میں موجود ہے۔

(P.M. HOLT)

- \* بربر: (قوم)، اس نام سے بالعموم وہ لوگ  
موسوم کہیے جاتے ہیں جو مصری سرحد (سیوہ  
[رک باں]) سے بحر اوقیانوس کے ساحل اور دریائے  
نائیجر کے بڑے موڑ تک آباد اور ایک ہی زبان بربر  
کی بولیاں (یا یوں کہیے کہ اس کی مقامی صورتیں)  
بولتے ہیں یا عربی رنگ میں رنگے جانے سے قبل  
نہ لا کرتے تھے۔ غالباً یہ کلمہ یونانی (بربری  
Barbaroi) اور لاطینی (بربری Barbari) نیز عربی  
(بربر، واحد بربری جمع برابر، برابرہ) میں استعمال  
ہوتا تھا اور جیسا کہ بعض لوگوں کا کہنا  
ہے کسی قومی نام کا مرتبہ نہیں رکھتا (قب  
La Tunisie : P.H. Antichan، ۱۸۸۳ء، ص ۳، نیز  
وہ بربر گروہ جو نویہ میں اور بربری شمالی لینڈ  
میں مقامی ناموں سے موسوم ہیں و G.S. Colin :  
Appellations données par les Arabes aux peuples  
hétéroglosses، در GLECS، ۷ : ۹۳ تا ۹۶)۔  
آمیزغ یا آمہغ (اور اس کی متبادل شکلیں)، جمع  
آمیزغین یا آمہغین (اور متبادل شکلیں) کی اصطلاح  
سے عمومی طور پر بربر مراد لیے جا سکتے ہیں لیکن  
خود بربر جب اپنا ذکر کرتے ہیں تو اپنے  
قبائلی نام استعمال کرتے ہیں یا کسی نہ کسی  
حد تک (رضامندی ہی سے [؟]) غیر ملکوں کے  
دیے ہوئے نام قبول کر لیتے ہیں (جیسے Kabyles،  
Chaouia وغیرہ)۔ کلمہ آمیزغ کے معنی ہیں  
"آزاد انسان" (تاہم دیکھیے J. Sarnelli : Sull' origine  
del nome Imazigen، در Mémorial André Basset

ایک ذریعہ تھا۔ آخری مہدوی حاکم محمد الزکی  
عثمان تھا۔ جب انگریزی اور مصری افواج کی  
پیش قدمی روکنے کے لیے اس کی استمداد کا کوئی  
نتیجہ برآمد نہ ہوا تو وہ صوبائی صدر مقام کو خالی  
کر گیا اور ستمبر ۱۸۹۷ء میں اس پر انگریزی و  
مصری افواج کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے دوبارہ فتح  
کیے جانے کے بعد بربر کی دوبارہ تشکیل کی گئی  
اور اس کی حدود مہدی کے عہد کی نسبت کم  
کر دی گئیں اور پھر بالآخر حلقہ اور دنقلہ کے  
ساتھ ملا کر اسے موجودہ شمالی صوبہ بنا دیا گیا۔

(۳) شہر بربر: ترکی و مصری دور حکومت  
سے قبل بربر نام کی بظاہر کوئی آبادی نہ تھی۔  
بروس Bruce (۱۷۷۲ء) نے بربر کے صدر مقام کا  
نام "Gooz" (یعنی قوز الفنج) بتایا ہے۔ Burckhardt  
کی آمد کے وقت (۱۸۱۳ء) اس مقام پر زوال آ چکا  
تھا اور دارالحکومت ایک گاؤں میں، جو اور بھی  
شمال کی جانب واقع تھا، منتقل ہو چکا تھا۔ اس کا  
نام اس نے Ankheyre بتایا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ  
المخیرف (المخیرف Mekheyr، در Cailliaud) کی  
غلط املا ہو، جو ترکی و مصری عہد میں صوبائی  
صدر مقام کا نام تھا۔ مہدی کے متبعین کی فتح کے  
بعد المخیرف چھوڑ دیا گیا۔ بربر کا موجودہ قصبہ  
اس سے بھی شمال میں اس جگہ واقع ہے جہاں  
مہدوی لشکر کا پڑاؤ تھا۔ اس علاقے کی دوبارہ فتح  
کے بعد قصبہ بربر کی اہمیت کم ہو گئی۔ ۱۹۰۰ء  
میں صوبائی دارالحکومت الدامر میں منتقل ہو گیا  
اور دوسری طرف رسل و رسائل کے مرکز کی حیثیت  
سے قطرہ کے جدید قصبے نے، جہاں ریلوے سٹیشن  
بھی موجود ہے، اس کی جگہ لے لی۔

مآخذ: (۱) J.L. Burckhardt : Travels in Nubia  
لندن ۱۸۱۹ء، ص ۲۰۷ تا ۲۰۸؛ (۲) نعوم شقیر :  
تاریخ السودان، قاہرہ ۱۹۰۳ء، ۱ : ۸۷ تا ۹۰؛ (۳)

زیادہ کثرت سے پائے جاتے ہیں اور اگرچہ ہمارے پاس کتبوں کے شواہد اور یونانی، لاطینی اور عرب مصنفوں کی تصنیفات بھی موجود ہیں پھر بھی اس بین طور پر مخلوط قوم کی پوری تاریخ پر ابھی تک تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس سے انکار عبث ہوگا کہ بربر زبان، جس کا ایک ہونا تو بہر حال ایک اضافی مسئلہ ہے، (دیکھیے حصہ ۵) خود اس کی اصل ابھی تک ایک راز ہے۔ لہذا اس مقام کا متعین کرنا بھی نا ممکن بات ہے جو اس زبان کے بولنے والوں کا گہوارہ تھا۔ بایں ہمہ اس دل چسپ موضوع پر کتابیات کی کوئی کمی نہیں اور بربروں کی اصل کے بارے میں کئی مفروضات کو بعض اوقات قائلوں کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ قدیم یونانی اور لاطینی مصنفوں نے انہیں باختلاف رائے اس دیس کے پراچین یا ایشیائی یا ایجین Aegean کے قدیم باشندے بتایا ہے۔ عربوں کی رائے بالعموم یہ ہے کہ بربر، ایشیائی کنعانی یا حمیری تھے۔ اس آخری مفروضے کی تائید میں حال ہی میں خاصے معقول دلائل پیش کئے گئے ہیں (Helfritz)۔ بعض جدید العصر مصنفوں (Antichan، Slouschz، Daumas) نے ان کے کنعانی الاصل ہونے والے مفروضے کی تجدید کی ہے۔ دوسری طرف کچھ لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ بربر یہاں کے اصل قدیمی باشندے تھے (Carette)، جن میں کچھ ایشیائی، بالخصوص فینیقی خون کی آمیزش ہو گئی تھی (Mercier، Fournel)۔ بعض لوگ، جو عموماً محقق نہیں مگر شوقیہ لکھنے والے ہیں، یہاں تک بڑھے کہ انہوں نے مالک بربر کے عہد عتیق کی آبادی کے جملہ اجزائے ترکیبی از سرنو مرتب کیے ہیں (Les origines berbères : Rina) الجزائر ۱۸۸۹ء : Col. de Lartigue : Monographie de : Aures، قسنطینہ ۱۹۰۰ء اور بڑی دلیری سے

پیرس ۱۹۰۷ء، ص ۱۳۱ تا ۱۳۸) اور ابھی تک یہ خاصے وسیع رقبے میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی تائید تمزغت (تمزخت) یا تمہق (اور اس کی متبادل شکلیں) بربر زبان کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ بربروں کے عمومی حالات پر صرف ایک تصنیف ہے، جو گو مختصر ہے مگر اس میں بہت عمدہ مقبول عام کوائف بیان ہوئے ہیں۔

(۱) تاریخ :

(الف) آغاز

(ب) قبل از اسلام

(ج) بعد از اسلام

(۲) موجودہ تقسیم

(۳) مذہب

(۴) رسوم؛ اجتماعی و سیاسی تنظیم

(۵) زبان

(۶) ادب اور فن

(الف) آغاز

اس وقت زبان ہی وہ واحد معیار ہے جس کی بنا پر بربروں کو متمیز کیا جا سکتا ہے، ورنہ علم الانسان کے نقطہ نظر سے ان کے چہرے مہرے کی ساخت میں طرح طرح کی جداگانہ بلکہ اس درجہ متباہن خصوصیات منکشف ہوتی ہیں جن کے پیش نظر کسی ہم جنس واحد "بربر نسل" کا ان سب پر اطلاق کرنا محال ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف اگر سیاسی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ لوگ ہمیشہ سے اس قدر منتشر و منقسم رہے ہیں کہ صحیح معنی میں ایک علیحدہ قوم نہیں بن سکے۔ اگرچہ اس وسیع و عربی خطہ ارض میں جسے ہم اپنی سہولت کے لیے "مالک بربر" (Barbary) کے نام سے پکارتے ہیں ازمنا قبل از تاریخ کے آثار نسبتاً



۱ : ۲۷۵ بعد؛ (۵) Beguinot : *Chi sono i Berberi ?*  
 در OM، ۱۹۲۱ء؛ (۶) M. Boule : *Les hommes fossiles*  
 پیرس ۱۹۲۱ء، ص ۳۷۶ بعد؛ (۷) R. Peyronnet :  
*Le problème nord - africain*، بار دوم، پیرس ۱۹۲۳ء،  
 ص ۱۰۳ بعد؛ (۸) A. Bernard : *L'Algérie*، پیرس  
 ۱۹۲۹ء، ص ۸۱ بعد؛ (۹) S. Gsell و G. Marcais و  
 G. Yver : *Histoire de l'Algérie*، پیرس ۱۹۲۹ء، ص  
 ۶ بعد؛ (۱۰) A.C. Haddon : *Les Races humaines*  
 پیرس ۱۹۳۰ء، ص ۶۶ بعد؛ (۱۱) V. Piquet :  
*Les civilisation de l'Afrique du Nord*، بار سوم، پیرس  
 ۱۹۳۱ء، ص ۳ بعد؛ (۱۲) E. Leblanc : *Le problème*  
*des Berbères*، ۱۹۳۱ء؛ (۱۳) H. Helfritz : *Le Pays*  
*sans ombre*، پیرس ۱۹۳۶ء، ص ۵۳ بعد؛ (۱۴) اسدیے  
 Essad Bey : *Allah est grand !*، پیرس ۱۹۳۷ء، ص  
 ۲۶۲؛ (۱۵) E. F. Gautier : *L'Afrique blanche*،  
 پیرس [۱۹۳۹ء]، ص ۱۷۰؛ (۱۶) Gen. Brémond :  
*Berbères et Arabes. La Berbérie est un pays européen*  
 پیرس ۱۹۴۲ء (اس کے مطالعے میں احتیاط اور  
 ناقدانہ نظر کی ضرورت ہے)؛ (۱۷) H. Lhote : *Les*  
*Touaregs du Hoggar*، پیرس ۱۹۴۴ء، ص ۷۶ بعد؛  
 (۱۸) Ch. A. Julien : *Histoire de l'Afrique du Nord*،  
 بار دوم، ج ۱، پیرس ۱۹۵۱ء؛ (۱۹) L. Balout :  
*Préhistoire de l'Afrique de Nord. Essai de chrono-*  
*logie*، پیرس ۱۹۵۰ء؛ (۲۰) R. Vaufray : *Préhistoire*  
*de l'Afrique*، ج ۱، در *Le Maghreb*، پیرس [۱۹۵۰ء]۔  
 (CH. PELLAT)

(ب) قبل از اسلام

پورے یقین کے ساتھ بس اتنا ہی کہا جا  
 سکتا ہے کہ انتہائی قدیم زمانے سے بربر شمالی  
 افریقہ میں آباد ہو چکے تھے۔ قدیم [یونانی و لاطینی]  
 مؤرخوں اور جغرافیہ نویسوں نے ان کا ذکر مختلف  
 ناموں کے تحت کیا ہے۔ لیکن یہ نام باقی نہ رہے،

ان کا رشتہ قدیم کیلٹ (Celts)، باسک (Basques) اور  
 قفقازی (Caucasians) اقوام سے جا ملتا ہے (Comm)  
 : *Les Origines coucasiennes des Touareg* : Cauvet  
 در - Bull Soc. Geog. Alger، ۱۹۲۵ء؛ وہی مصنف :  
*La Formation celtique de la nation targuie*، در مجلہ  
 مذکورہ، ۱۹۲۶ء، حتیٰ کہ انہیں بحر اوقیانوس  
 کے پار کی دیسی اقوام سے مربوط کر ڈالتے ہیں (وہی  
 مصنف : *Les Berbères en Amérique*، الجزائر، ۱۹۳۰ء)۔  
 نسلیات انسانی کا علم اس سلسلے میں ہماری کوئی  
 مدد نہیں کرتا۔ گورے رنگ کے بربروں کی  
 موجودگی سے بھی یہ مسئلہ سلجھانا کچھ آسان  
 نہیں ہو جاتا۔ مستند رائے رکھنے والے علما رائے  
 دینے میں احتیاط کرتے ہیں۔ عام طور پر ان کا خیال  
 یہ ہے کہ جنوب مشرق اور غالباً شمال کی جانب  
 سے بھی مختلف عناصر یہاں پہنچے اور اصل آبادی  
 میں ان کا اضافہ ہوا اور یہ اصل باشندے کم و  
 بیش اسی قسم کے تھے جس طرح کے بجزیرہ روم کے  
 شمالی سواحل پر آباد تھے۔ لیکن یہ سب کچھ  
 اتنے قدیم زمانے میں وقوع پذیر ہوا کہ اب ہمارے  
 لیے مختلف بیرونی نقل مکانی کی تاریخ متعین کرنا  
 ممکن نہیں رہا۔ بہر حال ان تمام باتوں کی حیثیت  
 مفروضات سے زیادہ نہیں۔ بربروں کی اصل کے راز سے  
 پردہ اٹھانے میں شاید لسانی مواد کارآمد ہو جائے  
 ورنہ بیسویں صدی کے نصف تک تو یہ بات پورا  
 معما بنی ہوئی ہے۔

مآخذ : مطالعے کے لیے اہم تصنیفات (۱) Olivier :

*Recherches sur l'origine des Berbères*، در Bull.  
 Acad. d'Alger، ۱۸۶۸ء؛ (۲) Tissot : *Géogra-*  
*phie comparée de la Province Romaine*، ۱۸۸۸ء،  
 ۱ : ۴۰۲؛ (۳) Carette : *Origines et migrations*  
*des principales tribus de l'Algérie*، ص ۲۳ بعد؛ (۴)  
 : *Histoire ancienne de l'Afrique du Nord* : S. Gsell

کیونکہ یہ یقینی امر ہے کہ خود بربروں کے متعلقہ گروہوں نے اپنے لیے وہ نام استعمال نہیں کیے، جیسے نسامون (Nasamonians) اور پسیلی (Psylli)، جو برقہ (Cyrenaica) اور طرابلس کے باشندے تھے؛ گرمانت (Garamantians)، جو صحرا میں بدوی زندگی بسر کرتے تھے، ماکیل (Machlyans) اور ماکسی (maxyans)، جو تونسی ساحل پر آباد تھے، [مسولان (Musulans)] اور نومیدی (Numidians)، جو المغرب کے مشرقی حصے میں رہتے تھے، کتول (Getulians)، جو صحرا کی سرحدوں اور بلند علاقوں کے پاسبان تھے اور آخر میں مور (Moors)، جو مغرب اوسط اور مغرب اقصیٰ کے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ فینیقی، قرطاجنی اور یونانی غیر ملکی نو آبادیوں کا وہاں کی تمام مقامی آبادیوں پر۔ غالباً قرطاجنہ کے بالکل نواحی علاقے کے سوا۔ محض محدود طور پر اثر پڑا۔ یہ آبادیاں مختلف حریف قبائل میں بٹی ہوئی تھیں، جو غیرملکیوں کے مقابلے میں عارضی طور پر متحد ہو سکتی تھیں لیکن کبھی اس حد تک نہیں کہ ان کا اتحاد طاقتور اور پائدار ریاستوں کے قیام کا موجب ہو سکتا۔ البتہ Punic [یا قرطاجنہ کی] جنگوں کے زمانے میں، جب کہ مشرق میں وہی بدنظمی پھیلی رہی، مرکز اور مغرب میں سیاسی تنظیمات کے آغاز کا (مسیلہ Massylae، مسیسلہ Masaesylae اور موریتانیا Mauritania کے بادشاہوں کا ظہور) پتا چلتا ہے۔ ماسنیسا Masinissa کی اعلیٰ ذہانت کو روما کی اعانت نے اتنا ابھار دیا کہ اس حکمران نے پورے نومیدیا کو اپنے زیر نگیں متحد کر کے چند ہی برس کے اندر ایک ایسی سلطنت وجود میں لانے کا موقع پا لیا جو ملویہ Moulauya سے خلیج سرت Syrtes تک پھیلی ہوئی ساری بربر آبادی پر مشتمل تھی۔ لیکن اس سلطنت کی زندگی صرف چند روزہ ثابت ہوئی۔ ۴۶ قبل مسیح میں یہ

صفحہ ہستی سے مٹ گئی اور مشرقی نومیدیا سلطنت روما کا ایک صوبہ بن گیا۔ چند سال بعد نومیدیا کی بادشاہی کی پھر تشکیل ہوئی مگر وہ محض سلطنت روما کی زیر حفاظت ریاست رہی۔ موریتانیا کی بادشاہی کی حیات اس سے بھی زیادہ مختصر ثابت ہوئی۔ اسے ۱۷ء میں اغسطس Augustus نے یوبا الثانی (Juba II) کے واسطے قائم کیا تھا اور یہ ۴۶ء میں ایک رومی صوبے میں تبدیل ہو گئی۔

افریقہ میں روما کی سلطنت پانچویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔ اس دوران میں بربر باشندے صوبہ افریقیہ اور نومیدیا کے اندر تو گھل مل گئے لیکن کوهستانی علاقوں میں بلندی کے خطے میں صحراے اعظم کی سرحدوں پر اور موریتانیا میں ان کے حال میں بہت کم تبدیلی پیدا ہو سکی۔ اس مدت کے بیشتر حصے میں رومیوں نے اسی بات پر اکتفا کیا کہ وہ لوگ باقاعدہ طور پر خراج ادا اور امدادی افواج سپاہ کرتے رہا کریں۔ جہاں تک قبائلی نظم و نسق کا تعلق تھا اسے انہوں نے مقامی شیوخ (Principes)، عاملین (Praefecti) اور ناظمین (Reguli) کے سپرد کیے رکھا۔ بہر حال بربروں کے سینے میں آزادی کا شعلہ سرد نہ ہو سکا۔ اس کا اظہار مختلف اوقات میں ہوتا رہا۔ کبھی توشورشوں کی صورت میں، جن کی رہنمائی تاکفاری ناس Tacfarinas (۱۷ تا ۴۹ء) جیسے ایک حد تک رومی رنگ میں رنگے ہوئے دیسی باشندے کرتے تھے اور کبھی کبھی بدویوں یا اندرون ملک کے برائے نام متمدن قبائل کے حملوں کی صورت میں۔ اغسطس اور دوستیان Domitian کے عہد میں نساموں اور گرمانت کے حملوں، ہدریان Hadrian، انطونینوس Antoninus اور کومودوس Commodus کے عہد میں موروں کی بغاوتوں اور فوجی بد نظمی کے زمانے میں کتول کی اور تیسری صدی کے اواخر



میں جرجرہ کے قبائلیہ کی سرکشی کی نوعیت یہی تھی۔ جوں جوں رومی اقتدار میں بتدریج زوال آتا گیا اسی نسبت سے بربروں میں روز افزوں اور عملی رجعت ہوئی اور ملحدانہ عقائد کے ذریعے انہوں نے اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کیا، مثلاً شہید پرستی کا دوناتی [سیحی] مذہب (Donatism) [جس نے چوتھی صدی عیسوی میں قرطاجنہ میں کلسکیانوس کے اسقفی انتخاب کے موقع پر جنم لیا اور جس کا یہ نام اس کے بانی دوناتوس کے نام پر ہے] اختیار کر لیا؛ چنانچہ چوتھی صدی عیسوی میں جن مذہبی جھگڑوں نے افریقہ میں تباہی پھیلانی وہ کئی اعتبار سے نسلی جنگیں تھیں۔ الکرکسلیون (Circumcellions) اسی قسم کی کسانوں کی بربر بغاوت معلوم ہوتی ہے جیسی چودھویں صدی کے فرانس میں ہوئی (=Jacquerie)۔ فرموس Firmus (۳۷۲ تا ۴۰۵ء) اور کیلدون (Gildon) (۴۹۸ء) کی سی شورشوں نے مقامی باشندوں کے ہیجان کا مزید ثبوت مہیا کیا، لیکن حسب سابق بربر مشترکہ دشمن کے مقابلے میں متحد ہونے اور اس کی جگہ لینے میں ناکام رہے۔ البتہ رومیوں کے ساتھ ان کی دشمنی کے باعث وندال قوم کی فتح آسان ہو گئی۔ رومیوں کی طرح جرمن نسل کے یہ حملہ آور بھی بربروں کا لحاظ کرنے پر مجبور تھے۔ جیسریخ Gaiseric نے انہیں اپنی افواج میں بھرتی کر کے قابو میں رکھا لیکن اس کے جانشینوں کو ان کے خلاف مسلسل جد و جہد کرنا پڑی۔ موریتانیا Mauritania، قبائلیہ Kabylia، اور اس Aures اور طرابلس (Tripolitania) نے اپنی آزادی قائم رکھی۔ بوزنطی، جو وندالوں کو شکست دے کر ایک صدی تک (۴۰۱ء تا ۴۰۲ء) شمالی افریقہ کے مالک بنے رہے، ان سے زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ مقامی سرداروں، مثلاً علاقہ بیزاسین Byzacene میں اتالس اور علاقہ اوراس Aures

میں یبداس Yabdas نے قیصر یوستیانوس (Justinian) کے فرستادہ صوبے دار سلیمان (Solomon) کا ایسا زبردست مقابلہ کیا کہ ان پر قابو پانے کے لیے اسے بے انتہا دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سپہ سالار کی وفات کے بعد، جو طرابلس کے لواتہ [رک بان] کے خلاف ایک باقاعدہ مہم میں مارا گیا، بوزنطی افریقہ کی صورت حال بہت نازک ہو گئی۔ جون تروجلیتا John Troglita صرف اوراس کے بربروں کی مدد ہی سے لواتہ کے حملے روکنے میں کامیاب ہو سکا۔ لیکن ساری دیسی آبادیوں نے بوزنطی سیادت تسلیم نہیں کی۔ بیزاسین یعنی سابق صوبہ افریقہ (= تونس) اور صوبہ قسنطینہ کے شمالی حصے، ساحلی شہروں اور اندرون ملک کے بعض مستحکم مقامات کے علاوہ ہر جگہ بربر آزاد تھے۔ اس زمانے میں ان کی تین گروہ بندیاں تھیں: (۱) مشرق میں، لواتہ (ہوارہ، اوریغہ، نفزاوہ، اوربہ)، جو طرابلس، برقہ، جرید اور اوراس کے علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے؛ (۲) مغرب میں صنہاجہ، جو مغرب الاوسط اور مغرب الاقصیٰ کے سارے علاقوں میں بکھرے ہوئے تھے (کتامہ، علاقہ قبائلیہ خرد میں؛ زواوہ، قبائلیہ کلان میں؛ زناتہ، الجزائر کے علاقہ قبائلیہ اور شلیف Chelif کے درمیان؛ بنویفرن، شلف سے ملویہ تک؛ غمارہ، ریف میں؛ مسمودہ، بحر اوقیانوس کے مراکشی ساحل پر؛ گزولہ (جزولہ [رک بان])، بالائی کوہستان اطلس میں؛ لمطہ، جنوبی مراکش میں؛ صنہاجہ (= اهل اللثام)، مغربی صحرائے اعظم میں بدوی زندگی بسر کرتے تھے؛ (۳) زناتہ، جو سطح مرتفع کی سرحدوں کے ساتھ ساتھ طرابلس سے جبل عمور تک اور پھر بتدریج زیادہ تعداد میں مغرب اوسط اور مغرب اقصیٰ تک پھیلتے چلے گئے تھے۔

مآخذ: اہم تصنیف: (۱) Histoire: S. Gsell

ne de l'Afrique du Nord، پیرس ۱۹۱۳ء تا

میں فتح ہسپانیہ کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا ان کا اصل قوام بربروں ہی سے بنا تھا۔ [بعض شورش پسندوں نے بغاوتیں کرنے کی کوشش کی لیکن آخر وہ ناکام ہوئے اور مسلمان پوری طرح قابض ہو گئے۔

اس کے بعد بربروں کی تاریخ خوارج، تاهرت، بنو مدرار، بنو یفرن، برغواطہ، اغلیبوں، فاطمیوں، ادریسیوں، زیریوں، المرابطون، الموحدون، بنو مسہرین اور بنو حفص کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

بربروں کے دو حکمران خانوادے یعنی المرابطون اور الموحدون تھوڑی تھوڑی مدتوں کے لیے شمالی افریقہ میں اپنی سیادت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ دونوں اصلاح یافتہ مذہبی عقائد کا اعلان کرتے تھے۔ المرابطون کی کامیابی لمتونہ قبیلے کی کامیابی تھی، جو اس وقت جنوبی مراکش اور سنی گال اور نائیجر کے کناروں کے درمیان خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے رہے تھے۔ انہوں نے تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں اسلام قبول کیا تھا۔ انہیں عبداللہ بن یاسین (م ۵۱۴/۵۰۹ء) [المرابطی] نے اسلامی عقائد و شعائر کی تعلیم دی تھی۔ انہوں نے سوڈان کے سیاہ فام اور جنوبی مراکش کے باہل باشندوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کی فتوحات بہت جلد ان حدود سے تجاوز کر گئیں۔ ابوبکر بن عمر نے شہر مراکش کی بنیاد رکھی (۵۶۲/۵۰۷ء) اور یوسف بن تاشفین (تاشفین) نے چند ہی برس میں پورے مراکش اور بنو حماد کی ریاست کی سرحدوں تک المغرب الاوسط کو زیر تسلط کر لیا، فتح زلّاقہ (۵۷۹/۵۸۶ء) سے جزیرہ نما آئیریا کے عیسائیوں کی پیش قدمی روک دی، اندلسی والیان ریاست کو حکومت سے بے دخل کیا اور پورے اسلامی اندلس کا واحد مالک بن گیا۔ المرابطون کا زوال بھی ان کے عروج کی طرح

۱۹۲۸ء؛ نیز دیکھیے (۲) تاریخی تصانیف جن کا حوالہ مادہ ہائے الجزائر، مراکش، تونس نیز سابقہ فصل کے ماخذ میں درج ہے اور (۳) Dureau de la Malle : 'L' Algérie byzantine' پیرس ۱۸۵۲ء؛ (۴) Diehl : 'L' Afrique Textes : S. Gsell (۵) ۱۸۹۶ء؛ (۶) P. Monceaux : 'Histoire littéraire de l'Afrique chrétienne depuis l'origine jusqu'à l'invasion arabe' پیرس ۱۹۰۰ تا ۱۹۲۳ء؛ (۷) 'L' Afrique saharienne et seudanaise : Berthelot Ce qu'en ont connu les Anciens' پیرس ۱۹۲۷ء؛ (۸) 'L' Afrique romaine : E. Albertini L' Aptitude des Berbères : J. Carcopino (۹) ۱۹۵۰ء؛ 'à la civilisation, VIII Convegno "Volta" Le Maroc chez les auteurs : R. Roget (۱۰) ۱۹۳۸ء؛ 'anciens' پیرس، تاریخ طبع ندارد؛ (۱۱) E. F. Gautier : 'Genséric, roi des Vandales' پیرس ۱۹۳۵ء؛ (۱۲) 'Histoire de l' Afrique du Nord : Ch. A. Julien Les Vandales : C. Courtois (۱۳) ۱۹۵۰ء؛ 'et l' Afrique' پیرس [۱۹۵۰ء] (بہت اہم تصنیف ہے)۔

(ج) مابعد اسلام

عربوں کی آمد سے [بربروں کی حالت پر صحت مند اثر ہوا۔ مسلمانوں نے رومیوں سے امن و صلح کو بحال کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی بار بار کی عہد شکنیوں سے تنگ آ کر آخر پورے علاقے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور] پہلی/ساتویں صدی کے اختتام پر مسلمان بالآخر پوری طرح فتح یاب ہو گئے۔ [بربروں نے عقبہ بن نافع [رک باں] ہی کے عہد سے آغوش اسلام میں آنا شروع کر دیا تھا۔ آخر پوری طرح مسلمان ہو گئے۔] جن فوجوں نے چند ہی سال میں عرب بلکہ طارق جیسے بربر سالاروں کے ماتحت المغرب کو مکمل طور پر فتح کیا اور نصف صدی سے بھی کم عرصے



ہوا (۵۶۸۸/۴۱۲۶۹)۔ اس سے قبل ہی ممالک مغرب نئی حکومتوں میں تقسیم ہو چکے تھے۔ بنو مرین [رک باں] نے فاس میں، بنو عبدالواد [رک باں] نے تلمسان میں اور بنو حفص [رک باں] نے تونس میں اپنی اپنی حکومت قائم کر لی تھی مگر ان خاندانوں میں سے کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ دوسروں پر اپنی سیادت قائم کر سکے یا خود اپنی رعایا ہی میں لائق احترام مانا جائے۔ مراکش میں کوهستانی علاقوں کے قبائل ہمیشہ بنو مرین کے خلاف باغی رہے۔ وانشریش کے بنو ومانو، جرجہ کے زاوہ اور صوبہ قسنطینہ کے القبائل اور زاب اور جرید کے باشندے، قسنطینہ، بجایہ اور تونس کے فرماں رواؤں کے دائرہ حکومت سے باہر رہے۔ اوراس اور جیل نفوسہ کے نخلستانوں کا بھی یہی حال تھا۔ اس سے قطعی طور پر آشکارا ہوتا ہے کہ بربر ایک بڑی حکومت کی صورت میں منظم نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے ان کی تاریخ کا مطالعہ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان کے مختلف قبائل نے ملکی معاملات میں جو حصہ لیا اس کا تاریخی جائزہ لیا جائے، لیکن بنو ہلال کی یورش سے جو تغیرات وجود پذیر ہوئے ان کی وجہ سے یہ کام بھی بے انتہا مشکل ہو گیا ہے۔ میدانوں میں اور سطح مرتفع پر بربر باشندے عربوں کے ساتھ خلط ملط ہو گئے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے اپنی زبان، اپنی رسوم حتیٰ کہ اپنا قدیم نام بھی ترک کر دیا۔ اس کے بجائے کسی ایسے شخص کا نام اختیار کر لیا جس سے وہ اپنا سلسلہ نسب ملاتے تھے۔ گویا وہ عربوں کے رنگ میں رنگے گئے۔ بعض گروہ اپنے وطنوں کے دور دست ہونے کے باعث اس تغیر سے بچ گئے، مثلاً اوراس، قبائلہ، ریف اور اطلس کے باشندے، ان کی تعداد ایسے تارکین وطن کی آمد سے بڑھ گئی جنہوں نے بہت سے مختلف مقامات سے آ کر ان کے ہاں پناہ لی تھی۔ پھر ان میں سے

بڑی سرعت سے ظہور پذیر ہوا۔ وہ اپنی فتوحات سے مضمحل ہو گئے اور ایک اعلیٰ تمدن سے رابطہ ہوا تو صحراے اعظم کے یہ بربر بہت تیزی سے غائب ہوتے چلے گئے۔ ان کی خالی جگہ پر کرنے کے لیے خلفائے المرابطون کے سامنے صرف یہی راستہ تھا کہ اجیر عیسائی سپاہیوں کو بھرتی کیا جائے؛ چنانچہ جب ابن تومرت [رک باں] کی تبلیغ سے کوہ اطلس پر رہنے والے مصمودہ الموحدون کا عقیدہ قبول کر کے المرابطون کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تو ان کی قیادت ایک انتہائی قابل اور ذکی شخص عبدالؤمن [رک باں] کر رہا تھا، جو قبیلہ کومیہ کا بربر تھا۔ انہوں نے کسی خاص دشواری کا سامنا کیے بغیر المرابطون کو مغلوب کر لیا (۵۴۱/۴۱۱۳۷)۔ الموحدون نے جو سلطنت قائم کی وہ ان کے پیشروؤں سے بھی زیادہ وسیع تھی۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ عبدالؤمن پورے اندلس کو زیر نگیں نہ کر سکا لیکن اس نے بجایہ کی حمادی اور افریقہ کی زیری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ عیسائیوں کو ان تمام بندرگاہوں سے نکال باہر کیا جہاں وہ قابض ہو چکے تھے اور مرت سے ساحل اوقیانوس تک سارے علاقے کا مالک و مختار بن گیا۔ اس طرح بربروں کی ایک عظیم سلطنت پورے شمالی افریقہ میں قائم ہو گئی لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ اس کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں۔ عبدالؤمن کی قائم کردہ سلطنت کے زوال کا ایک باعث یہ بھی ہوا کہ مختلف چھوٹے چھوٹے بربر گروہ باہمی خصومت و رقابت کا شکار تھے۔ مصمودہ اور کومیہ کے مابین جھگڑوں سے دربار مراکش میں ہمیشہ خون بہتا رہا۔ وسطی المغرب کے قبائل، بنو غانیہ [رک باں] کے اقدامات میں ان کی اعانت کرتے رہے یا خود آزاد ہو جانے کی کوشش کرتے تھے۔ عبدالؤمن کی وفات سے ایک صدی بعد اس کے خاندان کا آخری نام لیوا ابو دہوس، نہایت گمنامی میں فوت

- Les Siècles obscurs : E. F. Gautier، پیرس ۱۹۲۷ء؛  
 (۷) F. de la Chapelle، در Hesp.، ۱۹۳۰ء؛ (۸)  
 E. Lévi-Provençal (طبع)، Fragments historiques،  
 (۹) sur les Berbères au moyen âge، رباط ۱۹۳۳ء؛  
 T. Lewicki، در REI، ۱۹۳۳ء؛ (۱۰) P. Amilhat،  
 در REI، ۱۹۳۷ء؛ (۱۱) R. Montagne،  
 et le Makhzen dans le Sud du Maroc، پیرس ۱۹۳۰ء؛  
 (۱۲) وہی مصنف، در Hesp.، ۱۹۳۱ء؛ (۱۳) W. Marçais،  
 Comment l'Afrique du Nord a été arabisée، ج ۱،  
 در AIEO Alger، ۱۹۳۸ء، ج ۲، وہی مجلہ ۱۹۵۶ء؛  
 (۱۴) G. Marçais : در RAfr.، ۱۹۳۱ء؛ (۱۵)  
 E. Levi-Provençal، Hist. Esp. Mus.، بمدد اشارہ؛  
 (۱۶) Ch. A. Julien، Histoire de l'Afrique du Nord،  
 ج ۲، ۱۹۲۵ء؛ (۱۷) H. Terrasse، Histoire de Maroc،  
 پیرس ۱۹۵۱ء؛ (۱۸) Col. Justinard، Le Tazeroualt،  
 پیرس [۱۹۵۳ء]؛ (۱۹) G. Marçais، La Berbères،  
 پیرس ۱۹۳۶ء؛ (۲۰) وہی مصنف : La Berbérie du VII<sup>e</sup> au XVI<sup>e</sup>،  
 در Mèl d'hist et d'Archéol، الجزائر ۱۹۵۷ء،  
 ص ۱۷ تا ۲۲۔

### ۲۔ موجودہ تقسیم

اگرچہ آج کل شمالی افریقہ کی آبادی اساساً بلا شک و شبہہ بربروں پر مشتمل ہے تاہم اب یہ ایک واحد الجنس گروہ نہیں رہے اور ہم زیادہ سے زیادہ ان لوگوں کو بربر کہہ سکتے ہیں جنہوں نے بربر زبان کا استعمال محفوظ رکھا ہے۔ ان کی آبادی پچاس لاکھ سے زیادہ افراد پر مشتمل معلوم ہوتی ہے۔ ان میں سے بہت سے دو بلکہ تین زبانیں بولنے والے ہیں لیکن ان بربروں کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہے جو اپنی اصل ابتدا کی طرح اپنی رسوم اور اپنی زبان کے بارے میں تمام یادوں کو۔ اکثر اوقات بالارادہ۔ اپنے حافظے سے محو کر

بعض قبائل صحرائے اعظم میں دھکیل دیے گئے۔ چنانچہ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی سے ”بربروں نے سیاہ فام لوگوں کے ملک کی سرحد پر ویسا ہی حلقہ بنا لیا جیسا کہ عربوں نے مغرب کے دو خطوں اور افریقہ کی حدوں پر بنا رکھا تھا“ (ابن خلدون : العبر، ترجمہ de Slane، ۲ : ۱۰۴)۔ اس انتشار کے ساتھ ساتھ مسلم تہذیب کی ایک مراجعت بھی ہوئی۔ یہ کہنا مبالغے میں داخل نہ ہو گا کہ بربروں کے متعدد گروہوں نے ایک بار پھر پہلے کی سی نیم صحرائی زندگی اختیار کر لی اور اسلام کے صرف چند ابتدائی تصورات ان میں باقی رہ گئے۔ نویں۔ دسویں / پندرھویں۔ سولہویں صدیوں میں ان کے درمیان اسلام کی تجدید المرابطون (Marabouts) کی مرہون منت ہے۔ یہ اپنے آپ کو زیادہ تر جنوبی مراکش کے ایک مقام ساقیۃ الحمرا سے منسوب کرتے تھے جو افسانوں کا موضوع اور عوام کے تصور میں اولیا اور اہل دعوت و تبلیغ کی تربیت گاہ تھا۔ ان پرہیزگار لوگوں کا اس قدر اثر ہوا کہ آج قبائل کے قبائل اپنے آپ کو ان کی اولاد سمجھتے ہیں۔ صرف معدودے چند ہی ایسے گروہ ہوں گے جو ان کے دائرہ اثر میں نہ آسکے۔

مآخذ : بنیادی مآخذ : (۱) ابن خلدون : العبر،

بولاق ۱۲۸۳ھ، ۷ جلد (فرانسیسی ترجمہ از de Slane :

Histoire des Berbères، الجزائر ۱۸۵۲ تا ۱۸۵۶ء،

۳ جلد)۔ اس میں شمالی افریقہ کے دیگر عرب مؤرخین

کا اضافہ کر لیجیے جن کا حوالہ مادہ های الجزائر،

مراکش، تونس کے مآخذ میں درج ہے۔ نیز (۲)

Les Berbères : H. Fournel، پیرس ۱۸۷۵ء؛ (۳)

Chronique d'Abou Zakaria : E. Masqueray، الجزائر

Les Sanctuaires du Djebel : R. Basset (۴)؛ ۱۸۷۸ء

Nefause، پیرس ۱۸۹۹ء؛ (۵) S.A. Boulifa، Le :

Djurdjura à travers l'histoire، الجزائر ۱۹۲۵ء؛ (۶)



ہیں، جہاں وہ قابلِ اعتماد عہدوں پر فائز ہیں، مگر انہیں اپنی بولی سے محبت ہے، جو ان کے لیے خفیہ زبان کا بھی کام دیتی ہے (یہ سب بربر بولنے والے آبادی کا ایک فی صد ہیں)۔

الجزائر: بربر مدافعت کے دو بڑے ستون شمال میں قبائلیہ اور جنوب مشرق میں اوراس رہے ہیں۔ ان دونوں خطوں کے درمیان اب سطیف تک عربی بولنے والا ایک قطعہ حائل ہے، جو کچھ زیادہ وسیع نہیں۔ الجزائر اور اوران کے علاقہ تِل میں ان بربر گروہوں کو صرف بلیدہ Blida کے کوهستانی علاقے اور شلیف Cheliff (وانشریش چنڈل، بنو مناصر، شنوہ Chenaua) میں کچھ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ آخر میں چند قبائل الجزائر اور مراکش کی سرحد پر (تلمسان کے قریب بنی سنوس) نظر آتے ہیں (کل تیس فی صد آبادی بربر بولتی ہے)۔

مراکش: مراکش کی ارضی تشکیل بربر آبادی کے سلامت رہ جانے کے لیے بالخصوص مدد ثابت ہوئی ہے۔ اگرچہ متعدد قبائل نے بربر بولی کا استعمال چھوڑ دیا ہے تاہم ریف، وسطی اطلس، اطلس اعلیٰ اور آنروے اطلس (Anti-Atlas) نیز سوس Sous میں زنااتہ، مصمودہ اور صنہاجہ جیسے بڑے بڑے قبائل کی زبان ابھی تک بربر ہی ہے۔ R. Montagne (Vie Sociale، ص ۷۱) کا اندازہ ہے کہ مراکش میں کل آبادی کا دس سے پندرہ فی صد حصہ عربوں پر مشتمل ہے۔ چالیس سے پینتالیس فی صد تک عرب رنگ میں رنگے ہوئے بربروں پر اور باقی ماندہ چالیس سے پینتالیس فی صد تک وہ بربر ہیں جو اپنی اصل نسل سے انکار نہیں کر سکتے۔

صحرا: صحرا کے الجزائر اور مراکشی حصوں میں وادی ریخ (Oued Righ) اور جلہ Auragla، نفوسہ Ngousa کے نخلستانوں، مزاب Mzab کے

چکے ہیں۔۔۔ ان کے مقابلے میں بعض جماعتیں ادھر ادھر ایسی بھی ہیں جو ابھی تک بربر النسل ہونے کی مدعی ہیں، گو وہ اپنے اخلاف کی زبان بولنا چھوڑ چکے ہیں۔۔۔۔

بہر حال پہاڑوں کے جھرمٹوں اور صحرا میں گروہوں کی خاصی تعداد ابھی تک موجود ہے۔ یہ ایسے قریب قریب کے حلقوں سے بنے ہیں جو ایک دوسرے سے شیرازہ بند ہیں۔ یہ ابھی تک قدیم لسانیاتی اور نسلیاتی نمونے کی شہادت پیش کر رہے ہیں۔ اجمالاً کہا جا سکتا ہے کہ بربروں کی آبادیاں مشرق سے مغرب کی طرف زیادہ گنجان ہوتی چلی گئی ہیں۔ وہ ایک وسیع علاقے میں منتشر ہیں، جو مصری سرحد سے (سیوہ اور جربوب سمیت) بحر اوقیانوس تک اور ہمبوری Hombori کی بلند پہاڑی سے لے کر، جو نائیجر کے جنوب میں ہے، بحیرہ روم تک پھیلا ہوا ہے۔

لیبیا: متعدد بربر قبائل ابھی تک جبل غوریان کے علاقہ برقہ، یفرن، اور نفوسہ میں باقی ہیں۔ یہ لوگ اوجلہ، سقنہ اور تیمسا کے نخلستانوں اور ساحل پر زوارہ کے مقام پر بھی ملتے ہیں۔ اوجلہ، اور اوفلہ کی آبادی کے، جو طرابلس کے نواح میں واقع ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ بربر ہیں حالانکہ ان کی زبان عربی ہے (یہ کل آبادی کا تقریباً تینس فی صد ہیں)۔

تونس: جزیرہ جربہ میں چھے گاؤں۔ آجم، گوئلہ Guellala، سدوئی کش Sedovikech، المائی Elmai، مہبوبین Mahboubin اور سدغیشین Sodghiane، ان میں سات اور مواضع کا اضافہ کر لیجیے جو اندرون ملک میں واقع ہیں، تمجروت، سیند، زراوہ، تاوجوت، تمیزرت، چینی اور دوئی رت۔ ابھی تک جزوی طور پر بربر بولنے والے گاؤں ہیں۔ یہاں کے بربر ایک طویل عرصہ بلاد شمال میں گزارتے

دارالحکومت میں ہے۔ ان کی اکثریت قبائلیہ والوں پر مشتمل ہے، جو عارضی — اور بعض صورتوں میں مستقل — طور پر اپنی بنجر علاقے سے ترک وطن کر کے غیر ملک میں روزگار کے بہتر وسائل کی تلاش میں جیلے آئے ہیں۔ یہ بے گھر لوگ بھی ایک ایسی مزدور جماعت بن گئے ہیں جسے فرانس کے دارالحکومت میں حالات زندگی کو اپنانا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

مآخذ: (۱) E. F. Gautier و E. Douuté

*Enquête sur la dispersion de la langue berbère en*

*Algérie*، الجزائر، ۱۹۱۰ء: (۲) P. Mous- و A. Bernard

*Arabophones et berbérophones au Maroc*: sard

*La vie*: R. Montagne (۳) ۱۹۲۴ء: (۳)

*Ann. de Géog. sociale et la vie politique des Berbères*، پیرس، ۱۹۳۱ء،

ص ۹ و بعد: (۴) A. Basset

*Les Ksours berbéro-*، A. Basset

*phones du Gourara*، در *III<sup>e</sup> Congrès Soc. sav. de*

*Parlers touaregs du*: (۵) وہی مصنف:

*Af. du N. Soudan et du Niger*، در *Bull. Ét. hist. et éc du l'AOF*

*La langue berbère dans les*: (۶) وہی مصنف:

*Territoires du Sud*، در *RA fr.*، ۱۹۳۱ء، ص ۶۲ بعد:

(۷) وہی مصنف: *La langue berbère au Sahara*:

در *Cahiers Ch. de Foucauld*، ۱۹۳۸ء: (۸) وہی

مصنف: *Initiation à la Tunisie*، پیرس، ۱۹۵۰ء، ص ۲۲

تا ۲۲۶: (۹) E. Laoust، در *Initiation au Maroc*، پیرس

۱۹۳۵ء، ص ۱۹۱ تا ۲۱۹: (۱۰) *Répertoire alpha-*

*stétique des confédérations de tribus... de la zone*

*française de l'empire chérifien*، کاسابلانکا، ۱۹۳۹ء:

(۱۱) *Les Chleuh de la banlieue de Paris*: L. Justinard

در *REI*، ۱۹۲۸ء: (۱۲) L. Massignon

*répartition des Kabyles dans la région parisienne*

وہی مجلہ، ۱۹۳۰ء: (۱۳) وہی مصنف: *Annuaire du*

*Monde musulman*، بار چہارم، پیرس، ۱۹۵۰ء، بعد

سات قصبوں، غوارہ Gourara کے قصور Ksours،  
تاوت Touat، تدیکلت Tidikelt، فغوئغ Figuig،  
تافیلاٹ [رک باں] دادس Dades میں، پھر ایک  
وسیع خطے میں، جو مثلث نما ہے اور اس کے  
شمال میں غدایس، جنوب مغرب میں ٹمبکتو  
اور جنوب مشرق میں زندر واقع ہے، اس میں  
طوارق Touareg کے مختلف گروہ بہ شمول غات Ghat،  
جنت Djanet اور آہگر [رک باں] ملتے ہیں۔

موریتانیا (زناجہ) میں بھی تقریباً پچیس ہزار  
باشندے (بالخصوص ترارزہ) بربر بولتے ہیں۔ ایک  
درمیانی حلقے وڈہ Wada میں آزر بولی جاتی ہے۔  
یہ سونیکہ Soninke کی ایک شاخ ہے، جس میں  
بربر کے الفاظ ملے ہوئے ہیں۔

منتشرین: اوپر جن منطقوں کا سرسری سا  
جائزہ پیش کیا گیا ہے ان سے باہر مراکش  
(کاسابلانکا) اور الجزائر کے بڑے بڑے شہروں میں  
بربروں کی بکثرت آمد بھی ہماری توجہ کی محتاج  
ہے، کیونکہ شہروں میں آ کر انہیں سے ان کی  
”قبائلیت“ ختم ہوتی ہے اور وہ اپنی قدرتی قبائلی  
نگرانی اور نظم و ضبط سے محروم ہو کر (دیکھیے  
نیچے فصل ۴) ایک مفلس مزدور طبقے کی صورت میں  
ڈھلتے چلے جا رہے ہیں، جو ہر طرح کا کام کر گزرنے  
کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ ملک بربر سے باہر لبنان  
میں کتامہ قبیلے کی نسل کے لوگ ملتے ہیں، جو  
وہاں فاطمیوں کے ہمراہ پہنچے تھے۔ اسی طرح  
دمشق میں الجزائری بربر موجود ہیں، جو آغاز فتح  
کے زمانے سے ترک وطن کر آئے تھے اور یا امیر  
عبدالقادر [رک باں] یا اس کے اخلاف سے دوبارہ  
آ ملے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کچھ بربر  
یورپ کے مختلف ممالک ہی میں رہ گئے۔ حتیٰ کہ  
امریکہ میں بھی معدودے چند کی موجودگی کا پتا دیا  
جاتا ہے، لیکن ان کی سب سے زیادہ تعداد فرانس کے



حقیقت ہے کہ یہودیت پورے شمالی افریقہ میں پھیل گئی تھی۔ فی الحقیقت ان یہودیوں کی اولاد سے قطع نظر جنہیں نویں / ہندرہویں صدی میں اندلس سے نکالا گیا تھا ملکی یہودیوں کی اکثریت ان یہودیوں کی اولاد ہے جو ظہور اسلام سے قبل یہ دین قبول کر چکے تھے (دیکھیے: (۱) Slouschz : *Hebraeo Phéniciens et Judéo Berbères*، پیرس ۱۹۰۹ء؛ (۲) M.A. Simon : *Le Judaïsme berbère dans l' Afrique ancienne*، در *Rev. Hist. et Philos. Fac. théol. protestante de Strasbourg*، ۱۹۳۶ء؛ (۳) L. Voinot : *Pèlerinages judéo-musulmans du Maroc*، پیرس ۱۹۳۸ء؛ (۴) P. Flamand : *Population israélite du Sud marocain*، در *Hesp.*، ۱۹۵۰ء، ص ۳۶۳ بعد؛ (۵) وہی مصنف : *Un Mellah en pays berbère : Demnate*، پیرس ۱۹۵۲ء؛ (۶) وہی مصنف : *Les Communautés israélites du Sud. marocain*، تحقیقی مقالہ، ساربون Sorbonne ۱۹۵۷ء)۔

یہودیت نے مسیحیت کے لیے راستہ ہموار کر دیا اور اگرچہ آخرالذکر مذہب کو جاہلیت سے سخت کشمکش کرنا پڑی اور وہ خود اپنے اندرونی جھگڑوں میں مبتلا ہو گیا تاہم یہاں پھولتا پھلتا رہا۔ اس جگہ اتنا ہی یاد رکھنا کافی ہو گا کہ دین مسیحی بربروں کو رومی حکومت کے خلاف شیرازہ بند ہونے کا موقع فراہم کرتا تھا اور انہوں نے کلیسائے روم کے خلاف بھی نئے نئے ملحدانہ عقائد بڑے ذوق شوق سے قبول کیے (جیسے آریوسیت (Arianism) اور دوناتوسیت (Dontism) (دیکھیے *Étude sur l' influence du Christianism : P. S. Mesnage sur les Berbères*، پیرس ۱۹۰۲ء؛ (۲) وہی مصنف : *Christianisme en Afrique*، الجزائر ۱۹۱۵ء؛ (۳) E. Albertini : *L' Afrique romaine*، ص ۵۵ بعد؛ (۴) Dom Leclercq : *L' Afrique chrétienne*، پیرس ۱۹۰۳ء)۔

اشارہ، نیز دیکھیے *مآخذ مندرجہ فصل ۵*۔  
(G. YVER) و (CH. PELLAT)

۳۔ مذہب

معلوم ہوتا ہے ازمنہ قدیم میں بربر قبائلی تقسیم کے مطابق کثیر التعداد مقامی مذہبی فرقوں میں منقسم تھے۔ ان کے معبودوں کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم اور ناقص ہیں۔ لیکن بلاشبہ یہ مظاہر فطرت ہی ہوں گے، مثلاً بڑے بڑے غار، چٹانیں، چشمے، دریا اور پہاڑ۔ ان میں اجرام سماوی، کم از کم سورج، چاند اور بعض ستاروں کا اضافہ کر لینا چاہیے۔ ان کی جیسی تقدیس کی جاتی تھی اس کے آثار اب بھی بعض قصص، اعتقادات، تقاریب اور مذہبی رسوم میں ملتے ہیں۔ اپنے قبول اسلام اور ملت اسلامیہ کے ساتھ وابستہ رہنے کے گہرے احساس کے باوجود بربروں کے ہاں بعض جاہلی رسوم موجود ہیں، جن میں سے بعض تو کم و بیش اسلام کے سانچے میں ڈھل گئی ہیں، لیکن بعض رسوم اسلامی عقائد کے قطعی خلاف ہیں۔ ایسے آثار باقیہ بالخصوص زرعی رسوم اور تہواروں (بارش مانگنے کی رسوم، فصل کٹنے کی تقریب، بڑے بڑے الاؤ لگانا، عنصرہ [رک باں] عقیدہ پرکے [رک باں] اولیا پرستی وغیرہ) میں نمایاں طور پر ملتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قدیم فینیقی (قرطاجنی) زمانے ہی سے انہوں نے نہ صرف غیر ملکیوں کے دیوتاؤں کو اپنا لیا تھا بلکہ انہیں اپنے قومی معبودوں میں ضم بھی کر لیا تھا (رک بہ *Influences puniques chez les Berbères : H. Basset*، در *RAfr.*، ۱۹۲۱ء)۔ یہودیت کے بھی کثیر التعداد پرو یہاں پیدا ہو گئے تھے اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اسے وہ اہمیت حاصل نہیں ہوئی جس کا بعض صاحبوں نے دعویٰ کیا ہے، پھر بھی یہ

*Histoire littéraire de l'Afrique : Monceaux (۵)*  
*chrétienne*، پیرس ۱۹۰۰ تا ۱۹۲۳ء)۔

اسلامی فتوحات کے وقت بھی یہی صورت ہوئی۔  
 یعنی صرف دشمنوں کے نام ہی تبدیل ہوئے۔۔۔۔۔ کہیں  
 چھٹی / بارہویں صدی میں جا کر اسلام کو حتمًا  
 کامیابی حاصل ہوئی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب آخری  
 مقامی عیسائی صفحہ ہستی سے مٹ گئے بجا لیکہ یہودی  
 فرقے موجودہ زمانے تک باقی رہے۔ فتح اسلام کے وقت  
 نومسلم بربروں نے مسلک اہل سنت اختیار کیا کیونکہ  
 اس وقت وہ صرف اسی سے آشنا تھے۔ لیکن ان کے ہاں  
 خود مختاری کا جو جذبہ جاری و ساری تھا اس کا بہت  
 جلد اس طرح ظہور ہوا کہ انہوں نے خارجیوں کے عقائد  
 قبول کر لیے، بظاہر جن میں سب سے بڑھکر انسانی  
 مساوات کے اصول کی تعلیم تھی (رک بہ مادہ ہائے اباضیہ،  
 خارجی اور T. Lewicki کی تصانیف بالخصوص *Etudes*  
*ibādites nord-africaines*، وارسا ۱۹۵۵ء؛ اور  
*La répartition géographique des groupements ibādites*  
*dans l'Afrique du Nord au moyen âge*، در *Rocznik*  
*Orientalistyczny*، ۱۹۵۷ء؛ نیز دیکھیے Chikh Békri :  
*La Kharijisme berbère*، در *AIEO Alger*، ۱۹۵۷ء،  
 ص ۵۵ تا ۱۰۸)۔ مذہبی اعتقاد کا بنیادی  
 طور پر خارجیت سے زیادہ تعلق نہ تھا، جس کا واضح  
 طور پر اس بات سے پتا چلتا ہے کہ ایک جماعت  
 شیعوں کی حمایت کرنے لگی اور ان شیعوں میں صرف  
 فاس کے ادریسی ہی نہیں بلکہ وہ لوگ بھی تھے  
 جو ایرانی نقطہ نظر سے متأثر اور امام کو خدا کا  
 بروز سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں خارجیوں  
 (صفریہ اور اباضیہ) کے دوش بدوش فاطمی بھی موجود  
 تھے۔ چنانچہ مہدی عبید اللہ کو سب سے بڑھکر  
 مدد بربر قبیلہ کتامہ سے حاصل ہوئی۔ انتہا پسندی  
 کا یہ رجحان ایک بار پھر اس وقت دیکھنے میں آیا  
 جب تقویٰ کے رد عمل کی صورت میں سنی عقائد کو

غلبہ حاصل ہوا اور صحراے اعظم کے لمتونہ  
 (المرابطون)، جو انہیں دنوں یعنی پانچویں/  
 دسویں صدی میں مشرف باسلام ہوئے تھے، بربر  
 اقتدار آ گئے۔ اس کی مزید شہادت ہمیں کوہ اطلس  
 کے رہنے والے مصمودہ کے ہاں ملتی ہے، جنہوں  
 نے الموحدون کی سلطنت کی بنیاد رکھی اور بچے  
 کھچے مخالف عناصر کا قلع قمع کر دیا۔  
 صرف چند ایسے خارجی فرقے ان کی دستبرد سے بچ  
 گئے جنہیں پہاڑوں، صحرا یا سمندر کی پناہ حاصل  
 تھی۔ یہی چیز ایک بار پھر ان چھوٹی چھوٹی  
 مرابطی (Marabout) ریاستوں کی تشکیل کی صورت  
 میں منظر عام پر آئی جو مراکش میں پانچویں/  
 گیارہویں صدی سے آئندہ وقتاً فوقتاً وجود میں  
 آتی رہی ہیں (دیکھیے *Vie sociale : R. Montagne*  
 ص ۲۲ بعد)۔

مراکش میں سرکاری طور پر اسلام کا جو  
 مسلک نافذ رہا ہے اس کے خلاف رد عمل کے طور  
 پر ایک نیا مذہب تیار کرنے کی خاطر دو اور نظیروں  
 کا پیش کرنا ضروری ہے، یعنی ریف میں چوتھی/  
 دسویں صدی میں حامیم المفتری [رک بان]  
 اور ساحل اوقیانوس پر صالح بن طریف [رک بان]  
 کی کوششیں۔

اس علاقے نے مسیحی اغسطین (St. Augustine)  
 کی صورت میں کلیسا کو ایک بہت بڑی شخصیت  
 دی۔ اس کی ولادت سوق اہراس (Thagaste) میں  
 ہوئی تھی۔ جہاں کہیں بھی اہل سنت کو اقتدار  
 نصیب ہوا وہاں مسلک امام مالک ہی کو اختیار  
 کیا گیا؛ چنانچہ ممالک بربر میں اب تک اسی کا  
 غلبہ ہے۔ البتہ بعض خارجی فرقے (اباضیہ)  
 جبل نفوسہ میں جربہ کے مقام پر اور جنوبی تونس  
 اور مزاب میں باقی رہ گئے ہیں۔  
 مآخذ: بربروں اور ان کی باقیات کے قدیم مذہب



در *Folk-lore*، ۱۹۰۰ء: (۲۱) وہی مصنف: *Marriage ceremonies in Morocco* لندن ۱۹۱۳ء (فرانسیسی ترجمہ از F. Arin، پیرس ۱۹۲۱ء): (۲۲) وہی مصنف: *Ceremonies and beliefs connected with agriculture* ہلسنگفورس ۱۹۱۳ء: (۲۳) وہی مصنف: *The Moorish conception of Holiness (Baraka)* ہلسنگفورس ۱۹۱۶ء: (۲۴) وہی مصنف: *Ritual and belief in Morocco* لندن ۱۹۲۶ء، (جزوی ترجمہ از *Survivances païennes dans la civilisation*: R. Godet، پیرس ۱۹۳۵ء): (۲۵) J. Servier *Jeux rituels et rites agraires des Berbères d'Algérie*، ساربون، مقالہ ۱۹۰۵ء (غیر مطبوعہ): البربر میں اسلام کے موضوع پر: (۲۶) H. Dousté *L' Islam algérien*، الجزائر ۱۹۰۰ء: (۲۷) A. Bel *La Religion musulmane en Berbérie*، ج ۱ (صرف یہی جلد طبع ہوئی ہے)، پیرس ۱۹۳۸ء: (۲۸) G.H. Bousquet *L' Islam maghrébin*، الجزائر ۱۹۳۲ء: نیز دیکھیے: (۲۹) J. D. Pearson *Index Islamicus*، ۱۹۰۰-۱۹۰۶ء، کیمبرج ۱۹۰۸ء، شماره جات ۱۲۵۱۷ تا ۱۲۸۳۰ و ۱۲۸۳۱ تا ۱۳۰۶۸ بمواضع کثیرہ.

(CH. PELLAT و R. BASSET)

۴۔ رسوم، معاشرتی اور سیاسی تنظیم جن لوگوں کو بربروں کے کردار اور عادات شاہدہ کرنے کا موقع ملا ہے وہ متعجب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان باتوں میں وہ عربوں سے کئی اعتبار سے مختلف ہیں۔ بالخصوص جہاں تک عورتوں کا تعلق ہے جنہیں نسبتاً زیادہ آزادی حاصل ہے (مثلاً دیکھیے طوارق (اہل) کے ہاں "مجالسِ محبت"؛ *Tourags du Hoggar*: H. Lhote، ص ۲۸۸ بعد) اور ایک حد تک وہ زیادہ عزت و احترام کی مستحق سمجھی جاتی ہیں (عورتوں کے بارے میں دیکھیے: *La femme chaouia de l'Aurès*: M. Gaudry (۱)

کے بارے میں ماخذ کی فہرست بہت طویل ہے اور یہاں صرف اہم تصانیف کا ذکر کیا جاتا ہے: (۱) باسے *Recherches sur la religion des Berbères*: R. Basset، پیرس ۱۹۱۰ء (اقتباس از *RHR*): (۲) L. Brunot *Cultes naturalistes à Sefrou*، در *Arch. Berb.*، ۱۹۱۸ء، ج ۲: (۳) H. Basset *Le culte des grottes au Maroc*: الجزائر ۱۹۲۰ء: (۴) A. Bel *Quelques rites pour la pluie*، در *XIV<sup>e</sup> Congrès Orient.*، الجزائر ۱۹۰۵ء: (۵) وہی مصنف: در *Mél. Gaudefroy-Demombynes*، قاہرہ ۱۹۳۰ء: (۶) L. Joleaud *Gravures rupestres et rites du l'eau*، در *J. Soc. Africanistes*، ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۴ء: (۷) Probst-Biraben *Les Rites d'obtention de la pluie*، وہی مجلہ، ۱۹۳۲ تا ۱۹۳۳ء: (۸) Mouliéras *Le Maroc inconnu*: پیرس ۱۸۹۵ تا ۱۸۹۹ء: (۹) F. Nicolas *Les Industries de protection chez les Twareg de l'Azawagh*، در *Hesp.*، ۱۹۳۸ء: (۱۰) Rahmani *Le mois de mai chez les Kabyles*: الجزائر ۱۹۳۵ تا ۱۹۳۹ء: (۱۱) وہی مصنف: *Notes eth.*، قسنطنیہ ۱۹۳۳ء: (۱۲) Destaing، Montet *Le Culte des saints en Af. du N.*، مطبوعہ پیرس: (۱۳) E. Destaing *Fêtes et coutumes saisonnières chez les Beni-Snous*، در *RAfr.*، ۱۹۰۶ء: (۱۴) E. Laoust *Mois et choses berbères*، پیرس ۱۹۲۰ء: (۱۵) وہی مصنف: *Noms et cérémonies des feux de joie*، در *Hesp.*، ۱۹۲۱ء: (۱۶) E. Dousté *Magie et religion dans l'Afr. du N.*: الجزائر ۱۹۰۹ء: (۱۷) وہی مصنف: *En Tribu*، پیرس ۱۹۱۳ء: (۱۸) Dr. Foley *Mœurs et médecine des Touareg de l'Ahaggar*، الجزائر ۱۹۳۰ء: (۱۹) G. Marcy *Origine et signification des tatouages des tribus berbères*، در *RHR*، ۱۹۳۰ء: (۲۰) E. Westermarck *Midsummer customs in Morocco*

مسلم بربر ممالک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے قانون رواج کو ابھی تک قائم رکھا ہے، جس کا اطلاق سرکاری یا غیر سرکاری طور پر الجزائر اور تونس دونوں جگہ ہوتا ہے [رک بہ عادی، الجزائر، تونس]، (نیز دیکھیے: *Note sur la survivance du droit* : G. H. Bousquet *coutumier berbère en Tunisie*، در *Hesp.*، ۱۹۵۲ء، ج ۱ و ۲ : ص ۲۳۸ و ۲۳۹)۔ یہ قانون رواج (عادی، عرف، اُزرف، اتفاقات) اصولاً تو ذہنوں میں ہے لیکن پچھلے چند برسوں میں بعض قبائل نے خاص خاص قوانین، جرائم کی سیدھی سادی فہارس مع مناسب جرمانوں کے پیمانے (سزائے قید کو یہاں کوئی نہیں جانتا) کو عربی حتی کہ فرانسیسی زبان میں ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے، اگرچہ اس کام کے لیے بربر زبان کو شاذ ہی استعمال کیا گیا ہے (دیکھیے نیچے فصل ۶)۔ رواج پر مبنی عدالت یا تو ایک طرح کے (انفرادی) ثالث کی طرف سے عمل میں آتی ہے یا قانونی جماعتوں کی طرف سے جو آپ ہی مخفی عدالت بن جاتی ہیں (مثلاً اوراس میں، جہاں فرانسیسی قانون نافذ ہے) یا پھر انہیں باقاعدہ قانونی حیثیت حاصل ہوتی ہے (جیسے سرائکش میں ۱۶ مئی ۱۹۳۰ء کے مشہور فیصلے ("ظہیر") المعروف بہ "بربر دہر" [=ظہیر] کے بعد سے، جس پر احتجاجات کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا، کیونکہ اس کی رو سے رواجی عدالتوں کا قیام عمل میں آ گیا تھا)۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ قانون ہر جگہ یکساں نہیں بلکہ ہر گروہ میں خاصا مختلف ہوتا ہے اور چونکہ اس کی بنیاد عوام کے رواج پر ہے اور یہ سینہ بہ سینہ چلا آیا ہے اس لیے اس میں رد و بدل کی گنجائش ہے (دیکھیے *Hacoun-Cam*، *Etude sur l'evolution des coutumes kabyles* : predon

*La vie féminine* : A. M. Goichon (۲)؛ ۱۹۲۹ء؛ پیرس *au Mzab*، پیرس ۱۹۲۷ تا ۱۹۳۱ء؛ (۳) L. Bousquet-؛ *La femme Kabyle* : Lefèvre، پیرس ۱۹۳۹ء؛ مادری سیادت (Matriarchy) پر : (۴) G. Marcy *Les vestiges* : *de la parenté maternelle en droit coutumier berbère*، در *RAFI.*، ۱۹۳۱ء، ج ۳ و ۴)۔ چونکہ ہر گروہ کی رسوم دوسرے گروہ سے بالکل مختلف ہیں اس لیے ان سب کا ایک مرتب بنا دینا محال ہے۔ لہذا ہم شمالی افریقہ کی اقوام و نسلیات سے متعلق جو الگ الگ مقالات و تصنیفات کثیر تعداد میں شائع ہوئی ہیں صرف ان کے حوالے دینے پر اکتفا کریں گے۔

بربر (علاقہ مزاب سے قطع نظر) بنیادی طور پر دیہاتی لوگ ہیں، خواہ ایک جگہ آباد ہوں یا خانہ بدوش۔ بدوی خیموں میں رہتے ہیں۔ ان کے مختلف نمونوں کا بیان اکثر آتا رہا ہے، دیکھیے : (۱) *Tourages du Hoggar* : H. Lhote، ص ۲۲۱ بعد؛ [ (۲) وہی مصنف : *Comment Campent* : *les Touareges*، پیرس ۱۹۳۷ء؛ (۳) E. Laoust : *L' Habitation chez les transhumants du Maroc central*، در *Hesp.*، ۱۹۳۰ء؛ مستقل آبادی مکانوں میں رہتی ہے؛ دیکھیے : (۱) E. Laoust، مقالہ مذکورہ؛ (۲) *La Maison et le village dans quelques tribus de l' Anti-Atlas*، در *Hesp.*، ۱۹۵۰ء، ص ۲۸۹ بعد؛ یا شان دار قصبوں میں جو بعض اعتبار سے جنوبی عرب کی طرز کی یاد دلاتے ہیں، دیکھیے : (۱) *Kasbas berbères de l' Atlas et des oasis. Les Grandes architectures du Sud marocain*، پیرس ۱۹۳۸ء؛ (۲) A. Paris *Documents d' archi-*، پیرس ۱۹۲۵ء؛ (۳) K. A. C. *ecture berbère*، *A Bibliog. of Muslim Arch. in North* : Creswell *Africa*، پیرس ۱۹۵۴ء، بمواضع کثیرہ۔



نظام داوارق میں مسلط ہے، جہاں حکومت کی باگ ڈور ایک امینوکل [رک باں] aménokal (= طبقہ امراء) کے ہاتھ میں ہے اور ہر قبیلہ ایک امئر [رک باں] کے ماتحت ہوتا ہے۔ دوسری طرف باقی ممالک بربر میں ہمیں جمہوری قسم کا نظام ملتا ہے، جہاں ایک منتخب مجلس (جماعة، انقلس، ایت اربعین) ہوتی ہے۔ تمام اختیارات (قانون سازی، عدلیہ، انتظامیہ) اسی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ نیچے کے گروہ کی مجلس بالائی مجالس میں نمائندے بھیجتی ہے لیکن عام طور پر دیکھا جائے تو یہ ایک علاقے (یا اقطاع) کی مجلس ہی ہے جو سیاسی اعتبار سے بہت وزن رکھتی ہے۔ اس جمہوری نظام کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ اقتدار چند زعماء کے قبضے میں آجاتا ہے اور شخصی اقتدار کے قیام کے راستے میں بھی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ یہ صورت حال کم از کم ان خطوں میں پیش آتی ہے جہاں اندرونی جماعت بندیوں (لف) باہم مل کر خود مختار اقطاع بناتی ہیں (نہ کہ صرف گاؤں یا گاؤں کے حصے، جیسا کہ قبائلیہ میں ہے، اور ان جزوی جتھوں کو صفا soffs کہتے ہیں - Vie sociale : R. Montagne ص ۹۱ بعد نے مذکورہ بالا زعماء کی اس طاقت کے ارتقاء کی مختلف منازل کا موزوں تجزیہ کیا ہے جو "والیان اطلس" کے نام سے مشہور رہے ہیں۔

مآخذ: انسانیات و نسلیات کے لیے ان تصانیف کے علاوہ جن کا ذکر گزشتہ فصل میں آچکا ہے، دیکھیے: (۱) Les Touaregs du Nord : Duveyrier پیرس ۱۸۶۴ء؛ (۲) Les Touareg : Comm. Bissuel de l'Ouest الجزائر ۱۸۸۸ء؛ (۳) Benhazera : Six mois chez les Touaregs du Ahaggar الجزائر ۱۹۰۸ء؛ (۴) Les Touareg du Niger : A. Richer پیرس ۱۹۲۳ء؛ (۵) Les Touaregs du Hoggar : H. Lhote پیرس ۱۹۳۳ء (مع بہت مفصل مآخذ کے)؛ (۶)

الجزائر ۱۹۲۱ء)۔ بربروں کی معاشرتی تنظیم کی بنیاد خونی رشتے پر ہے، خواہ یہ حقیقی ہو خواہ فرضی۔ سب سے چھوٹی معاشری وحدت "چولہا" ہے۔ مستقل بسے ہوئے افراد کے چند "چولھے" مل کر گاؤں بنتا ہے اور خانہ بدوشوں میں اسے "دور" (tigammi 'asun وغیرہ) کہتے ہیں۔ بہت سے گاؤں یا دور ملتے ہیں تو ایک قطعہ (یا علاقہ) بن جاتا ہے۔ یہ چھوٹے پیمانے پر ایک ریاست ہوتی ہے۔ ایک قبیلے کے کئی اقطاع ہوتے ہیں لیکن ان میں سیاسی انفرادیت کم تر ہوتی ہے۔ قبائلی وفاق محض عارضی نوعیت کے اشتراک کے معنی رکھتا ہے، جس کی ضرورت نازک صورت حال اور اکثر اوقات جنگ کے موقع ہی پر ہوتی ہے۔

گروہ کے اندر رشتے داری کے تصور سے لازماً ایک قسم کے جماعتی اخلاق کا پاس و لحاظ پیدا ہوتا ہے اور اس کے افراد کے درمیان اتحاد و یک جہتی کا خیال برابر تازہ رہتا ہے جو خصوصیت سے جماعت کے لیے بلا اجرت مل کر کام (: تویزی) انجام دیتے ہیں۔ جس اجنبی کو ان میں سے کوئی فرد پناہ دے وہ سب کی حفاظت میں آجاتا ہے۔ اسی رشتے کی بنا پر غلے کی شاملاتی کوٹھیاں یا گودام بنائے جاتے ہیں (رک بہ اغادیر)۔

بہر حال حقیقت یہ ہے کہ ان کی سیاسی تنظیم میں ہمیں دو متضاد قسم کے نظام ملتے ہیں اگرچہ ان دونوں میں مفاہمت کی صورت بھی نکل سکتی ہے۔ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ نسلی اعتبار سے کئی مختلف عناصر بربر کے نام کے تحت یکجا ہو گئے ہیں: ایک طرف تو ایک امیرانہ نظام ہے جس میں جنگ جو امراء، ایک مذہبی برادری، خراج گزاری کی ایک جماعت اور سب سے آخر میں رعیت یا نیم کسان ہیں۔ یہ

*sociale et la vie politique des Berbères* پیرس  
*Notes sur la société et* : F. Nicolas (۲۶)؛ ۱۹۳۱ء  
*Bull. IFAN*، 'l'état des Touareg du Dinnik'  
*Note sur* : V. Monteil (۲۷)؛ ۱۹۳۹ء، ص ۵۷۹ بعد؛  
*Ifni et les Ait Ba-'amrān*، پیرس ۱۹۳۸ء؛ (۲۸)  
 وہی مصنف: *Note sur les Tekna*، پیرس ۱۹۳۸ء؛  
*Les Seksawa, Recherches sur* : J. Berque (۲۹)  
*les structures sociales du Haut Atlas occidental*  
 پیرس ۱۹۵۳ء؛ (۳۰) Ph. Marçais در *Memorial*  
*A. Basset*، ص ۶۹ تا ۸۲۔

(CH. PELLAT)

۵۔ زبان

(الف) زبان کی تاریخ : بحیثیت مجموعی بربری  
 کو بولی کا درجہ حاصل ہے۔ چونکہ تحریری مواد  
 کی کمی ہے اس لیے اس کی تاریخ تقریباً پردہ خفا میں  
 ہے۔ انیسویں صدی میں بعض یورپی محققوں نے  
 بربروں سے زبانی مواد جمع کر کے خاصی تعداد  
 میں کتابیں لکھیں۔ مقامی طور پر دستیاب ہونے والی  
 دستاویزات و تحریرات کم اور محدود نوعیت کی  
 ہیں۔ جنوبی مراکش سے عربی رسم خط میں  
 لکھے ہوئے کچھ مخطوطات ملے ہیں، جن کے  
 بعض جزوی، نا مکمل اور نایاب نسخے ہمیں بھی  
 دستیاب ہوئے ہیں۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ  
 ان تحریروں کی زبان دلچسپ ہونے کے باوجود قدرے  
 مصنوعی دکھائی دیتی ہے۔

بربری زبان کے وہ الفاظ و محاورات جو عرب  
 مصنفین نے نقل کیے ہیں ان پر بھی ابھی تک  
 باقاعدہ کام نہیں کیا جا سکا۔ ان الفاظ اور محاورات  
 میں سب سے پرانے اور مشہور ترین وہ الفاظ ہیں  
 جو لیوی پرووانسال E. Lévi Provençal نے اپنی کتاب  
*Documents inédits d'histoire almohade* میں جمع کیے  
 ہیں، جو ۱۹۲۸ء میں پیرس سے شائع ہوئی (قب)

*Les Kebailes du Djerdjera* : C. Devaux  
 پیرس ۱۸۵۹ء؛ (۷) *De Aurasio monte* : Masqueray  
 پیرس ۱۸۸۶ء؛ (۸) *Nedromah et les* : R. Basset  
*Traras*، پیرس ۱۹۰۱ء؛ (۹) *Le Tidikelt* : L. Voinot  
 اوران ۱۹۰۹ء؛ (۱۰) *Les Izayan d' Oulmès* : Abès  
 در *Arch. Berb.*، ج ۱، شماره ۳، ۱۹۱۶ء؛ (۱۱) وہی  
 مصنف: *Les Ait Ndhir*، وہی مجلہ، ج ۲، شماره ۲،  
 ۱۹۱۷ء؛ (۱۲) *Notes d' ethn. et de* : S. Biarnay  
*ling. nord-africaines*، پیرس ۱۹۲۳ء؛ (۱۳) : G. Marcy  
*Les Ait Warain*، در *Hesp.*، ۱۹۲۹ء؛ (۱۴)  
*Mélanges de sociol. nord africaine* : R. Maunier  
 پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۱۵) *J. Bourrilly* *Eléments d'*  
*ethographie marocaine*، پیرس ۱۹۳۲ء؛ (۱۶) قانون  
 رواج کے بارے میں ماخذ از H. Bruno، در *Rev.*  
*Algérienne*، ۱۹۲۰ء، ۱ : ۹۳ بعد؛ (۱۷) تنقیدی ماخذ  
 از G. H. Bousquet، در *Hesp.*، ۱۹۵۲ء، ص ۵۰۸  
 بعد۔ ان میں اس کا بھی اضافہ کیجیے : (۱۸)  
*Le Droit coutumier des Ait* : G. H. Bousquet  
*Haddidou*، در *AIEO Alger*، ۱۹۵۶ء، ص ۱۱۳ تا  
 ۲۳۰۔ دو بنیادی کتابیں یہ ہیں : (۱۹) قبائلیہ،  
 Hanoteau اور Letourneux کے بارے میں :  
*La Kabylie et les coutumes Kabyles*، طبع دوم،  
 پیرس ۱۸۹۳ء، جلد ۳، اور مراکش کے بارے میں : (۲۰)  
*Le Droit coutumier Zemmour* : G. Marcy  
 پیرس ۱۹۴۹ء (نیز دیکھیے مادۂ عادیۃ)۔ معاشرتی اور  
 سیاسی تنظیم پر گزشتہ فصلوں میں مذکورہ یک موضوعی  
 مقالات کے علاوہ : (۲۱) *Masqueray* *Formation des*  
*cités*، پیرس ۱۸۸۶ء؛ (۲۲) *M. Mercier* *La Civilisation*  
*urbaine au Mzab*، الجزائر ۱۹۲۳ء؛ (۲۳) *R. Montagne*  
*Villages et kasbas berbères*، پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۲۴) وہی  
 مصنف: *Les Berbères et le Makhzen dans le Sud*  
*du Maroc*، پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۲۵) وہی مصنف: *La Vie*



Tripulitania کے علاقے میں کتبات کا ایک سلسلہ دریافت ہوا ہے، جو لاطینی حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان کا مفہوم معلوم نہیں ہو سکا، البتہ ایک دو لفظ لاطینی ہیں۔ بعض کی تشریح و تعیین ممکن ہے، مگر کچھ ایسے بھی ہیں جن کی تعیین ممکن نہیں۔

(ج) افریقی الفاظ کی ایک بہت بڑی تعداد، جن میں زیادہ تر اسمائے معرفہ ہیں، قدیم مصنفوں کے ہاں دستیاب ہونے کے ساتھ ساتھ پیونی (Punic)، یونانی اور خصوصاً لاطینی حروف میں جا بجا بکھری ہوئی ملتی ہے۔ ان میں سے بعض الفاظ کے بارے میں یہ بات متعین ہو چکی ہے کہ وہ پیونی ہیں، مگر ان میں سے اکثر نے مبہم تشریحات کے ایک سلسلے کو جنم دیا ہے۔

بظاہر اس قدیم مواد سے زیادہ استفادہ نہیں کیا گیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ وجہ یہ ہے کہ بہت کم محققین اس میدان میں داخل ہونے کی جرأت کرتے ہیں اور جو اس طرف آتے بھی ہیں وہ عام طور پر کسی اور تحقیقی کام کے ضمن میں آتے ہیں، یا ان کے سامنے کام کا کوئی اور منصوبہ ہوتا ہے۔ مزید برآں مختلف ادوار سے تعلق رکھنے والے اور مختلف مقامات پر بکھرے ہوئے مواد میں وحدت پیدا کرنا اور اسے ترتیب دینا بھی ایک مشکل مسئلہ ہے۔ طرابلس الغرب کے کتبے قدیم دور سے تعلق رکھتے ہیں اور لیبیائی زبان کے کتبے تونس، الجزائر اور مراکش سے تعلق رکھتے ہیں اور مختلف صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کتبوں میں سے صرف ایک کتبے پر تاریخ درج ہے اور وہ ہے [مطابق] ۱۳۹ قبل مسیح۔ بعض کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رومی سلطنت کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ زیادہ تر کتبے ایسے ہیں جن کی تاریخ کا پتا لگانا ممکن نہیں۔ نام سے متعلق

G. Marcy، در Hesp.، ۱۹۳۲ء، ص ۶۱ تا ۷۱)۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بربری زبان بھی ایک جاندار زبان ہے۔ عربی کی کئی کتابوں میں بربری زبان کے بعض قبائلی اجناس اور انسانی اور علاقائی مقامات کے نام محفوظ ہو گئے ہیں۔ مگر ان کا بھی ابھی تک مطالعہ نہیں کیا جا سکا۔

گوانشی Guanshe زبان (جو سترھویں صدی میں جزیرہ کینری Canary میں بولی جاتی تھی) کے آثار باقیہ بربری زبان میں شامل سمجھے جاتے ہیں۔ بہر صورت یہ صرف J. D. Wolfel ہی تھا جس نے مفصل تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا کہ گوانشی زبان کے بعض اجزا بربری زبان سے قرب رکھتے ہیں۔

الموحدون سے پہلے کے ادوار کے سلسلے میں علمائے زبان کو کوئی بربری دستاویز یا تحریر دستیاب نہیں ہو سکی۔ عربوں کی فتوحات کے بعد کی ابتدائی صدیاں علمائے تاریخ کی نسبت علمائے لسانیات کے لیے زیادہ مبہم اور غیر واضح ہیں۔ بعدِ زمانی کے باعث اس سلسلے میں ہمیں خاصی مشکلات اور مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؛ چنانچہ بربری زبان کے متعلق ہم تک اتنا ہی عجیب و غریب دستاویزی مواد پہنچا ہے جتنا کہ دیگر افریقی بولیوں کے سلسلے میں بکثرت موجود ہے:

(الف) لیبیائی زبان کے ایک ہزار سے زائد کتبات شائع کیے جا چکے ہیں۔ ان کتبات میں استعمال شدہ حروف تہجی خاصی صحت کے ساتھ معلوم کر لیے گئے ہیں۔ کم سے کم ایک سے زائد زبانیں جاننے والوں کے لیے تو ان کا سمجھنا اور جاننا کوئی مشکل کام نہیں؛ لیکن اس سلسلے میں جو توجیہات پیش کی گئی ہیں وہ خاصی حد تک ناقابلِ یقین اور مختلف ہیں۔

(ب) مشرق میں اور خاص کر طرابلس الغرب

مواد اس سے بھی زیادہ پراگندہ و منتشر ہے۔ یہ مواد ایسے متون سے دستیاب ہوتا ہے جو مصر اور اوقیاس کے درمیانی خطوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہیرودوٹس سے لے کر بعد کے ازمینہ قدیمہ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس قسم کے مختلف النوع شواہد لازمی طور پر لسانی ارتقا کے مختلف مراحل کے آئینہ دار ہیں۔ اگر ان شواہد کی فہرست تیار کر کے انہیں تنقیدی مطالعے کا موضوع بحث بنایا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سلسلے میں ابتدائی نوعیت کا کام ہو چکا ہے اور نام سے متعلق (Onomastic) ایک عام فہرست تیار کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ اگرچہ اس قدیم مواد میں غیر معمولی اختلاف پایا جاتا ہے، مگر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قدیم مواد کی بنا پر ایسے اصول مرتب کیے جا سکیں گے جن سے جدید بربری لہجوں کے مسائل کا سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

فرہنگ سازی کا سلسلہ بھی عام ہے، مگر صرف آزاد موازنے کو آگے بڑھانے اور قیاس آرائی کرنے کے لیے، کیونکہ قدیم و جدید کی وحدت کا حقیقی ثبوت تو مختلف لہجوں کی مماثلتوں اور مطابقتوں ہی کے ذریعے مہیا کیا جا سکتا ہے۔ لیبیائی اور بربری زبان کے مابین رشتے اور تعلق کا دعویٰ بھی کیا جاتا ہے اور دونوں زبانوں کو ایک ہی زبان کے دو ارتقائی مراحل تصور کیا جاتا ہے۔ اس مفروضے کی بنیاد تاریخ پر ہے۔ تاریخ سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ قدیم زمانے ہی سے افریقہ میں بربر آباد ہو گئے تھے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ بربری زبان وہاں ابتدا ہی سے بولی جا رہی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس وقت وہاں صرف یہی ایک زبان بولی جا رہی تھی؟ کیا واقعی یہ بربری زبان ہے جو لیبیائی کتبات میں محفوظ ہے؟ وہ مماثلت اور یکسانی جس کے بارے میں یقین کیا جا سکتے

بہت شاذ و نادر دکھائی دیتی ہے۔ لیبیائی اور طوارقی (Touareg) رسم خط کی باہمی مماثلت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان دونوں زبانوں میں کوئی باہمی رشتہ ہے۔ اس سلسلے میں سامنے آنے والی مشکلات بحث و تنقید کا تقاضا کرتی ہیں۔ A. Basset نے اس حقیقت کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ اس سلسلے میں تاریخ سے جو دلیل پیش کی گئی ہے وہ منفی نوعیت کی ہے۔ A. Picard اور بھی زیادہ بدظن اور متردد دکھائی دیتا ہے۔ بربری زبان کے ماہروں نے جس احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثال اور کہیں نظر نہیں آتی۔ J.D. Wolfeld ایسا ماہر لغت و لسانیات بھی لیبیائی اور بربری کو ایک گروہ میں شمار کرتے ہوئے ان دونوں زبانوں کو ایک زبان قرار دینے سے ہچکچاتا ہے۔ ایک اور ماہر لسانیات J.G. Fevri نے ایک سوال اٹھایا ہے کہ کیا لیبیائی کو ایک قسم کی قبل از بربری زبان تصور نہیں کیا جا سکتا، مگر وہ خود کسی نتیجے تک نہیں پہنچتا۔ علم و تحقیق کے میدان میں اس قسم کا معقول شک ایک مبہم ادعا کی نسبت زیادہ قابل ترجیح ہوتا ہے۔ مبہم دعوے سے سلسلہ تحقیق محدود ہوتا ہے اور لیبیائی اور بربری کے باہمی تعلق کی نفی ہوتی ہے۔ اس بات سے ہمیں صرف اس حقیقت سے روشناس کرانا ہے کہ جو بات ایک مؤرخ کے لیے یقینی حیثیت رکھتی ہے وہ ایک ماہر لسانیات کو صرف قابل عمل کلیہ ہی مہیا کر سکتی ہے۔

۲۔ مماثل یا پڑوسی زبانیں : بربری زبان اور دیگر زبانوں کے تقابلی مطالعے سے بھی کوئی خاص نتائج برآمد نہیں ہو سکے۔ اس موقع پر وہ کوششیں قابل ذکر نہیں جن کے سلسلے میں غیر ضروری خوش فہمی کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح باسق Basque اور ہوسا Hausa زبانوں سے



کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ ہمیں مطالعہ و تحقیق کے اس وسیع میدان کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت ہے، جسے ”بحیرہ روم“ کے نام سے نسبت دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ اس مطالعے کا تعلق اس تمدن سے ہے جو ہندی۔ اروپائی اقوام کی آمد سے قبل بحیرہ روم کے کناروں پر پروان چڑھا تھا۔ اس مقام پر ذخیرہ الفاظ کی نسبت لسانیات کے اس شعبے سے زیادہ تعلق قائم ہو جاتا ہے جو الفاظ کی ساخت سے بحث کرتا ہے، کیونکہ مقصد یہ ہے کہ لسانی رشتہ ثابت کرنے کے بجائے ایک ثقافتی و تہذیبی گروہ کا تعین ہو جائے۔ جب آئیری اور باسقی زبانوں کا ذکر آتا ہے تو قدیم افریقی و بربری جغرافیائی مطالعہ بھی، جو اس قدیم دور کی شہادت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، ابھر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کم و بیش وہی اہمیت دی جاتی ہے جو ان کوششوں کو حاصل ہے جو بحیرہ روم کے زیریں خطے سے تعلق رکھتی ہیں (C. Battisti، V. Bertoldi وغیرہ) اور جو لاطینی میں غیر ہندی۔ اروپائی عناصر سے متعلق ہیں (G. Nencioni)، جو سارڈینیوں سے متعلق ہیں (B. Terracini اور M. L. Wagner)، جو کوہ الپس اور جبال البرانس کے منطقے سے متعلق ہیں (J. Hubschmid) اور اس سے بھی زیادہ عمومی طور پر جو اروپین۔ افریقی تمدن سے متعلق ہیں (J. D. Wölfel)۔

ناگزیر درجہ بندی، جائز حدود سے تجاوز اور اغلاط کے باوجود ان فکر انگیز مسائل کے بارے میں بحث و تحقیق سے چشم پوشی ممکن نہیں۔

شمالی افریقہ کے لہجوں کے سلسلے میں ایک اور مسئلہ زیادہ اہم ہے۔ اس بات کا تعین کیا جانا چاہیے کہ بربری زبان اور مغربی (= مراکشی) عربی نے ایک دوسرے پر کیا اثر ڈالا ہے۔ یہ طبقہ زیریں اور طبقہ بالا کا مسئلہ ہے۔ دستاویزی معلوماتی مواد کی کوئی کمی نہیں، مگر ابھی تک ہم ظاہری

بربری زبان کے ربط و تعلق کا مسئلہ بھی کوئی واضح شکل اختیار نہیں کر سکا۔ O. Rössler کی یہ رائے توجہ طلب ہے کہ بربری زبان بھی السنہ سامیہ میں سے ایک ہے اور اکادی زبان (Akkadian) سے قریبی ربط رکھتی ہے، مگر اس کے قبول کرنے میں بھی احتیاط ہی مد نظر رہے تو اچھا ہے۔

حامی۔ سامی والا وہ نظریہ زیادہ مفید اور نتیجہ خیز نظر آتا ہے جو بربری زبان کو قدیم مصری حبشہ کی کوشیتی (Cushitic) زبانوں اور السنہ سامیہ کو ایک ہی گروہ میں شامل کرنے کا قائل ہے۔ Marcel Cohen کا خیال یہ ہے کہ حامی۔ سامی نظریے کا یہ مدعا ہرگز نہیں کہ سامی شاخ کے مقابلے میں کسی حامی شاخ کا وجود بھی ہے۔ زبانوں کے اس گروہ کی ہر زبان کے سلسلے میں صحیح اور تسلی بخش معلومات ابھی حاصل نہیں ہو سکیں۔ ۱۸۴۴ء میں T. N. Newmann نے بربری زبان کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ افریقہ میں بولی جانے والی ایک عبرانی زبان ہے۔ ان میں مماثلت کے بعض پہلو موجود ہیں، مثلاً حروف صحیح اور حروف علت کا کردار اور اسی طرح دیگر لسانی عناصر کی نوعیت اور استعمال وغیرہ؛ چنانچہ ان کی بنا پر اس تحقیق کو جاری رکھنے کا جواز نکلتا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ دخیل الفاظ اور ان کے اثرات کی نشان دہی کی جائے اور اس کے ساتھ ہی باہمی مماثلتوں کا سراغ لگا کر ذخیرہ الفاظ میں اضافہ کیا جائے۔ ایک کتاب (*l'Essai Comparatif sur le vocabulaire et la phonétique du chamito-sémitique*) ۱۹۴۷ء میں مارسل کوہن Marcel Cohen نے پیرس سے شائع کی تھی۔ اس کتاب سے مترشح ہوتا ہے کہ بربری زبانوں اور دیگر زیر بحث زبانوں کا باہمی رشتہ کچھ زیادہ مضبوط نہیں۔

ان زبانوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت معلوم

خصائص کی بحث ہی میں الجھے ہوئے ہیں۔ بربری کی کتب لغت عربی سے مستعار الفاظ و کلمات کی نشان دہی تو کرتی ہیں مگر نہایت اختصار کے ساتھ۔ عربی کے بعض علماء، جیسے 'Ph.' W. Marçias، 'Ch. Pellat، G. S. Colin اور 'L. Brunat کے کارنامے بربری مسائل و معاملات کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ بربری زبان نے خطِ سرطان پر واقع افریقی خطوں سے کیا کچھ لیا ہے۔ بلا شبہ یہ بھی ایک بہت بڑا خلا ہوگا۔

(ب) بولیاں اور لسانی خصائص

بربر بولیوں کی جغرافیائی تقسیم کے لیے دیکھیے

فصل دوم۔

[بربر زبان لکھنے پڑھنے میں کم مستعمل رہی

ہے۔ مسلمان بربروں نے بھی اپنی زبان کے لیے عربی خط استعمال کیا اور ایسی چند قلمی کتابیں موجود بھی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی حروف تہجی میں انہوں نے کوئی اضافہ نہیں کیا اور اعراب میں تو اس سے بھی کم، حالانکہ بربر زبان میں ایسے حروف ہیں جو عربی میں نہیں۔ جس طرح پرانے اردو فارسی مخطوطات میں مثلاً ب اور پ یا ک اور گ میں امتیاز نہیں ہوتا تھا یہی حال بربر کا سمجھنا چاہیے۔ موجودہ زمانے میں بعض فرانسیسی یا دیگر مستشرقوں نے فارسی اور ترکی وغیرہ کے اصول پر بربر حروف تہجی میں کچھ اضافے کیے ہیں]۔۔۔۔۔

بہر حال بربر کے عربی حروف میں دو چیزیں قابل ذکر ہیں: ایک تو تلفظ کی تبدیلی اور دوسرے نئے حروف کی ایجاد۔ تلفظ کی تبدیلی میں یہ امر قابل بیان ہے کہ ت کا تلفظ تس ہوتا ہے اور ث کا ت؛ نیز ج لکھ کر ایسے اردو فارسی کی ژ کی طرح پڑھتے ہیں۔ مزید برآں ک کا تلفظ پشتو ص اور جرمن ch (مثلاً ich میں) سے مشابہ کہا

جا سکتا ہے، یعنی ش اور خ کی مخلوط سی آواز۔ اضافہ شدہ حرفوں میں گ کے لیے ک لکھ کر اس کے اوپر یا اس کے نیچے تین نقطے لگائے جاتے ہیں۔ بربر کی ایک مطبوعہ لغت میں چ بھی استعمال ہوئی ہے اور اسی آواز کے لیے جو اردو اور فارسی میں اس کے لیے مقرر ہے۔ ان کے علاوہ بربر میں ایک گ ہے، جو قریب قریب ی کی آواز دیتا ہے اور چونکہ وہ ترکی میں بھی ہے۔ اسے پرانے زمانے میں ترک بھی لکھتے تھے۔ ایک اور حرف ہے جو اردو کی ژ سے بہت قریب ہے۔ جس طرح ر اور ژ دو مختلف حرف ہیں اسی طرح ل، ش اور ز کی بھی دو صورتیں ہیں اور مخصوص آوازوں کے لیے زبان کو موڑ کر تلفظ کرتے ہیں۔ دو طرح کے ل کم از کم جنوبی ہند کی اردو میں بھی ہیں۔ لیکن یہ بربر لاموں سے ہو بہو مطابق نہیں کہے جا سکتے۔ انہیں علی الترتیب ل، ش، ژ لکھا جا سکتا ہے۔

حروف تہجی کے اس مختصر تذکرے کے بعد بربر کی مختلف مقامی بولیوں پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ پرانے زمانے کے متعلق مواد موجود نہیں ہے۔ آج کل کی زندہ بولیوں کے متعلق جو تحقیقات عمل میں لائی گئی ہیں اسی سے گزشتہ دس برسوں میں مثبت ترین نتیجے نکلے ہیں، بالخصوص باسے A. Basset کی کاوشوں کے باعث؛ لیکن بعض خوش فہمیاں اب بھی باقی ہیں، جنہیں چھوڑنا پڑے گا۔ ان بولیوں کی تقسیم کی نسبت اب تک جتنی بھی تجویزیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے درحقیقت کوئی بھی اطمینان بخش نہیں ہے۔ چونکہ آبادی مصمودہ، صنہاجہ اور زناہ قبائل میں بٹی ہوئی ہے (جیسا کہ فصل اول میں بیان ہوا) اس لیے بعض لوگ ان بولیوں کی بنیاد بھی اسی قبائلی تقسیم کے اندر ڈھونڈتے ہیں؛ لیکن اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ایک الجھی ہوئی تاریخ پر بھروسا کیا جائے۔



ماخذ: بنیادی تصنیف یہ ہے: (۱) A. Basset: *Hand book of African Languages*, اوکسفرڈ ۱۹۵۲ء، ص ۷۲ - ہم یہاں فقط ان باقاعدہ ماخذ کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کریں گے جو ۷۰ تا ۷۲ صفحات پر ہیں اور جن کی تکمیل: (الف) A. Basset: *Les études Linguistiques berbères depuis le Congrès de Paris (1948-1951) of the 23rd Intern. Congress of Orientalists* کیمبرج ۱۹۵۴ء، ص ۳۷۷ تا ۳۷۸ میں کی گئی ہے۔ متون کے لیے مفصلہ ذیل کا اضافہ کیا جائے: (ب) A. Roux: *La vie berbère par les textes* پیرس ۱۹۵۵ء؛ (ج) Ch. Pellat: *Textes berbères dans le parler des Ait Seghrouchen de la Moulouya* پیرس ۱۹۵۵ء؛ (د) A. Picard: *Textes berbères dans le parler des Irjen (Kabyle Algérie)* ۲ جلد، الجزائر ۱۹۵۸ء نے کی ہے اور قریب تر زمانے کی عام تصانیف کی مختصر تعداد کی نشان دہی کریں گے۔ خود A. Basset کی مطبوعات کے لیے قَب: (۲) ماخذ در *Orbis*، ۱۹۵۶ء، ص ۵۷۰ تا ۵۷۹؛ (۳) *The Memorial André Basset (1895-1956)* پیرس ۱۹۵۷ء، ص ۱۰۹ میں بربر مطالعات سے متعلق پندرہ مقالات باہم یکجا کر دیے گئے ہیں۔ Guanche پر: (۴) J.D. Wölfel: *Le problème des rapports du guanche et du berbère* در *Hesp.*، ۱۹۵۳ء۔ Libyan پر: (۵) قَب بالا، جلد ۶ اور (۶) J. G. Février: *Que Savons-nous du Libyque?* در *RAfr.*، ۱۹۵۶ء، ص ۲۶۳ تا ۲۷۳۔ Tripolitania کے کتبات پر: (۷) J.M. Reynolds و J.B. Ward Perkins: *The Inscriptions of Roman Tripolitania* روم و لندن ۱۹۵۲ء، ص ۷: ۲۸۶؛ (۸) J. G. Février: *La-prononciation punique des noms propres latins en-us et en ius* در *JA*، ۱۹۵۳ء، ص ۴۶۵ تا ۴۷۱۔ بربروں کی قرابت داری پر: (۹) M. Cohen: *Essai comparatif sur le vocabulaire et la phonétique du*

زیادہ بہتر یہ ہے کہ لسانیاتی واقعات و حالات سے نتیجے اخذ کیے جائیں۔۔۔۔

### ذخیرۃ الفاظ

غالباً بربر زبان کا وہ پہلو جس سے واقفیت کی سب سے زیادہ خواہش پائی جاتی ہے، لیکن جس کا تعین نہیں کیا جاتا، وہ اس کا ذخیرۃ الفاظ ہے۔ فوٹو Foucauld نے طوارق کی آہنگار بولی کے متعلق اور دالے Father Dallet نے قبائلیہ بولی کے متعلق جو لغتیں تیار کی ہیں انہیں تقریباً مکمل کہا جا سکتا ہے۔ اول الذکر لغت میں ایک ہزار چار سو اور دوسری میں تین ہزار پانچ سو افعال بصیغہ مجرد ہیں، یہ ذخیرۃ الفاظ ایسا ہے جو اصل میں ساری بولیوں میں مشترک سا ہے۔ لیکن، جیسا کہ باسے A. Basset نے واضح کیا ہے، ہر لفظ کا مطالعہ اس کی اپنی مخصوص زندگی (وقوع یا ہویت) کے ساتھ کرنا چاہیے۔ مزید برآں طوارق کو چھوڑ کر دوسری بولیوں میں دخیل الفاظ کی کثرت بھی مشاہدے میں آئی ہے اور یہ دیکھا گیا ہے کہ عربی سے آئے ہوئے الفاظ کے باعث بربر کی تلفظیات، بلکہ خود ساخت الفاظ میں بھی تبدیلیاں اور اضافے ہوئے ہیں، حالانکہ بربر میں اس کی غیر معمولی صلاحیت ہے کہ اجنبی عناصر کو اپنالے۔

ذخیرۃ الفاظ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ معین ہے اور اس کی فراوانی اور اس کے معانی کے دقائق اس وقت قابل ذکر ہو جاتے ہیں جبکہ ان کا تعلق زندگی کے کسی اہم میدان سے ہو (مثلاً طوارق کے ہاں اونٹ کی پرورش، اطلس کبیر میں آب پاشی وغیرہ)۔ ذہنی، علمی اور مذہبی زندگی کے لیے الفاظ کم ہیں اور زیادہ تر عربی سے لیے گئے ہیں، لیکن چند مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ادبی مواد موجود ہے البتہ اس سے کام لینا باقی ہے۔

*Tripolitanien*، در *AIUON*، سلسلہ جدید، ۱۹۵۳ء،  
ص ۱۳۵ تا ۱۵۲ - جبر و تشدد کے لیے: (۲۲)  
*Étude de linguistique sur le parler*: A. Picard  
*berbère des Irjen (Kabyle)*، الجزائر ۱۹۵۹ء - فرهنگ  
کے لیے: (۲۳) *Dictionaire*: Father de Foucauld  
*touareg-français (Dialecte de l'Ahaggar)*، جلد ۴  
پیرس ۱۹۵۱-۱۹۵۲ء، ۱۳+۲۰۲۸: (۲۴) Father  
*Le verbe kabyle (Lexique partiel du parler des At-Mangellat)*  
(فقط مفرد الفاظ شائع  
ہوئے ہیں)، Fort-National، ۱۹۵۳ء، ۲۸: ۰۳۹۱  
(L. GALAND)

### (۶) ادبیات اور فنون لطیفہ

کتے ہی قدیم زمانے پر کیوں نہ نظر ڈالیں،  
بربرستان میں، جسے ارض الفتح کا نام دیا جاتا ہے،  
اس کے فاتحوں کی زبان کے سوا تہذیب و تمدن کی  
[کوئی مقامی] زبان نہیں ملتی، چنانچہ بربر اہل قلم  
یکے بعد دیگرے - اگر قرطاجنہ والوں کی فینیقی  
(Punic) زبان کو استعمال نہ بھی کیا ہو تو کم  
از کم - لاطینی (مثلاً آپولے Apuleius، سینٹ آگسٹائن)،  
یونانی (؟)، عربی (ابن خلدون اور بہ کثرت دیگر  
مراکشی مصنفین)، اور اب خاص کر فرانسیسی میں  
لکھتے رہے ہیں - اس کے باوجود "بربر ادبیات"  
کے وجود سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، جو  
خواہ تحریری ہوں یا سینہ بہ سینہ زبانی منتقل ہوتی  
چلی آئی ہوں - بے شبہ کتبوں میں اس زبان کو  
استعمال نہ کیا گیا ہوگا، لیکن ان کتب سواغظ  
میں جو عربی کے زیر اثر لکھی گئیں، ان تاریخی  
رودادوں میں جو یورپی محققین کی درخواست  
یا سوالات پر تحریر کی گئیں قوانین یعنی مقامی  
رس و رواج کے تذکروں میں، اور سب سے آخر  
میں زینت زدہ نوک گیتوں اور شعری میں اس کا  
استعمال ہوا ہے۔

*chamito-sémitique*، پیرس ۱۹۳۷ء، ۱۱: ۲۳۸: (۱۰)  
*Comptes rendus du Groupe linguistique d'études*  
*chamito-sémitiques*، پیرس ۱۹۳۱ء، بعد: (۱۱)  
*Der semitische Charakter der liby-*: O. Rössler  
*schen Sprache*، در *ZA*، سلسلہ جدید، ۱۶: ۱۲۱  
تا ۱۵۰ - مسئلہ 'بحیرہ روم' پر: (۱۲) J.D. Wölfel  
*Eurafrikunische Wortschichten Salamanca als*  
*Acta Salman*، ۱۸۹ ص ۱۹۰۰ء، *Kulturschichten*  
(ticensia) - بربری بولیوں کے لیے: (۱۳) A. Basset  
لسانی جغرافیے پر تصانیف کی طرف رجوع کرنا چاہیے؛  
A. Basset، E. Laoust کی طرف جو  
اور A. Picard نے علی الترتیب لکھے ہیں، در  
*Initiation au Maroc*، طبع نو، پیرس ۱۹۳۵ء، ص ۱۹۱  
تا ۲۱۹، *Initiation à la Tunisie*، پیرس ۱۹۵۰ء، ص  
۲۲۰ تا ۲۲۶، *Initiation à l'Algérie*، پیرس ۱۹۵۷ء،  
ص ۱۹۷ تا ۲۱۳ - صرف و نحو کے جامع بیان کے لیے  
ف: (۱۵) A. Basset اور A. Picard *Eléments de*  
*grammaire berbère (Kabyle Irjen)*، الجزائر ۱۹۳۸ء،  
ص ۳۲۸ - صوتیاتی مسائل پر: (۱۶) L. Galand  
*La phonétique en dialectologie berbère*، در  
*Orbis*، ۱۹۵۳ء: ۲۲۵ تا ۲۳۶: (۱۷) T. F. Mitchell  
*Long Consonants in Phonology and Phonetics*، در  
*Studies in Linguistic Analysis*، آکسفورڈ ۱۹۵۷ء، ص  
۱۱۰ تا ۲۰۰ - ف: (۱۸) A. Basset *La Langue*  
*berbère, Morphologie, le verbe, étude de themes*  
پیرس ۱۹۵۹ء، ۳: ۲۳۸ - لسون میں ابتدائی  
حرف بخت پر: (۱۹) A. Basset *Sur la voyelle*  
*initiale en berbère*، *RAfr.*، ۱۹۵۰ء، ص ۸۰ تا  
۸۸: (۲۰) T. F. Mitchell *Particle-Noun Com-*  
*plexes in a Berber Dialect (Zawra)*، *BSOAS*  
۱۹۵۳ء، ص ۷۵ تا ۷۹: (۲۱) W. Vycichl  
*Der Umlaut in Berberischen des Dyebel Mefans in*



ایک خلاصہ الحوض کے نام سے ملتا ہے، جسے لوجیانی Luciani نے ترجمے کے ساتھ ۱۸۹۷ء میں شہر الجزائر سے شائع کیا ہے۔ اسی طرح اس کا ضمیمہ بحرالدروع ہے، جس کا ایک حصہ دیسلان De Slane نے *Histoire des Derbères*، ص: ۵۵۲ تا ۵۶۲ کے ضمیمے میں شائع کیا تھا (آخر الذکر کتاب کا کمال متن مع ترجمہ از ستریکر H.H. Stricker) (اس مقالے کے لکھتے وقت ۱۹۵۸ء میں) زیر طبع ہے۔ ان (مذہبی) کتابوں سے حامینم اور صالح بن طریف کے قرآن مجید کے نسخوں کا بھی ایک حد تک تعلق ہے، لیکن قرآن مجید کے یہ نسخے اب نہیں ملتے۔ ابن تومرت نے تشریح کی بربر بولی میں جو تین رسالے تالیف کیے تھے ان کا بھی یہی حشر ہوا ہے۔ خوارج نے غالباً بہت سی کتابیں لکھی تھیں، لیکن ان میں سے ابن غانم کی المدونۃ ہی باقی ہے (دیکھیے موتیلنسکی Motylinski کا مقالہ *Le Manuscrit arabo-berbère de Zouagha*، در *Actes du XIV<sup>e</sup> Congrès des Orient*، روئداد موتمر مستشرقین عالم، اجلاس ۱۳، الجزائر ۱۹۰۹ء، ۲: ۶۳ تا ۷۸)۔ ان مذہبی کتابوں میں سے بعض (خاص کر الحوض نیز بعض اور، جو اب تک محفوظ ہیں، ان کے لیے دیکھیے Roux A. کا مقالہ *Acts du XXI<sup>e</sup> Congrès des Orient*، روئداد موتمر مستشرقین عالم، اجلاس ۲۱، پیرس ۱۹۴۹ء، ص ۳۱۶ تا ۱۷) نظم میں لکھی گئی ہیں تا کہ حفظ کرنے میں سہولت ہو۔ مگر اس میں خرابی یہ ہے کہ عربی لفظ بہت استعمال کرنے پڑتے ہیں مذہبی نظموں کو بھی ادبیات کی زیر بحث صنف سے متعلق کرنا چاہیے، مثلاً ”صبی“ نامی نظم میں ایک لڑکا اپنے والدین کی تلاش میں دوزخ تک جاتا ہے (دیکھیے باسے *A. Basset: Le poème de Cabi*، پیرس ۱۸۷۹ء؛ گالان ہرنے *P. Galand-Pernet* کا

لیبیائی کتبوں کو حل کرنے کی کوئی ایسی صورت نہ نکل سکی جو ان کتبوں کو اطمینان بخش طور پر پڑھنے میں کارآمد ہو سکے۔ بعض ’دوزبانی‘ کتبوں کے باعث بہر حال لیبیائی خط کے حروف تہجی کا تعین ہو سکا ہے اور وہ اس قدیم خط سے خاصے مشابہ ہیں جو آج بھی بعض بربروں میں معروف ہے، جیسے تیفنغ (مفرد تیفنغ جو شاید لفظ فینیقی (Punica) سے ماخوذ ہے؟) کے ہاں۔ طوارق قبیلے کے بربر یہ خط بعض کتبوں کے کندہ کرنے میں بھی استعمال کرتے رہے ہیں، نیز کنگنوں وغیرہ پر حروف کھودنے میں، اور مختصر عاشقانہ خط و کتابت کرنے میں بھی۔ اس خط میں جو حروف تہجی ہیں ان میں لفظ کے درمیان تو صرف حروف صحیحہ پائے جاتے ہیں، البتہ لفظ کے آخر میں جو حرف علت ہو اسے بھی لکھا جاتا ہے۔ طویل اور مختصر آوازوں (یعنی مد اور بلا مد) میں امتیاز نہیں کیا جاتا۔ ایک لفظ کو دوسرے سے جدا کر کے نہیں لکھا جاتا۔ عبارت کو افقی طور پر (دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، یا سانپ کی چال کی طرح ایک سطر دائیں سے بائیں تو اس کے بعد کی سطر بائیں سے دائیں) بھی لکھا جا سکتا ہے، اور عمودی طور پر بھی (اوپر سے نیچے یا نیچے سے اوپر جانے والی سطروں میں)۔ عملاً ساری تحریری چیزیں بہت مختصر عبارتوں پر مشتمل ہیں، اور جو عبارتیں طویل ہیں (اور جو ہانوتو A. Hanoteau کی کتاب *Essai de grammaire de la langue tamachek*، پیرس ۱۸۶۰ء، میں درج ہیں) ان یورپی مکتشفین کی خواہش پر تیفنغ خط میں لکھی گئی ہیں۔

جو مذہبی کتابیں عربی کے زیر اثر تالیف کی گئی ہیں انہیں عربی خط میں لکھا گیا ہے، اور عربی حروف ہجا میں ضروری اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ ان کا مقصد احکام اسلام سے واقف کرانا اور مسلمانوں کو وعظ و نصیحت کرنا ہے۔ چنانچہ مختصر الخلیل کا

مضمون در *Mémorial A. Basset* پیرس ۱۹۵۷ء، ص ۳۹ تا ۵۰ میں، سدی حمو کی نظمیں (دیکھیے *Dichtkunst und Gedichte der schluh* : H. Stumme لائہزگ ۱۸۹۰ء میں جانسٹن Johnston کا مقالہ؛ *Actes du XIV<sup>e</sup> Congrès des Orient* (روئداد موتمر مستشرقین عالم، اجلاس ۱۳)، ۲ : ۱۰۰ تا ۱۰۱؛ وہی مؤلف : *The Songs of Sidi Hammou*، لنڈن ۱۹۰۷ء؛ زوستینار L. Justinard کا مضمون *Poésies dial du Sous marocain d'après un ms. arabo-berbère* در *JA*، ۱۹۲۸ء؛ منظوم قصہ حضرت یوسفؑ (لوبین یا ک Loubignac کی کتاب *Dialecte des Zulan*، پیرس ۱۹۲۳ تا ۱۹۲۵ء، ص ۳۵۹ بعد)؛ معراج نبویؐ کا قصہ اور البوصیری کے البردة [رک بان] کا ترجمہ۔ اسی ضمن میں توریت و انجیل کے ترجموں کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جو پروٹسٹنٹ یا کیتھولک منادوں نے کیے ہیں۔ عربی کی بربر زبان میں لغتوں اور عوامی طب کی کتابوں کو، جو عملی فوائد رکھتی ہیں، اگر نظر انداز کر دیں تو غیر مذہبی کتابیں کم اور نہایت کم ہیں، جو دراصل یورپی اہل علم کی ہدایت پر لکھی گئی ہیں، مثلاً *تسلحت بولی* میں سیدی ابراہیم کی تاریخ مغربی افریقہ *The Narrative of Sidi Ibrahim* (نیومن F.W. Newman، در *JRAS*، ۱۸۳۸ء، ص ۲۱۵ تا ۲۶۰ اور اس کا ترجمہ از باسے R. Basset، پیرس ۱۸۸۲ء، یا نفوسی بولی میں جبل نفوسہ کے حالات از سماخی (جسے ترجمے کے ساتھ موتیلنسکی Motylinski نے شہر الجزائر سے ۱۸۸۵ء میں شائع کیا۔ مزید براں ایک مجموعہ قصص کا ذکر کیا جا سکتا ہے، یعنی کتاب شلحہ (مخطوطہ کتب خانہ عمومی پاریس)، جو زیادہ تر بختیار نامہ [رک بان] نیز "ایک سو راتیں" *Hundred Nights* نامی کتب سے مأخوذ معلوم ہوتی

ہے (باسے R. Basset کا مضمون، در *Revue des traditions populaires*، ۱۸۹۱ء۔ اس کے اقتباسات دیسلان De Slane، روش سون تیکس De Rochemonteix نیز باسے R. Basset نے شائع کیے ہیں)۔ اسی صنف میں ان قصوں اور نسل نگاری (ethnographie) سے متعلق ان کتابوں کو بھی داخل کیا جا سکتا ہے جو یورپی مکتشفین کی خواہش پر تالیف کی گئیں۔ ان مکتشفین نے ان قصوں وغیرہ کو مقامی بولیوں سے متعلق لکھی ہوئی کتابوں میں شائع کیا یا مستقل مجموعوں کے طور پر چھاپا، جیسے فوکو Ch. de Foucauld کی کتاب *Textes touareg en prose*، الجزائر ۱۹۲۲ء۔ اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ صوبہ قبائلیہ کے شہر الاربعاء (فورٹا سیونال Fort National) میں دالے R.P. Dallet نے *Fichier de documentation berbère* سے ۱۹۳۷ء شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اس میں نہ صرف لسانیاتی اور نسلیاتی دستاویزیں ہوتی بلکہ مقالے اور مختصر نائک بھی بربر زبان میں ہوتے ہیں۔ بربروں میں "قانون" سے مراد مختلف بربر گروہوں کا رسم و رواج ہے۔ یہ "قانون" اصل بربر زبان میں کم ہی شائع ہوئے ہیں (دیکھیے اوپر فصل ۴)۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہو این سدیہ *Cours de Langue Kabyle* : Ben Sedira، ص ۲۹۵ تا ۳۵۵؛ بولیفہ Boulifa کا مضمون *Le kanoun d'Ad'ni* جو موتمر مستشرقین عالم کے چودھویں اجلاس کی روئداد *Recueil de mémoires ... XIV<sup>e</sup> Congrès Orient*، الجزائر ۱۹۰۷ء، ص ۱۵۲ تا ۱۷۸ میں ہے۔ زبان زد لوک گیت متنوع تہیں تو وافر مقدار میں ضرور ہیں۔ عجائب و غرائب کے متعلق افسانے، لطائف و ظرائف، سبق آموز کہانیاں، جاتوزوں کے قصے، افسانوی تاریخ، افسانہ نما مذہبی



خاصی شہرت حاصل کر لی تھی، لیکن ان کی نظمیں لوگ جلد بھول گئے، کیونکہ عربوں کی طرح ان کے ہاں راویوں کا رواج نہیں۔

بربر فنون لطیفہ بہت کم چیزوں سے عبارت ہیں۔ بے شبہہ چٹانوں پر کندہ کی ہوئی یا رنگ سے بنائی ہوئی تصویریں قدر و قیمت سے خالی نہیں، لیکن یہ دریافت طلب ہے کہ آیا یہ فن کار موجودہ بربروں کے اجداد ہی میں سے تھے؟ اگرچہ تعمیرات کی بڑی بڑی چیزیں موجود ہیں، جن کا ذکر اوپر (فصل ۴ میں) کیا گیا، لیکن سچ پوچھو تو عربوں یا ہسپانوی موروں کے فنون لطیفہ کے مد مقابل بربر فنون لطیفہ نہیں پائے جاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بربر لوگ دیہاتی، بلکہ خانہ بدوش سے ہیں اور انہیں روز مرہ کی ضرورت کی اور بہ آسانی قابل حمل و نقل چیزوں ہی کے حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کے فنون لطیفہ کا مقصد بھی روز مرہ کی آرائش میں دل کشی پیدا کرنا ہوتا ہے اور بس؛ اسی لیے یہ چیزیں دستکاری سے آگے نہیں بڑھتیں اور ان کا مقصد آنکھوں کو بہلا لکنے سے زیادہ زندگی میں کار آمد ہونا نہیں ہوتا۔ ان کی مصنوعات کو بعض وقت وہ لوگ خریدتے ہیں جو اجنبی چیزوں اور سازگی کے دلدادہ ہوتے ہیں، اور شمالی افریقہ میں حکومت بھی ان کی مدد اور سرپرستی کرتی ہے، تا آنہ صنعتی روایات اور طریقہ ہای ساخت کی بقا و ترقی ہو۔ لیکن یہ مصنوعات قالین (شطرنجی)، خیمہ، چٹائی، ریشمی کپڑوں، دیبا اور سوزن کاری، چینی کے برتنوں، مٹی کے برتنوں، لکڑی کے سامان، زرگری، پیتل کے سامان، گنکا جمنی زربفت کے کام (Damasquinerie) پر منحصر ہیں۔ آرائش کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عملاً صرف خط مستقیم استعمال ہوتا ہے (مثلاً، پٹی دار، چو گوشہ معین، چار خانی شکلیں)۔ اس

قصے (کرامات) نسلاً بعد نسل عورتوں میں مروج رہے ہیں جو انہیں رتجگوں کے موقع پر بیان کرتی ہیں۔ یورپ کے مستشرقین کے لیے اس قسم کے مقامی ادبیات کی فراہمی ہی سب سے زیادہ آسان رہی ہے اور ان میں شاذ ہی کوئی مکتشف ایسا ہوگا جس نے چند کہانیاں اور معنی درج نہ کیے ہوں۔ ان کتابوں کا کیا کہنا جن کا موضوع ہی یہ ہے کہ عوامی ادب کی معلومات لکھ کر لسانی دستاویزوں کے طور پر پیش کی جائیں۔

آخر میں غیر مذہبی شاعری کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اگرچہ یہ ابھی سادہ و پس ماندہ اور ابتدائی حالت میں ہے جیسا کہ سب ادبیات کے آغاز میں ہوا ہی کرتا ہے، لیکن تازگی میں غالباً وہ سب سے فائق ہے۔ 'آندس' یعنی مذہبی رسوم کے رقص کے موقع پر اجتماعی طور پر فی البدیہہ کہی جانے والی غنائی نظمیں (Chants)، بچوں کی لوریاں، تدفین کے وقت کے خطبے اور مختلف رسموں کی انجام دہی کے وقت گائی جانے والی نظمیں اور روایات ملک کے بڑے حصے کی حاصل ہیں۔ لیکن بربروں میں پیشہ ور شاعر بھی پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عام طور پر ان کی دوڑ عاشقانہ غزلوں اور رزمیہ نظموں ہی تک ہوتی ہے۔ مراکش میں امیازن لوگ (Imdyazan) (دیکھیے *Un chant d'andyaz, l'aède berbère du* : A. Roux 'Mémorial H. Basset', groupe linguistique berabber برس ۱۹۲۸ء، ۲ : ۲۳۷ تا ۲۴۲) مارے ملک میں گھومتے پھرتے ہیں، اور یورپ کے مطربوں (troubadours) کی طرح اہم حوادث کی حکایت کرتے ہیں، متوقع قدر دانوں کی تعریف کے گیت گاتے ہیں، یا دھوکا بازوں پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ بلاد القبائل کا شاعر محند و محند اور طوارق علاقے کی شاعرہ داسین Dassin نے، مقامی طور پر سہی،

*Märchen der Schluf*: وہی مصنف: (۱۵)؛ ۱۸۹۴ء  
*von Tazerwalt*، لائپزگ ۱۸۹۵ء؛ (۱۶) وہی مصنف:  
*Märchen der Berbern von Tamazratt*، لائپزگ، ۱۹۰۰ء؛  
*Textes berbères en parler des*: E. Destaing (۱۷)  
*Chlesulis du Sous*، پیرس، ۱۹۳۰ء؛ (۱۸) E. Laoust  
*Contes berbères du Maroc*، پیرس، ۱۹۳۹ء؛ (۱۹)  
*Trois contes berbères*: J. M. Dallet، در *IBLA*  
*Recueil de contes*: Rivière (۲۰)۔ فقط تراجم: (۲۰)۔  
*populaires de la Kabylie du Jurjura*، پیرس، ۱۸۸۲ء؛  
*Contes populaires berbères*: R. Basset (۲۱) پیرس  
*Nouveaux Contes*: وہی مصنف: (۲۲)؛ ۱۸۸۷ء  
*berbères*، پیرس، ۱۸۹۷ء؛ (۲۳) E. Dermenghem  
*Contes Kabyles*، الجزائر، ۱۹۳۵ء۔ گیت اور شاعری:  
*Chanson berbère de Djerba*: Motylinski (۲۴)  
*Bull. Corr. Afr.*، ۱۸۸۵ء؛ (۲۵) A. Hanoteau  
*Poésies populaires de la Kabylie du Jurjura*  
*L' Insurrection*: R. Basset (۲۶)؛ ۱۸۶۷ء پیرس  
*algérienne de 1871 dans les chansons Kabyles*  
*Chansons kabyles*: Luciani (۲۷)؛ ۱۸۹۲ء Louvain  
*de Smail Azikou*، الجزائر، ۱۸۹۹ء؛ (۲۸)  
*Poésies touarègues*: Ch. de Foucauld، پیرس، ۱۹۲۵ء۔  
*Chants berbères contre*: E. Laoust (۲۹)؛ ۱۹۳۰ء۔  
*l'occupation française*، در *Mémorial R. Basset*، پیرس  
*Poèmes touareg*: F. Nicolas (۳۰)؛ ۱۹۲۸ء  
*ETI*، ۱۹۳۱ - ۱۹۳۲ء؛ (۳۱) J. Servier  
*des femmes de l'Aurès*، غیر مطبوعہ مقالہ Sorbonne  
*Poèmes*: L. Justinard (۳۲)؛ ۱۹۵۵ء۔ صرف تراجم:  
*chleuhs*، در *RMM*، ۱۹۲۵ء؛ (۳۳) L. Paul  
*Chants berbères du Maroc*: Margueritte، ۱۹۳۵ء۔  
 فن، شمالی افریقہ میں مسلمانوں کے عام فن پر تصانیف  
 کے علاوہ دیکھئے: (۳۴) G. de Gironcourt  
*L' Art Chez les Touareg*، در *Rev. d' Eth. et de sociol.*

میں لکڑی کی گڑیوں کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے  
 جو بے انتہا حقیقت پسندی سے بنائی جاتی ہیں۔  
 مآخذ: (۱) اس سلسلے میں ضروری تصنیف  
*Essai sur la littérature des berbères*: H. Basset  
 الجزائر، ۱۹۲۰ء کی ہے، جس کی تلخیص A. Basset  
*Littérature berbère*، در *Hist des Litt.*، پیرس، ۱۹۵۵ء،  
 ۱: ۸۸۶ تا ۸۹۰ نے کی ہے۔ کتبے: (۲) Abbé Chebot  
*Recueil des inscriptions libyques*، پیرس، ۱۹۳۰ء؛ (۳)  
*Contrib. à l'étude des gravures*: M. Reygasse  
*rupestres et inscrip. tifinar' du Sahara Central*  
 الجزائر، ۱۹۳۲ء؛ (۴) Th. Monod، *L' Adrar Ahnet*،  
 پیرس، ۱۹۳۲ء، ص ۱۳۵ تا ۱۳۹؛ (۵) وہی مصنف:  
*Gravures, peintures et inscriptions repestres*، پیرس  
*Les Inscriptions libyques*: G. Marcy (۶)؛ ۱۹۳۸ء  
*biligues de l' Af. du N.*، پیرس، ۱۹۳۶ء؛ (۷)  
 وہی مصنف: *Introd. à un déchiffrement méthodique*  
*des inscriptions "tifnagh" du sahara central*  
 در *Hesp.*، ۱۹۳۷ء / ۱ - ۲؛ (۸) وہی مصنف:  
*Étude des doc. épigraphiques recueillis par*  
 M. Raygasse، در *R Afr.*، ۱۹۳۷ء؛ (۹) A. Tovar  
*Papeletas de epigrafia libica*، در *Bol. del Semin.*  
 Valladolid، ۱۹۳۳ء *de Est, de Arte y Arquelogia*  
 ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ - ۱۹۳۵ء۔ ان میں عوام میں مشہور  
 روایات و عقائد یا مقامی بولیوں پر مخصوص رسالوں کے  
 علاوہ، متون پائے جاتے ہیں: (۱۰) R. Basset  
*Loqman Berbère*، پیرس، ۱۸۹۰ء؛ (۱۱) Mouliéras  
*Légendes et contes merveilleux de la Grande Kabylie*  
 پیرس، ۱۸۹۳ - ۱۸۹۸ء؛ (۱۲) وہی مصنف: *Les*  
*Fourberies de Si Djeh'a*، Oran، ۱۸۹۱ء؛ (۱۳)  
*Essai de contes Kabyles*: Leblanc de perbois  
 Batna، ۱۸۹۷ء؛ (۱۴) H. Stumme، *Elf Stücke im*  
*Schilha-Dialekt von Tazerwalt*، در *ZDGM*



تا ۱۴۲۹ء) میں ایبوسینیا کی ایک مناجات میں آیا ہے اور فتوح الحبشة (۱۵۳۰ تا ۱۵۵۰ء) میں جا بجا ملتا ہے۔

بربری کا اصل محل وقوع بندر عباس تھا، جہاں موجودہ شہر کے مشرق میں اب گورستان ہے۔ یہاں کے نقابر میں ان تین سیدوں کے مقبرے بھی شامل ہیں جن کا تعلق بندر عباس کے بسائے جانے سے بتایا جاتا ہے، جیسے دوسرے عرب داعیان اسلام نے زیلع اور مقدشو بسائے۔ روایت کی رو سے یہ شہر عمود اور اویرہ کے زمانے کا ہے، جو مزید مغرب کی سمت واقع ہیں۔ یہ آدل کی اسلامی ریاست (جس کا کچھ عرصہ زیلع [رک باں] مرکز رہا) کا حصہ تھا۔ ۱۷ویں صدی میں قائم ہوئی تھی، چودھویں صدی میں منتہائے کمال پر پہنچی اور سولہویں صدی میں احمد ابراہیم الغازی (۱۵۰۶ - ۱۵۴۳ء) کی فتح حبشہ کے بعد بڑی تیزی سے زوال کا شکار ہو گئی۔ جن دنوں ایبوسینیا کی فوجیں پرتگیزی امداد سے اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات واپس لے رہی تھیں ۱۵۱۸ء میں بربری کو [پرتگیزی کپتان] سلڈنہا Saldanha نے تاراج کر دیا۔ سترہویں صدی میں زیلع اوریہ دونوں مہا کے شریفوں کے ماتحت ایک صوبہ بن گئے۔ پہلے برطانوی - سومالی معاہدے پر ۱۸۲۷ء میں دستخط ہوئے، یعنی انگریزی جہاز 'میری این' Mary Ann کے بربری کے سامنے لوٹ لیے جانے کے دو سال بعد ۱۸۴۰ء میں برطانیہ نے زیلع کے حاکم علی شرمکہ (سومالی: ہیریونس) کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کیے جس کی رو سے اسے یہاں کی بندرگاہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز لنگر انداز کرنے کے حقوق حاصل ہو گئے۔ ۱۸۵۰ء میں جب [رجرڈ] برٹن پر حملہ ہوا تو یہ یونس بربری میں انگریزوں کا قائم مقام (Agent) تھا۔ انیسویں صدی کے سیاحوں نے بربری کے بارے میں لکھا

جنوری - فروری ۱۹۱۴ء: P. Ricard (۳۵) Tissages :  
berberes des Ait Alssi 'Hesp. در ۱۹۲۵ء: (۳۶)  
Le peuple marocain : V. Piquet، باب ۱۸: (۳۷)  
Les Tissages sur métier de haute : G. Chantréaux  
'RAfr. در lisse à Ait Hichem at dans le Haut Sebaou  
۱۹۳۱ - ۱۹۳۲ء: (۳۸) وہی مصنف : Les Tissages  
'Hesp. در décorés chez les Beni-Mgild : ۱۹۳۵ء  
La Poterie des Ait Smail du : H. Balfet (۳۹)  
'RAfr. در Djurdjura، ص ۲۸۹ تا ۳۴۰: (۴۰)  
L Art des Berbères : G. Marçais، الجزائر ۱۹۵۶ء.  
[CH. PELLAT و R. BASSET]

• بربروسہ: راکہ بہ خیرالدین۔

• بربری: (= بربرا) برطانوی سمائی لینڈ کے زیر حفاظت علاقے کا سابق صدر مقام اور بندرگاہ جو ۱۰ درجہ ۲۶ دقیقہ عرض بلد شمالی اور ۴۵ درجہ ۳ دقیقہ طول بلد مشرق پر واقع ہے۔ سر زمین لوبان (Frankincense) کے ساحلی علاقے کا نام Periplus بطلمیوس اور Cosmas نے βαρβαρικὴ ἡπείρος یا βαρβαρία بتایا ہے۔ ممکن ہے کہ خود شہر کا نام Μαλάω ἐμπορίον ہو۔ قدیم تر عرب جغرافیہ نگاروں نے سر زمین بربری کا ذکر کیا ہے اور βαρβαροι خلیج عدن کو بحر بربری یا خلیج البربری لکھا ہے۔ یہاں کے باشندے بربرہ یا برابر موسوم ہیں۔ یہ سومالی (سومالی) ہیں۔ یا قوت (۴: ۶۰۲) نے انہیں کی نسبت بیان کیا ہے کہ وہ وحشی حبشی تھے، جن میں اسلام نے نفوذ کیا تھا اور زنج اور حبش کے درمیان کے علاقے میں رہتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے ابن سعید (م ۱۲۸۶ھ) پہلا شخص تھا جس نے بربری کے شہر کا ذکر کیا اور ان لوگوں کے بارے میں لکھا کہ وہ مسلمان تھے۔ ابن بطوطہ نے انہیں شافعی بتایا ہے اور آج بھی یہ شافعی ہی ہیں۔ لفظ سومالی پہلی بار نجاشی بسحاق کے عہد (۱۳۱۴ء)





واقع ہے۔ [جغرافیہ کی عربی کتابوں میں یہ شہر ثغر الاعلیٰ (Upper Frontier) کا ایک مضبوط مقام بیان ہوا ہے۔ نفع الطیب میں لکھا ہے کہ ابن حیان نے اسے علاقہ برطانیہ کا، جسے شریف الادریسی اعمال ثغر الاعلیٰ سے بتاتا ہے، ایک قصبہ لکھا ہے۔] ابن حیان نے لکھا ہے کہ ہسپانیہ میں مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات کے زمانے یعنی ۵۹۳/۶۱۲ء میں اس شہر پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا اور پانچویں صدی کے اوائل یعنی تین سو ساٹھ برس تک مسلسل ان کے ماتحت رہا۔ مجموعی طور پر یہاں اسلامی حکومت چار سو برس کے قریب رہی۔ یہ شہر ثغر الاعلیٰ کی حفاظت کے لیے بطور برج کام دیتا تھا اور اس تنظیم میں اسے سرقسطہ اور لارده Larda کو منسلک کرنے والی ایک کڑی کہہ سکتے ہیں۔

عبدالملک المظفر کی ۵۳۹۶/۶۱۰۰ء میں Pampeluna کے خلاف مہمات کے بیان میں بربشتر کو اسلامی مملکت کا آخری حصہ قرار دیا گیا ہے (ابن عذاری، ۳: ۱۲) - ۵۳۵۶/۶۱۰۶ء میں (دیکھیے سطور ذیل) جب یہ مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا تو اس پر سرقسطہ کے بنو ہود کا قبضہ تھا۔ اس کی آبادی خاصی تھی۔ بڑا خوش حال اور دولت مند شہر تھا (ابن حیان)۔ خلافت قرطبہ کے زوال پر زمانہ طوائف الملوک میں، جب کہ پانچویں صدی کے وسط میں سلاطین بنی ہود کے احمد المقتدر کی حکومت سرقسطہ میں تھی تو عیسائی بادشاہ اردملیس (الاردمیر) یعنی شاہ رامیرو Ramiro کے بیٹے Sancho نے بربشتر پر حملہ کر دیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ ۵۳۵۶/۶۱۰۶ء کے موسم گرما میں رابرٹ کریسپن Robert Crespin کے زیر قیادت نارمنوں اور کچھ دوسرے لوگوں پر مشتمل چالیس ہزار کا ایک لشکر بربشتر کے سامنے آنمودار ہوا (قائد کا یہ نام ایک رومی مؤرخ نے دیا ہے)۔ اسے پوپ کی

تائید بھی حاصل تھی۔ وہ لوگ اس مہم کو حروب صلیبیہ سے پہلے کی صلیبی جنگ قرار دیتے تھے۔ ایک ماہ سے زائد عرصے کے محاصرے کے بعد وہ شہر پر قبضہ کر لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ہر چند کہ ہسپانوی عیسائیوں نے اس جنگ میں جو حصہ لیا اس کی تفصیلات تاریکی میں ہیں اور گو بربشتر پر ایک برس کے بعد ہی دوبارہ قبضہ ہو گیا تھا پھر بھی اس کی پس پائی پورے ملک پر دوبارہ فتح کی ایک اہم منزل ہے۔ معاصرین نے اسے بے مثال واقعہ اور اسلامی اندلس کا سب سے بڑا سانحہ قرار دیا ہے۔ اندلس کے حالات پر ابن حیان کے انتہائی اندوہ گین تاثرات ان واقعات کی پیداوار ہیں۔ اس کا ذکر ابن عذاری (۳: ۲۵۴ تا ۲۵۵) نے کیا ہے۔ سرقسطہ کا المقتدر بن ہود دفاعی حملے کے لیے جب فوجیں جمع کر رہا تھا تو المعتضد عبادی نے اپنے اس نام نہاد اتحادی کے پاس صرف پانسو سواروں کا ایک دستہ بھیجا تھا، گو اشبیلیہ (Seville) کے سردار الہوزنی نے اسے یہاں تک کہا تھا کہ وہ بنفس نفیس اس مہم پر جائے (ابن سعید: المغرب فی حلی المغرب، طبع شوقی ضیف، ۱: ۲۳۴) اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانان اندلس تشمت و افتراق کا شکار تھے۔ یہ تو تیر اندازوں کی اعلیٰ کارکردگی کا نتیجہ تھا کہ المقتدر بن ہود شہر واپس لینے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن بربشتر کی قسمت میں نہ تھا کہ زیادہ دیر تک مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے۔ بالآخر ۱۱۰۱ء میں پڈرو ارغونی (Pedro of Aragon) نے اسے مسیحیوں کے لیے فتح کر لیا۔ یہ واقعہ یاقوت کے علم میں بھی تھا (قب معجم البلدان، بذیل مادہ)۔ [یاقوت نے اس کا تلفظ بَشْتَر دیا ہے اور لکھا ہے کہ کبھی اسے باشتر بھی کہتے ہیں۔ اور بتایا ہے کہ یہ اعمال ربہ کا ایک قلعہ تھا۔ اس کے اور قرطبہ کے درمیان

*Espana del Cid*، میڈرڈ ۱۹۲۹ء، ۱ : ۱۶۳ بعد۔  
(D. M. DUNLOP [و ادارہ])

بَرَبَط : رَكَ به عود۔

بَرَبَه : رَكَ به بارابہ۔

البرہاری : ابو محمد الحسن بن علی بن خلف

البرہاری، ایک نامور حنبلی فقیہ، جنہوں نے بغداد میں بڑی عمر میں وفات پائی۔ وہ بیک وقت عالم حدیث بھی تھے اور فقیہ بھی۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ان بڑے اور ہر دل عزیز واعظوں میں سے تھے جنہوں نے چوتھی / دسویں اور پانچویں / گیارہویں صدی میں خلافت کی تاریخ میں شیعہ دعاۃ کے خلاف سنیوں کی جد و جہد میں بڑا اہم اور نمایاں حصہ لیا اور کسی قسم کا مفاہمتی رویہ اختیار کیے بغیر اس عقیدہ کلام کی کامیابی سے مخالفت اور روک تھام کی جس کے محرک معتزلہ اور نیم معتزلہ تھے۔

البرہاری نے حنبلی [رَكَ به الحنابلہ] اصول کی تعلیم ابوبکر المرؤذی (م ۵۲۷۵ / ۴۸۸۸) سے حاصل کی (قب تاریخ بغداد، ۴ : ۳۲۳-۳۲۵؛ طبقات الحنابلہ، ۱ : ۵۶-۶۳؛ اختصار، ص ۳۲ تا ۳۴) جو حضرت امام احمد بن حنبلہ کے نہایت ہی عزیز شاگرد سمجھے جاتے تھے اور جنہوں نے جلیل القدر امام کے فقہ، اخلاق، ادب اور عقائد سے تعلق رکھنے والے افکار کو جس کاوش کے ساتھ پھیلا یا ان کے شاگردوں میں شاید ہی کسی نے پھیلا یا ہو۔ نامور صوفی سہل التستری (م ۵۲۸۳ / ۴۸۹۶) بھی، جس نے سالمیہ مکتب (تصوف) کی بنیاد رکھی (قب ل، لائڈن، بار اول، ۴ : ۱۱۹) اور جس سے حنبلی مذہب کے بعض بڑے بڑے نمائندے خاصے متاثر ہوئے، ان کا استاد تھا [رَكَ به سہل التستری]۔

البرہاری کتاب السنۃ کے مصنف ہیں، جس کی

حیثیت ایک عقیدے کی نمائندہ کتاب کی ہے۔ اس کا

تیس فرسخ کا فاصلہ تھا (معجم، بذیل مادہ)۔ الحمیدی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے اور اس کا تلفظ باشتُر دیا ہے اور اسے مالقہ کے قریب بتایا ہے۔ علاقہ مالقہ ہی کو علاقہ ربہ کہتے ہیں۔ ہسپانوی مؤرخ کونڈے نے لکھا ہے کہ جبال رندہ (Sierra de Ronda) میں ایک مقام بیشتر تھا اور وہ ادریسیوں (۵۴۲۷ / ۱۰۳۵ء تا ۵۴۴۹ / ۱۰۵۷ء) کے قبضے میں تھا۔ یہ وہی آج کل کا شہر بلشتر (Vilches) ہے جو وادی الکبیر کی دو شاخوں یعنی گوادالین اور گوارسیزاس کے درمیان واقع ہے۔ غرض تمام جغرافیہ دانوں نے بیشتر کو علاقہ مالقہ یا اعمال ربہ میں سے قرار دیا ہے۔ ڈوزی نے لکھا ہے کہ بیشتر سے مراد ایک پرانا رومی قلعہ ہے جو آج کل الکستیان کہلاتا ہے اور جس کا پرانا رومی نام Municipium Singilense Bartrastreuse تھا اور وہ انتقیرہ Antequera سے مغرب میں شہر تبا Teba کے قریب وادی القرشی (The Guadalhorce) کی بالائی گذرگاہ پر واقع ہے۔ تبا اور انتقیرہ کے درمیان تقریباً چھ میل کا فاصلہ ہے۔ اس قلعے کے موقع کی تعیین میں یورپی مؤرخوں نے بڑی کاوش کی ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ مقام ابن حفصون (م ۵۳۰۵ / ۹۱۷ء) عیسائی کا مستقر تھا، جو خلافت قرطبہ کے دشمنوں میں سے تھا اور جس نے سینتیس برس تک جنوبی اندلس کی فضا مکدر رکھی تھی (محمد عنایت اللہ : اندلس کا تاریخی جغرافیہ، ۱۹۲۷ء، ص ۱۴۴ بعد)۔

مآخذ : (۱) ابن عذاری : البیان المغرب، ۳ :

۲۲۵ تا ۲۲۸، ۲۵۳ تا ۲۵۵؛ (۲) المقری : Analectes

[نفع الطیب من حصن الاندلس الرطب، لائڈن ۱۸۶۱ تا

۱۸۶۵ء]، ۲ : ۷۴۹ بعد؛ (۳) Recherches : R. Dozy

sur l'histoire et la littérature de l'Espagne

سوم، ۲ : ۳۳۵ بعد؛ (۴) La : R. Menéndez Pidal



آخری کے لیے ضروری ہے۔ وہ ظاہر کے مقابلے میں باطن کو قطعی طور پر مسترد نہیں کرتے بشرطیکہ اس باطن کی اساس و بنیاد قرآن و سنت پر قائم ہو۔ وہ جس چیز کو ہر دوسری چیز کے مقابلے میں مردود و مسترد قرار دیتے ہیں وہ تشدد و انحراف ہے جو مذہبی عقائد میں تاویل، رائے اور قیاس کے بے محابا استعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ صفات باری کے مسئلے میں ان کے بیانات قرآن و سنت کے بیانات کے اعادے تک محدود ہیں۔

سیاسی طور پر وہ خلافت پر قریش کے حق کے زبردست مؤید و حامی معلوم ہوتے ہیں، اگرچہ وہ مسلمانوں کے حکمران طبقے کی اطاعت کی تاکید کرتے ہیں، اس صورت کے سوا کہ اس اطاعت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو۔ وہ خروج بالسیف یا ایسی بغاوت کی سختی سے مذمت کرتے ہیں جس میں اسلحہ سے کام لیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ قانون اور امن عامہ کی بحالی کے لیے ”دعوت امن“، ”نصیحت“ اور ”امر بالمعروف“ سے کام لینا چاہیے۔ ایک ایسے زمانے میں جبکہ عالم اسلام متعدد فرقوں اور گروہوں میں منقسم ہو چکا ہو ”اصحاب حدیث“ اور ”اہل السنہ و الجماعہ“ کا (جن کی فتح و نصرت کا اللہ کی طرف سے وعدہ ہو چکا ہے) خصوصی فرض ہے کہ وہ امر بالمعروف پر عمل کریں۔ البرہاری اپنے اصول و عقائد میں پختہ تھے۔ انہوں نے معتزلہ اور شیعہ کے خلاف شخصی طور پر زبردست مہم چلائی، جس کی وجہ سے بعض اوقات انہیں اقتدار پسندی کا مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ ۵۳۰ھ / ۹۲۱ء اور ۵۳۲ھ / ۹۴۱ء کے درمیان بغداد میں جو عوامی شورشیں اٹھیں اور ہنگامے برپا ہوئے ان کے پیچھے یہ بات بھی تھی کہ جب وزیر علی بن عیسیٰ نے الخلیفہ نو ۵۳۰ھ میں حنبلی مخالفین سے عقیدے

متن بڑی حد تک قاضی ابوالحسن نے اپنی طبقات (۲: ۱۸ تا ۴۳) کے ذریعے ہم تک پہنچایا ہے اور اس سے احمد غلام خلیل (م ۵۲۷۰/۸۸۸ء) کی تالیف کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ احمد خلیل ابو ہمزہ اور النوری (م ۵۲۹۷/۹۱۰ء) کے متشددانہ تصوف کا مخالف ہے اور اس کا میلان حنبلیت کی طرف ہے (قب L. Massignon: *Textes inédits*، ص ۲۱۲ تا ۲۱۳)۔ ابوالحسن الأشعری (م ۵۳۲۹ / ۹۴۱ء) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی الابانۃ البرہاری سے تبادلہ خیال کے بعد تصنیف کی تھی۔ دونوں کتابوں کو سامنے رکھ کر ان کے عقائد کا مطالعہ کیا جائے تو بظاہر یہ بات ناقابل قبول معلوم نہیں ہوتی۔

البرہاری کی ’اقرار ایمان پر کتاب‘ بنیادی طور پر مناظرانہ ہے، جس میں انہوں نے تمام بدعات کو مذموم قرار دیا ہے اور بڑے پر زور انداز میں اس دین عتیق کے احکام کی طرف لوٹنے کے تلقین کی ہے جس پر خلفائے ثلاثہ کے عہد میں عمل ہوتا تھا، کیونکہ ان کے خیال میں اختلافات حضرت عثمان رضی بن عفان کی شہادت اور حضرت علی رضی ابن ابی طالب کی خلافت کے بعد پیدا ہوئے۔ اس ”دین عتیق“ کی طرف رجوع کرنے کی غرض یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام رضی اور پاکباز تابعین رضی کی تقلید کی جائے۔ تابعین رضی میں البرہاری حضرت امام احمد بن حنبل رضی کی طرح امام مالک بن انس رضی (م ۵۱۷۹ / ۷۹۵ء)، عید اللہ ابن المبارک رضی (م ۵۱۸۱ / ۷۹۷ء)، فضیل بن عیاض رضی (م ۵۱۸۷ / ۸۰۳ء) اور بشر بن الحارث رضی (م ۵۲۲۷ / ۸۳۲ء) جیسے بزرگوں کے نام لیتے ہیں۔ البرہاری عقل کے استعمال کے مخالف نہیں بلکہ وہ اسے ایک ایسی نعمت سمجھتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں مختلف طریقوں سے تقسیم فرما دیا ہے اور یہ ان کی نجات

کے اختلافی مسائل پر مباحثہ و مناظرہ کرنے کی دعوت دی تو اس کی مخالفت میں البرہاری بھی شریک تھے۔ عوام کی اسی مخالفت اور دشمنی کی وجہ سے ۵۳۱ھ میں الطبری کو رات کے وقت ان کے گھر میں دفن کیا گیا (قب ان حوادث و وقائع کے سلسلے میں البدایة، ۱۱: ۱۳۲، ۱۳۵ تا ۱۴۶)۔

۵۳۱ھ/۶۲۹ء میں البرہاری کے متبعین اور ان کے مخالفین میں بغداد میں ایک بہت بڑا ہنگامہ برپا ہوا، جس میں بہت سے آدمی مارے گئے۔ نزاع کا سبب یہ تھا کہ دونوں گروہوں میں سورۃ بنی اسرائیل کی مندرجہ ذیل آیت (۱۷: ۷۹) کے معنی و مفہوم کے سلسلے میں اختلاف تھا: عَسَىٰ اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُودًا (قریب ہے کہ اللہ تمہیں ایک ایسے مقام میں پہنچا دے جو نہایت پسندیدہ ہو)۔ البرہاری کے پیرو کہتے تھے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنے تخت پر بٹھائے گا۔ اس کے برخلاف مخالفین کا، جو الطبری اور ابن خزیمہ کے عقائد کے پیرو تھے، خیال تھا کہ اس سے محض وہ "شفاعت" مراد ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن ان مسلمانوں کے حق میں فرمائیں گے جن سے گناہ کبیرہ سرزد ہوئے (قب البدایة، ۱۱: ۱۶۲ تا ۱۶۳)۔

۵۳۲ھ/۶۲۳ء [کذا؟ ۶۳۳ء] میں القاہر کے عہد خلافت میں جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر بر سر منبر لعنت کرنے کا سوال اٹھا، جس کا ہدف خالص حنبلی عقیدہ تھا، تو حاجب علی بن یلق نے البرہاری کو تلاش کرنے کا حکم دیا، جو کہیں چھپے ہوئے تھے، جالانکہ حنبلی علما کے بہت سے مرید اور شاگرد شہر بدر کر کے بصرے بھیج دیے گئے تھے (الکامل، ۸: ۲۰۴؛ البدایة، ۱۱: ۱۷۲)۔ اس کے بعد خلیفہ القاہر نے [اسن و] اخلاق کی بحالی کے لیے

جو تدابیر اختیار کیں ان کا مقصد کسی حد تک حنبلی معترضین کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔

۵۳۲ھ/۶۳۳ء میں الشلمغانی اور ابن مقسیم پر جو مقدمے چلائے گئے ان میں اگرچہ البرہاری کے حامیوں نے براہ راست کوئی حصہ نہیں لیا لیکن ابن شنبوذ قاری قرآن پر وزیر ابن مقلہ نے اس الزام کی بنا پر مقدمہ چلایا اور سزادی کہ وہ لوگوں کو قرآن پاک کی ایسی قراءتیں سکھاتا ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے نسخہ مصحف کے خلاف ہیں (قب الصولی، ترجمہ M. Canard، ۱: ۱۰۹ و ۱۳۵) تو بظاہر بغداد کے حنابلہ کے پر زور مظاہروں پر ایسا کیا۔

البرہاری کے حامیوں کی شورش نے الراضی کی خلافت کے ابتدائی دور (۵۳۳ھ/۶۳۵ء) میں، جہاں اس وقت تک ابن مقلہ ہی کی وزارت تھی انتہائی شدت اختیار کر لی۔ مسلم مؤرخوں (الصولی، ۱: ۱۱۳؛ الكامل، ۸: ۲۲۹ تا ۲۳۱؛ البدایة، ۱۱: ۱۸۱، ۱۸۲) نے ان واقعات کی جو تفصیل بیان کی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ حنابلہ نے قانونی دفعات کو نافذ کرنے کی غرض سے تجارتی کاروبار میں مداخلت کی، شراب فروشوں کو گانے والی عورتوں پر حملے کیے، آلات موسیقی کو توڑا پھوڑا، لوگوں کے گھروں میں گھسے، کسی مرد کو کسی غیر محرم عورت کے ساتھ چلتے پھرتے دیکھ کر اسے پولیس کے افسر اعلیٰ کے پاس پکڑ کر لے گئے (قب K. V. Zettersteen، در ال، لائڈن، بار اول، ۳: ۱۱۹۹، بذیل راضی)۔ اس ہنگامے کے بعد خلیفہ کے سرکاری عہدے داروں نے البرہاری کے حامیوں کو لوگوں سے ملنے اور تعلیم دینے اور مسلمانوں کو کسی ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے روک دیا جو حنبلی عقیدہ رکھتا ہو۔ چونکہ البرہاری کے حامیوں کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں



۲ : ۱۶، ۱۹)۔

عین یہی زمانہ تھا جب رجب ۵۳۲۹ / اپریل ۶۹۳۱ء میں توڑوں کی بہن کے گھر میں، جہاں البربہاری چھپے ہوئے تھے، ان کا انتقال ہو گیا۔ انہیں یہیں دفن کیا گیا (طبقات الحنابلة، ۲، ۳ تا ۴۵؛ البداية، ۱۱، ۲۰۱)۔

البربہاری کا اثر بہت سے ہم عصر حنبلی فقہا پر بھی نمایاں ہے۔ بالخصوص ابن بطہ العکبری (م ۵۳۸۷ / ۶۹۹۷) پر، جو ان سے کئی مرتبہ بغداد میں ملا اور جس کی کتاب الابانة میں ان کی کتاب العقيدة کا گہرا عکس ہے۔ ابن بطہ کے توسط سے ان کا بالواسطہ اثر قاضی ابو یعلیٰ بن الفراء (م ۵۳۵۸ / ۶۱۰۶۶) اور اس کے بہت سے شاگردوں پر بھی پڑا بالخصوص شریف ابو جعفر الهاشمی (م ۵۳۷۱ / ۶۱۰۷۸) پر، جو بدعت کے خلاف کئی پرزور مظاہروں کا محرک بنا۔

مآخذ: ابن ابی یعلیٰ: طبقات الحنابلة، قاہرہ ۵۱۳۷۱ / ۱۹۵۲ء، ۲: ۱۸ تا ۳۵؛ (۲) ابن کثیر: البداية، ۱۱: ۲۰۱ تا ۲۰۲؛ (۳) النابلسی: إحصار طبقات الحنابلة، دمشق، ۵۱۳۵۰، ۲۹۹ تا ۳۰۹؛ (۴) ابن العماد: شذرات، ۲: ۳۱۹ تا ۳۲۳؛ (۵) H. Laoust: La profession de foi d'Ibn Batta، در PIFD، ۵۱۹۵۸، ص ۳۸ تا ۴۱ و اشاریہ۔

(H. LAOUST)

- البرت: (جمع: البرتات)، ایک اندلسی مغرب لفظ، جس کا ماخذ لاطینی لفظ portus ہے۔ عرب مصنف اسے عربی لفظ باب (جمع: ابواب) کا مترادف ٹھہراتے ہیں۔ عربوں نے جزیرہ نماے آئیبریا کو جو مثلث نما شکل دی تھی وہ سب جانتے ہیں۔ بطلمیوس کے اتباع میں انہوں نے اس کا حسب ذیل حدود اربعہ مقرر کیا ہے۔ جنوب میں طریفہ، مغرب میں راس فینستہ Finisterre اور مشرق میں

آئی اس لیے ۵۳۲۳ میں خلیفہ الراضی نے ایک فرمان (متن در الکامل، ۸: ۲۳۰) جاری کیا، جس میں حنبلیت کو مذموم قرار دیتے ہوئے اس کے متبعین کو دائرۃ اسلام سے خارج کیا گیا ہے۔ فرمان میں حنبلیت کو مورد الزام ٹھہرایا گیا کہ وہ حلول کے عقیدہ تشبیہ کو نمایاں کرتی اور زیارة القبور (ائمہ کی قبور پر جانے) سے منع کرتی ہے۔ خلیفہ کے اس طرز عمل سے کچھ مدت کے لیے حنبلی مظاہرے رک گئے۔

البربہاری کے حامیوں نے ۵۳۲۷ / ۶۹۳۹ء میں بچکم کی امارت میں اپنی شورش زیادہ شدت سے شروع کی۔ انہوں نے ان لوگوں کو بہت تنگ کیا جو معیا کے تہوار یعنی ان رسوم میں شریک ہونے جا رہے تھے جو ۱۳ / ۱۵ شعبان کی درمیانی شب کو بعض مسجدوں میں منائی جانے والی تھیں (قب الصولی، ۱: ۲۰۴، ۲۰۵)۔ پولیس کے افسر اعلیٰ نے البربہاری کی تلاش کے لیے احکام جاری کیے۔ لیکن اس مرتبہ وہ پھر روپوش ہو گئے اور اس موقع پر ان کے ایک نائب کو، جس کا نام دلاء تھا، قتل کر دیا گیا۔

البربہاری کے حامیوں کی شورش کو ختم کرنے کے امکانات اس طرح اور بھی کم ہو گئے کہ ۵۳۲۸ / ۶۹۴۰ء میں امیر بچکم نے براٹا کی مسجد ازمر نو بنوا دی۔ اس مسجد کو خلیفہ المقتدر کے عہد خلافت میں مسمار کر دیا گیا تھا (قب الصولی، ۱: ۱۳۲، ۲۰۸)۔ جب ۵۳۲۹ء میں امیر بچکم کو کڑدی قزاقوں کی ایک جماعت نے قتل کر دیا تو حنبلیوں نے بڑے زور سے اپنے اطمینان کا اظہار کیا، براٹا کی مسجد مسمار کرنے کی کوشش کی اور درب عون میں صرافے اور ساہوکاروں کے علاقے پر حملہ کر دیا، جو گویا عباسی دارالسلطنت کی تجارتی اور اقتصادی زندگی کا مرکز و منبع تھا (الصولی،

بعض لوگوں کے نزدیک علاقہ اربونہ Narbonne اور بعض کے نزدیک لَلْبَرْغَاط Llobregat کی وادی اور ایک تیسرے گروہ کی رائے میں ہیکل الزہرہ (Portus veneris = Port Vendres) کے مقام پر اس کی حدود ختم ہوتی ہیں۔ سرحد کے تیسرے مقام کے تعین میں اختلاف دو سبب سے پیدا ہوا ہے اور اس کی طرف کسی نے قرار واقعی توجہ مبذول نہیں کی۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے عرب جغرافیہ نگاروں کے ہاں جبال البرانس (پیری نیز Pyrenees) کا کوئی واضح تصور موجود نہ تھا اور انہوں نے اس سلسلہ کوہ کے لیے کوئی نام بھی متعین نہیں کیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے شمال مشرقی سرحد کا تعین ایسے طریقوں سے کیا جو ان کے زمانے کے مروجہ تصورات اور اس علاقے کی سیاسی صورت حال کی بنا پر بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔

متقدمین میں سے چند ایک، مثلاً الرازی اور بعد ازاں ابن حیان اور الیسع، یہاں کی وزی قوطی (Visigothic) روایت کی پیروی کرتے ہوئے جزیرہ نما کی حدود علاقہ اربونہ Norbonne تک لے جاتے ہیں، جیسا کہ وِمْبا Wamba کے زمانے میں تھیں۔ زمانہ ما بعد کے دوسرے مصنف، مثلاً البکری نے شمال مشرقی سرحد کا تعین لَلْبَرْغَاط Llobregat کے خط پر کیا ہے۔ اسے اندلسی سرحدوں پر فرنگیوں (Franks) کی فتوحات کا علم تھا اور اس نے اس ملک کا کئی بار بری و بحری راستوں سے سفر کیا تھا؛ چنانچہ اس نے سرحد کا تعین اس شنید کی بنا پر کیا کہ برشلونہ اور جبال البرانس (پیری نیز) کے قطلونیوں (Catalans) کو "فرینک" کہا جاتا ہے۔ اسی سرحد پر البکری نے البرت (دروازہ) کا ذکر کیا ہے کہ یہ قطلونیا کی ساحلی حدود میں واقع ہے۔ پھر اس خیال سے کہ اس بارے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہ جائے کہ الاندلس اور براعظم

(الارض الکبیرة) کے درمیان سرحد اس دریا پر واقع ہے جس کے لاطینی نام Rubricatus سے وہ واقف تھا وہ لکھتا ہے کہ جبل البرت کے درے (ابواب) جزائر میورقہ Majorca و منورقہ Minorca کے مقابل ہیں۔ اس بیان کی تصدیق ابن سعید سے ہوتی ہے اور المقری اسے سب سے زیادہ صحیح روایت تسلیم کرتا ہے، کیونکہ بہت سے سیاحوں نے اس کی تصدیق کی ہے۔ ابن الأبار نے اس مشہور لڑائی کا ایک سے زیادہ مرتبہ ذکر کیا ہے جس کے دوران میں المرابطون کے امیر ابن عائشہ نے وفات پائی تھی اور اسے وہ "وَقِيعَةُ البرت" کے نام سے یاد کرتا ہے (مسیحی مآخذ میں اس کا حوالہ El Congost de Martorell کی لڑائی کے نام سے ملتا ہے)۔ ابن خلدون نے اس سفارت کا تذکرہ کیا ہے جسے برشلونہ کے فرنگی رئیس (Count) نے، جو البرت کے دوسری جانب رہتا تھا، عبدالرحمن الثالث کے دربار میں بھیجا تھا۔ اب الأدریسی کو لیجیے، جس کی تحریر چھٹی / بارہویں صدی کے نصف آخر سے تعلق رکھتی ہے اور جس کے زمانے میں قطلونیوں و ارغونیوں (- Catalan Aragonese) کی مملکت آزاد ہوئی۔ وہ خاص طور پر خیال رکھتا ہے کہ اہل قطلونیا کو فرنگی نہ کہا جائے۔ وہ الاندلس کی سرحد کا تعین ہیکل الزہرہ کے مقام پر کرتا ہے۔ اندلس کے چھبیس صوبوں یا اقلیم کا شمار کرتے ہوئے اس نے طرطوشہ Tortosa، طرکونہ Tarragona اور برشلونہ کو اقلیم البرتات میں بتایا ہے، جو جبال البرانس سے بھی جنوب میں واقع تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جبل البرت یا البرتات کو اقلیم مذکور کے وسط میں دکھاتا ہے۔

مآخذ: (۱) الأدریسی، متن: ص ۱۷۶، ترجمہ:

ص ۲۱۱: (۲) المقری: Analectes، ۱: ۲۵۲ تا ۲۵۳

زائیسات از الرازی، البکری و ابن سعید، ۱: ۸۲ تا



(۷۳۹ - ۷۵۷ء) یا بقول ابن حیان (المقری: نفع، ۱: ۲۱۳) اس کے بیٹے فروئلا Fruela اول (۷۵۷ تا ۷۶۸ء) نے موجودہ پرتگال کے شمالی علاقے پر قبضہ جما لیا تھا، جس میں اوپورٹو Oporto (= پرتقال) اور براغہ Braga اور ویسو Viseu کے قصبے شامل تھے۔ اول الذکر دونوں قصبے دریائے دویرہ کے شمال میں واقع تھے اور آخر الذکر اسی دریا کے جنوب میں۔ الفانسو کے ایک اور بیٹے آریلیو Aurelio (عہد حکومت ۷۶۸ تا ۷۷۳ء) کا ذکر ابن الخطیب: اعمال الاعلام، ص ۳۷۳ نے ارض پرتقال کے فاتح کی حیثیت سے کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ الفانسو دوم (۷۹۱ تا ۷۸۲ء) نے ۵۱۸۲/ ۷۹۸ء میں لزبن (الاشبونہ) پر قبضہ کیا تھا اور اس امر کی اطلاع شارلیمان کو ایک پیغام کے ذریعے ایکس لا چیپل Aix-la-Chapelle بھیجی تھی، لیکن یہ کامیابیاں، اگر تاریخی طور پر صحیح بھی ہوں تو بھی بالکل عارضی نوعیت کی تھیں۔ کہیں الفانسو سوم کے عہد میں جا کر، ۷۸۶۸ء میں، جب پرتقال (= اپورٹو) پر حتمی قبضہ ہو گیا تھا، یہ ممکن ہو سکا کہ عیسائی دریائے دویرہ کے سرحدی خط کو کم و بیش کامیابی سے قبضے میں رکھ سکیں۔

قلمریہ (Coimbra) ۷۲۶۳/۷۸۸۷ء میں مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا لیکن ۷۳۷۵/۷۹۸۵ء میں المنصور نے، جس کی قرطبہ سے شنت یعقوب (Santiago de Compostella) تک غیر معمولی بلغار کوریہ Coria اور ویسو Viseu کے راستے ہوئی تھی، اسے دوبارہ فتح کر لیا۔ الاشبونہ (لزنبن Lisbon) ابھی تک روہ زوال خلافت کے قبضے میں تھا، جس کا سربراہ ۷۳۰۰/۷۱۰۰۹ء میں المہدی ہوا (حمیدی، ص ۱۸)۔ آگے چل کر ملوک الطوائف کے عہد میں یہ شہر، بقلیوس

(۸۳): ابن الابار: تکملة، در BAH، ص: ۳۰۹، ۵۵؛ (۴) ابن خلدون: العبر، ص: ۱۴۲؛ (۵) وقائع ربول Ripoll و وقائع طرطوسہ، در Viaje literario: Villanuera، ص: ۲۴۷؛ ۵

(A. HUICI MIRANDA)

پرتقال (= پرتگال) عربوں نے یہ نام ایک قدیم شہر (Cale یا Cale، Portus Cale، موجودہ زمانے کا Oporto) کو، جو دریائے دویرہ Douro کے دہانے پر واقع تھا اور بعد ازاں سلطنت پرتگال کو دیا تھا۔ بارہویں صدی میں آزاد پرتگال کے قیام سے قبل اس علاقے کی تاریخ ہسپانیہ کی تاریخ کا حصہ رہی ہے [رک بہ الاندلس]۔ اگرچہ ہمیں تفصیلات تو نہیں ملتیں تاہم فتوحات عرب کے وقت یقیناً پرتگال کا تمام علاقہ مسلمانوں کے تصرف میں بڑی تیزی سے آ گیا ہوگا۔ ہمیں کتابوں سے صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ جنوب میں مزاحمت ہوئی اور اوورہ Evora، شترین Santarem اور قلمریہ Coimbra کو عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر (والی اندلس، ۷۹۵/۷۹۷ء تا ۷۹۷/۷۹۶ء) نے فتح کیا۔ مگر زمانہ ما بعد کے ایک مصنف نے محمد بن موسیٰ الرازی (تیسری/نویں صدی) کے حوالے سے لکھا ہے کہ شترین اور قلمریہ کو قبل ازیں، موسیٰ بن نصیر کے لشکریوں میں مفتوحہ ملک کی عمومی تقسیم کے وقت، بظاہر ایک معاہدے کے ماتحت، مستثنیٰ رکھا گیا تھا (قہ لیبوی پرووانسال Lévi-Provençal: Hist. Esp. Mas.، ص: ۲۰۱ تا ۲۰۲، وسطور زیرین)۔

الاندلس کے سیاسی انتشار اور بالخصوص ۷۵۰ء کے بعد سے قحط کے باعث شمال مغرب کے نو آباد (بیشتر بربر) اس علاقے سے اٹھ گئے تو عیسائیوں کے لیے اس کی بازیابی (Reconquista) کا راستہ ہموار ہو گیا۔ آشریاس کے الفانسو اول

متعلق ہے جن کے ساتھ ۱۰۲۰ء کے قریب اشبیلیہ کے بادشاہ المعتضد کی مڈ بھیڑ پرتگال پر لشکر کشی کے دوران میں حصن الاخوان کے مقام پر ہوئی تھی، جس کی جگہ آج ویسو Visou کے شمال میں الافونس Alafões یا الافوس (الاجون Alajoen) آباد ہے۔ ان مسیحیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ موسیٰ بن نصیر (قب سطور بالا) کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت اس علاقے پر قابض ہیں۔ اگرچہ وہ بلاشبہ مضاربہ Mozarabs (= متعرب، اندلسی نصاریٰ) تھے تاہم وہ اس بات کے مدعی تھے کہ وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر قبیلۃ بن الاہم کی اولاد میں سے ہیں، جو شام کا عیسائی عرب تھا (Fernandez y Gonzalez: وہی کتاب، قب Dozy: Locis de Abbadidis، ۲: ۷)۔

عہد خلافت میں کئی گورے (یعنی صوبے کے اضلاع، جن میں صدر مقام، عامل اور حفاظتی فوج متعین ہوتی تھی، رُک بہ الاندلس، ۲: ۳) کئی یا جزوی طور پر موجودہ پرتگال کے علاقے میں واقع تھے: (۱) انتہائی جنوب میں موجودہ صوبہ الگاروی Algarve (الغرب) کے مطابق اکشوبہ (Ocsoboba) کا کورہ تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ اسی نام کا ایک قدیم قصبہ تھا، جو موجودہ فارو Faro کے اندرونی علاقے میں واقع تھا۔ عربوں کی فتح کے بعد اہمیت کے لحاظ سے اس قصبے پر زوال آ گیا اور صوبائی دارالحکومت کی حیثیت سے شلب (Silves) نے اس کی جگہ لے لی۔ تاہم پانچویں / گیارھویں صدی میں بھی اس کا وجود باقی تھا (ابن عذاری، ۳: ۲۱۵)۔ شلب نسبتاً مغرب میں دو چھوٹے چھوٹے دریاؤں کے بحری دہانوں کے قریب واقع تھا۔ اس کا تذکرہ پہلی بار ۵۲۲۹ / ۸۴۴ء میں ناروے والوں (Norsemen) کی بحری تاخت کے زمانے میں بطور بندرگاہ کے آیا ہے [رُک بہ البحرالمحیط] اور یہ

کے افطسی [رُک بہ الافطس] حکمرانوں کی ماتحتی میں چلا گیا، جو الاندلس کے مغربی علاقے کی حکومت کے دعوے دار اور اس کے لیے اشبیلیہ کے عبّادی خاندان سے برسرِ نزاع تھے۔ ۵۴۵۶ / ۱۰۶۴ء میں جب قلمریہ حتمی طور پر ہاتھ سے جاتا (ابن عذاری، ۳: ۲۳۹) تو الاشبونہ شترین کے ساتھ تاجہ [رُک باں] کے شمال میں گھرا ہوا مسلم علاقہ ہو کر رہ گیا تاآنکہ پرتگال کے پہلے بادشاہ الفانسو ہنریکس Alfonso Henriques نے ۵۴۴۱ / ۱۱۴۷ء میں ان دونوں کو فتح کر لیا۔ عام روایت یہ ہے کہ الفانسو ہنریکس نے بادشاہ کا لقب اس فتح کے بعد اختیار کیا تھا جو اسے تاجہ [رُک باں] کے قریب اوریق Ourique کے مقام پر مسلمانوں پر حاصل ہوئی تھی (جولائی ۱۱۳۹ء)۔ اس کی وفات (۱۱۸۵ء) سے قبل پرتگیزیوں کا جنوب کے بیشتر علاقے پر قبضہ ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے قسمت کا پانساکس طرح پلٹتا رہا تھا اس کی ایک مثال لیمیگو Lamego ہے، جو دریاے Douro کے جنوب میں واقع تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۹۰۴ء میں اسے الفانسو سوم نے فتح کیا تھا لیکن بعد ازاں یہ ہاتھ سے نکل گیا۔ پھر ۱۰۳۸ء میں فرڈیننڈ اول اسے دوبارہ قبضے میں لایا، جب کہ اس کے بادشاہ یا والی کو وہاں عیسائیوں کے باج گزار کی حیثیت سے رہنے دیا گیا تھا۔ ۱۱۰۲ء سے کچھ مدت پہلے یہ ایک بار پھر مسلمانوں کے تسلط میں آ گیا لیکن بالآخر اسی سال کونڈے ڈوں ہنریک Conde Don Henrique کے حوالے کر دیا گیا (F. Fernandez y Gonzales: Mudejares de Gastilla، ص ۲۹)۔ اس علاقے میں عربیت کی جڑیں کس قدر گہری ہو چکی تھیں اس کا اندازہ بارھویں صدی کے مصنف الموعینی کے بیان سے ہوتا ہے (Historiadores: Pons Boigues، شماره ۱۸۹)؛ یہ عربی بولنے والے بعض مسیحیوں سے



طرح اسلامی پرتگال کی تاریخ میں خصوصی انفرادیت کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ تیسری / نویں صدی میں عبدالرحمن بن مروان، جسے اکثر ابن الجلیقی (= Galician جلیقیہ والے کا بیٹا) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور اس کے جانشینوں نے بطلیوس سے شدت لشکر کشی کر کے قرطبہ کو آزاد کرنے کی کوششیں کیں، جو جزوی طور پر کامیاب رہیں۔ اسی طرح کی کوششیں بنوبکر نے اسی صدی میں شنتہ میریہ کے مقام پر کیں۔ اس سے خاصی مدت بعد مغرب میں ابن قسی کے زیر قیادت ایک جارحانہ مذہبی تحریک کا آغاز ہوا۔ ابن قسی نے ۵۳۹ھ / ۱۱۴۳ء میں مارتلہ میں بغاوت برپا کی، جو المرابطون کے زوال کا باعث بنی۔ ابن قسی شلب کا حکمران بن گیا اور صرف وہ اور اس کا ہم عصر ابن وزیر ہی غالباً وہ مسلمان حکمران ہیں جنہوں نے سر زمین پرتگال میں اپنے سگے ضرب کرائے۔

پرتگال میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی کش مکش کے آخری دور کا ایک ممتاز واقعہ ۵۸۰ھ / ۱۱۸۳ء میں ابویعقوب یوسف الموحد کی سعی عظیم ہے، جو ناکام رہی۔ معلوم ہوتا ہے کہ الموحد کے بیڑے کو الاشبونہ (لِزبن) کے سامنے ناکامی ہوئی اور شنترین پر جو بڑا بڑی حملہ ہونا تھا اسے ترک کرنا پڑا۔ الموحد کے عقب لشکر (= ساقہ) پر پرتگالیوں کے ایک حملے میں ابو یعقوب کے زخم آیا، جس کے باعث وہ اشبیلیہ کو واپس جاتے ہوئے یابرہ Evora کے قریب وفات پا گیا۔

پرتگال میں یہ زک عام توقعات کے بالکل خلاف تھی، کیونکہ اس وقت الموحدین کی موت و ناموری کا ستارہ بلندی پر تھا۔ ۱۱۸۹ء میں، یعنی جس سال شلب پر پہلی بار پرتگالیوں کا قبضہ ہوا ہے، اس شہر (شلب) کے بارے میں ایک نامعلوم الاسم صلی سہرا ("نیورن کا نامعلوم الاسم") کا یہ بیان ملتا

آہستہ آہستہ، بالخصوص اغلباً خلافت کے خاتمے کے بعد، اشبیلیہ کے خاندان عبادیہ کے عہد میں، ایک بارونق اور خوش حال شہر بن گیا۔ ابن سعید (المغرب فی حلی المغرب، ذخائر العرب، ۱۹۵۳ تا ۱۹۵۵ء، ۱: ۱۰، ۳۸۰) کے بیان کے مطابق دوسرے قصبے یا بڑے بڑے گاؤں شنبوس یا شنبوس (؟ = شنبروس بجائے São Brás)، رمادہ، شنتہ میریہ (Santa Maria de Algarve، موجودہ Faro)، العلیہ (Loulé) اور قسطلہ (Cacela) تھے۔ الاڈریسی (نواح ۱۱۵۳ء) شلب کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ یہاں کے دیہاتی اور شہری دونوں خالص عربی بولتے تھے؛ (۲) اکتشونہ کے ساتھ ہی شمال میں موجودہ بیکسو النتجو (Baixo Alentejo) کی جگہ باجہ (بجہ Beja) کا کورہ تھا۔ اس کے صدر مقام کا نام بھی یہی تھا (رک بہ باجہ)۔ ابن سعید کی رو سے اس صوبے میں مارتلہ Mertola بھی شامل تھا، جسے ابن الخطیب نے شدونہ (Sidonia) کے کورے میں بیان کیا ہے؛ (۳) اس کے بھی شمال میں الاشبونہ یا لِزبن Lisbon کا کورہ تھا (المقری: نفع، ۱: ۹۶)، جس میں شنترین (Santarem)، شنترہ (Cintra) اور القبذاق یا القبذاق (قَب القبذاق = Alcaudete، قرطبہ اور غرناطہ کے درمیان) شامل تھے۔ پرتگال کے باقی کوروں کے نام نہیں دیے گئے۔ باجہ کے شمال میں یابرہ (Evora) کو ابن سعید نے بطلیوس کی شاہی مملکت میں شامل کیا ہے اور شاید دور خلافت میں یہ ماردہ یا میردہ Merida کے کورے کا ایک حصہ تھا (قَب المقری: نفع، ۱: ۱۰۳)۔ ہو سکتا ہے کہ قلمریہ (Coimbra)، جو ۵۲۶۳ / ۸۷۸ء سے قبل سلطنت اسلامی میں شامل تھا، کسی کورے کا صدر مقام ہو (قَب لیوی پرووانسال Esp. Mus : E. Lévi-Provençal، ۳: ۵۱)۔

الانڈلس کے دوسرے دور افتادہ حصوں کی

Kramers، ۱ : ۱۱۶ تا ۱۱۷) نے دی ہیں۔  
 مآخذ: (۱) کودیرا F. Codera : *Los Beni-meruán en Mérida y Badajoz = Noticias que referentes al Algarbe de Alandalús en todo el siglo III de la hégira y principios del IV, o sea desde el 200 al 317 (815a 929 de J.C.) encontramos en los Estudios criticos de Historia*، در *árabe española*، سلسلہ دوم (Colección de Estudios árabe española، میڈرڈ ۱۹۱۷ء، ۹ : ۱ تا ۷۳)؛ (۲) وہی مصنف : *Decadenica y Desaparición de los Almoravides en España* (Colección de Estudios árabe española)، ۳، سرقسطہ ۱۸۹۹ء : ۲۹ تا ۵۲؛ (۳) Os Árabes nas Obras de Alexandre : D. Lopes Herculano، *Notas marginaes de Lingua e historia portuguesa*، Academia des Ciências de Lisboa، Boletim de Segunda Classe، ج ۳، ۱۹۱۰ - ۱۹۱۱ء؛ (۴) وہی مصنف : *A Batalha de Ourique e comentário leve a uma polémica*، در *Biblos*، ج ۳، شماره ۱۱ و ۱۲، قلمریہ Coimbra ۱۹۲۷ء؛ (۵) José D. Garcia Domingues : *História Luso-Arabe, Episódios e figuras meridionais*، لیزبن ۱۹۵۰ء؛ (۶) *Los Almohades en Portugal* : Ambrosio Huici، در *Annais da Academia Portuguesa da Historia*، سلسلہ دوم، ۷ : ۱۹، بعد؛ (۷) R. Dozy : *L' expedition du Calife almohade Abou-Yacoub contre le Portugal*، در *Recherches*، بار سوم، ۲ : ۴۴ تا ۴۸؛ (۸) لیوی پرووانسال : *Hist. Esp. mus.* : E. Lévi-Provençal، ج ۱ تا ۳، بحد اشارہ۔

(D. M. DUNLOP)

برتنگ : رُكْ به بدخشان۔

برج : (جمع بروج، أبراج اور أبرجة)، مستطیل

یا مدور بلند عمارت، فصیل قلعہ سے ملی ہوئی یا الگ،

ہے کہ یہ عیسائیوں کے شہر لیزبن سے کہیں زیادہ مستحکم اور اس سے دس گنا دولت مند تھا۔ ۹۶۰ھ / ۱۲۱۲ء میں العقاب (Las Navas de Tolosa) کے مقام پر عیسائیوں کی فتح کے بعد، جس میں پرتگالی افواج نے حصہ لیا تھا، اس طویل جنگ کا نتیجہ سامنے نظر آنے لگا۔ ۱۲۴۹ء میں شلب پر عیسائیوں کا حتمی طور پر قبضہ ہو گیا اور الغرب (Algarve) سے مسلمانوں کی حکومت اٹھ گئی، جو موجودہ پرتگال میں ان کا آخری مقبوضہ تھا۔ ایک اور لڑائی کے دوران میں، جو ۱۳۴۰ھ / ۱۳۴۰ء میں رود سلادو (Roi Salado) کے کنارے طریفہ (Tarifa) کے قریب ہوئی تھی، فاس کے حکمران ابوالحسن علی المرینی کے افریقی لشکر اور یوسف اول سلطان غرناطہ کی امدادی فوج کے مقابلے میں پرتگیزی اپنے بادشاہ الفانسو چہارم والی پرتگال کے ماتحت اہل قشتالیہ (Castilians) سے جا ملے۔ ابن الخطیب نے بیان کیا ہے کہ کس طرح اندلسیوں نے اپنے پہلے حملے میں پرتگالیوں کی صفیں الٹ دی تھیں، لیکن ان کی جوان مردی کام نہ آئی اور میدان ان کے ہاتھ سے نکل گیا (اعمال الأعلام، ص ۳۸۹)۔ اس کے بعد الاندلس کے مغرب میں اسلامی حکومت کے دوبارہ قیام کی تمام امیدیں منقطع ہو گئیں۔

اسلامی پرتگال کے بڑے بڑے شہروں میں ادیبوں کی ایک خاصی بڑی تعداد پیدا ہوئی، جن کے نام عربی کی کتب سیر میں درج ہیں۔ معروف ترین مصنفوں میں یہ نام لیے جا سکتے ہیں : مؤرخ ابن بسام، ابوالولید الباجی [رُكْ به الباجی]، شاعر ابن عمار جو المعتمد بن عباد کا دوست تھا اور ابن قسی، جس کا تذکرہ پہلے آچکا ہے اور جو خلع النعلین فی التصوف اور دوسری کتابوں کا مصنف تھا۔

دسویں صدی کے پرتگال کی بعض منازل راہ الأسطحری (BGA، ۱ تا ۴۶) اور ابن حوقل (طبع



[اسلامی] فتوحات کے بعد ان اسلامی ممالک میں حفاظتی اور مدافعتی ضرورتوں سے تعمیر ہوئیں۔ ان کی حقیقی اہمیت برابر باقی رہی تاآنکہ بھاری توپ خانے اور میدانی توپخانے میں وسعت و ترقی ہوئی اور اس کی وجہ سے عسکری تصورات میں بتدریج تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ ان بلند اور بھاری بھرکم تعمیرات نے قرونِ وسطیٰ میں حفاظتی نظام کی حیثیت سے شہروں اور قلعوں کی فصیلوں کی حفاظت کرنے میں، یا بعض اوقات محض دفاعی تعمیر کی حیثیت سے (یعنی بطور دیدبانی برج، اشارتی برج کے) اہم کردار ادا کیا ہے، مگر اس کی وجہ سے یہ فراموش نہ کر دینا چاہیے کہ متعدد ایسے برج بھی انہیں علاقوں میں موجود تھے جو اپنے مقاصد کے لحاظ سے صحیح معنوں میں عسکری نہ تھے، یعنی شیشے دار برج، جنہیں بعض اوقات عام تعمیر سمجھ کر نظر انداز کر دینا جاتا ہے۔ مساجد کے میناروں سے قطع نظر، جن کا ارتقا اپنے طور سے ہوتا رہا، ان میں اسلامی برجوں کے وہ پہلے نمونے شامل ہیں جو مشرقِ وسطیٰ میں اموی رہائشی مکانوں کے کھنڈروں میں محفوظ ہیں اور جن کی بیرونی دیواروں کے ساتھ آگے کونکلی ہوئے پشتے موجود ہیں (رک بہ فن تعمیر)۔ یہ قلعہ نما یا مستحکم احاطوں (حیر) کے برج، جو اکثر و بیشتر زیادہ بڑے نہیں ہوتے، متناسب فاصلوں پر بنائے جاتے ہیں، تاکہ سپاٹ روکاروں میں توازن (rhythm) پیدا ہو جائے اور دروازے اونچے ہو جائیں۔ ان کی بنیادیں عموماً ٹھوس ہوتی ہیں، یا سطح زمین کے ساتھ ان میں ایسے استحکامات بنا دیے جاتے ہیں جن میں داخلہ آسان نہیں ہوتا (مدخلوں کو پردے کی دیواروں سے سدود کر دیا جاتا تھا بلکہ وہ بعض اوقات خود سکونتی مکانوں میں کھلتے تھے)۔ اور بعض دفعہ ان سے جانے ضرور کا کہ بھی لیا جاتا تھا۔ وہ عملاً

جو دفاعی دمدے یا بند قید خانے کا کام دیتی ہے۔ مخصوص معانی: فلک کے بارہ حصوں میں سے، جنہیں "منازل الشمس" سمجھا جاتا ہے، ہر حصے کا نام؛ مفصلات میں تھوڑی بہت جنگی استحکامات کی عمارت، جو باغوں کے درمیان بنالی گئی ہو (المغرب الشرقی)؛ وہ اونچی عمارت جو روشنی سے جہازوں کی رہ نمائی کے کام آتی ہے۔ ("برج المنار")، وہ بلند لائٹ جو پرندوں کے اترنے اور بیٹھنے کے لیے بنائی جائے، خاص کر نامہ بر کبوتروں کے لیے ("برج الحمام")، دیکھیے، J. Sauvaget: *La poste aux chevaux dans l'empire des Mamlouks* (پیرس ۱۹۳۱ء، عدد ۱۵۷)، پل کا تعمیر کیا ہوا پایہ، (موسیقی میں) ایک طرز، پھانک، بعض قدرتی قاش والے پھلوں (خربوزہ، سنترہ) کا چوتھائی حصہ، غلے کی بال میں دانوں کی قطار۔

تصغیر مؤنث کی شکل میں "البریجة"۔ مرآئش والوں نے مزگن کا نام رکھ دیا تھا، جب تک وہ ہر تکالیوں کے قبضے میں رہا۔

اس لفظ کا تعلق یقیناً یونانی κύριος اور لاطینی burgns سے معلوم ہوتا ہے (اسی سے جرمن لفظ burg ہے) اور پھر عبرانی اور ارامی میں بھی داخل ہو گیا (دیکھیے Fraenkel: *Arm. : Fremdwoörter im Arab*، ص ۲۳۵) مگر اس کا اس طرح مستعار لیا جانا ضرور بہت قدیم زمانے میں ہوا ہوگا، کیونکہ یہ سبائی (Sabacan) کتبوں تک میں موجود ہے (دیکھیے لینڈبرگ De Landberg: *Glossaire Dardinois*، ۱: ۱۳۸)۔

(G. S. COLIN)

• برج: (ع) عسکری فن تعمیر کی اصطلاح۔ مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی دور میں برجوں کی جو مختلف شکلیں۔ خصوصاً کبوں میں۔ نظر آتی ہیں وہ دراصل ان قلعہ بندیوں کا اہم جزو نہیں جو

بوزنطی اور رومی معسکروں کے دفاعی برجوں سے بہت مختلف ہوتے تھے، جو اس کے برعکس اس طرح بنائے جاتے تھے کہ سب منزلوں میں دالان یا حجرے ہوں اور قلعہ نشین سپاہی ان میں باسانی داخل ہو سکیں تاکہ آخری وقت وہ انہیں کے اندر مورچہ بندی کر سکیں، بلکہ ان برجوں کو ان متعدد دمدوں کی ایک تطبیق دادہ شکل سمجھنا چاہیے جو مشرق اوسط میں صدیوں سے معروف تھے، یعنی ایک ایسی تطبیق دادہ شکل جو ساسانی ایران کے قلعہ نما برجوں میں سے، جو اپنی وضع قطع میں [بوزنطی] سرحدی چوکیوں سے کمتر مکمل تھے، ہمیشہ سے استعمال ہوتی رہی تھی۔ یہ برج عسکری صلاحیت سے بالکل معرّانہ تھے، کیونکہ ان کے اوپر کے چبوتروں سے حملہ آوروں پر گولہ باری کی جا سکتی تھی، یا کم از کم کسی قلعے یا قصر کو آنے والے راستوں کی نگرانی کی جا سکتی تھی، نیز یہ ان اموی قلعوں سے بھی زیادہ مختلف نہ تھے جو اسی زمانے میں بوزنطی سرحد پر تعمیر ہوئے تھے؛ تاہم وہ شاہی عمارتوں کا، خواہ وہ مذہبی نوعیت کی ہوں یا دنیوی، ایک جزو لاینفک بن گئے۔ یہ برج ان کے منظر کے لیے باعث زیب و زینت تھے۔

تاہم اس طرز کے ان لوازم میں جو عظیم الشان اموی عمارتوں سے مخصوص تھے جلد ہی لچک پیدا ہو گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ دیواروں کو اس طرح مستحکم کرنے کا دستور جو ایسے موقعوں پر جب بڑی بڑی سطحوں کو جو باقاعدہ اینٹوں کے ردوں سے بنائی گئی ہوں خوش آئند اثر پیدا کرتے ہوئے یکسانیت سے بچانا مقصود ہو بالکل ختم نہیں ہوا، کیونکہ یہ ہمیں عباسی عہد کی ایک ایسی غیر عسکری عمارت، جیسی کہ سامرا میں المتوکل کی مسجد جامع، میں بھی دکھائی دیتا ہے، جس کی فصیل میں وقفوں کے بعد اینٹوں کے چوالیس

نیم مدور برج بنائے گئے ہیں؛ لیکن یہ دستور، جزوی طور پر مستحکم سکونتی عمارتوں میں بالخصوص باقی رہا۔ یہ روایت بعد ازاں رباطوں اور کارواں سراؤں میں جاری رہی اور اس کی دوسری صدی / آٹھویں صدی کے اختتام پر ایک بہت اچھی مثال عراق کے قصر اخیضر میں مل سکتی ہے۔ اس قصر میں متعدد نیم مدور برج ہیں (زاویوں کے برج ۱۰۰ میٹر، دربیانی برج ۳۰۱۵ میٹر قطر کے)۔ ان میں سے ہر ایک میں اوپر کی طرف ایک چھوٹا سا آتشباری کا کمرہ ہے، جس میں داخلہ ایک مسقف غلام گردش کے ذریعے ہوتا ہے۔ اس میں روزن موجود ہیں اور ایک ایسی صنعت رکھی گئی ہے جس سے غلام گردش کی پوری لمبائی میں نیچے کو آتش باری کی جا سکتی ہے، جو فصیل میں مسلسل روزن سازی (machicolation) کے تقریباً مرادف ہے (دیکھیے

*A Short Account of Early Muslim Architecture* : Creswell  
(در ماخذ).

اس طرح ہم دوبارہ ایسے بغلی برجوں سے دو چار ہوتے ہیں جنہیں قرون وسطیٰ کے عرب استحکامات میں اپنی جگہ باقی رکھا گیا ہے۔ یہ برج بوزنطی دفاعی استحکامات میں ایک کردار ادا کرتے رہے تھے اور ان سے پردے کی دیواروں کے ان حصوں کی مزید حفاظت کا تیقن ہو جاتا تھا جو ان کے پشتوں کے درمیان ہوں، خواہ ان کی شکل اور ضخامت کچھ بھی ہو (مربع، کثیر الاضلاع، مدور)۔ نئے [عرب] فاتحین نے اس اصول کو بغیر کسی طرح کی اصلاح کے نہ صرف باقی رکھا بلکہ زیادہ تر اس پر قناعت کی کہ جن شہروں کو مسخر کیا تھا (مثلاً شام میں حلب اور دمشق اور بعد کے زمانے میں ایشیائے کوچک میں قیصری اور بالائی عراق میں آمد) ان کی قابل ذکر چار دیواریوں کی حفاظت کی جائے یا وقتی طور پر ان کی



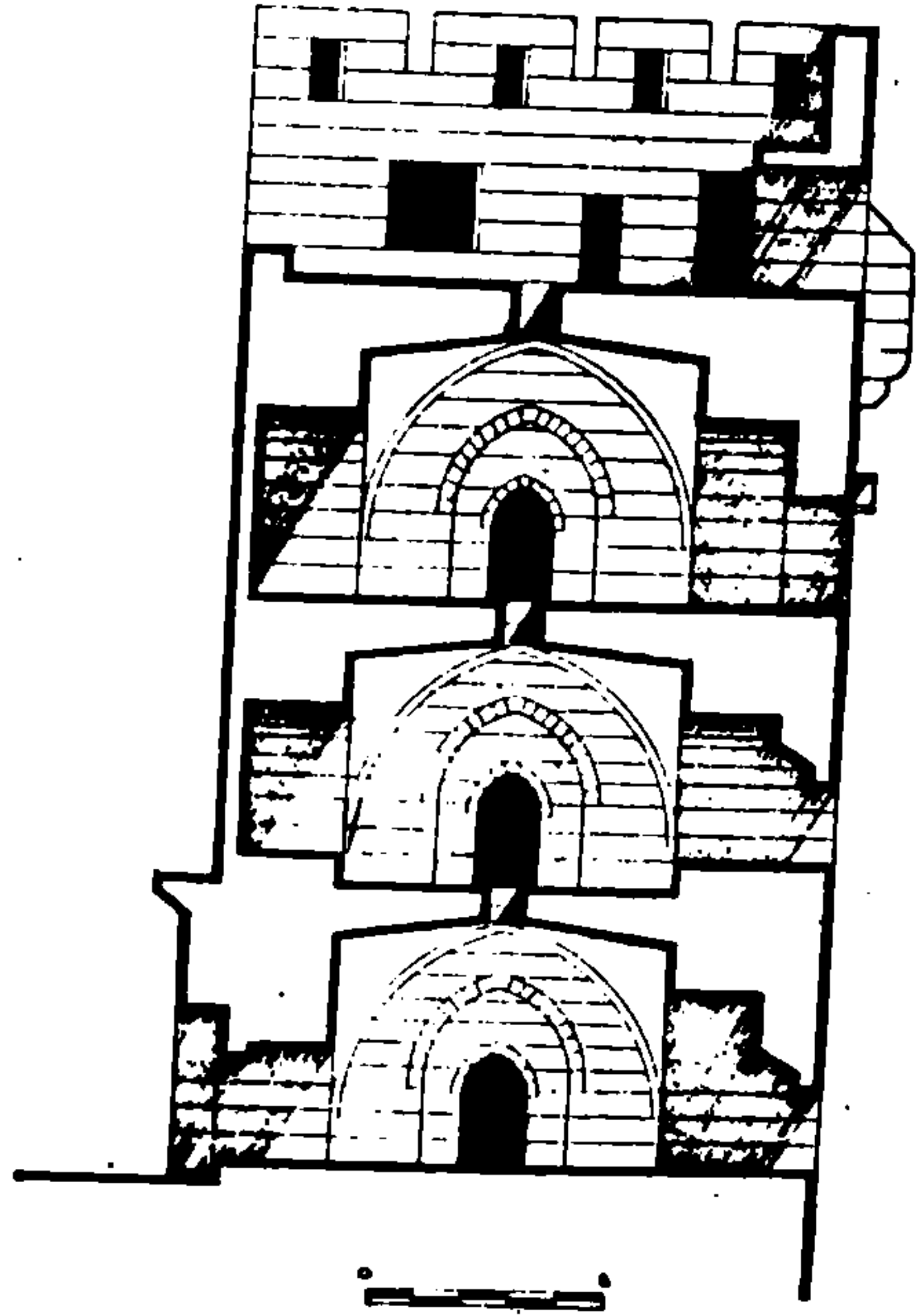
راستہ (chemin de ronde) بنا ہوا ہے، نیز وہ برج بھی جو بہت اچھی حالت میں محفوظ ہیں اور قاہرہ کے دروازوں، یعنی باب النصر، باب الفتوح اور باب الزویلہ، کے ساتھ ساتھ بنائے گئے ہیں، بالکل اسلامی طرز کے ہیں۔ انہیں بدرالجمالی نے ۱۰۸۷ء تا ۱۰۹۲ء میں بنوایا تھا اور وہ اس جدید احاطے (enceinte) سے ملحق ہیں جو اسی زمانے میں تعمیر ہوا تھا۔ ان عمارتوں میں، جو معمولی قد و قامت کی ہیں (بلندی تقریباً آٹھ میٹر)، بعض مستطیل اور بعض مدور ہیں، لیکن سب اپنی دو منزلوں تک ٹھوس ہیں۔ اوپر کی دو منزلوں میں دفاعی امکانات (سب سے اوپر ایک مسطح چبوترہ جو ایک مربع کمرے پر بنایا گیا ہے اور آتش باری کے لیے موزوں ہے اور جس کے اوپر ایک قبہ ہے اور تیرکش بھی ہیں) کے ساتھ نیچے کے حصوں کا ٹھوس پن (متوازی ردوں میں چنے ہوئے پتھر، ستونوں کی قطاریں، جو پانی مرنے (sapping) کی صورت میں دیواروں کو گرجانے سے روکنے کے لیے آ پار بنائے گئے ہیں) اور ان سب میں معتدل قسم کی آرائش ہے۔ یہاں ہمیں سیدھے سادے طریقے پر اور معماروں کی طرف سے بغیر کسی جدت کی تلاش کے ان اصولوں کا استعمال نظر آتا ہے جو مشرق وسطیٰ کے فوجی فن تعمیر میں اس انقلاب تک برابر استعمال ہوتے رہے جو ایوبی عہد کی اصلاحات کی بدولت رونما ہوا۔

اس زمانے میں فلسطین کی افرنجی سلطنتوں سے مستقل صورت جنگ اور ایوبی سلطنتوں کے اچانک ظہور کی بدولت مسلم مہنکاروں کو جو تجربہ حاصل ہوا وہ بعض ایسی شاندار اور مستحکم عمارتوں کی تعمیر کا باعث بن گیا جن میں جدید گولہ اندازی کا (ballistic) اصول کار فرما تھا کیونکہ فلسطین میں باہر مغربی مہندسوں نے خود اپنی روایات رائج

تجدید و مرمت کر دی جائے۔ لیکن بہت سی عمارتیں ایسی بھی ہیں جن کے بارے میں، باوجود باقراط کتباتی شہادت کے، ابھی تک یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ اصلی باقی ماندہ عمارت اور مسلم عہد کی متاخر تجدیدات میں کوئی حقیقی فرق ہے۔ ان سے اس عہد کے حد درجہ الجھے ہوئے تاریخی حوادث کی عکاسی ہوتی ہے؛ تاہم ایک خطے اور دوسرے خطے میں واضح اختلاف عیان ہیں اور ان صوبوں میں جو سب سے زیادہ دیر تک بوزنطی قبضے میں رہے قدیم تر عسکری فن تعمیر کی روایت زیادہ نمایاں طور پر باقی رہی اور سلجوقی یا آرتقی تخلیقات کو اس میدان میں کوئی جدت دکھانے کا موقع شاذ و نادر ہی ملا۔ ان کے برج، جنہیں ساخت اور آرائش کی محض چند جزئیات کی مدد سے پہچانا جا سکتا ہے، باقی نمونوں کے مماثل ہیں اور ان میں اسی قسم کے بالائی مسقف دریچے (Casemates) موجود ہیں؛ البتہ سطح زمین کے نشیب و فراز کے لحاظ سے اور ان ضرورتوں کے پیش نظر جو اس سے پیدا ہوتی ہیں ان میں مناسب رد و بدل کر دیا گیا ہے۔

اس سے زیادہ دلچسپ قاطعی عہد کے وہ آثار ہیں جو شام اور مصر کی عمارتوں میں باقی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان میں بہت سا ایسا مسالا جمع ہے جسے دوبارہ استعمال کر کے بعد کے ان زیادہ پیچیدہ نظاموں کا جزو بنا دیا گیا ہے جن کی وجہ سے ان کا مظاہرہ دشوار ہو جاتا ہے۔ تاہم بصری کے روی تھیٹر میں، جسے ایک لمحے میں تبدیل کر دیا گیا ہے، ہمیں ایک ابتدائی دور تعمیر کی جھلک دکھائی دیتی ہے (کتبات مورخہ ۱۰۸۹ء / ۱۰۸۹ء و ۱۱۳۶ء - ۱۱۳۷ء)۔ اس میں بلند چبوتروں پر بنے ہوئے برج فصیل کو سہارا دیتے ہیں، جس میں تیرکشوں کی دو قطاریں اور ایک گشتی

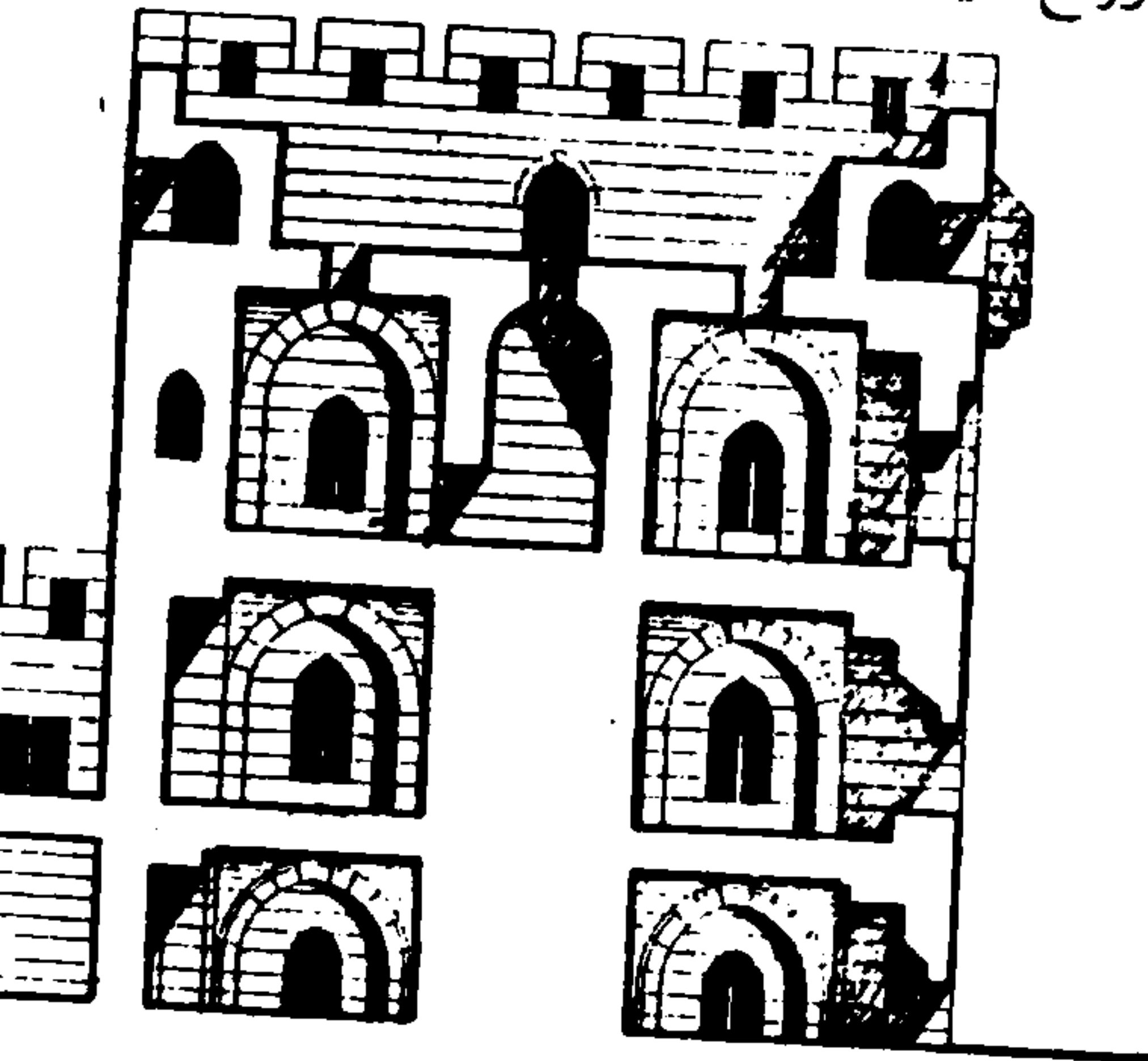
کر دی تھیں۔ ان متعدد عمارتوں میں جو ساتویں صدی / تیرھویں صدی کے آغاز میں الملک العادل (بالخصوص قاہرہ، بصری، دمشق اور کوہِ طاہور کے قلعے) اور الملک الظاہر (قلعہ حلب اور شمالی شام کے دیگر قلعے) نے بنوانا شروع کیں برج بہت بڑی ضخامت کے بنائے گئے۔ ان کا مصرف یہ تھا کہ قلعوں کے دفاعی حصوں کو مضبوط کریں۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ اس کے ساتھ ہی وسیع ہوادار حجروں کے لیے جگہ میسر آجائے جن میں سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد مستقل طور پر رہ سکے اور سپاہیوں کو اس کا اطمینان ہو کہ وہ احاطے کی غلام گردشوں اور اندرونی مخزن (ذخیرہ گولہ بارود) تک سرنگوں یا مسقف زینوں کے ذریعے آسانی پہنچ سکیں گے، نیز یہ بھی کہ اپنی دیواروں کی موٹائی اور اپنی تعمیری وضع قطع کی بنا پر (اس زمانے تک عمدہ تراشیدہ پتھر (ashlar) سے عمارت بنانا معمول بن



خاکہ ۱۔ دمشق کے قلعے میں ایوبی عہد کا

بغلی برج (از J. Sauvaget)

چکا تھا) اس کمزوری کی تلافی کر دیں جو مستحکم حجروں اور گلیاروں (gangways) کی کثیر تعداد کی وجہ سے پیدا ہو سکتی تھی۔ یہ بات مثال کے طور پر قلعہ دمشق کے دو برجوں (سنہ تعمیر ۱۲۰۹/۵۶۰ - ۱۲۱۰ء) سے ظاہر ہوتی ہے جنہیں یہاں سیکشن میں دکھایا گیا ہے۔ ان میں سے پہلا (خاکہ ۱)، غیر متناسب اور بڑے حجم کا پشتہ (مستطیل شکل کا، ۲۷ میٹر در ۱۳ میٹر، دیواریں ۳.۴ میٹر موٹی، پردے کی دیوار سے آگے کو نکلا ہوا، جس کی بلندی ۲۵ میٹر تک پہنچتی ہے) جس میں تین مسقف دالان ہیں جن تک آسانی سے پہنچ سکتے ہیں اور جن کی حفاظت پانچ تیرکشوں سے کی گئی ہے، جو گہرے مسقف طاقوں میں سوراخ کر کے بنائے گئے ہیں؛ برج کا چہروکا سطح صحن سے اٹھارہ میٹر بلند ہے اور اس کے گرد ایک گشتی راستہ ہے، اس کے زیرین دالانوں میں یہ راستہ چار سوراخدار چوبی دیواروں (machicolated brattices) تک جاتا ہے اور اس کے اوپر ایک کٹاؤ دار منڈیر ہے، جس کے کنگروں میں تیر اندازی کے پندرہ سوراخ ہیں۔ تعمیر کی تکمیل دیواروں پر غیر مجلا

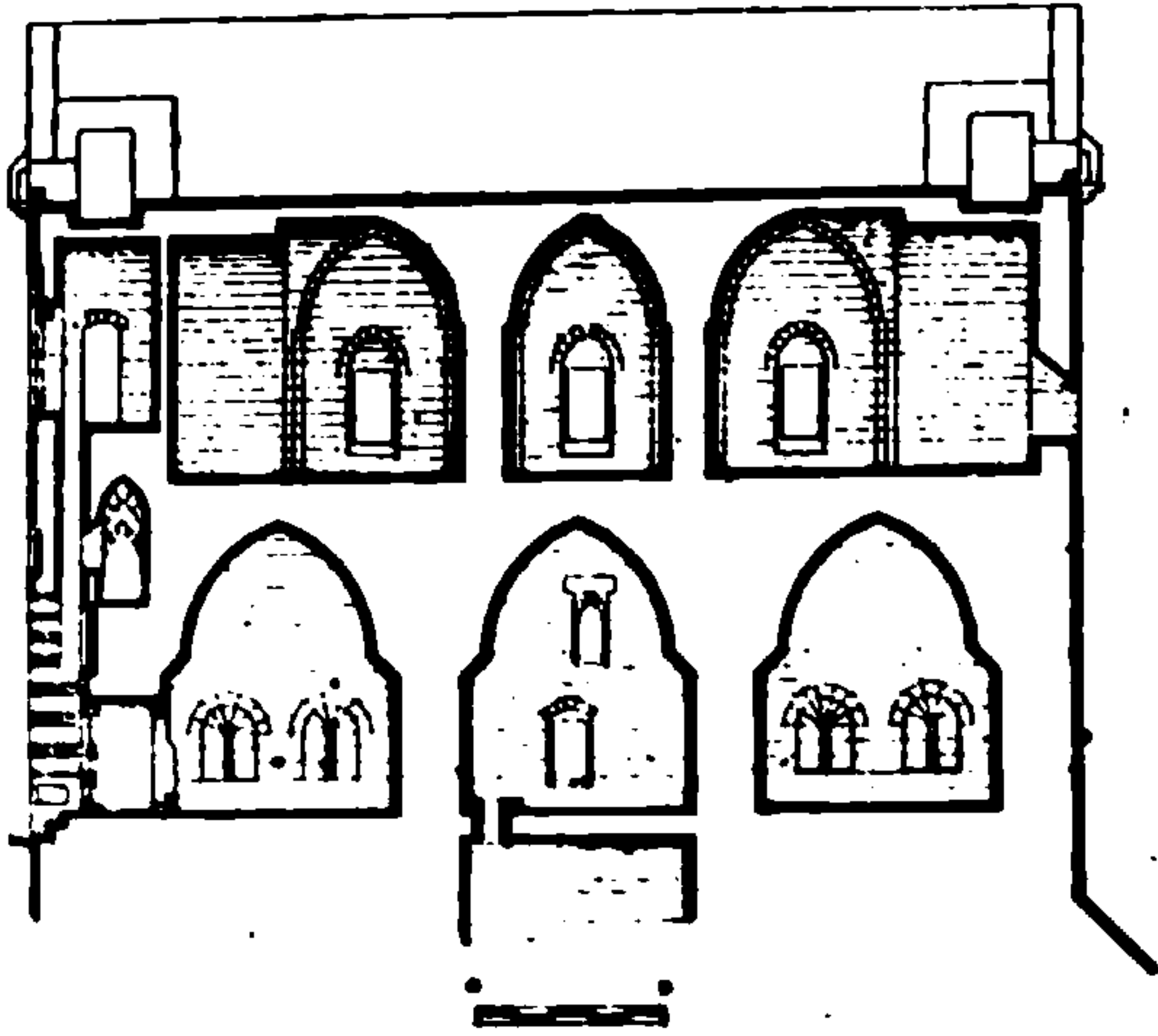


خاکہ ۲۔ دمشق کے قلعے میں ایوبی عہد

مرکزی دمدہ (donjon) (از J. Sauvaget)



برج السباع (شیروں کا برج) کا۔ یہ ایک بڑا طویل و غریب ساحلی قلعہ ہے (۲۸۵۰ در ۲۰۵۰ میٹر) جو دیکھنے میں بہت شاندار ہے، اس لیے کہ اس کا طول و عرض بہت مناسب ہے اور اس میں زیبائش بہت سوچ سمجھ کر کی گئی ہے، جو اس کی اندرونی پیچیدہ عمارت کے بالکل مطابق ہے۔ اس قسم کی عمارت میں دفاعی تقاضوں کی وجہ سے جو اختلافات پیدا ہوتے ہیں ان کا اوپر کے دو بڑے دالانوں میں پورا خیال رکھا گیا ہے (آتشباری کے متعدد مچان، ایسے انتظامات جن سے زیریں اور بالائی منزلوں کے دروازوں کی حفاظت کا اطمینان ہو جائے) اور سکونتی کمروں (حوض، مسجد اور ان لہڑ کیوں کا شمول، جن سے بالائی حصوں میں روشنی



خالہ ۳۔ طرابلس کے ایک مملوک برج کا سیکشن طول میں (از J. Sauvaget).

آتی ہے) (خالہ ۳)۔ اس اسلوب کو نوویں / پندرہویں صدی کے آخر کا قرار دیا جا سکتا ہے، اور اسی زمانے میں سلطان قایتبای نے حلب کے قلعے میں ایک پر شکوہ قلعہ بندی الملک الکمل کے برجوں کی جگہ لروائی۔ اسی زمانے میں توپوں کے لیے ان موٹوں (embrasures) اور بھاری توپوں کے لیے ان مسطح چوتروں (terrepleins) کا بھی ظہور ہوا جس سے

لکڑی لگا کر کی گئی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام نقشے میں بالائی حصوں کو کس قدر اہمیت دی جاتی تھی۔ دوسرا برج (خالہ ۲) جو درست طور پر ایک بڑا برج (donjon) کہلانے کا مستحق ہے، یہ مقدم الذکر برج سے محض اپنی تقریباً مربع شکل (۲۱ میٹر در ۲۳ میٹر) اور ایک بڑے مرکزی ستون کی موجودگی کی وجہ سے ممتاز ہے، جو اتنا ضخیم ہے کہ اس کے سبب سے اوپر کے کھنڈر میں ایک چھوٹا سا کمرہ بنایا جا سکا ہے۔ ان بڑے بڑے مستطیل دمدموں (bastions) کے ساتھ، جن میں کبھی کبھی، جیسے کہ بصری کے بڑے برج (donjon) میں بارکامیں (reception chambers) بھی نظر آتی ہیں، ان کمتر مستحکم پشتہ دار برجوں کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے جن پر سے قلعے کا گشتی راستہ بغیر کسی رکاوٹ کے دیکھا جا سکتا تھا، نیز ان ڈاک (برید) کے برجوں کا جن کا مقصد بنیادی طور پر دیکھ بھال کرنا تھا۔

اس کے بعد مملوک عہد میں، جہاں شروع زمانے میں حملے یا دفاع کے ذرائع میں لچھو جڈتیں نمایاں نہیں ہیں، محض اس پر قناعت کی گئی کہ شام کے فوجی فن تعمیر کے اس شاندار زمانہ عروج کو جاری رکھا جائے۔ برجوں میں بتدریج تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے لگے اور ان میں ابوی عہد کے زبردست ردوں اور بھدے ابھرے ہوئے نقش و نگار کی جگہ چھوٹے اور چکنے پتھر استعمال کیے جانے لگے اور محض کاریگری کے بل پر مختلف طرح کے کئی اسلوبوں کی نمائش شروع ہو گئی۔ پوری عمارت کو نفیس اور نازک مہبت کاری سے آراستہ کیا جانے لگا اور اسی طرح غیر ضروری رنگا رنگ کی گلکاریوں سے۔ لیکن ایک اہم اور قابل توجہ عمارت کا ذکر ضروری ہے، یعنی طرابلس کے

جنوئی (Genoan) احاطے کے بغلی برجوں کی نقل کا اظہار ہوتا ہے۔

مآخذ: (۱) K. A. C. Cresswell (۱) *Fortification* :

*Proceeding of the* در *in Islam before A. D. 1250*

*British Academy*، ۱۹۵۲ء، ص ۸۹ تا ۱۲۵: (۲)

وہی مصنف: *Early Muslim Architecture*، دو جلد،

اؤکسفورڈ ۱۹۳۲ء تا ۱۹۳۴ء، خلاصہ مع ترمیمات، در

*A short account of Early Muslim Architecture*

(Penguin Books) ۱۹۵۸ء: (۳) وہی مصنف: *Muslim*

*Architecture of Egypt*، ج ۱، اؤکسفورڈ ۱۹۵۲ء، ج ۲

[۱۱۷۱ تا ۱۳۲۶]، اؤکسفورڈ ۱۹۵۹ء: (۴) وہی مصنف:

*Archaeological Researches at the citadel of Cairo*

در *BIF*، ۲۳ (۱۹۲۴ء): ۸۹ تا ۱۶۷: (۵) H. Stern:

*Notes sur l'architecture des châteaux omeyyades*

در *Ars Islamica*، ۱۱ تا ۱۲ (۱۹۳۰ء): ۷۲ تا ۹۷:

(۶) E. Fatio و M. van Berchem *Voyage en Syrie*:

دو جلد، قاہرہ ۱۹۱۳-۱۹۱۵ء، بحد اشاریہ، بذیل مادہ

*La citadelle eyyubite de Bosra*: A. Abel (۷) Tour

*Eski Cham*، در *Ann. Arch. de Syrie*، ۶ (۱۹۵۶ء):

۹۵ تا ۱۳۸: (۸) J. Sauvaget *La citadelle de*:

*Damas*، در *Syria* (۱۹۳۰ء)، ص ۵۹ تا ۹۰ و ۲۱۶ تا

۲۴۱: (۹) وہی مصنف: *Notes sur des défenses de la*

*Marine de Tripoli*، در *Bull. du Musée de Beyrouth*

۲ (۱۹۳۸ء): ۱ تا ۲۵: (۱۰) A. Gabriel *Châteaux*:

*turcs du Bosphore*، پیرس ۱۹۳۳ء: [(۱۱) البستانی،

بذیل مادہ].

(J. SOURDEL-THOMINE)

۲ - فوجی فن تعمیر شمال مغربی

افریقہ کے مسلم ممالک میں

(۱) پس منظر: ممالک شمال مغربی افریقہ

کے مسلمانوں نے بربری اور انالیم میں قلعہ بندی

کی ایک ایسی روایت پائی جو سابق رومی

اس بے سود کوشش کی نشاندہی ہوتی ہے کہ برج کو جنگ و جدال کے ان حالات کے مطابق بنایا جائے جو آئندہ چل کر اس کے بعجلت غائب ہو جانے کا سبب بننے کو تھے۔

بہر حال اسی اثنا میں عثمانیوں کے ہاں عسکری

فن تعمیر کا ایک ایسا تصور پیدا ہوا جس کا

اسلوب اگرچہ کسی حد تک مختلف عناصر کا مرکب

تھا تاہم بعض تعمیراتی جزئیات کے اعتبار سے

اس پر مغربی اثرات نمایاں تھے۔ اسی اسلوب تعمیر

کی مدد سے ترکوں نے باسفورس کی گزرگاہ پر اپنا

تسلط اور قسطنطنیہ پر اپنا قبضہ برقرار رکھنے

کے لیے اس طرز کے آخری قلعے تعمیر کیے

جن میں توپوں کے استعمال کو مدنظر رکھتے

ہوئے قرون وسطیٰ کے اصولِ دفاع سے کام لیا۔

اناطولی حصاری [رک باں] (جو ۵۷۹۳ / ۱۳۹۰ -

۱۳۹۱ء میں بننا شروع ہوا) اور روم ایلی حصاری

[رک باں] (سنہ تعمیر ۵۸۵۶ / ۱۴۵۲ء) (ان کے ساتھ

یدی قلعہ کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے جسے سلطان

محمد فاتح نے اس کے ذرا بعد اپنے دارالسلطنت

استانبول کے حدود (enceinte) میں تعمیر کرایا تھا) کے

قلعوں کے برجوں کی خاص صفت یہ ہے کہ ان سب کا

نظامِ دفاع مکمل ہے۔ یہ غرض روم ایلی حصاری

میں ایک عظیم الشان پیمانے پر پوری کی گئی

ہے (تینوں بڑے برجوں (donjons) کا قطر

۲۳۰۸۰ میٹر سے لے کر ۲۶۰۷۰ میٹر تک، دیواروں

کی موٹائی ۵ سے لے کر ۷ میٹر تک کے درمیان)،

نیز بعض اور خصائص کا اضافہ کیا گیا، جیسے کھوکھلے

اسطوانہ نما اندرونی حصے، جو کڑیوں (joists) کے

ذریعے متعدد منزلوں میں تقسیم کر دیے گئے ہیں،

مدور گشتی راستہ جو اوپر کی سطح پر ایک استوانے

(drum) کو گھیرے ہوئے ہے، جس کی چہت نوکدار

شکل (conical) کی ہے، جن سے پیرا (Pera) میں واقع



سلطنت کے زمانے تک اور تونس میں جسٹینین Justinian کے ہاتھوں بوزنطیوں کے دوبارہ قبضے تک جاتی تھی۔ سابق رومی سلطنت کے قلعے بڑی تعداد میں تھے اگرچہ ان کے خطوط سیدھے سادے تھے اور جیسے رومی خمیہ گاہوں کا کوئی نقشہ نہیں ہوتا تھا ان کا بھی کوئی باقاعدہ نقشہ نہ تھا، ان بہت چھوٹی چھوٹی گڑھیوں (castella) کے سوا جو میدانوں میں واقع تھیں۔ انہیں زیادہ تر اس رقبے کی ہیئت کے مطابق بنایا جاتا تھا جس کی انہیں حفاظت کرنا مقصود ہوتی تھی اور اسی طرح زمین کے نشیب و فراز کو بھی مد نظر رکھنا پڑتا تھا۔ عمارتیں اگر دوبارہ استعمال شدہ مسالے کی بنی ہوئیں تو ان میں ایک ٹھوس اندرونی حصہ ہوتا تھا، جس کے دونوں طرف شکستہ پتھروں (rubble) کی روکاریں ہوتی تھیں، جنہیں بعض اوقات اینٹوں کی چنائی سے ہموار کر دیا جاتا تھا۔ پردے کی دیواریں بعض دفعہ دس میٹر تک بلند ہوتی تھیں اور ان کے اوپر کنگرہ دار منڈیریں بنائی جاتی تھیں۔ ان کی موٹائی بھی خاصی ہوتی تھی، یعنی اوسطاً تین میٹر۔ برج جو ایک دوسرے سے ایک تیر پرتاب (تخمیناً بیس میٹر) کے فاصلے پر ہوتے تھے پردے کی دیواروں کے لیے پشتوں کا کام دیتے تھے۔ یہ عموماً نیم مدور شکل کے ہوتے تھے (قطر پانچ یا چھ میٹر) اور کمتر مربع یا مستطیل شکل کے۔ یہ زیادہ تر فصیلوں کی بیرونی جانب بنائے جاتے تھے۔ کونوں کے برج اکثر بڑے بڑے دمدے ہوتے تھے جن کی بنیاد ٹھوس ہوتی تھی، اور ان میں کم از کم ایک دفاعی دالان ہوتا تھا۔ یہ پردے کی دیواروں سے ایک منزل بلند تر ہوتے تھے۔

دروازوں میں سے احاطے کے اندر داخلہ ایک سیدھے راستے سے ہوتا تھا، جس کا ایک حصہ دو

جسٹینین Justinian کی فتح کے بعد ہسپانیہ کے بحر متوسط کے صوبوں میں کسی طرح کی قلعہ بندیوں کا ہمیں کوئی علم نہیں، لیکن افریقہ کی بوزنطی قلعہ بندیوں کے بارے میں ہمیں بہت کچھ معلوم ہے۔ میدانی قلعوں یا گڑھیوں کے نقشے بہت باقاعدہ شکل کے ہیں۔ وہ صرف مربع برج ہیں، جو پردے کی دیوار کے باہر اور نمایاں طور پر آگے کو نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔ بنیاد کے قریب یہ ہمیشہ ٹھوس ہوتے ہیں، عمارت پتھر کی ہوتی ہے اور اینٹوں کا کوئی مزید کام نہیں ہوتا۔ جب قدیم تر مسالے سے دوبارہ کام نہیں لیا جاتا تو زیادہ تر چنائی میں شکستہ پتھر استعمال ہوتا ہے، جسے نرم ریتیلے پتھر (freestone) کے پیچ در پیچ ردوں سے مضبوط کیا جاتا ہے۔ پردہ تیسری/نویں اور چوتھی/دسویں صدی کے پردوں کے مقابلے میں کم موٹا ہوتا ہے، ایک گشتی راستہ اور کنگرہ دار منڈیر ہوتی ہے اور اس راستے کے ذریعے برج کے دفاعی دالانوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ دروازہ محض ایک سادے راستے اور سیدھے برآمدے پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان سب میں ہمیں محض سابق رومی سلطنت کے طریقوں کی بقا اور اکثر ان کی اصلاح بھی نظر آتی ہے۔

۲۔ افریقہ کی قلعہ بندی تیسری/نویں

سے چھٹی / بارہویں صدی تک اور اس کے سلسلے  
 اغلبی قلعے: اغلبی قلعہ بندی کے نمونے  
 بعض وسیع، پیچیدہ اور مختلف الاجزاء عمارتوں میں ملتے  
 ہیں، یعنی سوسہ اور سفا لس Sfax کی حدود میں، جو  
 تیسری صدی / نویں صدی میں تعمیر ہوئے تھے، یعنی  
 غیر مصفا یا معمولی طریقے سے مصفا شکستہ پتھروں  
 کی فصیلیں، جن کے گوشوں میں پیچ در پیچ ردے  
 ہیں اور جن کے کھانچے (toothing) ریتیلے  
 پتھر (freestone) سے بنائے گئے ہیں۔ پردے کے  
 پہلوؤں میں لمبوترے برج ہیں، جو استثنائی  
 طور پر گاؤدم شکل میں ڈھلواں بنائے گئے ہیں اور  
 پردے کی دیوار سے ایک منزل اونچے ہیں۔ سوسہ  
 میں گشتی راستے کو بعض جگہ چند گہری محرابوں  
 پر سے گزارا گیا ہے۔ بعض چھوٹے رباط بوزنطی  
 قلعوں سے بہت ملتے جلتے ہیں۔

ان مقامی روایتوں کے ساتھ بعض مغربی اثرات  
 کی آمیزش بھی ہو گئی تھی، خصوصاً سوسہ کے رباط  
 اور مناسٹر کے قدیم رباط میں۔ ان کے مستطیل احاطوں  
 کے گوشوں اور ہر پہلو کے وسط میں بغلی دمدسے بنے  
 ہوئے ہیں، جو تقریباً سب کے سب نیم مدور ہیں۔ ان کے  
 اندر چار دیواری کے ساتھ ساتھ چند عمارتیں ہیں اور  
 بڑا صحن [آمدورفت کے لیے] کھلا ہے، یہاں شام کے  
 اموی قلعوں کا اثر نظر آتا ہے۔ بعض برجوں کی  
 احرام نما وضع ہے، جو اسی زمانے کے میناروں کی زیریں  
 منازل کی نقل ہے، مصری اثر ظاہر ہوتا ہے۔

ممکن ہے کہ بعض بعجلت تعمیر شدہ  
 قلعہ بندیوں میں گارا (pisé) استعمال کیا گیا ہو۔  
 القیروان کی فصیلوں اور العباسیہ اور الرقادہ کے  
 سرکاری شہروں میں اغلب ہے کہ پتھر کی جگہ  
 کچی اور پکی اینٹیں استعمال کی گئی ہوں۔  
 صحرائی ملکوں کی قدیم روایتوں نے عراق اور

ایران سے آنے والے دیگر مشرقی اثرات کا راستہ  
 صاف کر دیا۔ یہ تمام اغلبی قلعہ بندی مقامی  
 روایت کا، جو ابھی تک غالب تھی، اور مشرق سے  
 درآمدہ روایتوں کا ایک خوشنما اور جاندار امتزاج ہے۔  
 فاطمی اور صنہاجی خاندانوں کے عہد کی  
 قلعہ بندی: آشیر کی فصیلیں اور بنو حماد کا قلعہ  
 شکستہ پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ ان دونوں میں سابقہ  
 عہد کی قلعہ بندی کا اسلوب باقی ہے (پہاڑی علاقے  
 میں بغلی برج کم نظر آتے ہیں)۔ آشیر میں [بنو] زیری  
 کا محل ایک مستطیل احاطے کے اندر ہے، اس کے  
 پہلوؤں میں باقاعدہ وقفوں کے بعد لمبوترے برج  
 ہیں اور ایک اندرونی صحن ہے، لیکن جو عمارتیں  
 خود فاطمی خلفا کی تعمیر کردہ ہیں ان میں بعض  
 جدتیں پیدا کر دی گئی ہیں۔ المہدیہ کی بیرونی  
 دیوار شکستہ پتھروں کی بنی ہوئی ہے اور اس کے  
 پہلوؤں میں مضبوط برج ہیں، جن میں سے کم از  
 کم ایک بلند طاقوں سے مزین ہے، جن سے بعد ازاں  
 قلعہ بنو حماد کے مینار کی آرائش میں بھی کام لیا  
 گیا، کیونکہ استرکاری کا نیا فن، جسے شہری عمارتوں  
 میں بڑی کامیابی سے استعمال کیا گیا تھا، اکثر  
 قلعوں میں بھی منتقل کر دیا جاتا تھا۔ اس  
 اکیلے شہری دروازے کے اوپر جو محفوظ رہ گیا  
 ہے ایک مضبوط اور بلند عمارت ہے، اس کے بیرونی  
 رخ کے ادھر ادھر دو ڈھلواں برج ہیں اور دروازے  
 کے محرابی راستے سے ایک لمبے مستطیل برآمدے کو  
 راستہ جاتا ہے، جسے شہتیروں (tie-beams) سے  
 مستحکم و محفوظ کیا گیا ہے اور جسے گزشتہ  
 زمانے میں لوہے کے خاردار اور تہہ ہو جانے والے  
 دروازوں سے بند کر دیا جاتا تھا۔ وہ دروازے جو  
 رومی یا بوزنطی روایت کے مطابق بنائے گئے تھے  
 کبھی اتنے مضبوط نہ تھے جتنا کہ یہ دروازہ۔  
 ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاطمی تعمیرات میں



ایک نئے فوجی فن عمارت کے جراثیم موجود تھے، لیکن اپنے نئے شہروں کے سوا، جو قدیم تہذیبی مرکزوں سے کچھ فاصلے پر واقع تھے، بنو صنہاجہ نے شاذ و نادر ہی کوئی بڑی اور مستحکم عمارت تعمیر کی۔

اس طرح فاطمی اور صنہاجی خاندانوں کے عہد میں مشرقی اثرات، جو بظاہر خلفا کے خود اپنے علاقوں میں زیادہ نمایاں تھے، مقامی روایتوں اور بنواغلب سے مستعار لیے ہوئے اصولوں کی جگہ لینے میں ناکام رہے۔

۳۔ اندلس کی قلعہ بندی اور افریقہ میں

اس کی توسیع

(۱) تیسری/نویس صدی : اندلس میں

اسلامی قلعہ بندی کی ابتدا تیسری صدی ہجری/نویس صدی عیسوی کے وسط سے پہلے نہیں مانی گئی، یعنی عبدالرحمن ثانی کی خانقاہ (Conventual) سے پہلے، جو بارڈہ Merida میں تعمیر ہوئی۔ یہ قصر، جو وادیانہ (Guadiana) کے پل کی حفاظت کرتا ہے، تقریباً مستطیل شکل کا ہے۔ پردے کی دیواروں کے پہلوؤں میں لمبوترے برج ہیں، جو ان سے زیادہ آگے کو نکلے ہوئے نہیں ہیں اور بہت قریب قریب بنے ہیں۔ معمار کے ذہن میں بلاشبہ وہ مقابل قلعہ (Counterfort) برج تھے جو جامع قرطبہ کی دیواروں کے ساتھ ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنے ہوئے ہیں۔ دروازے میں ایک نعل آسا (horse shoe) محراب نظر آتی ہے (جس کی اندرونی یا نیچے کی (intradosial) قوس نیم دائرے سے زیادہ ہے)۔ اس قسم کی محراب اموی فن تعمیر میں بھی اتنی ہی ہر دل عزیز تھی جتنی وزی قوطی (Visigothic) فن میں۔ دروازے کی محراب کے نیچے کے حصے (spring-ing) کو چوکور بغلی ستون (pilasters) سہارا دیے ہوئے ہیں اور دروازے کے کواڑوں کی چولوں

کی بھی حفاظت کرتے ہیں۔ عمارت ریتیلے پتھر (free stone) سے بنائی گئی ہے، جسے وزی قوطی فن تعمیر میں ترجیحاً استعمال دیا جاتا تھا اور جسے اموی فن کے ابتدائی دور میں بھی اسی پابندی سے استعمال کیا جاتا رہا، لیکن قصہ یہ ہے کہ نئی عمارتوں میں پرانی عمارتوں کے استعمال شدہ پتھر لٹا لیے جاتے تھے اور اس کی وجہ سے لہڑی اور پٹ چنائی کا انداز بدل جاتا تھا اور ترتیب بھی اس قاعدے کے مطابق نہ ہوتی تھی جس سے قرطبی معمار مانوس تھے۔

(۲) چوتھی/دسویس صدی : خلافت قرطبہ

کے تحت فوجی فن تعمیر، بلکہ ہر نوع کا یادگاری فن تعمیر، بڑی تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ جو نقشے اختیار کیے جاتے وہ بہت سی مختلف شکلوں کے ہوتے تھے۔ پہاڑی علاقے میں صحنوں کو سطح زمین کی بے قاعدگی کے مطابق بنایا جاتا تھا، بحالیکہ میدانوں میں ان کے اندر ہندسی باقاعدگی کا جو نسبتاً چھوٹی عمارتوں میں بالکل مکمل ہو جاتی ہے رجحان پایا جاتا تھا، برج لمبوترے یا بہت شاذ طور پر کثیر الاضلاع، مارڈہ کے برجوں کی نسبت زیادہ نمایاں طور پر آگے کو نکلے ہوئے ہیں اور ان کا درمیانی فاصلہ بھی زیادہ ہے۔ صحن کبھی دہرا نہیں ہوتا اور اس میں کوئی مستحکم مرکزی عمارت (keep) نہیں ہوتی بلکہ اندرونی حصے میں کوئی بھی عمارت نہیں بنائی جاتی۔

دروازہ ایک تنگ راستے (passage) میں کھلتا ہے۔ زیادہ بڑی عمارتوں میں یہ دو برجوں کے درمیان کھلتا ہے اور نسبتاً چھوٹے قلعوں میں اسے دو دمدموں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ پردے کی دیوار مختلف بلندی کی ہوتی ہے یعنی سات سے دس میٹر تک۔ اس کے ساتھ ایک گشتی راستہ ہوتا ہے اور اس کی بیرونی منڈیر کے اوپر، جیسے کہ خود برجوں کے اوپر، اہرام یا [مخروطی] کنگرنے

(merions) بنے ہوتے ہیں۔ کنگروں کی یہ شکل، جو ان سے مختلف ہے جو مشرقِ اوسط اور افریقہ میں بنائے جاتے تھے، بظاہر بوزنطی سلطنت کے کے سوراخدار گشتی راستوں کے نمونے کی ہے، جن کے اوپر کے حصے مخروطی شکل کے ہوتے تھے۔

پتھر کے کھڑے اور پٹ رڈے، جو باقاعدگی سے چنے جاتے ہیں اور اس خاندان کے بڑے بڑے یادگاری آثار میں اپنی بہترین شکل میں موجود ہیں، سب سے زیادہ پر تکلف قطعوں میں پائے جاتے ہیں، لیکن معمولاً کوئی زیادہ سستا مسالا استعمال کیا جاتا ہے، یعنی کنکر ملی ہوئی مٹی اور چونے کا کنکریٹ، جسے ملا کر سخت کر لیا جاتا ہے۔ اس مسالے کی ابتدا بہت قدیم آئیری دور کی ہے اور بلاشبہ یہ صوبائی اور عوامی عمارتوں میں برابر استعمال ہوتا رہا ہے۔ پہاڑی علاقوں کے بعض قلعوں میں شکستہ پتھروں کا استعمال بھی نظر آتا ہے، نیز اکثر تراشیدہ پتھر بھی، تناسب، میں کنکریٹ کے ساتھ، جسے سانچوں میں ڈھال لیا جاتا تھا، استعمال کیے گئے ہیں۔

تمام اموی عمارتوں کی کامیابی کا راز ان کی سادگی کے ساتھ ساتھ ان کے تناسب کی صحت میں، جو اکثر ایک قلعے اور دوسرے قلعے میں بہت مختلف ہو سکتا ہے، نیز ان کے اجسام (masses) کے خوش آئند توازن میں مضمر ہے۔ عسکری فن تعمیر میں جو روح کارفرما ہے وہ وہی ہے جو دورِ خلافت کے سارے فن تعمیر میں جلوہ گر ہے، یعنی جدت بلا کسی مستثنیٰ خصوصیت کے اور بے عیب توازن کا دوگانہ خیال۔

(۳) اندلس میں پانچویں / گیارہویں صدی سے لے کر ساتویں / تیرہویں صدی تک: ملوک الطوائف کے دور، یعنی پانچویں / گیارہویں صدی میں محل نما قلعوں کا ظہور دیکھنے

میں آتا ہے، جن میں ابتدائی نوعیت کی ایک مختصر سی عمارت میں فصیلوں کے ساتھ ساتھ متعدد کمرے بنائے جاتے تھے۔ اس قسم کا منفرد محل یا قصر شاید سابق دور میں بھی موجود تھا۔ جب ہم کوئی Mudejar قصر، جیسے کہ Santa Maria del Puerto کا، جس میں سوسی رباط کے خطوط کا تتبع کیا گیا ہے (جو خود شامی اموی نمونوں کے تھے)، دیکھتے ہیں تو یہ خیال کرنے کا لالچ پیدا ہوتا ہے کہ اس قصر کا مورث اعلیٰ خود ہسپانیہ میں رہا ہوگا اور یقیناً اس کی ابتدا [اموی] خاندان کے بانی سے ہوئی ہوگی، جس کی کوشش یہ تھی کہ اندلس میں کسی حد تک اپنے گم گشتہ وطن کا سامان پیدا کر دے۔ قصر الرصافہ میں، جس میں اس کے آبا و اجداد کے ایک محل کا نام محفوظ ہے، واقعی وہی نقشہ پھر بنا لیا گیا جو دمشق کے ملفا کے دیہاتی محلوں میں پایا جاتا تھا۔

مرسیہ Murcia کے محل Castillejo کے باہر باقاعدہ مستطیل شکل کا ایک قلعہ ہے، جس میں پاس پاس برج بنے ہیں لیکن فصیلوں اور صحن (patio) کے درمیان کی پوری جگہ میں سکونتی مکانات ہیں اور برجوں کے خالی حصوں کے سب سے بڑے کمروں کو پیچ میں سے تقسیم کرنے کا کام لیا گیا ہے؛ بجائے صحن کے دھنسی ہوئی کھاروں (parterres) کا باغ ہے، جس میں ایک دوسری کو قطع کرتی ہوئی روشیں بنائی گئی ہیں۔

اس کے برعکس شہروں یا بڑے بڑے قلعوں کی فصیلوں میں اب ہندسی باقاعدگی کا وہ رجحان نہیں رہا جو اموی خلافت کے زمانے میں تھا۔ ان کے پہلوؤں میں بعض اوقات اب بھی تنگ اور قریب قریب بنے ہوئے برج پائے جاتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر عمارتوں میں دسمے زیادہ بڑی ضخامت کے ہوتے ہیں اور وہ ایک طرف تو ایک کم و بیش



از بیش ضروری ہوتا جاتا ہے۔ یہ دروازے کے سوا، اور بعض اوقات پیچ در پیچ رڈوں میں تراشیدہ پتھر اور کنکریٹ کے ساتھ ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ مؤخرالذکر مسالا تقریباً ہمیشہ زیادہ مقدار میں نظر آتا ہے۔

اس طرح شاید ضرورۃً — کیونکہ مسیحی دباؤ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا اور عیسائیوں نے اپنی فتوحات کا دائرہ وسیع کر لیا تھا — اندلس کی اسلامی قلعہ بندی نے پانچویں / گیارہویں اور چھٹی / بارہویں صدی میں بہت ترقی کی۔

(۴) پانچویں / گیارہویں صدی سے ساتویں / تیرہویں صدی تک افریقہ میں : اسی نوع کی اندلسی قلعہ بندی چھٹی / بارہویں صدی کے آغاز میں المرابطون اور الموحدون (جن کے زیر نگیں اندلس بھی تھا) کی افریقی سلطنت میں پھیلنا شروع ہو گئی۔ ابتدائی المرابطی قلعے شکستہ پتھروں کے ہیں اور اپنی چٹائی اور دیگر جزئیات میں مغربی روایت لیے ہوئے ہیں، لیکن مساجد و محلات کی طرح ان قلعوں میں بھی اندلسی اثرات نے بہت جلد نفوذ کرنا شروع کر دیا۔ یہ وہ عظیم الشان عہد ہے جس میں صحن کنکریٹ کے بننے لگے اور مضبوط لمبوترے آگے کو نکلے ہوئے برجوں کی تعمیر شروع ہوئی، جو کم و بیش مساوی فاصلوں پر ہوتے تھے۔ افریقہ میں قلعوں کے خطوط میں سادگی کا رجحان پیدا ہو گیا، کیونکہ اب وہ بڑے بڑے مسقف دمدے اور البرانہ نظر نہیں آتے؛ تاہم قلعہ بند دروازے میں بعض جدتیں رونما ہوئیں، کیونکہ اب دروازے کے دونوں طرف ہمیشہ برج بننے لگے، جو عموماً بہت آگے کو نکلے ہوئے ہوتے ہیں اور خود دروازہ ایک بڑا سا دمدہ ہوتا ہے جو پردے کی دیوار کے پیچھے تک چلا جاتا ہے اور جس میں دو یا تین خموں کا ایک راستہ ہوتا ہے،

فاصلے کی حفاظت کرتے ہیں اور دوسری طرف خط عمارت (tracis) کی بے قاعدگیوں کی اصلاح یا فصیلوں کے کمزور تر حصوں کو مضبوط کرتے ہیں۔ بعض دفعہ ان میں دیہری فصیل بھی ہوتی ہے، یعنی ایک اندرونی اور ایک بیرونی دیوار، اور زیادہ کمزور حصوں کو دمدوں کے ذریعے تقویت بھی دی جا سکتی ہے۔ ”قصبہ“، جو شہر کے اندرونی قلعے (acropolis) کا کام دیتا ہے اور جس کے اندر شاہی محل واقع ہوتا ہے، اپنا جداگانہ اکھرا یا دیوار صحن رکھتا ہے۔

اس زمانے میں وہ دمدہ بھی معرض وجود میں آیا جس کے اوپر محرابی چھت کے کمرے ہوتے تھے۔ یہ مستحکم عمارتیں خود احاطے کے گرد مرتب کی جاتی ہیں نہ کہ بطور بڑے برجوں (donjons) یا مستحکم مرکزی عمارتوں (keeps) کے۔ اسی عہد میں مسلم اندلس میں ایک نئی شکل نظر آتی ہے، یعنی البرانہ برج، جو پردے کی دیوار سے باہر کو نکلا ہوا اور اس سے ایک اور دیوار کے ذریعے ملا ہوا ہوتا ہے، جس کے آر پار ایک محرابدار راستہ چلا جاتا ہے، مسقف دمدے اور البرانہ، جن سے بہت اچھی حفاظت ہوتی ہے، مجتمع بھی ہو سکتے ہیں۔

دروازے میں، جو بعض اوقات دو برجوں کے درمیان کھلتا ہے اور بعض دفعہ کسی یک لخت آگے کو نکلے ہوئے دمدے کے زیر سایہ، ہمیشہ ایک زاویہ دار راستہ ہوتا ہے، مدخل اور مخرج پر دو محرابیں ہوتی ہیں، جن کا زیرین حصہ مربع بغلی ستونوں (pilasters) پر قائم ہوتا ہے اور جو کواڑوں کے کھلنے اور بند ہونے کی جگہ کو گھیرے ہوتی ہیں۔ اوپر نیچے جانے والا آہنی دروازہ (portcullis) نہیں پایا جاتا۔

رتیلے پتھر (freestone) کا استعمال بیش

دوبارہ بنتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں - دروازے مع اپنے خمدار راستوں کے عظیم الشان عمارتیں ہیں - آٹھویں / چودھویں صدی میں الحمراء اور مالقہ کے قصر جبل الفارو (Gibraltar) میں معمولی طول و عرض کے چھوٹے اور زیادہ قریب قریب برجوں کی جگہ بڑے بڑے دمسے ہیں، جو زیادہ دور دور بنائے گئے ہیں - جہاں توپوں کی آمد سے قلعہ بندی میں کوئی تبدیلی کرنے کا وقت نہیں ملا وہاں قدیم عمارتوں کے نیچے ابتدائی نوعیت کے چبوترے بنا دیے گئے۔

شمالی افریقہ میں فاس (Faz) اور تلمسان کی سلطنتوں میں الموحدی روایات بغیر کسی تبدیلی کے باقی رہیں - پردے کی دیواریں اور برج کنکروں سے بنا دیے جاتے تھے، اور دروازے، جو ہمیشہ شاندار اور پیچدار راستوں والے ہوتے تھے، اکثر اوقات اینٹوں سے بنائے جاتے تھے نہ کہ پتھروں سے - افریقہ باوجود بعض الموحدی اثرات کو قبول کر لینے کے پتھر (کے استعمال) اور جزئیات میں اپنی روایتی اشکال کا پابند رہا۔

اس طرح اس طویل عرصے میں قلعے، محل اور زیارت گاہیں گزشتہ زمانے کی شکلوں سے بمشکل ہی آگے بڑھیں۔

۵ - زمانہ حال میں اسلامی ممالک میں قلعہ بندی: توپخانے کے ارتقا سے سب یورپی ممالک میں قلعہ بندی کے قدیم تصورات میں بہت بڑا تغیر پیدا ہو گیا، لیکن شمالی افریقہ میں کسی قسم کی نئی اشکال معرض وجود میں نہیں آئیں بلکہ یہاں کم و بیش وفاداری کے ساتھ انہیں نمونوں کے نقل کرنے پر قناعت کی گئی جو یورپ میں ایجاد ہوئی تھیں - مزید برآں وہاں درآمدہ تصورات کو محض اس صورت میں قبول کیا گیا جب کسی یوایی قوم کے خلاف اپنے دفاع کی ضرورت پیش آئی، مثلاً ساحل

جس کی غلام گردش کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ہوتا - دروازے کی محراب، اس کے دونوں بازو اور اس کی چوکھٹوں میں تراشیدہ پتھر کی پر تکلف آرایش نظر آتی ہے - مراکش اور رباط کے الموحدی عظیم الشان دروازے اسلامی قلعہ بند دروازوں میں نفیس ترین دروازے ہیں اور یقیناً سب سے زیادہ پر تکلف۔

۴ - اسلامی المغرب میں آٹھویں / چودھویں صدی سے لے کر نویں / پندرھویں صدی کے اختتام تک قلعہ بندی: باوجود ان تعمیری اسلوبوں کی بنیادی یکسانیت کے جو اس زمانے میں مسلم ہسپانیہ اور المغرب میں رائج تھے جزیرہ نما [آئیریا] اور افریقہ میں قلعہ بندی کا ارتقا مختلف نوعیت کا تھا - اندلس میں اسلامی حکومت اس وقت غرناطہ کی چھوٹی سی سلطنت تک محدود ہو کر رہ گئی تھی جو خود قشتالہ (Castile) کے زیر نگیں تھی مگر اکثر اپنے آقا کے خلاف برسرِ بغاوت بھی رہتی تھی، اور اس کا انحصار ایک قلعہ بند سرحد کی پناہ پر تھا - اس سرحد کے بہت سے قلعے بعض ان مسیحی قلعوں کے نمونے پر تھے جو ان کے مد مقابل تھے - یہ پتھر سے بنائے گئے تھے اور ان میں دیہرا احاطہ اور ایک بڑا برج (donjon) ہوتا تھا، جس کی بنا پر وہ المغرب کی اسلامی قلعہ بندی میں اجنبی سے معلوم ہوتے تھے، لیکن جلد ہی مسیحی اثرات مسلم ہسپانیہ کی روایات میں ایک حیات نو پیدا کرنے کے بجائے ادنی نمونوں میں ذلیل ہو کر رہ گئے - وہ نہ تو خود دارالسلطنت میں دکھائی دیتے ہیں اور نہ متأخر زمانے کی عمارتوں میں۔

یہاں ہمیں وہی شکلیں جو پانچویں / گیارھویں اور چھٹی / بارھویں صدیوں میں تخلیق ہوئی تھیں بغیر کسی معتدبہ تغیر و تبدل کے



کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

۶ - مستحکم بربر عمارتیں : شمالی افریقہ، بالخصوص مراکش میں کئی پہاڑی علاقوں میں بھی قلعہ بندیاں موجود تھیں، اور اسی طرح ان نخلستانوں میں جو صحراے اعظم کے کنارے کنارے تھے - بعض پتھر کے گاؤں اور تجارتی مراکز جو ہمیشہ بے قاعدہ شکل کے ہوتے تھے، صحیح معنوں میں کوئی احاطہ نہ رکھتے تھے، ان عمارتوں کے سوا جن کی مشترکہ بیرونی دیوار فصیل کا کام دیتی تھی، لیکن تقریباً سب جگہ اس قدیم فن تعمیر نے اپنی جگہ سخت مٹی (pise) اور گارے کی اینٹوں سے بنی ہوئی عمارتوں کو دے دی؛ یہ اینٹیں صحرا سے لائی جاتی تھیں - بعض گاؤں، خصوصاً پہاڑوں پر، بے قاعدہ شکل کے ہیں اور ان میں مکان اس طرح پاس پاس بنے ہوئے ہیں کہ ان کا ایک مسلسل محاذ بن گیا ہے - لیکن نخلستانوں کے فن تعمیر میں نقشے اور آرائش کی ایک مخصوص شکل نظر آتی ہے - میدانوں میں قلعہ بند گاؤں (قصور) بہت باقاعدہ شکل کے ہیں؛ ان کے گردا گرد ایک احاطہ ہوتا ہے، جس میں کئی دروازے کھلتے ہیں جو بڑے بڑے ہوتے ہیں اور جن کی حفاظت کونوں پر بنے ہوئے دسدوں سے کی جاتی ہے - ان میں ہسپانوی - مراکشی قلعہ بندی کا اثر بہت نمایاں ہے۔

منفرد سکونتی قلعے، یعنی مراکشی تغربت کی ابتدا زیادہ قدیم زمانے میں ہوئی - اس کی وضع ایک چھوٹے قلعے (castellum) کی سی ہوتی ہے، جس کے گوشوں پر چار برج ہوتے ہیں یا کمتر حالتوں میں صرف دو - اگر ان کے نقشے روسی نمونے کے ہوں تو استرکاری کا فن ایک قدیم تر اصل و نسل کا ہوتا ہے - مخروطی شکل کے برج، جن میں اکثر ایک ستون نما ابھار (entasis) ہوتا ہے،

علاقوں میں - باقی سب جگہ زمانہ وسطی کی قدیم تر قلعہ بندی کا دستور عام رہا - بربری جن حکومتوں کے درمیان تقسیم تھا انہیں صرف ایسے قبائل کو زیر کرنا یا ان کے درمیان نظم و نسق قائم رکھنا تھا جن کے پاس توپیں نہ تھیں۔

مراکش میں پرتگیزیوں نے دسویں / سولہویں صدی میں ساحل کے مختلف مقامات میں جو نفیس قلعہ بندیاں تعمیر کی تھیں ان کی نقل اغادیر [رک باں] میں واقع بنو سعد کے 'القصبۃ' (محل) میں محض اتفاق سے کی گئی ہے - باقی ساحلی قلعے یورپی معماروں کے بنائے ہوئے تھے، جن میں سے اکثر اسلام قبول کر چکے تھے اور سلاطین کی ملازمت میں تھے - اٹھارہویں صدی میں [شہر] مغادر Mogadir کی نفیس مرگب عمارت، جس کا نقشہ ایک فرانسیسی نے تیار کیا تھا، ایک انگریز نو مسلم اور اطالوی معماروں کی ساختہ تھی - ان یورپی نمونے کی قلعہ بندیوں کی انیسویں صدی میں مقامی کاریگروں نے نقل کی۔

الجزائر اور تونس میں عثمانی ترکوں نے قلعہ بندی کا ایک جدید اسلوب رائج کیا اور ان عمارتوں کے اسلوب سے خاصا مشابہ تھا جو مراکشی ساحل پر جگہ جگہ بن رہی تھیں - توپوں کے دسدے اور احاطے، جن کی حفاظت اکثر خندق اور باہر کو ڈھلوان پشتے (counterscarp) سے کی جاتی تھی، ابھی تک بلند بنائے جاتے تھے - Vauban نمونے کی پست قامت قلعہ بندیاں شمالی افریقہ میں غیر معروف تھیں۔

اس طرح اسلامی المغرب نے اپنے قلعوں میں، جیسے کہ اپنے تمام فوجی نظام میں، اپنی قدامت پسندی کا مظاہرہ کیا - چند مخصوص چیزیں جو یورپ سے مستعار لی گئی تھیں انہیں بھی قرون وسطی کی روایتوں پر لاد دیا گیا اور ان میں

مفہوم میں عسکری، یعنی ایسے دمدے (bastions) جو خط عمارت سے آگے کو بڑھے ہوئے ہوں اور جن میں درحقیقت کئی برج یا پشتے شامل ہوں، نیز وہ دمدے بھی جو صحن کے اندر توپخانے کے استعمال کے بعد تعمیر ہوئے اور بھاری توپوں کو نصب کرنے کی جگہوں کا کام دیتے تھے۔

مندرجہ ذیل بیانات صرف برجوں کے استعمال سے متعلق ہیں۔ ہندوستان کی اسلامی قلعہ بندی کی تاریخ ایک علیحدہ مقالے [آرٹیکل بہ حصار] میں بیان کی گئی ہے۔ میناروں کا ارتقا بھی ایک جداگانہ چیز ہے اور یہاں زیر بحث نہیں۔

۲۔ سلطنت دہلی چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی سے لیکر دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی تک: شروع کے مسلم حملہ آوروں کو ایک ایسے ملک سے واسطہ پڑا جہاں پہلے ہی سے بہت سی قلعہ بند عمارتیں موجود تھیں، جن کی ہندو زمانے کے ہندوستان میں ایک قدیم روایت چلی آتی تھی اور جو بعد کے زمانے میں بھی ملک کے ان حصوں میں جہاں اسلام نہیں پھیلا زندہ رہی۔ ان کا پہلا اضطرابی (static) اقدام یہ تھا کہ موجودہ عمارتوں پر تصرف کر کے ان میں تغیر و تبدل کر دیا جائے، مثلاً دہلی میں یہ پرتھوی چوہان کا پرانا قلعہ، یعنی قلعہ رائے پتھورا تھا، جہاں مسلمان سپاہی متعین کیے گئے اور جس کے اندرونی حصے (Citadel) یعنی لال کوٹ میں وہ قدیم ترین ہندوستانی مسجد تعمیر ہوئی جو قوت الاسلام کے نام سے موسوم ہے۔ اسے ۵۸۷/۱۱۹۱ء میں قطب الدین ایک نے بنوایا۔ یہاں پردے کے پہلوؤں میں قریب قریب برج بنے ہوئے ہیں؛ دفاع ایک چوڑی خندق سے کیا گیا ہے اور زبردست دمدوں کے اندر کو گھسے ہوئے (re entrant) زاویوں میں دروازے رکھے گئے

بلاشبہ، فراعینی مصر سے مأخوذ ہیں۔ اسلام کی شروع صدیوں کے بربری مینار بھی سربریدہ اہراموں کی شکل کے ہوتے تھے۔ دروازوں اور مراکشی نخلستانوں میں پائے جانے والے 'قصور' کی دیواروں کے اوپر اکثر پر تکلف نقش و نگار دکھائی دیتے ہیں، جو مٹی کی اینٹوں سے بنائے گئے ہیں اور ہسپانوی۔ مراکشی ہندسی عناصر سے مأخوذ ہیں۔

قدیم تر بربری عمارتوں نے مختلف اوقات میں مسلم قرون وسطیٰ کی وہ اشکال قبول کر لیں جنہیں مک کی قلعہ بندی میں سرکاری عمارتوں کے لیے اختیار کر لیا گیا تھا۔ لہذا بربری، خصوصاً مراکش، قلعہ بندیوں کا ایک حیرت انگیز نگارخانہ ہے، جس کا تصور نہایت قدیم روایتوں سے لیا گیا ہے۔

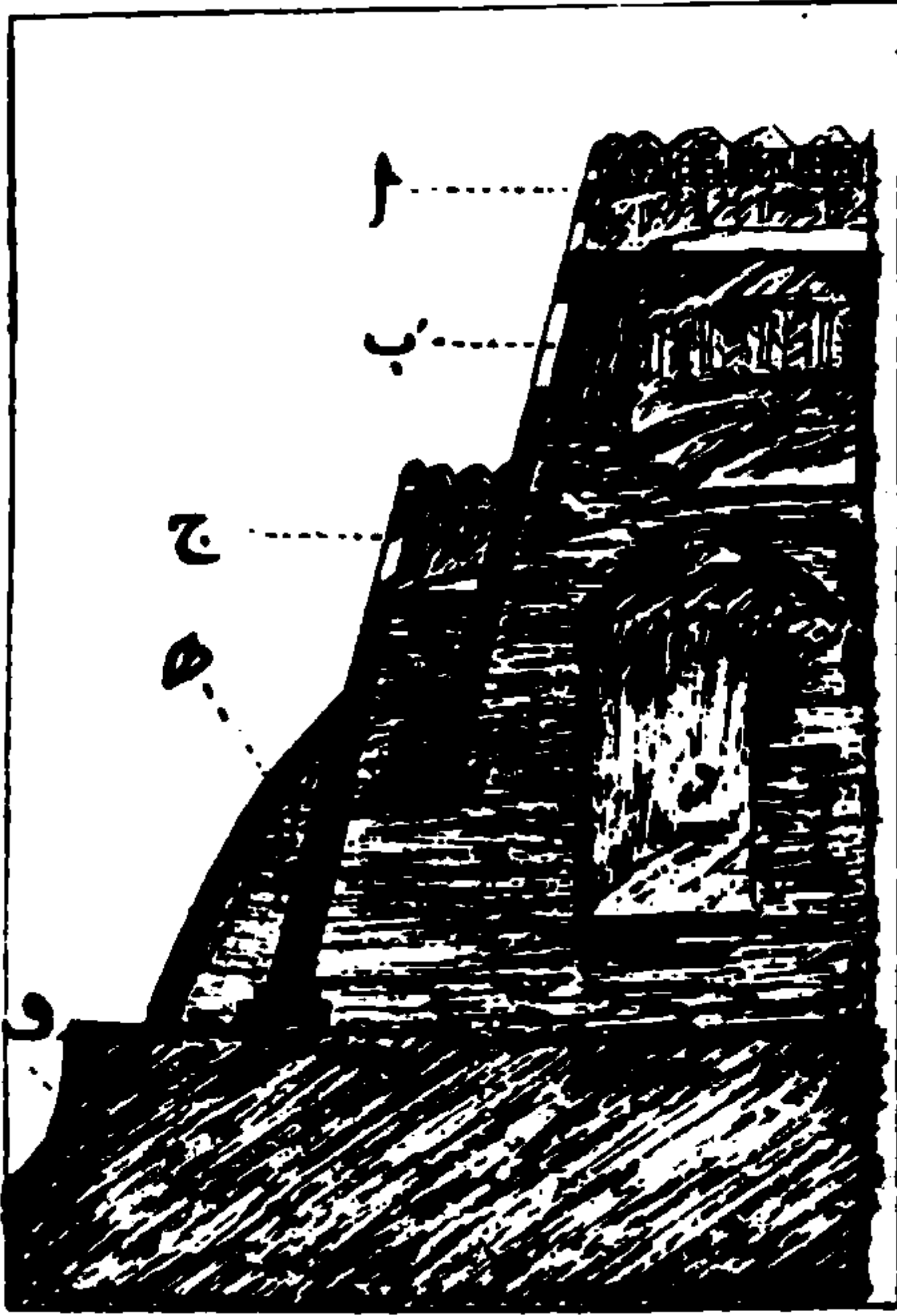
مآخذ: (۱) *L' architecture : G. Marçais* (۱) *musulmane d' Occident* پیرس ۱۹۰۴ء؛ (۲) *L' art hispano-mauresque des Origines : H. Terrasse* پیرس ۱۹۳۲ء؛ (۳) وہی مصنف: *Les forteresses de L' Espagne musulmane* در *Boletin de la Real Academia de la Historia* ۱۳۴ (۱۹۰۴ء)؛ ۴ تا ۳۸۳؛ (۴) *H. Terrasse و H. Basset* پیرس *Sanctuaires et forteresses almohades* ۱۹۳۲ء؛ (۵) متعدد مقالات از *L. Torres Balbás* زیادہ تر مجلہ *al - Andalus (Cronica arqueological)* میں ہیں۔

(H. TERRASSE)

۳۔ ہندوستان کے فن تعمیر میں برج - عمومی: اردو میں، جس سے یہ ہندوستان کی اور زبانوں میں بھی پھیل گیا، برج کے معنی ہمیشہ کسی "tower" یا "bastion" کے ہوتے ہیں اور اس میں وہ برج بھی شامل ہیں جو قلعہ بند محلوں کی دیواروں پر بنائے گئے اور جن کا مصرف محض آرائشی یا سکونتی تھا نہ کہ کسی



فاصلے پر خاصے آگے کو نکلے ہوئے نیم مدور دمدسے ہیں، اور یہ دمدسے اور دیواریں بہت ڈھلواں اور مورچہ بند ہیں۔ ان میں دفاع کی تین منزلیں ہیں: ایک بیرونی غلام گردش، ایک بڑی دیواری غلام گردش اور دندانے دار فصیل، جس میں روزنوں کی دو قطاریں ہیں۔ چٹانی بنیاد دیواروں کے خط سے نیچے ڈھلواں ہے اور اس کے اوپر ایک بھراؤ کی بنیاد ہے، جس میں اصلی دیوار کی کرسی تک سامنے پتھر لگے ہوئے ہیں، جن سے ایک مسلسل پشتہ بن گیا ہے اور بنیادوں میں پانی مرنے کے خلاف حفاظت بھی ہو گئی ہے (دیکھیے خاکہ م)۔ اندرونی قلعے



خاکہ م۔ تعلق آباد کے کونے کے دمدسے کا سیکشن: (الف) کنگرے؛ (ب) دیواروں سے محصور غلام گردش؛ (ج) بیرونی غلام گردش (داخلہ بردے کی دیواروں سے محصور غلام گردش میں سے)؛ (د) اندرونی مسقف برآمدہ؛ (ه) بھراؤ کی کرسی؛ (و) چٹانی ڈھال۔

ہیں۔ یہ دمدسے چار دیواری میں ابھار کر کے بنائے گئے ہیں اور کئی قلعے سے ہٹے ہوئے (counterfort) برج بھی ہیں۔ باقی ماندہ قلعہ بندی غالباً علاء الدین خلجی کے عہد (تقریباً ۱۲۰۳ء / ۱۲۰۴ء) کی ہے (ASI Report : Beglar، ص ۴، ۱۸۷۳ء)، جو غالباً ہندو عمارت کے آثار پر بنائی گئی ہے۔ زیادہ تر برج کم باہر کو نکلے ہوئے (counterforts) ہیں۔ علاء الدین کے نئے دارالسلطنت سیری کی دیواریں بھی تقریباً اسی زمانے میں پرانے دارالسلطنت کے شمال مشرق میں تعمیر ہوئیں۔ Campbell کا استدلال یہ ہے کہ سیری کا نام قطب گڑھ یعنی لال کوٹ کو دیا گیا تھا اور یہ کہ اب جس موقع کو بالعموم سیری کہا جاتا ہے اسے دسویں / سولہویں صدی میں بہلول لودھی نے تعمیر کیا تھا (Notes on the hist. and topography of the ancient cities of Delhi، ج ۳۰، شماره ۱، ۱۸۶۶ء)۔ اس کی کنگھم Cunningham نے معقول طور پر تردید کر دی ہے (ASI Report، ج ۱، ۱۸۷۱ء)۔ چار دیواری کے بعض حصے باقی ہیں۔ اس میں نیم مدور گاؤدم دمدسے ہیں، جو ایک دوسرے سے تقریباً ایک تیر پرتاب کے فاصلے پر بنے ہیں اور جن کے اوپر دیواروں کی طرح کنگرے سے بنے ہوئے ہیں اور ایک مسلسل گشتی راستہ ہے جو ایک محراب دار غلام گردش پر قائم ہے۔ یہاں جن اصولوں سے کام لیا گیا ہے وہ نئے دارالسلطنت تعلق آباد کے سے ہیں، جسے غیاث الدین تعلق نے ۱۲۲۰ء / ۱۲۲۱ء تا ۱۲۲۳ء / ۱۲۲۴ء میں بنوایا تھا، اور اسی طرح عادل آباد کے سے، جسے تقریباً ۱۲۲۰ء / ۱۲۲۵ء میں محمد تعلق نے تعمیر کیا۔ دونوں کی دیواروں کے اندر کنگرے اور روڑے بھرے گئے ہیں اور باہر کے رخ کھردرے سنگ مرہہ کے مربع چوکے لگائے گئے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے

آگے کو نکلے ہوئے ہیں اور ان میں سے بعض نیم بیضوی شکل کے ہیں۔ گول دندوں کا ایک سلسلہ قوسی شکل میں ہے۔ اس میں دو صحن ہیں، جن میں سے ایک میں سے خندق پر سے گزر کر شہر میں داخل ہوتے ہیں۔ بہمنی عہد میں جو تبدیلیاں عمل میں آئیں ان کی طرف سطور ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے۔

فیروز تغلق نے ایک اور دہلی بنائی، یعنی فیروز آباد نامی اپنا مستقر حکومت (۱۳۵۰ء/۱۳۵۴ء تا ۱۳۷۱ء/۱۳۷۰ء)، جسے بعد میں امیر تیمور نے برباد کر دیا اور جس کے آثار ایک کوئلے کے سوا اب کچھ نہیں رہے، جو خود بہت شکستہ ہو چکا ہے۔ یہاں دیواروں اور برجوں میں نمایاں ڈھال ہے؛ برج نیم مدور ہیں اور غالباً ان کے اوپر کھلے کوشک (چھتریاں) بنی ہوئی تھیں۔ دیدبانوں (barbicans) کے ان آثار میں جو دروازے کے باہر ہیں چھوٹے چھوٹے زاویے دار برج ہیں۔ غالباً پھرے داروں (ستریوں) کے استعمال کے لیے۔ ایک سے زیادہ حصوں پر مشتمل جس ہم عصر عمارت میں قدم شریف ہے اور جو اپنے تقدس کی بنا پر تیموری تاخت سے محفوظ رہی، اس کی حفاظت ایک مستحکم دندہ - پر پردے سے کی گئی ہے، جس میں ویران شدہ کوئلے کی بہ نسبت فیروز تغلق کی قلعہ بندی کے اصول زیادہ وضاحت سے نظر آتے ہیں۔ دیواروں اور برجوں کی بھراؤ کی کرسی کم ہو چکی ہے اور پانی مرنے کی روک تھام فصیل میں چھوٹے چھوٹے روزن بنا کر کی گئی ہے۔ اس زمانے کی بہت سی عمارتیں، بالخصوص مقبرے اور درگاہیں قلعہ بند چار دیواری کے اندر ہیں۔ اس زمانے میں برج کو ایک زیبائشی چیز کی حیثیت دے دی گئی، چنانچہ مساجد کی چار دیواریوں اور عیدگاہوں کی دیواروں میں باقاعدہ طور پر زاویوں اور کھونٹوں والے دندے

کے گرد دندے زیادہ قریب قریب بنے ہیں۔ دروازے دو دندوں کے بیچ میں کھلتے ہیں اور انہیں اکثر آگے کو نکلے ہوئے دیدبانوں (barbicans) سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ عادل آباد کی مزید حفاظت ایک بیرونی صحن (bailey) اور بیرونی دیوار سے کی گئی ہے۔ بہت سے برجوں کے بیچ میں غلہ خانوں کے آثار باقی ہیں۔ غیاث الدین کا مقبرہ تغلق آباد کے جنوب میں ایک مضبوط اور مستحکم عمارت ہے، جو قلعے کے باہر واقع ہے۔ اس میں بھی اسی وضع کے دندے ہیں لیکن بیرونی غلام گردش مفقود ہے۔

عادل آباد کے علاوہ محمد تغلق نے دہلی کے ایک اور شہر کی بھی تشکیل کی، یعنی جہاں پناہ (۱۳۲۵ء/۱۳۲۰ء)، جس کی دیواروں نے قلعہ رائے پتھورا اور سیری کے درمیانی رقبے کو گھیر لیا تھا۔ دیواروں میں نیم مدور ڈھلوان دندے ہیں، جو عادل آباد کے دندوں سے مشابہ ہیں لیکن بغیر بیرونی غلام گردش کے، اور ایک جگہ ان کے بیچ میں پشتہ اور پانی روکنے اور نکالنے کا پھاٹک آ گیا ہے، جو سات پلاہ کہلاتا ہے اور جس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ محافظین کے استعمال کے لیے دیواروں کے اندر پانی موجود رہے۔

محمد تغلق ہی کے عہد میں دہلی کی تباہی اور دارالسلطنت کی دیو گڑھ میں منتقلی بھی ظہور میں آئی، جس کا نیا نام دولت آباد رکھا گیا [رکھ بان]۔ دفاع کے تین خط، جو درے اور مرکزی قلعے کے درمیان ہیں، دیواروں پر مشتمل ہیں۔ ان میں مساوی فاصلوں پر ڈھلوان مدور دندے بنائے گئے ہیں، جو شمالی جانب اسی زمانے کی واقع عمارت کے دندوں سے ذرا کم باہر کو نکلے ہوئے ہیں اور ان میں بیرونی غلام گردشیں نہیں ہیں۔ دروازوں کے گرد کے دندے زیادہ بڑے اور زیادہ



اور موجودہ قلعہ اکبر کا تعمیر کردہ ہے، لہذا یہ کہنا دشوار ہے کہ عمارت کا کونسا حصہ سکندر کا رہین منت ہے۔

۳۔ دکن کے قلعے آٹھویں / چودھویں صدی سے گیارھویں / سترھویں صدی تک: یہاں بھی اسی طرح بہت سے مستحکم ہندو آثار تھے جو مسلمانوں کے ہاتھ لگے اور ان کے استعمال میں آئے، اور جنہیں انہوں نے ابتدائی برسوں میں کسی حد تک بدل دیا۔ ان کی پہلی نئی عمارت بظاہر گلبرگہ [رک بان] میں تھی، جس کی موٹی دیواریں (۱۶ میٹر) اندرونی پردے کے ساتھ ساتھ برج بنا کر دہری کر دی گئی ہیں۔ برج سب کے سب بہت ٹھوس بنائے گئے ہیں اور نیم دائرے کی شکل کے ہیں۔ ان میں سے کئی میں توپخانے کے استعمال کے لیے چبوترے (barbeltes) بھی ہیں، جن کا اضافہ بعد میں کر دیا گیا تھا۔ یہ ترمیم بیجاپور کے عادل شاہی حکمرانوں کی طرف منسوب ہونی چاہیے، کیونکہ کالاہاڑ برج کے ایک کتبے میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۵ء میں محمد... نے ہر ایک برج، دیوار اور دروازے کو از سر نو تعمیر کیا (Haig، در EIM، ۱۹۰۷-۱۹۰۸ء)۔ احاطے کے اندر بلند زمین پر ایک بڑا اور پختہ دندہ الگ تھلگ کھڑا ہے، جو کسی بڑی توپ کو نصب کرنے کا کام دیتا تھا۔ بیدر [رک بان] میں، جو بہمنی سلطنت کی بیرونی چوکی بن گیا تھا اور جہاں احمد شاہ العربی نے اپنا مستقر حکومت منتقل کر لیا تھا، ۱۲۲۲ھ / ۱۳۲۲ء میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا تو قلعہ بندیوں کی ایک دہری قطار موجود تھی (ضیاء الدین برنی: تاریخ فیروز شاہی، Bibl. Ind.، ص ۴۴۹)۔ ہمیں معلوم ہے کہ ۱۲۲۹ھ / ۱۳۲۹ء تا ۱۲۳۲ھ / ۱۳۳۲ء میں جو تعمیر از سر نو ہوئی اس کے لیے ایرانی اور ترک

نظر آتے ہیں جن کے اوپر مدور یا مربع چھتریاں یا پست گنبد بنے ہیں، جن میں ہمیشہ فیروز شاہ کا مخصوص ڈھال نظر آتا ہے۔ اسی کی نقل ان خالصہ زیبائشی پشتوں میں بھی کی گئی ہے جہاں ڈھال کو اوپر لے جا کر ایک گلدستے کی شکل دے دی گئی ہے اور جو دہلی کی فیروز شاہی مسجدوں میں پائے جاتے ہیں (بیگم پوری، کھڑکی، سنجر اور کلان مسجد، رک بہ دہلی، یادگار عمارتیں)۔ اس کی نقل دہلی کی لودھی عمارتوں اور جونپور [رک بان] اور دیگر مقامات میں بھی موجود ہے۔ یہ معلوم ہے کہ فیروز شاہ تغلق نے اپنے پیشروؤں کی متعدد عمارتوں کی مرمت کرائی اور اگرچہ اس کا اپنا بیان ہے کہ اس نے الشمس کے تعمیر کردہ مقبرے، یعنی ملکپور میں واقع ابوالفتح محمود ناصرالدین کے مقبرے کی بھی مرمت کرائی تھی، تاہم اتنا اغلب ہے کہ ان کے اسلوب کے پیش نظر، گوشوں کے برج کم از کم اپنی بالائی منزلوں میں فیروز شاہ کے تعمیر کردہ ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ متاخر تغلق اور خاندان سادات کے بادشاہوں نے نئے قلعہ بند آثار تعمیر نہیں کیے، اس کے سوا کہ ۱۲۲۱ھ / ۱۲۲۳ء میں مبارک شاہ [سید] نے لاہور کی فصیل کی جگہ، جنہیں امیر تیمور نے مسمار کر دیا تھا، ایک مٹی کا قلعہ بنایا تھا۔ تاہم اس کا اپنا مقبرہ (۱۲۳۳ھ / ۱۲۳۶ء) مبارک آباد کے چھوٹے سے شہر کی مرکب عمارت میں واقع ہے، جو دہلی کا ایک اور شہر تھا۔ یہاں برج چھوٹے چھوٹے ہیں لیکن اور لحاظ سے سابقہ نمونوں سے بہت کم مختلف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر لودھی نے آگرے میں ۱۵۰۲ھ / ۱۵۰۸ء میں ایک قلعہ بنوایا تھا، لیکن آگرے میں پہلے سے ایک قلعہ موجود تھا

فاصلوں پر بنایا گیا ہے۔ پردے کے حصے جہاں سب سے زیادہ معرض خطر میں ہیں وہاں یہ سب سے زیادہ قریب قریب ہیں۔ بیدر شہر کا چوبارہ، جسے احمد شاہ کی قلعہ بندیوں کا ایک جزو سمجھا جاتا ہے، ایک بلند مخروطی دیدبان ہے، جہاں سے پوری سطح مرتفع اور نشیبی زمینیں نظر آتی ہیں۔ اس کی کرسی بھاری اور گول ہے اور اس میں پاسبانوں کے حجرے اور ایک اندرونی زینہ ہے۔ بہمنی خانوادے [رک باں] کے زمانہ عروج میں دکن میں فوجی تعمیرات میں بہت سرگرمی رہی، یعنی دولت آباد، بیجاپور، گول گڑھ، ایلچ پور، نرنالا، پرندہ، نلدرگ، پنہالا، وارنگل، گولکنڈہ، مڈگل، رایچور وغیرہ میں۔ دولت آباد میں پرانے استحکامات کو چھوٹے پتھروں اور اینٹوں سے زیادہ مضبوط اور بلند کیا گیا۔ اس کی ایک نمایاں مثال مدخل کے شاندار جڑواں برج کے دوسرے صحن میں ایک دمدہ ہے، جو اس طرح بنایا گیا ہے کہ پرانے موکھوں (embrasures) کو (جو اتنے ہی بلند تھے جتنی پردے کی دیوار) پر کر کے ایک بلند بالائی منزل کا اضافہ کر دیا گیا ہے، لیکن دیواروں کے ڈھال کو بدستور باقی رکھا گیا ہے۔ علاوہ ازیں ایک محرابدار آگے کو نکلا ہوا جھروکا (oriel) بنایا گیا ہے، جو سہاروں (corbels) پر قائم ہے۔ یہ سہارے کسی ہندو عمارت کے مسالے کو دوبارہ استعمال کر کے بنائے گئے ہیں اور جن کا مصرف ایک مزید حجرہ دید بانی ہے۔ اس طرح نیچے کی ٹھوس بنیاد پر دو بالائی دالان بن گئے ہیں، جن میں چھوٹی توپوں کے لیے موکھے رکھے گئے ہیں۔ پرندہ میں۔ جس کی تعمیر بیشتر دوسرے دکنی قلعوں کی طرح محمود گوان سے منسوب ہے، لیکن جو درحقیقت زیادہ قدیم ہیں۔ جو برج قلعہ (fausse-braye) پر ہیں انہیں اور پردے کی دیوار کو بھاری اور آگے کو

انجینٹروں سے کام لیا گیا۔ اسی طرح محمد شاہ ثالث (۵۸۶۷/۱۳۶۳ء تا ۵۸۸۷/۱۳۸۲ء) کے عہد میں دکن میں بارود کا استعمال شروع ہونے کے بعد اس کے وزیر محمود گوان کے ہاتھوں مزید تجدید کے وقت بھی مدور دمدے کی جگہ زیادہ تر کثیر الاضلاع قسم کے دمدوں نے لے لی اگرچہ بعض مدور اور مربع برج باقی رہ گئے ہیں۔ تعمیر نو کے موقع پر قریب قریب جڑے ہوئے برکانی پتھر (trapstone) کے بڑے بڑے ٹکڑوں کی جگہ چھوٹے چھوٹے شکستہ پتھروں نے لے لی، جنہیں گارے کے زیادہ گہرے کھانچوں میں جمایا گیا ہے۔ برج بنیاد کے قریب ٹھوس ہیں اور ان کی حفاظت حجروں سے کی گئی ہے، جو اسی سطح پر بنے ہیں جس پر پردے کے کنگرے ہیں اور اپنے کنگروں سمیت ان سے ایک منزل اونچے ہیں۔ ان کی اور پردے کی حفاظت صندوق نما نطف اندازوں یا تیر کشوں سے کی گئی ہے۔ بے قاعدہ احاطے کے کونوں اور احاطے کے اندر بڑے اور بھاری دمدے ہیں، جن میں سے بعض در آمد کردہ برکانی پتھر سے اور بعض ریتلے سرخ پتھر (laterite) سے بنے ہیں۔ ان دمدوں کو بھاری توپوں کے نصب کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ ان کی حفاظت، جیسے مثلاً کلیانی برج میں، بعض اوقات دو یا دو سے زیادہ سوراخدار پردوں سے کی گئی ہے اور ان میں سپاہیوں کی بڑی تعداد سما سکتی ہے۔ بیدر کی فصیلیں برید شاہی عہد کی ہیں (تعمیر شدہ ۵۹۶۲/۱۵۵۵ء تا ۵۹۶۵/۱۵۵۸ء)۔ ان کے سینتیس دمدوں میں منڈا برج بھی شامل ہے، جو دو مستحکم منزلوں کا ہے اور جس میں اس زینے سے پہنچ سکتے ہیں جو خود دمدے کی عقبی دیوار میں بنایا گیا ہے۔ اس دمدے پر ایک دور مار توپ نصب کی جاتی تھی۔ قلعے کی پردے کی دیوار کی طرح یہاں بھی دمدوں کو مختلف



ان موکھوں کو پتھروں کے چھجوں (hoods) سے محفوظ کیا گیا ہے۔ ان میں سے کئی ایک کو بعد ازاں اس طرح بدل دیا گیا کہ ان پر بھاری توپیں نصب کی جاسکیں (محمد اور علی عادل شاہ ثانی کے کتبات)۔ ان میں سے ایک فرنگی یا تابوت برج کہلاتا ہے۔ یہ برج اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس میں کئی بڑے بڑے 'جنگال' آجائیں۔ بلند زمین پر خاصے اندر کو اوپری یا حیدر برج ہے، جو ایک ضخیم بیضوی شکل کا مچان (cavalier) ہے اور کوئی چوبیس میٹر بلند ہے۔ اسے ایک بڑی توپ (نومیٹر سے زیادہ لمبی نال کو جس کا دہانہ پندرہ سینٹی میٹر تھا) نصب کرنے کے لیے تعمیر کیا گیا تھا (کتبہ ۱۸۵۳/۵۹۹۲)۔ شیرزہ برج، جو سب سے بڑے برجوں میں سے ایک ہے، پردے کی دیوار سے باہر کو بنایا گیا ہے اور اس سے ایک چوڑے راستے کے ذریعے ملا دیا گیا ہے اور مل کر ان کی شکل سر اور گردن کی سی ہو جاتی ہے۔

دکن کی متاخر قلعہ بندیاں، جنہیں مرہٹوں کے تفوق کے زمانے میں تعمیر یا از سر نو تعمیر کیا گیا تھا، عموماً اسلامی ہند کے نمونے پر بنی ہیں۔

۴۔ شمالی ہندوستان دسویں / سولہویں صدی سے بارہویں / اٹھارویں صدی تک : بابر کی فتح (۱۵۲۶/۵۹۳۲) کے شروع زمانے میں کسی نئی طرز عمارت کا ظہور نہیں ہوا، اگرچہ گوالیار کے ہندو قلعے میں بابر کی دلچسپی اس کے وارثوں تک بھی پہنچی، جنہوں نے بہترین قسم کے قصر نما قلعے تعمیر کیے۔ اس کے بیٹے ہمایوں نے دہلی کا ایک شہر بنوایا، جو دین پناہ کہلاتا ہے لیکن اسے . . . شہنشاہ شیر شاہ سوری نے مسمار کر دیا۔ شیر شاہ نے خود اپنا ایک شہر بنانا شروع کیا، جس میں سے اب قلعے کے سوا کچھ بھی باقی

بہکے ہوئے دیدبانوں (bartizons) سے محفوظ کیا گیا ہے۔ قندیلار (یزدانی : Hyd. Arch. Dept. Report، ۱۳۳۱ تا ۱۳۳۳ ش / ۱۹۲۱ تا ۱۹۲۳ء، ص ۳) میں قلعہ (fausse-braye) کے اوپر بنے ہوئے دمدے مدور ہیں، لیکن پردے کے دمدے مستطیل ہیں اور ان میں ۱۵۸۸/۵۹۹۸ء کے کتبے ہیں، جن میں اس عمارت کو بنانے والے ترکوں کے نام ہیں۔ کلیانی میں جو کثیر الاضلاع اور مدور برج ہیں ان میں کنگروں (merlons) کی جگہ چھجوں کے اوپر صندوق نما نطف انداز بنائے گئے ہیں اور دیدبان (barbican) کے اندر ایک نمایاں دمدے میں ایک دیوار بند (mural) حجرہ ہے، جس کی حفاظت دیدبانوں (bartizons) سے کی گئی ہے۔ کنگروں کے اوپر ایک چبوترہ (barbette) ہے، جس میں تیر کشوں کی اوپر نیچے دو قطاریں ہیں۔ گولکنڈہ [رک باں] کے پرانے کاکتیبہ کے قلعے میں آگے پیچھے تین پردے کی دیواریں ہیں، جن میں طرح طرح کے برج ہیں۔ یہ قلعہ ۱۵۶۶ء / ۱۳۶۳ء میں بہمنیوں کو دے دیا گیا تھا۔ مربع، اسطوانی، نوکدار، کثیر الاضلاع قلعے کے دروازے کے سامنے کی اوٹ یا گھونگٹ (mantlet) میں ایک نیم سیزدہ پہلو برج ہے اور غیر متساوی الاضلاع مثلث اور ایک متاخر احاطے کے اوپر ایک ایک نو گوشہ دمدے ہے، جو خاصا آگے کو نکلا ہوا ہے اور جس کے گوشے مل کر باہر کے رخ ایک ربع دائرہ بناتے ہیں۔ یہ آخری چیز نڈرگ میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ بیجا پور [رک باں] میں شہر کی دیواریں علی عادل شاہ اول کے عہد کی ہیں (تاریخ تکمیل، ۱۵۶۵/۵۹۷۳ء)۔ یہ دیواریں ایک جیسی نہیں کیونکہ ہر امیر کے ذمے ایک حصے کی تعمیر تھی۔ ان میں کوئی چھیانوے دمدے ہیں، جو زیادہ تر نیم مدور ہیں اور جن میں موکھے بنے ہیں۔

محفوظ دالان ہے، جس میں تیرکشوں (loop holes) کی دو قطاریں ہیں۔ ان کے اوپر کے کمروں میں چند سوراخدار کنگرے (merlons) ہیں، جن کے بعض چھجے (hoods) پتھر کے ہیں اور بعض جالیدار ہیں۔ ان دو برجوں میں سے ایک کے اوپر چھتری ہے۔ عمارت کی پوری دیواریں سرخ ریتلے پتھر کی ہیں، جسے شکستہ پتھروں کے قالب (core) پر جڑا گیا ہے۔ اکبر کا نیا شہر فتح پور سیکری (۱۵۷۱ء/۱۵۷۹ء) اپنی قلعہ بندی کے لحاظ سے کوئی خاص امتیاز نہیں رکھتا؛ باہر کا اکہرا پردہ نا مکمل ہے اور اس کے نیم مدور دمدے محض فصیل میں ابھار کی طرح ہیں۔ قلعے کو چار دیواری سے گھیر لیا گیا تھا، مستحکم نہیں کیا گیا تھا، اگرچہ اسے اپنے بڑے دمدے پر ناز ہے، یعنی اس سنگین برج پر جو مشن شکل کا ہے اور جس میں محافظوں کے لیے ایک اندرونی دالان ہے۔ اس کا مصرف بھی غالباً رسمی ہے نہ دفاعی۔ یہ نیا شہر جلد ہی اجڑ گیا اور اکبر آگرے سے واپس چلا گیا، جہاں بعد ازاں اس کا بیٹا جہانگیر بھی قیام پذیر رہا۔ مشن برج غالباً اسی کے عہد کا ہے (جسے بعد میں سمن (یا سمن) برج کہنے لگے تھے)۔ یہ نیم مشن شکل کا ہے اور دریا کے رخ پر نکلا ہوا ہے اور ایک نیم مدور پشتے پر قائم ہے۔ اس کی دو منزلیں ہیں۔ ہر رخ پر کھلے محرابی راستے ہیں، جن میں نفیس پچی کاری (pietra dura) سے آرائش کی گئی ہے۔ اس عمارت کا کچھ حصہ غالباً شاہجہان کے عہد کا ہے، جس کی بڑی عمارتیں دہلی [آرک باں] اور لاہور [آرک باں] میں تھیں۔ دہلی کا نیا قلعہ (لال قلعہ) ۱۶۳۸ء/۱۶۴۸ء میں شروع ہوا اور دس سال کے اندر مکمل ہوا۔ اس کی تقریباً مربع چار دیواری میں نیم دائرے کی شکل کے دمدے ہیں، جو مساوی فاصلوں پر بنے ہیں اور جن کی

نہیں رہا۔ یہ شہر اسی مقام پر تعمیر ہوا تھا جہاں قدیم اندرپرستھا آباد تھا اور اب پرانے قلعے یا قلعہ کہنے کے نام سے موسوم ہے۔ غیر متساوی الاضلاع فصیل کی دیواریں اور دور دور بننے ہوئے دمدے بھدی چنائی کے شکستہ پتھروں کے ہیں، اور دروازے، جن میں سے ہر ایک کے پہلوؤں میں دو زیادہ آگے کو نکلے ہوئے دمدے ہیں، عمدہ رنگا رنگ کے تراشیدہ پتھروں سے بنائے گئے ہیں۔ برج نیم مدور ہیں اور پانچ میٹر بلندی تک ٹھوس ہیں۔ ان کے اوپر کئی کمروں اور غلام گردشوں کی منزلیں ہیں، جن میں چھوٹے صندوق نما نفط ریز ہیں۔ ایک دروازے میں ایک اندرونی سوراخدار پردہ (machicolation) ہے، جو ہندوستان میں ایک نئی چیز تھی۔ پرانے قلعے میں ہمایوں کے دوبارہ قیام پذیر ہونے سے کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ مغل قلعوں کی تعمیر اکبر سے شروع ہوئی۔ آگرے میں سکندر لودھی کا قلعہ کھنڈر ہو چکا تھا۔ اسے گرا دیا گیا اور نئی تعمیر ۱۵۶۳ء/۱۵۶۴ء میں شروع ہوئی۔ اندرونی اور بیرونی پردوں پر نیم مدور دمدے ہیں، جن کی بلندی وہی ہے جو دیواروں کی؛ اندرونی دائرہ بیرونی دائرے سے بہت اونچا ہے اور تیس میٹر کی بلندی تک پہنچ گیا ہے، بیرونی اور اندرونی دمدے ہم مرکز ہیں اور دونوں میں سوراخدار کنگرے ہیں، جنہیں ترکشوں کی دو یا زائد قطاروں سے محفوظ کیا گیا ہے اور بعض کی حفاظت نیچے کی طرف آتشباری کرنے کے لیے پتھروں کے چھجوں (hoods) سے کی گئی ہے۔ مغرب میں واقع اندرونی دہلی دروازے کی حفاظت دوشاندار نیم مدور مشن دمدوں سے کی گئی ہے۔ نیچے کی منزل کی سطح پر ایک محرابدار بند (blind) راستہ ہے، جسے سنگ مرمر اور رنگا رنگ کے تراشیدہ پتھروں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ پہلی منزل میں ہر سمت ایک بیرونی جھروکا ہے اور اوپر ایک



ان مغل برجوں کو قلعہ بند عمارتیں ہونے کا کوئی دعویٰ نہ تھا، اور اس طرح جس چیز کا ایک مہیب فوجی عمارت کے طور پر آغاز ہوا وہ مغل آرٹ کی جلوہ گری کا ایک ذریعہ بن گئی۔ دہلی میں شاہجہان کی بنوائی ہوئی دیواروں میں یقیناً دمدے ہیں لیکن انہیں برطانوی عہد میں اتنی دفعہ دوبارہ بنایا گیا ہے کہ اصلی مغل خاکے کو پہچاننا ممکن نہیں رہا۔

مآخذ: (۱) *The Strongholds of India* : S. Toy لندن ۱۹۵۷ء، اس میں بعض مسلم قلعہ بندیوں کے محل وقوع کا ذکر ہے اور برجوں کے بارے میں بہت کم معلومات ہیں؛ اس کی تاریخی معلومات ناقابل اعتماد ہیں اور قلعہ بندی کی کوئی تاریخ نہیں ہے۔ اس پر *The study of fortification in India and Pakistan* میں J. Burton-Page نے تبصرہ اور اضافہ کیا ہے، در *BSOAS*، ج ۲۳/۲، ۱۹۶۰ء۔ دہلی سلطنت کی عمارتوں کے لیے دیکھیے: (۲) *ASI Report* : A. Cunningham، ج ۱، ۱۸۷۱ء؛ (۳) *ASI Report* : J. D. Beglar، ج ۳، ۱۸۷۳ء؛ (۴) *Adilabād : a* : H. Waddington، در *Ancient India*، ج ۱، ۱۹۳۶ء؛ (۵) *A memoir on Kotla Firoz* : J.A. Page، در *Shah, Delhi*، در *MASI*، عدد ۵۲، دہلی ۱۹۳۷ء؛ (۶) نیز رگ بہ مآخذ تحت مقالات: دہلی: آثار اور دہلی: سلطنت؛ فن؛ (۷) دکن کے قلعوں کے لیے رگ بہ مآخذ تحت مقالات: بہمنی خاندان: آثار؛ یجاپور؛ دولت آباد؛ گولکنڈہ؛ (۸) نیز کندھار *Kandahār* کے لیے غلام یزدانی، در *Hyd. Arch. Dept. Report*، ۱۳۳۱ تا ۱۳۳۳ فصلی / ۱۹۲۱ تا ۱۹۲۳ء، عدد ۳؛ اور *EIM*، ۱۹۱۹ تا ۱۹۲۰ء، عدد ۲۔ مغل قلعوں کے لیے دیکھیے: (۹) *ASI Report* : A. C. L. Carlley، ج ۴، ۱۸۷۳ء (آگرہ)؛ (۱۰) *Agra and the Taj* : E. B. Havell، لندن *The Moghul Architec-* : E.W. Smith، ۱۹۱۲ء

حفاظت ان کی بلندی کے تقریباً نصف میں تیر کشوں کی ایک قطار اور کنگروں میں دو قطاروں سے کی گئی ہے۔ کنگروں کو نکالا بنا کر مزین کیا گیا ہے۔ ہر برج کے اوپر ایک چھتری ہے۔ دیدبانوں پر اسی وضع کے برج [شاہنشاہ] اورنگزیب کے عہد کے ہیں۔ دریا کے رخ کے شمالی اور جنوبی دمدے زیادہ بڑے ہیں اور صحن کی سطح سے دو منزل اونچے ہیں۔ ان کے اوپر چھتریاں بنی ہیں اور یہ شاہ برج اور اسد برج کہلاتے ہیں۔ ان کے مابین ایک زیادہ بڑی نیم مشن عمارت ہے یعنی مشن برج، جسے شروع میں برج طلا بھی کہتے تھے، کیونکہ اس کے اوپر سونے کے ملمع کا ایک مسی گنبد تھا، اس کے پانچ پہلو، جو دریا کے رخ ہیں، سنگ مرمر کی جالیوں سے بھرے گئے ہیں۔ لاہور کے قلعے میں بھی، جو اکبر نے تقریباً اسی زمانے میں بنایا تھا جب کہ آگرے کا (ابوالفضل: آئین اکبری، ترجمہ Blochmann، ۱ : ۵۳۸)، ایک ایسا ہی شاہ برج ہے جسے مشن برج کہتے ہیں (کتبے کی رو سے ۱۰۳۱/۱۶۳۱-۱۶۳۲ء میں مکمل ہوا)۔ یہ برج بہت بڑے حجم کا ہے (قطر پینتالیس میٹر)۔ منوچی Manucci اپنی تصنیف *Storia do mogor* میں ان عمارتوں کے بارے میں کہتا ہے کہ ”ہر جگہ (دہلی، آگرہ، لاہور) ایک بڑا دمدہ ہے، جو شاہ برج *Xaaburg* کہلاتا ہے۔ یہ دمدے قبہ دار ہیں اور ان میں عمدہ عمارتی مینا کاری (enamel) کی آرایش ہے، جس میں بہت سے قیمتی پتھر بھی شامل ہیں۔ یہاں بادشاہ خاص خاص لوگوں کے لیے اکثر دربار منعقد کرتا رہتا ہے اور یہیں سے وہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھتا ہے۔۔۔“ (ترجمہ Irvine، ۲ : ۳۶۳)۔ علاوہ ازیں دہلی کا مشن برج یقیناً شہنشاہ کے ”درشن“ (رسمی طور پر لوگوں کے سامنے آنا) کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔

دوسرے فوجی، جو مشرقی ممالک کے رہنے والے تھے، نیز غالباً مصر کی عام آبادی ناراض تھی۔ برجوان نے اس سلسلے میں شرقیوں کا ساتھ دیا۔ اس نے ۵۳۸۶/۶۹۹۶ء میں دمشق کے ترک والی منگتکین کو خط لکھ کر دعوت دی کہ اپنی فوجیں لے کر آئے اور مصر نیز خلیفہ کو بربروں کے ظلم سے نجات دے۔ منگتکین ترکوں، دیلمیوں، حبشیوں اور مقامی عربوں کی مدد سے مصر کی طرف بڑھا لیکن اس نے عسقلان کے تریب ابن عمار کی بھیجی ہوئی بربر فوج سے، جس کی کمان سلیمان بن جعفر بن فلاح کے ہاتھ میں تھی، شکست کھائی۔ برجوان وقتی طور پر ابن عمار کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور ہو گیا لیکن کچھ عرصہ بعد وہ ایک بگڑے ہوئے بربر افسر جیش بن صمصامہ کی مدد سے ابن عمار کو پھر دعوت مبارزت دینے کے قابل ہو گیا اور اس دفعہ اسے کامیابی ہوئی۔ ابن عمار کو کھلی جنگ میں شکست ہوئی اور وہ فرار ہو کر روپوش ہو گیا۔ دوسری طرف برجوان نے بحیثیت ”واسطہ“ اختیارات سنبھال لیے اور وہ مملکت کا اصل مختار بن گیا (۲۸ رمضان ۵۳۸۷/۴ اکتوبر ۶۹۹۷ء)۔ برجوان نے مصر میں ہزیمت خوردہ بربروں سے نرمی برتی لیکن ان کی قوت مستقل طور پر ختم ہو گئی۔ دمشق کا بربر والی بر طرف کر دیا گیا اور اس کی کتالی فوج کا قتل عام ہوا۔ شام میں بدنظمی کا ایک دور شروع ہو گیا، جسے برجوان نے سخت کارروائی سے ختم کیا۔ فلسطین اور صور (Tyre) میں عرب باغی کچل دیے گئے اور بوزنطیوں کے بری اور بحری حملے پسپا کیے گئے۔ سیاسی گفت و شنید بوزنطی اور فاطمی سلطنتوں کے درمیان ایک دہ سالہ عارضی صلح کے معاہدے کی صورت میں منتج ہوئی۔ مغرب میں برجوان نے برقہ اور طرابلس کو فتح کیا اور ان دونوں مقامات میں

ثا ۱۸۹۴، ۱۸، ج ۱، NIS، ASI، ture of Fathpur-Sikri  
Tile-mosaics in the : J. Ph. Vogel (۱۱)؛ ۱۸۹۸ء  
(۱۲)؛ ۱۹۲۰ء، ج ۱، NIS، ASI، Lahore fort  
Guide to the buildings and gardens : G. Sanderson  
Dehli Fort، دہلی ۱۹۱۳ء۔

(J. BURTON-PAGE)

\* بَرَج : رَكَ به علم نجوم .

\* بَرَجْرَد : رَكَ به بَرُوَجْرَد .

\* بَرَجْوَان : ابوالفتح، ایک غلام، جو کچھ عرصے تک [خلیفہ] الحاکم کے عہد میں مصر کا فرمانروا رہا۔ اس کی تربیت [خلیفہ] العزیز کے دربار میں ہوئی تھی، جہاں وہ داروغہ کے عہدے پر فائز تھا (خطط، ۲ : ۳؛ ابن تغری بردی، قاہرہ، ۴ : ۳۸؛ ابن خلیکان، ۲ : ۲۰۱)۔ وہ خواجہ سرا تھا اور استاذ [رَكَ بَا] کے لقب سے ملقب تھا۔ اس کی نسل کے متعلق کوئی یقینی بات معلوم نہیں۔ ابن خلیکان نے اسے حبشی اور ابن القلانسی نے صرف ایض اللون لکھا ہے۔ المقریزی نے اسے صقلی یا صقلی کہا ہے، کیونکہ خطط کے قلمی نسخے میں صقلی اور صقلی دونوں طرح پڑھا جاتا ہے (قب دی ساسی de Sacy : Chrestomothie، ۱ : ۱۳۰)۔

برجوان کو [خلیفہ] العزیز نے خلافت کے کم سن وارث کا ولی مقرر کیا اور جب رمضان ۵۳۸۶/ اکتوبر ۶۹۹۶ء میں العزیز کا انتقال ہوا تو اس نے اپنے زیر ولایت لڑکے کو خلیفہ الحاکم کا نام دے کر اس کی خلافت کا اعلان کر دیا۔ شروع شروع میں اس کا کام نو عمر فرمانروا کی ولایت تک محدود تھا۔ حکومت کے اصل اختیارات واسطہ ابن عمار الکتالی کے ہاتھ میں تھے، جو بربری فوجوں اور فرقے کا سردار تھا۔ ابن عمار کا اقتدار نو عمر خلیفہ اور اس کے ولی کو بلاشبہ ناگوار گزرتا تھا اور اس میں شک نہیں کہ بربروں کے تفوق سے ترک اور



فعل کا جواز بیان کرتے ہوئے برجوان پر الزام لگایا کہ وہ اس کے خلاف سازش کر رہا تھا۔ اس نے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ اس کی کم عمری اور نا تجربہ کاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی مدد کریں۔ اسی نوعیت کے مکتوبات باہر بھی بھیجے گئے۔ دروژی مکتوب السیرة المستقیمة میں، جو حمزہ کے قلم سے ہے، ایک دل چسپ عبارت ملتی ہے۔ اس میں فوج کی ناراضی کے خوف سے بے نیاز ہو کر نوجوان خلیفہ کا برجوان کو ہلاک کرنا ایک ایسا جرأت مندانہ اقدام قرار دیا گیا ہے جس کی سابق میں کوئی نظیر نہیں ملتی اور جو الحاکم کی حکومت کی معجزانہ خصوصیت پر دلالت کرتا ہے (المقتبس، ۵: ۳۰۶)۔

کہتے ہیں کہ برجوان بہت صاحبِ ذوق اور دنیاوی لذات کا شیدائی تھا۔ اس کا مکان شاعروں اور مغنیوں کی جلسہ گاہ تھا۔ جب وہ مرا تو لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس نے اپنے پیچھے کتنے کثیر اور کیسے گونا گوں ملبوسات، کتابیں، اصطبل کے جانور اور ساز و سامان چھوڑا ہے۔ قاہرہ میں ایک سڑک اس کے نام سے منسوب ہے۔

\_\_\_\_\_ مآخذ: (۱) ابن الصیرفی: الإشارة إلى من نال الوزارة، ص ۲۷ تا ۲۸؛ (۲) سورس Severus بن المقفع: Patriarchs، ۲: ۱۲۱؛ (۳) ابن القلابی، ص ۴۴ تا ۵۱، ۵۹؛ (۴) ابن المیسر، ص ۵۱، ۵۲، ۵۳ تا ۵۵؛ (۵) ابن خلکان، ۱: ۱۱۰ (انگریزی ترجمہ، ۱: ۲۵۳) و ۲: ۲۰۱؛ (۶) ابن الأثیر، ج ۹، بحد اشاریہ: (۷) ابن خلدون: العبر، ۳: ۵۷؛ (۸) ابن العبری (Bar-Hebraeus): Chronographia، انگریزی ترجمہ، ص ۱۸۰، ۱۸۲؛ (۹) ابن تغری بردی، قاہرہ، ج ۴ بحد اشاریہ: (۱۰) یحییٰ بن سعید الأنطاکی: Annales، طبع شیخو Cheikho، ص ۱۸۰ و طبع Vassiliev و Kratschkovski، ص ۴۰۳، ۴۰۴؛ مفصل ترین بیان کے لیے دیکھیے: (۱) المقریزی: خطط، ۳: ۲

خواجہ سرا والی مقرر کیے۔ مؤخر الذکر فتح بہت قلیل المیعاد ثابت ہوئی۔ ان کامیابیوں سے برجوان کی جرأت اتنی بڑھ گئی کہ اس نے خلیفہ کے ساتھ جابرانہ سلوک شروع کر دیا، یہاں تک کہ بعض مآخذ کی رو سے اس نے خلیفہ کے گھوڑے پر سوار ہونے اور تحائف میں روپیہ صرف کرنے پر بھی پابندی عائد کر دی (النویری؛ ابوالفرج ابن العبری)۔ النویری نے ایک عجیب قصہ بیان کیا ہے: کہتے ہیں کہ برجوان الحاکم کو "وزغہ" (= چھپکلی) کے نام سے پکارا کرتا تھا۔ یہ لقب خلیفہ کو بہت ناگوار تھا، چنانچہ جب الحاکم نے برجوان کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے طلب کیا تو اس کا پیغام یہ تھا کہ "برجوان سے کہو کہ ننھی چھپکلی بہت بڑا اژدھا بن گئی ہے اور اب اسے بلاتی ہے"۔ الحاکم کی ناراضی کو ایک اور غلام خواجہ سرا ابوالفضل ریدان الصقلی نے بھی ہوا دی۔ اس نے خلیفہ کو خبردار کیا کہ برجوان اب کافور کی ریس کرنے والا ہے اور اس کے ساتھ وہی سلوک کرنے کے درپے ہے جو کافور نے اخشیدیوں کے ساتھ کیا تھا۔ ۲۶ اور ۲۷ ربیع الثانی ۵۳۹ھ اپریل ۱۰۰۰ء کی درسیانی شب کو خلیفہ کے حکم سے ریدان نے خنجر بھونک کر برجوان کو ہلاک کر دیا (ابن الصیرفی، نے صحیح دن نہیں بتایا؛ ابن خلکان؛ المقریزی؛ ابن میسر کے ہاں "تسعین" کی جگہ "سبعین" صریحاً غلط لکھا ہے: ابن القلابی اور اس کے بعد ابن الأثیر نے سال ۵۳۸۹ بتایا ہے)۔

برجوان کے قتل سے عام باشندوں اور ترکوں دونوں میں سخت ناراضی پھیل گئی، کیونکہ انہیں بلاشبہ یہ خدشہ تھا کہ بربروں کی حکومت پھر قائم ہو جائے گی، تاہم خلیفہ اپنے قصر کے دروازے کے اوپر مسلح مجمع کے سامنے آیا اور اپنے

قلاوون (از ۵۶۷۸/۵۱۲۷۹ تا ۵۶۸۹/۵۱۲۹۰) اور اس کے لڑکے الاشرف خلیل (۵۶۸۹/۵۱۲۹۰ تا ۵۶۹۳/۵۱۲۹۳) کے عہدِ سلطنت میں برجیہ کا امورِ مملکت میں دخیل ہونا زیادہ نمایاں نہ تھا، لیکن خلیل کے قتل کیے جانے کے فوراً بعد ان کا ذکر امیر سنجر الشجاعی کے ممتاز ترین طرف داوروں کی حیثیت سے آتا ہے۔ ان کے مقابلے میں اس کے مددِ مقابل امیر کتبغا کے طرف دار وافیہ [رک بان] تاتاری اور شہر زوری کرد تھے۔ کتبغا نے سنجر کو شکست دی اور صغیر سن بادشاہ الناصر محمد بن قلاوون (۵۶۹۳/۵۱۲۹۳) کو معزول کر کے خود تخت نشین ہو گیا۔ اس نے برجیہ سے انتقام اس طرح لیا کہ ان کا ایک حصہ قلعے سے نکال دیا اور دارالسلطنت کے مختلف مقامات— میدان اللوق، الکبش اور دارالوزارۃ— میں انہیں رہنے کی جگہ دی۔

یہ پہلی ضرب تھی جو اس جمعیت پر پڑی مگر کتبغا کو بہت جلد معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ لاجین (۵۶۹۶-۵۱۲۹۶) نے سنبھالی اور برجیہ کی حیثیت پھر بحال ہو گئی۔ جب انہوں نے اپنے سالار کرجی مقدم البرجیہ کی زیرِ قیادت سلطان لاجین (۵۶۹۸/۵۱۲۹۸) کو قتل کر دیا تو وہ انتہا درجے کے طاقتور ہو گئے۔ الناصر محمد بن قلاوون (۵۶۹۸/۵۱۲۹۸ تا ۵۷۰۸/۵۱۳۰۸) کے دوبارہ سلطان ہو جانے کے زمانے میں اس فوج کے سردار رفتہ رفتہ مملوک سلطنت کے اصلی فرمانروا بن گئے۔ جب امیر بیبرس الجشکی اور سالار میں تخت کے لیے جنگ ہوئی تو برجیہ فطری طور پر بیبرس کے حامی تھے، کیونکہ وہ انہیں میں سے ایک تھا۔ اس کے مقابلے میں سالار کے طرفدار الصالحیہ اور الظاہریہ تھے۔ (الصالحیہ اس بحریہ فوج کا باقی ماندہ حصہ تھے جسے الصالح نجم الدین ایوب

تا ۳۰؛ قب وہی کتاب، ص ۲۸۵ (= Silvestre de Sacy : Chrestomathie arabe، ۱، پیرس ۱۸۲۶ : ۵۲ بعد اور ترجمہ، ص ۹۳ بعد)؛ نیز دیکھیے : (۱۲) Exposé de la Religion des Druzes: Silvestre de Sacy، پیرس ۱۸۳۸، ۱ : cclxxxiv تا ccxcv : (۱۳) History of Egypt in the Middle : S. Lane-Poole، ص ۱۲۳ تا ۱۲۵ : (۱۴) L' Egypte : G. Wiet، ص ۱۹۷ تا ۱۹۹ : (۱۵) محمد عبداللہ عنان : الحاکم بامر اللہ، قاہرہ [۱۹۳۷]، ص ۳۳ تا ۳۹ : (۱۶) Die Slawen im Dienste der fātimiden : I. Herbek، در ۲۱، (۱۹۵۳) : ۵۷۰ تا ۵۷۶ .

(B. LEWIS)

برجیہ : مملوک سلطنت کی پوری تاریخ میں برجیہ کی فوجی جمعیت (Regiment) صرف بحریہ [رک بان] کی جمعیت سے دوسرے درجے پر تھی۔ سلطان المنصور قلاوون نے اس کی بنا ڈالی اور اپنے ہی ممالک میں سے تین ہزار سات سو آدمی اس غرض سے پہنچائے کہ انہیں قاہرہ کے برجوں ("ابراج"، مفرد برج) میں رہنے کی جگہ دی؛ چنانچہ اسی وجہ سے اس فوج کا نام برجیہ مشہور ہو گیا۔ ماخذ میں اس فوج کے بنانے کا ذکر صرف اس جگہ آیا ہے جہاں وہ قلاوون کے زمان سلطنت کے اختتام پر اس کے عہد کے کارنامے گنواتے ہیں لیکن بنائے فوج کی تاریخ کی صراحت نہیں کرتے۔ اس فوج کو ان ممالک سے ترتیب دیا گیا تھا جو اہل قفقاز (الجرکس و الاص = چرکسی اور ابخازی) سے تھے۔ المقریزی (خطط، ۲ : ۲۱۳ و ۱۱۹ : ۲۲ تا ۲۶) آص کے بجائے اہل ارمنیہ (ارمن) کا نام لکھتا ہے۔ اسی مقام میں اس نے خطائیوں اور تپچاقیوں کا ذکر بھی کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ خاصکیہ [رک بان] کے فرائض انجام دیتے تھے، لیکن وہ برجیہ میں شامل نہیں معلوم ہوتے۔



۱۵۱۳۵۰ : ۱ : ۵۰۲ تا ۵۰۷ : (۷) ابن تفریہردی :  
 النجوم الزاهرة، قاہرہ ۱۹۳۸ تا ۱۹۴۳ء، ۷ : ۸ و ۳۳۰ :  
 ۳۵، ۳۸، ۳۹، ۱۰۰، ۱۰۲ تا ۱۰۳، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۱۳،  
 ۲۳۵، ۲۳۷، ۲۵۵، ۲۵۸، ۲۷۰ : (۸) المنہل  
 الصافی، ۵ : ورق ۳۲ الف و ۸ : ورق ۳۳ الف : (۹)  
 المقریزی : کتاب السلوک، طبع زیادہ، قاہرہ ۱۹۳۳ -  
 ۱۹۳۴ء : ۱ : ۲۳۶، ۲۹۸، ۸۰۲، ۸۰۸ تا ۸۱۰، ۸۶۷ و  
 ۲ : ۲۵، ۳۷، ۳۳، ۳۵، ۳۶، ۵۲ تا ۵۳، ۵۸، ۵۹،  
 ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۳، ۷۶، ۱۰۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۲۶، ۵۲۳ :  
 (۱۰) وہی مصنف : خط، ۲ : ۱۳۳، ۲۱۳ .

(ب) تصانیف : (۱۱) G. Weil : *Geschichte des*  
*Stuttgart 'Abbaside chalifats in Egypten*  
 ۱۸۶۰ء : ۱ : ۱۷۰ : (۱۲) لین پول S. Lane-Poole :  
*A History of Egypt in the Middle Ages* لندن  
 ۱۹۳۶ء، ص ۲۸۲ : (۱۳) G. Weil : *L'Égypte*  
*musalmane*، در *Précis de l'Histoire d'Égypte*، ج ۲،  
 قاہرہ ۱۹۳۲ء : (۱۴) وہی مصنف : *L'Égypte Arabe*،  
 در *Histoire de la Nation Égyptienne*، ج ۴، پیرس  
 ۱۹۳۷ء : (۱۵) W. Popper : *Egypt and Syria*  
*under the Circassian Sultans*، برکلے  
 ۱۹۵۷ء، ۲ : ۱۱ : (۱۶) علی ابراہیم حسن : تاریخ  
 الممالیک البحریہ، قاہرہ ۱۹۳۳ء، بمدد اشاریہ، بذیل  
 مادہ الممالیک البرجیہ .

(D. AYALON)

- بردان : خلفائے عباسیہ کے زمانے میں عراق کا ایک شہر۔ عرب جغرافیہ نگاروں کا بیان ہے کہ اس کا جامے وقوع بغداد سے پندرہ میل شمال کی جانب سامرا جانے والی شاہ راہ پر دجلے کے مشرقی کنارے سے تھوڑے سے فاصلے پر اس جگہ سے ذرا اوپر تھا جہاں نہر الخالص اور دجلہ باہم ملتے ہیں۔ نہر الخالص، جو نہروان (یا دیالہ) کی ایک شاخ ہے، بردان سے بالکل ملی ہوئی بہتی تھی۔ خلیفہ

نہے قائم کیا تھا، اور الظاہریہ الظاہر بیبرس کے ممالیک تھے)۔ بیبرس جشنگیر نے سلار کو آسانی سے شکست دے دی اور الناصر محمد کی جگہ تخت پر قابض ہو گیا (۵۷۰ھ / ۱۱۷۰ء)۔

المظفر بیبرس کے زمان سلطنت میں برجیہ اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئے، لیکن ان کا یہ عروج چند روزہ تھا کیونکہ الناصر محمد تھوڑے ہی دن میں تیسری بار تخت نشین ہوا (۵۷۰ھ / ۱۱۷۰ء تا ۵۷۱ھ / ۱۱۷۱ء) اور اس نے برجیہ کو اقتدار سے محروم کر دیا۔ چونکہ الناصر اس مرتبہ تیس سال سے زیادہ مدت تک بلا انقطاع فرمانروا رہا، اس لیے برجیہ کا رفتہ رفتہ ایسا زوال ہوا کہ اس کی حکومت کے بعد کے ماخذ میں اس فوج کا نام بھی مشکل سے ملتا ہے۔

ممالیک کی سلطنت کے پہلے اور دوسرے دور کو مستشرقین عام طور پر "بحری اور برجی دور" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ اصطلاح عہد مملوک کے اصل ماخذ میں مذکور نہیں۔ ان کے ہاں پہلے دور بلکہ ممالیک کے پورے عہد کا نام "دولۃ الترك" اور اس کے متاخر حصے کا نام "دولۃ الجرجس" ملتا ہے۔

ماخذ : (الف) مصادر : (۱) المفضل بن ابی الفضائل :

النہج السدید (در *Patrologia Orientalis*)، ۱۳ : ۵۸۳،  
 ۵۸۵، ۲۰۹ : ۱۷۰ : (۲) *Beiträger zur Geschichte der*  
*Mamlukensultane*، طبع Zetterstéen، لندن ۱۹۱۹ء،  
 ص ۳۰، ۳۲، ۵۰، ۱۲۹ : (۳) الذہبی : *دول الاسلام*،  
 حیدرآباد [دکن] ۱۳۳۷ھ، ۲ : ۱۵۷ : (۴)  
 ابن القرات : *تاریخ الدول و المملوک* (طبع  
 Zureik)، بیروت ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۷ء، ۸ : ۱۸۱،  
 ۱۸۳، ۱۹۱، ۱۹۲ : (۵) ابن خلدون : *کتاب العبر*،  
 قاہرہ ۱۲۸۳ھ، ۵ : ۳۶۱ تا ۳۶۲ : (۶) ابن حجر  
 العسقلانی : *الدور الکامنة*، حیدرآباد [دکن] ۱۳۳۸ تا

المنصور نے جب تک یہ پختہ ارادہ نہ کر لیا کہ اس جگہ جہاں آج کل بغداد ہے اپنا نیا دارالسلطنت تعمیر کرے اپنا دربار کچھ مدت تک یہیں منعقد کیا (قبّ الیعقوبی: البلدان، ص ۲۵۶)۔ ایک پل، ایک بازار اور ایک دروازہ (بعد میں ایک گورستان بھی) بغداد کے مشرقی نصف حصے میں تھا۔ یہ حصہ بھی بردان کے نام پر، جو بغداد سے ڈاک کی دو منزل کے فاصلے پر تھا، بردان ہی کہلاتا تھا، قبّ لیسٹرنج *Baghdad during the Abbasid Caliphate: Le Strange*، ص ۱۹۰، ص ۳۶ (اشاریہ)۔ مرصد [الأطلاع] کے مصنف نے جب یاقوت کی عبارت اپنی کتاب میں درج کی ہے اس وقت (تقریباً ۵۷۰ھ / ۱۱۳۰ء) بردان بالکل ویران ہو چکا تھا اور کوئی اسے جانتا بھی نہ تھا۔ اب اس کا سراغ بلاشبہ موجودہ بردان کے کھنڈروں کے ٹیلے میں مل سکتا ہے، جس کا جائے وقوع بالکل عرب مصنفین کے بیان کے مطابق ہے۔ عرب مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ بردان فارسی ”بَرْدَه دان“ (= قیدیوں کا گھر) کا معرب ہے۔ اس سے اس بات کا امکان نکلتا ہے کہ یہاں غالباً بخت نصر نے یہودیوں کی نو آبادی قائم کی ہوگی۔

مآخذ: (۱) BGA، بمواضع کثیرہ؛ (۲) یاقوت، ۱: ۵۵۱ بعد؛ (۳) ابن عبد الحق: مرصد [الأطلاع]، طبع Juynboll، ۱: ۱۶۸؛ (۴) M. Streck، *Babylonien nach den arab. geographien*، ۲: ۲۳۰ بعد؛ (۵) Le Strange، ص ۵۰؛ (۶) H. Petermann، *Chalifen: Weil*، ۲: ۵۶۹؛ (۷) *Reisen im Orient*، ۲ (۱۸۶۱): ۳۱۱؛ (۸) Černik، در *Pettermann's geogr Mitteil*، Erg. Heft، ۳۳، ۳۴، ۳۶ الف، ۳۸۔

(S. H. LONGRIGG و M. STRECK)

• بردر: جنوب مغربی ایشیائے کوچک کا

marfat.com

ایک قصبہ، جو اسی نام کی جھیل (= بردر کولی Burdur Gölü) کے جنوب مشرقی کنارے سے کوئی چار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بعض کی رائے ہے کہ قدیم Limobrama (جس سے Limnobria = جھیل کا شہر مراد لیا گیا ہے) اسی مقام پر یا اس کے قریب واقع تھا جہاں اس وقت بردر آباد ہے، مگر اس رائے کی صحت مشکوک ہے (رکبہ Ramsay، Pauly-Wissowa، بذیل مادہ Limobrama، اور Honigmann)۔ اس شہر کا موجودہ نام بردر (مقامی ترکی باشندے اپنی بولی میں اور بہت سے سیاح، جنہوں نے اس علاقے کی سیاحت کی ہے، اپنے سفرناموں میں اسے بلدر کہتے ہیں، نیز کلیسائے قدیم (Orthodox) کے عیسائی، جو پہلے زمانے میں یہاں رہتے تھے، اسے پردر (یونانی Πουρδού) کہتے تھے) یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ اور قرون وسطیٰ کا Polydorion (یونانی Πολυδώριον) ایک ہی چیز ہیں۔ جھیل بردر، سو یہ وہی قدیم Ασχανίαλίμνη ہے جو Pisidia میں تھی۔ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان بوزنطیوں اور ترکوں کے درمیان جو طویل جنگیں ہوئیں ان کے دوران میں بردر روم کے سلجوق سلاطین کے قبضے میں آ گیا؛ اس کے بعد چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں حمید کے بیگوں کی زیر حکومت چلا گیا اور آگے چل کر پندرہویں صدی عیسوی میں سلاطین عثمانیہ کی حکومت میں شامل ہو گیا۔ بردر کی آبادی پہلے زمانے میں کلیسائے قدیم کے عیسائیوں (Orthodox Christians) کی معتدبہ تعداد پر مشتمل تھی، جو ترکی کو اپنی زبان کے طور پر بولتے تھے (Cuinet) نے ضبط کیا ہے کہ اس شہر میں چار ہزار یونانی اور تقریباً ایک ہزار ارمن بھی بستے تھے)۔ عثمانی حکومت میں پہلے بردر آنادولو (Anadolu = اناطولی) کی ایالت کی سنجاق حمید کی ایک قضا تھا۔



۱ : ۸۳۲ بعد؛ (۱۳) سامی : قاموس الاعلام،  
استانبول ۱۳۰۶، ۲ : ۱۳۷۵؛ (۱۴) علی جواد :  
تاریخ و جغرافیہ لغاتی، استانبول ۱۳۱۳ تا ۱۳۱۴،  
ص ۲۰۶ تا ۲۰۷؛ (۱۵) Pauly - Wissowa، ۲ / ۲  
(۱۸۹۶ء) بذیل مادہ Λσχανία λίμνη، عمود ۱۶۱۰  
اور ۱۳ / ۱ (۱۹۲۶ء)، بذیل مادہ Limobrama، عمود  
۷۱۰؛ (۱۶) (۱۶) ت، بذیل مادہ Burdur (از Besim  
(Darkot).

(V.J. PARRY)

بردو سیر : راک بہ کرمان .

بردو : [صحیح تلفظ باردو] تونس کے حکمرانوں  
(Beys) کی اقامت گاہ، جو شہر تونس سے سوا  
بیل دور جنوب مغرب میں واقع تھی۔ بردو کا  
مقام موسم گرما میں اپنی خنک آب و ہوا کے باعث  
مشہور تھا اور پتا چلتا ہے کہ شہر کے امرا زمانہ قدیم  
سے وہاں جایا کرتے تھے اور وہاں ان کے باغ اور  
دیہاتی مکان تھے۔ بردو میں ابو فہر کا حدیقہ  
(= park)، تھا، جسے بنو حفص کے امیر المستنصر  
(۱۲۳۹ تا ۱۲۷۷ء) نے تیار کرایا تھا۔  
اس میں نادر درختوں کے جھنڈ تھے۔ اس میں ایک  
جھیل بھی تھی، جس میں زغوان کی کاریز کے ذریعے  
پانی پہنچتا تھا اور یہ اتنی بڑی تھی کہ اس میں  
حرم کی خواتین کشتیوں میں بیٹھ کر سیر و تفریح  
کرتی تھیں۔ سبزہ زار میں بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے  
بنگلوں میں پچی کاری کی ہوئی تھی اور چوبی  
منبت کاری سے ان کی آرائش کی گئی تھی (دیکھیے ابن  
خلدون : [العبر] Histoire des Berbers، مترجمہ دسلان،  
۲ : ۳۳۹)۔ سولہویں صدی عیسوی میں اکثر  
حکمران یہاں سکونت رکھتے تھے۔ ترکوں  
نے اپنے پیش روؤں کی اس روایت کو  
برقرار رکھا۔ Chevalier d'Arvieux نے قصر باردو  
(house of the Bards or of Bard) کا حال بڑی تفصیل

اس کے بعد ولایت قونیہ [رک باں] کا ایک سنجاق  
ہو گیا۔ آج کل یہ ترکی کے موجودہ صوبہ بردو کا  
سرکاری صدر مقام ہے۔ شہر کی آبادی بیس [پچیس]  
ہزار سے زائد ہے۔

مآخذ : (۱) ابن بطوطہ : تحفة النظائر، طبع  
C. Defrémery اور B.R. Sanguinetti، پیرس ۱۸۵۳ تا  
۱۸۵۹ء، ۲ : ۲۶۵ تا ۲۶۶؛ (۲) P. Lucas Voyage ... :  
Rouen، dans la Turquie، ۱۷۱۹ء، ۱ : ۲۳۳  
بعد؛ (۳) W.M. Leake Journal of a Tour in Asia :  
London، ۱۸۲۳ء، ص ۱۳۷ تا ۱۳۸، ۱۴۵ تا  
۱۴۶؛ (۴) F. V. J. Arundell A Visit to the Seven :  
London، ۱۸۲۸ء، ص ۱۳۷ بعد؛ (۵) وہی مصنف :  
Discoveries in Asia Minor، London، ۱۸۳۳ء، ۲ : ۹۶  
بعد؛ (۶) W. J. Hamilton Researches in Asia :  
London، ۱۸۳۲ء، ۱ : ۳۹۲  
بعد؛ (۷) F. Sarre Reise in Kleinasien، Berlin،  
۱۸۹۶ء، ص ۱۶۷، ۱۶۹؛ (۸) W. M. Ramsay :  
The Cities and Bishoprics of Phrygia،  
Oxford، ۱۸۹۵ء، ص ۲۹۸ تا ۲۹۹ اور ۳۲۳ بعد؛ (۹)  
Le Synekdèmos d'Hièroklès et l'opuscule géogra-  
phique de Georges de Chypre (Corpus Bruxellense  
Historiae Byzantinae : Forma Imperii Byzantini)  
کراسہ ۱، طبع E. Honigmann، برسلز ۱۹۳۹ء، ص ۳۰  
(بذیل مادہ ((δῆμος Ὀβραμύα)) : (۱۰) E. Rossi :  
The iscrizioni turche in caratteri greci di Burdur  
Anatolia in، در Rend. Line، سلسلہ ۸، روم  
۱۹۵۳ء، ۸ : ۶۹ تا ۷۵؛ (۱۱) اوزون چارشیلی :  
Anadolu Beylikleri ve Akkoyunlu، Karakoyunlu  
Devletleri (Türk Tarih Kurumu Yayınlarından  
سلسلہ عدد ۲، انقرہ ۱۹۳۷ء، ۸ : ۱۷ و ۹۲؛ (۱۲)  
La Turquie d'Asie : V. Cuinet، پیرس ۱۸۹۰ء،

کر دیا گیا۔ صرف 'بے' کے اقامتی کمروں، نیز مسجد اور حرم کو باقی رہنے دیا گیا اور اب یہ حرم آثار قدیمہ کے عجائب خانے (Musée Alaoui) میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ قصر ابی سعید بردو سے کچھ زیادہ دور نہیں۔ وہاں ۱۲ مئی ۱۸۸۱ء کے معاہدے پر دستخط ہوئے تھے، جس کی رو سے تونس فرانس کا "زیر حفاظت علاقہ" قرار پایا۔ یہ معاہدہ غلطی سے معاہدہ بردو کے نام سے مشہور ہو گیا [رک بہ تونس ۶ : ۷۹۶، عمود ۲]۔

(G. YVER)

• **بردة : (۱)** اونی کپڑے کی [دھاری دار] چادر [ثوب مخطط]، جو دن کو لبادے اور رات کو کمبل کے طور پر اوڑھنے کے کام آتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس قسم کی ایک چادر کو خاص شہرت حاصل ہے۔ کعب بن زہیر [رک بان] کو ان کے ایک قصیدے پر آپ نے بطور انعام وہ "بردة" [چادر] عطا فرمائی تھی جو آپ نے اس وقت اوڑھے ہوئے تھے بعد میں امیر معاویہ نے وہ چادر کعب بن زہیر کے بیٹے سے خرید لی [نیز رک بہ بانٹ سعاد] اور بعد ازاں یہ خلفائے عباسیہ کے خزانے میں محفوظ رہی، تا آنکہ بغداد پر مغول نے قبضہ کر لیا اور ہلا گونے اسے جلوا دیا؛ تاہم آگے چل کر یہ دعویٰ کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلی چادر بچالی گئی تھی اور وہ اب تک قسطنطنیہ میں محفوظ ہے۔

**مآخذ : (۱)** [لسان بذیل مادہ؛ اقرب الموارد؛

النهاية وغيره]؛ (۲) Dozy : *Dictionnaire des noms de*

*vêtements chez les Arabes*، ایسٹرڈم ۱۸۴۵ء، ص

۵۹ تا ۶۴؛ (۳) *Le Bānat So'ād* : R. Basset، الجزائر

۱۹۱۰ء، ص ۹۰ تا ۹۱ اور وہ مصنفین جن کا حوالہ

اس میں دیا گیا ہے؛ (۴) تبرکات استانبول کے لیے

دیکھیے تحسین اوز : خرقة سعادت دائرہ سی و امانت

سے بیان کیا ہے، جسے محمد پاشا نے تعمیر کرایا تھا اور جہاں رأس العبد (Cape Negro) میں ایک فرانسیسی کارخانے کے قیام کے بارے میں معاہدے پر دستخط ثبت ہوئے تھے (۱۶۶۹ء؛ *Memoires : d' Arvieux*، ۴ : ۴۷)۔ حسینی خاندان کے حکمرانوں کا یہ دل پسند مسکن تھا۔ حسین ابن علی (۱۷۰۵ تا ۱۷۴۰ء) نے یہاں ایک مسجد اور ایک محل بنوایا۔ پیسونل Peyssonnel، جس نے ۱۷۲۴ء میں تونس کی سیاحت کی تھی، ان کے محل کے متعلق لکھتا ہے : "یہ بہت سی عمارتوں کا مجموعہ ہے، جو تقریباً مربع شکل کا ہے۔ اس کے چاروں طرف فصیل ہے، جس کے پہلوؤں میں متعدد مربع برج بنے ہوئے ہیں۔ زیر عمارت رقبے کا محیط تقریباً بارہ سو قدم ہے۔ 'بے' کے محل کے علاوہ دوسری عمارتیں بڑے بڑے اہلکاروں کے لیے بنائی گئی ہیں" (دیکھیے *Relation d'un : Peyssonnel voyage sur les côtes de Barbarie*، مکتوب ۲، ص ۲۶ بعد)۔ علی پاشا نے عمارتوں کے اس پورے مجموعے کے گردا گرد ایک گہری خندق کھدوا کر چار دیواری تعمیر کرائی۔ چار دیواری میں بندو قچیوں کے لیے روزن اور توپخانے کے لیے موکھے رکھے گئے تھے۔ محمد بے نے اس پر بھاری رقمیں صرف کیں۔ عمارت کی تعمیر اور اس کے آرائشی کام کے لیے اس نے غیر ملکی، خصوصاً اطالوی کاریگر ملازم رکھے، جو مقامی کاریگروں کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے (قب محمد بن یوسف : *Mechra el-Melki, Chronique* مترجمہ V. Serres و محمد الاصرم Muhammad Lasram)۔ انیسویں صدی میں تونس کے حکمرانوں نے بردو سے بے توجہی برتی، چنانچہ جب اس پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہوا تو اس کی بیشتر عمارتیں کھنڈر ہو چکی تھیں۔ ان عمارتوں کو فصیل سمیت صاف



مقتسہ، استانبول ۱۹۵۳ء۔

(۲) البوصیری [رَدِّ بَا] کے مشہور قصیدے کا نام۔ اسے قصیدہ بردہ اس لیے کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (خواب میں) اپنی چادر مبارک بوصیری کے شانوں پر ڈالی تھی۔ روایت ہے کہ بوصیری جسے فالج کا حملہ ہو چکا تھا شفا یاب ہو گیا اور یہ قصیدہ کہا۔ اس معجزانہ شفا یابی کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور یہ قصیدہ، جس کا عنوان الْكَوَاكِبُ الدَّرِيَّةُ فِي مَدْحِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ تھا، ”البردة“ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ اس کے اشعار فوق العادة قوتوں کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ آج کل بنی انہیں ردِ بلیات کے لیے نیز تجہیز و تکفین کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ عربی کی کسی نظم کو ایسی شہرت حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی نوے سے زیادہ شرحیں عربی، فارسی، ترکی، بربر اور اردو میں لکھی جا چکی ہیں۔ اس کی تخمیس، تثلیث اور تشطیر میں جو نظمیں لکھی گئی ہیں ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ قدیم عربی شاعری کے اسلوب کے مطابق یہ قصیدہ بھی نسیب ہی سے شروع ہوتا ہے۔ پھر شاعر اپنی جوانی ضائع کر دینے پر اظہارِ تأسف اور اپنی تقصیروں کا اعتراف کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل بیان کرتا ہے اور بعد کے اشعار میں آپؐ کے معجزات بیان کرتا ہے (جو حدیث سے بھی ثابت شدہ ہیں)۔ قصیدے کا اختتام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب و نعت پر ہوتا ہے اور آخر میں آپؐ کے حضور میں ایک التجا ہے۔۔۔۔

البردة کی چند خاص شرحوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے: (۱) تاریخی اعتبار سے اولین شرح ابو شامة عبدالرحمن بن اسمعیل الدمشقی (۵۹۶ / ۱۱۹۹ء تا ۶۶۵ / ۱۲۶۶ء) کی ہے، جس کے نسخے پیرس (کتاب خانہ ملی، عدد ۱۶۲) اور میونخ (عدد ۵۴۷)

میں موجود ہیں؛ (۲) شرح ابن مرزوق التلمسانی (م ۵۸۴۲ / ۱۳۳۸ - ۱۳۳۹ء)، جسے ڈوزی Dozy نے ”عظیم و پُر جلال“ (Stupendus et horrendus) قرار دیا ہے؛ (۳) شرح خالد الأزہری (م ۵۹۰۵ / ۱۳۹۹ - ۱۵۰۰ء)، جو کئی بار چھپ چکی ہے۔ بعض اوقات یہ (م) ابراہیم الباجوری (م ۲۳ ذوالقعدة ۵۱۲۷ / ۱۳ جون ۱۸۶۰ء) کی ”شرح“ کے ساتھ بھی شائع ہوئی ہے؛ (۴) شرح ابن عاشور (قاہرہ ۱۲۹۶ھ)۔ اصل قصیدہ پہلی بار اوری Uri نے ۱۷۶۱ء میں لائڈن سے، بعنوان Carmen Mysticum Borda Dictum، لاطینی ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ اس وقت سے یہ قصیدہ خصوصاً بلاد مشرق میں متعدد بار چھپ چکا ہے، چنانچہ عارفانہ کلام کا کوئی ایسا مجموعہ مشکل ہی سے ہو گا جس میں یہ قصیدہ شامل نہ ہو۔ مغرب میں von Rosenzweig کا مطبوعہ نسخہ، بعنوان Funkelnde Wandelsterne zum Lobe des Besten der Geschöpfe (ویانا ۱۸۲۳ء)، مع جرمن ترجمہ و حواشی، قابل ذکر ہے۔ ایک اچھا مطبوعہ نسخہ Rolfs کا ہے، جو اس کی وفات کے بعد Behrnauer نے شائع کیا، یعنی Die Burda, ein Lobgedicht auf Muhammad (ویانا ۱۸۶۰ء)، مع فارسی و ترکی و جرمن تراجم، لیکن اس میں وہ الحاقی اشعار شامل نہیں جو von Rozenzweig کے نسخے میں درج ہیں۔ البردة کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔ یہاں ان سب ترجموں کی فہرست نہیں دی جا سکتی تاہم مذکورہ بالا تراجم کے علاوہ حسب ذیل قابل ذکر ہیں: (۱) ترجمہ د ساسی de Sacy، پیر علی بیگیوی Birgevi کی تصنیف کے ترجمے، بعنوان Exposition de la Foi musulmane (از گارسان د تاسی Garcin de Tassy کے آخر میں، پیرس ۱۸۲۲ء)؛ (۲) ترجمہ از R. Basset مع شرح (پیرس ۱۸۹۳ء)؛

[= آبانہ] کے نام سے کیا ہے۔ (الملوک الثانی، باب ۵، ۱۲) اور جسے یونانی اور لاطینی مصنفوں نے Chrysorroas لکھا ہے، الجبل الشرقي (Anti-Lebanon) کی مشرقی ڈھلانوں پر بہنے والا اہم ترین سدا رواں دریا ہے۔ اسی کی بدولت دمشق کی جائے وقوع متعین ہوئی اور غوطۃ کی نشو و نما بھی اسی کی رہین منت ہے۔

اس دریا کا وجود پہاڑ کی ان بلند چوٹیوں کا مرہون ہے جو زبدانی اور سرغایہ کے درمیانی خلا کے اوپر سر اٹھائے کھڑی ہیں۔ ایک ہزار میٹر سے زیادہ بلند چونے کے پتھر کی ایک چٹان کے دامن میں ایک قدرتی معدنی [Vauclusion، منسوب بہ Vaucluse در فرانس] چشمہ اُبلتا ہے، جس سے درۃ زبدانی کے مغربی پہلو میں، جبل شیخ منصور کے دامن میں، ایک وسیع جھیل بن گئی ہے۔ اس جھیل سے جو پانی چھلک کر بہہ نکلا ہے اسی نے دریائے بردی کی شکل اختیار کر لی ہے، جو میدان زبدانی کی آہستہ آہستہ ڈھلتی ہوئی سطح پر پیچ و خم کھاتا ہوا بہتا ہے اور راستے میں اس خطے کے بہت سے چشمے اس میں ملتے جاتے ہیں۔ جب اس کا بہاؤ پرسکوں اور راستہ متعین ہو جاتا ہے تو یہ دریا مشرق کی طرف مڑ جاتا ہے اور الجبل الشرقي (Anti-Lebanon) کی مشرقی شاخ کے متوازی گھومتا ہوا بہتا چلا جاتا ہے۔ تکیہ کے مقام پر (جہاں پن بجلی کا کارخانہ ہے) یہ نیچے گرنا شروع ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر اس کی صورت ایک تیز دھارے کی سی ہو جاتی ہے جو ایک بند گھاٹی کی دیواروں سے لگ کر اچھلتا ہوا گزرتا ہو۔ یہ دیواریں ایسے ذروں کے تحجر و تراکم (conglomerates) سے بنی ہیں جن کا تعلق طبقات الارض کے جدید تر طبقے (Pliocene) اور تیسرے طبقے کے اسفل درجے (eocene) سے ہے۔ سوق وادی بردی (قدیم: ایللة)

(۳) ترجمہ از W. A. Redhouse (در W. A. Arabian Poetry for English Readers : Clouston ص ۳۲۲ تا ۳۴۱، گلاسکو ۱۸۸۱ء)؛ (۴) اطالوی ترجمہ از G. Gabrieli : al-Burdatayn ('البرداتین')، فلارنس ۱۹۰۱ء، ص ۳۰ تا ۸۵ مع حواشی۔ [اردو کے تراجم و حواشی کے لیے رک بہ البوصیری]۔

مآخذ: [۱] السیوطی: حسن المحاضرة، ۱:

۳۶۰؛ (۲) مبارک: الخطط الجديدة، ۱۰: ۸؛ (۳)

قوات الوفیات، ۲: ۲۰۵؛ (۴) الوافی بالوفیات، ۳: ۱۰۵

یعد؛ (۵) آداب اللغة، ۳: ۱۲۰؛ (۶) البستانی: دائرة

المعارف، بذیل مادہ؛ [۷] R. Basset Les Manuscrits

Arabes des Bibliothèques des Zaouias de 'Ain Madhi

et Temacin... الجزائر ۱۸۸۶ء، ص ۴۶ تا ۵۴؛ (۸)

I. Goldzihr، در Revue de l'Histoire des Religions

۳۱: ۳۰۴ یعد؛ (۹) براکلمان، ۱: ۲۶۳ تا ۲۶۶

[تکملہ، ۱: ۴۶۷ یعد]۔

(R. BASSET)

\* بردی: یا بردان؛ قدیم نام: کائیدنوس Cydnus؛

موجودہ نام: جیحون؛ ایک دریا، جو Cappadocia سے نکل کر مغرب کی سمت بہتا ہے۔ یہ دریا ان باغوں کو سیراب کرتا ہے جو مرعش کے حوالی نیز طرسوس میں واقع ہیں اور کلیکیا Cilicia کے نشیبی میدانوں میں دریائی مٹی بچھاتا ہوا خلیج اسکندرونہ Alexandretta کے مغربی کنارے پر سمندر میں جا گرتا ہے۔ قدیم زمانے میں طرسوس تک اس میں چھوٹے چھوٹے جہاز چلا کرتے تھے۔

مآخذ: (۱) المسعودی: مروج، ۱: ۲۶۳؛ (۲)

یاقوت، ۱، ۳۸۹ و ۵۲۶؛ (۲) Le Strange

، ص ۶۳، ۲۷۸، ۳۱۹؛ (۳)

La Syrie du Nord: Cl. Cahen، ص ۱۴۶ تا ۱۵۱۔

(N. ELISSÉEFF)

\* بردی: جس کا ذکر نعمان المجدوم نے ابنہ



ہے، جس کی بدولت دمشق کے بسالتی (Basalt) نشیب کے پچیس کیلومیٹر سے زیادہ لمبے اور پندرہ کیلومیٹر چوڑے رقبے میں اس زرخیز مٹی (marl) کی کناد بچھ گئی ہے جو دریا کی تہ میں بیٹھی ہوئی ہے اور یوں یہ اراضی ایک زرخیز نخلستان میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ بردی سے تقریباً دس ہزار ہیکٹر پھلوں کے اور دوسرے باغ سیراب ہوتے ہیں اور صحرا پہاڑوں سے تقریباً بیس کیلومیٹر پرے سرک گیا ہے۔ غوطہ کے پرے "مرج" میں ہرے بھرے کھیت دور دور تک پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں اور دسمبر سے جون تک یہ سارا خٹلہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے زمین پر سبز مخمل کا فرش بچھا دیا ہو۔

آب پاشی کے بعد دریا کا جو پانی بچ رہتا ہے وہ صحرا کی جانب نکل جاتا ہے جہاں نکاس کی کوئی صورت نہ ہونے کے باعث یہ رک کر العقیبہ [العقیبہ؟] کی دلدلوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ بردی کے بہاؤ کی سمت اس سے مندرجہ ذیل نہریں نکلتی ہیں: (۱) بائیں کنارے پر حما کے مقام سے نہر یزید، جسے اول اول نبطیوں نے نکالا اور پھر یزید اول نے دوبارہ جاری کیا۔ یہ نہر ثورا میں گر کر اس کے پانی میں اضافہ کرتی ہے؛ (۲) دائیں کنارے پر دمر کے مقام سے نہر مزاولی، جس سے شہر مزہ کے لیے، جو مندی بھی ہے، پانی فراہم ہوتا ہے؛ (۳) اسی کنارے پر آگے چل کر نہر دارانی، جو نرسوس اور داریا کو پانی پہنچاتی ہے؛ (۴) پھر بائیں کنارے سے نہر ثورا، جسے ابتدا میں آرامیوں نے نکالا تھا اور جو بجائے خود تقریباً آدھے نخلستان کو سیراب کرتی ہے؛ (۵) ربوہ کے حوالی میں ایک ہی مقام سے دو نہریں نکلتی ہیں جو زیادہ تر آباد شہروں میں سے گذرتی ہیں: یعنی نہر قنات، جسے رومیوں نے بنایا اور بنو امیہ نے دوبارہ

پر یہ گھاٹی کچھ چوڑی ہو جاتی ہے۔ پھر اپنے منبع سے تیس کیلومیٹر تک بہنے کے بعد عین فیجہ اس میں آ ملتا ہے۔ یہ چشمہ بردی کی سطح آب سے فقط چند میٹر ہی بلند ہے اور اس کے ملنے سے بردی کا حجم دو چند ہو جاتا ہے۔ اس سے پانی ہمیشہ چھلکتا اور کثیر مقدار میں بڑی یکسانیت کے ساتھ بہتا رہتا ہے۔ اس کا سوتا چونے کے ایسے پتھروں میں ہے جن میں کھریا کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس غار کے اوپر رومیوں کا ایک معبد ہے۔ جب پانی اتر جاتا ہے تو بھی اس سے پانچ مکعب میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے پانی خارج ہوتا رہتا ہے۔ اگر یہ پانی میسر نہ آئے تو موسم گرما میں بردی بالکل خشک ہو کر رہ جائے۔ اس چشمے کا کچھ پانی روک کر نلوں کے ذریعے دمشق پہنچایا گیا ہے جو وہاں کے لوگوں کے پینے کے کام آتا ہے۔ اگرچہ دمشق کی سمت بردی کا بہاؤ بہت تیز و تند ہے تاہم انسانی تدابیر سے اس کی تیز رفتاری روک کر اسے قابو میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر یہ تدبیریں بروئے کار نہ لائی جاتیں تو بردی دمشق کے نشیب کے عین وسط میں اپنا راستہ کاٹ کر نہایت سست رفتاری سے بہنے لگتا اور اس سے سیراب ہونے والی زمین کی صورت خشک اور لقی و دق میدانوں کے درمیان ایک سرسبز پٹی کی سی ہوتی جو آخر کار دلدلوں کے درمیان غائب ہو جاتی ہے۔ صدیوں سے انسان اس دریا میں سے پے در پے نہریں نکالنے کی کوشش میں لگا رہا ہے۔ یہ نہریں دریا کی گزرگاہ کے متوازی مختلف سطحوں پر بہتی ہیں، حتیٰ کہ ربوہ کے حوالی میں پہنچ جاتی ہیں۔ یہاں پہنچ کر جبل قاسیون کے دامن میں اس سے چھ بڑی نہریں نکلتی ہیں۔ ان نہروں کو کثیر التعداد شاخوں میں پھیلا کر ان کے پانی سے بنجر زمینوں کے لیے زندگی بخش سیرابی فراہم کی گئی

نے بردی نام کی ایک نہر کی بھی نشان دہی کی ہے، جو سلیمان بن عبدالملک الاسوی نے الرملہ میں کھدوائی تھی [یاقوت نے نہر بردی ثغر طرسوس میں بتائی ہے (بذیل مادہ) اور الرملہ والی نہر کا نام بردہ تھا]۔

مآخذ: (۱) ابن عساکر: تاریخ مدینۃ دمشق، در PAAD، ۱۹۵۱ء، ص ۱۳۵ تا ۱۳۸؛ (۲) یاقوت: معجم البلدان، مطبوعہ بیروت، ۱: ۳۷۸ تا ۳۷۹؛ (۳) گورد علی: غوطۃ دمشق، در PAAD، ۱۹۵۲ء، ص ۱۱۳ تا ۱۱۹؛ (۴) P. Geyer: *Intinera Hierosolymi*، ص ۲۷۶؛ (۵) *Palestine Under: Le Strange*، ص ۲۶۵ تا ۲۶۹؛ (۶) Watzinger و Wultzinger: *Damaskus*، بیعد؛ (۷) R. Dussaud: *Topographie*، ۲: ۳۷؛ (۸) *historique de la Syrie*، ص ۲۸۷؛ (۹) R. Tresse: *Irrigation dans la Ghouta de Damas*، در *REI*، ۱۹۲۹ء، ص ۴۵۹ تا ۴۶۳؛ (۱۰) *L'hydrologie... de la Syrie et du Liban...*، در *Rev. Géogr. Phys. et Géol. dyn.*، ۱۹۳۳ء، ۶: ۴۳۹؛ (۱۱) *Esquisse d'une histoire de la ville de Damas*، در *REI*، ۱۹۳۴ء، ص ۴۲۷؛ (۱۲) R. Thoumin: *Géographie humaine de la Syrie*، ص ۵۲ تا ۹۰؛ (۱۳) M. Ecochard: *Centrale Les Bains de Damas*، در *PIFD*، ص ۶۱۹؛ (۱۴) L. Dubertret: *A Perçu de Géographie Physique sur le Liban, l'Anti-Liban et la Damascène*، در *Notes et Mémoires*، ۱۹۳۸ء، ۴: ۱۹۱ [بذیل مادہ]۔

(N. ELISSÉEFF)

برذیضان: Bardesanes راک بہ دیصانیہ۔

برذعة: ارمن میں: پرتو (Partav): جدید:

برذعة: قفقاز کے جنوب میں ایک قصبہ، جو پہلے اران، یعنی قدیم البانیہ، کا دارالحکومت تھا۔

جاری کیا اور جو قدیم نہر کے پانی میں اضافہ کرتی ہے، اور [دوسری] نہر باناس (ادبی شکل) یا بانیاس جو آرامیوں کی بنائی ہوئی ہے۔ تقریباً ۶۷۰ء میں آرنلف Arnulf "چار بڑی نہروں" (magna IV flumina) کا ذکر کرتا ہے۔ یہ وہی ہیں جو ۷۲۴ء میں ہشام بن عبدالملک کے عہد میں موجود تھیں، یعنی نہر یزید، نہر ثورا، نہر باناس اور نہر قنوت۔ یہ نہریں چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی یعنی ابن عساکر کے زمانے میں بھی موجود تھیں۔ ۱۵۷۲ء میں جرمن سیاحوں نے دمشق کا جو نقشہ تیار کیا تھا اس میں بردی کو کشتی رانی کے قابل دریا دکھایا ہے۔

شہر میں حماموں، مسجدوں، فواروں اور گھروں کے لیے پانی نہر قنوت، باناس اور خود بردی سے مہیا ہوتا ہے (پینے کے لیے پانی حال ہی میں عین فیجہ سے نلوں کے ذریعے لایا گیا ہے) اور وہاں سے پھر دیہات کی طرف نکل جاتا ہے۔ آپاشی کے ایک بہت ہی عمدہ نظام کی بدولت ایک ایسا مصنوعی نخلستان وجود میں آسکا ہے جو غیر معمولی طور پر زرخیز ہے۔ بردی سے پاس پاس نکلی ہوئی کثیر التعداد نہروں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے، جس سے دیہاتی علاقے اور غوطہ کے سبزہ زاروں کی بخوبی آب پاشی ہو جاتی ہے۔ اس علاقے میں بارش کی کمی (دمشق میں صرف دوسو ملی میٹر) کو دور کرنے میں بردی کا بڑا حصہ ہے۔ یہ فضا کو مرطوب کرتا ہے، بہار اور خزان میں دھند پیدا کرتا ہے، اور نباتی اور حیوانی زندگی کو برقرار رکھتا ہے، جس کے باعث انسانوں کے رہنے کے لیے یہ خطہ بہت موزوں ہو گیا ہے [عرب شعرا کے کلام میں بردی کا ذکر ملتا ہے]۔

یاقوت (۱: ۳۸۹) نے بردی نام کے ایک گاؤں

کا ذکر کیا ہے، جو حلب کے مشرق میں واقع تھا۔

لامنس Lammons نے اسے برد لکھا ہے اور اس کا

محل وقوع جبل سمعان بتایا ہے۔ یاقوت (۳: ۶۹)



ازان برذعہ ”ان علاقوں میں مسلمانوں کے تسلط و تدبیر مملکت کے ہراول کی حیثیت سے“ (V. Minorsky) اچھی طرح لیس ہو گیا، چنانچہ دوسری جنگ عرب و خزر کے دوران میں اور پھر عہد عباسیہ میں اس کا بار بار ذکر آتا ہے۔ دسویں صدی تک یہاں کی آبادی نے اپنی آرائی بولی برقرار رکھی (الإصطخیری، ص ۱۹۲)۔

جب الإصطخیری نے اس کا حال لکھا (نواح ۵۳۲ / ۴۹۳۲) تو برذعہ کی خوشحالی اپنے حدِ کمال تک پہنچ چکی تھی، گو اس کے بعد جلد ہی اس پر زوال آنے والا تھا۔ اس میں کئی میل لمبا چوڑا سرسبز و شاداب علاقہ شامل تھا، جو محض اپنی وسعت کے اعتبار ہی سے اصفہان اور رے کا ہم سر تھا۔ ضلع آندراب میں، جس کی حدود اس شہر سے ایک دو میل پر شروع ہو جاتی تھیں، باغ اور پھل دار درختوں کے ذخیرے چاروں سمت ایک دن کی مسافت بلکہ اس سے بھی دور تک مسلسل پھیلتے چلے گئے تھے۔ اعلیٰ ترین قسم کے فندق (Hazel-nuts) اور جوز (Chest-nuts)، نیز سنجہ (Service-tree) سے مشابہ ایک مقامی پھل یہاں بافراط ملتا تھا۔ برذعہ میں اعلیٰ درجے کے انجیر بھی پیدا ہوتے تھے۔ یہاں ریشم خصوصیت سے تیار ہوتا تھا اور خوزستان اور فارس کو برآمد کیا جاتا تھا۔ شہتوت کے درخت، جن پر ریشم کے کیڑے پلتے تھے، سرکاری ملکیت تھے اور بقول ابن حوقل (دیکھیے سطور ذیل) ریشم کی تیاری میں آبادی کی کثیر تعداد حصہ لیتی تھی۔ دریائے کور سے کئی قسم کی مچھلی پکڑی جاتی تھی، ان میں ایک قسم سرماہی یا شورماہی (فارسی: نمکین مچھلی) تھی۔ اسے بھی نمک لگا کر برآمد کیا جاتا تھا۔ برذعہ کے خجروں کا المقسّی (ص ۳۸۰) نے ذکر کیا ہے۔ ان کی وسط ایشیا تک تعریف ہوتی تھی (مثلاً ۵۳۱۶ / ۱۰۲۵)۔

یہ قصبہ دریائے کور سے تقریباً چودہ میل دور (عرب جغرافیہ نویسوں کی رو سے دو یا تین فرسخ؛ المسعودی (مروج، ۲: ۷۰) نے غلطی سے تین میل لکھا ہے)۔ اسی نام کے دریا کے کنارے آباد ہے (المقّسی، ص ۳۷۵) جسے آج کل تریتر (ثرتور، یاقوت: بلدان، ۱: ۵۶۰) کہتے ہیں۔ بقول البلاذری (ص ۱۹۳) اسے ساسانی بادشاہ قباد [اول] (عہد حکومت ۳۸۸ تا ۴۰۱ء) نے بسایا تھا۔ الدمشقی (Cosmographie، طبع Mehren، ص ۱۸۹) نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے ایک افسانوی شخص برذعہ بن ارمینی (?) کو بانی شہر قرار دیا ہے، جو قباد سے پہلے گزرا ہے۔ عربوں نے اس نام کی تشریح یوں کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ فارسی لفظ ”بردہ دار“ سے مشتق ہے، جس کے معنی ”قیدیوں کی جگہ“ کے ہیں اور ابتداءً اسے اسی مقصد سے آباد کیا گیا تھا۔

آگے چل کر ساسانیوں اور عربوں کے عہد میں برذعہ شمال اور مغرب سے آنے والے حملہ آوروں کے مقابلے میں ایک سرحدی قلعے کا کام دیتا رہا۔ عربوں کی فتوحات کے دوران میں یہ مختصر سی مدافعت کے بعد سلمان بن ربیعۃ الباہلی کے ہاتھوں سر ہوا تھا (البلاذری، ص ۲۰۱)۔ یہ واقعہ غالباً ۵۳۲ / ۶۵۲ء سے پہلے پیش آیا، جو بلنجبر [رک بان] کے مقام پر عربوں کی ہزیمت کا سال ہے۔ اس کے بعد آران، یعنی وہ صوبہ جس میں برذعہ اور اس سے متعلقہ علاقہ شامل تھا، عام طور سے ارمینیہ کے ساتھ اور بعض اوقات ایک ہی والی کے ماتحت ارمینیہ اور آذربائیجان کے ساتھ ملحق رہا۔ عبدالملک کے عہدِ خلافت میں عبدالعزیز بن حاتم نے اس کے استحکامات نئے سرے سے درست کیے (الذہبی: دُول الإسلام، ۱: ۳۰، بذیل ۵۸۶ / ۷۰۵ء) اور غالباً کچھ عرصے بعد محمد بن مروان نے ان کی مزید اصلاح کی (قَبّ البلاذری، ص ۲۰۳)۔ بعد

History of the Jewish Khazars، ص ۲۰۹ بعد،  
۲۳۸ بعد) - وہ دریائے گور میں سفر کرتے  
ہوئے پہنچے، اور آذربيجان کے حکمران المرزبان بن  
محمد المسافری کی افواج کو شکست دے کر برذعة  
پر قبضہ کر لیا۔ روسیوں کا قبضہ کئی ماہ (بتول  
یاقوت (۲ : ۸۳۴) ایک سال) تک رہا اور جب ایک  
وبا کے باعث ان کی تعداد میں بہت کمی واقع ہو  
گئی تب کہیں جا کر انہیں بڑی مشکل سے  
نکالا جا سکا۔

ابن حوقل نے روسی حملے کے مضر اثرات کا  
ذکر کیا ہے، لیکن جیسا کہ اب اس کی تصنیف کی  
اشاعت ثانی (دیکھیے ماخذ) سے ظاہر ہوا ہے وہ  
اپنے زمانے میں برذعة کے تباہ کن زوال کا باعث  
(جس کی توضیح اس خبر سے ہوتی ہے کہ جہاں  
قبل ازیں بارہ سو نان بائی ہوا کرتے تھے وہاں  
اب صرف پانچ رہ گئے ہیں) محض روسیوں کی  
تباہ کاری کو قرار نہیں دیتا۔ وہ بتاتا ہے کہ اس کا  
اصل باعث حکمرانوں کی ”بے انصافی اور مجنونانہ  
نظم و نسق“ تھا (بار اول، ص ۲۴۱) - بار دوم  
(ص ۳۳۶) میں ان کلمات کی توضیح و تشریح  
یوں کی گئی ہے کہ یہ حکمران مالی معاملات  
میں لوگوں کو تنگ کیا کرتے تھے، اس چیز  
نے ”اسے اور اس کے باشندوں کو کہا لیا“ - اس کا  
ایک باعث گرجستانیوں کا پڑوس بھی ظاہر کیا گیا ہے  
(بار دوم، ص ۳۳۷، ۳۳۹)؛ معلوم ہوتا ہے کہ  
گرجستانیوں کا حوالہ اس دست درازی کے سلسلے میں  
آیا ہے جو انہوں نے گنجہ (جنزہ) کی طرف سے کی  
تھی۔ یہ مقام آگے چل کر ایلزیوٹپول Elizavetpol  
کے نام سے مشہور ہوا اور برذعة سے صرف نو فرسخ  
کے فاصلے پر تھا (یاقوت، ۱ : ۵۵۹) - یہاں چوتھی /  
دسویں صدی کے نصف آخر میں خاندان شدادیہ  
حکومت کرتا تھا۔ اس تباہی کی ایک وجہ حکومت

میں سمرقند میں، دیکھیے بارٹولڈ Barthold :  
Turkestan، ص ۲۸۳) - ان کے علاوہ دوسری  
اجناس، مثلاً شمالی علاقوں کا سمور، جس کا تذکرہ  
المقدسی (تنبیہ، ص ۶۳) نے کیا ہے، نیز مجیٹھ اور  
زیرے (حدود العالم، ص ۱۴۳) کی اتوار کو لگنے  
والے بازار (سوق الکری) میں بلاشبہ سب سے زیادہ  
بکری ہوتی تھی (سوق الکری Kypiazıق سے مشتق  
ہے، جس کے معنی ہیں خداوند کا دن - اس سے  
یہاں کے باشندوں کے پرانے مذہب، یعنی مسیحیت،  
کا پتا چلتا ہے)۔ یہ بازار باب الأُراد سے باہر  
مضافات میں لگتا تھا اور یہاں عراق تک سے خریدار  
آتے تھے۔ برذعة کا بیت المال بنو امیہ کے زمانے سے  
قائم ہوا (ابن حوقل)۔ قدیم دستور کے مطابق یہ  
جامع مسجد میں تھا، جس کے پہلو میں دارالامارة  
واقع تھا۔

شہر کا مذکورہ بالا حال ابن حوقل کے اس  
بیان کی بنیاد بھی ہے جو اس نے تقریباً پچاس سال  
بعد (۵۳۶۷ / ۶۹۷۷ میں) قلمبند کیا تھا۔ بڑا فرق  
یہ ہے کہ ابن حوقل کو اس امر کا علم تھا کہ  
۵۳۳۲ / ۶۹۴۳ میں برذعة کو روسیوں نے فتح کر کے  
اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس قابل ذکر واقعے  
کا حال ابن الاثیر (۸ : ۳۰۸ تا ۳۱۰) نے لکھا ہے  
اور اس سے بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ۔ بظاہر کسی  
عینی شاہد سے سن کر۔ ابن مسکویہ نے (The Eclipse  
of the Abbasid Caliphate، طبع D. S. Margoliouth،  
۲ : ۶۲ تا ۶۷؛ انگریزی ترجمہ، ۵ : ۶۷ تا ۷۴؛  
منقول در چیڈوک Chadwick : The Beginnings of  
Russian History، کیمبرج ۱۹۴۶ء، ص ۱۳۸ تا ۱۴۴)۔  
روسی بحیرہ خزر کے قریب نمودار ہوئے تھے۔ ان کی  
تعداد نہیں بتائی گئی، لیکن وہ کم از کم کئی ہزار  
ہوں گے اور بلاشبہ دوسرے مواقع کی طرح والگا کے  
علاقہ خزر سے آئے ہوں گے (قب D.M. Dunlop)۔



کی وہ بد نظمی اور محصولات کی بھر مار بھی ہے، جس کا ذکر ابن حوقل نے کیا ہے۔ یہ صورت حال غالباً دیلم کے مسافر یہ فرمانرواؤں ہی سے منسوب کی جائے گی، جو نہیں چاہتے تھے کہ برذعه اپنی پرانی حیثیت حاصل کر لے، کیونکہ اس سے آردبیل کو ضعف پہنچنے کا خدشہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ [بیچ میں] برذعه کی حالت کچھ سنبھل گئی ہو، کیونکہ جب اس پر ابخاز کے ایک بادشاہ نے حملہ کیا تو کہا جاتا ہے کہ ۵۳۶ھ / ۱۰۶۸ء میں سلجوقی بادشاہ آلپ ارسلان نے اس کے خلاف انتقامی کارروائی کی۔ بہر حال مغول کے عہد میں اس کا ذکر شاذ و نادر ہی آیا ہے اور اس وقت سے اب تک جو طویل وقفہ گزرا ہے اس کے دوران میں اس کی حالت آج کے مقابلے میں کھنڈروں کے درمیان ایک گاؤں سے کچھ بہتر نہ رہی ہوگی۔

مآخذ: (۱) الاضطحری، ص ۱۸۲ تا ۱۸۳؛ (۲) ابن حوقل، بار اول (طبع ذخویہ De Goeje)، ص ۳۳ تا ۳۴ و بار دوم (طبع Kramers)، ص ۳۲۶ تا ۳۳۹؛ (۳) یاقوت، ۱: ۵۵۸ تا ۵۶۱؛ (۴) القزوينی: آثار البلاد، ص ۳۳۳؛ (۵) حدود العالم، بمدد اشاریہ؛ (۶) V. Minorsky: *Studies in Caucasian History*، لندن ۱۹۵۳ء، ص ۱۶ تا ۱۷، ۶۵، ۱۰۳، ۱۱۷؛ (۷) D.M. Dunlop: *History of the Jewish Khazars*، پرنسٹن ۱۹۵۳ء، بمدد اشاریہ؛ (۸) المقدسی، ص ۳۷۵۔

(D.M. DUNLOP)

⊕ بر: (ع) اس کا مادہ ب ر ر ہے۔ بر اسماعی الہی میں سے ایک ہے، مادہ ب ر ر کا اصل مفہوم توسع فراخی اور کشادگی ہے۔ وسعت کے ساتھ ساتھ اس کے معنی کثرت کے بھی ہیں، چنانچہ آبر الرجل کے معنی ہیں وہ شخص کثیر العیال ہو گیا یا کہتے ہیں آبر القوم یعنی قوم کی تعداد بڑھ گئی۔ یہ لفظ غلبہ، فوقیت اور تسلط کے معنوں میں بھی استعمال

ہونے لگا، چنانچہ آبر علیہم کے معنی ہیں وہ ان پر فوقیت لے گیا اور ابرار علیہ اور مبر غالب کو کہتے ہیں (تاج العروس، بذیل مادہ: ابن الاثیر: نہایة، ۱: ۸۷)۔ عربی زبان میں جہاں ب اور ر جمع ہو جائیں تو اس لفظ میں عموماً عیاں اور ظاہر ہونے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے، مثلاً کلمہ زیر بحث کے علاوہ برخ، برج اور برز، برص وغیرہ میں (صدیق حسن خاں: العلم الخفاق، قسطنطنیہ ۱۲۹۶ھ)۔ سلمان رضی کی حدیث من اَصْلَحَ جَوَانِبِهِ اَصْلَحَ اللهُ بَرَانِيَهُ میں بر کے معنی ابن الاثیر نے ظاہر اور علانیہ کے کیے ہیں یعنی جو اپنے باطن کو درست رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر کو درست کر دے گا (نہایة، بذیل مادہ)۔ غرض ب ر کے مادے میں وسعت، کثرت، قوت، غلبے اور ظہور کا مفہوم پایا جاتا ہے، بر کا لفظ بھی اسی مادے سے ہے۔ اس کے ایک معنی امام راغب نے التوسع فی الخیر یعنی وسیع پیمانے پر نیکی کے کیے ہیں اور لکھا ہے کہ بر (نیکی) دو قسم کی ہے، اعتقادی اور عملی۔ اسی لیے ایک موقع پر جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے بر کی تشریح پوچھی گئی تو آپ نے جواباً سورۃ البقرۃ کی آیت لیس البر ان تولوا وجوهکم الایة (۲: ۱۷۷) تلاوت فرمائی، کیونکہ اس آیت میں عفائد و اعمال اور فرائض و نوافل کی پوری تفصیل موجود ہے۔ گویا مذہبی شعائر کو صرف رسمی طور پر ادا کر لینے کا نام بر نہیں اور نہ یہ محض برائیوں سے بچنے کے سلبی مفہوم تک محدود ہے بلکہ یہ لفظ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتا ہے اور نیکی کے مثبت پہلوؤں پر بھی حاوی ہے۔ نگاہ کی کشادگی اور دل کی وسعت کے اعتبار سے بر کے معنی وسیع پیمانے پر حسن سلوک، صلہ رحمی اور احسان کے ہیں۔ پھر اس کے معنی بات پر پورا اترنا، قسم میں سچا ہونا اور اطاعت کے بھی ہیں۔ حج مبرور وہ حج

استعمال ہوا ہے (الترمذی، کتاب الفتن، باب ۳۸)، اور بر کے معنی اچھے خلق کے بھی کیے گئے ہیں الترمذی، کتاب الزهد، باب ۵۳) اور بر کو عمر میں اضافے کا ذریعہ بتایا گیا ہے (ابن ماجہ، مقدمہ)۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے بر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: کُلُّ عَمَلٍ يَفْعَلُهُ الْإِنْسَانُ قَضِيَّةً لِاتِّقَادِهِ لِلْمَلَأَةِ الْأَعْلَى وَاضْمِحْلَالِهِ فِي تَلْقَى الْإِلَهَامِ مِنَ اللَّهِ وَصِرُورَتِهِ فَنَائِيًا فِي مَرَادِ الْحَقِّ وَكُلُّ عَمَلٍ لِيَجَازِيَ عَلَيْهِ خَيْرًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَكُلُّ عَمَلٍ يَصْلُحُ الْارْتِفَاعَاتِ الَّتِي بَنَى عَلَيْهَا نِظَامَ الْإِنْسَانِ، وَكُلُّ عَمَلٍ يَفِيدُ حَالَةَ الْإِتِّقَادِ وَيَرْفَعُ الْحُجُبَ (حجة الله البالغة، المبحث الخامس) یعنی بر وہ عمل ہے جو انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کی متابعت سے یا الہام کے قبول کرنے میں ہمہ تن محو ہو جانے سے یا منشاء الہی میں جذب ہو جانے سے سر انجام دیتا ہے۔ بر وہ عمل ہے جس کی جزا دنیا و آخرت دونوں میں ملتی ہے۔ پھر یہ وہ عمل ہے جس سے ارتفاقات، یعنی ان بابرکت امور کی اصلاح و ترقی ہو جن پر نظام انسانی کی بنیاد قائم ہے، یہ وہ عمل ہے جس سے اطاعت کا اظہار ہو اور جو حجابات کو دور کرے۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب نے اس کے بالمقابل اثم کی تشریح کی ہے اور لکھا ہے کہ بر کی راہیں اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر کھولتا ہے جو فرشتوں کے نور سے تائید یافتہ ہوتے ہیں اور پھر تفصیل سے ان راہوں کے اصول بیان کیے ہیں۔

مآخذ: ان کتب کے علاوہ جن کا حوالہ متن مقالہ میں آچکا ہے (۱) تفسیر قرآن مجید تحت ۲ [البقرة]: ۱۷۷، مثلاً: (۱) ابن جریر الطبری؛ (ب) الکشاف؛ (ج) البحر المحیط؛ (د) روح المعانی؛ (۲) الزمخشري؛ الفائق، تحت مادة ب ر ر؛ (۳) احمد بن حنبل؛ مسند، ۲: ۱۷۶؛ (۴) البخاری؛ الادب المفرد، باب ۱۰؛ (۵) ابن ماجہ، کتاب الادب، باب ۱؛ (۶) شاہ ولی اللہ؛ حجة الله البالغة،

جس میں رفت، فسوق اور جدال نہ ہو اور جس میں غریبوں کو لہانا لہلایا جائے (احمد: مسند، ۳: ۳۲۵؛ بخاری، کتاب الحج، باب ۱۰۲) اور بیع مبرور جو دھوکے وغیرہ سے مبرا ہو (احمد: مسند، ۳: ۳۶۶)۔ قرآن مجید میں بر کا لفظ اثم کے مقابلے میں جو عدوان سے زیادہ وسعت رکھتا ہے استعمال ہوا ہے۔ اثم کے معنی ہیں وہ کام جو نیکی اور ثواب سے باز رکھے اور روکے، گویا اس کے اصل معنی میں رکاوٹ اور تاخیر کا مفہوم ہے (الاثم اسم للافعال المبطنة عن الثواب: مفردات، بذیل مادہ)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: الْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي صَدْرِكَ وَكَرِهْتَ أَنْ يَطَّلَعَ عَلَيْهِ النَّاسُ (مسلم - کتاب البر، باب ۴: احمد بن حنبل: مسند، ۴: ۱۸۲، ۲۲۷ و ۵: ۲۵۱ بعد) یعنی وہ افعال اثم ہیں جن کا ارتکاب تمہارے دل میں کھٹکے اور تم نہ چاہو کہ لوگ تمہارے ان افعال سے باخبر ہوں اور اس کے مقابلے میں بر کے متعلق فرمایا: مَا أَطْمَأَنَّتْ إِلَيْهِ النَّفْسُ، وَهِيَ تَطَّلِعُ عَلَى نَفْسٍ فِي أَطْمِينَانَ بِيَدِهَا كَرْتِي هِيَ - ان وجوہ سے بر کے معنی ہوں گے: قوت، نشاط عمل اور وسعت - قرآن مجید میں ابرار کے مقابلے میں فجار کا لفظ استعمال کیا گیا ہے (۸۲ [الانفطار]: ۱۴) اور فجور کے معنی ہیں نافرمانی، دین کی بے حرمتی، بد کاری، گناہ، کذب، اللہ تعالیٰ سے دوری، اس لحاظ سے بر کے معنی ہونگے اطاعت، دین کی حفاظت، پاکیزگی، نیکی، صداقت اور قرب الہی۔

تقویٰ اور بر میں یہ فرق ہے کہ تقویٰ میں گناہوں سے بچنے اور اللہ تعالیٰ کو سپر بنانے کا مفہوم ہے اور زیادہ تر سلبی رنگ رکھتا ہے اور بر میں وسیع پیمانے پر نیکیوں کے بجا لانے کا مثبت مفہوم ہے اور زیادہ تر ایجابی رنگ رکھتا ہے۔ حدیث میں بر کا لفظ جفا کے مقابلے میں بھی



میں الدرَجینی کی کتاب پر تنقیدی نظر ڈالی گئی ہے اور اس سلسلے میں نئے واقعات اور مختصر مقدمات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ کتاب کے خاتمے پر فرقہ اباضیہ کی کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے، جسے موٹیلنسکی A. de Motylinski نے ترجمہ کر کے شائع کر دیا ہے۔

الشماخی کے بیان کے مطابق البرادی ایک اور رسالہ کا بھی مصنف ہے، جس میں اس کا مخاطب شیخ ابو عبد اللہ محمد بن احمد الصّدغیانی سے ہے۔ اس رسالے میں اس نے نہایت وضاحت اور صفائی سے ایمان باللہ اور توحید باری تعالیٰ کے متعلق اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے احمد ابن التزاتی کی کتاب الدّعائم اور ابویعقوب بن ابراہیم السّدراتی کی کتاب العَدل فی اُصول الفقه کی شرحیں بھی لکھیں۔ الشماخی کے ہاں سیر العمانیہ کا کوئی ذکر نہیں، جس کا حوالہ Lewicki نے (Hand-wörterbuch، بذیل مادہ اباضیہ) دیا ہے اور جس کا مخطوطہ لُوف Lwów میں موجود ہے۔

مأخذ: (۱) الشماخی: کتاب السیر، قاہرہ، ۱۳۰۱ھ،

ص ۵۷۴ تا ۵۷۵؛ (۲) Chronique: E. Masqueray

d' Abou Zakariya، الجزائر، ۱۸۷۸ء، ص ۱۴۱؛ (۳)

Bibl. du Mzab. Les livres de la secte abadhite، الجزائر،

۱۸۸۵ء؛ (۴) Bull. de corr. afr.، ۳، الجزائر،

۱۸۸۵ء؛ (۵) R. Rubinacci، ۳ تا ۴؛ (۶) براکلیمان: تکلمہ،

۲: ۳۳۹؛ (۷) Notizia di alcuni manoscritti ihāditi esistenti presso l' Istituto Uni-

versitario Orientale di Napoli، در AIUON، سلسلہ

جدید، ۱۹۳۹ء، ۳: ۳۳ تا ۳۳۵؛ (۸) وہی مصنف:

Il "Kitāb al-Gawāhir" di al-Barrādi، در مجلہ مذکور،

۱۹۵۲ء، ۳: ۹۵ تا ۱۱۰؛ (۹) وہی مصنف:

Il califfo Abdal-Malik b. Marwān e gli Ibāditi، در

مجلہ مذکور، ۱۹۵۱ء، ۵: ۹۹ تا ۱۲۱؛ (۱۰)

المبحث الخامس؛ (۷) وینسک Wensinck: المعجم المقهرس، لائڈن، ۱۹۳۶ء، ۱: ۱۵۹، بعد، مادہ ب ر ر کے دوسرے مشتقات کے لیے دیکھیے لسان؛ تاج العروس وغیرہ۔

(عبدالمنان عمر)

البرادی: ابوالفضل ابوالحاسم [کذا، صحیح: ابوالقاسم] بن براہیم [الدمری]، شمالی افریقہ کا ایک اباضی فاضل، جس کا زمانہ آٹھویں صدی / چودھویں صدی کا نصف آخر ہے۔ وہ جنوبی تونس کے ایک گاؤں دمر کا رہنے والا تھا، جہاں اس نے ابوالبقاء یعیث الجربی سے تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے وہ شیخ ابوساکن عامر الشماخی (م ۵۷۹۲ / ۱۳۹۰ء) کے حلقہ درس میں شریک ہونے کی غرض سے یفرن [= افرین] گیا، جو جبل نفوسہ میں واقع ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے چربہ میں اقامت اختیار کر لی۔ یہاں وہ کئی سال تک تدریس میں مصروف رہا۔ وہ وادی الزیب کی مسجد میں درس دیا کرتا تھا۔ اس کی وفات چربہ ہی میں ہوئی۔ البرادی کے کئی بیٹے تھے۔ الشماخی کے بیان کے مطابق ان میں سب سے مشہور عبد اللہ ابو محمد تھا، جس نے خصوصیت سے اصول میں شہرت حاصل کی۔

کتاب الجواهر المنتقات (طبع سنگی، قاہرہ ۱۳۰۲ / ۱۸۸۵ء) البرادی کی ممتاز ترین تصنیف ہے، جو دراصل ساتویں صدی / تیرھویں صدی کے ایک مغربی مصنف ابوالعباس احمد الدرَجینی [رک بان] کی کتاب طبقات المشائخ کا تکملہ ہے۔ یہ کتاب دو "طبقات" میں منقسم ہے۔ پہلے "طبقة" میں اباضیہ کے نقطہ نظر سے اسلام کی ابتدائی تاریخ پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے، جسے الدرَجینی نے اپنی کتاب میں نظر انداز کر دیا تھا۔ کتاب کے اس حصے میں ان مشاہیر کے سوانح درج ہیں جن کا الدرَجینی نے ذکر نہیں کیا تھا۔ دوسرے "طبقة"

پشاور اور ۱۱۱۶ھ / ۱۷۰۳-۱۷۰۵ء میں ان کے فرزند شاہ محمد غوث لاہوری ان مجذوب سے ملے لیکن کچھ اچھا تاثر لے کر نہیں گئے۔ شاہ محمد غوث فرماتے ہیں: ”در پندی بہ شاہ لطیف نام مجذوب صاحب کشف و جذب رفتہ، او را دیدم و آثار مکاشفہ و جذبہ او معائنہ نمودم۔ اما مقصود فقیر چیزے ازو حاصل نشد“۔ ان دو معاصرین نے انہیں بری نہیں لکھا۔ ان کے علاوہ منشی شہامت علی نے بھی، جو دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور جنہوں نے ۱۸۳۸ء میں اپنی کتاب لکھی (دیکھیے ماخذ)، ان کے نام کے ساتھ بری نہیں لکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ دستور العمل دربار شاہ لطیف بری (۱۲ ستمبر ۱۸۵۹ء) قدیم ترین تحریر ہے جس میں ان کے نام کے ساتھ بری لکھا گیا ہے۔ نسب نامہ شریف ۱۸۸۱ء میں اس لفظ کی یہ توجیہ کی گئی ہے:-

بویرانہ شب روز در بندگی  
بسر کرد در بندگی زندگی  
چو گردید بر کوہ و ہامون و دشت  
بعالم ازان بری مشہور گشت  
انہوں نے چار حضرات کو بیعت کیا: مٹھہ شاہ، دونگ شاہ، عنایت شاہ اور شاہ حسین۔ ان کی طرح یہ چاروں لا ولد فوت ہوئے۔ اس خانوادہ طریقت میں پیر و مرید کے بجائے مرشد اور چیلہ یا بالکا کے الفاظ مستعمل ہیں۔ مفتی غلام سرور نے تحفۃ القادریۃ (شاہ ابوالمعالی) اور معارج الولاية (عبید اللہ خویشگی) کے حوالے سے ان کے مرشد کا عرف حیات المیر اور شیخ بہلول دریائی نو ان کا مرید بتایا ہے، مگر ان دونوں کتابوں میں نہ تو شاہ لطیف بری کا نام ہے اور نہ کسی کا عرف حیات المیر۔ بہر حال رپورٹ مردم شماری ۱۸۸۳ء، اشجار طریقت اور جن جن تذکروں میں ان کا ذکر آیا ہے سب نے

*Il conflitto 'Ali-Mu'āwiya e la secessione Khārigita riesaminati alla luce di fonti ibādite*، در AIUON، سلسلہ جدید، ۱۹۵۲ء، بمواضع کثیرہ؛ (۹) وہی مصنف: *Traduzione di passi riguardanti il conflitto 'Ali-Mu'āwiya e la secessione Khārigita*، در مجلہ مذکور، ۱۹۵۴ء: ۱ تا ۲۵۔ (R. RUBINACCI)

\* البراسان : البراسان، رك به رزين، بنو۔

۸ بری: شاہ لطیف بری قادری (م ۱۱۱۷ھ / ۱۷۰۵-۱۷۰۶ء)، پوٹھوہار کے ایک بزرگ، جو بری بادشاہ، بری سلطان اور امام بری کے القاب سے معروف ہیں، موضع چوری کرسال، ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شاہ محمود بن حامد بن بودلہ ایک خاندانی تنازعے کے باعث ترک وطن کر کے موضع باغاں میں رہنے لگے اور شاہ لطیف مویشی چرانے پر مامور ہوئے۔ لڑپن ہی میں والد کی سخت گیری سے تنگ آ کر گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور بارہ سال جنگلوں اور غاروں میں ریاضت کرتے رہے۔ ایک روز بستی کٹھاہوت کے قریب ایک غار میں چلہ کش تھے کہ ایک قادری المشرب بزرگ تشریف لائے اور انہیں بیعت سے مشرف فرمایا۔ پھر وہ اس بستی میں سکونت پذیر ہو گئے اور اس کا نام نور پور رکھا۔ یہ نور پور شاہاں اور موضع باغاں اب پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد میں آ گئے ہیں۔

پیر و مرشد کے ایما پر انہوں نے کئی بار طویل چلہ کشی کی۔ ضلع ہزارہ کی ایک ندی میں وہ بارہ سال کا چلہ کاٹ رہے تھے کہ حالت غیر ہو گئی۔ مرشد نے آ کر انہیں ندی سے نکالا۔ اس کے بعد ان پر جذب و مستی کا بہت زیادہ غلبہ ہو گیا۔

۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۷-۱۶۶۸ء میں سید حسن قادری



A Glossary : H. A. Rose (۹) : ۱۳۹ : ۱ : ۱۸۳۷  
 of Tribes etc. لاہور ۱۹۱۹ء، ۱ : ۱۳۰ : (۱۰)  
 Rawalpindi District Gazetteers، بابت ۱۸۸۳ و  
 ۱۹۰۷ء

(منظور الحق صدیقی)

برزال : [بن ورنید؛ یا برزالہ] زَنَاتَه گروہ کا  
 ایک بربر [اباضی] قبیلہ، جو چوتھی / دسویں  
 صدی کے شروع میں الزاب الاسفل (المسیلہ کے  
 جنوب) میں آباد تھا۔ فاطمی خلیفہ عیبد اللہ  
 [۵۲۹۷ / ۵۹۰۹ تا ۵۳۲۲ / ۵۹۳۴] نے ان کی  
 سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے المسیلہ  
 میں ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ بنو برزال نے اس کی  
 مخالفت میں شورش پسند ابویزید (النکاری)  
 [رک بان] کا ساتھ دیا اور جب فاطمی خلیفہ المنصور  
 [۵۳۳۴ / ۵۹۴۵ تا ۵۳۴۱ / ۵۹۵۲] نے اس کا  
 تعاقب کیا تو اسے پناہ دی۔ اگرچہ المنصور  
 نے ان بربروں کو معاف کر دیا، تاہم انہوں نے  
 ۵۳۶۰ / ۵۹۷۱ء میں جعفر ابن الاندلسی [رک بان]،  
 والی زاب، کی بغاوت میں پھر شرکت کی۔ فاطمیوں  
 کے جبر و تشدد نے انہیں راہ فرار اختیار کرنے پر  
 مجبور کر دیا، چنانچہ انہوں نے اندلس میں  
 جا کر پناہ لی، جہاں انہوں نے اموی فرماؤں  
 کی ملازمت اختیار کر کے بربر فوج کا ایک جیش  
 تشکیل کر لیا۔ خلیفہ الحاکم الثانی کی وفات پر  
 بنو برزال کے سرداروں نے ابن ابی عامر کے فریق کا  
 ساتھ دیا، جس کے صلے میں ان کے ایک سردار کو  
 قرمونہ Carmona کا والی بنا دیا گیا۔ اندلس کی  
 طوائف الملوک کے دوران میں بنو برزال نے قرمونہ  
 میں ایک چھوٹی سی خودمختار ریاست قائم کر لی،  
 جس نے اشبیلیہ (Seville) کے بنو عبّاد کی درازدستیوں  
 کی مقاومت کی کوشش کی۔ بالآخر وہ ۵۴۰۹ /  
 ۱۰۶۷ء میں شاہ اشبیلیہ کی اطاعت پر مجبور

انہیں قادری لکھا ہے۔  
 ان کا مزار نور پور شاہاں (اب اسلام آباد)  
 میں ہے جہاں سال بھر زائرین کا تانتا بندھا  
 رہتا ہے۔ یہاں ضلع راولپنڈی کا بہت بڑا میلا  
 لگتا ہے۔ ۶ جولائی ۱۹۶۰ء کو یہ مزار  
 محکمہ اوقاف کی تحویل میں آیا۔ ۱۹۶۱ء سے  
 میلے کو عرس کہنے لگے اور مزار سے دس دس  
 میل تک قمار بازی اور طوائفوں کا مجرا ممنوع قرار  
 پایا۔ اس میلے (اب عرس) کا آغاز عرق گلاب کی  
 اٹھارہ بوتلوں کی ڈالی کی آمد سے ہوتا ہے، جسے  
 عہد عالمگیری کے بزرگ ابوالبرکات سید حسن قادری  
 پشاوری کے گھرانے سے لے کر ایک پیدل قافلہ  
 مزار پر لاتا ہے۔ مزار پر نذرانوں سے محکمہ اوقاف  
 کو سال ۱۹۶۵-۱۹۶۶ء میں اکیس ہزار پانچ روپے  
 وصول ہوئے۔

مآخذ: (۱) شاہ محمد غوث قادری لاہوری: رسالہ  
 در بیان کسب سلوک و بیان طریقت و حقیقت (۱۷۷۰ء)،  
 قلمی، محمد امیر شاہ قادری یکہ توت پشاور کے پاس ہے؛  
 (۲) شاہ غلام قادری: خوارق عادات سید حسن (۱۷۷۰ء)،  
 بقلم مصنف (۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵-۱۷۷۶ء)، ملوکہ  
 محمد امیر شاہ مذکور؛ (۳) شجرۃ نسب مالکن اراضی و  
 دستور العمل دربار شاہ لطیف بری، مشمولہ واجب العرض  
 موضع نور پور شاہاں، ضلع راولپنڈی، ۱۸۵۹-۱۸۶۰ء؛  
 (۴) مولوی محمد شاہ مشہدی: نسب نامہ شریف، مصنفہ  
 و مکتوبہ ۱۸۸۱ء، مشمولہ "مثل مقدمہ نمبر ۴، وقف لیس"،  
 تاریخ فیصلہ بعدالت ڈسٹرکٹ و سشن جج، راولپنڈی؛  
 ۲۳ دسمبر ۱۹۶۳ء؛ (۵) شاہ غلام حسین بخاری (۱۸۹۳ء):  
 کرامات شاہ لطیف بری، قلمی، مقالہ نثار کے  
 پاس ہے؛ (۶) مفتی غلام سرور: خزینۃ الأصفیاء، لاہور  
 ۱۲۸۳ھ / ۱۷۶۷-۱۸۶۸ء، ص ۱۲۲؛ (۷) منظور الحق  
 صدیقی: شاہ لطیف بری و تاریخ نور پور شاہاں (زیر طبع)؛  
 (۸) شہامت علی: The Sikhs and the Afghans، لندن

ہو گئے اور کم از کم ایک جداگانہ گروہ کی حیثیت سے باقی نہ رہے، بعینہ جیسے وہ اس سے قبل المغرب سے مفقود ہو گئے تھے۔

مآخذ: (۱) الیعقوبی: بلدان، ص ۲۱۵؛ (۲) ابن حوقل، ص ۸۶، ۱۰۶؛ (۳) ابن حزم: [جمہرۃ انساب العرب، قاہرہ ۵۱۳۸۲ / ۱۹۶۲ء، ص ۳۹۸]؛ (۴) البکری: *Descr. de l'Afr. Sept.*، طبع دیسلان de Slane، الجزائر ۱۹۱۱ء، ص ۵۹؛ (۵) الإدْرِیسی: المغرب، ص ۹۹؛ (۶) کتاب الاستبصار، طبع کریمر Kremer، ویانا ۱۸۵۲ء، ص ۶۰؛ (۷) المرآکشی: معجب، مترجمہ Fagnan، الجزائر ۱۸۹۳ء، ص ۶۳، ۸۳؛ (۸) ابن عداری، ۱: ۱۹۰ تا ۱۹۱ (مترجمہ Fagnan، ص ۲۷۲، ۲۷۳)؛ (۹) ابن الأثیر، مترجمہ Fagnan، ص ۳۴۵؛ (۱۰) کتاب مفاخر البربر، طبع لیوی پرووانسال Lévi-Provençal، رباط ۱۹۳۴ء، ص ۴۴؛ (۱۱) ابن خلدون: *Berbères*، مترجمہ دیسلان de Slane، ۳: ۱۸۶، ۲۰۳، ۲۱۰، ۲۹۱ تا ۲۹۳)؛ (۱۲) ڈوزی Dozy: *Hist. des Mus. d'Esp.*، بار دوم، ۲: ۲۰۲، ۲۰۶ تا ۲۰۷ و ۳: ۲۳۱؛ (۱۳) لیوی پرووانسال E. Lévi Provençal: *Hist. Esp. Mus.*، بمدد اشاریہ۔

(R. LE TOURNEAU)

\* البرزالی: علم الدین القاسم بن محمد بن یوسف المعروف بہ ابن البرزالی، ایک شامی مؤرخ اور عالم حدیث، دمشق میں جمادی الاولیٰ یا جمادی الآخرہ ۵۶۶۵ / فروری - اپریل ۱۲۶۷ء میں پیدا ہوا۔ اگرچہ بعض بیانات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے پہلے، یعنی ۵۶۶۳ / ۱۲۶۵ء میں، پیدا ہوا تھا لیکن خود البرزالی کا دعویٰ بظاہر یہی ہے کہ اس کا سنہ ولادت ۵۶۶۵ تھا۔ اس کے آبا و اجداد بربر قبیلہ بنو برزال [رک بان] سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کا پردادا زکی الدین محمد

ابن یوسف (پیدائش: نواح ۵۷۷ / ۱۱۸۱-۱۱۸۲ء؛ وفات بمقام حما: ۵۶۳۶ / ۱۲۳۹ء) ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے شروع میں شام میں مقیم ہو گیا تھا۔ زکی الدین کی دوسری نسبت، یعنی الاشبیلی، سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ خود یا اس کے اجداد میں سے کوئی فرد کبھی اشبیلیہ میں بھی رہا تھا۔ اس کی ایک تصنیف دمشق میں محفوظ ہے (قَب G. Makdisi، در BSOAS، ۱۹۵۶ء، ۱۸: ۲۲)۔ اس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ابن عساکر کی تاریخ دمشق کی دو جلدیں بانکی پور میں محفوظ ہیں (فہرست [کتاب خانہ بانکی پور]، ۱۲: ۱۳۳، بعد، شمارہ ۸۰۰ تا ۸۰۱؛ قَب نیز ۵: ۲، ۲۲۳، شمارہ ۳۸۱)۔

البرزالی کا دادا اپنے والد کی وفات پر جامع فلوس (J. Sauvaget: *Les monuments historiques de Damas*، بیروت ۱۹۳۲ء، ص ۶۰، کے لکھے ہوئے تلفظ کے مطابق فلوس [؟]: قَب النعمی: الدارس، ۱: ۸۶ و ۲: ۳۶۱) کی امامت پر فائز ہوا، لیکن اس نے عین عالم شباب میں تیس برس کی عمر میں وفات پائی اور اپنے پیچھے البرزالی کے والد بہاء الدین کو چھوڑ گیا، جس نے اے نانا کے ہاں تربیت پائی۔ بہاء الدین عدلیہ کا ایک عہدے دار اور عالم کامل تھا اور ۵۶۹۹ / ۱۳۰۰ء میں اپنی عمر کے ساٹھویں برس میں فوت ہوا (قَب ابن قاضی شہبہ: اعلام، بذیل ۵۶۹۹)۔

چونکہ البرزالی علما کے ایک گھرانے سے تھا، لہذا اس نے اور اس کی ہمشیرہ زینب نے اپنے والد اور دوسرے مشہور و معروف علما سے تعلیم حاصل کی۔ مثال کے طور پر ابن تیمیہ نے اس کے گھر میں درس دیے (فہرست، بانکی پور، ۵: ۲، ۱۸۰)۔ اس نے اوائل عمر ہی میں اپنے کام کی ابتدا کر دی اور باوجودیکہ اس کا ذہن قبل از وقت پختہ ہو چکا



”ذیل“ (تمہ) ہے اور البرزالی کی اس کتاب المقتفی کا ”ذیل“ تقی الدین ابو بکر بن قاضی شہبہ (م ۵۸۵۱ / ۸۱۴) نے لکھا۔ [قب السخاوی، در F. Rosenthal : A History of Muslim Historiography، ص ۱۴، لیکن النعیمی (الدارس، ۱ : ۵۷۸) نے ایک کتاب، بعنوان المنتقی [المقتفی؟] کا ذکر کیا ہے، گویا یہ اس تاریخ سے کوئی مختلف کتاب ہے جس کا اثر حوالہ دیتا رہا ہے۔] - المقتفی مخطوطے کی صورت میں کتاب خانہ طوب قہوسرای (ذخیرہ احمد ثالث، عدد ۲۹۵۱) میں محفوظ ہے (قب المنجمہ، در Revue de l'Institut des Manuscrits arabes، ص ۱۰۱، ۱۹۵۶ء، ص ۱۰۱، بعد)۔ البرزالی کی ضخیم معجم، جو ہم عصر اہل علم کے حالات کے ماخذ کے طور پر نہایت قابل تعریف کتاب تسلیم کی جاتی تھی اور اکثر استناداً اس کے حوالے دیے جاتے تھے، محفوظ نہیں رہی۔ ایک چھوٹی سی معجم، جو اس کے اوائل عمر کے اساتذہ کے حالات پر مشتمل ہے، دمشق میں محفوظ ہے (قب ی - العیش : فہرست مخطوطات دارالکتب الظاہریۃ، التاریخ، دمشق ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء، ص ۲۲۸، بعد)۔ ابن طولون نے لمعات (دمشق ۱۳۳۸ء)، ص ۳۵ اور ۳۳، میں ایک معجم البلدان و القری کا ذکر کیا ہے۔ ایک مختصر سی تصنیف، جو غزوہ بدر کے مجاہدوں کے متعلق ہے، اس بنا پر البرزالی کی طرف منسوب کی جاتی ہے کہ اس کے مخطوطہ دمشق کا خط دارالکتب الظاہریۃ میں البرزالی کے دوسرے خودنوشت نسخوں سے ملتا جلتا ہے (قب العیش : کتاب مذکور، ص ۴۶)۔ اس نے حدیث پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے اربعوں بلدانیۃ کا ذکر ملتا ہے۔ عوالی الحدیث کے دو انتخابات، جنہیں اس نے اپنے استادوں سے جمع کیا تھا اور ثلاثیات بن مسند احمد بن حنبل بانکی پور میں محفوظ ہیں

تھا اس نے عمر بھر طلب علم کے شوق میں کمی نہ پیدا ہونے دی۔ اس نے علوم دینی کے پورے نصاب کی تکمیل کی اور تحصیل علم کے لیے شام کے دوسرے شہروں اور مصر کی سیاحت کی تھی۔ اس نے کچھ عرصے بطور سرکاری گواہ ملازمت کی، لیکن اس کی زندگی کا بیشتر حصہ دمشق کی بڑی بڑی درسگاہوں میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے بسر ہوا۔ اس منصب پر اس نے ”النوریۃ“ میں جو زمانہ گزارا وہ قابل ذکر ہے (اس نے جو درس یہاں دیے ان کے اجازے بانکی پور میں محفوظ ہیں، دیکھیے فہرست، ۲: ۵، ۵۰، بعد، ۱۹۸، بعد)۔ اس نے کئی بار حج کیا اور ۴ ذوالحجہ ۵۷۳۹ھ / ۱۳ جون ۱۳۳۹ء کو ارض پاک میں خلیص کے مقام پر وفات پائی۔ اس کے سب بچے اس کی زندگی ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ ان میں سے دو، محمد اور فاطمہ، خداداد قابلیت رکھنے والے فاضل تھے۔ اس کے متعدد تلامذہ و رفقا، جن میں الذہبی قابل ذکر ہے، اپنے زمانے کے مشہور ترین فضلا میں شمار ہوتے تھے۔ البرزالی کے تمام سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ وہ غیر معمولی طور پر دل کش شخصیت کا حامل تھا۔ وہ بہت خوب رو، منکسر المزاج، اور اپنی کتابوں اور علم کے معاملے میں بے حد قیاض تھا۔ قدرت نے اسے خوشخطی کا خاص جوہر عطا کیا تھا۔ تحصیل علم میں وہ انتہائی معنت سے کام لیتا تھا۔ اسے سب دبستانوں کے علما کا اعتماد حاصل تھا، حتیٰ کہ ان کا بھی جو آپس میں ہمیشہ برسر پیکار رہتے تھے۔

اس کی تصانیف کی کوئی فہرست نہیں ملتی اور نہ اس کی کوئی کتاب ہی اب تک شائع ہو سکی۔ اس کی تاریخ کبیر کا، جو ۱۳۳۶ھ - ۱۳۳۷ھ پر ختم ہوتی ہے، اکثر حوالہ دیا جاتا رہا ہے۔ [یہ دراصل ابو شامہ (رک بان) کی مشہور تاریخ کا

۱۹۵۷ء، ص ۱۴۳ تا ۱۴۶؛ [۱۴] (الأعلام، ۶: ۱۷۰).

(F. ROSENTHAL)

برزخ: (ع، ف) اس کے معنی ہیں مانع، رکاوٹ، افتراق (شاید فارسی لفظ فرسخ [رک بان] کا مرادف جو فاصلے کا ایک ناپ ہے۔ قرآن حکیم میں اس کا ذکر تین موقعوں پر آیا ہے: **وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ** = اور بعثت کے دن تک ان کے پیچھے ایک روک ہے (۲۳ [المؤمنون]: ۱۰۰)؛ **وَهُوَ الَّذِي مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هَذَا عَذْبٌ فَرَاتٌ وَ هَذَا مِلْحٌ أجاجٌ وَ جَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَ حِجْرًا مَحْجُورًا** = اور وہی ہے جس نے دو دریاؤں کو ملایا ہے جن میں ایک (کا پانی) شیریں اور ایک (کا پانی) شور و تلخ ہے اور ان کے درمیان ایک حجاب اور ایک مانع قوی رکھ دیا ہے (۲۵ [الفرقان]: ۵۳)؛ **مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَا يَبْغِيَانِ** = اس نے دو دریاؤں کو ملایا کہ (ظاہر میں) باہم ملے ہوئے ہیں اور (حقیقت) ان دونوں کے درمیان ایک حجاب ہے کہ دونوں (اس سے) بڑھ نہیں سکتے۔ (۵۵ [الرحمن]: ۱۹ تا ۲۰) اور ان موقعوں پر ان کا مفہوم کبھی روحانی لیا جاتا ہے اور کبھی مادی۔ سورۃ المؤمنون (۱۰۰) میں گنہ گار یہ التجا کرتے ہیں کہ انہیں دنیا میں واپس جانے کی اجازت دی جائے تا کہ وہ اس نیکی کو مکمل کر لیں جو انہوں نے اپنی زندگی میں نہیں کی تھی لیکن ان کے پیچھے ایک برزخ ہے جو راستہ روکے ہوئے ہے۔ الزمخشری نے اس موقع پر برزخ کا مفہوم "حائل" کے لفظ سے ادا کیا ہے اور اس سے ایک روحانی مفہوم مراد لیا ہے، یعنی خدا کی طرف سے ممانعت۔ دوسرے مفسر اس کے ظاہری معنوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس سے مراد وہ پردہ لیتے ہیں جو جنت اور دوزخ کے درمیان ہے۔ یا پھر قبر جو اس زندگی اور آئندہ زندگی کے درمیان حائل ہے۔ کلام پاک کی

(فہرست کتب، ۵: ۲، ۱۹۴، بیعد، شماره ۴۶۲: ۲، ۳ و ۶)۔ الشُّرُوطُ پر ایک فقہی تالیف قاہرہ میں موجود ہے۔ ہمیں قوی امید ہے کہ آگے چل کر اس کی دوسری مصنفات بھی منظر عام پر آجائیں گی۔ بہر کیف البرزالی نے جو کچھ لکھا وہ سب شائع نہیں کیا؛ لہذا یہ محض اتفاق ہے کہ اس کی تصنیفات محفوظ رہ گئیں۔ النعمی (الدارس، ۱: ۱۱۳) نے یہ بات قابل ذکر سمجھی کہ ۵۸۹۴ / ۱۳۸۹ء میں التاریخ کی آخری جلد اس کی نظر سے گزری تھی۔

مآخذ: خاندان کی تاریخ کے لیے دیکھیے بالخصوص سوانح زکی الدین، در (۱) الذہبی: نبلاء، مخطوطہ عربی، ییل Yale یونیورسٹی، عدد L ۵۷۱، جلد ۲ (Cat. Nemoy، عدد ۱۱۷۷)، ورق ۳۳۰ ب تا ۳۳۱ ب۔ مفسلہ ذیل سوانح عمریاں قابل ذکر ہیں: (۲) ابن فضل اللہ العمری: مسالک، مخطوطہ عربی، ییل یونیورسٹی، عدد L ۳۴۱ (Nemoy، عدد ۱۱۸۵)، ورق ۱۷۹ ب تا ۱۸۲ ب؛ (۳) حسینی دمشقی: ذیل طبقات الحفاظ، دمشق ۱۳۴۷ھ، ص ۱۸ تا ۲۱؛ (۴) الکتبی: قوات، قاہرہ ۱۹۵۱ء، ۲: ۲۶۲؛ (۵) السبکی: طبقات الشافعیہ، ۶: ۲۳۶ بیعد؛ (۶) ابن کثیر: البدایہ، ۱۴: ۱۸۵ بیعد؛ (۷) ابن حجر: الدرر، ۳: ۲۳۷ تا ۲۳۹؛ (۸) النعمی: الدارس، دمشق ۱۳۶۷ھ / ۱۹۴۸ء تا ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء؛ (۹) ابن قاضی شہبہ: أعلام، مخطوطہ اوکسفورڈ، مجموعہ مارش Marsh، عدد ۱۱۳۳، بذیل ۱۵۷۳۹: ۱۱۲ بیعد۔ الذہبی کی بعض غیر مطبوعہ تصانیف، جس نے البرزالی کی سوانح عمری پر ایک مخصوص رسالہ لکھا تھا (Rosenthal: کتاب مذکور، ص ۵۲۳)؛ نیز (۱۰) الصفدی: الوافی میں بھی قابل قدر معلومات موجود ہیں۔ قَبْ مزید برآں (۱۱) براکلمان، ۲: ۷۷ و تکملہ، ۲: ۳۴ بیعد؛ (۱۲) Les certificats de lecture: G. Vajda، پیرس ۱۹۵۷ء، ص ۳۵، ۵۶؛ (۱۳) وہی مصنف، در J،



اس کے برعکس بے جان اجسام ”مردہ“ برزخ میں (دیکھیے *Le Philosophie illuminative : Carra de Vaux* *d'après Suhrawardi Meqtoul*، در JA، جنوری - فروری ۱۹۰۲ء)۔

بعض اوقات برزخ کا ترجمہ Purgatory کے عیسائی تصور کے قیاس پر اعراف کر دیا جاتا ہے [یعنی وہ مقام جہاں روحوں کو عیسائی عقیدے کے مطابق صغیرہ گناہوں سے پاک کیا جاتا ہے]، لیکن یہ معنی صحیح نہیں۔ یہ Limbo [وہ مقام جہاں روحوں موت اور قیامت کے درمیان رہتی ہیں] کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے (نیز دیکھیے تھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون، بذیل مادہ)۔

(B. CARRA DE VAUX)

- البرزلی: ابو القاسم بن احمد بن محمد، قبیلہ بنو برزالیہ [کذا: صحیح برزالیہ (قیروان کا ایک شہر)] کا ایک مصنف، جو امام مالکؒ کا پیرو تھا۔ البرزلی قیروان میں پیدا ہوا اور تیس یا چالیس برس تک ابن عرفہ کے سامنے زانوئے تلمذتہہ کیا۔ پھر دوسرے بڑے بڑے علمائے تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ خود بھی تونس میں فقہ اسلامی کا استاد اور جامع زیتونہ کا امام ہو گیا۔ ۵۸۰ھ / ۱۱۸۰ء [صحیح ۵۸۰ھ] میں وہ حج کو جاتے ہوئے قاہرہ سے گزرا جہاں اس نے کئی اجازے (= تعلیمی اسناد) دیے۔ ۵۸۳ھ / ۱۱۸۳ء (اور بقول بعض ۸۳۲ یا ۵۸۴ھ [یا ۵۸۳ھ]) میں اس نے تونس میں وفات پائی۔ [بقول السخاوی] انتقال کے وقت اس کی عمر ایک سو تین برس تھی۔ اسے اپنے مجموعہ فتاویٰ و نوازل کے باعث شہرت حاصل ہے، جس کا نام جامع مسائل الأحکام مما نزل من القضايا للمفتين و الحکام ہے۔ یہ دو جلدوں میں ہے اور اس کے بہت سے نسخوں کا علم ہے۔ یہ کتاب الوائشیشی (م ۵۹۱ھ / ۱۱۹۰ء) کی المعیار کے بنیادی ماخذ میں شمار ہوتی

باقی دو آیتوں میں دو سمندروں یا دو بڑے دریاؤں کا ذکر ہے، جن میں سے ایک میٹھا ہے اور دوسرا کھاری، اور ان دونوں کے درمیان ایک برزخ ہے جو انہیں ملتے نہیں دیتا۔ سورہ ۲۷ [النمل]: ۶۱ میں بھی اسی چیز کا ذکر موجود ہے۔ اس آیت مبارکہ میں ”برزخ“ کی جگہ لفظ ”حاجز“ استعمال ہوا ہے [وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا]۔ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ اشارہ شط العرب کے میٹھے پانی کی طرف ہے جو کھاری سمندر میں ملے بغیر دور تک بہتا چلا گیا ہے۔ یہاں رکاوٹ وہ قانونِ فطرت ہے جو خدا کا قائم کردہ ہے۔

مسائل معاد کے سلسلے میں لفظ برزخ اس حد فاصل کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا ہے جو انسانی دنیا کو جس میں آسمان، زمین اور عالمِ سفلی شامل ہیں خدا اور پاکیزہ روحوں کی دنیا سے جدا کرتی ہے، دیکھیے ابراہیم حقی کی کتاب معرفت نامہ (بولاق ۱۲۵۱ تا ۱۲۵۵ھ) کی وہ تصویریں جو اس تصور کی مصوری کرتی ہیں، نیز قب : *Fragments d'eschatologie musulmane : Carra de Vaux* *Life between Death and Resurrection : R. Eklund* Uppsala، according to Islam، ۱۹۳۱ء۔

صوفیہ بھی اس لفظ کو مادی دنیا اور پاک روحوں کی دنیا کے درمیانی خلا کے لیے استعمال کرتے ہیں؛ اسی لیے اس کے ساتھ مختلف قسم کے کئی مفہوم وابستہ ہو گئے ہیں، دیکھیے C. E. Wilson : *The Masnavi*، کتاب ثانی، ج ۲، حاشیہ ۲۔

یہی لفظ اس فلسفے میں بھی ملتا ہے جو ”اشراقی“ (الحکمة المشرقية) کے نام سے معروف ہے۔ وہاں اس سے سیاہ اشیا یا اجسام مراد ہوتے ہیں، یعنی برزخ یا جسم فطرۃ تاریک ہے اور صرف روح سے روشنی حاصل کرنے پر روشن ہوتا ہے۔ آسمانی کرمے ”جاندار“ یا ”زندہ“ برزخ میں اور

شرقی (گرینچ) اور ۳۹ درجہ ۲۰ دقیقہ عرض بلد شمالی پر واقع ہے۔

قرون وسطیٰ کے کئی جغرافیہ نگاروں کے ہاں

(قب یاقوت، ۱ : ۵۶۲؛ حدود العالم، ص ۳۰۳)

برزند اور برزنج (نزد تفس) کے درمیان التباس ہو گیا

ہے، جسے اگر المقدسی (ص ۳۷۸) کے اس بیان

کے ساتھ دیکھا جائے کہ برزند ارسنوں کی ایک

مندی تھی تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کئی

ایک جغرافیہ نگاروں (مثلاً یاقوت) نے برزند کا

محل وقوع ارسینیہ میں لیوں قرار دیا ہے۔

افشین [رک باں] کے زمانے سے قبل ہمیں اس

مقام کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اس نے ۵۲۲/

۸۳۵ میں بابک [رک باں] پر فوج کشی کے دوران

میں برزند کو بھی اپنا ایک مستقر بنایا تھا۔ بہت

سے ماخذ میں مذکور ہے کہ افشین نے برزند کو

تباہ و برباد پایا اور اسے از سر نو تعمیر کرایا

(Schwarz، ص ۱۰۹)۔ ممکن ہے بابک نے اس قصبے

کو تباہ کر دیا ہو اس لیے کہ یہ مغان کے بے گیہ

میدان کے شمال میں اردبیل سے آنے والی شاہراہ

پر فوجی نقطہ نظر سے بڑے اہم مقام پر

واقع تھا۔ افشین کے عہد کے بعد برزند ایک بڑا

قصبہ بن گیا [اس کی تصدیق ابن حوقل نے کی ہے

(لیسٹرینج، ص ۱۷۶)]۔ اس میں ایک پر رونق بازار

تھا جو کپڑے کی صنعت کے لیے مشہور تھا۔ ممکن

ہے کہ مغول کی فتوحات کے دوران میں اسے

کچھ نقصان اٹھانا پڑا ہو، کیونکہ حمد اللہ المستوفی

(نزهة، مترجمہ لیسٹرینج G. Le Strange، ص ۹۱)

بتاتا ہے کہ اس کے زمانے (آٹھویں صدی/چودھویں

صدی کے وسط) میں یہ قصبہ ویران ہو چکا تھا۔

آگے چل کر اس کا رقبہ قبیلہ شاہ سون [رک باں]

کی چراگاہوں میں شامل ہو گیا تھا اور یہاں

کے رہنے والے آج کل کی طرح آذری ترکی بولتے تھے۔

ہے۔ نویں اور پھر بارہویں صدی عیسوی میں اس کے دو اقتباسات مرتب کیے گئے تھے۔ البرزلی نے اس میں بہت سے فتاویٰ (responsa) نقل کیے ہیں اور ان کے ساتھ ان مفتیوں کے نام بھی لکھ دیے ہیں جو مشہور عالم و فقیہ تھے، اور جن کے زمانے اور مقام کا پتا آسانی سے چلایا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر یہ کتاب افریقیہ [تونس] کے اس زمانے کے معاشرے کی تاریخ کے ایک اہم ترین ماخذ کا کام دیتی ہے۔ اس زمانے میں القیروان اور المہدیہ کے زیری (دسویں صدی سے بارہویں صدی عیسوی تک) اور بنو حفص (تیرہویں صدی سے چودھویں صدی عیسوی تک) حکمران تھے۔

ماخذ: (۱) الزرکشی: تاریخ الدولتین، تونس

۵۱۲۸۹/۱۸۷۲ء، ص ۶۱، ۱۰۹، ۱۲۲ و مترجمہ

E. Fagnan، قسنطینہ ۱۸۹۵ء، ص ۱۱۲، ۲۰۲، ۲۲۶؛

(۲) احمد بابا التنبکشی: نیل الإبتہاج، قاہرہ ۱۳۲۹ھ/

۱۹۱۱ء، ص ۲۲۵ تا ۲۲۶؛ (۳) السخاوی: الضوء اللامع،

قاہرہ ۱۳۵۵ھ، ج ۱۱، عدد ۳۲۹، نیز ص ۱۸۹؛ (۴)

محمد بن شیب: اجازة، عدد ۲۶۱؛ (۵) ابن مریم:

البتان، الجزائر ۱۹۰۸ء، ص ۱۵۰ تا ۱۵۲ و مترجمہ

F. Provenzali، الجزائر ۱۹۱۰ء، ص ۱۶۴ تا ۱۶۷،

اشاریہ: ص ۵۸۸؛ (۶) براکلیمان، ۲: ۳۱۹ و تکملہ، ۲:

۳۴۷؛ (۷) La Berbérie Orientale: R. Brunschvig

sous les Hafsides، بیرس ۱۹۴۰ تا ۱۹۴۷ء، ج ۲،

بمد اشاریہ، ص ۴۵۶؛ (۸) ادریس H.R. Idris La

Berbérie Orientale sous les Zirides، بمواضع کثیرہ۔

(H. R. IDRIS)

\* برزند: اردبیل کے شہرستان (ضلع) اور

گرہی کے بخش (County) میں ایک گاؤں اور

دیہستان (Township) جو ان پہاڑوں میں واقع ہے

جہاں سے شمال کے رخ مغان کا میدان نظر آتا ہے۔

اس نام کے لفظی معنی "اُونچا مقام" ہو سکتے

ہیں۔ یہ گاؤں تقریباً ۷۴ درجہ ۴۰ دقیقہ طول بلد





*Giorn. Soc.* در *Susen la cantatrice* : V. Rugarli  
*Asiat. Italiana*، ج ۱۱۱، ۱۸۹۷ - ۱۸۹۸؛ (۶)  
 العوفی: لباب الالباب، ۱، لائڈن ۱۹۰۶ء: ۷۲ تا  
 ۷۵؛ (۷) ذبیح اللہ صفا: حماسہ سرائی در ایران، تہران  
 ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۶ء، ص ۲۸۸ تا ۲۹۵؛ (۸) وہی مصنف:  
تاریخ ادبیات در ایران، تہران ۱۳۳۶ھ / ۱۹۵۸ء، ۲:  
 ۳۷۷ بعد.

([H. MASSÉ] و CL. HUART)

\* برزوئیہ: ایک قلعے کا عربی نام، جس کی  
 توثیق یاقوت نے کی ہے، [نیز برزئیہ و برزئیہ۔  
 ابوالفداء نے لکھا ہے کہ حصن برزئیہ شہر اور  
 نکاس کے جنوب میں اور سپہوں کے مشرق میں  
 ان مقامات سے تقریباً ایک ایک روز کی مسافت پر  
 واقع تھا۔ تقریباً سب مسلمان جغرافیہ نگاروں کا بیان  
 ہے کہ یہ انتہائی مستحکم اور ناقابلِ تسخیر قلعہ  
 تھا] ایسا کومنینا Anna Comnena نے اس کے بارے  
 میں ایک حوالہ دیا ہے، جس کی پیروی کرتے  
 ہوئے جدید مصنف اسے بورزی Bourzey کہنا  
 زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مقامی باشندے اسے قلعہ  
 مرزہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس قلعے کے  
 کھنڈر الاوت Alaouite [ابوالفداء: الخیط] کے بلند  
 سلسلہ کوہ کی مشرقی ڈھلان پر واقع ہیں اور آج  
 بھی غاب کی دلدلی نشیب [بقول ابوالفداء اور الدمشقی  
 جہیل قاسیہ] پر مشرف ہیں۔ یونانی عہد سے اس کی  
 تاریخ پر آشوب رہی ہے، جب کہ Lysias کے  
 متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہے۔  
 ۵۳۶۵ / ۹۷۵ء میں شام پر شہنشاہ زمسکس  
 Tzimisce کی لشکر کشی کے وقت یہ قلعہ حمدانیوں  
 کے ہاتھ سے نکل کر بوزنطیوں کے قبضے  
 میں چلا گیا۔ بالآخر اس پر صلیبیوں (Crusadors)  
 کا قبضہ ہوا اور اس کا شمار ریاست انطاکیہ کے  
 بہترین دفاعی مقامات میں ہونے لگا (معلوم ہوتا

بہادروں کو پکڑ لیا تھا اور جب ایرانی بہادر  
 فرامرز اچانک انہیں چھڑانے کے لیے پہنچا تو وہ  
 انہیں پابزنجیر افراسیاب کے پاس بھیجنے کا فیصلہ  
 کر چکی تھی۔ یہ برزونامہ کے بہترین حصوں  
 میں سے ہے اور اسے بجائے خود ایک اعلیٰ درجے کا  
 فن پارہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

[برزونامہ کے ایک اور قصے کو، جو برزو کے

ایک شکار سے متعلق ہے، (Chrest. Schahnam) Vullars  
 ص ۸۷ تا ۹۹) اور de Sacy (در *Journal des*  
*Savants*، ۱۸۳۶ء، ص ۲۰۷ بعد) نے شائع کیا  
 ہے۔ اس کا ترجمہ Kosegarten نے لیا ہے (*Mines*  
*de l'Orient*، ۵: ۱۰۹ تا ۱۲۵)۔

[ذبیح اللہ صفا نے حماسہ سرائی در ایران میں  
 برزونامہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے] ایک اور  
 رزمیہ نظم بیژن نامہ بھی عطاء سے منسوب کی  
 جا سکتی ہے، جس میں ایک اور ایرانی بہادر کے  
 کارناموں کا ذکر ہے اور جس کا آخری شعر یہ ہے :-

چوزیں داستان دل پر داختم

سوی رزم برزو ہمی تاختم

[عطاء بن یعقوب نے عربی اور فارسی دونوں

زبانوں میں شعر کہے۔ بقول محمد عوفی (۱: ۷۲)  
 اس کے دو دیوان ہیں اور دونوں فضلائے عرب و  
 عجم میں مقبول ہیں۔ اس کے عربی دیوان میں  
 ایک نعتیہ قصیدہ بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ نمونہ  
 کلام کے لیے دیکھیے لباب الالباب، ۱: ۷۲ تا  
 ۷۵ و صفا: تاریخ ادبیات در ایران، ۲: ۳۷۹ تا  
 ۳۸۳۔

مآخذ: (۱) دسائی S. de Sacy، در *Journal de*

*savants*، ۱۸۳۶ء، ص ۲۰۷ بعد؛ (۲) J. Mohl:

*Le Livre des Rois*، مقدمہ، ص ۶۴ بعد؛ (۳) نوالدیکہ

T. Nöldeke، در *Grundriss der Iran. Philologie*

۲: ۲۰۹؛ (۴) Éthé، در کتاب مذکور، ص ۲۳۳؛ (۵)



شہر تھا۔ اس کے نہایت وسیع کھنڈروں کو، جو بابلی عہد کے باقی ماندہ شکستہ آثار میں سب سے زیادہ بڑے ہیں، اہل عرب نمرود بن کنعان کا ("صرح نمرود"، در یاقوت، ۱: ۱۳۶) یا بخت نصر (یاقوت، ۱: ۵۶۵) کا محل سمجھا کرتے تھے۔ عصرِ جدید میں بھی انہیں برجِ بابل کے کھنڈر ہی خیال کیا جاتا تھا اور کتبوں کے ذریعے رالسن H. Rawlinson کے ثابت کرنے کے بعد بھی کہ یہ بورسپہ کے معبدِ نبو Nebo کے برج کے شکستہ آثار ہیں، یہ غلط نظریہ برابر سامنے آتا رہا۔ یہ امر اچھی طرح واضح نہیں کہ آیا ابتدائی اسلامی دور میں بھی اس مقام پر کوئی بستی تھی یا نہیں۔ البلاذری نے فقط اجماتِ برس (آشوری: اگمہ agamma)، یعنی برس کی دلدلی جھیلوں کے نواحی علاقے کا ذکر کیا ہے (نیز دیکھیے یاقوت، ۱: ۱۳۶) جن پر حضرت علیؓ نے قبضہ کر لیا تھا۔ بالائی اور زیرین برس کا ذکر قدامہ کے ہاں ملتا ہے اور ابن خردادبہ انہیں محصولات کی فہرست میں السبین اور الوقوف کے نام سے موسوم اور صوبہ (استان) بھقیباز الوسطی کے اضلاع طسوج میں شمار کرتا ہے۔

عہدِ قدیم میں بھی بابل اور بالخصوص بورسپہ اپنی صنعت پارچہ بافی کے لیے مشہور تھا ([دیکھیے] مثلاً Strabo، ۱۷: ۱، ۷)۔ یہ صنعت عربوں کے عہد تک سلامت رہی۔ بقول المسعودی (مروج، ۶: ۵۹) ضلع برس میں تیار ہونے والے ملبوسات برسپہ کہلاتے تھے یا اس ضلع کے نام پر خرنیہ جو برس، بابل اور جلع کے درمیان واقع تھا (G. Hoffmann کی تصحیح کے اتباع میں)۔ یاقوت (۴: ۷۷۳) میں نرسیہ کی تصحیح کر کے برسپہ پڑھنا چاہیے۔

مآخذ: (۱) ابن خردادبہ، ج ۲: ۲ (۲) البلاذری،

۱۱۸۸/۵۵۸۴ء میں سلطان صلاح الدین ایوبی نے بزورِ شمشیر اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ مملوکوں کے دور سے اس کی اہمیت بڑی تیزی سے ختم ہوتی گئی، چنانچہ زمانہ مابعد کے وقائع نگار اس کا ذکر محض سرسری طور پر کرتے ہیں۔

مآخذ: (۱) یاقوت، ۱: ۵۶۵: (۲) ابوالفداء: تقویم، ص ۲۶۱: (۳) الدمشقی، طبع Mehren، ص ۲۰۵: (۴) Das Liwa el-Ladkijé: M. Hartmann، در ZDPV، ۱۳: ۱۷۳ و ۲۱۲: (۵) M. van Berchem: Inscriptions arabes de Syrie، ص ۸۲: (۶) وہی، مصنف: Notes sur les croisades، در JA، ۱۹۰۲، ۱: ۳۳۳: (۷) Topographie historique de la Syrie: R. Dussaud، پیرس ۱۹۲۷ء، بالخصوص ص ۱۵۱ تا ۱۵۳: (۸) Palestine under the Moslems: G. Le Strange، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۳۲۱: (۹) Histoire de la dynastie des Hamdanides، الجزائر ۱۹۵۱ء، ص ۲۱۵، ۸۳۳: (۱۰) La Syrie du Nord: Cl. Cahen، پیرس ۱۸۳۰ء، بحد اشاریہ (بذیل Borzei): (۱۱) J. Weu، بحد اشاریہ Le pays des Alaouites: Iersse، بحد اشاریہ (بذیل Bourzey): (۱۲) Le château de Bourzey، در Annales Archéologiques de Syrie، ۱۹۵۶ء، ص ۱۳۹ تا ۱۶۲۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

برس: اسے برس نمرود اور قدیم تر ادبیات میں برس [یاقوت، ۱: ۵۶۵] بھی کہتے ہیں۔ یہ ویران موضع لبِ فرات کے شہر جلع سے نومیل جنوب مغرب میں اور بابل کے جنوب جنوب مغرب میں تقریباً بارہ میل دور جھیل ہندیہ کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔

یہ وہی مقام ہے جو قدیم زمانے میں بورسپہ Borsippa کے نام سے مشہور اور بابل کے ساحل کا

متعلق اس طرح کا حکم نافذ کیا جاتا تھا تو وہ عام طور سے روپیہ دے کر اس کی زد سے بچ جاتے تھے۔ بایں ہمہ اسے ایک مدافعتی تدبیر بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ ان دنوں اہل یورپ کے جنگی جہاز بحیرہ روم میں زوروں سے سرگرم عمل تھے۔ اسی بناء پر ایک سخت گیرانہ قانون (Draconian decree) نافذ کیا گیا، جس کی رو سے مصر اور شام میں یورپ والوں کی جائداد ضبط کر لی گئی اور کسی یورپی کو اپنے وطن واپس جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کے بعد عارضی طور پر یورپی سگوں کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا، لیکن اس اقدام کے نتائج غیر یقینی رہے۔

حکومت مصر نے فوجی اعتبار سے بڑی زبردست حفاظتی تدابیر بھی اختیار کیں۔ ساحل کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹے چھوٹے قلعے تعمیر ہوئے اور چھوٹی جنگی کشتیوں کا ایک بیڑا تیار کیا گیا۔ بہر حال سلطان برابر اپنے عظیم مقصد کے حصول، یعنی قبرص پر لشکر کشی کی تیاریوں میں مصروف رہا۔ ابتدائی دیکھ بھال کی کئی مہموں کے بعد بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی شروع ہوئی۔ معرکہ کارزار صرف ایک ہی بار گرم ہوا، جس میں بے انتہا خون ریزی ہوئی۔ اہل قبرص نے شکست کھائی اور فاتحین ان کے بادشاہ یانوس Janus کو گرفتار کر کے اپنے ہمراہ قاہرہ لے گئے۔ اسے پابجولاں شہر میں پھرایا گیا اور اس کی آزادی اور بادشاہت کی بحالی اس شرط پر عمل میں آئی کہ وہ سالانہ خراج ادا کیا کرے گا۔ مال غنیمت کا ایک حصہ مکہ معظمہ کی کئی یادگار عمارتوں کی مرمت پر صرف کیا گیا (۵۸۳۰/۵۸۲۷ء)۔

تاہم اس سہل الحصول فتح نے اس بدانتظامی کو ظاہر کر دیا جو فوجوں میں خطرناک حد تک موجود تھی، چنانچہ قرہ قویونلو قبیلے کے

بمدد اشاریہ؛ (۳) قَدَامَه (طبع د خویہ de Goeje)، ص ۲۳۸؛ (۴) المَسْعُودِي: مَرُوج، ۶: ۵۹، (۵) البَكْرِي، ص ۱۴۹؛ (۶) ياقوت، ۱: ۱۳۶، ۵۶۵ و ۷: ۷۷۳؛ (۷) *Babylonien nach den arabischen*: M. Streck (۷) *Beiträge*: A. Berliner (۸)؛ ۱۶؛ *Geographien zur Geographie und Ethnographie Babyloniens im Talmud und Midrasch*: G. Hoffmann (۹)؛ ۲۶؛ *Syrische Akten Persischer Märtyrer*، ص ۲۶، حاشیہ ۲۰۶؛ *On the Birs Nimrūd*: H. Rawlinson (۱۰)؛ ۲۰۶؛ *or the Great Temple of Borsippa Explorations*: H. V. Hilprecht (۱۱)؛ (۱۸۶۰ء)؛ *in Bible Lands*، ص ۱۸۲ بعد۔

(E. HERZFELD)

برسبای: الملک الأشرف ابو النصر، ۵۸۲۵/۵۸۲۲ تا ۵۸۳۱/۵۸۳۸ء، مصر کا مملوک سلطان۔ وہ سلطان برقوق کے مملوکوں کے زمرے میں داخل ہوا اور [المؤید] شیخ کے عہد حکومت میں اسے پہلی ترقی ملی۔ چنانچہ وہ طرابلس [الشام] کے صوبے کا والی ہو گیا۔ حکومت کے دوسرے اہلکاروں کی طرح وہ بھی قید و بند سے نہ بچ سکا اور کچھ مدت مرقب اور دمشق کے قید خانوں میں رہا۔ سلطان "ططر" کی تخت نشینی پر اس کے دن پھرے اور باوجودیکہ "ططر" نے بہت تھوڑی مدت حکومت کی، برسبای قاہرہ میں عروج و اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ [وہ دوادار اور الصالح کا اتابک بھی رہا]۔

بر سر حکومت آنے ہی برسبای کے مزاج کی اہم خصوصیات . . . ظاہر ہونے لگیں۔ اس کے ابتدائی کارناموں میں سے ایک یہ تھا کہ اس نے ایک قدیم فرمان کی تجدید کر دی جس کی رو سے یہودی اور عیسائی سرکاری ملازم نہیں ہو سکتے تھے۔ اس فرمان کو در پردہ ایک طرح کا ٹیکس بھی کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ جب غیر مسلموں کے



ساتھ ظلم و حقارت کے سلوک کے باعث بہت ہوا ملی اور فریقین کے مابین بڑی پر مغز سیاسی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ بایں ہمہ سلطان برسبای کے عہد حکومت میں اس مناقشے کا کوئی فوری نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

فرمانروائے مصر کی حکمت عملی کی اساس بلاشبہ ذاتی عزت و اقتدار کے تصور پر قائم تھی، لیکن اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ مغل سلطان کو سرکاری عمال کے ذریعے عرب میں اپنے قدم جمانے سے روکے کیونکہ اس سے مصر کے تجارتی مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ برسبای نے کچھ عرصہ پہلے ہندوستان سے آنے والے تاجروں سے خواہش کی تھی کہ وہ اپنا تجارتی مال بجائے عدن میں اتارنے کے، جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتے تھے، جڈے میں اتارا کریں۔ یہ ایک بہت اچھا آغاز تھا، لیکن برسبای نے . . . تاجروں کو مجبور کیا کہ وہ محصول ادا کرنے کی غرض سے اپنا مال قاہرہ لے کر جائیں۔ اس تکلیف دہ قانون میں جلدی ہی ترمیم کر دی گئی، جس کی رو سے تاجروں کو قاہرہ جانے کی تو ضرورت باقی نہ رہی لیکن جڈے میں انہیں بہت بھاری محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ بہر صورت یہ بندرگاہ اس وقت سے بڑی اہم تجارتی منڈی بن گئی۔ یہاں جتنے محاصل وصول ہوتے ان کا نصف تو شریف مگہ کے خزانے میں جاتا اور نصف حکومت مصر کو ملتا تھا۔ محصلین کا پورا عملہ حکومت مصر کا ہوتا تھا۔

برسبای کا انجام ایک درد انگیز اور المناک داستان ہے۔ مصر میں طاعون کی وبا پھیلی تو اس نے اس خوف سے کہ مبادا وہ بھی اس مہلک وبا کا شکار ہو جائے مذکورہ بالا تمام تکلیف دہ اقتصادی اقدامات کو واپس لینے کا فیصلہ کر لیا اور کھلے

ترکمانی حاکم قرہ یولق کی فوج کے ساتھ ایک سرحدی جھڑپ کے موقع پر مملوکوں نے الریا (Edessa) کے شہر پر دھاوا کیا اور اس پر قبضہ کر لینے کے بعد وہاں کے لوگوں کو انتہائی ظلم و ستم کا نشانہ بنایا۔ ہمسایوں کے اس باہمی نفاق سے بالائی الجزیرہ (Mesopotemia) کی خوشحالی کو سخت نقصان پہنچا اور طرفین اسے باری باری تباہ و برباد کرتے رہے۔ برسبای نے خاصے تامل کے بعد ایک بہت بڑی فوج جمع کی، جس نے آخر کار آمد (دیار بکر) کا محاصرہ کر لیا لیکن ترکمانی دارالسلطنت پر قبضہ نہ ہو سکا، جس سے برسبای، کو سخت اذیت پہنچی۔ فوج کے اندر بڑھتی ہوئی بے اطمینانی سے مجبور ہو کر سلطان مصالحتی گفت و شنید پر مجبور ہو گیا۔ قرہ یولق نے صلح کی تجویز مان لی اور ذرا گول مول الفاظ میں سلطان مصر کی سیادت کو تسلیم کر لیا۔ مملوک فوج قاہرہ کی جانب واپس روانہ ہو گئی۔ اس کی واپسی ایک غیر مطمئن سپاہ کی بھگدڑ تھی۔ اس کے دستے انتہائی بد نظمی اور انتشار کے ساتھ لوٹ رہے تھے، جنہیں دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ایک شکست خوردہ فوج بڑی تیزی سے پسپا ہو رہی ہے (۵۸۳۷ / ۶۱۴۳۳)۔ سلطان نے اپنی مجموعی فوج کا آدھا حصہ اپنے پیچھے الجزیرہ میں چھوڑ دیا تھا۔

اس کے بعد تیموری سلطان شاہ رخ سے ایک عجیب و غریب سیاسی کشمکش شروع ہو گئی۔ مغل فرمانروا کعبے پر غلاف چڑھانے کے حق کا دعویدار تھا، حالانکہ حقیقت میں یہ اہل مصر کا حق تھا جو انہیں قدیم دستور کی بنا پر حاصل تھا۔ سلطان برسبای اس حق کو ترک کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اور اس معاملے میں اسے اپنی مجلس قضا کی پوری تائید حاصل تھی۔ اس مناقشے کو وکلا کی لفظی شعبہ بازیوں اور سفیروں کے

کے عہد کا ایک بڑا منصب دار، جس کے اخلاف نے بھی چھٹی / بارہویں صدی کے آغاز میں بڑا قابل ذکر کردار ادا کیا۔ برسوق نوجوان ہی تھا کہ اس نے طغرل بیگ کے امرائے کبار میں شامل ہو کر تاریخ میں اپنے لیے جگہ پیدا کر لی۔ طغرل بیگ نے، جو ۱۰۵۸/۵۴۵ تا ۱۰۵۹/۵۴۶ کے الم ناک واقعات کے بعد بغداد میں اپنا تسلط دوبارہ قائم کر رہا تھا، برسوق کو بغداد میں اپنا پہلا شخہ (= ناظم عسکر) مقرر کیا: تاہم سلاجقہ کی صلح پسندانہ حکومت میں ضروری اختیارات عمید، یعنی شہری ناظم کے ہاتھ میں رہتے تھے اور یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ بغداد میں کوئی شخہ بارہ برس سے زیادہ مستقل رہا ہو۔ بہر کیف برسوق اس عہدے پر دیر تک فائز نہ رہا کیونکہ پتا چلتا ہے کہ ۱۰۶۳/۵۴۵ء میں وہ سلطان کے حاجب کی حیثیت سے اس کی ہمراہی میں تھا (سبط ابن الجوزی: مرآة الزمان، کتاب خزائن ملیہ پیرس، عربی مخطوطہ، شمارہ ۱۵۰۶، ورق ۸۷ ب)۔ پھر ۱۰۶۴/۵۴۶ء میں نئے سلطان آلپ ارسلان نے اسے یہ کام تفویض کیا کہ ایک باجگذار سے خراج کا بقایا وصول کر کے لائے (وہی کتاب، ورق ۹۹ ب، ۱۰۰ ب)۔ بعد ازاں پندرہ برس تک اس کے بارے میں خاموشی چھائی ہوئی ہے جس کا ہم کوئی سبب بیان نہیں کر سکتے۔ دوبارہ اس کا نام ۱۰۷۸/۵۴۱ء کے قریب سننے میں آتا ہے جب ملک شاہ نے اسے سلجوق باغیوں کے مقابلے میں، جو قتلش کے بیٹے تھے، اناطولیہ بھیجا۔ وہاں اس نے ان میں سے ایک یعنی منصور کو ہلاک کر ڈالا، لیکن دوسرے بیٹے سلیمان کو کچلنے میں ناکام رہا (ابن العبری Chronography: Bar Hebraeus، مترجمہ Budge، ص ۲۲۷)۔ ۱۰۸۶/۵۴۹ء میں اس نے بوزان کے ساتھ مل کر ملک شاہ کے لشکر کے اس

دل سے خیرات کرنے لگا، تاہم اسی زمانے میں اس نے اپنے دو طبیوں کو قتل کروا دیا۔ ۱۳ ذوالحجہ ۵۸۴/۱ جون ۱۳۳۸ء کو وہ طاعون کے مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا۔

سلطان برسبای سے متعلق اپنے تاثرات پیش کرنے کے لیے ہمیں اس کی زندگی کے دو پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کے دل پر ہمیشہ اپنے ایک حریف جانی بیگ صوفی کی دہشت طاری رہتی تھی، جسے اس نے اپنی تخت نشینی کے وقت قید کر دیا تھا، لیکن وہ قید سے نکل بھاگا تھا۔ اس خوف کی بنا پر اس سے کبھی کبھی عجیب و غریب حرکات سرزد ہوتی تھیں، لیکن یہ حرکتیں ان اقدامات کے مقابلے میں بہت معمولی درجے کی ہوتی تھیں جو وہ اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر کیا کرتا تھا۔ مملوکوں کے عہد میں بعض ایسی باتوں کا رواج ہو گیا تھا جو بالآخر ان کی سلطنت کی تباہی کا باعث بنیں، مثلاً بڑے بڑے عہدوں کا بکنا، ایسی دولت کی ضبطی جو بہت نمایاں ہو، حکومت کی اجارہ داری کی غیر معمولی وسعت اور زندگی کی بنیادی اشیائے ضرورت کی جبری خرید کا رواج، جنہیں حکومت پہلے سے خرید رکھتی تھی۔ عرب مؤرخ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ برسبای ایک ذہین فرمانروا اور ایک قابل اور متوازن سیاست دان تھا۔۔۔ لیکن بعض واقعات سے اس کے برعکس بھی ثابت ہوتا ہے۔

مآخذ: (۱) Les biographes du Manhal: Wiet

Safi، عدد ۶۴۴؛ (۲) وہی مصنف: Histoire de la

nation égyptienne، ۴: ۵۴۹ تا ۵۷۶؛ (۳) وہی مصنف:

Les Marchands d'épices sous les sultans mamlouks.

ص ۹۷ تا ۱۰۳؛ (۴) السخاوی: الضوء، ۳: ۸؛

(۵) ابن ایاس، ۲: ۱۵۔

(G. WIET)

برسوق: (مشرقی ترکی "بجو") سلاجقہ کبار



اعانت کی تھی۔ غالباً یہی سبب تھا کہ جب برکیاروق کی وفات کے بعد ۵۳۹۸/۱۱۰۵ء میں محمد تخت نشین ہوا تو اس نے زنگھی کو محبوس کر دیا۔ لیکن اس خاندان نے محمد کے ساتھ مفاہمت کی صورت نکال لی اور وہ یوں کہ انہوں نے نہ صرف باغی منگبرس کا ساتھ نہیں دیا بلکہ اسے دغا بازی سے سلطان کے حوالے کر دیا۔ اس پر زنگھی، جسے موت کی سزا ملنا تھی، رہا کر دیا گیا اور اگرچہ سلطان نے بنو برسق سے ان کی اقطاع کی واپسی کا مطالبہ کیا، لیکن اس کے بدلے میں انہیں دینور عطا کر دیا۔ بہر حال یہ تبادلہ بھی بظاہر عارضی سا تھا کیونکہ کچھ مدت بعد بنو برسق ایک بار پھر تستر پر قابض نظر آتے ہیں۔ اس دوران میں محمد نے برسق (ابن برسق) کو صوبہ ہمدان کا والی مقرر کر دیا، جس کا شمار سلطنت کے صدر مقامات میں ہوتا تھا (ابن القلانسی، طبع Amedroz، ص ۱۷۴)۔

سلطان محمد نے اپنی قوت اچھی طرح مستحکم کرنے کے بعد شام کے فرینکوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ برسق بن برسق ۵۰۰/۱۱۱۱ء کی مہم کے ممتاز ترین شرکا میں سے تھا۔ لیکن یہ مہم اس وجہ سے کامیاب نہ ہوئی کہ ایک تو سرداروں میں نزاع تھی دوسرے شامی والیان ریاست کو ”شرقیوں“ سے عناد تھا، مزید برآں برسق قریب قریب تمام عرصہ علیل رہا۔ تاہم ۵۰۹/۱۱۱۵ء کی مہم کی سپہ سالاری اسے سونپی گئی۔ اس مرتبہ بھی بڑی دشواریوں کا سامنا ہوا: ترکمانان دیار بکر کے سردار اعلیٰ ایل غازی، تفتکین حاکم دمشق اور حلب کے نائب السلطنۃ لوہ لوہ نے اس کے خلاف فرینکوں سے اتحاد کر لیا۔ حمص، جہاں کا حاکم اس کا دوست تھا اور حما، جسے اس نے فتح کیا تھا، جیسے شہروں کو اپنا فوجی مستقر بنا کر برسق نے اتحادی فوجوں کو

اول دستے کی کمان کی، جس نے سلیمان کی موت کے بعد حلب پر قبضہ کیا تھا اور غالباً یہیں سے اسے سلیمان کے جانشین کے مقابلے پر ایشیائے کوچک بھیجا گیا، جو اس وقت نیقیہ Nicaea [= موجودہ ازنیق] میں تھا اور سلطان کی کوششوں کے باوجود بوزنطی شہنشاہ الکسیس کومنینوس Alexius Comnenus اس کی اعانت کیے جا رہا تھا (Alexiad : Anna Comena، مطبوعہ بون، ص ۳۰۲ تا ۳۱۱)۔ شاید اسی موقع پر اس نے قسطنطینیہ سے تین لاکھ دینار کا وہ خراج حاصل کیا جس کا ذکر البنداری (طبع هوتسما Houtsma، ص ۷۰) نے کیا ہے۔ اس سے چند دنوں بعد برسق نے ملک شاہ کی ایک بیٹی سے خلیفہ بغداد کی شادی کی تقریب کے سلسلے میں بغداد میں جشن کا اہتمام کیا۔ سلطان کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کی باہمی چپقلش میں برسق نے برکیاروق کا ساتھ دیا اور خصوصیت سے تشریح کی مخالفت میں حصہ لیا۔ وہ شاہزادہ برکیاروق کے پیچھے پیچھے اصفہان گیا اور وہیں حشیشین کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔ دو سال بعد (۵۳۹۰/۱۰۹۶-۱۰۹۷ء) اس کے بیٹوں نے برکیاروق کے شیعہ مستوفی مجدالملک البلاسانی کو سزائے موت دلوا کر اس کا انتقام لیا کیونکہ انہیں شبہہ تھا کہ برسق اور دوسروں کے قتل کا محرک وہی تھا۔

برسق کے بیٹے یعنی زنگھی، آقبوری، ایلبکی اور برسق عام طور سے ایک خاندان کی صورت میں مربوط و متحد رہے اور جب تک برکیاروق زندہ رہا اس کے دامن سے وابستہ رہے لیکن اس گھرانے کا قیام بالعموم اپنے اقطاع، یعنی صوبہ آہواز، میں رہا، جس کا سب سے بڑا شہر تستر تھا۔ ان علاقوں کو قانوناً یا ان کے قبضے کی بنا پر ان کی موروثی ملکیت تسلیم کیا جاتا تھا۔ برکیاروق کی اپنے بھائی محمد سے زے واپس لینے میں برسق نے

ذکر یہی ہے اور اس کے اخلاف کا خوزستان کے آئندہ حاکموں کے باجگذاروں کی فہرست میں کہیں نام نہیں ملتا۔  
 آق سنقر البرسقی [رک باں] نے برسق اول ہی کے عہدیدار کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔

مآخذ: متن میں مذکورہ حوالوں کے علاوہ: (۱) ابن الاثیر: الکامل، ج ۱۰، ۱۱، بمدد اشاریہ؛ (۲) عماد الدین الاصفہانی در نسخہ بنداری (طبع ہوتسا: Recueil)، ج ۲، بمدد اشاریہ؛ (۳) راوندی، راحت الصدور، طبع محمد اقبال، بمدد اشاریہ؛ (۴) مہمات شام کے سلسلے میں ماخذ کی تفصیل La Syrie: Cl. Cahen du Nord etc. ص ۲۵۱-۲۵۳، ۲۷۳-۲۷۴ میں درج ہے؛ نیز (۵) Histoire des Croisades: Grousset، ۱: ۴۶۳ بعد و ۴۹۵ بعد۔

(CL. CAHEN)

البرسقی: رک بہ آق سنقر۔

برسلونہ: رک بہ برسلونہ۔

برسوق: رک بہ برسق۔

برسہ: [= برسہ، لاج؛ البستانی، سامی؛]

[برسہ] جسے ترکان آل عثمان قدیم شہر برسہ

(Prusa): (προυσα) کے نام کی رعایت سے برسہ بھی

کہتے ہیں، کوہسار کشیش طاغ (Mysian Olympus)

کی شمال رویہ دامنی پہاڑیوں میں واقع ہے۔ ۵۷۲۶/

۱۳۲۶ء اور ۵۸۰۵ / ۱۴۰۲ء کے درمیان یہ

سلطنت عثمانیہ کا بڑا دارالحکومت بن گیا تھا۔

پیکانی برس Pachymeres نے اسے نیقیہ

Nicaea [= ازیق] اور آلاشہر (Philadelphia) کے

ساتھ ان تین بڑے شہروں میں شمار کیا ہے جو

۵۶۹۹ / ۱۲۰۰ء کے قریب پورے مغربی اناطولیہ پر

سرحدی ترکوں کی یورشوں کے وقت بھی بوزنطیوں کے قبضے میں رہ گئے تھے۔

ان کے مورچوں سے نکال دینے کی کوشش کی لیکن وہ صرف ان سے رابطہ قائم کر سکا، اور پیچھے ہٹ گیا، پھر پلٹ کر گیا اور بالآخر رودِ عاصی (Orentes) کے مشرق میں دانیث کے مقام پر راجر Roger، حاکم انطاکیہ نے اسے ہزیمت دی۔ وہ ابھی انتقام لینے کی تیاریاں ہی کر رہا تھا کہ پیغام اجل آپہنچا، اور ۵۰۱/۱۱۱۶ء ہی میں اس کا بھائی زنگھی بھی عالم بقا کو سدھار گیا۔ اس کی وفات اور دو سال بعد سلطان محمد کی رحلت نے گویا فرینکوں کے علاقے میں سلجوقی سلطنت کی طرف سے سیاسی مداخلت کا خاتمہ کر دیا۔

برسق کے آخری جانشینوں کا، جو خوزستان میں پھر مستحکم ہو گئے تھے، دوبارہ ذکر صرف اس موقع پر سننے میں آتا ہے جب سلجوقی شہزادوں میں ان بن ہوئی۔ آقبوری اور زنگھی اور ایلبکی کے بعض بیٹے سلطان محمود کی اس فوج میں نظر آتے ہیں جسے محمود نے اپنے چچا سنجر کے خلاف صف آرا کیا، اور برسق بن برسق زبرین عراق کے پیچ در پیچ جھگڑوں میں حصہ لیتا رہا۔ محمود کی وفات پر اس خاندان کے دو بھائی طغرل اور برسق، سلجوقی طغرل کے اس گروہ میں موجود تھے جس نے سنجر کی حفاظت کی، پھر جب طغرل فوت ہو گیا تو انہوں نے داؤد کے گروہ میں شمولیت اختیار کی، جس کی پشت پر خلیفہ تھا۔ بایں ہمہ آگے چل کر وہ فاتح سلطان مسعود (۵۲۹/۱۱۳۳ء تا ۵۳۱/۱۱۳۶ء) سے مفاہمت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ آیا وہ شخص بھی انہیں دو میں سے ایک تھا جس کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے ابن ابی طیبی (حوالہ در ابن الفرات، سلسلہ جدید، وی انا، ۲: ۱۱۵-الف) نے لکھا ہے کہ وہ ۵۳۳/۱۱۳۹ء میں حاکم تستر تھا۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے ایک رکن کا آخری



اطلاع دیتا ہے کہ قلعے میں ایک ہزار مکانات تھے۔ ۱۱۰۰/۱۶۴۰ء میں اس کے متعلق ایک اور بیان اولیاء چلبی (۲: ۹) کے ہاں ملتا ہے۔ اور خان [رک باں] کا محل (بیگ سرا) فصیل کے اندر بوزنطی کلیسا کے قریب واقع تھا جسے مسجد بنا لیا گیا تھا (ابن بطوطہ، ۲: ۳۲۲)۔ یہ مقام، جہاں سے نیچے کا میدان بخوبی نظر آتا ہے، آج کل توپ خانہ کہلاتا ہے۔ اس کے قریب ۱۳۳۷/۱۳۳۷ء کا ایک کتبہ پایا گیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ اورخان نے یہاں ایک مسجد بھی تعمیر کرائی تھی (اے۔ توحید: برسہ وہ آگ اسکی کتابہ، در *TOEM*، ۵: ۳۱۸ تا ۳۲۰)۔ اورخان نے برسہ کو اپنا دارالحکومت بنایا اور یہیں ۱۳۲۷ء میں اپنا پہلا چاندی کا سکہ "آقچہ" ضرب کرایا (*Belleten*، ۱۰: ۲۰۷)۔ ۱۳۳۹-۱۳۴۰ء میں اس نے قلعے کے نیچے میدان میں ایک مسجد، ایک لنگر خانہ [عمارت]، ایک حمام اور ایک کارواں سرا (بیگ خانی) تعمیر کرائی۔ عمارات عامہ کا یہ مجموعہ عثمانی دور کے برسہ کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا، اور آج بھی یہ برسہ کا سب سے بارونق تجارتی مرکز ہے۔ اسی دور میں نئے نئے محلے مثلاً علاؤالدین بیگ، چوبان بیگ، قوجہ نائب، وجود میں آئے۔ ۱۳۳۳/۱۳۳۳ء میں ابن بطوطہ (وہی کتاب) نے برسہ کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا کہ یہ ایک بڑا اور عظیم الشان شہر ہے، جس میں دلکش بازار اور وسیع سڑکیں ہیں۔ آنے والے بادشاہوں کے عہد میں سلاطین اور اعلیٰ عہدیداروں نے اس شہر کے دوسرے حصوں میں نئے بازار اور مذہبی عمارات بنوائیں، جن کے ساتھ گراں بہا اوقاف وابستہ تھے۔ یہ برسہ کے نئے محلوں، مثلاً پلدریم، امیر سلطان، سلطان محمد (موجودہ پشل) وغیرہ کے پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

بقول عاشق پاشا زادہ (طبع Fr. Giese، ص ۲۲ تا ۲۳) آل عثمان نے پہلی بار برسہ کا محاصرہ اس وقت کیا تھا جب وہ یہاں کے بوزنطی تکفور [رک باں] (= رئیس) کو شکست دے کر برسہ کے میدان میں داخل ہوئے تھے۔ اس نے دوسرے تکفوروں کو اپنا حلیف بنا کر ۱۳۱۸/۱۳۱۷ء کے لگ بھگ ان کے حملے کو درہ دینوز Dinboz میں روکنے کی کوشش کی تھی۔ یہ پہلا محاصرہ ناکام رہا۔ پھر کئی برس کی ناکہ بندی (قب عاشق پاشا زادہ، ص ۲۸ تا ۲۹: ابن بطوطہ، مطبوعہ پیرس ۱۸۷۷ء، ۲: ۳۱۷: Pachymeres، حوالہ در A. Wächter: *Der verfall des Griechentums in Kleinasien*، لائپزگ ۱۹۰۳ء، ص ۵۵) کی وجہ سے جب فاقوں کی نوبت آئی تو شہر والوں کو آل عثمان کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا (۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۶/۶ اپریل ۱۳۲۶ء) اور بھاری خراج ادا کرنا پڑا (Pachymeres، محلّ مذکور، در نشری، طبع Taeschner، ۱: ۳۹، تیس ہزار "فلوری" Flori [= اشرفیاں])۔ بوزنطی سپہ سالار کو برسہ سے استانبول جانے کی اجازت دے دی گئی لیکن اس کا مشیر صروز (؟)، جو شہر کو حوالے کر دینے کا ذمے دار تھا، ترکوں کے پاس ہی رہا (عاشق پاشا زادہ، ص ۲۹: نشری، ۱: ۳۹)۔ برسہ کا یونانی اسقف آل عثمان کے ماتحت بھی اپنے فرائض انجام دیتا رہا، لیکن اس کے محاصل میں خاصی کمی واقع ہو گئی (A. Wächter، محلّ مذکور)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں کو قلعے سے خارج کر کے اس کے نیچے کے ایک علاقے میں منتقل کر دیا گیا تھا، چنانچہ پندرہویں صدی کے کاغذات قضا سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس وقت بھی وہیں آباد تھے۔ خود قلعے میں ترک آباد ہو گئے اور دربار قائم ہوا۔ ۱۳۳۲/۱۳۳۲ء میں لکھتے ہوئے B. de la Broquière (ص ۱۳۶)

بایزید اول [رک باں] کے عہد میں اس شہر کو خاص طور پر بڑی ترقی نصیب ہوئی۔ ۱۳۹۹ء میں یہاں کی عظیم الشان مسجد اولو جامع تعمیر ہوئی۔ ایک معاصر J. Schiltberger نے اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر بیان کیا ہے کہ شہر میں دو لاکھ (؟) مکان اور آٹھ ہسپتال [لنگر خانے] ("عمارات") تھے، جہاں غریب لوگوں کو رکھا جاتا تھا، خواہ وہ عیسائی، یہودی یا کوئی اور غیر مسلم ہوں (طبع Telfer، ص ۴۰)۔ ۱۴۰۲ء/۱۴۰۳ء میں جب تیمور نے بایزید اول پر فتح پائی تو اس کی فوج کے ایک دستے نے برسہ کو تاخت و تاراج کرنے کے بعد جلا ڈالا۔ اس کے بعد سے برسہ کی جگہ اڈریانوپل (دیکھیے اڈرنہ) کو سلطنت عثمانیہ کے دارالسلطنت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ تاہم خانہ جنگی (۱۴۰۶ء/۱۴۰۷ء تا ۱۴۱۳ء) کے دوران میں ہر فریق کی انتہائی کوشش یہی رہی کہ اڈرنہ کے علاوہ برسہ پر بھی قبضہ ہو جائے۔ مراد ثانی کے خوش حال عہد حکومت میں، جس کی تخت نشینی برسہ میں ہوئی تھی، اس شہر کی حالت تیزی سے بہتر ہونے لگی اور یہ بہت پھیل گیا۔ نئے محلے سلطان مراد، فضل اللہ پاشا، حاجی عوض پاشا، حسن پاشا، عمر بیگ، جیبہ علی بیگ، شہاب الدین پاشا اور ریخان کے ناموں سے موسوم ہوئے اور انہوں نے ان محلوں کے لیے اوقاف قائم کیے۔ ۱۴۳۶ء/۱۴۳۷ء میں B. de La Broquiere نے اپنے مشاہدات یوں قلمبند کیے ہیں کہ "ceste ville le Bourse est Bien bonne ville et merchande, et est la meilleure ville que la Turc aye." ("بورسہ کا یہ شہر بہت اچھا شہر اور تجارتی منڈی ہے اور یہ ترک [سلطان] کا بہترین شہر ہے")۔ اس سے قبل کہ محمد ثانی [رک باں] نے استانبول کو اپنا دارالسلطنت بنایا برسہ کو بوزنطی استانبول کی ہمسری کا دعویٰ

ہو چلا تھا، لیکن برسہ کے بہت سے باشندوں کو نئے دارالخلافہ میں نقل مکانی کرنا پڑی۔ تاہم سلطان موصوف کے عہد میں توسیع سلطنت کے باعث برسہ کو معاشی اعتبار سے بڑا فائدہ ہوا۔ علاوہ ازیں سلطان نے اپنی مشرقی مہمات کے لیے اسے برابر اپنا مستقر بنائے رکھا۔ اس کے انتقال (۱۳۸۶ء/۱۳۸۷ء) کے بعد خانہ جنگی کے دوران میں برسہ کے لوگوں نے جم [رک باں] کا ساتھ دیا جو اٹھارہ دن تک وہاں بحیثیت سلطان تخت نشین رہا۔ اس نے وہاں اپنے نام کے سگے ضرب لڑائے اور اس کا ارادہ تھا کہ برسہ کو دارالحکومت بنا کر وہ کم از کم آناطولیہ پر حکمران رہے۔ گیارہویں صدی / سترہویں صدی تک یہ شہر سلطنت کے تین صدر مقامات میں شمار ہوتا رہا اور ترک سلاطین، برسہ کے محل کی نگہداشت کرتے رہے اور وقتاً فوقتاً اسے اپنے استعمال میں لاتے رہے (پیچوی، ۲: ۳۱۳؛ اولیاء چلبی، ۲: ۱۰)۔

شہر کی آبادی کی افزائش کا لچھ اندازہ ان اعداد سے ہو سکتا ہے جو خاندانوں کی عوارض [رک باں] یعنی اکائیوں سے متعلق سرکاری کاغذات میں درج ہیں۔ مثال کے طور پر محمد ثانی کے عہد میں "عوارض" خاندانوں کی [یعنی ان خاندانوں کی جن پر عوارض نام کا محصول عائد ہوتا تھا] تعداد پانچ ہزار تھی، ۱۳۸۷ء/۱۳۸۸ء میں چھ ہزار چار سو چھپن اور ۱۳۹۶ء/۱۳۹۷ء میں چھ ہزار تین سو اکاون۔ دسویں صدی / سولہویں صدی کے وسط میں P. Belon (Les observations) نے یہ لکھا ہے "Encores de présent Bource est aussi riche et anssi peuplée que Constantinople et osons dire d'avantage qu'elle est plus riche que Constantinople. La richesse de Bource provient de la soye." ("آج کل بھی برسہ اتنا ہی مالدار اور آباد



کہا جا سکتا ہے کہ سلطنت آل عثمان کی تاریخ میں برسہ کو سیاسی سے نہیں زیادہ اقتصادی اہمیت حاصل رہی۔ چونکہ یہ سلطنت عثمانیہ میں مسیحی دنیا سے قریب ترین مسلم شہروں میں سے تھا اس لیے تھوڑی سی مدت میں یہ ایک بین الاقوامی منڈی بن گیا۔ یہ واقعہ ہے کہ ریشم لانے والے ایرانی قافلے طرابزون اور حلب جیسی پرانی منڈیوں کو کسی حد تک ترک کر کے برسہ کی منڈی میں روز افزوں تعداد میں پہنچنے لگے تھے۔ جیسا کہ Schiltberger (ص ۳۴) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے ۱۴۰۰ء کے لگ بھگ ہی سے برسہ ریشم کی تجارت اور صنعت کا ایک بین الاقوامی مرکز بن چکا تھا۔ ریشم کے قافلوں کی سب سے بڑی شاہراہ برسہ تک تبریز، ارزروم اور توقاد سے ہو کر آتی تھی۔ اس زمانے میں دوسری اہم تجارتی شاہراہوں کا اتصال بھی یہیں آ کر ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں کتاہیہ کی قدیم شاہراہ کو ایک بار پھر اہمیت حاصل ہو چلی تھی۔ ۱۴۳۶ء / ۱۴۳۲ء میں B. de la Broquière دمشق میں مکہ معظمہ کو جانے والے ایک قافلے میں شامل ہوا، جس نے یہی راستہ اختیار کیا، اور جو گرم مسالے یہ قافلہ اپنے ساتھ لایا تھا وہ برسہ میں جنوا کے ان سوداگروں کے ہاتھ فروخت کیے گئے جو پیرا (غلطہ) میں باروبار لرتے تھے۔ مصر اور شام سے برسہ میں آنے والی اشیاء، مثلاً گرم مسالے، چینی، رنگ، صابن اور عطریات کی سرگرم تجارت کے باعث نوے پندرہویں صدی میں ایک طرف تو حلب سے برسہ کی شاہراہ کی اور دوسری طرف اناطولیہ سے سکدریہ کی بحری گزرگاہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ علاوہ ازیں برسہ میں تجارت کی خاطر آنے والے ہندی سوداگر بھی جس راستے اختیار کرتے تھے: مثال کے طور پر

ہے جتنا کہ قسطنطنیہ، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وہ قسطنطنیہ سے بھی زیادہ سالدار ہے۔ برسہ کی دولت کا سرچشمہ ریشم ہے“۔

۱۵۷۷/۸۹۸۰ء میں حفاظتی تدابیر کے پیش نظر سلطان کے ایک فرمان خصوصی کی تعمیل میں شہر کے مختلف حصوں کے بیچ بیچ مضبوط دروازے تعمیر کیے گئے اور ان پر محافظ مقرر ہوئے۔ شہر میں روم ایلی سے آنے والے البانوی مہاجرین اب واقعی ایک خطرہ بن گئے تھے (دستاویزات در H.T. Dagfioglu : ۱۶ عصرہ برسہ، برسہ ۱۹۳۳ء)۔ پھر ۱۵۹۵ء سے جلالی [رک باں] جتھوں کے حملے کا خوف لگا رہا اور ۱۶۰۸ء میں قلندر اوغلو [رک باں] سے لوٹنے کے لیے آئے (نعیم، استانبول ۱۲۸۳، ۲: ۲۷)۔

[ایک زمانے میں] برسہ ایالت آنادولو [اناطولیا] کی اس سنجاق کا صدر مقام تھا جو خداوندکار یا بیگ کے نام سے موسوم تھی۔ ۱۸۳۲ء / ۱۲۳۸ء میں جب خداوندکار کی نئی ایالت کی تشکیل ہوئی تو وہ اس ایالت کا صدر مقام بن گیا جس میں برسہ، قرہ حصار، کتاہیہ، بلہ جک، اردک اور بیگہ کی متصرفیوں (تحصیلوں) شامل تھیں اور جب ۱۸۶۳ء / ۱۲۸۱ء میں خداوندکار کو قرہ سی، قرہ ایلی، قرہ حصار اور کتاہیہ کے لواؤں پر مشتمل ایک ولایت (= صوبہ) بنا دیا گیا تو برسہ والی کا صدر مقام قرار پایا۔ ۱۸۹۲ء / ۱۱۳۰ء میں یہاں کی آبادی چھتر ہزار تھی، جس میں ۵۱۵۸ یونانی، ۷۵۳۱ ارمنی، ۲۵۳۸ یہودی اور باقی ماندہ مسلمان تھے۔ یہاں ایک سو پینسٹھ مسجدیں، ستاون مکتب، ستائیس مدرسے، سات لنگرخانے (باشفاخانے)، سات گرجا، تین صومعے، انچاس کارواں سرائیں اور چھتیس کارخانے تھے (خداوندکار ولایتی سالنامہ سی، بابت ۱۸۹۲ء / ۱۳۱۰ء)۔

ٹر لیا جاتا تھا - ۵۹۰۶ / ۱۵۰۱ء میں Maringhi نے، جو برسہ میں میڈیچی Medici خاندان کا نمائندہ تھا، اندازہ لگایا کہ ریشم کی ایک گانٹھ (Fardello) پر ستر سے اسی ڈوکت ducat تک نفع حاصل ہو جاتا تھا - ۵۸۸۳ / ۱۳۷۹ء میں ایران سے یہاں درآمد ہونے والے ریشم کی کل مالیت تقریباً ڈیڑھ لاکھ وینسی ڈولٹ ducat تھی - اس کی بیشتر مقدار ریشم کی مقامی صنعت میں لہپ جاتی تھی - ۵۹۰۷ / ۱۵۰۲ء میں ایک سرکاری معائنے سے ظاہر ہوا کہ برسہ میں ریشم بافی کے ایک ہزار سے زیادہ کرگھے مصروف کار تھے (بورسہ احتساب قانونو، طبع برکان O.L. Barkan : تاریخ وثیقہ لری درگیسی، ۷ : ۳۰) - یہ صنعت نجی ملکیت میں تھی اور اس کی وجہ سے مسلمانوں کا ایک خوشحال متوسط طبقہ وجود میں آ گیا - پندرہویں صدی کے نصف آخر میں برسہ کی تقریباً ستر فی صد آبادی اعلیٰ اور متوسط طبقے کے افراد پر مشتمل تھی (دیکھیے اقتصاد فا کولتہ سی مجموعہ سی، استانبول، ج ۱۰، شماره ۱، تا ۴ : ص ۵۵ تا ۵۷) - ریشم کی صنعت میں کام کرنے والے بیشتر افراد غلام تھے اور کچھ مدت بعد ان میں سے اکثر کو آزاد کر دیا جاتا تھا اور پھر وہ خود کارخانوں کے مالک بن جاتے تھے - مذکورہ بالا قواعد احتساب میں بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ اس کاروبار کے مختلف گروہ کون کون سے تھے اور مختلف اقسام کے ریشم کی تیاری میں کیا کیا طریقے استعمال ہوتے تھے - برسہ کا قیمتی کمخا [مخواب] اور زردوز مخمل (مذہب قطیفہ) درآمد کی جاتی تھی اور ان کپڑوں کی یورپ، مصر اور ایران میں بڑی مانگ رہتی تھی، لیکن ان کی زیادہ تر مقدار دربار سلطانی ہی میں کھپ جاتی تھی دیکھیے اوز T. ÖZ : ترک قماشلری، استانبول

۵۸۸۵ / ۱۳۸۰ء کے قریب محمود گواں [رک باں] کے گماشتے برسہ میں ہندی سامان تجارت درآمد کیا کرتے تھے - اس تجارت کی اتنی اہمیت ضرور ہوگی کہ تقریباً ۵۸۷۴ / ۱۳۷۰ء میں فلورنس والوں کو برسہ کی منڈی سے اپنے لیے گرم مسالا حاصل کرنے کی امید ہو جائے - لیکن یہاں یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ برسہ میں زیادہ قیمتوں کے باعث گرم مسالے کی تجارت اتنی ترقی نہ کر سکی کہ یہ شہر مصری منڈیوں کا مقابلہ کر سکے - ۵۸۹۲ / ۱۳۸۷ء میں برسہ میں درآمد ہونے والے رنگوں اور کالی مرچ پر محصول سے سالانہ آمدنی ایک لاکھ آچھہ (تقریباً دو ہزار پانچ سو وینسی ڈوکت ducats) ہوتی تھی (باش وکالت آرشیوی، استانبول تا پو دفتر، شماره ۲۳، مقاطعات برسہ) - بہر صورت گیارہویں صدی / سترہویں صدی تک برسہ کو استانبول اور ریاست ہائے بلقان، حتیٰ کہ مشرقی یورپ کے لیے بھی ایشیائی مال کی اہم ترین منڈی کی حیثیت حاصل رہی۔

برسہ کی خوشحالی وہاں کی ریشم کی صنعت و تجارت پر مبنی تھی - تبریز سے قافلے گیلان، استرآباد، اور ساری کا قیمتی ریشم برسہ لاتے تھے اور یہاں اس کی تجارت زور شور سے ہوتی تھی - برسہ کے قاضیوں کے کاغذات (جو اب عجائب خانہ برسہ میں محفوظ ہیں) اور فلورنس کے خاندان میڈیچی Medici کی دستاویزات سے، جنہیں G.R.B. Richards نے شائع کیا ہے (Florentine Merchants in the age of the Medici، کیمبرج، مخطوطہ عدد ۱۹۳۲)؛ اس کی توثیق ہوتی ہے - جنوا، وینس اور فلورنس کے سوداگر، جن کے نمائندے عموماً برسہ میں رہتے تھے، ایک دوسرے کے مقابلے میں حتیٰ الامکان زیادہ سے زیادہ ریشم خریدتے تھے اور اس تجارت کا عام طریقہ یہ تھا کہ ریشم کا ان کے درآمد کردہ اونی کپڑے سے مبادلہ



مد مقابل بن گیا، جس سے برسہ کی سابقہ خوشحالی پر اثر پڑا ( *Hist. du commerce* : P. Masson ) *Français dans le Levant* ، پیرس ۱۹۱۱ء ، ۲ : ۴۹۲)۔ تاہم یہاں اندرون ملک میں کھپت کے لیے برسوی ریشمی نیڑا تیار ہوتا رہا۔ تیرہویں صدی/انیسویں صدی میں یورپ کا ارزاں سوتی کپڑا اس مقامی تجارت میں بھی رخنہ انداز ہوا، چنانچہ ۱۲۶۲ء / ۱۳۶۶ء میں برسہ کے برطانوی قنصل D. Sandison نے لکھا کہ ”برسہ کے بنے ہوئے ریشمی اور سوتی کپڑے روز بروز متروک ہوتے جا رہے ہیں ( *F.O. Public Record Office* ، ۱۷۸۰ء ، ۷۰۱)۔ برطانیہ، جرمنی اور سوئٹزرلینڈ میں برسہ کے جو نقلی ریشمی اور سوتی کپڑے تیار ہونے لگے تھے ان کی خود برسہ میں بڑی مانگ ہو گئی تھی اور اندیشہ تھا کہ آئندہ برسہ محض بلاد مغرب کے لیے خام ریشم پیدا کیا کرے گا، لیکن ۱۲۵۳ء / ۱۸۳۷ء میں دخانی طاقت سے چلنے والے کارخانوں کے قیام سے وہ اس صورت حال سے بچ گیا۔ پچیس برس بعد ریشم کاتنے کے کارخانوں کی تعداد پینتیس تھی اور ۱۳۳۲ء / ۱۹۱۳ء میں خام ریشم کی پیداوار ایک ہزار ٹن تک پہنچ گئی تھی۔ جنگ آزادی کے دنوں (۱۳۳۷ء / ۱۹۱۹ء تا ۱۳۴۱ء / ۱۹۲۲ء) میں اس ترقی پر برا اثر پڑا، لیکن جمہوریہ ترکیہ کی ملکی صنعتوں کے تحفظ کی حکمت عملی کی بدولت ریشم کی پیداوار ایک حد تک بحال ہو گئی (۱۹۵۸ء میں ایک لاکھ چالیس ہزار ٹن)۔ اس کے مقابلے میں برسہ کی پارچہ بافی نے بے حد ترقی کی کیونکہ اب خام مواد کے طور پر مصنوعی ریشم ملنے لگا تھا (۱۹۵۸ء میں برقی قوت سے چلنے والے چھ ہزار کرگھے تھے)۔ مزید برآں ۱۹۳۸ء میں اونی کپڑے کے ایک بڑے کارخانے کے قیام سے اس شہر کی صنعتی حیثیت مضبوط ہو گئی۔ ۱۹۴۰ء میں اس کی

۱۹۴۶ء : H. Inalcik و R. Anhegger : قانون نامہ سلطانی بر موجب عرف عثمانی، انقرہ ۱۹۵۶ء ، ص ۳۶)۔ برسہ میں باریک ریشمی کپڑے، والہ (voile) اور تافتہ (taffeta) تیار ہوتے تھے اور عام استعمال کے لیے بھاری مقدار میں باہر بھیجے جاتے تھے۔

برسہ کی اتنی کچھ تجارتی سرگرمی کا مزید ثبوت ان متعدد کاروانسراؤں (خان) سے ملتا ہے جو نویں صدی / پندرہویں صدی میں تعمیر ہوئیں، مثلاً ایک خانی بعہد محمد اول، محمود پاشا خانی بعہد محمد ثانی اور نسبتاً بڑی سرائیں، جنہیں قوزہ خانی اور پرنج خانی کہا جاتا تھا، بعہد بایزید ثانی۔ برسہ مغربی اناطولیہ کے سوتی کپڑے کی بھی منڈی بن گیا، جو بالخصوص روم ایللی اور مشرقی یورپ کو برآمد کیا جاتا تھا۔ برسہ میں درآمد شدہ اشیاء کے محاصل کی رقم ۵۸۹۲ / ۱۳۸۷ء میں تقریباً ایک لاکھ چالیس ہزار ڈوکت تھی (باش وکالت آرشیوی، تاپو دفتر، شماره ۲۳)۔ تانبے اور چاندی کے سکو کی بڑی ٹکسالیں [رک بہ ضرب خانہ] بھی برسہ میں واقع تھیں اور اس اجارہ داری کے باعث سال مذکور میں سالانہ آمدنی چھ ہزار ڈوکت ہوئی تھی۔

۱۵۹۹ء / ۱۰۰۷ء اور ۱۶۲۸ء / ۱۰۳۷ء کے درمیان شاہ عباس اعظم نے کوشش کی کہ ایرانی ریشم ترکی منڈی میں نہ جانے پائے (دیکھیے *Bulletin* ، شماره ۶۰ : ص ۶۶۵)۔ اس سے سلاطین عثمانیہ کو ترغیب ہوئی کہ خود برسہ اور اس کے نواح میں ریشم کی پیداوار کی ہمت افزائی کریں۔ بارہویں صدی / اٹھارہویں صدی میں یورپ (اطالیہ، فرانس) میں اچھی قسم کا ریشم تیار ہونے لگا اور ادھر بلاد مشرق کے سامان تجارت کی منڈی کی حیثیت سے ازبیر [رک باں] اس کا

آبادی ستر ہزار تھی، جو ۱۹۵۵ء میں تقریباً دو گنی ہو کر ایک لاکھ اکتیس ہزار تک جا پہنچی۔

مآخذ: کتب: (۱) اے۔ توحید: برسہ دہ اشک  
اسکی کتابہ، در *TOEM*، ۵: ۳۱۸، (۲) وہی مصنف:  
برسہ دہ عمر بیک جامعی کتابہ سی، در *TOEM*، ۳:  
۸۶۵؛ (۳) وہی مصنف: ایک آلتی پادشا ہمزگ برسہ  
دہ کائن تربہ لری، در *TOEM*، ۳: ۹۷۷، ۱۰۳۷؛  
(۴) ایم۔ عارف: برسہ دہ ولد یانج جامعی، در *TOEM*،  
۳: ۹۶۷؛ (۵) کنتر H. B. Kunter: کتابہ لریمز، در *وقفلر*  
در گیس، ۲ (۱۹۳۸ء): ۳۳۷ تا ۳۴۷؛ (۶) ایم۔ ضیا:  
برسہ دہ کی تربہ لریمزہ غیر مکتوب کتابہ لری، در  
*TOEM*، ۱۰: ۱۳ تا ۱۲۹؛ (۷) Fr. Taeschner:  
*Beiträge zur frühosmanischer Epigraphie und*  
*Archaeologie*، در *Der Islam*، ۱۸: ۶۰ و ۲۰: ۱۰۹ و  
۲۲: ۶۹؛ (۸) R. Mantran: *Les inscriptions arabes*:  
*de Brousse*، در *B. Ét. Or.*، ۱۳ (۱۹۵۲ء): ۸۷  
تا ۱۱۳۔

عمارتی آثار: (۱) H. Wilde: *Brussa, eine*  
*Entwicklungsstätte türkischer Architektur in*  
*Kleinasien unter den ersten Osmanen*، برلن ۱۹۰۹ء؛  
(۲) A. Gabriel: *Une Capitale turque, Broussa*،  
پیرس ۱۹۵۹ء؛ (۳) ایس۔ چتن طاش S. Çetintaş:  
ترک معماری اٹلری، عثمانلی دوری، برسہ دہ ایک  
اٹلری، استانبول ۱۹۴۶ء؛ (۴) کے۔ بیکال: برسہ و اٹلری،  
برسہ ۱۹۵۰ء؛ (۵) قپہ جی اوغلو: برسہ خانلری،  
برسہ ۱۹۳۵ء؛ (۶) وہی مصنف: برسہ حماملری،  
برسہ ۱۹۳۸ء۔

دستاویزات: (۱) ایچ۔ اینالچیق: برسہ شرعیہ  
سجلاتندہ فاتح سلطان محمد گ فرمانلری، در *Bellefen*،  
۳۳ (۱۹۴۷ء): ۶۹۳ تا ۷۰۵؛ (۲) وہی مصنف:  
۱۵ عصر ترکیہ اقتصادی و اجتماعی تاریخی قیناقلری، در

اقتصادی فائلوتہ سی مجموعہ سی، استانبول، ج ۱۵،  
شمارہ ۱ تا ۴ (۱۹۵۳-۱۹۵۴ء): ۵۱ تا ۵۷؛ (۳)  
ایچ۔ تورخانہ طاغلی اوغلو: ۱۶ عصرہ برسہ، برسہ  
۱۹۴۳ء؛ (۴) نئی دستاویزات جو برسہ کے قاضیوں کے  
سرکاری کاغذات سے منتخب کی گئی ہیں، طبع در  
اولوطاغ، برسہ حلق اوی در گیس: (۵) او۔ ایل۔  
یرکن: قانون نامہ احتساب برسہ (۱۵۰۲ء)، در تاریخ  
وثیقہ لری در گیس، ۲: ۷، ۱۵ تا ۳۰؛ (۶) ارزی:  
برسہ دہ اسحاقی درویشلرینہ مخصوص زاویہ نگ وقیہ سی،  
در *وقفلر* در گیس، ۲ (۱۹۴۲ء): ۲۳ تا ۳۲۸۔

سوانح: (۱) بلدرزادہ محمد: کتاب *روضۃ الاولیاء*،  
مخطوطہ، در اورخان جامعی کتب خانہ سی، برسہ، شمارہ  
۴: (۲) اسمعیل بلین: *گلدستہ ریاض عرفان*، طبع اشرف،  
برسہ ۱۳۰۲ھ؛ (۳) اشرف زادہ شیخ احمد ضیاء الدین:  
*وقیات العرفاء*، مخطوطہ، در اورخان جامعی کتب خانہ  
سی، برسہ، شمارہ ۵۸؛ (۴) شیخ عبدالطیف: *روضۃ*  
*المفلحون*، در اورخان جامعی کتب خانہ سی، وہی شمارہ،  
برسہ: (۵) *خلاصۃ الوقیات*، سلیمانید کت، اند افندی  
کتابلری؛ (۶) بکر جی راشد محمد افندی: *زبدہ الوقائع*  
در *بلدہ جلیل برسہ*، فاتح ملت کتب خانہ سی، استانبول:  
(۶) برسہ لی محمد طاہر: عثمانلی مؤقفلری، ج ۱ تا ۳،  
استانبول ۱۳۳۳ تا ۱۳۴۲ھ۔

سفرنامے: (۱) ابن بطوطہ: *Voyages*، طبع و ترجمہ  
C. Defrémery و B.R. Sanguinetti، پیرس ۱۸۵۳ تا  
۱۸۵۸ء؛ (۲) J. Schiltberger: *Bondage and*  
*Travels*، K. F. Neumann کے جرمن نسخے سے ترجمہ  
و طبع J.B. Telber، Hakluyt Society، لندن  
۱۸۷۹ء؛ (۳) B. de La Broquière: *Le Voyage*  
*d'Outremer*، طبع Ch. Schefer، پیرس ۱۸۹۲ء،  
ص ۱۳۲ تا ۱۳۷؛ (۴) اولیا چلبی: *سیاحت نامہ*، ج ۲،  
استانبول ۱۳۱۴ھ؛ (۵) کاتب چلبی: *جہان نما*،  
استانبول ۱۱۳۵ھ، ص ۶۵۷ تا ۶۵۸؛ (۶) P. Belon:



*bithynische siedlungen-Nikomedia, Nikäa, Prusa, Byzantin-neugriech. Jahrbücher* ج ۱، ۱۹۲۰ء؛ (۷)  
*Der Verfall des Griechentums in : A. Wächter Kleinasien*، لائپزگ ۱۹۰۳ء؛ (۸) حکومت عثمانیہ کے دور میں برسہ سے یہ اخبارات شائع ہوتے تھے؛ خداوندگار (سرکاری)؛ برسہ، گون طوغدی؛ فوائد . *Faoäid*

(ایچ - اینالجی)

- برشاوَر: رَکْ بہ پشاور.
- برشلونہ: ہسپانوی بارسیلونا Barcelona [کہیں کہیں برشینونہ اور برجیلونہ بھی آتا ہے، اندلس کا تاریخی جغرافیہ، ص ۱۵۳ و ۱۵۴]، آئیبریہ کا قدیم شہر Barcino (Ruscino سے مقابلہ کیجیے، جس سے Roussillon مشتق ہے)۔ یہاں ضمناً یہ بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہملکار برکہ Hamilcar Barca سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ برشلونہ کسی زمانے میں لیتانیوں (Laetians) کا وطن تھا۔ اس نے بتدریج تراکو Tarraco [عربوں کا طرکونہ، آج کل تارا گونا Tarragona] کی جگہ لے لی، جو اس کے جنوب مغرب میں واقع تھا اور یوں شمال مشرقی رومی ہسپانیہ (اسبانیہ الشمالية الشرقية الرومانية) کا دارالحکومت بن گیا۔ الاڈریسی اور البکری کی تصنیفات کے جن اجزا کو ابن عبدالمنعم الحمیری نے مرتب کیا ہے، ان سے پتا چلتا ہے کہ انہیں کے زمانے میں برشلونہ ایک بڑا شہر بن چکا تھا۔ اسے ایک مضبوط فصیل گھیرے ہوئے تھی اور اس کی بندرگاہ چٹانوں سے پر تھی، چنانچہ صرف وہی کھتان جو یہاں کے پانی کے راستوں سے خوب واقف تھے اپنے جہاز یہاں لاسکتے تھے۔ "شاہ افرنجہ" اسی شہر میں، جو اس کے ملک کا دارالحکومت تھا، رہتا تھا۔ اس بادشاہ کے پاس سفر اور بحری تاختوں کے لیے

*Les Observations de plusieurs singularités et choses mémorables trouvées en Grèce...* برس ۱۵۸۸ء  
 Relation : I.P. de Tournefort (۷)؛ ۳۵۰ تا ۳۵۱  
*d'un voyage du Levant*؛ ۳۶۹؛ لیونز ۱۷۱۷ء  
*Umblick auf einer Reise von : J. von Hammer (۸) Konstantinopel nach Brussa*؛ ۱۸۱۸ء  
*Reise durch Rumelien und nach : A. Grisebach (۹) Brussa im Jahre 1839*؛ ۱۸۳۱ء  
*Anatolien, skizzen : A. B. Mordtmann (۱۰) und Reisebriefe aus Kleinasien*؛ ۱۸۵۰ تا ۱۸۵۹ء  
*Souvenir d'un : G. Perrot (۱۱)؛ ۱۹۲۰ء؛ voyage en Asie Mineure*؛ ۱۸۶۳ء؛ (۱۲)  
*Asie Mineure : P. D. Tchihatcheff*؛ ۱۸۶۶ء؛ (۱۳)  
*Brussa und der asiatische Olymp*؛ ۱۸۷۵ء؛ (۱۴)  
*V. Cuinet (۱۴)؛ La Turquie d'Asie, géographie administrative*؛ ۱۸۹۳ء؛ (۱۵)  
*Im neuen Anatolie*؛ ۱۹۲۸ء؛ (۱۶)  
*J. Lewis Farley (۱۶)؛ The Resources of Turkey*؛ ۱۸۶۲ء  
 لندن (D. Sandison) اس میں برطانوی قنصل متعینہ برسہ کی ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اسی قسم کی اور رپورٹیں پبلک ریکارڈ آفس میں موجود ہیں، F.O.؛ ۱۹۰۱ء؛ ص ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸،

مسلح جہاز تھے۔ افرنجیوں (فطلونیوں) کی افتاد طبع جنگجو رہا۔ یہی جس کے باعث وہ بہت جرأت کے کام آگے چلے گئے۔

برشلونہ کے علاقے میں گہیوں اور دوسری اقسام کا اناج نیز شہد بڑی مقدار میں پیدا ہوتا تھا۔ وہاں اللہ ہی یہودی آباد تھے جتنے عیسائی۔ یہ شہر ۵۹۶ / ۱۳ تا ۵۹۸ / ۱۶ء میں عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر کے زیر نمان عربوں نے پہلے ہی حملے میں ان کے قبضے میں آ گیا۔ عربی میں اس شہر کو برشلونہ ابھی کہتے ہیں، جو عہدِ اخیر کی لاطینی کے *Barclonou* سے مشتق ہے (اب اوروسوس *Oronua* میں پہلے سے *Barcelona* کا نام آیا ہے، یعنی رتبہ برشلونہ *Ravenna Barcelona* کا جغرافیہ نویس، *Hilbner* در *Pauly-Wissowa* بدل مادہ)۔ لیکن اس کے باوجود اب تک برشلونہ ہی زبانِ روزِ عام ہے، جس سے موجودہ نام برشلونہ نکلا ہے۔

اس نام کی ایک شکل برشلونہ زیادہ شاذ ہے۔ وہ نام البرشلونی کے مختصر لقب کی اصل ہے، جو مابعد عرب مصنفین اکثر ارغون *Aragon* اور فطلونہ *Catalonia* کے بادشاہ کے لیے استعمال کرتے تھے (قسط ۱۹۰۷ : ۲۷۹ء بعد)۔

۵۸۰ / ۱۸۵ء میں شارلمان کے بیٹے لوئی نے اگونیا *Aquaine* کے بادشاہ کی حیثیت سے برشلونہ فتح کر لیا۔ اس کے بعد سے یہ افرنجی سلطنت کے ہسپانوی سرحدی علاقوں کا دارالحکومت بن گیا اور ۸۸۸ء سے ہرشونہ یا فطلونہ کے خود مختار کاؤنٹوں *Counts* یا مارکوائسوں *Marquesses* کا صدر مقام رہا۔ ۸۵۹ / ۲۵۲ء میں برشلونہ پر عربوں کا عارضی طور پر قبضہ ہو گیا ز الیون المغربیہ بار دوم، ۹۵ : ۹۰ تا ۹۰۰ - ۱۵۲۷ / ۵۵۸ء میں لٹری اور لٹریٹس کے

نے یورش کر کے اس پر قبضہ کر لیا *Histoire : Dozy des Musulmans*، بار دوم، ۲ : ۲۳۸ تا ۲۳۹ء، لیکن ۹۸۷ء میں کاؤنٹ بوریل *Borell* اول نے اسے پھر فتح کر لیا۔ بارہویں صدی (۱۱۳۷ء) میں یہ ایک دفعہ پھر مملکتِ ارغون میں شامل لیا گیا۔ دانیہ *(Denis)* کے مسلمان بادشاہ علی بن مجاہد العاسری کا وہ فرمانِ قابلِ ذکر ہے جس کی رو سے بلیار *(Balears)* [رک باں] کی مستعرب (مضارب) اسقیان دانیہ اور بیولہ *Oribuela* کی اسقیون کی طرح برشلونہ کے استقف اعظم کے ماتحت نردی گئی *(Historia de los Mozarabes : Simonet)* *de Espana—Memoria de la Real Academia de la* *His...*، میڈرڈ ۱۹۰۰ء، ۱۳ : ۶۵۱ تا ۶۵۴ء *Bosquejo histórico de la dominacion : Campaner* *Palma: islamita en las Islas Baleares*، ۱۸۸۸ء، ص ۸۲ تا ۸۳)۔

مآخذ: (۱) *تراصد الأطلاع*، لائن ۱۸۵۹ء، *Diccionario geogr. estud. : Madoz* (۲) : ۳۰۳ : ۳ *hist.* : ۳ : ۵۸۲ بعد : (۳) *Bofarull* *Barcelona vindicados*، برشلونہ ۱۸۳۹ء : (۴) القری (اشارہ)، ۲ : ۸۳۳ : (۵) *Simonet* (دیکھیے اوپر)، ص ۹۲۹ (اشارہ) : (۶) *Lévi Provençal* *La Péninsule* : *Ibérique*، ص ۵۳ : (۷) وہی مصنف : *Hist. Esp.* : *Mus.*، ج ۱ و ۲، بموانع کثیرہ۔ *(A. HUIZI MIRANDA و C. F. SEYBOLD)*

برشلونہ : رک بہ علم نجوم۔

برصیحا : ایک نیم افسانوی نیم تاریخی شخصیت، ایک راہب، جس کا زمانہ، مابعد کی تاویلات کی رو سے وہی زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے جو سینٹ انٹونی *St. Anthony* کے ہے۔ ایک نوک کھانی کی حیثیت سے دیکھا جائے تو کھانا جاسکتا ہے کہ برصیحا کی روایت نے کئی صورتیں اختیار کی



الطبری نے انسان ایک خاص شخص کے معنی میں جو پہلی چار روایات پیش کی ہیں ان کا تعلق ایک تارک الدنیا شخص سے ہے، جو یا تو کوئی راہب ہے (الطبری، ۲۸ : ۳۳۲) یا عابد (رجل بن بنی اسرائیل)، یا کوئی عیسائی پادری ("قس")۔ اس متقی شخص کی کہانی تقریباً یکساں چلی آئی ہے۔ تین بھائی اپنی بیمار بہن کو اس کے سپرد کر کے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ راہب شیطان کے بہکانے میں آجاتا ہے پھر کوشش کرتا ہے کہ اپنی معصیت کے نتیجے سے چھٹکارا پالے اور اپنی معصیت کے ثبوت کو مٹانے کے لیے اسے ہلاک کر ڈالتا ہے اور ایک پوشیدہ مقام میں (اپنے گھر کے اندر ایک درخت کے نیچے) دفن کر دیتا ہے۔ جب بھائی واپس آتے ہیں تو شروع شروع میں اس بات کا یقین کر لیتے ہیں کہ ان کی بہن طبعی موت مری ہے، لیکن پھر شیطان خواب میں آ کر ان پر عابد کا جرم ظاہر کرتا ہے۔ عابد کو جب علم ہوتا ہے کہ اس کے جرم کا پردہ فاش ہو گیا ہے تو وہ بے انتہا خوفزدہ ہو جاتا ہے۔ تب شیطان ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ اگر تو میرے سامنے سجدہ کر لے اور خدا سے انکار کر دے تو میں تجھے بچا لوں گا۔ جب یہ بدبخت انسان گر کر گناہ کے اس آخری درجے تک پہنچ جاتا ہے تو شیطان اس کا تمسخر اڑاتا ہے۔ الطبری کے بعد برصیصا کا نام راویوں کے ہاتھ لگا اور انہوں نے اسے اس کہانی کے مرکزی کردار پر چسپان کر دیا۔ میکڈانلڈ Duncan B. Macdonald نے ان سب، مآخذ کا حوالہ دیا ہے (۱۰، لائڈن، بار اول، بذیل مادہ برصیصا)۔ ابواللیث سمرقندی (م ۹۸۵ یا ۹۹۳ء) بظاہر وہ پہلا مصنف ہے جس نے اپنی کتاب تہیۃ الغافلین میں برصیصا کے نام کا ذکر کیا ہے۔ پھر البغوی (م ۱۱۲۲ء) نے اس کی تقلید کی۔

ہونگی، کیونکہ بعد کے زمانے میں ابن بطوطہ نے طرابلس اور اسکندریہ کے درمیان ایک "قصر برصیصا [برصیص] العابد" دیکھا تھا۔ اس نام سے ذہن میں قدیس انطونی کی زندگی اور عزت نشینی کے اس طویل دور کی یاد تازہ ہوتی ہے جو اس نے ایک قدیم قصر (صیصت) میں گزارا تھا۔ اگر آرامی زبان میں لفظ برصیصا کے اشتقاق پر غور کیا جائے تو اس سے اعلیٰ ترین کاہنانہ منصب کا تصور ذہن میں آتا ہے۔ خواہ صیصا سے وہ 'چار آئینہ' (pectoral) مراد لیا جائے جو کاہن اعظم اپنے سینے پر لگاتا تھا یا دستار مقدس کی اوپر کی گرہیں۔ بعض مسلمان مصنفوں کی کتابوں میں برصیصا وہ راہب تھا جس نے ایک طویل مدت تک زہد و تقویٰ کی زندگی بسر کی اور پھر شیطان کی متواتر ترغیبات کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ بالآخر شیطان نے اسے خدا سے منکر ہو جانے پر آمادہ کر لیا اور اس کے بعد اسے دائمی یاس کی حالت میں چھوڑ گیا۔

اس روایت کا تعلق [۱۱، لائڈن، بار دوم کے مضمون نکار کے نزدیک] قرآن مجید کی انستھویں سورۃ [الحشر] کی سولہویں آیت کی تفسیر سے ہے، جس میں مومنوں کو بہکانے والے منافقوں کا حال بیان کیا گیا ہے :-

كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اٰكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّىْ يٰرَبِّىْ مَنَّكَ اِنِّىْ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ [جیسے شیطان کی وہ حالت جب وہ انسان سے کہے تو منکر ہو جا پھر جب وہ منکر ہو جائے تو کہے میں الگ ہوں تجھ سے، میں ڈرتا ہوں اللہ سے جو رب ہے سارے جہان کا] لیکن یہ توجیہ معلیٰ نظر ہے۔ یہاں لفظ "انسان" کی دو مختلف تاویلیں کی جاتی ہیں جنہیں الطبری (۲۸ : ۳۱ بعد) نے یوں پیش کیا ہے : "یہاں سوال کسی خاص انسان کا ہے یا بحیثیت مجموعی پوری نوع انسان کا؟"

*Legende vom Mönch* نے *Goldziher-Landberg* میں یہ قصہ ان تمام ترمیمات و اضافات کے ساتھ درج کیا ہے جو اس میں آگے چل کر داخل ہوئے، جیسا کہ یہ القزویٰ (طبع *وَسْتَنْفَلُکْ*، ۱: ۳۶۸)، ابن ابشیبہ کی *الْمُسْتَرْفِ* (باب ۶۴)، السیوطی اور وہاں سے *الکتاب الوزراء الاربعین* [داستان چہل وزیر] میں مذکور ہوا ہے۔ آخر الذکر کتاب مطبوعہ استانبول، ۱۳۰۳ھ، ص ۱۲۰ تا ۱۲۶، میں اس کا بالتفصیل ذکر ہے جو اس بیان سے زیادہ طویل ہے جس کا *Pétis de la Croix* اور *Gibb* نے ترجمہ کیا ہے۔

[یورپ میں برصیصا کا قصہ] خواہ ہسپانیہ سے پہنچا ہو یا کتاب *الوزراء الاربعین* کے ترجمے کی وساطت سے، لازمی طور پر راہب لیوس *Lewis* کے قوطی رومان *Ambrosio or the Monk* کا مأخذ ہوگا، جس میں تمام جزئیات پوری تفصیل کے ساتھ اور اپنے زمانے کے مذاق کے مطابق ڈھال کر پیش کی گئی ہیں۔

مآخذ: (۱) *D. B. Macdonald*، در *و*، لائنن بار اول و *Handwörterbuch des Islam*، بذیل برصیصا و تعلقہ، در *و*، ت، بذیل برصیصا؛ (۲) *Chauvin*؛ *Bibliographie des Ouvrages arabes*، ۸: ۱۲۸ بعد؛ (۳) *Bersisā, le Moine qui défia le Diable* : *A. Abel*، برسلز ۱۹۵۹ء، در *Publications de l'Institut de Philologie et d'histoire orientales*.

(A. ABEL)

\* **بَرطاس** : یا **بَرْدَاس** (البکری کے ہاں **فَرْدَاس**)، دریاے والگا کے طاس میں ایک وثنی المذہب قبیلہ۔ برطاس اور اس کے شمال اور جنوب میں آباد ہمسایہ قبائل **خَزَر** اور **بَلْغَار** کے لیے **رُک** بہ **بَلْغَار**۔ **المسعودی** (مروج، ۲: ۱۴ و التنبیہ، ص ۶۲) نے **بَرطاس** ایک دریا کا نام بھی بتایا ہے، جو ایتل

(= والگا) میں جا گرتا ہے۔ **Marquart** اسے اور **سَامَرَه** **Samara** کو ایک ہی دریا قرار دیتا ہے (**Streifzüge**)، ص ۳۳۶)۔ مأخذ میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا جس سے معلوم ہو کہ قبیلہ **بَرطاس** میں مسلمان بھی موجود تھے۔ اس کے برعکس **خزر** اور **بَلْغَار** کے احوال میں اس کی صراحت موجود ہے۔ **یاقوت** نے **بَرطاس** کا جو حال لکھا ہے (۱: ۵۶۷) وہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے اور وہ یہ کہ اس نے **بَلْغَار** کے بارے میں **الاصطخری** کے بیان (ص ۲۲۵) کا اطلاق **بَرطاس** پر کر دیا ہے۔ جن مأخذ میں **بَرطاس** کا ذکر ملتا ہے یعنی **ابن رستہ** (ص ۱۴۰ بعد)، **البکری** (*Kunik و Rosen: Izvestiya al-Bekri, etc*، ۱: ۴۴) اور **گَرْدِیْزِی** (*Barthold: Oicet o poyezdkie v srednyuyu: Aziju*، ص ۹۶ بعد) ان میں **بَرطاس** کے مذہب کے بارے میں محض اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ ان کے عقائد وہی تھے جو **غَز** (ترکوں) کے تھے اور ان میں بعض اپنے مردوں کو جلاتے اور بعض دفناتے تھے۔ انہوں نے اپنے پڑوسیوں کو، جنہیں تہذیب و تمدن سے قریبی رابطہ رہا، اپنے سے آگے نکل جانے دیا۔ ان کے ہاں منظم حکومت کا فقدان تھا اور تمام معاملات کی باگ ڈور ہر قبیلے کے بزرگوں کو سونپ دی جاتی تھی۔ اسلامی دنیا اور **بَرطاس** کے درمیان اگر کوئی قابل ذکر تجارتی رابطہ تھا تو وہ محض پوستینوں کی تجارت کا تھا، جس کے لیے **یاقوت** (محلّ مذکور) نے "فراء" (جمع **فرو**) کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اکثر مستند مصنفوں (*V. V. Holmsted*)، *(A.P. Smirnov, P.D. Stepanov)* نے **بَرطاس** اور **رِن لینڈ** کے **مردوہ**۔ **مُوکَشہ** *Mordve Moksha* (جنہیں *Ruburquis* نے *Moksel* لکھا ہے) کو ایک ہی قرار دیا ہے، یعنی وہ قبائل جو **قرون وسطی** کے آغاز میں **خوپر** اور **مِدوِدِتْزہ** *Madveditza* دریاؤں اور **والگا**



اثرات ہوئے اور وہ سترھویں صدی سے راسخ العقیدہ مذہب کے دائرے میں شامل ہو چکے ہیں۔ لیکن یہاں ایک اور مردوہ - موکشہ گروہ کا ذکر بھی ضروری ہے، جو علاقہ تاتار (جمہوریہ ترستان کے ضلع گمسکو آستسک Kamsko Ustinsk میں رہتے ہیں، یعنی قرہ تائی - سترھویں صدی سے یہ لوگ تاتاری اثرات کے ماتحت رہتے چلے آئے ہیں اور اب تاتاریت کے رنگ میں مکمل طور پر رنگے جا چکے ہیں۔ یہ قرہ تائی اپنی فنی زبان کا استعمال فراموش کر چکے ہیں اور قازان کی تاتاری بولتے ہیں، اگرچہ سرکاری طور پر ان کا شمار راسخ العقیدہ مسیحیوں میں کیا جاتا ہے مگر حقیقت میں وہ مسلمان ہیں۔

مآخذ : (۱) D. A. Chwolson : *Izvestija*

*okhazarakh, Burtasakh, Bolgarakh, Madyarakh*

*Slavyanakh i Rusakh Abu Ali Ahmed ben Omar*

*Ibn Dastu*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۶۹ء؛ (۲) V. V.

*Barthold : Arabskie Izvestiya o rusakh*، در

*Sovetskoe Vostokovedenie*، ج ۱؛ (۳) A. Kunik و

*Izvestiya Al-Bekri i drugikh avtorov : V. Rosen*

*o Rusi i slavanakh*، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۷۸ء؛ (۴)

*Skazaniya musul' maskikh : A. Y. Garwaki*

*pisatelej o slavjanokh i russikh*، سینٹ پیٹرز برگ

۱۸۷۰ء؛ (۵) V. V. Holmsted : *Burtas*، در

*Soobshcheniya Instituta Izučeniya Material'noi*

*Kul'turi*، ۱۹۳۶ء، کراسہ ۱۳ : ص ۱۷ تا ۲۵؛ (۶)

*Izvestiya obshchestva*، در *Morva : I. N. Smirnov*

*Arkheologii Istorii i Etnografii pri Kazanskoi*

*Un-te*، ج ۱۰، ۱۱، ۱۲، قازان ۱۸۹۲ تا ۱۸۹۳ء؛ (۷)

*Učenie Zapiski* در *Burtasi i Mordva : A. I. Popov*

*Leningradskogo Un-ta*، ۱۹۳۸ء، شمارہ ۱۰۰،

اورینٹل سیریز، کراسہ ۲، حصہ ۱ : ص ۱۹۹ تا ۲۱۰؛

کی دائیں تنخ کے درمیانی علاقے میں آباد تھے اور شمال کی جانب اتنی دور تک پھیلتے چلے گئے تھے کہ فن لینڈ والے یہاں صقال قوم کے متصل ہمسایے ہو جاتے تھے۔ دوسرے مصنفوں (A. E. A. I. Popov) نے ان کا مبدأ شمالی قفقاز کے نیم صحرائی میدانوں میں قرار دیا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ برطاس نے شمال کی سمت نقل مکانی آلتون اردو (Golden Horde) کے زمانے ہی میں کی تھی، بعض اور مصنفوں (Rittich Sboev) نے انہیں چواش *Čuwash* کے آبا و اجداد میں جگہ دی ہے۔ *Tokarev* کا خیال ہے کہ برطاس ایک فنی قبیلہ تھا، جو کم و بیش ترکی رنگ میں رنگا گیا تھا اور بالآخر کچھ تو مردوہ - موکشہ میں اور کچھ چواش میں مدغم ہو گیا۔

تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے روسی وقائع میں برطاس کا ذکر آلتون اردو کے باجگزاروں کے طور پر ملتا ہے۔ جب قازان کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو سولہویں صدی میں روسیوں نے ان کا علاقہ فتح کر کے وہاں اپنی بستیاں بسا لیں۔ اٹھارھویں صدی کے اوائل میں ان کی بعض بغاوتوں کا حال بڑھنے میں آتا ہے، لیکن اس زمانے سے برطاس کا نام روسی دستاویزات میں آنا بند ہو جاتا ہے۔

موجودہ مردوہ (روسی میں مردوا Mordva) دو بین جماعتوں میں منقسم ہیں : موکشہ Moksha اور اریزیہ Erzia اور ان کی تعداد چودہ لاکھ پچاس ہزار ہے (سوویٹ مردم شماری بابت ۱۹۳۹ء)۔ وہ ایک خود مختیار سوویٹ جمہوریہ میں آباد ہیں (سوویٹ اشتراکی جمہوریہ مردوہ، دارالحکومت سرانسک Saransk) تاہم مردوہ کی ایک کثیرتعداد اپنی جمہوریہ کی حدود سے باہر، بالخصوص تاتارستان، بشکریہ اور سائبیریا میں سکونت پذیر ہے۔

مردوہ پر روسی ثقافت کے بہت گہرے

ایجنٹ کِسرک Kerk نے برغش کا اعتماد حاصل کر لیا اور وہ زنجبار کی ایک ذی اثر شخصیت بن گیا۔ وہ ۱۸۸۶ء میں وہاں سے رخصت ہوا۔ افریقہ کے عقبی علاقے میں برغش کو بہت سے دعاوی اور کسی قدر وقار ورثے میں ملا تھا، لیکن اس کا اقتدار نہ ہونے کے برابر تھا۔ ۱۸۷۷ء میں جب ساحل اور وکٹوریا نائی آنزا Victoric Nyanza کے درمیانی علاقے کی ترقی کے سلسلے میں مراعات کے سوال پر سر ولیم میکین Mackinnon سے گفت و شنید تا کام ہو گئی تو برغش کے ہاتھ سے اندرون ملک میں اقتدار قائم کرنے کا بہترین موقع نکل گیا۔ ۱۸۸۱ء میں اس کی یہ تجویز کہ برطانیہ اس کی ضمانت دے کہ بادشاہت اس کے خاندان ہی میں رہے گی اور اگر وہ کوئی نابالغ وارث چھوڑ کر فوت ہوا تو وہ نائب کا کام کرے گی، مسترد کر دی گئی۔ ۱۸۸۳ء میں جرمنی کے ایجنٹ پیٹرز Peters نے ان سرداروں سے بارہ معاہدے کیے جن کی سیادت کا برغش مدعی تھا۔ ان کے علاقے تبورہ Tabora اور اچیچی Ujiji جانے والی تجارتی شاہراہ کے ساتھ ساتھ واقع تھے۔ ۱۸۸۵ء میں جرمنی نے انہیں اور سلطان ویتو Witu کو اپنے زیر حفاظت لے لیا۔ برغش نے احتجاج کے جواب میں جرمنی کے پانچ جنگی جہاز وہاں پہنچ گئے اور اسے الٹی میٹم دے دیا گیا۔ برطانوی تائید حاصل نہ ہونے کے باعث برغش کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس کے بعد برطانوی جرمن اور فرانسیسی نمائندوں کے ایک کمیشن نے اس علاقے کی حدود متعین کیں جس پر برغش کا اقتدار تسلیم کرنا مقصود تھا۔ برطانوی دباؤ کے تحت اس نے مجبوراً ان کا فیصلہ تسلیم کر لیا (تفصیلات کے لیے دیکھیے بو سعید)۔ اس کی صحت اب خراب ہو چکی تھی اور عمان کے ایک سفر سے واپس آتے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ برغش

(۸) A. E. Alikhova : *K voprosu o burtasakh*، در *Sovetskaya Etnografiya*، شماره ۱، ص ۳۸ تا ۵۷؛ (۹) A. P. Smirnov : *K voprosu o burtasakh*، در *Kratkie Soobshcheniya Instituta Izučeniya Materialnoi Kul'tury*، شماره ۳، ص ۳۵ تا ۵۰؛ (۱۰) *Etnografiya Narsdov SSSR* : Tokarev، ماسکو، ۱۹۵۸ء، ص ۱۵۰۔

([CH. QUELQUEJAY] و W. BARTHOLD)

\* برغش : بن سعید بن سلطان، سلطان زنجبار، ۷ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو اپنے بھائی مجید کی جگہ تخت پر بیٹھا اور اپنی وفات یعنی ۲۷ مارچ ۱۸۸۸ء تک حکومت کرتا رہا۔ اس نے پہلے ۱۸۵۶ء میں اپنے باپ کے انتقال پر اور پھر ۱۸۵۹ء میں بھی حکومت پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن انگریزوں کی مداخلت سے اسے شکست ہوئی اور دو سال کے لیے اسے بمبئی بھیج دیا گیا۔ بعد میں برطانوی حکومت نے اس کی تخت نشینی کی حمایت کی، لیکن برغش نے فوراً ہی انگریزوں کی ان کوششوں کی مخالفت شروع کر دی جو انہوں نے بردہ فروشی کے انسداد کے لیے شروع کر رکھی تھیں، کیونکہ اسے ایک حد تک فرقہ اباضی ملوہ پر انحصار کرنا پڑتا تھا، جو اس قسم کے معاملات میں یورپ کے لوگوں کی دخل اندازی کا مخالف تھا۔ ۱۸۷۳ء میں برغش غلاموں کی تمام منڈیاں بند کرنے اور دوسرے ممالک بلکہ اپنی مملکت کے دوسرے حصوں تک میں غلاموں کی برآمد کی کلیتاً ممانعت کر دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے بعد اسے لندن آنے کی دعوت دی گئی۔ ۱۸۷۶ء میں خشکی پر غلاموں کے قافلوں کی نقل و حرکت ممنوع قرار دی گئی۔ اس حکمت عملی کے نفاذ کی خاطر لائڈ میتھیوز Lloyd Mathews نے ۱۸۷۷ء میں افریقی دستوں کو تربیت دینا شروع کی۔ برطانوی



پر حملہ کیا اور پھر ۵۳۲۲ / ۶۳۳ میں، جب اس نے وشمہ Osmā میں رسیروٹانی (Ramiro II) کو محاصرے میں لے لیا تھا تو اسے دوبارہ برباد کر دیا۔ ۵۳۲۸ / ۹۳۹ - ۶۳۰ میں Fernán González، جس کا نام مشہور ہے، برغش Burgos کا رئیس (Count) تھا اور مملکت لیون Leon کے اقتدار سے آزاد ہونے کا اعلان کر چکا تھا۔ اس کی سرحدیں قشتالہ، اشتوراس شنتیلانہ، Cerezo، The Lantaron اور البہ Alava تک پھیلی ہوئی تھیں۔ عبدالرحمن ثالث کے عہد کے اختتام کے وقت برغش بھی لیون Leon اور بنبلونہ Pamplona کی طرح اسے خراج ادا کرتا تھا۔ چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی کے وسط میں الاڈریسی کے قول کے مطابق یہ ایک پر رونق اور بڑا شہر تھا، جس میں بہت سے بازار تھے اور تجارت بکثرت ہوتی تھی۔ دریا نے اسے دو حصوں میں منقسم کر رکھا تھا اور ہر حصے کے گرد فصیل تھی۔ ایک حصے میں آبادی کی اکثریت یہودی تھی۔ اس کی قدیم یادگار عمارتوں میں سے ایک Hospital del Rey ہے، جو اس ہسپتال کا ہم عصر ہے جس کے لیے مراکش میں الموحد خلیفہ یعقوب المنصور نے بہت بڑی جائداد وقف کر رکھی تھی۔

مآخذ: (۱) الاڈریسی، در Geografia: Saavedra de España، متن ص ۱۶۷، ترجمہ ص ۸۱؛ (۲) Hist. de l'Espagne musulmane: E. Lévi Provençal، ۲: ۳۱، ۵۳؛ (۳) Gomez Moreno، Anales: Castellanos، ص ۱۳؛ (۴) محمد عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، حیدرآباد دکن ۱۹۲۷ء، ص ۱۵۳۔

(A. HUICI MIRANDA)

برغواطہ: اکثر اوقات یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ شمالی افریقہ کے بربری ممالک میں اسلام کی

ایک قابل اور باہمت حکمران تھا۔ اس نے زنجبار کے لیے بہت کچھ کیا، یہاں میٹھے پانی کی فراہمی کا بندوبست کیا، سستا غلہ درآمد کرنے کا انتظام کیا اور ۱۸۷۳ء کے گردباد کے بعد لونگ کی تجارت کو بحال کرنے کی بہت کوشش کی۔ ہم عصر یورپی اکثر یہ کہتے تھے کہ وہ اجنبیوں کا بہت مخالف تھا لیکن اسے بہت سی دشواریوں کا سامنا تھا۔ برطانیہ نے، جس کا وہ خاص طور پر ۱۸۷۰ء میں فرانسیسیوں کے زوال کے بعد، کسی طرح بھی مقابلہ نہ کر سکتا تھا، اسے غلامی کے خلاف حکمت عملی اختیار کرنے پر مجبور کیا، جو اس کی رعایا میں حد درجہ غیر مقبول ہوئی اور اسی وجہ سے رعایا نے جرمنوں کے مقابلے میں اس کی کوئی مدد نہ کی۔

مآخذ: (۱) R.N. Lyne، Zanzibar in Con-

temporary Times، ۱۹۰۵ء؛ (۲) Emily Rüte

(برغش کی بہن جو ایک جرمن کے ساتھ بھاگ گئی تھی):

Memoiren einer arabischen Prinzessin، ۱۸۸۶ء؛ (۳)

The Exploitation of East Africa: R. Coupland

۱۹۳۹ء، جس میں برطانوی سرکاری مآخذ اور برطانوی

افسروں کے نجی کاغذات کے حوالے موجود ہیں۔

(C.H. BECKER) و [C.F. BEKINGHAM]

برغش: ہسپانوی زبان میں Burgos، [شمالی اندلس میں] اسی نام کے ایک صوبے کا صدر مقام، جو دریائے ارلانزون Atlanzon کے کناروں پر ایک وادی میں واقع ہے۔ اس کی آبادی اسی ہزار ہے اور یہ سپین کا بہت ہی قابل دید مقام ہے کیونکہ یہاں کئی ایسی یادگار عمارتیں ہیں جن سے قرون وسطیٰ میں اس شہر کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، جبکہ وہ Caput Castellae کے نام سے مشہور تھا۔ ۵۲۶۸ / ۸۸۱ - ۸۸۲ء میں Count Diego Rodriguez نے اسے دوبارہ آباد کیا اور ۵۳۰۸ / ۶۳۰ء میں عبدالرحمن ثالث نے اس

کے شرکاءے کار منتشر ہو گئے اور طریف، جو اس وقت زنا تہ اور زواغہ کا سردار تھا، تمیسہ (تمستہ) کے علاقے میں چلا گیا۔ بربروں نے اسے اپنا امیر بنا لیا اور اس کی حکمرانی قبول کر لی۔ اس کی وفات کے بعد زنا تہ کی امارت اس کے بیٹے صالح کے ہاتھ آ گئی، جو اپنے باپ کے ساتھ جنگوں میں شریک رہا تھا اور اپنی دانائی اور خوبیوں کی وجہ سے مشہور تھا۔

صالح نے بربروں کے سامنے نبوت کا دعویٰ دیا اور انہیں ان اصول و عقائد کی تعلیم دی جن پر وہ یقین رکھتے تھے اور قرآن مجید کے مقابلے پر ایک نئی کتاب بھی دی، جس کے متعلق وہ کہا کرتا تھا کہ یہ اس پر خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ زبور ابوصالح نے، جسے ان بیانات کے لیے البکری اپنی سند میں پیش کرتا ہے اور جو صالح کے پیروں میں سے تھا، اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا ہے کہ صالح مؤمنوں کا وہ ولی تھا جس کا ذکر قرآن پاک کی سورۃ ۶۶ [تحریم] آیت ۴ میں آیا ہے [وَ اِنْ تَطَهَّرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَ جِبْرِيلُ وَ صَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظٰهِرِيْنَ] [ظاہر ہے کہ اس کا یہ قول اپنے باطل فرقے کے تعصب پر مبنی ہے اور لایعنی ہے]۔ صالح نے اپنے اصول و عقائد کی تعلیم اپنے بیٹے الیاس کو بھی دی لیکن اس سے یہ کہہ دیا کہ وہ ان تعلیمات کا اظہار کسی سے نہ کرے جب تک کہ وہ انہیں سنوانے کی طاقت پیدا نہ کر لے، کیونکہ اسے نہ صرف ان کی تبلیغ کرنا تھی بلکہ ان لوگوں کو قتل بھی کرنا تھا جو اس کی مخالفت کی جرأت کریں۔ اس نے اسے نصیحت کی کہ وہ اندلس کے حکمران اموی بادشاہ سے دوستانہ تعلقات پیدا کرے۔ اس کے بعد وہ مشرق کی جانب روانہ ہو گیا اور اپنے معتقدین سے یہ وعدہ کر گیا کہ وہ ان کے پاس اس وقت واپس آئے گا جب

نشر و اشاعت محض سطحی طریقے سے ہوئی، لیکن حقیقت حال اس کے برعکس تھی۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں کئی ایسے مقامی بربر فرقے پیدا ہوئے جو واضح طور پر اسلامی نمونے پر قائم ہو گئے تھے، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک بربروں میں اسلام کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں۔ ایک خاص نوعیت کی تحریک جس کا ہمیں صحیح طور پر علم ہے برغواطہ کے قبائلی گروہ میں رونما ہوئی [مگر اسلام کی قوت نے اسے دبا دیا]۔

برغواطہ، مضمودہ بربروں کا ایک گروہ تھا، جس نے تیسری صدی کے آخر میں ایک نیا مذہب اختیار کر لیا، جسے اسلام کی جگہ رائج کرنے کا ارادہ تھا، لیکن جو ایک صدی سے کچھ زیادہ عرصے کے بعد یہ خود بخود ختم ہو گیا۔ اس گروہ میں جراوہ Jerawa، زواغہ Zauagha، برنس Beranis، بنو ابی نصر، منجصدہ Menjasa، بنو ابی نوح، بنو وغمر Waghmer، متغره، بنو براغ، بنو دیمر، مطماطہ اور بنو وزقنط Wazekeint شامل تھے، اور یہ سب کے سب مغرب بعید میں تمیسا Tamesa (موجودہ نام شاویہ) کے علاقے میں رہا کرتے تھے۔ اس نئے مذہب کے عروج سے پہلے ان قبائل نے خارجی مذہب قبول کر لیا تھا، اور اس کی تعلیم ان کے اس نئے مذہب پر اثر انداز ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اس نئے مذہب کا بانی صالح تھا، جو ایک شیخ طریف بن شمعون بن یعقوب بن اسحق کے چار بیٹوں میں سے ایک تھا۔ طریف نے تیسرے المتغری المعروف بہ 'الحقیر' کی مہموں میں حصہ لیا تھا۔ یہ شخص خارجیوں کی صفریہ شاخ کے ملحدانہ عقائد کا سرگرم حامی تھا اور دراصل وہ کسی اعتبار سے معمولی بھی نہ تھا، کیونکہ اس نے عربوں کو ان سے اپنی قریب قریب تمام جنگوں میں شکست دی تھی۔ تیسرے کی وفات کے بعد اس



دھوتے تھے، پھر منہ کو، گردن کے اگلے اور پچھلے حصے کا گیلے ہاتھ سے مسح کرتے تھے، پھر ہاتھ کا یعنی کہنی سے لے کر پہنچے تک۔ اس کے بعد تر ہاتھ سے تین دفعہ سر کا اور کانوں کا مسح کرتے تھے، پھر گھٹنوں سے شروع کر کے ٹانگیں دھوتے تھے۔ ان کی بعض نمازیں الفاظ کے بغیر محض اشاروں پر مشتمل ہوتی تھیں اور بعض دوسری نمازیں مسلمانوں کی طرح پڑھتے تھے۔ ان کی نمازیوں شروع ہوتی تھی کہ وہ ایک ہاتھ دوسرے پر رکھ کر کہتے تھے: بسم این یکوش (= بسم خدا)، پھر مقریکوش (= خداے بزرگ)، تشہد پڑھتے وقت وہ دونوں ہاتھ لہول کر زمین پر ٹیک لیتے تھے، اپنی کتاب کی آدھا جز حالت قیام میں پڑھتے تھے اور باقی رکوع کی حالت میں، نماز ختم ہونے کے بعد وہ بربری زبان میں کہا کرتے تھے۔ "خدا ہمارے اوپر ہے اور زمین و آسمان میں کوئی چیز اس سے پوشیدہ نہیں"۔ اس کے بعد وہ پچیس مرتبہ مقریکوش اور اتنی ہی مرتبہ اہان یکوش (= اللہ ایک ہے) دہراتے تھے، اور اس کے بعد اور دم یکوش (= خدا کی مانند اور کوئی نہیں ہے) کا ورد کیا کرتے تھے۔ جمعے کی نماز کے بجائے وہ جمعرات کو باجماعت نماز پڑھتے تھے اور ہر ہفتے ایک روزہ رکھا کرتے تھے۔ وہ اناج پر عشر ادا کیا کرتے تھے، جسے 'زکایت' کے نام سے موسوم کرتے تھے، لیکن مسلمانوں سے عشر کا مطالبہ نہیں کرتے تھے۔

ان کے ہاں بیویوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن قریبی رشتہ داروں (عم زاد، خالہ زاد، پھپی زاد، وغیرہ، تین درجے تک) سے نکاح ممنوع تھا۔ لونڈیاں رکھنا یا مسلمان عورتوں سے شادی کرنا یا مسلمانوں کو بیٹیاں دینا بھی ممنوع تھا، طلاق دینے کی پوری آزادی تھی۔ مطلقہ بیویوں

ان کا ساتواں بادشاہ تخت نشین ہو گا۔ اس نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ وہ سہدی ہے جو موجودہ دنیا کے اختتام پر ظاہر ہو کر دجال "العدو" کے خلاف لڑے گا اور [وہ بہک کر] یہ بھی کہتا تھا کہ حضرت عیسیٰ ابن مریمؑ اس کے مریدوں میں سے تھے۔ بربری زبان میں قرآن مجید کے مقابلے پر ایک مزعومہ الہامی کتاب کے علاوہ ایسے مقالات بھی لکھے جن کے متعلق اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس پر اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ پر، جو عباسیوں کے مورث اعلیٰ تھے، حضرت موسیٰ الکلیمؑ کے ذریعے وحی لیے گئے تھے جن کا یہ نام عہدنامہ عتیق کے نبی حضرت موسیٰؑ کے لیے آیا ہے [وَلَقَدْ كَلَّمْنَا]۔

صالح کی تالیف کردہ یہ کتاب اسی سورتوں [حصوں] پر مشتمل تھی، جن کے نام زیادہ تر لسی نہ کسی شخصیت کے نام پر ہیں، چنانچہ پہلے حصے کا نام ایوب ہے اور آخری کا یونس (غالباً اس میں حروف تہجی کی ترتیب مد نظر تھی)۔ دوسرے حصوں کے نام یہ تھے: فرعون، کورہ [القری؟] ہامان، یاجوج و ماجوج، الدجال، العجل [= بنو اسرائیل کا سنہری بچہڑا جو سامری نے بنایا تھا]، ہاروت و ماروت، طاوت (Saul)، نمرود، مرغ، تیر، ٹڈا، اونٹ، سانپ اور عجائبات دنیا (البکری Description of North Africa، طبع Le Bn. de Slane، الجزائر، بار دوم، ۱۹۱۱ء، ص ۱۴۰)۔

البکری نے [اس من گھڑت] پہلی سورت کے افتتاحی حصے کا ترجمہ بھی لکھا ہے۔

برغواطہ مذہب کے پیرو ماہ رمضان کے بجائے ماہ رجب میں روزے رکھتے تھے۔ پانچ نمازیں دن کو اور پانچ رات کو پڑھتے تھے۔ عید قربان گیارہ محرم کو منایا کرتے تھے۔ وضو کرتے وقت وہ پہلے ناف اور زیریں ناف کے سارے حصے کو

کو جتنی بار چاہیں دوبارہ عقد میں لا سکتے تھے۔ چور کو موت کی سزا دی جاتی تھی۔ زانی سنگسار کیے جاتے تھے۔ جھوٹے کو المَغیر (سج) کو بدلنے والا) کا لقب دے کر برادری سے خارج کر دیا جاتا تھا۔ آدمی کے قتل کا قصاص ایک سو پیل تھا۔ انہیں کسی جانور کا سر کھانے کی اجازت نہ تھی اور نہ ایسی مچھلی کھا سکتے تھے جو شرعاً ذبح نہ کی گئی ہو۔ انڈوں کا کھانا منع تھا اور مرغیاں بھی محض ضرورتاً کھائی جا سکتی تھیں۔

ان کے ہاں اذان نہیں دی جاتی تھی اور نہ نماز سے پہلے اقامت ہی کہی جاتی تھی۔ نماز کے اوقات کے متعین کرنے میں وہ مرغ کی اذان کا لحاظ رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ انہیں ستاروں کا اچھا علم تھا اور عام نجوم میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ یہ تمام تفصیلات البکری نے زبور ابو صالح برغواطہ اور سعید ابن ہشام مسمودہ بربری کی سند سے لکھی ہیں۔

مذہب برغواطہ کی علی الاعلان پیروی صالح کے پوتے یونس نے کی، اور اس نے ان تمام آدمیوں کو قتل کروا ڈالا جنہوں نے یہ مذہب قبول کرنے سے انکار کیا۔ چنانچہ بہت سے لوگ موت کے گھاٹ اتارے گئے، جن میں بہت سے صنہاجہ بربر تھے۔ اس کا جانشین ابو غفیر محمد بن معاد بن اَلسع تھا، جو اسی نئے مذہب کا پابند تھا اور جس نے اپنی فتوحات سے برغواطہ کی طاقت کو بہت وسعت دی۔ بقول البکری اس نے ۵۳۰۰ / ۹۱۲ء میں انیس برس حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ لیکن یہ تاریخی حساب غیر معتبر ہے، کیونکہ دیے ہوئے برسوں میں کوئی ستر سال کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر بیچ کے کچھ رہنما چھوٹ گئے ہیں۔ ابو غفیر کا بیٹا ابوالانصار عبداللہ تھا،

جو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب سے بڑا بادشاہ گزرا ہے۔ وہ ہر سال اپنی فوج کو جمع کر کے اعلان کر دیا کرتا تھا کہ میں کسی پڑوس کے علاقے پر حملہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس قسم کے مظاہروں سے وہ اپنے پڑوسیوں کو مجبور کرتا تھا کہ وہ اسے نذرانے پیش کریں، چنانچہ نذرانے پا لینے کے بعد وہ اپنی فوجوں کو منتشر کر دیا کرتا تھا اور اس طریق سے وہ برابر چالیس سال تک امن و عافیت سے حکومت کرتا رہا۔ اسے تامسلاخت [= امسلاخت] میں دفن کیا گیا، جہاں اس کا مقبرہ البکری کے زمانے میں بھی دکھایا جاتا تھا۔ اس کا جانشین ابو منصور عیسیٰ تھا، جس نے اپنے پیشرووں کی مذہبی اور فوجی روایات پورے طور پر قائم رکھیں۔ چونکہ وہ اس سلسلے کا ساتواں بادشاہ تھا اس لیے اسے یہ امید تھی کہ بانی خاندان صالح بن ظریف [رك باں] اس کے عہد میں اپنے وعدے کے مطابق مشرق سے واپس آئے گا [قب ابن خلدون، ۶ : ۴۲۸ تا ۴۳۵]۔

برغواطہ اپنے مذہب پر قائم رہے اور اس کی تبلیغ بزور شمشیر کرتے رہے، جس کی وجہ سے ۵۴۲ / ۱۰۲۹ء تک المغرب میں بڑی بدنظمی کا دور دورہ رہا۔ اس کے بعد ابو کمال تمیم نے، جو بنو یفرن [= افرن] میں سے تھا، ان کے خلاف فوج کشی کی اور ان کے ملک پر قابض ہو کر وہاں سکونت اختیار کر لی۔ اس نے آبادی کے کچھ حصے کو تو ملک سے نکال دیا اور باقی کو اپنا غلام بنا لیا۔ اس وقت سے برغواطہ کا زوال شروع ہو گیا اور ان کے عقائد باطلہ ایسے غائب ہوئے کہ نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ البکری کے زمانے میں اس پورے علاقے کا مذہب اسلام ہی تھا جو اس سے پہلے برغواطہ کے زیر اقتدار تھا [قب البکری : المغرب، ص ۱۳۴ تا ۱۴۱]۔

(DE L. O'LEARY)



ارتقا میں خاصا حصہ ہے کیونکہ وہ یہ سکھاتا ہے کہ اللہ انسان کو کسی خاص کام کے کرنے اور مومن یا کافر ہونے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اور یہ عقیدہ اس کے جبری کہلائے جانے کے منافی نہیں۔

مآخذ : (۱) الأشعری : مقالات الاسلامیین، استانبول، لائیزگ ۱۹۲۹ء؛ (۲) البغدادی : الفرق بین الفرق، قاہرہ ۱۹۱۰ء؛ (۳) الخياط : کتاب الانتصار، قاہرہ ۱۹۲۵ء؛ (۴) المرتضیٰ : المنیة و الآمل، لائیزگ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ - ۱۸۹۹ء (ان سب میں اشارے موجود ہیں)؛ (۵) الشہرستانی : الملل و النحل، لنڈن ۱۹۲۳ء (طبع مکرر)، ص ۶۳، ۱۰۳؛ (۶) ابن خزم : کتاب الفصل، قاہرہ ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ - ۱۹۰۳ء، ص ۲۲، ۳؛ (۷) المرتضیٰ : غایات الأفكار و نہایات الأنظار، موزة بریطانیہ، مخطوطہ، عدد ۳۹۳۷، ورق ۲۶، ۵۶، ب، ۱۵۸؛ (۸) Free Will : W. Montgomery Watt (۸) : ۱۹۷، ب، ۱۵۸۔

and Predestination in Early Islam، لنڈن ۱۹۳۸ء۔

(A. S. TRITTON)

برق بابا : [= باراق بابا]، ایک ترکی درویش، جس نے ایلخانیوں کے عہد میں کسی قدر شہرت حاصل کر لی تھی۔ کہا گیا ہے کہ وہ مشہور صاری صالقی [رکب بآں] کا مرید تھا اور اس کا ذکر بابائی، بکتاشی اور مولوی تحریکوں کے ساتھ ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کے پیرو برقی کہلاتے تھے۔ حیران امیرجی اس کا خلیفہ تھا۔ ایک حکایت میں، جو یزید جی اوغلو علی کے ہاں محفوظ ہے، کہا گیا ہے کہ وہ دراصل ایک سلجوقی شہزادہ تھا، جسے ایک یونانی بطریق نے عیسائی بنا لیا تھا اور صاری صالقی نے دوبارہ مسلمان کر کے اپنی فوق الفطرت قوتیں اس کی طرف منتقل کر دیں اور اسے برق کا خطاب عطا کیا۔ عربی مآخذ اسے توقات [= توقاد] کا باشندہ بتاتے ہیں (ابن حجر کے متن میں توقات کا لفظ اس کے مطابق صحیح

البرغوثیہ : ایک فرقہ، جو محمد بن عیسیٰ الکاتب، جسے برغوث (عربی لفظ بمعنی پسو) کہتے تھے کی طرف منسوب ہے۔ یہ فرقہ نجاریہ [رکب بآں] کی ایک شاخ ہے اور ان کی طرح اس کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ اللہ کی ایک فطرت (ماہیت) ہے اور اس کی صفات صرف سلبی مفہوم رکھتی ہیں، (مثلاً) جواد کا مطلب یہ ہے کہ وہ بخیل نہیں ہے) اور جو کچھ ہونے والا تھا اس کا علم اسے ہمیشہ سے تھا۔ لیکن برغوثیہ کا مخصوص عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات یا روح کی وجہ سے کلام کرتا ہے، یعنی اس کا کلام اس کی ذات کی صفت ہے، اگرچہ ایک روایت یہ ہے کہ ان کے نزدیک اس کا کلام ایک فعل ہے (لہ کلام فاعلی)، جس سے [نعوذ باللہ] یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ قرآن اللہ کا کلام نہیں ہے۔ اللہ کو "فاعل" یا "خالق" نہیں کہنا چاہیے، کیونکہ یہ دونوں انسان کے لیے برے مفہوم میں بولے جا سکتے ہیں۔ مثلاً وَتَخْلُقُونَ أَفْکًا (= تم جھوٹ گھڑ لیتے ہو) (۲۹ [العنکبوت] : ۱۷)۔ افعال ثانویہ (مولدات طبائع اشیاء کے ذریعے) اللہ کے افعال ہیں۔ اللہ فضائے خالیہ ہے (مگر ساتھ ہی) ایک جسم بھی ہے، جس کے اندر (مخلوقات کا) حدوث ہوتا ہے (ابن ابی حدید، ۱ : ۲۹۵)۔ انسان حوادث کا ایک مجموعہ ہے۔ "استطاعة" فعل کے ایک حصے کے ساتھ واقع ہوتی ہے اور جس وقت کوئی عضو حرکت کرتا ہے تو اعضاء ساکنہ بھی اس حرکت کے احداث میں حصہ لیتے ہیں اور اسی طرح اس متحرک عضو کا بھی ان ساکن اعضاء کو سکون کی حالت کے اندر رکھنے میں کچھ حصہ ہوتا ہے۔ جو کوئی کسی فعل کا اکتساب کرتا ہے وہ اس کا فاعل نہیں کہا جا سکتا۔ اگر برغوث وہی محمد بن عیسیٰ ہے جس کا ذکر الاشعری کے مقالات، ص ۵۵۲ پر آیا ہے تو اس کا علم کلام کے

پیرس ۱۹۱۸ تا ۱۹۲۲ء، ۲ : ۳۲۳ : (۲) المشریزی :  
 السلوک، ۲ : ۲۸ تا ۲۹ (Mamlouks: Quatremère)  
 ۲ : ۲۶۷ تا ۲۶۸ : (۳) ابن حجر: الدرر الكامنة، ۱ : ۳۷۳  
 تا ۳۷۴ : (۴) ابن تغری بردی : النجوم [الزاهرة]، فاعره،  
 ۸ : ۱۶۹ تا ۱۷۰ : (۵) السنبل الصافی (طبع Wiet، حاشیہ  
 ۶۳۸) : (۶) العینی : عقد الجمال، جس کا حوالہ حسین  
 حسام الدین نے اسیہ تاریخی میں ص ۳۶۰ تا ۳۶۳ پر  
 دیا ہے۔ محمد فؤاد کوپرولو نے برق بابا کا مطالعہ کیا  
 ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس کی تعلیمات اور طرز عمل  
 میں اسلام پر ترکی۔ مغول شہنیت کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔  
 دیکھیے اس کی (۶) ترک ادبیاتندہ ایلک متصوفلر، استانبول  
 ۱۹۱۸ء، ص ۲۳۵ اور حاشیہ ۱ : (۴) اندلودہ اسلامیت،  
 دارالفنون ادبیات فاکولتہ سی مجموعہ سی، ۱۹۲۲ء،  
 ۲ : ۳۹۲ تا ۳۹۳ : (۸) اندلو سلجوقلری تاریخینگ برلی  
 قاینقلری، بلیتن، ج ۲، ۱۹۳۳ء، ص ۳۱ و حاشیہ ۱ :  
 (۹) *Influence du Chamanisme turco-mongol...*  
 استانبول ۱۹۲۹ء، ص ۱۳ تا ۱۷ : دیکھیے نیز (۱۰)  
 P. Wittek : *Yazijiogulu 'Ali on the Christian Turks of*  
*the Dobruja*، در BSOAS، ۱۳، ۱۹۵۲ء، ص ۶۵۰، ۶۵۸  
 تا ۶۵۹ : (۱۱) عبدالباقی گوال ہناری : یونس امر حیات،  
 استانبول ۱۹۳۶ء، ص ۳۸ تا ۳۹، (یہ کتاب مقالہ نویس  
 کے مطالعے میں نہیں آئی)۔

(B. LEWIS)

**برقعید** : عباسی دور کے ان چھوٹے چھوٹے  
 شہروں میں سے ایک شہر جو صوبہ الجزیرہ  
 میں نصیبین سے موصول جانے والی شاہراہ پر  
 واقع تھے۔ اس سلسلے کے دوسرے شہروں میں  
 ایک اڈرمہ تھا، جو مغرب میں واقع تھا، اور  
 بائیناٹھ اور بلد (جہاں موصل و سنجر کی سڑک جنوب  
 مغرب کی جانب دو طرف کو نکل جاتی تھی) جو  
 مشرق میں واقع تھے۔ برقعید، جس کی جائے وقوع  
 کی نشان دہی شاید موجودہ شہر تل رومیلان

کر لینا چاہیے)۔ کہتے ہیں کہ اس کا باپ ایک  
 اعلیٰ سرکاری عہدے دار تھا اور اس کا چچا ایک  
 مشہور کاتب۔ یہ ترکی سے ایران چلا گیا، جہاں  
 لٹھا جاتا ہے کہ اس نے غازان اور الجایتو پر اپنا  
 کسی قدر اثر جما لیا۔ جمادی الاولیٰ ۵۰۶ھ/  
 نومبر ۱۳۰۶ء میں وہ اپنے مریدوں کی ایک جماعت  
 لے کر دمشق پہنچا۔ یہاں اس کا لباس اور  
 طرز عمل اتنا قابل توجہ ثابت ہوا کہ اسے معلوم  
 سلطنت کی عربی تاریخ میں جگہ مل گئی۔  
 اس کے بعد وہ یروشلم گیا۔ لیکن مصر جانے سے  
 اسے روک دیا گیا اور وہ پھر ایران واپس آ گیا۔  
 ۵۰۷ھ/۱۳۰۷-۱۳۰۸ء میں اس نے الجایتو  
 کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ اسے مبلغ کی حیثیت  
 سے گیلان بھیج دے، جہاں اسے قتل کر دیا گیا۔

ترکی نام برق [باراق] کو عربی براق [رک  
 با] سے ملتبس کر کے بعض اوقات غلط طور پر  
 براق لکھ دیا جاتا ہے۔ Huart نے اس کی جو  
 شکل براق لکھی ہے وہ بھی صحیح نہیں۔ درحقیقت  
 براق ایک ترکی لفظ ہے جو ایک خاص قسم  
 کے کتے کے لیے استعمال ہوتا ہے جسے کوپرولو  
 ”بن بالوں کا کتا“ کہتا ہے (Chamanisme،  
 ص ۱۴ تا ۱۵، حاشیہ ۲۶) اور Pelliot ”لمیے  
 بالوں والا“ کم و بیش ایک افسانوی کتا بتاتا  
 ہے (Notes sur l'histoire de la Horde d'or، پیرس  
 ۱۹۵۰ء، ص ۵۷ تا ۵۸)۔ یہ نام مغول اور ترکانوں  
 میں تیرھویں صدی سے پندرھویں صدی تک خاصا عام  
 تھا۔ بعض مثالوں کے لیے دیکھیے G. Moravczik :  
 Byzantinoturcica، پوڈاپسٹ ۱۹۳۲-۱۹۳۳ء،  
 بذیل مادہ βαράκος اور παράκ : نیز رک بہ براق  
 حاجب اور براق خان)۔

• آخذ : (۱) آفلاکی : مناقب العارفين، ترجمہ  
 Les saints des derviches tourneurs : Cl. Huart



تا ۱۹۸ (حاشیہ از ڈخوبہ).

([S. H. LONGRIGG] M. STRECK)

\* برقلس: Proclus [= پروکلو] (۳۱۰ [یا ۳۱۲])

تا ۴۸۵ء، ایتھنز میں عہد بت پرستی کی درس گاہ فلسفہ ("افلاطونی اکادمی") کا صدر، جسے نو فلاطونی فلسفے کے مسائل کی تدریس و تہذیب میں بڑا امتیاز اور قدیم اور قرون وسطیٰ کے فلسفے کے درمیان ایک اہم کڑی کی حیثیت حاصل ہے۔ قرون وسطیٰ کے عربی تصورات پر اس کے جو اثرات کار فرما ہوئے اگرچہ بہ تخصیص ان کے بارے میں کوئی مستقل مقالہ لکھنا قبل از وقت کوشش ہوگی، تاہم اس وقت ہمیں جو معلومات میسر ہیں وہ اتنی کم نہیں کہ برقلس پر R. Beutler کے جامع مقالے (Pauly-Wissowa-Kroll، ۱۳۵، ۱۹۵۷ء: عمود ۱۸۶) (بعد) میں اس پہلو کو قطعی نظر انداز کر دینے کا جواز نکل سکے۔ اس سے بہتر معلومات E. Zeller: *Philosophie der Griechen III* (بار چہارم): ۱۸۳۹ء شماره ۱ اور E. R. Dodds: *Proclus the Elements of Theology*، اوکسفورڈ ۱۹۳۳ء، ص xxviii بعد میں ملتی ہیں [قب البستانی: دائرة المعارف، ۵: ۹۱- تا ۳۹۲]۔

برقلس کی جو تصنیفات کسی نہ کسی طرح عرب علما کے علم میں آئیں ان کی ایک فہرست ابن الندیم: الفہرست، ص ۲۵۲، طبع Flügel (= ص ۳۳۳، مطبوعہ مصر) میں ملتی ہے۔ اسے چند نام چھوڑ کر ابن القفطی: تاریخ الحکماء (طبع Lippert)، ص ۸۹، نے بھی نقل کیا ہے۔

(۱)

برقلس کی بعض تصانیف عربی میں غلط ناموں کے تحت متعارف ہوئی ہیں۔

۱- مرتین لئیات نے کتاب الاثالوجیا کے نام سے

جس کا نام لائیو ہے اور جسے حاجی خلیفہ

ریلوے لائن کے شمال میں (اور اسی لائن پر تل کوچک سٹیشن کے قریب) کرتا ہے، غالباً Bec de Canard (شام کے موجودہ صوبے الجزیرہ کی انتہائی مشرقی حد) کے اندر اور نصیبین سے تقریباً پچاس پچن میل اور موصل سے اسی میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ متعدد عرب جغرافیہ نویسوں نے اس کا ذکر ایک خاصے بڑے مقام کی حیثیت سے کیا ہے، بالخصوص تیسری / نویں صدی میں۔ اس کی ایک شہر پناہ تھی، جس میں تین دروازے تھے اور اس کے علاوہ اعلیٰ درجے کے چشمے اور دو سو دکانیں تھیں، اور آمد و رفت کی چہل پہل تھی۔ اپنے زمانہ عروج میں یہ البقاء کے ضلع کا مرکزی شہر تھا، جس میں موصل اور نصیبین کے درمیان کا زیادہ تر علاقہ شامل تھا۔ ساتویں صدی / تیرھویں صدی تک یہ برابر ڈاک کی ایک معروف چوکی رہا، لیکن اس کی وسعت بہت کم ہو گئی، اس لیے کہ یہ اپنے چور اور ڈاکو باشندوں کے لیے بدنام بلکہ ضرب المثل تھا اور مسافر اور قافلے قدرتی طور پر ادھر سے بچ کر نکلنا چاہتے تھے۔ اسی لیے برقعید رفتہ رفتہ محض ایک معمولی سا ڈوں رہ گیا اور اس کے زیادہ نیک نام قریبی شہروں (خصوصاً باشزی جو ایک متبادل راستے پر واقع تھا) نے ترقی کر لی۔ [بہت سے اہل علم البرقعیدی کی نسبت سے مشہور ہیں]۔

مآخذ: (۱) BGA، مواضع کثیرہ، بالخصوص

۶: ۲۱۴ حاشیہ ایف (نیز ص ۱۶۸): (۲) یاقوت، ۱:

۵۷۱ بعد، ۷۰۱؛ (۳) ابوالفداء، تقویم، ۲: ۲۹۳:

(۴) الحریری: [مقامات]، مقامہ عتہ: (۵) Le Strange،

ص ۹۹؛ (۶) K. Ritter: *Erdkunde*، ۹: ۱۶۲ تا

۱۶۳؛ (۷) F. Tuch: *ZDMG*، ۱: ۶۲ تا ۹۳؛

(۸) M. v. Oppenheim: *Vom Mittelmeer zum*

*persisch. Golf* (1900)، ۲: ۱۳۳ تا ۱۶۵

لگ بھگ تحریر ہوا تھا، P. Kraus نے دریافت کیا (Bulletin de l'Institut d'Egypte) ، ۲۳ ، ۱۹۳۰ - ۱۹۳۱ (۶۱۹۳۱ : ۲۷۷) اور احمد بدوی نے شائع کیا ہے (شباب مذکور، ص ۲۴۸ بعد)۔ یہ کتاب دراصل برقلس کے ان اقتباسات کا ترجمہ ہے جسے پرانے زمانے میں مرتب کیا گیا تھا یا یہ کسی قدیم عرب فلسفی کی مرتب کردہ ہے، اس سوال کا فیصلہ اب ہونا ممکن نہیں۔

(۲)

۱۔ عرب مفکروں کے ہاں برقلس کی شہرت زیادہ تر اس لیے تھی کہ وہ عالم نو قدیم بتاتا تھا۔ اس عقیدے کے بارے میں اس کے ان اٹھارہ مسائل (Επιχειρήματα περί αἰδιότητος κόσμου) سے، جو اصل یونانی میں مفقود ہو چکے ہیں، عرب اسی قدر واقف تھے جس قدر یوحنا فلوبونوس (John Philoponus) کی شہرت سے (De aeternitate mundi contra Proclum)، جس کے یونانی مخطوطات میں ابتدائی حصہ موجود نہیں۔ پہلے نو مسائل کو اب احمد بدوی نے اسحق بن حنین کے عربی ترجمے میں شائع کر دیا ہے (کتاب مذکور، ص ۳۵)۔ ان میں سے آٹھ مسائل کا علم تو یوحنا فلوبونوس کے اقتباسات سے ہوا ہے، لیکن پہلا مسئلہ صرف عربی ہی میں محفوظ رہا ہے (قَب C. G. Anawati : Mélanges A. Diès، پیرس ۱۹۵۶ء، ص ۲۱ بعد)۔ محمد بن زکریا الرازی نے اپنی تصنیف کتاب الشکوک التي علی برقلس میں اس تصنیف کا حوالہ دیا ہے (قَب S. Pines : Beiträge zur islamischen Atomenlehre، برلن ۱۹۳۶ء، ص ۹۳، حاشیہ ۱)۔ ممکن ہے کہ اس نے یوحنا فلوبونوس سے استفادہ کیا ہو۔ ایسا ہی مثال کے طور پر الشہرستانی (کتاب الملل و النحل، طبع Cureton، ص ۳۳۸ بعد) نے کیا ہے، جس

۵ : ۶۶ (طبع فلوگل Flügel) نے برقلس اور اسکندر (!) سے منسوب کیا ہے، بظاہر وہ نوافلاطونی ما بعد الطبیعیات کی ایک باقاعدہ مرتب درسی کتاب رہی ہے جو "مبادیات الہیات" Elements of Theology (Στοιχείωσις Θεολογική) کے نام سے معروف ہے۔ احمد بدوی نے ارسطو عند العرب میں مسائل ۱۵ تا ۱۷ (Dodds کے ہاں ۱۶ تا ۲۰) کا عربی متن گیارہویں صدی کے ایک دستخطی مخطوطے سے لے کر شائع کیا ہے (قاہرہ ۱۹۳۷ء، ص ۲۹۱ بعد)، جس میں یہ متن غلط طور پر الاسکندر الافروڈیسی (Alexander of Aphrodisias) سے منسوب کر دیا ہے۔ اصل حقیقت کا انکشاف اپنے اپنے طور پر B. Lewin (Orientalia suecana) ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۱ بعد اور S. Pines (Oriens) ۱۹۵۵ء، ص ۱۹۵ بعد نے کیا ہے۔ اس کا مترجم دبستان حنین کا ایک نسبتاً غیر مشہور رکن ابو عثمان سعید ابن یعقوب الدمشقی تھا۔

ب۔ ایک اور تصنیف کتاب الايضاح فی الخير المحض کو، جو "مبادیات الہیات" کے اکتیس مسائل پر مبنی ہے، بلاد مغرب میں Gerard of Cremona کے زمانے (بارہویں صدی کے نصف آخر) سے ارسطو کی Liber de causis [= کتاب العلل] سمجھا جاتا رہا ہے۔ عربی متن کا ایک تنقیدی نسخہ (جسے لاطینی اور عبرانی تراجم پر مبنی ہونا چاہیے اور جس کا یونانی اصل سے دقت نظر کے ساتھ مقابلہ ضروری ہے) G. C. Anawati تیار کر رہا ہے (قَب Mélanges Massignon، دمشق ۱۹۵۶ء، ص ۷۳ بعد)۔ فی الحال ہمیں O. Bardenhewer کے طبع کردہ نسخے (Freiburg - Breisgau، ۱۸۸۲ء، جو دوبارہ طبع ہو چکا ہے) اور احمد بدوی کے متن (در Islamica، ۱۹۵۵ء : ۱ بعد) پر قناعت کرنی ہوگی۔ عربی متن (منسوب بہ ارسطو) کا ایک خلاصہ، جو ۱۲۰۰ء کے



[مآخذ : متن میں آگئے ہیں]۔

(R. WALZER)

\* برقوق : الملک الظاهر سيف الدين مملوک سلطان مصر، فرمانرواؤں کے اس نئے سلسلے کا پہلا فرمانروا جو تاریخ میں یا تو اس ملک کے نام پر جہاں سے وہ شروع میں بطور غلام خریدے گئے تھے چرنسی (Circassians) کہلاتے ہیں یا برجی [رک بہ برجیہ] اس لیے کہ برقوق وہ پہلا بادشاہ تھا جو اس فوجی دستے میں تھا جن کی بارکین قلعہ قاہرہ کے برج میں تھیں۔

برقوق کو مملوک سلاطین کے دونوں خاندانوں کی درمیانی کڑی کی حیثیت حاصل ہے، یعنی تخت نشین ہونے سے پہلے بھی وہ سپہ سالار اعظم (آتابک العساکر [رک باں] کی حیثیت سے قلاؤن خاندان کے دو نابالغ سلطانوں کے پر آشوب ادوار میں مصر پر حکومت کرتا رہا تھا۔

برقوق قریم (کریمیا) میں خریدا گیا تھا اور دوسرے غلاموں کی طرح کسی غیر معروف آدمی کی اولاد نہیں تھا۔۔۔۔۔ وہ انس [= انص] کا فرزند تھا، جسے مصر بلوایا گیا تھا اور یہاں اسے ایک نمایاں حیثیت حاصل تھی۔

برقوق، مقتدر سالار اعظم یلبغا عمری کے ہاتھ فروخت ہوا تھا، جس نے بد قسمت ملک ناصر حسن کو تباہ و برباد کیا تھا۔ برقوق اپنے آقا کے قتل کے بعد تھوڑے عرصے تک قید میں رہا۔ پھر وہ بحیثیت ملازم کے دربار کے ساتھ منسلک ہو گیا، لیکن جلد ہی اس سازش میں الجھ گیا جس کا خاتمہ ۵۷۷۸ / ۱۳۷۶ - ۱۳۷۷ء میں سلطان اشرف شعبان کے قتل پر ہوا [قب الضوء اللامع، ۳ : ۱۱]۔

اس کے بعد اسے ملک منصور علی نے، جس کی عمر اس وقت صرف سات سال تھی، سپہ سالاری کے منصب پر فائز کر دیا۔ اسے اپنے بعض جاہ پسند

نے یہ بھی بتایا ہے کہ ابن سینا نے برقوق کے دلائل سے کام لیا تھا۔ امام غزالی بھی ان مسائل سے واقف تھے (قب S. van den Bergh : Averroes' Tahāfut al Tahāfut، لندن ۱۹۵۴ء، ۱ : xvii و ۲ : ۱)۔  
ب۔ عرب فلاسفہ میں برقوق کی مقبولیت کا مزید ثبوت بعض دوسری تحریروں کے اجزا کے اتفاقہ دستیاب ہو جانے سے بہم پہنچا ہے۔ احمد بدوی (کتاب مذکور، ص ۴۳ بعد، قب B. Lewin : Orientalia Suecana، ص ۱۶، ۱۹۵۸ء) نے آٹھ (اقتباسات) Προβλήματα φυσικά شائع کیے ہیں۔ یہ بین طور پر ایک زیادہ بڑے رسالے کا حصہ ہیں، جو بہت ممکن ہے کہ اصلی ہو۔ اسی طرح ایک چھوٹا سا جزو αγαθόν کے تصور کے بارے میں Lesser Στοιχείωσις سے لیا گیا ہے۔ اس کا ذکر عربی کتابیات کے مرتبوں نے کیا ہے (بدوی : کتاب مذکور، ص ۲۵۷)۔ F. Rosenthal نے انگریزی ترجمے میں اس کی تصنیف On the Immortality of the Soul according to Plato کے ایک ٹکڑے سے روشناس کیا۔ Timaeus پر اس کی نہایت ضخیم شرح کے گمشدہ حصے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جرمن زبان میں ملتا ہے [رک بہ افلاطون]۔ عرب ان شرحوں سے واقف تھے جو اس نے یونانی دیومالا کی کہانی "Gorgias" اور افلاطون کے رسالے فیدو (Phaedo) پر لکھے تھے، لیکن ابھی تک ان کے سریانی یا عربی باقی ماندہ آثار کا سراغ نہیں مل سکا۔ نام نہاد فیثاغورثی "منظومات زریں" (Golden Verses) کے حواشی اس سے غلط طور پر منسوب ہیں۔ اس کا باعث یہ ہے کہ ایک کم معروف نو فلاتونی ہرقلس Hierokles کے نام کو غلطی سے برقوق سے پڑھ لیا گیا ہے (اور اس غلطی کی توجیہ آسانی سے کی جا سکتی ہے)۔

رفقا کا مقابلہ کرنا پڑا اور لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، جس میں بالآخر وہ کامیاب و کامران ہوا۔ اب اس نے اپنے گرد موالی کا ایک گروہ جمع کر لیا اور جب ۵۷۸۴ھ / ۱۳۸۲ء میں سلطان کا طاعون سے انتقال ہو گیا تو برقوق نے پہلا کام یہ کیا کہ سلطان کے گیارہ سالہ بھائی حاجی کو تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن بالآخر اپنے ارادوں کو بے نقاب کر دیا اور اس کی تحریک پر کہ ملک کی حفاظت کے لیے ایک مضبوط اور صاحب قوت فرمانروا کی ضرورت ہے اسی سال کے آخر میں ایک مجلس قضاة نے، جس کا صدر خلیفہ [عباسی] تھا، تاج و تخت اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔

لیکن برقوق کو جلدی ہی سخت مشکلات و مصائب سے دو چار ہونا پڑا اور نتیجہ یہ ہوا کہ عارضی طور پر اس کا اقتدار اس سے چھن گیا۔ ان مصائب کا آغاز صوبہ حلب کے والی یلبغا الناصری کی بغاوت سے ہوا، جس کے ساتھ ایک معزول شدہ مملوک منطاش بھی شامل ہو گیا۔ شام کے باقی والی بھی بغاوت میں شریک ہو گئے، جن میں سب سے دور افتادہ سرحدی مقام بیس کا والی بھی شامل تھا۔ جب سلطان نے اپنے خاص خاص افسروں سے دوبارہ حلف وفاداری لے کر باغیوں کے خلاف کارروائی کرنے کا فیصلہ لیا تو یلبغا تمام شام پر قابض ہو چکا تھا اور ربیع الاول ۵۹۱ھ / مارچ ۱۳۸۹ء میں دمشق کی دیواروں کے عین نیچے اس شاہی فوج کو شکست دے چکا تھا جو اس کے خلاف بھیجی گئی تھی۔

سلطان نے ایک دوسری فوج مرتب کی اور کسی قدر عجلت میں اپنی تیاریاں مکمل کیں، کیونکہ یلبغا کے فوجی دستوں نے قُطیا کے مقام سے مصر میں داخل ہو کر صالحیہ میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ سلطان بھی اپنی فوجیں مطریہ میں لے آیا،

لیکن اسے بحسرت ویاس قاہرہ لوٹنا پڑا، اس لیے کہ اس کے بیشتر افسر یہ اندازہ کر کے کہ فریقین میں سے فتح کسے حاصل ہو گی، سلطان کو چھوڑ کر دشمن سے جا ملے۔ بائیں ہمہ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اس قضیے کو لڑائی لڑ کر ہی طے کیا جائے، چنانچہ ۹ جمادی الاولیٰ/یکم مئی کو قاہرہ کے شمال میں شہر کی دیواروں تلے لڑائی ہوئی، لیکن وہ فیصلہ کن ثابت نہ ہوئی۔ جب برقوق نے دیکھا کہ اس کے ساتھیوں کی وفاداری روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے تو وہ بھیس بدل کر ایک دن قلعے سے نکل گیا اور کہیں رو پوش ہو گیا۔ لوگوں نے اسے دھونڈ نکالا اور سر زمین مؤاب میں قلعہ گرگ میں قید کر کے حاجی کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا۔ لیکن جو فتنہ انگیز فوجی افسر حاجی پر حاوی تھے انہوں نے آپس میں ذلیل قسم کی لڑائیاں شروع کر دیں۔ برقوق نے اس انتشار سے فائدہ اٹھایا اور قید سے باہر نکل کر پھر ایک فوج مرتب کی جو بیشتر بدوی عربوں پر مشتمل تھی۔ بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھنے کے بعد، جن میں سے بعض تو بالکل داستانیں معلوم ہوئی ہیں، وہ صفر ۵۹۲ھ / فروری ۱۳۹۰ء میں فاتحانہ طریقے سے قاہرہ میں داخل ہوا [قب ابن ایاس، ۱: ۲۵۸]۔

ظاہر ہے کہ حاجی حکومت سے دست بردار ہو جانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتا تھا، لیکن اسے اور کسی طرح تنگ نہیں کیا گیا۔ علاوہ ازیں سلطان برقوق کو ابھی اپنے پرانے حریف، منطاش سے نمٹنا تھا، چنانچہ اسے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے مزید دو سال تک جنگ جاری رہنی پڑی۔

جیسا کہ واقعات سے ظاہر ہے، سلطان برقوق کی حکومت کے یہ دونوں ادوار یوں تو حوادث سے پر تھے لیکن ان سے مصر کی عظمت میں ذرا بھی



برقوی نے شامی سرحد کے سلسلے میں بعض نئے تقرر کیے، چنانچہ ملطیہ، طرسوس، الرہا اور قلعة الروم میں نئے سپہ سالار متعین ہوئے۔ مزید برآں کتبات سے پتا چلتا ہے کہ اس وقت بعلبک کے قلعے میں، جو شام کی سرحد پر سب سے اہم چوکی تھی، بعض تعمیرات کی گئیں۔ اسی طرح ان تھوڑے سے اشاروں کی مدد سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ شام میں سے گزرتے ہوئے برقوی نے اپنے علاقے کے دفاع کا انتظام کیا۔ وہ ۱۳ صفر ۵۷۹ھ / دسمبر ۱۳۹۳ء کو قاہرہ واپس آ گیا۔

اس کے عہد حکومت کا آخری زمانہ تاریخی واقعات کے لحاظ سے غیر اہم ہے۔ سلطان نے ۱۵ شوال ۵۸۰ھ / ۲۰ جون ۱۳۹۹ء کو وفات پائی۔ [اس نے رفاہ عامہ کے بہت سے کام کیے]۔

برقوی نے تریسٹھ سال عمر پائی اور بیس سال تک مصر پر حکومت کی، پہلے بحیثیت سپہ سالار اعظم اور پھر بحیثیت سلطان۔ [سلطان برقوی ایک بہادر، اولوالعزم اور نیک دل حکمران تھا۔] بعض اتفاقات ایسے بھی ہیں جن کی بنا پر یہ قیاس لیا جا سکتا ہے کہ بڑے بڑے شامی عمال کو تیمور کے کارندوں کے عیارانہ پروپیگنڈے نے بغاوت پر آمادہ کیا تھا تا کہ تیمور اس انتشار سے فائدہ اٹھائے [قب الضوء اللامع، ۳ : ۱۰ تا ۱۲]۔

مأخذ (۱) المنہل الصافی، سوانح، حصہ متعلقہ مصر، ج ۱۹، عدد ۶۵۰ : (۲) Wiet : *Histoire de la Nation Egyptienne*، ۳ : ۵۰۸ تا ۵۲۰ : (۳) ابن تغری بردی : [النجوم الزاهرة]، طبع Popper، ج ۵ و ۶ : مطبوعہ قاہرہ، ج ۱۱ : (۵) Hauteceur و Wiet : *Les Mosquées du Caire*، بحد اشارہ : (۶) ابن فرات، جلد ۱۰،

(G. WIET)

• برقہ : عرب مصنفین اس لفظ کو ایک شہر

اضافہ نہیں ہوا بلکہ آٹھویں / چودھویں صدی کے آخری پچاس سال تو واقعی افسوسناک رہے۔

اس جگہ بعض اور واقعات کا ذکر بھی ضروری ہے، اگرچہ اس وقت ان کے نتائج کی اہمیت عیاں نہیں تھی۔ ۵۷۸۸ھ / ۱۳۸۶ء ہی میں برقوی کے پہلے عہد حکومت کے دوران میں قاہرہ میں یہ افواہیں گرم تھیں کہ ”تیمور نامی ایک مغول باغی“ نے تبریز پر چڑھائی کر دی ہے اور اس کی سرکاری طور پر تصدیق بہت جلد جلائری سلطان عراق احمد بن اویس کے مراسلے سے ہو گئی، جس میں برقوی کو ہوشیار و خبردار رہنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس پر مملوک حکومت نے اپنے سراغ رساں کارندوں میں سے ایک شخص کو بھیجا کہ وہ موقع پر پہنچ کر تحقیقات کرے۔ یہ کارندہ رجب ۵۷۸۹ھ / جولائی ۱۳۸۷ء میں کسی قدر بریشان کن خبر لے کر واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ مغول فوج کے لچھو دستے ترکمان فرمانروا قرہ محمد کے دستوں کو منتشر و پراگندہ کرنے کے بعد الرہا (Edessa) اور ملطیہ کے مقامات پر بالائی عراق عرب اور ایشیائے کوچک میں داخل ہو گئے ہیں۔

۵۷۹۵ھ / ۱۳۹۳ء کے وسط میں تیمور نے پھر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ عثمانی سلطان بایزید نے ایک سفارتی وفد مصری حکومت کے پاس بھیجا اور احتیاطی فوجی تدابیر اختیار کرنے کی تاکید کی اور سلطان بغداد احمد بن اویس، جسے مغول دستوں نے اس کی مملکت سے نکال دیا تھا، مملوک سلطنت میں پناہ گزین ہوا؛ تاہم تیمور نے برقوی سے مصالحت آمیز طریقے پر نامہ و پیام شروع کیا لیکن اس نے دور اندیشی سے کام نہ لیتے ہوئے مغول قاصد کو قتل کر دیا۔

مصری سلطان ایک فوج کے ہمراہ شام کی طرف جا چکا تھا۔ اس موقع پر چند جھڑپیں ہوئیں۔

اس کا درجہ حرارت معتدل رہتا ہے۔ بارش خاصی ہوتی ہے۔ بن غازی میں سطح سمندر پر جنوری اور جولائی۔ اگست کے مہینوں میں درجہ حرارت ۱۳.۵ اور ۲۵.۸ سینٹی گریڈ کے درمیان رہتا ہے اور المَرج میں، جو چھ سو پچاس میٹر کی بلندی پر واقع ہے، ۱۰.۴ اور ۲۳.۹ درجے اور قورینا میں، جو سطح سمندر سے چھ سو اکیس میٹر بلند ہے، ۸.۴ اور ۲۲.۳ درجے ہوتا ہے، جہاں برف بھی گرتی ہے۔ بارش مغربی ساحلی علاقے میں کم ہوتی ہے (بن غازی میں دو سو چھیاسٹو ملی میٹر) اور بغیر آب پاشی کے تقریباً اسی طرح کی لہیتی باڑی کے لیے کافی نہیں، اس لیے کہ مقامی مٹی عام طور سے بھاری ہے؛ لیکن پہلی سطح کے شمالی حصوں میں بارش نسبتاً زیادہ ہوتی ہے، مثلاً المَرج میں چار سو اسی میٹر تک پہنچ جاتی ہے بالخصوص دوسری سطح مرتفع پر قورینا کے علاقے میں تو پانچ سو ملی میٹر سے بھی زیادہ بلکہ چھ سو ملی میٹر تک ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں جوں جوں مشرق کی طرف بڑھیں بارش کی مقدار کم ہوتی جاتی ہے (درنہ Derna میں تین سو ملی میٹر) اور پھر جنوب مشرق اور جنوب میں اس میں اور بھی کمی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ان ندیوں میں جو صحرا کی طرف بہتی ہیں پانی صرف اس وقت آتا ہے جب زبردست بارش ہو اور وہ چاروں طرف سے گھرے ہوئے عریض نشیبوں میں پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ بحیرہ روم کی بہت ہی چھوٹی اور بہنے لگی گہرے کناروں سے گہری ہوئی معاون ندیوں میں صرف وادی درنہ Derna میں پانی سال بھر رہتا ہے۔ بارش کا پانی سطح مرتفع کے چوڑے حصوں میں جذب ہو جاتا ہے اور کہیں کہیں بعض قدرتی ("Vauclusion") چشموں کی صورت میں بعض

(موجودہ المَرج) اور اس کے گرد و پیش کے علاقے یعنی سیرینیکا Cyrenaica کے لیے استعمال کرتے تھے، جو افریقہ کا ایک وسیع و عریض جزیرہ نما ہے اور مشرقی بحیرہ روم میں خلیج بمبہ Bomba اور خلیج سیرتس الکبیر (Syrtis) کے درمیان واقع ہے اور اس طرح گویا اس کی جائے وقوع گرینوچ کے مشرق میں ۲۰ درجے اور ۳۰ درجے طول البلد اور ۳۰ درجے اور ۳۳ درجے عرض بلد کے درمیان ہے۔ اس کی مشرقی حد پر مرماریکا Marmarica شروع ہو جاتا ہے اور جنوب میں مشرقی لیبیا کا وسیع و عریض صحرا پھیلا ہوا ہے۔

یہ علاقہ سطح مرتفع کئی تہوں پر مشتمل ہے، جس کی تشکیل تیسرے ارضیاتی دور (Miocene age) میں کینومینی (Cenomanian) چوڑے کی موٹی موٹی تہوں اور زمین کی تیسری تہہ (Tertiary) کے سکڑ جانے سے ہوئی ہے۔ یہ مرتفع سطحیں آہستہ آہستہ جنوب کی سمت میں ڈھلتی گئی ہیں، جہاں صحرائی سطح زمین زیادہ بلند نہیں اور ان کی جگہ سیلابی مٹی کے نشیبی میدان لے لیتے ہیں، جو بتدریج نیچے ہوتے ہوتے سمندر سے جا ملے ہیں۔ بلندترین سطح مرتفع جبل اخضر ("سبز پہاڑ") کی بلندی سطح زمین سے پانچ سو میٹر سے لے کر چھ سو میٹر تک ہے اور اس کا بلند ترین مقام سرنہ Cyrene [= کیرنا = قورینا] کے کھنڈروں کے جنوب میں آٹھ سو اڑسٹھ میٹر اونچا ہے۔ ایک درمیانی سطح مرتفع دو سو پچاس سے چار سو میٹر تک بلند ہے، جو شمال میں تنگ ہے اور پھر مغرب اور جنوب مغرب کی سمت کشادہ ہوتی چلی گئی ہے۔ المَرج اسی میں واقع ہے اور بن غازی کا ساحلی میدان، جو خود بھی چوڑے کا ہے، اس کے عین سامنے نظر آتا ہے برقہ کے اپنے وسیع و عریض عقبی علاقے کی طرح صحرا نہیں، جس کی وجہ اس کی بلندی اور سمندر کا اثر ہے۔ گرمیوں میں



حصوں سے منقطع کر دیتے ہیں اور یہ ہمیشہ سے مشرق کے زیرِ نگیں رہا ہے۔ خانہ بدوش لیبائی باشندوں کی یہ سر زمین یونانی دنیا کی واحد ماتحت مملکت بن گئی، جس میں انطابلس (پانچ شہر) (Pentapolis) کی یہ پانچ نوآبادیاں شامل تھیں، جن کی بنیاد ساتویں اور پانچویں صدی قبل مسیح کے درمیان رکھی گئی: (۱) سرنہ [= قورینا]، جو سب سے پہلے وجود میں آئی اور جبل اخضر کے قلب میں ایک موزوں جگہ میں واقع تھی؛ (۲) اس کی بندرگاہ اپولونیا Apollonia (مرساوسا)؛ (۳) برکہ Barké (المرج)؛ (۴) یوہسپریڈیس Euesperidis (بن غازی) اور (۵) تیوچیرہ Teuchira (توکرہ)، جس کا الحاق آگے چل کر بطلمیوسی مصر سے ہو گیا اور اسی زمانے میں Ptolemais (طلمیثہ) اور Darnis (درنہ) وجود میں آئے۔ جن دنوں یہ رومی صوبہ تھا یہاں اکثر فتنہ و فساد اور انتشار رہا اور خوش حالی نام کو نہیں تھی۔ چوتھی صدی عیسوی میں اسے مشرقی [رومی] سلطنت کے ساتھ ملحق کر لیا گیا اور ساتویں صدی تک یہ بوزنطی سلطنت کا حصہ رہا؛ لیکن یونانی دور کی سی خوش حالی اسے کبھی نصیب نہ ہوئی۔ اسلامی فتح سے ذرا پہلے چراگاہی زندگی بڑی تیزی سے زراعتی زندگی کی جگہ لے رہی تھی۔ برقہ پر عربوں نے ۵۲۲ / ۶۴۲ء اور ۵۲۳ / ۶۴۳ء میں حضرت عمرو بن العاصؓ کے زیرِ قیادت دو حملوں کے بعد قبضہ کر لیا۔ بعد کے حملے اس میں سے گزر کر کیے گئے اور بتدریج ”المغرب“ کو فتح کر لیا گیا۔ اس طرح گویا یہ علاقہ جنوبی نشیب اور نخلستانوں، مثلاً اوجہ کی راہ سے یا شمالی سطحات مرتفعہ کے زیادہ چکر والے راستے سے ہو کر مصر سے المغرب کی جانب جانے والی خاص فوجی اور تجارتی شاعرہ بن گیا۔

ڈھلانوں کی بنیادوں کے قریب دوبارہ نکل آتا ہے۔ مرتفع سطحات کی زمین پانی جذب کر لیتی ہے۔ اس میں جگہ جگہ سوراخ اور گڑھے ہیں اور پانی کے نکاس کے لیے نالیاں نہیں ہیں۔ جبل اخضر کی بلند سطح مرتفع میں آج کل بھی المرج اور قورینا کے جنوب میں اقی سرو، سبز شاہ بلوطوں، حلبی صنوبروں اور فینیقی سدا بہار صنوبری جھاڑیوں (junipers) کے کئی عمدہ جنگل ہیں؛ لیکن اس کا زیادہ تر حصہ پستہ قد درختوں، جنگلی زیتون اور مصطکی کی جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا ہے؛ چنانچہ برقہ میں ایک لاکھ دس ہزار ہیکٹر (یس ہزار چار سو اکتھتر ایکڑ) زمین میں جنگل اور جھاڑیاں ہیں۔ کھلے علاقوں میں، جنہیں انسانوں نے اور بڑھا لیا ہے، اچھی چراگاہیں اور بھورے اور سرمئی رنگ کی زرخیز زراعتی زمین موجود ہے۔ یہ بہت ہی مختصر اچھا خطہ ساحل پر اور جنوب کی سمت چھدری جھاڑیوں کے میدان میں تبدیل ہو جاتا ہے، جس میں چند سدا بہار صنوبری جھاڑیاں نمایاں ہیں اور ان کے درمیان بے آب و گیہ میدانوں کے رقبے ہیں، جو رفتہ رفتہ بڑھتے چلے گئے ہیں۔ بڑی بڑی ابھری ہوئی چٹانوں کے درمیان سرخ مٹی کی نسبتاً زرخیز زمینیں ہیں، لیکن چونکہ یہاں بارش بہت کم ہوتی ہے، اس لیے انہیں بہت زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بن غازی سے پچپن کلومیٹر جنوب مشرق اور درنہ سے ساٹھ کلومیٹر جنوب کی جانب صحراے اعظم شروع ہو جاتا ہے، جس میں سبزہ بے حد کم ہے اور جس کی مٹی ہلکی ہے۔

”کارآمد“ برقہ، جو ایک تنگ اور زرخیز علاقہ ہے اور اقامت پذیر زندگی کے لیے مساعد و موزوں ہے۔ اسے مرمیکا Marmarica اور برقہ کے بے آب و گیہ جنگل اور لیبیا کے صحرا دوسرے

بربری قبائل لواتہ، ہوارہ اور اوریخہ عربی عناصر سے گھل مل گئے۔ وہ مویشی رکننے اور پالنے کے کام کی طرف زیادہ متوجہ ہوتے چلے گئے اور زراعت کے بجائے بہ پیشہ زیادہ عام ہونا گیا۔ اس زمانے میں مصر کی جانب برآمد کی خاص اشیا مویشی، اون، شہد اور رال تھیں (البکری، ترجمہ de Slane، ص ۱۰۵)۔ برقہ اس علاقے کا واحد مرکز بن گیا۔ اس خطے کا مصر سے رابطہ ہو جانے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مصر کی طرح یہ بھی علی الترتیب دمشق، بغداد اور پھر فاطمیوں کا دست نگر رہا۔ بنو ہلال اور بنو سلیم، جو پانچویں/گیارہویں صدی میں مصر سے نکلے اور تمام المغرب پر چھا گئے، برقہ کے علاقے سے ہو کر گزرے، جو بتدریج بالکل بدوی بن گیا۔ ابن خلدون کے زمانے میں آٹھویں / چودھویں صدی میں (Histoire، مترجمہ De Slane، ۱۰۵) : ۱۶۴ تا ۱۶۵) اس کے شہر اور قصبے بالکل ویران پڑے تھے اور اس کے باشندے بنو عزہ چرواہے تھے، جو جنوب کے نخلستانوں کے علاقے سے لے کر شمالی سطحات مرتفعہ تک خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے تھے اور جو کی کاشت کرتے تھے؛ لیکن برقہ اور پرنیکا (بن غازی) کا، نیز اوجیلہ اور آجدابیہ کے نخلستانوں کا ذکر آج بھی [کتابوں میں] موجود ہے۔ یہ علاقہ کم از کم نظری طور پر اب بھی مصر کے تابع تھا اور دسویں / سولہویں صدی میں ترکوں نے مصر کی طرح اس پر بھی قبضہ کر لیا؛ تاہم اسے طرابلس کے والیوں کے ماتحت کر دیا گیا جن کا اقتدار حقیقی نہیں، بلکہ برائے نام تھا۔ ان والیوں کو ہٹا کر قرہمانلی خاندان نے ۱۷۱۱ سے ۱۸۳۵ء تک یہاں قبضہ رکھا۔ برقہ غائب ہو گیا اور انیسویں صدی کے شروع میں سرنیکا (ایک یورپی اصطلاح) میں جنوبی نخلستانوں کے علاوہ صرف دو مرکز تھے، جن کا وجود بیرونی آبادکاروں کا

رہین منت تھا، یعنی بن غازی، قدیم یوہسپریڈیس Euphesperidis، جو پندرہویں صدی کے اختتام پر طرابلس کے باشندوں کی درآمد سے وجود میں آیا اور درنہ، جس کی بنیاد لچہ عرصہ پہلے قدیم دارنس Darnis کے محل وقوع پر اندلسیوں نے رکھی تھی اور جو اپنی معمولی سی ترقی کے لیے بے محمد کا مرہون منت ہے جس نے سترہویں صدی میں نظام آب پاشی کی از سر نو تنظیم کی اور اب یہ سمندر کے کنارے کھجوروں کا ایک چھوٹا سا نخلستان بن گیا ہے، جس میں خوبصورت باغات ہیں۔ اندرونی علاقے میں ۱۸۴۰ء میں برقہ کے محل وقوع پر ایک ترکی قلعے کی تعمیر کی بدولت المرج وجود میں آیا، لیکن انیسویں صدی کے نصف آخر میں سرنیکا [= برقہ] عملی طور پر سنوسیہ کی عظیم جماعت کے زیر اقتدار آ گیا۔ سنوسیہ کی حیثیت ایک زبردست سیاسی و مذہبی تنظیم کی تھی جو ایک مضبوط تجارتی نظام کی اساس پر وجود میں آئی تھی۔ آخر کار ۱۸۹۷ء میں یونانی فتح کے بعد جزیرہ اقریطش (Crete) سے بھاگنے والے مسلمانوں نے اپولونیا Apollonia کے کھنڈروں پر مرساوسہ کا چھوٹا سا شہر بسا لیا۔

جب ۱۹۱۱ء میں اطالوی بن غازی اور طرابلس میں داخل ہوئے تو انہوں نے چند معمولی شہری آبادیوں کے علاوہ اس پورے علاقے کو کمالاً بدویوں کا علاقہ پایا، جہاں نخلستانوں سے باہر ایک دوں تک نہیں تھا۔ پوری آبادی نیم خانہ بدوش اور خانہ بدوش چرواہوں اور گلہ بانوں پر مشتمل تھی، جو محض خیموں میں رہتے تھے۔ قبائل دو بڑے گروہوں میں منقسم تھے: مرابطین اور بنو سعادی۔ مرابطون بربری الاصل سمجھے جاتے ہیں اور ان کے دو گروہ ہیں: مغرب کی جانب براغیث، جن کے بڑے قبیلے مغارہ



شہر کی شکل دینے کی غرض سے اسے بہت بڑے پیمانے پر نو آبادی کی پوری ضروریات اور ساز و سامان مہیا کرنا شروع کیا، یعنی بن غازی سے المرج اور سلوک Soluk تک (ایک سو چونسٹھ کیلومیٹر) ریلوے لائن، شمال و جنوب میں پختہ سڑکوں کا پورا جال، بندرگاہیں (بالخصوص بن غازی میں)، ہوائی اڈے، تعلیمی ادارے اور شفاخانے، محکمہ ڈاٹ، پانی کی بہم رسانی کے انتظامات، جن میں دو سو کیلومیٹر کی ایک پائپ لائن بہت نمایاں تھی اور اس سے متعلق پانی لہینچ کر نکالنے کے سٹیشن، پانی کے بڑے بڑے ذخیرے اور جبل اخضر کے دیہات کی آسائش کے لیے ان سے نکلنے والی نالیاں وغیرہ۔ چنانچہ سرنیکا [پہلی] جنگ [عظیم] کے زمانے تک ایک پورا ترقی یافتہ شہر بن چکا تھا۔ لیکن نومبر - دسمبر ۱۹۴۲ء میں آٹھویں برطانوی فوج کی آخری فتح مندانہ پیش قدمی کے وقت تمام اطالوی اس علاقے کو چھوڑ کر چلے گئے اور یہ علاقہ برطانوی فوجی نظم و نسق کے ماتحت چلا گیا۔ اس کے بعد برطانویوں نے سنوسی راہنما ادریس کو سرنیکا کی امارت تفویض کر دی اور ۱۹۵۱ء میں اسے لیبیا کے وفاق (Libyan Federal Union) کا تخت حکومت سنبھالنے میں مدد دی۔ اس وفاق میں سرنیکا کے ساتھ طرابلس اور فزان بھی شامل ہیں۔ اطالویوں نے یہاں جو زرعی اصلاحات کی تھیں ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ ملک پھر اپنی سابقہ چوپانی زندگی کی طرف عود کر آیا ہے اگرچہ کہیں کہیں جو کی تھوڑی بہت کاشت ہوتی ہے۔ دیہات تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ اسی طرح اطالویوں نے بن غازی میں جو چند صنعتی کاروبار (مچھلی لوڈیوں میں بند کرنے کے کارخانے، بیئر beer ساز بھٹیاں، شراب کشید کرنے کے کارخانے، جفت سازی کے کارخانے) جاری

(سرتک - Cyrtic)، عرفہ اور عبید (المرج) ہیں، اور دوسری طرف ہری، جن میں الدرہ (سمندر کے کنارے) الہسہ، عیلت فائض اور براغسہ [برسہ]، (جبل اخضر کے شمال اور جنوب میں) اور بالخصوص اباضیہ (درندہ اور خلیج بمبہ Bombu کے جنوب کے نخلستانوں میں) شامل ہیں۔ جہاں تک سعادی کا تعلق ہے وہ اپنے دو خالص عربی الاصل بتائے ہیں۔ ان میں فواشر Fwāsher اور اواعر، جنوب مغربی بے آب و گیاه جنگلوں میں، مریکا اور علاقہ اوجیلہ جلو کے خانہ بدوشوں کے چھوٹے چھوٹے قبیلے شامل ہیں۔ شہروں کے باہر پوری آبادی مالکی سنیوں کی ہے۔ یہ سب مغربی طرز کی عربی بولیاں بولتے ہیں، جنوب میں اوجیلہ کے باشندوں کے سوا جو مغرب کی سمت جاتے وقت وہ پہلا مقام ہے جہاں بربری زبان بولی جاتی ہے۔

بدوویوں اور سنوسیوں کی جان توڑ مزاحمت کی وجہ سے اطالوی پورے سرنیکا اور اس کے عقبی علاقے پر ۱۹۳۱ء سے پہلے قابض نہیں ہو سکے۔ انہوں نے اسے اپنی نو آبادی بنانے کی انتہائی کوشش کی۔ سب سے پہلے نو آبادکار کسی قدر پر خطر حالات میں، بن غازی کے ناسازگار میدان اور المرج کے قرب و جوار میں آباد ہوئے۔ تاہم اطالویوں نے جبل اخضر کی آباد کاری اور اس سے منفعت گیری کی طرف منظم طریقے پر توجہ مبذول کی اور ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیان وہاں ایک درجن گاؤں تعمیر ہوئے۔ پہلے "نسلی" اور پھر "عام" آباد کاری کے عمل کو اسی ہزار ہیکٹر کے وسیع و عریض علاقے میں جاری کیا گیا، جہاں کی خاص پیداوار شراب اور زیتون کا تیل تھا۔ ۹ جنوری ۱۹۳۱ء کو طرابلس کی طرح یہ بھی مع اپنے عقبی علاقے کے اطالوی مملکت میں شامل کر لیا گیا۔ اب اطالویوں نے سرنیکا کو ایک جدید

: G. Narducci (۴)؛ ۱۹۲۵ء؛ طرابلس، *della Cirenaica*  
 میلان، *Storia della colonizzazione della Cirenaica*  
 The : K. Walton و W. B. Fisher (۵)؛ ۱۹۳۲ء  
*Aberdeen University expedition to Cyrenaica in*  
 19۵1ء، در *Scottish geogr. magazine*، ۱۹۵۲ء تا ۱۹۵۳ء؛  
 (۶) Barka : N. A. Ziadeh، بیروت، ۱۹۵۰ء۔

(J. DESPOIS)

\* برکات : مکہ مکرمہ کے چار شریفوں کا نام :  
 (۱) برکات اول : ابن حسن بن عجلان، قتادہ بن  
 ادریس کی ساتویں پشت میں سے تھا (دیکھیے  
 العرب، جزیرہ، مکہ)۔ یہ شریفوں کے آخری سلسلے  
 کا بانی تھا۔ آغاز جوانی میں برکات، حکومت میں، جس  
 کے کئی عمزاد بھائی دعویدار تھے، اپنے والد  
 (۵۸۰۹/۱۳۰۷ء تا ۵۸۲۱/۱۳۱۸ء) کے ساتھ  
 شریک رہا۔ ۵۸۲۱/۱۳۱۸ء میں باپ بڑھاپے کی  
 وجہ سے تخت سے دست بردار ہو گیا گو وہ ۵۸۲۹ء  
 ۱۳۲۶ء تک زندہ رہا۔ مصر کے مملوک سلطان  
 برسبای کی جانب سے، جس نے مکہ معظمہ پر  
 اعلیٰ اقتدار قائم کر لیا تھا، اپنی مسند نشینی  
 کی تصدیق کے بعد برکات نے اپنے بھائیوں کی  
 مخالفت کے باوجود ۵۸۴۵/۱۳۴۲ء تک حکومت  
 کی۔ ۵۸۴۵/۱۳۴۲ء میں خاندان کے دوسرے  
 لوگوں نے اسے تخت سے اتار دیا، لیکن اپنی عمر کے  
 آخری برسوں میں (۵۸۵۱/۱۳۴۷ء تا ۵۸۵۹/۱۳۵۷ء-  
 ۱۳۵۵ء) برکات پھر بر سر حکومت ہو گیا۔ برکات  
 کے عہد میں مملوک سلطان جقمق نے مقدس شہروں  
 کے لیے ایک ناظر مقرر کیا اور مکہ مکرمہ میں  
 پچاس سواروں کا ایک محافظ دستہ متعین کیا۔  
 بحر احمر میں جوں جوں مصری اقتدار بڑھتا گیا  
 ہندوستان سے تجارت اور ہندوستان سے آنے والے  
 زائرین حج کی تعداد میں بھی نمایاں اضافہ  
 ہوتا گیا۔ برکات ۵۸۵۱/۱۳۴۷ء میں مصر بھی

تھے ان کے بھی کچھ آثار باقی نہیں رہے۔  
 برآمد کی چیزوں میں اب صرف وہ چیزیں جو  
 سویشیوں کی پرورش سے حاصل ہوتی ہیں اور نمک  
 اور اسفنج (sponge) شامل ہیں، جنہیں یونانی  
 خلیج بمبہ Bomba اور سرتس Syrtis کلاں میں تیار  
 کرتے ہیں۔ سرنیکا، جو اپنے وسیع و عریض  
 صحرائی عقبی علاقے کی وجہ سے خاصا طول طویل  
 ہو گیا ہے، ۲۰ درجہ عرض بلد تک چلا گیا ہے۔  
 اور کفرہ کے نخلستان بھی اس میں شامل ہیں۔  
 اس کا مجموعی رقبہ آٹھ لاکھ پچپن ہزار چار سو  
 نیلو میٹر ہے (تمام لیبیا کے وفاق کا مجموعی رقبہ  
 سترہ لاکھ انسٹھ ہزار پانچ سو نیلو میٹر ہے)۔ گو  
 اس کی آبادی صرف دو لاکھ اکانوے ہزار تین سو  
 پچاس ہے، جو تقریباً ساری کی ساری شمال میں ہے  
 (وفاق کی مجموعی آبادی دس لاکھ اکانوے ہزار آٹھ  
 سو ہے)۔ اس کی اوسط سالانہ پیداوار تین لاکھ ساٹھ  
 ہزار کوانٹل quintals [= ایک ہنڈروٹ یا ایک سو  
 بارہ ہونڈ] غلہ (جوار اور گندم) ہے، اور یہاں  
 ساڑھے چار لاکھ سے پانچ لاکھ تک بھیڑیں، تین  
 لاکھ پچاس ہزار سے لے کر چار لاکھ تک بکریاں،  
 تیس ہزار سے پینتیس ہزار تک سویشی (گائے وغیرہ)  
 اور بیس ہزار اونٹ موجود ہیں۔ آبادی گنجان  
 نہیں اور شمال کے بعض علاقوں کے زرخیز ہونے  
 کے باوجود بہت کم ہے، مالی وسائل ناقص اور  
 نظم و نسق کا عملہ ناکافی ہے، اور اسی وجہ  
 سے سرنیکا اقتصادی اور فنی امداد کے لیے اقوام  
 متحدہ، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور دیگر طاقتوں  
 کا دست نگر ہے۔

مآخذ : رک بہ لیبیا، نیز : (۱) F. Chamoux

*Cyrène sous la monarchie des Battiades*، پیرس

۱۹۵۲ء؛ (۲) P. Romanelli : *La Cirenaica romana*

روم ۱۹۳۳ء؛ (۳) E. de Agostini : *Le popolazioni*



کیا تھا۔ اس کا بیٹا محمد اس کا جانشین ہوا (عہد حکومت ۵۸۵۹/۱۳۵۵ء تا ۵۹۰۳/۱۳۹۷ء)۔

(۲) برکات ثانی: ابن محمد، برکات اول کا پوتا، جو ۵۸۷۸/۱۳۷۳ء تا ۵۹۰۳/۱۳۹۷ء کے دوران میں اپنے والد کے ساتھ شریک سلطنت رہا۔ ۵۹۰۳ کے بعد سے وہ اپنے بھائیوں عزاع اور احمد جازان سے لڑائیاں لڑتا رہا۔ ۵۹۰۸/۱۵۰۳ء میں برکات نو پابزنجیر نر کے مصر بھیج دیا گیا اور یوں اس کے ایک اور بھائی حمیضہ کے لیے شریف بننے کا راستہ ہموار ہو گیا۔ ۵۹۱۰/۱۵۰۴ء میں اسے بحال کر دیا گیا اور پھر وہ تاحیات یعنی ۵۹۳۱/۱۵۲۵ء تک مکہ مکرمہ کا شریف رہا۔ ۵۹۱۰/۱۵۰۴ء تا ۵۹۱۸/۱۵۱۲ء کے دوران میں اس کا بھائی قایتبای حکومت کے کام میں اس کے ساتھ شریک رہا اور اس کے بعد اس کا نوجوان بیٹا محمد ابو نومی ثانی۔ پرتگیزیوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے نئے خطرے کے باعث مملوک سلطان قانصوہ الغوری نے حسین الکردی کو فوج دے کر جدے کی حفاظت کے لیے روانہ کیا۔ حسین الکردی نے جدے کے گرد فصیل اور برج بنا دیے۔ قاہرہ میں سلطان سلیم باووز [اول] کے داخلے کے وقت ۵۹۲۳/۱۵۱۷ء میں برکات نے ابو نومی کو (تقریباً بارہ سال کی عمر میں) اس کی خدمت میں بھیجا اور عثمانی فاتح نے مکے کی موجودہ حیثیت کی تصدیق کر دی۔ اسی وجہ سے سلطان سلیم نے اس موقع پر حج بیت اللہ کا شرف حاصل نہ دیا، حالانکہ پہلا ترکی محل ۵۹۲۳ء میں مکے بھیجا گیا اور اسی سال اہل مکہ کے لیے گندم کی پہلی ٹھیس سویز کے راستے سے جدہ بھیجی گئی۔ برکات کے بعد ابو نومی مسند نشین ہوا (دور حکومت ۵۹۳۱/۱۵۲۵ء تا ۵۹۷۳/۱۵۶۶ء) اور بعد میں آنے والے تمام شریف اسی کی اولاد سے تھے۔

گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی

عیسوی کے نصف اول سے لے کر چودھویں صدی ہجری / بیسویں صدی عیسوی تک ابو نومی ثانی کی اولاد میں سے تین نئے منصب شرافت کے لیے آپس میں لڑتے رہے: ذوو زید، ذوو عبداللہ اور ذوو برکات۔ ذوو برکات کا نام ابو نومی کے بیٹے برکات کے نام پر پڑا جسے بھی منصب شرافت نہیں ملا۔

(۳) برکات ثالث: ابن محمد ابراہیم ذوو برکات کے مورث اعلیٰ کا پرپوتا اس نئے کا پہلا شخص تھا جس نے ۵۱۰۸۲/۱۶۷۱-۱۶۷۲ء میں منصب شرافت کا اعزاز حاصل کیا۔ اسے مسند نشین کرانے کا کام شمالی افریقہ کے محمد بن سلیمان الرودانی نے انجام دیا تھا، جو ذوو زید کا دشمن اور عثمانی وزیر اعظم احمد نوپرولو کا بے تکلف دوست تھا۔ برکات کی حکومت کے ابتدائی زمانے میں محمد ابن سلیمان نے متعدد اہم اصلاحات دیں، جن کا مقصد یہ تھا کہ قدیم امرا کے طبقوں کے مقابلے میں بیرونی عناصر اور غریبوں کی حالت کو بہتر بنایا جائے۔ ۵۱۰۸۷/۱۶۷۶ء میں نوپرولو کی وفات سے اس مصلح کا ستارہ اقبال زوال پذیر ہو گیا۔ برکات ۵۱۰۹۳/۱۶۸۲ء میں اپنی وفات تک 'شرافت' کے منصب پر قائم رہا۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا سعید اس کا جانشین ہوا (دور حکومت ۵۱۰۹۳/۱۶۸۲ء تا ۵۱۰۹۵/۱۶۸۴ء)۔

(۴) برکات رابع: ابن یحییٰ، برکات ثالث کا پوتا، جس نے دو مہینے سے بھی کم مدت (۱۱۳۵ تا ۵۱۱۳۶/۱۷۲۳ء) حکومت کی۔ اپنے باپ کی حکومت سے دست برداری کے بعد ذوو زید نے اسے شکست دی اور اس کے بعد وہ اور اس کا باپ بھاگ کر مصر چلے گئے۔

خاندان ذوو برکات کا آخری شرف عبداللہ بن حسین تھا، جو برکات رابع کا بھتیجا تھا۔ اس کا دور حکومت بھی اتنا ہی مختصر تھا جتنا اس کے چچا

اور عالم روحانی میں فلاح اور خوشی میسر ہوتی ہے۔  
[جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے] متن قرآن  
(تلاہ اللہ) برکت سے پر ہے۔ اللہ عز و جل اپنی برکت  
اپنے انبیاء اور اولیاء کی شخصیتوں میں ودیعت  
دیتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ  
کی آل نو برکت و حصہ وافر ملا ہے [ہم درود میں  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مزید رحمت  
و برکت کی دعا کرتے ہیں]۔ مقدس ہستیاں  
اپنی برکات کے اثرات کو معمولی انسان کے  
اندر منتقل کر سکتی ہیں۔ منتقل کرنے کے ذرائع  
متنوع ہیں بلکہ بعض اوقات حیرت انگیز بھی۔

زراعت پیشہ لوگوں میں برکت غلہ اور اناج  
میں نمودار ہوتی ہے اور اسے مافوق العادة لہی  
گنا بڑھا دیتی ہے۔ برکت کا استعمال جاہجا مختلف  
انبیاء کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں  
درخت زیتون [۲۴] [التور]: ۳۵] کو اور رمضان کی  
[ایک رات دو جو بعض کے نزدیک] ستائیسویں  
ہے [۲۴] [الدخان]: ۳] مبارک کہا گیا ہے۔  
[اس طرح اللہ تعالیٰ کے متعلق بھی یہ لفظ بولا گیا  
ہے قَبَارَتِ اللّٰہِ] [۱۷] [الاعراف]: ۵۴؛ ۲۳ [المؤمنون]  
: ۱۴]؛ اور بیت اللہ، قرآن مجید اور وادی سینا  
کو بھی مبارک کہا گیا ہے [۳] [آل عمران]:  
۹۶؛ ۶ [الانعام]: ۹۲؛ ۲۸ [التقصص]: ۳۰]۔

عام بول چال میں آخر کار برکت کے معنی  
"مناسب مقدار" کے لیے جانے لگے مثلاً یہ  
نہیں گے: "ما فیہ برکت"۔ وہ مقدار جو خوش آئند  
طور پر کافی و مناسب ہو۔ الموحدون کی اصطلاح  
میں اس کے معنی "گریجویٹی" سپاہی کی تنخواہ  
پر زائد انعام کے لیے جاتے ہیں۔ المغرب کی بولیوں  
میں یہ لفظ "کافی" کے مفہوم میں بطور صفت استعمال  
ہوتا ہے۔

مادہ ب ر ک کے مشتقات بہت سے اچھے

کا۔ سپاہ سالار محمد ابو ذہب نے، جسے مصر کے  
علی بن [رک بان] نے حجاز بھیجا تھا، عبداللہ نو  
۱۱۸۳ھ / ۱۷۷۰ء میں حکومت تفویض کی، لیکن  
اس میں اتنی قوت نہیں تھی کہ ابو ذہب کے  
چلے جانے کے بعد اپنا اقتدار قائم رکھ سکے۔ اس  
وقت سے لے کر شریف مکہ کا منصب خالصتاً ذوو زید  
اور بعد میں ذوو عبداللہ کی ملکیت بن گیا۔

مآخذ: (۱) Die Chroniken der Stadt Mekka

طبع F. Wüstenfeld، گوٹنکن ۱۸۵۷ تا ۱۸۶۱ء؛  
(۲) احمد بن زینی دحلان: خلاصۃ الکلام، قاہرہ ۱۳۰۵ھ؛  
(۳) احمد السباعی: تاریخ مکہ، قاہرہ ۱۳۷۲ھ؛ (۴)  
Mekka: C. Snouck Hurgronje، ہیگ ۱۸۸۸ تا  
۱۸۸۹ء۔

(G. RENTZ)

\* بَرَكَة: [برکت کا لفظ ر ک مادے سے ہے۔  
بَرَكَ البَعِيرُ کے معنی ہیں اونٹ بیٹھ گیا اور اس  
جگہ پر جما رہا (لسان العرب، بذیل مادہ)،  
اس وجہ سے لزوم و ثبات کے معنی کے اظہار کے لیے  
برکت کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اہل لغت نے نمو اور  
بڑھنا بھی برکت کے معنی لکھے ہیں۔ المفردات میں  
ہے: البرکت ثبوت الخیر الالہی فی الشیء، یعنی کسی  
چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر کا مضبوطی سے  
قائم ہو جانا۔ اور جس میں ایسی بھلائیاں جمع ہوں  
وہ مبارک ہے، مبارک کے معنی صاحب لسان العرب  
نے یہ دیے ہیں: "جس کی طرف خیر نثر آتی رہے"۔  
اور ابن عباسؓ سے برکت کے معنی "الکثرة فی نل  
خیر" مروی ہیں یعنی ہر بھلائی میں ثمرت۔ [قرآن  
مجدید میں یہ لفظ صرف بصورت جمع 'برکات'  
مستعمل ہوا ہے۔ برکات، رحمت اور سلام کی طرح  
انسان پر اللہ عز و جل کی طرف سے نازل ہوتی ہیں۔  
یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آنے والی وہ بھلائیاں  
جس سے عالم جسمانی میں چیز کی بہتات ہوتی ہے



سے منقطع ہو جائے۔ ربرک نے اس کے قبولِ اسلام کا تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اپنے اردو میں لحم خنزیر کھانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس کے اسلام لانے کی تاریخ معلوم نہیں۔ جوزجانی کا یہ بیان بہ مشکل ہی قابلِ یقین معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی سے اس کی تربیت بطور مسلمان کے ہوئی تھی۔ دوسری طرف بظاہر مونگکے کی خان کی حیثیت سے تخت نشینی سے قبل وہ مسلمان ہو چکا تھا، کیونکہ بقول جوینی اس موقع پر خیافت کے لیے جو جانور مہیا کیے گئے تھے وہ اس کی خاطر اسلامی شعار کے مطابق ذبح کیے گئے تھے۔

جوینی کے قول کے مطابق باتو [خان] کا انتقال اس رت ہوا جب اس کا بیٹا سرتاق خان اعظم کے دربار کو جاتے ہوئے راہ میں تھا۔ سرتاق نے اپنا سفر جاری رکھا اور مونگکے نے اسے اس کے باپ کا جانشین نامزد کیا، لیکن وہ خود تھوڑے ہی عرصے بعد فوت ہو گیا۔ اس کی جگہ ایک نوعمر شہزادہ الّغ چی [= اولاغچی] تخت پر بیٹھا، جو اس کا بیٹا یا بھائی تھا اور باتو کی بیوہ براق چین اتالیق ریاست مقرر ہوئی۔ روسی وقائع کی رو سے ایک مدت یعنی ۱۲۵۷ء تک روسی شہزادے الّوجی (Ulavcii) کے لشکرگاہ میں آتے رہے۔ اس نوعمر خان کی وفات کے بعد ہی، جو غالباً اسی سال واقع ہوئی، برکہ تخت نشین ہو سکا۔

معلوم ہوتا ہے کہ باتو خان کی طرح برکہ کو بھی اپنے عہدِ حکومت کے ابتدائی برسوں میں ساوراء النہر پر بعض حقوق نیادت حاصل تھے۔ بقول جوزجانی وہ بخارا بھی گیا تھا، جہاں اس نے علمائے شہر کی بہت تعظیم و توقیر کی؛ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے سمرقند کے عیسائیوں کو اپنے مسلمان ہم وطنوں سے بد سلوکی کرنے کی پاداش میں سزادینے اور ان کے گرجاؤں کو منہدم کرنے

مواقع پر استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ادائے شکر، تعجبات یا تحسین کے موقع پر زائج محاورات میں ان کے ساتھ س ع د کے مشقات کا استعمال بھی اکثر ملتا ہے۔ آیت "تَبْرُکَ الَّذِیْ بَیْدَہِ الْمَلْکَ... آایة" (۶۷ [الملک]: ۲) نظر بد سے بچانے کے لیے عام طور پر پڑھی جاتی ہے۔

مآخذ: (۱) [لسان: بذیل مادہ: (۳) تاج العروس، بذیل مادہ: (۳) المفردات، بذیل مادہ: (۴) Wellhausen: E. Wester- (۵) ۱۳۹: ۲, Reste arab. Heidentums: Ritual and Belief in Morocco: marck Genou, famille, force dans le domaine: M. Cohen (۶) chamito-sémitique, در Mémorial Henri Basset, پیرس ۱۹۲۸ء، ۲۰۳: ۱، La Baraka: J. Chelhod (۷) ۱۹۵۰ء، RHR، ۴۱۹۵۰، (۸) (۸) ، ترکی، بذیل مادہ برکت (از Kasim Kufra)۔

G. S. COLIN و [ادارہ]

برکہ [خان]: ایک مغول شہزادہ، آلتون اردو (اردوے مطلقاً Golden Horde) کا فرمانروا، چنگیزخان کا پوتا اور جوچی کا تیسرا بیٹا۔ اس کی ابتدائی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ اس نے ان جنگوں میں کوئی حصہ نہ لیا جو ۱۲۳۷ء تا ۱۲۳۹ء/۱۲۴۲ء میں روس اور مشرقی یورپ میں لڑی گئی تھیں لیکن باتو [خان، رک بان] کی بہ نسبت اس کی آمد و رفت منگولیا میں زیادہ رہی، جہاں اس نے گویوک [= گویوک] (۱۲۳۶ء/۱۲۳۷ء) اور مونگکے [= منکو] (۱۲۵۱ء/۱۲۴۹ء) کی تخت نشینی کی تقریبوں پر باتو کی نمائندگی کے فرائض سرانجام دیے۔ ربرک Rubruck کے قول کے مطابق اس کی جاگیر کا یرت (= خیمہ گاہ) شروع شروع میں ڈربند کی طرف واقع تھا۔ لیکن ۱۲۵۵ء/۱۲۵۳ء سے پہلے باتو کے حکم سے اسے والکا کے مشرق میں منتقل کر دیا گیا تاکہ برکہ کا رابطہ اپنے ہم مذہب مسلمانوں

نے، جو آریغ بوکہ کی زیر قیادت لڑ چکا تھا، آریغ بوکہ کی شکست کے بعد بھی آلو کے خلاف لڑائی جاری رکھی اور پرکہ اسے مدد دیتا رہا۔

مغرب میں لتھونیا Lithuania والوں اور گلیشیا کے بادشاہ ڈینیل Daniel کے خلاف مہمات کچھ زیادہ اہم نہ تھیں اور پرکہ کی ذاتی مداخلت کے بغیر سرحدی سپہ سالار ہی انہیں چلاتے رہے۔ شاہ ڈینیل پولینڈ اور ہنگری کی سمت بھاگ گیا اور اس کے بیٹے اور بھائی کو مجبوراً اپنے تمام بڑے بڑے شہروں کے استحکامات منہدم کرنے پڑے۔

پرکہ اور اس کے عم زاد بھائی ہلاگو فاتح ایران کے درمیان جنگ زیادہ اہم تھی اور اس میں پرکہ کو ایسی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس جنگ کے اسباب مختلف طریقے پر بیان کیے گئے ہیں۔ بعض مؤرخین نے پرکہ کو ایک حامی اسلام کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ اس نے ہلاگو کو متعدد اسلامی ممالک کی تباہی اور بالخصوص خلیفہ المستعصم کے قتل پر سخت ملامت کی تھی۔ تاہم ان مؤرخین کا بیان غالباً زیادہ قرین صواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ایران میں ایک نئی مغول سلطنت کے قیام سے جوچی کے وارثوں کو اپنے حقوق معرض خطر میں نظر آنے لگے تھے۔ اراں اور آذربيجان جیسے بعض علاقے، جو اس نئی سلطنت میں شامل کیے گئے، قبل ازین چنگیز خان کے عہد میں پامال ہو چکے تھے اور اس لیے فاتح کی ہدایت کے بموجب جوچی کی ریاست کا حصہ تھے۔ خود جنگ کے بارے میں متضاد شہادتیں ملتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ہلاگو کو فتح ہوئی اور وہ پیش قدمی کرتا ہوا (۱۲۶۲ء کے اواخر میں) تیرک ندی کو عبور کر گیا اور پھر اسے پرکہ کی فوجوں نے شکست دی (اس وقت پرکہ بذات خود وہاں موجود نہ تھا) اور پسپا ہوتے وقت

کا حکم دیا تھا۔ جب مونگکے کی وفات کی خبر پہنچی (۱۲۵۹ء) تو نہ صرف ماوراءالنہر بلکہ خراسان میں بھی پرکہ کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اگلے چار برس (۱۲۶۰ تا ۱۲۶۳ء) کے دوران میں مرجوم خان اعظم کے دو بھائیوں قبلائی اور آریغ بوکہ کے درمیان تخت کے لیے جنگ جاری رہی، جیسا کہ ان سکوں سے جو بلغار میں ضرب ہوئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے پرکہ نے ناکام مدعی حکومت آریغ بوکہ کو جائز وارث تسلیم کر لیا تھا۔ تقریباً اسی زمانے میں چغتائی کا ایک پوتا شہزادہ آلو وسط ایشیا میں نمودار ہوا، وہ پہلے تو آریغ بوکہ کے نمائندے کے طور پر آیا لیکن پھر کھلم کھلا اس کے خلاف باغی ہو گیا۔ وہ نہ صرف اپنے دادا کی پوری جاگیر کو زیر نگین کرنے میں کامیاب ہو گیا بلکہ خوارزم پر بھی قابض ہو گیا جو ہمیشہ سے جوچی اور اس کے جانشینوں کی حکومت میں شامل رہا تھا، پرکہ کے مقرر کردہ عمال اور اہلکار شہروں سے نکال باہر کیے گئے۔ وصال (مطبوعہ بمبئی، ص ۵۱) نے بخارا میں پرکہ کی فوج کے پانچ ہزار نفوس پر مشتمل ایک دستہ فوج کے قتل عام کا ذکر کیا ہے۔ یہ قتل عام نہ تو وصال کے خیال کے مطابق قبلائی کے اور نہ جیسا کہ d'Ohsson کا گمان ہے، ہلاگو کے، بلکہ ضرور آلو کے ہاتھوں ہوا ہوگا۔ پرکہ اور آلو کے درمیان جنگ مؤخر الذکر کی موت تک جاری رہی۔ اس کی زندگی کے آخری برسوں میں اس کی فوج نے آریغ بوکہ کو حتمی طور پر شکست دینے کے بعد شہر اطرار [= اترار] پر قبضہ کرنے کے بعد اسے برباد کر دیا تھا۔ پرکہ کی فوجیں جنوب اور مغرب میں مصروف پیکار تھیں، اس لیے وہ مشرق میں اپنے دشمنوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کر سکا لیکن وہ اپنے دعاوی سے دست بردار نہیں ہوا؛ اوگدای کے ایک پوتے شہزادہ قیدو



چھوڑی، چنانچہ تخت سلطنت باتو کے پوتے مونگکے تیمور کو مل گیا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں مغول سلطنت میں باتو کی طرح اس کی حیثیت خان اعظم کے ماتحت کی سی نہیں رہی تھی، بلکہ وہ ایک خود مختار سلطنت کا فرمانروا بن گیا تھا، اگرچہ یہ ارتقا اس کے جانشین کے عہد میں جا کر مکمل ہو سکا، جس نے خوانین قیچاق میں سب سے پہلے اپنے نام کا سکہ جاری کیا۔ اس بات کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے برکہ نے اپنی رعایا میں دین اسلام کے فروغ کے لیے کیا کام کیا، مصری بیانات میں ایسے مدارس قائم کرنے کا ذکر آتا ہے جہاں بچوں کو قرآن مجید کی تعلیم دی جاتی تھی؛ صرف خان ہی نہیں بلکہ اس کی ہریوی اور امیر کے وابستگان میں ایک امام اور ایک مؤذن شامل ہوتا تھا۔ نہ صرف خود برکہ بلکہ کہا جاتا ہے کہ اس کے کئی بھائی بھی مسلمان ہو گئے تھے؛ اس کے باوجود اس کی وفات کو جب نصف صدی گزر گئی تب کہیں جا کر اس کی سلطنت میں اسلام کو قطعی غلبہ حاصل ہو سکا۔

برکہ شہر ینی سرامے (یہ نام اسے باتو کے بنا کردہ سرامے نامی شہر سے ممیز کرنے کے لیے دیا گیا تھا) کا بانی تھا، جو بالائی آختیہ کے مشرقی کنارے پر موجودہ لینسک Leninsk کے قریب سٹالن گراڈ Stalingrad سے تقریباً تیس میل مشرق میں واقع تھا۔

مآخذ: وہی جو مادہ باتو میں درج ہیں۔

(J. A. BOYLE و W. BARTHOLD)

⊗ برکہ ہارٹ: (J. L. Burckhardt) نامور مستشرق

اور سیاح، سوئٹزرلینڈ کے مشہور شہر لوزان Lausanne کے قریب کرخگارٹن Kirchgarten کے گاؤں میں ۲۴ نومبر ۱۷۸۴ء کو پیدا ہوا۔ لائپزگ اور گوٹنگن (جرمنی) میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ

ہلاگو کے لشکر کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو گیا، ترک کو عبور کرتے ہوئے بہت سے لوگ ڈوب گئے کیونکہ [سطح دریا پر منجمد] برف ان کے گھوڑوں کے سموں کی متحمل نہ ہوئی اور ٹوٹ گئی۔ ان جنگوں کے آغاز سے بھی قبل مصر کے سلطان یبرس [رک باں] نے برکہ سے مراسلت کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تا کہ اپنے مشترک دشمن ہلاگو کے خلاف اتحاد قائم کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں ایک پیغام ۱۲۶۱ء ہی میں قاہرہ سے برکہ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ ۱۶ نومبر ۱۲۶۲ء کو ایک سفارت بھی اسی مقصد کے لیے روانہ ہوئی۔ اگلے سال برکہ کے سفیروں کا یبرس نے خیر مقدم کیا۔ قسطنطنیہ میں مغول اور مصری سفرا کے روک لیے جانے کے باعث بوزنطی حکومت اور آلتون آردو (Golden Hordes) کے درمیان لڑائی چھڑ گئی۔ برکہ نے شہزادہ نوقای کے زیر قیادت ایک لشکر تھریس Thrac میں بھیجا، جہاں یہ بلغاریوں کی افواج سے مل گیا، اور سلجوقی سلطان عزالدین کیکاؤس کو، جسے ایشیائے کوچک سے نکال کر بحیرہ ایجین کے کنارے قلعہ اینوس Ainos میں قید کر دیا گیا تھا، رہا کر کے کریمیا لایا گیا۔

۱۲۶۵ء میں، جو ہلاگو کا سال وفات تھا، قیچاق اور ایرانی مغول ایک بار پھر برسر پیکار ہو گئے برکہ اور آباقا کی سپہ سالاری میں دونوں فوجیں ملت تک دریائے گر کے آر پار ایک دوسرے کے مقابل صف آرا رہیں۔ دریا عبور کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے کی غرض سے برکہ دریا کے اوپر کے رخ چلتا ہوا تفلیس تک جا پہنچا، جہاں (۱۲۶۶ء میں) اس کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد فوجیں واپس ہو گئیں۔

برکہ نے اپنے پیچھے کوئی اولاد نہیں

تین سو پچاس مجلّات کی شکل میں کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں بذیل شمارہ عمومی Q9 محفوظ ہیں۔ اس کی مندرجہ ذیل تالیفات چھپ چکی ہیں:

- ۱۔ مجموعة من الامثال العربية (مع انگریزی ترجمہ)، ۱۸۳۰ء؛ ۲۔ *Travels in Nubia* (۱۸۱۹ء)؛
- ۳۔ *Travels in Syria & the Holy Lands*، ۱۸۲۲ء؛
- ۴۔ *Travels in Arabia*، ۱۸۲۹ء؛ ۵۔ *Notes on Bedouins & Wahabys*، ۱۸۳۰ء۔

مآخذ: (۱) براؤن: *Handlist of Muhammadan MSS.*، ۱۹۰۰ء، ص ۱۷۵، ۳۳۲ تا ۳۳۵، ۳۷۳ تا ۳۸۰؛ (۲) شیخو: الآداب العربية، ۱۹۰۸ء، ۱: ۱۱؛ (۳) سرکیس: معجم المطبوعات، عمود ۶۰۱؛ (۴) نجیب العقیقی: المستشرقون، ۱۹۴۷ء، ۸۶ تا ۸۷؛ (۵) جواد علی: تاریخ العرب قبل الاسلام، ۱: ۷۵؛ (۶) براکلیمان، بامداد اشاریہ؛ (۷) الزرکلی: الأعلام، بذیل مادہ یوہن؛ (۸) انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا، لندن ۱۸۷۵ء، ۴: ۵۳۱؛ (۹) انسائیکلوپیڈیا امریکانا، ۱۹۶۰ء، ۵: ۳۳ تا ۳۴؛ (۱۰) *Revue d'Egypte*، ۱: ۳۳؛ (۱۱) H. Schwabe-Burckhardt و C. Burckhardt-Sarasin: *Scheikh Ibrahim*، ۱۹۰۶ء۔

(رانا احسان الہی)

برکی: ایک خاندان یا قبیلہ، جس کے افراد اس وقت جالندھر (بھارت) اور پاکستان کے بعض مقامات میں آباد ہیں۔

برکی، افغانستان کی وادی لوہگڑھ (Loghar) میں، جو کابل سے تیس میل جنوب کی طرف ہے، آباد ہیں۔ یہ لوگ یوں تو افغانستان کے متعدد دیات میں موجود ہیں لیکن ان کی بڑی جمعیت برک برکیاں اور برکی راجن میں رہتی ہے۔ الفنسٹن Mounstuart Elphinstone نے ان کے کنبوں کی تعداد آٹھ ہزار بتائی ہے (*An Account*)

سے واقفیت حاصل کی۔ بائیس سال کی عمر میں اس نے شمالی افریقہ کے استکشاف کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ چنانچہ بلومن باخ J. F. Blumenbach کی سفارش پر اسے لندن کی افریقن ایسوسی ایشن اور رائل سوسائٹی کے صدر سر جوزف بینکس Sir Joseph Banks نے اپنے پاس بلا لیا۔ تین سال لندن اور کیمبرج میں مزید تعلیم حاصل کر کے وہ ۱۸۰۹ء میں مالٹا کے راستے حلب (شام) روانہ ہو گیا، جہاں دو سال کے قیام میں اس نے ترکی زبان سیکھنے کے علاوہ اپنے عربی لہجے کو صاف کیا اور قرآن کریم کے مطالب اور فقہ اسلامی میں خاص دسترس پیدا کر لی۔ پھر شیخ ابراہیم بن عبداللہ اللوزانی کا نام اختیار کر کے تدمیر، دمشق اور بعلبک سے ہوتا ہوا ۱۸۱۲ء میں وہ مصر پہنچا تاکہ اپنی اصل مہم یعنی دریائے نائجر Niger کے صحرائی منبع تک پہنچنے کا اہتمام کر سکے۔ مگر اسے فزان (طرابلس الغرب) کو جانے والا کاروان میسر نہ آیا۔ اس نے اس فرصت میں ایک مفلوک الحال شامی سوداگر کے بھیس میں دریائے نیل کے ساتھ ساتھ اسوان تک سفر کیا اور نوبہ کی واحد بندرگاہ سواکن پہنچ کر بحیرہ قلزم پار کیا اور جزیرہ عرب میں داخل ہو گیا۔ اس نے ۱۲۲۹ھ / نومبر ۱۸۱۴ء میں حج کیا۔ دو تین ماہ مکہ مکرمہ میں گزارے۔ پھر مدینہ منورہ کی زیارت کرتے ہوئے وہ جون ۱۸۱۵ء میں قاہرہ پہنچ گیا۔ اگلے سال جبل سیناء کی سیاحت کر کے پھر جون ۱۸۱۶ء میں قاہرہ واپس آ گیا اور پھر فزان کے سفر کی تیاری میں لگ گیا۔ مگر اپریل ۱۸۱۶ء میں وہ بیمار پڑا اور ذوالحجہ ۱۲۳۲ھ / اکتوبر ۱۸۱۷ء کو نوجوانی کے عالم میں مر گیا۔ قاہرہ میں اس کی قبر موجود ہے۔

برکھارٹ کے مقالوں، رسالچوں اور مختلف النوع مجموعوں کی تعداد آٹھ سو تک ہے، جو تقریباً



ہوتی ہے تو اس غرض کے لیے لوہگڑھ رجمنٹ ہی کو متعین کیا جاتا ہے (The Indian Borderland 1880-1900، ص ۴۱)۔ الفنسٹن (کتاب مذکور، باب ۱۲) نے لکھا ہے کہ برکی تاجیک نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو دوسرے تاجیک قبائل سے اس لحاظ سے مختلف ہیں کہ ان کے اپنے الگ قبیلے اور سردار ہیں۔ روایات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ برکیوں کو سلطان محمود غزنوی نے گیارہویں صدی عیسوی میں اس علاقے میں آباد کیا تھا۔ یہاں یہ وسیع علاقے کے مالک ہیں۔ لیکن ان کے نسب و نژاد کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہی جا سکتی۔ وہ خود عربی النسل ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، لیکن بعض وقائع نگاروں کے نزدیک ان کے آبا گورد تھے۔ گورد نسل سے تعلق رکھنے کا ثبوت ان کی زبان سے بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان ارمری ہے جو مشرقی ایران کی ایک مستقل زبان ہے، محض ایک بولی نہیں (Olaf Caroe: کتاب مذکور، ص ۲۳)۔ افغانستان میں ایسی زبان کی ترویج کا ذکر پہلی بار شاہنشاہ بابر نے اپنی توڑک میں کیا ہے، جس کا ترجمہ مسز بیورج نے بابر نامہ کے نام سے ۱۹۲۱ء میں شائع کرایا تھا۔ اس میں بابر نے ”برکی“ زبان کو کابل میں بولی جانے والی گیارہ زبانوں میں شمار کیا ہے۔ مصنف نے یہ بھی لکھا ہے (بابر نامہ، مترجمہ مسز بیورج، ص ۲۲۵ حاشیہ) کہ ”برکی“ یا ”برکی“ (زبان) کو عام طور پر ”ارمری“ کہا جاتا ہے، اگرچہ اس زبان کے بولنے والے اسے ”بریگستہ“ کہتے ہیں۔ یہ وزیرستان کے قصبہ کانی گرام کے لوگوں کی زبان ہے۔ اس کا نام برک کی مناسبت سے برکی ہوا، جو وادی لوہگڑھ میں واقع ہے اور جہاں برکی آباد ہیں۔ یہ زبان ایرانی ہے اور گوردی زبان سے ملتی جلتی ہے۔ ہشتو، کوچی سے اس کا کوئی

of the Kingdom of Caubul، ج ۱، باب ۱۲)۔ وزیرستان کے علاقہ کانی گرام میں بھی یہ خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ اولف نیرو (Olaf Caroe نے ۱۹۵۰ء میں ان کے نسبوں کی تعداد تین ہزار بتائی ہے۔ کابل کے نواحی ڈوں برکی چکری، گردی کچ، کماری اور کابل کے محلہ فرمل میں بھی برکی آباد ہیں۔ بقول محمد حسین خان (A Few Phases of the Afghans in Jullunder Basties، ص ۲۰۱) کچھ برکی بتخاک، گردیز اور غزنی میں بھی آباد ہیں۔ ان کے علاوہ پشاور سے تقریباً دس میل مشرقی جانب امربالا، امر میانہ اور امر پایان میں برکی آباد ہیں، جو اب دوسرے قبائل میں مل جاتے ہیں (The Pathans، ص ۲۳)۔ یہ اپنے آپ کو ”برکی“ کہتے ہیں، لیکن بعض ان میں سے ”ارمر“ بھی کہلاتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ برکی اور ارمر رفتہ رفتہ ایک ہی قومیت کے مترادف نام ہو گئے (The Problem of the North West: Collin Davies Frontier 1890-1908)۔ لوہگڑھ اور کانی گرام کے برکی اگرچہ افغانوں میں رہتے تھے، لیکن انہوں نے اپنی زبان اور تمدن برقرار رکھا۔

نسب و نژاد: برکیوں کے نسب و نژاد پر روایات کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ الفنسٹن (کتاب مذکور، باب ۱۲) لکھتا ہے کہ برکیوں کو سپاہیانہ اوصاف کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل ہے۔ وہ انٹر حکومت نو فوجی دستے مہیا کرتے ہیں۔ ہولڈیج (Col. Sir T.H. Holdich)، جو روسی افغان باؤنڈری کمیشن کا چیف سروے افسر تھا اور بعد میں افغان و ہند باؤنڈری کمیشن کا رٹن مقرر ہوا، لکھتا ہے کہ برکی بہت نامور سپاہی ہیں۔ ان کی رجمنٹ امیر کابل کی معتمد علیہ رجمنٹوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس رجمنٹ کے سپاہی اسی علاقے سے بھرتی کیے جاتے ہیں۔ جب کسی یورپی سفیر کی حفاظت مطلوب

تعلق نہیں۔ پس عام روایت کے مطابق، نیز برکیوں کی زبان کی بنا پر، ان کی قرابت کردوں ہی سے ظاہر ہوتی ہے، جو اس امر سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ارمر قبیلہ ترکستان میں اب بھی آباد ہے۔ ارل پرسی Earl Percy ترکیہ کی سیاحت کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ ایک کرد قبیلہ ارمر کردستان کے حکیاری Hakkiari علاقے میں آباد ہے، جو ترکیہ کے انتہائی جنوب مشرق میں ہے اور یہ لیمرک Julemerik سے تیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس علاقے کے ایک سلسلہ کوہ کا نام ارمر طاغ ہے۔ اس کی مزید وضاحت پرسی کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ دو اور کرد قبائل اب بھی کانی گرام میں موجود ہیں (Highlands of Asiatic Turkey، ص ۲۰۶)۔ ایک اور قبیلہ، جس کا ذکر ارل پرسی نے کیا ہے، زیرانی ہے، جو ارمر کے قریب آباد ہے (کتاب مذکور، ص ۱۹۱ حاشیہ)۔ یہ بھی کانی گرام کے برکیوں کی ایک شاخ ہے۔ کردوں کا ایک قبیلہ ”شیخان“ کے نام سے موسوم ہے، جو اربیل (عراق) کے قریب آباد ہے (Capt. S. A. Waheed: Kurds and their country، ص ۱۸۱)۔ یہ بھی برکیوں ہی کی ایک شاخ ہے۔ آخر میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ مشرقی پنجاب کے دو قصبوں ارمر اور ٹانڈہ کے برکی بختیاری قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں، جو تقسیم ہندوستان کے بعد پاکستان میں آباد ہوئے ہیں۔ ان حقائق کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ برکی مغربی ایران کے مشہور بختیاری قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے علاقے کی سرحد کردستان سے ملی ہوئی ہے، نیز یہ کہ برکیوں کے خاندان، جو ترک وطن کر کے افغانستان آئے، دراصل کردستان کے رہنے والے تھے۔

برکیوں کا ورود ہند: برکی خاندان کے کچھ افراد سکندر لودھی کے زمانے میں وزیرستان کے

قصبہ کانی گرام سے ایک صوفی باصفا شیخ احمد غوث انصاری (م ۱۹۹۹ھ) کی معیت میں جالندھر آئے۔ شیخ احمد غوث کے مورث اعلیٰ ابراہیم دانشمند دس واسطوں سے اپنا سلسلہ نسب مدینہ منورہ کے خالد انصاری (۵۵۵ھ) سے ملاتے ہیں۔ ابراہیم اپنے پیر بھائی مخدوم بہاء الدین زکریا ملتانی (۵۵۶ تا ۵۶۶ھ) سے ملنے ملتان آئے اور پھر حضرت مخدوم کے ارشاد پر وطن واپس جانے کا ارادہ ترک کر کے لوہستان سلیمان میں برکی قوم کی تعلیم و تربیت کے لیے کانی گرام کے قریب سکونت پذیر ہو گئے (علی محمد: تذکرۃ الانصار، ص ۲۱، ۲۸)۔ مولانا ابراہیم دانشمند کے چار بیٹے تھے: (۱) شیخ محمود، جن کی نسل سے بایزید انصاری موسوم بہ پیر روشن [کباں] ہوئے؛ (۲) شیخ سراج الدین: ان کی نسل سے شیخ درویش تھے، جن کے ساتھ برکی ۱۶۱۸ء میں جالندھر آئے؛ (۳) شیخ یوسف، جن کی اولاد دانشمندی انصار تھے؛ (۴) شیخ لعل، جو لاولد فوت ہوئے۔

برکیوں نے جالندھر کے آس پاس ذیل کی بستیاں آباد کیں: (۱) بستی دانشمندان؛ (۲) بستی شیخ درویش؛ (۳) بستی بابا خیل؛ (۴) بستی پیر داؤد؛ (۵) بستی غزاں؛ (۶) محلہ برک (= کرارخان)، جالندھر شہر؛ (۷) محلہ راستہ (= اخوند)، جالندھر شہر (A Glossary of the Tribes and Castes of the Panjab and the North West Frontier Provinces، بذیل مادہ برکی)۔

مرزا خاں، جن کا نام مرزا خاں اور لقب اوحد الدین تھا، عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ نظم الدرر والمرجان فی تلخیص سیر سید الانس والجان کے نام سے تصنیف کی۔ اس کا ایک خطی نسخہ کتب خانہ دانش گاہ پنجاب، ذخیرہ مخطوطات



اپنے ایک رسالے سیف المسلول کے دیباچے میں دیا ہے۔

برکی خاندان نے علمی خدمات کا سلسلہ بدستور جاری رکھا۔ مرزا خاں کے فرزند بہلول بھی نامور عالم اور ادیب تھے۔ انہوں نے اپنا نام بہلول گول برکی بتایا ہے (رک بہ مخطوطہ شرح مثنوی، اوراق ۲۳، ۲۲، ۲۳)۔ بعض مشہور فارسی شعرا کے دواوین کی شرحیں آپ کی یادگار ہیں، جو بصورت مخطوطات کتب خانہ دانشگاہ پنجاب، لاہور، ذخیرہ مخطوطات شیرانی، میں موجود ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے : (۱) شرح دیوان حافظ (عدد ۲۲۲۷، اوراق ۷۸) : اس شرح کا دوسرا خطی نسخہ، عدد ۲۲۸۹، اوراق ۸۶)۔ ایک خطی نسخہ راقم الحروف کے ذاتی کتب خانے میں بھی موجود ہے (اوراق ۱۳۱، خطنستعلیق شکستہ آمیز، عبارت گنجان، سطور پچیس فی صفحہ، سائز سوا نو انچ × پونے سات انچ)۔ مصنف نے خاتمہ کتاب میں لکھا ہے کہ یہ تالیف شاہنشاہ اورنگ زیب کی وفات کے ایک سال بعد، یعنی ۱۱۱۹ھ میں، مکمل ہوئی : (۲) شرح دیوان صائب (عدد ۲۱۸۱، اوراق ۱ تا ۴۹) : (۳) شرح دیوان ناصر علی (عدد ۲۱۸۱، اوراق ۵۰ تا ۱۵۰) : (۴) شرح دیوان غنی (عدد ۲۱۸۱، اوراق ۱۵۱ تا ۱۸۴) : (۵) شرح مثنوی (عدد ۶۳۶، اوراق ۱۷۷) : اس کے دوسرے نسخے کے لیے دیکھیے سید عبداللہ : *A Descriptive Catalogue...* (۲/۱ : ۲۱۰)۔

مذکورہ بالا شروح کے علاوہ بہلول گول نے دو رسالے بھی لکھے، جن کے خطی نسخے کتب خانہ دانشگاہ پنجاب، ذخیرہ مخطوطات شیرانی، میں موجود ہیں : (۱) سیف المسلول (عدد ۱۳۷۴، اوراق ۱۲) : (۲) عقائد علیہ در مذہب صوفیہ (عدد ۱۳۷۴ ب، اوراق ۱۸)۔

بہلول کا ایک ہی بیٹا یعنی نامی تھا، جو

شیرانی، میں موجود ہے (عدد ۲۱۵۸)۔  
۵۱۱۳۷ میں علیم اللہ الحسینی جالندھری نے نثر الجواہر فی تلخیص سیر ابی الطیب و الطاهر کے نام سے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا، جو ۱۹۰۲ء میں پیسہ اخبار لاہور سے شائع ہوا۔ مترجم نے دیباچے میں لکھا ہے : ”میں نے محسوس کیا کہ اوحد الدین میرزا خان البرکی ثم الجالندھری کی عربی کتاب نظم الدرر و المرجان فی تلخیص سیر الانس والجان اگرچہ مبسوط نہیں، لیکن یہ نادر معلومات پر محیط ہے اور ہر چند کہ خواص اس سے بہرہ مند ہوتے ہیں لیکن عوام اس کے اشارات سے محروم رہتے ہیں، اس لیے مجھے خیال آیا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے کے لیے اختصار کو بصورت تفصیل پیش کر کے اس کا ترجمہ نثر الجواہر فی تلخیص سیر ابی الطیب و الطاهر کے نام سے فارسی میں کروں۔ پس میں نے ترجمہ شروع کر دیا“ (ص ۲)۔

سٹوری نے نظم الدرر اور نثر الجواہر دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا ہے۔ لیکن تفصیل بتاتے ہوئے اس سے سہو ہو گیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ کتاب نظم الدرر علیم اللہ الحسینی کی تصنیف ہے اور اس کا ترجمہ مرزا خاں نے نثر الجواہر کے نام سے کیا ہے (*Persian Literature*، ص ۲۰۶)، لیکن جیسا کہ اوپر کی عبارت سے واضح ہے، حقیقت اس کے برعکس ہے۔

مرزا خاں نے نظم الدرر کے علاوہ مندرجہ ذیل رسائل بھی تصنیف کیے، جن کے خطی نسخے کتب خانہ دانشگاہ پنجاب، ذخیرہ مخطوطات شیرانی میں موجود ہیں : (۱) کتمان الاسرار (عدد ۲۱۵۸، اوراق ۵۶، ورق ۱ تا ۱۶ موجود نہیں) : (۲) تنبیہ الاغیا (عدد ۲۱۵۸) : (۳) شرح اقوال جنید بغدادی (عدد ۲۱۵۸)۔ انہوں نے سماع پر بھی ایک رسالہ تصنیف کیا، جس کا حوالہ ان کے فرزند بہلول برکی نے

سکھوں کے خلاف لڑتے ہوئے ۱۷۵۷ء میں شہید ہوا۔  
برکی خاندان کے ایک نامور بزرگ شیخ العالم

میاں شیخ درویش (م ۱۰۸۲ھ / ۱۶۷۱ء) تھے۔  
شیخ العالم اور ان کے مورث اعلیٰ ابراہیم دانشمند  
کے حالات میاں منصور کی تصنیف نفعات الاسرار اور  
دوسرے رسالوں میں ملتے ہیں۔ یہ حالات علی محمد  
انصاری دانشمند نے اپنی کتاب تذکرۃ الانصار میں  
جمع کیے ہیں۔ تذکرۃ الانصار پورے دو سو صفحات  
پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک مقدمہ، اکیس مقالے  
اور ایک خاتمہ ہے۔ اس کا ایک خطی نسخہ  
راقم الحروف کو خان زمان خاں صاحب نے جالندھر  
میں دکھایا تھا۔ علی محمد انصاری نے محلہ راستہ کے  
برکیوں میں سے مندرجہ ذیل اکابر کا ذکر کیا ہے :-

(۱) میاں علی شیر حافظ خیل دانشمند : آپ  
صاحب کشف و کرامات تھے۔ دانشمندوں میں وہ  
سب سے پہلے جالندھر آئے؛ (۲) شیخ سلطان ادیس خیل  
دانشمند؛ (۳) شیخ عبدالرحمن ادیس خیل  
دانشمند؛ صاحب کرامت بزرگ تھے اور شیخ احمد  
غوٹ کے، جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، ہم عصر تھے؛  
(۴) شیخ جلال بن شیخ سلطان ادیس خیل دانشمند؛  
نوکری پیشہ تھے اور قصبہ ہانڈیہ (برہان پور) کی  
سرکار میں متعین تھے؛ (۵) قطب الزمان شیخ  
عثمان دانشمند (م ۱۰۳۰ھ / ۱۶۳۰ء) : اسی خاندان  
کے نامور عالم تھے۔ ان کا شمار اس وقت کے  
اولیائے کرام میں ہوتا تھا۔ آپ شیخ الاعظم پیر ولی اور  
خواجہ عبدالباقی نقشبندی دہلوی سے فیض یاب ہوئے۔  
رسالہ اسرار یہ ہیں ان کے مفصل حالات درج ہیں۔  
ان کے مریدوں میں سے ایک صاحب باقی خان تھے،  
جو شاہجہاں کے درباری امیر تھے۔ ان کی تصنیفات  
تحفۃ القلوب، ہدیۃ الارواح اور چہل مکتوب ہیں۔  
مؤخر الذکر کا اردو ترجمہ ملک چمن دین نے لاہور  
سے طبع کرایا۔ ایک رسالہ شوقیہ و ذوقیہ بھی ان

کی طرف منسوب ہے۔ شیخ عثمان کے بعد ان کے  
حقیقی بھائی کے پوتے میاں عبدالقادر بن میاں عبداللہ  
مسند خلافت پر بیٹھے۔ آپ ۱۱۰۳ھ میں فوت ہوئے۔  
شیخ عثمان کے ایک مرید شیخ جوہر بن میر محمد  
مدد خیل تھے۔ یہ بھی حضرت شیخ یوسف بن  
ابراہیم دانشمند کی اولاد میں سے تھے۔ انہوں نے  
ایک رسالہ تصنیف کیا، جس میں محلہ راستہ کے  
دانشمندی بزرگوں اور اپنے بعض عزیزوں کے حالات  
لکھے، جو نواح بجواڑہ ضلع ہوشیار پور میں مقیم تھے۔  
انہوں نے دینی مسائل پر بھی ایک کتاب لکھی،  
جس کا نام جواہر الفقہ تھا۔ ان کی تاریخ وفات  
۱۰۸۳ھ ہے (مزید تفصیلات کے لیے دیکھیے  
محمد جہانگیر خاں؛ شیخ العالم میاں شیخ درویش، در  
اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۵۵ء، خصوصاً  
ص ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۵)۔

• آخذ : (۱) علی محمد دشمن (= دانشمند) :  
تذکرۃ الانصار (مخطوطہ)؛ (۲) محمد جہانگیر خاں، در  
اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۵۵ء؛ (۳) R.C.  
Temple، ج ۳ (The Legends of the Punjab، ج ۸)؛  
(۴) خان محمد حسین خان : A Few Phases of the  
Afghans in Jullunder Basties : Olaf Caroe (۵)؛  
The Pathans، مطبوعہ میکملن کمپنی، ۱۹۶۲ء؛  
(۶) Collin Davies : The Problems of the North West  
Frontier, 1890-1908؛ (۷) Holdich : The Indian Border-land 1880-1900، مطبوعہ Mathuen and Co.، ۱۹۰۱ء؛  
(۸) Earl Percy : Highlands of Asiatic Turkey؛ (۹)  
Capt. S.A. Waheed : The Kurds and their Country؛  
(۱۰) H. A. Rose : A Glossary of the Tribes and  
Castes of the Punjab and the North West Frontier  
Provinces، مطبوعہ سول اینڈ ملٹری گزٹ پریس، لاہور  
۱۹۱۱ء، ج ۲؛ (۱۱) C.A. Storey : Persian Literature؛  
(۱۲) سید عبداللہ : A Descriptive Catalogue of Persian



نہ تھا بلکہ ایک مبہم سی قبائلی [حکومت میں] افراد خاندان کے اشتراک اور وسیع تر معنوں میں خاندان کے سب سے بڑے فرد کے نفوق کے حق میں تھی، اس لیے برکیاروق کے ماموں اور ملکشاہ کے چچا زاد بھائی اسمعیل بن یاقوتی، نیز اس کے بھائی تئش [رک بان]، جوشام میں اس کی طرف سے حاکم تھا، اور اس کے دوسرے بھائی آرسلان آرغون، جو خراسان میں سرگرم عمل تھا، [تینوں] کو تخت کا دعویدار ہونے کا موقع مل گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک پیچیدہ قسم کی خانہ جنگی شروع ہو گئی جو آگے چل کر ان چھوٹی موٹی جھڑپوں کے مقابلے میں جو آلپ آرسلان [رک بان] اور ملکشاہ کی تخت نشینی کے وقت ہوئی تھیں، یہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوئی۔ بالآخر برکیاروق غالب آیا، اس لیے کہ پہلے تو نظام الملک کے پیرووں کے ہاتھوں تاج الملک قتل ہو گیا، پھر ترکان خاتون اور محمود بھی لقمہ اجل بن گئے۔ اسمعیل بھی، جس نے کبھی ترکان خاتون کا ساتھ دیا اور کبھی برکیاروق کا، انہیں لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ دریں اثنا تئش، جو ان دعویداروں میں سب سے زیادہ خطرناک تھا، سارے عراق (بشمول بغداد) میں اپنا اقتدار تسلیم کروانے میں کامیاب ہو چکا تھا اور اس نے ایران کی سطح مرتفع پر حملہ کر دیا تھا لیکن پہلے تو اس کے بڑے شامی امیروں، یعنی حلب کے آق سنقر اور الرہا (Edessa) کے بوژان نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور پھر امرائے ایران بھی ایک نئی حکومت کے ظہور میں آجانے کے خوف سے اس کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور تئش آخری جنگ میں کام آیا۔ باقی رہا آرسلان آرغون، جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ خراسان کو ایک آزاد باجگزار علاقہ بنا دے، تو وہ بھی بوری یوس کو، جو ملک شاہ کا سب سے آخری بھائی تھا اور جسے برکیاروق نے اس کے خلاف مبہم پر بھیجا تھا،

*Urdu and Arabic Manuscripts in the Punjab University Library*، ج ۱، کراہہ ۲؛ (۱۳) Mountstuart  
*An Account of Kingdom of Caubul* : Elphinstone  
 (محمد جہانگیر خان)

برکیاروق: (برکیاروق) چوتھا سلجوقی سلطان، جس کے عہد حکومت میں سلطنت کا زوال نمایاں طور پر شروع ہو گیا۔ وہ ملکشاہ کا سب سے بڑا بیٹا تھا لیکن باپ کی وفات (شوال ۵۴۸ھ / نومبر ۱۰۹۲ء) کے وقت اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ اگرچہ ملکشاہ بھی اسی عمر میں تخت پر بیٹھا تھا، لیکن اسے اپنے وزیر اور اتابک نظام الملک کی رہنمائی حاصل تھی۔ اس کے برخلاف برکیاروق کے درباریوں میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جسے مسلمہ اقتدار حاصل ہو۔ مزید برآں ملکشاہ کی آخری بیوی ترکان خاتون، جو خود ایک شریف ترین خاندان سے تھی، اپنے خاوند کی زندگی کے آخری ایام میں اس پر پوری طرح حاوی تھی اور اب چونکہ خزانہ اسی کے قبضہ و اختیار میں تھا اس لیے اس نے بغداد میں اپنے چار سالہ بیٹے محمود کے سلطان ہونے کا اعلان کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک سلطنت کی وراثت کے معاملے میں خلیفہ کا فیصلہ ایک اہم عنصر بن چکا تھا، بعینہ اس سے قبل اس کا فیصلہ خود سلجوقی خاندان کے اندر ہی ہوتا رہا تھا۔ مزید برآں تاج الملک، جو ترکان خاتون کے مشیر نظام الملک کا جانشین اور دشمن تھا، اس کے پیروں کی خاصی بڑی مسلح جماعت کو، جو سابق وزیر کے بیٹوں کے گرد و پیٹھ اکھٹی ہو گئی تھی، ختم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور انتقام کے دہے تھا۔ نظام الملک کے ساتھیوں نے برکیاروق کو اصفہان سے اغوا کر لیا اور اپنے مرکز رے میں اس کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ سب سے آخری بات یہ ہوئی کہ چونکہ کوئی قانون وراثت موجود

کردے۔ اس نے آذربيجان اور اس کے سرحدی اضلاع میں بھی یہی کیا، جو ایک پر خطر سرحدی علاقہ تھا (جیسا کہ اسمعیل بن یاقوتی کی [ناکام] کوشش سے ثابت ہوا تھا)، کیونکہ ترکمانوں کے گروہ ہمیشہ ہر ایسے اقدام کا ساتھ دینے کے لیے تیار رہتے تھے جس میں لوٹ کھسوٹ کا موقع ملنے کا امکان ہو۔ اس علاقے میں برکیاروق نے اپنے سب سے چھوٹے بھائی محمد کو متمکن کر دیا اور اپنی طرف سے ایک اتابگ مقرر کر کے اس کے ساتھ بھیج دیا۔

بہر کیف برکیاروق کے مصائب کا اب بھی خاتمہ نہ ہو پایا۔ محمد اور سنجر کو، جو ایک ہی والدہ سے تھے (لیکن برکیاروق کی والدہ سے نہیں)۔ خاص طور پر نظام الملک کے بیٹے مؤید الدین نے (جسے برکیاروق نے اپنے ایک بھائی کے حق میں، جس سے اس کا جھگڑا ہو گیا تھا، وزارت سے برطرف کر دیا تھا) ورغلیا کہ وہ اپنے بڑے بھائی کے اقتدار کا جوا اتار پھینکیں اور اس کے خلاف بغاوت کر دیں۔ کئی لڑائیوں کے بعد، جنہوں نے بعض امرا کے پیہم کبھی ایک اور کبھی دوسرے کے ساتھ ہو جانے کی وجہ سے بہت پیچیدہ صورت اختیار کر لی تھی اور جن کے دوران میں دونوں گروہوں کے سرغنہ باری باری فرار ہونے پر مجبور ہوتے رہے، طرفین کے معتدل عناصر کی کوششوں سے ایک معاہدہ مرتب ہو گیا۔ اس معاہدے کی ر سے محمد کو "ملک" کا خطاب ملا اور اسے برکیاروق کے زیر سایہ آذربيجان کا، جس میں ارمینیہ بھی شامل تھا، حکمران بنا دیا گیا اور برکیاروق بلا شرکت غیرے سلطان تسلیم کر گیا۔ محمد کو یہ معاہدہ پسند نہ آیا۔ اس دوبارہ لڑائی شروع کر دی، لیکن بالآخر اسے مجبور ہو کر ارمینیہ کی طرف بھاگنا پڑا۔ بایں ہمہ آخر کار برکیاروق، جو بیمار تھا اور لڑائی سے تنگ آ

مغلوب کرنے کے کچھ عرصے بعد مر گیا۔ یوں برکیاروق کو ۵۴۸۸ / ۱۰۹۵ء کے بعد سے خلیفہ نے اپنی سلطنت کے عرب صوبجات اور ایران کی سر زمین مرتفع کا حکمران تسلیم کر لیا اور آئندہ سال وہ خراسان کے صوبے کی اطاعت و انقیاد حاصل کرنے اور سمرقند اور غزنہ پر بھی از سر نو سلجوقی سیادت کا دعویٰ کرنے کی غرض سے اصفہان کی جانب روانہ ہو گیا۔ لیکن وہ سلطنت جس پر اس کی فرمانروائی تھی اس سلطنت سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں رکھتی جس پر اس کے پیش رو حکومت کرتے آئے تھے۔

آلپ ارسلان نے اور بالخصوص ملکشاہ نے پہلے ہی سے اپنے خاندان کے شاعزادوں اور بعض استثنائی صورتوں میں بڑے بڑے امرا کے لیے بھی جاگیریں اور بڑے بڑے مناصب قائم کر دیے تھے، لیکن اس تقسیم کا اثر فی الجملہ سرحدی علاقوں اور دور دراز کے اضلاع ہی پر پڑا تھا اور بعض خطرناک حوادث کے باوجود اس سے سلطنت کے اتحاد میں کوئی زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ برکیاروق کے عہد میں صورت حال بدل گئی اور سلطنت نے آزاد حکمرانوں کے ایک وفاق کی صورت اختیار کر لی۔

شام میں تئش کے بیٹوں، یعنی دقاق حاکم دمشق اور رضوان حاکم حلب نے اصولاً اس کی سیادت کو تسلیم کر لیا تھا، لیکن برکیاروق کو کبھی ان کے معاملات میں دخل دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔

خراسان کی طرف مشرق کے ناقابل عبور پہاڑی علاقوں میں برابر باغیوں کا زور رہا، جن میں ملکشاہ کے ایک چچا زاد بھائی کے علاوہ یسفوقی اولاد میں سے ایک شخص اور طغرل بیگ کا بھائی وغیرہ شامل تھے؛ لہذا برکیاروق نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ تمام خراسان کو بطور جاگیر اپنے بھائی سنجر کے سپرد کر دے اور اس کی مدد کے لیے ایک والی مقرر



جو سابقہ ہوزنطی علاقے میں قائم ہو چکی تھیں اور انہی کی روادی ریاست کے ساتھ سُکمان القطبی کی ریاست کا بھی اضافہ ہو گیا، جو اسمعیل کے سابقہ عمال میں سے تھا اور جس نے اخلاط میں اپنے شاہ ارسین ہونے کا اعلان کر دیا۔ عراق کی سرحدوں پر بیتیجہ [= بطیحہ] کے حکمرانوں اور مزیدی عربوں کی قوت قابلِ اعتنا حد تک بڑھ گئی۔ خراسان اور بحیرہ خزر کے صوبوں سے قطع نظر، جہاں آزاد ریاستوں کے وجود کو ہمیشہ سے تسلیم کیا جاتا رہا تھا، اور قدیم بویہی اور کرد خاندانوں کی ان ریاستوں کے علاوہ جن کے وجود کو سلجوقی ہمیشہ گوارا کرتے رہے، ایران بلکہ خوزستان تک میں بھی بعض موروثی جاگیردار خاندانوں کی تشکیل دیکھنے میں آتی ہے۔ یہ جاگیردار بڑے بڑے سلجوق حکام کی نسل سے تھے، جن میں سب سے مشہور تستر کے مقام پر برسق کے بیٹوں کا خاندان تھا۔ مندرجہ ذیل افراد یکے بعد دیگرے برکیاروق کے وزیر ہوئے: نظام الملک کے تین بیٹے، یعنی عزالملک (۵۴۸ھ/۱۱۰۹ء)، مؤید الملک (ایک ہی سال کے بعد معزول ہوا) اور فخرالملک (۵۴۹ھ/۱۱۰۹ء [کذا، صحیح ۱۰۹۹ - ۱۱۰۰ء]) پھر عبدالجلیل الدہستانی (جو لڑائی میں مارا گیا) اور المیبذی (۵۴۹ھ/۱۱۰۱ء تا ۵۴۹۸ھ/۱۱۰۳ء)۔

اس کے عہد حکومت کے مناقشات سے حسن بن الصباح کے اسمعیلی نزاریوں نے فائدہ اٹھایا اور شمالی ایران کے پہاڑوں اور اصفہان کے قرب و جوار میں ناقابلِ تسخیر قلعوں پر قابض ہو گئے۔ اس کے علاوہ صحرا میں طبس کی سابقہ اسمعیلی ریاست بھی ان کے تصرف میں آ گئی؛ چنانچہ جب نظام الملک کے ساتھی محمد اور سنجر کے طرف دار بن گئے تھے تو برکیاروق کا نائب طبس سے بھی اس کے لیے

تھا، ۵۴۹ھ/۱۱۰۳ - ۱۱۰۴ء میں سلطنت کی عملی تقسیم پر راضی ہو گیا۔ اگرچہ اس نے جبال اور رے کے علاوہ طبرستان، فارس، خوزستان، بغداد اور مقامات مقدسہ، بالفاظ دیگر تمام وہ شہر جو حد درجہ اہمیت رکھتے تھے اور سلطنت کے مرکزی علاقوں کا قلب تھے، اپنے پاس ہی رکھے، تاہم اسے مجبوراً اپنے بھائی کو اصفہان، نصف عراق اور آذربایجان سے لے کر شام تک پورے سرحدی علاقے کا فرمانروا تسلیم کرنا پڑا اور صلیبی جنگ کی قیادت بھی اسے تفویض کرنا پڑی۔ باقی رہا سنجر، تو اسے اس کی اجازت دی گئی کہ وہ بیک وقت اپنے اور محمد کے نام کا خطبہ پڑھوائے اور اس میں برکیاروق کا کوئی ذکر نہ ہو۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر برکیاروق جلد ہی نہ مر جاتا اور اس کے مرنے کے بعد محمد کے عہد میں سلطنت کا ایک عارضی اتحاد ظہور میں نہ آ گیا ہوتا اور اسے بار آور ہونے کا موقع مل جاتا تو اس معاہدے کا کیا نتیجہ نکلتا۔ بہر حال ان علاقوں میں بھی، جو دونوں بھائیوں کو اس معاہدے کی رو سے ملے تھے ان کے اختیار و اقتدار کی حقیقت ہرگز مسلم نہ تھی۔

مختلف علاقوں میں آزادی اور خود مختاری کی جو کوششیں ہو رہی تھیں ان پر نظر رکھنا قطعاً ممکن نہیں تھا، اور اسرا کی، جو دونوں مدعیوں میں سے کبھی ایک کی طرف ہو جاتے تھے کبھی دوسرے کی طرف، تائید و اعانت خریدنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بالائی عراق عرب میں بھی کربغا اور بالخصوص اس کا جانشین چکریش موصل میں قریب قریب خود مختار نظر آتے تھے اور دوسری طرف ارتقی اپنے مفاد کے لیے دیار بکر کو ایک کرنے کے ابتدائی اقدامات کر رہے تھے۔ ارمینیہ میں ان ترکمانی ریاستوں کے

بہت سے امدادی دستے بھرتی کرتا نظر آتا ہے؛ تاہم اسمعیلیوں کو جو اثر و اقتدار حاصل ہو گیا تھا اور برکیاروق کے حامیوں میں اس رواداری کے باعث جو اس نے اسمعیلیوں کے ساتھ روا رکھی تھی جو بددلی پیدا ہو گئی تھی اس کی وجہ سے برکیاروق کو اپنے عہد حکومت کے آخری ایام میں خطرہ محسوس ہونے لگا اور اس نے بغداد اور ایران میں اسمعیلیوں کے قتل عام کی حوصلہ افزائی کی، گوان کی قوت کو توڑنے کی کوئی تدبیر عمل میں نہیں لائی گئی۔

برکیاروق نے ربیع الآخر ۵۴۹۸ / ۱۱۰۵ء کے آغاز میں پچیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ وہ یقیناً کوئی بڑا آدمی نہ تھا اور جس بھونڈے پن سے اس نے نظام الملک کے پیروں کو اپنا مخالف بنا لیا وہ واقعی بڑی سخت غلطی تھی۔ تاہم یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ نہایت کم عمر تھا اور اس امر کو نظر انداز کر دینا بے انصافی ہو گی کہ انتشار کے جو پہلو اس کے عہد میں رونما ہوئے وہ در پردہ بڑے سلجوق سلاطین کے زمانے میں بھی موجود تھے۔

مآخذ: (۱) سلجوقوں کی تاریخ از عماد الدین اصفہانی (وہنداری کے نسخے کی طبع از هوتسما، در *Recueil*، ج ۲، ۱۸۸۸ء)، جس کا متعلقہ حصہ وزیرانوشیروان کے فارسی تذکرے پر مبنی ہے؛ (۲) ابن الأثیر: *الکامل*، ج ۱۰، جس میں عراقی، خراسانی اور دوسرے ذرائع سے سیر حاصل معلومات جمع کر دی گئی ہیں؛ علاوہ اس مواد کے جو متذکرۃ الصدر تصنیف میں فراہم کر دیا گیا ہے؛ (۳) ظاہر الدین نیشاپوری: *سلجوق نامہ*، تخریجی متن، طبع جلالہ خاور، تہران ۱۹۵۳ء مع اس پر مبنی *راحة الصدور از الراوندی*، طبع محمد اقبال، در *GMS*، ۱۹۲۱ء؛ ان میں تشش کی بغاوت کے لیے شامی تاریخ کے مسلم اور عیسائی مآخذ کا اضافہ کر لیا

جائے، بالخصوص (۵) ابن القلائسی، طبع *Amedroz*؛ نیز دیکھیے: (۶) فارسی میں *مجلد التواریخ از نامعلوم مصنف*، طبع بہار، ۱۹۳۸ء؛ (۷) مختصر مگر اسی عہد کی تصنیف، اور ماری *Mari* وغیرہ کے نسطوری تذکرے، طبع *Gismondi*؛ جدید تصانیف: (۸) *Recher- Defréméry*؛ در *JA*، *ches sur le règne du Sultan Barkyarok*؛ (۹) *The Decline of the Saldjukid*؛ ثناء اللہ؛ (۱۰) *Empire*، کلکتہ ۱۹۳۸ء؛ (۱۱) *The Order of the Assassins*، ۱۹۵۵ء؛ (۱۱) مودودی: *سلاجقہ، لاہور*۔

(CL. CAHEN)

برگس: [= برغوس] (برگس، زوسوپولس *Zossopolis*، قدیم اپولونیا *Appolonia* کے قریب) جاے وقوع ۴۲ درجے ۳۰ دقیقے عرض بلد شمالی، ۲۷ درجے ۲۸ دقیقے طول بلد مشرقی، ورنہ *Varna* کے بعد بلغاریا کی سب سے بڑی بندرگاہ اور پانچواں بڑا شہر۔ برگس ایک ضلع کا مرکز اور سیرو سیاحت کا مقام ہے، جہاں جدید طرز کی بندرگاہ تیار ہو چکی ہے اور پارچہ بافی، مچھلی کے شکار اور نمک کے کارخانے ہیں۔ یہ شہر خلیج برگس پر واقع ہے اور ۱۳۷۶ء / ۱۹۵۶ء میں اس کی آبادی تینتالیس ہزار چھ سو چوراسی (ضلع کی بہتر ہزار سات سو پچانوے) تھی۔ اس کا یہ نام یونانی پزگوس *Pyrgos* سے ماخوذ ہے۔ ۱۳۶۷ء / ۱۳۶۷ء تا ۱۳۶۹ء / ۱۳۶۸ء کے لگ بھگ [سلطان] مراد اول نے برگس کے ضلع پر قبضہ کر لیا (*B. de la Brocquière*) ص ۱۶۸ تا ۱۷۰ اور اس کا حوالہ در *Jorga* : *GOR* : ۲۰۷؛ اوزون چارشیلی *I.H. Uzunçarşili*؛ عثمانی تاریخ، ۱: ۶۱، ۶۹؛ دانشمند *I. H. Danismend* : *Kronoloji*... ۱: ۳۷ تا ۳۸)۔ عثمانی تاریخ میں برگس نے معمولی سا حصہ لیا۔ یہ بلقان کی مہمات میں بحری بیڑے اور جہازسازی کا مرکز تھا



۱۹۳۲ء: (۵) برطانیہ عظمیٰ، دفتر حرب: Bulgaria  
 (لنڈن ۱۹۳۵ء): (۶) Bol'shaya sovtetskaya  
 entsiklopediia، بار دوم، بہ تنقیح جدید، ۱۹۵۱ء: ۲  
 ۲۹۵: (۷) Die Wirtschaft Bulgariens: R. Rochlin  
 (۸) A. Stokolnikov، برلن ۱۹۵۷ء: (۸)  
 (۹) E. B. Valev، ص ۱۱۲ تا ۲۱۷: (۹)  
 Bolgarika: ekonomiko-geograficheskaia kharak-  
 teristika، صوفیا ۱۹۵۷ء، ص ۳۶ تا ۳۹، دوان  
 کثیرہ، مع عمدہ نقشوں کے۔

(H. A. REED)

برگمہ: [= برگمہ، پرغامس] قدیم برگمن  
 Pergamon، جو بیسیا Mysia (قب مواد و حوالہ جات  
 مذکورہ در Pausanias) میں واقع ہے،  
 ایشیائے کوچک پر مسلمانوں کے حملوں کی وجہ  
 سے جو ارنی بھاگ آئے تھے وہ ساتویں صدی  
 کے دوران میں بوزنطی عہد کے برگمن Pergamon  
 میں آباد ہو گئے۔ بوزنطی شہنشاہ فلیپس  
 Philippiakes (۱۱۱ء تا ۱۳۷ء) ارنی الاصل تھا  
 اور برگمن کا باشندہ تھا۔ ۱۹۷ء میں مسیح  
 بن عبدالملک کی سپہ سالاری میں مسیح  
 نے اس شہر کو تاراج کر دیا تھا۔  
 جب ۱۷۱ء تا ۱۸۱۸ء میں عربوں نے فتح قطعیہ کی  
 کوشش ترک کر دی تو اسے دوبارہ آباد اور قلعہ بہ  
 کر لیا گیا۔ برگمن، نو سوہ (Lava) کے عہد  
 ۱۷۱۷ء تا ۱۷۱۸ء سے تراکیہ (Tarakiva) کے  
 صوبے میں اور یونانہ کے عہد (۱۸۶۱ء تا ۱۹۱۲ء) سے  
 سوسون Sams کے صوبے میں شامل رہا۔ جنگ  
 تریکون (= ملازگرد، ملاز گرد) ۱۸۷۷ء کے  
 بعد مغربی ایشیائے کوچک پر فرانسیسیوں کے حملوں  
 میں اس شہر کو خانہ کھنڈی پہنچا، تاہم خاندان  
 Karaman کے جو بھی نسبت سے اس

خاص طور پر جنگ لیپانتو Lepanto ۱۵۷۱ء /  
 ۱۵۷۱ء کے بعد سے (اوزون چارشیلی Uzuncarsili  
 کتاب مذکور، ۲: ۲۳۰، ۳، بار اول، ص ۲۱)۔  
 ایک عثمانی اصلاحی کمیشن نے، جو جدید طرز  
 کے استعمالات کی تحقیق کر رہا تھا، ۱۱۹۸ء /  
 ۱۷۸۳ء میں اس شہر کے قلعے کا معائنہ کیا (وہی  
 کتاب، ۳، بار اول: ۳۸۳) اور جب ۱۲۳۵ء /  
 ۱۸۲۹ء میں روسی ادرنہ پر چڑھائی کر رہے تھے تو  
 یہی شہر ان کے اترنے کا مقام تھا۔ ۱۲۷۲ء / ۱۸۵۵ء  
 میں اس شہر میں پولینڈ کے شاعر Adam Mickiewicz  
 نے کچھ عرصہ قیام کیا۔ انیسویں صدی کے اواخر  
 میں بلغاریا کی تحریک آزادی میں، جو ۱۳۲۶ء /  
 ۱۹۰۸ء میں انتہا کو پہنچی، برگمن نے کوئی  
 حصہ نہیں لیا۔

استانبول کے سامنے واقع جزائر پرنس (قدیم  
 زمانے کا Antigone) میں سے ایک کا نام بھی  
 برگمن ہے (G. Schlumberger)، ترجمہ یونگول  
 N. Yungul: استانبول لٹہ لری Istanbul Adalari،  
 استانبول ۱۹۳۷ء: Cabinet، ۳: ۶۸۳ تا ۶۸۷  
 E. Manbouy: The Tourists' Istanbul، استانبول  
 ۱۹۵۳ء) اور جنوبی ترکی کے دس دیہات کا بھی  
 (ترکیہ وہ سکون برلری قلاوڑی، ج ۱، تا ۳، اقرہ  
 ۱۹۳۶ء تا ۱۹۳۷ء: نیز یہی نام آریہ برگمن،  
 Aralburgaz، چتل برگمن Catalburgaz اور لونہ برگمن  
 Lulburgaz میں بھی موجود ہے، جن میں سے کسی  
 کا حال یہاں نہیں دیا گیا ہے۔

مآخذ: (۱) Bulgaria: علاقائی اقتضائے  
 ویکٹر ۱۹۵۷ء: Bulgaria: Bulgarska enciklopediia، صوفیا  
 ۱۹۶۶ء: L.A.D. Delft: Bulgaria  
 فونڈک ۱۹۵۷ء، ص ۵۵ تا ۵۵ و بوق  
 کیر: A. Girard: Les monuments historiques  
 et religieuses de Bulgarie





میں برگوی کی آرا رد کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ شیخ الاسلام ابوالسعود افندی نے بھی اس نزاع میں حصہ لیا اور اس خیال سے کہ اگر برگوی کے نظریات (بالخصوص اس کا یہ نظریہ کہ مضروب سکتے اور دوسری منقولہ جائداد کو وقف کرنا جائز نہیں ہے) پھیل گئے تو اوقاف کو بہت خسارہ ہوگا اس کے خلاف ایک فتویٰ صادر کر دیا۔ اس کے بعد بلال زادہ نے یہاں تک کہہ دیا کہ برگوی منافقت سے کام لیتا رہا ہے۔

برگوی کی تصانیف میں ایک ترکی کتاب وصیت نامہ کے نام سے ہے، جس نے اب تک اس کا نام زندہ رکھا ہے۔ یہ کتاب دینیات کے مبادی پر مشتمل ہے اور مذہبی مسائل کے بارے میں اب بھی عوام کی ضروریات کو پورا کرتی ہے۔

قاضی زادہ احمد افندی اور قونیہ کے شیخ علی افندی نے اس کتاب پر شرحیں لکھیں اور موخر الذکر شرح کی شرح عثمان پازاری کے مفتی اسمعیل نیازی نے لکھی۔ وصیت نامہ بارہا طبع ہوتا رہا اور توقمش اوغلو نے اس کا شمالی ترکی میں ترجمہ بھی کیا (مطبوعہ قازان ۱۸۰۲ و ۱۸۰۶ء دیکھیے Zenker :

*Bibliotheca orientalis* ۱۰ : ۱۳۶۳، بعد، ۲ : ۱۱۹۲

بعد: JA، ۶۱۸۳۳، ۲ : ۳۲، ۵۵، ۱۶۱۸۵۹، ۵۲۲ :

*Chrestomathie Ottomane : Dieterici*، ص ۸۸ بعد:

ترجموں کے سلسلے میں دیکھیے بالخصوص فرانسیسی

ترجمہ از گارسان دتاسی: *L'Islanisme d'après le*

*Coran...*، ۶۱۸۷۳)۔ صرف و نحو پر اس کی

دو کتابیں اظہار [الأسرار] اور العوامل برسوں تک

مدرسوں میں پڑھائی جاتی رہیں اور اپنے وقت میں

ان سے عربی کی تعلیم میں بہت آسانی ہو گئی۔

اس کی تصنیف الطریقة المحمدیة نے، جس میں

اس کے عربی مواعظ اور خطبے ہیں، اہل علم کے

طبقے میں بڑی قدر و منزلت پائی۔ علی القاری نے

میں شیخ عبدالرحمن قرہ مانی نے اسے سلسلہ پیرامیہ میں مرید کیا۔ اپنے پیر عبدالرحمن افندی کے اثر و رسوخ کی مدد سے اس نے ادرنہ کی فوج میں قسام کا عہدہ حاصل کر لیا، لیکن جلد ہی اس نے اس عہدے اور تعلیم و تدریس کے کام سے سبکدوش ہونا چاہا؛ مگر اس کے شیخ [پیر] نے اسے تبلیغ و تعلیم کا مشغلہ یکسر ترک کرنے کی اجازت نہ دی، چنانچہ جب خود اس کے ایک ہم وطن عطاء اللہ افندی نے، جو سلطان سلیم ثانی کا اتالیق تھا، اسے برگوی میں اپنے بنا کردہ مدرسے میں مدرسے کا عہدہ پیش کیا تو محمد علی نے اسے قبول کر لیا۔ برگوی میں (جس کی نسبت سے وہ برگوی کہلاتا ہے) اس کا تعلیم و تدریس، تالیف و تصنیف اور اشاعت و تبلیغ کا شغل ۱۸۸۱ء / ۱۲۰۳ء میں مرض طاعون سے اس کی وفات ہی پر ختم ہوا۔

وہ امام ابن تیمیہ [رک باں] کی طرح قانون شریعت کی حمایت میں ہر قسم کی بدعت کا جم کر مقابلہ کرتا رہا اور کسی منصب و مرتبہ کی پاسداری سے وہ احکام دین کے ترک کرنے میں چشم پوشی نہ کرتا تھا، حتیٰ کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس نے وزیر اعظم محمد پاشا کو بعض گزشتہ بے قاعدگیوں کی اصلاح کے لیے تلقین و نصیحت کرنے کی خاطر برگوی سے استانبول تک کا سفر بھی کیا۔ مذہبی معاملات میں سخت شدت پسند ہونے کی وجہ سے وہ شریعت سے ذرا سا انحراف بھی برداشت نہ کرتا تھا۔ اس نے اس موضوع پر جو رسالے لکھے، کہ روپے کی خاطر قرآن مجید کی تعلیم دینا یا کسی عبادت کے کام کا کوئی معاوضہ قبول کرنا حرام ہے، انہوں نے اسے ہم عصر اہل علم کے ساتھ بحث و مناظرہ میں الجھا دیا، اس کا بڑا چرچا ہوا۔ اس زمانے کا ایک نہایت مشہور قاضی بلال زادہ اس کا سب سے بڑا حریف نکلا اور اس نے ایسے رسائل لکھے جن

ایک طولانی قصیدہ لکھا، جس میں اس نے علمائے اسلام میں برگوی کی حیثیت کو واضح کیا ہے۔ خادم لی محمد افندی اور عبدالغنی النابلسی نے الطریقة المحمدیة کی شرحیں لکھیں۔ امین افندی نے اسے دستور العمل کی حیثیت سے اختیار کیا، جس کے نتیجے میں اس کا عرف ہی ”طریقتچی“ ہو گیا تھا، بلکہ اس کے انتقال کے بعد ایک سلسلہ طریقت بھی اسی کے نام سے معرض وجود میں آ گیا تھا۔

مآخذ: (۱) عطائی: حدیقة الحقائق، ۱۲۶۸ھ، ۱: ۱۷۹؛ (۲) علی بن بلال: المقصد المنظوم (ابن خلیکان، قاہرہ، ۱۳۱۰ھ، ۲: ۳۳۰ کے حواشی پر)؛ (۳) کاتب چلبی: میزان الحق (= G. L. Lewis: The Balance of Truth، لندن ۱۹۵۷ء، باب ۲)؛ (۴) سچل عثمانی؛ (۵) عثمانی مؤلف لری، ۱: ۲۵۵؛ (۶) سامی: قاموس الأعلام؛ (۷) براکلمان، ۲: ۳۳۰، بعد، و بحد اشاریہ؛ (۸) Catalogue of the Arabic books: A. G. Ellis؛ (۹) C. Rieu: in the Brit. Mus. Suppl. to the Cat. of the Arabic MSS. in the Brit. Mus. اعداد ۹۷۹ و ۹۸۰، ۶۱۹؛ (۱۰) وہی مصنف: Cat. of the Turkish Mss. in the Brit. Mus. ۶ ب بعد؛ [(۱۱) الزرکلی، ۶: ۲۸۶]

(تاسم گفروی)

برگہ: (برگی، بعض اوقات برگی یا برکی بھی) مغربی ایشیائے کوچک میں ایک چھوٹا سا قصبہ، جو وادی کوچوک مندریس میں واقع ہے۔ یہ صوبہ ازمیر (سمرنا) میں اودیش کی قضا کے ایک ناحیہ کا مرکز ہے۔ یہیں لید (Lydia) کا قدیم Διος 'Ιερον واقع تھا۔ بوزنطی دور میں یہ خριστοπούλις نیز Πυργίον کے ناموں سے مشہور تھا۔ ۱۱۹۳ء اور ۱۱۹۹ء کے مابین اس شہر کو ایک اسقف کے صدر مقام (= میٹروپول) کا درجہ دے دیا گیا اور اس طرح وہ افسوس (Ephesos) کی

کلیسائی ماتحتی سے آزاد ہو گیا، لیکن ۱۳۸۷ء میں یہ شہر ایک بار پھر افسوس کے مددگار (Suffragan) اسقف کا مرکز ہو گیا۔ ۱۳۰۴ء میں قتلانیوں (Catalans) نے Roger de Flor کی زیر قیادت ترکوں کو بہاں سے نکالا اور خود شہر لوٹ لیا۔ اس کے بعد سے برگہ، آیدین کے ترک بیگوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ان کے دور حکومت کے عمارتی آثار۔ جن میں اولو جامع قابل ذکر ہے۔ اب بھی شہر میں نظر آتے ہیں۔ برگہ ۱۵۹۳ء/ ۱۳۹۱ء میں عثمانی ترکوں کے قبضے میں آیا اور اس کے بعد انہیں کے پاس رہا، ایک مختصر وقفے کے سوا، جس میں آیدین کے خانوادے کے رئیسوں کو امیر تیمور نے بحال کر دیا اور وہ ایک بار پھر (۱۳۰۲ تا ۱۳۳۵ء) اس علاقے پر قابض رہے۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۲ء کے برسوں میں مغربی ایشیائے کوچک میں یونانیوں اور ترکوں کے مابین جنگ کے دوران میں اس شہر کو خاصا نقصان پہنچا۔ ۱۹۴۵ء میں برگہ کی آبادی دو ہزار ایک سو پچاس نفوس کے لگ بھگ تھی۔

مآخذ: (۱) العمری: مسالک الألبصار، طبع

F. Taeschner، لائپزگ ۱۹۲۹ء، ص ۴۵ بعد؛ (۲)

ابن بطوطہ: تحفة النظائر، طبع Sanguinetti و Defreméry،

پیرس ۱۸۵۳ تا ۱۸۵۹ء، ۲: ۲۹۵ بعد؛ (۳)

اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ۹، استانبول ۱۹۳۵ء: ۱۷۳

بعد؛ (۴) Pachymeres، بون ۱۸۳۵ء، ۲: ۳۳۶؛

(۵) Dukas، بون ۱۸۳۴ء، ص ۸۳؛ (۶) W. Toma-

Zur historischen Topographie von Kleinasien: scheck

Bd.، Phil-Hist. Cl. SBak. Wien، (در) im Mittelalter

(۱۲۳)۔ وی انا ۱۸۹۱ء، ۱: ۹۱، ۳۳؛ (۷) A. Wächter

Der Verfall des Griechentums in Kleinasien im XIV.

Jahrhundert، لائپزگ ۱۹۰۳ء، ص ۴۱ تا ۴۴؛ (۸)

Bericht über eine: A. von Premerstein و J. Keil



میں ایک ضلع نیز ایک جھیل کا نام - جھیل مذکور دریائے نیل کی دو شاخوں رشید Rosetta اور دمیاط Damietta کے دہانوں کے درمیان واقع ہے اور اسے بحیرہ روم سے صرف ریت کے ٹیلوں کی ایک تنگ سی پٹی جدا کرتی ہے۔

یہ عربی نام یونانی لفظ Paralos کی معرب شکل ہے، جو قبطنی کے واسطے سے عربی میں آیا اور جس کے معنی ”بمندر کے نزدیک کا ساحلی علاقہ“ ہیں، لہذا علاقہ مذکور پر اس کا اطلاق بالکل طبعی ہے، یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یاقوت اور ابن بطوطہ اس کے بالفتح تلفظ ”برلس“ سے واقف تھے جو اب باقی نہیں رہا۔

ملک کے نسبتاً زیادہ بڑے حصوں میں تقسیم ہونے سے قبل یہ ایک گورنر کے انتظامی مرکز تھا۔ اس کے بعد اسے نستر اوہ کا ایک حصہ بنا دیا گیا۔ اور آٹھویں / چودھویں صدی میں یہ صوبہ اپنے صدر مقام کے نام بر آشمون طنح کہلانے لگا۔ اب علاقہ بر آس صوبہ الغربیہ میں شامل ہے۔

قرون وسطیٰ میں یہ جھیل ایسے مقام کے نام پر جو اب باقی نہیں رہا بحیرہ نستر اوہ کہلاتی تھی۔ ابن حوقل نے اسے بشمور کی جھیل لکھا ہے، جو اس دلدلی علاقے کا ایک اور نام ہے۔

اس جھیل میں ماہی گیری کا ٹھیکا دیا جاتا تھا۔ یہ ایک قدیم دستور تھا جو اسلامی عہد کے پہلے سے موجود تھا۔ یہ ماننا ذرا مشکل ہے کہ مختلف حکومتوں نے ایسے منفعت بخش ذریعہ آمدنی سے دستکش ہونا منظور کیا ہو گا اور جب تیسری / نویں صدی کے مآخذ اس طریقے کے جاری کرنے کا ذکر کرتے ہیں تو غالباً ان کا روئے سخن مالی دشواریوں میں اضافے کی جانب ہوتا ہے۔ اسی طرح جب وہ محصول کی موقوفی کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد غالباً صورت حال میں بہتری ہوتی ہے۔

*dritte Reise in Lydien (Akad. d. Wiss. in Wien, Denkschriften, Phil-Hist. Kl. جلد ۱/۵۷)، ویانا ۱۹۱۳ء، ص ۶۲ بعد؛ (۶) F. Taeschner : Das anatolische Wegenetz nach Osmanischen Quellen (Turkische Bibliothek Bd. ۲۳)، لایپزگ ۱۹۳۶ء، ۱: ۱۷۶، ۲: ۳۹؛ (۱۰) R. M. Riefstahl : Turkish Architecture in South Western Anatolia (Mass. [امریکہ])، کتبات طبع ۱۹۳۱ء، ۱: ۲۳ تا ۳۲، ۲: ۱۰۲ تا ۱۰۶، (کتبات طبع (P. Wittek) : (۱۱) L'Émirat d' Aydin, Byzance et l'Occident : Recherches sur "La Geste d'Umur Pacha" (Bibliothèque Byzantine Etudes, عدد ۲)، پیرس ۱۹۵۷ء، ص ۲۱ بعد، ۲۵۸ (بعد اشاریہ)؛ (۱۲) ایم۔ فواد کوہرولو زاده : آیدین اوغلری تاریخہ عائد در ترکیات مجموعہ سی، ۲ : استانبول ۱۹۲۸ء : ۳۲۲؛ (۱۳) اوزون چارشیلی : کتابہ لرانو دلو ترک تاریخی وثیقہ لرنڈن ایکنجی کتاب، استانبول ۱۹۲۹ء، ص ۱۰۵ بعد؛ (۱۴) ہمت آتین Himmet Akin : آیدین اوغلری حقدہ بیراراشترمه (اقرہ یونیورسٹی سی دل و تاریخ - جغرافیا فاکولتہ سی یا پتلی، عدد ۶)، استانبول ۱۹۳۶ء، ص ۱۰۳ بعد؛ (۱۵) V. Cuinet : La Turquie d'Asie، پیرس ۱۸۹۳ء : ۵۱۶ بعد؛ (۱۶) سامی : قاموس الأعلام، ۲، استانبول ۱۳۰۶ھ : ۱۲۸۵؛ (۱۷) علی جواد : تاریخ و جغرافیا لغتی، استانبول ۱۳۱۳ تا ۱۳۱۴، ص ۱۶۹؛ (۱۸) Pauly-Wissowa، ج ۳، حصہ اول (۱۸۹۹ء)، بذیل مادہ Christopolis : عمود ۲۳۵۲ و ۱/۳، ۱۹۰۵ء، بذیل مادہ Dios Hieron : عمود ۱۰۸۳ تا ۱۰۸۴؛ (۱۹) لوی، ترکی، بذیل مادہ برگی (از ہسم دار کوت)۔*

(V. J. PARRY)

• برلام اور جوزاقت : راکہ بہ پلوھر و یوڈانسف [یوڈانسف]۔

• برلس : Borollos، مصر کے ڈیلٹا کے شمال

الہرّوی نے جو رسول کریم ﷺ کے بارہ صحابہؓ کے مقبروں کا ذکر کیا ہے اس سے غالباً کسی عرب فتح کی طرف اشارہ مقصود ہے، اگرچہ روایات کے مطابق برلس کے حوالہ نے عربوں سے سمجھوتہ کر لیا تھا تاہم یہ ممکن ہے کہ ۵۵۳/۶۷۳ء میں بوزنطیوں کے ساحل پر اترنے کے بعد کچھ جنگیں ہوئی ہوں۔ کئی اہل علم البرلسی کی نسبت سے مشہور ہیں۔ برلس کے باشندے سراغ رسانی میں مہارت کے لیے مشہور تھے:

مآخذ: (۱) ابن عبدالحکم، ص ۸۵ و ۱۲۴؛ (۲) الیعقوبی، ص ۳۳۸؛ ترجمہ Wiet، ص ۱۹۵؛ (۳) ابن حوقل، بار دوم، ص ۱۳۸ تا ۱۳۹؛ (۴) الہرّوی، ص ۴۷، مترجمہ Sourdel-Thomine، ص ۱۱۰؛ (۵) یاقوت، ۱: ۵۹۳؛ (۶) ابن بطوطہ، ۱: ۵۸، مترجمہ Gibb، ۱: ۳۵؛ (۷) ابن دُقمق، ۵: ۱۱۳؛ (۸) المستطرف، ۱: ۱۰۱؛ مترجمہ Rat، ۲: ۱۷۶؛ (۹) المقرئیزی، طبع Wiet، ۱: ۱۱۳ و ۲: ۹۲، ۹۶، ۹۷ و ۹۸؛ ۳: ۱۳۲ تا ۱۳۳ و ۳: ۳۹، ۸۱؛ (۱۰) الظاہری، ص ۱۰۸؛ مترجمہ Venture de Paradis، ص ۱۸۰؛ (۱۱) *Materiaux pour servir à la géographie de l'Égypte*، ص ۳۶، ۴۱، ۴۳، ۲۱۱؛ (۱۲) عمر طوسون: *La géographie de l'Égypte, dans Mémoires de la société royale de géographie de l'Égypte*، ۸: ۱۸، ۵۲، ۶۸، ۲۲۳؛ (۱۳) عبداللطیف، ص ۷۰۸؛ (۱۴) النوبیری: *نہایۃ الأرب*، ۸: ۲۶۳؛ ۱۰: ۳۲۳؛ (۱۵) السمعانی: *الانساب*۔

(G. WIET)

\* برما: یہ ملک پہلی بار اراکان کے بادشاہ نرامیہ کلا (Narameihkla) کے ذریعے بڑے پیمانے پر اسلام سے متاثر ہوا۔ یہ بادشاہ بنگال میں جلا وطنی کے ایام گزار کر اپنے مسلمان پیرووں کے ساتھ ۱۴۳۰ء میں برما واپس آیا۔ اس نے

مروہانگ Mrohaung میں اپنا دارالحکومت قائم کیا، جہاں مسجد سنّدی خان تعمیر کی گئی۔ بعد میں آنے والے اراکانی بادشاہ اگرچہ بدھ مت کے پیرو تھے لیکن انہوں نے اسلامی خطابات استعمال کیے بلکہ ایسے تمنّے بھی جاری کیے جن پر کلمہ طیبہ نندہ تھا۔ جب ۱۶۶۰ء میں عالمگیر کے بھائی شاہ شجاع نے اراکان کی طرف راہ فرار اختیار کی تو وہاں اسلامی اثرات اور بھی بڑھ گئے۔ شاہ شجاع کو وہاں کے بادشاہ سنّہ تھودمہ (Sandathudamma) نے قتل کر ڈالا اور اس کا خزانہ ضبط کر لیا، لیکن اس کے ساتھیوں کو شاہی پاسبانوں میں تیر اندازوں کے طور پر ملازم رکھا اور اس حیثیت سے انہوں نے کئی بار وہاں کے بادشاہوں کے عزل و نصب میں حصہ لیا۔ ان مغل درباریوں کی اولاد آج تک دوسروں سے متمیز رہی ہے۔ برما خاص میں مسلمانوں کی آبادی چند گجراتی تاجروں اور بعض توپچیوں اور دیگر غیر ملکی فنی ماہرین پر مشتمل تھی، جنہیں شاہانِ آوا Ava نے اپنی ملازمت میں جبراً بھرتی کر لیا تھا۔ ۱۸۲۶ء میں جب برطانوی حکومت نے اراکان کا اپنی سلطنت سے الحاق کر لیا تو ساحلی شہروں خصوصاً آکیاب میں چٹاگانگ سے مسلمان بہ کثرت آنا شروع ہو گئے۔ جنوبی برما کے الحاق (۱۸۵۲ء) کے بعد ۱۸۸۰ء سے ہندوستانیوں کی برما میں نقل مکانی بڑے پیمانے پر ہونے لگی۔ ۱۹۳۱ء کی سر شماری (یہ آخری سر شماری تھی جو پوری تفصیل کے ساتھ پایہ تکمیل کو پہنچی) میں برما کی کل آبادی ۱۴۶۶۷۱۴۶ اور اس میں مسلمانوں کی آبادی ۵۸۴۸۳۹ تھی۔ ان مسلمانوں میں سے ۳۹۶۵۰۴ ہندی الاصل تھے، ۱۴۷۴ چینی (پنتھے Panthay) اور ۱۸۶۸۶۱ مقامی نو مسلم، بیشتر اراکانی، تھے، مسلمان اراکانی برطانوی حکومت کے شروع کے عہدیداروں اور



پولیس کے عمال میں شامل تھے، انہوں نے اعلیٰ تعلیم سے فائدہ اٹھایا اور ان میں سے بہت سے سرکاری ملازمت، بینک کے کاروبار اور تجارت میں نمایاں تھے۔ ساحلی اور دریائی دکانی جہازوں کے قریب قریب تمام ملاح چائنگسی مسلمانوں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے۔ خوردہ فروشی میں اسمعیلی (خوجی) اور گجراتی مسلمان چھانے ہوئے تھے۔ ۱۹۳۰ء سے شروع ہونے والے دس سال کساد بازاری کے تھے اور مسلمان، جو اقتصادیات کے میدان میں دوسروں سے آگے تھے، ایک حد تک لوگوں کا ہدف ملامت بن گئے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۸ء میں تشدد آمیز فسادات برپا ہوئے۔ مؤخر الذکر فسادات جولائی سے دسمبر تک جاری رہے اور رنگون اور ماندلے میں سب سے زیادہ شدید تھے۔ ان میں تقریباً دو سو مسلمان ہلاک ہوئے۔ جاپانیوں کے حملے (۱۹۴۲ء) کے بعد بہت سے ہندوستانی یہاں سے بھاگ نکلے، ان میں سے کچھ جنگ کے بعد واپس آ گئے لیکن ان کی تعداد پہلے کی بہ نسبت کم ہو گئی ہے۔ ۱۹۵۸ء میں مسلمانوں کی کل آبادی ۱۹۳۱ء کے مقابلے میں غالباً کسی قدر زیادہ اور شاید چھ لاکھ تھی (۱۹۵۳-۱۹۵۴ء کی سرشماری بالکل نامکمل ہے)۔ ان میں سے نصف پاکستان اور بھارت کے باشندے ہیں۔ ایک سیاسی تنظیم برما مسلم کانگریس کے نام سے ۱۹۴۵ء میں قائم کی گئی، جس کا تعلق سرکاری مخلوط (Coalition) جماعت "اینٹی فاشسٹ پیپلز فریڈم لیگ" سے ہے۔ آزادی کے بعد عرصے سے دو مسلمان کابینہ وزارت کے ارکان رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو ایم۔ اے رشید (ولادت ۱۹۱۲ء) ایک ممتاز ٹریڈ یونینسٹ اور تاجر ہیں اور دوسرے اوکھن مانگ لت U Khin Maung Lat (عبداللطیف، ولادت ۱۹۱۳ء) وکیل ہیں۔ آزاد برما کے

قائدین، جن میں اوٹو UNu پیش پیش ہیں، اپنی بدھ میراث پر بہت زور دیتے ہیں؛ مسلمان مساوی درجے کے شہری تسلیم کیے جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ خوشگوار تعلقات میں خلل انداز ہونے والے کئی محرکات موجود رہے ہیں۔ شمالی اراکان میں مجاہدوں کی بغاوت کا مقصد یہ تھا کہ اس علاقے کا الحاق پاکستان سے ہو جائے۔ اس بغاوت کا قائد قاسم نامی ایک ماہی گیر تھا۔ مجاہدوں نے ۱۹۳۸ سے ۱۹۵۴ء تک بوتھی ڈانگ Buthidaung سے مانگ ڈاؤ Maungdaw تک کے علاقے کو خوف زدہ بنائے رکھا۔ لیکن جب قاسم پاکستان میں قید ہو گیا تو ان کی سرگرمیاں بڑی حد تک کم ہو گئیں۔ ستمبر ۱۹۵۴ء میں ملک میں ایک سیاسی بحران سا پیدا ہو گیا تھا، جس کا باعث سرکاری مدارس میں اسلامیات کی تعلیم کے خلاف بھکشوؤں کا احتجاج تھا۔ لیکن عام طور پر باہمی تعلقات خوشگوار ہیں۔ اراکان میں، جہاں بدھوں اور مسلمانوں کی مخلوط آبادی ہے، بدھوں نے بہت سی اسلامی رسوم اپنا لی ہیں، حتیٰ کہ گلے کا گوشت بھی کھاتے ہیں۔ لیکن جنوبی برما میں عید کے موقع پر جانوروں کی قربانی اور گلے کا گوشت کھانے کو روکنے کے عملی اقدام کیے جاتے ہیں۔ مارچ ۱۹۵۳ء میں قانون "فسخ نکاح مسلمانان برما" منظور ہوا، جس کی رو سے مسلمان عورتوں کو بدھ عورتوں کے مساوی حقوق مل گئے، یعنی اپنے خاوندوں کو طلاق دینے کا مساوی موقع اور فسخ نکاح کے بعد شادی کا جہیز اپنی ملکیت میں رکھنے کا حق۔ برما سے باہر اس قانون کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی لیکن برما مسلم کانگریس نے اسے قبول کر لیا۔ برما میں شادی شدہ مسلم خواتین چہرے پر نقاب نہیں ڈالتیں۔ ۱۹۵۵ء میں اوٹو نے بحیثیت وزیر اعظم قرآن مجید کا

برن : بلند شہر [رک بان] کا قدیم نام۔

برنڈاس : رک بہ انجیل۔

برنتہ : ایک اصطلاح، جو ترکی دنیا کے مشرقی

حصے (تلیوت، قرغز، قزاق، وغیرہ) میں مستعمل ہے

اگرچہ آج کل پرانی طرز کی سمجھی جاتی ہے۔ (اس

لفظ کی مختلف شکلوں کے لیے قب برمتہ، برمتہ،

برمتہ، پرنٹی، برمتاد اور برمتای)۔ کچھ شکلیں، جو

بعض ماخذ میں ملتی ہیں، ابھی تک پوری

طرح سمجھ میں نہیں آئیں، تاہم شیخ سلیمان

کا برنت اور ایچ۔ کے قدری کا برتا ضرور غلط ہیں۔

برنتہ کے معنی عموماً غارت گری، اٹھائی گیری،

تاراج کرنا، لے بھاگنا اور لوٹ لینا لیے جاتے ہیں،

نیز نسی قرض خواہ یا ستائے ہوئے شخص کا انتقاماً اپنے

مد مقابل پر حملہ کر کے اس کے پالتو جانور، مویشی

وغیرہ پکڑ لے جانا اور یہیں سے اس کے معنی

”مویشیوں کی چوری“ ہو گئے۔ اس سے متعلقہ الفاظ کے

لیے قب ”برمتہ جی (سی)“ (= ڈھولے جانے والا لٹیرا)،

”پرنٹی جی“ (= اچکا)، ”برمتلا“ (= اپنا حق لوگوں

کے جانور ہانک لے جا کر وصول کرنا، چھاپا مارنا)،

”برمتلاش“ (= جائداد کے لیے باہم جھگڑنا)، ”یاردی

مین یولداش بولغونچوبای مین برمتلاش“ (ایک

مفلس کی دوستی کے سبب ایک مالدار سے لڑنا)۔

یہ لفظ روسی زبان میں بھی اسی معنی کے

ساتھ داخل ہو گیا ہے۔ baranta (= انتقام—بدلے

میں قتل کرنا، لوٹ لے جانے کے بدلے میں جانور

ہانک لے جانا، چھاپا مارنا، غارت کرنا وغیرہ)

اور اس کے مشتقات barantary، barantovscik (= دشمنانہ

تاخت میں حصہ لینے والا، ڈاکو)؛ Barantoviy (= غارت

سے متعلق)؛ barantovat (= تاخت کرنا) وغیرہ۔

Russ. etym. Wb.) M. Vasmer ہانڈل برگ

۱۹۵۰ء، یہ دیکھ کر کہ روسی barantia مشرقی روس

اور قفقاز میں مستعمل ہے، کہتا ہے کہ یہ لفظ ترکی

برمی زبان میں ترجمہ کرنے کے ایک منصوبے کا

آغاز کیا۔ [۴ جنوری ۱۹۳۸ء کو یونین آف برما کا

قیام عمل میں آیا اور آخری برطانوی گورنر

Sir Habert Rance نے زمام اقتدار جمہوریہ برما کے

پہلے صدر Sao Shwe Thaik کے سپرد کر دی۔ ۲ مارچ

۱۹۶۲ء کو جنرل نی ون Ne Win نے حکومت کا

تختہ الٹ کر انقلابی حکومت قائم کی اور صدر کا

عہدہ سنبھال لیا۔ آج کل برما کا رقبہ ۲۶۱۷۸۹

مربع میل ہے۔ پاکستان سے سرحدوں کی تعیین

۱۹۶۳ء میں ہوئی۔ ۱۹۶۶ء میں کل آبادی

۲۵۲۳۶۰۰۰ تھی (مسلمان : تقریباً تیس لاکھ)۔

رنگون دارالحکومت ہے۔ دوسرے دو بڑے شہر

مانڈلے اور مولین ہیں۔ بدھ مت اب حکومت کا

مذہب نہیں رہا۔ ذریعہ تعلیم برمی زبان ہے

اور پرائمری تک تعلیم مفت ہے۔ برما کا سکہ

کیات Kyat ہے جو ڈیڑھ شلنگ کے برابر ہے

(ایک ڈالر = ۳۰۷ کیات)۔ ۱۹۶۳ء سے تمام بینک

قومیا لیے کئے ہیں۔ برما کے پاکستان سے سفارتی

تعلقات قائم ہیں۔]

ماخذ: (۱) ہندوستان کی سر شماری رپورٹ،

۱۹۳۱ء، ج ۱۱، (برما)، رنگون ۱۹۳۳ء؛ (۲) H. Tinker:

The Union of Burma، لنڈن ۱۹۵۷ء؛ [مزید حالات

اور ماخذ کے لیے دیکھیے (۳) SYB، ۱۹۶۷-۱۹۶۸ء،

ص ۸۶۸ بعد اور (۴) انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا، بذیل

Burma؛ (۵) Statesman's Year Book، ۱۹۶۷-۱۹۶۸

۔ [۱۹۶۸ء]

H. TINKER (و ادارہ)

برمک (آل) : رک بہ برامکہ۔

برمکیہ : رک بہ برامکہ۔

برمنی : رک بہ برما۔

برمہ : رک بہ برما۔



مبانی کی تبدیلی اور اقتصادی حالات کے تغیر سے، دیگر بہت سے عوامی دستوروں کی طرح جن کی بنیاد رسم و رواج پر قائم تھی، برنتہ بھی اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ اس لفظ کے مفہوم میں آہستہ آہستہ تنزل واقع ہوتا رہا اور اس کے معنی محض چوری کے رہ گئے۔

پھر بھی محدود حلقوں میں جہاں ابھی تک پرانے رسم و رواج موجود ہیں برنتہ کا نظام ابھی تک قائم ہے اور ملکی قانون یہ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اس کے وجود کو تسلیم کرے، مثلاً ۱۶ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو روسی مرکزی انتظامی محکمے (VTSIK) نے خود مختار جمہوریہ قزاقستان اور اویرات کے علاقوں میں مروجہ قانون کے خلاف جرائم کے سلسلے میں برنتہ کے نظام کا مطالعہ تین عنوانوں کے تحت کیا: معمولی، مسلح اور قبائلی۔

مآخذ: متن مقالہ میں ذکر کردہ مآخذ کے علاوہ دیکھیے: (۱) V. Barthold اور عبد اللہ عنان، در (۱)، ترکی، مادۂ برنتہ؛ (۲) Radloff: Wh. (۱۸۹۳ تا ۱۹۱۱ء)؛ (۳) Budagov: *Sravn. slov. tur.*؛ (۴) Bukin: *Rus. Kirg. tat. nar.*؛ (۵) غنی زادہ: *Rus.-tat slov.*؛ (۶) K. K. Yudaxin: قرغیز سوز لغو (ترکی ترجمہ از تیماس A. Taymas)، انقرہ ۱۹۴۵ء؛ (۷) A. N. Čudinov: *Sprav. slov.*؛ (۸) N. V. Goryaev: *Sravn. etimol. slov. russ. yaz.*؛ (۹) I. Y. Pavlovsk: *Russko-nemetsk.*؛ (۱۰) Kovalevskiy: *Mong.-slov.*؛ (۱۱) I. J. Schmidt: *russ.-frans. slov.*؛ (۱۲) *Mong.-Deutsch.-Russ Wh.*؛ (۱۳) F. Boberg: *Mong.-Engl. Dict.*؛ (۱۴) *Sibirsk. sovietsk. entsiklop.*؛ (۱۵) *Entsiklop. slov.*؛ اور ۱۸۰۱ء اور ۱۸۰۵ء؛

سے لیا گیا ہے، جہاں یہ مغولی سے آیا (دیکھیے مغولی لغات میں *barim*، *barimda* (= ہاتھ سے مضبوط پکڑنا)، *barimdalagu* (= قبضے میں آ جانا، مضبوط گرفت میں آنا، محفوظ رکھنا، پالنا)، *barimdalal* (= مضبوط پکڑنے کا فعل، نیز جکڑنے وغیرہ کا)، قَب بالخصوص: *Kalm. Wb.*: G. J. Ramstedt (Helsinki ۱۹۳۵ء)؛ *bärmta* (= گرفت کرنا، مضبوط پکڑنا، حملہ کرنا، چڑھ دوڑنا)، *b. keɣa* (= تاخت پر جانا تاکہ دشمن سے آئندہ حملوں کی ضمانت لے لی جائے)، *bärmtlyv* (= لے لینا، مضبوط تھام لینا) *bärütč*، *bärä* (قَب) وغیرہ)۔

یہ بالکل صاف ہے کہ خانہ بدوش ترکی قوموں میں یہ لفظ کبھی ایک خاص قانونی تصور کا حامل تھا؛ ترکی میں مغول کی طرح اس میں عہد و پیمان اور ضمانت کا مفہوم پایا جاتا ہے اور ہمارے مآخذ سے ظاہر ہوتا ہے کہ برنتہ صرف کسی خاص غرض کے لیے کام میں لایا جاتا تھا اور اس سے کام لینے کے لیے کچھ قاعدے بھی مقرر تھے۔ ایک ستایا ہوا شخص اپنا حق واپس لینے کے لیے اپنے مخالف کے مال کے ایک حصے پر قبضہ کر لے تو اس کا یہ فعل برنتہ کہلائے گا۔ اس مال کا واپس کرنا مخالف پارٹیوں کے درمیان عدالتی کارروائی کے فیصلے پر موقوف ہوتا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ باہمی برنتوں سے بعض اوقات زیادہ بڑی جماعتیں بھی متاثر ہوتی تھیں۔ ضابطے کا تقاضا یہ تھا کہ باہمی جھگڑے کے لیے برنتہ دن کے وقت اور پہلے سے اطلاع دے کر کیا جانا چاہیے۔ برنتہ میں کسی خانہ بدوش خاندان کے نوجوانوں کو اپنی بہادری، ہوشیاری اور نئی نئی ترکیبیں نکالنے کا موقع بھی مل جاتا تھا اور اس طرح اپنے کارنامے دکھا کر وہ 'بہادر' کا لقب حاصل کر لیتے تھے اور ان کی بڑی عزت کی جاتی تھی۔ معاشرے کے

Der. Grosse Brockhaus، لائپزگ ۱۹۲۹ء۔

(R. RAHMETI ARAT)

\* برنی : رَک بہ بن غازی۔

\* برنی : ضیاء الدین، سلاطین (دہلی) کے زمانے

کا مؤرخ اور نظم و نسق حکومت پر لکھنے والا، اس کی پیدائش ۵۶۸۴ / ۱۲۸۵ء سے بعد کی نہیں تھی (بلکہ غالباً اس سے ذرا پہلے ہی کی تھی، کیونکہ

علاء الدین خلجی کے دور حکومت (۵۶۸۹ / ۱۲۹۰ء تا ۵۶۹۵ / ۱۲۹۶ء) میں اس کی عمر اتنی تھی کہ اسے اس زمانے کی مجالس و محافل کا دیکھنا یاد

تھا اور وہ پورا قرآن کریم پڑھ چکا تھا۔ دہلی کے امرا و عمائد سے برنی کے بہت اچھے تعلقات

تھے۔ اس کا والد مؤید الملک سلطان جلال الدین کے

دوسرے بیٹے آر تلی [ار لیک] خان کا نائب تھا

اور سلطان علاء الدین خلجی کی حکومت کے پہلے ہی

سال وہ برن کا نائب اور "خواجہ" بن گیا تھا۔

برنی کا چچا ملک علاء الملک علاء الدین خلجی کے

عہد میں دہلی کا کوتوال اور ایک ممتاز شاہی

مشیر تھا۔ اس کے نانا سپہ سالار حسام الدین کو،

جو ملک بار بک [کشلو خان] کا وکیل دار تھا،

سلطان بلبن نے لکھنوتی کی شحکی کے منصب پر

ماسور کیا تھا۔

خود برنی بھی سترہ سال اور تین مہینے تک

سلطان محمد بن تغلق (۵۲۵ / ۱۳۲۵ء تا ۵۵۲ /

۱۳۵۱ء) کا درباری رہا۔ سیرالاولیاء میں اسے ایک

دلچسپ اور خوش بیان ندیم اور امیر خسرو اور

امیر حسن کا دوست بتایا گیا ہے۔

فیروز شاہ تغلق (۵۵۲ / ۱۳۵۱ء تا ۵۹۰ /

۱۳۸۸ء) کے آغاز حکومت میں برنی کو دربار سے

برطرف کر دیا گیا تھا اور اس کے اپنے بیان کے

مطابق، جو نعت محمدی میں ملتا ہے، وہ کچھ

عرصے پھتیز کے قلعے میں مقید رہا۔ یہ قیاس

ممکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواجہ جہان احمد  
ایاز کی اس سازش میں شریک رہا جو اس زمانے  
میں محمد بن تغلق کے ایک نابالغ بیٹے کو  
فیروز تغلق کے تخت پر متمکن کرنے کی غرض سے  
کی گئی تھی جب وہ (فیروز تغلق) اور [شاہی] فوج  
محمد بن تغلق کی اس مہم سے پیچھا چھڑا کر  
واپس آ رہی تھی جو اس نے ٹھٹھہ کے خلاف  
بھیجی تھی [سازش میں شرکت محل نظر ہے]۔

برنی نے اپنی باقی عمر کس مہم اور عسرت

میں بسر کی اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہا۔

۵۵۸ / ۱۳۵۷ء کے لچھ عرصے بعد اس کا انتقال

ہو گیا اور وہ غیاث پور میں نظام الدین اولیاء

کے مزار کے قریب دفن ہوا۔ برنی کی تصانیف میں

چار کتابیں اہم ہیں: تاریخ فیروز شاہی،

فتاویٰ جہانداری، نعت محمدی اور برمکیوں سے

متعلق حکایات کا ترجمہ بعنوان اخبار برمکیاں۔

[فتاویٰ جہانداری ادارہ تحقیقات پاکستان لاہور کے

زیر اہتمام چھپ چکی ہے (۱۹۶۹ء)۔]

حکومت کے موضوع پر ہندوستان کے مسلمان

مفکرین میں برنی کی حیثیت ممتاز اور اہم ہے

تاریخ اسلام میں صرف خلفائے راشدین کو معیاری

حکمران تسلیم کرتے ہوئے برنی نے فتاویٰ جہانداری

اور تاریخ فیروز شاہی کے ذریعے اپنے عہد کے

سلاطین کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ

اسلام کی جانب سے ان کے فرائض کیا ہیں۔ برنی

نے فتاویٰ جہانداری میں سلاطین کو شریعت

نافذ کرنے، بدعات خصوصاً گمراہ کن فلسفیانہ

خیالات کے ختم کرنے، کفار کا استیصال کرنے،

صرف صاحب تقویٰ لوگوں کو ملازم رکھنے کی

تلقین کی ہے اور شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ ساتھ

خوف خدا اور عجز و نیاز پر بھی زور دیا ہے۔

[یہ کتاب برنی کے سیاسی نظریات کا مرقع ہے]۔



حبيب الله: *Re-evaluation of the Literary Sources of Pre-Mughal History*, در IC، اپریل ۱۹۴۱ء، ص ۲۰۹ تا ۲۱۳؛ (۸) ایس۔ نورالحسن: *Sahifa-i-Na't-i-Muhammadi of Ziya al-Din Barni*، در *Medieval Indian Quarterly*، ۱ و ۳ و ۴، ۱۹۵۴ء، ص ۱۰۰ تا ۱۰۵؛ (۹) ایس۔ معین الحق: *Some Aspects of Ziya al-Din Barni's Political Thought*، در *Journal of Pakistan Historical Society*، ۱/۳، جنوری ۱۹۵۶ء، ص ۳ تا ۲۶؛ (۱۰) P. Hardy: *The Oratio Recta of Barani's Ta'rikh-i Firuz Shāhi—Fact or Fiction?*، در *BSOS*، ۱۹۵۷ء، ۲۰: ۳۱۵ تا ۳۲۱؛ (۱۱) ضیاء الدین برنی: فتاویٰ جہانداری، دیباچہ از محمد حبیب اور انگریزی ترجمہ از افسر جہاں سلیم، در *Medieval Indian Quarterly*، ج ۱/۳ و ۲، علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۱ تا ۸۷، نیز طبع لاہور ۱۹۶۹ء؛ (۱۲) مقبول بیگ بدخشانی: ضیا برنی کے سیاسی نظریات، در ماہنامہ ثقافت، لاہور۔

(P. HARDY [و ارادہ])

⊕ البروج: قرآن مجید کی پچاسویں سورت کا نام، جو ابتدائی مکی زمانے میں نازل ہوئی۔ اس میں ایک ر نوع اور بائیس آیتیں، ایک سو نو کلمات اور چار سو اٹھاون حروف ہیں۔ بروج کے معنی ہیں ستارے، چنانچہ ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ بروج کیا چیز ہیں تو آپ نے فرمایا الکواکب یعنی ان سے ستارے مراد ہیں، اس لیے مجاہد نے بھی اس کے معنی ستارے کیے ہیں (ابن جریر)۔ پھر بروج کے معنی ہیں ستاروں کی گردش کی جگہیں اور ان کے دائرے، منازل شمس و قمر (معجم غریب القرآن)۔ اس کا مفرد برج ہے اور برج ہر نمایاں اور بلند چیز کو کہتے ہیں اور شہر کے برج اس کے قلعے ہیں، جو شہر کی فصیل

تاریخ فیروز شاہی میں، جسے برنی نے فیروز شاہ تغلق کے نام سے منسوب کیا ہے اور جس کا انداز نمایاں طور پر اخلاق آموز ہے، یہ تاریخ بلبن کے دور حکومت (۵۶۶۳/۱۲۶۶ء تا ۵۶۸۶/۱۲۸۷ء) کے آغاز سے فیروز شاہ تغلق کی حکومت کے چھٹے سال تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ سلاطین دہلی میں سے ہر ایک کے حالات و واقعات حکایاتی انداز میں بیان کیے گئے ہیں اور حکایت یا واقعے کے اچھے یا برے انجام سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ سلطان کی کامیابی یا ناکامی ان مذہبی و سیاسی نظریات کی پابندی یا عدم پابندی پر منحصر ہے جو برنی نے پیش کیے ہیں۔ مثال کے طور پر سلطان علاء الدین خلجی کو اس اعتبار سے ایک کامیاب حکمران بتایا گیا ہے کہ اس نے ہندوؤں کو مطیع کیا، فتنہ و فساد پر غلبہ حاصل کیا، شراب کو ممنوع قرار دیا اور یتیموں اور نرخوں کو دم نثر کے معاشی زندگی کو مستحکم کیا، لیکن برنی کے خیال میں وہ دین دار نہ تھا، وہ شعائر مذہبی کا پابند نہیں تھا، اس نے ادنیٰ قسم کے لوگوں کو ملازم رکھا اور دین دار لوگوں کی صحبت سے اجتناب کیا، خصوصاً حضرت نظام الدین اولیاء کی صحبت سے جن کے میامن و برکات ہی اس کے عہد کی شان و شوکت کا اصل سبب تھے۔

مآخذ: (۱) Storey، ۱/۱: ۵۰۵ تا ۵۰۹، ۲/۱: ۱۳۱۱؛ (۲) فتاویٰ جہانداری، ابتھے Été، عدد ۲۰۶۳؛ (۳) نعت محمدی: رضا لائبریری، رام پور، مخطوطہ، عدد تاریخ ۱۲۷؛ (۴) اخبار برمکیان یا تاریخ آل برمک، طبع سنگی، بمبئی ۱۸۸۹ء؛ (۵) سید حسن برنی: ضیاء الدین برنی، در اسلامک کلچر، جنوری ۱۹۳۸ء، ص ۷۶ تا ۹۷؛ (۶) شیخ عبدالرشید: ضیاء الدین برنی، در *Muslim University Journal*، علی گڑھ ۱۹۴۲ء، ص ۲۳۸ تا ۲۷۸؛ (۷) ای۔ بی۔ ایم

الاحكام القرآن؛ (۵) الشوكاني: فتح القدير، بذيل سورة  
البروج [۸۵]؛ (۶) البخاري، كتاب تفسير القرآن، باب  
سورة البروج؛ (۷) الترمذي، ابواب تفسير القرآن، سورة  
البروج؛ (۸) امير علي: تفسير مواهب الرحمن، ۳۰:  
۲۸۲ تا ۳۱۳؛ (۹) لسان العرب؛ (۱۰) المفردات.

(عبدالقيوم)

البروج: رك به علم نجوم.

بروجرد: (يا بروجرد) ايران کے چھٹے آستان

(لرستان) میں ایک شہر، جو حرم آباد کے راستے  
همدان سے آہواز جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ یہ  
"فرمان دار" (ڈپٹی گورنر) کا صدر مقام ہے۔  
یہاں کی آبادی سینتالیس ہزار ہے۔

بروجرد ایک وسیع اور خوب زرخیز میدان میں  
واقع ہے، جس کی مغربی سرحد کوہستان زگروس  
Zagros ہے۔ گرمی میں یہاں کا موسم معتدل ہوتا  
ہے، لیکن جاڑے میں سردی ہو جاتی ہے۔ یہاں  
کوئی نو سو دکانیں ہیں، جن میں سے اکثر یہاں  
کے دو بڑے بازاروں میں واقع ہیں۔ جامع مسجد  
مغولی عہد کی بنی ہوئی ہے۔ سلجوق شہزادہ  
برکیاروق [رك باں] نے بروجرد ہی کے مقام پر ۵۴۸۵/  
۱۰۹۲-۱۰۹۳ء میں اپنی ماں ترکان خاتون کی  
فوج کو شکست دی تھی، جو اپنے خاوند ملک شاہ  
کی وفات کے بعد اپنے چھوٹے بیٹے محمود کی حمایت  
میں اٹھی تھی۔

مآخذ: (۱) یاقوت، ۱: ۲۸۸ تا ۲۸۹؛ (۲)

Travels in Luristan and Arabistan: de Bode، ۲:

۳۰۲ تا ۳۰۷؛ (۳) Early Adventures: A. H. Layard، ۳:

۱۸۸۷، لندن، in Persia, Susiana and Babylonia

Journeys in: Mrs. Bishop، ۳: ۲۹۱ تا ۲۸۸؛ (۴)

Persia and Kurdistan، لندن ۱۸۹۱ء، ۲: ۱۳۰ تا

۱۳۲؛ (۵) سرتیپ رزم آرا و سرتیپ نوتاش: فرهنگ

جغرافیہ ایران، تہران ۱۳۳۰ ش / ۱۹۵۱ء، ۶: ۳۷۔

(L. LOCKHART)

پر بنائے جاتے ہیں۔ آسمان کے برج اس کے ستارے ہیں۔  
قصر اور محل کو بھی برج (رك باں) کہتے ہیں  
(تاج العروس)؛ اور اسی مادے سے ہے تہرج بمعنی  
عورتوں کی زیب و زینت اور اظہار محاسن۔

بقول الزمخشری جب مشرکین مکہ کی طرف  
سے مسلمانوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جانے  
لگے تو اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں مسلمانوں کو  
صبر و ثابت قدمی کی تلقین فرمائی اور بتایا کہ  
پہلی قوموں نے بھی ایمان والوں کو بڑی تکلیفیں  
اور اذیتیں پہنچائی تھیں، کفر اور ایمان کی  
شمشکس ہمیشہ سے چلی آتی ہے، لیکن بالآخر فتح  
ایمان والوں کی ہوتی ہے اور وہی آخرت میں بھی  
ایمان و عمل صالح کے صلے میں جنت کے وارث  
ہوں گے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو مومن مردوں  
اور عورتوں کو تکلیفیں دیتے ہیں، پھر توبہ بھی  
نہیں کرتے تو ان کے لیے جہنم کی بھڑکتی ہوئی  
جلا دینے والی آگ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس بات پر  
قدرت ہے؛ اور مثال کے طور پر فرعون و ثمود کی  
قوموں کا انجام مومنوں کے سامنے رکھا تاکہ وہ  
ایمان و ایقان میں پختہ رہیں۔ اس میں یہ سبق  
بھی ہے کہ اہل ایمان کو دلو دینے کا نتیجہ کبھی  
اچھا نہیں نکلا کرتا۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی  
سخت گرفت کرتا ہے اور مومنوں کو فتح و نصرت سے  
نوازتا ہے۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کے جلال و  
جمال کے نشی پہلویان لیے گئے ہیں، مثلاً بطش  
شدید، ابداء و اعادہ، مغفرت و ود، عرش مجید،  
قدرت کاملہ، قرآن مجید، لوح محفوظ وغیرہ۔  
احادیث میں مذکور ہے کہ حضرت نبی کریم صلی  
اللہ علیہ وسلم اس سورت کو نماز ظہر و عصر اور  
عشا میں پڑھا کرتے تھے۔

مآخذ: (۱) الطبری: تفسیر؛ (۲) الرازی: تفسیر

کبیر؛ (۳) الزمخشری: الکشاف؛ (۴) القرطبی: جامع



• بروج : رَکْ به بھڑوچ۔

• بروج : رَکْ به برسہ۔

⊕ برونئی : Brunei، جسے اس کے باشندے دارالسلام بھی کہتے ہیں۔ بورنیو Borneo کے شمال مغربی ساحل پر ۴ درجہ ۲ دقیقہ اور ۵ درجہ ۳ دقیقہ شمال اور ۱۱۴ درجہ ۴ دقیقہ اور ۱۱۵ درجہ ۲۲ دقیقہ مشرق کے درمیان ایک علاقہ، جس کا رقبہ ۲۲۲۶ میل اور آبادی [۱۱۸۴۵۲] ہے۔ اس میں چھتر فی صد مسلمان ہیں۔ دارالحکومت کا نام بھی برونئی ہے، جو اسی نام کے دریا کے دہانے سے نو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ سنٹا پور سے بحری مسافت کے لحاظ سے سات سو اٹھاون میل دور ہے۔

برونی برطانیہ کے زیرِ حمایت ہے۔ کسی زمانے میں یہ مملکت بڑی طاقتور تھی اور اس کے حکمرانوں کا تسلط بورنیو Borneo کے ایک بہت بڑے حصے اور ملحقہ جزائر پر تھا۔ اس کے سب سے پہلے مسلمان بادشاہ یا سلطان کا نام اوانگ آلک بیتر Awang Alak Betar (انسائیکلوپیڈیا بریٹینیکا میں Alak-ber-Tata، بذیل مادہ) تھا۔ وہ اسلام لانے سے پہلے نویں صدی/پندرھویں صدی میں یہاں کا حکمران تھا۔ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اس نے اپنا نام محمد رکھا۔ اس کے اسلام لانے کا واقعہ یہ ہے کہ وہ ۵۸۲۸/۱۴۲۵ء میں سلطان محمد شاہ سے ملنے ملاکا Malacca گیا تو اسلام کی تعلیمات اور توحید سے اتنا متاثر ہوا کہ اسلام قبول کر لیا۔ اس کے عہدِ حکومت میں سلطان برکت نام ایک عرب عالم و مبلغ برونئی آیا اور اسلام کی تبلیغ میں منہمک ہو گیا۔ اس کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں برونئی کے طول و عرض میں اسلام پھیل گیا۔ اسی زمانے سے برونئی ایک مسلم سلطنت ہے۔

سلطان برکت کے علم و حکمت اور دینی کارناموں سے متاثر ہو کر سلطان برونئی نے اپنی

بہتیجی کی شادی اس سے کر دی۔ سلطان برکت نے برونئی میں ایک عظیم الشان جامع مسجد تعمیر کی اور ملک میں اسلامی قوانین نافذ کروائے اور چینیوں کی مدد سے دریائے برونئی کے دہانے پر پتھر کا ایک بند بنوایا، جو آج بھی موجود ہے۔

مغربی طاقتوں میں سے سب سے پہلے ولندیزیوں نے مملکت برونئی کے کچھ حصوں پر قبضہ کر لیا۔ بعد ازاں ۱۸۸۸ء سے یہ برطانوی سرپرستی میں چلی آ رہی ہے۔ ۱۹۰۶ء کے بعد اس کی عنانِ حکومت عملاً برطانوی ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں تھی اور سلطان محض ایک آئینی حکمران تھا، جو ایک مجلس کی مدد سے حکومت تھا۔ اس مجلس کے نو ارکان تھے، جن میں ایک برطانوی ریزیڈنٹ ہوتا تھا۔ ۱۹۴۱ء میں جاپان نے جب برونئی پر قبضہ کیا تو اس وقت میجر پینگیلی E. E. Pengilly ریزیڈنٹ تھا۔

برونی حکومت کا یہ مسلمہ طریق کار تھا کہ وہاں کا برطانوی ریزیڈنٹ ملائی سول سروس سے تعلق رکھتا ہو۔ پولیس، زراعت، جنگلات، صحت اور رفاہ عامہ کے محکموں کے سربراہ انگریز ہوتے تھے۔ ۱۹۵۹ء میں سلطان اور حکومت برطانیہ کے درمیان ایک معاہدے کی رو سے برونئی کی انتظامیہ علیحدہ ہو گئی۔

برونی کو وفاقِ ملائیشیا (Malaysia Federation) میں شامل ہونے کی تجویز پیش کی گئی، لیکن اس نے بالآخر ایسا کرنے سے انکار کر دیا، چنانچہ اب وہ برطانیہ کے زیرِ سایہ ایک علیحدہ خود مختار سلطنت ہے۔

برونی کی آب و ہوا منطقہ حارہ کی آب و ہوا کی سی ہے، دن کے وقت گرم مرطوب اور رات کے وقت سرد۔ آبادی کا بیشتر حصہ دارالحکومت یا اس کے مضافات میں رہتا ہے۔

برونی کے اندرونی حصے میں زیادہ تر جنگلات ہیں، جن میں اعلیٰ درجے کی عمارتی لکڑی بکثرت پائی جاتی ہے۔ چاول اور ربڑ اہم زرعی پیداوار ہے۔ ملک کی معیشت کا انحصار مٹی کے تیل پر ہے، جو برآمدات کا ننانوے فی صد ہے۔ برطانوی دولت مشترکہ میں برونی مٹی کے تیل کی پیداوار کے لحاظ سے کینیڈا سے دوسرے درجے پر ہے۔ اس کی دیگر برآمدات چاول، تمباکو، چینی اور کپڑا ہیں۔ برونی پیتل کے برتنوں، گھریلو دستکاری مثلاً کشیدہ کاری کے لیے مشہور ہے۔

مآخذ: (۱) *World Muslim Gazetteer*، طبع مؤتمر عالم اسلامی، کراچی، ص ۵۲۶ تا ۵۲۷؛ (۲) *Encyclopaedia Britannica*، ۳: ۲۸۳ تا ۲۸۵، ۱۹۵۰ء؛ (۳) *Sir Hugh Low (Book of the Descent) of the Rajas of Brunei*؛ (۴) *Journal of the Straits Branch of the Royal Asiatic Society*، جون ۱۸۸۰ء؛ (۵) *[The Statesman's Year-Book, 1967-68]*

(نصیر احمد ناصر)

\* **بروہ**: (Barawa یا Brava)، اطالوی شمالی لینڈ میں ایک ساحلی شہر۔ جس کے تقریباً نو ہزار باشندے زیادہ تر دیگل شمالی Digil Somali کے Tunni قبیلے کے ہیں، جو Adjurān کو نکال کر یہاں آسا اور بران گلا Boran Galla کے ساتھ مخلوط ہے۔ یہاں کی زمین خاصی زرخیز ہے؛ کٹھالیں، غلہ اور مکھن کی تجارت ہوتی ہے اور چمڑا نمایاں جاتا ہے۔ بروہ شاید وہی ہے جسے یاقوت نے باوری لکھا ہے، جہاں سے عنبر دساور بھیجا جاتا تھا اور یہی ادریسی کا بروہ Barwa (دوسری شکل مروہ Mirwa) ہے، جو صنم پرستوں کی سرحد پر ہے، دیگر اسلامی جغرافیہ نویسوں نے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ Barros ایک کٹوہ Kithwa وقائع کے، جواب نہیں ملتا۔

تبع کرتے ہوئے کہتا ہے کہ زیدیوں نے الأحساء سے آکر مقدشو کے تھوڑے ہی دن بعد اس کی بنیاد رکھی۔ سٹیگنڈ Stigand کا ماخذ بتاتا ہے کہ اسے ۵۷۷/۶۹۶ - ۶۹۷ء میں خلیفہ عبدالملک بن مروان نے آباد کیا تھا۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں یہ Pate کے زیر اقتدار تھا۔ چینیوں نے تقریباً ۵۸۲۱/۱۳۱۸ء میں "Pu la wa" کی سیاحت کی تھی۔ ۹۰۸ - ۹۰۹ء / ۱۰۰۳ء میں بارہ شیوخ نے، جنہیں Rui Lourenço Ravasco نے گرفتار کر لیا تھا، بروہ کو پرتگال کا باجگزار بنا دیا۔ ۱۵۰۶/۱۵۰۷ء میں Tristão da Cunha اور Albuquerque نے اس پر یورش کی اور اسے جلا کر خاک کر دیا۔ بروہ نے چار یا چھ ہزار دفاعی فوج جمع کر لی تھی اور پیش قیمت مال غنیمت پیش کیا۔ اس کے بعد اس کی حالت عارضی طور پر درست ہو گئی لیکن Galla کی ترقی کے بعد اسے زوال آ گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پرتگالیوں کا اقتدار یہاں تسلیم کیا جاتا رہا۔ پرتگالی مصنف اسے جمہوریہ لکھتے ہیں، جو بارہ شیوخ کے زیر حکومت تھی۔ Guillain ایک مجلس شوریٰ کا ذکر کرتا ہے، جس میں پانچ شمالی اور دو عرب قبیلوں کے سردار شامل تھے اور ایک حاکم تھا جسے سات سال کے لیے منتخب کیا جاتا تھا، اور کسی زمانے میں یہ دستور رائج تھا کہ مدت مقررہ گزرنے کے بعد اسے قتل کر دیا جاتا تھا۔ بروہ برائے نام آل بو سعید [رک باں] کے زیر فرمان تھا، جنہوں نے اپنا اقتدار تقریباً ۱۲۳۸/۱۸۲۲ء میں Mazrui کے مقابلے میں قائم کر لیا تھا مگر خراج کبھی کبھی شمالی سرداروں کو ادا کیا جاتا تھا۔ ۱۲۹۲/۱۸۷۵ء میں تقریباً دو ماہ کے لیے اس پر مصریوں نے قبضہ رکھا۔ ۱۳۰۳/۱۸۸۵ - ۱۸۸۶ء میں برطانوی۔ المانوی اعلان میں یہاں بو سعیدی حکومت تسلیم کی گئی۔





موقع پر بھی ان مشرکین سے برهان طلب کی جائے گی (۲۸ [القصص]: ۷۵)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب نبوت دے کر فرعون کو راہ راست پر لانے کے لیے بھیجا گیا تو انہیں جو دو معجزے - يَدِ بِيضَاءٍ اور عَصَا - عطا ہوئے تھے انہیں بھی قرآن کریم دو ربانی برهان کا نام دیتا ہے: فَذَنْكَ بُرْهَانِنِ مِنْ رَبِّكَ اِلَى فِرْعَوْنَ وَمَلَاِيْهِ (فرعون اور اس کے مصاحبوں کے لیے تجھے تیرے پروردگار کی طرف سے یہ دو برہانیں دی جاتی ہیں، ۲۸ [القصص]: ۳۲)۔ حضرت یوسف علیہ السلام بھی برهان ربانی دیکھ کر (لَوْلَا اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّهِ، ۱۲ [یوسف]: ۲۴) برائی کے ارتکاب سے بچ گئے۔ اللہ کے رسولوں، ان کے معجزات، دین اسلام اور قرآن کریم کو بھی نور اور برهان سے تعبیر کیا گیا ہے (۴ [النساء]: ۱۷۴)۔

حدیث میں صدقے کو برهان کہا گیا ہے (الصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ) اور اس کی وضاحت یہ کی گئی ہے کہ صدقہ طالب اجر و ثواب کے لیے حجت ہے باین معنی کہ یہ ایک ایسا فریضہ ہے جس کی جزا اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ صدقے کو برهان اس لیے کہا گیا ہے کہ صدقہ انسان کے ایمان کی قطعی دلیل ہے، کیونکہ دل اور مال کا بڑا گہرا رشتہ ہے اور جو شخص آسانی سے راہ خدا میں مال کا صدقہ کرتا ہے تو یہ اس کے پاکیزہ دل اور سخی ہونے کی قطعی دلیل ہے (قَبْ تَاجِ الْعُرُوسِ وَالنَّهَائِيَةِ، بذیل مادہ)۔

اسلام کے ابتدائی دور میں یہ لفظ اپنے لغوی معنی (قطعی دلیل یا واضح ثبوت) ہی میں استعمال ہوتا رہا، لیکن اسلامی علوم کی تدوین کے ساتھ اور خصوصاً فلسفہ و منطق کی ترویج کے ساتھ اور کئی ایک الفاظ کی طرح یہ لفظ بھی اصطلاحی مفہوم کی شکل اختیار کر گیا اور اب برهان کے معنی منطقی استدلال اور قیاس ہو گئے۔ فقہا نے یہ اصطلاح

بہت کم استعمال کی ہے۔ ان کے ہاں ”حجت“ اور ”قیاس“ کا استعمال زیادہ عام تھا (سَلَّمَ الْوَصُولَ اِلَى عِلْمِ الْاَصُوْلِ، ص ۲۰۵)، البتہ متکلمین اور فلاسفہ نے برهان کو بمعنی منطقی استدلال و قیاس بکثرت استعمال کیا ہے (نَجَاةً، ص ۱۰۳؛ التَّعْرِيفَاتُ، ص ۲۹)۔ الفارابی کے بیان کے مطابق اقویل برہانیہ (یعنی وہ اقوال جنہیں برهان یا دلیل قطعی کا درجہ حاصل ہوتا ہے) وہ اقوال ہیں جو امر مطلوب کی معرفت کے سلسلے میں علم یقینی کا فائدہ دیتے ہیں خواہ ان اقوال برہانیہ کو انسان امر مطلوب کے استنباط کی غرض سے خود اپنے دل میں استعمال میں لائے خواہ ان کے ذریعے کسی دوسرے شخص کو مخاطب کرے یا کوئی دوسرا اسے مخاطب کرے اور مقصد و امر مطلوب کی تصحیح اور وضاحت کرے، ہر صورت اور ہر حال میں یہ اقویل برہانیہ (یا برهان کا درجہ رکھنے والے اقوال) علم یقینی ہی کا فائدہ دیں گے، اور علم یقینی وہ ہے جس کی مخالفت سرے سے ناممکن ہو اور اس سے رجوع کرنا یا برگشتہ ہونا انسان کے لیے ممکن نہ رہے اور انسان یہ اعتقاد یا خیال ہی دل میں نہ لاسکے کہ اس سے رجوع کرنا یا ہٹنا ممکن ہے۔ اس علم میں نہ تو کسی انسان کو شبہہ ہو سکے، نہ کسی مغالطے کے ذریعے اسے اس سے برگشتہ کیا جاسکے اور نہ اس سلسلے میں اسے کسی وجہ سے مورد الزام ٹھیرایا جاسکے (احصاء العلوم، ص ۲۱)۔

اخوان الصفاء نے بھی برهان کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے۔ ان کے نزدیک برهان حکما کے لیے ایک ترازو کی حیثیت رکھتی ہے، جس کے ذریعے وہ اقوال میں صدق کو کذب سے، آرا و افکار میں غلط کو صواب سے، اعتقادات میں حق کو باطل سے اور افعال و اعمال میں خیر کو شر سے ممیز و ممتاز کرتے ہیں۔ جس طرح عوام کسی مقدار یا



ہمارے اندر غصہ ہے، یا ہمارے اندر خوف ہے، یا ہم ادراک کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ حدسیات سے مراد وہ مقدمات ہیں جن میں مبادی مرتبہ دفعۃً اور یک یک ظہور میں آجاتے ہیں اور اس کے لیے تکرارِ مشاہدہ وغیرہ کی ضرورت پیش نہیں آتی، جیسے یہ کہنا نُورِ الْقَمَرِ مُسْتَفَادٌ مِنْ نُورِ الشَّمْسِ (چاند کی روشنی سورج کی روشنی سے مستعار ہے)۔ تجزیات یعنی وہ مقدمات اور قضایا جن پر پختہ حکم لگانے کے لیے عقل انسانی تکرارِ مشاہدہ کی محتاج ہو، جیسے روٹی سے بھوک مٹی ہے یا چوٹ سے حیوان کو درد ہوتا ہے یا ستمونیا صفراء کے لیے مسہل ہے۔ متواترات ان قضایا یا مقدمات کو کہتے ہیں جن میں عقل انسانی یقینی حکم لگاتی ہے لیکن ایک ایسی کثیر التعداد جماعت کے واسطے سے جن کا جھوٹ پر متفق ہونا عقلاً محال معلوم ہو رہا ہو، جیسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان کیا اور آپ کے ہاتھ سے معجزات ظہور میں آئے (قُبَّ سَلْمِ الْعُلُومِ، ص ۱۶۹)۔

برہان کی دو قسمیں ہیں: برہانِ اِنِّی (برہانِ اِنِّی) اور برہانِ لَمِّی (برہانِ اِلْمِی)، جیسا کہ حدِ اوسط باعتبار ذہن کے علت ہوتی ہے ایسے ہی اگر نفس الامر کے اعتبار سے بھی حکم کے لیے علت بن رہی ہو تو اسے برہانِ لَمِّی کہتے ہیں، جیسے زید مُتَعَفِّنِ الْاَخْلَاطِ ہے اور ہر متعفن الاخلاط بخار میں مبتلا ہوتا ہے اس لیے زید بخار میں مبتلا ہے۔ تو اس مثال میں حدِ اوسط جو متعفن الاخلاط ہے حقیقت اور نفس الامر میں بھی بخار کی علت ہے جیسا کہ ذہن کے اعتبار سے علت ہے۔ اور اگر حدِ اوسط صرف ذہن کے اعتبار ہی سے علت بن رہی ہو اور حقیقتہً خارج میں وہ علت نہ ہو تو اسے برہانِ اِنِّی کہا جائے گا، جیسے ہم کہیں کہ زید بخار میں مبتلا ہے اور ہر بخار میں مبتلا متعفن الاخلاط

اندازے میں اختلاف کی صورت میں وزن اور ناپ کے پیمانے سے اشیا کو تولتے اور ناپتے ہیں اسی طرح صناعت برہان سے واقفیت رکھنے والے علما بھی حقائق اشیا کو معلوم کرتے ہوئے برہان کو کام میں لاتے ہیں یا جس طرح علم عروض و قوافی کا ماہر میزانِ شعر کو کام میں لاتے ہوئے بحور و زحافات کی کیفیت معلوم کرتے ہیں اسی طرح جب عقل و فکر کے تخمینے میں اختلاف واقع ہوتا ہے تو حکما برہان کو کام میں لاتے ہیں (رسائل اخوان الصفاء، ۱: ۲۰۴)۔

منطقیوں کے نزدیک برہان وہ قیاس یا منطقی استدلال ہے جو یقینات سے مراد ہے اور اس قیاس یا استدلال کا منطقی نتیجہ بھی علم یقینی ہوتا ہے (قُبَّ نَجَاةً، ص ۱۰۳ و کتاب التعریفات، ص ۲۹)۔ جن یقینات سے برہان مرکب ہوتی ہے ان کی چھ قسمیں ہیں: اولیات، فطریات، مشاہدات، حدسیات، تجزیات اور متواترات (قُبَّ نَجَاةً، ص ۱۰۳ و سلم العلوم، ص ۱۶۸)۔ اولیات وہ مقدمات ہیں جن میں طرفین کے تصور ہی سے عقل انسانی کو پختہ اور یقینی علم حاصل ہو جائے، مثلاً الْكُلُّ اَعْظَمُ مِنَ الْجُزْءِ (کل جز سے بڑا ہوتا ہے) یا جیسے دو اور دو چار ہوتے ہیں۔ فطریات سے مراد وہ مقدمات ہیں جن میں عقل انسانی کسی ایسے ”واسطے“ سے حکم لگاتی ہے جو ذہن سے تصور طرفین (صغری و کبری) کے وقت غائب نہ ہو، مثلاً الْاَرْبَعَةُ زَوْجٌ (چار جفت ہے)۔ مشاہدات سے مراد وہ مقدمات یا قضایا ہیں جن میں عقل انسانی ”حس“ کے واسطے سے حکم لگاتی ہے اگر حس ظاہری کا واسطہ ہو تو وہ حسیات کہلائیں گے، جیسے آگ جلاتی ہے اور سورج روشنی دیتا ہے۔ اگر عقل انسانی حکم لگاتی ہوئے حس باطنی کو کام میں لائے تو اسے وجدانیات کا نام دیا جاتا ہے، جیسے

البيضاوي؛ (۹) الرازي؛ تفسير كبير؛ (۱۰) ابن نديم؛  
الفهرست، قاهره؛ (۱۱) رشيد رضا؛ تفسير المنار؛ (۱۲)  
الزمخشري؛ الفائق؛ (۱۳) وهي مصنف؛ اساس البلاغة؛  
(۱۴) وهي مصنف؛ الكشاف؛ (۱۵) الجرجاني؛ كتاب  
التعريفات، مصر ۱۳۲۱ھ؛ (۱۶) الفارابي؛ احصاء العلوم،  
مصر ۱۹۳۱ء؛ (۱۷) ابن سينا؛ نجات؛ (۱۸) عمر عبدالله؛  
سلم الوصول، مصر ۱۹۵۶ء؛ (۱۹) نصيرالدين طوسي؛  
شرح الاشارات؛ (۲۰) رسائل اخوان الصفا، ج ۲، قاهره  
۱۹۲۸ء.

(ظہور احمد اظہر)

• **برهان** : بخارا کا فرماں روا خاندان، جس نے  
پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی اور  
چھٹی صدی ہجری / بارھویں صدی عیسوی کے  
اوائل میں حکومت کی۔ یہ خاندان صدرالصدور  
[رك بان] کے لقب سے مشہور ہے۔

• **برهان عماد شاہ** : رك به عماد شاہ۔

• **برهان** : محمد حسين بن خلف التبريزي کا  
تخلص، جو فارسی لغت برهان قاطع کا مؤلف ہے۔  
اسے اس نے ۱۰۶۲ھ / ۱۶۵۱-۱۶۵۲ء میں حیدرآباد  
میں مکمل کیا اور گولکنڈہ کے فرمانروا سلطان  
عبدالله قطب شاہ کے نام سے معنون کیا۔ برهان قاطع  
کی ایک نظر ثانی شدہ طبع نو حواشی و تصاویر کے  
ساتھ چار جلدوں میں تہران میں ۱۳۳۰ھ / ۱۹۵۱ء  
تا ۱۳۳۵ھ / ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی (طبع  
محمد معین)۔ مؤرخ عاصم افندی [رك بان] نے اس  
کا ترکی ترجمہ سلطان سلیم ثالث کو پیش کیا تھا۔

(ادارہ)

• **برهان پور** : مدھیا پردیش (بھارت) کا شہر،  
جو ۱۱°-۱۸' عرض بلد شمالی اور ۷۶°-۱۲' طول بلد  
مشرقی پر دریائے تاپتی کے شمالی کنارے پر واقع  
ہے۔ دریا کی جانب گھاٹ بنے ہوئے ہیں؛ شہر کے  
باقی اطراف میں ایک سنگین فصیل ہے، جس میں

ہوتا ہے لہذا زید بھی متعفن الاخلاط ہے۔ ان  
مقدمات میں بخار میں مبتلا حد اوسط ہے جو حکم  
کے لیے صرف ذہن کے اعتبار سے علت ہے مگر  
نفس الامر اور واقع میں یہ حکم کے لیے علت نہیں۔  
کیونکہ حقیقت میں یہ نہیں ہوتا کہ بخار واقعہ  
متعفن الاخلاط ہونے کی علت بن جائے بلکہ معاملہ  
تو اس کے برعکس ہوتا ہے۔ تعفن اخلاط بخار کی  
علت ہوتی ہے، کیونکہ پہلے اخلاط میں فساد واقع  
ہوتا ہے جو بعد میں بخار کی علت یا سبب بن  
جاتا ہے (قب سلم العلوم، ص ۱۷۰؛ نجات، ص ۱۰۴ تا  
۱۰۵)۔ بعض علمائے منطق نے برهان لمی و برهان انی  
کی وضاحت یوں کی ہے کہ اگر علت سے معلول  
کی طرف استدلال کیا جائے تو اسے برهان لمی کہا  
جائے گا اور اگر معلول سے علت کی طرف استدلال ہو  
تو یہ برهان انی ہوگی (كتاب التعريفات، ص ۳۰)۔  
مثال کے طور پر ایک شخص نو چوٹیں لگیں اور  
اس کے اعضاءے رئیسہ نو ایسا صدمہ پہنچا جو  
عادۃً مہلک ہوا کرتا۔ ہے تو ہم اس کے زخموں  
کو دیکھ کر جب یہ کہیں گے کہ اس شخص کا  
دماغ لاٹھی کی چوٹ سے پاش پاش ہو گیا ہے اور  
جس کا دماغ پاش پاش ہو جائے وہ مر ہی جاتا ہے  
لہذا یہ شخص بھی مر جائے گا تو یہ استدلال لمی  
کی صورت ہوگی، استدلال انی کی شکل یہ ہے کہ  
مرنے کے بعد ڈاکٹر لاش کو دیکھ کر اس شخص کی  
موت کے اسباب (پوسٹ مارٹم کے ذریعے) معلوم کریں۔  
مآخذ: (۱) القرآن الکریم (خصوصاً سورة البقرة،  
النساء، يوسف، الانبياء، المؤمنون، النمل اور القصص،  
بذیل مادہ برهان)؛ (۲) تاج العروس، بذیل مادہ؛ (۳)  
لسان العرب، بذیل مادہ؛ (۴) راغب؛ مفردات القرآن،  
بذیل مادہ؛ (۵) السيوطي؛ الدرالنشير؛ (۶) ابن الأثير؛  
النهاية في غريب الحديث والاثار؛ (۷) البيضاوي؛  
انوار التنزيل و اسرار التأويل؛ (۸) الخفاجي؛ حاشية علي



مقرر کیا گیا۔ وہ برہان پور میں خاصے طویل عرصے تک ٹھہرا۔ برہان پور ہی میں اس کے بڑے بیٹے میرزا ایرج (ملقب بہ شاہ نواز خان) کا انتقال ہوا۔ اس کے باپ نے یہیں اس کا مقبرہ بنوایا۔ اسی شہر میں انگریزی سفیر سرٹامس رو Sir Thomas Roe ۱۶۰۲ء / ۱۶۱۳ء میں جہانگیر کے بڑے بیٹے پرویز کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ۱۶۱۶ء / ۱۶۲۵ء میں شاہجہان نے، جو اس وقت شہزادہ خرم تھا، اپنی دکن کی سهموں کے دوران میں اسے اپنا عمومی صدر مقام بنایا۔ شہزادہ پرویز (ابن جہانگیر) ۱۶۲۶ء / ۱۶۲۶ء میں یہیں فوت ہوا۔ اورنگ زیب نے اپنے باپ شاہجہان کی معزولی کے بعد اس پر پرویز کو زہر دینے کا الزام لگایا تھا۔ ۱۶۳۰ء / ۱۶۳۲ء تا ۱۶۳۲ء / ۱۶۳۲ء میں یہ دوبارہ شاہجہان کی دکن کی ریاستوں سے معرکہ آرائی میں فوجی مرکز بنا۔ ان ایام میں شدید قحط کی وجہ سے یہاں زبردست اتلاف جان ہوا، جس نے شہر کو اجاڑ دیا۔ ۱۶۳۱ء / ۱۶۳۱ء میں شاہجہان کی ملکہ ممتاز محل کا یہاں انتقال ہوا اور اس کی میت کو مستقل طور پر تدفین کے لیے آگرے لے جانے سے پہلے امانت زین آباد میں دفنایا گیا۔ ۱۶۳۶ء / ۱۶۳۶ء میں اورنگ زیب کو، جو اس وقت اٹھارہ سالہ نوجوان تھا، دکن کا بشمول خاندیش صوبیدار مقرر کیا گیا۔ اس نے برہان پور کو اپنا صدر مقام بنایا۔ دکن کی اسی صوبیداری کے زمانے میں اورنگ زیب شیخ نظام برہان پوری سے متعارف ہوا، جو تقریباً چالیس سال اس کی ملازمت میں رہے اور بعد میں فتاویٰ عالمگیری [رک باں] کی تدوین کرنے والے علما و فقہا کی مجلس کے صدر مقرر کیے گئے۔ ۱۶۸۱ء / ۱۶۸۱ء میں اورنگ زیب نے یجاپور [رک باں] کا محاصرہ کرنے سے پہلے برہان پور میں دوبارہ پڑاؤ کیا۔ ۱۶۸۰ء / ۱۶۸۰ء میں شہنشاہ کے

کئی بڑے بڑے بھانک اور لہڑیاں ہیں۔ یہ فصیل نظام الملک آصف جاہ اول [رک باں] نے ۱۱۳۱ھ / ۱۷۲۸ء میں برہان پور کی صوبے داری کے دوران میں بنوائی تھی۔ ۱۹۵۱ء میں اس کی آبادی ستر ہزار چھیاسٹھ تھی۔ فصیل سے گھرے ہوئے قصبے کا رقبہ ڈھائی مربع میل ہے۔ لیکن فصیل سے باہر کے متعدد آثار ظاہر کرتے ہیں کہ مضافات، جن میں اب عادل پورہ شامل ہے، بہت وسیع رہے ہوں گے۔

اس شہر کو قرون وسطیٰ میں عسکری اعتبار سے بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس کی بنیاد خاندیش (جس کا نام بعد میں اکبر نے اپنے بیٹے مرزا دانیال کے نام پر داندیش رکھا تھا، لیکن عوام کو کبھی نہ بھایا) کے فاروقی خاندان کے بانی نصیر خان الفاروقی نے ۱۳۹۸-۱۳۹۹ء میں یا اس کے بھگ لگ رکھی۔ اس کا نام دکن کے ایک بزرگ برہان الدین غریب [رک باں] کے نام پر رکھا گیا۔ انہیں دنوں تاپنی کے دوسری طرف ایک اور شہر کی بنیاد رکھی گئی جو برہان الدین غریب کے ایک خلیفہ شیخ زین الدین داؤد الشیرازی کے نام پر زین آباد کہلایا۔

۱۵۶۱ء / ۱۵۶۱ء میں بیرم خان [رک باں] کے ایک ماتحت سردار پیر محمد شروانی نے برہان پور کو تاخت و تاراج کر دیا اور باشندگان شہر کا قتل عام کر کے بے انتہا دولت لوٹ کر لیے گیا۔ لیکن یہ فاروقی خاندان کا صدر مقام ۱۶۰۱ء / ۱۶۰۱ء تک رہا، جب کہ شہنشاہ اکبر نے فاروقی خاندان کا خاتمہ کر کے اس مملکت کو سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔ اس شہر پر شاہی فوجوں نے ابوالفضل غلامی [رک باں] کی سپہ سالاری میں ۱۵۹۹ء / ۱۵۹۹ء میں قبضہ کر لیا تھا۔ عبدالرحیم خان خانان [رک باں] کو اس کا صوبیدار

بڑی تعداد موجود ہے، ان میں سے متعدد بزرگ سندھ اور گجرات سے آئے تھے اور ان کا ذکر گلزارِ ابرار میں آتا ہے، جس کا مصنف محمد غوثی کٹی بار برہان پور آیا تھا۔ دوسری قابل ذکر عمارات میں مبارک شاہ الفاروقی اور راجے علی خان ملقب بے عادل شاہ الفاروقی کے مقبرے، مؤخر الذکر کی ۱۵۹۹ء / ۱۵۸۸ء میں تعمیر کردہ جامع مسجد اور دریائے تاپتی کے کنارے واقع پرانا قلعہ، جو اب بالکل شکستہ حالت میں ہے، شامل ہیں۔ عبدالرحیم خان خانان کی تعمیر کردہ کاروان سراے اب بھی موجود ہے۔

شہر کے لیے جنہانگیر کا نظام آب رسانی کا، جسے گیارہویں / سترہویں صدی میں خان خانان نے مکمل کیا، کسی بھی جدید نظام آب رسانی سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ دورِ مغلیہ میں برہان پور میں کئی شاہی کارخانے قائم تھے، جن میں شاہی گھرانے کے لیے عمدہ اور قیمتی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ ان کارخانوں میں کام کرنے والے زیادہ تر ٹھٹھہ [رک باں] کے بڑے ماہر بافندے تھے، جو خان خانان کی صوبیداری کے زمانے میں نقل مکانی کر کے برہان پور میں آسے تھے۔

مآخذ: (۱) خلیل الرحمن: تاریخ برہان پور، دہلی ۱۳۱۷ء / ۱۸۹۹ء؛ (۲) آئین اکبری (انگریزی ترجمہ از بلوخمین و جیرٹ)، ۳: ۲۲۳ اور بمدد اشاریہ؛ (۳) محمد قاسم فرشتہ: گلشنِ ابراہیمی، بمبئی ۱۸۳۱ء؛ (۴) سجان رائے بھنڈاری: خلاصۃ التواریخ (مرتبہ ظفر حسن)، دہلی ۱۳۳۷ء / ۱۹۱۸ء، بمدد اشاریہ؛ (۵) عبدالحمید لاہوری: بادشاہ نامہ، (Bib. Ind.) بمدد اشاریہ؛ (۶) محمد ساقی مستعد خان: مآثر عالمگیری (Bib. Ind.) بمدد اشاریہ؛ (۷) مصمص الدولہ شاہ نواز خان: مآثر الامراء، (Bib. Ind.) بمدد اشاریہ؛ (۸) Peter Mundi: Travels in Asia، (طبع رچرڈ ٹمپل (Richard Temple)، Hakluyt Society، جلد ۲، ۱۹۱۴ء، جلد ۳، ۱۹۱۹ء؛ (۹)

شہر چھوڑ جانے کے تھوڑے ہی عرصے بعد مرہٹوں نے اس میں لوٹ مار مچائی۔ اس کے بعد اس کے گرد و نواح میں لڑائیاں ہوتی رہیں اور برہان پور پریشانی اور غارت گری کا شکار ہوتا رہا، تاآنکہ [بہادر شاہ اول نے] ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۹ء میں مرہٹوں کا چوتھ (محصول کا ایک چوتھائی حصہ) وصول کرنے کا مطالبہ باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا۔ ۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۰ء میں نظام الملک آصف جاہ اول نے بھی دکن کا صوبیدار مقرر ہونے پر اسے اپنا صدر مقام بنایا۔ پھر ۱۱۳۷ھ / ۱۷۲۴ء میں دہلی سے اس کی واپسی کے وقت سے لے کر ۱۱۶۱ھ / ۱۷۴۸ء میں اس کی وفات تک برہان پور آصف جاہ کی قائم کردہ نئی مملکت کی ایک اہم فوجی چوکی بنا رہا اور وقتاً فوقتاً آصف جاہ کا صدر مقام بھی رہا۔ آصف جاہ اول کے انتقال کے بعد اس پر مرہٹوں نے قبضہ کر لیا۔ انہیں ایک مدت بعد ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں لارڈ ویلزلی نے بالآخر یہاں سے نکال دیا۔ پھر بھی برہان پور مختلف ہاتھوں میں آتا جاتا رہا، تاآنکہ ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۰ء میں اس پر پورا برطانوی تسلط ہو گیا ۱۲۶۶ھ / ۱۸۴۹ء میں یہاں ایک ہولناک ہندو مسلم فساد ہوا، جس میں بہت سی جانیں ضائع ہوئیں۔ ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء میں شہر کا ایک علاقہ سندھی پورہ، جس کے باشندے زیادہ تر سندھ کے متعدد شہروں سے ابتدائی دور میں آئے ہوئے تارکینِ وطن کی اولاد میں سے تھے، آگ سے بالکل تباہ ہو گیا۔ اگلے سال داؤد پورہ میں بہت سے مکان آگ سے جل گئے اور ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۷ء میں تیسری آگ سے لہار منڈی کا ایک حصہ، جس میں چوٹ کی مسجد بھی تھی، تباہ ہو گیا۔ ۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۳ء میں وبائے طاعون سے لوگ بکثرت ہلاک ہوئے۔

برہان پور میں اولیا اور صوفیہ کے مزاروں کی



اور ۱۳۶۳/۵۷۶۶ - ۱۳۶۵ء میں اپنے وطن پیدائش کو لوٹا، جہاں حاکم وقت غیاث الدین ایتنا اس اکیس سالہ نوجوان سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے (شمس الدین محمد کی جگہ جو ایک سال پہلے وفات پا چکا تھا) نہ صرف اسے قاضی کے عہدے پر مامور کر دیا بلکہ اپنی بیٹی کی شادی بھی اسی سے کر دی۔ اس کے باوجود برہان الدین خفیہ طور پر بیگوں کی اس بغاوت میں شریک رہا جس میں اس کے خسر کو (۱۳۶۵/۵۷۶۷ - ۱۳۶۶ء میں) قتل کر دیا گیا۔ غیاث الدین کے بعد، خاندان ایتنا کے نالائق حکمرانوں کے دور حکومت میں اس نے وزیر اور اتابک کی حیثیت سے بڑی سرگرمی دکھائی اور بالآخر ۱۳۸۱/۵۷۸۳ - ۱۳۸۲ء میں اس نے خاندان ایتنا (قبلاً، ت، کراسہ ۳۲، ص ۳۰۹) کے زیر نگیں علاقوں کا سلطان ہونے کا اعلان کر دیا اور عام قاعدے اور طریق کے مطابق اس نے نئے سگے جاری کیے اور جمعہ کی نماز میں اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا۔ اس نے سیواس کو اپنا مستقر بنایا۔ اس کی سلطانی کے اٹھارہ سال ملک کے سرکش بیگوں کے خلاف مسلسل پیکار میں گزرے، اس کے علاوہ اسے کرمانیوں اور عثمانیوں جیسے طاقتور ہمسایوں سے جنگیں لڑنی پڑیں۔ اس نے ہمیشہ شجاعت اور دلیری کا ثبوت دیا اور ایک موقع پر ایک قوی تر مصری فوج سے ٹکر لی مگر اس سے شکست کھائی (۱۳۸۷/۵۷۸۹ء)۔ لیکن کچھ ہی مدت بعد اس نے انہیں مصری مملوکوں سے آق قویونلو [رک باں] کے خلاف، جو مشرق کی طرف سے بڑھے چلے آ رہے تھے، مدد طلب کی اور پھر آق قویونلو کے ساتھ ملکر اماسیہ اور آرزنجان کے سرکش بیگوں کا مقابلہ کیا۔ بالآخر ایک فیصلہ کن واقعہ پیش آیا۔ اس نے قیصریہ کے باغی صوبیدار شیخ مؤید کے قتل کا حکم دیا۔ اور اس کا یہ فعل اس کے لیے آق قویونلو

*Travels: Tavernier* (طبع V. Ball)، لندن ۱۸۸۹ء؛ (۱۰) یوسف حسین خان: نظام الملک آصف جاہ، منگلور ۱۹۳۶ء، بحد اشاریہ؛ (۱۱) سید محمد مطیع اللہ راشد برہان پوری: برہان پور کے سندھی اولیاء (اردو میں)، کراچی ۱۹۵۷ء؛ (۱۲) *Imperial Gazetteer of India*، اوکسفورڈ ۱۹۰۸ء، ۹: ۱۰۳ تا ۱۰۶؛ (۱۳) سعید احمد مارہروی، درمغزن (اردو ماہنامہ)، لاہور، اگست ۱۹۰۸ء؛ (۱۴) عبدالباقی نہاوندی: مآثر رحیمی (Bib. Ind.)، بحد اشاریہ؛ (۱۵) محمد صالح کنبوہ: عمل صالح (Bib. Ind.)، بحد اشاریہ؛ (۱۶) معارف (اردو ماہنامہ)، اعظم گڑھ، ۲/۷۲، ۵/۶۷؛ (۱۷) *Cambridge History of India*، ۳: ۵۷ تا ۵۷؛ (۱۸) خافی خان: منتخب اللباب (Bib. Ind.)، بحد اشاریہ؛ (۱۹) *The Embassy of Sir Thomas Roe to India* (طبع William Forster)، لندن ۱۹۲۶ء، بحد اشاریہ؛ (۲۰) نظام الدین احمد: طبقات اکبری (انگریزی ترجمہ)، بحد اشاریہ۔

(اے۔ ایس۔ بزمی انصاری)

## برہان الدین قاضی احمد: مشرقی

ایشیائے کوچک کا شاعر (اس کا دلام آذری [رک باں] بولی میں ہے اور اس بولی کی نمایاں خصوصیات اس میں موجود ہیں)۔ برہان الدین شاعر ہونے کے علاوہ عالم بھی تھا۔ اس کی زندگی ہنگاموں میں بسر ہوئی اور یکے بعد دیگرے قاضی، وزیر، اتابک اور سلطان کے منصبوں پر فائز رہا۔ وہ ۳ رمضان ۵۷۴۵/۸ جنوری ۱۳۴۵ء کو قیصریہ (موجودہ نام: کپڑی) میں پیدا ہوا؛ اس کا باپ شمس الدین محمد قاضی تھا (اس کے گھرانے میں قضاة تین پشتوں سے چلی آ رہی تھی) اور ددھیال کی طرف سے اس کا سلسلہ سائور کے قبیلہ اوغوز سے ملتا تھا، جس کا ابتدائی مسکن خوارزم تھا۔ برہان الدین نے علم کے مروجہ شعبوں میں تعلیم پہلے اپنے باپ سے حاصل کی پھر مصر، دمشق اور حلب میں مختلف اساتذہ سے تکمیل کی

قرہ یُولُوق عثمان بیگ کے عتاب کا باعث بنا۔ برہان الدین، آق قویونلو سے جنگ کے دوران میں قرہ بل کے مقام پر مارا گیا (لیکن سعد الدین کا بیان ہے کہ اس کی موت کوہستان خربوت [رک باں] میں ہوئی، جہاں وہ عثمانی سلطان بایزید اول سے بھاگ کر چلا گیا تھا)۔ بعض بیانات کے مطابق، جنہیں مصلحت آمیز اور غرض مندانہ لہا جاسکتا ہے (ابن عرب شاہ، طبع Schildberger)، قرہ یُولُوق نے اسے گرفتار کر لیا اور وہ ذوالقعدہ ۸۰۰ھ / جولائی - اگست ۱۳۹۸ء میں قتل ہوا۔ مآخذ میں بعض دوسری تاریخیں بھی ملتی ہیں۔ برہان الدین کا مقبرہ سیواس میں موجود ہے لیکن اس کے کتبے پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ سیواس ہی میں برہان الدین کا بیٹا محمد چلبی (م ۹۳۳ھ / ۱۳۹۱ء) اور بیٹی حبیبہ سلجوق خاتون (م ۸۵۰ھ / ۱۴۴۶ء - ۱۴۴۷ء) دفن ہیں۔ حبیبہ سلجوق خاتون کے نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کی پر دادی، روم کے سلجوقی سلطان، کیکاؤس دوم [عزالدین، م ۶۳۴ھ / ۱۲۳۶ء] کی پوتی تھی (van Berchem، در CIA، ۵: ۳)۔

یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ برہان الدین کو، جس کی ساری عمر سیاست اور جنگ کی مسلسل پریشانیوں میں گذری، اتنی فرصت اور اتنا سکون میسر آ گیا کہ وہ عالم اور شاعر کی حیثیت سے بھی سرگرم عمل رہا۔ ترجیح التوضیح (یہ شعبان ۷۹۹ھ / مئی ۱۳۹۷ء میں تالیف ہوئی) اور اکسیر السعادات فی أسرار العبادات اس کی فقہی تصانیف ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب اب بھی علما میں احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ ان سے کہیں زیادہ اہم برہان الدین کا دیوان ہے، جس میں پندرہ سو سے زیادہ غزلیں (ردیف وار ترتیب اور مخلص کے بغیر)، بیس رباعیاں، ایک سو

انیس تیوغ (یہ مشرقی ترکی بولی میں ہیں) اور چند مفرد آیات شامل ہیں۔ اس میں کئی مقامات پر عروضی وزن کی ایسی خامیاں ہیں جن کا بعد کے زمانے میں ہونا ناممکن تھا۔ تیوغ میں نصف مصرع سالم، افاعیل تفاعیل میں اور دوسرا نصف زحافات کی صورت میں ایک ساتھ ملتے ہیں۔ برہان الدین کی شاعری مجازی عشق کی شاعری ہے، تصوف کا رنگ اس کے نلام میں شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔ غزلوں میں وہ موضوع اور بیان دونوں کے لحاظ سے ایرانی غزل کی روایات کی تقلید کرتا ہے۔ اگرچہ وہ پائے کا شاعر ہے لیکن نہ تذکروں میں اس حیثیت سے اس کا کوئی ذکر موجود ہے اور نہ آذربایجان اور عثمانیوں کی شاعری پر اس کا کوئی اثر نظر آتا ہے (صرف چند مؤرخوں کے ہاں مختصر حوالے ملتے ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ عربی اور فارسی میں شاعری بھی کرتا تھا (قب کب، ۱: ۲۰۸)۔

مآخذ : برہان الدین کی زندگی سے متعلق مجموعی طور پر: (۱) بزم و رزم (المعروف بہ مناقب قاضی برہان الدین، جو ۸۰۰ھ / ۱۳۹۸ء میں مکمل ہوئی) اس کا مصنف اس کا رفیق عزیز بن آرد شیر استر آبادی تھا (فارسی متن، استانبول ۱۹۲۸ء)، ترکی میں مقدمہ از کوپرولو زادہ محمد نواد، دیکھیے Storey، ۲/۲: ۴۱۰؛ (۲) Das Werk des Aziz ibn : H. H. Giesecke (۲) Ardesir Asterabadi، لائپزگ ۱۹۴۰ء اور جو غالباً (بروایت Babinger، در GOW، ص ۵) تاریخ القاضی برہان الدین السیواسی، ۴ جلد، از عبدالعزیز بغدادی (حاجی خلیفہ، عدد ۲۲۷۳) ہی ہے؛ (۳) احمد توحید: قاضی برہان الدین احمد، در TOEM، ۱۳۳۰ھ / ۱۹۱۱ء - ۱۹۱۲ء، ۵: ۱۰۶ تا ۱۰۹، ۱۷۸ تا ۱۸۲، ۲۳۴ تا ۲۴۱، ۲۹۶ تا ۳۰۷، ۳۴۷ تا ۳۵۷ اور ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ - ۱۹۱۳ء، ۶: ۴۰۵ تا ۴۰۹، ۴۶۸ تا ۴۷۸؛



*Kādi Burhān al-Dīn ghazel ve rubā'iyātından bir kısmı ve tuyuqları* مع دیباچہ از جناب شہاب الدین بیگ (غیر تسلی بخش: قب محمد فؤاد کواپرولو، در *Türkiyat Mecmuası*، ۲ : ۲۲۰ اور Babinger، در *GOW*، ص ۳)؛ (۱۶) *Kadi Burhanettin divani*، ج ۱، استانبول ۱۹۳۳ء (موزہ بریطانیہ کے ۵۷۹۶ / ۱۳۹۳ - ۱۳۹۴ کے عمدہ مخطوطے شمارہ Or. ۱۲۶ کی نقل: نہایت عمدہ مخطوطہ، جو غالباً خاص اسی سلطان شاعر کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اس کے حاشیے پر تصحیحات ہیں، جن کے متعلق گمان ہے کہ وہ اس کے اپنے ہاتھ کی ہیں)؛ (۱۷) Muharrem Ergin : *Kadi Burhaneddin Divani üzerinde bir gramer denemesi*، در *Türk Dili ve Edebiyatı Dergisi*، ۳/۳، استانبول ۱۹۵۱ء : ۲۸۷ تا ۳۲۷؛ (۱۸) A. Nihad Tarlan : *Kadi Burhaneddin'de tasavvuf*، در محولہ بالا کتاب، ۱۹۵۸ء : ۸ تا ۱۵۔

(I. RYPKA)

برہان الدین غریب: شیخ محمد بن ناصر الدین محمود [فقیہ، زاہد اور صاحب وجد و حال]۔ شیخ جمال الدین نعمانی ہانسوی (قب اخبار الاخیار، ص ۶۷) کے بھانجے۔ شیخ الاسلام نظام الدین اولیاء (۱۸ ربیع الآخر ۵۷۲۵ / ۳ اپریل ۱۳۲۵ء) کے ممتاز معتقدوں اور برگزیدہ خلفا میں سے تھے۔ ان کا مولد و منشا ہانسوی (مشرقی پنجاب [بھارت]) تھا جہاں وہ ۵۶۵۳ / ۱۲۵۶ء میں پیدا ہوئے اور دیوگیر (دولت آباد) میں ۱۱ صفر ۵۷۳۸ / ۸ ستمبر ۱۳۳۷ء کو ان کا وصال ہوا (نزہۃ الخواطر، بحوالہ روضۃ الاولیاء)۔ ان کا مزار روضہ (خلد آباد) میں ہے [جو قلعہ دولت آباد سے تین کوس پر ہے]۔ بعض کے نزدیک ان کا سنہ وفات ۵۷۴۱ / ۱۳۴۰ - ۱۳۴۱ء ہے (خزینۃ الاصفیاء، بحوالہ شجرہ چشتیہ)۔ بچپن ہانسوی میں گزار کر دارالملک دہلی گئے اور اساتذہ عصر

*Twórczość Burhanaddina : S. Rymkiewiczowa* (۳) برہان الدین کی قوت تخلیق (اس کے عصر اور اثرات کی روشنی میں)، وارسا، مقالہ برائے ڈاکٹریٹ ۱۹۳۹ء؛ (۵) خلیل ادہم : *Duvel-i-Islamiyye*، استانبول ۱۹۲۸ء، ۳۸۳ تا ۳۸۸؛ (۶) *Ottoman Poetry : Gibb* : ۲۰۳ تا ۲۲۳ (بنی بر ابن حجرالمسقلانی : *الدور الکائنۃ فی اعیان المئۃ الثانیۃ*، حیدرآباد ۱۳۳۸ / ۱۹۲۹ء تا ۱۳۵۰ / ۱۹۳۲ء) اور ۶ : ۱۶ تا ۲۰ (متن)؛ (۷) کواپرولو زادہ محمد فؤاد و شہاب الدین سلیمان : *یگی عثمانلی تاریخ ادبیات*، ۱، استانبول ۱۳۳۲ / ۱۹۱۳ - ۱۹۱۴ : ۱۶۹ تا ۱۷۳ (متن کے نمونوں کے ساتھ)؛ (۸) عثمانلی مؤلفی، ۱ : ۳۹۶؛ (۹) مرزا بلا : *قاضی برہان الدین، درگزوار*، ت، کراہہ ۵۵ (۱۹۵۲ء) : ص ۳۶ تا ۳۸ (یہ بہترین کتاب ہے)؛ (۱۰) *Istoria Turciyi i yeya : A. Krymskiy* (۱۱) *literaturı*، ماسکو ۱۹۱۶ء، ۱ : ۲۷۰ تا ۲۷۹؛ (۱۱) وہی مصنف : *Istoriya Turččini ta yiyi pıs' menstva*، ۲/۲، Kiev ۱۹۲۷ء میں بھی وافر مواد ہے؛ (۱۲) *Storia della Letteratura turca : A. Bombaci*، میلان ۱۹۵۶ء، ص ۲۹۳ بعد؛ (۱۳) *H. Mezioglu* : *Kadi Burhaneddin*، در *Arayis*، عدد ۱۹، ۱۹۵۷ء : ص ۳ تا ۵ (عام فہم انداز کا مضمون، جس میں لاطینی حروف میں متن کے نمونوں کے ساتھ نہایت مختصر شکل میں لنڈن کے مخطوطے کے آغاز اور انجام کو دوبارہ چھاپا گیا ہے)۔ برہان الدین کے متعلق حوالے تاریخی مآخذ میں ادھر ادھر ملتے ہیں: دیکھیے احمد توحید و مرزا بلا *Bala* کے مضمونہ بالا مقالات: نیز دیکھیے : (۱۴) *Otrivki iz divanu Achmeda Burhan ed-Dinu Sivasskogo*، در *Vostočniye Zametki*، SPb.، ۱۸۹۵ء، ص ۱۳۱ تا ۱۵۲ (متن اور بیس رباعیوں اور بارہ تیوغ کا ترجمہ)؛ (۱۵)

سے علوم فقہ، اصول اور عربی ادب و زبان کا مطالعہ کیا۔ پھر شیخ نظام الدین محمد بداؤنی سے (۱۲۹۳/۵۶۹۳) تک ان کی خدمت میں حاضر رہے (قبّ نزہۃ، ص ۱۳۳؛ سیر الاولیاء، ص ۲۷۹؛ فوائد الفوائد، لکھنؤ ۱۹۰۸ء، ص ۱۵، ۲۳، ۲۴ (۵۷۰۸)؛ ص ۳۳ (۵۷۰۹)؛ ص ۸۳ (۵۷۱۲)؛ الخ خانی: ظفر الوالد، لائڈن ۱۹۲۹ء، ۳: ۸۵۷ (بعد)۔ وصال شیخ کے بعد وہ چند سال تک زندہ رہے اور لوگوں سے بیعت لیتے رہے۔ جب محمد تغلق (۵۷۲۵/۱۳۲۵ء تا ۵۷۵۲/۱۳۵۱ء) نے دہلی کے امرا و مشائخ و سادات کو اپنے نئے دارالملک دیوگیر میں جا بسنے پر مجبور کیا (تقریباً ۵۷۲۷/۱۳۲۶-۱۳۲۷ء؛ مبارک شاہی، ص ۹۸) تو یہ بھی دیوگیر گئے (بداؤنی، ۱: ۲۲۶؛ محمد ساقی: مآثر عالمگیری، مطبوعہ لکھتہ، ص ۲۳۷)، مگر اکثر متاخرین کے نزدیک انہیں شیخ الاسلام نے اپنے بعض مریدوں کے ساتھ ”رواج اسلام و ارشاد ساکنان“ دکن کے لیے ادھر بھیجا (فرشتہ؛ سفینہ: مانڈوی (اذکار ابرار، ترجمہ، گلزار ابرار)، آگرہ ۱۳۲۶ھ، ص ۹۰)؛ معارج: خزینہ، ص ۳۲۲ (معاصروں نے ان کے دکن جانے کا سبب نہیں بتایا)۔ وہاں انہوں نے اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کی۔ دکن میں وہ مبلغین اسلام کے پیشرووں میں سے تھے اور انہوں نے وہاں اسلام کی تبلیغ اور اسلامی ثقافت کی نشر و اشاعت میں سعی بلیغ کی (سفینہ)۔ اس طرح آپ نے اپنے نامور خلفا تیار لیے (خزینہ، ص ۳۳۳)۔ ان میں سے شیخ رتن الدین کاشانی نے آپ کے ملفوظات نفائس الانفاس کے نام سے جمع لیے (ان میں سے نو ملفوظات (معارج، حوالہ سابق میں درج ہیں)۔ اسی طرح کاشانی مذکور کے دو بھائیوں نے احسن الآقوال اور غرائب الکرامات مع شمعہ بقیۃ الغرائب کے نام سے (نزہۃ) اور حمید شاعر قلندر نے

بھی (اخبار الاخیار، ص ۸۶) آپ کے بعض ملفوظات جمع کیے (نزہۃ؛ اخیار، ص ۸۶)۔ غریب کو جاذب شخصیت ملی تھی، فضائل زمانہ اور خوش طبعان وقت مثلاً امیر خسرو، میر حسن، مسعود بک (آپ نے اپنی تصانیف خصوصاً یوسف زلیخا میں جناب برہان الدین کی بہت مدح کی ہے) اور خوش طبع لوگ آپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ نصیر الدین ”چراغ دہلی“ اور محمد مبارک کرمانی (صاحب سیر الاولیاء) کا بھی یہی حال تھا (سیر الاولیاء، ص ۲۷۸ (بعد)۔ شوق و ذوق اور وجد و کیف آپ میں جمع تھے؛ دلام عشق آمیز تھا اور گفتگو دلفریب؛ سماع میں آپ کو غلو تھا۔ رقص صوفیانہ میں آپ اور آپ کے اصحاب کی (جنہیں ”برہانی“ کہتے تھے) طرز خاص تھی۔ برہان پور کو (جو خاندیس میں دریائے تاپتی پر واقع ہے) والی خاندیس ناصر خاں فاروقی (۵۸۰۱/۱۳۹۹ء تا ۵۸۳۷/۱۴۳۷ء) نے آباد کیا تو آپ کے نام پر موسوم کیا، اس لیے کہ دہلی سے دیوگیر جاتے ہوئے آپ اس موضع میں ٹھہرے، جو اس زمانے میں اس مقام پر واقع تھا؛ اور فاروقیوں کے جد اعلیٰ کے لیے، جو اس زمانے میں وہاں پولیس کا افسر اعلیٰ (شحنہ) تھا، آپ نے دعا کی اور اسے بشارت دی کہ اس کی اولاد وہاں فرمانروا ہوگی۔ چنانچہ فاروقیوں نے چند دنوں آپ کے روضے کے لیے پیش لیے، جو مانڈوی کی تصنیف گلزار ابرار کے وقت (۵۱۰۲/۱۶۱۱-۱۶۱۲ء) تک بدستور مجاوروں کے نام پر تھے۔ یہی مصنف، جو ۵۱۰۰/۱۵۹۲-۱۵۹۳ء میں زیارت کے لیے روضے پر پہنچا، لکھتا ہے کہ ان کے سالانہ عرس پر بڑی دھوم دھام ہوتی ہے۔ دارا شکوہ نے بھی روضے کی زیارت کی۔ اسی مقام پر آپ کے سوا نو اور اولیاء اللہ کی خواب ۵۷۲: ۲ اور نک زیب (خانی خان، ۲: ۵۴۹ تا ۵۷۲: ۲) مآثر الامراء، ۲: ۸۳۴) اور دو نظام الملک بھی



اسی جوار میں مدفون ہیں۔

مآخذ: ان کے علاوہ جو متن میں مذکور ہیں دیکھیے: (۱) محمد مبارک علوی کرمانی: سیرالاولیاء، دہلی ۱۳۰۲ء، ص ۲۷۸ (= عبدالحق: اخبار الاخیار، دہلی ۱۳۰۹ء، ص ۹۳ = علی اردستانی: محفل الاصفیاء، مجموعہ آذر، دانش گہ پنجاب، ورق ۷۶-۷۷)؛ (۲) آئین اکبری، طبع Blochmann، کلکتہ، ۲: ۲۱۶؛ ترجمہ جیرٹ Jarrett، ۳: ۳۶۵ و ۲۲۳: تعلیقہ ۳؛ (۳) امین احمد رازی: ہفت اقلیم، نسخہ دانش گہ پنجاب (مجموعہ شیرانی)، ورق ۱۳۷ ب (بذیل دہلی)؛ (۴) فرشتہ، بمبئی ۱۸۳۲ء، ۲: ۷۰؛ (۵) دارا شکوہ: سفینۃ الاولیاء، لکھنؤ ۱۸۷۲ء، ص ۱۰۱؛ (۶) عبید اللہ خویشکسی: معارج الولایۃ، نسخہ دانش گہ پنجاب (مجموعہ آذر)، ورق ۱۲۳ ب تا ۱۲۵ ب؛ (۷) سبزواری: سوانح (دیکھیے سٹوری Storey، یہ نسخہ راقم کے پیش نظر نہیں ہے)؛ (۸) غلام علی آزاد: روضۃ الاولیاء (بواسطہ نزہۃ الخواطر)؛ (۹) مفتی غلام سرور: خزینۃ الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۳ء، ص ۳۳۲؛ (۱۰) عبدالحی لکھنوی: نزہۃ الخواطر، ۲: ۱۳۳؛ (۱۱) Oriental biographical dictionary، کلکتہ ۱۸۸۱ء، ص ۷۰؛ (۱۲) Storey: Persian Literature، ص ۱۰۲۵ و ۱۰۲۷۔

(محمد شفیق)

• **برهان الدین قطب عالم: بن عبد اللہ بن ناصر الدین بن جلال الدین، مخدوم جہانیاں؛ کنیت: ابو محمد؛ لقب: "قطب عالم" اور "ثانی مخدوم جہانیاں" (معارج)۔ ان کے والد ناصر الدین کا نام آئین ابری میں محمد، مرآت احمدی میں محمود اور مرآت سکندری میں ص ۲۶ پر محمد اور ص ۱۲۶ و ۲۸۵ پر محمود ہے۔ ان کا سلسلہ سہروردیہ ہے اور وہ گجرات کے سادات بخارا کے سلسلہ اور ولایت گجرات کے نامی مشائخ میں سے ہیں۔ ۱۳ رجب ۵۹۰ھ / ۱۹ جولائی ۱۳۸۸ء**

کو آج میں (جو اب علاقہ بہاول پور میں ہے) پیدا ہوئے اور موضع بتوہ (درالغ خانی، ۱: ۱۳۰، ص ۷؛ بتوہ (یا حرکات)، در محفل الاصفیاء؛ باتوہ، در معارج، [یعنی بتوہ اور باٹوہ]) میں، جو احمد آباد گجرات کے جنوب میں چھ میل پر واقع ہے، ۸ ذی الحجہ ۸۵۷ھ / ۱۰ دسمبر ۱۴۵۳ء کو فوت اور وہیں دفن ہوئے۔ بقول صاحب اخبار الاخیار "مطلع یوم الترویہ" (۸۵۷) سے تاریخ وفات حاصل ہوتی ہے (مگر اکثر مآخذ کے خلاف معارج میں تاریخ وفات ۸۵۶ھ دی ہے)۔ ترک وطن کر کے گجرات میں متوطن ہوئے۔ اس مہاجرت کے سبب اور اس کے زمانے کے متعلق رواۃ میں اختلاف ہے (مثلاً دیکھیے آئین، معارج، مائت الامراء وغیرہ)۔ سطور ذیل کا بیان مرآت احمدی کے خاتمے پر مبنی ہے۔ وہ دس سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوا۔ باپ کے چچا شاہ راجو قتال (م ۸۲۷ھ / ۱۴۲۳ء، خزینۃ الاصفیاء، ص ۷۳) نے پوری طرح سے تربیت کی۔ جب وہ چودہ سال کے ہوئے تو چچا نے "ارشاد اہل گجرات" کا کام ان کے حوالے کر کے ادھر روانہ کیا۔ وہ ۸۰۲ھ / ۱۳۹۹ - ۱۴۰۰ء میں پٹن پہنچے۔ سلطان مظفر اول، جو ان کے دادا کا مرید تھا، بہت احترام سے پیش آیا۔ انہوں نے پٹن میں علوم ظاہری کا مطالعہ مولانا علی شیر گجراتی (شطاری؟: یاد ایام، ص ۷) سے کیا۔ ۸۱۳ھ / ۱۴۱۱ء میں احمد آباد آباد ہوا تو وہ وہاں سے قریب ہی ساہرمتی کے کنارے اساول کھنہ کی بستی میں آ بسے، پھر بتوہ میں مستقل سکونت اختیار کی اور آخر دم تک وہیں رہے۔ جن شیوخ سے انہوں نے خرقہ حاصل کیا ان کی فہرست نزہۃ الخواطر (۳: ۹۷) میں موجود ہے۔ ان میں شیخ احمد کھنٹو (م ۸۴۹ھ / ۱۴۴۶ء) بھی شامل ہیں۔ صورت و معنی کی بزرگی پا کر قطب عالم نے اہل گجرات کی ہدایت و ارشاد میں

(حدود ۵۱۱۷۶ / ۱۷۶۲ء) مطافِ اہلِ گجرات ہے۔ جو زبان وہ بولتے تھے اس کے دو ایک جملوں کے لیے ملاحظہ ہو مرآت سکندری، ص ۲۵۴ (قَب) مرآت احمدی، خاتمہ، ص ۱۷؛ ظفرالوالہ، ۱: (۲۳۶)؛ وہیں ان کی ایک مشہور کرامت کا حال بھی درج ہے۔ ان کے بارہ بیٹے اور کئی بیٹیاں تھیں۔ مرآة احمدی (خاتمہ) میں ان کے خلفا اور لڑکوں کا حال تفصیل سے دیا ہے۔

مآخذ: کتب مذکور متن کے علاوہ دیکھیے: (۱) ابوالفضل: آئین اہری، طبع Blochmann، کلکتہ، ۲: ۲۲۱، ترجمہ جیرٹ Jarrett، ۳: ۳۷۲؛ (۲) اسکندر ابن محمد: مرآت سکندری، بمبئی ۱۳۰۸ء، ص ۵۲، بعد، ۴۶ (قَب) ۱۲۶ و ۲۸۵، ۱۴۲، ۲۵۴، ۳۲۳، بعد، وغیرہ؛ (۳) آغ خان: ظفرالوالہ، طبع E. D. Ross، لندن، ۱۹۱۰ء تا ۱۹۲۸ء، بمدد اشاریہ، بذیل برہان الدین قطب عالم و بیوہ؛ (۴) محمد غوثی مانڈوی: گلزار ابرار، (ترجمہ اردو اذکار ابرار، آگرہ ۱۳۲۶ھ)؛ (۵) عبدالحق دہلوی: اخبار الاخبار، آگرہ ۱۳۰۹ھ، ص ۱۵۷؛ (۶) جہانگیر: توزک جہانگیری، طبع سید احمد خان، علی گڑھ ۱۸۶۳ء، ص ۲۰۸-۲۱۶، ۲۳۱؛ انگریزی ترجمہ، ۱: ۳۲۱، ۳۳۸ و ۳۵۰؛ (۷) فرشتہ، جہی ۱۸۳۲ء، ۲: ۳۷۹، ۳۹۰، ۳۲۳؛ (۸) میر علی اکبر حسینی اردستانی: محفل الاصفیاء، نسخہ دانش گاہ پنجاب، مجموعہ آذر، ورق ۷۶۹ ب؛ (۹) دارا شکوہ: سفینة الاولیاء، لکھنؤ ۱۸۷۲ء، ص ۱۱۷؛ (۱۰) عبید اللہ خویشگی: معارج الولاية، مخطوطہ دانش گاہ پنجاب، مجموعہ آذر، ورق ۵۰۸؛ (۱۱) خافی خان: منتخب التواریخ، ۱: ۵۳۸؛ (۱۲) شاہنواز خان: مآثر الامراء، ۳: ۳۳۷، بعد (ص ۳۳۸ س ۱۳ کے مہم مضمون کے ساتھ)؛ قَب شوستری: مجالس المؤمنین، تہران ۱۲۹۹ھ، ص ۶۴؛ (۱۳) علی محمد خان: مرآت احمدی، خاتمہ، کلکتہ ۱۹۳۰ء، ۲۶ تا ۳۴، ۳۷ تا ۶۱ و انگریزی

مساعی جمیلہ کیں۔ ان کے بعد ان کے جانشینوں، خصوصاً ان کے بیٹے شاہ عالم اور ان کے مریدوں نے اس سلسلے کو خوب ترقی دی۔ گجرات کے خاص و عام میں اس سلسلے کے خوارق و کرامات مشہور تھے اور احمد شاہی سلاطین خصوصیت کے ساتھ ان کے بہت معتقد تھے (قَب توزک جہانگیری، ص ۲۰۸، بعد، ترجمہ راجرز، ۱: ۳۲۱؛ مرآت سکندری، ص ۱۱۸۵، ۱۲، ۲۸۸، ۱۲ س ۱۲)۔ احمد شاہیوں کے بعد جہانگیر کے زمانے سے لے کر بعد کے بادشاہوں تک متعدد مغل بادشاہ مشایخ گجرات کو گونا گوں عنایات کا مورد بناتے رہے (مثلاً دیکھیے مرآت احمدی، خاتمہ، ص ۲۸؛ توزک جہانگیری، مطبوعہ علیگڑھ، ص ۲۱۶، ۲۳۳، ترجمہ انگریزی، ۱: ۳۰۱ و ۲: ۳۵؛ Burgess، ۲: ۱۶)۔ شاہجہان نے ان میں سے ایک کو شش ہزاری منصب اور صدارتِ دل دی۔ اورنگ زیب نے اس کے لڑکے کو صدرالصدور بنایا (تحفة الکرام، ۲: ۳۱؛ مآثر عالمگیری، ص ۶۶، ۳۳۷)۔ ہمایوں اور جہانگیر زیارت و فاتحہ خوانی کے لیے ان بزرگوں کے مزاروں پر بھی پہنچے۔ ان کی اولاد کی تفصیل مرآت احمدی، خاتمہ، میں دی ہے۔ وہیں ان مواضع کی تفصیل بھی ہے جو "عمود سابقہ کے فرمان" کے مطابق صاحبِ سجادہ و فرزندان و سادات قطیبہ کو ملے تھے۔ بعد کے ادوار میں ان اوفاف کے حالات کے لیے دیکھیے J. Burgess، ۱: ۶۲، بعد و ۲: ۱۶، بعد۔ جناب قطب عالم کا عالی شان مزار، جو امرائے گجرات نے بنوایا تھا، اب شکستہ حالت میں ہے (Burgess، ۱: ۶۰، بعد، لوحہ ۷۳ و ۷۴)۔ ان کے لڑکے حضرت شاہ عالم کا مزار البتہ بہتر حالت میں ہے (دیکھیے وہی کتاب، ۲: ۱۵، بعد و لوحہ ۲۴، بعد)۔ صاحبِ مرآة احمدی (محلِ مذکور) نے لکھا ہے کہ مرقد شریف حضرت قطب عالم "تاحال"



ترجمہ، ص ۲۷ تا ۳۰، ۳۹ تا ۶۰ (حالات زندگی، اولاد، خلفاء، اوقاف): (۱۳) علی شیر قانع: تحفة الکرام، دہلی ۱۳۰۳ء، ۱: ۱۶، بعد: قب ۲: ۳۰: (۱۵) مفتی غلام سرور: خزینة الاصفیاء، لاہور ۱۲۸۴ء، ص ۷۳: (۱۶) عبدالحی لکھنوی: تزهة الخواطر، حیدرآباد، ۱۳۷۱ء، ۳: ۹۶: (۱۷) وہی مصنف: یادِ ایام (اردو)، علی گڑھ ۱۳۳۷ء، ص ۵۲.

(نحمد شفیق)

\* برہان الدین مرغینانی: رک بہ المرغینانی.

\* برہان شاہ اول: رک بہ نظام شاہ.

\* برہان شاہ ثانی: رک بہ نظام شاہ.

\* برہان الملک: میر محمد امین سعادت خان

بن سید محمد نصیر الموسوی، نیشاپور کا باشندہ۔ اودھ کے نواب وزیروں کے خانوادے کا بانی۔ دہلی میں اس کی آمد کی تاریخ کا علم نہیں [لیکن تاریخ عماد السعادت (مطبوعہ نول کشور، ۱۸۹۷ء، ص ۵ بعد) کی رو سے، جسے غلام علی تقوی نے نواب سعادت علی کے حکم سے ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء میں تالیف کیا، محمد امین کا باپ میرزا نصیر اور بڑا بھائی محمد باقر ایوان سے "سواری جہاز" ۱۱۱۸ھ/۱۷۰۶ء میں براہ راست بنگالہ آئے اور عظیم آباد پٹنہ میں سکونت اختیار کی۔ نواب بنگالہ نے ان کی کچھ مدد معاش مقرر کر دی تھی۔ دو سال بعد محمد امین باپ سے ملنے آیا، مگر وہ فوت ہو چکا تھا، چنانچہ دونوں بھائیوں نے دہلی کا رخ کیا اور محمد امین سرہند خان صوبیدار گجرات کی سرکار میں "میرمنزلی" کی خدمت پر مامور ہو گیا، لیکن معتوب ہو کر نوکری چھوڑ دی اور دوبارہ دہلی آ گیا۔ "بادشاہ گرسادات" کے دیوان رتن چند کی عنایت سے ۱۱۲۸ھ/۱۷۱۶ء میں [اسے ہندوں بیانہ کا کمپدان مقرر کیا گیا] اور اس طرح وہاں کی فوجداری کی سند مل گئی۔ وہاں اس نے علاقے کے سرکش راجپوتوں

اور جاٹ زمینداروں کی سرکوبی کی۔ بادشاہ گرسامیر الامرا سید حسین علی خان بارہہ کے قتل (اواخر ۱۱۳۳ھ) کی سازش میں جو کارگزاری اس نے دکھائی [طباطبائی: سیر المتأخرین، ج ۲] اس کے صلے میں اسے ۱۱۳۳ھ/۱۷۲۰ء میں پنج ہزاری ذات اور تین ہزار سوار کی سپہ سالاری کا منصب اور سعادت خان بہادر کا خطاب ملا۔ اسی سال اسے اکبر آباد (آگرہ) کا صوبیدار مقرر کیا گیا۔ تھوڑی ہی مدت کے بعد اسے اودھ کا صوبیدار مقرر کیا گیا، جہاں اس نے لکھنؤ کے شیخ زادوں کو نہایت سختی سے دبایا اور سرکش ٹھاکروں کا قلع قمع کیا، جس کے صلے میں بہادر جنگ کا دوسرا خطاب اور "ماہی مراتب" عطا ہوئے۔ اس نے صوبے میں مالگزار کے نئے بندوبست کا حکم دیا، جس سے اراخی کے شاہی محاصل میں اضافہ ہوا۔ شہنشاہ محمد شاہ نے اس کی خدمات کے صلے میں اسے برہان الملک کا خطاب دیا۔

پورے اودھ پر، جو اس وقت انتشار کی حالت میں تھا، اپنا تسلط جما لینے کے بعد اس نے بنارس اور جون پور کے منحرف جاگیرداروں کو سزا دی۔ ۱۱۳۸ھ/۱۷۳۵ء میں کورہ جہاں آباد کا ضلع اس کی تحویل میں دے دیا گیا، جس کا زمیندار بھگونت رائے گڑ بڑ کا باعث بن رہا تھا؛ وہ بالآخر نواب کی فوجوں سے تصادم میں مارا گیا۔ اسی سال مسلسل کامیابیوں سے سرشار برہان الملک مزید شاہی سرپرستی حاصل کرنے کی امید میں دہلی محمد شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ۱۱۳۹ھ/۱۷۳۷ء میں اس نے مرہٹوں پر، جنہوں نے دو آب کے ایک حصے پر قبضہ کر رکھا تھا [اور دہلی کے نواح میں لوٹ مچا رکھی تھی] (History: Grant Duff of the Marhattas، ۱: ۳۳۱) پر حملہ کیا، انہیں شکست دی اور شدید نقصانات پہنچا کر وہاں سے

بہت سے بیش بہا نوادر شامل ہیں، لٹوانے کا باعث ہوا (واقعہ خرابی دہلی؛ نادرنامہ، تالیف مرزا مہدی میر منشی نادرشاہ؛ تذکرہ آند رام مخلص؛ نیز تراجم و انتخابات از Elliot : *History of India*، ج ۸، وغیرہ] - دوسرے ماخذ کے مطابق، جن میں مآثر الامرا (۱ : ۳۶۶) شامل ہے، برہان الملک کی موت پرانے زخم کے پھٹ جانے کی وجہ سے ہوئی، جس کی دیکھ بھال اس نے نہیں کی تھی؛ مگر اس بیان میں برہان الملک کے سر سے ان افعال کی ذمہ داری ہٹانے کی سعی کا شائبہ پایا جاتا ہے جن کی وجہ سے باشندگان دہلی کو ان گنت مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔

برہان الملک اور اعتبار سے اچھا آدمی ہونے کے باوجود جاہ طلب تھا۔ اس کی غرض پرستی سے حسین علی خان جیسا شخص بھی نہ بچ سکا حالانکہ سید اور شیعی ہونے کی وجہ سے برہان الملک حسین علی کا منظور نظر اور متوسل تھا۔ دہلی کی ایک نہر جو اب اٹ گئی ہے اس کے نام پر نہر سعادت خان کہلاتی تھی۔ یہ نہر فیض نہر سے نکالی ہوئی معلوم ہوتی ہے، جو دور مغلیہ کے اواخر میں شہر میں آب رسانی کا سب سے اہم ذریعہ تھی۔

ماخذ: (۱) مصمص الدولہ شاہ نواز خان : مآثر

الامراء (Bibl. Ind.)، ۱ : ۳۶۳ تا ۳۶۶؛ (۲)

غلام علی خان نقوی : عماد السعادت، لکھنؤ ۱۸۶۳ء؛

(۳) محمد فیض بخش : فرح بخش (انگریزی ترجمہ از

W. Hocy، الہ آباد ۱۸۸۸ء؛ (۴) کمال الدین حیدر : تاریخ

اودھ (اردو)، ۲ جلدیں، لکھنؤ ۱۸۷۹ء؛ (۵) درگا پرشاد مہر

سندیلوی : بستان اودھ، لکھنؤ ۱۸۹۲ء؛ (۶) مولوی

ابن حسن : برہان اودھ (خطی، مجموعہ سبحان اللہ، مسلم

یونیورسٹی علیگڑھ)؛ (۷) نجم الغنی رامپوری :

تاریخ اودھ (اردو)، ۵ جلد، لکھنؤ ۱۹۱۸ء؛ (۸)

غلام حسین خان طباطبائی : سیر المتأخرین، ج ۲، لکھنؤ

نکال دیا . . . . .  
 ۵۱۱۵۱ [صحیح ۵۱۱۳۷/۵۱۷۳۸] میں جب  
 نادر شاہ افشار نے ہندوستان پر چڑھائی کی تو  
 برہان الملک تیس ہزار کا لشکر جرار لیکر اودھ سے  
 نکلا۔ گو اس کا سامان کرنال میں اردوے شاہی تک  
 پہنچنے سے پہلے ہی دشمن نے لوٹ لیا، تاہم اس  
 نے وزیر نظام الملک اور بادشاہ کے حکم کے خلاف  
 فیصلہ کیا کہ جلمہ آوروں کا مقابلہ کرے؛ مگر  
 عین لڑائی میں اسے اس کے ایک نیشاپوزی  
 ہم وطن نے پہچان لیا اور اس کا ہاتھی بغیر کسی  
 مزاحمت کے دشمن کے کیمپ میں ہانک کر پہنچا  
 دیا گیا۔ برہان الملک نے . . . افشار کو تاوان جنگ  
 بڑھانے پر آمادہ کیا۔ محمد شاہ کے سفیر نظام الملک  
 آصف جاہ اور ایرانی حملہ آور کے درمیان طے پا چکا  
 تھا کہ پچاس لاکھ روپیہ ہوگا، مگر برہان الملک  
 نے کہا کہ اتنی رقم تو مغل دربار کا ایک ہی  
 امیر باسانی ادا کر سکتا ہے۔ خود برہان الملک  
 کو تین کروڑ تیس لاکھ روپیہ نقد تاوان جنگ میں  
 اپنے حصے کے طور پر دینا پڑا، لیکن دہلی واپس  
 آنے کے تھوڑے عرصے بعد ۱۰ ذوالحجہ ۱۱۵۱ھ /  
 ۱۹ مارچ ۱۷۳۹ء کو اس کی ناگہانی موت واقع  
 ہو گئی۔ یہ موت ایسی غیر متوقع تھی کہ متعدد  
 قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ  
 چونکہ وہ حملہ آور کے لیے تاوان جنگ (بیس کروڑ  
 روپیہ)، جس کا اس نے وعدہ کر لیا تھا، ادا کرنے کا  
 انتظام نہیں کر سکا تھا اس لیے نادر شاہ نے اسے  
 طرح طرح سے اتنا ذلیل کیا کہ وہ ذلت برداشت نہ  
 کر سکا اور اس نے خود کشی کر لی [مگر معاصر  
 تاریخوں سے یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ نادر شاہ  
 کو دہلی لا کر بادشاہی کارخانوں کی نشان دہی  
 برہان الملک ہی نے کی اور کروڑوں روپے کے  
 جواہرات، جن میں شاہجہان کا "تخت طاؤس" اور



بھی پتا چلتا ہے۔

چندر بہان برہمن کی تصانیف یہ ہیں : (۱) چہار چمن؛ (۲) گلدستہ؛ (۳) تحفۃ الانوار؛ (۴) نگارنامہ؛ (۵) تحفۃ الفصحا؛ (۶) مجموعۃ الفقرا؛ (۷) منشآت اور (۸) دیوان۔ بعض اور کتابوں کا بھی کہیں کہیں ذکر آیا ہے، مگر مشہور کتابیں یہی ہیں۔

برہمن کا امتیاز شاعری کے ایک خاص انداز اور انشا پردازی میں سادہ اسلوب کی وجہ سے ہے۔ مکتوب نویسی میں اس کی ایک خاص روش تھی، جس کی وجہ سے دارا شکوہ اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ تقریح العمارات کے بیان کے مطابق اس نے آگرے میں باغ اور کچھ عمارتیں بنوائی تھیں۔ تذکرۃ خوش نویساں میں اس کے خط کی پاکیزگی کی تعریف کی گئی ہے۔

برہمن کے شاعرانہ رتبے کا اعتراف صائب نے یوں کیا ہے کہ اس کے چند منتخب اشعار اپنی بیاض میں شامل کیے ہیں۔ نثر عشق کے بیان کے مطابق برہمن نے اپنے دیوان کے چند نسخے خوشنما خط میں لکھوا کر شعراے ایران و توران کو بغرض انتخاب بھیجے تھے۔ اس کے دیوان میں غزلیات و رباعیات ہیں، جن میں بعض مدحیہ بھی ہیں، مگر قصیدے شاید نہیں لکھے (پنجاب پبلک لائبریری، لاہور کے مخطوطے سے یہی اندازہ ہوتا ہے)۔

مآخذ : (۱) محمد صالح : عمل صالح، (مخطوطہ دانشگاہ پنجاب، ورق ۷۱۳) - شیر خان لودھی : مرآۃ الخیال، بذیل مادہ؛ (۲) حسین قلی خان عشق : نثر عشق (مخطوطہ دانشگاہ پنجاب) بذیل مادہ؛ (۳) حسین دوست : تذکرۃ حسینی (مخطوطہ دانشگاہ پنجاب) بذیل مادہ؛ (۴) سید عبداللہ : ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، مطبوعہ انجمن ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۷ء، ص ۶۹ تا ۷۶ و ۷۹ تا ۸۴۔

(ادارہ)

۵۱۳۲۳/۴۱۸۹۷ : (۹) اے۔ ایل۔ سری واستوا : *The First Two Nawabs of Oudh*، لکھنؤ ۱۹۳۳ء (اس تصنیف میں نہایت جامع اور تنقیدی فہرست مآخذ دی گئی ہے)؛ (۱۰) *Cambridge History of India* ج ۳، بمبئی اشاریہ؛ (۱۱) *A History of the Freedom Movement*، کراچی ۱۹۵۷ء، ۱ : ۲۱۰ تا ۲۱۳؛ (۱۲) سٹوری، ۱/۲ : ۲۰۳ تا ۷۱۳؛ علاوہ ازین رگ بہ مادۃ نادرشاہ اودھ؛ (۱۳) *William Irvine* : *Later Mughals*، ۲ : ۵۵ تا ۵۷، ۲۸۷ بعد، ۳۳۳ تا ۳۳۷ بعد۔

(بزمی انصاری)

⊕ برہمن : منشی چندر بہان کا تخلص، والد کا نام دھرم داس، لاہور کا رہنے والا، عہد شاہجہانی کا متصدی (عمل صالح، مخطوطہ دانشگاہ پنجاب، ورق ۷۱۳، قَب تذکرۃ حسینی، مخطوطہ دانشگاہ پنجاب، ورق ۵۴، جس کے بیان کے مطابق دھرم داس اصلاً اکبر آباد سے متعلق تھا)۔ دھرم داس کے چار بیٹے تھے۔ چندر بہان کے علاوہ اودے بہان، رائے بہان اور اندر بہان، ان میں سے دو ملازمت میں تھے اور رائے بہان اور اودے بہان نے آزاد اور بے تعلق زندگی بسر کی۔

ابتدائی تعلیم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی سے حاصل کی (نثر عشق، مخطوطہ دانشگاہ پنجاب، ج ۱، ق ۹۰)۔ چندر بہان پہلے امیر عبدالکریم میر عمارت کی ملازمت میں رہا۔ پھر افضل خاں وزیر کل کا منشی اور آخر میں داراشکوہ کا منشی خاص بنا۔ شاہجہان کے دربار میں بھی حاضر ہونے کا موقع ملا (نثر عشق، مخطوطہ دانشگاہ پنجاب، ج ۱، ق ۹۰)۔

دارا کی وفات کے بعد چندر بہان نے گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ۱۰۷۳ھ میں بنارس میں وفات پائی۔ منشآت برہمن سے اس کے ایک فرزند تیج بہان کا

\* برہوتی : و بروہی رَکْ بہ براہوتی۔

\* برہوت : (نیز برہوت یا بلہوت)، حضر موت

میں ایک وادی، جس کی ایک دیوار میں مشہور  
بئر برہوت ہے، جو اب کنواں نہیں بلکہ غار  
کہلاتا ہے۔ یہ وادی، جو شہر تریم کے مشرق  
میں واقع ہے، المسیلہ میں، جو جنوب کی جانب  
سے وادی حضر موت کا زیرین خطہ ہے، جا کر  
ختم ہو جاتی ہے۔ برہوت کے دیانے پر قبر ہود<sup>۴</sup>  
[رَکْ بہ ہود<sup>۴</sup>] ہے، یہ جنوبی عرب کا سب سے  
زیادہ متبرک مزار ہے اور ہر [گیارہ] شعبان کو  
اس کی زیارت کی جاتی ہے۔

قدیم روایات میں بئر برہوت کو  
کرۃ ارض کا بدترین کنواں کہا گیا ہے،  
جس میں کافروں اور منافقوں کی ارواح منڈلاتی  
رہتی ہیں۔ برہوت غالباً حضرت ہود علیہ السلام  
کے مقبرے کی موجودگی کی وجہ سے تمام عرب  
میں مشہور ہو گیا تھا۔ اس کی اور کوئی وجہ نہیں  
(قب Wensinck جو von Kremer کا حوالہ دیتا ہے، در  
۱۱، لائنڈن، بار اول، ۲ : ۳۲۸)، کیونکہ محض ایک  
غار کو اتنی شہرت کا حاصل ہو جانا قرین قیاس  
معلوم نہیں ہوتا۔ بئر برہوت کی اصل حقیقت کو  
سب سے پہلے H. von D. van der Meulen اور  
Wissmann نے بے نقاب کیا، جنہوں نے ۱۹۳۱ء  
میں اس کا کھوج لگایا تھا۔ اس وادی کی سطح  
سے تقریباً تین سو فٹ اوپر انہوں نے ایک  
خاص قسم کے چونے کا غار دیکھا، جس کے گرد  
کوئی آتش فشانی مادہ نہ تھا۔ اس کے اندر جو  
عجیب و غریب مگر بے ضرر بوہے وہ گندھک  
کے بخارات سے نہیں آتی، یہ غالباً چٹان کی فرسودگی  
کی وجہ سے آتی ہے یا شاید چمگادڑوں کی وجہ سے؛  
بڑے برآمدے اور دیگر کئی بغلی برآمدوں کا  
تحقیقی جائزہ لیا گیا لیکن اس میں کچھ قابل ذکر

آثار نہیں ملے۔

مآخذ : بئر برہوت کے متعلق قدیم باطل اعتقادات

کے لیے دیکھیے : (۱) حوالہ جات از J. Schleifer در ۱،

لائڈن، بار اول، ۱ : ۶۵۴ : (۲) ان میں اضافہ

کر لینا چاہیے، Études sur : C. von Landberg

les dialectes des l'Arabic méridionale، جلد اول، لائڈن

۱۹۰۱ء ص ۳۲ تا ۳۴، ۳۸۱ تا ۳۸۳ : (۳) غار کے

لیے دیکھیے : H. von Wissman و D. van der Meulen

، لائڈن ۱۹۳۲ء

(G. REMTZ)

\* برہیدریس : Barhebraeus رَکْ بہ ابن العبری۔

\* البریجہ : رَکْ بہ سزگان۔

\* برید :، لاطینی لفظ veredus یونانی beredos

(جس کی اصل غیر یقینی ہے، شاید آشوری ہو) بمعنی

”ڈاک کا گھوڑا“۔ بالعموم اس کا اطلاق اسلامی

ممالک کے سرکاری محکمہ خبرسانی اور ڈاک پر ہوتا

ہے۔ اسی طرح یہ لفظ ڈاک کے جانور، ہرکارے

اور ڈاک کی چوکی کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔

بوزنطیوں اور ساسانیوں کے ہاں سرکاری ڈاک کا

نظام موجود تھا۔ اسلامی زمانے میں نظام برید

اموی دور سے رائج تھا۔ اسے سب سے پہلے

معاویہ رض بن ابی سفیان نے اختیار کیا تھا (دیکھیے

قلقشندی : صبح الأعشی، قاہرہ ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء،

۱۳ : ۳۶۷ بعد)۔ کہا جاتا ہے کہ عبدالملک

نے ملک کے اندرونی نظم و نسق کو از سر نو

استوار کر کے اس ادارے کو مستحکم کیا۔

عباسی دور حکومت کے آغاز ہی سے ڈاک کے محکمے

کا شمار حکومت کے نہایت اہم محکموں میں ہوتا

تھا اور اس کا اہتمام ہمیشہ مقرب ندیموں مثلاً

جعفر برمکی یا شاہی محل کے خواجہ سراؤں کو

تفویض ہوتا تھا۔ متعدد خلفا نے نال کے طریق کار

کو ترقی دی۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری / نویں



جب اپنے باپ کی وفات کی اطلاع پا کر جرجان سے بغداد واپس آنا پڑا تو اس نے ڈاک کے گھوڑوں سے کام لیا (الطبری، ۳ : ۵۴۷ : الجہشیاری : کتاب الوزراء، مطبوعہ قاہرہ، ص ۱۶۷)۔ پوسٹ ماسٹر (اصحاب البرید)، جو ڈاک کے محکمے کے ڈائریکٹر (صاحب دیوان البرید) کے ماتحت ہوتے تھے، کے فرائض صرف یہیں تک محدود نہ تھے کہ وہ محض سرکاری مراسلات، جو مقامی ارکان حکومت یا مرکز کی جانب سے بھیجے جاتیں، پہنچا دیں (المنصور کے زمانہ خلافت کے متعلق طبری کی ایک روایت سے اور قدامہ: ٹی کتاب میں محفوظ ایک سند عطیہ سے ڈاک کے محکمے کے افسروں کے فرائض منصبی کی تفصیل معلوم ہوتی ہیں)، بلکہ برید کے فرائض انجام دینے کے علاوہ ان کا یہ بھی فرض تھا کہ مرکزی حکومت کو اپنے صوبے اور اپنے عمال کی ہر گونہ سرگرمیوں سے باخبر رکھیں، سرکاری زمینوں اور لگان اراضی سے متعلق کمشنروں کے رویے اور طرز عمل کی اطلاع دیتے رہیں، نیز قاضیوں کی کارگزاری اور اپنے صوبے کے مالی اور اقتصادی حالات سے آگاہ کرتے رہیں۔ حکام ضلع تک کی نگرانی ان کے فرائض میں شامل تھی جیسا کہ طاہر [رک باں] کی خود مختار ریاست خراسان کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے۔ لوگوں کی شکایات کا ازالہ بھی ان کے فرائض میں داخل تھا (مسکویہ: Eclipse، ۱ : ۲۵)۔ بغداد میں مہتمم دیوان کے پاس جو اطلاعات جمع ہو جاتی تھیں، کم از کم ابتدائی دور میں، انہیں براہ راست خلیفہ کے پاس بھیج دیا جاتا تھا۔ مزید برآں ایک مہتمم خبر (اطلاعات) بھی ہوتا تھا جو افسروں اور دارالخلافہ کے حکام (بشمولیت وزیر) کی نگرانی پر مامور تھا (مسکویہ: Eclipse، ۱ : ۲۴)، یہ منصب جو بظاہر ڈاک کے محکمے سے بے تعلق اور آزاد تھا، خواجہ سراؤں یا ایسے امرا کو تفویض کیا

صدی عیسوی کے وسط تک اس کا جال ملک بھر میں پھیل چکا تھا۔ عباسی عہد حکومت میں ڈاک کے محکمے کی حقیقی معنوں میں تنظیم کے متعلق تسلی بخش معلومات ابن خردادبہ اور قدامہ کی تصانیف میں ہیں، جو انہوں نے تیسری / نویں اور چوتھی / دسویں صدیوں کے دوران میں خلافت کے کاتبوں کے استعمال و استفادے کے لیے جمع کی تھیں۔ ان تصانیف میں ڈاک کی چوکیوں کی فہرستیں بھی موجود ہیں۔ ملک بھر میں کم و بیش نو سو تیس ڈاک چوکیاں تھیں (ڈاک یعنی "سکة" جسے ایران میں رباط اور مصر میں مرکز البرید کہتے تھے)۔ ایران میں یہ چوکیاں اصولاً ایک دوسرے سے دو فرسخ (۱۲ کیلو میٹر) کے فاصلے پر واقع تھیں۔ مغربی صوبوں میں ان کا باہمی فاصلہ چار فرسخ (۲۴ میٹر) تھا۔ ڈاک (الخراط) کو مقررہ اوقات کے اندر پہنچانا حکومت کے اہلکاروں (مرتبوں) کی منصبی ذمہ داری تھی۔ ہرکارے (فیوج، فرائق) ایران میں بیشتر خچروں سے اور المغرب میں اونٹوں سے اور کبھی کبھی گھوڑوں سے بھی کام لے لیتے تھے مگر یہ نظام برید قابل رد و بدل بھی تھا۔ چنانچہ بسا اوقات خلیفہ یا وزیر بلکہ معمولی حاکم صوبہ بھی سیاسی یا فوجی ضروریات کے پیش نظر کسی خاص راستے پر ڈاک کے محکمے کو وقتی طور پر مستحکم بناتے نظر آتے ہیں۔ بہت ضروری خبروں کی ترسیل میں کبوتروں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔ یہ ایک سرکاری محکمہ تھا۔ اس لیے ڈاک کے ذریعے نجی خطوط کی ترسیل صرف مستثنیٰ حالتوں ہی میں ہوتی تھی۔ ڈاک کے گھوڑے ایسے اشخاص کو بھی لے جاتے تھے جو حکومت کے نمائندے ہوتے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ نئے خلیفہ الہادی کو بھی

جاتا تھا جو فرمانرواے وقت کے خاص معتمد علیہ ہوتے تھے۔

اگر ہم العُمَرِی کی التعریف کے بیان پر اعتماد کریں تو معلوم ہو گا کہ آل بویہ نے خلیفہ کو اطلاعات سے محروم رکھنے کے لیے برید (سلسلہ مراسلات) کو منقطع کر دیا تھا اور اس طرح گویا انہوں نے خلیفہ کو اپنا پابند بنا لیا تھا۔ دراصل پہلے پہل انہیں کے عہد میں "سُعَات" (تیز کام ہرکارے) کا مشرق میں ظہور ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاک کے محکمے کا انتظام روز بروز خراب ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ سلجوقیوں نے (۵۴۰۰/۶۳۰۰ء میں) اسے بالکل ختم کر دیا اور اس کے بعد خاص قسم کے جاسوسوں سے کام لیا جاتا رہا۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں زنگیوں اور ایویوں کے ہاں صحیح معنوں میں رسل و رسائل کا محکمہ نہ تھا۔ البتہ وہ ہرکاروں اور تیزرو شتربانوں اور کبوتروں سے کام لیتے رہے۔

مملوکوں کے دور اقتدار میں ڈاک کے محکمے نے ایک بار پھر اپنی پہلی سی اہمیت حاصل کر لی اور اس کے طریق کار کی تفصیلات تحریروں اور آثار سے معلوم ہوتی ہیں۔ اس کی از سر نو تنظیم بیبرس (یکے از بادشاہان مملوک) نے کی، جس نے نہ صرف عباسی خلفا کی مثال کو مشعلِ راہ بنایا بلکہ ان مفلوں سے بھی سبق لیا جن سے اس کا مقابلہ رہتا تھا۔ "محکمہ برید" مملوک نظام حکومت کا ایک ایسا شعبہ تھا جسے مذہبی لڑائیوں سے گہرا تعلق تھا۔ لہذا ابتداءً اسے ایک سیاسی اور فوجی حیثیت حاصل تھی لیکن بعد میں اسے تجارتی کاروبار سے وابستہ کر دیا گیا۔ اول اول تو اس کی زمام اختیار براہ راست سلطان کے ہاتھ میں رہی۔ بعد میں یہ شعبہ حکومت کے کاتبوں کے ہاتھوں میں چلا گیا، جنہیں بنو فضل اللہ

کے نامور خاندان میں سے مقرر کیا جاتا تھا۔ انہوں نے اسے اسیر دوا دار کے ہاتھوں میں واپس جانے سے پیشتر دفتری رنگ دے دیا تھا۔ ہرکاروں (بریدی) کے علاوہ، جو مقدم البریدیہ (پوسٹ ماسٹر) کے زیر کمان ہوتے اور جو سلطان کے ایوان خاص کے مملوکوں میں سے بھرتی کیے جاتے تھے، اس ادارے کے افراد میں سرکاری چوکیدار، سائس اور سائق بھی شامل ہوتے تھے۔ ڈاک رسانی کا محکمہ اول اول مصر میں قاہرہ تا دمشق کی شاہراہ پر، جو عام حالات میں ایک ہفتے کی مسافت تھی، شروع ہوا اور بعد میں شام کے ساحل پر واقع شہروں اور سرحد طوروس Taurus کے قلعوں تک اس کی توسیع ہو گئی۔ گھوڑوں کے بدلنے کی چوکیاں، جو اصلاً ایک دوسرے سے چار فرسخ کے فاصلے پر واقع تھیں، ابتداءً عام مسافر خانوں میں قائم کی گئیں۔ ازاں بعد اس مقصد کے لیے خاص عمارات تعمیر کی گئیں جو تعمیری خوبیوں کا لحاظ رکھے بغیر تقریباً سب ہی ایک نمونے پر اس طرح بنائی جاتیں کہ سلطان کے گھوڑے وہاں باندھے جا سکیں اور کچھ لوگ، جن کی تحویل میں یہ گھوڑے ہوتے تھے، وہاں قیام کر سکیں (J. Sauvoget)؛ بعد میں راستے اس قابل بنا دیے گئے جن پر آمد و رفت زیادہ تیزی اور باقاعدگی کے ساتھ ہو سکے۔ اسی زمانے میں ان ہرکاروں کا سلطان کی طرف سے ایک باقاعدہ تقریب کی شکل میں خیر مقدم کیا جاتا تھا اور ان کے عہدوں کے امتیازی نشانات کو، جو بحیثیت مملوک نامہ بر کی خدمات انجام دینے کی وجہ سے معروف و مشہور تھے، زیادہ پر تکلف شکل دیدی گئی تھی۔ کبوتروں کے ذریعے ڈاک رسانی اور معین اشارات سے پیغام رسانی کے فن میں بھی ترقی ہوئی۔ یہ تمام نظام تیمور کے حملے (۵۸۰۳/۶۱۳۰۰ء) سے



• مآخذ: عہد عباسی کے تاریخی حوالوں کے علاوہ جہاں وقتاً فوقتاً ان کا ذکر آجاتا ہے خاص طور سے ملاحظہ ہو: (۱) الطبری، ۳: ۳۳۵؛ (۲) الخوارزمی: مفاتیح العلوم، مطبوعہ قاہرہ، ص ۳۲؛ (۳) ابن خردادبہ، مواضع کثیرہ؛ (۴) قدامہ بن جعفر: الخراج، طبع De Goeje، ص ۱۸۳ و Köprülü، مخطوطہ، ۱۵ تا ۱۶؛ (۵) The Kurrah Papyri: N. Abbott، شکاگو ۱۹۳۸ء، ص ۱۵، ۱۶؛ (۶) Die Post-und: A. Sprenger؛ (۷) Reiserouten des Orients، لائپزگ ۱۸۶۳ء؛ (۸) A. Mez؛ (۹) Renaissance، ص ۳۶۳ تا ۳۷۱؛ (۱۰) J. Sauvoget؛ (۱۱) La poste aux chevaux dans empire des Mamelouks، پیرس ۱۹۳۱ء؛ (۱۲) Hist. Esp. mus: Levi Provençal؛ (۱۳) La Berbérie: R. Brunschvig؛ (۱۴) orientale sous les Haf-sides، پیرس ۱۹۳۱ء، ص ۲؛ (۱۵) [ان کے علاوہ جو حوالے متن میں درج ہیں]۔

(D. SOURDEL)

- بریدہ: سعودی عرب کے ضلع القصیم کا موجودہ صدر مقام، اس کی جائے وقوع ۲۶ درجے ۲۰ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۴۳ درجے ۵۸ دقیقے طول بلد پر وادی الرّمہ کے بائیں کنارے ٹھیک اس مقام کے مغرب میں واقع ہے جہاں وہ نفود السّر کے ریگستان میں نہہ کر جاتی ہے۔ یہ شہر نفود البریدہ کی ایک پہاڑی پر شہر عنیزہ کے مقابل، جو اس کے پرانا حریف ہے، ۲۵ کیلومیٹر شمال میں ندی کے سامنے کے کنارے پر واقع ہے۔ القصیم میں یہ ندی عموماً الوادی کے نام سے مشہور ہے۔ نفود بریدہ کے ٹیلوں کے درمیان سیلابی کھاد سے ادھر ادھر سطح قطعات نکل آئے ہیں، جن پر باغ لگے ہوئے ہیں۔ یہ گڑوں مجموعی طور پر الغیوب (مفرد خب) کہلاتے ہیں۔ یہ زرخیز قطعات الوادی کے سیلابوں کے مرہون بنت ہیں اور اسی ندی کی بدولت انہیں

پانی پانے کا ذریعہ بنا رہتا ہے۔

درہم برہم ہو گیا۔ اس کے بعد سرکاری ڈاک کے لیے تیز روشتر سواروں اور ہرکاروں سے کام لیا جانے لگا۔ ڈاک کا ادارہ کئی اسلامی حکومتوں میں قائم تھا، جہاں یہ عملی تقاضوں کو پورا کرتا تھا اور اسلام کے اخلاقی اصولوں کے مطابق خطوط کی حفاظت اور امور سلطنت کی رازداری کا اہتمام کرتا تھا۔ تاہم اس کی حالت ہر جگہ یکساں نہ تھی۔ چوتھی صدی / دسویں صدی میں اندلس میں سرکاری ڈاک کے محکمے کو وہ اہمیت حاصل نہ تھی جو مشرق میں تھی۔ یہ لوگ جن قاصدوں سے کام لیتے تھے وہ خچروں اور سوڈانی گھوڑوں [رقاص] پر سواری کرتے تھے۔ اس سے اس نظام کی خامی ہویدا ہے۔ اس کی باگ ڈور ڈاک کے ایک اعلیٰ افسر (صاحب البرد) کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ بظاہر اس کے ماتحت کثیر التعداد کارندے ہر جگہ اطلاعات بہم پہنچانے پر لگے ہوئے تھے۔ مشرقی بربر کی حفصی ریاست میں ڈاک کا کام نہایت ہی ابتدائی اور نا مکمل صورت میں ہوتا تھا۔ ہرکارے اپنے لیے خود خچر مہیا کرتے تھے اور ایسی چوکیاں بھی متعین نہ تھیں جہاں وہ اپنے خچر بدل سکتے۔ ڈاک کا محکمہ ایران میں صفویوں کے عہد میں نیز سلطنت عثمانیہ میں موجود تھا [نیز رک بہ ہوستہ؛ رقص]۔ [ابن بطوطہ، جس نے محمد تغلق کے زمانے میں ہندوستان وغیرہ کی سیاحت کی، اپنے سفر نامے میں لکھتا ہے کہ ڈاک کو ہندوستان میں برید کہتے ہیں۔ ڈاک دو قسم کی ہوتی ہے: (۱) گھوڑوں کی (الاق یا الاغ) اور (۲) پیادوں کی۔ ہرکاروں کے نظام کے بارے میں ابن بطوطہ نے بڑی دلچسپ معلومات دی ہیں۔ ان تفصیل کے لیے دیکھیے بداؤنی: منتخب التواریخ؛ فرشتہ: الفتشدی: صبح الاعشی (جہاں نامہ بر کبوتروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے)۔

قرار دیا ہے لیکن اس نے اپنے ماخذ کا پتا نہیں دیا۔ بہر حال اس شہر کا ایک سیاسی قوت ہونے کی حیثیت سے پہلا ذکر ابن بشر نے، جو زمانہ حال کے وسط عرب کا ممتاز مورخ ہے، کیا ہے۔ وہ اس لڑائی کے مختصر حالات بیان کرتا ہے جو بریدہ اور عنیزہ کے درمیان ۱۱۰۷ھ / ۱۶۶۵ء - ۱۶۹۶ء میں ہوئی۔

بریدہ کی مقامی تاریخ بڑی حد تک چار خاندانوں کی کہانی اور وسط عرب کی سیاسیات میں خود مختارانہ حیثیت سے یا صوبے کے والی کی حیثیت سے ان کے دخل دینے کا بیان ہے۔ سب سے پہلا خاندان آل الدریبی (یا شاید البریدی، بحوالہ ابن لُعبون) ہے، جو بنو تمیم کی شاخ العناقر میں سے تھا۔ Corancez کے خیال میں اسی کے جد امجد رشید الدریبی کو بریدہ کی بنیاد رکھنے کا فخر حاصل ہے۔ اس خاندان سے متعلق اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ اس نے ایک باہم تباہ کن لڑائی اپنے چچا زاد بھائیوں یعنی العناقر کے آل علیان سے جاری رکھی۔ عنیزہ سے جو لڑائی مسلسل چلی آتی تھی اس کی وجہ سے آل الدریبی نے ۱۱۸۲ھ / ۱۷۶۸ - ۱۷۶۹ء میں آل سعود سے فوجی امداد کی درخواست کی۔ اس اقدام سے بریدہ تھوڑے ہی دن میں سعودی حلقہ اثر میں آ گیا، آل علیان کو قوت حاصل ہو گئی اور القسیم مدت دراز تک جبل شمر کے آل رشید اور آل سعود کے درمیان لڑائی کا اکھاڑا بنا رہا۔

آل علیان نے آل سعود کے عاملوں کی حیثیت سے اور بعض اوقات الحجاز کے ترک - مصری حملہ آوروں کے تحت ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ - ۱۷۷۶ء سے ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۳ - ۱۸۶۳ء تک حکومت کی۔ ان کے قابل اعتماد نہ ہونے کی بنا پر ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ - ۱۸۴۹ء سے ۱۲۷۰ھ / ۱۸۵۳ - ۱۸۵۴ء تک

بریدہ کا ارتفاع اس کے ہوائی اڈے پر ۶۱۰ میٹر ہے۔ شہر کے شمال اور مغرب میں بہت اچھی چراگاہیں اور نفیس نمک کے وافر ذخیرے ہیں اور اسی وجہ سے کسی زمانے میں یہ شہر گھوڑوں، اونٹوں اور دوسرے مویشیوں کی بھی مشہور منڈی تھی۔ جانوروں کی کثرت، زرعی پیداوار کی فراوانی الخبواب کے پانی کے ذخیرے اور مدینے سے بصرے کی سڑک پر اس شہر کا مرکزی مقام یہ سب وہ اسباب تھے جنہوں نے بریدہ کو بڑھاتے بڑھاتے عرب کے بڑے تجارتی مرکزوں میں سے ایک مرکز بنا دیا تھا۔ اس کی مخلوط آبادی - جس میں مستقل رہنے والے قبیلے حرب، عنزہ، مطیر، عتیبہ اور بنو تمیم کے گروہ شامل تھے - تمام عربی دنیا میں تجارت کرتی تھی۔ بریدہ کے باشندے، جو عقیل نامی تجارتی جمعیت سے تعلق رکھتے تھے، قاہرہ سے بمبئی تک مویشیوں کے بیوپاری اور کارواں والے مشہور تھے۔

یہ بات واضح طور پر معلوم نہیں کہ یہ شہر کب اور کیسے تعمیر ہوا۔ یاقوت بریدہ کے ذکر میں کہتا ہے کہ یہ بنو ضبینہ، جو قبیلہ عبس میں سے تھے، کی پانی پلانے کی جگہ تھی۔ عرب کے موجودہ جغرافیہ دان الخانجی اور ابن بلیہد اسی ابتدائی نام کو موجودہ شہر کی وجہ تسمیہ مانتے ہیں۔ جب تک کوئی مزید شہادت نہ ملے اس وقت تک اسی پانی پلانے کی جگہ کو موجودہ بریدہ سمجھنا قابل تسلیم نہیں۔ شہر کی بنیاد رکھے جانے کی تاریخ کی کسی معقول شہادت سے تائید نہیں ہوتی اگرچہ مقامی روایات اور مغربی سیاح اس پر متفق ہیں کہ تقریباً دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں اس کا معقول امکان ہے۔ کاسیکل Caskel نے بریدہ کی بنیاد رکھے جانے کا زمانہ ۹۵۰ھ / ۱۵۴۳ - ۱۵۴۴ء



ہو گئے تو اس وقت سے بریدہ کی پہلی مہیب شکل بالکل بدل گئی۔ اب فقط الجردہ کی وسیع منڈی کا چوک اور اس کے مغرب کی طرف دکانوں کے تنگ پیچ در پیچ بازار رہ گئے ہیں، جو اس کے پہلے زمانے کے بڑے تجارتی مرکز ہونے کی یاد دلاتے ہیں۔ اس کی آبادی کی حالت خاصی یکساں چلی آتی ہے، جس کا اندازہ پچیس تیس ہزار لگایا گیا ہے۔ اس میں آدھے الخبواب کے چھوٹے چھوٹے دیات میں رہنے والے لوگ ہیں۔

مآخذ: (۱) یاقوت، بذیل مادہ؛ (۲) عثمان بن بشر؛ عنوان المجد، مکہ ۱۳۳۹ھ؛ (۳) محمد بن بلیہد؛ صحیح الأخبار، قاہرہ ۱۹۵۱-۱۹۵۳ء؛ (۴) ابن لعیون؛ تاریخ، مکہ ۱۳۵۷ھ؛ (۵) محمد امین الخانجی؛ منجم العُمران، قاہرہ ۱۹۰۷ء؛ (۶) Arabia: Philby of the Wahhabis، لندن ۱۹۲۸ء؛ (۷) M. v. Dic: W. Caskel اور E. Bräunlich، Oppenheim، لائیپزگ Wiesbaden ۱۹۳۹-۱۹۵۲ء۔

(R. HEADLEY)

- بریدہ بن الحصیبؓ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی، قبیلہ اسلم بن انصی کے سردار، اسی خاندانوں کو لے کر، جو ان کے ساتھ تھے، اس وقت اسلام لائے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے ان کی بستی القمیم میں ٹھہرے (مگر ابن حجر کے قول کے مطابق وہ جنگ بدر کے بعد اسلام میں داخل ہوئے)۔ بریدہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مدینے میں جنگ احد کے بعد آئے اور مدینے میں آنے کے بعد وہیں رہے اور آپ کے ساتھ تمام غزوات میں حصہ لیا۔ ۵۹ھ / ۶۳۰ء میں وہ بنو اسلم اور بنو غفار سے صلقات وصول کرنے اور پھر انہیں غزوة تبوک میں شرکت کی دعوت دینے کے لیے بھیجے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

الجلوی بن ترکی آل سعود کو القسیم کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اور عنزہ کے آل ابوالخیل کا خاندان مہتا ۱۲۸۰ھ / ۱۸۹۳-۱۸۶۳ء سے ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸-۱۹۰۹ء تک بریدہ کے حاکم بنے رہے۔

آل علیان اور آل ابوالخیل دونوں میں سے کوئی اس قابل نہ ثابت ہوا کہ آل سعود کی خدمت کو مقامی اقتدار حاصل کرنے کی ہوس پر فائق رکھتا۔ آل رشید اور آل سعود کے درمیان جنگ کی طویل مدت کے دوران میں وہ دونوں آقاؤں کی رفاقت یکساں فریب و ریاکاری سے کرتے رہے۔

جب آل سعود نے ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء میں القسیم کو حتمی طور پر فتح کر لیا تو اس کے سابق حاکم الجلوی آل سعود کے تندخو بیٹے عبداللہ کو القسیم کا والی بنا کر بریدہ میں بٹھا دیا گیا تا کہ اس جنگی اہمیت کے مرکز میں مقامی سازشیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔ عبداللہ کے بعد اس کا چچیرا بھائی عبدالعزیز بن مساعد آل سعود مقرر ہوا، جو حائل کا حاکم تھا، اور کچھ دن بعد عبداللہ بن عبدالعزیز بن مساعد اس کا جانشین ہوا، جو شمالی سرحدی علاقے کا والی تھا۔

بد نظمی اور شورش کے وہ چند سال جو شاہ عبدالعزیز آل سعود کے ملک کو منظم و منضبط کرنے سے پہلے گزرے انہوں نے بریدہ کی تجارت کو بہت نقصان پہنچایا پھر جب شاہ موصوف نے الحساء اور الحجاز کو فتح کر لیا تو وسط عرب سے دونوں ساحلوں کی بندرگاہوں تک بے روک ٹوک آمد و رفت کی صورت نکل آئی اور القسیم کے تجارتی اجارے میں رخسہ پڑ گیا۔ ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴-۱۹۵۵ء میں جب اس شہر کے سب سے نمایاں نشانات یعنی شہر کی بڑی فصلیں اور آل مہتا کا قلعہ سمار کر دیے گئے اور ان کی جگہ جدید طرز کی سرکاری عمارتیں، سکول اور ہسپتال تعمیر

اور بیجا پور، احمد نگر اور گولکنڈہ میں عملاً خود مختار ہو چکے تھے، لیکن یہ بات کہ وہ دارالسلطنت بیدر [رک بان] میں تھا اس کے حق میں تھی۔ قاسم ۵۹۱. / ۱۵۰۴ء میں وفات پا گیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا امیر برید تخت پر بیٹھا۔ قاسم نے بہمنی سلاطین کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا تھا۔ ان کا رہا سہا اقتدار اس کے جانشین نے ختم کر دیا، یہاں تک کہ اس کے نام نہاد آخری حکمران کلیم اللہ کے بھاگ جانے پر بیدر پر اس کا اقتدار مسلم ہو گیا۔ اب اس کا مقابلہ بیجا پور کے فرمانروا علی عادل شاہ سے ہوا، جس نے بیدر کے حکمران کو شکست فاش دے کر وہاں قبضہ کر لیا۔ قلعہ کچھ عرصے کے بعد، جب قندیار اور کلیانی کے قلعے بیجا پور میں شامل کر لیے گئے، بحال کر دیا گیا۔ امیر برید نے کم از کم چھوٹے چھوٹے جاگیرداروں کو براہ راست مرکزی حکومت کے زیر اقتدار لانے کی کوشش کی، جیسا کہ اس سے پیشتر محمود گوان [رک بان] نے کیا تھا۔ لیکن اسے اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کا انتقال ۵۹۵. / ۱۵۴۳ء میں ہو گیا اور اس کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا۔

علی برید کو ادب، مصوری اور فن تعمیر سے بڑی دلچسپی تھی اور بیدر کے رنگین محل اور اس کا نہایت ہی موزوں و متناسب مقبرہ اس کے حسن ذوق کی دو شاندار یادگاریں ہیں۔ اسے طویل مدت تک حکومت کرنے کا موقع ملا۔ بریدی حکمرانوں میں سے وہ پہلا تھا جس نے شاہی لقب اختیار کیا؛ اگرچہ اس نے محض الملک المالک کے لقب پر قناعت کی جو رنگین محل میں بڑی خوبصورتی سے سیپی کے کام سے کندہ کیا ہوا ہے۔ وہ ان چار حلیف فرمانرواؤں میں سے ایک تھا جنہوں نے بالآخر ۱۵۶۵ء میں وجیانگر کے حاکم

کی وفات کے بعد وہ مدینے ہی میں قیام پذیر رہے لیکن جب بصرہ آباد ہو گیا تو وہاں چلے گئے اور وہیں ایک مکان تعمیر کر لیا۔ کچھ مدت بعد وہ فوج کے ساتھ خراسان چلے گئے اور مرو میں سکونت پذیر ہو گئے۔ اور وہیں ۵۶۰. / ۱۱۶۸ء یا ۵۶۳. / ۱۱۷۳ء یزید بن معاویہ کے زمانے میں ان کی وفات ہوئی۔ بعض مآخذ (البلاذری اور ابن الأثیر) کا بیان ہے کہ وہ خراسان ۵۵۱. / ۱۱۵۷ء میں الربیع بن زیاد کے ہمراہ ان پچاس ہزار کی جماعت میں شامل ہو کر گئے تھے جو بصرے اور کوفے سے مع اپنے گھر بار کے زیاد بن ایبہ کے حکم کے مطابق ادھر منتقل ہوئے تھے۔ [ان سے ایک سو پچاس کے قریب احادیث مروی ہیں]۔

مآخذ: (۱) ابن سعد، ۱/۴ : ۱۷۸ تا ۱۷۹؛ (۲) الطبری، ۱ : ۱۳، ۱۵۷۹ و ۳ : ۲۳۳۸ تا ۲۳۴۹؛ (۳) ابن الأثیر : الکامل، ۳ : ۴۰۸؛ (۴) البلاذری : فتوح، ص ۴۱۰؛ (۵) ابن حجر، ۱ : ۲۹۶؛ بعد؛ (۶) أسد الغابۃ، ۱ : ۱۷۵؛ (۷) النووی، ص ۱۷۳؛ (۸) کائانی : Caetani : Annali، بحد اشاریہ؛ (۹) سیر اعلام النبلاء، ۲ : ۳۳۵ بعد۔

([W. ARAFAT] K. V. ZETTERSTÉBN)

\* برید شاہی : دکن میں حکمرانوں کا ایک خاندان، جس کی بنیاد قاسم برید نے رکھی، جو اولاً ایک ترکی غلام تھا، جسے بہمنی خاندان [رک بان] کے تیرہویں فرمانروا محمد شاہ ثالث نے خریدا تھا۔ قاسم برید غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا اور اعلیٰ درجے کا خطاط اور مغنی ہونے کے علاوہ جوان مرد سپاہی بھی تھا۔ محمود شاہ کے عہد حکومت میں کوتوال کے منصب تک پہنچ گیا اور ملک حسن نظام الملک کی وفات کے بعد ڈگمگاتی ہوئی بہمنی سلطنت کی وزارت عظمیٰ کے منصب پر قابض ہو گیا۔ اس کا زیادہ وقت ان جاگیرداروں سے لڑنے میں گزرا جو طاقت میں اس سے زیادہ تھے



یادگاریں شہر بیدر [رک بان] ہی میں ہیں۔ چونکہ یہ لوگ بہمنی خاندان کی مستحکم سلطنت کے جانشین تھے اس لیے انہیں بہت سی اعلیٰ درجے کی عمارتیں ورثے میں ملیں اس لیے ان کی تعمیری سرگرمیاں کوئی اہم عمارت تعمیر کرنے کے بجائے زیادہ تر پرانی عمارتوں کو از سر نو تعمیر کرنے یا ان میں رد و بدل کرنے تک محدود رہیں۔ بریدی طرز تعمیر کی ترقی کے بڑے رقبے کے نمونے ان کے بنوائے ہوئے مزار ہیں، جو شہر سے تقریباً چھ کیلومیٹر کے فاصلے پر مغربی جانب شاہی قبرستان کی شکل میں موجود ہیں۔ یہ قبرستان بڑے وسیع و عریض رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس لیے کہ ہر مقبرے یا مزار کے ساتھ باغ کا وسیع احاطہ شامل ہے۔ زیر نظر مقالے میں جن صفحات کا حوالہ دیا گیا ہے وہ غلام یزدانی کی کتاب *Bidar, its History and Monuments*، اوکسفورڈ ۱۹۴۷ء سے متعلق ہیں۔

قاسم اول (م ۱۱۰۰ھ / ۱۵۰۳ء) کا مقبرہ ایک چھوٹی سی اور معمولی قسم کی تعمیر ہے، جس میں ایک سادہ سا مخروطی شکل کا گنبد ہے (ص ۱۴۹)۔ اس کے جانشین امیر برید اول ۵ مقبرہ ۱۱۴۹ھ / ۱۵۳۲ء میں اس کی ناگہانی موت کے باعث نامکمل رہ گیا تھا۔ اس پر کوئی گنبد نہیں۔ سامنے کے رخ محرابوں کی دو منزلیں ہیں اور ان محرابوں کے درمیان میں ایک بڑی محراب ہے، جو دونوں منزلوں پر محیط ہے۔ سب محرابوں کے سرے قدیم بہمنی عمارتوں کے طرز پر گولانی لیے ہوئے ہیں (ص ۱۵۰ تا ۱۵۱)۔ علی برید کے زمانہ حکومت (۱۱۴۹ھ / ۱۵۳۲ء تا ۱۱۵۷ھ / ۱۵۷۹ء) میں خاصی تعمیری سرگرمی رہی۔ قلعہ اور شہر کی فصیل میں بڑے پیمانے پر ترمیمیں اور تبدیلیاں کی گئیں اور فصیلوں پر خاصی تعداد میں توپوں کا اضافہ کیا گیا۔ رنگین محل کی از سر نو تعمیر ہوئی

راما رائے کی قوت کو ختم کیا۔ ابراہیم قطب شاہ کے ساتھ حلیفوں کے میسرہ کی کمان علی بریدی کے سپرد تھی۔ اس کا انتقال ۱۱۴۸ھ / ۱۵۷۹ء میں ہوا۔ علی برید کی وفات کے بعد خاندان کا اقتدار بھی جلد ہی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ابراہیم اور پھر قاسم ثانی تخت پر بیٹھا اور قاسم کے بعد اس کا شیر خوار بیٹا، جو مرزا علی برید شاہ کے نام سے معروف ہے، تخت کا وارث ہوا۔ لیکن اس کے ایک رشتے دار امیر برید شاہ ثانی نے اسے تخت سے اتار کر تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس کا جانشین ایک اور شخص ہوا۔ جس کا نام ایک دو لسانی تیبے میں مرزا ولی امیر برید شاہ درج ہے۔ اسی کے عہد حکومت میں بریدی خاندان کا خاتمہ ہوا اور بیدر نے ۱۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹ء میں بیجا پور کا الحاق کر لیا۔ گنتی کے چند ہی بریدی سگے دستیاب ہوئے ہیں۔ اگرچہ فرشتہ کا بیان ہے کہ قاسم برید نے بھی اپنے نام کے سگے ضرب کرائے تھے لیکن اس وقت تک جن سگوں کا پتا چلا ہے وہ یا تو تانبے کے سگے ہیں جن پر ”امیر شاہ“ کے ٹھپے کے نشان ہیں، جو امیر برید ثانی کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، یا پھر تانبے کے فلس اور نیم فلس، جن پر ”امیر برید السلطان“ کندہ ہے، لیکن ان پر کوئی تاریخ نہیں۔ یہ تمام سگے حیدرآباد کے عجائب گھر میں موجود ہیں۔

مآخذ: (۱) فرشتہ: گلشن ابراہیمی؛ (۲) علی طباطبائی: تاریخ برہان مآثر؛ (۳) تاریخ محمد قطب شاہ؛ (۴) زبیری، سائین السلاطین؛ (۵) غلام یزدانی: *Bidar, its History and Monuments*، ”بیدر، اس کی تاریخ اور یادگاریں“؛ (۶) شروانی: *The Bahmanis of the Deccan*

(H. K. SHERWANI)

۲۔ یادگار عمارتیں: اس خاندان کی تمام

میں ہندوچکر Cakra سے کام لیا گیا ہے (ص ۱۶۰ تا ۱۶۱)۔ دونوں مزاروں پر ایک ایک بڑا گنبد ہے، جو ستونوں پر قائم نہیں۔ لیکن کرسی نیچے دہری خمدار ہے اور تین چوتھائی دائرے کی شکل کی ہے جو عمارت کی نسبت سے بہت بھاری ہے۔ گنبد کی عمارت اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اس عہد کی خطیب شاہی اور عادل شاہی [رک باں] عمارتوں سے ملتی جلتی ہے۔ قاسم ثانی کے مزار میں پھر ایک ہی دروازہ ملتا ہے، جو تناسب کے اعتبار سے بہتر ہے لیکن کالی مسجد کے گنبد کے محراب کا نمونہ کھلا ہوا اور کشادہ ہے (ص ۱۹۶ تا ۱۹۷)۔ شہر کی جامع مسجد [رک بہ بیدر]، جو بہت بعد کی بہمنی عمارت ہے، بریدی عہد حکومت میں از سر نو تعمیر کی گئی۔ روکار پر زنجیرے اور آویزے کا نمونہ ہے (ص ۱۰۳ تا ۱۰۴)۔ علی برید کے زمانے سے عمارتوں کی آرائش میں زیادہ نمائش اور تکلف پیدا ہو گیا اور ہندو فن تعمیر کا اثر زیادہ نمایاں نظر آنے لگا۔ بعض بریدی عمارتوں۔ مثلاً کالی مسجد۔ میں پتھر پر جو نقش و نگار پیش کیے ہیں وہ لکڑی کے کام کے لیے موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ بعد میں ہونے والا کام دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جو خاندان رو بزوال ہوتا ہے اس کی عمارتوں میں تکلف اور نمائش نمایاں ہونے لگتی ہے۔

مآخذ: بہت سی مذکورہ بالا عمارات سے متعلق زیادہ تفصیلی معلومات بیدر [رک باں] پر مقالے میں ہیں۔ خاص طور سے دیکھا جائے: یزدانی: کتاب مذکور، جس میں پورے حوالے، بکثرت تصاویر، نقشے اور خاکے ہیں نیز وہ مآخذ جو مقالہ بیدر میں دیے گئے ہیں۔

(J. BURTON PAGE)

البریدی: (منسوب ببریڈ) یہ نسبت خاص طور سے ان تین بھائیوں کی وجہ سے مشہور ہو

اور اس میں نہایت نفیس سیپی کی پچی کاری اور بڑا نازک لکڑی کی کھدائی کا کام کروایا گیا، جس میں ہندو طرز اور اسلامی طرز کی آمیزش کی گئی تھی (ص ۴۴ تا ۴۹)۔ ترکی محل میں بھی خاصی ترمیم ہوئی، بالخصوص بالائی منزل میں، جس میں زنجیرے اور آویزے کا کام، جو اس وقت سے بریدی طرز کی خصوصیت سمجھا جانے لگا، زیادہ نمایاں ہے (ص ۷۰ تا ۷۹) اور علی کا مقبرہ، جو بہت ہی اچھی جگہ بنا ہوا ہے اور جس کا بیرونی پھاٹک بڑا شاندار ہے اور وسیع محرابوں اور نیچے ستونوں پر قائم ہے اور جس کے بالائی کمروں میں کثرت سے ہلالی شکل کے جھروکے بنے ہوئے ہیں۔ مقبرے کی ہر دیوار میں ایک وسیع محراب ہے، جس کے اندر سے چمکدار سیاہ اور سبز رنگ کے پتھر کا سنگ مزار دکھائی دیتا ہے۔ یوں اس کا اندرونی حصہ نہایت روشن اور ہوادار ہے اور اسے عمدہ قسم کی سفید رنگ کی موسی ٹائلوں سے مزین کیا گیا ہے (خطِ ثلث میں خواجہ عطار کے اشعار اور قرآن پاک کی آیات مبارکہ)؛ گو یہ کام زیادہ پر تکلف نہیں۔ چونکہ قبر چاروں طرف سے کھلی ہے اس لیے اس میں قبلے کا احاطہ نہیں اور قبر سے ملحق ہلکے پھلکے میناروں اور گنبد دار چہت والی ایک چھوٹی سی مسجد علیحدہ بنی ہوئی ہے اور روکار پر نہایت نفیس پلستر کی مینا کاری ہے۔ قبر، دروازہ اور مسجد میں تپتیا کٹاؤ (trefoil) کے کام کی منڈیر ہے، جو آخری بہمنی دور کی یادگار ہے (ص ۱۵۱ تا ۱۶۰)۔ ابراہیم (م ۹۹۴ھ) کا مزار چھوٹے پیمانے پر ہو بہو اپنے باپ کے مزار کی نقل ہے۔ لیکن وہ نامکمل حالت میں ہے اور اس کے اوپر کے حصے پر چونے گچ کا کام کیا ہوا ہے۔ کئی ہوئے کناروں کے پھاٹکوں کی سجاوٹ



وزیر امور خانہ داری (حاجب) یاقوت کا سکریٹری (ناظر) ہو جانے کے بعد ۵۳۲۴ / ۶۹۳۶ء میں یاقوت کو درمیان سے ہٹا دینے میں کامیاب ہو گیا اور اہواز کا واحد مالک و مختار بن گیا۔ یہاں اس نے غیر محتاط طریقوں سے بہت زیادہ دولت جمع کر لی اور مرکزی حکومت کو واجب الادا رقوم کی ادائیگی ہمیشہ معرض التوا میں رکھی، ادھر بغداد میں اس کا بھائی ابو یوسف یعقوب اس کی نمائندگی کرتا تھا۔

امیر الامرا ابن رائق نے بہت جلد اس پر لگام گورنر کو قابو میں لانے کے لیے قدم اٹھایا اور اہواز پر قبضہ کر لیا، لیکن البریدی بہت ہوشیار نکلا۔ اس نے فارس کے گورنر (والی) امیر علی بن بویہ کے پاس پناہ لی، جس کی حمایت اسے حاصل ہو گئی۔ ۵۳۲۵ / ۶۹۳۷ء میں وہ ابن رائق سے دوبارہ گٹھ جوڑ کرنے میں کامیاب ہو گیا، جس نے اسے صوبہ اہواز کے محاصل کا پٹہ اور صوبے کی گورنری دے دی۔ جب بعد میں ابن رائق کی مذہبیڑ اس کے ترک حریف بجکم سے ہوئی تو ابو عبد اللہ نے یکے بعد دیگرے دونوں فریقوں سے گٹھ جوڑ کیا اور ۵۳۲۶ / ۶۹۳۸ء میں جب بجکم کو غلبہ حاصل ہوا تو ابو عبد اللہ نے وزارت حاصل کر لی، اس کے ساتھ صوبے پر بھی قابض رہا اور خلیفہ کو خراج ادا کرتا رہا۔ اسے جلدی ہی معزول کر دیا گیا، لیکن المثنیٰ کی حکومت کے آغاز (۵۳۲۹ / ۶۹۴۱ء) میں بجکم کی وفات کے بعد وہ فوج لے کر بغداد میں داخل ہو گیا اور ابو عبد اللہ کو پھر وزارت مل گئی، جس پر وہ برابر ماسور رہا، تاآنکہ ایک فوجی بغاوت نے اسے واسط واپس چلا جانے پر مجبور کر دیا۔ اگلے سال (۵۳۳۰ / ۶۹۴۱ء) ابو عبد اللہ نے اپنے بھائی ابوالحسن کو ایک فوج کی نمانندگی کی، جو بغداد پر قبضہ

کئی جو البصرہ کے بریدی (پوسٹ ماسٹر) کے بیٹے تھے اور اسی بنا پر بنو البریدی کے نام سے موسوم ہوئے۔ انہوں نے بغداد کے خلیفہ المنصور اور اس کے جانشینوں کے عہد حکومت میں اہم کردار انجام دیا تھا۔ یہ دونوں بھائی اجارہ دار محصل اور عسکری قائد تھے، جنہوں نے اپنی جاہ طلبی اور دورخی حکمت عملی کی وجہ سے نمایاں حیثیت حاصل کر لی۔ ان کی زندگی، جو اہم واقعات سے بھر پور تھی، آل بویہ کے سابق عہد کی خصوصیات کی حامل تھی۔ ان تینوں میں سب سے بڑے بھائی ابو عبد اللہ احمد نے علی بن عیسیٰ کی دوسری وزارت کے دوران (۵۳۱۵ / ۶۹۲۷ء تا ۵۳۱۶ / ۶۹۲۸ء) میں سیاسی میدان میں قدم رکھا۔ وہ ان چھوٹے چھوٹے عہدوں پر مطمئن نہ ہوا جن پر اسے اور اس کے بھائیوں کو متعین کیا گیا۔ اس نے اگلے وزیر ابن مثنیٰ سے بیس ہزار درہم نذرانے کے عوض اپنے لیے صوبہ اہواز کے محصولات وصول کرنے کی اجارہ داری لے لی اور اپنے بھائیوں کے لیے منفعت بخش اسمیاں حاصل کیں۔ دو سال بعد ابن مقلہ کی معزولی پر انہیں گرفتار کر لیا گیا؛ محاصل کے یہ اجارہ دار، جو تھوڑے ہی عرصے میں بڑے دولت مند ہو گئے تھے، اس قابل تھے کہ اپنی رہائی کی قیمت بھاری جرمانے کی شکل میں ادا کر دیں۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصے بعد آئندہ خلیفہ القاہر کے زمانے میں ابو عبد اللہ نے از سر نو اپنا اثر و اقتدار قائم کر لیا۔ اس نے المقتدر کے سابق حامیوں کے خلاف سہم چلانے کا پورا خرچ برداشت کیا اور اہواز کے محاصل کا ٹھیکہ پھر حاصل کر لیا، اور الراضی کے ابتدائے عہد حکومت (۵۳۲۲ / ۶۹۳۴ء) میں بے شمار شیب و فراز پیش آنے کے باوجود ابن مقلہ کے از سر نو برسر اقتدار آ جانے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے منصب پر جما رہا۔

تا ۱۲۰، ۱۶۴؛ (۵) عرب، طبع ڈخوبہ De Goeje،  
 ص ۱۳۸؛ (۶) مسکویہ، ضمیمہ، H. F. Amedroz و  
*The Eclipse of the Abbasid*: D. S. Margoliouth  
*Caliphate*، اوکسفورڈ، ۱۹۲۰-۱۹۲۱ء، بمدد اشاریہ؛ (۷)  
 ابن الاثیر، جلد ۸، بمدد اشاریہ؛ (۸) H. Derenbourg  
 در *Orientalische Studien Th. Nöldeke gewidmet*  
 Giessen ۱۹۰۶ء، ۱ : ۱۹۳ تا ۱۹۶؛ (۹)  
 Zambaur، ص ۱۵؛ (۱۰) L. Massignon، در *ZDMG*  
 ۱۹۳۸ء، ص ۳۸۰؛ (۱۱) M. Canard، *Histoire de*  
*la dynastie des Hamdānides*، الجزائر ۱۹۵۱ء،  
 ۱ : ۴۴ تا ۴۴۳ و ۵۱۰ تا ۵۱۱.

(D. SOURDEL)

بربرہ رضی: ایک کنیز، جنہوں نے اپنے  
 آقا سے یہ طے کیا تھا کہ وہ نو (یا پانچ) سالانہ  
 قسطیں ادا کرنے کے بعد آزاد ہو جائیگی۔  
 وہ حضرت عائشہ رضی کی خدمت میں حاضر ہوئیں  
 اور مدد کی درخواست کی۔ آپ نے پوری رقم ادا کرنے  
 کا وعدہ فرمایا۔ ان کا آقا انہیں فروخت کرنے پر تو  
 رضامند تھا لیکن اسے ان کی وراثت کا حق قائم  
 و برقرار رکھنے پر اصرار تھا۔ جب آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سنی تو آپ نے  
 حضرت عائشہ صدیقہ رضی سے فرمایا کہ کنیز کو  
 خرید لیجیے کیونکہ حق وراثت اسی شخص کو پہنچتا  
 ہے جو کسی غلام کو (خرید کر) آزاد کر دے۔  
 چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی نے بربرہ رضی کو خرید  
 کر آزاد کر دیا۔ لیکن وہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی  
 کی خدمت ہی میں رہیں اور کہتے ہیں کہ انہوں  
 نے یزید اول (۵۶۰ / ۶۸۰ء تا ۵۶۴ / ۶۸۳ء)  
 کے عہد میں وفات پائی۔ ان سے تین احادیث مروی  
 ہیں: (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے  
 فرمایا کہ کسی شخص کی وراثت کا حق  
 اسی کو پہنچتا ہے جو اسے آزاد کر دے؛ (۲)

کرنے میں کامیاب ہو گئی؛ خلیفہ اور ابن رائق کو  
 الموصل میں حمدانیوں کی پناہ لینے کے سوا کوئی  
 چارہ کار نہ رہا۔ ادھر ابوالحسن نے اپنے خلاف  
 اس قدر شدید نفرت پیدا کر لی کہ حمدانی فوجی  
 دستوں نے اسے بغداد اور واسط سے نکال باہر کیا۔  
 تینوں بھائی، اس کے باوجود کہ انہیں عمان کے  
 فرمانراو سے، جس نے ابلہہ پر فوج اتار کر قبضہ  
 کر لیا تھا، سخت تباہ کن جنگ لڑنا پڑی تھی،  
 بصرے میں جمعے رہے۔ ان مہمات نے ابو عبداللہ  
 کے مالی وسائل کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے اپنے بھائی  
 یوسف کو صفر ۵۳۳ / نومبر ۶۴۳ء میں محض  
 اس کی دولت پر قبضہ کرنے کی غرض سے بیدریغ  
 قتل کرا دیا، لیکن وہ خود بھی جلدی ہی شوال  
 ۵۳۳ / جون ۶۴۳ء میں وفات پا گیا اور اس کی  
 جگہ اس کا بیٹا ابوالقاسم وارث ہوا۔ ابوالقاسم کو  
 اپنی حفاظت کے لیے اپنے چچا ابوالحسن کی مخالفانہ  
 سازشوں کا سد باب لڑنا پڑا۔ ابوالحسن کے خلاف،  
 جو اپنے لیے البصرہ کی گورنری کے حصول کے  
 لیے کوشاں تھا، انجام کار بغداد میں موت کا فتویٰ  
 صادر ہوا اور اواخر ۵۳۳ / ۶۴۳ء میں اسے قتل  
 کر دیا گیا۔ اب ابوالقاسم کو بوہبی معزالدولہ سے  
 لڑنا پڑا، جس نے اسے ۵۳۶ / ۶۴۷ء میں  
 البصرہ سے نکال دیا۔ اسے البحرین کے قرامطہ  
 کے ہاں پناہ لینی پڑی اور یوں اس کی سیاسی زندگی  
 کا خاتمہ ہو گیا۔ اس نے ۵۳۹ / ۶۴۰ء میں وفات  
 پائی۔ ابو عبداللہ کے چار بیٹے بھی تھے جن کی طرف  
 تذکروں میں کہیں کہیں اشارات پائے جاتے ہیں۔  
 مأخذ: (۱) بجزری: دیوان، ۱: ۲۱۷؛ (۲) الصولی:  
 اخبار ابراصی، ترجمہ Canard، الجزائر ۱۹۳۶-۱۹۵۰ء؛  
 ۱۰۳ حاشیہ و (۲: ۳۰ حاشیہ)؛ (۳) التتوخی: نثار  
 [المحاضر]، ۱: ۱۸۸، ۱۰۵، ۱۰۷، ۱۰۷، ۱۰۷؛ (۴) وہی مصنف:  
 الفرج بَعْدَ التَّيْمَةِ، ۱: ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹



(۵۱۲۷۲/۵۱۸۵۶ تا ۵۱۳۴۰/۵۱۹۲۱، تذکرہ علمائے ہند، ص ۹۸) کو اپنا پیشوا تسلیم کرتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ گروہ محمد بن عبدالوہاب نجدی [رک بان] کی تحریک، خانوادہ شاہ ولی اللہی خصوصاً شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسمعیل شہید کے بعض دینی افکار اور علمائے دیوبند کی تحریک کے رد عمل کے طور پر وجود میں آیا (حیات اعلیٰ حضرت، ص ۲۰ تا ۳۶ و رسالہ سلطان العارفین، مئی ۱۹۶۷ء و سبحان السبوح)۔ اسلاف میں یہ لوگ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خیالات سے متفق اور اپنے عقائد کی تائید میں ان کے اقوال سے استشہاد کرتے ہیں (جاء الحق، ص ۲۰۳ بعد و حیات الموات)۔ یہ لوگ حنفی ہیں۔

اس مکتب فکر کا اولین مرکز شہر بریلی (رک بان) ہے، جہاں اس کے بانی نے "جامعہ منظر الاسلام" کے نام سے ایک دینی مدرسہ قائم کیا، اس مدرسے میں متداول علوم اسلامیہ کی تعلیم و تدریس ہوتی ہے اور برصغیر کے مختلف علاقوں سے دینی فتوے بھی دریافت کیے جاتے ہیں (قبّ الیواقیت، ص ۷۳ تا ۸۰)۔ اس مکتب فکر کا دوسرا اہم فکری و تعلیمی مرکز مراد آباد ہے، جہاں ۱۳۲۸ھ میں شیخ محمد نعیم الدین مرادآبادی (۱۳۰۰ھ - ۱۳۸۰ھ) نے "دارالعلوم نعیمیہ" کے نام سے ایک دینی درسگاہ کی بنیاد رکھی۔ اس مکتب فکر کے ممتاز علما کی اکثریت اسی درسگاہ کے فارغ التحصیل نظر آتے ہیں (الیواقیت المہریہ، ص ۷۵ تا ۷۹)۔ پاکستان میں اس مکتب فکر کے اہم تعلیمی مراکز میں لاہور (جہاں جامعہ نعیمیہ گڑھی شامو اور دارالعلوم حزب الاحناف قابل ذکر ہیں)، ٹراچی (جہاں مولانا عبدالعالم بدائونی کی درسگاہ "جامعہ تبلیغیہ" ایک اہم تعلیمی مرکز ہے

اپنے شوہر مغیث جو ایک حبشی غلام تھے، کے ہاں رہنے کے سلسلے میں انہیں اختیار دیا گیا اور جب انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مغیث کے حق میں سفارش کے باوجود ان کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تو ان سے کہا گیا کہ وہ ایک مطلقہ عورت کی طرح عدت کی مدت پوری کریں۔ کہتے ہیں کہ مغیث مدینہ منورہ کی گلیوں میں ان کے پیچھے روتے پھرا کرتے تھے؛ (۳) ایک مرتبہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے تو گوشت پک رہا تھا لیکن کھانے کے وقت ان کی خدمت میں گوشت کے بجائے کوئی اور چیز پیش کی گئی تو آپ نے اس کی وجہ دریافت فرمائی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ گوشت صدقے کا ہے، جو بریرہؓ کو ملا ہے۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ یہ بریرہؓ کے لیے صدقہ ہے مگر ہمارے لیے ہدیہ ہے۔ اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ اگر کسی کو کوئی چیز بطور صدقہ ملی ہو تو وہ اس کا کچھ حصہ دوسرے کو بطور ہدیہ پیش کر سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بریرہؓ نے عبدالملک بن مروان کو تنبیہ کی تھی کہ اگر وہ بادشاہ ہو جائے تو بے گناہ مسلمانوں کی خونریزی سے بچے۔

مآخذ: Wensinck: مفتاح کنوز السنۃ، بذیل

بریرہؓ؛ (۲) ابن عبدالبر: الاستیعاب، ۴: ۲۴۲؛ (۳) ابن حجر: الآصاب، عدد ۱۷۷ (کتاب النساء): (۴) وہی مصنف: تہذیب التہذیب، ۱۲: ۴۰۳؛ (۵) ابن الأثیر: السد الغابہ، قاہرہ، ۵۱۳۸۰/۱۸۶۳ - ۱۸۶۴: ۵۰۹: ۵۰۹ بعد؛ [(۶) الذہبی: سیر اعلام النبلاء، ۲۰: ۲۱۵ تا ۲۲۱]۔

(J. ROBSON)

بریلوی: برصغیر ہند و ہند میں اہل السنۃ والجماعۃ (رک بان) [حزب الاحناف] کا ایک گروہ، جو افکار و عقائد میں احمد رضا خان بریلوی قادری

آپؐ کے علاوہ دوسرے اولیا اللہ کے لیے بھی جائز ہے۔ ارواح طیبہ کے لیے دیکھنے سننے میں دور و نزدیک سب یکساں ہے۔ اولیائے کرام نور خدا سے دیکھتے ہیں اور نور خدا کو کوئی چیز حاجب نہیں۔ اس لیے ارواح اولیا کے لیے کچھ پردہ نہیں اور ان کے لیے سارا جہاں یکساں ہے (حیات الموات، ص ۱۷۸)۔ اولیا اللہ کی کرامات اور ان کے تصرفات ان کی وفات کے بعد بھی بدستور ہیں اور ان کے انتقال سے یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوتا (وہی کتاب، ص ۱۱۳ بعد)، اس لیے ان کی نصرت ہر جگہ جاری ہے، کچھ نزدیک کے لوگوں پر منحصر نہیں، اس لیے ان سے استمداد اور ان کی ندا میں حضور مزار کی شرط نہیں بلکہ جہاں سے پکارا جائے صحیح اور درست ہے (وہی کتاب، ص ۱۷۹)۔ امت میں چالیس ابدال [رک باں] ہمیشہ رہیں گے جن کے طفیل اللہ تعالیٰ اہل زمین کی آفتوں کو ٹالتا رہے گا (الامن والعلی، ص ۲۵)۔ اسی طرح کچھ اولیا بھی ہوں گے جن کے ذریعے خلق کی حیات، روزی، بارش، پودے اٹنے اور آفتوں کے ٹالنے کا کام انجام پائے گا (وہی کتاب، ص ۲۶)۔ مردے قبروں میں سنتے، دیکھتے اور جنتے ہیں اور ان کا علم سمع و بصر یوں تو ہمیشہ ہے مگر جمعے کے دن اس میں اضافہ ہو جاتا ہے اور عام مردے بھی بلا تخصیص قبر پر آنے والے زائرین سے کلام کرتے ہیں اور ان کے سلام کا جواب دیتے ہیں (مب حیات الموات، ص ۱۱۰، ۱۷۴: جاء الحق، ص ۱۸۴ بعد)۔

بریلوی جماعت کے نزدیک اولیا اللہ کی نیاز دینا اور ان کے مزارات پر جا کر ان سے مدد مانگنا جائز ہے۔ اسی طرح نماز جنازہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا، فاتحہ خوانی، تیجے، چالیسویں اور برسی پر مردوں کو ثواب پہنچانے کے لیے اچھے

(الیواقیت، ص ۱۵۵)، لائل پور (مدرسہ مظہر الاسلام) اور ملتان (مدرسہ انوارالعلوم) خاص مقام رکھتے ہیں۔ بریلوی مکتب فکر سے وابستہ حضرات کا یہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاضر و ناظر ہیں اور وہ بایں طور کہ عالم کا ذرہ ذرہ آپؐ کی روحانیت و نورانیت کی جلوہ گاہ ہے، ایسی روحانیت و نورانیت جس کے لیے قرب اور بعد مکانی یکساں ہے کیونکہ ”عالم خلق“ زمان و مکان کی قید سے مقید ہوتا ہے لیکن ”عالم امر“ ان قیود سے پاک اور آزاد ہے، اس لیے بیک وقت متعدد مقامات پر آپؐ کا موجود ہونا اور کئی مقامات پر کھلم کھلا بیداری میں اولیا اللہ کا حضورؐ کی زیارت سے مشرف ہونا ممکن اور جائز ہے کیونکہ آپؐ نور ہیں اور نور کو اپنی نظر سے تمام دنیا کو دیکھنا اور متعدد مقامات پر موجود ہونا ممکن ہے (تسکین الخواطر، ص ۸۲)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے علم غیب عطا فرمایا حتیٰ کہ ”پانچ غیبوں“ میں سے بہت سی جزئیات کا علم بھی دیا۔ حقیقت روح اور مشابہات قرآن کا علم بھی آپؐ کو عطا ہوا تھا، تمام آئندہ و گزشتہ واقعات جو لوح محفوظ میں ہیں ان کا بھی اور ان کے علاوہ واقعات کا بھی آپؐ علم رکھتے تھے (جاء الحق، ص ۳۹ بعد)۔ آنحضرتؐ نور تھے اور آپؐ کا سایہ نہ تھا۔ آپؐ کی بشریت دوسرے انسانوں کی بشریت سے مختلف ہے (جاء الحق، ص ۱۶۶ بعد)۔ چونکہ آپؐ حاضر و ناظر، عالم الغیب اور نور ہیں اس لیے بریلوی حضرات کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مدد مانگنا اور آپؐ کو پکارنا اور ”یا رسول اللہ“ کا نعرہ لگانا جائز ہے (جاء الحق، ص ۱۴۷ بعد)۔ آپؐ کو مدد کے لیے جو پکارتا ہے اس کی آپؐ سنتے ہیں اور مدد کو پہنچتے ہیں۔ اور یہ مدد مانگنا اور فریاد رسی کے لیے پکارنا



پیش آئی تاکہ اس میں اور رائے بریلی میں جو حضرت سید احمد بریلوی [رک باں] کا مولد تھا تمیز ہو سکے۔

روہیلکھنڈ کے راجپوت قبیلوں کی لوٹ مار کا سدّ باب کرنے کے لیے شاہنشاہ اکبر کے عہد میں یہاں ایک قلعہ تعمیر ہوا تھا۔ جیسا کہ دستور ہے قلعے کے گرد آہستہ آہستہ ایک قصبہ بسنا شروع ہو گیا، جو ترقی کرتے کرتے ۱۰۰۰/۱۰۹۶ء تک ایک پرگنہ کا صدر مقام بن گیا۔ پہلے اسے کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی لیکن شاہجہان کے عہد میں اسے کٹھیر (روہیلکھنڈ کا پرانا نام) کا دارالحکومت بنا دیا گیا۔ ۱۰۶۸/۱۶۵۷ء میں مکرند رائے نے، جو علی قلی خان کی جگہ صوبیدار مقرر ہوا تھا، ایک نئے شہر کی بنیاد رکھی۔ علی قلی خان ۱۰۳۸/۱۶۲۸ء سے اس عہدے پر فائز تھا۔ مغلوں کے دور میں شہر پر ایک صوبیدار حکومت کرتا تھا۔ ۱۱۱۹/۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد بریلی کے ہندوؤں نے مغلوں کے صوبیدار لونکال باہر لیا۔ خراج دینے سے انکار کر دیا اور خود حکومت سنبھال لی۔ تاہم ان میں جلد ہی پھوٹ پڑ گئی اور انہوں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے روہیلہ سردار علی محمد خان کو دعوت دی۔ اس نے تھوڑی سی مدت میں اپنی حدود کماؤں میں الموزہ تک وسیع کر لیں لیکن ۱۱۵۸/۱۷۴۶ء میں محمد شاہ بادشاہ دہلی نے اس پر چڑھائی کر دی اور اسے گرفتار کر کے دہلی لے گیا۔ تاہم اس نے جلد ہی آزادی حاصل کر لی اور ۱۱۶۰/۱۷۴۸ء میں بریلی کی صوبیداری پر واپس آ گیا۔ ۱۱۶۲/۱۷۴۹ء میں اس کی وفات پر حافظ رحمت خان اس کا جانشین ہوا، جو اودھ کی فوجوں کے ساتھ سخت جھڑپوں کے بعد مرہٹہ دستوں کی مدد سے

اچھے لہانوں پر ختم دلانا، قبر پر اذان دینا، مردے کے کفن پر کلمہ طیبہ لکھنا، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی گیارہویں دینا اور اولیاء اللہ کے نام پر جانور پالنا جائز اور کارِ ثواب ہے (تفصیل کے لیے دیکھیے جاء الحق و زهق الباطل از مفتی احمد یار خان)۔

مآخذ: (۱) رحمن علی: تذکرہ علمائے ہند، کراچی ۱۹۶۱ء؛ (۲) مظفر الدین: حیات اعلیٰ حضرت، کراچی ۱۹۵۵ء؛ (۳) رسالہ العلم، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۵۸ء؛ (۴) احمد رضا خان: حساء الحرمین؛ (۵) وہی مصنف: الامن والعلی، لاہور؛ (۶) وہی مصنف: سبحان السبوح، لاہور؛ (۷) وہی مصنف: حیات السوات، لاہور؛ (۸) وہی مصنف: سلطنة المصطفیٰ فی دل الوری؛ (۹) وہی مصنف: قمر التمام فی نفی الظل عن سید الانام، بریلی؛ (۱۰) بدرالدین: سوانح اعلیٰ حضرت، لاہور؛ (۱۱) احمد سعید کاظمی: تسکین الخواطر، ملتان؛ (۱۲) احمد یار خان: جاء الحق و زهق الباطل، لاہور؛ (۱۳) غلام سہر علی: الیواقیت المہریۃ، چشتیان؛ (۱۴) رسالہ سلطان العارفین، گکھڑ، مئی ۱۹۶۷ء؛ (۱۵) رسالہ انوار الصوفیہ، مئی ۱۹۱۱ء۔

(ظہور احمد اظہر)

• بریلی: اتر پردیش، بھارت کے ایک ضلع کا صدر مقام۔ یہ شہر، ۲۸° ۲۲' عرض بلد شمالی اور ۷۹° ۲۴' طول بلد مشرقی پر دریائے رام گنگا کے کنارے ایک سطح مرتفع پر واقع ہے۔ آبادی ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۹۳۹۷۹ تھی۔ اس شہر کی بنیاد ۱۵۳۷/۱۵۳۷ء میں رکھی گئی۔ روایت یہ ہے کہ اس کا نام ایک شخص باندیو کے نام پر رکھا گیا، جو ذات کا برہیلہ راجپوت تھا۔ عام طور پر اسے بانس بریلی کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے نواح میں بانس کا ایک جنگل ہے اور اس اضافے کی ضرورت اس لیے

کیا ہے۔

بریلی بریکید ۵ جنرل بخت خان [رک باں] جو ۱۸۵۷ء کے آشوب دہلی کے زمانے میں انگریزوں کی مخالف فوجوں کا سپہ سالار مقرر ہوا تھا اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ احمد رضا خان (م ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء) [رک بہ بریلوی] بھی، جو ایک عالم دین اور فاضل تھے، یہیں کے تھے۔ ان کے معتقدین اپنے آپ کو حزب الاحناف کہتے ہیں۔ عوام میں وہ بریلویوں [رک بہ بریلوی] کے نام سے مشہور ہیں۔

یہاں کی واحد قابل ذکر عمارت حافظ رحمت خان ۵ مقبرہ ہے، جسے اس کے بیٹے ذوالفقار خان نے ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء میں تعمیر کرایا تھا۔ اس مقبرے کی لٹی بار مرمت ہو چکی ہے۔ آخری مرمت ۱۸۹۱-۱۸۹۲ء میں برطانوی حکومت نے لرائی تھی۔

مآخذ: (۱) گلزاری لال: تواریخ بریلی (مخطوطہ)؛  
(۲) *Imperial Gazetteer of India*، اوکسفورڈ ۱۹۰۸ء؛  
۳ تا ۱۳؛ (۳) الغنائی علی بریلوی: حیات حافظ رحمت خان،  
بداؤں ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۳ء؛ (۴) *JRAS*، ۱۸۹۷ء، ص  
۳۰۳؛ (۵) نیز رگ بمقالہ حافظ رحمت خان: (۵)  
العلم (سہ ماہی جریدہ)، کراچی ۱/۳: ۲۸ تا ۳۲؛ (۶)  
البدائنی (Bib. Ind.) بمدد اشاریہ۔

(بزمی انصاری)

**البریمی:** مشرقی عرب میں ایک نخلستان۔  
اس علاقے کی بڑی بستی کا بھی یہی نام ہے۔  
اس کی جاے وقوع ۲۴ درجے ۱۴ دقیقے عرض بلد  
شمالی اور ۵۳ درجے ۴۶ دقیقے طول بلد شرقی  
میں ہے۔ بریمی کی بستی کے مغرب میں قصبہ حماسہ  
بھی اسی نخلستان کے کنارے پر واقع ہے۔ اس  
کے بعد اس نخلستان میں ایک اور آباد مقام، جسے  
منڈی ہونے کی بنا پر قصبہ کہا جا سکتا ہے،  
العین ہے، جو تمام بستیوں کے جنوب مشرقی کنارے

اتنا طاقتور ہو گیا کہ روہیلکھنڈ کا مسلمہ حکمران  
بن گیا۔ ۱۱۸۳ھ / ۱۷۷۰ء میں سندھیا اور ہلکر  
کے زیر نمان مرہٹہ فوجوں کی مدد سے نجیب الدولہ  
نے رحمت خان کو شکست دی۔ شجاع الدولہ  
روہیلوں کی امداد کی خاطر آیا لیکن جلد ہی  
اس کی ان سے ٹھن گئی اور اس نے سردار  
رحمت خان کو مار ڈالا۔ ۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۴ء میں  
سعادت یار خان وزیر اودھ کے ماتحت بریلی کا  
صوبیدار مقرر ہوا۔ ۱۲۱۶ھ / ۱۸۰۱ء میں جب  
سارے روہیلکھنڈ پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو یہ  
شہر بھی ان کے ہاتھ لگا۔ ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں  
امیر خان پنڈاری نے بریلی پر حملہ کیا لیکن اسے  
شدید نقصان اٹھا کر پسا ہونا پڑا۔ ۱۲۳۲ھ /  
۱۸۱۶ء میں ایک مقامی ٹیکس عائد کیے جانے پر  
یہاں کے باشندوں نے شورش کی، جسے سختی سے  
کچل دیا گیا۔ ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء اور ۱۲۵۷ھ /  
۱۸۴۲ء میں یہاں سخت ہندو مسلم فسادات ہوئے۔  
۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے دوران میں جب  
حافظ رحمت خان کے پوتے خان بہادر خان کی  
صوبیداری کا اعلان ہوا تو شہر میں بہت  
شورش برپا ہوئی۔ ستمبر ۱۸۵۷ء میں سقوطِ دہلی  
کے بعد [مجاہد] قائدین۔ فضل حسین خان  
نواب فرخ آباد، بٹھور کے نانا صاحب اور مغل  
شہزادے فیروز شاہ اس شہر میں پناہ گزین  
ہوئے۔ بہر حال انہیں شکست ہوئی اور وہ مئی  
۱۸۵۸ء کو شہر پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ  
ہو گیا (*District Gazetteers of the U. P.*، ۱۳،  
الہ آباد ۱۹۱۱ء: ۱۷۸)۔ ۱۲۸۷ھ / ۱۸۷۱ء  
میں ایک بار پھر ہندو مسلم فساد ہوا اور تب  
سے لٹی مذہبی فسادات ہو چکے ہیں۔ ۱۳۶۶ھ /  
۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان پر بریلی سے وہاں  
کی مسلم آبادی کا بیشتر حصہ ہجرت کر



پختہ نالیوں کا جال گزر رہا ہے ان کی وجہ سے یہ سارے گاؤں آپس میں ایک دوسرے کے محتاج ہیں، کیونکہ ان بستیوں میں سے بعض محل وقوع کے اعتبار سے دوسری بستیوں کا پانی اپنے اختیار میں رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ کھجوریں، آلفلفہ (برسیم حجازی)، ترکاریاں اور سیوے، جن میں آم اور میٹھی اور کھٹی نارنگیاں شامل ہیں، اس نخلستان سے برآمد کیے جاتے ہیں، جس کی بڑی بندرگاہ دُبئی [رَکْ بَا] ہے۔ شہر کی منڈیوں میں سویشیوں کا اچھا خاصا کاروبار ہوتا ہے اور یہ اس خطے کی اندرونی بستیوں اور قبیلوں میں مبادلہ اجناس کے مراکز ہیں۔

البریمی کو وہی جگہ قرار دیا جا چکا ہے جسے قدیم عرب جغرافیہ نویس توّام کہتے تھے (لسان العرب نے اس کی متبادل شکل "تعام" دی ہے، اس کے علاوہ اور شکلیں Lane کی لغت میں دی گئی ہیں) اور اس کے معنی موتیوں کی خرید کی جگہ بتائے ہیں (اسی وجہ سے "توامیہ" کو لؤلؤہ اور درّہ کا مرادف سمجھا جاتا ہے)۔ البریمی کو توّام قرار دینا مشکوک معلوم ہوتا ہے اور ساتھ ہی اس کا بھی امکان ہے کہ اس میں کسی اور مقام سے، جو در حقیقت خلیج فارس میں تھا، التباس ہو گیا ہے۔ مشرقی عرب کے مصنفین نے اس نخلستان کا قدیم نام الْجَوّ اور الْجَوّف [رَکْ بَا] بھی بتایا ہے۔

اس نخلستان کی انیسویں صدی سے پہلے کی تاریخ کی بابت بہت کم معلومات ہیں۔ مقامی مؤرخ لکھتے ہیں کہ ۵۲۸/۶۸۹۳ میں اس پر اس فوج نے قبضہ کر لیا تھا جو خلیفہ المعتضد نے خشکی کے راستے البحرین سے روانہ کی تھی۔

۱۹۳۳ / ۱۹۳۴ - ۱۹۳۵ اور دوسری

خالمکیر جنگ کے درمیان کے زمانے میں سعودی

پر واقع ہے۔ یہ نخلستان تقریباً ۶ کیلومیٹر x ۶ کیلومیٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں یہ گاؤں شامل ہیں: صَعْرِي، هَيْلِي، الْقَطَّارَه، الْقِيَمِي (جو مقامی بولی میں الذَّيْمِي مشہور ہے) اور الْمُعْتَرَض - الجاهلی (جو مقامی بولی میں الیاهلی کہلاتا ہے) میں زراعت دوبارہ ہونے لگی ہے اور آل بوفلاح کی، جو ابوظہبی [رَکْ بَا] کا حکمران خاندان ہے، المَوَيْقِي میں ایک جاگیر بھی ہے۔ اس نخلستان کی سیرابی کا دار و مدار اس پانی پر ہے جو زمین دوز پختہ نالیوں ("فلج" رَکْ بَا) کے ذریعے اَلْهَجْر پھاڑوں سے، جو مشرق کی طرف یہاں سے کچھ دور نہیں ہیں، نیز جبل حنیت کی بلند چوٹیوں والی پھاڑی سے لایا گیا ہے۔ یہ پھاڑی بالکل متصل جنوبی میدان میں الگ تھلگ اٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

البریمی وادی الجزی کے درے کے مغربی سرے کے قریب ہے، جس سے گزر کر الباطنہ کے ساحلی مقام صحار کو جاتے ہیں۔ یہ اس بڑی شاہراہ پر بھی واقع ہے جو دُبئی سے الظاہرہ [رَکْ بَا] ہوتی ہوئی ضنک، عبری اور نزوہ کو گئی ہے۔ نزوہ اندرونی عمان کا صدر مقام ہے اور مدت تک [خارجی] فرقہ اباضیہ کے امام کا مستقر رہ چکا ہے۔ اس نخلستان کے باشندے، جو تقریباً دس ہزار ہیں، زیادہ تر قبیلہ نَعِيم سے ہیں (جس کے دو بڑے شعبے آل بو خریبان اور آل بوشامس ہیں)، جن کے بعض افراد خانہ بدوش یا نیم خانہ بدوش ہیں، یا پھر کچھ لوگ قبیلہ الظواہر کے ہیں جو یہاں آباد ہو گئے ہیں اور نخلستان سے باہر ان کے افراد نہیں پائے جاتے۔ نخلستان کے دوسرے باشندے بنو قتب، بنو کعب، آل بو خمیر، آل بوفلاسی اور بو فلاح سے تعلق رکھتے ہیں۔

بستیوں کے زیریں علاقے سے جو پانی کی

استعفا دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ثالثی عدالت کی مدت محرم ۱۳۷۵ھ / ستمبر ۱۹۵۵ء میں ختم ہو گئی اور اس کی نوبت ہی نہ آئی کہ وہ ان الزامات کی بابت یا اصل قضیے سے متعلق اپنی کوئی رائے صادر کرے۔ ربیع الاول ۱۳۷۵ھ / اکتوبر ۱۹۵۵ء میں ہنٹاسی صلح کے متعینہ عمانی لشکروں (Trucial Oman Levies) نے برطانوی فوجی افسروں کی زیر قیادت نخلستان پر قبضہ کر لیا اور پھر اس کو ابوظہبی اور مسقط کے درمیان بانٹ دیا۔ سلطان مسقط نے قصبہ البریمی میں اپنا ایک والی مقرر کر دیا اور ابوظہبی کے امیر نے اپنے ایک بھائی کو نخلستان میں اپنا نمائندہ نامزد کیا۔ بنو نعیم کا سب سے بڑا شیخ سقر بن سلطان، اور دیگر شیوخ اپنے حامیوں سمیت سعودی عرب کے مشرقی صوبے کے صدر مقام الدمام میں جلا وطن ہو گئے۔

مآخذ: توأم کے لیے لغت کی کتابوں کے علاوہ دیکھیے: (۱) یاقوت؛ (۲) البکری؛ معجم ما استعجم، قاہرہ ۱۹۳۵-۱۹۵۱ء؛ (۳) عبد اللہ السالمی؛ تحفة الاعیان، قاہرہ ۱۳۳۲-۱۳۴۷ھ؛ (۴) ابن بشر؛ عنوان المجد؛ (۵) ابن عیسیٰ؛ عقد الدرر، قاہرہ ۱۳۷۳ھ؛ (۶) ابن غنم؛ روضة الافکار، بمبئی ۱۳۳۷ء؛ (۷) ابن رزق؛ الفتح المبین، (مخطوطہ شماره Add. ۲۸۹۲، کیمرج)؛ ترجمہ از G. Badger: *Imams and Seyyids*؛ لندن ۱۸۷۱ء؛ (۸) *Revue Egyptienne de Droit International*؛ جلد ۲، ۱۹۵۵ء؛ (۹) *A Handbook of Arabia*؛ لندن ۱۹۱۶-۱۹۱۷ء؛ (۱۰) وہی محکمہ؛ *Iraq and the Persian Gulf*؛ لندن ۱۹۴۴ء؛ (۱۱) *Footsteps in the Sand*؛ D. Harrison؛ لندن ۱۹۵۹ء؛ (۱۲) *Eastern Arabia*؛ H. Hazard؛ نیو ہیون New Haven ۱۹۵۶ء؛ (۱۳) وہی مصنف؛ *Saudi Selections from the Records of Arabia*؛ لندن ۱۹۵۶ء؛ (۱۴) *of the Bombay Government*؛ سلسلہ جدید، ۲۴، بمبئی

عرب اور حکومت برطانیہ کے درمیان سعودی عرب کی جنوبی اور مشرقی حدود کی بابت گفت و شنید ہوئی، حکومت برطانیہ نے ابوظہبی کے امیر کی طرف سے گفتگو کی؛ لیکن اس وقت البریمی خصوصیت کے ساتھ نزاعی مسائل میں شامل نہ تھا۔ ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۱-۱۹۵۲ء میں سعودی عرب کا ایک امیر اس نخلستان میں پہنچا اور حماسہ میں اپنا مستقر بنایا تاکہ ابوظہبی اور مسقط کے خلاف اس علاقے پر سعودی تسلط ثابت کرے۔ اس اقدام سے نیز بریمی کے جنوب مغرب میں ستر ہزار مربع میل کے رقبے پر قبضے کے جو متضاد دعوے کیے جا رہے تھے اس سے تنازع پیدا ہوا اور ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء میں حکومت برطانیہ اور سعودی عرب رضامند ہو گئے کہ اسے فیصلے کے لیے ثالث کے سپرد کر دیا جائے۔ اس ثالثی کے نتیجے میں البریمی کا جغرافیہ، تاریخ جدید اور اس کے باشندوں کے نہایت مفصل حالات ضبط تحریر میں آئے، کیونکہ فریقین نے ثالثی کی عدالت میں اس علاقے کے متعلق طویل تفصیلی یادداشتیں پیش کیں۔ سعودی عرب کا دعویٰ یہ تھا کہ کل نخلستان اس کی حکومت کا جزو لاینفک ہے، حکومت برطانیہ اس بات پر مصر تھی کہ نخلستان پر حکومت بلا شرط غیرے ابوظہبی کے حامی اور سلطان مسقط کے سپرد کی جانی چاہیے، کیونکہ بنو نعیم (جن کی آبادی قصبہ البریمی، حماسہ اور صعری میں سب سے زیادہ تھی) پشت ہا پشت سے مسقط کے وفادار چلے آئے ہیں اور الظواہر کی (جو باقی ماندہ اکثر بستیوں میں غالب تعداد رکھتے ہیں) وفاداری ابوظہبی سے وابستہ رہی ہے۔

برطانیہ نے جب سعودی عرب پر رشوت اور دیگر بدعنوانیوں کے الزامات لگائے تو ثالثی عدالت کے برطانوی رکن نے اس بنا پر ثالثی عدالت سے



اٹھا لیا گیا۔ اس اثنا میں اجے سنگھ والی جو دہ پور نے محمد شاہ کے دربار سے گجرات کی صوبے داری کا پروانہ حاصل کر کے بڑودے پر حملہ کیا اور پیلاچی کو نکال دیا، بعد ازاں اپنے ایک خاص کارندے کے ذریعے اسے قتل کر دیا (۵۱۱۳۵ / ۴۱۷۳۲)۔ پھر پیلاچی کے بیٹے داماجی راؤ کانکواڑ نے بڑودے پر قبضہ کر لیا (۵۱۱۳۷ / ۴۱۷۳۳) اور گجرات کے مغل صوبے دار مومن خاں سے عہدنامہ کر کے راہ امن نکال لی۔ داماجی کے عہد میں کانکواڑ خاندان کی حکمرانی مستحکم ہو گئی۔ اس نے مرہٹوں کی طرف سے ہانی پت کی تیسری جنگ (جنوری ۱۷۶۱ء) میں بھی حصہ لیا اور وہ ان چند خوش نصیبوں میں سے تھا جو مرہٹوں کی اس قتل گاہ سے زندہ بچ نکلے تھے۔ وہ ۱۷۶۷ء میں مرا تو اس کے چار بیٹوں میں جانشینی کے لیے کشمکش جاری ہو گئی۔ پہلے فتح سنگھ پھر مانک جی نے گدی سنبھالی، آخر گووند راؤ (۱۷۹۳ء تا ۱۸۰۰ء) کو دربار پیشوا سے مستقل منظوری حاصل ہوئی۔ اس زمانے میں ریاست بڑودہ مرہٹہ وفاق کا ایک اہم رکن تھی۔ گووند راؤ کے بعد اس کے دو بیٹے یکے بعد دیگرے جانشین ہوئے (انند راؤ ۱۸۰۰ء تا ۱۸۱۹ء اور سیاچی راؤ (۱۸۱۹ء تا ۱۸۳۷ء)۔ پھر سیاچی راؤ کے تین بیٹے باری باری مستد نشین ہوئے (گنپت راؤ ۱۸۳۷ء تا ۱۸۵۶ء، لہانڈے راؤ ۱۸۵۶ء تا ۱۸۷۰ء اور بلہار راؤ ۱۸۷۰ء تا ۱۸۷۳ء)۔ بلہار راؤ انگریز ریڈیڈنٹ کو زہر دلانے کے الزام میں معزول ہوا اور لہانڈے راؤ کی بیوہ جٹا بائی نے خاندان میں سے سیاچی کو متبئی کر لیا، جو ۱۸۷۵ء سے ۱۹۳۹ء تک والی بڑودہ رہا۔ اسی کے عہد میں ریاست نے ہر پہلو سے حیرت انگیز ترقی کی۔ آخری فرمانروا ہرتاب سنگھ (۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۹ء) تھا، جس کے دور میں ریاست ختم ہو گئی۔

۱۸۵۶ء: (۱۵) Handbook، شائع کردہ عراق پیٹرولیم کمپنی، لندن ۱۹۳۸ء: (۱۶) J. Kelly، در International Affairs، لندن ۱۹۵۶ء: (۱۷) دشت القمۃ، طبع H. Klein، ہیبرگ ۱۹۳۸ء: (۱۸) J. Lorimer، Gazetteer of the Persian Gulf، Oman and Central Arabia، ۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۵ء: (۱۹) S. Miles، The Countries and Tribes of the Persian Gulf، لندن ۱۹۱۹ء: (۲۰) J. Morris، Sultan in Oman، لندن ۱۹۵۷ء: (۲۱) H. Philby، Saudi Arabia، لندن ۱۹۵۵ء: (۲۲) E. Ross، Annals of Oman، کلکتہ ۱۸۷۳ء: (۲۳) Saudi Arabia، Memorial of the Government of Saudi Arabia، Indianapolis، (al-Buraymi Arbitration) ۱۹۵۰ء: (۲۴) B. Thomas، Alarms and Excursions in Arabia، Arbitration concerning Buraimi and the Common Frontier between Abu Dhabi and Saudi Arabia، شائع کردہ حکومت برطانیہ، ۱۹۵۵ء۔

(W. E. MULLIGAN & G. RENT7)

⊕ بڑودہ: گجرات کانکواڑ کی ایک سابق ہندوستانی ریاست (رقبہ آٹھ ہزار دو سو پنتیس مربع میل، آبادی اٹھائیس لاکھ پچپن ہزار)، پہلے یہ مغربی ہند اور ریاستہائے گجرات کانکواڑ میں ضم ہوئی تھی۔ یکم مئی ۱۹۳۹ء سے صوبہ بمبئی میں شامل کر دی گئی، نیز اسی نام کا شہر جو ریاست کا دارالحکومت تھا۔

ریاست کی بنیاد اتھارہویں صدی میں پڑی تھی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت مغلیہ میں ضعف کے آثار نمودار ہوئے تو پیلاچی کانکواڑ نے گجرات کے مغل صوبے دار سر بلند خاں سے بڑودہ چھین لیا (۱۷۳۱ء)۔ مرہٹہ پیشوا باجی راؤ نے اپنے مقاصد کے پیش نظر پیلاچی کے اخراج کی غرض سے بڑودے کا محاصرہ کر لیا لیکن نظام الملک کی جانب سے حملے کا خطرہ رونما ہوا تو محاصرہ

ڈرائنگ، نجاری، رنگریزی، بافندگی، زراعت وغیرہ سکھائی جاتی تھی۔ ریاست بھر میں کتب خانوں کا جال بچھ گیا تھا۔ ایک میوزیم اور عالی شان کتب خانہ مراد میں تھا۔ پنچائیتیں قائم تھیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈوں میں عورتوں کو بھی ووٹ کا حق حاصل تھا۔

شہر بڑودہ (آبادی دو لاکھ گیارہ ہزار سات سو)، دریائے وشوامتری کے کنارے آباد ہے (۱۸۰۲۲) عرض بلد شمالی اور ۱۵۰۷۳ طول بلد شرقی)۔ مقامی لوگ "وڈوڈرہ" کہلاتے ہیں، جو بظاہر سنسکرت لفظ "وڈودار" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس کے معنی ہیں "درختہائے برگد کے درسان" یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ یہاں بہت سے بڑے درخت تھے اور اب بھی نواح میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ شہر کا قدیم نام "ویرکشر" یا "ویراوتی" تھا، جس کا مطلب ہے "بہادروں کی سرزمین"۔ گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کے گجراتی شاعر پرمانند کی نظموں میں بھی یہ نام آیا ہے۔ اصل شہر پرانے قلعے کی فصیل سے محصور تھا، جو اب منہدم ہو چکی ہے۔ نئی سرکاری اور غیر سرکاری عمارتوں کی کثرت، بازاروں اور گلیوں کی کشادگی، باغوں اور پارکوں کے اہتمام سے شہر نے بالکل نئی صورت اختیار کر لی ہے۔ یہاں کی بہترین عمارت "لکشمی ولاس" ہے، جو مہاراجا کا سب سے بڑا محل ہے۔ اس کی تعمیر پر چار لاکھ پونڈ یا تقریباً ساٹھ لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ یہاں بعض نہایت بیش قیمت جواہرات اور مرصع نوادر بھی ہیں، مثلاً منتخب موتیوں کا ہار جس کی سات لڑیاں ہیں، ہیروں کا ہار، اس میں تین ایسے ہیرے شامل ہیں، جنہیں عالمی شہرت حاصل ہے۔ دو نہایت نادر قالین، جن میں موتی ٹنکے ہوئے ہیں۔ ایک مرصع غلاف

اس کے صرف خاص کے لیے ساڑھے چھبیس لاکھ روپے سالانہ منظور کیے گئے، لیکن بعد میں اس سے کئی ایسی حرکات سرزد ہوئیں کہ حکومت ہند نے اس کی حیثیت حکمرانی ختم کر کے یو راج فتح سنگھ کو فرمانروا بڑودہ تسلیم کر لیا لیکن اس کے صرف خاص کے لیے صرف دس لاکھ روپے تجویز ہوئے۔ اس ریاست کے علاقے حیدرآباد، میسور وغیرہ کی طرح یک جا نہ تھے بلکہ جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔

خاندانی لقب (کائیکواڑ) کی تشریح عموماً یہی کی جاتی رہی کہ یہ لوگ ابتدا میں گڈریے تھے، مویشی چرانے پر انحصار تھا۔ لیکن کن کیڈ Kincaid کے بیان کے مطابق یہ لقب دو لفظوں سے مرکب ہے۔ ایک "گائے"، دوسرا "کواڑ" یعنی دروازہ۔ چونکہ اس خاندان کے ایک فرد نے، جو معمولی حیثیت میں کسی گڑھی کا پاسبان تھا، چند گائیں قصابوں سے چھڑا کر چھوٹے دروازے سے گڑھی کے اندر محفوظ کر لی تھیں اس لیے فخریہ یہ لقب اختیار کر لیا۔

مہاراجا سیاجی راؤ چونستھ سال حکمران رہا۔ اس عہد میں ریاست کی کایا پلٹ گئی۔ ۱۹۳۷ء - ۱۹۳۸ء میں ریاست کی آمدنی پانچ کروڑ ترستھ لاکھ تھی۔ ۱۸۹۳ء سے ریاست بھر میں ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی کر دی گئی تھی۔ لڑکوں کے لیے سات سے بارہ سال اور لڑکیوں کے لیے سات سے دس سال کی عمر تک۔ تمام تعلیمی اداروں کی تعداد دو ہزار پانسو بیالیس تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں ادنیٰ، اعلیٰ ہر قسم کے ادارے شامل تھے۔ یہاں تک کہ ایک کالج صرف تجارت اور اقتصادیات کے لیے قائم ہو چکا تھا۔ انجمنہائے امداد باہمی کی تعداد ۱۵۰۹ تھی۔ ریاست کی اپنی ریل تھی۔ سڑکیں اچھی بن گئی تھیں۔ ٹیکنیکل سکول میں



ہو گئے تھے۔ ان کے لشکر کو، جو طلیحہ نذاب کے تحت مسلمانوں سے لڑنے نکلا تھا، حضرت ابو بکرؓ کے امیر لشکر حضرت خالد بن الولید نے بئر بزاعہ پر ۵۱۱ / ۶۳۲ء میں شکست دی۔ اس لڑائی میں خالد بن ولید تنویرت یہ پہنچی کہ بنو طیہ کے ایک ہزار آدمی طلیحہ سے الگ ہو کر حضرت خالد بن ولید کے لشکر میں آئے، طلیحہ کی مدد پر عیینہ بن حصن اور غطفان کے قبیلہ فزارہ کے سات سو جوان بھی تھے، جو بنو اسد کے برائے حلیف تھے۔ خونریز لڑائی کے بعد عیینہ نے جب دیکھا کہ طلیحہ جن پیغمبری قوتوں کا دعویٰ کیا کرتا تھا وہ مسلمانوں کے مقابلے میں عملاً بیکار ثابت ہو رہی ہیں تو وہ میدان جنگ سے بھاگ گیا۔ چنانچہ طلیحہ کو بھی شام کی طرف بھاگنا پڑا۔ بنو اسد نے خالد بن ولید کی اطاعت قبول کر لی۔ اس پاس کے قبائل، جیسے بنو عامر، جو جنگ کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے اب اسلام کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔

مآخذ: (۱) باہوت، ۱: ۶۰۱ تا ۶۰۲؛ (۲) ابن سعد، ۲/۳: ۳۶ تا ۳۷؛ (۳) الطبری، ۱: ۱۸۹-۱۸۸؛ (۴) ابن الاثیر، ۲: ۲۵۹ تا ۲۶۳؛ (۵) البلاذری، ص ۹۵ تا ۹۷؛ (۶) Wellhausen؛ (۷) *Skizzen*، ۳: ۹ تا ۱۲؛ (۸) *Annali*؛ (۹) *Caliphate*؛ (۱۰) *Muir*، بار چہارم، اڈنبرا ۱۹۱۵ء، ص ۱۹ تا ۲۳۔

(C. E. BOSWORTH)

- بزاعہ: (یا بزاعہ) شمالی شام میں ایک مقام، جو حلب کے مشرق میں چالیس لیلومیٹر کے فاصلے پر نہر الذهب یا وادی بطنان [بطنان] کی زرخیز وادی میں واقع ہے۔ یہ مقام پہلی بہت خوشحال تھا لیکن پھر یہ خوشحالی اس کے محض مغربی حصے بلکہ بزاعہ میں منتقل ہو گئی۔ جو آج کل ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور البلب کے

بھی بتایا جاتا ہے، جو پاک و ہند سے مدینہ منورہ بھیجا جا رہا تھا کہ راستے میں لوٹ لیا گیا۔ بڑودہ بمبئی سے دو سو پینتالیس میل شمال میں بی بی اینڈ سی آئی ریلوے پر واقع ہے۔ شہر کے لیے آب رسانی کا انتظام ایک جھیل سے لیا گیا ہے۔ یہاں ایک اہم ادارہ "کائیکواڑ انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل ریسرچ" (ادارہ تحقیق علوم شرقیہ) ہے۔ جس نے ہندوستانی اسلامی تاریخ کے متعلق فارسی کی متعدد اہم تصانیف شائع کی ہیں۔

مآخذ: (۱) *The Story of : V. P. Menon* (۱) *the Integration of the Indian States* (ہندوستانی ریاستوں کے الحاق کی کہانی)، کلکتہ ۱۹۵۶ء، ص ۳۱۶ تا ۳۲۲؛ (۲) *Imperial Gazetteer of India*؛ (۳) سارا بھائی؛ (۴) *اوکسفرڈ*، ۱۹۰۸ء، ص ۳۱ تا ۳۰، ۸۱ تا ۸۳؛ (۵) *حقیقت سرکار کائیکواڑ (مخطوطہ انڈیا آفس، شمارہ ۲۵۲۵)*؛ (۶) *Rulers of Baroda*؛ (۷) *White-paper on Indian States*؛ (۸) *A History of the Maratha*؛ (۹) *People*، جلد دوم و سوم؛ (۱۰) *Statesman's Year-Book*؛ (۱۱) *India: 1956*؛ (۱۲) *Indian Cyclopaedia*، مطبوعہ حیدرآباد سندھ، بار دوم، ۱۹۳۸ء؛ (۱۳) *اطلاعات حکومت ہند*؛ (۱۴) *رام پوری: کارنامہ راجپوتان، مطبوعہ پنجابی گزٹ پریس، بریلی*؛ (۱۵) *انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا*، بار چہارم، ۱۹۳۸ء [۱۶] *لاٹن* سے خاص طور سے استفادہ کیا گیا ہے۔

(غلام رسول مہر)

- بزاعہ: قبیلہ اسد یا ان کے ہمسایہ بنو طیہ کے علاقہ نجد میں ایک کنواں (قبۃ المقضیات، ص ۳۶۱، حاشیہ ۳)۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بنو اسد اسلام سے منحرف

(جس کے ساتھ بزاعہ اور تاذف دو مینار بھی تعمیر کیے گئے تھے، جن کے کتبوں پر ۵۰۶ھ / ۱۳۵۵ء اور ۵۰۵ھ / ۱۳۵۴ء کی تاریخیں درج ہیں) اور دوسرے ان متعدد اداری تدابیر سے جو اس عمارت کے دروازوں پر ۵۰۵ھ / ۱۳۵۳ء اور ۵۰۸ھ / ۱۳۵۴ء کے درمیان کندہ کی گئی ہیں۔ اس کے قریب کے گاؤں تاذف میں کچھ اور اثبات کے ٹکڑے بھی محفوظ ہیں۔

مآخذ: (۱) R. Dussaud : *Topographie*

*historique de la Syrie* پیرس ۱۹۲۷ء، خصوصاً

ص ۴۷۵؛ (۲) M. van Berchem : *Arabische*

*Inschriften*، در M. F. von Oppenheim *Beiträge*

*zur Assyriologie*، ۷، لائپزگ ۱۹۰۹ء : ۵۰ تا

۵۷ (عدد ۶۳ تا ۷۲)؛ (۳) J. and D. Sourdél،

در *Annales archéologiques de Syrie*، ۱۹۵۳ء، ص

۹۶ تا ۱۰۲؛ (۴) M. Canard : *Histoire de la*

*dynasties des Hamdanides*، ۱، الجزائر ۱۹۵۱ء : ص

۲۱۹، ۲۲۳ تا ۲۲۴؛ (۵) Cl. Cahen : *La Syrie du Nord*،

پیرس ۱۹۴۰ء، بحد اشاریہ (بذیل مادہ 'a Bab Bouzā')

(۶) M. Gaudéfroy-Demombynes : *La Syrie a*

*l'époque des Mamelouks*، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۲۱۹، ۹۲؛

(۷) G. Le Strange : *Palestine under the Moslems*،

لنڈن ۱۸۹۰ء، ص ۴۰۶، ۴۲۶، ۵۳۰؛ (۸) ابن جبیر:

رحلة، طبع ڈخویہ، ص ۲۴۹ تا ۲۵۰؛ (۹) یاقوت،

۱: ۴۳۷، ۶۰۳، ۸۱۱؛ (۱۰) ابن شداد : *Description*

*d' Alep*، طبع Sourdél، ص ۵۷؛ (۱۱) ابوالفداء : تقویم،

ص ۲۶۷؛ (۱۲) الدمشقی، طبع Mehren، ص ۱۱۴،

۲۰۰

(J. SOURDEL - THOMINE)

بزرگہ : رَکْ به بنزرت۔

بزرگمہر : رَکْ به بزرگ مہر۔

بزرگ (بن شہریار) : چوتھی صدی ہجری/

نام سے موسوم ہے۔ اس کے باغوں کی تر و تازگی اور تجارتی چہل پہل نے ابن جبیر کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور وہ بیج سے حلب کو جانے والے کاروانی راستے پر سفر کرنے ہوئے ۵۰۸ھ / ۱۱۸۴ء میں یہاں ٹھہرا تھا۔ ابن جبیر نے لکھا ہے کہ یہ مقام آدھا شہر اور آدھا گاؤں ہے اور اس کی طاقت کا دار و مدار اس قلعے پر ہے جو اس کی سب سے بلند عمارت ہے۔ جب صلیبی جنگ آزماؤں نے شام کو اپنا مستقر بنایا تو اس پر کئی حملے ہوئے، جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علاقہ بارہا تاراج ہوا۔ ۵۳۲ھ / ۱۱۳۸ء میں فرینکوں نے اس پر قبضہ بھی کر لیا لیکن اسی سال [نور الدین] زنگی دوبارہ اس پر قابض ہو گیا۔ اس کے ایک نئے (مؤرخہ ۵۰۶ھ / ۱۱۷۱ء) میں نور الدین کے بیٹے اسمعیل کا نام درج ہے۔ اس کے بعد ۵۷۱ھ / ۱۱۷۵ء میں صلاح الدین نے اسے فتح کر لیا اور پھر ۶۵۷ھ / ۱۲۵۸ء میں یہ مغول کے قبضے میں چلا گیا۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ ۵۷۰ھ / ۱۱۷۴ء میں ۱۱۷۵ء میں یہاں اسمعیلیوں کا قتل عام ہوا، جن کا بظاہر اس سے پہلے اس علاقے میں غلبہ تھا، نیز یہ کہ اس کے قرب و جوار میں واقع عقیل بن ابی طالب کے "مشہد" کی بہت عزت و تعظیم کی جاتی تھی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مملوؤں کے

عہد حکومت میں الباب کے گاؤں کو، جس کا نام

قرون وسطیٰ کی تصانیف میں بزاعہ سے الگ نہیں ملتا،

نمایاں برتری حاصل ہو گئی۔ بزاعہ حلب کے

صوبے کے چوبیسویں ضلع کا سب سے بڑا شہر تھا

اور یاقوت اس کا ذر سوتی سامان کی برآمد کے

ایک مرکز کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس

زمانے میں اس شہر کی اہمیت کی شہادت اول تو

یہاں کی عظیم الشان مسجد کی تعمیر سے ملتی ہے



یہ قلعہ حسن بن صباح کے لیے اس وقت فتح کیا گیا جب اس پر قبضہ رکھنے والوں نے اسمعیلیوں سے اپنا معاہدہ توڑ کر یہ منصوبہ بنایا کہ سلجوق امیر نوشنگین شیرگیر کو وہاں بلوائیں۔ بزرگ امید نے مقامی مزدوروں کو بینکار میں پکڑ کر قلعے کو از سر نو تعمیر کیا اور اس میں پانی پہنچانے کا بندوبست کر کے نفیس باغ لگوائے۔ یہیں اس نے اس آخری اور سب سے خطرناک حملے کا ذمیابی کے ساتھ مقابلہ کیا جو ۵۱۱ھ/۱۱۱۷ء میں محمد تپر کی فوجوں نے شیرگیر کی سرکردگی میں اسمعیلیوں پر کیا تھا۔ ۵۱۸ھ/۱۱۲۳ء میں حسن بن صباح نے اپنے بستر مرگ پر اسے اپنے فرقے کے صدر داعی کی حیثیت سے اپنا جانشین نامزد کیا اور اس کے تین رفیق نامزد کر دیے، اس کے عہد حکومت میں اسمعیلی ریاست نے نئے حملوں کے مقابلے میں اپنی خود مختاری بحال رکھی [رک بہ الموت: حکمران خاندان]۔ ۵۲۰ھ/۱۱۲۶ء میں نئی جدید جنگی قلعے تیار کیے گئے، جن میں میمون دژ شامل تھا۔ ۵۲۶ھ/۱۱۳۱ء میں اس نے ایک زیدی امام ابوہاشم نوشکست دے کر قتل کر ڈالا، جس نے دیلمان میں خروج کیا تھا اور جس کے پیرو خراسان تک پھیل گئے تھے۔ بزرگ امید نے ۵۳۲ھ/۱۱۳۸ء میں وفات پائی اور داعی کا منصب اپنے لڑکے محمد کے لیے چھوڑ گیا۔ اسے حسن بن صباح کے قریب دفن کیا گیا اور عقیدت مند لوگ اس کی قبر کی زیارت کو جانے لگے۔ اس کی اولاد الموت کا سربر آوردہ خاندان بن گئی تھی۔

مآخذ: (۱) رشید الدین: جامع التواریخ، فصل

در بیان نزاریان؛ (۲) جوینی، ۳: ۲۰۸، بعد؛ اور اس

کے علاوہ (۳) Hodgson: *The Order of Assassins*۔

ٹیک ۱۹۵۰ء، جلد ۱، ساریہ۔

(M.G.S. Hodgson)

دسویں صدی عیسوی کا رامہرمز ۵ باشندہ، ایک ایرانی ناخدا اور کتاب عجائب الہند کا مصنف۔ یہ کتاب عربی میں ایک سو چونتیس لہائیوں (محاضرات) کا مجموعہ ہے، جنہیں مصنف نے جہازوں کے ناخداؤں، ملاحوں، تاجروں اور دیگر بحری سیاحوں سے، جو بحر ہند کا چکر لگاتے رہتے تھے، سن کر جمع کیا تھا۔ یہ لوگ بڑے شوق سے مشرقی افریقہ، مجمع جزائر الہند اور چین میں اپنے درناموں کے افسانے سنایا کرتے تھے۔ ان حکایات میں ضمناً متعلقہ ملکوں اور ان کے باشندوں کے رسم و رواج کے بارے میں معلومات موجود ہیں اور کبھی کبھی کسی مذکورہ واقعے کی تاریخ بھی ان میں مل جاتی ہے۔ سب سے آخری تاریخ جو دی گئی ہے وہ ۵۳۴ھ/۹۵۳ء ہے۔ اس کتاب کی زبان میں زمانہ اوسط کی عربی کی بعض خصوصیات نظر آتی ہیں۔

مآخذ: (۱) عربی متن صرف مخطوطہ استنبول،

ایاصوفیا، شمارہ ۳۳۰۶، میں محفوظ ہے، جسے P. A. van

der Lith نے طبع کیا اور اس کے ساتھ M. Devic کا

فرانسیسی ترجمہ بھی شامل کیا (لائڈن ۱۸۸۳ تا

۱۸۸۶ء)؛ (۲) فرانسیسی میں ایک نیا ترجمہ J. Sauvaget

کی *Mémorial*، ۱، دمشق ۱۹۵۴ء: ۱۸۸ تا ۲۰۰

میں موجود ہے؛ (۳) روسی ترجمہ از R.I. Ehrlich،

ماسکو ۱۹۵۹ء؛ نیز (۴) براکلمان: تکملہ، ۱: ۳۰۹۔

(J. W. FUCH)

بزرگ امید، کیا: نزاری اسمعیلیوں کا

انموت [رک بان] میں دوسرا داعی (۱۱۲۳ تا

۱۱۳۸ء)۔ بظاہر شادی کے ذریعے اس کا ماژندران

کے حکمران خاندانوں سے رشتہ تھا۔ وہ ۵۴۹ھ

۱۱۰۱ء تا ۵۱۸ھ/۱۱۲۳ء میں نصیر ۵، جو

رودبار الموت کا ایک قلعہ تھا، اسمعیلی خانم

رہا۔ اس نے تین اور سرداروں کی معیت میں

بزرگ مہر: ایک ایرانی اسمِ معرفہ (معرب شکل بزرگ مہر)۔ ایک روایت کی رو سے جو ایرانی اور عرب مصنفوں نے نقل کی ہے یہ ایک ایسے شخص کا نام تھا جس میں ہر کام کرنے کی اہلیت اور ہر ایک نیک صفت موجود تھی اور جو خسرو اول انوشروان [رک باں] (چھٹی صدی عیسوی) کا وزیر تھا۔ قدیم ترین مستند مصنف، جو پہلوی خدای نامہ (ناماغ) (Khvadhaynāmagh) " کتاب السلاطین" سے واقف تھے، بزرگ مہر کا کچھ ذکر نہیں کرتے (یہ کتاب ساسانی عہد کے اواخر (ساتویں صدی عیسوی) میں لکھی گئی تھی اور ایران کے عہد قبل اسلام کے عرب مؤرخین (الطبری؛ ابن قتیبہ) کے قدیم ترین بیانات کا مآخذ ہے۔ صرف متأخرین کی کتابوں میں یہ شخص ایسی حکایات کا ہیرو بن گیا ہے جو عوامی روایت سے مستنبط ہیں مثلاً [التعالی: تاریخ ملوک الفرس میں، غرر السیر کی ایک فصل میں۔۔ رک بہ لا، انگریزی، بار اول، ۴ : ۷۷، عمود لا، اور غیر معمولی کثرت کے ساتھ فردوسی کے شاہنامہ میں]۔ بعض دفعہ وہ متعدد حکیمانہ اقوال اسی کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں جو ساسانی عہد کے مجموعہ نصائح (اندرز) کے باقیات سے ہیں اور ساسانی عہد کے بعد کی بعض چھوٹی چھوٹی کتابوں (خصوصاً پند نامہ (ناماغ) وزرع مہر بختگان یعنی "بزرگ مہر فرزند بوغ تہ کی کتاب نصائح") میں محفوظ ہیں۔ ان پند و نصائح کا کئی مصنفین نے عربی اور فارسی میں ترجمہ کیا، جیسے نظام الملک المسعودی اور فردوسی (جس کے [شاہنامہ] کی رو سے بزرگ مہر شاہ ایران کو ایک کتاب خرد پیش کرتا ہے، جو ان کی باہمی گفتگو کا ماحصل ہے مگر جو درحقیقت پند نامہ (= پند ناماغ) سے ماخوذ ہے)، بزرگ مہر سے

متعلق تین حکایتیں معنی خیز ہیں، کیونکہ ان میں بعض عوامی مقبول عام عناصر پائے جاتے ہیں: (۱) شاہ ایران نے خواب دیکھا کہ جیسے وہ شراب پی رہا ہے اور ایک خنزیر نے اس کے پیالے میں اپنی تھوتھنی ڈال دی ہے۔ اس خواب کی تعبیر نوئی نہ بتا سکا یہاں تک کہ وہ نو عمر بزرگ مہر نے بادشاہ کو بتایا کہ اس کی بیویوں میں سے ایک لسی اور شخص پر مہربان ہو گئی ہے اور اس کی پوری تحقیق کرنے کے لیے محل کی تمام عورتوں کو برہنہ اپنے سامنے حاضر ہونے کا حکم دیا جائے۔ جب یہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان میں عورت کے بھیس میں ایک مرد بھی شامل ہے (یہاں اس مقبول عام موضوع کے علاوہ وہ ایک نو عمر لڑکا خواب کی تعبیر بتاتا ہے، عورتوں کا اسی طرح کا وہ جائزہ لیا جانا بھی یاد آ جاتا ہے جو مصر قدیم کی ایک کہانی میں مذکور ہے)؛ (۲) ہند کے راجا نے شاہ ایران کے پاس امتحاناً شطرنج کا کھیل بھیجا تھا، بزرگ مہر نے نہ صرف اس کا راز معلوم کر لیا بلکہ اپنی طرف سے ایک کھیل (نرد یا چوسر) ایجاد کر کے بھیجا، جس کا بھید راجا اور اس کے درباریوں میں سے کوئی دریافت نہ کر سکا (اس حکایت کا مآخذ ایک مختصر عوامی قسم کا پہلوی رسالہ سازغان چترنگ یعنی شطرنج کے کھیل کی کہانی ہے)؛ (۳) ایک مرتبہ بزرگ مہر معتوب ہو کر قید کر دیا گیا تھا، انہیں دنوں شہنشاہ بوزنطہ نے ایک سر بمہر صندوق شہنشاہ ایران کے پاس بھیجا اور کہا کہ ہماری طرف سے شاہ ایران کو خراج ادا نہیں کیا جائے گا جب تک کہ وہ اس صندوق کو بغیر کھولے نہ بتا دے کہ اس میں کیا ہے۔ اس پر بادشاہ نے بزرگ مہر کو زندان سے بلا بھیجا اور اس نے آ کر یہ معما حل کر دیا اور اس طرح وہ پھر بادشاہ کا موردِ الطاف



روایت بَرزویہ کی طرف منسوب ہے اور ابن المقفع کے عربی ترجمے کی وساطت سے ہم تک پہنچی ہے، ایسی سوانحی تفصیلات موجود ہیں جنہیں مصنفین بزرگ سہر سے بھی منسوب کرتے ہیں، یا دونوں کو ان میں برابر کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اَنوشروان کے عہد میں ایران پر ہندوستانی ثقافت کا اثر ہوا اور اس اثر میں چند اہل خرد کا ہاتھ تھا جن میں سے ایک بَرزویہ تھا، جس کا نام اس وجہ سے زیادہ مشہور ہوا کہ اس نے پنچ تَنتر کا پہلوی میں ترجمہ کیا؛ شطرنج کا ایران میں تعارف، متعدد نصائح اور اقوال حکمت اور آگے چل کر دانائی اور تعبیر و کہانت کی خاص صفات بھی، جو پہلے سے عوامی روایات میں چلی آتی تھیں، اس کی طرف منسوب کر دی گئیں، اس کے بعد اس کا نام عربی رسم خط میں غلط پڑھ لیا گیا اور اس سے بَرزویہ اور بزرگ سہر دو الگ الگ شخصیتیں وجود میں آ گئیں۔

مآخذ: (۱) A. Christensen : *La légende du sage Buzurjmihir* در *Acta Orientalia*، ۱۹۳۰ء، ۱/۳ : ۸۱ تا ۱۲۸ (یہ بنیادی اور تفصیلی مطالعہ ہے، جس میں اصلی مآخذ کا تجزیہ اور ان سے اقتباسات دیے گئے ہیں)؛ (۲) وہی مصنف: *Iran sous les Sassanides* (خصوصیت کے ساتھ ص ۷ تا ۵۸ اور اشاریہ بذیل مقالات *Burzōē*، *Vuzurgmihir*؛ (۳) خضر نامہ پر دیکھیے متن در *Chrest. persane* : Ch. Schefer، ۱ : ۱ تا ۷؛ اور (۴) Christensen کا ترجمہ در *La légende*، ص ۱۲۱ : (۵) *Grundriss der Iran. Philologie*، ۲ : ۳۳۷ تا ۳۳۶ (H. MASSÉ)

- بَرزاسْتان : رَکْ بہ قِصْرِیہ .
- بزمِ عالم : رَکْ بہ والدہ سلطان .
- بزنتی : رَکْ بہ البَزَنْدُون .

ہو گیا (اس قصے کے ساتھ ایک مرد دانا کے قید سے چھوٹنے اور اپنی عقلمندی کا صلہ پانے کی حکایت بھی جوڑ دی گئی ہے۔ نولدیکہ Nöldeke کو اس قصے کی آخر دانا کی تاریخ میں اسی طرح کے ایک قصے سے مشابہت نظر آتی ہے)۔ ان حکایات نے بزرگ سہر کو عوامی روایات کے ساتھ براہ راست مربوط کر دیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آیا وہ کوئی تاریخی شخصیت ہے یا محض افسانوی۔ A. Christensen اپنے ایک اہم مقالے میں بجا طور پر توجہ دلاتا ہے کہ بزرگ سہر کے ذکر کے علاوہ چند اور حوالے ان اشخاص سے متعلق آئے ہیں جنہیں اَنوشروان کے فرزند و جانشین ہرمزد نے اپنے باپ کے شیروں میں سے قتل کرنے کا حکم دیا تھا اور ان میں سے ایک کا نام بَرز سہر (الثعالبی) بیان کیا گیا ہے۔ پھر یہی نام فردوسی کے ہاں پیار کے طور پر اسمِ مصغر "سماہ بَرزین" آیا ہے۔ مشہور طبیب بَرزویہ کے نام میں، جسے کَلیلۃ و دینتہ کے پہلوی ترجمے کا مصنف فرض لیا جاتا ہے اور جو اَنوشروان کا ہم عصر تھا، *Justi* (*Iran Namenbuch*، ص ۷۴) اور Christensen کے مطابق اس کا مادہ بَرز (بلند) ہے، جس کے آخر میں بائے تصغیر ہے (جیسا کہ بَرزین میں)۔ چونکہ ایسے نام جن میں مادہ بَرز موجود ہے اور جو ساسانی عہد سے مخصوص ہیں بہت کم ہیں، اس لیے بَرز سہر [= بلند مرتبہ مٹھرا (کی حفاظت میں)] مفہوم کے لحاظ سے "بزرگ سہر" (= بزرگ Mithra [کی حفاظت میں]) کے ساتھ علاقہ رکھتا ہے؛ اس کے علاوہ ان دونوں ناموں کو عربی رسم خط میں لکھنے ہی سے معلوم ہو جائے گا کہ ان میں آسانی سے التباس ہو سکتا ہے۔ آخر میں یہ امر بھی قابل التفات ہے کہ کَلیلۃ کے دیباچے کی بعض عبارتوں میں، جو

البساسیری : ابوالحارث آرسلان المظفر، اصلاً ایک ترقی یافتہ غلام تھا، عہد آل بویہ کے اواخر میں اعلیٰ فوجی قائد بن گیا۔ یہ نسبت البساسیری (البساسیری) ابوالحارث کے اولین آقا سے قائم ہوئی ہے، جو فارس کے ایک مقام بسا (فسا) کا رہنے والا تھا۔ ابوالحارث کی منصبی زندگی بہاء الدولہ کے ایک مولیٰ کی حیثیت سے شروع ہوئی اور ترقی کرتے کرتے وہ آخر بلند ترین منصب تک پہنچ گیا۔ اس کا ذکر پہلی بار ان لٹرائیوں کے سلسلے میں آتا ہے جو جلال الدولہ (۵۴۱ھ / ۱۱۰۲ء تا ۵۴۳ھ / ۱۱۰۴ء - ۱۱۰۴ء / ۱۱۰۴ء) کو اپنے بھتیجے ابو کالیجار اور موصل کے عقیلیوں کے خلاف لڑنی پڑی تھیں۔ ملک رحیم خسرو فیروز کا عہد (۵۴۴ھ / ۱۱۰۴ء تا ۱۱۰۸ء / ۱۱۰۸ء) بغداد میں متعین ترک دستوں کی بے نظمی، دارالحکومت میں سنیوں اور شیعیوں کی شکست، عقیلی اور بویہی مدعیان حکومت کی جاہ طلبی، عرب اور کرد قبیلوں کی غارتگری اور سب کے آخر میں، دوآبہ دجلہ و فرات کے معاملات میں سلجوقی سلطان طغرل بیگ کی مداخلت کے باعث مسلسل شورشوں کا دور تھا، جس میں البساسیری نے نمایاں خدمات انجام دیں (مثلاً کرواش العقیلی سے انبار لے لیا (۵۴۴ھ / ۱۱۰۴ء)، ملک رحیم کے بھائی سے بصرہ چھینا (۵۴۴ھ / ۱۱۰۴ء)، بوازيج (مدینة البوازيج) میں عرب اور کرد غارت گروں کے خلاف فوجی اقدامات لیے (۵۴۵ھ / ۱۱۰۵ء)، مزیدی شیعی دیس کی اعانت کی، جس پر بمقام الجامعان (جو آگے چل کر جہ کے نام سے مشہور ہوا) بنو خفاجہ نے حملہ کر دیا تھا وغیرہ)، لیکن ۵۴۶ھ / ۱۱۰۵ء میں وہ ترکان بغداد کی بغاوت روکنے میں ناکام رہا، جس کے بعد غارتگری اور تحط پھر بردان پر موصل کے عقیلی حاکم کے دستوں کی یلغار دیکھنے میں آئی، یہاں تک

بزہ : رك به بسطه  
بزیذخ : رك به چرکس۔  
بزیغ بن موسیٰ : جو الحائک [یعنی جولاہا] کہلاتا تھا، ایک ملحد۔ وہ ابوالخطاب [رك بان] کا شاگرد تھا اور امام جعفر الصادقؑ نے اس کے استاد کی طرح اسے بھی منکر دین قرار دیا تھا، بلکہ بقول النوبختی خود ابوالخطاب نے بھی اسے دھتکار دیا تھا۔ الکشی نے بیان کیا ہے کہ جب امام جعفر الصادقؑ سے کہا گیا کہ بزیغ قتل کر دیا گیا تو انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ اس حکایت کی رو سے بزیغ کی وفات امام جعفر الصادقؑ کی وفات (۵۴۸ھ / ۱۱۰۸ء) سے پہلے ہوئی۔ شروع کے اور بہت سے غلّات کی طرح بزیغ بھی دستکار یعنی کوفے کا ایک جلاہا تھا۔۔۔ اس کے پیروکار بزیغیہ کہلاتے تھے۔

مآخذ: (۱) الکشی: معرفة الرجال، بمبئی ۱۳۱۷ھ، ص ۱۹۶ تا ۱۹۷؛ (۲) النوبختی: فرق الشيعة (طبع H. Ritter) استانبول ۱۹۳۱ء، ص ۳۸، ۴۰؛ (۳) الأشعری: مقالات الاسلاميين (طبع H. Ritter)، استانبول ۱۹۲۹ء، ۱: ۱۲؛ (۴) البغدادي: الفرق بين الفرق (انگریزی ترجمہ از A. S. Halkin، تل ایب Tel-aviv ۱۹۳۵ء)، ص ۶۴ تا ۶۵؛ (۵) المقریزی: الخطط، ۲: ۳۵۲؛ (۶) الشہرستانی: الملل، ص ۱۳۷؛ (۷) الألبیعی: مواقف، ص ۳۴۶؛ (۸) J. Friedländer: The Heterodoxies of the Shi'ites، در JAOS، ۱۹۰۷ء اور ۱۹۰۸ء، بحد اشاریہ؛ (۹) A. S. Tritton: Muslim Theology، لندن ۱۹۴۷ء، ص ۲۷ تا ۲۸؛ (۱۰) مقاله جو لندن یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کی سند کے لیے پیش کیا گیا۔

(B. LEWIS)

marfat.com



ہوتا ہے المستنصر سے درخواست کرنے میں پہل الساسیری نے نہیں کی تھی بلکہ مؤید طغرل کے بغداد پہنچنے سے بھی پہلے فاطمی خلیفہ کو لکھ چکا تھا لیکن اس کے خطوط سلجوقیوں کے داخلہ بغداد سے پیشتر المستنصر کے پاس نہ پہنچ سکے۔ قاہرہ سے فاطمی خلیفہ نے جو روپیہ، سامان اور فرمان حکومت الساسیری کے پاس بھیجا تھا اسے مؤید ہی رجبہ لایا تھا۔

فاطمیوں کے حق میں انتہائی سرگرم تبلیغ ۵۴۴۸ / ۱۰۵۶ - ۱۰۵۷ء میں ہوئی۔ اس کی تصدیق ان متعدد خطوط سے ہوتی ہے جو مؤید نے عراق اور الجزیرہ کے امیروں کو فاطمیوں کا حامی بنانے کے لیے تحریر کیے۔ غزوں کی زیادتیوں کے باعث اس تبلیغ کو تقویت پہنچی۔ واسط اور عراق کے دوسرے شہروں میں المستنصر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا اور دیس، جو بہ حالت مجبوری طغرل کے حق میں قدم اٹھا چکا تھا، پھر ایک بار الساسیری کا حلیف بن گیا۔ عرب بدویوں اور بغداد کے ترکوں سے طغرل سب کچھ چھین چکا تھا۔ ان کی امداد سے الساسیری کی قوت میں بہت اضافہ ہوا۔ چنانچہ وہ دیس کے ہمراہ خاصی بڑی فوج لے کر سنجاہ کے علاقے پر حملہ آور ہوا، جہاں اس نے طغرل کے عم زاد بھائی قتلش اور اس کے حلیف قریش فرمانروائے موصل کے زیر کمان سلجوقی دستوں کو شکست دی۔ اس جنگ میں بہت خونریزی ہوئی۔ قتلش آذربایجان بھاگ گیا۔ قریش زخمی ہو کر گرفتار ہوا (۲۹ شوال ۵۴۴۸ / ۹ جنوری ۱۰۵۷ء) اور وہ الساسیری کا ہم نوا بن گیا۔ اب الساسیری موصل کی طرف بڑھا، جہاں فاطمی المستنصر کو خلیفہ تسلیم کر لیا گیا۔

طغرل کے جوابی اقدامات میں تاخیر نہ ہوئی وہ ۱۰ ذوالقعدہ ۵۴۴۸ / ۱۹ جنوری ۱۰۵۷ء کو

نہ وہ الساسیری کے اصطبل سے گھوڑے اور اونٹ نکال لے گئے۔ اسی سال ماہ نومبر میں انبار پر (جو الساسیری کی جائگہ میں تھا) قریش نے قبضہ کر لیا اور انہوں نے بویہی سلطان سے روگردانی کر کے طغرل بیگ کے نام کا خطبہ پڑھنا شروع کر دیا۔

بغداد میں الساسیری کا ایک طاقت ور حریف خلیفہ کا وزیر رئیس الروساء ابن المسلمہ تھا، جس نے یہ اندازہ کر کے کہ آل بویہ کا خاتمہ قریب ہے پہلے ہی سے طغرل بیگ کے ساتھ رابطہ قائم کر لیا تھا اس لیے کہ ۵۴۴۶ / ۱۰۵۴ - ۱۰۵۵ء میں ترک سردار اور خلیفہ نیز اس کے حاشیہ نشینوں کے درمیان باہمی اختلاف نے نمایاں صورت اختیار کی تو الساسیری نے ابن المسلمہ پر طغرل کے حامی غزوں کو طلب کرنے کا الزام لگایا، جو ۵۴۴۴ / ۱۰۵۲ - ۱۰۵۳ء سے حلوان میں تھے۔

طغرل کے حکم پر دیس کو الساسیری سے تعلقات منقطع کرنے پڑے اور وہ رجبہ چلا گیا، جو فرات کے کنارے واقع ہے۔ ساتھ ہی فاطمی خلیفہ کو لکھا کہ قاہرہ آنے کی اجازت دی جائے وزیر الیازوری کو اس خیال سے اتفاق نہ تھا لیکن خلیفہ نے فاطمی امداد کے لیے الساسیری کی درخواست منظور کرتے ہوئے لکھا کہ بغداد کو میرے نام پر مسخر لیا جائے نیز طغرل نوشام و مصر پر فوج کشی سے روکا جائے۔ المستنصر نے الساسیری کو رجبہ کا گورنر مقرر کر دیا اور اسے پانچ لاکھ دینار، اتنی ہی مالیت کے بیڑے، پانسو گھوڑے، دس ہزار گمانیں، ایک ہزار تلواریں، نیزے اور تیر بھیجے۔

المؤید فی الدین الشیرازی، جس نے بظاہر بغاوت کی آگ بھڑکائی تھی، فاطمی داعی تھا اور اس معاملے میں درحقیقت فاطمیوں کا وکیل مختار بھی تھا۔ اس کی سوانح عمری سے معلوم

بغداد سے نکلا اور ایران سے کمک آجانے کے بعد موصل پر حملہ آور ہوا۔ اسے فتح کرنے کے بعد وہ نصیبین کی طرف بڑھا۔ دیس اور قریش ایک بار پھر اس سے جا ملے اور البناسیری بغدادی ترکوں اور عقیق کی ایک جماعت کے ہمراہ رجبہ نون گیا۔ لیکن سلطان کے بھائی ابراہیم ایٹال کی آمد کے بعد، جو عربوں نو سخت نایسند لرتا تھا، قریش پھر البناسیری سے مل گیا اور دیس نے رجبہ کے راستے پھر جامعان پر قبضہ کر لیا۔ ۵۰۸ھ کی حریت کے انتقام میں سنجار نو اپنے غم و غصہ کا نشانہ بنا کر اور ایٹال کو الموصل میں چھوڑ کر طغرل بغداد چلا گیا، جہاں خلیفہ نے اس کے شاہانہ استقبال کیا اور اسے سمن المشرق و المغرب کے خطاب سے نوازا۔ ۵۰۹ھ ذوالقعدہ ۵۰۹ھ / جنوری ۵۰۸ھ ع۔

ادھر ابراہیم ایٹال خود سخت لینے کا آرزو مند تھا۔ اس نے البناسیری سے بھی روابط میں اپنے اور مؤید کے پاس بھی، جو جنب چلا گیا تھا، ایک قصد بھیجا۔ مقصد یہ تھا نہ بھائی سے سخت حاصل کرنے میں فاضیوں کی مدد حاصل کی جائے۔ اس کے بدلے میں اس نے وعدہ کیا نہ وہ فاضیوں کے نام کا خطبہ پڑھوائے؟۔ چنانچہ اس نے الموصل خاں کر دیا، البناسیری اور قریش وعدہ پہنچ گئے۔ چار مہینے کے معاہدے کے بعد حصار موصل فتح ہو گیا تو البناسیری رجبہ نون گیا لیکن طغرل نے دوبارہ الموصل فتح کر لیا اور نصیبین کی طرف بڑھا۔ مؤید کی خود نوشت سوانح عمری سے واضح ہوتا ہے کہ البناسیری ہر اس زدہ تھا اور اس نے دمشق کا رخ کر لیا۔ اس موقع پر ایٹال نے عمہ بغاوت بند کر دیا اور حیل کی طرف چلا گیا۔ ۵۱۰ھ رمضان ۵۱۰ھ نومبر ۵۰۹ھ کو طغرل نصیبین سے ایٹال کے قتل میں روانہ ہوا۔

اب عراق نچو عرصے کے لیے سلجوقیوں سے خالی ہو گیا تھا، اس لیے البناسیری کی واپسی اور جوابی جارحانہ کارروائیوں کے لیے نونی رکوت باقی نہ رہی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد خبر ملی کہ وہ پہلے ہیٹ پھر انبار میں پہنچ گیا ہے۔ خلیفہ قائم پہلے مذہب رہا نہ لیا زوید اختیار کرنے لیکن پھر دیس العزیمی کی طرف سے یتاہ کی پیشکش کے باوجود اپنی دفاعی قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے بغداد ہی میں ٹھہرے رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۵۰۸ھ ذوالقعدہ ۵۰۸ھ ۲۷ دسمبر ۱۰۵۸ء کو البناسیری شہر بغداد کے مغربی حصے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ صرف چار سو سوار تھے جو معمولی ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ قریش مزید دو سو سواروں کے ساتھ اس کے ہمراہ تھا۔ آئندہ جمعے یعنی یکم جنوری ۱۰۵۹ء کو شیعہ اذان ہونی اور مسجد منصور میں فاضیوں کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ پھر لشتیوں کو پیل دوبارہ قائم کر کے دریا عبور کیا اور ۸ جنوری کو مسجد رسالہ میں خلیفہ مستنصر کی خلافت کا اعلان کر دیا گیا۔ خلیفہ القائم عباسی نے قصر خلافت کی قلعہ بندی کر رکھی تھی، لیکن البناسیری کو صرف لڑنے کے شیعوں ہی کی حمایت حاصل نہ تھی بلکہ شیعوں کی بھی بڑی تعداد غزوں سے نفرت اور مایہ نغیبت کے لالچ میں اس کے ساتھ مل گئی تھی۔ فاضیوں کی ایک جماعت اور قصر کے خواجہ سراؤں کو تکت دینے کے بعد، جنہیں وزیر کی شہ تھی، البناسیری نے یکم ذوالحجہ ۵۰۹ھ [۱۰ جنوری ۱۰۵۹ء کو قصر خلافت پر حملہ کیا اور باب التوی کے راستے "حریم" میں داخل ہوا۔ جب خلیفہ نے دیکھا کہ بازی ہو چکی ہے تو اپنے آپ کو نوز وزیر کو قریش کے ہاتھوں سے مار دیا، جس نے انہیں اس وقت چلتا دکھایا۔



جمادی الآخرہ ۵۴۵ھ / جولائی ۱۰۵۹ء میں طغرل اپنے بھائی پر فتح حاصل کر کے بغداد لوٹنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ وہ البساسیری کو اس شرط پر بغداد میں رکھنے کے لیے آمادہ ہوا کہ وہ اس کے نام کا خطبہ پڑھوائے، اس کے نام کا سکہ جاری کرے اور تخت خلافت دوبارہ خلیفہ القائم کے حوالے کرے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ان حالات میں وہ عراق واپس نہیں آئے ۵۔ اس نے قریش کو عداوت کی کہ اگر البساسیری یہ شرطیں قبول نہ کرے تو اس سے علیحدگی اختیار کرے۔ البساسیری نے بطور خود خلیفہ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی اور اسے اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ وہ سلجوقیوں سے قطع تعلق کرے، لیکن یہ کوشش ناکام ہوئی۔ قریش نے اسے فاطمیوں کی احسان فراموشی کی طرف توجہ دلائی اور یہ امید بھی دلائی کہ طغرل اس کا قصور معاف کر دے گا، لیکن البساسیری نے شرطیں قبول نہ کیں: چنانچہ طغرل نے بغداد کی طرف کوچ کر دیا۔ سلجوقیوں کی درخواست پر سہارش نے خلیفہ القائم کو چھوڑ دیا، جس نے ۲۴ ذوالقعدہ ۵۴۵ھ / ۳ جنوری ۱۰۶۰ء کو نہروان کے مقام پر سلطان سے ملاقات کی اور اس کے ساتھ اپنے بصر میں پہنچ گیا۔ پہلے ہی سے البساسیری کا ساتھ چھوڑ دیا۔ غرض البساسیری اہل و عیال کے ساتھ ۶ ذوالقعدہ ۵۴۵ھ کو بغداد سے رخصت ہو کر نونے کی جانب روانہ ہو گیا۔

طغرل کے سامنے نے بڑی تیر رفتاری سے البساسیری کا بیچھا لیا اور اسے جا بجا دس جی ساتھ تھا، جس نے عربوں سے نرنے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ وہ توفراز ہو گیا لیکن البساسیری نے جنگ کو ترجیح دی۔ ایک تیر سے زخمی ہو کر وہ نونے سے گریزا اور ذوالقعدہ ۵۴۵ھ / ۳ جنوری ۱۰۶۰ء

جب محل لوٹا جا رہا تھا تو البساسیری نے نشانِ خلافت "سندیل"، "رداء"، اور "شباک" پر قبضہ جمایا اور یہ چیزیں نشانِ فتح کے طور پر قاہرہ بھیجی گئیں۔ ۲۹ جنوری ۱۰۵۹ء کو عید گاہ میں پروقار طریق سے عید قربان منائی، جہاں مصری پرچم لہرا رہے تھے۔ البساسیری اس بات پر راضی ہو گیا کہ خلیفہ قریش کے پاس رہے، جسے قریش نے اپنے عمزاد بھائی سہارش کے پاس حدیثہ عانہ میں پہنچا دیا۔ البساسیری کو اصرار تھا کہ اس کا دشمن وزیر ابن المسلمہ اس کے حوالے کر دیا جائے، چنانچہ ابن المسلمہ کو ذلت کے ساتھ شہر میں پھرا کر ۱۶ فروری ۱۰۵۹ء کو بڑے ہولناک طریق سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس کے بعد البساسیری نے واسط اور بصرے پر بھی قبضہ کر لیا لیکن خوزستان کو فاطمی پرچم کے زیر سایہ لانے میں ناکام رہا۔

اس وقت تک قاہرہ والے البساسیری سے تقریباً مایوس ہو چکے تھے۔ شروع شروع میں اس کے اقدامات سے دلوں میں بڑی بڑی امیدیں پیدا ہوئی تھیں۔ مستنصر کو یقین تھا کہ وہ خلیفہ القائم کو ایک قیدی کی حیثیت سے اس کے سامنے پیش کرے گا، چنانچہ اس کے لیے قاہرہ میں مغربی قصر صغیر تیار کر لیا تھا لیکن جب القائم کو قریش کے حوالے کر دیا گیا تو المستنصر کو سخت غصہ آیا۔ علاوہ بریں وزیر یازوری کو معزول کر دیا گیا، کیونکہ اس نے البساسیری کی خاطر مصر کی مالی حالت تباہ کر ڈالی تھی پھر سزائے موت دے دی گئی۔ جون ۱۰۵۸ء سے سابق مدیر ابن الحفری، جو بغداد میں البساسیری کے بھانے فرار ہوا تھا، وزیر رہا۔ جب البساسیری نے اسے خط لکھا تو اس نے بچھو ایسے انداز سے جواب دیا کہ البساسیری کو قاہرہ سے کسی قسم کی مدد کی امید باقی نہ رہی۔ ادھر

دوفے کے نزدیک سنی الفرات کے مقام پر سلجوقی وزیر الکندی کے ایک دیبر کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کا سر سلطان کی خدمت میں لایا گیا۔ اس طرح البساسیری کی طالع آزمائی کا خاتمہ ہوا۔ ایک سال تک اس نے حکومت بغداد سے بنی فاطمہ کی سیادت تسلیم کرائی۔ کہا جاتا ہے کہ فاطمیوں کے نام کا خطبہ وہاں چالیس بار پڑھا گیا۔ ایک طرف فاطمیوں اور دوسری طرف سلجوقیوں کی توسیع سلطنت کی کوششوں کی باہمی آویزش کے اس واقعے سے یقیناً سلجوقیوں کے موقف کو فائدہ پہنچا اور بنو عباس کے حق خلافت کو، جس کی حمایت کا سب سے بڑا مدعی طغرل بیگ تھا، بہت تقویت ملی۔

مآخذ: (۱) سیرت المؤید فی الدین داعی الدعاة،

طبع کامل حسین، ۱۹۳۰ء، مقدمہ ص ۱۶ تا ۱۷، ۲۲ تا

۲۳ و بمدد اشاریہ؛ (۲) الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد،

۹: ۳۹۹ تا ۴۰۳؛ (۳) ابن الصیرفی: کتاب

الإشارة...، ص ۶۹؛ (۴) ابن القلانسی:

ذیل تاریخ دمشق، ص ۸۱ تا ۹۰؛ (۵) البنداری:

تاریخ دولة آل سلجوق، قاہرہ ۱۲۱۸ھ، ص ۱۲

تا ۱۷ (Recueil: Houtsma، ۲: ۱۲ تا ۱۸)؛ (۶)

یاقوت، ۱: ۶۰۸ و ۳: ۸۹۲، ۵۹۵؛ (۷) ابن الأثیر،

۹: (s. a.)، ۳۲۵، ۳۲۸، ۳۳۲، ۳۳۱، ۳۳۳، ۳۳۴،

۳۳۵ تا ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱؛ (۸) ابن

العبری Chronography: Bar Hebraeus، ص ۲۱۰،

۲۱۳ تا ۲۱۴، ۲۱۵؛ (۹) ابن خلکان، مطبوعہ بولاق،

۱: ۷۶؛ (۱۰) ابن میسر: ترجمہ Annales d' Egypte،

ص ۷ تا ۸، ۱۰ تا ۱۱، ۲۰؛ (۱۱) الفخری، طبع

Derenbourg، ص ۳۹۳، ۳۹۶ تا ۳۹۸ (مترجمہ

Amar، ص ۵۰۵، ۵۰۸ تا ۵۰۹)؛ (۱۲) ابن خلدون:

العبر، ۳: ۳۵۳ تا ۳۶۳ و ۳: ۳۸۸ تا ۳۹۳؛ (۱۳)

المتربزی: الخطط، مطبوعہ بولاق، ۱: ۳۵۶، ۳۵۹،

۳۵۷؛ (۱۴) ابن تغری بردی: النجوم، قاہرہ، ۵:

۱۲، ۵ تا ۱۲ و بمدد اشاریہ؛ (۱۵) Quatremère:

Mémoires sur l'Egypte، ۱: ۳۲۶ ببعده؛ (۱۶) Weil:

Chalifén، ۳: ۹۲ تا ۱۰۲؛ (۱۷) Müller Der:

Islam im Morgen und Abendland، ۱: ۶۳۶، ۶۳۹؛

۲: ۸۱ ببعده؛ (۱۸) Wüstenfeld Gesch. der Fat.:

Chalifen، ص ۲۳۸ تا ۲۳۸؛ (۱۹) Le Strange

لیسٹریج، ص ۱۰۶؛ (۲۰) وہی مصنف: Baghdad،

ص ۳۶؛ (۲۱) G. Wiet. Hist. de la Nat. Egypt.:

L'Egypte arabe، ۳: ۲۳۲ تا ۲۳۶؛ (۲)

حسن ابراہیم حسن: الفاطمیون فی مصر، ص ۳۱۵.

(M. CANARD)

بساط: رک بہ قالی.

بساون، عہد اکبری (۵۹۶۳ / ۱۵۵۶ء)

تا ۱۱۰۱ھ / ۱۶۰۵ء) کا ایک ممتاز مصور، یہ

مغل دبستان فن کے ان چار مصوروں میں سے ایک تھا

جن کا ابوالفضل علامی نے آئین اکبری میں (ترجمہ

H. Blochmann، لککتہ [۱۶۸۷: ۱۰۸ و ۱۸۷۵ء،

۱: ۱۱۳] نیز متن، مطبوعہ نول نشور، لکھنؤ

۱۸۶۹ء، ۱۰: ۱۳۳] مصوری پر اپنے مختصر سے

بیان میں ذکر کیا ہے۔ اس واحد ہم عصر مآخذ کی رو

سے بساون کا شمار "اس فن کے پیشرووں میں

ہوٹا ہے... طراحی، چہرہ کشائی، رنگ آمیزی،

مانند نگاری [portrait painting] اور اس فن کی

دیگر شاخوں میں یگانہ زمان ہے اور بہت سے

نقادان فن نے تو اسے دسوتھ پر ترجیح دی ہے۔"

بساون کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہندو تھا

اور گو اس کی زندگی کے بارے میں ہماری معلومات

نہ ہونے کے برابر ہیں تاہم قیاس یہ ہے کہ

وہ عہد اکبری کے ابتدائی برسوں میں شاہی

نکار خانے میں ملازم رہا گیا تھا، چونکہ تقریباً

۱۶۰۰ء سے بعد کے مخطوطات میں اس کی بنائی



تیار کرتا تھا اور پھر اس کے معاونین اس میں رنگ بھرتے تھے۔ یہ مسئلہ کچھ اور بھی پیچیدہ یوں ہو جاتا ہے کہ کبھی کبھی اسانڈہ فن اپنے قلم سے تصویر میں کسی شہیہ کا یا بعض دیگر تفصیلات و جزئیات کا اضافہ کر دیتے تھے۔ خوش قسمتی سے عہد اکبری کی تصاویر میں سے بعض ایسی بھی ہیں جنہیں اسانڈہ فن نے کسی مدد کے بغیر خود تیار کیا تھا اور ان کی بدولت ہم ان میں سے ہر ایک استاد کے منفرد اسلوب سے آشنا ہو سکتے ہیں۔ تصاویر کا یہ مجموعہ چھوٹے چھوٹے خاص طور سے مزین مخطوطات پر مشتمل ہے جنہیں شہنشاہ اور اس کے حلقہ مقربین کی ذاتی تفریح کے لیے لکھا اور مصور کیا گیا تھا۔ ان میں سے بیشتر نظم و حکایات کی لتائیں ہیں اور ان کی اثر تصاویر اپنے عہد کی ممتاز خصوصیات کی حامل ہیں۔ اس نوع کی کتابوں میں بساون کی نو عدد میناتور (miniatures) تصویریں ہمارے علم میں ہیں، جن میں سے چھ پر اس کا نام درج ہے۔ حسب ذیل تصاویر میں اس عہد کی خصوصیات ملتی ہیں:-

(۱) "ایک جراح بندر کے خون سے ایک مریض کا علاج کر رہا ہے"، ضیاء الدین نخشبی کے طوطی نامہ، نواح ۱۵۶۵ء میں سے، کلیولینڈ Cleveland ریاستہائے متحدہ امریکہ، کلیولینڈ موزہ فنون، عدد ۲۷۹-۶۲:

(۲) "طوطی دربار میں"، اسی کتاب (شمارہ ۱) سے، کلیولینڈ موزہ فنون، عدد ۲۷۹-۶۲، شکل ۱:

(۳) "شہزادی ہما کا ایک شیخ کی زیارت کو جانا"، از داراب نامہ، نواح ۱۵۷۵ء، لندن، موزہ بریطانیہ، عدد ۱۳۶۱۵، ms. or. ۱۳۶۱۵، ورق ۳۴ - الف، اشکال ۲ و ۳:

ہوتی تصاویر نہیں ملتیں لہذا قیاساً وہ اس زمانے کے قریب قریب یا تو ملازمت سے سبکدوش ہو چکا تھا یا فوت ہو گیا تھا۔ اس کا نم از کم ایک بیٹا تھا، جس کا نام منوہر تھا۔ وہ بھی عہد اکبری کا ایک مشہور فن کار تھا اور اس د شمار جہانگیر کے ان مقرب بارہ مصوروں میں ہوتا تھا جنہوں نے شبیہ لشی اور حیوانات کی تصویریں بنانے میں نام پیدا کیا (گرے Basil Gray: *Painting*. Sir Leigh Ashton, *The Art of India and Pakistan*, لندن ۱۹۵۰ء، ص ۱۳۳، لوح ۱۲۱)۔

ستاد W. Staude کی یہ رائے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ بساون نے داستان امیر حمزہ کو مصور کرنے کے لیے لپڑے پر نقاشی کے ایک طویل سلسلے میں حصہ لیا (Die: H. Gluck *Indischen Miniaturen des Haemzac-Romanes*، وی انا ۱۹۲۵ء)۔ اس منصوبے پر ایرانی مصوروں میں سید علی اور عبدالصمد کے زیر نگرانی کام ہو رہا تھا (W. Staude: *Contribution a L'etude de* *Basawan*، در *Revue des Arts Asiatiques*، ج ۸، عدد ۱ (۱۹۲۳ء) اور وہی مصنف: *Les Artistes de la cour d'Akhar et les illustrations du Dastan-i-Amir Hamzah*، در *Arts Asiatiques*، ج ۲، ٹراسہ ۱ (۱۹۵۵ء): ص ۴۷)۔ اوائل عہد اکبری کی ان بہت سی مہتم بالشان تصاویر میں اگرچہ بساون کے اسلوب کے بعض پہلو نمایاں ہیں تاہم ان میں سے کسی تصویر کو بھی پورے یقین کے ساتھ اس سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ منسوب کرنے کا مسئلہ یہاں اس لیے بھی دشوار ہو جاتا ہے کہ اس سلسلے کی ہر ایک تصویر۔ مغلوں کے وسیع تر منصوبوں کے تحت تیار کردہ بیشتر تصاویر کی طرح۔ متعدد فن کاروں کی بنائی ہوئی ہیں۔ ان تصاویر کا خا نہ پہلے کوئی استاد

۱. *The Paintings of Basawan*، لٹت کلا، عدد ۱۰، (۱۹۶۳ء)۔

اگرچہ شبیہ نشی میں بساون کی بے حد تعریف و تحسین کی جاتی تھی تاہم اس میدان میں اس کے فن کے صرف دو نمونے ملتے ہیں۔ پہلی تصویر تو بھارت کے ایک نجی مجموعے میں محفوظ ہے اور اس میں سیاہ پس منظر کے سامنے ایک امیر کو دکھایا گیا ہے، جس کی شناخت نہیں ہوتی۔ اس تصویر پر ایک معاصرانہ تحریر میں اسے بڑے قابل وثوق طور پر بساون سے منسوب دیا گیا ہے۔ دوسری تصویر امریکہ کے ایک نجی مجموعے میں محفوظ ہے، جس میں ایک مغل کو کسی باغ کے اندر ایک راجپوت سے محو گفتگو دکھایا گیا ہے (تصویر ۵)۔ اگرچہ اس پر کوئی تحریر موجود نہیں، تاہم اسلوب کی بنا پر اس تصویر کو بساون سے منسوب دیا جاسکتا ہے۔

جو تصاویر ہمعصر تحریروں کے ذریعے بساون سے منسوب کی گئی ہیں ان میں سے بہت زیادہ تعداد ایسی تصاویر کی ہے جن کے خاکے تو اس نے تیار کیے لیکن رنگ اس کے معاونین نے بھرا (ان میں سے کئی تصاویر W. Staude نے اپنے مذکورہ بالا مقالات میں شائع کی ہیں)، تاہم ایسی بعض تصاویر سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان میں استاد نے اتنی ہی دلچسپی لی ہے جتنی کہ پوری اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی تصاویر میں؛ بلکہ چند ایک تصویروں میں تو استاد کی اپنی اصلاح کی علامات بھی نظر آتی ہیں (*The Paintings of Basawan* : Welch)۔ یہ تصویریں جن تاریخی یا رزمیہ تصانیف میں محفوظ رہ گئی ہیں ان میں سے کوئی کتاب بھی ابھی تک مکمل شکل میں شائع نہیں ہوئی، اس لیے ان تمام مینا توری تصاویر کا اپنے قارئین کے سامنے حوالہ پیش

(۴) "ایک شیخ کی ایک درویش سے گفتگو"۔ از بہارستان جامی، جس کی کتابت محمد حسین زرین قلم نے بمقام لاہور ۳۹ سنہ الہی (۱۵۹۴ - ۱۵۹۵ء) میں کی، اوکسفورڈ، کتاب خانہ بوڈلین، مجموعہ Elliot، عدد ۲۵۴، ورق ۹ - الف، شکل ۴: (۵) "دربار کا منظر"، از انوار سہیلی، مؤرخہ ۱۵۹۶ - ۱۵۹۷ء، ورق ۵ الف، بنارس، بھارت۔ لٹا بھون (*The Paintings of Basawan* : S.C. Welch) لٹت کلا، عدد ۱۰، (۱۹۶۳ء)، رنگین لوح:

(۶) "ایک ہندو کا ایک درویش سے ڈر رہا کتا"، امیر خسرو دہلوی کے خمسہ کا ایک تنہا ورق، مؤرخہ ۱۵۹۷ - ۱۵۹۸ء، نیویارک سٹی میٹرو پولیٹن موزیئم فنون، عدد ۱۳۰۲۲۸۰۲۹ (*A Handbook of Muhammedan Art* : Maurice Dimand) بار دوم، نیویارک (۱۹۴۴ء، شکل ۳۳):

حسب ذیل مینا توری تصاویر پر [مصور ڈا] نام تو درج نہیں البتہ اسلوب کی بنا پر انہیں بساون سے منسوب دیا جاسکتا ہے:

(۷) "تقب زنون کا محل سے فرار"، کسی ناشناختہ مخطوطے کا ایک تنہا ورق، جسے اب ایک مرقع میں چسپاں کر دیا گیا ہے، نواح ۱۵۹۵ء (*Indian Miniatures of the Moghul School* : L. Hayek) لنڈن، ۱۹۶۰ء، شکل ۴، لوح ۶):

(۸) "شاعر کی تحقیر"، شاہی کے دیوان کا ایک تنہا ورق، نواح ۱۵۹۵ء، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، نجی مجموعہ (*Early Mughal Miniature Paintings* : S. C. Welch) در *Ars Orientalis*، ج ۳ (۱۹۵۹ء، شکل ۵):

(۹) "اسکندر کی جوگی سے ملاقات"، اسی مخطوطے سے نکلا ہوا تنہا ورق، جس سے مذکورہ بالا تصویر، عدد ۶، لی گئی ہے، نیویارک سٹی میٹرو پولیٹن موزیئم فنون، عدد ۱۳۰۲۲۸۰۳۰، (*Welch* :



پر محفوظ اس مخطوطے کی کئی تصاویر W. Staude نے شائع کر دی ہیں۔ باقی تصویریں، جن میں سے کوئی بھی بساون کی نہیں ہے، Basil Gray : *Persian Miniatures*، نیویارک ۱۹۵۶ء، میں ملتی ہیں (الواح عکسی ۲۹ تا ۳۳، رنگین)۔

(۵) تیمور نامہ، نواح ۱۵۹۰ تا ۱۵۹۵ء، ہٹنہ، بانکی پور سٹیٹ لائبریری۔ اس اہم مخطوطے کے چند ایک صفحات Josef Strzygowski : *Asiatische Miniaturenmalerei*، Klagenfurt ۱۹۳۳ء اور

اور *Indian Paintings under the Mughals* : Percy Brown، اوٹسفرڈ ۱۹۲۳ء، لوحہ ۳۳) نے شائع کر دیے ہیں۔

(۶) اکبر نامہ، از ابوالفضل، نواح ۱۵۹۰ تا ۱۶۰۰ء۔ اس کے ۱۱۷ اوراق مع ۱۱۶

میناتور تصاویر کے وکٹوریہ البرٹ میوزیم، لندن میں محفوظ ہیں۔ اگرچہ یہ اوراق ابھی تک تمام و کمال شائع نہیں ہوئے تاہم ان کا مختصر سا

حال *An Akbar Namah Manuscript* : Emmy Wellesz، در *Burlington Magazine*.... ج ۸۰ (جون ۱۹۴۲ء):

ص ۱۳۵ تا ۱۴۱، میں درج ہے۔ اس کتاب میں بساون کے خاکوں کو مغلیہ مصوری کی تاریخ کے درخشندہ ترین نمونوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

اس کا فن کے اعتبار سے ایک بہترین نمونہ ”ست ہاتھی پر اکبر کی سواری“ (وکٹوریہ

البرٹ میوزیم، عدد S.I. ۲-۱۸۹۶، ۱۱۷/۲۲، شکل ۶) ہے، جسے چتر نے مکمل کیا تھا اور

اور جو اس امر کا ثبوت ہے کہ عہد مغلیہ میں مختلف فن کاروں کی مشترکہ مساعی سے تصویر

تیار کرنے کا جو طریقہ معمول بن چکا تھا اس سے کام کے معیار پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا تھا۔

ایران اور دوسرے اسلامی ممالک کی طرح مغلوں کو بھی خطاطی کے نمونوں کے مرقعے جمع کرنے کا شوق تھا، جن میں میناتور تصاویر اور

کرنا ممکن نہیں، بہر کیف ہم یہاں مخطوطات کی فہرست دے کر ان سے متعلق اہم کتابیات کا ذکر کرتے ہیں۔

(الف) رزم نامہ، نواح ۱۵۸۵ - ۱۵۹۰ء، جے پور، عجائب خانہ مہاراجا جے پور (T.H.)

*The Razm Namah manuscript* : Hendley، در *Memorials of Jaypur Exhibitions*، لندن ۱۸۸۳ء، جلد ۴، اس

مخطوطے میں، جسے دل کھول کر مصور کیا گیا ہے، کئی تصویریں ایسی ہیں جن کا خاکہ

بساون نے تیار کیا تھا۔ قریب قریب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہندو رزمیہ [مہا بھارت] کے

فارسی ترجمے (از بداؤنی، در ۱۵۸۰ء) کا وہی نسخہ ہے جو اکبر کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

(ب) راماین، نواح ۱۵۸۵ تا ۱۵۹۰ء، جے پور، عجائب خانہ مہاراجا جے پور۔ رزم نامہ کے سلسلے کی ایک غیر مطبوعہ جلد۔

(ج) بابر نامہ، نواح ۱۵۹۰ء، اس منتشر مخطوطے کے الگ الگ اوراق کئی عوامی اور نجی

مجموعوں میں محفوظ ہیں۔ شترہ صفحات وکٹوریہ البرٹ میوزیم میں ہیں، ایک صفحہ، جس کا خاکہ

بساون کا بنایا ہوا اور تصویر دھرم داس کی تیار کی ہوئی ہے، امریکہ کے ایک نجی مجموعے

میں ملتا ہے (*Early Mughal Miniature* : Welch، *Paintings*، کتاب مذکور، ص ۱۳۵، شکل ۲)،

چونکہ اس مخطوطے کی میناتور تصاویر ایک قدیم اسلوب کی ہیں جنہیں دیکھ کر اکثر داستان

امیر حمزہ اور داراب نامہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اس لیے گمان گزرتا ہے کہ یہ شہنشاہ [اکبر] کا

اپنے دادا کی خود نوشت سیرت کے [فارسی] ترجمے کا ذاتی نسخہ تھا۔

(د) جامع التواریخ، از رشید الدین، مؤرخہ ۱۵۹۵ء، کتاب خانہ گلستان، تہران۔ جزوی طور

منسوب کیے جا سکتے ہیں:-

(و) ”چند درویش“، لنڈن، انڈیا آفس

لائبریری، Johnson Album عدد ۲۲، ورق ۱۳

(Painting : Basil Gray، کتاب مذکور، عدد ۷۳۶،

لوحة ۱۳۷، تاریخ غلط ہے اور [کسی سے] منسوب

نہیں):

(ز) ”قدرتی منظر میں چند اشکال“، نیویارک

شہر Miss Adrienne Minassian، غیر مطبوعہ۔

بساون کی قدیم ترین تصویر سے جو ہمارے

علم میں ہے (تصویر ۱) اور جسے ۱۵۶۰ء کے

زمانے سے منسوب کیا جا سکتا ہے فن کار کی

تخلیقی قوت اور اس کی شخصیت کی فنی ایچ کا

اظہار ہوتا ہے، جسے ہم یقیناً مغلیہ اسلوب کے

ارتقا میں کارفرما قوتوں میں شمار کر سکتے ہیں۔

عوامی نفسیات سے بساون کی گہری واقفیت،

ابعاد ثلاثہ کو پیش کرنے پر قدرت (جو کسی حد تک

غالباً یورپی فن کے مطالعے کا نتیجہ تھی) اور قلم کے

استعمال میں آزادی اکبر کے متحرک، پر معنی اور

واقعیت پسندانہ اسلوب کے لیے انتہائی موزوں

تھی۔ داراب نامہ میں، جو ۱۵۷۰ء کے زمانے سے

تعلق رکھتا ہے، بساون کی تصاویر (تصویر ۲ و ۳)

اس بات کے ثبوت میں بطور مثال پیش کی جا سکتی

ہیں کہ وہ ملاح کی ”کوتاہ نمائی“ (fore-shortening)

اور منظر میں عمارت کی ”دور نمائی“ (recession)

جیسے مشکل مسائل سے کس بے پائی سے

عہدہ برا ہوا ہے۔ عہد اکبری کے دوسرے اساتذہ

کی طرح ۱۵۹۳ء تک بساون کی تکنیک میں نفاست

اور لطافت پیدا ہو گئی تھی۔ اب اس کی تصویر

کے مختلف اجزا میں ایک تنظیم، اس کے موقلم

کی جنبشوں میں ایک ٹھیراؤ، اس کے رنگوں میں

ایک ہم آہنگی اور اس کے مناظر میں فطرت کی

عکاسی جھلکنے لگی تھی۔ اس کی تصاویر ”ایک

دوسری چیزیں بھی شامل کر لی جاتی تھیں۔ بسا

اوقات ان گراں بہا اشیا کو ایسے حاشیوں کے

اندر لگایا جاتا تھا جو خاص طور پر ان کے لیے

تیار کیے جاتے تھے اور جن میں آب زر اور دوسرے

رنگوں سے اشکال بنی ہوتی تھیں۔ بساون کے

تیار کردہ اس قسم کے ایک حاشیے کا ذکر J.V.S.

Indian Paintings in a Persian : Basil Gray و Wilkinson

Museum، در Burlington Magazine (اپریل ۱۹۳۵ء)،

ص ۱۷۳ میں کیا گیا ہے۔

بساون کے کئی خاکے ہمارے علم میں

آچکے ہیں۔ ان میں سے پانچ پر اس کا نام بھی

درج ہے:

(الف) ”دیومالائی منظر“، پیرس، Musee

Guimet عدد ۲۰۶۱۹، J. A. (Ivan Stchoukine :

Miniatures Indiennes Du Louvre، پیرس ۱۹۲۹ء، ص

۱۵؛ Paintings : B. Gray، کتاب مذکور، عدد ۶۶۹،

لوحة ۱۲۸):

(ب) ”ایک عورت ایک عفریت کے سر پر

ایستادہ“، پیرس Musee Guimet عدد ۳۰۶۱۹، G. D.

(Stchoukine) : وہی مصنف، ص ۱۵ : W. Staude :

Les Artistes de la Cour d' Akbar ...، کتاب مذکور

شکل ۱۱):

(ج) ”ایک جوان عورت اور ایک بوڑھا

مرد“، پیرس Musee Guimet عدد ۳۰۶۱۹، J. B.

(Stchoukin) : وہی مصنف، ص ۱۶):

(د) ”ایک نئے نواز“، پیرس Musee Guimet

عدد ۳۰۶۱۹، G. A. (Stchoukine) : کتاب مذکور،

ص ۱۶):

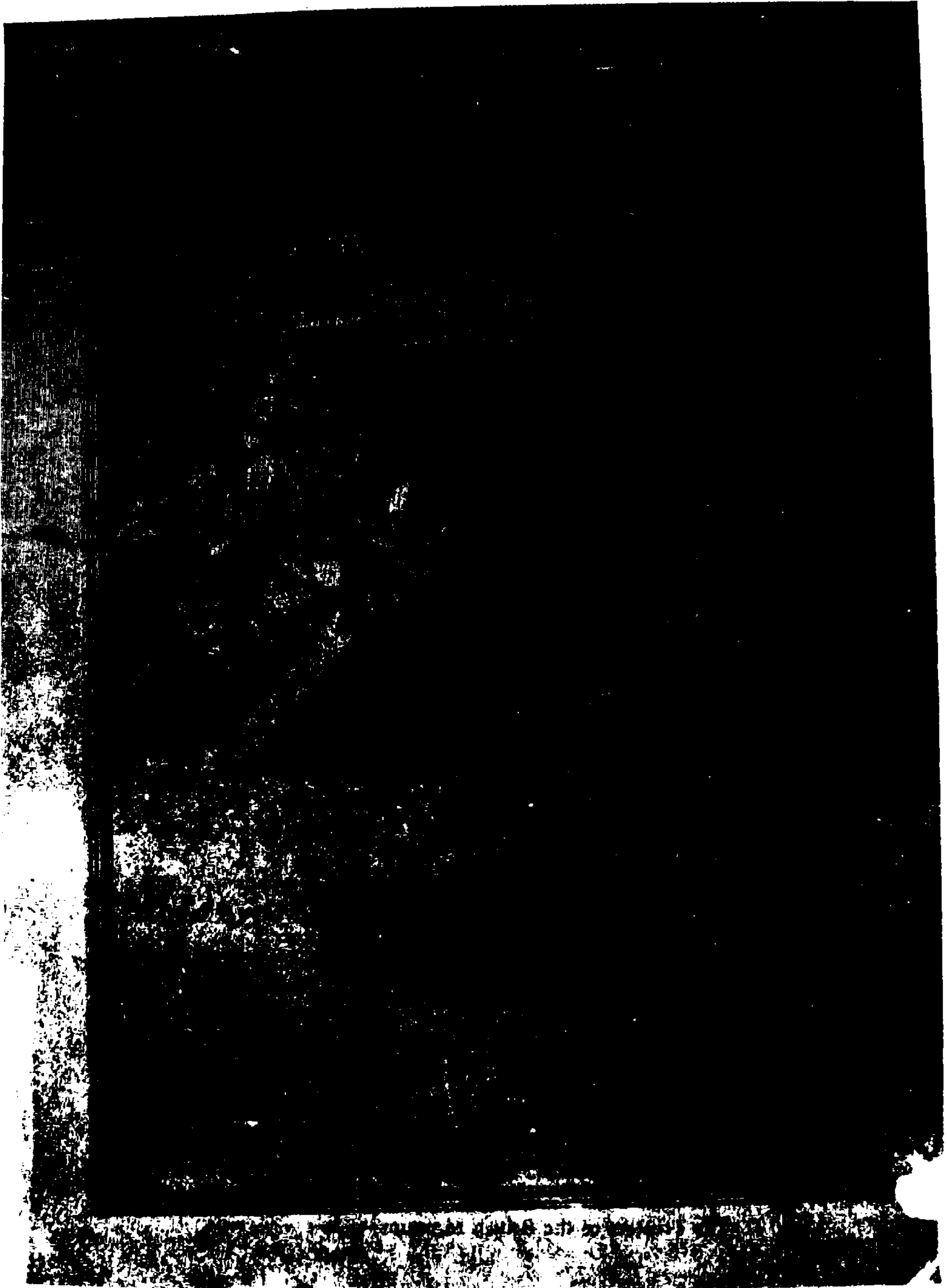
(ه) ”ایک درویش“، پیرس Musee Guimet

عدد ۳۰۶۱۹، G. B. (Stchoukine) : کتاب مذکور،

ص ۱۶):

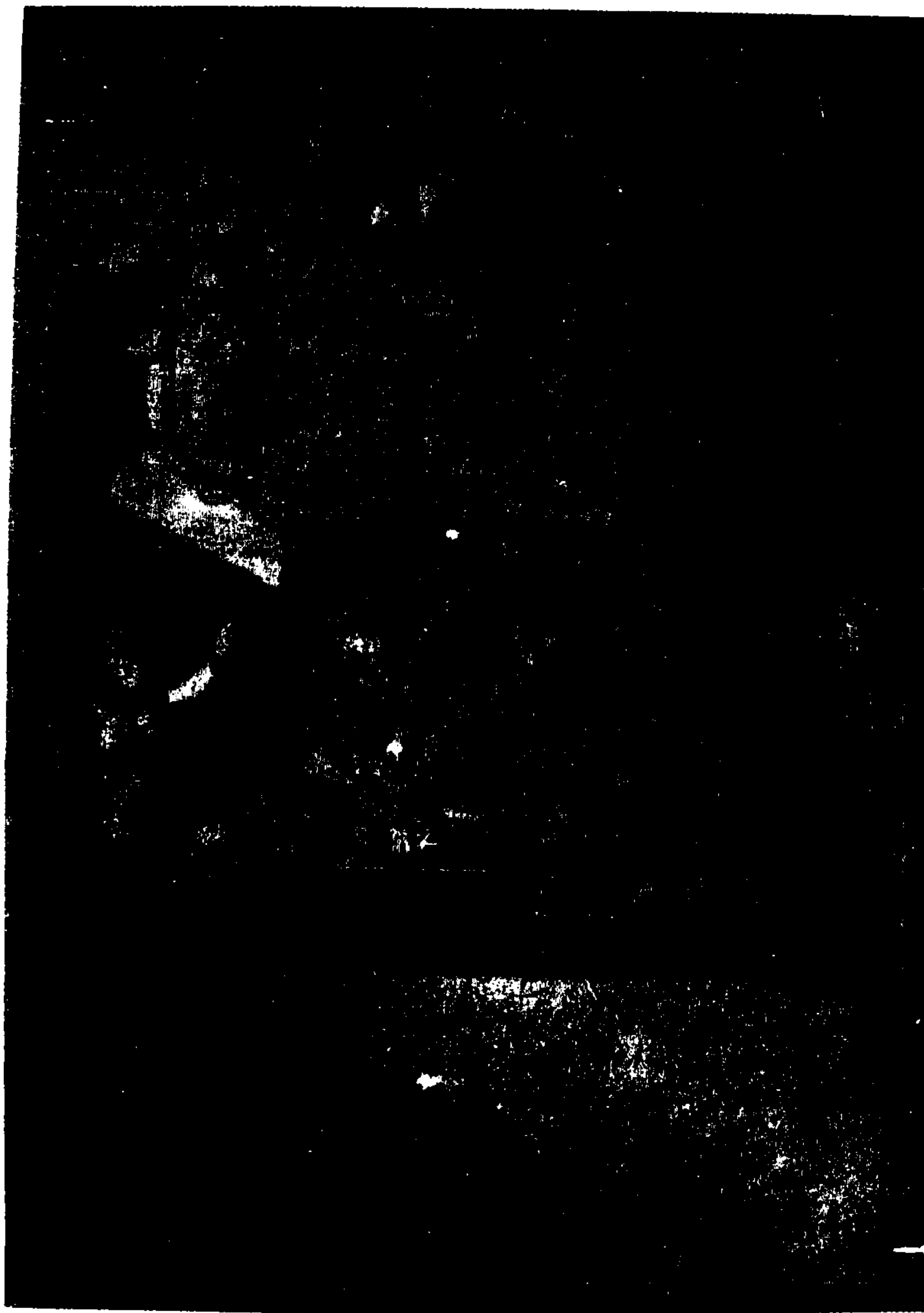
اسلوب کی بنا پر دو اور خاکے بھی بساون سے





تصویر ۱ | The Cleveland Museum of Art

Marfat.com



• تصوير ۲ بشکریہ The Trustees of the British Museum

marfat.com

Marfat.com

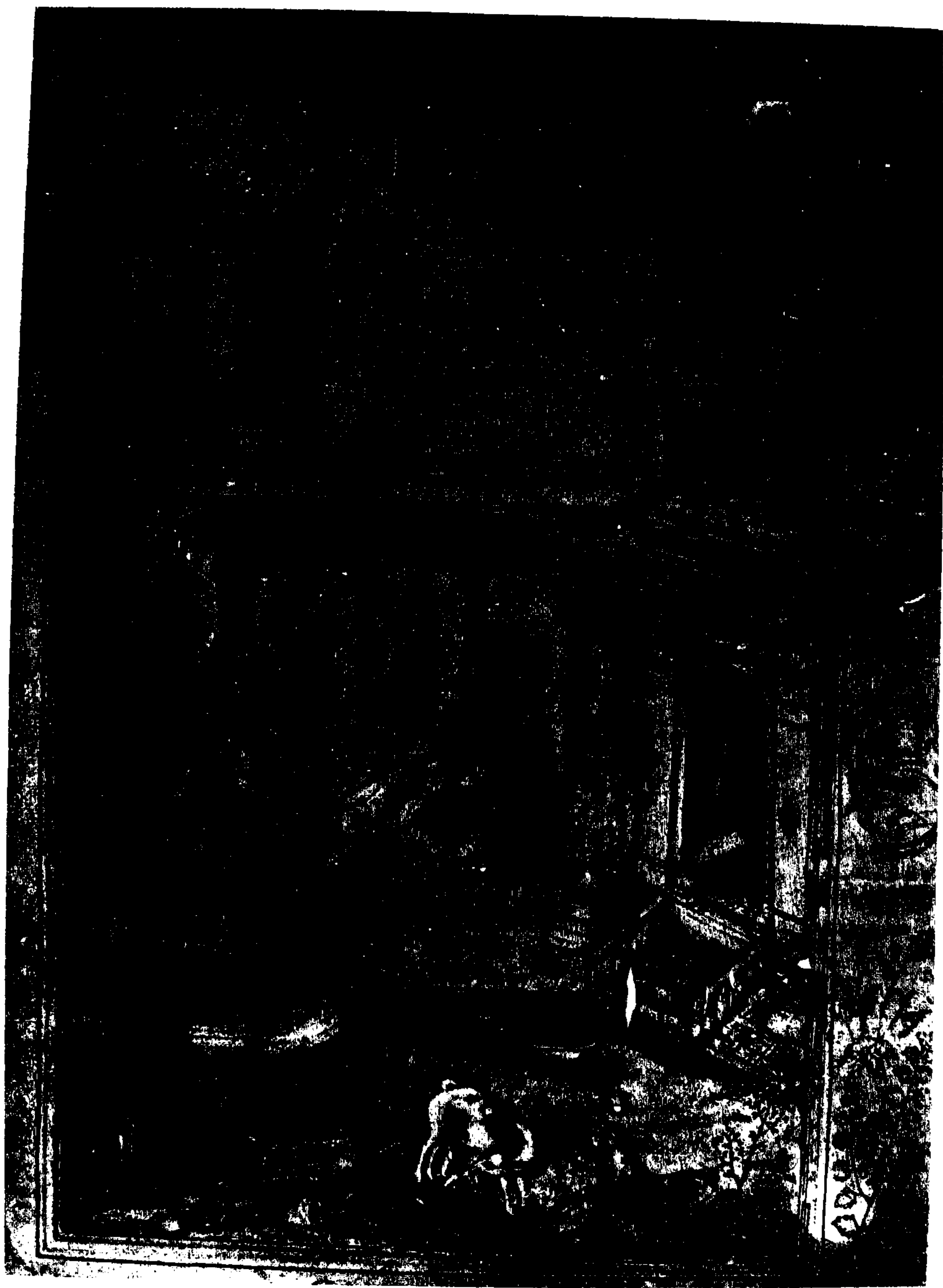




تصویر ۳

marfat.com

Marfat.com

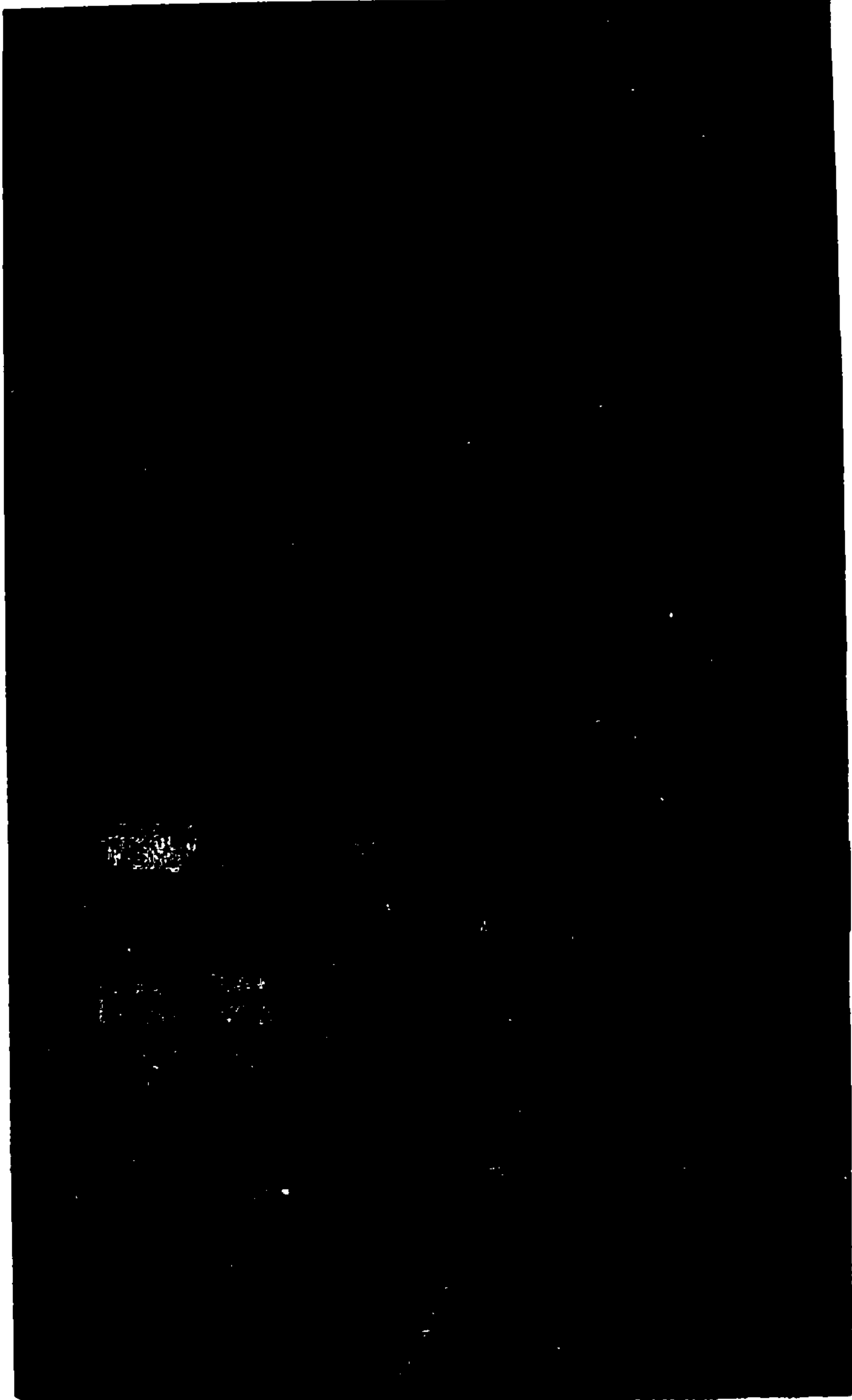


تصویر م شکرہ The Bodleian Library

marfat.com

Marfat.com





تصویر ۵

marfat.com

Marfat.com



تصویر ۶ بشکریہ The Victoria and Albert Museum

marfat.com

Marfat.com



شیخ اور ایک درویش“ (تصویر ۴) اور ”ایک مغل ایک راجپوت سے محو گفتگو“ (تصویر ۵) انسانی کردار و نفسیات کی گہرائیوں سے ساون کی غیر معمولی واقفیت کی غمازی کرتی ہیں۔ اس نے اپنی اس صلاحیت کو ایک تمثیل نگار کی سی نکتہ سنجی اور حساسیت سے کام لیتے ہوئے اجاگر کیا ہے۔ اس کی تمام تر خود تیار کردہ تصاویر میں سے اگرچہ اکثر کا تعلق حیاتِ ذہنی سے ہے تاہم اس کے رزمیہ و تاریخی مناظر کے خاکوں۔ مثلاً اکبر کی مست ہاتھی پر دلیرانہ سواری کی سنسنی خیز شبیہ (شکل ۶)۔ سے پتا چلتا ہے کہ وہ شدت تیز عمل تصویر کشی میں کیسی بلند و ارفع صلاحیت کا مالک تھا۔ ابوالفضل اور اس کے شاہی سرپرست [یعنی اکبر] نے اسے جو بلند مرتبہ دیا تھا اس کا جواز اس کے فن کے ان قلیل نمونوں سے ملتا ہے جو محفوظ رہ گئے ہیں۔

مآخذ: متن میں مذکور حوالہ جات کے علاوہ

- (۱) *The Loves of Krishna* : W. G. Archer، لندن
- (۲) وہی مصنف: *Indian Miniatures*، لوحہ ۱: ۱۹۵۷ء، گرینوچ (ریاستہائے متحدہ امریکہ) ۱۹۶۰ء، لوحہ ۲۰:
- (۳) *Islamic Art*، مطبوعہ کلیولینڈ میوزیم آو آرٹ، کلیولینڈ ۱۹۴۴ء، لوحہ ۲۵: Ernst Kuhnel (۴)
- Miniaturmalerei im Islamischen Orient*، برلن ۱۹۲۲ء، لوحہ ۱۰۸: Ph. W. Schulz (۵)
- Persisch-islamische Miniaturmalerei*، لائپزگ ۱۹۱۳ء، ج ۲، لوحہ ۱۹۳: Wilhelm Staude (۶)
- Basawan*، در *The Encyclopaedia of World Art*، نیویارک ۱۹۶۰ء، جلد ۲: Ivan Stchoukine (۷)
- La Peinture Indienne*، پیرس ۱۹۲۹ء، لوحہ ۱۷: (۸)
- Akbar's Religious Thought Reflected in Mogul Painting*، لندن ۱۹۵۲ء، الواح ۹، ۱۰، ۱۱، ۱۲ (لوہہ ۳۵ در حقیقت دولت کی تخلیق ہے)۔

(STUART C. WELCH)

بسنبرائے: بن ہری گربہ داس کایستہ، جسے ”گرکارنی“ بھی کہتے ہیں، ایک ہندو مصنف جو فارسی میں لکھتا تھا۔ سنسکرت میں اس کے نام کا صحیح تلفظ وشورائے (”دنیا کا راجہ“) خلف ہری گربہ [کذا، گربہ؟] داس (خدا کا غلام) ہے۔ وہ ایک خاصے معروف کایستہ خاندان سے تھا، جو اپنی ایرانی طرز زندگی کے لیے خاص طور پر مشہور ہوا۔ اس کے لقب ”گرکارنی“ کے معنی ہیں ”وہ شخص جس کے کان اتنے بڑے ہوں جتنے کہ ہاتھ“ اس نے اپنے پیشروؤں کے کام سے استفادہ کرتے ہوئے ۱۰۶۱ھ/۱۶۵۰ء تا ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۱ء میں شاہجہان کے عہد حکومت میں سنسکرت کی ایک داستان وکرم چرترم کا ترجمہ فارسی میں کیا (سنسکرت کی اصلی تصنیف کا نام بھی وکرم چرترم ہے یعنی وکرم کی زندگی، جس سے مراد ہے راجا وکرم اڈتھ جس کے عہد حکومت میں بگرمی سمت شروع ہوا، جو اب ۲۰۱۵ برس کو پہنچ گیا ہے)۔ یہ ترجمہ سنگھاسن بتیسی (سنسکرت سنگھاسن بتیسی ”تخت شیر کی بتیس کہانیاں“) کے نام سے بھی معروف ہے اور Lescallier نے اس کا ترجمہ فرانسیسی میں کیا ہے (Le Trone enchanté، نیویارک ۱۸۱۷ء)۔ اس سنسکرت کہانی کے مختلف نسخوں اور فارسی ترجموں کے لیے دیکھیے وہ تصانیف جو نیچے مذکور ہیں۔

مآخذ: (۱) Ethé، *Grundriss der Iranischen*

*Philologie*، ۲: ۳۰۳: Rieu (۲) *Cat. Pers. MSS.*

*Brit. Museum*، ۲: ۷۶۳: بعد: (۳) Pertsch

*Cat. Berlin*، ص ۱۰۳۴ بعد۔

(سعید نفیسی)

بست: (فارسی) حرم، مامن ایک اصطلاح، جو بعض ایسے مقامات کے لیے استعمال کی جاتی تھی جہاں کسی مجرم کو واجب الاحترام

پناہ مل سکے خواہ اس کا جرم کتنا ہی سنگین ہو؛ مجرم ایک دفعہ "ہست" کی پناہ میں آجاتا تو پھر تعاقب کرنے والوں کے ساتھ گفت و شنید کر کے زرِ فدیہ طے کرنے کا مجاز تھا اور یوں "ہست" سے نکلنے کے بعد وہ اپنی جان کی سلامتی خرید سکتا تھا۔ ایران میں "ہست" کا تصور بالخصوص ان مقامات سے وابستہ تھا : (۱) مساجد اور دوسری متبرک عمارات، بالخصوص اولیائے کرام کے مزار (مثلاً کہا جاتا ہے کہ ۵۸۰۶ھ / ۱۳۰۴ء میں تیمور نے آردبیل میں شیخ صفی الدین کے مزار کو، جو صفوی سلسلے کا بانی تھا، "ہست" کی حیثیت سے تسلیم کر لیا تھا)؛ (۲) شاہی اصطبل اور اس کے گھوڑے (مجرم گھوڑے کے سر یا دم کے پاس کھڑا ہو کر جان کی امان طلب کر سکتا تھا)؛ (۳) توپ خانے کے قریب کی جگہ خصوصاً تہران کا "میدان توپ خانہ"۔ شاردان Chardin کے بیان کے مطابق، آخری صفویوں کے عہد میں شاہی باورچی خانے (مطبخ) اور اصفہان میں عالی قابو کے محل کا دروازہ بھی "ہست" تسلیم ہوتا تھا۔ میلکم Malcolm کا کہنا ہے کہ مجتہدین کی اقامت گاہیں بھی بالعموم "ہست" متصور ہوتی تھیں، اور ایک خاص مشہور و معروف مجتہد کا مکان تو اس کی موت کے بعد بھی "ہست" تسلیم کیا جاتا رہا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب تار برقی مواصلات کا نظام جاری ہوا تو شروع میں تار گھروں کو بھی "ہست" کا درجہ دیا گیا تھا۔ ۱۸۸۹ء کے لگ بھگ ناصرالدین شاہ نے "ہست" کا دستور ختم کر دینا چاہا مگر اسے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ (ناصرالدین شاہ [قاچار] نے ۱۸۹۱ء میں شاہ عبدالعظیم کے "ہست" کی جو بے حرمتی کی اس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے مادہ جمال الدین افغانی)

موجودہ صدی میں ان واقعات کے دوران میں جنہوں نے ۱۹۰۶ء میں مظفرالدین شاہ [قاچار] کو مجبور کر دیا کہ وہ ملک کو دستورِ اساسی عطا کرے تو "ہست" کے دستور نے (جسے تحصن بھی کہتے ہیں) بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی۔ دسمبر ۱۹۰۵ء میں سوداگروں، علما اور طلباء کے ایک گروہ نے شاہ کو اپنی شکایات سننے پر مجبور کرنے کے لیے پہلے تو تہران کی مسجد جامع میں پناہ لی اور پھر اس مقدس جگہ سے جبراً نکالے جانے پر شاہ عبدالعظیم کی خانقاہ میں جو تہران سے جنوب و جنوب مشرق کی سمت میں چھ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ایک ماہ بعد شاہ کی طرف سے کچھ وعدوں اور یقین دہانیوں کے بعد یہ ہستی خانقاہ سے نکل آئے۔ دوسرا "ہست" (جولائی ۱۹۰۶ء) میں پیش آیا، جب علما، تاجروں اور تجارتی انجمنوں کے ارکان کی سرکردگی میں کوئی بارہ ہزار آدمیوں نے تہران میں برطانوی سفارت خانے کے باغ میں پناہ لی اور آخر کار (اگست ۱۹۰۶ء میں) وہ لوگ شاہ سے دستورِ اساسی کے عطا کرنے کا وعدہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ ملی مجلس شوریٰ کے ارکان کے انتخابات کے سلسلے میں، جس کا پہلا اجلاس ۱ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ہوا، جو فسادات رونما ہوئے ان کے دوران میں آئین پسندوں نے ایک بار پھر برطانوی سفارت خانے میں پناہ لی؛ صوبوں میں بھی آئین پسندوں نے برطانوی سفارت خانوں (بالخصوص تبریز اور کرمان شاہ کے) اور تار گھروں کو "ہست" کے طور پر استعمال کیا۔ [اسی طرح] جون ۱۹۰۷ء میں دستور کے مخالفین نے لوگوں کو آئینی تحریک کے خلاف مشتعل کرنے کی ناکام کوشش میں شاہ عبدالعظیم کی خانقاہ ہی کو "ہست" بنایا تھا۔

مآخذ : Sir John Chardin : Voyages du



شاہراہ پر یہ ایک منزل کا کام دیتا تھا اور عین اسی جگہ واقع تھا جہاں دریا، زرنج کی جانب بہتے ہوئے جہازرانی کے قابل ہو جاتا ہے اور جہاں کشتیوں کا ایک پل بنا ہوا تھا۔ پہلی صدیوں کے عرب جغرافیہ نویس جہاں اس کی اس بنا پر مذمت کرتے ہیں کہ یہاں اکثر وبائی بیماریاں پھیلتی رہتی تھیں وہاں وہ اس کی تجارتی اور علمی سرگرمیوں اور اس کے گرد و نواح کے علاقے کی پیداوار کا بھی ضرور ذکر کرتے ہیں، جہاں سیوہ دار درختوں، انگور کی بیلوں اور کھجور کے درختوں کی کاشت ہوتی تھی۔

غالباً یہ خوشحالی قدیم تر زمانے سے چلی آتی ہو گی لیکن ہست کی ترقی کے ابتدائی مراحل کے بارے میں ٹھیک ٹھیک معلومات مفقود ہیں۔ پارٹیوں (Parthians = اشکانیوں) کے زمانے میں اس کے وجود کی تصدیق ہوتی ہے البتہ اس کا پتا نہیں چلتا کہ جب صوبہ سیستان کے لیے ساسانی فرمانرواؤں اور زابلستان کے Chionite-Hephtalite (چینی یفتلیوں کی نسل کے) حکمرانوں کے درمیان لڑائی ہوتی رہتی تھی تو اس صوبے میں ہست کا کیا مقام تھا۔

اسی طرح ہست کی تاریخ اس زمانے سے بھی کچھ الجھی ہوئی ہے جب شاید ۵۲۹/۶۴۹ - ۶۵۰ء یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں یا اغلب یہ ہے کہ ۵۴۲/۶۶۲ء یعنی عہد بنی امیہ کے آغاز میں اسے عبدالرحمن بن سمرہ [رک باں] نے اسلامی سلطنت میں شامل کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عربوں کی ابتدائی مہموں کی نوعیت ایسی تھی جن سے کوئی مستقل نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا تھا چنانچہ اس علاقے [کے حکمرانوں کی عہد شکنی کے باعث کئی مرتبہ اس کو اسلامی سلطنت میں شامل کیا گیا، دیدھیہ البلاذری: فتوح]۔

*Chevalier Chardin en Perse et autres lieux de l'Orient* (طبع Langlès)، پیرس ۱۸۱۱ء، ۷: ۳۶۹ تا ۳۷۰؛ *History of Persia: Sir John Malcolm* (۲)؛ لندن ۱۸۱۰ء، ۲: ۳۳۳ تا ۳۳۴؛ *G.N. Curzon* (۳)؛ لندن ۱۸۹۲ء، ۱: ۱۵۴ تا ۱۵۵، ۱۵۵، ۱۵۷، ۳۳۷؛ *E.G. Browne* (۴)؛ لندن ۱۹۱۰ء، ۱۱۲ بعد؛ *V.Minorsky* (۵)؛ تذکرۃ الملوک، لندن ۱۹۴۳ء، ص ۱۸۹ تا ۱۹۰؛ (۶) مہدی ملک زادہ؛ تاریخ انقلاب مشروطیت ایران، تہران ۱۳۲۹ھ / ۱۹۵۱ء، ۲: ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳، ۱۵۵۴، ۱۵۵۵، ۱۵۵۶، ۱۵۵۷، ۱۵۵۸، ۱۵۵۹، ۱۵۶۰، ۱۵۶۱، ۱۵۶۲، ۱۵۶۳، ۱۵۶۴، ۱۵۶۵، ۱۵۶۶، ۱۵۶۷، ۱۵۶۸، ۱۵۶۹، ۱۵۷۰، ۱۵۷۱، ۱۵۷۲، ۱۵۷۳، ۱۵۷۴، ۱۵۷۵، ۱۵۷۶، ۱۵۷۷، ۱۵۷۸، ۱۵۷۹، ۱۵۸۰، ۱۵۸۱، ۱۵۸۲، ۱۵۸۳، ۱۵۸۴، ۱۵۸۵، ۱۵۸۶، ۱۵۸۷، ۱۵۸۸، ۱۵۸۹، ۱۵۹۰، ۱۵۹۱، ۱۵۹۲، ۱۵۹۳، ۱۵۹۴، ۱۵۹۵، ۱۵۹۶، ۱۵۹۷، ۱۵۹۸، ۱۵۹۹، ۱۶۰۰، ۱۶۰۱، ۱۶۰۲، ۱۶۰۳، ۱۶۰۴، ۱۶۰۵، ۱۶۰۶، ۱۶۰۷، ۱۶۰۸، ۱۶۰۹، ۱۶۱۰، ۱۶۱۱، ۱۶۱۲، ۱۶۱۳، ۱۶۱۴، ۱۶۱۵، ۱۶۱۶، ۱۶۱۷، ۱۶۱۸، ۱۶۱۹، ۱۶۲۰، ۱۶۲۱، ۱۶۲۲، ۱۶۲۳، ۱۶۲۴، ۱۶۲۵، ۱۶۲۶، ۱۶۲۷، ۱۶۲۸، ۱۶۲۹، ۱۶۳۰، ۱۶۳۱، ۱۶۳۲، ۱۶۳۳، ۱۶۳۴، ۱۶۳۵، ۱۶۳۶، ۱۶۳۷، ۱۶۳۸، ۱۶۳۹، ۱۶۴۰، ۱۶۴۱، ۱۶۴۲، ۱۶۴۳، ۱۶۴۴، ۱۶۴۵، ۱۶۴۶، ۱۶۴۷، ۱۶۴۸، ۱۶۴۹، ۱۶۵۰، ۱۶۵۱، ۱۶۵۲، ۱۶۵۳، ۱۶۵۴، ۱۶۵

مشرقی پڑوسیوں کے خلاف اس کی مہمات اور اس علاقے میں اس کے دوروں کے سلسلے میں ہست کا ذکر تاریخ سیستان میں چند بار آیا ہے۔ جب سامانیوں کا زمانہ آیا تو انہوں نے بھی یہاں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی۔ مختلف مناقشوں اور ان کے سلسلے میں عسکری مہمات نے ہست کے باشندوں کو دربار خراسان، نیز خلفائے بغداد کی جانب سے آئے ہوئے سفیروں کا مخالف بنا دیا۔ لیکن درحقیقت اپنی تقریباً ایک صدی تک کی انتہائی شاندار ترقی کے لیے ہست غزنویوں کا مرہون منت ہے جب اسے سبکتگین نے ۵۳۶۶/۶۹۷۶ء میں فتح کیا اور صوبہ زرنج سے علیحدہ کر دیا۔ ہست شاہان غزنہ کا ضمنی محل اقامت رہا۔ انہوں نے یہاں ایک مستقل چھاؤنی (العسکر) قائم کر رکھی تھی، جس کا المقدسی نے ذکر کیا ہے، اور البیہقی بیان کرتا ہے کہ ہست میں کسی بادشاہ مثلاً ۵۴۲۸/۱۳۰۶ء میں مسعود اول، کے ورود پر کیسی کچھ گہما گہمی پیدا ہو جاتی تھی۔ سفیروں کو شرف باریابی بخشا جاتا، شکار کھیلا جاتا اور دریاے ہلمند کے کنارے مجالس طرب آراستہ ہوتیں۔ یہیں غزنوی فرمانرو عبدالرشید کی فوجوں نے ۵۴۴۱/۱۰۴۹ - ۱۰۵۰ء میں سلاجقہ کی پیش قدمی کو کامیابی سے روکا، جنہیں اس سے پہلے بھی علاقہ مذکور کو فتح کرنے کی کوششوں میں متعدد بار ہزیمت اٹھانا پڑی تھی؛ لیکن ۵۵۴۴/۱۱۴۹ء میں علاء الدین غوری کے ہاتھوں غزنہ کی غارت گری کے کچھ ہی عرصے بعد ہست بھی فتح ہو گیا، اسے لوٹا گیا اور شاہی محل نذر آتش کر دیے گئے اور یوں اس شہر کے زوال کا آغاز ہو گیا، جس کی صدائے باز گشت اس زمانے کے جغرافیہ نویس یا قوت [کی معجم البلدان] کے صفحات میں سنائی دیتی ہے۔

پہلی صدی / ساتویں صدی کے نصف آخر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہست کو اسلامی مقبوضات کی ایک ایسی سرحدی چوکی کی حیثیت حاصل ہو گئی جو مشرق کے متصلہ ممالک کے ان مقامی خود مختار حکمرانوں کے مقابلے کے لیے قائم کی گئی تھی جن کا لقب "زنبیل" [رتیل؟] تھا (R. Hartman ہارتمان)۔ قدیم ماخذ میں اس کے قرب و جوار میں ان موقعوں پر جنگی معرکوں کا ذکر ملتا ہے جب کہ اموی اور شروع کے عباسی خلفا نے سجستان کی مقامی بغاوتوں کو کچلنے یا خوارج کے فتنہ و فساد کو (جن پر تاریخ سیستان میں بڑا زور دیا گیا ہے) فرو کرنے کی غرض سے اپنے والی بھیجے، نیز حکم دیا کہ کابلستان کے فرمانروا سے جنگ یا گفت و شنید کی جائے۔ اس سلسلے میں ابن الأشعث [رک بان] کی بغاوت کے حالات خاص طور سے ملتے ہیں، جو ہست میں واقع ہوئی اور جسے کچھ مدت بعد معن بن زائدة الشیبانی نے، اسی مقام پر ۵۱۵۶/۷۷۳ء میں اپنی شہادت سے قبل فرو کیا۔ اگرچہ الیعقوبی اس زمانے میں ہست کی مقامی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ صوبے کا سب سے بڑا شہر اور خوشحالی میں خراسان کا مد مقابل تھا اور اگرچہ ہم یہ بھی تصور کر سکتے ہیں کہ ان دنوں اس کا قلعہ عسکری نقطہ نظر سے کس قدر اہمیت کا حامل تھا، پھر بھی ہمیں اس شہر کے نظم و نسق کے بارے میں کسی قسم کی تفصیلات دستیاب نہیں ہوتیں، حالانکہ وہ بظاہر ان دنوں، بالخصوص سیاسی لحاظ سے پر آشوب ادوار میں، ایران اور وسط ایشیا کے دوسرے مقامات کی طرح نسبتاً خود مختار تھا۔

آگے چل کر یعقوب بن اللیث الصفاری نے ۵۲۵۷/۸۷۱ء میں کابل پر قابض ہونے کے بعد اپنی مملکت کو ہست تک پھیلا لیا، چنانچہ اپنے



اب تک دریافت نہیں ہوا تھا اور سابقہ تفتیش کرنے والوں نے شاید ہی اس کا ذکر کیا تھا۔ یہاں کھنڈروں کا ایک میدان سات کیلومیٹر لمبا اور بعض مقامات پر دو کیلومیٹر چوڑا ہے۔ پہلے اس کے صرف جنوبی سرے ہی پر توجہ کی گئی تھی اب ان کھنڈروں کے شمال میں فصیل شہر اور اس کے قلعے کے آثار اور ”قوس بست“ کا بلند یک رخنی منظر نیز خود قصر شاہی اور اس جگہ کی دریافت عمل میں آ گئی ہے جسے عرب مصنفین ’العسکر‘ اور فارسی کتابوں کے لکھنے والے ’لشکر گاہ‘ کے نام سے یاد کرتے رہے ہیں۔ اس کے تین یادگار محل۔ جن کے گرد کسی زمانے میں باغ تھے اور جن کے آثار آج بھی بلند فصیلوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ اور شہر کی معتدل آب و ہوا غزنویوں کے اس ثانوی دارالحکومت کی دل کشی کا اصل سبب تھے۔ یہ محل ”شاہی شہر“ کے احاطے کے اندر بنے ہوئے ہیں اور ان میں خاص طور پر جنوبی قصر متعدد کھدائیوں کی وجہ سے اب قریب قریب بالکل صاف کر لیا گیا ہے۔ اس قصر کے سامنے ایک وسیع ہموار میدان ہے جس میں ایک بڑی مسجد کا دروازہ کھلتا ہے۔ اس قصر تک نصف کیلومیٹر لمبی ایک سڑک گئی ہے، جس کے دونوں طرف ستون دار برآمدوں کے پیچھے، دکانوں کی قطاریں ہیں۔ قصر میں ایک مرکزی صحن کے گرد چار ایوان اور ”بیوت“ کی شکل میں کمروں کے مجموعے ہیں۔ ان میں سے بعض کمرے زیادہ وسیع اور پر تکلف بنے ہوئے ہیں۔ اس کھدائی سے محض عمارت کے نقشے کی مخصوص تفصیلات ہی منظر عام پر نہیں آئیں بلکہ بلند تر حصوں کے گرنے سے مٹی کے جو ڈھیر لگے ہوئے تھے (عمارت زیادہ تر ناہموار اینٹوں کی بنی ہوئی ہے) ان کے اور دو متواتر آتش زدگیوں کے باوجود جن کے

بہر بھی اس زمانے میں بست پوری طرح برباد نہیں ہوا تھا۔ غزنویوں کے پرانے محلات کی جلد ہی مرمت ہو گئی اور اس علاقے میں غوریوں کے مقرر کردہ والیوں اور آگے چل کر خوارزم شاہی والیوں نے انہیں نئے سرے سے آباد کر دیا۔ شہر کے لیے مختلف معرکے اور لڑائیاں ہوئیں مگر اس دوران میں اس کا وجود بدستور قائم رہا۔ دوسری چیزوں کے علاوہ اس بات کی تصدیق سب سے زیادہ یہاں کی قبور کے تعویذوں سے ہوتی ہے جنہیں بڑی خوبصورتی سے بنایا گیا ہے اور جو چھٹی صدی/ بارہویں صدی سے لے کر ساتویں صدی/ تیرہویں صدی کے نصف اول تک کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر اہم لوگوں کے القاب کندہ ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ بیک وقت ایسے دینی اور دنیوی اقتدار کے مالک تھے جو خالصاً مقامی نوعیت کا تھا۔ بہر حال ۵۶۱۸/۱۱۲۲ء کے قریب مغول کے حملے اور آٹھویں صدی / چودھویں صدی کے آخر میں تیمور کے لشکروں کے گزرنے کے سلسلے میں جو تباہی مچی اس نے بست کو بالآخر بالکل اجاڑ دیا اور اس کی مزروعہ اراضی کو صحرائی چراگاہوں میں تبدیل کر دیا۔ صرف اس کا قلعہ باقی بچا جو ایران کے خلاف ہندوستان کے سلاطین مغلیہ کی جنگوں کے دوران میں کام آتا رہا اور اس زمانے میں اس کی عمارت میں رد و بدل بھی عمل میں آیا جو ابھی تک نمایاں ہے تا آنکہ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے اس کے برج و بارہ کو تڑوا دیا۔

بست کی تاریخ سے متعلق اب بعض حقائق منظر عام پر آئے ہیں بالخصوص جب سے Schlumberger نے اکتشافات کیے اور آثار قدیمہ کے فرانسیسی وفد نے افغانستان میں جا کر قدیم عمارتوں کے ایک ایسے مجموعے کا بڑی احتیاط سے معائنہ کیا جو

آثار عمارت میں ابھی تک نمایاں ہیں، اس کی بیرونی اور بالخصوص اندرونی آرائش کے اہم عناصر کا پتا چلانا بھی ممکن ہو گیا ہے۔ اس آرائش کے نیچے ننگی اینٹیں ہیں، مٹی یا پلستر میں ابھرے ہوئے نقوش اور دیواری رنگین تصویروں ہیں جن میں سے ایک میں آدمی دکھائے گئے ہیں۔ آثار قدیمہ کی ان مرتسم شہادتوں کا بعض دوسری تعمیرات سے موازنہ کرنے سے مفید نتائج نکل سکتے ہیں۔ مثلاً ازمنہ وسطیٰ کے ایران کی شہری تعمیرات کے اس عظیم المثل نمونے کا بغداد اور سامرا کی ان عمارتوں سے مقابلہ جو عباسی خلفا کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں۔ الغرض لشکر بازار کے کھنڈروں سے پانچویں صدی / گیارہویں اور ساتویں صدی / تیرہویں صدی کے درمیانی زمانے میں بست اور اس کے 'شاہی مضافات' کی شان و شوکت سے متعلق جو ناقابل تردید شہادت ملتی ہے وہ ایک دور افتادہ صوبے میں فن اسلامی کے مؤرخ کے لیے بڑے فکر افروز درس کی حامل ہے۔

مآخذ: (۱) الإصطخري، ص ۲۴۵؛ (۲) المقدسي، ص ۳۰۴ تا ۳۰۵؛ (۳) اليعقوبي: بلدان، ص ۲۸۱، ۲۸۵ (نیز رڪ به BGA، بحد اشاريه)؛ (۴) ياقوت، ۱؛ ۶۱۲؛ (۵) حدود العالم، بحد اشاريه؛ (۶) Le Strange، ص ۳۳۳؛ (۷) Erānšahr: J. Marquart، برلن، ۱۹۰۱ء، بحد اشاريه؛ (۸) البلاذري: فتوح، ص ۳۹۴، ۳۹۶، ۳۹۹، ۴۰۱؛ (۹) العتبي: كتاب اليميني، مطبوعه لاهور، ص ۱۷ تا ۱۹، ۱۵۱ تا ۱۵۲ (تب مترجمه J Reynolds، لندن ۱۸۵۸ء، ص ۲۶ بحد، ۲۷۱ بحد)؛ (۱۰) طبقات ناصري، ترجمه Raverty، كلكته ۱۸۷۳ تا ۱۸۸۱ء، ص ۲۱، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹



کے قبض الوصول یا تنخواہ کے سیاہوں میں دو قسمیں د لہائی کئی ہیں: غلمان باغچی خاند (نجی باغات کے چھو لڑے) اور غلمان ہستانیاں (باغ کے چھو لڑے)۔ ۱۵۷۶/۵۹۸۳ء کی تنخواہ کے ایک سیاہے میں جو آدمی سلطان کے نجی باغوں میں ملازم تھے ان کے یس بلوک (bölüks) [رک باں] (حلتے) اور جو سبزی کے باغوں میں کام کرتے تھے ان کی پچیس جماعتیں درج ہیں۔ اس زمانے میں چھ سو پینتالیس ہستانجی نجی باغوں میں اور نو سو ا دھتر سبزی ترکاری کے بازوں میں کام کر رہے تھے۔ ۱۱۷۳ء / ۱۷۶۰ء اور ۱۱۹۲ء / ۱۷۷۸ء کے قبض الوصول سے ظاہر ہوتا ہے کہ نجی باغات میں یس بلوک تھے اور چونکہ جماعتیں باہر کے پھولوں اور سبزی کے باغوں میں کام کرتی تھیں۔ ہستانجیوں کو ان مقامات کے امن و انتظام سے بھی تعلق تھا جہاں کے باغوں میں وہ کام کرتے تھے۔ ہر ایک ضلع میں ان کی ایک جماعت ہوتی تھی جس کے سردار کو آستا (= استاد) کہتے تھے۔ یہ آستا ضلع کے حکام پولیس کے سے فرائض انجام دیتے تھے۔ جو آستا ہستانجیوں کے اوجاق کے چار بالطہ جی (Baltadjis) [رک باں] میں سے مقرر کیے جاتے تھے۔ آستا کدی کویو یا آستابیک سے مراد ان باغوں کے آستا ہیں جو ان ضلعوں میں واقع تھے۔ ہر آستا کے عملے میں یس سے تیس تک ہستانجی ہوتے تھے اور ان کی تعداد ضلع کی حیثیت پر موقوف تھی۔ کشتی ڈھوں اور ٹھینے والی کشتیوں کے ہستانجی اس خدمت کے لیے خاص طور پر چنے جاتے تھے اور سلطان کی چوبیس چپو والی خاص کشتی کے ملاح حملگی ہاشی (صدر ملاح) کے ماتحت کشتی چلاتے تھے۔ Thevenot کہتا ہے جب کبھی سلطان کوئی بحری سفر یا دورہ کرنا چاہتا تھا تو عموماً عجمی اعلان، دائیں طرف کے چپوں پر اور ترکی لڑکے

اور ان کا سردار ہستانجی ہاشی ہوتا تھا۔ ہستانجی کے دو اوجاقوں میں، زبردستی بھرتی کیے ہوئے لوگوں میں صرف وہ قبول کیے جاتے جو سب سے زیادہ قوی اور جاندار ہوتے تھے، خواہ براہ راست بھرتی ہوں یا عجمی اعلان [رک باں] کے گروہ سے لیے جائیں۔ ہستانجیوں کے گروہ میں نو مدارج ہوتے تھے۔ نئے بھرتی کیے ہوئے جوان اپنی عمر کے گرد ایک ہٹکا باندھتے جو ان کی سرکاری وردی کے حاشیے (یلکے) سے بنا ہوتا تھا مگر جو سب سے اونچے درجے کے ہستانجی ہوتے تھے وہ ایک سبز پٹی لگاتے تھے جو "مقدم" کہلاتی تھی۔ جب ہستانجیوں کی معینہ مدت خدمت پوری ہو جاتی تھی تو انہیں کو ترقی دے کر نئی چربیوں کے اوجاق میں داخل کر دیا جاتا تھا۔ ہر شخص کو ترقی کے وقت ایک ہزار آچہ ضروری سامان کی تیاری کے لیے ملتے تھے۔ سترھویں صدی کے اواخر اور اٹھارھویں صدی میں ایسی صورتیں بھی پیش آئیں کہ ہستانجیوں کو قبی قلم کے سواروں کے اوجاق (لشکر) میں لیا گیا۔ ان سے شاہی محل کے اندر اور باہر دونوں جگہ کام لیا جاتا تھا۔ کچھ براہ راست پھولوں اور سبزیوں کے باغات، کشتی گاہوں یا ان سے متعلقہ امور میں مشغول تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن سے سلطان کی جاگیروں میں کام لیا جاتا، مثلاً اماسیہ، منسہ، برسہ اور ازبید [= ازقمید، تو میدیہ، ازمیت] میں، علاوہ ان خدمات کے جن کا اوپر ذکر ہوا، استانبول کے ہستانجیوں کو کچھ اور خدمات بھی سپرد کی جاتی تھیں، جیسے محل سلطانی کی چوکیداری، سلطانی محلوں اور مسجدوں کے لیے سامان تعمیر لانا اور لے جانا اور ان کشتیوں میں کام کرنا جن میں اطراف ازبید سے شہر لائے جاتے تھے (۷ قانون نامہ آل عثمان، طبع عارف بے، در TOEM، ضمیمہ ۲: ۲۵)۔ ہستانجیوں

نجی باغوں میں ان کے دس بلوک کام کرتے تھے اور یہ ان کے علاوہ تھے جو دوسرے تین باغوں میں ملازم تھے۔ بستانجی سر پر ٹوپ اوڑھا کرتے تھے، جسے برتہ کہتے تھے۔ ان میں وہ جو اصل میں دیو شرمی (جبریہ بھرتی کیے ہوئے) میں سے لیے جاتے تھے ناکدخدا ہوتے تھے۔ آگے چل کر شادی کی اجازت ہو گئی تھی۔ اپنے سرداروں یا بستانجی باشیوں کے علاوہ ان کے دوسرے عامل بھی ہوتے تھے جو ان کے کدخدا، خاصکی آغا، حملجی، قراقلق، بش تبدیل اور ادا باشی کہلاتے تھے۔ اوجاق کے چار قدیم الخدمت افراد ”بالطہ جی“ کہلاتے تھے۔ کبھی کبھی بستانجیوں نے فوجی شورشوں میں بھی حصہ لیا، اس لیے سلطان کو ان پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ اسی بنا پر احمد ثالث نے مجبور ہو کر ان کے درمیان کچھ تبدیلیاں کیں۔ سلیم ثالث کے قاتلوں میں ایک بستانجی شامل تھا، جسے ”دلی“ (Deli = دل چلاہ مصطفیٰ) کہتے تھے۔ بستانجی فوج کی نئی انتظامی تدابیر کے بھی خلاف تھے جنہیں نظام جدید اور سگبان جدید کہا جاتا تھا۔ جب یمنی چریوں کا لشکر موقوف کر دیا گیا اور نئی عثمانی فوج (عسا کر منصورہ) کی تنظیم میں توسیع ہوئی تو اس فوج نے ضلعوں کا انتظامی کام، جو پہلے بستانجیوں کے سپرد تھا، سنبھال لیا اور بستانجیوں کا کام اب صرف باغبانی اور رات کا چوکیدارہ رہ گیا۔ محرم ۱۲۴۲ھ / اگست ۱۸۲۶ء سے بستانجی نئی تنظیم میں داخل کر لیے گئے۔ جدید قانون کی رو سے ایک ہزار پانچ سو آدمی بستانجیوں میں سے انتخاب کر کے ایک بن باشی (= میجر) کے ماتحت رکھے گئے۔ انہیں قصر شاہی اور اس کے اطراف (اور تانکوں اور دلما باغچہ) کی حفاظت کا کام سونپ دیا گیا۔ اسی گروہ سے

بائیں طرف کے چپوؤں پر ماسور ہوتے تھے۔ بستانجی جن پھولوں اور سبزیوں کے باغوں کا انتظام کرتے تھے ان کا حساب ہر سال نومبر میں سلطان کے سامنے بستانجی باشی کے ذریعے سے پیش ہوتا تھا اور ان کی آمدنی سلطان کے ذاتی خزانے میں داخل کی جاتی تھی۔ اس رقم میں سے ایک تھیلی (پانچ سو پیاسٹر کی) بستانجیوں کو عطا کی جاتی اور ایک تھیلی داؤد پاشا کی مسجد کے ’وقف‘ میں شامل ہو جاتی تھی۔ اس طریقے سے جب مالی حساب پیش ہوتا تھا تو سب سے زیادہ قدیم الخدمت بارہ بستانجیوں کو تاحیات حق ملکیت کی بنا پر جائداد عطا کی جاتی تھی اور انہیں ترقی دے کر ”قی قلس“ کے سواروں کے اوجاق یا متفرقہ [رک باں] کی صف میں داخل کر دیا جاتا تھا۔

جب کبھی موقع آ پڑتا تھا بستانجیوں کو جنگی مہمات میں بھی بھیج دیا جاتا تھا؛ مثلاً ۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء میں تین ہزار بستانجی جہاز پر سوار کرا کے روسیوں کے خلاف لڑنے کے لیے ”بندر“ Bender بھیجے گئے (دیکھیے صبحی: تاریخ، ص ۱۲۷)۔

بستانجیوں کی تعداد وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھی۔ سولہویں صدی کے شروع میں تین ہزار تین سو چھیانوے، وسط صدی میں دو ہزار نو سو سینتالیس اور صدی کے آخر میں ایک ہزار نو سو اٹھانوے تھی۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں دو ہزار چار سو بستانجی تھے۔

ادرنہ کے بستانجیوں کے جداگانہ اوجاق کی اپنی الگ تنظیم تھی۔ اس کی تعداد استانبول کے اوجاق والوں سے بہت کم تھی: سترھویں صدی کے شروع میں چار سو پینتالیس، صدی کے آخر میں سات سو اکاون اور اٹھارہویں صدی کے شروع میں بھی اتنے ہی تھے۔ ادرنہ میں سلطان کے



اوجاق [رک باں، در لڈ، لائن، باردوم] کا افسرِ اعلیٰ۔ اس کی جمعیت متعدد طبقوں کے بستانجیوں پر مشتمل تھی۔ یالی کوشک [رک بہ استانبول] اس کی قیام گاہ تھی، جو استانبول میں راس سراجلیو (Seraglio Point) پر واقع تھی۔ چونکہ اس کے ذمے شاخ زریں، بحیرہ مارمورا اور باسفورس کے سواحل کا انتظام تھا اس لیے وہ ایک کشتی میں اپنے تیس آدمیوں کے ہمراہ ان سواحل کی گشت کرتا اور استانبول کے نواحی دیہات اور جنگلات کا بھی معائنہ کرتا رہتا تھا۔ جب سلطان چپوؤں والی کشتی میں سفر کرتا تو پتوار پکڑنے کا اعزاز بستانجی باشی کو حاصل ہوتا تھا (قانون نامہ آل عثمان، در TOEM، ضمیمہ ۲ : ۲۴)۔ اسی کی بدولت اسے سلطان سے تنہائی میں بات چیت کرنے کا موقع مل جاتا تھا اور وہ سلطان کو حسب دلخواہ جھوٹی سچی خبریں سنا سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام عمائدین سلطنت منجملہ صدر اعظم، اپنا بھلا بستانجی باشی کو خوش رکھنے ہی میں سمجھتے تھے۔ جب کبھی سلطان محل سے باہر جاتا تو بستانجی باشی اس کا بازو یا اس کی رکاب تھامنے کا مجاز ہوتا تھا۔

بستانجیوں کے اوجاق ہی کا کوئی فرد ترقی پا کر بستانجی باشی کے منصب پر فائز ہوتا تھا اور اوجاق والے ایسا کبھی نہ ہونے دیتے کہ کوئی باہر والا یہ عہدہ حاصل کرے، خواہ وہ ادرنہ کے اوجاق کا رکن ہی کیوں نہ ہو۔ ۱۰۷۲ھ / ۱۶۶۱ء میں، جبکہ فاضل احمد پاشا کا دور وزارت تھا، ایک بار سلطان محمد رابع کو ادرنہ سے استانبول کی جانب سفر کرتے وقت راستے میں شکار کے لیے زیادہ جانور نہ ملے۔ غضبناک ہو کر اس نے شعبان آغا بستانجی باشی کو اس کے عہدے سے برطرف کر دیا اور اس کی جگہ ادرنہ کے بستانجی

اس محافظ فوج کی ابتدا ہوئی جسے عثمانی عہد میں خاصہ عسکری کہتے تھے۔ ان کی نگرانی کے لیے ایک وزارت قائم کی گئی جس کا نام وزارت بوستانیاں خاصہ (= سلطانی بستانجی) رکھا گیا۔ ساتھ ہی ادرنہ کے بستانجیوں کے اوجاق کو موقوف کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) ایوبی افندی: قانون نامہ (ایک نجی کتبخانے میں)؛ (۲) نعیم: تاریخ، ۴ : ۳۸۶؛ (۳) راشد: تاریخ، ۳ : ۸۵، ۸۹؛ (۴) صبغی: تاریخ، ص ۱۲۷؛ (۵) لطفی: تاریخ، ۱ : ۲۰۰؛ (۶) ایک دستاویز جس میں مصطفیٰ ثانی کا حوالہ دیا گیا ہے (باش وکالت ارشیوی، Amiri's Classification No. 14954)؛ (۷) حسب افندی، وزیر سلطانی بستانجی، بستانجی باشی اور عثمان خیری آغا، بابت تنظیم اوجاق بستانجی (باش وکالت ارشیوی)، قانون متعلق (اوجاق باش وکالت ارشیوی، cupboard عدد ۳، خانہ عدد ۹۲)؛ (۸) Artisan's Register (اہل صنعت دفتری) باش وکالت ارشیوی، در Kamil's classification؛ (۹) Hist. Générale des Turcs : Chalcondyle (پرس ۱۶۶۲ء، شعبہ متعلق تنظیم)؛ (۱۰) History of the Present state of the : Rycant Le vogage de M. d'Aramon (۱۱)؛ Ottoman Empire (طبع Schefer، پرس ۱۸۸۷ء)، ص ۳۹؛ (۱۲) A. Ollivier؛ Voyage dans l'Empire Ottoman (۱۸۰۱ء، جلد ۱، کراہ ۴)؛ (۱۳) اندرونی عطا: تاریخ، ج ۱؛ (۱۴) غلمان عجیبان معاش اجمالی (اختصارات قبض الوصول عجمی اوغلان)، (باش وکالت ارشیوی)؛ (۱۵) Relation d'un voyage fait au Levant : M. Thévenot (۱۶۶۳ء، ص ۱۱۳ وغیرہ)؛ (۱۶) Gibb-Bowen : ۱/۱، بمدد اشاریہ۔

(اسمعیل حقّی اوزون چارشیلی)

بستانجی باشی: بستانجیوں [رک باں] کے

باشی بدر سنان آغا کو دے دی۔ اس پر قدیم تجربہ کار بستانجیوں نے احتجاج کیا اور دلیل پیش کی کہ کسی اور اوجاق سے سردار مقرر کرنا معمول کے خلاف ہے (سلاح دار: تاریخ، ۱: ۲۲۳)۔

بستانجی باشی ہر موسم بہار میں استانبول کے کاغد خانہ (= یورپ کے میٹھے پانیوں) کی ضیافت، شاہانہ کے موقع پر سلطان کی تفریح و تفتن کا سامان کیا کرتے تھے (واصف: تاریخ، ۱: ۱۳)۔ بستانجی باشی کو جب کسی بیرونی عہدے پر مقرر کیا جاتا تو اسے عموماً قبوجی باشی یا سنجاق بے کا درجہ دیا جاتا۔ جس پر سلطان کی خاص نظر عنایت ہوتی تھی وہ بیگلر بے کا مرتبہ پا جاتا تھا۔ آگے چل کر قواعد تنظیم کی پابندی کم ہو گئی تو ایسی صورتیں بھی پیش آئیں کہ بستانجی باشی کا تقرر صدر اعظم کے عہدے تک ہونے لگا۔ ایسے خوش نصیبوں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں: درویش پاشا، حسن پاشا، توپل رجب پاشا، مولدوانجی علی پاشا، حافظ پاشا، اسمعیل پاشا اور عبداللہ پاشا۔

بستانجی باشی صرف بستانجیوں کے سردار ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ طوپ قبی، یالی، کوشک، سپتچہ لیر، صوغوق چشمہ، باغچہ لیر، ایشلمہ جیلر Islemecilar، بامیہ جی لیر Bamyacilar، کوش خانہ Kuşhane، گل خانہ Gülhane، انجلی Incili، طولاب دغرمان Dolap-Değirman، بالق خانہ Bali Khân، مزبلہ کشان (Mezbele-Keşan)، وغیرہ کے اوجاقوں کے نگران بھی ہوتے تھے۔ اندرونی عطا کا کہنا ہے کہ یہ ذمے داری قصر شاہی کے بعض مشغول عہدہ داروں مثلاً سلاحدار (= اسلحہ خانے کا افسر)، چغہ دار (= توشک خانے کا افسر، اور قپو آغاسی (= صدر فرنگی خواجہ سرا) اور قپوجیلر کتخداسی (شاہی پہرہ داروں کا افسر) نے

بستانجی باشی کے سپرد کر دی تھی۔ مزید برآں خاصگی، یعنی سلطان کے ذاتی حفاظتی دستے کے ارکان بھی بستانجی باشی کے ماتحت ہوتے تھے۔ بستانجی باشی کے زیر کمان اوجاقوں میں سے بالق خانہ (= مچھلی منڈی) کا اوجاق بہت بدنام تھا۔ جن وزرا یا وزراء اعظم کو جلاوطنی یا موت کی سزا دی جاتی تھی انہیں وہیں بھیجا جاتا تھا۔ اوجاق میں نظر بند وزیر اعظم کی قسمت کا فیصلہ شربت کے اس رنگ سے معلوم ہو جاتا تھا جو انہیں بستانجی باشی پیش کرتا تھا۔ سفید شربت کے معنی جلا وطنی اور سرخ شربت کے معنی موت کے ہوتے تھے۔

ب کبھی بستانجی باشی کو معزول یا تبدیل کیا جاتا تو اس کی جگہ بستانجیوں کے کدخدا (= منتظم) یا خاصگیوں کے آغا (= کماندار) کو متعین کیا جاتا تھا۔ مگر بعض اوقات اس قاعدے کو نظر انداز بھی کر دیا جاتا تھا۔ جب کسی نئے بستانجی باشی کا تقرر عمل میں آتا تو دستور تھا کہ اسے وزیر اعظم کے روبرو خلعت پہنایا جاتا (عززی: تاریخ، ص ۱۱۰)۔ استانبول میں بستانجی باشیوں کی ساحلی اقامت گاہوں کا ایک رجسٹر محفوظ ہے۔

ادرنہ کا بستانجی ادرنہ اور اس کے گرد و نواح میں نظم و ضبط کا ذمے دار تھا۔ یہ شہر سلطنت کا دوسرا صدر مقام ہونے کی وجہ سے روم ایلی کے والی کی عمل داری میں نہ تھا بلکہ اس کی حکومت براہ راست بستانجی باشی کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ اس کے قبضے میں آمدنی کے بہت سے وسائل تھے اور اسے بڑی بڑی بدعنوانیوں کے مواقع میسر تھے، مثلاً نئے بھرتی کیے ہوئے جوانوں سے روپیہ لے کر ان کے عوضی قبول کر لیے جاتے تھے۔

ماخذ: (۱) سلاح دار: تاریخ، ۱: ۲۲۳: ۲۹



۳۳۷: (۲) واصف : تاریخ، ۱ : ۱۳ : (۳) رشید : تاریخ، ۳ : ۸۹ : ۱۳۴ و ۵ : ۹۰ : (۴) رشید و چلبی، زادہ : تاریخ، ص ۶۱، ۳۷۱ : (۵) عزی : تاریخ، ص ۲۸۷، ۲۳۶ : دیگر تصانیف کے لیے دیکھیے ماخذ بذیل مادہ ہستانجی۔

(اسمعیل حتی اوزون چارشیلی)

ہستان زادہ : [ہستان زادہ] عثمانی علما کے ایک گھرانے کا نام، جس نے سولہویں صدی عیسوی کے دوران اور سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں کسی قدر ناموری حاصل کی تھی۔

(۱) مصطفیٰ بن محمد

(۳) مصطفیٰ

(۲) محمد

(۵) یحییٰ

(۴) مصطفیٰ

(۱) مصطفیٰ افندی اس گھرانے کا بانی تھا۔ وہ ولایت آیدین کے شہر تیرہ میں پیدا ہوا۔ اس کا سال پیدائش ۵۹۰ھ / ۱۳۹۸ - ۱۳۹۹ء اور عرف "ہستان" یا "ہستان" تھا؛ اس کے والد محمد کا پیشہ تجارت تھا (عطائی کی کتاب کے متن میں نیز اس کے کتبہ مزار پر، جو استانبول کے ترک اسلام عصرلری موزہ سی میں محفوظ ہے، اسی طرح لکھا ہے۔ عطائی کے ہاں جو عنوان "مصطفیٰ بن علی" دیا گیا ہے وہ بلاشبہ غلط ہے اور اس میں اس کے ہمنام مصطفیٰ المعروف بہ کوچک ہستان سے التباس ہو گیا ہے؛ عطائی، ص ۱۳۲؛ قِب Hüseyn Gazi Yurdaydin، در Bell، ۱۹ (۱۹۵۵ء) : ۱۸۹، حاشیہ ۱۳۶)۔ مصطفیٰ افندی اپنے مولد اور استانبول میں مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد برابر تعلیمی اور عدالتی خدمات پر مامور رہا اور ۵۹۵ھ / ۱۵۴۷ء میں آناطولی کا قاضی عسکر اور تھوڑے ہی دن بعد روم اہلی کا قاضی عسکر مقرر ہو گیا۔

۵۹۵۸ / ۱۵۵۱ء میں اس کی ملازمت ختم کر دی گئی، جس کا سبب یہ ہوا کہ اس نے ایک مقدمے کا فیصلہ وزیراعظم رستم پاشا کی خواہش کے خلاف کر دیا۔ اگرچہ بعد کی تحقیقات میں اسے بے قصور قرار دیا گیا، لیکن اپنے عہدے پر بحال نہ کیا گیا۔ ۲۵ رمضان ۵۹۷۷ھ / ۳ مارچ ۱۵۷۰ء کو اس نے وفات پائی (اس کے کتبہ مزار پر یہی لکھا ہے، عطائی نے تاریخ وفات ۲۷ رمضان ۵۹۷۷ھ لکھی ہے؛ عثمانی مؤلف لری میں اس کی وفات ۵۹۶۸ھ قرار دی گئی ہے)۔ تفسیر القرآن اور دینیات سے متعلق اس کی متعدد تصانیف ہیں، جن میں بعض کے قلمی نسخے استانبول کے کتب خانوں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ حال ہی میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ سلیمان نامہ، جسے فردی کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، اسی کی تصنیف ہے (Yurdaydin، در Bell، ۱۹ (۱۹۵۵ء) : ۱۳۷، بعد)۔

ماخذ : (۱) عطائی : ذیل الشقائق، ص ۱۲۹، بعد؛ (۲) Yurdaydin : کتاب مذکور، ص ۱۸۹، بعد؛ (۳) عثمانی مؤلف لری، ۱ : ۲۵۳ : (۴) سجل عثمانی، ۳ : ۳۳۶۔

(۲) ہستان زادہ محمد افندی : سابق الذکر کا فرزند، ۵۹۴۲ھ / ۱۵۳۵ - ۱۵۳۶ء میں پیدا ہوا اور اکیس ہی سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر "ملازمت" [رک باں، در لا، لاڈن، بار دوم] حاصل کر لی۔ پہلے مختلف تدریسی خدمات پر فائز رہا، پھر ۵۹۸۱ھ / ۱۵۷۳ء میں اس نے تعلیم و تدریس کو خیرباد کہا اور "علمیہ پیشے" کی عدالتی شاخ میں شامل ہو کر قاضی دمشق مقرر ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے بڑی تیزی سے ترقی کی؛ بروسد [ = برسہ، رک باں] اور ادرنہ میں قاضی رہنے کے بعد وہ ۵۹۸۴ھ / ۱۵۷۶ء میں استانبول کا قاضی، ۵۹۸۵ھ / ۱۵۷۷ء میں آناطولی کا قاضی عسکر اور

۱۵۷۲ء تا ۱۶۰۱ء/۱۶۰۱ء: صحنِ ثمان [رک بان، در اول، لائڈن، بار دوم] میں مدرس رہا اور اس کے بعد اسگدار کا قاضی ہو گیا (عطائی، ص ۴۴۹)۔

مصطفیٰ [بن محمد افندی] کا بھائی (۵) یحییٰ: (م ۱۰۴۹/۱۶۳۹ء) استانبول کا قاضی اور پھر روم ایلی کا قاضی عسکر ہو گیا۔ یحییٰ افندی علم الاخلاق پر ایک کتاب مرآة الاخلاق کا مصنف ہے، جسے اس نے سلطان احمد اول کے نام معنون کیا۔ اس نے گلِ صد برگ کے نام سے ایک کتاب معجزات النبیؐ پر بھی لکھی تھی (عثمانی مؤلفی، ۱: ۲۷؛ سچل عثمانی، ۴: ۶۳۶؛ Hammer-Purgstall، بمدد اشاریہ۔

(B. Lewis)

البستانی: مارونی فرقے کا ایک خاندان، جو لبنان میں اقامت پذیر ہوا اور جس نے اپنے ادبی کارناموں کی بدولت غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اس خاندان نے بعض معروف شخصیتیں پیدا کیں: (۱) اس خاندان کا ایک فرد پطرس [بن پولوس بن عبد اللہ] البستانی ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۹ء میں بیروت کے قریب موضع الدیہ میں پیدا ہوا [اور ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۳ء میں فوت ہوا]؛ ابتدائی تعلیم اس نے عین ورقہ کے مسیحی مدرسے (مدرسة المعلمین) میں پائی لیکن ۱۸۴۰ء میں بیروت کے امریکن مشنری ہائی سکول میں داخل ہو کر پروٹسٹنٹ مذہب اختیار کر لیا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد [۱۸۶۰ء میں] وہ عیہ میں عربی کا استاد مقرر ہو گیا۔ یہاں اپنے دو سالہ قیام کے دوران میں اس نے حساب پر ایک رسالہ بعنوان کشف الحجاب [فی علم الحساب] شائع کیا۔ بعد ازاں وہ بیروت چلا آیا جہاں پروٹسٹنٹ مشن کی فرمائش پر اس نے انجیل کا [عبرانی سے] عربی میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔ اسی دوران میں اس نے محیط المحيط [۱۸۶۷ء تا

۱۵۸۸ھ/۱۵۸۰ء میں روم ایلی کا قاضی عسکر ہو گیا۔ اگلے سال اسے ملازمت سے الگ کر دیا گیا تھا، لیکن ۱۵۹۱ھ/۱۵۸۳ء میں اسے قاضی بنا کر مصر بھیجا گیا۔ تین سال تک وہ وہیں رہا۔ ۱۵۹۵ھ/۱۵۸۷ء میں وہ دوبارہ قاضی عسکر مقرر ہوا اور ۱۵۹۷ھ/۱۵۸۹ء میں شیخ الاسلام کے مرتبے پر فائز ہوا۔ ۱۵۹۲ھ/۱۶۰۰ء میں اسے ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا (اس سے متعلقہ حالات کے لیے دیکھیں نعیم، بذیل ۱۰۰۰ھ)، مگر بعد ازاں روم ایلی کے قاضی عسکر کی حیثیت سے دوبارہ ملازمت میں لے لیا گیا اور ۱۶۰۱ھ/۱۵۹۳ء میں دوسری مرتبہ شیخ الاسلام مقرر ہو کر آخر وقت تک اس عہدے پر مامور رہا، یہاں تک کہ ۱۶۰۶ھ/۱۵۹۸ء میں وفات پائی۔ عربی، فارسی اور ترکی میں شعر گوئی کے علاوہ اس نے احیاء العلوم کا ترکی میں ترجمہ کیا اور ملتقی کی شرح لکھی۔ حاجی خلیفہ اس کے ایک منظوم فتوے کا ذکر کرتا ہے، جس میں اس نے قہوے کو جائز قرار دیا ہے (میزان الحق، باب ۶، ترجمہ از G. L. Lewis، ص ۶۰ تا ۶۲)۔

مآخذ: (۱) عطائی، ص ۴۱۰؛ (۲) رفعت: دوحۃ

المشائخ، ص ۳۳؛ (۳) علمیہ سالنامہ سی، ص ۴۱۰؛ (۴)

عثمانی مؤلفی، ۱: ۲۵۶؛ (۵) سچل عثمانی، ۴:

۱۳۳؛ Hammer-Purgstall، بمدد اشاریہ۔

شیخ الاسلام محمد افندی کے گھرانے کے دیگر نامور اشخاص میں سے ایک اس کا چھوٹا بھائی (۳) مصطفیٰ افندی (۱۵۳۶ھ/۱۵۳۹-۱۵۴۰ء تا ۱۶۰۱ھ/۱۶۰۵-۱۶۰۶ء) یکے بعد دیگرے آناطولی اور روم ایلی کے قاضی عسکر کے عہدوں پر فائز ہوا (عطائی، ص ۵۰۶ تا ۵۰۷؛ سچل عثمانی، ۴: ۳۸۱)۔ مصطفیٰ افندی کے بعد اس کا بھتیجا (۴) مصطفیٰ [بن محمد] (۱۵۸۰ھ/



بعد تدوین و تالیف اور طباعت کا کام بند کر دیا گیا] - تسامحات کے باوجود بھی یہ کتاب عربی زبان کا ایک مہتمم بالشان کارنامہ ہے اور اسے عربی میں اسی قسم کی دیگر مطبوعات مابعد کا پیش خیمہ قرار دیا جا سکتا ہے، جیسے فرید وجدی المصری کی تصنیف جس پر حسین ہیکل نے فی اوقات الفراغ میں بہت کڑی تنقید کی ہے۔

(۲) سلیمان البستانی (۱۸۵۶ء تا ۱۹۲۵ء): اس خاندان کا یہ نمایاں فرد، لبنان کے موضع بکشیتین میں ایک غریب لسان کے ہاں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اس نے اپنے چچا مطران البستانی سے پائی اور جب بڑا ہوا تو اس کا باپ اسے مدرسہ ”الوطینہ“ میں پڑھوانے کے لیے بیروت لے گیا جسے اس کے چچا بطرس البستانی نے قائم کیا تھا۔ یہاں اسے عربی ادب کے بلند پایہ اساتذہ ناصیف الیازجی [م ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء] اور یوسف الأسیر [م ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء] کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا۔ ان سے اس نے نہ صرف ذوق ادب بلکہ نظم و نثر لکھنے کی صلاحیت بھی حاصل کی۔ ۱۸۷۱ء میں وہ العجّنة کے ادارہ تحریر میں شامل ہوا اور زان بعد العجّنة کو خود مرتب کرنے لگا، جسے ابتداءً سلیم البستانی نے جاری کیا تھا۔ دائرۃ المعارف کے لیے بھی اس نے مقالات لکھے۔ ایک ماہر محرر کی حیثیت سے اس کی شہرت سے متاثر ہو کر قاسم زہیر نے اسے بصرے بلا لیا اور ایک مجلے کی، جو نیا جاری ہوا تھا، ادارت اس کے سپرد کر دی۔ اس کا یہ عہدہ فقط ایک سال تک قائم رہ سکا کیونکہ قاسم زہیر کو معلوم ہوا کہ کنجوروں کی تجارت کسی ایسی مجلے کے اہتمام کی بہ نسبت کہیں زیادہ منفعت بخش ہے۔ اس کے بعد سلیمان بغداد چلا گیا۔ کچھ دن بعد اس نے عرب کے دور دراز مقامات کی سیاحت کی اور حضر موت پہنچ

۱۸۶۹ء کے عنوان سے زبان عربی کی ایک لغت فیروز آبادی کی تالیف [القاموس] میں اضافے کر کے دو جلدوں میں تیار کی اور پھر اس کا اختصار قطرالمحیط کے نام سے مرتب کیا، جو ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا۔ اس کی انتہک ہمت اور محنت کا پتا دو مجلوں العجّنة (= گلستان) اور العجّنة (= بوستان)، کی تاسیس سے چلتا ہے جن کا اجراء اس نے اپنے بیٹے سلیم کے ساتھ مل کر کیا۔ بعد ازاں یہ مجلے ماہنامہ الجّنان کے نام کے تحت مدغم ہو گئے۔ اس کے بعد (ع - د) اس نے ممتاز افراد کے ناموں پر مشتمل ایک نوع کی قاموس الاعلام بھی شائع کی۔ ۱۸۷۵ء میں اس نے ایک عظیم کام کا آغاز کیا جو عربی ادب میں اس کے پیش روؤں کے تجربوں پر مبنی تھا، یعنی تمام اقسام علوم کا ایک ضخیم مجموعہ معلومات جس کا نام اس نے دائرۃ المعارف رکھا۔ اس تالیف میں متعدد معاونین نے اس کے ساتھ شرکت کی۔ اس کی پہلی جلدیں ۱۸۷۶ء میں سلطان مراد الخامس کے نام معنون کی گئیں، جو تھوڑے دن حکومت کرنے کے بعد خلل دماغ کے شبہ میں معزول کر دیا گیا۔ بطرس البستانی اس کی آخری جلدوں کی طباعت نہ دیکھ سکا کیونکہ ۱۸۸۳ء میں [چھ جلدیں مکمل طبع کرنے اور ساتویں کی طباعت شروع ہونے] کے بعد وہ وفات پا گیا اور یہ کام اپنے بیٹے سلیم کے لیے چھوڑ گیا [جو ساتویں اور آٹھویں جلدیں پایہ تکمیل کو پہنچانے کے بعد وفات پا گیا]۔ اس کے بعد ۱۸۸۴ء میں اس کے دوسرے بیٹوں اور رشتہ داروں [نجیب اور نسیم البستانی نے سلیمان البستانی کی معاونت سے] اس جلیل القدر کام کو سنبھالا اور [نویں، دسویں اور گیارہویں جلد کو] پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ [گیارہویں جلد ۱۹۰۰ء میں طبع ہوئی اور مادۃ عثمانیہ تک پہنچی۔ بارہویں جلد شروع کرنے کے

کر قبائل کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور مصر کے ماہنامے *المقتطف* (۱۸۸۷ء) میں قبیلہ صلیب (Slabs) [صلیبی؟] کی زبوں حالی کے بارے میں مضامین شائع کراتا رہا۔

۱۸۸۵ء میں سلیمان بیروت پہنچ گیا، جہاں اس نے اپنے چچا زاد بھائی سلیم کی وفات کے بعد دائرۃ المعارف کا کام سنبھال لیا۔ اس وقت اسے دائرۃ کو ترکی میں ترجمہ کرنے کا خیال پیدا ہوا لیکن ان دنوں ترکی کتب کی اشاعت پر بڑی سخت پابندی عائد تھی، چنانچہ اس کے لیے اجازت نامہ حاصل کرنے کی غرض سے سلیمان نے قسطنطنیہ کا سفر کیا، جہاں وہ تین ماہ تک مقیم رہا اور اس قیام کے دوران میں اس نے ترکی حکام کے طریق نظم و نسق سے شناسائی پیدا کی۔ اپنے رسالہ *عبرة و ذکر* میں اس نے برسرِ حکومت عمال کی بد اعمالیوں کے بارے میں اپنے تاثرات شائع کیے۔ جب بالآخر اسے ترکی متن کی اشاعت کا پروانہ اجازت مل گیا تو بیروت کے محکمہ انتقاد کے عہدیداروں نے اس کی طباعت کے راستے میں اس قدر دشواریاں پیدا کیں کہ سلیمان مایوس ہو کر ۱۸۸۷ء میں مصر چلا گیا۔ وہاں اس کے عربی مختصر نویسی (Short-hand) (کتابۃ الاختزال) کی اختراع کا ایسا دوستانہ خیر مقدم ہوا کہ اس نے اپنے قانون اختزال کو اور زیادہ وسیع کیا۔ بہر حال اس کے الاختزال و استنوگرافیہ [الاختزال العربی] کو کہیں ۱۹۲۰ء میں جا کر قبول عام نصیب ہوا۔

معاش کے کسی قدر وسائل مہیا کر لینے کے بعد سلیمان البستانی نے لمبے لمبے سفر کرنے شروع کر دیے۔ وہ ایران اور ہندوستان گیا اور ان دونوں ملکوں کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہاں سے بغداد واپس آ کر اس نے عربوں کی ایک تاریخ کی تکمیل کا کام سنبھالا۔ بعد ازاں اس نے قسطنطنیہ کا

سفر کیا اور اسے ۱۸۹۳ء میں شکاگو میں ہونے والی عالمی نمائش کے ترکی نمائندے کا مشیر مقرر کیا گیا۔ اس کے انتھک قلم نے وہاں ایک ترکی اخبار شکاگو سیرگیسی (*Sikago Sergisi*) : نمائش (شکاگو) کی بنیاد رکھی اور اس کی مزید دیکھ بھال کا کام عبیداللہ افندی کے سپرد کر دیا۔ قسطنطنیہ واپس آ کر اس نے نوجوان ترکوں کی تحریک کے ساتھ اپنی ہمدردی کا علانیہ اظہار شروع کر دیا۔ اس وقت اس نے اپنی اس عظیم تصنیف کی تکمیل کی جو ۱۹۰۳ء میں قاہرہ کے نئے وسعت یافتہ مطبع الہلال سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مضامین کی طرح اس کے نام میں بھی ایک دلکش جدت پائی جاتی ہے یعنی *الیاذۃ ہومیروس* (*Iliad, hat, Homeros*) یہ ایلید کا [منظوم عربی] ترجمہ ہے اور اس کے طویل مقدمے سے پتا چلتا ہے کہ مصنف کا ابتدائی مطالعہ بہت گہرا تھا۔ اس نے نو عمری میں بلٹن کی ”فردوس گم گشتہ“ (*Paradise Lost*) بہت ذوق و شوق سے پڑھی تھی اور اس امر پر اظہارِ افسوس کیا تھا کہ عربی ادب کا دامن کسی ایسے شعری شاہکار سے خالی ہے۔ اس نے کوشش کی کہ اصل کو عربی میں بعینہ منتقل کرے لیکن اسے اصل کی نظموں کی بھور کو قائم رکھنے میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس شاندار کتاب کی قدر دانی ابتدا میں کم ہوئی کیونکہ قدیم یونانی شاعری کا عربی ادب پر کچھ یوں ہی سا اثر ہوا ہو تو ہوا ہو لیکن اس کے ساتھ ہی دوسری جانب حکمت یونانیہ کے طلبہ اور عرب میں اسے ترقی دینے والے فضلا بہت سے پیدا ہو گئے۔ یونانی تمثیلی ادب سے بھی عرب مصنفین نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ کہیں نصف صدی کے بعد جا کر شعراء عرب کے اذہان کو یونانی شاعری سے



دی۔ وہ ہندوستان میں کئی برس مقیم رہا اور خاصے دن فلسطین میں گزارے۔ اس نے سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا اور اسرائیلی تحریک کی غاصبانہ ریشہ دوانیوں کے خلاف، جس نے اس صوبے میں عربوں کی زندگی خطرے میں ڈال دی تھی، قلمی جہاد کیا۔ اس نے رباعیاتِ عمر خیام (۱۹۱۲ء) اور ہندوستان کی رزمیہ داستانِ مہابھارت کے ایک بڑے حصے (۱۹۵۳ء) کا استادانہ کاوش سے ترجمہ کر کے عربی ادیب کی حیثیت سے بڑا ممتاز مقام حاصل کیا ہے۔ اس ادب دوست خاندان کی اعلیٰ روایات کو اس کے بعض افراد نے ابھی تک برقرار رکھا ہوا ہے، مثلاً بطرس البستانی ([پیدائش] ۱۹۰۰ء)، جو بیروت کی امریکی یونیورسٹی میں ادب کے پروفیسر اور ادبِ العرب (جلد ۳) اور ابن شہید کی التوابع و الزوابع کا مصنف ہے اور سعید البستانی (ولادت ۱۹۳۰ء) پیرس کی یونیورسٹی میں عربی کا استاد۔

[مآخذ: دائرة المعارف الاسلامیہ عربی، میں مادۃ البستانی کے تحت حسب ذیل مآخذ درج ہیں: (۱) جرجی زیدان: مشاہیر الشرق: ۲: ۲۳ بعد؛ (۲) شیخو: المشرق، ۱۲: ۹۲۹ و بعد؛ (۳) براکلمان، ۲: ۴۹۵؛ (۴) Zeitschr. der Deutsch Morgenl. Ges.، ۳۳: ۵۷۹ بعد؛ (۵) جرجی زیدان: تاریخ آداب اللغة العربیة، بیروت ۱۹۶۷ء، ۴: ۶۳۲ تا ۶۳۳؛ (۶) الزرکلی: الاعلام، باردوم، ۲: ۳۱؛ (۷) سرکیس: معجم المطبوعات العربیہ، عمود ۵۵۷ تا ۵۵۹، ۵۶۰؛ (۸) حسن السندوبی: اعیان البیان، مصر ۱۹۱۳ء، ص ۲۰۵؛ (۹) اعلام اللبانیین، بیروت ۱۹۳۸ء؛ (۱۰) یوسف الدبس: الجامع المفصل، بیروت ۱۹۰۰ء، ص ۵۳۱]

(عبدالکریم جولیس جرمانوس و [ادارہ])

بستل: جمع بستل، یہ لفظ لغت میں موجود نہیں البتہ اگر ہم قبة الصخرہ کے متعلق العمری

آشنا کرنے کے بارے میں سلیمان البستانی کی کوششوں کا اعتراف کیا گیا۔ اس وقت سے متعدد ماہر عرب مترجمین نے مہر سکوت توڑ کر عرب قارئین کے سامنے یونانی تمثیل اور شاعری کے دروازے کھول دیے ہیں۔ لیکن اس راہ کی دریافت کا سہرا سلیمان البستانی ہی کے سر ہے۔

ایک انسان کی حیثیت سے سلیمان نے اپنے گھرانے اور اپنی قوم کی قدامت پسندانہ روش کی نکہبانی کی۔ وہ سلطان عبدالحمید ثانی کے خلاف ۱۹۰۸ء میں بیروت کے نمائندے کی حیثیت سے نوجوان ترکوں کی مجلس ملی میں شامل ہو گیا۔ ۱۹۱۰ء میں وہ سٹیٹ کا رکن اور اس بلند پایہ جماعت کا دوسرا صدر منتخب ہوا۔ جنگ بلقان کے بعد سعید حلیم پاشا نے اسے وزارت تجارت و زراعت پیش کی۔ ترکوں کی جماعت اتحاد و ترقی کے ساتھ اس کی ہمدردی پر خلوص اور غیر متزلزل تھی، لیکن پہلی عالمگیر جنگ کے چھڑنے پر اس نے تعجب سے یہ دیکھا کہ انتہا پسندانہ تورانیت کا جذبہ زوروں پر ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ غیر ترکی عناصر انتظام مملکت سے خارج کر دیے جائیں، چنانچہ اپنے بلند منصب سے مستعفی ہو کر وہ سوئٹزرلینڈ چلا گیا اور پھر عرب تارکین وطن کی دعوت پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو روانہ ہو گیا، جہاں اس کا ہر جوش استقبال ہوا۔ یکم اپریل ۱۹۲۵ء کو اس نے داعی اجل کو لبیک کہا، جس پر اس کے تمام ہمعصروں نے غم و الم کا اظہار کیا۔

(۳) ودیع البستانی (۱۸۸۸ تا ۱۹۵۳ء) دیہ [لبنان] میں پیدا ہوا، جو اس بستانی گھرانے کا اصل وطن تھا [اس نے وفات بھی وہیں پائی]۔ اس نے مشرقی ادب کا مطالعہ کیا اور بلادِ مشرق و مغرب کی دور دور تک سیاحت کر کے اپنے علم کو ترقی

انہیں اس طرح دکھایا گیا ہے گویا وہ محض نمائشی محرابیں ہیں۔ العمری نے شہتیروں کے لیے بساتل کا جو لفظ استعمال کیا ہے وہ ظاہر کرتا ہے کہ متذکرہ صدر امر کی اہمیت اس پر پوری طرح واضح تھی۔ کیونکہ جو لفظ اس نے استعمال کیا ہے وہ یونانی لفظ  $\xi\pi\iota\sigma\tau\upsilon\lambda\acute{\iota}\omicron\nu$  سے مشتق ہے، جس کی تفسیر Liddel اور Scott نے ستونوں کی قطار کے اوپر والے مرغولوں یا سرستونوں سے کی ہے۔

(K.A.C. CREMELL)

• **البستی**: ابوالفتح علی بن محمد، چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کا ایک عربی شاعر۔ وہ ایرانی الاصل تھا اور بست [رک باں] کا رہنے والا تھا۔ جہاں اس نے حدیث، فقہ اور ادب کی تعلیم حاصل کی۔ وہ محدث ابن حبان کا شاگرد تھا جس نے ۳۴۰ھ/۹۵۱ء سے اپنی وفات (۳۵۴ھ/۹۶۵ء) تک کا زمانہ بست ہی میں بسر کیا اور ایک دوسرا محدث الخطابی (۳۸۸ھ/۹۹۸ء) البستی کا دوست تھا۔ فقہ میں وہ شافعی مسلک کا پیرو تھا۔ نوجوانی میں وہ بست کے سردار بایتوز کا کاتب (سیکرٹری) ہو گیا۔ جب ۳۶۷ھ/۹۷۷ء میں بست کو سبکتگین نے فتح کیا تو البستی اس سے جا ملا۔ کسی سازش کا شکار ہو کر اس نے مجبورا رنج کے ضلع کے ایک گاؤں میں رہنا شروع کر دیا۔ لیکن چند ماہ کے بعد سبکتگین نے اسے واپس بلا لیا اور وہ العتبی کے ساتھ محمود [غزنوی] کے زمانے تک اپنے عہدے پر فائز رہا۔ سرکاری کاتب ہونے کی حیثیت سے اس نے وہ سرکاری مراسلے لکھے جن میں [سلطان] محمود کی شاندار فتوحات کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان مراسلوں کو بڑی تحسین کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ کچھ دن بعد اس پر عتاب نازل ہوا اور اسے ”ترکوں کی سرزمین“ یعنی

[ابن فضل اللہ کی کتاب] مسالک الابصار، ص ۱۴۱ کی عبارت کا اصل عمارت کے بالمقابل کھڑے ہو کر مطالعہ کریں تو معنی واضح ہو جاتے ہیں۔ ہشت پہلو محرابی راستے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے: ”کرسی کو چھوڑ کر ستونوں کی بلندی ساڑھے چھ ہاتھ ہے، ان پر منبت کاری کر کے ایسے بساتل بنائے گئے ہیں جن کے اوپر پیتل کا پترا چڑھا ہوا ہے اور منبت کاری پر ملمع ہے۔ بساتل کے اوپر گلٹ کے فصوص (شیشے کی پچی کاری میں استعمال ہونے والے چھوٹے چھوٹے کعب) سے ڈھکی ہوئی محرابیں (قناطر) ہیں“۔

جب ہم موقع پر کھڑے ہوتے ہیں تو سامنے ہشت پہلو مسقف محرابی راستے کے مرمرین ستون نظر آتے ہیں۔ ان ستونوں پر کڑیوں کو سہارا دینے والی لکڑی کی دھنیاں ٹکی ہوئی ہیں، جن پر اندر اور باہر کی طرف کانسی یا پیتل کے خول چڑھے ہوئے ہیں اور ان پر گلٹ سے ابھرے ہوئے نقش بنائے گئے ہیں۔ اندر کا رخ لکڑی کے بنے ہوئے نہایت اعلیٰ قسم کے کورنتھی سرستونوں سے مزین ہے، جو رنگے ہوئے یا ملمع شدہ ہیں۔ ان کے اوپر محرابیں ہیں جو شیشے کی پچی کاری سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ اگرچہ میں نے ان شہتیروں کو سہارے کی دھنیاں لکھا ہے اور وہ فی الواقع یہی ہیں کیونکہ وہ کڑیوں کو ٹھونس کر محکم کرنے کے لیے لگائی گئی ہیں۔ اور یہ بات اس امر سے بھی ظاہر ہے کہ ان کے سروں کی چولیں مضبوطی سے بٹھائی گئی ہیں۔ تاہم اندر کے رخ پر انہیں محرابوں کی بیرونی تزئین کرنے والے نقش و نگار (مرغول) کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ کیونکہ بڑی محنت سے تیار کردہ کورنتھی کگر کو خاص طور پر نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی۔ اوپر کی محرابوں کے لیے ایسی کوشش نہیں کی گئی بلکہ





تحریر مضمک (Parody) کی مثالیں اس سے پہلے بھی موجود ہیں، تاہم بسحاق اس صنف سخن کا بادشاہ ہے، جس میں اس نے اپنی تمام تر ادبی صلاحیت صرف کر دی ہے۔ . . . اس نے جو محدود میدان اپنے لیے منتخب کیا اس میں کمال پیدا کیا اور قدم قدم پر ظرافت و جدت کا ثبوت دیا۔ ایک قادر الکلام صاحب طرز شاعر ہونے کی وجہ سے اس نے تمام اصناف سخن میں بے تکلف شعر کہے اور اس سلسلے میں معیاری زبان اور فارس کی مقامی بولی دونوں سے کام لیا۔ اس کے بارے میں آخری قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس نے بہت سی فنی اصطلاحات کو قعر گمناسی سے نکال کر سرف کرایا، جس طرح کہ اس کے مقلد [نظام الدین] محمود قاری نے کیا، جس نے دیوان بسحاق کی طرز پر اپنا دیوان الیسہ [لباس کی جمع] تصنیف کیا۔

مآخذ: (۱) *Shāfi'a Asar, poète: H. Ferté*

*Satirique et Recueil de poésies gastronomiques d'*

*Abou Ishaq Halladj Chirazi*، در JA، ۱۸۸۶ء،

(انتخاب منظومات جن کا بہت اچھا ترجمہ کیا گیا

ہے): (۲) *P. Horn*، در *Beilage zur Allg. Zeitung*

*in München*، ۲۶ و ۲۷ جنوری ۱۸۹۹ء؛ (۳) دولت شاہ،

ص ۳۶۶ تا ۳۷۱؛ (۴) لطف علی آذر: *آتشکدہ* (مطبوعہ

بمبئی ۱۲۷۷ھ)، بذیل مادہ؛ (۵) رضا قلی خان:

*مجمع الفصحاء*، ۲: ۱۰؛ (۶) نیز ریاض العارفین، تہران

۱۳۰۵ھ، ص ۴۴ تا ۴۵؛ (۷) *Browne*، ۳: ۳۴۴ تا

۳۵۱؛ (۸) وہی مصنف: *Some notes on the poetry*

*of the Perian Dialects*، در *JRAS*، ۱۸۹۵ء، مقالہ

۲۴، ص ۷۸۷، ۷۸۸ و ۸۲۰ تا ۸۲۳۔

(P. HORN و [H. MASSÉ])

بسر: بن [ارطاة بن عمیر (= ابی ارطاة) اور بعض

غیر مستند اسباب میں بسر بن ابی ارطاة بھی آیا ہے]،

ایک عرب سپہ سالار، جو قریش کی شاخ بنو عامر سے

بیان کردہ ایک حکایت کے علاوہ) ہمیں بس اس قدر معلوم ہے، بقول ہدایت (ریاض العارفین) مشہور صوفی شاعر شاہ نعمت اللہ [رک باں] سے اس کے روابط تھے۔ حلاج کے لفظ سے، یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ روئی دھننے والا تھا۔ فارسی زبان کی فرہنگوں میں کہانوں سے متعلق الفاظ میں اس کی سند پیش کی جاتی ہے اور اس کے عرف "أطعمہ" کی وجہ تسمیہ یہی ہے۔ میرزا حبیب اصفہانی نے اس کے دیوان کا ایک عمدہ نسخہ مرتب کر کے ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵-۱۸۸۶ء میں استانبول سے شائع کیا تھا اور اس کے ساتھ فرہنگ اصطلاحات مع عربی و ترکی مترادفات، کا بھی اضافہ کر دیا تھا (ان میں سے تقریباً پچاس [اصطلاحات] کا H. Ferté نے ترجمہ کیا ہے)۔ اس دیوان میں کنزالاشتہاء (اشتہاء کا خزانہ) مع ایک دیباچے کے (مترجمہ Ferté و Browne) شامل ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ مختلف اصناف سخن کو اس کے پیش رو پہلے ہی شہرت دوام عطا کر چکے تھے اور جو کچھ اسے کہنا تھا وہ سب باتیں اس سے پہلے کہی جا چکی تھیں۔ چنانچہ اس نے محض اتنا کام کیا کہ بہت سے نامی گرامی شعراء (ان کے ناموں کے لیے دیکھیے براؤن) کے تخیلات کو "مطبخی" اور "اشتہائی" سانچوں میں ڈھال کر پیش کر دیا، گویا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ بسحاق ایک ظریف نقال تھا۔ یہ بات کنزالاشتہاء کے علاوہ دیوان کے جزو دوم پر بھی صادق آتی ہے، تیسرا حصہ دو مختصر منشور تصنیفات پر مشتمل ہے، جن میں جا بجا اسی رنگ کے اشعار ملتے ہیں ان کے آخر میں اصطلاحات مطبخ کی ایک مزاحیہ فرہنگ ہے (ان میں سے بعض کا ترجمہ Ferté نے کیا ہے)۔ اگر عبید زاکانی ہجو کا استاد ہے تو، گو



آئے، اور اس سخت کارروائی سے انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آخری مسلح حامی کو اطاعت پر مجبور کر دیا، بعد ازاں ہم بسر کو بوزنظلی سلطنت کے خلاف کئی بحری مہمات کی قیادت کرتے دیکھتے ہیں۔ ۶۷۰/۵۵ کے بعد امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے یہ نائب جو کبھی سپہ سالار اور کبھی امیر البحر رہے، میدان سیاست سے غائب ہو جاتے ہیں، اگرچہ کہا جاتا ہے کہ وہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات تک ان کے دربار میں رہے۔ خلیفہ ولید اول کے عہد میں ان کا ذکر پھر ملتا ہے جب کہا جاتا ہے کہ انہوں نے افریقی فوج کشی میں دوبارہ حصہ لیا تھا۔ دوسرے ماخذ کی رو سے انہوں نے عبدالملک کے عہد میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ بسر نے بہت طویل عمر پائی [ان کی اولاد و احفاد میں نامور محدث گزرے ہیں، جن سے امام بخاری اور امام مسلم نے اپنی صحیحین میں روایت کی ہے (السمعانی: الانساب؛ تاج العروس، بذیل مادہ)].

ماخذ: (۱) Études Sur le : H. Lammens

régne de Mo'awia I ص ۴۲ تا ۴۸، ۲۸۳؛ (۲)

البلادری: فتوح، ص ۲۲۶ تا ۲۲۸، ۴۵۶؛ (۳) ابن

حجر: الاصابة: ۱: ۳۰۰؛ (۴) ابن الاثیر: اسد الغابۃ،

۱: ۱۷۹ تا ۱۸۰، ۲: ۳۹۲؛ (۵) المسعودی: مروج،

۵: ۴۷۴ تا ۴۷۵؛ (۶) الاغانی، ۴: ۱۳۱ تا ۱۳۲ و

۱۰: ۴۵ تا ۴۷؛ (۷) الطبری، ۱: ۲۱۰، ۲۳۴،

۳۴۰، ۳۴۵ تا ۳۵۲ و ۲: ۱۱ تا ۱۳، ۲۲؛

(۸) الترمذی: صحیح، ۱: ۲۷۴ (طبع بولاق)؛ (۹)

تصنیف المحدثین (مخطوطہ در کتبخانہ خدیویہ، قاہرہ؛

(۱۰) ابن ابی الحدید: شرح تہج البلاغہ، ۱: ۱۱۶

بعید: [(۱۱) ابن حزم: جمہرۃ انساب العرب، ص ۱۷۰؛

(۱۲) الزرکلی: الاعلام، ۲: ۲۳، خصوصاً ماخذ: (۱۳)

انساب الاشراف، ص ۹۲.]

(H. LAMMENS و [ادارہ])

تھے اور مکے میں ہجرت سے قبل کے آخری دس سال میں پیدا ہوئے۔ ان کے صحابی ہونے سے انکار صرف شیعہ روایات میں ملتا ہے۔ بسر نے اس امدادی فوج کے ساتھ جس کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید تھے شام گئے، جہاں وہ اپنی دلیری کے باعث ممتاز رہے۔ بعد ازاں انہوں نے فتح افریقہ میں حصہ لیا۔ یہ ان کی جانبازی کی بنا پر تھا نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے لیے دعا فرمائی اور انہیں انعام عطا کیا۔ خانہ جنگی کے دوران میں بسر نے بڑے جوش و خروش سے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا اور بنو کینہہ کے بااثر شیخ شرحبیل بن السیمط کو ان کی حمایت پر آمادہ کیا۔ جنگ صفین کے موقع پر وہ شامی لشکر میں شامل تھے۔ آگے چل کر انہوں نے مصر کو امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لیے دوبارہ فتح کرنے میں عمرو بن العاص کی اعانت کی۔ بسر بڑی نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ وہ قدیم طرز کے بدوی سرداروں کا نمونہ تھے اور بڑے سخت گیر مشہور تھے۔ جب بسر کو حامیان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں اندرون عرب میں بھیجا گیا تو انہوں نے بڑی بے جگری سے جنگ کی، اور حجاز میں مخالفین حضرت عثمان کے ٹھکانوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اس طرح انہوں نے بنو امیہ کے ساتھ ایسی وفاداری کا ثبوت دیا جس پر بعد میں صرف مسلم بن عقبہ اور حجاج ہی سہت لے جا سکے۔ یمن میں بسر نے عبید اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے دو نوعمر بیٹوں کو ہلاک کیا، اور اس مختصر مہم میں جس کا انجام حضرت حسن رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ کی خلافت سے دست برداری پر ہوا وہ ہراول فوج کے سالار تھے۔ انعام میں انہیں بصرے کا عامل بنایا گیا۔ جہاں انہوں نے ایک آمرانہ حکومت قائم کر لی۔ بسر عراق میں بہت قلیل عرصے تک رہے، لیکن وہ یہاں ایک بار پھر زیاد بن ابیہ کے بچوں کو گرفتار کرنے

حلقہ اسلام میں شامل ہو گئے۔

مآخذ: (۱) Smirnov : Oičet o 8 Arkheolo-

Journal du Ministère de gičeskom siezde در

'Instruction Publique'، سینٹ پیٹرز برگ، ۱۸۹۰ء، ص

۲۶۹، ۱ تا ۳۷؛ (۲) V. Belitzer : Problema ;

Trudy Instituta، در Proizkhozdeniya Besermyan

، Etnoğrafii، ماسکو ۱۹۱۷ء، ج ۱؛ (۳) Negovitzin :

Besermyane، در Bolshaya Sovetskaya Entziklopediya،

۱۹۳۰ء تا ۱۹۲۲ء۔

(A. BENNIGSEN)

بسن سر بیا : Bessarabia رگ بہ بجا۔

بسط : (ع) صوفیوں کی ایک اصطلاح، جس کا

اطلاق اس روحانی کیفیت (حال) پر ہوتا ہے جو

مقام امید (رجا) میں طاری ہوتی ہے۔ اس کی ضد

”قبض“ ہے [رگ باں]۔ قبض و بسط کی تائید

میں یہ قرآنی آیت پیش کی جاتی ہے : **وَاللّٰهُ يَبْسُطُ**

**وَيَقْبِضُ**... الآية (۲ [البقرة]: ۲۴۵) (= قبض و بسط دونوں

حالتیں اللہ ہی طاری کرتا ہے) چونکہ بسط محض ایک

”حال“ ہے لہذا اس کا شخصی اعمال سے کوئی

تعلق نہیں بلکہ وہ ایک احساس مسرت و فرحت ہے

جو صوفی کو اللہ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ اسی لیے

بعض صوفی اس مقام کو مقام ”قبض“ سے ادنیٰ تصور

کرتے ہیں۔ اس بنا پر کہ جب تک آخر کار خدا کا

وصل حاصل نہ ہو اور انسان کی انفرادی ہستی اس کی

ذات میں گم نہ ہو جائے یا اس کے سوا کوئی اور

احساس نامناسب ہے۔ اس نکتے کی وضاحت جنیدؒ

بغدادی کے اس بیان سے ہوتی ہے : ”خوف خدا

مجھ میں ’قبض‘ پیدا کرتا ہے اور اس کی بارگہ

سے امید مجھ میں ’بسط‘ پیدا کرتی ہے۔ جب

وہ خوف کے ذریعے مجھ میں ’قبض‘ پیدا کرتا ہے تو

میں اپنی خودی سے باہر ہو جاتا ہوں لیکن

وہ رجا کے ذریعے مجھ میں ’بسط‘ پیدا کرتا ہے

بسر می : (Besermyans) یا گلازوف تاتاری

، نسلی اعتبار سے ایک منفرد قوم،

(Glazov Tatars)، جو شمالی روس میں رہنے والے ادمرتوں (Udmurts)

(Votyaks) سے رشتہ رکھتی ہے۔ ان کی اصل کے

بارے میں مختلف نظریات ملتے ہیں۔ لوگ انہیں

فنستانی (Finns) بتاتے ہیں جو ترکی اثر کے ماتحت

آگئے اور بعض کا خیال ہے کہ یہ قدیم کاما بلغاروں

(Kama Bulghars) کی نسل سے ہیں، جو پوری طرح

ادمرت زبان و ثقافت سے متاثر ہو گئے ہیں۔ اب یہ

سوویت میں شامل ہیں۔

سوویت حکومت کی ۱۹۲۶ء کی سر شماری

میں بسر میوں کی تعداد دس ہزار پینتیس بتائی گئی ہے،

جن میں سے نو ہزار ایک سو پچانوے خود مختار

جمہوریہ اشتراکیہ ادمرت کے اضلاع بلیزینو Balezino

اور یگامنسکو Yukamenskoe سے تعلق رکھتے ہیں اور

انہو سو چونتیس موضع سلوبوڈ سکو Slobodskoe کے

گرد و نواح سے، جو علاقہ کروف Kirov میں دریائے

ویاتکا Vyatka اور دریائے چپتزه Ceptza کے سنگم پر

واقع ہے۔ بسر می دو زبانیں جانتے ہیں۔ یہ

روسی جمہوریہ ادمرت میں روسی زبان اور علاقہ کروف

میں قازانی تاتاری بولتے ہیں، نیز ادمرت، جس میں

تاتاری زبان کا بہت دخل ہو گیا ہے۔ سرکاری

طور پر انہیں سترھویں صدی عیسوی میں عیسائی

بنا لیا گیا تھا اور اکتوبر کے انقلاب تک انہیں

کلیسائے یونان کا مکمل بیرو سمجھا جاتا تھا، لیکن

حقیقت یہ ہے کہ وہ دل سے مسلمان ہی رہے اور

انہوں نے ایسی رسوم برقرار رکھیں جو روایۃ

اسلامی ہیں، خصوصاً جب کسی کی موت واقع

ہو جاتی تو وہ آرتھوڈکس پادری کے بعد تاتاری

ملا کو بھی بلا لیا کرتے تھے۔

جب ۱۹۰۵ء میں مذہبی عبادت کی آزادی

کا اعلان ہوا تو زیادہ تر بسر می علانیہ طور پر دوبارہ



شاہرود سے چھے کیلومیٹر (تقریباً دو میل) جانب شمال البرز کے پہاڑوں میں ہے۔

اس شہر کی تاریخ قبل اسلام معلوم نہیں۔ ایک روایت کے مطابق اس کی بنیاد بسطام نام حاکم خراسان نے اپنے بھتیجے خسرو دوم (ہرویز) کے عہد حکومت میں رکھی تھی (نواح ۴۵۹)۔ یاقوت اس شہر کو شاپور دوم سے منسوب کرتا ہے (قب Schwarz)۔

عربوں کے دور فتوحات میں سوید بن مقرن نے جرجان پر حملہ کرنے سے پہلے اس شہر پر قبضہ کر لیا، لیکن تاریخ فتح غیر یقینی ہے (طبری، حوالہ در Schwarz)۔

عباسی خلافت میں بسطام صوبہ قویس میں صوبائی صدر مقام دامغان کے بعد دوسرا بڑا شہر تھا۔ حضرت بایزیدؒ البسطامی [رک باں] کا مدفن ہونے کے علاوہ اس شہر کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں۔ تاتاری حملے کے بعد اس کا زوال شروع ہوا اور بلحاظ اہمیت شاہرود نے اس کی جگہ لے لی۔ بایزیدؒ کے مقبرے کے متعلق دیکھیے - Houtum

Schindler، در JRAS، ۱۹۰۹ء، ص ۱۶۱

آج کل حضرت بایزیدؒ کے مقبرے اور خانقاہ کے علاوہ یہاں چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی کے قلعے کے کھنڈر اور ایک امام زادے محمد کے آثار بھی ملتے ہیں۔ مسجد غالباً اٹھارہویں صدی عیسوی کی بنی ہوئی ہے لیکن مینار اور اس کے برابر کا گنبد بہت پہلے کے ہیں۔ ان یادگاروں

کے لیے دیکھیے E. Herzfeld، در Der Islam، ۱۱ (۱۹۲۱ء) : ۱۶۸ تا ۱۶۹۔

مآخذ : (۱) Le Strange، ص ۳۶۵ : (۲)

Schwarz : Iran im Mittelalter، ۱۲، لائپزگ ۱۹۲۶ء،

۸۲۰ تا ۸۲۲ : (۳) فرهنگ جغرافیائی ایران، طبع رزم آرا،

تہران ۱۹۵۱ء، ۳ : ۴۷۔

(R. N. FRYE)

تو میں اپنی خودی میں واپس آ جاتا ہوں“ (القشیری : الرسالة، ص ۴)۔ ابن الفارض کے یہ اشعار اس صوفی نظریے کا خلاصہ بہت خوبی سے بیان کرتے ہیں :

أَوْ فِي رَحْمَتِ الْبَسْطِ نَلِي رَغْبَةٌ  
بَهَا انبَسَطَتْ أَمَالٌ أَثَلُ بَسِيطِي  
وَفِي رَهْبَتِ الْفَبْضِ نَلِي غَيْبَةٌ  
فَنِيْمَا أَجَلْتُ الْعَيْنَ مَنَى أَجَلْتُ

(دیوان ابن الفارض، بیروت ۱۹۵۷ء، ص ۶۰۶ س آخر) (ترجمہ : بسط کے حال میں جو رحم ہے میں اس میں سراپا خواہش بن جاتا ہوں، اس کی وجہ سے تمام دنیا کی خواہشات وسیع ہو جاتی ہیں۔ ”قبض“ کی حالت میں جو دہشت ہوتی ہے اس میں مجسم ہیبت بن جاتا ہوں اور جس کسی پر میری نظر پڑتی ہے اس کی گردن میرے سامنے احتراماً جھک جاتی ہے) (قب) نکلسن : Studies in Islamic Mysticism، ص ۲۵۶)۔ [حضرت علی] ہجویریؒ لکھتے ہیں [پس قبض عبارتیں بود از قبض قلوب اندر حالت حجاب و بسط عبارتیں از بسط قلوب اندر حالت کشف (کشف المحجوب، تہران ۱۳۳۶ھ، ص ۴۸۹، س ۱ تا ۲)] (= ”قبض“ سے مراد ہے حالت حجاب میں دل کا سکڑ جانا اور ”بسط“ سے مراد ہے حالت کشف میں اس کا پھیل جانا)۔ [مآخذ : (۱) الرسالة القشيرية؛ (۲) کشف المحجوب، تہران، ص ۴۸۹؛ (۳) تہانوی : کشف اصطلاحات الفنون، بیروت ۱۹۶۶ء، ۱ : ۱۲۶ تا ۱۲۷]۔ (A. J. ARBERRY)

بسطام : (نیز بسطام اور تبہی تبہی بسطام)

خراسان کا ایک شہر جس کی آبادی (۱۹۵۰ء کی سرشماری کے مطابق) چار ہزار کے قریب ہے اور جو ضلع (شہرستان) شاہرود کے قلعہ نو کے بخش (County) میں واقع ہے۔ اس کی جگہ وقوع ۵۵ درجے طول بلد مشرقی اور ۳۶ درجے ۳۰ دقیقے عرض البلد شمالی

بسٹام : بن قیس بن مسعود بن قیس، ابو الحسنیہ  
یا ابو زریق (بقول ابن الکلبی : جمہورہ، ص ۲۰۳،  
المعروف بہ "المستمر")، زمانہ جاہلیت کا بطل، شاعر  
اور بنو شیبان کا سید۔ اس کا خاندان تین شریف  
اور معزز ترین بدوی خاندانوں میں شمار ہوتا  
تھا (الآغانی، ۱۷ : ۱۰۵)۔ اس کا والد (المعبر،  
ص ۲۵۳) ذوو الآکال (بیرونی ممالک کے حکمرانوں  
سے عطیات لینے والوں) میں سے تھا، اور سامانی  
بادشاہوں نے اسے ابلہ اور ملحدہ سرحدی علاقے  
(طَفَّ صَفْوَان) اس شرط پر بطور جاگیر دے رکھے  
تھے کہ وہ قبائلیوں کو تارتاز سے باز رکھے۔  
چونکہ خود اپنے ہی قبیلے والوں کی مخالفت کی بنا  
پر وہ اپنا یہ فریضہ ادا نہ کر سکا اور اس پر یہ شبہہ  
بھی کیا گیا کہ اس نے ایرانی حکومت کے خلاف  
عرب سرداروں سے ساز باز کر رکھی ہے اس لیے  
اسے قید کر دیا گیا اور ایک ایرانی قید خانے ہی  
میں اس کی وفات ہوئی (الآغانی، ۲۰ : ۱۳۰)۔

یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ بسٹام نے اپنے  
والد کی موت کا انتقام نہیں لیا۔ اس کے برعکس ذوقار  
میں عربوں کی فتح کے باوجود، ایرانی حکمت عملی  
بسٹام کی رفاقت حاصل کرنے میں کامیاب رہی  
اور ایک خاصی معتبر روایت (الثناض، ص ۵۸۰) سے  
پتا چلتا ہے کہ شیبانی فوجوں کو عین تمر کے  
ایرانی عامل نے مسلح کیا تھا۔ بسٹام چھٹی صدی  
عیسوی کے اواخر میں پیدا ہوا (T. Nöldeke، در  
Der Islam، ۱۳ : ۱۲۵) اور بیس برس کی عمر میں  
اپنے قبیلے کا سردار بن گیا (ابن الکلبی : کتاب  
مذکور) اور بڑی کامیابی سے اپنے قبیلے کو متحد  
کیا۔ اس کا شمار "جراروں" میں سے ہوتا ہے  
(المعبر، ص ۲۵۰)۔ ایرانیوں سے لڑنے کا خیال  
ترک کر کے اس نے اپنی تمام سرگرمیاں اپنے  
ہمسایہ بنو تمیم کے خلاف معطوف کر دیں۔

البلاذری نے بیان کے مطابق بنو تمیم کی  
شاخ بنو یربوع کے خلاف اس کا پہلا حملہ  
الاعشاش کے مقام پر ہوا (انساب، ۱۰ : ۹۹۸ - ب)۔  
شیبانی فوجوں کو شکست ہوئی، بسٹام خود  
گرفتار ہوا اور فدیے کے بغیر رہا کر دیا گیا۔ اس کا  
دوسرا حملہ غالباً قساوہ کے مقام پر ہوا (انساب، ۱۰ :  
۱۰۰۳ - ب)۔ اس موقع پر یہ بات واضح طور پر  
دہی گئی ہے کہ بسٹام نے بذات خود حملہ آور  
دستوں کی قیادت کی، لیکن اس حملے کی بجائے خود  
کوئی اہمیت نہیں تھی اور یہ محض قبیلہ بنو سلیط  
[بن یربوع] کے چند اونٹ پکڑنے پر ختم ہوا۔ سلمان  
کے مقام پر الأقرع بن حابس سے جنگ بھی بظاہر  
اسی شروع زمانے کا واقعہ ہے۔ اس جنگ میں  
الأقرع [رک باں] گرفتار ہوا۔ غیظ المدرة کا حملہ  
(جو یوم بطن النلج کے نام سے مشہور ہے) ذرا  
زیادہ سنگین تھا۔ بسٹام کے فوجی دستوں نے  
ثعالب کے ایک قبائلی وفاق پر حملہ کیا اور اس پر  
غلبہ پایا، لیکن جب حملہ آوروں نے بنو مالک بن  
حنظله کے خلاف پیش قدمی کی تو انہیں مزاحمت کا  
سامنا کرنا پڑا اور بنو یربوع کے جنگجو سپاہیوں  
کی مدد سے بنو مالک نے انہیں مار بھگایا۔ بسٹام  
کو عتیبہ بن حارث نے گرفتار کر لیا، اسے بہت بڑا  
فدیہ دینا پڑا اور مجبوراً یہ عہد کرنا پڑا کہ وہ  
آئندہ قبیلہ عتیبہ پر حملہ نہیں کرے گا (انساب،  
ورق ۹۹۸ - الف، ۹۹۵ - ب، ۹۹۶ - الف)۔ کچھ  
عرصے بعد اس نے اپنا عہد توڑ کر ذوقار کے مقام پر  
عتیبہ کے بیٹے کے خیمے پر حملہ کر دیا (انساب،  
ورق ۹۹۵ - ب، ۹۹۸ - الف) اور اس کے اونٹوں پر  
قبضہ کر لیا (یہ حملہ یوم فیحان کے نام سے بھی  
مشہور ہے)۔ بسٹام اس کامیابی سے مطمئن نہیں  
ہوا اور اس نے عتیبہ کو اسیر کرنے کے لیے  
بنو تمیم پر حملہ کرنے کی تیاری کی، لیکن اس نے



مآخذ: (۱) مآخذ مذکورہ در E. Bräunlich :  
 Th. Nöldeke، لائپزک ۱۹۲۳ء اور جو Bisām b Kays  
 نے Bräunlich کی کتاب کے تبصرے میں دیے ہیں،  
 Isl.، ۱۳ : ۱۲۳؛ (۲) ابن الکلبی: جمہرة الأنساب،  
 مخطوطہ موزہ برطانیہ، عدد Add. ۲۳۲۹۷ (اس کی اطلاع  
 محمد بن حبیب نے دی ہے)، ورق ۲۰۳؛ (۳) البلاذری:  
 أنساب، مخطوطہ، ۱۰ : ورق ۹۸۸ - الف، ۹۹۵ - ب،  
 ۹۹۸ - الف، ۱۰۰۳ - ب، ۱۰۰۴ - ب؛ (۴) الجاحظ:  
 البیان، (طبع السندوی)، بمدد اشاریہ؛ (۵) محمد  
 بن حبیب: المعجم، بمدد اشاریہ؛ (۶) السویدی:  
 سبائك، بغداد ۱۲۸۰ھ، ص ۱۰۳، ۱۱۲، ۱۱۳؛ (۷)  
 الأمدی: المؤلف، ص ۶۴، ۱۳۱؛ (۸) المرزبانی:  
 معجم الشعراء (طبع Krenkow)، ص ۳۰۰، ۳۲۳،  
 ۳۰۵؛ (۹) ابن حزم: جمہرة (طبع Lévi-Provençal)،  
 ص ۳۰۶؛ (۱۰) جواد علی: تاریخ، بغداد ۱۹۵۵ء،  
 ص ۳۶۲ تا ۳۶۳ و ۳۷۰؛ (۱۱) R. Blachère:  
 'A propos de trois poètes arabes d' époque archaïque'  
 در Arabica، ۳ : ۲۳۱ تا ۲۳۹؛ (۱۲) W. Caskel:  
 Aijām al-'Arab، در Islamica، ۳ : ۱۰۰۰؛ (۱۳)  
 محمد بن زیاد العربی: أسماء الخیل (طبع Levi della Vida)،  
 ص ۶۰، ۸۹؛ (۱۴) ابوالبقاء ہبذ اللہ: المناقب،  
 مخطوطہ موزہ برطانیہ، عدد ۲۳۲۹۶، ورق ۳۶ - الف،  
 ۳۸ - ب، ۴۲ - الف، ۴۴ - الف، ۱۱۱ - ب؛ (۱۵) الجاحظ:  
 الحيوان، (طبع عبدالسلام ہارون)، ۱ : ۳۳۰، ۲ : ۱۰۳؛  
 (۱۶) المبرد: الكامل، بمدد اشاریہ۔

(M. J. KISTER)

- البسطامی: ابو یزید، ركبہ ابو یزید۔
- البسطامی: عبدالرحمن بن محمد بن علی بن  
 احمد الحنفی الحروفی، انطاکیہ میں پیدا ہوا اور  
 معلوم ہوتا ہے کہ ۵۸۰ھ / ۱۱۸۰ء میں تیمور  
 کے ہاتھوں حلب کی جو پرپادی ہوئی وہ اس نے  
 اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اس نے پہلے مصر  
 میں تعلیم حاصل کی اور پھر برسہ گیا، جو اس

اس موقع پر الصمد (ذو طلوح) کے مقام پر اسے شکست  
 ہوئی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر بھاگا  
 (انساب، ورق ۹۹۸ - الف)۔ الآفانہ کے مقام پر ایک  
 اور لڑائی ہوئی، جو الغبیطین یا العظانہ کی لڑائی  
 کہلاتی ہے۔ اس کی تیاری اور امداد ایرانی عامل  
 عین تمر نے کی تھی۔ اس میں حملہ آوروں کو  
 شکست ہوئی اور بسطام فرار ہوا (انساب، ق  
 ۱۰۰۴ - ب)۔ بسطام نے آخری لڑائی بقا الحسن کے  
 مقام پر لڑی۔ وہ ایک نیم دیوانے خبی، عاصم بن  
 خلیفہ، کے ہاتھوں مارا گیا، جس کے متعلق مشہور ہے  
 کہ اس نے حضرت عثمان رضی عنہ کے حضور میں اپنے اس  
 کارنامے کا ذکر بڑے فخر کے ساتھ کیا تھا۔ اس کی  
 تاریخ وفات تقریباً ۶۱۵ھ متعین کی جا سکتی ہے۔

بسطام کی اولاد و اخلاف سے متعلق ہمارے  
 پاس بہت کم معلومات ہیں۔ اس کے بیٹے زینق کی  
 بیٹی حدراہ کی شادی الفرزدق سے ہونے والی تھی  
 لیکن تاریخ مقررہ سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا  
 [ابن حزم: جمہرة، ص ۲۰۶، ۳۲۶]۔

بسطام کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ  
 عیسائی تھا۔ وہ اپنے قبیلے کا سید [سردار] تھا۔  
 جب اس کی موت کی خبر اس کے قبیلے والوں کو  
 پہنچی تو انہوں نے اظہارِ غم کے طور پر اپنے  
 خیمے گرا دیے۔ اس کی موت پر بہت سے مرثیے  
 کہے گئے اور اس کی ذات کو بدوی جرات و  
 شجاعت کا نمونہ اور مثال قرار دیا گیا۔ لیکن  
 الجاحظ کے وقت تک عراق کے شہروں کے مخلوط  
 شہری معاشرے میں اس کی شہرت کا آفتاب  
 غروب ہو چکا تھا اور لوگ اس کے مقابلے میں عنترہ  
 [بن شداد] کے قصے سننا زیادہ پسند کرتے تھے  
 (البیان، ۱ : ۳۴)، جو ان کے معاشرتی مساوات کے  
 میلانات سے فریب تر تھا (دیکھیے لوات، ت، بذیل مادہ  
 عنترہ از R. Blachère)۔

رو سے وہ خاص رعایت جو وزیر اعظم محمود [پاشا] نے شاہ بوسنہ کے لیے منظور کی تھی منسوخ کر دی گئی، اور پھر . . . اس پر بھی تیار ہو گیا کہ اس بادشاہ کے لیے جو موت کا حکم دیا گیا تھا اس کا نفاذ اپنے ہاتھ سے کرے، چنانچہ اس نے واقعی اس کا سر کاٹ لیا۔ البسطامی نے عربی اور فارسی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں الزمخشری کی الکشاف کی شرح بھی شامل ہے۔ بسطامی فخر الدین الرازی کے اخلاف میں سے تھا۔

مآخذ: (۱) Hammer: *Gesch. des Osman*;

Reiches، بمدد اشاریہ؛ (۲) سعد الدین: تاج التواریخ، ۱: ۳۹۶؛ (۳) [۱، ۲، ۳]، ع، بذیل مادہ۔

(CL. HUART)

**بسطہ: Basta**، ہسپانوی نام بازا Baza، جسے جغرافیہ قدیم میں بستی کہا گیا ہے، [پرانہ رومی نام یاستی تھا، بعد کو بستہ یا بستیانہ Bastiana ہوا۔ عربی نام بسطہ اسی رومی نام سے بنا ہے۔ آج کل وہ بازا کہلاتا ہے: اندلس کا تاریخی جغرافیہ، ص ۱۵۶]۔ آج کل صوبہ غرناطہ (Granada) کی ایک قسمت (Partido) کا صدر مقام ہے۔ یہ غرناطہ سے شمال مشرق کی جانب سڑک کے راستے ایک سو تیس کیلومیٹر ہے۔ الادریسی بتاتا ہے یہ درمیانے درجے کا خوشحال اور خوب آباد شہر تھا، جو ایک خوشگوار مقام پر واقع تھا، نیز قاعدہ بند تھا اور اس میں متعدد بازار تھے اور ایک تجارتی مرکز بھی تھا، جہاں مقامی اہل حرفہ طرح طرح کی صنعت کاریوں میں مصروف رہتے تھے۔ شہر میں شہتوت کے درختوں کی فراوانی تھی [اور ریشم کے کیڑے پالے جاتے تھے]، اس سبب سے یہاں ریشم کی صنعت وسیع پیمانے پر تھی بازار زیتون کے باغوں اور مختلف اقسام کے پھلوں کے درختوں سے بھی مالا مال تھا۔ یہیں وہ کارخانے

وقت عثمانی ترکوں کا دارالخلافہ اور سلطان کی قیام گاہ تھا۔ وہاں اسے سلطان مراد ثانی کا تقرب حاصل ہوا، جو علم و فضل کا بڑا سرپرست تھا۔ البسطامی کی بہت سی تصانیف سلطان موصوف کے نام سے منسوب ہیں۔ ۵۸۵۸/۱۴۵۴ء میں برسہ میں اس کا انتقال ہوا [تاریخ و سیر کا عالم تھا]۔

البسطامی صوفی مشرب تھا اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے وہ حروفی [رک باں] درویشوں کے سلسلے سے منسلک تھا، جو ابجد کے حروف اور ان کے مراتب کو صوفیاندہمیت دیتے تھے۔ (دیکھیے اس کی کتاب کشف اسرار الحروف اور شمس الآفاق فی علم الحروف، جو ۵۸۲۶/۱۴۲۳ء میں لکھی گئی)۔ اس کی اسی قسم کی کتابوں میں سے ایک مفتاح الجفر الجامع بھی ہے۔ اس نے تصوف پر متعدد کتابیں لکھیں، جن میں مباحج التوسل فی مباحج التوسل سب سے زیادہ معروف ہے۔ اس نے تاریخ اور جغرافیہ کے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا۔ اس کی اس قسم کی کتابوں میں اس کی وہ دائرۃ المعارف ہے جس کا نام الفوائج المسکئیۃ فی الفوائج المسکئیۃ ہے۔

مآخذ: (۱) براکلمان Brockelmann، ۲: ۳۰۰؛

(۲) حاجی خلیفہ (طبع Flügel)، ۳: ۳۶۸؛ (۳) JRAS،

۱۸۹۹ء، ص ۹۰۷؛ [(۴) الاعلام، ۴: ۹۱]۔

(M. SMITH)

**البسطامی: علاء الدین علی بن محمد، جو مصنفک (= چھوٹا مصنف) کہلاتا ہے، کیونکہ وہ چھوٹی عمر ہی سے میدان تصنیف و تالیف میں اتر آیا تھا۔ ۵۸۰۳/۱۴۰۰-۱۴۰۱ء میں بمقام بسطام پیدا ہوا۔ ۵۸۴۸/۱۴۴۴-۱۴۴۵ء میں ترکی میں بود و باش اختیار کی اور وہیں ۵۸۷۵/۱۴۷۰-۱۴۷۱ء میں وفات پائی۔ سلطان محمد ثانی کے ایمان سے اس نے ایک فتویٰ دے دیا، جس کی**



بسکرہ: الجزائر کے جنوب مشرق اور صحرا کے شمالی کنارے پر ایک قصبہ اور زبان کا نخلستان، جو سطح بحر سے ایک سو سے ایک سو بیس فٹ کی بلندی پر دریائی مٹی کی مغروٹی پہاڑی اور اوید [وادی] بسکرہ کے مغربی کنارے کے وسیع نشیب کے دہانے پر، جو اوراس [رک باں] کے تودہ کوہ سے لے کر کوہ اطلس کی مغربی صحرائی چوٹیوں تک پھیلا ہوا ہے، واقع ہے۔ یہ مقام ہمیشہ سے خانہ بدوشوں اور فاتح چرواہوں کی گزرگاہ رہا ہے۔ یہاں کے نیلکوں آسمان کی، جس پر شاید ہی کبھی بادل آتے ہوں، اور معتدل سرمائی آب و ہوا (ماہ جنوری میں اوسط درجہ حرارت ۱۱.۵۲ درجے [سینٹی گریڈ] = ۵۲ درجے فارن ہائٹ ہوتا ہے) کی وجہ سے اسے ایک سرمائی صحت افزا مقام کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے (یہاں بہت سے ہوٹل ہیں)۔ لیکن گرمیوں میں یہاں شدید گرمی ہوتی ہے (جولائی میں ۳۳.۳ درجے [سینٹی گریڈ] = ۹۲ درجے فارن ہائٹ) جو کھجوروں کے پکنے کے لیے اچھی ہوتی ہے۔ بارش بالعموم بہت کم (۱۵۶ ملی میٹر۔ ۱۰۱۴ انچ سالانہ) اور بہت بے قاعدہ ہوتی ہے۔ تیرہ سو ہیکٹر کے رقبے میں پھیلے ہوئے نخلستان میں پندرہ ہزار سے زیادہ کھجور کے درخت اور پھلوں کے ہزاروں دوسرے درخت ہیں۔ انہیں چشموں کے پانی سے، جسے نہروں کے ذریعے پھیلا یا گیا ہے سیراب کیا جاتا ہے۔ نخلستان کے جنوبی کنارے پر جو اور گندم کے وسیع نہایت ہیں، جو سردیوں کے فاضل پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔ یہاں فصل اپریل کے شروع میں کاٹی جاتی ہے۔ آبادی کا یورپی حصہ، جس نے مغربی شہر کی صورت اختیار کر لی ہے اور جو انتظامی، تجارتی اور سیاحی مرکز ہے، متوازی خطوط میں بنایا گیا ہے؛ اسے نخلستان سے دریا کے اوپر کی سمت ایک قلعے کے قریب

(طروز) واقع تھے جن میں چانمازیں یا مصلے (جنہیں بسکی کہا جاتا تھا) بنتے تھے۔ یہ زرہفت سے تیار کیے جاتے تھے اور (خوبی کے اعتبار سے) بے مثل مانے جاتے تھے۔ یہاں سرمہ (کحل یا Sulphide of Antimony)، جو آنکھوں کی صفائی کے لیے استعمال ہوتا تھا، شہر کے قریب ایک پہاڑ سے دستیاب ہوتا تھا، جو جبل الکحل کہلاتا تھا۔ اموی خلافت کے زمانے میں بازار میں فرقہ مضارب کے لوگ خاصی تعداد میں موجود تھے، جس کا استغنی نظام (Bishopric) طلیطلہ (Toledo) کے ماتحت تھا۔ البیان کے آخری حصے میں... اس شہر پر الموحدین کے عہد حکومت کے نئی والیوں کے نام ملتے ہیں۔ ۵۶۳۵/۱۲۳۷ء میں بازار، نصری سلطنت [رک بہ نصر، بنو] کے بانی محمد بن یوسف بن احمد کے قبضے میں آ گیا۔

مآخذ: (۱) الادریسی، متن، ص ۲۰۲، ترجمہ ص ۲۳۷: (۲) یاقوت، ۱: ۶۲۴: (۳) القزوینی: Cosm.، ۲: ۳۴۴، العذری کے مطابق: (۴) E. Lévi-Provençal: La Peninsule iberique، ص ۵۶ تا ۵۷۔

(A. HUCI MIRANDA)

[تعلیقہ: مسلمان ۵۹۴/۱۲۱۳ء میں اس شہر پر قابض ہوئے اور نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے آخر تک یہ برابر اسلامی حکومت میں رہا، دور آخر میں غرناطہ کے تین بڑے شہروں میں سے ایک یہ بھی تھا۔ مسلمانوں کے زمانے میں یہاں تجارت کی گرم بازاری تھی اور آبادی پچاس ہزار کے قریب تھی۔ ۵۸۹۵/۱۴۸۹ء میں فرڈیننڈ اور ازابیلہ نے اس پر قبضہ کیا۔ گویا آٹھ سو برس تک یہاں مسلمانوں کی حکومت رہی (اندلس کی تاریخی جغرافیہ، صفحہ ۱۵۶)۔ اب آبادی اسی ہزار کے قریب ہے۔

(غلام رسول مہر)

تعمیر کیا گیا تھا۔ مسلمان کاشت کار دیہاتوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور کچھ کچی اینٹوں کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ یہ سب گاؤں زیادہ تر جنوب میں ایک قدیم ترک قلعے کے ارد گرد واقع ہیں۔ ان دیہات کے نام یہ ہیں: مسید Msid، باب الدرب، رأس القرية (al-Guerria)، سیدی برکات مجنشه (Medjeniche) اور قیداشہ (= قداشہ) (Gueddacha)۔ ان دیہات سے ذرا ہٹ کر شہر کے کنارے بنی مرہ، الکورہ، فلیاش Filiach اور عالیہ Aliya کے دیہات ہیں۔ بسکرہ زبان کے نخلستانوں کا سب سے بڑا مرکز ہے اور یہاں کی آبادی باون ہزار پانچ سو ہے، جن میں سے کچھ یورپی ہیں۔ یہاں تَغْرَت (Touggourt) اور قسطنطین کے درمیان ریل چلتی ہے اور پائپ لائن بھی ہے، جس کے ذریعے ۱۹۵۸ء کے بعد سے حسای مسعود Hassi Messoud کا پٹرول فلپ ولہ Phillipeville تک پہنچایا جاتا ہے اور جسے بجایہ تک بڑھا دینے کی تجویز ہے۔

بسکرہ قدیم شہر وشکرہ Vescara کی جگہ بنا ہوا ہے۔ یہ شہر رومی چوکیوں (Limes posts) میں سے ایک چوکی تھی، جس پر بوزنطیوں کا قبضہ یقیناً نہیں تھا۔ اس نام کا سراغ تیسری صدی ہجری/گیارہویں [بہ تصحیح نویں] صدی عیسوی سے ملتا ہے، جب کہ القیروان کے بنو اغلب نے اسے زاب (جمع زبان) کے سارے صوبے سمیت فتح کیا تھا، جس کا صدر مقام اس زمانے میں طَبْنَه تھا، جو مشرقی ہُدْنَه Hodna میں واقع ہے۔ بنو حماد کے زیر حکومت بسکرہ خود مختار تھا اور اس کا انتظام شیوخ کی ایک کونسل کے ہاتھ میں تھا۔ اس کونسل کی قیادت کے لیے بنو رمان اور بنو سندی برابر لڑتے رہتے تھے۔ البکری (Slane) کا ترجمہ، بار دوم، ص ۱۱۱ تا ۱۱۲) اس زمانے کے بسکرہ کی خوبصورتی اور

خوشحالی کا تذکرہ کرتا ہے اور اس کی فصیل، شاداب نخلستان اور بربر چرواہوں مگر اوہ اور سدراتہ کا حال لکھتا ہے جو اس کے گرد و پیش خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں الموحدين کے دور میں بسکرہ نے طَبْنَه کی جگہ لے لی اور بالآخر یہ تہودہ کا قائم مقام بن گیا، جو زمانہ قدیم میں تبودیوس Tobudeos کے نام سے مشہور تھا۔ ادریسی کے بیان کے مطابق یہ شہر ہمیشہ ہی سے اچھی طرح قلعہ بند تھا۔ زاب پر مشرق سے آنے والے اَبِج (ہلالی) عربوں نے قبضہ کر لیا ہے۔ اَبِج وفاق میں سے لطیف قبیلے کے ایک مقیم خاندان بنو مزنی نے بنو رمان سے اقتدار حاصل کرنا چاہا۔ بنو رمان کے ملک کے ساتھ پرانے تعلقات تھے۔ انہوں نے ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی میں تونس کے بنو حفص کی مدد سے کامیابی حاصل کی اور بسکرہ حفصی ریاستوں کے تمام جنوب مغربی علاقے کا ایک بڑا شہر بن گیا، لیکن حقیقت میں یہ ایک خوش حال اور آزاد حکومت کا صدر مقام تھا، جہاں فافلے آتے تھے اور تل کی اشیا کے بدلے صحرا کی پیداوار لے جاتے تھے۔

آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں بنو مزنی نے کئی مرتبہ بجایہ، تلمسان یا فیض کے حکمرانوں کے مفاد کی خاطر بنو حفص کے خلاف باغیانہ سرگرمیاں دکھائیں۔ پھر ۸۰۴ھ / ۱۴۰۱-۱۴۰۲ء میں شاہ ابو فارس نے بسکرہ پر تونس کا اقتدار دوبارہ قائم کیا۔ اس نے بنو مزنی کے آخری سردار کو گرفتار کر لیا اور اس کی جگہ اپنی پسند کے کسی آدمی کو قائد مقرر کر دیا۔

نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے آخر میں بنو حفص کے زوال پر بسکرہ اور زاب



میں نُغْرَت (Touggart) کے فوجی علاقے سے ملحق تھا۔ یہ شہر اب مخلوط برکنوں کا مرکز ہے اور اسے پورے اختیارات حاصل ہیں۔ یہ شہر حال ہی میں (۱۹۵۶ء میں) بتند Batna کے جدید ضلع کی ماتحت کوتوالی (sous-prefecture) کا صدر مقام بن گیا ہے اور زبان کا اقتصادی مرکز ہے۔

(J. DESPOIS)

بِسْكْرَة اَبَا زَه: (یا بِشْكْرَة اَبَا زَه) ایک مسلمان قوم کا روسی نام، جو ایرو۔ قفقاری (Ibero-Caucasian) خاندان کی ابسگو۔ چرکسی (Abasgo-Circassian) (ادیغہ) شاخ میں شامل ہے۔ نسلیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کباردیوں (Kabardians) سے قریب ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے آغاز سے ابازہ قوم مختلف بولیاں بولنے والی دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ شمالی یا تپنتہ گروہ، جو چھے قبائل پر مشتمل تھا اور شکاروہ گروہ۔ اس میں بھی چھے قبائل تھے۔ ۱۹۲۶ء کی سر شماری کی رو سے ابازہ کی تعداد ۱۳۸۲۵ تھی لیکن لاوروف (Lavrov) کا خیال ہے کہ ان کی اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے اور آج کل یہ شاید بیس ہزار کے قریب ہوگی۔ ابازہ کی اکثریت (۱۹۲۶ء میں کل تعداد ۱۳۸۲۵ میں سے ۱۰۹۹۳) سرکیشیا کے خود مختار علاقے اور زلینجچک کلان و خرد اور کوبن اور کاما ندیوں کی بلند وادیوں میں آباد ہے۔ یہاں ان کے تیرہ گاؤں ہیں۔ ان کے علاوہ سٹیوروپول Stavropol کے پرگنے (Krai) میں کسلووولسک Kislovodsk کے قریب دو اور ابازہ گاؤں ہیں۔ نیز ادیغہ کے خود مختار علاقے میں چرکسی اور نوغای Nogai مواقع میں بھی ابازہ کے چند ایک گروہ آباد ہیں۔

ابازہ ان کثیراللسان قبائل کی نسل سے ہیں

جو سنہ عیسوی کے آغاز کے وقت بحیرہ اسود کے

خانہ بدوش قباوئہ عربوں کی جاگیر بن گئے۔ ۱۰ویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں محمد بن حسن الوزان الزیاتی (Leo Africanus) کی تحریر (ترجمہ از Epaulard، ص ۲۴۰) کے مطابق ”شہر میں اب بھی خاضی آبادی تھی“ لیکن لوگ غریب تھے۔ یہی زمانہ ہے جب ترنوں نے ۱۵۴۹/۱۵۴۴ء میں مسن آٹا کی اور ۱۵۵۶/۱۵۵۲ء میں صلاح رئیس کی دو یلغاروں کے بعد ایک محافظ فوج رکھنے اور قلعہ تعمیر کرنے کا تہیہ کیا۔ اقدار عملاً قبیلہ بوعکاز کے سرداروں کے ہاتھوں میں تھا، جنہیں شیخ العرب کا لقب ملا ہوا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں بے صلاح قسطنطینی نے ان کی قوت محسوس کر کے بن جناح نامی قبیلے کو ان کا حریف بنا کر کھڑا کیا۔ بسکرہ کو اس حریفانہ رقابت اور ترکوں کے ناپسندیدہ عمل سے سخت نقصان پہنچا۔ یہاں کے باشندوں نے آہستہ آہستہ شہر خالی کر دیا اور نخلستان میں پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے دیہات میں منتشر ہو گئے۔

فرانسیسیوں کے الجزائر میں اترنے (۱۸۳۰ء) کے بعد بھی رقابت جاری رہی۔ بوعکاز قبیلے کے نمائندے فرحت بن سعید نے عبدالقادر سے مدد طلب کی، لیکن بن جناح قبیلہ قسطنطین کے قبضے کے بعد ۱۸۳۸ء میں فرانس سے مل گیا۔ بسکرہ پر ۱۸۳۴ء میں اومالہ Aumale کے ڈیوک نے قبضہ کر لیا۔ اگلے سال ایک مستقل محافظ فوج قائم کی گئی اور قدیم قصبے کی جگہ ایک قلعہ تعمیر کیا گیا۔ قبیلہ بن جناح کا اقتدار اب بھی قائم رہا اور اس علاقے میں بڑے بڑے عہدے انہیں کے قبضے میں رہے۔ کچھ عرصہ ہوا [۱۹۳۸ء میں] انہوں نے قبیلہ بوعکاز سے سمجھوتا کر لیا ہے اور اب وہ ان کے حلیف ہیں۔ بسکرہ اب ایک خوشحال مرکزی مقام اور اس ضلع کا اہم ترین شہر ہے جو کسی زمانے

جد و جہد کی حمایت کی - روسیوں کی فتح کے بعد، جو ۱۸۵۸ء اور ۱۸۶۳ء کے مابین ہوئی تھی، شکاروہ کی اثریت (تم، قزل پک، بگ، چگری اور مسلبای قبائل) ترکی کو ہجرت کر گئے - سرکاری بیانات کے مطابق ان تارکانِ وطن کی تعداد تیس ہزار بتائی جاتی ہے لیکن یہ اندازہ اصل سے بہت کم معلوم ہوتا ہے - سرکیشیا کی جنگوں کے بعد اس علاقے میں صرف نو ہزار نوسو اکیس ابازہ باقی رہ گئے تھے (Čistovie dannie o gorskom i pročem : E. Felitsin) در *musulmanskom noselenii Kubanskoi oblasti*، *Sbornik Svedenii o Kavkaze*، تفلیس ۱۸۸۵ء، ۹ : ۸۷ تا ۹۴)۔

ابازہ کے قبول اسلام کا آغاز (جو قبل ازیں ارواح پرست یا عیسائی تھے) شمالی قفقاز کی طرف ان کی نقل مکانی کے بعد ہوا جب سے کہ ان کا میل جول قرم (Crimea) کے تاتاریوں اور نوغای کے ساتھ ہونے لگا - انہوں نے ان اقوام کی عادات اور نظام تنویم (جو بارہ بارہ سال کے حیوانی دوروں پر مشتمل تھا) کے ساتھ ساتھ حنفی مسلک اختیار کر لیا - ان کی تبدیلی مذہب کی رفتار مست تھی، چنانچہ سترھویں صدی عیسوی کے اختتام تک قریب قریب سارے قبائل، جو کوبن کے جنوب میں آباد تھے، ارواح پرست یا عیسائی ہی تھے (حسین ہزار فن، حوالہ در V.D. Smirnov : *Krimskoie Khānstvo pod verkhovenstvom Ottomanskoi Porti do načala XVIII veka*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۸۷ء، ص ۳۷) - اولیا چلبی وثوق سے کہتا ہے کہ پیر ڈرا، جن کا شمار اہم ترین ابازہ قبائل میں ہوتا ہے، مسلمان نہیں - اٹھارھویں صدی کے خاتمے تک تقریباً تمام تپنتہ اسلام قبول کر چکے تھے لیکن P.S. Pallas کی ان کے علاقے میں آمد کے وقت تک شکاروہ عیسائی ہی تھے اور اسلام صرف اعلیٰ طبقے

سواحل پر، موجودہ زمانے کے ابخازیہ کے شمال مغرب میں رہتے تھے - اور چند صدیوں میں گھل مل کر ایک قومی وحدت بن گئے، جس نے ابخاز کا نام پایا۔ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں اکثر ابازہ نے ساحلی علاقے میں (تواپسہ = Tuapse اور بزیب = Bzib کے درمیان) اپنا اصلی وطن چھوڑ کر قفقاز کو عبور کیا اور کباردیوں کو نکال کر اس علاقے میں بس گئے جہاں وہ آج کل رہتے ہیں - اس کے بعد سے انہیں برابر سرکیشیا والوں کی مخاصمت کا سامنا کرنا پڑا اور ان کی تاریخ ایک سست رفتار مگر مسلسل انحطاط کی مظہر ہے - سولھویں صدی کے خاتمے پر ابازہ قبائل نے جو قبل ازیں اس علاقے پر مسلط تھے، طوعاً و کرہاً کباردی اور بسلنی (Beslenci) حکمرانوں کی اطاعت تسلیم کر لی - اسی زمانے میں (عہد مراد ثالث) ترکوں نے اپنے زیر حفاظت علاقے کی حدود میں مشرقی قفقاز کو بھی شامل کر لیا لیکن عہد نامہ بلغراد کی رو سے کباردیا سے دستکش ہو گئے اور اسے ایک خود مختار ریاست تسلیم کر لیا گیا - اس وقت ترکوں کی سرحد دریائے کوبن کے ساتھ ساتھ جاتی تھی اور تپنتہ قبائل، جو اس دریا کے دونوں کناروں پر بدوی زندگی بسر کر رہے تھے، خود مختار ہو گئے اور واضح طور پر کسی حکومت کے بھی مطیع نہ رہے - عہد نامہ کوچک قینارجہ (۱۷۷۴ء) کے بعد روسیوں نے کباردیا پر قبضہ جمالیہ اور ۱۸۰۲ء میں ابازہ کے علاقے کا بہت بڑا حصہ نوغای قوم کے علاقے کے ساتھ شامل کر کے اسے ایک خاص ضلع (Pristavstvo) کی شکل دے دی گئی، جس کا نظم و نسق براہ راست روسیوں کے ہاتھ میں تھا - قفقاز کی جنگوں میں ابازہ اطاعت کے اعتبار سے بٹ گئے - تپنتہ روسیوں کے حلیف ہو گئے اور شکاروہ نے مریدیوں (Muridists) کی



تھی، تاہم وہ اپنے آقا تبدیل کر سکتے تھے اور خود اپنے انوی یا لگ رکھ سکتے تھے۔ ان کے اوپر وہ طبقہ تھا جو تعداد میں سب سے زیادہ تھا یعنی آزاد کاشتکار یا اکوی (= akavi یا تلنک شو = t'akashaw)۔ پھر طبقہ امرا تھا، جو چھوٹے امرا (امیستہ amista) اور بڑے امرا (امیستدی Amistadi) (شکاروہ کے یہاں تود tawad) پر مشتمل تھا، چھوٹے امرا اور بڑے ملوک یا امرا کے مصاحب و حشم ہوتے جو خود اپنے خدم و حشم رکھ سکتے تھے۔ اس معاشرے کا بلند ترین طبقہ "ملوک" کا تھا۔ جو اپنے اپنے خیلوں کے سردار یعنی اخوا اور بسکنی [لیکن قبلا، فرانسیسی: Besteneis] اور لباردی فرمانرواؤں کے باجگذار ہوتے تھے۔ ان کی جگہ سرکیشیا کے طبقہ امرا (پشہ pshə) میں نہیں بلکہ اس سے کمتر درجے کے طبقہ تلکووتش میں ہوتی تھی۔ اخوا کی وہ اولاد جو ادنیٰ طبقے کی عورتوں سے ہوتی ان کی ایک علیحدہ جماعت "تمہ" بن گئی تھی۔

انقلاب اکتوبر تک بلکہ سوویت حکومت کے ابتدائی برسوں میں بھی ابازہ نے قبائلی سرداری اور جاگیرداری کی رسوم برقرار رکھیں (مثلاً قبیلے کی شاخوں میں تقسیم، خون کا بدلہ، کالیم Kaiym، اتالک atalik وغیرہ)۔

### زبان اور ادب

ابازہ زبان ایرو۔ قفقازی زبانوں کی شاخ ایجازو۔ ادیغہ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ ایجاز سے اس قدر قریب ہے کہ بعض اوقات اسے محض اس زبان کی ایک بولی ہی سمجھ لیا جاتا ہے۔ لیکن اس میں بعض لباردی خصائص بھی موجود ہیں۔ یہاں دو بولیاں ہیں: آشکرہ جنوب میں بولی جاتی ہے۔ اس کی بھی دو ضمنی شاخیں ہیں یعنی آپسوا اول Aspsua اول کی اور دو۔ری

تک محدود تھا (Bermerkungen auf einer Reise and die südlichen Statthaltertschaften des Russischen Reichs in den Jahren 1793 und 1794، لائپزگ ۱۷۹۹ء، ص ۳۹۵)۔ اسی زمانے میں J. Reineggs (Allgemeine historisch-topographische Beschreibung des Kaukasus) نے سینٹ پیٹرزبرگ ۱۷۹۶ء، ص ۲۷۳ بتاتا ہے کہ تم، چغری اور بریکہ قبائل، جو شکاروہ گروہ میں سے ہیں، "دشمنان اسلام" تھے۔ ۱۸۰۷ء میں J. Klaproth (Reise in den Kaukasus und nach Georgien) نے مسآہدہ کیا کہ تم اسلام قبول کر چکے ہیں لیکن عقائد میں پتے نہ تھے]۔ اس کی تصدیق Kavkaz، شماره ۹۳، ۱۸۵۰ء میں مطبوعہ مقالہ Gorskie plēmēna živushčiē za Kuban'yu کے بلا نام مصنف سے ہوتی ہے۔ جس کے بیان کے مطابق تم "بہت ڈھیلے ڈھالے سے مسلمان" تھے، چغری "چند ایک امرا کے علاوہ اسلامی رسوم مذہبی کی کچھ زیادہ پروا نہ کرتے تھے"، بگ (اسی گروہ کا ایک قبیلہ) کے کوئی معین عقائد نہ تھے اور بریکہ صرف جزوی طور پر مسلمان ہوئے تھے۔ لہذا معلوم ہوتا ہے کہ شکاروہ نے پوری طرح انیسویں صدی عیسوی کے وسط ہی میں اسلام قبول کیا ہے جو سرکیشیا کے علاقے میں شامل [رک بان] کے نائب محمد امین کے تبلیغی جوش کا مرہون منت ہے۔

یسویں صدی عیسوی کے آغاز تک ابازہ قوم نے اپنا انتہائی قسم کا پیچیدہ جاگیرداری نظام، جو سرکیشیا والوں کے مماثل تھا، برقرار رکھا۔ اس معاشری ڈھانچے میں سب سے نیچے کے درجے پر غلام یا انوی (Unavi) سرکیشیا والوں کے یہاں انوت (Unawt) تھے۔ ان کے بعد دوامی رعیت (serfs) کھیروں یعنی لگ (= lig شکاروہ کے یہاں گریگ عوہ grig'vc) اور آزاد شدہ رعیت، آزت لگ (azat-lig) کا درجہ تھا۔ ان پر خاص خاص خدمتوں کی انجام دہی لازم

ابازہ زبان کے بارے میں دیکھیے: (۶) K. Lomatidsé: *Tapantskii dialekt abkhaszskogo yazika Tbilissi* ۱۹۳۴ء؛ اور بالخصوص (۷) G.P. Serdüčenko: *Abazinskie dialekti*، ماسکو ۱۹۳۹ء؛ (۸) *Abazinskaia Literatura* (Scientific Memoirs of the Pedagogical Institute of Rostov-on-Don ۱۹۳۹ء، جلد ۱)؛ اور (۹) *Abazinskaia Fonetika* (اسی مجموعے کی ج ۵)، Rostov-on-Don ۱۹۳۹ء۔ (A. BENNIGSEN اور H. CARRÉRE D'ENCAUSSE)

بِسْمِکَہ بے: رَکْ بہ بِشِکَہ Beshike.

بِسْمَلْنِی: رَکْ بہ چِرِکَس.

بِسْمِ اللّٰہ: رَکْ بہ بِسْمَلَة.

بِسْمِچِی: (Basmacıs) (=ازبکی زبان میں "راہزن"، "ڈاکو")۔ یہ نام روسیوں کی طرف سے ترکستانی مسلم اقوام کی اس انقلابی تحریک کو دیا گیا تھا جو سوویت حکام کے خلاف ۱۹۱۸ء میں شروع ہوئی اور ۱۹۳۰ء یا کچھ بعد میں ختم ہو گئی، رَکْ بہ: ترکستان، ازبک، تاجیک، خوقند، خیوہ، ترکمان، انور پاشا۔

[مأخذ: Serge A. Zenkovsky: *Pan-Turkism and Islam in Russia*، کمبرج (امریکہ) ۱۹۶۰ء، ہمد اشاریہ.]

(A BENNIGSEN)

بِسْمَلَة: (عربی)، لغوی اعتبار سے اسم مصدر ہے، جس کے معنی ہیں بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھنا یا لکھنا۔ جس طرح استعاذہ کا مطلب اَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّحِیْمِ کہنا اور حَمْدَلَة کا مطلب الحمد للہ کہنا ہے۔ چنانچہ عرب کہتے ہیں: بِسْمَلِ الرَّجُلِ اِذَا قَالَ اَوْ کَتَبَ بِسْمِ اللّٰہِ یعنی بِسْمَلَة کے معنی ہیں جب کوئی شخص بِسْمِ اللّٰہِ زبان سے کہے یا لکھے (قَب لِسَانِ الْعَرَبِ، بذیل مادہ) کبھی کبھی بِسْمَلَة کے بجائے

ستارو staro اور نوو کوونسکو Novo-Kuvinskoe کی - دوسری بولی تپنتہ شمال میں بولی جاتی ہے۔ اس کی بھی ذہنی بولیاں دو ہیں یعنی کبندہ - البرگن Kubna-El'burgan کی اور پسز - کرسنو وستو چنو Psiz-Krasno Vastocnoe کی - انقلاب اکتوبر تک ابازہ زبان تحریری نہیں تھی - ۱۹۳۲ء میں اس کے لیے ایک ترمیم یافتہ روسی "رسم الخط" بنایا گیا اور اس زبان میں ایک صفحے کا چرکس ادیفہ زبان کے روزنامے چرکس کٹپ شچ (Čerkes K'apshc) میں اضافہ کیا گیا۔ ۱۹۳۹ء میں روسی رسم الخط کی جگہ (قدیم روسی) سراییلی Cyrillic نے لے لی اور ۱۹۴۰ء کے بعد سے ابازہ مصنفین کی تصنیفات پہلی بار اس رسم الخط میں شائع ہونے لگیں (تسکوف Tsekov اور تخیت سکوف Thkai sakov کی نظموں کے مجموعے، ژروف Zirov اور تبولوف Tabuloč کے چھوٹے ناول، افسانے)۔

مأخذ: (۱) L.I. Lavrov: *Abazini (Istoričesko-*

*Etnografičeski Očerk Kavkazskii Etnogra-* در *fičeskii Sbornik*، بو-آر-ایس-ایس اکادمی آوسائینسز، ماسکو ۱۹۵۵ء، ۵ تا ۴۸ (تاریخ اور علم الاقوام کی رو سے بہترین مطالعہ)؛ (۲) دیکھیے مصنف مذکور، در *Sovetskaia Etnografiia*، عدد ۴، ۱۹۴۶ء (Obezi)؛ (۳) Shora Bekmurzin Nogmov: *(russkikh letopisei Istorii Adikheiskogo naroda sostavlennaiia po predaniyam Kabardintsev*، تفلس ۱۸۶۱ء؛ سوویت حکومت کے عہد میں ابازہ کے حالات کے بارے میں وہ تصنیفات دیکھیے جو علاقہ خود مختار سرکیشیا سے متعلق ہیں، بالخصوص: (۴) نامعلوم مصنف: *20 let Stavropol' Čerkeskoi Avtonomoi oblasti Krasnaia* (۵) متعلقہ مضامین در چرکسی مجلہ *Čerkessia* (شمارہ ۲۳۷، ۲۳۵، ۲۳۹، بابت ۱۹۴۰ء)۔



۱ : ۸) نے صراحت کی ہے کہ اس بات پر امت اسلامیہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ بسم اللہ قرآن کریم کی آیت اور اس کا جز ہے، کیونکہ سورۃ النمل میں قرآن کے متن کے حصے کے طور پر وارد ہوئی ہے۔ البتہ اس مقام پر بسم اللہ مستقل آیت نہیں بلکہ آیت کا حصہ ہے (وہی کتاب، ۱ : ۱۲)۔

سورتوں کے اوائل میں بسم اللہ الرحمن الرحیم ان کا جز ہے یا نہیں اس سلسلے میں فقہائے اسلام میں امام مالک، امام اوزاعی، داؤد ظاہری اور ابن جریر الطبری کی رائے یہ ہے کہ سورۃ النمل کے متن میں واقع بسم اللہ کو چھوڑ کر باقی تمام سورتوں کے شروع میں بسم اللہ سورت کا جز نہیں (احکام القرآن، ۱ : ۹ تا ۱۱)۔ امام احمدؒ اور ایک روایت میں امام شافعیؒ اور فقہائے کوفہ و مکہ اور علمائے عراق کے نزدیک بسم اللہ سورۃ فاتحہ کا تو جز ہے مگر باقی سورتوں کا جز نہیں (وہی کتاب اور نصب الرایۃ، ۱ : ۳۲۷)۔ امام شافعیؒ اور ان کے متبعین کے نزدیک سورۃ براءۃ کو چھوڑ کر باقی تمام سورتوں کے شروع میں بسم اللہ بطور ایک آیت اور جز کے واقع ہوئی ہے (احکام القرآن، ۱ : ۹ تا ۱۱؛ نصب

الرایۃ، ۱ : ۳۲۷)۔ البعد؛ النشر فی القراءات العشر، ۱ : ۲۵۸)۔ (الآمدی نے شافعی مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل دلائل قلمبند کیے ہیں: (۱) حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سورت کا اختتام اور دوسری کا آغاز معلوم نہ کر سکتے تھے جب تک بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل نہ ہوتی؛ (۲) بسم اللہ ہر سورت کے آغاز میں قرآنی رسم خط میں آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے لکھی جاتی تھی؛ (۳) جب بعض لوگوں نے آغاز سورت میں بسم اللہ کی قراءت ترک کر دی تو حضرت

تسمیۃ بھی کہا جاتا ہے اور دونوں کا مطلب اللہ کا نام لیکر کوئی کام شروع کرنا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

لَقَدْ بَسَمْتُ لَيْلَى غَدَاةً لَقِيَتْهَا  
فِيَا حَبِذَا ذَاكَ الْحَبِيبِ الْمَسْمُومِ

(جب میں ایک صبح لیلیٰ سے ملا تو وہ بسم اللہ پڑھنے لگی، کیا کہنا اس بسم اللہ کہنے والے محبوب کا!)

قرآن کریم میں سورۃ براءۃ [رکباً] کے سوا ہر سورت کا آغاز بسم اللہ... سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ متن قرآن مجید میں یہ آیت دو جگہ اور وارد ہوئی ہے، ایک جگہ مکمل شکل میں اور وہ حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کے ضمن میں: إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمٍ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ (۲۷ [النمل]: ۳۰) (= یہ خط سلیمان کی جانب سے ہے اور یہ اللہ کے نام سے شروع ہوتا ہے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے) اور دوسری جگہ اختصار کے ساتھ وارد ہوئی ہے اور وہ حضرت نوحؑ کے تصریح میں وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرَاهَا وَمُرْسَاهَا (۱۱ [هود]: ۴۱) (= حضرت نوحؑ نے لوگوں سے کہا اس کشتی میں سوار ہو جاؤ اس کا چلنا اور لنگر انداز ہونا اللہ کے نام سے ہے)۔

بسم اللہ کے سلسلے میں فقہائے اسلام میں یہ بحث ہے کہ جن قرآنی سورتوں کے آغاز میں بسم اللہ... آیا ہے یہ ان سورتوں کی ایک آیت اور جز ہے یا نہیں؟ پھر یہ مستقل آیت ہے یا دوسری آیات کا جز ہے؟ اسی طرح اس اختلاف رائے سے مترتب ہونے والے مسائل میں بھی اختلاف ہے، مثلاً بسم اللہ کو نماز میں بلند آواز سے پڑھنا یا نہ پڑھنا اور اس کے بغیر نماز کا مکمل ہونا یا نہ ہونا وغیرہ (دیکھیے جصاص: احکام القرآن، ۱ : ۶)۔ البعد؛ النشر فی القراءات العشر، ۱ : ۲۶۲)۔ ابوبکر جصاص (احکام القرآن

محمدؐ، زفرؐ اور امام شافعیؒ کا قول یہ ہے کہ استعاذہ کے بعد اور سورہ فاتحہ سے قبل بسم اللہ پڑھنا چاہیے۔ جہری نمازوں میں بلند آواز سے بسم اللہ پڑھنے کے بارے میں بھی اختلاف رائے ہے۔ حنفی علما اور امام ثوریؒ کا قول ہے کہ اخفا کیا جائے، امام ابن ابی لیلیٰؒ کا قول ہے کہ چاہے تو بالجہر پڑھے چاہے تو اخفا کرے اور امام شافعیؒ کے نزدیک بسم اللہ بھی بالجہر پڑھنی چاہیے اور یہ اختلاف صرف اسی صورت میں ہے جب جہری نمازیں یا جماعت پڑھی جائیں (احکام القرآن، ۱: ۱۵)۔

استاذ احمد شاکر (دیکھیے حاشیہ مقالہ بسملة (۱)، ع) نے امام زیلیؒ (نصب الرایۃ، ۱: ۳۲۸) کے بیان کی بنیاد پر کہا ہے کہ ہماری رائے میں وہ قراءت باطل ہے جس میں بسملہ کو سورتوں کے درمیان سے حذف کرنا یا ترک کرنا جائز قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہ بات صحت قراءت کی ان شرائط کے خلاف ہے جنہیں ابوالخیر ابن الجزری نے اپنی کتاب النشرفی القراءات العشر کے مقدمے میں بیان کیا ہے (۱: ۹) جن میں سے ایک شرط یہ ہے کہ ہر قراءت مصحف عثمانیہ کے مطابق بھی ہو۔ اور اس بات پر اہل علم کا اتفاق ہے کہ مصحف عثمانیہ میں سورہ براءۃ کے سوا ہر سورت کے شروع میں بسملہ لکھی گئی ہے اور یہ کہ ان کی صحت پر صحابہؓ کا اجماع ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ صحابہؓ نے قرآن میں کوئی کلمہ غیر کلام اللہ کا شامل نہیں ہونے دیا اور اس بات کی امت نے بڑی حفاظت کی ہے اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کی ایک سو چودہ سورتوں میں سے ایک سو تیرہ کے شروع میں جو بسم اللہ مکتوب ہے وہ کلام اللہ ہے اور قرآن کا حصہ ہے۔ استاذ احمد محمد شاکر کی تائید ابوبکر جصاص

ابن عباسؓ نے فرمایا کہ شیطان نے لوگوں سے ایک آیت قرآنی چوری کر لی ہے (الاحکام فی اصول الأحکام، ص ۲۳۴، بعد، مصر ۱۹۱۴ء)۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بسم اللہ چونکہ سورہ فاتحہ کا جز ہے اس لیے جو شخص نماز میں اسے نہیں پڑھے گا اسے نماز کا اعادہ کرنا پڑے گا (احکام القرآن، ۱: ۸)۔ ائمہ قراءت بالاجماع بسم اللہ کو سورہ براءۃ کے سوا ہر سورہ کے شروع میں ضروری قرار دیتے ہیں اور کسی قاری نے بھی اس کے بغیر قراءت کی ابتدا کو جائز نہیں رکھا (النشر فی القراءات العشر، ۱: ۲۶۲، بعد)۔ آج بھی عالم اسلام کے قاریوں کا یہی معمول ہے بلکہ کسی رکوع یا آیت کی تلاوت کا آغاز بھی استعاذہ اور بسملہ سے ہوتا ہے۔ البتہ جب مسلسل تلاوت قرآن کے دوران ایک سورت ختم ہو اور دوسری سورت شروع ہو تو اس صورت میں بسملہ پڑھنے یا نہ پڑھنے کے سلسلے میں قراء کا اختلاف ہے۔ قاری ابن کثیر، عاصم، کسائی اور قالون وغیرہ کے نزدیک بسم اللہ پڑھ کر ایک سورت کو دوسری سورت سے الگ (فصل) کرنا ضروری ہے سورہ الانفال اور براءۃ کے سوا کہ ان کے درمیان بسملہ نہیں ہے (النشرفی القراءات العشر، ۱: ۲۵۸) لیکن قاری حمزہ اور خلف کا مشہور مسلک یہ ہے کہ دوران تلاوت بسم اللہ پڑھ کر دونوں سورتوں کو الگ (فصل) نہیں کرنا چاہیے، بلکہ بسم اللہ کے بغیر دونوں سورتوں کو ملا دینا (وصل) چاہیے (وہی کتاب)۔ ابو عمرو، ابن عامر اور ورش کے مسلک کے بارے میں مختلف روایات ہیں: کہیں فصل، کہیں وصل اور کہیں سکت یعنی اتنی دیر خاموش رہنا جتنی دیر میں بسم اللہ پڑھی جاتی ہے (وہی کتاب)۔ نماز میں بسملہ کے متعلق امام ابو حنیفہؒ، اور حضرات ابن ابی لیلیٰؒ، حسن بن صالحؒ، ابو یوسفؒ،



ظاہری اور ان کے متبعین۔ امام احمدؒ سے بھی یہی منقول ہے۔ علمائے احناف کی ایک جماعت کا بھی یہی مسلک ہے اور بقول ابوبکر رازیؒ، امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کا مقتضا بھی یہی ہے اور اہل علم محققین کا بھی یہی قول ہے۔

بسملہ کے سورۃ الفاتحہ کے جز ہونے کے بارے میں بھی دو مسلک ہیں۔ ایک یہ کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سورۃ الفاتحہ کی ایک آیت ہے، اس لیے جہاں سورۃ الفاتحہ کی قراءت واجب ہوگی وہاں بسملہ بھی واجب ہے۔ دوسرا مسلک جسے امام زیلعی صحیح ترین مسلک قرار دینے میں یہ ہے کہ الفاتحہ اور دیگر سورتوں میں کوئی فرق نہیں، ان آیت بسملہ کی جو حیثیت دیگر سورتوں کے اوائل میں ہوگی، وہی الفاتحہ کے شروع میں بھی ہوگی۔ اسی طرح نماز میں بسملہ کی قراءت کے بارے میں بھی تین اقوال ہیں۔ امام شافعیؒ، ایک روایت میں امام احمدؒ بھی اور علمائے حدیث کے ایک گروہ کے نزدیک نماز میں سورۃ الفاتحہ کی باقی آیات کی طرح بسملہ کی قراءت بھی واجب ہے، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ ہے کہ سراً یا جہراً بسملہ کی قراءت مکروہ ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس کی قراءت جائز بلکہ مستحب ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور مشہور روایت میں امام احمدؒ بن حنبل اور اکثریت اہل حدیث کا بھی مسلک ہے (نصب الراية، ۱ : ۲۳۷ بعد)۔ قواعد کی رو سے بسم اللہ کی ”با“ چونکہ حرف جر ہے اور ہر حرف جر سے قبل ایک فعل ہونا لازمی ہے جس سے جار اور مجرور متعلق ہوتے ہیں اس لیے اس سے پہلے ایک فعل محذوف مقدر سمجھا جاتا ہے مثلاً اقرأ یا ابدأ گویا اصل عبارت یوں ہوگی : اقرأ (یا ابدأ) بِسْمِ اللّٰهِ (میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے) (دیکھیے احکام القرآن، ۱ : ۷)۔ تحریر میں یہ دستور بن گیا ہے کہ اسم کا الف حذف کر دیا جاتا

(احکام القرآن، ۱ : ۱۲) کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ بسم اللہ جہاں جہاں قرآن میں مکتوب ہے وہاں بحیثیت آیت قرآنی مکتوب ہے البتہ اس کے سورۃ الفاتحہ یا دیگر سورتوں کا جز ہونے کے بارے میں اختلاف رائے جائز ہے۔ جصاص کے نزدیک سورتوں کے آغاز میں بسملہ ابتداء قراءت کے لیے مستقل آیت کے طور پر نازل ہوتی رہی ہے سوا آغاز سورۃ براءۃ کے اور اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے کہ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يَعْرِفُ فَضْلَ السُّورَةِ حَتَّى يَنْزِلَ عَلَيْهِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (نصب الراية، ۱ : ۳۲۷) اور امام محمدؒ کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے کہ جب ان سے سوال کیا گیا کہ بسملہ قرآن کا جز ہے تو انہوں نے کہا کہ جو کچھ مصحف کے اندر ہے سب کا سب قرآن ہے (السرخسی : المبسوط، ۱ : ۱۶)۔ امام زیلعیؒ (نصب الراية، ۱ : ۳۳۷) لکھتے ہیں کہ بسملہ کے جزو قرآن ہونے کے سلسلے میں علما کے تین مسلک ہیں : ایک طرف تو دو انتہا پسند مسلک ہیں اور ایک ان کے درمیان مسلک اعتدال ہے۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ بسم اللہ قرآن کا جز نہیں سوا ایک سورۃ النمل کے جیسا کہ امام مالکؒ اور ایک گروہ احناف اور ایک قول احمدؒ بن حنبل سے منسوب ہے؛ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ بسم اللہ ہر سورت کی ایک آیت اور جز ہے جیسا کہ امام شافعی کا مشہور مسلک ہے۔ مسلک اعتدال یہ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں بسم اللہ مکتوب ہے وہ قرآن کا حصہ ہے لیکن یہ ہر سورت کا جز بھی نہیں بلکہ ہر سورت کے شروع میں مستقل آیت کے طور پر الگ مکتوب ہے اور ہر سورت کے شروع میں الگ اور مستقل آیت کے طور پر اس کی تلاوت ہوتی ہے۔ اس مسلک کو پسند کرنے والے ہیں عبداللہ بن المبارک، داؤد

وہ ناقص اور برکت و اعانتِ ربانی سے محروم رہے گا۔ ابوبکر الجصاص صاحب احکام القرآن (۱: ۱۷) کا بیان ہے کہ امورِ زندگی کا اللہ کے نام سے آغاز کرنے کا مقصد باعث برکت ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ عز و جل کی تعظیم کا بھی اظہار ہے۔ اور یہ دین اسلام کا شعار اور علامت ہے کہ مومن اللہ کے نام سے ہر کام کا آغاز کرتا ہے۔ اس سے شیطانی قوتیں بھی دور بھاگتی ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب بندہ کھانے پر اللہ کا نام لیتا ہے تو شیطان اس میں سے کچھ نہیں پا سکتا اور اگر وہ اللہ کا نام نہ لے تو شیطان اس کھانے میں سے لے لیتا ہے۔

- مآخذ: (۱) احمد: المسند، ۲: ۳۵۹؛  
 (۲) السيوطي: الاتقان في علوم القرآن، ص ۹۳  
 بعبء، طبع مطبع احمدی؛ (۳) ملا علی القاری:  
 شرح الوقایة، ص ۷۴ بعبء، مطبوعہ دہلی؛ (۴) المرغینانی:  
 ہدایة، ص ۱۰۵ بعبء (مطبوعہ لکھنؤ)؛ (۵) ابن  
 الجزری: النشر فی القراءات العشر، ۱: ۲۵۸ بعبء؛  
 (۶) الجصاص: احکام القرآن، ۱: ۶ بعبء، استانبول  
 ۱۳۳۵ھ؛ (۷) الزیلعی: نصب الرایة، ۱: ۳۲۷ بعبء؛  
 (۸) الباجوری: حاشیہ.... علی جوہرۃ التوحید، قاہرہ  
 ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء؛ (۹) القروانی: الرسالة،  
 بولاق ۱۳۱۹ھ؛ (۱۰) J. Jomier: Le nom divin  
 Mélanges Louis در "al-Rahmān" dans le Coran  
 Massignon، ۲، دمشق ۱۹۵۷ء: ۳۶۱ تا ۳۸۱ -  
 اس میں متن اور تفاسیر کے بے شمار حوالے درج ہیں؛ (۱۱)  
 Les études d'epigraphie sud-sémitique: Y. Moubarac  
 et la naissance de l' Islam، دوسرا حصہ، ۱۹۵۷ء: ص  
 ۵۸ تا ۶۱؛ (۱۲) بسم اللہ کے سلسلے میں غالی  
 شیعہ کی تاویلات کے لیے دیکھیے: Studies: Ivanow  
 in Early Persian Isma'ilism، بمبئی ۱۹۵۵ء، ص  
 ۶۸؛ (۱۳) القرطبی: الجامع لاحکام القرآن، ۱:

ہے اور با کو لمبا کر کے لکھا جاتا ہے چنانچہ بسم اللہ کے بجائے "بِسْمِ اللّٰهِ" لکھا جاتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس رسم الخط کی بنیاد حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے رکھی۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے کاتب سے کہا کہ الف کو حذف کر کے با کو لمبا کر دو، اسی طرح سین کے دندانوں کو زیادہ نمایاں کر کے میم کو ذرا گولائی دے دو اور اللہ کے لام کو ذرا سا جھکا دو (دیکھیے مقالہ بسملة عربی دائرۃ معارف اسلامیہ مع حاشیہ استاذ احمد محمد شاہ)۔ مسلمان ماہرین خطاطی نے بسملة کو مختلف مگر بڑے خوبصورت، دلکش اور دیدہ زیب اسالیب میں لکھا ہے اور فن تعمیر میں زیب و زینت کے سلسلے میں بھی اس سے بہت کام لیا جاتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں اس بات کی بڑی تاکید ہے کہ ہر جائز اور صحیح کام کا آغاز بسم اللہ سے کیا جائے، کیونکہ یہ بات اللہ کی رحمت و برکت اور اعانت کو اپنے شامل حال کرنے کے مترادف ہے۔ قرآن کریم کی سب سے پہلے نازل ہونے والی آیت میں بسم اللہ یعنی اللہ کے نام سے آغاز کا حکم دیا گیا: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ (۹۶ [العلق]: ۱)؛ اور ذبیحہ کے لیے بھی حکم دیا گیا کہ آغازِ ذبح اللہ کے نام سے ہو اور جس کا آغازِ ذبح اللہ کے نام سے نہ ہو اس کے کھانے سے منع کر دیا گیا؛ اسی طرح طہارت، وضو، اکل و شرب، اور تمام جائز و صحیح اعمال کا آغاز اللہ کے نام سے باعثِ ثواب و برکت قرار دیا گیا ہے (احکام القرآن، ۱: ۸) بلکہ حدیث میں تو یہاں تک آتا ہے کہ جس اہم کام کا آغاز بسم اللہ سے نہ ہو وہ ادھورا اور بے برکت ہو جاتا ہے۔ کُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ لَّمْ يَبْدَأْ بِبِسْمِ اللّٰهِ فَهُوَ آتِرٌ (احمد: المسند، ۲: ۳۵۹) یعنی ہر اہمیت والا کام جس کا آغاز اللہ کے نام سے نہ ہو



(چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی)۔ اس سے پہلے یہ اپنے جنوبی ہمسائے قیسوں کے مقابلے میں ہاند رہا، جسے اس زمانے میں زیادہ اہمیت حاصل تھی اور خود بھی [دوسرے مقامات] بالخصوص مرعش سے منسلک تھا۔ بسنی کو عروج غالباً اس وقت حاصل ہوا جب بوزنطی فتح کے بعد ارمی بڑی تعداد میں یہاں آ گئے۔ پانچویں صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی کے خاتمے پر یہ فیلیت Philaret اور کوغ واصل Kogh - Vasil کی ریاستوں میں شامل رہا اور فرانسیسی۔ ارمی سرحد کے صوبہ الرہا (Edessa) کے ان مقامات میں سے تھا جن کا ذکر صلیبی جنگوں کے زمانے میں بکثرت آیا ہے۔ اس کے لیے حلب کے زنگی یا ایوبی فرمانروا اور روم کے سلجوقی جنگ کرتے رہے، جنہوں نے ساتویں صدی ہجری/تیرہویں صدی عیسوی میں اس کا الحاق اپنے سرحدی صوبے مرعش سے کر لیا تھا۔ مغول نے اسے کلیکیا کی ارمی حکومت کو تفویض کر دیا تھا لیکن اس کے تقریباً فوراً ہی بعد یہ ایک بار پھر مملوک سلطنت کے ساتھ ملحق کر لیا گیا اور آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے خاتمے تک اس کی قسمت انہیں کی سلطنت کے ساتھ وابستہ رہی۔ اس کے بعد یہ ذوالقدر [= ذوالقدر] ترکمانوں کی ترک تازیوں کے دائرے میں آیا، پھر تیمور کے ہاتھوں تاراج ہوا۔ پندرہویں صدی کے اختتام پر یہ دوبارہ مملوکوں کے زیر نگیں چلا گیا اور ۱۵۱۶ء/۱۵۱۶ء میں عثمانی ترکوں نے شام کے ساتھ اس پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد سے یہ محض مقامی اہمیت ہی کا حامل رہا ہے۔ اس قصبے میں ایک قلعہ ابھی تک موجود ہے، جس کی تجدید زیادہ تر قائم بے نے کرائی تھی۔ اس کی آبادی ۱۹۵۵ء میں دس ہزار پانچ سو تھی۔

۹۱ تا ۱۰۷، قاہرہ ۱۹۳۵ء؛ (۱۴) محمد رشید رضا: تفسیر المنار، ۱: ۳۹، بعد، مصر ۱۳۴۶ء؛ (۱۵) محمد جمال القاسمی: تفسیر القاسمی، ج ۲، مطبوعہ مصر؛ (۱۶) الشوکانی: تفسیر فتح القدير، ۱: ۷، بعد، مصر ۱۳۴۹ء؛ (۱۷) الآمدی: الاحکام فی اصول الاحکام، ص ۲۳۴، بعد، مصر ۱۹۱۴ء؛ (۱۸) محمد ابراہیم میر: تفسیر واضح البیان، ص ۶۸، بعد۔

(ظہور اظہر و [ادارہ])

بسنی: (قرون وسطیٰ میں بسنی)، سریانی پت ہسنا سے مشتق۔ یہ بستی مَلطیہ - حلب اور کلیکیا - مرعش - دیار بکر کی سڑکوں کے اہم مقام اتصال پر دو ہزار نو سو فٹ سے بھی زیادہ بلندی پر واقع ہے۔ بسنی قلعوں کے ان سلسلوں کے درمیان ایک محور کی طرح تھا جو ایک طرف تو دریائے فرات کی بڑی قوس کے شمالی جانب چلے گئے تھے اور جن سے اس دریا کے دائیں جانب کی معاون ندیوں کی بالائی وادیوں کی ان حملوں سے حفاظت ہوتی تھی جو طارس کے اونچے پہاڑوں اور بلند میدانوں کی طرف سے ہوتے رہتے تھے اور دوسری طرف جنوب کی طرف عین تاب کے شمال میں چھوٹے چھوٹے طاسوں پر چھانے ہوئے تھے۔ مزید برآں بسنی ایک ایسے درے کے بالکل قریب واقع تھا جس سے شمال مغرب کی جانب آق صو کی تنگ وادی کو راستہ جاتا تھا، اور یہیں ایک زمانے میں العَدث الحمرہ [قَب] المتنبی:

هل العَدث الحمرہ تعرف لونها

و تعلم ابي الساقين الغمام

قصیدہ در مدح سيف الدولہ حمدانی] کا قدیم مستحکم قلعہ واقع تھا۔ ان تمام فوائد اور اپنے نام کے قدیم اشتقاق کے باوجود بسنی کا تذکرہ کتابوں میں صرف قلعہ العَدث کی بربادی کے بعد ہی آتا ہے، جس کی جگہ اس نے لے لی تھی

مآخذ: (۱) بسنی کا تذکرہ صلیبی جنگوں کے زمانے کے تمام وقائع نگاروں بالخصوص، الرہا کے میتھیو Matthew، شام کے میکائیل Michael اور کمال الدین العدیم کے ہاں آیا ہے۔ مؤخر الذکر نے اپنی کتاب بغیة (ایاصوفیا، شماره ۳۰۳۶، ۱: ۳۳۳) کے جغرافیائی حصے میں؛ اور اسی طرح (۲) عزالدین بن شداد نے اپنی الأعلاق (= ابن السَّحْنَة، طبع شیخو Gheiko، ص ۱۷۱) میں اس پر ایک حاشیہ لکھا ہے؛ (۳) ملاوک وقائع نگاروں میں سے دیکھیے بالخصوص ابن کثیر، ابن حجر، المقریزی، العینی، ابن تغری بردی، ابن ایاس؛ عصر جدید کے بارے میں دیکھیے بالخصوص: Ainsworth (۴): Travels، ۱: ۲۶۵؛ اور (۵) Cuinet، ۲: ۳۷۶؛ (۶) مکریمین خلیل: مرعش اسیرلری، در TTEM، سال ۱۳ تا ۱۵؛ (۷) La Syrie du Nord: Cl. Cahen، ص ۱۲۰ تا ۱۲۱؛ (۸) مزید حوالے در بسیم دار کوت Besni: Besim Darkot، در ۱، ت، بذیل مادہ.

(CL. CAHEN)

البسوس: بنت منقذ بن سلمان التمیمیہ، زمانہ قبل اسلام کی رزمیہ داستانوں (ایام العرب) کی ایک روایتی شخصیت، جسے کلیب بن ربیعہ التغلیبی کے قتل اور اس کے بعد بکر بن وائل اور تغلب بن وائل کے درمیان واقع ہونے والی جنگ (حرب البسوس) کا ذمے دار قرار دیا گیا ہے۔ ان واقعات کے تاریخی پس منظر کے لیے رک بہ کلیب بن ربیعہ۔ اس روایتی قصے میں کلیب کو ایک جابر و مستبد شخص کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، جس نے بدوی عربوں کے قدیم دستور کو نظر انداز کر کے اپنی پسندیدہ چراگاہ (حمی) میں مویشی چرانے اور شکار کھیلنے کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔ ایک بار البسوس نے، جو اپنے بھانجے اور کلیب کے بردار نسبتی جسّاس [بن مرہ] کے پاس مقیم تھی، اپنی اونٹنی کو (یا بعض متبادل روایات کے مطابق سعد العربی کی اونٹنی کو جو باختلاف روایات اس

کا شوہر تھا یا اس کی پناہ میں تھا) کلیب کی چراگاہ میں چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور کلیب نے اس اونٹنی کو مار ڈالا (یا ایک اور روایت کی رو سے، اونٹنی کے بچے کو مار ڈالا اور اس کے تھنوں کو زخمی کر دیا)۔ حقوق مہمان نوازی کی اس خلاف ورزی پر مشتعل ہو کر جسّاس نے (بعض روایات کے مطابق اپنے عم زاد بھائیوں کی معیت میں) کلیب کو قتل کر دیا اور یہ دونوں قبیلوں کے درمیان جنگ کا باعث ہوا۔ نابغة الجعدی م نواح ۵۶۵/۶۸۳ء نے البسوس کا ذکر کیے بغیر کلیب کے ہاتھوں اونٹنی کے مارے جانے اور پھر خود اس کی اپنی ہلاکت کا تذکرہ کیا ہے (قب الاغانی، بار دوم، ۴: ۱۲۷، ۱۳۰ اور نالینو M. Nallino در RSO، ۱۳: ۴۰۵ ب بعد)۔ البسوس کا نام ضرب الامثال میں بھی آیا ہے، مثلاً أشام من ناقة البسوس (قب المنضل بن سلمة: فاخر، ص ۷۶)۔ پورا قصہ ابو عبیدہ کی سند سے تقاض جریب والفرزدق، ص ۹۰ تا ۹۰۷ میں اور معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ ایام العرب کے جامعین کے یہاں بیان ہوا ہے۔ فاخر، ص ۷۶ میں، تبریزی کی شرح الحماسة، ص ۴۰ میں (ابو رباح ۵۳۳۹/۹۰۰ء کی سند سے) اور بعض دوسری کتابوں میں البسوس کی زبان سے چار اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں، جن میں سعد کو مخاطب کر کے بالواسطہ جسّاس کو کلیب سے انتقام لینے پر آمادہ کیا گیا ہے۔ یہ اشعار تحریض (جذبات کو ابھارنے) کا اچھا نمونہ ہیں اور رسائل اخوان الصفا، قاہرہ ۱۲۳۷ھ، ۱: ۱۳۳ میں اعمال انسانی پر شاعری کے بے پناہ اثر کی مثال کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ ۱، ۷، ۸، ۹، ۳: ۶۳۶ میں البسوس کے پانچ اشعار درج ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے:

لعمری لو أصحبت فی دار منقذ  
لما ضیم سعد و هو جار لأبیاتی



کے معنی واضح ہیں۔ منطق، ریاضیات اور موسیقی میں مرکب کے بجائے عموماً لفظ مؤلف کا استعمال کیا جاتا ہے۔ لفظ ممتزج کا استعمال طبیعیات اور طب کے ساتھ مخصوص ہے، جہاں یہ لفظ کبھی مرکب کے مترادف کے طور پر اور کبھی اس سے مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

ایک چیز اضافی طور پر بسیط ہو سکتی ہے یا مطلقاً بسیط۔ مطلقاً بسیط وہ چیز ہے جس کے خارجی یا ذہنی طور پر اجزا نہ ہوں۔ پہلی قسم کی مثال جزء لا يتجزئ ہے اور دوسری کی جنس عالی (بسیط کی اس تعریف کے لیے کہ وہ ناقابل تقسیم ہے دیکھیے: ارسطو: ما بعد الطبیعیات (Metaphysics)، ص ۹۸۹ ب ۱۷)۔ بسیط اضافی وہ ہے جو کسی مرکب میں بطور جز کے موجود ہو خواہ وہ فی نفسہ منقسم ہو یا نہ ہو۔ صورت اور مادے کی ”ترکیب“ کے لحاظ سے (اور اس نقطہ نظر سے کہ تمام عالم عنصری مرکب ہے) صرف مادہ اولیٰ، جس کی کوئی صورت نہیں، یا وہ موجودات جن میں مادے کو دخل نہیں بسیط کہلانے کے مستحق ہیں؛ اگرچہ ارسطو اور مسلمان فلاسفہ صرف مؤخر الذکر کو بسیط کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

واقعہ موجود عالم مادی میں (مادہ اولیٰ چونکہ صورت سے محروم ہے لہذا اس کا وجود نہیں) عناصر اربعہ۔ آگ، ہوا، پانی اور خاک۔ کو بنیادی اجسام بسیط کہا جاتا ہے، جن کے امتزاج سے تمام مادی اشیا وجود میں آتی ہیں۔ ارسطو کے نزدیک (اس موضوع کی اہم ترین کتاب ارسطو کا ’رسالہ کون و فساد‘ De Gen. et Corr. مقالہ ۱، باب ۱۵) ترکیب کی ایک صورت یہ ہے کہ مرکب میں مختلف اجزا اپنی اصلی حالت پر رہتے ہیں جیسا کہ ریت اور شکر کے امتزاج میں۔ اس صورت کو

بعض علما کے نزدیک قرب المثل اَشَامٌ مِنْ البسوس عہد شجاعت کی اس ولولہ انگیز شخصیت سے متعلق نہیں بلکہ اس کی ایک ہمنام یہودی عورت سے متعلق ہے جو (ایک مشہور حکایت کے مطابق) اپنی بے وقوفی کی بدولت ان تین مرادوں کی تکمیل سے محروم ہو گئی جو خدا کی طرف سے اس کے شوہر کو عطا ہوئی تھیں [لا، ع، ۳: ۶۴۶]۔

مآخذ: متن میں دیے ہوئے حوالوں کے علاوہ:

(۱) ابن عبد ربہ: العقد، قاہرہ ۱۳۱۶ھ، ۳: ۶۶ بعد؛

(۲) الميدانی: مجمع الأمثال (طبع Freytag)، ۱: ۶۸۳ تا ۶۸۷؛ (۳) یاقوت، ۱: ۱۵۰؛ (۴) ابن الأثیر، ۱: ۳۸۵ بعد؛ (۵) خزائن الادب، ۱: ۳۰۰ بعد؛ (۶) W. Caskel: آیام العرب (= Islamica، ج ۳، ضمیمہ)، ص ۷۶ و ۷۷ (جرمن ترجمہ النقاظ، ص ۹۰ و ۹۱) تا ۹۰۶ (ص ۳)؛ (۷) برامے البسوس یہودیہ رک بہ L.A. و T.A. بذیل مادہ ب س س: (۸) Proverbia: Freytag (۹) Arabum، ۱: ۶۸۷؛ (۱۰) الدبیری نے بذیل مادہ کلب (مترجمہ R. Basset، 1001 contes، ۲: ۱۸) یہ قصہ بیان کیا ہے لیکن عورت کا نام حذف کر دیا ہے؛ (۱۰) ”تین خواہشوں“ کے بنیادی خیال کے لیے قب J. Bolte اور G. Polivka: Anmerkungen zu den Kinder- und Hausmärchen der Brüder Grimm، ج ۲ (۱۹۱۵ء)، ص ۲۲۳، [نکلسن: A Literary History of the Arabs، بدم اشاریہ]۔

(J.W. Fück)

• بسیط: رَک بہ عروض۔

⊕ بسیط و مرکب: ... [بہ نحو، طب اور فلسفے کی اصطلاح ہے]۔ نحو میں (نیز فلسفے اور طب میں) بسیط کے بجائے لفظ مفرد کا استعمال کیا جاتا ہے۔ نحو میں مفرد اکیلے اسم کو اور مرکب اسم کی ترکیبی حالت کو (مثلاً مرکب اضافی، مرکب توصیفی) کہتے ہیں، اور طب میں مفرد اور مرکب

کو جس کے مزاج سے منسوب کیا گیا ہے اور جسمانی آلام کے ادراک کو جس لمسی کی ترکیب سے)۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ خالص صورتیں جن میں مادے کو دخل نہیں بسیط کہلاتی ہیں۔ لہذا جوہر عقلی ایک بسیط جوہر ہے، نہ صرف اس لیے کہ وہ مادے سے مبرا ہے بلکہ اس لیے بھی کہ ادراک عقلی میں عالم اور معلوم کی ثنویت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس قسم کی بساطت بھی مختلف مدارج کی متحمل ہے۔ اس کا کمترین درجہ عقلِ انسانی ہے۔ متوسط درجہ عقول افلاک ہیں جنہیں اگرچہ ادراک کے لیے کسی جسمانی شے پر انحصار نہیں کرنا پڑتا تاہم ان کے معلومات میں ایک قسم کا تکثر پایا جاتا ہے، اور اس کا بلند ترین درجہ ذاتِ الہی کی روئت ہے جہاں معلومات کا تکثر بالکل معدوم ہو جاتا ہے۔ جو فلاسفہ ابن سینا کی طرح اس نظریے کے قائل ہیں کہ ذاتِ باری کے علاوہ ہر چیز میں ماہیت اور وجود کی ثنویت موجود ہے ان کے نزدیک اس لحاظ سے بھی بسیط علی الاطلاق صرف خدا کی ذات ہے (رک بہ ماہیت، جود)۔

مآخذ: متن میں مذکور کتابوں کے علاوہ دیکھیے: (۱) الجرجانی: کتاب التعریفات؛ (۲) تھانوی: کشف اصطلاحات الفنون؛ ان کے علاوہ طبیعیات اور ما بعد الطبیعیات کی اکثر کتابوں میں یہ بحث موجود ہے۔ (فضل الرحمن)

البسیط: اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ایک نام، رَکَّ بِهِ اللہ؛ الاسماء الحسنی۔

البسیط: ہسپانوی زبان میں البسیت Albacete، سپین کا ایک شہر، اسی نام کے صوبے کا سب سے بڑا شہر، جو مرسہ Murcia کی قدیم مملکت کے شمال مغربی حصے پر مشتمل ہے۔ یہ مانسہ La Mancha

ارسطو مؤلف (Synthesis) کہتا ہے۔ دوسری صورت میں اجزا اپنی عینیت کھو دیتے ہیں اور ایک مشترک صفت سے موصوف ہو جاتے ہیں جیسا کہ دودھ میں شکر ملانے سے، اسے وہ آمیزہ (Mixture) کہتا ہے۔ مسلمان فلاسفہ کے ہاں پہلی قسم کی ”ترکیب“ کا ذکر نہیں ہے۔ ان کے قول کے مطابق ترکیب کی ایک قسم ایسی ہے جس میں اجزا اپنی عینیت بھی زائل نہیں کرتے اور مرکب پر ایک عام اور کلی کیفیت طاری ہوتی ہے جو اجزا میں انفرادی طور پر سرایت نہیں کرتی؛ اس کی مثال مرکب اعداد و اشکال اور موسیقی کے نغمے ہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس میں کلی کیفیت ہر جز میں ساری ہو جاتی ہے، مثلاً گوشت کے ہر حصے میں لحمی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ایسے مرکب کو متشابہ الاجزا کہا جاتا ہے۔ جہاں ارضی حیوانی اجسام کے مختلف اجزا مثلاً گوشت اور ہڈی انفرادی طور پر متشابہ الاجزا ہیں لیکن سارا جسم مجموعی طور پر ایسا نہیں۔ اس کے برخلاف اجسام سماوی پورے کے پورے متشابہ الاجزا ہیں۔ مزاج اور ترکیب میں فرق یہ ہے کہ مزاج ایک مجموعی داخلی کیفیت کا نام ہے اور ترکیب اس ہیئت کا نام ہے جو اس مزاج کے باعث وجود میں آتی ہے؛ مثلاً کیفیات اربعہ—حرارت، برودت، رطوبت، یبوست—کے ایک خاص اور متناسب مقداری امتزاج سے وہ مزاج پیدا ہوتا ہے جو گوشت کے ایک زندہ ٹکڑے کا مزاج ہے؛ اور یہ مزاج ایک مجموعی داخلی کیفیت ہے۔ پھر اس مزاج کی بنا پر ایک صورت ترکیبی پیدا ہوتی ہے، جس کا نام لحمیت ہے (دیکھیے ابن سینا: کتاب الشفاء، طبیعیات، فن ۳، فصل ۷، نیز دیکھیے کتاب الشفاء، کتاب النفس، مقالہ ۲، فصل ۳، جہاں کیفیات اربعہ کے ادراک



متعدد سرسبز وادیاں مراد ہوتی ہیں جو اس علاقے کو باہم قطع کرتی ہیں (وادی بادول Padul، وادی بزناں Béznar، وادی سنیارون Lanjarón، وادی ارجیفنا Orgiva، وادی قادیار Cádjar و وادی اجیار Ugijar، وادی القلیعہ Alcoléa، وادی لویار Laujar، وادی کنیاریار Canjayar، وادی رگل Rágol، وادی جادو Gádor)۔ قرون وسطیٰ میں البشارات کا رقبہ آج کی نسبت زیادہ تھا کیونکہ ان دنوں دارالحکومت جیان Jaén تھا اور بہت سے قلعوں کے علاوہ اس میں چھ سو سے زیادہ ایسے گاؤں تھے جہاں ریشم تیار ہوتا تھا۔ ابن حفصون [رک باں]، جو جیان Jaén پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا، لازماً اس خطے کو اپنے زیر تسلط لے آیا ہو گا یا کم از کم یہاں اس نے اپنے دوست اور حلیف پیدا کر لیے ہوں گے، کیونکہ ۵۳۰۰ / ۹۱۳ء میں عبدالرحمن ثالث نے اس کے سفیروں کو فناہ کے مقام پر گرفتار کر لیا اور جبل الثلج کو عبور کر کے Juviles کو محاصرے میں لے لیا تھا۔ ایک قلیل عرصے کے محاصرے کے بعد اس نے قلعے کی عیسائی محافظ فوج کو گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا، جسے ابن حنصون نے وہاں متعین کر رکھا تھا۔ ان وادیوں میں، جو تمام اطراف میں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی گذرتی ہیں، رہنے والے جنگ جو قبائل یعنی اہل البشارات عربوں کے دور حکومت میں فی الحقیقت باغیانہ رجحانات رکھتے تھے اور ۱۳۹۲ء کے بعد سے یہ پیہم بغاوتیں ان کی تاریخ میں نمایاں رہیں۔ ۱۵۶۸ تا ۱۵۷۰ء کی عظیم بغاوت بالخصوص قابل ذکر ہے، جس کے سربراہ ابن امیہ اور عبداللہ بن عبوتھے اور جسے Don John of Austria اور Marquis of Mondéjar نے بہت سے مسلمانوں کا خون بہا کر فرو کیا تھا [رک بہ Moriscos]۔

(A. HUICI MIRANDA و C. F. SEYBOLD)

اور قشتالہ جدید (New Castile) کے جنوب مغرب میں، سات سو میٹر کی بلندی پر وسطی آئی پیریا Iberia کے مسیتہ Meseta کی جنوب مشرقی ڈھلانوں پر واقع ہے۔ [اس شہر کا نام پہلی بار ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی میں الضبی القرطبی اور ابن الآبار البلیسی کی کتابوں میں ایک جنگ کے سلسلے میں آیا ہے، جو مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ۲ شعبان ۵۴۰ / ۱۱۴۶ء کو ہوئی۔ عرب مؤرخوں نے اس سخت لڑائی کا مقام موضع اللج اور البسیط لکھا ہے۔ اس لڑائی کو اللج کی لڑائی بھی کہتے ہیں، جو جنجالہ Chinchilla کے قریب ہے]۔

مآخذ (۱) الضبی [بغیة المسلمین] (طبع کودیرا Cudera و ریبیرا Ribera)، ص ۳۳؛ (۲) ابن الآبار: العلة السیرا، (Notices : Dozy، ص ۲۱۵، ۲۱۹، ۲۲۶)؛ (۳) Decadencia y desaparicion de los Almoravides en Espana، سرقسطہ ۱۸۹۹ء، ص ۱۰۹، ۸۶؛ (۴) Murcia Musulmana : Caspar Remiro، سرقسطہ ۱۹۰۰ء، ص ۱۷۹ بعد؛ (۵) سیبولڈ Seybold، در ZDMG، ج ۶۲؛ (۶) [محمد عنایت اللہ : آندلس کا تاریخی جغرافیہ، حیدرآباد دکن ۱۳۳۵ھ / ۱۹۲۷ء، ہذیل مادہ البسیط؛ (۷) Murcia Musulmana : Ramiro، سرقسطہ ۱۹۰۰ء]۔

(C.F. SEYBOLD و [A-HUICI MISANDA])

البشارات : چراگاہیں (۱) sierras de yerba (de pastos) ہسپانوی لفظ الپوجراس Alpujarras کی اصل ہے۔ درحقیقت عربی زبان کے اس جغرافیائی نام کا اطلاق اس سارے کوہستانی خطے پر ہوتا ہے جو جنوب میں بحیرہ روم کی طرف بڑھے ہوئے جبل الثلج (Sierra Nevada) کے علاقے پر مشتمل ہے اور مطریل Motril سے عدرہ Adra اور المریہ Almeria تک پھیلا ہوا ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ اس نام سے وہ

قبیلے پر صرف ایک ہی "ناظر" یا سردار مقرر کر دیا گیا۔ بشارین کی حالیہ تاریخ لائق ذکر واقعات سے خالی ہے۔

مآخذ: (۱) *The Bisharin* : G.E.R. Sandars  
در *Sudan Notes and Records*, ۱۶/۲، ۱۹۲۳ء :  
ص ۱۱۹ تا ۱۴۹؛ (۲) خرطوم اور بجه کے تحت  
بھی دیکھیے۔

(P.M. HOLT)

بشارین : ایک خانہ بدوش بچہ [رک بان] قبیلہ، جو اب دو علاقوں میں مقیم ہے: (الف) عتبات یا بحر احمر کی پہاڑیوں کی مغربی ڈھلانوں پر واقع تقریباً ۲۳ درجے اور ۱۹ درجے عرض بلد شمالی نے درمیان؛ (ب) عطبرا ندی کے کنارے اور ملحقہ اراضی پر تقریباً ۱۷ درجے اور ۱۶ درجے عرض بلد شمالی نے درمیان۔ یہ قبیلہ دو بڑے شعوب میں تقسیم ہے: (الف) ام علی، شمال مشرقی عتبات میں؛ (ب) ام ناحی، جنوب مغربی عتبات میں اور عطبرا پر۔ ماہلی سب ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا تعلق عرب اولاد کاہل (نواحیہ) سے تھا، جو چودھویں صدی عیسوی میں عیذاب کے قریب رہنے لگے۔ بشارین کا اصلی وطن اس خطے میں حبل اذہ کے وادی علاقے میں تھا۔ ہندرہویں صدی عیسوی میں اس نامعلوم ہوا ہے کہ وہ بنو Balaw نواحیہ کے علاقے میں پھیل گئے۔ بلو شاید زیادہ وسطی کے عرب مصنفین کے "حبارب" کے نام سے مشہور ہوں۔ عصر کی زیادہ زرخیز اراضی میں ان کا مرکز بن گیا۔ لاؤ احمد عمران کے تحت غالباً ۱۷۶۰ء تک ان کے قریب پروردگی سمبیر ہوا تھا۔ سوڈان میں متعدد شہر اور قصبوں کے بعد عطبرا کے مشرقی حصے کے علاقے اور عتبات کے علاقے وچ علاقہ زراعت بھی رہے۔ بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں فلسطین کے ضلع زیب میں پھار کے سے مہ کورا۔ ذریعوں گروہ تک دوسرے سے اور زیب دور ہو گئے۔ ان میں سے کسی تک گروہ بھی مہذبہ تحریک میں حصہ لیا۔ اگرچہ شمالی حصہ کا حصہ مشرقی عربوں نے کچھ حصہ لیا۔ بحر و مدینہ کی مشورہ حکومت کے تحت میں ان دور گروہ سے دور تک مشورہ تک

بشلیق: سغدی (?) پنچگت (دونوں بمعنی "شہر پنچ") مشرقی ترکستان کا ایک شہر، جس کا ذکر دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی اور ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے درمیان بار بار آیا ہے (نام کے متعلق قب منورسکی Minorsky، در حدود العالم، ص ۲۷۱ بعد اور ص ۲۷۱ سطر ۵)۔ روسی جویندوں نے ان معلومات کی مدد سے جو چینی مآخذ میں پائی جاتی ہیں یہ مقام دوبارہ دریافت کیا۔ اس کا محل وقوع کوشنگ (چینی گچنگ Ku-c'ong) کے جس کی بنا آٹھارہویں صدی عیسوی میں رکھی گئی تھی، سینتالیس نیومیٹر مغرب میں اور تسی موہ Tsi-mu-sa کے دس کیلومیٹر شمال میں موقع Hu-pao-tse کے قریب ہے۔ اس کے کھنڈروں کا جو پوجونگ تسی (P-o-c'ong-tse) کے نام سے معروف ہیں، دور دس کیلومیٹر ہے B. Dolbezer، در: *Russk. Komar. IX*، ۱۹۰۵ء، ص ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷، ۱۹۰۵ء، ص ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲، *Zap. Ak. Nauk*، ج ۱۰، ۱۹۰۵ء، ص ۷۷۔ ۷۸، *IX*، ۱۹۰۵ء، ص ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲، *Documents*، Ed. Clavares

۱۹۰۵ء، ص ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲، *IX*، ۱۹۰۵ء، ص ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲، *Documents*، Ed. Clavares



باشندے اس مصنوعی ذریعہ آبپاشی سے فائدہ اٹھاتے اور سبزیاں اگا کر گذر اوقات کرتے تھے، دوسرے لوگ گھوڑے پالتے اور دھات کا کام کرتے تھے۔ قدیم مسلم ماخذ میں اس شہر کا فقط ایک ہی بار ذکر (حدود العالم، ص ۱۷۰ الف، ترجمہ ص ۹۴ میں) آیا ہے اور وہ اسی مذکورہ بالا سال کے تحت ملتا ہے۔ اس شہر کے متعلق مذکور ہے کہ وہ تغزغز [رک باں] کے حکمران کی سکونت گاہ تھا۔ اس امر کے اور تغزغز اور شتعو Scha-t'ao کے موازنے کے متعلق قب سنور سکی، در حدود العالم، ص ۲۶۶ تا ۲۷۲، ۳۸۱ - الادریسی، ۱ : ۳۹۱، ۵۰۲ نے اس شہر کا جو ذکر کیا ہے قیاساً اس کی بنیاد کسی مختلف اطلاع پر ہوگی، یعنی تمیم بن بحر المطوعی (قب ماخذ) کے بیان پر۔ ریاست کے مغربی حصے کے حکمران (ادوق قوت، ادی قوت یا ادوت؟) کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے بشلیق قرہ خطائیوں [رک باں] کے زیر نگین آ گیا۔ (اس پر ایک چینی تصنیف کا ذکر Wang-Kuo-Wei نے Wittfogel، ص ۶۱۵ نیچے بائیں جانب کیا ہے) - ۱۲۰۹ء میں اویغوز حکمران نے خود اپنی مرضی سے یہ شہر مغول کے حوالے کر دیا اور ان کی سپہوں میں حصہ لیا۔ بشلیق کا اسلامی دنیا کے اس حصے سے جو مغول سلطنت کے اندر تھا گہرا ربط پیدا ہو گیا اور ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی میں بتدریج اسلام کا اس شہر میں نفوذ ہوتا گیا، اس کے باوجود کہ اویغوروں نے اس کی مزاحمت کی، کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ دین اسلام کی ترویج سے مغول سلطنت کی روحانی قیادت ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ جب ۱۲۵۲-۱۲۵۳ء میں وسطی ایشیا کا مغول والی مسعود بن محمود یالاواچ (=سینیر) بشلیق میں اپنے عہدے پر فائز ہو

بعد سے وہ ایک چینی انتظامی علاقے کا صدر مقام تھا (جس میں چینی یا ترک حاکم ہوتا تھا)۔ اسے یہ مرتبہ اس وجہ سے حاصل تھا کہ وہ "خطہ پنج شہر" کا دارالحکومت اور چینی "چار چھاؤنی" میں سے ایک تھا۔ اورخون کتبوں میں بھی اس کا ذکر پایا جاتا ہے (E II، ۲۸، قلی - چور کتبہ؛ قب Wilhelm Thomson، در ZDMG، ۱۹۲۳، ۶۱، ص ۱۵۳؛ Social'no-ekonomi ceskiy story : A. N. Bernstamm Orkhono Yeniseyskikh Tyurok VI-Viii vekov (اورخون اورینی سے ترکوں کا معاشری اور اقتصادی نظام، چھٹی صدی عیسوی سے آٹھویں صدی عیسوی تک)، ماسکو اور لینن گراڈ ۱۹۳۶ء، بعدد اشاریہ)۔ اسی عہد اور اس کے بعد سے بشلیق کے چینی نام کنمن Kinman اور خصوصاً پیتنگ Pei-t'ing بہ معنی "شمالی دربار" دیکھنے میں آتے ہیں۔

بقول تنگ شو T'ang-schu (Doc : Chavannes) (ص ۹۶ تا ۹۹)، شاتعو Scha-t'ao (ریگستان کے لوگ، قب نیچے) ۷۱۲ء اور ۸۱۸ء کے درمیان بشلیق کے قریب رہتے تھے۔ طویل تنازعات کے بعد (قب Chavannes : Doc، ص ۱۱۳ بعد؛ کاشغری : دیوان [لغات ترک]، ۱ : ۱۰۳، ۳۰۷ (طبع براکلمان، ص ۲۳۲)؛ المروزی، ص ۷۳؛ حدود العالم، ص ۲۲۷، ۲۲۸)، یہ شہر ۷۹۱ء میں اہل تبت کے قبضے میں چلا گیا (Chavanner، ص ۳۰۵) اور بعد میں یہ ترکی سہیل خانوادے کے رئیسوں کی سکونت گاہ بن گیا، جن کی میراث ۱۸۶۰ء میں اویغور ترکوں نے ("ادوق قوت" یعنی مقدس سرکار کے خطاب کے ساتھ) لے لی۔ ۹۸۲ء کے ایک چینی وفد کی اطلاع کی رو سے (تراجم کی فہرست کے لیے قب Wittfogel، ص ۱۰۴) اس شہر میں پچاس سے زائد بدھ مندر، ایک بدھ خانقاہ، مانوی زیارت گاہیں، اور ایک (مصنوعی؟) جھیل تھی۔ اس کے کچھ

*Mediaeval* : E. Bretschneider (۲) : ۶۵۵، ۶۳۶  
*Researches ...* دو جلدیں، لندن، ۱۹۱۰ء، ۱ : ۶۵  
 بعد و ۲ : ۲۷ تا ۳۳، اور ایک نقشہ؛ (۳) وہی  
 مصنف : *Notices of the Mediaeval Geography*  
 در *JRAS*، شمالی چینی شاخ N.R.X. (۶۱۸۷۶)،  
 ص ۷۵ تا ۳۰۷ : (۴) *China, the*  
*Turks and India*، طبع منورسکی V. Minorsky، لندن  
 ۱۹۳۲ء بعد اشاریہ؛ (۵) حدود العالم، بمدد اشاریہ، بذیل  
 مادہ پنچیکٹ و پیتینگ؛ (۶) *Turkestan* : Barthold  
 بعد اشاریہ؛ (۷) وہی مصنف : اور تہ اسیا ترک تاریخی  
 حقنہ درسرا، استانبول ۱۹۲۷ء (جرمن ترجمہ  
*12 Vorlesungen über die Geschichte der Türken*  
*Mittelasiens*، برلن ۱۹۳۵ء، فرانسیسی ترجمہ  
*des Turcs d'Asie centrale* : پیرس ۱۹۳۵ء)؛ (۸)  
 منورسکی : *Tamim ibn Bahr's Journey*، در *BSOAS*  
 ۲/۱۲، ۱۹۳۸ء، ۲۷۵ تا ۳۰۵ : (۹) وہی مصنف،  
 در *BSOAS*، ۲/۱۵، ۱۹۵۵ء، ۲۶۳ : نقشے در  
*Karachanidische Studien* : O. Pritsak، مقالہ گوئنجن  
 ۱۹۳۸ء (ٹائپ شدہ مسودہ)؛ (۱۰) A. Herrmann،  
 چین کی اٹلس، کیمبرج [امریکہ]، ۱۹۳۵ء، ص ۳۳ تا ۳۹  
 (B. SPULER)

بش پرمق : ("پانچ انگلیاں") ایک ترکی

نام جو بعض اوقات پہاڑی سلسلوں کے لیے استعمال  
 ہوتا ہے، جو ایشیائے کوچک اور دیگر علاقوں میں  
 موجود ہیں۔ اس کی معروف ترین مثال وہ بش پرمق  
 طاغ ہے جو جنوب مغربی ایشیائے کوچک میں  
 بویوک منڈرس کی زیرین گذرگاہوں پر واقع ہے۔  
 اس سلسلہ کوہ کی بلند ترین چوٹی ایک ہزار تین سو  
 سڑسٹھ میٹر اونچی ہے۔ قدیم زمانے میں یہ خاص پہاڑ  
 Ó Λάτμος (اودت موس) کے نام سے مشہور تھا۔ قرون  
 وسطیٰ میں یہ علاقہ عیسائیوں کی مذہبی زندگی  
 کا ایک سرگرم مرکز بن گیا تھا، جو تیرھویں و

گیا تو کہا جاتا ہے کہ ایدق قوت نے ستمبر  
 ۱۲۵۸ء میں شہر کے تمام مسلمانوں کو قتل کر  
 دینے کے خفیہ احکام صادر کیے۔ خان اعظم  
 مونگکھ Mongke کے حکم سے اسے گرفتار کر کے  
 قتل کر دیا گیا، لیکن اس کا خاندان سلامت رہا  
 (جوینی، ۲ : ۳۳ بعد، ۸۸ و ۳ : ۶۰ بعد؛  
 رشیدالدین (طبع بلوشے Blochet)، ۲ : ۳۰۳ بعد؛  
 حمد اللہ المستوفی القزوینی : تاریخ گزیدہ، ص ۵۷۷؛  
*Die Mongolen in Iran* : B. Spuler، بار دوم،  
 برلن ۱۹۵۵ء، ص ۲۳۹)۔

۱۲۶۰ء کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس  
 شہر نے خان اعظم کی سلطنت اور ریاست چغتائی  
 کے درمیان آزادی کا زمانہ گزارا۔ اس نے ۱۲۷۵ء  
 میں مغرب کی طرف سے ایک حملے کو پسپا کیا۔  
 اس وقت بشلیق چین سے وسط ایشیا کو جانے  
 والی ڈاک کی شاہرہ کا مقام آغاز تھا (Not. 208  
 Bretschneider)۔ معلوم ہوتا ہے اس وقت بشلیق کا  
 خطہ چغتائی کی ریاست میں شامل تھا۔ اس بات کا پتا  
 نہیں چلتا کہ خود اس شہر پر بعد میں کیا  
 گزری۔ بظاہر یہ شہر چودھویں صدی عیسوی  
 میں خانوادہ ایدق قوت کے ساتھ ہی ناپید ہو گیا۔  
 اس کے بعد اہل چین پیتینگ Pei-t'ing کا نام اس  
 خطے کے لیے جو (بقول محمد حیدر دوغلات :  
 تاریخ رشیدی، ترجمہ E. Denison Ross، لندن ۱۸۹۵ء،  
 ص ۳۶۵) سولہویں صدی عیسوی میں مغولستان  
 کہلاتا تھا، اور جہاں اب اسلام مضبوطی سے اپنے  
 قدم جما چکا تھا، فقط ایک علاقائی نام کے طور  
 پر استعمال کرتے تھے، اس کے بعد خود بشلیق کا  
 کوئی ذکر نہیں ملتا۔

مآخذ : (۱) چینی روئدادیں، در K.A. Wittfogel

و *Hist. of the Chinese Society* : Fêng Chia-Shêng

*Liao*، فیلاڈلفیا ۱۹۳۹ء، ص ۹۵، ۱۰۳، ۱۰۷



ہے) جَمْہَرَة اشعار العزب، ص ۱۰۴ میں بھی پائی جاتی ہے، جبکہ ابن الشجرى اپنے الحماسة (ماہرہ ۱۳۰۶، ص ۶۵ تا ۸۳) میں چھ نظموں کا انتخاب کرتا ہے۔ اس کے کثیر اشعار، جن کا لغات، شروح اور کتب ادب میں حوالہ دیا گیا ہے، ابھی تک جمع نہیں کیے گئے، [قب عبدالقیوم: فہارس لسان العرب، جلد ۱: اسماء الشعراء]۔

بشر کی زندگی کے بہت ہی کم حالات معلوم ہیں، بجز ان کے جن کا اس کی نظموں سے ہمیں علم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے جو حالات ملتے ہیں وہ اکثر متضاد اور غیر معتبر ہیں۔ النصار [قب تاج العروس] کے مقام پر اپنے قبیلے کی فتح کی جس وضاحت سے اس نے کیفیت لکھی ہے (دیکھیے المفضلیات، قصیدہ، ۹۶، اشعار ۹ تا ۲۲) اس سے یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ بشر اس لڑائی میں شریک تھا، جس کی تاریخ Lyall نے تقریباً ۵۷۰ء قرار دی ہے۔ بنو اسد کے دیگر کارناموں کے جو حوالے اس کی نظموں میں آتے ہیں ان سے کسی تاریخ کا پتا نہیں چلتا۔ نظموں میں اوس بن حارثہ بن لام الطائی کی، جو بنو اسد کے پڑوسی قبیلہ طییہ کا سردار تھا، شخصیت چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ عبد القادر: وہی کتاب، ص ۳۱۷، ۱ (ابو عبیدہ کی) شرح کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ بنو اسد کے بعض حلیفوں پر طییہ نے ایک چھاپا مارا، جس کی بنا پر بشر نے اوس بن حارثہ کے خلاف نظم لکھی اور اس میں دھمکی دی کہ اگر اس نے مصالحت نہ کی تو پھر وہ اس کی ہجو لکھے گا (نیز دیکھیے المفضلیات، ۱: ۲۹۳، ۱۰ اور Lane، ص ۱۱۲۶)۔ ایسی ہجویات مختارات، ص ۶۶ بعد اور ۶۸ بعد میں اب تک محفوظ ہیں۔ المبرد (الکامل، ۱: ۱۳۲ بعد) نے اس قبائلی نزاع کا سبب بالکل مختلف بتایا ہے اور ابن الأثیر (الکامل، ۱: ۱۶۹

چودھویں صدی میں مغربی ایشیائے کوچک پر ترکوں کے مسلط ہونے تک قائم رہا۔

مآخذ: (۱) Th. Wiegand (Köni- : Der Latmos gliche Museen zu Berlin. Milet : Ergebnisse der Ausgrabungen und Untersuchungen seit dem Jahre ۱۸۹۹ء، طبع Th. Wiegand، جلد ۱/۳)، برلن ۱۹۱۳ء؛ (۲) A. Philippson (Reisen und Forschungen im westlichen Kleinasien، جلد ۵ (=Ergänzungsheft zu Petermann's Mitteilungen، شماره ۱۸۳، گوٹھا ۱۹۱۵ء: ۸ بعد؛ (۳) F. Krischen (Die Befestigungen von Herakleia an Latmos (Staatliche Museen zu Berlin, Milet : Ergebnisse der Ausgrabungen und Untersuchungen seit dem Jahre ۱۸۹۹ء، طبع Th. Wiegand، ج ۲/۳)، برلن اور لائیرگ ۱۹۲۲ء؛ (۴) Pauly-Wissowa، ۱/۱۲ (۱۹۲۴ء): عمود ۹۶۴ تا ۹۶۶، بذیل مادہ Latmos.

(V.J. PARRY)

• بشجرت: (بشکرت) رک بہ باشقرت۔  
• بشر بن ابی خازم: نہ کہ "خازم"، (عبدالقادر: خزائن الادب، بار اول، ۲: ۲۶۲) چھٹی صدی عیسوی کے نصف آخر میں بنو اسد بن خزیمہ کا عہد جاہلیت کا سب سے بڑا اور ممتاز شاعر۔ الفرزدق (دیوان، طبع صاوی، ص ۷۲۱) اسے اپنے بزرگ متقدمین میں شمار کرتا ہے۔ ابو عمرو بن العلاء اسے بڑے اور مستند (= فحول) شعرا میں شمار کرتا ہے۔ اس کی منظومات الأضحیٰ اور ابن السکیت (المہرست، ۱۵۸، ۶) نے جمع کی نہیں۔ ابو عبیدہ نے اس کے دیوان کی شرح لکھی، جس سے عبدالقادر البغدادی نے استفادہ کیا (وہی کتاب، ۲: ۲۶۲، ۴)۔ المفضلیات (قصیدہ ۹۶ تا ۹۹ طبع Lyall) میں بشر کی چار نظمیں شامل ہیں۔ ان میں سے آخری (جو غلطی سے قصیدہ ۱۰۰ سے ملا دی گئی

ابناء بنو صعصعہ پر چھاپا مارنے کے دوران میں سہلک طور پر زخمی ہوا تھا (دیکھیے عبدالقادر: وہی کتاب، ۲: ۲۶۲؛ المنضلیات، ۱: ۳۱؛ المرزبانی: معجم الشعراء، ص ۲۲۲)۔ یہ روایت افسانوی ہے کہ حاتم طائی نے بشر، عبید بن الابرص (م حدود ۵۵ تا ۵۶) اور النابغة الذبیانی تینوں کو پر تکلف دعوت دی تھی (ابن قتیبة: الشعر، ص ۱۲۴؛ الاغانی، ۱۶: ۹۸)۔ ابو عبیدہ کا یہ قیاس بھی ناقابل تسلیم ہے کہ "ملک" عمرو بن ام ایاس، جس سے بشر نے کم سے کم دو نظموں میں خطاب کیا ہے، حجر آمل المرار کا پوتا تھا (الاغانی، بار اول، ۱۵: ۸۷؛ نیز دیکھیے عبدالقادر: وہی کتاب، ۲: ۱۸۲)۔ لہذا کبھی بشر کے قبیلے کے ایک متأخر شاعر کے اشعار بھی اس سے منسوب کر دیے جاتے تھے (نقائض، ص ۲۴۱، ۲۴۵، طبع Bevan) [لسان العرب میں بشر کے اشعار بکثرت منقول ہیں]۔

مآخذ: ان کتب کے علاوہ جو مقالے میں مذکور

ہیں: (۱) ابن قتیبة: الشعر والشعراء، ص ۱۴۵ تا ۱۴۷؛ (۲) خزائن الادب، بار اول، ۲: ۲۶۲ تا ۲۶۴؛ (۳) المرزبانی: الموشح، ص ۵۹؛ (۴) المنضلیات، طبع Ch. Lyall، ۲: ۲۶۸؛ بعد: (۵) A. Hartigan،: MFOB، ۱: ۲۸۴ تا ۳۰۲؛ (۶) G. Von Grunebaum، بشر بن ابی حازم، در Collection of Fragments، ۱۹۳۹ء، ص ۵۳۳ تا ۵۶۷؛ [۷] ابن حزم: جمهرة انساب العرب، بامداد اشاریہ؛ (۸) براکلمان (تاریخ الادب العربی) (تعریب عبد الحلیم النجار)، ۱: ۷۷، ۱۱۸]۔ (J. W. FUCH)

بشر بن البراء: مدنی صحابی رض، خزیج کی شاخ بنو سلمہ سے تھے۔ انہوں نے اور ان کے باپ البراء بن معرور [ربک باں] دونوں نے ابتدا ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور یہ ان ستر (یا کچھ زیادہ) اہل مدینہ میں سے تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

ببعد) نے اس پر حاشیہ لکھا ہے۔ اس بیان کی رو سے جو بشر کو الحظیئة (م حدود ۴۳/۴۵) کا ہم عصر بتاتا ہے یہ نزاع النعمان بن المنذر (عہد حکومت ۵۸ تا ۶۰ء) کے دربار میں شروع ہوئی تھی۔ اوس بن حارثہ نے بنو اسد پر چھاپا مارا، بشر کو پکڑ لیا، لیکن اس کی جان بخشی کر دی۔ اسی پر بشر نے اپنے محسن کی مدح میں پانچ قصیدے لکھ کر اپنی پانچ ہجوؤں کی تلافی کر دی۔ حقیقت خواہ کچھ ہو، بشر کی نظموں میں یقیناً اوس بن حارثہ کی مدح میں چند قصائد موجود ہیں (مختارات، ص ۷۵؛ ابن الشجری، الحماسة، ۱۰۳) اور اسی طرح کے ایک اور قصیدے کے اجزا بھی ملتے ہیں (قب عبدالقادر: وہی کتاب، ۱: ۲۵۵ تا ۲۶۳ و ۳: ۱۱۱ اور المبرد: الکامل، ص ۱۳۳) مگر انہیں جنڈب بن خارجہ الطائی سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ اگر بشر کی یہ معذرت مستند ہے (مرتضی: امالی، ۲: ۱۴۴) تو پھر یہ قصائد، ہجوؤں سے مؤخر ہیں۔ ایک اور ہجو (القالی: امالی، بار اول، ۲: ۲۳۳؛ المنضلیات، ۱: ۳۴۰، ۵۸۴، ۷۶۰؛ Freytag: Prov Arabum، ۱: ۲۵۱) عتبہ بن مالک بن جعفر بن کلاب کے خلاف لکھی گئی ہے۔ اس عتبہ کا ایک لڑکا عروۃ الریحال تھا، جسے البراء [الکنانی] نے تقریباً ۵۹ء میں قتل کر دیا تھا۔ ابو عمرو ابن العلاء (الاغانی، بار اول، ص ۱۹، ۷۵) کا قول ہے کہ اس قتل کے بعد، جو فجار کی دوسری جنک کا باعث بنا، البراء نے بشر سے کہا تھا کہ وہ حرب ابن امیہ اور قریش کے دوسرے سرداروں کو متنبہ کر دے کہ قیس عیلان کا قصاص لیا جائے گا اور بنو اسد، قریش کے حلیف تھے (ابن سعد، ۱/۱: ۸۱ س ۹)۔ آخر میں شاعر کا خود اپنا ایک مرثیہ ہے (مختارات، ص ۸۱ تا ۸۳)، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اس وقت [فی البدیہہ] کہا تھا جب وہ



اور رنگریز اور مذہب کے لحاظ سے یہودی تھا۔ بشر مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد زید بن الخطاب کا "مولیٰ" ہو گیا۔ وہ بغداد کے مغربی علاقے کے "درب المریس" (یا "المریسی") میں رہتا تھا اسی لیے وہ "المریسی" [قب السمانی: الانساب و لب الالباب] مشہور ہوا۔ وفات بغداد میں ۵۲۱۸ / ۶۸۳۳ میں ہوئی۔

بشر فقہ میں امام ابو یوسف کا بہت محنتی شاگرد تھا اور اگرچہ وہ کچھ مستنل آرا بھی رکھتا ہے، مگر اسے حنفی مذہب کے پیروؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے حماد بن سلمہ، سفیان بن عیینہ اور دوسرے محدثین سے بھی حدیث کی سماعت کی۔ الہیات میں وہ فرقہ مرجئہ کے عام مسلک کا حامی ہے اور بدعتی فرقوں کا کھوج لگانے والے مسلمان مصنفین اس کے متبعین کو، جنہیں کسبھی کسبھی "المریسیہ" بھی کہتے ہیں، اسی مرجئہ تحریک کی ایک شاخ سمجھتے ہیں۔ بشر نے "ایمان" کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ دین اسلام کا قلب و زبان سے اقرار (تصدیق) کرنا ہے اور جوشی، تصدیق نہیں وہ ایمان بھی نہیں۔ اس کا الٹ یہ ہوا کہ سورج کو سجدہ کرنا بذات خود کفر نہیں بلکہ ایک علامت کفر ہے۔ دوسری طرف اس کے نزدیک خدا کی نافرمانی کے تمام افعال گناہ کبیرہ ہیں لیکن اس کے متبعین (اور قیاس چاہتا ہے کہ خود بشر بھی) قرآن کریم سورۃ الزلزال (آیت ۷: فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ) کی روشنی میں اس بات کو منطقی طور پر نا ممکن خیال کرتا ہے کہ مسلمان گناہگار ابد الابد تک دوزخ میں رہیں گے۔

بشر کی رائے میں قرآن مجید مخلوق تھا، یہ عقیدہ، جسے سب سے پہلے صراحتاً جہم بن صفوان [رك بان] نے پیش کیا اس بات کا باعث ہوا کہ

کے ساتھ عقبہ کی دوسری بیعت میں شامل تھے۔ بعد میں بشر نے بدر، احد، خندق اور خیبر (۵۷/۶۲۸ء) کے غزوات میں حصہ لیا۔ خیبر میں انہوں نے زہر آلودہ بھیڑ کا گوشت کھایا، جسے ایک یہودیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا تھا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چکھ کر زہر معلوم کر لیا اور گوشت کو تھوک دیا، لیکن بشر اسے نگل گئے اور فوت ہو گئے۔ بعض روایات کی رو سے فوراً ہی اور بعض کی رو سے ایک برس بیمار رہنے کے بعد۔

بشر ایک مشہور تیر انداز اور پرجوش مسلمان تھے۔ یہودی مدینہ کے ساتھ ان کے مناظروں کا ذکر آتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں قبیلہ بنی سلمہ کا "سید" (سردار) کے لفظ سے یاد فرمایا کرتے تھے۔ الشیرازی (المہذب، قاہرہ، ۲: ۱۷۶ تا ۱۷۷) نے زہر دینے کے اس جرم کبیرہ کے سلسلے میں بشر کے اس واقعے کو بیان کیا ہے۔

ماخذ: (۱) ابن ہشام، ص ۳۰۹، ۳۷۸، ۳۹۹، ۷۶۳ تا ۷۶۵؛ (۲) ابن سعد، ۲/۳: ۱۱۱ تا ۱۱۲؛ (۳) الطبری، ۱: ۱۵۸۳ تا ۱۵۸۴ و ۳: ۲۵۳۸؛ (۴) ابن الأثیر: الكامل، ۲: ۱۷۰؛ (۵) الیعقوبی: تاریخ، ۲: ۵۷؛ (۶) اسد الغابۃ، ۱: ۱۸۳؛ (۷) النووی، ص ۱۷۳ تا ۱۷۴؛ (۸) کائناتی: Annali: Caetani، بحد اشاریہ؛ (۹) ابن حزم: جمہرۃ، ص ۳۵۹؛ (۱۰) ابن حجر: الاصابۃ، ۱: ۱۵۵؛ (۱۱) الذہبی: سیر اعلام النبلاہ، ۱: ۱۹۰۔

(W. 'ARAFAT)

بشر بن غیاث: بن ابی کریمہ [عبدالرحمن]، ابو عبدالرحمن المریسی، ایک ممتاز عالم دینیات، جس کا تعلق مرجئہ [رك بان] فرقے سے تھا۔ کہتے ہیں اس کا باپ کوفی کا قصار (اونی کپڑے دھونے والا)

بشر نو بھی آگے چل کر لوگ ازراہ مذمت ”جہمی“ کہنے لگے۔ یہ معتزلہ [رک باں] کا بھی ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ چنانچہ بدعتی فرقوں پر لکھنے والے اسے جہمی کے ساتھ معتزلہ میں بھی شامل کر سکتے تھے۔ بشر نے مشیت الہی کی الگ الگ دو قسمیں قرار دی ہیں۔ اس سے تقدیر کے مسئلے میں اس کی حیثیت قدریہ و جبریہ [رک باں] کے دو انتہا پسندانہ عقیدوں کے بین بین ہو جاتی ہے اور یہ وہی متوسط مسلک ہے جو اہل السنۃ والجماعت [رک باں] کا عقیدہ ہے اور جو معتزلہ عقیدے کے خلاف ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ بشر کے خاص شاگرد النجار [رک باں] کے عقیدے پر، اس کے ہم عصر معتزلیوں نے حملہ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا عقیدہ اپنے استاد کے عقیدے سے ہم آہنگ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ بشر پر اس کے اعتقادات کی وجہ سے جبر و تشدد کیا گیا۔ خصوصاً کہتے ہیں کہ اسے عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں بیس برس تک روپوش رہنا پڑا۔ غالباً یہ محض افسانہ ہے، کیونکہ راسخ العقیدہ اہل السنۃ والجماعۃ کے رکن رکن امام الشافعیؒ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بغداد میں اپنے قیام کے دوران میں بشر اور ان کی ماں کے ہاں، جو ایک مسلمان پاداش خاتون تھی، مقیم رہے اور یہ بشر کی مبینہ روپوشی کی مدت کے دوران کا واقعہ ہے، لیکن یہ سچ ہے کہ اہل الحدیث [رک باں] خصوصاً احمد بن حنبلؒ اور ان کے متبعین نے بشر کی سخت نفرت کے ساتھ مخالفت کی ہے۔ چنانچہ بعد میں راسخ العقیدہ سنی، بشر کی زاہدانہ زندگی کے باوجود اسے مسلمانوں میں رئیس الملاحذہ خیال کرنے لگے اور اس کی سوانح عمری میں اہانت آمیز ناپاک خصائل کا اضافہ کر دیا گیا۔

مآخذ: (۱) النوبختی: فرق الشیعہ، طبع رٹر Ritter

بمدد اشاریہ (مع مآخذ): (۲) عثمان بن سعید الدارمی (م ۲۸۲ھ): رد الامام الدارمی . . . علی بشر المرسی، قاہرہ ۵۱۳۵۸؛ (۳) الخیاط: کتاب الانتصار، طبع Nyberg، ۱۹۲۵ (فرانسیسی ترجمہ Nader، ۱۹۵۷)، بمدد اشاریہ؛ (۴) الاشعری: مقالات الاسلامیین، طبع رٹر Ritter (مع مآخذ): (۵) البغدادی: الفرق بین الفرق، ص ۱۹۲ بعد (ترجمہ A.S. Halkin: Moslem Schisms and sects، ۱۹۳۵، ص ۵ بعد)؛ (۶) الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۷: ۵۶ بعد؛ (۷) الاسفرائینی: التبصیر فی الدین، ص ۶۱؛ (۸) الشہرستانی، ص ۱۰۷ (مترجمہ Harbrücker: Religionsspartheien und Philosophen-Schulen، ص ۱۶۲، ۱۷۰)؛ (۹) السمعانی، ص ۵۲۳ - ب بعد؛ (۱۰) ابن خلکان، بذیل مادہ؛ (۱۱) عبدالقادر: الجواهر المصیئۃ، ۱: ۱۶۴ بعد؛ (۱۲) ابن حجر العسقلانی: لسان المیزان، ۲: ۲۹ بعد؛ (۱۳) عبداللہ مصطفیٰ المراغی: الفتح المبین فی طبقات الاصولیین، ۱: ۱۴۳ بعد؛ (۱۴) براکلمان Brockelmann، ۱: ۲۰۶؛ تکملہ، ۱: ۳۴۰؛ (۱۵) رٹر، در Isl، شماره ۱۶، ۱۹۲۷: ۲۵۲ بعد؛ (۱۶) [الذہبی: میزان الاعتدال، ۱: ۱۵۰؛ (۱۷) یاقوت: معجم البلدان، بذیل مادہ مریسہ]؛ (۱۸) A. N. Nader: Le système philosophique des mu'tazila، ص ۱۰۶؛ (۱۹) Laoust: La profession de foi d'Ibn Batta، ص ۱۶۷، عدد ۳ (مع مآخذ).

(J. SCHACHT و A.N. NADER مع CARRA DE VAUX)

بشر بن مروان: بن الحکم، ابو مروان ایک اموی شہزادہ، خلیفہ مروان [رک باں] اور قطیہ بنت بشر (بنو جعفر بن کلاب، گویا قیسی قبیلے سے) کا بیٹا تھا۔ اس نے جنگ مرج راهط (۵۶۵ھ/۶۸۴ء) میں حصہ لیا اور اسی جنگ میں [بنو] کلاب کے ایک سردار کو قتل کیا۔ اس کا باپ جب خلافت پر متحکم ہوا اور اس نے مصر پر چڑھائی کی تو اس



خلاف جنگوں کی قیادت کامیابی سے نہیں کی تھی۔ اسی سال کے آخر میں یا ۵۷۴ء میں بشر، عمرو بن حرث المعزومی کو کوفے میں اپنا نائب چھوڑ کر خود شہر بصرہ میں منتقل ہو گیا۔ والی کوفہ کی حیثیت سے بشر نے عبدالملک کی طرف سے خوارج کے خلاف سہم کو کمک دینے کے لیے امدادی فوجیں بھیجیں، اور اگرچہ اسے امیر لشکر مقرر کیا گیا تھا، اسے براہ راست عبدالملک کا حکم ملا کہ وہ اس فرقے کے خلاف لڑنے والی فوج کی سپہ سالاری المہلب [رک بان] کے سپرد کر دے۔ جب وہ بصرے پہنچا تو اس نے اپنی سخت ناپسندیدگی کے باوجود حکم کی تعمیل کی، کیونکہ وہ عمر بن عبید اللہ بن معمر کو مقرر کرنا چاہتا تھا اس وجہ سے اسے بے حد صدمہ پہنچا کہ خلیفہ نے اس معاملے میں اسے اختیار سے محروم کر دیا (الطبری، ۲: ۸۵۵ بعد وغیرہ)، چنانچہ اس نے کوفے کے سردار لشکر کو مشورہ دیا کہ وہ المہلب کے فوجی اقدام کی مخالفت کرے۔ اس بات سے مہلب بہت ناراض ہوا (الطبری، ۲: ۸۵۶)۔

بصرے پہنچنے سے پہلے ہی بشر کسی پوشیدہ مرض (البلاذری، ۵: ۱۷۱، ۱۷۹ وغیرہ) یا کسی متعدی بیماری میں مبتلا ہو چکا تھا (ابن کثیر، ۹: ۷) اور چند ہی روز بعد چالیس سال سے کچھ اوپر عمر میں انتقال کر گیا۔ ابن عساکر کے قول کے مطابق ۵۷۴/۶۹۳-۶۹۴ء میں (بقول الواقدی، بحوالہ الطبری، ۲: ۸۵۲، ۵۷۳ء میں اور بقول الذہبی ۵۷۵: تاریخ، مخطوطہ Bodl، جلد ۲ ورق ۹۵؛ الیافعی: مرآة الجنان، مخطوطہ پیرس ۱۵۸۹ء، ورق ۵۵) اسے بصرے میں دفن کیا گیا، لیکن چند ہی دن بعد اس کی قبر اور ایک زنگی کی قبر میں، جو اسی دن فوت ہوا تھا، تمیز کرنا محال ہو گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے

وقت بشر اس کے ہم رکاب بصر گیا، کیونکہ ماخذ ہمیں بتاتے ہیں کہ ۵۶۵/۶۸۴ء میں جب مروان نے یہ صوبہ بنو امیہ کے لیے دوبارہ فتح کر لیا، جسے ابن الزبیر [رک بان] نے شعبان ۵۶۴/مارچ۔ اپریل ۶۸۴ء میں چھین لیا تھا، تو نماز کی امامت اور وصولی خراج کا اہتمام اپنے بیٹے عبدالعزیز [رک بان] کو تفویض کیا اور اس کے ساتھ بشر کو وہاں چھوڑ دیا تا کہ وہ عبدالعزیز کی معیت میں رہے اور اسے اپنے گھر بار سے جدائی کا غم بھلانے کے کام آئے۔ لیکن کچھ عرصے میں دونوں بھائیوں کے تعلقات بگڑ گئے اور بشر غالباً ملک شام میں واپس چلا آیا۔ وقائع نکار ۵۷۱/۶۹۰-۶۹۱ء کے واقعات کے سلسلے میں اس کا ایک بار پھر ذکر کرتے ہیں (الطبری، ۲: ۸۱۶)۔ یہ وہ سال ہے جس میں خلیفہ عبدالملک نے اسے کوفے کا والی مقرر کیا۔ لیکن اس منصب پر فائز ہونے کی نوبت غالباً مصعب بن الزبیر [رک بان] کے خلاف مہم کے ختم ہو جانے کے بعد آئی، جس میں بشر نے حصہ لیا تھا (البلاذری: انساب، ۵: ۳۳۵، ۳۳۸) اور وہ ۵۷۲ء میں کوفے میں مقیم ہوا (الطبری، ۲: ۸۲۲) اور اس کے پاس نہ صرف اس کا چچا روح بن زبناح [رک بان] مشیر تھا۔ بلکہ موسیٰ بن نصیر بھی تھا، جس کو اسی نیت سے عبدالملک نے عبدالعزیز سے طلب کیا تھا (بروئے کتاب احادیث الامامة و السیاسة: P. D. Gayangos: The History of Moh. Dynasties in Spain، لندن ۱۸۴۰ء تا ۱۸۴۳ء، ۱۱ کے ضمیمے میں)۔ ۵۷۳/۶۹۲-۶۹۳ء میں خلیفہ نے کوفے کے صوبے کے علاوہ بصرے کا صوبہ بھی اس کی تحویل میں دے دیا، جسے اس نے خالد بن عبداللہ بن خالد بن اسید سے چند ہی ماہ میں واپس لے لیا تھا۔ کیونکہ اس نے خوارج کے

کہ اس زمانے میں قبور کے متعلق کس قدر بے توجہی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس کی وفات کی خبر سے مہلب کی فوج کے بعض لوگ مہلب کا ساتھ چھوڑ کر چل دیے۔

بشر نہایت دلپذیر نوجوان تھا، وہ ایسا حاکم تھا جس تک رسائی بغیر کسی مشکل کے ہو جاتی تھی (دیکھیے آئمن بن حُرَیم [رک باں] کے اشعار در الاغانی، ۲۱: ۱۲)۔ وہ نمایاں طور پر رحمدلی کی طرف مائل رہتا تھا تاہم اس نے ابن الزبیر کے داعیوں کو قتل کروا دیا، جو مصعب کی موت کے بعد بھی شہر بصرہ میں سازشیں کرتے رہتے تھے۔ اس کی حکومت کے خلاف ایک الزام تو یہ تھا کہ وہ عبادات میں بعض بدعات کو رواج دینے کا مرتکب تھا اور دوسرا الزام یہ تھا کہ وہ غلہ اپنی رعایا میں تقسیم کرنے کے بجائے اپنے مصاحبوں اور درباریوں کے لیے محفوظ کر لیتا تھا (البلاذری، ۱۸۰: ۵)۔

المسعودی [مروج، ۵: ۲۵۴ تا ۲۵۸] ہمیں ایک ایسی چال کا قصہ سناتا ہے جو اس کے ایک دوست نے اسے اس کے ماموں روح کی موجودگی سے چھٹکارا دلانے کے لیے چلی تھی، کیونکہ یہ موجودگی آزادی میں بہت خلل انداز ہونے لگی تھی۔ مگر روح کے ہٹائے جانے کی وجہ ابن قتیبہ (عیون الاخبار، طبع براکلمان Brockelmann، ص ۲۰۷) نے مختلف بیان کی ہے۔ بشر کو گانا سننے اور شعر کہنے کا بھی شوق تھا، اور شعرا اس کے کرم اور فیاضی سے مستفید ہوتے تھے (دیکھیے ایک طویل قصیدہ و مرثیہ در دیوان فرزدق طبع Boucher، پیرس ۱۸۷۰ء، ص ۱۷۳ تا ۱۷۵، ۱۲۹، ترجمہ ۵۲۱ تا ۵۲۵، طبع هل Hell، میونخ ۱۹۰۰ء، بحد اشاریہ؛ نیز اس کی شان میں الاخطل کے قصائد، دیوان، طبع سلحانی، ص ۳۸، ۵۸، ۶۸، ۱۲۰)۔

دیگر شعرا بھی اس کے جلو میں رہتے تھے یا اس کی مدح میں شعر کہتے تھے، جیسے جریر، نَثیر عَزَّہ، نصیب، سراقہ بن مرداس البارقی، بنو شیبان کا الاعشی، آئمن بن حُرَیم الأسدی، المتوکل اللیثی، ابن قیس الرقیات، ابن الزبیر، الحکم بن عبدل، الاقشیر [۱۱: العقیشر] الاسدی، العجاج، کعب الأشقری، الراعی۔ دوسری طرف زفر بن الحارث نے، جو مصعب کا طرفدار تھا، بشر کی ہجو کہی۔

مآخذ: (۱) سب سے طویل سوانح حیات البلاذری

کے ہاں ہیں، انساب، طبع Goitein، ۵: ۱۶۶ تا ۱۸۰ (نیز دیکھیے: ۵: ۱۴۰، ۱۶۴)؛ (۲) سبط ابن الجوزی:

مرآة الزمان، مخطوطہ Bodl. Marsh، ۲۸۹، ورق ۱۰۔ ب تا ۱۶۸ الف، مخطوطہ پیرس ۶۱۳۱، ورق

۲۲۳ ب تا ۲۲۴ الف؛ (۳) ابن کثیر: البداية والنهاية، قاہرہ ۵۱۳۵۱ / ۱۹۳۲ء، ۹: ۷؛ ان حوالوں کے علاوہ

جو مقالے میں مذکور ہیں دیکھیے: (۴) ابن سعد: الطبقات، ۵: ۲۴، ۱۱۵؛ (۵) الطبری، ۲: ۸۲۵ بعد،

۸۲۸، ۸۵۳ بعد، ۸۵۵ بعد، ۸۵۷، ۸۷۳؛ (۵) الکندی:

The Governors and Judges of Egypt، طبع Guest،

ص ۴۷؛ (۶) ابن عساکر: تاریخ دمشق، در فصل

۷۳؛ (۷) ابن الأثیر، ۴: ۲۷۰، ۲۸۰، ۲۸۳، ۲۹۵،

۲۹۷؛ (۸) ابن قتیبہ: الشعر والشعراء، ص ۳۴۵؛ (۹)

المبرد: الكامل، طبع رائٹ Wright، ص ۶۶۲، ۶۶۳،

۶۶۴، ۶۶۶ (= ابن ابی الحدید: شرح نہج البلاغہ،

۱: ۳۹۵)؛ (۱۰) المسعودی: مروج، ۵: ۲۰۸؛ (۱۱)

الآغانی، بحد اشاریہ؛ (۱۲) یاقوت، ۲: ۶۴۷، ۷۳۸ و

بحد اشاریہ؛ (۱۳) Ahlwardt: Sammlungen alter arab.

Dichter، برلن ۱۹۰۲ تا ۱۹۰۳ء، ۲: xxv، عدد xvii؛

(۱۴) Ch. Pellat: Le milieu basrien، پیرس ۱۹۵۳ء،

۱۵۶، ۲۴۷، ۲۵۰، ۲۷۸؛ (۱۵) V. Rizzitano:

Abd al-'Aziz b. Marwān, governatore umayyade

d'Egitto، در Academia Nazionale dei Lincei،



*Rendiconti della Classe di scienze morale, storiche  
& filologiche*، سلسلہ، ۳، ج ۲، کراسہ ۵ تا ۱۹۴۷ :  
ص ۳۲۱ تا ۳۴۷ .

(L. VECCIA VAGLIERI)

بشر بن المعتز : (ابو سهل الہلالی) بغداد میں پیدا ہوا، جہاں سے وہ بصرے گیا اور وہاں اس کی ملاقات بشر بن سعید اور ابو عثمان الزعفرانی سے ہوئی، یہ دونوں واصل بن عطاء (بانی فرقہ معتزلہ) کے رفیق تھے۔ انہوں نے اسے اس مذہب کے اصول سکھائے۔ اس کے استادوں میں ایک معتز بن عباد السلمی تھا۔ بغداد کو مراجعت کے بعد بشر بہت سے لوگوں کو مذہب اعتزال قبول کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ ہارون الرشید نے، جو عقیدہ معتزلہ کا دشمن تھا، اسے زندان میں ڈال دیا۔ اس پر بشر نے ”العدل“، ”التوحید“ اور ”الوعید“ پر جو دبستان معتزلہ کے تین بنیادی اصول ہیں، کوئی بیس ہزار نہایت فصیح و بلیغ بیت نظم کر دیے۔ یہ اشعار زندان کی چار دیواری سے باہر پہنچ گئے اور جگہ جگہ جلسوں میں پڑھے جانے لگے۔ الرشید نے یہ سمجھ کر کہ بشر کے اشعار کا عوام پر اثر و نفوذ اس کے قید ہو جانے سے پہلے کی تلقین سے زیادہ ہے اسے رہا کر دیا۔ بشر نے سچ سچ ایک والہانہ نظم عقل کے نام معنون کی ہے۔ وہ بیک وقت ایک عظیم شاعر بھی تھا اور عظیم خطیب بھی۔ اس نے مصنفوں خصوصاً شاعروں کو جو نصیحت کی تھی اسے الجاحظ کے ایک یادگار ورق میں نقل کیا گیا ہے (البیان، ۱ : ۱۰۴)۔ وہ کہتا ہے: ”شاعر کو وہ خفیہ سماوی تاثر محسوس کر لینا چاہیے اور اسے نفیس و جمیل الفاظ منتخب کرنا چاہیے جو سادہ اور ادائے مطلب میں واضح ہوں۔“ معتزلی اصولوں پر اس کی تصنیفات میں سے فقط چند اجزا ہم تک پہنچے ہیں۔ اس نے اخلاقی

ذمے داری پر خصوصیت سے زور دیا اور وہ پہلا شخص تھا جس نے ”افعال زائیدہ“ ( : ”التولد“ ) پر کلام کیا تا کہ اس ذمے داری کی حقیقت واضح کرے اور ساتھ ہی حسی ہیجان کے مسئلے کی تشریح کر دے۔ ”زائیدہ فعل“ ( = تولد ) وہ فعل ہے جس کی کسی ایسی علت سے تحریک ہوتی ہو جو بذات خود کسی اور علت کی معلول ہوتی ہے۔ چنانچہ کنجی سے دروازہ کھولنے کے فعل میں پہلے ایک ارادی فعل ہوتا ہے، پھر اس ہاتھ کی حرکت ہوتی ہے جو کنجی کو گھماتی ہے اور اخیر میں چابی کی حرکت ہوتی ہے جو قفل کے پیچ کو گھماتی ہے، آخری حرکت ”زائیدہ فعل“ ہے، کیونکہ یہ کسی ارادی فیصلے سے براہ راست ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ اس طرح وہ کہتا ہے کہ ہم ان افعال کے ذمے دار ہیں جن کی ہم سے ابتدا ہوتی ہے : یا تو براہ راست یا ہمارے براہ راست (ارادی) افعال سے پیدا ہونے والے عمل سے۔ یہ ذمے داری اسی حد تک عائد ہو گی جس حد تک ہم ان کے تمام عواقب سے آگاہ ہوں۔ بشر نے جس کے بھی زائیدہ فعل ہونے کی حیثیت سے اس کی تشریح کی ہے اور وہ یہ ہے کہ : اس تاثر کے ذریعے جو پہلے حواس خمسہ پر ہوتا ہے، پھر حواس فطری طور پر اس تاثر کو پہچان میں بدل دیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ عقل جونہیں بلوغت کو پہنچ جاتی ہے بلند اخلاقی مسائل کا ادراک کر سکتی ہے، نیکی اور بدی میں کسی وحی سے بھی پہلے تمیز کر سکتی ہے، لہذا کسی خوبی یا عدم خوبی کا انحصار ہم پر ہی ہوتا ہے، اس لیے کہ ہمیں انتخاب اور عمل کی آزادی ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ ”اس شخص کی خوبی زیادہ ہے جو خود اپنے ہی وسائل سے نیکی کرتا ہے بہ نسبت اس کے جسے خدا کے فضل سے مدد ملی

۱۹۰۳ء، ص ۳۰، ۳۵؛ (۶) الجاحظ: البيان، قاهرة  
 ۱۹۲۶ء، ۱: ۱۰۳؛ (۷) الخياط: كتاب الانتصار،  
 قاهرة ۱۹۲۶ء، بمواضع كثيرة (اسی کتاب کا فرانسیسی  
 ترجمہ، از A. Nader، بیروت ۱۹۵۷ء)؛ (۸) المظني:  
 كتاب التبيين، ص ۳۰؛ (۹) القرطبي (ابوعمر): كتاب  
 جامع بيان العلم وفضله، قاهرة ۱۳۳۶ھ / ۱۹۲۸ء، ص  
 ۶۲؛ (۱۰) الشہرستانی: العليل (ابن حزم کے  
 حاشیے میں)، قاهرة ۱۳۳۷ھ / ۱۹۲۸ء، ۱: ۵۰؛  
 ۶۱؛ (۱۱) ابن المرتضى: المنية و الامل، حیدرآباد  
 ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۹ء (معتزلہ پر ابواب)؛ (۱۲) احمد  
 امین: ضحی الاسلام، قاهرة ۱۹۳۸ء، ج ۳؛ (۱۳) A.  
 Nader: Le Systeme Philosophique des Mu'tazila،  
 بیروت ۱۹۵۶ء، ص ۳۸ و مواضع کثیرہ.

(ALBERT N. NADER)

بشر بن الولید: بن عبدالمک، اموی شہزادہ،  
 خلیفہ الولید کی کثیر اولاد زینہ میں سے ایک اور  
 خلیفہ یزید سوم اور ابراہیم کا بھائی، اپنی  
 علمیت کی وجہ سے اس نے "عالم بن مروان" کا  
 خطاب حاصل کیا۔ اس نے بہت سی فوجی مہموں  
 کی قیادت کی (یقیناً ۵۹۲ھ / ۷۱۰-۷۱۱ء میں،  
 الیعقوبی، ۲: ۳۵۰ اور ۵۹۶ھ / ۷۱۳-۷۱۵ء میں  
 بوزنطیوں کے خلاف، الطبری ۲: ۱۲۶۹ وغیرہ)۔  
 اس کے باپ نے ۵۹۵ھ / ۷۱۳ء میں اسے "امیر  
 الحج" مقرر کیا۔ اس کا نام اس وقت تک مآخذ میں  
 نہیں آیا جب تک اس کے چچیرے بھائی الولید ثانی  
 کے خلاف ۵۱۲ھ / ۷۳۳-۷۳۴ء میں سازش نہ  
 ہوئی۔ اپنے مشہور سپہ سالار بھائی العباس کی  
 ممانعت کے باوجود وہ خلیفہ کے مخالفوں میں شامل  
 ہو گیا، جو یزید بن الولید (بعد میں یزید سوم)  
 کی حمایت کرتے تھے۔ مگر اپنے خاندان میں صرفہ  
 وہی ایک فرد نہیں تھا جس نے ایسا کیا، بلکہ تیرہ  
 اور بھائیوں نے بھی یزید کی حمایت کی تھی۔

ہو۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ارادی فیصلے  
 کے لیے ضروری نہیں کہ اس پر عمل بھی کیا  
 جائے، چاہے اس میں دوسرے موانع نہ ہوں۔  
 ہم اسی حد تک اپنے ذمے دار ہوتے ہیں جس حد  
 تک ہم ان کی اخلاقی قدر کو پہچانتے ہوں، لاعلمی  
 کی حالت میں ہم پر کوئی ذمے داری عائد نہیں  
 ہوتی۔ وہ کہتا ہے کہ توبہ کرنا بے سود ہے،  
 جب تک اس کے ساتھ یہ عزم نہ ہو کہ گناہ  
 کا پھر ارتکاب نہیں کیا جائے گا اور اس پر مزید  
 اصرار نہیں کیا جائے گا۔

جہاں تک عالم خارجی کے متعلق ہمارے  
 علم کا تعلق ہے یہ جزوی اور اضافی ہو سکتا ہے؛  
 لیکن اس سے عقل کی قدر و قیمت پر کوئی حرف  
 نہیں آتا۔ وہ اسے درست سمجھتا ہے کہ حرکت  
 دو لمحات ساکن کے درمیان واقع ہوتی ہے، جن  
 میں سے عامل متحرک گذرتا ہے۔ اس کی رائے  
 ہے کہ علت کو بہر صورت معلول سے پہلے ہونا  
 چاہیے۔ وہ پوری کائنات پر تقدیر کی کار فرمائی کی  
 وکالت کرتا ہے اور صرف انسان کی آزادی حرکت  
 ہی کو مستثنیٰ سمجھتا ہے۔ اخیر میں، وہ روح کو  
 انسانی جسم سے ناگزیر طور پر متحد تصور  
 کرتا ہے۔

بشر کے شاگرد آگے چل کر معتزلہ کے  
 استاد بن گئے۔ ابو موسیٰ المراد، ثمانہ،  
 اور احمد بن ابی دؤاد۔ اس کی وفات غالباً ۵۲۱ھ /  
 ۸۲۵ء اور ۵۲۶ھ / ۸۳۰ء کے درمیان ہوئی۔

مآخذ: (۱) الأشعری: مقالات، استانبول ۱۹۲۹ء،  
 ص ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۵۳، ۳۷۳، ۳۸۹، ۳۹۱، ۴۰۱؛  
 (۲) البغدادی: الفرق، قاهرة ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء، ص  
 ۹۳، ۱۱۱، ۱۱۵، ۱۳۳، ۱۵۱؛ (۳) ابن حزم: الفصل،  
 قاهرة ۱۳۳۷ھ / ۱۹۲۸ء، ۳: ۱۳۹؛ (۴) الأیجی:  
 المواقف، ص ۴۱۶؛ (۵) الأسفرائینی: التبصیر، قاهرة



جو مرو الشاهجان کے قریب ایک گاؤں پُکُرد یا مَابَرَسَام میں ۵۱۰ / ۵۶۷ء (یا ۵۱۵۲ / ۵۷۶۹ء) میں پیدا ہوئے اور بغداد میں وفات پائی (بعض مآخذ کی رو سے وہ ۵۲۲۶ / ۵۸۳۰ء یا ۵۲۲۷ / ۵۸۳۱ - ۵۸۳۲ء میں بمقام مرو فوت ہوئے، لیکن یہ بیان صحیح معلوم نہیں ہوتا)۔ ان کی ابتدائی زندگی کے بہت کم حالات معلوم ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ابتدائی دور میں مرو میں ان کا تعلق نوجوانوں کی کسی انجمن یا کسی گروہ کے ساتھ تھا اور وہ آزاد طبع آدمی تھے۔ ایک اور روایت میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ تکلے بنا کر روزی کماتے تھے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ بات کس حد تک درست ہے اور ان کی زندگی کے کس دور سے تعلق رکھتی ہے، لیکن اس قدر یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ اپنے ماموں علی بن خَشْرَم (۵۱۶۵ / ۵۷۸۱ء تا ۵۲۵۸ / ۵۸۷۱ - ۵۸۷۲ء) کی طرح وہ بھی ایک محدث تھے۔ عبداللہ بن المبارک (المتوطن بہ مرو، جنہوں نے بہت سیر و سیاحت کی تھی) کے سوا ان کے سب استاد عربی بولنے والے علاقوں کے رہنے والے تھے۔ اس طرح گویا بشر نے گھر سے نکلنے کے بعد بھی یقیناً حدیث کا مطالعہ جاری رکھا ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ مطالعے کے اسی شوق نے انہیں سیر و سفر پر آمادہ کیا ہو۔ جب وہ عبادان سے پہلی بار بغداد پہنچے تو وہ خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے؛ چنانچہ بغداد میں ایک محدث ان سے ملنے کا مشتاق تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بشر حضرت مالک بن انسؓ (م ۵۱۷۹ / ۵۷۹۵ء) کے حلقہ درس میں بھی شریک ہوئے اور حج کے لیے ان کے ساتھ مکہ معظمہ گئے۔ تاریخی شواہد کی بنا پر یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ وہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے بھی شاگرد رہے، جیسا

آرمینہ اور عراق کا والی مروان بن محمد جب یزید کے جانشین ابراہیم کے خلاف ۵۱۲۷ / ۵۷۴ - ۵۷۵ء میں میدان میں اترے تو وہ قسربین کا والی تھا۔ مروان جب شہر کی حفاظتی فوج کو، جو زیادہ تر بنو قیس پر مشتمل تھی، اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا تو اس نے ان کے سردار کو آمادہ کیا کہ وہ بشر اور اس کے بھائی مسرور کو اس کے حوالے کر دیں اور پھر اس نے دونوں کو قید میں ڈال دیا۔ بشر کی تاریخ وفات معلوم نہیں، لیکن چونکہ مروان نے عین الجَرِّ کی لڑائی کے بعد دوران سفر میں خلافت خود سنبھال لی تو یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ دونوں قیدی آزاد نہ ہوئے اور قید ہی میں مر گئے۔

مآخذ: (۱) الطبری، ۲: ۱۱۲۶۹، (۳)، (۱۱)، ۱۲۷۰، ۱۷۸۷، ۱۸۷۶، بعد؛ (۲) ابن الجوزی: المنتظم، مخطوطہ آياصوفيا، ۳۰۹۳، ورق ۱۱۳۶، مخطوطہ گوتھا Gotha، ۱۰۵۰۳، ورق ۵۲ [مطبوعہ حیدرآباد دکن، ۶: ۱۳۷، ۱۵۷، ۱۶۵، ۲۰۰]؛ (۳) ابن عساکر: تاریخ دمشق، درجز ۲۳؛ (۴) سبط ابن الجوزی: کتاب مرآة الزمان، مخطوطہ پیرس ۶۱۳۱، ورق ۳۳ ب؛ (۵) ابن الاثیر، ۵: ۲۱۳، ۲۳۳؛ (۶) ابن شاکر الکتبی: عیون التواریخ، مخطوطہ پیرس ۵۱۵۸۷، ورق ۳۵ الف؛ (۷) Fragmenta historicorum arab. طبع ۵ خوبہ De Goeje، ص ۱۱۳، ۱۳۹؛ (۸) ابن قتیبہ: کتاب المعارف، ص ۱۸۳ (مطبوعہ قاہرہ ۵۱۳۰۰، ص ۱۲۳)؛ (۹) المسعودی: مروج، ۵: ۳۶۱، ۹: ۶۰؛ (۱۰) الاغانی، ۶: ۱۳۷؛ (۱۱) Al-Walid: F. Gabrieli، ibn Yazid, il Califfo e il poeta، در RSO، ج ۱۰، ۱۹۳۳ء۔

(L. VECCHI A VAGLIERI)

بشر الحافى: پورا نام ابو نصر بشر بن العارث بن عبدالرحمن بن عطاء بن ہلال بن ماہان بن عبداللہ (اصلًا بعبور) الحافى، ایک صوفی بزرگ،

ہجوری اور عطار نے بیان کیا ہے۔

یہ بات بھی واضح نہیں کہ وہ صوفی کتب اور کتبوں کے سلسلہ صوفیہ میں ان کے داخل ہونے کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ ان کے تغیر حال و قلب ماہیت کے اسباب کے سلسلے میں دو بالکل مختلف واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ ایک روایت کے مطابق کسی اسحق المغازلی نے (جسے بد قسمتی سے ہم نہیں جانتے) ایک خط لکھا، جس میں اس نے ان سے پوچھا تھا کہ اگر تمہاری بصارت اور سماعت جاتی رہے اور تم تکلے بنانے کے قابل نہ رہو۔ کیسے روزی کماؤ گے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ انہیں بازار میں کاغذ کا ایک پرزہ پڑا ہوا ملا (ایک روایت کے مطابق اس وقت وہ اچھی حالت میں نہ تھے)، جس پر اللہ تعالیٰ کا نام لکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اس پرزے کو عطر میں بسایا اور بڑے احترام سے اپنے پاس رکھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ خود بشر نے یا کسی اور نے خواب دیکھا، جس میں بشر کے نام کی شہرت و رفعت کی بشارت دی گئی تھی۔ ان دونوں روایتوں کے بعد بیان کیا گیا ہے کہ بشر نے ایک پاکیزہ زندگی اختیار کر لی۔ اختلاف روایات سے قطع نظر ہم یہ نہیں جانتے کہ ان کی پاکیزہ زندگی کا انداز اور رخ کیا تھا، یعنی کیا انہوں نے اس کے بعد جمع حدیث و تدوین حدیث کا کام شروع کیا؟ پھر ہمارے پاس اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ سچ سچ یہی واقعات ان کی صوفیانہ زندگی کے محرک ثابت ہوئے۔ ان کے اقوال سے جو اب تک محفوظ ہیں، ہمیں صرف یہ پتا چلتا ہے کہ زندگی کے کسی مرحلے پر۔ زیادہ سے زیادہ قیام بغداد کے دور میں۔ انہوں نے حدیث کی تعلیمات سے تڑپ تعلق کر کے اپنی لکھی ہوئی احادیث کو دفن کر دیا اور اس کے بعد اپنی ساری توجہ تصوف پر مرکوز کر دی۔ اس کے لیے عذر یہ

پیش کیا کہ علم کسی کو موت کے لیے تیار نہیں کرتا، یہ محض دنیاوی مسرت حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے اور اس سے زہد کو نقصان پہنچتا ہے۔ انہوں نے اپنے سابقہ رفقا سے کہا کہ وہ علم کو اتنی اہمیت نہ دیں جتنی اب تک دیتے رہے ہیں، یعنی انہوں نے جو کچھ زبانی یاد کیا ہے اور جسے وہ اپنے خطبات میں بڑے وثوق سے استادانہ انداز میں روایت کرتے ہیں اس کا صرف ڈھائی فیصد سچے دل سے قبول کریں اور اس پر عمل کریں۔ وہ اگرچہ حدیث پڑھانے سے احتراز کرتے تھے مگر ان کے دل میں اس کے پڑھانے کی زبردست خواہش تھی۔ وہ کہتے تھے کہ جب میں حدیث پڑھانے کی اس خواہش پر غلبہ پا لوں گا تو پھر اس طرف لوٹ آؤں گا۔ وہ کہتے تھے کہ (لفظ) ”حدیثا“ کہنے میں ایک عجیب حلاوت پائی جاتی ہے۔ وہ علم حدیث کے صرف اس لیے قائل تھے کہ اسے صرف خدا کے لیے اختیار کیا جائے۔ وہ دورانِ گفتگو میں احادیث کا حوالہ صرف اس جگہ دیتے تھے جہاں اس سے تزکیہ نفس کی تعلیم دینی مقصود ہوتی تھی۔ لیکن چونکہ ہمیں اس بات کا علم نہیں کہ ان کی ابتدائی روایت پسندی میں ان کی ذہنی کیفیت کیا تھی اس لیے ہم کسی طرح بھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا بعد کا طرزِ عمل ان کے ابتدائی طرزِ عمل سے انحراف یا انقطاع تھا۔

بشر کے صوفیانہ زہد و تقویٰ کی بنیاد قوانین شریعت اور خلفائے راشدین کے عمل پر قائم ہے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت تھی۔ وہ محض امام احمد بن حنبل ہی کی نظر میں محترم نہیں تھے بلکہ اماموں بھی ان کا احترام



بھی میسر نہیں آسکتی۔ یہ کہنے سے ان کی مراد یہ ہرگز نہیں تھی کہ معاشری بہبود کا کوئی عمل اس فریضہ حج کا بدل ہو سکتا ہے جو شرعاً لازم ہے۔ ان کی مراد پہلے حج کے بعد کے دوسرے حجوں سے تھی۔ طاؤس بن کيسان (م. ۱۰۵ھ/ ۷۲۳-۷۲۴ء) کے متعلق یہ بات پہلے ہی منقول ہے کہ انہوں نے حج پر جانے کے مقابلے میں اس بات کو ترجیح دی کہ ایک بیمار دوست کی تیمارداری میں مصروف رہیں (حلیۃ الاولیاء، ص ۴، ۱۰؛ قبّ *Zwei islamische Lehrerzählungen bei Tolstoj* : Meier در *Asiatische Studien*، ۱۹۵۸ء)۔ بشر نے حج کو عورتوں کا جہاد قرار دیا ہے، لیکن امام جعفر الصادق (القاضی النعمان: دعائم الاسلام، ۱: ۳۳۶-۳۳۷) کے برخلاف خیرات کو حج اور جہاد دونوں پر ترجیح دی ہے، اس لیے کہ خیرات پوشیدہ طور پر دوسروں پر ظاہر کیے بغیر دی جا سکتی ہے۔ بشر کے نزدیک آدمی کی یہ خواہش کہ لوگوں میں اس کے نیک کاموں کا چرچا ہو دنیا دارانہ ذہنیت کی مظہر ہے، اور یہ خواہش انسان کے نیک اعمال کو برباد کر دیتی ہے۔ دوسروں کی نظر میں پسندیدہ بننے کی خواہش کو وہ اس قدر مذموم سمجھتے ہیں کہ وہ دوسروں سے ملنے جلنے سے بھی منع کرتے ہیں، چاہے یہ ملنا جلنا شہادت دینے وقت یا نماز پڑھانے کے موقع ہی پر کیوں نہ ہو۔ اس مقام پر ان کی تعلیمات ملامتیہ فرقے کی اس تعلیم کے قریب آ جاتی ہیں کہ ”محض دوسروں کی ملامت سے بچنے کے لیے کسی کو کچھ مت دو“ اور ”اپنے نیک اعمال کو بھی اپنے برے اعمال کی طرح چھپاؤ“۔ انہیں اس بات کا اقرار ہے کہ وہ اب بھی اس بات کو اہمیت دیتے ہیں کہ ان کی شخصیت دوسروں کو متاثر لرتی ہے اور ان کا ظاہر زاہدوں اور بارساؤں کا سا ہے،

کرتا تھا، جو معتزلہ کا سر پرست تھا۔ ان کے متعلق ہجویری کے اس بیان کو صحیح تسلیم کرنا دشوار ہے کہ ان کے نزدیک ایمان کے معنی مثبت اقرار، سچے اعتقاد اور اس اعتقاد کے مطابق عمل کرنے کے ہیں، حالانکہ ان کے عمل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ بشر کے نزدیک اصل چیز خود عمل ہے اور عمل چونکہ اس سلسلے میں ایک ایسی ضروری شرط ہے جس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں لہذا وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ انسان کو کسی طور گناہ نہیں کرنا چاہیے اور یہ بات حاصل کرنے کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی میں تدبیر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی زاہدانہ زندگی کے باوجود بشر مرتے دم تک اللہ تعالیٰ کی کبریائی کے سامنے لرزہ بر اندام رہے۔ خدا اور دنیا میں سے کسے اختیار کیا جائے؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے بلا تامل خدا کو اختیار کیا اور ہر طرح کی دنیاوی خواہش اور خود غرضی کی مذمت کی۔ ان کی تعلیم تھی کہ انسان فقر کو صبر و سخاوت کے ساتھ قبول کرے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن ان کی ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جو سردی سے کانپ رہا تھا۔ چونکہ بشر اس کی کسی طرح مدد نہ کر سکتے تھے اس لیے اس کی ہمدردی میں اور مثال قائم کرنے کے لیے اپنے کپڑے اتار دیے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ فوت ہوئے تو ان کے جسم پر مانگے کا کترہ تھا، اس لیے کہ انہوں نے اپنا کترہ کسی مفلس کو دے دیا تھا۔ وہ ہمیشہ حریصوں کی مذمت کرتے تھے اور کہتے تھے کہ انہیں دیکھ کر ان کا دل سخت ہو جاتا ہے۔ انہوں نے ایک مرتبہ ایک آدمی سے، جو حج کو جانے والا تھا، کہا کہ اپنا روپیہ کسی یتیم یا غریب کو دے دو، اس لیے کہ اس طرح تمہیں اتنی خوشی حاصل ہوگی جو سو حج کر کے

لیکن انہوں نے تصنع کے خلاف بڑی سختی سے علم بغاوت بلند کیا ہے؛ یہ تصنع خواہ ان کی اپنی ذات میں ہو خواہ دوسروں میں۔ جو لوگ ان سے یہ کہتے ہیں کہ انسان کو اپنے آپ کو عبادت الہی اور تبلیغ دین کے لیے وقف کر دینا چاہیے ان سے وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ صرف انہیں کو اپنا ہم خیال سمجھتے ہیں جو اپنے آپ کو ہٹے پرانے کپڑوں (مرفعات) میں ملبوس رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک موقع پر صرف اس بنا پر ایک دکان کے عقب میں تاریکی میں کھجوریں قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ پوشیدگی میں وہ اس حالت سے مختلف نہ ہو جائیں جیسا کہ انہیں عام طور پر سمجھا جاتا تھا۔ ان کا ورع محض مشتبہات سے بچنے کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ وہ اپنے آپ کو مباحات کی لذت سے بھی محروم رکھنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ”جو کچھ مباح ہے اس میں اسراف کے لیے کوئی گنجائش نہیں نکلتی“۔ وہ ہر چیز اس مقدار سے کسی قدر کم لہاتے تھے جس کی اجازت ان کا ضمیر دیتا تھا۔ اس طرح گویا عمل ان غیر معتدل حدود میں داخل ہو جاتا ہے جن کی سفارش یہودیوں کے ہاں پرفی آبوٹ میں کی گئی ہے۔ مفلسی اور ناداری کی حالت میں انہوں نے ہمیشہ صرف روٹی پر گذر بسر کی اور بعض اوقات ان کی زندگی فاقوں میں کٹی۔ جہاں تک خدا پر توکل کا تعلق ہے انہوں نے ناداروں کی تین قسمیں بیان کی ہیں: (۱) جو نہ تو مانگتے ہیں اور نہ کسی سے کچھ لیتے ہیں، پھر بھی وہ جو کچھ خدا سے مانگتے ہیں انہیں ملتا ہے؛ (۲) جو مانگتے تو نہیں لیکن جب کوئی انہیں کچھ دے تو لے لیتے ہیں؛ (۳) جو اس وقت تک صبر کرتے ہیں جب تک ممکن ہو، لیکن پھر مانگ لیتے ہیں ((ابو عبدالرحمن السنی : طبقات [الصوفیة]،

ص ۷۷؛ عطار : تذکرۃ، ۱ : ۱۱۰)۔ دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والوں کے متعلق ان کی رائے ہے کہ وہ خدا کی قدرت اور مرضی پر بھروسا کرنے والے ہیں، لیکن ایک دوسرے موقع پر (تذکرۃ، ۱ : ۱۱۰، ۲۴ تا ۲۵) وہ کہتے ہیں کہ توکل کا مطلب ہے اس بات کا عزم بالجزم کر لینا کہ کسی انسان سے کچھ نہ لیا جائے۔ ایک اور موقع پر وہ توکل کو انسانی عمل سے ہم آہنگ قرار دیتے ہیں، بشرطیکہ عمل خدا کی رضا کے مطابق کیا جائے (حلیۃ، ۸ : ۳۵۱)۔ لیکن ”اضطراب بلا سکون و سکون بلا اضطراب“ کی جو پر اسرار تعریف انہوں نے کی وہ شکوک و شبہات سے بالا نظر نہیں آتی۔ یہ بات مسلم ہے کہ بشر نے صرف سِرِّ السَّقَطِ کے سامنے دستِ سوال دراز کیا کیونکہ انہیں علم تھا کہ وہ دنیاوی مال و متاع کے نقصان پر مسرت محسوس کرتے تھے۔ اس کے برعکس بعض روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ زیادہ تر اپنی بہنِ مخہ کی کمائی پر گذر بسر کرتے تھے، جو سوت کات کر روزی کماتی اور ان کی دیکھ بھال کرتی تھی (بشر کی تین بہنیں تھیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ تینوں بغداد میں رہتی تھیں)۔ گدائی کے مسئلے کا سلسلہ ”لین دین“ سے جا ملتا ہے، جسے تصوف میں بالخصوص بعد کے زمانے میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے (قب Meire : Die Vita des Scheich، Abū Ishāq al Kāzarūnī، در Bibliotheca Islamica، ص ۱۳، ۱۹۳۸ء، مقدمہ : ص ۵۷ تا ۶۱)۔ غربا اور مسالین کے معاملے سے اس قدر دلچسپی رکھنے کے باوجود بشر نے کبھی ان کے ترجمان یا ثالث کی حیثیت اختیار نہیں کی، جیسی کہ مثلاً کازرونی نے کی، بلکہ ہمیشہ کنارہ کشی کا رویہ قائم رکھا۔ انہوں نے بادشاہوں اور حاکموں کو نصیحت کرنے سے بھی احتراز کیا حتیٰ کہ وہ اس نہر کا پانی



سے مغلوب نہیں ہونا چاہتے۔ وہ آڑو اس لیے نہیں کہتے کہ ان کا دل آڑو کھانے کی طلب کرتا ہے۔ وہ پھلوں سے اس لیے پرہیز کرتے ہیں کہ پھل کھانے سے ان کی پھل کھانے کی خواہش کو تسکین ملتی ہے۔ لیکن وہ جنسی خواہشات کے دبانے کے حق میں نہیں؛ وہ تسکین جنس پر معترض نہیں گو خود وہ تمام عمر مجرد رہے۔

اس حقیقت کے باوجود کہ بشر نے عمل کو علم پر سبقت دی ہے، انہیں صاحب علم بھی سمجھا جاتا ہے اور ذہین بھی۔ لوگوں نے ان کا ذکر محض ایک عالم دین کی حیثیت سے نہیں کیا بلکہ اس ذکر میں ان کی استعداد کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں کہ وہ مذہبی خیال اور جذبے کو شدت سے محسوس بھی کرتے ہیں اور اس کی وضاحت پر بھی قادر ہیں اور ان کی طرز زندگی پاکیزہ اور زاہدانہ ہے۔ بشر کے نزدیک عقل مند وہ نہیں جو محض نیک و بد کا علم رکھتا ہو بلکہ وہ ہے جو ایک کو اختیار اور دوسرے کو ترک کرتا ہے؛ ”پہلا درجہ علم کا، دوسرا عمل کا اور پھر معرفت کا ہے“۔ احمد بن حنبلؒ بڑے تسلیم شدہ عالم دین تھے، بشر کے متعلق انہوں نے بھی کہا ہے کہ وہ حقائق کا علم رکھتا ہے۔ گو بشر کے صرف چند ایسے ملفوظات اور اشعار ہم تک پہنچے ہیں جنہیں ”زہدیات“ کہا جا سکتا ہے، لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ انہوں نے تقریروں کے ذریعے اس خیال کی اشاعت میں خاصہ حصہ لیا کہ انسان کس طرح اپنے آپ کو حقیقی تصوف کے سانچے میں ڈھال سکتا ہے۔ ان کے چند اقوال کا تعلق ابتدائی روایت سے ہے، جس پر سے وہ سرسری گزر جاتے ہیں، لیکن جن صوفی اساتذہ کا انہوں نے بکثرت حوالہ دیا ہے ان میں سے ایک فضیل ابن عیاض ہیں۔ جن لوگوں نے ان سے تعلیم حاصل

ہیں سے بھی معترز رہتے تھے جو کسی بادشاہ نے کھدوائی ہو۔ وہ تلقین کرتے تھے کہ گرانی اور قحط کے دنوں میں لوگ موت کی طرف دھیان دیں کہ اس سے تسکین ملتی ہے۔ وہ اس بات سے باخبر تھے کہ بنی نوع انسان کو کسی طرح بھی مطمئن نہیں کیا جا سکتا اور خصوصیت سے اپنے زمانے کے متعلق ان کا خیال یہ تھا کہ وہ طمانینت کے تصور سے بہت دور ہو گیا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے: ”اگر کسی انسان کے سر پر آسمان سے ٹوپی آگرے تو وہ اسے لے کر خوش نہیں ہوگا“۔ المعانی کی طرح بشر نے بھی اپنے زمانے میں اہل ریا کی مذمت کی ہے۔ اس بارے میں ان کے الفاظ ہیں: ”شریف النفس ڈاکو، دوں فطرت دین دار سے بہتر ہے“۔ ان کے نزدیک حقیقی تقویٰ محض معدودے چند لوگوں میں موجود ہے۔ وہ کہتے ہیں: ”آج بیرون شہر (یعنی قبرستان) کے مقابلے میں اندرون شہر میں زیادہ مردے ہیں“۔ صوفی وہ ہے جو اپنے خدا کے سامنے قلب صافی لے کر کھڑا ہو اور کامل صرف وہ ہے جس سے اس کے دشمن بھی خائف نہ ہوں، لیکن بشر کے اپنے قول کے مطابق ان کے زمانے میں دوستوں کو بھی ایک دوسرے پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ متقی کو جس دشمن پر سب سے زیادہ غلبہ حاصل کرنا ہے وہ اس کی نفسانی خواہشات [= شہوات] ہیں۔ عبادت الہی سے صرف وہی لوگ حظ اٹھا سکتے ہیں جنہوں نے ان نفسانی خواہشات کے راستے میں آہنی دیوار کھڑی کر لی ہو۔ وہ ان لوگوں کو خاموش رہنے کی تلقین کرتے ہیں جنہیں بولنے میں لذت محسوس ہوتی ہے اور ان لوگوں کو بولنے کی تاکید کرتے ہیں جن کے لیے خاموش رہنے میں لذت ہے۔ وہ دین کی تعلیم دینے سے بھی اس لیے اجتناب کرتے ہیں کہ وہ ایسا کرنے کی خواہش

نے اپنے آپ کو "حافی" (= ننگے پاؤں) کا لقب خود دیا تھا اور اس پر ایک لڑکی نے انہیں یہ طعنہ دیا تھا کہ "تمہیں دو دانق دے کر صرف ایک جوتا خریدنے کی ضرورت ہے لیکن اس طرح تمہارا حسین نام تم سے چھن جائے گا" (لیسنگ Lessing کی کتاب *Nathan der Weise* میں حافی درویش کا نام ہے۔ گو Lessing کی تمثیل کے لکھے جانے سے پہلے *Reiske* کی کتاب *Abilfedue Annales Moslemici*، جلد ۱، لائپزگ ۱۷۵۴ء، جس میں صفحہ ۱۹۳ پر اس صوفی کا ذکر آتا ہے (*vulgo Beschri ol Hafi (seu nudipes)*) *dictus* طبع ہو چکی تھی، لیکن اسے لیسنگ Lessing کا مآخذ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ زیادہ قرین قیاس یہ بات ہے کہ لیسنگ نے *Reiske* سے بذات خود مشورہ لیا ہو یا یہ نام *d'Herbelot* (قَب *Baschar al-Hafi* اور *Hafi*) سے لے لیا ہو)۔

مآخذ: (۱) ابونصر السراج: کتاب اللع فی التصوف، طبع نکلسن R.A. Nicolson، سلسلہ یادگار گیب، ص ۲۲، ۱۹۱۳ء؛ (۲) ابوبکر محمد الکلاباذی: التعرف، طبع آربری A.J. Arberry، قاہرہ ۱۹۳۳ء؛ (۳) ابو عبدالرحمن السلمی، طبقات الصوفیہ، طبع شریبہ، قاہرہ ۱۹۵۳ء (بشمول مزید مآخذ)؛ (۴) ابونعیم الاصبہانی: حلیۃ الاولیاء، قاہرہ ۱۹۳۸ء، ۸: ۳۳۶ تا ۳۶۰؛ (۵) القشیری: الرسالة؛ (۶) الہجویری: کشف المحجوب، مترجمہ آر۔ اے۔ نکلسن، در *Gibb Mem. Ser.*، ۱۷، طبع نو ۱۹۳۶ء؛ (۷) آنصاری الہروی: طبقات الصوفیہ، مخطوطہ یوسف Kethuda ۵۸۸۶، قونیہ ۱۸ الف؛ (۸) الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، قاہرہ ۱۹۳۱ء، ۷: ۶۷ تا ۸۰؛ (۹) ابن الجوزی: صفة الصوفیة، حیدرآباد ۱۳۵۵ھ، ۲: ۱۸۳ تا ۱۹۰؛ (۱۰) فرید الدین عطار: تذکرۃ الاولیاء، طبع آر۔ اے۔ نکلسن، لنڈن ولانڈن ۱۹۰۵ء، ۱: ۱۰۶ تا ۱۱۳؛ (۱۱) ابن خلکان: وفيات الأعیان، بولاق ۱۲۹۹ھ، ۱: ۱۱۲ تا ۱۱۳؛ (۱۲) الیافعی: مرآة الجنان، حیدرآباد ۱۱۳۷ھ،

کی ان کا علم ان کے ملفوظات کی اسناد سے ہو سکتا ہے۔

بشر کے لقب "حافی" [= ننگے پاؤں] کی اصل

کے متعلق ابن خلکان نے ذیل کی روایت بیان کی ہے:

ایک دفعہ بشر نے ایک موجی سے اپنے چیل کے لیے ایک نیا تسمہ بنانے کو کہا، لیکن موجی نے اسے مصیبت سمجھ کر ٹال دیا۔ بشر نے اپنے

دونوں چیل پھینک دیے اور ننگے پیر چل دیے۔ اگرچہ اس روایت کی تفصیل واضح نہیں ہے،

لیکن اس کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

اگر بشر کو موجی کے جواب پر غصہ آ گیا تو ایک

پاکباز انسان ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اس غصے

کا خمیازہ خود ہی بھگتا؟ یا انہوں نے اپنے آپ کو

قصور وار ٹھیراتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ وہ آئندہ

پھر کبھی موجی کو زحمت نہیں دیں گے؟ آگے

چل کر بشر نے وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ الْاَرْضَ بِسَاطًا (۱۷)

[نوح: ۱۹] (= خدانے تمہارے لیے زمین کو بچھونا

بنایا) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ کوئی

بادشاہ کے فرش پر جوتے پہن کر نہیں چلتا۔

اپنی بات کی تائید میں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ

میثاقِ ازل کے وقت انسان برہنہ پا تھا۔ غالباً یہ

اشارہ اس میثاق کی طرف ہے جو انسان نے روئے زمین

پر آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا (الست

بربکم، ۷ [اعراف: ۱۷۲]۔ اس قسم کی توجیہات ان

علامتی تصورات کا حصہ ہیں جنہیں آگے چل کر

صوفیہ نے اپنے لباس کے مختلف حصوں اور رنگوں سے

منسوب کیا ہے (قَب *Ein Knigge für Sufi's*: Meier

در *RSO*، ۳۲ (۱۹۵۷ء): ۴۸۵ تا ۵۲۴)۔ حضرت

ہجویری کی یہ توجیہ اور عطار کی تائید کہ بشر کا

برہنہ پا رہنا ان کے استغراق کا نتیجہ تھا شائد

قابل قبول نہ ہو اور ان بیانات اور توجیہات کو

ہم محض نظری کہہ سکتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بشر



میں اچانک جا لیا اور بڑے سفاکانہ طریقے سے قتل عام کیا۔ الاخطل کا چفہ بہت میلا تھا، لہذا اسے غلام سمجھ کر چھوڑ دیا گیا، لیکن اس کا لڑکا قتل کر دیا گیا۔ عورتوں کے پیٹ چاک لیے گئے اور یہ بدلہ تھا تغلب کی اسی قسم کی حرکت کا جو وہ پہلے کر چکے تھے۔

الجَعْفَافِ خلیفہ عبدالملک کے غصے سے بچنے کے لیے بوزنطی علاقے میں بھاگ جانے پر مجبور ہو گیا، لیکن پھر لوٹ آیا اور بنو تغلب کو ایک لاکھ درہم کا تاوان بطور فدیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔

مآخذ: (۱) الاخطل: دیوان، طبع سلحانی، ۱۹۰۵ء، ص ۱۰، بعد، ۲۸۶؛ (۲) النقاظ، ۱: ۳۰۱ تا ۳۰۲، ۵۰۷ تا ۵۰۹، ۸۹۹ تا ۹۰۰؛ (۳) ابن قتیبة: الشعر والشعراء، ص ۳۰۳؛ (۴) الآغانی، بار اول، ۹: ۵۷ تا ۶۱؛ (۵) ابن الاثیر، ۳: ۲۶۱ تا ۲۶۳؛ (۶) یاقوت، ۱: ۶۳۱ تا ۶۳۲، ۲: ۷۶۸ تا ۷۶۹؛ (۷) Topographie historique de la Syrie: R. Dussaud، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۲۵۲، ۲۵۸، ۳۱۳؛ (۸) Le chantre des Omiades: Lammens، پیرس ۱۸۹۵ء، ص ۱۳۰ تا ۱۳۳ (= J.A. ۱۸۹۳)؛ (۹) Das arabische Reich: Wellhausen، ص ۱۲۹ تا ۱۳۰ (انگریزی ترجمہ، ص ۲۰۷ تا ۲۰۸)؛ (۱۰) Chronografia Islamica: Caetani، ۳: ۸۶۱۔

(C. E. BOSWORTH)

- **بشرا**: Bsharrā یا Bécharré، شمالی لبنان کا ایک بہت قدیم موضع، جو سطح سمندر سے ایک ہزار چار سو میٹر بلند ہے۔ یہ گاؤں قدیشہ کی تنگ وادی کے منہ پر ایک نیم دائرے کی شکل کے پہاڑی سلسلے کے دامن میں واقع ہے۔ اس کھوکھلی وادی میں بہت سے غار اور درویشوں کے تکیے ہیں اور راہوں

۲: ۹۴ تا ۹۳؛ (۱۳) عبدالرحمن جامی: نفعات الأنس، کلکتہ ۱۸۵۸ء، ص ۵۳ تا ۵۴؛ (۱۴) عبدالوہاب الشعرانی: الطبقات الكبرى، قاہرہ ۱۳۵۵ھ، ۱: ۶۲ تا ۸۳؛ (۱۵) ابن العماد: شذرات الذهب، قاہرہ ۱۳۰۰ھ، ۲: ۶۰ تا ۶۲؛ نیز دیگر مجموعہ ہائے سوانح و کتب تصوف۔

(F. MEIER)

● **البشر**: مشرقی شام میں سلیم اور تغلب کے عرب قبائل کے درمیان ۵۷۳/۶۹۲ - ۶۹۳ء میں برپا ہونے والی ایک لڑائی اس مقام پر ہوئی تھی۔ حضرت خالد بن ولید نے ۵۱۲/۶۳۳ء میں اس جگہ چڑھائی کی تھی (الطبری، ۱: ۲۰۶۸، ۲۰۷۲ تا ۲۰۷۳)۔ یاقوت اس کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے جو تدمر (Palmyra) کے نزدیک عرض سے لے کر دریائے فرات تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ مقام جدید جبل البشری سے مطابقت رکھتا ہے۔ مذکورہ بالا لڑائی کبھی کبھی ایک مقامی ندی الرحوب کے نام سے بھی موسوم کی جاتی ہے۔

”یوم البشر“ ان دو قبیلوں کے درمیان متعدد آویزشوں کا نقطہ عروج تھا۔۔۔۔۔ دونوں قبائل شمالی عرب شمار ہوتے تھے، اور اس لڑائی کا فوری سبب یہ تھا کہ بنو سلیم نے الجزيرة میں [بنو] تغلب کی چراگاہوں پر دراز دستی کی تھی۔ ان میں جو غیر تسلی بخش سی صلح ہوئی تھی اسے دربار دمشق کے مسیحی تغلبی شاعر الاخطل کی ہجو خوانیوں نے توڑ دیا، جن سے سلیمی سردار الجعاف بن حکیم مشتعل ہو گیا۔ اس نے ایک ایسا جعلی پروانہ حاصل کر لیا جس کی رو سے اسے تغاب و بکر کے صدقات وصول کرنے کا مجاز بنا دیا گیا تھا، اور اس بہانے سے وہ ایک ہزار سلیمیوں کو لے کر روانہ ہو گیا۔ انہوں نے البشر میں بنو تغلب کو ان کی قیام گاہ

منتشر ہیں جہاں انکور کی بیلوں اور توت کی کاشت سطح ڈھلانوں پر کی جاتی ہے۔ بشرا سے ذرا اوپر درختوں کا ایک جھنڈ ہے جو لبنان کے مشہور غابۃ الأرز کی باقی ماندہ یادگار ہے اور جو ۶۱۸۴۳ سے مارونی فرقے کے بطریق کی حفاظت اور نگرانی میں دے دیا گیا ہے۔

مآخذ: (۱) جعجاج: بشرا مدینة المقدسین، در

المشرق، ۱۹۳۲ء، ص ۴۶۴، ۵۳۸، ۶۸۵، ۷۷۹؛

(۲) *Palestine under the Moslems*: G. Le Strange

ص ۳۵۲؛ (۳) *La Syrie*: H. Lammens؛ ۲: ۳۸؛ (۴)

*Topographiè Historique de la Syrie*: R. Dussaud

ص ۳۲، ۳۹۷؛ (۵) عادل اسمعیل: *Histoire du Liban*

ص ۱۳۳، ۵۰۰، *du xviiiè siècle à nos Jours*

(N. ELISSÉEFF)

بشار بن برد: ابو معاذ، دوسری صدی ہجری/

آٹھویں صدی عیسوی کا مشہور عراقی عربی شاعر، کانوں میں بالیاں پہننے کی وجہ سے المرعث کا لقب پایا۔ اس کا خاندان اصل میں طخارستان یا مشرقی ایران یا خراسان کا رہنے والا تھا۔ اس کے باپ کو المہلب بن ابی صفرۃ [رکب] کی مہم کے وقت گرفتار کر کے بصرے لے گئے تھے۔ بنو عقیل بن کعب کی ایک معزز خاتون نے اسے آزاد کر دیا۔ وہ اسی شہر میں اینٹیں پاتھنے کا کام کرتا تھا۔ بشار بصرے میں پیدا ہوا۔ اس کی تاریخ ولادت غیر یقینی ہے لیکن قیاس غالب یہ ہے کہ وہ ۹۵ یا ۵۹۶ / ۷۱۴ یا ۷۱۵ء کے قریب پیدا ہوا۔ ایک طویل عرصے تک وہ بنو عقیل کے ساتھ بطور مولیٰ (آزاد کردہ غلام) منسلک رہا [اور اسی ماحول میں اس نے عربی زبان سیکھی، جسکی صحت و فصاحت پر اسے ہمیشہ ناز رہا]، لیکن اس دوران میں بھی وہ اپنے شعوبی میلانات کے مطابق قدیم ایران کی شوکت و عظمت کی یاد تازہ

کی بہت قدیم بستیوں کے آثار ملتے ہیں۔ عرب جغرافیہ نگاروں نے اس ضلع کا ذکر "جبة بشریة" یا بشرا کے نام سے کیا ہے۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں یہ علاقہ طرابلس کی ریاست (کاونٹی) کی ایک جاگیر ہو گیا تھا، جسے بوئی سرا Buissera کہتے تھے۔ جبل مارونی کا ایک مستحکم مقام ہونے کی وجہ سے مملوکوں کے غلبے کے زمانے میں یہ نیابت طرابلس کے تابع رہا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قاہرہ کی طرف سے جو "مقدم" یہاں مقرر کیا جاتا تھا وہ ہمیشہ کوئی مارونی عیسائی ہوتا تھا، ایک مقدم عبدالؤمن ایوب ثانی کے سوا، جو پندرہویں صدی کے اواخر میں جبکہ طرابلس کے گرد و نواح میں حلولی عقیدے (= Monophysism) کی زور شور سے تبلیغ کی جا رہی تھی، اس فرقے میں شامل ہو گیا تھا اگرچہ عقیدے کی اس تبدیلی سے اس کے ماتحت عمال میں ایک بغاوت برپا ہو گئی تھی۔ بشرا سے اس سڑک کی نگرانی ہوتی ہے جو بعلبک سے چل کر عینتہ کے درۃ کوہ سے گزرتی ہوئی طرابلس (الثام) کو جاتی ہے۔

یہ وہی "طریق الأرز" (شارع صنوبر، Road of the Cedars) ہے جسے سلطان قایت بای اپنا سفر معائنہ کرتے وقت کام میں لایا کرتا تھا (نویں صدی ہجری/ پندرہویں صدی عیسوی) اور اسی سڑک سے اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں علاقہ بقعة کے مسلح گروہ، جنہیں ترکی عمال کی تائید اور مدد حاصل تھی، مارونی فرقے کے عیسائیوں پر چھاہے مارنے کے لیے گزرا کرتے تھے۔ ان مارونیوں کو طرابلس کے ترکی حکام سے بھی اپنا بھاؤ کرنا پڑتا تھا۔

آج کل اس چھوٹی سی بستی میں چار ہزار مارونی آباد ہیں جن کے مکانات ایک ٹیلے پر



لڑپن میں ہجو گوئی کی وجہ سے باپ کے ہاتھوں پشنا بھی رہا۔

بشار کے جو اشعار ہم تک پہنچے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ وہ بنو امیہ کے گورنروں کا درباری شاعر تھا۔ مثلاً اس نے ابن ہبیرہ [رک باں] (دیکھیے الاغانی، ۳ : ۱۹۷، ۲۳۶) یا مسلم بن قتیبہ (شاید ۵۱۳۲/۵۷۰ء میں، وہی کتاب، ص ۱۹۰) یا شہزادہ سلیمان ابن خلیفہ ہشام (دیکھیے دیوان،

۱ : ۲۹۱ تا ۳۰۳) کی شان میں قصیدے لکھے۔

یہاں تک کہ آخری اموی حکمران مروان کی شان میں بھی ایک قصیدہ موجود ہے (دیکھیے دیوان،

۱ : ۳۰۶ بعد)۔ معلوم ہوتا ہے کہ عباسیوں کا

ظہور بھی شاعر کی بڑھتی ہوئی شہرت کی راہ میں

حائل نہیں ہوا، جس کی عمر اس وقت سینتیس سال

تھی۔ وہ اتنا نادان نہ تھا کہ اپنے آپ کو نئے حالات

کے سانچے میں نہ ڈھال سکے۔ اس بات کی پوری

تفصیلات پیش کرنا مشکل ہے، لیکن ایک

تعریفی نظم جو پہلے ابراہیم بن عبداللہ العلوی

کی شان میں لکھی گئی تھی بالآخر عباسی خلیفہ

المنصور کے نام سے معنون کی گئی (الاجانی،

۳ : ۲۱۳، تحت: قَب العسکری : دیوان المعانی

۱ : ۱۳۶ تا ۱۳۷)۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو

یہ بات اس کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ بشار

بغداد کی تاسیس (۵۱۳۵/۷۶۲ء) کے وقت سے

اسی شہر میں رہتا تھا (دیکھیے المرزبانی : الموشح،

ص ۲۳۷ تا ۲۳۸)۔ اس زمانے میں اس کے قصائد

یا تو بصرے کے اکابر کی شان میں ہوتے تھے

(جیسے سلیمان العبسی (۵۱۳۲/۷۵۹-۷۶۰ء میں

گورنر) یا اس کے بیٹے (۵۱۷۶/۷۹۲ء کے قریب

گورنر) (دیکھیے الاغانی، ۳ : ۱۶۵ تا ۱۶۷،

۲۰۷ : Pellat، ۱۶۶، ۲۸۰) یا ایسے لوگوں

کی شان میں جیسے عقبہ بن سلم (۵۱۳۷/۷۶۳ء

کرنے کے خیال سے غافل نہیں رہا اور بلاشبہ یہی چیز اس لحاظ سے مفید ثابت ہوئی کہ اس کے یہ نام کرنے والوں کی توجہ اس کے ادنیٰ حسب و نسب کی طرف متوجہ نہیں ہوئی جو اس کی شاہانہ اصل کے دعووں کے باوجود چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ (بشار کا سادہ حسب و نسب جو الاغانی میں دیا گیا ہے، ۳ : ۱۳۵)۔ [نیز دیوان بشار، ص ۷۳، ۱۱۲، ص ۸۱، ۱۱۳]۔

شاعری کا ملکہ بشار میں فطری تھا۔ کہتے

ہیں کہ اس کا اظہار دس ہی سال کی عمر میں

ہو گیا تھا (دیکھیے الاغانی، ۳ : ۱۳۳، ۱۳۴،

بصرے کے ایک ماخذ سے)۔ بصرے کا ماحول اس کی

اس فطری صلاحیت کو ابھارنے کا ذریعہ ثابت ہوا۔

کاروان سرائے (مرید)، جسے تیسری صدی ہجری/نویں

صدی عیسوی کے وسط تک بڑی اہمیت حاصل

تھی (قَب Pellat : Milieu basrien، ۱۵۸ بعد)، نوجوان

فن کار کے لیے ایک قسم کا دبستان تھا جس میں

وہ کر اس نے اپنے آپ کو ان شعری روایات میں

ڈھالا جو اس وقت وسطی اور مشرقی عرب میں

پورے شباب پر تھیں (دیکھیے الاغانی، ۳ :

۱۳۳ تا ۱۴۵)، کی وہ حکایت جس میں بشار کی جریر

سے ملاقات کا تذکرہ ہے، جس کی شہرت اس وقت

پورے عروج پر تھی۔ برا کلمان کا یہ قیاس کہ اس

حکایت میں جریر کے ہم نام کے ساتھ التباس ہے

قابل قبول نہیں)۔ بحیثیت شاعر کے بشار میں

قصیدہ گو، مرثیہ گو اور ہجو گو کی خصوصیات

جمع تھیں۔ یہ بڑے تعجب کی بات ہے کہ مادر زاد

نایینا اور حد درجہ بد صورت ہونے کے باوجود

اس عہد کے صاحب اثر اور صاحب اقتدار

لوگ اس سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اس لیے

کہ وہ اپنی تعالیوں اور فقرے بازیوں سے لوگوں کو

متاثر اور مرعوب کرنے کا گر اچھی طرح جانتا تھا۔

تند مزاجی، اس کا عجیب و غریب کردار اور سب سے بڑھ کر کم نسبی اور خاندانی بے حیثیتی کی بنا پر اس کا ذکاوت احساس، یہ ایسی چیزیں ہیں جن سے اس کی اس زبان درازی اور بد گوئی کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے جو وہ اپنے حریفوں اور دشمنوں کے خلاف استعمال کرتا تھا۔ گو ان اسباب کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے جو عقیدے کی سطح پر ان اختلافات کا باعث بنے۔

ان میں سے ایک سبب ”شعوبیت“ ہے (مثلاً الاغانی، ۳: ۱۳۸، ۱۳۹ بالخصوص ۱۲۴ تا ۱۲۵، بدوی شاعر عقبہ بن رؤبہ بن العجاج کے خلاف، نیز دیکھیے وہی کتاب ۵: ۱۶۶، ایک بدو کے خلاف ایک قطعہ اور ۲: ۳ تا ۲: ۴، جس میں ایک شریف آدمی شاعر کو اس امر پر ملامت کرتا ہے کہ اس نے ان کے عرب آقاؤں کے خلاف موالیوں کو بھڑکایا ہے)۔ معتزلہ کے موضوع پر بشار کی رائے کا تلون ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً واصل بن عطا [رک باں] (م ۱۳۱/۵۲۴۹ در بصرہ) سے متعلق، جس کی وہ ایک مرتبہ تعریف و خوشامد کرنے کے بعد ہجو کرتا ہے (دیکھیے الجاحظ: البیان، ۱: ۱۶، ۱۶) بعد اور پھر الاغانی، ۳: ۱۴۵ (بعد) نیز بشار اور معتزلی شاعر صفوان الانصاری بصری کی شدید شاعرانہ چشمک (دیکھیے Pellat: Milieu basrien ۱۲۵ تا ۱۲۷ مع ترجمہ اشعار صفوان)۔

بشار کے مذہبی خیالات کے متعلق کوئی یقینی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ ساز آدمی کی طرح اس نے اپنے دل کی بات کسی پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ جن شعرا کو وہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے مثلاً الکُمیت یا السید الحمیری جو ۱۴۷/۵۲۶۳ سے ۱۵۷/۵۲۳-۵۲۴ تک

میں گورنر) (دیکھیے الاغانی، ۳: ۱۲۴ تا ۱۲۵؛ قَب Pellat، فہرست) یا اس کے بیٹے نافع (۵۱۵۱/۵۲۶۸ میں گورنر) (دیکھیے الاغانی، ۳: ۲۳۰؛ قَب Pellat، ۲۸۱) کی مدح میں۔ بہت سی حکایتوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ المنصور بشار پر بہت مہربان تھا اور اس کے ساتھ غالباً وہ حج کے لیے بھی گیا تھا (دیکھیے الاغانی، ۳: ۱۵۳، ۱۵۹، ۱۸۸، ۲۱۲، ۲۳۹) (بالخصوص دیوان، ۲: ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰)۔ آگے چل کر اس کے اور بادشاہ کے تعلقات کشیدہ ہو گئے (دیکھیے آگے)۔ بادشاہ سے اس کے تعلقات کی اس نوعیت کی بدولت شاعر کی زندگی سے متعلق ہمیں بہت سی قیمتی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ان سے بھی زیادہ اس کی قیمتی باتیں وہ ہیں جن کا تعلق بعض دوسرے لوگوں سے ہے، مثلاً بصرے کے نحویوں سے، جیسے ابو عمرو بن العلاء، ابو عبیدہ یا الاصمعی [رک باں] یا شہر کے مذہبی لوگوں کے ساتھ، جیسے حسن البصری [رک باں] (م ۱۱۰/۵۲۲۸؛ الاغانی، ۳: ۱۶۹، ۱۷۰) یا مالک بن دینار [رک باں] (۱۳۱/۵۲۴۸؛ وہی کتاب، ۵: ۱۷۰) کے ساتھ اس کے معارضات و تعلقات۔ دو مؤخر الذکر بزرگوں کے متعلق اس کے طنزیہ اشعار اس کی اس عادت کے مطابق ہیں کہ اسے ان لوگوں کا مذاق اڑانے میں لطف آتا تھا جنہیں ان کے افعال و اطوار یا مذہبی عقائد کی وجہ سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ ہمارے پاس ایسا مواد موجود ہے جس کی حیثیت کم و بیش افسانوی ہے، جس سے بشار کی زندگی کے اس پہلو کی تصویر سامنے آتی ہے۔ اس کے خیالات میں کہیں کہیں الحاد کا میلان پایا جاتا ہے (مثلاً الاغانی، ۳: ۱۸۵ تا ۱۸۶)، [اور چند دوسرے واقعات بھی ہیں جن سے اس کے عدم خلوص کا اظہار ہوتا ہے، ان سب باتوں سے اس کی آزاد ذہنیت کا پتا چلتا ہے]۔ اس کی



پڑ سکا۔ ایک سازش نے، جو بصرے میں اس کے خلاف تیار کی گئی، اسے خلیفہ مہدی کی نظروں سے گرا دیا (دیکھیے الاغانی کی بعض حکایتیں، ۳ : ۲۴۳ بعد) اس لیے کہ اس سازش کا تعلق بعض ایسے واقعات سے تھا جن کی اہمیت بڑی دور رس تھی۔ اس فرمانروا کے عہد میں ان تمام لوگوں پر بڑی سختی ہوئی جن کا شمار زندقہ [رک باں] میں ہوتا تھا (دیکھیے وہی کتاب، ص ۲۴۶ بعد، بالخصوص *Appunti: Gabrieli*، ص ۱۵۸)۔ بشار کو بھی پکڑ لیا گیا، خوب زد و کوب کی گئی اور بطیحہ کی ایک دلدل میں پھینک دیا گیا (الطبری، مطبوعہ قاہرہ، ۶ : ۱ : ۳۰۱؛ الاغانی، ۳ : ۲۴۷ تا ۲۴۸)۔ یہ ۱۶۷ یا ۱۶۸ / ۷۸۳ - ۷۸۵ء کا واقعہ ہے جب کہ بشار کی عمر ستر برس سے متجاوز ہو چکی تھی (نوے کی نہیں تھی جیسا کہ کتابت کی غلطی کی وجہ سے غلط فہمی ہو گئی ہے، قب الاغانی، ۳ : ۲۴۷، ۲۴۹ میں دونوں اعداد دیے ہیں؛ الخطیب البغدادی: تاریخ بغداد، ۷ : ۱۱۸، اور ابن خلکان، ۱ : ۸۸، میں صرف دوسرا عدد ہی دیا گیا ہے)۔ بشار اپنے زمانے میں بطور مقرر و خطیب، انشا پرداز اور نثار کے مشہور و معروف آدمی تھا (الجاحظ: البیان، ۱ : ۴۹) [وہ نقاد بھی تھا، اس نے الاعشی میمون بن قیس کو مقدمین شعرا میں سر فہرست شمار کیا ہے (برا کلمان، تعریب، ۱ : ۱۴۹)]، لیکن ان اوصاف سے کہیں زیادہ اس کی شہرت و مقبولیت اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کی بنا پر ہے۔ شاعری میں اس کی تخلیقات کثیر بھی عین اور متنوع بھی۔ لیکن بد قسمتی سے وہ اپنی اصل حالت میں ہم تک نہیں پہنچیں۔ چونکہ بشار نابینا تھا اس لیے وہ راویوں کا محتاج تھا جن میں سے چار کے نام عمین معلوم ہیں بالخصوص [روایت میں] بدنام خلف الاحمر (دیکھیے الاغانی، ۳ : ۱۳۷، ۱۶۴ (۹ : ۱۱۲)،

بصرے میں رہا (قب الاغانی، ۳ : ۲۲۵ و ۷ : ۲۳۷، لیکن یہ واقعات غیر یقینی ہیں)، ان کے متعلق اظہار رائے میں اس نے جو احتیاط برتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شیعہ نہیں تھا (لیکن دیکھیے Pellat، ص ۱۷۸ جس کا خیال ہے کہ بشار نے کاملیہ کے تمام شیعہ عقائد کو اکٹھا لیا جس کے متعلق دیکھیے وہی کتاب ۲۰۱)۔ بشار کے خلاف زندقہ کے الزام کی تائید میں جو قصے پیش کیے گئے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اس کے خیالات میں بڑا تضاد تھا۔ ان خیالات سے مانوی اعتقادات کا اظہار ہوتا ہے جن پر زرتشتی عقائد کا بڑا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے (دیکھیے الجاحظ: البیان، ۱ : ۱۶؛ نیز قب الفہرست، ص ۳۳۸، سطر ۱۰، جس میں شاعر کو زندیقوں - دوسری صدی / آٹھویں صدی کے مانویوں - کے زمرے میں شمار کیا گیا ہے)۔

ان معتقدات کے ساتھ ساتھ اس میں ہمیشہ گہرے تشکک (دیکھیے الاغانی، ۳ : ۲۲۷، سطر ۱ بعد؛ دیوان، ۲ : ۲۴۶) کا اثر بھی نمایاں ہے، جس میں قدرت کی آمیزش بھی ہے، جس نے بشار کو قنوطی اور لذت پسند بنا دیا تھا (وہی کتاب، ص ۲۳۲ و اقتباس از ابن قتیبہ: عیون، ۱ : ۴۰)۔ اپنے رفقا کی طرح بشار کو بھی "تقیہ" کا سہارا لینا پڑا۔ اور اس نے عقیدت پسندی اور مذہبی سرگرمی کا ایسا لبادہ اوڑھا جو اس کے حقیقی عقائد کے قطعی منافی تھا (مثلاً ملحد ابن العوجاء کے خلاف اس کے اشعار جسے نوفے میں قتل کیا گیا (الاغانی، ۳ : ۱۴۷)، اور سب سے بڑھ کر دیوان میں اس کا شعر (۲ : ۳۶ سطر ۳) جس میں سخت قسم کے اسلامی عقیدے کی نمائش کی گئی ہے۔ اس معاملے میں اس نے جس مصلحت اندیشی کو دخل دیا اس سے اس کی ناشائستگی، اس کی ہجوئیات کی تلخی اور اس کی آزاد روی پر پردہ نہ

لیکن ان میں سے کسی نے بھی بشار کے دیوان کو جمع اور مرتب کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ بعض ہندسی نظمیں، فی البدیہہ اشعار اور لطائف و ظرائف بہت جلد فراموش ہو جاتے تھے۔ علاوہ بریں بعض ایسی نظمیں جو مستند نہیں بشار کی طرف منسوب ہوتی چلی گئیں (دیکھیے شرح دیوان، ۱: ۳۰۹)۔ تیسری / نویں صدی کے بعد شاعر کا کلام اشعار کے منتخب مجموعوں اور تذکروں کے ذریعے لوگوں کے علم میں آیا؛ مثلاً ہارون بن علی (م ۵۲۸۸ / ۹۰۰-۹۱۰ء؛ قب الفہرست، ص ۱۳۳) یا احمد بن ابی طاهر طینور (م ۵۲۸۰ / ۸۹۳ء)، جس نے اختیار شعر بشار کے نام سے ایک مجموعہ مرتب کیا (دیکھیے فہرست، ص ۱۳۷) کے ذریعہ۔ یہ معلوم ہے کہ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں ابن الندیم نے نظموں کے ایک مجموعے سے استفادہ کیا، جو ایک ہزار صفحات سے زیادہ تھا (الفہرست، ۵: ۱۰۹)۔ لیکن موصل کے الخالدی نام کے دو بھائیوں [ = الخالدین ] کی المختار من شعر بشار کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے، جس کا ابن الندیم نے بطور ان کی تالیف کے کوئی ذکر نہیں کیا (کتاب مذکور، ۱۶۹)۔ اس آخری تالیف کا علم ہمیں صرف التجیبی (پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی، طبع [محمد بدر الدین] العلوی، علی گڑھ ۱۹۳۵ء) کے اقتباسات اور ملخصات سے ہوا ہے۔ مشرقی منفرد مخطوطہ (چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی کا؟)، جس میں ”الف“ سے لے کر ”ز“ تک ردیفیں آ گئی ہیں اور جو ابن عاشور کے ایڈیشن (تین جلد، قاہرہ ۱۹۵۰ تا ۱۹۵۷ء) کی اساس ہے، قطعی قابل اعتبار نہیں۔ اس طرح ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ بشار کی تخلیقات کا مطالعہ ذرا احتیاط سے کرنا چاہیے۔

بشار رسمی قصیدے کا شاعر ہے، جو تین حصوں

[تشبیہ، مدح، مقصد] پر مشتمل ہوتا ہے اور اس کا اسلوب بڑا چست ہے۔ اس کے اشعار ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے روایتی معلوم ہوتے ہیں، لیکن اس نے پچھلی نسل کی روایتوں سے یقیناً انحراف کیا ہے۔ اس کی پھبتیوں اور چٹکلوں کی بامعنی طنزیت اسے عہد امیہ کے ہجو نویسوں کی صف میں اہم جگہ دلواتی ہے (مثلاً دیوان، ۲: ۶۶، حماد عجرد کے خلاف؛ نیز الاغانی، ۳: ۱۸۸، ۲۰۲)، یہاں بھی اس کا ذوق تضحیک و تشنیع نئی نئی اختراعات کی صورت اختیار کرتا ہے (مثلاً اپنے گدھے سے اس کا خیالی خطاب، الاغانی، ۳: ۲۳۱)، لیکن غالباً مرثیہ ہی وہ صنف ہے جس سے اس کی شہرت کو دوام حاصل ہوا ہے۔ اکثر اوقات اس کی خمریات عاشقانہ اشعار کا رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔ ان اشعار کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بشار نے وہ روایتی انداز ترک کر دیا ہے جس کی نمایاں اور واضح مثال وہ اشعار ہیں جو الاعشی میمون [رک بان] سے منسوب ہیں۔ عاشقانہ نوحے اس کی شاعری کا اہم حصہ ہیں اور ان میں شاعر کا مخاطب خصوصیت سے ایک بصری خاتون عبده سے ہے، لیکن بعض دوسری خواتین بھی اس کی مخاطب ہیں، جن میں سے بعض نام غالباً فرضی ہیں۔ اس کے اشعار میں کہیں کہیں شہوانی رنگ ہے لیکن حقیقت پر مبنی (مثلاً الاغانی، ۳: ۱۵۵، ۱۶۵، ۱۸۲، وغیرہ)، کہیں وہ درباری تکلفات سے بھر پور ہیں۔ . . . .۔ بشار کے کلام میں بلند قسم کی فکری نظموں کی بھی کمی نہیں اور گو ان میں حقیقی گہرائی عموماً نہیں مگر ان میں وہ سوئیت سے پرہیز کرتا ہے اور بعض اوقات بڑی بصیرت افروز باتیں کہہ جاتا ہے۔ اپنے آپ کو موقع و حالات کے سانچے میں



نزدیک اس کا مرتبہ کتنا بلند ہے (دیکھیے البیان، بمدد اشاریہ) [البکری کے نزدیک بشار اپنے عہد کا بہترین فطری شاعر تھا۔ اس کے اشعار میں حکمت و دانش کے موتی بھی موجود ہیں۔ ابو تمام نے کتاب الوحشیات (مصر ۱۹۶۱ء) میں اس کے تین قطعے نقل کیے ہیں]۔

آخری بات یہ کہ بشار نے شعرا کی آنے والی نسل پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ابو العتاہیہ [رک بآن]، العباس بن الاحنف [رک بآن]، ابو نواس [رک بآن] سلم الخاسر اور بہت سے دوسرے شعرا کی سوانح عمریوں میں اس طرح کے جو بیانات ملتے ہیں ان کی تائید ان شاعروں کے کلام کے مطالعے سے ہوتی ہے۔ عہد حاضر کے مشرقی نقادوں نے بشار کو عرب شاعری کی دنیا کے اکابر میں جگہ دی ہے [ابن منظور نے لسان العرب میں صرف آٹھ نو مرتبہ اس سے استشہاد کیا ہے دیکھیے عبد القیوم: فہارس لسان العرب، جلد اول]۔

[فصاحت و بلاغت اور تنوع مضامین کے باوجود بشار کا کلام عرصہ دراز تک غیر مطبوعہ رہا۔ البتہ کتب تاریخ و ادب اور تذکروں میں مذکور کلام ضرور شائع ہوا۔ اختیار الخالدین موسوم بہ المختار من شعر بشار للخالدین، مع شرح ابو طاہر اسمعیل بن احمد بن زیادہ اللہ التجیبی البرقی، کو علیگڑھ کے استاد بدرالدین علوی نے تصحیح و تحقیق کے بعد ۱۹۳۵ء میں شائع کیا۔ یہ شرح بڑی نفیس، کارآمد اور معلومات افزا ہے۔ اس کے مطالعے سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ بشار کن کن شعراے متقدمین کا رہن منت ہے اور کون کون سے متاخرین شعرا بشار کے خوشہ چین ہیں۔ بشار کا دیوان مع شرح طاہر بن عاشور تین جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ بشار نے ایک قصیدہ تفضیل النار (فضیلت آتش) پر کہا تھا۔ اس کے مقابلے پر

ڈھال لینا بشار کے طرز فکر کی بنیادی خصوصیت ہے، قصیدے میں یہ چیز روایت کی پابندی اور متروکات کی پیروی کی صورت اختیار کرتی ہے (مثلاً دیوان، ۱: ۳۰۶ بعد) لیکن عاشقانہ نوحوں میں یہ انداز کچھ ایسا رنگ اختیار کر لیتا ہے کہ پڑھنے والا لطف و انبساط محسوس کرتا ہے۔ ان نظموں میں شاعر زبان و بیان کے استعمال میں بھی غیر معمولی جرأت سے کام لیتا ہے (مثلاً دیوان، ۲: ۵، سطر ۱۰، سطر ۳ و ۱۰، سطر ۲)۔ بشار کی نمایاں خصوصیت بدوی عرب شاعروں کی وہ روایات ہیں جو اسے ورثے میں ملی ہیں۔ بہت سی حیثیتوں سے وہ دبستان حجاز سے زیادہ قریب ہے، جیسا کہ ہمیں عمر بن ابی ربیعہ [رک بآن] میں نظر آتا ہے۔ لیکن اس نے اپنی داخلی دنیا کی کیفیتوں اور خارجی دنیا کے ان تلخ تجربات کو روایت میں سمو دیا جو اسے اپنی جسمانی معذوریوں اور گرد و پیش کی پریشان کن اور پر آشوب دنیا سے حاصل ہوئے تھے۔

دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی کے وسط کی شاعری کے عبوری دور میں بشار کی شاعری کی جو اہمیت ہے اسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کسی فن کار یا فن کے اثر کا اندازہ معاصرین کے رد و قبول سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا شمار بصرے کی مایہ ناز ہستیوں میں ہوتا تھا۔ اس کے اشعار جو عام طور پر گا کر پڑھے جاتے تھے نوجوانوں اور عورتوں میں بے حد مقبول تھے۔ خواص میں اس کا کلام جس قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اس کا اندازہ ماہرین فن کی ان آرا سے لگایا جا سکتا ہے جو ابو عبیدہ، الاصمعی، خلف الاحمر اور بہت سے دوسرے فضلاء فن کی طرف منسوب ہیں (دیکھیے الاغانی، ج ۳، بمواضع کثیرہ)۔ یہ بات بھی ہمارے علم میں ہے کہ الجاحظ کے

۱ : ۲۳۲ تا ۲۳۲؛ (۱۷) حسین منصور: بشار بن برد  
 بین الجَدِّ و المَجُون، قاہرہ ۱۹۳۰ء؛ (۱۸) حَنَامِر :  
 بشار بن برد، حمص ۱۹۳۳ء؛ (۱۹) الحمصی : بشار بن  
 برد، در الرَّعْد، دمشق ۱۹۳۹ء، ص ۷۷ تا ۷۶؛  
 (۲۰) احمد حسنین : بشار بن برد، شعرہ و اخبارہ، قاہرہ  
 ۱۹۲۵ء، ص ۱۰۹؛ (۲۱) محمد النوبھی : شخصیۃ بشار،  
 قاہرہ ۱۸۵۷ء، ص ۲۸۰؛ (بشار کے دیوان اور متون  
 کے لیے دیکھیے مقالے میں مندرج حوالے) نیز [۲۲] انیس  
 المقدسی : امراء الشعر العربی فی العصر العباسی، بیروت  
 ۱۹۳۲ء؛ (۲۳) احمد فرید رفاعی : عصر الامون، ۲ : ۲۵۲  
 تا ۲۷۶، مصر ۱۹۲۷ء؛ (۲۴) طہ الحاجری : بشار بن برد،  
 سلسلۃ نوابغ الفكر العربی، قاہرہ؛ (۲۵) مارون عبود :  
 الراس، بیروت ۱۹۳۶ء، ص ۸۷ تا ۱۰۰؛ (۲۶) عبدالقیوم :  
 فہرس اسماء الشعراء (لسان العرب)، لاہور ۱۹۳۸ء؛ (۲۷)  
 عمر فروخ : بشار بن برد، باردوم، بیروت؛ (۲۸) الزرکلی :  
 الاعلام (سادة بشار)؛ (۲۹) ابن تغری بردی : النجوم  
 الزاہرۃ، ۲ : ۵۳؛ (۳۰) الیافعی : مرآة الجنان، ۱ : ۳۵۳؛  
 (۳۱) ابن المعتز : طبقات الشعراء (طبع عبدالستار احمد  
 فراج)، بمدد اشاریہ، دارالمعارف، مصر؛ (۳۲) ابن رشیق :  
 العمدة، بمدد اشاریہ؛ (۳۳) البکری : سبط اللآلی، ۱۹۶ تا  
 ۱۹۸؛ (۳۴) الحصری : زہر الآداب، ص ۲۳ تا ۲۴، قاہرہ  
 ۱۹۲۷ء؛ (۳۵) الموجز فی الادب العربی و تاریخہ، ۳ :  
 ۱۲۲ تا ۱۳۳، قاہرہ؛ (۳۶) براکلمان : تاریخ الادب  
 العربی، ۲ : ۱۳ تا ۱۶ (تعریب عبدالحلم النجار)، قاہرہ  
 ۱۹۶۱ء۔

R. BLACHERE [و عبدالقیوم]

بشار الشعیری : ایک شیعی دانشور، جو  
 دوسری صدی ہجری میں مشہور ہوا۔ وہ کوفے میں  
 رہتا تھا اور جو (شعیر) بیچ کر بسر اوقات کرتا تھا اور  
 اسی نسبت سے اس کا نام شعیری پڑا۔ منہاج اور  
 منتہی المقال کے بیان کے مطابق اسے بعض اوقات  
 غلطی سے الشعیری کے بجائے الاشعری بھی کہہ

صفوان الانصاری نے ایک قصیدہ لکھا جس میں  
 آگ پر زمین کی فضیلت بیان کی گئی ہے (دیکھیے  
 البیان، ۱ : ۱۶ تا ۱۹؛ البغدادی : الفرق بین الفرق،  
 ص ۳۹ - ۴۲)۔

مآخذ : (۱) ابن قتیبہ : الشعر والشعراء (طبع  
 ڈخویہ)، ص ۳۷ تا ۳۹ و بمدد اشاریہ؛  
 (۲) الجاحظ : البیان، طبع ہارون، ۱ : ۳۹ و بمدد  
 اشاریہ (بشار کے ۲۴ حوالے)؛ (۳) الاغانی، بار سوم،  
 ۳ : ۱۳۵ تا ۲۳۹ و ۴ : ۱۵، ۲۸ تا ۲۹، ۳۳ تا ۳۴،  
 ۷۰ تا ۷۱ و ۶ : ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۳۲، ۲۳۷ و بمدد اشاریہ؛  
 (۴) الفہرست، ص ۳۳۸؛ (۵) خطیب البغدادی :  
 تاریخ بغداد، ۷ : ۱۱۲ تا ۱۱۸؛ (۶) المرزبانی : الموشح،  
 ص ۲۴۶ تا ۲۵۰؛ (۷) ابن خلکان، قاہرہ ۱۳۱۰ھ :  
 ۸۹ تا ۹۰ و طبع عبدالحمید (قاہرہ)، ۱ : ۲۴۵، عدد ۱۱۰؛  
 سوانح حیات کے دوسرے ثانوی مآخذ کے لیے : (۸)  
 براکلمان : تکملہ، ۱ : ۱۰۰؛ پس منظر کے لیے : (۹)  
 Les : G. Vadja (۱۰) : Renaissance : v. A. Mez  
 'Zindiq . . . au début de la période abbaside  
 در RSO، ۱۷ (۱۹۳۷) : ۱۷۳ تا ۲۲۹؛ (۱۱)  
 Le milieu basrien et la formation de : Ch. Pellat  
 Gāhiz، پیرس ۱۹۵۳ء، ۱۷۶ تا ۱۷۸، ۲۵۶ تا ۲۵۹  
 و بمدد اشاریہ؛ بشار پر خاص مطالعہ از (۱۲)  
 La Poesia arabe nel I secolo degli : Di Matteo.  
 Abbāsidi، پالمو ۱۹۳۵ء، ص ۹ تا ۱۲؛ (۱۳)  
 Appunti su B. i. B. : F. Gabrieli، در BSOS، ۹  
 (۱۹۳۷) : ۵۱ تا ۶۳۔

عام مقالات اور یک موضوعی مقالات بزبان عربی : (۱۴)  
 عباس محمود العقاد : مراجعات فی الادب و الفنون،  
 قاہرہ ۱۹۲۵ء، ص ۱۱۹ تا ۱۵۸؛ (۱۵) عبدالقادر المغربي،  
 در مجلة المجمع العلمی العربی، ۹ (۱۹۲۹) : ۷۰۵  
 تا ۷۲۲؛ (۱۶) طہ حسین : حدیث الاربعاء، بار اول،



البشکنش : [یا البشکنش] Basques، ایک غیر یقینی الاصل قوم، جو جبل البرانس Pyrenees کے مغرب میں جبال کنتبریاں (Cantabrian Mountains) کے قرب و جوار میں، ساحل اوقیانوس کے جنوب میں آباد ہے۔ بشکنش بظاہر لاطینی لفظ 'Vascônes' سے بنا ہے اور جیسا کہ عام ہے "و" "ب" سے بدل گئی ہے۔ بشکنشی (Basque) زبان "البشقیہ" کہلاتی ہے (الروض المعطار، طبع Lévi Provençal، ص ۵۶)۔

بشکنش کا سب سے بڑا مرکز بنبلونہ Pampeluna، (اصلی نام Pompeiopolis سے)، جو آگے چل کر نبرہ (Navarre) کا صدر مقام بنا، فتح ہسپانیہ کے دوران میں موسیٰ ابن نصیر نے اس حصہ ملک پر حملہ کیا (کتاب الامامة والسياسة، Colección de Obras Árâbigas، ۲ : ۱۳۲ بعد) اور اسی زمانے میں یا اس سے کچھ عرصہ بعد لیکن بہر حال ۵۱۰۰/۷۱۸ - ۷۱۹ سے پہلے Codera کے بیان کے مطابق پمپے لونا نے مسلمانوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ عقبہ بن الحجاج نے (جو ۵۱۱۶/۷۳۳ سے پانچ سال تک ہسپانیہ کا والی رہا) وہاں ایک محافظ فوجی دستہ متعین کر دیا (ابن العذاری، ۲ : ۲۸)۔ چند سال بعد (۵۱۳۸/۷۵۵ - ۷۵۶) بشکنش نے علم بغاوت بلند کر دیا اور امیر یوسف الفہری کی مرسلہ فوج کو تہاہ کر دیا۔ یہ واقعہ تقریباً اسی وقت کا ہے جب عبدالرحمن اول [الداخل] ہسپانیہ پہنچا۔ جب شمالی ہسپانیہ پر شارلیمین Charlemagne نے اپنا مشہور حملہ کیا (۵۱۶۱/۷۷۸) تو بنبلونہ نے اس کی اطاعت قبول کر لی، لیکن غالباً یہ بستی دستے تھے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر Roncevalles کے مقام پر اس کے عقبی دستوں کو تہس نہس

دیا جاتا ہے۔ روایات کی رو سے، جن کا ذکر الکشی نے کیا ہے، امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اپنے یہاں سے نکال دیا تھا اور اس سے بے تعلق ظاہر کی تھی (رجال، ص ۲۵۲ تا ۲۵۴)؛ قَب ص ۱۹۷، جہاں ابوالبشار الاشعری [؟] کو المغیرہ بن سعید، بزینغ، ابوالخطاب، معمر اور حمزہ البربری جیسے معروف ملحدوں کے ساتھ ساتھ کذاب اور ملعون کہا گیا ہے۔ یہ پورا اقتباس اس ایڈیشن میں بالکل مسخ شدہ ہے)۔ نصیری الخصیبی، بشار کو مفضل بن عمر الجعفی کا راوی بتاتا ہے (Massignon : سلمان، ۴۴، حاشیہ ۴)۔ نصیری کے ایک متن میں، جسے Strothmann نے شائع کیا ہے، امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ سے اس کا ایک مکالمہ نقل کیا گیا ہے، جس میں "بسم اللہ" کے ایسے پر اسرار معانی بیان کیے ہیں جو خواص نو بتائے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بشار غالی شیعہ فرقہ خطابیہ [رک باں] سے تعلق رکھتا تھا اور ان عقائد کی تبلیغ کرتا تھا جو اس فرقے سے مخصوص ہیں۔۔۔۔

مآخذ: الکشی: معرفة الرجال، بمبئی ۱۳۱۷ھ، ص ۲۵۲ تا ۲۵۴؛ (۲) الأسترآبادی: منهج المقال، تہران ۱۳۰۷ھ، ص ۶۸ تا ۶۹؛ (۳) الحائری: منتهی المقال، تہران ۱۳۰۷ھ، ص ۶۵؛ (۴) L. Massignon : سلمان پاک Salmân Pâk، Tours ۱۹۳۴ء، ص ۳۸، ۳۹ تا ۴۰؛ (۵) R. Strothmann : 'Morgen- ländische Geheimsekten in abendländischer Forschung'، برلن ۱۹۰۳ء، ص ۳۱ تا ۳۲؛ (۶) W. W. Rajkowski : 'Early Shi'ism in Irak'، لندن یونیورسٹی کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ، ۱۹۰۰ء۔

(B. LEWIS)

بشکر: رک بہ بائبرت۔

بشکطاش: [بشقطاش]، رک بہ استانبول۔

جزیرہ بوزجہ آطہ (Tenedos) کے بالمقابل واقع ہے۔ یہ قوم قلعہ سے تقریباً ۲۳ کلومیٹر جنوب میں قوم بورنو اور بشک بورنو کی دو راسوں کے درمیان ہے اور اگرچہ سمندر کے سامنے کھلی ہوئی ہے تاہم جہازوں کے لیے اچھی حفاظت کی جگہ ہے۔ ساحل سے اندرونی علاقے کی طرف قدیم تروس Troas واقع ہے اور خود بشکہ کے قریبی نواح میں آثارِ قدیمہ کی موجودگی کی شہادت ملتی ہے۔ جون ۱۸۵۳ء میں برطانوی اور فرانسیسی بیڑے اس بحران کے زمانے میں جس سے جنگِ قریم (Crimea) کا آغاز ہوا بشکہ آئے تھے۔ برطانیہ عظمیٰ نے ۱۸۷۶ء اور ۱۸۷۸ء میں بھی اپنا بیڑا بشکہ بھیجا تھا۔

مآخذ: (۱) *La Turquie d'Asie* : V. Cuinet، (۲) علی جواد : ۳، پیرس ۱۸۹۴ء : ۷۶۶ : (۳) علی جواد : تاریخ و جغرافیہ لغتی، استانبول ۱۳۱۳ - ۱۳۱۴ء، ص ۱۷۲ : (۳) Pauly-Wissowa، ج ۷، i/A (۱۹۳۹ء)، بذیل مادہ Troas (عمود ۵۴۶، ۵۵۷، ۵۶۸، ۵۷۶)۔ (V. J. PARRY)

بشک : رک بہ سکہ۔

بش محاسبہ : رک بہ مینرانیہ۔

بشقی : (= باشماق) رک بہ النعل الشریف۔

بشقلیق : [= باشماق، لغوی معنی جوتے،

موزے، جوتوں کا چمڑا] یہ لفظ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں آل عثمان کے دورِ حکومت میں ان جاگیری محاصل کے لیے استعمال ہوتا تھا جو حرمِ سلطانی کی خواتین کے لیے مخصوص کر دیے جاتے تھے، اور جن سے وہ اپنی نجی ضرورت کی چیزیں، بالخصوص کپڑے اور جوتے (بشقی یا بشق) [= باشماق، باشماق] ترکی زبان میں سلپر کو کہتے ہیں) خریدتی تھیں۔ یہ لفظ ابھی تک سولہویں صدی عیسوی کے آخر تک کسی تحریر میں نہیں ملا اور پھر اٹھارہویں صدی

کر دیا (قبّ Lévi-Provençal، *Hist. Esp. Mus.*، ۱۹۳۴ء، ۱ : ۸۹) - ۵۱۶۴ / ۷۸۰ - ۷۸۱ء میں یا اس سے اگلے سال اپنے طویل عہدِ حکومت کے خاتمے کے قریب عبدالرحمن اول کو بشکنش پر بذاتِ خود چڑھائی کرنا پڑی۔

۵۱۸۲ / ۷۹۸ء تک پمپے لونا کے بشکنشوں (Basques) نے مسلمانوں سے اپنا رشتہ وفاداری، جیسا کہ آگے چل کر ثابت ہوا، مستقل طور پر توڑ لیا تھا اور الفانسو Alfonso ثانی شاہِ آستوریس کے باج گزار ہونے کا اعلان کر چکے تھے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد بنبلونہ کے ایک آزاد و خود مختار بستی سردار غرسیہ بن ونقو (Garcia Iniguez) کا نام سننے میں آتا ہے جو اپنی پوتی اینگا Iniga کے تعلق سے، جس کی شادی عبداللہ اموی سے ہوئی تھی، عبدالرحمن ثالث، الناصر، کا مورثِ اعلیٰ ہوا۔ بشکنش کے لوگوں میں ۹۰۰ء میں اقتدار کی ایک نئی گروہ بندی عمل میں آئی، جب سینچو گرسیس اول (Sancho Garces I) نے قدیم تر شاہی خاندان کو ختم کر کے نبرہ (Navarre) کی مستحکم سلطنت کی بنیاد رکھی۔ مغربی بستی (Basques) اس کے بعد بھی شاہِ آستوریس کے باج گزار رہے۔ اس کے بعد سے مسلمانوں کے نقطہ نظر سے اسلامی ہسپانیہ میں جو چیز بستی خطرے کے نام سے موسوم رہی (E. Levi Provençal) اس کی نمائندگی بالخصوص نبرہ (Navarre) کی تاریخ سے ہوتی ہے۔

مآخذ: (۱) *Estudios críticos de* : F. Codera،

*Historia árabe española*، ص ۱۰۱ تا ۱۰۵، ۱۶۹ تا

۱۸۴، *Pamplona en el siglo VIII*، (۲) Lévi-Provençal،

*Hist. Esp. Mus.*، بمدد اشاریہ۔

(D. M. DUNLOP)

\* بشکہ (بشکہ کورفزی - بسکہ)، ایک خلیج جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر



عیسوی کے شروع سے متروک ہو گیا۔ جو خواتین "بشقیق" کی اہل اور مستحق سمجھی جاتی تھیں ان میں سلطان کی والدہ، بہنیں، بیٹیاں، اس کی بیویاں [قادینلر] اور اس کی کنیزیں (خاصگی) شامل تھیں۔ یہ بات نہیں معلوم ہو سکی کہ ان میں سے ہر رشتے دار کو کس کس قیمت کی جاگیریں عطا ہوتی تھیں، یا واقعی اس کا دعویٰ مقررہ اصول تھا بھی کہ نہیں، لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ جاگیریں زندگی بھر کے لیے عوتی تھیں اور سترھویں صدی عیسوی میں خالی شدہ فوجی جاگیروں کو ملا کر ان کی مقدار نامناسب طریقے پر محاصل کی معمولی حد (یعنی بیس ہزار آچہ) سے بھی زیادہ بڑھا دی گئی تھی۔ گو اٹھارھویں صدی عیسوی کے شروع سے بشقیق کی اصطلاح بالکل متروک ہو گئی، لیکن یہ جاگیری محاصل "خاص" کے نام سے شاعی حرم کی خواتین کے نام برابر جاری رہے اور چونکہ اس وقت تک قریب قریب تمام محاصل "مقاطعہ" کے ذریعے وصول ہونے لگے تھے لہذا یہ "خاص" ان رقموں پر مشتمل ہوتے تھے جو ٹھیکیداروں سے پیشگی وصول کر لی جاتی تھیں۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں دستور بہ ہو گیا کہ یہ مقاطعات براہ راست خود خواتین متعلقہ کو مانگانہ کے طور پر یا زندگی بھر کے لیے دے دیے جاتے تھے، لیکن اصلاحات کے دور میں یہ عطیے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیے گئے اور ان کے عوض انہیں سالانہ نقد وظیفے دیے جانے لگے۔

مآخذ: (۱) فوجیوں: رسالہ، استانبول ۱۳۰۳ء

ص ۱۷، ۲۴؛ (۲) Hammer: *Des Osmanischen Reichs*

*Staatsverfassung*، ۲: ۳۴، ۱۰۹؛ (۳) *و اولاً*، ت، کا

مقالہ، از Gökbilgin؛ (۴) Bowen و Gibb: *Islamic*

*Society and the West*، ج ۱، حصہ اول، بمدد اشاریہ.

(H. BOWEN)

بشیر بن سعد: ایک مدنی صحابی، جو بنو خزرج میں سے تھے اور جن کا شمار اسباقوں الاولوں میں ہوتا ہے۔ عقبہ کے مقام پر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے [اہل یثرب کی] دوسری ملاقات کے وقت وہ بھی موجود تھے۔ وہ ہجرت نبویؐ کے بعد ہونے والے تمام غزوات میں شریک ہوئے اور دو مہموں کی سرکردگی بھی کی۔ ان میں سے ایک تو شعبان ۷ھ / دسمبر [۶۲۸ء] کو بنی مرہ کے خلاف فدک کی طرف بھیجی گئی تھی اور دوسری بنو غطفان کے ایک لشکر کے خلاف، جسے عیینہ بن حصین مدینے پر حملہ کرنے کی غرض سے وادی القریٰ اور فدک کے درمیان جمع کر رہا تھا۔ پہلی مہم میں کامیابی نہیں ہوئی؛ خود (حضرت) بشیر بن سعد بڑی دلیری سے لڑے لیکن زخمی ہوئے اور دشمن انہیں مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے۔ رات کے وقت وہ کسی نہ کسی طرح فدک میں ایک یہودی کے گھر پہنچے، وہاں چند روز تک پناہ گزین رہے اور پھر مدینے واپس آئے۔ دوسری مہم، جس میں ان کے ساتھ تین سو آدمی تھے، کامیاب رہی۔ عیینہ کی فوج منتشر کر دی گئی اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ لگا۔ اسی سال جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ کے مطابق، جو اس سے ایک سال پہلے ہو چکی تھی، عمرے کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو حضرت بشیر بن سعد اس مسلح دستے کے سالار تھے جو آپؐ کی حفاظت کے لیے ساتھ گیا تھا، لیکن مکہ معظمہ میں داخل نہیں ہوا تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب بعض اہل مدینہ نے ثقیفہ [بنی ساعدہ] میں جمع ہو کر آپؐ کی جانشینی کے لیے کسی انصاری کو منتخب کرنے کی کوشش کی تو حضرت بشیر بن سعد نے ان کے

تعمیر کے لیے جگہ تجویز کی (جو ۵۵۵ھ / ۱۳۵۱ء میں  
بننا شروع ہوا، قَب [آ]، ت، مقالہ ادرنہ Edirne  
[از م - طیب گوک بلکن]، ص ۱۱۷ ب)۔

اس سے جو عثمانی تاریخ منسوب کی جاتی  
ہے (تواریخ آل عثمان، درتورک ادبیاتی اور نکلی  
ج ۳، استانبول ۱۹۳۶ء) وہ دراصل Giese:  
*Anonymous Chronicles* کا ایک دوسرا مخطوطہ ہے  
(جیسا کہ عدنان ارضی نے ثابت کیا ہے (Bell,  
۱۳، ۱۹۳۹ء: ۱۸۱ تا ۱۸۵): یہ مخطوطہ Giese  
کے مخطوطہ وی انا (۲) = مخطوطہ فلوگل، عدد  
۹۸۳ سے بہت قریب ہے)۔ بشیر چلبی نے اس تاریخ  
کا مصنف ہے، نہ تاریخ ادرنہ کا۔

مآخذ: (۱) عثمان نوری پرمجسی: ادرنہ  
تاریخی، استانبول ۱۹۳۰ء، ص ۱۶۷: (۲)  
A. Süheyl Ünver: فاتح و حکیم بشیر چلبی، در  
تورک طب تاریخی آرشوی، ص ۲۱ تا ۲۲، ۱۹۳۳ء:  
(۳) وہی مصنف: *Fatih Külliyesi ve Zamanı İlim*  
*Hayatı*، استانبول ۱۹۳۶ء، ص ۱۶۷، ۲۲۶ تا  
۲۲۷: (۴) وہی مصنف: *İlim ve Sanat Bakimindan*  
*Fatih Devri Notları*، بار اول، استانبول ۱۹۳۸ء،  
ص ۱۳ تا ۱۶: (۵) وہی مصنف: *Edirne'de Fatih'in*  
*Cihannümâ Kasrı*، استانبول ۱۹۵۳ء، ص ۱۷ تا ۱۸۔  
(V. L. MÉNAGE)

بشیر شہاب ثانی: (بن قاسم بن عمر حیدر  
الشہابی) امیر لبنان (۱۷۸۸ تا ۱۸۳۰ء)۔ وہ ۱۱۸۰ھ /  
۱۷۶۷ء میں بمقام غزیر پیدا ہوا۔ ابتدائے  
عمر ہی میں باپ کے سائے سے محروم ہو گیا اور  
جلد ہی اسے لبنان کے دارالحکومت دیر الثمر کے  
میدان سیاست میں قسمت آزمائی پر مجبور ہونا پڑا۔  
وہ ایک قوی ہیکل، ذہین اور محتاط و دور اندیش  
انسان تھا، چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ  
لوگوں کی نظریں لبنان کی گورنری کے ایک امیدوار

بجائے فریش کے دعوے کی حمایت کی۔ وہ پہلے شخص  
تھے یا پہلے اشخاص میں سے ایک تھے جنہوں نے  
نرت ابوبکر صدیق رضی کی بیعت کرنے کا فیصلہ دن  
اقدام کیا۔ آگے چل کر وہ عراق کی مہم میں بھی  
شریک ہوئے اور جب حضرت خالد بن الولید نے  
الجیرہ فتح لیا تو وہاں موجود تھے۔ حضرت بشیر رضی  
نے ۵۱۲ / ۶۳۳ء میں عین الثمر کے مقام پر رحلت  
فرمائی۔ یہ بات پورے یقین سے نہیں کہی جا سکتی  
کہ وہ میدان جنگ میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے یا  
زخمی ہو کر بعد میں انتقال کیا۔ حضرت بشیر رضی ان  
معدودے چند اصحاب میں سے تھے جو لکھنا جانتے  
تھے۔ وہ نعمان بن بشیر [رک بان] کے والد تھے۔

مآخذ: (۱) [ابن ہشام]: سیرة، ص ۳۰۸، ۳۹۸،  
۶۷۱ تا ۶۷۲، ۹۷۵: (۲) ابن سعد، ۳: ۸۳، ۲: بعد: (۳)  
الطبری، ۱: ۱۵۹۲ تا ۱۵۹۳، ۱۵۹۶ تا ۱۵۹۷،  
۱۸۳۲، ۱۸۳۳: (۴) البلاذری، ص ۲۳۳، ۲۳۸،  
۳۷۳: (۵) الیعقوبی، ۲: ۷۸، ۱۳۷: (۶) ابن الأثیر:  
الکامل، ۲: ۱۷۲: بعد، ۲۵۰: بعد، ۳۰۳: (۷) آمد  
الغابت، ۱: ۱۹۵: (۸) النووی، ص ۱۷۷: (۹) ابن عساکر،  
دمشق ۱۳۳۱ھ، ۳: ۲۶۱ تا ۲۶۳: (۱۰) الاغانی،  
۱۳: ۱۱۹: بعد: (۱۱) *Annali: Caetani*، بمدد اشارید۔

(W. 'ARAFAT)

\* بشیر چلبی: ایک طیب، جو نویں صدی  
هجری / پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں  
نامور ہوا۔ ایک مختصر رسالے حکایت بشیر چلبی  
نام کے رسالے (جس کے مخطوطے کی ہو بہو نقل  
I. H. Ertaylan: تاریخ (مخطوطے کی عکسی طباعت،  
تاریخ ادرنہ: حکایت بشیر چلبی، درتورک ادبیاتی  
اور نکلی، ج ۳، استانبول ۱۹۳۶ء) کی رو سے محمد  
ثانی نے اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد اسے قونیہ سے  
استانبول طلب کیا۔ اس نے سلطان کے سامنے ادرنہ کی  
آب و ہوا کی خوبیاں بیان کیں اور قصر جدید کی



میں اس نے جن بلاطوں سے بھاری رقمیں طلب کیں اور ۱۸۲۴ء میں انہیں میدان جنگ میں منسلک دے کر بھلا دیا۔ اسی دوران میں بشیر نے مقامی دستوں کو مضبوط کرنا شروع کیا اور انہیں سام و فلسطین میں سب سے زیادہ طاقتور فوج بنا دیا۔ اس کے پندرہ ہزار سپاہی مجموعی طور پر شام کے تمام پاشاؤں کی مجموعی فوج پر بھاری تھے۔ مزید برآں لبنانی سپاہی بڑے جانباز اور ہتھیاروں کے استعمال میں انتہائی چابک دست تھے۔

اس اثنا میں بشیر عیسائی بطریقوں اور استفوں کو جو امدادی رقمیں دیتا رہتا تھا ان کی بدولت، نیز مذہبی رواداری کے باعث، اسے مذہبی حلقوں نیز فرانسیسی قونصل کی مدد حاصل ہوتی گئی۔ ۱۸۱۷ء میں پوپ پائس ہفتم (Pius VII) نے امیر کی مذہبی رواداری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اسے ایک ذاتی خط لکھا۔ پوپ گریگوری شانزدہم (Gregory XVI) نے ۱۸۳۵ء میں امیر کو باوفا بیٹا کہہ کر خطاب دیا اور تبدیلی مذہب پر اسے سراہا؛ لیکن اپنے ہم مذہب دروزیوں کے ساتھ بشیر کا سلوک بالکل مختلف تھا۔ اس کے عہد تک دروزیوں کا صرف ایک مذہبی سربراہ ہوتا تھا، جسے شیخ العقل کہتے تھے؛ بشیر نے ایک اور سربراہ کا اضافہ کر دیا اور یوں اسے اپنے ہمسر کے مقابل لا کھڑا کیا۔

بشیر کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ مقامی ترکوں کی سازشوں کا قلع قمع کر کے لبنان کے تاریخی خود مختاری محفوظ کر لے؛ چنانچہ اس نے فلسطین میں نپولین کی پیشقدمی کے وقت ہوشیاری اور چالاکی سے کام لیتے ہوئے نہ تو واضح طور پر اس کی حمایت کی نہ مخالفت۔ جونہیں فرانسیسی فوجیں مصر کی طرف ہٹیں وہ بذات خود وزیر اعظم (سلطنت عثمانیہ) کے مسخر العریش پہنچا (۱۷۹۹ء)

کی حیثیت سے اس پر پڑنے لگیں۔ ایک دولت مند اور طاقتور جاگیر دار، شیخ قاسم جن بلاط نے سب سے پہلے بشیر کی خداداد صلاحیتوں اور سمکات کا صحیح اندازہ لیا۔ اس کی طرف سے قیام مراسم کی ابتدائی کوششیں کامیاب رہیں اور قاسم و بشیر حلیف و دوست بن گئے۔ ۱۷۸۸ء میں انہیں مشترکہ عملی قدم اٹھانے کا موقع مل گیا۔ سیدون، طرابلس الشام اور دمشق کے ترک پاشاؤں کے خاندان درودہ بھاری محاصل سے عاجز آ کر لبنان کے گورنر امیر یوسف شہاب نے عام صورت حال پر غور و مشورہ کے لیے ملک کے ممتاز افراد کا ایک اجلاس دیر القمر میں بلایا۔ حاضرین کو بڑا تعجب ہوا جب اس نے سیدون کے جزائر پاشا [رک باں] سے مناعمت میں ناکامی کا اعتراف کرتے ہوئے جانشین کے متعلق مشورہ طلب کیا۔ شیخ قاسم اور اس کے حامیوں نے نوجوان بشیر کا نام تجویز کیا تو امیر یوسف نے ان سے اتفاق کیا؛ چنانچہ معمول کے مطابق بشیر نے عسکری سفر اختیار کیا، جہاں جزائر پاشا کا قلعہ واقع تھا؛ وہ لوٹا تو لبنان کا گورنر تھا۔

جزائر پاشا ایک حریص اور سازشی آدمی تھا۔ اس نے ۱۷۹۳/۱۲۰۹ء میں لبنان کے بہت سے ممتاز سرداروں کو بغاوت پر اکسایا اور امیر یوسف کے ایک بیٹے کو لبنان کی گورنری کا لالچ دیا۔ پھر بشیر سے ایک رقم خطیر لے کر امداد کا وعدہ کر لیا۔ پاشا کی حرص و آرزو کے لیے تسکین کا انتظام کر کے بشیر داخلی استحکام کے کام میں مصروف ہو گیا۔ ۱۷۹۳ء میں اس نے جن بلاطوں اور آمد امرا کو اس بات کی اجازت دے دی کہ خود اس کے دیوان میں بہت سے ننگ سرداروں کو قتل کر ڈالیں۔ پھر اس نے جن بلاطوں کی مدد سے آمد امرا کو لبنان چھوڑنے اور کہیں اور پناہ گزین ہونے پر مجبور کر دیا (۱۷۹۹ء، ۱۸۰۸ء، ۱۸۱۹ء)۔ ۱۸۲۲/۱۲۳۷ء

کامیاب ہو کر لبنان واپس آیا۔

۱۲۳۷ھ / ۱۸۳۱ء میں محمد علی نے ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ سلطان نے یونان اور روس کی جنگ میں سخت نقصانات اٹھائے تھے اور ۱۸۲۶ء میں یونی چریوں کی فوج توڑ ڈالی تھی۔ باب عالی کے سفیروں نے (محمد علی کے خلاف امداد حاصل کرنے کے سلسلے میں) وعدہ کیا کہ کوہ لبنان کے حقوق و مراعات کا پورا احترام کیا جائے گا، لیکن بشیر کا جواب یہ تھا کہ ”جن لوگوں کو آپ نے ہمیشہ نظر انداز کیا ہے ان سے کسی مدد کی توقع نہیں رکھنی چاہیے“۔ لبنانی فوجیں طرابلس الشام میں عثمان پاشا سے لڑیں، دمشق پر چڑھائی کرنے والے لشکر میں شامل ہوئیں اور شمالی جانب حلب تک مصری لشکر کے سلسلہ رسد اور عقب کی حفاظت کی۔ اس کے بدلے میں محمد علی پاشا نے لبنان کے قدیم حقوق تسلیم کر لیے اور وعدہ لیا کہ وہ داخلی مسائل میں براہ راست مداخلت نہیں کرے گا (۱۸۳۳ء تا ۱۸۴۰ء)۔ [فلپ حتی نے ذکر البطل الفاتح ابراہیم پاشا کے حوالے سے لکھا ہے کہ شام کے مفتوحہ شہر بشیر کے بیٹوں کی فوجی حکومت میں دے دیے گئے؛ خود بشیر کو شام کا گورنر بنانے کی پیش کش کی گئی، مگر اس نے انکار کر دیا، تاریخ لبنان، صفحہ ۲۱]۔ چونکہ سلطان نئی صورت حال کو عزت و وقار کے منافی سمجھتا تھا اس لیے محمد علی پاشا کو ایک اور آزمائش کے لیے تیار رہنا پڑا۔ مطلب یہ کہ اسے فوج کے لیے مزید آدمیوں اور روز افزون اخراجات کے لیے مزید روپیے کی ضرورت پیش آئی، لہذا اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ لوگوں سے ہتھیار لے لے، فوجی بھرتی لازم قرار دے دے اور نئے محاصل لگائے۔ لبنانیوں کی ذہنیت سے ناواقف ہونے کے باعث اس نے حکم دے دیا کہ نئے قواعد کا اطلاق لبنان و حوران کے

اور ایک شاہی فرمان حاصل کر لیا، جس کی رو سے لبنان براہ راست باب عالی کے ماتحت آ گیا۔ وزیر اعظم کی وفات کے بعد اس فرمان کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی اور بشیر کو دوسرے ذرائع اختیار کرنے پڑے۔ جزار کا جانشین سلیمان پاشا (۱۸۰۴ تا ۱۸۱۹ء) نسبتاً حلیم و شفیق تھا اور بشیر نے دمشق کے کینج پاشا کی حرص و آز اور حد سے بڑھی ہوئی ہوس کا سدباب کرنے کے لیے سلیمان پاشا کی خوشنودی حاصل کر لی۔ ۱۸۱۰ء میں یوسف کینج پاشا نے دعویٰ پیش کر دیا کہ بقاع کی زرخیز وادی اس کے زیر اقتدار رہنی چاہیے۔ جب ہر طرح کی کوششیں پاشا کو اس ارادے سے باز نہ رکھ سکیں تو بشیر نے پندرہ ہزار فوج کے ساتھ دمشق پر چڑھائی کر دی اور پاشا مصر بھاگ گیا۔ ۱۸۲۰ء میں بشیر کو اسی مقصد کے لیے دمشق پر دوبارہ فوج کشی کرنی پڑی۔ ایک سال بعد درویش باب عالی کی خوشنودی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اس نے بشیر کے حلیف عبداللہ پاشا پر چڑھائی کر دی۔ اس موقع پر درویش کو اپنے رفیق پاشاے حلب سے بھی معتدبہ مدد ملی۔ عبداللہ عکا میں قلعہ بند ہو گیا۔ بشیر نے مصر سے اعانت طلب کی (۱۸۲۱-۱۸۲۲ء)۔

اسی زمانے میں محمد علی پاشا [رک باں] حاکم مصر اپنی خود مختاری کی بنیادیں استوار کر رہا تھا۔ اسے باب عالی کے مخالفانہ ارادوں کا اندازہ ہو چکا تھا اور وہ اپنے آپ کو جنگ آزادی کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اسے امیر بشیر کی فوجی قوت اور جنگی نقطہ نظر سے کوہ لبنان کی اہمیت کا پورا اندازہ تھا۔ دونوں نے باہم تبادلہ خیال کیا اور اس صورت حال کے متعلق ان میں کامل اتفاق ہو گیا۔ محمد علی نے باب عالی میں عبداللہ پاشا کی سفارش و حمایت کی اور بشیر اپنے مقصد میں



ہونے کی اجازت مل گئی۔ اس نے ۱۸۵۱ء میں وفات پائی اور اسے غلطہ (قسطنطینیہ) کے ارسنی کیتھولک کلیسا میں دفن کیا گیا۔ جب ۱۹۴۶ء میں لبنان کو وہ آزادی حاصل ہوئی جس کے لیے بشیر کوشاں رہا تھا تو جمہوری حکومت نے اس کی لاش لبنان منگالی [فلپ حتی کا بیان ہے کہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۴۰ء کو بشیر کی حوالگی عمل میں آئی تھی اور کہا گیا تھا کہ شام و فرانس کے باہر جہاں رہنا چاہو انتظام کر دیا جائے گا۔ وہ اپنی بیوی، تین بیٹوں، پوتوں، شاعر سکرٹری بطراس طرامہ، سونے سے بھری ہوئی تھیلیوں اور خزانے کے ساتھ مالٹا چلا گیا۔ ستر سپاہی ساتھ تھے۔ گیارہ مہینے کے بعد وہ قسطنطینیہ منتقل ہو گیا۔ وہیں ۱۸۵۰ء میں اس نے وفات پائی اور اس کی لاش ۱۹۴۷ء میں لبنان لا کر "بیت الدین" کے خاندانی گورستان میں دفن کی گئی (تاریخ لبنان، ص ۴۲۵)۔

مآخذ: (الف) دستاویزات: (۱) A. J. Rustum:

*Corpus of Arabic Documents relating to the History*

*of Syria under Mehemet Ali Pasha* ۱۸۳۱ تا

۱۸۴۱ء، ۵ جلدیں، بیروت ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۳ء؛ (۲)

وہی مصنف: *Calendar of State Papers relating to*

*the Affairs of Syria* ۱۸۰۵ تا ۱۸۴۱ء، ۴ جلدیں، بیروت

۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۳ء؛ (۳) *Correspondence relative to the*

*Affairs of the Levant, British Parliamentary Papers*

۱۸۳۳ تا ۱۸۴۱ء، لندن؛ (۴) G. Douin:

*Première Guerre de Syrie*، ۲ جلدیں، قاہرہ ۱۹۳۱ء؛

(۵) E. Driault: *L'Égypte et l'Europe*، ۱۸۳۹ تا

۱۸۴۱ء، ۴ جلدیں، قاہرہ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۳ء۔

(ب) بیانات: (۶) H. Chehab: *Le Liban à*

*l'Époque des Emirs Chehabs* (طبع Rustum و

Boustany)، ۳ جلدیں، بیروت ۱۹۳۳ء؛ (۷)

طنوس الشدباق: *أخبار الأعیان*، بیروت ۱۸۵۹ء

دروزی کوہستانی علاقے پر بھی ہو اور اس کے نتائج بھی اسے بھگتنے پڑے۔ ۱۸۳۷-۱۸۳۸ء کے موسم خزان و سرما میں حوران کے اندر شورش کی آگ بھڑک اٹھی اور کئی ہزار مصریوں کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۸ء میں لبنان شرقی (Anti Lebanon) کے اندر مصریوں کو پھر ایک بار تباہ و برباد کیا گیا۔

مصری فوجوں اور عثمانی لشکر کے درمیان تصادم کا جو خطرہ درپیش تھا وہ بالآخر ۱۸۳۹ء کے موسم گرما کے اوائل میں ترکی سرحد پر نرب کے مقام پر رونما ہو گیا۔ مصریوں نے ترکوں کو شکست دے کر بھاگا دیا تھا اور اب قسطنطینیہ (استانبول) کی طرف ان کی پیش قدمی کا اندیشہ لاحق تھا۔ معاہدہ خونکار اسکاہ سی (۱۸۳۳ء) کی رو سے روس پر لازم تھا کہ وہ ترکی کو مدد دے اور چونکہ فرانس برابر محمد علی پاشا کی حمایت کر رہا تھا اس لیے ایک بار پھر "المسئلة الشرقيه" زیر بحث آ گیا۔ برطانوی اور ترکی سفیر بھیس بدل کر لبنان پہنچے اور امیر بشیر کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ امیر نے خود تو دامن بچایا لیکن لبنانی ہتیار سنبھال کر علانیہ بغاوت پر اتر آئے۔ ۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ء کے موسم گرما تک فرانس تن تنہا رہ گیا اور دولِ عظمیٰ نے، جن میں روس بھی شامل تھا، معاہدہ لندن پر دستخط کر دیے؛ اتحادی بحریہ کے دستے لبنانی سمندروں میں پہنچ گئے اور ایک ترکی فوج خلیج جونہ (Junieh) کے کنارے اتر آئی۔ لبنانی، ترکی اور نیلی پوش دستوں نے بہر سف کے مقام پر ابراہیم پاشا کو شکست دی اور بشیر ثالث کے لیے لبنان کی گورنری کا اعلان ہو گیا۔ بشیر ثانی نے سیدون میں اپنے آپ کو برطانیہ کے حوالے کر دیا اور اسے جلا وطن کر کے مالٹا بھیج دیا گیا۔ کئی ماہ بعد اسے ایشیائے کوچک میں سکونت پذیر

یہ قصبہ غالباً اس جگہ بسایا گیا جہاں قدیم شہر دریدیتس Diriditis (یا تریدون Teredon) فرات کی ایک شاخ یا نہر کے مغربی کنارے آباد تھا۔ [زمانہ قدیم کی اٹلسوں میں یہ نام مل جاتا ہے۔ نظر بظاہر بصرے کا موقع اور محل وہ نہیں جو تریدون کا تھا]۔ زیادہ یقینی امر یہ ہے کہ نئی اسلامی بستی و ہشت آباد اردشیر نامی ایرانی بستی کے آثار پر وجود میں آئی۔ ۵۱۴ / ۶۳۵ء میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی عتبہ بن غزوٰن [رک باں] قدیم ایرانی چوکی کے کھنڈروں پر خیمہ زن ہوئے، جسے عربوں نے الخربہ (چھوٹا سا خرابہ) کا نام دے رکھا تھا۔ پھر امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب کے حکم سے اس مقام کو فوجی چھاؤنی کی غرض سے منتخب کر لیا (۵۱۷ / ۶۳۸ء)؛ یہی چھاؤنی قصبہ بصرہ کی بنیاد بنی (اس کا نام غالباً وہاں کی زمین کی کیفیت کی بنا پر رکھا گیا تھا) [کہا جاتا ہے "بصرہ" کے لفظی معنی ہیں "سیاہ سنگریزے"۔ چونکہ یہاں ایسے سنگریزے تھے، لہذا یہ نام رکھ لیا گیا]۔ یہ مقام شط العرب سے تخمیناً پندرہ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں فوجی چھاؤنی بنانے کی غرض یہ تھی کہ عراق، خلیج فارس اور ایران کے راستے کی نگرانی کی جا سکے۔ یہ مقصد بھی تھا کہ آئندہ فرات و دجلہ کے مشرق کی طرف شروع ہونے والی مہموں کے لیے یہ مقام نقطہ آغاز بن سکے۔ ایک ضمنی فائدہ بھی ہوا کہ یہاں کی آبادکاری کا انتظام ہو گیا۔ شروع شروع میں یہاں کے مسکن سیدھے سادے جھونپڑوں پر مشتمل تھے، جو سرکنڈوں سے بنائے جاتے تھے۔ سرکنڈے آس پاس کی بطائح [رک بہ البطحہ] سے باسانی فراہم ہو سکتے تھے۔ بعد میں چھڑی چھوٹی دیواریں بنا کر انہیں کسی قدر پختہ کر دیا گیا۔ پھر

(بار دوم ۱۹۵۴ء) [۸] الزرکلی : الاعلام، بذیل مادہ؛  
(ج) تذکرے اور ملاحظیات : R. Baz (۹) :  
Memoires، بیروت ۱۹۵۶ء؛ (۱۰) H. Guys : Beyrout  
et le Liban، پیرس ۱۸۵۰ء؛ (۱۱) F. Perrier :  
La Syrie sous le Gouvernement de Mehemet Ali  
پیرس ۱۸۴۲ء۔  
(د) جدید تصنیفات : (۱۲) H. Lammens : La Syrie  
ج ۲، بیروت ۱۹۲۲ء؛ (۱۳) M. Chebli : Une  
histoire du Liban، بیروت ۱۹۵۵ء؛ (۱۴) P.K. Hitti :  
Lebanon in History، لندن ۱۹۵۷ء؛ (۱۵) A. J. Rustum  
Bechir II entre le Sultan et le Khedive، بیروت ۱۹۵۶ء۔  
۱۹۵۷ء۔ مزید کتابوں کے حوالوں کے لیے دیکھیے : (۱۶)  
Origins of the Egyptian Expedition : A.J. Rustum  
to Syria، بیروت ۱۹۳۶ء۔

(A. J. RUSTUM)

البصرہ : (قرون وسطیٰ کے یورپ میں بلسورہ Balsora؛ ٹے ورنیر Tavernier کے ہاں بلسرا Balsara؛ دور حاضر کے روایت پسند اہل یورپ کے ہاں بصرہ، بصرہ، بصورا)۔ زیرین دوآبہ عراق کا ایک قصبہ جو شط العرب پر بغداد سے جنوب مشرق میں ۲۷۹ میل (۴۲۰ کیلومیٹر) کے فاصلے پر واقع ہے۔ مرور ایام سے اس کی جگہ کچھ بدل گئی ہے، ہمیں قدیم بصرے (موجودہ موضع "زبیر") اور جدید بصرے کا فرق ملحوظ رکھنا چاہیے (جس کی بنیاد گیارہویں صدی ہجری/اٹھارہویں [بہ تصحیح سترہویں] صدی عیسوی میں قدیم شہر الأبلہ [رک باں] کے آس پاس رکھی گئی تھی۔ یہیں سے جدید بصرے کی حد شروع ہوتی ہے۔ قصبے کے اتنی جلدی ترقی کر جانے کا سبب تیل کے چشموں کی دریافت ہے، جو زبیر کے مغرب میں پائے گئے۔

۱۔ البصرہ، تاتاریوں کی فتح (۶۵۶ھ/

۱۲۵۸ء) تک :-



پھر واقعات کی رفتار تیز تر ہو گئی اور اسی قصبے میں جنگ جمل [رک بہ الجمل] پیش آئی، جس میں مسلمان پہلی بار اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف نبرد آزما ہوئے (۵۳۶/۶۵۶ء)۔ اگلے سال (۵۳۷/۶۵۷ء) اہل البصرہ نے صفین [رک باں] کی جنگ میں حضرت علیؓ کی حمایت کی۔ عین اسی وقت البصرہ سے اولین ”خارجیوں“ کی خاصی تعداد فراہم ہوئی۔ ۵۳۱/۶۶۲ء میں امیر معاویہؓ نے البصرہ میں ازسرنو اموی اقتدار بحال کیا اور ۵۴۵/۶۶۵ء میں زیاد کو وہاں بھیج دیا۔ ایک حد تک اس قصبے کی خوشحالی کا ذمے دار زیاد ہی تھا۔ اس وقت البصرہ پانچ قبائلی حلقوں (خمس، جمع، اخماس) میں منقسم تھا: اول اہل العالیہ (حجاز کے بالائی علاقے کے باشندے)، دوم بنو تمیم، سوم بنو بکر بن وائل، چہارم بنو عبدالقیس اور پنجم بنو ازد۔ البصرہ کے فوجی سرداروں کا طبقہ انہیں عرب عناصر سے مرکب تھا۔ ”موالی“ میں اصل باشندے (جو بلاشبہ نسبتاً بہت کم تھے) اور باہر سے آئے ہوئے گروہ (ایرانی، ہندی، سندھی، ملائی، زنجی وغیرہ) شامل تھے۔ انہوں نے اپنے آقاؤں کے تنازعات کو اپنا لیا تھا، جن کی قدیم قبائلی عصیت کا زور رفتہ رفتہ ہی ٹوٹا۔ عبید اللہ بن زیاد کے عہد امارت میں مقامی حالت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ اس کی وفات (۵۶۴/۶۸۳ء) پر شدید فسادات برپا ہو گئے۔ ایک عرصے کی بدنظمی کے بعد البصرہ حاسیان عبداللہ ابن زبیر کے زیر اقتدار آ گیا اور ۵۷۲/۶۹۱ء تک انہیں کے پاس رہا۔ اگلے چند برس میں شورشیں دبانا ہی بنو امیہ کا اولین کام رہا۔ ان میں سے اہم ترین شورش ابن الأشعث [رک باں] کی تھی (۵۸۱/۷۰۱ء)۔ پھر الحجاج کی موت (۵۹۵/۷۱۴ء) تک امن و امان کا دور دورہ رہا۔ بعد ازاں مہلبیوں کی بغاوت (۵۱۰-۵۱۱/۷۲۰-۷۲۱ء)

ایک آتشزدگی کے بعد مکان خام اینٹوں سے ازسرنو تعمیر کیے گئے۔ زیاد بن [ابیہ] کا عہد آیا تو خام اینٹوں کی جگہ پختہ اینٹوں نے لے لی اور البصرہ واقعی ایک قصبے کی شکل اختیار کرنے لگا۔ اس میں ایک نئی جامع مسجد، دارالامارۃ، شہر پناہ اور اس کے گردا گرد خندق تھی۔ یہ سب کچھ ۵۱۵/۷۲۱-۷۲۲ء میں مکمل ہوا۔ شہر کے لیے پینے کے پانی کا معاملہ برابر ایک نازک مسئلہ بنا رہا اور اگرچہ متعدد نہریں بھی کھودی گئیں اور قدیم دریائے Pallacopas کے طاس سے بھی کام لیا گیا تاکہ قصبے کے لیے دریائی بندرگاہ کا انتظام ہو جائے، تاہم باشندگان البصرہ کو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے دریائے دجلہ تک جانا ہی پڑتا تھا۔

ان صعوبتوں پر موسم کی ستم رانیاں البصرے کے فوجی مرکز کو بڑا شہر بننے میں یقیناً حائل ہو جاتیں، لیکن سیاسی، اقتصادی اور نفسیاتی عوامل اتنے قوی تھے کہ اہل البصرہ قصبے میں جمے رہے اور شہر کی ترقی کا سلسلہ جاری رہا، تاآنکہ دوسرے اسباب بیچ میں حائل ہو گئے: اول شہر بغداد کی تاسیس، پھر مرکزی قوت کا انحطاط اور ملک میں افراتفری کا دور دورہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس سرعت سے شہر ترقی کر گیا تھا ان عوامل کے سبب اسی سرعت سے اس کا زوال انتہا پر پہنچ گیا۔

ابتدا ہی سے البصرہ فاتح عرب فوجوں کے لیے بھرتی کا ایک مرکز تھا۔ اہل البصرہ نے جنگ نہاوند (۵۲۱/۶۴۲ء) نیز اصطخر، فارس، خراسان اور سجستان کی تسخیر (۵۲۹/۶۵۰ء) میں حصہ لیا۔ اس مرحلے پر یہ فوجی مرکز اپنا طبعی کردار ادا کر رہا تھا، لیکن جب مال غنیمت کی کا وفور ہونے لگا تو اہل البصرہ کو بھی اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔

قدیم البصرہ کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔ البصرہ دوسری صدی ہجری/آٹھویں صدی عیسوی کے دوران، نیز تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے آغاز میں کمال عروج کو پہنچ گیا اور اس کی آبادی بہت ہی بڑھ گئی تھی۔ اگرچہ باشندوں کی تعداد میں بہت اختلاف ہے (دو لاکھ نفوس سے لے کر چھ لاکھ تک)، تاہم اس میں شک نہیں کہ البصرہ ازنہ وسطی کا بہت بڑا شہر تھا، بلکہ اسے واقعی ام البلاد کہنا چاہیے: یہ ایک تجارتی مرکز بھی تھا؛ وہاں مرید (اونٹ بٹھانے کی جگہ) تھا، جہاں قافلے آ کر ٹھہرا کرتے تھے؛ دریائی بندرگاہ تھی، یعنی ”الکلاء“ (= کشتیوں کے ٹھہرنے کی جگہ)، جہاں خاصے بڑے جہاز لنگر انداز ہو سکتے تھے۔ یہودیوں، مسیحیوں اور دوسرے غیر عرب سرمایہ داروں کی بدولت یہ ایک بڑا مرکز مالیات بھی بن گیا تھا۔ اسلحہ سازی کے کارخانوں نے البصرہ کو ایک صنعتی مرکز بنا دیا تھا۔ پھر اس اعتبار سے اسے زرعی مرکز بھی کہہ سکتے تھے کہ یہاں بے شمار قسم کی کھجوریں ہوتی تھیں۔ سب سے آخر میں یہ کہ البصرہ نہایت زبردست دینی و علمی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھا۔ ”در حقیقت البصرہ وہ بھٹی ہے جہاں پہلی اور چوتھی صدی ہجری کے درمیان (۵۱۶/۶۳۷ء سے ۵۳۱۱/۹۲۳ء تک) اسلامی ثقافت کلاسیکی سانچے میں ڈھل کر نکھری“ (L. Massignon)۔ یاد رکھنا چاہیے کہ البصرہ ہی وہ مقام ہے جہاں عربی صرف و نحو نے جنم لیا اور سیویہ اور خلیل بن احمد [رک باں] نے اسے چار چاند لگا دیے۔ واصل بن عطاء، عمرو بن عبید، ابوالہذیل، النظام اور متعدد دوسرے اصحاب کی آغوش میں معتزلیت یہیں پروان چڑھی۔ یہی وہ شہر تھا جہاں ابو عمرو بن العلاء، ابو عبیدہ، الاصمعی

اور چند ایک چھوٹی چھوٹی شورشوں نے مزید ابتری پیدا کر دی۔ عباسیوں کا دور آیا تو البصرہ کسی شدید دشواری کے بغیر ان کے قبضے میں چلا گیا؛ لیکن نئے دارالخلافت کے قرب کی وجہ سے البصرہ کی نیم خود مختار حیثیت ختم ہو گئی جو اسے اول روز سے حاصل تھی۔ اس کے بعد سے یہ محض ایک معمولی صوبائی قصبہ رہ گیا، البتہ وہاں وقتاً فوقتاً ایسی بغاوتیں ہوتی رہیں جو سیاسی کم اور سماجی زیادہ تھیں۔ ان میں پہلی بغاوت زط [رک باں] کی تھی، جس کی بدولت ۵۲۰ھ/۶۸۲ء سے ۵۲۲ھ/۸۳۵ء تک اس علاقے میں دہشت اور خوف و ہراس کا دور جاری رہا۔ پھر زنج [رک باں] (صاحب الزنج) کی بغاوت پیش آئی، جس نے ۵۲۵ھ/۸۷۱ء میں زور پکڑا۔ آخری بغاوت قرامطہ کی تھی، جنہوں نے ۵۳۱۱ھ/۹۲۳ء میں البصرہ کو تاخت و تاراج کیا۔ کچھ عرصے کے بعد یہ آل برید [رک بہ برید] کے ہاتھوں میں پڑ گیا۔ ان سے ۵۳۳۶ھ/۹۴۷ء میں آل بویہ [رک باں] نے چھین لیا۔ ازاں بعد یہ بنو مزید [رک باں] کے زیر نگیں آ گیا۔ اور اس کی خوشحالی پھر سے عود کر آئی۔ بایں ہمہ نئی شہر پناہ ۵۱۲ھ/۱۱۲۳ء میں اس قدیم شہر پناہ سے دو کیلومیٹر اندر کی طرف تعمیر کی گئی، جو پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی میں برباد ہو گئی تھی اور یہ قصبے کے زوال و انحطاط کا واضح ثبوت ہے۔ گردونواح کے بدویوں (بالخصوص المنتفق) نے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے البصرہ کو غارت گری کا تختہ مشق بنا لیا۔ ابن حوقل کی کتاب کے ایک ناقل کا بیان ہے کہ ۵۳۷ھ/۱۱۴۲ء سے ۱۱۴۳ء سے متعدد عمارات منہدم کر دی گئیں۔ ہمارے زمانے میں ایک مسجد (جو مسجد علی کے نام سے مشہور ہے)، نیز حضرات طلحہ رض، زبیر رض، ابن میرین رض اور حسن رض بصری کے مزارات کے سوا



*Le Milieu basrien et la formation de* : Ch. Pellat  
*Gāhiz*، پیرس ۱۹۵۳ء، جس میں شہر کی پوری تاریخ  
یوم تاسیس سے تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی  
کے وسط تک، مع فہرست مآخذ، موجود ہے؛ نیز (۵)  
*Recherches sur l'histoire et la* : J. Saint-Martin  
*géographie de la Mésène et de la Characène*، پیرس  
۱۸۳۸ء، ۴۷ بعد؛ (۶) *The five great* : Rawlinson  
*Monarchies*، ۳ : ۲۹۰؛ (۷) ناصر خسرو: سفر نامہ؛  
شہر کی قدیم جغرافیائی تاریخ پر دیکھیے: (۸) صالح العلی  
کا مبسوط مقالہ *خط البصرہ*، در *Sumer*، ۱۹۵۲ء،  
ص ۷۲ تا ۸۳، ۲۸۱ تا ۳۰۳ (اس مجلہ کے بعد کے شمارے  
بھی دیکھیے) اور (۹) L. Massignon کا خیال انگیز مقالہ  
*Explication du plan de Basra*، در *Westostliche*  
*Abhandlungen R. Tschudi*، Wiesbaden، ۱۹۵۴ء،  
ص ۱۵۴ تا ۱۷۴ - اس میں دو نقشے بھی ہیں جن  
میں اولاً دونوں بصروں کا محل وقوع دکھایا گیا ہے  
اور ثانیاً اخصاس کا مقام متعین کیا ہے؛ پہلی صدی  
ہجری / ساتویں صدی عیسوی کے معاشی اور اقتصادی  
اداروں کا نہایت جامع حال: (۱۰) صالح العلی: *التنظیمات*  
*الاجتماعیة والاقتصادیة فی البصرہ*، بغداد ۱۹۵۳ء  
(مع مکمل مآخذ) میں موجود ہے۔

(CH. PELLAT)

۲ - دور حاضر کا البصرہ

البصرہ جو پہلے ہی پانچویں صدی ہجری /  
گیارہویں صدی عیسوی سے ساتویں صدی ہجری /  
تیرہویں صدی عیسوی تک بلحاظ وسعت و رونق  
گھٹتا جا رہا تھا اب اس تباہی و بربادی اور انتشار  
اور عدم توجہ کی وجہ سے بڑی تیزی سے زوال پذیر  
ہو گیا جو ۵۶۵۶ / ۱۲۵۸ء میں ہلاکو کے ورود  
عراق اور ایلخانی حکومت کے قیام کے بعد نمودار  
ہوئی۔ البصرہ ایلخانی حکومت کا ایسا بعینہ ترین صوبہ  
تھا جہاں سرکشی، بد امنی اور افتراق کے کئی دور

اور ابوالحسن المدائنی ایسے فضلا پیدا ہوئے  
جنہوں نے اشعار اور تاریخی روایتیں جمع کر کے  
آنے والے مصنفوں کے لیے مواد فراہم کیا۔ مذہبی  
حلقوں میں درخشانی علوم کمال پر پہنچ گئی۔  
حسن بصری اور ان کے عقیدت مندوں نے تصوف کی بنیاد  
بھی یہیں رکھی۔ شعر و شاعری کے میدان میں  
عہد امیہ کے بڑے بڑے شاعر اور بشار بن برد  
اور ابونواس ایسے مجدد پسند شعراء، اسی سر زمین سے  
اٹھے۔ البصرہ کے بارے میں آخری اہم بات یہ ہے  
کہ یہیں عربی نثر نے ابن المقفع، سہل بن  
ہارون اور الجاحظ کی مساعی سے جنم لیا۔ تیسری  
صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے بعد ذہنی اور  
علمی انحطاط اتنا نمایاں نہیں جتنا سیاسی اور  
اقتصادی زوال تھا۔ ابن سوار کو خدا جزامے خیر  
دے کہ اس کے طفیل البصرہ کو ایک ایسا  
کتب خانہ مل گیا جسے غیر فانی شہرت حاصل ہے۔  
اخوان الصفا اور الحریری نے قدیم شہر کی عزت و  
آبرو برقرار رکھنے میں حصہ لیا، لیکن ان کے زمانے  
میں عرب ثقافت عمومی طور پر رو بہ تنزل تھی۔  
بغداد کے علاوہ صوبائی صدر مقامات نے البصرہ کو  
پس پشت ڈال دیا تھا۔

مآخذ: البصرہ کی تاریخ کم از کم چار مصنفوں

نے لکھی تھی: عمر بن شبہ، المدائنی، الساجی اور ابن  
الاعرابی، لیکن ان کی کتابیں نہیں ملتیں، لہذا یہاں  
البلاذری، الطبری، ابن سعد، ابن الأثیر، ابن الفقیہ،  
الاصطخری، المقدسی، الادریسی، یاقوت وغیرہم کی عظیم  
کتب تاریخ و سیرت و جغرافیہ کا حوالہ ہی دیا جا  
سکتا ہے۔ مزید برآں انہیں کتابوں سے استفادہ کرنے  
والوں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں: (۱)  
*Annali* : L. Caetani، ۳ : ۲۹۲ تا ۳۰۹، ۷۶۹ تا  
۷۸۳؛ نیز دیکھیے: (۲) وہی مصنف: *Chronographia*،  
بمواقع کثیرہ؛ (۳) *Le Strange*، ص ۴۴ تا ۴۶؛ (۴)

میں البصرہ کے آزاد و خود مختار امرا بہت زیادہ سرکش ہو گئے تو وسطی عراق سے دو سہمیں روانہ کی گئیں، جو حکومت کا خواب دیکھنے والے طاقتور مقامی (قبائلی یا شہری) اسیدواروں میں بظاہر سلطان کے اقتدار و اختیار کو بحال کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ برائے نام شاہی حکمرانی میں رہ کر نیم خود مختاری کی ایک زیادہ طویل اور زیادہ کامیاب کوشش ایک مقامی ممتاز شخصیت افراسیاب [رک باں] اور اس کے بیٹے علی پاشا (۵۱۰۳۴/۴۱۶۲۴) اور پوتے حسین پاشا (۵۱۰۶۰/۴۱۶۵۰) نے کی۔ اس کی اصل و نسل کا بھی آج پتا نہیں چل سکتا۔ اس عجیب و غریب (دلچسپ) خاندان نے بصرے کے دروازے اور آبی راستے فرنگیوں (پرتگالی، برطانوی، ولندیزی) کے نمائندوں اور ان کے تجارتی جہازوں کے لیے کھول دیے۔ یہ فرنگی اس وقت خلیج فارس کی تجارت میں مصروف تھے۔ تقریباً پینتالیس برس تک یہ خاندان انقلابوں میں سے گزرتا ہوا اور رکاوٹوں سے دو چار ہوتا ہوا پاشاے بغداد کی جنگی کوششوں اور سیاسی چال بازیوں اور صفوی فرمانروا کی دھمکیوں اور مقامی حریفوں اور ابنائے وقت قبائلیوں کی سازشوں کے مقابلے میں ڈٹا رہا۔ اس کی ترکی سے دوبارہ سیاسی وابستگی هنوز نامکمل تھی حتیٰ کہ یہ کام ایک پوری نسل کی مقامی شورش، ایرانی دراندازی، قبائلی (حویزہ قبیلہ اور مستفق قبیلوں کے) غلبے اور طاعون کی تباہ کاری نے پورا کر دیا۔

ان واقعات کے بعد دو صدیوں (بارہویں - تیرہویں صدی ہجری / اٹھارہویں - انیسویں صدی عیسوی) کے دوران میں البصرہ برابر جنوبی عراق کا صدر مقام، ملک کی واحد بندرگاہ (بے سرو سامانی اور ابتدائی حالت میں ہونے کے باوجود) اور فرسودہ اور حقیقت بحری بیڑے کی گودی بنا رہا۔ کھجور

آئے۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں ابن بطوطہ نے شہر کو زیادہ تر کھنڈروں کی شکل میں پایا اور اگرچہ کچھ بڑی عمارات (جن میں مسجد جامع شامل تھی) هنوز باقی تھیں لیکن شہر اپنی جگہ سے دوسری جگہ (موجودہ مقام پر) منتقل ہوتا جا رہا تھا، یعنی کوئی بارہ میل کے فاصلے پر ابلہ کی جگہ یا اس کے نواح میں۔ اس اقدام کا محرک کچھ تو تحفظ کا خیال تھا اور کچھ یہ کہ نہروں کی حالت ابتر ہو چکی تھی۔ شط العرب کی کھجوروں کا عظیم خطہ ہمیشہ اہل البصرہ کے لیے مایہ فخر و مباہات رہا؛ لیکن اس کی ثقافت اور اقتصادی زندگی عراقی تاریخ کے جلائری اور ترکمانی ادوار (۵۲۰/۱۳۴۰ تا ۵۹۱/۱۵۰۸ء میں برابر گرتی ہی چلی گئی اور بالآخر جب مؤخر الذکر سنہ میں یہ علاقہ تمام عراق کے ساتھ ایک قلیل عرصے (۵۹۱/۱۵۰۸ء تا ۵۹۴/۱۵۳۴ء) کے لیے شاہ اسمعیل کی ایرانی حکومت کے ہاتھ بٹ گیا تو اس زمانے میں یہ مقام اپنی نئی حالت میں بڑی نہر (دور حاضر کی خلیج عشار) کے ساتھ دو میل اوپر کی جانب واقع تھا۔ یہ صرف ایک صوبائی قصبہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اب اس کی اہمیت اس قدر تھی کہ اس میں بحری بندرگاہ تھی، باغ تھے اور دور دست حکمرانوں کے پنجنہ استبداد سے آزاد رہنے کا پر جوش جذبہ تھا۔

۵۹۴/۱۵۳۴ء میں عراق پر عثمانی فتح نے اس شہر کی حیثیت اور قسمت پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اس کی آبادی میں سنی عنصر، جو پہلے بھی غالب تھا، زیادہ قوی ہو گیا۔ ترکی پاشا قبائل کے نرغے میں آئے ہوئے اور دلدلوں سے گھرے ہوئے جنوب اقصیٰ کے اس شہر سے کم سے کم تعظیم اور اقل قلیل خراج کی وصولی پر بھی مطمئن رہتا تھا؛ اور جب ۵۹۵۳/۱۵۴۶ء



بے نتیجہ ہی رہا، مثلاً ۱۲۳۱ھ / ۱۸۲۵ء میں -  
۱۲۳۷ھ / ۱۸۳۱ء میں بغداد کے خوفناک طاعون  
نے اس بندرگاہ کو بھی نہ چھوڑا اور اس کی  
کمزوری اور بدنظمی میں خاصہ اضافہ کر دیا۔

۱۲۳۸ھ / ۱۸۳۲ء تا ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۳ء کا  
زمانہ دھیمی ترقی کا دور ہے۔ اس عرصے میں تحفظ  
کو بہتر کیا گیا اور یورپ اور امریکہ کے ساتھ  
تجارتی تعلقات بڑھائے گئے۔ ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۰ء  
میں البصرہ "ولایت" قرار دے دیا گیا۔ اور اس کے  
ممتاز خاندانوں اور شخصیتوں میں بڑھتی ہوئی عربی  
قومیت کا ظہور ہوا

عراق پر برطانوی قبضے (۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۳ء)  
کے دوران میں اور بعد کے منشور (۱۳۳۹ھ /  
۱۹۲۰ء تا ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء) کے دوران میں  
البصرہ بڑی تیزی سے ایک جدید شہر کا روپ  
دھار گیا۔ بندرگاہ کو نہایت وسیع اور جدید  
ترین طریقوں کے مطابق تعمیر کیا گیا اور اسے  
تمام ضروری سامان سے لیس کیا گیا۔ شط العرب  
کے دہانے پر ایک گہری رود بار کھودی گئی  
اور خود شہر اور اس کے مضافات کو مختلف  
قسم کی سڑکوں، عمارتوں اور عوامی محکموں سے  
آراستہ کیا گیا۔ وہ عراق ریلوے کا جنوبی ٹرمینس  
(آخری سٹیشن) قرار دیا گیا۔ اور روز افزوں اہمیت  
کا ہوائی مرکز بھی ہو گیا۔ عراقی حکومت کے  
ماتحت یہ ایک "نوا" کا صدر مقام قرار پایا، جس  
میں ابوالخضیب اور قرنہ کے ماتحت قضا شامل تھے۔  
شہر اور اس کے مضافات "معیل" و "عشار"  
۱۹۵۵ء میں دو لاکھ نفوس پر مشتمل تھے۔  
تحفظ اور مواصلات کے بہتر ہو جانے کے باعث البصرہ  
خلیج فارس کی بہت ہی اعلیٰ درجے کی بندرگاہ، گودام  
اور عراق کی ایک نہایت ہی اہم گزرگاہ بن گیا۔  
۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء سے ما قبل کے تیس برس میں

کی تجارت کا مرکز اور عرب، خوزستان اور خلیج  
فارس کے شاہزادوں اور قبائل کے بچے دروازے کا  
کام دیتا۔ یہ شہر جس کا نظم و نسق ۱۲۳۷ھ /  
۱۸۳۱ء کے بعد بتدریج تجدید کی جانب آمادہ ہوا  
ہمیشہ قبائلی ڈاکوؤں بلکہ حملہ آوروں بالخصوص  
کثیر التعداد قبیلہ منتفق، نیز طاعون اور سیلاب کے  
رحم و کرم پر رہا۔

اس صدی کے وسط میں نادر شاہ کے عراق پر  
حملوں کے دوران میں البصرہ کو خطرہ لاحق  
ہوا بلکہ کچھ عرصے کے لیے اس کا محاصرہ بھی کیا  
گیا اور جب نادری فوجیں واپس لوٹیں تو حسب  
معمول افتراق کی یورشیں ہو گئیں۔ (عراق میں)  
مضبوط طاقتور حکومت صرف خاص الخاص مسلمین  
کے دور ہی میں (بشمول سلیمان ابولیلی (از ۱۲۶۶ھ /  
۱۷۴۹ء [بہ تصحیح ۱۸۳۹ء]) اور سلیمان اعظم  
از ۱۲۸۲ھ / ۱۷۶۵ء) [بہ تصحیح ۱۸۶۵ء]  
دیکھنے میں آئی ہے۔ فرنگیوں (برطانوی، فرانسیسی  
اور اطالوی) کے مستقل تجارتی مرکز، قونصل خانوں  
اور سفارتوں نے آہستہ آہستہ قدم جما لیے لیکن  
اس سے بے چینی ذرا بھی کم نہ ہوئی۔ قبیلہ منتفق  
میں طاقتور سوڈانی قیادت کے ظہور (۱۲۵۶ھ /  
۱۷۴۰ء [بہ تصحیح ۱۸۳۰ء]) کے بعد قبائلی  
دہشت انگیزی اور بڑھ گئی۔ کریم خان  
[رک بان] کے بھائی صادق خان کی ایرانی افواج  
اس شہر اور ضلع کا محاصرہ اور قبضہ (۱۱۸۹ھ /  
۱۷۷۵ء تا ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء) البصرہ کی تاریخ  
میں ایک بالکل جداگانہ سا واقعہ ہے۔ اس کے بعد  
حالات جیسے پہلے تھے ویسے ہی ہو گئے۔  
جنوبی عراق کے قبائلی یا حکومتی اقتدار کے  
خواہاں مخالفوں نے امام مسقط کی طرف دوستی کا  
ہاتھ بڑھایا تھا، پھر بھی ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء  
میں امام مسقط کے بیڑے کا البصرہ کے لیے خطرہ

زبردست شہر سدھار اور گلیاں (جن میں اعلیٰ درجے کی کرنیچی Corniche سڑک بھی شامل ہے)، عوامی اور تجارتی عمارات، رفاہ عامہ اور بہبود کے اداروں کی شکل میں مزید ترقیاں ہوئیں۔ کھجوروں کے وسیع و عریض باغ (جن میں زندگی اپنی اسی مفلسی اور ابتدائی حالت میں رہی) اور شط العرب کے شاندار آب گزر نے اس جدید وضع کے شہر اور اس کے ان پھیلتے ہوئے مضافات کو جو ابتدائی وسطی دور اور بالکل جدید طرز کی خصوصیات کا امتزاج ہیں، حیرت انگیز رنگ و روپ میں ڈھال دیا ہے۔ کھجوروں کی برآمد کو اب زیادہ منظم کر دیا گیا ہے۔ البصرہ میں ایک بورڈ قائم کر کے اس کی تجارت کو ایک مرکز پر لایا گیا ہے۔ عراق پٹرولیم کمپنی کی ایک شاخ نے پٹرول کی تلاش شروع کی تو ان کی جستجو کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۳۶۸ھ / ۱۹۴۸ء میں زبیر کے نواح میں تیل کا ایک بڑا ذخیرہ دریافت ہوا۔ اس کے بعد ”لوا“ میں کئی ایک اور ذخیرے (بالخصوص الرونیلہ کا) دریافت ہوئے۔ ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۱ء میں اسے پائپ لائن کے ذریعے فاوو Fāo سے ملا دیا گیا۔ صنعت نے نہایت سرعت کے ساتھ اور بہت بڑے پیمانے پر ترقی کی۔ یہ ترقی البصرہ میں روزگار، فنی تعلیم اور مال دولت کا بہت بڑا ذریعہ بن گئی۔ ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء میں مفتیہ میں تیل کو صاف کرنے کا ایک کارخانہ جاری کیا گیا۔ اسی دوران میں شہر اور ضلع البصرہ (۱۳۵۳ھ / ۱۹۳۴ء) نے بہت استفادہ کیا۔ لیکن زیادہ فائدہ ۱۳۷۲ھ / ۱۹۵۲ء سے شروع ہوا جب عراق کی مرکزی حکومت نے اپنے تیل کے ذرائع کو جلب زر میں صرف کر کے بہت دولت کمائی۔ شہر کے قرب و جوار میں سیلاب سے تحفظ، سمندر سے زمین کی بازیابی اور مستقل آب پاشی کے معاملات میں

ترقیاتی منصوبے بھی بنائے گئے۔  
 مآخذ: بصرے کے جدید عہد کی ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء تک کی تاریخ کے لیے قلمی اور مطبوعہ مآخذ کی فہرست Four Centuries of : S. H. Longrigg (اوکسفورڈ ۱۹۲۵ء، ص ۳۲۰ تا ۳۳۰) Modern Iraq (۱۹۲۵ء، ص ۳۲۰ تا ۳۳۰) میں ملے گی؛ ۱۳۱۸ھ / ۱۹۰۰ء تا ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۰ء کے دور کے لیے دیکھیے وہی مصنف: Iraq 1900 to 1950 لندن ۱۹۵۳ء، ص ۳۰۱ تا ۳۱۲۔

(S.H. LONGRIGG)

البصرہ: مراکش کا ایک قصبہ، جو اب موجود نہیں ہے۔ اس کا نام عراق کے شہر البصرہ ہی سے لیا گیا تھا۔ سرخ مٹی کی دو پہاڑیوں کے درمیان (جن سے اس کا لقب الحمراء ہو گیا تھا) ایک سطح مرتفع پر، جہاں سے مشرق کی جانب وزان جانے والی سڑک، مغرب میں ویدمدا Wed Mda کی وادی اور شمال مشرق کی سمت ویدلقوس Wed Lekkus پر نظر پڑتی تھی، قصر الکبیر کے جنوب میں ساڑھے بارہ میل (بیس کیلومیٹر) کے فاصلے پر واقع تھا۔ ٹسو Tissot کے بیان کے مطابق اس کا محل وقوع وہی تھا جو رومی شہر Tremulae کا تھا۔ اس کی بنا قریب قریب انہیں دنوں میں پڑی جب اصیلہ (Arzila) [رک باں] کی بنیاد رکھی گئی اور اس لیے غالباً ادریس ثانی ہی کے ہاتھوں تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے شروع میں۔ اس کی تاسیس کا مقصد بلاشبہ یہ تھا کہ فاس کے ادریسی حکمرانوں کے لیے گرمائی مسکن کا کام دے۔ جب محمد بن ادریس ثانی نے اپنی مملکت کو تقسیم کیا تو البصرہ اور تنجیر [طنجہ] مع اس کے توابع کے اس کے بھائی القاسم کے حصے میں آیا۔ اگلی صدی میں یہ ایک چھوٹی سی ریاست کا (جو ریف اور غمارة کے علاقے پر مشتمل تھی) صدر مقام ہو گیا اور اس کا نظم و نسق ایک ادریسی شاہزادے



(فرانسیسی ترجمہ از Beaumier، ص ۶۲)؛ (۵)  
الحسن بن محمد الوزان الزیاتی Leo Africanus، مترجمہ  
Épaulard، پیرس ۱۹۰۶ء، ص ۲۵۹؛ (۶) Tissot Rech.:  
'géog. sur la comparée de la Mauritanie tingitane  
پیرس ۱۸۷۷ء، ص ۱۶۰ بعد؛ (۷) H. Terrasse Hist. du  
Maroc، کاسابلانکا ۱۹۳۹ء تا ۱۹۵۰ء، بمدد اشاریہ؛ (۸)  
Hist. Esp. Mus.: E. Lévi-Provençal، بمدد اشاریہ؛  
El-Basra, capitale idrissite, et : D. Eustache (۹)  
son port، در Hespéris، ۱۹۵۰ء، ص ۲۱۷ تا ۲۳۸  
(مع فہرست مآخذ و مولای بوسلہام پر ایک مضمون کے  
جو غالباً البصرہ کی بندرگاہ تھی)۔

(G. YVER)

\* بصری (Bostra)، جنوبی شام کا ایک شہر، جو  
صوبہ حوران (Notita dignitatum کا Houranitidis)  
کے، جسے بائبل میں Idumea لکھا ہے، زر خیز  
میدان تقرہ میں واقع ہے۔ اس کا محل وقوع  
۳۲ درجہ ۳۰ دقیقہ عرض بلد شمالی اور ۳۶  
درجہ ۲۸ دقیقہ طول بلد شرقی میں ہے۔ آج کل  
اسے بصری اسکی شام کہتے ہیں (تا کہ اس میں  
اور بصری الحریری میں فرق کیا جا سکے، جو عذراء  
Ezra سے ساڑھے بارہ میل دور، لجاہ کے جنوبی  
کنارے پر واقع ہے)۔ بصری اردن کی موجودہ سرحد  
سے انیس میل شمال کی جانب اس سڑک پر ہے جو  
مغرب میں واقع درعہ کو سلخند سے، جو مشرق میں  
ہے، ملاتی ہے، یہ دو موسمی (یعنی وقفوں سے  
بہنے والی) ندیوں، وادی زیدی اور وادی بطم کے  
قریب ہے، جو دریائے یرموک کی معاون ہیں۔  
"بصری" نام کے مصدقہ معنی بلند قلعہ (Citadel)  
کے ہیں (Inscr. Palm : De Vogué، ص ۲۵)۔ یہ شہر،  
جسے اس کی بنا کے زمانے سے قلعہ بند کر دیا گیا تھا،  
بظاہر عرب (یعنی نبطی = Nabataeans) بادشاہوں کا  
شمال کی جانب مستحکم مقام رہا ہے۔ Damascius

حسن بن غنون (گنون) کو تفویض ہوا۔ لیکن  
اس کے جلد بعد (۵ محرم الحرام ۵۳۶ھ / ۶  
اکتوبر ۱۱۴۳ء) قرطبہ کے اموی خلیفہ الحکم ثانی  
کی فوجوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ یہیں یحییٰ  
بن حمدون نے ایک آزاد فرمانروا کے طور پر حکومت  
شروع کی تاآنکہ اسے بلگین بن زیری نے وہاں سے  
نکل دیا اور شہر کے استحکامات مسمار کر دیے۔  
البصرہ کی تاریخ سے متعلق تقریباً بس اتنے ہی  
واضح بیانات ہمارے پاس موجود ہیں۔

المقدسی (طبع و ترجمہ Pellat، ص ۲۷) کے  
اس بیان کے علی الرغم کہ وہ [اس کے زمانے میں]  
کھنڈر ہو چکا تھا یہ شہر بظاہر چوتھی صدی  
ہجری / دسویں صدی عیسوی اور پانچویں صدی  
ہجری / گیارہویں صدی عیسوی تک خاصا خوشحال  
تھا، جیسا کہ ابن حوقل اور البکری کے بیان سے  
معلوم ہوتا ہے، جنہوں نے لکھا ہے کہ اس کی  
شہر پنہ میں دس دروازے تھے، اور یہاں کئی حمام،  
مسجدیں، باغ اور مرغزار تھے۔ انہوں نے یہاں کے  
مکئی اور کپاس کے کھیتوں کا بھی ذکر کیا ہے،  
جو شہر کے چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ تاہم  
اس کا زوال بہت تیزی سے ہوا اور بالآخر یہ بالکل  
کھنڈر ہو کر رہ گیا۔ الحسن بن محمد الوزان الزیاتی  
(Leo Africanus) کے زمانے میں یہاں دو ہزار سے زیادہ  
گھر نہ تھے اور اس کی دیواریں اجڑے ہوئے باغوں کے  
درمیان کھڑی تھیں۔ آج صرف پتھر کی دیوار باقی  
رہ گئی ہے۔

مآخذ: (۱) ابن حوقل : Desc. de l'Afr. et

de l'Espagne، مترجمہ د یسلان de Slane، در

JA؛ ۱۸۳۲ء، ص ۱۹۲؛ (۲) البکری Desc. de

l'Afr. Sept.، مترجمہ د یسلان، بمدد اشاریہ؛ (۳)

الادریسی، مترجمہ ڈوزی و ڈخویہ، ص ۲۰۲؛

(۳) ابن ابی زرع : الروض، رباط ۱۹۳۶ء، ص ۷۱

بصری کے نقشے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت روما میں شامل کیے جانے کے وقت اس شہر کی توسیع یقیناً عمل میں آئی۔ اگرچہ چوتھی صدی عیسوی میں بھی یہ ایک مستحکم جنگی قلعہ رہا، جو جراسہ Gerasa اور فلاڈلفیا Philadelphia کی طرح روسیوں کے صوبہ عرب میں سب سے اہم murorum firmitate firmissimas (= قلعہ بند فوجی چوکی) تھا (Ammianus Marcellinus، ۱۳ : ۸)۔ لیکن اصلی خطِ دفاع کے جنوب کی جانب ہٹا دیے جانے سے آئندہ کے لیے یہ صرف تیسرے قیروانی جیش (Third Cyrenaican Legion) کی ایک مقامی چھاؤنی ہی نہیں رہا (Notitia Dignitatum، Ptolemy، ۱۷۰ : ۷) بلکہ ایک اہم مرکزی شہر بن گیا۔ جس نے کچھ ہی مدت بعد مسیحیت قبول کی اور Nêa Trajané Bostra کے نام سے صوبہ عرب کی حکومت کا صدر مقام بن گیا۔ بوسترا کا سنہ یا سمت (The Era of Bostra) جس کا آغاز ۱۰۵ء سے ہوتا ہے اس کی اہمیت کا ثبوت ہے۔ ان تجارتی راستوں کی بدولت جو ایک طرف اسے فلاڈلفیا اور خلیج فارس سے ملاتے تھے اور دوسری طرف فلسطین سے ہوتے ہوئے بحر متوسط تک اس کی رسائی کا ذریعہ تھے، یہ اس تجارت کا بھی اہم مرکز بن گیا جس کا مدار شمالی جانب دمشق پر تھا، جہاں تک بوسترا سے دو راستے جاتے تھے۔ اس میں بڑی بڑی منڈیاں تھیں، جن کے کھنڈر اب تک پائے جاتے ہیں، اس کا سگہ بھی اپنا تھا اور اس سگے میں جو قیصر فلپ 'العربی' (Philip 'the Arab') نے مضروب کیا، بوسترا کو نو آبادی (Colonia) کے ساتھ دارالسلطنت (Motropolis) کا بھی لقب دیا گیا ہے۔ یہ فلپ خود بھی بوسترا کا باشندہ (Syria : Butler، ج A، ۳، ۱۶، عدد ۳۳، ۳۲) تھا۔ اسی بادشاہ نے زره بکتر پوش

(Vita Isid، فصل ۱۹۹)، جو چھٹی صدی عیسوی میں لکھ رہا ہے، اسے ایک قدیم مستحکم شہر بتاتا ہے، جس کے گرد عرب بادشاہوں نے دسدسے بنا دیے تھے۔ توراہ کی کتاب مکابیس Maccabees اس کو پیریا Perea کے بڑے قلعہ بند خطے کے ماتحت بتاتی اور بصورہ Bossora کے نام سے یاد کرتی ہے۔ نبطیوں (Nabateans) کے دور تک پھیلے ہوئے قبرستان، جو اسے گھیرے ہوئے ہیں، اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ نبطیوں کی مملکت میں شامل رہا ہے۔ اس کے پڑوسی شہر سلخدا (اہل روما کا Salcha) کے دو کتبوں میں پہلی صدی عیسوی کے آٹھویں عشرے کے بادشاہ ملخو (Damascius کے Malchus) کا نام تحریر ہے (Semitic Inscr. : Littmann، در Syria، ج ۳، الف، عدد ۲۳ و ۲۸)۔ نبطی زبان کا استعمال رومن فتح کے بعد بھی جاری رہا (کتاب مذکور، ص ۱۲، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۶)۔ بعض نبطی کتبوں میں ایک یونانی متن بھی شامل ہے۔ Cornelius Palma کے ہاتھوں ۱۰۵ء تا ۱۰۶ء میں قدیم نبطی سلطنت کے الحاق کے بعد جب بصری رومن سلطنت میں شامل ہو گیا (Pauly-Wissowa، بذیل مادہ Bostra، ۲ : ۳۵۹، ۱۱، بیعد) تو تراجن Trajan کی تحریک پر اس کی از سر نو تنظیم کی گئی۔ روما کی تاریخ لکھنے والے اس کی تاریخ بنا کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں۔ رٹر B. Ritter (Erdkunde، ۱۵ : ۹۶۹) کی رائے میں یہ شہر رومیوں کا بنا کردہ ہے۔ Damascius اسے باقاعدہ رومی شہر بنانے کا سہرا Alexander Severus کے سر رکھتا ہے۔ مؤخر الذکر نے اتنا تو ضرور کیا کہ بصری کو Nova Trajana Alexandrina کے نام کے ساتھ ساتھ Colonia Bostra کا نام دیا (۲۲۲ تا ۲۳۵ء)، لیکن Malalas اس کی تاریخ بنیاد اور پیچھے ہٹا کر اغسطس Augustus تک لے جاتا ہے۔



Synarchontes (= حکام) کی مشترکہ جماعت تھی، جس کے ساتھ ایک مجلس شوری (bouleutai) بھی شامل تھی۔ جس زمانے تک عیسائیت کا فروغ وہاں نہ ہوا تھا اس عہد کے سلطنت روما کے سرکاری دیوتاؤں نیز حوران کے اصنام کے ناموں کے کتبے ملتے ہیں، جن میں دیوتاؤں کے اصلی یا یونانی شکل کے نام مذکور ہیں (Cultures du Hauran : D. Sourdel، پیرس ۱۹۵۲ء)۔ اس کے بعد عیسائیت کے دور میں بہت سے کتبوں میں مذکور ہے کہ حضرت مریم اور سرجیوس Sergius یا بعض گم نام مرئی پادریوں کے لیے نئے کنیسے بنائے گئے یا دوبارہ آباد کیے گئے۔ نیز ان دو خانقاہوں کا بھی ذکر ہے جن میں سے کم سے کم ایک، جو سیری گوس Cyricus راہب کے نام پر وقف کی گئی تھی، لڑکیوں کے لیے تھی۔ قبروں کے کتبوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ آبادی کی ساسی اصل قائم رہی، اگرچہ کبھی کبھی جزوی طور پر اس پر اطالیہ، ایشیائے کوچک، کارنتھ، بلکہ پنونیہ Pannonia (ایک قلعہ نشین دستہ فوج کی منتقلی کے باعث) تک کے نئے خون کی آمیزش سے رومن رنگ چڑھ گیا۔ اُسقیہ کبریٰ کے وہاں موجود ہونے کی وجہ سے بصری میں ایک باسلیق (basilica، یعنی مخروطی ایوان دارانقضاء) مدت تک قائم رہا، جس کے معقول آثار اب تک باقی ہیں، نیز یہاں ایک اسقف کا محل بھی تھا لیکن اس کے نشانات اب بہت کم باقی ہیں۔ خانقاہ، جو ممکن ہے سرجیوس راہب (Saint Sergius) کے نام وقف ہو، یہاں سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ اس میں ایک بڑا گرجا بھی تھا، جس کی دیواریں اور محراب (apse) ابھی تک باقی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ بحیرا راہب [رک باب] کی اقامت گاہ تھی، یعنی وہی بحیرا جو عیسائیوں میں پیغمبر اسلام کی آئندہ رسالت کی گواہی دینے

سواروں (Cataphractaries) کی ایک فوج بھی وہاں متعین کر دی۔

مذہب مانی کے مناقشے کے ابتدائی دور میں بوسترا کے اسقف تیطس Titus (تقریباً ۴۶۰ء) نے ایک راسخ العقیدہ موقف اختیار کیا (Part. graeca، ۱۸، ۶۹، ۱۰ تا ۱۲۶ء)، اور ایسی کارگزاری دکھائی کہ اپنے زمانے کے مذہبی مصنفین کی صف اول میں جگہ پائی، جس کا سبب اس کا علم، فلسفیانہ تربیت اور اس کے ساتھ دنیوی سرگرمیاں تھیں۔ اس سے پہلے اوریجینوس Origen کے زیر اثر Beryllus (۲۲۲ تا ۲۳۳ء) بھی اعتقادات قدیمہ کو دوبارہ اختیار کر کے [مانوی] الحاد کے بطلان کا ثبوت دے چکا تھا۔ بوزنطی عہد کا بوسترا (= بصری) ایک سرحدی منڈی کا کام دیتا تھا، جہاں عرب کے کاروان اور چرواہے دونوں ہی ضروریات زندگی خریدنے آتے تھے اور وہاں کی مقیم فوج ان کی نگران رہتی تھی۔

حکومت کا ایک انتظامی مرکز ہونے کی حیثیت سے بصری میں ملکی عمال اور عہدے داروں کی بھی بڑی آبادی تھی۔ یہ انطاکیہ کے بطریق کے ماتحت ایک اسقفی کا مرکز تھا۔ انستاسیوس Anastasius کے ایک فرمان نے (Butler : وہی کتاب، عدد ۵۶۱) وہاں کے محکموں کو رشوت ستانی اور بدعنوانی سے پاک کر کے اور ان کے لیے سالانہ پیداوار (Annuona) نیز غلے کی تجارت اور دوازدہوی کے محاصل وقف کر کے ان میں استقامت پیدا کی۔ رومی بوزنطی کتبات اس شہر کی انتظامی اہمیت کے شاہد ہیں۔ صوبہ عرب کے صوبے دار کا یہاں مقام تھا، جسے علاوہ hégémon (سردار) و dux (سرخیل، یونانی : δούξ) کے القاب کے Scholasticos (معلم) کا لقب بھی ملا ہوا تھا (عدد ۴۸۸)۔ ایک بلدیہ کی حیثیت سے اس کے اپنے میر مجلس (Prohédros) اور چار

کی درستی اور مرمت ہوتی رہی، وہ اس شہر کے استحکام کے کام میں ہمہ تن مصروف رہے تاکہ اسے فاطمیوں کی دست برد سے بچائیں۔ اس کی مزید ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ابو غانم کے قرامطہ [رک باں] نے اسے تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ مسجد عمری کی، جس کی بنا ۱۲۸ھ / ۷۴۵ء سے پہلے پڑی تھی (دیکھیے عثمان بن الحکم کے اسے دوبارہ بحال کرنے کی تاریخ، عربی کتبہ، Littmann، عدد ۳)، ۵۰۸ھ / ۱۱۱۴ء میں از سر نو مرمت کی گئی اور اس کے بعد ایوبیوں کے زمانے میں ایک مصری معمار کے زیر نگرانی ۶۱۸ھ / ۱۲۲۱ء میں اسے دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ ۵۲۶ھ / ۱۱۳۲ء میں مسجد خضر کو گمشدگان نے بحال کیا۔ ”بہت قدیم“ مسجد مبرک کے ساتھ ایک حنفی مدرسہ تھا، جو اس کے پہلو میں ۵۳۰ھ / ۱۱۳۶ء میں بنایا گیا تھا (Sauvaget در Syria، ۲۴ : ۲۳۱)۔

۶۳۰ھ / ۱۲۳۳ء میں ایوبی عمال نے ایک اور حنفی مدرسہ بنا کر اس شہر کی رونق میں اضافہ کیا (Littmann : کتاب مذکور، عدد ۳۸)۔ مدرسہ مسجد موسوم بہ الدبّاغۃ کی تاریخ بنا ۶۵۵ھ / ۱۲۵۷ء ہے۔ مسجد مبرک کے گردا گرد ایک مشہور قبرستان تھا، جو اب بھی باقی ہے اور جو شہر کے جنوبی مقبرہ شہدا کا جوڑ ہے۔ کتبات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں دیگر یادگار عمارتوں کی تعمیر و تجدید ہوئی جو اب مفقود ہو گئی ہیں۔

ان تعمیرات کا زمانہ وہ تھا جب اس شہر کی اہمیت ایوبیوں کے زمانے میں اپنے فوجی کردار کی بنا پر از سر نو بڑھ گئی، جو اسے یا تو صلیبی سورماؤں کے مقابلے میں حاصل ہوا اور یا صلاح الدین کے جانشینوں کے باہمی مناقشات کے دوران میں۔ اس فوجی کردار کا عظیم شاہد بصری کا قلعہ ہے۔

والوں میں تھا (ممکن ہے اس کے نام میں جس کی ابھی تک تشریح نہیں ہو سکی، پخورو Pakhūro کا نام پوشیدہ ہو، جس کی تصدیق سلخد کے ایک نسبتی کتبے سے ہوتی ہے (Nabat : Littmann، ص ۲۴ س ۵) اور اسی طرح الرہا (Edessa) کے Bartholomew کے بیان سے، P.G.، ص ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷)۔ اسلامی رزمیہ روایات میں آگے چل کر اس شہر کی فتح کو وہ پہلا بوزنطی مرکز کہا گیا ہے جسے عربوں نے فتح کیا اور اس واقعے کو دعوتِ اسلام کے سنجانب اللہ ہونے کی علامت قرار دیا گیا (الواقدی : فتوح الشام، قاہرہ ۱۹۵۴ء، ص ۱۶ تا ۱۷)۔

باوجود ان فوائد کے جو حاجیوں کے راستے پر ہونے کی وجہ سے اسے حاصل تھے عربوں کی فتح اور اس کے بعد سلطنتِ امویہ کے قیام کے بعد اس شہر کی اہمیت کم ہو گئی۔ کیونکہ اب وہ صوبائی صدر مقام اور ایک بڑی سرحدی چھاؤنی کے مرتبے سے محروم ہو گیا۔ اس کی کسی قدر عزت و توقیر دو قصوں کی وجہ سے باقی رہی، یعنی ایک تو بحیرا اور دوسرے اس اونٹ کے گھٹنے ٹیکنے کے قصے سے جو قرآن مجید کے ”شامی“ نسخے کو لیے جا رہا تھا۔ (Gesch. des Qurans : Schwally و Nöldeke، ۲ : ۱۱۲)۔ (بمعنی) - معلوم ہوتا ہے اسے وہ ایک مقدس عوامی روایت کا مقام بن گیا، جس کی تصدیق حج کے سفر ناموں (مثلاً الہروی، طبع J. Sourdel و Thomine، ص ۱۷) اور اس کی مسجدوں کے ناموں جیسے العمری (Sauvaget، در Syria، ۲۲ : ۴۱) فاطمہ، خضر، المبرک نیز ان عوامی کہانیوں سے ہوتی ہے جو ان مسجدوں سے متعلق ہیں۔ کثیر التعداد کتبے اس کے شاہد ہیں کہ جس زمانے سے سلاطین سلجوق کو بصری پر اقتدار حاصل ہوا وقتاً فوقتاً ان مسجدوں



ہوئی، کیونکہ اس نے مملوک سلطنت کی شامی حکومت کے لیے حد مشہور شخصیتیں پیدا کیں، جن کا خاندانی لقب البصری تھا، یہ اس پرانی رومن شاہراہ پر جو دمشق سے فلاڈلفیا - عمان کو جاتی تھی ایسا مقام بنا رہا جہاں سے حجاج ہو کر گزرتے تھے۔ اس کے بركة الحجاج کی دیواروں پر ابھی تک حجاج کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں باقی ہیں۔

جب مصر کی تجارت زیادہ تر بحر احمر کے راستے ہونے لگی اور دوسری طرف مقدس شہروں (مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ) میں روز بروز تنگ حالی بڑھنے کی وجہ سے ان کا گزارہ زیادہ تر مصر کی مدد پر موقوف ہو گیا تو بصری کی وہ سابقہ حیثیت جو اسے تجارتی مرکز کی وجہ سے حاصل تھی جاتی رہی۔ عثمانی ترکوں کے حملے اور فتح کے بعد یہ ایک چھوٹا سا صوبائی شہر اور وطن سے دور افتادہ گننام سے عہدے داروں کا مسکن بن گیا، جن کے پاس شہر کے بچاؤ کے ذرائع تک نہ ہوتے تھے۔

اب حوران کا انتظامی صدر مقام دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں مزیرب Mzeyrib اور مرکز Merkez میں منتقل کر دیا گیا۔

گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی میں عنزہ قبیلے کے بدوی اپنے گلے لیے ہوئے حوران کے کنارے تک بڑھ آئے، ان کے غارتگرانہ حملوں کا خطرہ اس پورے علاقے کے باشندوں اور مسافروں دونوں کے سر پر منڈلانے لگا۔ حجاج نے یہ حالت دیکھ کر اپنا راستہ مغرب کی جانب صمنین اور مزیرب سے بنا لیا، جو آج تک درب الحج ہے۔ اسی راستے کے ساتھ ساتھ موجودہ صدی کے شروع میں حجاز ریلوے بنائی گئی تھی۔

آج کل بصری کی زراعتی بستی اپنا گزارہ میدان النقرہ کے نفیس گیہوں کے کھیتوں کا کاشت

ان عمال کے تحت جو دمشق کے اتابکوں کے مقرر کردہ تھے شہر کے جنوب میں قدیم قلعے کے حصار کے باہر خالی میدان میں، جو رومیوں کی پرانی تماشا گاہ (theatre) تھی، اسے ایک دیوار اور بازوؤں پر تین برج بنا کر دفاع کے لیے تیار کیا گیا۔ ۵۳۸۱ھ / ۱۰۸۹ء اور ۵۶۳۹ھ / ۱۲۵۱ء کے درمیان ان بادشاہوں نے جن کی بصری پر یکے بعد دیگرے حکومت رہی اس قلعے کو مزید وسعت دی، جس کی وجہ سے انجام کار یہ مسلم دنیا کی ایک یادگار فوجی عمارت بن گیا۔ ۱۹۵۶ء تک بھی وہ فاطمیوں کے زمانے سے مملوکوں کے زمانے تک کے جنگی استحکامات کی پرہ پر تعمیری ترکیبوں کا اندازہ کرنے کے لیے مکمل ترین مستند دستاویز تھا۔ ۵۶۵۹ھ / ۱۲۶۱ء کے مغولی حملے کے بعد، جس سے قلعے کو بہت نقصان پہنچا تھا، پیرس نے مصر سے ایک وفد بھیجا، جس نے اس یادگار قلعے کو از سر نو درست کیا بلکہ اسے وسیع بھی کیا اور مستحکم کر دیا (La citadelle cyyubite de Bosra : Abel) Eski cham، در Annales archéologiques de Syrie، ۶ (۱۹۵۶ء) : ۹۵ تا ۱۳۸؛ لوح یازدہم)۔ اس ترمیم اور درستی میں تعمیری مسالے کی بہت بڑی مقدار صرف ہوئی اور کوئی شبہ نہیں کہ اس کی وجہ سے قدیم رومن گھڑ دوڑ کے میدان (hippodrome) کا، جو کبھی تماشا گاہ کے جنوب میں واقع تھا، بالکل خاتمہ ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغول کی چند روزہ بورش کی وجہ سے، جس نے دور دور تک تباہی پھیلا دی اور آبادی کو کم کر دیا، یہ شہر دوبارہ قعر گننامی میں گر گیا۔ ”بیرون شہر پناہ“ کے قلعے کی بحالی کا اس سے صرف جزوی تعلق تھا (المقربزی : Hist. des Sultans Mamelukes، ترجمہ Quatremère، ۱ : ۱۳۱)۔ تاہم پندرہویں صدی عیسوی میں اس شہر کو کسی قدر اہمیت نصیب

*Provincia Arabia*، ۱: ۴۸۱ تا ۵۰۷ و ۳: ۳۶۷ تا ۳۶۸ - آثار قدیمہ کی عام تحقیق کی بابت: (۲) *Publications of the Princeton University Archeological Expeditions to Syria in 1904-5 and 1909* (تقسیم ۲، Howard Corosby Butler، *Ancient*)، *Archetecture in Syria*، تقسیم سوم، *Greek and Latin*، *Inscriptions in Syria*، حصہ الف، *Southern Syria*، حصہ م، بصری، تقسیم ۴، Enno Littmann، *Semetic Inscriptions*، فصل الف، *Nabataean Inscriptions*، فصل ج، *Arabic Inscriptions*؛ (۳) Pauly-Wissowa، بذیل مادہ 'Bostra' (Benzinger)؛ (۵) *Dictionnaire d'Histoire et de Géographie ecclésiastique*؛ بذیل مادہ 'Bostra'؛ (۶) J. Sauvaget، *Inscriptions arabes de la Mosquée de Bosra*، در *Syria*، ۲۲: ۵۳ تا ۶۵ (۱۰۲ تا ۱۱۸)؛ (۶) F. Lassus، *Sanctuaires chrétiens de Syrie* (ناشر de l'Inst. Français d'Archéologie de Beyrouth)، پیرس ۱۹۴۷ء؛ *Sur les ères de quelques villes de*؛ (۷) H. Seyrig، *Syrie*، در *Syria*، ۲۷: ۴۲؛ (۸) وہی مصنف؛ *Inscriptions de Bostra*، ۲۲: ۴۴ تا ۴۸؛ (۹) وہی مصنف؛ *Postes romains sur la route de Médine*؛ ۲۲۱ تا ۲۲۳؛ (۱۰) J. Sauvaget، *Quelques monuments musulmans de syrie*، در *Syria*، ۲۴: ۲۳۱ - فہرست مآخذ از Buhl، در *Journal*، انگریزی، بار اول، بذیل مادہ *Bosrā* - علاوہ ان دلچسپ بیانات کے (ان سے مقابلہ کرنا چاہیے) جو پرانے Baedeker اور *Guide Bleu* میں موجود ہیں؛ ایک سہل الوصول دستی رسالہ، سلیمان عبداللہ المقدر نے بنام بصری تیار کر دیا ہے، جو عربی اور فرانسیسی میں دمشق سے (بدون تاریخ) شائع ہو چکا ہے۔

(A. ABEL)

البصیر: ابو علی الفضل بن جعفر بن الفضل

سے کرتی ہے، بشرطیکہ بارش کافی ہو جائے - اس کی خوش قسمتی سے پانی کا بہت اچھا ذخیرہ اسے میسر ہے، جس کی وجہ سے مویشیوں کی اچھی خاصی تعداد کو بحالت حبس (یعنی چشموں اور چراگاہوں پر لے جائے بغیر) رکھا جا سکتا ہے - اس کے اچھی قسم کے تاکستان ابھی تک محفوظ ہیں۔

یہ شہر آثار قدیمہ کے اعتبار سے بہت دل کش ہے - اسیویں صدی عیسوی کے شروع ہی سے اس کے رومی کنہڈر دیکھ کر سیاحوں کے دل پر بہت اثر ہوتا تھا اور وہ اس کے قلعے اور ٹوٹے ہوئے دمدموں کو غور سے دیکھنے کے لیے رک جاتے تھے - پرنسٹن کی تحقیقاتی جمعیت ۱۹۰۳، ۱۹۰۵ و ۱۹۰۹ نے یونانی اور لاطینی (David Magie Jr.، Littmann اور Duane Reed Stuart)، نبطی (Littmann) اور عربی (Littmann) کتبوں کی ایک بڑی تعداد شائع کی - فرانسیسی اداروں Institut Français de Damas اور Institut Français d'Archeologie کے ارکان نے مجلہ *Syria* اور اول الذکر کی مطبوعات میں، اور قریب تر ایام میں *Annales Archeologiques de Syrie* میں جو محنت سے تیار کیے ہوئے مقالات شائع کیے ہیں ان سے اس شہر سے ہماری واقفیت میں خاصا اضافہ ہوا ہے - عمری مسجد میں زیادہ تر Sauvaget کی سعی سے، مرمت کے کام کامیابی سے عمل میں آئے ہیں - شامی محکمہ آثار قدیمہ نے وسیع پیمانے پر کھدائیاں بھی کی ہیں۔

عہد قدیم اور قرون وسطیٰ کے آب رسانی کے طریقوں، یادگار عمارات کی نوعیت اور ان کے مختلف زمانوں کی تعیین اور سب سے بڑھ کر، تعمیر کی مختلف سطحات کا ایک جامع منصوبے کے ماتحت مطالعہ ابھی باقی ہے۔

مآخذ: بصری کی سیاحتوں کی تاریخ اور بصری

سے متعلق قدیم بیانات کی بابت: (۱) Brunnow



دونوں ضائع ہو چکے ہیں۔ اس کی جو نظمیں ہم تک پہنچی ہیں ان میں سے بعض کی تاریخ معین کی جا سکتی ہے، مثلاً ایک نظم جو ۵۲۴۷ / ۸۶۱ء میں اس وقت لکھی گئی تھی جب المتوکل سامرا سے اپنی نئی جاے قیام الجعفریہ میں منتقل ہوا (یاقوت، ۲: ۸۷؛ البصیری کے بجائے البصیر پڑھیے)، ایک طویل نظم کے چند اشعار، جن میں اس نے ۵۲۴۹ / ۸۶۳ء میں المستعین سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنے بیٹے العباس کو اپنا جانشین نامزد کر دے (المسعودی: مروج، ۷: ۳۳۶، ابو(علی) البصیر پڑھیے)، نیز وہ تہنیتی قصیدہ جو ۵۲۵۲ / ۸۶۶ء جنوری ۲۵ کو المعتز کی تخت نشینی کے موقع پر پڑھا گیا (المسعودی: مروج، ۷: ۳۷۸)۔ اس سے ضمناً یہ بھی پتا چلتا ہے کہ المرزبان کی بیان کے برعکس وہ ۵۲۵۱ / ۸۶۵ء کی خانہ جنگی کے دوران میں نہیں مرا۔ ابن حجر نے اس کی موت کا زمانہ المعتد کا دور حکومت (۲۵۶ تا ۵۲۷۹ / ۸۶۹ تا ۸۹۲ء) لکھا ہے۔

مأخذ: (۱) الفہرست، ص ۱۲۳؛ (۲) المرزبانی:

معجم الشعراء، ص ۳۱۴، طبع Krenkow؛ (۳) ابن

حجر، لسان المیزان، ص ۳۳۸؛ (۴) المسعودی:

مروج، ۷: ۳۲۸، بعد، ۳۳۶؛ نیز دیکھیے: (۵) القالی:

الامالی؛ (۶) ابن شجری: حماسۃ (بذیل مادۃ ابو

علی الضریح)؛ (۷) الثعلبی: ثمار القلوب، ص ۱۶۴، ۱۶۵،

۱۲۶۸، ۱۳۸۳، ۱۳۹۶؛ (۸) الأغانی، ۱۰: ۱۰۸ و ۲۰:

۰۳۱

(J. W. Fück)

- بصیری، (تقریباً ۱۳۶۵ تا ۱۵۳۵ء)، ترکی اور فارسی کا شاعر۔ اگرچہ لطیفی اور عالی (نہ اخبار) نے لکھا ہے کہ وہ ایران کے ملک سے روم آیا تھا، تاہم ریاضی کے تذکرہ اور کشف الظنون میں وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ وہ بغداد

بن یونس الأتباری النخعی الکاتب، تیسری صدی ہجری/نویں صدی عیسوی کے نصف آخر کا شاعر اور انشا پرداز۔ وہ ایک فارسی نژاد خاندان میں کوفے میں پیدا ہوا، جو پہلے الأنبار میں رہتا تھا، لیکن بعد کو کوفے میں منتقل ہو گیا اور یمنی قبیلے النخع کے محلے میں آباد ہو گیا۔ نایبنا ہونے کی وجہ سے اس کا لقب البصیر اور الضریح ہو گیا تھا (تسمیہ بالضد دیکھیے A. Fischer، در ZDMG، ۶۱: ۶۱، ۴۳۰)۔ جب ۵۲۲۱ / ۸۳۶ء میں سامرا تعمیر ہوا تو وہ نئے دارالسلطنت میں چلا گیا اور باوجود اپنے مضبوط بلکہ عالی شیعہ رجحانات کے المعتصم اور اس کے جانشینوں کی مدح سرائی کرتا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو الفتح بن خاقان [رک باں] اور اس کے بھتیجے عبید اللہ بن یحییٰ [رک بہ ابن خاقان] کے ساتھ منسلک کر لیا۔ اور اپنے قصائد میں ان کی مدح و ستائش کی (دیکھیے مثلاً ابن شجری: حماسۃ، ۱۱۷: المبرد: الکامل، ص ۶؛ یاقوت: ارشاد، ۶: ۱۲۲؛ ابن رشیق: العمدۃ، ۱: ۷۸)۔ وہ ابوالعیناء [رک باں] سعید بن حمید، ابن ابی طاہر [رک باں] ابوہقان اور دوسرے ارباب علم و ادب سے متعارف تھا؛ یہ سب اپنے اشعار میں ایک دوسرے کا ذکر مزاحیہ اور طنزیہ انداز میں کیا کرتے تھے۔ اسے ادبیت اور انشا پردازی فطرت سے ودیعت ہوئی تھی؛ اس کے بعض پرستار تو اسے مرتبے میں جریر سے بھی بلند تر قرار دیتے ہیں۔ ابونواس اور مسلم بن الولید کی شاعری کے متعلق اس کی رائے اچھی نہیں تھی (دیکھیے المرزبانی: موشح، ص ۲۸۲، بعد)۔ ابوالحسن ابن المنجم نے اپنے والد کی کتاب الباہر کے ضمیمے میں اور ابن حاجب النعمان نے اپنی اشعار الکتاب میں اس کی شاعری کے لیے ایک ایک باب وقف کیا ہے۔ الفہرست، ۱۱۳۳، ۱۱۶۶، ۲۳)۔ اس کا دیوان اور اس کے رسائل کا مجموعہ

روم پہنچنے کے بعد اس نے اپنی ذہانت سے اپنے آپ کو وہاں کے ادبی حلقوں سے اتنی کامیابی کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا کہ تذکرہ نویس اس کا ذکر بڑے اچھے الفاظ میں کرتے ہیں۔ اپنی پاکیزہ اور ظریفانہ شاعری کی وجہ سے وہ اونچے حلقوں میں بے حد مقبول تھا۔ [سلطان] سلیمان قانونی کے عہد حکومت میں وہ دفتر دار اسکندر چلبی کے مصاحبین میں سے تھا اور ایا صوفیا کے اوقاف اور شاہی خزانے سے اس کا وظیفہ مقرر تھا۔ اس کی فارسی اور ترکی دونوں زبانوں کی شاعری سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اسے ان تمام علوم سے گہری واقفیت تھی جو اس وقت کی شاعری کا جزو لاینفک سمجھے جاتے تھے اور جن پر شاعری کی اساس قائم تھی۔ ظرافت، فصاحت اور بالخصوص تجنیس اور ایہام کی صنعتیں اس کی شاعری کی بڑی خصوصیتیں ہیں۔ اگرچہ اس کی شاعری نے مقامی ادب پر خاصا اثر ڈالا تاہم اس کی شاعری میں سولہویں صدی عیسوی کی آناتولی کلاسیکی خصوصیات نظر نہیں آتیں بلکہ حقیقت میں وہ پندرہویں صدی عیسوی کی فارسی شاعری سے زیادہ قریب ہے۔ اس کے لطیف چٹکلوں اور شستہ مذاق سے کسی کی دل آزاری نہیں ہوتی تھی۔ اس کے بعض لطائف تذکروں میں منقول ہیں اور اس نے خود بھی انہیں ایک رسالہ میں جمع کر دیا ہے۔ ترکی دیوان کے علاوہ اس نے ایک ہنگی نامہ بھی لکھا ہے۔ اس نے اپنی عمر کے سترویں سال میں استانبول میں وفات پائی۔

مآخذ: (۱) حکیم محمد شاہ القزوینی کا مجالس النفاث کا [فارسی] ترجمہ؛ (۲) سہی بے، لطینی، حسن چلبی، عاشق چلبی اور ریاضی کے تذکرے؛ (۳) کشف الظنون۔

(ALI NIHAD TARLAN)

البطائحي: رآه به البطحه.

البطائحي: ابو عبدالله محمد بن فاتك، ملقب

رہنے والا تھا۔ ایک جسمانی عارضے (برص) کئی بنا پر، جس میں وہ مبتلا تھا، اسے الاجہ (داغ دار) بصیری کہتے تھے۔ اس کی پرورش ہرات کے علمی اور ادبی ماحول میں ہوئی اور وہ سلطان حسین بایقرا (۱۳۳۸ تا ۱۵۰۷ء)، جامی (۱۴۲۴ تا ۱۴۹۲ء)، اور نوائی (۱۴۳۱ تا ۱۵۰۱ء) کے حلقوں میں اکثر شریک ہوتا رہا۔ چونکہ نوائی کی کتاب مجالس النفاث میں اس کا ذکر موجود نہیں، اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک اس نے اس حلقے میں شہرت حاصل نہیں کی تھی لیکن مجالس النفاث کے فارسی ترجمے کے ضمیمے میں حکیم محمد شاہ قزوینی نے اس کا ذکر [سلطان] سلیم شاہ اول کے شعرا میں کیا ہے۔ بصیری ۱۴۹۲ء سے پہلے کسی وقت ہرات سے روم چلا آیا اور جامی اور نوائی کی کتابیں اور غزلیں اور ان کے سپرد کردہ بعض کام اپنے ساتھ لایا۔ کچھ عرصے تک وہ آق قویونلو کی ملازمت میں رہا۔ جب اغرلو کا بیٹا گودہ آق قویونلو کے تخت پر بیٹھا (۱۴۹۶ء) تو اس نے بصیری کو سلطان بایزید ثانی کے دربار میں سفیر بنا کر بھیج دیا۔ وہ ۱۴۹۶ یا ۱۴۹۷ء میں استانبول پہنچا۔ ۱۴۹۷ء میں اصفہان کے گرد و نواح میں جو لڑائی ہوئی اس میں احمد گودہ مارا گیا اور بصیری نے فیصلہ کیا کہ ایران واپس جانے کے بجائے وہ استانبول ہی میں اقامت اختیار کر لے۔ بعد ازاں ۱۵۰۳ تا ۱۵۰۷ء مؤیدزادہ قاضی عسکر کے ساتھ منسلک رہا، اور اس سے اس کی بڑی بے تکلفی ہو گئی۔ تذکروں کی شہادت یہی ہے کہ نوائی کے دیوان کو بصیری ہی روہ لایا تھا۔

گو بصیری شعر فارسی ہی میں [بالعموم] کہتا تھا لیکن چونکہ اس کی نشوونما حسین بایقرا اور نوائی کی صحبت میں ہوئی تھی اس لیے اسے ترکی زبان اور ترکی ادب پر پورا عبور تھا۔



زائد عرصہ گزرنے کے بعد تک بھی جانے سکونت کے طور پر استعمال ہوتا تھا، لیکن ابن خلدان، جس کے ذریعے یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں (ترجمہ de Slane، ۲ : ۴۲۶)، اس میں اتنا اضافہ کرتا ہے کہ اس کے وقت میں یہ مکان ایک حنفی مدرسہ بن گیا تھا۔

مأخذ : (۱) ابن الأثير، ۱۰ : ۳۱۷، ۳۳۳ تا

۳۳۴؛ (۲) المقريزي : الخطط (مطبوعه بولاق) ۱۰ : ۱۲۵

تا ۱۲۸؛ (۳) ابن القلايسی، ص ۹۰۲، ۱۲، ۲۱۲.

(D. M. DUNLOP)

### \* البَطَّاحِرَة : (بَطْحَرِي) ایک مختصر سا کم حیثیت

قبیلہ، جو صرف تقریباً سو آدمیوں پر مشتمل اور اس نوس اور راس سُوْقِرہ کے درمیان جنوبی عرب کے ساحل پر جزائر کوربہ موربہ کے بالمقابل آباد ہے۔ ان لوگوں کی بیشتر گذر اوقات مچھلیاں پکڑنے اور بکریوں کے ریوڑ پالنے پر ہے، لیکن ان کے پاس کچھ اونٹ، لوبان کے درخت اور تجارتی کشتیاں بھی ہیں۔ عربی کے علاوہ یہ لوگ بَطْحَرِي (بَطْحَرِيَّت) بولتے ہیں، جس میں جنوب کی مندرجہ ذیل ہم جنس ساسی بولیوں کے مقابلے میں "عین" (ع) زیادہ محفوظ رہا ہے : المہرہ کی مہری، الحراسيس کی خرسوسى، الشحرہ اور ان کے آقاؤں القراء کی شحرِي اور سقوطرہ کے لوگوں کی سقوطري (بنیادی طور پر مہری، لیکن بہت مخلوط)۔ مذہباً بطاحرہ شافعی مسلمان ہیں اور سیاسی گروہ بندی کے اعتبار سے غافری۔

ان کی بڑی بڑی جماعتیں (عربی ناموں سے) یہ ہیں : (المحَابِشَة (مَحْبِشِي)، المَشَارِمَة (مَشْرَمِي)، المَطَّارِہ (مَطْطَرِي)، المَجَاعِرَة (مَجْعَرِي) اور المَكَادِشَة (مَكْدَشِي)۔ آخر الذکر جبال ظفار میں القراء کے درمیان رہتے ہیں اور ان کی طرح گائیں پالتے ہیں۔ المَجَاعِرَة کے دس افراد کی ۵۱۳۷۶/۵۱۹۵۷ کے قریب "بخار" سے ہلاکت کے بعد ان کے کل چھ

بہ المأمون، فاطمی وزیر، ایک غیر معروف حسب و نسب کا شخص، جس کا باپ عراق میں مصری کارندہ (جاسوس) رہا تھا۔ البطائحي مشہور و معروف فاطمی وزیر الأفضل کی تربیت و حمایت سے پایہ اقتدار کو پہنچا تھا اور جس کے قتل (۵۱۵/۱۱۲۱ء) میں اس کا ہاتھ تھا اور جس کا وہ الأمر (عہد حکومت ۵۹۵/۱۱۰۱ء تا ۵۲۳/۱۱۳۰ء) کے پہلے وزیر کی حیثیت سے جانشین ہوا۔

قاہرہ میں ایک رصدگاہ کی تعمیر کا جو منصوبہ الأفضل نے بنایا تھا اس کا آغاز البطائحي نے کیا، جس میں فلسفی ابن باجہ کے ایک ہسپانوی دوست ابو جعفر یوسف بن حسدائی نے مصر کے اور غیر ممالک کے دیگر دانشوروں کے ساتھ ۵۱۹/۱۱۲۵ء تک نمایاں حصہ لیا۔ اسی سال البطائحي خلیفہ کی نظر میں مشکوک ہو گیا اور اپنا اقتدار کھو بیٹھا۔ اس کے جرائم کی فہرست میں رصدگاہ کی تعمیر کو بھی شامل کیا گیا اور یہ الزام لگایا گیا کہ اس رصدگاہ کو اس کا اپنے نام پر "المأمونی" موسوم کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ خود خلافت حاصل کرنے کا متمنی تھا۔ جب البطائحي کو گرفتار کر لیا گیا تو خلیفہ نے اس تعمیر کو جاری رکھنے سے انکار کر دیا اور کسی کی یہ جرات نہ تھی کہ وہ اس کا ذکر تک بھی اس کے سامنے کر سکے۔ اس نے اسے منہدم کرنے کا حکم دیا اور اس کا سامان سرکاری گوداموں میں منتقل کر دیا گیا۔ معمار اور ماہرین فرار ہو گئے۔ مؤخر الذکر میں ابو جعفر یوسف بن حسدائی کے علاوہ طرابلس کا قاضی ابن ابی العیش مہندس، اسکندریہ کا ابوالنجاہ بن سید آلات گر (ساعاتی)، اور صقلیہ کا مہندس ابو محمد عبدالکریم شامل تھے۔ خود البطائحي خلیفہ کے حکم سے مصلوب کیا گیا۔ قاہرہ میں اس کا وسیع مکان تیس سال سے

۲۳۱ : ۱۹۳۷ء لندن، Proc. Brit. Acad.، ۲۳، لندن ۱۹۳۷ء : ۲۳۱ تا ۲۳۲؛ (۲) وہی مصنف : Arabia Felix، نیویارک ۱۹۳۷ء، لندن ۱۹۳۲ء و ۱۹۳۶ء، ص ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱؛ (۳) وہی مصنف : Among Some Unknown Tribes of South Arabia، JRAI، شمارہ ۵۹، ۱۹۲۹ء : ص ۹۷ تا ۱۱۱۔  
عام حوالے کے لیے : (۴) Youakim Moubarac : Éléments de Bibliographie Sud-Sémitique، در RÊI، ۱۹۵۵ء (مطبوعہ ۱۹۵۷ء)؛ (۵) Index Islamicus (۱۹۰۶ تا ۱۹۵۵ء)، کیمبرج ۱۹۵۸ء (Dr. Wolf)؛ (۶) Leslau، کیلی فورنیا یونیورسٹی، لاس اینجلس اور Mainz کے جدید تر مطالعات (بالخصوص اہم ہیں)۔

(C.D. MATTHEWS)

\* بطرس البستانی : رك به البستانی .

\* البطر و جی : نورالدین ابواسحق، جسے

قرون وسطیٰ کے یورپی مصنفوں نے Alpetragius لکھا ہے، اندلس کا ایک عرب ہیئت دان اور ابن طفیل (تقریباً ۱۱۲۰ء/۱۱۲۰ء [بتصحیح ۱۲۰۳-۱۲۰۴ء] کا دوست اور شاگرد۔ اس نے اپنے نظریہ ہیئت میں ارسطو طالیس کے فلسفے کی طرف رجوع کیا ہے اور یہ وہ انداز فکر ہے جس کی ابتدا ابن باجہ اور دیگر اندلسی فلاسفہ، مثلاً ابن طفیل اور ہیئت دان جابر بن آفلح کر چکے تھے۔ اس نظریے میں قوت محرکہ (impetus) کے اصول کو دوبارہ داخل کیا گیا ہے جسے سیمپلیشیس Simplicius نے (چھٹی صدی عیسوی) میں ابستدائی شکل دی تھی۔ علاوہ ازیں اس میں "فلک التدویر" اور دوائر خارج از مرکز کے تصور، نیز وہ نقطہ نگاہ ترک کر دیا گیا ہے جس کی رو سے دوائر آسمانی مختلف محوروں پر گھومتے ہیں اور اپنے عمل سے حرکت لولبی (spiral movement) پیدا کرتے ہیں۔ اس کتاب

مرد باقی رہ گئے تھے۔ المعابشہ کی دو شاخیں ہیں : بیت حبیش (ابن حبیش) اور بیت مجدیرہ (ابن مجدیرہ)۔ مؤخر الذکر میں سے ۵۱۳۷۸/۱۹۵۹ء میں سردار قبیلہ حثیث تھا، جو اس تاریخ سے تقریباً سات سال پہلے اپنے والد محمد راعی حمراء کا جانشین ہوا توہا (لقب مقدم، جمع مقدموتین، کے بجائے اب اکثر عربی اصطلاح شیخ استعمال کی جاتی ہے)۔ اہم معاملات میں قبیلے کا سردار الجنبہ اور المہرہ کے بڑے آدمیوں سے مشورہ کر لیتا ہے، اگرچہ وہ ان کا تابع نہیں ہے۔ چونکہ یہاں قرب مکانی کا لحاظ خونی قرابت کے مقابلے میں زیادہ ہے اس لیے البتاحرہ کی سماجی حیثیت ہمسایہ قبیلوں میں کسی سے ازدواجی رشتہ قائم کرنے میں مانع نہیں ہوتی۔

ان کے غیر ہموار ساحلی خطے میں۔ جو اندرونی علاقے کے مقابلے میں، جس کے وہ اپنے دعوے کے مطابق ایک زمانے میں مالک تھے، مختصر سا ہے۔ ان کے قریب ترین ہمسائے یہ ہیں : القراء اور الشحرہ جنوب مغرب میں، الحراسیس اور المہرہ کے مشرقی گروہ اندرونی علاقے میں اور الجنبہ شمال مشرق میں؛ لہذا ان کے علاقے کے جغرافیائی ناموں میں غیر عربی زبانوں اور عوامی عرب بولیوں کی۔ خاص طور پر اس عربی کی جو الجنبہ بولتے ہیں۔ اشکال کے درمیان اگر اختلاف نہیں تو کم از کم تنوع بہت پایا جاتا ہے۔ چونکہ سیاسی اور معاشی ترقیات کے باعث عربی کی توسیع و ترویج کی رفتار تیز ہوتی جا رہی ہے اس لیے یہاں اور جنوب کی دوسری جگہوں میں اس نوعیت کے مقامی نام بالآخر تاریخی غیر عربی زبانوں کے واحد نہیں تو اہم ترین آثار کے طور پر ضرور شمار ہوتے رہیں گے۔

مآخذ : (۱) Four Strange : Bertram Thomas

Tongues from Central South Arabia ... منقول از



میں بلوط کے درخت بکثرت تھے اور ایک بڑی حد تک آج کل بھی ہیں۔ یہ بلوط بہت سی انواع و اقسام کے تھے اور اپنے پھلوں (acorns) کی عمدگی کی وجہ سے ممتاز تھے۔ یہاں کے باشندے ان درختوں کو بڑی احتیاط سے بوتے تھے، کیونکہ قحط کے زمانے میں ان کے پھل غذا کا کام دیتے تھے، چنانچہ الرازی کے قول کے مطابق تمام ہسپانیہ میں یہیں کے بلوط کے پھل سب سے افضل و اعلیٰ تھے۔ ابوحنیفہ عمر البلوطی نے، جو اصلاً بطروشی تھا، افریٹس (Crete) پر حرب الریض (Battle of the Suburb) کے باقی ماندہ لوگوں کے ساتھ قبضہ کر لیا اور ایک حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی، جو وہاں ۵۳۵/۹۶۱ء تک حکومت کرتا رہا۔ Los Pedroches کے ضلع میں بسنے والے بربروں نے ایک اندلسی صوفی ابو علی السراج کی سرکردگی میں اس بغاوت میں شرکت کی جو امیر عبداللہ کے خلاف برپا ہوئی تھی اور جس کا انجام یہ ہوا کہ سمورہ (Zamora) کی دیواروں کے سامنے ان کے سردار کو بری طرح شکست ہوئی اور وہ لڑائی میں مارا گیا (۲۸۸ ۹۰۱ء)۔ المرابطون اور الموحدون کے عہد میں بطروش کی تاریخ کی بابت ہمیں فقط اتنا معلوم ہے کہ ۵۵۰/۱۱۰۵ء میں قرطبہ کے گورنر ابو زید عبدالرحمن بن القبط (Igi) نے موحدون کے لشکر کے ساتھ بطروش اور علاقہ فحص البلوط کے قلعوں پر حملہ کیا (جن پر الفانسو ہفتم نے اس سے ذرا پہلے ایک بلغار کے دوران میں قبضہ کر لیا تھا اور اسی وجہ سے وہ اندوشر (Andujar) پر قبضہ کرنے کے قابل ہو گیا تھا)۔ ابن القبط نے بطروش کے حکمران ”کاونٹ“ کو، جسے الفانسو ہفتم وہاں کا گورنر مقرر کر گیا تھا، بری طرح شکست دی اور قلعے پر حملہ کر کے اسے قید کر لیا اور مراکش بھیج دیا۔

کا نام، جس میں اس نے ان اصول کو بیان کیا ہے، کتاب فی الہیئة ہے۔ میکائیل سکاٹ Michael Scot نے اس کا ترجمہ کیا اور ۱۹۵۲ء میں کارموڈی Carmody نے برکلے سے اس ترجمے کو اصل عربی سے تنقیدی مقابلے کے بعد شائع کیا۔ ۱۲۵۹/۵۶۵ء میں موشے ابن طبون Moshe ibn Tibbon نے اس کتاب کا عربی سے عبرانی میں ترجمہ کیا اور ۱۵۲۷/۵۹۳ء میں قلمنیوس بن داؤد Kalomnimos ben David نے اس کا لاطینی میں ترجمہ کیا، جو ۱۵۳۱ء میں وینس میں طبع ہوا اور اسی سال سکروبوسکو Sacrobosco کی تالیف (Treatise on the sphere) بھی طبع ہوئی۔

مآخذ: (۱) دیکھیے وہ تصانیف جن کا

'al-Bitruji, De Motibus Coelorum : F. J. Carmody  
برکلے Berkeley ۱۹۵۲ء، نے ذکر کیا ہے؛ (۲) Sarton :  
Introduction to the History of Science : ۲ : ۳۹۹  
و بمدد اشاریہ۔

(J. VERNET)

\* بطروش : ہسپانوی میں Pedroche - یہ Pozoblanco کے انتظامی ضلع میں ایک چھوٹا سا مقام ہے اور قرطبہ (Cordoba) سے شمال کی جانب ساٹھ کیلومیٹر کے فاصلے پر اس سڑک پر واقع ہے جو قرطبہ سے طلیطلہ کو جاتی ہے۔ اس کا فاصلہ دارالبقر سے بھی (جو اب El Vacar کہلاتا ہے) ساٹھ کیلومیٹر ہی ہے۔ الادرسی کے بیان کے مطابق یہ ایک خوب گنجان آباد اور مستحکم شہر تھا، جس کی فصیلیں اونچی اونچی تھیں۔ یہ شہر علاقہ فحص البلوط میں واقع تھا، جس کا صدر مقام غافق تھا (جو آج کل Belalcázar کہلاتا ہے)۔ صوبے کا قاضی بھی اسی (بطروش) میں رہتا تھا۔ غافق کے باشندوں کی طرح یہاں کے لوگوں نے بھی عیسائیوں کے حملوں کو رد کر کے شجاعت میں نام پیدا کیا تھا۔ اس کے میدانوں اور پہاڑوں

فتوحات نے عربوں کی حیثیت اور منصب میں تبدیلی پیدا کر دی اور اب رومیوں کی رعایا اور حلیف ہونے کی جگہ انہیں فاتحین کی حیثیت حاصل ہو گئی تو انہوں نے بطریق کا لقب ترک کر دیا، جس کی زمانہ قبل اسلام میں عرب رئیس بڑی خواہش رکھتے تھے؛ کیونکہ وہ ان کے روم سے تعلقات کی علامت تھا، تاہم بطریق کا لفظ ان میں بطور ایک ادبی اصطلاح کے باقی رہ گیا۔ اسلام سے پہلے کے شعراء عرب کے کلام میں بطریق کا استعمال شاذ و نادر ملتا ہے، تاہم اس کی جمع مکسر کی تین شکلیں پائی جاتی ہیں اور یہ لفظ اسلامی عہد کے ادب میں بھی مروج ہو گیا ہے۔ اس لفظ کو المتنبی اور ابوفراس نے عربی اشعار میں داخل کیا اور مؤرخ اور جغرافیہ نویس بھی اسے بکثرت استعمال کرنے لگے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربوں اور بوزنٹیوں کی باہمی جنگوں کے ذکر میں یہ نام باقاعدہ طور پر بوزنٹی سپہ سالار کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ اس کے لیے بعض اور الفاظ بھی ہیں، جیسے سردغوس *στρατηγός*، دستق (domesticus) اور دوقس (dux)، لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ ان میں سے بطریق کے لفظ ہی نے، جو ایک غیر عسکری اصطلاح تھی، سب سے زیادہ رواج پایا۔

(۳) عرب مصنفوں کے ہاں لفظ بطریق کے بکثرت استعمال کے ساتھ التباسات اور غلط فہمیاں بھی موجود تھیں، مثلاً بطریق کے لقب کے متعلق وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ (الف) ایک عہدہ ہے؛ (ب) موروثی ہے؛ (ج) ایرانیوں پر اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے اور (د) بطرک (Patriarch) کے بجائے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بطریق کا لقب اعزازی، غیر موروثی، خصوصیت کے ساتھ بوزنٹی اور کلیسا سے غیر متعلق تھا، تاہم اس فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے جو ادبی

مآخذ: (۱) الإدریسی، ص ۱۲۵، ۲۱۳ (متن) و ص ۲۱۱، ۲۶۳ (ترجمہ)؛ (۲) ابن عبدالمنعم: الروض المعطار، ص ۴۵ (متن) و ص ۵۷ (ترجمہ)؛ (۳) الرازی، ص ۵۱؛ (۴) ابن خلدون: کتاب العبر، ص ۲۱۱؛ (۵) Hist. Mus. Esp.: E. Lévi-Provençal، ص ۳۸۵؛ (۶) البیان المغرب، تیسرا حصہ، مخطوطہ تمغروت Tamgrut؛ (۷) Annales toledanos primeros: A. Huici، ص ۳۳۸۔ (A. HUICI MIRANDA)

\* بطریق: لاطینی لفظ Patricius کی معرب شکل۔ بطریق کا لقب (patriciatus dignitas) قیصر قسطنطین (Constantine) (۳۰۶ تا ۳۳۷ء) نے قائم کیا تھا۔ یہ ایک اعزازی لقب تھا، جس کا کسی منصب یا عہدے سے کوئی تعلق نہ تھا اور اس شخص کو عطا کیا جاتا تھا جس نے حکومت کی نمایاں خدمات انجام دی ہوں۔

(۱) یہ امر متحقق ہے کہ غسانیوں سے پہلے سلطنت روم کے کسی عرب ملازم کو بطریق (patriciate) کا لقب عطا نہیں کیا گیا اور بنو غسان [رک غسان، بنو] میں بھی حارث بن جبلة سے پہلے کسی کو یہ عزت حاصل نہیں ہوئی جسے (تقریباً ۶۵۴ء میں) اس لقب سے سلقب کیا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کے فرزند اور جانشین المنذر کو بھی (تقریباً ۶۵۷ء میں) یہ لقب عطا ہوا۔ غسانی خاندان کے افراد کا اس لقب سے سلقب ہونا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ انہیں روم کے طبقہ امرا میں کیسی قدر و منزلت حاصل تھی۔ عربوں کی قبل از اسلام تاریخ میں الحارث اور المنذر ہی دو ایسے شخص ہیں جن کا بطریق کے لقب سے سرفراز ہونا وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے اور ہمارے مآخذ میں اس کی کوئی قوی دلیل نہیں کہ رومیوں نے المنذر کے بعد کسی اور غسانی کو یہ لقب مرحمت کیا ہو۔

(۲) جب ساتویں صدی عیسوی میں اسلامی



میں عربوں کا سالار، جسے اس ترکی افسانے میں جو اس کے کارناموں سے تعلق رکھتا ہے عباسی دور کا ایک بطل بنا دیا گیا ہے۔ اس طرح البطال ملتہ کے امیر عمرو بن عبید اللہ الاقطع (م ۵۲۴۹ / ۴۸۶۳) کا ہم عصر ہو گیا اور اسے ملتہ کے رزمیہ دور میں شامل کر لیا گیا۔ امیر دانشمند کی فتح ملتہ (۵۴۹۵ / ۴۱۱۰۲) کے بعد ترکوں نے ملتہ کے رزمیہ کو اپنے رزمیہ دور میں شامل کر لیا اور اپنے قومی بہادروں کی ابتدا اسطوری۔ البطال سے قرار دی۔ ترکی افسانے میں ہمیں جو بطل ملتا ہے وہ ترکی رنگ میں رنگا ہوا ہے، اسے حضرت علیؑ کی قرابت داری کا اعزاز دیا گیا ہے اور اس کا اصلی نام جعفر بتایا گیا ہے۔ جن ترکی مؤرخوں نے اس رزمیہ افسانے کو ایک تاریخی مآخذ کے طور پر استعمال کیا انہوں نے اس کے اسطوری عناصر کو اکثر تاریخی حقائق کے طور پر تسلیم کر لیا، بلکہ قصے کی ترتیب زمانی کے تسلیم کرنے میں بھی تامل نہ کیا۔ چنانچہ اولیا چلبی نے بطال کو ہارون الرشید کا ہم عصر بنا کر اس کے عہد حکومت کو ۵۲۴۸ / ۴۸۵۹ [؟، ۴۸۶۲] میں پہنچا دیا، یعنی وہ سال جس میں چلبی کے نزدیک اس نے استانبول کا محاصرہ کیا تھا۔ یہ تاریخی غلطی الطبری کے ترکی ترجمے میں بھی ملتی ہے؛ یہ ترجمہ ایک گم نام مترجم نے کیا ہے اور اس میں کئی بیانات ترکی رزمیہ روایت سے لے کر شامل کر دیے گئے ہیں۔

البطال کا ذکر دو بڑے رزمیہ افسانوں میں آتا ہے۔ عربی قصہ ذات الہمة (دلہمتہ) [رک بہ ذوالہمتہ] میں اور ترکی کے افسانہ سید بطال میں۔ یہ دونوں قصے اگرچہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں تاہم ان پر ایک دوسرے کے اثرات نہیں پڑے۔ ان دونوں کا تعلق غالباً البطال سے متعلق کسی عربی روایت سے ہے، جس کا کوئی تحریری

تصنیفات مثلاً التوخی کی الفرج [بعد الشدة] کے غیر محتاط استعمال اور مؤرخوں اور جغرافیہ نویسوں کی سنجیدہ تصنیفات کے محتاط استعمال میں پایا جاتا ہے۔ ان مؤخر الذکر تصانیف میں اس لقب کی بابت بالخصوص اصطلاح  $\pi\rho\omega\tau\omicron\pi\alpha\tau\rho\iota\chi\iota\omicron\varsigma$  کے تعلق سے ایسی معلومات محفوظ کر دی ہیں جو بوزنطی تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے دلچسپی کا موجب ہیں۔

(۴) بطریق کے لفظ کو عربی لغت نویسوں نے ایک غیر عربی لفظ قرار دیا ہے اور بعض نے اسے ایک فرضی عربی الاصل لفظ کا ہم صوت اور ہم شکل لفظ تصور کیا ہے، جو علاوہ دیگر معانی کے "ایک متکبر اور خود پسند شخص" کا مفہوم ادا کرتا ہے۔

مآخذ: (۱) *Patres, patricii* : B. Kübler، در Pauly-Wissowa، ج ۱۸، حصہ ۴: عمود ۲۲۳۱ تا ۲۲۳۲ : (۲) *Die Ghassanischen* : Th. Nöldeke، *Fürsten aus dem Hause Gafna's Abh. Pr. AK. W.* برلن ۱۸۸۷ء، ص ۱۳ تا ۱۴؛ حاشیہ ۳ پر ص ۱۳ صحیح نہیں؛ (۳) عرب مصنفین کے بطریق کے استعمال کے متعلق دیکھیے *Byzance et les Arabes* : A. A. Vasiliev، برسلز ۱۹۳۵ء، ۱۹۵۰ء، ج ۱، ۲، بمواضع کثیرہ؛ اور (۴) *Les aventures d'un prisonnier arabe et d'un patrice byzantin a l'époque des guerres bulgare-byzantines*, *Dumbarton Oaks Papers* (Harvard یونیورسٹی پریس ۱۹۵۶ء)، ج ۹ تا ۱۰، خصوصاً ص ۶۲ حاشیہ ۱۳، ص ۶۶، ۶۸ حاشیہ ۲۸؛ (۵) *Arabic-English Lexicon* : Lane، نیویارک ۱۹۵۰ء، حصہ اول، ۱: ۲۱۷ تا ۲۱۸۔

(IRFAN KAWAR)

البطال: [ابو محمد عبدا اللہ المعروف بہ] سید بطال غازی، اموی عہد میں بوزنطہ کے خلاف جنگوں

بطل آفشین کی جگہ دے دی گئی ہے، جس کا نام ۵۲۲۰ / ۶۸۴۰ء میں اس کے معنوب اور متول ہونے کے بعد ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ یہ قصہ غالباً ان ”بابک ناموں“ میں سے ہے جن کے وجود کا علم ہمیں ابن الندیم سے ہوتا ہے اور جسے بطل کے رومان میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اسی طرح دلہمہ کے ترکی رومان میں پہلی صلیبی جنگ کے زمانے کی بعض یادیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی تالیف غالباً چھٹی ہجری / بارہویں عیسوی یا ساتویں ہجری / تیرہویں صدی عیسوی کے بالکل شروع میں ہوئی، کیونکہ ”ملک دانشمند کے رومان“ کو، جس میں ملطیہ کے پہلے ترکی فاتح کی جنگوں کی یاد تازہ کی گئی ہے اور جو سب سے پہلے ۵۶۳۳ / ۱۲۴۰ء میں لکھا گیا تھا، بطل ہی کے رومان کا سلسلہ خیال کیا گیا ہے؛ سلجوقی عہد کے کچھ راویوں نے اس میں ایک باب کا اضافہ کیا ہے، جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ کس طرح آناطولیا کے سلجوقیوں نے اس بہادر کی قبر دریافت کی۔ [سلطان] مصطفیٰ ثالث (۱۲۵۷ تا ۱۲۷۴ء) کے عہد کا لکھا ہوا بطل کے رومان کا ایک منظوم نسخہ بھی ملتا ہے، جو بقائی کی طرف منسوب ہے۔ رزیہ دور کو چھوڑ کر بطل کا نام اب تک کئی آناطولی قصوں میں موجود ہے اور خاص طور پر علوی اور یکتشی فرقوں [رکبہ نصیریہ اور یکتشیہ] کی اولیاء سے متعلق کہانیوں میں، جنہوں نے اسے اپنا ایک بطل بنا لیا ہے۔

مآخذ: (۱) Ethé: *Die Fahrten des Sajjid*؛ (۲) M. Canard: *Batthal*، دو جلدیں، لائپزگ ۱۸۷۱ء؛ (۳) *Un Personnage de Roman Arabo-Byzantin*، در *Actes du IIème Congrès National des Sciences Historiques*، الجزائر ۱۹۳۲ء (دیکھیے نیز مذکورہ مقالات)؛ (۴) H. Gregoire: *L'Épopée byzantine*؛ (۵) *Byzantion*، ۱۲: ۱۸۶۔

سراغ ہمارے پاس موجود نہیں لیکن جس کے وجود کا ثبوت چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی کی دو تاریخی شہادتوں سے ملتا ہے (قب) M. Canard، در *JA*، ۲۰۸: ۱۱۶؛ وہی مصنف، در *Byzantion*، ۱۲: ۱۸۶۔

ترکی رومان: آناطولیا کی فتح کے بعد ترکوں نے عرب۔بوزنطی جنگوں سے متعلق مقامی رزیہ روایات کو اپنی روایات بنا لیا۔ ان روایات سے، جن کی صورت ترکی عناصر نیز ترکی رنگ میں رنگے ہوئے ایرانی عناصر کے اضافے کی وجہ سے بدل چکی تھی، ایک نئی آناطولی رزیہ کی تخلیق ہوئی، جس کا موضوع ایشائے کوچک کی فتح تھا۔ بطل کا رومان اس ترکی ادب کا ابتدائی نمونہ تھا، تاہم شروع ہی سے اس میں وہ عناصر داخل ہو گئے جو ترکی عوام میں لوک کہانیوں کی شکل میں رائج تھے، یعنی ایسے واقعات جو ایک خیالی دنیا میں رونما ہوئے، جس میں مردم خور دیو اور مافوق الفطرت مخلوقات آباد ہے، ایسے موضوع جو ایرانی دیو و پری کے قصوں، یا رزیہ افسانوں اور شاہنامہ کی عوامی روایتوں سے لیے گئے تھے، نیز وہ مضامین جو مختلف اور مخلوط تصورات کے تاریخی افسانوں، مثلاً ’قصہ ابو مسلم‘ سے، جو تمام ترکی علاقوں میں مقبول ہے، ماخوذ تھے۔ بطل کا ترکی رومان ایک ایسا مرقع معلوم ہوتا جس میں مختلف زمانوں اور مآخذ کے عناصر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے ہیں۔ ان سب عناصر میں وہ حصہ کتاب جس میں ملحد بابک کی بغاوت اور گرفتاری کا قصہ بیان کیا گیا ہے اپنی تاریخی بنیاد کی وجہ سے، جو افسانے کی عبارت آرائی میں سے صاف طور پر عیاں ہے، باقی حصوں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ اس قصے میں، جو المعتمد کی خلافت کے زمانے (۸۳۲ تا ۸۴۲ء) کا ہے، بطل کو سہم کے اصل



اور ہم یہ نہیں جان سکتے کہ اس میں کوئی قابلِ اعتماد تاریخی عنصر شامل ہے یا نہیں۔ یہ بات تاریخی ہے کہ البطل نے معاویہ بن ہشام کے ہراول دستے کے سالار کی حیثیت سے ۵۱۰۹/۵۲۸ء میں پافلاگونیا Paphlagonia میں جنجرہ (Grangra) کو فتح کیا۔ ۵۱۱۳/۵۳۱-۵۳۲ء میں اس نے اس مہم میں حصہ لیا جس میں اموی دور کا ایک اور نامور غازی عبدالوہاب بن بخت شہید ہوا۔ ۵۱۱۳/۵۳۲-۵۳۳ء یا ۵۱۱۵ء میں اس نے فریجیا Phrygia پر معاویہ بن ہشام کے حملے کے دوران میں قراحصار (Akroinon) کے علاقے میں ایک بوزنطی قائد قسطنطین کوشکست دے کر گرفتار کیا۔ اس کے بعد سے اس کی تاریخِ وفات یعنی ۵۱۴۲/۵۴۰ء تک اس کا کوئی مزید ذکر نہیں ملتا۔ اسی سال کے دوران میں سلیمان بن ہشام کی فوج نے آناطولیا کے کئی حصوں پر حملہ کیا۔ البطل کے دستے پر، جو ملطیہ کے گورنر مالک بن شیب (یا شعیب) کی قیادت میں تھا، شہنشاہ لیو ثالث اور اس کا بیٹا قسطنطین اچانک حملہ آور ہوئے اور قراحصار (Akroinon) کے قریب اسے شکست دی۔ اس معرکے میں دونوں سردار مارے گئے اور ان کے پسماندہ سپاہی جنوب میں سنّادہ Synnada کی طرف بھاگ گئے اور سلیمان سے جا ملے۔ تاہم البطل کا سنّہ وفات ۱۲۱ یا ۱۲۳ بلکہ ۵۱۱۳ بھی بتایا جاتا ہے۔

ہر چند کہ ابتدائی عہد کے مؤرخوں نے البطل کی شخصیت کو زیادہ اہمیت نہیں دی تاہم اس کے فوجی کارناموں کا ذکر قدیم زمانے سے مقبول عام روایت کے ذریعے مختلف بیانات اور حکایات میں آتا رہا۔ المسعودی کے زمانے یعنی چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے نصف اول

Bull. et ses rapports avec l'epopée turque CL. Lettres de l'ARB ۱۷ (۱۹۳۱ء) : ۳۳ تا ۳۸۱؛ (۳) Boratav، مقالہ Battal، در اور، ت، ۱۹۳۳ء بعد (دیکھیے ماخذ)؛ (۵) طاہر الانگو: بیزانس و ترک قہر مانلک ایوسلرینک چیتی سی اوزرینہ، در ترک دلی، ۲، انقرہ ۱۹۵۳ء : ۵۳۱ تا ۵۵۷؛ (۶) الاعلام، ۲۰۱ : ۳۔

(I. MELIKOFF)

[مزید معلومات کے لیے دیکھیے (۲) آگے]

(۲) عبدالله، اموی عہد کا مشہور غازی، جس نے بوزنطیوں کے خلاف بہت سی جنگوں میں حصہ لیا۔ اس کے لقب البطل کے معنی ہیں ”بہادر“، ”قہرمان“ لیکن یہ لفظ تحقیر آمیز معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے (قبّ مثلاً ابن حوقل، ص ۸۵ اور [عربی] لغات)۔ البطل کے متعلق صرف تھوڑا سا تاریخی مواد، کچھ نیم تاریخی روایات، اور مزید برآں ایک عربی قصہ سیرۃ دلہمۃ و البطل اور اسی سے منسلک ایک ترکی رومان سید بطل موجود ہے۔

ابتدائی دور کے مؤرخوں (الیعقوبی اور الطبری) کے نزدیک البطل کا تذکرہ ہشام بن عبدالملک کے عہد (۱۰۵ تا ۵۱۲۵/۵۲۳ تا ۵۴۳ء) میں ۵۱۰۹/۵۲۷-۵۲۸ء سے پہلے نہیں ملتا۔ اسی طرح بوزنطی مؤرخ تھیوفینس Theophanes اور تل مہری کے نقلی ڈائیونسس (Pseudo-Dionysius of Tell Mahre) کے نام سے مشہور سریانی تاریخ کے مصنف نے بھی صرف اس کے سنّہ وفات کا ذکر کیا ہے، جو ۵۳۰ء ہے۔ تاہم الطبری کے فارسی ترجمے میں، جو البلعبی نے ۵۳۵۲/۹۶۳ء میں کیا، ایک پرانی روایت درج ہے، جس میں البطل کو ۵۹۸/۵۱۷ء میں مسلمہ بن عبدالملک کے ساتھ اس کی استانبول کی مشہور مہم میں شریک بتایا گیا ہے۔ ہمیں زیادہ تر واسطہ ایک اسطوری بیان سے ہے

ابن شاکر الکتبی، ابن فضل اللہ العمری اور ابن کثیر وغیرہ بھی شامل ہیں، کم و بیش مکمل نقل کیا ہے۔ اس روایت میں مسلمہ کے معرکے میں البطل کے کردار کے متعلق ایک مختصر سے اشارے کے بعد کئی رومانی حکایات درج ہیں، جن میں سے بعض البطل کے رومان میں بھی موجود ہیں۔ وہ حکایات یہ ہیں: (۱) البطل بحیثیت ایک بہوت کے ایک رات کسی یونانی گاؤں میں وارد ہوتا ہے، ایک ماں کی آواز سنتا ہے جو اپنے روتے ہوئے بچے کو یہ کہہ کر ڈرا رہی ہے کہ اگر وہ رونے سے باز نہ آیا تو وہ اسے البطل کے حوالے کر دے گی؛ (۲) اس کا ایک یونانی خانقاہ میں داخل ہونا: البطل کو، جو پیٹ کے شدید درد سے کمزور ہو گیا ہے، اس کا گھوڑا ایک خانقاہ کی طرف لے جاتا ہے، جہاں اسے پناہ مل جاتی ہے۔ وہ رئیس خانقاہ کی بدولت ایک بوزنطی بطریق کی تفتیش و تجسس سے بچ جاتا ہے، اس کی روانگی پر اس کا پیچھا کرتا ہے، اسے قتل کرتا ہے اور خانقاہ واپس جا کر سب راہبہ عورتوں کو قید کر لیتا ہے اور رئیس خانقاہ سے شادی کر لیتا ہے؛ (۳) ایک حیلے سے اس کا عموریہ میں داخل ہونا: اپنے ساتھیوں سے علیحدہ ہو جانے پر وہ عموریہ پہنچتا ہے، جہاں وہ شہنشاہ کا قاصد ہونے کے بہانے سے بطریق تک رسائی حاصل کرتا ہے اور اسے مسلمانوں کی فوج کا مقام و پتا بتانے پر مجبور کرتا ہے اور پھر واپس آ کر فوج سے مل جاتا ہے؛ (۴) میدان جنگ میں اس کی موت، جہاں شہنشاہ لیو Leo آخری لمحات میں اس کے پاس آتا ہے، اس کی دیکھ بھال کرتا ہے اور مسلمان اسیروں کو اس کی تدفین کی اجازت دیتا ہے۔

جن مصنفوں نے یہ حکایات نقل کی ہیں وہ انہیں سیرۃ دلہمۃ و البطل کی ان جھوٹی باتوں سے مختلف بتاتے ہیں جن کے وجود کا علم ہمیں یہودی

میں البطل کا شمار ان نامور مسلمانوں میں ہوتا تھا جن کی تصویر بوزنطی اپنے معبدوں میں ملطیہ (Melitene) کے مشہور امیر عمرو بن عبید اللہ الاقطع (جس نے ۵۲۳۹ / ۸۶۳ء میں شکست کھائی اور مارا گیا) کی شبیہ کے ساتھ آویزاں رکھتے تھے۔ (مروج، ۸: ۷۴)۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ ان دونوں کی داستان نے اس تاریخ کے فوراً بعد پہلی بوزنطی فتح کے نتیجے کے طور پر نشو و نما پائی ہو۔ معرکہ مسلمہ کے متعلق البلعمی کے بیان میں مذکور ہے کہ البطل کو استانبول کے ایک دروازے پر متعین کیا گیا کہ وہ اس وقت جب مسلمہ اکیلا گھوڑے پر سوار شہر میں داخل ہو دروازے کو کھولا رکھے اور اگر مسلمہ پر کوئی مصیبت آئے تو البطل فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہو جائے۔ کتاب العیون (پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی یا چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی) میں بوزنطی دارالسلطنت کے محاصرے کے بیان میں البطل کا ذکر مسلمہ کے ہمراہی کی حیثیت سے بھی آیا ہے۔ یہاں سال ۱۱۵ھ کے ضمن میں البطل کی ایک بگہ و تنہا نبرد آزمائی کا رومانی قصہ بھی درج ہے۔ عظیم القدر اندلسی صوفی ابن العربی (م ۵۶۳۸م / ۱۲۳۰ء) نے مسلمہ کے معرکے کے مشہور بیان میں، جو البلعمی کے بیان سے مناسبت رکھتا ہے، البطل کی طرف ایک اہم منصب منسوب کیا ہے، جس میں اسے الجزیرہ اور شام کی افواج کا سالار اور مسلمہ کے ہراول دستوں کا رئیس بتایا گیا ہے اور استانبول کے سامنے اسے اسی کام پر مامور دکھایا گیا ہے جو البلعمی کے بیان میں مذکور ہے۔ ایک طویل سوانحی بیان میں، جس کا سلسلہ ابن عساکر (م ۵۷۱م / ۱۱۷۵-۱۱۷۶ء) تک پہنچتا ہے، ایک شامی روایت ملتی ہے، جسے مختلف مؤرخوں نے، جن میں ابن الاثیر، سبط ابن الجوزی،



ص ۶۳ تا ۶۶؛ (۱۱) الذہبی: تاریخ الاسلام (قاہرہ ۱۳۶۷ھ)؛ ۳: ۲۲۷ و ۵: ۲۶؛ (۱۲) وہی مصنف: کتاب العبر (مخطوطہ پیرس، عدد ۱۵۸۳)، ورق ۳۶ الف؛ (۱۳) وہی مصنف: کتاب دُول الاسلام، حیدرآباد ۱۳۳۷ھ، ۱: ۵۹؛ (۱۴) ابن کثیر: البداية و النہایة، ۹: ۳۳۱ تا ۳۳۳؛ (۱۵) ابن تغری بردی: النجوم (مطبوعہ قاہرہ)، ۱: ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۸؛ (۱۶) السیوطی: تاریخ الخلفاء، قاہرہ ۱۳۰۵ھ، ص ۹۶؛ (۱۷) القرمانی: اخبار الدُول، ابن الاثیر کے حاشیے پر، بولاق ۱۲۹۰ھ، ۳: ۲۱۳ تا ۲۱۸؛ (۱۸) Denys، متوطن تل مسرہ، سے منسوب کتاب، مترجمہ Chabot، بذیل ۱۰۳۶ / ۴۳۳ - ۲۳۵، ۲۵؛ (۱۹) A. M. Theophanes، ۶۲۳، طبع De Boor، ص ۱۱۱؛ (۲۰) Ramsay، Hist. Geogr. of Asia Minor، ص ۸۷، ۳۲۲؛ (۲۱) Le Strange، ص ۱۵۲؛ (۲۲) Chalifen: Weil، ۱: ۶۳۸ تا ۳۶۹؛ (۲۳) Constantin: A. Lombard، ۳۲؛ (۲۴) The Arabs in Asia Minor: E. W. Brooks، Journ. of Hell. Stud.، ۹۳ (۱۸۹۸)، ۱: ۱۹۳؛ بعد، ۱۹۸؛ بعد، (۲۵) M. Canard، Les expéd. des Arabes contre Constantinople، در JA، ۲۰۸: ۸۶، بعد، ۱۰۰، بعد، ۱۶۶؛ بعد، (۲۶) Il Califfato di Hisham: F. Gabrieli، ۱۹۳۵، ص ۸۷ تا ۹۱۔

(M. CANARD)

- بطلمیوس: عربی رسم الخط میں یونانی۔
- لاطینی نام Ptolemaeus کی تقریباً بلا استثناء مستعمل شکل۔ المسعودی (تنبیہ) یہ نام ہمیشہ ابطل میوس سے لکھتا ہے جسے ابطلمیوس پڑھا جا سکتا ہے، جو بعد امکان صحیح ترین عربی شکل ہے۔ ایک جگہ، ص ۱۲۹، وہ یہ تشریح کرتا ہے کہ "بطلاماوس بلغاتیہم"۔ اس کے اسم نسبت القلوذی کے بارے میں المسعودی یہ کہتا ہے کہ بعض لوگ اسے یقین کے ساتھ "چھٹے" روسی شہنشاہ

نو مسلم سمائل بن یحییٰ المغربی کے زمانے میں بھی ہوتا ہے، جس نے اپنی کتاب ۵۶۷ / ۱۱۶۹ - ۱۱۷۰ء میں لکھی تھی۔

شروع زمانے کے مؤرخوں نے البطل کے حسب و نسب کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ متأخر مؤرخوں کی رائے میں وہ انطاکیہ (یا دمشق) کا باشندہ تھا۔ اس نے انطاکیہ ہی میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اپنے ساتھی عبدالوہاب بن بخت کی طرح کہ وہ بوی سیرۃ دلیمہ و البطل کا ایک بہت بڑا کردار ہے، بنو امیہ کا مولیٰ تھا۔ اس کی کنیت کبھی ابو محمد، کبھی ابو یحییٰ اور کبھی ابوالحسین بتائی جاتی ہے۔ اس کے والد کا نام حسین یا عمرو تھا۔ اس کے نسب کے لیے، جیسا کہ سیرۃ دلیمہ یا ترکی روایت سید بطل میں درج ہے، دیکھیے ان دونوں رومانوں پر لکھے ہوئے مقالات۔

مآخذ: (۱) الیعقوبی، ۲: ۳۹۵؛ (۲) الطبری، ۲: ۱۵۵۹، ۱۵۶۱، ۱۷۱۶؛ (۳) الطبری (فارسی ترجمہ از البلقمی) انگریزی ترجمہ از Zotenberg، ۳: ۲۳۹؛ بعد؛ (۴) کتاب العیون، در Fragn. Hist. Arab.، طبع ڈخویہ، ۱: ۲۸؛ بعد، ۹۰، ۹۱، ۱۰۰؛ (۵) سمائل بن یحییٰ المغربی: انعام الیہود، در M. Schreiner، Monatsschrift für Gesch. u. Wiss. d. Jud.، ۶ (۱۸۹۸): ۳۱۸؛ (۶) ابن الاثیر، (طبع ٹورن برگ Tornberg)، ۵: ۱۲۹، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۸۶ تا ۱۸۷؛ (۷) یسط ابن الجوزی: مرآة الزمان (مخطوطہ پیرس، عدد ۶۱۳۲) ورق ۱۲۶ الف و ۱۵۶ الف، ۱۶۰ الف؛ بعد؛ (۸) ابن شاکر الکتبی: عیون التواریخ (مخطوطہ پیرس، عدد ۱۵۸۷)، ورق ۱۵۲ ب تا ۱۵۳ الف، ۱۷۷ ب تا ۱۷۹ الف؛ (۹) ابن العربی: معاصرۃ الأبرار و مسامرة الأخبار (قاہرہ ۱۹۰۶)، ۲: ۲۲۳ تا ۲۳۳؛ (۱۰) ابن فضل اللہ العمری: تسلیک الأبصار، طبع F. Taeschner (Bericht über Anatolien)، ۱۹۲۹، ۱۷۱۹۲۹

(۵) موسیقی (Harmonics) : Ingemar Düring :  
 Die Harmonielehre des Klaudios-Ptolemaios : ۱۹۳۰ء :  
 Gesch. d. griech. Lit. : Christ-Schmid-Stählin  
 ششم، ۲/۲، ۱۹۲۴ء : ص ۹۰۲  
 (۶) مناظر (Optics) : Christ : وغیرہ، وہی  
 کتاب .

ذیل میں ہیئت، نجوم، جغرافیہ، موسیقی اور مناظر  
 کے متعلق بطلمیوس کی ان تصانیف کی ایک فہرست  
 درج کی جاتی ہے جن کا نقش اسلامی علوم پر باقی  
 ہے۔ ہر ایک عنوان کے تحت سب سے پہلے یونانی  
 تصنیف کا نام لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ نام آتے  
 ہیں جو صرف عربی میں یا عربی سے ترجموں میں  
 معروف ہیں۔ مآخذ حسب ذیل ہیں : الفہرست  
 (ف)، ابن صاعد الاندلسی (ص)، القفطی (ق) اور ابن  
 ابی اصیبعہ (أ) : علاوہ ازیں براکلمان اور مخطوطات  
 کی فہرستیں - مغربی [زبانوں میں] تراجم کے لیے  
 Die europ. Übersetzungen a. d. : M. Steinschneider  
 Arab. اور Sarton اور Thorndike کی مذکورہ بالا  
 تصانیف کے علاوہ ہم مندرجہ ذیل سے استفادہ  
 کرتے ہیں :-

(۱) Las traducciones : J. M. Millás Vallicrosa  
 orientales en los manuscritos de la Biblioteca Catedral  
 de Toledo : F. J. Carmody (۲) : ۱۹۳۲ء :  
 Arabic astro-nomical and Astrological Sciences in Latin Trans-  
 lation : ۱۹۵۶ء (جزوی طور پر قابل اعتماد ہے) :  
 Notes upon some mediéval Latin : L. Thorndike (۳)  
 astronomical, astrological and mathematical manu-  
 scripts at the Vatican : Isis، شماره ۳۷، ۱۹۵۶ء : ص  
 ۳۹۱ تا ۴۰۴ : (۴) وہی مصنف : Notes on some... :  
 manuscripts of the Bibliothèque nationale, Paris :  
 Journal of the Warburg and Courtauld Institutes  
 ج ۲۰، ۱۹۵۷ء : ص ۱۱۲ تا ۱۷۲ : (صرف متعلقہ

Claudius کا بیٹا سمجھتے ہیں ( باختلاف قراءت :  
 دوسرے، یعنی Tiberius کا ) جو درحقیقت تیسرا  
 تھا۔ وہ خود اس کے زمانے کا صحیح تعین کرتا  
 ہے اور اسی طرح ابن صاعد الاندلسی طبقات الاسم،  
 ص ۲۹ ( طبع شیخو Cheikho ) بھی - نیز اس سے  
 پہلے ہی الفہرست، ص ۲۶۷ ( طبع Flügel )،  
 المسعودی، محلّ مذکور، و دیگر مصنفین اس  
 ہیئت دان کے مصر کے یونانی بادشاہوں میں سے ایک  
 کا مرادف ہونے کی بھی تردید کرتے ہیں۔ چونکہ  
 کوئی یونانی سائنس دان یکساں طور پر قرون وسطی  
 کے مغربی اور مشرقی علم ہیئت، جغرافیہ اور یہاں  
 تک کہ علم عالم (Weltenschaung) پر اس قدر  
 حاوی نہیں تھا جتنا کہ بطلمیوس (Ptolemy) اس لیے  
 ہم نے چند ایسی کتابوں کی فہرست پیش کرنے پر  
 اکتفا کیا ہے جن سے ایک بڑے پیمانے پر اس کے  
 اثر کا اظہار ہوتا ہے :-

(۱) عمومی : سارٹن : IHS [= مقدمہ تاریخ سائنس]،  
 ج ۱ تا ۳، بمدد اشاریہ : وہی مصنف : The Appreciation  
 of ancient and medieval science during the Renaissance  
 ۱۹۵۵ء، باب ۳، ص ۵ : وہی مصنف : Ancient  
 science and modern civilization، ۱۹۵۴ء، باب ۲ :  
 History of Magic, etc. : L. Thorndike، ج ۱، ۱۹۲۳ء،  
 ص ۱۰۴ بعد : دوسری جلدوں کے لیے دیکھیے اشاریہ۔  
 (۲) علم ہیئت : C. A. Nalino : علم الفلك،  
 ۱۹۱۱ء، اطالوی ترجمہ در Raccolta di Scritti، ج  
 ۱۵ : O. Neugebauer : The transmission of  
 planetary theories in ancient and medieval astronomy  
 Emanuel Stern Lecture، نیو یارک ۱۹۵۶ء۔  
 (۳) علم نجوم : F. Boll : Kleine Schriften zur  
 Sternkunde des Altertums، ۱۹۵۰ء۔  
 (۴) جغرافیہ : E. Honigmann : Die 7 Klimata



ایک شرح، جو اب تک غیر معروف تھی (برا کلمان، ۳۸۷: ۱) G. Vajda نے دریافت کی ہے (کتاب خانہ ملید، پیرس، عربی ۱۳۸۲، ۹، قہ RSO ۲۵۰: ۸)۔ ایک اور شرح مصنفہ جابر بن حیان کا محض نام ہی معلوم ہے؛ قہ Jābir-ibn Ḥayyān: Kraus، ج ۱، ۱۹۳۳، ۶، شماره ۲۸۳۳ - Ch. H. Haskins اور D. P. Lockwood کا بیان ہے کہ ۱۱۷۵ء میں قرونہ کے جیرارڈ Gerard نے جو ترجمہ عربی سے کیا تھا اس سے بارہ سال پہلے ایک ترجمہ براہ راست یونانی سے کیا جا چکا تھا اور اسی کو پہلا لاطینی ترجمہ سمجھنا چاہیے (The Sicilian Translators of the 12th Century and the first Latin version of Ptolemy's Almagest، در Harvard Studies Classical Philology، ج ۲۱، ۱۹۱۰ء: ص ۷۵ تا ۱۰۲؛ نیز قہ J. L. Heiberg، در Hermes، ج ۳۵، ۱۹۱۰ء: ص ۵۷ تا ۶۶، ج ۳۶: ص ۲۰۷ تا ۲۱۶)۔ نیز دیکھیے Carmody، ص ۱۵ اور Millas، فصل ۳۵۔

(ب) πρόχειροι χανόνες (Tabulae manuales) قہ Steinschneider، در ZDMG، ۱: ۲۱۷ و ۳۳۱؛ الیعقوبی، ۱: ۱۵۹ = Klamroth، ص ۲۵۔ اس تصنیف کو، جس کا اس نے تجزیہ کیا ہے، کتاب القانون فی علم النجوم و حسابها و قسمة اجزائها و تعدیلها کے نام سے موسوم کرتا ہے، لیکن جیسا کہ Honigmann، ص ۱۱۸ بعد نے ثابت کیا ہے یہ کتاب بطلمیوس کی نہیں ہے۔ اس آخر الذکر کو پہلے ہی یونانی عہد میں Theo Alexandrinus کی لکھی ہوئی شرح سے ملتبس کیا جا چکا ہے۔ یہ حقیقت بعض عرب دانشوروں کو معلوم تھی جیسا کہ Honigmann، ص ۱۲۰ نے ثابت کیا ہے۔ بطلمیوس پر Theo کی شرحوں نے الکندی کو متاثر کیا جیسا کہ F. Rosenthal نے اپنے مخطوطہ ایاصوفیا عدد ۳۸۳ کے تجزیے میں ثابت کیا ہے (Studi... G.)، Levi della Vida، ۱۹۵۶ء: ۲، ۳۳۶ بعد)۔

مضمون کے زائد نسخے (Offprints) برائے فروخت)۔  
(۲) علم ہیئت: (۱) The Almagest، چونکہ نالینو Nallino نے نئے دلائل سے کوپ Koppe کے خیال کی تائید کی ہے کہ یہ لفظ μεγάλη σύνταξις سے بذریعہ نعت اخذ کیا گیا ہے (Raccolta، ۵: ۲۶۲) اس لیے سابقہ رائے جس کے مطابق اسے μεγίστη سے مأخوذ قرار دیا گیا تھا (Suter، ۱، باراول بذیل مادہ Almagest)، بالعموم ترک کر دی گئی ہے۔ اس کی عربی شکل المَجِسطی ہے (جسے حاجی خلیفہ، ۵: ۳۸۵ نے خوب واضح طور پر بیان کیا ہے۔ ابن العبری (Barhebraeus) نے اس نام کی صحیح یونانی شکل سُونَطَاکِسیس بھی دی ہے (طبع Sallhani، ص ۱۲۳)۔ کتب ۱ تا ۴ کے مضامین کے مفصل بیان الیعقوبی میں ہے، ۱: ۱۵۱ تا ۱۵۴؛ قہ Klamroth، در ZDMG، ۳۲: ۱۷ تا ۱۸۔ تسہیل المَجِسطی از ثابت بن قرة، قہ برا کلمان، ۱: ۳۸۳، ۱: ۷ الف۔ پہلا مترجم سہل الطبری نہیں (اور یہ شخص سہل بن بشر کا مرادف نہیں جیسا کہ Arab. Lit.: Steinschneider، ص ۲۴ کا خیال ہے) جیسا کہ سارٹن Sarton، IHS، ۵۶۲: ۱ کا بیان ہے۔ اس تمام مسئلے سے نالینو Nallino، محل مذکور، نے از سر نو بحث کی ہے جو اس بارے میں الفہرست میں مندرج بیان کی ایک نئی تاویل بھی پیش کرتا ہے (Raccolta، ۵: ۲۶۳)، اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ پہلا مترجم نامعلوم ہے۔ مخطوطہ اسکوریال، عدد ۹۱۵ سے O. J. Tailgren نے استفادہ کیا ہے: Un point d'astronomie gréco-arabe-romane، Neuphilologische Mitteilungen، ج ۲۹، ۱۹۲۸ء: ص ۳۹ تا ۴۴؛ نیز قہ وہی مصنف: Survivance arabo-romane du Catalogue d'étoiles de Ptolemée Stud. Or. Soc. Or. Fenn.، ۲ (۱۹۲۸ء): ۲۰۲ تا ۲۸۳۔ ابو جعفر الخازن کی لکھی ہوئی

حاجی خلیفہ، ۳ : [م. ۷]، شماره ۶۳۷۱ کہتا ہے : "تاریخ فیلبس الرومی البناء (= فیلب رومی البناء کی تاریخ) لیکن یہ اضافہ کرتا ہے "ذوالقرنین" کا ساتھی"۔ بطلمیوس کے مقابلے میں البیرونی ہخامنشی بادشاہوں میں سے دو کا عہد حکومت دو سال زیادہ بتاتا ہے۔ اس کے باوجود بخت نصر سے لے کر اسکندر کی وفات تک بطلمیوس کی طرح البیرونی کے مخطوطات بھی مجموعی طور پر ۳۲۳ سال شمار کرتے ہیں، بحالیکہ Sachau نے اس عدد کی جگہ حساب کے مطابق ۳۲۸ لکھا ہے (آخری ۸۹)۔ نیز قب ابن القنطی، ص ۹۶ (طبع Lippert)، الطبری ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۹ء، ۱ : ۳۱۲ بعد: ابن صاعد، ص ۳، (طبع شیخو Cheikho)۔

ان جدولوں (tables) میں سے ایک جدول بنام  $\kappa\alpha\nu\omega\nu\ \beta\alpha\sigma\iota\lambda\epsilon\iota\omega\nu$  کی جانب خاص توجہ ضروری ہے، جسے C. Wachsmuth نے اپنی کتاب *Einleitung in des Studium der alten Geschichte*، ۱۸۹۵ء، ص ۳۰۴ تا ۳۰۶ میں طبع کیا اور جو عربی ہندسوں میں اور ہر ایک بادشاہ کے عہد کے عیسوی سنوں کے ساتھ F. K. Ginzel کی کتاب *Handbuch der mathematischen u. technischen Chronologie*، ج ۱، ص ۱۹۰-۶ میں دوبارہ طبع ہوئی۔ اس کے متن کا الیعقوبی، ۱ : ۱۶۱ نے یونانی اور رومی بادشاہوں کے ضمن میں حوالہ دیا ہے۔ اسکندر اعظم اس جدول میں دارا سوم کے بعد آتا ہے، اس کے بعد "اسکندر اعظم = البناء کا ساتھی" فیلبس [= فیلب] Philippus (Arrhidaeus = آرہیدایوس)، پھر "اسکندر ثانی" یعنی اسکندر اعظم کا بیٹا جو اس کی وفات کے بعد پیدا ہوا)۔ مؤخر الذکر کے عہد (۳۱۷ تا ۳۰۵ ق م) کے دوران میں سلوقی (Seleucid) دور کا آغاز ہو جاتا ہے، جسے اس وجہ سے عہد اسکندری (Aera Alexandri) بھی کہا جاتا ہے۔ اس ترتیب کو البیرونی : آثار، ص ۸۸ بعد نے اختیار کر لیا ہے، جیسا کہ اس نے بالصراحت بیان کیا ہے (سطر ۵)۔ ص ۸۹ پر وہ اسکندر اعظم کو صحیح طور پر البناء (یونانی  $\kappa\alpha\tau\iota\sigma\tau\eta\varsigma$ ) کے لقب سے ملقب کرتا ہے اور ص ۹۲ پر وہ اسکندر کے بیٹے کو الثانی کہتا ہے۔ تاہم ایک روایت اس مؤخر الذکر کو ذوالقرنین کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ بظاہر اس لیے کہ اس کا پیشرو بھی Philippus کہلاتا تھا۔ کئی مصنف بجا طور پر اس بارہ سال کے فرق کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو اسکندر اعظم کی وفات اور اس عہد کے آغاز کے درمیان ہے جو مبینہ طور پر اس کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

(ج)  $\Upsilon\pi\omicron\theta\epsilon\sigma\epsilon\iota\varsigma\ \tau\omega\nu\ \pi\lambda\alpha\nu\omega\mu\acute{\epsilon}\nu\omega\nu$  شاید وہ کتاب جو الفہرست، ص ۲۶۸ میں کتاب فی سیر (نہ کہ سیر!) السبعة کے نام سے موسوم ہے، قب *Ar. Ub. : Steinschneider*، ص ۲۱۱، جس کا یہ بیان صحیح ہے کہ دراصل اس کتاب کا عربی نام اقتصاص احوال الکواکب ہے، بحوالہ ابن القنطی، ص ۹۸، قب براکلمان، ۱ : ۳۸۴، ۷ ب۔ عربی متن (مخطوطہ لائڈن Leiden) کا شماره ۱۰۳۵ ہے، ۱۰۳۴ نہیں، جس میں *Almagest* شامل ہے) ثابت بن قرہ کی "اصلاح" ہے، جو کتاب دوم سے متعلق ہے اور فقط یہی محفوظ ہے۔ دونوں کتابوں کا L. Nix نے جرمن میں ترجمہ کیا ہے اور انہیں مع *Opera : Claudii Ptolemaei astronomica minora*، طبع J. L. Heiberg، ۱۹۰۷ء (Bibl. Teubn.) کی جلد اول کے متن کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔

(د)  $\Phi\acute{\alpha}\sigma\epsilon\iota\varsigma\ \acute{\alpha}\pi\lambda\alpha\nu\omega\nu\ \alpha\sigma\tau\acute{\epsilon}\rho\omega\nu$  عربی کتاب الانواع (ص ۲۹)، اس نام کے مفہوم کے بارے میں قب نالینو Nallino : علم الفلك،



(۳) علم نجوم: (1) 'Αποτελεσματική σύνταξις (2) یا τετραβιβλος، طبع و انگریزی ترجمہ، از F. E. Roberts، ۱۹۳۰ء (Locb. Class. Libr.) مع (Manetho)؛ طبع جدید از F. Boll و Ae Boer، بار دوم ۱۹۵۷ء؛ الفہرست، ص ۶۸۔ کتاب الأربعة، فصل ۲۱: کتاب المقالات الاربع (ابن العبری، ص ۱۲۳: الأربعة مقالات) فی احکام النجوم: لاطینی تراجم: Carmody، ص ۱۸: Millás، باب ۳۷: شرح از علی بن رضوان، باب ۳۹۔ اس میں سے جو اقتباسات جابر کی کتاب البحث میں درج ہیں انہیں Kraus نے یکجا کیا، شماره ۲۸۳۴ (ص ۱۶۸، حاشیہ ۱)۔ ثابت کی compendium کے لیے قَب Sieben Klimata: Honigmann، ص ۱۱۶۔

(ب) Καρπός (fructus یا centiloquium)، مستند نہیں۔ الفہرست، ص ۲۶۸: کتاب الثمرة؛ احمد بن یوسف المصری المہندس (احمد بن طولون کے سیرت نگار) کی لکھی ہوئی شرح کا بھی ذکر کیا گیا ہے، قَب براکلمان، ۱: ۲۲۹: یونانی متن کی ایک جدید طبع از Ae. Boer، ۱۹۵۲ء؛ لاطینی ترجمے در Carmody، ص ۱۶ و Millás، باب ۳۷ تا ۳۸۔ اور ب کے لیے دیکھیے نیز Thorndike: Journal of the Warb وغیرہ اور Isis، محلّ مذکور۔ دس مقولے جعلی المعربی کی غایۃ الحکیم (Picatrix)، طبع Ritter، ۱۹۳۳ء، ص ۳۲۳ تا ۳۲۴، میں نقل کیے گئے ہیں؛ مقولہ ۹ پر احمد کی شرح کی پوری عبارت اس میں نقل کی گئی ہے، ص ۵۰۔ ایک نیا جزو P. Kraus نے دریافت کیا ہے، بشکل مخطوطہ تیمور: اخلاق، ص ۲۹۰، ۱۳، قَب اس کی دراسات، ج ۱، ۱۹۳۹ء، ص ۶۔

(ج) دمدار تاروں پر کتاب، جسے الفہرست، ص ۲۶۸، نے ذوات ذالوائب [کذا، ذوات الذوائب؟] کے نام سے نقل کیا ہے، قَب

ص ۱۳۳ بعد (= Raccolta، ۱۹۱: ۵: بعد)، نیز I. Kratchkovsky در ابو حنیفہ الدینوری: کتاب الاخبار الطوال، دیباچہ وغیرہ، ۱۹۱۲ء، ص ۴۰ بعد؛ کتاب کی نوعیت کا بیان المسعودی: تنبیہ، ص ۱۷، میں موجود ہے۔ Boll (Sphaera)، ۱۹۰۳ء، ص ۱۳ بعد) کو یہ یقین نہیں ہے کہ ابو معشر نے اپنی Paranatellonta کی فہرست، طبع و ترجمہ A. Dyroff، وہی کتاب، ص ۴۰ بعد، کے لیے اس کتاب سے استفادہ کیا تھا بلکہ وہ اسے ایک ایسی کتاب سمجھتا ہے جو غلط طور پر بطلمیوس سے منسوب کر دی گئی ہے۔

(۵) 'Απλωσις ἐπιφανείας σφαιρας (Plani-) (sphaerium)، الفہرست، ص ۲۶۹، نے Pappus کے تحت میں تفسیر کتاب بطلمیوس فی تسطیح الكرة، ترجمہ از ثابت، کا ذکر کیا ہے۔ الیعقوبی، ۱: ۱۵۴، کتاب فی ذات الحلق کا تجزیہ کرتا ہے، قَب Klamroth، ص ۲۰ بعد۔ تسلمة المعربی کی Compendium کا متن، جو پہلے صرف عبرانی اور لاطینی ترجموں کی صورت میں معروف تھی، زمانہ حال میں G. Vajda نے دریافت کیا تھا، RSO، ۲۵: ۸ (مخطوطہ پیرس، عربی عدد ۴۸۲۱، ص ۱۰)؛ لاطینی ترجمے کے لیے دیکھیے Carmody، ص ۱۸۔

(و) الیعقوبی، ۱: ۱۵۷، اسطرلاب [رک باں] پر ایک کتاب فی ذات الصفائح وہی الاسطرلاب کا بھی ذکر کرتا ہے، قَب Klamroth، ص ۲۳ بعد اور Steinschneider، ص ۲۱۵ تا ۲۱۶۔ لاطینی ترجمے کی طبقات کے لیے دیکھیے Carmody، ص ۱۸؛ عربی۔ ہسپانوی اسطرلابوں پر بطلمیوس کے اثر کے بارے میں دیکھیے Assaig: J. Millás Vallicrosa d'història de les idees físiques i matemàtiques a la Catalunya medieval، ۱۹۳۱ء، باب ۶ تا ۷۔

میں بہت سے مخطوطات کی صورت میں موجود ہے، قَب (Ar. Übs.: Steinschneider، شماره ۱۷۷؛ Carmody، ص ۲۰؛ Journ. Warb. Court.: Thorndike، ص ۱۱۸ - ایک عربی متن، بعنوان رسالۃ فی صور الدرج، جو بطلمیوس سے منسوب ہے، سفینۃ الاحکام کے ماخذ میں سے ہے جس کا مصنف کوئی شخص بنام حضرت النصیری ہے، مخطوطات: برلن، Pet. ۱ : ۶۷۶ و موزہ بریطانیہ، شماره Add. ۲۳۴۰۰ (فہرست میں مندرج شماره ۸۴۸ کو Steinschneider نے غلط طور پر Arab. Übs. Philos.، ۹. اور عام اشاریہ میں ۱۳۴۸ لکھا ہے، Maths. ۲۱۷ کو غلطی سے ۸۴۳ اور ۳۵۳ کو ۸۷۴ بتایا ہے)، لیکن عربی اور لاطینی متون کی مطابقت کی اب تک جانچ نہیں کی گئی ہے - عنوان کے مفہوم کے لیے قَب Sphaera : Boll، ص ۴۲۶ بعد.

(ح) The Liber ad Heristhonem یا Aristonem de iudiciis (Ar. Übs. Steinschneider، ص ۲۱۸، شماره ۱۱) کا تجزیہ Millás (ص ۱۷۵) نے کیا ہے؛ بطلمیوس سے منسوب سائل متون کے لیے قَب Carmody، ص ۱۷ و ۲۰.

(ط) Messealach (= ماشاء اللہ) و Ptholomeus : de electionibus، وینس ۱۵۰۹ء، قَب Steinschneider : Eur. Übs.، شماره ۱۶۴ d، اور Arab. Lit. d. Juden، ص ۲۲، شماره ۲۶، کو Carmody، ص ۴۱، نے قیاساً ایک کتاب، موسوم بہ کتاب الاختیارات، مخطوطہ اسکوربال، عدد ۹۱۹، سے شناخت کیا ہے - اسی عنوان کے ایک اور مخطوطے کا حوالہ براکلمان، تکملہ ۳ : ۱۲۰۵، بذیل اضافہ ۳۹۲، میں ہے، جو اسکندریہ میں موجود ہے، حروف ۱۲ - بقول Thorndike : The Latin Translations of astrological works by Messahala، در Osiris، ج ۱۲، ۱۹۵۶ء، ص

Ar. Übs : Stenschneider، ص ۲۱۸ شماره ۲۲ - Carmody، جس کا مبحث لاطینی ترجمے ہیں (ص ۱۶ تا ۱۷)، اس کے متن کو (Centiloquium) مسئلہ ۹۹ کا ایک ضمیمہ کہتا ہے.

(د) زائچوں پر، الفہرست، ص ۲۶۸ : کتاب المواید، منقولہ جابر : کتاب المواید الصغیر، قَب Jābir : Kraus ۲ : ص ۲۵۸، حاشیہ ۱، جو اس کتاب کی اصلیت کا بھی قائل نہیں.

(ه) ایک اور غیر مستند کتاب بنام کتاب الملمحہ، جو ان متعدد اقتباسات کی وجہ سے معروف ہے جو یاقوت کی معجم البلدان میں درج ہیں، قَب ان مقامی ناموں کا مجموعہ جو اس میں مذکور ہیں اور اس سے متعلق مزید کتابیں، جو Honigmann : Sieben Klimata، ص ۱۲۵ تا ۱۳۴ میں مذکور ہیں - مَلْحَمَة کا مفہوم پورے طور پر واضح نہیں ہے اور مذکورہ بالا اقتباسات کتاب کی اصل نوعیت کے بارے میں کافی شہادت سہیا نہیں کرتے.

(و) حال میں ایک مختصر سا متن طبع کیا گیا ہے، جس میں بطلمیوس کا حوالہ ہے، بعنوان ذکر ما جاء فی النیروز و احکامہ مما فسره بطلمیوس الحکیم و وجدہ عن علم دانیال (!)، طبع عبدالسلام ہارون، از مخطوطہ استانبول، مراد ملا، عدد ۳۳۸، بعنوان نوادر المخطوطات، ۵ (ج ۱/۲)، ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۴ء، ص ۵ تا ۸ (یہ معاونات ہیرو Hebrew یونیورسٹی لائبریری کے M. Schwarz نے سہیا کی ہیں) - یہ ہفتے کے دنوں میں سے اس دن کی اہمیت پر بحث کرتا ہے جس سے نیا سال شروع ہوتا ہے.

(ز) ان اشکال کے بارے میں، ایک کتاب جو کرۃ فلکی کے ۳۶ درجوں میں نظر آتی ہیں اور جو Liber imaginum Ptolemaei یا اسی طرح کے دوسرے ناموں سے موسوم ہے - یہ لاطینی



الصناظر درج ہے، لاطینی ترجمہ Carmody، ص ۱۸، کی فہرست میں ہے۔ ابن الہیثم پر اس کے اثر کے بارے میں دیکھیے Ar. Übs. : Steinschneider، پیرا ۱۲۲۔

۷۔ متفرقات (Alia)۔

قیمتی پتھروں کے خواص پر ایک کتاب بنام کتاب منافع الاحجار، مخطوطہ پیرس، عدد ۲۷۷۲، میں محفوظ ہے، قِب J. Ruska و W. Hartner : Katalog der orientalischen und lateinischen Originalhandschriften, Abschriften und Photokopien des Instituts für Geschichte der medicin und der Naturwissenschaften in Berlin، ص ۷۸، ۱۹۳۹ء، (Index Général : G. Vajda، ۱۹۵۳ء میں نہیں ہے)۔  
مآخذ: متن مقالہ میں مذکور ہیں، قِب نیز عبدالرحمن البدوی کا اپنی تصنیف Fontes Graecae (sic) doctrinarum politicarum Islamicarum، کا دیباچہ، ۱۹۵۳ء : L. Thorndike، در Isis، ۵۰ (۱۹۵۹ء) : ۳۳ تا ۵۰۔

(M. PLESSNER)

- بطلیموس: رک بہ بدلیس۔
- بطلیموس: ہسپانوی Badajoz؛ آج کل اسی نام کے صوبے کا قلعہ بند صدر مقام، جو ہسپانوی استریمدورا Estremadura کے جنوبی نصف پر مشتمل ہے اور اسپین کا سب سے بڑا صوبہ ہے۔ وادی آنہ (Guadiana) پرتگالی سرحد کے قریب جہاں جنوب کی جانب خم کھاتا ہے وہاں سے ذرا ورے بائیں کنارے پر بطلیموس واقع ہے۔ اس کی آبادی ایک لاکھ ہے۔ اس کے نام کو Pax (Julia) Augusta یا Colonia Pacensis کا مرادف قرار دینا بے بنیاد ہے، کیونکہ یہ چیز ایک غلط جذبہ وطن پرستی پر مبنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس شہر کا نام رومی نو آبادی سے

(۶۹)، یہ تصنیف غلط طور پر ماشاء اللہ سے منسوب ہے اور اس کا مصنف سہل بن بشر ہے۔ اس نے وینس Venice کی طبع کا ذکر نہیں کیا ہے اور اس طرح اس نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ بطلیموس کی کتاب کوئی دوسری تصنیف تصور کی جاتی ہے یا یہ کہ مذکورہ بالا طبع سے تصنیف کے مشترک ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ امر ابھی تک تحقیق طلب ہے۔

۸۔ جغرافیہ:

Γεωγραφικὴ ὑφήγησις کے عربی تراجم اور مسلمانوں کے جغرافیائی نظریات پر اس تصنیف کے اثر کے بارے میں J. H. Kramer کا بیان (۱۱)، لائڈن، تکملہ، بذیل مادہ جغرافیہ) کسی طرح بھی فرسودہ نہیں ہے؛ قِب نیز اس کا مضمون بعنوان Geography and Commerce، در The Legacy of Islam، ۱۹۳۱ء، ص ۷۹ تا ۱۰۷۔ وہ تصانیف قابل توجہ ہیں جو ان مقالات میں مذکور ہیں، نیز Ar. Übs. : Steinschneider، پیرا ۱۱۹ اور Geographische Zeitschrift (ص ۲۴، ۲۷ تا ۸۱) میں H. v. Mzik کی مطبوعات پر Ruska کا تبصرہ بھی قابل توجہ ہے۔ استانبول کے فاتح محمد فاتح کے لیے کیے ہوئے ترجمے کے بارے میں جو مخطوطہ AS ۲۵۹۶ میں محفوظ ہے، قِب Honigmann، ص ۱۱۳؛ Plessner، در Islamica، ج ۳، ۱۹۳۱ء، ص ۵۴۷؛ Ritter، در Isl.، ج ۱۹، ۱۹۳۱ء، ص ۵۲؛ بعد، جہاں ایک اور مخطوطہ AS ۲۶۱۰ کا بیان بھی ہے۔

۵۔ موسیقی (نغمہ، Harmonics)۔

الفارابی کی کتاب الموسیقی الکبیر پر اس کے اثر انداز ہونے کے بارے میں قِب P. Kraus، Jābir، ۲ : ۲۰۴، حاشیہ ۲۔

۶۔ مناظر (Optics)۔

ابن ساعد، ص ۲۹، میں اس کا عنوان کتاب

کی قدیم ریاست کے شمال کے سب سے بڑے حصے کو دوبارہ ایک واحد اہم سلطنت کی شکل میں متحد کر دیا تھا۔ ۱۰۸۶ء میں بظلیوس کے شمال مشرق میں الزلاقیہ (Sacralias) کے مقام پر عیسائیوں کی تباہ کن شکست کے بعد شمال مغرب کی ریاست، جو بظلیوس اور ملوک الطوائف کے دوسرے علاقوں پر مشتمل تھی، رفتہ رفتہ المرابطون [رک باں] کے زیر حکومت آگئی، جو مراکش سے نکل کر بعجلت تمام اپنے ہم مذہبوں کی امداد کے لیے آئے تھے۔ ۱۰۹۳ء میں یہ معاون خود اس قدر طاقتور ہو گئے کہ یہ سارا علاقہ ان کے قبضے میں آ گیا اور [آگے چل کر] شمال مغربی افریقہ کی سلطنت المرابطون اور اس کے سقوط کے بعد اس کی جانشین سلطنت الموحّدون کے ہسپانوی صوبے یا باجگذار ریاست کے ایک حصے پر مشتمل رہا۔ ۱۱۶۸ء میں پرتگال کے بادشاہ الفانسو اول ہنریق (Alfonso I Henriques) نے اچانک حملہ کر کے بظلیوس پر قبضہ کر لیا لیکن لیون کے حاکم فرڈیننڈ (Ferdinand de Leon) نے اسے فوراً وہاں سے نکال دیا۔ [یہی حالت تھی کہ] بظلیوس دوبارہ موحّدون کے قبضے میں آ گیا۔ پھر کہیں ۱۲۳۰ء میں جا کر لیون اور قشتالیہ (Castile) کے فرمانروا الفانسو نہم نے اسے قطعی طور پر فتح کیا۔ بظلیوس متعدد عرب دانشوروں کی جائے ولادت ہے، جن میں سب سے زیادہ ناموری [علم نحو و لغت کے امام، ابو محمد] عبد اللہ بن محمد بن السید البظلیوسی نے حاصل کی۔ اس نے ۵۲۱ھ / ۱۱۲۷ء میں وفات پائی (قبّ براکلمان، ۱: ۴۲۷، جہاں ۵۴۴ھ / ۱۰۵۲ء پڑھنا چاہیے؛ ابن بشکوال، ص ۶۳۹)۔ [اس سلسلے میں عالم حدیث ابوالولید ہشام بن یحییٰ بن حجاج البظلیوسی (م شوال ۵۳۸ھ) کا نام بھی قابل ذکر ہے۔]

مآخذ: (۱) باقوت، ۱: ۶۶۳؛ (۲) مرآئد الإطلاع،

مآخوذ ہے وہ بداجوز نہیں بلکہ ہر تگالی شہر Beja (عربی باجہ = پیجہ، مآخوذ از Pacem) ہے۔ میکسیمس Valerius Maximus اور پلوٹارک Plutarch کے مشتبہ بادیا Badia سے بداجوز Badajoz کا مرادف ہونا بھی اسی قدر غیر یقینی ہے۔ بداجوز کے نام کا مسلمہ طور پر تاریخ میں پہلی بار ظہور بظلیوس کی عربی شکل میں ہوا (جو موجودہ ہسپانوی نام بداجوز کی اصل میں موجود ہے)۔ بظلیوس زمانہ حال کا تعمیر شدہ ہے، کیونکہ عبدالرحمن بن مروان موسوم بہ الجلیقی (the Galician) نے امیر عبداللہ کے حکم سے اس کی بنیاد رکھی تھی، جس نے اس کام کے لیے چند معمار اور کچھ سرمایہ اس کے سپرد کر دیا تھا۔ عبدالرحمن نے جامع مسجد کی تعمیر سے کام کا آغاز کیا۔ اس نے قلعے کے اندر بھی ایک خاص مسجد بنوائی۔ اسی نے اس شہر کے دروازے کے قریب حمام بنوائے۔ یہ شہر پہلے بھی قرطبہ کے خلیفہ محمد اول کے خلاف ایک امدادی مرکز اور پشت پناہ کے طور پر اس کے کام آتا رہا تھا۔ عبدالرحمن ثالث کے عہد یعنی ۵۳۱ھ / ۶۹۳ء سے پہلے اس شہر کو ابن مروان کے بہادر فرزند کے قبضے سے نہ نکالا جا سکا (البیان، ص ۱۰۵ بعد، ۱۳۰، ۱۹۵، ۲۱۳ تا ۲۱۶، ۲۱۶)۔ عربوں کے تعمیر کردہ اس نئے شہر (ابوالفداء: وہی محدثۃ اسلامیة) بظلیوس نے بتدریج ترقی کرتے کرتے اہمیت کے اعتبار سے ماردہ (= پیردہ = Colonia Augusta Emerita، وادی آنہ کے بالائی جانب، اس کے شمالی کنارے پر، بداجوز سے ۳۷ میل = ۶۰ کلومیٹر مشرق میں) کی جگہ لے لی، جس کا تنزل برابر جاری رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ قرطبہ کی اموی خلافت کے زمانہ تنزل میں بظلیوس بنو الانطس [رک باں] کے حکمرانوں کی ہر شکوہ جاملے قیام بن گیا، جنہوں نے ۱۰۲۲ سے ۱۰۹۳ء تک لوزیتانیا Lusitania



۱۸۸۰ء؛ (۳) فہرستہ؛ (۴) امام مالکؒ کی الموطا کی شرح؛ (۵) المعری: سقط الزند کی شرح۔ اصل کتاب تلف ہو چکی ہے، لیکن اس پر ابن العربی کی تنقیدات سے مشتعل ہو کر ابن السید نے اس کا تلخ جواب دیا، بعنوان الانتصار بمن عدل عن الاستبصار (طبع حامد عبدالمجید، قاہرہ ۱۹۵۵ء)؛ (۶) الانصاف فی التبیہ علی الأسباب الستی اوجہت الاختلاف، قاہرہ ۱۳۱۹ھ (قب) Vorlesungen über den Islam: Goldziher، بار دوم، ۱۹۲۵ء، ص ۳۳۰، حاشیہ ۱۱۶)۔

مآخذ: (۱) ابن بشکوال، شمارہ ۶۳۹؛ (۲) الضبی، شمارہ ۸۹۲؛ (۳) ابن القتیبي؛ (۴) ابن العماد: شذرات الذهب؛ (۵) ابن خلکان، ۱: ۳۳۲ (مترجمہ de Slane، ۲: ۶۱)؛ (۶) الشقندی (مترجمہ Garcia Gómez: Elogio del Islam español، میڈرڈ ۱۹۳۳ء، ص ۵۴، حاشیہ ۵۰)؛ (۷) Pons Boigues: Ensayo، شمارہ ۱۰۱؛ (۸) Historia de la literatura: González Palencia arábigo-española، بار دوم، ۱۹۳۵ء، ص ۲۲۹؛ (۹) سرکیس Sarkis، عمود ۵۶۹ تا ۵۷۰؛ (۱۰) براکلمان، ۱: ۱۲۲، ۳۲۷ و تکملہ، ۱: ۱۸۵، ۲۵۸۔

(E. LÉVI-PROVENÇAL)

• **بَطْن**: [(ع) اس کی جمع اَبْطَن، بطون اور بطنان ہے اور تصغیر بَطِين۔ اس کے معنی ہیں: پیٹ، اندرونی حصہ، نیچے کی جانب؛ بطن الامر = معاملے کی تہ؛ بطن الوادی = وادی کا نشیبی حصہ۔ کسی پیچیدہ معاملے کو بھی بطن کہتے ہیں؛ اس چیز کو جس کا حاسہ بصر سے ادراک ہو سکے ظاہر اور جس کا حاسہ بصر سے ادراک نہ ہو سکے باطن کہا جاتا ہے۔ لباس کے استر اور نیچے کے اور اندرونی حصے کو بطانة کہا جاتا ہے۔ بطن فلان بفلان کے معنی ہیں کسی شخص کے اندرونی معاملات سے واقف ہونا اور بطور استعارہ ہر اس شخص کو جو

Histoire des: Dozy (۳): ۳۳۳: ۳ و ۱۵۰: ۱  
Musulmans d'Espagne، ۱۸۳: ۲، بعد، ۲۰۷، ۲۳۸،  
Diccionario: Madoz (۴): ۲۶۰: ۳، بعد؛  
Historia del: M. R. Martinez y Martinez (۵)  
reino de Badajoz؛ (۶) البکری، مخطوطہ فاس، ورق  
۲۶۰؛ (۷) الإذریسی، بتن: ص ۱۸۰ و ترجمہ: ص ۲۶۰؛  
La Péninsule ibérique: E. Lévi-Provençal (۸)  
Las Grandes batallas de: A. Huici (۹): ۵۸  
la Reconquista durante las Invasiones africanas  
ص ۱۹ تا ۸۲؛ [(۱۰) لاء، ع، تعلیقات، بذیل مادہ  
بطلیوس؛ (۱۱) محمد عنایت اللہ: اندلس کا تاریخی  
جغرافیہ، حیدر آباد ۱۹۲۷ء، ص ۱۵۸، بعد؛] نیز رک بہ  
الافض، بنو۔

([A. HUICI-MIRANDA] C.F. SEYBOLD)

• **البَطْلِيُوسِي**: ابو محمد عبداللہ بن محمد بن السید، ایک مشہور اندلسی نحوی اور فلسفی، جو ۵۳۳ھ / ۱۰۵۲ء میں بطلیوس میں پیدا ہوا اور وسط رجب ۵۲۱ھ / اواخر جولائی ۱۱۲۷ء میں بلنسیہ کے مقام پر فوت ہوا۔ وہ ابن رزین [رک بہ رزین، جو] کا معتوب ہونے اور کچھ مدت تک سرقسطہ (Saragossa) میں پناہ لینے کے بعد بلنسیہ میں آکر بس گیا تھا۔ بلنسیہ میں اس کا ایک معروف شاگرد ابن بشکوال [رک بان] رہتا تھا۔ ابن السید کوئی بیس کتابوں کا مصنف ہے، جن میں ذیل کی کتب شامل ہیں: (۱) ابن قتیبہ کی ادب الکاتب کی شرح، بعنوان الإقتضاب فی شرح ادب الکتاب (طبع عبداللہ البستانی، بیروت ۱۹۰۱ء)؛ (۲) کتاب الحدائق (طبع و ترجمہ از Asia، ۱۹۳۰ء)، جس سے کسی حد تک یہودیوں کا مقامی علم کلام متاثر ہوا (دیکھیے عبرانی ترجمہ: Die Spuren al-Bataljusi in der jüdischen Religionsphilosophie، طبع D. Kaufmann، بوڈا پست

دوسرے کا رازدان ہو بطانة کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت الباطن ہے، جس کی تشریح آنحضرتؐ سے ان الفاظ میں مروی ہے: لیس دونہ شیئی اور اسی کی تشریح میں حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں: یا من غایة معرفته القصور عن معرفته، یعنی اے وہ ذات جس کی معرفت کی انتہا اس کی معرفت سے درماندگی ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اللہ اپنی آیات کے لحاظ سے ظاہر ہے اور باعتبار ذات کے باطن ہے، یا اس لحاظ سے باطن ہے کہ وہ ہمارے احاطہ ادراک میں نہیں آسکتا۔ اسی کی تشریح میں حضرت علیؓ فرماتے ہیں: تجلی لعبادہ بن غیر ان راہ واراہم نفسہ من غیر ان تجلی لہم یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر تجلی فرمائی اس کے بدوں کہ بندے اسے دیکھ سکیں اور اپنی ذات کو دکھلایا ہے اس کے بدوں کہ وہ ان کے سامنے جلوہ افروز ہو (مفردات: لسان العرب)۔ [ذَوْبَطْنِہَا کے معنی ہیں اس کے رحم کا ثمر، جو کچھ اس کے رحم میں ہے، اسی مفہوم کا اظہار قبیلے کے ایک جزو کے لیے لفظ بطن کے استعمال سے بھی ہوتا ہے، جسے رَحْم، فخذ اور اسے الفاظ کے ایک پورے سلسلے کے مماثل بتایا گیا ہے جن سے قرابتِ رحمی مراد ہوتی ہے۔ وٹسٹائن Wetzstein نے دمشق کی آبادی کے سلسلے میں جو اصطلاحات استعمال کی ہیں ان کی رو سے جدید عربی میں مادری اور پدری رشتہ داروں میں تمیز کرنے کے لیے ابھی تک اولاد البطن اور اولاد الظہر کی اصطلاحات مستعمل ہیں (نیز دیکھیے Arabica، ۵: ۱، ۸۰ تا ۸۱، میں وینکوف Vinnikov کے ایک مقالے پر کانار M. Canard کا تبصرہ)۔ رابرٹ سن سمٹھ W. Robertson Smith (Journal of Philology، ۹: ۸۶) کا خیال ہے کہ ان عربی قبیلے لغت کے قول کو جو اعضا بے بدن کی ترتیب کے مطابق ”بطن“ کو ”فخذ“ اور

”قبیلہ“ کے درمیان رکھتے ہیں رد کر دینا چاہیے، کیونکہ اسے یقین ہے کہ اس نے کتاب ایوب (Book of Job)، ۱۹: ۱۷، کی ایک جڈت آمیز تفسیر کی رو سے عبرانی ”بطن“ کے وہ معنی معلوم کر لیے ہیں جو عربی کلمہ ”بطن“ میں پائے جاتے ہیں [قَبّ الکتاب المقدس (عربی)، بیروت، ۱۹۵۰ء، ص ۸۱: ابناء أحشائی = کتاب مقدس (فارسی)، لنڈن ۱۹۷۳ء، ص ۸۰: اولادِ رحمِ مادرم]۔ حوالہ مذکور میں ”بطنی“ نے شارحین کوشش و پنج میں ڈال دیا تھا؛ یہ مرکب عربی کے ”بطنی“ کے مطابق سمجھا جا سکتا ہے (Kinship and Marriage in early Arabia، بار دوم، ص ۲۸)۔ سمٹھ کے نظریے بحث کے لیے قَبّ مقالات عائِلَة، عشیرَة، قبیلَة وغیرہ۔

جغرافیائی ناموں میں ”بطن“ کا لفظ مجازی طور پر نشیب اور طاس کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (قَبّ یاقوت، ۱: ۶۶۵ بعد)۔ ”داخلي“ کے مفہوم میں اس کے مشتقات ”باطن“ اور ”باطنیہ“ [رک باں] ہیں۔

J. LECERF [و ادارہ]

- **بَطْنَان**: ایک وادی کا نام، جو حلب کے مشرق میں تیس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس جگہ کئی چھوٹے چھوٹے چشموں کا پانی ایک بڑی ندی نہر الذهب میں آ کر ملتا ہے، جو جنوب کی طرف بہتی ہوئی بکھاری پانی کی جھیل جبول میں جا گرتی ہے۔ پانی کی اس فراوانی کی وجہ سے اس علاقے میں کئی گاؤں آباد ہو گئے ہیں، جو بنیادی طور پر زرعی ہیں (یہاں کیپاس اور پھلوں کے درختوں کی کاشت ہوتی ہے)۔ ان میں اہم ترین قبیلے اور منڈیاں باب اور بزاعہ ہیں۔ یہ جگہ وادی قویق سے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے، جہاں الرہا (Edessa) اور رَقہ سے آنے والے مسافر سہولت سے



میں شاہنشاہ جان (John II Comnenos) نے بزاعہ اور باب دونوں پر قبضہ کر لیا۔ حلب میں نورالدین کے ورود سے یہاں ایک بار پھر امن قائم ہوا۔ اس زمانے کے بطنان کا حال ہمیں عرب جغرافیہ دانوں کے ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے جو تعداد میں بہت زیادہ ہونے کے باوجود نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایک سے ہیں (ان بیانات کو Le Strange اور Dussaud نے نقل کیا ہے)۔

مملوکوں کے عہد میں بطنان کی سیاسی حیثیت ختم ہو گئی اور اس علاقے کا انتظام دو مملوک جندیوں کے تحت آ گیا، جنہیں حلب کا نائب مقرر کرتا تھا۔ ان میں سے ایک جندی باب اور بزاعہ کے شہروں پر حکمرانی کرتا تھا اور دوسرا جبول کے آس پاس کے علاقے کا حاکم تھا۔ ترکوں نے اسے ایک "قضبا" قرار دیا اور یہاں حلب کے پاشا کے تحت قائم مقام جبول کی نمک کی کانوں کی نگرانی کرتا تھا (انیسویں صدی کے وسط میں یہاں کی سالانہ آمدنی چار اور پانچ لاکھ پونڈ کے درمیان تھی)۔ یہ قائم مقام شہر باب میں رہتا تھا، جس کی آبادی اس وقت چھے ہزار تھی۔

مآخذ: عمومی: (۱) R. Dussaud : *Topogra-*  
*phie historique de la syrie antique medievale*  
 پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۳۳۰، ۳۵۰، ۳۷۰، ۳۹۱  
 ۱۹۵۱ء : (۲) G. Le Strange : *Palestine under*  
*the Moslems*، لندن، ۱۸۹۰ء، ص ۳۹، ۶۲، ۳۰۶  
 ۱۹۳۶ء : (۳) J. Sauvaget : *Alep*، پیرس ۱۹۳۱ء،  
 ص ۱۲، ۱۳، ۱۸، ۲۰، ۲۰۳، ۲۶۱ (حاشیہ)، ۳۶۳،  
 ۴۱۶، ۴۵۰

آثار قدیمہ: (۴) Pauly-Wissowa : ۳ : ۱۲۵  
 ۱۳۰ و تکملہ ۱ : ۲۳۳ تا ۲۳۵ : (۵) E. Honigmann :  
*Evêques et évêchés monophysites d'Asie an-*  
*Louvain térieure au VI<sup>e</sup> siècle*، پیرس، ۱۹۰۱ء، ص ۳۱

پہنچ کر قیام کر سکتے ہیں۔ جبول کے نمک کے ذخیروں سے وصول ہونے والا محصول شمالی شام کے والیوں یا فرمانرواؤں کے لیے ہمیشہ سے آمدنی کا بہت اچھا ذریعہ رہا ہے۔

عام طور سے بطنان کو بطن سے مشتق بتایا گیا ہے اور اسی کی بنا پر اس کا مفہوم نشیبی زمین قرار دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ بوزنطی Batnai اور رومی Batnae، بلکہ اس سے بھی بعد کی ریاست Patin سے زیادہ متعلق معلوم ہوتا ہے اور ان پرانے مقامات کی یاد تازہ کرتا ہے۔

حبیب بن مسلمہ نے بطنان کو فتح کیا تو اس کے بعد یہ بہت جلد نئے مرکز حلب کے زیر اثر آ گیا اور آئندہ کے لیے اس کی حیثیت اتفاقی واقعات کی مرہون منت رہی :- ۵۷۰/۶۸۹۔ ۶۹۹ء میں خلیفہ عبدالملک نے مصعب بن الزبیرؓ کے ساتھ جنگ کے دوران میں موسم سرما اسی وادی میں گزارا - ۵۲۸۹/۵۹۰ء میں قرامطہ [رکبان] تباہی مچاتے ہوئے یہاں پہنچے - سیف الدولہ کے عہد حکومت میں اُسے Nicephoros Phocas نے تباہ و برباد کر ڈالا (۵۳۶۵/۵۹۷۶) - بنو مرداس کے زمانے میں مختلف جنگوں کے باعث یہاں انتشار پھیلا ہوا تھا - ۵۴۲۲/۵۱۰۸۰ء میں اس پر تمش کا قبضہ ہو گیا - صلیبی جنگوں اور الرہا اور انطاکیہ پر فرینکوں کے قبضے سے یہاں بدامنی کا ایک دور شروع ہوا۔ اس کا آغاز ۴۹۱ - ۵۴۹۲/۱۰۹۸ء میں ارمنوں کے حملے سے ہوا، جس کا تعلق یقیناً انطاکیہ کے محاصرے سے تھا - حلب کے سلجوقیوں نے اس حملے کا فوراً جواب دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ باب میں اسمعیلیوں کی بڑی آبادی کا استیصال ہو گیا - تل باشر Tell Bāshir کے جوسیلین Joscelin نے ۵۰۱۸/۱۱۲۵ء میں اسے حلا کر تباہ کر دیا اور اس کے بعد ۵۳۲/۱۱۳۸ء

*Turquie d'Asie*، پیرس ۱۸۹۰ تا ۱۸۹۵ء، ۲: ۲۱۷  
 بعد: (۲۳) *M. Gaudetroy-Demombynes*  
*Syrie à l'époque des Mamluks*، پیرس ۱۹۲۳ء،  
 ص ۸۳، ۹۲، ۱۹۲: (۲۴) *H. Guys* *Statistique du*  
*Pachalik d'Alep*، مارسیلز ۱۸۵۳ء، ص ۲۱، ۲۶،  
 ۵۰ تا ۱۳۲، ۵۱.

(F. HOURS)

\* البَطِيحَة: (= دلدلی زمین) اس نام کا اطلاق  
 ایک ایسے مرغزار نما نشیبی علاقے پر کیا جاتا ہے  
 جہاں کم و بیش مقررہ اوقات میں سیلاب آتا رہتا  
 ہے اور اس وجہ سے دلدلی بن جاتا ہے۔ عباسی دور  
 کے عرب مصنف خاص طور پر اس کا اطلاق اس  
 وسیع دلدلی علاقے پر کرتے ہیں جو شمال  
 میں کوفے اور واسط اور جنوب میں بصرے کے  
 درمیان دریائے فرات اور دریائے دجلہ کی زبیریں  
 گذرگاہ پر واقع ہے، جسے اکثر البطائح (البطیحة کی  
 جمع) اور بعض دفعہ ملحقہ شہروں کی رعایت سے  
 بَطِيحَةُ الكُوفَةِ، بَطِيحَةُ الوَاسِطِ یا بَطِيحَةُ البَصْرَةِ  
 بھی کہا جاتا ہے۔

جنوبی بابل میں بہت سی دلدلوں کا  
 وجود بہت قدیم زمانے سے چلا آتا ہے۔ یہاں  
 کا میدان سیلابی مٹی سے بنا ہے اور یہ نرم  
 اور تقریباً ہموار ہے۔ دریائی بہاؤ کے راستے کم  
 گہرے ہیں اور ان کی تہ میں جلد ہی گاد جم جانے  
 کا خطرہ رہتا ہے۔ کنارے نرم اور نیچے ہیں، لہذا  
 سیلاب کا پانی کناروں پر سے بہ نکلتا ہے جس کی  
 بدولت وسیع دلدلیں بن جاتی ہیں۔ یہ معمولی  
 حالات میں غائب ہو جاتی لیکن ہر سال آنے والے  
 سیلاب اس سے مانع ہیں۔ علاوہ ازیں دریا اپنا  
 رخ بدل لیتے ہیں، جس کی وجہ سے بجائے خود نئی  
 دلدلیں پیدا ہو جاتی ہیں، یہاں تک کہ خطِ میخی  
 کے کتبوں میں بھی اگسی *agammé* (دلدلوں)

*Archäologische* : E. Herzfeld و F. Sarre (۶)  
*Reise im Euphrat-und Tigris Gebiet*، برلن ۱۹۱۱ء،  
 ۱: ۱۱۳ تا ۱۱۹: (۷) *Villages antiques de la Syrie du Nord*  
 بیروت ۱۹۵۷ء۔  
 قرون وسطی: (۸) ابوالفداء، تقویم، ص ۲۶۷:  
 (۹) *Annali: Caetani*، ج ۳، حاشیہ ۲۷۹ بعد: (۱۰)  
*La Syrie du Nord à l'époque des* : Cl. Cahen  
*Croisades*، پیرس ۱۹۳۰ء، ص ۲۱۳: (۱۱) *M. Canard*  
*Historie de la dynastie des H'amdânides de*  
*Jazira et de Syrie*، الجزائر ۱۹۵۱ء، ۱: ۸۲۵: (۱۲)  
 وہی مصنف: *Saif ad Daula*، الجزائر ۱۹۳۳ء، ص  
 ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۹۶، ۲۶۸: (۱۳) *Deffréméry*  
*recherches sur les Ismaéliens ou Bathiniens de*  
*Syrie*، پیرس ۱۸۵۵ء، ص ۵۳: (۱۴) *الدمشقی:*  
*Cosmographie*، طبع Mehren، سینٹ پیٹرز برگ  
 ۱۸۶۶ء، ص ۲۰۵: (۱۵) *E. Honigmann*  
*Ostgrenze des Byzantinischen Reiches Byzance et*  
*les Arabes Vasiliev*، ج ۳، برسلز ۱۹۳۵ء، ص  
 ۱۳۱ تا ۱۳۲: (۱۶) ابن العَدِيم: *زبدة الحلب فی*  
*تاریخ حلب*، طبع Dahan، دمشق ۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۳ء،  
 ۱: ۸۸، ۸۸، ۱۰۲، ۱۵۱، ۲: ۶۱ تا ۶۳، ۹۰، ۱۲۳، ۱۷۵ تا  
 ۱۵۷، ۱۹۳، ۱۹۷، ۲۰۶، ۲۰۹، ۲۱۳، ۲۳۷، ۲۶۳ تا  
 ۲۶۹، ۳۲۳: (۱۷) ابن جَبْرِ: *الرحلة*، طبع Wright،  
 لائڈن ۱۸۵۲ء، ص ۲۵۱ تا ۲۵۲: (۱۸) ابن شُحْنَه:  
*الدرا المنتخب فی تاریخ مملکت حلب*، طبع سرکیم، بیروت  
 ۱۹۰۹ء، ص ۳ تا ۳۸، ۹۷، ۱۵۶ تا ۱۵۷، ۱۷۲ تا ۱۷۵:  
 (۱۹) القزوينی: *کتاب عجائب المخلوقات*، طبع  
*Wüstenfeld*، گوٹنگن ۱۸۳۸ء، ص ۱۷۸: (۲۰) *مراصد*  
*الإطلاع*، طبع Juynboll، لائڈن ۱۸۵۰ء تا ۱۸۶۳ء،  
 ۱: ۱۵۹، ۲۳۹ و ۳: ۳۳۵: (۲۱) یاقوت، ۱: ۶۰۳،  
 ۲ و ۶۶۳: ۳۹، ۲۰۰، ۳۰۸۔  
 مملوک اور ترک: (۲۲) *V. Cuinet* *La*



شمال کی طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ممکن ہے کہ اس دلدل کی ابتدا ایک ایسے دوپہری ڈھلان کے نشیب (synicline) سے ہوئی ہو، جو طبقات ارضی کی تشکیل کے زمانے میں بن گیا ہو۔ اس کے بعض حصے گد کی کثیر مقدار سے اٹ گئے، بحالیکہ دوسرے حصے نیچے رہ گئے اور انہیں پانی نے پر کر دیا۔ اس طرح انہوں نے وہ شکل اختیار کر لی جسے قرون وسطیٰ کے مسلمان البطائح کے نام سے موسوم کرتے تھے۔ مذکورہ بالا نشیب کی ڈھلانیں تاریخی ادوار میں پانی سے کٹ گئی ہوں گی (قَب De Morgan و G. M. Lees و N. L. Falcon Bibliography : *History of the Mesopotamean plains* در *Geographical Journal*؛ سمندر کے پیچھے ہٹ جانے کے بارے میں قَب De Morgan، ۱ : ۴ تا ۴۸؛ Seton Lloyd، ص ۱۹۔

بابل میں آب رسانی کے انتظام اور پانی کے نکاس کی جانب ساسانیوں نے حسب دستور بہت توجہ کی۔ اس سے دلدلوں میں کمی ہو جانا چاہیے تھی، تاہم اس خاندان کے مؤخر بادشاہوں کے عہد میں زرخیز اراضی کا وسیع رقبہ سیلاب کی نذر ہو گیا اور دلدلوں کے علاقے میں اتنا اضافہ ہو گیا کہ عرب البطیحة کا آغاز اسی دور سے شمار کرنے لگے۔ ان کا یہ خیال ہے کہ قباز فیروز (۵۷۷ تا ۵۶۳ء) کے عہد میں کسکر کے قریب ایک بڑا شکاف پیدا ہو گیا اور اس کی وجہ سے مزروعہ زمین کے بڑے بڑے قطعات زیر آب ہو گئے۔ پھر کہیں خسرو اول انوشروان کے عہد (۵۳۱ تا ۵۷۸ء) میں جا کر بند کے پشتوں کی جزوی طور پر مرمت کی گئی اور کچھ زمینیں زیر کاشت لائی گئیں۔ لیکن ۶ یا ۷ء / ۶۲۷ء [۶۲۸ء] میں خسرو ثانی پرویز کے عہد میں دریائے فرات اور دریائے دجلہ میں پانی کی سطح دوبارہ بلند ہو گئی اور اس نے ایک ایسے

اور اپراتہ apparatus (نرکلی زمینوں) کا اکثر جگہ ذکر آتا ہے، قَب Assy. Handwörterb. : Delitzsch، ص ۱۱۵، ۱۱۶۔ بالخصوص وہ تمام علاقہ جو جنوب میں محمرہ، شمال میں قرنہ سے آگے ایک حد تک اور مشرق میں دریائے کارون کے پار تک کے علاقے کے درمیان واقع ہے، یقیناً ایک عظیم دلدلی جھیل سے محیط ہوگا؛ قَب Delitzsch، ص ۶۲۷؛ *The Sea land of Ancient Arabia : Dougherty*، ۱۹۳۳ء۔

اسی طرح یونانی اور رومی مصنفین بھی اس سے واقف ہیں (بطور λιμνη یا chaldaicus lacus)۔ اس سلسلے میں Nearchus کا بیان بالخصوص پر از معلومات ہے، کیونکہ اس نے خود اس قطعہ آب کو عبور کیا تھا اور اس کی چوڑائی کا اندازہ چھ سو سٹاڈیا stadia (= ۸۰ میل) کیا تھا۔ لوحہ پوتینجریانا (*The Tabula Peutingeriana*) سے بھی بابل کی دلدلوں کے حدود کی تعیین ہوتی ہے۔ اس میں پالودس Paludes کے علاوہ دیوتاہی Diotahi کا نام بھی مذکور ہے (جس کی تصحیح غالباً بشکل بیوتاہی Biotahi (= بطائح) کرنا چاہیے)۔ سیخی کتبوں اور قدیم یونانی اور رومی مصنفین کی تحریروں میں اس کے ذکر کے بارے میں قَب Andreas، در *Pauly-Wissowa*، ۱ : ۲۳۶، ۸۱۵، ۱۸۷۸ بعد، *Weissbach*، ۲۸۱۲ : کتاب مذکور، ۳ : ۲۰۴۴ و ۶ : ۱۲۰۱ بعد؛ Streck، ۵ : ۱۱۳۷ (بذیل مادہ Diotahi)؛ *Researches : Ainsworth*، ۲ : ۱۸۰ بعد۔

قدیم زمانے سے یہ عظیم دلدلی جھیل دریاؤں سے آنے والی گد سے بتدریج پر ہوتی رہی ہے اور اس طرح موجودہ ڈیلٹا وجود میں آ گیا ہے۔ اس کے باوجود بعض جگہیں زیر آب رہ گئی ہیں۔ یہ جگہیں موجودہ خور [= حور] الحویزہ، خور الحمار، اور خور الشامیہ کے ارد گرد اور غالباً آگے مزید

سیلاب کی شکل اختیار کر لی جیسا اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ دونوں دریاؤں نے اپنے اپنے بند توڑ ڈالے، جس سے بہت وسیع شگاف رونما ہو گئے۔ متعدد طسوج کی زرعی املاک کو غرق کرتا ہوا یہ سیلاب ان جگہوں تک پہنچ گیا جہاں دلدلیں واقع ہیں۔ اس کے بعد کے پر آشوب دور میں اور اس زمانے میں جبکہ مسلم افواج نے عراق پر تسلط جمانا شروع کیا تھا تقریباً تمام بندوں اور پشتوں میں شگاف پیدا ہو گئے، جن کی مرمت کرنے سے دیہقان قاصر تھے؛ چنانچہ ہر طرف دلدلوں میں اضافہ ہو گیا (البلاذری، ص ۲۹۲ تا ۲۹۳؛ قدامہ، ص ۲۳۰؛ Streck، ص ۱: ۲۹ تا ۳۲ و ۳: ۳۰ تا ۳۱؛ لسٹرینج، ص ۲۷)۔ الحجاج نے دلدلی علاقے میں کچھ ہندی نژاد لوگوں کو بھی جو زط [آرک باں] [= جاٹ] کہلاتے تھے، آباد کر دیا جن کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں بھینسوں کے ریوڑ بھی تھے۔ حلیفہ کے بھائی مسلمہ نے تقریباً تیس لاکھ درہم بندوں اور پشتوں کی مرمت میں صرف کیے اور اس کے معاوضے میں اسے بازیافتہ زمین کے بہت وسیع رقبے مل گئے (البلاذری، ص ۲۹۳؛ قدامہ، ص ۲۳۰ تا ۲۳۱؛ *Das Arabische Reich*: Wellhausen، ص ۱۹۰، ۱۵۶ تا ۱۵۸)۔

اموی حکمرانوں نے البطحہ کی بحالیات میں دلچسپی لی۔ امیر معاویہ رض کے عہد میں البطحہ کی جو زمینیں ابن دراج کی کوششوں سے دوبارہ زیر کاشت آئیں ان کی آمدنی پچاس لاکھ درہم سالانہ تھی۔ اس نے یہ کام نرکلوں کو کاٹ کر اور پانی کو بندوں کے ذریعے روک کر انجام دیا۔ یہ زمینیں الجوامد کہلاتی تھیں (البلاذری، ص ۲۹۴؛ مروج، ص ۱: ۲۲۵ تا ۲۲۶)۔ ۵۸۱/۷۰۱ء میں سیلاب آنے سے یہ اراضی دوبارہ زیر آب ہو گئی کیونکہ پانی کے زور سے ایک نیا شگاف پیدا ہو گیا تھا جس کی مرمت کی جانب الحجاج نے بے پروائی برتی۔

اس کے فوراً بعد الحجاج نے البطحہ کے قریب کے

سیلابی مٹی کے میدان میں واسط کا شہر آباد کیا۔ اس سلسلے میں لازمی طور پر نہروں کے افتادہ نظام کی بحالی، پانی کے بندوں اور ان کے پھانکوں کی تعمیر اور زمینوں کی بازیافت عمل میں آئی ہو گی۔ اس نے دو نہریں نیل اور زابی کھدوائیں تاکہ ان دو بڑے دریاؤں (دجلہ و فرات) کا گذر البطحہ میں ہونے سے پہلے ان کے زاید پانی کے ایک حصے کو دوسری طرف موڑ دیا جائے اور ساتھ ہی واسط سے اوپر کے خشک رقبوں کو سیراب کر کے زرخیز بنا دیا جائے (البلاذری، ص ۲۹۰ تا ۲۹۲؛ قدامہ، ص ۲۳۰؛ Streck، ص ۱: ۲۹ تا ۳۲ و ۳: ۳۰ تا ۳۱؛ لسٹرینج، ص ۲۷)۔ الحجاج نے دلدلی علاقے میں کچھ ہندی نژاد لوگوں کو بھی جو زط [آرک باں] [= جاٹ] کہلاتے تھے، آباد کر دیا جن کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں بھینسوں کے ریوڑ بھی تھے۔ حلیفہ کے بھائی مسلمہ نے تقریباً تیس لاکھ درہم بندوں اور پشتوں کی مرمت میں صرف کیے اور اس کے معاوضے میں اسے بازیافتہ زمین کے بہت وسیع رقبے مل گئے (البلاذری، ص ۲۹۳؛ قدامہ، ص ۲۳۰ تا ۲۳۱؛ *Das Arabische Reich*: Wellhausen، ص ۱۹۰، ۱۵۶ تا ۱۵۸)۔

زمین کی بحالی کا کام جاری رہا، بالخصوص خلیفہ ہشام اور اس کے نائب عراق خالد القسری کے زمانے میں، جس نے دریائے دجلہ پر ایک بند بنوایا (البلاذری، ص ۲۹۳ تا ۲۹۴؛ قدامہ، ص ۲۳۰؛ ابن رستہ، ص ۹۵) اور کئی نہریں کھدوائیں، مثلاً نہر الرمان اور نہر المبارک۔ اس طرح اس نے زمین کے بڑے رقبے دوبارہ کارآمد بنا دیے، جن سے بہت آمدنی ہوتی تھی، لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ پانی کی ایک بڑی مقدار اس میں صرف ہو گئی اور آب رسانی کے لیے جس مقدار کی ضرورت تھی اس میں کمی ہو گئی۔



تقریباً ساسانی عہد کے خاتمے کے زمانے سے  
دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے  
نصفِ اول تک دریائے دجلہ شہر واسط اور کئی  
اور شہروں کے قریب سے گزرتا ہوا اپنے مغربی معبر  
(موجودہ شَطُّ الدَّجِيلَة) میں بہتا تھا، یہاں تک کہ  
چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں وہ  
قَطْر میں البَطِيحَة سے مل جاتا تھا (مروج، ۱: ۲۸۸؛  
سہراب، ص ۱۱۸ تا ۱۱۹، ۱۳۵؛ ابن خردادبہ،  
ص ۵۹؛ ابن رستہ، ص ۱۸۵)۔ المَسْتَوْفَى کے بیان کے  
مطابق قَطْر تیس فرسنگ (تقریباً ۱۰.۷ میل = ۱۷.۲  
کیلومیٹر) کے فاصلے پر واسط کے جنوب میں ہے  
(نزہة، ص ۱۶۶) اور قدامہ (ص ۱۹۳) کے قول کے  
مطابق بائیس فرسنگ۔

البطیحة کی جنوبی حدود بصرے کے قریب تک  
پہنچتی ہیں (البلاذری، ص ۳۶۲؛ انساب الاشراف،  
۵: ۲۵۷)۔ سہراب (ص ۱۳۵) البطیحة کی کیفیت  
اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ چار خوروں (= اُھوار)  
پر مشتمل تھی: بَحْصَا، بَكْمِصَا، بَصْرِيَاثَا اور  
المَحْمَدِيَّة۔ ہر خور میں وافر پانی تھا، جس میں  
سرکنڈے بالکل نہیں تھے، البتہ نرکلوں کے ایک  
تنگ راستے کے ذریعے ایک خور دوسرے سے ملا  
ہوا تھا۔ ان میں سے خور المحمدیہ سب سے بڑا تھا  
اور نرکلی راستہ اس سے لے کر نہر ابی اسد تک  
پھیلا ہوا تھا، جو حالہ اور کوانین اور وہاں سے  
الدجلة العوراء (= یک چشم دجلہ) تک جاتی تھی۔  
یاقوت جن خوروں کا ذکر کرتا ہے وہ سلام (۳: ۳۱۱)،  
جرچین (۲: ۵۶)، غراف (۳: ۵۸۱) اور ربہ  
(۲: ۱۳۴) ہیں۔

جنوبی بابل کے سیلابی مٹی کے نرم اور ہموار  
میدان میں پانی کا بہاؤ اور نکاس یکساں حالت میں نہیں  
رہ سکتا تھا، خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ نہری  
اور آب رسانی کا نظام سیاسی اور معاشی صورت حال

جب عباسی خاندان بر سرِ اقتدار آیا (۸۱۳۲ /  
۷۰۷ء) تو بندوں میں نئے شکاف پیدا ہو گئے، جن کی  
وجہ سے دلدلوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس طرح  
دریائے فرات کے علاقے میں بھی جھاڑیوں کے جنگل  
بن گئے، جن کے بعض حصوں کو دوبارہ قابلِ کاشت  
بنایا گیا۔

شمال مغرب میں البطیحة تقریباً کوفے اور  
بغداد تک پہنچ گئی تھی، بحالیکہ زیادہ دور مشرق میں  
یہ واسط سے خاصے فاصلے پر شروع ہوتی تھی۔  
اس حصے کو قرونِ وسطیٰ کے بہت سے مسلم ماخذ  
میں بَطِيحَة الكوفة کہا گیا ہے۔ ان کے بے ڈھنگے نقشے  
(قب Mappae Arabica : Miller)، انہیں [یعنی مذکورہ  
بالا شہروں کو] جنوبی البطیحة سے ملحق نہیں دکھاتے  
اور نہ ان سے کسی بستی یا کھیت کا پتا چلتا ہے۔  
بایں ہمہ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی  
کے ماخذ میں وثوق سے یہ کہا گیا ہے کہ دریائے  
فرات کا پانی واسط اور بصرے کے درمیان البطیحة  
میں داخل ہو جاتا تھا (المسعودی: مروج، ۱:  
۲۱۵؛ سہراب، ص ۱۱۸)۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا  
ہے کہ دریائے فرات کا موجودہ زیرین خطہ چھٹی  
صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی تک بطائح  
سے گھرا ہوا تھا یعنی جس زمانے میں ماخذ کے  
بیان کے مطابق مظاہرہ میں زیریں دریائے فرات کا  
دریائے دجلہ سے اتصال ہوتا تھا (یاقوت، ۲: ۵۵۳)۔  
یہ کیفیت لازمی طور پر شنافیہ کے نشیب میں، جو  
اس وقت یقیناً زیادہ گہرا ہو گا، پانی کے بہاؤ اور  
نکاس کی تبدیلیوں سے، نیز دریا کے پانی میں کمی  
آجانے اور اس کی تہ میں گد جم جانے سے پیدا ہونی  
ہو گی۔ اس کا باعث وہ متعدد نہریں تھیں جن کے  
ذریعے دریائے فرات کا پانی شمالی اور وسطی بابل  
کو سیراب کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا (قب  
لسٹرینج، ص ۷۵ بعد)۔

آثار قدیمہ کے ماہروں نے بیان کی ہے وہ خاصی صحیح ہے۔ دریائے فرات کی بڑی دھار بابل، حلب اور دیوانیہ کے بیچ میں سے گذرتی تھی۔ متعدد شاخیں اور نہریں اس دھار سے جدا ہو جاتی تھیں جن میں سے بہت سی الکاربیم کے قریب دوبارہ اس میں مل جاتی تھیں جو دریا کے ڈیلٹا کے سرے پر واقع تھا۔ سیلابوں کے موسم میں پانی تقریباً تیس میل لمبے علاقے میں پھیل جاتا تھا، دس سے چودہ میل تک بڑی شاخ کے مغرب میں اور اس سے بہت زیادہ دور تک مشرقی سمت میں۔ اس الٹے بہاؤ سے معلوم کی دلدلوں کی تشکیل ہوتی ہے۔ تیس سال کے بعد دریائے فرات کے پانی کا بیشتر حصہ مغربی ہندیہ نہر میں سے گذرتا تھا جو سترھویں صدی میں [اودھ (ہندوستان) کے نواب] آصف الدولہ نے کھدوائی تھی۔ یہ زیادہ جنوب کی طرف میدانوں میں جا کر نکلتی اور پایاب بحر النجف اور شنافیہ نامی دلدلوں کی تخلیق کرتی تھی، جو ۱۹۱۱ء میں ہندیہ بند (barrage) کی تعمیر کے بعد بھی باقی رہیں، جس کا مقصد حلبہ کی شاخ کے پانی میں اضافہ کرنا تھا۔ یہ دلدلیں ایک وسیع نشیب میں واقع ہیں جس کا دہانہ نسبتاً زیادہ کشادہ ہے اور جو تقریباً چالیس میل (= ۶۵ کیلومیٹر) لمبا اور پندرہ میل (= ۲۵ کیلومیٹر) چوڑا ہے۔ سیلاب کے پانی کی گہرائی مختلف ہے، یعنی شمال میں چند سینٹی میٹر سے لیکر وسط میں دو سے تین میٹر تک۔ اس میں سے کئی چھوٹے خوروں کی شاخیں نکلتی ہیں: مشرق میں العوجہ، الوریجی، ابن نجم، العنصرہ، ابو غربال، الرماح، الہوا اور ابو ججر کے خور ہیں؛ شامیہ شاخ کے مغرب میں غادودی، رغیلہ، کلیبی، ابوجلانہ، زیادہ اور حویجہ کے خور واقع ہیں؛ کوفی شاخ کے قریب طبگ، غزالات، اور صلیب کے اخوار ہیں، ان خوروں کے رقبے سیلاب کے بعد سمٹ

کے مطابق بدلتا رہتا تھا۔ اگرچہ ان تغیرات کی ابھی تک بالتفصیل چہان بین نہیں کی گئی، تاہم ان کا ایک سراغ چھٹی/بارہویں صدی میں یاقوت کے اس بیان سے مل سکتا ہے کہ واسط سے نیچے دریائے دجلہ پانچ شاخوں میں منقسم تھا اور یہ باہم دریائے فرات کے ساتھ مطارہ میں مل جاتی تھیں، جو بصرے سے ایک دن کی مسافت پر واقع تھا (۲: ۵۵۳)۔ اس میں شبہہ نہیں البطیحة سے گھری ہوئی زمینوں کا رقبہ سیلاب کے پانی کی روک تھام میں کمی بیشی اور شمال میں آب رسانی کے لیے پانی کے خرچ کی مقدار کے مطابق بدلتا رہتا تھا۔

اگرچہ البطیحة کی بیشتر زمینیں زیر آب تھیں تاہم اس میں بنجر زمین کے قطعات، مزرعہ زمینیں، شہر اور دیہات، نیز ندیاں اور نہریں موجود تھیں (المقدسی، ص ۱۱۹: السمعانی: انساب، بذیل مادہ البطائحی؛ ابن الاثیر، لباب، ۱: ۱۲۹)۔ ابن رستہ (ص ۹۵) کا بیان ہے کہ "نسباً اونچی جگہوں نے ان ٹیلوں کی شکل اختیار کر لی جو بطائح میں معروف ہیں اور سرطغان، طستغان اور اقرالسید کے ناموں سے موسوم ہیں۔ انہیں جگہوں میں زطّا رہتے ہیں"۔ المقدسی (ص ۱۳۴) البطیحة کو ایک ضلع (ناحیة) کہتا ہے، جس کا صدر مقام صلیق تھا اور دوسرے شہر جامدہ، ہرار، حدادیہ اور زبیدیہ تھے۔ ان میں سے بیشتر شہر واسط کے شمال مغرب میں تھے۔ یاقوت البطیحة کے شہروں کے طور پر حلبہ (الدیس) (۱: ۵۹۴ و ۲: ۳۲۳)، خشمیہ (۴: ۸۸۴)، ہرار (۴: ۹۷۰)، منصورہ (۴: ۶۶۴) اور بعض دوسری جگہوں کا ذکر کرتا ہے اور اس کے دریاؤں میں آبا، خرز، الزطّ (۲: ۹۳۰ و ۴: ۸۴۰) اور یما (۴: ۱۰۲۶) نامی نہروں کو شمار کرتا ہے۔ دریائے فرات کی مغربی دلدلوں کی جو کیفیت انیسویں صدی کے وسط کے قریب یورپی سیاحوں اور



جاتے ہیں اور زمین چاول کی کاشت کے لیے بہترین ثابت ہوتی ہے۔

بغداد کے جنوب میں دریائے دجلہ ایک سپاٹ میدان کے بیچ میں بہتا ہے اور اس کے کنارے اتنے اونچے نہیں ہیں کہ سیلاب کے پانی کا عظیم حجم ان کے اندر سما سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دریا کے دونوں طرف کئی شکاف اور مصنوعی کنارے (levees) پیدا ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے بہت سی دلدلیں بن جاتی ہیں۔ ان میں سے سب سے بڑی دلدل بغداد اور کوت [العمارة] کے درمیان خور شوہجہ ہے، جو دریائے دجلہ کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا تقریباً ۳۱ میل (پچاس کیلومیٹر) لمبا اور پندرہ میل (۲۵ کیلومیٹر) چوڑا ایک قدرتی نشیب ہے۔ اس خور میں پشتِ کوہ کے پہاڑی خطوں سے آنے والی متعدد چھوٹی ندیوں کا پانی گرتا ہے۔ خور حویشہ، جو نسبتاً کم چوڑی ہے، علیٰ الغریبی سے لے کر عمارہ تک پھیلا ہوا ہے۔ جہاں وہ خور سنائیہ کے قریب تک پہنچ جاتی ہے۔ عمارہ کے قریب دریائے دجلہ سے بہت سی شاخیں نکلتی ہیں، مثلاً مشرح، جحلہ (Cahla)، شیرہ۔ ان کا پانی عمارہ کے چاول کی کاشت کے رقبے میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، جہاں سیلاب کا پانی بڑی نالیوں کے ذریعے نکال کر دوسری اطراف میں لے جایا جاتا ہے۔ یہ شاخیں اپنے بنائے ہوئے خوروں کے باوجود بخوبی نمایاں ہیں اور خور تیزہ میں جا کر گرتی ہیں، جو خور حویزہ کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ان میں پانی ذوبِ برف اور طیب کے دریاؤں نیز انکرخہ (قدیم Choaspes) سے آتا ہے۔ ان اخوار میں تخمیناً ستر لاکھ مکعب انچ سالانہ پانی آتا ہے۔ موسم گرما میں یہ پانی متعدد نالیوں کے ذریعے، جو العزیر سے آگے تھوڑے فاصلے پر شروع ہوتی ہیں، دریائے دجلہ میں واپس چلا جاتا ہے۔

دریائے دجلہ کے داہنے کنارے پر کوت سے نیچے سب سے بڑا شکاف مصندق کا سیلابی قطعہ ہے۔ اس کا دھانہ ۴۵ میٹر چوڑا ہے، جو بہت جلد تقریباً ایک جھیل کی سی وسعت اختیار کر لیتا ہے اور بالآخر متعدد مقابلہ چھوٹی اور باب نالیوں میں شاخ وار تقسیم ہو کر خور السنیہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہ خور ایک عظیم قدرتی نشیب ہے، جو مصندق کے سیلابی قطعے اور کئی نسبتاً چھوٹے شکافوں کے علاوہ ان سیلابی نہروں کی بدولت پانی سے بھر جاتا ہے جو سیلاب کے دوران میں دریائے دجلہ کا پانی دیگر اطراف میں لے جاتی ہیں۔ اس پانی کا گزر بالترتیب بخاری، الدویمہ، جفافی شاہ علی، شائریہ اخوار، اور خور برہان، عودہ، صیرہ، سگال، رویدہ اور صفار سے ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ حمار ناسی گاؤں کے نزدیک حمار کی جھیل تک پہنچ جاتا ہے۔ دریائے دجلہ کے سیلاب کے پورے زور میں ۴۴ مربع میل (۱۱۰۰ مربع کیلومیٹر) سے زائد رقبے کو خور السنیہ زیر آب کر دیتی ہے۔ سیلاب کے ختم ہو جانے کے بعد اس کے پانی کا اخراج اس قلیل مقدار کے سوا جس کا پمپ سے سینچے ہوئے کھیتوں سے سطحی نکاس ہو جاتا ہے، خور السنیہ میں نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ انجذاب اور تبخیر کے عمل کی بدولت خور السنیہ کا رقبہ ۷۷ مربع میل (= ۲۰۰ مربع کیلومیٹر) سے بھی کم رہ جاتا ہے۔ حمار کی جھیل سب سے بڑا خور ہے، جو تقریباً ۲۰۰ مربع میل (۵۲۰۰ مربع کیلومیٹر) پر محیط ہے۔ اس کا پھیلاؤ سوق الشیوخ کے قریب دریائے فرات کے معاونین سے لے کر کرمہ علی تک (تقریباً ۸۰ میل = ۱۳۰ کیلومیٹر) ہے۔ اس کا جنوبی حصہ خور سناف کہلاتا ہے، جو دریائے فرات اور غراف سے پانی حاصل کرتا ہے۔ علاوہ ازیں مذکورہ بالا

متعدد اخوار کے ذریعے مُصنِّق سے بھی اس میں پانی آتا ہے۔ حمار کے رقبے میں جملہ منابع سے تقریباً ۲۵۴ مکعب میٹر فی سیکنڈ (cumecs) پانی آتا ہے۔ تبخیری اور انجذابی ضیاع تقریباً ۵۰۰ مکعب میٹر فی سیکنڈ ہے۔ خزاں کے آخر میں جھیل حمار کے کنارے کی موسمی سطح آب گر کر ۶ سے ۸ میٹر تک رہ جاتی ہے اور مئی یا جون میں سیلاب کا موسم ختم ہونے پر زیادہ سے زیادہ ۲۰ سے ۲۰۸ میٹر تک پہنچ جاتی ہے۔ سطح آب گرنے پر اس کا تقریباً دو تہائی رقبہ جھیل اور دلدل پر مشتمل ہوتا ہے، جس میں پانی کے چند پھیلے ہوئے قطعات ہوتے ہیں، جہاں نرکلوں کے بیج میں سے گزرتی ہوئی پتلی پتلی نالیوں کا ایک جال سا پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔ زیادہ گہری نالیاں (ایک سے دو میٹر تک) بالعموم شمال سے جنوب یا شمال مغرب سے جنوب مشرق کی سمت میں جاتی ہیں۔ یہاں نرکلوں کے بیج میں گہرے پانی کے پیچدار راستے (= گواہین) بھی پائے جاتے ہیں، جو بعض جگہ صرف چند گز چوڑے ہونے کے باوجود اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ ان میں کشتی چلائی جا سکتی ہے۔

جزیرہ سلایل کے قریب واقع جزیروں کے گرد چند بہت گہرے آبی راستے (۱۰ تا ۲۰ میٹر) پائے جاتے ہیں۔ جنوبی حصوں میں مد و جزر کا اثر محسوس کیا جاتا ہے۔ پایاب رقبے بہت سے ہیں۔ حمار کے جنوبی کناروں کی زمین بنجر اور غیر آباد ہے، جو ہر سال جھیل میں آنے والے سیلاب کی زد میں رہتی ہے۔

ایک دشوار گزار علاقہ ہونے کی وجہ سے البطیحة در قسم کے رھزوں اور باغیوں کے چھینے کی جگہ اور سرکش لوگوں کی جائے پناہ تھی۔

الحجاج نے زط [رک باں] (= جاٹ) قوم کے جن افراد کو ان کی بے شمار بھینسوں کے ریوڑوں کے ہمراہ

دلدلوں میں لا کر آباد کر دیا تھا وہ بنو عباس کے اوائل عہد میں بعض دوسرے موالی کے ساتھ مل کر رھزنی اور لوٹ مار کرنے اور بلاد جنوب سے تجارت اور آمد و رفت میں خلل انداز ہونے کی وجہ سے عراق کے لیے پریشانی اور تکلیف کا باعث بن گئے تھے۔ ان کا اثر المأمون کے زمانے میں زیادہ شدت سے محسوس کیا گیا۔ خلیفہ المعتصم بڑی سخت کوششوں کے بعد انہیں زیر کرنے اور شام کے شمالی سرحدی علاقوں میں منتقل کرنے میں کامیاب ہو سکا (البلاذری، ص ۱۷۱ تا ۳۷۵؛ الطبری، ۳: ۱۰۳۳ تا ۱۰۳۵، ۱۱۶۷ تا ۱۱۷۰؛ المسعودی: تنبیہ، ص ۳۵۵)۔ نہر الزط انہیں کے نام سے موسوم ہے (یاقوت، ۴: ۸۴۰)۔

زنج (رک باں) کا بڑا خروج ان سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ انہوں نے علی بن محمد (رک باں) کی قیادت میں بصرے کے قریب ایک زبردست بغاوت (۵۲۵۵/۵۸۶۹ تا ۵۲۷۰/۵۸۸۳) برپا کر دی اور کئی سال تک البطیحة پر مسلط رہے (الطبری، ۳: ۱۷۳۲ بعد؛ Nöldeke: Sketches from Eastern History، ص ۱۳۶ تا ۱۷۵؛ الف۔ السامر: ثورة الزنج، بغداد ۱۹۵۲ء)۔

آئندہ صدیوں میں بنو شاہین (رک بہ عمران بن شاہین) اور ان کے بعد بنو مظفر (رک باں) نے دلدلی علاقوں میں کم و بیش ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی، جس میں آگے چل کر بنو مزید (رک باں) بھی ان کے شریک حکومت رہے۔ بنو مزید نے ۵۴۰۳ سے ۵۴۳۸ تک جملہ میں حکومت کی اور ان کے زوال کے بعد بنو المنتفق نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا، لیکن ۵۶۱۷/۱۲۲۰ء میں خلیفہ الناصر ان کے زعماء، یعنی بنو معروف کا خاتمہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

جب مغولوں نے عراق فتح کیا (۵۶۵۶/



یا [عربوں کے ہاں] الصَّبَاءِ ہیں، یعنی قرونِ وسطیٰ کے مَغْتَسِلَةَ (قَبِ ابنِ النَّدِيمِ، ص ۳۳۰؛ المَسْعُودِي: تَنْبِيْه، ص ۱۶۱)۔ یہ الصَّبَاءِ ابھی تک دلدلوں کے اندر بعض مقامات میں باقی ہیں، مثلاً سُوْق الشُّيُوخ، قَلْعَةُ الصَّالِحِ اور خُور الحُوَيْزَه (حُوَيْزَة) میں، جہاں حُوَيْزَة کا شہر ان کا بڑا مرکز ہے (قَبِ Drower، در مآخذ)۔

بہر حال یہاں کچھ عرب آباد ہو گئے تھے۔ ابنِ رَسْتَه کا بیان ہے کہ [بنو] يَشْكُر، باهلة اور بنو العنبر البطيحة کی تشکیل سے پہلے اس کے قریب رہتے تھے۔ البلاذري باہلی موالی کا ذکر کرتا ہے، جو المأمون کے وقت میں زط کے برپا کردہ فسادات میں ان کے شریک ہو گئے تھے۔ الطبري (۳: ۱۸۵۸، ۱۸۹۸، ۱۹۰۳) بعض باہلیوں کا ذکر کرتا ہے، جو تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی میں زنگیوں (= زنج) کی سرگرمیوں میں شریک ہو گئے تھے۔ وہ البطيحة میں بنو عجل کی موجودگی کا ذکر بھی کرتا ہے (۳: ۱۷۵۹)۔ بنو مزید کا تسلط یقیناً بنو آسد (رك بآن) کے یہاں آباد ہونے کا باعث ہوا ہو گا، یہاں تک کہ الناصر نے ان کا خاتمہ کر دیا۔ ابن خلدون بنو ربيعة کے متعلق یہ کہتا ہے کہ وہ اس علاقے پر قابض ہیں (۶: ۱۲)، جس سے اس کی مراد غالباً بنو منتفق (رك بآن) ہیں۔ ابن بطوطة نے خفاجة اور معادی کا ذکر کیا ہے (۲: ۳۰۲)۔

موجودہ باشندوں کا بیشتر حصہ عرب نسل کے نیم خانہ بدوشوں اور کسانوں پر مشتمل ہے، جو قبائلی بنیادوں پر منظم ہیں۔ چند سنیوں کے سوا، جن میں سب سے زیادہ مقتدر سعدون خاندان کے لوگ ہیں، وہ سب شیعی ہیں۔

ان عرب قبیلوں میں اہم ترین قبیلے، جو بجائے خود بہت سے چھوٹے گروہوں میں منقسم ہیں،

[۱۲۵۸ع] تو البطيحة کا علاقہ ان کے ہاتھ لگ گیا، لیکن عرب قبائل کی طرف سے برابر شورشیں ہوتی رہیں۔ اس وقت سے یہ علاقہ الجزائر یا الجوازر کے نام سے موسوم رہا۔ ۵۷۹۵ھ/ [۱۳۹۲ع] میں اسے تیمور نے اور ۵۸۲۶ھ/ ۱۴۲۳ع میں اویس الجلائری نے فتح کیا۔ ۵۸۳۳ھ میں اسے بنو مشعشع (رك بآن) نے فتح کیا، جو یہاں ۵۹۵۳ تک حکومت کرتے رہے۔ پھر سلطان سلیمان نے اس پر قبضہ کر لیا، مگر اس علاقے پر ترکی حکومت کی گرفت مستحکم نہ تھی، چنانچہ وہ یہاں کی مختلف قبائلی ریاستوں کو ختم کرنے میں ناکام رہی، مثلاً آل علیان حمار پر حکومت کرتے رہے، یہاں تک کہ ۵۹۷۵ھ میں انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا؛ علیٰ ہذا بنو لام دریائے دجلہ کے جنوبی علاقے پر قابض رہے تا آنکہ ابو محمد ان کے مقابلے پر آ گیا اور یوں ترکوں کو ان پر قابو پا لینے کا موقع مل گیا۔ بنو منتفق نے دریائے فرات کے جنوبی علاقے پر حکومت کی، لیکن ۱۸۶۱ع میں مدحت پاشا یہاں والی بغداد کی نگرانی میں ایک "متصرفیہ" قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا (Four : Longrigg : *Centuries of Modern Iraq*، اوکسفرڈ؛ العزاوی: *العراق بین احتلالین ۸ جلدیں، بغداد ۱۹۳۷* تا ۱۹۵۷ع؛ *The Anthropology of Iraq* : Field، در *Field Museum of Natural History*، ج ۳۰، حصہ اول، شماره ۲، ۱۹۳۹ع)۔

بابل کی آرامی الاصل (اور عیسائی) آبادی کی بڑی تعداد (بقول عرب مصنفین نبطی) بہت عرصے تک البطائح میں باقی رہی، جس کی وجہ سے بہت سے مآخذ میں انہیں نبط کی دلدلیں ("بطائح النبط") کہا گیا ہے (لسان العرب، ۳: ۲۳۷؛ نیز قَبِ المَسْعُودِي: تَنْبِيْه، ص ۱۶۱؛ بسکویہ ۳: ۲۰۹؛ المقدسی، ص ۱۲۸)۔ غالباً ایک اور بقیہ آبادی المنديان (Mandaeans)

(۱) بنو لام: سولہویں صدی عیسوی میں یہ لوگ اتنے قوی تھے کہ دریائے دجلہ کے علاقوں پر حویزہ سے لے کر شمال میں بغداد کے مضافات تک اور مشرق میں پشتِ کوہ کی بیرونی پہاڑیوں تک مشرق میں انکی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں گوت العمارۃ ان کے شیخ کی جائے سکونت تھا، لیکن انیسویں صدی کے دوران میں ان کا علاقہ اور اقتدار کم ہو گیا اور دریائے دجلہ کے مشرق اور عمارۃ کے شمالی علاقوں تک محدود رہ گیا۔ اس قبیلے کے لوگ بھیڑیں پالتے ہیں اور ابھی تک بدوی ہیں۔

(۲) ابو (= ابو = آل ابی) محمد: یہ لوگ بھی دریائے دجلہ کے مشرق میں چحلہ Cahla کے کناروں اور اس کے بڑے معاونوں کے نزدیک رہتے ہیں، جہاں وہ دس پشت پہلے آباد ہوئے تھے اور اس وقت سے دریائے دجلہ کے دونوں طرف عمارۃ اور عزیز کے درمیان نہروں اور دلدلوں پر پھیل چکے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر کاشتکار ہیں، لیکن ان میں سے بعض دلدلوں میں بھی رہتے ہیں اور ان کا پیشہ بھینسین پالنا اور نرکل کی چٹائیاں بنانا ہے۔

(۳) ربیعہ: دریائے دجلہ کے مغرب میں آباد ہیں۔ ان کی ایک شاخ المیاح الغراف کے ساتھ ساتھ شطرة تک پھیل گئی ہے۔ ان کا مرکزی مقام حی ہے۔

(۴) زبید: دریائے دجلہ کے مغرب میں آباد ہیں۔ ان کا علاقہ شمال میں بغداد اور جنوب مشرق میں کوت الحی کے درمیان واقع ہے۔ جنوب کی طرف ان کا علاقہ الخزاعل کی زمین سے ملحق ہے۔

(۵) الخزاعل: بنو زبید کے جنوب مغرب میں آباد ہیں۔ یہ کفل اور نقر کے کھنڈروں کے درمیانی ضلع سے لے کر الدبوانیہ کے جنوب تک آباد

ہیں، جہاں ان کی سرحد بنو المنتفق کے علاقے سے مل جاتی ہے [دیکھیے معجم القبائل العرب، ۱: ۳۴]۔  
(۶) المنتفق: قبائل کا ایک ڈھیلا ڈھالا سا وفاق۔ اس کی قیادت بنو سعدوں کے سپرد ہے، جو پندرہویں صدی میں حجاز سے آئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف زبیر فرات کے قبائل کو مطیع کر لیا بلکہ بعض اوقات ان کا دائرہ اقتدار بصرے تک پھیلتا رہا۔ ان لوگوں کی نیم خود مختار حکومت ۱۸۶۱ء تک برقرار رہی جبکہ مدحت پاشا نے ان کے اقتدار کا خاتمہ کر کے ناصریتہ میں ایک متصرفیہ قائم کر دی۔ بنو المنتفق تین بڑے گروہوں میں منقسم ہیں: (۱) الآجود، جو ذراچی سے سوق الشیوخ تک اور الغراف کے زبیر حصوں میں آباد ہیں؛ (۲) بنو مالک، جو الحمار کے کناروں پر رہتے ہیں؛ (۳) بنو سعید، جو کرہ بنی سعید کے قریب رہتے ہیں۔

(۷) الجزائر: یہ جوازیر بھی کہلاتے ہیں۔ ان سے مراد دلدلی زمینیں ہیں (بخلاف شامیہ، جس سے مراد خشک ریگستانی زمین ہے)۔ اس اصطلاح سے ان قبائل کا ایک وفاق موسوم ہے جن کا ذکر بیسویں صدی تک مغول اور ترکی مآخذ میں بار بار آتا ہے۔ ان کا علاقہ ریاست مشعشع کا ایک جزو تھا (العزّاوی: تاریخ، ۳: ۱۱۲، ۱۷۴، ۲۷۲)؛ پھر العلیان کا حصہ رہا (العزّاوی، ۴: ۱۰۷)؛ اسے ترکوں نے فتح کیا (العزّاوی، ۴: ۵۰، بحوالہ مرآة الکائنات، ص ۱۲۷؛ اولیا چلبی، ۴: ۴۱۴)؛ بعض اوقات یہ ایرانیوں اور بنو المنتفق کے ماتحت بھی رہا، یہاں تک کہ مدحت پاشا کے وقت میں یہ قطعی طور پر ترکان عثمانی کے تصرف میں آ گیا، جنہوں نے اس کی بعض زمینوں کو دوبارہ زیر کاشت لانے کی کوشش کی (الزور، ص ۵۶۸)۔ الجزائر کے قبائل نے اپنا ایک وفاق قائم کیا تھا، جو مندرجہ ذیل



ایک ذریعہ نرکل ہیں، جو ہر قسم کے گھریلو کاموں میں استعمال ہوتے ہیں اور جو قدیم زمانے سے لکھنے کے قلم بنانے کے لیے بکثرت مستعمل رہے ہیں (دیکھیے OLZ ۹ : ۱۹۰)۔ قرونِ وسطیٰ میں واسط کی نرکلی قلمیں اور انیسویں صدی عیسوی میں دزفولی کی قلمیں سارے بلادِ مشرق میں بہترین سمجھی جاتی تھیں (قَب Les Calligraphes : Cl. Huart، et les miniaturistes de l'Orient Musulm. ۱۹۰۸ء، ص ۱۳)، یہاں تک کہ موجودہ وقت میں بھی پچاس سے ستر ہزار ٹن نرکل ہر سال چبایش کے مضافات میں کاٹے جاتے ہیں (Tams، ص ۶۰)۔

ہزید برآں یہاں مچھلیاں بہت کثرت سے ہیں، جن کی بدولت نہ صرف مقامی باشندوں کو مسلسل خوراک ملتی رہتی ہے بلکہ یہ دیگر اضلاع میں برآمد بھی ہوتی ہیں۔ ابنِ رستہ (ص ۹۴) قرونِ وسطیٰ میں بطیحة کے نرکلوں اور مچھلیوں کی پیداوار کی اہمیت کا ذکر کرتا ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ علاقہ ہر سال تقریباً دو ہزار ٹن مچھلیاں فراہم کرتا ہے، جس کے لیے تقریباً پانچ سو ماہی گیر مصروف کار رہتے ہیں۔

عمارة کے جنوب میں اور الحمار کی دلدلوں میں رہنے والوں کے لیے بھینسیں دولت کمانے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ ان کے دودھ سے حاصل کیا ہوا مکھن قرب و جوار کے شہروں اور بغداد میں بھیجا جاتا ہے۔ معمولی تعداد میں بھیڑیں بھی پالی جاتی ہیں (خاص طور پر قرۃ میں)۔

جہاں تک کہ بطیحة میں پائے جانے والے باقی جانوروں کا تعلق ہے، ان میں ہر قسم کے آبی پرندے بکثرت ہیں، مثلاً مرغایاں (gull)، بڑی مرغایاں (wild ducks)، بطخیں، راج ہنس وغیرہ۔ علاوہ ازیں کلنگ، حواصل، لم ڈھنگ، لق لقی، تغدار اور بگلے بھی جھنڈوں کی شکل میں

قبائل پر مشتمل تھا : (۱) بنوآسد (رکبآن)، جو سوق الشیوخ اور قرۃ کے درمیان بس گئے تھے اور ان کا مرکز چبایش (Cabayish) تھا؛ (۲) الحسینی؛ (۳) بنو حطیط، حمار میں؛ (۴) عباده، سوق الشیوخ اور چبایش کے درمیان (قَب ابن خلدون، ۲ : ۳۱۰ تا ۳۱۲)؛ (۵) بنو منصور، جو قرۃ کے قریب آباد تھے۔ (۸) المعدان : یہ غالباً وہی معادی ہیں جن کے بارے میں ابن بطوطہ نے کہا ہے کہ وہ کوفے اور واسط کے درمیان رہتے تھے (ج ۲) : Loftus (ص ۱۲۰ تا ۱۲۲) نے ان کی ابتدائی معاشرت اور ان کے ماحول کی کیفیت بیان کی ہے۔ وہ دلدلوں میں رہتے ہیں، ادنی پیمانے پر ایک قبیلے کی شکل میں منظم ہیں اور اجتماعی طور پر ان میں کوئی اتحاد نہیں ہے۔ یہ لوگ مچھلیاں پکڑتے، نرکل چنتے اور بھینسیں پالتے ہیں۔ دوسرے عرب انہیں ان کے پیشے اور ان کے اخلاقی معیار کی بنا پر، جو بادیہ نشینوں کے اخلاقی معیار سے قدرے مختلف ہے، حقارت سے دیکھتے ہیں۔

دلدلوں میں رہنے والوں کی آبادیاں بالعموم ایسے ہموار ٹیلوں اور جزیروں پر ہیں جو ہر سال آنے والے سیلابوں سے مکمل طور پر زیر آب نہیں ہوتے۔ بعض دفعہ یہ بستیاں دیہات کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ دیہات لمبی لمبی جھونپڑیوں پر مشتمل ہوتے ہیں، جو نرکلوں اور نرکل کی چٹائیوں سے بنائی جاتی ہیں (Thesiger : کتاب مذکور؛ شاکر سلیم الجبایش، ۱ : ۲۳ تا ۲۴، بغداد ۱۹۵۷ء، نیز قَب Nöldeke در WZKM ۱۶ : ۱۹۸، حاشیہ ۱)۔

دلدلوں کی سب سے اہم پیداوار چاول ہے۔ علاوہ ازیں جو، زرد مکئی، چینا (sorghum)، مسور، خربزے، تربوز، اور کسی قدر بھنڈی (بامیہ) اور پیاز کی فصلیں بھی ہوتی ہیں۔ سرکاری آمدنی کا

ملتے ہیں۔ بعض گوشت خور جانور بھی پائے جاتے ہیں۔ قدیم زمانے اور قرونِ وسطیٰ میں یہاں شیر بہر پایا جاتا تھا اور اس کا ذکر آخری بار انیسویں صدی میں ملتا ہے (Loftus، کتاب مذکور، ص ۲۴۲)۔ ان کے علاوہ یہاں کچھ چیتے، گیدڑ، بھیرے، سیاہ گوش (بن بلاؤ) اور جنگلی بلیاں بھی اپنے بھٹوں میں رہتی ہیں۔ جنگلی سور (suscrofa) بڑے بڑے گلوں میں ملتے ہیں اور دلدلوں میں لوٹ نکلتے رہتے ہیں۔

لاتعداد مچھروں اور بھنگوں کے دل بادل بجائے خود ایک خوفناک آزار ہیں اور یہاں کے مخصوص علاقائی امراض، مثلاً موسمی بخار (malaria)، کا باعث بنتے رہے ہیں۔ اس ضلع کے انحطاط میں اس کا بھی لازمی طور پر بڑا عمل دخل رہا ہے۔

• آخذ: جغرافیہ و تاریخ پر: (۱) BGA، بمواقع کثیرہ، بالخصوص ۶: ۲۳۳، ۲۳۶، ۲۴۰، بعد (قدامة) و ۹۴: بعد، ۱۸۶ (ابن رسته)؛ (۲) البلاذری، ص ۲۹۲ تا ۲۹۴؛ (۳) سہراب: صورۃ الاقالیم السبعة، طبع Mzik، ص ۱۲۶، ۱۳۶؛ (۴) المسعودی: مروج، ۱: ۲۴۴، بعد؛ (۵) الماوردی: کتاب الاحکام السلطانیة، طبع R. Enger، بون ۱۸۵۳ء، ص ۳۱۱، بعد؛ (۶) یاقوت، ۱: ۶۶۸، بعد (بلد اشاریہ)؛ (۷) مرآئد الاطلاع، طبع Juynboll، لائڈن، ۱۸۵۰ء، ۱: ۱۶۰ تا ۱۶۱ و ۴: ۳۳۳، ۳۳۸ (Juynboll کا حاشیہ)؛ (۸) ابوالفداء: تنویر، ص ۳۳، ۵۱؛ (۹) ابن بطوطة: Travels، طبع Defrémery، مطبوعہ پیرس، ص ۲۹۶؛ (۱۰) M. Streck: Babylonien nach den Arab. Geographen، ۲ جلدیں؛ (۱۱) Le Strange، ص ۲۶ تا ۲۹، ۴۰ تا ۴۳؛ (۱۲) De Morgan: Délégation en Perse, Mémoires، پیرس، ۱۹۰۰ء؛ (۱۳) Woolley: Ur of the Chaldees، ۱۹۳۸ء؛ (۱۴) Seton Lloyd: Twin Rivers، اوکسفرڈ، ۱۹۳۴ء؛ (۱۵) G. M. Lee و N. L. Falcon: The

، *Geographical History of the Mesopotamian Plains* در *Geographical Journal*، ۱۱۸: ۲۴ تا ۳۹ و ۱۲۲: ۳۹۹ تا ۴۰۱ و ۱۲۰: ۳۹۴ تا ۳۸۷۔  
موجودہ حالات پر: (۱۶) W. F. Ainsworth: *A personal narrative of the Euphrates*، لنڈن ۱۸۵۷ء؛ (۱۷) *Researches in Assyria, Babylonia and Chaldea*، لنڈن ۱۸۳۸ء؛ (۱۸) W. K. Loftus: *Travels and Researches in Chaldea and Susiana* نیویارک ۱۸۵۷ء؛ (۱۹) J. B. Fraser: *Travels in Koordistan and Mesopotamia*، لنڈن ۱۸۸۰ء؛ (۲۰) *The Expedition of the Survey*، لنڈن ۱۸۵۰ء؛ (۲۱) W. Willcocks: *Irrigation of Meso-potamia*، لنڈن ۱۹۱۷ء؛ (۲۲) M. G. Ionides: *The Regime of the Rivers Euphrates and Tigris*، لنڈن ۱۹۳۷ء؛ (۲۳) Thesiger: *The Marshes of Southern Iraq*، در *Geographical Journal*، ج ۱۲۲، شماره ۳، ۱۹۵۴ء؛ (۲۴) A. N. Sussa: *سوسہ فی ریّ العراق*، ۲ جلدیں، بغداد ۱۹۴۵ء؛ (۲۵) وہی مصنف: *تطور ریّ العراق*، ۱۹۴۶ء؛ (۲۶) وہی مصنف: *خزن خور الشویجة*، مطبوعہ بغداد؛ (۲۷) *Tigris Irrigation*، بغداد ۱۹۵۲ء؛ (۲۸) Abbett و Tippetts: *Department Study of the Lower Tigris*، بغداد ۱۹۵۸ء۔  
باشندوں پر: (۲۹) Von Kremer: *SBAK*، در *Wien*، ۱۸۵۰ء، ص ۲۵۰ تا ۲۵۴؛ (۳۰) Chiha: *La Province de Baghdad*، قاہرہ ۱۹۰۸ء؛ (۳۱) Sprenger: *ZDMG*، ۱۷: ۲۲۳، بعد؛ (۳۲) Freiherr: *Vom Mittelmeer zum Persischen*، von Oppenheim، ۲: ۶۷ تا ۷۶؛ (۳۳) وہی مصنف: *Die Beduinen*، Wiesbaden ۱۹۵۲ء، ج ۳؛ (۳۴) H. Field: *Anthropology of Iraq*، حصہ ۱، شماره ۲، ۱۹۴۹ء؛ (۳۵) عباس العزّاوی: *عشائر العراق*، ج ۳ و ۴، بغداد



[الوس]

مآخذ: (۱) ابن ہشام، ص ۳۸۵ تا ۳۸۷، ۵۵۱ تا ۵۵۳؛ (۲) ابن سعد، ۲/۳: ۹۸ تا ۲۹۹؛ (۳) باقوت، ۱: ۶۷۰ تا ۶۷۱؛ (۴) Medina vor: Wellhausen؛ (۵) dem Islam، در Skizzen، ۳: ۲۷ تا ۳۶، ۵۲ تا ۶۳، جس نے ابن الاثیر، الآغانی اور الحماسة سے اقتباسات دیے ہیں؛ (۶) Die geschichte Medinas: Wüstenfeld؛ (۷) (= السمهودی)، در Abl, Gött. Gesell. Wiss.؛ (۸) W. Montgomery Watt؛ (۹) ۵۰ تا ۵۳؛ (۱۰) Muhammad at Medina، آوکسفرڈ ۱۹۵۶ء، ص ۱۵۶ تا ۱۵۸۔

(C. E. BOSWORTH)

بَعَث: [(ع)، بَعَث، يَبْعَث، بَعَثًا، بمعنى (۱) \*] (۱) بھیجنا، روانہ کرنا؛ (۲) نبی یا رسول مبعوث کرنا؛ (۳) برپا کرنا۔ (۴) خواہیدہ شخص کو بیدار کرنا؛ (۵) مسلط کرنا، (۶) اللہ تعالیٰ کا مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا۔ اس مقالے میں بحث آخری زاویہ نگاہ سے ہو گی۔ بَعَث بمعنی لشکر بھی مستعمل ہے (لسان العرب، بذیل مادہ)۔ بعثت رسالت و نبوت کے لیے رَکَ بہ نبی۔

اسلامی عقائد میں آخرت (رَکَ بَأَن) کا عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور اس عقیدے کی ایک اہم کڑی بَعَث بَعْدَ الْمَوْتِ، یعنی مرنے کے بعد قیامت کے دن مردوں کا دوبارہ جی اٹھنا ہے اور بعث بعد الموت کا عقیدہ اجزائے ایمان میں شامل ہے۔ مشہور حدیث ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ . . . . . وَابْعَثَ بَعْدَ الْمَوْتِ (= یہ کہ تو) منجملہ دیگر عقائد کے) مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر ایمان رکھے۔ البخاری: الصحيح، کتاب ۴، باب ۳۷، سؤال جبریل النبی صلی اللہ علیہ وسلم؛

۱۹۰۰ء؛ (۳۶) Thesiger: کتاب مذکور؛ (۳۷) The Mandaean: Drower، آوکسفرڈ ۱۹۳۸ء؛ (۳۸) محمد الباقر الجلالی: موجز تاریخ عشائر العمارة، بغداد ۱۹۴۷ء؛ (۳۹) عبدالجبار فارس: عمان فی الفرات الأوسط، نجف [۱۳۵۳ھ]؛ (۴۰) S.W. Hellbusch؛ (۴۱) Die Kultur der Ma'dan in Gegenwart und Vergangenheit، در Sümer، ج ۱۲، ۱۹۵۵ء؛ (۴۲) شاکر سلیم: الجبایش، ۲ جلدیں، بغداد ۱۹۵۷ء؛ (۴۳) عمر رضا کحالیہ: معجم قبائل العرب]۔

(M. STRECK و صالح علی)

بَطَيْن: رَکَ بہ علم نجوم۔

بَعَاث: وہ مقام جہاں تقریباً ۶۱۷ء میں مدینے کے دو قبیلوں اوس اور خزرج [رَکَ بَأَن] کے بیشتر کنبوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ یہ مقام نخلستان مدینہ کے جنوب مشرقی حصے میں بنو قریظہ کے علاقے میں واقع تھا۔ یہ جنگ اندرونی جھگڑوں کے ایک سلسلے کا آخری نتیجہ تھی۔ قبیلہ اوس کی حالت خراب ہو چکی تھی، لیکن اس کی طرف دو بڑے یہودی قبیلے قریظہ اور النضیر اور بدوی قبیلہ مزینہ شامل ہو گئے۔ ان کا سردار حَضِر بن سِماک تھا۔ اس کا مد مقابل سردار بِيَاضَة کا عمرو بن النعمان تھا، جس کے ساتھیوں میں بڑی تعداد تو خزرج کی تھی لیکن بنو جہینہ اور بنو اشجع کے کچھ بدوی بھی آملے تھے؛ تاہم عبداللہ بن ابی (رَکَ بَأَن) اور خزرج کے ایک اور سردار نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اوس کا ایک خاندان حارثہ بنی غیر جانب دار رہا۔ جنگ میں اول اول اوس کو پیچھے ہٹا دیا گیا تھا، لیکن انجام کار انہوں نے اپنے مخالفوں کو ہنگامہ دیا۔ اگرچہ دونوں طرف کے سرگروہ لڑائی میں ہلاک ہو گئے پھر بھی کوئی قطعی تصفیہ نہ ہو سکا بلکہ لڑائی کا خاتمہ ایک غیر تسلی بخش عارضی صلح پر ہوا [نیز رَکَ بہ ایام العرب (بالخصوص مآخذ)؛

احمد: مسند، عدد ۱۸۴)۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلام کا موقف یہ ہے کہ انسان جو عمل بھی اس دنیا میں کرتا ہے اس کا محاسبہ ہوگا۔ اس مقصد کے لیے آخرت تیار کی گئی ہے۔ نیکوں کو ان کے نیک اعمال کا صلہ دینے اور بڑوں کو ان کی برائی کی سزا دینے کے لیے آخرت کی زندگی مقرر کی گئی ہے۔ مرنے کے بعد زندگی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ ایک نئی زندگی کے آغاز کی طرح ڈالی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا: **وَالْمَوْتَىٰ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ ثُمَّ إِلَيْهِ يُرْجَعُونَ** (۶ [الانعام]: ۳۶)، یعنی اللہ تعالیٰ مردوں کو از سر نو زندہ کرے گا، پھر وہ اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

کفار دوبارہ جی اٹھنے (= بعث) اور محاسبے کا انکار کرتے تھے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کی قسم کھا کر تحدی سے فرمایا کہ ان لوگوں کو دوبارہ زندہ کر کے قبروں سے یقیناً اٹھایا جائے گا اور ان کے اعمال سے انہیں آگہ کیا جائے گا اور ایسا کرنا اللہ کے لیے آسان ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ملاحظہ ہو: **زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا ۗ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۗ وَذَلِكُمْ عَلَىٰ اللَّهِ يَسِيرٌ** (۶۴ [التغابن]: ۷)۔ قرآن مجید میں احيائے موتی، یعنی مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے کا کئی مرتبہ ذکر آیا ہے: **ثُمَّ يَبْعَثُكُمُ اللَّهُ فِي جَسَدٍ آخَرَ ۗ ثُمَّ يَحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ** (۲ [البقرہ]: ۲۸)، یعنی پھر وہ تمہیں مارے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا پھر تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ یہی بات سورۃ الحج (۲۲: ۶۶)، سورۃ الروم (۳۰: ۴۰) اور سورۃ الجاثیہ (۳۵: ۲۶) میں دہرائی گئی ہے۔ کفار تعجب سے پوچھتے تھے کہ ہم مر کر مٹی ہو جائیں گے اور ہڈیاں گل سڑ جائیں گی تو کیا ہم کو پھر از سر نو زندہ کر دیا جائے گا؟ کیا ہمارے

اگلے باپ داداؤں کو بھی دوبارہ زندہ کیا جائے گا؟ قرآن مجید نے جواب دیا: ہاں، بلکہ مستزاد یہ کہ تمہیں اس وقت اپنی کسرتوتوں کے باعث ذلت و رسوائی سے بھی دوچار ہونا پڑے گا: **إِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا ۖ أَنَا لِمَبْعُوثُونَ لَوْ ابْتَأْنَا الْأُولَىٰ ۗ قُلْ نَعَمْ ۗ وَأَنْتُمْ دَاخِرُونَ ۗ فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ فَإِذَا هُمْ يَنْظُرُونَ** (۳۷ [الصفہ]: ۱۶ تا ۱۹)۔ قرآن مجید میں اسی تصور کو الساعة اور القيامة کے الفاظ سے بھی ادا کیا گیا ہے: (۱) **إِنَّ السَّاعَةَ لَأْتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا** (۴۰ [المؤمن]: ۵۹)، یعنی قیامت ضرور آئی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں: (۲) **لِيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ** (۶ [الانعام]: ۱۲)، یعنی تمہیں قیامت کے دن تک کہ اس میں کوئی شک نہیں ضرور اکٹھا کر دے گا: (۳) **ثُمَّ إِنَّكُمْ مِنْهُ لَمَعِينُونَ ۗ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تَبْعَثُونَ** (۲۳ [المؤمنون]: ۱۵، ۱۶)، یعنی پھر تم کو مرنا ہے اور پھر تم کو قیامت کے دن دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ **مَالِكُ يَوْمَ الدِّينِ** (سورۃ الفاتحہ) اور **وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ** (۲ [البقرہ]: ۴) جزا و سزا کے دن کے مالک کا اقرار اور آخرت پر ایقان و ایمان اسی یوم البعث کا تصور محکم و مضبوط کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا گیا ہے کہ دوبارہ جی اٹھنے کا وقت کسی کو بھی معلوم نہیں اور اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے: **وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ** (۲۷ [النمل]: ۶۵)۔

اسلام کا شروع سے دعویٰ یہ رہا ہے کہ سارے انبیا ایک ہی دین کی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ جب کسی نبی کی تعلیم دنیا سے بالکل ناپید یا مسخ ہو جاتی تھی تو خدا اپنی لا محدود رحمت سے ایک نیا نبی مبعوث فرما دیتا تھا۔ ان حالات میں کوئی تعجب نہیں اگر حیات بعد الموت کا عقیدہ بعض



اور آواز دو، وہ فوراً چاروں سمتوں سے لپک کر اڑتے ہوئے حاضر ہو جائیں گے۔ انسانی روہیں بھی خدا کے لیے سدھائی ہوئی چڑیاں سمجھو (لسان العرب (۶: ۱۴۵) میں لکھا ہے کہ "نصرہن الیک" کے معنی، مانوس کرنے، سدھانے اور ہلالینے کے ہیں، اور کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بھی، بالخصوص جبکہ نصرہن پڑھیں)۔

بعث جسمانی ہوگا یا روحانی؟ بعض فلاسفہ صرف روح کے بعث کے قائل تھے اور یہ اس تصور پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ روح ایک لافانی چیز ہے؛ لیکن قرآنی تعلیم یہ ہے کہ کُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (۲۸) [القصاص]: ۸۸ = خدا کے سوا ہر چیز ہلاکت پذیر ہے۔ اس سے نہ روح مستثنیٰ ہے، نہ جنت و دوزخ اور نہ ملائکہ۔ ان حالات میں ہر وہ شخص جو فنا عالم کے بعد کائنات کی تخلیق جدید کا قائل ہو اس کے لیے روح کی بنا پر کوئی دشواری نہیں پیدا ہوتی، کیونکہ فنا شدہ روح کا دوبارہ وجود میں لایا جانا اتنا ہی مشکل (یا آسان) ہے جتنا فنا شدہ جسم کا۔ راہ خدا میں مارے جانے والوں کے متعلق قرآن مجید (۲) [البقرہ]: ۱۵۴: ۳ [ال عمران]: ۱۶۹ میں یہ ضرور بیان کیا ہے کہ وہ مرتے نہیں، لیکن اس کا تعلق تا قیام قیامت و ماقبل نفخ صور سے ہے: اس لیے ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

جسمانی حشر کے سلسلے میں قرآن مجید (۶۹) [الحاقة]: ۳۲ نے ستر ہاتھ لمبی بیڑی یا زنجیر کا ذکر کیا ہے۔ احادیث میں مختلف گناہکاروں کے قد و قامت کا ذکر ہے: کسی کے سر پر اونٹ سوار ہوگا، کسی کا دانت ہی احد پہاڑ کے برابر ہوگا۔ اس سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ حشر کے وقت موجودہ ہونے دو گز کا قد برقرار رہنا ضروری نہیں، البتہ یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ

دوسرے قدیم مذہبوں میں بھی ملتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ قدیم مصریوں کے ہاں جو روح اور نامہ اعمال کا تصور اور قدیم ایرانیوں میں پل صراط کا جو عقیدہ ملتا ہے، شاید اس کی تاویل کچھ اسی قسم کی ہو۔

اسلام سے قبل اہل مکہ خدا کے وجود کے تو قائل تھے، لیکن موت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے کو محال سمجھتے تھے (۳۶) [یس]: ۷۸: ۴۵ [الجاثیہ]: ۲۴: ۲۹ (النزعت): ۱۰ تا ۱۱: ۲۳ [المؤمنون]: ۳۵ تا ۳۷ وغیرہ)۔ قرآن مجید نے اپنی ساری تعلیم حتیٰ کہ معتقدات کو بھی چونکہ تفکر و تدبر پر مبنی کیا ہے اس لیے بعث کی تائید میں بھی دلیلیں دی ہیں۔ کبھی تو یہ کہا ہے کہ جس نے تمہیں عدم محض سے پیدا کیا اس کے لیے یہ کیا دشوار ہے کہ تمہیں ایک بار پھر زندہ کرے۔ کبھی یہ یاد دلایا کہ خدا مبدیٰ بھی ہے، معید بھی اور ایک مرتبہ خلق کرنے کے بعد بار بار (اولاد کی شکل میں) اس کا اعادہ بھی کرتا رہتا ہے۔ کبھی یہ بتایا کہ تاریخ انسانی میں بعض اوقات مردے زندہ بھی ہوتے رہے ہیں، مثلاً معجزۃ حضرت عیسیٰؑ، قصۃ اصحاب کہف، قصۃ حضرت عزیزؑ اور قصۃ حضرت موسیٰؑ و خضرؑ و حوت . . . اور کبھی یہ سمجھایا ہے کہ موت کو نیند پر قیاس کرو کہ دونوں میں ایک طرح کی مشابہت ہے، چنانچہ جب خدا نیند سے بیدار کر سکتا ہے تو موت سے بھی کر سکتا ہے۔

بعث و حشر کس طرح ہوگا؟ یہ سوال حضرت ابراہیمؑ نے بھی کیا تھا (۲) [البقرہ]: ۲۶۰۔ انہیں جو جواب ملا وہ دلچسپ بھی ہے اور بصیرت افزا بھی: چار پرندوں کو سدھاؤ۔ جب وہ خوب هل جائیں اور آواز پر لپک کہنے کے عادی ہو جائیں تو ہر ایک کو الگ الگ پہاڑی پر رکھو

جنت و دوزخ کے سارے تذکرے ایک آن دیکھی  
 جنت کے بہان اور تفصیلات پر مشتمل ہیں۔ موجودہ  
 دنیاوی ماحول سے باہر کی چیز سے ناواقف انسان  
 کو اس کا سمجھنا ٹیڑھی ٹھہیر ہے۔ جنت کے  
 حور و علمان، آرام و آسائش اور وہ ساری لذت آمیز  
 نعمیں ہار ہار اور تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔  
 تمام انسانوں کے لیے یہی انداز ضروری ہے،  
 لیکن ذہین آدمی کی تسکین کے لیے اور اسلوب  
 احتیاط، زبان، چنانچہ قرآن مجید میں جنت اور مستان  
 کا بیان ہے۔ ”وَرِضْوَانٍ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرَ“  
 (۱۰۰) (۲۳) [المؤمنون]: ”مِنَ وَرَائِهِم  
 بَرزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ“ کا ذکر ہے سیاق و سباق  
 سے اس کے معنی صرف یہ معلوم ہوتے ہیں کہ  
 مرنے کے بعد جب برے آدمیوں کو عذاب ہونے  
 لگے گا تو وہ التجا کریں گے کہ انہیں دوبارہ دنیا  
 میں بھیج دیا جائے تاکہ اب کی دفعہ وہ اچھے  
 کام کریں، لیکن یہ ممکن نہ ہوگا اور وہ یوم البعث  
 تک برزخ (رکّ بان) یعنی اس عالم میں رہیں گے جو  
 دنیا اور عقبیٰ کو جدا کرتا ہے۔

مرنے کے بعد عام طور پر انسان مٹی میں مل  
 جاتا ہے۔ بعض حدیثوں کے الفاظ سے بظاہر یہ  
 معلوم ہوتا ہے کہ ”عجب“ یعنی ریڑھ کی ہڈی کی  
 نیچے کی گانٹھ گل نہیں جاتی اور تخلیق جدید  
 کا آغاز اسی سے ہوگا [مسلم: الصحيح، کتاب ۵۲،  
 حدیث ۱۰۳۲، ۱۰۳۳؛ ابن الاثیر: النہایة، بذیل مادہ]۔  
 یہ افراد کی موت کا حال ہے۔

اجتماعی اور عمومی ہلاکت کے لیے ایک  
 خاص گھڑی مقرر ہے، مگر اس کا صحیح وقت  
 خدائی راز ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں  
 جانتا۔ حدیث میں ”اِشْرَاطُ سَاعَةٍ“ یعنی قیامت کے  
 قریب دنیا میں پیش آنے اور شاہد ہونے والے  
 متعدد واقعات کا ذکر ہے: ”رَكَ بِه دَابَّةٌ، نَجَّانٌ،  
 عِيسَى“۔ اس سے میں قرآن مجید [مخزن]:  
 ”مِنَ وَرَائِهِم بَرزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ“ کا  
 معنی سمجھتا ہوں ہے۔ اختتام عالم  
 کی خلاص صورت بنوکتے سے بنتی جائے گی۔ پھر جب  
 خدا کو منظور ہوگا تو پھر فتح صورت ہوگا  
 [اسراء: ۸۰؛ [اسراء: ۸۰] : ۸۰۔ : ۸۰۔  
 پر یہ بیعت و حشر کے لیے ہوگا۔ حدیث میں  
 مٹی مرنے کا نام حضرت رفیق ہے۔ قرآن  
 مجید میں ہے: ”وَجَاءَتْ سَاجِدًا لِلَّهِ يُخِيبُ  
 كَلِمَاتٍ هُتِفَ عَلَى الْمَوْتِمُوتِ“

پہلوئوں کی شکل میں جنت میں جا رہتی ہیں۔  
 ”وَرِضْوَانٍ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرَ“ کا ذکر ہے سیاق و سباق  
 سے اس کے معنی صرف یہ معلوم ہوتے ہیں کہ  
 مرنے کے بعد جب برے آدمیوں کو عذاب ہونے  
 لگے گا تو وہ التجا کریں گے کہ انہیں دوبارہ دنیا  
 میں بھیج دیا جائے تاکہ اب کی دفعہ وہ اچھے  
 کام کریں، لیکن یہ ممکن نہ ہوگا اور وہ یوم البعث  
 تک برزخ (رکّ بان) یعنی اس عالم میں رہیں گے جو  
 دنیا اور عقبیٰ کو جدا کرتا ہے۔

مرنے کے بعد عام طور پر انسان مٹی میں مل  
 جاتا ہے۔ بعض حدیثوں کے الفاظ سے بظاہر یہ  
 معلوم ہوتا ہے کہ ”عجب“ یعنی ریڑھ کی ہڈی کی  
 نیچے کی گانٹھ گل نہیں جاتی اور تخلیق جدید  
 کا آغاز اسی سے ہوگا [مسلم: الصحيح، کتاب ۵۲،  
 حدیث ۱۰۳۲، ۱۰۳۳؛ ابن الاثیر: النہایة، بذیل مادہ]۔  
 یہ افراد کی موت کا حال ہے۔

اجتماعی اور عمومی ہلاکت کے لیے ایک  
 خاص گھڑی مقرر ہے، مگر اس کا صحیح وقت  
 خدائی راز ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں  
 جانتا۔ حدیث میں ”اِشْرَاطُ سَاعَةٍ“ یعنی قیامت کے  
 قریب دنیا میں پیش آنے اور شاہد ہونے والے  
 متعدد واقعات کا ذکر ہے: ”رَكَ بِه دَابَّةٌ، نَجَّانٌ،  
 عِيسَى“۔ اس سے میں قرآن مجید [مخزن]:  
 ”مِنَ وَرَائِهِم بَرزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ“ کا  
 معنی سمجھتا ہوں ہے۔ اختتام عالم  
 کی خلاص صورت بنوکتے سے بنتی جائے گی۔ پھر جب  
 خدا کو منظور ہوگا تو پھر فتح صورت ہوگا  
 [اسراء: ۸۰؛ [اسراء: ۸۰] : ۸۰۔ : ۸۰۔  
 پر یہ بیعت و حشر کے لیے ہوگا۔ حدیث میں  
 مٹی مرنے کا نام حضرت رفیق ہے۔ قرآن  
 مجید میں ہے: ”وَجَاءَتْ سَاجِدًا لِلَّهِ يُخِيبُ  
 كَلِمَاتٍ هُتِفَ عَلَى الْمَوْتِمُوتِ“



اور ہم ہی وسعت دینے والے ہیں“ (۱۵) [الذّٰرِیَّتِ:] (۴۷) میں توسیع فضا اور نظریہ اضافیت کی - حدیث میں ذکر ہے کہ انسانوں وغیرہ کے بعد آخر میں شیطان کے مرنے کی باری آئے گی۔ وہ ہر طرف بھاگ کر چھپنے کی کوشش کرے گا، مگر یہ لا حاصل ہوگا۔

دوسرے صور، یعنی فنا کے بعد اعادے کی کیفیت بھی کچھ کم تفصیل سے قرآن مجید نے نہیں بیان کی ہے : ایک زجرہ (للكار یا ڈپٹ) پر مردے اسی طرح زندہ ہو جائیں گے، جس طرح سونے والے بیدار ہو جاتے ہیں (۳۷) [الصّٰفٰتِ:] ۱۹؛ ۷۹ [النّٰزِعٰتِ:] (۱۳)؛ قبریں کرید کر سارے مردے نکال لیے جائیں گے (۸۲) [الانفطّٰرِ:] ۱۰۰؛ ۱۰۱ [العُدّٰیّتِ:] (۹)؛ سارے لوگ اپنے بلانے والے کی طرف بے تحاشا دوڑیں گے (۱۴) [ابرهیم:] ۴۳؛ ۵۴ [القمر:] ۶ تا ۸؛ ۷۰ [المعارج:] (۴۳)؛ ہر جگہ سے گروہ اور ٹکڑیاں نکلیں گی (۷۸) [النبا:] ۱۸؛ ۹۹ [الزلزال:] (۶)؛ جو گویا بکھری ہوئی ٹڈیوں کی طرح ہوں گی (۵۴) [القمر:] (۷)؛ ایک نئی زمین، نیز نئے آسمان پیدا کیے جائیں گے (۱۴) [ابرهیم:] (۴۸) (اور ۱۱ [ہود:] ۱۰۷ تا ۱۰۸ کے مطابق یہ نئے زمین و آسمان ہمیشہ باقی رہیں گے)؛ کچھ لوگ اندھے، بہرے، گونگے رہ کر زندہ ہوں گے (۱۷) [بنی اسرائیل] ۹۷؛ ۲۰ [طہ:] (۱۲۵)؛ جو لوگ حاضری سے انکار کریں گے انہیں ٹانگ پکڑ کر منہ کے بل گوسیتھے دوے لایا جائے گا (۲۵) [الفرقان:] (۳۴)؛ زمین اللہ کی مٹھی میں ہوگی اور سارے آسمان لپٹے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے (۳۹) [الزمر:] (۶۷)؛ لوگ تین گروہوں میں بٹ جائیں گے : سابقین یعنی انبیاء، اصحاب الیمین یعنی جنتی اور اصحاب الشمال یعنی جہنمی (۵۶) [الواقعہ:] (۷)؛ چاند اور سورج

پہلے صور پر جو کیفیت ہوگی اس کا قرآن مجید میں بار بار ذکر ہے : زمین اور آسمانوں میں رہنے والے سارے ایک چیخ مار کر ختم ہو جائیں گے (۲۹) [الزمر:] (۶۸)؛ آسمان پھٹ پڑے گا۔ ستارے تتر بتر ہو جائیں گے اور سمندروں کا پانی انڈیل دیا جائے گا (۸۲) [الانفطّٰرِ:] ۱ تا ۳، نیز ۷۷ [المّرسلّتِ:] ۷ تا ۱۰؛ ۸۱ [التکویرِ:] (۱ تا ۱۱)؛ زمین اور پہاڑ ارز جائیں گے اور پہاڑ بالو بن کر رہ جائیں گے اور بچے مارے دہشت کے بوڑھے ہو جائیں گے (۷۳) [العزّٰبِ:] (۱۴) نیز ۱) اور پہاڑوں کی اس بالو سے سراب نظر آسکے گا (۷۸) [النبا:] (۲۰)؛ لوگ گرے ہوئے پروانوں کی طرح مرے پڑے ہوں گے (۱۰۱) [القارعة:] (۴)؛ وغیرہ وغیرہ۔ بعض آیات (۱۳) [الرعد:] ۲؛ ۳۵ [فاطر:] ۱۳؛ ۳۶ [یس:] ۳۸؛ ۳۹ [الزمر:] (۵) میں یہ کہا گیا ہے کہ چاند اور سورج وغیرہ ایک مدت معینہ کے لیے تیر رہے یا بہہ رہے ہیں؛ پھر ان اجرام فلکی کی روشنی ختم ہو جائے گی اور وہ گر پڑیں گے۔ جب سے مصنوعی سیارے انسان نے بنا لیے ہیں، متعدد اسرار زیادہ عام فہم ہو گئے ہیں، مثلاً یہ اسپوٹنک بھی بوقت واحد دو حرکتیں کرتے ہیں: نہ صرف اپنے محور پر، بلکہ خود اپنے اطراف پر بھی اور قوت محرکہ ختم ہونے پر وہ گر بھی پڑتے ہیں۔

”ثبورا کثیرا“ (= موت کو بار بار پکارو ۲۵ [الفرقان:] (۱۴) سے تناسخ کے معنی نکالنے فضول ہیں۔ آیت کا منشا صرف یہ ہے کہ دوزخ میں موت کو پکارنا، چاہے جتنے بار ہو، بیکار ہے، لیکن ”وَقَدْ خَلَقْنَاكُمْ اَطْوَارًا“ (= خدانے انسان کو طور بہ طور پیدا کیا ہے، ۷۱ [نوح:] (۱۴) سے متقدمین نے یہ سمجھا تھا کہ نطفہ، علقہ، مضغہ وغیرہ مراد ہیں۔ جدید مفکر اس میں نظریہ ارتقا کی گنجائش پاتے ہیں اور ”آسمان کو ہم نے مستحکم بنایا

ہوگا (النساء: ۳۹ وغیرہ)۔ دنیوی زندگی میں ہر انسان پر نگران فرشتے متعین تھے، جو اس کے ہر فعل کی یادداشت لیتے رہے (الانعام: ۶۱: ۵۰)۔ [ق: ۱۷ تا ۱۸: ۸۲] [الانفطار: ۱۰ تا ۱۲: ۸۶] [الطارق: ۳]۔ یہ نامہ اعمال ہر شخص کے مقدسے کے ساتھ پیش ہوگا (الجاثیہ: ۲۸: ۸۱) [التکویر: ۱۰: ۸۳] [الانشقاق: ۷ تا ۱۲ وغیرہ] اور یہ فرشتے بھی حاضر رہیں گے (ق: ۲۱) اور خود انسان کے ہاتھ پاؤں اور سارے اعضا بولنے لگیں گے اور کثرت کا اعتراف کریں گے اور انسان کے خلاف گواہی دیں گے (یس: ۶۵: ۳۶) [حم السجدة: ۲۲]۔ ہر نیکی اور بدی کی قدر و قیمت بے کم و کاست جانچنے کے لیے ترازو ہوگی (الاعراف: ۸: ۱۸) [الکہف: ۱۰۵: ۲۱] [الانبیاء: ۴۷: ۲۳] [المؤمنون: ۱۰۳: ۱۰۱] [القارعة: ۸]، جس میں نیکی بدی کا ذرہ ذرہ تولا جائے گا (الزلزال: ۷ تا ۸)۔ اگرچہ بغیر کسی ظلم کے سزا بھی دی جا سکتی ہے (یہ اختلافی مسئلہ ہے - معتزلہ منکر ہیں)، لیکن معافی بھی ہو سکتی ہے۔ کبھی خدا بطور خود معاف کرے گا اور کبھی کسی کی شفاعت (رکب بآن) پر، مگر یہ شفاعت یوں ہی نہ ہو سکتی ہے، بلکہ اس کے لیے خدا ہی کی اجازت حاصل کرنا ہوگی۔ جنت اور دوزخ پاس پاس ہوں گی اور فیصلوں کی فوری تعمیل ہوگی (الشعراء: ۹۰ تا ۹۱)۔ قرآن مجید (۳۷: الصفت): ۲۳ میں ”صراط العجیم“ (= دوزخ کے راستے) کا ذکر بغیر کسی تفصیل کے ہے۔ اس کی تفصیل حدیث میں ہے کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا اور ہر شخص کو اس پر سے گزرنا پڑے گا اور دوزخی ہی گریں گے اور جنتی حسب مراتب تیزی سے صحیح سلامت عبور کر جائیں گے۔ آیت ”وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا“ سے بعض لوگوں

دونوں یکجا ہو جائیں گے اور کوئی نہ چھپ سکے گا اور نہ بھاگ سکے گا (القیمة: ۹)۔ ابن ماجہ: سنن (کتاب ۵، باب ۱۹۶) کے مطابق بیت المقدس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارض المحشر والمنشر فرمایا اور اجازت دی کہ خاص طور پر وہاں جا کر نماز پڑھیں۔ بخاری وغیرہ میں ہے کہ میدان حشر میں مدتوں انتظار کرنا پڑے گا۔ گرمی سے لوگوں کو جو پسینا آئے گا وہ زمین میں ستر ہاتھ گہرا بن جائے گا۔ نیکوں کے وہ صرف تلووں تک رہے گا اور بروں کو کانوں تک غرق کر دے گا۔ اس صورت حال سے نجات دلانے کے لیے لوگ یکے بعد دیگرے سب انبیا سے التماس کریں گے کہ خدا کی بارگاہ میں شفاعت کریں۔ آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام میں سے ہر بنی اپنی کسی نہ کسی لغزش کو یاد کر کے خدا سے کچھ عرض کرنے سے شرمائیں گے۔ آخر جب لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں گے تو آپ فرمائیں گے: ہاں خدا نے ہر نبی کو ایک دعا کرنے کا حق دیا تھا؛ میں نے اپنے اس حق کو آج ہی کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ پھر آپ گڑ گڑائیں گے اور آپ کی دعا قبول ہوگی اور حساب کا حکم ہوگا۔ داد گستری کے لیے خدا کی تشریف آوری کے ذکر میں اس شاہانہ طمطراق کا پورا لحاظ ہے جس کے انسان عادی ہیں: بادلوں کا پردہ پھٹے گا، مالک الملک کی آمد ہوگی اور صف بہ صف فرشتے جلو میں ہوں گے (البقرة: ۲۱۰: ۲۵) [الفرقان: ۲۵: ۲۵] [الفجر: ۲۲]۔ بادشاہ کسی کے سامنے پیدل نہیں چلتے، اس لیے خدا ایک بڑے تخت پر متمکن ہوگا جس کے ہر پامے کو دو دو، جملہ آٹھ فرشتے اٹھائے ہوں گے (الحاقة: ۱۷: ۱۷)۔ دربار میں صف بہ صف فرشتے پرا جمائے رہیں گے (النبا: ۳۸)۔ کسی پر رتی برابر ظلم نہ



متقی لوگ تو نجات پا جائیں گے، لیکن ظالم وہاں سے بھاگ نہ سکیں گے، بلکہ وہیں گھنٹوں کے بل (غالباً مشکین کسے ہوئے) پڑے رہیں گے (تاکہ فرشتے ان کو چن چن کر دوزخ میں جھونک دیں): چنانچہ قرآن مجید (۲۱ [الانبیاء]: ۱۰۱) میں صراحت ہے کہ جن کی قسمت میں نیکی پہلے سے ٹھہر چکی تھی وہ اس (دوزخ) سے دور رکھے جائیں گے۔ [بہر حال بعث (یعنی مرنے کے بعد قیامت کے دن حساب کتاب کے لیے دوبارہ زندہ کیا جانا) اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے اور اس کی اہمیت کے پیش نظر قرآن و حدیث میں بارہا اس کا ذکر آیا ہے۔

مآخذ: (۱) الغزالی: احیاء علوم الدین، باب ۸، قسم ۲، (نیز اردو ترجمہ)؛ (۲) وہی مصنف: الدرۃ الفاخرۃ (اس کا جرمن اور فرانسیسی ترجمہ بھی ہے)؛ (۳) محمد بن ابی الشریف: کتاب المسامرة؛ (۴) الثعالبی: عرائس المجالس؛ (۵) سید قطب: مشاہد القیامۃ، مصر ۱۹۴۷ء؛ (۶) Louis Gardet: Introduction a la théologie musulmane؛ (۷) Francis Bar: Les routes de l'autre؛ (۸) O. Wolff: Muhammad- monde؛ (۹) anische Eschatologie، ۱۸۷۲ء؛ (۱۰) مفتاح کنوز السنۃ، بذیل مادہ (حدیث کی تفصیلات بالخصوص قابل اعتنا ہیں)۔

(محمد حمید اللہ و [ادارہ])

- بعثت: رک بہ نبی۔
- بعقوبہ: زیادہ صحیح (لیکن آج کل غیر مستعمل) بعقوبا؛ [نیز باعقوبا (یا قوت، ۱: ۶۷۲)] آرامی بابعقوبا (= بیت یعقوب) = "یعقوب کا گھر" سے؛ ایک شہر، جو بغداد سے چالیس میل شمال مشرق میں (۳۰°، ۳۷' شرق ۳۳°، ۴۵' شمال) زمانہ قبل از اسلام کی ایک نہایت قدیم بستی کی جگہ پر واقع تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایام خلافت میں یہ نہروان - دیالی (رک بان) کے مغربی کنارے پر آباد

کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ اچھے برے ہر شخص کو دوزخ میں جانا پڑے گا اور نیکوں کو جلد یا بدیر رہائی ہو جائے گی، لیکن اس آیت کے سیاق و سباق (۱۹ [مریم]: ۶۶ تا ۷۲) میں اس تعبیر کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ معلوم صرف یہ کرنا ہے کہ "اور کوئی نہیں تم میں جو اس پر نہ پہنچے گا" کی عبارت میں "اس پر" کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ یہ ہے: "اور کہتا ہے آدمی: کیا جب میں مر گیا پھر نکلوں گا جی کر؟ کیا یاد نہیں رکھتا آدمی کہ ہم نے اس کو بنایا پہلے سے اور وہ کچھ چیز نہ تھا؟ سو قسم ہے تیرے رب کی ہم گھیر بلاویں گے ان کو اور شیطانوں کو۔ پھر سامنے لاویں گے گرد دوزخ کے گھنٹوں پر گرے۔ پھر جدا کریں گے ہم ہر فرقے میں جو نسا ان میں سے سخت رکھتا تھا رحمن سے اکڑ۔ پھر ہم کو خوب معلوم ہیں جو بہت قابل ہیں اس میں بیٹھنے کے۔ اور کوئی نہیں تم میں جو نہ پہنچے گا اس پر۔ ہو چکا تیرے رب پر ضرور مقرر۔ پھر بچاویں گے ہم ان کو جو ڈرتے رہے اور چھوڑ دیں گے گنہگاروں کو اسی میں گھنٹوں پر گرے (لفظ "چٹیا" کا ترجمہ اوپر "گھنٹوں پر گرے" کر کے یہاں آخری آیت میں "اوندھے گرے" کیا تھا، ہم نے ایک ہی لفظ ہونے کے باعث دونوں جگہ یکساں کر دیا)۔

اس قرآنی عبارت کو غور سے پڑھیں تو نظر آتا ہے جو لوگ حیات بعد الممات کے قائل نہیں ان سے کہا جاتا ہے کہ دوزخ کے ماحول میں جو میدانِ حشر و حساب ہوگا اس میں تمام لوگوں کو ضرور حاضر ہونا پڑے گا، اور یہ بات خدا نے اپنے اوپر مقرر کر لی ہے۔ منکرین حشر و نشر وہاں گھنٹوں کے بل لائے جائیں گے۔ اس ماحولِ جہنم، یعنی میدانِ حشر و حساب، سے

استعمال ہوتا ہے: (۱) خاوند، شوہر (اور بعلہ بمعنی بیوی، زوجہ)؛ (۲) آقا و مالک؛ (۳) وہ پودا یا درخت، بالخصوص کھجور کا درخت، جو زمین کے اندرونی آبی ذخائر سے سیراب ہوتا ہے؛ (۴) حضرت الیاس علیہ السلام کی قوم کے بت کا نام (لسان العرب، بذیل مادہ)۔

گزشتہ صدی میں W. R. Smith نے اپنی کتاب *Kinship and Marriage in early Arabia* (بار دوم، لندن ۱۹۰۳ء) میں [اول] الذکر مفہوم کی اہمیت کی طرف خصوصیت سے توجہ دلائی تھی، لیکن اس کا یہ نظریہ پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکا کہ خود یہ اصطلاح عربوں نے شمالی ساسیوں سے مستعار لی۔ کلاسیکی عربی میں اس لفظ کے یہ مختلف معانی برابر باقی رہے، البتہ محل استعمال، وقت اور علاقے کے لحاظ سے معانی کی اہمیت کم و بیش ہوتی رہی ہے۔

”کسی کا“ آقا کے معنوں میں عربی میں ”بعل“ کی جگہ متعدد مترادفات نے لے لی، چنانچہ عبرانی بعل کے برخلاف یہ متعدد مرکبات کی شکل میں نہیں ملتا، البتہ ”زوج“ یا شوہر کے معنوں میں یہ لفظ زیادہ اچھی طرح باقی رہا اور اس کا سبب غالباً یہ ہے کہ اسے قرآن کریم کی تین آیتوں میں انہیں معنوں میں استعمال کیا گیا ہے:-

۱۔ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرِدْهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا إِصْلَاحًا (۲ [البقرة]: ۲۲۸) = ”اور ان کے شوہر (جنہوں نے طلاق دی ہے) اگر عدت کے اس زمانے کے اندر اصلاح حال کے لیے آمادہ ہو جائیں تو وہ انہیں اپنی زوجیت میں واپس لینے کے زیادہ حقدار ہیں“۔

۲۔ قَالَتْ يَوِئِلَتِي لَأَدَّ وَأَنَا عَجُوزٌ وَهَذَا بَعْلِي شَيْخًا (۱۱ [هود]: ۷۲) = ”وہ بولی: ہائے افسوس! کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ میرے اولاد ہو حالانکہ

تھا۔ یہ بغداد - خراسان کی شاہ راہ پر ایک اہم مقام اور بالائی نہروان کے ضلع کا صدر مقام تھا۔ عباسی عہد حکومت میں یہ مقام نہایت خوشحال تھا اور یہاں کے کھجوروں اور پھلوں کے باغ مشہور تھے۔ اس کے گرد و نواح کا علاقہ نہایت زرخیز اور آباد تھا۔ اس کے آس پاس بیسیوں دیہات تھے۔

جدید بعقوبہ عراق کا ایک صوبائی شہر ہے اور یہاں تقریباً آٹھ ہزار کی سنی شیعہ مخلوط آبادی ہے۔ آج کل یہ لوہے دیالی کا صدر مقام ہے، جس میں منڈلی، خالص، خانیقین اور خود بعقوبہ کی ماتحت قضائیں شامل ہیں۔ مؤخر الذکر قضاء میں کنعان اور مکضادیہ (سابق شہربان) کے اہم ناچے شامل ہیں۔ [آج کل] یہ شہر خوشحال ہے اور اس کی شکل و صورت جدید قسم کی عمارتوں، بازاروں اور ذرائع حمل و نقل اور عمدہ وسائل مواصلات کی وجہ سے کسی حد تک بدل گئی ہے۔ عراقی ریلوے کی بغداد - [ارپیل] لائن یہاں ایک بلند پل پر سے ہو کر دیالی کو عبور کرتی ہے۔

مآخذ: یاقوت، ۱: ۴۷۲، ۶۷۲؛ (۲) ابوالفداء:

تقویم، ص ۲۹۴؛ (۳) وہی مصنف: *Annal. Moslem.*

[= مختصر تاریخ البشر]، طبع Reiske، ص ۶۹۰؛ (۴)

رشیدالدین: *Hist. des Mongols*، طبع Quatremère، ص

۸-۲ بعد؛ (۵) *La Turquie d'Asie: V. Cuinet*، ص ۱۱۹؛

(۶) *Descr. du Pachalik de Bagdad*، طبع Rousseau، ص

۸۰؛ (۷) *Au Kurdistan, en Mesopotamie et*؛ Binder

*en Perse*، پیرس ۱۸۸۷ء، ص ۳۱۹ بعد؛ (۸)

لسٹریچ: *The Lands of the Eastern Caliphate*، کیمبرج

۱۹۰۰ء، لندن ۱۹۶۶ء؛ (۹) *La Perse*؛ E. Aubin

*d'aujourd' hui*، ۱۹۰۸ء، ص ۳۵۷ بعد؛ (۱۰) S. H.

*Iraq 1900 to 1960*؛ Longrigg، لندن ۱۹۵۳ء۔

(S. H. LONGRIGG)

بعل: (ع)، جمع بعولہ؛ مختلف معنوں میں



کہ بعل دیوتا کا تعین مندرجہ ذیل دو صورتوں میں غیر شعوری طور پر باقی ہے :-

(الف) فعل بعل اور صفت بعل (= حیرت میں کھو جانا)، یعنی ابتداء جیسا کہ نولڈیکہ (Nöldeke ZDMG، ۱۸۸۶ء، ۳۰ : ۱۷۳) نے واضح کیا ہے "بعل سے مسحور ہو جانا"۔

(ب) بعل اور بعلی کی اصطلاحیں بمعنی "بے آب کاشت" - ایک شعر میں، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے صحابی حضرت عبداللہ بن رواحہ کی طرف منسوب ہے (لسان العرب ۱۳ : ۶۰)، ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں: هَنَالِكْ لَا اَبَالِي نَخْلَ بَعْلٍ - اس قسم کی عبارت میں ممکن ہے کہ "بعل" کا وہ اصلی مفہوم قائم ہو جو صاحب لسان العرب کی سمجھ میں نہیں آیا، یعنی دیوتا (مذکر) کا مفہوم جو زمین (مؤنث) کو بارش سے یا تحت الارض پانی سے زرخیز بنا رہا ہے - "سیراب زمین" (مع ان مصطلحات کے جو اسی مادہ "سقی" سے ہیں) اور "بعل کے کھیت یا مکان" میں جو تضاد ہے اس کی تائید و توثیق ترکم اور تالمود سے پوری طرح ہوتی ہے (Dict. of Jastrow : the Talmud، مادہ b'la، و W. R. Smith : Shky Lectures : on the Religion of the Semites، لندن - ۱۹۲۰ء، بعد اشاریہ : G. Dalman : Arbeit und Sitte in Palästina Gütersloh، ۱۹۳۲ء، ۲ : ۳۲ تا ۳۳)۔

ابتدائی ہجری صدیوں کی کلاسیکی عربی میں بعل کا لفظ متعدد مواقع پر تنہا "غیر سیراب مزروعہ زمین" کے مفہوم میں ملتا ہے، یعنی کسی مرکب شکل میں نہیں کہ جس کی مختلف طرح تاویل کی جا سکے۔ فقہ کی کتابوں میں یہ لفظ اس مفہوم میں زیادہ تر پیداوار پر معینہ زکوٰۃ یا صدقے کے ضمن میں استعمال ہوا ہے۔ شعی اور سنی دونوں کے قانون شرعی میں شرح زکوٰۃ یا صدقے کو اس صورت میں عشر کا آدھا،

میں بڑھیا ہو گئی ہوں اور یہ میرا شوہر بھی ہو چکا ہے"۔

۳ - وَلَا يَدِينُ زَيْتُونِ الْأَبْعُولِيَّوْنَ أَوْ أَبَائِيَّوْنَ أَوْ آبَاءَ بَعُولِيَّوْنَ أَوْ ابْنَائِيَّوْنَ أَوْ أَبْنَاءَ بَعُولِيَّوْنَ (النور : ۳۱) = "اور اپنی زینت کے مقامات کو (کسی پر) ظاہر نہ ہونے دیں، مگر اپنے شوہروں پر یا اپنے باپوں پر یا اپنے خاوندوں کے باپوں پر یا اپنے بیٹوں پر یا اپنے شوہروں کے بیٹوں پر"۔

یہ استعمال واحد میں بھی ہوا ہے اور جمع میں بھی (بعولۃ) کی جگہ بعد ازاں کلاسیکی عربی میں بالعموم بعول یا بعال کے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ "آقا" کا مفہوم اب تک بھی پوری طرح سے موجود ہے، بعلی (= میرا شوہر) سورۃ ۱۱ [ہود] : ۷۲ میں بائبل کے "adōni" کا مرادف ہے (سارہ کی زبان سے کتاب پیدائش، باب ۱۷ : آیت ۱۲ : Targum Onkelos : ribboni) - مؤنث کے لیے کلاسیکی عربی میں بعل یا بعلة کی شکلیں موجود ہیں۔ بہت سے مشتقات فعلی اسی ازدواجی مفہوم سے پیدا ہو گئے ہیں۔

۲ - قرآن مجید (۳۷ [الصفت] : ۱۲۵) (الیاس) کا قصہ، قب سلاطین، کتاب اول، باب ۱۸ : رآك به الیاس) میں بعل کا ذکر ہے۔ اس وجہ سے بعل کے متعلق مسلمان جانتے ہیں کہ وہ مشرکین کا ایک دیوتا تھا [حضرت الیاس علیہ السلام اپنی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں : اَتَدْعُونَ بَعْلًا وَ تَذَرُونَ أَحْسَنَ الْخَالِقِينَ = "کیا تم احسن الخالقین کو چھوڑ کر (مشکل پڑنے پر) بعل کو پکارتے ہو"]۔ درحقیقت یہ مفہوم محض فنی طور پر قرون وسطی کے مصنفین کے ہاں [شہر] بعلبک [رک بان] کے نام کی تشریح و تحقیق کے سلسلے میں اس شہر کے بت کے متعلق مفروضہ داستانوں کے ساتھ ملتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے

متعلق مندرجہ ذیل دو نتیجے نکلتے ہیں : (الف) لفظ مذکور بدنی اور شاید یعنی احادیث سے بھی متعلق معلوم ہوتا ہے، لیکن قدیم ترین عراقی احادیث اس سے نا آشنا معلوم ہوتی ہیں (غالباً اس لیے کہ عراق کی سر زمین بیشتر آب پاشی کی زمین ہے)۔ عراقی الاصل حنفی فقہ عام طور سے اس لفظ کو استعمال نہیں کرتی، اگرچہ اس مسئلے میں وہ بھی وہی اصول بتاتی ہے جو دوسرے مذاہب نے بتایا ہے۔

(ب) جن احادیث میں یہ اصطلاح آئی ہے ان میں اسے اس شق میں شامل کیا گیا ہے جس میں بعل بظاہر ان زمینوں سے الگ ہے جو چشموں کے پانی، بارش یا سطحی آب رسانی سے سینچی جاتی ہیں۔ با ایں ہمہ بعض شارحین اور لغویین دعویٰ کرتے ہیں کہ لفظ ”بعل“ کا اطلاق تمام بارانی مزروعہ زمینوں پر ہوتا ہے۔ دوسروں نے، جو غالباً احادیث کے لفظی مفہوم سے متاثر ہیں یا مقامی محاورات سے، اس لفظ کی نسبت محدود تعبیریں کی ہیں جو سب کی سب بارانی خشک زراعتی زمین کے تصور سے قریب ہیں۔ بعض کے نزدیک اس کا اطلاق صرف ان زمینوں پر ہوتا ہے جہاں پودے اپنی جڑوں کے ذریعے سطح زمین کے نیچے سے پانی حاصل کرتے ہیں (مفصل بحث در لسان العرب، محل مذکور، نیز دیکھیے W. R. Smith : Lectures....، ص ۹۸ تا ۹۹ : Lokkegaard : Islamic Taxation، کوپن ہیگن ۱۹۵۰ء، ص ۱۲۱)۔

مذکورہ بالا شق میں جو ہم معنی یا قریب المعنی الفاظ ملتے ہیں اور جو اکثر اوقات یا تو بعل کے بجائے استعمال ہوئے ہیں یا اس کے ساتھ ساتھ آئے ہیں ان میں لفظ عثری خاص توجہ کا مستحق ہے (مثلاً البخاری : صحیح، کتاب الزکوٰۃ)۔ عرب اور جنوبی عرب کے دیوتاؤں

یعنی یسوان حصہ کر دیا گیا ہے جب فصل کا انحصار مصنوعی آب پاشی پر ہو، جس میں کچھ مشقت کرنا پڑتی ہے؛ اس کے برعکس جہاں تک بعل کی پیداوار کا تعلق ہے زکوٰۃ فی الواقع دسواں حصہ ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ اصطلاح امام مالکؒ کی الموطأ (دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی) سے لے کر بعد کی بہت سی احادیث میں ملتی ہے (دیکھیے الباجی : المنتقی، ۲ : ۱۵۷ تا ۱۵۸) اور تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کی فقہ کی کتابوں، مثلاً [امام] شافعیؒ کی کتاب الامم (۲ : ۳۲) اور سخون مالکی کی المدونة (۲ : ۱۰۸، ۹۹) میں بھی استعمال ہوئی ہے۔ تقریباً اسی شکل میں یہ احادیث ابو داؤد (سنن، عدد ۱۵۹۶ تا ۱۵۹۸)، نیز مال و خراج سے متعلق شروع زمانے (تیسری تا چوتھی صدی ہجری / نویں تا دسویں صدی عیسوی) کے ماہرین کے ہاں بھی ملتی ہیں، مثلاً یحییٰ بن آدم (کتاب الخراج، قاہرہ ۱۳۴۷ھ، عدد ۳۶۴ تا ۳۹۵، جہاں ایک معنی خیز متبادل حدیث، عدد ۳۸۱، میں یہ عبارت ملتی ہے : ”وہ زمین جسے بعل نے سینچا ہو“، جسے البلاذری نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے (فتوح، ص ۷۰)؛ ابو عبید بن سلام (کتاب الاموال، قاہرہ ۱۳۵۳ھ، شمارہ ۱۴۱۰ تا ۱۴۲۱)؛ قدامہ بن جعفر (کتاب الخراج، جزو ۷، باب ۷، بمطابق ڈخویہ : Glossaive، بر البلاذری : فتوح، ص ۱۴)؛ اس موضوع پر الخوارزمی کی مفاتیح العلوم صرف اس کتاب ہی کا ملخص ہے، اسی طرح فاطمی فقہ میں، جو چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں افریقیہ میں رائج ہو چکی تھی، مثلاً قاضی النعمان : دعائم الإسلام [طبع فیضی]، قاہرہ ۱۹۵۱ء، ۱ : ۳۱۶؛ اور اسی طرح بہت سی متأخر کتابوں میں۔

ان متون سے لفظ بعل کے استعمال سے



(قاہرہ ۱۹۳۸ء) اور شافعی فقیہ الماوردی کی اسی نام کی کتاب، مترجمہ Fagnan، الجزائر ۱۹۱۵ء، ص ۳۱۴) میں بھی ملتا ہے۔ اس لگان کا حساب کرتے وقت وہ یہ فہمائش کرتے ہیں کہ پانی کے ماخذ کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اس سے مزروعہ اراضی کی چار قسموں کا پتا چلتا ہے، جن میں انہوں نے بعل کی تعریف بہت وضاحت سے کی ہے اور جو قریب قریب وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے، یعنی اس زمین کی ضد جسے سینچا جائے یا جو آبِ باران سے بخوبی سیراب ہوتی ہو۔

جغرافیہ نویس المقدسی نے چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں رملہ، اسکندریہ اور سندھ میں زرعی پیداوار کا ذکر کرتے ہوئے یہ اصطلاح تین بار استعمال کی ہے (BGA، ۱۹۷: ۳، ۱۹۷، ۴۷۴)۔ وہ اس کا استعمال ہمیشہ ترکیب ”علی البعل“ کی شکل میں کرتا ہے، لیکن یہ اس بات کا کافی ثبوت نہیں ہے کہ یہ اصطلاح شام و فلسطین کے باہر بھی استعمال ہوتی تھی، جو مصنف کی جائے پیدائش ہے۔ اس جغرافیائی علاقے میں جہاں ”افراط آب کے پرفریب تصور کے باوجود زراعت قدیم زمانے سے خشک کاشت پر مبنی رہی ہے“ (J. Weulersse: *Paysans de Syrie*، پیرس ۱۹۴۶ء، ص ۱۴۴)، عہد حاضر میں ہمیں ”ارض بعل“ کی اصطلاح قدیم زمانے کی طرح ارض سنی کی ضد کے طور پر ملتی ہے (G. Dalman: کتاب مذکور، ص ۳۰، جس کا ذکر E. Meier، در *ZDMG*، ۱۸۶۳ء، ۱۷: ۶۰۷، میں پہلے ہی کر چکا ہے)۔

قرونِ وسطیٰ کے مصر میں اس اصطلاح کے استعمال کی ایک خاص مثال یہ ہے: قاہرہ میں مملوکوں کے اور شاید اس سے پہلے فاطمیوں ہی کے عہد میں خلیج کے قریب ایک کھلا میدان تھا، جو آگے چل کر ایک عام سیرگاہ بن گیا۔ یہ

کی دیوسبھا (Pantheon) میں عثّر (= Istarte، اِشتر) ایک کوکبی دیوتا تھا، جو زمین کی زرخیزی پر اثر انداز ہوتا تھا اور جس کے لیے بعض اوقات بعل کا نام بطور صفت استعمال ہوتا تھا (*Études sur les religions sémitiques*: Lagrange) پیرس ۱۹۰۳ء، ص ۱۳۳ تا ۱۳۶: Nielsen، *Handbuch der Altarab. Altertumskunde*، کوپن ہیگن ۱۹۲۷ء، ج ۱، بحد اشاریہ: Jamme، در *Le Museon*، ۱۹۳۷ء، ص ۸۵ تا ۱۰۰: G. Ryckmans، در *Alti Accad. Lincei*، ۱۹۳۸ء، ص ۳۶: وہی مصنف: *Les religions arabes préislamiques*، بار دوم، Louvain ۱۹۵۱ء، ص ۴۱ و مواضع کثیرہ: Jamme، در *Hist. des Religions*: Aigrain و Brillant، ۱۹۵۶ء، ۴: ۲۶۴ تا ۲۶۵)۔ ت ث کا ادغام ث ث [ = ث مشدد] میں کلاسیکی عربی میں مسلمہ ہے اور یہاں بعل کے ساتھ معنوی تطابق جاذب توجہ ہے۔

یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ اسی مفہوم میں بعل کے لفظ کا استعمال ان شرائط میں ہوا ہے جو ۵۹ھ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور قانون اراضی یا تو دومة الجندل کے نخلستان پر (وہاں کے شیخ اکیدر بن عبد الملک کے ذریعے) اور یا قریب کے کلبی قبائل پر (ان کے سردار حارثہ بن قطن کے ذریعے) عائد فرمائی تھیں: دیکھیے *Annali*: Caetani، ۲: ۱، ۲۵۹ تا ۲۶۹ (Musil نے بھی ان پر بحث کی ہے: *Arabia Deserta*، نیویارک ۱۹۲۷ء، ضمیمہ ۷: نیز دیکھیے W. M. Watt: *Muhammad at Medina*، اوکسفورڈ ۱۹۵۶ء، ص ۳۶۲ تا ۳۶۵)۔

پھر یہی لفظ زمین کے لگان (خراج) کے سلسلے میں ہمیں پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کے قانون عائہ کی گراں قدر تصانیف (ابویعلیٰ الحنبلی: الاحکام السلطانیة

نام کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے اور اس سے مقصود اس ترکاری یا پھل کی عمدہ قسم پر زور دینا ہوتا ہے۔ فاس (Fez) میں اس کی مؤنث شکل ”بعلیۃ“ کا اطلاق ایک قسم کے تازہ اور رسیلے انجیر پر ہوتا ہے۔ دوسری طرف بعلی کسی ایسے آدمی کو کہا جاتا ہے جو حریص، خشک اور اتنا سخت ہو جتنی کہ وہ زمین جو اسی نام سے موسوم ہے (L. Brunot کی فراہم کردہ معلومات)۔

یہ بات افسوسناک ہے کہ بول چال کی عربی اور بہت سے لغوی عناصر کی طرح ہم کافی صحت کے ساتھ ان علاقوں کا پتا لگانے سے قاصر ہیں جہاں بعل اور بعلی کے الفاظ، جن سے وسیع و عریض عربی بولنے والے علاقے قطعی نا آشنا ہیں، درحقیقت بولے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کی صحیح تقسیم کا علم کئی پہلوؤں سے کارآمد ہوگا۔

(R. BRUNSCHVIG)

بعلبنت: اندرون لبنان میں ایک چھوٹا سا شہر جو بقاع، [رک باں] کی سطح مرتفع کے کنارے قریب قریب تین ہزار سات سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور باغوں کے ایک نخلستان سے گھرا ہوا ہے۔ انہیں رأس العین کا بڑا چشمہ سیراب کرتا ہے، جو ضد لبنان (Anti-Lebanon) کے سلسلہ کوہ کے دامن سے نکلتا ہے۔ اس کی آب و ہوا کی تروتازگی اور اس کی نباتات کے حسن و جمال نے عرب مصنفین سے خراج تحسین حاصل کیا ہے اور وہ اس کے غوطہ [= مرغزار] کی تعریف کرتے ہوئے ہمیشہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے دمشق کے غوطہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کے نام کے اشتقاق کے متعلق بہت سے مفروضے قائم کیے گئے ہیں، چنانچہ اس سلسلے میں سامی [دیوتا] بعل (Baal) [رک باں] کا ذکر آتا ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی نظریہ یہی طح اطمینان بخش نہیں معلوم ہوتا۔

بستان البعل کہلاتا تھا اور پھر ”ارض البعل“ کہلانے لگا؛ دیکھیے المقریزی: خطط، بولاق ۱۲۷۰، ۲: ۱۲۹، جو یہاں بعل کے لفظ کو واضح طور پر اس جغرافیائی مفہوم میں لیتا ہے۔ اندلس کے مسلمان ”ٹھیک عہد حاضر کے ہسپانوی کاشتکاروں کی طرح secano (عربی: بعل) اور regadio (عربی: سقی) زمین میں امتیاز کرتے تھے اور ان میں سے مقدم الذکر خاص طور پر غلے کی کاشت کے لیے محفوظ رکھی جاتی تھی“ (Hist. Esp. mus.: Lévi-Provençal، پیرس ۱۹۵۳ء، ۳: ۲۷۰)۔ اشبیلیہ کا مشہور ماہر فلاحت ابن العوام (چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی) بھی اس فرق کی توثیق کرتا ہے (کتاب الفلاحة، طبع Banqueri، میڈرڈ ۱۸۰۲ء، ۱: ۵)۔ یہ فرق معاہدوں، بالخصوص مسزوعہ زمینوں کے پٹوں، یا مغارسہ میں بھی ظاہر ہوتا تھا، مثلاً ابن سلمون کے مرتبہ ضابطہ قانونی کتاب العقد المنظم، قاہرہ ۱۳۰۲ھ، ۲: ۲۱ تا ۲۲ میں۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں اسم صفت کی دو شکلیں بعلی اور سقوی استعمال ہوتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ صفت کی یہ دونوں شکلیں عہد حاضر میں اسما کی طرح استعمال ہونے لگی ہیں، بعض علاقوں میں شاید اس مثال کی بدولت جو ”عشری“ میں موجود تھی۔ جنوبی عرب میں جو بولیاں بولی جاتی ہیں ان میں عشری کے ساتھ ساتھ بعلی بھی دیکھنے میں آتا ہے: Glossaire Datinois: Landberg، لائڈن ۱۹۲۰ء، ۱: ۱۸۶، جہاں عشری کی جگہ قریب قریب یقینی طور پر عث (ث) ری پڑھنا چاہیے۔ پہلی نظر میں یہ معلوم کر لینا ہمیشہ آسان نہیں کہ آج کل مشرق اور شمالی افریقہ میں بعلی بطور اسم استعمال ہوتا ہے یا بطور صفت۔ یہ اکثر اوقات (اپنی ضد ”سقوی“ سے کہیں زیادہ) کسی ترکاری یا پھل کے



حصص کی فتح سے ذرا پہلے اس معاہدے کی شرائط کے ماتحت جس کا علم ہمیں البلاذری کے ذریعے ہوتا ہے مسلمانوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ آگے چل کر یہ دمشق کے اموی "جند" کا حصہ بن گیا۔ پھر یہ عباسیوں کے زیر اقتدار آ گیا، تاآنکہ فاطمی خلیفہ المعزز نے ۵۳۶۱ / ۶۹۷۲ء میں یہاں ایک عامل متعین کر دیا۔ ۵۳۶۳ / ۶۹۷۴ء میں بوزنطی بادشاہ جان زسیکس John Tzimiskes نے اور ۵۳۱۶ / ۶۱۰۲۵ء میں حلب کے بادشاہ صالح ابن مرداس نے اس پر عارضی طور پر قبضہ جما لیا۔ اس کے بعد یہ ۵۳۶۸ / ۶۱۰۷۵ء میں سلجوقی سلطان تتش اور اس کے بیٹوں کے ہاتھ آ گیا اور بوریوں کے عہد میں ان کے خاندانی جھگڑوں کے دوران میں یہ باری باری عامل گشتکین، بوری اور اس کے بیٹے محمد اور بالآخر مشہور اَنر Onor کے قبضے میں آیا، جس سے کچھ عرصے کے لیے زنگی نے چھین کر اسے صلاح الدین ایوبی کے والد ایوب کے حوالے کر دیا۔ ۵۵۳۹ / ۱۱۵۴ء میں نورالدین نے اسے ازسرنو فتح کیا اور چونکہ ۵۵۶۵ / ۱۱۷۰ء کے شدید زلزلے سے یہ تباہ و برباد ہو گیا تھا، لہذا اس کی دیواروں کو ازسرنو بنانا پڑا۔ ۵۵۷۰ / ۱۱۷۴ء میں یہ شہر [نورالدین زنگی] کے جانشینوں کے ہاتھ سے نکل کر صلاح الدین کے قبضے میں آ گیا، جو اسے اپنے بعض درباریوں یا خاندان کے بعض افراد کو یکے بعد دیگرے جاگیر کے طور پر دیتا رہا۔ ان میں سے اس کے بھائی کا پوتا الملک الامجد بہرام شاہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس کے قبضے میں یہ قلعہ ۵۵۷۸ / ۱۱۸۲ء سے ۵۶۲۷ / ۱۲۳۰ء تک رہا جب کہ حاکم دمشق الملک الأشرف موسیٰ نے اسے اس سے چھین لیا۔ اس کے بعد متعدد ایوبی اس کے قبضہ کے لیے آپس میں لڑتے رہے اور آخر ۶۵۸ھ / ۱۲۶۰ء میں یہ مصریوں کے

بعلبک زیادہ تر اپنے کھنڈروں کی وجہ سے مشہور ہے جو اب بھی اس کی جگہ وقوع پر نظر آتے ہیں اور جہاں یہ شہر بلاشبہ بہت قدیم زمانے سے آباد تھا۔ یہ اس زمانے میں خصوصیت سے بارونق تھا جب اس مقام کو ہیلیوپولس Heliopolis کا یونانی نام دیا گیا اور جب وہاں کے مروجہ مذہب ہیلیوپولسی تثلیث (یعنی شامی دیوتاؤں، شمس (Zeus) زہرہ (Aphrodite) اور ہرمز (Hermes)) کے اوتار کے فروغ سے وہ شاندار خانقاہیں وجود میں آئیں جنہیں قرون وسطیٰ میں حضرت سلیمانؑ کی قوت سے منسوب کیا جانے لگا۔ آج بھی ان یادگاروں کا بڑا حصہ، جس میں دو بہت بڑے اور لمبے چوڑے مندر، دو صحن (جن کے بڑے بڑے دروازے ہیں) اور حصار شہر (جس کی ٹھوس اور چوڑی چکلی بنیادیں ہیں) شامل ہیں، دیکھنے والے کو مرعوب و متاثر کرتا ہے۔ عربوں کے دور میں ان عبارتوں کو ایک مضبوط قلعے کی شکل دے دی گئی تھی، جس کا نقشہ ۱۹۰۰ تا ۱۹۰۴ء میں آثار قدیمہ کی ایک جرمن مہم کے ارکان نے تیار کیا تھا، لیکن محل وقوع کو اس کی اصل حالت پر لانے اور جدید کھدائیاں کرنے کی خاطر اس قلعے کے بعض حصوں کو قربان کر دیا گیا۔

چونکہ بعلبک کو ارد گرد کے اضلاع میں اور دمشق سے حصص کو جانے والی شاہ راہ پر مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اس لیے اس کی پوری تاریخ واقعات سے معمور ہے۔ جب سے مسیحیت نے اس کی عبادت گاہوں کی خوش حالی پر ایک کاری ضرب لگائی اور عربوں نے اپنی فتح کے بعد اس کے بالاحصار (aeropalis) کو قلعے یا حاکم علاقہ کے مرکز کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا اس کی زیادہ تر اہمیت فوجی رہ گئی۔ ۵۱۶ھ / ۶۳۷ء میں ابو عبیدہؓ کے زیر کمان دمشق کی فتح کے بعد اور

بن بوری کے عہدِ حکومت میں ہوا، جس نے بعلبک کا بڑی کامیابی سے بچاؤ کیا تھا، یا زنگی کے عہدِ سلطنت میں، جس نے اس وقت کے کتبوں اور تحریری دستاویزات کی رو سے قلعے کی حالت کو درست کرنے کے لیے کئی اقدامات کیے۔ بہرام شاہ کے عہد میں نئی روکار کو جدید برجوں سے مستحکم کیا گیا۔ آخر میں قلاؤن کا عہد اس لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں کام کو زیادہ ترقی یافتہ انداز میں انجام دیا گیا۔ چھوٹے مندر کے جنوب مشرقی کونے پر ایک بھاری برج کی تعمیر اور پرانے جنوبی دروازے کے اردگرد دہرے برجوں کی تعمیر اس کے نمایاں پہلو ہیں۔

قدیم آثار اور کتبوں کا ساتھ ساتھ مطالعہ کیا جائے تو ہم اس تمام تعمیری مجموعے کے متعدد حصوں کی تاریخ کا تعین یقین کے ساتھ کر سکتے ہیں جسے قرونِ وسطیٰ کے شام میں عربوں کی فوجی تعمیرات کے نہایت دلچسپ آثار میں شمار کرنا چاہیے۔ رأس العین کی چھوٹی سی مسجد بھی اسی عہد کی یادگار ہے اور اسی طرح بالخصوص شہر کے اندر کی بڑی مسجد، جو قلعے سے بہت زیادہ دور نہیں اور جو کسی قدیم عمارت کے مسالے سے بنائی گئی تھی اور جس کا ایوانِ نماز، چار دالان اور شاندار مینار اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ دونوں مسجدوں پر مملوک فرامین کے ستون کندہ ہیں۔ دوسری یادگاروں میں، جو اب بٹ چکی ہیں، مدرسے، رباط، سرائیں، خانقاہیں اور حدیث کی درسگاہیں شامل تھیں، جن کا ذکر اس شہر کے قدیم بیانات میں ملتا ہے۔

مآخذ: (۱) R. Dussaud : *Topographie histo-*

*rique de la Syrie*، پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۳۹۷، ۴۰۳ تا

۴۰۴؛ (۲) G. Le Strange : *Palestine under the*

*Moslems*، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۲۹۵ تا ۲۹۸؛ (۳)

قبضے میں چلا گیا، لیکن اس سے قبل مغول بھی اسے فتح کر چکے تھے۔ پھر مملوکوں کے دورِ اقتدار میں یہ دمشق کے صوبے کے تیسرے شمالی سرحدی ضلع کا صدر مقام قرار پایا اور اس کا اختیار شام کے نائب نے یہاں کے عامل کے سپرد کر دیا جس کا اقتدار پورے ”بقاع“ پر نہیں تھا اور جو براہ راست اس کے ماتحت تھا۔ اس کے بعد اس شہر کی اہمیت بظاہر کم ہوتی چلی گئی اور ڈاک کی خاص مملوک شاہراہیں، دمشق تا حمص اور دمشق تا طرابلس اس شہر کو چھوڑ کر قلموں سے گزرنے لگیں اور زمانہ حال کی تجارتی شاہراہوں نے بھی بعد میں یہی شکل اختیار کی۔ ۱۵۱۶ء / ۱۵۲۲ء میں یہ پورے شام کے ساتھ ترکانِ عثمانی کے ہاتھوں میں چلا گیا اور چھوٹے چھوٹے سرداروں کے زیرِ فرمان رہا، جن میں ہرقش کا خاندان خاص طور سے قابل ذکر ہے، یہاں تک کہ باب عالی نے ۱۸۵۰ء میں وہاں اپنا باضابطہ نظم و ضبط قائم کر دیا۔

بوری، زنگی اور ایوبی ادوار میں، جب کہ بظاہر جنوبی شام پر اقتدار قائم رکھنے کے لیے اس شہر پر قابض ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا، اس پر قبضہ کرنے کے لیے آویزش اور کشمکش کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اسی لیے یہ بات بھی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ یہاں عربوں کی تعمیری سرگرمی کیوں مستقل طور پر اس دفاعی نظام کی اصلاح پر مشتمل رہی جس کا بڑا مقصد شروع میں زیادہ تر جنوب مغربی گوشے کے دونوں قدیم مندروں کے چیوتروں (podia) کی درمیانی خلا کو پُر کرنا تھا۔ [تعمیری] کام کے جن چار زمانوں کو ایک دوسرے سے سمیٹا جاسکا ہے، ان میں سے دوسرے دور میں خاص بات یہ ہوئی کہ مستحکم صدر دروازے کو مغربی جانب سے جنوب کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ یہ کام یا تو محمد



کی شہرت تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ البعیت کی شاعرانہ سرگرمی کا تعلق بھی دونوں حریف شعراء، یعنی جریر اور الفرزدق، کی سرگرمیوں سے تھا۔ برسوں تک جریر اور اس کے درمیان سلسلہ مہاجات جاری رہا، بالآخر اسے الفرزدق کو اپنی مدد کے لیے بلانا پڑا؛ مگر وہ بھی اس سے ہمیشہ شریفانہ برتاؤ نہیں کرتا (وہ اس کا ذکر ابن حمراء العجبان کے [غیر مہذب] لقب سے بھی کرتا ہے، جس میں اس کی ماں کے ادنیٰ نسب پر چوٹ کی گئی ہے کیونکہ وہ ایک سجستانی کنیز تھی)۔ یاقوت اس کی وفات کا سال ۵۱۳ھ / ۷۵۲ء بتاتا ہے، مگر چونکہ وہ اس میں یہ اضافہ بھی کرتا ہے کہ "خليفة وليد بن عبدالمليک کے عہد حکومت میں" (جس نے ۵۸۸ھ / ۷۰۶ء تا ۵۹۸ھ / ۷۱۶ء حکومت کی)، لہذا اس تاریخ کو قابل یقین نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مآخذ: (۱) الجاحظ: البيان و الحيوان، بمدد اشاریہ؛ (۲) ابن قتیبہ: الشعر [و الشعراء] طبع شاکر، ص ۴۷۲ تا ۴۷۳؛ (۳) نقائض جریر و الفرزدق، بمواضع کثیرہ؛ (۴) جریر اور فرزدق کے دیوان، بمواضع کثیرہ؛ (۵) ابن سلام: طبقات، بمدد اشاریہ؛ (۶) ابن درید: [کتاب] الإشتقاق، ص ۱۳۷؛ (۷) ابن عساکر، ۵: ۱۲۲ تا ۱۲۳؛ (۸) الامدی: المؤتلف، ص ۵۶، ۱۰۸؛ (۹) یاقوت: [معجم] الادباء ۱۱: ۵۲ تا ۵۵؛ (۱۰) C. A. Letteratura: Nallino، بمدد اشاریہ۔

(CH. PELLAT)

- بغالشرابی: (= جام بردار)، جو الصغیر بھی کہلاتا تھا؛ ایک ترک سپہ سالار جس کا خطاب "مولیٰ امیر المؤمنین" تھا۔ اسے اس کے ہم نام معاصر بغالکبیر سے ملتبس نہ کرنا چاہیے۔ اس نے المتوکل کے ماتحت آذربایجان کے باغیوں کے خلاف جنگ آزمائی کی۔ بعد ازاں اسے شبہ ہوا کہ خلیفہ ترک سرداروں کا زور گھٹانا چاہتا ہے، چنانچہ

*La Syrie à l'époque*: M. Gaudetroy-Demombynes *des Mamelouks*، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۷۰ تا ۷۳ و ۱۸۱؛ (۳) البلاذری: فتوح، ص ۱۲۹ تا ۱۳۰ (تب) *Conversion and the Poll*: D. C. Dennett، کیمبرج (Mass.)، ۱۹۵۰ء، ص ۵۵ تا ۶۴؛ (۵) BGA، بمدد اشاریات؛ (۶) یاقوت، بذیل مادہ؛ (۷) ابن شداد: الأعلاق الخطيرة، مخطوطة لائڈن، عدد ۸۰۰، ورق ۸۵ ب تا ۸۸ ب وبمطابق *Palermo Centenario.... Amari*: M. Sobernheim، ۱۹۱۰ء، ۲: ۱۵۲ تا ۱۶۳؛ (۸) *Hist. Or. Cr.*، بمدد اشاریہ؛ (۹) Th. Wiegand *Baalbek, Ergebnisse der Ausgrabungen und Untersuchungen in den Jahren 1898 bis 1905*، برلن و لائپزگ ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۵ء، ج ۳ (جہاں M. Sobernheim نے عربی کتبات شائع کیے ہیں اور قرون وسطیٰ کے ستون کا جائزہ لیا ہے)؛ قدیم عہد کے لیے نیز دیکھیے (۱۰) Pauly-Wissowa، بذیل مادہ *Heliopolis* و *Heliopolitamus* اور (۱۱) R. Dussaud اور H. Seyrig کے مقالات، جن میں سے بیشتر *Syria* میں شائع ہوئے ہیں؛ عربی کتبات کے لیے دیکھیے نیز (۱۲) G. Wiet: *Notes d'épigraphie syro-musulmane*، در *Syria*، ۱۹۲۵ء، ص ۱۵۰ بعد؛ (۱۳) J. Sauvaget: *Notes sur quelques inscriptions arabes de Baalbek et de Tripoli*، در *Bull. du Musée de Beyrouth*، ۸۹ (۱۹۳۹ء): ۷ تا ۱۱۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

• البعیت: بصرے کے ایک ہجوگو شاعر خدش بن بشر المجاشعی کا عرف۔ وہ اگرچہ [بنو] تمیم کا سب سے زیادہ فصیح البیان مقرر سمجھا جاتا تھا، تاہم ابن سلام نے اسے اسلامی شعرا کی صف دوم میں جگہ دی ہے۔ بہر کیف نقادوں کی رائے میں اس کے نسبتاً گم نام ہونے کا سبب محض جریر

عرصے تک برید (محکمہ ڈاک) کا انتظام اسی کی زیر نگرانی رہا۔

مآخذ: (۱) الطبری، بمدد اشاریہ؛ (۲) الیعقوبی،

بمدد اشاریہ؛ (۳) البلدان، ص ۲۶۲؛ (۴) البلاذری:

فتوح، ص ۲۱۱؛ (۵) المسعودی: مروج، ج ۲، بمدد

اشاریہ؛ (۶) التنوخی: نشوار، ۸: ۳۵ تا ۳۸؛ (۷) ابن

الاثیر، بمدد اشاریہ۔

(D. SOURDEL)

بغبور: رُكْ به فغفور.

- بغداد: بغداد دریا کے دجلہ کے دونوں کناروں پر آباد ہے اور اس کا محل وقوع ۳۳ درجہ ۲۶ دقیقہ ۱۸ ثانیہ عرض بلد شمالی اور ۴۴ درجہ ۲۳ دقیقہ ۹ ثانیہ طول بلد مشرقی ہے۔ اس کی بنیاد آٹھویں صدی عیسوی میں رکھی گئی اور اس وقت سے خلافت عباسیہ کے خاتمے تک یہ برابر دارالخلافہ اور صدہا سال تک عالم اسلام کا ثقافتی مرکز رہا۔ ۱۲۵۸ء کے بعد یہ ایک صوبے کا صدر مقام اور عثمانی ترکوں کے تحت ولایت بغداد کا مرکز رہا۔ ۱۹۲۱ء میں یہ جدید مملکت عراق کا دارالحکومت ہو گیا۔

تاریخ:

بغداد اسلامی عہد سے پہلے کا نام ہے، جس کا تعلق زمانہ سابق کی ان بستیوں سے ہے جو اسی مقام پر آباد تھیں۔ عرب مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور حسب معمول اس کی فارسی اصل کا سراغ لگاتے ہیں (قب المقدسی: البد، ۴: ۱۰۱؛ ابن رستہ، ص ۱۰۸)۔ انہوں نے اس کے مختلف قیاسی معنی دیے ہیں، جن میں سے زیادہ مقبول "دادہ خدا" یا "عطیہ خدا" (یا "عطیہ الصنم") ہے (دیکھیے الخطیب، مطبوعہ قاہرہ، ۱: ۵۸ تا ۵۹؛ یاقوت، ۱: ۶۷۸ تا ۶۷۹؛ ابوالفداء، ۱: ۲۹۲؛ ابن الجوزی: مناقب، ص ۶؛ البکری، ۱:

اس نے اس کے خلاف ایک سازش کی سربراہی کی اور اسے قتل کرا دیا۔ آگے چل کر وہ اور اس کا حلیف واصف خلیفہ المستنصر اور خلیفہ المستعین کے عہد حکومت میں برسر اقتدار رہے، تاہم ۵۲۵/۸۶۶ء میں المعتز نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے اس قدیمی دشمن اور اپنے باپ کے قاتل سے چھٹکارا پانے کی ٹھانی اور اسے تمام مناصب و اعزازات سے محروم کر کے قیدخانے میں ڈال کر مروا ڈالا (۵۲۵/۸۶۸ء)۔

مآخذ: (۱) الطبری، بمدد اشاریہ؛ (۲) الیعقوبی،

بمدد اشاریہ؛ (۳) البلدان، ص ۲۶۲؛ (۴) البلاذری:

فتوح، ص ۲۳۰؛ (۵) المسعودی: مروج، ج ۲، بمدد

اشاریہ؛ (۶) ابن الاثیر، بمدد اشاریہ؛ (۷) احمد امین:

ظہر الاسلام، ۱: ۱۱، ۲۰ تا ۲۲؛ (۸) D. Sourdel:

'Le vizirat 'abbaside' ج ۱، دمشق ۱۹۵۹ء، بمدد

اشاریہ۔

(D. SOURDEL)

بغداد الکبیر: ایک ترک نژاد فوجی سردار، جس نے خلافت عباسیہ کے ایک پر آشوب دور میں سیاسی اعتبار سے نمایاں حصہ لیا۔ اس نے المعتصم اور اس کے جانشینوں کے عہد میں باغی قبائل کے خلاف کئی مہموں میں حصہ لے کر امتیاز حاصل کیا، مثلاً نواح مدینہ میں ۵۲۳/۸۳۴ - ۵۲۵/۸۳۵ میں، آرمینیا میں ۵۲۷/۸۵۱ - ۵۲۸/۸۵۲ میں اور بوزنطیوں کے خلاف ۵۲۳/۵۲۴ [بہ تصحیح ۵۲۸/۵۲۹] میں - ۵۲۷/۵۲۸ میں المتوکل کے قتل کے وقت وہ حاضر نہ تھا، لیکن اس کے بعد وہ سامرا واپس آیا اور دوسرے ترک سرداروں کو شریک مقصد کر کے ۵۲۸/۵۲۹ میں المستعین کو جبراً خلیفہ بنوا دیا، مگر خود اسی سال فوت ہو گیا۔

اس کے بیٹے موسیٰ بن بغا نے بھی سامرا کی

سیاسیات میں ایک اہم مقام حاصل کیا اور کچھ



ذادی“ میں ”نہر شری“ (Nah. Sharri) کے کنارے واقع تھا (Délégation en perse : De Morgan، ۱ : ۸۶ تا ۹۲)۔ اسی طرح تالمود میں ”بگ دثا“ Bagdatha کا ذکر کئی دفعہ آیا ہے۔ ان دونوں شہادتوں کے پیش نظر عہدِ حمورابی کے مذکورہ بالا لفظ کو بگ پڑھنا زیادہ قرینِ صحت ہوگا (Obermeyer : Landschaft Babylonien، ۱۹۲۹ء، ص ۱۳۷ بعد؛ Jewish Encyc.، بذیلِ مادۃ بغداد۔ ایک اور سنگِ سرحد پر، جو بابل کے بادشاہ مردخ بلادان Mardukapaliddin کے عہد (۱۲۰۸ تا ۱۱۹۰ ق م) کا ہے، شہر بغداد کا ذکر ملتا ہے (Délégation en Perse، ۳ : ۳۲ تا ۳۹)۔

اددنراری (Adad-nirari) دوم (۹۱۱ تا ۸۹۱ ق م) نے جن مقامات کو لوٹا ان میں سے ایک بگدا (دو) بھی تھا (Synchronistic History، جلد ۳، ایل ۱۲ = K.BI، ۲۰۰)۔ آٹھویں صدی عیسوی میں بغداد ایک آرامی نوآبادی ہو گیا۔ تیگلات پلاسر (Tiglatpilasser) سوم (۷۴۵ تا ۷۲۷ ق م) ایک آرامی قبیلے کے سلسلے میں بگدادو کا ذکر کرتا ہے (Paradies : Delitzsch، ص ۲۳۸)۔

ان سب باتوں کے پیش نظر یہ تسلیم کرنا بجا ہوگا کہ اس نام کی اصل واضح نہیں ہے۔ یہ حقیقت بھی مذکورہ بالا صورت حال کو نہیں بدلتی کہ ایرانیوں نے آٹھویں صدی ق م کے قریب ”بگ“ کا لفظ خدا کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ اشخاص کے ناموں کا جز بھی بننے لگا تھا (Reallexikon، ۱ : ۳۳۱)۔

المنصور نے اپنے شہر کا نام مدینۃ السلام (= سلامتی کا شہر) رکھا اور اس میں جنت کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے (قرآن مجید، ۶ [الانعام] : ۱۲۷، [یونس] : ۲۵)۔ یہی سرکاری نام دستاویزات، سگوں اور باٹوں وغیرہ پر لکھا جاتا تھا۔

۱۶۹: ابن الفقیہ، بخطوطہ مشہد، ورق ۲۹ (ب)۔ [فرہنگ آندراج (بذیل مادۃ ’بغ‘ و ’بغداد‘) میں ہے کہ بغ ایک بت کا نام تھا اور شہر بغداد کی بنیاد اسی بت کے نام پر رکھی گئی، نیز یہ کہ بغداد دراصل ’باغ داد‘ ہے، یعنی وہ باغ جہاں نوشیران مظلوموں کی دادرسی کیا کرتا تھا۔] جدید مصنفین کا رجحان بھی عموماً اس طرف ہے کہ اصل میں یہ فارسی لفظ ہے (قب Salmon : Introduction، ص ۲۳ تا ۲۴ : Baghdad : Le Strange، ص ۱۰ تا ۱۱ : Landschaft : Streck، ۱ : ۳۹ تا ۴۰ : Paikuli : Herzfeld، ص ۱۵۳ : By Nile and : W. Budge، Tigris، ۱ : ۱۷۸ : JRIA، ۱ : ۳۶ تا ۳۷)؛ مگر بعض دوسرے مصنفین کی رائے یہ ہے کہ اسی لفظ کی اصل آرامی ہے، جس کے معنی ہیں ”بھیڑوں کا بازو یا احاطہ“ (A. Karmali و Y. Ghanima، در لغة العرب، ۴ : ۲۷ : ۶ : ۷۳۸)۔ الطبری نے بغداد کی جائے وقوع کے ضمن میں سوق البقر (= گایوں کی منڈی) کا جو ذکر کیا ہے وہ قابلِ لحاظ ہے (۳ : ۲۷۷)۔ Delitzsch اس کے آرامی الاصل ہونے کے حق میں ہے، لیکن وہ اس کے معنی بیان نہیں کرتا (Delitzsch : Paradies، ص ۲۰۶، ۲۳۸)۔

حمورابی Hammurabi کے عہد (۱۸۰۰ ق م) کی ایک قانونی دستاویز میں شہر ”بگدادو“ Bagdadu کا ذکر ہے (Altbabylonische : Schorr، Rechtsurkunden، عدد ۱۹۷، سطر ۱)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نام حمورابی کے عہد سے قبل اور قطعی طور پر ایرانی اثر سے پہلے مستعمل تھا۔ [اسی عہد کے رسم الخط میں] لفظ ’بگ‘ اور ’ہو‘ کے لیے ایک ہی علامت استعمال ہوتی تھی۔ خاندان کسی (Kassite) کا بادشاہ نزیمارتاش Nazimaruttaš (۱۳۴۱ تا ۱۳۱۶ ق م) کے زمانے کے ایک سنگِ سرحد میں ایک شہر پلاری Pilari کا ذکر آتا ہے، جو ضلع ”بگ“

اور بناوڑی - خود کرخ (آرامی میں کرخہ، جس کے معنی ہیں قلعہ بند شہر) کا نام ایک قدیم گاؤں سے ماخوذ ہے، جسے ایرانی روایات میں شاپور دوم (۳۰۹ تا ۳۷۹ء) سے منسوب کیا جاتا ہے (المستوفی، ص ۳۰۰؛ دیکھیے الطبری، ۳: ۲۷۸ تا ۲۷۹؛ الخطیب، ص ۲۷، ۳۳؛ ابن الاثیر، ۳۳۲ تا ۳۳۳؛ یاقوت، ۳: ۶۱۳؛ ابن الجوزی: مناقب، ص ۷)۔

زینوفن Xenophon کے بیان کے مطابق ہخامنشیوں کے عہد میں بغداد کے ضلع میں (بقام سیتا کہ Sittake) وسیع سبزہ زار [= حدائق] تھے۔ عرب مصنف اس قسم کے دو باغوں کا ذکر کرتے ہیں (قَب الخطیب، ص ۲۸؛ المستوفی، ص ۳۰)۔ نہر عیسیٰ کے دہانے کے قریب ایک ساسانی قصر (قصر سابور) تھا، جہاں بعد میں منصور نے ایک پل تعمیر کیا۔ قدیم پل ("القنطرة العتیقہ") باب الکوفہ کے جنوب مغرب میں نہر صراة کے آر پار ساسانیوں کا بنوایا ہوا تھا۔ مشرقی جانب سوق الثلاثاء اور مقبرۃ الخیزرانیۃ عہد اسلامی سے پہلے کے تھے۔ اس علاقے میں چند دیر بھی اسلام سے پہلے کے تھے مثلاً دیر مارفثیون Mārfathion (الدير العتیق) جہاں قصر الخلد تعمیر کیا گیا، دیر بستان القس اور دیر الجائلیق، جس کے قریب [مشہور صوفی بزرگ] شیخ معروف [کرخی] کو دفن کیا گیا۔ (الطبری، ۳: ۲۷۳، ۲۷۷؛ ابن الفقیہ، ورق ۳۶ تا ۳۷؛ الخطیب، ص ۳۶، ۲۸؛ المسعودی: التنبیہ، ص ۳۱۲؛ الذہبی: دول، ۱: ۷۶؛ المستوفی، ص ۳۰)۔

ان قدیم بستیوں میں سے کسی کو بھی کوئی سیاسی یا تجارتی اہمیت حاصل نہ ہو سکی، لہذا المنصور کے شہر کو بنانے نو قرار دیا جاسکتا ہے۔ قرون وسطیٰ کے یورپی سیاحوں نے بسا اوقات بغداد کو بابل کے ساتھ اور بعض اوقات

اس کی مختلف شکلیں، خصوصاً بغداد اور عرفی نام جیسے مدینۃ ابی جعفر، مدینۃ المنصور، مدینۃ الخلفاء، اور الزوراء بھی استعمال کیے جاتے تھے (ابن الفقیہ، ورق ۲۹ ب؛ یاقوت، ۱: ۶۷۸؛ ابن رستہ، ص ۱۰۸)۔ الزوراء قدیم نام معلوم ہوتا ہے، جیسا کہ الفخری نے کہا ہے (الفخری، ص ۱۳۵؛ قَب المستوفی: نزہة، ص ۴۱)۔ بعد کی توجیہات کے لیے دیکھیے المسعودی: التنبیہ (قاہرہ)، ص ۳۱۲؛ یاقوت، ۲: ۹۵۴۔ عرب مصنفوں کا بیان ہے کہ منصور نے اپنا شہر جہاں آباد کیا وہاں اسلام سے پہلے کی بہت سی بستیاں موجود تھیں۔ ان میں سے سب سے اہم گاؤں بغداد تھا (دیکھیے الطبری: ۲: ۲۷۷ و ۱: ۲۰۶؛ ابن الجوزی: مناقب، ص ۷؛ الیعقوبی: بلدان، ص ۲۳۷)۔ اس کا محل وقوع دجلہ کے مغربی کنارے پر صراة کے شمالی جانب تھا (الطبری، ۳: ۲۷۷)۔ بعض اسے بدوریا کا حصہ سمجھتے ہیں اور اس کے سالانہ میلے کا ذکر کرتے ہیں (الخطیب، ۱: ۲۵ تا ۲۷؛ ابن الجوزی: مناقب، ص ۶؛ الیعقوبی: بلدان، ص ۲۷۵) اور اس سے اس امر کی توجیہ ہو سکتی ہے کہ کرخ آگے چل کر سودا گروں کا محلہ کیوں بنا۔ کچھ قدیم بستیاں، جن میں سے بیشتر آرامی تھیں، کرخ کے نواح میں مغربی جانب واقع تھیں۔ ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں: خطایہ (باب الشام کے پاس)؛ شرفانیہ اور اس کے شمال میں وردانیہ، جو محلہ الحریبہ کے اندر آ گئی تھی؛ سونایا، صراة اور دجلہ کے سنگھم کے قریب (جو بعد میں العتیقہ کہلائی)؛ قطفتا، اس کونے میں جہاں نہر رفیل دریائے دجلہ میں گرتی ہے اور برائے، جہاں سے نہر عیسیٰ سے نہر کرخایہ کی شاخ نکلتی ہے۔ تین چھوٹی چھوٹی بستیاں نہر کرخایہ اور صراة کے بیچ میں تھیں، یعنی مال، وزئالا (جو بعد میں قلاعین کا محلہ بنا)



میں واقع تھا، جہاں دریا کے دونوں جانب کھیتی خوب ہوتی تھی۔ یہ خراسان کی سڑک پر ایسی جگہ آباد تھا جہاں کاروانوں کے مختلف راستے آ کر ملتے تھے اور سہینے کے سہینے میلے لگتے تھے؛ چنانچہ عوام اور فوج کے لیے یہاں سامان رسد افراط سے مل سکتا تھا۔ اس کے ارد گرد نہروں کا ایک جال تھا، جو زراعت کے لیے بھی نہایت کارآمد تھیں اور شہری دفاع کا بھی کام دے سکتی تھیں۔ یہ مقام عراق کے وسط میں واقع تھا، آب و ہوا معتدل اور صحت افزا تھی اور مچھروں سے بھی خاصاً محفوظ تھا (الیعقوبی، ص ۲۳۵ تا ۲۳۸؛ الطبری، ص ۳؛ ۲۷۱ تا ۲۷۵؛ یاقوت، ص ۱؛ ۶۷۹ تا ۶۷۰؛ مناقب، ص ۷ تا ۸؛ المقدسی، ص ۱۱۹ تا ۱۲۰؛ ابن الاثیر، ص ۵؛ ۴۲۶ تا ۴۲۷؛ ابن الجوزی، ص ۷؛ الیعقوبی، ص ۲؛ ۴۳۹؛ الفخری، ص ۱۳۳ تا ۱۳۵)۔ اس کی خوبیوں اور المنصور کے ہاتھوں اس کی تعمیر کے مقتدر ہونے کے متعلق وضعی داستانیں بعد میں مشہور ہوئیں (قب الیعقوبی : البلدان، ص ۲۳۷؛ الفخری، ص ۱۳۳؛ الطبری (قاہرہ)، ص ۲۳۳ تا ۲۳۵؛ ابن الجوزی : مناقب، ص ۷ تا ۸)۔

بغداد کی قسمت میں بابل، سلوقیہ اور مدائن (Ctesiphon) کی جگہ لینا اور ان سب سے بازی لے جانا لکھا تھا۔

جہاں تک بغداد کے بارے میں قدیم ترین تفصیلی بیانات کا تعلق ہے الیعقوبی (۵۲۷۸/۵۸۹۱) اور ابن الفقیہ (۵۲۹۰/۵۹۰۳) نے اس کا محلہ وار ذکر کیا ہے اور سہراب (تقریباً ۵۹۰۰) نے اس علاقے کے نہری نظام کا حال بیان کیا ہے۔ اپنے بیرونی استحکامات اور اندرونی نقشے کے لحاظ سے یہ شہر ایک بڑا قلعہ معلوم ہوتا ہے۔ شروع زمانے میں اس شہر کے چاروں طرف ۴ ذراع (= ۲۰۰۲ میٹر) چوڑی گہری خندق تھی؛ اس کے بعد اینٹوں کا

سلوقیہ Seleucia [= سلفقیہ] کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے؛ چنانچہ ان کے سفرناموں میں اس کا نام بابل Babel اور بابلونیا Babellonia وغیرہ آتا ہے۔ آخر الذکر غلط نام عہد عباسیہ میں بابلی قبائل کے شیوخ (Babylonian Geonim) کی تفاسیر تالمود میں اور اس طرح بعد کے یہودی مصنفین کے ہاں بھی بغداد کے لیے عام طور پر آتا ہے۔ سب سے پہلے Pietro Jella Valle نے، جو ۱۶۱۶-۱۶۱۷ء میں بغداد میں موجود تھا، اس غلطی کی تردید کی جو اس کے زمانے میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ سترھویں صدی عیسوی تک مغرب میں بغداد کا بگڑا ہوا نام بلدخ Baldach (بلداکو Baldacco) عام طور سے مشہور رہا؛ ہوسکتا ہے کہ یہ نام بغداد کے نام کی چینی شکل سے ماخوذ ہو (قب Bretschneider : Medieval Researches، ص ۱ : ۱۳۸ و ۲ : ۱۲۳؛ "مارکوپولو کا سفرنامہ"، طبع Frampton، ص ۱۲۶، ۱۲۹)۔

جب عباسیوں نے مشرق کا رخ کیا اور اپنے لیے ایک جدید دارالسلطنت بنانا چاہا جو ان کی حکومت کی نمائندہ علامت قرار پائے، تو ان کا پہلا خلیفہ السفاح کوفہ چھوڑ کر انبارچلا آیا۔ المنصور ہاشمیہ میں منتقل ہوا، جو کوفہ کے قریب تھا، لیکن اسے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ کوفہ اس کے لیے مورزوں مقام نہیں، اس لیے کہ مخالف عناصر بکثرت ہونے کے باعث یہ جگہ حملے سے محفوظ نہیں تھی جیسا کہ راوندیہ کے خروج سے ثابت ہوا (قب یاقوت، ص ۱ : ۶۸۰ تا ۶۸۱؛ الطبری، ص ۳ : ۲۷۱ تا ۲۷۲؛ الفخری (قاہرہ)، ص ۱۳۳)، لہذا اسے فوجی لحاظ سے مناسب جگہ کی جستجو ہوئی۔ بڑی دیکھ بھال اور چہان بین کے بعد اس نے بالآخر فوجی، اور غذائی نیز آب و ہوا کے لحاظ سے بغداد کا مقام پسند کیا۔ وہ ایک زرخیز میدان

ایک ہشتہ اور اس کے بعد پہلی فصیل، جس کی چوڑائی سطح زمین پر ۱۸ ذراع (۹ میٹر) تھی۔ اس کے آگے اندر کی طرف دفاعی اغراض کے لیے ۵۶۰۹ میٹر (۱۰۰۰ ذراع) ناپ کے لیے دیکھیے Ruyyis (خراب) جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی۔ اس کے آگے کچی اینٹوں کی اصل فصیل تھی، جس کی بلندی ۳۳،۱۴ میٹر اور چوڑائی نیچے کی طرف ۵۰،۲ میٹر اور چوٹی پر ۱۴۰۲۲ میٹر تھی۔ ہر دو دروازوں کے درمیان اٹھائیس اٹھائیس بڑے بڑے برج تھے، البتہ باب الکوفہ اور باب البصرہ کے درمیان ان کی تعداد اٹھائیس تھی۔ ہر دروازے پر ایک قبہ بنا تھا، جہاں سے سارا شہر دکھائی دیتا تھا اور نیچے پاسبانوں کے گھر تھے۔ اس فصیل کے بعد ۷۰۰۰ میٹر چوڑا میدان تھا جس میں مکانات بنے ہوئے تھے۔ یہاں صرف فوجی سرداروں اور متوسلین (موالی) کو مکن بنانے کی اجازت تھی، پھر بھی ہر سڑک پر دونوں طرف مقبوض پھانک بنے تھے جو مقفل کیے جا سکتے تھے۔ اس کے بعد ایک تیسری سادہ سی دیوار آئی تھی جو اندر کے اس وسیع رقبے پر حاوی تھی جس میں فظ ذیل کی عمارتیں تھیں: قصر خلافت (باب انشعب)، جامع مسجد، متعدد دیوان (سرکاری دفاتر)، خلیفہ کی اولاد کے مکانات اور دو سفینے کہ ایک بہرہ داروں کے سردار کے لیے تھا اور دوسرا شرطہ (پولیس) کے حاکم کے لیے۔ شہر میں نظم و ضبط کے قیام، اندرونی مواصلات کی سہولت اور بیرونی کروائی راستوں سے بہ آسانی رابطہ رکھنے کے لیے شہر کو دو سڑکوں کے ذریعے چار برابر حصوں میں منقسم کیا گیا تھا۔ یہ سڑکیں یکساں فاصلہ رکھنے والے دروازوں سے آئی اور وسط شہر میں ایک دوسرے کو قطع کرتی تھیں۔ باب خراسان (جسے باب المدونہ بھی کہتے تھے) شمال مشرق میں تھا، اس کے مقابل جنوب مغرب میں

باب البصرہ تھا۔ شمال مغرب میں باب الشام تھا اور جنوب مشرق میں باب الکوفہ۔ اس طرح اندرونی حلقے میں جانے کے لیے پہلے خندق کو پار کرنا پڑتا تھا، اس کے بعد پانچ دروازوں میں سے گزرنا پڑتا تھا، یعنی باہر کی دیوار کے دو دروازے، دو بڑی فصیل کے عظیم دروازے اور ایک اندرونی دیوار کا دروازہ (دیکھیے الیعقوبی: البلدان: ۱: ۲۳۸ تا ۲۴۲، الطبری: ۳: ۳۲۲ تا ۳۲۳، ابن الجوزی: مناقب، ص ۹ تا ۱۰: الخطیب ص ۹ تا ۱۲: ابن الاثیر ۵: ۴۲۷ تا ۴۲۸، ۴۳۹: الیعقوبی، ۲: ۴۴۹: ابن الفقیہ، مخطوطہ، ورق ۳۳ الف)۔

قدیم شہنشاہی روایات بھی اس نقشہ عمارت میں رجود ہیں: خلیفہ کا اپنی رعایا سے بالکل الگ تھلگ رہنا، سلطنت نو کی عظمت کی نمائش کے لیے قصر شاہی اور مسجد کی عمارت کو پر شکوہ بنانا، آبادی کا الگ الگ محلوں میں بانٹ دینا، جن کے دروازوں کو رات کے وقت تالا ڈالا جا سکے اور الگ الگ پہرے بٹھائے جا سکیں۔ یہ سب باتیں پرانی روایات کی شاعد ہیں۔

المنصور نے اپنے بعض انتہائی مخلص حامیوں اور فوجی سرداروں کو شہر کے باہر دروازوں سے ملحقہ قطعات اراضی عطا کیے تھے اور اپنے سپاہیوں کو مضافات کی اراضی (أرباض) مکانات بنانے کے لیے دی اور اپنے بعض اعزہ و اقارب کو دور افتادہ زمینیں (أطراف) عطا کی تھیں (الیعقوبی، ۲: ۴۴۹ تا ۴۵۰: قب این حوقل، ۱۰: ۲۴۰)۔

اس مدور شہر کی عظمت کا مظہر اس کا جز گنبد [القبة الخضراء] تھا جو ۸۰۳ میٹر بلند اور قصر شامی کے اوپر تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی چوٹی پر ایک ایسی سوار [کا مجسمہ] نصب تھا۔ ۵۳۶ / ۱۱۴۱ء میں ایک نازرات کے وقت طوفان آیا اور یہ گنبد غالباً بجز گرنے سے گر پڑا (اصولی:



اور تاتاریوں کے حملے سے بچ نکلی۔

بغداد کا نقشہ تعمیر معاشرتی تصورات کا مظہر ہے۔ ہر محلے میں ایک ذمے دار شخص ہوتا اور آبادی عموماً مخلوط سی ہوتی تھی، چنانچہ یہاں مختلف نسلوں (ایرانی، عرب، خوارزمی) اور مختلف پیشوں کے لوگ آباد تھے۔ سپاہیوں کے گھر شہر پناہ سے باہر اور عموماً شہر کے شمالی یا مغربی جانب تھے، جب کہ سوداگروں اور کاریگروں کے مراکز نہر صرّاء کے جنوبی جانب کُرخ میں تھے (دیکھیے ابن الفقیہ، مخطوطہ، ورق ۳۷ ب، ۳۳ ب، ۲۹ ب)۔

بغداد کے نقشے میں منڈیوں کی اہمیت بہت نمایاں رہی ہے۔ شروع ہی میں بڑی فصیل سے اندرونی دیوار تک چاروں شاہراہوں کے کنارے کنارے بلند محرابوں والے کمرے (طاقات) تھے جن میں دکانیں کھولی گئیں اور یوں شہر میں چار منڈیاں قائم ہو گئیں (قَب الطبری، ۳ : ۳۲۲)۔ علاوہ بریں خلیفہ کا حکم تھا کہ دیوار کے باہر کے چاروں حصوں میں منڈیوں کے لیے کافی زمین چھوڑی جائے تاکہ ہر حصے میں ایک بڑی منڈی قائم ہو سکے (الیعقوبی: البلدان، ص ۲۴۲)۔ امن و حفاظت کے خیال سے المنصور نے ۱۵۷ھ / ۷۷۳ء میں حکم دیا کہ منڈیاں مدور شہر سے کُرخ میں منتقل کر دی جائیں۔ وہ چاہتا تھا کہ شور و شغب کرنے والے عناصر شہر سے دور رکھے جائیں، چنانچہ اس نے اس امر کا بندوبست کیا کہ رات کے وقت محلوں کے پھانک منڈیوں میں آمد و رفت کے لیے کھلے نہ رہے جائیں اور لوگوں کے ساتھ مل کر شہر کے اندر جاسوس داخل نہ ہونے پائیں۔ اس کے بدلے اس نے نہر صرّاء اور نہر عیسیٰ کے درمیان منڈیاں بنانے کا منصوبہ تیار کیا (الطبری، ۳ : ۳۲۴ تا ۳۲۵؛ ابن الجوزی : مناقب، ص ۱۳ تا ۱۴؛ یاقوت،

اخبارالراضی، ص ۲۲۹؛ ابن الجوزی : المنتظم، ۶ : ۳۱۷ تا ۳۱۸؛ مناقب، ص ۱۱؛ ابوالمحاسن، ۳ : ۲۷۰؛ الخطیب، ص ۱۱)، تاہم اس کی دیواریں بہت عرصے تک قائم رہیں اور ۶۵۳ھ / ۱۲۵۵ء میں جا کر منہدم ہوئیں (ابن الفوطی، ص ۳۰۳؛ سبط ابن الجوزی : مرآة الزمان، ۸ : ۶۷)۔ قصر باب الذهب کی تعمیر میں سنگ مرمر اور پتھر استعمال کیا گیا تھا اور اس کے پھانک کی تزئین طلائی کام سے کی گئی تھی۔ یہ محل تقریباً نصف صدی تک [خلیفہ کی] سرکاری سکونت گاہ رہا۔ اگرچہ خلیفہ [ہارون] الرشید نے اس کی طرف التفات نہ کیا، تاہم امین نے اس میں ایک نئے حصے کا اضافہ کیا اور اس کے گرد ایک "میدان" بھی بنوایا۔ ۱۹۸ھ / ۸۱۴ء میں محاصرہ بغداد کے دوران اس محل کو بہت نقصان پہنچا۔ اس کے بعد یہ سرکاری مسکن نہ رہا اور اس کی دیکھ بھال موقوف ہو گئی (قَب ابن الفوطی، ص ۳۰۳)۔

جامع مسجد (= جامع المنصور) چونکہ قصر کے بعد تعمیر کی گئی تھی، اس لیے یہ سمت قبلہ سے ذرا ہٹی ہوئی تھی (قَب الطبری (قاہرہ)، ۶ : ۲۶۵؛ ابن الاثیر، ۵ : ۴۳۹)۔ ۱۹۱ھ / ۸۰۷ء میں ہارون الرشید نے اسے گرا دیا اور دوبارہ اینٹوں سے تعمیر کیا۔ ۲۶۱ھ / ۸۷۵ء میں اسے وسیع کیا گیا اور پھر ۲۸۰ھ / ۸۹۳ء میں آخری مرتبہ اضافہ کیا گیا۔ المعتضد نے اس میں ایک اور صحن کا اضافہ کیا اور دوسرے حصوں کی مرمت کی (المنتظم، ۵ : ۲۱، ۱۴۳)۔ اس مسجد میں ایک مینار تھا (الخطیب، ۵ : ۱۲۵)، جو ۳۰۳ھ / ۹۱۵ء میں جل گیا (المنتظم، ۶ : ۱۳۰)، مگر پھر دوبارہ بنا دیا گیا (قَب ابن الجوزی : المنتظم، ۷ : ۲۸۴)۔ عہد خلافت میں یہی مسجد بغداد کی جامع مسجد رہی۔ ۶۵۳ھ / ۱۲۵۵ء میں یہ سیلاب کی زد میں آ گئی، لیکن وہ اس سے

(۲۵۴ : ۲)

ہر حرفے یا پیشے کے لیے اس کی علیحدہ منڈی یا بازار (درب) ہوتا تھا۔ کرخ کی منڈیاں حسب ذیل تھیں : پہلوں کی منڈی، کپڑے کی منڈی، غلے وغیرہ کی منڈی، بازار صرافہ، کتب فروشوں کا بازار، بھیڑ بکری کی منڈی (الیعقوبی : البلدان، ص ۲۳۱، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۵۳ : الاضطخری، ص ۸۳ : ابن حوقل، ص ۲۴۲ : الخطیب، ص ۲۲، ۳۱، ۶۷ : ابن الجوزی : مناقب، ص ۲۶ تا ۲۸) - یہ بھی پتا چلتا ہے شہر کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہاں خراسان، ساوراء، النہر، مرو، بلخ، بخارا اور خوارزم سے سوداگر آنے لگے۔ ان کی منڈیاں محلہ حریہ میں تھیں۔ ان سوداگروں کے ہر ایک گروہ کا ایک قائد اور ایک سردار ہوتا تھا (الیعقوبی : البلدان، ص ۲۳۶ تا ۲۳۸)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر حرفے والوں کا سردار حکومت منتخب کرتی تھی (دیکھیے الدوری : تاریخ العراق الاقتصادي، ص ۸۱)۔

ایک روایت ہے کہ [خلیفہ] المنصور چاہتا تھا کہ مدائن کے قصر سفید کا ایک حصہ منہدم کر کے اس کی اینٹیں اپنی عمارتوں میں لگائے، لیکن چونکہ اس کام میں خرچ ضرورت سے کہیں زیادہ اٹھتا تھا، لہذا وہ اس اقدام سے باز رہا۔ ایک اور روایت میں کہا گیا ہے کہ المنصور کے دل میں قصر سفید کی مرمت کرانے کا خیال تھا، لیکن اس کو اپنی تجویز پر عمل کرنے کا وقت نہیں ملا۔ یہ دونوں حکایتیں شعوبیہ مناقشے کی یاد دلاتی ہیں۔ شہر بغداد کا زیادہ حصہ لچی اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔

الیعقوبی کا بیان ہے کہ بغداد کی تعمیر کا نقشہ ۵۸/۱۳۱ء میں تیار ہو چکا تھا، (الیعقوبی : البلدان، ص ۲۳۸)، لیکن تعمیر کا کام یکم جمادی الاولیٰ ۱۴۵/۲ اگست ۷۶۲ء میں شروع ہوا (الخوارزمی کا بیان، در الخطیب، ص ۲)۔

قُب الیعقوبی، مترجمہ Wiet، ص ۱۱، حاشیہ ۴)۔ چار ماہرین فن عمارت نے اس شہر کا منصوبہ تیار کر لیا۔ حجاج بن اَرتاة نے مسجد کا نقشہ تیار کیا۔ (الطبری (قاہرہ) ۶۰ : ۲۶۵، ۲۳۷ : الیعقوبی، ص ۲۳۱)۔ تعمیر کے لیے المنصور نے ایک لاکھ مزدور اور کاریگر اکٹھے کیے تھے (الیعقوبی، ص ۲۳۸ : الطبری، ۳ : ۲۷۷)۔ نہر کرخا یہ سے ایک چھوٹی نہر مقام تعمیر تک نکالی گئی تھی تا کہ تعمیری کاموں اور پینے کے لیے پانی فراہم ہو سکے (الیعقوبی، ص ۲۳۸)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۵۱۳۶/۷۶۳ء میں کم از کم محل، مسجد اور سرکاری دفاتر بن کر تیار ہو چکے تھے اور المنصور بغداد میں منتقل ہو گیا تھا (الطبری، ۳ : ۳۱۳ : الخطیب، ص ۲)۔ ۵۱۳۹/۷۶۶ء تک مدور شہر کی تعمیر پایہ تکمیل کو پہنچ گئی (الطبری، ۳ : ۳۵۳ : الخطیب، ص ۲ تا ۳)۔

المنصور کا مدور شہر شہری منصوبہ بندی کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ دائرے کی شکل میں ہونے کی وجہ سے اس کا مرکز اپنے مختلف حصوں سے یکساں فاصلے پر تھا، لہذا شہر کا انتظام اور دفاع آسانی سے ہو سکتا تھا۔ عرب مصنفین اس نقشے کو بے مثل قرار دیتے ہیں (الیعقوبی، ص ۲۳۸ : ابن الفقیہ، ورق ۳۳ ب : الخطیب، ص ۶۷ : الذہبی : دول، ۱ : ۷۶)، تاہم مدور شہر کا منصوبہ مشرق قریب میں کوئی غیر معروف چیز نہیں ہے۔ ارگ (Uruk) کا نقشہ قریب قریب گول ہے (Alttertumskunde : V. Christian، جلد ۲، جدول ۱۳)۔ اشوریہ کی فوجی چھاونیوں کے احاطے گول ہیں۔ کریسول Creswell نے ایسے گیارہ شہروں کی فہرست دی ہے جو بیضوی یا مدور تھے۔ ان میں سے حران، عقبہ Agbatana الحضر Hatra اور داراب جرد ہیں۔ داراب جرد نقشے کے لحاظ سے المنصور کے شہر سے



نے نقل کیا ہے (الخطیب، ص ۵؛ ابوالمحاسن، ۱ : ۳۴۱)۔ اس پیمائش کے مطابق شہر کا قطر ۲۳۵۲ میٹر ہوتا ہے۔ الیعقوبی کا اندازہ کہ ہر دو دروازوں کا درمیانی فاصلہ خندق کے باہر سے ۵۰۰ ذراع لمبوا (۲۵۳۰۰ میٹر) تھا، مذکورہ بالا پیمائش کی روشنی میں قرین قیاس ٹھہرتا ہے۔

المنصور نے اس شہر کی تعمیر پر کتنا روپیہ صرف کیا؟ اس کی بابت بھی مختلف بیانات ملتے ہیں۔ ایک بیان میں خرچ کی رقم ایک کروڑ اسی لاکھ بتائی گئی ہے (اور غالباً دنیا مراد ہیں) (الخطیب، ص ۵؛ ابن الجوزی: مناقب، ص ۳۳؛ یاقوت، ۱ : ۶۸۳؛ الأریلی: تبر، ص ۵۳۳)۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ دس کروڑ درہم خرچ ہوئے (ابوالمحاسن، ۱ : ۳۴۱)۔ بہر حال اس سرکاری بیان کی رو سے، جو دفاتر خلافت کی قدیم دستاویزوں پر مبنی ہے، المنصور نے اس گول شہر پر چالیس لاکھ سو تراسی درہم خرچ کیے (الطبری، ۳ : ۳۲۶؛ الخلیسی: ص ۱۲۱؛ الخطیب، ص ۵ تا ۶؛ نیز دیکھیے ابن الاثیر، ۵ : ۳۱۹؛ ابن الجوزی: مناقب، ص ۳۳)۔ اگر ہم اس بات کا لحاظ کریں کہ اس زمانے میں مزدوری اور سامان تعمیر سستا تھا اور انحصار بنات خود حساب کتاب کی جانچ پڑتال معنی کے ساتھ کرتا تھا، تو یہ رقم قابلِ توجہ نہیں نظر آتی ہے۔

۱۵۷۷ء میں المنصور نے باب الخراسان کے مقابل ایک نئے دروازے درجہ کے کنارے تعمیر کیے، جس میں وسیع باغات تھے اور اس کا نام الخندق رکھا۔ یہ جگہ مجھوں نے ۱۹۰۷ء میں اور قازو ہوا کے لیے مشہور تھی۔ خود اس کا نام بیشت کی یاد دلائے والا تھا (الطبری، ۳ : ۳۲۶؛ الخطیب، ص ۵؛ یاقوت، ۵ : ۸۳؛ ابن الجوزی: مناقب، ص ۳۳؛ ابن الاثیر، ۶ : ۲۶۵)۔

بہت زیادہ ملتا جلتا ہے (Early Muslim : Creswell Arch. (short) ، ص ۱۷۱ تا ۱۷۳؛ Meissner : Baby- lonien und Assyrian ، جلد، ۱ : جدول ۱۶۱)۔

غالباً اس مدور شہر کے معمار اس قسم کے نقشوں سے واقف تھے۔ ابن الفقیہ بتاتا ہے کہ نقشے پسند کرتے وقت سوچا گیا تھا کہ شہر کی شکل مربع ہو یا گول؛ گول شکل زیادہ مکمل ہوتی ہے (البلدان، مخطوطہ، ورق ۳۳ ب)؛ تاہم غالب یہ ہے کہ گول قلعے کے تصور کی بنا پر اس شہر کا خاکہ گول بنایا گیا۔ الطبری کا بیان ہے کہ المنصور نے شہر کے چار دروازے فوجی چھاؤنیوں کے دستور کے موافق بنائے (الطبری، مطبوعہ قاہرہ، ۶ : ۲۶۵)۔

المنصور کے شہر کی وسعت کے متعلق مختلف معلومات ملتی ہیں۔ ایک بیان یہ ہے کہ باب الخراسان سے باب الکوفہ تک کا فاصلہ ۸۰۰ ذراع (= ۳۰۵۰۱۲ میٹر) ہے اور باب الشام سے باب البصرہ تک ۶۰۰ ذراع (= ۳۰۳۰۱۲ میٹر) کا فاصلہ ہے (الخطیب، ص ۹ تا ۱۱؛ ابن الفقیہ : مخطوطہ، ورق ۳۳ ب)۔ وکیع کی اصلاح کے مطابق ہر دو دروازوں کے درمیان ۱۲۰۰ ذراع (= ۶۰۸۰۲۸ میٹر) کا فاصلہ ہے (الخطیب، ص ۱۱)؛ مگر ان دونوں بیانات میں شہر کی وسعت کا اندازہ کم لگایا گیا ہے۔ تیسری اصلاح ریح کی ہے، جو شہر کے معماروں میں سے تھا۔ اس میں ہر دو دروازوں کے درمیان ایک میل کا فاصلہ بتایا گیا ہے (یہ ۵۰۰۰ ذراع مرسلہ = ۸۳۸۰ میٹر، دیکھیے D. Rayy ، ص ۲۸؛ الخطیب، ص ۸)۔ یہی تخمینہ ابن الجوزی (مناقب، ص ۳۳) یاقوت (تہذیب، ص ۳۳۳) ابو الحسن (ص ۱۰۰) اور الأریلی (تبر، ص ۵) میں دیا ہے۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے جو مختلف حکم کے مطابق کی گئی اور جسے ابن الجوزی

جنگی مصالح اور المنصور کی یہ حکمت عملی کہ فوج کو منقسم رکھا جائے، پھر جگہ کی کمی، یہ وجوہ تھوڑے ہی دن میں اس بات کے محرک ہوئے کہ خلیفہ ولی عہد المہدی کے لیے دریائے دجلہ کی شرقی جانب ایک فوجی معسکر تعمیر کرے۔ اس کا مرکزی حصہ معسکر المہدی تھا (جس کا نام بعد میں رصافہ ہو گیا کیونکہ الرشید نے وہاں اسی نام کا ایک محل بنایا تھا)، جس میں اس کے محل اور مسجد کی تعمیر ہوئی۔ اس کے گردا گرد فوجی سرداروں اور ستوسلین کے لیے گھر تھے۔ تجارتی سرگرمیاں بھی بہت جلد باب الطاق کی منڈیوں (اسواق) میں شروع ہو گئیں۔ اس کے فوجی حصے کے آثار معسکر المہدی کے چاروں طرف بنائی ہوئی دیوار اور خندق سے ظاہر ہیں۔ اس کی تعمیر ۵۱۵۱/۶۶۸ء میں شروع اور ۵۱۵۷/۶۷۳ء میں مکمل ہوئی۔ رصافہ المنصور کے شہر کے تقریباً مقابل بنا تھا (الیعقوبی: البلدان، ص ۲۵۱ تا ۲۵۳؛ الاضطحری، ص ۸۳ تا ۸۴؛ الخطیب، ص ۲۳ تا ۲۵؛ ابن الجوزی: مناقب، ص ۱۲ تا ۱۳؛ المقدسی، ص ۱۲۱؛ ابوالمحاسن، ۲: ۱۶؛ یاقوت، ۲: ۷۸)۔

بغداد بہت جلد کثرتِ عمارات، تجارتی چہل پہل، ثروت اور آبادی میں بڑھتا چلا گیا۔ مشرقی بغداد میں لوگوں کی ہر طرف سے بھرمار ہو گئی اور وہ اول تو مہدی کے عطیات کی کشش سے اور بعد ازاں براہِ مکہ [رک باں] کی وجہ سے، جنہوں نے باب الشماسیہ کے قریب اپنا ایک خاص محلہ بنا لیا تھا، یہاں کھچتے چلے آئے (الیعقوبی: البلدان، ص ۲۵۱؛ الاغانی (بولاق)، ۶: ۷۸؛ ۵: ۸؛ ابن خلیکان (بولاق)، ۲: ۳۱۱)۔ یحییٰ برمکی نے ایک شاندار محل تعمیر کیا اور اس کا نام از رہ انکسار "قصر الطین" رکھا (الاغانی، ۵: ۸)۔ جعفر نے مشرقی

بغداد کے زیریں جانب ایک بڑا پر تکلف محل بنایا، جو بعد میں المأمون کو دے دیا گیا۔ الرشید کے زمانے میں شہر کا شرقی پہلو باب الشماسیہ سے (جو باب القطر بل کے سامنے تھا) مغرب تک پھیلا ہوا تھا (اس کی جنوبی حد قنطرة المأمون الجديدة تک ہے) (الیعقوبی: البلدان، ص ۲۵۳ تا ۲۵۴)۔ دوسری جانب الامین نے قصر الخلد سے، جہاں ہارون الرشید رہتا تھا، باب الذهب کی طرف رخ کیا، اسے دوبارہ درست کرایا اور اس میں ایک طرف مکانات کی قطار کا اضافہ کر کے اس کے چاروں جانب چوکور احاطہ بنا دیا (قب الجہشیری، قاہرہ ۱۹۳۸ء، ص ۱۹۳؛ ابن الاثیر، ۱۱: ۱۵۲)۔ ملکہ زبیدہ نے دریائے دجلہ کے کنارے ایک مسجد بنوائی (جس کا نام اسی کے نام پر رکھا گیا)؛ یہ شاہی محلات کے قریب تھی۔ ایک اور شاندار مسجد شہر کے شمال میں اپنے محلے قطیغہ [ام جعفر (= زبیدہ)] میں تعمیر کی (یاقوت، ۳: ۲۱۱؛ [؟، ۱۳۱]، ابن خلیکان، ص ۱۸۸؛ المستطرف (طبع بولاق)، ۱: ۲۸۹)۔ اسی ملکہ نے قصر الخلد کے قریب ایک اور محل بنوایا، جو قصر القرار کہلاتا تھا (قب، الخطیب، ۱: ۸۷)۔ شہر کا مغربی حصہ شمال میں باب القطر بل اور محلہ کرخ کے درمیان پھیلنا شروع ہوا۔ محلہ کرخ نہر عیسیٰ تک پھیل گیا (یہ نہر موجودہ تلول خشم الدورہ کے مقام پر دریائے دجلہ سے مل جاتی تھی)؛ مغرب کی جانب یہ محول کے قرب و جوار تک پہنچ گیا (مشرق، ۱۹۳۴ء، ص ۸۹؛ قب آیات، در یاقوت، ۱: ۶۸۶؛ المسعودی، ۶: ۴۵۴؛ الطبری، ۳: ۸۷۳، ۸۷۶)۔ بغداد کے حسن و جمال کی تعریف میں شعرا رطب اللسان ہیں اور اسے "فردوس ارضی" کہتے ہیں۔ اس کے حیرت انگیز باغ، سرسبز دیہات، اونچے اونچے عالیشان محلات، جن کے دروازے



زندگی پائی۔ اس نے شرقی جانب ایک محل تعمیر کیا (الیعقوبی، ص ۲۵۵؛ قب الخطیب، ص ۴۷)۔ اس کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی نئی ترکی فوج کے لیے نیا دارالسلطنت تعمیر کرے۔ بغداد اتنا گنجان آباد تھا کہ اس میں فوج کی گنجائش نہ تھی۔ ادھر بغداد کے شہری اور پرانے فوجی دستے دونوں اس کی ترک فوج سے عناد رکھتے تھے اور المأمون کو فساد کا خطرہ تھا۔ سامرا کے دور (۸۳۶ تا ۸۹۲ء) میں بغداد خلفا کی براہ راست توجہ سے محروم رہا (قب الیعقوبی، ص ۲ : ۲۰۸؛ الإربلی، ص ۱۶۱)، تاہم وہ تجارتی اور ثقافتی سرگرمیوں کا بڑا مرکز بنا رہا۔

بغداد کو ترکوں کے ہنگاموں سے بھی نقصان پہنچا، جب المستعین سامرا، چھوڑ کر بغداد آ گیا اور وہاں المعتز کی فوج نے ۵۲۵۱ / ۸۶۵ء میں اسے سال بھر محصور کیے رکھا۔ اس زمانے میں رصافہ سوق الثلاثاء تک (آج کل کے شارع سمائل تک) پھیل گیا تھا۔ المستعین نے بغداد کے دفاعی استحکام کا حکم صادر کیا۔ شرقی جانب کی دیوار باب الشمسیہ سے سوق الثلاثاء تک بڑھا دی گئی اور غربی جانب قطیعة ام جعفر [زیادہ] سے مختلف سکونتی علاقوں کے گرد ہوتی ہوئی صراة تک پہنچ گئی اور اس کے گرد کی مشہور خندق [جس کا نام طاہر تھا] کھودی گئی (الطبری، ص ۳ : ۱۸۵۱)۔ محاصرے کے زمانے میں مشرقی دیوار کے باہر کے مکان، دہانیں اور باغ دفاعی تدبیر کے طور پر تباہ کر دیے گئے (الطبری، ص ۳ : ۱۵۷۱) اور شمسید، رصافہ اور مخیم کے مشرقی محلوں کو سخت نقصان پہنچا۔

۵۲۷۸ / ۸۹۱ء میں المعتد قطی طور پر

بغداد منتقل ہو گیا۔ اس نے بوران سے قصر حینی مانگا، چنانچہ بوران نے اس کی نئے سرے سے

اور ایوان اعلیٰ درجے کے نقش و نگار سے آراستہ اور نفیس و پر تکلف فرش و فرش سے مزین تھے، بہت مشہور تھے (قب الطبری، ص ۳ : ۸۷۳، القالی : امالی، ص ۲ : ۲۳۷؛ یاقوت، ص ۱ : ۶۸۶)۔

بغداد کو الامین اور المأمون کے باہمی جدال و قتال کے زمانے میں سخت صدمہ پہنچا۔ چودہ ماہ تک اس کا محاصرہ رہا تو جنگ خود شہر تک پہنچ گئی (المسعودی، ص ۶ : ۴۵۶)۔ اہل شہر کی شدید مقاومت سے زچ ہو کر طاہر نے حکم دیا کہ مدافعین کے گھر منہدم کر دیے جائیں؛ چنانچہ دریائے دجلہ، دارالرقیق (باب الخراسان کے شمال میں)، باب الشام، باب الکوفہ سے نہر صراة، نہر کرخایہ اور گناسہ تک محلے کے محلے تباہ و برباد کر دیے گئے (الطبری، ص ۳ : ۸۸۷)۔ سرکش بلوائیوں، بے لگام رضاکاروں اور عیاروں کے ہاتھوں یہ تباہی پایہ تکمیل تک پہنچ گئی۔ قصر الخلد اور دیگر محلات، کرخ اور مشرقی جانب کے چند محلوں کو بہت سخت نقصان پہنچا۔ "تباہی اور غارتگری خوب زوروں پر رہی یہاں تک کہ بغداد کی ساری شان و شوکت جاتی رہی"؛ یہ الطبری اور المسعودی کے الفاظ ہیں (دیکھیے الطبری، ص ۳ : ۸۷۰ تا ۸۷۹، ۹۲۵ تا ۹۲۶؛ المسعودی، ص ۶ : ۴۵۴ تا ۴۵۹؛ ابن الاثیر، ص ۶ : ۱۸۸)۔ بغداد میں یہ انتشار جاری رہا تا آنکہ ۵۲۰۴ / ۸۱۹ء میں المأمون مرو سے بغداد پہنچ گیا۔ المأمون آ کر اپنے قصر میں ٹھہرا اور اسے اتنا وسیع کیا کہ ایک گھڑ دوڑ کا میدان، ایک چڑیا گھر اور اس کے خاص جان نثاروں کے مکانات اس کے اندرین گئے (یاقوت، ص ۱ : ۸۰۷)۔ پھر اس نے اپنا یہ محل الحسن بن سہل کو عطا کر دیا، جو آئندہ قصر الحسنی کے نام سے مشہور ہوا اور اس نے یہ محل بروئے وصیت اپنی دختر بوران کو دے دیا۔ المأمون کے عہد میں بغداد نے دوبارہ

اس کا تھوڑا سا حصہ ہی گرایا گیا تھا کہ آل ہاشم نے صدائے احتجاج بلند کی کہ یہ شہر پناہ عباسیوں کی شان و شوکت کی مظہر ہے۔ اس پر المعتضد نے اسے گروانا موقوف کر دیا۔ بایں ہمہ لوگوں نے رفتہ رفتہ فصیل کو گرا کے اپنے اپنے گھروں میں توسیع شروع کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انجام کار ساری شہر پناہ منہدم ہو گئی اور شہر برباد ہو گیا (التوخی: نشوار، ۱: ۴۷ تا ۷۰)۔

المکتفی (۵۲۸۹/۱ تا ۵۲۹۵/۷) نے قصر التاج تعمیر کیا۔ اس میں ایوان اور قبة بنائے اور دجلے پر بارانداز بڑی تعمیر کیا۔ اس کے احاطے میں اس نے ایک بلند نیم گروی گنبد بنایا تا کہ وہ گدھے پر سوار ہو کر اس کی چوٹی تک پہنچ سکے (الخطیب، ص ۳۸؛ الأربلی، ص ۱۷۵؛ یاقوت، ۱: ۸۰؛ ابن الجوزی: المنتظم، ۵: ۱۳۳)۔ ۹۰۱-۹۰۲ء میں المکتفی نے محل کے قیدخانے ڈھا دیے اور ایک جامع مسجد (جامع القصر) تعمیر کی، جو مقتدر کے زمانے تک تیسری جامع مسجد بنی رہی (ابن الجوزی: المنتظم، ۶: ۳؛ الخطیب، ص ۶۲)۔

المقتدر (۵۲۹۵/۸ تا ۵۳۲۰/۳۲) نے شاہی محلات میں نئی عمارتوں کا اضافہ کیا اور ان کی تزئین و آرائش مبالغے کی حد تک کی۔ اس نے چڑیا گھر (حیر الوحوش) کی طرف خاص توجہ مبذول کی (قب الخطیب، ص ۴۸، ۵۳)۔ خطیب نے سال ۵۳۰ھ/۹۱۷-۹۱۸ء کے جو تفصیلی واقعات بیان کیے ہیں وہ پڑھنے کے قابل ہیں۔ محلات کے گرد کی محکم فصیل اور مقتدر کے دیوان عام سے شہر کے ایک دروازے تک خفیہ راستہ، دفاع کی ضروری تدبیریں تھیں (دیکھیے الخطیب، ص ۵۱)۔ نوادر عجائبات میں ایک دارالشجرہ تھا۔ یہ ایک بڑے حوض کے اندر چاندی کا درخت تھا، جس کے اٹھارہ ٹہنے اور شاخ در شاخ ٹہنیاں تھیں۔ ان پر قرئی

مرمت کرائی اور اسے خلیفہ کے شایان شان آراستہ و پیراستہ کر کے اس کے حوالے کر دیا (قب ابن الجوزی: المنتظم، ۵: ۱۳۳)۔ اس کے بعد ۵۲۸۰/۸۹۳ء میں المعتضد نے اس محل کو نئے سرے سے تعمیر کیا؛ اس کے میدانوں کو وسعت دی، اس میں نئے مکانات کا اضافہ کیا اور اس کے قطعات (مطابیر) پر قید خانے بڑی تعمیر کیے، اس میں ایک گھڑ دوڑ کا میدان بوی بنا دیا اور پھر اس رقبے کے گرد خاص دیوار کھینچ دی۔ اسے دارالخلافة بنانا مقصود تھا، چنانچہ اس میں اضافے ہوتے رہے اور یہ مستقر حکومت بنا رہا (الخطیب، ۵: ۲؛ ابن الجوزی: المنتظم، ۶: ۵۳؛ مناقب، ص ۱۵؛ التوخی: نشوار، ۸: ۱۵؛ ابوالمعاسن، ۳: ۸۵؛ الأربلی، ص ۱۷۳)۔

پھر اس نے قریب ہی دریائے دجلہ کے کنارے قصر التاج کی بنیاد رکھی، مگر بعد میں یہ دیکھ کر کہ وہاں شہر کا دھواں بہت اکھٹا ہو جاتا ہے، اس نے ایک اور محل شمال مشرق کی طرف دو میل کے فاصلے پر بنانے کا فیصلہ کیا اور یوں رفیع و پر شکوہ قصر الثریا کی تعمیر ہوئی، جسے ایک زمین دوز راستے کے ذریعے القصر (الحسنی) سے ملا دیا گیا۔ اس کے ارد گرد باغات لگائے گئے اور نہر موسیٰ سے وہاں پانی پہنچایا گیا (دیکھیے ابن المعتز کا بیان، در دیوان (بیروت ۱۹۱۳ء)، ص ۱۳۸ تا ۱۳۹)۔

ہوا کو صاف رکھنے کی غرض سے اس نے حکم دیا کہ بغداد کے ارد گرد دھان اور کھجور کے درخت نہ بوئے جائیں (دیکھیے ابن الجوزی: المنتظم، ۵: ۱۳۲)۔ قصر الثریا ۵۳۶۹ھ [۱۰۷۶-۱۰۷۷ء] تک اچھی حالت میں رہا اور پھر اسے سیلاب بہا کر لے گیا اور وہ تباہ و برباد ہو گیا (ابن الجوزی: مناقب، ص ۵۱؛ یاقوت، ۱: ۸۰۸)۔ اب ملوڑ شہر کی ویرانی شروع ہوئی۔ المعتضد نے حکم دیا تھا کہ شہر کی فصیل کو ڈھا دیا جائے، لیکن ابھی



جب مشرقی بغداد میں بڑی توسیع ہوئی تھی۔ ان سب روایات میں بغداد کی لمبائی دونوں جانب تقریباً یکساں تھی، کیونکہ الاصطخری اور طیفور دونوں کے بیان کے مطابق پہلی پیمائش (۵۲۷۹ / ۵۸۹۲) میں بغداد کا طول تقریباً ۱۷ کیلومیٹر اور عرض ۶ کیلومیٹر دیا ہے۔ اس کے مقابلے میں المقتدر کے زمانے (۵۳۲ / ۵۹۳۲) کی پیمائش میں طول تقریباً ۸ کیلومیٹر ہے اور عرض ۱۷ کیلومیٹر تھا۔

بغداد کا جغرافیائی مقام، اس کے سرگرم عمل باشندے (قَبّ انجاض : کتاب البغداد، ص ۳۹؛ التنوخی : الفرج، ۲ : ۱۱)، پھر حکومت کا لوگوں کو تجارت کی ترغیب دینا (قَبّ الیعقوبی، ص ۵۹) اور خلافت کی شہرت و ناموری، ان سب باتوں نے بغداد کو بہت جلد تجارت کا ایک عظیم مرکز بنا دیا (دیکھیے : الدوری : تاریخ العراق الاقتصادية، ص ۱۳۳ تا ۱۵۷)۔ سنڈیاں بغداد کی زندگی کی ایک خصوصیت بن گئیں، جو رصافہ میں اور خصوصیت سے کٹوخ میں قائم تھیں۔ ہر جنس تجارت کا ایک الگ بازار (سوق) تھا، مثلاً میوے کا بازار، کپڑے کا بازار، روئی کا بازار، کتب فروشوں کا بازار (جس میں سو سے زیادہ دکانیں تھیں)، صرافہ اور کٹوخ میں دوائفروشوں (عطّارین) کی منڈی۔ غیر ملکی سوداگروں کے بازار باب الشام میں تھے۔ شہر کے مشرقی حصے میں بھی مختلف قسم کے بازار تھے۔ ان میں پھولوں کا بازار (سوق الطیب)، کھانے کا بازار، سناروں کا بازار، بکر منڈی، کتب فروشوں کا بازار اور چین سے درآمد شدہ اشیاء کا بازار شامل تھے (الیعقوبی : البلدان، ص ۲۳۱، ۲۳۶، ۲۳۸، ۲۵۳؛ الاصطخری، ص ۳۸؛ الخطیب، ص ۲۲، ۶۵، ۶۶، ۶۹؛ ابن الجوزی : مناقب، ص ۲۶، ۲۷ تا ۲۸؛ ابن حوقل، ص ۲۳۲)۔

یا طلائی پرند اور چڑیاں بیٹھی تھیں، جو کبھی کبھی سیٹیاں بجاتی تھیں۔ حوض کے دونوں طرف شہ سواروں کے پندرہ مجسمے ایک ہی سمت میں حرکت کرتے تھے، گویا ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے ہوں (ص ۵۴)۔ ایک ۳.۰ x ۲.۰ ذراع پارے کا حوض تھا، جس میں ۳ طلائی کشتیاں تھیں۔ اور اس کے گرد ایک پرستان جیسا باغ تھا۔ چڑیا گھر کے اندر ہر قسم کے جانور تھے۔ ایک شیر گھر تھا، جس میں ایک سوشیر تھے۔ ایک قصر الفردوس تھا، جس میں قابل دید اسلحہ تھے۔ شاہی احاطے کے اندر محلات کی تعداد تیس تھی (قَبّ الخطیب، ص ۵۳ تا ۵۵؛ ابن الجوزی : المنتظم، ۶ : ۱۳۳)۔

اس زمانے میں بغداد اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گیا۔ شرقی حصہ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں شمسیہ سے دارالخلافہ تک پانچ میل (ایک میل = ۱۸۴۸ میٹر) پھیل گیا تھا (الاصطخری، ص ۸۳)۔ طیفور (۵۸۹۳ م) لکھتا ہے کہ الموفق نے ۵۲۷۹ / ۵۸۹۲ سے پہلے بغداد کی مساحت کا حکم دیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا رقبہ ۳۳۷۵۰ جریب ہے۔ اس میں سے ۲۶۲۵۰ جریب مشرقی بغداد کا تھا اور ۱۷۵۰۰ جریب مغربی بغداد کا (ابن الفقیہ، ورق ۳۳ ب؛ قَبّ ابن حوقل، ۱ : ۲۳۳)۔ طیفور کے ایک اور قول کے مطابق مشرقی بغداد الموفق کے زمانے میں ۱۶۷۵۰ جریب (ایک جریب = ۱۳۶۶ مربع میٹر) اور مغربی بغداد ۲۷۰۰۰ جریب تھا۔ یہ قول زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس وقت تک مغربی بغداد کی اہمیت زیادہ تھی۔ ایک اور روایت میں بغداد کا کل رقبہ ۵۳۷۵۰ جریب دیا ہے، یعنی ۲۶۷۵۰ جریب مشرقی بغداد میں اور ۲۷۰۰۰ جریب مغربی بغداد میں (الخطیب، ص ۷۳)۔ اغلب یہ ہے کہ مؤخر الذکر پیمائش المقتدر کے زمانے کی ہو

ہوتا ہے۔ صرافوں کے اپنے بازار تھے، خاص کر کرخ میں (قبّ الجہیشیاری، ص ۲۲۸)؛ وہ زیادہ تر عوام الناس کے کام آتے تھے، جب کہ جہبذ زیادہ تر حکومت اور اس کے عہدہ داروں کا کام کرتے تھے۔

بغداد آبادی کے لحاظ سے بین الاقوامی شہر

بن گیا۔ یہاں کے باشندوں میں مختلف اقوام، رنگ

اور مذاہب کے لوگ موجود تھے جو یہاں تجارت

کرنے، فوج میں بھرتی ہونے، بطور غلام یا دیگر

روزگاروں کے لیے آئے تھے۔ قابل ذکر بات یہ ہے

کہ اس کی شہری زندگی میں عام باشندے بڑا

حصہ لینے لگے تھے (دیکھیے ابن الاثیر، ۸ : ۸۵ تا

۸۶؛ مسکویہ، ۱ : ۲۳ تا ۲۵؛ الاصفہانی : تاریخ

(ریاضۃ برلن)، ص ۱۳۰۔ ۵۳۰/۹۱۹ء میں بازار

میں چیزوں کی قیمتیں بڑھ جانے کے خلاف ان کی شورش

اور ۴۰۱ھ / ۸۱۶ء میں الامین کے قتل کے بعد جو

افراقی ہوئی اس میں ان کی قیام امن کی کوشش

کے لیے دیکھیے الطبری، ۳ : ۱۰۰۹ تا ۱۰۱۰؛

ابن الاثیر، ۶ : ۲۲۸ تا ۲۲۹ و ۷ : ۱۳ تا ۱۴۔

عیارین اور شطاروں کی عملی سرگرمیاں اسی زمانے میں

شروع ہوئیں (دیکھیے الطبری، ۳ : ۱۰۰۸، ۱۰۸۶؛

المسعودی، ۶ : ۳۵۷، ۳۶۱ بعد)۔

بغداد کی آبادی کا تخمینہ بتانا مشکل ہے۔

مسجدوں اور حماموں کے تخمینے صریحاً مبالغہ آمیز

ہیں۔ الموفق کے زمانے میں تین لاکھ مسجدیں

اور ساٹھ ہزار حمام؛ المقتدر کے زمانے میں ستائیس

ہزار حمام؛ معزالدولہ کے زمانے میں سترہ ہزار؛

عضدالدولہ کے زمانے میں پانچ ہزار؛ بہاء الدولہ کے

زمانے میں تین ہزار بتائے گئے ہیں (الخطیب، ص

۷۴ تا ۷۶؛ ابن الفقیہ، ورق ۵۹ ب؛ ہلال الصابی :

رسوم دارالخلافة، مخطوطہ، ورق ۲۷ تا ۳۰)۔

۵۳۸۳ / ۹۹۳ء میں حماموں کا شمار کیا گیا تو

ڈیڑھ ہزار حمام نکلے تھے۔ روایات میں اس بات

المنصور کے زمانے سے منڈیوں کی نگرانی کے لیے

محتسب مقرر کیا جاتا تھا، جو دھوکے بازی اور

فریب کا انسداد، ناپ تول کے باٹوں کی جانچ پڑتال

کرتا تھا (قبّ الخطیب، ص ۲؛ الصابی : رسائل، ص

۱۱۳، ۱۳۱ تا ۱۳۲؛ الماوردی، ص ۱۳۱ تا ۱۳۲)۔

محتسب حماموں کی نگرانی بھی کرتا تھا اور ممکن

ہے کہ مسجدوں کی دیکھ بھال بھی اسی کے ذمے

ہو (الخطیب، ص ۷۸)۔ وہ تخریبی کارروائیوں کی

روک تھام بھی کرتا تھا۔

ہر منڈی اور ہر حرفے کا ایک سردار ہوتا،

جسے حکومت مقرر کرتی تھی۔ ہر پیشے کا "ثانی"

اور "استاذ" ہوا کرتے تھے (قبّ اخوان الصفا، ۱ :

۲۵۵؛ قبّ رسائل الجاحظ (طبع السندی)، ص ۱۲۶)۔

بغداد سے سوتی اور ریشمی پارچہ دساور جاتا تھا،

خاص کر رومال، پیش بند، عمامے، تراشیدہ بلور،

روغنی برتن، مختلف قسم کے تیل، عرق، معجونیں

(حدود العالم، ورق ۱۱ الف؛ المقدسی، ص ۱۲۸)۔

بغداد میں رنگ برنگ کے قمیص، باریک کپڑے

کے عمامے اور تولیے تیار ہوتے تھے۔ ان تولیوں کی

بڑی شہرت تھی (الدمشقی : تجارة، ص ۲۶)۔ اس

کے باریک سفید سوتی قمیصوں کا کہیں جواب نہ

تھا (ابن الفقیہ، ص ۲۵۳)۔ بغداد کا سَقْلَطُون

(ریشمی کپڑا)، مَلْحَم اور عَتَابی (ریشمی اور سوتی)

کپڑا شہرہ آفاق تھا (حدود العالم، ص ۳۸؛ النویری،

۱ : ۳۶۹؛ ابوالقاسم، ص ۳۵؛ المقدسی، ص ۳۲۳؛ ابن

حوقل، ص ۲۶۱)۔ باب الطاق میں بہت عمدہ تلواریں

تیار ہوتی تھیں (العرب [ : صلة تاریخ الطبری ]، ص ۵)۔

اسی طرح وہ اپنی چربی مصنوعات اور کاغذ سازی میں

مشہور تھا (قبّ ابن الفقیہ، ص ۲۵۱)۔

بغداد میں بنکاری کے نظام کی ترقی بھی تجارت

اور صنعت و حرفت کے لیے ایک بہت بڑا محرک تھی

جیسا کہ صرافوں اور جہبذوں کی سرگرمیوں سے ظاہر



کے عموماً تین حصے ہوتے، جن کے گرد ایک دیوار کھینچ دی جاتی تھی : (۱) زنان خانہ، (۲) دیوان خانہ اور (۳) شاگرد پیشہ۔ باغوں کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی (الأغانی، ۲ : ۲۳ و ۳ : ۳۱ و ۳ : ۱۳۳ و ۵ : ۳۸ و ۱۷ : ۱۲۹)؛ ہلال الصابی : رسوم، ص ۳۲)۔ قالین، دیوان، پردے اور تکیے گھر کے سامان کی نمایاں چیزیں تھیں (ابوالقاسم، ص ۳۶)۔ گرمی میں پنکھوں اور خاص کر ٹھنڈے کیے ہوئے گھروں اور تہ خانوں (سرداب) سے کام لیا جاتا تھا (دیکھیے، [جمیل نخلة] المدور: حضارة الاسلام، ص ۳۰، ۱۱۷) کتبوں، نیز جانوروں اور پودوں کی اشکال وغیرہ سے دروازوں کو مزین کیا جاتا تھا (کتاب مذکور، ص ۲۹؛ ابوالقاسم، ص ۲، ۳۶)۔

بغداد کی زندگی کی بڑی خصوصیت، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، مسجدوں اور حماموں کی کثرت تھی۔

بغداد ثقافت کا عظیم مرکز تھا۔ یہ حنفی اور حنبلی فقہ کا گھر تھا۔ اس میں بیت الحكمة قائم ہوا، جس میں دوسری زبانوں کی علمی کتابوں کے ترجمے بھی ہوتے تھے۔ اس مرکز سے باہر بھی ترجمے کیے جاتے تھے۔ پھر یہاں علوم طبیعی سے متعلق کچھ تجربے بھی کیے جاتے تھے۔ بغداد کی مسجدیں، خصوصاً جامع المنصور، علوم کے بڑے مرکز تھے، کتابوں کی دکانوں کی کثیر تعداد سے، جو بعض اوقات ادبی مراکز کا درجہ رکھتی تھیں، ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں تہذیب و ثقافت کی سرگرمیاں کس قدر وسیع پیمانے پر جاری تھیں۔ اس کے شاعروں، مؤرخوں اور فضلا کی اتنی زیادہ تعداد تھی کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ الخطیب کی تاریخ بغداد کو دیکھ کر معلوم ہو سکتا ہے کہ علم کے ایک ایک شعبے میں بغداد سے تعلق رکھنے والے فضلا کی

پر زور دیا گیا ہے کہ ایک حمام تقریباً دو سو گھروں کے کام آتا ہے (ابن الفقیہ، ورق ۵۹ ب، ۶۰ الف؛ ہلال الصابی، مخطوطہ، ورق ۲۹)۔ اگر ایک گھر کی اوسط تعداد پانچ نفر ہو تو بغداد کی آبادی پندرہ لاکھ کے قریب ہوتی ہے۔ المقتدر نے بنان بن ثابت کو حکم دیا کہ طبیوں کا امتحان لے اور طبابت کرنے کا اجازت نامہ صرف انہیں دے جو اس میں قابلیت رکھتے ہوں۔ نتیجہ تقریباً آٹھ سو ساٹھ طبیوں کو اجازت نامے دیے گئے (ابن الاثیر، ۸ : ۸۵؛ ابن ابی اصیبعہ، ۲ : ۲۰۰ بعد، ۲۲۴، ۳۱۰؛ ابن القفطی، ص ۱۶۴ بعد)۔ اگر ہم اس میں ان اطباء کا اضافہ کریں جو سرکاری شفاخانوں میں ملازم تھے اور غیر مجاز طبیوں کو بھی شامل کر لیں تو یہ تعداد غالباً ایک ہزار تک پہنچ جائے گی۔ مسجد کے رقبے کی پیمائش کے پیش نظر جمعة الوداع کے دن جامع المنصور اور جامع رصافہ میں نماز ادا کرنے والوں کی تعداد کا اندازہ چونسٹھ ہزار کیا گیا تھا (ابن الفقیہ، ورق ۶۲ الف؛ نیز دیکھیے الطبری، ۳ : ۱۷۳۰)۔ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے اواخر میں کشتیوں کی تعداد کا تخمینہ تیس ہزار کیا گیا تھا (ابن الجوزی : مناقب، ص ۲۴)۔ ان اعداد و شمار کے مطابق نیز شہر کے رقبے کے لحاظ سے چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں بغداد کی آبادی کا تخمینہ پندرہ لاکھ ہوتا ہے۔ الایلیدی بھی، جو اسی زمانے میں ہوا ہے، یہی اندازہ بتاتا ہے۔

بغداد میں امرا کے محلے بھی تھے، جیسے الظاہر، الشمسیہ، المأمونیہ اور درب عون اور غریبوں کے بھی، جیسے قطیعة الکلاب اور نہر الدجاج (ابوالقاسم البغدادی، ص ۲۳، ۱۰۶)۔ گھر دو منزلہ ہوتے تھے، مگر عوام الناس کے گھر ایک منزلہ ہی تھے۔ مالداروں کے مکانوں میں حمام ہوتے تھے: ان مکانوں

کا ذکر کرتا ہے (ابن الجوزی: مناقب، ص ۲۰؛ الاصلطخری، ص ۸۳) - ۵۳۸۷ / ۶۹۹۷ میں بہاء الدولہ نے ایک پل سوق الثلاثاء کے قریب بنایا (بِشْرَعَةِ الْقَتَّانِينَ) اور یہی تیسرا پل ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت زیادہ توجہ شمالی بغداد سے ہٹ کر سوق الثلاثاء کی طرف ہو گئی تھی (ابن الجوزی: المنتظم، ۷: ۱۷۱؛ قَبِ ابْنِ الْجَوْزِيِّ: مناقب، ص ۲۰؛ الخطیب، ص ۷۱ تا ۷۲)۔

الأمین کے زمانے تک بغداد کی زندگی میں استحکام و ثبات رہا۔ پہلے محاصرے کے زمانے میں "عامۃ" الناس میں شورش پسند عناصر کا ظہور ہوا۔ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے آخری ربع سے سیلاب اور آتشزدگی نے بھی تباہی میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ ۵۲۷۰ / ۶۸۸۳ کے سیلاب نے کرخ میں سات ہزار گھر تباہ کر دیے۔ ۵۲۹۲ / ۶۹۰۴ اور ۵۳۲۸ / [۶۹۳۹] میں بغداد کو سیلاب سے خاصا نقصان پہنچا (الطبری، ۳: ۲۱۰۵؛ ابن الأثیر، ۸: ۳۷۱؛ ابوالمحاسن، ۳: ۱۵۷ اور ۲۶۶) - ۵۳۷۳ / ۶۹۸۳ میں سیلاب باب الکوفہ سے آگے بڑھ کر شہر میں داخل ہو گیا (الصولی: اخبارالراضی، ص ۲۷۸؛ الخطیب، ص ۱۶)۔ نہروں کی طرف سے بے پروائی، خصوصاً امیرالامرا کے زمانے (۵۳۲۴ / ۶۹۳۵ تا ۵۳۳۴ / ۶۹۴۵) میں، ان سیلابوں کی اور ضلع بادوریا کی پربادی کی ذمے دار تھی (سکویہ، ۲: [۹]؛ الصولی: اخبارالراضی، ص ۱۰۶، ۲۲۵؛ ۱۳۷ تا ۱۳۸)۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قحط اور طاعون جو ۵۳۲۰ / ۶۹۳۲ سے پہلے کبھی کبھار کی بات تھی اس کے بعد متواتر آنے لگے (قَبِ ابْنِ الْأَثِيرِ، ۷: ۱۷۷، ۱۸۷، ۳۳۸) - ۵۳۰۷ / ۶۹۱۹ کا قحط اجارہ داری کی وجہ سے تھا اور اس پر جلد ہی قابو پا لیا گیا۔ ذیل کے سنین میں اشیا کم یاب رہیں:

تعداد کتنی زیادہ تھی۔ صرف خلفا ہی نہیں بلکہ وزرا اور بڑے بڑے عہدے دار سب علم و فضل کی ہر طرح کی قدر افزائی کرتے تھے۔ اسلامی ثقافت کا تخلیقی عہد بغداد کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسی عہد میں آگے چل کر عام کتب خانے جو مطالعے اور تعلیم کے مرکز تھے قائم کیے گئے، ان میں سب سے زیادہ مشہور ابونصر سابور بن آردشیر کا دارالعلم تھا۔ جب مدرسوں کا دور شروع ہوا تو بغداد ہی اس میدان میں سب سے آگے تھا، جہاں النظامیہ اور المستنصریہ جیسے مدرسے قائم ہوئے اور ان کا اثر تمام مدارس کے طریقِ درس اور طرزِ تعمیر پر پڑا۔

تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں شفاخانوں کی طرف بالخصوص توجہ کی جاتی تھی۔ ان میں البیمارستان السیدہ (۵۳۰۶ / ۶۹۱۸)، البیمارستان المقتدری (۵۳۰۶ / ۶۹۱۸) اور البیمارستان العضدی (۵۳۷۲ / ۶۹۸۲) بہت مشہور تھے۔ وزیروں اور دیگر افراد نے بھی شفاخانے قائم کیے تھے۔ اطبا کی وقتاً فوقتاً نگرانی کی جاتی تھی (دیکھیے بیان بالا)۔

الرشید کے زمانے میں بغداد میں تین پل تھے (یعقوبی، ۲: ۵۱۰) ان میں سے باب الخرسان کے قریب کرخ کے دو پل زیادہ مشہور تھے (قَبِ الْيَعْقُوبِيِّ، ۲: ۵۴۲؛ الجہیشیاری، ص ۲۵۴؛ الطبری، ۳: ۱۲۳۲)۔ الرشید نے شمسیہ پر دو پل بنائے تھے، لیکن انہیں پہلے محاصرے میں تباہ کر دیا گیا تھا (ابن الجوزی: مناقب، ص ۲۰؛ ابن الفقیہ، ورق ۴۲ الف)۔ مذکورہ بالا تینوں پل تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے آخر تک باقی تھے (ابن الفقیہ، ورق ۴۲ الف)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمالی پل منہدم ہو گیا تھا، کیونکہ الاصلطخری فقط دو پلوں



دس لاکھ دینار (ایک کروڑ دس لاکھ درہم) خرچ  
کیے؛ مگر ۵۳۱۸ / ۱۰۲۷ء میں اسے گرا دیا گیا  
(التنوخی : نشوار، ۱ : ۷۰ تا ۷۱؛ ابن الأثیر، ۸ :  
۳۹۷ تا ۳۹۸ : ۹ : ۲۵۶)۔ عضدالدولہ نے معزالدولہ  
کے حاجب سبکتگین کا گھر دوبارہ بنوایا۔ یہ  
مخبرہ کے بالائی حصے میں تھا اور اس میں  
وسیع و عریض باغات کا اضافہ کیا اور نہروں کے  
ذریعے نہر الخالص سے وہاں پانی پہنچایا، جس پر  
بڑی رقم خرچ ہوئی۔ یہ محل آل بویہ کے سلاطین  
کا دارالامارۃ (سرکاری مسکن) بن گیا (الخطیب،  
ص ۵۸ تا ۵۹؛ ابن الجوزی : المنتظم، ۷ : ۷۷ تا ۷۸؛  
قب مسکویہ، ۳ : ۱۲۴)۔

عضدالدولہ نے بغداد کو بدحالی کا شکار  
پایا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے مکانات اور بازار  
نئے سرے سے بنائے جائیں۔ اس کی جامع مسجدوں کی  
دوبارہ تعمیر میں اس نے بہت سا روپیہ خرچ کیا۔  
اس نے دریائے دجلہ کے گھاٹوں کے مرمت کرائی اور  
مالداروں کو حکم دیا کہ دجلہ پر جو ان کے  
مکانات ہیں ان کی مرمت کرائیں اور ویران جگہوں  
میں، جو کسی کی ملک نہ تھیں، باغ لگائیں۔  
اس نے یہ دیکھ کر کہ شہر کے بیچ کا پل تنگ  
ھے اور بوسیدہ بھی ہو گیا ھے، اسے نئے سرے سے  
بنوایا اور کشادہ بھی کر دیا (ابن الأثیر، ۸ :  
۵۵۸؛ ابن الجوزی : المنتظم، ۷ : ۱۱۴؛ مسکویہ،  
۲ : ۴۰۴ تا ۴۰۶)۔ ۵۳۷۲ / ۹۸۲ء میں اس نے  
عضدی ہسپتال بنوایا، اس میں اطباء، نگران اور  
ذخیروں کے داروغہ مقرر کیے۔ اور اس کے لیے  
دوائیں، خوراک، اوزار اور فرش فروش کا سامان  
افراط سے مہیا کیا۔ شفاخانے کے اخراجات کے لیے  
اوقاف مخصوص کر دیے گئے (ابن الجوزی : المنتظم،  
۷ : ۱۱۲ تا ۱۱۴)۔ [نیز دیکھیے اوریشنل کالج  
سیگزین، ضمیمہ، اگست ۱۹۳۸ء جلد ۱۴، عدد

۵۳۲۳ / ۹۳۴ - ۵۳۲۶ / ۹۳۷ - ۵۳۲۸ / ۹۳۸  
۵۳۲۹ / ۹۴۰ (اس کے ساتھ طاعون بھی تھا)۔ ۵۳۳۰ /  
۵۳۳۱ / ۹۴۱ (مع ویا)، ۵۳۳۲ / ۹۴۲  
اور ۵۳۳۷ / ۹۴۸ء؛ اس طرح زندگی اجیرن  
ہو گئی (الصوفی : اخبارالراضی، ص ۱۰۳، ۱۰۳۶،  
۲۵۱؛ ابن الأثیر، ۸ : ۲۸۲، ۳۱۱؛ الاصفہانی :  
تاریخ، ص ۱۲۵؛ ابوالعلاء، ص ۳ : ۲۷۰، ۲۷۴)۔

۵۳۰۸ / ۹۲۰ء و ۵۳۰۹ / ۹۲۱ء میں  
کرخ کو آتشزدگی سے خاصا نقصان پہنچا (ابن  
الأثیر، ۸ : ۸۹، ۹۵)۔ ۵۳۲۳ / ۹۳۴ء میں کرخ  
میں ایسی آگ لگی جو عطاروں (دوا فروشوں)،  
روغن فروشوں، جوہریوں اور دوسرے لوگوں کے  
محلوں تک پہنچ گئی اور اس کے آثار سالہا سال بعد  
تک نظر آتے تھے (الصوفی : اخبارالراضی، ص ۶۸)۔  
آل بویہ کا زمانہ بغداد کے لیے خاصا دشوار  
تھا۔ معزالدولہ (۵۳۳۵ / ۹۴۶ء) نے پہلے بادوریا  
کی کچھ نہروں کی مرمت کرائی، جس سے  
معیشت نسبتاً بہتر ہو گئی (مسکویہ، ۲ : ۱۶۵)۔  
لیکن اس کے بعد غفلت اور بے پروائی کا زمانہ شروع  
ہوا۔ بہت سی نہریں، جن سے مغربی بغداد میں  
آب رسانی ہوتی تھی، تباہ ہو گئیں۔ ۵۳۶۷ /  
۹۷۷ء تا ۵۳۷۲ / ۹۸۲ء میں عضدالدولہ نے ان  
کو صاف کرایا اور پل اور قلابے دوبارہ تعمیر کرائے  
(مسکویہ، ۲ : ۴۰۶؛ ۳ : ۶۹؛ ابن الأثیر، ۸ :  
۵۱۸)۔ اس کے بعد ایسے کسی کام کی پھر کوئی  
خبر نہیں ملتی۔

عمارتی سرگرمیاں محدود ہو گئی تھیں۔  
۵۳۵۰ / ۹۹۱ء میں معزالدولہ نے باب الشماسیہ  
کے پاس ایک بڑا محل بنوایا اور اس کے ساتھ ایک  
بڑا میدان، گھاٹ اور خوشنما باغات تیار کرائے۔  
اس محل کے لیے اس نے شہر مدور، یعنی پرانے بغداد  
کے ساتوں آحنی دروازے منگوائیے اور محل پر کوئی

۳ ص ۳.]

بایں ہمہ آل بویہ کے دور میں بغداد کو تنزل ہوا (التنوخی: نشوار، ۱: ۶۶، کے نزدیک ۵۳۴۵/۶۹۵۶ کا بغداد المقتدر کے زمانے کے بغداد کا دسواں حصہ رہ گیا تھا)۔ مدیعة المنصور سے اس زمانے میں بے پروائی برتی جاتی تھی اور اس میں کوئی رونق نہ تھی (المقدسی، ص ۱۲۰)۔ مغربی بغداد کے اکثر محلوں کی حالت خراب تھی اور وہ سمٹ گئے تھے۔ مغربی بغداد میں کرخ سب سے زیادہ بارونق تھا، کیونکہ تاجروں کی دکانیں اس میں تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی بغداد کو اب کرخ کہتے ہیں (ابن حوقل، ۱: ۲۴۱ تا ۲۴۲؛ المقدسی، ص ۱۲۰)۔

شہر کا مشرقی حصہ زیادہ پر رونق تھا۔ سرکاری عہدے دار عموماً اسی طرف رہتے تھے (قب) ابن حوقل، ص ۲۴۰)۔ یہاں شاندار مقامات یہ تھے: باب الباق، جہاں بڑا بازار تھا؛ دارالامارة، جو معرم میں تھا اور خلیفہ کے محل اس کے جنوبی سرے پر تھے (قب المقدسی، ص ۱۲۰، ابن حوقل، ۱: ۲۴۰ تا ۲۴۱؛ الاضطحری، ص ۸۴)۔ اکا دکا مکانات کلوآذا تک چلے گئے تھے۔ ابن حوقل نے وہاں چار جامع مساجد دیکھیں: جامع المنصور، جامع رصافہ، جامع براثا اور جامع دارالسلطان (ص ۲۴۱)۔ اس کے بعد ۵۳۷۹/۶۹۸۹ اور ۵۳۸۳/۶۹۹۳ میں قطیعه اور حربیہ کی مسجدیں بھی جامع مساجد ہو گئیں (ابن الجوزی: المنتظم، ۷: ۶۷۱؛ الخطیب، ص ۵۳ تا ۵۴؛ ابن الجوزی: مناقب، ص ۲۱ تا ۲۲؛ ابن الاثیر، ۹: ۴۸)۔

ابن حوقل نے دو پل دیکھے، جن میں سے ایک بیکار ہو گیا تھا (۱: ۲۴۱)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معزالدولہ کے زمانے میں تین پل تھے: ایک باب الشماسیہ کے سامنے (اس کے محل کے

پاس)، دوسرا باب الطاق کے پاس اور تیسرا سوق الثلاثاء کے سامنے۔ ان میں سے پہلا بھی باب الطاق کے پاس منتقل کر دیا گیا؛ اس طرح وہاں دو پل رہ گئے تھے، لیکن آگے چل کر ان میں سے ایک بیکار ہو گیا (قب ابن الجوزی: مناقب، ص ۲۰)۔

بغداد کو عوام کی شورشوں سے، فرقوں کے باہمی اختلافات سے اور "عیاروں" سے بہت نقصان پہنچا۔ ہمارے مآخذ عوام کی جہالت کا بار بار ذکر کرتے ہیں، لیکن ان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھے لوگ تھے، اگرچہ ہر ایک کی بات ماننے اور قانون شکنی کرنے پر بھی تیار ہو جاتے تھے (قب المسعودی، ۵: ۸۱، ۸۲ تا ۸۳، ۸۵ تا ۸۷؛ الغزالی: فضائح، ص ۵۳؛ ابن الجوزی: مناقب، ص ۳۱ تا ۳۲؛ البغدادی: الفرق بین الفرق، ص ۱۴۱)۔ ۶۸۹۲/۵۲۷۹-۶۸۹۲ میں المعتضد نے قصہ گوئیوں اور نجومیوں کو مسجدوں یا گلی کوچوں میں بیٹھنے سے منع کر دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ ان کے گرد جمع نہ ہوں اور مناظرے نہ کریں (ابن الجوزی: المنتظم، ۵: ۱۲۲، ۱۲۱)۔ آل بویہ کے دور سے قبل حنبلی زوروں پر تھے اور کبھی کبھی لوگوں کے اخلاق زبردستی درست کرنے کی کوشش کرتے تھے (قب ابن الاثیر، ۸: ۲۲۹ تا ۲۳۰، ۸۳ تا ۸۵، ۱۵۷ تا ۱۵۸؛ الصولی: اخبار الراضی، ص ۱۹۸)۔ اس عہد میں فرقہ دارانہ فسادات بڑھ گئے، جن کی وجہ سے جان و مال کا بہت زیادہ نقصان ہوا۔ آل بویہ نے ۱۰ محرم کو عام ماتم کا دن قرار دیا اور حکم دیا کہ اس روز بازار بند رہیں اور لوگوں کو جلوس نکالنے کی ترغیب دی، جس میں عورتیں اپنے منہ پیٹی جاتی تھیں (قب ابن الجوزی، ۷: ۱۵)۔ علاوہ ازیں ۱۸ ذوالحجہ (یوم غدیر) کو عید کا دن بنایا گیا۔ اس کے مقابلے میں سنیوں نے دو دن الگ مقرر کیے، جو شیعوں کے مندرجہ بالا تہواروں کے علی الترتیب



ان کی تحریک ان کی زبوں حالی کی زندگی اور سیاسی  
ابترا سے پیدا ہوئی۔ وہ مال داروں اور حکومت  
کرنے والوں کے خلاف اٹھے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان  
کی سرگرمیاں خاص طور پر دولت مندوں، منڈیوں،  
پولیس اور اعلیٰ سرکاری عہدے داروں کے خلاف  
ہوتی تھیں (قَبّ التَّوْحِي: الفرج، ۲: ۱۰۶،  
۱۰۷ تا ۱۰۸؛ ابن الجوزی: المنتظم، ۷: ۱۷۳، ۲۲۰؛  
ابن الأثیر، ۹: ۱۱۵)۔ ان کے کچھ اخلاقی اصول  
تھے، جیسے ناداروں اور عورتوں کا احترام اور مدد،  
باہم تعاون، صبر اور تحمل، آگے چل کر فتوٰۃ کی  
جو جماعت بنی وہ انہیں 'عیاروں' کی تحریک سے  
کچھ نہ کچھ ربط رکھتی تھی (قَبّ ابن الجوزی:  
تلبیس ابلیس، ص ۳۹۲؛ القشیری: الرسالة، ص ۱۱۳  
تا ۱۱۴؛ ابن الجوزی: المنتظم، ۸: ۷۷؛ التَّوْحِي:  
الفرج، ۲: ۱۸۰)۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں  
صدی عیسوی میں انہیں منظم کیا گیا۔ علاوہ  
دوسرے القاب کے المتقدّم، القائد اور الامیر بھی ان کے  
سرداروں کے القاب ہوتے تھے۔ جماعت میں نیا  
آدمی شامل کرنے کے لیے ان میں خاص رسمیں مقرر  
تھیں (دیکھیے المنتظم، ۸: ۳۹، ۱۵۱، ۷۸؛  
مسکویہ، ۲: ۳۰۶؛ القشیری: الرسالة، ص ۱۱۳؛  
التَّوْحِي: الفرج، ۲: ۱۰۹)۔ علاوہ ازیں ان میں سنی  
اور شیعہ کی تفریق تھی (ابن الجوزی: المنتظم، ۸:

۷۸ تا ۷۹)۔  
'عیاروں' کے ہاتھوں لوگوں کو اپنی جان  
اور مال کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ وہ منڈیوں پر  
اور سڑکوں پر چلنے کا محصول وصول کرتے یا  
راہ گیروں کو لوٹتے اور ہمیشہ راتوں کو گھروں  
میں گھس کر لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے  
تلوار اور آگ کے ذریعے تباہی پھیلائی اور بہت  
سے محلے اور بازار، خاص طور پر باب الطاق اور سوق  
یحییٰ (مشرقی بغداد میں)، اور کرخ جلادیں، کیونکہ

آٹھ دن بعد منائے جاتے تھے (قَبّ ابن الأثیر،  
۹: ۱۱۰)۔ اس زمانے میں جو ۵۳۳۸ / ۶۴۹ سے  
شروع ہوتا ہے، سنی اور شیعہ کے جھگڑے روزمرہ  
کے واقعات بن گئے تھے۔ سب سے پہلے سنی مذکور  
میں کرخ کو لوٹا گیا (ابن الجوزی: المنتظم، ۶:  
۳۶۳)۔ ۵۳۳۸ / ۶۵۹ء میں ان دونوں فرقوں  
میں لڑائیاں ہوئیں، جن میں باب الطاق تباہ ہوا  
اور اسے آگ لگا دی گئی (وہی کتاب، ص ۳۹۰)۔  
۵۳۶۱ / ۶۷۱ء میں کرخ میں پھر فسادات ہوئے اور  
اسے آگ لگا دی گئی؛ نتیجہً سترہ ہزار نفوس ہلاک  
ہوئے اور تین سو دکانیں بہت سے مکان اور تینتیس  
مسجدیں جل کر راکھ ہو گئیں (ابن الأثیر، ۸:  
۲۰۷؛ قَبّ ابن الجوزی: المنتظم، ۷: ۶۰)۔  
۵۳۶۳ / ۶۷۳ء میں آگ کی وجہ سے کرخ کا  
بیشتر حصہ جل گیا (مسکویہ، ۲: ۳۲۷)۔ ۵۳۸۱ /  
۶۹۱ء میں پھر فساد برپا ہوا اور بہت سے محلوں  
میں آگ لگا دی گئی (ابن الأثیر، ۹: ۳۱)۔ ۱۰۱۶ء  
میں نہر طابق، باب القطن اور باب البصرہ کے بہت  
سے محلے جلا دیے گئے (ابن الأثیر، ۹: ۱۰۲،  
نیز دیکھیے ۸: ۱۸۳؛ ۹: ۲۵ تا ۲۶، ۳۲، ۵۸)۔  
۵۳۲۲ / ۱۰۳۰-۱۰۳۱ء میں ان فسادات میں  
بہت سے بازار تباہ کر دیے گئے (ابن الجوزی:  
المنتظم، ۸: ۵۵)۔ عیاروں نے نسبتاً زیادہ نقصان  
پہنچایا اور ابتری پھیلائی، چنانچہ وہ چوتھی صدی /  
دسویں صدی کے آخر ربیع سے لے کر اس دور کے  
اختتام تک خصوصیت سے ہنگامہ برپا کرتے رہے۔  
(بغداد کے دو محاصروں کے زمانے میں انہوں نے  
جو کام کیا اس کے لیے دیکھیے الطبری، ۳: ۸۷۷،  
۱۰۰۸ تا ۱۰۱۰، ۱۰۵۲، ۱۰۵۶ تا ۱۰۵۷؛  
المسعودی، ۶: ۴۵۰ بعد)۔ مورخ ان کی سرگرمیوں  
کو غلط روی سمجھتے اور ان کو لٹیروں اور  
چوروں کے زمرے میں داخل کرتے ہیں، لیکن

دارالامارة کا رقبہ وسیع کیا، اس نے بہت سی دکانیں اور مکانات ڈھا دیے: دارالامارة کو اس نے نئے سرے سے تعمیر کیا اور اس کے گرد فصیل کھینچ دی (ابن الجوزی، المنتظم، ۷: ۱۶۹)۔ ۵۸۰/۵۰۸ء میں آگ لگی اور یہ جل کر تباہ ہو گیا۔ بعد ازاں اسے نئے سرے سے تعمیر کیا گیا (ابن الجوزی: المنتظم، ۷: ۷۷۸) اور اس کا نام دارالمملکۃ پڑ گیا۔ ۵۰۹/۱۱۱۵ء میں اسے پھر تعمیر کیا گیا، لیکن ۵۱۵/۱۱۲۱ء میں اتفاقی حادثے سے جل گیا اور اس کی جگہ ایک بار پھر نیا قصر تعمیر کیا گیا (ابن الجوزی: مناقب ص ۱۶: المنتظم، ۹: ۲۲۳)۔ ۵۸۳/۱۰۹۱ء میں ملک شاہ نے مسجد مخیرم کو، جو قصر کے قریب تھی، بہت کچھ بڑھا کر نئے سرے سے تعمیر کیا اور اس وقت سے اس کا نام جامع السلطان ہو گیا۔ ۵۰۲/۱۱۰۸ء میں اس کی مرمت کی گئی (ابن الجوزی: المنتظم، ۹: ۱۵۹) اور ۵۲۳/۱۱۲۹ء میں جا کر یہ بالکل مکمل ہو گئی (ابوالفداء، ۲: ۲۱۱: ابن الجوزی: مناقب، ص ۲۳: ابوالمحاسن، ۵: ۱۳۵)۔

ساری چہل پہل مشرقی بغداد میں خلیفہ کے محلات کے گرد ہونے لگی تھی۔ المقتدی (۵۶۷/۱۰۷۳ء) ۱۰۷۳ء تا ۱۰۹۳ء (۵۸۷/۱۰۹۳ء) عمارتیں بنانے کی ترغیب دیتا تھا۔ اس لیے محلات کے ارد گرد کے محلے، جیسے بصلیہ، قطیعہ، حلبہ، اجمہ، وغیرہ، بڑی رونق پر تھے۔ اس نے دریا کے قرب و جوار میں ایک محل (دارالشاطیہ) قدیم قصر التاج کے پاس تعمیر کیا (ابن الجوزی: المنتظم، ۸: ۲۹۳): ابن الاثیر: ۱۰: ۱۵۶، قَب Le Strange، ص ۲۵۳، قَب ابن الفوطی، ص ۲۱)۔ ۵۲۳/۱۱۲۹ء میں قصر التاج کو ڈھا کر دوبارہ تعمیر کیا گیا (ابن الجوزی: المنتظم، ۱۰: ۱۴)۔ ان محلوں کے گرد فصیل نہ تھی۔ اس لیے ۱۰۷۰ء کے سیلاب سے

یہی دولت مندوں کے محلے تھے۔ لوگوں کے دورات کے وقت اپنے اپنے گلی کوچوں کے پھانک مقل کرنے پڑتے تھے اور سوداگر راتوں کو چوکیداری کراتے تھے۔ بدنظمی اور لوٹ مار نے چیزوں کی قیمتیں بڑھا دیں (ابن الجوزی: المنتظم، ۷: ۲۲۰، ۱۵۱: ۸: ۲۱ تا ۲۲، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰)۔ ۱۰۳۰/۱۱۳۷ء میں ایک واعظ دعا مانگتا تھا: ”اے اللہ مملکت کو عوام اور شوریدہ سروں سے بچا“ (ابن الجوزی: المنتظم، ۸: ۳۳)۔ برجی عیاروں کا ایک مشہور سردار تھا، جس نے چار سال تک (۱۰۳۰/۱۱۳۷ء تا ۱۰۳۳/۱۱۴۰ء) بغداد پر عملاً حکمرانی کی اور ابتری پھیلا دی (وہی کتاب، ص ۵۷ تا ۷۶)۔ حکومت نے بس تھی اور ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی (قَب، ص ۴۹) اور انہیں محمول اور تاوان وصول کرنے کی چھٹی دے دی تھی کہ لوگ ادا کر کے ان کی مار دھاڑ سے بچیں (وہی کتاب، ص ۷۸)۔ بہت سے لوگ ان سے محفوظ رہنے کے لیے مکان اور محلے چھوڑ کر چلے گئے (وہی کتاب، ص ۱۴۲)۔ ان کی دہشت انگیزی سلجوقیوں کے آنے تک برابر قائم رہی (وہی کتاب، ص ۱۶۱)۔

۱۰۵۵/۱۰۶۲ء میں طغرل بیگ بغداد میں داخل ہوا۔ سلجوقیوں نے آل بویہ کے برعکس حکمت عملی اختیار کی اور سنیوں کی حوصلہ افزائی کی (قَب ابوالمحاسن، ۵: ۵۹)۔ ۱۰۵۸/۱۰۶۵ء میں البساسیری نے... بغداد پر فاطمیوں کے نام سے قبضہ کر لیا (قَب ابوالفداء، ۲: ۱۸۶: ابن القلانسی، ص ۸۷)۔ ۱۰۵۹/۱۰۶۶ء میں سلجوقی افواج نے اسے شکست دی اور مار ڈالا (ابوالفداء، ۲: ۱۸۷ تا ۱۸۸)۔ اس دور میں بغداد نے وہ شکل اختیار کی جس میں آئندہ بہت اہم تبدیلی واقع ہوئی۔

۱۰۵۶/۱۰۶۳ء میں طغرل بیگ نے



باغات، چڑیا گھر اور ایک جھیل کا ذکر کرتا ہے۔ وہ عضدی شفاخانے کی بڑی تعریف کرتا ہے، جس میں ساٹھ طبیب تھے اور ایک دماغی مریضوں کے لیے صحت گاہ (سینی ٹوریم) تھی۔ اس وقت بغداد میں چالیس ہزار یہودی آباد تھے، جن کے لیے دس مدرسے تھے (Itinerary، طبع و ترجمہ از A. Asher، نیویارک ۱۸۴۰ - ۱۸۴۲ء، ج ۱، متن: ص ۵۴ تا ۶۴ و ترجمہ: ص ۹۳ تا ۱۰۵؛ عربی ترجمہ، از ای - ایچ - ہداد، بغداد ۱۹۴۵ء، ص ۱۳۱ تا ۱۳۸)۔ ابن جبیر نے بغداد کی کیفیت ۵۸۱ھ / ۱۱۸۵ء میں لکھی ہے۔ اس نے شہر کے عام انحطاط کا مشاہدہ کیا اور باشندوں کے تکبر کی مذمت کی (ص ۲۱۸)۔ شرقی جانب کا حصہ بہت کچھ تباہ ہو چکا تھا، لیکن پھر بھی اس میں ابھی تک الگ الگ سترہ محلے تھے، جن میں سے ہر ایک میں دو، تین یا آٹھ حمام تھے (ص ۲۲۵)۔ خلیفہ سے متعلق حصے میں عالیشان محلات اور باغات تھے، جنہوں نے شہر کے اس پہلو کا کوئی چوتھائی یا زیادہ رقبہ گھیر رکھا تھا (ص ۲۲۶ تا ۲۲۷)۔ یہ علاقہ خوب آباد تھا اور اس میں بہت اچھے بازار تھے (ص ۲۲۸)۔ سب سے بڑا محلہ قریہ تھا (غالب گمان یہ ہے کہ یہ الاحراس کے موجودہ پل اور راس القریہ کے درمیان واقع تھا)۔ اس کے قریب مربعہ کا "ربض" یا نواحی بستی تھی (غالباً موجودہ سید سلطان علی کے قریب)۔ اس علاقے میں تین جامع مسجدیں تھیں: جامع السلطان، شہر پناہ کے شمال میں؛ جامع رصافہ، اس سے اوپر کی جانب کوئی ایک میل کے فاصلے پر (ص ۲۲۸ تا ۲۲۹) اور جامع الخلیفہ - تیس کے قریب دارالعلوم تھے، جن میں سے ہر ایک کی اپنی اعلیٰ درجے کی عمارت تھی۔ انہیں چلانے اور طلبہ کے اخراجات پورا کرنے کے لیے بہت سے اوقاف اور موہوبہ

ان کو بہت نقصان پہنچا - ۵۴۸۸ / ۱۰۹۵ء میں المستظہر نے "حریم" نام کے محلوں کے گرد دیوار تعمیر کر دی۔ اس کے بعد ۵۵۱۷ / ۱۱۲۳ء میں المسترشد نے اسے دوبارہ تعمیر کیا اور اس میں چار بڑے دروازے بھی بنائے اور اس کی چوڑائی ۲۲ ذراع کر دی - ۵۵۵۴ / ۱۱۰۹ء کے سیلاب نے اس دیوار کو گھیر لیا اور اس میں ایک جگہ شکاف ڈال کے بہت سے محلوں کو تباہ کر دیا۔ اس شکاف کو بعد میں بند کر کے وہاں ایک پشتہ بنانا شروع کیا گیا، جو بعد میں ساری دیوار کے گرد مکمل کر دیا گیا (قب ابن الجوزی: مناقب، ص ۳۴؛ وہی مصنف: المنتظم، ۱۰: ۱۸۹ تا ۱۹۰)۔ اس دیوار کو از سر نو تعمیر کرنے یا مرمت کرنے کے اقدامات الناصر اور المستنصر کے عہد میں بھی ہوئے (ابن الفوطی، ص ۱۶، ۱۱۱)۔ اس دیوار نے مشرقی بغداد کی حدود معین کر دیں جو عہد عثمانی کے آخر تک قائم رہیں۔

اس زمانے میں بغداد رو بہ انحطاط اور فقط اپنی قدیم شان و شوکت کے بل پر زندہ رہا۔ پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے اس کے مقامی جغرافیے میں بہت سے تغیرات رونما ہوئے۔ مغربی بغداد میں متعدد محلے ویران ہو گئے تھے اور جہاں پہلے باغات اور مکانات تھے وہاں اب خالی میدان نظر آنے لگے (قب الخطیب، ص ۶۷؛ التنوخی: نشوار، ۱: ۷۴ تا ۷۵)۔ شاید اس سے جامع مسجدوں کی تعداد میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ شامیہ، رصافہ اور مغرم کے قدیم محلے غفلت کی نذر ہو رہے تھے (قب ابن حوقل، ص ۲۴۱)۔

بن یامین، باشندہ تودلہ (Benjamin of Tudela)، جس نے ۵۶۷ / ۱۱۷۱ء کے قریب بغداد کی سیر کی، خلیفہ کے محل کی عظمت و شان اور اس کی فصیل،

وجہ سے مشہور تھا (ص ۲۲۶) - ابن جبیر (ص ۲۲۹) نے بغداد میں دو ہزار حمام اور گیارہ جامع مسجدوں کا ذکر کیا ہے۔

المستترشد کے زمانے (۵۱۲ / ۱۱۱۸ء تا ۵۲۹ / ۱۱۳۴ء) میں نہر عیسیٰ کے قریب ایک پل تھا، جسے بعد میں باب القریہ کے قریب منتقل کر دیا گیا۔ المستضیٰ کے عہد (۵۶۶ / ۱۱۷۰ء تا ۵۷۵ / ۱۱۷۹ء) میں باب القریہ میں نیا پل بنایا گیا اور پرانے پل کو دوبارہ اس کی اصلی جگہ نہر عیسیٰ کے قریب منتقل کر دیا گیا۔ ابن جبیر نے فقط پہلے پل کو دیکھا تھا، لیکن وہ اس کی توثیق کرتا ہے کہ عموماً دو پل ہوتے تھے۔ ابن الجوزی بھی حس نے سقوط بغداد سے کچھ ہی پہلے اپنی کتاب لکھی تھی، اس بات کی تصدیق کرتا ہے (ابن الجوزی: مناقب، ص ۲۰؛ ابن جبیر، ص ۲۲۵)۔

نصف صدی بعد یاقوت (۵۶۲۳ / ۱۲۲۶ء) کچھ مزید مفید معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ اس نے مغربی بغداد کا یہ نقشہ پیش کیا ہے کہ وہ چند الگ الگ محلوں کا مجموعہ ہے، جن میں ہر ایک کی اپنی اپنی فصیل ہے؛ بیچ میں کھنڈروں کی خالی زمین آ جانے سے بھی یہ الگ الگ ہو گئے ہیں۔ حریبہ اور الحریم الطاہری شمال میں، چہار سوج مع نصیریہ، عتائین اور دارالقر جنوب مغرب میں، محول مغرب میں، قصر عیسیٰ مشرق میں، اور قریہ اور کرخ جنوب میں قابل ذکر محلے ہیں۔

مشرقی بغداد میں حریم دارالخلافہ کے آس پاس کے محلے رونق کا مرکز ہو گئے تھے۔ یہ دیواروں سے محصور رقبے کے تقریباً ایک تہائی حصے میں پھیلے ہوئے تھے۔ بڑے بڑے بارونق محلے یہ تھے: باب الازج اور اس کی منڈیاں؛ اس کے بعد الماسونیہ، سوق الثلاثاء، نہر المعلیٰ اور القریہ

جائداد میں موجود تھیں۔ سب سے زیادہ مشہور مدرسہ نظامیہ تھا، جسے ۱۱۱۰ء میں دوبارہ تعمیر کیا گیا تھا (ص ۲۲۹)۔

المستترشد کی فصیل کا، جو "شرقیہ" کا احاطہ کرتی تھی، بیان کرتے ہوئے ابن جبیر کہتا ہے کہ اس کے چار دروازے تھے: (۱) باب السلطان، شمال کی جانب (جس کا نام بعد میں باب المعظم ہوا)؛ (۲) باب الظفریہ (شمال مشرق میں)؛ جو بعد میں باب الوسطانی کہلایا؛ (۳) باب الحلہ (مشرق میں)؛ جو آگے چل کر باب الطلیسم ہو گیا؛ (۴) باب البصلیہ (جنوب میں)؛ جو بعد میں الباب الشرقی مشہور ہوا۔ شرقیہ کی فصیل اس علاقے کو نصف دائرے کی شکل میں احاطہ کیے ہوئے تھی، جس کے دونوں سرے دریائے دجلہ پر ختم ہوتے تھے (ص ۲۲۹)۔ وہ محلہ ابوحنیفہ کی گنجان آبادی کا ذکر کرتا ہے، جب کہ رصافہ، شامیہ کے قدیم محلے اور مخرم کا بڑا حصہ ویران ہو گیا تھا (ص ۲۲۶؛ ابن حوقل، ص ۲۴۱)۔ مغربی بغداد میں ہر طرف ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں کے محلوں میں کرخ کا، جسے وہ ایک فصیل دار شہر بتاتا ہے، اور محلہ باب البصرہ کا، جس میں مسجد منصور اور پرانے شہر کا بچا کھچا حصہ تھا، ذکر کرتا ہے (ص ۲۲۵)۔ محلہ الشارع (دریائے دجلہ کے قریب)، کرخ، باب البصرہ اور قریہ بغداد کے سب سے بڑے محلے تھے (ص ۲۲۵)۔ الشارع اور باب البصرہ کے درمیان محلہ سوق المارستان ایک چھوٹے سے شہر کی طرح تھا، جس کے مشہور و معروف عضدی شفاخانے میں عملے اور ذخائر کی کچھ کمی نہ تھی (ص ۲۲۵ تا ۲۲۶)۔ ان کے علاوہ اس نے دو اور محلوں کا ذکر کیا ہے: ایک محلہ حریبہ، انتہائی شمال میں اور دوسرا محلہ عتائیہ، جو اپنے ریشمی سوتی کپڑے "عتائی" کی



(ابن جبیر، ص ۲۲۹؛ نیز دیکھیے محمد جواد، در  
 Review of the Higher Teachers' College، بغداد،  
 ۵ : ۱۱۰ بعد و ۶ : ۸۶ بعد)۔ ابن جبیر کی  
 سیاحت کے بعد مزید مدرسے قائم کیے گئے (قب  
 ابن الفوطی، ص ۲۳ تا ۲۵، ۵۳، ۱۲۸، ۳۰۸؛  
 ابن الأثیر، ۱۱ : ۲۱۱)۔ سب سے زیادہ مشہور  
 دارالعلوم یہ تھے : (۱) نظامیہ، جو ۵۰۹/۱۰۶۶ء  
 میں قائم ہوا؛ (۲) مدرسہ ابو حنیفہ، جو اسی سال قائم  
 ہوا (ابن الجوزی : المنتظم، ۸ : ۲۳۵ تا ۲۳۶؛  
 یہ آج تک "کلیۃ الشریعہ" کے نام سے موجود ہے)  
 اور (۳) المستنصریہ، جو المستنصر نے ۶۳۱/۱۲۳۳ء  
 میں قائم کیا اور سترہویں صدی تک جاری رہا۔  
 یہ مدارس چاروں مذاہب فقہ میں سے کسی ایک  
 مذہب کے ساتھ مخصوص تھے، بجز المستنصریہ  
 اور البشیریہ کے (جو ۶۵۳/۱۲۵۵ء میں قائم ہوا)  
 کہ ان دو میں چاروں مذاہب کی فقہ پڑھائی جاتی  
 تھی (دیکھیے ابن الفوطی، ص ۳۰۸؛ ابن الجوزی :  
 المنتظم، ۸ : ۲۳۵ تا ۲۳۶، ۲۳۶ تا ۲۳۷؛  
 ابن الأثیر، ۱۰ : ۳۸؛ ابن الفوطی، ص ۵۳ تا ۵۴،  
 ۵۸ تا ۵۹، قب عواد، در سمر (Sumer)، جلد  
 ۱، ۱۹۴۵ء)۔ یتیموں کا ایک مکتب (School)  
 بھی تھا، جو شمس الملک (فرزند نظام الملک) نے  
 قائم کیا تھا (الاصنہانی : سلجوق (Seljuks)، ص  
 ۱۲۳ تا ۱۲۵)۔ ۵۶۰۶/۱۲۰۹ء میں بغداد کے  
 ہر محلے میں ایک مہمان خانہ (دارالضیافہ) تعمیر  
 کیا گیا تاکہ رمضان شریف میں غریبوں کو کھانا  
 کھلایا جائے (ابن الأثیر، ۱۲ : ۲۸۶؛ مزید حوالے  
 وہی کتاب، ص ۱۸۳؛ ابن الفوطی، ص ۹۴)۔

ان ایام میں بغداد کو آتشزدگی، سیلاب اور  
 فتنہ و فساد سے نقصان پہنچا۔ ۵۴۴۹/۱۰۵۷ء میں  
 کرخ اور باب محول کے محلے اور کرخ کی اکثر  
 منڈیاں جل گئیں۔ ۵۴۴۱/۱۰۵۹ء میں کرخ کا

(یاقوت، ۱ : ۲۳۲، ۴۴۱، ۴۴۳، ۵۳۳، ۶۵۵ و  
 ۲ : ۸۸، ۱۶۷، ۲۳۳، ۳۵۹، ۵۱۲، ۷۸۳، ۹۱۷ و  
 ۳ : ۱۹۳ تا ۱۹۴، ۱۹۷، ۲۳۱، ۲۷۹، ۲۹۱،  
 ۳۸۹ و ۴ : ۱۱۷، ۲۵۲، ۲۵۵، ۳۸۵، ۴۳۲،  
 ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۸۶، ۸۳۱، ۸۳۵)۔

اس عہد میں غریبہ (مغربی بغداد) میں  
 جامع مسجدوں کی تعداد بڑھ گئی، جو ان محلوں کی  
 نیم آزادانہ حیثیت پر دلالت کرتی ہے۔ ابن الجوزی  
 ۵۵۳/۱۱۳۵ء اور ۵۵۷/۱۱۷۶ء کے درمیان  
 چھ مسجدیں گنواتا ہے، جو جامع المنصور کے علاوہ  
 تھیں (ابن الجوزی : مناقب، ص ۲۳؛ نیز دیکھیے  
 ابن الفوطی)۔ کرخ کی مسجدوں کی مرمت  
 المستنصر نے کی (ابن الفوطی، ص ۱۵)۔ جامع  
 القصر کی تجدید ۵۴۷۵/۱۰۸۲ء میں ہوئی۔  
 آگے چل کر ۵۶۷۳/ [۱۲۷۳ء] میں المستنصر  
 نے اس کی مرمت کروائی (ابن الجوزی :  
 المنتظم، ۹ : ۳؛ لسٹرنج : ۲۶۹)۔ مسجد قمریہ  
 ۵۶۲۶/۱۲۲۸ء میں تعمیر کی گئی (ابن الفوطی،  
 ص ۴)۔

تصوف [رک باں] کا زور رباط [رک باں] کی  
 کثرت تعداد سے ظاہر ہے جو خلافت کی آخری  
 صدی میں تعمیر کی گئیں اور جنہیں خلفا یا ان کے  
 رشتے داروں نے بنوایا تھا (قب : ابن الفوطی، ص ۲،  
 ۷۴، ۷۵، ۷۹، ۸۰، ۸۷، ۱۱۷، ۲۶۱؛ ابن الجوزی :  
 المنتظم، ۹ : ۱۱؛ ابن الأثیر، ۱۱ : ۷۷، ۳۳ و ۱۲ :  
 ۲۷، ۶۷ تا ۶۸)۔

درس گاہیں قائم کرنے کی طرف بہت توجہ  
 کی گئی۔ اس تحریک کی وجوہ اولاً شافعی گروہ کے  
 اندر مذہبی جوش کے احیا، نیز سیاسی اور انتظامی  
 ضرورتوں کو قرار دے سکتے ہیں، مگر بعد میں  
 یہ ثقافتی تحریک کی شکل میں جاری رہی۔  
 ابن جبیر نے مشرقی بغداد میں تیس مدرسے دیکھے

۱۲۴۲ء میں المأمونہ اور باب الآزج کے محلوں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں، جن کی لیٹ میں نظامیہ بازار بھی آ گیا۔ پھر محلہ مختارہ اور سوق السلطان کے محلوں میں اور قطفنا اور قریہ (مغربی بغداد) کے درمیان لڑائیاں ہوئیں؛ بہت سے آدمی مارے گئے اور دکانیں لوٹ لی گئیں (ابن الفوطی، ص ۱۷۵ تا ۱۷۷؛ قب ابن ابی الحدید، ۲: ۵۵۳)۔ ۱۲۵۵ء کے قریب تک حالات بہت زیادہ دگرگوں ہو چکے تھے۔ رصافہ (سنی) اور خضیرین (شیعہ) کے درمیان لڑائیاں ہوئیں کچھ دن بعد باب البصرہ رصافہ کا طرفدار ہو گیا اور دوسرے گروہ کی حمایت کرخ نے کی (ابن الفوطی، ص ۲۹۸ تا ۲۹۹)۔ یہ جھگڑے ان محلوں کے درمیان جوشِ مسابقت کو ظاہر کرتے ہیں جو حکومت کے نظم و ضبط میں کمی ہو جانے کے باعث بہت بڑھ گیا تھا۔ جب کرخ اور باب البصرہ میں لڑائی دوبارہ شروع ہوئی تو جو سپاہی اسے دبانے کے لیے بھیجے گئے تھے انہوں نے کرخ کو لوٹ لیا اور حالت بد سے بدتر ہو گئی (کتاب مذکور، ص ۲۶۷ تا ۲۷۷)۔ ۱۲۵۶ء میں معاملہ انتہا کو پہنچ گیا۔ کرخ کے لوگوں نے کسی آدمی کو مار ڈالا تھا۔ وہاں امن قائم رکھنے کے لیے سپاہی بھیجے گئے تو خود ان کے ساتھ 'عامہ' کے جتھے مل گئے؛ چنانچہ سب نے مل کر کرخ کو خوب لوٹا، کئی جگہ آگ لگا دی، بہت سے آدمیوں کو مار ڈالا اور عورتوں کو پکڑ کر لے گئے۔ ان شریروں کو بعد میں سزائیں ملیں، مگر یہ المناک حادثہ بھلایا نہ جا سکا (کتاب مذکور، ص ۳۱۴ تا ۳۱۵)۔ اس زمانے میں 'عیاروں' نے بھی بڑی سرگرمی دکھائی۔ انہوں نے دکانیں لوٹیں، راتوں کو گھروں میں ڈاکے ڈالے، یہاں تک کہ المستعصم پر بھی دو مرتبہ ڈاکے ڈالے (ابن الفوطی، ص ۲۵۴، ۲۶۰، ۲۶۲، ۳۷۸)۔

بڑا حصہ اور بغدادِ قدیم جل گیا (ابن الجوزی: المنتظم، ۸: ۸۱، ابن الاثیر، ۱۰: ۵)۔ نہر المعلیٰ اور دارالخلافتہ کے قرب و جوار کے کوچہ و بازار میں کئی دفعہ آگ لگی (ابن الاثیر، ۱۰: ۳۵، ۶۷، ۳۱۸؛ ابن الجوزی: المنتظم، ۸: ۲۳۱؛ ۹: ۶۱، ۱۳۸، ۱۸۳؛ ۱۰: ۳۵)۔ ۱۱۵۶ھ/۵۵۱ء میں قرب و جوار کے محلوں سے آگ دارالخلافتہ اور اس کے آس پاس کے بازاروں تک پہنچ گئی (ابن الاثیر، ۱۱: ۱۳۳؛ انہیں محلوں میں ۵۶۰ھ/۱۱۶۳ء، ۵۶۹ھ/۱۱۷۳ء، ۵۸۳ھ/۱۱۸۷ء میں پھر آگ لگی، ابن الاثیر، ۱۱: ۳۷۰، ۳۷۲؛ المنتظم، ۱۰: ۲۱۲)۔

سلجوقی عہد میں عیاروں نے خاصی سرگرمیاں دکھائیں۔ انہوں نے دکانیں لوٹیں، گھر تاراج کیے اور بدامنی پھیلا دی (۵۴۹ھ/۱۰۵۷ء سے ۵۳۷ھ/۱۱۴۲ء تک سنین کے حالات کے لیے دیکھیے ابن الجوزی: المنتظم، ۸: ۱۳۹، ۲۳۴؛ ابن الاثیر، ۱۰: ۲۰۳، ۳۸۳ و ۱۱: ۲۹، ۲۶، ۵۹، ۶۳)۔ ادھر 'عامہ' (یعنی عوامی بلوائیوں) کے فسادات اور ان کی فرقہ دارانہ جنگ و جدال (حنبلی اور شافعی، سنی اور شیعہ کے درمیان) جاری رہے، جن کی وجہ سے بہت خونریزیاں ہوئیں اور تباہیاں پھیلیں۔ ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ ۵۰۲ھ/۱۱۰۸ء میں ان کے درمیان عارضی مصالحت ہو گئی اور اس کے ساتھ یہ فرقہ بڑھا دیا ہے؛ "ان ('عامہ') سے ہمیشہ شر و فساد پیدا ہوا ہے" (۱۰: ۳۲۹؛ نیز دیکھیے ۱۰: ۸۰، ۲۵۹، ۱۰۴، ۱۰۸ تا ۱۰۹، ۱۱۲، ۱۱۷ تا ۱۱۸)۔ یہ مصالحت تھوڑے ہی دن رہی۔ جھگڑے اور لڑائیاں چلتی رہیں اور المستعصم کے زمانے میں انہوں نے ہولناک شکل اختیار کر لی (ابن الاثیر، ۱۰: ۳۶۰ و ۱۱: ۲۷۱، ۳۴۳ و ۱۲: ۱۳۳، ۲۱۶)۔ ۵۶۴۰ھ/



لاکھ سے لے کر بیس لاکھ تک کیا گیا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہا ہے (الفخری، ص ۱۳۰: ابن الفوطی، ص ۲۸۱: الذہبی: دول، ۲: ۱۲۱: ابن کثیر: البدایہ، ۱۳: ۲۰۲)۔ چینی سیاح چانگ تی Ch'ang Te کہتا ہے (۱۲۵۹ء) کہ لاکھوں آدمی مارے گئے۔ ظاہر ہے کہ اس نے یہ اطلاع مغل مآخذ سے حاصل کی تھی (Medieval Researches: Bretschneider، ۱: ۱۳۸ تا ۱۳۹)۔ بہر حال صحیح تعداد بتانا مشکل ہے، مگر غالب گمان یہ ہے کہ وہ ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ بہت سے محلے محاصرے، لوٹ یا آگ سے تباہ ہوئے۔ مسجد جامع الخلفا اور مقبرہ کاظمین جلا ڈالا گیا (ابن الفوطی، ص ۳۲ تا ۳۳: ابن العبری، ص ۲۷)۔ بایں ہمہ بغداد مکمل تباہی سے بچ گیا: غالباً علما کا یہ فتویٰ بھی جو ان سے زبردستی لیا گیا تھا، کارآمد ہوا کہ ”عادل کافر“ ”ظالم امام“ سے بہتر ہے۔ بغداد سے واپس جانے سے پہلے ہلاکونے کچھ سرکاری عمارتوں کے واگذار کرنے کا حکم دیا۔ اوقاف کے نگران نے جامع الخلفاء کو دوبارہ تعمیر کرا دیا اور مدارس و رباط کو دوبارہ کھولنے کا بندوبست بھی کر دیا (ابن العبری، ص ۳۵: ابن الفوطی، ص ۳۷)۔ ثقافت کو سخت نقصان پہنچا، لیکن مٹنے سے بچ گئی۔ بغداد ہر لحاظ سے محض ایک صوبے کا صدر مقام ہو کر رہ گیا۔

۱۳۳۹ - ۱۳۴۰ء تک بغداد ایلخانیوں کے تحت رہا۔ وہاں کا والی اس کا انتظام شیخہ اور محافظ دستہ فوج کی مدد سے انجام دیتا تھا (ابن الفوطی، ص ۳۴)۔

مغول نے باشندوں کے دس دس سو سو اور ہزار ہزار کے گروہ کی فہرستیں تیار کیں تا کہ

حکومت اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ نظم و ضبط قائم رکھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ سیلاب بار بار آنے لگے جو حکومت کی کمزوری اور آب پاشی کے ذرائع کی طرف سے غفلت پر دلالت کرتے تھے۔ سیلاب ۵۶۴۱ / ۱۲۴۳ء میں النظامیہ اور اس کے قرب و جوار تک پہنچ گیا اور چند محلوں کو تباہ کر گیا۔ ۵۶۴۶ / ۱۲۴۸ء میں سیلاب نے مشرقی بغداد کو گھیر لیا۔ فصیل کا ایک حصہ منہدم ہو گیا اور پانی حریم کے محلوں تک پہنچ گیا۔ رصافہ بھی اس کی زد میں آ گیا اور اس کے بہت سے مکانات گر گئے۔ مغربی بغداد میں بھی پانی بھر گیا اور مکانات کی کثیر تعداد منہدم ہو گئی۔ باب البصرہ کا ایک حصہ اور کرخ بچ گئے، لیکن دریا کے کنارے کے مکانات گر گئے۔ بغداد ۵۶۵۱ / ۱۲۵۳ء اور ۵۶۵۳ / ۱۲۵۵ء میں بھی سیلاب کا نشانہ بنا، بہت سے مکان بیٹھ گئے اور زراعت کو نقصان پہنچا۔ بدترین سیلاب ۵۶۵۴ / ۱۲۵۶ء کا تھا۔ اس میں شہر کے دونوں حصوں کو پانی نے گھیر لیا اور مشرقی بغداد کے بازاروں، دارالخلافہ اور نظامیہ تک میں داخل ہو گیا (ابن الفوطی، ص ۱۸۶ تا ۱۸۷، ۲۶۷، ۲۲۹ تا ۲۳۳، ۲۷۷، ۳۰۴، ۳۱۷ تا ۳۱۹)۔ اس طرح گویا حوادث طبعیہ اور انسان دونوں نے بغداد کی رونق کے مٹانے کے لیے ایک کر لیا تھا۔

دو سال بعد بغداد پر مغلوں کا حملہ ہوا۔ ۵۶۵۶ / ۱۰ فروری ۱۲۵۸ء کو خلیفہ المستعصم نے غیر مشروط طور پر ہتیار ڈال دیے۔ بغداد کے باشندے ایک ہفتے سے زیادہ تک بیدریغ قتل کیے جاتے رہے۔ دیہات کے جو لوگ محاصرے سے پہلے بغداد میں ایک بڑی تعداد میں آ کر اکٹھے ہو گئے تھے، ان کا بھی یہی المناک حشر ہوا۔ مقتولوں کا اندازہ آٹھ

محصول مقرر اور وصول کرنے میں سہولت ہو۔ بوڑھوں اور بچوں کے سوا ہر ایک پر فی کس محصول لگایا گیا اور یہ کوئی دو سال تک برابر وصول کیا جاتا رہا (ابن الفوطی، ص ۳۳۹: قَب الجَوینِی (ترجمہ Boyle)، ۱: ۳۳)۔ جب بغداد کا انتظام زیادہ تر ایرانیوں کے سپرد کیا گیا تو رفتہ رفتہ زندگی کے آثار پھر پیدا ہونے لگے۔ یہ زیادہ تر عطاء ملک الجوینی کی سیاسی تدبیر کا نتیجہ تھا، جو تیس برس تک (۵۶۵/۱۲۵۸ء تا ۵۶۸۱/۱۲۸۲ء) بغداد کا والی رہا۔ اس کے عہد میں جامع الخلفاء کے مینار اور النظامیہ بازار دوبارہ تعمیر کیے گئے۔ المستنصریہ کی مرمت کی گئی اور آب رسانی کے ایک نئے نظام کا اضافہ کیا گیا (ابن الفوطی، ص ۳۷۱)۔ مسجد شیخ معروف اور مسجد قمریہ کی مرمت کی گئی (وہی کتاب، ص ۳۰۸: العزّاوی: تاریخ العراق، ۱: ۲۶۷، ۲۹۶)۔

بعض پرانے مدرسوں خصوصاً النظامیہ، المستنصریہ، البشیریہ، التّشیّہ اور مدرسة الاصحاب نے اپنا کام پھر شروع کر دیا (قَب ابن بطوطہ، قاهرة ۱۹۱۸ء، ۱: ۱۴۰ تا ۱۴۱، ابن الفوطی، ص ۱۸۲، ۳۸۵، ۳۹۶: العزّاوی: تاریخ، ۱: ۳۱۸)۔ الجوینی کی اہلیہ نے مذاہب اربعہ کی تدریس کے لیے مدرسة العصمتیہ قائم کیا اور اس کے قریب ایک رباط تعمیر کی (ابن الفوطی، ص ۳۷۷)۔ ایلخان تکوذر [۵۶۸۱/۱۲۸۲ء: لاڈن: ۵۸۸۱/۱۲۸۱ء] نے بغداد میں پیغام بھیجا کہ مسجدوں اور مدرسوں کے اوقاف اس طرح واگذار کر دیے جائیں جیسے عباسیوں کے زمانے میں تھے، مگر غالباً یہ ایک نیک خواہش ہی رہی (کرمّلی: الفوز، ص ۱۲)۔ ان ایلخانیوں کی حکمت عملی غیر مسلموں کے خلاف ہنگاموں کا باعث ہوئی۔ یہ بادشاہ نصاری کی سرپرستی کرتے تھے اور انہیں جزیے

سے مستثنیٰ کر دیا تھا، ان کے کیسا بنی دوبارہ تعمیر کرائے اور مسیحی مدارس جاری کیے گئے۔ انہیں باتوں کا نتیجہ تھا کہ (نصاری کے خلاف) ۵۶۶۵/۱۲۶۷ء میں ہنگامہ برپا ہوا۔ ارغون (۵۶۸۳/۱۲۸۳ تا ۵۶۹۰/۱۲۹۱ء) کے عہد میں یہودی وزیر مال سعدالدولہ کے وسیلے سے یہود کو نمایاں رسوخ حاصل ہوا۔ سعدالدولہ نے اپنے بھائی کو بغداد کا حاکم بنا دیا۔ ۵۶۹۰/۱۲۹۱ء میں سعدالدولہ قتل کر دیا گیا اور بغداد کے باشندے یہودیوں پر ٹوٹ پڑے۔ غازان کے عہد میں غیر مسلموں سے متعلق حکومت کی روش میں خاصی تبدیلی رونما ہوئی... (قَب عمرو بن متی: کتاب المجدل، ص ۱۲۰ تا ۱۲۲، ۱۲۵: ابن الفوطی، ص ۳۵۴، ۳۶۵ تا ۳۶۶: ۳۸۳، وصف، ۲: ۲۳۸، کرمّلی: کتاب مذکور، ص ۱۴ تا ۱۵، ۲۱: العزّاوی، ۱: ۳۴۹، ۵۱۳)۔ ایلخانیوں نے نوش کی کہ کاغذی سگہ چاؤ (Čae) [رک باں] چلایا جائے، لیکن بغداد میں یہ بہت نامقبول ثابت ہوا اور بالآخر ۵۶۹۷/۱۲۹۷ء میں غازان نے اسے موقوف کر دیا (ابن الفوطی، ص ۳۷۷، ۳۹۲)۔

اس عہد کے متعلق تین جغرافیہ نگاروں کے بیانات ہمارے پاس موجود ہیں: [عبدالؤمن] ابن عبدالحق (تقریباً ۵۷۰۰/۱۳۰۰ء)، ابن بطوطہ (۵۷۲۷/۱۳۲۷ء) اور [حمد اللہ] المستوفی (۵۷۴۰/۱۳۳۹ء)۔

[ابن عبدالحق]، مصنف مرصد الاطلاع، کہتا ہے کہ مغربی بغداد میں چند ایک دوسرے سے الگ محلوں کے سوا کچھ نہیں بچا؛ ان میں سب سے زیادہ آباد کرخ تھا (ص ۲۰۱)۔ جن محلوں اور مقاموں کا اس نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں: محلّہ قریّہ؛ محلّہ ربلیّہ، جو خوب آباد تھا؛ دارالرقیق کی منڈی؛ دارالقز، جو سب سے الگ تھا



میں شافعیوں اور حنبلیوں کا زور دیکھا، گو دوسرے فقہی دبستانوں کے متبعین کی تعداد بھی کثیر تھی۔ مدرسے اور رباط بہت سے تھے۔ ان میں سب سے بڑا نظامیہ تھا، لیکن مستنصریہ کی عمارت سب سے زیادہ خوبصورت تھی (نزہۃ، ص ۳۰ تا ۳۲)۔ ممکن ہے کہ ست زبیدہ کا مقبرہ اسی عہد سے تعلق رکھتا ہو اور زبیدہ وہی خاتون ہو جو المستعصم کے سب سے بڑے لڑکے کی پوتی تھی (العزّاوی، ۱: ۳۰۶)۔

۵۷۳/۱۳۳۹ء میں حسن بزرگ نے بغداد میں اپنا قبضہ جمایا اور خاندانِ جلائری کی بنیاد رکھی، جو ۵۸۱۳/۱۳۱۰ء تک قائم رہا۔ مسجد مرجان اسی زمانے میں تعمیر ہوئی۔ اس کے کتبوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مرجان نے، جو اویس کا ایک فوجی سردار تھا، ایک مدرسے اور اس کی ملحقہ مسجد کی بنیاد حسن بزرگ کے زمانے میں رکھی، جس کی تکمیل اویس کے عہد (۵۷۸/۱۳۵۷ء) میں ہوئی۔ یہ مدرسہ شوافع اور احناف دونوں کے لیے تھا (متن کتبات در آلوسی: مساجد، ص ۳۵ بعد: Mission: Massignon، ۲: ۱ بعد)۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ جو سننے میں آتا ہے وہ سیلاب، محاصروں اور دیگر آفات کا ذکر ہے، جن سے بہت ضرر پہنچا اور نقصانات ہوئے۔ تیمور نے بغداد کو دو بار فتح کیا۔ پہلی بار ۵۷۹۵/۱۳۹۲-۱۳۹۳ء میں جب کہ شہر معمولی سا نقصان اٹھا کر بچ گیا اور دوسری بار ۵۸۰۳/۱۳۰۰-۱۳۰۱ء میں جب کہ باشندوں کا بے دریغ قتل عام کیا گیا اور بہت سی (عبّاسی) سرکاری عمارتیں اور محلے ویران کر دیے گئے۔ یہ بغداد کی ثقافت پر ایک کاری ضرب تھی۔ ۵۸۰۷/۱۳۰۳-۱۳۰۵ء میں احمد جلائری بغداد واپس آیا، تیمور نے جو فصیلیں منہدم کر ڈالی تھیں

اور جہاں کاغذ بنتا تھا اور محلّہ باب المَحْوَل، جو ایک الگ تہلگ گاؤں کی طرح واقع تھا (مراصد، مطبوعہ قاہرہ، ص ۱۳۶، ۲۰۱، ۵۰۷، ۷۷۳، ۱۰۸۸)۔ وہ عضدی شفاخانے کا بھی ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ الحریم الطاہری، نہر طابق اور قطیعہ کے محلّوں میں کچھ باقی نہیں رہا اور محلّہ توٹا (Tutha) سب سے کٹ کر الگ گاؤں معلوم ہوتا ہے (مراصد، ص ۲۸۰، ۳۳۷، ۳۹۷، ۱۳۰۳)۔ مشرقی بغداد کی بابت مراصد میں لکھا ہے کہ ”جب تاتاری آئے تو اس کا بہت بڑا حصہ ویران ہو گیا۔ انہوں نے وہاں کے باشندوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور بہت تھوڑے بچے رہ گئے۔ پھر وہاں باہر کے لوگ آ کر بسے“ (ص ۲۰۱)۔ وہ بیان کرتا ہے کہ حلبہ، قریہ اور قطیعہ العجم خوب آباد محلّے تھے (مراصد، ص ۳۱۷، ۱۰۸۸، ۱۱۱۰)۔ ابن بطوطہ، ابن جبیر کے تھوڑے ہی دن بعد آیا تھا، مگر وہ بغداد کے دو پلوں کا ذکر کرتا ہے اور شہر کے اندر نفیس حماموں کے متعلق نئی تفصیلات دیتا ہے (قاہرہ ۱۹۰۸ء، ۱: ۱۳۰ تا ۱۳۱)۔ وہ کہتا ہے کہ مسجدیں اور مدرسے ہیں تو بہت لیکن سب ویران حالت میں ہیں (وہی کتاب، ص ۱: ۱۳۰)۔

المستوفی کی فراہم کردہ معلومات بہت کام کی ہیں۔ اس نے مشرقی بغداد کی فصیل کی جو کیفیت لکھی وہ ابن جبیر کے بیان کے مطابق ہے: اس کے چار دروازے ہیں اور شہر کو نصف دائرے کی شکل میں گھیرے ہوئے ہے، جس کا محیط اٹھارہ ہزار قدم ہے۔ مغربی بغداد کو وہ کرخ کہتا ہے۔ یہ بھی ایک دیوار سے گھرا ہوا ہے، جس کا گھیر بارہ ہزار قدم ہے۔ اس نے بغداد میں معاشرت کی آسانیاں دیکھیں اور باشندوں کو خوش مزاج پایا، لیکن ان کی عربی بگڑی ہوئی تھی۔ اس نے بغداد

اور اسے ”خليفة الخلفاء“ کا لقب دیا (العزّاوی، ۳ : ۳۳۶ تا ۳۳۳)۔ بہت سے ایرانی سوداگر بغداد چلے آئے اور تجارتی کاروبار کو ترقی دی۔ کچھ دنوں کے لیے کرد سردار ذوالفقار کا بھی بغداد پر قبضہ ہوا اور اس نے سلطان سلیمان قانونی کے زیرِ اطاعت ہونے کا اعلان کیا؛ لیکن ۱۵۲۹ / ۵۹۳۶ - ۱۵۳۰ء میں شاہ طہماسپ نے دوبارہ شہر پر قبضہ کر لیا۔ ۱۵۳۱ / ۵۹۳۸ میں سلطان سلیمان بغداد میں داخل ہوا۔ اس نے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے مزار پر گنبد اور اس کے ساتھ مسجد اور مدرسہ تعمیر کیا۔ شیخ عبدالقادر الجیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا تکیہ (Tekke) اور مزار ازسرنو درست کیے اور دونوں مسجدوں میں غریبوں کے لیے مسلمان خانے قائم کیے۔ کاظمین میں جس مقبرے اور مسجد کی شاہ اسمعیل نے تعمیر شروع کی تھی، سلطان نے اس کی تکمیل کی (سلیمان نامہ، ص ۱۱۹؛ اولیا چلبی، ۳ : ۲۶۶؛ الألوسی : مساجد، ص ۱۱۷؛ العزّاوی، ۳ : ۲۸)۔ اس نے مملوکہ اراضی کی جانچ پڑتال اور باقاعدہ اندراج کا حکم دیا اور صوبے کا نظم و نسق مرتب کیا (اولیا چلبی، ۳ : ۴۱)۔ یہ انتظام ایک گورنر (پاشا)، ایک دفتر دار (مالیہ کے لیے) اور ایک قاضی کے تفویض کیا گیا۔ بغداد کے لیے ایک محافظ فوج متعین کر دی، جس کی ریڑھ کی ہڈی بنی چری تھی۔

اس کے بعد کے زمانے میں معدودے چند عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ ۱۵۷۰ / ۵۹۷۸ء میں مراد پاشا نے محلّہ میدان میں مرادیہ مسجد بنائی۔ گیلانی مسجد کو ازسرنو تعمیر کیا گیا۔ چگلزادہ نے ایک مشہور سرائے بنائی، ایک قہوہ خانہ اور ایک بازار تعمیر کیا۔ اسی نے جامع الصفا (یا جامع الخفافین) بنائی اور ”مولوی تکہ“ (تکیہ) جو آج کل مسجد آصفیہ کہلاتا ہے دوبارہ تعمیر کیا (العزّاوی، ۳ : ۱۱۶، ۱۲۸ تا ۱۳۲؛ قِب الألوسی : مساجد،

انہیں پھر سے بنوایا اور کچھ عمارتوں اور بازاروں کی مرمت کی کوشش کی، لیکن وہ زیادہ مدت زندہ نہ رہا۔

۱۵۸۱ / ۱۶۱۰ء میں بغداد قرہ قویونلو ترکمانوں کے قبضے میں چلا گیا اور ۱۵۸۲ / ۱۶۶۷ - ۱۶۶۸ء تک انہیں کے قبضے میں رہا۔ اس کے بعد آق قویونلو ترکمان قابض ہو گئے۔ ترکمانوں کی عملداری میں بغداد کی حالت اور بھی ابتر ہو گئی اور بدنظمی کی وجہ سے اسے بہت نقصان پہنچا۔ بہت سے باشندے شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ نظامِ آبپاشی خراب ہو جانے سے بار بار سیلاب آنے لگے، جن سے بڑی تباہی پھیلی۔ ۱۵۸۱ / ۱۶۳۷ء کے واقعات بیان کرتے ہوئے المقریزی کہتا ہے : ”بغداد تباہ ہو گیا۔ اس میں کوئی مسجد باقی نہیں۔ نہ جمعہ ہوتا ہے، نہ کوئی بازار ہے۔ اس کی اکثر نہریں خشک ہو چکی ہیں۔ اسے شہر مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے“ (المقریزی : سلوک، ۳ : ۱۰۰؛ دیکھیے العزّاوی، ۳ : ۷۹؛ بعد : کربلی، ص ۶۱)۔ مزید برآں قبائلی عصبیت ہر جگہ پھیل گئی اور قبائلی جتھوں نے ملک میں فساد انگیزی شروع کر دی۔

۱۵۰۸ / ۵۹۱۳ء میں بغداد شاہ اسمعیل صفوی کے تحت آ گیا اور ایرانیوں اور عثمانیوں میں اس کے قبضے کے لیے لڑائیوں کے دور کا آغاز ہوا۔ اس کا نقشہ بغداد کے مشہور گیت میں کھینچا گیا ہے : ”ایرانیوں اور رومیوں کے بیچ میں ہماری کیا گت بنی“۔ شاہ اسمعیل کے حکم سے بہت سے سنی مزار، خصوصاً مزار [امام] ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور [شیخ] عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اجاڑ دیے گئے اور بہت سے سربر آوردہ سنی قتل ہوئے۔ اس نے [امام] موسیٰ الکاظم رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ تعمیر کرانی شروع کی۔ بغداد میں ایک والی مقرر کیا



کیے گئے تھے، جن میں چار برج بھی شامل تھے۔ ان پر کانسی کی چار بڑی توپیں نصب کی گئی تھیں، جو اچھی حالت میں تھیں (Travels : Texeira، طبع Hakluyt، ص ۳۱)۔ فصیل کا گھیر دو سے تین میل تک کا بتایا جاتا ہے۔ John Eldred (۱۵۸۳ء) نے لکھا ہے کہ بغداد میں تین زبانیں بولی جاتی تھیں: عربی، ترکی اور فارسی (طبع Hakluyt، ص ۳: ۳۲۵)۔ Ralph Fitch (۱۵۸۳ء) نے بغداد کو بہت بڑا شہر تو نہیں پایا، لیکن آبادی بہت گنجان تھی۔ پرتگالی سیاح Pedro Texeira (۱۶۰۳ء) نے بغداد میں گھروں کی تعداد کا اندازہ بیس سے تیس ہزار تک دیا ہے۔ بغداد میں ایک ٹکسال تھی جس میں زرنے، چاندی اور تانبے کے سگے ضرب کیے جاتے تھے۔ ایک مدرسہ تیر اندازی کا اور ایک بندوق بازی کا تھا، جن کی کفالت و نگرانی حکومت کرتی تھی (Travels، طبع Hakluyt، ص ۳۱)۔

بکر صوباشی [رک باں] کی بغاوت کے بعد شاہ عباس اول نے بغداد کو ۱۶۰۳ء / ۱۶۲۲ء میں فتح کر لیا۔ مدرسوں کی عمارتیں اور سنیوں کے مقبرے منہدم کر دیے گئے، ان میں شیخ عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرے بھی شامل تھے۔ ہزاروں آدمی قتل کر دیے گئے یا غلام بنا کر بیچ دیے گئے اور بہت سے لوگوں کو شدید ایذاں دی گئیں (کاتب چلبی: فذلک، ص ۲: ۵۰؛ خلاصۃ الآثار ۱: ۳۸۳؛ العزاوی، ص ۳: ۱۷۸ تا ۱۸۲)۔ اسی زمانے میں ایرانی حاکم صفی قلی خان نے "سرائے" (یعنی دارالامارۃ) تعمیر کی تھی۔ ۱۶۳۸ء / ۱۶۳۸ء میں عثمانی ترکوں نے سلطان مراد چہارم کی ذاتی قیادت میں بغداد پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس نے مقبروں کو خصوصاً امام ابو حنیفہ اور شیخ عبدالقادر گیلانی کے مزاروں کو دوبارہ

ص ۳۰ تا ۳۱، ۶۲ تا ۶۳)۔ حسن پاشا نے ایک مسجد بنوائی، جو اسی کے نام سے موسوم ہوئی؛ اسے جامع انوزیر بھی کہتے ہیں (گلشنِ خلفاء، ص ۶۶؛ اولیا چلبی، ص ۴: ۴۱۹)۔ اس نے کرخ کے گرد ایک فصیل اور ایک خندق بھی بنوائی تاکہ وہ بدویوں سے محفوظ رہے۔

اسی زمانے میں یورپ کے سیاح بغداد کی سیاحت کے لیے آنے لگے۔ وہ اسے کاروانوں کا مقام اتصال اور عرب، ایران اور ترکی کی تجارت کے لیے بڑا مرکز بتاتے ہیں۔ فریڈریگو (Caesar Frederigo) کے زمانے میں (۱۵۶۳ء) بہت سے بیرونی تاجر شہر میں موجود تھے۔ شرلی (Sir Anthony Sherley) نے وہاں "انواع و اقسام کے بہت عمدہ تجارتی سامان دیکھا، جو بہت ارزاں تھا" (Purchas، ص ۸: ۳۸۳)۔ یہاں ایک پل کشتیوں کا تھا، جنہیں لوہے کی ایک بڑی زنجیر سے باندھ رکھا تھا؛ جب دریا سے نیچے یا اوپر کے رخ کشتیوں کو گزرنا ہوتا تو اس پل کی کچھ کشتیاں الگ کر دی جاتی تھیں تاکہ آنے جانے والی کشتیاں گزر جائیں (Ralph Fitch، در ۱۵۸۳ء، Hakluyt، ص ۳: ۲۸۲ تا ۲۸۳)۔ Rauwolf (۱۵۷۳ء) نے یہاں کی گلیاں تنگ پائیں اور گھر بھی بہت گھٹیا، بدحال تھے۔ بہت سی عمارتیں خراب خستہ حالت میں تھیں۔ کچھ سرکاری عمارتیں جیسے پاشا کے رہنے کی جگہ، بڑا بازار یا صرافہ اچھی حالت میں تھے۔ شہر کے حمام گھٹیا قسم کے تھے۔ مشرقی حصہ فصیل اور خندق کے ذریعے خوب مستحکم تھا، لیکن مغربی حصہ کھلا ہوا تھا اور ایک بڑے گاؤں کی طرح دکھائی دیتا تھا (Travels : Rauwolf، در Ray's Collections، لندن ۱۶۰۵ء، ص ۱: ۱۷۹)۔ شہر کی دیواریں اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں اور ان میں کچھ اضافے بھی

(باب الوسطانی) یا سفید دروازہ مشرق میں۔ چوتھا دروازہ پل پر تھا۔ اولیا چلبی نے فصیل کو ناپا تو آہستہ رفتار سے اٹھائیس ہزار آٹھ سو قدم یا سات میل پایا (ایک میل = چار ہزار قدم)؛ لیکن حاجی خلیفہ نے اسے بارہ ہزار دو سو ذراع یا دو میل بتایا ہے (Neibuhr اور Olivier مشرقی بغداد کی لمبائی دو میل قرار دیتے ہیں)۔ Welisted کی رائے میں دیوار کا گھیر سات میل ہے۔ Felix Jones نے ۱۸۵۳ء میں بغداد کی پیمائش کی؛ وہ مشرقی دیوار کے گھیر کو جس میں دریا کا رخ بھی شامل ہے، دس ہزار چھ سو گز یا تقریباً چھ میل لکھتا ہے (Olivier : Voyage، ۲ : ۳۷۹ تا ۳۸۰ : Wellsted : Travels، ۲۵۵ : Felix Jones، ص ۳۱۸ : قب Rousseau، ص ۵۰ اور Tavernier، ص ۸۴)۔

فصیل کو ایک خندق گھیرے ہوئے تھی، جس کی چوڑائی ساٹھ ذراع تھی اور اس میں دریائے دجلہ سے پانی لایا گیا تھا۔ دیوار کے شمال مغربی جانب قلعہ (اندرونی قصر) باب المعظم سے دریائے دجلہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس قلعے کے گرد اکھری دیوار تھی، جس میں چھوٹے چھوٹے برج تھے اور ان پر توپیں نصب تھیں۔ اس میں فوجی سپاہیوں کی بارکیں، سامان حرب اور سامان خوراک کے ذخیرے، نیز سرکاری خزانہ اور نکسال تھے۔ ”سرائے“، جہاں پاشا بود و باش رکھتا تھا، قلعے کے نیچے تھی۔ اس میں طویل و عریض باغات اور عمدہ کوشکیں تھیں۔ پل کے دوسرے سرے پر کرخ کی طرف ایک اور قلعہ تھا، جسے قشور قلعہ سی (= پرندوں کا قصر) کہتے تھے۔ اس کا ایک دروازہ پل پر تھا (اولیا چلبی؛ ۴ : ۳۱۶ : حاجی خلیفہ : جہاں نما، ۴۵۰ تا ۴۵۷ : Tavernier، ص ۶۴ : Voyage : Thevenot، ۲ : ۲۱۱)۔ اولیا چلبی بغداد میں مسجدوں کی بڑی تعداد بتاتا ہے اور نو

تعمیر کرا دیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد باب الطلیسم کے گرد فصیل بنا دی گئی اور وہ اسی حالت میں رہا، یہاں تک کہ ۱۹۱۷ء میں ترکوں نے شہر کو خالی کرتے وقت اسے اڑا دیا۔ سلطان مراد کے وزیر اعظم نے ”قلعہ“ کی بہت اچھی مرمت کرا دی۔ اس زمانے کے سیاحوں مثلاً Tavernier (۱۶۵۲ء)، اولیا چلبی (۱۶۵۵ء) اور Thevenot (۱۶۶۳ء) نے مزید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ مشرقی بغداد کے گرد کی دیوار قریب قریب دائرے کی شکل کی تھی۔ یہ ساٹھ ذراع اونچی اور دس سے پندرہ ذراع تک چوڑی تھی اور اس میں بندوقوں کے لیے روزن بنے ہوئے تھے۔ اس کے بڑے بڑے کونوں پر بڑے بڑے برج تھے، جن میں سے پانچ اس زمانے میں مشہور تھے، نیز تھوڑے تھوڑے فاصلے سے چھوٹے چھوٹے برج بنائے گئے تھے۔ بڑے بڑے برجوں پر برنجی توپیں لگی ہوئی تھیں۔ مناسب دفاع کے لیے دریا کے جانب کی دیوار بھی مکمل کر دی گئی تھی (نصوح الصلاحی کے نقشے میں بھی، جو اس نے ۱۵۳۷ء میں سلطان سایمان کے لیے بنایا تھا، یہ دیوار دکھائی گئی ہے : Atlas of Baghdad : A. Sousa، ص ۱۲)۔ اس فصیل میں خشکی کے رخ ایک سو اٹھارہ اور دریا کے رخ پینتالیس برج تھے (حاجی خلیفہ (۱۶۵۷ء) : جہاں نما، ص ۴۵۷ بعد : Ker Porter (۱۸۱۹ء)، ایک سو سترہ برج بتلاتا ہے، جن میں سے سترہ بڑے تھے (Travels، ص ۲۶۵)؛ قب Buckingham : Travels، ص ۳۷۲)۔ خشکی کی طرف فصیل کے تین دروازے تھے (کیونکہ باب الطلیسم کو تیغا کر دیا گیا تھا) : (۱) باب الامام الاعظم، شمال میں دریائے دجلہ سے سات سو ذراع کے فاصلے پر؛ (۲) قرانلق قیو (باب الكلوآذا) یا تاریک دروازہ، جنوب میں دریائے دجلہ سے پچاس ذراع کے فاصلے پر اور (۳) آق قیو



کی مرمت کرائی اور برج الصابونی (۱۶۸۷ء) تعمیر کیا۔ مسجدوں کی طرف بھی کچھ توجہ کی گئی۔ دلی حسین پاشا (۱۶۴۴ء) نے مسجد قمریہ کو دوبارہ تعمیر کیا۔ خاصکی محمد (۱۶۵۷ء) نے رأس القریہ میں "خاصکی مسجد" بنائی۔ سلحدار حسین پاشا (۱۶۷۱ء) نے مسجد الفضل کو دوبارہ بنوایا، جو جامع حسین پاشا کہلانے لگی۔ اس نے عمر سہروردی کے مقبرے کے گرد دیوار کھچوا دی اور ایک نہر کے ذریعے اس میں پانی پہنچایا۔ عبدالرحمن پاشا (۱۶۷۳ء) نے جامع شیخ معروف کی مرمت کرائی اور اس پشتے کی تکمیل کی جو اس کے پیش رو نے اعظمیہ کو سیلاب سے بچانے کے لیے تعمیر کرنا شروع کیا تھا۔ قپلان مصطفیٰ (۱۶۷۶ء) نے جامع الشیخ القدوری کو نئے سرے سے بنوایا، جو جامع القپلانیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ عمر پاشا (۱۶۷۸ء) نے مسجد ابوحنیفہ کی مرمت کرائی اور اس کے لیے جدید اوقاف مخصوص کیے۔ ابراہیم پاشا (۱۶۸۱ء) نے جامع سید سلطان علی اور جامع السراے کو نئے سرے سے بنوایا۔ اسمعیل پاشا (۱۶۹۸ء) نے جامع الخفایین کو دوبارہ بنوایا (العزاوی، ص: ۳، ۲۷، ۶۴، ۱۰۹، ۱۱۶، ۱۳۳؛ گلشن خلفاء، ص: ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۶؛ الأوسی: مساجد، ص: ۳۷، ۵۷ تا ۵۸)۔ احمد بشناق (۱۶۷۸ء) نے مشہور و معروف خان بنی سعد بنوائی اور سلحدار حسین پاشا نے مستنصریہ کے پاس ایک نیا بازار بنوایا۔

اٹھارھویں صدی کے شروع میں ایالت بغداد میں سخت ابتری پڑ گئی۔ بنی چری شہر کے مالک تھے، عرب قبائل آس پاس کے دیہات پر قبضہ جمائے ہوئے تھے، تجارت کی حفاظت اور امن و امان یکسر مفقود تھا۔ ۱۷۰۳ء میں حسن پاشا کا تقرر ہوا۔ اس کے اور بعد ازاں اس کے جانشین اور بیٹے احمد کے ماتحت

خاص مسجدوں کا ذکر کرتا ہے۔ مدارس میں المرجانیہ اور مدرسة الخلفاء (المستنصریہ) سب سے بڑے دو مدرسے تھے۔ سرائیں بہت سی تھیں، لیکن اچھی دو تھیں۔ اس نے آٹھ گرجاؤں اور تین یہودی صومعوں کا ذکر کیا ہے اور تکیوں کی تعداد سات سو اور حماموں کی پانچ سو بتائی ہے، جو مبالغہ آمیز ہے۔ کشتیوں کے پل میں پانی کے اتار چڑھاؤ کے مطابق سینتیس سے چالیس تک کشتیاں جوڑی جاتی تھیں۔ رات کے وقت حفاظت کی غرض سے یا دریا میں جہازوں کو راستہ دینے کے لیے یا فوجی احتیاط کے طور پر بیچ میں سے کچھ کشتیاں الگ کر دی جاتی تھیں۔ شہر کی بڑی بڑی زبانیں عربی، ترکی، اور فارسی تھیں۔ بغداد میں بہترین پیغام رساں کبوتر موجود تھے۔

بایں ہمہ بغداد ابھی تک رو بزوال تھا۔ اس کی آبادی گھٹ کر صرف پندرہ ہزار رہ گئی تھی (Travels: Tavernier، لندن ۱۶۷۸ء، ص ۸۵ تا ۸۶؛ اولیا چلبی: سیاحت، ص: ۳۲۰؛ بعد: Thevenot: Voyage، ۲: ۲۱۱)۔

۱۷۰۳ء/۱۱۱۶ھ سے ۱۶۳۸ء/۱۷۰۳ء تک بغداد پر چوبیس پاشاؤں کی حکومت رہی اور کسی حقیقی ترقی کی گنجائش نہ نکلی۔ یہ پاشا نیم خود مختار ہوتے تھے اور بنی چریوں کی قوت بڑھی ہوئی تھی۔ ادھر قبائل کا زور بھی بڑھا اور وہ رفتہ رفتہ شہر کی زندگی کے لیے ایک خطرہ بن گئے۔

اس زمانے میں اس سے زیادہ کچھ نہ ہوا کہ شہر کی دیواروں اور مسجدوں کی مرمت کرا دی گئی۔ کوچک حسن پاشا (۱۶۴۲ء) نے برج العجم کے قریب تین برج تعمیر کیے۔ خاصکی محمد پاشا نے طایب الفاتح کو دوبارہ بنوایا اور ۱۶۵۷ء کے سیلاب کے بعد دیواروں کی مرمت کرا دی۔ احمد بشناق نے برجوں کی خصوصاً برج الجاویش (چاؤش)

بغداد میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ وہ بنی چریوں کا زور توڑنے کے لیے مملوکوں (Kölemen) کو لائے اور یوں مملوکوں کے اقتدار کی بنیاد پڑی، جو ۱۸۳۱ء تک قائم رہا۔ بنی چریوں اور عرب قبائل کو قابو میں کر لیا گیا، نظم و نسق بحال کر دیا گیا اور ایرانی خطرہ ٹل گیا۔ حسن پاشا نے مسجد سرائے (جدید حسن پاشا) کو دوبارہ تعمیر کیا۔ اس نے ایندھن اور سامان خوراک پر سے محصول اٹھا دیا اور محلوں کو اس زرستانی سے محفوظ کر دیا جو قتل کی وارداتوں کے بعد کی جاتی تھی (Gazetteer of the Persian Gulf)۔

۱. حصہ اول: ۱۱۹۳ تا ۱۱۹۴، سلیمان فائق: حروب الایرانیین، بخطوطہ، ورق ۱۸ تا ۱۹؛ وہی مصنف: تاریخ المالک، بخطوطہ، ورق ۴؛ حدیقة الزوراء (ملخص)، بخطوطہ، ورق ۹: گلشن خلفاء، ص ۲۲۵)۔ احمد پاشا نے اپنے والد (حسن) کے طریقے پر کام جاری رکھا اور بغداد کی قدر و منزلت بہت بڑھا دی۔ ۱۷۳۷ء اور ۱۷۴۳ء میں نادر شاہ نے بغداد کا دو بار محاصرہ کیا اور گو پہلے محاصرے میں بغداد کو نقصان بہت ہوا پھر بھی احمد پاشا ڈٹا رہا اور شہر کو بچا لیا۔ جب ۱۷۴۷ء میں احمد پاشا کی وفات ہو گئی تو قسطنطنیہ نے دوبارہ بغداد پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہا، لیکن مملوکوں کی مزاحمت کی وجہ سے کامیابی نہیں ہوئی۔ سلیمان پاشا پہلا مملوک تھا جو ۱۷۴۹ء میں بغداد کا والی بنایا گیا۔ یہی شخص عراق میں مملوکوں کی عملداری کا اصل بانی تھا۔ اس وقت سے سلطان کو مملوکوں کے مرتبے کا اقرار کرنا پڑا اور عموماً وہ انہیں کے نامزد کردہ والی کی توثیق کرنے لگا۔ حسن پاشا عثمانی دربار کا تربیت یافتہ (خانہ زاد) تھا اور اسی دربار کی پیروی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے چرکسی و گرجستانی مملوکوں کی، نیز مقاسی مقتدر لوگوں کے لڑکوں کی

تعلیم و تربیت کے لیے تربیت گاہیں قائم کیں۔ سلیمان نے [آگے چل کر تربیت کا دائرہ وسیع کر دیا] چنانچہ درس گاہ میں ہر وقت تقریباً دو سو طلبہ زیر تربیت رہتے تھے تاکہ آگے چل کر انہیں میں سے عہدے دار اور اہلکار مقرر کیے جائیں۔ انہیں وہاں ادبی تعلیم اور اسلحہ کے استعمال کرنے کی تربیت دی جاتی، فنونِ مردانگی اور ورزشی کھیل سکھائے جاتے اور آخر میں محلات کے رسوم و آداب کی تعلیم دی جاتی تاکہ حکومت کے لیے بہترین اور منتخب کارندے پیدا کیے جاسکیں (سلیمان فائق: تاریخ الممالیک؛ دوحۃ الوزراء، ص ۸)۔ اس طرح ایک حکمران جماعت تیار کر دی گئی تھی، جو تربیت یافتہ، مستعد اور چاق و چوبند تھی، لیکن اس کی کمزوری تھی حسد اور خفیہ ساز باز۔ سلیمان پاشا نے قبائل کو مطیع اور نظم و ضبط اور امن و امان قائم کیا اور تجارت کی حوصلہ افزائی کی۔ ۱۷۵۵ء / ۱۷۶۲ء میں علی پاشا اس کا جانشین ہوا اور اس کے بعد ۱۷۵۷ء / ۱۷۶۴ء میں عمر پاشا کا دور آیا (تاریخ جودت، بار دوم، ۱: ۳۳۹ تا ۳۴۰)۔ ۱۷۶۶ء میں بمبئی کے انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ بغداد میں برطانوی وکیل (ریزیڈنٹ) مقرر کیا جائے (Gazetteer، ۱: ۱۲۴۵)۔ ۱۷۸۶ء / ۱۷۷۲ء میں بغداد میں ایک ہولناک وبا پھیلی، جو چھ مہینے تک رہی اور ہزاروں آدمی مر گئے؛ بعض لوگوں نے شہر تک چھوڑ دیا اور ساری تجارتی سرگرمیاں ٹھنڈی پڑ گئیں (Gazetteer، ۱: ۳۲۴)۔

امن و امان نے بغداد کو ایک بڑا تجارتی مرکز بنا دیا، چنانچہ ۱۷۷۳ء میں ایک عینی شاہد لکھتا ہے: ”یہ (بغداد) ہندوستان، ایران، قسطنطنیہ، حلب اور دمشق کے مال کی بڑی منڈی ہے۔ مختصر یہ کہ مشرق کی بہت بڑی ذخیرہ گاہ ہے“ (Gazetteer، ۱: ۱۲۴۳)۔



بحال کیا، آپاشی کی چند نہریں صاف کرائیں، کپڑے اور اسلحہ کے کارخانے قائم کیے اور مقامی صنعت کی حوصلہ افزائی کی۔ اس نے تین بہت بڑی مسجدیں بنوائیں، جن میں ممتاز ترین مسجد حیدر خانہ تھی۔ اس نے تین مدرسوں کی بنیاد رکھی اور پل کے پاس ایک بازار بنوایا، تقریباً بیس ہزار سپاہیوں کی ایک فوج مرتب کی اور انہیں فوجی تربیت دینے کے لیے ایک فرانسیسی افسر مقرر کیا۔ اس کی مستعد اور سمجھدار انتظامیہ کی وجہ سے شہر بغداد میں خوشحالی پیدا ہوئی۔ داؤد پاشا کے زوال اور سمالیک کے خاتمے کا باعث سلطان محمود ثانی کی اصلاحات اور حکومت میں مرکزیت پیدا کرنے کی کوشش تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ خوفناک وبا، قحط سالی اور سیلاب نے بھی اپنا کام کیا اور ان آفتوں سے شہر کے اکثر باشندے بری طرح متاثر ہوئے (۵۱۲۴۷/۱۸۳۱ء) (حدیقة الزوراء (ملخص)، مخطوطہ، ورق ۳۳ تا ۳۴، ۵۳، ۵۵ تا ۶۵؛ اے۔ آر۔ سویدی: نزہة الادباء، مخطوطہ، ورق ۳۱ تا ۳۲؛ مرآة الزوراء، ص ۵۹؛ سلمان فائق: تاریخ الممالیک، مخطوطہ، ورق ۳۹ تا ۵۲؛ Gazetteer، ۱: ۱۳۱۶؛ Travels: Frazer، ۱۰: ۸۰ تا ۲۲۳؛ Handbook of Mesopotamia، ۱۰: ۸۰ تا ۸۱)۔

بغداد کا نظام حکومت چھوٹے پیمانے پر حکومت قسطنطنیہ کی نقل تھا۔ اعلیٰ فوجی اور انتظامی اختیارات پاشا کے ہاتھ میں تھے۔ انتظامیہ کا سربراہ کتخدا (یا کہیہ) تھا، جس کی حیثیت وزیر کی سی تھی۔ اس کا ایک معاون دفتر دار کہلاتا تھا، جو مالیات کا ناظم ہوتا تھا اور دوسرا دیوان افندیسی، یعنی دیوان وزارت کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔ پھر محل کے محافظ سپاہیوں کا سالار اور بنی چربیوں کا آغا تھے۔ محکمہ قضا کا حاکم قاضی ہوتا تھا۔ اہم مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے

باہمی نزاع اور کمزور قیادت کے باعث مملوکوں میں اضطراب اور انتشار کا دور آیا، قبائل میں بدنظمی کی انتہا ہو گئی اور ایران نے بصرہ فتح کر لیا۔ جب سلیمان پاشاے اعظم ۱۱۹۳ھ / ۱۷۷۹ء میں واپس آیا اور اس نے بغداد، شاہر زور اور بصرے کو باہم ملا دیا تو یہ ابتری دور ہوئی۔ قبائل کو قابو میں کیا گیا، امن بحال ہوا اور مملوکوں کا اقتدار از سر نو قائم ہو گیا (تاریخ جودت، ۲: ۱۳۶، ۱۵۷، ۱۵۸؛ صوفی: تاریخ الممالیک، ص ۱۹، ۲۰، ۲۱؛ سلمان فائق: تاریخ الممالیک، ورق ۱۶ تا ۱۷)۔

سلیمان پاشا نے مشرقی بغداد کی فصیخیں درست کرائیں، کرخ کے گرد ایک دیوار کینچوا دی اور اس کے چاروں طرف خندق بنوائی۔ اس نے "سرامے" اور مدرسہ سلیمانہ کو بھی دوبارہ تعمیر کرایا اور قپلانیه Kaplaniyya، فضل اور خلفا کی مسجدوں کی مرمت کرائی۔ علاوہ بریں اس نے سوق السراجین تعمیر کیا۔ اس کے کہیہ [= کتخدا، یعنی سربراہ انتظامیہ] نے احمدیہ مسجد (جامع الميدان) بنوانی شروع کی، جس کی تکمیل کہیہ کے بھائی (عثمان بن سند (ملخص نسخہ)، ص ۷۰ تا ۷۳، ۷۶ تا ۷۷) نے کی۔ سلیمان کے آخری سال (۱۸۰۲ء) میں بغداد میں ایک وبا آئی (Gazetteer، ۱: ۱۲۸۵؛ یس آفندی العمری: غرائب الآثار، ص ۶۴)۔ کوچک سلیمان نے سزائے موت موقوف کر دی (۱۸۰۸ء)، بجز اس کے کہ شرعی عدالتیں ایسا فیصلہ کریں۔ اس نے املاک کی ضبطی کو ممنوع اور عدالتی مواجب منسوخ کر دیے اور حاکمان عدالت کی تنخواہ مقرر کر دی (سلمان فائق: تاریخ الممالیک، ورق ۱۹؛ دوحة الزوراء، ص ۲۵۰)۔

اس پر آشوب دور کے بعد داؤد پاشا آیا (۱۸۱۶ء)۔ اس نے قبائل کو قابو میں کیا، امن و امان

سراے (یعنی دارالامارة) بہت فراخ تھی؛ اس کے احاطے کے اندر خوش نما باغات تھے اور پر تکلف ساز و سامان سے آراستہ تھی (روسو، ص ۶؛ Ker Porter، ص ۲۶۳)۔

مغربی بغداد، یعنی کرخ، کسی نواحی بستی کے مانند تھا، جس میں بہت سے باغ تھے۔ پہلے اس کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہ تھا (روسو، ص ۵؛ Ives، ص ۲۸)، پھر سلیمان پاشاے اعظم نے اس کے گرد دیوار بنوا دی۔ اس کے چار دروازے تھے: باب الکاظم (شمال)، باب الشیخ معروف (مغرب)، باب الحلة (جنوب مغرب) اور باب الکریمات (جنوب)۔ ان دیواروں کا طول پانچ ہزار آٹھ سو گز تھا اور یہ دوسو چھالیس ایکڑ رقبہ گھیرے ہوئے تھیں (F. Jones، ص ۳۰۹)۔ کیر پورٹر Ker Porter (۱۸۱۸ء) نے اس بستی کے کثیر و وسیع کوچہ و بازار کے ساتھ ساتھ کثرت سے دکانیں بنی ہوئیں دیکھیں (Ker Porter، ص ۲: ۲۵۵؛ المنشی، البغدادی: رحلة، ص ۳۱)۔ مزید برآں، یہ اتنا آباد نہ تھا جتنا مشرقی حصہ اور اس میں عموماً عوام کی آبادی تھی (Niebuhr، ص ۲: ۲۴۴؛ Rousseau، ص ۴)۔ نشیوں کا پل چھ فٹ چوڑا تھا اور لوگ دریا کے پار اسی پر سے جاتے تھے یا پھر قفف ("guffas"، یعنی ڈونگے یا چھوٹی کشتیاں) استعمال کرتے تھے (Ker Porter، ص ۲: ۲۵۵؛ Niebuhr، ص ۲: ۲۴۴؛ المنشی، البغدادی، ص ۲۴۳)۔

اس زمانے میں رفتہ رفتہ آبادی بڑھی۔ روسو Rousseau (ص ۸) نے اس کا اندازہ پینتالیس ہزار (تقریباً ۱۸۰۰ء) اور اولیویر Olivier (۲: ۳۸۵) نے اسی ہزار بیان کیا ہے۔ شہر والے اس کی تعداد ایک لاکھ بتاتے تھے۔ بکنگھم Buckingham (Travels، ص ۲: ۳۸۰) کا اندازہ اسی ہزار ہے (۱۸۱۶ء)۔ کیر پورٹر Ker Porter (Travels، ص ۲۶۵) نے آبادی

پاشا دیوان کا اجلاس طلب کرتا تھا، جس میں کہیہ، دفتر دار، قاضی اور سالار، نیز دیگر عمائد شرکت کرتے تھے۔ بجل کے اندر مکانات بنے ہوئے تھے جن میں اساتذہ اور اتالیق (لالات) رہتے تھے کہ مملوکوں کو تعلیم دیں (جوڈت، ۲: ۲۸۷ و ۳: ۲۰۴؛ عثمان بن سند، ص ۳۱ تا ۳۲، ۵۶، ۳۹؛ روسو Rousseau، ص ۲۵ بعد)۔ مملوکوں کی فوج کی تعداد ساڑھے بارہ ہزار تھی اور ضرورت کے وقت مقامی بھرتی کر کے یا ولایت کے دوسرے حصوں سے امدادی دستے بلا کر تیس ہزار تک بڑھائی جا سکتی تھی (سلمان فائق: تاریخ ممالیک، ورق ۵۱ تا ۵۲)۔

اس زمانے کے یورپی سیاح بغداد کی بابت کچھ نہ کچھ معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ شہر کی فصیلیں مختلف اوقات میں کئی بار بنوائی گئیں اور ان کی مرمت کرائی گئی۔ ان کے پرانے بنے ہوئے حصے سب سے اچھے تھے (Buckingham: Travels، ص ۱۸۲۷؛ دیکھیے Felix Jones: Memoir، ص ۳۳۲)۔ فیلکس جونس کی پیمائش کے مطابق فصیل (مشرق) سے گھرے ہوئے حصے کا رقبہ ۵۹۱ ایکڑ تھا (قب: Dr. Ives: Journey، لندن ۱۷۷۸ء، ص ۲: روسو Rousseau: Description، ص ۵)۔ دریا کی طرف کی دیوار بظاہر نظر انداز کر دی گئی تھی اور دریا کے کنارے پر مکانات تعمیر کر لیے گئے تھے (Olivier: Voyage، ص ۱۸۰۳، ۲: ۳۷۹)۔ فصیل کے اندر شہر کا ایک بڑا حصہ، خصوصاً مشرقی جانب، غیر آباد پڑا تھا۔ دریا کے قریب کا حصہ خوب آباد تھا، لیکن یہاں بھی باغوں کی کثرت تھی اور یہ ایک ایسے شہر کی طرح دکھائی دیتا تھا جو کسی نخلستان کے درمیان سے ابھر رہا ہو (Niebuhr، ص ۲: ۲۳۹؛ Buckingham، ص ۳۷۳؛ Wellsted: Travels، ص ۱: ۲۵۵)۔



بھی تھیں، جن میں چمڑے کی دباغت اور روئی، ریشم اور اون کی پارچہ بافی خاص طور پر قابل ذکر ہے (Rousseau، ص ۹ تا ۱۰)۔

۱۸۳۱ء سے عثمانی عہد کے خاتمے تک بغداد براہ راست حکومتِ قسطنطنیہ کے ماتحت رہا۔ بعض والیوں نے وہاں اصلاحات نافذ کرنے کی کوشش کی۔ محمد رشید پاشا (۱۸۳۷ء) پہلا والی تھا جس نے اقتصادی حالات سنوارنے کی کوشش کی۔ اس نے بغداد اور بصرے کے درمیان باربرداری کے لیے دو جہاز خریدنے کی غرض سے ایک کمپنی بنائی، جس کی کامیابی دیکھ کر انگریزوں نے بھی ایک ویسا ہی منصوبہ تیار کیا۔ نایق پاشا نے دبیر خانہ کی بنیاد رکھی (۱۸۵۳ء)، جہاں جہازوں کی مرمت ہو سکتی تھی (Chihā، ص ۵۸، ۵۹ تا ۵۹، Gazetteer، ۱، ۱۳۶۰، ۱۳۶۵ تا ۱۳۶۶، ۱۳۷۲)۔ مدحت پاشا (۱۸۶۹ تا ۱۸۷۲ء) نے جدید نظام "ولایت" جاری کیا۔ والی کا ایک معاون، ایک مدیر برائے امور خارجہ اور ایک ماسون یا کاتب (سکرٹری) ہوتا تھا۔ ولایت سات سنجاقوں میں تقسیم کی گئی۔ ہر سنجاق کا حاکم اعلیٰ متصرف کہلاتا تھا۔ بغداد بھی ایک سنجاق تھا (Gazetteer، ۱)۔ ۱۳۴۲، ۱۳۴۷ تا ۱۳۴۸)۔ مدحت نے چند نسبت ناپسندیدہ محصول موقوف کر دیے، مثلاً (۱) احساب: یہ چنگی کا محصول تھا جو فصل سہر کے اندر باہر کی ہر پیداوار فروخت کے لیے لانے پر لگایا گیا تھا؛ (۲) طالبیہ: یہ محصول دریا میں کشتی چلانے پر لگایا گیا تھا؛ (۳) خمسِ حسب، یعنی ایسے ہر بس فی صد محصول اور (۴) "روس آبکار" یعنی آب پاشی کے لیے رھٹ نکانے پر محصول، جس کے بدلے اس نے پیداوار پر عشر (دسواں حصہ) مقرر کر دیا (Gazetteer، ۱، ۱۳۴۲)۔ ۱۸۷۰ء میں مدحت نے بغداد اور کالمین کے درمیان فریم گاڑی چلائی، جو

ایک لاکھ بتائی ہے (۱۸۱۸ء)۔ المنشی البغدادی کا یہ قول تقاسی آرا کی صدائے بازگشت ہے کہ بغداد میں ایک لاکھ مکانات تھے، جن میں سے پندرہ سو یہودیوں کے اور آٹھ سو عیسائیوں کے تھے (رحلہ، ص ۲۴)۔ ۱۸۳۰ء کے آتے آتے یہ اندازہ ایک لاکھ بیس ہزار سے ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گیا (Frazer، ۱، ۲۲۴ تا ۲۲۵ اور Wellsted)۔ یہ مختلف قوم و مذہب کے لوگوں کی مخلوط آبادی تھی۔ عہدے داروں کا طبقہ ترکوں (یا مملوکوں) پر مشتمل تھا؛ سوداگر زیادہ تر تو عرب تھے، پھر ایرانی، کرد اور کچھ ہندوستانی بھی تھے (Buckingham، ص ۳۸۷، Niebhur، ۲، ۲۵۰؛ Ker Porter، ۱، ۲۵۱ تا ۲۶۵؛ Wellsted)۔ بغداد میں، خصوصاً پل کے نزدیک بہت سے بازار تھے۔ ان میں سے بڑے بڑے بازاروں پر اینٹوں کی محراب دار چھتیں تھیں اور باقی پر کنجور کے ٹھنڈے ڈالے دیے تھے۔ بہت سی کارواں سرائیں ("خان")، چوبیس حمام، پانچ بڑے مدرسے اور بیس بڑی اور متعدد چھوٹی مسجدیں تھیں (Buckingham، ص ۳۷۸ تا ۳۷۹؛ Ives، ص ۲۷۳؛ المنشی البغدادی، ص ۳۱؛ Niebhur، ۲، ۲۳۰؛ Wellsted، ۱، ۲۵۷؛ Olivier، ۲، ۳۸۲)۔ گلیاں تنگ تھیں۔ بعض کے پٹانک تھے، جو رات کے وقت حفاظت کے لیے بند کر دیے جاتے تھے۔ مکانات اونچے تھے، جن کی کھڑکیاں گلی کی طرف کم ہوتی تھیں۔ گھر کے اندر کمرے قطار اندر قطار ہوتے تھے، جن کے دروازے ایک چوکور صحن کی طرف کھلتے تھے اور صحن میں عموماً باغ ہوتا تھا۔ موسم گرما میں گرمی سے بچنے کے لیے سرداب (تہ خانے) کام میں لائے جاتے تھے اور سہ بیہر کے بعد کھلے چبوترے آرام دہ ثابت ہوتے تھے۔ گرمی میں نوگ چیتوں پر سوتے تھے (قب Buckingham، ص ۳۸)۔ بغداد میں کچھ صنعتیں

(لغة العرب، ۱۹۱۳ء، ص ۳۳۵) - ۱۸۸۳ اور ۱۹۰۷ء کے درمیان پانچ مطابع قائم ہو گئے۔ بغداد میں ۱۹۰۸ء کے بعد سے اخبار نکلنے لگے اور ۱۹۱۵ء تک مختلف اشخاص نے پینتالیس اخبار جاری کئے۔

مدحت کے بعد والی بہت جلد جلد ایک دوسرے کے بعد آئے، لیکن انہوں نے کوئی نمایاں کام نہیں کیا۔ ۱۸۸۶ء میں جبرہ بھرتی جاری ہو گئی (فقط مسلمانوں کے لیے)۔ مدحت کے تعمیر کیے ہوئے ہسپتال کا آخر کار ۱۸۷۹ء میں افتتاح کیا گیا (الزوراء، شماره ۸۱۰)۔ ۱۹۰۲ء میں کشتیوں کا ایک نیا پل تعمیر کیا گیا، جو اتنا چوڑا تھا کہ اس پر سے گاڑیاں گزر سکتی تھیں اور اس کے جنوبی جانب ایک قہوہ خانہ بنایا گیا (الآوسی، ص ۲۵؛ Handbook، ۲: ۳۷۴)۔ ۱۹۰۸ء میں بغداد نے عثمانی پارلیمان میں اپنے تین نمائندے بھیجے (العزاوی، ۸: ۱۶۵)۔ ۱۹۱۰ء میں ناظم پاشا نے مشرقی بغداد کے گرد ایک بند بنا دیا تاکہ وہ سیلاب سے محفوظ ہو جائے (العزاوی، ۸: ۲۰۰ تا ۲۰۱)۔ یہ آخری مستعد اور سرگرم والی تھا۔

اس زمانے میں والی کی مدد کے لیے جو نظم و نسق کا اعنی حاکم تھا، ایک مجلس بھی تھی، جس کے تقریباً آدھے ارکان منتخب ہوتے تھے اور باقی ارکان بلحاظ منصب مقرر کیے جاتے تھے۔ منتخب ارکان میں سے تقریباً دو غیر مسلم ہوتے تھے۔ والی کا ایک مددگار ہوتا تھا، جسے "قائم مقام" کہتے تھے (الزوراء، شماره ۱۳۶۹؛ سالنامہ ۱۲۹۲ھ)۔ دوسرے اہم عہدے یہ تھے: نظامتِ معارف نظامتِ طپو (Tapu)، دفترِ تسجيل (Registration) اور دیوانی عدالتیں (سالنامہ ۱۳۰۰ھ)، ص ۸۲ تا ۹۶)۔ ۱۷۶۸ء تک بغداد تین ایالتوں، یعنی موصل، بصرہ اور بغداد کا صدر مقام تھا۔ ۱۸۶۱ء

سائرس تک چلتی رہی (علی حیدر مدحت: Life، ص ۱۵۱)۔ اس نے ۱۸۶۹ء میں سب سے پہلا دارالاشاعت اور مطبع ولایت بغداد میں قائم کیا اور اخبار الزوراء کی بنیاد رکھی، جو عراق میں صوبے کا سب سے پہلا سرکاری ترجمان تھا۔ یہ ۱۹۱۷ء تک ہفتہ وار اخبار کی صورت میں شائع ہوتا رہا (العزاوی، ۷: ۲۳۱؛ علی حیدر مدحت: The Life of Midhat Pasha، لندن ۱۹۰۳ء، ص ۳۷۷؛ بعد: الطرازی: Arabic Press، ۱: ۷۸؛ چند فرانسیسی مشنری مدارس کے سوا بغداد میں طرز جدید کا کوئی مدرسہ نہ تھا۔ ۱۸۶۹ اور ۱۸۷۱ء کے درمیان مدحت پاشا نے نئی طرز کے مدارس قائم کئے: ایک صنعتی مدرسہ، ایک ابتدائی (= رشدی) اور ایک ثانوی (= اعدادی) فوجی درس گاہ اور ایک ابتدائی اور ثانوی ملکی (= Civil) مدرسہ (الزوراء، شماره ۱۸۲؛ العزاوی، ۸: ۲۱؛ سالنامہ بغداد (۱۹۰۰ء)، ص ۳۵۳؛ Chiha، ص ۱۰۰ تا ۱۰۲)۔ مدحت نے شہر کی فصیلیں گروا دیں اور یہ شہر کو جدید طرز پر بنانے کی طرف پہلا قدم تھا۔ اس نے "سرائے" کی عمارت کو، جو نامق پاشا نے شروع کی تھی، مکمل کر دیا (Chiha، ص ۶۶)۔

مدحت پاشا نے جو تعلیمی تحریک شروع کی تھی وہ اس کے بعد جاری رہی۔ لڑکیوں کا پہلا ابتدائی مدرسہ ۱۸۹۰ء میں کھولا گیا (سالنامہ، ۱۳۱۸ھ)۔ چار ابتدائی مدرسے ۱۸۹۰ء میں جاری ہوئے اور ایک ابتدائی مدرسة المعلمین ۱۹۰۰ء میں (سالنامہ معارف، استانبول ۱۹۰۰ء؛ ایس۔ فیضی: نضال، ص ۵۸ تا ۵۹)۔ ۱۹۱۳ء کے آتے آتے عراق میں ایک سو تین مدرسے ہو گئے، جن میں ایک سو سڑسٹھ ابتدائی، انیس رشدی اور پانچ ثانوی تھے اور ایک کالج، یعنی کلیہ قانون، بھی جاری ہو گیا



ص ۸: *Geary : Through Asiatic Turkey*، ۱۸۷۸ء،  
 (۱۲۶: ۱) - ۱۸۹۰ سے ۱۸۹۹ء تک یہ اندازہ اسی  
 ہزار سے ایک لاکھ ہو گیا (*Harris : From Batum*)  
*Baghdad*، ۱۵، ص ۲۹۹: *Cowper : Through Asiatic*  
*Turkey*، ص ۲۷۰) - ۱۹۰۰ء میں آبادی ایک لاکھ  
 تھی (*Province : Chiha*)، ص ۱۶۵: دیکھیے سالنامہ  
 (۱۳۲۰ھ)، ص ۱۳۶ تا ۱۳۷، ۱۸۱)۔

ایک اور تخمینے کی رو سے ۱۹۰۳ء میں  
 یہ آبادی ایک لاکھ چالیس ہزار تھی (*Handbook of*  
*Mesopotamia*، ۱: ۸۹) - ۱۹۱۸ء تک آبادی  
 کی تعداد دو لاکھ ہو گئی (*Handbook*، ۲:  
 ۳۳۳: *الآلوسی : اخبار بغداد*، ص ۲۸۰ تا ۲۸۱)۔  
 ۱۹۱۸ء میں آبادی کی تعداد ایک لاکھ پچاس ہزار  
 تھی (دیکھیے *R. Coke : Baghdad*، ص ۲۹۸)۔ سیاح  
 یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوتے تھے کہ وہاں  
 قومیں ایک دوسرے سے خوب خلط ملط ہو گئی  
 ہیں، مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، غیر مسلم  
 باشندے غیر معمولی آزادی سے بہرہ اندوز ہیں  
 اور عوام میں باہم بڑی رواداری ہے (*Jones*)،  
 ص ۳۳۹: *Olivier*، ۲: ۳۸۸ تا ۳۸۹)۔ یہ اختلاط  
 بغداد کی مقامی زبان پر اپنا نقش چھوڑ گیا ہے  
 (عبداللطیف: قاموس لہجات بغداد، مخطوطہ)۔

بائیں ہمہ عام زبان عربی تھی۔ قبائلی آنا  
 شروع ہوئے تو عرب آبادی بڑھنے لگی (*Geary*):  
 کتاب مذکور، ۱: ۱۳۶، ۲۱۳)۔ عموماً ایک  
 عقیدے یا نسل کے لوگ ایک خاص محلے میں  
 اکٹھے ہو جاتے تھے (قب *F. Jones : Memoir*،  
 ص ۳۳۹)۔ ترک عام طور پر شہر کے شمالی محلوں  
 میں بودویاش رکھتے تھے جب کہ یہودی اور  
 عیسائی اپنے اپنے پرانے محلوں میں، علی الترتیب  
 سوق الغزل کے شمال اور مغرب میں، رہتے تھے۔  
 بہت سے ایرانی مغربی بغداد میں رہتے تھے، مگر

میں موصل اور ۱۸۸۳ء میں بصرہ علیحدہ کر دیے گئے  
 اور بغداد تین متصرفلیکوں کا صدر مقام رہ گیا  
 (*Province : Chiha*، ص ۸۵)۔

۱۸۳۱ء میں طاعون اور سیلاب نے بغداد  
 میں بڑے خوفناک اثرات چھوڑے تھے۔ مشرقی  
 بغداد کے بہت سے گھر ویران ہو گئے۔ شہر پناہ  
 کے اندرونی علاقے کا دو تہائی حصہ خالی ہو گیا۔  
 ادھر کرخ کا بڑا حصہ اجڑ گیا۔ دونوں طرف کی  
 فصیل میں سیلاب کی وجہ سے بڑے بڑے شکست  
 پڑ گئے۔ داؤد پاشا کے عہد کے مقابلے میں اس وقت  
 شہر کی حالت بہت زیادہ خراب تھی (*Frazer : Travels*،  
 ۱: ۲۶۹، ۲۳۳ تا ۲۳۴، ۲۵۲)۔ ساؤتھ گیٹ  
 Southgate کے زمانے (۱۸۳۷ء) میں شہر ان آفات کے  
 آہستہ آہستہ پھر سنبھلنے لگا تھا؛ اس نے آبادی کا  
 اندازہ چالیس ہزار لگایا، مگر مدرسے کس پیرسی کی  
 حالت میں تھے۔ انہیں جو امداد ملتی تھی اس سے  
 ٹھیک کام نہیں لیا جاتا تھا (*Narrative : Southgate*  
 (جلد ۲)، ۱۸۵۱ء، ۲: ۱۸۰، ۱۶۵ تا ۱۶۶؛  
*Handbook of Mesopotamia*، ۱: ۸۰ تا ۸۱)۔

جب فیلکس جونز *Felix Jones* نے بغداد کی سیاحت  
 کی (۱۸۵۳ء) تو حالت سنور چکی تھی۔ اس نے  
 لکھا ہے کہ مشرقی بغداد میں تریسٹو اور کرخ میں  
 پچیس محلے تھے، جن میں بہت سے آج بھی اپنے  
 پرانے ناموں سے موسوم چلے آتے ہیں (*Memoir*،  
 ص ۳۳۹: قب *Frazer*، ص ۲۳۳ تا ۲۳۴)۔

انیسویں صدی عیسوی کے وسط سے شہر کی  
 آبادی مستقل بڑھتی رہی؛ ۱۸۵۳ء میں تقریباً  
 ساٹھ ہزار تھی (*Felix Jones*، ص ۳۱۵، ۳۲۹)۔  
 ۱۸۶۷ء میں بغداد میں مردوں کی تعداد  
 ۶۷۲۷۳ دی ہوئی ہے (لغات العرب، ۱۹۱۳ء)۔  
 ۱۸۷۷ء میں ساری آبادی کا اندازہ ستر سے  
 اسی ہزار تک دیا گیا ہے (*Persian Gulf Gazetteer*)،

سے پل کے قریب تک اور دوسری جنوبی دروازے سے بڑے بازار کے سرے تک جاتی تھی۔ ۱۹۱۵ء میں شمالی دروازے کو جنوبی دروازے سے ایک سڑک کے ذریعے ملا دیا گیا تھا۔ یہ سڑک آج کل ”شارع رشید“ کہلاتی ہے (Handbook، ۱: ۳۷۷؛ سالنامہ (۱۳۱۸ھ)، ۵۹۹ تا ۶۰۰)۔

۱۹۲۲ء میں نامق پاشا نے بعض سڑکوں کی مرمت کرانی چاہی (سالنامہ، ۱۳۱۸ھ، ص ۶۰)۔ ۱۳۰۷ھ - ۱۸۸۹ء میں سیری پاشا نے ”میدان“ کو ایک کھلے چوک میں بدل دیا اور اس میں ایک باغ لگا دیا (دیکھیے سالنامہ، ۱۳۲۱ھ، ص ۷۶)۔ ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۹ء میں مدحت نے انتخابات کے ذریعے ایک مجلس بلدیہ قائم کی اور احکام جاری کیے کہ سڑکیں صاف کر دی جائیں۔ ۱۸۷۹ء میں بلدیات باقاعدہ قائم کی گئیں اور صفائی اور بدرروئیں بنانے کے احکام دیے گئے (الزوراء، شماره ۲۳۱، شماره ۸۷۸، شماره ۸۱۷، شماره ۱۷۷۳؛ لغات العرب، ۱: ۱۷؛ سالنامہ (۱۳۰۰ھ)، ص ۱۳۶)۔ مٹی کے تیل سے روشنی کرنے کا انتظام کیا گیا، اور اس کا اہتمام ایک ٹھیکے دار کے سپرد کیا گیا؛ لیکن عملاً فقط ان سڑکوں پر روشنی ہوئی جہاں سربرآوردہ اشخاص رہتے تھے (الزوراء، شماره ۴۹۰، شماره ۸۳۷؛ اس کے علاوہ رگہ بہ بلدیہ)۔

یسویں صدی عیسوی کے شروع میں بغداد شہر کا رقبہ تقریباً چار مربع میل تھا۔ مدحت پاشا کی گرائی ہوئی مشرقی دیوار کے آثار دریا کے ساتھ مل کر ایک متوازی الاضلاع شکل بناتے تھے، جس کا طول تقریباً دو میل اور عرض اوسطاً ایک میل سے زائد تھا۔ اس رقبے کا تقریباً ایک تہائی حصہ خالی پڑا تھا یا قبروں اور کھنڈروں سے پر تھا، اور جنوب کی جانب بہت سی جگہ کھجوروں کے

کرخ میں زیادہ تر عرب آبادی تھی (F. Jones، ص ۳۳۹؛ Persian Gulf، ص ۷۹، ۷۹ تا ۸۰؛ Handbook، ۲: ۳۸۱؛ Southgate، ۲: ۱۸۲)۔ اگرچہ ان تینوں مذاہب والے عربی ہی بولتے تھے، لیکن ان کی بولیوں میں فرق تھا (لغات العرب، ۱۹۱۱ء، ص ۶۹ تا ۷۱)۔ اس صدی کے خاتمے پر بھی بغداد میں کچھ صنعتیں باقی تھیں۔ پارچہ بافی کی صنعت میں ریشمی اور سوتی کپڑے، اون اور ریشم کو ملا کر بنایا ہوا کپڑا، دھاری دار سوتی کپڑا، اور برقعوں، جبوں، چادروں اور مستورات کے بیرونی لباس کے لیے موٹا سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ بغداد کے بنے ہوئے ریشمی کپڑے اپنے رنگ اور کاری گری کی وجہ سے مشہور تھے۔ رنگریزی کی بہت اعلیٰ صنعت موجود تھی۔ صنعتِ دباغت یہاں کی بڑی صنعتوں میں سے تھی اور معظم میں اس کے چالیس کے قریب کارخانے تھے۔ نجاری اور تیغ سازی کی صنعت ترقی یافتہ تھی۔ کپڑا بننے کا ایک فوجی کارخانہ بھی تھا (Handbook، ۱: ۱۳۱؛ سالنامہ (۱۳۰۰ھ)، ص ۷۹، ۱۳۶)۔

بغداد کے بازار مسقف تھے یا کھلے ہوئے، جیسے سوق الغزل۔ مشرقی پل کے بیرونی سرے پر ”سرائے“ کے بازاروں، ”میدان“، شرجہ (Shordjo) اور کپڑے کے بازار میں، جسے داؤد پاشا نے دوبارہ بنایا تھا، تجارت کا بڑا زور تھا۔ بعض بازاروں میں خاص خاص پیشہ ور ہوتے تھے، جن کی اپنی اپنی انجمنیں تھیں اور بازار کا نام بھی اسی دستکاری کے نام پر رکھ دیا جاتا تھا، مثلاً سوق الصفاہیر (تانبے والوں کا بازار)، سوق السراجین (زین بنانے والوں کا بازار)، سوق الصاغا (چاندی والوں کا بازار)، سوق انخفافین (جوئے والوں کا بازار) وغیرہ (اولیا چلبی، ۳: ۲۲؛ MGTB، ۱: ۲۲ تا ۲۳)۔

دوسڑکیں مشہور تھیں۔ ایک شمالی دروازے



اور موسم سرما میں ۳۶ درجے سے ۳۱ درجے فارن ہیٹ تک، لیکن کبھی کبھی گرمی میں ۱۲۳ درجے فارن ہیٹ تک چڑھ جاتا اور جاڑے میں بیس درجے فارن ہیٹ تک گر جاتا تھا۔

بغداد نے عثمانی ترکوں کے عہد میں ممتاز شعرا پیدا کیے، جیسے فضولی [رک باں]، ذہنی [رک باں]، آخرس۔ اسی طرح عبدالباقی العمیری، مرتضیٰ غرابی اور شکر الالوسی جیسے مؤرخ وہاں ہوئے؛ فقہا میں عبداللہ سویدی اور ابوالشاه الالوسی جیسے لوگ گزرے (دیکھیے الالوسی: المسک الاذفر، بغداد، ۱۹۳۰ء)۔

موجودہ بغداد بہت کچھ بدل گیا ہے (خصوصاً ۱۹۳۰ تا ۱۹۳۹ء میں)۔ وہ اس قدر پھیل گیا ہے کہ شمال کی طرف اعظمیہ اور کاظمین سے، مشرق میں بند سے، جنوب میں دجلے کے بڑے موڑ سے اور ادھر المطار المدنی اور قریبی مضافات مثلاً منصور اور مأمون کے شہروں سے جا ملا ہے۔ کرخ اور رصافہ میں چھتر محلے ہیں، اعظمیہ میں آٹھ، کرذ شرقیہ میں چار اور کاظمین میں چھ (Atlas : Sousa Baghdad، ص ۲۱ تا ۲۵)۔ بغداد کے حدود بلدیہ کے اندر کی آبادی ۱۹۴۷ء میں ۴۶۶۷۳۳ تھی، جو ۱۹۵۷ء میں بڑھ کر سات لاکھ پینتیس ہزار تک پہنچ گئی۔ قدیم عمارتوں کی طرز کے بجائے شہر کے باہر نئے مکان مغربی انداز پر تیار ہو گئے ہیں۔ پرانی آبادیوں کی بھی رفتہ رفتہ شکل بدلتی جا رہی ہے۔ کشتیوں کا پل اب ناپید ہے اور چار پختہ پل تعمیر ہو گئے ہیں۔

تجدد کا عمل، مادی بھی اور معاشرتی بھی، اس تیزی سے ہو رہا ہے کہ یہ مقالہ اسے ضبطِ تحریر میں لانے سے قاصر ہے۔

مآخذ: مقالے میں مآخذ بیان ہو چکے ہیں۔ بڑے بڑے مؤرخوں، جیسے الطبری، المسعودی، الیعقوبی،

کرخ دریا کے زیادہ اوپر کی طرف سے شروع ہوتا تھا، لیکن یہ اس سے لمبائی اور چوڑائی میں کہیں چھوٹا تھا (Handbook، ۲: ۲۷۶) - ۱۸۸۲ء میں کل گھروں کی تعداد ۱۶۳۰۳ تھی، چھ سو سرائیں تھیں، اکیس حمام، چھیالیس جامع مسجدیں اور چھتیس چھوٹی مسجدیں تھیں، چونتیس بچوں کے مکتب اور اکیس مذہبی مدارس تھے، ۱۸۴۴ قہوہ خانے اور ۳۲۲۱ دیگر دکانیں تھیں (سالنامہ (۱۳۰۰ھ)، ص ۱۳۶) - ۱۸۸۴ء میں ان کی تعداد حسب ذیل تھی: ۱۶۴۲۶ مکان، ۲۰۵ سرائیں، انتالیس حمام، ترانوں جامع مسجدیں اور بیالیس چھوٹی مسجدیں اور چھتیس بچوں کے مکتب (سالنامہ (۱۳۰۲ھ)، ص ۳۳۵)۔

۱۹۰۳ء میں بغداد میں چار ہزار دکانیں تھیں؛ دو سو پچاسی قہوہ خانے، ایک سو پینتیس میوہ دار باغ، ایک سو پینتالیس جامع مسجدیں، چھ ابتدائی مدرسے، آٹھ غیر مسلموں کے سکول، بیس خانقاہیں (تکیے)، بارہ کتب فروشوں کی دکانیں، ایک عوامی کتب خانہ، بیس لڑکوں کے مکتب، آٹھ گرجا گھر، نو دباغت کے کارخانے، ایک صابون کا کارخانہ، ایک سوانتیس کرگھے اور بائیس پارچہ بافی کے کارخانے تھے (سالنامہ (۱۳۲۱ھ)، ص ۱۷۹) - ۱۹۰۹ء تک مکانوں کی تعداد نوے ہزار تک پہنچ گئی۔ تین غیر سرکاری چھاپے خانے، چھ گرجا گھر اور نو صومعے تھے (سالنامہ (۱۳۲۴ھ)، ص ۳۲۳)۔

شکر الالوسی نے مشرقی بغداد میں چوالیس اور کرخ میں اٹھارہ مسجدوں کی کیفیت لکھی ہے (الالوسی: مساجد؛ Mission : Massignon، ۲: ۶۳ تا ۶۵)۔

بغداد میں درجہ حرارت موسم گرما میں ۱۱۳ درجے سے ۱۲۱ درجے فارن ہیٹ تک رہتا تھا

العزّاوی: تاریخ العراق بین الإحتلالین، ۸ جلد، بغداد ۱۹۳۶ تا ۱۹۵۸ء؛ (۲۱) عثمان بن سَند البصری: مطالع الصعود فی اخبار السوالی داؤد، D. of Ant. Library، مخطوطه عدد ۲۳۳ (اختصار از ایم - ایچ - المدنی)، قاهرہ ۱۳۷۱ھ؛ (۲۲) سلمان فائق: تاریخ الممالیک فی بغداد (Lib. Dept. of Ant. Baghdad) مخطوطه عدد ۱۲۲؛ (۲۳) وہی مصنف: حروف الایرانیین فی العراق (Lib. of D. of Ant. Baghdad، عدد ۱۹۵۲)؛ (۲۴) حدیقة الزوراء، اختصار از عبدالرحمن السهروردی (مخطوطه)؛ (۲۵) عبدالرحمن السهروردی: نزهة الأدباء فی تراجم علماء و وزراء بغداد (مخطوطه)؛ (۲۶) A.M. Karmali: الفوز بالمراد فی تاریخ بغداد، ۱۳۲۹ھ؛ (۲۷) فریدون بی: منشآت السلاطین، استانبول ۱۲۷۴ھ؛ (۲۸) کاتب چلبی: فذلک، ج ۲، استانبول ۱۲۹۷ھ؛ (۲۹) مرتضی: گلشن خلفاء؛ (۳۰) محمد امین: بغداد و حادثہ ضیاعی، استانبول ۱۳۳۸ - ۱۳۴۱ھ؛ (۳۱) جودت پاشا: تاریخ، بار دوم، استانبول ۱۳۰۱ تا ۱۳۰۹ھ؛ (۳۲) الأزدی: حکایة ابی القاسم البغدادی، طبع A. Mez هانڈل برگ ۱۹۰۲ء؛ (۳۳) الزوراء، Gov. Gazette (Dept. of Ant. Library)؛ (۳۴) اے - کیو - شہربانی: تذکرة الشعراء، طبع A.M. Karmali، بغداد ۱۹۳۶ء؛ (۳۵) الآلوسی: مساجد بغداد، بغداد ۱۳۴۶ھ؛ (۳۶) ابن طیفور: تاریخ بغداد، ج ۶، لائپزگ ۱۹۰۸ء؛ (۳۷) Histoire de Baghdad dans les temps modernes: Cl. Huart، پیرس ۱۹۰۴ء؛ (۳۸) J. R. Wellsted: Travels in the city of the caliphs، لندن ۱۸۴۰ء؛ (۳۹) Description du pachalik: Rousseau، پیرس ۱۸۰۹ء؛ (۴۰) Herzfeld و Sarre: Archäologische Reise im Euphrat und Tigris-Gebiet، برلن ۱۹۰۰ء؛ (۴۱) Rev. H. Southgate: Tour through Armenia, Kurdistan, Persia and Mesopotamia، دو جلد، لندن ۱۸۵۰ء؛ (۴۲) M. de

ابن الأثیر کی تصانیف؛ جغرافیہ دان، مثلاً ابن رسته، ابن الفقیہ (مخطوطات مشہد)، ابن حوقل، الیعقوبی، المقدسی، یاقوت کی تصانیف؛ [ابن عبدالحق کی] مرصدا الإطلاع، حدود العالم اور المستوفی کی تصانیف؛ سیاحوں، مثلاً ابن جبیر، ابن بطوطہ اور تطیلہ کے بنجمن (Benjamin of Tudela) کے سیاحت ناموں کے علاوہ مندرجہ ذیل تصانیف کا ذکر مناسب ہے: (۱) ابن الساعی: الجامع المختصر، طبع مصطفیٰ جواد، بغداد ۱۹۳۴ء؛ (۲) ابن الجوزی: مناتب بغداد، بغداد ۱۹۲۱ء؛ (۳) وہی مصنف: المنتظم، حیدرآباد دکن ۱۳۵۷ تا ۱۳۵۹ھ؛ (۴) مسکوئیہ: تجارب الامم، ج ۱ تا ۷ (طبع و ترجمہ از Margoliouth و Amedroz، ۱۹۲۰ - ۱۹۲۱ء)؛ (۵) سہراب: عجائب الاقالیم السبعہ، طبع Hans von Mzik، لائپزگ ۱۹۳۰ء؛ (۶) الشاہستی: کتاب الدیارات، طبع جرجیس Gurgis عواد، بغداد ۱۹۵۱ء؛ (۷) ہلال الصابی: رسوم دارالخلافہ، Dept. of Ant. Library، مخطوطه عدد ۲۹۰؛ (۸) ابن الفوطی: الحوادث الجامعہ، طبع مصطفیٰ جواد، بغداد ۱۳۵۱ھ؛ (۹) الصولی: اخبار الراضی والمتقی باللہ، قاهرہ ۱۹۳۵ء؛ (۱۰) التبوخی: نِسوار المحاضرة، ج ۱، قاهرہ ۱۹۲۱ء و ج ۸، دمشق ۱۹۳۰ء؛ (۱۱) ایم - ایچ - آللوسی: المسک الأذقر، ج ۱، بغداد ۱۹۳۰ء؛ (۱۲) اولیاء چلبی: سیاحت نامہ، ج ۳، قسطنطنیہ ۱۳۱۴ھ؛ (۱۳) المنشی البغدادی: رحلہ، مترجمہ عباس العزّاوی، بغداد ۱۹۴۸ء؛ (۱۴) سالنامہ بغداد، سال ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۲۱، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، W. B. (۱۵) Harris: From Batum to Baghdad، ایڈنبرا ۱۸۹۶ء؛ (۱۶) الحسینی: اخبارالدولة السلجوقیہ، طبع محمد اقبال، لاہور ۱۹۳۳ء؛ (۱۷) Chiha: La Province de Baghdad، قاهرہ، تقریباً ۱۹۰۰ء؛ (۱۸) حاجی خلیفہ: جہان ناما، قسطنطنیہ ۱۱۴۵ھ؛ (۱۹) یس العمری: غرائب الاثر، طبع ایم - ایچ - جلیلی، موصل ۱۹۴۰ء؛ (۲۰) عباس



بزرگ کے نام سے معروف ہے) کی بیوی، جس کے ساتھ اس نے ۵۷۲۳ھ / ۱۳۲۳ء میں نکاح کیا تھا۔ ۱۳۲۵ء میں ایران کے ایلخانی حکمران ابو سعید (عہد حکومت ۵۷۱۷ھ / ۱۳۱۷ء تا ۵۷۳۶ھ / ۱۳۳۵ء) نے چنگیز خان کے یاسا (= قوانین) کا حوالہ نظیر کے طور پر پیش کر کے چاہا کہ امیر حسن اسے طلاق دے دے تا کہ ابو سعید خود اس سے نکاح کر سکے، لیکن ابو سعید کی یہ کوشش امیر چوبان نے کامیاب نہ ہونے دی۔ اکتوبر یا نومبر ۱۳۲۷ء میں ابو سعید کی انگیخت پر غیاث الدین گرت نے امیر چوبان کو ہرات میں دھوکے سے قتل کر دیا، جس کے بعد ابو سعید بغداد خاتون کے ساتھ نکاح کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بغداد خاتون نے بڑے اثر و رسوخ کا مقام حاصل کر لیا اور اسے ”خداوند گار“ (= فرمانروا) کا لقب ملا۔ ۵۷۳۲ھ / ۱۳۳۱ء میں شیخ حسن پر الزام لگا کہ وہ اپنی سابقہ بیوی بغداد خاتون کے ساتھ مل کر ابو سعید کو مروانے کی سازش کر رہا ہے۔ اس وجہ سے ابو سعید اور بغداد خاتون کے تعلقات کشیدہ ہو گئے، لیکن اس سے اگلے سال جب ثابت ہو گیا کہ سازش کا الزام جھوٹا تھا تو بغداد خاتون پھر مورد عنایات ہو گئی۔ ۵۷۳۴ھ / ۱۳۳۳ء میں ابو سعید نے بغداد خاتون کی بھیتجی [؟] دلشاد خاتون سے شادی کر لی اور اسے اپنی دوسری بیویوں سے اونچا رتبہ دے دیا۔ اس بات نے بغداد خاتون کے دل میں حسد پیدا کر دیا اور جب ۱۳ ربیع الآخر ۵۷۳۶ھ۔۔ ۳ نومبر ۱۳۳۵ء کو ابو سعید اچانک فوت ہوا تو بغداد خاتون پر زہر خورانی کا شبہ کیا گیا اور امرا نے اسے قتل کرا دیا۔ ایک اور قول یہ ہے کہ اس کے قتل کی وجہ یہ تھی کہ بغداد خاتون نے مغول کے بڑے بادشاہ (= ”التون اردو“ کے خان) ازبک سے خط و کتابت

*'Relation d'un voyage fait au Levant : Thevenot*  
 دو جلد: (۳۳) J. S. Buckingham  
*Mesopotamia*، لندن ۱۸۲۷ء؛ (۳۴) Felix Jones  
*Memoir on Baghdad*، بمبئی ۱۸۵۷ء؛ (۳۵)  
*Voyage en Arabie : C. Niebuhr*، ج ۲، ۱۷۸۰ء؛  
*Travels in Syria, Persia, Armenia, : Ker Porter* (۳۶)  
*Ancient Babylonia*، جلد ۲، لندن ۱۸۱۷ء تا ۱۸۲۰ء؛  
*Gazetteer of the Persian Gulf : J. G. Lorimer* (۳۷)  
 ج ۱، جزو ۱ و ۲، کلکتہ ۱۹۲۵ء؛ (۳۸) *Handbook of*  
*Mesopotamia*، جلد ۳، لندن ۱۹۱۷ء؛ (۳۹) Olivier  
*Voyages*، جلد ۲، پیرس ۱۸۰۳ء؛ (۴۰) S.H. Longrigg  
*Four centuries of Modern Iraq*، اوکسفورڈ ۱۹۲۵ء؛  
*Reallexikon der Assyriologie* (۵۱) برلن ۱۹۲۸ء؛  
*Mission en Mesopotamie : L. Massignon* (۵۲) ج ۲،  
 قاہرہ ۱۹۱۲ء؛ (۵۳) E. Ives *Journey from Persia*  
*to Baghdad*، لندن ۱۷۷۸ء؛ (۵۴) نقشہ دارالعلوم  
 بغداد، از A. Sousa و M. Diawād، مع دلیل مفصل،  
 بغداد ۱۹۵۸ء؛ (۵۵) لسٹرنیج : *Baghdad*  
*during the Abbasid Caliphate*، اوکسفورڈ ۱۹۲۴ء؛  
*A Baghdad Chronicle : R. Levy* (۵۶) کیمبریج  
 ۱۹۲۹ء؛ (۵۷) A. Abel *Les Marchés de Baghdad*  
 در *Bulletin de la Société belge d'Études géogra-*  
*phiques*، ۱۹۳۹ء، ص ۱۳۸ تا ۱۶۳؛ (۵۸) D. S.  
*History of the Jews in Baghdad : Sassoon*  
 Letchworth ۱۹۳۹ء؛ (۵۹) *Baghdad*، بذیل مادۃ بغداد  
 (از جاوید یسون)؛ (۶۰) R. Coke *Baghdad the*  
*City of Peace*، لندن ۱۹۲۷ء؛ (۶۱) M. Streck *Die*  
*Alte Landschaft Babylonien*، ج ۱، لائن ۱۹۰۰ء؛  
*Atlas Baghdad : A. Sousa* (۶۲) بغداد ۱۹۵۲ء۔  
 (A. A. DURI)

بغداد خاتون: امیر الامرا امیر چوبان کی بیٹی  
 اور امیر حسن جلاٹری (جو عام طور پر شیخ حسن

محمفوظ رہ گئی ہے)۔ اس نے الہیات پر بھی متعدد کتابیں لکھیں: کتاب الملل و النحل مفقود ہو گئی ہے؛ اصول الدین ترتیب و تدوین کے اعتبار سے بہت عمدہ رسالہ ہے، جس کے شروع میں علم کی ماہیت، تخلیقِ عالم، خالق کائنات کی معرفت کا طریقہ، اس کی صفات وغیرہ بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتاب محمد بن عمر الرازی کی المحصل سے بہت مشابہت رکھتی ہے، لیکن اس میں ہر مسئلے کے بارے میں تمام مختلف فرقوں کی آرا بیان کر دی گئی ہیں۔

السبکی نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے کوئی کتاب بھی اس سے مطابقت نہیں رکھتی۔ اس کتاب کا اندازِ تحریر شروع سے آخر تک محققانہ ہے۔ یہ بات اس کی دوسری کتاب الفرق بین الفرق میں نظر نہیں آتی، جس میں ہر فرقے کا ذکر الگ الگ کرتے ہوئے ان سب کا جائزہ مسلمہ عقائدِ اہل سنت کی روشنی میں لیا گیا ہے اور جو فرقے [اس کے نزدیک] صراطِ مستقیم سے منحرف ہیں ان سب کی مذمت کی گئی ہے۔ یہ کتاب الشہرستانی کی کتاب الملل و النحل کی طرح محض حقائق کا بیان نہیں بلکہ مناظرانہ تنقید کی حامل ہے۔ اس کتاب میں اگرچہ سقراط اور افلاطون کے عنوان سے ایک باب موجود ہے، لیکن اس کا عام موضوع اسلام ہی ہے۔ کتاب کے خاتمے پر مسلمانوں کے مسلمہ عقائد کی تشریح کی گئی ہے۔ دو کتابیں اغلاط ابی الہذیل اور اغلاط ابن کرام، جو بظاہر زیادہ شرح اور مفصل تھیں، محفوظ نہیں رہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس نے ان نظریات سے جن کی وہ مذمت کرتا ہے ایسے نتائج اخذ کیے ہیں جو انہیں پہلی بار پیش کرنے والوں کے کبھی مد نظر نہ تھے۔

مآخذ: (۱) السبکی: طبقات الشافعیہ، ۳: ۲۳۸، بیعد؛

(۲) ابن خلکان، شماره ۳۰۲: (۳) ZDMG، ص ۶۵،

کر کے اسے ایران پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا تھا۔ مآخذ: (۱) حافظ آبرو: ذیل جامع التواریخ رشیدی (طبع ک۔ بیانی)، تہران ۱۳۱۷ھ/۱۹۳۸ء، بہ امداد اشاریہ؛ (۲) ابن بطوطہ، طبع Defrémery و Sanguinetti، بیس ۱۸۵۳ء، ۲: ۱۱۷، بیعد؛ (۳) تاریخ شیخ اویس (طبع J. B. van Leon)، ہیگ ۱۹۵۴ء، ص ۵۹۰، ۵۹۱: C.D' Ohsson، *Histoire des Mongols*؛ ہیگ و ایمسٹرڈم ۱۸۳۵ء، ۳: ۶۶۷، بیعد، ۷۱۴، بیعد، ۷۲۰: H. Howorth، *History of the Mongols*؛ لنڈن ۱۸۷۶ تا ۱۸۸۸ء، ۳: ۶۰۵، بیعد، ۶۲۲، بیعد؛ (۶) عباس العزازی: تاریخ العراق، بغداد ۱۹۳۵ء، ص ۴۹۳ تا ۴۹۶ و بہ امداد اشاریہ؛ (۷) B. Spuler، *Die Mongolen in Iran*، بار دوم، برلن ۱۹۵۵ء، بہ امداد اشاریہ۔

(R. M. SAVORY)

\* البغدادی، الخطیب: رَک بہ الخطیب البغدادی۔

\* البغدادی: عبدالقادر بن عمر، رَک بہ عبدالقادر۔

\* البغدادی: عبدالقادر بن طاہر، ابو منصور الشافعی (م ۴۲۹ھ/۱۰۳۷ء)۔ باپ تو اسے صرف تعلیم کے لیے نیشاپور لے گیا تھا مگر عبدالقادر نے وہیں سکونت اختیار کر لی۔ خراسان کے اکثر علما و فضلا اس کے شاگرد تھے۔ وہ سترہ مضامین کی تعلیم دینے کی صلاحیت رکھتا تھا، جن میں سے فقہ، اصول، حساب، قانون وراثت (=فرائض) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ترکمانوں کے فتنہ و فساد کی وجہ سے اس نے نیشاپور کو خیر باد کہا اور اُسفرائین چلا گیا اور تھوڑے عرصے کے بعد وہیں فوت ہو گیا۔ وہ خاصا دولت مند تھا اور اہل علم کی امداد کیا کرتا تھا۔ فقہ، حساب اور وراثت پر اس کی کتابیں بہت مقبول تھیں (حساب پر ایک کتاب



*Beiträge zur Frühgesch. der Türk in : Fr. Babinger*  
*Rumelien*، ص ۲۱) اور سلطان نے بغداد کے سوداگروں  
کو تمام عثمانی ممالک سے تجارت کرنے کی اجازت  
دے دی (Kraeitz : کتاب مذکور)۔

سٹیفن اعظم (۱۳۵۷ تا ۱۵۰۰ء) نے شاہ  
پولینڈ کا نئے سرے سے باجگزار ہونا منظور کیا اور  
اہل قریم (کریمیا) کے حملے کو ۱۳۶۹ء/۵۸۷۳ء میں  
پسپا کیا؛ اس کے علاوہ اوزون حسن [رك باں]  
کے ساتھ سیاسی تعلقات قائم کیے اور روم ایلی کے  
عثمانی بیگلر بیگی کو (۲ رمضان ۵۸۷۹ء/۱ جنوری  
۱۳۷۵ء کو) شکست دی۔ بالآخر محمد ثانی  
نے بغداد پر حملہ کیا اور اس کے صدر مقام  
سوجیوہ (Sučava) کو جلا دیا (ربیع الاول ۵۸۸۱ء/  
جولائی ۱۳۷۶ء) - ۵۸۸۹ء/۱۳۸۳ء میں بایزید  
ثانی اور اس کے باجگزار خان قریم نے مل  
کر فوج کشی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آق کرمان اور  
کیلیا (کیلی Kili) پر عثمانیوں نے اور کوشان Kawshan  
اور تومبَسار Tombasār پر خان نے قبضہ کر لیا۔  
۵۸۹۷ء/۱۳۹۲ء میں سٹیفن Stephen نے اپنا لڑکا  
مع خراج باب عالی میں بھیج کر عثمانی تسلط  
قبول کر لیا۔

عثمانیوں کے عہد میں آق کرمان اور نیلیا  
کے لوگ بحیرہ روم کے مشرقی ملکوں (Levant) کی  
تجارت میں سرگرمی دیکھنے لگے (آج کل اس کا  
ثبوت اس زمانے کے عثمانی جنگی خانوں کے دفاتر  
سے مل سکتا ہے جو استانبول کے باش وکالت آرشوی،  
استانبول، Maliye، عدد ۶، میں موجود ہیں)۔ بغداد سے  
غلے، گوشت، مکھن اور موم برآمد ہوتا تھا اور ایک  
اجارہ داری نظام کے تحت اس کی تجارت کا انحصار  
روز بروز استانبول کی منڈی پر ہوتا چلا گیا۔

عثمانیوں اور بغداد کے باہمی تعلقات دارالعہد

[رك باں] کے اسلامی اصول پر مبنی تھے جیسا کہ

۳۴۹ بےعد: (۳) MO، ص ۱۹، ۱۸۷ بےعد: (۵) براکلمان،  
۱ : ۳۸۵؛ تکملہ، ۱ : ۶۶۶ : [ (۶) الزرکیلی : الأعلام  
۳ : ۱۷۳ : (۷) مفتاح السعادة، ۲ : ۱۸۵ : (۸) انباء الرواة،  
۲ : ۱۸۵ ]۔

(A. S. TRITTON)

**بغداد** : اصل میں بغداد ایلی، یا بغداد ولایتی  
(= سرزمین بغداد)، صوبہ مولداوہ (مالدیویا Moldavia)  
کا ترکی نام، جو بغداد [= بوغدان] کے نام پر رکھا گیا۔  
اس نے ۱۳۵۹ء/۵۷۶۰ء میں جبال کربیات (Carpathians)  
اور دنیستر Daniester (طورلہ Turla) کے مشرقی  
جانب ایک ریاست قائم کی۔ بغداد ایلی کا نام  
محمد ثانی کے ”حکم“، مؤرخہ ۵۸۵۹ء/۱۳۵۵ء،  
میں ملتا ہے (Osm. Urk. : Kraeitz، لوحہ ۱)۔  
قرہ بغداد کا نام امینک Iminek کے مکتوب  
مؤرخہ ۵۸۸۱ء/۱۳۷۶ء میں ملتا ہے (Belleten،  
عدد ۳ تا ۴، ص ۶۳۳) اور عثمانی وقائع نگاروں کے  
ہاں بھی عام طور پر پایا جاتا ہے۔

اس ریاست پر عثمانی ترکوں کا پہلا حملہ  
(= آقین) ۵۸۲۳ء/۱۳۲۰ء میں ہوا (آق کرمان کا  
ناکام محاصرہ) - ۵۸۳۱ء/۱۳۲۸ء میں آلتون اردو  
(Golden Horde) کے خان الگ محمد نے سلطان  
مراد ثانی کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ دونوں  
متحد ہو کر افلاق قوم (Vlach) کے کفار کو (جو  
ان دونوں کے درمیان رہتے تھے) مطیع کر لیں  
(قَب Kurat : Yarlik ve Bitikler، ص ۸)۔ حاجی گرای  
[رك باں] نے محمد ثانی کے ساتھ بغداد ایلی  
کے خلاف اتحاد کر لیا اور ایک ترکی بیڑے نے  
۵۸۵۸ء/۱۳۵۳ء میں آق کرمان پر حملہ کر دیا۔  
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے حاکم  
پٹرو آرون Petru Aron نے عثمانی اقتدار کو  
تسلیم کر لیا اور دو ہزار دو سو دعات ducats سالانہ خراج  
ادا کرنا منظور کیا (موسم خزاں ۵۸۵۹ء/۱۳۵۵ء)

ان عہدناموں سے جو سلاطین عثمانیہ نے عطا کیے اور ان شاہی فرامین ("پرات") سے ظاہر ہوتا ہے جو ووی وودوں (Voyvode = مقامی حکام) کے نام جاری ہوئے (قب پرات، بنام الیکساندرو Alexandru ششم ایلش، Iliash، در فریدون: منشیات، ۲: ۳۹۸)۔ جب ووی وودہ کا تقرر براہ راست سلطان کی طرف سے ہونے لگا تو اس کے روابط باب عالی سے اور زیادہ مضبوط ہو گئے؛ اس طریقے سے جو پہلا ووی وودہ (والی) مقرر ہوا وہ پیٹرو چہارم ررش (Petru IV Rares) تھا (۵۹۳۳/۱۵۲۷ء)۔ ووی وودہ کی ساری قوت کا سرچشمہ سلطان تھا۔ سلطان اپنے پرات (شاہی فرمان) میں تمام سرداروں (boyars)، پادریوں اور عوام کے نام حکم جاری کرتا تھا کہ وہ ووی وودہ کو اپنا حاکم (بیگ) سمجھیں اور اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا علاقہ دارالحرب قرار دیا جائے گا۔ ووی وودہ کے نشانِ حاکمیت علم، خلعت اور سرخ بوزک (ترکی ٹوپ) تھے۔ ووی وودہ کے ہمراہ ایک آغا اس کے دارالحکومت میں جا کر اسے تخت پر بٹھاتا تھا اور اعلانِ تخت نشینی لوگوں کو پڑھ کر سناتا تھا۔ دسویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی تک بھی یہ ضروری سمجھا جاتا تھا کہ ہر ووی وودہ سابق ووی وودہ کی اولاد میں سے ہونا چاہیے (قب فریدون، ۲: ۳۹۸، ۳۳۶)۔ با این ہمہ مقامی سرداروں (بویاروں) کی رائے کا خیال رکھا جاتا تھا۔ عثمانیوں کے لیے، جنہیں کریمیا کے تاتاریوں کی مدد حاصل تھی، اس بات میں کچھ زیادہ مشکل پیش نہ آتی تھی کہ وہ ان مدعیانِ تخت کو جن کی پولینڈ یا قازق (Cossacks) اعانت کرتے تھے یا ان ووی وودوں کو جنہیں سلطان معزول کر دیتا تھا اور وہ اپنی جگہ سے نہ ٹلتے تھے الگ کر دیں۔ ۱۱۲۳ھ/۱۷۱۰ء میں دمتری کانتیر Dimitri Kantemir کی غداری کے بعد یہ دستور ہو گیا

تھا کہ ووی وودہ محض فناری (Phanariot) یونانیوں کے چند خاندانوں، یعنی مورجزداتو (Movrokordati، کلماکی Kallimachi، اہسلانتی Hysilanti، سے منتخب کیے جائیں۔ اس فناری (Phanariot) یونانی دور (۱۱۲۳ تا ۱۲۳۶ھ/۱۷۱۱ تا ۱۸۲۱ء) میں ووی وودہ اپنے درجے سے گر کر فقط عثمانی عہدے دار بن کے رہ گئے تھے۔ انہیں اکثر بدل دیا جاتا تھا، مگر ۱۲۱۷ھ/۱۸۰۲ء کے بعد روس کے دباؤ کی وجہ سے انہیں سات سال کے لیے مقرر کیا جانے لگا۔ "اہل العہد" کی حیثیت سے اہل مولداوہ زمین کا جو لگان ادا کرتے تھے اسے "خراج مقطوع" سمجھا جاتا تھا؛ گویا زمین کو ووی وودہ کاشت کراتا تھا اور عامل (ٹیکس وصول کرنے والے) کی حیثیت سے اس سے توقع کی جاتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ زر لگان، جس کا ملک متحمل ہو سکے، وصول کرے۔ ۱۸۵۹ھ/۱۸۵۵ء میں خراج دو ہزار ڈوکٹ (ducats) [ایک ڈوکٹ = تقریباً ۹ شلنگ] مقرر کیا گیا۔ پھر اسے بڑھا کر سٹیفن اعظم کے زمانے میں چار ہزار، پیٹرو چہارم ررش کے زمانے میں دس ہزار اور ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء میں گشپر (Gashpar) کے عہد میں چالیس ہزار ڈوکٹ (ducats) کر دیا گیا۔ بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ خراج پینسٹھ ہزار قرش [رک باں] ہو گیا۔ بغداد بھی سالانہ سات ہزار ڈوکٹ خراج خانِ قریم کو ادا کرتا تھا۔ ووی وودہ جو پیشکش (نذرانہ) سلطان، وزرا اور دیگر با اثر لوگوں کو پیش کرتا تھا اس نے ایک مقرر رواج کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور اس کی مجموعی رقم خراج کی رقم کے برابر ہو جاتی تھی۔

ووی وودہ کو جو عہد نامہ عطا کیا جاتا تھا اس میں یہ شرط بھی لکھی جاتی تھی کہ "وہ سلطان کے دوستوں کا دوست اور اس کے دشمنوں کا



جب روس نے اس ملک پر قبضہ کر رکھا تھا۔ بویاروں کی مجلس کو یہ حق عطا ہوا کہ وہ وویوودہ کا خود انتخاب کریں۔

جوں جوں زمانہ گزرتا گیا دولت عثمانیہ اس ریاست کے مختلف حصے دارالاسلام میں مدغم کرتی گئی۔ سلیمان اول کی ۱۵۳۸ء کی فوج کشی سے کئی لحاظ سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے؛ چنانچہ وویوودہ کو باب عالی کا بہت زیادہ دست نگر بنا دیا گیا اور آق کرمان کی بندرگاہ کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے ضلع بجاق [رک باں] کا الحاق کر لیا گیا۔ ۱۶۲۱ء میں عثمان دوم نے پولینڈ والوں سے خوتین چھڑا لیا تاکہ اسے بغداد کو دے دیا جائے، مگر اسمعیل کے شمال کی طرف کا علاقہ عثمانی املاک میں شامل کر لیا۔ بجاق [یا بوجاق] کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے دستری کانٹمیر نے ۱۱۲۳ھ / ۱۷۱۱ء میں خفیہ طور پر زار (روس) کی سرپرستی منظور کر لی۔ معاہدہ پروت (Pruth) کے بعد باب عالی نے خوتین اور اس کے ارد گرد کے ضلعے کو پروت تک ایک عثمانی پاشا کے ماتحت کر دیا۔ ۱۱۸۹ھ / ۱۷۷۵ء میں آسٹریا نے ملک کے شمال مغربی حصے (Bukovina) پر قبضہ کر لیا اور ۱۲۲۷ھ / ۱۸۱۲ء میں روس نے بس سربیا [رک باں] کا اپنے ملک کے ساتھ الحاق کر لیا اور معاہدہ کوچک قینارجہ (۱۱۸۸ھ / ۱۷۷۳ء) کے بعد روس مولداوہ کا محافظ بن بیٹھا۔ آخر کار معاہدہ آق کرمان (۵ ربیع الاول ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء) کے بعد اس ریاست پر عثمانی اقتدار برائے نام رہ گیا اور روس کو محافظ طاقت تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۲۷۶ھ / ۱۸۵۹ء میں افلاق (Walachia) اور مولداوہ کی دو توأم ریاستوں کو ملا کر ایک کر دیا گیا، اور سلطان نے اس اتحاد کو دو سال کے بعد تسلیم کیا (۲۸

دشمن ہوگا، بوقت ضرورت عندالمطالبہ اسے فوج مہیا کرنی پڑے گی اور جب سلطان خود میدان میں نکلے گا تو وویوودہ کو بھی بذات خود اس کے ساتھ نکلنا پڑے گا (نعیم، ۶ : ۳۲۲)، لیکن پراتوں (=شاہی فرامین) میں بتا کید لکھا جاتا تھا کہ عثمانی عہدے دار ریاست کے اندرونی مسائل میں کسی طرح دخل نہیں دیں گے۔ وویوودہ کا استانبول میں ایک نمائندہ (قپوکتخداسی یا کہیہ) ہوتا تھا جس کا کام ان معاملات کا طے کرنا تھا جو وویوودہ اور باب عالی کے درمیان پیدا ہوتے تھے۔ بغداد کے باشندے سلطان کی باجگزار رعایا شمار ہوتے تھے۔ سلطان کا فرض تھا کہ ان کے دشمنوں سے ان کی حفاظت کرے اور جو وویوودہ ان پر ظلم و ستم کرے اسے معزول کر دے۔ بویاروں کا کوئی ایسا طبقہ امرا کبھی نہیں بنا جو موروثی ہو۔ نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں وہ کاشتکاروں کے ایک دولت مند طبقے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ سلاطین روم اس علاقے پر اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے بویاروں کو وویوودوں کے خلاف اور وویوودوں کو بویاروں کے خلاف اکساتے رہتے تھے۔ بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی میں بویار بڑے بڑے زمیندار بن گئے اور کاشتکاروں کی حیثیت گھٹتے گھٹتے غلاموں کی سی رہ گئی، مگر فناری یونانی وویوودوں نے بویاروں کی طاقت توڑنے کی کوشش کی اور ۱۱۵۳ھ / ۱۷۴۰ء میں قسطنطین مور کرداتونے مزارعین کی غلامی کو موقوف کیا اور کاشتکاروں کو سرداروں کے پنجے سے چھوڑا کر آزاد کر دیا۔ اس وقت سے لے کر بویار عیسائی طاقتوں، خصوصاً روس سے، زیادہ سے زیادہ امداد کی توقع رکھنے لگے۔ ضابطہ نظم و نسق (Regulamentul Organic) کی رو سے، جو ۱۲۴۷ھ / ۱۸۳۱ء میں اس وقت لکھا گیا

طرح وہ بطور ایک پڑاؤ کے، نیز فوجی نقطہ نظر سے ایک اہم مقام تھا۔ اس علاقے میں جو عربوں اور بوزنٹیوں کی ابتدائی جنگوں کے دوران میں برباد ہو گیا تھا مسلمہ نے آبادکار بسائے؛ اس سے اس کی رونق پھر سے بحال ہو گئی۔ ہشام نے وہاں ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کروایا تھا۔ پھر قدرتی طور پر اسے عواصم [رک باں] کے علاقے میں شامل کر دیا گیا، جن کا سلسلہ ہارون الرشید نے شام اور کیلیکیا Cilicia کی سرحدوں کے پیچھے تعمیر کرایا تھا۔ البلیخی کے وقت میں یہاں مسافروں کے آرام کے لیے ایک سرے موجود تھی، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ زبیدہ نے تعمیر کرائی تھی۔ اس کے فوجی استحکامات اصلاً Nicephorus Phocas کے تعمیر کرائے ہوئے ہیں، جس نے کیلیکیا کا علاقہ از سر نو فتح کیا اور انطاکیہ کو سر کرنے کے منصوبہ بنایا (۳۵۷ - ۵۳۵ / ۹۶۸ء)؛ Michael Bourzes بغراس ہی سے فوج لے کر چلا تھا جب اگلے سال اس نے انطاکیہ پر قبضہ جمایا۔ بغراس کو سلیمان بن قتلیش نے جنگ کیے بغیر حاصل کر لیا۔ بعد میں صلیبی اس پر قابض ہو گئے۔ چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی کے وسط میں ٹمپلروں (Templars = فرسان ہیکل) نے اس شہر پر قبضہ کیا، لیکن ۱۱۸۸ء میں سلطان صلاح الدین کچھ عرصے کے لیے اس پر قابض ہو گیا۔ ۱۱۹۱ء میں لیو Leo نے، جو نسل کیلیکیائی آرمین تھا، اس پر قبضہ کر لیا، لیکن ۱۲۱۸ء میں اس نے اسے ٹمپلروں کے حوالے کر دیا، جنہیں یہ شہر ۱۲۶۳ء میں اس وقت چھوڑنا پڑا جب مملوک سلطان بیبرس [رک باں] نے انطاکیہ کو مسخر کر لیا۔ اس زمانے سے بغراس کیلیکیائی آرمین مملکت کے مقابلے میں مملوک سلطنت کی سرحدی حفاظتی چوکی کا کام دیتا رہا تا آنکہ یہ مملکت ختم ہو گئی۔

جمادی الاولى ۵۱۲۷۸ / ۲ دسمبر ۱۸۶۱ء)۔  
 مأخذ: (۱) *Hist. des Roumains* : N. Lorga  
 دس جلدیں، بخارست ۱۹۳۶ تا ۱۹۳۹ء؛ (۲) J. Nistor :  
*Die auswärtigen Handelsbeziehungen der Moldau im XIV und XVI Jahrh.* Gotha ۱۹۱۲ء؛ (۳)  
*Chronique de Moldavie* : G. Urechi، رومانوی متن،  
 مع فرانسیسی ترجمہ از E. Picot، پیرس ۱۸۸۳ تا  
 ۱۸۸۶ء؛ (۴) فریدون : منشآت، ۲ : ۳۳ تا ۳۳، ۳۳،  
 ۳۹۸، ۳۳۶؛ (۵) *Nouvelles études d'histoire*، مطبوعہ  
 l'académie de la R. P. R. بخارست ۱۹۵۵ء؛ (۶)  
 اولیاء چلبی : سیاحت نامہ، استانبول ۱۳۱۵ھ، ۵ :  
 ۱۰۶ تا ۲۱۸؛ (۷) ت، مقالہ بوغدان (از Aurel Decei)  
 (HALIL İNALCIK)

بغرا : شرقی ترکی [چغتائی زبان] میں اس لفظ کے معنی ہیں سانڈنی، مگر عام طور پر اس سے نر اونٹ مراد لیا جاتا ہے (قب بوغور)۔ بغرا وسط ایشیا کے متعدد حکمرانوں کا نام بھی تھا (قب بغرا خان)، جن کے نام پر ایک کھانے کو موسوم کیا گیا، جسے عثمانی ترکی میں "عجم یخنی سی" (= ایرانی دم پخت گوشت) اور توہ بورکی (= قیمہ بھرا نان) کہتے ہیں۔

مأخذ: (۱) سلیمان افندی : لغات چغتائی، ص ۸۲؛  
 (۲) *Çagataische Sprachstudien* : Vámbéry، ص ۲۳۸؛  
 (۳) *Dictionnaire turc-oriental* : Pavet de Courteille،  
 ص ۱۷۲؛ (۴) [بسحاق =] ابو اسحاق حلاج کے دیوان  
 اطعمہ کی فرہنگ از میرزا حبیب، ص ۱۷۵۔  
 (CL. HUART)

بغراخان : رک بہ قرہ خانیہ۔  
 بغراس : قدیم شہر پجرائی Pagrae، جو انطاکیہ سے اسکندریہ جانے والی سڑک پر درباے آمانوس Amanus کے پار درہ بیلان کے اسی حصے کی حفاظت کرتا ہے جو شام کی طرف ہے۔ اور اس



علاقے میں موضع بَغْطُورَہ (نیز بَغْطُورَہ) میں پیدا ہوا۔ ابوالعباس احمد بن ابی عثمان الشماخی [رک بآں] کی کتاب السیر کی رو سے جو دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی کی تاریخ و سوانح پر ایک اہم اباضی تصنیف ہے، البغطوری فرقہ اباضی کی تاریخ و سیر کے دو علما ابو یحییٰ توفیق بن یحییٰ الجناونی اور ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ بن مسعود (المعروف بہ المَجُولی) کا شاگرد تھا۔ جن دنوں وہ اول الذکر استاد کے ہاں موضع اجناون (نیز جناون، موجودہ جناون، جو علاقہ جادو میں واقع ہے) میں تعلیم حاصل کر رہا تھا، البغطوری نے ربیع الآخر ۵۹۹ھ / دسمبر ۱۲۰۲ء - جنوری ۱۲۰۳ء کے دوران میں ان اباضی مشاہیر کی سوانح پر مشتمل اپنی اہم تریس کتاب قلمبند کی جو جیل نفوسہ میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ کتاب جو کتاب سیر مشائخ نفوسہ (=سیر نفوسہ) اور شاید زیادہ تر السیر کے نام سے مشہور تھی آج ناپید ہے۔ یہ الشماخی کی کتاب السیر کے بنیادی مآخذ میں سے ایک تھی، جس سے اس نے بالخصوص اپنی کتاب کے وسطی حصے (ص ۱۴۳ تا ۳۴۴) میں اصل عبارتوں کے اقتباسات درج کیے ہیں۔ اس تالیف کا جو نسخہ الشماخی کے پیش نظر تھا وہ غالباً آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے ابتدائی سین میں جیل نفوسہ کے مشہور اباضی کاتب اور عالم یحییٰ بن ابی العز الشماخی التفریسی کا لکھا ہوا تھا۔

مآخذ: (۱) ابوالعباس احمد الشماخی: کتاب السیر، قاہرہ، ۱۳۰۱/۱۸۸۳ء، بمواضع کثیرہ (بالخصوص ص ۲۱۲، ۳۲ تا ۵۳۳، ۵۳۸ و ضمیمہ، ص ۵۷۸)؛ (۲) Une chronique ibādite: T. Lewicki، در REI، ۱۹۳۳ء، ص ۷۰ تا ۷۵ و بمواضع کثیرہ؛ (۳) وہی مصنف: Études ibādites nord-africaines، حصہ ۱: Tasmiya šuyūh Ġabal Nafūsa wa-qurāhum، وارسا

ان دنوں یہ شہر ولایت حلب کے توابع میں ایک اہم فوجی مستقر تھا۔ ملوک سلاطین کی ان مہمات کے تذکرے میں جو وہ عثمانی فتوحات کے وقت تک اپنی شمالی سرحدوں کی حفاظت کے لیے اختیار کرتے رہے اتفاق یہ طور پر بغراس کا ذکر بھی آجاتا ہے، لیکن عثمانی فتح کے بعد یہ شہر ویران ہو گیا۔ آج کل اس جگہ ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔ قلعہ اوسط درجے کی اہمیت رکھتا ہے، لیکن یہ کبھی آثار قدیمہ کی باقاعدہ تحقیقات کا موضوع نہیں بنا۔ یہ قلعہ بوزنٹیوں اور ملوکوں ہی کا تعمیر کرایا ہوا معلوم ہوتا ہے، جس میں ٹمپلوں اور ارسینوں کا کوئی حصہ نہیں نظر آتا۔

مآخذ: (۱) البلاذری، فتوح، ص ۱۴۸، ۱۶۳، ۱۶۷؛ (۲) الاصطخری، ۱: ۶۵؛ (۳) یحییٰ الانطاکی: Patrol. Or.، ۱۸: ۸۱۶؛ (۴) عزالدین بن شداد: الأعتاق وغیرہ، در المشرق، ۱۹۳۵ء؛ (۵) ابوالفداء، طبع Reinaud، ص ۲۵۸؛ (۶) ابن بطوطہ، طبع Defréméry، ۱: ۱۶۳ (= طبع Gibb، ص ۱۰۳ تا ۱۰۵)؛ (۷) العمری: تعریف، مطبوعۃ قاہرہ، ص ۱۸۱؛ (۸) Pauly-Wissowa، ۱۸: ۲/۲۳۱۵؛ (۹) La lutte entre les Arabes et les Byzantins، اسکندریہ ۱۹۳۷ء، بمدد اشاریہ؛ (۱۰) Les Hamdanides: M. Canard، ۱: ۲۲۸؛ (۱۱) Topography etc.: Dussaud، ص ۳۳ تا ۳۴؛ (۱۲) la Syrie du Nord: Cl. Cahen، ۱۹۳۰ء، بمدد اشاریہ؛ (۱۳) M. Hartmann، در ZG Erdk. Berl.، ۲۹: ۱۷۰؛ (۱۴) Guides Bleus، شام و فلسطین، ص ۱۸۹؛ (۱۵) Antioche centre de tourisme: P. Jacquot، ۲: ۱۹۳؛ (۱۶) البستانی و (۱۷) ع، بذیل مادہ۔

(CL. CAHEN)

البغطوری: تفرین بن محمد، اباضی مورخ اور سوانح نگار، جیل نفوسہ [رک بآں] کے مغربی

۱۹۵۵ء، ص ۲۸، ۶۹ و بمواضع کثیرہ.

(T. LEWICKI)

\* **بغل:** (= خچر)، جمع: بغال، مؤنث: بَغْلَةٌ، لیکن بعض کا خیال یہ ہے کہ بغل کا اطلاق نر و مادہ کے امتیاز کے بغیر دوغلے جانور پر ہوتا ہے اور بَغْلَةٌ صیغہ واحد ہے جو دونوں جنسوں پر بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ گھوڑے اور گدھی کے ملاپ سے پیدا ہونے والے خچر (قَبّ "کوڈر"، در المسعودی، ۲: ۸۰۸؛ اس کے برعکس الجاحظ، ص ۱۲۰، میں **بِغَالٌ**؛ **الدَّبِيرِي** میں بذیل مادہ: **قَبّ الجاحظ:** **التربيع**، طبع Pellat، اشاریہ، بذیل مادہ) اور گدھے اور گھوڑی کے ملاپ سے پیدا ہونے والے خچر دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ دونوں تسموں کی صورتی خصوصیات گدھے اور گھوڑے دونوں کے بین بین ہوتی ہیں، البتہ ماں کی طرف سے ملنے والے اوصاف کسی قدر زیادہ پائے جاتے ہیں۔ پہلا شخص جس نے یہ دو نسلی پیوند لگایا **قارون (Korah) Kārūn** (دیکھیے **الدَّبِيرِي**) یا **ظُھمورث** (دیکھیے **انطبری**) کا فارسی ترجمہ، از **بلّعی**، طبع **Zotenberg**، ۱: ۱۰۱) تھا۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی خچر تھے (خاص طور پر دلدل، جو اسیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد تک زندہ رہا)۔ اگرچہ وہ احادیث جو (گدھے کے گوشت کی طرح) خچر کا گوشت کھانے کی سماعت میں آئی ہیں مستند ہیں، لیکن گدھوں اور گھوڑیوں کے ملاپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا [دیکھیے **مفتاح کنوز السنّة**، بذیل مادہ **البِغَال**]۔ ڈاک کا محکمہ خچروں کو استعمال کرتا تھا اور ان کی سرکشی اور اڑیل پن کے باوجود خاندانی شرفاء اور خواتین ان کی سواری سے کوئی اجتناب نہ کرتے تھے، کیونکہ خچر اپنی یکساں چال اور ثابت قدمی کے باعث قیمتی سواری سمجھے جاتے تھے۔

متجسسانہ طبیعت رکھنے والے لوگ اس دوغلے جانور اور اس کے بانجھ پن سے خاص دلچسپی ظاہر کرتے رہے ہیں۔ علم الحيوانات کے عرب ماہروں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مادہ خچر طبعی طور پر حاملہ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے، لیکن نر کی متحمل نہیں (لا تعلق) ہوتی، یا اس کے استخوان اتنے چھوٹے ہیں کہ وہ اپنی جان دینے بغیر بچہ نہیں جن سکتی۔ اس قسم کے حادثات کو روکنے کے لیے بعض اوقات مادہ خچر کو "سی دیا" جاتا تھا (: مکتوبہ)، لیکن **الدَّبِيرِي** لکھتا ہے کہ ۵۴۴ / ۱۰۵۲ء میں ایک مادہ خچر نے ایک سیاہ بچھیری اور ایک سفید خچر کو جنم دیا تھا۔

تجرد کے باعث خچر کے سر وغیرہ کی جسامت، اس کی عمر کی درازی، اس کے بانجھ پن، اس کے اڑیل پن وغیرہ خاص خاص اوصاف ضرب المثل بن گئے ہیں اور بغل اور بغلہ کے الفاظ کثرت سے روزمرہ کی بول چال میں استعمال کیے جاتے ہیں (ابو دلامہ کی مادہ خچر کے بارے میں، جو اپنے معائب کی وجہ سے **ضرب المثل بن گئی** تھی، دیکھیے **محمد بن شنب**: ابو دلامہ، الجزائر ۱۹۲۲ء؛ **الجاحظ**: **البِغَال**، ص ۱۰۰ بعد)۔ خچر کے جسم کے بعض حصے، خصوصاً دانت، ایال، سم اور خون، دواؤں کی تیاری میں اور تعویذوں اور ٹونے ٹونکوں میں استعمال کیے جاتے تھے۔ خواب میں خچر کے دیکھنے کی تعبیر "بحری سفر، درازی عمر، تنزل، بانجھ پن" وغیرہ لی جاتی تھی۔ عرب لغات نویسوں اور ڈوژی **Dozy** نے اس لفظ کے جو دوسرے معانی جمع کیے ہیں، ان کے علاوہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مصر میں لفظ **بغلہ** (جمع: **بِغَالَات**) ان کنیزوں کے لیے آتا تھا جو صقالہ اور کسی دوسری نسل کے باہمی ملاپ سے پیدا ہوتی تھیں (دیکھیے **الجاحظ**: **البِغَال**، ص ۶۶)۔



احادیث جو صحیح البخاری اور صحیح مسلم سے لی گئی ہیں، اس کے بعد ”حسن“ یعنی وہ احادیث جو سنن ابی داؤد، جامع الترمذی اور دیگر ائمہ حدیث کی کتابوں سے لی ہیں۔ بہت سے ابواب میں ”غریب“ احادیث بھی ہیں، جن کے سلسلہ اسناد میں کسی جگہ فقط ایک ہی راوی رہ جاتا ہے، بلکہ بعض ایسی حدیثیں بھی ہیں جن کی اسناد [زیادہ] قوی نہیں، لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ اس کتاب میں کوئی ”منکر“ (جس کو رد کر دیا گیا ہو) یا ”موضوع“ (جو گھڑی گئی ہو) حدیث نہیں۔ کتاب میں اسناد کو حذف کر دیا گیا ہے، لیکن اس کی ترتیب، جو احادیث کے مراتبِ صحت کے لحاظ پر مبنی ہے، یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ کونسی احادیث مقبول ہیں۔ البغوی نے تصریح کی ہے کہ اس کتاب کا مقصد پابندِ شرع لوگوں کے لیے ایسا مواد فراہم کرنا ہے جو اللہ کی رضا کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ان کی مدد کر سکے۔ یہ کتاب بولاق (۱۲۹۳ھ) اور قاہرہ میں (۱۳۱۸ھ) بھی طبع ہوئی ہے۔ [احادیث کی تعداد وغیرہ کے لیے دیکھیے معجم المطبوعات العربیہ، عمود ۵۷۳۔] عوام میں اس کی مقبولیت بہت زیادہ ہے، خاص کر اس نسخے کی صورت میں جو ولی الدین (م ۱۲۳۳ھ/ ۱۳۴۲ء) نے مرتب کیا اور اس کا نام مشکوٰۃ المصابیح رکھا۔ مشکوٰۃ بارہا طبع ہو چکی ہے۔ A.N. Mathews نے اس کا انگریزی ترجمہ [دو جلدوں میں] شائع کیا (کلکتہ ۱۸۰۹ء و ۱۸۱۰ء)۔ ایک اور انگریزی ترجمہ مولانا فضل الکریم نے متن کو کسی قدر اپنے طور پر ترتیب دے کر شائع کیا (کلکتہ ۱۹۳۸ء تا ۱۹۴۹ء)۔ اسی طباعت میں ہر صفحے میں دو عمود ہیں؛ ایک میں عربی متن اور اس کے مقابل دوسرے میں انگریزی ترجمہ ہے۔ البغوی کی دیگر تصانیف جو محفوظ رہ گئی

مآخذ: علم الحيوانات (اس سلسلے میں الدمیری کی لغت ایک بنیادی تالیف ہے)، مخازن الادویہ، تعبیر رؤیا وغیرہ کی کتب (مثال کے طور پر رک بہ افنی، مآخذ) کے علاوہ، جو خاصی معلومات بہم پہنچاتی ہیں، یہ اس خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اپنی عجیب و غریب اصل کی وجہ سے خچر کو الجاحظ نے ایک خصوصی مطالعے کی کتاب القول فی البغال (طبع Ch. Pellat، قاہرہ ۱۳۷۵ / ۱۹۵۵ء) کا موضوع بنایا۔ اس تالیف کو کتاب الحيوانات کا تتمہ سمجھنا چاہیے۔ اس میں مصنف نے ان جانوروں کی افادیت اور خواص کو ظاہر کرنے کے لیے حکایتیں اور اشعار جمع کر دیے ہیں۔

(CH. PELLAT)

بَغْلِي : رَكَّ بِهِ دِرْهَمٌ .

البغوی: رکن الدین، محیی السنۃ، ابو محمد الحسین بن مسعود بن محمد الفراء (یا ابن الفراء)، شافعی مذهب کے عالم، محدث اور مفسرِ قرآن۔ یغ یا بغشور اس کا وطن تھا، جو ہرات کے قریب ایک گاؤں ہے (قَب السَّعْمَانِي، [بذیل مادہ])۔ الفراء (=صانع یا تاجر پوستین) کا لقب انہیں اپنے باپ کے پیشے کی وجہ سے ملا۔ انہوں نے فقہ کی تعلیم قاضی الحسین بن محمد المروروذی کی زیر نگرانی حاصل کی۔ وہ اپنے استاد کے بہت عزیز شاگرد تھے اور محدثین کی ایک جماعت سے حدیث کی سماعت کی۔ وہ زہد و پرهیزگاری میں مشہور تھے اور درس دینے وقت پابندی سے پاک صاف اور با وضو رہتے تھے۔ یوں تو انہوں نے [تفسیر، حدیث اور فقہ] پر کتابیں لکھی ہیں، لیکن ان کی سب سے زیادہ شہرت کتاب مصابیح السنۃ (یا مصابیح الدجی) پر مبنی ہے، جس میں انہوں نے مضامین کے لحاظ سے ترتیب دے کر احادیث جمع کی ہیں۔ ہر باب میں پہلے وہ ”صحیح“ احادیث دیتے ہیں، یعنی وہ

ہیں ان کا [نیز مشکوٰۃ المصابیح کی شروح کا] تذکرہ براکلمان نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔ البغوی کی وفات مرواروڈ میں ۵۱۶ھ / ۱۱۲۲ء میں ہوئی، لیکن ابن خلکان نے سال وفات ۵۱۰ھ / ۱۱۱۷ء بھی دیا ہے۔ الذہبی کہتا ہے کہ ممکن ہے ان کی عمر اسی سال کی ہو، لیکن السبکی کا اندازہ ہے کہ شاید وہ نوے سال کے قریب زندہ رہے۔

[البغوی کی دوسری اہم تصنیف قرآن مجید کی تفسیر معالم التنزیل ہے، جو تفسیر بغوی کے نام سے بھی مشہور ہے]۔

ماخذ: (۱) الذہبی: تذکرہ الحفاظ، ۳: ۵۲  
 بعد: (۲) السبکی: طبقات الشافعیۃ الکبریٰ، ۴: ۲۱۴  
 بعد: (۳) ابن خلکان، عدد ۱۷۷: (۴) یاقوت، متعدد مقامات پر؛ (۵) ابن العماد: شذرات الذهب، ۴: ۳۸  
 بعد: (۶) براکلمان، ۱: ۴۴۷ بعد و تکملہ، ۱: ۶۲۰  
 بعد: (۷) سرکیس: معجم المطبوعات العربیۃ، عمود ۵۷۳؛  
 (۸) Muh. stud. : Goldzihr، ۲: ۲۶۳، ۲۷۰ بعد؛  
 (۹) الزرکلی: الاعلام، ۲: ۲۸۴؛ (۱۰) ابن عساکر: تہذیب، ۴: ۳۴۵؛ (۱۱) عبدالعزیز دہلوی: بستان المحدثین؛ (۱۲) ع، بذیل مادہ؛ (۱۳) صدیق حسن: اتحاف النبلاء، ص ۲۴۴؛ (۱۴) رابسن: انگریزی ترجمہ مشکوٰۃ المصابیح، دیباچہ از مترجم، ص ۱۲ تا ۱۶]۔

(J. ROBSON)

بقاء و فنا: یہ دونوں صوفیانہ اصطلاحات ہیں۔ یہ اصطلاحات، یعنی فنا اور بقاء، جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں، درحقیقت ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔ اسلامی تصوف میں اس نوع کی اور اصطلاحات بھی ہیں، مثلاً صحو و سکر، جمع و تفرقہ (یا وحدت و کثرت) اور نفی و اثبات [جو ضد ہونے کے باوجود باہم تکمیلی حیثیت رکھتی ہیں]۔

مسلمان صوفیہ نے فنا کی دو تعریفیں کی ہیں، جن کا ایک دوسرے کے ساتھ بین تعلق ہے: (۱) صوفی کا صفات و کمالات الہی کے مشاہدے میں اتنا مستغرق ہو جانا کہ اس شعور کے سامنے کائنات کے وجود کے شعور اور خود صوفی کا اپنے ذاتی ہستی کے شعور کو کھو بیٹھنا، یہاں تک کہ یہ شعور بھی ضائع ہو جائے کہ صوفی اس شعور کو کھو بیٹھا ہے۔ صوفی کی اس حالت کو "فنا فی اللہ" کے نام سے پکارا جاتا ہے؛ (۲) صوفی کی بشری اور اعتباری صفات کا محو ہو جانا اور جناب قدسی کی کامل صفات کا ان کی جگہ حاصل ہو جانا، یعنی وہ صفات جو جناب الہی کے خاص فیض سے صوفی پر نازل ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں سندرجہ ذیل نکات کا ملحوظ رکھنا لازمی ہے:

(۱) معاملہ صرف صفات کا ہے، ذات کا نہیں۔ اس ذوق میں صوفی کی بشری ذات منحل ہو کر ذات الہی میں جذب نہیں ہو جاتی، نہ ذات الہی حلول کر کے بسم انسانی میں اتر آتی ہے۔ حقیقت صرف یہی نہیں کہ ذات بشری فنا نہیں ہوتی بلکہ انسانی "انا" کی صفات میں تبدیلی آنے کی وجہ سے اس "انا" کی ایک نئی تشکیل و توسیع ہوتی ہے؛ جیسا کہ حضرت علی ہجویری اور دیگر صوفیہ کہتے ہیں صفات کا مورد انسانی "انا" ہی رہتا ہے۔ اتحاد اور حلول صوفیہ کے ذوق کی بنا پر دونوں غلط تعبیریں قرار دی گئی ہیں، حتیٰ کہ وہ صوفیہ بھی جو اس ذوق کی بنا پر صوفی کی ذات کے عالم ظاہر (Phenomenal world) سے چھٹکارا پا کر عالم باطن میں داخل ہونے کے قائل ہیں، اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسان اپنے ذاتی وجود سے نکل کر خدا کے لامتناہی وجود میں شامل نہیں ہو سکتا اور نہ وہ اپنی ذات اور ذات الہی کی عینیت کا اعلان کر سکتا ہے۔ "قطرہ



یونانی نظریہ Ecstasis (جس کا مطلب ہے "خروج از خودی" = ایسا خروج جو انسان کو انقلابی طور پر تبدیل کر دے) سے بھی مختلف ہے۔

بقا ذوقِ فنا کا دوسرا (اثباتی) پہلو ہے۔ فنا کی مذکورہ بالا دونوں تعریفوں کے پیش نظر بقا کا مطلب ہے: (۱) ان صفات کو برقرار رکھنا جو فیضِ الہی سے صوفی پر نازل ہو کر اس کی پہلی صفات کی جگہ لے چکی ہیں؛ لہذا اس کو بقا باللہ کے نام سے پکارا جاتا ہے اور (۲) کائنات کی کثرت اور اس کے نقص کے شعور کا، جو وحدتِ الہی کے شعور کے تحت زائل ہو چکا تھا، لوٹ آنا۔ اکثر صوفیہ کے نزدیک یہ حالت فنا کی حالت سے برتر ہے اور صوفیوں کے مشہور قول کا کہ "صحو سکر کے بعد طاری ہوتا ہے" یہی مطلب ہے۔ درحقیقت بقا کے دوسرے معنی پہلے معنی سے نکلتے ہیں، کیونکہ اگر صوفی "خدا کے ساتھ" ہے تو اسے یقیناً خدا کی مخلوق کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔ خود ابن عربی بھی، جنہیں وحدۃ الوجود کے نظریے کا متہم قرار دیا گیا ہے، کہتے ہیں کہ عالم کثرت اور عالم وحدت، خدائی حقیقتِ علی الاطلاق کے دو پہلو ہیں۔

صوفی کا یہ "رجوع" الی الخلق یقیناً ان سلبی صفات کی طرف رجوع نہیں جو اس میں قبل از فنا موجود تھیں۔ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مخلوقات کے نقائص پر نظر کرے اور ان نقائص کو اپنے ذوق سے حاصل شدہ علوم کی روشنی میں ایک اخلاقی جہاد کی شکل میں دور کرنے کی کوشش کرے تاکہ مخلوق ان کمالات کو حاصل کر سکے جو اس کے خالق نے اسے ودیعت کیے ہیں۔ اسلامی تصوف کے اس نظریہ بقا سے ایک عام صوفی کے شعور اور ایک نبی کے شعور کے بنیادی فرق پر ایک نئی روشنی پڑتی ہے۔ اکثر صوفی فنا کی

اگر سمندر میں شامل ہوتی ہو جائے تو بھی وہ سمندر کے ساتھ عینیت حاصل نہیں کر سکتا۔

(۲) فنا کا ذوق صوفی کے لیے ایک شخصی یا نفسیاتی کیفیت ہے، کوئی لاهوتی حقیقت نہیں۔ جو فوائد اس سے صوفی کو حاصل ہوتے ہیں وہ اخلاقی اور روحانی ہیں، لاهوتی نہیں؛ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صوفی کی ذات حقیقت میں عین حق ہو گئی ہے اور دائمی ہے؛ اسی لیے اس نفسیاتی حالت کو "سکر" کہا گیا ہے، جس میں صوفی کا شعور کائنات معدوم ہو جاتا ہے، نہ کہ خود کائنات [جس کا صوفی ایک حصہ ہے؛ لہذا فنا کے کائنات اور صوفی کے وجود کے عدم اور لاهوتی وجود میں اس کے جذب ہونے کا نام نہیں، صرف شعور کائنات کے معدوم ہونے کا نام ہے]۔

(۳) صوفی کے حقیقی فوائد، جو اسے اس ذوق سے حاصل ہوتے ہیں، صفاتی ہیں۔ اس کی بشری سلبی صفات، مثلاً جہالت، خود غرضی، طمع وغیرہ، اعنی اور اثباتی صفات میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس سے ایک تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ صوفی کے اخلاق و اعمال میں ایک انقلابی تغیر رونما ہوتا ہے اور یہ اخلاق اور اعمال اسلام کے روحانی نظام کی جان ہیں۔ بلاشبہ اخلاقِ طیبہ اور اعمالِ حسنہ ہی وہ عناصر ہیں جنہوں نے تصوف کو اسلام کے اندر ایک با وقار جگہ دی ہے، حتیٰ کہ صوفی یہ کہنے کے قابل ہوئے کہ تصوف نہ صرف یہ کہ اسلام کا مخالف نہیں بلکہ اس کے بالکل مطابق ہے۔ اس نظریے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی نظریہ فنا اور ہندوؤں کے نظریہ "نروان" میں بڑا تفاوت ہے۔ "نروان" کی رو سے انسان کی فلاح کسی اثباتی کردار کو حاصل کرنے میں نہیں بلکہ ہر قسم کے کردار و عمل سے چھٹکارا پا کر نفسِ کلی میں فنا ہو جانے کا نام ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی نظریہ فنا

عام تصور سے قدرے ہٹا ہوا نظریہ تشکیل دیا ہے۔

(فضل الرحمان)

**البقاع:** البقعة کی جمع، جس کے معنی ہیں قطعہ زمین۔ البقاع لمبے پھیلے ہوئے میدان کا نام بھی ہے، جسے عرف عام میں پکا کہا جاتا ہے۔ یہ اوسطاً ایک ہزار میٹر کی بلندی پر لبنان کے پہاڑوں اور جبل الشرق کے سلسلہ کوہ کے درمیان واقع ہے۔ قدما نے اس کی واضح تعریف مجوف شام (Coele Syria) کی اصطلاح سے کی ہے، جس کا اطلاق بعد میں وسیع ہو گیا۔ یہ ایک جوف یا نشیب ہے، جو اصل میں طبقات الارض کی ساخت سے پیدا ہو گیا اور گد مٹی سے بھر گیا اور اردن اس درز نما خلا کی توسیع ہے جو شمالاً جنوباً وسطی خط کے ساتھ چلا جاتا ہے اور مشرق قریب کی اراضی کی ساخت میں ایک بنیادی خصوصیت بن گیا ہے۔ لیتانی اور نہر عاصی (Orontes)، دو دریا، جن کے منبع فاصل آب بعلبک کے ہر دو کناروں پر ہیں، اس نشیب کے پانی کا ناکافی طور پر نکاس کرتے ہوئے آگے راستہ نکالتے ہیں۔ ایک دریا تو جنوب کی پتھریلی سطح مرتفع سے اور دوسرا ان گھاٹیوں میں سے گزرتا ہے جو حمص کے سیاہ مرمریں (basalt) پہاڑی میدان کی طرف کھلتی ہیں۔ اس سرزمین کی خالص بری آب و ہوا نے اسے نیم صحرائی، خشک اور بے آب میدان بنا دیا ہے، تاہم کہیں کہیں نخلستان اور نشیب پائے جاتے ہیں۔ یہ نشیب ایک مدت مدید تک دلدلی تھے، جس کی بنا پر القلقشندی اپنے زمانے میں ”بحیرۃ البقاع“ کا ذکر کرنے میں حق بجانب تھا۔

پانی کے نکاس اور آبپاشی کے امدادی ذرائع نے اس علاقے کی ترقی میں حصہ لیا؛ ان میں عہد مالیک کے آغاز میں والی شام تنکیز کے بنائے ہوئے کام (نہر و تالاب) مشہور رہے ہیں، پھر بھی یہ

حالت سے بقا کی حالت کی طرف ہٹ کر نہیں آتے اور پلٹنا چاہتے بھی نہیں۔ یہ ایک رسول ہی کا منصب ہے کہ وہ بیک وقت خدا کے ساتھ بھی اور مخلوق کے ساتھ بھی اور جو دینی اور اخلاقی معرفت اس کو خدا کے ساتھ رہنے میں حاصل ہوتی ہے وہ اسے انسانیت کی بہتری کے لیے عمل میں لاتے ہوئے انسانی تاریخ کو نئے سانچوں میں ڈھال دے۔ فنا و بقا کے مربوط نظریے کا ارتقا خاص طور سے منصور الحلاج کے قتل (۹۲۲ء) کے بعد کے دور میں واقع ہوا جب کہ مسلمان صوفیوں نے باطنی ذوق کو دین کے قریب لا کر اسے نئے اسلوب میں بیان کرنا شروع کیا تا کہ تصوف کے خلاف اہل ظاہر کی غلط فہمیوں کو رفع کیا جائے، تصوف کے لیے نظام اسلام میں ایک با وقار اور ضروری جگہ حاصل کی جائے اور الحلاج کے قول ”انا الحق“ (= میں حق یا خدا ہوں) کو ظاہری معنوں سے مبرا قرار دیا جائے۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ کئی اور صوفی بھی اپنے سکر کی شدت میں اس قسم کی باتیں کہتے رہے ہیں، خصوصاً اشعار میں، تاہم اکابر صوفیہ ذات انسانی اور ذات الہی کی عینیت کو قطعاً غلط قرار دیتے چلے آئے ہیں۔

مآخذ: معروف کتب تصوف کے علاوہ، جن میں ابو نصر السراج کی کتاب اللع اور علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب اس موضوع کے لیے سب سے زیادہ اہم ہیں، مغربی زبانوں میں R. A. Nicholson: *The Mystics of Islam*، لندن ۱۹۱۶ء، اور خصوصاً اس کا آخری باب بہت مفید ہے۔ ہجویریؒ کے قول کے مطابق نظریہ فنا و بقا کا موجد ابو سعید الخراز ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ جنیدؒ اور دیگر صوفیہ نے اس کے ارتقا میں بڑا حصہ لیا۔ شیخ احمد سرہندیؒ نے اپنے مکتوبات میں (جو تاحال علمی مطالعے کے محتاج ہیں) فنا و بقا کا ایک دلچسپ اور



مذہب کے کچھ بچے کھچے آثار کا سراغ متعدد مقبول عام انتسابات میں بھی مل جائے، جن کی مقامی تسمیہ مقامات اور بعض یادگار عمارتیں شاہد ہیں۔ ان میں زیادہ تر یا تو حضرت نوح<sup>۴</sup> اور طوفانِ نوح<sup>۴</sup> کے قصے کی یاد تازہ ہوتی ہے یا حضرت الیاس<sup>۴</sup> کی شخصیت کی۔ آخر الذکر کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ زاہد عزلت نشین اور بعل پرستی سے نفور تھے۔

مآخذ: (۱) P. Birot و J. Dresch : *La Méditerranée et le Moyen - Orient*، جلد ۲، پیرس ۱۹۵۶ء، بمدد اشاریہ، بذیل مادہ Bekaa؛ (۲) R. Dussaud : *Topographie historique de la Syrie*، پیرس ۱۹۲۳ء، اشاریہ، بذیل مادہ 'Beqa'؛ (۳) لسٹرنیج G. Le Strange : *Palestine under the Moslems*، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۶۹، ۳۲۲؛ (۴) M. Gauddefroy : *La Syrie à l'époque des Mamelouks*، Demombynes، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۲۰، ۷۳، ۱۸۱؛ (۵) یاقوت، ۱ : ۶۹۹؛ (۶) الہروی : کتاب الزیارت، طبع Sourdel-Thomine، ص ۹ تا ۱۰؛ (۷) ع، بذیل مادہ بقعة]۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

بقر: [ع، اسم جنس:] قرون وسطیٰ کی عربی ادبیات میں یہ لفظ گائے اور بیل کے رائج الوقت معنوں تک محدود نہ تھا۔۔۔۔۔ عرب مصنفین پالتو گائے (البقر الاهی) اور نیل گائے (البقر الوحشی) کی اقسام میں فرق کرتے ہیں۔ البقر الوحشی کی شناخت کے سلسلے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یا تو اس کے معنی مہا (= نیل گائے) (النویری ۹ : ۳۲۲ یعد) ہیں، یا ایل (= پہاڑی بکرا؛ مارخور) [رک باں]، جو قزوینی کی بیان کردہ کیفیت کے مطابق ہے، یا اس زمرے کے دوسرے جانور بھی (جن کا ذکر Lane نے ص ۲۳۴ پر bovine antelopes (= برگ، چکارا) کے نام سے کیا ہے) اس میں شامل ہیں؛ لیکن الہیری کے نزدیک یہ ان دونوں قسموں سے علیحدہ

علاقہ آج کل کم آباد ہے (ایک مربع کلومیٹر میں اڑتیس باشندے)۔ اناج کی کاشت اس کی روایات میں ہے جو شاملات کے یا بڑی بڑی جاگیرداروں کے نژاد کے ذریعے برقرار رکھی جاتی ہے۔ اس میں مسلمان زیادہ تعداد میں آباد ہیں؛ شمال میں شیعی اکثریت میں ہیں۔ یہ آبادی دامنِ کوہ کے بڑے بڑے دیہات میں رہتی ہے۔ مدت سے اس پہاڑ کے غاروں میں ان لوگوں کے لیے بڑی کشش تھی جو راہبانہ زندگی کے دلدادہ تھے۔ یہ بلند وادی زمانہ قدیم میں حضری باشندوں کی سکونت کا علاقہ اور کثیر الاستعمال تجارتی شاہراہ تھی، اس لیے یہ عرب فتوحات کے وقت سے صوبہ دمشق کے خوشحال ترین اضلاع میں شمار ہونے لگا تھا۔ یہاں کے بہت سے مقامات میں، جو اپنے دیرینہ آثار اور غاروں کی کندہ کاریوں کے لیے مشہور ہیں، اموی قصر عین الجبر [رک باں]، مملوک عہد کے دارالحکومت کرک نوح کا پراگندہ گاؤں اور زحلہ کی طرح کے موجودہ چھوٹے چھوٹے خوشحال دیہات قابل ذکر ہیں۔ بعلبک [رک باں] ہمیشہ اہم ترین مرکز رہا ہے۔ عرصہ دراز تک تمام علاقے کے حاکم کا مستقر رہنے کے بعد عہدِ مملوک میں اس قلعے کی عمل داری بہت کچھ کم ہو گئی تھی اور اس کے قرب و جوار کے علاقے کو دو اضلاع میں تقسیم کر کے ایک آزاد والی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اس وقت سے بعلبک کی "نیابۃ" کے ساتھ ساتھ دو ولایتیں ہو گئی تھیں، ایک "البقاع البعلبکی" اور دوسری "البقاع العزیزی"۔

عرب مؤرخوں کے اقوال کی رو سے آخری نام سلطان صلاح الدین کے ایک لڑکے العزیز [رک باں] سے نسبت رکھتا ہے، مگر بعض جدید محققین کی رائے کے مطابق یہ ایک قدیم مقامی دیوتا عزیزوس Azizos کے نام سے متعلق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ قدیم

اشاریہ؛ (۶) *Säugethiere : Hommel*، بمدد اشاریہ، بذیل مادّہ *Rindvieh*؛ (۶) ابن العوام: الفلاحة (ترجمہ Clément Mullet ۲/ب: ۱ بعد؛ (۷) ابن قتیبة: عیون الأخبار، قاہرہ ۱۹۲۵ تا ۱۹۳۰، ۶: ۲، ۷۰، ۷۵، ۸۱، ۹۳ (مترجمہ Kopf، ص ۳۳، ۵۰، ۵۷، ۷۰)؛ (۸) ابن البیطار: الجامع، بولاق ۱۲۹۱ھ، ۱۰۵ بعد؛ (۹) داؤد الانطاکی: تذکرۃ، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، ۱: ۷۳ بعد؛ (۱۰) ابن سیدۃ: المخصّص، ۸: ۳۲ بعد؛ (۱۱) ابن سیرین: منتخب الکلام، باب ۳۳؛ (۱۲) الإشبیلی: المستطرف، باب ۶۲، بذیل مادّہ؛ (۱۳) القزوينی (طبع Wüstenfeld)، ۱: ۳۸۰ بعد؛ (۱۴) المعلوف: معجم الحيوان، قاہرہ ۱۹۳۲، بمدد اشاریہ؛ (۱۵) المستوفی القزوينی (طبع Stephenson)، ص ۳۳؛ (۱۶) النويری: نهاية الأرب، ۹: ۳۲۲ بعد و ۱۰: ۱۲۰ بعد؛ (۱۷) *Arahian : A. D. Carruthers*، *Adventure to the Great Nafud in Quest of the Oryx* لنڈن ۱۹۳۵ء.

(L. KOPF)

**بقراط:** یا ابقراط، Hippocrates نام کی عربی شکل؛ مشرقی دانشوروں میں بقراط کی بہت شہرت تھی اور وہ اس کی بہت سی تصانیف سے واقف تھے۔ رأس العین کے سرجیوس Sergius نے اس کی تصانیف کا سریانی میں ترجمہ کیا۔ عربی میں اس کے مشہور مترجم حنین بن اسحاق، نسطا بن نوقا، عیسیٰ بن یحییٰ اور عبدالرحمن بن علی تھے۔ حنین نے ”وئانی امراض کی کتاب“ (Book of epidemics) کا ترجمہ کیا۔ اس عنوان کے تحت عرب سات کتابوں سے واقف تھے، جن میں سے صرف چھ اور تیسری ستر طور پر بقراط کی تصنیف کردہ ہیں۔ اسی ترجمہ نے ان مقالات کے ترجمے بھی کیے، جن کے عنوان *Prognostica* (قیمة الحرفة) اور *De Natura Hominis* (صیغۃ الانسان) ہیں۔ بخاروں اور امراض شبیہ میں

ایک تیسری قسم ہے، نیز یحضور (= چکارا) اور تپتیل *bubule antelope*، یعنی چپتیل [انگریزی لغت میں لفظی معنی جنگلی بیل یا نیل گے بھی لکھے ہیں، لیکن ممکن ہے عربی لفظ ”چپتیل“ ہی کی تعریب ہو، اگرچہ لغات میں یہ صراحت نہیں دیکھی گئی]؛ لیکن ممتاز کرنے کے لیے حرف تعریف ہمیشہ استعمال نہیں کیا جاتا اور اس طرح لفظ بقر (یا فاعلی ہیغہ واحد میں بقرة) کئی اور جنگلی جانوروں کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ عربی شاعری (مثلاً دیکھیے الجاحظ، ۵: ۲۱۸) اور اس کی شرحوں، نیز لغات کی فراہم کردہ معلومات (ابن سیدۃ نے کتاب الوحوش میں بقر پر بحث کی ہے)، حتیٰ کہ حیوانیات کی کتابوں (مثلاً الجاحظ: ۲، ۱۹۹۹، ۳: ۳۹۹۳) پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ تعبیر رویا کے موضوع پر کتابوں میں ”بقر“ کو ایک اہم مقام حاصل ہے، لیکن عر جبکہ پوری صحت کے ساتھ اس لفظ کا مطلب متعین کرنا دشوار ہے۔ معوم ہونا ہے کہ قرابادین کی کتابوں میں بھی مصنف بہت نام منسب کر دیے گئے ہیں۔ ان کتابوں میں بقر کے سنگوں کا اکثر ذکر ملتا ہے بحالیکہ عصر عرب مصنفین بقر اعلیٰ کو بے سینگ کا جانور بیان کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس سے مراد موسیٰ یا گے و گئی ہے۔ مزید برآں یہ لفظ دوسرے ضرب الامثال اور کتب حدیث میں بھی آتا ہے۔

مآخذ: (۱) عبد الغنی الشافعی: تعصیر لادب، بذیل مادّہ: (۲) بو حنین شوحیری: استیعاب، ۱: ۱۰۰، ۱۹۰ تا ۱۰۰، ۱۰۹، ۱۲۰، ۱۲۱ و ۱۲۲ (ترجمہ L. Kopf: Osiris، ۱۰ [۱۹۵۰]؛ (۳) ابن سیرین: (۴) علی الطبری: فرروس حکمہ صغ صغری، ص ۱۰۰ بعد؛ (۵) النیریزی، بذیل مادّہ، ترجمہ Jayakar، ۱: ۱۰۰ بعد؛ (۶) الجاحظ: حیوان، ص ۱۰۰



(۱۸۳) لکھتا ہے کہ اسے اس واقعے کا علم کتاب ایمان بقراط کی شرح سے ہوا (التنبیہ، ص ۱۳۱)، جو جالینوس نے لکھی تھی اور جس کا ترجمہ حنین بن اسحق نے کیا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت قوس کا شہر ارتکزرس Artaxerxes کے زیر حکومت تھا جسے وہ آرطخشست کے نام سے موسوم کرتا ہے اور اسے بہمن بن اسفندیار کا مرادف قرار دیتا ہے۔ تاریخ الحکماء کے مصنف کے نزدیک یہ بادشاہ آردشیر تھا۔

عرب مصنفین بقراط کا زمانہ اسکندر سے تقریباً سو سال قبل بتاتے ہیں۔ تاریخ الحکماء کے مطابق اس کی سکونت حمص میں تھی اور بعد میں دمشق میں۔ وہ مؤخر الذکر شہر کے ایک باغ میں ایک جگہ درس دیا کرتا تھا، جو اب تک ”صفۃ بقراط“ (بقراط کی نشست گاہ) کے نام سے موسوم ہے۔

چونکہ اس صاحب عظمت طبیب کے کئی بیٹے پوتے ہوئے، جو اسی کے نام کے حامل تھے اور اسی فن کے علم بردار تھے، اس لیے بعض مصنفوں کے ذہن میں کچھ التباس پیدا ہو گیا ہے؛ چنانچہ وہ چار بقراط شمار کرتے ہیں، یہاں تک کہ انہوں نے بقراط نام سے ایک جمع کا صیغہ ”البقراطون“ [یا ”البقارطة“] (کتاب التنبیہ والاشراف، ص ۱۳۲) بھی وضع کر لیا ہے۔ ثابت بن قرۃ پہلا شخص ہے جس نے بقراطوں کی تعداد کا مسئلہ حل کیا (تاریخ الحکماء، [ص ۹]۔) وہ لکھتا ہے: ”پہلا بقراط وہ ہے جو اسقلیبوس Aesculapius کے خاندان سے تھا اور دوسرا بقراط ابرقلیدس Heraclides کا بیٹا تھا۔ پہلے اور دوسرے کے درمیان نو پشتوں کا فاصلہ تھا، یعنی اتنا ہی جتنا کہ اسقلیبوس اور پہلے بقراط کے درمیان۔ دوسرے بقراط نے تین بچے چھوڑے: ٹاسلوس، دارقن [یا دراقن

غذا“ پر اس کی تصنیف *περι διαίτης ο εἶων* کا ترجمہ عیسیٰ بن یحییٰ نے کیا، جس کا عربی عنوان کتاب الامراض العادۃ ہے۔ *The Book of Precepts* کا ترجمہ مذکورہ بالا چار مصنفین نے الفصول کے نام سے کیا۔ ان مشہور تصانیف کے علاوہ حاجی خلیفہ نے متعدد دیگر کتابوں کے نام دیے ہیں، جو بقراط سے منسوب ہیں۔ Wenrich نے ایسی پچاس سے زائد کتابوں کی فہرست مرتب کی ہے (*De Auctorum Graecorum Versionibus et Commentariis*، ص ۹۵ تا ۱۱۳)۔

مشرقی دانشوروں نے اس عظیم یونانی طبیب کی تصانیف کا ترجمہ کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ شروح و حواشی بھی لکھے، بالخصوص تقدیمہ المعرفة (*Prognostica*) اور الفصول (*Precepts*) کی شرحیں لکھی گئیں۔ ثابت بن قرہ نے *De Aëre, Aqua et locis* (= کتاب الماء والهواء) کا خلاصہ لکھا اور فلسفی الکندی نے بقراط کے اصول طب پر اپنی کتاب الطب البقراطی تصنیف کی۔

بقراط کی زندگی کے ایک ایسے قابل ذکر واقعے سے بھی عرب واقف تھے جو اس کے کردار کے لیے باعث فخر ہے۔ ایک وبا کے دوران میں، جو ایرانی مملکت میں تباہی برپا کر رہی تھی، ایران کے بادشاہ آرطخشست (*Artaxerxes Longimanus*) نے بقراط کے بارے میں، جو قوس Cos میں مقیم تھا، یہ حکم دیا کہ اس سے مدد کی درخواست کی جائے اور بہت کچھ اعزاز و اکرام اور رقمیں پیش کیں، لیکن اس طبیب نے یہ کہہ کر انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ اپنے ملک کے دشمنوں کی خدمت نہیں کرے گا اور یہ کہ اس کا اولیٰ فرض اپنے ہم وطنوں کی خدمت ہے [قب تاریخ الحکماء، ص ۹۱]۔

المسعودی (التنبیہ، متن: ص ۱۳۱ و ترجمہ:

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے قول کے مطابق آیت ۲۸۱ (وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ) اور آیات ربا (۲۷۵ تا ۲۸۰) کے سوا، جو حجۃ النوداع کے موقع پر مکہ معظمہ میں یوم النحر (= قربانی کے دن) کو نازل ہوئیں، ہجرت نبویؐ کے بعد مدینہ منورہ میں سب سے پہلے یہی سورت نازل ہوئی تھی (ابن کثیر، ۱: ۳۵؛ الخازن ۱: ۱۹؛ المراغی، ۱: ۳۸)۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آیت ۲۸۱ قرآن کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت ہے (المراغی، ۱: ۳۸)۔

مفسرین نے سورۃ البقرہ کا سورۃ الفاتحہ سے ربط و تعلق یہ بیان کیا ہے کہ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے طلبِ ہدایت اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعا کی گئی، چنانچہ بندے کی یہ دعا قبول کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے البقرہ نازل کر کے ہدایت کا سامان مہیا کر دیا اور کہا کہ یہ وہ کتاب ہے جو بلا شبہہ متقی اور طالبانِ حق کے لیے رہنمائی و ہدایت کا سامان ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ الفاتحہ میں اللہ کی ربوبیت، پھر بندے کی عبودیت کا اظہار اور آخر میں طلبِ ہدایت ہے؛ اسی طرح سورۃ البقرہ میں اللہ رب العالمین کی معرفت کا بیان ہے کہ اس پر بغیر دیکھے ایمان لانا پڑے گا (آیت ۳۴)، پھر عبادات (نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ) کی فرضیت وغیرہ کا ذکر آیا اور اس کے ساتھ ہی ان جملہ امور کا بھی مفصل ذکر آ گیا جو دنیا و آخرت کی کامیاب زندگی کے لیے طالبانِ حق کو ضرورت ہو سکتی ہے (روح المعانی، ۱: ۹۸)۔

مضامین کی کثرت کے باعث اس سورت کی اہمیت اور فضیلت کے بارے میں بھی کتبِ حدیث و تفسیر میں بہت کچھ وارد ہوا ہے۔ البقرہ سبع طویل (= سات طویل سورتوں) میں سے ایک ہے۔ ان سات طویل سورتوں (البقرہ، آل عمران، النساء، المائدہ، الانعام، الاعراف اور الانفال) کے بارے میں

(التنبیہ، ص ۱۳۲) اور ایک لڑکی ماناریسا، جس نے اپنے بھائیوں سے بڑھ کر شہرت حاصل کی۔ دارقن اور ماناریسا دونوں کا ایک ایک لڑکا تھا، جو بقراط کے نام سے موسوم تھا“ [قب تاریخ الحکماء، ص ۹۴]۔ اسی مصنف کے قول کے مطابق ازمنہ قدیمہ میں فن طب کے آئندہ استاد ہوئے ہیں، جو اسکلیپوس سے لے کر جالینوس (Galen) تک تقریباً باقاعدہ وقفوں سے ایک دوسرے کے جانشین ہوئے۔ اس ترتیب اور تسلسل میں ہمیں مشرقی دانشوروں اور بالخصوص صابینین (Sabaens) کا وہ رجحان نظر آ سکتا ہے جس کی رو سے وہ قدیم زمانے کے حکما کو پیغمبر صفت تصور کرتے تھے۔ بلند مرتبہ اطبا کے اس سلسلے کا تصور، جس کی ابتدا ایک نیم دیوتا اسکلیپوس سے ہوتی ہے، سلسلہ [صلحا] کے نظریے سے مماثلت رکھتا ہے (دیکھیے الفہرست؛ ابن ابی اصیبعہ، ۱: ۲۴ بعد)۔

(B. CARRA DE VAUX)

\* بقر عید : رك به بيرام [= بیرم]؛ عید۔

⊗ البقرہ : قرآن مجید کی دوسری سورت کا نام، اس سورت کے اور بھی نام بیان ہوئے ہیں، مثلاً فسطاط القرآن (= قرآن کا خیمہ)، سنم القرآن (= قرآن کا کوہان یا چوٹی) اور سورۃ الفردوس (القرطبی، ۱: ۱۵۲؛ روح المعانی، ۱: ۹۸)۔

البقرہ قرآن کریم کی طویل ترین سورت ہے اور اس میں ۲۸۶ آیات، ۶۱۲۱ کلمات اور ساڑھے پچیس ہزار حروف ہیں (الزمخشری : الکشاف، ۱: ۱۹؛ ابن کثیر، ۱: ۳۵؛ الخازن، ۱: ۱۹؛ المراغی، ۱: ۳۸؛ روح المعانی، ۱: ۹۸)؛ اسی سورت میں قرآن کریم کی طویل ترین آیت (عدد ۲۸۲) وارد ہوئی ہے۔

بالاجماع البقرہ مدنی سورت ہے اور حضرت



سے سورۃ البقرۃ یاد کرنے کے صلے کے طور پر دو ہزار درہم کا وظیفہ ملتا تھا، اس میں حضرت عمرؓ کے حکم سے پانچ سو درہم کا اضافہ کر دیا گیا تھا (القرطبی؛ ۱ : ۱۵۳؛ الشعر و الشعراء، ص ۱۹۵؛ کتاب الاغانی، ۱۳ : ۹۳)۔ کعب الاحبار کے سامنے ایک شخص نے نماز میں البقرۃ اور آل عمران کی تلاوت کی۔ جب وہ فارغ ہوا تو کعب نے کہا: بخدا ان دونوں سورتوں میں اللہ کا وہ نام (اسم اعظم) ہے کہ جب اس کے ذریعے دعا کی جائے ضرور قبول ہوتی ہے (ابن کثیر، ۱ : ۳۴)۔

مآخذ: (۱) ابن کثیر: تفسیر، مطبوعہ مصر، ۱ : ۳۲ تا ۳۵؛ (۲) الخازن: تفسیر، مطبوعہ بولاق، ۱ : ۱۹ تا ۲۰؛ (۳) البخاری: الجامع الصحیح، بولاق ۱۳۱۳ھ، ۶ : ۳۳؛ (۴) الزمخشری: الکشاف، مطبوعہ مصر، ۱ : ۱۹؛ (۵) محمود الالوسی: روح المعانی، مطبع المنیرہ قاہرہ، ۱ : ۹۸؛ (۶) محمد بن احمد القرطبی: الجامع الاحکام القرآن، قاہرہ ۱۹۳۵ء، ۱ : ۱۵۲؛ (۷) محمد جمال الدین القاسمی: محاسن التأویل، طبع الحلبي، قاہرہ ۱۹۵۷ء، ۲ : ۳۱؛ (۸) احمد مصطفی المراغی: تفسیر المراغی، قاہرہ ۱۹۳۶ء، ۱ : ۳۸؛ (۹) ابن قتیبہ: الشعر و الشعراء، بیروت ۱۹۶۳ء، ۱۰ : ۱۰۰؛ (۱۰) ابوالفرج الاصفہانی: کتاب الاغانی، مطبوعہ بولاق، ۱۳ : ۹۳۔ (ظہور احمد اظہر)۔

- بقط: [لسان العرب اور تاج العروس ایسی عربی لغات میں اس لفظ کے معانی: گھر کا اٹانہ، گھاس پھوس، متفرق، منتشر، فرقہ، کوئی چیز تھوڑی تھوڑی حاصل کرنا، ایک تہائی یا ایک چوتھائی پر پھل دار باغ ٹھیکے پر دینا، وغیرہ درج ہیں]؛ (لاطینی: Pactum؛ یونانی: πάχτον)۔ یونانی دنیا میں اس لفظ کا اطلاق اس معاہدے اور اس سے متعلق ادائیگیوں پر ہوتا تھا جس کا تعلق باہمی ذمے داریوں سے نہ۔ عربوں کے ہاں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جیسے یہ حاصل ہو گئیں وہ ایک عالم ہے (مَنْ أَخَذَ السَّبْعَ الْأَوَّلَ فَهُوَ جَبْرٌ، ابن کثیر ۱ : ۳۴)۔ ایک اور جگہ آپؐ نے فرمایا کہ سات طویل سورتیں (سبع طوال) مجھے تورات کی جگہ عطا کی گئی ہیں (حوالہ سابق)۔ سورۃ البقرۃ کی ہر آیت کے ساتھ اسی فرشتے نازل ہوتے تھے اور اس کی ایک آیت (آیۃ الکرسی) سب آیات پر فوقیت رکھتی ہے، جسے عرش ربانی کے نیچے سے نکالا گیا اور البقرۃ میں شامل کر دیا گیا (ابن کثیر، ۱ : ۳۲؛ روح المعانی، ۱ : ۹۸)۔ ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ سورۃ البقرۃ سیکھ لو، کیونکہ اس کا سیکھنا باعث برکت ہے اور اس کا ترک کرنا باعث حسرت ہے اور اسے جادوگر نہیں سیکھ سکتے (ابن کثیر ۱ : ۳۳؛ روح المعانی ۱ : ۹۸؛ القاسمی ۲ : ۳۱)۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے سورۃ البقرۃ کو سیکھنے اور اس کے احکام سمجھنے کے لیے بارہ سال کا عرصہ صرف کیا اور آپؐ کے فرزند عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اسے سمجھنے کے لیے آٹھ سال وقف کیے (القرطبی، ۱ : ۱۵۲؛ روح المعانی، ۱ : ۹۸)۔ القرطبی نے ابن العربی کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے شیوخ سے یہ سنا تھا کہ سورۃ البقرۃ میں ۱۰ ہزار اوامر، ایک ہزار نواہی، ایک ہزار احکام، اور ایک ہزار اخبار ہیں (القرطبی، ۱ : ۱۵۲؛ روح المعانی، ۱ : ۹۸؛ ابن کثیر، ۱ : ۳۵)۔ ایک روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مہم پر ایک کثیر التعداد لشکر روانہ کیا تو اس کی قیادت سب سے کم عمر نوجوان کے سپرد کی، محض اس لیے کہ اسے سورۃ البقرۃ زبانی یاد تھی (القرطبی، ۱ : ۱۵۲؛ ابن کثیر ۱ : ۳۵)۔ حضرت لیبیدؓ بن ربیعہ العامری کو، جو زمانہ قبل اسلام کے چوٹی کے شعرا میں سے تھے، بیت المال

اس کا اطلاق اس رقم پر ہونے لگا جسے وہ [شمال مشرقی افریقہ کے علاقہ] نویہ کے عیسائیوں سے بطور خراج وصول کرتے تھے۔ نویہ نے کچھ تو اپنے جغرافیائی محل وقوع اور کچھ اپنے باشندوں کی عربہ جو طبیعت کی وجہ سے مسلمان فاتحین کی اولیں یورش کا جہم کر مقابلہ کیا۔ آخر ایک شدید لڑائی کے بعد عبداللہ بن سعد بن ابی سرح، عامل مصر، نے دنگلہ (Dongola) کا علاقہ فتح کر لیا اور ۵۳۱/۶۵۲ء میں اہل نویہ کے درمیان دو طرفہ ذمے داریوں کا ایک معاہدہ طے کیا، جو ”صلح“ عام فقہی اصطلاحی حدود سے مختلف تھا؛ چنانچہ فریقین نے باتفاق یہ مان لیا کہ دونوں کو ایک دوسرے کے ممالک سے گزرنے کا حق ہوگا، البتہ یہ اجازت نہیں ہوگی کہ کہیں مستقلاً قیام کر سکیں۔ اہل نویہ نے اس بات کا ذمہ لیا کہ مفرور کہیروں، غلاموں اور جزیہ ادا کرنے والے ذبیوں کو واپس بلا لیں گے، نیز دنگلہ میں خود اپنے خرچ سے ایک مسجد تعمیر کرائیں گے اور ہر سال تین سو [اور بقول دیگر چار سو] غلام بھیجا کریں گے، حتیٰ کہ یہ دستور قائم ہو گیا کہ ان سرکاری افسروں کو بھی جو اس معاملے کا انتظام اور نگرانی کر رہے تھے چالیس غلام دیے جائیں گے۔ دوسری طرف مسلمانوں پر از روئے معاہدہ یہ ضروری قرار دیا گیا کہ اس کے مقابلے میں انہیں گندم، دوسری اجناس اور کپڑا بہم پہنچائیں گے۔۔۔۔۔ اس طرح کی سیاسی صورت حال کو ہدنه یا ہنگامی صلح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ امام مالکؒ کی رائے میں تو از روئے فقہ یہ صلح ہی تھی، لیکن آپ نے بیشتر رفقا کے نزدیک یہ متارکہ جنگ کا عارضی معاہدہ تھا اور اس کی رو سے مسلمان اس امر کے پابند نہ تھے کہ اگر کوئی تیسری طاقت نویہ پر حملہ آور

ہو تو مسلمان اس کے دفاع کریں گے۔ اس معاہدے کی تصدیق و توثیق آئندہ حکمرانوں نے بھی کی، جن میں الطبری نے عمر بن ثانی [عمر بن عبدالعزیزؒ] کا خاص طور سے ذکر کیا ہے (الطبری، سلسلہ اول، ۵: ۲۵۹۳)۔ آگے چل کر اہل نویہ کی طرف سے اپنی ذمے داریاں ادا کرنے میں کوتاہی ہونے لگی۔ بعد میں غلاموں کے ساتھ چڑیا گھروں اور طبی تجارب کے لیے کچھ جانوروں کا لینا معاہدے میں شامل کرایا گیا۔۔۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ المہدی اور المعتصم کے زمانے میں ان شرائط کو بہت حد تک بدل دیا گیا۔ مؤخر الذکر کے عہد حکومت میں تو قریب تھا کہ اہل نویہ اس معاہدے کو توڑ دیں۔ المعتصم کے عہد ہی میں اہل نویہ کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنا مقررہ حصہ ہر تیسرے سال ادا کر دیا کریں، البتہ ان کی یہ درخواست کہ نویہ کی سرحد پر القصر میں جو محافظ فوج متعین ہے واپس بلا لی جائے مسترد کر دی گئی۔ القصر وہی مقام ہے جہاں اہل نویہ اپنا مقررہ حصہ ادا کرتے تھے۔ ۵۶۷۳/۱۲۷۶ء میں بیبرس البندقداری کے عہد میں نویہ ہمیشہ کے لیے مسخر ہو گیا اور اس کا ایک حصہ پورے طور پر اسلامی مملکت میں شامل کر لیا گیا، تاہم چھوٹی چھوٹی مقامی ریاستوں نے اپنی آزادانہ حیثیت کچھ عرصہ کم و بیش برقرار رکھی۔ اس کے بعد اہل نویہ تیزی سے اسلام قبول کرتے چلے گئے؛ لہذا اس اصطلاح، یعنی بقط کا استعمال متروک ہو گیا۔ اس لیے کہ بدلتے ہوئے حالات میں اس کا مفہوم بھی باقی نہ رہا تھا۔

مآخذ: المقریزی: الخطط، بلاق ۱۲۷۰ء،

۱: ۱۹۹ بعد (قاہرہ ۱۲۳۳ھ، ۱: ۳۲۲ بعد)؛

(۲) البلاذری: فتوح البلدان، ص ۲۳۶ تا ۲۳۸؛ (۳)

Mémoires géographiques et : E. M. Quatremèr



نے عربی دنیا اور وثنی قبائل کے درمیان، جو جنوب کی طرف نکل گئے تھے، ایک روک قائم کر دی۔ البقارہ ان عرب بادشاہوں کے ماتحت تو تھے اور انہیں خراج بھی ادا کرتے، لیکن ان کے لیے اکثر مشکلات کا باعث بنتے رہتے تھے۔ وہ ان علاقوں میں چلے جاتے جو ان کے زیر تسلط نہیں تھے۔ لونڈی غلاموں کے لیے جنوب کے وثنی قبائل پر یورش اور یوں ان سے رشتہ مناکحت کے باعث ان کی جسمانی ہیئت میں فرق آ گیا۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدیوں کے درمیان رزقیات بقارہ دارفور کے زیر سیادت تھے۔ پھر سوڈانی برہہ فروش الزبیر رحمہ منصور سے ان کی ان بن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۷۴ء میں مصریوں نے دارفور پر قبضہ کر لیا۔ البقارہ نے مصری تسلط سے آزادی حاصل کرنے میں اگرچہ محمد احمد المہدی [رک باں] کی امداد کی تھی، لیکن خود اس کی حکومت کے لیے ایک شورش پسند عنصر ثابت ہوئے، البتہ خلیفہ عبداللہ بن محمد نے، جو خود بھی البقارہ کے قبیلہ تعایشہ سے تھا، ان سے فوج میں کام لیا اور اپنے بڑے بڑے مددگار بھی انہیں میں سے چنے۔ ۱۸۸۸ - ۱۸۸۹ء میں اس نے دارفور کے بقارہ قبائل کو مجبور کیا کہ وہ ام درمان اور اس کے نواح میں ہجرت کر جائیں تاکہ ایک طرف تو انہیں اولاد البلد۔ [رک باں] کے خلاف استعمال کیا جائے اور دوسری طرف زیادہ قریب سے خود ان کی بھی نگرانی ہو سکے۔ پھر کچھ تو اس بے وطنی کی بدولت اور کچھ لسانیوں اور وباؤں میں اتلاف جان سے بقارہ کمزور ہوتے چلے گئے۔ سوڈان کی مکرر فتح (۱۸۹۶-۱۸۹۸ء) کے دوران میں بہت سے بقارہ اپنی قدیم زمینوں میں چلے گئے اور ان کی قبائلی جمعیت ٹوٹ گئی۔ انہوں نے مشترکہ انگریزی حکومت (۱۸۹۹ تا ۱۹۰۵ء) کے خلاف بہت کم سر اٹھایا، چنانچہ یہی حکومت تھی جس کے ماتحت البقارہ پھر

*historiques sure l'Egypte* : ۲ : ۴۲ بعد؛ (۴)  
*Zeitschrift für Assyriologie* : C. H. Becker : ۲۲  
 بعد؛ (۵) Pauly-Wissowa، طبع جدید، ۱۹۴۲ء،  
 بذیل مادۃ Pactum؛ [(۶) ۱۱، ع، بذیل مادۃ.]  
 (F. LOKKEGAARD)

• البَقَّعَة : رَکْ به البِقَاع .

• البَقَّارَة : سوڈان کے عربی بولنے والے خانہ بدوش، جو جھیل چاڈ سے نیل ایض کے علاقے پر ۹ درجے عرض بلد شمالی سے ۱۳ درجے عرض بلد شمالی تک قابض ہیں۔ ان کا ذریعہ معاش بقر، یعنی مویشی پالنا اور چرانا ہے؛ اس سے ان کا نام البقارہ ہو گیا۔ خشک سالی کے دن وہ جنوب کی دریائی زمینوں میں بسر کرتے ہیں۔ برسات آنے پر شمال کی طرف موسمی چراگاہوں میں چلے جاتے ہیں اور دوران سفر میں جس جس راستے سے ان کا گزر ہوتا ہے وہاں غلہ بوتے چلے جاتے ہیں تاکہ واپسی پر فصل کاٹ لیں۔ البقارہ کی اصل پردۂ خفا میں ہے۔ نسب ناموں کا تعلق بھی ان کے موجودہ گروہوں سے ہے، اس سے نہیں کہ وہ کس کی اولاد ہیں۔ خیال یہ ہے کہ یہ لوگ قبیلہ جہینہ کی اس شاخ سے ہیں جس نے چودھویں صدی عیسوی میں مصر سے نویہ میں قدم رکھا تھا۔ سترھویں صدی تک ان کی خانہ بدوش جمعیتیں نیل سے چل کر ان علاقوں میں جا پہنچیں جو ودای اور جھیل چاڈ کے درمیان واقع ہیں، ان کے بعض گروہوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ وہ ہلالی الاصل ہیں۔ جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے جب وہ ایسے علاقوں میں پہنچے جہاں شتر پروری ممکن نہیں تھی تو انہوں نے مویشی پالنا شروع کر دیے۔ بعض مشرق کی طرف بڑھتے ہوئے ودای، دارفور اور کُردفان کے جنوبی زراعتی رقبوں میں جا بسے، جہاں اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے خاندانوں کی حکومت قائم تھی۔ یوں انہوں

اور لفظ 'خَضَارُ' سے بھی ادا کیا جاتا تھا۔  
 بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں مراکشی  
 شہروں کا بقال لازمی طور پر روغنیات، یعنی تیل،  
 محفوظ کیے ہوئے مکھن، چربی میں محفوظ کیے ہوئے  
 گوشت وغیرہ کا پرچون فروش ہوا کرتا تھا۔ ان  
 چیزوں کے علاوہ وہ شہد، صابون، لیموں کے رس  
 میں زیتون، چائے، شکر اور موم بتیاں بھی بیچتا تھا۔  
 یہ بات مشتبہ ہے کہ اس وسیع مفہوم میں  
 لفظ بقال کا استعمال کیا واقعی مدت سے ہو رہا ہے۔  
 بیسویں صدی عیسوی سے پہلے لفظ پنساری (sensu  
 lato) کا استعمال تقریباً ہر جگہ رائج تھا۔  
 الجزائر میں 'سکاکری' (شکر فروش) اور  
 تونس میں 'عطار' [رک باں] اسی طرح کی مثالیں ہیں۔  
 جہاں تک قاہرہ کا تعلق ہے انیسویں صدی کے  
 نصف اول میں لین E. W. Lane کو صرف "زیات"  
 کا لفظ ملا، جو تیل، مکھن، پنیر اور شہد وغیرہ کے  
 بیچنے والے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ شام میں  
 اس کے لیے "سمان" (یعنی مکھن فروش) کا لفظ ہے۔  
 ان کے علاوہ ہر شہر میں پنساری (sensu lato)  
 کا مطلب عام طور سے یہی سمجھا جاتا تھا وہ  
 دکاندار ہے جس کا اصل کام چیزیں فروخت  
 کرنا ہے۔ غرناطہ میں بقال اور خضار کے الفاظ  
 'سوقی' (بازار میں بیٹھ کر چیزیں فروخت کرنے  
 والا) کے مترادف تھے۔ سوقی کی تانیث "سوقیہ" کے  
 لیے عربی میں لفظ 'خضارہ' موجود ہے؛ قشتالی  
 میں اس کا مرادف "havacera" ہے، یعنی پھلیاں  
 بیچنے والا۔ شروع شروع میں قسنطینہ اور تونس  
 میں "سوقی"، بالعموم تیل، محفوظ کیا ہوا مکھن،  
 شہد، کھجوریں اور زیتون کا اچار وغیرہ بیچتا تھا۔  
 الجزائر اور قسنطینہ کی دیہاتی آبادیوں میں  
 پنساری کو اصلاً دکاندار سمجھتے ہوئے 'حوانیتی'  
 (بہ اختلاف) کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ مشرق میں

سے آباد ہوئے اور انہیں ملک کے نظم و نسق میں  
 شامل کر لیا گیا۔  
 [بقارہ نام کے اور بھی قبائل ہیں؛ دیکھیے  
 عمر رضا کحانہ: معجم قبائل العرب، بذیل مادہ]۔  
 مأخذ: (۱) Sahārā und Sūdān : G. Nāchtigal  
 لائپزگ ۱۸۸۹ء، ۳ : ۲۰۶ بعد، ۳۰۳ بعد؛ (۲)  
 Fire and Sword in the Sudan : R. C. Slatin  
 لندن ۱۸۹۶ء، ص ۳۵ بعد؛ (۳) The : H. A. MacMichael  
 Tribes of Northern and Central Kordofan  
 A History of the Arabs (۴) : ۱۰۵ تا ۱۳۰  
 in the Sudan، کیمبرج ۱۹۲۲ء، ۱ : ۲۷۱ تا ۳۰۶،  
 نیز بمدد اشاریہ؛ (۵) مقالات، در Sudan Notes  
 and Records، خرطوم ۱۹۱۸ء، مثلاً (۶) K.D.D.  
 A Note on the Migration of the Messiria: Henderson  
 Tribe into South West Kordofan، در SNR، ۱۹۳۹ء،  
 ۱/۲۲ تا ۳۹، (ب) I. Cunnison The Humr and  
 their Land، در SNR، ۱۹۵۳ء، ۲/۳۵ : ۵۰ تا ۶۸؛  
 [۶) نعوم شقیر: تاریخ السودان، ۱ : ۵۶]۔

(P.M. HOLT)

\* بقال : باعتبار اشتقاق اس لفظ کے معنی ہیں  
 سبزی فروش، لیکن اپنے وسیع تر مفہوم میں وہ  
 انگریزی لفظ grocer کا مرادف ہے اور انہیں معنوں  
 میں فارسی اور ترکی اور ترکی کے ذریعے جزیرہ نماے  
 بلقان کی زبانوں میں پہنچا۔ اپنے اصل اشتقاقی  
 معنوں میں یہ لفظ ساتویں صدی ہجری / تیرھویں  
 صدی عیسوی میں بلنسیہ کی ہسپانوی عربی  
 بول چال میں مستعمل تھا؛ چنانچہ oleram venditor  
 کی فرہنگ موجود ہے؛ لیکن غرناطہ کی بولی (نویں  
 صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی) میں یہ  
 لفظ قشتالی بولی کے لفظ regaton (= Regrattier)  
 کا قائم مقام تھا، جس کے معنی ہیں عام سامان  
 خوراک کا پرچون فروش اور جس کا مفہوم ایک



کی وہ لکڑی جو رنگنے کے کام آتی ہے اور جسے املتاس وغیرہ (Caesalpinia sappan) سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بقول الدینوری یہ لفظ قدیم عربی شاعری میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ حالانکہ اس طرح کا کوئی درخت عرب میں پیدا نہیں ہوتا (Lewin) کے نسخے میں بعد کے اقتباسات کے مطابق شجر کے بجائے خشب شجر پڑھیے)۔ یہ دراصل برصغیر پاک و ہند اور ملک زنج کا پیڑ ہے، جس کا تنا اور شاخیں سرخ ہوتی ہیں اور جنہیں پانی میں جوش دے کر رنگ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ لفظ بقم سنسکرت کے لفظ پتنگہ سے مشتق ہے اور غالباً عربی میں فارسی کی راہ سے داخل ہوا۔ عربی ماہرین لسانیات نے اس لفظ کا عجمی الاصل ہونا تسلیم کیا ہے اور اپنے اس خیال کی تائید میں یہ کہتے ہیں کہ عربی زبان میں اس کی کسی تصریفی مثال کا جواز نہیں ملتا۔ وہ عام طور پر لفظ عندم کو اس کا عربی مترادف ٹھہراتے ہیں، جس کے معنی دم الآخوین (=خون سیاوشان) ہیں، یعنی ایک سرخ گوند جو [علاج کے علاوہ] رنگ کے لیے استعمال ہوتا تھا اور بعض درختوں سے نکلتا ہے۔ ان لفظوں کو غلطی سے ایک ہی ٹھہرانے کی وجہ یہ ہے کہ بقم اور عندم دونوں سرخ رنگ کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔

مسلمان عطاروں اور دواسازوں نے سپن کی لکڑی کے متعدد طبی استعمال بیان کیے ہیں۔ یہ زخم کو مندمل اور بہتے ہوئے ناسور کو خشک کر دیتی ہے، نیز خون کا بہنا اس سے رک جاتا ہے۔ کا رس جلد کو ملائم کرتا اور اس کے رنگ کو چمکاتا ہے۔ اس کی جڑوں سے ایسا زہر نکلتا ہے جو بہت سریع الاثر ہے۔

مآخذ: (۱) ابو حنیفہ الدینوری: The Book

کہیں کہیں دکا کینی اور دکا کچی کی اصطلاحیں مستعمل تھیں۔

اندلس کے عربی بولنے والوں میں لفظ معانج (لغوی معنی علاج کرنے والا، سنوارنے والا) کا استعمال پھل اور سبزی کے پرچون فروشوں کے لیے ہوتا تھا۔ ڈوزی Dozy نے اپنے ضمیمے میں اس کا جو ترجمہ کیا ہے اس کی تصحیح ہو جانی چاہیے۔ دیہات میں سبزی فروش کو خضار، خضری یا خضاری کہا جاتا تھا۔ عطار عام طور پر گرم مسالا، ادویات اور عطر بیچتے تھے۔ ان کے سامان تجارت میں کاغذ قلم، خوردہ فروشی اور لوہے کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی شامل تھیں۔

مختلف اسباب کی بنا پر پنساری کا پیشہ بالعموم ایک ہی حسب و نسب کے لوگ اختیار کرتے تھے۔ ماضی قریب تک مراکش کے شہروں میں، ماسوائے طیطوان، بقال مختصاً قبیلہ آملن Ameln سے متعلق سوسر کا بربری (جمع: شلوخ) ہوا کرتا تھا۔ الجزائر میں اہل مزاب حقیقی معنوں میں اس پیشے کے اجارہ دار ہیں۔ مشرق میں عصر حاضر کا بقال بالعموم یونانی ہوا کرتا تھا۔

[اردو میں بقال کے معنی ہیں کنجڑا، کاجھی، بقال فروش۔ اصطلاحاً بنیے اور پرچونے کو بھی بقال کہتے ہیں (فرہنگ آسیفہ)۔ فارسی میں یہ لفظ سیوہ فروش کے لیے استعمال ہوتا ہے، بلکہ عطار کے لیے بھی، دیکھئے فرہنگ آندراج؛ بقال روٹی بھی بیچتے تھے، دیکھئے بوستان سعدی: "مخرنان ز بقال کوی"۔

مآخذ: (۱) W. Marçais: Textes arabes de Tanger، ص ۲۳۳؛ (۲) Dozy: suppl.، ان الفاظ کے تحت جو اس مقالے میں درج ہیں۔

(G. S. COLIN)

بقم: (ع) سپن کی لکڑی؛ ارض پاک و ہند

۱۳۶؛ (۴) النویری در *Exposé : Silvestre de Sacy*  
*de la religion des Druzes*، پیرس ۱۸۳۸ء، ج ۱،  
 دیباچہ، ص ۷۷؛ (۵) Friedländer، *Heterodoxies : I.*  
*of the Shiites*، در *JAOS*، ۲۹ : ۱۱۰ تا ۱۱۱ (بحوالہ  
 ابن حزم، متعلقہ برہواری)؛ *Memoire : M. J. de Goeje*  
*sur les Carmathes de Bahrain et les Fatimids*، لاٹن  
 ۱۸۸۶ء، ص ۹۹ تا ۱۰۰۔

(M. G. S. HODGSON)

• البقوم: (واحد بقمی)، مغربی عرب کے ایک  
 قبیلہ، جو روایتاً ازدی الاصل تصور کیا جاتا ہے۔  
 ہر چند کہ یہ قبیلہ حجازی ہے، لیکن یہ اس  
 علاقے میں جو الطائف کے مشرق میں واقع ہے،  
 حرۃ نمن اور حرۃ البقوم کے لاوے سے بنے ہوئے  
 میدانوں کے قریب تک پھیلا ہوا ہے۔ یہاں حجاز  
 اور نجد کی درمیانی سرحدیں صاف طور پر معین نہیں۔  
 اس قبیلے کے بارے میں اندازہ ہے کہ اس میں  
 تقریباً دس ہزار نفوس شامل ہیں، جن میں نصف سے  
 کم بدوی ہیں۔ بقوم کئی صدیوں سے وادی تربہ  
 (ایضاً تربہ) میں نخلستانوں کی کاشت کر رہے ہیں  
 اور تربہ کا شہر (۲۱ درجہ ۱۴ دقیقہ شمال اور ۴۱  
 درجہ ۳۷ دقیقہ مشرق) ان کی آبادی کا اصل مرکز  
 ہے۔ البقوم دو شاخوں میں منقسم ہیں، المحابید  
 اور آل وازع۔

وہابی مملکت کی توسیع کے ابتدائی دور میں  
 البقوم نجد کے خلاف شریف غالب کے طرف دار تھے۔  
 ۱۲۲۸ھ/۱۸۱۳ء سے وہ مصر کے ترکی نائب محمد علی  
 کی افواج کے مقابلے میں اپنے علاقے کی مدافعت  
 کرتے رہے۔ ان سہموں میں غالبہ نام ایک عورت  
 نے خاص طور پر ناموری حاصل کی۔ بالآخر البقوم  
 ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے اور ۱۲۳۰ھ/  
 ۱۸۱۵ء میں تربہ پر محمد علی کا قبضہ ہو گیا؛  
 لیکن بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں البقوم کی

*of Plant*، طبع Lewin، شماره ۸۰، ص ۲۳؛ (۲)  
 داؤد الانطاکی: تذکرہ، قاہرہ ۱۳۲۳ھ، ۱ : ۷۳؛ (۳)  
 الغافقی، طبع Meyerhof-Sobhy، عدد ۱۲۳؛ (۴)  
 ابن البیطار: الجامع، بولاق ۱۲۹۱ھ، ۱ : ۱۰۳؛ (۵)  
 ابن سیدہ: المخصص، ۱۱ : ۲۱۲؛ (۶) Löw :  
*Aram. Pflanzennamen*، بمدد اشاریہ، بذیل مادہ؛  
 (۷) وہی مصنف: *Die Flora der Juden*، ۳ : ۱۲۸  
 یبعد؛ (۸) وہی مصنف، در *ZSI* (۱۹۲۲ء)، ص ۱۴۵  
 یبعد؛ (۹) تحفۃ الاحباب، طبع Renaud-Colin، ص  
 ۱۳۹ یبعد۔

(L. KOPF)

• البقلیۃ: عراق زیریں کے سواد میں عام  
 مسلمانوں سے الگ ایک اسلامی فرقہ، جسے قرابطہ  
 سے منسلک سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ  
 ابو حاتم ناسی ایک شخص نے ان کے لیے لہسن،  
 پیاز اور شلغم (یا چقندر) کھانا اور جانداروں کا  
 ذبح کرنا ممنوع قرار دیا، لیکن شرعی ارکان کی  
 پابندی ختم کر دی۔ ۳۱۶ھ/۹۲۸-۹۲۹ء میں  
 ابوطاہر کی مہم فرات کے دوران میں اس فرقے نے  
 متعدد قائدین بالخصوص مسعود بن حرث اور  
 عبدان کے بھتیجے عیسیٰ بن موسیٰ کی زیر قیادت کوفے  
 اور واسط کے علاقوں میں عروج حاصل کیا۔ ان کے  
 سفید جھنڈوں پر قرآن مجید کی وہ آیات لکھی ہوئی  
 تھیں جن میں فرعون کے پنجنہ استبداد سے بنی  
 اسرائیل کی رہائی کا ذکر ہے۔ انہیں شروع  
 شروع میں کامیابی ہوئی؛ لیکن بعد کو [خلیفہ]  
 مقتدر باللہ کے سالار ہارون بن غریب نے ان کا خاتمہ  
 کر دیا۔ بظاہر یہی لوگ ہیں جنہیں بورانیہ بھی  
 کہا جاتا تھا:

مأخذ: (۱) المسعودی: التنبیہ، ص ۳۹۱؛  
 (۲) غریب القرطبی: صلتۃ تاریخ الطبری، طبع ذخوبہ،  
 لاٹن ۱۸۹۷ء، ص ۱۳۷؛ (۳) ابن الاثیر، ۸ :



l'histoire des origines seldjukides, Oriens, ۱۹۳۹ء، ص ۵۷

(CL. CAHEN)

بقی بن مخلد: [بن یزید] ابو عبد الرحمن، \*  
الاندلسی، الحافظ، قرطبہ کے ایک نامور محدث و  
مفسر، غالباً نصرانی الاصل تھے۔ ۵۲۰/۸۱۷ء میں  
پیدا ہوئے اور ۵۲۷/۸۸۹ء میں وفات پائی۔  
بہت سے دوسرے اندلسی مسلمانوں کی طرح انہوں  
نے مشرق کے بڑے بڑے شہروں میں ائمہ [حدیث]،  
بالخصوص امام احمد بن حنبل اور ابوبکر بن  
ابی شیبہ، سے بکثرت تحصیل حدیث کی۔ [تقریباً  
پینتیس برس تک طلب علم کے سلسلے میں مشرق میں  
قیام پذیر رہے اور پونے تین سو اساتذہ کے سامنے  
زانوئے تلمذتہ کیا۔ تحصیل علم کے بعد قرطبہ  
واپس پہنچے تو ان کے علم و فضل کے چرچے ہونے  
لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں اندلس کے مجتہد امام  
تسلیم کیے گئے۔ ان کے حلقہ درس کے باعث قرطبہ  
کی فضا قرآن و حدیث کے نغموں سے گونجنے لگی۔  
وہ اپنے زمانے کے عظیم النظر عالم، صالح اور  
عابد و زاہد تھے۔ امام مجتہد ہونے کے باوجود  
ان کا رجحان حنبلی مکتب فکر کی طرف تھا۔ [فکری  
اختلاف اور رقابت کے باعث ان کے لیے موت تک کی  
سزا تجویز ہوئی، لیکن امیر محمد اول (۵۳۸/۸۵۲ء  
تا ۵۴۳/۸۸۶ء) کی مداخلت سے بچ گئے۔  
ان کی بڑی بڑی تصانیف، جو سب کی سب ناپید  
ہو چکی ہیں، حسب ذیل ہیں: (۱) تفسیر القرآن،  
جسے ابن حزم نے تفسیر طبری سے اعلیٰ قرار دیا ہے۔  
اور (۲) مسند، جس میں [تیرہ سو صحابہ کرام سے  
احادیث روایت کیں، پھر ہر صحابی کی احادیث  
کو ابواب فقہ اور مسائل احکام کے لحاظ سے ترتیب  
دیا؛ چنانچہ یہ مجموعہ احادیث بیک وقت مسند  
بھی تھا اور مصنف بھی]۔

وفاداری بٹ گئی؛ کچھ عبدالعزیز بن سعود کے  
طرف دار ہو گئے اور کچھ شریف حسین کے۔ المعامید  
نے شریف کا ساتھ دینے کا اعلان کیا اور آل وازع نے  
ابن سعود کی حمایت میں جنگ کی۔ البتہ ۵۳۳/۱۱۳۹ء  
میں جب ابن سعود نے تربہ فتح کر لیا  
تو المعامید نے بھی اس کی اطاعت قبول کر لی،  
چنانچہ آگے چل کر البقوم کے ان دونوں گروہوں نے  
ان سعودی مہمات میں شرکت کی جن کا تعلق  
مغرب سے ہے۔

۱۹۵۹ء میں المعامید کا سردار حسین بن محیی  
تھا اور آل وازع کا محمد بن غنم۔

مآخذ: (۱) Arabian : H. St. J. Philby

Highlands, Ithaca, ۱۹۵۲ء؛ (۲) J. L. Burckhardt

Notes on the Bedouins and the Wahábys, لندن، ۱۸۳۱ء؛

Die Beduinen : W. Caskel و M. v. Openheim (۳)

ج ۳، Wiesbaden، ۱۹۵۲ء؛ (۴) عمر رضا کحالة :

معجم قبائل العرب القديمة والحديثة، دمشق، ۱۹۴۹ء؛

(۵) أحمد بن زینی دحلان : خلاصة الكلام، قاہرہ

۱۸۸۷ء؛ (۶) حسین بن غنم : روضة الأفكار والآفهام،

بمبئی بدون تاریخ۔

(F. S. VIDAL)

\* بقہ : خراسان کے اغز قبائل کے سرداروں میں  
سے ایک، جسے ارسلان بن سلجوق کی گرفتاری اور  
وفات (۵۳۷/۱۰۳۶ء؟) کے بعد غزنوی افواج نے  
ان کی تاخت و تاراج کے سبب اس علاقے سے نکال دیا۔  
باین ہمہ انہوں نے اپنی لوٹ مار کا سلسلہ وسطی اور  
مغربی ایران میں ارمینیہ کے سرحدی علاقوں اور بالائی  
عراق عرب کی حدود تک جاری رکھا، لیکن یہاں  
عرب بدویوں اور کردوں انہیں نے مار مار کر فنا  
کر دیا۔ یہ ۵۳۵/۱۰۴۴ء کا واقعہ ہے۔ اس کے  
لیے رك به سلجوق، آل، در اور، لائڈن، بار اول؛  
نیز دیکھیے Le Maliknameh et : Cl. Cahen

خاردار جھاڑیوں سے، جنہیں غرقد کہتے ہیں، پر تھا۔ مدینے میں ایسے کئی بقیع ہیں۔ یہ جگہ شہر کے جنوب مشرقی سرے پر، روضہ نبویؐ سے تھوڑے ہی فاصلے پر، فصیل شہز سے باہر واقع ہے۔ یہ فصیل، جس کے ایک دروازے، یعنی باب البقیع، سے قبرستان میں داخل ہونے کا راستہ ہے، منہدم ہو چکی ہے (دیکھیے مدینہ منورہ کا نقشہ، در *Annali: Caetani*، ۲: ۱۷۳)۔ مہاجرین میں سے سب سے پہلے البقیع میں دفن ہونے والے نبی اکرمؐ کے ایک صحابی حضرت عثمانؓ بن مظعون تھے، جن کا انتقال ۵/۶۲۶ - ۶۲۷ء میں ہوا۔ اس میدان کو خاردار جھاڑیوں سے صاف کیا گیا اور مدینے میں وفات پانے والے مسلمانوں کے لیے اسے قبرستان کے طور پر وقف کر دیا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں، آپ کے معصوم فرزند حضرت ابراہیمؑ، امہات المومنینؓ (ماسوا حضرت خدیجہؓ جو قبہ المعلیٰ (مکہ معظمہ) میں مدفون ہیں) اور حضرت امام حسینؓ کے سوا آپ کے باقی تمام اخلاف بھی یہیں مدفون ہیں (حضرت فاطمہ الزہراء [رک باں] کے مزار کا مسئلہ متنازع فیہ ہے)۔ یہاں دفن ہونے والے دوسرے جلیل القدر بزرگوں میں حضرت عثمانؓ بن عفان [رک باں]، مالکؓ بن انس [رک باں] اور ان کے استاد نافع، نبی اکرمؐ کی رضاعی والدہ حضرت حلیمہ السعدیہؓ [رک باں] اور آپ کے چچا حضرت عباسؓ [رک باں] بھی شامل ہیں۔ رفتہ رفتہ اہل بیت [رک باں]، ائمہ کرام اور صلحائے امت کے درمیان اس جگہ دفن ہونے کو ایک اعزاز سمجھا جانے لگا۔ مشہور و معروف متوفیوں کی قبروں پر شاندار قبے اور گنبد تعمیر کیے گئے، مثلاً ابن جبیر کے بیان کے مطابق حضرت حسنؓ بن علیؓ اور حضرت العباسؓ کی قبروں کے گنبد خاصے بلند تھے۔ لیکن وہابی استیلاء کے

بتی نے، جن کی سوانح عمری شہزادہ عبداللہ الزاہد نے لکھی، اپنی زندگی کے آخری ایام میں بسبب زہد و تقویٰ بڑی شہرت پائی، حتیٰ کہ تقدس کے درجے تک جا پہنچے۔

ابن حزم نے حدیث کے میدان میں بتی کو امام بخاریؒ اور دوسرے نامور محدثین کے ہم پلہ قرار دیا ہے، [نیز أصحاب الفتیاء میں شمار کیا ہے]۔

مآخذ: (۱) ابن بشکوال، عدد ۲۷۷؛ (۲) الضبی [بغیة الملتس]، عدد ۵۸۴؛ (۳) ابن الفرضی، عدد ۲۸۱؛ (۴) ابن عساکر: تاریخ دمشق، ۳: ۲۷۷ تا ۲۸۲؛ (۵) ابن حزم: الرسالة، (فرانسیسی ترجمہ از Pellat، در الاندلس، ۱۹۵۴ء، فصول ۱۷ و ۳۵)؛ (۶) ابن عذاری: البیان، ۲: ۱۱۲ بعد؛ (۷) النبی: مرقبة، بمواضع کثیرہ؛ (۸) الخشنی: قضاة، بمدد اشاریہ؛ (۹) المقری: نفع الطیب، ۱: ۳۹۱؛ [۸۱۲]؛ (۱۰) Muh. St.: I. Goldziher، ۲: ۲۶۰؛ (۱۱) وہی مصنف: Zahiriten، ص ۱۱۵؛ (۱۲) M. Asin؛ (۱۳) لیوی پرووانسال: Hist. Esp. Mus. بمدد اشاریہ؛ (۱۴) براکلمان: تکلمہ، ۱: ۲۷۱ [تعریب: تاریخ الادب العربی، ۳: ۲۰۱ تا ۲۰۲]؛ (۱۵) حوالہ جات در La profession de foi d'Ibn Batta، دمشق ۱۹۵۸ء، ص ۲۰ حاشیہ؛ [۱۶] یاقوت: معجم الادباء، ۲: ۳۶۸ تا ۳۷۱؛ (۱۷) الذہبی: تذکرۃ الحفاظ، ۲: ۲۰۳ تا ۲۰۵ (بار دوم، ۲: ۱۸۳)؛ (۱۸) الیافعی: مرآة الجنان، ۲: ۱۹۰؛ (۱۹) ابن ابی یعلیٰ: طبقات الحنابلة، قاہرہ ۱۹۵۲ء، ۱: ۱۲۰؛ (۲۰) الاعلام، بذیل مادہ]۔

(CH. PELLAT [و ادارہ])

\* بقیع الغرقد: (جسے جنة البقیع یا محض البقیع بھی کہتے ہیں) مدینہ منورہ کا قدیم ترین اور پہلا اسلامی قبرستان۔ اس نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اصل میں ایک میدان تھا جو ایک قسم کی



تا ۱۷۳: (۳) R. F. Burton *Pilgrimage to el-Medina and Meccah*، لندن ۱۸۵۵ء، ۲: ۳۰۰ تا ۳۳۰: (۴) ابن جبیر (طبع ڈخوبہ)، ص ۱۹۵ بعد؛ (۵) برک ہارٹ *Travels in Arabia*: Burckhardt، لندن ۱۸۲۹ء، ص ۲۲۲ تا ۲۲۶: (۶) A. J. Wensinck *Mohammed*؛ *en de Joden te Medina*، لاڈن ۱۹۰۸ء، ص ۱۵: (۷) ابن النجار: *أخبار مدينة الرسول*، مکہ مکرمہ ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء، ص ۱۲۷ تا ۱۳۰: (۸) محمد بن عبدالحمید العباسی: *عمدة الأخبار في مدينة المختار*، بار سوم، دمشق ۱۳۷۱ھ/۱۹۵۱ء، ص ۹۳ تا ۱۰۲: (۹) E. Rutter *The Holy Cities of Arabia*، نیویارک ۱۹۲۸ء، ۲: ۲۵۶ بعد؛ (۱۰) لیب التبنونی: *الرحلة الحجازية*، قاہرہ ۱۳۲۹ھ، ص ۲۵۶ تا ۲۵۷: (۱۱) عبدالسلام ندوی: *تاریخ العربین الشریفین* (بزبان اردو)، پنڈی بہاؤالدین ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۳ء، ص ۲۰۹ و ۲۱۸: (۱۲) یوسف عبدالرزاق: *معالم دار الهجرة*، قاہرہ بدون تاریخ، ص ۲۹۷ تا ۲۹۹: (۱۳) المرآعی: *تحقیق النصرة*، المدینہ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۵ء، ص ۱۲۳ تا ۱۲۹ و اشاریہ: (۱۴) محمد بن احمد المطری: *التغريف بما آنت الحجرة من معالم دار الهجرة*، دمشق ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء، ص ۳۶ تا ۴۰: (۱۵) عبدالقدوس الانصاری: *آثار المدينة المنورة*، دمشق ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۴ء.

A. J. WENSINCK [و بزمی انصاری]

• البقیعة: (اس سے بالخصوص وہ چھوٹا سا میدانی قطعہ مراد ہے جو البقاع کے شمال میں اور جبل انصاریہ کے جنوب میں واقع ہے اور جس کی سطح سمندر سے بلندی اوسطاً اڑھائی سو میٹر ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں چشمے بکثرت پائے جاتے ہیں، جن سے نہر الکبیر نکلتی ہے۔ صلیبی جنگوں کے دور میں یہ Boqué کے نام سے مشہور تھا اور اس پر حصن الانصار

بعد جب برک ہارٹ Burckhardt یہاں آیا تو اس نے البقیع کو مشرق کا ایک ویران اور خستہ ترین قبرستان پایا۔ اُحد میں حضرت حمزہؓ کے مزار اور نواح مدینہ میں قبا کے مقام پر پہلی اسلامی مسجد کی طرح البقیع بھی ان متبرک مقامات میں سے ایک ہے جن کی زیارت زائرین مدینہ منورہ کے نزدیک کارِ ثواب ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں البقیع بہت چھوٹی سی جگہ تھی اور حضرت عثمانؓ ابن عفان اور حلیمہ السعدیہ کی قبریں اس کی حد سے باہر تھیں۔ حضرت عثمانؓ بن عفان حش کوکب میں مدفون تھے، جسے امویوں نے بہت بعد میں البقیع میں شامل کیا، یہاں تک کہ وہ احاطہ بھی البقیع کی موجودہ حدود سے باہر تھا جس میں مدینہ منورہ پر اموی حملے کے وقت شہید ہونے والوں میں سے بعض دفن تھے۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں شروع کے وہابیوں نے جو گنبد اور قبے گرائے تھے انہیں ترکی کے سلطان عبدالحمید ثانی [رک باں] نے از سر نو تعمیر کرا دیا تھا، لیکن انہیں عبدالعزیز آل سعود نے ۱۹۲۶ء میں دوبارہ گرا دیا۔۔۔ رٹر Rutter، جس نے وہابیوں کے استیلاے ثانی کے فوراً بعد ۱۹۲۶ء میں اسے دیکھا تھا، البقیع کو ایک ایسے شہر سے تشبیہ دیتا ہے جسے زلزلے نے تباہ کر دیا ہو۔ ۱۹۵۴ء میں شاہ سعود بن عبدالعزیز کے حکم سے حاجیوں اور زائرین کی آمد و رفت کی سہولت کے لیے سارے قبرستان میں سیمنٹ کے پختہ راستے بنا دیے گئے۔

مآخذ: (۱) نورالدین علی السّمہودی: *وفاء الوفا*،

قاہرہ ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء، ص ۷۸ تا ۱۰۴ (Wüstenfeld)؛

*Geschichte der Stadt Medina*، گوننجن ۱۸۶۰ء، ص

۱۴۰ بعد؛ (۲) عبدالحق محدث دہلوی: *جذب القلوب*

إلى ديار المحبوب، کن پور ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء، ص ۱۴۹

روایات اور بعض ایسی تاریخی تصانیف میں مذکور ہے جو ان کے زیر اثر لکھی گئیں۔

بہر حال یہ تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں حاجی بکتاش خراسانی کا ظہور آناطولیا کے زمرہ درویشوں میں ہوا۔ غالباً وہ بابا اسحاق (رک بہ بابائی) کے مرید تھے، جنہوں نے ۵۶۳۸ھ / ۱۱۳۰ء میں، بغاوت کی۔ ان کے حریف سلسلہ مولویہ کے معتبر متوسلین نے آگے چل کر اس پر بہت زور دیا ہے۔ ایم۔ فواد کوپرولو کی تحقیق یہ ہے کہ یہ سلسلہ ان کے اپنے حلقہ مریدین سے معرض وجود میں آیا، لیکن حاجی بکتاش کے مقالات میں، جو دراصل عربی میں لکھے گئے اور جن کا خطیب اوغلو نے منظوم ترکی ترجمہ کیا اور پھر ترکی نثر میں بھی ترجمہ ہوا، ان مخفی رسوم و عقائد پر کوئی خاص زور نہیں دیا گیا جو سلسلہ بکتاشیہ کی خصوصیت میں سے ہیں۔ بہر کیف یہ سلسلہ، جس کے بلا فصل اسلاف ابدالان روم معلوم ہوتے ہیں، آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی میں موجود تھا۔ دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں شیخ سلسلہ بالم سلطان "پیر دوم" نے اسے اس کی معینہ شکل دی۔

ترک درویشوں کے اداروں کو ان کے مخصوص خد و خال مغربی ترکستان میں احمد یسوی (۵۶۲۴ھ / ۱۱۶۶ء) نے دیے تھے۔ آناطولیا میں ان اداروں کا حلقہ وسیع ہوتا رہا، لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے بدعتی رجحانات بھی اختیار کر لیے تھے؛ چنانچہ سلسلہ بکتاشیہ میں بہت سے جاہلی اور بدعتی عناصر پر جمے رہنے کا مادہ موجود تھا۔ جن علاقوں میں یہ سلسلہ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کو اپنے طریق میں داخل کرنے لگا وہاں آبادی کا بڑا حصہ اس میں شامل ہو گیا، مثلاً

[رک بان] کا تسلط تھا۔ اس حصن کے کھنڈر اب بھی میدان پر مشرف ہیں (دیکھیے M. van Berchem و Voyage en Syrie : E. Fatio، قاہرہ ۱۹۱۴-۱۹۱۵ء، ص ۴۲ : R. Dussaud : Topographie historique de la Syrie، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۹۲ : J. Weulersse : Le pays des Alcoiutes، Tours ۱۹۴۰ء، بمدد اشاریہ، بذیل مادہ Bouqai'a)۔

اسی طرح بقیعہ کا نام شرق اردن میں بھی ملتا ہے اور اس سے اندرون ملک کا وہ چھوٹا سا میدان مراد لیا جاتا ہے جو سطح مرتفع البلقاء کے شمال میں سویلج کے نواح میں واقع ہے (دیکھیے Géographie de la Palestine : F. M. Abel، پیرس ۱۹۳۳ء : ۱ : ۹۱)۔

(J. SOURDEL - THOMINE)

\* رک : رک بہ بیگ۔

\* بکتاشی : رک بہ بن باشی۔

\* بکتاش : رک بہ بکتاشیہ۔

\* بکتاشیہ : ترکی کا ایک سلسلہ درویشوں - اس

سلسلے کے سرپرست حاجی بکتاش ولی ہیں۔ ان کی زندگی کے حالات اس سلسلے کی روایتی تصانیف میں ملتے ہیں (جن میں سے پہلی تصنیف تقریباً نویں صدی ہجری / پندرھویں صدی عیسوی کی ہے)، لیکن یہ سب افسانوی رنگ میں ہیں اور بظاہر مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ بانی سلسلہ کو مشہور مذہبی شخصیتوں کے دوش بدوش لایا جائے اور ان کے کارناموں پر اصرار کر کے سلسلہ بکتاشیہ کی اس سیاسی اہمیت کی توجیہ کی جائے جو اسے بعد کے زمانے میں حاصل ہوئی۔ یہ امر قطعاً خارج از بحث ہے کہ بکتاش کا عثمان یا اورخان [رک بان] سے کبھی کوئی تعلق رہا تھا یا انہوں نے بنی چری دستے کے لیے دعائے خیر و برکت کی تھی (جو سب سے پہلے مراد اول کے عہد میں قائم ہوا)، جیسا کہ بکتاشی



بکتاشیوں کے اناطولی پشرووں میں پہلے سے موجود رہے ہوں۔ دوسرے اجزا شاید ان عیسائی گروہوں سے اخذ کیے گئے ہیں جو بعد میں اس فرقے میں شامل ہوئے۔ یہ لوگ نئے ارکان کو شامل کرنے کے موقع پر شراب، روٹی اور پنیر تقسیم کرتے ہیں جو شاید اس عشاء ربانی (Holy Communion) کی باقی ماندہ یادگار ہے جسے Artotyrites (ایک کوهستانی فرقے کے لوگ) منایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بکتاشی لوگ اپنے روحانی پیشواؤں کے آگے اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں اور وہ ان سے وعدہ مغفرت کرتے ہیں۔ ان کی مذہبی تقریبات میں عورتیں بے نقاب شامل ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ تجرد میں زندگی بسر کرنے کا عہد کر لیتے ہیں۔ ایسا عہد کرنے والے امتیازی نشان کے طور پر کان میں بالیاں پہنے رہتے ہیں۔ ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ بکتاشیوں میں تجرد کا رواج پہلے ہی سے موجود تھا یا نہیں؛ غالباً اس کو پہلی بار بالم سلطان نے جاری کیا۔

اکثر ایسا ہوتا رہا ہے کہ بکتاشیوں نے مشہور زیارت گاہوں میں اقامت اختیار کر کے ان کے تقدس کی توجیہ اپنی روایات کے مطابق کر لی، مثلاً "اسکی شہر" کے قریب "سپد غازی" اور البانیا کے متعدد مقامات میں۔ ان کے اولیا کے افسانوں میں جو کرامتیں بیان کی گئی ہیں ان میں اکثر شمنی خصوصیات موجود ہیں۔

ان کی پوری جماعت پر چلبی کی حکومت تھی۔ وہ حاجی بکتاش کی مرکزی خانقاہ (پیراوی) میں رہتا تھا جو ولی موصوف کی قبر پر (قبر شہر اور قیصری کے درمیان) بنائی گئی تھی۔ چلبی کا منصب اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران میں [بالعموم] باپ سے بیٹے کو ورثے میں پہنچتا رہا، تاہم یہ ہمیشہ موروثی نہیں ہوتا تھا۔ اہل تجرد کا

جنوبی اناطولیا میں اور خصوصاً البانیا میں، جہاں ایک قسم کا مخلوط مذہب پیدا ہو گیا جو اسلامی اور عیسائی دونوں عناصر پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ اور فرقے بھی، جن کے مذہبی رسوم و عقائد باہم ملتے جلتے تھے، ان میں شامل ہو گئے؛ خاص طور پر وہ گروہ جو فیلباش کہلاتا تھا ان سے ایک طرح کی وابستگی رکھتا تھا۔

بکتاشیوں کے عوام پسند تصوف کی خصوصیات اور اسلامی رسوم و عبادات حتیٰ کہ نماز تک سے ان کی غایت درجہ بے تعلقی دونوں ہی ایسی باتیں ہیں جن سے اسلام کی جانب ان کے رویے کا اظہار ہوتا ہے۔ اندرونی عقائد کی رو سے وہ شیعی ہیں، بارہ اماموں کے قائل ہیں اور خصوصیت کے ساتھ امام جعفر الصادقؑ کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ ان کی عبادت کا مرکز حضرت علیؑ کی ذات ہے۔ یہ لوگ حضرت علیؑ کو اللہ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملا کر ایک طرح کی تثلیث کے قائل ہیں۔ یکم محرم سے ۱۰ محرم تک وہ "ماتمی راتیں" (ماتم گیلری) مناتے ہیں؛ نیز دو-رے علوی شہدا اور بالخصوص معصوم پاک (جن کی وفات بچپن میں ہوئی) کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں [معصوم پاک سے مراد غالباً حضرت علی اصغر ہیں]۔ نوہں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں ان میں "حروفیوں کے اعداد رمزیہ" کے قیاسات دخل پا گئے؛ فضل اللہ حروفی کی تالیف جاویدان [نامہ] کا ترمیم شدہ فارسی نسخہ اور اس فرقے کے عقائد کی ترکی زبان میں تشریح موسومہ عشق نامہ، جو فرشتہ اوغلو نے لکھی ہے، دونوں ان کے نزدیک قانون شرعی کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ مزید برآں یہ لوگ تناسخ کے قائل ہیں۔

منکن ہے کہ عیسائی عناصر کسی حد تک

عرصے بعد جبل المقطم کی ڈھلان پر (مؤخرالذکر نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں بھی موجود تھی)؛ دیگر بستیاں بغداد اور کربلا میں واقع ہیں۔

درویشی مذہب کی بکتاشی شکل نے ترک عوام کے دینی رجحانات پر گہرا اثر کیا۔ اس فرقے کی خاص تالیفات تصوف کے بعد بکتاشی شاعروں کی ولولہ انگیز اور پرلطف شنائی شاعری کو اطراف و جوانب میں بڑا عروج حاصل ہوا۔

اس سلسلے کی سیاسی اہمیت کا باعث اس کی یمنی چری سے وابستگی تھی۔ عثمانی ترکوں کے شروع زمانے کے دیگر سیاسی اداروں کی طرح یمنی چری بھی شروع ہی سے مذہبی جمیعتوں کے زیر اثر تھے اور اگر پہلے نہیں تو نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں بکتاشیوں کو ان پر بلا شرکتِ غیرے اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ یمنی چریوں میں بکتاشی عقائد کی مقبولیت کا سبب شاید یہ تھا کہ وہ خود عیسائی اصل کے تھے۔ اس نہایت منظم جماعت کے ساتھ تعلق سے یمنی چری دستہ فوج کو ایک مربوط جمعیت کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بکتاشیوں نے عثمانی حکومت کے خلاف درویشوں کی متعدد بغاوتوں میں بھی حصہ لیا، مثلاً قلندر اوغلو کی بغاوت (۵۹۳۳ / ۱۵۲۶ - ۱۵۲۷ء) میں - ۱۲۳۱ / ۱۸۲۶ء میں جب سلطان محمود ثانی نے یمنی چری فوجیوں کو تباہ کر دیا تو اس سے وہ جماعت بھی متاثر ہوئی جس سے وہ منسلک تھے؛ چنانچہ بہت سی خانقاہیں اسی زمانے میں برباد کر دی گئیں۔ انیسویں صدی کے وسط میں اس سلسلے کی تجدید ہوئی اور خانقاہوں کی دوبارہ تعمیر شروع ہو گئی۔ بکتاشیوں میں پھر جان پڑی، جس کا اظہار ان کی تالیفی و تصنیفی سرگرمیوں سے ہوتا ہے جو انیسویں صدی کے اختتام سے

مرشد اعظم (= ددہ) علیحدہ ہوتا ہے۔ کسی ایک تنہا خانقاہ (تگہ) کے صدر کو بابا (Baba) کہتے ہیں، پورے طور پر داخل سلسلہ رکن کو درویش، جس نے صرف پہلی سو گند کھائی ہو اسے محب اور جو ابھی صرف وابستگی رکھتا ہو اور داخل سلسلہ نہیں ہوا اسے عاشق کہتے ہیں۔ ضبط و نظم بیشتر اس تعلق سے قائم رہتا ہے جو مرشد کا اپنے مریدان خاص یا نووارد چیلوں سے ہوتا ہے۔

بکتاشی سفید ٹوپی پہنتے ہیں، جس میں چار یا بارہ گوشے ہوتے ہیں۔ چار کے عدد سے اشارہ ”چار ابواب“، یعنی شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت، اور ان کے مطابق لوگوں کے چار طبقات، یعنی عابد، زاہد، عارف اور محب کی طرف ہے؛ بارہ کا عدد بارہ اماموں کی تعداد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس فرقے سے دو اور چیزیں بھی مخصوص ہیں، ایک تو بارہ پنالیوں (گول ابھری ہوئی لکیروں) کا ”تسلیم طاشی“ (سنگِ تسلیم) جو گلے میں پہنا جاتا ہے اور دوسرے تبر (دو پھل والی کلہاڑی)۔ ان کی تصویریں J. K. Birge کی تالیف میں ملیں گی (دیکھیے مآخذ)۔

بڑی بڑی خانقاہیں (تکیے) چار حصوں پر مشتمل ہوتی ہیں: (۱) میدانِ اوی، اصل خانقاہ جس میں عبادت گاہ بڑی ہوتی ہے؛ (۲) ایک اوی، یعنی تنورخانہ اور مستورات کے رہنے کی جگہ؛ (۳) آس اوی، یعنی باورچی خانہ؛ (۴) سہمان اوی، یعنی سہمان خانہ۔

اس سلسلے کی متعدد قدیم تر بستیوں میں سے مندرجہ ذیل لائق ذکر ہیں: روم ایلی میں دیمتوقہ Dimetoka اور قالقان دین Kalkandelen؛ آناطولیا میں امامیہ کے شمال مغرب میں عثمان جق اور لیشیا (Lycia) میں اجمالی؛ قاہرہ کے قریب پہلے قصر العین اور اس کے تھوڑے ہی



۱۹۳۲ء، ص ۷ تا ۱۳؛ (۱۰) OM، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء،

۱۹۳۶ء، مزید حوالے در؛ (۱۱) J. D. Pearson:

Index Islamicus، عدد ۲۵۸۱ تا ۲۶۰۰۔

(R. Tschudi)

- بکتگین : رَکْ بہ بکتگین (بنو)۔
- بکر صوباشی : مرکزی عراق کا ایک فوجی سالار اور صوبائی گورنر، جس نے بغداد کے ایک کمزور پاشا کے عہد میں ۱۰۲۹ھ / ۱۶۱۹ء - ۱۶۲۰ء تک اپنے سفاکانہ مظالم سے ایک نمایاں فوجی اور غیر فوجی حیثیت حاصل کر لی۔ لڑائی میں کامیابی کے بعد اس نے دارالحکومت میں اپنے دشمنوں کی سازشوں کے خلاف ایک سخت جہاد کی کارروائی کی اور صوبے میں مؤثر نظم و ضبط قائم کر کے سلطان کو عرضداشت بھیجی کہ اسے سرکاری طور پر بیلر بے کا خطاب عطا کیا جائے؛ پھر اسے خود ہی اختیار بھی کر لیا اور سلطان سے اس کی سرکاری منظوری کی درخواست کی، لیکن سلطان نے یہ درخواست مسترد کر دی اور بغداد میں نظم و ضبط اور امن بحال کرنے کے لیے قریب ترین اطاعت گزار صوبے دیاربکر سے فوجیں روانہ کیں۔ شاہی اور غاصب فوجوں کے درمیان کئی ہفتے تک شدید مقابلہ رہا، جس کے بعد بکر نے عیارانہ غداری سے ایران کے شاہ عباس کو عراق پر دوبارہ قبضہ کرنے کی دعوت دینے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح دیاربکر کا والی حافظ احمد [پاشا] بادل ناخواستہ بکر کو صوبے کا پاشا تسلیم کرنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ اس وقت صرف وہی ایک ایسا شخص تھا جو اس ترکی علاقے کے ایسے شرمناک طور پر ایران کے حوالے کر دینے کو روک سکتا تھا۔ وفادار فوجیں پیچھے ہٹ گئیں اور ایرانی فوجیں شہر کے قریب آ پہنچیں۔ بکر نے شہر کے دروازے کھولنے سے انکار کیا۔ شاہ عباس

۱۹۰۸ء کے بعد تک بھی جاری رہیں۔

۱۹۲۵ء کے موسم خزاں میں تمام درویشی سلسلوں کی طرح سلسلہ بکتاشیہ کو بھی ختم کر دیا گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بکتاشی ہی تھے جنہوں نے جمہوریہ ترکیہ کے لیے متعدد اقدامات کا دروازہ کھول دیا تھا (راسخ اسلامی عقیدے سے تعلق، عورتوں کا مقام)۔ آج کل بکتاشی جزیرہ نمائے بلقان خصوصاً البانیا میں، جہاں ان کی بڑی خانقاہ تیرانہ میں واقع ہے، اپنی ہستی باقی رکھے ہوئے ہیں۔ بعض سرکاری دستاویزات کے مطابق ترکی میں ۱۹۵۲ء تک بھی تیس ہزار بکتاشی تھے (قب) (COC، ۱۹۵۲ء، ص ۲۰۶)۔

مآخذ : محققانہ جستجو کا راستہ دکھانے والی تحریریں G. Jacob اور کوپرولو زادہ محمد فواد اور ان کے دبستان کے مطالعات ہیں۔ ان تحریروں اور باقی ماندہ کتابیات کا ذکر ذیل کی کتاب میں ہے: (۱) J. K. Brige: *The Bektashi Order of Derwishes*، لندن و ہارٹفرڈ، ۱۹۳۷ء؛ (۲) Fr. Taeschner در *OLZ*، ۳۲ (۱۹۳۹ء): ۷۵۱ تا ۷۵۶؛ نیز (۳) H. H. Schaefer در *OLZ*، ج ۳۱ (۱۹۲۸ء)، ص ۱۳۰۸ تا ۱۰۵۷؛ (۴) H. Jansky در *OLZ*، ۲۹ (۱۹۲۶ء): ۵۵۳ تا ۵۵۹؛ (۵) F. Babinger: *Das Bektashikloster Demir*؛ (۶) Else Krohn: *Baba Vorislamisches in einigen vorderasiatischen Sekten und Derrischorden*، در *Ethen. Studien*، ۱: ۲۹۵ تا ۳۳۵؛ (۷) وہی مصنف: *Kleine Beitrage zur Kenntnis islamischer Sekten. und Orden auf der Balkanhalbinsel*، در *Mitteilungs. der Ges. für Völkerkunde*؛ (۸) (۱۸) ترکی، بذیل مادہ بکتاش (از محمد فواد کوپرولو): (۸) عبدالباقی گول بناری: ولایت نامہ، استانبول ۱۹۵۸ء؛ (۹) E. E. Ramsaw: *The Bektashi*، در *Moslem World*، *Dervishes and the Young Turks*

تیم اللہ (تیم اللات) اور قیس کے ذیلی قبائل میں منقسم تھا۔ قبیلہ بکر کے لوگ یمامہ کے علاقے میں رہتے تھے اس وقت العریض (= وادی حنیفہ) اور اس کے معاونین لعی (نقشوں میں شیب ہا)، نساح اور السلی، جنوب کی سمت الخرج کا ضلع اور آب پاش (watershed) کے شمال میں ضلع الوتر اور اس کے معاونین بھی اسی علاقے میں شامل تھے۔ الیمامہ کا دارالحکومت الحجر (موجودہ ریاض کے قریب) پہلے بنو حنیفہ کے قبضے میں تھا۔ بعد میں بکر کے دوسرے قبیلوں کے لوگ بھی وہاں جا کر آباد ہو گئے۔ الحجر کے جنوب مشرق میں دوسرے بڑے شہر جو (جو الیمامہ، بعد ازاں الخضریہ) میں بھی رہے۔ بنو حنیفہ آباد تھے۔ وہ قرآن اور ملہم کے نخلستانوں کے مالک بھی تھے، جو آب پاش (watershed) کے پرے واقع تھے۔ شمال مغرب میں الوشم اور السدیر کے علاقوں میں بھی بنو حنیفہ کی بستیاں موجود تھیں۔ ذہل بن ثعلبہ (قریہ بنی) سدوس میں (جس کا نام ان کے ایک ذیلی قبیلے کے نام پر تھا) ایک وادی [ندی] کے کنارے رہتے تھے، جو الوتر میں گرتی تھی اور قیس بن ثعلبہ دوسرے مقامات کے علاوہ، ریاض کے جنوب میں، منفوحہ میں رہتے تھے۔ یشکر، عجل اور شیبان کے گانوں کے وجود کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ جو اور الحجر اس قدیم ثقافت کے مقامات تھے جسے متأخر داستانوں میں سسم و جدیس کے گم شدہ قبیلوں، سے منسوب کیا گیا ہے۔ الحجر کے پتھر کے مینار ابتدائی اسلامی عہد تک بھی دیکھے جا سکتے تھے، لیکن جو میں یہ مینار جنوبی عرب کے قبیلہ حسان کے ایک فرد کے حملے کے دوران میں تباہ و برباد ہو گئے تھے (الأعشی، عدد ۱۱۳، ص ۱۶ تا ۲۱)۔

تمام نخلستانوں میں کھجور کے درختوں کی

نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور بالآخر صوباشی کے اپنے بیٹے نے غداری سے شہر کو دشمنوں کے حوالے کر دیا۔ بغداد تاخت و تاراج ہوا، سینکڑوں قتل ہوئے اور بکر کو بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد عراق ایرانیوں ہی کے زیر تسلط رہا تاآنکہ ۱۰۳۸ھ / ۱۶۳۸ء میں سلطان مراد [رابع] نے اسے دوبارہ فتح کیا۔ [اس سلسلے میں دیکھیے وہ منظوم خط و کتابت جو حافظ احمد پاشا اور سلطان مراد (م ۱۶۴۰ء) کے درمیان ہوئی تھی (History of Ottoman Poetry: Gibb، ج ۶)۔]

مآخذ: (۱) S. H. Longrigg، Four centuries of Modern Iraq

(۱۹۲۵ء)، ص ۵۱ تا ۵۷ اور وہ مآخذ جن کا وہاں حوالہ دیا ہے (ص ۵۱، حاشیہ) بالخصوص (۲) مرتضیٰ ناظم زادہ: گلشن خلفا (طبع Longrigg)، ص ۳۲۷۔

(S. H. LONGRIGG)

بکر بن وائل: وسط عرب، مشرقی عرب اور

(بعد میں) شمالی عرب کے عرب قبیلوں کا ایک گروہ۔ بنو عبدالقیس [رک بان] کی طرح بنو بکر بھی انہیں لوگوں میں سے تھے جو بعد میں ربیعہ کے نام سے مشہور ہوئے۔ انساب قبائل [عرب] میں ان کا مقام مؤخر الذکر قبیلے سے تین درجے نیچے ہے۔ ثعلبہ (بن عکابہ) کو بنو بکر کی اصل سمجھا جاتا ہے۔ Joshua Stylites (فصل ۷۵) نے ۵۰۳ء کے تحت اسی قبیلے کو شمالی عرب کی سلطنت کنندہ کا سرکردہ قبیلہ بتایا ہے اور اسی کے کچھ عرصے بعد ان کا نام جنوبی عرب کے ایک کتبے میں ملتا ہے (Ryckmans، ص ۵۱، Le Muséon، ۱۹۵۳ء)۔ قبیلہ بکر کے شجرہ نسب میں بنو ثعلبہ، بنو عجل اور حنیفہ بن لجم ایک ہی سطح پر ہیں اور یشکر بن بکر ان سے تین درجے اوپر ہیں۔ خود قبیلہ ثعلبہ، بنو شیبان، ذہل،



میں کہیں چھٹی صدی کے وسط میں جا کر ایک صلح نامے سے ختم ہوئی (معلقہ، العارث بن حلزہ، طبع آرنلڈ، ص ۶۶) یوم کلاب اول (۵۰۳ء کے قریب، دواہمی کے جنوب مغرب میں تہلان کے مقام پر، سلطنت کیندہ کے دو وارثوں کے درمیان ایک لڑائی) کو بجا طور پر اس خانہ جنگی کا ایک اہم واقعہ سمجھا جاتا ہے۔ تھوڑی مدت بعد بنو تغلب نے، جو اس وقت بالائی سر میں ساجر سے خلیج فارس کے قریب نطاعی تک کے علاقوں میں نقل مکانی کرتے رہتے تھے (المفضلیات، ص ۳۳، سطر ۱۳؛ معلقہ، العارث، شعر ۷۹)، جنوبی عرب سے ترک وطن کیا اور فرات زبیر کے اطراف کے قریب لق و دق میدانوں میں جا کر آباد ہو گئے، جہاں قیاس کہتا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ پہلے سے آباد ہو چکے تھے۔ ان کے بعد بنو بکر نے بھی ادھر کا رخ کیا، لیکن وہ بطن فلج سے آگے نہیں بڑھے۔ اس وقت اور زمانہ مابعد کے شعرا نے جن مقامات کے نام لیے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنو بکر کے خانہ بدوش قبائل نے اگلے دس بیس برسوں میں جو راستے اختیار کیے وہ شمالاً جنوباً تھے۔ الطویق کے خم کی قریبی سمت میں جو علاقہ بنو تغلب اور بنو بکر نے آگے چل کر خالی کیا اس میں ۵۰۳ء سے پہلے غالباً کچھ بنو تمیم بھی منتشر طور پر آباد تھے، جن کی آبادیاں التشریر کے دونوں طرف تھیں۔ ۵۰۳ء کے بعد وہ انطویق کے اوپر مشرقی عرب تک پھیل گئے۔ چونکہ دونوں قبیلوں کی خانہ بدوشانہ گزرگاہیں ایک دوسرے کو قطع کرتی تھیں اس لیے انہیں ہر حال میں امن قائم رکھنا پڑتا تھا اور حقیقت میں سنین مابعد میں بنو بکر اور بنو تمیم کے مابین لڑائیوں کا تذکرہ نہیں ملتا۔

جس زمانے میں بکر، تغلب، تمیم اور شاہان کندہ و العیرہ کے باہمی تعلقات کی برابر بدلتی ہوئی

کاشت ہوتی تھی، لیکن وادی العرض اور الخرج میں اناج بویا جاتا تھا۔ جب فصل اچھی ہوتی تھی تو اناج مکے کو برآمد بھی کیا جاتا تھا، لیکن جب فصل اچھی نہیں ہوتی تھی تو یہ مقامی آبادی کے لیے بھی کافی نہیں ہوتا تھا (المتمیس، طبع Vollers، عدد ۵، ص ۸؛ الأعشی، عدد ۱۹، ص ۲۳ و عدد ۲۳، ص ۲۲ تا ۲۳؛ ابن ہشام، ص ۹۹۷ بعد)۔ چونکہ بنو بکر کے دیہات ایک دوسرے سے متصل تھے، اس لیے ان کے درمیان بعض اوقات خانہ جنگیاں بھی ہوتی رہتی تھیں، جن میں نخلستانوں کو آگ لگا دی جاتی تھی (الأعشی، عدد ۱۵، ص ۵۶ تا ۵۷ و عدد ۳۸، ص ۹ تا ۱۱؛ یاقوت، بذیل مادۃ المحرقہ، سدوس کے نیچے)۔ بنو بکر میں سے بعض نے ان حالات سے بچنے کے لیے ترک وطن کیا اور مستاجر سپاہیوں میں شامل ہو گئے (اوس بن حجر، طبع Geyer، عدد ۱۳؛ المفضلیات، طبع Lyall، عدد ۱۱۹) اور کئی قبیلے خانہ بدوش ہو گئے؛ آگے چل کر زیادہ تر قبیلوں نے یہی زندگی اختیار کر لی۔

عین ممکن ہے کہ بدوی زندگی کا یہ سلسلہ پانچویں صدی کے نصف آخر میں بنو کیندہ کے ظہور کے وقت شروع ہوا ہو (مقالہ عبدالقیس، سطر ۱۳ میں یوں ترمیم کر لیں: چھٹی سے پانچویں صدی تک)۔ ہمیں اس کے متعلق کوئی قطعی معلومات حاصل نہیں کہ بنو بکر کے خانہ بدوش قبیلوں نے اس زمانے میں کونسے راستے اختیار کیے تھے، گو بعد کے ماخذ (Ryckmans، ص ۵۱؛ المفضلیات، ص ۳۳ سطر ۱۳) سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ الیمامہ کے مغرب (اور مشرق؟) کی سمت گئے تھے۔ اس زمانے میں بنو بکر اور ان کے بھائی بند بنو تغلب کے درمیان ایک طویل خانہ جنگی ہوئی اور مکے کی زبیر سرپرستی حرم سے باہر ذوالمجاز

نوعیت کا تقاضا تھا کہ سیاسی بصیرت رکھنے والے رہنما پیدا ہوں، شیوخ کے کئی ممتاز گھرانے معرضِ ظہور میں آئے؛ چنانچہ E. Bräunlich کی کتاب بسطام بن قیس (لائپزگ ۱۹۲۳ء) کا بطل داستان انہیں خاندانوں میں سے ذوالجدین کا ایک فرد ہے۔ الحیرہ سے تعلقات کی بنا پر ابتدائی زمانے ہی میں شاعری نے ترقی کی، بالخصوص قبیلہ قیس بن ثعلبہ کے ہاں؛ ثبوت کے لیے دیکھیے حسب ذیل شعرا کے اشعار: المرقيش (اس سے متعلق داستان پہلی مرتبہ طرفہ کے ہاں ملتی ہے، الشعراء الستة، عدد ۱۳، شعر ۱۳ تا ۱۹، جو الحیرہ کے ایک متأخر شاعر کی نقل ہے؛ خیال رہے کہ المرقيش الاصغر کا کبھی کوئی وجود نہ تھا جیسا کہ الفرزدق کے کلام (نقائض، قصیدہ ۲۰۰، شعر ۱۵) سے ظاہر ہے)؛ عمرو بن قیسہ [رک باں]، جس نے امرؤالقیس کے ساتھ کبھی بوزنظیم کا سفر نہیں کیا؛ طرفہ؛ الاعشى، جو ساتویں صدی تک زندہ رہا۔ بنویشکر کے ہاں بھی شعر و شاعری نے فروغ پایا اور انہیں میں سے حارث بن حیلزہ بھی تھا۔

۵۶۹ - ۵۷۰ء میں قبیلہ بنو تغلب کے سردار عمرو بن کلثوم کے ہاتھوں الحیرہ کے بادشاہ عمرو ابن ہند کے قتل ہو جانے کے بعد بنو تغلب فرات زبیر کے چٹیل میدانوں کو خالی کر کے دریا کے اوپر کی طرف چلے گئے تو خانہ بدوش بنو بکر گویا ایک نئے دور میں داخل ہوئے۔ ۵۸۰ء کے قریب ایک شاعر کہتا ہے (المفضليات، عدد ۳۱، شعر ۱۱):

وَبَكَرَتْهَا ظَهْرَ الْعِرَاقِ، وَإِنْ تَشَأْ  
يَعْلُ دُونَهَا مِنَ الْيَمَامَةِ حَاجِبٌ

یعنی قبیلہ بنو بکر، عراق کا تمام وسیع میدان ان کا ہے، لیکن اگر وہ ایسا چاہیں تو ان کے گھروں کی حفاظت کے لیے یمامہ سے ایک مدد آ پہنچی

ہے۔ تقریباً دس سال کے بعد بنو تمیم، بالخصوص بنو یربوع نے موسم بہار میں الحزن میں خیمہ زن ہونے کے لیے آگے بڑھنا شروع کیا۔ اس طرح باہمی حملوں کا آغاز ہوا (جن میں سے کچھ حملے ۶۰۵ء اور ۶۱۵ء کے مابین ہوئے)، جن کا تذکرہ Bräunliche نے مذکورہ بالا کتاب میں کیا ہے۔ اس عہد کے خانہ بدوش قبائل بنو بکر کے متعلق بہت سے حالات معلوم ہیں نیز ان علاقوں کا بھی کچھ علم ہے جن میں وہ پھیلے ہوئے تھے۔ یہ قبیلے بنو شیبان، بنو عجل، بنو قیس اور تیم اللات بن ثعلبہ تھے۔ بنو عجل مغرب میں اس مقام تک گئے جو آگے چل کر کوفی حاجیوں کا راستہ بنا، اور مشرق میں تقید تک؛ بنو شیبان نے اپنے خیمے (خلیج کویت کے قریب) الکاظمة کے خط کے شمال و جنوب، یعنی رأس العين (= البسیہ؟) میں نصب کیے، بنو سلمان، اور قیس بن ثعلبہ نے ان علاقوں کے جنوب مشرق میں المسنہ (یاقوت میں غلط طور پر المثناة) اور رأس العين (الاعشى، عدد ۱۳، شعر ۲ و عدد ۲۹، شعر ۲۳) کے مابین ڈیرے ڈالے۔ تیم اللات، قیس اور عجل نے وفاق لہازم قائم کیا تا کہ بنو شیبان ان پر غالب نہ آسکیں۔ یہ بات قطعیت کے ساتھ معلوم نہیں کہ شمال میں رہنے والے بنو بکر سردیاں کہاں گزارتے تھے، لیکن قیس بن ثعلبہ کے بارے میں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کم از کم اسی برس الیمامة اور شمال کے مابین ایک جگہ سے دوسری جگہ آتے جاتے رہے (الاعشى، عدد ۳۲، ایک ابتدائی نظم، بالخصوص عدد ۵، شعر ۳۸)۔ بنو شیبان گاہ بگاہ مشرقی عرب میں نخلستان بحرین تک جاتے رہے، اور بنو عجل بظاہر شمال ہی میں رہے۔ گرمی کے دنوں میں عین صید اور ابوغر کے درمیان طرف کے اس طرف جہاں کہیں پانی دستیاب ہوتا تھا یہ قبائل وہیں اکھٹے ہو جاتے تھے۔ یہی



کی کتاب الاصنام میں نہیں ملتا۔  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ سے  
 پیشتر ہی ہوذہ بن علی، والی یمامہ، کو دعوت اسلام  
 بھیجی، لیکن آپ کی اس دعوت کا جواب سرد مہری  
 اور تکبر سے دیا گیا۔ العَجْر میں اس کا جانشین  
 سَیْلَمہ تھا۔ تعجب ہے کہ سیرۃ اور ردۃ کے تمامۃ  
 بن اثال کا ذکر ابن الکلبی کے دیے ہوئے نسب ناموں  
 میں نہیں ملتا، حالانکہ اس سلسلے میں اس کتاب کی  
 بنیاد بنو بکر کی ایک سند پر ہے۔ مشرقی عرب  
 میں ردہ کے متعلق، جس کی ابتدا قیس بن ثعلبہ سے  
 ہوئی تھی، کچھ نہ کچھ معلومات Wellhausen:  
*Skizzen und Vorarbeiten*، ۶: ۲۰، بعد، میں مل  
 سکتی ہیں۔ جب بنو بکر شمال میں تھے انہوں نے  
 مدائن کی متنازع فیہ جانشینی (۶۲۸ تا ۶۳۲ء)  
 سے فائدہ اٹھا کر کھیتوں کو خوب لوٹا (جیسا کہ  
 وہ ذوقار سے پہلے کر چکے تھے)۔ اس موقع  
 پر [قبیلہ] ذہل بن شیبان کے ایک سردار المثنیٰ بن  
 حارثہ نے ناموری حاصل کی اور جب اسے ردہ کی  
 شکست کی اطلاع ہوئی تو اس نے اسلام قبول کر لیا  
 اور خالد بن ولید کی معیت میں اس نے ایسے  
 حالات پیدا کیے جن سے آگے چل کر الحیرہ کو  
 ہتھیار ڈالنے پڑے۔ ۶۳۴ء کے شروع میں حضرت  
 خالد بن ولید کی شام کی طرف روانگی کے بعد جب مسلمان  
 مدافعانہ جنگ لڑ رہے تھے تو اس نے ۶۳۴ء  
 کے موسم خزاں میں جنگ الجسر سے پسپا ہوتی  
 ہوئی مسلمان فوجوں کی حفاظت کی۔ اس کا آخری  
 شاندار کارنامہ ایک سال بعد بویب کی لڑائی تھی،  
 جس میں وہ زخمی ہو کر فوت ہوا۔ بنو بکر (اور  
 بنو تمیم؟) نے بھی اس علاقے کو، جو آگے چل کر  
 بصرے کا صوبہ بنا، فتح کرنے کے لیے زمین ہموار کی۔  
 بنو عجل اور بنو حنیفہ نے ۶۳۲ء میں جنگ نہاوند  
 میں حصہ لیا۔ بنو بکر بصرے سے فوجیں لے کے

علاقہ ہے جس میں ۶۰۵ء کے لگ بھگ ذوقار  
 کی مشہور جنگ لڑی گئی اور بنو شیبان نے  
 ہامرز [رکبان] کے ایرانی سوراؤں کے ہراول  
 دستے کو پسپا کیا (الاعشی، عدد ۴)۔ اس کے باوجود  
 بنو بکر جلد ہی دوبارہ ایرانیوں کے زیر اقتدار  
 آ گئے۔ اسی زمانے میں بنو بکر اور بنو تمیم کی لڑائی  
 شمال سے بڑھ کر وسط عرب تک پھیل گئی اور اس  
 میں بنو تمیم نے جو کے شہزادے ہوذہ بن علی کو،  
 جو قبیلہ بنو حنیفہ سے تعلق رکھتا تھا اور ایرانیوں  
 کا باج گزار تھا، بہت پریشان کیا تا آنکہ بحرین  
 کے ایرانی گورنر نے بڑی سختی سے ان کی قوت کا  
 خاتمہ کر دیا (دیکھیے الاعشی، عدد ۱۳، شعر ۶۲  
 تا ۶۹)۔ اس واقعے کے بعد ہم اسلامی دور میں  
 پہنچ جاتے ہیں۔

شمال میں بھی اور جنوب میں بھی، بنو بکر  
 میں سے بعض نے، بالخصوص بنو عجل اور (شیبان  
 میں سے) ذوالجدین نے مسیحیت اختیار کر لی تھی؛  
 چنانچہ الاعشی اور ہوذہ بن علی مسیحی تھے۔ سَیْلَمہ  
 (کذاب) [رکبان] کے ساتھ یمامہ کی وابستگی سے  
 ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں مسیحیت کی بنیادیں مضبوط  
 نہیں ہوئی تھیں، لیکن شمال میں صورت حال اس کے  
 برعکس تھی: بنو عجل میں سابق [قائد عسکر]  
 ابجر بن جابر کی مثال ملتی ہے، جس نے ۶۴۱ء میں کوفے  
 میں ایک مسیحی کی حیثیت سے وفات پائی؛ ایسے ایک  
 استثنائی واقعہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ ذوالجدین  
 بھی مسیحی عقائد پر قائم رہے۔ دور جاہلیت کی  
 بت پرستی سے متعلق عمرو بن قبیثہ، عدد ۲، شعر  
 ۹ تا ۱۵، میں ایک دلچسپ بیان ہے، لیکن بعد کے  
 شعرا کے ہاں مشکل سے ہی کوئی ذکر ملتا ہے  
 اس کے سوا کہ الاعشی، عدد ۳۹، شعر ۲، کو شمار  
 کر لیا جائے؛ اسی طرح بنو سلمان کے بت معرق  
 (باقوت: ج ۴، بذیل مادۃ معرق) کا ذکر ابن الکلبی

بڑھنا شروع کیا، جہاں وہ دریائے دجاہ کے دونوں کناروں پر آباد ہو گئے۔ عمرو بن قمیہ کے دیوان (عدد ۱۶) میں اتفاق سے تین ایسے شعر آ گئے ہیں جن میں ایک ایسی لڑکی کے جذبات کی مصوری کی گئی ہے جو ساتیڈما (غالباً شہر کے بالمقابل، جبل مقلوب) تک اجنبی علاقوں میں اس سفر کے دوران وطن کی یاد میں بے قرار ہے۔ قبیلہ ذہل بن شیبان کے معزز و ممتاز خارجی قائد شیب بن یزید (م ۶۹۷) سے متعلق ابومخنف کی اطلاعات (الطبری، ج ۲) میں اس وقت کی بدوی اور حضری زندگی کے درمیان عجیب و غریب قسم کی کشمکش کا ذکر ملتا ہے۔ بنوبکر وہاں سے شمال میں دیاربکر (بعد کا نام) اور آذربایجان تک پھیل گئے۔

بنوشیبان نے ایک بار پھر ایک وسیع خانہ بدوش قبیلے کی صورت میں زندگی بسر کی۔ وہ موسم بہار اور موسم گرما میں بالائی اور زیریں زاب کے درمیان خیمہ زن ہوتے تھے اور موسم سرما میں کوفے کے نچلے علاقوں تک چلے جاتے تھے۔ نویں صدی میں انہوں نے موصل کے میدانی علاقوں پر بکثرت حملے کیے، جنہیں روکنے کے لیے خلیفہ المعتضد کی سرکردگی میں ۸۹۳ء میں ایک مہم شروع ہوئی۔ گیارہویں صدی میں انہوں نے عراق کے مزروعہ اور آباد علاقے پر پیش قدمی کی، لیکن آئندہ صدی کے آغاز ہی میں وہاں سے غائب ہو گئے۔ بصرے اور خراسان میں بکر اور عبدالقیس اور شرقی جزیرہ (= دیار ربیعہ) میں بکر و تغلب کے قبائلی ناموں کے بدلے ربیعہ کا نام استعمال ہونے لگا۔ یہی صورت عرب میں بھی پیش آئی۔ آل سعود کا شاہی خاندان اپنا سلسلہ ربیعہ ہی سے ملاتا ہے۔

مآخذ: (۱) ابن الکلبی: جمہرۃ الأنساب، مخطوطہ لندن، ورق ۱۹۳ الف تا ۲۲۶ ب و مخطوطہ اسکوریا، ورق ۱ تا ۹۴؛ (۲) الطبری، بحد اشاریہ؛ (۳) نقایض جریر

خراسان پہنچے اور ۷۱۵ء میں وہاں ان کی تعداد سات ہزار تھی (الطبری، ۲: ۱۲۹۱)۔ ان دونوں مقامات پر قبائلی خانہ جنگی پھیلانے کی جزوی ذمے داری انہیں پر عائد ہوتی ہے، جو وہاں ایک زیادہ وسیع پیمانے پر جاری رہی۔ بصرے میں انہوں نے بنو عبدالقیس سے مل کر ربیعہ نامی گروہ بنا لیا اور بعد میں آزد عمان سے مل گئے، جو ۶۸۰ء کے قریب نقل وطن کر کے آئے تھے۔ چونکہ بنو تمیم بصرے میں گروہ قیس (اہل العالیہ) کے ساتھ وابستہ تھے اس لیے ان کے درمیان پھر اختلافات پیدا ہو گئے، لیکن دونوں گروہوں کی یہ لڑائی کچھ عرصے جاری رہ کر ۶۸۴ء میں یزید اول کی موت پر ختم ہو گئی اور ۶۹۰ء میں جب (قبیلہ قیس بن ثعلبہ کے ایک ممتاز فرد) مالک بن یسعم نے خلیفہ عبدالملک کی حمایت کا اعلان کیا تو بنوبکر کو امن میسر ہوا۔ خراسان میں البتہ صورت حال مختلف تھی، جہاں ۶۸۴ء میں بنوبکر اور بنو تمیم کے درمیان ایک خونریز لڑائی ہوئی اور اس نے آزد، ربیعہ اور قیس تمیم کے درمیان ایک مستقل اختلاف کی صورت اختیار کر لی، جو کہیں اس وقت جا کر ختم ہوا جب یہاں بھی بنوبکر میں ایک ہوشمند قائد (یحییٰ بن حنین) پیدا ہوا۔ اس قبیلے کی آخری قابل ذکر شخصیت بنو ذہل کا سپہ سالار اور مدبر معن بن زائدة [رک باں] تھا۔

غیر آباد نواحی بصرہ میں تو بنوبکر کا خاتمہ بہت جلد ہو گیا، لیکن کوفے کے قرب و جوار میں وہ زیادہ دیر تک رہے۔ بنو عجل کی بود و باش اپنے خانہ بدوش علاقے میں رہی، جسے انہوں نے شمال مشرق کی طرف وسیع کر لیا، لیکن بنوشیبان نقل وطن کر کے شمال مغرب میں اللصف کے چشموں تک چلے گئے، جو کوفے سے زیادہ دور نہیں تھے اور بعد میں انہوں نے بڑی تعداد میں شمال میں موصل کی طرف



البکری تیرھویں صدی کے نصف آخر میں ہوا ہے۔ اگرچہ اس نتیجے کو سر دست بہت کچھ معطل نظر قرار دینا ضروری ہے، تاہم البکری کی سببہ شخصیت کے تاریخی ہونے میں شبہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ اگر ”بصری واعظ“ کا لقب جو بعض موقعوں پر اسے دیا گیا ہے، قابل اعتبار مانا جائے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ عراق میں مستعد و سرگرم عمل تھا۔

یہ بات کسی طرح بھی قابل وثوق نہیں ہے کہ البکری کے نام سے منسوب تمام تصانیف ایک ہی مصنف کی لکھی ہوئی ہیں، مثلاً سیرۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں حقیقی مصنفین اور تصانیف کے اقتباسات موجود ہیں، بحالیکہ بعض دوسری کتابوں میں ماخذ کے حوالے سببہ اور مشتبه ہیں اور اگر شاذ و نادر کہیں راویوں کا نام دیا گیا ہے تو ان کے فرضی نام اختیار کیے گئے ہیں۔ مزید برآں بظاہر الذہبی کو اس سیرت کا علم نہ تھا اور ابن حجر (لسان، ۱: ۲۰۲) نے الذہبی سے اس کے سوانح حیات نقل کرتے ہوئے اس سیرت کا اضافہ کیا ہے۔ اس کی مختلف تصانیف یا ان کے ترمیم شدہ نسخوں میں باہمی تعلق کی ابھی تک تحقیق نہیں ہوئی، اور کسی صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ان متعدد قلمی نسخوں کا مطالعہ کیا جائے جو دور دور تک منتشر کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔

ماخذ: (۱) مغرب میں البکری سے متعلق معلومات L. Marracci سے شروع ہوتی ہیں، قہب C.A. Nallino: Raccolta di scritti، ۲: ۱۱۵؛ قہب نیز R. Paret: Die legendäre Maghāzi-Literature، ٹوبنگن، ۱۹۳۰ء، ص ۱۵۵ تا ۱۵۸؛ (۲) براکلمان، ۱: ۴۴۵ و تکملة، ۱: ۶۱۶ (یہ بیان بنیادی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اغلاط بھی ہیں)؛ (۳) ابن حجر الہیتمی: الفتاوی العبدیة،

والفرزدق، طبع Bevan بمدد اشاریہ؛ (۴) M. Frh. von Wiesbaden: Die Beduinen، ج ۳، Wiesbaden، ۱۹۵۲ء، ص ۲۱۱، بعد، ۳۵۱، بعد؛ (۵) Ulrich Thilo: Die Ortsnamen in der altarahischen Poesie، Schrifton der Frh. von =) ۱۹۵۸ Wiesbaden؛ (۶) ابن حزم: جمهرة انساب العرب، بمدد اشاریہ خصوصاً ص ۳۱۲؛ تمامہ بن اثال کا نسب؛ (۷) البلاذری: انساب الاشراف، جلد اول، بمدد اشاریہ؛ (۸) القلقشندی: نہایۃ الارب؛ (۹) عمر رضا کحالیہ: معجم قبائل العرب، ۱: ۹۳ تا ۹۹؛ (۱۰) (۱)، عربی، بذیل مادہ]۔

(W. CASHEL)

بکروش: رک بہ بخاریسٹ۔  
 البکری: رک بہ بکریہ و [محمد بن عبدالرحمن صدیقی و محمد بن محمد] صدیقی۔  
 البکری: ابوالحسن احمد بن عبداللہ بن محمد؛ بظاہر یہی اس [قصہ گو] کے نام کی سب سے زیادہ مقبول شکل ہے جسے اسلام کے ابتدائی سنین سے متعلق تاریخی قصوں کا مصنف یا راوی مانا جاتا ہے۔ اس کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک ”مولد“ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو افسانوی رنگ میں لکھا ہے۔ اس کی زندگی کے سب سے پہلے حالات الذہبی کی میزان، قاہرہ ۱۳۲۵ھ، ۱: ۵۳، میں ملتے ہیں۔ الذہبی اسے کذاب اور جھوٹے قصوں کا مخترع بتاتا ہے۔ جب ہم ان مزید واقعات پر نظر ڈالتے ہیں کہ اس کی ایک کتاب کے مخطوطے (Vatican Borg)، عدد ۲۵) پر ۵۶۹۳/۱۲۹۵ء کی تاریخ دی گئی ہے اور تیرھویں صدی کے اواخر کے بعض مصنفین تک کا حوالہ اس کی سیرۃ النبی میں موجود ہے (Verzeichniss der arab. Hss .....: Ahlwardt) zu Berlin، عدد ۹۶۲۳) تو ماننا پڑتا ہے کہ

نام ذخیرۃ العلوم و نتیجۃ الفہوم ہے (Pertsch) :  
*Die ar. Hdss. zu Gotha*، عدد ۱۵۷۸۔

مآخذ: (۱) علی پاشا مبارک: "الخطّ التوفیقیہ

الجدیدہ، بولاق ۱۳۰۶ھ، ۳: ۱۲۷؛ (۲) Wüstenfeld:

*Die Geschichtsschreiber der Araber*، عدد ۵۲۰؛

(۳) براکلمان، ۲: ۳۳۳، ۳۸۲ و تکملہ، ۲: ۳۸۱؛

تا ۳۸۲؛ (۴) ابن العماذ: شذرات، ۸: ۲۹۲؛ (۵)

الزرکلی: الاعلام، ۷: ۲۸۵ تا ۲۸۶، بالخصوص حاشیہ

ص ۲۸۶۔

(C. BROCKELMANN)

• البکری بن ابی السرور: دو عرب مؤرخوں

کا نام جو طریقہ بکریہ (سلسلہ شاذلیہ) کے مصری شیوخ کے ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔

(۱) محمد بن ابی السرور بن محمد بن علی

الصدیقی المصری ۱۰۲۸ھ/۱۶۱۹ء، حن کی تصانیف

میں حسب ذیل کتب شامل ہیں: ایک تاریخ عالم

دو حصوں میں (عیون الأخبار اور نزہۃ الأبصار، نیز

اس کا خلاصہ بعنوان تحفة (یا تذکرۃ) الظرفاء)۔ عثمانی

ترکوں کی کئی تاریخیں (فیض المنان، الدرر الاثمان

فی اصیل منبع آل عثمان اور المنح الرحمانیہ، جس کے

ساتھ اللطائف الربانیہ کے عنوان سے مصر کی بابت

ایک ضمیمہ بھی ہے)، مصر کی عثمانی فتح پر ایک

تصنیف الفتوحات العثمانیہ اور ایک تصنیف التفریح

الکبری فی دفع (او رفع) الطلبة، جس میں ۱۰۱۷ھ/

۱۶۰۸ء-۱۶۰۹ء میں محمد پاشا والی مصر کے

"حق الطریق" نامی ٹیکس کو موقوف کرنے کی

کوشش کا ذکر ہے۔

مآخذ: براکلمان، ۲: ۳۸۸ و تکملہ، ۲: ۳۱۲؛

(۲) Wüstenfeld: *Geschichtsschreiber*، عدد ۵۵۲؛ (۳)

Babinger، ص ۱۳۷؛ (۴) حاجی خلیفہ: طبع فلوگل،

اعداد ۲۶۱۹، ۳۹۸۱، ۸۳۵۸، ۹۳۲۵، ۱۳۱۵۲؛

(۵) اسمعیل پاشا بغدادی: ہدیۃ العارفین، استانبول

قاہرہ ۱۳۵۳ھ/۱۹۳۳ء، ص ۱۱۶، جس میں البکری

کی لکھی ہوئی سیرۃ النبیؐ کا پڑھنا ممنوع قرار دیا

ہے۔ مزید برآں رک بہ مغازی اور تاریخ؛ [(م) الذہبی:

میزان الاعتدال، جہاں البکری پر حسب ذیل الفاظ میں

تفقید کی ہے: احمد بن عبد اللہ البکری ذاک الکذاب

الدجال واضح القصص التي لم تكن قط فما أجهل وأقل

حیاء وما روى حرفاً من العلم بسند... الخ؛ (۵) الزرکلی:

الاعلام، بذیل مادہ]۔

(F. ROSENTHAL)

• البکری: عبد اللہ رک بہ ابو عبید۔

• البکری: ابو المکارم شمس الدین محمد

ابن عبدالرحمن الصدیقی الشافعی الأشعری، عرب

شاعر اور صوفی، جو ۸۹۸ھ/۱۴۹۲ء میں پیدا ہوا۔

وہ باری باری ایک سال قاہرہ اور دوسرے سال مکہ

معظمہ میں رہتا تھا۔ ۹۵۲ھ/۱۵۴۵ء میں وفات پائی۔

ایک دیوان (کتاب خانہ ملی، پیرس، *Catalogue*

*des mss. ar.*، از Slane، عدد ۳۲۲۹ تا ۳۲۳۳؛

*Descriptive Catalogue of the Arabic, Pers. and*

*Turk. Mss.*، کتاب خانہ ٹرنٹی کالج، کیمبرج

۱۸۷۰ء، عدد ۵۵ تا ۵۷)، صوفیانہ نظموں کا ایک

مجموعہ ترجمان الأسرار (*Katalog der islam: Vollers*)

*usw. Hass. der Universitätsbiblioth. zu Leipzig*، عدد

۵۷۳؛ *Les mss. ar. de l'Escurial: Derenbourg*، عدد

۴۳۹) اور تصوف پر متعدد رسالوں (جن کے ایک

مجموعے کا مخطوطہ Gotha (عدد ۸۶۵) میں ہے)

کے علاوہ اس نے فتح مکہ کی ایک تاریخ افسانوی

رنگ میں نظم کی ہے اور اس کا نام الدرۃ المکملۃ فی

فتح مکة المبجلة رکھا ہے (قاہرہ ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء،

۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء، ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء، ۱۲۹۷ھ/

۱۸۷۰ء، ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء، ۱۳۰۱ھ، ۱۳۰۳ھ،

۱۳۰۴ھ)؛ علاوہ ازیں اس کی ایک تصنیف اور بھی

ہے، جس کے مضامین زیادہ تر تاریخی ہیں۔ اس کا



(الدر الجمانی) اور ایک رسالہ تصوف الدرر الاعالیٰ.

مآخذ: متن مقالہ میں مندرجہ کتب کے علاوہ (۱)

برا کلمان، ۲: ۳۸۳ و تکملہ، ۲: ۳۰۹؛ (۲) Wüstenfeld:

Geschichtsschreiber، عدد ۵۶۵؛ (۳) Babinger، ص

۱۸۸؛ [(۱۳) الزرکلی: الاعلام، ۷: ۲۹۳ تا ۲۹۴].

(STANFORD J. SHAW)

### • البکری: محیی الدین مصطفیٰ بن کمال الدین

ابن علی الصدیقی الحنفی الخلوتی، عرب مصنف

اور صوفی، جو ذوالقعدة ۵۱۰۹ھ / ستمبر ۱۶۸۸ء

میں دمشق میں پیدا ہوا۔ وہ بچپن ہی میں

یتیم ہو گیا اور اس کے چچا نے اس کی پرورش کی۔

پھر وہ خلوتیہ درویشوں کے سلسلے میں داخل

ہو گیا۔ ۵۱۲۲ھ / ۱۷۱۰ء میں وہ پہلی مرتبہ

بیت المقدس کی زیارت کے لیے گیا۔ وہاں اس نے

اپنی کتاب الادعیہ الفتح القدسی لکھی اور ادرنہ کے

علی قرہباش سے فتویٰ لیا کہ اس کی کتاب رات

کے آخری حصے میں بلند آواز سے پڑھنا بدعت نہیں،

جیسا کہ اس کے ایک مخالف نے کہا تھا۔ اسی سال

شعبان (اکتوبر ۱۷۱۰ء) میں وہ دمشق واپس

چلا آیا اور آئندہ برسوں میں متعدد بار زیارت کے

لیے بیت المقدس گیا اور وہاں وزیر راغب پاشا سے

تعارف حاصل کیا، جس کے ہمراہ اس نے ایک مرتبہ

قاہرہ کا سفر بھی کیا۔ اس سرپرست کے سایہ عاطفت

میں وہ اوائل ۵۱۳۵ھ / اکتوبر ۱۷۲۲ء میں

بیت المقدس سے استانبول کے سفر پر روانہ ہوا اور

۱۷ شعبان ۵۱۳۵ھ / ۲۴ مئی ۱۷۲۳ء کو وہاں

پہنچا۔ چار سال بعد وہ بیت المقدس واپس چلا آیا۔

۵۱۳۸ھ / ۱۷۳۵ء میں اس نے مکہ مکرمہ کا حج

کیا، جس کا ارادہ اس نے ۵۱۲۹ھ / ۱۷۱۷ء

ہی سے کر رکھا تھا، لیکن اپنے چچا سے ایک

جھگڑے کے باعث ملتوی کر دیا تھا۔ ۵۱۳۸ھ /

۱۷۳۵ء میں وہ دوبارہ استانبول گیا اور وہاں

۱۹۵۵ء، ۲: ۲۱۶۔ البکری کے والد ابو السرور

(م ۵۱۰۰ھ / ۱۵۹۸ - ۱۵۹۹ء) کے لیے دیکھیے

(۶) بحبی: خلاصہ، ۱: ۱۱۷؛ [(۷) الزرکلی، ۷: ۲۹۱].

(۲) ابو عبدالله شمس الدین محمد بن محمد بن

ابی السرور، مذکور بالا کا بیٹا.

وہ تقریباً ۵۱۰۰ھ / ۱۵۹۶ء میں پیدا ہوا

اور تقریباً ۵۱۰۶ھ / ۱۶۵۰ء میں وفات پائی۔

سمیر الاصحاب کے نام کی ایک عالمی تاریخ اور مصر

کی دو عام تاریخوں (الروضۃ المانوسۃ اور

الروضۃ (یا النزہۃ) الزہیۃ فی ولایۃ مصر القاہرۃ المعزیۃ)

کے علاوہ اس نے مصر کی ایک تیسری تاریخ

الکواکب السائرة کے نام سے بھی تصنیف کی، جس میں

دور عثمانیہ کی ۵۱۰۴ھ / ۱۶۳۳ء تک پوری تفصیلات

دی ہیں۔ اس کتاب کا، جو ابھی تک طبع نہیں

ہوئی، ترجمہ S. de Sacy نے Notices et Extraits

Manscrits de la Billiothèque du Roi، ۱، ۱۷۸۸ء:

۱۶۵ تا ۲۸۰، میں Le Livre des Étoiles errantes

کے عنوان سے کیا تھا۔ فرانسیسی نسخے سے اس کا

جرمن ترجمہ G. Hanisch نے Hildburgshausen سے

۱۷۹۱ء میں شائع کیا تھا۔ J. J. Marcel نے اپنی

کتاب Histoire d'Égypte (پیرس ۱۸۴۸ء) کے لیے

اسی کتاب اور اس کے ساتھ اس کے تتمہ تا ۵۱۱۶ھ /

۱۷۵۴ء، از مصطفیٰ بن ابراہیم (قب Marcel: کتاب

مذکور، ص XXV)، سے وسیع پیمانے پر استفادہ کیا

ہے۔ اس کی دوسری تصانیف میں ذیل کی کتابیں

شامل ہیں: ترکی فتح مصر کی تاریخ موسوم بہ

التحفۃ البسیۃ؛ المتریزی کی کتاب الخطط کا خلاصہ

بعنوان قطف الأزهار (یہ تصنیف بعض اوقات البکری

کے چچا شمس الدین ابوالحسن محمد بن زین العابدین

بن محمد بن علی (م ۵۱۰۸ھ / ۱۶۷۶ء) کی

طرف منسوب کی جاتی ہے، قب بحبی: خلاصہ، ۳:

۴۶۵)؛ صوفی شیخ العجمی الکرانی کی سوانح عمری

البکریۃ: درویشوں کا ایک سلسلہ، جس کا نام d'Ohsson کے بیان کے مطابق پیر ابوبکر وفائی کے نام پر ہے، جن کا انتقال ۵۹۰۲ / ۱۱۹۶ء میں یا ۵۹۰۹ / ۱۵۰۳ - ۱۵۰۴ء میں حلب میں ہوا۔ بقول رن Rinn (Marabouts et Khouan) یہ شاذلیۃ [رک باں] کی ایک شاخ ہیں۔

البکریۃ: اسم جمع، جو ان تمام لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو اپنا سلسلہ نسب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاتے ہیں۔ مصر میں اس خاندان کا سردار شیخ البکری ۱۸۱۱ء سے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاف کا سربراہ (= نقیب الاشراف) چلا آ رہا ہے۔ ۱۹۰۶ء سے وہ سین المشائخ، یعنی تمام صوفی سلسلوں کا شیخ ہو گیا تھا، دیکھیے RMM، ۴: ۲۴۱ بعد؛ 'Annuaire du Monde Musulman: L. Massignon' بارچہارم، ۱۹۵۳ء، ص ۲۷۳۔

بکسر: ہندوستان کے صوبہ بہار کی قسمت پٹنہ کے ضلع شاہ آباد میں ایک شہر، جو گگا کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ ۱۹۵۱ء کی سرشماری کے مطابق اس کی آبادی ۱۸۰۸۷ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں یہ بڑا مقدس مقام تھا اور لوگوں میں اپنے اصلی نام وید گریہ (= ویدوں کا بطن مادر) سے معروف تھا۔ مقامی روایات کے مطابق اس کا نام ایک تالاب کے نام سے لیا گیا ہے، جسے اصل میں آگھسر کہتے تھے، یعنی گناہوں کا مٹا دینے والا۔ بعد میں یہ نام بدل کر باگھسر ہو گیا، یعنی شیر کا تالاب۔ بکسر وہی مقام ہے جہاں میجر ہکٹر منرو Hector Munro نے ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بنگال کے سابق نواب میر قاسم اور اودھ کے نواب وزیر شجاع الدولہ کو شکست دی۔ اس فتح سے پلاسی کی مہم کی تکمیل ہو گئی۔ ان کے بعد سے انگریز بنگال کے بلا شرکت غیرے حاکم

سے سمندر کے راستے اسکندریہ اور قاہرہ ہوتا ہوا واپس آیا۔ اگلے سال وہ پھر حج کو گیا اور وہاں سے دیار بکر چلا گیا، جہاں وہ آٹھ مہینے مقیم رہا۔ ایک مرتبہ گیارہ مہینے تک نابلس میں رہ کر وہ شوال ۱۱۵۲ھ / جنوری ۱۷۴۰ء میں بیت المقدس واپس آیا۔ اپنے تیسرے سفر حج کے دوران میں اس نے ۱۸ ربیع الآخر ۱۱۶۲ھ / ۸ اپریل ۱۷۴۹ء کو قاہرہ میں وفات پائی۔ تصوف پر اس کے بہت سے رسالے، دعائیں اور نظمیں ہیں، جن کی [المرادی اور] براکلمان نے نشان دہی کی ہے (دیکھیے نیچے، نیز قبّ الحکم الالہیۃ و الموارد البہیۃ؛ دیکھیے Katalog der islam. usw. Hdds. der: Vollers Universitätsbiblioth. ek zu Leipzig، عدد ۲/۸۵ و الوصیہ الجلیلة للسالکین لطریقۃ الخلوتیۃ؛ وہی کتاب، ج ۴: A List of Arabic Mss. in: E. Littmann Princeton University Library، عدد ۳۵۱ ب)۔ یہ سب کی سب اب تک غیر مطبوعہ ہیں، بجز مجموعۃ صلوات و اوراد (قاہرہ ۱۳۰۸) کے۔ اس نے دمشق سے بیت المقدس تک اپنے پہلے سفر (۱۱۲۲ھ / ۱۷۱۰ء) کا حال اپنی کتاب بعنوان الخمرۃ الحسیۃ فی الرحلة القدسیۃ (Verzeichnis der Hdss. zu Berlin: Ahlwardt، عدد ۶۱۳۹) میں اور اپنے سفر دمشق اور وہاں کے قیام کا حال "المدامة الشامیۃ فی المقامة الشامیۃ" (وہی کتاب، عدد ۶۱۳۸) میں تحریر کیا ہے۔

ماخذ: المرادی: سلک الدرر فی اعیان القرن الثانی عشر، قاہرہ ۱۲۹۱ - ۱۳۰۱ھ، ۳: ۱۹۰ تا ۲۰۰؛ (۲) الجبرتی: عجائب الآثار فی التراجم و الاخبار، بولاق ۱۲۹۷ھ، ۱: ۱۲۵ تا ۱۲۶؛ (۳) علی پاشا مبارک: الخطط التوفیقیۃ الجدیدة، بولاق ۱۳۰۶ھ، ۳: ۱۲۹؛ (۴) براکلمان، ۲: ۳۳۸، تکملہ، ۲: ۳۷۷؛ (۵) الزرکلی، ۸: ۱۳۱۔

(C. BROCKELMANN)



(۱۰۶۶): (۸) هَيْثَمُ الْبَكَّاءُ; (۹) صَفْوَانُ بْنُ مَعْرُزٍ (الجاحظ: [كتاب] البحلاء، ص ۵): (۱۰) هَشَامُ بْنُ حَسَّانٍ (ونسک: Some Semitic Rites of Wensinck: Mourning، ص ۸۵ بعد): (۱۱) ابراہیم الْبَكَّاءُ (السلمی: طبقات، ص ۸۷)۔ اسی طرح صالح المرّی، غالب بن الجبّیّی، کھمس اور محمد بن واسع بھی گریہ و بکا کے لیے مشہور ہیں۔ ان گریہ و بکا کرنے والوں کا کوئی خاص فرقہ یا طبقہ نہیں تھا جیسا کہ نکلسن R. A. Nicholson (ERE، ۲: ۱۰۰)، ونسک A. J. Wensinck (Some Semitic Rites، Essai) L. Massignon (ص ۸۶)، H. Lammens (L. Islam، ص ۱۵۲)، Ch. Pellat (Le milieu basrien et la formation de) Gāhiz (ص ۹۴) اور ڈوزی R. Dozy (Suppl.) بذیل مادہ بکاء کا خیال ہے، بلکہ البکاء ایک عام اصطلاح ہے جس کا اطلاق ان تمام لوگوں پر ہوتا رہا جو بکثرت گریہ و زاری کرتے تھے اور افراد کے لیے اس کا استعمال محض کبھی کبھی لقب یا عرف کے طور پر ہوا ہے۔ اس اصطلاح کا مقابلہ حماد سے کرنا چاہیے جس کا ذکر حلیۃ (۵: ۶۹) میں آیا ہے اور جس کا اطلاق اس شخص پر ہوتا ہے جو رنج و راحت ہر حالت میں خدا کی حمد و ثنا کرے۔ محمد بن واسع جو خود بہت رونے والے تھے اپنے آپ کو بکاء کہلوانا پسند نہیں کرتے تھے (حلیۃ ۲: ۳۴۷)۔ قدیم اسرائیلیوں میں بھی بکاء کا ذکر آیا ہے (ابن قتیبہ: عیون الأخبار، ۲: ۲۸۴، حلیۃ، ۵: ۱۶۴)۔

ابو الدرداء اپنے گریہ و بکا کی تین وجوہ بتاتے ہیں: (۱) موت کے فوراً بعد پیش آنے والے حالات کا خوف؛ (۲) اپنی نجات کے لیے مزید کوشش کا عدم امکان اور (۳) اس بات کا دغدغہ کہ قیامت کے دن کسی کے حق میں کیا فیصلہ ہوگا (الجاحظ: البيان، ۳: ۱۵۱: ابن قتیبہ: عیون، ۲:

ہو گئے اور اودھ بھی انگریزی کمپنی کے تصرف اور قبضے میں آ گیا۔

مآخذ: (۱) The Battle: C. E. A. W. Oldham (۱) of Buxar در JBORS، ج ۱۲: ۱ تا ۳۸: (۲) A. L. Shuja-ud-Daula: Srivastava، کلکتہ ۱۹۳۹ء، ج ۱، باب ۸۔

(C. COLLIN DAVIES)

\* بکاء: جمع بکاءون اور بکاء (بکثرت گریہ و زاری کرنے والے، رونے والے)، وہ زہاد جو عبادت و ریاضت کے دوران میں بکثرت گریہ و زاری کرتے ہیں۔ توبہ و استغفار، انکسار، خشوع و خضوع اور گریہ و بکا کے ساتھ گناہوں کا شدید احساس، یہ تمام باتیں زمانہ قدیم سے مسلمان زاہدوں اور صوفیوں کی خصوصیات رہی ہیں۔ ابو نعیم کی حلیۃ الاولیاء سے گریہ و زاری کرنے والوں یا کم از کم اس عمل کو مستحسن قرار دینے والوں کی ایک طویل فہرست تیار ہو سکتی ہے۔ اس طبقے میں حسن البصری، ابن سیرین، مالک بن دینار، ابو الدرداء (ان کی کتاب الریقۃ و البکاء کے عنوان سے ایک تصنیف بھی ہے)، ابراہیم النخعی، ابو سلیمان الدارانی، فضیل بن عیاض، حبیب العجمی، عبدالواحد بن زید، سفیان الثوری، ذوالنون المصري، یحییٰ بن معاذ الرازی وغیرہ جیسے مشہور و معروف بزرگ شامل ہیں۔ تاہم ایسے لوگ معدودے چند تھے جنہیں البکاء کے عرف سے شہرت حاصل ہوئی یا کم از کم البکاء کا لقب دیا گیا۔ ان کے نام یہ ہیں: (۱) یحییٰ البکاء جو بصرے میں تھے (حلیۃ، ۲: ۳۴۷): (۲) ابو سعید احمد بن محمد البکاء (حلیۃ، ۷: ۳۸۵): (۳) مطرف بن طریف: (۴) محمد بن سوّہ: (۵) عبدالملک بن ابجر: (۶) ابو سنان ضرار بن مرّة (یہ چاروں بزرگ کوفے میں تھے (حلیۃ، ۵: ۹۱): (۷) سیار التباہی، لقب بہ باکی (حلیۃ، ۱۰:

کے بہنے سے گہری لکیریں پڑ گئیں۔ کئی لوگوں کے رونے سے ان کی پلکیں اور پیوٹے گر گئے اور بعض کی تو ہڈیوں پسیوں کی صورت بگڑ گئی، بصارت کمزور ہو گئی یا بالکل جاتی رہی۔

طوافِ کعبہ کے وقت آنسو بہانا، میدانِ عرفات میں اور روضہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر رونا، مجالسِ سماع میں صوفیہ کا رونا، اہل تشیع کا ائمہ کرام اور ان کے مزارات پر گریہ و بکا کرنا، یا توبہ کرنے والوں کا یا خوارج کا رونا، یہ ایسے موضوع ہیں جن پر کسی بسوط و مفصل بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں [قب مفتاح کنوز السنہ، بذیل مادہ بکی]۔

- مآخذ: (۱) الجاحظ: [کتاب] البخلاء، طبع الحاجری [قاہرہ ۱۹۴۸ء]، ص ۵ و ترجمہ از Pellat، ص ۸ تا ۹؛ (۲) وہی مصنف: البيان والتبيين، طبع عبدالسلام ہارون، ۱۳۹: ۳ بعد؛ (۳) ابن قتیبہ: عيون الاخبار، قاہرہ ۱۹۲۸ء، ۲: ۲۶۱ بعد؛ (۴) خلیل بن آیبک الصفدنی: تشيف السمع في انسكاب الدمع، قاہرہ ۱۳۲۱ھ؛ (۵) ابو نعیم احمد الاصفہانی: حلیۃ الاولیاء، قاہرہ ۱۹۳۲ء، بمواضع کثیرہ؛ (۶) ابن الجوزی: صفة الصفة اور تصوف کے دوسرے رسائل اور تذکرے؛ (۷) ونسنگ A. J. Wensinck: [مفتاح كنوز السنہ]، بذیل مادہ البکاء، نیز [المعجم المفهرس لا لفاظ الحدیث النبوی]، بذیل مادہ بکی؛ (۹) وہی مصنف: Some semitic Rites of Mourning and Religion، Verh. Ak. Wetenschappen، N. R. te Amsterdam Letterkunde، ۱۸، عدد ۱، ۱۹۱۷ء؛ (۱۰) Mystic Treatises by Isaac of Nineveh، در مجلہ مذکور، ۱/۲۳، ۱۹۲۳ء؛ (۱۱) R. Dozy: Suppl.، بذیل مادہ بکاء و رقة؛ (۱۲) R. A. Nicholson: Asceticism (Muslim)، در E.R.E.، ۲: ۱۰۰؛ (۱۳) Der erste Chalife: Eduard Sachau، ۱۹۱۳ء، Sb. preuss. Ak. Wiss.، ۱۹۱۳ء

(۳۵۹)۔ یزید بن میسرۃ کے بیان کے مطابق بالعموم رونے کے سات اسباب ہوتے ہیں: حزن، اندوہ، درد و کرب، ریا، اور فرح اور شکر اور خشیت الہی (حلیۃ)، (۳۵: ۲)۔ ابو سعید الخزاز نے گریہ و بکا کی اثنارہ وجوہ بیان کی ہیں، جو بکاء کی تین اقسام، یعنی خدا سے بعد، اس کے قرب اور معیت کے مقابلے میں محض ذیلی حیثیت رکھتی ہیں (سراج: اللمع فی التصوف، طبع نکلسن، ص ۲۲۹)۔

بذیل، شمیٹ اور کہمس کسی تقریب میں اپنے میں سے کسی کے مکان میں داخل ہوئے اور کہا: "تعالوا، الیوم نبکی علی الماء البارید"، یعنی آؤ آج اس ٹھنڈے پانی کے لیے گریہ کریں (جو ہمیں قیامت کے دن نصیب نہ ہوگا) (حلیۃ، ۶: ۲۱۳)۔ مخصوص لفظ "ویحی" پکار پکار کر رونے والوں کی طویل گریہ و زاری کا ذکر حلیۃ (۴: ۲۵۵ تا ۲۶۰) میں آیا ہے۔ نیز حلیۃ (۱: ۱۶۳) میں تین رونے والوں کی باہمی گفتگو کا ذکر ملتا ہے۔ رونے والوں کی اشک ریزی کی مقدار کے متعلق بہت سی ناقابل یقین کہانیاں مشہور ہیں۔ منجملہ ان کے ایک حکایت یہ ہے کہ ایک شخص بعض اوقات تین دن اور تین رات مسلسل روتا رہا۔ بعض لوگ اتنے روئے کہ ان کی ڈاڑھیاں اور تکیے آنسوؤں سے تر ہو گئے۔ بعض نے پورے پورے ریت کے بوروں کو اپنے آنسوؤں سے تر بتر کر دیا۔ ایک رونے والے کے متعلق سنا گیا کہ اس کے آنسو پاؤں تک پہنچے جا رہے تھے۔ ایک اور شخص رو چکنے کے بعد اپنے آنسوؤں سے پر ایک اتنے بڑے گڑھے پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے وہاں وضو کیا ہے۔ ایک اور شخص کے رونے سے جو آنسو زمین پر گرے ان سے وہاں گھاس اگ آئی۔ ایک شخص نے قصداً ایک نالی میں آنسو بہائے۔ بعض رونے والوں کے گالوں پر آنسوؤں



ہندوستان سے بھاگ رہا تھا پناہ دینے سے انکار کر دیا تو ہمایوں نے اس جزیرے کے قلعے کو سر کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا۔ ۱۵۷۴ء میں اکبر کے عہد میں اسے مغلیہ سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ سندھ کی مغلیہ فتوحات کا بہترین اور مکمل ترین بیان بگر کے ایک باشندے محمد معصوم کی تاریخ معصومی میں ملتا ہے۔ ۱۷۳۶ء میں سندھ کے کلہورا حکمران نے بگر پر قبضہ کر لیا تھا۔ بعد ازاں یہ جزیرہ پہلے افغانوں کے ہاتھ میں اور بعد کو خیرپور کے حکمران کے ہاتھ میں چلا گیا۔ ۱۸۳۹ء میں اس جزیرے اور قلعے پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور افغانستان کی پہلی جنگ (۱۸۳۹ تا ۱۸۴۲ء) کے دوران میں اسے اپنا خاص اسلحہ خانہ بنایا۔ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۶ء تک اسے جیل کے طور پر استعمال کیا گیا۔

مآخذ: (۱) *Gazetteer of the Province of Sindh* : A. W. Hughes

(۲) *Province of Sindh* : E. H. Aitken

(۳) *Gazetteer of the Province of Sindh* : (۱۹۰۷ء)

[سید محمد معصوم بگری: تاریخ معصومی، بمبئی

۱۹۳۸ء، بمدد اشاریہ: (۴) ابو ظفر ندوی: تاریخ سندھ،

اعظم گڑھ ۱۹۴۷ء]۔

(C. COLLIN DAVIES)

بگہ: رَکْ بہ مکہ۔

بگوینا: رَکْ بہ خوتین۔

بکیر بن ماہان: ابو ہاشم، خلافت بنو امیہ

کے آخری ایام کا ایک عباسی داعی۔ یہ سجستان کا باشندہ تھا۔ شروع میں وہ والی سندھ الجنید بن عبدالرحمن کا دبیر تھا، لیکن ۱۰۲ھ / ۷۲۰ء میں میسرۃ العبیدی اور محمد بن خنیس کی ترغیب سے خلافت بنی امیہ کے خلاف ہو گیا اور اس نے سندھ میں کاروبار کر کے جو دولت جمع کی تھی وہ ان کی جماعت کے حوالے کر دی۔ میسرۃ کے انتقال کے

۱: ۲۱ بعد: J.H. Palache (۱۴) *Ueber das Weinen* : *in der jüdischen Religion* : ZDMG ۷۰ (۱۹۱۶) : ۲۵۱ بعد: L. Massignon (۱۵) *Essai sur les origines du lexique technique de la mystique musulmane* : بار دوم (۱۹۵۴)، ص ۱۶۶ تا ۱۶۷ : H. Lammens (۱۶) *L'Islam, Croyances et Institutions* : بار دوم، بیروت ۱۹۴۱ء، ص ۱۵۲ تا ۱۵۵ : H. Ritter (۱۷) *Studien zur Islamischen Frömmigkeit I* : *Der Islam*، عدد ۲۱ (۱۹۳۳) : (۱۸) : G. Zapper *Ueber den Ausdruck des geistigen Schmerzes in Mittelalter* : *Schmerz in Mittelalter* : *Denkschr. d. Ak.* : W. Heffening (۱۹) : ۷۳ بعد: (۱۹۵۴) : *Wien Die griechische Ephraem - Paraenesis gegen das Oriens* : *Lachen in arabischer Uebersetzung* : Christianus (۲۰) : ۱۱ (۱۹۳۶) : ۵۴ بعد: (۲۱) : F. Meier *Oriens* : ۹ (۱۹۵۶) : ۳۲۳ : J. Balogh *Unbeachtetes in Augustins Konfessionen* : *Didaskaleion* : ۴ (۱۹۲۶) : ۱۰ بعد: *Das "Gebetweinen" (imber lacrimarum)* : *ARW*، ۲۹ (۱۹۲۹) : ۳۶۵ بعد: *ARW*، ۲۹ (۱۹۳۱) : ۲۰۱ بعد: K. Meuli (۲۲) *Das Weinen als Sitte* (غیر مطبوعہ تصنیف، جسے دیکھنے کی مجھے اجازت ملی تھی)۔

(F. MEIER)

بگر [= بھگر] : نیز بکھر : [ مغربی پاکستان

میں ] دریائے سندھ کا ایک قلعہ بند جزیرہ، جو سکھر اور روہڑی کے شہروں کے درمیان واقع ہے۔ ابن بطوطہ نے محمد بن تغلق کے عہد میں اس جزیرے کو دیکھا اور اس کی اہمیت کا حال اپنے سفرنامے میں درج کیا ہے۔ ۱۵۲۲ء میں آرغون خاندان کے بانی شاہ بیگ نے اس جزیرے کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ ۱۵۴۰ء میں جب شاہ بیگ کے بیٹے شاہ حسین نے شہنشاہ ہمایوں کو جب وہ

مشہور ہوا۔ رہا ہونے کے بعد وہ ۵۱۲۶/۷۴۳ء میں امام محمد کی وفات کا اعلان کرنے اور بنو عباس کے طرفداروں سے متوفی امام کے بیٹے ابراہیم کی بیعت لینے خراسان گیا۔ پھر ایران میں جمع کیے ہوئے روپے کو لے کر عراق واپس آیا۔ اس کے تھوڑے ہی دن بعد ابو سلمہ حفص بن سلیمان [رک باں] کو اپنا جانشین نامزد کرنے کے بعد ۵۱۲۷/۷۴۴ء میں وہ فوت ہو گیا۔ آگے چل کر اس کے اس انتخاب کو ابراہیم نے بھی منظور کر لیا۔

مآخذ: (۱) الطبری؛ (۲) الیعقوبی؛ (۳) الدینوری،

بمدد اشاریہ؛ (۴) L. Caetani (۴) Chronographia

Islamica، ص ۱۲۸۰، ۱۳۱۷، ۱۳۳۸، ۱۳۸۳، ۱۵۰۹،

Das : J. Wellhausen (۵) : ۱۶۲۲، ۱۵۹۲، ۱۵۵۸

arabische Reich، برلن ۱۹۰۲ء، ص ۳۱۶ تا ۳۲۰،

De opkomst der Abbasiden in : G. van Vloten (۶)

Chorasan، لائڈن ۱۸۹۰ء، بموضع کثیرہ .

( D. SOURDEL )

بکیر بن وشاح [= وساج] : عبدالملک بن مروان کی خلافت کے آغاز میں خراسان کا والی۔ قبیلہ بنو سعد کے اس تمیمی نے جو عبداللہ بن خازم [رک باں] کا سابق نائب تھا، انتشار کے اُس زمانے میں ناموری حاصل کی جس کی نمایاں خصوصیت بنو تمیم کی بغاوتیں تھیں۔ ان بغاوتوں کے دوران میں اس نے ہرات میں محمد بن عبداللہ بن خازم کی فوج کی قیادت کی، اور مزید برآں مرو کو باغیوں سے چھڑانے کے بعد وہ اس شہر میں یہاں کے والی کی نیابت کرتا رہا۔ ۵۷۲/۶۹۱ - ۶۹۲ء میں اموی خلیفہ عبدالملک کی کامیابی کے سبب، جس نے عراق اور عرب میں اپنا اقتدار مضبوطی سے قائم کر لیا تھا، اسے اس کا موقع مل گیا کہ وہ رسمی طور پر مرو کا والی نامزد ہو جائے اور زبردستی

بعد ۵۱۰۵/۷۲۳ - ۷۲۴ء میں جماعت کی قیادت اس کے سپرد کر دی گئی اور اس نے خراسانیوں میں اپنے معاونین پیدا کرنے میں غیر معمولی سرگرمی سے کام لیا۔ ۵۱۰۷/۷۲۵ - ۷۲۶ء میں اس نے ادھر بہت سے داعی بھی روانہ کیے جو عمار بن العبادی کے سوا باقی سب کے سب اسی وقت گرفتار ہو کر وہاں کے والی آسد بن عبداللہ کے حکم سے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ آگے چل کر ۵۱۱۸/۷۳۶ء میں اس نے عمار بن یزید کو ان دوسرے گماشتوں کا سردار مقرر کر دیا جو پہلے گرفتار ہوئے تھے، مگر بعد ازاں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ عمار نے مرو میں اپنا صدر مقام بنایا، خدّاش کا نام اختیار کیا اور کچھ کامیابی بھی حاصل کی، لیکن خرمیہ [رک باں] فرقے کے عقائد اختیار کر لینے کی وجہ سے وہ بھی گرفتار ہوا اور مبتلائے عذاب کیے جانے کے بعد والی صوبہ آسد کے حکم سے ہلاک کر دیا گیا۔ اس صورت حال سے امام محمد کو بہت پریشانی ہوئی۔ ۵۱۲۰/۷۳۸ء میں خراسانیوں کے مندوب سلیمان بن کثیر [رک باں] کی پیش کردہ وضاحت سے وہ مطمئن نہیں ہوئے، چنانچہ انہوں نے خود بکیر کو خدّاش کے عقائد کی علانیہ تکذیب کرنے کی غرض سے بھیجا۔ پہلی بار بکیر کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں ہوا، لیکن دوسری بار وہ بنو عباس کے حامیوں کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بعد ازاں ۵۱۲۴/۷۴۱ - ۷۴۲ء میں جب وہ عراق واپس آ گیا تو اسے ان سیاسی جلسوں کا ذمے دار ٹھہرایا گیا جو کوفے کے ایک مکان میں ہوا کرتے تھے اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ وہاں اس نے عیسیٰ بن معقل کو اپنے ساتھ ملا لیا، جس سے ایک غیر معتبر روایت کی رو سے اس نے وہ غلام خریدنا جو آئندہ چل کر ابو سلیم [رک باں] کے نام سے



این خازم کی جگہ اپنا اقتدار قائم کر لے، جس نے بنو امیہ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا اور جو اس کے جلد ہی بعد تریذ کی جانب بھاگتے ہوئے قتل ہو گیا؛ لیکن چونکہ اس علاقے میں فتنہ و فساد جاری رہا، جہاں در حقیقت بنو تمیم ایک خانہ جنگی میں الجھے ہوئے تھے، اس لیے بکیر کو معزول کر دیا گیا اور بجائے مرو کے طخارستان کا والی مقرر کر دیا گیا۔ یہ یقینی ہے کہ ۵۷۴ / ۶۹۳ - ۶۹۴ء میں اسے اپنی جگہ قریش کے امیہ ابن عبداللہ بن خالد کے لیے خالی کرنا پڑی، جسے خلیفہ نے بھیجا تھا اور جو بعض مآخذ کے مطابق اس منصب کے لیے شاید ۵۷۲ / ۶۹۱ - ۶۹۲ء ہی میں منتخب کر لیا گیا تھا۔ بعض ایسے حالات میں جن کی تفصیلات مختلف طور پر بیان کی گئی ہیں، برخاست شدہ امیر نے کچھ عرصے بعد نئے والی کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر، جو ۵۷۷ / ۶۹۶ء میں بخارا کے خلاف جنگ میں باہر گیا ہوا تھا، اپنے مقصد کے حصول کے لیے مرو کے باشندوں کو بھڑکا دیا اور اس طرح امیہ کو جلد از جلد واپس آ کر اس باغی شہر کے معاصرے پر مجبور کر دیا۔ اس کے نتیجے میں قبولِ اطاعت کا جو معاہدہ ہوا وہ بکیر کے لیے باعزت شرائط پر مبنی تھا، لیکن وہ حسب سابق ریشہ دوانیوں میں مصروف رہا۔ اسی سال اس کے ایک دشمن نے اسے فریب دے کر مار ڈالا۔

مآخذ: (۱) الطبری، بحد اشاریہ؛ (۲) البلاذری؛

فتوح، ص ۳۱۵ تا ۳۱۷؛ (۳) الیعقوبی، ۲: ۳۲۳؛ (۴)

البلدان، ص ۲۹۹؛ (۵) Das Arabische: Wellhausen

Reich، برلن ۱۹۰۲ء، ص ۲۶۰ تا ۲۶۳؛ (۶) Caetani:

Chronographia، ص ۸۳۹، ۸۵۹، ۸۷۷، ۹۱۵، ۹۲۱؛

[(۷) ابن حزم: جمهرة انساب العرب، ص ۲۱۸ و ۲۱۹.]

(J. SOURDEL-PHOMINE)

- بگتگین: Begga رگ بہ بگتگین۔
- بگتگین: رگ بہ شاہ آرمین۔
- بگتگین: ایک اہم جاگیردار خاندان، جو اگرچہ اپنی طاقتور ہمسایہ حکومتوں کے تسلط سے کبھی پورے طور پر آزاد نہ ہو سکا، تاہم ایک صدی تک بالائی الجزیرہ (Mesopotamia) میں وسیع قطععات زمین پر قابض رہا، جن میں سے کچھ تو مشرق کی جانب اربیل کے گردا گرد تھے اور کچھ مغرب میں حران کے نواح میں واقع تھے۔ مؤخر الذکر اراضی پر ان کا اقتدار کسی قدر کم مدت کے لیے رہا۔ اس خاندان کا بانی زین الدین علی کوچک بن بگتگین ایک ترکمان سردار تھا، جس کی قسمت ابتدا ہی سے [عماد الدین] زنگی سے وابستہ ہو گئی تھی۔ وہ اس حکمران کے ساتھ گردوں کے علاقے پر حملہ کرنے میں شامل تھا اور غالباً اسی لیے ہم اسے ان متعدد اضلاع پر قابض دیکھتے ہیں جو زاب اکبر سے لے کر ہمیدی اور ہکاری کردوں کے علاقوں اور تکریت اور شہرزور تک پھیلے ہوئے تھے اور جن کا مرکز اربیل تھا۔ ۵۳۹ / ۱۱۳۴ - ۱۱۳۵ء میں جب سلجوقی سلطان آلپ ارسلان نے موصل میں علیم بغاوت بلند کیا تو زنگی نے اس شہر کا فوجی نظم و نسق بھی اسی کے حوالے کر دیا۔ اتنی قوت حاصل ہونے کے باوجود وہ موصل میں زنگی کے دو جانشینوں، یعنی سیف الدین اور قطب الدین، نیز ان کے وزیر جمال الدین الاصفہانی کا وفادار نائب رہا اور اس کے زوال کے زمانے تک اپنی وفاداری میں فرق نہ آنے دیا۔ ان حکمرانوں میں سے مؤخر الذکر (قطب الدین) نے اپنے ملکوں میں سینجار اور حران کا اضافہ کر لیا۔ حران اسے حصص (شام) کے بدلے میں ملا، جسے اس کے ایک بھائی نے قطب الدین کے چچا نور الدین کو دے دیا تھا، جو حلب کا فرمانروا تھا۔ بہر حال

اپنے آپ کو فقط خلیفہ ہی کا باجگزار تصور کرتا تھا۔ اس نے ان جنگوں میں جو اس وقت بالائی الجزیرہ کے متفرق فرمانرواؤں کے درمیان ہو رہی تھیں بڑی ہوشیاری سے حصہ لیا، یعنی پہلے تو ایوبیوں کی زنگیوں کے خلاف مدد کی اور پھر کمزور زنگیوں کی حمایت پر کمر باندھی، اپنی دو لڑکیاں ان سے بیاہ دیں اور [ملک] العادل کے بیٹوں سے ان کی طرف سے مقابلہ کیا۔ آخر میں وہ بدرالدین لؤلؤ کے مقابلے میں سینہ سپر ہو گیا۔۔۔۔۔ یہ بدرالدین لؤلؤ زنگیوں کا جانشین اور سردار اور الأشرف الایوبی کا حلیف تھا۔ عمر کے اختتام کے قریب جب اس نے دیکھا کہ اس کی اپنی اولاد کوئی نہیں اور ساتھ ہی اسے اس بات کا خوف ہوا کہ اس کے مخالف ہمسائے دخل انداز ہوں گے تو گوکبری نے اپنی ریاست کو وصیت کے ذریعے اپنی وفات کے وقت خلیفہ کے نام منتقل کر دیا اور خلیفہ نے اس پر (۵۶۳/۱۲۳۲ - ۱۲۳۳ء میں) عملی طور پر قبضہ کر لیا۔

سیاسی اور فوجی امور کے علاوہ گوکبری نے معاشری اور سماجی بہبود کے بھی کئی کام کیے۔ یہ اقدامات خصوصیت کے ساتھ شہر اربل سے متعلق تھے، اگرچہ ان کا اثر شہر کے باہر بھی پھیلا۔ اس نے مدرسے، خانقاہیں، شفاخانے اور خیرات خانے تعمیر کیے۔ حاجیوں کی اعانت کے لیے عمومی خدمات کا ادارہ قائم کیا اور جو لوگ فرنگیوں کی قید میں تھے ان کے لیے زرفدیہ منہیا کرنے میں بھی حصہ لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلا فرمانروا تھا جس نے ”جشن مولد“ باقاعدہ طور پر منایا۔ یہ مولد شاید شعی موالید یا عیسائی عید میلاد کا جواب تھا، جسے اربل کے عیسائی باقاعدہ مناتے تھے۔ وہ ایک عبادت گزار اور اچھا پڑھا لکھا شخص تھا اور اس کی ملاقات کو بیرونی ممالک سے بہت سے فضلا اور مصنفین آتے رہتے تھے۔ انتظام

اواخر عمر میں زین الدین نے اپنی تمام املاک قطب الدین کو دے دیں اور اس کے بدلے میں اپنے فرزند کے لیے یہ حق حاصل کر لیا کہ وہ اس کے بعد صرف اربل کا مالک ہوگا۔ ۱۱۶۷/۵۶۳ - ۱۱۶۷ - ۱۱۶۸ء میں وہ سن رسیدہ ہو کر وفات پا گیا اور لوگوں کے دلوں میں اپنی شجاعت، عدالت، اعتدال پسندی اور پرهیزگاری کی حمایت کی یاد چھوڑ گیا۔

اس کے فرزند مظفر الدین گوکبری نے اس سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی۔ مظفر الدین کو پہلے تو اربل کے (اور پھر موصل کے) والی قایماز نے اربل سے نکال دیا اور اس کی جگہ اس کے چھوٹے بھائی زین الدین یوسف کو حاکم بنا دیا۔ اس کے بدلے میں اسے قطب الدین نے حران دے دیا، جو پہلے اس کے باپ کے قبضے میں تھا۔ اس کے بعد ایک مناسب موقع پر وہ [سلطان] صلاح الدین کے ساتھ مل گیا۔ [سلطان] صلاح الدین نے اسے الرها (Edessa) اور سمیساط دے دیا اور اپنی ایک بہن سے اس کی شادی کر دی۔ اس وقت سے اس نے [سلطان] صلاح الدین کی بیشتر جنگوں میں، خصوصاً فتح فلسطین و شام اور فرنگیوں کا مقابلہ کرنے (تیسری صلیبی جنگ) میں شاندار حصہ لیا۔ اس کے بعد جب ۵۸۶/۱۱۹۰ء میں اس کے بھائی یوسف کی وفات ہو گئی اور خود اسے بھی عکا کے مقام پر فرنگیوں کے متحدہ لشکر سے شکست کھا کر وہ علاقہ ہاتھ سے دینا پڑا تو گوکبری نے دیار مضر کے علاقے اپنے بھائی تقی الدین عمر کی طرف سے [سلطان] صلاح الدین کے حوالے کر دیے، جو عملاً زنگیوں کا آقا بن گیا تھا، اور اس سے اربل کے سارے صوبے کے وارث ہونے کا حق حاصل کر لیا۔ اس صوبے پر وہ چوالیس قمری برس قابض رہا، یہاں تک کہ وہ اسی سال کی عمر کو جا پہنچا۔ اس کے محاصل سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ [سلطان] صلاح الدین کی وفات کے بعد وہ



• **بگرمی:** [= باجرمی، باغرمی، بجرمی] اٹیسویں صدی عیسوی میں ایک حبشی مسلم ریاست کا نام جو دریائے شری [= شاری] کے دائیں کنارے جھیل [= بحیرہ] شاد Chad [= تشاد] کے جنوب مشرق میں واقع تھی۔ Barth کے زمانے (۱۸۵۲ء) میں اس ریاست کا صدر مقام **مسنیہ** [= ماسینیہ] تھا۔ اس کے حلقے میں چند باجگزار علاقے تھے، جو ۱۰ درجے اور ۱۲ درجے عرض بلد شمالی اور ۱۵ درجے اور ۱۸ درجے طول بلد مشرقی کے درمیان واقع تھے۔ آج کل کے سرکاری کاغذات میں یہ تاریخی نام مستعمل نہیں، صرف **مسنیہ** کا ضلع موجود ہے۔ اس کے دوسرے باجگزار علاقے **کچو بوسو** Bousso کے ضلع میں اور **کچو ملفی** Melfi کے ضلع میں شامل کر لیے گئے ہیں۔

دور سابق میں جو علاقہ **بگرمی** کہلاتا تھا وہ سطح بحر سے ایک ہزار فٹ بلند ایک وسیع میدان ہے، جس کی تدریجی ڈھلان جھیل شاد کی طرف ہے۔ دریائی مٹی کے مسطح میدان میں کہیں کہیں بیچ میں صرف بے گیاه ٹیلے ہیں، اور مشرق میں **پکا کائر** Bekakire کے پرگنے میں الگ الگ پہاڑیاں آگئی ہیں۔ یہ علاقے ساحل اور سوڈان کے وسیع گیاہی خطوں کے کنارے پر واقع ہیں۔ سال میں دو موسم ہوتے ہیں: ایک تو خشک موسم، جس میں جاڑے کے زمانے میں سردی اور خزان و بہار میں سخت گرمی ہوتی ہے: دوسرا موسم گرم، جو گرم اور مرطوب ہوتا ہے۔ بارش کا اوسط سال بھر میں ۷۰۰ ملی میٹر (= ۲۸ انچ) کے لگ بھگ ہے، لیکن تبخیر حد سے زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ شاری اس علاقے کا تنہا مستقل دریا ہے۔ دوسرے دریا (بحر ارگوبگ اور بحر نرا) صرف اگست سے دسمبر تک بہتے ہیں۔

اس علاقے کی معاش کا انحصار کاشت کاری اور

سلطنت میں، بالخصوص ایسے موقعوں پر، اس کا وزیر اس کی مدد کرتا تھا جو اپنی سابقہ کارگزاریوں کی بنا پر اربل کا **مستوفی** کہلاتا تھا اور جس نے موصل کی تاریخ لکھی تھی۔ ابن خلیکان [رک باں] اور اس کے خاندان کے افراد ان کے سب سے زیادہ مشہور وظیفہ خواروں میں سے تھے۔ شہر اربل کے گرد، جو ہمیشہ سے عیسائی چلا آ رہا تھا اور مسلم تاریخ کے دھارے سے کسی قدر کنارے ہی پر رہا تھا، ایک نیا شہر زیریں علاقے میں آباد ہو گیا اور پھر یہ پورا شہر مل کر ایک مسلم مرکز بن گیا جو خاصا اہم ثابت ہوا۔ یہ ترقی، جس کے لیے خاصی سخت مالی حکمت عملی سے کام لینا پڑا تھا، تاتاریوں کے ۱۲۳۷ء / ۵۶۳ھ کے حملے سے سب خاک میں مل گئی۔

**مآخذ:** صلاح الدین کے مؤرخوں کے علاوہ خاص طور پر دیکھیے: (۱) ابن الأثیر: **اتابک اور الکامل** (بمدد اشاریہ)؛ (۲) **سبط ابن العجوزی: مرآة**، ص ۶۸۰ تا ۶۸۳؛ (۳) ابن واصل: **مفرج الکروب**، کتاب خانہ ملیہ، پیرس، عدد ۱۷۰۲؛ ورق ۲۸۸ ب تا ۲۸۹ ب؛ (۴) ابن العیث، طبع Cl. Cahen، در **BEO**، ۱۹۵۸ء، بذیل ۵۶۳؛ (۵) ابن خلیکان، طبع و ترجمہ از De Slane، ص ۵۳۵ بعد (قب ۵۵۲)، ۶۳۸؛ (۶) ابن القوطی، طبع مصطفیٰ جواد، ص ۳۳ بعد؛ (۷) **یاقوت**، ۱: ۱۸۶ تا ۱۸۷؛ (۸) برٹش میوزیم کے سگنوں کی فہرستیں، از Lane-Poole، ج ۳، نیز استانبول کے سگنوں کی فہرستیں، از اسمعیل غالب؛ (۹) H. Gottschalk: **الملك الكامل**، ص ۱۳ تا ۱۴؛ (۱۰) **عباس العزازی: آل بکتگین کوکبری او امارة اربل فی عہدہم**، در **مجلة [مجمع اللغة العربية]** Revue de l'Académie arabe du Caire، ج ۲۱ تا ۲۲، ۱۹۵۶-۱۹۵۷ء؛ نیز **رک بہ اربل؛ مؤید**۔

(CL. CAHEN)

قائم ہوئی۔ ابتدا میں یہ بہت خوشحال ریاست تھی۔ پھر انیسویں صدی کے آغاز میں ودائی (= وادائی) سے جنگوں کے باعث زوال پذیر ہو گئی۔ ۱۸۷۰ء میں ودائی کے سلطان نے مسینیہ پر قبضہ جما لیا اور سلطان ابو سکیئہ کو نکال دیا۔ مؤخر الذکر کے جانشین گورانگ نے رباح (رک بہ بورنو) کی طرف سے خطرہ محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو فرانس کی حفاظت میں دے دیا (۱۸۹۷ء)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے رباح نے بگرمی کو اپنے جذبہ انتقام کا تختہ مشق بنایا۔ بعد ازاں جب مؤخر الذکر نے گوسپری (kousere) میں شکست کھائی اور وہ مارا گیا (۲۲ اپریل ۱۹۰۰ء) تو فرانس نے یہاں اپنا پورا عمل دخل جما لیا۔ سلطان کو محض نمائش کے لیے برقرار رکھا گیا، لیکن اس کا اقتدار مسینیہ کے پرگنے تک محدود تھا۔ صدر مقام مسینیہ بارتھ Barth کے وقت میں ایک اہم شہر تھا، جس کی فصیل کا دور سات میل تھا۔ یہ شہر ۱۸۷۰ء میں جزوی طور پر تباہ ہوا اور پھر رباح کے حملے کے وقت ویران ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد اپنی پہلی جگہ سے بیس کیلومیٹر (= ساڑھے بارہ میل) جنوب مشرق کی طرف یہ شہر دوسری دفعہ تعمیر ہوا، لیکن اب یہ محض ایک بڑا گاؤں ہے، جس کی آبادی ایک ہزار سات سو باشندوں پر مشتمل ہے۔ دراصل سارا ضلع تجارت کی بڑی شاہراہوں سے دور ہے۔ اس علاقے کی پیداوار، یعنی مونگ پھلی، مکھن، کھالوں وغیرہ کا صرف تھوڑا سا حصہ بونگور، بوکورو، اور قلعہ لاسی (Fort Lamy) کی منڈیوں میں لایا جاتا ہے۔

مآخذ (۱) محمد التونسی: Voyage au Wadai، ترجمہ از Perron، پیرس ۱۸۵۲ء، ج ۵ و ۶؛ (۲) H. Barth: Reisen und Entdeckungen، گوتہا ۱۸۵۸ء، ۳: (xi-xv)؛ (۳) G. Nachtigal: Sahara und Sudan، La

موشی پالنے پر ہے۔ یہاں بڑی فصل باجرے (ناگر باجرا اور جوار) کی ہوتی ہے۔ باشندوں کی اصل خوراک یہی ہے۔ نخلستانوں کے نواح میں مکئی بھی بوئی جاتی ہے، جو باجرے کی فصل کاٹنے اور بونے کے درمیان ضمنی فصل کا کام دیتی ہے۔ ان کے علاوہ مٹر، شکر قند، (gombo?) تل اور مونگ پھلی بھی کاشت کی جاتی ہے۔ اس علاقے کے جنوب مشرق میں دریائے شاری کے کنارے کے ساتھ کپاس کی کاشت کو بھی رائج کیا جا رہا ہے۔ چراگاہیں اگرچہ معمولی درجے کی ہیں، تاہم ان میں موشی اور بھیڑ بکری کی پرورش کی جا سکتی ہے۔

اس علاقے کی آبادی بہت مختلف عناصر پر مشتمل ہے۔ اس میں حبشی (بگرمی، بورنوئی، سرہ اور مسہ)، عرب (پسیئہ، نکاکرہ، اولاد موسی) فلنی اور بورورو فلنی شامل ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں باشندوں کی کل تعداد ستر ہزار پانچ سو تھی، یعنی اوسط آبادی ۶۰۴ فی مربع میل تھی۔

مستقل طور پر آباد حبشی فصلیں بوتے، کاٹنے اور ماہی گیری کرتے ہیں (مسہ قوم کے سوا جو موشی چراتے ہیں)۔ خانہ بدوش فلنی لوگوں اور جھیل شاد تک نقل مکانی کرتے رہتے ہیں اور بورورو فلنی آبی اور سورو کے ضلعوں تک چلے جاتے ہیں۔ نیم خانہ بدوش عرب اپنے دیہات اور دریائے شاری کے کناروں کے درمیان نقل و حرکت کرتے رہتے ہیں، جہاں برسات میں وہ کاشت کرتے ہیں اور خشک موسم کے اختتام پر دریائے شاری کے کنارے چلے جاتے ہیں۔

مسہ اور سرہ اقوام کے سوا، جو اب تک ارواح پرست ہیں، باقی لوگوں نے اب سے ساڑھے تین سو سال پہلے فلنی مبلغین اور ہوزا [= الحوصہ] تاجروں کے زیر اثر دین اسلام قبول کر لیا تھا۔

بگرمی کی ریاست سولہویں صدی عیسوی میں



عملداری شرطہ میں نہ تھے بلکہ دوسرے فوجی سرداروں کے ماتحت تھے۔

**مأخذ:** (۱) عثمان نوری (= عثمان ارگن): مجلہ امورِ بلدیہ، استانبول، ۱۳۳۰ھ، ۱: ۲۹۹ تا ۳۰۰ اور ۱۳۶۷: (۲) Bowen و Gibb، ۱/۱: ۶۶ حاشیہ، ۱۱۱ حاشیہ، ۲۸۷، ۳۲۳ و ۱/۲: ۸۸؛ نیز رک بہ استانبول۔

(B. LEWIS)

**بِلَادُ الْعَرَبِ: رَکْ بہ عرب۔**

**البلاذری:** [ابوالحسن] احمد بن یحییٰ بن جابر بن داؤد، تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کا ایک بہت بڑا عرب مؤرخ، ماہر انساب اور جغرافیہ نگار۔ اس کی زندگی کے متعلق معلومات بہت کم میسر ہیں۔ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخوں کی براہ راست کوئی توثیق نہیں ہوتی۔ اس کے اساتذہ کی تاریخوں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ وہ نویں صدی عیسوی کے دوسرے عشرے کے آغاز ہی میں پیدا ہوا ہوگا۔ اس کی وفات کی تاریخ کے متعلق مسلمان مصنفین کا قیاس ہے کہ اغلب ترین تاریخ ۸۹۲ء کے قریب کی ہے۔ چونکہ اس کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ اس نے فارسی کتابوں کے ترجمے کیے تھے اس لیے بلا کسی ثبوت کے یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ وہ ایرانی النسل تھا، لیکن یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ اس کا دادا مصر میں الخصب کی ملازمت میں رہ چکا تھا (الجبشیری، ورق ۶۲ الف)۔ وہ غالباً بغداد میں پیدا ہوا اور یقیناً اس نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ اسی شہر اور اس کی نواحی بستیوں میں بسر کیا۔ اس کا شوق تحصیل اے دمشق، حمص اور انطاکیہ لے گیا اور عراق میں منجملہ اور استادوں کے اس نے المدائنی، ابن سعد اور مصعب الزبیری جیسے مشہور مؤرخین سے شرف تلمذ حاصل کیا۔

، chute de l'empire de Rabah پیرس ۱۹۰۲ء،  
Deux années dans la région du : A. Forneau (۵)  
Bulletin du Comité de l'Afrique  
française، Renseignements coloniaux، ۱۹۰۳ء،  
شمارہ ۵: (۶) Lt. Col. Largeau، L'occupation du  
Wadai، در Revue de Paris، ج، ۱، جنوری ۱۹۱۰ء؛  
(۷) La colonie du Tchad : Ferrandi، پیرس وینسی  
L. Annuaire de monde : Massignen (۸) ۱۹۳۰ء؛  
Musulman، بار چہارم، ص ۳۶۰؛ [(۹) براکلمان:  
تاریخ الشعوب الاسلامیہ، بیروت ۱۹۶۵ء، ص ۶۳۰،  
۶۵۱ تا ۶۵۵؛ (۱۰) عبدالرحمن زکی: تاریخ احوال  
الاسلامیة السودانیہ، تھرت ۱۹۶۱ء، ص ۲۰۹ تا ۲۱۱؛  
(۱۱) البستانی: دائرة المعارف، بذیل مادہ باغرمی]۔  
(R. CAPOT—REY)

**بَنگَارَہ: رَکْ بہ بقارہ۔**

**بَنگِی: (بجی) رَکْ بہ سلاویسی (Celebes)،**

نیز اندونیشیا۔

**بلاد ثلاثہ: تین قصبے [یا نوآبادیاں]۔ یہ**

اصطلاح عثمانی قانونی اور انتظامی امور میں ایوب، غلطہ اور اسکوڈار [رَکْ باں] کے لیے استعمال ہوتی تھی، یعنی استانبول کے ساتھ ملحقہ تین جدا جدا شہری علاقوں کے لیے۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک قاضی ہوتا تھا، جو استانبول کے قاضی سے قطعاً آزاد تھا، گو اس کا درجہ کم تر ہوتا تھا۔ ان "بلاد ثلاثہ" کے قاضی ہر چہار شنبہ کو استانبول کے قاضی کے ساتھ مل کر وزیر اعظم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ ان تینوں بستیوں کی اس عدالتی خود اختیاری کی تاریخ ابتدائی عثمانی دور سے تعلق رکھتی ہے بلکہ شاید فتح [قسطنطینیہ] کے زمانے تک جاتی ہے۔ پولیس (شرطہ) کے معاملات میں بھی ان تینوں بستیوں کو کچھ نہ کچھ خود اختیاری حاصل تھی، کیونکہ وہ استانبول شہر کی طرح بنی چری کے آغا کی

طغراؤں کے استعمال کے سلسلے میں بوزنظیوں سے تنازع، لگان کے مسائل، خاتم کا استعمال، سکے اور زر رائج الوقت اور عربی رسم الخط کی تاریخ - اس کتاب کو جو عربوں کی فتوحات پر نہایت ہی بیش قیمت تاریخی معلومات کا ایک مأخذ ہے، ذخویہ نے طبع کیا: *Liber expugnationis regionum*، لائنڈن ۱۸۶۳ تا ۱۸۶۶ء - اس کے بعد یہ متعدد بار چھپ کر شائع ہو چکی ہے: انگریزی ترجمہ، از *The Origins of the Islamic State*: F. C. Murgotten و P. K. Hitti، نیو یارک ۱۹۱۶ء و ۱۹۲۳ء: جرمن ترجمہ (طبع ڈخویہ کے ص ۲۳۹ تک)، از *O. Rescher*، لائپزگ ۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۳ء۔

۲ - اس کی دوسری کتاب انساب الاشراف ایک بہت ضخیم کتاب ہے، جو مکمل نہیں ہو سکی۔ اس کی ترتیب انساب وار کی گئی ہے اور اس کا آغاز آنحضرتؐ کی حیات اور آپ کے اعزہ و اقارب کے حالات زندگی سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد علوی آتے ہیں اور پھر عباسی - عبدالشمس، جس کے ذیل میں بنو اسبہ کو غیر متناسب جگہ دی گئی ہے، بنو ہاشم کے بعد آتے ہیں۔ اس کے بعد بقیہ قریش اور بنو مضر کے دوسرے قبائل کا تذکرہ ہے۔ تیس اور بالخصوص بنو ثقیف کا ذکر کتاب کے آخری اوراق میں ہے۔ اس کتاب کی آخری قابل ذکر سیرت، جس پر خاصے صفحات صرف کیے گئے ہیں، الحجاج [بن یوسف] کی ہے۔ گو اپنی ظاہری شکل و صورت میں کتاب الانساب شجروں کا مجموعہ ہے، لیکن انساب دراصل ابن سعد کے انداز کے طبقات ہیں، جنہیں نسب کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ترتیب کے اس انداز کی پابندی سختی سے نہیں کی گئی، اس لیے کہ منفرد فرمانرواؤں کی زندگیوں کے اہم سوانح ہمیشہ انہیں سے تعلق رکھنے والے ابواب میں اضافہ کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح کتاب الانساب خوارج کی

وہ المتوکل کا ندیم تھا اور دربار میں اس کا اثر بظاہر المستعین کے عہد تک قائم رہا، لیکن اس کی قسمت کا ستارہ المعتد کے دور حکومت میں نہایت سرعت کے ساتھ غروب ہونا شروع ہوا۔ یہ روایت کہ کہ وہ شاعر ابن المعتز کا اتالیق تھا اس التباس کا نتیجہ ہے جو ہمارے اس مؤرخ اور نحوی ثعلب (= ابوالعباس احمد بن یحییٰ) [رک باں] میں پیدا ہو گیا ہے۔ اسی طرح اس روایت کا تعلق بھی اس سے نہیں بلکہ اس کے دادا سے ہے کہ اس کی موت حالت جنون میں اس طرح واقع ہوئی کہ اس نے غلطی سے بلاذری (بلاذری، ہندی: بھلانوہ)، انگریزی: *Marking - nut*، لاطینی: *Semecarpus Anacardium*) استعمال کر لی تھی، جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ذہن اور حافظے کی قوت کے لیے مفید ہے؛ لیکن پھر بھی یہ ایک ایسا معما ہے جس کا ہمارے مأخذ کوئی قابل اطمینان حل پیش نہیں کرتے۔

البلاذری کی مندرجہ ذیل دو عظیم تاریخی کتابیں، جو زمانے کی دستبرد سے بچ گئی ہیں، اس کی ثقافت اور ذوق تنقید کے باعث عام طور پر مشہور و معروف ہیں:-

۱ - فتوح البلدان، یعنی مسلم فتوحات کی تاریخ، اسی موضوع کی ایک زیادہ مبسوط کتاب کا اختصار ہے۔ کتاب کا آغاز غزوات نبویؐ سے ہوتا ہے، جس کے بعد تحریک ردة اور شام، الجزيرة، ارمینیہ، مصر اور المغرب کی فتوحات کا ذکر ہے اور آخر میں عراق اور ایران پر قبضہ و تصرف کے حالات ہیں۔ تاریخی سوانح بیان کرتے وقت البلاذری نے بیچ بیچ میں ثقافتی اور معاشرتی حالات کے متعلق بڑے اہم اشارے کیے ہیں، مثلاً اس نے ان باتوں پر بحث کی ہے: حکومت کے دفتروں میں یونانی اور فارسی کے بجائے عربی کو سرکاری زبان قرار دینا، مصر سے جاری شدہ خطوط کی پستائی پر املاسی مذہبی



نے طوالت اور حاشیہ آرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کی تصانیف کے فروری حصوں اور بعد کی زیادہ تفصیلی تصانیف میں جو مطابقت و موافقت ہے اس کی بنا پر بڑی صحت سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ البلاذری نے بہت سی صورتوں میں اپنے پیش نظر مواد کو مختصر کر کے پیش کر دیا ہے، گو وہ اکثر اوقات اپنے اصلی مآخذ کا حد درجہ پابند رہا۔ البلاذری کا اسلوب تحریر اختصار پسندانہ ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات وہ اس اختصار پسندی پر فنی تاثر کو بھی قربان کر دیتا ہے۔ اگرچہ اس کے ہاں طول طویل قصے بھی ملتے ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ فتوح [البلدان] میں البلاذری نے تاریخی سوانح کو مختلف حصوں میں منقسم کر دینے اور انہیں مختلف مقاموں پر پیش کرنے کا قدیم اصول جاری رکھا ہے اور (اس کے برعکس) انسب [الاشراف] میں اس نے طبقات (ابن سعد) کے انداز کی کتابوں، نیز قدیم تر تاریخوں (ابن اسحاق، ابو یوسف، المدائنی) کے مواد کو ایک تیسری قسم کے اسلوب، یعنی انسب کی طرز کی ادبیات (ابن الکلبی) کے ساتھ ملا دیا ہے۔

مآخذ: (۱) قدیم ترین تاریخی مآخذ بغداد کا مؤرخ عبید اللہ بن عبد اللہ بن ابی طاہر طیفور ہے (محفوظ نہیں رہ سکا)؛ (۲) عبید اللہ اور تمام دوسرے عربی مآخذ سے یاقوت نے ارشاد [الاریب = معجم الادباء] میں استفادہ کیا ہے، ۲: ۱۲۷ تا ۱۳۲؛ بعض مزید حوالے اس تالیف میں ملیں گے جو ڈخویہ کی مطبوعہ فتوح کے مقدمے میں شائع کر دیے گئے ہیں، قب براکلمان، ۱: ۱۳۷ بعد و تکملہ ۱: ۲۱۶۔

(F. ROSENTHAL و C. H. BECKER) [وادارہ]

⊗ بلاساغون: [بلاساغون، در جوہنی، ۲: ۱۸۷] مانویں اور تیرھویں صدی کے مابین بلاساغون

تاریخ کے لیے نہایت ہی بیش قیمت تاریخی مآخذ کا کام دیتی ہے۔ اس کتاب کا ایک حصہ ایک گمنام مخطوطے سے دستیاب ہوا، جس کی شناخت اور ترتیب و تدوین W. Ahlwardt نے کی اور اسے *Anonyme Arabische Chronik*، ج ۱۱ کے نام سے طبع کرایا (لائپزگ ۱۸۸۳ء)۔ کتاب مذکور کا ایک مکمل مخطوطہ C. H. Becker کو استانبول میں ملا (مخطوطہ عشر افندی، عدد ۵۹۷-۵۹۸؛ مکمل کتاب کی فہرست مضامین از محمد حمید اللہ، در *Bull d'Et.*، Or. ج ۱۳، دمشق ۱۹۵۳ء، ص ۱۹۷ تا ۲۱۱)؛ نیز انسب [الشرف، طبع محمد حمید اللہ، مصر ۱۹۵۹ء، ۱: ۳۳ تا ۵۳ (مقدمہ المحقق)]۔ بیت المقدس کی عبرانی یونیورسٹی نے کتاب مذکور کی طباعت کا جو ذمہ لیا ہے اس کے تحت ج ۳ ب (طبع S. D. F. Max. Schiössinger، ۱۹۳۸ء) اور ج ۵ (طبع S. D. F. Goitein، ۱۹۳۶ء، مع ایک مفید پیش لفظ) شائع ہو چکی ہیں۔ O. Pinto اور G. Levi Della Vida نے *Il Califfo Mu'awiya I secondo il "Kitâb Ansâb al-Ašraf"*، روم ۱۹۳۸ء، کے نام سے اس کے ایک حصے کا ترجمہ کیا ہے؛ قب نیز F. Gabrieli: *La Rivolta dei Muhallabiti nel 'Irâq e il nuovo Rendiconti, R. Accad. dei Lincei, Cl. sc.* در *Balâduri mor., stor. e ilol.* ج ۶ / ۱۳ (۱۹۳۸ء)؛ ۱۹۹ تا ۲۳۶۔ [پہلی جلد، جو میرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہے، محمد حمید اللہ نے دارالمعارف، مصر سے ۱۹۵۹ء میں شائع کی۔ اس جلد میں بھی ایک مفید اور پر از معلومات مقدمہ شامل ہے]۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود ایک تاریخی مصدر و مآخذ کی حیثیت سے البلاذری کے مرتبے کی تعیین میں کچھ مبالغے سے کام لیا گیا ہے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ ہمیشہ اصل متون اور حوالے پیش کرتا ہے جنہیں مصنفین مابعد

بلاساغون اور شو (یا شویاب) کے شہر آق پشین اور توقماق (بورانہ) کے آثار کے قرب و جوار میں واقع تھے، البیرونی اور محمود کاشغری کی تحریروں سے خاص طور پر واضح ہوتی ہے۔ البیرونی نے اپنے وقت کے جن شہروں کی فہرست دی ہے اور طول بلد اور عرض بلد کے درجے لکھ کر ان کے محل وقوع کا تعین کیا ہے، ان میں بلاساغون اور متعدد نواحی قصبات، مثلاً اسپجباب، چڈگل (چتقل)، طراز، قوچقار باشی، برسگان اور آت باشی بھی شامل ہیں۔ ان مقامات کا محل وقوع درجوں اور دقیقوں تک متعین کیا گیا ہے (دیکھیے زکی ولیدی طوغان: *Birunis picture of the World*، ص ۵۰ تا ۵۲)۔ البیرونی کی اس فہرست میں بلاساغون کا محل وقوع طراز ([متصل] اولیا اتا) سے ۱۰ درجے جانب مشرق، برسگان (برسکون جو ایسیک گول جنیل کے جنوب مشرقی ساحل پر واقع ہے) سے ۷ درجے مغرب اور قوچقار باشی (موجودہ قوچقار اتا) سے صرف ۲۰ دقیقے جانب شمال بتایا گیا ہے۔ محمود کاشغری نے درۂ زہنی (موجودہ شمسی) کا ذکر کیا ہے، جو قوچقار باشی اور بلاساغون کے درمیان واقع ہے (۳: ۳۲۵) اور درۂ یوان آریک (موجودہ جوان آریک) کو بلاساغون کے قریب موسم گرما کی چراگاہ بتایا ہے (۳: ۱۰۶)۔ ولایت اردو کے مرکزی شہر اردو کو، جو دریائے چو کے طاس کے ان شہروں میں سے تھا جو عربوں کو معلوم تھے (المقدس، ص ۲۷۵)، محمود کاشغری نے بلاساغون کے نواح کی ایک ولایت ظاہر کیا ہے (۱: ۱۱۲)۔ یہ مصنف (۳: ۳۰۶) شو یا شویاب کے قلعے کو بلاساغون کے قرب و جوار کا ایک قلعہ (حصن شو یا حصن شویاب) ظاہر کرتا ہے (دیکھیے ص ۶۲۳ - بسیم اتالی (ترجمہ، ۳: ۴۱۳) کا یہ بیان غلط ہے کہ یہ قلعہ بلاساغون کے محل

وسط ایشیا کے ترکی خاقانوں کا ایک صدر مقام تھا، لیکن اس کے صحیح محل وقوع کے متعلق الجہن پیدا ہو گئی ہے، اس لیے کہ السمعانی میں یہ نام دو لفظوں، یعنی "بلاد" اور "سغور" کی شکل میں مرقوم ہے (دیکھیے [۱: ۷۰۸] نے ان دو لفظوں کو ملا کر بلاساغون لکھا ہے (دیکھیے *Otchet o poyezdke v Sredniya : Barthold* در *Aziy: Memoires de l'Académie des Sciences de St. Petersburg*، ج ۸، سلسلہ *Classe hist. phil.*، ۱/۳۰: ۳۵)، لیکن گزشتہ صدی میں یہ محسوس کیا گیا کہ شہر مذکور ضرور دریائے چو *Ču* کے طاس میں واقع ہوگا (E. Bret- *Medieval Researches : schneider*، ۱: ۲۲۶ تا ۲۷۲)۔ Barthold نے خود اس علاقے میں تحقیقات کیں (کتاب مذکور، ص ۳۹) اور صحیح طور پر یہ رائے ظاہر کی کہ بلاساغون کا محل وقوع وہ جگہ تھی جہاں اب آق پشین کے کھنڈر واقع ہیں اور توقماق قدیم میں بورانہ کے جو آثار آق پشین کے آثار سے پانچ یا چھ کیلومیٹر کے فاصلے پر شمال مغرب کی طرف ملتے ہیں وہ کسی دوسرے شہر کے ہیں جو بلاساغون کے قریب آباد تھا۔ مقامی ترک بورانہ کے کھنڈروں کو شو کے نام سے موسوم کرتے ہیں (Barthold: *12 Vorlesungen*، ص ۸)۔ بورانہ عربی لفظ "بنارہ" کا قرغز تلفظ ہے۔ حیدر مرزا دوغلات نے لکھا ہے کہ جب اس نے سولہویں صدی عیسوی میں ان اطراف میں سفر کیا تو اس وقت مغول اسے بورانہ ہی کے نام سے پکارتے تھے اور وہاں امام محمد [فقیہ] البلاساغونی (م ۵۷۱۱ / ۱۳۱۱ء) کا سنگ مزار دکھاتے تھے (لوح مزار کے عربی متن کے لیے دیکھیے *Izsledovanya o Kasi- : Velyaminov-Zernov* *movskih tsaryah*، ۲: ۱۶۲ بعد)۔ یہ بات کہ



وہی کتاب، ص ۲۲۶: ”ہوسزی وو۔ لو۔ دو“۔  
 عربی اور ایرانی ماخذ میں جو نام بلاساغون اور  
 بلاساغون کی شکل میں مذکور ہے اسے المقدسی  
 و لاسکون اور بلاسکون [ص ۲۶۳، ۲۷۵] لکھتا ہے۔  
 ضروری ہے کہ حسب ذیل اعلام کی تشریح اس طرح  
 کی جائے کہ گویا وہ سب ایک ہی جگہ کے مختلف  
 نام تھے: ایک نام قرہ بلغاسون ہے، جو دریائے  
 اورخون پر آباد تھا اور ایغور سلطنت کا صدر مقام  
 تھا۔ اس کی دوسری شکل بلغاسین ہے، جو قازقوں  
 کا دیا ہوا نام ہے اور تیسری شکل بلاساغان ہے جو  
 ان ہنوں کا صدر مقام تھا جو قفقاز کی طرف چلے  
 گئے تھے (دیکھیے زکی ولیدی طوغان: Ibn Fadlan،  
 ص ۱۹۳)۔ اگر ابتدائی اور اصلی نام بلغاسون تھا تو  
 اس نام کا آخری لاحقہ سین یا سون مزار یا شہر  
 کے معنی کا حامل ہے۔ اس نام کی تشریح بلغاسین  
 یا بالینگ سین کی صورتوں میں کی جا سکتی ہے،  
 لیکن تانگ خاندان کی تاریخ میں اس شہر کا نام  
 ”فی لوتسیان کیون“ کی شکل میں آیا ہے،  
 جس سے واضح طور پر بلاساغون کی شکل ظاہر  
 ہوتی ہے۔ یہ نام اس زمانے سے چلا آتا ہے جس کے  
 متعلق روایت ہے کہ اس میں اس کی بنیاد رکھی  
 گئی تھی۔ جوینی (جنہاں کشا، ۱: ۴) نے ایک  
 کہانی نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بلاساغون  
 کا شہر اویغوری خاقان افراسیاب نے بسایا تھا۔  
 اسی طرح کاشغری نے حکایت نقل کی ہے کہ یہ  
 شہر اس وقت بنی موجود تھا جب سکندر اعظم  
 نے وسط ایشیا کے ملکوں پر حملے کیے۔ یہ  
 حقیقت کہ اسلام کے دور اول میں یہ شہر ترک  
 خاقان کا صدر مقام تھا، اس بات سے ظاہر ہے کہ  
 ابن خردادبہ نے صدر مقام (مدینہ) کا نام بلاساغون  
 لکھا ہے۔ المقدسی (ص ۲۷۵) کا بیان ہے کہ  
 بلاساغون کی آبادی بہت تھی اور شہر بہت بڑا

کے سامنے واقع ہے)۔ اس نے یہ روایت بھی نقل  
 کی ہے کہ ترک فرمانروا شو کوہستان آلتون طاغ  
 سے واپس آتے ہوئے بلاساغون میں ٹھہرا اور  
 اس نے بعد میں اس شہر کے پاس ایک قلعہ  
 تعمیر کرایا۔ قدیم چینی ماخذ کے مطابق شو یا  
 شویاب کا قلعہ دریائے چو کے جنوب میں واقع تھا،  
 اور فاصلوں کی جو تفصیلات دی گئی ہیں ان سے  
 اس کے محل وقوع کا تعین اس جگہ پر ہوتا ہے جہاں  
 آج توقماق واقع ہے (دیکھیے Otchet: Barthold،  
 ص ۳۱)۔ اس طرح گویا شو (شویاب)، جو چینی  
 ماخذ میں سوئی بی چنگ (شو کا قلعہ) کے نام سے  
 معروف ہے، اس جگہ واقع تھا جہاں آج بورانہ  
 (قدیم توقماق) کے آثار ہیں اور جو آج اسی نام سے  
 موسوم و معروف ہیں۔ قوچقار باشی سے درہ شمس  
 (زنبی) کی راہ سے چلیں اور اسی نام کے دریا کے کنارے  
 پر بسے ہوئے توقماق جدید کی طرف آئیں تو میدان  
 میں جو آثار سب سے پہلے نظر آتے ہیں وہ آق پشین  
 کے ہیں۔ تانگ T'ang کی تواریخ (De Guignes:  
 Histoire generale des Huns، ص ۱، ۲، LXVI) میں  
 فی لوتسیان کیون کا شہر شویہ سے بیس لی  
 (= ۶ تا ۱۰ کیلومیٹر) کے فاصلے پر جانب مشرق  
 (صحیح تر جانب جنوب مشرق) بتایا گیا ہے، جو  
 آق پشین کے محل وقوع کے عین مطابق ہے۔ اس  
 طرح یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ تینوں نام حقیقت میں  
 ایک ہی شہر کے ہیں۔

ابن خردادبہ اور [ابن] قدامة نے ترکی خاقان کے  
 صدر مقام (مدینة خاقان التریکی) کا جو حال تفصیلات  
 کے ساتھ لکھا ہے وہ بلاساغون (آق پشین) کے  
 حال کے عین مطابق ہے۔ بلاساغون، قوز اردو،  
 قوز اولوش اور قوز بالیق کے ناسوں سے بھی معروف تھا  
 (دیکھیے کاشغری ۱: ۱۱۲، ۱۶۰)۔ قوز اردو نام چینی  
 ماخذ میں بھی ملتا ہے (دیکھیے Bretschneider:

ایک گروہ بخارا اور سمرقند سے آ کر بلاساغون میں آباد ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے ترکی لباس اور ترکی رسم و رواج اختیار کر لیا تھا۔ یہ لوگ ”سغدک“ کہلاتے تھے۔ قراخانی دور کے سکوں پر (اس شہر کا نام بلاساغون نہیں بلکہ قوز اردو منقوش ہے۔ Vasmer کے اشاریے میں قوز اردو کے بجائے ”قرا اردو“ پڑھیے)۔ ۱۱۲۵ء میں قرہ خٹائیوں نے بلاساغون پر قبضہ جما لیا اور اسے اپنا صدر مقام بنا لیا۔ چینی ماخذ میں اس واقعے کی تفصیلات میں شہر کا نام قوز اردو مذکور ہے (Bretschneider: وہی کتاب، ۱: ۱۸)۔ میر خواند (روضۃ الصفا، بمبئی، ۵: ۲۲) اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ مغول نے اس شہر کو گوبالیق کا نام دیا، جس کے معنی ”خوبصورت شہر“ کے ہیں۔ اس بیان پر انحصار کرتے ہوئے بارٹولڈ نے تسلیم کیا ہے کہ اس شہر کو گوبالیق یا گوبالیق کا نام دیا گیا تھا، لیکن اسی مضمون پر میر خواند کا ماخذ جوینی (۲: ص ۸۷) لکھتا ہے کہ مغول بلاساغون کو ”غزبالیغ“ (بعض نسخوں میں قربالیغ یا غربالیغ، یا غوبالیغ، در حبیب السیر) کہتے تھے۔ Marquart نے غزبالیغ کو صحیح تسلیم کیا ہے اور اس کے معنی غز ترکوں کا شہر لیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مقام پر غزبالیغ قوزبالیق ہی کا بدلا ہوا تلفظ ہے۔ ۱۲۱۰ء میں قرہ خٹائی گورخان نے تلاس کے قریب محمد خوارزم شاہ کو شکست دی۔ اس پر بلاساغون کے مسلمان باشندوں نے بغاوت کی اور گورخان کے ہاتھوں خوفناک طریق پر قتل ہوئے۔ جب مغول کی فتوحات کا سیلاب بلاساغون تک پہنچا تو اسی وقت یہ شہر قرہ خانیوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ قرہ خانیوں کا قائد ان دنوں آلمالیغ کا فرمانروا بزرخان تھا۔ ۱۲۱۸ء میں اس نے بطیب

اور باثروت تھا۔ نظام الملک (سیاست نامہ، طبع Schefer، ص ۱۸۹) میں آیا ہے کہ اس شہر پر کافر ترکوں نے قبضہ جما لیا تھا، چنانچہ سامانی حکمرانوں نے ۵۳۳ھ / [۱۱۳۹ء] میں اس شہر کی بازیابی کے لیے ایک مہم بھیجی یا لشکر کشی کی تیاری کی۔ اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ۹۳۳ء سے کچھ عرصہ پہلے اس شہر پر سامانی قابض ہو چکے تھے (دیکھیے *Turkestan down to the Mongol Invasion*: Barthold، ص ۲۳۳، ۲۵۶)۔ حدود العالم (ورق ۱۸) اور گریزی: زین الاخبار (دیکھیے *Ochet*: Barthold، ص ۱۰۲) میں دریائے چو کے طاس کی پچھلی صدی کی کینیاں لکھی ہیں۔ ان میں متعدد قصبوں اور شہروں کے حالات بھی درج ہیں۔ ان لوگوں نے بلاساغون کا ذکر چھوڑ کر صرف نواحی قلعے شویاب کا ذکر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس وقت یہ قلعہ زیادہ اہمیت رکھتا تھا اور اس لیے بلاساغون کو اسی میں شامل سمجھ لیا گیا۔ سو سال بعد کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ بلاساغون قراخانیوں کے اہم مراکزوں میں سے ایک مرکز تھا۔ ماوراء النہر کے فاتح ہارون بغرا خان ابن موسیٰ لونہ (۶۹۵ء) اور طوغان خان (دیکھیے البیہقی: تاریخ، طبع Morley، ص ۹۸، ۶۶۵) نے اس جگہ کو اپنا صدر مقام بنایا۔ تندر تو بلیک [ترکی زبان کا قدیم ترین منظوم کلام] کا مصنف یوسف خاص حاجب، جس نے ۱۰۶۹-۱۰۷۰ء میں اپنی کتاب لکھنا شروع کی، بلاساغون ہی کا باشندہ تھا۔ کاشغری (۱: ۳۱) لکھتا ہے کہ بلاساغون کے باشندے سفری اور ترکی بولتے تھے، لیکن اسپجباب سے بلاساغون تک ارغو کے سارے علاقے میں عوام ناصی ترکی میں گفتگو کرتے تھے۔ ایک اور مقام پر (۱: ۳۹۱) وہ لکھتا ہے کہ سفدی لوگوں کا



خاطر چنگیز خان کی اطاعت قبول کر لی، جس کی اولاد نے اس کے خاندان کے ساتھ خفیہ تعلقات برقرار رکھے۔ مغول عہد میں بلاساغون ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا اور اس شہر میں متعدد اہل علم پہلے پہلے۔ ملحقات الصراح کا مصنف جمال القرشی دراصل اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ اس کی کتاب میں مغول اور قرہ خانیوں کی تاریخ کے متعلق بہت سی معلومات درج ہیں۔ کاشغر کے حیدر مرزا دوغلات نے جب جمال قرشی کی کتاب میں ان علما کی فہرست پڑھی جو اصلاً بلاساغون کے باشندے تھے تو اسے یہ بات تسلیم کرنے میں بہت تامل ہوا کہ بلاساغون کسی وقت میں علم و ادب کا مرکز رہ چکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے زمانے میں اس شہر کی حالت بالکل تباہ ہو چکی تھی (دیکھیے *The Tarikh-i-Rashidi : Denison Ross* ص ۳۶۴)۔ ملحقات الصراح کا جو نسخہ زمانے کی دستبرد سے بچ کر ہم تک پہنچا ہے (دیکھیے *Turkestan v epokhu Mongolskago : Barthold* ص ۱۲۸ تا ۱۵۲)۔ اس کے بعض حصوں میں ان علما کا تذکرہ تو موجود ہے جو کاشغر، ختن، فرغانہ اور شاش میں پہلے پہلے، لیکن جس حصے میں بلاساغون کے اہل علم کا ذکر تھا وہ موجود نہیں، البتہ جملہ معترضہ کے طور پر وہ اپنے استاد احمد بن ایوب البلاساغونی اور اس کے والد ایوب بن احمد البلاساغونی کا ذکر کرتا ہے (ص ۱۴۱)۔ جمال القرشی راوی ہے کہ دانشمند تگین (مذکور الصدر بزرخان کا پوتا) نے، جو اس کے زمانے میں المایغ اور بلاساغون کا حکمران تھا، ۱۲۵۹/۵۶۵۷ء میں قوزبالیق میں وفات پائی۔ قوزبالیق کا نام ان دستاویزوں میں نظر آتا ہے جو قرہ خانی خاندان کے متعلق اب تک موجود ہیں (دیکھیے *Protokoli Turkestanskago*

*krujka lyubiteley archcologii*، ص ۸۸)۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ مغول کے عہد میں عوام کی زبان پر اس شہر کا نام بلاساغون نہیں تھا، بلکہ قوزبالیق (غزبالیغ) تھا، لیکن اہل علم اپنی نسبت قدیم نام سے کرتے تھے اور البلاساغونی لکھتے تھے۔ اس نسبت کا آخری عالم محمد فقیہ (مذکور الصدر) تھا جس کے لوح مزار پر اس کی تاریخ وفات ۱۳۱۱ھ / ۱۳۱۱ء درج ہے؛ ہمارے علم میں ہے کہ یہ کتبہ مزار حیدر مرزا نے پڑھا تھا۔ اسی مصنف کا بیان ہے کہ یہ کتبہ عمر خوجہ آہنگر نے کندہ کیا تھا۔ اس بیان سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قوزبالیق کا شہر ۱۳۱۱ء میں موجود تھا۔ بلاساغون کی ثقافتی سرگرمیوں کے خاتمے کو، جیسا کہ ترک تاریخن انا خط لری میں مذکور ہے، ترکستان میں مسلسل قحطسالی کے رونما ہونے کے نظریے سے کوئی تعلق نہیں۔ دریاے چو اور دریاے ایلبہ کے طاسوں کے دوسرے شہروں کی طرح بلاساغون کا خاتمہ مغل خوانین کی قرتلای (= جرگہ) کے اس فیصلے کا نتیجہ تھا کہ ان دریاؤں کے طاس خانہ بدوش لوگوں کے خوالے کر دیے جائیں اور ان کی شہری آبادیوں کو کسی دوسری جگہ بسا دیا جائے (دیکھیے: ہوگونکی ترکستان و یاقین ماضی سی، بار دوم، ص ۳: ۶۱)۔ ان وادیوں میں شہری زندگی نے انیسویں صدی عیسوی میں خوقند کے خوانین کے منصوبوں کے مطابق از سر نو جنم لیا۔ آق پشین (بلاساغون کے محل وقوع) اور توقماق قدیم (شویاب کے محل وقوع) کے کہندروں میں عیسائیوں کے بے شمار الواح مزار ملتے ہیں، جن کے نقوش ترکی زبان اور سریانی رسم الخط میں ہیں۔ مینار (سار بورانہ) کی تصویر، جس کے نام پر یہ آثار موسوم ہیں، ہارٹولڈ نے شائع کی تھی (دیکھیے *Otchet*، لوحہ

کے قریب Albalat dela Ribera، ہلسیہ (Valencia) کے قریب Albalat dels Sorells، اور سربیطر Sagunto کے علاقے میں واقع Albalat dels Tarongers کا رومی شاہراہوں سے بظاہر کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ محض چھوٹے یا بڑے دیہات کے نام معلوم ہوتے ہیں۔ تیروئل Teruel، وشقہ (Huesca)، وادی الحجارة Guadalajara، قلعہ رباح Ciudad-Real، اور طلیطلہ (Toledo) کے صوبوں اور اشبیلیہ (Seville) کے Ajarfe میں جو متعدد البلاط ہیں ان کی توجیہ بھی اسی طرح کرنا چاہیے۔ Platea یا Palatium سے اشتقاق جس کا یروشلم، شام اور مدینے کے مقامات کے ناموں پر اطلاق ہوتا ہے، الاندلس میں نہیں پایا جاتا۔ اندلس کی البلاط نامی اقلیم کے علاوہ پرتگیزی منطقے میں بھی ایک اقلیم البلاطہ تھی۔ یہ فص البلاطہ میں واقع تھی، جو لیزبن Lisbon اور شترین (Santarem) کے درمیان ایک وسیع میدان تھا۔ ان دو شہروں کے علاوہ اس اقلیم میں شترہ Cintra کا شہر اور ملحقہ علاقے (جہاں موجودہ رباطیہ Ribateja واقع ہے) بھی شامل تھے۔ الادرسی کا دیا ہوا نام البلاطہ Azambuja میں واقع ایک چھوٹے سے شہر Vallada کے مطابق ہے۔ علاوہ ازیں el-Campo de Vallada کا، جو فص البلاطہ کا ترجمہ ہے، حوالہ بھی ملتا ہے، اگرچہ اس کی وسعت اس سے کم ہے جتنی الادرسی نے اس کی طرف منسوب کی ہے۔ Plata یا Vallata سے اس کا اشتقاق نہ تو مستند معلوم ہوتا ہے اور نہ قابل قبول۔

مآخذ: (۱) الادرسی، متن، ص ۱۷۵ تا ۱۷۸، ترجمہ، ص ۲۱۱، ۲۲۵ تا ۲۲۶؛ (۲) یاقوت، ۱: ۷۰۹؛ (۳) La Geografia de España del Edrisi: E. Saavedra، ص ۵۱ تا ۵۲؛ (۴) David Lopes، Estudo dos nomes geographicos do territorio muçulmano, que depois foi português، ص ۳۷؛ (۵) محمد عنایت اللہ: اندلس کا

(۶)۔ اس مینار کا طرز تعمیر ظاہر کرتا ہے کہ وہ قرہخانیوں کے عہد میں بنایا گیا ہوگا، لیکن اس جگہ اسلامی عہد کا کوئی کتبہ محفوظ نہیں رہا۔ محمد جان آغا تیش (؟ تائیش) پای نے بلاساغون کے آثار پر جو مقالہ قلم بند کیا ہے (Krasnorechinskiye Izvest. turkest. old. razvalini i gorod Balasagun، rus. geog. Obsch.، ۱۷: ۱۸۵)، وہ زیادہ تر بارٹولڈ کی تحقیقات پر مبنی ہے۔

(زکی ولیدی طوغان)

\* بلاط: (بلاط) ہسپانیہ میں، لفظ بلاط کے متعدد معانی میں سب سے زیادہ صریح معنی "فرش" معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ یہ لفظ جزیرہ نماے آئی پیریا میں رومی شاہراہوں کے لیے استعمال ہوتا تھا، جس کے ثبوت میں دیکھیے وہ لغات جو Raimundo Martín کی طرف منسوب ہے۔ المرار Almaraz پل کے قریب دریائے تاجہ کے گھاٹ سے ملحق Romangordo کی سرحد پر، موجودہ ویران شہر البلاط کا نام بھی ضرور انہیں شاہراہوں میں سے کسی ایک شاہراہ کے نام پر ہوگا، Tours اور Poitiers کے میدان جنگ سے جسے رومن شاہراہ کے نام پر بلاط الشهداء [رك بان] کہتے ہیں بظاہر اس معنی کی تصدیق ہوتی ہے، لیکن یہ بات حد درجہ مشکوک ہے کہ اس مفہوم کا اطلاق اس پوری اقلیم پر ہوتا تھا جس میں الادرسی کے بیان کے مطابق مذکورہ البلاط کے علاوہ موجودہ ہسپانوی استریمدورا Estramadura کا ایک بڑا حصہ اور حصن الحنث Alange، مدین Medellín، ترجالہ Trujillo اور قاصرش Cáceres بھی شامل ہیں۔ اس کے برعکس متعدد ہسپانوی مقامات کے ناموں، مثلاً البلاط Albalat، البلاطہ Albalate اور ان کے مشتقات اور اسمائے مصغر Albadalejo، Albalatillo کی توجیہ البلد، البلاد، بمعنی جگہ و علاقہ سے زیادہ اچھی طرح ہو سکتی ہے، چنانچہ دریائے شقر Jucar



تاریخی جغرافیہ، ص ۱۶۲، ۱۵۳]۔

(A. HUICI MIRANDI)

• **بلاط:** [بلاط] قاریہ Caria میں قدیم میلٹہ (Miletos) کی جگہ آج کل ایک چھوٹا سا گاؤں۔ یہ لفظ بلاط "Παλατια" سے ماخوذ ہے جو کم از کم تیرھویں صدی کے ابتدائی برسوں سے اس علاقے کا نام تھا۔ بلاط تیرھویں صدی کے اختتام کے قریب **مینٹشہ** [رک بان] کے بیگوں کے قبضے میں آیا اور چونکہ یہ دریائے بویوک مندرس کے دہانے کے قریب ایک بہت موزوں جگہ پر واقع تھا اس لیے یہ بیگ اس سے بحیرہ ایجین کے علاقوں میں حملے کرنے کے لیے نقطہ آغاز کا کام لیتے تھے؛ آگے چل کر یہ خاصا تجارتی مرکز بن گیا۔ ۱۳۵۰ء تک یہاں اہل وینس کا ایک گرجا اور قونصل خانہ بن چکا تھا۔ اس وقت بلاط زعفران، تیل، موم، کوتاہیہ کی پھٹکری، مجمع الجزائر سے برآمدہ غلاموں وغیرہ کی تجارت کی بدولت خاصا خوش حال تھا۔ جب عثمانی سلطان بایزید اول نے ۱۴۹۱ء - ۱۴۹۲ء / ۱۳۸۹ - ۱۳۹۰ء کے موسم سرما میں **مینٹشہ** کے ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا تو اس نے ان مراعات کی توثیق کر دی جو اہل وینس کو بلاط میں حاصل تھیں۔ تیموریگ نے ۱۴۸۰ء / ۱۴۰۲ء میں انقرہ کے مقام پر عثمانی ترکوں کو شکست دینے کے بعد وہاں کے مقامی خاندان کے ایک شخص الیاس کو تخت پر بٹھا دیا، لیکن ۱۴۱۸ء / ۱۳۱۵ء میں اس حکمران کو سلطان محمد اول کا اطاعت گزار بننا پڑا اور ۱۴۲۹ء / ۱۴۲۵ - ۱۴۲۶ء میں **مینٹشہ** ایک بار پھر۔ اور اس مرتبہ قطعی طور پر۔ عثمانی سلطنت میں ضم ہو گیا۔ پندرھویں صدی کے دوران میں، بڑی حد تک تو اس کی تپ اور آب و ہوا کی وجہ سے اور کسی حد تک دریا کے دہانے پر بتدریج مٹی

جمع ہو جانے کے باعث، بلاط آہستہ آہستہ زوال پذیر ہونا شروع ہوا؛ تاہم جب اولیا چلبی ۱۶۷۱ - ۱۶۷۲ء میں یہاں سے گزرا تو اس وقت بھی بلاط کو تجارت کا سرگرم اگرچہ، لیکن رو بہ زوال مرکز سمجھا جاتا تھا۔ بلاط، جسے اب صوبہ آیدین کی قضا سوکھ Söke کا حصہ بنا دیا گیا ہے، سمندر سے تقریباً نو کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ۱۹۳۵ء میں اس کی آبادی سات سو افراد کے قریب تھی۔

مآخذ: (۱) Pauly-Wissowa، ج ۱۰، Stuttgart ۱۹۳۲ء، عمود ۱۶۱۹ تا ۱۶۲۱ء، بذیل مادہ Miletos؛ (۲) W. Heyd: *Histoire du commerce du Levant*؛ لائپزگ ۱۹۲۳ء، ۱: ۵۳۳ بعد و ۲: ۳۵۳ بعد؛ (۳) P. Wittek: *Das Fürstentum Mentesehe* (Istanbul: *Mitteilungen*، جلد ۲)، استانبول ۱۹۳۳ء، ص ۱۸۵ (اشاریہ)؛ (۴) K. Wulzinger و P. Wittek و F. Sarre: *Das Islamische Milet* (Staatliche Museen zu Berlin)، برلن و لائپزگ ۱۹۳۵ء (قب نیز F. Taeschner، *OLZ*، ج ۳۹، برلن ۱۹۳۶ء، عدد ۱۰، عمود ۶۲۱ تا ۶۲۳)؛ (۵) علی جواد: *جغرافیای لغاتی*، جز ۱، استانبول ۱۳۱۳ھ: ص ۱۹۱؛ (۶) اولیا چلبی: *سیاحت نامہ*، استانبول، ۱۹۳۵ء، ۹: ۱۳۶ بعد؛ (۷) ت، بذیل مادہ بلاط (از بسیم دارکوت (Besim Darkot)۔

(V. J. PARRY)

• **بلاط:** [بلاط] لاطینی یا یونانی سے اپنے دوکانہ اشتقاق کے باعث اس لفظ کے متعدد مختلف معانی ہو گئے ہیں۔ اگر اسے [لاطینی] Palatium سے مشتق مانیں تو اس کے معنی "قصر" ہوتے ہیں (المسعودی: تنبیہ، ص ۱۶۷؛ ابن العدیم: زبده، طبع Dahan، ۱: ۱۳۲ تا ۱۳۵؛ المقدسی، ص ۱۳۷ اور ابن حوقل بار دوم،

Platanus سے بھی مشتق ہو سکتا ہے)؛ بیت المقدس میں باب البلاط (قب J. Sauvaget *Les perles choisies*، بیروت ۱۹۳۳ء، ص ۹۹ حاشیہ ۱؛ مدینہ منورہ میں البلاط کا مفروش چوک؛ استانبول [رک بان] میں محلہ بلاط؛ ایشیائے کوچک میں قدیم مِلت Milet کے کھنڈروں سے ملحق اور سلجوقی دور کے شہر بلاطیہ Balatia کا مرادف قصبہ بلاط (دیکھیے Pauly-Wissowa، بذیل Miletos)۔

مآخذ: (۱) *Histoire des sultans mamelouks* : E. Quatremère، پیرس ۱۸۳۵ء، ۱/۲ : ۲۷۷، حاشیہ ۳؛ بشمول (۲) *Alep* : J. Sauvaget، پیرس ۱۹۳۱ء، حاشیہ ۱۱۲ و (۳) *La mosquée omeyyade de Médine*، پیرس ۱۹۳۷ء، ص ۶۹، حاشیہ ۲؛ مقامی ناموں کے لیے دیکھیے (۴) یاقوت، ۱ : ۷۰۹؛ (۵) بطرس البستانی : دائرة المعارف، بذیل مادہ۔

(D. SOURDEL)

بلاط الشهداء : عرب مؤرخوں نے یہ Poitiers کی جنگ کے لیے استعمال کیا ہے، جو چارلس مارٹل کی زیر قیادت فرنگی مسیحی فوجوں اور اندلس کے عامل امیر عبدالرحمن بن عبداللہ الغافی کے درمیان رمضان ۱۱۳ھ / اکتوبر ۷۳۲ء میں لڑی گئی۔

ازمنہ وسطی کے عرب مؤرخوں نے نہ تو کہیں Poitiers کے نام کا ذکر کیا ہے اور نہ Tours کا، جہاں تک اصطلاح بلاط الشهداء کا تعلق ہے اس کا استعمال پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی کے بعد سے ملنا شروع ہوتا ہے اور وہ بھی صرف اندلسی مؤرخوں کی تحریروں میں : ابن حیان (م ۵۳۶ھ / ۱۰۷۶ء)، جس کا حوالہ الحقری : نفع الطیب، لائڈن، ۲ : ۹، سطر ۱۵ تا ۱۶، قاہرہ ۱۹۳۹ء، ۳ : ۱۵، س ۳ میں ملتا ہے (اس مؤرخ نے اسے وقعة البلاط کا نام بھی دیا ہے، لائڈن، ۲ : ۹، سطر ۳ و قاہرہ ۱۹۳۹ء، ۳ : ۱۳، سطر ۹؛ اخبار مجموعہ

ص ۱۹۵، نے دارالبلاط کو قسطنطینیہ میں بتایا ہے؛ (قب *Extraits des sources arabes* : M. Canard، بمطابق *Byzance et les Arabes* : A. A. Vasiliev، برسلز ۱۹۵۰ء، ۲/۲ : ۳۱۲، ۳۲۳ و حاشیہ ۲) اور اگر اسے (آرامی زبان کی وساطت سے) [یونانی] "πλατεία" سے مشتق قرار دیں تو اس کے دو بڑے معنی ایک یونانی اصطلاح کے مطابق قرار پاتے ہیں، جس سے مراد ہے ایک "مفروش راستہ"، جو ایک قدیم روسی شاہراہ تھی (دیکھیے ابن العدیم : زبده، ۱ : ۱۶۳)، "پتھر کا فرش بنانا"، یا بطور اسم وحدت بلاطہ، بمعنی سنگ فرش یا فرشی پتھر، یہ پتھر خواہ کسی نوعیت کا ہو بشرطیکہ یہ زمین پر فرش کرنے، یا مینار یا کوئی یادگار کتبہ ایستادہ کرنے کے کام آتا ہو (مثال کے لیے دیکھیے : مجیرالدین العلیمی : الانس الجلیل، قاہرہ ۱۲۵۳ھ، ص ۳۷۲)، لہذا یہ معنی ستون کتبہ، دھلیز (ڈیوڑھی) یا "بہت سے ستونوں والی غلام گردش" اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ "ناف مسجد" (دیکھیے ابن جبیر : رحلۃ، طبع ڈخویہ، ص ۱۹۰)۔

لفظ بلاط اسلامی مغرب اور بلاد مشرق (جہاں یہ شام و فلسطین میں بالخصوص عام ہے) دونوں میں بہت سے دیہاتی اور شہری مقامی ناموں میں ملتا ہے۔ ان میں سے خاص خاص مقام درج ذیل ہیں : شمالی شام میں قصبہ البلاط، جو ایک روسی شاہراہ کے قریب واقع تھا (*Histoire des Hamdanides* : M. Canard، الجزائر ۱۹۵۱ء، ۱ : ۲۱۸)؛ البلاط، حلب کا ایک محلہ جس سے قدیم یادگار شاہراہ کی یاد تازہ ہوتی ہے (J. Sauvaget)؛ دسشق کے القوطۃ میں بیت البلاط نام کا ایک سابقہ گاؤں؛ فلسطین میں بلاطۃ یا بلاطۃ نام کا ایک گاؤں (جس کا نام لاطینی



الضبي (م ۵۰۹۹ / ۱۲۰۲ء): بغية الملتيمس، طبع Codera اور Ribera، ميڈرڈ ۱۸۸۵ء، عدد ۱۰۲۱، ص ۳۵۳، سطر ۲ (اور جس میں جنگ کی تاریخ ۵۱۱۵ ہے): ابن الأثير (م ۵۶۳۰ / ۱۲۳۳ء)، ص ۱۳۰ و ۳۷۴، ترجمہ از *Annales: Fagnan*، الجزائر ۱۹۰۱ء، ص ۶۰ سطر ۶ و ص ۹۴ سطر ۱ تا ۲.

جدید عرب مؤرخوں بالخصوص یورپی مؤرخوں

کے سامنے یہ مسئلہ رہا ہے کہ لفظ بلاط [الشهداء]

کی تعبیر و تشریح کریں اور اس جنگ کا صحیح

محل وقوع متعین کریں۔ بلاط [ركبًا] [ان کے

نزدیک] یونانی لاطینی زبان سے مستعار ہے اور

اس کے معنی بظاہر Platea: "فراخ پختہ سڑک"،

"پختہ عام چوک" اور Platum "قصر" ہیں،

جہاں تک Poitiers کی جنگ کا تعلق ہے اس کی

تعبیر "شاہراہ" اور "پختہ فرش" دونوں ہی طرح

کی گئی ہے: Pavè [شهداء کا]: *Invasions: Reinaud*

*des Sarrazins en France, et de France, en Savoie, en*

*Piémont et dans la Suisse, pendant les 8<sup>e</sup>, 9<sup>e</sup>, et 10<sup>e</sup>*

*siècles de notre ère*، پیرس ۱۸۳۶ء، ص ۴۹:

*Pascal de Gayangos*: کتاب مذکور، ۲: ۳۳، ۳۷:

"Pavement of the martyrs": *Cl. Huart*

*des Arabes*، ۱۹۱۳ء، ۲: ۱۳۸: *H. Fournel*

*Les Berbers....*، ۱: (۱۸۷۵ء): ۲۸۰، حاشیہ ۳:

*M. Mercier* اور *A. Seguin*: *Charles Martel et la*

*Bataille de Piotiers*، ۱۹۳۳ء، ص ۱۷، ۱۹، ۲۶، ۲۷:

۳۹: *C.F. Seybold*، در لاء، ت، ۱: ۵۵ [بذیل مادہ

عبدالرحمن... الغافقي] - *Chaussée* [شهداء کا]

*Histoire des Musulmans d' Espagne*: *Dozy*

۱: ۲۵۲، بار دوم از *Lévi Provençal*، ۱۹۳۲ء، ۱:

۱۵۸ و حاشیہ ۱: *Lafuente y Alcantara* کتاب:

مذکور، ص ۳۶: *Calzada*: *Fr. Codera*: *Narbona*:

۱۹۰۶ تا ۱۹۲۰ء، *Gerona y Barcelona*...

جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں اور جس کا پانچویں

صدی ہجری/گیارہویں صدی عیسوی سے آغاز ہوتا

ہے، طبع *Lafuente y Alcantara*، ميڈرڈ ۱۸۶۸ء،

متن ص ۲۵: ہسپانوی ترجمہ ص ۳۶ و حاشیہ ۲):

آگے چل کر ابن بشکوال (م ۵۵۷۸ / ۱۱۸۲ -

۱۱۸۳ء) حوالہ در المقری: کتاب مذکور، لائڈن،

۲: ۹، سطر ۱۶ تا ۱۷، قاہرہ ۳: ۱۵ سطر ۵، لیکن

ایک مختلف شکل غزوة البلاط کے ساتھ، ابن

عذاری (م آخر چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی

عیسوی): *البيان المغرب*، طبع ڈوزی، ۱: ۳۷،

طبع *Colin و Lévi-Provinçal*، ۱: ۵۱: ترجمہ

*Fagnan*، ۱: ۴۹: لیکن اس مؤرخ نے واقعے کے آغاز

کی تاریخ ۵۱۱۳ کے بجائے ۵۱۱۵ بتائی ہے:

ابن خلدون (م ۵۸۰۸ / ۱۴۰۶ء): *العبر*، بولاق

۴: ۱۱۹ سطر ۶، جس میں بعض بیاض ہیں جنہیں

کتاب خانہ ملی، پیرس کے قلمی نسخوں سے اور

المقری کے حرف بہ حرف اقتباسات، لائڈن، ۱: ۱۴۶

سطر ۳ اور قاہرہ ۱۹۳۹ء، ۱: ۲۲۰ سطر ۱۵ سے پر کیا

جا سکتا ہے: المقری (م ۵۱۰۳ / ۱۶۳۲ء اوپر، بذیل

ابن بشکوال و ابن خلدون: پہلے عبارت کا ترجمہ

*Lafuente y Alcantara* نے اشاریات اخبار مجموعہ

(*Ajbar Machmûla*)، ص ۱۹۸ میں کیا ہے، اور

دوسرے حصے کے *Pascual de Gayangos* نے *The History*

*of the Mohammedan Dynasteis in Spain*، ۲ (لنڈن

۱۸۳۳ء): ۳۷ و حاشیہ ۲ میں کیا ہے۔

ازمنہ وسطی کے دوسرے عرب مؤرخوں نے

اس بات کی طرف محض اشارہ کیا ہے کہ مسلمان

اور ان کے سردار عبدالرحمن وہاں [اسلام کی خاطر]

شہید ہوئے (یستشهد یا استشهد): ابن عبد الحکم

(م ۵۲۵۷ / ۸۷۱ء): *فتوح افریقیة و الاندلس*، طبع

*A. Gateau*، بار دوم، الجزائر ۱۹۳۸ء، متن ص ۱۲۰

سطر ۱۱: فرانسیسی ترجمہ ص ۱۲۱ سطر ۲۲،

*Bataille de Poitiers*، پیرس ۱۹۳۳ء، ۹۳ تا ۹۹ جس میں ۱۳۵ کتابوں کے حوالے دیے ہوئے ہیں، کے اختتام پر جو ماخذ M. Mercier اور A. Seguin نے دیے ہیں ان کی طرف بھی رجوع کرنا چاہیے۔ درج ذیل جدید عرب مؤرخوں کی تصانیف بھی دیکھیے، جن کا تمام و کمال مطالعہ (۴) Reynaud کی کتاب *Invasions des Sarrazins*... (پیرس ۱۸۳۶ء؛ انگریزی ترجمہ از ہارون خان شیروانی در IC، ۴/۱۹۳۰ء و ۵/۱۹۳۱ء) پر مبنی ہے۔ یہ ایک صدی سے کچھ زیادہ پرانی تصنیف ہے؛ (۵) شکیب ارسلان: تاریخ غزوات العرب فی فرانسه و سویسرائ و ایطالیہ و جزائر البحر المتوسط، قاہرہ ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء، ص ۳۸، ۵۶، ۵۷، ۸۳، ۸۵، ۹۲ تا ۱۰۳: واقعة البلاط الشهداء؛ (۶) ایم۔ عبداللہ عنان: تاریخ العرب فی اسبانیاء...، قاہرہ ۱۹۲۴ء، ص ۵۵ تا ۵۹؛ (۷) وہی مصنف: مواقف حاسمة فی تاریخ الإسلام، قاہرہ ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء، ص ۱۶ و ۱۱۳؛ (۸) وہی مصنف: العرب فی غالیس و سویسرائ: در مجلہ قاہرہ الرسالة، عدد ۷۲ (۱۹ نومبر ۱۹۳۳ء)، عدد ۷۳ (۲۶ نومبر ۱۹۳۳ء) و عدد ۷۴ (۳ دسمبر ۱۹۳۳ء)؛ (۹) حسن مراد: تاریخ العرب فی الاندلس، قاہرہ ۱۳۴۸ھ/۱۹۳۰ء، ص ۲۷ (عربی اصطلاح [بلاط الشهداء] استعمال نہیں کرتا)؛ (۱۰) بطرس البستانی: معارک العرب فی الشرق والغرب، بیروت، ۱۹۴۴ء، ص ۵۵ تا ۵۶؛ (۱۱) حسین مونس: آثار ظہور الإسلام فی أوضاع السیاسیة والاقتصادیة والاجتماعیة فی البحر الابيض المتوسط، در المجلہ التاريخیة المصریة جسے Société Egyptienne d'Études Historiques نے قاہرہ سے سات اجزاء میں شائع کیا۔ ۱/۵۵: (مئی ۱۹۵۱ء): ۶۷ تا ۶۸ مع ماخذ ۶۸ حاشیہ ۱۔

درج ذیل دو تصانیف بھی قابل ذکر ہیں:

(۱۲) S. Lane.Pool کی کتاب: *The Moors in Spain*، لندن ۱۸۸۷ء، بار دوم ۱۹۲۰ء کا عربی ترجمہ از

*Historia*: Ballesteros y Beretta، *Calzada*: ۱۹۱ ص ۲، *de España...* (۱۹۲۰ء) ۹ تا ۱۰؛ *Calzada*: *Le monde oriental*: (Ch. Diehl اور) G. Marçais، *de 395 à 1081*، ص ۳۳ و حاشیہ ۱؛ *Hist. Esp. Mus.*: E. Lévi-Provençal، ۱۹۵۰ء، ص ۶۲: ”دین کی خاطر شہداء کی شاہراہ“ (یا رومی سڑک)۔

متون کے مطالعے اور Poitiers و طورس کے درمیانی خطے کی چھان بین سے محققین بڑی حد تک متفقہ نتائج تک پہنچے ہیں، جن کا خلاصہ پروفیسر Lévi-Provençal نے نہایت خوبی سے ان لفظوں میں کر دیا ہے کہ ”[یہ لڑائی] Chatelleraut کو Poitiers سے ملانے والی رومی شاہراہ کے نزدیک، مؤخر الذکر شہر سے جنوب مشرق میں تقریباً بیس کیلومیٹر پر، غالباً اسی جگہ جو آج کل بھی Moussais-la-Bataille... کے نام سے مشہور ہے، رمضان ۱۱۱ھ/اکتوبر ۷۳۲ء... یا زیادہ صحت کے ساتھ ۲۵ اور ۳۱ اکتوبر ۷۳۲ء کے درمیان لڑی گئی“ (*Hist. Esp. Mus.*، ۱: ۶۱ تا ۶۲)۔

ماخذ: متن مادہ میں بیان شدہ تصانیف کے علاوہ (۱) ان حوالوں کو دیکھنا چاہیے جو لیوی پرووانسال Lévi-Provençal نے *Histoire des Musulmans d'Espagne*، از ڈوزی، باردوم، لائنڈن ۱۹۳۲ء، ۱: ۱۵۸ حاشیہ ۱۵۸ پر اور خود اپنی کتاب *Hist. Esp. Mus.*، پیرس و لائنڈن ۱۹۵۰ء، ۱: ۵۹ تا ۶۲ میں دیے ہیں۔ مزید برآں (۲) H. Zotenberg *Note sur les invasions arabes dans le Languedoc d'après les sources chrétiennes et les historiens musulmans*، در Dom J. Vaissette و Cl. Devic *Histoire générale du Languedoc*، تولوس (Toulouse) ۱۸۷۵ء، ۲: ۵۴۹ تا ۵۵۸ (مسیحی ماخذ: ۵۴۹ تا ۵۵۴؛ عربی ماخذ: ۵۵۵ تا ۵۵۸)؛ (۳) *Charles Martel et la*



یہ فرنگیوں ہی کے قبضے میں رہا۔ ۱۱۸۸ء میں صلاح الدین ایوبی نے اس پر قبضہ کر لیا، اور عہدِ ایوبی میں یہ عارضی طور پر الملک الظاہر کی حکومت حلب کا حصہ رہا۔ مغول کے حملے کے بعد، جس سے ایک مقامی خاندان کی جد و جہد آزادی کی حوصلہ افزائی ہوئی، اس قلعے کو ۱۲۶۷ء/ ۱۲۶۸-۱۲۶۹ء میں بیبرس کے آگے ہتھیار ڈالنا پڑے اور مملوکوں کے عہد میں نیابتِ طرابلس کے چھ ضلعوں میں سے ایک ضلع کا صدر مقام بن گیا۔

اس کا علم نہیں کہ یہ ویران کب ہوا اور کب اس کا پرانا نام (جو لاطینی Platanus سے ماخوذ ہے) نئے نام سے بدلا گیا جس کی وجہ سے اس کی شناخت میں عرصے تک دشواری پیش آتی رہی۔

مآخذ: (۱) یاقوت، ۱: ۷۱۰؛ (۲) M. Hartmann:

*Das Liwa el - Ladkije*، در ZDPV، ۱۳: ۱۸۰؛ (۳)

*Voyage en Syrie*: E. Fatio و M. van Berchem

قاہرہ ۱۹۱۳-۱۹۱۵ء، ص ۲۸۳ تا ۲۸۸؛ (۴)

*Topographie historique de lu Syrie*: R. Dussaud

پیرس ۱۹۲۷ء، ص ۱۵۰؛ (۵) G. Le Strange:

*Palestine under the Moslems*، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۳۱۶؛

*Le Syrie à*: M. Gauderfroy - Demombynes (۶)

*l'époque des Mamelouks*، پیرس ۱۹۲۳ء، ص ۱۱۳ و

۲۲۶؛ (۷) Cl. Cahen: *La Syrie du Nord*، پیرس

۱۹۳۰ء، بحد اشارہ؛ (۸) J. Weulersse: *Le puy des*

*Alaouites*، طورس Tours، ۱۹۳۰ء، بحد اشارہ؛ (۹)

ع، ہذیل مادہ]۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

بلاغت: لفظ "بلاغت" اسم مصدر ہے۔  
 بلوغ کے معنی ہیں پہنچنا، (پہل کا) پکنا، اثر  
 آفرینی [کہتے ہیں بلوغ بینی کلامک اور اس کے معنی  
 ہیں تمہاری گفتگو نے میرے دل پر گہرا اثر کیا ہے۔  
 اور بلاغۃ کے معنی ہیں فصیح و بلیغ ہونا]۔

علی جارم: العرب فی اسبانیہ، قاہرہ ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء،  
 ص ۲۷ تا ۲۸، اور (۱۳) جرجی زیدان (م ۱۳۳۲ھ/  
 ۱۹۱۳ء) کا تاریخی رومان: شارل و عبدالرحمن: روایۃ  
 تاریخیۃ غرابیۃ، قاہرہ ۱۹۰۳ء، بارچہارم ۱۹۲۶ء، ص  
 ۱۸۱ و ۱۸۵، ۲۱۸، ۲۲۳ و ۲۳۰؛ خاتمے میں یہ بات  
 بھی قابل ذکر ہے کہ الطبری (م ۳۱۰ھ/ ۹۲۳ء)  
 Poitiers کی لڑائی کے بارے میں بالکل خاموش ہے۔  
 (اس کی تصنیف تاریخ الامم و الملوک [صحیح،  
 تاریخ الرسل و الملوک] (Annales)، زیر سنہ ۱۱۱۳ یا دو  
 تین سال پیشتر یا بعد) میں کچھ بھی مذکور نہیں ہے) یہی  
 حال ابن القوطیہ (م ۳۶۷ھ/ ۹۷۷ء): کی افتتاح الاندلس  
 کا ہے۔

(H. PERES)

بلاطنس: قرون وسطیٰ میں شام کا ایک قلعہ،  
 جو آج کل ویران ہے اور قلعة المسہلبۃ کہلاتا ہے۔  
 یہ قلعہ جبل انصاریہ کے ایک طرف نکلے ہوئے  
 حصے پر بنایا گیا تھا اور بقول الدمشقی اس قلعے  
 سے اور قلعہ صہیون سے لاذیقیہ کا پورا میدان نظر  
 آتا تھا؛ اور یہ دونوں اس سڑک کی حفاظت  
 کرتے تھے جو ارنٹس Orontes سے اس کی بندرگاہ جبیلہ  
 تک جاتی تھی۔

... [البنویری نے لکھا ہے] کہ اسے بنوا الاحمر  
 نے بنانا شروع کیا تھا، اس کے بعد جب اس پر  
 بوزنطیوں کا قبضہ ہو گیا تو انہوں نے اس کی تعمیر  
 جاری رکھی اور باسل دوم (Basil II) کے زمانے  
 میں ساحلی علاقے کی جہاں انہوں نے سکونت  
 اختیار کر لی تھی حفاظت جزوی طور پر اسی پر مبنی  
 رکھی۔ یہ دوبارہ مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا،  
 لیکن پہلی صلیبی جنگ کے بعد یہ انطاکیہ کے  
 روجر Roger کے ہاتھ میں چلا گیا اور اس نے اسے  
 بطور جاگیر ساؤن Saône کے رئیس کو دے دیا۔  
 ۱۱۱۸ء/ ۵۱۲ء سے ۱۱۸۸ء/ ۵۸۳ء تک

حیثیت رکھتا ہے، اسلوب بیان اور قرآن کی معجزانہ خوبیوں پر رسالے تصنیف کیے۔ اعجاز قرآن پر ایک نہایت جامع، واضح اور پر از معلومات کتاب ابوبکر الباقلائی [رک باں] (م ۵۴۰۳ / ۶۳۰۱۳) نے تالیف کی۔ اپنی کتاب اعجاز القرآن میں اس نے اعجاز کو مختلف زاویوں سے پرکھا ہے اور قرآن کے اسلوب بیان پر تفصیل سے بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ کس حد تک ادبی تنقید کے ذریعے ہم اعجاز القرآن کے اسرار کو سمجھ سکتے ہیں [دیکھیے لا، اردو، ۳: ۹۷۹]۔ [عبدالقادر الجرجانی (م ۵۴۷۱) نے بھی اعجاز القرآن کے نام سے ایک کتاب تالیف کی]۔

اصول تنقید کے خصوصی مطالعے کے اس دور میں چند مصنفوں نے تنقید شعر اور نامور شعرا کے کلام کی خوبیوں کو سامنے رکھ کر مطالعے پر زیادہ زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں دو مصنفوں کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ ایک الآمدی [رک باں] (م ۵۳۷۱ / ۶۹۸۱)، جس نے قبیلہ طیبی کے دو نامور شاعروں، یعنی ابوتام [رک باں] اور البحتری [رک باں] کے باہم مقابلے پر کتاب (الموازنة بين ابی تمام و البحتری) تصنیف کی اور دوسرا القاضی الجرجانی (م ۵۳۶۶ / ۶۹۷۶) جس نے اپنی کتاب [الوساطة بين المتنبي و خصومه] میں المتنبی کے کلام پر مجادلین کے مابین محاکمہ کیا۔ دیگر تألیفات نے جو اس ضمن میں منصبہ شہود پر آئیں ذیل کی دو صورتیں اختیار کیں:

(۱) ادبی مجموعات کے متن کی شرح اور حل مثلاً المجد (م ۵۲۸۵ / ۶۸۹۸) کی انکلیل؛ (۲) شعرا کے سوانح حیات اور طبقات (مثلاً ابن قتیبة کی الشعر و الشعراء، محمد بن سلام الجمحی (م ۵۲۳۲ / ۶۸۳۶) کی طبقات الشعراء، اور ابو الفرج الاصبہانی (م ۵۳۵۶ / ۶۶۶ - ۶۹۶۷) کی کتب الآغانی)۔ خصوصی مطالعے کی ایسی مختلف کوششوں سے تنقید کے کئی مسائل پیدا ہوئے، مثلاً ابتداء و تقلید، انتحال و سرقت،

تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی سے لفظ "بلاغت" عام تنقید کی ان چند اصطلاحات۔ مثل معانی، بیان، بدیع، فصاحت، صناعت، نقد۔ میں شامل ہو گیا جو ادب سے متعلقہ تصنیفات کے علاوہ "اعجاز القرآن" کے علوم میں کثرت سے مستعمل و مروج تھیں، لیکن ساتویں / تیرھویں صدی کے لگ بھگ... اسے تین معین فنون۔ معانی، بیان، اور بدیع پر تقسیم کر دیا گیا۔

علم بلاغت کے اس ارتقاء کی تاریخ کو ہم چار ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں: (۱) اصول تنقید کے خصوصی مطالعے کا دور؛ (۲) علم تنقید کے عمومی مطالعے کا دور؛ (۳) علم تنقید پر فلسفیانہ بحث اور اصول بلاغت کی ترتیب و تنظیم کا دور؛ (۴) اصول بلاغت کی آخری اور جامد تدوین کا دور۔

پہلا دور: تیسری اور چوتھی صدی ہجری / نویں اور دسویں صدی عیسوی میں جب اسلامی تہذیب کو عروج حاصل ہوا تو اس دور کے علمائے اسلام نے ادب و لغت کے میدان میں علوم خصوصی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا۔ علما نے کچھ تو قرآن کی تفسیر اور اعجاز القرآن کے اسرار کو معلوم کرنے کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اور کچھ اس نظریے کا لحاظ رکھتے ہوئے کہ عربی زبان کو ایک معیار پر لایا جائے اور حسن بیان کے اصول معین کیے جائیں، قرآن کے اسلوب بیان اور اس کی ادبی خوبیوں پر غور کرنا شروع کیا۔ علوم قرآن کے اس دائرے میں قدیم ترین تصنیفات میں سے ابو عبیدہ (م ۵۲۰۸ / ۶۸۲۳) کی کتاب مجاز القرآن ہے، جس میں قرآنی اصطلاحات اور استعارات سے بحث کی گئی ہے۔ تنقید نگار و مصنف ابن قتیبة (م ۵۲۷۶ / ۶۸۸۹) نے کتاب مشکل القرآن لکھی جس میں قرآن کی غامض آیات کا حل پیش کیا۔ بہت سے مصنفین نے، جن میں معتزلی متکلم الجاحظ (م ۵۲۵۵ / ۶۸۶۹) نمایاں



بھی تھا علم البدیع [یعنی صنائع ادبی اور معاسن کلام] پر پہلی کتاب تصنیف کی۔ جس میں سترہ صنعتوں کا ذکر کیا، مثلاً استعارہ، تجنیس وغیرہ اور انہیں کو بلاغت کی علامات تصور کیا گیا ہے [ابن المعتز کی کتاب البدیع پر تبصرہ دیکھیے ۱۱، اردو، ۱: ۷۰۰ تا ۷۰۱]۔

تیسری اور چوتھی/نویں اور دسویں صدی میں سریانی زبان کے علما نے عرب کے اصول تنقید اور فنون بلاغت کی مزید خدمت کی۔ انہوں نے یونانی کتب کا ترجمہ بتوسط سریانی شروع کیا۔ تیسری صدی کے آخر میں اسحاق بن حنین (م ۵۲۹۸/۹۱۰ء) [رک باں] نے ارسطو کی کتاب ریطوریکا (Rhetorica) یعنی بلاغت و خطابت کا ترجمہ پیش کیا اور چوتھی صدی میں متی بن یونس (م ۵۳۲۸/۹۳۹ - ۶۴۰ء) نے ارسطو کی دوسری کتاب بوطیکا (Poetica) یعنی فن الشعر کا عربی میں ترجمہ کیا۔ عربوں کے فن تنقید میں یونانی اثر کو پہلی مرتبہ ظاہر کرنے والا مصنف قدامہ بن جعفر (م ۵۳۳۷/۹۴۸ء) تھا اور غالباً یہ پہلا مصنف ہے جس نے اپنی کتابوں میں عربوں کے قدیم فن بلاغت کو "نقد" (= تنقید) سے تعبیر کیا۔ علم تنقید پر قدامہ کی دو تالیفات ہیں: نقد الشعر اور نقد النثر۔ قدامہ نے اپنی کتاب نقد الشعر کے دیباچے میں واضح کیا ہے کہ متقدمین نے شعر کے تنقیدی پہلو کو، جو بہت ضروری اور اہم تھا، نظر انداز کر دیا۔ اور شعر کے غیر ضروری پہلوؤں پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، مثلاً عروض اور نحو پر زور دیا؛ چنانچہ یہ کمی دور کرنے کے لیے اس نے نقد الشعر لکھی، جس کا خاکہ اس نے بڑے معقول انداز پر تیار کیا اور اسے آٹھ فصلوں پر تقسیم کیا جن کا محور لفظ و معنی کا باہم علاقہ ہے۔ دوسری کتاب، یعنی نقد النثر میں (جس کے مستند ہونے کے بارے میں علما میں اختلاف ہے)

عبارات و معانی، اختراع، تخلیق ادب، استعداد شعر کے عناصر ترکیبی، ماحول کا اثر اور ایسے ہی دیگر مسائل۔ ان مسائل کی بدولت تزئین کلام سے متعلقہ عام اصطلاحات بھی قائم ہو گئیں، مثلاً استعارہ، تشبیہ، تعریض، کنایہ، تجنیس، ایجاز، وضوح و ابہام اور ایسی بہت سی اصطلاحات جو بعد میں علم بلاغت کے مقبول عام مباحث قرار پائے۔ دوسرا دور: اصول تنقید کے خصوصی مطالعے کے ساتھ ساتھ معاسن ادب پر اجمالی و عمومی ابہام کی کوششیں بھی ہونے لگیں۔ ایسی تصنیفات میں الجاحظ کی کتاب البیان و التبيين ایک پیش رو کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں تعبیر کے مختلف اسباب و ذرائع کا ذکر کیا گیا ہے مثلاً اشارہ، علامت، لفظ اور کلام کے معاسن۔ و معائب کے خصائص گنوائے ہیں۔ اس سلسلے میں اس نے عرب کے مشہور فصحا اور ان قبائل کے کلام سے جو اپنی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے معروف تھے، اقتباسات بطور مثال پیش کیے ہیں۔ قدیم مہذب اقوام کے فصیح و بلیغ کلام کے ترجمے بھی الجاحظ کے سامنے موجود تھے۔ ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے بلاغت کے مفہوم کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، اور بلاغت کے سلسلے میں اس نے ایرانی، یونانی، رومی اور ہندی علما کی آرا بھی پیش کی ہیں۔ اور آگے چل کر اس نے عرب علما کے نظریے بھی بیان کیے ہیں جن میں سہل بن ہارون، العتّابی اور ابن المقفع [رک باں] شامل ہیں۔ ان کے نظریات بظاہر چند خواص پر مرتکز ہوتے ہیں، مثلاً حسن تقسیم، اختیار الکلام، ایضاح الدلالة، ایجاز، مطابقت الکلام لمقتضى الحال اور تحصیل غرض (جیسے تاثیر، ترغیب، اتناع)۔ یہ خواص ایک طویل زمانے تک عربی بلاغت کی جان سمجھے گئے۔ اسی دور میں شہزادہ ابن المعتز (م ۵۲۹۶/۹۰۸ء) [رک باں] نے جو شاعر

عبدالقاہر نے فنونِ بلاغت کے سلسلے میں جو خدمت کی ہے وہ اس کی دو قابل قدر کتابوں، یعنی دلائل الإعجاز اور اسرار البلاغة میں نمایاں ہے۔ اور انہیں کتابوں کی بنا پر عبدالقاہر کو عربوں کے فنِ بلاغت کا مؤسس و بانی سمجھا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں کے مجموعی مطالعے سے ادب کے اصولی نظریے اور تنقید کے بنیادی فلسفے کا پتا چلتا ہے۔ دلائل میں کلام کے ترکیبی پہلو (یعنی نظم) پر بحث کی گئی ہے اور اسرار البلاغة میں فن ادب کے جمالیاتی اور تاثیر پھلو کا تجزیہ کیا گیا ہے، اور یہی بلاغت کی جان ہے۔ اگرچہ پہلی کتاب میں عبدالقاہر کا اصل مقصد تو نظم قرآن کی ان خوبیوں کو دریافت کرنا تھا جن کا مثیل لانا انسان کی طاقت سے باہر ہے، لیکن بحث کے دوران میں اسے قدرتی طور پر محاسنِ ادب کے وسیع مسئلے کو چھیڑنا پڑا؛ چنانچہ اس نے ایک نظریہ قائم کیا اور اس کے اثبات کے لیے نظم کلام کی مختلف وجوہ ترکیب میں اس کا استعمال، مثلاً وصل و فصل، ذکر و حذف، تعریف و تنکیر، . . . وغیرہ میں دکھایا اور اس سلسلے میں قرآن اور قدیم عربی نظم و نثر سے شواہد مع تجزیہ پیش کیے۔ اس کتاب کا بنیادی اصول ان لفظوں میں پیش کیا جا سکتا ہے: ”کلام کا اہم رکن نظم کلام ہے اور نظم کلام کا اصل جوہر معنی ہے؛ چنانچہ جب معنی ایک مرتبہ عقل میں اپنی صحیح ترتیب سے مرتسم ہو جائیں تو عبارت ایک معین انداز میں ان معنوں پر خود بہ خود منطبق ہوتی چلی جاتی ہے“۔ اگر یہ تجزیہ درست ہے تو یہ ظاہر ہو جائے گا کہ حسن کلام کا تعلق معنی سے ہے نہ کہ لفظ سے۔

اسرار البلاغة میں عبدالقاہر نے علم بلاغت کے بنیادی اصول دریافت کرنے کی کوشش کو جاری رکھا ہے۔ اور ان اصول کو قانونِ نفسیات

کتاب کا ابتدائی حصہ الجاحظ کی مذکورہ بالا کتاب البیان پر تنقید کے لیے مختص ہے۔ اس کے بعد ”علم بیان“ کو بہتر منظم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن علم تنقید کا زیادہ وسیع اور مفصل بیان ابو ہلال العسکری (م ۵۳۹۵ / ۱۰۰۳ - ۱۰۰۵ء) نے اپنی کتاب الصناعتین (یعنی دو صنعتوں: صنعت کتابت (= نثر) اور صنعت شعر پر کتاب) میں کیا ہے۔ العسکری نے متقدمین کے پیش کردہ مواد کو بہتر ترتیب دینے کی کوشش کی ہے اور علم البدیع کی صنعتوں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ اپنے دیباچے میں اس نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بعد سب سے زیادہ لائق توجہ علم البلاغة ہے جس پر اللہ کی کتاب کے اعجاز کو صحیح طور پر سمجھنے کا مدار ہے۔ اس کے علاوہ علم بلاغت کا مطالعہ ادب کا ذوق پیدا کرتا ہے، شعر گوئی اور انشا پردازی میں مدد دیتا ہے اور شعر و نثر کے عمدہ انتخابات مرتب کرنے میں رہنمائی کرتا ہے۔ کتاب کی پہلی فصل میں مصنف نے ”بلاغت“ اور ”فصاحت“ کے دقیق تصورات کے باہمی تعلق پر بحث کی ہے، اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فصاحت دراصل بلاغت کا لازمی جزو ہے؛ چنانچہ اس نے بلاغت کی تعریف یوں کی ہے: ”بلاغت ہر وہ ذریعہ ہے جس سے آپ اپنے معنی کو مقبول اور خوب صورت انداز میں (یعنی فصاحت کے ساتھ) سامع تک پہنچائیں اور سامع کے دل میں ایسا نقش بٹھائیں جیسا کہ آپ کے اپنے دل میں ہے“۔ کتاب کا ایک بڑا حصہ علم البدیع کی صنعتوں کے احصا اور ان کے شواہد پر مشتمل ہے۔ تیسرا دور: پانچویں صدی ہجری / گیارھویں صدی عیسوی کے آغاز سے بلاغة العرب کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے اور اس دور کا نمائندہ عبدالقاہر الجرجانی (م ۵۳۷۱ / ۱۰۷۸ء) ہے۔



کی اصل روح کو چھوڑ دیا، کیونکہ انہوں نے ظاہری ڈھانچے پر زیادہ توجہ کی؛ (۳) اس نے ادبی تنقید اور نفسیاتی و جمالیاتی مطالعے کے باہمی ربط و تعلق کو بھی پہلی مرتبہ ظاہر کیا۔ عصر حاضر کی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ الجرجانی کی تالیف صحیح راہ کی جانب ایک قدم تھا اور اس طرح وہ عبدالقاهر کو جدید فن تنقید کے پیش رووں میں کھڑا کرتی ہے۔

اگرچہ عبدالقاهر اپنے زمانے کے لحاظ سے قدیم فن بلاغت اور فلسفہ تنقید میں ایک بلند پایہ، بلکہ ایک عظیم النظیر، پیش رو کی حیثیت رکھتا ہے تاہم اس کے دور میں اور اس کے بعد کے دو سو سال تک بہت سے ایسے مصنف پیدا ہوئے جنہوں نے تمام فن ادب پر محیط مبسوط کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے کم از کم تین مصنف فن تنقید کے اس تاریخی جائزے میں قابل ذکر ہیں: (۱) ابن رشیق القیروانی (م ۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ء) [رک بان] جو شمالی افریقہ کا باشندہ تھا اور عبدالقاهر کا ہم عصر اس نے ایک معیاری کتاب بعنوان العمدۃ فی صناعۃ الشعر و نقیہ لکھی ہے۔ کتاب کا آغاز ادب سے متعلقہ عمومی مسائل کی بحث سے ہوتا ہے، مثلاً فضائل شعر، ان لوگوں کا رد جو شغل شعر گوئی کو ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں، خلفاء، قضاة اور فقہا جیسے عمائد کے اشعار، قبائل جاہلیہ کا باری باری سے شعری فضیلت کا حقدار ہونا، قدما اور محدثین کے کلام کی خوبیوں وغیرہ۔ اس کے بعد مصنف شعر کی فنی اصطلاحات کا ذکر کرتا ہے، مثلاً اوزان و قوافی اور بعد کو عام مصطلحات کی تعریفات پیش کرتا ہے، مثلاً بلاغت، ایجاز، بیان، نظم، بدیع وغیرہ۔ ان اصطلاحات کو القیروانی نے اپنی کتاب کے جو چھ صفحات پر مشتمل ہے ایک تہائی حصے میں پیش کر چکنے کے بعد باقی ماندہ

میں تلاش کرنے کی طرف قدم اٹھایا۔ اس نے تجزیہ کیا: ”جب ہم ایک جمیل ادبی عبارت سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں کیا کیفیت پیدا ہوتی ہے؟ اور کس طور پر سجع اور تجنیس جیسی صنعتیں ہمیں خوش کرتی ہیں؟ ایک خوب صورت استعارہ یا ایک سلیقے سے چنی ہوئی تشبیہ یا تمثیل کس طرح ہم پر اثر کرتی ہے؟ اور کون سی چیز ہمارے ادبی ذوق سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے، البختری کا سلیس شعر یا ابوتمام کی گہری اور پیچیدہ نظم؟ اور اس کی وجہ کیا ہے؟“ اگر ہم ایسے سوالات کے لیے اپنی قوت ادراک و تاثر کے جلی سرچشموں کی طرف رجوع کریں تو ہمیں تحسین ادب کی مضبوط اساس کا پتا چل سکتا ہے۔ تنقیدی فکر کی تجدید کے لیے الجرجانی نے جو کوشش کی ہے اس میں الجرجانی کی طبیعت کے دو پہلوؤں کا حسین امتزاج نمایاں ہے۔ اول اس کا منطقیانہ ذہن جو تحلیل و ترکیب کے اصول سے خوب واقف ہے اور دوم تحسین ادب اور اس سے حظاندوزی کا حقیقی ذوق۔ الجرجانی کے تجزیہ اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے معلوم تھا کہ ادب ایک وسیع تر مفہوم کا جسے فن (art) سے تعبیر کرتے ہیں محض ایک حصہ ہے؛ چنانچہ جا بجا اس نے دوسرے فنون لطیفہ کی طرف توجہ دلائی ہے، مثلاً مصوری اور سنگ تراشی اور جمالیاتی تصورات، مانند تالیف و تناسب۔ عبدالقاهر کی کتاب کی اہمیت کا دارومدار اس کے مندرجہ ذیل کارہائے نمایاں پر ہے: (۱) اس نے متقدمین کی تصنیفات متعلقہ تنقید و بلاغت سے مواد حاصل کیا اور ان سے فلسفہ تنقید کی ایک باقاعدہ صورت پیدا کرنے کی کوشش کی؛ (۲) اس نے تنقید کی ایسی بنیاد رکھی جس پر متاخرین نے اپنی سہ فنی علم بلاغت کی عمارت کھڑی کی۔ اگرچہ یہ محض ایک ظاہری بناوٹ تھی، لیکن متاخرین نے فن بلاغت

سے بھی اقتباسات شامل کیے ہیں۔ اسی بناء پر المثل السائر کو تنقید کے نظریاتی نقطہ نگاہ سے لکھی ہوئی کتاب ہونے کی نسبت ادبی رجحان رکھنے والوں اور عملی تنقید نگاروں کے لیے زیادہ مفید راہنما سمجھا گیا ہے۔

چوتھا دور: تقریباً ساتویں / تیرھویں صدی سے بلاغت کی تین مختلف شاخیں ممیز ہونا شروع ہو گئیں اور بلاغت کی یہ تقسیم پہلے پہل غالباً ابو یعقوب السکاکی الخوارزمی (م ۵۶۹۹ / ۶۱۲۹۹) نے پیش کی۔ اس دور کا آغاز السکاکی کی کتاب مفتاح العلوم سے ہوتا ہے۔ ادب کی تین اہم شاخیں جن سے السکاکی نے بحث کی ہے یہ ہیں: (۱) علم الصرف، (۲) علم النحو، (۳) علم المعانی و علم البیان۔ اس تیسرے باب میں السکاکی نے بلاغت کے دو مختلف علوم کی حدود متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلا وہ علم جس میں نظم کلام کی خصوصیات پر اس حیثیت سے بحث کی جائے کہ کلام اپنے مقتضی الحال کے موافق ہو جائے۔ یہ علم المعانی کہلاتا ہے اور دوسرا وہ علم جس میں ایضاح الدلالة کی مختلف طریق پر اس حیثیت سے بحث کی جائے کہ مقصود صحیح طور پر حاصل ہو۔ یہ علم البیان کہلاتا ہے۔ فنون بلاغت کی اس تقسیم سے مصنف نے نظم کلام اور زور کلام کی باہمی تفریق کو جسے عبدالقاهر نے نمایاں کرنے کی کوشش کی تھی ایک منطقیانہ انداز سے ثابت کر دیا۔ اس تقسیم کے ساتھ السکاکی نے محسنات کلام پر ایک چھوٹی سی فصل بھی شامل کر دی، جس نے بعد میں رفتہ رفتہ بلاغت کے تیسرے مستقل فن - یعنی علم البدیع کی حیثیت حاصل کر لی۔

فنون بلاغت کی اس تعیین کو متاخرین نے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ان علما میں سب سے ممتاز (جلال الدین) الخطیب القزوی (م ۵۷۳۹ /

دو تہائی حصے کو العسکری اور ابن المعتز کی طرح صنائع و بدائع کی تشریح پر صرف کیا ہے اور صنعتوں کا شمار سائہ سے کچھ اوپر پہنچا دیا ہے۔ کتاب کا خاتمہ اقسام شعر اور اصناف سخن کے بیان پر کیا ہے، مثلاً مدیح، رثاء، ہجاء، اعتذار۔ (۲) دوسرا نامور مصنف پانچویں / گیارھویں صدی کا ایک اور نقاد [ابو محمد عبداللہ] ابن سنان الخفاجی الحلبي (م ۵۴۶۶ / ۶۱۰۷۳) ہے جس نے سرفصاحة تصنیف کی۔ ابن سنان نے اپنی کتاب کے پہلے حصے میں عربی حروف کی اصوات اور ان کی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی ہے، پھر اس نے فصاحت اور بلاغت کی تعریف کرتے ہوئے متقدمین کی آرا پیش کی ہیں اور ان کی بعض آرا و مسلمات پر تنقید کی ہے اور استدلالاً شعر اور نثر سے منتخب مثالیں درج کی ہیں۔ (۳) عربی مصنفین کے اس سلسلے میں تیسرا مصنف ضیاء الدین ابن الاثیر (م ۵۶۳۷ / ۶۱۲۳۹) [رکبہ ابن الاثیر (۳)] ہے، جو صلاح الدین الایوبی کا وزیر اور مشہور رسائل نویس تھا۔ وہ القاضی الفاضل (م ۵۵۹۶ / ۶۱۱۹۹) کا شاگرد تھا۔ اس نے المثل السائر فی ادب الکاتب و الشاعر تصنیف کی۔ ابن الاثیر نے اپنا موضوع بحث فن ادب کا سارا وسیع مضمون قرار دیا اور عبدالقاهر کی طرح ادبی متون کی تحلیل و تشریح میں دوسروں پر سبقت لے گیا، لیکن کاتب و شاعر کی تربیت کے لیے اس نے تجرباتی طریقے پر زیادہ زور دے کر خاص شہرت پائی۔ اس نے اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لیے قرآن، حدیث اور قدیم عربی سرچشمہ ادب کے گہرے اور متواتر مطالعے کو نہ صرف پسند یا تجویز کیا بلکہ اس پر بہت زور دیا۔ اپنی کتاب میں اس نے کلام کے ارکان - لفظ، معنی اور نظم - پر بحث کرتے ہوئے اپنی رائے کی تائید میں بہت سے شواہد پیش کیے ہیں اور اپنی تصنیفات



مزید اضافات کے ساتھ اس کی ایک شرح لکھی جس کا نام الإيضاح رکھا۔ اس کے بعد آنے والے علما نے، جو دنیائے اسلام کے مختلف اطراف و ممالک سے تعلق رکھتے تھے، اس علمی سرگرمی میں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں مشہور و نامور ہستیاں حسب ذیل ہیں: [المصنفک (م ۵۷۵۶ / ۱۳۵۵ء)]: بہاء الدین السبکی (م ۵۷۷۳ / ۱۳۷۱ء)؛ صاحب عروس الأفراح بشرح تلخیص المفتاح؛ سعد الدین التفتازانی الخراسانی (م ۵۷۹۲ / ۱۳۹۰ء)، جنہوں نے تلخیص پر دو بہت معروف و متداول شرحیں [المطول و مختصر المعانی] تصنیف کی ہیں؛ السید الشریف الجرجانی (م ۵۸۱۶ / ۱۳۱۳ء) [رک باں] جنہوں نے التفتازانی کی شرح المطول پر حاشیہ لکھا ہے؛ ابواللیث السمرقندی (م ۵۸۸۸ / ۱۳۸۳ء) جنہوں نے المطول پر حاشیہ لکھا؛ جلال الدین السيوطی (م ۵۹۱۱ / ۱۵۰۵ء)؛ ابن کمال پاشا الرومی (م ۵۹۳۰ / ۱۵۳۳ء)؛ عصام الدین الأسفرائینی (م ۵۹۳۳ / ۱۵۳۷ء؟)؛ صاحب الاطول؛ [ملا عبدالحکیم السیالکوتی] (م ۵۱۰۶ / ۱۶۵۶ء)؛ جنہوں نے التفتازانی کی المطول پر ایک عمدہ حاشیہ لکھا ہے؛ احمد السنہوری (م ۵۱۱۹۲ / ۱۷۷۸ء)؛ [الدسوقی] (م ۵۱۲۳۰ / ۱۸۱۳ - ۱۸۱۵ء)؛ محمد الامیر (م ۵۱۲۳۲ / ۱۸۱۶ - ۱۸۱۷ء)؛ حسن (بن) العطار (م ۵۱۲۵۰ / ۱۸۳۳ء)۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں انیسویں صدی عیسوی کے خاتمے تک علما کی سرگرمیوں کا یہی رنگ رہا۔ [فارسی، ترکی اور اردو میں بھی علم بلاغت کا بنیادی اسلوب یہی رہا۔ ان زبانوں کے علم بلاغت کے لیے متعلقہ زبانوں پر مقالے ملاحظہ ہوں۔] بہر حال رسمی اور تقلیدی بحث و تمحیص سے جو علم کے میدان میں بہت نمایاں ہو چکی تھی علما ذوق ادب کے تخلیقی پہلو کو نہ ابھار سکے، بلکہ مناظرانہ

ہے، جس نے مفتاح العلوم کا اختصار ایک متن کی صورت میں پیش کیا اور اس کا نام تلخیص المفتاح رکھا۔ اس کتاب میں بلاغت اور فصاحت کی آخری تعریف اور تمیز، ان کا اپنا اپنا دائرہ عمل اور باہمی تعلق بیان کیا گیا ہے۔ (القزوينی نے تصریح کی ہے کہ) فصاحت سے لفظ مفرد، کلام اور متکلم تینوں متصف ہوتے ہیں، لیکن بلاغت سے صرف کلام اور متکلم ہی متصف ہوتے ہیں، چنانچہ فصاحت بلاغت کی ایک لازمی شرط ہے۔ فصاحت اور بلاغت کے اصول سے متعلقہ علوم کی تقسیم تین فنون پر ہے: معانی، بیان اور بدیع؛ علم المعانی کا تعلق ترکیب کلام سے ہے، یعنی اسناد خبری اور متعلقات فعل سے۔ اس علم کے موضوع سے چند ابواب کے ضمن میں بحث کی جاتی ہے، مثلاً ذکر و حذف، وصل و فصل، قصر و ایجاز و اطناب، مساواة وغیرہ۔ دوسرے علم، یعنی علم البیان کی تین اہم اور نمایاں اقسام یہ ہیں: تشبیہ، استعارہ، اور کنایہ اور علم البدیع کی مشہور صنعتیں حسب ذیل ہیں: تضاد، ارضاد، رجوع، لف و نشر، جمع، تفریق، تجرید، مبالغہ، مذهب کلامی، تعجیب، سجع، موازنہ وغیرہ۔ کتاب کا خاتمہ سقرات شعری کی فصل پر ہوتا ہے، جسے قدیم زمانے میں خاص اہمیت حاصل تھی۔

القزوينی کی تلخیص المفتاح کو عربی فی بلاغت کی ایک معیاری کتاب سمجھا گیا اور یہ بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک دنیا کے تمام اسلامی اور عربی مدارس میں علوم بلاغت کی اساسی کتاب تصور ہوتی رہی، چنانچہ اس علم پر قلم اٹھانے والے علما نے اپنی تمام تر توجہ قرناً بعد قرن تلخیص کی ایضاح، شرح، حواشی اور اختصار تالیف کرنے پر لگا دی، بلکہ القزوينی کو خود بھی اپنی تلخیص کی وضاحت و شرح کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس نے

مغرب کے انداز تنقید کا مطالعہ اور متعلقہ کتب کا ترجمہ کیا جائے، پھر عربی ادب میں اس انداز فکر کو اپنایا جائے۔ پہلی تحریک کے مؤیدین میں سے المرصفي المصري (م ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) کو تقدم حاصل ہے۔ اس نے عربی ادب کے علوم کو پھر سے ایک بڑی مبسوط کتاب بعنوان الوسيلة الأدبية إلى العلوم العربية میں مرتب کرنے کی کوشش کی۔ یہ نوکلاسیکی انداز (Neo-Classicism) تریستی دارالعلوم (ٹریننگ کالج) میں، جو عربی زبان کے اساتذہ کے لیے انیسویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں قاہرہ میں قائم کیا گیا تھا عربی زبان و ادب کے طرز تعلیم پر اثر انداز ہوا۔ دور حاضر کے ادبا اور شعرا کے ایک گروہ نے مغرب کے تنقید ادب و اصطلاحات کا مطالعہ کیا اور ان کی اشاعت کی مہم شروع کی۔ نمایاں حصہ لینے والوں میں شاعر و ادیب عباس محمود العقاد اور اس کے ”اصحاب دیوان“ ساتھی ہیں، لیکن عربی فن تنقید کے احیا اور اس میں اضافہ کرنے میں ازھر یونیورسٹی کے ان علما کا نمایاں حصہ ہے جنہوں نے یسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں اپنی تحریک جاری کی۔ دنیائے عرب میں اس تحریک کا بانی طہ حسین تھا جس نے ادب عربی کی تنقید اور مطالعے کو ترقی دے کر اور اسے جدید نظریات کے مطابق ڈھال کر علم و ادب کی بڑی خدمت سر انجام دی ہے، لیکن عربی فن تنقید کے نشو و نما اور ترقی پر سب سے اہم لیکن بلا واسطہ اثر عربی میں نئے اصناف ادب کی ترویج نے ڈالا ہے، جس کے لیے نئے تنقیدی نظریے اور اصطلاحات کی ضرورت پڑی۔ انیسویں صدی کے نصف ثانی سے عربی میں فسانہ اور کہانی کو جگہ ملنی شروع ہوئی۔ یہ تحریک پہلے پہل ترجمے کے ذریعے شروع ہوئی اور بعد ازاں عرب ادیبوں نے طبع زاد قصے کہانیاں اور افسانے لکھ کر

و متکلمانہ موشگافیوں (یا خوش تدبیریوں) میں الجھ گئے۔ ادبی تنقید اپنے عملی دائرے میں محض صنائع و بدائع کی تلاش سے آگے نہ بڑھ سکی اور اپنے نظریاتی دائرے میں ان صنائع و بدائع کی مختلف انواع اور تعریفات میں گم ہو گئی۔ تاہم یہ علمی سرگرمیاں بے مطالب و بے فائدہ نہیں رہیں۔ ان کے ذریعے اسلام کی علمی اور ادبی میراث محفوظ ہو گئی اور پھر دور حاضر کے اس تنقید پسند تخلیقی ذہن تک پہنچ گئی جو انیسویں صدی عیسوی میں بیدار ہونے لگا تھا۔

(ہ) انیسویں صدی عیسوی میں مشرق کے اسلامی ممالک میں نشاۃ ثانیہ ہوئی۔ دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے سیاسی، سماجی اور تعلیمی اصلاحات کے حاسی اور مؤید اٹھے اور انہوں نے اسلامی ممالک کو اپنی گزشتہ عظمتوں کے احیاء کے لیے ابھارا اور انہیں علمی ترقیوں اور علوم جدیدہ سے استفادہ کرنے پر آمادہ کیا اور اپنے سماجی اور تعلیمی نظام کی اصلاح اور اپنے سیاسی حقوق اور قومی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے پر اکسایا۔۔۔ مسلمان علما نے علوم جدیدہ کے نتائج اور استدلال کے طریقوں سے فائدہ اٹھایا۔ قدیم مدارس کے ساتھ ساتھ مغربی طرز کے پبلک سکول بھی کھولے گئے۔ مغرب کے ادب و تنقید سے متعلق تصنیفات کے عربی اور دیگر السنۃ شرقیہ میں تراجم ہوئے جن سے عرب کا ذہن فن ادب کی دیگر اصناف اور ادب کے دیگر انداز تنقید سے متعارف ہو گیا۔ عصر جدید کے ادبا اور تنقید نگاروں کی کوششوں نے دو مختلف مگر باہم ایک دوسرے کو مکمل کرنے والی راہیں اختیار کیں۔ پہلی تحریک یہ تھی کہ عربی بلاغت اور تنقید پر ان قدیم تصنیفات کا جو عربی اسلامی تہذیب کے دور زریں میں لکھی گئی تھیں احیاء کیا جائے۔ اور دوسری کوشش یہ تھی کہ



قاہرہ ۱۳۲۱ھ: (۴) ابن قتیبہ: مشکل القرآن؛ (۵) ابن المعتز: کتاب البديع (طبع کراٹشکوفسکی)، لندن ۱۹۳۵ء؛ (۶) قدامة بن جعفر: نقد الشعر، استانبول ۱۳۰۲ھ؛ (۷) وہی مصنف: نقد النثر، قاہرہ ۱۹۳۳ء؛ (۸) الأغاني، بولاق ۱۳۸۳-۱۳۸۵، ۲۱ جلد، ۱۸۸۸ء؛ (۹) الحسن بن بشر الأمدی: الموازنة بين أبي تمام والبحتري، قاہرہ ۱۹۲۸ء؛ (۱۰) الجرجاني علی بن عبدالعزیز: الوساطة بين المتنبی وخصومه، صیدا ۱۳۳۱ھ؛ (۱۱) ابو هلال العسكري: کتاب الصناعتين، استانبول ۱۳۲۰ھ؛ (۱۲) ابوبکر الباقلائی: اعجاز القرآن، قاہرہ ۱۳۳۹ھ؛ (۱۳) ابن رشيق القيرواني: العمدة، قاہرہ ۱۹۰۷ء؛ (۱۴) ابن سنان الخفاجي العلي: سر الفصاحة، قاہرہ ۱۹۳۲ء؛ (۱۵) عبدالقاهر الجرجاني: دلائل الإعجاز، قاہرہ ۱۳۳۱ھ؛ (۱۶) وہی مصنف: أسرار البلاغة، قاہرہ ۱۳۲۰ھ؛ (۱۷) السكاكي: مفتاح العلوم، قاہرہ ۱۳۱۸ھ؛ (۱۸) ضياء الدين ابن الاثير: المثل السائر، قاہرہ ۱۳۱۳ھ؛ (۱۹) جلال الدين القزويني: تلخيص المفتاح، قاہرہ ۱۹۰۳ء؛ (۲۰) وہی مصنف: الأيضاح، قاہرہ ۱۳۶۷ھ؛ (۲۱) بهاء الدين الشبلي: غروس الأفرح، بولاق ۱۳۱۸ھ؛ (۲۲) سعد الدين التفتازاني: المَطْوَل (= الشرح الكبير)، استانبول ۱۳۰۳ھ؛ (۲۳) وہی مصنف: المختصر (الشرح الصغير)، کلکتہ ۱۸۱۳ء؛ (۲۴) المرصفي: الوسيلة الأدبية، قاہرہ، ۱۲۹۲ھ؛ (۲۵) المرغبي احمد مصطفى: تاريخ علوم البلاغة؛ (۲۶) السيد نوفل: البلاغة العربية في دور نشأتها؛ (۲۷) محمد خلف الله: من الوجبة النفسية، قاہرہ؛ (۲۸) وہی مصنف: مقاله البديع از محمد خلف الله، در *Journal of Quranic Studies* (۲۹) *as an Important Factor in the development of Arabic Literary Criticism*، مقاله در اسکندريہ يونيورسٹی، فيکلٹی آف آرٹس بلين، ۱۹۵۲؛ (۳۰) *Abd al-Qahir's Theory in his Secrets of Eloquence*، مقاله

اس صنف ادب کو اوج کمال تک پہنچا دیا۔ اسی نصف صدی کے دوران میں عربی کے مقبول شاہکار از قسم منظوم ڈرامہ، مختصر افسانہ اور ناول دنیا کی کئی زبانوں، مثلاً انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی میں ترجمہ ہو چکے ہیں۔

چنانچہ ادب کی اس نئی تحریک کے لیے نئے انداز تنقید کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قدیم بلاغت کے اصول نئے اصناف ادب کی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکتے تھے۔ پلاٹ، کردار نگاری، تصنیف کی ہم آہنگی، رازہائے حیات کی تعبیر، کلام میں شاعر یا مصنف کے ذلتی رنگ کی جھلک، آرٹ کے مقصد سے متعلقہ مسائل، ادبی تنقید اور دیگر خصائل بشری کے باہمی ربط جیسے مسائل قدیم بلاغت کی صنعتوں، مثلاً استعارہ، تشبیہ اور کنایہ کی نسبت عصر حاضر کے تنقیدنگار کے لیے زیادہ جاذب توجہ بن گئے۔ مغرب کے مختلف نظریات ادب، جو اسلوب بیان اور طرز ادا سے متعلق ہیں، محاکمہ اور تعبیر، کلاسیکی انداز، رومانی طرز انشا اور دیگر بہت سے نظریے اور مسلک اب دور جدید کے تنقیدنگار کے ضروری وسائل بن گئے ہیں، لیکن بظاہر دور حاضر کے ادب کے ارتقا کا میلان، قدیم فن بلاغت اور جدید طرز تنقید کے درمیان تصادم و تفریق کی نسبت ان کے باہمی امتزاج و ہم آہنگی کی طرف زیادہ ہے۔ تاہم عربی زبان اور اس کے ذوق ادب میں محاسن اسلوب کا لحاظ رکھنا اس قدر راسخ ہو چکا ہے کہ جدید انداز تنقید اسے معونہ نہیں کر سکا، چنانچہ عربی فن بلاغت و تنقید کا مستقبل غالباً تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے فن تنقید اور جدید انداز تنقید کے امتزاج کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

مآخذ: (۱) ابو عبیدہ معمر بن الشثی: معجاز غریب القرآن، قاہرہ؛ (۲) محمد بن سلام الجمعی: طبقات فحول الشعراء، قاہرہ ۱۹۵۲ء؛ (۳) الجاحظ: کتاب البیان والتبيين،

(۳۸) انشاء اللہ خان انشا : دریائے لطافت، مرشد آباد  
 ۵۱۳۶۶؛ (۳۹) ذوالفقار علی : تذکرۃ البلاغۃ، دہلی  
 ۱۹۳۷ (بار سوم)؛ (۵۰) نجم الغنی : بحر الفصاحة،  
 لکھنؤ ۱۹۲۶؛ (۵۱) وہی مصنف : مفتاح البلاغۃ،  
 لاہور ۱۹۲۱؛ (۵۲) مرزا محمد عسکری : آئینۃ بلاغت،  
 لکھنؤ ۱۹۳۷؛ (۵۳) عبدالرحمان : مرآة الشعر،  
 دہلی ۱۹۲۶؛ (۵۴) جعفری، جلال الدین احمد :  
 کنز البلاغۃ، کراچی (بدون تاریخ)؛ (۵۵) سجاد مرزا :  
 تسہیل البلاغۃ ] .

(محمد خلف اللہ [و ادارہ])

- \* بلال : یہ لفظ [انڈونیشیا] میں عموماً مؤذن کے لیے استعمال ہوتا ہے .
- \* بلال بن ابی بردہ : رکن بہ الأشعری ابو بردہ .
- \* بلال بن جریر المحدثی : ابوالندا، عدن کا زریعی [رک بان] وزیر اور والی، اسے زریعی شہزادہ سبا بن ابی السعود نے اپنے عم زاد شریک سلطنت علی بن ابی الغرأت المسعودی کے خلاف ۵۳۱ - ۵۳۲ / ۱۱۳۶ - ۱۱۳۸ء کی جنگ کے موقع پر اس منصب پر متعین کیا تھا - ۵۳۳ / ۱۱۳۸ - ۱۱۳۹ء میں سبا کی وفات پر اس کے بیٹے اور جانشین الاعز نے، جو بلال سے سخت حسد رکھتا تھا، اسے مروا دینا چاہا، لیکن ۵۳۴ / ۱۱۳۹ - ۱۱۴۰ء میں وہ اس کام کو سر انجام دینے سے بے رغبت ہو گیا - اس کی اچانک موت پر بلال نے سبا کے چھوٹے لڑکے محمد کو تعز سے بلایا، جہاں وہ اپنے بھائی کے غیظ و غضب اور نفرت سے جان بچا کر چھپا ہوا تھا، اور اسے الاعز کے چھوٹے بیٹوں کے مقابلے میں تخت پر بٹھا دیا اور اپنی بیٹی سے اس کی شادی کر دی - اس وفاداری کے صلے میں بلال متحدہ شہر کا وزیر مقرر ہوا اور اپنی موت (۵۳۶ - ۵۳۷ / ۱۱۵۲ - ۱۲۵۳ء) تک اسی منصب پر فائز رہا - محمد بن سبا کی تخت نشینی کے

در *Journal of New Eastern Studies*، ۱۹۵۵ء، امریکہ؛  
 (۳۱) *The Philosophy of Rhetoric* : I.A. Richards  
 لنڈن؛ (۳۲) *Rhétorique* : J.B. Saint-Hilaire  
 (?) *d'Aristote*، پیرس؛ (۳۳) *La* : M.G. De Tassy  
*Rhétorique des Nations Musalmanes*، مقالہ در  
*Asiatique*، ملخص از حدائق البلاغۃ مؤلفہ شمس الدین  
 فقیر الدہلوی؛ (۳۴) *A History* : G. Saintsbury  
*of Criticism and Literary Taste in Europe*، لنڈن؛  
 (۳۵) *Arabic Literary* : J.E. von Grunebaum  
*Criticism in the 10th Century A.D.*، مقالہ در  
*J. Am. Orient. Society*، ۱۹۳۱ء؛ [Puttenham (۳۶)]  
*Art of English Poesie*، کیمبرج ۱۹۳۶ء؛ (۳۷)  
*Elements of Rhetoric* : Wheatley، لنڈن ۱۸۶۳ء؛  
 (۳۸) *Die Rhetorik der Araber* : A.F. Mehren  
 کوپن ہاگن ۱۸۵۳ء؛ (۳۹) *Short* : G. G. Loane  
 لنڈن ۱۹۲۳ء؛ (۴۰) *Handbook of Literary Terms*،  
 J.E. von Grunebaum  
*of Arabic Criticism*، لنڈن ۱۹۵۰ء؛ (۴۱) احسان الہی :  
 جلال الدین القزوینی در معارف، اعظم گڑھ جنوری  
 ۱۹۳۳ء؛ (۴۲) وہی مصنف : بدیعیات، در المنار، لاہور  
 اپریل ۱۹۵۱ء؛ فارسی علم بلاغت کے لیے دیکھیے :  
 (۴۳) رشید الدین الوطواط : حدائق السعیر، تہران  
 ۱۹۳۵ء؛ (۴۴) شمس قیس رازی - المعجم فی معاییر  
 أشعار العجم، لنڈن ۱۹۰۹ء؛ (۴۵) F. Gladwin  
*A Dissertation of the Rhetoric, Prosody and*  
*Rhyme of the Persians*، کلکتہ ۱۸۱۱ء؛ (۴۶)  
*Rhetorique et Prosedie des* : M. G. De Tassy  
 پیرس ۱۸۷۳ء؛ (۴۷) *Langues de l'Orient Mussulman*  
 E. G. Browne  
*A Literary History of Persia* : E. G. Browne  
 لنڈن ۱۹۰۶ء؛ ترکی فن بلاغت کے لیے دیکھیے :  
 (۴۸) *A History of Ottoman Poetry* : E. J. W. Gibb  
 لنڈن ۱۹۰۰ء؛ اردو فن بلاغت کے لیے دیکھیے :



بعض روایات میں ہے کہ بالغوں میں حضرت ابوبکرؓ کے بعد یہی مسلمان ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ غلام ہونے کی وجہ سے ان پر بہت سختیاں اور ظلم کیے گئے، خصوصاً امیہ بن خلف نے انہیں سخت ایذائیں پہنچائیں، لیکن انہوں نے تمام مصائب بڑے صبر سے برداشت کیے اور اسلام کو نہیں چھوڑا۔ بالآخر حضرت ابوبکرؓ ان کی نجات کا سبب بنے۔ آپ نے حضرت بلالؓ کو خرید لیا یا اپنے ایک تندرست غلام سے بدل لیا جو مسلمان نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد بلالؓ ہمیشہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں رہے۔

مدینہ منورہ کو ہجرت کرنے کے بعد حضرت بلالؓ حضرت ابوبکرؓ اور بہت سے مکی مسلمان بخار میں مبتلا رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ اور ابو رویحہؓ الخثعمی کے درمیان رشتہ مؤاخاة قائم کر دیا۔ یہ وہی ابو رویحہؓ ہیں جنہیں بلالؓ نے شام کی مہم پر جاتے وقت اپنا وظیفہ لینے کا مجاز منتخب کیا تھا۔ اس رشتہ مؤاخاة کی بنا پر حضرت عمرؓ نے افریقہ کے وظیفہ لینے والوں کی فہرست قبیلہ خثعم کے ساتھ منسلک کر دی تھی۔ ابن اسحاق کی روایت کے مطابق اس کے زمانے میں شام میں بھی یہی صورت حال تھی۔

ہجرت کے پہلے سال جب نماز سے پہلے اذان دینے کا فیصلہ ہوا تو حضرت بلالؓ مؤذن مقرر ہوئے۔ وہ تمام غزوات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہوئے۔ غزوہ بدر [رک باں] میں انہوں نے امیہ بن خلف اور اس کے بیٹے کو قتل کر دیا۔۔۔۔

حضرت بلالؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مؤذن ہی کی حیثیت سے زیادہ مشہور و معروف ہیں تاہم وہ آنحضرتؐ کے عصا بردار [رک بہ عنزة]، خازن اور ذاتی خادم بھی تھے اور بعض اوقات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاون

بعد فاطمی خلیفہ الحافظ کی طرف سے بلال کو الشیخ السعید الموفق السدید کا خطاب ملا۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے اپنے دور وزارت میں خاصی دولت جمع کر لی تھی جو اس کی موت پر بادشاہ کے قبضے میں چلی گئی۔ بلال کے بعد اس کے دو بیٹے اس منصب پر فائز رہے یہاں تک کہ جنوبی افریقہ کے ایویوں کے حملے (۵۶۹ / ۶۱۱ء) سے اس خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

مآخذ : (۱) H. C. Kay *Yaman, its early*

*mediaeval history*، لندن ۱۸۹۲ء، بحد اشاریہ؛ (۲)

ابومخرمة: تاریخ ثغر عدن، در *Arabische*

*Texte zur Kenntnis der Stadt Aden*، آپسالہ Uppsala

۱۹۳۶ء تا ۱۹۵۰ء، ۲ : ۳۲ و بمواضع کثیرہ؛ (۳)

الجدی: السلوک (مخطوطہ پیرس، شماره ۲۱۲۷ Add.

۷۶۷، ورق ۱۸۵ ب تا ۱۸۶ الف)؛ (۴) الغزرجی:

الکفاية (مخطوطہ موزہ بریطانیہ، عدد Or. ۶۹۳۱ ورق

۵۶ الف تا ۵۸ ب)؛ (۵) وہی مصنف: طراز (مخطوطہ

موزہ بریطانیہ، شماره Or. ۲۳۲۵، ورق ۲۱۳ الف)؛

(۶) ابن المجاور: تاریخ المستبصر، در O. Löfgren:

*Descriptio Arabial Meridionalis*، لائنڈن ۱۹۵۱ء تا

۱۹۵۳ء، ص ۱۲۳ تا ۱۲۶۔

(C. L. GEDDES)

\* بلال بن رباح: جنہیں بعض دفعہ ان کی

والدہ کی نسبت سے ابن حمامہ بھی کہا جاتا ہے،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اور

حضورؐ کے مؤذن کی حیثیت سے معروف و مشہور ہیں۔

بلال حبشی (افریقی؟) نژاد تھے۔ مکہ مکرمہ میں

قبیلہ بنو جمح کے درمیان [مقام] سراء میں غلام پیدا

ہوئے۔ بعض روایتوں میں ان کا آقا امیہ بن خلف [رک

باں] بتایا گیا ہے، لیکن کہیں کہیں اس قبیلے کے کسی

گننام مرد یا عورت کو بھی ان کا آقا کہا گیا ہے۔

وہ سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں سے تھے۔

طبقات، ۱/۳ : ۱۶۵ بعد؛ (۳) الطبری، بمدد اشاریہ؛  
 (۴) البلاذری، ۲ : ۴۵؛ (۵) ابن الاثیر، الکامل، بمدد  
 اشاریہ؛ (۶) الیعقوبی، ص ۱۱، ۲۷، ۳۳، ۵۱، ۶۲،  
 ۱۵۸، ۱۶۸؛ (۷) المسعودی: مروج، ۱ : ۱۳۶ تا ۱۳۷،  
 ۳ : ۱۳۷ و ۱۵۵؛ (۸) ابن حجر: الاصابہ، ۱ : ۳۳۶  
 بعد؛ (۹) اسد الغابۃ ۱ : ۲۰۶؛ (۱۰) النووی : تہذیب  
 الاسماء، ص ۱۷۶ تا ۱۷۸ (۱۱)؛ [البلاذری: انساب الاشراف،  
 ۱ : ۱۸۳ تا ۱۹۳؛ (۱۲) الذہبی : سیر اعلام النبلاء،  
 ۱ : ۲۵۱ تا ۲۵۹؛ (۱۳) وہی مصنف : تاریخ الاسلام،  
 ۲ : ۳۱ بعد؛ (۱۴) ابن حزم : جوامع السیرۃ، بمدد  
 اشاریہ؛ (۱۵) الخولانی : تاریخ داریا، ص ۲۹؛ (۱۶)  
 ابو نعیم : حلیۃ الاولیاء، ۱ : ۱۳۷۔

(W. 'ARAFAT)

**بلاوات** : ایک چھوٹا سا گاؤں جو موصل سے  
 تقریباً سولہ میل جنوب مشرق کی طرف دیرمار بہنام  
 قرہ قوش شاہراد پر واقع ہے۔ یاقوت میں اس کا ذکر  
 بلاباد کے عنوان کے تحت کیا گیا ہے اور لکھا  
 ہے کہ ”یہ ایک گاؤں ہے جو موصل کے مشرق میں  
 اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر صوبہ نینوا میں  
 واقع ہے۔ یہاں کارواں بہ کثرت آتے ہیں اور  
 مسافروں کے لیے یہاں ایک سرایے موجود ہے۔  
 یہ دریائے دجلہ اور دریائے زاب کے درمیان ہے۔“  
 بلاوات عراق میں لواء موصل کے ناحیۃ حمدانیہ کے  
 دیہات میں سے ایک گاؤں ہے۔ اس کے اکثر  
 باشندے مذہب شَبَک کے پیرو ہیں (قَب احمد حامد  
 الصراف : الشبک، ص ۱۰)۔ بلاوات کی شہرت کا  
 سبب صرف ایک تاریخی ٹیلا ہے، جو اس سے  
 چند قدم پر واقع ہے۔ اس ٹیلے کا نام ”تل بلاوات“  
 ہے اور یہ ان آشوری تاریخی مقامات میں سے ہے  
 جو انیسویں صدی کی کھدائی میں نکلے تھے۔  
 موصل کے ہرمز رسام کو یہاں ۱۸۷۸ء میں  
 آشوری بادشاہ شالمنیسر Shalmanassar، ثالث (۸۵۹

و پیش کار بھی ہوتے تھے۔ مؤذن کی حیثیت سے  
 انہیں اس وقت عروج حاصل ہوا جب مسلمانوں نے  
 مکہ مکرمہ کو فتح کر لیا اور بلال رضی نے پہلی مرتبہ  
 کعبے کی چہت پر سے مومنوں کو نماز کی طرف بلایا۔  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد  
 حضرت بلال رضی نے حضرت ابوبکر رضی کے عہد میں بھی  
 مؤذن رہنا منظور کر لیا، لیکن جب حضرت عمر رضی  
 نے ان سے اس منصب پر قائم رہنے کو کہا تو وہ  
 راضی نہ ہوئے اور شام کی مہموں میں جا ملے اور  
 زندگی کا باقی حصہ وہیں بسر کیا۔ بعض ماخذ سے  
 پتا چلتا ہے کہ انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ  
 وسلم کے وصال کے بعد ہی مؤذن کا منصب  
 ترک کر دیا تھا اور اس کے بعد صرف دو موقعوں پر  
 اذان دی۔ پہلا موقع وہ تھا جب حضرت عمر رضی جابیہ  
 تشریف لے گئے اور دوسرا وہ جب خود بلال رضی باز دید  
 کے لیے مدینے آئے اور امام حسن رضی اور امام حسین رضی نے  
 ان سے اذان دینے کے لیے کہا۔ یہ دونوں موقعے  
 رقت انگیز تھے۔

حضرت بلال رضی کو ان کی زندگی ہی میں بڑی  
 عزت حاصل ہو گئی تھی۔۔۔ اور جب حضرت عمر رضی  
 نے خالد بن ولید رضی کے خلاف تحقیقات کرنے کے لیے  
 اپنا ایک نمائندہ شام بھیجا تو حضرت بلال رضی نے  
 خلیفہ کے نمائندے اور متامل سالار ابو عبیدۃ [رک باں]  
 دونوں کی مدد کی (بقول الطبری، ۱ : ۲۵۲)۔

آپ کا حلیہ یہ بیان کیا جاتا ہے : قد لمبا  
 اور کسی قدر خمیدہ، رنگ سیاہ، چہرہ پتلا، گھنے  
 بال جن میں بہت سے سفید بال ملے ہوئے تھے۔  
 [ساٹھ سے اوپر عمر پائی]۔ ان کی تاریخ وفات روایتوں  
 میں ۵۱۷ھ/۶۳۹ء، ۵۱۸ھ/۶۴۱ء، ۵۲۰ھ/۶۴۲ء یا  
 ۵۲۱ھ/۶۴۳ء بیان کی گئی ہے اور ان کا مدفن حاب  
 یا بگمان غالب دمشق یا داریا بتایا گیا ہے۔

مآخذ : (۱) ابن ہشام، بمدد اشاریہ؛ (۲) ابن سعد :



بارہویں صدی کے جغرافیہ نویس الاڈریسی کے ہاں آیا ہے۔ یہاں مسلمانوں کے زمانے کے ایک قلعے کے آثار ابھی تک دیکھے جا سکتے ہیں۔

مآخذ: (۱) الاڈریسی: [نزہۃ المشتاق]، طبع اور ترجمہ از ڈوزی اور ڈخوبہ de Goeje، متن، ص ۲۰۵، ترجمہ، ص ۲۵۳؛ (۲) ابن حیان: المقتبس، مخطوطہ بوڈلین، بمواضع کثیرہ؛ (۳) ڈوزی: Histoire des Musulmans d'Espagne، بار دوم، لاڈن ۱۹۳۲ء، ۲: ۶۲؛ بعد؛ (۴) وہی مصنف: Recherches، ۱: ۳۰۷؛ (۵) Lévi-Provençal: Hist. Esp. Mus.، ۱: ۳۳۸، ۳۲۲ تا ۳۷۶۔

(E. LÉVI-PROVENÇAL)

- لباس: C. J. Edmonds (ص ۲۲ تا ۲۲۲) کی روایت کے مطابق منگور، مائش پیران، سن اور رامک نامی پانچ قبیلوں کا وفاق۔ کوہستانی منگور ایک اہم قبیلہ ہے جو فارس میں لاوین (ایران میں زاب خرد کے بالائی حصے) کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ میدانی منگور عراق میں رہتے ہیں جہاں ان کی دو شاخیں ہیں: منگور زودی اور منگور۔ ۱۔ روتہ [از عربی عراة] (= برہنہ منگور)۔ میدانی منگور کوہستانی منگور کے بڑے خاندان کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہیں جن کا سردار میدان میں رہنے والے منگور پر حکومت کرنے کے لیے ہر سال ایک یا دو آدمی (جو اس کے اپنے خاندان کے نہ ہوں) مقرر کرتا ہے۔ مائش دوسرا اہم قبیلہ ہے جو فارس میں لاوین کے مشرق اور منگور کے شمال میں آباد ہے۔ ان کی ایک شاخ عراق میں بھی آباد ہے جو مائش۔ ۱۔ ریشکہ (سیاہ مائش) کہلاتے ہیں۔ قبیلہ پیران ایک کوہستانی شاخ فارس میں منگور کے شمال اور لاوین کے مغرب میں اور دوسری شاخ عراق میں آباد ہے۔ سن اور رامک قبیلے جنہوں نے ایک زمانے میں نادر شاہ کی سوار فوج

تا ۸۲۴ ق م) کے محل کے دو کانسے کے کواڑ ملے تھے، جنہیں موزہ بریطانیہ لنڈن میں منتقل کر دیا گیا۔ ان پر جو کتبے اور منظر کندہ ہیں وہ اس بادشاہ کے عہد کے پہلے ایک تہائی حصے کا نقشہ پیش کرتے ہیں اور نویں صدی قبل مسیح کے بعض حالات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض آشوری متون سے ظاہر ہوتا ہے کہ تل بلاوات کا قدیم نام اِنلِل Imgur-Enlil تھا۔

مآخذ: (۱) یا قوت، ۱: ۷۰۷؛ (۲) ابن عبدالحق: مرآصد، قاہرہ ۱۹۵۳ء، ۱: ۲۱۳؛ (۳) آبدال: اللؤلؤ النضید، موصل ۱۹۵۱ء، ص ۲۱۳؛ (۴) Pinches: Trans. Soc. Bibl. Arch.، ۸۳۶۱۸۸۲ تا ۱۱۱۸؛ (۵) The Bronze Ornaments of the Pinches و Birch Palace Gates of Balawat (۱۸۸۰ء تا ۱۹۰۲ء)؛ (۶) Asshur and the land of Nimrod: H. Rassam، نیویارک ۱۸۹۷ء، ص ۲۰۰؛ بعد؛ (۷) Billerbeck و Die Palasttore Salmanassars II: Delitzsch لائپزگ ۱۹۰۸ء؛ (۸) L. W. King: Bronze Reliefs from the Gates of Shalmanesar King of Assyria، لنڈن ۱۹۱۳ء۔

(G. AWAD)

- بلای: (ہولی Poley کی مغرب شکل) جو جنوبی ہسپانیہ میں ایک قلعے کا پرانا نام ہے، جس کی جگہ زمانہ حال کا چھوٹا سا قصبہ اگوی لار ڈی لا فرنٹیرا Aguilar de la Frontera آباد ہے (جیسا کہ ڈوزی: Rech.، بار سوم، ۱: ۳۰۷، نے ۱۲۵۸ء کے ایک فرمان میں مندرجہ اطلاع کی بنا پر ثابت کیا ہے)۔ یہ قرطبہ کے صوبے میں آبرہ Cabra اور الیشانہ Lucena سے بارہ میل شمال مغرب میں واقع ہے، اس شہر کا، جس نے مشہور و معروف عمر بن حفصون [رک باں] کی قرطبہ کے اموی امرا کے خلاف بغاوت میں خاصا حصہ لیا تھا، دوبارہ ذکر

(بڑے) کہلاتے ہیں جسے ویگنر Wagner نے مزن (muzin) لکھا ہے۔ وراثت سردار کے اس بیٹے یا بھائی کی طرف منتقل ہوتی ہے جسے سب سے زیادہ بہادر تسلیم کیا جاتا ہے۔

مآخذ: (۱) Rawlinson: ایک سفر کے حالات،

در JRAS، ۲: (۲) ویگنر Wagner: *Reise nach Persien*،

u. dem lande der Kurden، لائپزگ ۱۸۵۲ء: (۳)

Forchungen über die Kurden, und: P. Lerch

iranischen Nordchaldäer، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۵۷ء تا

۱۸۵۸ء، ۱: ۹۳ تا ۹۵: (۴) ایم۔ اے۔ زکی:

خلاصہ تاریخ الکرد و الکردستان، بغداد ۱۹۳۷ء:

(۵) Kurds, Turks, Arabs: C. J. Edmonds، اوکسفورڈ

۱۹۵۷ء: (۶) Les Kurdes: B. Nikitine، پیرس

۱۹۵۶ء، بمدد اشاریہ۔

(B. NIKITINE)

\* بلبل: [ہزار داستان، داستان سرا، مرغ چمن، عندلیب، گلدنم؛ مذکر و مؤنث]: فارسی اور ترکی [اور اردو] ادب کے ایک بڑے حصے میں بلبل کا ذکر آتا ہے۔ اس پرندے کے امتیازی خصائص اس کی خوش آئند آواز اور نغمہ ہیں۔ آزاد کا بیان ہے گلاب کے موسم میں اس کی پر سوز آواز رات بھر گونجتی رہتی ہے۔ صبح صادق سے قبل کے چند گھنٹوں میں اس کے نغموں سے جیسے جان سی پڑ جاتی ہے۔ وہ عاشقِ گل (گلاب) ہے۔ عاشق کے مانسند اس کی سرشت میں گویا محبت کو غالب ترین جذبے کی حیثیت حاصل ہے اور یہ جذبہ اس کے باقی تمام خصائل کے لیے محور کا کام دیتا ہے [اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے محمد حسین آزاد: سخندان فارس]۔

فارسی ادب میں شعراء نے اپنے اپنے میلان

طبیعت کے مطابق بلبل کا ذکر کیا ہے۔ بعض

کے ہاں یہ پرندہ ایک ایسے عشق کے راگ

الاپتا ہے جس کا کوئی مقصد نہیں اور بعض کے

میں نام پیدا کیا تھا (کتاب مذکور، ص ۱۴۵) لیکن جنہیں بعد میں سلیم بابان (۱۷۴۳ تا ۱۷۵۷ء) نے شہرزور سے نکال دیا تھا (کتاب مذکور، ص ۱۴۲ تا ۱۴۳)، اپنی قدیم عظمت و شان کھو کر اب دریائے زاب کے قریب بتوین کے پانچ غریب دیہات میں آباد ہیں۔ قبیلہ رامک کچل۔ و۔ کلموہ سپی (گنجے اور سفید کلاہ) اور قتی ویسی شاخوں میں منقسم ہے۔

بعض موقعوں پر [قبیلہ] آجاق کو بھی بلباس

ہی میں شمار کیا جاتا ہے جو عراق میں منگور زودی کے اوپر آٹو سرحدی دیہات میں آباد ہے۔

سنورسکی Minorsky "آجاق کا خضری" کو بلباس میں شمار کرتا ہے، لیکن سن اور رامک قبیلوں کو ان میں شامل نہیں کرتا۔ بلباس قبائل کی شاخوں کی تقسیم کے لیے دیکھیے ایم۔ اے۔ زکی (خلاصہ،

ص ۳۹۱، ۴۰۷، ۴۴۷)۔ ویگنر Wagner کے

ہاں (۲: ۱۱۶، ۲۲۸)، جو ۱۸۵۲ء میں بلباس

کے درمیان رہ چکا تھا، لیکن جو زیادہ تر Niebuhr

(۱۷۶۶ء)، Rich (۱۸۳۶-۱۸۳۷ء) اور Ker Porter

(۱۸۲۲ء) کے حوالے دیتا ہے، زیادہ مفصل معلومات

ملتی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ جب کبھی قبائلی

معاملات پر بحث ہوتی ہے تو قبیلے کے ہر شخص

کو اس کے حق میں یا مخالف بولنے کا مساوی حق

حاصل ہوتا ہے۔ قتل کا خون بہا بائیس یلوں کی

صورت میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ زنا کی سزا موت ہے۔

لڑکیوں کو دوسرے قبائل میں شادی کرنے کی

قطعاً اجازت نہیں ہوتی، لیکن باہمی سناکحت کے

[مضر] اثرات اغوا کے عام رواج کے باعث کم

ہو جاتے ہیں۔ ایڈمنڈس C. J. Edmunds بلباس کی

لڑکیوں کے رومانی کردار کی طرف خاص طور سے

توجہ دلاتا ہے، لیکن اغوا کے حقیقی خطرے پر بھی

زور دیتا ہے (ص ۲۲۵)، سردارانِ بلباس مزن (mazin)



[بلبل ز شاخ سرو بگلبانگ پہلوی  
می خواند دوش درس مقامات معنوی]  
محمود غزنوی کے ایک درباری شاعر فرخی  
سیستانی (م ۵۳۷۰/۷۱۰۷۷) بھی تصور میں بلبل  
کو شاخ سرو پر دیکھتا ہے اور کہتا ہے: "بلبلین  
گویا خطیب ہیں جو درختوں پر سے خطبہ ارشاد  
کرتی ہیں"، یا "اب بلبل سرو پر بیٹھے توریت کی  
تلاوت کر رہے ہیں"۔

اپنے ایک قصیدے میں منوچہری (م بعد از  
۵۳۲۳/۷۱۰۳۲) اس کے نغمے کی ایک دینی تعبیر  
کرتا ہے:

[قدح و بلبلہ را سر بسجود آور زود

کہ ہی بلبل بر سرو زند بانگ نماز]

اور اس کی تائید میں اس کے دیوان میں کئی  
اشعار موجود ہیں۔

فارسی کے صوفی شاعر محمد شیرین مغربی  
(م ۵۸۰۹/۷۱۳۰۶) نے بلبل کی مثال روح سے دی  
ہے جو گوشت پوست کے قفس میں اسیر ہے۔  
یہاں گوشت پوست کا قفس وہ نفس ہے جو عالم  
وحدت سے عالم عناصر میں آگرا ہے۔ ایک اور صوفی  
شاعر کمال خجندی (م ۵۸۰۳/۷۱۳۰۰) نے بلبل  
کی ایک اور خصوصیت پیدا کی ہے: "کمال گل رخوں  
کی محبت میں مبتلا ہوئے بغیر غزل نہیں کہتا  
اور بلبل مخمور ہوئے بغیر گاتا نہیں"۔ سعدی نے  
بھی ایک غزل میں بلبل اور بہار کو پہلو بہ پہلو  
پیش کیا ہے: "درختوں پر شکوفے پھوٹ رہے  
ہیں، بلبل مست ہیں، دنیا جوان ہو گئی ہے،  
عشاق طرب و شادمانی میں مستغرق ہیں"۔ سعدی  
کی نظر میں بلبل در اصل بہار کا نقیب ہے؛  
اس کے ہر عکس آلو ہری اور منحوس خبر لاتا ہے۔  
ہلالی چغتائی (م ۵۹۳۹/۷۱۵۳۲) نے بھی ایک شعر  
میں یہ فرق بیان کیا ہے: "بلبل باغ میں

ہاں یہ ایسے عشق مجازی کا ترجمان یا علامت ہے  
جو عشق حقیقی کے راستے کی ایک منزل ہے۔ تصوف  
کی کتابوں میں اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے  
فریدالدین عطار [رک باں] (م ۵۶۲۷/۱۲۲۹-۱۲۳۰) کی  
منطق الطیر (۵۵۸۳/۱۱۸۷-۱۱۸۸) کا مطالعہ  
ضروری ہے۔ اس تصنیف میں بلبل کا خاص وصف یہ  
بیان کیا گیا ہے کہ وہ مست ہے اور عشقِ گل میں  
کامل ہونے کے باعث اپنا مادی وجود فنا کر دینے  
پر آمادہ (دیکھیے *Le langage des oiseaux*)۔

فارسی شاعر خواجہ کرمانی [رک باں] (۵۶۷۹/  
۱۲۸۰ تا ۵۷۵۲/۱۳۵۱) نے اپنی کتاب روضۃ الانوار  
میں اس "مرغ چمن" کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ  
پرنده جذبہ عشق و آرزو میں مبتلا، رات کے وقت نغمہ ریز  
ہوتا ہے اور نیند اڑا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ گل و بلبل  
کو انسانی عشاق و امق و عذرا [رک باں] کے  
مائل قرار دیتا ہے۔ ایک قطعے میں سعدی شیرازی  
(م ۵۶۹۰/۱۲۹۱ یا ۵۶۹۱/۱۲۹۲) نے، جو  
اکثر اوقات اور علی الخصوص اپنی غزلوں میں  
بلبل کا ذکر کرتے رہے ہیں، سچا عاشق پروانے  
کو قرار دیا ہے۔ حزین لاهیجی (م ۵۱۱۸۰/  
۱۷۶۶) نے ان الفاظ میں بلبل اور پروانے کا فرق  
واضح کر دیا ہے: "بلبل اس لیے فریادی ہے کہ  
اس نے تازہ تازہ محبت کرنا سیکھا ہے؛ ہم نے  
پروانے کے منہ سے کبھی کوئی آواز نہیں سنی"۔  
مولانا رومی بیزی کی ایک کتاب (تذکرہ شاہ  
محمد قزوینی) میں بھی گل و بلبل اور شمع  
و پروانہ کا مناظرہ درج ہے۔ فارسی شاعر زمان  
بزدی نے بھی بلبل اور پروانے کا مقابلہ کیا ہے۔

دیگر شعراے فارسی کی طرح حافظ (م ۵۷۹۱/  
۱۳۸۹) نے اپنے ایک شعر میں بلبل کو مقامات  
معنوی کا درس دینے والا پرنده قرار دیا ہے:

میں گج)، سَنَدِ گِج (Tel.)، سَنَدِوِچ (Rab.) سَنَدِ لَچ (S.S.) - شیخ سلیمان بخاری چغتائی نے اپنی لغت میں اس لفظ کی نسبت لکھا ہے کہ یہ عندلیب (nightingale) کی طرح کا ایک پرندہ ہے اور تشریح یوں کی ہے کہ یہ زردک ہے۔ قَدَّ گُو بِلِگ (۱۰۶۹ - ۱۰۷۰ء) کے مطابق ”گلستان میں بلبل ہزار آوازوں سے گاتا ہے (ہزار داستان)، گویا کہ وہ شب و روز مزامیر کی تلاوت کر رہا ہو“ (شعر ۷۸)۔

عہدِ اسلامی کے شروع ہونے پر ترکی ادب میں سَنَدِوِچ کا لفظ رفتہ رفتہ متروک ہو گیا اور اس کی جگہ ”عندلیب“، ”ہزار“ (صرف قدیم کتابی ادب میں) اور ”بلبل“ (کتابی اور عوامی ادب دونوں میں) جیسے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ عوامی ادب میں بلبل گل کا عاشق ہے؛ یہ ایک اجنبی ہے، جو موسم بہار میں رات کو اور صبح صادق سے قبل گاتا ہے (قرہ جہ اوغلان)۔ عوامی اور کتابی ادب دونوں میں اسیرِ قفس بلبل کو جسم میں گرفتار روح سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ ترکی دواوین شعر میں بلبل کے جو خصائل بیان کیے گئے ہیں وہ مثنوی گل و بلبل میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ بد مثنوی فضلی نے سلطان سلیمان کے بیٹے مصطفیٰ کے لیے تصنیف کی تھی (۵۹۶۰ھ / ۱۵۵۳ء)۔ اس کے مطابق بلبل ایک دل فگار اور مضطرب درویش ہے۔ اس کی فطرت عشق ہے۔ اس کی آواز دل کش، اطوار پاکیزہ اور پسندیدہ ہیں۔ بذلہ سنج و میخوار ہے۔ کوچہ عشق کے پھیرے لگاتا رہتا ہے۔ عشق نے اس کے آئینہ دل کو مجلا کر دیا ہے۔ درویشوں کی طرح وہ صوف کے جے میں ملبوس رہتا ہے تا کہ صوف کے نیچے کا آئینہ زنگ آلود نہ ہونے پائے۔ معرکہ آرائی کے بعد گل و بلبل کا وصال ہو جاتا ہے۔ اس تصنیف میں فضل

آشیانہ بناتا ہے اور آلو کھنڈروں اور ویرانوں میں؛ ہر شخص اپنا گھر اپنی خواہشات کے مطابق تعمیر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اس ضرب المثل کا ذکر کرنا ناسوزوں نہ ہوگا کہ ”بلبل کے سات بچوں میں سے صرف ایک بلبل [ہزار داستان] بتا ہے“ (دہخدا: امثال و حکم)۔

”سبکِ ہندی“ میں لکھنے والے شعرا کو بلبل سے اور بھی نازک و لطیف صنائع پیدا کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اس ادب میں، جو عمومی طور پر تصوف کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، بلبل کو عشق مجازی اور عشق حقیقی کے مابین ایک مقام حاصل ہے۔ سترھویں صدی کے شاعر شوکت بخاری نے بلبل کے متعلق اپنی ایک غزل میں یوں سخن سرائی کی ہے: ”محبوب کب تک اپنے عشاق کو، جو اس کے اسیر ہیں، پہچاننے سے اغماض برتے گا؟ جب بلبل ملول ہو کر آنسو بہاتا ہے تو اس کا آشیانہ بھولوں بھری ٹوکری سے مشابہ نظر آنے لگتا ہے۔ شاخ گل ہی پر اپنا دکھتا ہوا سر ٹیک کر بلبل آرام پا سکتا ہے“۔

یہ خیال کہ بلبل کو اس کی خوش آوازی کے باعث پکڑ کر پنجرے میں قید کر لیا جاتا ہے، ادب میں بھی بار پا گیا ہے؛ چنانچہ ترکی شاعر بیگدلی (۵۱۱۳۴ھ / ۱۷۲۲ء تا ۵۱۱۹۵ھ / ۱۷۸۱ء) کے ایک شعر کا ترجمہ یہ ہے: ”اپنے نالہ و فریاد کی وجہ سے اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے اور وہ اپنی آزادی سے محروم ہو جاتا ہے“۔

اس پرندے کا تذکرہ ترکی کی قدیم ترین تصانیف ادب میں ملتا ہے۔ متعدد ترکی بولیوں میں بلبل کے حسب ذیل نام ہیں: [قدیم ترکی شاعر یوسف خاص حاجب کی] قَدَّ گُو بِلِگ میں (جو ۱۰۶۹-۱۰۷۰ء میں لکھی گئی): سَنَدِوِچ، سَنَدِوِچ، سَنَدِوِچ؛ دوسری بولیوں میں سَدِوِچ (قازقی



اور کمزور استعداد شعری کے سطحی آثار کی غمازی کرتی ہے۔ اس میں کوئی نئی بات بھی نہیں، لیکن عبدالحق حامد (رک بآن) نے اپنی نظیرہ میں، جو ہرسکلی کی حسب حال کے جواب میں ہے، اور اپنی نظم ”ہائڈ پارک میں پھرتے ہوئے“ میں مقضائے زمانہ کے مطابق بلبل کے بارے میں نئے خیالات پیش کیے ہیں: ”صبح کے وقت یہ اذان بلند کرتا ہے۔ اس کا آشیانہ تاریکی میں حب الوطنی کی علامت فائقہ ہے۔ اس کے نغمے عشقیہ قصائد کے لیے نمونے کا کام دیتے ہیں۔ اس کے اظہار حال کی ہیئت اتنی ہی جدید ہے جتنا جدید ادب (تجدد ادبیاتی)۔ یہ خدا کا شاعر ہے۔ اس کے قصیدے اوراقِ فطرت سے پڑھے جاتے ہیں“ (نظیرہ حسب حال)۔ [یہ تمام تصورات جو بلبل کے ساتھ فارسی اور ترکی شاعری میں وابستہ ہیں وہ اردو میں بھی موجود ہیں اور ہر عہد کے شاعروں نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔

مآخذ: متن میں آگئے ہیں۔

(ALI NIHAT TARLAN)

بلبلن: غیاث الدین خاندانِ غلاماں کا نامور بادشاہ، سلطنتِ دہلی کا فرمانروا (۶۶۴-۵۶۶۵/ ۱۲۶۶ء تا ۵۶۸۶/ ۱۲۸۷ء)۔ وہ اصلاً البری ترک تھا۔ یہ وہی قبیلہ ہے جس سے خود التمش (رک بآن) کا تعلق تھا۔ اس کا باپ ایک قبیلے کا سردار تھا۔ بلبلن منگولوں کے حملے میں گرفتار ہوا اور بغداد میں خواجہ جمال الدین بصری کے ہاتھ بکا، جو اسے دہلی لے آئے۔ یہاں اسے شمس الدین التمش (۵۶۰۷/ ۱۲۱۰ء تا ۵۶۴۳/ ۱۲۳۵ء) نے خرید لیا۔ اپنی ذہانت اور معاملہ فہمی کی بنا پر وہ سلطان کا خاصہ بردار بن کر ترکان چہل گانی میں شامل ہوا۔ رضیہ سلطانہ کے عہد ۵۶۴۴/ ۱۲۳۶ء تا ۵۶۴۷/ ۱۲۳۹ء میں اسے میر شکار کا عہدہ ملا۔

نے بلبل کے پردے میں ایک خاص صوفیانہ تصور پیش کیا ہے۔ اس تمثیلی قصے میں بلبل سے دل مراد ہے اور گل سے نفس۔

جب ہم سترھویں صدی کے دواوین اشعار کا مطالعہ شروع کرتے ہیں تو بلبل ایک ایسے عاشق کے روپ میں نظر آتا ہے جو آتشِ عشق میں جل رہا ہو۔ شاعری میں اس تصور کو یوں پیش کیا جاتا ہے کہ گل باعتبار رنگ آگ سے مشابہ ہے۔ یہ بلبل کے آگ لگاتا اور اسے جلا کر خاکستر کر ڈالتا ہے۔ بلبل کا رنگ خاکستری ہے۔

نائلی (م ۱۶۳۴ء) اور نشاطی (م ۱۶۷۴ء) کی غزلیں، جن کی ردیف ”بلبل“ ہے، دونوں اس عہد کے ادب میں بڑا مقام اور سبکِ ہندی کی طرف میلان رکھتی ہیں۔ نائلی کی غزل کا مقطع گل و بلبل میں صوفیانہ رابطے کا انکشاف ہے۔ بارہویں / اٹھارہویں صدی میں ندیم (م ۱۱۴۳ھ / ۱۷۳۰ء) نے اپنی متعدد نظموں میں بلبل کا ذکر کیا ہے۔ ایک غزل میں، جس کی ردیف بھی بلبل ہے، وہ لکھتا ہے: ”یہ نہ سمجھیے کہ بلبل کا آشیانہ اشکھائے خونیں سے لبریز ہے۔ یہ آشیانہ تو سرخ روشنائی کی ایک دوات ہے، جو اسرارِ شوق کے قلمبند کرنے کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہ نہ خیال فرمائیے کہ ساقیِ بہار نے گلاب پر شبنم انڈیلی ہے، اس نے تو ساغرِ بلبل سے لبریز کیا ہے“۔

”تنظیمات“ کے بعد ”انجمنِ شعرا“ کے شاعروں کے ہاں، جو قدیم ادب کی پیروی کرتے تھے، بلبل کے مضمون میں کوئی جدت پیدا نہیں کی۔ فارسی شعرا میں سے مغربی کی طرح ترکی میں ہر سکی عارفِ حکمت (۱۸۳۹ تا ۱۹۰۳ء) نے اپنی ایک نظم بعنوان حسب حال میں بلبل کو بالکل صوفیانہ نقطہ نظر سے دیکھا ہے۔ رجائی زادہ کی نظم، جس کی ردیف ”بلبل“ ہے، اس کے قنوطی مزاج

خود بادشاہ بننے سے پہلے بلبن نے سلاطین کے ماتحت مختلف خدمات انجام دیں۔ سلطان ناصر الدین محمود (۵۶۴۴ / ۱۲۴۶ء تا ۵۶۶۴ / ۱۲۶۵ء) نے اسے اپنا نائب الممالک بنا دیا۔ اس سے قبل وہ منگولوں کے حملوں کو کامیابی سے روک چکا تھا (۱۲۴۵ء) اور سرکش امرا کے خلاف اپنے حسن تدبیر و سیاست کا سکہ بٹھا چکا تھا۔ اب نائب الممالک ہو کر وہ سیاہ و سفید کا مالک بن گیا اور خدمات شائستہ انجام دیں۔ وہ ایک مرتبہ مقہور بھی ہوا، لیکن سلطان نے اس کے اثر و رسوخ اور دوسرے حالات کی وجہ سے دوبارہ دربار میں بلا لیا۔ سلطان کی وفات کے بعد وہ تخت دہلی پر متمکن ہو گیا (۶۶۴ یا ۵۶۶۵ / ۱۲۶۶ء)۔

بلبن کی زندگی کے اہم واقعات تو بہت سے ہیں، لیکن چند نمایاں طور سے قابل ذکر ہیں، مثلاً اس نے اپنی سلطنت کو منگولوں کے حملوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شمالی اور شمال مغربی سرحدوں کو بہت مستحکم کیا۔ ۵۶۶۹ / ۱۲۷۰ء میں وہ خود لاہور آیا اور شہر اور قلعے کو از سر نو مستحکم کیا۔ سندھ اور ملتان میں بھی ایسے انتظامات کیے کہ منگولوں کے حملے خاصی مدت تک ناکام رہے۔ ان سرحدوں کی حفاظت کے فرائض خصوصیت سے اپنے فرزند شہزادہ محمد کے سپرد کیے، جیسا کہ آگے چل کر ذکر آئے گا۔

بلبن نے ملک کو قزاقوں اور رھزنوں سے پاک کرنے کے لیے بڑے بڑے اقدامات کیے اور ملک اودھ کے بڑے بڑے جنگل کٹوا کر کٹھیر (بداؤن) اور کنپل (فرخ آباد) وغیرہ کو قزاقی سے پاک کیا۔

۶۷۷ - ۵۶۷۸ / ۱۲۷۹ء میں حاکم بنگالہ طغرل خان نے، جو بلبن کا غلام تھا اور اس کی شجاعت کی وجہ سے بنگال کے لیے اسے منتخب کیا

کیا تھا، اپنے نادان مشیروں کے مشورے سے علم بغاوت بلند کر کے سلطان مغیث الدین کے لقب سے اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ بلبن نے اس کی سرکوبی کے لیے پہلے امیر خان کو بھیجا، مگر اسے طغرل نے شکست دے دی۔ پھر ایک آدھ ناکام کوشش اور ہوئی۔ آخر میں بلبن نے خود فوج کشی کی۔ دہلی کے امور سلطنت ملک فخرالدین کے سپرد کیے اور شمالی سرحدوں کی حفاظت شہزادہ محمد کو تفویض کر کے ایک لشکر جرار لے کر لکھنوتی کی طرف بڑھا۔ طغرل اس خبر کے ستنے ہی بھاگ نکلا، مگر اس کی تلاش جاری رہی۔ آخر وہ گرفتار ہو کر قتل ہوا اور اس کے ساتھ اس کے ہوا خواہوں اور حلیفوں کو بھی عبرت ناک سزائیں ملیں، جن کی تفصیل مؤرخ برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں دی ہے۔ بلبن نے جس سختی اور ذرشتی سے اس بغاوت کو فرو کیا اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ملک بھر میں اس کا رعب قائم ہو گیا اور استحکام سلطنت میں اس سے بڑی مدد ملی۔ اس کے بعد بلبن نے بنگالے کی گورنری اپنے بیٹے بغرا خان کے سپرد کی۔ ۶۸۳ - ۵۶۸۴ / ۱۱۸۵ء میں بلبن کو اپنے بہادر فرزند شہزادہ محمد کی شہادت کے غم انگیز واقعے سے دو چار ہونا پڑا۔ یہ شہزادہ بارہ تیرہ سال سے شمالی اور شمال مغربی سرحدوں پر منگولوں کے خلاف کامیاب مدافعت کر رہا تھا۔ سال مذکور میں منگولوں نے تمر خان؟ (تیمور خان) کی قیادت میں پھر حملہ کیا، مگر شکست کھائی۔ شہزادے نے تعاقب جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اپنے لشکر سے خاصا دور نکل آیا۔ ناگہ گھات میں بیٹھے ہوئے منگولوں نے محاصرہ کر لیا۔ اس آویزش میں شہزادہ اور اس کے رفقا شہید ہو گئے۔ اس واقعے سے بلبن بے حد مغموم ہوا اور ملک کے عوام بھی غم زدہ ہوئے۔ شرعاً عصر اور خسرو اور حسن نے مرثیے



مآخذ: (۱) خسرو: قران السعدین (سلسلہ کلیات خسروی، علی گڑھ)، طبع حسن برنی، ۱۹۱۸ء؛ (۲) نیابرنی: تاریخ فیروز شاہی، طبع سر سید، کلکتہ ۱۸۶۰۔  
 ۱۸۶۲ء؛ (۳) یحییٰ بن احمد سرہندی: تاریخ مبارک شاہی، طبع ہدایت حسین، کلکتہ ۱۹۳۱ء؛ (۴) عصامی: فتوح السلاطین، طبع آغا سہدی حسن، آگرہ ۱۹۳۸ء؛ (۵) نظام الدین بخشی: طبقات اکبری، کلکتہ ۱۹۱۳ء؛ (۶) بد اوئی: منتخب التواریخ، کلکتہ ۱۸۶۳۔  
 ۱۸۶۹ء؛ (۷) فرشتہ: گلشن ابراہیمی، مطبوعہ نولکشور، لکھنؤ ۱۸۶۳ - ۱۸۶۵ء؛ (۸) Dowson و Elliot: History of India.....، طبع کلکتہ؛ (۹) ذکاء اللہ: تاریخ ہندوستان، ج ۱؛ (۱۰) سید ہاشمی فرید آبادی: تاریخ پاکستان و بھارت، مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۶۶ء؛ (۱۱) ایشوری پرشاد: History of Medieval India...، الہ آباد ۱۹۲۵ء۔

[ادارہ]

بلبیس: مصر کا ایک شہر، جو ارسنہ وسطی میں اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کا نام قبطی زبان کے لفظ فلبیس Phelbès سے ماخوذ ہے۔ عرب مصنفوں نے اس کے تلفظ میں شبہ ظاہر کرتے ہوئے اسے بلبیس یا بلبیس بھی کہا ہے۔ [مشرق کی طرف سے آنے والے] حملہ آوروں کے عین راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے یہ شہر ہمیشہ ان فوجوں کی آماجگاہ رہا جو مصر فتح کرنے کی غرض سے آتی تھیں۔ سب سے پہلے ۵۱۹ء / ۶۴۰ء میں عربوں نے اس کا محاصرہ کیا، جو یہاں ایک مہینے تک خیمہ زن رہے۔ صلیبی جنگوں کے دوران میں ایوبی سلاطین کی باہمی جنگوں کے اثنا میں اموری افرنگی (Amalric) نے اس شہر کا محاصرہ کیا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی فصیل کو ہمیشہ درست حالت میں رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح یہ شہر دارالحکومت سے فلسطین جانے والی افواج کی پہلی منزل بھی تھی اور

لکھے۔ کہتے ہیں کہ اس مہم میں امیر خسرو بھی گرفتار ہو گئے تھے اور انہیں دو سال کے بعد رہائی نصیب ہوئی۔

شہزادہ محمد کی شہادت نے بلبن کی کمر ہمت توڑ ڈالی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ بغرا خان کو اپنا جانشین بنائے، مگر بغرا خان رضامند نہ ہوا۔ اس کے بعد شہزادہ محمد کے فرزند کیخسرو کو نامزد کیا، مگر بلبن کے انتقال کے بعد امرا نے اس کے بجائے بغرا خان کے بیٹے کیتباد کو سلطان بنا دیا (۵۶۸۶ / ۱۲۸۵ء): لیکن وہ بھی کامیاب ثابت نہ ہوا۔ امیر خسرو کی مثنوی قران السعدین باپ (بغرا خان) اور بیٹے (کیتباد) کی باہم ملاقات کی روداد ہے۔ بغرا خان بنگالہ سے اپنے بیٹے کو سلطان بننے پر مبارکباد پیش کرنے کے لیے دیہلی کی طرف بڑھا تھا اور کیتباد استقبال کے لیے پورب کی طرف (تفصیل کے لیے دیکھیے، مقدمہ قران السعدین، سلسلہ خسرویہ، علی گڑھ)۔ امرانے پھر کیتباد کے نابالغ فرزند شمس الدین کیورٹ کو بادشاہ بنا دیا، مگر جلال الدین خلجی نے اسے مروا ڈالا اور خود بادشاہ بن گیا۔ اس طرح ۵۶۸۹ / ۱۲۹۰ء (بروایت برنی: ۵۶۸۸ و فرشتہ: ۵۶۸۷) میں خاندان شمسی (=خاندان غلامان) کا خاتمہ ہو گیا۔

بلبن بڑا مدبر اور باہمت سپہ سالار اور بعد میں ایک ہوش مند اور رعب و جلال والا حکمران ثابت ہوا۔ سخت گیر ہونے کے باوجود وہ منصف مزاج بنی تھا اور شوکت و دبدبہ کو لازمہ جہان داری سمجھتا تھا۔ اس کے باوجود، ذاتی عادات میں وہ ایک نیک اور پرہیز گار بادشاہ تھا۔ مشائخ اور اہل علم کا احترام کرتا تھا۔ اور علما کے مواعظ میں شریک ہوتا تھا۔ اسے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کے عظیم معماروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

'd' *Histoire d' Egypte* '۲ : ۸۳، ۱۰۹، ۱۳۰، ۱۳۷،  
 ۱۹۶ : *Histoire de la Nation Egyptienne* (۱۲) :  
 ۵۷، ۱۷۱، ۱۹۵، ۲۹۱، ۳۵۹؛ نیز (۱۳) مکمل و  
 جامع مآخذ در Wiet و Maspero : *Matériaux pour*  
*servir à la Géographie de l' Égypte* ص ۳۵ تا ۳۷.  
 (G. WIET)

- **بَلتِستان** : جس کا ذکر مسلمان مصنفوں نے  
 "تبت خرد"، یعنی چھوٹا تبت کے نام سے کیا ہے  
 اور جو ۳۴ درجے اور ۳۶ درجے شمال اور ۷۵  
 درجے اور ۷۷ درجے مشرق میں گلگت اور لداخ  
 کے درمیان واقع ہے اور دریائے سندھ کے دونوں  
 کناروں پر کوئی ڈیڑھ سو میل تک ۸۵۲۲  
 مربع میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک  
 کوہستانی علاقہ ہے جس کی کچھ چوٹیاں دنیا  
 کی بلندترین چوٹیاں ہیں : گوڈون آسٹن Godwin  
 Austen، یعنی K2، اٹھائیس ہزار دو سو پچاس  
 فٹ، اسے ۱۹۵۳ء میں تسخیر کیا گیا؛ گیشبرم  
 Gasherbrum، چھبیس ہزار چار سو ستر فٹ، جو  
 ۱۹۵۸ء میں تسخیر ہوئی اور ہرموش Haramosh،  
 چوبیس ہزار فٹ۔ اس کا سب سے بڑا شہر سکرڈو  
 Skardu ہے، جہاں ۱۹۵۱ء میں بجلی لگائی گئی۔  
 یہاں ایک چھوٹا سا ہوائی اڈا، جدید طرز کا ایک  
 ہسپتال اور متعدد مدرسے ہیں۔ حال ہی میں یہاں  
 ایک نیا بازار تعمیر ہوا ہے۔

بلیسوں کو آٹھویں صدی ہجری / چودھویں  
 عیسوی میں سری نگر (کشمیر) کے سید علی ہمدانی  
 نے اور کسی حد تک ان کے خلیفہ سید محمد نور بخش  
 نے مسلمان کیا۔ وہ بلحاظ مذہب شیعہ ہیں  
 [اور عام طور پر نور بخشی کہلاتے ہیں۔ حنفی اور  
 اہل حدیث مسلک کے پیرو بھی موجود ہیں  
 اور ان کے اپنے دینی دارالعلوم بھی ہیں]۔  
 ان کے ہمسائے ہنزہ آغا خان کے پیرو ہیں۔

فوجیں اکثر یہاں پڑاؤ ڈالتی تھیں۔ الدمشقی نے  
 اسے "باب الشام" کہا ہے۔ بوزنطیوں کے خلاف  
 ایک خوفناک فوجی نقل و حرکت کے دوران میں  
 فاطمی خلیفہ العزیز یہاں بیمار پڑا، یہیں اس کا  
 انتقال ہوا اور یہیں خلافت اس کے بیٹے الحاکم کے  
 سپرد کی گئی۔

بلیس ڈاک لے جانے والے ہرکاروں کے راستے  
 پر واقع تھا اور نامہ بر کبوتروں کا بھی مرکز تھا۔  
 موجودہ زمانے تک یہ صوبہ شرقیہ کا دارالحکومت  
 تھا، لیکن انیسویں صدی میں قازیق نے اس کی  
 جگہ لے لی۔

۱۰۹ھ / ۷۲۷ء میں مصر کے منظم مالیات  
 نے قبیلہ قیس کے ایک حصے کو بلیس کے علاقے  
 میں آباد کیا۔ اس قبیلے نے، جو تعداد میں تقریباً  
 تین ہزار افراد پر مشتمل تھا، شتربانوں کی حیثیت  
 سے تجارتی آمد و رفت میں بڑی مدد دی اور  
 ایک ایسی فوج کی صورت اختیار کی جسے جنگ  
 کے لیے تیار کیا جا سکتا تھا۔ اس مقصد کے لیے  
 نظریہ انتخاب بلیس پر پڑی، کیونکہ یہاں کی آبادی  
 گنجان نہ تھی۔ یہاں کے پہلے باشندوں کو کوئی  
 نقصان نہیں پہنچایا گیا اور محصولات کی وصولی میں  
 بھی کمی کا کوئی اندیشہ پیدا نہیں ہوا۔

مآخذ: (۱) ابن عبدالحکم، ص ۵۹؛ (۲) الکندی،  
 ص ۷۶، ۸ تا ۷۷، ۹۳، ۱۰۳، ۱۸۰؛ (۳) ابن حوقل،  
 ۱ : ۱۳۳؛ (۴) المقنسی، ص ۲۱۴؛ (۵) ابن میسر، ص  
 ۳۸، ۵۲ (در JA، ۱۹۲۱ء، ص ۱۱، ۱۰۳)؛ (۶)  
 القلقشنندی، ۳ : ۲۷ و ۱۳ : ۳۹۲، ۳۹۶؛ (۷)  
*La Syrie : Gaudefroy-Demombynes*، ص ۲۵۵ تا  
 ۲۵۶؛ (۸) *Gesch. der Staatskanzlei : Björkman*  
 ص ۱۰۰؛ (۹) المقریزی، طبع Weit، ۳ : ۱۸۸، ۲۲۴  
 تا ۲۲۶ و ۳ : ۳۳ (حاشیہ ۱)، ۸۵؛ (۱۰) عمارة الیمنی،  
 ج ۲، فرانسیسی حصہ، ص ۱۳۳؛ (۱۱) *Précis*



لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو گیا ہے۔ اس علاقے کی اقتصادی ترقی کے لیے (خصوصاً سڑکوں کی تعمیر کے لیے) بڑی مقدار میں روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔

مآخذ: (۱) *Imp. Gaz. of India* (طبع نو)،

۶: ۲۶۱ تا ۲۶۵؛ (۲) *R. C. Arora*، *The Land of*

*Ladakh, Kashmir and Gilgit*، علی گڑھ، ۱۹۳۰ء،

ص ۱۹۳ تا ۲۱۸؛ (۳) *Kashmir Gazetteer*، کلکتہ

۱۹۰۹ء؛ (۴) جی۔ ایم۔ ڈی صوفی: *Kashir*، لاہور

۱۹۳۹ء، ۱: ۱۶-۱۷ و ۲: ۵۶۲، ۲۶۳، ۷۷۷؛ (۵)

*History of Western Tibet*: A. H. Francke، لندن

۱۹۰۷ء؛ (۶) *Horned Moon*: I. Stephen، لندن

۱۹۵۳ء، ۱: ۱۸۳ تا ۱۸۸ و بمواضع کثیرہ؛ (۷)

پاکستان سوسائٹی آف لندن کے *Bulletin*، عدد ۱۹، جولائی

۱۹۵۷ء، ص ۲۱ تا ۲۳؛ (۸) *Travel in*: G. T. Vigne

*Kashmir, Ladakh, Iskardu*، لندن ۱۸۹۲ء۔

(بزمی انصاری)

- بلج بن بشر: بن عیاض القشیری، ایک بہادر، لیکن متکبر عرب فوجی سردار۔ وہ اس فوج کے شامی سواروں کے دستے کا قائد تھا جو ۵۱۲۳/۷۷۳ء میں خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے بلج کے چچا کلثوم بن عیاض کی سرکردگی میں بربروں کے مقابلے کے لیے بھیجی تھی۔ یہ فوج افریقہ پہنچی (رمضان ۵۱۲۳/از ۲۰ جولائی تا ۱۸ اگست ۷۷۳ء) تو بلج اور اس کے شامی سواروں کی تند مزاجی اور نخوت کی وجہ سے افریقہ کے عرب اور خصوصاً انصار، جو حرہ کی لڑائی (۵۶۳/۶۸۳ء) کے بعد ایک ساتھ مغربی افریقہ کی طرف بھاگے تھے، ان کے سخت دشمن ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تیلسان کے قریب جب شامی فوجیں اور افریقی فوجیں یکجا ہوئیں (جن کی مجموعی تعداد تقریباً ساٹھ ہزار نفر ہو گئی تھی) تو شامی فوج کی تند مزاجی کی وجہ سے اور اس چپقلش کی وجہ سے جو بلج اور افریقی فوج کے

بلتستان والوں کی زبان لداخی اور تبتی زبانوں کی مخلوط صورت ہے۔ اس میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھی قدرے آمیزش ہے، جو اسلامی اثر و نفوذ پر دلالت کرتے ہیں۔

بلتستان کے قدیم حکمرانوں کو راجا یا گیالپو کہتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ مشہور علی شیرخان ہے، جس نے دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی میں ناموری حاصل کی۔ سکردو کا قلعہ بھی اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ اس پاس کے علاقوں پر اس کی مہموں کا ذکر مقامی عوامی گیتوں میں اب تک ملتا ہے۔ گیارہویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں ایک اور گیالپو علی میر نے، جو سکردو کا سردار تھا، بلتیوں کے وطن پر حملہ کر کے اسے فتح کیا۔ آخری گیالپو احمد شاہ نے ۱۸۳۰ء میں ڈوگرا جنرل زور اور سنگھ سے شکست کھائی اور اس طرح ان کی آزادی کا خاتمہ ہوا؛ بلتستان کشمیر میں شامل کر لیا گیا، جس پر ان دنوں راجا گلاب سنگھ کی حکومت تھی۔ ۱۸۳۶ء میں معاہدہ امرتسر کی رو سے یہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا اور وزارت لداخ کے تحت کر دیا گیا۔

فروری ۱۹۴۸ء میں بلتستان کے باشندوں نے مہاراجا کشمیر کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور حکومت پاکستان سے درخواست کی کہ ان کے علاقے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس نئے دور میں اس نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی ہے۔ اس کے تقریباً سارے علاقے میں ٹٹوؤں کے راستوں کا جال پھیل گیا ہے۔ سکردو کو ہوائی جہاز کے ذریعے راولپنڈی سے ملا دیا گیا ہے۔ بلتستان اور پاکستان کے درمیان ہوائی ڈاک کا سلسلہ بھی قائم ہے۔ بہتر قسم کی تعلیمی، طبی اور دوسری سہولتیں مہیا کی گئی ہیں اور یوں

نے شامیوں سے یہ وعدہ کیا کہ جب ہسپانیہ سے ان کی واپسی کا وقت آئے گا تو انہیں سب کو الگ الگ جماعتوں کے بجائے ایک ساتھ افریقہ پہنچا دیا جائے گا کیونکہ الگ ہونے کی صورت میں انہیں بڑی آسانی سے زیر کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے انہیں مغربی ساحل کے ایسے مقام پر اتارنے کی ذمہ داری بھی قبول کی جہاں پر عربوں کا مؤثر اقتدار ہوگا۔ ہسپانیہ میں بلج اور اس کے سواروں کی مداخلت فیصلہ کن ثابت ہوئی۔ بربروں نے اپنے آپ کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ بلج نے ایک گروہ پر تیزی سے حملہ کیا اور اسے مدینہ شدونہ کی طرف بھگا دیا۔ دوسرے گروہ کو قرطبہ کے علاقے کی طرف بھگا دیا گیا۔ تیسرے گروہ کو، جو تعداد میں سب سے بڑا تھا اور جس نے طلیطلہ کا محاصرہ کر رکھا تھا، وادی سلیط (وادی سلیط کو Guazaletہ نے Arroyo لکھا ہے، یہ تاجہ [رک باں] کے بائیں کنارے کا ایک چھوٹا سا معاون دریا ہے) کی جنگ میں بری طرح شکست ہوئی۔ اس کے بعد عبدالملک کی طرف بھی خواہش تھی کہ ان مددگاروں کو افریقہ واپس بھیج دے۔ اس نے جب انہیں سبتہ بھیجنے کے لیے جہاز میں بٹھانا چاہا تو غضبناک ”جندیوں“ (= سپاہیوں) نے قرطبہ کی کمزور محافظ فوج پر تیزی سے اچانک حملہ کر کے عامل عبدالملک کو اس کے محل سے نکال باہر کیا اور اس کی جگہ بلج کو بٹھا دیا۔ اس موقع پر بلج نے یہ غلطی کی کہ عبدالملک کے بڑھاپے کے باوجود اسے سخت اذیتیں پہنچائیں۔ کچھ دن بعد شوال ۵۱۲ھ / اگست ۷۳۲ء میں آقوا برطوره (Aqua Portora) کے مقام پر، جو قرطبہ سے کچھ فرسنگ شمال میں واقع تھا، دونوں فریقوں میں مقابلہ ہوا اور اس میں شامیوں کو فتح حاصل ہوئی۔ اس کے باوجود اربونہ [رک باں] (Narbonne) کے

قائد حبیب بن ابی عبیدہ کے درمیان پیدا ہو گئی تھی، دونوں فوجوں میں ہاتھ پائی کی نوبت آ گئی۔ دشمن کی قوت گینٹانے کی غرض سے بربری فوج المغرب کے بعیدترین گوشے میں پیچھے ہٹ کر دریائے سبو Sebu تک چلی گئی۔ بربر فوج کے ساتھ مقابلہ ہونے سے ذرا پہلے کلثوم نے افریقی فوج کی قیادت حبیب کے ہاتھ سے لے لی، جو بربروں کے انداز جنگ سے اچھی طرح واقف تھا، لیکن بلج اس کے سشوروں کو رد کر دیا کرتا تھا۔ کلثوم نے اب حبیب کو ہٹا کر افریقی فوج کی قیادت دو شامی افسروں کے حوالے کی۔ اس اقدام سے افریقیوں کی ناراضی اور بھی بڑھ گئی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کو بقادورہ (یا بندورہ، دریائے سبو کے کنارے فاس کے شمال میں، دیکھیے Les : Fournel Berbers : ۱۰ : ۱۰۲۹۳ rem. ۱) کے مقام پر شکست فاش ہوئی (ذوالحجہ ۵۱۲ھ / ۱۷ - ۱۸ نومبر ۷۳۱ء)۔ اس تباہی کا اصل سبب خود بلج تھا، جس نے حد سے زیادہ خود اعتمادی کی بنا پر حملے میں جلد بازی سے کام لیا اور لڑائی کے وقت اپنی پیادہ فوج سے جدا ہو گیا۔ کوئی سات ہزار سوار اس کے ساتھ رہ گئے۔ وہ ان کی مدد سے لڑتا ہوا دشمنوں کے درمیان میں سے نکل کر سبتہ (Ceuta) جا پہنچا، جہاں اسے ایک طویل عرصے تک بربروں میں رہنا پڑا، یہاں تک کہ قرطبہ کا والی عبدالملک ابن قطن [رک باں]، جو انصاری تھا، اسے اور اس کے شامی سواروں کو ہسپانیہ لے گیا تاکہ ان کی مدد سے وہاں کے ان بربروں کو زیر کر سکے جو بغاوت پر آمادہ تھے۔ بہر حال اس سلسلے میں طرفین نے احتیاط سے کام لیا۔ بلج نے اس بات کا عہد کیا کہ بربروں کی بغاوت فرو ہوتے ہی وہ ہسپانیہ سے چلا جائے گا اور اس سلسلے میں اس نے اپنے کچھ آدمی بطور ضمانت دے دیے۔ ادھر عامل عبدالملک



کے لیے مشہور تھا، پہلی جنگ کے بعد پیش آنے والے حوادث میں بہت نقصان اٹھایا۔ ۱۹۲۱ء میں یونانی فوجوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا اور اگلے سال کے موسم خزاں سے پہلے ترک اسے پوری طرح پر واپس نہ لے سکے۔ ۱۹۵۰ء میں یہاں کی آبادی چارہزار نو سو سے کچھ کم تھی۔

• آخذ: (۱) حاجی خلیفہ: جہان نما، استانبول ۱۱۳۵ھ / ۱۷۳۲ء، ص ۶۴۳؛ (۲) Pachymeres، بون ۱۸۳۵ء، ص ۳۱۳؛ (۳) Hammer - Purgstall، در GOR، Pest ۱۸۲۷ء، ص ۱۳۵؛ (۴) C. von der Anatolische Ausflüge: Goltz، برلن ۱۸۹۶ء، ص ۱۳۵؛ (۵) Konia: C. Huart، پیرس ۱۸۹۷ء، ص ۲۲۲؛ (۶) The Historical Geogra-: W. Ramsay، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۱۹۰، ۲۰۷؛ (۷) phy of Asia Minor، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۱۹۰، ۲۰۷؛ (۸) Das anatolische Wegenetz nach: F. Taeschner، (۹) Türkische Bibliothek، osmannischen Quellen، لاہور ۱۹۲۶ء، ص ۱۰۰، ۱۰۳، ۱۲۳؛ (۱۰) La Turquie d'Asie: V. Cuient، پیرس ۱۸۹۵ء، ص ۱۶۸؛ (۱۱) سامی: قاموس الاعلام، ۲، استانبول، ۱۳۰۶ھ، ص ۱۳۳۳؛ (۱۲) علی جواد: تاریخ و جغرافیای لغاتی، استانبول ۱۳۱۳ تا ۱۳۱۴ھ، ص ۲۲۷؛ (۱۳) Pauly - Wissowa، ۱/۱ (۱۸۹۳ء): عمود ۸۹۳، بذیل مادہ Agrilion: (۱۴) ت، بذیل مادہ Bilecik، از (Besim Darkot)۔

(V.J. PARRY)

- بل حارث: راک بہ حارث بن کعب۔
- بلخ: ایک قدیم شہر، جس کے آثار افغانستان میں شہر مزار شریف کے قریب ایک گاؤں کے اطراف میں اب بھی موجود ہیں (طول بلد شرقی ۶۷ درجہ، عرض بلد شمالی ۳۶ درجہ ۵۵ دقیقہ)۔ اگرچہ اس کا قدیم نام اس صوبے کے نام سے مشتق ہے جس کا ذکر دارا کے کتبات میں باختیس Baxtris اور

گورنر نے اس موقع پر بڑی بیادری دکھائی اور اس کے ہاتھوں بلج کے ایسا زخم لگا جو اس کی موت کا سبب بنا۔

• آخذ: (۱) ابن خلدون: Hist. des Berb، ۱: ۱۳۷؛ (۲) ابن عذاری، ۱: ۳۱ تا ۳۳ و ۲: ۳۰ تا ۳۲؛ (۳) المقرئ، ۲: ۱۱ تا ۱۳؛ (۴) ابن الاثیر، بحد اشارہ؛ (۵) Hist. des Musulmans d' Espagne: Dozy، ۱: ۲۳۳؛ (۶) Les Berbers: Faurnel، ۱: ۲۹۱ تا ۲۹۷؛ (۷) Der Islam: Muller، ۲: ۳۰۶ تا ۳۰۹؛ (۸) Hist. de l'Afrique septentr: Mercier، ۱: ۳۵۰؛ (۹) F. Gabrieli، ۲۳۱ تا ۲۳۳، ۲۳۵ تا ۲۳۷؛ (۱۰) Califfato di Hisham، ۲: ۱۱۳ تا ۱۱۷؛ (۱۱) Hist. Esp. Mus.: Lévi-Provençal، ۱: ۳۳ تا ۳۷؛ (۱۲) ابن حزم: جمہورہ انساب العرب، بحد اشارہ؛ (۱۳) الزرکلی: الاعلام، بذیل مادہ؛ (۱۴) ابن عساکر: ۳: ۲۹۰۔

(A. HUICI-MIRANDA و M. SCHMITZ)

\* بلجک [دیکھیے قاموس الاعلام، ص ۱۳۳۳] بیلہ جک [Biledjik (بوزنطی زمانے کا Βηλόζωμα) شمال مغربی ایشیائے کوچک میں دریائے ستاریا کے ایک معاون قروصو کے کنارے ایک قصبہ - خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ قدیم اگریلیون Agrilion (Peutinger کے نقشوں میں Agrillum) کا محل وقوع بلجک سے زیادہ دور واقع نہیں تھا - عثمانیوں نے بلجک شہر عثمانیوں کے عہد حکومت میں بوزنطیوں سے چھین لیا - عثمانی حکومت میں یہ شہر ایالتِ آناطولی (= آناڈولو Anadolu) [رک باں] میں شامل تھا، لیکن بعد میں ولایت خداوندگار (بروسہ) میں ارفغرل [رک باں] کے سنجاق کا انتظامی مرکز بن گیا۔ یہ شہر اب موجودہ صوبہ بلجک Bilecik کا مرکز ہے۔ اس شہر نے، جو زمانہ قدیم سے ریشمی پارچہ بانی

وزرا کا خاندان کئی نسلوں تک اس کا مالک رہا۔ گرد و پیش کی ساری زمین اور سات فرسخ تک کے فاصلے تک تمام باغ انہیں کی ملک تھے اور عبادت گاہوں کے تمام خادم ان کے غلام سمجھے جاتے تھے۔

شہر بلخ جنوب میں واقع پہاڑیوں کے دامن سے چار فرسخ اور آمو دریا [رک باں] (جیحون) سے بارہ فرسخ کے فاصلے پر تھا۔ قدیم یونانی عہد میں دریائے بلخاب، جو شہر کو سیراب کرتا تھا، آمو دریا سے جا ملتا تھا اور اس پر حمل و نقل کشتیوں کے ذریعے ہوتی تھی، لیکن اسلامی عہد میں اس دریا کے پانی سے صرف انگوروں کی باڑیوں اور باغوں کو سیراب کرنے کا کام لیا جانے لگا اور وہ آمو دریا تک بہہ کر نہیں جاتا تھا۔ گواک ترکوں (Gök Turks) کے زمانے میں بلخ ایک ترک شہزادے، یعنی طخارستان کے بیغو کے زیر حکومت تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد (۵۳۲/۶۵۳ء) میں آحنف بن قیس [رک باں] نے اس کا محاصرہ کر کے اسے تاراج کیا، لیکن آخر کار اسے امان مل گئی اور یہ محفوظ رہا (البلاذری: ص ۴۰۸)۔ گیارہ سال بعد (۵۴۳/۶۶۳ء) قیس بن ہیثم نے شہر پر پورا قبضہ کر لیا اور نوبہار کو تباہ اور اس کے بلند گنبد کو مسخار کر دیا۔ برصغور نے، جو نوبہار پر حکومت کرتا تھا، اپنی جاگیر کو بچانے کے خیال سے عربوں کی اطاعت قبول کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے طخارستان کے بیغو اور دوسرے ترکی امیروں کی جانب سے بہت تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ تورکش بیگی نیزک ترخان نے بھی، جو سیستان اور طاس ہلمند کا بادشاہ تھا، عربوں کی اطاعت قبول کر کے بظاہر اسلام قبول کر لیا، لیکن بعد میں وہ علی الاعلان مرتد ہو گیا اور اس نے اپنا پرانا دین بدھ مت اختیار کر لیا۔ وہ آگے بڑھا اور بلخ کو

یونانی ماخذ میں باکترا Baktra کے نام سے ہوا ہے (Gründriss der Iranischen Philologie، ۲، ۱۹۳۲ء) تاہم اسم بلخ قدیم یونانیوں کے ہاں Báktra کی شکل میں موجود تھا (Haussig، در ZDMG، ۱۰۹: ۱۸۴)۔ اسکندر کے نمودار ہونے تک غالباً ایسا کوئی شہر موجود نہ تھا، لیکن اس کی فتوحات کے بعد اس کا نام ایک یونانی۔ باختری ریاست کے صدر مقام کی حیثیت سے سامنے آیا۔ گشن Kushan، افتالی (Ephtalit) اور گواک ترکوں (Gök-Turks) کے زمانے میں یہ بدھ مت کی ایک عبادت گاہ تھا۔ ۶۲۸ء میں ایک چینی بدھ بھکشو ہوان سانگ یہاں آیا تھا۔ اس نے اس شہر اور اس کے مضافات کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے (Memoires، ۱: ۳۰۱، La vie، ص ۶۴)۔ شہر کے باہر جنوب کی طرف نوبہار (Nawbahār) یا نو وبارہ (Naw Vihārah) واقع تھا، جو بدھ مت کے مندروں کا مجموعہ تھا اور جس تک رسائی اس پہانک میں سے ہو کر ہوتی تھی جس کا نام بعد میں باب نوبہار (Nawbahar Gate) پڑا۔ یہ مندر دریائے بلخاب Belxab کے کنارے بنے ہوئے تھے، جو شہر کے بیچ میں ہو کر بہتا تھا۔ ہوان سانگ کے بیان کے مطابق اس مقام پر بدھوں کی تقریباً ایک سو عبادت گاہیں تھیں، جن میں سے ہر ایک میں تین سے زیادہ بھکشو رہتے تھے۔ دسویں صدی کے عرب جغرافیہ دان ابن الفقیہ نے نوبہار کا ذکر کیا ہے (ص ۳۲۲)۔ اس کے بیان کے مطابق نوبہار میں سب سے بڑی عمارت ایک گنبد تھا، جس کا قطر اور بلندی دونوں ایک سو ذراع تھے اور جس کے گرد تین سو ساٹھ الگ الگ کمرے (مقصورے) بنے ہوئے تھے۔ یہ گنبد اوستون (بلند) کے مخصوص نام سے معروف تھا، جس کا ترکی لفظ ہونا ظاہر ہے۔ عباسیوں کے عہد میں برصغور



ترقی کا بہت شاندار دور تھا۔ عرب جغرافیہ نویسوں نے اس شہر کے اس زمانے کے حالات لکھے ہیں۔ اسلامی عہد سے پہلے ہی یہ شہر ماوراءالنہر، ترکستان اور ہندوستان کی باہمی تجارت کا مرکز تھا۔ اسلامی عہد میں سائنس اور ثقافت کے اعتبار سے اس کی حیثیت اور بھی بہتر ہو گئی [ = أم البلاد ]۔ اس علاقے میں جو غلہ پیدا ہوتا تھا اس سے سارے ماوراءالنہر یہاں تک کہ خوارزم تک کے شہروں کو غذا ملتی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی المقدسی نے لکھا ہے کہ اس لحاظ سے دوسرے شہر اس سے بہت پیچھے تھے۔ یہ شہر دو حصوں میں منقسم تھا: (۱) اندرون شہر، جو شہرستان یا مدینہ کہلاتا تھا اور (۲) ریح (مضافات شہر)، جو ایک بڑی نواحی بستی تھی۔ ان دونوں کے گرد فصیل کھنچی ہوئی تھی۔ الیعقوبی (ص ۲۸۸) ایک دیوار کا ذکر کرتا ہے، جس میں چار دروازے تھے۔ یہ دیوار غالباً اندرونی قلعے کی دیوار ہوگی۔ اسلامی عہد میں اس بڑی دیوار کے، جس کے اندر ”ریح“ بھی شامل تھا، سات دروازے تھے۔ ان کے نام ابن حوقل، الاضطخری اور المقدسی نے یوں لکھے ہیں: (۱) باب نوبہار؛ (۲) باب وخیہ (الاضطخری کے ہاں ریحہ)؛ (۳) باب الحدید؛ (۴) باب ہندوان؛ (۵) باب الیہود؛ (۶) باب شست مین (الاضطخری کے ہاں شست بند) اور (۷) باب بختی [بحوالہ لسٹرینج، باب یحییٰ]۔ شہر کی بڑی مسجد شہرستان میں تھی اور بڑے بڑے بازار ریح میں۔ الاضطخری نے اس شہر کا مختصر حال لکھا ہے، جس کا ماخذ بلخ کے ایک باخبر باشندے ابوزید البلخی کی ایک کتاب ہے۔ ان معلومات میں ابن حوقل نے بہت سی نئی معلومات کا اضافہ کیا ہے (طبع جدید، ص ۴۴۸)۔ شہر اور اس کے گرد و نواح کا حال بیان کرتے ہوئے وہ کہتا ہے: ”یہ بہت پرانا شہر ہے اور ہمیشہ سے

عربوں کے قبضے سے نکال لیا۔ اس نے وہاں کے برومکی فرمانروا اور اس کے بیٹوں کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا، ان میں سے فقط خالد کا باپ، جو بعد میں وزراے عباسیہ کا مورث اعلیٰ ہوا، زندہ بچا۔ اسے کشمیر پہنچا دیا گیا، جہاں اس نے وہاں کے بدھی وٹاروں میں تحصیل علم کی۔ اس نے صفانیہ کے ترک فرمانروا کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اس شادی سے اس کے ہاں خالد پیدا ہوا، جو عباسی وزیر فضل بن یحییٰ کا دادا تھا۔ قتیبہ [بن مسلم] کے زمانے تک (۵۹۶ / ۷۱۵ء)، جب کہ اس شہر پر مکمل قبضہ ہوا، یہ یکے بعد دیگرے مختلف لوگوں کے قبضے میں آتا جاتا رہا۔ الطبری کے قول کے مطابق ۵۸۷ / ۷۰۶ء تک اس کی حالت خراب رہی۔ عربوں نے اپنی حفاظتی فوجیں شہر سے دو فرسخ مشرق کی طرف برقان میں رکھی تھیں۔ ۵۱۰ / ۷۲۵ء میں خراسان کے والی اسد بن عبداللہ القسری نے اپنی محافظ فوجوں اور صوبے کی حکومت کو [مرو سے] بلخ میں منتقل کر دیا اور اس شہر کی تعمیر شروع ہوئی۔ ان تعمیری کاموں کا نگران اس نے برامکہ کو مقرر کیا اور انہوں نے اس کام میں ایسی قابلیت دکھائی کہ وہ عرب والیوں کی نظر میں معتبر اور معزز ہو گئے؛ لیکن والیان عرب کی نظریہ التفات آل خطل، یعنی طخارستان کے بڑے بڑے سرداروں (بیکہ) کی طرف بھی یکساں تھی، چنانچہ باینچور (Bayuncur) [ = بانی جور ] کا بیٹا عباس اور اس کا بیٹا داؤد بلخ کے گورنر ہوئے (Marquart: ایران شہر، ص ۳۰۱)۔ داؤد نے بلخ میں ایک عظیم الشان محل بنوایا جو نوشاد کہلاتا تھا۔ جب ۵۲۵ / ۸۷۰ - ۵۸۷ء میں یعقوب بن لیث نے بلخ پر قبضہ کر لیا تو وہاں باینچور کے بیٹوں کی نیم خود مختار حکومت ختم ہو گئی۔ یعقوب نے ان کا محل نوشاد بھی منہدم کر دیا۔ ۵۲۸ / ۵۹۰ء میں یہ شہر سامانیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ یہ شہر کی

تھا۔ سامانیوں کے بعد غزنویوں کا زمانہ آیا۔  
 ۱۰۳۱ء/۵۳۱ھ میں بلخ پر چغری بے نے قبضہ کر لیا۔  
 اس کے بعد وہ سلجوقیوں کے قبضے میں چلا گیا۔  
 ابن حوقل کی کتاب میں جو اضافے سلجوقیوں کے  
 عہد میں کیے گئے ہیں (طبع جدید: ص ۴۷) ان کی  
 رو سے یہ شہر ۵۵۰/۱۱۵۰ء میں غزوں [اوغوز]  
 کے ہاتھوں تباہ ہوا، اس کے بعد بلخ کے گورنر  
 امیر قماچ نے اس شہر کو ایک نئی جگہ، ہموار میدان  
 میں منتقل کر دیا۔ اسی امیر قماچ کے زمانے میں  
 ۱۱۳۶ء کے کچھ بعد (۵۳۰ھ) عبدالحمید الاندلسی  
 لکھتا ہے کہ اس نے ایک خواب کے ذریعے بلخ  
 کے قریب کے ایک گاؤں خیر نامی میں حضرت علیؑ  
 کی قبر معلوم کی تھی (طبع G. Ferran، ص ۱۴۵ تا  
 ۱۴۷)۔ اگر اس کا کسی شہر سے کچھ تعلق ہے  
 تو یہ ضرور حال کے افغانی ترکستان کے صدر مقام  
 مزار شریف کی طرف اشارہ ہوگا، جو بلخ کے مشرق کی  
 طرف بائیس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس  
 مزار کے حضرت علیؑ کی طرف منسوب ہونے سے  
 بلخ کی اہمیت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اوغوز  
 کے ہاتھوں تباہ ہو جانے کے بعد یہ پہلے کی طرح  
 پھر دوبارہ دارالسلطنت ہو گیا۔ ۱۱۶۵ اور ۱۱۹۸ء  
 کے درمیان یہ شہر قراختائیوں کے ہاتھوں میں  
 چلا گیا اور ۱۱۹۸ء/۵۹۴ھ کے بعد اس پر غوریوں کا  
 قبضہ ہو گیا؛ ۱۲۰۶ء/۶۰۳ھ میں خوارزم شاہ اس پر  
 قابض ہو گیا اور آخر کار ۱۲۲۰ء/۶۱۷ھ میں اسے  
 چنگیز خان نے تباہ کر ڈالا۔ چودھویں صدی کے اوائل  
 میں کپک خان (Kepu Khan) نے، جو چغتائی خوانین  
 میں سے تھا، اسے پھر بحال کیا، لیکن تھوڑے  
 ہی دن بعد جب عرب سیاح ابن بطوطہ وہاں  
 پہنچا تو یہ شہر خراب و خستہ حالت میں تھا  
 (مطبوعہ پیرس، ۳: ۵۸، ۶۳)، لیکن چونکہ تباہ شدہ  
 عمارتوں کی بنیادیں محفوظ تھیں اس لیے دور سے

معروف ہے۔ سوداگر یہاں ہر طرف سے آتے اور  
 ہر طرح کا سامان تجارت لاتے ہیں۔ یہاں کے  
 باشندوں کا علمی ذوق بہت بلند ہے اور انہوں نے  
 اپنے آپ کو فقہ اور علمی مباحث میں ممتاز کیا  
 ہے، چنانچہ ان میں سے بہت سوں کا شمار ناموروں  
 میں ہے۔ المقدسی (ص ۳۰۲)، جس نے اپنی معلومات  
 کی بنیاد بلخ کے ایک اور باشندے عبدالقادر  
 العکبی کی تصنیف پر رکھی ہے، اس شہر اور اس کے  
 مضافات کا ذکر بڑی تعریف کے ساتھ کرتا ہے۔  
 اس مصنف کی کتاب کا ایک مخطوطہ استانبول کے  
 کتبخانہ ایاصوفیہ میں موجود ہے اور اس میں  
 اس شہر کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا  
 ہے: دوسرے ایرانی شہروں کے مقابلے میں اس کی  
 سڑکیں زیادہ چوڑی ہیں۔ اس کی مسجدیں خوبصورتی  
 میں بے نظیر ہیں، اس کے گھروں کے صحن  
 دندانقان کے علاوہ خراسان کے تمام شہروں کے  
 صحنوں سے زیادہ کشادہ ہیں۔ ان تمام تصانیف  
 میں سے جن میں اس شہر کی قدیم تاریخ خصوصیت  
 کے ساتھ بیان کی گئی ہے صرف سیف الدین ابوبکر  
 البلخی کی تصنیف فضائل بلخ، جو ۵۶۱۰/۱۲۱۴ء  
 میں عربی میں لکھی گئی تھی، ایک مختصر فارسی  
 ترجمے کی صورت میں، جو ۵۶۷۷ میں کیا گیا تھا  
 (Chrestomathie Persane : Schefer، ج ۱، حصہ ۱ و ۲)  
 باقی ہے۔ فارسی کی چند اور کتابیں، جو اس سے  
 ملتی جلتی ہیں، ازبک عہد سے ہم تک پہنچی  
 ہیں (Persian Literature : C. A. Storey، ۱/۲)۔  
 حدود العالم کے بیان کے مطابق شہر کے  
 اندر دریائے بلخاب بارہ نہروں میں منقسم تھا۔  
 یہ دریا شہر سے نکل کر شمال میں ترمذ کی طرف  
 بہتا تھا اور اس شہر میں سے گزر کر جسے عرب  
 سیاہ چرد کہتے تھے اور جو آج کل سیاگر کے نام  
 سے مشہور ہے، کہیتوں میں پھیل کر ختم ہو جاتا



حافظ ابرو کی زبده التواریخ کے ذیلی حصہ جغرافیہ میں درج ہے۔ اس زمانے میں اس کی زیادہ ترقی شاہرخ کے عہد میں شروع ہوئی۔

شہر کے گرد و نواح کے علاقے پر ترکی رنگ اسی وقت چڑھنا شروع ہو گیا تھا جب خوارزم شاہیوں کے زمانے میں قبچاق یہاں آ کر بسے تھے۔ مغول اور تیموریوں کے زمانے میں یہ زیادہ وسیع پیمانے پر پھیلا۔ حافظ ابرو نے جن دیہات کے نام گنوائے ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل ترکی نام خصوصیت سے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں: قریہ برلاس، قریہ مغل، قارلیق، قفچاقیان، ارغون، قریہ ختایان، چراغچی، قرہ کسک، غازان، توست، کنگریک، قرہ تیمور، آی تیمور، طوغای بوقا، چرکس، منگی، اختاجی، بوقا تیمور، قرہ تپہ، آق تیلو، شیخ آرسلان، تیمورک، توغان، آلائی، دوربون، مانقوتلوق (حافظ ابرو: جغرافیہ، مخطوطہ مؤزہ بریطانیہ، عدد ۹۳۱۶ Or. ۷۲، ۱: ۲۶۱ تا ۲۶۲)۔ سلطان حسین بایقرا کے زمانے میں قدیم قریہ خیر میں حضرت علیؑ کے [مزعومہ] مزار کی دوبارہ مرمت کی گئی اور ۱۳۸۰ء میں اس سلطان نے اس خیالی مزار پر بعض شاندار نئی عمارتیں تعمیر کروائیں۔

ازبکوں کے زمانے میں پرانے بلخ کے شمال مشرق میں نئے بلخ کے نام سے ایک قصبہ بن گیا، پھر بھی کچھ لوگ بلخ قدیم میں رہتے رہے۔ ازبکوں کے زمانے کے بلخ اور اس کے صوبے کے تاریخی اور جغرافیائی حالات سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ کتاب بحر الاسرار فی مناقب الاخیار کی پہلی جلد میں ملیں گے، جو جغرافیائی حالات کے لیے مخصوص ہے۔ یہ کتاب سترھویں صدی کے وسط میں محمود بن ولی نے نادر محمد خان کے لیے لکھی، جو بلخ کا اور پھر بخارا کا بادشاہ ہوا (C. A. Storey: Persian Literature، ۲: ۳۷۵ تا ۳۷۶؛ زکی ولیدی

دیکھنے والے پر یہ اثر پڑتا تھا کہ شہر ابھی آباد ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے یہاں کا چینی [کاشی] کا کام صحیح سالم تھا، اور بلخ کی مشہور مسجد، جو عباسیوں کے عہد میں وہاں کے گورنر داؤد بن علی (یعنی داؤد بک بن عباس بن باینچور) کی بیوی نے بنوائی تھی، نیز وہ تگہ [تکیہ] اور رباط [زاویہ] جو اس نے مسجد کے پہلو میں بنوائے تھے، اس کے وقت تک اچھی حالت میں تھے۔ ابن بطوطہ ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ بلخ کے باہر ایک مزار اور اس سے ملحق ایک تگہ [تکیہ] ہے، جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عکاشہؓ بن محسن الاسدی کا مزار ہے جو صحابہ میں سے تھے۔ حضرت عکاشہؓ بن محسن نے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے ضرور خراسان کی فتوحات میں حصہ لیا ہوگا (اسد الغابہ ۴: ۲-۳)۔ [یہ خیال درست نہیں کیونکہ حضرت عکاشہؓ الاسدی البدری ۱۱۱ھ / ۷۳۲ء (خلافت ابوبکر صدیقؓ) میں شہید ہوئے (سیر اعلام النبلاء، ۱: ۲۲۳) اور یہ زمانہ فتوحات خراسان سے بہت پہلے کا ہے۔] اس مزار پر تیموریوں کے زمانے میں ایک عظیم الشان نئی عمارت بنائی گئی تھی، جو بلخ قدیم کی فصیل کے باہر آج بھی موجود ہے اور اس سڑک پر واقع ہے جو بلخ جدید سے مزار شریف کو جاتی ہے۔ تیمور سے پہلے بلخ قدیم کو امیر قزاکن اور حسین نے ترقی دی تھی۔ اس نے بالخصوص قدیم شہر کے حصہ شہرستان میں، جو اس کے زمانے میں "قلعہ ہندوان" کہلاتا تھا، عمارتیں بنوائیں اور لوگوں کو وہاں بسایا۔ تیمور نے قدیم "ریض" کے حصے کو بھی از سر نو تعمیر کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہرات اور مرقند کے بعد بلخ وسط ایشیا کا سب سے زیادہ اہم تجارتی مرکز بن گیا۔ تیموریوں کے زمانے میں بلخ کی کیفیت کا حال

تھا۔ اس مصنف کے زمانے میں شہر کے محلہ ربض کے دروازے حسب ذیل تھے: جنوبی جانب ”دروازہ خواجہ سلطان“ (یا دروازہ سلطان احمد خسروییہ) تھا، جو پزانی کے زمانے میں ”نوبہار دروازہ“ کہلاتا تھا؛ مغربی جانب ”دروازہ آب“ تھا، جس کے پاس نہر اصفہان تھی، جو فضل بن یحییٰ برمکی نے بنوائی تھی۔ یہ دروازہ ضرور وہی ہوگا جسے عرب مصنفوں نے رختہ، رجبہ اور رختہ کی شکلوں میں لکھا ہے۔ اس کے شمال مغرب میں ”دروازہ جبہ خان“ تھا، جو عربی کا باب الحدید ہے (شاید باب الجبویۃ زیادہ صحیح ہو)۔ اس کے جنوب مغرب میں ”دروازہ دیہ شیخ“ تھا، جہاں سے نہر اصفہان شہر کے باہر جاتی تھی۔ محمود بن ولی کے بیان کے مطابق یہ دروازہ شروع میں موجود نہ تھا بلکہ بعد کے زمانے میں بنایا گیا تھا۔ باہر کی جانب قریہ دیہ شیخ واقع تھا۔ محلہ ربض کے شمال کی طرف ”دروازہ خیابان“ تھا۔ بعض مآخذ میں مشرق کی طرف ”باب التُّرک“ اور ”باب الصِّین“ کا نام لیا گیا ہے، لیکن یہ محمود بن ولی کے زمانے میں موجود نہ تھے۔ اس نے فقط ”دروازہ عشق آباد“ کا ذکر کیا ہے، جو عرب مصنفین کے ”باب الہند“ سے مطابقت رکھتا ہے۔ محمود بن ولی کے زمانے میں ربض کا محلہ مشرق اور مغرب کی جانب سے قہندز کا احاطہ کیے ہوئے تھا اور یہی صورت ابن حوقل کے زمانے میں تھی (طبع جدید، ص ۸۴)۔ محمود بن ولی نے جن مآخذ سے کام لیا ان میں سے ابو زید البلخی کی کتاب مسالک الممالک اور تاریخ بہجۃ میں اس شہر کو اسلام سے پہلے بدھ مت کا مرکز بتایا گیا ہے اور ہندوستان کے ساتھ اس کے تعلقات کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اسلامی عہد میں قبل اس کے کہ قہندز اور ربض دونوں کو ایک بڑی فصیل سے گھیر دیا جائے، نوبہار اور قہندز

طوغان : Zapiski Vost. Old. russk. arx. Obs. : ۲۳ : ۲۵۵ تا ۲۵۹، لیکن اس کتاب کا جغرافیائی حصہ اس وقت ضائع ہو گیا جب بخارا پر روس کا قبضہ ہوا اور آرک جلا دیا گیا، پھر بھی بلخ کی تاریخ اور جغرافیے سے متعلق بہت سی اہم معلومات کتاب کے اس نسخے کی چھٹی جلد میں موجود ہیں جو انڈیا آفس میں محفوظ ہے (عدد ۵۷۵)۔ ایک اور کتاب بھی ہم تک پہنچی ہے جو ابوبکر صنی الدین البلخی کی عربی کتاب (۵۶۱/۱۲۱۳ء) کا فضائل بلخ کے نام سے مختصر فارسی ترجمہ ہے (Storey : کتاب مذکور، ۲/۱ : ۱۲۹۶)۔ اس کتاب میں ان سب کتابوں سے مواد اکٹھا کیا گیا ہے جو بلخ کی تاریخ سے متعلق ابوالقاسم السمرقندی (اسحق بن محمد، در ارمنان علمی محمد شفیع، ص ۲۲۵، ۲۲۸)، ابو زید البلخی، سید شریف مدینی وغیرہ مشہور مصنفین نے لکھی ہیں۔ زمانہ قبل اسلام کے بلخ کے حالات سے متعلق بہت سی اہم اطلاعات ایک اور کتاب تاریخ بہجۃ (جس سے ہم ناواقف ہیں) میں بھی موجود ہیں۔ اس سے جو کچھ ہماری سمجھ میں آتا ہے یہ ہے کہ اس شہر کے اسلامی عہد سے پہلے کے قلعے، یعنی ”قلعہ ہندوان“ (جسے ”بام قہندز“، ”مدینہ“، ”شہرستان“ یا ”شہر اندرون“ بھی کہتے ہیں) کے چار بڑے دروازے تھے۔ ان میں سے اس دروازے کا نام درب عراق تھا جو جنوب کی طرف تھا اور جس میں سے ہو کر ربض کے محلے میں جاتے تھے۔ مصنف کے کہنے کے مطابق اس کا پرانا نام درب بجز (؟) اور درب الیہود تھا۔ مغربی سمت کا دروازہ بعد میں درب اسلام کہلانے لگا، لیکن اس کا پرانا نام سیتمند تھا۔ شمال کی طرف کے دروازے کا نام ”آستر [ستر؟] خوار“ تھا اور مشرقی جانب کا دروازہ ”خواجہ عکاشہ“ تھا اور اس کا پرانا نام ”بختی“



اور ان کے بیچ میں ربض تینوں الگ الگ قلعے تھے اور تینوں کی اپنی اپنی فصیل تھی۔ نوبہار کے شمال میں جو حصہ اس سے بالکل ملا ہوا تھا اسے حصن وراں کہتے تھے (غالباً یہ وراں بھی اوراں ہے، جیسا کہ اسم واروالز Varvaliz کے متعلق کہا گیا ہے)۔ شہر کے مشرقی رخ قہندیز کی طرف ایک ضلع پھیلا ہوا تھا، جسے ”حصن کوفج“ کہتے تھے۔ مغربی جانب کے اضلاع جیہ خان کہلاتے تھے۔ چونکہ شہر کا چوتھا حصہ قہندیز دوسرے حصوں کے مقابلے میں چھوٹا تھا اس لیے عربوں کے زمانے میں اس کا نام ”حصن صغیر“ تھا۔ نوبہار کے عبادت خانے فضل بن یحییٰ برمکی کے نامور جد اعلیٰ جیہ خان نے بنوائے تھے اور فضل کو اس بات پر شرمندگی محسوس ہوتی تھی کہ وہ ایک ایسے جد کی اولاد ہے، اس لیے اس کا ارادہ تھا کہ جیہ خان کے محلے میں اس کے جتنے محل تھے انہیں گرا کر ان کی جگہ نہریں بنا دے؛ چنانچہ جب وہ بلخ آیا تو اس نے علما کو طلب کیا اور ان سے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور جو انہوں نے کہا اس پر عمل کیا۔ بلخ کے اس حاکم کا نام جبو (جسے جبا اور جبا بھی لکھتے تھے) اور حقیقت میں جبو یا جبوہ تھا، اور جفکا (یا جفقا جیسا کہ ابن سہنا: حلیۃ الانسان، طبع استانبول، ص ۱۴۵ میں ہے) یغوق کی ایک شکل تھی جو ضرور اس کا لقب ہوگا۔ اس خان کے محل تو مسمار کر دیئے گئے، لیکن محمود بن ولی نے جب ۱۰۴۴ء / ۱۶۳۴ء میں اپنی کتاب لکھی تو ضلع اور شہر کا بڑا دروازہ اسی کے نام سے مشہور تھے۔ محمود بن ولی کے بیان کے مطابق چغتائی خان بساور نے اپنے لوگوں کو ماوراء النہر سے غزنہ متقل کر دیا۔ اس کے بعد کپک خان اس کا جانشین ہوا، جو انہیں بلخ کے قریب لے آیا اور انہیں قلعہ بلخ

کے مغربی جانب ”قریہ بساور“ میں بسا دیا۔ خان نے یہیں اپنا دارالضرب بھی بنا رکھا تھا۔ اس کے جانشین ایلچی گرای خان نے ایک اور گاؤں بلخ کے جنوب مغرب میں بسایا، جس کا نام قریہ ایلچی گرای رکھا۔ اسی نے نئی نہریں بنا کر قلعہ ہندوان کی حالت درست کی۔ محمود بن ولی نے ان تمام تفریح گاہوں، باغوں، محلوں، نہروں، مسجدوں مدرسوں کے مفصل حالات لکھے ہیں جو بلخ میں ازبک خوانین کے عہد میں بنائے گئے۔ سترھویں صدی میں فرمانرواؤں کے بڑے بڑے محل یہ تھے: نادر محمد خان کا محل، جس نے سارا ”باغ خانی“ گھیر رکھا تھا جو جیہ خان اور دیہ شیخ کے دروازوں کے درمیان ایک وسیع میدان تھا؛ ”باغ شمال“، جو دروازہ خیابان کے قریب تھا اور ”باغ گل زمین“، جو دروازہ عشق آباد کے قریب تھا۔

پرانے بلخ کے کھنڈروں کا حال ہمارے زمانے میں لکھا گیا ہے۔ شہر کا اندرونی قلعہ، جو شہرستان، قلعہ ہندوان اور آرک کہلاتا ہے۔ زمانہ قبل اسلام کے بلخ کا فقط یہی حصہ ہے جو بچا ہوا اور فصیل سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے گرد پینتالیس منٹ میں پورا چکر لگایا جا سکتا ہے، لیکن اسلامی عہد کے شہر ربض کے گرد چکر لگاتے میں دو گھنٹے لگتے ہیں۔ اندرونی فصیل سے بیرونی فصیل کے بعیدترین حصے کا فاصلہ ڈیڑھ ہزار میٹر ہے۔ شہر کے جن سات دروازوں کا ذکر عرب مصنفوں نے کیا ہے انہیں آج بھی متعین کیا جا سکتا ہے۔ پرانی عمارتوں میں سے پرانی مسجد، عکاشہ کا مقبرہ، اور وہ شاندار عمارت جو عبدالؤمن خان ازبک نے ۱۵۹۹ء میں مشہور نقشبندی شیخ خواجہ پارسا کی قبر پر تعمیر کی تھی بلخ کی سب سے اہم یادگار عمارتیں ہیں۔ نوبہار قدیم بلخ بھی دروازہ نوبہار کے جنوبی علاقے میں

ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ مزید برآں اس تصنیف کی عبارات اتنی مغلق ہیں کہ جب تک آثارِ بلخ کا ذاتی طور پر مشاہدہ نہ کیا جائے، سمجھ میں نہیں آسکتیں؛ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بارٹولڈ Barthold نے ۱۹۲۶ء میں تسلیم کیا کہ وہ ان عبارات کو سمجھ نہ سکا اور اس لیے اس نے بلخ پر اپنی تصنیف *The Historical Geography of Iran* (ص ۱۸) میں محمود بن ولی کی معلومات کو اپنا موضوع تحقیق بنانے کی کوشش نہیں کی۔ اس شہر کی تاریخ میں شیخ الاسلام ابوبکر صنی الدین البلخی کی تصنیف (دیکھیے *Persian Literature : Storey*، ۱/۲ : ۱۲۹۶) تو معروف ہے، لیکن اس شہر کی مقام نگاری کے متعلق ان کی نگارشات ابھی شائع نہیں ہوئیں۔ بہر کیف ازبک خوانین کے عہد میں اس شہر کے محاصرے کے متعلق رسالوں میں جو احوال مندرج ہیں وہ نہایت اہم اور درست ہیں۔ ان میں سے اہم ترین حافظ تیش (? تائیش) کی تحریرات ہیں جو ازبک عبداللہ خان کے ۱۵۷۳ء میں اس شہر کے محاصرے کے متعلق ہیں۔ میر محمد امین بخاری نے ازبک خان کے ۱۷۰۷ء میں اس شہر کے محاصرے کے متعلق جو احوال لکھے ہیں وہ بہت اہم ہیں۔

مآخذ: (۱) الاضطحری، ص ۲۷۸؛ (۲) ابن حوقل، طبع جدید، ص ۳۷ تا ۳۸؛ (۳) المقدسی، ص ۳۰۱ تا ۳۰۲؛ (۴) *The Lands of the Le Strange*؛ (۵) *Eastern Caliphate*، ص ۳۲ تا ۳۳؛ (۶) *Istoriko-geograficeski Obzor Irana*، ص ۱ تا ۱۰؛ (۷) *Volume Presented to C. E. Pavry. : P. Schwarz*؛ (۸) *La vielle route de l'Inde de Bactres à Taxila*؛ (۹) *Niedermeyer*؛ (۱۰) تصاویر کے لیے *Afghanistan*، لائپزگ ۱۹۲۳ء۔

(زکی ولیدی طوغان)

موجود ہے اور اس کا نام اب "تختِ رستم" یا "تپہ رستم" ہے۔ تختِ رستم نے پانچ سو میٹر لمبے قطعہ زمین سے زیادہ زمین گھیر رکھی ہے۔ بلخ قدیم زمانے میں بدھ مت کا مرکز اور پورے طور پر ہندو تہذیب کے زیر اثر رہا ہے، لیکن ایرانی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی عہد تک بھی بلخ زردشتیوں کا مرکز اور ایرانیوں کا سب سے پرانا مذہبی صدر مقام تھا۔ عمر بن آرزق الکرمانی کی کتاب میں، جس سے یاقوت الحموی نے مواد لیا ہے، نوبہار کو ایک مکمل زردشتی شہر قرار دیا گیا ہے اور اس بارے میں اس مضمون کی روایات نقل کی گئی ہیں کہ یہاں کی عمارتوں کا تعلق ایران کے نامور قوسی ہیرو رستم کے ساتھ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قدیم شہر بلخ کی جزئیاتی تاریخ کو ابھی تک موضوع تحقیق نہیں بنایا گیا ہے۔ فرانسیسی جماعتِ آثارِ قدیمہ (The French Archeological Delegation) نے شمالی افغانستان میں نہایت اہم تحقیقات کی ہیں اور اس نے گو شہر کے اندر اور اس کے نواح میں آثارِ قدیمہ کا، خصوصاً بدھ مت کی یادگاروں کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے، لیکن اس نے قرونِ وسطیٰ کے شہر کی تاریخ کو مجموعی طور پر نہیں چھیڑا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مغرب کے بیشتر ماہرانِ آثارِ قدیمہ کو وہ مشرقی مخطوطاتی مآخذ دستیاب نہیں جن میں اس شہر کے مقامی جغرافیے کا حال درج ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ محمود بن امیر ولی کی تصنیف بحر الآثار فی مناقب الاخیار (انڈیا آفس مخطوطہ، عدد ۱۳۹۶، ورق ۳۱۰ تا ۳۱۸) جس میں دورِ اسلامی خصوصاً سولہویں صدی کے ازبک خوانین کے عہد حکومت کے دوران میں اس شہر کے مقامی جغرافیے کے کچھ احوال درج ہیں،



ان شاہی فوجوں نے ۱۱۸۷ھ / ۱۷۷۳ء کے اوائل میں قباد خاں کو راستے سے ہٹا دیا اور بلخ کے مسائل کو سلجھا دیا (محمد امین ابوالحسن گلستانہ (؟): مجمل التواریخ، لائڈن ۱۸۹۶ء، ص ۱۱۸)۔ چونکہ تیمور شاہ بھائیوں کے باہمی اختلافات میں الجھا ہوا اور پنجاب و پشاور پر یورش کرنے میں منہمک تھا، اس لیے بخارا کے حاکم شاہ مراد بے نے موقع کو غنیمت تصور کرتے ہوئے مرو پر قبضہ جما لیا اور بلخ کو خطرے میں ڈال دیا؛ لہذا ۱۲۰۳ھ / ۱۷۸۹ء کے موسم بہار میں افغانستان کے شمالی علاقوں میں فتنہ و فساد کو دور کرنے کی غرض سے تیمور شاہ ایک لاکھ فوج کے ساتھ چل پڑا۔ آچہ بلخ کے حدود میں جنگ ہوئی، جس میں شاہ مراد بے کے چھ ہزار آدمی مارے گئے اور اس کے سپاہیوں کو شکست ہوئی۔ اس شکست کے بعد شاہ بخارا نے علما کے ہاتھ قرآن مجید اور کچھ تحفہ تحائف تیمور شاہ کے پاس بھیجے۔ تیمور نے اس کی عذر خواہی قبول کی اور اس سے صلح کر لی؛ چنانچہ بلخ فتح کرنے اور اس کے امور طے کرنے کے بعد وہ کابل پلٹ آیا اور پیر دوست خاں کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا (فیض محمد ہزارہ کابلی: سراج التواریخ، مخطوطہ، ص ۲۷۸؛ قاضی عطاء اللہ: تاریخ افغانستان (پشتو)، پشاور، ص ۱۵۶)۔

۱۲۰۷ھ / ۱۷۹۲-۱۷۹۳ء میں تیمور شاہ کابل میں فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا زبان شاہ تخت نشین ہوا، لیکن ساتھ ہی اس کی اپنے بھائیوں سے خانہ جنگی شروع ہو گئی۔

جس وقت زبان شاہ ہندوستان پر چڑھائی کرنے کے خیال سے پشاور اور پنجاب پر اپنی فوج لے آیا، بخارا کے حاکم شاہ مراد بے نے دوبارہ بلخ پر اپنا قبضہ جما لیا، لیکن چونکہ وہ بلخ پر ایسا نہ

بلخ افغانی سلطنت کے زمانے میں: دسویں صدی ہجری میں آہستہ آہستہ بلخ کی شہرت کم ہوتی گئی اور یہ شہر رفتہ رفتہ ویران ہو گیا۔ شہر کی آبادی کا بڑا حصہ شہر مزار شریف (سابقہ قریہ خواجہ خیران) میں منتقل ہو گیا، اور یہ نیا شہر بلخ کے بجائے آباد ہو گیا، چنانچہ بلخ کی حیثیت اب ایک چھوٹے سے قصبے کی رہ گئی جس میں صرف چند سو مکان تھے۔ ۱۱۶۳ھ / ۱۷۴۹ء میں احمد شاہ ابدالی نے اپنے وزیر اعظم شاہ ولی خاں کو ہرات سے دس ہزار فوج دے کر مرو اور میمنہ بھیجا۔ شاہ ولی خاں نے بلخ و بدخشان کے کل علاقوں، یعنی افغانستان کے شمالی حصے کو احمد شاہی سلطنت میں شامل کر لیا اور وہاں افغانی حکام متعین کر دیے (میر غلام محمد غبار: احمد شاہ بابا، کابل ۱۳۲۲ھ ش، ص ۲۰۹ بعد)۔

چونکہ بخارا کے امیر بلخ میں اور دریائے آمو کے سواحل پر لوگوں کو احمد شاہی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پر اکساتے تھے، اس لیے احمد شاہ ابدالی نے ۱۱۸۱ھ / ۱۷۶۷-۱۷۶۸ء میں شاہ ولی خاں کو چھ ہزار سواروں کے ہمراہ قندھار سے افغانستان کے شمالی حصوں کی طرف روانہ کیا۔ وزیر نے بلخ پہنچ کر حکومت کے کاموں کو منظم کیا اور آمو دریا کو پار کر لیا، لیکن بخارا کے بادشاہ نے صلح کر لی اور آمو کو افغانستان کی سرحد تسلیم کر لیا۔ شاہ ولی خاں مختلف امور کی تنظیم کے بعد کابل ہوا بلخ سے قندھار لوٹ آیا (وہی مصنف: احمد شاہ بابا، ص ۲۹۱)۔

احمد شاہ ابدالی کے مرنے پر جب اس کا بیٹا تیمور شاہ افغانی تخت حکومت پر بیٹھا تو قباد خاں اوزبک بلخ میں بغاوت کر بیٹھا۔ اس پر تیمور شاہ نے پیر دوست خاں کے بیٹے برخوردار خاں کو کابل سے ایک فوجی جمعیت کے ساتھ بلخ روانہ کیا۔

میں گنج غلی سہترِ خلم اور سر پل میں، جو بلخ کے جانب مغرب تھا، محمود خاں کی حکومتیں تھیں؛ لیکن امیر دوست محمد خاں نے اپنے بیٹے سردار محمد اکرم خاں کو اس طرف روانہ کیا اور ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء تک بلخ کا تمام علاقہ اور دریائے آمو تک اس کے ملحقات کو مسخر کر کے اسے کابل کی سلطنت میں شامل کر لیا (سید قاسم رشتیا: کتاب مذکور، ص ۱۲۸)۔ مزار شریف کو شمالی افغانستان کی ولایت کا مرکز قرار دیا۔

۱۲۶۶ھ / ۱۸۴۹ء میں خوانین بلخ نے از سر نو بغاوت کی، لیکن کابل کی فوجوں نے انہیں شکست دی۔ امیر دوست محمد خاں نے خود اپنے بیٹے سردار محمد افضل خاں کو بلخ اور سرپل کا حاکم مقرر کر دیا۔ اس نے بلخ میں اپنے سردار عبدالرحمن خاں اور جرنیل شیر محمد خاں (انگریز نو مسلم مسٹر کیول) کی سرکردگی میں پندرہ ہزار باقاعدہ اور پندرہ ہزار بے قاعدہ (ایلہ جاری) فوج تیار کی اور ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء میں اطراف بلخ میں تختہ پل کی بنیاد رکھی اور وہاں افغانی فوجوں کے لیے چھاؤنی قائم کی (امیر عبدالرحمن خاں: پندنامہ دنیا و دین، طبع کابل، بدون تاریخ، ص ۶)۔ امیر دوست محمد خاں نے بلخ کے اطراف کی حکومت بھی اپنے دوسرے بیٹوں کو سونپ دی، چنانچہ تاشقرغان (شرقی بلخ) میں سردار محمد امین خاں اور آقچہ (جنوبی بلخ) میں سردار ولی محمد خاں حکومت کرتے تھے۔ یوں بلخ کا تمام علاقہ محفوظ ہو گیا (سید سہدی فرخ: تاریخ سیاسی افغانستان، تہران ۱۳۱۴ھ ش، ص ۶۵)۔

جب امیر دوست محمد خاں (۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء) میں ہرات کے مقام پر انتقال کر گیا تو بلخ کے علاقے میں دوبارہ شورش برپا ہوئی اور وہاں کے حاکم میر اتالیق نے بغاوت کر دی، لیکن سردار عبدالرحمن خاں نے اس فتنے کو کچل دیا

قائم نہیں رکھ سکتا تھا، لہذا زمان شاہ کے دربار میں اپنا ایلچی بھیجا اور بلخ اور شمالی افغانستان کے علاقوں کو اس شرط پر خالی کرنے کا وعدہ کیا کہ تیمور شاہ اپنے باپ کی طرح اس سے صلح کر لے۔ اس طور پر بلخ کا تعلق دوبارہ سلطنتِ افغانہ سے ہو گیا اور مراد بے اس سے دست بردار ہو گیا (الفنشن: سلطنت کابل، لنڈن ۱۸۱۵ء، ص ۵۶۴)۔

اس کے بعد افغانستان میں فتنہ و فساد کے دور، وزیر فتح خان کے بھائیوں کی جنگوں اور احمد شاہ ابدالی کے خاندان کے سقوط کا آغاز ہوا اور افغانوں اور انگریزوں کے درمیان افغانستان کی پہلی اور دوسری لڑائی ہوئی۔ اس تمام مدت میں شمالی افغانستان کے علاقوں میں مقامی امرا حکومت کرتے رہے۔ ان میں سے ایک نے بلخ کے نزدیک خلم میں اپنا مرکز بنا رکھا تھا، لیکن جہاں تک بلخ کا تعلق ہے وہ اجڑ کر تقریباً غیر آباد ہو گیا تھا اور اس کا وجود صرف ایک گاؤں کی حیثیت سے باقی رہ گیا تھا۔ ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء میں جب انگریزی فوج سے شکست کھانے کے بعد امیر دوست محمد خاں بخارا کی طرف بھاگ رہا تھا، خلم و بلخ پر میر محمد امین حکمران تھا۔ اس نے امیر سے اچھا سلوک کیا اور اسے بلخ کے راستے بخارا بھیج دیا۔ بعد ازاں جس وقت امیر نے بخارا سے کابل پر حملہ کیا، نیز ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء میں بھی اس نے امیر کی امداد کی (سید قاسم رشتیا: افغانستان در قرن نوزدهم، کابل ۱۳۲۹ھ، ص ۸۴)۔

دو سال بعد (۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں) جب امیر دوست محمد خاں دوسری بار کابل کے تخت پر بیٹھا تو بلخ کے علاقوں میں طوائف الملوک کا دور دورہ تھا۔ خود بلخ میں میر اوراق کی حکومت تھی۔ بلخ کے نزدیک آقچہ میں حدود میر، آقچہ اور شبرغان میں میر حکیم خاں، خلم بلخ



(سید سہدی فرخ، کتاب مذکور، ص ۲۰۱)۔

امیر دوست محمد خاں کے بعد اس کا بیٹا امیر شیر علی خاں اس کی جگہ تخت پر بیٹھا، اور سارے افغانی ترکستان کے ساتھ ساتھ بلخ پر بھی اس کا تصرف ہو گیا۔ سردار فتح محمد خاں وہاں کا حاکم اور شہاب الدین خاں بارکزی وہاں فوج کا افسر اعلیٰ تھا۔ بعد میں امیر محمد افضل خاں اور امیر محمد اعظم خاں کی بادشاہت کے زمانے میں بھی یہ افغانستانی سلطنت سے وابستہ تھا حتیٰ کہ ۱۸۷۹ء/۱۲۹۶ھ میں امیر شیر علی خاں مزار شریف (بلخ) میں فوت ہو گیا اور وہیں سپرد خاک ہوا۔ شعبان ۱۲۹۷ھ/۲۱ جولائی ۱۸۸۰ء کو امیر عبدالرحمن خاں کابل کا بادشاہ ہو گیا اور افغانی ترکستان کی حکومت، یعنی بلخ اور شمالی افغانستان کے دوسرے حصوں کو سردار محمد اسحق خاں ولد امیر محمد اعظم خاں کے سپرد کر دیا گیا، لیکن اس نے ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء میں بغاوت کر دی۔ امیر عبدالرحمن نے اسے شکست دی اور شمال کے تمام علاقوں اور بلخ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور عطا محمد خاں توخی کو وہاں کا حاکم مقرر کیا اور بلخ کے قرب و جوار میں بہت بڑے فوجی مستقر (دھدادی) کی بنیاد رکھی۔

بعد ازین حبیب اللہ خاں کے زمانے میں ۱۹۰۱ء سے لے کر اب تک مزار شریف اور بلخ افغانستان کی ایک ولایت ہیں۔ مزار شریف میں ایک گورنر (حاکم) مقرر ہوتا ہے، جو پوری ولایت پر حکمرانی کرتا ہے اور دھدادی کے سرمائی مستقر (قشتلہ) میں ایک میجر جنرل کے ماتحت دس ہزار تک منظم فوج ہوتی ہے۔ اب بلخ مزار شریف کی ولایت میں ایک ضلع ہے؛ مزار شریف سے اس کا فاصلہ بائیس کیلومیٹر اور کابل سے چھ سو تینتالیس کیلومیٹر ہے؛ سطح سمندر سے اس کی بلندی گیارہ سو پچاس میٹر ہے۔

اس کا مشرقی طول البلد ۶۶ درجہ، ۲۴ دقیقہ، ۲۳ ثانیہ اور شمالی عرض البلد ۳۶ درجہ، ۳۵ دقیقہ، ۵ ثانیہ ہے۔

۱۳۱۲ھ/۱۹۳۳ء میں محمد گل خاں، وزیر امور داخلہ افغانستان نے شہر بلخ کی نئی بنا ڈالی اور مسجد خواجہ پارسا کو مرکز قرار دیا اور وہاں سے چار طرف راستے کھولے اور شمالی سڑک کو دریائے آمو کی بندرگاہ تک کھینچا دیا اور اس میں بازار، حکومتی مراکز اور تجارت خانے بنائے۔ افغانستان کی ملکی تشکیلات و تنظیمات میں ذیل کے علاقے بلخ کے ضلع (حکومت کلاں) سے متعلق ہیں:

دولت آباد، بائیس مواضع اور سات ہزار پانچ سو چھیاسٹھ خاندانوں پر مشتمل؛ کشندہ، پچپتر مواضع اور تین سو بانوے خاندانوں پر مشتمل؛ شور تپہ، بارہ مواضع اور تین ہزار چار سو خاندانوں پر مشتمل؛ چمتال اور متعدد دوسرے مواضع، جو تقریباً آٹھ ہزار گھرانوں پر مشتمل ہیں۔ بلخ کے اس پورے علاقے میں اس وقت چھ ابتدائی تعلیم کے مکتب ہیں۔ یہاں کے رہنے والے ازبک، تاجک اور پختون ہیں، اور فارسی، ازبکی اور پشتو بولتے ہیں۔

بلخ کی اہم پیداوار یہ ہے: قرہ قلی، قانین اور برک (ایک طرح کا موٹا اونٹنی کیڑا)، شام، رشمیں ابرہ، مختلف قسم کے لباس اور غلہ مثلاً گیہوں، جو، جوار، باقلا، ماش، لویسا اور چنا، کپاس، گاجر و شلغم، بیکن، تربوز، کھیرا اور مختلف قسم کے میوے۔ بلخ کا خربوزہ بہت شیریں اور مشہور ہے۔ گھریلو جانوروں میں وہاں کے گھوڑے بہت مشہور ہوتے ہیں۔ کائیں، بکریاں، بھیڑیں اور اونٹ بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کا پیشہ زراعت اور قدرتی بیڑوں

جسے جگہ جگہ سے پہاڑی نالوں نے کاٹ دیا ہے۔ مغرب میں اس کی بلندی آٹھ سو میٹر سے زیادہ نہیں۔ ان پہاڑوں میں، جہاں المقدسی (ص ۲۸۵، سطر ۱۳ بعد) کے بیان کے مطابق جنگلی گھوڑے اور مویشی پائے جاتے تھے، آس پاس کے لوگوں کو لوہے کی تلاش رہی۔ تقریباً ۵۳۲۰ھ / ۱۰۲۹ء تا ۵۳۲۲ھ / ۱۰۳۱ء میں خراسان سے آنے والے ترکمان قبائل پسپا ہو کر یہاں آئے (قب ابن الأثیر، طبع ٹورن برگ، ۹: ۲۶۷)۔ بعد کی صدیوں میں اس علاقے میں ترکمانوں کی گنجان آبادیاں بسائی گئیں اور اس کی اقتصادی اہمیت روز بروز کم ہوتی گئی۔ ۱۸۶۹ء کے بعد بحیرہ خزر میں اس بلخانی تنگ کھاڑی پر روسی بندرگاہوں کے بننے اور ۱۸۸۱ء کے بعد ماورائے خزر ریلوے کی تعمیر کے باعث اسے دوبارہ کچھ اہمیت حاصل ہو گئی، لیکن یہ اہمیت ۱۹۰۵ء میں اورن برگ Orenburg - تاشقند لائن بننے سے زوال پذیر ہو گئی۔

مآخذ: (۱) Brockhaus - Efron Enciklo-

pedičeskiy Slovař، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۱ء، ص:

۸۳۴؛ (۲) Bolshaya Sovetskaya Enciklopediya،

باردوم، ص (۱۹۵۰ء): ۱۶۷ بعد۔

(B. SPULER و W. BARTHOLD)

• بلخش: آرال [رک باں] کے بعد وسط ایشیا کے علاقے میں سب سے بڑی جھیل (اٹھارہ ہزار چار سو بیس مربع کیلو میٹر)۔ اس جھیل میں دریائے ایلی اور بہت سے دوسرے نسبتاً کم اہم دریا جا گرتے ہیں۔ ازنہ وسطی کے عرب جغرافیہ نویسوں کو اس جھیل کے وجود کا علم نہیں تھا۔ حدود العالم کے نامعلوم الاسم مصنف (۵۳۷۲ھ / ۹۸۲ - ۹۸۳ء) (قب J. Marquart) نے لکھا ہے کہ دریائے ایلی (ایلا) جھیل ایسیک کول [رک باں] میں جا کر گرتا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے

کی پرورش، قالین بافی اور گھوڑے پالنا ہے۔ بلخ کی زمین کا رقبہ، جو انتالیس ہزار جریب کے قریب ہے، بلخ کی اٹھارہ نہروں سے، جو بلخاب سے آتی ہیں، سیراب ہوتا ہے۔ یہ دریا کوہ انبرز سے نکلتا ہے، جو بلخ کے جنوب میں ہے۔

۱۹۳۰ء میں بلخ میں کپاس صاف کرنے کا ایک کارخانہ قائم کیا گیا تھا، لیکن بلخ کے دکنی حصے کی آب و ہوا بہت ناقص ہے۔ وہاں ملیریا کے مچھر بہت ہوتے ہیں۔ شہر کے پرانے کھنڈروں سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اور وہ شورہ زار ہیں۔ گرما میں سخت گرمی اور جازوں میں سخت سردی ہوتی ہے۔

بلخ میں اب تک بہت سے قدیم بزرگان اسلام کے سزار موجود ہیں، جن سے لوگ واقف ہیں، مثلاً خواجہ ابونصر پارسا، خواجہ عکاشہ (جن کے متعلق لوگ کہتے ہیں صحابی تھے)، امام محمد حنفیہ، امام ابو حنص بن برعش، شیخ الاسلام امام ابو عبد اللہ اسماعیل، ابو القاسم انصاری، امام ضحاک، فقیہ حنفی، شفیق بلخی وغیرہ (دیکھیے تاسوس جغرافیائی افغانستان، کابل ۱۳۳۵ھ شمسی، ۱: ۳۵۸)۔

[مآخذ: متن میں درج ہیں]۔

(عبدالحمی حبیبی)

\* بلخان: بحیرہ خزر کے مشرق میں دو سلسلہ ہائے کوہ جو خشک شدہ دریا ازبوی (قب، آمو دریا) کی گزرگاہ کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس دریا کے شمال میں بلخان کلاں واقع ہے۔ یہ چونے کے پتھر کی اونچی پہاڑی ہے جہاں تک پہنچنا بہت دشوار ہے کیونکہ اس کی ڈھلانیں سلامی دار ہیں۔ سب سے زیادہ بلند مقام دونش قلعہ ہے، جن کی بلندی تقریباً ایک ہزار آٹھ سو اسی میٹر ہے۔ بلخان خرد ازبوی کے جنوب میں واقع ہے،



Society، سینٹ پیٹرز برگ ۱۸۸۱ء۔

بلخس کے قرب و جوار کے علاقے انتہائی ویران اور خشک نظر آتے ہیں اور ”انقلاب اکتوبر“ تک اس جھیل کو کوئی اقتصادی اہمیت حاصل نہ تھی۔ ۱۹۳۶ء میں بلخس کے وسیع صنعتی شہر کی تعمیر کے وقت اس کی ترقی و عروج کا دور شروع ہوا۔ یہ شہر جھیل کے شمالی ساحل پر خلیج برتس Bertis پر آباد کیا گیا ہے۔

(W. BARTHOLD [و A. BENNIGSEN])

- **البلخی:** ابو زید احمد بن سہل، ایک مشہور و معروف عالم، جو آج کل زیادہ تر اپنی جغرافیائی تصانیف کی وجہ سے مشہور ہے۔ وہ صوبہ خراسان میں بلخ کے قریب ایک گاؤں میں تقریباً ۵۲۳۶/۸۵۰ء میں پیدا ہوا اور اسی سال سے متجاوز عمر پا کر ذوالقعدہ ۵۳۲۲/ اکتوبر ۹۳۴ء میں اس نے وفات پائی۔ اس کا باپ سجستان کا ایک مدرس تھا۔ البلخی فرقہ امامیہ سے تعلق رکھتا تھا، لہذا نوجوانی میں اس مذہب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے حاجیوں کے قافلے کے ساتھ اس نے عراق کا پیدل سفر کیا اور وہاں آٹھ سال رہا، شہرہ آفاق شخصیت الکندی کی شاگردی کی اور آس پاس کے ملکوں کی سیاحت بھی کی۔ آخری عمر میں جب امیر بخارا نے اسے بلایا تو اس نے بلخ چھوڑ کر بخارا جانے کے لیے دریائے جیحون کو عبور کرنے سے انکار کر دیا۔

عراق میں اپنے عرصہ قیام کے دوران میں البلخی نے فلسفہ، نجوم، ہیئت، طب اور علوم طبیعیات کا مطالعہ کیا (یاقوت: ارشاد، ۱: ۱۴۵ تا ۱۴۶)۔ کچھ مدت تک وہ اپنے فرقہ امامیہ کے مذہبی اعتقاد اور نجوم کے اصول و قواعد کے درسیان، جن کا اس زمانے میں بہت رواج تھا، تذبذب میں مبتلا رہا۔ بعد میں وہ مذہبی عقائد کا حاسی اور قطعی طور پر راسخ العقیدہ ہو گیا اور فلسفے کے ساتھ ساتھ

تمام مسلم مصنفوں میں سے صرف محمد حیدر ایک ایسا شخص ہے جس نے دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی کے وسط میں جھیل بلخس کی کیفیت لکھی ہے (تاریخ رشیدی، مترجمہ E. D. Ross، ص ۳۶۶)۔ اس جھیل کا نام، جو اس وقت ازبکستان اور مغولستان کی حد فاصل تھی، مصنف موصوف نے کوکچہ تنیز Kōkčā-Teñiz (= نیلی جھیل) تحریر کیا، نیز بتایا ہے کہ وہ میٹھے پانی کا ذخیرہ ہے، لیکن اس نے اس جھیل کی لمبائی اور چوڑائی بیان کرنے میں مبالغے سے کام لیا ہے۔ وہ والکا ایتل [رک بان] کا منبع بلخس کو بتاتا ہے۔ تاہم جھیل کے پانی کے ذائقے کے متعلق محمد حیدر کا بیان اہمیت رکھتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تمام جدید جغرافیہ نویس بلخس کو کھاری پانی کی جھیل سمجھتے رہے، لیکن کہیں ۱۹۰۳ء میں جا کر امپیریل روسی جغرافیائی سوسائٹی (Imperial Russian Geographical Society) کے شعبہ ترکستان کی تحقیقات کے مطابق، جو ۱۹۳۱ء میں سرکاری ادارہ مائیات (State Institute of Hydrology) کی تصانیف اور ۱۹۴۱ء میں اشتراکی روس کی اکادمی، علوم کے ادارہ علوم ارضیات کی تصانیف شائع ہونے پر مکمل ہوئیں، یہ ثابت ہوا کہ اس جھیل کے پانی کا ایک حصہ میٹھا ہے۔

اس جھیل کو سب سے پہلے قلموق لوگوں نے بلخس کے مغولی نام سے موسوم کیا۔ درحقیقت سترہویں صدی اور اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں وہ ان علاقوں پر قابض رہے۔ جھیل کا نام بلخس Balchas، جو سویڈن کے ایک ماتحت افسر رینا J.G. Renat کے نقشے میں دیا ہے، اس زمانے میں بہت صحیح تھا۔ رینا ۱۷۱۶ء تا ۱۷۳۳ء سترہ سال قلموق کے علاقوں میں رہا، قلموق Carte de la Dzoungarie dressée par le suédois Renat pendant sa captivité chez Russ. Imp. Geog. مطبوعہ les kalmüks de 1717 à 1733

طور پر الاضطخری اور ابن حوقل کی جغرافیے کی تصانیف کی بنیاد تسلیم کی جاتی ہے اور اس کتاب کو معیاری عرب جغرافیہ نویس کی ابتدا مانا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دنیا کا ایک نقشہ تھا، جو بیس حصوں میں منقسم تھا اور ان کے ساتھ مختصر شرح کے ستون بھی تھے (المقدسی، ص ۴)۔ بار ٹولڈ Barthold (حدود العالم، مقدمہ، ص ۱۸، حاشیہ ۵، قِب V. Minorsky : کتاب مذکور، ص ۱۵) نے اس رائے کا بھی اظہار کیا ہے کہ ممکن ہے کہ البلخی نے اپنی تصنیف میں ابو جعفر الخازن کے دیے ہوئے نقشے پر صرف تشریح کا اضافہ کیا ہو (برا کلمان : تکلمہ، ۱ : ۳۸۷)۔ جغرافیہ دان کی حیثیت سے البلخی کی شہرت کا انحصار کلی طور پر اسی کتاب پر ہے جس کے متعلق صورۃ مأمونیۃ کو پیش نظر رکھتے ہوئے بمشکل یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس کی طبع زاد تصنیف تھی۔ خود صورۃ مأمونیۃ بھی نقشوں کی ایک کتاب ہے، جس کا ذکر خلیفہ المأمون کے عہد (۸۱۹۸/۸۱۳ تا ۸۳۳/۵۲۱۸) میں المسعودی نے کیا ہے (التنبیہ، ص ۳۳)۔ ہو سکتا ہے کہ البلخی کا جغرافیے کی طرف رجحان اور شوق اس کے استاد الکندی کے باعث ہوا، جس کے لیے اس مضمون پر بطلمیوس [رک بان] کے ایک رسالے کا ترجمہ کیا گیا تھا (الفہرست، ص ۲۶۸) اور جس کے ایک دوسرے شاگرد احمد بن الطیب السرخسی نے کتاب المسالک و الممالک تصنیف کی تھی (التنبیہ، ص ۶۷)۔ یہ کتاب بظاہر مسلمانوں کی اسی نام کی جغرافیے کی متعدد کتابوں میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ گو المقدسی (ص ۶۸، ۲۶۰) کی رائے یہ ہے کہ البلخی نے زیادہ سفر نہیں کیے، تاہم وہ یہ تسلیم کرتا ہے کہ البلخی خراسان بالخصوص اپنے صوبے سے متعلق دیوان (محاصل کے رجسٹر) میں بڑا ماہر تھا (کتاب مذکور، ص ۳۰۷)۔ المقدسی

اس نے مذہبی علوم کا مطالعہ بھی شروع کر دیا۔ دونوں علوم میں یکساں مہارت رکھنے میں اسے بے مثال مقام حاصل رہا ہے۔ الشہرستانی اسے حکمائے اسلام میں شمار کرتا ہے (الملل، طبع Cureton، ص ۳۳۸)۔ اس کا اپنا بیان ہے کہ اسے اپنی ایک کتاب شائع کرنے کی وجہ سے سالار حسین بن علی العروودی کی حمایت اور سرپرستی سے محروم ہونا پڑا اور نصر بن احمد سامانی کے وزیر اور اپنے مرئی ابو علی الجیہانی کو وہ ایک دوسری کتاب تصنیف کر کے کھو بیٹھا، اگرچہ سپہ سالار مذکور قریطی اور یہ وزیر ثنوی عقائد رکھتا تھا (ابوعلی، ابو عبد اللہ الجیہانی جغرافیہ دان [رک بان] کا لڑکا تھا، یہاں غالباً وہی مراد ہے قِب بارٹولڈ : Turkestan : Barthold، ص ۱۲)۔ اس کے باوجود مستند ناقدوں نے مذہبی موضوعات پر البلخی کی تصانیف کی بڑی تعریف کی ہے، بالخصوص اس کی نظم القرآن کی، جو بظاہر علم تفسیر سے متعلق ہے (ارشاد، ۱ : ۱۳۸)۔ یاقوت (ارشاد، ۱ : ۱۳۲، ۱۳۳، قِب ۱۵۰) نے البلخی کی تقریباً ساٹھ کتابوں میں سے چھپن کتابوں کے نام دیے ہیں، یعنی اس نے الفہرست (طبع فاوگل، ص ۱۲۸) میں دی ہوئی اس کی تینتالیس تصنیفات پر تیرہ کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔ حاجی خلیفہ ان میں سے نصف درجن سے بھی کم کتابوں کا ذکر کرتا ہے۔ کتاب مصالح الابدان و الأنفس (جس کے لیے دیکھیے برا کلمان : تکلمہ، ۱ : ۳۰۸) سے قطع نظر البلخی صرف اپنی ایک تصنیف کے باعث مشہور و معروف ہے، جو اب بظاہر ناپید ہو چکی ہے۔ یہ نام نہاد کتاب صور الاقالیم [الاسلامیۃ] یا بالفاظ دیگر تقویم البلدان ہے (یاقوت نے اس کی کتابوں کی فہرست میں ان دو ناموں میں سے کسی کا ذکر نہیں کیا)، جو ڈخوبہ کے رسالے کے چھپنے کے بعد سے عام



اور اسے فعل خیر ہی کرنا چاہیے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بالکل جداگانہ ہے۔ اس سے کوئی بھی اعلیٰ نہیں ہے؛ اس کے کیے ہوئے فعل سے بہتر فعل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ معتزلی عقائد سے اتفاق کرنے کے باوجود وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا کہ اللہ کی صفات اس کی ذات سے الگ ہیں۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ عدم وجود، جس میں وجود کی صلاحیت ہے، ایک خارج از وجود مسلمہ شے، یعنی ایک جوہر بسیط، ہے۔ وہ ذرے کو محدود اور ذاتی صفات سے معرّا سمجھتا تھا۔ جسد کی صفات چونکہ ذرات کے مجموعے سے حاصل ہوتی ہیں، لہذا وہ واجب نہیں بلکہ حادث ہیں۔ اس نے احساس اور تاثر میں امتیاز کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان معقول موضوعات کا تصور اپنی عقل سے کرتا ہے اور اس کے مختلف حواس ان سے متاثر ہوتے ہیں، لیکن خود ان حواس سے کوئی تصور حاصل نہیں ہو سکتا۔ حواس کا کام یہ ہے کہ وہ مرتب تاثرات کو عقل تک پہنچانے کا ذریعہ بنیں۔ اس کے نزدیک اختیاری فعل قطعیت اور تذبذب کا لازمی نتیجہ ہے اور یہ دونوں باتیں انسان ایسی ناقص ہستی کا خاصہ ہیں؛ بخلاف اس کے ذات باری میں یہ بالکل معدوم ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ امامت قریش ہی کو ملنی چاہیے، لیکن اگر اس سلسلے میں کسی سازش کا اندیشہ ہو تو غیر قریشی بھی امام بن سکتا ہے۔

مآخذ: (۱) الاشعری: مقالات الاسلامیین، استانبول

۱۹۲۹ء، ص ۳۱۴، ۵۵۵؛ (۲) بغدادی: الفرق،

قاہرہ ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء، ص ۹۳، ۱۶۳، ۱۶۶،

۱۶۷؛ (۳) الألبی: المواقف، قاہرہ ۱۳۵۷ھ / ۱۹۳۹ء؛

(۴) الاسفرائینی: التبصیر فی الدین، قاہرہ ۱۹۴۰ء،

ص ۵۲؛ (۵) الخیاط: الانتصار، قاہرہ ۱۹۲۵ء، بمواضع

کا یہ قول دوسرے مآخذ میں البلخی سے متعلق اس روایت کی تائید کرتا ہے کہ وہ سامانیوں کے عہد میں کاتب، یعنی سیکرٹری رہا تھا (ارشاد، ۱: ۱۳۷)؛ المقریزی (خط، مطبوعہ بولاق، ۱: ۱۱۵) میں بھی البلخی کی تصنیف کا حوالہ موجود ہے۔

مآخذ: (۱) یاقوت: ارشاد، ۱: ۱۲۵ و ۱۳۱ تا

۱۵۲؛ (۲) آلبیہقی: تتمہ صوان الحکمة، طبع محمد شفیع

لاہوری، ص ۲۶ تا ۲۷؛ (۳) M. J. de Goeje:

Die Istahri-Balhi Frage، در ZDMG، ص ۲۵: ۲۲ تا

La question Balhi-Istahri-: J. H. Kramers (۴): ۵۸

Acta، در Ibn Hauqal et l'Atlas de l'Islam

Orientalia، ۱۰: ۹ تا ۳۰؛ (۵) حدود العالم، مقدمہ،

ص ۱۵ تا ۲۳؛ (۶) V. Minorsky: A False Jayhani،

در BSOAS، ۱۳: (۶۱۹۴۹) ۹۳ تا ۹۴۔

(D. M. DUNLOP)

البلخی: ابوالقاسم (عبد اللہ بن احمد بن محمود)

معتزلی، جو ابوالقاسم الکعبی البلخی کے نام سے بھی

مشہور ہے، بلخ میں پیدا ہوا۔ ایک طویل مدت

تک بغداد میں رہا، جہاں وہ ابوالحسن الخیاط

معتزلی کا شاگرد رہا۔ اس نے نسف میں ایک مدرسے

کی بنیاد ڈالی اور خراسان کے کئی باشندوں نے اس کے

ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ ابتداءً شعبان ۳۱۹ھ /

اگست ۹۳۱ء میں اس نے بلخ کے مقام پر وفات پائی۔

اس کے شاگردوں میں ابن شہاب (ابو الطیب ابراہیم

بن محمد)، جو ۳۵۰ھ / ۸۶۲ء کے بعد فوت ہوا

اور الاحدب (ابوالحسن) کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس کی تصانیف میں کتاب المقالات اور کتاب معائن

خراسان کا ذکر ملتا ہے؛ مؤخر الذکر میں وہ ابن

الراوندی کا ذکر کرتا ہے۔

اس نے معتزلہ کے اس خوش آئند کلیے کی

تائید کی ہے کہ خدا نسبتاً کم بہتر کے لیے بہتر

کو ترک نہیں کر سکتا۔ انسان خیر پر قادر ہے

سے دریغ نہیں کریں گے؛ وہ انہیں ہر قسم کے مظالم کا نشانہ بنائیں گے اور اس کی حرمت ان کے لیے روک نہ رہے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سرور کائنات حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مکے میں قیام عارضی ہوگا اور آخر آپؐ کو یہاں سے ہجرت کرنا پڑے گی اور اس کے بعد گو بطور فاتح یہاں آپؐ کی آمد ہوگی، لیکن عارضی قیام کے بعد آپؐ واپس چلے جائیں گے، کیونکہ جل کے ایک معنی ”النازل بالمكان“، یعنی کسی جگہ عارضی طور پر اترنے والے کے بھی ہیں۔ اس طرح آپؐ کے اس شہر مکہ میں واپس آ کر عارضی قیام سے حلت کی ایک صورت پیدا کی جائے گی اور آپؐ کو مکے پر حملے کی اجازت دی جائے گی، نیز آپؐ کے لیے یہ شہر کچھ وقت کے لیے جلال ہو جائے گا (قب البخاری، کتاب جزاء الصيد، باب یحل القتال بمكة) اور یوں آپؐ ان تمام برکات کے وارث ٹھہرائے جائیں گے جو اس شہر سے وابستہ ہیں۔ بقول ابن کثیر جل بمعنی مقیم و ساکن بھی ہے (تفسیر ابن کثیر؛ السجستانی: غریب القرآن)۔ سرفرازیوں اور بلند درجات پانے کے لیے آپؐ اور آپؐ کے ماننے والوں کے لیے تکالیف شاقہ میں سے گزرنا ضروری ہے اور اس کے لیے مکہ مکرمہ سے تعلق رکھنے والے دو عظیم انسانوں کی مشترکہ قربانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے، جو باپ اور بیٹا تھے، یعنی حضرت ابراہیم اور اسمعیل علیہما السلام۔ لقد خلقنا الإنسان فی کبد (آیت ۴)، یعنی ہم نے یقیناً انسان کو رہین محنت بنایا ہے؛ اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشقت و محنت انسان کی خلقت میں ودیعت کر دی ہے، چنانچہ انسان محنت و مشقت کے ذریعے ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے کی طرف ترقی کرتا ہے (الراغب: المفردات) اور امور دنیا و آخرت کے لیے جہاد زندگی میں سرگرم عمل رہتا ہے۔ اخلاقی، دینی اور معاشرتی ذمے داریوں

کثیرہ؛ (۶) الملطی: کتاب التنبیہ (طبع Dedering)؛ (۷) الرّسعی: مختصر کتاب الفرق، قاہرہ ۱۹۲۴ء، ص ۱۱۹، ۱۲۰؛ (۸) الرازی: محصل افکار المتقدّمین و المتأخّرين، قاہرہ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء، ص ۳۷؛ (۹) الشہرستانی: الملل و النحل، بر حاشیہ ابن حزم، قاہرہ ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء، ۱: ۶۲، ۸۲؛ (۱۰) نہایة الاقدام، طبع A. Guillaume اوكسفورڈ، ۱۹۳۴ء، ص ۲۳۸، ۲۴۰، ۲۴۳؛ (۱۱) ابن المرتضی: المّنیة و الآمل، حیدرآباد ۱۳۱۶ھ / ۱۸۹۸ء، ص ۴۵ تا ۵۱؛ (۱۲) ابن الندیم: الفہرست، قاہرہ ۱۹۲۹ء، ۴: ۲۴۷؛ (۱۳) ابن حزم: الفصل، قاہرہ ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء، ۴: ۱۵۴؛ (۱۴) چلبی: شرح المواقف، استانبول ۱۲۸۶ھ، ص ۳۱۲؛ (۱۵) احمد امین: ضحی الاسلام، قاہرہ ۱۳۶۰ھ / ۱۹۴۱ء، ۳: ۱۴۱؛ (۱۶) براکلمان، ۱: ۳۴۳؛ (۱۷) اے۔ این۔ نادر: Le Systeme philosophique des mu'tazila، بیروت ۱۹۵۶ء؛ (۱۸) جار اللہ زہدی: المعتزلہ، قاہرہ ۱۳۶۶ھ / ۱۹۴۷ء، ص ۱۵۳۔

(ALBERT N. NADER)

⊗ **الْبَلَد**: قرآن مجید کی ایک مکی سورت کا نام، جس کا دوسرا نام لَا اُقْسِمُ بھی ہے (البخاری)؛ عدد تلاوت و ترتیب نوے اور عدد نزول پینتیس۔ اس میں ایک رکوع، بیس آیتیں، بیاسی کلمات اور تین سو بیس حروف ہیں۔ بلد کے معنی ہیں شہر اور البلد سے یہاں مکہ معظمہ مراد ہے (البخاری، ابن جریر)۔ اس سورت میں کئی تاریخی اشارات ہیں، مثلاً یہ کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپؐ کے ماننے والوں پر کفار کی طرف سے مظالم کا آغاز ہو جائے گا۔ ہر چند کہ قریش مکہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مکے میں کسی کو تکلیف دینا جائز نہیں، لیکن پھر بھی لوگ مکے کی اس حرمت کو نظر انداز کر کے مسلمانوں کو مبتلائے آلام کرنے



و تعاطف کی تلقین کرتے ہیں۔ اخلاق اسلامی کے نقطہ نظر سے اس صورت میں چار بنیادی فضائل کی طرف خاص توجہ دلائی گئی ہے: فضیلتِ عِفَّت (سخاوت و اطعام الطعام)، فضیلتِ حِکْمَت (=ایمان)، فضیلتِ شِجَاعَت (= تکالیف پر صبر) اور فضیلتِ عَدَالَت (= تراحم و تعاطف)۔ ان فضائل و خصائل حمیدہ کے حامل گروہ کو اصحابُ المِیْمَنَةِ (=دائیں طرف والے) کا لقب دے کر کامیاب اور فائز العرام لوگ قرار دیا اور ان فضائل سے محروم کفار کو بدعملی و بدکرداری کے باعث اصحابُ المَشْئِمَةِ (=بائیں طرف والے) ٹھہرا کر انہیں جہنم کا ایندھن قرار دیا۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے انہیں اوصاف کی بدولت دین و دنیا میں کامیاب ہوں گے اور ان سے پہلو تہی کرنے کے باعث کفار کی ناکامی اور لُربادی ہو کر رہے گی۔

مآخذ: (۱) ابن جریر: تفسیر: (۲) الزمخشری: الکشاف: (۳) ابن کثیر: تفسیر، بذیل تفسیر سورة البلد: (۴) جمال الدین القاسمی: تفسیر القاسمی، ۱۷: ۶۱۵۸ بعد: (۵) المراغی: تفسیر المراغی، ۳۰: ۱۵۵ تا ۱۶۴؛ (۶) سید امیر علی: مواہب الرحمن، ۳۰: ۴۵۷ تا ۴۸۴، نولکشور، لکھنؤ، ۱۳۵۰ھ/۱۹۳۱ء؛ (۷) المہاشمی: تفسیر تبصیر الرحمن، ۲: ۴۰۲، ۴۰۳، مصر ۱۲۹۵ھ؛ (۸) البخاری، کتاب تفسیر القرآن، بذیل تفسیر سورة لا اقسام: (۹) الترمذی، تفسیر القرآن، بذیل تفسیر سورة البلد: (۱۰) الراغب: المفردات: (۱۱) السجستانی: غریب القرآن۔

(ادارہ)

بَلَدِيَّةٌ : رَلَكٌ بِهٖ بَرَدْرٌ .

بَلَدِيَّةٌ : ميونسپلٹی (municipality)، یہ اصطلاح

ہے جو عربی، ترکی (belediye) اور دوسری اسلامی زبانوں میں شہری اداروں کے لیے استعمال ہوتی

سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تکالیف شاقہ برداشت کرنا ایک ناگزیر امر ہے۔ اس کے بعد بعض ان اخلاقی اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے جن کی بنا پر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ساتھی کامیاب ہوں گے اور آپ کے مخالفوں کے لیے ناکامی مقدر ہے۔ فرمایا کہ یہ مخالفین اسلام محاسبہ اعمال سے غافل ہیں، مال و دولت صحیح مصرف و ضرورت کے مطابق خرچ نہیں کرتے، بلکہ بے موقع اسراف سے کام لے کر نام و نمود کے لیے اسے برباد کرتے ہیں۔ لوگ بھی انہیں دیکھ رہے ہیں اور ان کی نیتوں پر اللہ تعالیٰ کی بھی نظر ہے۔ مال و دولت اور طاقت و قوت پر ان کا غرور بالکل بے کار ہے۔ وہ قادر مطلق خدا کے عذاب سے بچ نہیں سکتے، پھر فرمایا کہ انہوں نے ہدایت کے سب ذرائع نظر انداز کر رکھے ہیں، یہ آنکھیں رکھنے کے باوجود ان سے کام نہیں لیتے، زبان موجود ہے لیکن کسی سے صحیح راستہ نہیں پوچھتے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دین و دنیا کی ترقی اور نیکی و بدی کی راہیں واضح ہو چکی ہیں، لیکن یہ کفار حق و صداقت سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں اور عقل و خرد سے کورے ہیں۔ اس سورت میں اس امر کی نشاندہی بھی کی گئی ہے کہ اسلام نے پہلے دن سے غلامی کے خلاف آواز بلند کی ہے، اور جو بات دنیا کی سمجھ میں آج آئی ہے قرآن مجید نے صدیوں پہلے اس کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس ضمن میں بتایا گیا ہے کہ ایمان اور ایثار و قربانی سے سربلندی اور نجات حاصل ہوتی ہے۔ اسی سلسلے میں غلاموں کو آزاد کرنے اور یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ مومنوں کی ایک صفت یہ بنی بتائی ہے کہ وہ تکالیف و مصائب کے وقت ایک دوسرے کو صبر اور تراحم

۱۸۲۹ء / ۱۲۴۵ھ کے شاہی فرمان کی رو سے یہ وظائف مختاروں کے سپرد کر دیے گئے، جن میں سے دو یعنی پہلا اور دوسرا ہر شہر کے مختلف محلوں میں مقرر کیے جاتے تھے۔ لطفی کا بیان ہے کہ اس اختراع پر استانبول کے باشندوں نے اعتراض و تنقید کی اور کہنا شروع کیا: ”شہروں میں دیہاتی سرپنچ مقرر کر دیے گئے ہیں، اب کچھ دن بعد ”سالیانے“ کے رجسٹر بھی ہمارے محلوں میں آ جائیں گے“ (لطفی، ۲: ۱۷۳)۔ کچھ عرصے بعد مختاروں کی تقویت کے لیے چند افراد پر مشتمل بزرگوں کی ایک کمیٹی (اختیار ہیٹی) بنا دی گئی۔ اس کے ارکان کی تعداد تین سے پانچ تک ہوتی تھی۔ یہ طریقہ بعد میں آہستہ آہستہ دوسرے شہروں میں بھی پھیلا دیا گیا۔

۱۸۳۱ء / ۱۲۴۷ھ میں شہر مینی *Shehremini* (= شہر کے کمشنر) کا عہدہ، جو قسطنطنیہ کی عثمانی فتح کے وقت سے اب تک چلا آ رہا تھا، منسوخ کر دیا گیا۔ اس کے بعض فرائض، جو سرکاری عمارتوں کی نگرانی سے متعلق تھے، نئے قائم شدہ محکمے اپنی خاصہ *Ebniye-i Khāssa* (نظامت عمارت مملکت) (لطفی، ۳: ۱۶۵؛ مجلہ امور بلدیہ، ۱: ۹۸۰، ۱۳۶۵ء) فرمان کا تقویم وقائع (سرکاری گزٹ) میں حوالہ دیتے ہوئے، ج ۷، عدد ۲، ص ۱۲۴۷ میں منتقل کر دیے گئے۔

اس کام کا دوسرا دور ۱۲۷۱ء / ۱۸۵۴ء میں شروع ہوا جب دو نئی تبدیلیاں کی گئیں۔ پہلی یہ کہ استانبول کے لیے نئی شہری کمشنری شہرامانت *Shehremānet* قائم کی گئی۔ نام سے قطع نظر اس نئے ادارے کو سابق ادارے سے کوئی مشابہت نہ تھی۔ یہ حقیقت میں فرانسیسی *Préfecture de la ville* کی ایک صورت تھی اور اس کا تعلق زیادہ تر منڈیوں کی نگرانی اور قیمتوں کی دیکھ بھال

ہے اور قدیم انداز کے شہری نظم و نسق کے اداروں سے مختلف ہے [رک بہ مدینہ]۔ مسلمانوں کی دوسری متعدد جدید اختراعات اور مختارات کی طرح یہ چیز بھی سب سے پہلے ترکی میں استعمال ہونی شروع ہوئی، جہاں یہ جدید طرز کے شہری نظم و نسق کے اداروں اور تنظیمات [رک باں] کے عمومی پروگرام کے اجزا کے طور پر رائج کی گئی۔

(۱) ترکی

معلوم ہوتا ہے کہ جدید شہری نظم و نسق کے طریقوں کو سب سے پہلے سلطان محمود ثانی نے بنی چری [رک باں] (Janissaries) کو ختم کرنے کے بعد اپنے اصلاحی پروگرام کا حصہ بنایا۔ ۱۸۲۷ء / ۱۲۴۲ھ میں ایک محکمہ احتساب (احتساب نظارتی) قائم کیا گیا، جس نے بعض فرائض و خدمات کو، جن کا تعلق منڈیوں، بازاروں، اوزان اور پیمانوں وغیرہ کی نگرانی اور احتساب سے تھا، یکجا کر دیا۔ ان کاموں کو اس وقت تک علما انجام دیتے چلے آتے تھے (دیکھیے محتسب)۔ ۱۲۴۵ء / ۱۸۲۹ء میں اقتدار و احتساب کو ایک مرکز پر مجتمع کرنے اور اماموں کے تساہل اور سستی کو ختم کرنے کی غرض سے (لطفی کے الفاظ میں *“we-imāmlarīn musāmaḥa edememesi ičün”*) استانبول کے شہری اضلاع میں مختار [رک باں] کا نظام جاری کیا گیا۔ اس وقت سے پہلے اس کام کے لیے دیہات میں سرپنچ ہوا کرتے تھے (مسلمانوں کے گاؤں میں کوئی کیتخداسی *Köy Ketkhudasi* اور عیسائیوں کے گاؤں میں کواجہ بشی *Kodja bashi*، لیکن شہروں میں ایسا نہیں تھا۔ وہاں مردوں کی آبادی کے رجسٹروں کا رکھنا اور ان کی نقل و حرکت اور تبادلوں کی نگرانی اور ایسے دوسرے فرائض کی سرانجام دہی قاضیوں اور ان کے نائبوں اور (مساجد کے) اماموں کے ذمے تھی۔



میں علاقے کے باشندوں نے نئی قسم کے اچھے راستوں، سڑکوں آبدوز نالیوں اور آبی سلسلوں کے علاوہ صفائی اور روشنی کے بہتر انتظام کا مطالبہ کیا اور اسے آبادی... کی امداد سے پورا کیا گیا۔ جنگ کربیا کے دوران میں شہر میں یورپ سے آمدہ اتحادی فوجوں کی بہت بڑی تعداد کی موجودگی سے ان مطالبات کی قوت اور ان کی ضرورت اور بھی زیادہ محسوس کی جانے لگی اور اصلاحات کے اس نئے دور میں جو ۱۸۵۳ء سے شروع ہوا نظام شہری کے ضروری مسائل اور دارالحکومت کی ملازمتوں کی طرف تھوڑی بہت توجہ کی گئی۔ ان مسائل کے متعلق ترک مصلحین کا جو رویہ تھا اس کا بہت اچھا اندازہ اس مضمون کو پڑھ کر کیا جا سکتا ہے جو شاعر اور مضمون نگار ابراہیمی شنیاسی نے استانبول کی گلیوں کی صفائی اور روشنی کے متعلق تصویر افکار میں لکھا (جسے ابوالضیا توفیق نے نمونہ ادبیات عثمانیہ میں دوبارہ شائع کیا (بار اول، استانبول ۱۲۹۶ھ / ۱۸۷۸ء) بارسوم، استانبول ۱۳۰۶ھ، ص ۲۲۷ - ۲۳۵۔

ان امور میں مجلس اعلیٰ برائے اصلاحات کی کارروائیوں کی روداد سے اس وقت کی حکومت عثمانیہ کی مختلف مصروفیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ وزارت تجارت کے ماتحت شہر میں منتظم اعلیٰ (پریفیکٹ) کے نظام کی تخلیق دراصل جزوی طور پر ایک حقیقی ضرورت کو پورا کرنے کی ایک کوشش تھی...

اس کمیشن نے چار سال تک اپنا کام جاری رکھا اور اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کی بڑی بڑی سفارشات یہ تھیں: سڑکوں، پیدل راستوں، بدرروؤں اور پانی کی نالیوں کی تعمیر، گلیوں کی باقاعدہ صفائی اور روشنی کا انتظام اور جہاں ممکن ہو وہاں راستوں کی توسیع، بدیاب و عیحدہ مالیاتی نظام، بلدیاتی

سے تھا۔ افسر اعلیٰ (پریفیکٹ) کی اعانت کے لیے ایک شہر مجلسی *Shehir Medjlisi* (سٹی کونسل) تھی، جس کے ارکان سوداگروں کی انجمنوں سے لیے جاتے تھے۔ "احتساب نظارتی" منسوخ کر دی گئی اور اس کے فرائض شہری مجلس کے سپرد کر دیے گئے۔ محض نام کی اس تبدیلی سے بظاہر کوئی فوری نتیجہ نہیں نکلا اور سرکاری عہدے داروں کی شہری مسائل کی طرف سے غفلت اور بے توجہی کی شکایتیں شروع ہو گئیں؛ چنانچہ چند ماہ بعد "تنظیمات کی مجلس اعلیٰ نے ایک انتظام شہر کمیشن (*Intizam-i Shehir Komisyonu*) قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کمیشن کی روح و رواں Antoine Allion تھا، جو ایک دولت مند فرانسیسی ساہوکار خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور انقلاب فرانس کے وقت ترکی میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ کمیشن کے دوسرے ارکان زیادہ تر یونانی، ارسنی اور یہودی جماعتوں سے لیے گئے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ مسلمان ترک بھی شامل کیے گئے تھے، جن میں سے ایک حکیم باشی *Hekimbashi* محمد صالح آفندی بھی تھا، جو سلطان محمود کے طبیبہ کالج کے پہلے سندیافتہ لوگوں میں سے تھا۔ کمیشن کو ہدایت کی گئی کہ وہ یورپ کے میونسپل نظام قواعد اور ضابطہ عمل کے متعلق باب عالی کے حضور اپنی رپورٹ اور سفارشات پیش کرے۔

بہت سے ملے جلے اسباب تھے جن کی بنا پر حکومت عثمانیہ نے یہ اقدام کیے۔ استانبول میں یورپ کے مالی اور تجارتی مفاد بتدریج بڑھ رہے تھے اور گیلاتا *Galata* اور بے اوغلو (*Pera*) ایک بستی بنتے جا رہے تھے، جو اپنی عمارتوں، دکانوں اور ہوٹلوں کے اعتبار سے بالکل یورپی طرز کی تھی اور جس میں مختلف قسم کی گھوڑے گاڑیوں کی تعداد (دیکھیے عربہ) روزمرہ بڑھ رہی تھی۔ ان حالات

اٹھانے کے لیے تیار تھے۔ جب اس مثال سے لوگ ان اداروں کی خوبیوں سے واقف اور آگاہ ہو جائیں گے تو انہیں مکمل طور سے اختیار کر لیا جائے گا۔۔۔

اس چھٹے ضلع کی بلدیہ کا آئین، اس کے فرائض اور ذمے داریوں کی تفصیل جسے نمونہ دائرہ سی *numūne dā'iresi* (نمونے کا ضلع) کہتے تھے ۲۴ شوال ۱۲۴۷ھ / ۷ جولائی ۱۸۵۸ء کے شاہی فرمان (ارادے *irade*) میں درج کر دیے گئے تھے۔ بلدیاتی مجلس ایک صدر اور بارہ ارکان پر مشتمل ہوتی تھی جو سب کے سب شاہی فرمان ('ارادے') کے ذریعے مقرر کیے جاتے تھے۔ صدر کا تقرر غیر معینہ مدت کے لیے ہوتا تھا اور باقی تمام ارکان کی میعاد تین سال ہوتی تھی۔ مجلس اپنے ارکان میں سے خود دو عہدے دار منتخب کرتی، ایک نائب صدر اور دوسرا خازن، یہ تمام ارکان اعزازی ہوتے تھے اور مشاہرہ کے بغیر کام کرتے تھے۔ مستقل عہدے داروں میں ایک صدر کا معاون ہوتا، ایک معتمد عمومی، دو ترجمان معتمد، ایک سول انجینیئر اور ایک میر عمارات۔ ان سب کا تقرر مجلس کرتی تھی اور یہ سب تنخواہ دار ملازم ہوتے تھے۔ مجلس کے انعقاد کے وقت اس کے فرائض و اختیارات کے جو حدود مقرر کیے گئے تھے ان میں وہ سب چیزیں شامل تھیں جن کا تعلق صفائی اور رفاہ عامہ (نظافت و نزاحت عمومیہ) سے تھا اور جس میں خصوصیت کے ساتھ راستوں، گلیوں، بدرروؤں، پٹریوں، بازار کی روشنیوں، گلیوں کو صاف رکھنے اور ان میں پانی چھڑکنے، ان کے کشادہ اور سیدھا کرنے اور گیس بہم پہنچانے، خطرناک اور شکستہ حال عمارات کو ناقابل استعمال قرار دینے، ذخائر خوردنی کا معائنہ اور نگرانی کرنے، قیمتوں میں اعتدال اور توازن قائم رکھنے، باٹوں اور پیمانوں کا معائنہ کرنے، پبلک مقامات مثلاً تھیٹر،

اغراض کے لیے ایک ٹیکسی کا نفاذ اور بلدیاتی قواعد و ضوابط کا عملی انتظام (مضبوطہ، ۲۷ صفر ۱۲۷۴ھ / ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء، در "مجلہ امور بلدیہ" *Medj. Um. Bel. i*، ۱: ۱۳۰۲ - ۱۳۰۳)۔

۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء میں مجلس اعلیٰ نے یہ سفارشات منظور کر لینے کا فیصلہ کیا، لیکن وقتی طور پر ان کا عملی اطلاق تجربے کے طور پر ایک تجرباتی بلدیہ کے حدود تک محدود رکھا جو ایک ضلع کے طور پر بے اوغلو اور گیلاتا میں قائم کی جانے والی تھی۔ اس ضلع کا قیام اگرچہ سب سے پہلے عمل میں آیا تھا، لیکن اس کا نام *Altindji dā'ire* (چھٹا ضلع) رکھا گیا۔ شاید اس لیے، جیسا کہ عثمان نوری کا خیال ہے ("مجلہ امور بلدیہ" *Medj. Um. Bel. i*، ۱۳۱۵، شماره ۹۳) کہ پیرس کی چھٹی *arrondissement* اس شہر کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ آبادی سمجھی جاتی تھی۔ اس اقدام کی وجوہ مضبوطہ، ۲۱ ربیع الاول ۱۲۷۴ھ / ۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء ("مجلہ امور بلدیہ" *Medj. Um. Bel. i*، ۱: ۱۳۱۸ - ۱۳۱۹) میں بیان کیے گئے ہیں۔ بلدیاتی خدمات اور اصلاحات کی نہایت شدید ضرورت تھی، اس لیے ان کا انتظام لازمی تھا اور یہ بھی کہ اس کے اخراجات کا بار خزانہ عامہ پر نہیں پڑنا چاہیے بلکہ اس ضرورت کو شہریوں سے ایک خاص ٹیکس لے کر پورا کرنا چاہیے جو اس سے مستفید ہوں گے۔ نئے نظام کو پورے استانبول پر نافذ کرنا بہت دشوار اور ناممکن العمل تھا، اسی لیے فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس کی ابتدا چھٹے ضلع سے کی جائے جو بے اوغلو اور گیلاتا کو ملا کر بنایا گیا ہے اور جہاں بے شمار جائدادیں اور اعلیٰ درجے کی عمارتیں تھیں اور جہاں کے باشندے دوسرے ملکوں کے طور طریقوں سے واقف تھے، اس لیے بلدیاتی اداروں کے اخراجات کا بار



جاری کیا گیا، جس کی غرض و غایت یہ تھی کہ بلدیہ کے نظام کو استانبول کے باقی کے چودہ اضلاع میں بھی پھیلا یا جائے۔ اس ضابطے کی رو سے ہر ایک ضلع کے لیے آٹھ سے بارہ اراکین تک کا ایک بلدیاتی کمیشن ہوگا جو اپنے میں سے ایک کو صدر منتخب کرے گا۔ پورے استانبول کے لیے چھپن ارکان پر مشتمل ایک "جمعیت عمومیہ" (جنرل اسمبلی) ہوگی جس میں ہر ضلع کے تین نمائندے ہوں گے۔ نیز چھ آدمیوں پر مشتمل پریفیکٹوں کی ایک مجلس امانت (کونسل) ہوگی، جو مرکزی حکومت کی مقرر کردہ ہوگی اور اس سے اسے تنخواہ بھی ملے گی۔ یہ دونوں جماعتیں *Shehremini* (پریفیکٹ) کے زیر نگرانی کام کریں گی جو ہمیشہ سرکاری عہدے دار ہوا کرے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضابطہ، جسے نہایت کاوش سے تیار کیا گیا تھا، ۱۲۹۳/۱۸۷۶ء - ۱۲۹۴/۱۸۷۷ء تک گلستہ طاق نسیان بنا رہا اور اس سال ایک نئی آئینی تحریک کے زیر اثر دارالخلافہ اور صوبائی شہروں کے لیے نئے ضابطے جاری کیے گئے؛ جو ضابطہ استانبول کے لیے جاری کیا گیا تھا وہ دراصل پرانے ضابطے کی ترمیم شدہ صورت تھی۔ پرانے ضابطے میں جو تبدیلیاں کی گئی تھیں ان میں اہم تر یہ تھیں کہ اضلاع کی تعداد چودہ سے بڑھا کر بیس کر دی گئی اور رکن بننے کے لیے جائداد کی صلاحیت پانچ ہزار پیاسٹرا سے بڑھا کر اتنی کر دی گئی جس پر سالانہ ٹیکس ڈھائی سو پیاسٹرا ہو۔ جدید ضابطے کی جنت کا پہلو اس کی دفعات کی تبدیلی سے زیادہ یہ تھا کہ اسے باب عالی کی طرف سے نہیں بلکہ تھوڑے عرصے قائم رہنے والی عثمانی پارلیمنٹ کی طرف سے جاری کیا گیا تھا، لیکن اس ضابطے کے جاری ہونے کے بعد ہی جنگوں کا جو بحرانی دور شروع ہوا اس کی وجہ سے یہ ضابطہ بھی

منڈیوں، ہوٹلوں، مدرسوں، رقص خانوں، قہوہ خانوں، گھروں اور سزاؤں کی نگرانی کرنے کے کام شامل تھے۔ علاوہ بریں مجلس بلدیہ کو نرخ اور محاصل مقرر کرنے اور اس طرح روپیہ جمع کرنے اور حدود کے اندر قرضے لینے اور بعض خاص حالات میں جائدادوں پر قبضہ کرنے کا اختیار بھی دیا گیا تھا۔ صدر کے لیے ضروری تھا کہ میزانیہ مجلس کے سامنے اور پھر تصدیق و توثیق کے لیے باب عالی میں پیش کرے، جس کے بغیر اسے درست نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اس تفصیل سے اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۲۷۱/۱۸۵۴ء تا ۱۲۷۴/۱۸۵۸ء میں شہری زندگی کے متعلق جو ذمے داریاں قبول اور اختیار کی گئی تھیں... اس میں اسے میزانیہ کے متعلق تھوڑے سے آزادانہ اختیارات حاصل تھے۔ اس قسم کی خاص خاص مجلسیں عثمانی نظام مملکت میں نئی نہیں تھیں (دیکھیے Emin)؛ جنت اگر تھی تو اس بات میں کہ بعض خاص طرح کے اختیارات اس کے سپرد کیے گئے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ نمونے کے چھٹے ضلع کی بلدیاتی مجلس نے اچھا کام کیا۔ منجملہ دوسرے نمایاں کارناموں کے اس نے ضلع کی پیمائش کرائی۔ دو بلدیاتی تفریح گاہیں بنوائیں؛ دو شفاخانے کھولے اور شہریوں کی صحت، تحفظ اور سہولت کے سلسلے میں بہت سی اصلاحات نافذ کیں۔ ان تمام اصلاحات کے باوجود سرکاری وقائع نگار لطفی آفندی نے ان پر بڑی سختی سے نکتہ چینی کی ہے (عثمان نوری نے *Şehircilik*، ص ۱۲۷ میں یہ اعتراضات نقل کیے ہیں)؛ لیکن نئے بلدیاتی اداروں کے قیام اور توسیع کی تحریک برابر جاری رہی۔ ۱۲۸۵/۱۸۶۸ء میں (بلدیاتی قواعد و ضوابط کا ایک ضابطہ) بلدیہ نظام نامے سے *beldiyye nizānnamesi*

کے لحاظ سے چھ سے لے کر بارہ ارکان تک ہوتے تھے۔ اس کونسل کی مدت عمل چار سال رکھی گئی تھی، لیکن ہر دو سال کے بعد آدھے ارکان کا انتخاب ہونا ضروری تھا۔

علاقے کا طبیب، انجینیئر اور طبیب حیوانات اپنے عہدے کی بنا پر مشیر کے طور پر مجلس کے ارکان ہوتے تھے۔ رکنیت صرف ان لوگوں کے لیے محدود تھی جو ایک صد پیاسٹر سالانہ ٹیکس ادا کرتے تھے۔ مجلس کے ارکان میں سے ایک رکن صدر ہوتا تھا جو منتخب ہونے کے بجائے حکومت کی طرف سے نامزد ہوتا تھا۔ میزانیہ اور تخمینوں کو ایک جمعیت بلدیہ (میونسپل اسمبلی) منظور کرتی تھی چر ای غرض کے لیے سال میں دوبار اجلاس کرتی تھی اور جو مجلس عمومی ولایت (صوبے کی جنرل کونسل) کے رو برو جواب دہ ہوتی تھی (Medj. Um. Bel.، ۱: ۱۶۶۴ بعد)۔

”نوجوان ترکی انقلاب“ کے بعد جمہوری طرز کے جدید بلدیاتی اداروں کو جاری کرنے کی ایک تازہ کوشش کی گئی۔ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء کا قانون چند ترمیموں کے ساتھ بحال کیا گیا اور پوری سنجیدگی سے اسے عملی صورت دینے کی کوشش کی گئی۔ یہ تجربہ زیادہ کامیاب نہیں ہوا۔ ضلع کمیٹیوں کے اراکین گوجوشیلے کارکن تھے، لیکن نا تجربہ کار تھے اور مشترکہ مقاصد میں اضلاع کے درمیان باہمی تعاون کی کمی تھی۔ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۲ء میں ایک جدید قانون کی رو سے اس نظام کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا اور اس کی جگہ استانبول میں صرف ایک بلدیہ جس کا نام شہر امانت ”Shehremānet“ تھا قائم کی گئی، جس کی ضلعوں میں نو شاخیں (شعوب) تھیں اور ہر شاخ کی نگرانی ایک سرکاری افسر کے سپرد تھی۔ پریفیکٹ کی اعانت کے لیے چون ارکان کی ایک بڑی مجلس تھی، جس میں ہر ضلع

پچلھے ضابطوں کی طرح برے اثر رہا۔ (واحد استثنا پرنس آئی لینڈ تھا جہاں ایک ساتواں ضلع بنا دیا گیا تھا۔ سعید پاشا: خاطرات، استانبول ۱۳۲۸: ۱)۔ (’مجلہ اسور بلدیہ‘ Medj. Um. Bel.، ۱: ۱۳۵۷)۔ بالآخر ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء میں ’ضابطے‘ کا ایک نیا اور زیادہ عملی نسخہ شائع کیا گیا، جس پر صحیح وقت پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔ اس کی رو سے شہر کو دس بلدیاتی علاقوں (اضلاع) میں تقسیم کر دیا گیا۔ سابقہ تنظیم میں کونسلوں اور کمیٹیوں کا جو وسیع نظام تھا اسے ختم کر دیا گیا۔ پریفیکٹ کی اعانت کے لیے صرف کونسل آف پریفیکٹ باقی رکھی گئی، اور ہر دس اضلاع کے لیے حکومت نے ایک ڈائریکٹر یا مدیر (müdür) مقرر کیا۔ یہ نظام ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۸ء تک جاری رہا۔

صوبوں میں اصلاح پسندوں کی پالیسی بالکل ایک سی تھی۔ اعیان اور شہر کتخداسی Shehir kethudası (رک باں) کے سابقہ اختیارات ختم کر دیے گئے تھے۔ بڑے شہروں کے اکثر شہری علاقوں میں محمود ثانی کا شروع کردہ مختاری نظام (mukhtār system) جاری کیا گیا اور ۱۲۸۱ھ/۱۸۶۴ء کے قانون ولایت کی رو سے انتخابات کے قواعد و ضوابط مرتب ہوئے (باب چہارم و پنجم)۔ ۱۲۸۷ھ/۱۸۷۰ء کے قانون ’ولایت‘ میں تقریباً اسی انداز سے صوبائی شہروں میں میونسپل کونسلوں کے قیام کی ایک دفعہ رکھی گئی جیسی استانبول کے ضابطے میں رکھی گئی تھی۔ اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ اس سلسلے میں کچھ زیادہ کام ہوا ہو، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۷ء کے قوانین ولایت بلدیہ (صوبائی میونسپل کوڈ) کے بعض اجزا کو عملی شکل دینے کی کچھ کوشش کی گئی تھی۔ قانون کی رو سے ہر شہر کے لیے ایک میونسپل کونسل کا ہونا ضروری تھا، جس میں آبادی



۱۳۲۵ء/۱۹۰۹ء میں ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے پریفیکٹ کے عہدے کو گورنر کے عہدے سے علیحدہ کر دیا۔ جدید قانون کی رو سے یہ طے ہوا کہ صرف استانبول میں میئر اور ”والی“ کے عہدوں کو ملا دیا جائے گا، گو ولایت اور بلدیہ کے نظام ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔ اس قانون کی رو سے دیہات کی طرح بلدیات کی بھی ایک متحدہ قانونی حیثیت اور واضح طور پر قانونی حدود ہوں گی۔ اس قانون کی ایک سو پینسٹھ دفعات میں بلدیات کے انتخاب اور ان کے نظام کار کے متعلق قواعد کا پورا ضابطہ موجود تھا جو بجز چند معمولی ترمیموں کے آج تک رائج رہا ہے۔ ان قواعد کے ماتحت بلدیات کا نظام ایک میئر، ایک مستقل کمیشن اور ایک میونسپل کونسل کے زیر نگرانی ہے۔ میئر کا انتخاب کونسل کرتی ہے اور خود کونسل کا انتخاب جس کی سیماد چار سال ہوتی ہے عام رائے دہندگی کے ذریعے ہوتا ہے۔ جن شہروں کی آبادی دو ہزار سے بیس ہزار تک ہے انہیں ”قصبہ“ کہا جاتا ہے اور بیس ہزار سے زیادہ آبادی والوں کو شہر۔ کونسل کے اراکین کی تعداد باشندوں کی تعداد کے لحاظ سے ہوتی ہے، لیکن تین ہزار سے کم آبادی کی بستیوں کے لیے اراکین کی تعداد کا کم سے کم بارہ ہونا ضروری ہے۔ کونسل کا اجلاس سال میں تین مرتبہ، یعنی فروری، اپریل اور نومبر کے شروع میں ہوتا ہے۔ دوسرے دنوں میں اس کی جگہ ایک مستقل کمیشن (daimi encümen) کام کرتا ہے، جس کے تین رکن تو اسی کونسل کے ہوتے ہیں اور ان کی مدد کے لیے ان کے ساتھ بلدیہ کے مستقل افسر کام کرتے ہیں۔ بلدیہ کے وظائف میں صحت عامہ (ہسپتال، دواخانے، دافع امراض ادویہ، صفائی اور خوراک کا معائنہ وغیرہ)، خدمات عامہ (ٹرام، بس، گیس بجلی وغیرہ)، شہری منصوبہ

کی طرف سے چھ آدمی منتخب ہو کر آتے تھے۔ اس طرح نیز اور کئی صورتوں میں جدید طرز حکومت رفتہ رفتہ ایک مرکزی نظام کی شکل اختیار کر رہی تھی۔ بہت سی دشواریوں کے باوجود نوجوان ترکوں نے استانبول کی زندگی میں سہولتیں پیدا کرنے کے کام کو بہت آگے بڑھایا۔ بدرروؤں کا نیا نظام تجویز اور تعمیر ہوا۔ پولیس کے نظم و نسق کے لیے اور آتش زدگی کو روکنے کے کام میں اصلاحات کی گئیں اور کتوں کے وہ غول جو عرصہ دراز سے قسطنطنیہ کے گلی کوچوں کے لیے مصیبت بنے ہوئے تھے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیے گئے۔

جمہوری حکومت نے شہری زندگی کا جو پہلا قابل ذکر اقدام کیا وہ یہ تھا کہ ۱۶ فروری ۱۹۲۳ء کو ایک قانون بنایا گیا، جس کی رو سے انقرہ میں پریفیکٹ کا نظام (شہر امانت) قائم کیا گیا (قوانین مجموعہ سی، ۲: ۲۱۸)۔ پہلا پریفیکٹ علی حیدر تھا، جس کی اعانت کے لیے چوبیس اراکین کی ایک مجلس عام تھی۔ اس کا آئین بجز چند تبدیلیوں کے قسطنطنیہ کے آئین کے انداز پر تھا جس کا مقصد زیادہ تر یہ تھا کہ تمام مالی اور حفاظتی معاملات میں بلدیہ کی خود مختاری کو محدود کر کے اسے زیادہ سختی سے وزارت داخلہ کے ماتحت کر دیا جائے۔

۳ اپریل ۱۹۳۰ء کو بلدیات کا ایک نیا قانون پاس ہوا (Resmi Gazete، ص ۱۳۷۱، ۱۵۸۰: OM؛ ۱۹۳۰ء، ص ۵۵)۔ قدیم نام شہر امانت Shihremānet اور شہر امینی Shihremini ترک کر دیے گئے اور ان کی جگہ بلدیہ Belediye اور بلدیہ رئیسی Belediye reisi نے لے لی جس کا ترجمہ عموماً میئر کیا جاتا ہے۔ سلطان عبدالحمید کے عہد حکومت میں استانبول کے پریفیکٹ اور گورنر کے عہدے یک وقت ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ نوجوان ترکوں نے

جو سنہ سے آخری ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا۔  
جمہوریہ کے بلدیاتی قوانین کے لیے دیکھیے *La vie*  
*Juridique des Peuples*، ترکی، پیرس ۱۹۳۹ء : ۵۷  
بعد: Albert Gorvine کی *An Outline of Turkish*  
*Provincial and local Government*، انقرہ ۱۹۵۶ء۔  
(B. LEWIS)

(۲) مشرقی عرب:

اصلاحات کے ابتدائی دور کی قصباتی مجالس  
جیسے ”مجلس دمشق“، جو ابراہیم پاشا نے شام پر  
مصری قبضے کے دوران ۱۸۳۲ - ۱۸۴۰ء میں قائم  
کی تھی (A. J. Rustum) ”المحافظة الملكية المصرية :  
بیان بوثائق الشام، بیروت ۱۹۴۰ - ۱۹۴۳ء اور  
ایک اور مجلس کا جو ایک اصلاحی محافظ نورالدین  
نے ۱۸۵۴ء میں سواکن میں قائم کی (J. Hamilton :  
*Sinai*، ۱۸۵۷ء) قانون سازی سے کوئی تعلق نہیں  
تھا اور یہ زیادہ عرصے تک قائم بھی نہ رہ سکیں۔  
۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۳ء - ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء کا عثمانی  
بلدیاتی قانون بعض سرحدی علاقوں اور مصر کے  
علاوہ، جہاں بلدیاتی نظام ایک بالکل الگ انداز  
سے ترقی کر رہا تھا، تمام عربی بولنے والے صوبوں  
میں رائج تھا۔ جہاں صوبے کے ”والی“ کا رویہ  
”تنظیمات“ کے ساتھ ہمدردانہ تھا وہاں نئی  
بلدیات نے خوب ترقی کی اور جہاں یہ صورت نہیں  
تھی وہاں بلدیات کو ترقی کا موقع نہ ملا۔ یوں  
گویا احمد مدحت پاشا کی راہنمائی میں بغداد میں  
۱۸۶۹ تا ۱۸۷۲ء میں اور دمشق میں (۱۸۷۸ تا  
۱۸۸۰ء) کو مختصر مدت کے لیے سہی، بلدیاتی  
تنظیم کا ایک بہت اچھا دوز آیا، جس میں شہر  
پناہوں کو گرا دیا گیا اور گلیوں، مسقف منڈیوں  
اور دوسری عمارات عامہ کی تعمیر عمل میں آئی۔  
خدمت پسند مقامی اکابر کی دلچسپی نے شہری اصلاح  
کے کام کو بہت آگے بڑھایا۔ موصل میں ۱۸۶۹ء

بندی اور انجینیئری (جس میں شہر کے اندر کی سڑکیں  
اور ریل، عام تفریح گاہیں، باغات، گلیوں کی روشنی،  
صفائی، پانی کی نکاسی اور بہم رسانی وغیرہ) شامل  
ہیں۔ قلتِ اشیا کے زمانے میں تھوڑی تھوڑی مقدار میں  
سامانِ خور و نوش کی تقسیم کا کام بھی اس کے ذمے  
ہوتا ہے۔ اس کی اپنی مجلسِ تنفیذی (ضابطہ) بھی  
ہوتی ہے۔ بلدیہ ٹیکس لگاتی ہے اور اس کا  
علیحدہ میزانیہ ہوتا ہے، لیکن اس کا مستقل عملہ  
سرکاری ملازم ہوتا ہے۔

مآخذ: سب سے زیادہ پر از معلومات مواد عثمان  
نوری (عثمان Ergin) کے مجلہ اور بلدیہ، ۵ جلدیں،  
استانبول، ۱۳۳۰ تا ۱۳۳۸ھ میں ملے گا، پہلی  
جلد میں اسلام اور ترکی میں بلدیاتی اداروں کے  
تاریخی مواد کو تاریخ وار نہایت محنت سے جمع  
کر دیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں بلدیاتی معاملات  
کے متعلق عثمانی قوانین و فرامین کے متون یکجا  
کر دیے گئے ہیں۔ باقی تینوں جلدوں میں مختلف  
اور متنوع، مگر مخصوص موضوعات جیسے بلدیاتی  
معاهدات، بلدیہ کے مخصوص حقوق، صحت، رفاہ عامہ  
وغیرہ مضامین پر نقد و بحث ہے۔ اسی موضوع پر اسی  
مصنف کے ایک تعارف کے لیے دیکھیے Osman Ergin :  
*Türkiyede Şehirciliğin Tarihi İnkışafı*، استانبول  
۱۹۳۶ء۔ بلدیاتی امور سے متعلق قوانین کا متن ”دستور“  
استانبول ۱۸۷۲ تا ۱۹۲۸ء، در *Kawānin Medjmu'ası*  
اور *Kanunlar Dergisi*، ۱۹۲۰ء بعد اور *Resmi Gazete*  
میں ملیں گے (فرانسیسی تراجم در G. Young، کی  
*Corps de droit ottoman*، اوکسفورڈ ۱۹۰۵ -  
۱۹۰۶ء، میں: Aristarchi : *Législation ottomane*،  
قسطنطنیہ ۱۸۷۴ - ۱۸۷۸ء: *La Législation*  
*turque*، استانبول ۱۹۲۳ء بعد)۔ شہر امانت  
*Shehremānet*، کے نظام اور صوبائی بلدیات کے  
متعلق حکومت عثمانی کے ’سالناموں‘ میں مواد ملے گا،



تک محدود کر دیا اور ۱۹۲۵ء کے ”قانون بلدیات“ نے اس بات کی اجازت دے دی کہ دارالسلطنت کی بلدیہ کے رئیس کا تقرر کونسل کے باہر سے بھی کر لیا جائے۔ یہی صورت حال دمشق میں آج کل بھی موجود ہے۔

لبنان میں ۱۹۲۲ء میں ۱۸۷۷ء کے عثمانی قانون کی جگہ ایک بلدیاتی فرمان جاری ہوا، جس کی رو سے وزیر داخلہ نے سابق عثمانی والی کے تمام محتسابانہ فرائض اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ ۱۹۲۳ء میں بیروت کو ایک خاص حیثیت دے کر مرکزی شہر بنا دیا گیا اور یہاں پیرس کے نمونے پر ایک نظام قائم کر دیا گیا۔ اگرچہ اس سال سے لے کر فرانسیسی معاہدہ تحفظ (mandate) کے ختم ہونے تک کونسل اور اس کے صدر کا تقرر وزیر ہی کرتا رہا۔ ۱۹۵۳ء کے قانونی فرمان عدد ۵ کی رو سے بیروت کی یہ مخصوص حیثیت ختم کر دی گئی اور یہاں بارہ ارکان کی ایک کونسل قائم کر دی گئی، جن میں سے نصف منتخب کیے جاتے تھے۔ صدر جو ارکان مجلس ہی میں سے منتخب کیا جاتا ہے میونسپل مجلس واضح قوانین کا رئیس یا ”محافظ“ ہے۔ یہ ریاست کا نمائندہ اور شہر کا انتظامی سربراہ بھی ہوتا ہے۔ شام کی بلدیات، جن میں دمشق بھی شامل ہے، ”قانون البلدیات“ کے مطابق کام کرتی ہیں، جسے ۱۹۵۶ء کے فرمان عدد ۱۷۲ کی رو سے نافذ کیا گیا تھا۔

دمشق، بیروت، بغداد اور عمان کی بلدیات کے رئیس ”امین العاصمہ“ کہلاتے ہیں، جس سے دارالحکومت سے ان کے تعلق کی اہمیت کا اظہار مقصود ہے۔ دوسرے مقامات پر پہلا لقب ”رئیس البلدیہ“ بحال رکھا گیا ہے۔ دارالحکومت میں صدر کا تقرر وزرا کی کونسل کرتی ہے۔ دوسری بلدیات میں اس کا انتخاب یا تو میونسپل

کے بعد سے برابر اس کے شاہی خاندانوں کی بدولت شہری نظام کا سلسلہ قائم ہے۔ مملکت عثمانیہ کی تمام صوبائی بلدیات کی ایک عام کمزوری یہ تھی کہ وہاں کی بلدیاتی پولیس (بلدیہ چاؤش لری belediyye ça'ushlari، عربی: شرطة البلدیہ) قطعی غیر مؤثر ہوتی تھی۔

باوجود اپنی ان کوتاہیوں کے جن کی طرف حکومتوں کے سفیر اپنے مراسلات میں بڑی مستعدی سے اشارے کرتے رہتے تھے ۱۹۱۵-۱۹۱۸ء کی عالم گیر جنگ کے بعد جب عثمانی سلطنت منتشر ہو گئی اور عرب ممالک کی مقامی حکومتوں میں ایک خلا پیدا ہو گیا تو اس وقت بھی مملکت عثمانیہ کے بلدیاتی نظام نے قائم رہنے کی غیر معمولی قوت کا ثبوت پیش کیا۔ عبوری دور میں تسلسل قائم رکھنے کے لیے برطانیہ نے عراق، فلسطین اور شرق اردن میں اور فرانس نے شام اور لبنان میں کئی سال تک عثمانی بلدیاتی ضابطے کو برقرار رکھا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ ایسی تبدیلیاں کرنی شروع کیں جو ان کے اثر اور اقتدار کی غمازی کرتی تھیں۔ ۱۹۲۲ء میں بغداد کے ایک محافظ کا تقرر عمل میں آیا، جو یک وقت بغداد کا انتظامی افسر اعلیٰ بھی تھا اور بلدیاتی مجلس کا صدر بھی۔ یہ دونوں عہدے ۱۹۲۳ء میں الگ الگ کر دیے گئے، لیکن ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۷ء کا عثمانی قانون (ولایت بلدیہ قانونو wilayat Belediyye Kanunu) اس وقت تک منسوخ نہیں کیا گیا جب تک ۱۹۳۱ء کے قانون عدد ۸۳ (”ادارة البلدیات“) کا نفاذ نہیں ہوا۔ فلسطینی حکومت نے عثمانی نظام سے اس وقت تک اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا جب تک ۱۹۳۳ء کا میونسپل کارپوریشن آرڈیننس جاری نہیں ہوا۔ شرق اردن میں حالات نے کونسلوں کی حیثیت کو محض مشاورتی ذمے داریوں

کونسل کرتی ہے یا اسے وزیر داخلہ مقرر کرتا ہے، جس کی وزارت میں عموماً ایک محکمہ (مصلحہ، مَدیرِیہ) ہوتا ہے جو تمام بلدیاتی معاملات کی نگرانی کرتا ہے۔ مصر اور سوڈان میں دیہاتی اور قصباتی امور کے لیے مخصوص وزارتیں قائم کر دی گئی ہیں۔

مصر نے لوکل گورنمنٹ کی اپنی ایک مخصوص روایت قائم کر لی ہے۔ اسکندریہ میں یورپی قونصلوں اور یورپی تاجروں کی جماعت کی موجودگی کی وجہ سے میونسپل حکومت کی بنیادیں ۱۸۳۵ء سے موجود تھیں جب کہ ایک مجلس مشاورت "مجلس التنظيم" (conseil de l'ornato) قائم کر دی گئی۔ اس کے بعد ۱۸۶۹ء میں ایک بلدیہ کا تقرر عمل میں آیا جس میں جزوی طور پر منتخب شدہ ایک اور کونسل ہوتی تھی، جس کا صدر نامزد کیا جاتا تھا۔ خدیو اسمعیل اور اس کے جانشینوں نے ۱۹۴۹ء تک قاہرہ کو بلدیاتی حقوق سے محروم رکھا اگرچہ مصری صوبوں میں محدود اختیارات کے ساتھ بلدیاتی ادارے مدتوں سے موجود تھے۔

۱۹۰۱ء میں ایک فرمان کے ذریعے سوڈان کے گورنر جنرل کو بلدیاتی مجالس کے قیام کا اختیار دے دیا گیا، مگر اس پر کبھی عمل نہیں ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں خرطوم، اورام ڈرمان اور شمالی خرطوم کے قریبی شہروں میں ایک مجلس مشاورت قائم کی گئی اور ہر شہر میں ایک علاقائی مجلس بھی قائم ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں پورٹ سوڈان میں ایک مجلس بلدیہ بنی اور اس کے بعد دوسرے شہروں میں۔ ۱۹۴۵ء میں صدر مقام کی تین علاقائی کمیٹیوں کی جگہ بلدیاتی مجالس بنا دی گئیں۔ ۱۹۵۱ء میں ایک قانون نافذ ہوا جس میں مزید عدم مرکزیت کی دفعہ موجود تھی۔

عرب میں حکومت عثمانی نے ۱۸۷۰ء کے

قریب مدینے، جدے، طائف اور ينبوع میں بلدیاتی ادارے قائم کیے تھے۔ مکہ مکرمہ میں خدمتی اداروں کا انتظام و انصرام عین الزبیدہ کی مجلس آب رسانی (مجلس تعمیرات komisyonu) اور عام مقاصد کی مجلس کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ حجاز میں ان اداروں کی کوئی اساس اور روایت نہیں تھی، اس لیے وہ ۱۹۱۵ - ۱۹۱۹ء کی عالمگیر جنگ ہی میں ختم ہو گئیں۔ ۱۹۲۶ء میں حکومت سعودیہ نے ایک انتظامی منشور جاری کیا جس میں مکے، مدینے اور جدے کے اکابر اور تجار کی منتخب شدہ بلدیاتی مجالس بنائی گئیں اور ساتھ ہی ان میں سے ہر ایک شہر میں فنی انتظامی مجلس قائم کی گئی جو بلدیہ کے ناظم اور ہر محکمے کے رئیس شعبہ پر مشتمل تھی۔

عدن میں ۱۸۵۵ء تک ایک بلدیاتی ادارہ موجود تھا اور ۱۹۰۰ء میں عدن میں ایک مقامی ادارہ قائم کیا گیا، گو ۱۹۴۷ء تک قلعے کے اندر انتخابی عنصر کو قطعی دخل نہ تھا۔ ۱۹۵۳ء میں قلعے کے شہری ادارے کو عدن کی بلدیہ میں تبدیل کر دیا گیا، جس کا صدر نامزد ہوتا تھا اور جس کی مجلس میں سرکاری افسروں کی اکثریت ہوتی تھی؛ لیکن یہ مجلس زیادہ وسیع انتخابی بنیادوں پر قائم تھی اور اسے اپنے میزانیہ پر پورا اختیار حاصل تھا۔ بحرین کی بلدیات میں فرمانروا کا مقرر کردہ رئیس مجلس البلدیہ ایک ڈائریکٹر (معاون سکریٹر) اور جزوی طور پر منتخب شدہ ایک کونسل ہوتی ہے۔ کویت کی بلدیہ کا نظم و نسق ایک مدیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو "رئیس البلدیہ" کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔ یہ حکمران خاندان کا کوئی فرد ہوتا ہے۔ مصوع اور حرر کے عربی بولنے والے قبائل نے شہر کے نظم و نسق میں بہت ہی کم حصہ لیا ہے۔ ۱۸۹۳ء کے ایک فرمان



میں کسی قسم کا حصہ لینے کے مواقع حاصل نہیں ہوتے، اکثر اوقات اپنے جوش کا اظہار شہری سیاسیات کے معاملے میں کرتے تھے۔ بلدیات اس لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ وہ کس حد تک عمارتوں کی تعمیر اور وسائل نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کرتی ہیں اور کس حد تک عوام الناس کے رفاہ و فلاح اور انہیں سہولتیں بہم پہنچانے کے مسئلے کو اہمیت دیتی ہیں۔ صرف مصر میں عورتوں کو رائے دینے اور بلدیات کا رکن منتخب ہونے کا حق حاصل ہے۔ بلدیاتی ملازمتوں میں عورتیں ہر جگہ بہت کم ہیں۔ کسی ریاست میں بھی قومی پیمانے پر خدمتی ملازمتیں اور ادارے موجود نہیں ہیں، جن کی اپنی ایسی ہی روایات ہوں جیسی قومی سرکاری ملازمتوں کی ہوتی ہے۔ مقامی حکومت کو مرکزی حکومت کی ایک علاقائی شاخ سمجھا جاتا ہے، جسے کوئی قانونی یا حقیقی معنوں میں مالی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود بڑی بڑی بلدیات کی روز افزوں دولت و ثروت اور ان کے کاروبار کی پیچیدگی نیز ان کے نظم و نسق کی پختگی اور حسن انتظام کی بدولت انہیں عملاً ایک طرح کی آزادی اور خود مختاری حاصل ہے۔

مآخذ: (الف) مصر (دور عثمانی کے قوانین (۱):

*Organisation du conseil de l'oronto à Alexandrie,*

*Règlements de la municipalite (۲)*

*Rapport de la (۳) 'd'Alexandrie، اسکندریہ، ۱۸۶۹ء؛*

*'commission....municipale provisoire، ۱۸۸۱-۱۸۸۲ء؛*

*Lois, décrets, arrêtés et règlements intéressant (۴)*

*la municipalité d'Alexandrie، ۱۹۰۶ء، تکملہ،*

۱۹۱۳ء۔

(ب) ۱۹۱۸ء سے بعد کے قوانین: مختلف ریاستوں

کے بلدیاتی قوانین شائع شدہ نیشنل سرکاری گزٹ اور

بعد ازان بالعموم کتابی صورت میں چھاپ کر شائع

کے ذریعے جو ۱۹۰۱ء میں منسوخ کر دیا گیا، اطالوی حکومت نے مصوع میں ایک بلدیاتی مجلس قائم کی، جس میں نامزد مقامی باشندوں کی برائے نام نمائندگی ہوتی تھی اور جن کی اہلیت بھی محدود ہوتی تھی۔ حبشہ کی حکومت نے دو ایسے اقدامات کیے جن سے منتخب مجالس بلدیہ کے لیے راہ ہموار ہو گئی جیسے ۱۹۴۲ء کا انتظامی فرمان عدد ۱، جس میں بلدیات کے اعلان عدد ۷ کے ذریعے توسیع کر دی گئی تھی۔

مشرقی عرب میں عموماً بجلی اور پانی کی بہم رسانی کا انتظام بلدیات کے ہاتھ میں نہیں ہوتا اور ذرائع نقل و حمل کا انتظام بھی بہت کم صورتوں میں ان کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ ان چیزوں کا انتظام (جنہیں اب رفتہ رفتہ قومی ملکیت بنایا جا رہا ہے) وہ بورڈ کرتے ہیں جو براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت ہیں، جن میں سے بعض میں بلدیاتی نمائندگی ہے اور بعض میں نہیں ہے۔ بلدیہ کے ارکان عوام کی براہ راست رائے دہی سے منتخب ہوتے ہیں۔ لوگوں کو اپنی کارکردگی سے آگہ کرنے کے لحاظ سے بلدیات کے مختلف مدارج ہیں۔ جو بلدیات ایسے شہروں میں ہیں جو سیاسی اعتبار سے زیادہ بیدار اور ترقی یافتہ ہیں، جیسے دمشق، بیروت، بغداد، قاہرہ اور اسکندریہ کی بلدیات، وہ اپنا میزانہ منظر عام پر لاتی اور اپنے منصوبوں کا اعلان اور اشاعت کرتی ہیں، دوسری ایسا نہیں کرتیں۔ اخبار والوں کو بلدیات کے جلسوں میں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ قومی معاملات کے مقابلے میں مقامی امور کی طرف سے لوگوں کی بے التفاتی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بلدیاتی مجالس کے انتخابات کے وقت بہت کم لوگ ووٹ دینے آتے ہیں۔ اگرچہ فلسطینی، جنہیں برطانوی حکم نامے کے ماتحت ملکی معاملات

*The Ethiopian Empire... laws*، رائٹڈم ۱۹۵۴ء۔

(R. L. Hill)

(۳) شمالی افریقہ: (۱) تونس

تونس میں پہلی بلدیہ محمد بی کے عہد حکومت میں وجود میں آئی، جس نے ۳۰ اگست ۱۸۵۸ء کے فرمان کی رو سے شہر تونس کے انتظام کے لیے ایک بلدیاتی مجلس قائم کی، جو ایک صدر، ایک معتمد اور بارہ ارکان پر مشتمل تھی۔ یہ ارکان سر پر آوردہ ترین مقامی باشندوں میں سے منتخب کیے گئے تھے اور ان کا ایک ٹلٹ ہر سال اپنی نشستوں سے دست بردار ہو جاتا تھا۔ اس مجلس کے فرائض اور ذمے داریاں یہ تھیں کہ وہ سڑکوں کی دیکھ بھال اور تعمیر کروائے، سڑکوں کو کشادہ کرنے کے لیے جس زمین کی ضرورت ہو وہ حاصل کرے اور عمارتوں کی تعمیر کے اجازت نامے جاری کرے۔ مجلس اپنا انتظامی اختیار، جس کا اظہار مبہم انداز میں کیا گیا تھا، براہ راست بادشاہ سے حاصل کرتی تھی۔ تونس کی مجلس بلدیہ کا آئین فرانسیسی اقتدار کے قائم ہو جانے کے بعد محمد بی کے فرمان مؤرخہ ۳۱ اکتوبر ۱۸۸۳ء کی رو سے بدل دیا گیا۔ دو سال بعد یکم اپریل ۱۸۸۵ء کو پورے تونس کے لیے ایک بلدیاتی منشور شائع کیا گیا اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد (۱۰ جون ۱۸۸۵ء کو) ایک اور فرمان جاری ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ تونس میں تمام بلدیاتی ارکان کا تقرر حکومت کرے گی۔ اس فرمان میں ان تمام امور کی تفصیل بیان کر دی گئی تھی جنہیں انجام دینے کا اختیار مجلس بلدیہ کو حاصل تھا۔ اس فرمان کی رو سے ملک بھر کا نظم و نسق انہیں مجالس کے ذریعے مرتب و منظم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ آگے چل کر دو اصلاحات اور عمل میں آئیں ایک تو ۱ اگست ۱۹۳۸ء کے فرمان سے، جس نے یہ قاعدہ

کر دیے گئے؛ (۵) مثلاً شام: قانون البلديات السوري مع تعديلاته الاخيرة بموجب مرسوم ۱۷۲، ۱۹۵۶ء؛ (۶) لبنان: مجموعة القوانين، ۱۹۳۸ء، ج ۲، جزء ۲، بلديات؛ (۷) اردن: مجموعة القوانين والانتظمة...، ۱۹۱۸-۱۹۳۶ء، ج ۳؛ (۸) قاہرہ: القانون رقم ۱۳۵، ۱۹۳۹ء، بانشاء مجلس بلدی لمدينة القاهرة والتعديلات. (ج) دیگر حوالے: (۹) (i) مصر ہر سالانہ رپورٹیں، ۱۸۹۱-۱۸۹۷ء؛ (ii) مصر اور سوڈان ۱۸۹۸-۱۹۱۹ء، از برٹش ایجنٹ قونصل جنرل (۱۹۱۳ء کے بعد از ہائی کمشنر)؛ سالانہ رپورٹیں لیگ آف نیشنز کے ہاں؛ (۱۰) شام و لبنان ۱۹۲۰-۱۹۳۹ء؛ (۱۱) عراق ۱۹۲۵-۱۹۳۳ء؛ (۱۲) فلسطین و شرق اردن ۱۹۱۷-۱۹۳۷ء؛ (۱۳) عدن، بحرین اور کویت کی حکومتوں کو ان کی میونسپلٹیوں کی سالانہ رپورٹیں *Municipalité de Damas, exposé des opérations effectuées de 1920 à 1924*، (عربی و فرانسیسی)، دمشق بدون تاریخ؛ (۱۴) *Municipal government: W.H. Ritscher*؛ (۱۵) *G.L. Bell*؛ (۱۶) *in the Lebanon: Review of the civil administration of Mesopotamia: O. Colucci*؛ (۱۷) *Cmd. ۱۰۶۱، ۱۹۲۰ء؛ (۱۸) Constantinople: BIE؛ شماره ۸، ۱۸۶۳ء؛ (۱۹) La Ville du Caire... Essai: A. T. Cancrî؛ (۲۰) sur la création d'une municipalité La vie municipale: R. Maunier؛ (۲۱) en Égypte (Conger. internat des villes Gand)؛ (۲۲) E' institution: M. Delacroix؛ (۲۳) municipale en Égypte, Égy. contemporaine؛ (۲۴) Rept. on local: A. H. Marshall؛ (۲۵)؛ (۲۶) government in the Sudan: N. Marcin؛ (۲۷)*



مجلس متعلقہ کے قائد کے علاوہ دوسرے قائد بذریعہ فرمان خاص مقرر کرتے ہیں، ایک نائب صدر اور کچھ نمائندے ہوتے ہیں جنہیں مجلس بلدیہ اپنے ارکان میں سے منتخب کرتی ہے۔ مجلس دیہی کی ہیئت ناظمہ "شیخ المدینہ" ہے، یعنی صدر، جسے شہر تونس کی مجلس بلدیہ مقرر کرتی ہے اور جس کی امداد کے لیے دو نائب صدر ہوتے ہیں۔ تونس میں گروہی تنظیم کا نظام آزادی کے بعد ۱۳ مارچ ۱۹۵۷ء کے بلدیاتی قانون کے ذریعے تبدیل کر دیا گیا۔ اس نئے قانون نے مجالس دیہی کی تعداد بڑھا کر چورانوے کر دی۔ موجودہ کونسلیں امیدواروں کی فہرست میں سے ایک ہی ووٹ کے ذریعے تین سال کے لیے منتخب کی جاتی ہیں۔ انتخاب کرنے والوں میں بیس سال سے زائد عمر کے تونسوی مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوتے ہیں۔ امیدواروں کے لیے کم سے کم پچیس سال کی عمر ہونی ضروری ہے۔ فرانسیسی اب بلدیاتی مجالس کے رکن نہیں بن سکتے، لیکن قانون نے یہ اجازت دے رکھی ہے کہ ان فرانسیسیوں اور غیر ملکوں کو جنہیں حق رائے دیہی حاصل ہو تونسوی حکومت ممبر نامزد کر سکتی ہے، جو ہر مجلس دیہی کے لیے ایسے ارکان کی تعداد مقرر کرنے کی مجاز ہوگی۔

مرکزی اور مقامی طور پر انتظامی نگرانی وزیر داخلہ اور گورنر کرتے ہیں۔ دو اور اہم اختراعات کا ذکر بھی ضروری ہے: صدر اور نائبین کو کونسل منتخب کرتی ہے، لیکن بلدیہ تونس کی مجلس کے صدر کا تقرر اب بھی وزیر اعظم کے فرمان سے عمل میں آتا ہے اور کونسل کے صدر کو وزیر داخلہ نامزد کرتا ہے؛ اس کے برعکس بلدیاتی مجالس دیہی مجالس کے ہونے کام سرانجام دیتی ہیں۔

(۳) شمالی افریقہ: (۲) مراکش

ختم کر دیا کہ مجالس نے جن معاملات پر غور و خوض کرنا ہو ان کے لیے پیشگی منظوری حاصل کریں اور دوسری ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کے فرمان کی رو سے، جس نے تونس کے لیے ایک منتخب شدہ مجلس تجویز کر دی جس میں تونسویوں اور فرانسیسیوں کی تعداد برابر برابر ہو۔

لیکن اس ادارے کو بحیثیت مجموعی بے نے ۲۰ دسمبر ۱۹۵۲ء کے فرمان کی رو سے بہت زیادہ بدل دیا اور مجلس ملکی کی تعریف ان الفاظ میں کی: سرکاری قانون کے ماتحت ہیئت اجتماعیہ، جو شہری حیثیت رکھتی ہو، مالی طور پر بالکل آزاد اور خودمختار ہو اور بلدیاتی امور کے چلانے کی ذمہ دار ہو۔ ہیئت اجتماعیہ کی جو جماعت غور و فکر کا کام کرے وہ مجلس بلدیہ ہوگی۔ یہ دو انتخابی جماعتوں کی براہ راست رائے دیہی سے چھ سال کے لیے فرانسیسی اور تونسوی ارکان کا علیحدہ علیحدہ انتخاب کرتی تھی ان میں سے نصف ارکان تین سال کے بعد اپنی نشستیں خالی کر دیتے تھے۔ چونکہ دیہی مجالس میں سے انتالیس اپنی اپنی بلدیاتی مجالس میں فرانسیسیوں اور تونسویوں کی مساوی تعداد نامزد کرتی تھیں۔ بقیہ یا تو صرف تونسویوں کو نامزد کرتی تھیں یا تونسویوں کی اکثریت کو۔ انتخابات عام رائے دیہی کے حق کی بنیاد پر ہوتے تھے، اس شرط کے ساتھ کہ فرانسیسی عورتوں کو تو حق رائے دیہی حاصل ہوتا تھا، لیکن تونسوی عورتوں کو یہ حق حاصل نہیں تھا۔ مجلس بلدیہ سال میں چار عام اجلاس کرتی تھی۔ اس کے اختیارات محدود ہوتے تھے اور مجلس دیہاتی گروہ کے تمام کاروبار پر حاوی نہیں ہوتی تھی۔ مجلس ہر مرکز کی طرف سے وزیر مملکت کی اور مقامی طور پر "قائد" کی نگرانی اب بھی قائم ہے۔ مجلس دیہی کی مجلس منتظمہ میں ایک صدر، جسے

[عہد حاضرہ میں] ۱۹۱۲ء سے پہلے مراکش میں نہ تو بلدیات تھیں، نہ وہاں کوئی شہری زندگی تھی۔ شہروں کے پاس اپنا کوئی سرمایہ یا خزانہ بھی نہیں تھا۔ سرکاری ملازموں کا خرچ زیادہ تر اس رقم سے ادا کیا جاتا تھا جو مذہبی اداروں یا ”حبوس“ (= اوقاف) سے حاصل ہوتی تھی اور تعمیر و اصلاح کا انحصار بالکل بادشاہ کی مرضی پر ہوتا تھا، جو چاہتا تو مطلوبہ رقم خزانہ عامرہ کے ذمے لگا دیتا تھا۔ شہریوں کی نمائندہ جماعتیں بھی موجود نہیں تھیں۔ گورنر یا عامل کو اختیارات براہ راست سلطان سے ملتے تھے۔ محتسب سوداگروں کے حقوق کا نگہبان نہیں تھا جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ ان کا منتخب کردہ نہیں ہوتا تھا البتہ جو گورنر دانشمند ہوتا وہ اپنے علاقے کے سربراہوں سے مشورہ لے لیا کرتا تھا، گو وہ ان مشوروں کا پابند نہیں تھا۔

جدید طرز کا اولین ادارہ جو فرانسیسی حکمرانوں نے قائم کیا وہ فاس کی بلدیہ (المجلس البلدی) تھی جو ۲ ستمبر ۱۹۱۲ء کے ڈیپارٹمنٹ (فرمان) کی رو سے قائم کی گئی تھی۔ اس ادارے میں پندرہ آدمی تھے، جنہیں رائے دینے کا حق حاصل تھا۔ سات سرکاری عہدے دار مخصوص اسباب کی بنا پر مقرر کیے گئے تھے اور آٹھ سرکردہ افراد اور تھے، جو دو سال کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ یہ نظام ۱۹۱۷ء کے بلدیاتی منشور تک قائم رہا۔

یکم اپریل ۱۹۱۳ء کے ایک ڈیپارٹمنٹ کی رو سے شریفی مملکت کی بندرگاہوں میں بلدیاتی ادارے قائم کر دیے گئے۔ ۸ اپریل ۱۹۱۷ء کے فرمان میں اس اعلان کا اعادہ اور اس کی وضاحت کی گئی۔ انیس شہروں کو بلدیات کا درجہ عطا ہوا (۱۹۵۱-۱۹۵۲ء کی سرشماری کی رو سے کل آبادی ۱۸۲۲۷۳۶ تھی)۔ اس فرمان میں بلدیاتی اختیارات

کے حدود بیان کیے گئے ہیں۔ پاشا یا گورنر کی تقرری مرکزی حکومت کے ہاتھ میں تھی۔ بلدیہ کی رہنمائی ایک تجربہ کار بلدیاتی افسر کے ہاتھ میں ہوتی تھی، جو ۱۹۳۷ء کے بعد سے شہری معاملات کے ارکان کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس کے علاوہ ایک میونسپل کمیشن تھا، جسے صرف بحث و تمحیص کا حق حاصل تھا اور جو نامزد ہوتا تھا، منتخب ہو کر نہیں آتا تھا۔ اس میں دو حصے مراکش کے تھے (ایک مسلمان اور ایک یہودی) اور ایک حصہ فرانسیسی تھا۔ بلدیات میں ملازمتیں بلدیات کے افسر اعلیٰ کی ہدایات کے مطابق دی جاتی تھیں اور انہیں مندرجہ ذیل حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا: معلم، رفاہ عامہ، حفظان صحت، صفائی اور مالیات۔ ان کے سیزائے انہیں کے وسائل سے حاصل کی ہوئی آمدنیوں سے مرتب کیے جاتے تھے، جو براہ راست اور ضمنی یا ذیلی محاصل زمین، آبکاری اور چنگی کے محاصل کے عوض سپہا ہوتے تھے۔

فاس کی طرح الدارالبیضاء (Casablanca) کو بھی ۱۹۲۲ء میں ایک خاص نظام دیا گیا۔ میونسپل کمیشن اگرچہ ابھی تک نامزد کیا جاتا ہے، لیکن اب اسے حق رائے دہی حاصل ہے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۵۳ء کے فرمان کے ذریعے بلدیات کے نظام میں اصلاح کی گئی اور فاس اور الدارالبیضاء کے مخصوص نظام منسوخ کر دیے گئے۔ اس فرمان کی رو سے جو خاص تبدیلی ہوئی وہ یہ تھی کہ میونسپل کمیشن، جس میں فرانسیسیوں اور مراکشوں کی تعداد برابر ہو، نامزد ہونے کے بجائے منتخب کیا جائے۔ اس طرح شہر کے تمام معاملات کا انتظام و انصرام کمیشن کے ہاتھ میں آ گیا، اگرچہ اس کے نیپلوں کی تصدیق و توثیق مرکزی محتسب کے یہاں سے لازمی ہوتی ہے۔



تھا؛ اس کے نیچے ”داروغہ“ اور ”کلاتر“ تھے اور بڑے شہروں کے ہر محلے میں ایک ”کدخدا“ ہوتا تھا۔ بازار میں صنعت کاروں کی انجمنیں تھیں، جو اپنے اندرونی معاملات میں بڑی حد تک آزاد تھیں۔ شہر کی گلیاں تنگ اور بیشتر کچی تھیں جو سردیوں میں کیچڑ بھری، گرمیوں میں غبار آلود اور رات کے وقت تاریک ہوتی تھیں۔ با این ہمہ بلدیاتی معاملات میں اصلاحات کا کبھی مطالبہ نہ ہوا تھا اور ۱۹۰۶ء میں آئین کے منظور ہو جانے کے بعد بھی عہد حاضر کے انداز پر بلدیات کے قیام کے لیے کوئی تقاضا یا کوئی مطالبہ نہ ہوا تھا۔ ۲۰ ربیع الآخر ۱۳۲۵ھ / ۲ جون ۱۹۰۷ء کو ایک بلدیاتی قانون منظور ہوا، لیکن چونکہ شہری ترقی کے منصوبوں کے لیے کافی سرمایہ مہیا نہیں ہو سکا تھا اس لیے یہ معرض التوا میں پڑا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں سید ضیاء الدین طباطبائی کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں تہران کے لیے جدید اصولوں پر ایک بلدیہ قائم کرنے کا منصوبہ مرتب کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا، لیکن اس نے اپنا کام پورا نہیں کیا (Recent Happenings : J. M. Balfour in Persia، لنڈن ۱۹۲۲ء، ص ۲۴۰)۔ ۱۹۲۲ء میں ڈاکٹر ریان Ryan نامی ایک امریکی کو تہران کے بلدیاتی مشیر کے طور پر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۲۳ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ کسی اور کو مقرر نہیں کیا گیا (A. C. Millspaugh : The American Task in Persia، نیویارک و لنڈن ۱۹۲۵ء، ص ۲۱، ۲۱۲)۔ رضا شاہ کے عہد حکومت میں بلدیاتی معاملات میں خاصی ترقی ہوئی اور ۱۹۲۷ - ۱۹۲۸ء تک ۱۲۴ بلدیات وجود میں آ چکی تھیں۔ ۱۳۰۹ھ / ۱۹۳۰ء تک کے بلدیاتی قانون کی رو سے وزارت داخلہ نے بلدیہ کا افسر اعلیٰ (رئیس ادارہ بلدیہ) مقرر

اس قانون کی انتظامی دفعات پر تو عمل درآمد شروع کر دیا گیا، لیکن انتخاب سے تعلق رکھنے والی دفعات پر کوئی عمل نہیں ہوا۔ اس رکاوٹ کا سبب ۱۹۵۳ء کا سیاسی بحران تھا۔ پرانے قائم شدہ کمیشن باقی رہے اور مراکش کے آزاد ہو جانے پر ختم کر دیے گئے۔

مراکش کی آزاد حکومت نے بلدیات کے قانون میں کوئی تبدیلی نہیں کی، البتہ جیسا کہ قدرۃ ہونا چاہیے تھا، فرانسیسی اقتدار اور کمیشن ختم ہو گئے۔ ایک نیا نظام نمائندگی تیار کیا گیا ہے۔ یہ نظام محض شہروں سے متعلق نہیں ہوگا بلکہ اس کی رو سے ملک بھر میں دیہی مجالس کا قیام عمل میں آ جائے گا، جو پرانے قبائلی یا شعوبی نظام کی جگہ لے لے گا اور منتخب شدہ کونسلوں کے ذریعے چلایا جائے گا۔ تا دم تحریر اس قانون کا اعلان نہیں ہوا۔ اس کا زیادہ حصہ ۶ جولائی ۱۹۵۱ء کے ”فرمان“ ہی کا چربہ معلوم ہوتا ہے، جس کی رو سے منتخب شدہ ادارے قائم کیے گئے تھے اور جنہیں بالعموم قبیلے یا شعوب کے جماعتی نظام کے اندر حق رائے دہی حاصل تھا۔

الجزائر کے قصبوں اور دیہات میں وہی میونسپل نظام نافذ ہے جو فرانس میں رائج ہے۔ ”قدیم مخلوط“ دیہی مجالس کی جگہ، جسے حکومت کے مقرر کردہ افسر چلاتے تھے اور جو نائب پریفیکٹوں کے ماتحت تھا، اب پوری با اختیار دیہی مجالس نے لے لی ہے۔

مأخذ : *Traite' de droit : Emmanuel Durand : public marocain* پیرس ۱۹۰۰ء۔

(A. ADAM)

(۴) ایران :

انیسویں اور بیسویں صدی کے آغاز میں گورنر کے بعد شہر کا سب سے بڑا افسر ”یگلیگی“

۱۹۵۲ء اور ۲۵ خرداد ۱۳۳۲ھ ش / ۱۹۵۳ء کی رو سے ڈاکٹر مصدق کی وزارت عظمیٰ کے دوران میں جاری ہوئے اور ۱۱ تیر ۱۳۳۳ھ ش / ۱۹۵۵ء کے قانون کے ذریعے بلدیہ (= میونسپلٹی) اور بلدیاتی مجلس (= میونسپل کونسل) کی حیثیت میں کچھ ترمیمات کی گئیں۔ بعض حیثیتوں سے بلدیاتی مجلس کی حیثیت مضبوط ہو گئی، لیکن اس کی آزادی عمل اس قدر محدود ہو گئی کہ بعض حالات میں وزارت داخلہ اس (مجلس) کے توڑ دینے کا مطالبہ کرنے کی مجاز تھی۔ بلدیاتی مجلس کے نہ ہونے کی صورت میں، وزارت داخلہ کو مجلس کا قائم مقام سمجھا جاتا تھا۔ دوسرے ہفت سالہ منصوبے کے تحت، جو مارچ ۱۹۵۶ء میں منظور ہوا، ایران کو بلدیاتی نشو و نما کی غرض سے تین علاقوں میں تقسیم کر دیا گیا، جن میں سے ہر ایک علاقہ کی ذمہ داری مشیروں کی ایک جماعت کے سپرد کر دی گئی (Iran, Economic and Commercial : F.C. Mason) *Conditions in Iran*، اگست ۱۹۵۷ء، در HMSO، ۱۹۵۷ء، ص ۷۴ تا ۷۵)۔ رضا شاہ کے عہد حکومت میں بلدیہ کو "شہرداری" کہنے لگے اور رئیس بلدیہ کو "شہردار"۔

(A. K. S. LAMBTON)

(۵) [برصغیر پاکستان و] ہندوستان۔

[برصغیر پاک و] ہند کی قدیم ایسی دیہاتی جماعتیں جو دیہی کونسلوں یا پنچائتوں کے زیر اقتدار تھیں مقامی حکومت خود اختیاری ہی کے ایک صورت تھی، لیکن سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد جو سیاسی ابتری پیدا ہوئی اس نے عملی حیثیت سے اس نظام کو بالکل ختم کر دیا۔ پرتگالی مقبوضات کے گورنر البوقرق نے ۱۵۰۹ء سے ۱۵۱۵ء کے درمیان گوا Goa کے نظم و نسق میں مروجہ دیہاتی جماعتوں کو برقرار رکھا تھا۔ ۱۶۷۴ء میں جنرل

کیا۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ بلدیہ کی ترقی اور بلدیاتی نظام کے منصوبوں کو عملی صورت دینے کی تدابیر اختیار کرے۔ اوزان اور ناپ تول کے آلات کی نگرانی، انجمنوں پر اختیار اور سامان خور و نوش، کرایوں اور قیمتوں کو استوار رکھنا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ اس قانون میں چھ سے بارہ تک ارکان کی منتخب شدہ مجلس بھی تجویز کی گئی۔ اس کی میعاد دو سال تھی اور بلدیہ کی سرگرمیوں کی نگرانی، بلدیہ کے میزانیہ کی منظوری اور بلدیاتی محاصل تجویز کر کے بلدیہ کے افسر اعلیٰ کے توسط سے وزارت داخلہ کے پاس بھیجنا اس کے فرائض منصبی میں سے تھا۔ رضا شاہ کے عہد میں شہری منصوبہ بندی کے سلسلے میں خاصی ترقی ہوئی، لیکن انتہا درجے کی مرکزیت اور بلدیاتی معاملات پر وزارت داخلہ کی سخت نگرانی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بلدیاتی معاملات میں مقامی عناصر کی ذمہ داری اور ان کا اقتدار و اختیار بہت کم رہ گیا۔ ۱۳۲۸ھ ش / ۱۹۴۹ء میں ایک نئے قانون کی رو سے بلدیاتی مجالس میں ارکان کی تعداد چھ سے بڑھا کر تیس کر دی گئی اور اس کی مدت قیام بھی دو سال کے بجائے چار سال مقرر ہوئی۔ بلدیہ کے رئیس کا تقرر وزارت داخلہ ان تین امیدواروں میں سے کرتی تھی جن کے نام کونسل تجویز کرتی تھی۔ بلدیہ کی طرف سے اس کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر دینے کی صورت میں اسے برطرف کر دیا جاتا، لیکن بلدیہ کے اختیارات میں جو اضافہ کیا گیا تھا وہ یوں کالعدم ہو جاتا تھا کہ گورنر جنرل اور کونسل میں اختلاف پیدا ہو جانے کی صورت میں معاملہ وزارت داخلہ کے سپرد کر دیا جاتا تھا، جس کا فیصلہ قطعی اور حتمی ہوتا تھا۔ آگے چل کر انتظامی حکم (لائسنس قانونی) مؤرخہ ۱۱ آبان ۱۳۳۱ھ ش /



۱۷۹۳ء کے چارٹر ایکٹ کی رو سے گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ پریسیڈنسی شہروں کے نظم و نسق کے لیے منصفان امن (Justices of Peace) مقرر کرے۔ عدلی فرائض کے علاوہ چوکیداروں اور خاکروبیوں کا تقرر اور اس غرض کے لیے صفائی کا ایک ٹیکس لگانا بھی ان کے ذمے تھا۔ یہ بلدیاتی نظام مدراس میں تو کسی حد تک کامیابی سے چلتا رہا لیکن بمبئی اور کلکتے میں نہ چل سکا۔ منصف گورنمنٹ کے ناسزد ہوتے تھے۔ یہ نظام ۱۸۷۲ء تک قائم رہا اور اس سال ان بڑے شہروں کے ٹیکس گزاروں کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنے نمائندے آپ منتخب کریں۔

۱۸۳۲ء اور ۱۸۶۳ء کے درمیان متعدد قواعد کی رو سے میونسپل اداروں کی توسیع دوسرے شہروں میں ہوئی۔ ۱۸۶۱ء کے کونسل ایکٹ کے بعد میونسپل گورنمنٹ کے نظام کو مقامی قانون ساز جماعتوں نے بالکل نئے سانچے میں ڈھال لیا۔ لارڈ میو کی حکومت نے ہندوستانیوں کو لوکل سیلف گورنمنٹ میں شامل کرنے کی ضرورت واضح کی۔ لارڈ رین کے دور حکمرانی (۱۸۸۰ تا ۱۸۸۳ء) میں لوکل سیلف گورنمنٹ میں بڑی توسیع عمل میں آئی، جس میں یہ توقع ظاہر کی گئی تھی کہ وہ ہندوستانیوں کی سیاسی تربیت کا ذریعہ بنے گی۔ ساتھ ہی ساتھ بلدیاتی مجالس کی طرح کی دیہی مجالس کے قیام سے یہ نظام دیہاتی رقبوں تک بھی پھیل گیا۔ جب مائیکو چمفرڈ کی دو غنلی حکومت وجود میں آئی تو یہ مقامی ادارے عوام کے ہاتھ میں آ گئے اور لوکل سیلف گورنمنٹ کا انتظام منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں آ گیا [پاکستان کے موجودہ بلدیاتی نظام کے لیے ریک بہ پاکستان]۔

مآخذ : J. G. Drummond : Panchayats in

India، بمبئی ۱۹۳۷ء؛ W. S. Gonde : Municipal

جیرالڈ اونگیر Angier نے بھی بمبئی میں قدیم پنچائتوں ہی سے کام لیا۔ مرہٹہ پیشواؤں کے علاقوں میں کسی حد تک پنچائتی نظام قائم رہا اور اس کے علاوہ آثار دوسری جگہوں پر بھی ملتے ہیں۔ اسی بنا پر ماؤنٹ سٹوارٹ الٹنسن نے بمبئی میں اور ٹاس منرو نے مدراس میں اس بات کی سفارش کی کہ جہاں کہیں ممکن ہو پنچائتی نظام کو قائم و برقرار رکھا جائے، لیکن ان کی تجاویز کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا اور انیسویں صدی کے وسط میں برطانوی حکومت نے ”لوکل سیلف گورنمنٹ“ (مقامی حکومت خود اختیاری) کا جو نظام قائم کیا وہ بالکل بدیسی قسم کا تھا۔ مائیکو چمفرڈ کی ۱۹۱۹ء کی اصلاحات برطانوی نظام سے زیادہ فرانسیسی نظام سے مشابہ تھیں، کیونکہ برطانوی ہند کے ضلعی افسر کو فرانسیسی محکمے کے پریفیکٹ کی طرح صوبائی حکام پر مکمل اقتدار حاصل تھا۔ کام میں افسروں کی مداخلت ضرورت سے زیادہ تھی۔ اور برطانوی حکمران کسی ایسے نظام کی نسبت جو عوامی اقتدار کے ماتحت ہو اور جسے حقیقی معنی میں لوکل سیلف گورنمنٹ کہا جا سکے ایسے نظام کو زیادہ پسند کرتے تھے جو براہ راست سرکار کے ماتحت ہو اور زیادہ مستعدی سے کام کرے۔

برطانوی عہد حکومت میں بلدیاتی اداروں کا نشو و ارتقا تین پریسیڈنسی شہروں، یعنی مدراس، بمبئی اور کلکتے میں شروع ہوا۔ ۱۶۸۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز کے حکم سے مدراس میں میونسپل کارپوریشن اور میئر کی عدالت کا قیام عمل میں آیا۔ اسی قسم کے ادارے ۱۷۲۶ء میں بمبئی اور کلکتے میں بھی قائم ہو گئے، لیکن ان عدالتوں کا مقصد انتظامی فرائض کی ادائیگی کے بجائے زیادہ تر عدالتی امور کی انجام دہی تھا۔

ہر کمیشن کا ایک ہمہ وقتی صدر تھا، جس کا تقرر گورنر کرتا تھا۔ کمیشن کے کچھ سرکاری اور غیر سرکاری رکن تھے جو ابتدا میں انتخاب کے ذریعے لیے جاتے تھے۔ اس طریق عمل میں بعد کو یہ تجدید کر دی گئی کہ آدھے ارکان انتخاب سے مقرر ہوتے تھے اور آدھوں کو گورنر نامزد کرتا تھا۔ ۱۹۱۳ء تک، جب آبنائے نو آبادیات میں بلدیاتی فرمان نافذ کیا گیا، انتخابی طریق قطعی ترک ہو چکا تھا اور سب کے سب کسٹمر نامزد ہونے لگے تھے۔ اور ان کے ذریعے رائے عامہ، تاجرانہ حلقوں اور مذہبی اور نسلی گروہوں کو نمائندگی دی جاتی تھی۔ نامزدگی کا یہ طریق دوسری عالمگیر جنگ کے بعد تک جاری رہا، تاآنکہ انتخابی طریق سب سے پہلے سنگاپور میں (۱۹۴۹ء) اور بعد کو پنانگ اور ملاکا میں دوبارہ رائج کیا گیا۔ اس مرحلے پر کمیشن کے دو تہائی ارکان بالغ رائے دہی کے ذریعے منتخب ہوتے تھے۔ ۱۹۵۷ء تک سنگاپور اور جارج ٹاؤن کے میونسپل کمیشن، سٹی کونسل بن گئے۔ ان دونوں شہروں کے ارکان منتخب ہونے لگے۔ جو اپنا صدر خود منتخب کرتے جو میئر (dato' bandar) کہلاتا تھا۔ آبنائے نو آبادیات کے بلدیاتی فرمان نے یہ شرط لازمی کر دی تھی کہ میونسپل کمیشن کے ارکان انگریزی پڑھ اور بول سکتے ہوں اس لیے کہ انگریزی سرکاری زبان تسلیم ہو چکی تھی۔ اس شرط کے نفاذ نیز کسٹروں کی نامزدگی کے طریق نے بلدیاتی معاملات میں لوگوں کی دلچسپی بہت کم کر دی۔ ۱۹۵۷ء کے بعد سنگاپور کونسل کے جلسوں کے لیے انگریزی کے علاوہ چینی، تامل اور ملائی زبانوں کو بھی سرکاری زبانیں قرار دے دیا گیا۔ ملاکا اور پنانگ میں ملائی زبان کو، جو وفاق ملایا کی قومی زبان تھی، انگریزی کے ساتھ

Calcutta، ایڈنبرا ۱۹۱۶ء؛ (۳) Imperial Gazetteer of India، جلد ۳، باب ۹ (۱۹۰۹ء)؛ (۴) J. H. Lindsay : Cambridge History of India، جلد ۶، باب ۲۸، ۲۹؛ (۵) R. P. Masani : Evolution of Local Self-Government in Bombay، بمبئی ۱۹۲۹ء؛ (۶) K. P. K. Pillay : Local Self-Government in the Madras Presidency، ۱۸۵۰-۱۹۱۹ء، Journal of Local Self-Government، بمبئی ۱۹۵۱-۱۹۵۲ء؛ (۷) H. Tinker : The Foundations of Local Self-Government in India, Pakistan and Burma، لنڈن ۱۹۵۴ء۔  
(C. COLLIN DAVIES)

(۶) ملایا اور سنگاپور :

برطانوی دولت مشترکہ کے دوسرے حصوں کی طرح ملایا کی بلدیات کی بنیاد بھی انگلستان کے لوکل گورنمنٹ کے نظام کے انداز پر قائم کی گئی۔ ان علاقوں میں یہ ادارے سب سے پہلے آبنائے ملاکا، پنانگ اور سنگاپور میں قائم کیے گئے۔ آبنائے میں بلدیاتی نظام سب سے پہلے ۱۸۲۷ء میں ایک لوکل کمیٹی کی شکل میں شروع ہوا، جس کا کام پنانگ میں سڑکوں اور بدرروؤں کا انتظام کرنا تھا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد اسی قسم کی کمیٹیاں ملاکا اور سنگاپور میں بھی قائم ہو گئیں۔ ۱۸۵۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا (ایسٹ انڈیا کمپنی) نے سنگاپور، ملاکا اور پرنس آف ویلز آئی لینڈ (پنانگ) میں میونسپل کمیشن مقرر کرنے کے لیے ایک قانون بنایا۔ ۱۸۵۸ء میں ان کے جلسے مہینے میں دوبار ہوا کرتے تھے اور ان میں عوام کو شرکت کرنے کی اجازت ہوتی تھی۔ پرنس آف ویلز آئی لینڈ (پنانگ) کا میونسپل کمیشن ۱۸۸۸ء میں جارج ٹاؤن کا میونسپل کمیشن قرار پایا۔ اسی صدی کے آخر تک سنگاپور، جارج ٹاؤن، پنانگ، ملاکا کے قلعے اور شہر کے لیے تین کمیشن بن چکے تھے۔



ریاستہائے ملایا میں صحیح معنوں میں بلدیاتی اداروں کی تخلیق ۱۹۴۸ء میں وفاق ملایا کے قیام کے بعد ہوئی۔ آبنائے نو آبادیات کا بلدیاتی فرمان پورے وفاق کے لیے (ملایا کی نو ریاستوں اور پنانگ اور ملاکا کی نو آبادیوں پر مشتمل تھا) پاس کیا گیا۔ سنگاپور کو وفاق میں شامل نہیں کیا گیا تھا۔ اسی سال وفاق کے صدر مقام کوالالامپور کے ٹاؤن بورڈ کو میونسپلٹی بنا دیا گیا۔ اس کی سابقہ ذمے داریاں بحال رہیں، جن میں گرد و پیش کے دیہات کا انتظام بھی شامل تھا البتہ داخلی بلدیاتی رقبے اور خارجی بلدیاتی رقبے میں امتیاز کر دیا گیا۔ داخلی رقبے سے خالص شہر مراد تھا اور دوسرے سے وہ تمام گاؤں جو اس کے گرد و نواح میں واقع تھے۔ اس کے بعد سے برابر طرح طرح کی تبدیلیاں واقع ہوتی گئیں۔ ٹاؤن بورڈ، ٹاؤن کونسل (مجلس بندران) بن گئے۔ انتخابی طریق کار رائج کر دیا گیا۔ کونسلوں کو زیادہ اختیارات تفویض کیے گئے اور مقامی معاملات میں واضح طور پر زیادہ دلچسپی بھی ظاہر کی جانے لگی۔ حقیقت میں ملایا میں مقامی انتخابات کو وہی اہمیت حاصل ہو گئی جو بہت زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں اس قسم کے علاقائی یا مقامی انتخابات کو حاصل ہے جہاں یہ انتخابات مختلف بااثر قومی سیاسی جماعتوں کے اقتدار اور اثر کی امتحان گاہ بن گئے ہیں۔

وفاق ملایا میں بلدیات (بربندران) ہنوز عبوری دور میں ہیں۔ بلدیاتی فرمان پر اب تک پورے وفاق میں پوری طرح عمل شروع نہیں ہوا۔ (جارج ٹاؤن سٹی کونسل اور کوالالامپور اور ملاکا کی بلدیات کے علاوہ وفاق میں اس وقت ستائیس بڑے شہروں میں منتخب شدہ ٹاؤن کونسلیں ہیں، جن میں سے بارہ مالی طور پر خود مختار ہیں

تسلیم کر لیا گیا۔ اس طرح عوام اور کونسل میں جو خلیج حائل ہو گئی تھی وہ ختم ہو گئی اور انگریزی نہ جاننے والے تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے انتخابات میں کھڑے ہونے کے مواقع بھی پیدا ہو گئے اور ترقی اور تبدیلی کے رجحانات بھی عام ہونے لگے۔ سنگاپور، جارج ٹاؤن اور ملاکا کے شہر اور قلعے کی بلدیات ہمیشہ سے وہ خدمات انجام دیتی رہی ہیں جو مقامی یا اختیار اداروں کو انجام دینی چاہئیں۔ اس کے علاوہ انہیں اس کی بھی اجازت تھی کہ وہ پانی کی بہم رسانی، گیس اور بجلی کے انتظام بھی پوری طرح اپنے ہاتھ میں لے لیں۔

ریاستہائے ملایا اور جزیرہ نما میں برطانوی طریق نظم و نسق کے اجرا کے بعد ایک بالکل نئے انداز کی لوکل گورنمنٹ کا رواج ہو گیا۔ یہ نظام سب سے پہلے پیرک Perek کی وفاق ریاستوں، نگری سمبلان Negri Sembilan اور پہنگ Pahang میں قائم ہوا۔ غیر وفاق ریاستہائے ملایا نے بھی اس طرح کے اداروں کے نام اور اختیارات میں تھوڑی بہت مقامی ترمیمیں کر کے اختیار کر لیا۔ یہ چیز پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ بلدیاتی مجالس لوکل گورنمنٹ سے کم اور مرکزی حکومت سے زیادہ قریب تھیں۔ وہ پوری سلطنت کے تابع تھیں اور ان کے تمام ملازم سلطنت کے ملازم تھے۔ میونسپل کمیشن کے خلاف وہ قانونی طور پر مرکزی حکومت سے آزاد نہیں تھے بلکہ ایک لحاظ سے ان کے نمائندے تھے۔ صدر اور اراکین کو مرکزی حکومت غیر معینہ مدت کے لیے مقرر کرتی تھی، چار سال کے لیے نہیں، جیسا کہ میونسپل کمیشن کی صورت میں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ان بلدیاتی مجالس اور میونسپل کمیشنوں میں یہ بھی فرق تھا کہ ان کا دائرہ عمل شہر سے باہر آس پاس کے دیہات تک پھیلا دیا گیا تھا۔

*Federation of Malaya Colony of Singapore government gazette* (۱۰) شماره ۵، نومبر ۱۹۵۷ء؛  
*supplement*، شماره ۲۳ و شماره ۲۴، ۱۹۵۷ء؛ (۱۱)  
*Singapore legislative assembly select committee Report No. L.A. 10 'on Local Government Bill*  
 1957؛ (۱۲) *Municipal Ordinance (extended appli-*  
*cation ordinance 1948*؛ (Federation of Malaya)  
 (۱۳) ثانوی ذرائع: S.W. Jones: *Public administration*: S.W. Jones: *in Malaya*  
 مطبوعہ اوکسفورڈ۔  
 (زکی بدوی)

### (۷) انڈونیشیا :

انڈونیشیا کے اسلام سے پہلے کے قدیم شہروں اور قصبوں، جیسے قدیم *Matram*، یا بعد میں *Modjopahit* یا *Tuban*، *Gresik* یا *پلمبگ* کے عظیم الشان مراکز کی سیاسی زندگی اور طرز حکومت کے متعلق ہمیں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ اس وقت تک ایسی کوئی شہادت میسر نہیں آسکی جس کی بنا پر کہا جاسکے کہ وہاں کبھی کسی شکل میں حکومت یا عوامی اداروں میں کسی طرح کی آزادی حاصل تھی یا نہیں۔ جب ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی کے بعد سے اسلام بتدریج تمام سماترا اور جاوا میں اور مجمع الجزائر کے بہت سے دوسرے شہروں میں پھیلنا شروع ہوا تو ایسے مقامی اداروں کی کمی رہی۔ سولہویں اور سترھویں صدی عیسوی کے یورپی اور غیر یورپی دونوں قسم کے مآخذ ہمیں بتاتے ہیں کہ شہروں یا شہری منڈیوں کے باشندوں پر سلطان کے خدام یا شہزادوں کی فرمانروائی ہوتی تھی اور ان کے قصابات کی حیثیت قانونی یا عدلی وحدت کی نہیں تھی۔ ماضی بعید یا ماضی قریب میں انڈونیشیا کے اصلی قدیم شہروں نے قانون کے نشو و ارتقا پر کبھی

اور دوسری اس طرف قدم بڑھا رہی ہیں)۔ توقع ہے کہ فرمان میں ایسی ترمیمیں کر دی جائیں گی جن سے جدید بلدیاتی ضروری تقاضوں کو برقرار رکھتے ہوئے ہر ایک مقامی فرق اور ضرورت ملحوظ رکھتے ہوئے اسے اپنایا جاسکے۔

مآخذ: ملایا میں بلدیات کی ابتدا اور ان کی ابتدائی نشو و ارتقا کے لیے دیکھیے: (۱) *Buckley* و *History of Singapore*: C. Burton، سنگاپور ۱۹۰۲ء؛ (۲) *Records of the East India Co.* B. Pub. Range 12، جلد ۶۹، ۳۰ اکتوبر ۱۸۳۲ء؛ B. Pub. Range 13، جلد ۲۷، ۲ مئی ۱۸۳۸ء؛ B. Pub. Range 13، جلد ۷۷، ۱۳ جون ۱۸۳۹ء؛ B. Pub. Range 13، جلد ۷۹، ۱۷ اکتوبر ۱۸۳۹ء؛ P.P Command Papers، ۳۶۷۲، جلد ۵۲، ۱۸۶۶ء۔

۱۹۳۸ء تک میونسپل اداروں کے کام اور ان کے نشو و ارتقا سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے دیکھیے: (۳) *Local Government*: W.C. Taylor *in Malaya* - اس کتاب میں میونسپل کمیشنوں کے طریق کار، ہنانگ کی میونسپل کمیشن اور ملایا میں دوسرے لوکل گورنمنٹ اداروں کے طریق کار کا وقت تحریر کتاب پر نہایت بیش قیمت معلومات ہیں۔ نیز دیکھیے: (۴) *Municipal Ordinance of the Straits settlements (Annotated) Report of the Committee on local Government 1956* (سنگاپور کی نوآبادی)؛ (۶) *Report on the reform of Local Government 1952*؛ (۷) *Report on the introduction of elections in the municipality of George Town, Penang*، ۱۹۵۱ء؛ (۸) *Annual reports of the straits settlements and the Malay States*، قبل از ۱۹۳۸ء - ملایا میں موجودہ وقت میونسپلٹیوں کے کاروبار اور ان کی ساخت سے متعلق دیکھیے: (۹) *Fact sheets on the*



مالی وسائل سپیا کرنا (ہم یہاں علاقائی مجالس پر بحث نہیں کریں گے)، گویا اس ایکٹ کا مقصد یہ ہرگز نہ تھا کہ انڈونیشیا کے دیہی اور حقیقی معنوں میں ملکی اداروں میں باہمی جو فرق و اختلاف تھا اس کی اصلاح کی جائے۔ اس میدان میں ہر ایک چیز کی بنیاد قانونی رواج (عادات) پر رکھی گئی تھی اور اس کے لیے مخصوص قواعد و ضوابط بنائے گئے تھے۔ قانون کے اس نئے باب نے بالواسطہ یہ بتا دیا کہ بلدیاتی ادارے کس طرح قائم کیے جائیں۔

بڑے بڑے شہروں مثلاً *Batavia* (موجودہ جاکارتا)، *Srayia*، *Serang*، *Bandung* اور شہروں سے ملتی جلتی بہت سی دوسری بستیوں کا انداز مغربی ہو گیا۔ یورپ کے لوگوں اور چینیوں کی بہت بڑی اکثریت اور متعدد دوسری غیر انڈونیشی جماعتیں وہاں آباد تھیں۔ خود انڈونیشی باشندے بھی زیادہ تر نسل، زبان اور عادت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مغربی تجارتی اور صنعتی کاروبار کے مراکز بھی انہیں مقامات پر تھے۔ اس قسم کے بڑے بڑے نیم مغربی اور نیم مشرقی اجتماعی مراکزوں میں وہ تمام مسائل موجود تھے جو عموماً بڑے بڑے شہروں میں ہر جگہ دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان تمام مسائل کو بلدیاتی افسر اور ملازمین مرکزی حکومت کے سول سروس کے افسروں کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے سے حل کر سکتے تھے۔ آگے چل کر ۱۹۰۰ء میں گورنر جنرل نے جو قانونی اقدام کیے ان کی غرض اس مقصد کی تکمیل تھی جو بنیادی قانون میں پیش نظر رکھا گیا تھا۔ *Batavia* بلدیہ بن گیا۔ شروع شروع میں بلدیہ کے ارکان منتخب نہیں کیے جاتے تھے بلکہ گورنر جنرل نامزد کرتا تھا۔ *Batavia* کا ریزیڈنٹ کونسل کل سرکاری صدر ہوتا تھا۔ میئر کونسل

کوئی تخلیقی اثر نہیں ڈالا جیسا کہ مغربی یورپ کے قصبات اور شہروں نے اپنے قانون ساز اداروں اور مخصوص بلدیاتی عدالتوں کے ذریعے ڈالا ہے۔

جو قصبے ڈچ ایسٹ انڈین کمپنی کے زیر اقتدار آئے یا اس شاہی فرمان سے قائم شدہ کمپنی نے بنائے (مثلاً *Batavia*) ان میں سترھویں صدی کے مغربی وضع کے بعض شہری ادارے قائم کیے گئے جن میں سے *Weeskamer* (یتیموں کے معاملات کی دیکو بہال کرنے والی کونسل) کا ذکر کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ یہ کمپنی کے ختم ہونے کے بعد آج بھی موجود ہے۔ جب یورپی اور مجمع الجزائر کے غیر انڈونیشی باشندوں کے لیے انیسویں اور یسویں صدی میں شہری قانون پاس کیا گیا تو اس میں بھی اس کا اثر نظر آتا ہے۔

جب کمپنی کے خاتمے اور برطانیہ کا عارضی دور ختم ہو جانے پر یہ جزیرے ہالینڈ کی سلطنت کا حصہ بن گئے (۱۸۱۶ء) تو وہاں ایک ایسا نظام حکومت قائم کیا گیا جو اپنی نوعیت میں حد درجہ مرکزی اور خالصتاً سرکاری معلوم ہوتا تھا۔ یہ نظام بغیر کسی رد و بدل کے انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہا۔ جبکہ بعض نہایت مشہور و ممتاز خصوصی مستعمرین کے زیر اثر "لامرکزیت" کے خیالات کا غلبہ شروع ہوا۔ اگرچہ ۱۸۹۳ء اور بعد کے چند برسوں میں متعدد قانونی مسودوں پر غور و خوض کیا گیا (جو قانون ساز مجلسوں سے پاس نہیں ہوئے)، لیکن لامرکزیت کا قانون، جس کا نام *Indische decen-tralisatiewet* تھا، ۱۹۰۳ء سے پہلے پاس ہو گیا تھا۔ اس ایکٹ کے دو مقاصد تھے۔ مقامی اور علاقائی عوامی مجالس کی تخلیق کے لیے راستہ ہموار کرنا، دوسرے ان مجالس کے اخراجات کے لیے

معلوم ہوا کہ صدر بلدیہ کا عہدہ کسی یورپی ہی کو دیا جائے۔ Wethouders (سرپنچ) کا انتخاب کونسل اپنے ہی ارکان میں سے کرتی تھی۔ یہی رکن بل کر کونسل کی مجلس منتظمہ کہلاتے تھے، جس کی صدارت برگوماسٹر (= صدر بلدیہ) کرتا تھا۔ دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے کے دس برسوں میں حکومت نے انڈونیشی صدر بلدیہ مقرر کرنے شروع کیے۔ موجودہ انڈونیشی جمہوریہ میں اس کے ہنگامی آئین کی دفعہ ۱۳۱ کی رو سے اختیارات کی تقسیم، نیز آزادی و خود مختاری اور مقامی حکومت کا اصول تسلیم کیا گیا ہے، لیکن اس اصول کو عملی شکل دینے کے لیے جو نئے قانونی ضابطے بنائے گئے ہیں ان پر اب عمل شروع نہیں ہوا۔ کم از کم جاوا کے لیے یہ ہوا ہے کہ ۱۹۴۸ء (عدد ۲۲) کے ایک قانون نے، جسے سابق انڈونیشی جمہوریہ (Vulgo: the Jogja-republic) نے نافذ کیا تھا، علاقے کے خود مختار حصوں کو تین مدارج میں باقاعدہ طور پر تقسیم کر دیا ہے: (۱) صوبجات؛ (۲) kabupaten یا ریجنسیاں اور بڑے بڑے شہر؛ (۳) چھوٹی بلدیات اور دیہی وحدتیں۔ مذکورہ ہنگامی آئین (undang-undang dasar Republik Indonesia) شائع شدہ ۲۷ اگست ۱۹۵۰ء کی دفعہ ۱۴۲) کی رو سے وہ تمام سابق قواعد جو بالصراحت منسوخ یا تبدیل نہیں کیے گئے، جمہوریہ کے فرامین یا قواعد سمجھے جائیں گے۔ اس طرح گویا شہری بلدیات سے تعلق رکھنے والے جنگ سے پہلے کے قوانین کے تمام ضروری حصے اب تک نافذ ہیں، اگرچہ صدر بلدیہ کو آج کل سرکاری طور پر ولیکوٹا wali kota کہتے ہیں۔ میونسپل کونسل کو ان کی تقرری میں دخل حاصل ہے اور کونسل کے ارکان کے انتخاب کا حق اٹھارہ سال سے زیادہ عمر کے مردوں اور عورتوں کو یا ان لوگوں کو حاصل

Meester-Cornelis، اور بوٹن زرگ Buitenzorg، (موجودہ جاتی نگر Djatinegara اور بوگور) میں بھی ۱۹۰۵ء میں بلدیاتی مجالس قائم ہو گئیں۔ یہ جدید نظام بتدریج ترقی کرتا گیا یہاں تک کہ جاوا کے تمام شہروں اور بڑے بڑے قصبوں نیز دوسرے مقامات کے بڑے بڑے شہروں (میدان Medan، پمتنگسیانتر Pamatangsiantar، بدنگ Padang، مکسر Makassar، میناڈو Menado وغیرہ) میں بلدیات قائم ہو گئیں اور ۱۹۱۸ء کے بعد سے ان کونسلوں کے ارکان کو وہاں کے باشندے خود منتخب کرنے لگے۔

۱۹۲۵ء سے جاوا کے ہر بلدیاتی ادارے کے ہر بالغ مرد کو، جس کی کم سے کم سالانہ آمدنی تین سو گلڈر ہو اور جو ڈچ، ملائی یا کسی ملکی زبان میں لکھ پڑھ سکتا ہو، ووٹ دینے کا حق حاصل ہو گیا۔ بیرونی صوبوں میں دوسرے قواعد رائج ہو سکتے تھے۔ یہ نئی بلدیات اجتماعی وحدتیں بنا دی گئیں۔ شہری بلدیات کی سرگرمیوں میں سڑکوں، باغوں، تفریح گاہوں اور بدرروؤں کا انتظام، آگ بجھانے کی خدمت، رفاہ عامہ اور صحت عامہ کے کام شامل تھے۔ انہیں بلدیاتی قواعد و ضوابط بنانے کا اختیار تھا۔ ۱۹۱۶ء میں ایک نئے آرڈیننس کی رو سے حکومت کو ان شہروں اور قصبوں کے لیے صدر بلدیہ (burgomaster) مقرر کرنے کا اختیار مل گیا، جہاں ایسے افسر کی ضرورت محسوس ہوتی تھی (ہالینڈ کی طرح صدر بلدیہ مرکزی حکومت کی طرف سے مقرر کیے جاتے تھے)۔ ان کے مشاہرے مرکزی حکومت ادا کرتی تھی۔ اس کا کچھ حصہ بلدیاتی خزانے سے لیا جاتا تھا چونکہ یہ بلدیاتی مجلس اس سر زمین میں جو "قانون عادت" کی پابند تھی مغربی وضع کا محروسہ علاقہ سمجھا جاتا تھا اس لیے پہلے بیس برسوں میں یہ آسان



خالص مقامی خاندان کی بنیاد ڈالی، جس کا اقتدار ۱۵۰۰ء / ۱۵۰۰ء تک قائم رہا۔ بنو کلب کا دور حکومت نہ صرف بلرم، بلکہ پورے جزیرہ صقلیہ میں، عربوں کے عہد کا سب سے شاندار زمانہ تھا۔ اس خاندان کے آخری حکمران صمصام کو، جو ایک مدت کی شورش اور فساد کے بعد افریقہ کے زیری خاندان کی براہ راست مداخلت سے تخت پر بیٹھا تھا، ۱۵۰۵ء / ۱۵۰۳ء میں شہر بدر کر دیا گیا اور اس کے بعد بلرم کی "جماعت" یا بلدیہ نے یہاں کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس دوران میں دارالسلطنت اور ملک کے باقی حصوں کے درمیان باہمی روابط بہت کمزور پڑ گئے اور بالآخر بالکل ختم ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ نارسوں کے خلاف صقلیہ کی اسلامی حکومت کے دفاع میں اہل بلرم نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا اور بڑی بے نیازی سے اپنے فاتحین کا انتظار کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ شہر پناہ کے نیچے پہنچ گئے، لیکن اس موقع پر انہوں نے پوری تندہی سے مدافعت کی۔ آخر کار پانچ ماہ کے محاصرے کے بعد ربیع الآخر ۱۵۰۶ء / جنوری ۱۵۰۲ء میں رابرٹ Robert اور روجر د ہاتویل Roger d' Hauteville کے آگے ہتھیار ڈال دیے گئے۔ یوں گویا یہ جزیرہ ڈیڑھ سو سال کے اسلامی عروج اور غلبے کے بعد ایک مرتبہ پھر عیسائیوں کے قبضے میں آ گیا، لیکن بلرم سے عربوں کے اثرات بتدریج ہی محو ہو سکے۔ اگرچہ قبضے کے فوراً بعد یہاں کی جامع مسجد کو عیسائی عبادت گاہ بنا دیا گیا اور مسلمان اس کے بعد سے وہاں نارسوں کی رعایا بن کر رہے، لیکن عرب آبادی، عربی یادگاروں اور عربی رسم و رواج کو مٹتے مٹتے بھی ایک صدی سے کچھ زیادہ مدت لگی۔ خاصے عرصے بعد، یعنی ۱۵۰۸ء / ۱۱۸۳ء میں، مسلمان سیاح ابن جبیر بلرم پہنچا تو اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کے لیے بعض

ہوگا جن کی شادی اس عمر میں پہلے ہو چکی ہو۔ جکارتا [رک بان] کی مخصوص اور ہنگامی حالت کا ذکر جہاں کونسل کے چوبیس ارکان کا تقرر حکومت کرتی ہے، یہاں بے محل ہے۔

مآخذ: (۱) Ph. Kleintjes : *Staatsinstellingen*

(۲) *van Nederlands-Indië*، بار پنجم (۱۹۲۹ء)، جلد ۲،

باب ۱۹؛ (۳) *De Nederlandsch-Indischē* : H. Westra

*staatsregeling*، بار دوم (۱۹۳۳ء)، ورق ۳۱۸؛ (۴)

*Het Staatsrecht van Indonesië* : J. H. Logemann

*The* : A. A. Schiller (۳)؛ ۱۹۲ تا ۱۵۸

۱۹۵۳ء ص *formatton of federal Indonesia*، ۱۹۵۰ء ص

۱۳۸ تا ۱۴۷

(J. PRINS)

\* بلرم : (= پالمو Palermo)، جزیرہ صقلیہ میں عربوں کی آمد کے چار سال بعد یہ مقام رجب ۲۱۶ھ / اگست - ستمبر ۸۳۱ء میں ایک مختصر سے محاصرے کے بعد ان کے قبضے میں آ گیا اور معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے سے جزیرہ مذکور میں یہ مسلمانوں کے تفوق و اقتدار کا مضبوط مرکز بن گیا۔ یہاں کے عاملین نے پہلے افریقہ کے بنو اغلب اور پھر فاطمی خلفا کے ماتحت اسے اپنا صدر مقام قرار دیا، تاہم فاطمیوں کو متعدد بار اس سرکش نوآبادی میں اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے مہمیں بھیجی گئیں۔ ان میں سے ایک مہم تو عبداللہ بن ابراہیم بن الاغلب کی تھی، جو اس کے والد نے ۲۸۷ھ / ۹۰۰ء میں بھیجی اور دوسری ابو سعید کی، جو فاطمی خلیفہ سیدی نے ۳۰۴ھ / ۹۱۶-۹۱۷ء میں روانہ کی تھی۔ ہر ایک شہر کے بالمقابل خالصہ (Calsa) کا قلعہ اسی نے تعمیر کرایا تھا۔ ۳۳۶ھ / ۹۴۷-۹۴۸ء میں فاطمی عامل الحسن بن علی الکلبی نے بلرم کی حکومت پر قبضہ کر کے فاطمی حکومت کے زیر حمایت ایک

ہی کم ہیں، مثلاً S. Giovanni degli Eremiti کے کلیسا کے قریب ایک مسجد کے آثار اور شاہی محل (Torre pisana) کے اندرون عمارت میں قدیم فن تعمیر کے چند نمونے حال ہی میں منظرِ عام پر آئے ہیں۔

مآخذ: (۱) M. Amari: *Storia dei Musulmani*

*di Sicilia* Catania ۱۹۳۳-۱۹۳۸ء، بمواضع کثیرہ؛

(۲) ابن حوقل، طبع ڈخویہ، در BGA، ۱: ۸۲ تا ۸۷؛ (۳)

ابن جبیر، طبع رائٹ Wright و ڈخویہ، در GMS،

۵: ۳۳۱ تا ۳۳۳؛ (۴) الادریسی، طبع Amari و

*L' Italia nel libro del Re Ruggero*: Schiaparelli

روم ۱۸۸۳ء، ص ۲۲ تا ۲۳ (متن) و ۲۵ تا ۲۷ (ترجمہ)؛

(۵) *Per la topografia antica di*: G.M. Columba

*Palermo*، در *Centenario Amari*، پالمو ۱۹۱۰ء،

۲: ۳۹۵ تا ۴۲۶؛ (۶) *L' Italia*: U. Rizzitano

*nel Kitab ar-Rawd al-mi'ār*، (عربی متن [الروض

المعطار])، قاہرہ ۱۹۵۸ء، ص ۱۳۶ تا ۱۳۸۔

(F. GABRIELI)

بَلَطَه جی : رَکْ بَہ بِالطَه جی .

بَلَعَم بِن بَاعُور : بَلَعَم (عبرانی میں بلعم) کو!

بَلَعَم یا بَلَعَام اور بَاعُور کو بَاعُورا یا بَعُور (نیز

الطبری کے ہاں بَاعَر یا اَبَر) بھی لکھا جاتا ہے۔

عربی زبان میں بَلَعَم کا مطلب ہے: (۱) بسیار خور

(۲) گدھے کی ناک پر سفید نشان (دیکھیے

لسان و تاج)۔

توریت، کتاب العدد، باب ۲۲ تا ۲۴، کی رو

سے بلعام بن باعور ایک مستجاب الدعوات شخص

تھا، جسے بالاق، شاہ موآب، نے بنو اسرائیل کے

حق میں بد دعا دینے کے لیے طلب کیا، لیکن خدا

کے حکم سے اس کی زبان سے بار بار ان کے حق میں

دعا ہی صادر ہوئی۔ کتاب العدد، ۳۱: ۱۶،

سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد ازان بلعام کے کہنے

علاقے مخصوص کر دیے گئے ہیں اور مسجدوں، مدرسوں اور بازاروں میں ان کی کثرت ہے اور عربی زبان خاصی بولی جاتی ہے۔ نارمنوں کے دارالحکومت میں ان مسلمانوں کی حالت جو روجر نام کے دو حکمرانوں کے روادارانہ عہد میں خاصی اچھی رہی ان کے جانشینوں کے زمانے میں بہت ابتر ہو گئی۔ ۵۵۶ / ۱۱۶۱ء میں یہاں مسلمانوں کے خلاف ایک بلوہ ہوا جس میں ان کا منظم طور پر قتل عام کیا گیا۔ پھر ولیم ثانی کی موت (۱۱۹۰ء) کے بعد ہونے والے فسادات کے باعث حالات ان کے لیے ناقابل برداشت ہو گئے۔ چھٹی صدی ہجری/بارہویں صدی عیسوی کے اختتام تک بلرم میں عرب بستی کا وجود قریب قریب ختم ہو چکا تھا اور محض چند معزز مسلمان فریڈرک ثانی کے دربار میں باقی رہ گئے تھے۔

عربوں کے عہد میں ہمیں بلرم کے حالات کا جن لوگوں کے بیانات سے بیش قیمت علم ہوتا ہے وہ سدرجہ ذیل ہیں: ابن حوقل، جس نے ۵۳۶ / ۱۱۴۲ء میں اس شہر کو دیکھا؛ ابن جبیر اور الادریسی، جو دو صدی بعد نارمنوں کے عہد میں یہاں آئے۔ ابن حوقل کے بیان کے مطابق بنو کلب کا یہ دارالحکومت پانچ حصوں میں منقسم تھا: قصر (Cassaro)، یعنی قدیم شہر، جس کے گرد فصیل تھی؛ خالصہ (Calsa)، جس کی بنیاد فاطمیوں نے رکھی تھی اور اس کے گرد بھی فصیل تھی؛ جنوب میں الحبارۃ المسجد اور الحبارۃ الجدیدہ کے کھلے علاقے اور شمال میں الحبارۃ الصقالبہ۔ بنو کلب کے زمانے میں Amari کے اندازے کے مطابق بلرم کی آبادی تین یا ساڑھے تین لاکھ تھی۔ عربوں کے دورِ حکومت کے جو آثار اس وقت موجود ہیں وہ (نارمن اسلامی فن تعمیر کی مشہور یادگاروں سے قطع نظر) بہت



وہ ہو گیا گمراہوں میں۔ اور ہم چاہتے تو بلند کرتے اس کا رتبہ ان آیتوں کی بدولت، لیکن وہ تو ہو رہا زمین کا اور پیچھے ہو لیا اپنی خواہش کے۔ تو اس کا حال ایسا جیسے کتا، اس پر تو بوجھ لادے تو ہانپے اور چھوڑ دے تو ہانپے۔ یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو۔ سو بیان کر یہ احوال تاکہ وہ دھیان کریں۔

الطبری نے اپنی تفسیر میں جو روایات بیان کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل یا مدینۃ الجبارین سے، یا اہل یمن میں سے یا کنعانیوں میں سے تھا (تفسیر، ۱۳ : ۲۵۲ بیعد)۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان آیات کا اشارہ زمانہ جاہلیت کے حکیم شاعر امیہ بن ابی الصلت (رکبآن) کی طرف ہے جو اگرچہ اہل کتاب کی صحبت میں خداپرستی اور دینداری کے خیالات سے آشنا ہو گیا تھا، لیکن بعثت نبوی کے بعد اس نے اتباع حق نہ کیا اور طمع کی کہ وہ خود عرب کا پیغمبر کیوں نہ ہوا، چنانچہ ادراک حق کی جو توفیق اسے دی گئی تھی وہ ضائع گئی اور ہوائے نفس کی پیروی نے اسے محروم و نامراد کر دیا (الطبری، حوالہ مذکور؛ ترجمان القرآن، ۲ : ۴۴)۔ ایک راے یہ بھی ہے کہ یہاں صفی بن راہب کا ذکر ہے، جو بعض کے نزدیک بلقا کا باشندہ تھا، اسم اعظم سے واقف تھا اور جبارین کے ساتھ بیت المقدس میں رہتا تھا اور بعض کے نزدیک وہ ایک یمنی تھا جس نے کلام خدا کو ترک کر دیا تھا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ علمائے بنی اسرائیل میں سے تھا، جس کی دعا مقبول ہو جاتی تھی اور سختیوں کے وقت بنی اسرائیل اسے آگے کر دیا کرتے تھے۔ اسے حضرت موسیٰ نے دعوت دین دینے کے لیے مدین کے بادشاہ کے پاس بھیجا، جس نے اسے کئی گاؤں اور بہت سا انعام و اکرام دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اور

پر مدیانیوں نے اپنی عورتیں بنو اسرائیل کے پاس بھیجی تھیں تاکہ وہ آمادہ گناہ ہو کر عتاب الہی کے مورد ہوں، چنانچہ اسی کی پاداش میں دوسرے مدیانیوں کے ساتھ بلعام بھی فینحاس بن الیعزر بن ہارون کے ہاتھوں قتل ہوا (نیز دیکھیے کتاب العدد، ۳۱ : ۸ و کتاب یسوع، ۱۳ : ۱۲)۔ بعض اسرائیلی روایات میں بتایا جاتا ہے کہ بلعام اور آدم کا بادشاہ بالغ بن بعور (تکوین، ۳۶ : ۳۲) یا آرام کا باپ قومئیل (تکوین، ۲۲ : ۲۱) یا یعقوب کا خسر لابن (تکوین، ۳۰ : ۲۷) ایک ہی شخص تھا (تفصیل کے لیے دیکھیے *Jewish Encyclopaedia*، ۲ : ۴۶۸، ۴۶۹)۔ پطرس الفانسوس *Petrus Alphonsus* کی راے میں بلعم وہی ہے جسے عربی میں لقمان کہتے ہیں (*Patr. Lat.*، ۱۵۷ : ۶۷۳، *Bibl. ar.*، ۳ : ۷، ماخذ)، لیکن اسے حکیم لقمان بن باعور سے ملتبس نہ کرنا چاہیے، جن کا ذکر الثعلبی نے *قصص الانبیاء* میں کیا ہے۔

انجیل کی رو سے بلعام نے نہ صرف خود گمراہی اختیار کی بلکہ بالاق کو بتوں کی قربانیاں کرنے اور زنا کاری کی بھی تعلیم دی (پطرس، ۲ : ۱۵؛ یہودا، آیت ۱۱؛ رؤیا یوحنا، ۲ : ۱۴)۔

قرآن مجید میں بلعم بن باعور کا نام نہیں آیا، تاہم بعض مفسرین کے نزدیک مندرجہ ذیل آیات میں اسی کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے : **وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخْنَا مِنْهَا فَاتَّبَعَ الشَّيْطَانَ فَكَانَ مِنَ الْغَافِلِينَ ۝ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هُدًى فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۖ إِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ أَوْ تَتْرَكْهُ يَلْهَثُ ۚ ذَٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا ۚ فَاقْصِرْ الْقِصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝ (۷ [الاعراف] :**

۱۷۵ و ۱۷۶ = اور سنا دے ان کو حال اس شخص کا جس کو ہم نے دی تھی اپنی آیتیں۔ پھر وہ ان کو چھوڑ نکلا۔ پھر اس کے پیچھے لگا شیطان تو

۶۷۳: (۱۰) Sidersky، ص ۱۰۵ تا ۱۰۸؛ (۱۶)؛  
 Chronicon Samaritanum، طبع Th. W. J. Juynboll،  
 لائڈن ۱۸۳۸ء، ۱۳۳/۳ تا ۱۳۸/۸؛ (۱۷)؛  
 Encyclopaedia Britannica، بذیل مادہ؛ (۱۸) Jewish  
 Encyclopaedia، بذیل مادہ؛ (۱۹)؛ (۱۹)؛ ع، بذیل مادہ۔  
 D. B. MACDONALD و G. VAJDA [وادارہ]

- بلعمی: دو سامانی وزرا (باپ اور بیٹے) کی نسبت، جن میں سے مؤخر الذکر (یعنی بیٹا) الطبری کی مشہور تاریخ کے مترجم کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہے۔ اس نسبت کی اصل کا علم نہیں۔ السمعانی (کتاب الانساب، ورق ۹۰ راست) نے ابن ماکولا (برا کلمان، ۱: ۳۵۴) کی توضیح بیان کی ہے کہ یہ بلعم سے ہے، جو یونانیوں کی سرزمین میں ایک شہر تھا (بلد من دیار الروم)۔ یہ مقام اور تو کسی لحاظ سے معروف نہیں، لیکن شاید یہ وہی Balaam ہے جس کا ذکر پرسکس Priscus نے ۴۷۲ء میں کیا ہے (Excerpta de Legationibus، طبع بون، ص ۱۶۵)۔ بقول المعدانی (قب السمعانی، ورق ۵۳۶ راست [طبع حیدرآباد، دکن ۱۹۶۳ء، ۲: ۳۱۴]) یہ بلعمان سے ہے، جو مرو کے قریب [قربہ] بلاشجرد [کے نیچے] ایک مقام تھا۔ دونوں ماخذ یہ بیان کرتے ہیں کہ بلعمیوں کا مورث اعلیٰ عرب قبیلہ بنو تمیم کا ایک [شہسوار] تھا جو بقول ابن ماکولا عہد ابتدائے اسلام میں مسلمہ بین عبدالملک اور بقول المعدانی قتیبہ بن مسلم کے جیش میں شریک تھا۔ اب ان دونوں وزرا کے کوائف آتے ہیں:

(۱) والد: ابوالفضل محمد بن عبید اللہ (جس کا نام بعض اوقات عبداللہ البلعمی التیمی بھی لکھا گیا ہے) کے بارے میں السمعانی نے ایک سے زیادہ بار لکھا ہے (ورق ۹۰ راست، ۲۶۲ چپ) کہ وہ سامانی امیر اسمعیل بن احمد (۵۲۷۹/

اس نے دین موسوی ترک کر دیا (تفسیر ابن کثیر، بذیل [الاعراف]: ۱۲۵ و ۱۲۶)۔ بہر حال مذکورہ بالا آیات میں جس شخص کا ذکر آیا ہے اس کے نام کی تصریح قرآن و حدیث میں نہیں ملتی، چنانچہ مفسرین نے عہد رسالت اور اس سے پہلے کی تاریخ کے مختلف اشخاص پر اس مثال کو چسپاں کر دیا (تفہیم القرآن، ۳: ۱۰۰)۔

ابن قتیبہ نے وہب بن سنیہ سے منسوب ایک روایت بیان کی ہے (کتاب المعارف، ص ۲۱) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بلعم اس جماعت کا ایک فرد تھا جس میں حضرت خضر<sup>۴</sup> اور شعیب<sup>۴</sup> شامل تھے اور جو حضرت ابراہیم<sup>۴</sup> پر ایمان لائے تھے اور ہجرتِ شام میں ان کے ہمراہ تھے۔ حضرت ابراہیم<sup>۴</sup> نے، لوط<sup>۴</sup> کی ایک بیٹی بھی اس سے بیاہ دی تھی۔ یہ قصہ بالکل بے بنیاد اور غالباً یہودیوں کا وضع کردہ ہے۔

البلخی سے غلط طور پر منسوب تصنیف البدء و التاريخ میں ابدیت عالم کے بارے میں چند اولیدہ خیالات بلعم سے منسوب کیے گئے ہیں۔  
 ماخذ: مختلف تفاسیر قرآن، مثلاً (۱) الطبری، مطبوعہ مصر، ۱۳: ۲۵۲؛ (۲) ابن کثیر، ۱، بذیل [الاعراف]: ۱۲۵، ۱۲۶؛ (۳) ابوالکلام آزاد: ترجمان القرآن، ۲: ۴۴؛ (۴) ابو الاعلیٰ مودودی: تفہیم القرآن، ۲: ۱۰۰؛ نیز دیکھیے؛ (۵) بائبل (حوالے متن میں درج ہیں)؛ (۶) ابن قتیبہ: معارف، ص ۲۱؛ (۷) المحاسبی: رعایة، ص ۲۵۶ بعد، ۲۸۲؛ (۸) الطبری: تاریخ، ۱: ۵۰۸ تا ۵۱۰؛ (۹) المسعودی: مروج، ۱: ۹۹ تا ۱۰۰؛ (۱۰) البلخی (؟): البدء و التاريخ، ۱: ۵۱/۵۲، ۷۷/۷۸، ۹۰/۹۱، ۱۳۱/۱۳۰، ۱۳۸/۱۳۳؛ (۱۱) الثعلبی: عرائس المجالس، ص ۱۳۳، ۱۹۶؛ (۱۲) الکسائی: قصص الانبیاء، ص ۲۲۷؛ (۱۳) الفزالی: احیاء، ۳: ۲۹۳؛ (۱۴) Petrus Alphonsi، در PL، ۱۵۸:



آئیں۔ المقنسی (ص ۳۳۸) نے اسے بصیغہ تصغیر  
ایبیرٹکا بلعی لکھا ہے اور بیان کرتا ہے کہ  
وہ ۵۰ مرتبہ عبدالملک کے جانشین المتصور الاول بن  
نوح (۵۳۵/۵۹۶ تا ۵۳۶/۵۹۷) کا وزیر  
ہوا اور اسی نے اسے ۵۳۵/۵۹۶ میں الطبری کا  
ترجمہ کرنے کا حکم دیا تھا (قَب Catalogue : Rieu  
'of the Persian MSS. in the British Museum  
۱ : ۶۹)۔ اس ترجمے کی وجہ سے اسے بڑی شہرت  
حاصل ہوئی۔ یہ ترجمہ موجودہ فارسی نثر کی  
قدیم ترین تصانیف میں سے ہے اور اس سے فارسی  
کی تاریخی تصانیف کے ایک طویل اور درخشاں دور  
کا آغاز ہوتا ہے۔

بلعی نے تاریخ کو اپنے عہد تک لانے کی  
کوشش نہیں کی۔ وہ سلسلہ اسناد کو حذف کر دیتا  
ہے اور ایک ہی واقعے کے کئی متبادل بیانات کو،  
جو الطبری کی ایک خصوصیت ہے، چھوڑ دیتا ہے  
اور ان بیانات سے جو ایک مسلسل و مربوط واقعہ  
نکلتا ہے صرف اسے پیش کرنے پر اکتفا کرتا  
ہے۔ بعد کے آنے والے عرب مؤرخین نے اسی  
طریقے کا تتبع کیا، مثلاً ابن الاثیر (قَب G. Weil :  
'Geschichte der Caliphen' ۳ : ۱۰)۔ اس کا نتیجہ  
یہ ہے کہ یہ کتاب اصل کے مقابلے میں بہت  
مختصر ہو گئی ہے (الطبری، طبع لائڈن، ۱۰ جلد  
کے مقابلے میں فرانسیسی ترجمہ از Zotenberg، ۴  
جلد اور طبع لکھنؤ صرف ایک جلد)۔ بایں ہمہ  
بلعی کی تاریخ محض الطبری کا اختصار نہیں ہے۔  
وقتاً فوقتاً وہ وسیع معلومات کا اضافہ بھی کرتا ہے،  
مثلاً ۵۳۳/۵۹۴ کے بعد حروب عرب و خزر  
کے واقعات کے سلسلے میں (متن دو B. Dorn :  
'Nachrichten über die Chazaren' دیکھیے)۔  
جین کا مآخذ ابن اعثم الکوفی کی کتاب الفتح  
معلوم ہوتی ہے (قَب Abū Akden Nimet Kurat

۵۸۹۲ تا ۵۳۹۵ / ۵۹۰۷) کا وزیر تھا، لیکن  
نصر الثانی بن احمد کے عہد حکومت (۵۳۰/۵۹۱  
تا ۵۳۱/۵۹۲) سے پہلے اس کی کارکردگیوں  
کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ وہ غالباً ۵۳۱/۵۹۲  
میں نصر کا وزیر ہوا (قَب Turkestan : Barthold  
ص ۲۳۱) اور المقنسی (ص ۳۳۷) کے بیان کے  
مطابق اس کا بلا فصل پیشرو، ابوالفضل بن یعقوب  
نیشاپوری تھا۔ اس سال وہ استرآباد میں تھا  
(ابن الاثیر، ۸ : ۹۶)۔ اس کے بعد اس کا ذکر بار  
بار آتا ہے (ابن الاثیر، ۸ : ۱۹۶ تا ۲۰۷)۔ قَب  
المقنسی، ص ۳۱۷)۔ ۵۳۲/۹۳۷ - ۵۳۸/۹۴۴ میں  
اس کی جگہ الجیہانی الاصفہر کا تقرر ہوا (ابن  
الاثیر، ۸ : ۲۸۳)۔ لیکن قَب المقنسی، ص ۳۳۷)۔  
الإصطخری (ص ۲۶۰) کہتا ہے کہ اس کے مکانات  
سرو میں تھے اور بخارا میں ایک دروازہ اس کے  
نام پر ہے جو باب الشیخ الجلیل کہلاتا ہے (وہی  
کتاب، ص ۷۷)۔ غالباً یہ وہی دروازہ ہے جو آگرے  
چل کر شیخ الجلال کے نام سے مشہور ہوا۔  
تمام مآخذ اس کی لیاقت کے معترف ہیں۔ وہ علیہ کا  
صہبی تھا۔ السمعانی (ورق ۳۶۲ جیب) کا بیان ہے  
کہ وہ روڈی کو عربوں اور ایرانیوں میں سب سے  
بہتر اور بے مثل سمجھتا تھا۔ السمعانی (ورق ۹۰  
ولمت [طبع لندن : ۱۳۱۳]) کے بیان کے مطابق  
اس نے ۲۰ صفر ۵۳۲ / ۱۳ نومبر ۵۹۷ء کی رات  
کو وفات پائی۔  
(۲) ابو علی محمد بن محمد البلعی، جو  
مذکورہ بالا کا بیٹا تھا، عبدالملک اول بن نوح  
(۵۳۳/۵۹۴ تا ۵۳۵/۵۹۶) کے عہد کے  
آخر میں "حاجب" الہتکن کے اثر و رسوخ کی  
بدولت وزیر مقرر ہوا (گردیزی : زین الاخبار، طبع  
محمد ناظم، سلسلہ یادگار براؤن، ۱۹۲۸ء، ص ۳۳)۔  
باپ کی سی عملی صلاحیتیں اس کے حصے میں نہیں

(۵) *Mem. Russ. Acad.*، سلسلہ ششم، سیاسیات وغیرہ، سینٹ پیٹرز برگ، ۱۸۴۴ء، ۶: ۳۳۵ تا ۶۰۱؛ (۶) *Chronique de... Tabari traduite sur : H. Zotenberg 'la version persane d'Abou-'Ali Mohammad Bel'ami* جلد، پیرس ۱۸۶۷ تا ۱۸۷۳ء (بار دوم، پیرس ۱۹۰۸ء)۔

(D. M. DUNLOP)

بَلْعَمِيَّيْنِ : رَكْ به عنبر (بنو)۔

• بلغار : اسلامی ادب میں یہ ایک ترکی النسل قوم کا نام ہے، جس نے اوائل قرون وسطیٰ میں دریائے والگا اور دریائے ڈینیوب کے کنارے دو ریاستوں کی بنیاد رکھی تھی۔

ابتدائی تاریخ : معلوم ہوتا ہے کہ قدیم بلغار ہنوں کی آمد کے کسی دھارے کے ساتھ جنوبی روس کے بے گیاہ و برگ میدانوں (Steppe) میں پہنچے ہوں گے۔ پہلی باران کا تذکرہ Joannes Antioch (*Fragm. Hist. Graec. : Müller*، ۴: ۶۱۹) نے ۴۸۱ میں کیا ہے جب انہوں نے گاتھوں کے ساتھ لڑائی میں شہنشاہ زینو Zeno کی مدد کی تھی۔ اس زمانے میں سر زمین بلغار کا مرکز دریائے کُبن Kuban اور بحیرہ ازوف (the Maeotis) کے نواح میں واقع سٹیپ کے میدان تھے، لیکن ان کے کچھ گروہ زیزین ڈینیوب کے علاقے اور قفقاز میں بھی آباد تھے۔ بوزنطی وقائع میں ان کے اصل وطن کبن کو عظیم بلغاریہ (Theophanes, Nice-phorus) کہا گیا ہے۔ ۶۴۲ء میں خان کورت کی وفات کے بعد غالباً نئی ابھرتی ہوئی سلطنت خزر کے دباؤ کے باعث بلغاروں کے اتحاد کا خاتمہ ہو گیا۔ بلغاروں کا ایک حصہ دسویں صدی تک دریائے کُبن کے کنارے اور Maeotis میں اپنی قدیم آبادیوں ہی میں مقیم رہا۔ اس زمانے میں اس ملک کو قسطنطین (Constantine Porphy. *De adam. imp.*) ص

*Muhammad Ahmad bin A'sam al-Kūfī'nin. kitab Ankara Univ. Dil ve Tarih-cog. 'al-fūtūhu* در *Fak. Dergisi*، ۱۹۴۹ء، ص ۲۲۵ تا ۲۸۲؛ D. M. *History of the Jewish Khazars : Dunlop* (ص ۵۸)۔ بلعمی کے جو مخطوطات رہ گئے ہیں ان میں سے سب سے مکمل اور اہم مخطوطہ بعد کا مرتب شدہ نسخہ ہے؛ اس کی تخمینی تاریخ کا پتا ایک مختصر سے ضمیمے سے چلتا ہے جس میں خلفائے عباسیہ کے حالات المستظہر کی وفات اور المسترشد کی تخت نشینی (۵۱۲/۱۱۱۸ء) تک درج ہیں۔ بقول (The Evolution of Persian Historiography) B. Spuler سامانیوں کی زیر نگرانی فارسی زبان میں الطبری کا ترجمہ محض ایک ثقافتی ضرورت ہی کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس سے ایرانیوں پر یہ ظاہر کرنا بھی مقصود تھا کہ ان کی قوم کا مقدر اب دین حق کے ساتھ وابستہ ہو چکا ہے۔

گردیزی (طبع محمد ناظم، ص ۴۶) کے بیان کے مطابق بلعمی نے جمادی الآخرہ ۵۲۶۳/۲۷ فروری - ۲۷ مارچ ۹۷۴ء) میں وفات پائی۔ العتبی (تاریخ یمنی، قاہرہ ۱۲۸۶ھ، ۱: ۱۷۰) نے اس کی وفات کی تاریخ بہت بعد کی بتائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے نوح ثانی بن منصور نے بخارا کی تسخیر کے بعد بہت تھوڑی مدت کے لیے ربیع الاول ۵۳۸۲/ مئی ۹۹۲ء میں اپنا وزیر مقرر کیا تھا۔ یہ تاریخ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی۔

مآخذ : (۱) Storey، ص ۶۱ تا ۶۵؛ (۲)

*Turkestan : W. Barthold*، بمدد اشاریہ؛ (۳) تاریخ طبری، لیتھو، لکھنؤ ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۳ء (دوسرے ہندوستانی مطبوعہ نسخوں کے لیے دیکھیے Storey)؛ (۴) B. Dorn : *Beiträge zur Geschichte der Kaukasischen Länder und Völker*، ج ۴ : *Tabary's Nachrichten über die Chasaren*، (بلعمی کا متن، مع جرمن ترجمہ و حواشی)؛



المسعودی، اور المقنسی کے یہاں ملتے ہیں اور چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے بعد کے حالات ابن حوقل کے بیان کیے ہوئے ہیں۔ ان بنیادی ماخذ کے علاوہ ہمیں دوسری عربی اور فارسی تصنیفات، مثلاً البیرونی، بیہقی، ابن الندیم وغیرہ میں بھی کچھ اشارے مل جاتے ہیں۔ چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں ابو حامد الاندلسی نے بلغار کی سیاحت کی اور دو صدی بعد ابن بطوطہ وہاں گیا، لیکن مؤخرالذکر کے بیانات اس احتمال سے خالی نہیں کہ ان میں ایجاد بندہ کو دخل ہے۔ دور مغول کے مؤرخین، مثلاً ابن الاثیر، ابوالفداء، رشیدالدین، جوینی وغیرہ سے ہمیں ریاست بلغار کے خاتمے کے متعلق معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ یورپی ماخذ میں صرف روسی وقائع ہماری مدد کرتے ہیں، جو حملہ مغول سے قبل اور بعد کے دور کی معلومات کے قیمتی ماخذ ہیں، چونکہ ہمارے ماخذ زیادہ تر چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے بلغار کے داخلی کوائف کا جو خاکہ سطور ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے وہ انہیں سے ماخوذ ہے اور اس کا اطلاق زمانہ ما بعد ہر محض بالواسطہ ہوتا ہے۔

حدود ریاست اور آبادی: سلطنت بلغار کے مرکز کی تشکیل والکا اور کاما دریاؤں کی درمیانی مثلث اور ان دونوں دریاؤں کے سنگم میں واقع علاقوں سے ہوتی تھی۔ جہاں تک بلغار کی حدود ریاست کا تعلق ہے ہمارے ماخذ سے اس پر ذرا بھی روشنی نہیں پڑتی، اور حدود العالم کا اکاون وان باب (جس کا عنوان غلطی سے برطاس لکھا گیا ہے) اس لحاظ سے قطعی یکار ہے کہ اس سے اس کے ہمسایہ ممالک کے متعین کرنے میں قطعاً مدد نہیں ملی۔ تاہم ہمیں کچھ ایسے اشارے مل جاتے ہیں، جن کی مدد سے ان پڑوسیوں اور سلطنت

نے ”سیاہ بلغاریہ“ کے نام سے موسوم کیا اور روسی وقائع میں ان لوگوں کو ”سیاہ بلغار“ کا نام دیا گیا ہے۔ ان بلغاروں نے تاریخ میں کوئی اہم کارنامہ سرانجام نہیں دیا اور بعد ازاں مجیار (Magyars)، پچنگ (Pechenegs) اور کمان (Kumans) قوم کے لوگوں کے جو دھارے داخل ہوئے یہ لوگ غالباً ان میں مدغم ہو کر رہ گئے۔ بلغاروں کا ان سے کہیں بڑا گروہ خان اسپہ رخ کے زیر قیادت ترک وطن کر کے ریاستہائے بلقان اور ڈینیوب کے علاقے میں جا پہنچا، جہاں انہوں نے جنوبی صقالی قبائل کے درمیان ایک ریاست قائم کی۔ نسبتاً قلیل مدت میں ترکی بلغار، جو تعداد میں تھوڑے تھے، کثیر التعداد صقالیہ میں جذب ہو کر معدوم ہو گئے۔ اسلامی ماخذ میں اس ریاست اور اس کے باشندوں کو برجان کہا گیا ہے۔

تیسرا اور سب سے چھوٹا گروہ والکا کے کنارے کنارے شمال کی جانب پسپا ہو گیا (اس بات کی تصدیق آثارِ قدیمہ کی فراہم کی ہوئی معلومات سے ہو چکی ہے) اور دریائے کاما (Kama) اور والکا کے سنگم کے قریب آباد ہو گیا۔ یہاں انہوں نے فن لینڈ کے اصلی باشندوں کو مطیع کر کے ایک نئی ریاست کی بنیاد رکھی۔ یہی گروہ ہے جسے عربی ماخذ بلغار اور فارسی ماخذ بلکار لکھتے ہیں اور یہ نام ان کے ملک اور ان کی ریاست کے دارالحکومت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

ماخذ: بلغار کے متعلق ہمارا ممتاز ترین ماخذ ابن فضلان ہے جو ۳۰۹ - ۳۱۰ / ۹۲۱ - ۹۲۲ء میں اس سفارت میں شریک تھا جو خلیفہ العتدر باللہ نے شاہ بلغار کے پاس بھیجی تھی۔ اس سے ذرا پہلے کا ماخذ ابن رستہ، حدود العالم، گردیزی، البکری اور التروزی میں محفوظ ہے۔ ابن فضلان سے چند عشرے پہلے کے حالات الاصطخری،

قبیلے کا ذکر کیا ہے جو آلتونجار کے نام سے مشہور تھا۔ یہ قبیلہ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکا تھا اور اس نے ایک چوبی مسجد بھی بنائی تھی۔ جنگلات میں مطیع شدہ فنی قبائل رہتے تھے اور شہروں میں (زمانہ ما بعد میں) سوداگروں اور دستکاروں کی ملی جلی آبادی تھی، جو روس، خزر، وسط ایشیا حتیٰ کہ بغداد تک سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔

سیاسی ادارے: بلغار کے فرمانروا کا لقب یلتوار (yiltuwar) (ابن فضلان کے ہاں یلتوار) تھا۔ یہ ایک ترکی لقب تھا جو کتبات اور خون میں التیر کی صورت میں بھی ملتا ہے۔ اس لقب سے پتا چلتا ہے کہ یہ منصب نسبتاً کم رتبہ فرمانروا کا تھا جو خاقان کا باج گزار تھا اور یہاں مراد خزر خاقان ہے۔ اس سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ ملک بلغار شروع میں محض ایک بڑی سلطنت کا حصہ تھا اور اس کا فرمانروا پوری طرح خود مختار نہ تھا۔ بلغار ہر گھر سے خزروں کو سمور کی ایک کھال بطور محصول دیتے تھے۔ ان کی ماتحتی کی حیثیت اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ شاہ بلغار کا ایک لڑکا یرغمال کے طور پر ضرور خاقان کے دربار میں رہتا تھا۔ شاہ بلغار کے خلیفہ بغداد کا حلیف بن جانے سے غالباً ان جاگیردارانہ روابط میں فرق آ گیا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مکمل آزادی اس وقت حاصل ہوئی جب ۹۶۵ء میں خزر حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ خلیفہ المسلمین کا حلیف بن جانے کے بعد شاہ بلغار کی حیثیت میں جو فرق پیدا ہوا اس کا اظہار اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس نے قدیم لقب یلتوار کو بدل کر نیا لقب امیر اختیار کر لیا۔ یہ گویا اس چیز کی علامت تھی کہ خزر خاقان کی سابقہ اطاعت کا رشتہ منقطع کر دیا گیا ہے۔ ریاست بلغار کی حیثیت ایک سیاسی وحدت کی

بلغار کے ساتھ ان کے تعلقات کا کچھ علم ہو جاتا ہے۔ شمال میں مختلف فنی اگریہ (Finno-Ugrian) قبائل رہتے تھے، مثلاً وی سو (روسی ماخذ میں Veps، آجکل Veps) اور یورہ (روسی Yugra)؛ یہ دونوں مختلف اوقات میں کم از کم برائے نام ہی سہی بلغاروں کے زیر سیادت رہے ہیں۔ مشرق میں بسجرت (بشکرت) بلغاروں کی رعایا تھے اور جنوب مشرق میں کچھ پچنگ اور غز قبائل بلغاروں سے بالکل آزاد خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ بلغاروں اور خزر قبائل کے درمیانی علاقے میں جنگلات کے اندر نسبتاً قدیم تر باشندے برطاس [رک باں] (برداس) آباد تھے، جو غالباً مردوہ (Mordva) کے اسلاف تھے۔ یہ لوگ خزروں کی رعیت تھے اور اکثر بلغاروں کے حملوں کا نشانہ بنتے رہتے تھے اور آگے چل کر انہیں کی ریاست میں مدغم ہو گئے۔ الاضطحری کے بیان کے مطابق خزروں اور برطاس کے علاقوں کے درمیان پندرہ روز کی مسافت تھی اور اس قوم کے علاقے کی آخری حدود تک پہنچنے میں پندرہ دن اور لگتے تھے، یہ حدود غالباً شمال مغربی سمت واقع تھیں۔ مغرب کی طرف حقالبی (روسی) قبائل آباد تھے، لیکن ان کی مشرقی نوآبادیوں کی حدود کا تعین یقین کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات کہ وہ دسویں صدی میں بلغاروں کی رعایا تھے اس امر سے واضح ہے کہ ابن فضلان نے شاہ بلغار کو اکثر اوقات "ملک الصقالہ" لکھا ہے۔

بلغار کئی جتھوں اور گروہوں میں منقسم تھے جن کا ذکر مسلمان مصنفین نے مختلف ناموں کے تحت کیا ہے۔ ابن رستہ اور اس کے پیشرووں نے جن تین بڑے گروہوں کا نام لیا ہے وہ برصولہ اشکل (ما اسکل) اور بلکار تھے۔ ابن فضلان نے اسکل کے علاوہ قبیلہ سوار، نیز ایک اور گروہ یا بڑے



جا رہا تھا۔ اس زمانے تک سابقہ معاشرت کی بہت سی رسمیں بدستور قائم تھیں، مثلاً فرمانروا کی سکونت کے لیے کوئی مستقل دارالحکومت نہیں تھا؛ وہ جا بجا گھومتا پھرتا اور ایک بڑے خیمے میں رہتا تھا۔ الاضطحری کا بیان ہے کہ لوگ جاڑوں میں چوبی مکانات میں اور گرمیوں میں خیموں میں رہتے تھے۔ زیر بحث صدی کے آخری حصے میں بلغار ایک خوشحال زرعی تجارتی مرکز بن چکا تھا۔

یہاں کی اہم پیداوار باجرہ، گندم اور جو تھی (ابن رستہ اور ابن فضلان) اور گھوڑے کا گوشت اور یہ چیزیں بنیادی خوراک کا کام دیتی تھیں۔ لوگ اپنی زرعی پیداوار سے بادشاہ کو کسی قسم کا مالیانہ نہیں دیتے تھے۔ آثار قدیمہ کے اکتشافات سے پتا چلتا ہے کہ ان کے زراعت کے طریقے خاصے ترقی یافتہ تھے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ لوگ غلہ برآمد بھی کرتے تھے؛ ۱۰۲۳ء میں جب سوزدل (Suzdal) میں قحط پڑا تو وہاں کے روسی بلغار سے گندم لائے اور اپنی جانیں بچائیں۔

اگرچہ زراعت ان کا اصلی پیشہ تھا، لیکن مویشی پالنے کو ان کی معاشیات میں اب بھی بڑی اہمیت حاصل تھی اور وہ متعدد صنعتوں کی خصوصاً چمڑا رنگنے کی صنعت کی، نیز برآمدی تجارت کی اساس تھی۔ آگے چل کر بلغاری چمڑا (موجودہ روسی چمڑا یفت "Yuff") اور بلغاری جوتے (فارسی: موزہ بلغاری) خاص طور پر مشرق میں مشہور تھے۔ آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے بہت سی صنعتی اشیاء (مثلاً تانبے کے برتن، گلی ظروف، جواہرات اور اوزار وغیرہ) ملی ہیں جو مقابلہ اعلیٰ درجے کی ہیں۔ ملک کی دولت کا سب سے بڑا سرچشمہ بہر حال بین الاقوامی تجارت تھی۔ دریائے والکا دنیا کی قدیم ترین تجارتی شاہراہوں میں سے ہے اور شہر بلغاریہ شرقاً غرباً اور شمالاً جنوباً تجارتی

نہیں تھی اس لیے کہ قبائلی سرداروں (ابن فضلان انہیں ملوک کہتا ہے) کو یقیناً آزادی و خود مختاری حاصل تھی، یہ بات ابن فضلان کے اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے جس میں اس نے بتایا ہے کہ قبیلہ اسکل کے ملک [= سردار، امیر] نے بادشاہ کا ایک حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اگرچہ روسی وقائع میں صرف ایک بلغار ریاست کا بتواتر ذکر ملتا ہے، لیکن ۱۱۸۳ء کے حالات کے تحت ہمیں ایک ایسی جنگ کا ذکر ملتا ہے جو کمانوں (Komans) کے ایک حلیف بلغار فرمانروا نے بولگری Bolgary کے عظیم شہر کے خلاف لڑی تھی۔ اس کے علاوہ دور مغول میں ایک اور ریاست ژکوٹین (Zhukotin) (جکہ تاؤ Djuke-Tao) کی بنیاد پڑنے کا ذکر بھی ہے۔

ابن فضلان کے زمانے میں فرمانروا کے تعلقات اپنی رعایا کے ساتھ سر قبائلی قسم کے تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے دارالحکومت میں (جو کہ خیموں کا شہر تھا) اکیلا پھرتا۔ اس کے ساتھ کسی قسم کا ذاتی محافظ یا حفاظتی دستہ نہیں ہوتا تھا۔ اپنے فرمانروا کو دیکھتے ہی رعایا کے افراد اٹھ کھڑے ہوتے اور اپنے سر برہنہ کر لیتے۔ حکمران طبقہ، بادشاہ کے خاندان اور قبائلی ملوک (= سرداروں) کے علاوہ، پانچ سو اہم خاندانوں پر مشتمل ہوتا تھا۔

معاشیات و تجارت: دسویں صدی کے نصف اول تک روسی شیپ کے میدانوں میں بسنے والی دوسری ترکی اقوام کی طرح بلغار بھی خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے اور مویشی پالنا ان کا سب سے بڑا پیشہ اور ان کی معاشیات کی اساس تھا۔ قدیم ماخذ میں یہ بات واضح طور پر بیان کی گئی ہے، چنانچہ بقول ابن رستہ محصولات گھوڑوں کی صورت میں ادا کیے جاتے تھے۔ ابن فضلان کا بیان ہے کہ معاشرہ آہستہ آہستہ بدویت سے حضرت کی طرف

بارہویں صدی تک مشرقی یورپ کے دوسرے حصوں کی طرح سمور (خاص طور پر لومڑیوں، مگر مچھوں اور گلہریوں کا) بنیادی سکنے کا کام دیتا تھا۔ اس کے علاوہ چاندی کا سکہ بھی رائج تھا جو اسلامی ممالک سے لایا گیا تھا، اور جسے روسیوں اور صقالبہ سے چیزیں خریدنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے آغاز سے سامانی درہموں کی نقلیں بلغار میں ڈھالی جانے لگیں؛ ان درہموں پر اگرچہ اصل نکسال کا نام اور اصل سن ضرب ہی درج ہوتا تھا، لیکن اس پر امیر بلغار میکائیل بن جعفر (غالباً اس جعفر بن عبداللہ کا جانشین اور بیٹا جو کہ ابن فضلان کے عہد میں حکومت کرتا تھا) کا نام بھی کندہ کیا جاتا تھا۔ ۵۳۳۷ / ۹۴۸ - ۶۹۴۹ میں بلغار کی ایک نکسال میں طالب بن احمد کے نام پر پہلی بار درہم ضرب کیے گئے اور ۵۳۵۷ / ۶۹۶۸ تک ڈھالے جاتے رہے۔ دوسرے سکنوں پر جو سوار اور بلغار میں تیار ہوئے مومن بن احمد (۵۳۶۶ / ۹۷۶ - ۶۹۷۷) کا اور کچھ سکنوں پر مومن بن حسن (۵۳۶۶ / ۹۷۶ - ۹۷۷) اور ۵۳۷۰ / ۶۹۸۰ کے مابین) کا نام کندہ ہے۔ مؤخر الذکر سکنے بھی انہیں نکسالوں میں ضرب ہوئے (دیکھیے *Wiener Vasmer*، *Num. Ztschr*، ۵۷، ۱۹۲۳ء، ص ۶۳ بعد)۔ ان حکمرانوں کے ناموں کے علاوہ سکنوں پر عباسی خلفا کے نام بھی ملتے ہیں۔

جب ابن فضلان یہاں آیا تو اس نے یہاں کوئی قصبہ یا گاؤں نہیں دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ اس زمانے میں بلغار بدویت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قلعے کی تعمیر نے، جو بغدادی سفارت کے نمایاں اور اہم کاموں میں سے ایک تھا، بلغار کے آئندہ بننے والے شہر کا بنیاد رکھی۔ بغدادی سفارت کی آمد سے قبل بلغار میں قصبوں

شاہراہوں کے عین مقام اتصال پر واقع تھا، ان دونوں سے پورا فائدہ اٹھایا گیا۔ بلغار خود زیادہ تر شمال میں اور اس سے کم وسط ایشیا میں تجارت کرتے تھے، لیکن شہر بلغار کی اصل اہمیت اس بنا پر تھی کہ وہ غیر ملکی تاجروں، یعنی روسیوں، خزروں اور مسلمانوں کے لیے ایک مقام اتصال و اجتماع تھا۔ بادشاہ آبی راستے سے جانے والے جملہ سامان پر دس فی صد محصول وصول کرتا تھا، مثلاً روسی تاجر ہر دس غلاموں پر ایک غلام بادشاہ کو محصول کے طور پر دیتے تھے۔ سب سے بڑی تجارتی شاہراہ وسط ایشیا (خوارزم) اور خیسوہ کو جاتی تھی۔ بلغار شمالی ممالک سے مگر مچھوں، سموروں، اودبلاؤں، لومڑیوں اور گلہریوں کی کھالیں درآمد کرتے تھے اور ان شمالی اقوام مثلاً وی سو اور یورہ کے ساتھ ان کا مبادلہ جنس کے بدلے جنس کی صورت میں ہوتا تھا (دیکھیے ابن فضلان، البیرونی، المروزی، ابو حامد، ابن بطوطہ)۔ روسی بھی سمور لاتے تھے، غلام ان کی دوسری بڑی جنس درآمد تھے جو تجارتی شاہراہ کے ذریعے وسط ایشیا کو اور والگا کے راستے صوبجات خزر کو بھیج دیے جاتے تھے۔ المقدسی نے ص ۳۲۵ پر بلغار کی اشیائے برآمد کی ایک طویل فہرست درج کی ہے۔ اس میں بہت سی اقسام کی سمور، گھوڑوں اور بکریوں کی کھالیں، جوتے، قلنسو، تیر، تلواریں، ہتیار، بھیڑیں، مویشی، باز، مصنوعات ماہی (جیسے *Isinglass*، *Fish-teeth*)، برچ کی لکڑی، اخروٹ، موم، شہد اور صقالبی غلام شامل ہیں۔ ان میں سے بہت سی چیزوں کا ذکر دوسرے ماخذ، مثلاً ابن رستہ، الاصلطخری، ابو حامد وغیرہ میں بھی ملتا ہے۔

اسلامی ممالک سے درآمد ہونے والی خاص ایشیا میں کپڑا، ہتیار، سامان تعیش اور گلی ظروف شامل تھے۔



قیمتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلغار (یعنی بلغرسکوئی کے کھنڈر) صرف دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی ہی میں دارالحکومت تھا، بعد ازاں یہ اعزاز بلیر کو مل گیا جو ملک کے وسطی حصے میں دریائے چریشن کے کنارے واقع تھا۔ یہ بتانا دشوار ہے کہ ان دونوں میں سے روسی وقائع کا بلغری کا عظیم قصبہ کون سا تھا۔

مذہب: قدیم ترین ماخذ (ابن رستہ اور حدود العالم ۵۳۰۰ / ۹۱۲ء جس میں قدیم تر زمانے کا حال موجود ہے) کی رو سے بلغاروں میں اسلام پوری طرح جاگزیں ہو چکا تھا اور ان کے علاقے میں کچھ چوبی مساجد موجود تھیں۔ اس بات کی توثیق مکمل طور پر ابن فضلان سے ہو جاتی ہے جس نے اپنی سیاحت کے دوران میں بہت سے مسلمانوں اور مسجدوں کے علاوہ ایک خطیب اور ایک مؤذن کو بھی دیکھا۔ بلغار میں اسلام کی آمد کے بارے میں قدیم عربی ماخذ بالکل خاموش ہیں اور صرف بارہویں صدی عیسوی کے ایک سیاح ابو حامد نے ایک روایت بیان کی ہے جس کا تعلق بلغار کے اشتقاق سے ہے؛ لیکن یہ داستان زمانہ ما بعد کی تاتاری روایات میں نہیں ملتی۔ بغدادی سفارتوں بالخصوص ابن فضلان والی سفارت کا ایک مقصد یہ تھا کہ وہاں اسلام کی بنیادوں کو مستحکم کیا جائے، قانون اسلامی نافذ ہو، ایک مسجد اور منبر تعمیر ہو اور پورا ملک اسلام کے رنگ میں رنگا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام کامیابی سے انجام پذیر ہوا۔ بلغار میں اسلام پہلے پہل وسط ایشیا سے پہنچا؛ یہاں جس انداز سے اذان دی جاتی تھی اس میں مذہب امام ابوحنیفہ کی پیروی کی جاتی تھی جو ان دنوں وسط ایشیا کے ترکوں میں رائج تھا، چونکہ ابن فضلان شافعی مذہب کا پیرو تھا اس لیے اس کے اور بلغار کے

کے موجود نہ ہونے کی توثیق ایک طرف تو اس امر سے ہوتی ہے کہ ابن رستہ کے گروہ کے ماخذ میں ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور دوسری طرف خود بلغار کے نام کا محل استعمال یہ ظاہر کرتا ہے۔ ابن رستہ اور ابن فضلان نے یہ نام ہمیشہ ملک یا قوم کے لیے استعمال کیا ہے، شہر کے لیے کبھی نہیں کیا۔ الاطخری پہلا مصنف ہے جس نے بلغار اور سوار نامی قصبوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ان میں لکڑی کے مکان اور مسجدیں تھیں اور یہاں دس ہزار باشندے آباد تھے۔ اس بیان کا اعادہ تمام آنے والے مصنفین نے بعض جزوی اضافوں کے ساتھ کیا ہے (حدود العالم: ۲۰ ہزار باشندے؛ گردیزی: پانچ لاکھ خاندان)۔ روسی وقائع نگاروں کے یہاں بلغار نام کے کئی قصبوں کا ذکر ملتا ہے، لیکن تفصیلات کی کمی کی بنا پر ان قصبوں کا صحیح محل وقوع متعین نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے اہم ترین قصبہ بلغری کا عظیم قصبہ (Velikiy gorod Bolgary) تھا، جس کا وقائع میں کئی بار ذکر آیا ہے۔

گزشتہ نصف صدی میں روسیوں نے علاقہ بلغار میں ان مقامات پر آثار قدیمہ کی کئی کھدائیاں کی ہیں جہاں قدیم قصبے آباد تھے۔ والگا سے ۶ کیلومیٹر کے فاصلے پر موضع بلغرسکوئی (Bulgarskoie) کے قریب کے کھنڈروں سے پتا چلتا ہے کہ تیرہویں صدی اور چودھویں صدی میں یہاں اعلیٰ درجے کی ثقافت موجود تھی۔ تمام عمارتیں، یعنی محل، مسجدیں، حمام اور ان کے علاوہ فصیلیں پتھر کی تھیں۔ قصبے کا محیط تقریباً ۶ میل تھا اور اس کے ارد گرد شمال اور مغرب کی جانب مضافات تھے۔ اس زمانے میں یہاں کی آبادی یقیناً پچاس ہزار کے قریب ہوگی۔ بلیر اور سوار میں جو تازہ اکتشافات ہوئے ہیں وہ بلغرسکوئی کی دریافتوں سے زیادہ

برعکس ہوتا تھا؛ چھوٹے سے دن میں روزانہ نماز پنجگانہ کا ادا کرنا آسان نہیں تھا اور معینہ اوقات کی پابندی تو قطعی ممکن نہیں تھی۔ اسی طرح کی دشواریاں رمضان میں بھی پیدا ہوتی تھیں۔ شمالی عرض بلد کے علاقوں کی اس خصوصیت نے، جس سے دوسرے اسلامی ممالک کو سابقہ نہیں پڑا تھا، جلد ہی مسلمان مصنفین کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی اور اس موضوع پر ایک طویل بحث شروع ہو گئی کہ ان مسائل کا صحیح حل کیا ہے، چنانچہ ۱۸۶۰ء میں قازان کے ایک مؤرخ مرجانی نے انہیں مسائل سے متعلق ایک رسالہ لکھا ہے (دیکھیے زکی ولیدی طوغان : ابن فضلان، ص ۱۰۰، جہاں مزید حوالے بھی ہیں)۔

زبان اور ادب : خزروں کی زبان کی طرح بلغاروں کی زبان کے بھی بہت کم آثار موجود ہیں، جو جغرافیائی ناموں، صوتی الفاظ اور بارہویں صدی عیسوی کے آغاز سے خاص تعداد میں ہزاروں کی صورت میں تھے۔ ایک مدت تک ان کی لسانی مشابہت ایک مشبہ بنی رہی۔ الاطخری نے ص ۲۲۵ پر بتایا ہے کہ بلغار کی زبان خزروں کی بول چال سے مشابہ تھی، لیکن یہ دونوں برطاس اور روس کی زبانوں سے مختلف تھیں (بلغار زبان کے بارے میں کاشغری کے بیان کا تجزیہ اور اس کے ساتھ اس پورے مسئلے پر بحث کے لیے دیکھیے Pritsak در ZDMG عدد ۱۰۹، ۱۹۵۹ء، ص ۹۲ تا ۱۱۶)، لیکن اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بلغار زبان ترکی زبانوں کی مغربی (یا مغربی ہن) شاخ کے اس گروہ سے تعلق رکھتی ہے جسے بلغاری (Bolgarian) کہا جاتا ہے۔ اس شاخ کے دوسرے گروہ غز، قپچاق اور قزلق ہیں۔ بلغاری گروہ میں خزری زبان کے علاوہ مندرجہ ذیل زبانیں بھی شامل ہیں : (۱) ابتدائی بلغاری : ابتدائی بلغاری کتبات کی اور

مؤذن کے درمیان جسے شاہ بلغار کی حمایت حاصل تھی، اختلاف رائے پیدا ہوا۔ اپنی پوری تاریخ میں بلغار نے حنفی مذہب سے اپنی وابستگی برقرار رکھی۔ قصبوں میں مسجدیں اور جامع مسجدیں تھیں اور حدودالعالم سے اس بات کی تصدیق ہو گئی ہے کہ بلغار اور سوار کے باشندے اپنے مذہب کے بڑے پر جوش مبلغ تھے۔ بقول المسعودی (سراج، ۲ : ۱۶) المقتدر کے عہد میں شاہ بلغار کے ایک بیٹے نے سفر حج بیت اللہ کیا تھا۔ بلغار کے فرمانرواؤں کے مذہبی جوش کا ایک ثبوت اس تحفے سے بھی ملتا ہے جو ۵۴۱۵ / ۱۰۲۴ء میں امیر بلغار ابو اسحق بن ابراہیم بن محمد بن پلتوار [= پلتوار] نے سبزواری اور خسرو جرد کی مساجد کے لیے پیش کیا تھا (دیکھیے، تاریخ بیہق، طبع تہران، ص ۶۳)۔ معلوم ہوتا ہے کہ پچینگ اور گمان جیسے ترکی بدوی قبائل کے قبول اسلام کے سلسلے میں بلغاروں کے اثر کی نوعیت فیصلہ کن تھی۔ ان کے دلوں میں یہ خیال بھی برابر موجود رہا کہ وہ روس کو بھی، جو دسویں صدی تک کافر و مشرک تھا، دائرہ اسلام میں شامل کر لیں گے۔ شہزادہ ولدمیر (Vladimir) کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لیے ایک سفارت ۹۸۶ء میں خیوہ کو روانہ کی گئی اور عرصے بعد اسی حکمران نے جو اپنے اور اپنی رعایا کے لیے ایک موزوں مذہب کی تلاش میں تھا، بلغار کے مسلمانوں کو دعوت دی کہ وہ آکر اسے اپنے دین کے اصول بتائیں اور بڑے بڑے مذاہب کے نمائندوں کے ساتھ ایک مذہبی مباحثے میں حصہ لیں۔

یہ اسلامی علاقہ انتہائی شمال میں واقع تھا، اس لیے وہاں مذہبی ارکان و رسوم کی بجا آوری کے سلسلے میں بعض مسائل پیش آتے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ جاڑوں میں دن چھوٹے اور راتیں بڑی ہوتی تھیں اور گرما میں معاملہ اس کے



تاریخ کا سلسلے وار مطالعہ کرنا ممکن نہیں۔ بلغاروں کے حالات نے پہلی بار ابن فضلان کی آمد کے وقت تاریخ کی کتاب میں جگہ پائی۔ اس زمانے میں ان کا فرمانروا یلتوار آلمش بن شلکی تھا، جس نے بالآخر اپنا لقب اور نام تبدیل کر کے امیر جعفر بن عبداللہ رکھا۔ سگوں پر اس کے بیٹے اور جانشین میکائیل بن جعفر کے علاوہ تین اور فرمان رواؤں، یعنی طالب بن احمد، مومن بن احمد اور مومن بن الحسن کے نام بھی ملتے ہیں (تاریخوں کے لیے دیکھیے سطور بالا فصل متعلقہ اقتصادیات)۔ خزر خاقانیوں کی سلطنت کے زوال تک بلغار کو ان کی باج گزار ریاست کی حیثیت حاصل رہی۔ ۹۶۸ء میں والگا کے طاس کا علاقہ خیوہ کے حکمران سویاتوسلاف Svyatoslav نے تاراج و ویران کر ڈالا۔ اس کی صدائے بازگشت ابن حوقل کی اس داستان میں سنائی دیتی ہے جو اس نے بلغار، برطاس اور خزر کی ۵۳۵۸/۹۶۸-۹۶۹ء کی فتح کے سلسلے میں بیان کی ہے، لیکن یہ تاریخ روسی مہم کی تاریخ نہیں، بلکہ یہ وہ سال ہے جب ابن حوقل کو ان واقعات کی اطلاع ملی تھی۔ اس حملے سے بلغار کی خوشحالی پر دیرپا اثرات مرتب نہیں ہوئے؛ اسی طرح ۹۸۵ء میں روسیوں کی دوسری فوج کشی سے بھی، جس کی کمان سویاتوسلاف Svyatoslav کے بیٹے ولد میر Vladimir کے ہاتھ میں تھی کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا۔ اس کے برعکس خزر خاقانی سلطنت کے زوال سے بلغار کو فائدہ پہنچا؛ فتح کے بعد روسی فوجوں کی مراجعت کے فوراً بعد طاقتور خزر کے مقام پر پچنگ کے بدوی قبیلے نے قبضہ کر لیا، جن سے بلغاروں کو کوئی خاص خطرہ نہیں تھا۔ ایک مختصر سی مدت کے لیے روسیوں اور بلغاروں کے تعلقات بہتر ہو گئے، جیسا کہ اس تجارتی معاہدے

ڈینیوب کے بلغاروں کی نام نہاد فہرست ملوک کی زبان؛ یہ فہرست ایک قدیم روسی واقع میں ملتی ہے (دیکھیے *Die bulgarische Fürstenliste: O. Pritsak*، Wiesbaden ۱۹۵۵ء)؛ (۲) گبن بلغاری (Kuban-Bulgarian)؛ اس زبان کی باقیات ان مستعار الفاظ کی صورت میں موجود ہیں جو ہنگروی زبان میں ملتے ہیں اور (۳) والگا بلغاری؛ یعنی ان کتبات مزار کی زبان جو عربی رسم الخط میں لکھے گئے اور بلغار کے علاقے میں ملتے ہیں۔ اس بات کی تا حال تشفی بخش تحقیق اور تصریح نہیں ہو سکی کہ موجودہ زمانے کی جوش زبان اور اس زبان میں کس درجے مماثلت موجود ہے۔ چونکہ جوش بلغاری انتہائی ترقی یافتہ اسلامی ثقافت سے بہت کم متاثر ہوئے ہیں، اس لیے ان کا بلغاری کی نسل سے ہونا قرین قیاس نہیں، البتہ موجودہ قازان تاتار کو اس بات کا زیادہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنا سلسلہ بلغار سے ملائیں۔

مزاروں کے مذکورہ بالا کتبات کے علاوہ، جو کہ بارہویں سے چوہودہین صدی عیسوی تک کے ہیں، ہمارے پاس بلغاروں کی ادبی سرگرمیوں کے کچھ آثار موجود نہیں۔ ابن الندیم نے اپنی فہرست میں لکھا ہے کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے بلغار چینیوں اور مانویوں کے رسم الخط استعمال کرتے تھے، لیکن اس کا کوئی نمونہ ہم تک نہیں پہنچا۔ ابو حامد نے بارہویں صدی کے اوائل کے قاضی یعقوب بن نعمان البلقاری کی ایک تاریخ بلغار کا پتا دیا ہے۔ ۵۹۸۹/۱۵۸۱ء میں شرف الدین حسام الدین البلقاری نے تاتار زبان میں ایک رسالہ تواریخ بلغاریہ تالیف کیا، جو تبلیغ اسلام اور اولیائے کرام کی زندگیوں کے متعلق غیر معتبر حکایات کے مجموعے سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ رسالہ ۱۹۰۲ء میں قازان میں طبع ہوا تھا۔

تاریخ: ماخذ کی کم یابی کے باعث بلغاری کی

بے دردی سے لیا گیا: ۱۲۲۹ء میں دریائے یائیک (یورال) کے کنارے بلغار کے ہراول دستے کو مار کر بھگا دیا گیا اور پھر اسلامی مآخذ کی رو سے ۱۲۳۶ء میں اور روسی مآخذ کے مطابق ۱۲۳۷ء میں مغولوں نے ریاست بلغار پر حملہ کر کے اس کے دارالحکومت کو تمام باشندوں سمیت نیست و نابود کر ڈالا۔

اس کے بعد سے بلغار کی ریاست مغول کی مشرقی یورپ کی سلطنت آلتون آردو کا حصہ بن گئی (رک بہ باتو، خانوادہ)۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسبتاً کمتر مدت میں دارالحکومت بلغار میں ایک بار پھر خوشحالی آئی۔ آثارِ قدیمہ کے اکتشافات سے ایک اعلیٰ درجے کی ثقافت کا سراغ ملتا ہے جس کا آغاز عین اسی زمانے سے ہوا تھا؛ اس کے علاوہ مزاروں کے جو کتبات ملتے ہیں وہ بھی زیادہ تر دورِ مغول ہی کے ہیں۔ اس ملک اور اس کے دارالحکومت کی تاریخ ما بعد کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات حاصل ہیں، چنانچہ اس بات کا پتا بھی نہیں چلتا کہ اس شہر کو یہاں کے باشندوں نے کب اور کیوں چھوڑا۔ ۱۳۹۵ء میں تیمور کے حملے کا بلغار پر کوئی اثر نہیں ہوا، لیکن اس کے بعد جلد ہی ۱۳۹۹ء میں روسیوں نے اسے برباد کر ڈالا۔ غالباً ان جنگوں سے کہیں زیادہ نقصان بلغار کو قازان (نیز المعروف بہ نوی بلغار یا بلغار جدید) کے عروج سے پہنچا، جس کی بنیاد اس سے ذرا قبل باتو خان [رک باں] نے رکھی تھی۔ جب آنگ [یگ] محمد [رک باں] نے اس شہر کو ایک نئی تاتار سلطنت کے دارالحکومت کے لیے منتخب کیا تو گویا شہر بلغار کی قسمت کا آخری فیصلہ ہو گیا۔ وسطی والگا کے کنارے سب سے بڑی منڈی کی حیثیت سے اسے جو اہمیت حاصل تھی وہ پہلے قازان اور پھر نرنی نووگراڈ (Nizniy Novgorod) (موجودہ گورکی Gorkiy)

سے ظاہر ہوتا ہے جو ۱۰۰۶ء میں مساوی شرائط پر طے پایا، لیکن چونکہ ان دونوں ریاستوں کو شمالی علاقے میں تجارتِ سمور سے یکساں دلچسپی تھی اس لیے گیارہویں صدی عیسوی کے نصف آخر سے دونوں کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس زمانے کے بعد سے بلغار کی تاریخ روسیوں کے ساتھ جنگوں کی تاریخ ہے۔

۱۰۸۸ء میں بلغاروں نے مروم (Murom) کے روسی قصبے پر قبضہ کر لیا، لیکن یہ قبضہ صرف تھوڑی مدت تک قائم رہ سکا۔ اس واقعے کے بعد وہ زیادہ تر اپنے دفاع ہی میں مصروف رہے اور کئی موقعوں پر ۱۱۲۰ء، ۱۱۶۳ء، ۱۱۷۲ء، ۱۱۸۳ء، ۱۲۲۰ء میں روسیوں نے بلغار کے شہر کا محاصرہ کیا۔ اس دوران میں صرف دو موقعے ایسے آئے جب بلغار کی طرف سے کوئی جارحانہ اقدام ہوا، انہوں نے ۱۱۰۷ء میں سوزدل (Suzdal) کے قصبے پر ناکام حملہ کیا اور ۱۲۱۸ء میں بہت دور شمال میں واقع شہر اُست یگ (Ust' yug) تباہ و برباد کر ڈالا۔ مغول کے حملے کے باعث روسیوں سے ساتھ مزید جنگیں تقریباً دو صدی تک ملتوی رہیں۔ ابو حامد نے بارہویں صدی کے نصف اول میں شہر بلغار اور والگا کے طاس کے علاقے کی سیاحت کی تھی، لیکن اس نے یہاں کی سیاسی تاریخ کے بارے میں اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا کہ زبرین والگا کے کنارے شہر سقسین میں ایک بلغار امیر رہتا تھا اور یہاں ایک بلغاری مسجد موجود تھی۔

دریائے کالکا (Kalka) کے کنارے روسیوں پر فتح حاصل کر کے (۱۲۲۳ء) جب مغول مشرق کی جانب لوٹ رہے تھے تو بلغاروں نے گھات لگا کر ان پر حملہ کر دیا اور انہیں سخت نقصان پہنچایا (ابن الاثیر، ۱۲ : ۲۵۴)۔ اس کا انتقام بڑی



کو مل گئی۔

لفظ بلغار صرف ایک ملک کے نام کے طور پر ادب میں اب بھی باقی ہے، البتہ انیسویں صدی تک تاتار اپنے آپ کو بلغاری کہتے تھے۔

مآخذ: اسلامی مآخذ: (۱) ابن رستہ؛ (۲) ابن فضلان؛ (۳) المسعودی: مروج؛ (۴) الاضطحری؛ (۵) ابن حوقل؛ (۶) القنسی؛ (۷) البیرونی؛ (۸) گردیزی؛ (۹) البکری؛ (۱۰) ابوالحامد الأندلسی: تعفہ (طبع: Ferrand)؛ (۱۲) وہی مصنف: مغرب (طبع: Dubler)؛ (۱۲) یاقوت؛ (۱۳) القزوینی؛ (۱۴) ابوالفداء؛ (۱۵) الدمشقی۔ دور مغول کے لیے: (۱۶) ابن الاثیر؛ (۱۷) ابوالفداء؛ (۱۸) رشید الدین؛ (۱۹) الجوبینی؛ (۲۰) ابن بطوطہ وغیرہ (رگ بہ مآخذ در Die Goldene Horde، لائپزگ ۱۹۳۳ء)۔ روسی وقائع در: (۲۱) Polnoe sobraniye russkikh Petopisey، ماسکو ۱۸۳۶ء۔ جدید مطالعات: (۲۲) Ibn: Z. V. Togan؛ (۲۳) Fadlān's Reisebericht، لائپزگ ۱۹۳۹ء؛ (۲۴) Volzhskiye Bolgary, Istoricheskiye zapiski: Grekov؛ (۲۵) A. P. Smirnov؛ (۲۶) Volzhskiye Bolgary، ماسکو ۱۹۵۱ء؛ (۲۷) K istoricheskoy topografii Itila i: Yakubovskiy؛ (۲۸) Bulgara, Soviet. Arkheologiya، ۱۰، ۱۹۳۸ء؛ (۲۹) Trudy Kuybishevskoy: A. P. Smirnov؛ (۳۰) Arkheolog. Ekspediciyi، ماسکو ۱۹۵۳ء؛ (۳۱) Istoriya Tatarskoy ASSR، ج ۱، قازان ۱۹۵۶ء؛ (۳۲) Kniga Achmeda Ibn Fadlana...، ماسکو ۱۹۵۶ء؛ (۳۳) Kharkov، ماسکو ۱۹۵۶ء؛ (۳۴) Ibn: M. Canard؛ (۳۵) Fadlān chez les Bulgares de la Volga، در AIEO، الجزائر ۱۹۵۸ء، ص ۱ تا ۱۳۶؛ (۳۶) حدود العالم۔

(I. HRBEK)

بلغارطاغ: ترک اس نام کو، جس کا صحیح املا بوغا (بغا) یا بوغا (بغا) ہے۔

ترکی میں بیل تورس Taurus کو کہتے ہیں (سلیشیائی تورس [= طوروس] Cilician Taurus) کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

بلغار معدن: بلغارطاغ کی شمالی ڈھلانوں پر چاندی کی مشہور کانیں، جوقونیه (ارگلی Eregli) سے گولک بوغاز (سلیشیائی ڈریے) کو جانے والی عظیم تجارتی شاہراہ کے جنوب میں واقع ہیں۔ ۱۸۲۵ء سے ان کانوں میں بڑی بے توجہی سے کان کنی کی جا رہی ہے۔ ان سے جو کچی دھات برآمد ہوتی ہے اس میں سونا اور چاندی شامل ہے اور اس سے سبسہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اعداد و شمار Cuienet: La Turquie d'Asie، ۱: ۸۳۷ میں درج ہیں۔ یہ بات، جیسا کہ مصنف مذکور نے لکھا ہے، درست نہیں کہ یہ کانیں ۱۸۲۵ء ہی میں دریافت ہوئی تھیں اس لیے کہ قرون وسطیٰ میں بھی ابن فضل اللہ نے لؤلؤہ کے مقام پر چاندی کی کانوں کا ذکر کیا ہے اور یہ بلغار معدن کی کانوں کی جائے وقوع کے عین مطابق ہے۔

بلغاریا: Bulgaria بلقان کی ایک ریاست۔ اس کی نسبت ایک ترکی النسل قوم بلغار سے ہے، جس نے اولاً ۶۷۹ء میں اسپرخ یا اسپرخ کے زیر قیادت دوپروجہ [رک باں] پر حملہ آور ہو کر موسیہ Moesia کے بوزنطی صوبے میں ایک خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی تھی۔ بوزنطیوں سے کلیسائے یونانی (Orthodox) کی مسیحیت قبول کر کے (۸۶۵ء) اور مقامی اسلافی قوم کے ساتھ خلط ملط ہو کر، جو پہلے سے بلغاریا میں سکونت پذیر ہو چکے تھے، بلغاروں نے بلقان میں ایک مستحکم سلطنت تیار کر لی، جو زارسمیون Czar Symeon (۸۹۳ء تا ۹۲۷ء) کے عہد میں دریائے ڈینیوب سے بحیرہ ایڈریاتک تک پھیلی ہوئی تھی۔

بلغاریا کے بارے میں مسلمانوں کی سب سے

(۱۳۰۰ تا ۱۳۲۲ء) کے ہاتھ سے مارا گیا۔

ہم عصر عرب مآخذ (بیرس: زبده الفکر، در

Altinordu....: I.H. Izmirli، ۱، ۱۹۳۱ء: ۲۲۱؛

ابوالفداء، ص ۲۹۵) میں بلغاریا کو سرزمین "اولق"

بتایا گیا ہے اور بلغاریوں کے متعلق یہ خیال ظاہر

کیا گیا ہے کہ وہ اور اولق ایک ہی قوم تھی۔

ہمیں معلوم ہے کہ کلوجن Kalojan نے اپنے لیے

imperator totius Bulgarie et Valachie (یعنی کل

بلغاریا اور ولاشیا کا امپراطور) کا لقب اختیار

کیا تھا (Hist. of the Byzantine : G. Ostrogorsky)

State، ص ۳۵۸)۔ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی

ہو جانے والے کمانوں کو بھی ضرور "ولاش" Vlach

کے نام میں داخل کر لیا گیا ہے۔

ویدین Vidin کے کمان امیر ششمن کے تخت پر

قابض ہونے سے خاندان ششمینہ پر سر حکومت آیا

(۱۳۲۳ تا ۱۳۹۵ء)۔

اناطولی کے "غازی" ترکوں کا بلغاریوں سے

واسطہ اس وقت پڑا جب آیدین اوغلو امور [رک بان]

قانتاقوزن (Cantacuzenus) کا حلیف بنا۔ پہلے

۱۳۳۱ء / ۵۴۳ء میں امور نے بلغاری زار ایون

الیگزاندرو Ivan Alexander کے برخلاف اسے مدد

دی اور پھر ۵ ربیع الاول ۵۴۶ء / جولائی ۱۳۳۵ء

کو اس نے سوم چلو Momčilo کا قلع قمع کیا، جو

ایک بلغاری منچلاتھا اور علاقہ رھوڈوپ Rhodope

پر چھایا ہوا تھا (L' Emirat d'Aydin : P. Lemerle،

بیرس ۱۹۵۷ء)۔ آل عثمان کو، جنہوں نے

قانتاقوزن کے حلیف کی حیثیت سے امور کی جگہ

لے لی تھی، بلغاریوں سے بظاہر پہلی بار ۵۵۳ء /

۱۳۵۲ء میں سابقہ پڑا، جب کہ بلغاریوں اس کے

حریف یان پنجم John V کی حمایت کے لیے آئے تھے۔

ادرنہ [رک بان] کو فتح کرنے کے بعد ۵۶۲ء /

۱۳۶۱ء میں معلوم ہوتا ہے لالا شاہین زغرہ

پہلی رودادیں مسلم الجزی (تقریباً ۵۲۳۱ / ۵۸۳۵ء)،

ہارون بن یحییٰ (۵۳۳۹ / ۵۹۶۰ء) اور ابراہیم بن

یعقوب (۵۳۳۹ / ۵۹۶۰ء) کے قلم سے اسی زمانے کے

متعلق ملتی ہیں۔ ہارون (در ابن رستہ، طبع ڈخویہ،

ص ۱۲۷) نے بتایا ہے کہ الصقالبۃ المتصیرۃ، یعنی

عیسائی شدہ اسملائیوں نے بلغار کے حاکم سوس کے

بعد عیسائی مذہب قبول کیا تھا۔ ۱۰۱۸ء اور

۱۱۸۶ء کے مابین سلطنت بوزنطہ میں ضم ہو جانے

کے بعد بلغاریا کی تنظیم دو صوبوں (Themes) میں

کی گئی تھی، یعنی صوبہ بلغاریا، جس کا صدر مقام

اسکوب Skoplje تھا اور Paristrion یا Paradunavon،

جس کا مرکز سیلیستریہ Silistria میں واقع تھا۔

ڈینیوب کے زیرین علاقے میں کمانوں (Cumans)

کے حملے اور آباد ہو جانے سے اس سلطنت کے قیام کا

راستہ ہموار ہوا جو اسی خاندان Assenids کے ماتحت

(۱۱۸۵ تا ۱۲۷۹ء) دوسری بلغاری سلطنت کہلانے

لگی ہے۔

۱۲۶۲ء میں بوزنطی شہنشاہ میخائیل Michael

ہشتم نے بلغاریوں سے انکیالس Anchialus اور

مسمبریہ Mesembria چھین کر دوپروجہ میں ان

اناطولی ترکوں کو لا بسایا جنہوں نے عزالدین

کیکاؤس ثانی [رک بان] کی معیت میں بوزنطہ میں

پناہ لی تھی۔ ان میں سے اکثر ۵۷۰ء / ۱۳۰۷ء

میں اناطولیہ کو لوٹ گئے اور جو باقی رہ گئے انہیں

گیگازوں (Gagauzes) [رک بان] کے اجداد سمجھا

جاتا ہے (Yazijloghlu Ali on the Chrishian : P. Wittek)

Turks of the Dobruja، در BSOAS، ۱۳ / ۳)۔

ترتر اول (۱۲۷۹ تا ۱۳۰۰ء) نے نوغے [رک بان]

کی سیادت تسلیم کر لی (۱۲۸۵ء) اور اپنی بیٹی

اس کے بیٹے چقہ کو بیہ دی، جس نے آگے چل کر

ترنوو Tronovo میں پناہ لی اور اپنے خسر کے تخت پر

قبضہ جمایا (۵۱۳۰۰)، لیکن جلد ہی ترتر ثانی



بڑی تعداد میں بسائے گئے۔ نش Nish پر عثمانیوں کا قبضہ ایک عرصے بعد، یعنی ۱۵۸۷ء / ۱۳۸۵ء میں ہوا (نشری، طبع Taeschner، ۱ : ۵۸)۔ ۱۵۸۰ء / ۱۳۷۸ء تک شہر صوفیہ ششمن ہی کے قبضے میں تھا (Gesch. der Bulgaren : C. Jireček، ۱۸۷۶ء، ص ۳۳۹)۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے سال مذکورہ بالا اور ۱۵۸۷ء / ۱۳۸۵ء کے درمیان ہتھیار ڈالے۔ ۱۵۸۹ء / ۱۳۸۷ء میں جب مراد اول نے دیکھا کہ سربیا کے خلاف اس کے باج گزار، یعنی بلغاریا میں ششمن اور دوبروجہ میں ایون کو Ivanko اس کا ساتھ نہیں دے رہے تو اس نے بڑی عجلت سے اپنے عقب کے تحفظ کے لیے علی پاشا کے زیرِ کمان فوراً ایک فوج روانہ کی۔ اس مہم کے بارے میں ہماری معلومات کا سرچشمہ نشری اور روحی ہیں، جنہوں نے اس موقع پر ایک مفصل اور معتبر مآخذ کو پیش نظر رکھا ہے، لہذا یہاں ان کی دی ہوئی تاریخی ترتیب میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں (قب F. Babinger : Beiträge zur Frühgesch. der Türkenherrschaft in Rumelien، میونخ ۱۹۳۳ء، ص ۲۹ تا ۳۵)۔ ۱۵۹۱ء / ۱۳۸۸-۱۳۸۹ء کے موسم سرما میں علی پاشا نے پروویدیہ (Pravadi)، ونچی، مدیرہ Madera اور شمنی (Shumen) پر قبضہ کر لیا اور سرما کے ایام مؤخر الذکر مقام پر بسر کیے۔ ۱۵۹۱ء / ۱۳۸۹ء کے موسم بہار میں اس نے بخشی بیگ کو ”ابن دوبروجہ“ کے بمقابلے پر روانہ کیا، جو ورنہ میں مقیم تھا اور خود سلطان کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے یان بولی چلا آیا۔ ششمن بھی وہاں پہنچ گیا اور سلطان مراد اول کے سامنے سرباطاعت خم کیا۔ لیکن یہاں سے واپس جا کر اس نے اپنے وعدے کے مطابق سیلسترہ عثمانیوں کے حوالے نہ کیا۔ اس پر علی پاشا ششمن کے دارالحکومت

(Berrhoea) اور فلبہ Filibe [رک باں] کی جانب سرگرم ہو گیا (وقائع میں تاریخیں مختلف ملتی ہیں: ۱۵۶۳ء / ۱۳۶۲ء، ۱۵۶۵ء / ۱۳۶۳ء، ۱۵۶۶ء / ۱۳۶۵ء)۔ لیکن عام رائے یہ ہے کہ بوزنطیوں اور بلغاریوں کے درمیان ۱۵۶۵ء / ۱۳۶۳ء میں جو تصادم ہوا اس کا تعلق عثمانیوں اور بلغاریوں کے معاہدے سے تھا۔ ۱۵۶۶ء / ۱۳۶۵ء میں زار ایون الیگزائڈر نے اپنی سلطنت اپنے دو بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دی۔ سٹرائسیمیر Stratsimir کو ودین کا علاقہ ملا اور ششمن کو ترنوو Trnovo کی حکومت ”زار“ کے خطاب کے ساتھ دی۔ دوبروجہ میں دو برٹیچ Dobrotič کا علاقہ اور ورنہ شہر واقعہ خود مختار تھے [رک بہ دوبروجہ]۔ اسی سال ہنگری نے ودین پر قبضہ کیا اور ترنوو پر زد ڈالی۔ دوسری طرف امیدیو Amadeo حاکم سیوائے نے بوزنطہ کی طرف سے عثمانیوں کا علاقہ گیلی پولی ہی نہیں بلکہ ۱۵۶۷ء / ۱۳۶۶ء میں مسمبریہ Mesembria، سوزوپولیس Sozopolis اور انکیالس Anchialus بھی فتح کر لیے۔ عثمانیوں کی امدادی فوج لے کر ششمن نے ودین کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی (۱۵۶۹ء / ۱۳۶۸ء) اور اپنی بہن ثمر Thamar مراد اول کے نکاح میں دے دی۔ عثمانی وقائع (دیکھیے سعد الدین، ۱ : ۸۶ تا ۸۷) کی رو سے عثمانی افواج قزل آغاچ - ینی چسی، یان بولی (Iambol)، قرین اواسی (Karnobat)، ایدوس (Aitos)، سوزوپولیس Sozopolis تیمور تاش کے زیرِ کمان تقریباً ۱۵۷۰ء / ۱۳۶۸-۱۳۶۹ء میں اور ایہتمان Ihtiman اور سماکوف Samakov لالا شاہین کے زیرِ قیادت ۱۵۷۲ء / ۱۳۷۰ء میں فتح کرتی ہوئی بلقان کے بڑے دروں تک جا پہنچیں۔ ایک طرف غلبہ اور دوسری طرف یان بولی - قرین - اوواسی کا علاقہ اس زمانے کے وہ خاص ”اوج“ Udjs (ہرگئے) تھے جہاں آقینچی، بوروک [رک باں] اور تاتاری

پہنچتے ہی سلطان نے اسے پکڑ کر اس کا سر قلم کر دیا اور نکہہ بولی پر قبضہ کر کے اسے سلطنت عثمانیہ کا ایک "سنجاق" بنا دیا۔ اسلافی (Slavic) ماخذ (دیکھیے J. Bogdan : *Archiv. f. slav. Philo.* ۱۳: ۳۹۶) میں ششمن کی تاریخ انتقال ۱۲ شعبان ۵۷۹۷ھ / ۳ جون ۱۳۹۵ء بتائی گئی ہے، جو اس عثمانی شہادت کے مطابق نکلتی ہے۔

جنگ نکہہ بولی (۲۳ ذوالحجہ ۵۷۹۸ھ / ۲۸ ستمبر ۱۳۹۶ء) نے بلغاریا کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔ اس فتح یابی کے بعد بایزید نے سٹرائسیر کے مقبوضہ ودین پر بھی حملہ کیا۔ اس نے ہنگری اور ولاشیہ کے مقابلے میں ودین، سلستہ اور نکہہ بولی میں طاقتور "اوج بیگیوں" کو بسا دیا۔ ۵۸۴۷ھ / ۱۳۴۳ء میں جب ہنگری کی ایک فوج نے بلغاریا کے اندر پیش قدمی کی تو بلغاریوں نے "رعایا" اور Voynuks، جو صوفیہ اور رادومیر Radomir میں آباد تھے، حملہ آوروں کے ساتھ مل گئے، لیکن عثمانیوں نے انہیں بہت جلد کچل دیا (قب Fatih Devri : Inalcik، انقرہ ۱۹۵۳ء، ص ۲۰)۔

اس دور میں علی الخصوص ۵۸۰۵ھ / ۱۴۰۲ء کے بعد بلغاریا پر عثمانیت کا رنگ بہت گہرا ہو گیا، جیسا کہ ۱۵۲۰ء کی سرکاری مساحتوں سے معلوم ہوتا ہے (قب Ö.L. Barkan : *Iktisat Fakültesi Mecmuasi*، ج ۱۱ نقشہ) مشرقی بلغاریا میں مسلم آبادی کو قطعی طور پر اکثریت حاصل تھی۔ ۵۸۵۹ھ / ۱۴۵۵ء میں فلہ میں غیر مسلموں کے پچاس گھرانوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے چھ سو گھرانے آباد تھے۔ بلغاریا چرین، صوفیہ، سلستہ، نکہہ بولی اور ودین کے سنجاقوں میں منقسم تھا جو روم ایلی کی "ایالت" یا صوبے میں داخل تھے۔ گیارہویں / سترہویں صدی میں نکہہ بولی اور سلستہ کے سنجاق اوزو کی نئی ایالت میں شامل

ترنوو کے سامنے نمودار ہو گیا۔ کفار نے شہر کی کنجیاں اسے پیش کر دیں، جس کا مطلب اطاعت تھا۔ راہ میں کئی اور شہروں کی اطاعت قبول کرتے ہوئے علی بالآخر نکہہ بولی یا نیکوپولیس Nicopolis-Nikeboli پہنچا اور اس کا محاصرہ کر لیا جہاں ششمن نے پناہ لی تھی۔ ششمن نے معافی طلب کی جو اسے عطا کر دی گئی۔ اس کے بعد علی افواج مراد کے ساتھ جا ملا۔

قوسوہ Kosovo کی لڑائی کے بعد بایزید کو اناطولی میں رکنا پڑا اور دوسری طرف مرچہ Mircea نے، جسے سجمند Sigismund کی اعانت حاصل تھی، سلستہ اور دوبروجہ پر قبضہ کر کے ۵۷۹۳ھ / ۱۳۹۱ء میں قرین اوووسی کے "اقینجیوں" پر ایک کاسیاب چھاپہ مارا۔ ۵۷۹۵ھ / ۱۳۹۳ء میں کہیں جا کر بایزید ادھر آسکا اور اس نے ترنوو پر بزور شمشیر قبضہ کیا (۶ رمضان / ۱۷ جولائی) اور دوبروجہ اور سلستہ کو بھی تسخیر کر لیا، لیکن اب بھی ششمن کو اس کے مستحکم قلعے نکہہ بولی میں ایک باجگزار کی حیثیت سے رہنے دیا گیا۔ اب اس نے سجمند کے سامنے دست طلب دراز کیا۔ یہی چیز ٹرانسلوانیا Transylvania پر بایزید [رک بان] کے حملے اور مرچہ کے برخلاف جنگ ارگیش کا موجب بنی (۲۶ رجب ۵۷۹۷ھ / ۱۷ مئی ۱۳۹۵ء)۔ حال ہی میں ایک دستاویز دستیاب ہوئی ہے (محافظ خانہ توپ قہی سراے، استانبول، شماره ۶۳۷۴)، جس میں تحریر ہے کہ "دریائے ارخس کو عبور کرنے کے بعد یلدرم خان نکہہ بولی کے قلعے کے سامنے پہنچا، جس کا حاکم ششمن نامی ایک سردار تھا۔ وہ بھی افاق (= ولاشیہ) کے ویوڈہ Voyvode کی طرح اسے خراج ادا کیا کرتا تھا۔ سلطان نے اسے جہاز بھیجنے کا حکم دیا، جس کی اس نے تعمیل کی۔ دوسرے کنارے پر



۱۹۳۳ء، دستاویز، عدد ۳) - بالائی سیرج Meriç (میرتسہ Maritsa) کی وادی میں چاول کی پیداوار سے ۱۹۳۳ء/۵۸۸۸ کے لگ بھگ حکومت کو بطور "مقاطعہ" (زک باں) دس لاکھ "اقچہ" (بیس ہزار طلائی ڈوکت ducats) کے قریب سالانہ مالیہ وصول ہوا (Edirne ve Paşa Livasi : T. Gökbilgin) استانبول ۱۹۵۲ء، ص ۱۳۱) - ۱۹۴۹ء/۱۵۷۱ء میں اخیولی میں جنگی جہازوں کی تعمیر کے لیے شہنی، ہزار غراد، ترونوو (Tronovo) سے عمارتی لکڑی اور سماکوف (Samakov) سے لوہا منہا کیا گیا (A. Refik، دستاویز، عدد ۱۹، ص ۲۲) - اس دور میں قلعہ، شہنی اور اسلمیہ (Silven) میں کپڑے اور نعلے کی صنعت کو فروغ ہوا اور یہ چیزیں سلطنت کے دوسرے حصوں کو برآمد کی جاتی تھیں (A. Refik، دستاویز، عدد ۱۸) - ۱۳۵۰ سے ۱۵۹۵ء تک بلغاریہ کو نہ تو کستی بیرونی حملے کا سامنا کرنا پڑا، نہ اندرونی بغاوت کا - بلغاریہ قصبے، بالخصوص قلعہ، صوفیہ اور سلستریہ، جو روم ایل (زک باں) جانے والی بڑی بڑی شاہراہوں پر واقع تھیں، فوجی اور تجارتی مراکزوں کی حیثیت سے ترقی کر گئے - ان شہروں میں تھے مسلمان نعلے جامع مسجدوں اور سرکاری عمارتوں نیز قیمتی اشیاء کے مستحق بازاروں (بستان) اور عنام مندوں کے گرد بس گئے جن کے ساتھ بڑے قیمتی اوقاف ملحق تھے (دیکھئے اولیا چلبی (۱۰۶۱ھ/۱۹۵۱ء) کے مفصل حالات، ص ۳: ۳۰۱ تا ۳۱۱ و Beiträge zur Kenntnis Thrakiens : H. J. Kissling Wiesbaden im 17 Jahr، ۱۹۵۶ء) - ۱۵۲۰ء کی عثمانی مردم شماری کی رو سے (دیکھئے Ö.L. Barkan، در JESHO، ۱/۱، ۱۹۵۷ء، ص ۳۲) سلستریہ، جرمن، نیکولی، ویدین اور صوفیہ کے سنجاقوں میں ایک لاکھ پچیس ہزار گھرانے آباد تھے؛ اس میں

کر دیے گئے جسے قازقوں کے مقابلے میں قائم کیا گیا تھا - جدید صوبے کا صدر مقام اوزو اور سلستریہ تھا - ۱۹۲۳ء/۱۵۱۸ء میں سلستریہ کے سنجاق میں پرودی، یان بولی، ہرسووہ، وزنہ، اخیولی Anchialus، ایدوس، قرین اوستی اور روسی قسری Rousokastron شامل تھے - بلغاریہ میں سلطنت عثمانیہ کا مخصوص نظم و نسق نظام "تیمار" (زک باں) کے ساتھ رائج کر دیا گیا (قوانین و ضوابط کے لیے دیکھئے Ö.L. Barkan : Kamilar، استانبول ۱۹۳۳ء، ص ۲۵۵ تا ۲۸۹) - دور عثمانی سے قبل کا عسکری گروہ بیشتر عثمانیوں کی عسکری تنظیم میں مدغم کر لیا گیا (قب راقم مقالہ کی Fatih Devri، ص ۱۳۶ تا ۱۸۳) - وہاں کے "پرونجاروں" (pronijar) کو تیماردار اور "ووی نکون" Woiniks کو عثمانی "وے ٹی" کی حیثیت دے دی گئی - جہاں تک بلغاریہ عاتہ الناس کا تعلق ہے، اسے ذمی [زک باں] رعایا کا درجہ دیا گیا، لیکن اس میں بہت سے گروہ مالی اعتبار سے ایک خصوصی مرتبے کے مستحق سمجھے گئے؛ انہیں "در بندختی" (کوہستانی دروں کے محافظ) کا اور نعل شاہی یا لشکر کے لیے چاول، گوشت وغیرہ بہم پہنچانے والوں کا منصب مل گیا - علاوہ ازیں بلغاریہ میں فوجی بھرتی کے قانون "دیو شربہ" کا اطلاق بھی وسیع پیمانے پر کیا گیا۔

چونکہ استانبول اور لشکر کو سامان خوراک کی بہت کثیر مقدار کی فراہمی کے سلسلے میں بلغاریہ پر انحصار کرنا پڑتا تھا اس لیے حکومت نے بلغاریہ گوشت اور چاول کی برآمد پر پابندی عائد کر دیں - ۱۹۴۳ء/۱۵۹۵ء میں جو لوگ مغربی بلغاریہ میں بیٹیوں کے مالک ہوئے تھے، انہیں حکم دیا گیا کہ لشکر کے لیے ۱۹۲۹ء بلہڑیں منہا کریں (Türk İdaresinde Bulgaristan : A. Refik، استانبول

Bessarabia [رک بہ بجا] میں آباد ہونے کے لیے روسی فوج کے پیچھے پیچھے چل دیے تھے۔ ۱۸۶۱ء میں دس ہزار کے قریب نفوس ترک وطن کر کے کریمیا کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔

اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں بلغاریا میں "اعیان" خاص طور پر طاقتور ہو گئے تھے۔ وہ "ملتزمین" (رک بان) [مالگذاری وصول کرنے کے ٹھیکیدار] اور سرکاری اراضی، یعنی چفٹلیک (رک بان) کے موروثی قابضوں کی حیثیت سے وہ ملک کے حقیقی مالک بن گئے تھے، کیونکہ رعایا سے محاصل وصول کرنے کے سلسلے میں حکومت کو ان پر انحصار کرنا پڑتا تھا؛ چنانچہ ان میں سے سربر آوردہ افراد، مثلاً روسچق Rusdjuk میں ٹریسٹیک اوغلی، اسمعیل اور بیرق دار مصطفیٰ (رک بان) اور ہزار غراد میں حاجی عمر، اپنی نجی فوجیں تک رکھتے تھے، جن کی طرف سخت مشکل کے وقت سلطان کو بھی رجوع کرنا پڑتا تھا (A. Refik، دستاویز، عدد ۹۰)۔

رودوپ (Rhodopes) اور بلقان کے پہاڑ ان ڈاکوؤں کی جائے پناہ بن گئے جن کی تعداد روز افزوں تھی اور جنہیں اس دور میں "کیر جلی" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر پزوند اوغلی یا پاسبان اوغلی عثمان (رک بان) نامی ایک قسمت آزما فوجی نے بغاوت برپا کی اور پھر ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۷ء سے ۱۲۲۱ھ / ۱۸۰۶ء تک بطور پاشاے ودین مغربی بلغاریا پر حکومت کرتا رہا (جودت: تاریخ، ۷: ۲۳۷، ۲۳۰، ۲۵۰ و ۸: ۱۳۶ تا ۱۳۸)۔ سلطان محمود ثانی کے عہد میں "اعیان" کا خاتمہ کر دیا گیا اور بلغاریا میں مرکزی حکومت کا نظم و نسق قائم ہو گیا۔

دور "تنظیمات" میں بلغاریا کی از سر نو تشکیل ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۶ء - ۱۸۴۷ء میں ہوئی اور اسے سلسترہ، ودین اور نیش کی ایالتوں میں تقسیم کر دیا

وہ آبادی شامل نہیں جو بلغاریا کے پاشا کے مملوکہ مقامات میں موجود تھی۔

سولہویں صدی کے اواخر سے کئی محصولوں کی شرح میں اضافہ کیا گیا اور بلغاریوی رعایا کی طرف سے مقامی اہلکاروں اور سپاہیوں کے استحصال کی شکایات شروع ہو گئیں (A. Refik، دستاویز، عدد ۳۷، ۳۸، ۳۱، ۳۲، ۳۶، ۳۷) - ۱۳۰۱ھ / ۱۶۰۵ء میں علاقہ صوفیہ کی رعایا نے شکایت کی کہ بطریق کے کارندے رعایا سے وصول ہونے والے مواجب کی شرح میں ۶ آچہ سے ۱۲ آچہ اور مقامی پادریوں سے ۶۰ سے ۳۰۰ آچہ تک اضافہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں (A. Refik، دستاویز ۳۸)۔ بلغاریا کی پہلی اہم شورش افلاقی ترنوو (Veliko - Trnovo) کے مقام پر ۱۰۰۳ھ / ۱۵۹۵ء میں رونما ہوئی جب افلاق (Wallachia) کے والی مائیکل (Michael) نے بلغاریا پر کامیاب دھاوا کیا۔ سنان پاشا (رک بان) نے اس بغاوت کو فرو کیا اور ہزاروں بلغاریویوں نے افلاق میں پناہ لی۔ اسی زمانے سے عثمانی مآخذ میں بلغاریوی "ہیدود" یا "اشقیاء" کا ذکر بار بار آنے لگتا ہے (A. Refik، دستاویز ۵۲، ۵۳، ۷۵)۔ اب تقریباً ہر بیرونی دشمن کے حملے میں "رعایا" اس کے ساتھ مل جاتی تھی اور جب وہ واپس جاتا تھا تو رعایا کے بڑے بڑے گروہ بھی اس کے ساتھ ہو لیتے تھے، حالانکہ عثمانی حکومت انہیں ہر طرح کا اطمینان دلاتی رہتی تھی (مثلاً ۱۱۰۰ھ / ۱۶۸۸ء میں ودین، قتلوفجہ Kutlofdja، پیروت اور برقوفجہ Berkofdja کے علاقے کی رعایا (A. Refik، دستاویز، عدد ۵۹)، ۱۱۵۰ھ / ۱۷۳۷ء میں علاقہ ازنبول (Znepolje) کی رعایا (A. Refik، دستاویز، عدد ۸۱، ۸۲)، ۱۲۰۸ھ / ۱۷۹۳ء میں اسمعیل اور سٹانیکا Stanimaka کے علاقے کی رعایا) - ۱۲۳۵ھ / ۱۸۲۹ء میں ستر اسی ہزار بلغاریوی پس سربیا



انقلابیوں نے خوب ہوا دی اور بالآخر ۱۲۸۶ء / ۱۸۶۹ء میں ایک مرکزی مجلس انقلاب بلغاریا میں منظم کر لی۔ ۱۲۸۱ء / ۱۸۶۳ء میں نئی انتظامی اصلاحات پہلی بار بلغاریا میں نافذ کی گئیں۔ روسچق، ورن، ویدین، تلجی (تلچہ)، ترونوو کے سنجاق ولایت تونہ (Tuna) میں اور صوفیہ اور نیش کے سنجاق ولایت صوفیہ میں شامل کیے گئے۔ تونہ کا پہلا والی مدحت پاشا (رک بان) مقرر ہوا، جس نے اس ولایت کو سلطنت کا سب سے ترقی پذیر صوبہ بنا دیا (مدحت، ص ۲۴ تا ۵۰)۔ اس کے زمانہ حکومت میں ولایت کا مالیانہ پچاس فی صد بڑھ گیا، زراعت کو ترقی ہوئی اور عوام کی مدد سے نئی شاہراہیں تعمیر کی گئیں۔ ۱۲۸۷ء / ۱۸۷۰ء میں ایک آزاد بلغاریا کلیسا کے لیے جد و جہد صدر استغنی (Exarchate) کے قیام پر منتج ہوئی اور یہ ایک قومی فتح سمجھی گئی۔ اسی زمانے میں بلغاریا انقلابیوں "قومنجی" کی، جنہیں روسیوں کی عملی امداد حاصل تھی، بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کا نتیجہ ۱۲۹۳ء / اپریل - مئی ۱۸۷۶ء کی عظیم بغاوت کی صورت میں نکلا۔ ۱۲۹۳ء / ۱۸۷۷ء کی جنگ روم و روس کا سب سے بڑا میدان کارزار بلغاریا بنا۔ اس کے باعث مسلمان آبادی جنوب کی طرف منتقل ہو گئی۔ معاہدہ سانستیفانو Sanstefano کے ذریعے روس نے کوشش کی کہ ڈینیوب سے بحیرہ ایجیئن تک اس کے زیر حمایت ایک عظیم بلغاریا حکومت بنائی جائے، لیکن دولِ عظمیٰ نے اس معاہدے کی جگہ معاہدہ برلن کو دے دی، جس کی رو سے بلغاریا کی ایک ریاست "بلغارستان امارتی" سلطان کے زیر سیادت قائم ہو گئی اور صوبہ مشرقی روم ایلی (روم ایلی شرقی ولایت) کو حقوق خود اختیاری مل گئے۔ ۱۳۰۲ء / ۱۸۸۵ء ستمبر ۱۸ء کو فلہ میں جو انقلاب آیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

گیا۔ یہاں صوبائی مجالس شوری قائم ہوئیں، جن میں بلغاریائی نمائندوں کو بھی جگہ دی گئی؛ لیکن ان انتظامی اصلاحات سے بلغاریوں کی بے چینی کا سد باب نہ ہو سکا، چنانچہ علاقہ نیش میں ایک بغاوت ۱۲۵۷ء / ۱۸۴۱ء میں اور اس سے بھی سخت اور شدید تر بغاوت ۱۲۶۶ء / ۱۸۴۹ء۔ ۱۸۵۰ء میں ویدین کے علاقے میں برپا ہوئی۔ اس کا باعث کچھ تو سربیا اور افلاق کے انقلاب پسندوں کی اشتعال انگیزی تھی اور کچھ اس چفتلک نظام کی خرابیاں جو وہاں مسلمان آغاؤں یا "گوسپوداروں" نے قائم کر رکھا تھا (دیکھیے راقم مقالہ : *Tanzimat ve Bulgar Meselsi*، انقرہ ۱۹۴۳ء)۔

انیسویں صدی کے وسط میں بہت سے

مبصر ( *La population de la Turquie : N. V. Michoff et de la Bulgarie*، جلد ۳، صوفیہ ۱۹۱۵ تا ۱۹۲۹ء) اس نتیجے پر پہنچے کہ بلغاریا کی ایک تہائی آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ اس میں تقریباً چار یا پانچ لاکھ ہومک (Pomatzki) تھے، یعنی بلغاریا کے وہ اصلی باشندے جنہوں نے سولہویں اور سترہویں صدی میں رودوپ کے وسطی اور مغربی علاقے میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ۱۲۹۳ء / ۱۸۷۶ء تک فلہ، ویدین، شینی، روسچق، رازگراد، ورنہ، ہلونہ، عثمان بازار، اسکی جمعہ، بنی زغرہ کے شہروں میں مسلمان اکثریت میں تھے اور گبروو (Gabrovo)، نیش، صوفیہ، ترونوو، قرین اواسی (Karno bat) میں اقلیت میں۔ جنگ کریمیا کے بعد عثمانی حکومت نے بلغاریا میں ستر یا نوے ہزار چرکسی اور تقریباً ایک لاکھ تاتاری بسا دیے تھے (اے۔ ایچ مدحت : مدحت پاشا، قاہرہ ۱۳۲۲ء / ۱۹۰۴ء، ص ۳۵ : ۳۵۰۰۰۰ سہاجرین)۔ ان کے اور مقامی بلغاریوں کے درمیان جو کشیدگی تھی اسے بلغاریائی

لائبزیگ ۱۹۱۷ء: (۱۵) I. Sakazov : *Bulgarische Wirtschaftsgeschichte*، برلن - لائبزیگ ۱۹۲۹ء؛  
*Sources Osmāno - Turques* : G. D. Galabov (۱۶) *pour l'Histoire Bulgare, Annuaire de l'Uni. de Sofia*، ج ۳۳، شماره ۲ و ج ۳۵، شماره ۶ و ج ۳۹  
 (۱۹۳۸-۱۹۳۳ء)؛ (۱۷) F. Ph. Kanitz : *Donau - Bulgarien und der Balkan*، جلد ۳، لائبزیگ ۱۸۷۵-  
 ۱۸۷۹ء؛ (۱۸) H. Wilhelmy : *Hochbulgarien Geschichte* : N. Jorga (۱۹) ۱۹۳۰-۱۹۳۶ء؛  
*des Osmanischen Reiches*، جلد ۵، گوتھا ۱۹۰۸-  
 ۱۹۱۳ء؛ (۲۰) H. Inalcik : *Tanzimat ve Bulgar Meselesi*، انقرہ ۱۹۳۳ء؛ (۲۱) زکی ولیدی طوغان : مقاله  
 Balkan، در [ ]، ت [ ]، نیز رک بہ بلقان] :  
 (H. İNALCİK)

● بلغراد : (سربیا کی موجودہ زبان میں یوگراڈ = Beograd = سفید شہر) یوگوسلاویا کی جمہوریہ ملیہ اتحادیہ (Federal People's Republic of Yugoslavia) اور سربیا کی جمہوریہ ملیہ (People's Republic of Serbia) کا دارالحکومت، جو دریائے ساوا Sava اور ڈینیوب Danube کے سنگم پر واقع ہے۔ اس میں یہ علاقے شامل ہیں: یوگراڈ، جو ساوا اور ڈینیوب کے دائیں کنارے پر قدیم شہر ہے؛ نووی یوگراڈ Novi Beograd (بلغراد جدید)، جو ساوا کے بائیں کنارے پر نوآباد شہر ہے اور ابھی زیر تعمیر ہے اور زمین Zemün، جو ڈینیوب پر قدیم شہر ہے۔ ساوا اور ڈینیوب کے دونوں جانب چھوٹے چھوٹے چند مقامات بھی بلغراد ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی آبادی پانچ لاکھ سے زائد ہے۔  
 ۱۹۱۸ء سے بلغراد یوگوسلاویا کا دارالحکومت بنا اور اسی زمانے سے یہ ساوا اور ڈینیوب کے اطراف میں دور تک پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ قبل ازیں اس میں سنگم کے نیچے صرف ساوا کے دائیں کنارے

یہ دونوں علاقے ایک دوسرے سے متحد ہو گئے (A.F. Türkgeldi) : مسائل مہمہ سیاسیہ، انقرہ ۱۹۵۷ء، ص ۱۹۳ تا ۲۳۶)۔ استانبول کے انقلاب ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء کے وقت فرڈیننڈ Ferdinand، والی بلغاریا نے بلغاریا کی آزادی کا اعلان کر کے "زاز" کا لقب اختیار کر لیا (۷ رمضان ۱۳۲۶ھ / ۳ اکتوبر ۱۹۰۸ء)۔  
 مآخذ : (۱) N. V. Michoff : *Bibliographie sur l'histoire de la Turquie et de la Bulgarie*، جلد ۳، صوفیہ ۱۹۱۳-۱۹۳۳ء؛ (۲) C. Jireček : *Geschichte der Bulgaren*، پراگ ۱۸۷۶ء؛ (۳) وہی مصنف : *Des Fürstenthum Bulgarien - Die Heerstrasse von Belgrad nach Constantinpel und die Balkanpässe*، پراگ ۱۸۷۷ء؛ (۴) V. Zlatarski : *Geschichte der Bulgaren*، لائبزیگ ۱۹۱۸ء؛ (۵) P. Nikov : *Turskoto zavaldevane na Bulgarija i sadbata na poslednite Sišmanovci*، در *Izvestija na Istor. Druzestvo*، ۸/۷ (۱۹۲۸ء) : ۱۱۲ تا ۱۱۳؛ (۶) A. Hajek : *Bulgarien unter der Türkenherrschaft*، شٹٹگارٹ ۱۹۲۵ء؛ (۷) وہی مصنف : *Die Bulgaren im Spiegel der Reiseliterature des 16. bis 19. Jahrhunderts*، بلغاریا ۱۹۳۲ء، ص ۴۷ تا ۹۹؛ (۸) S. Runciman : *A History of the First Bulgarian Empire*، لندن ۱۹۳۰ء؛ (۹) R. L. Wolff : *The 'Second Bulgarian Empire', its Origin and History to 1204*، در *Speculum*، ۲۳ (۱۹۴۹ء) : ۱۶۷ تا ۲۰۶؛ (۱۰) احمد رفیق : تورک ادارہ سندھ بلغارستان، استانبول ۱۹۳۳ء؛ (۱۱) وہی مصنف : *Othmanli Imperatorluğ- unda Fener Patrikhanesi ve Bulgar Kilesesi*، در *TTEM*، شماره ۸ (۱۳۳۱ھ)؛ (۱۲) وہی مصنف : *1284 Bulgar İhtilali*، شماره ۹ (۱۳۳۱ھ)؛ (۱۳) N. Staneff : *Geschichte der Bulgaren*



دیگرے مختلف فرمانروا (بوزنطی، بلغار، ہنگروی اور سرب) اس پر قابض رہے۔ سربیا کے مطلق العنان بادشاہ سٹیفان لزاروچ Stevan Lazarević کی وفات (۱۳۸۷ء) کے بعد یہ شہر ہنگرویوں کے ہاتھ آیا۔ کوئی ایک صدی تک ترکی حملوں سے ہنگری کی جنوبی سرحدوں کی حفاظت کے لیے سب سے اہم مقام یہی تھا۔

اگر ہم ان غیر یقینی اطلاعات کو نظر انداز کر دیں جو بایزید اول کے محاصرہ بلغراد کے بارے میں ملتی ہیں تو ۱۳۶۳ء/۱۳۵۹ء سے پہلے ترکوں نے بلغراد پر دو حملے کیے: ایک ۱۳۳۹ء/۱۳۳۰ء میں، جس میں چھ مہینے تک اس شہر کو محاصرے کا سامنا رہا اور دوسرا سلطان محمد ثانی فاتح کے تحت، جو ۱۳۶۰ء/۱۳۵۶ء میں ایک لشکر جبار، جنگی بیڑا اور مضبوط توپ خانہ لے کر وارد ہوا۔ خشکی کی جانب فوجی گھیرا تھا؛ ترکی بیڑے نے سارے ڈینیوب کی ناکہ بندی کر رکھی تھی، زور کی گولہ باری ہو رہی تھی پھر بھی بلغراد نے استقامت دکھائی اور سب مشکلات کا مقابلہ کرتا رہا۔ آخر کار شہر کو مدد پہنچ گئی اس کا قائد ہونیاد (János Hunyady) محاصرے کو چیر کر شہر تک پہنچ گیا اور عنانِ دفاع اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ہر چند کہ ترک زیریں قلعہ بندی میں گھس آئے تھے، حفاظتی دستے کامیابی سے مدافعت کرتے رہے۔ ترکوں نے ایک عاجلانہ حملے کے بعد آخر کار ۲۳ جولائی کو محاصرہ اٹھا لیا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ بلغراد نے پھر ”سیحی دنیا کی بیرونی فصیل“ کے طور پر شہرت حاصل کی۔

۱۳۴۱ء/۱۳۴۰ء - ۱۳۴۲ء میں ترکوں نے بلغراد کے بالکل سامنے اوالہ (Havala) پہاڑ پر ایک قلعہ تعمیر کیا۔ ۱۳۶۳ء/۱۳۵۹ء میں جب سربیا انجام کار ترکوں کے زیرِ نگیں ہو گیا تو اس قلعے نے بلغراد پر ترکی حملوں میں بہت کام دیا۔ دسویں صدی ہجری/سولہویں صدی عیسوی کے ابتدائی عشروں میں ترکوں

اور ڈینیوب کے دائیں کنارے کا ملحقہ علاقہ شامل تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں Celtic Scordici نے ایک بستی آباد کی اور اس کا نام Singidun رکھا؛ سلطنت روما کے عہد تک اس شہر کا یہی نام Singidunum رہا۔ نویں صدی میں جب یہاں بلغار کی حکومت تھی تو اس شہر کا نام سلافی زبان میں رکنا گیا، جو باوجود حکومتوں (بشمول بوزنطی اور مابعد کی ہنگروی حکومت) کے برابر بدلتے رہنے کے یہی نام جاری رہا؛ تاہم یہ نام اکثر و بیشتر مختلف شکلوں میں لکھا جاتا رہا (جیسے Alba Bulgarica، Alba Graeca، Nandeor Fejérvár، Nandeor Alba، Griechisch Weissenburg)۔ ترک اپنے زمانے میں اسے بلغراد کہتے تھے اور اس غرض سے کہ البانیہ، ہنگری اور ٹرانسیلوانیا کے شہروں سے (جہاں بلگریڈ نام کے اور شہر تھے) امتیاز کیا جا سکے۔ وقتاً فوقتاً اسے بلغراد انگوروز (نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی میں)، آسفی بلغراد، تونہ بلغرادی، بلغراد سمندری اور ان سے ملتے جلتے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ بعض ترکی سرکاری کاغذات اور ہم عصر جغرافیائی اور تاریخی کتابوں میں بلغراد کو کہیں کہیں ایسے ناموں سے بھی یاد کیا گیا ہے جو اسلامی دنیا میں سرحدی شہروں اور جنگی مقاصد کی اہم قلعہ بندیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے؛ چنانچہ اسے جابجا دارالجهاد کہا گیا ہے، جس سے ہرانے سربیا کے مؤرخوں نے سمجھ لیا کہ بلغراد کا ترکی نام دارالجهاد تھا۔ پروفیسر F. Bajraktarević نے ثابت کیا ہے کہ اس رسم کا بیان بے اصل ہے۔

بہلی عالمگیر جنگ تک بلغراد وسطی یورپ سے مشرقِ قریب کو جانے والی شاہراہ پر واقع ایک اہم قلعہ بند شہر تھا۔ جنگی مقاصد کا اہم مقام ہونے کی بدولت گزشتہ زمانے میں بلغراد طوفان خیز واقعات کا مرکز رہا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں یکے بعد

سے لڑتے لڑتے بلغراد کی دفاعی قوت گھٹتی چلی گئی۔ سیاسی اور مالی بحرانوں کے باعث ہنگری اس قابل بھی نہ رہا کہ محافظ قلعہ فوج کو باقاعدہ تنخواہ دے سکے؛ چنانچہ دفاعی استحکامات کا ترقی دینا اور بھی مشکل ہو گیا۔

سلطان سلیمان کی پہلی مہم (۱۵۲۱/۱۵۲۲ء) کے دوران میں ترکی فوج ایک طویل محاصرے کے بعد ۲۹ اگست ۱۵۲۱ء کو بلغراد میں داخل ہو گئی۔ ہنگری کی فوجیں واپس بھیج دی گئیں۔ سربیا کے لوگوں کو قسطنطنیہ میں بسا دیا گیا۔ ڈینیوب کے سربی جنگی جہازوں کے عملے کے کچھ لوگ ترکی جنگی بیڑے کے جہازران بن گئے۔ اسی زمانے میں سمندریہ (Semendire = Smederevo) کے سنجاق کا صدر مقام بلغراد منتقل کر دیا گیا اور یحییٰ پاشا کے فرزند بالی بے (Bali-Bey) (م ۱۵۳۳ء/۱۵۲۷ء) کو گورنر بنا دیا گیا۔ بالی بے نے بلغراد کو محفوظ بنانے کے لیے سیرمیہ Syrmia کے قرب و جوار کی بستیوں کی تمام عمارتوں کو مسمار کرادیا اور پھر سیرمیہ کی مسمار شدہ عمارتوں اور ان گرائی ہوئی عمارتوں کے ملبے کو بلغراد کے جدید دفاعی استحکامات میں استعمال کیا، جو اب ہنگری کے خلاف نہایت ہی اہم استحکامات بن گئے۔ موہاکس Mohács کے قریب (۱۵۲۶/۱۵۲۷ء کی) جنگ ہونے کے بعد مشرقی اور وسطی سیرمیہ کے قصبات بلغراد کے سنجاق بیگ کے زیر حکومت آ گئے۔ بالی بے کی وفات کے بعد اس کے بھائی محمد بے نے (جس نے ۱۵۴۸/۱۵۵۵ء میں جبکہ وہ بودہ Buda کا پاشا تھا وفات پائی) ملک گیری کی روش جاری رکھی۔ ۱۵۳۷/۱۵۳۸ء تک سیرمیہ Syrmia، سلاوانیا Slavonia اور جنوبی ہنگری کے مفتوحہ علاقے بلغراد کے سنجاق بیگ کے ماتحت رہے۔ بعد ازاں پوزغا (Pozega) کا سنجاق سلاوانیا میں قائم کر دیا گیا۔ ۱۵۳۸/۱۵۴۱ء میں جب بودہ فتح

ہو گیا اور ایالت بودہ قائم ہو گئی تو سمندرہ کا سنجاق اپنے صدر مقام بلغراد سمیت اس ایالت میں شامل ہو گیا۔ بودہ کے پاشا کا نمائندہ (قائم مقام) بلغراد ہی میں رہتا تھا، کیونکہ اس مقام کی، جو مغرب سے لڑائی ہونے سے پہلے بھی ترکی افواج بندی کا اڈا تھا، زبردست فوجی اہمیت بودہ کی فتح کے بعد بھی کچھ کم نہ ہوئی۔ ترکی افواج کی طرح سلطان اور وزیر اعظم بھی بلغراد ہی میں سے ہو کر گزرتے تھے اور وہاں پر تھوڑے بہت دن قیام کرتے تھے۔ ترکوں کی تاریخ کے متعدد واقعات بلغراد سے تعلق رکھتے ہیں۔ سیاسی وفود بھی، جو ڈینیوب کے راستے مغرب کی جانب سے سلطان ترکی کے پاس جاتے تھے، کچھ عرصہ بلغراد میں ٹھہرتے تھے، کیونکہ یہیں سے خشکی کا سفر شروع ہوتا تھا۔

بلغراد فتح کرتے ہی ترکوں نے وہاں کے استحکامات میں اضافے کرنے کی طرف توجہ کی۔ ہنگری عہدِ حکومت میں یہ زیرین و بالائی دونوں قلعہ بندیوں پر مشتمل تھا اور اب اسے توپ خانے سے اچھی طرح آراستہ کر دیا گیا تھا۔ ان دونوں قلعہ بندیوں میں سے ہر ایک میں الگ الگ کمانڈر (دزدار) متعین تھے۔ ترکوں نے بلغراد کو ایک محافظ فوج اور ایک جنگی بیڑے سے لیس کیا۔ ڈینیوب پر ہر ایک بیڑے کا موجود ہونا خصوصیت سے اس لیے ضروری تھا کہ ہنگری سے جنگ جاری تھی اور دسویں صدی ہجری/ سولہویں صدی عیسوی میں سربیا کے Martolos (مارتول) وہاں متعین کیے گئے۔ (۱۵۳۶/۱۵۳۷ء - ۱۵۳۷ء میں وہاں پر ویوڈہ وک Vuk کے زیر قیادت چالیس جزیروں (oda) میں ۳۸۵ مارتولوز Martolos اور ۳۹ ادہ باشی (odabashi) تھے)۔ سولہویں صدی کے نصف آخر میں بلغراد کے اندر معقول حفاظتی فوج موجود تھی (چنانچہ ۱۵۶۰ء میں ۲۲۳ مستحفظ، ۹ جباچی



djebedji، ۴ طویچی topdju مع ۵ بولوک باشی  
 bülükbaşî، ۴ قوبرہ جی (Kumbaradji)، ۱۰۱ ازب  
 azab، ۹۶ مارتولوز (Martolos) مع ایک آغا اور ۸  
 ادہ باشی Odabashi کے موجود تھے۔ آغا اور طویچی  
 کے ایک بولوک (bölük) کے سوا مارتولوز تمام کے  
 تمام سریا کے لوگ تھے۔

ہر چند کہ ترکوں کے قابض ہونے کے بعد  
 بلغراد نے بحیثیت ایک قلعہ بند شہر کے بہت جلد  
 بڑی ترقی کی، لیکن اس کی اقتصادی اور تجارتی  
 جہتی کی بابت یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔  
 ۱۵۳۶/۵۹۳۳ - ۱۵۳۷ میں بلغراد کے اندر چار  
 مسجدوں کے ارد گرد مسلمانوں کے چار محلے تھے۔  
 غیر فوجی مسلم آبادی کی تقریباً نصف تعداد بطور  
 اہل حرفہ دیچ رجسٹر ہوئی تھی۔ شہر کے باہر  
 محلوں میں عیسائیوں کے رہ گھر تھے۔ اہل شہر  
 کو قانونی ٹیکس ادا کرنا نہیں پڑتا تھا۔ ایسے  
 شہری سرکھت کی نگہداشت ان کے غم تھی۔  
 لیکن اس وقت بلغراد میں رہنے والے فلاح  
 کے بہتر گھر تھے ایسا کہ فلاح سے  
 مراد یہ خانہ سونے جیوے ہیں۔ اس مراد  
 نہیں۔ یہ لوگ بارون کے سرکاری مشرف کی  
 خدمت کرتے تھے۔ اس طرح خانہ بیسوں کے بھی  
 گھر تھے۔ بیسوں کے جہازوں کی مرمت کیا  
 ان کے غم تھے۔ بیسوں میں عیسائی کے نیچے  
 غنیمت (۴۰ تا ۶۵) اور نوونک (Dobanok) کے  
 تعمیر تیلنگروڈ کی ایک جنت مندریہ سے آکر  
 بلغراد میں ہی گئی۔

کا آکر بس جانا؛ مقامی باشندوں کا قبول اسلام۔  
 ۱۵۳۸/۵۹۳۱ء میں جس وقت بودہ اور (۵۹۵۹/  
 ۱۵۵۲ء) میں جب تیسور (Temesvar) برکی حلویس  
 میں آگئے تو بلغراد کی اہمیت ایک تجارتی مراکز  
 کی حیثیت سے بہت بڑھ گئی۔ ۱۵۶۷/۱۵۵۹۔  
 ۱۵۶۷ء تک بلغراد میں مسلمانوں کے سواہ محلے  
 تھے، جن میں ۳۶۰ سے زیادہ گھرانے تھے، اور  
 عیسائیوں کے ۶۰ سے تجاوز تھے۔ مسیح و مسلمان  
 خوب ترقی کر گئی اور جدید نسلی مسیحی آباد  
 ہوئیں۔ ۱۵۶۸-۱۵۷۰-۱۵۷۳ء کے درمیان  
 ("تقریباً") کی تفصیلات سے معلوم ہوا کہ  
 ترقی کی نشاندہی ملتی ہے۔ اس دور میں اہل  
 محلوں کے اندر جو جو سے زیادہ عیسائیوں کے  
 اور جنے جو سے زیادہ عیسائیوں کے گھر  
 خانہ بیسوں کے ایک سرایتیں اور بیسوں کے  
 میں گھر تھے۔

نسبوں میں عیسائی۔ عیسائی۔ عیسائی۔  
 کہ پونڈ اور گھریلو میں عیسائی۔ عیسائی۔  
 عیسائی کے طرف میں عیسائی کے۔ عیسائی کے  
 عیسائیوں کے پاس تھا۔ ایک عیسائی۔ عیسائی۔  
 کے طرف نظر دینا۔ عیسائی۔ عیسائی۔  
 عیسائی جو عیسائی کی وقت سے۔ عیسائی۔  
 کے عیسائی عیسائی گھریلو میں عیسائی۔  
 عیسائی عیسائی عیسائی۔ عیسائی۔ عیسائی۔  
 عیسائی عیسائی عیسائی کے عیسائی۔ عیسائی۔  
 عیسائی عیسائی عیسائی۔ عیسائی۔ عیسائی۔  
 عیسائی۔ عیسائی۔ عیسائی عیسائی عیسائی کے  
 عیسائی۔ عیسائی عیسائی۔ عیسائی۔ عیسائی۔  
 عیسائی عیسائی عیسائی۔ عیسائی۔ عیسائی۔  
 عیسائی عیسائی عیسائی کے عیسائی۔ عیسائی۔  
 عیسائی عیسائی عیسائی۔ عیسائی۔ عیسائی۔

۸ رمضان ۱۱۲۹ھ / ۱۶ اگست ۱۷۱۷ء کو سیوائے کے یوجنی Eugene of Savoy کے زیر قیادت شاہی فوج نے بلغراد کے قریب ترکوں کو شکست دی۔ صلح پوزارے واک (Pas-) Požarevac کے قبضے میں آ کر شمالی سریا کا دارالحکومت بن گیا۔ تباہ شدہ بلغراد ایک بار پھر پھلنے پھولنے لگا اور استحکامات کی تجدید کی گئی، موجودہ فصیلیں اسی زمانے کی یادگار ہیں۔

۱۱۵۲ھ / ۱۷۳۹ء کے صلح نامہ بلغراد کی رو سے دریائے ساوا اور دریائے ڈینیوب کو سرحد قرار دیا گیا۔ بلغراد سے بے توجہی کی گئی، وہ محض بنی چریوں کا ایک سرحدی حفاظتی مقام ہو کر رہ گیا۔ وہاں ایک پاشا کو وزیر کا لقب دے کر متعین کر دیا گیا۔ شمالی سریا کا ذکر بلغراد "پاشالک" کے نام سے کیا جانے لگا، اگرچہ سرکاری کاغذوں میں ہنوز اس کا نام سمندرہ سنجاق ہی تھا۔ ۱۷۸۹ء سے ۱۷۹۱ء تک بلغراد پھر آسٹریا کے قبضے میں رہا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں اس کی آبادی پچیس ہزار کے قریب تھی۔

صلح نامہ Svishtov (۱۷۹۱ء) کے بعد بنی چریوں کو بلغراد سے نکال دیا گیا۔ اگرچہ بہت دن نہ گزرنے پائے تھے کہ سلطان سلیم ثالث کو پھر ان کے واپس آنے کی اجازت دینی پڑی، لیکن انہوں نے وہاں پر خوف و ہراس کی حکومت جو قائم کر دی اس پر سریا والوں (سریوں) نے ۱۸۰۴ء میں پہلی بار بغاوت برپا کر دی۔ گو باغیوں نے بلغراد کے گرد فوراً گھیرا ڈال دیا، لیکن قبضہ کہیں ۱۸۰۶ء کے اواخر میں پا سکے۔ بلغراد باغی سریوں کی حکومت کے خاتمے ۱۸۱۳ء تک ان کا دارالحکومت رہا۔ ۱۸۱۵ء میں جب سریوں کی دوسری بغاوت پھوٹ پڑی اور ترکوں

کا تھا۔ اولیا چلبی کے بیان کے مطابق بلغراد میں ۲۱۷ محرابیں تھیں (کاتب چلبی وہاں کی صرف ۱۰۰ مسجدوں کا ذکر کرتا ہے)۔ قلعے کے اندر سلطان سلیمان کی مسجد، جو بقول اولیا چلبی معمار سنان نے بنائی تھی، اور شہر کے زیریں حصے والی مسجد، جو محمد پاشا ولد یحییٰ پاشا نے بنوائی تھی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بلغراد میں ایک سو ساٹھ محل (سرائیں) اور سات حمام تھے اور بکثرت چوک اور بازار، نیز ایشیا کی ایک خوبصورت مسقف منڈی (= یزستان [یا بدستان])، ۶ کارواں سرائیں اور متعدد "خان" (= چھوٹی سرائیں) تھیں۔ ایک ٹکسال بھی تھی۔ اسی زمانے سے شہر اور وہاں کے پیشہوروں کی جماعتوں پر بنی چریوں کا اثر ہے۔ بلغراد ایک "ملا" کی قیام گاہ تھی، جس کے تین نائب تھے، ایک مفتی بھی یہاں متعین تھا۔ اس میں سترہ تکیے، آٹھ مدرسے اور نو حدیث کی درسگاہیں (دارالحدیث) تھیں۔ یہاں کلیسا اور عیسائی اور یہودی اقلیتوں کے ثقافتی مراکز بھی تھے۔ اولیا چلبی کے فراہم کردہ اعداد و شمار بعض اوقات مبالغہ آمیز ہوتے ہیں، لیکن گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے تمام سیاح بلغراد کو ایک عظیم شہر کہتے ہیں اور اس کی تجارتی اہمیت پر خاص زور دیتے ہیں۔ باہر کے سیاحوں نے شہر کی مشرقی وضع قطع کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

۱۰۹۹ھ / ۱۶۸۸ء میں شاہی فوج نے بویریا کے الیکٹریکسمین Elector Maximilian کے زیر قیادت ایک ماہ کے محاصرے کے بعد بلغراد پر قبضہ کر لیا۔ اس موقع پر بلغراد نے سخت نقصان اٹھایا۔ دو سال تک یہ آسٹریا کے زیر نگیں رہا۔ اس کے بعد پھر ترکوں نے اسے لے لیا اور یہ صلح کارلوسی (Karlovcı) (Karlowitz)، ۱۱۱۰ھ / ۱۶۹۸ - ۱۶۹۹ء کے بعد تک بھی ترکی سلطنت میں شامل رہا۔



ہیں، ہجرت کر کے آئے تھے۔

مآخذ: (۱) بلغراد کے خلاف سلیمان کی مہم (۱۵۲۱ء)، در فریدوں پر: منشآت، بار دوم، ۱: ۵۰۷ تا ۵۱۳؛ (۲) *Histoire de la Campagne: F. Tauer* (۲) *du Sultan Suleyman Contre Belgrad en 1521. Texte person . . . . . avec une traduction abrégée*؛ (۳) *Prague ۱۹۱۳ء*: G. Elezović-G. Skrivanić *Kako su Turci posle više opšada zauzeli Beograd* (متواتر حملوں کے بعد ترکوں کا بلغراد کو سر کرنا)، بلغراد ۱۹۵۶ء؛ (۴) دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی اور گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی کے اندر بلغراد پر ترکی حکومت سے متعلق *Başvekâlet arşivi* در استانبول، ٹیو دفتر لری عدد ۹۷۸: ۱۳۵، ۱۸۷، ۳۱۶، ۵۱۷؛ بیرونی سیاحوں، عیسائی مشن کے ارکان (A. Verancius، S. Gerlach وغیرہ)، پاپائی زائرین (P. Masarechi وغیرہ) کے بیانات کی بابت *قُب Rimska: J. Radonić*؛ بلغراد ۱۹۵۰ء، کاتب چلبی (*Rumeli ve Bosna*) اور بالخصوص اولیا چلبی (۵: ۳۶۷ تا ۳۸۵)؛ (۵) *F. Bajraktarević* *Kako su Turci zvali Beograd? (Comment les Turcs appelaient-ils Belgrade?)* *Istorki časopis* ج ۳، بلغراد ۱۹۵۲ء؛ (۶) *R. Veselinović* *Neka pitanja iz prošlosti Beograda XVI-XIX Veka (Some questions concerning the history of Belgrade in the 16th to 19th centuries)*، ج ۲، ۱۹۵۰ء؛ (۷) *Ilustrovana istorija Beograda: M. Ilić-Agapova*؛ (۸) *Zagreb Enciklopedija Jugoslavije*؛ بلغراد ۱۹۳۳ء؛ (۹) *Beograd*، مقالہ بر *Beograd*، ص ۳۳ تا ۳۷؛ اور *Beogradski Pašahuk*، ص ۳۷ تا ۳۸۔ (B. DJURDJEV)

بلغورٹ: رَکْ به قلعة الشیف.

کو ان سے سمجھوتا کرنا پڑا اور نتیجہ سربیا میں دو عملی حکومت قائم ہو گئی تو ترکوں کے حکام اور حفاظتی دستے بلغراد میں موجود رہے۔ جون جون سربوں کی ماتحت حکومت قوت پکڑتی گئی بلغراد بھی سربیا کا شہر بنتا چلا گیا۔ سربوں اور ترکوں میں ایک خونریز تصادم کے بعد ترکی حفاظتی فوج نے شہر پر گولہ باری کی (۱۸۶۲ء)۔ اس کے بعد سیاسی گفت و شنید کا ایک طویل سلسلہ جاری ہوا۔ ۱۸۶۷ء میں قلعہ بند شہروں کو سربیا کے حوالے کر دیا گیا اور تب بلغراد سربیا کا دارالسلطنت بن گیا۔

جس طرح بلغراد کی قدیم عمارتوں میں سے محض معدودے چند عمارتیں سالم رکھی گئی تھیں اسی طرح اب ترکی عہد حکومت کی چند ہی یادگاریں باقی ہیں۔ ان میں سے کچھ وہیں پرانے قلعے میں ہیں (جو آج کل ایک پارک ہے)۔ خود شہر کے اندر ایسی صرف دو عمارتیں ہیں، جن میں ایک مسجد ہے اور ایک تریہ (مقبرہ)۔ ترکی حکومت کے نمایاں نشانات شہر کے مختلف حصوں اور قرب و جوار کے مقامات کے ناموں میں معلوم کیے جا سکتے ہیں، مثلاً قلعہ میدان *Kalemegdan*، قرہ برمہ *Karaburma*، تش معدنی *Taşmajdan*، درت بول *Dorčol*، روسپی کوپری / کوپریسی *Rospičuprija*، طویچی درہ سی (*Topčider*)، اولہ *Havale* وغیرہ۔

آج کل بلغراد میں جو مسلمان رہتے ہیں وہ ترکی زمانے کے سابقہ مسلمانوں کی اولاد نہیں۔ قدیم بلغراد کے مسلمانوں کے آخری کنبے ۱۸۶۷ء میں یہاں سے ہجرت کر گئے (ان میں سے بیشتر شمالی بوسنہ میں آباد ہو گئے)۔ اس وقت بلغراد میں جو مسلمان آباد ہیں وہ وہاں ۱۹۱۸ء کے بعد بوسنہ *Bosnia*، ہرسک *Hercegovina*، مقدونیہ اور بوگوسلاویہ کے دوسرے علاقوں سے، جہاں مسلمان

شمالی سرحد - ۱۰۶ء میں تراجنہ کے ماتحت عرب کا نیا صوبہ یہاں تک پھیلا ہوا تھا، لیکن بوزنطی دور میں ارنون Arnon کا عربی صوبہ، جس میں اس وقت عمان (Philadelphia)، حَسْبَان (اسبوس Esbus) اور مادبا کے علاقے شامل تھے اور ملک کے شمال میں پیدا شدہ فلسطینی تیرتہ (Palestine Tertia) کے مابین سرحد کا کام دیتا تھا۔ ستوط دمشق اور عمان کی پر اسن سپراندازی کے کچھ ہی عرصے بعد جب یزید بن ابی سفیان نے اس علاقے کو فتح کر لیا تو اموی دور میں اسے دوبارہ پہلے کی سی خوشحالی نصیب ہوئی اور یہاں بہت سے خلفا اور شہزادوں کے قصر موجود تھے (جیسے المشتاء، الزیاء، القسطل اور ام الولید؛ ان میں مشرق کی طرف پھیلے ہوئے قصیر عمراء، الخزانہ، قصر الحلبات یا قصر الطوبی شامل نہیں ہیں)۔ اس زمانے میں لفظ البلقاء وسیع معنوں میں مستعمل تھا جس کی تصدیق بعد کو یاقوت کے بیان سے ہوتی ہے اور وقائع نگاروں کے بیانات کے مطابق اس میں عجلون کے شہر، مثلاً اربد (اربد)، جہاں یزید ثانی نے وفات پائی (طبری ۲: ۱۴۶۴)، اور مؤتہ [رک بان] کی مانند ماب کا شہر بھی شامل تھے۔ اس انتظامی ضلع کا علیحدہ عامل تھا۔ نشیب و فراز کے مختلف ادوار سے گزرنے سے پہلے یہ علاقہ پورے ازمئہ وسطیٰ میں براہ راست دمشق کے ماتحت تھا۔ الیعقوبی کا بیان اس لحاظ سے المقدسی کے بیان سے مختلف ہے کہ وہ ”دمشق کی اس نوآبادی میں“ غور (بڑا شہر: Tericho) اور ظاہر (بڑا شہر عمان) کا ذکر الگ الگ حصوں کے طور پر کرتا ہے اور المقدسی ایک صدی کے بعد بیان کرتا ہے کہ بلقاء فلسطین کے علاقے کے ماتحت تھا۔ اسی طرح ایوبی عہد میں ابو الفداء نے اس علاقے کو شرات سے متعلق بتایا ہے۔ اس کے برعکس الہروی نے اس علاقے اور بلد ماب سے

بل فقیہ: رَکْ بہ مادہ فقیہ بل۔  
 البلقاء: عرب جغرافیہ دانوں نے یہ نام یا تو شرق اردن کے ان تمام علاقوں کے لیے استعمال کیا ہے جو تقریباً قدیم عمون ماب، یہاں تک کہ گلیڈ Gilead علاقوں کے برابر ہے یا اس کے وسطی حصے کے لیے جس کا مرکزی شہر مختلف وقتوں میں عمان [رک بان] حَسْبَان یا السُّلُط رہا ہے۔ گو یہ نام آج کل بھی پوری صحت کے ساتھ استعمال نہیں ہوتا تاہم اس کا جغرافیائی مفہوم عام طور سے چونے کے پتھر کی اس سطح مرتفع تک محدود ہے (اوسط بلندی سات سو میٹر سے آٹھ سو میٹر تک) جو شمال میں وادی زرقاء اور جنوب میں وادی الموجب (= ارنون Arnon) کے مابین واقع ہے۔ صحرا کی طرف یہ علاقہ چوکور شکل میں ابھرا ہوا ہے، لیکن بحر مردار اور اردن (شمال میں السُّلُط) کے قریب کوہ نبی یوشع کی چوٹی (۱۰۹۶ میٹر) اور مادبا کے علاقے میں کوہ نیبو Nebo (۸۳۵ میٹر) کے نشیبی علاقوں کے برابر برابر اس کی سطح بہت کٹی پھٹی ہے، بارش کے پانی نے مٹی کو کاٹ کاٹ کر اس کی نشیبی گھاٹیوں کو اور گہرا کر دیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ علاقہ خشک اور ویران ہے، لیکن گھاٹیوں کے دامن اور میدانی حصوں میں زراعت ممکن ہے، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قدیم الایام میں اس کی زمینوں کی زرخیزی اور اس کے دیہاتوں کی آسودگی کی اس قدر تعریف کیوں کی گئی ہے۔

یونانی عہد میں البلقاء کی ملکی تقسیم یہ تھی: مغربی کنارے پر پیریاہ Peraea جس کا صدر مقام گدارہ Gadara (السُّلُط کے قریب) تھا۔ عمان (Philadelphia) کا علاقہ جو بطور شہر کے دیکاپولس Decapolis سے ملحق تھا اور نبطی سلطنت کی



• بلقان : (جزیرہ نما)، وجہ تسمیہ : لفظ بلقان کے معنی پہاڑ یا سلسلہ کوہ ہیں اور ترکی زبان کے بلقان لبق کی صورت میں (بقول H. Eren) اس کے معنی ناہموار خطہ ہیں۔ اب اس لفظ کا رشتہ اشتقاق بَلق بمعنی کیچڑ یا مٹی اور ترکی تصغیری لاحقہ ”ان“ سے مربوط ہے۔ ترکمنستان میں ”بلخان“ نام کا ایک پہاڑ موجود ہے۔ روم ایلی کے عثمانی ترک اول اول اس لفظ کو ”پہاڑ“ کے معنوں میں استعمال کرتے تھے؛ مثلاً ’کوجہ بلقان‘ ’چتل بلقان‘ اور ’انگرس بلقانی‘ (یعنی کاریتھی کوهستان)، لیکن تخصیصی طور پر اس لفظ کا اطلاق اس سلسلہ کوہ پر کیا جاتا تھا جسے قدیم اور ازنہ وسطی کے جغرافیہ دان ہی موس Haemus کے نام سے موسوم کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ پہاڑ شمال کے غیر مہذب اور وحشی اور جنوب کے تمدن علاقوں کے درمیان حد فاصل ہے۔ تاریخ و ثقافت کے اعتبار سے شمال میں بلقان کی مختلف سرحدیں بتائی جا سکتی ہیں۔ روسیوں نے صوبہ دوبروجہ Dobruja میں چرناوودا Černa Voda اور Constanza کے درمیان تراجنہ (Trajan) کی فصیل کو آگے بڑھا کر دریائے ڈینیوب کے کنارے اپنی خاص دفاعی حدیں قائم کی تھیں، پھر (جسٹینین اول اور باسل دوم کے عہد میں بوزنطی سلطنت کی شمالی سرحدیں بھی دریائے ڈینیوب اور دریائے دراوہ Drava ہی تک مستد تھیں اور آخر میں ۵۸۴۸ / ۶۱۴۴ کے معاہدے کی رو سے عثمانی ترک اور ہنگری والے بھی اس بات پر باہم رضامند ہو گئے تھے کہ ان میں سے کوئی فریق دریائے ڈینیوب کو عبور نہ کرے گا؛ چنانچہ سترھویں صدی تک یہ دریا عثمانی ولایت روم ایلی کی شمالی سرحد رہا۔ اس ولایت میں دریائے مذکور کے جنوب کا سارا جزیرہ نما شامل تھا۔ قدیم رومی اور بعد کی عثمانی سلطنت پر دو

علیحدہ علیحدہ بحث کی ہے۔ بالآخر ممالیک کے اقتدار کے زمانے میں بلقاء کا ضلع (بڑا شہر حسبان) اصولاً صوبہ دمشق میں شامل تھا، گو بعض اوقات اسے السط کا علیحدہ صوبہ تسلیم کیا جاتا تھا؛ معلوم ہوتا ہے کہ بلقاء کلی طور پر یا جزوی طور پر الکرک کی عارضی نیابت میں رہا ہے۔

عرب جغرافیہ دانوں کے نزدیک البلقاء کے نام کا تعلق، جس میں ابلق (متنوع رنگ برنگ) کے صیغہ تانیث کا احتمال بھی موجود ہے، بنو عمان ابن لوط کے اخلاف میں سے ایک نامور شخص سے ہے جس میں یہی اوصاف پائے جاتے تھے۔ اس بات سے تورات کی روایت اور اس علاقے میں حضرت لوط علیہ السلام کی ان یادگاروں کی یاد تازہ ہوتی ہے جہاں قرآن مجید (۵ [المائدة] : ۲۲) کے بیان کردہ علاقے ”ان فیہا قوماً جبارین“ (جسے عمان سمجھا گیا ہے) اور اصحاب الکہف [رک باں] کے غار کا محل وقوع بیان کیا جاتا ہے۔

مآخذ : (۱) F. M. Abel : *Geographie de la*

*Palestine*، پیرس ۱۹۳۳-۱۹۳۸ء، ۱ : ۶۸، ۹۰، ۲۷۷ تا ۲۸۱، ۳۷۹ تا ۳۸۳ و ج ۲، بمواضع کثیرہ؛ (۲) *Palestine under the Moslems* : G. Le Strange، لندن ۱۸۹۰ء، ص ۳۵؛ (۳) A. S. Marmardji : *Textes Geographiques.....*، پیرس ۱۹۰۱ء، ص ۲۲؛ (۴) M. : *La Syrie a l'époque des Mamelouks*، پیرس ۱۹۲۳ء، بالخصوص ص ۶۷ تا ۶۸، ۱۸۰؛ (۵) البلاذری : فتوح، ۱۱۳ و ۱۲۶؛ (۶) الطبری : بحد اشاریہ؛ (۷) یعقوبی، ۱ : ۳۷؛ (۸) BGA بحد اشاریہ؛ (۹) یاقوت، ۱ : ۷۲۸؛ (۱۰) البکری : *Das Geo-graphische Wörterbuch* [معجم ما استعجم]، طبع Wüstenfeld، ۱، گوننگن ۱۸۷۶ء : ۱۶۰؛ (۱۱) الہروی : کتاب الزیارات، طبع Sourdel-Thomine، ص ۱۸؛ (۱۲) ابو الفداء : تقویم، ص ۲۲۷۔

(J. SOURDEL-THOMINE)

نہیں، لیکن بلقان کی شہرت اس بات کی مرہونِ منت نہیں کہ اس میں اور محولہ بالا ممالک میں جغرافیائی مشابہت پائی جاتی ہے۔ انیسویں صدی کے دوران میں جب جغرافیہ نگار اور علمائے ارضیات بلقان کے اندرونی علاقوں کی نئی معلومات حاصل کرنے میں مصروف اور اسے ایک مستقل وحدت خیال کر رہے تھے اس میں بڑے بڑے سیاسی انقلابات وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ وہ قومیں جو ترکیہ کے زیرِ نگیں آ گئی تھیں ان میں قومیت و وطنیت کے جذبات ابھر رہے تھے اور وہ اپنی علیحدہ علیحدہ قومی حکومتیں قائم کرنے میں کوشاں تھیں، اور جب سلطنتِ ترکیہ کے حدود میں کمی واقع ہوئی تو نقشے پر نئے نام ظاہر ہوئے۔ بعد کے واقعات آگے آتے ہیں: نیز دیکھیے: *Ency. Brittanica*، بذیل مادہ]۔

بلقان اسلامی تاریخ میں:

(۱) اولین مسلم جغرافیہ نویس جنہوں نے بلقان کی بابت کچھ لکھا انہیں کے زمانے میں یہ اہم واقعات اور تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ ابن خردادبہ، جس کی معلومات بھی دوسرے جغرافیہ نویسوں کی معلومات کی طرح تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے اواخر اور چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے وسط کے تین مبصروں کی اطلاعات سے ماخوذ تھیں (دیکھیے زکی ولیدی طوغان: بلقان، در اول، ت) لکھتا ہے کہ تفلہ، تراکیہ اور مقدونہ کی بوزنطی حدود کے آگے مغرب میں بلاد الصقالبہ اور شمال میں ارض برجان (قوم بلغار) واقع ہیں۔ حدود العالم میں دریائے ڈینیوب کو رود بلغاری اور بلقانی سلسلہ جبال کو کوہ بلغاری کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بلقان میں اول اول اناطولی بزرگ صاری صالتق [رک بان]

نے دریائے ڈینیوب کے دونوں کناروں کے میدانی اقطاع پر قبضہ قائم رکھنے کی بھی کوشش کی۔ اس دریا کا زیریں حصہ ہمیشہ ان حملہ آور ترکوں اور مغول کے لیے راستہ بن جاتا تھا جنہوں نے پانچویں صدی سے لے کر تیرہویں صدی تک یکے بعد دیگرے بلقان پر حملے کیے۔ یہ حملہ آور ہن، آوار، بلغار، پچنق، گمان اور قیچاقی تاتار تھے۔ آوار حملے ہی چھٹی صدی عیسوی میں بلقان میں سلافیوں کے داخلے اور آبادکاری کا سبب سمجھے جاتے ہیں۔ اس وقت وہاں کے مقامی والش اور البانی باشندوں کو پہاڑوں میں ہٹنا پڑا اور وہ اگلی کئی صدیوں تک بھیڑ بکریاں پال پال کر گزارہ کرتے رہے۔ ۶۸۰ء کے قریب بلغار نام کی ایک ترک قوم بحر اسود کے شمال سے آ کر زیرین ڈینیوب میں آباد ہو گئی اور سلافیوں پر عسکری امرا کی حکومت قائم کر کے انہوں نے بلقان میں ایسی مملکت کی بنیاد ڈالی جو بوزنطی سلطنت کی پہلی طاقتور حریف بنی۔ ۸۶۴ء میں ان کے قبولِ مسیحیت سے اس جزیرہ نما کی تاریخ پر بہت دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ کیونکہ بوزنطی کلیسا اور بوزنطی تصورِ ریاست نے نہ صرف بلغاریا کی زاریت کو ایک حتمی شکل دی بلکہ اسی کے واسطے سے ان ریاستوں کو اسی سانچے میں ڈھال دیا جو آئندہ ریاست ہائے بلقان میں نمودار ہوئیں (دیکھیے F. Dölger: *Byzanz und europäische Staatenwelt*، ص ۲۶۱ تا ۲۸۲)۔

[انیسویں صدی کے اوائل سے براعظمِ یورپ کی تین جنوبی توسیعات میں جو سب سے زیادہ مشرقی جانب ہے اسے بلقان کہا جا رہا ہے۔ جزیرہ نما بلقان کے متعلق یہ تصور کہ اس میں اور آئیری اور اطالوی جزیرہ نماؤں کے درمیان مماثلت پائی جاتی ہے حال ہی کی پیداوار ہے اور دلچسپی سے خالی



تیمور کی فتح نے بلقانیوں کے حق میں بہت اہم نتائج پیدا کیے۔ اناطولی میں اپنے اکثر مقبوضات ہاتھ سے نکل جانے کے بعد عثمانی ترکوں کو اس وقت بلقان ہی اپنا اصل ٹھکانا معلوم ہوا اور آئندہ شہر ادرنہ عثمانی سلاطین کا اصل دارالحکومت بن گیا۔ تیمور کے حملے کے بعد اناطولی کے ترک دوبارہ بلقان کی طرف اسٹڈ آئے۔ بایزید اول کے جانشینوں نے اس کی شہنشاہیت پسندی کو ترک کر دیا اور سلطان محمد دوم کو فتح قسطنطنیہ (۱۴۵۳/۱۴۵۲) تک سریا اور بوزنطہ کو کسی حد تک آزادی عمل حاصل رہی، مگر سلطان محمد دوم نے دوبارہ جملہ ولایات کو واحد مرکز کے تحت لانے کی سرگرم اور کامیاب تدابیر اختیار کیں۔ ۱۴۶۳/۱۴۵۹ء میں سریا، ۱۴۶۳/۱۴۶۰ء میں مورہ اور ۱۴۶۲/۱۴۶۳ء میں بوسنہ براہ راست عثمانیوں کے زیر حکم آ گئے، لیکن عثمانیوں کی ان کامیابیوں کا انحصار فوجی قوت کی بہ نسبت دوسرے اہم عوامل پر زیادہ تھا۔

عثمانی فتوحات اور تمام اختیارات مرکز میں رکھنے کے خلاف جد و جہد کرنے میں بلقان کے مقامی امرا اور جاگیرداری ریاستوں کے والی مدد کے لیے مغرب کی طرف دیکھتے تھے اور یورپی ممالک کو نہ صرف اپنے علاقوں میں مراعات دینے پر تیار ہو جاتے تھے بلکہ مذہبی معاملات میں بھی انہیں مراعات دینا قبول کر لیتے تھے، چنانچہ پندرہویں صدی کے نصف اول میں، جب ہنگری بوسنہ، سریا اور ولاشیا Wallachia [= افلاق] پر اپنی سیادت قائم کر رہا تھا، ریاست وینس، بحر ایجین اور مورہ میں نیز سواحل البانیا کی اہم جگہوں پر قابض ہو گئی اور سلاویک (سالونیکا) پر قبضہ کرنے کے بعد اسے قسطنطنیہ تک لینے کی ہوس ہو گئی تھی۔ یہ مغربی ریاستیں کیتھولک

کے ساتھ ۱۲۶۲/۱۲۶۳ء میں آیا۔ آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں مغربی اناطولیہ کے اقطاع "غازی" کے اناطولی ترکوں کی تاختوں کے بعد عثمانی ترک بالآخر پوری استقامت سے در دانیال کے یورپی سواحل پر ۱۲۵۵ء/۱۳۵۴ء میں آ بسے، مگر عثمانیوں کے اس ابتدائی کشور کشائی کے زمانے میں بھی ان کی مرکزی حکومت کے اقدامات اور غازی ترک سرداروں کی ترک تازیوں میں فرق ملحوظ رکھنا چاہیے کہ یہ جنگجو سردار تو "آج"، یعنی سرحدوں پر مسلسل لڑتے رہتے تھے اور عثمانی حکومت اپنی رعایا کے سود و بہبود پر بھی متوجہ رہتی تھی۔

غالباً عثمانی فتح کا اہم ترین سبب چودھویں صدی میں اناطولی [رک باں] سے بلقان کی طرف وسیع پیمانے پر ہجرت تھی، جس نے تھریس اور مشرقی بلغاریا کو ترکی رنگ میں رنگ دیا (دیکھیے *Studia Islamica*، ۲: ۱۰۳ تا ۱۲۹)۔ اس وقت عثمانی ریاست کو بلقان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی باہمی پیچیدہ کشمکش میں ایک مفید معاون سمجھا جاتا تھا، لیکن طاقت پکڑنے کے بعد عثمانی سلطان بہت جلد اپنے حلیفوں کا حاکم اعلیٰ بن گیا۔ بعد میں جب انہوں نے ایک متحدہ معاذ قائم کرنے کی کوشش کی یا مغرب کی مسیحی دنیا کو مدد کے لیے پکارا تو انہیں مایوسی کا سامنا ہوا (Cermanon ۱۴۴۳ء / ۱۳۴۱ء؛ Kossova ۱۴۹۱ء / ۱۳۸۹ء)۔ سلطان بایزید اول نے ماتحت ممالک پر براہ راست قبضہ کر کے ایک نئی حکمت عملی اختیار کی۔ اس کی خواہش تھی کہ بلقان میں ایک واحد سلطنت قائم کرے۔ اس نے ۱۳۹۳ء اور ۱۳۹۶ء کے درمیان سارے بلغاریا، مقدونیہ اور تھسلی کو فتح کر لیا اور تاریخی دارالسلطنت قسطنطنیہ کو چھین لینے کی کوشش کی۔ بایزید اول پر ۱۴۰۳ء/۱۴۰۲ء میں

جاگیردار امراء ہی کے حق میں ہوا اور پالیولوجوس Palaeologi نامی بادشاہوں کے دور تک مرکزی حکومت تمام اختیارات سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی، لیکن عثمانی دور میں بلقان میں دوبارہ ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم ہوئی، جس نے کسانوں سے ہر طرح کے مقامی استبداد کو روکنے اور جاگیرداری طریقوں کے سدباب کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر تین روز کی بیگار اور ایندھن، گھاس وغیرہ جاگیردار کو مفت مہیا کرنے کی جملہ پابندیوں کے بجائے عثمانیوں نے صرف چفت رسمی [رک باں] نام کی ایک معمولی سی کر لگا دی۔ قاضی [رک باں] اور قبی قولو سلطان کے براہ راست ماتحت علاقے ہوتے تھے اور ولایات میں قوانین شاہی کی تعمیل پر کڑی نگرانی کرتے تھے۔ اس طرح یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ عثمانیوں کے خلاف کشمکش کے دوران میں مسیحی کاشتکار اپنے رئیس جاگیرداروں کی قسمت کی طرف سے بے پروا رہے۔ گیارہویں صدی ہجری / سترہویں صدی عیسوی تک بلقان کے کاشتکاروں میں کسی خاص بغاوت کا تاریخ میں ذکر نہیں ملتا۔ یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ عثمانیوں نے بلقان میں آبادی کے سابقہ طبقات کو اپنے نظام معاشرت میں جگہ دیتے وقت اصولاً ان کی قدیم حیثیت کو برقرار رکھا تھا۔ عثمانی دور سے قبل اعلیٰ خاندانی امراء جو اکثر جاگیروں (pronoia) کے مالک تھے عثمانیوں نے انہیں اپنے جاگیرداری (= تیمار) نظام میں شامل کر دیا اور آگے چل کر سلطانی دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا۔ کم درجے کے خاندانی جاگیرداروں، بالخصوص voiniks (ترکی میں وای نوق voynuk) کی، جو سابقہ دور میں سلطنت ستیفن دشن Stephan Dushan کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے، بلقان کے اکثر

عقیدہ رکھتی تھیں۔ ان کا مقصد بلقان میں زرستانی اور سیاسی اقتدار جمانا تھا، لہذا انہیں اور ان کے حاسی بوزنطی یا بلقانی رئیسوں کو کلیسائے قدیم (یونانی) کے پادری اور عام طور پر بلقان کے باشندے دشمنی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ عثمانیوں نے ان مغربی اور مقامی رئیسوں سے عوام کی برگشتگی کا فائدہ اٹھایا۔ وہ کلیسائے یونان کے سرپرست بن گئے اور کیتھولک عقائد کو بلقان بدر کرنے کی کوشش کی۔ قسطنطنیہ میں ۱۴۵۴ء میں جنادیوس Gennadius کو تمام مسیحی کلیسا کا بطریق مقرر کرنے سے پیشتر بھی عثمانی حکومت کی طرف سے ہر جگہ کلیسائے یونان کے راہبوں اور مسیحی پیشواؤں کو وظائف بلکہ تیمار [رک باں] (یعنی جاگیریں) تک عطا کیے جاتے تھے۔ دوسری طرف نویں صدی ہجری / پندرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں جب لاطینی بلقان سے نکال دیے گئے تو مقامی تاجروں نے، جن میں مسلمان، یونانی اور اہل رغوہہ نیز یہودی شامل تھے، تجارت اور ساہوکارے میں ان کی جگہ سنبھال لی۔ رغوہہ Ragusa نے عثمانیوں کی سرپرستی میں بلقان کی تجارت میں ایسی وقعت حاصل کی جو ازمنہ وسطیٰ میں اسے پہلے کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ غالباً اس کا اہم سبب یہ تھا کہ عثمانیوں کے مال گزاری اور زمینداری نظام (دیکھیے دفتر خاقانی) نے بلقان کے کسان طبقے کی زندگی میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ بوزنطی قیصرہ دسویں صدی میں بڑی کوششیں کرتے رہے کہ صوبے کے ارباب اقتدار کے مقابلے میں، جو برابر اپنے علاقے اور اختیارات بڑھانے میں کوشاں رہتے تھے، کسان طبقے کی حمایت کر کے مرکزی حکومت کا اقتدار بحال رکھیں۔ کومننان نام کے بادشاہوں (Comneni) کے وقت میں اسی جدوجہد کا خاتمہ



کا ایک نادر دور آیا۔ ہر جگہ بنجر زمینیں قابل کاشت بنائی گئیں۔ ۱۵۳۰ء میں آبادی پچاس لاکھ تک بڑھ گئی۔ شہروں نے ترقی کی۔ یہ معلومات ہمیں عثمانی دفتروں سے ملتی ہیں، جو ترکی محافظخانوں میں محفوظ ہیں (دیکھیے اقتصادی نکولتسی میکورسی *Iktisat Fakültesi Mecmuası*، استانبول، عدد ۳، ۱۱، ۱۵)۔ بلقان میں یونانی زبان کے بعد ترکی زبان نے تہذیب و تمدن کی مشترکہ زبان کا درجہ حاصل کر لیا۔

جیسا کہ آرنلڈ نے *Preaching of Islam*، لنڈن (بار اول ۱۸۹۶ء، بار سوم ۱۹۳۵ء، ص ۱۳۵ بعد) صراحتاً بیان کیا ہے کہ اہل بلقان میں اسلام کی اشاعت عام طور سے کسی سرکاری حکمت عملی یا جبر کا نتیجہ نہ تھی، تاہم اس سلسلے میں تین ادوار میں امتیاز کرنا چاہیے۔ سلطان بایزید ثانی کے دور تک عثمانیوں نے مذہبی معاملات میں نہایت رواداری سے کام لیا۔ اس دور میں عثمانی عسکری [رک باں] میں جو بلقانی شرفا شامل کیے گئے بالخصوص بوسنہ میں بوگومیل (Bogomils) لوگوں نے رضاکارانہ طور پر اسلام قبول کیا۔ سلطان بایزید ثانی کے عہد کے بعد عثمانی ریاست کو ایک مسلم ریاست ہونے اور شریعت نافذ کرنے کا کچھ زیادہ احساس ہوا۔ گیارہویں صدی ہجری / سترھویں صدی عیسوی کے مابعد بلقان میں فرانسیسی (Franciscan) راہبوں کے وفود کی سرگرمیوں کے نتیجے کے طور پر ابتداء عثمانیوں کو سربیا، البانیا اور دریائے ڈینیوب پر واقع علاقہ بلغاریا میں عیسائیوں کی پورش کے خلاف احتیاطی تدابیر اختیار کرنا پڑیں، کیونکہ شاہان ہسبرگ اور اہل وینس سیاسی اغراض کی خاطر ان مسیحی وفود کی پشت پناہی کرتے تھے۔ اس دور میں بھی ان ممالک میں کسی حد تک عوام الناس نے اسلام

حصوں میں بولوک *Bölük* [رک باں] کی صورت میں از سر نو تنظیم کی اور سولہویں صدی عیسوی تک وہ عثمانی فوج کا ایک حصہ بنے رہے۔ سولہویں صدی میں ان کی افادی حیثیت ختم ہو گئی اور وہ صرف معمولی حیثیت کی رعایا رہ گئے۔ خانہ بدوش افلاق اور مرتولوس کے دوسرے فوجی دستے ولایات میں عثمانی افواج میں ضم کر لیے گئے (دیکھیے راقم مقالہ کی فاتح ووری، انقرہ ۱۹۵۳ء، ۱: ۱۳۵ تا ۱۸۴)۔ دیوشیرمہ *Devshirme* (رک باں) کے آئین کی بدولت رعایا کو بھی حکمران طبقے تک رسائی حاصل تھی۔ معلوم ہوا ہے کہ رعایا، یعنی مسلم یا مسیحی مزارعین کی طبقہ بندی کے سلسلے میں عثمانیوں سے پہلے جو نظام رائج تھا، اسی سے ملتا جلتا دستور نافذ رہا اور بوزنطی دور کے کاشتکار (paroikoi) جو زیوگرات *zeugarate* اور بوئدون *boldion* نیز الیوتھروی (eleutheroi) جماعتوں میں منقسم تھے عثمانی دور میں بھی مختلف ناموں سے باقی رہے، نیز چند بوزنطی محصول عثمانی دور میں جوں کے توں برقرار رہے؛ مثلاً رسوم عرفیہ یا عادت قدیمہ۔ یہ مواجب صاحب تیمار (یعنی جاگیرداروں) کو تفویض کر دیے جاتے تھے۔ عثمانی نظام تیمار نے، جو پہلے دور میں سلطنت کا سنگ بنیاد تھا، بلقان ہی میں حتیٰ شکل اختیار کی۔ آخر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اہل بلقان کی تاریخ کی بنیادی اوضاع عثمانیوں کے دور میں بھی برقرار رہیں۔ یہ درست ہے کہ مقامی ثقافت کی ترقی و عروج کے سابقہ مراکز ختم ہو گئے، لیکن کاشتکاری اور کلیسائی نظام برابر موجود رہے اور انیسویں صدی عیسوی میں بھی نظام وہاں کی قومی ریاستوں کی بنیاد بن گئے۔

دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں جزیرہ نماے بلقان کی تاریخ میں امن و خوشحالی

کہ ابوالفداء (طبع Schier، ص ۲۸۸) نے بھی دریائے ڈینیوب کی وادی کے شہروں کے بارے میں لکھا ہے کہ ”ان کے نام عجیب اور ناقابلِ فہم ہیں، ہمیں ان کا کچھ حال معلوم نہیں۔“

مسلمان مصنفوں نے اس علاقے کے بارے میں ابتدائی معلومات مسلم الجریبی کی کتاب سے حاصل کیں جو وہاں ۸۴۵ء تک جنگی قیدی کے طور پر رہا تھا، اور کچھ معلومات ایک یہودی ہارون بن یحییٰ کے سفرنامے سے حاصل ہوئیں، جس نے ۸۸۰ء سے ۹۰۰ء تک یورپ کا سفر کیا (دیکھیے حدود العالم، طبع منورسکی Minorsky، ص ۴۱۹: Semi-narium Kondakovianum : ۱۴۹ تا ۱۶۴)۔ اس کے علاوہ انہوں نے مزید معلومات ابراہیم بن یعقوب الاسرائیلی سے حاصل کیں (جس نے اپنا سفر ۹۶۰ء میں کیا) (دیکھیے البکری، طبع و ترجمہ Baron von Rosen Izvest al-Bakri drugih avtorov o rusi i : slavyanah، پیٹرزبرگ ۱۸۷۸ء، ۱: ۷۰)۔ بعض مصنفوں نے ان معلومات کو بڑی احتیاط کے ساتھ درج کیا ہے اور راویوں کے الفاظ الگ کر کے لکھے ہیں۔ بعض نے (مثلاً حدود عالم، جو ۹۸۲ء میں لکھی گئی تھی) ان معلومات کو خلط ملط کر دیا ہے۔ ابن خردادبہ (ص ۱۰۵: قدامہ، ص ۲۵۷) نے مختصراً اور ابن الفقیہ نے تفصیلات کے ساتھ (قب یاقوت: معجم البلدان، طبع وسٹنفلٹ، ۲: ۸۶۳) مسلم کو اپنا مأخذ بتایا ہے۔ ان کے نزدیک اس کے تین صوبے ہیں: (۱) تفلہ (دیکھیے Minorsky: وہی کتاب، ص ۴۲۱)، جس کا صدر مقام قسطنطنیہ ہے اور جس میں وہ علاقہ شامل ہے جو جنوب میں بحیرہ شام (بحیرہ ایض یا ایجین)، شمال میں بحیرہ خزر (بلکہ بحیرہ اسود)، مغرب میں سدّ طویل (مقدون تیخمس)، یعنی Anastatius کی دیواریں جو برگز سے دریائے مارٹزا تک ہیں پھیلا

قبول کیا۔ اہل البانیا نے بعد کی صدیوں میں وسیع پیمانے پر اسلام قبول کیا [رک بہ آرنا ودلوق]۔ اسلام قبول کرنے والا تیسرا علاقہ رھوڈوپ Rhodope میں واقع ہے، جہاں بلغاری زبان بولنے والے مسلمانوں کو پوماق [رک باں] کہا جاتا ہے۔ عثمانیوں کے زیر حکومت ما بعد کے ادوار میں بلقان کی ترقیات کے لیے رک بہ روم ایللی۔

مآخذ: (۱) J. Cvijić: *La Péninsule balcanique*،

پیرس ۱۹۱۸ء؛ (۲) J. Ancel: *Peuples et nations des Balkans*،

پیرس ۱۹۳۰ء؛ (۳) A. Boué: *La Turquie d'Europe*،

پیرس ۱۸۴۰ء؛ (۴) F. Ph. Kanitz: *Donau-Bulgarien und der Balkan*،

لاٹزگ ۱۸۷۵ء تا

۱۸۷۹ء؛ (۵) N. Jorga: *Formes byzantines et réalités balkaniques*،

پیرس ۱۹۲۲ء؛ (۶) وہی مصنف:

*Historie des Etats balkaniques jusqu'à 1924*، پیرس

۱۹۲۵ء؛ (۷) W. Tomaschek: *Zur Kunde der Hämus-Halbinsel, Sitz, Berich. der Akad. Wien.*

*Geschichte*: G. Stadtmüller (۸)؛ ۱۸۸۷ء؛ *hist-klas.*

*des Südosteuropas*، میونخ ۱۹۰۰ء؛ (۹) C. Jireček:

*Staat und Gesellschaft im mittelalterlichen Serbien*،

ویانا ۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۹ء؛ (۱۰) وہی مصنف:

*Die Heerstrasse von Belgrad nach Constantinopel und*

*die Balkanpässe*، Prag ۱۸۷۷ء؛ (۱۱) M. Braun:

*Die Slawen auf dem Balkan bis zur Befreiung von*

*der türkischen Herrschaft*، لاٹزگ ۱۹۳۱ء؛ (۱۲)

G. Ostrogorsky: *History of the Byzantine State*،

ترجمہ J. Hussey، آکسفورڈ ۱۹۰۶ء؛ (۱۳) وہی ت،

بذیل مادہ۔

(خلیل ابنالحق)

(۲) سلجوقیوں، مغول اور بالآخر عثمانی ترکوں

کے ادوار سے پہلے مسلمانوں کو جزیرہ نما بلقان

کے متعلق بہت کم باتیں معلوم تھیں۔ یہاں تک



۲۲۵، ۲۲۹، ۲۶۳)۔ یہ مصنف قفقاز سے متعلقہ تحریرات کو بھی اس طریق سے استعمال کرتا ہے گویا وہ ان عیسائی بلغاروں کے بارے میں جو بوزنطہ کے تابع تھے نیز ویلندروں (Velenders) کے بعض حصوں اور ایسے ہی دیگر قبائل کے متعلق ہیں جو ان کے ساتھ بلقان میں آئے (زکی ولیدی طوغان: *Völkerschaften des Chazarenreiches*، در KCA، ص ۳: ۳۷، ۵۱)۔ المسعودی دریائے ڈینیوب کے متعلق بھی بعض معلومات درج کرتا ہے، جو اس نے غالباً مسلم الجرمی ہی سے لی ہیں۔ یہ دریا (ڈینیوب) دو کوهستانی سلسلوں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ اس کی چوڑائی بعض مقامات پر تین میل تک پہنچ جاتی ہے۔ اس نے اس دریا اور ایک اور دریا ملاوہ یا سراوہ کے کناروں پر بسنے والی ایک قوم کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس جگہ المسعودی دریائے ڈینیوب کو دریائے جیحون سے اور دریا کے ایک معاون دریائے چرچک سے ملتے کر رہا ہے (دیکھیے Carra de Vaux، ص ۹۹)۔

حدود العالم کا مصنف، جس نے ہارون بن یحییٰ سے معلومات اخذ کی ہیں، کوهستان بلقان کو کوہ بلغری کا نام دیتا ہے (ورق ۱۱ ب و ۳۷ الف) اور دریائے ڈینیوب کو ”روز بلغری“ (ورق ۱۱) لکھتا ہے۔ یہ دریا، جیسا کہ منورسکی Minorsky (ص ۲۲۱) کا خیال ہے، دریائے مارتزا نہیں۔ دوسرے مصنفین کی طرح، جنہوں نے ہارون سے استفادہ کیا ہے، حدود العالم کا مصنف بھی ڈینیوبی بلغاروں کو بلغر کہتا ہے، جو اس اصطلاح سے مختلف ہے جو ایل [رک باں] بلغاروں پر منطبق کی جاتی تھی (یعنی بلکار یا بلغار)۔ ابن رستہ (ص ۱۲۶) کی طرح، جس کا ماخذ ہارون ہے، حدود العالم میں بھی اس نہر کو جو بلغراد کے جنگل سے قسطنطنیہ میں پانی لاتی ہے دریائے

ہوا ہے (دیکھیے *Histoire de l'Empire : A. Vasiliev*، *Byzantin*، پیرس ۱۹۳۲ء، ۱: ۱۳۱)؛ (۲) تراقیہ (تھریس)، جس کا صدر مقام ارقدہ (Arcadiopolis) ہے۔ یہ صوبہ ان اقطاع پر مشتمل تھا جو سید طویل سے پرے واقع ہیں؛ (۳) مقدونیہ، یہ تراقیہ کے جنوب میں واقع تھا اور اس کا صدر مقام Bands (بندس؟) میں تھا۔ یہ بوزنطی سلطنت کی نواحی ریاستوں کے طور پر ایک تو سلافیوں کا علاقہ بیان کیا گیا ہے جو مقدونیہ سے مغرب میں واقع ہے (اس کا نام بلاد الصقالیہ، یعنی جنوبی سلافیوں کا ملک ہے) دوسرے برجان (دریائے ڈینیوب پر کے بلغاروں) کا علاقہ، جو تراقیہ کے مغرب میں اور مقدونیہ کے شمال میں ہے۔ المسعودی (التنبیہ) نے مسلم الجرمی کو ماخذ قرار دیتے ہوئے دو صوبوں کا اضافہ کیا ہے اور بلقان میں بوزنطی صوبوں کی تعداد پانچ تک قرار دی ہے؛ (۴) پلوپونیسوس Peloponesus اور (۵) عیسائی بلغاروں اور ویلندروں (Velenders) کے وہ علاقے جو بوزنطی حکومت کے مطیع تھے۔ یہ مصنف سید طویل کو ان علاقوں کے مغرب میں بیان کرتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق برجان اور صقالیہ ہمسائے تھے، جو سید طویل کے مغرب میں رہتے تھے۔ اس کتاب میں نیز اخبار الزمان میں (دیکھیے SBAR، ویانا، ۱۸۵۰ء، ص ۲۱۰ بعد: *Skazanya musulmaskih : Harkavi*، *pisateley o slavyanah*، ص ۱۲۶ بعد) المسعودی ان معلومات کو جو ڈینیوبی بلغاروں کے بارے میں دی ہیں برجان پر منطبق کرتا ہے۔ مزید برآں وہ برجان قوم کے لیے وہ ساری معلومات استعمال کرتا ہے جو اسے دیگر ذرائع سے بورغندیوں (Burgundians) کے متعلق ملیں (دیکھیے [المسعودی کا فرانسیسی ترجمہ: *Le Livre de : Macoudi*، *Avertissement*، ترجمہ از Carra de Vaux، ص

بلغر کا نام دیا گیا ہے۔ Barthold اور منورسکی Minorsky (ص ۱۲، ۴۲۳) یہ خیال ظاہر کرنے میں غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ لفظ بلغراد ان دنوں مستعمل تھا اور لکھا ہے کہ یہ دریا ان پہاڑوں سے نکلتا ہے جو قسطنطنیہ سے بیس دن کی مسافت پر واقع ہیں۔ اس طرح اسے دریائے ڈینیوب ہی کا سلسلہ ظاہر کیا گیا ہے، حالانکہ یہ خیال درست نہیں۔ ہارون بن یحییٰ کا بیان ہے کہ کوهستان میں رہنے والے بلغار شاہ بورس کی رعایا ہیں (ابن رستہ، طبع ڈخویہ De Goejge، ص ۱۲۷، بذیل سوس، نیز حاشیہ) اور اس کے ساتھ مسیحیت قبول کر چکے ہیں۔ یہ مصنف انہیں نو عیسائی سلافی (الصقالبة المتنصرة) کہتا ہے۔ بہر کیف یہ لوگ متذکرہ صدر جنوبی سلافی ہوں گے۔ ہارون بن یحییٰ برگندیوں سے بھی آگاہ تھا (قب ابن رستہ، ص ۱۳۰؛ Streifzuge : Marquart، ص ۲۶۹)۔ حدود العالم کے مصنف نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ مسلم الجریبی نے جن برجانوں کا ذکر کیا ہے اور ہارون نے جن بلغاروں کا حال لکھا ہے وہ دو ہمسایہ قبائل تھے جو دریائے ڈینیوب کے طاس میں رہتے تھے۔ البکری (طبع Rosen، ص ۴۵) نے بھی، جس نے المسعودی سے معلومات اخذ کیں، یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ حدود العالم (ورق ۱۱ ب، ۳۷ الف) میں براقیہ نامی (تراقیہ نہیں) ایک شہر کا ذکر ہے (Minorsky نے اسے براقیہ یعنی قوم برجان کا صدر مقام پڑھا ہے، لیکن یہ بتانا ناممکن ہے کہ یہ شہر کون سا تھا) قب حدود العالم، (انگریزی ترجمہ) ص ۱۵۶۔ ابراہیم بن یعقوب (دیکھیے البکری، ص ۳۸) نے بلقارین، یعنی ڈینیوبی بلغاروں کا ذکر ایسے لوگوں کے طور پر کیا ہے جو بحر الشام (بحر ایجیئن) سے المانی (جرمن) اقوام کی سرزمین تک پھیلی ہوئی سلافی اقوام کے سرکردہ قبائل ہیں۔ وہ لکھتا ہے

کہ اس قوم کے حکمران نے قسطنطنیہ کے محاصرے کے دوران میں مسیحیت اختیار کر لی تھی۔ اس کے بعد یہ مصنف ان سلافیوں کا تذکرہ کرتا ہے جو بلغاروں کے مغرب میں سنگلاخ اور ڈھلوان پہاڑوں میں رہتے ہیں (جبال شامخہ و عرات المسالک)۔ الإصطخیری اور ابن حوقل (ص ۳۹۷) ڈینیوبی بلغاروں کو 'بلغار عظام' کا نام دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان کی تعداد بہت ہے اور انہوں نے نواحی یونانی اقوام کو اپنا تابع بنا رکھا ہے۔ القصہ عرب اس کشمکش اقتدار سے عام طور پر آگاہ تھے جو ۶۹۱۲ تا ۶۹۲۷ کے دور میں بلغاروں اور بوزنٹیوں کے درمیان جاری تھی (دیکھیے Bizantiya i : Vasilyev، ۲: ۲۱۳ تا ۲۲۸)۔

الأدریسی (م ۱۱۶۲ء) نے اپنی اقلیم پنجم کے چوتھے اور پانچویں حصے میں جزیرہ نما بلقان کا حال قلمبند کیا ہے۔ دوسرے عرب مصنفوں کی طرح وہ ڈینیوبی بلغاروں کے علاقے کو برجانوں کا ملک (ارض برجان) لکھتا ہے۔ اس جگہ کے علاوہ وہ اسلامی مآخذ کو کہیں استعمال نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ اس کے سب نام یورپی مآخذ سے لیے گئے ہیں۔ اس مصنف کو علم تھا کہ برجانوں کے شمال میں دریائے نیسٹر و دریائے نیپر کے طاس روسیوں کے قبضے میں تھے۔ اس نے اقلیم ششم کے حصہ چہارم میں "اقوام روس کے جنوبی حصے" کا جو ذکر کیا ہے اس سے غالباً اس کی مراد کارپتھی کوهستان کے روسیوں سے تھی۔ ابن سعید المغربی (م ۱۲۷۴ء) نے الأدریسی سے بہت استفادہ کیا ہے اور اس پر اپنی طرف سے مزید اہم حاشیے لکھے ہیں۔ اس نے اس دریا کا نام جس کے ساتھ ساتھ مجار (ہنگروی) آباد ہیں دوما (یعنی طونا یا ڈینیوب) لکھا ہے۔ دوسرے مقام پر وہ اس دریا کا نام طنبرس (Dnieper) لکھتا ہے اور کہتا ہے



کی مہم میں جس آہنی دروازے کا ذکر آیا ہے اس سے ڈینیوب کا آہنی دروازہ مراد ہے (The Turno- Severin Pass، دیکھیے E. Oberhummer : Eisernes : Tor : Mitteilungen der Wiener geog. Gesellschaft، ۱۹۱۶ء، ص ۲۰۲ بعد)۔ ان اقطاع کے مغل سالار نے قہقاقوں کا تعاقب کیا، جو اس راستے سے بھاگ رہے تھے اور آوروں کوت اور بداج کے صوبوں پر قبضہ جما لیا (Blochet، ص ۵۶؛ عربی نسخہ ص ۶۰۴؛ نیز دیکھیے Hammer : Gold Horde، ص ۱۲۰، ۱۲۵؛ Berezin : Nushstviya Batiya : Journal ministerst. narodn prosve- na Rossiya، در schenya، شماره ۵، ص ۳۲ بعد نے رشید الدین کے مآخذ کو سطحی طور پر استعمال کیا ہے)۔ آوروں کوت اور بداج یا باراج (اس نام کے لیے دیکھیے زکی ولیدی طوغان : Ibn Fazlan، ص ۱۵۶ بعد) ایسے دو مقام تھے جن پر دریائے ڈینیوب کی مجارستانی طرف پر قہقاقی قبائل نے قبضہ جما لیا تھا۔ ان لڑائیوں کے تذکرے میں جو ۱۲۹۹ء میں اردوے مغل کے توتہ خان اور نوغانی کے درمیان ہوئیں، کہا گیا ہے کہ نوغانی نے دو لاکھ سپاہ کے ساتھ دریائے ڈینیوب کے آہنی دروازوں پر اپنا جنگی مرکز قائم کیا۔ اس کی فوج میں باغار اور ضقالبہ بھی تھے۔ نوغانی کے بیٹے نے باغار بادشاہ تیرتیر کی بیٹی سے شادی کی (دیکھیے N. Veselovskiy : Nogay i ego vremya، در Mémoire de L'Académie des science de Russie، سلسلہ ہشتم، ج ۱۳، شماره ۶، ۱۹۲۶ء : ص ۳۱، ۳۶)۔ مصری مصنف رکن الدین بیرس راوی ہے کہ نوغانی تیرتیر پر قبضہ جانے کے بعد مارا گیا۔ ازاں بعد توتہ کے بیٹوں نے نوغانی کی مملکت پر قبضہ جما لیا اور ساتھی اور آہنی دروازوں پر ممکن ہو گئے (دیکھیے Tiesenhausen : اسمعیل حتی ازبیرلی :

کہ اس دریا پر بلغاروں کا مشہور ملک آباد ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جگہ وہ ڈینیوبی بلغاروں کو ایتل [آرک باں] بلغاروں کے ساتھ ملتس کر رہا ہے۔ وہ اس بات سے بھی آگہ تھا کہ ڈینیوبی بلغاروں کا صدر مقام دریائے ڈینیوب (طنبرس) کے جنوب میں واقع ہے۔ مزید برآں وہ لکھتا ہے کہ بلغاروں کا ایک شہر سودا نامی بھی ہے، جو اس دریا سے ساڑھے آٹھ دن کی مسافت پر جانب مشرق واقع ہے۔ بلاشبہ اسے اس معاملے میں شہر سوار کے ساتھ التباس ہوا ہے، جو ایتل بلغاروں کا شہر تھا (دیکھیے Festschrift für Chwolson : Barthold، برلن ۱۸۹۹ء، ص ۲۳۳ بعد)۔

عہد مغل کے مآخذ ظاہر کرتے ہیں کہ جزیرہ نما بلقان کے ان حصوں کے نام جو ترکوں کی بلغاروں کا تختہ مشق بن چکے تھے ترک رنگ میں رنگے جا چکے ہیں۔ ۱۲۳۹ء کی مہم میں مغل تیسہ (تیسہ، تنہا یا تنہا) اور ڈینیوب کے طاسوں میں سے گزر کر کاریتھی کوہستان تک جا پہنچے، جسے وہ پیرک تاک (پیراق طاغ) کہتے تھے (رشید الدین، طبع Blochet، ص ۵۵، کتب خانہ ایاصوفیا، عربی نسخہ شماره ۳۰۳، ص ۶۰۴ میں "جبال مراقتان" لکھتا ہے)۔ انہوں نے آنگ (افاتی) یونانیوں کو قرہ آنگ نام سے پکارا۔ اور اس حصے کے کوہستان کو جبال بایاقتوق (عربی نسخہ، ص ۶۰۴) کا نام دیا (طبع Blochet میں یہ نام نظر نہیں آتا)۔ ان اقطاع کو منگوخان کے بھائی بوچک نے سر کیا تھا۔ ۱۲۳۹ء کی جنگوں کے حال میں جس دمیرقوبو (آہنی دروازہ) کا ذکر آیا ہے اس سے رشید الدین کے خیال کے مطابق (رشید الدین، طبع Blochet، ص ۵۷؛ عربی نسخہ ص ۸۵ "تیمور قہلقہ"۔ عربی نسخے میں اس کے علاوہ ایور کے ضلع (نواحی ایر) کا ذکر آیا ہے) درہ خزر مراد ہے۔ اس طرح ۱۲۳۱ء

التین اردو تاریخہ عاید میں لیر، ۱ : ۲۲۱، ۲۸۲)۔  
 اردوے مطلا کی تاریخ مابعد میں آق تاو ترک،  
 جو نوغانی کی رعایا تھے، بوزنطہ کی سرحدوں کے  
 قریبی علاقوں میں جا کر آباد ہو گئے۔ اس لیے  
 بحیرہ اسود کے سواحل پر کے چٹیل میدان ”اسری  
 یاکا“ (صحاری اسریقہ) کے نام سے معروف ہیں۔  
 (دیکھیے شرف الدین یزدی : ظفر نامہ، ۱ : ۷۵۹)۔  
 ابوالفداء (م ۱۳۳۱ء) نے، جو بلقان اور مشرقی یورپ  
 کے حالات سے بہت باخبر ہے، بلقان کے بارے میں  
 بہت اہم معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ البتہ وہ  
 بعض اوقات اپنی معلومات کو اپنے پیش روؤں کے  
 بیانات کے ساتھ خلط ملط کر دیتا ہے (مثلاً ص ۲۵۹  
 پر برغندی کے معنوں میں لفظ برجان بشکل برجان  
 آیا ہے جو ابو سعید سے لیا گیا ہے؛ قَب حدود  
 العالم، ورق ۱۱ ب سطر ۲۰ ”برشان“، طبع  
 منورسکی، بحد اشاریہ) اس مصنف کے بیان  
 کے مطابق دریائے ڈینیوب کوہستان دنیوس  
 (دنیوس الکبیر) سے نکلتا ہے۔ اس لیے اس کا نام  
 دونیا یا ترکی تلفظ ”طنا“ ہے۔ یہ دریا دجلہ اور فرات  
 دونوں کے مجموعے سے بھی بڑا ہے اور مشرق کی  
 جانب جبل قشقہ طاغ تک بہتا ہوا سقچی، یعنی  
 ایساقچہ کے مقام پر سمندر میں جا گرتا ہے۔ اس  
 دریا کے طاس میں مجار اور صرب (ہنگری اور  
 سروی) ایسے کافر قبائل آباد ہیں (ص ۵۶، ۲۸۸)۔  
 کتاب کے ایک اور حصے میں (ص ۲۹۵) خستگہ طاغ  
 کو ایساقچہ کے مغرب میں ظاہر کیا گیا ہے  
 گویا یہ ٹرانسلوانیا میں ہے اور یہ کہ ڈینیوب  
 مشرق کی طرف بہتا ہے۔ اس صورت میں اس کی مراد  
 کوہستان بلقان ہے۔ ترنو کا قلعہ ایساقچہ کے مغرب  
 میں تین دن کی مسافت پر بتایا گیا ہے اور اس کے  
 باشندوں کو افاقی (ویلشوی) لکھا گیا ہے۔ یہ بات  
 بھی اعلیٰ ترنو یا ترنو کے متعلق ہے، جو ٹرانسلوانیا

میں واقع ہے، لیکن ابوالفداء یہ بھی کہتا ہے کہ لفظ  
 برغال (المسعودی میں ”برغر“، دیکھیے زکی ولیدی  
 طوغان : *Ibn Fazlan*، ص ۱۲۳) بھی ویلشیوں  
 کے لیے مستعمل تھا۔ یہ مصنف ان لوگوں کو  
 بلغاروں سے ملتیس کر دیتا ہے۔ نیز ترنو کے  
 قصبے کو، جو ویلنیشیا میں واقع ہے، اس نے ترنو یا  
 ترنوہ کے ساتھ ملتیس کر دیا ہے، جس کے حالات  
 اس نے بعض مہمانوں اور مسافروں سے سنے تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل عثمانی  
 ترکوں نے کوہستان خیمس کو بلقان کا نام دیا ہے  
 (دیکھیے مادہ خیمس *Hamus* در *Pauly-Wisowa*)۔  
 اس امر کا امکان بے بنیاد ہے کہ یہ نام ایرانی لفظ  
 ”بالاخانہ“ (دیکھیے *Radloff* : *Wb*، ۴ : ۱۳۹۹) سے  
 نکلا یا ابوالغازی کے بیان کے مطابق ”ابوالخان“  
 سے مشتق ہوا۔ مغربی ترک اس لفظ کو ”کوہستانی  
 سنگلاخ سرزمین“ کے لیے استعمال کرتے ہیں  
 (دیکھیے سوز درلمہ درگیسی *Söz derleme dergisi*، ۱ :  
 ۱۵۹، ”*Balgan*“)۔ اس امر کے لیے کہ ترکمانستان  
 میں کوہستان بلخان واقع ہے اور یہ نام کوہستان  
 خیمس کو دیا گیا دیکھیے *Marquart* : *Ungarischen*  
*Yahrbücher*، ف ۴ : ۲۸۵ و *Barthold* : *لا*، ت، زیر  
 مادہ بلخان *Balhan*۔ باشقرت لفظ بلقان کو پہاڑ کے  
 معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اچلی کوال کے  
 قریب اس نام کا پہاڑ ہے (دیکھیے *Moskvityanin*،  
 ۱۸۳۳ء، ۱ : ۱۱۳)۔ یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ  
 اس موضوع پر بعض تصانیف، مثلاً *W. Tomaschek* :  
*Zur kunde der Hämus Halbinsel* (در *SBAK*) وی انا،  
*Hist-Kl.* ص ۱۱۳، ۱۸۸۷ء سے استفادہ نہیں کیا  
 جا سکا۔

(زکی ولیدی طوغان)

(۳) عثمانی ترکوں کے زمانہ زوال میں  
 بلقان یورپ کی بڑی طاقتوں کی سازشوں کی آماج گاہ



اس معاہدے میں البانیا کو شامل ہونے کی دعوت نہیں دی گئی اور بلغاریا نے اس کا رکن بننے سے انکار کر دیا۔ چند ماہ بعد (۲ اکتوبر تا ۲ نومبر ۱۹۳۴ء) انقرہ میں معاہدہ بلقان پر دستخط کرنے والی چار طاقتوں نے اتحاد بلقان (Balkan Entente) کی تنظیم کی؛ چنانچہ ایک مستقل کونسل اور ایک مشاورتی اقتصادی کونسل کا بطور اس کی مجالس منتظمہ کے، قیام عمل میں آیا۔ ان کونسلوں نے اس اتحاد سے فوائد حاصل کرنے کے بعض عملی اقدامات بھی کیے۔ یہ اتحاد بلقان ہی کا اثر و نفوذ تھا کہ Montreux کانفرنس (منعقدہ ۲۲ جون تا ۲ جولائی ۱۹۳۶ء) میں ترکیہ کی حمایت میں Convention of the Straits پر نظر ثانی کی گئی۔

۱۹۳۶ تا ۱۹۳۸ء کے دوران میں جب یورپ ایک زبردست سیاسی بحران سے دوچار ہوا تو بلقان کے ممالک پھر سیاسی ریشہ دوانیوں کی آماجگہ بن گئے۔ اطالیہ نے جرمنی کی شہ پر جہشہ پر حملہ کیا تو یہ گویا لیگ آف نیشنز League of Nations اور دیگر بڑی طاقتوں، مثلاً برطانیہ، فرانس اور روس کو ایک کھلا چیلنج تھا، نیز سپین میں بغاوت ہو جانے سے یورپ کی سیاسی صورت حال اور زیادہ مخدوش ہو گئی۔ اطالیہ اور جرمنی نے اتحاد بلقان کو بالخصوص ختم اور ان کے فرانس اور مغربی یورپ کے ساتھ تعلقات منقطع کرانے کی کوشش کی۔ جرمنی ہر قیمت پر چیکوسلواکیا کو دوسرے ممالک سے علیحدہ کرانے اور اسے تباہ کرنے اور رومانیہ، یونان، ترکیہ، یوگوسلاویا اور بلغاریا کی حمایت حاصل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

۲۴ جنوری ۱۹۳۷ء میں بلغاریا اور یوگوسلاویا کے درمیان ایک مستقل دوستی کا عہدنامہ طے پایا، چونکہ یہ عہدنامہ "اتحاد بلقان" کی اطلاع کے بغیر طے ہوا تھا، لہذا یوگوسلاویا کی حکمت عملی

بن گیا۔ بڑا مقصد یہ تھا کہ اس علاقے کو ترکوں کے تسلط اور اثر سے آزاد کرایا جائے۔ اس زمانے کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اہم واقعات میں ایک جنگ بلقان تھی اور دوسرا دور رس واقعہ جنگ عظیم اول۔ ان کے بعد ترکیہ کا اثر کم سے کم ہو گیا اور یہ علاقے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی صورت میں خود مختار ہو گئے۔ دوسری جنگ عظیم سے کچھ پہلے اتحاد بلقان کی بنیاد پڑی۔ یہ ایک سیاسی تنظیم تھی، جس کی تشکیل ۹ فروری ۱۹۳۴ء کو ان چار بلقانی ممالک کے لیے کی گئی تھی: یوگوسلاویا، رومانیہ، یونان اور ترکیہ اور اس کا مقصد باہمی دفاع اور دیگر مشترکہ مفادات کی حفاظت تھا۔

اتحاد بلقان کا پس منظر: بلقان کے وفاق یا اتحاد کا تصور بہت پرانا ہے۔ جنوبی یورپ کی اقوام میں نظریہ قومیت کے فروغ کے ساتھ یہ احساس نشوونما پانے لگا کہ چھوٹی قوموں کے اتحاد سے عثمانی ترکوں یا Habsburg کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے۔ جنوبی سلاوی اقوام میں بالخصوص ہم نسی کے جذبے نے فروغ پکایا اور اس نے تاریخی و جغرافیائی رشتوں کو مزید مضبوط بنانے کے تصور کو تقویت پہنچائی۔ لیکن یورپ کے سیاسی حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ ۱۹۳۴ء تک اتحاد بلقان کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ گو ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۳ء تک اتحاد بلقان کے لیے چار غیر رسمی کانفرنسیں منعقد کی گئیں، جن میں بلقان کے تمام ممالک نے خصوصاً ترکیہ اور یونان نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، نتیجہ اس اتحاد کی راہیں کچھ نہ کچھ حموار ضرور ہو گئیں؛ چنانچہ ۹ فروری ۱۹۳۴ء کو یونان، رومانیہ، ترکیہ اور یوگوسلاویا نے اینٹیز کے مقام پر معاہدہ بلقان پر دستخط کر دیے۔ یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ بلقان کی چار طاقتوں کے

جرمنی کے اقتصادی دام میں پھنس چکے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بلقان کے یہ تمام ممالک ایک دوسرے کی پروا کیے بغیر اپنی اپنی راہ پر چلنے کا تمبیہ کر چکے تھے، گو اتحادِ بلقان بظاہر ابھی تک قائم تھا۔ ۲۰-۲۲ فروری ۱۹۳۹ء کو اتحادِ بلقان کی کونسل کا بخارست میں اجلاس ہوا، جس میں اتحاد کو قائم رکھنے پر بہت کچھ کہا سنا گیا، لیکن جرمنی کی اقتصادی اور سیاسی قوت نے یورپ کو جس بحران میں مبتلا کر دیا تھا اس کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ اگرچہ برطانیہ اور فرانس نے پولینڈ کو ضمانت دینے (۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء) کے بعد یونان اور رومانیہ اور ترکیہ کو جارحانہ حملے کے خلاف ضمانت دینے کا اعلان کیا، لیکن اس سے اتحادِ بلقان کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ یہ یاد رہے کہ یوگوسلاویا کو ایسی کوئی ضمانت نہیں دی گئی، غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے ہی سے جرمنی اور اٹلی کی محوری طاقتوں سے تین طرف سے گھرا ہوا تھا۔

آخر کار جب یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو جرمنی نے پولینڈ پر حملہ کر کے جنگ کا آغاز کیا تو رفقائے ”اتحادِ بلقان“ نے ایک بار پھر متحدہ رہنے کا اقرار کیا، لیکن ہر ملک اندر سے اپنی انفرادی حکمت عملی پر گامزن رہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اتحادِ بلقان کی کونسل کا آخری اجلاس ۲-۳ فروری ۱۹۴۰ء کو بلغراد کے شہر میں منعقد ہوا۔ اس میں فیصلہ ہوا کہ اتحادِ بلقان کے ممالک کو آپس میں سیاسی اور اقتصادی طور پر متحد رہنا چاہیے اور جنگ سے دور اور آپس میں امن و آسٹنی سے رہنے کی کوشش کرتی چاہیے، نیز یہ طے پایا کہ کونسل کا آئندہ اجلاس فروری ۱۹۴۱ء میں ایتھنز میں ہوگا۔ آثار بتا رہے تھے کہ کونسل کے یہ تمام فیصلے محض زبانی جمع و خرچ تھے اور انہیں

پر بہت اعتراضات کیے گئے اور یونان اور رومانیہ کی حکومتوں کو اس سے سخت تشویش لاحق ہوئی۔ بہر حال ۱۵-۱۸ فروری ۱۹۳۷ء کو اتحادِ بلقان کا ایتھنز میں اجتماع ہوا، جس میں یورپ اور بلقان کی نئی صورت حال، نیز بلغاریا اور یوگوسلاویا کے معاہدے پر غور کیا گیا اور آخر کار اس معاہدے پر تسلی کا اظہار کیا گیا۔

جس طرح یوگوسلاویا نے اپنی مرضی سے بلغاریا سے معاہدہ کیا تھا اسی طرح اس نے اطالیہ سے عسکری معاہدہ کر لیا، اس کے بعد ان دو ملکوں میں اقتصادی معاہدہ طے پایا۔ ان دونوں معاہدوں نے بلاشبہ اتحادِ بلقان کو ایک کاری ضرب لگائی۔ علاوہ ازیں جرمنی کی اقتصادی حکمت عملی سے نہ صرف بلقان کے ممالک بلکہ برطانیہ اور فرانس کی اقتصادی حالت اس قدر کمزور ہو گئی کہ اتحادِ بلقان کا ہر ملک اس اقتصادی اور سیاسی بحران سے بچنے کے لیے اپنے طور پر ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور ہو گیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کے معاہدہ میونخ کے باعث جب چیکوسلوواکیا کی محکومی پر دستخط ہو گئے تو اس سے Little Entente کا، جس کا چیکوسلوواکیا ایک اہم ترین رکن تھا، تباہ ہو جانا قدرتی تھا۔ اگرچہ معاہدہ میونخ کی وجہ سے اتحادِ بلقان کا خاتمہ نہ ہوا لیکن معاہدہ میونخ اور بعد کے سیاسی حالات نے اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور اس کے ٹوٹ جانے کے آثار یقینی ہو گئے۔ عہدنامہ میونخ کے بعد جب دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا تو نیشنل سوشلسٹ جرمنی نے بلقان کے علاقے کو پر امن طریقے سے فتح کرنے کی حکمت عملی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ رومانیہ ۲۳ مارچ ۱۹۳۹ء کے اقتصادی معاہدے کی رو سے جرمنی کا محکوم بن چکا تھا، جب کہ بلغاریا، یوگوسلاویا اور یونان، نیز ترکیہ بھی



سمندری خلیج Συμβόγων λιήην پر واقع تھا۔ یہاں تورانی آباد تھے اور وہ اسے بطور پناہ گاہ کے بھی استعمال کرتے تھے۔ بعد میں یہ روسیوں اور بوزنظیوں کے زیر اقتدار آ گیا اور نویں صدی سے تیرھویں صدی تک روسیوں کے ساتھ ایک معمولی سی تجارت مبادلہ کا مرکز بنا رہا۔ یہاں ۱۳۶۰ء کے قریب اہل جنوا آباد ہو گئے اور انہوں نے ایک رومن کیتھولک اسقفی (bishopric) قائم کی۔ ۱۳۸۰ء میں بوزنظہ نے گتھ (Feodosiya) تک کریمیا کا پورا مغربی ساحل ان کے حوالے کر دیا۔ اس وقت اس شہر کا نام سمبالو Cembalo (غالباً mbolon سے ماخوذ) تھا اور یہ بہت مضبوط و مستحکم تھا، چنانچہ اس کی دیواروں کے آثار انیسویں صدی تک دیکھنے میں آتے تھے۔ ۱۴۳۳ - ۱۴۳۴ء میں یہاں کے یونانی باشندوں نے اپنے آپ کو جنوا والوں کی حکومت سے آزاد کرنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ ۱۴۷۵ء میں بٹالاوہ کریمیا کے تاتاریوں کے ہاتھوں میں آ گیا، اور ۱۷۸۳ء تک انہیں کے قبضے میں رہا۔ یہ ان علاقوں کے ساتھ جو براہ راست ترکی سلطنت کے ماتحت تھے ان کی مملکت جنوبی کی حد بناتا تھا (قب محمد رضا، طبع کاظم بیگ، ص ۹۲، ایک تاریخ، تقریباً ۱۶۴۰ء کے ضمن میں)۔ اس زمانے میں اس شہر کی اہمیت محض تجارتی تھی۔ تاتاری لوگ، جو اس شہر میں رفتہ رفتہ آباد ہو گئے تھے، اس پر روسیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد (۱۷۸۳ء) اسے چھوڑ کر چلے گئے اور ان کی جگہ جزائر ایجین سے یونانی آ کر یہاں بس گئے، جنہوں نے ۱۷۶۸ تا ۱۷۷۴ء کی جنگ میں روسیوں کا ساتھ دیا۔ ان لوگوں نے ۱۷۹۵ء سے لے کر ۱۸۵۹ء تک اپنا فوجی دستہ بنائے رکھا۔ جنگ کریمیا کے دوران میں ۲۵ اکتوبر ۱۹۰۴ء کو بلقلاوہ کے قریب ایک لڑائی لڑی گئی۔ آج کل بلقلاوہ ایک چھوٹا سا

عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی ملک بھی تیار نہ تھا۔ چنانچہ کونسل کا فروری ۱۹۴۱ء کا مجوزہ اجلاس کبھی منعقد نہ ہوا۔ ۱۹۴۰ء کے موسم گرما میں رومانیہ کے حصے بخرے کر دیے گئے، رومن نے بس سربیا Bessarabia [رک بہ بجات] اور Bukovina کے علاقے ہتیا لیے اور ہنگری Transylvania کے ایک حصے پر چڑھ دوڑا، جبکہ جرمنی کی فوجوں نے اندرون ملک پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۴۱ء کے موسم گرما میں رومانیہ کی فوجوں نے جرمنی کی فوجوں کے ساتھ مل کر سوویت یونین میں چڑھائی کر دی۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو اطالیہ نے یونان پر حملہ کر دیا، اور پھر اطالیہ اور جرمنی کی فوجوں نے مل کر یوگوسلاویا اور یونان دونوں کو فتح کر لیا۔ ترکیہ کم از کم کچھ عرصے کے لیے بے دست و پا ہو کے رہ گیا۔ اتحاد بلقان کے ممالک کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود وہ کہیں بھی جارحانہ حملے کا مل کر مقابلہ نہ کر سکے اور ایک ایک کر کے تمام ممالک جارحانہ حملوں کا شکار ہو گئے۔ اب ترکی و یونان کے سوا یہ ریاستیں روس کے زیر اثر ہیں اور میثاق وارسا میں شامل ہیں۔

[ادارہ]

بلقلاوہ: [ = بالقی لاوہ ]، تاتاری زبان میں بالقی لاوہ (جس کے عوامی اشتقاقی معنی ماہی گیری (یا مچھان پکڑنے کی جگہ) کے ہیں [جدید ترکی میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں مستعمل ہے])۔ یہ کریمیا میں ایک چھوٹی سی بندرگاہ، جو بحیرہ اسود کی ایک دور تک خشکی کے اندر آئی ہوئی کھاڑی پر جو سمندر سے نظر نہیں آتی، سواستوپول سے سولہ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

یونانی جغرافیہ دان (Strabo وغیرہ) اس شہر کو Palakion کے نام سے جانتے تھے، جو

بن شرحبیل لکھا ہے (الاعلام، بذیل مادہ)؛ ابن حزم نے ایلی اشرح (بعض کے ہاں الیشرح)، اور ساتھ ہی لکھا ہے کہ ان کے انساب میں الجہن بھی ہے اور اختلاف رائے بھی، نیز ان کے انساب اور حالات کے متعلق بہت کم باتیں درست ہیں (جمہرۃ انساب العرب، ص ۳۹)۔ وہ شاہانِ یمن کے تبع خاندان سے تھی۔

”عہد قدیم“ میں ملکہ سبا کا مختصر تذکرہ نام لیے بغیر ملتا ہے جب وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی نبوت کا ذکر سن کر تحفے لیے جلوس کی شکل میں یروشلم میں داخل ہوتی ہے اور ان سے سوالات کرتی ہے اور وہ ہر بات کا تسلی بخش جواب دیتے ہیں۔ ملکہ سبا حضرت سلیمانؑ کے خدام و مصاحبین اور جاہ و حشم سے متاثر ہوتی ہے اور ان کی حکمت اور ان کے پروردگار کی عظمت کی قائل ہو جاتی ہے اور پھر حضرت سلیمانؑ اسے عطیات اور تحائف دیتے ہیں اور وہ اپنے خدام کے ساتھ اپنے وطن لوٹ جاتی ہے (قب کتاب المقدس، ملوک اول، باب ۱، آیات ۱ تا ۱۰ و ۱۳)۔

ملکہ بلقیس ان تاریخی شخصیات میں سے ہے جن کا نام لیے بغیر قرآن مجید نے ذکر کیا ہے جیسے عزیز مصر کی بیوی زلیخا (”امرات العزیز“ ۱۲ [یوسف]؛ ۳) یا فرعون کی بیوی آسیہ (”امرات فرعون“ ۶۶ [التحریم]؛ ۱۱)۔ قرآن کریم نے ملکہ سبا (بلقیس) کا قصہ بڑے اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے (۲۷ [النمل]؛ ۲۲ تا ۳۳) بعد میں مسلم مفسرین نے اسرائیلیات اور دیگر روایات کی بنیاد پر اس قصے کی مختلف تفصیل بیان کی ہیں۔ قرآن کریم نے ملکہ بلقیس کی جو تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے اس سے وہ ایک اعلیٰ درجے کی ذہین، مدبر اور دور اندیش حکمران خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ تواضع اور خوش خوئی

تجارتی شہر ہے جہاں اہم پیشہ ماہی گیری اور انگور کی پیلین لگانا ہے۔

مآخذ: *Krimskiy Sbornik* : P. Köppen، سینٹ

پیٹرزبرگ ۱۸۳۷ء، ص ۲۱۰ تا ۲۲۷ (ایک خاکے سمیت)؛

(۲) *Krimskoye Khanstvo* : V. Smirnov، سینٹ

پیٹرزبرگ ۱۸۸۷ء، بحد اشاریہ؛ (۳) E. S. Zevakin و

*Iz istorii social'nikh otnosheniy v* : N. A. Pencko

*genuezskikh koloniyakh Sev. Pricernomorya v XV*

*veke*، در *Istoričeskiye Zapiski*، ۱۹۳۰ء، شماره ۷؛

(۴) *Enciklopedičeskiy Slovar* : Brockhaus Yefron (۴)

ج ۴ (IIA)، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۹۱ء، ص ۷۸۳ بعد؛

(۵) *Bol' shaya Sovetskaya Enciklopediya*، طبع ثانی،

۴ (۱۹۵۰ء) : ۱۰۲ بعد؛ قدیم زمانے میں بلقلاوہ

کے لیے قب *Pauly-Wissowa*، ج ۱۸ / ۲ (۱۹۳۲ء)؛

عمود ۲۳۹۸ (از Ernst Diehl) و سلسلہ ثانی ج ۴ الف،

۱ (= ۷)، (۱۹۳۱ء)؛ عمود ۱۰۹۷ (از E. Oberhummer

مع محل وقوع پر مکمل بحث) بلقلاوہ پر اہل

جنوآ کی حکومت کے لیے قب *Die Goldene* : B. Spuler

*Horde*، لائپزگ ۱۹۳۳ء، ص ۲۴۰ بعد، ۲۶۷ بعد

(مع مزید مآخذ کے حواجات)۔

(B. SPULER)

\* بلقیس : با اور قاف کی زیر کے ساتھ، لیکن

بعض اوقات با پر زیر بھی پڑھی جاتی ہے [= بلقیس]۔

(بعض علمائے لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ

اصل کے لحاظ سے عبرانی ہے اور معرب ہونے

سے پہلے بلقیس (بفتح با) تھا، مگر معرب ہونے کے

بعد بلقیس (بکسر با) پڑھا جانے لگا)، ایک خوبصورت

اور ذہین عورت کا نام جو ملک سبا کی ملکہ تھی

(قب تاج العروس، فرهنگ آندراج، بذیل مادہ)۔ عرب

علمائے لغت اور مفسرین کا خیال ہے کہ اس کا باپ

شراحیل بن مالک سرزمین یمن کا بادشاہ تھا۔ [بلقیس

کے باپ کے نام میں اختلاف ہے، الزرکلی نے الہدھاد



علاوہ لڑکیوں کے لباس میں پانچ سو غلام بھی تھے۔ حضرت سلیمانؑ لوندیوں اور غلاموں میں تمیز کرنے اور تعائف کو مسترد کر دینے کے علاوہ ایسے عظیم الشان لشکر کے ذریعے چڑھائی کی دھمکی بھی دیتے ہیں جس کی ان لوگوں میں قوتِ مقاوت نہیں ہوگی (الکشاف، ۳ : ۱۶۵ تا ۱۶۶؛ روح المعانی، ۱۹ : ۱۹۹)۔ مفسرین کا خیال ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو بذریعہ وحی یہ علم ہو چکا تھا کہ ملکہ سبا بغرض آزمائش آنیوالی ہے، چنانچہ اعجازِ ربّانی سے اسے لاجواب کرنے کے لیے اس کا تخت منگوانا چاہا جسے وہ ساٹھ مقل دروازوں میں محفوظ کر کے ان کے پاس روانہ ہوئی تھی۔ ایک زور آور جن (عَفْرِیْتُ مِنَ الْجِنِّ) نے جو قوت و اعانت سے بھی متصف تھا، حضرت سلیمانؑ کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہونے کی دیر میں تخت حاضر کرنے کو کہا، مگر ان کے وزیر آصف بن برخیا نے (جس کے پاس علم الکتاب، یعنی اللہ کا اسم اعظم یا روحانی قوت تھی) آنکھ جھپکنے کی دیر میں لا دینے کو کہا (الکشاف، ۳ : ۳۶۷)۔ بہر حال ملکہ سے پہلے ہر ممکن تیزی کے ساتھ اس کا تخت لایا گیا اور بطورِ آزمائش اس کی شکل میں کچھ تبدیلی کر دی گئی۔ ذہین و زود فہم ملکہ امتحان میں پوری اتری اور اعتراف کیا کہ ہم تو آپ کی عظمت اور دعوتِ توحید کو پہلے ہی معلوم کر کے مسلمان ہو چکے تھے اور یوں حضرت سلیمان علیہ السلام نے اسے اور اس کی قوم کو غیر اللہ کی پرستش سے روک دیا۔

ملکہ بقیہ کی آمد سے پہلے سلیمان علیہ السلام نے جنات کو سفید شیشے کا صاف و شفاف محل تعمیر کرنے کا حکم دیا اور محل کے نیچے سے پانی جاری کرا دیا جس میں ہر قسم کے آبی جانور تیرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ حضرت سلیمان

سے بھی متصف نظر آتی ہے۔ پرندہ ہڈھ ہڈھ حضرت سلیمان علیہ السلام کے پاس ملک سبا کے بارے میں یقینی خبر لے کر آتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس ملک پر ایک عورت حکمران ہے اور وہ سب اللہ کو چھوڑ کر سوج کی پرستش کرتے ہیں، یہ لوگ بڑے خوش حال ہیں اور ان کی ملکہ کے پاس سب کچھ موجود ہے اور اس کے پاس ایک بہت بڑا تخت ہے (مسلم مفسرین کے بیان کے مطابق یہ تخت سونے کا بنا ہوا تھا جو تیس ضرب تیس گز لمبا چوڑا اور تیس گز ہی بلند تھا، پائے قیمتی جواہرات اور سرخ و سبز یاقوت کے تھے، قَبِّ رُوحِ الْمَعَانِی، ۱۹ : ۱۹۰؛ الکشاف، ۳ : ۳۶۰)۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ہڈھ کو ایک خط لکھ کر دیتے ہیں، جس میں ملکہ سبا اور اس کی قوم کے لوگوں کو دعوتِ اسلام دی جاتی ہے۔ پرندہ یہ خط حسب حکم سلیمانی ملکہ کی خوابگاہ میں ڈال دیتا ہے جس کے تمام دروازے اور کھڑکیاں اندر سے مقل تھیں۔ ملکہ اس خط کو اپنی خوابگاہ میں دیکھ کر حیرت میں پڑ جاتی ہے کہ یہ اندر کس طرح پہنچ گیا؟ اس موقع پر ملکہ اپنے انتہائی حزم و احتیاط اور کمالِ دوراندیشی کا ثبوت دیتی ہے اور اپنے مصاحبوں سے مشورہ لیتی ہے اور اگرچہ وہ سب اپنی طاقت و شجاعت کے گھمنڈ میں جنگ کا مشورہ دیتے ہیں لیکن ملکہ پہلے پر امن طریق سے اس مسئلے کو حل کرنے کا عزم کرتی ہے اور ایک پتے کی بات یہ کہتی ہے کہ جنگ میں شکست کی صورت میں مفتوحین کو تباہی اور ذلت سے دوچار ہونا پڑتا ہے (قَبِّ مَفَاتِیحِ الْغِیْبِ، ۶ : ۴۴۳؛ الکشاف، ۳ : ۳۶۴؛ روح المعانی، ۱۹ : ۱۹۴)۔ ملکہ یہ جانچنے کے لیے کہ آیا سلیمان علیہ السلام کی دعوتِ نبوت سچی ہے یا نہیں، بڑے قیمتی تعائف بھیجتی ہے، جن میں سونا، چاندی، جواہرات کے

کے علاقے میں بلقینہ کے مقام پر آباد ہو گیا تھا۔

(۱) عمر بن رسلان بن ناصر بن صالح، سراج الدین،

ابو حفص الکنانی، ۱۲ شعبان ۵۲۳ھ / ۴ اگست

۱۳۲۳ء کو پیدا ہوا اور ۱۰ ذوالقعدہ ۵۸۰ھ /

یکم جون ۱۳۰۳ء کو فوت ہوا۔ قاہرہ میں

اپنے زمانے کے مشہور ترین علما سے تعلیم حاصل

کی، جن میں ابن عقیل [رک باں] بھی شامل تھا

جس کی بیٹی سے اس نے شادی کی اور ۵۹ھ /

۱۳۵۸ء میں جب ابن عقیل ایک قلیل مدت کے لیے

قاضی القضاة کے عہدے پر فائز ہوا تو اس نے

اس کے نائب کے فرائض سرانجام دیے۔ ۶۵ھ /

۱۳۶۳ء میں وہ دارالعدل میں مفتی مقرر ہوا

تو اس نے اپنے عہد کے سب سے نامور فقیہ

کی حیثیت سے شہرت حاصل کی (قب ابن خلدون:

مقدمة، باب ۶، فصل ۲: [Quatremere، ۳: ۱۸])، لیکن

ایک قلیل عرصے کے علاوہ جب ۶۹ھ / ۱۳۶۷ -

۱۳۶۸ء میں اسے دمشق میں شافعی قاضی القضاة

مقرر کیا گیا تھا، (یہ دور اس کا اپنے استاد تاج الدین

السبکی کا حریف ہونے کی وجہ سے قابل ذکر ہے) اسے

کبھی قاضی القضاة کا منصب حاصل نہیں ہوا، البتہ

اس سے کمتر درجے کے منصب، یعنی قاضی عسکر

کے عہدے پر (جو آمدنی کے اعتبار سے بہت

فائدہ بخش تھا) فائز کیا گیا۔ معلمی کی متعدد اسامیاں

اس کے علاوہ تھیں۔ زندگی کے آخری ایام میں اسے

شیخ الاسلام کا خطاب دے کر اعزاز بخشا گیا۔

یہ اعزاز قاضی القضاة کے مساوی یا اس سے بھی بلند

تصور کیا جاتا تھا۔ بعض لوگوں کی نظر میں وہ

آٹھویں صدی [هجری] کا مجدد تھا۔ اپنے وسیع علم

کے باوجود وہ اپنی کوئی تصنیف مکمل نہیں

کر سکا [لیکن قب الزرکلی: الاعلام، ۵: ۲۰۵]۔

محاسن الاصطلاح پر ایک رسالے کے علاوہ

شافعی فقہ پر ایک نامکمل کتبہ التدریب بھی اس کی

علیہ السلام نے ملکہ کو اس محل میں داخل ہونے کو  
کہا، مگر وہ پانی کو دیکھ کر گھبرا گئی کہ شاید  
یہ گھبرا پانی ہے (اور شاید سلیمانؑ مجھے بطور سزا  
اس میں غرق کرنا چاہتے ہیں)، مگر سلیمان علیہ السلام  
نے کہا کہ یہ تو ایک محل (صرح معرود بن قواریر)  
ہے جو شیشے سے ہموار بنایا گیا ہے (قب الکشاف،  
۳: ۳۷۰؛ روح المعانی، ۱۹: ۲۰۸)۔

بعض روایات کے مطابق حضرت سلیمان  
علیہ السلام نے ملکہ بلقیس سے شادی کر لی اور اسے  
اسے ملک پر بطور حکمران برقرار رکھا، اس سے  
محبت کرتے، ہر ماہ ایک دفعہ اس سے ملنے کے لیے  
جاتے، اس سے اولاد بھی ہوئی اور جنات کو حکم  
دے کر سیلحین اور غمدان کے محل نما قلعے بھی اس  
کے لیے تعمیر کروائے (قب الکشاف، ۳: ۳۷۰؛  
الصحاح، تحت مادۃ غمدان)، مگر بعض روایات کی رو  
سے ملکہ کی مرضی کے مطابق ہمدان کے بادشاہ  
بائے ساتھ اسے بیاہ دیا اور یمن کا اقتدار بھی اسے ہی  
سونپ دیا اور ایک زوبعد نامی جن اس کی اطاعت  
میں دے دیا (الکشاف، ۳: ۳۷۰)۔

مآخذ: (۱) القرآن (۲۷: ۲۰ تا ۳۳)؛ (۲)  
الزمخشری: الکشاف؛ (۳) الرازی: مفاتیح الغیب؛  
(۴) الألوسی: روح المعانی، ج ۱۹، مصر؛ (۵) البيضاوی:  
انوار التنزیل و اسرار التأویل؛ (۶) الخفاجی:  
حاشیہ علی البيضاوی؛ (۷) محمد علی، لاہوری:  
بیان القرآن، لاہور ۱۳۳۲ھ؛ (۸) تاج العربوس، بذیل مادہ؛  
(۹) فرہنگ آندراج، بذیل مادہ؛ (۱۰) الكتاب المقدس  
(ملوک اول، باب ۱۰، آیات ۱ تا ۱۰ و ۱۳)؛ (۱۱)  
الزرکلی: الاعلام، بذیل مادہ، بالخصوص مآخذ]۔

(ظہور احمد اظہر [وادارہ])

بَلْقِيسُ : رَكَّ بِهٖ قَيْنٌ .

\* البَلْقِينِي : مصري علما کا ایک خاندان جو  
نسلاً فلسطینی تھا اور جس کا جد امجد صالح الغریبہ



اشاریہ؛ (۳) Wiet شماره ۱۳۸۱؛ (۴) القلقشندی :  
صبح الاعشى، ۹ : ۱۸۰ - قرآن و فقہ پر اس کی  
جو تصنیفات ابھی تک موجود ہیں ان کے لیے دیکھیے :  
(۵) براکلمان، ۲ : ۱۱۲؛ تکلمہ، ۲ : ۱۳۹؛  
(۶) اس کے بیٹے تاج الدین محمد قاضی العسکر کے لیے :  
النجوم، ۷ : ۳۶۱؛ (۷) الضوء اللامع، ۷ : ۲۹۳ تا ۲۹۵؛ (۸)  
السیوطی: نظم العقیان، ص ۱۵۱؛ (۹) Weit، شماره ۲۱۸۰  
اور زین الدین قاسم ناظر الجوالی؛ (۱۰) الضوء اللامع، ۵ :  
۱۸۱-۱۸۲؛ ۷ : ۲۹۵؛ (۱۱) Wiet، شماره ۱۸۰۷؛ (۱۲)  
ابن حجر، انباء الغمر، برٹش میوزیم، اورینٹل ۵۳۱۱ :  
۱۰۵ الف، ۲۳، ۳۳۰، ۱۰۶ الف، ۶، Add.، ۷۳۲۱،  
۲۵۸ الف و ب؛ [(۱۳) ابن فہد : لحظہ الالحظ؛ (۱۴)  
ابن العماد : شذرات الذهب، ۷ : ۱۶۶؛ (۱۵) الزرکلی :  
الاعلام، ۳ : ۹۳.]

(۴) صالح بن عمر، علم الدین، ابوالبقاء ۵۷۹۱ھ /  
۱۳۸۹ء تا ۵۸۶۸ھ / ۱۳۶۳ء (۱) کاسب سے چھوٹا  
بیٹا جو ۵۸۲۵ھ / ۱۳۲۲ء سے اپنی وفات تک آٹھ  
بار قاہرہ میں شافعی قاضی القضاة کے عہدے پر  
فائز رہا۔ کئی مدرسوں میں معلم اور خانقاہ بیبرسیہ کا  
ناظر رہا۔ فقہ میں وہ السخاوی اور السیوطی کا استاد تھا۔  
اپنے والد کے فتاویٰ اور مہمات کی تالیف اور اس کی  
کتاب التدریب کی تکمیل اور اس کی سوانح عمری  
تصنیف کرنے کے علاوہ اس نے ایک تفسیر اور حدیث  
وقفہ پر دوسری کتابیں بھی تصنیف کیں۔

مآخذ: (۱) السخاوی: الضوء اللامع، ۳ : ۳۱۲ تا  
۳۱۳، ۳ : ۳۰ (اس کے بیٹے ضیاء الدین عبدالخالق کی  
سوانح عمری)؛ (۲) ابن تغری بردی: النجوم، ۷ : ۲۹۲ تا ۲۹۳  
و اشاریہ؛ (۳) Wiet، شماره ۱۱۹۷؛ (۴) السیوطی: حسن  
المحاضرة، ۱ تا ۲۰۵؛ (۵) وہی مصنف: نظم العقیان،  
ص ۱۱۹؛ (۶) براکلمان، ۲ : ۹۶؛ تکلمہ، ۲ : ۱۱۳  
تا ۱۱۵؛ [(۷) الزرکلی : الاعلام، ۳ : ۲۷۹.]

(۵) ابوالسعادت بدرالدین، محمد بن (تاج الدین)  
محمّد بن عبدالرحمن، ۵۸۱۹ھ / ۱۳۱۷ء یا ۵۸۲۱ھ /

یادگار ہے۔ وہ ہرات میں بہاء الدین قراقوش میں  
خاندانی مدرسے کا بانی تھا۔

مآخذ: (۱) السخاوی: الضوء اللامع، ۵ : ۸۵ تا ۹۰،  
۱۸۲؛ (۲) ابن تغری بردی: النجوم (طبع Popper)، ج  
۵ (طبع قاہرہ، ج ۱۲)، اشاریہ ۶، ۱۵۶؛ (۳) المنہل  
الصافی، اشاریہ از Wiet، شماره ۱۷۲۳ (مع خاندانی  
شجرہ و اضافی مآخذ)؛ (۴) ابن حجر: الدرر الکامنة، ۲ :  
۲۶۷، ۲۷۷؛ (۵) السیوطی: حسن المحاضرة، ۱ : ۱۳۸  
(۱۳۵)؛ (۶) براکلمان، ۲ : ۹۳؛ تکلمہ، ۲ : ۱۱۰؛ (۷)  
ابن حجر: انباء الغمر (برٹش میوزیم مخطوطہ Add.،  
۷۳۲۱)، ص ۱۳۳ راست و چپ؛ [(۸) الزرکلی: الاعلام،  
۵ : ۲۰۰.]

(۲) بدر الدین محمد بن عمر (۵۷۵۷ھ / ۱۳۵۶ء  
تا ۵۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء)، نمبر (۱) کاسب سے بڑا بیٹا  
جو ۵۷۷۹ھ / ۱۳۷۷ء میں قاضی عسکر اور مفتی  
دارالعدل کے عہدوں پر اس کا جانشین ہوا۔

مآخذ: (۱) ابن حجر: الدرر الکامنة، ۳ : ۱۰۵؛  
(۲) Wiet، شماره ۲۲۸۸ اس کا بیٹا تقی الدین محمد؛ (۳)  
الضوء اللامع، ۱۰ : ۱۷۱؛ (۴) Wiet، شماره ۲۳۵۰  
اور ہوتا ولی الدین احمد قاضی دمشق؛ (۵) النجوم، ۷ :  
۵۳۵؛ (۶) الضوء اللامع، ۲ : ۱۸۸؛ (۷) السیوطی: نظم  
العقیان (طبع Hitte) ص ۹۰۔

(۳) جلال الدین عبدالرحمن بن عمر (۵۷۶۳ھ /  
۱۳۶۳ء تا ۵۸۲۳ھ / ۱۳۲۱ء) - ۵۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء میں  
قاضی عسکر کے عہدے پر اپنے بھائی محمد کا  
جانشین ہوا۔ وہ انتہائی پر شکوہ زندگی بسر کرتا  
تھا۔ تین سو مملوک اس کے عملہ خدام میں شامل  
تھے۔ ۵۸۰۳ھ / ۱۳۰۱ء میں اسے شافعی قاضی القضاة  
کا منصب حاصل ہوا جس پر وہ اپنی وفات تک  
وقفوں کے ساتھ فائز رہا۔

مآخذ: (۱) السخاوی: الضوء اللامع، ۳ : ۱۰۶ تا  
۱۱۳؛ (۲) ابن تغری بردی: النجوم، ۶ : ۵۳۸ تا ۵۳۹ و

اس کے ساتھ چلا گیا۔ اس کے بعد کے برسوں میں  
 عانہ اور حدیثہ کے چھوٹے شہروں کے لیے عربوں کے  
 خلاف ناکام جنگ کرتا ہوا یا بغداد سے ایران سڑک  
 کو کردوں اور ترکمانوں کے حملوں سے بچاتا ہوا  
 دکھائی دیتا ہے۔ ۵۳۹۸ھ / ۱۱۰۵ء میں ایلغازی کی  
 معزولی پر اس کے ساتھ دیار بکر چلا گیا، جو ان  
 لوگوں کا خاندانی مستقر تھا۔ ۱۱۱۰ء میں وہ  
 اس کے ساتھ شام کی مہم پر چلا گیا۔ اس مہم میں  
 اخلاط کے سقمان (= سکمان) القطیبی نے بھی حصہ لیا۔  
 ایلغازی اور سقمان میں لڑائی ہو گئی تو سقمان اسے  
 قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گیا، لیکن سقمان کے مر جانے  
 پر وہ جلد ہی آزاد کر دیا گیا اور ۱۱۱۳ء میں  
 ترکمان رئیس جیک کی موت سے فائدہ اٹھا کر اس نے  
 مشرقی فرات (= مراد صو) پر واقع پالو پر قبضہ کر لیا۔  
 ملطیہ کے نوجوان سلجوقی شاہزادے طغرل آرتلان  
 کی ماں شاہ بیگم نے، جسے قونیہ کے سلجوق مسعود  
 کے خلاف کسی معاون و محافظ کی ضرورت تھی،  
 بلک سے شادی کر لی اور اسے نوجوان شاہزادے  
 کا اتابک (اتالیق) مقرر کر دیا۔ اس اتحاد سے بلک  
 کو اتنی قوت حاصل ہو گئی کہ اس نے بلک  
 خنزرت پر مع اس کے قلعہ خرت پرت کے، جو بعد ازاں  
 اس کا بڑا مستقر بنا رہا، قبضہ کر لیا (تقریباً  
 ۱۱۱۵ء)۔ اس نے شمال میں ینگوچک کے علاقے  
 پر جو دست درازیاں کیں ان کی وجہ سے مؤخر الذکر  
 اور اس کے اتحادی گورس Gavras سے، جو طرابزون  
 کا بوزنطی ڈیوک تھا، لڑائی میں الجھ گیا۔  
 دانشمندی گوموشتکین کی مدد سے اس نے انہیں  
 سخت ہزیمت دی (۱۱۱۸ء) اور مراد صو کے دائیں  
 جانب کی چھوٹی چھوٹی معاون وادیوں کو  
 شمشکیزک اور میزگرد تک اپنی ریاست میں شامل  
 کر لیا۔ اسی دوران میں اس کے زیر نگرانی شہزادے  
 طغرل آرتلان نے الرھا (Edessa) کے فرینکوں کے ارمن

۱۳۱۹ء تا ۵۸۹۰ / ۱۳۸۵ء (۳) کا پوتا جو  
 اپنے چچا صالح کا نائب رہا اور ۵۸۵۵ /  
 ۱۳۵۱ء میں اپنے والد کی وفات پر اس کی جگہ  
 قاضی العسکر مقرر ہوا اور ۵۸۷۱ / ۱۳۶۶ء میں  
 شافعی قاضی القضاة کا عہدہ حاصل کیا، لیکن  
 اس عہدے پر وہ صرف چار ماہ تک فائز رہا اور  
 اپنی فضول خرچیوں سے اس نے اپنے خاندان کو  
 بہت بدنام کیا۔

مآخذ: (۱) السخاوی: الضوء اللامع، ۹: ۹۵۔  
 ۱۰۰: (۲) ابن تغری بردی: النجوم، ۷: ۷۳۲؛ (۳)  
 ابن ایاس (طبع Khale) ۲: ۱۱۱؛ اس کے بھائی علاء الدین علی  
 کے لیے دیکھیے: (۴) الضوء اللامع، ۵: ۳۱۰؛ اور  
 شہاب الدین احمد کے لیے: الضوء اللامع، ۲: ۱۱۹  
 ان کے بیٹوں کے لیے الضوء اللامع، ۳: ۲۸، ۶: ۱۰۲،  
 ۷: ۷۰۔

نمبر (۱) کے عم زاد بھائیوں ابو بکر بن رسلان  
 اور محمد بن مظفر بن ناصر کی نسل سے جو ضمنی  
 شاخیں پیدا ہوئیں ان کے تصرف میں المحلہ اور  
 اسکندریہ وغیرہ کے قاضی کے عہدے رہے، دیکھیے:  
 (۱) شجرہ در Wiet، شماره ۱۷۲۳ (جس کا تکملہ  
 مندرجہ بالا طریق سے کیا جا سکتا ہے) اور (۲)  
 السخاوی: الضوء اللامع، ۱: ۲۵۳، ۳: ۲۲۸، ۲۳۲،  
 ۶: ۲۹۶، ۸: ۶۲۔

(H. A. R. GIBB)

• بلک: نور الدولہ بلک بن بہرام بن آرتق،  
 اولین آرتقیوں میں سے تھا اور زیادہ تر ایک بہادر  
 سپاہی کی حیثیت سے مشہور ہے۔ تاریخ میں  
 وہ پہلی مرتبہ ۵۸۸۹ / ۱۰۹۶ء میں وسطی فرات  
 پر واقع سروج کے کماندار کی حیثیت سے آتا ہے۔  
 یہ علاقہ صلیبی جنگجوؤں نے اگلے سال اس سے  
 چھین لیا اور جب اس کے چچا ایلغازی کو  
 سلطان محمد نے عراق کا گورنر مقرر کیا تو وہ



(۱۱۲۳ء) - اس کے مرنے پر خرت پرت اس کے چچا زاد بھائی داؤد کے قبضے میں چلا گیا، جس کے بیٹے نے بلک کی بیٹی اور واحد جانشین سے شادی کر لی۔

بلک کو دنیا اس کی جنگجویانہ مہمات کے سوا کسی اور حیثیت سے نہیں جانتی۔ اس کے متعلق مزید جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے دشمنوں کے علاقوں پر اپنی غارتگریوں کے اثر کو اس طرح کم کیا کہ ایک جگہ کے کسانوں کو جبراً دوسری جگہ آباد کیا اور ان کسانوں نے مقبوضہ زمینوں کو از سر نو پیداوار کے قابل بنا دیا۔ گو بنیادی طور پر وہ پھر بھی ایک ترکمان سردار ہی تھا، لیکن ایک حیرت انگیز شخصیت کا مالک تھا اور اسی وجہ سے زندگی کے آخری دنوں میں اس کا شمار ضلیبیوں کے خلاف اسلامی دفاع کو از سر نو زندگی دینے والوں کی صف اول میں ہوتا ہے۔

مآخذ: ماخذ وہی ہیں جو زیر بحث زمانے میں شام اور عراق عرب کی عام تاریخ کے مآخذ ہیں اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ، عراق کے لیے: (۱) ابن الاثیر؛ بالائی عراق عرب کے لیے: وہی مصنف نیز (۲) ابن الأزرق (غیر مطبوعہ)؛ شام کے لیے: (۳) ابن القلانسی؛ اور (۴) ابن ابی طی (در ابن الفرات، غیر مطبوعہ)، ان کے علاوہ صلیبی جنگوں کے فرینک مصنف؛ (۵) Orderic Vitalis، (طبع le Prévost)؛ (۶) الرہا کا ارسنی Matthew اور (۷) شامی میکائیل (طبع و ترجمہ شابو Chabot)۔ عہد حاضر کی تصانیف میں دیکھیے: صلیبی جنگوں کے مصنفین، بالخصوص (۸) Grousset، ج ۱؛ (۹) C. Cahen، *Syrie: du Nord a, l'epoque des Croisades* (مع مطالعہ مآخذ) اور اسی عالم کی (۱۰) *Diyar Bakr au temps des premiers Urtukides*، ج ۱، ۱۹۳۵ء؛ نیز دیکھیے: (۱۱) *La tombe de P. : J. Sauvaget*، ج ۲، ۱۹۳۸ء۔

باجگزاروں سے سرعش کی طرف مجہان کا صوبہ چھین لیا۔ ۱۱۲۲/۵۰۱۶ء میں اس نے فرات کے کنارے پر واقع جرجراہ (گرگر) پر حملہ کر دیا۔ اور یکے بعد دیگرے پہلے الرہا کے کاؤنٹ جوشلن Joscelyn اور اس کے بعد بیت المقدس کے شاہ بالڈون Baldwin ثانی کو، جو جوشلن کی مدد کے لیے آیا تھا، گرفتار کر کے فوجی ناموری حاصل کی۔ ایلغازی کی وفات پر، جو اس وقت تک حلب کا مالک بن چکا تھا، اس شہر میں ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ ایلغازی کے کاہل الوجود بیٹے بدرالدولہ سلیمان کے مقابلے میں بلک فرینکوں کا مقابلے کرنے کے لیے زیادہ موزوں رہے گا؛ چنانچہ بلک جانشینی کا دعوے دار بن گیا اور لوٹ مار اور چالاک سے شہر پر قبضہ کر کے فوراً اورنٹس Orontes کے مشرق میں فرینکوں کے علاقے پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد اسے اطلاع ملی کہ خرت پرت کے فرینک قیدیوں نے مقامی رومنوں کے ساتھ مل کر بغاوت کر دی ہے اور قلعے پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس نے فوراً ہی ادھر کا رخ کیا اور قلعے کو از سر نو فتح کر کے تمام قیدیوں کو تہ تیغ کر دیا، جوشلن اور بالڈون کے سوا، جن میں سے پہلا تو بچ کر نکل گیا اور دوسرے کو اس نے بطور یرغمال کے اپنے پاس روک لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی غیر حاضری میں حلب کے شیعوں نے اس کی سیادت کو ختم کرنے کی کوشش کی، چنانچہ اس نے ان کے خلاف اقدام کیا اور ان کے سردار ابن الغشاب کو شہر بدر کر دیا۔ حلب پر اپنے قبضے کو زیادہ مضبوط کرنے کے لیے اس نے منبج کے ضرورت سے زیادہ خود مختار ترکی گورنر پر حملہ کر دیا۔ اس نے جوشلن سے مدد مانگی۔ بلک نے جوشلن کو تو شکست دے دی لیکن محاصرے کے دوران میں وہ ایک تیر لگنے سے ہلاک ہو گیا (۵۰۱۸/۱۰۰۸)۔

نیز رگ بہ آرتقیہ۔

(CL. CAHEN)

بلکار: [= بلکر] رگ بہ بلکر و قفقاز۔

بلکر: وسطی قفقاز کی ایک مسلم قوم، جس کی اصل متضاد قیاس آرائیوں کا موضوع بن گئی ہے۔ بعض مفروضوں کے مطابق یہ بلغار کے اخلاف ہیں، جنہیں بارہویں تیرہویں صدی میں پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا تھا، ایک اور قول یہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد خزر تھے، جو گیارہویں صدی میں بالائی تیرک کی طرف پسپا کر دیے گئے تھے۔ آخر میں بعض کے نزدیک بلکر آئیری قفقازی بلکہ فن لینڈ کے لوگ ہیں، جنہوں نے ترک قومیت اختیار کر لی۔ بلکری روایات میں کہا گیا ہے کہ ان کے آبا و اجداد کو، جب کسی وقت کوبان Kuban کے لقی و دق میدانوں میں رہتے تھے، چرکس قبیلوں (ادیغ) نے پہاڑوں کی طرف دھکیل دیا، جہاں سے خود انہوں نے اوست Osset قبائل کو بھگا دیا یا جزوی طور پر اپنی قوم میں جذب کر لیا۔

۱۹۴۶ء سے پہلے قفقاز کے بڑے سلسلہ کوہ کی شمالی ڈھلانوں پر بلکر کا وطن مغرب میں البرز [رگ باں] اور مشرق میں اوست Osset کے علاقے کے درمیان تیرک ندی کے معاونوں کی وادیاں تھیں۔ بلکر (جن کی تعداد ۱۹۲۶ء میں ۳۳۳۰۷، جن میں سے فقط دو فی صد شہروں میں آباد تھے، اور ۱۹۳۹ء میں ۴۲۶۶۶ تھی) پانچ قبیلوں میں منقسم ہیں۔

سولہویں صدی میں بلکر کو کبرڈ قوم نے مغلوب کر لیا، جس کے بعد انہوں نے اپنے آقاؤں کے جاگیرداری نظام کی نقل کرتے ہوئے انہیں کی مادی تہذیب کے طور طریقے اختیار کر لیے۔ یہ نظام روسی فتح تک عملاً بجنسہ برقرار رہا۔ اور اس میں یہ پانچ طبقے تھے: (۱) شہزادے یا

”توبی“ Tawbii (یہ ادیغ کے Psho کے مشابہ تھے)؛ (۲) امرا یا آزدن (ادیغوں میں: یورخ uorkh)؛ (۳) آزاد کاشتکار یا کراکش (ابازہ میں: tl'fakashaw)؛ (۴) نیم غلام کسان جن سے بیگار لی جاتی تھی اور جو چقار Cagar کہلاتے تھے (کبرڈ میں اوغ og) اور (۵) غلام یا کزخ (کبرڈ میں: آنوت)۔

بلکر میں اٹھارہویں صدی کے اختتام پر کریمیا کے تاتاریوں اور کوبان کے نوغائیوں نے سنی حنفی مذہب رائج کیا، لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں بھی اسلام سے پہلے کے آثار (سیحیت اور مظاہرپرستی) موجود تھے۔

تیرک کی معاون ندیوں کی بلند وادیوں پر روسی نفاذ اٹھارہویں صدی کے اواخر میں شروع ہو کر ۱۸۲۷ء میں اس وقت تکمیل کو پہنچا جب انہوں نے بلکر کا علاقہ فتح کر لیا، لیکن ادیغ (Adighs) کی طرح یہاں بعد میں دیہی نوآبادیاں نہیں بسائی گئیں۔ روسی حکمران اسے ترجیح دینے کے حق میں تھے کہ کومیک، اوست Osset اور پہاڑوں میں رہنے والے یہودیوں کو بلکر علاقے کے وسط میں آباد کر دیا جائے۔

سوویت بلکاریا: سوویت حکومت، جس کے قیام کا اعلان عارضی طور پر دسمبر ۱۹۱۸ء میں ہوا، مارچ ۱۹۲۰ء میں مکمل طور پر قائم ہو گئی۔ آل یونین سنٹرل ایگزیکٹیو کمیٹی کے ایک فرمان مجربہ ۲۱ جنوری ۱۹۲۱ء کی رو سے بلکر کی اوکرگ okrug کو پہاڑی باشندوں کی سوویت جمہوریہ (Gorskaya ASSR) سے ملحق کر دیا گیا۔ یکم ستمبر ۱۹۲۱ء کو بلکر کا علاقہ کبرڈ Kabarda سے ملا دینے کے بعد RSFSR میں ”کبرڈینی بلکر“ کو بھی حکومت خود اختیاری کا ایک خطہ بنا دیا گیا اور پانچ دسمبر کو اسے بھی ایک سوویت اشتراکی ریاست قرار دیا گیا۔



مركز ہے۔ آخر کار ۱۹۳۸ء میں لاطینی حروف کے بجائے Cyrillic (اسلافی قدیم) رسم الخط رائج ہو گیا۔  
 مآخذ: (۱) S. S. Anisimov : Kabardino-  
 Balkariya، ماسکو ۱۹۳۷ء؛ (۲) ابراہیموف : Les  
 Balkars, Bulgares musulmans du Caucase، در  
 RMM، شماره ۸ جون ۱۹۰۹ء: ص ۲۰۶ تا ۲۱۸؛  
 (۳) L. Dobruskin : Kabarda i Balkariya،  
 در Prošlom، شماره ۳ تا  
 ۱۹۳۳ء: ص ۱۹۶ تا ۲۲۲؛ (۴) عمر علیو:  
 Natsional'nyi vopros i natsional' naya kultura،  
 در Severo Kavkazskom Krue، Rostov on Don،  
 ۱۹۲۶ء؛ (۵) Korenizatsiya Aparata v Kabardino-Balkarii،  
 در Revolyutsiya i National nosti، شماره ۶،  
 ۱۹۳۶ء: ص ۳۷ تا ۹۱؛ (۶) A. Karaulov :  
 Kratkii oçerk grammatiki i Yazyka balkar،  
 اور Kratkii slovar balkarskogo yazyka،  
 در Sbornik materialov dlya opisaniya mestnostei i plemen Kavkaza،  
 تفلس، ۱۹۱۲ء، ج ۱۳: (۷) سعادت چغتائی: قرہچای جہ  
 بر قاج، متن در انقرہ یونیورسٹی سی ڈل۔ تاریخ۔  
 جغرافیا فاکولتہ سی درگیسی، ۱۹۵۱ء، ص ۲۷۷  
 تا ۳۰۰ (جہاں اور حوالے بھی دیے گئے ہیں)۔

(A. BENNINGSEN)

بلگوارا: رَکْ بہ سامرا۔

- بلگرام: ہندوستان کے ضلع ہردوئی کا ایک
- بہت قدیم قصبہ، جو ۲۷ دقیقے ۱۰ ثانیے شمال، ۸۰  
 دقیقے ۲ ثانیے مشرق میں واقع ہے اور جس کی  
 آبادی (۱۹۵۱ء میں) نو ہزار پانچ سو پینسٹھ  
 تھی۔ اس شہر نے بہت سی عظیم شخصیتیں پیدا کی  
 ہیں۔ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ یہاں کے باشندے  
 زیادہ تر ذہین اور موسیقی کے بڑے اچھے مبصر ہیں۔  
 ابتدائی زمانے میں یہاں ٹھہرے آباد تھے  
 (اس بات کی تصدیق حالیہ دریافتوں سے ہوتی ہے)۔

دوسری جنگ عظیم میں مختصر سے عرصے کے لیے  
 جرمن فوجیں بلکاریا پر قابض رہیں۔ ۲۵ جون  
 ۱۹۴۶ء کو اشتراکی روس کی مجلس اعلیٰ کی صدارت  
 نے اس کی جداگانہ حکومت کو ختم کر کے بلگر  
 کو وسط ایشیا میں جلا وطن کر دیا۔ اس کا ایک  
 حصہ (وادی بکسان) جورجیا کی اشتراکی جمہوریہ  
 (SSR) میں شامل کیا گیا اور باقی ماندہ کبردینی  
 جمہوریہ میں۔ آخر روس کے صدر حکومت کے ایک  
 فرمان مجریہ ۹ جنوری ۱۹۵۷ء کے ذریعے کبردینی  
 بلگر Kabardino-Balkar ریاست کو ایک اشتراکی  
 جمہوریہ کی حیثیت سے دوبارہ بحال کیا گیا اور  
 جلا وطن بلگر کو دوبارہ وطن آنے کی اجازت دے  
 دی گئی۔

بلگری زبان، جو محض ایک قرہ چای [رَکْ بان]  
 بولی ہے، ترکی زبانوں کے قبچاق گروہ سے تعلق  
 رکھتی ہے۔ اس پر اوستی اور گرد و نواح کے  
 آئیری۔ قفقازی زبانوں، یعنی کبرد Kabard، چچن  
 اور ابازہ Abaza کا بہت قوی اثر ہے۔

بلگر قرہچای کو، جو پہلے تحریری زبان نہ  
 تھی، ۱۹۲۰ء میں کسی قدر ترمیم کے ساتھ عربی  
 حروف میں لکھا جانے لگا، مگر ۱۹۳۵ء میں  
 ان کی جگہ لاطینی حروف نے لے لی۔ بلگر قرہچای زبان  
 کی پہلی تصانیف اگلے سال شائع ہوئیں: نظموں  
 کا ایک مجموعہ از عمر علیو اور چیدہ چیدہ اقتباسات  
 Billim از آسخت بیجیو۔ ۱۹۲۶ء میں تلچق کے  
 مقام پر کبردینی بلگر کے خود مختار علاقے کا  
 سب سے پہلا اخبار قرہمخلاق نکلا، جس کا ایک  
 صفحہ ادیغہ Adighe میں اور دوسرا بلگری قرہچای  
 زبان میں ہوتا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں مکویان شجر کے  
 مقام پر بلگر قرہچای زبان کا اولین روزنامہ تولوجاشا  
 Tawha-Djashaw شائع ہوا۔ مکویان شجر (موجودہ  
 قلو خوری) قرہچای کے خود مختار علاقے کا انتظامی

مصنّف: سید علی بلگرامی اور ان کے بڑے بھائی عماد الملک سید حسین بلگرامی جو پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جنہیں (۱۹۰۷ء میں) سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کی کونسل کا ممبر نامزد کیا گیا تھا؛ سید مرتضیٰ الزییدی [رک باں]، مصنّف تاج العروس بھی بلگرام ہی کے رہنے والے تھے۔ اورنگ زیب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے سادات بلگرام کو مسجد کی لکڑی سے نسبت دی تھی جو نہ تو قابلِ فروخت ہے نہ قابلِ سوخت (قوم سادات مثل چوب مسجد اند نہ فروختی نہ سوختی) [اورنگ زیب نے یہ الفاظ سادات بارہہ (رک بہ بارہ سید) کے بارے میں لکھے تھے نہ کہ سادات بلگرام کے متعلق]۔

گو شیوخ بلگرام میں (بجز روح الامین کے، جو صوبہ پنجاب کے بائیس صوبوں کے حاکم اور کچھ مدت برہان الملک [رک باں] کے ماتحت اودھ کے نائب گورنر رہے، اور مرتضیٰ حسین معروف بہ اللہ یار ثانی، مصنّف حدیقة الاقالیم) کوئی نامور آدمی پیدا نہیں ہوا، تاہم بلگرام کا منصب قضا عموماً انہیں کے پاس رہا۔ زیادہ تر اپنے اسی دعوے کو ثابت کرنے کی غرض سے فرشوری اور ان کی برادری کے دوسرے لوگوں نے بعض کتابیں لکھی ہیں (دیکھیے مآخذ)۔

مآخذ: (۱) غلام علی آزاد: مآثر الکرّام فی تاریخ بلگرام، ج ۱، آگرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء، ج ۲ (سرو آزاد)، لاہور ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء؛ (۲) غلام حسین "ثمین فرشوری": شرائف عثمانی (قلمی نسخہ آصفیہ عدد ۲۰۲)؛ (۳) احمد اللہ بلگرامی: مسجلات فی تاریخ قضاة (مخطوطہ)؛ (۴) وصی الحسن: روضة الکرّام شجرة سادات بلگرام، گورکھپور ۱۹۲۰ء؛ (۵) محمد محمود حمد: تنقیح الکلام فی تاریخ البلگرام، علی گڑھ ۱۹۳۰ء؛ (۶) سید جنید صفرووی بلگرامی: جنیدیہ (سادات بلگرام و بارہہ کے شجرہ نسب پر)؛ (۷) سید محمد: تبصرہ

جنہیں قنوج کے حملہ آور راجپوتوں نے نکال باہر کیا۔ مغل دورِ حکومت میں بھی بلگرام قنوج کی سرکار کا ایک پرگنہ تھا (آئین اکبری، ترجمہ بلاخمن، ۱: ۴۴۴)۔ ہندوستان پر سلطان محمود غزنوی کے حملوں کے دوران ۱۰۱۸ھ/۱۱۰۸ء میں قاضی محمد یوسف عثمانی المدنی الکاژرونی نے اس شہر کو فتح کیا۔ ہندوستان میں غزنوی سلطنت کے زوال کے بعد یہاں جو افراطی پھیلی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مقامی ہندوؤں نے بلگرام کے مسلمان حکمران کو مار بھگایا اور قصبے پر دوبارہ قبضہ کر لیا، لیکن سلطان شمس الدین التتمش [رک باں] کے دورِ حکومت میں ابوالفرح واسطی کے ایک براہ راست جانشین سید محمد صفرووی نے ۱۱۶۱ھ/۱۲۱۷ء میں ایک مضبوط شاہی دستے کے ساتھ بلگرام پر حملہ کیا اور راجا سیری کو شکست دی، جس کے نام پر یہ قصبہ سری نگر کہلانے لگا تھا اور مسلمانوں نے شہر پر دوبارہ تسلط جما لیا۔ ۱۱۹۸ھ/۱۵۴۱ء میں یہاں ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی فوجوں کے درمیان ایک زبردست معرکہ ہوا، جس میں ہمایوں کی فوجیں بالکل تباہ ہو گئیں۔ ۱۱۰۲ھ/۱۵۹۳ء میں اکبر نے یہاں شراب اور دوسری منشیات کی علی الاعلان فروخت کو ممنوع قرار دینے کے لیے ایک فرمان جاری کیا۔

سادات بلگرام نے، جو اپنے حریف عثمانی اور فرشوری شیوخ پر زندگی کے ہر میدان میں سبقت لے گئے تھے، تاریخ میں مصنفین، علماء، شعرا اور مدیرین کی حیثیت سے ناموری حاصل کی۔ ان میں سے مندرجہ ذیل زیادہ مشہور ہیں: عبدالواحد بلگرامی مصنّف سبع سنابل، عبدالجلیل بلگرامی [رک بہ بلگرامی]، ان کا بیٹا محمد، جس کا تخلص شاعر تھا، غلام علی آزاد [رک باں]، امیر حیدر، آزاد بلگرامی کے پوتے اور سوانح اکبری کے



جہاں انہوں نے اپنے آپ کو سید حسین علی خان بارہہ کے ساتھ منسلک کر لیا۔ ان کی وفات ۱۱۳۸ھ / ۱۷۲۵ء میں دہلی میں ہوئی، لیکن ان کی میت تدفین کے لیے بلگرام لائی گئی۔

رشتے میں وہ آزاد بلگرامی (رک باں) کے نانا تھے، جنہوں نے اپنی مختلف تصنیفات میں ان پر لمبے لمبے ابواب تحریر کیے ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے۔ شروع میں عربی اور فارسی میں شعر کہے اور پھر ترکی اور ہندی زبانوں میں بھی اشعار کہے۔

مآخذ: (۱) غلام علی آزاد: مآثر الکرام، آگرہ ۱۹۱۰ء، ص ۲۵۷ تا ۲۷۷؛ (۲) وہی مصنف: سرو آزاد، لاہور ۱۹۱۳ء، ص ۲۵۳ تا ۲۸۶؛ (۳) وہی مصنف: سبحة المرجان، بمبئی ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۶ء، ص ۷۹ تا ۸۵؛ (۴) وہی مصنف: خزائن عامرہ، کانپور ۱۸۷۱ء، ص ۲۸۴ تا ۲۸۶؛ (۵) رحمن علی: تذکرہ علمائے ہند، طبع دوم، کانپور ۱۹۱۳ء، ص ۱۰۸ تا ۱۰۹؛ (۶) صدیق حسن خان: شمع انجمن، بھوپال ۱۲۹۲-۱۲۹۳ھ / ۱۸۷۶ء، ص ۳۱۳؛ (۷) بندرین داس خوش گو: سفینہ خوش گو (مخطوطہ بانکی پور)؛ (۸) علی ابراہیم خان خلیل: خلاصۃ الکلام (مخطوطہ بانکی پور)؛ (۹) مقبول احمد صدیقی: حیات جلیل (بزبان اردو)، الہ آباد ۱۹۲۹ء؛ (۱۰) سید محمد شاعر: تبصرۃ الناظرین (مخطوطہ)؛ (۱۱) علی شیر قانع: مقالات الشعراء (طبع حسام الدین راشدی)، کراچی ۱۹۵۷ء، ص ۴۰۶ تا ۴۱۳؛ (۱۲) عبدالحی: نزہۃ الخواطر، حیدرآباد ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۷ء، ۶: ۱۳۹ تا ۱۴۰؛ (۱۳) فقیر محمد لاہوری: حدائق الحنفیہ، طبع سوم لکھنؤ ۱۹۰۶ء، ص ۴۷۔

(بزمی انصاری)

(۲) سید علی بن سید زین الدین حسین ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۱ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۲۹۱ھ / ۱۸۷۴ء میں پٹنہ کالج سے بی۔ اے کیا اور سنسکرت میں امتیاز حاصل کیا۔

الناظرین (مخطوطہ)؛ (۸) سید محمد بن غلام نبی: نظم اللالی فی نسب علاء الدین العالی (مخطوطہ)؛ (۹) شیر علی افسوس: آرائش محفل، کلکتہ ۱۸۰۸ء؛ (۱۰) شریف احمد عثمانی: تکلمۃ شرائف عثمانی (قلمی)؛ (۱۱) Imp. Gaz. of India، ۸: ۲۳۴ تا ۲۳۵؛ (۱۲) آزاد بلگرامی: شجرۃ طیبه (مخطوطہ آصفیہ، ج ۲، عدد ۱۱۴)؛ (۱۳) Storey، ۲/۱: ۱۱۸۳۔

(بزمی انصاری)

بلگرامی (۱) عبدالجلیل بن سید احمد الحسنی الواسطی، ۱۳ شوال ۱۰۷۱ھ / ۱ نومبر ۱۶۶۰ء کو بلگرام میں پیدا ہوئے۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے آبائی شہر میں سعد اللہ بلگرامی سے تعلیم حاصل کی اور بعد میں آگرے جا کر اورنگ زیب کے ایک کاتب (سیکرٹری) فضائل خان سے پڑھا۔ جب شاہ حسین خان لکھنؤ کی سرکار کا دیوان مقرر ہوا تو یہ اس کے ساتھ وہاں گئے اور پانچ سال تک اس کے ساتھ رہے۔ یہیں انہوں نے غلام نبی نقشبند لکھنوی (م ۱۱۲۶ھ / ۱۷۱۳ء) کے درس میں شرکت کی اور علم کے مختلف شعبوں بالخصوص عربی لسانیات اور ادب میں کمال حاصل کیا۔

وہ پہلی مرتبہ ۱۱۰۴ھ / ۱۶۹۲ء میں دربار دکن گئے، اور پھر ۱۱۱۱ھ / ۱۶۹۹ء میں اس وقت جب وہ گجرات (شاہ دولہ) [مغربی پاکستان] کے بخشی اور وقائع نگار مقرر ہوئے۔ وہ اپنی برطرفی (۱۱۱۶ھ / ۱۷۰۳ء) تک اس عہدے پر فائز رہے، لیکن اسی سال وہ پھر بحال کر دیے گئے اور انہیں بھنگر (رک بہ بنگر) تبدیل کر دیا گیا اور سیوستان (موجودہ سیہوان) ان کا صدر مقام ہوا۔ ۱۱۲۶ھ / ۱۷۱۳ء میں انہیں سرکاری جربدے میں ایک عجیب و غریب اندراج کرنے کی بنا پر معزول کر دیا گیا۔ اس اندراج میں یہ کہا گیا تھا کہ جتونی کے ہر گنے میں شکر کے اولوں کی بارش ہوئی۔ وہ دہلی واپس آگئے

کا مخطوطہ شائع ہوا۔ ان کی وفات ہردوٹی میں ۱۳۲۹ھ/۲ مئی ۱۹۱۱ء کو اچانک ہوئی۔

مآخذ: (۱) عبدالحق: چند همعصر، کراچی ۱۹۵۳ء، ص ۷۱ تا ۱۰۳؛ (۲) غلام پنجن شمشاد: حیدر آباد کے بڑے لوگ، حیدر آباد (دکن) ۱۹۵۷ء؛ (۳) [رسالہ] ادیب (الہ آباد، جون ۱۹۱۱ء)، ص ۲۷۱ تا ۲۷۷؛ (۴) حامد حسن قادری: داستان تاریخ اردو، طبع دوم، آگرہ ۱۹۵۷ء، ص ۵۹۴ تا ۶۰۹۔ (بزمی انصاری)

ہلگین بن محمد بن حماد: ركب به حماد (بنو)۔

ہلگین: (= ہلگین) عربی میں ہلگین (بن زیری بن

مناد، افریقیہ کا پہلا زیری فرمانروا (چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی)۔ اس نے امیر صنهاجہ کی حیثیت سے زناتہ کے مقابلے میں فاطمی خلفا کی ممتاز خدمات انجام دیں اور ان خدمات کا اسے یہ انعام ملا کہ المعز لدین اللہ [الفاطمی] نے اسے افریقیہ کا عامل نامزد کر دیا۔ چونکہ اسے قریب قریب ہمیشہ وسطی المغرب کی مہمات میں مصروف رہنا پڑتا تھا، اس لیے اس نے قیروان اور مشرقی افریقیہ کا نظم و نسق ایک نائب امیر کے سپرد کر دیا جس کا اقتدار روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ اس کی زندگی کے اہم واقعات حسب ذیل ہیں:

ہلگین نے الجزائر، ملیانہ (Miliana) اور میدیا (Médéa) [کے شہروں] کی بنیاد رکھی (۵۳۴۹ھ/۹۶۶ء)، ابو خزر کے خلاف لڑائی لڑی (۵۳۵۸ھ/۹۶۸-۹۶۹ء) اور زناتہ کو شکست دی (۵۳۶۰ھ/۹۷۱ء)۔ اس کے باپ زیری کو مسیلہ (Msila) اور زاب کے باغی عامل جعفر بن علی بن حمدون الاندلسی نے قتل کر دیا تھا (رمضان ۵۳۶۰ھ/جون۔ جولائی ۹۷۱ء)۔ صنهاجہ کے نئے امیر نے زناتہ کو وسطی المغرب سے نکال دیا (اواخر ۵۳۶۰ھ/خزان ۹۷۱ء) اور مسیلہ اور زاب پر قبضہ کر لیا۔ ۲ ذوالحجہ ۵۳۶۱ھ/۲ اکتوبر ۹۷۲ء کو اسے ابوالفتح یوسف کے لقب سے حقیقہ اور

۵۱۲۹۲/۱۸۷۵ء میں مقاسی (اور بعد میں انڈین) سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں پورے بہار میں اول رہے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد انہوں نے ارضیات، نقشہ نویسی، معدنیات اور علم الحيوانات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لنڈن یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے پورے براعظم یورپ کا دورہ کیا۔ سید علی کئی زبانوں کے ماہر تھے اور جرمن، فرانسیسی، عربی، فارسی، سنسکرت، بنگلہ، مرہٹی، تلگو یا تیلگو، گجراتی، انگریزی اور اپنی مادری زبان اردو میں پوری مہارت رکھتے تھے۔ کئی سال تک وہ مدراس یونیورسٹی میں سنسکرت کے محقق رہے۔ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء میں انہیں حکومت ہند کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں وہ کیمبرج یونیورسٹی میں مرہٹی زبان میں ریڈر مقرر ہوئے۔ اسی سال انہیں انڈیا آفس لائبریری میں عربی اور فارسی مخطوطات کی ایک دستی فہرست مرتب کرنے پر مامور کیا گیا۔ کئی سال تک وہ سابق ریاست حیدرآباد میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۰۹ء میں انہیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری ملی۔ وہ عام طور پر ان ترجموں کی وجہ سے معروف ہوئے ہیں جو انہوں نے فرانسیسی اور انگریزی سے اردو میں کیے۔ ان کے قابل ذکر ترجمے یہ ہیں: (۱) تمدن عرب (آگرہ ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۸ء)، یہ کتاب Gustave le Bon کی تصنیف *La civilisation des arabes* کا ترجمہ ہے؛ (۲) تمدن ہند (آگرہ ۱۹۱۳ء)، یہ کتاب بھی لیبان (Le Bon) کی ایک دوسری تصنیف *La civilisation de l'Inde* کا اردو ترجمہ ہے۔ وہ رسالہ در تحقیق کتاب کلیلہ و دمنہ کے مصنف بھی ہیں جس میں انہوں نے اصل سنسکرت کتاب کے مآخذ، ترتیب اور کرداروں وغیرہ پر تنقید کی ہے۔ یہ انہیں کی مساعی کا نتیجہ تھا کہ بہادر نامہ کا حیدرآباد



(زیر ترتیب)

(ادریس H.R. IDRIS)

بلی ٹون Billiton : بلی ٹنگ Belitung کی بگڑی ہوئی شکل، انڈونیشیا میں ایک جزیرہ، جو ۱۰۸ درجے مشرقی طول بلد اور ۳ درجے جنوبی عرض بلد پر واقع ہے۔ اس کا رقبہ اٹھارہ سو مربع میل سے کچھ زیادہ ہے۔ یہ جزیرہ ٹین (= قلعی) کی کانوں کے لیے مشہور ہے اور اسی بنا پر اس کا ذکر تقریباً ۹۰۰ عیسوی کی انڈونیشی دستاویزات میں ملتا ہے۔ انیسویں صدی میں ملک کی آبادی کے ایک حصے نے جو ایک لاکھ سے کچھ کم تھی اسلام قبول کر لیا تھا۔

مآخذ: (۱) A. W. Nieuwenhuis: در ۱۱-

انگریزی طبع اول، بذیل مادہ۔

(C. C. BERG)

بلور: بلور، یہ بات محقق نہیں کہ آیا یہ لفظ یونانی βήρυλλος سے نکلا ہے، قب ڈوزی تکملہ (Supplément)، ۱: ۱۰۰: اس کے معنی معدنی شیشے کے ہیں۔ ارسطو کی Petrology کے مطابق یہ پتھر شیشے کی ایک قسم ہے، جو شیشے سے زیادہ سخت اور گتھا ہوا ہوتا ہے۔ بلور قدرتی شیشوں میں سب سے زیادہ نفیس، خالص اور شفاف ہوتا ہے اور یاقوت کے رنگوں میں بھی ملتا ہے۔ خاکی رنگ کے بلوروں سے دھونیں کے رنگ کا پکھراج (topaz) مراد ہے۔ اسے مصنوعی طور پر رنگا بھی جا سکتا ہے، اور یہ سورج کی شعاعوں کو اس حد تک مرکوز کر لیتا ہے کہ اس سے کسی سیاہ کپڑے یا روئی اور اون کے ٹکڑوں کو سلکایا جا سکتا ہے۔ بلور سے امیروں کے لیے قیمتی برتن تیار کیے جاتے ہیں۔ بلور کی ایک عام قسم جو زیادہ سخت ہوتی ہے اور نمک، یعنی کار پتھر (quartz) کی طرح معلوم ہوتی ہے، لوہے سے رگڑ لگنے پر شعلہ دیتی ہے اور اچھے شاہی ملازمین

طرابلس کے علاوہ فاطمی سلطنت کے پورے مغربی علاقے کا حاکم بنا دیا گیا۔ اس نے المغرب میں مہمات سر انجام دیں (۳۶۲ تا ۵۳۶۳/۹۷۳ تا ۹۷۴) اور عبداللہ بن محمد الکاتب کو افریقہ کا عامل مقرر کیا؛ اس نے گتامة سے جنگ کی (۳۶۳ تا ۵۳۶۵/۹۷۴ تا ۹۷۵) اور طرابلس، سرت اور اجداییہ فتح کر لیے (۵۳۶۷/۹۷۷-۹۷۸)۔ اپنی آخری مہم (۳۶۸ تا ۵۳۷۳/۹۷۹ تا ۹۸۳) کے دوران میں اس نے فاس، سجلماسة اور بصرہ [المغرب] فتح کیے، برغواطہ کو شکست دی اور وہاں سے واپس آتے ہوئے ۲۱ ذوالحجہ ۵۳۷۳/۲۵ مئی ۹۸۳ء کو وفات پائی۔ اس کا بیٹا المنصور اس کا جانشین ہوا۔

مآخذ: (۱) ابن العذاری: [المغرب] (طبع Lévi-

Colin و Provençal)، ۱: ۲۲۸ تا ۲۳۲، ۲۳۹، ۲۹۶،

۲: ۲۳۳، ۲۹۳ (طبع ڈوزی)، ۱: ۲۳۷ تا ۲۴۰، ۲۴۸، ۳۰۵،

۲: ۲۵۹، ۳۱۶؛ ۳: ۲۶۳؛ (۲) وہی مصنف، ترجمہ

Fagnan، ج ۱ و ۲، بمدد اشاریہ؛ (۳) ابن الاثیر: [الکامل]،

قاہرہ ۱۳۵۳ھ، ۲: ۳۵، ۳۸، ۴۸، ۱۲۰ تا ۱۲۱ (ترجمہ

Fagnan، بمدد اشاریہ)؛ (۴) الثوری، طبع G. Remiro،

۱: ۱۰۱، ۱۰۷ تا ۱۱۶؛ (۵) ابن خلدون: العبر، ۶: ۱۵۳

تا ۱۵۷ (Hist. des Berberes، ج ۳، بمدد اشاریہ)؛ (۶)

ابن خلدون، قاہرہ ۱۳۱۰ھ، ۱: ۹۳؛ (۷) مفاخر البربر، ص

۶۲، ۸۶، ۱۳، ۱۶ تا ۱۸؛ (۸) ابن ابی دینار: المونس، ص

۶۳ تا ۶۴، ۷۱ تا ۷۲؛ (۹) ابن تغری بردی: [النجوم الزاهرة]،

۳: ۷۲؛ (۱۰) ابن العماد: شدرا، ۳: ۵۳ تا ۵۴،

۸۰ تا ۸۱؛ (۱۱) المقریزی: اتعاظ، قاہرہ ۱۹۳۵ء،

ص ۱۳۲ تا ۱۳۵، ۱۸۰، ۱۸۶، ۱۹۶، ۱۹۸، ۲۹۳؛

(۱۲) ابن الخطیب: أعمال، در Centenario M. Amari،

۲: ۴۵۱ تا ۴۵۳؛ (۱۳) Berbères: Fournel، ۲:

۲۰۵ تا ۲۰۶، ۲۳۹، ۲۵۲، ۳۰۰، ۳۶۳؛ (۱۴)

La Berbérie orientale sous les Zirides: H. R. Idris.

خوبصورت اور شفاف تھا۔ الغزولی اور المقریزی جن کی معلومات کی بنیاد قدیم ترین مآخذ پر ہے، لکھتے ہیں کہ مصر میں بلوری مصنوعات کی صنعت فاطمی دور کے ابتدائی دنوں میں ضرور انتہائی عروج پر ہوگی۔ ۵۳۵۳ / ۱۰۶۱ء اور ۵۳۶۱ / ۱۰۶۹ء کے دوران میں خلیفہ المستنصر کے خزانوں کی جو پراگندگی و ویرانی ہوئی اس سے یقیناً اس صنعت پر کاری ضرب لگی ہوگی۔ اس لیے کہ اس طرح بے شمار چیزیں منڈیوں میں آ گئیں جن میں سے بعض کی تفصیل کتابوں میں بیان کی گئی ہے۔ یہ چیزیں یا تو مجرد (سادہ یا پہلو دار) ہوتی تھیں یا منقوش، اور ہمیں البیرونی نے جو کچھ بتایا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس زمانے میں منقوش چیزیں سادہ چیزوں کی بہ نسبت زیادہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔

صفوی، مغل اور ازبک وسطی کے بعد کے دوروں میں بنی ہوئی چیزوں کے علاوہ، کوئی ۱۶۵ ایسی بلوری چیزیں موجود ہیں جنہیں بغیر کسی اختلاف کے عہد اسلامی کی مصنوعات کہا جاتا ہے۔ زیادہ تر صورتوں میں یہ نوادر یورپی کلیساؤں کے خزانوں میں محفوظ ہیں اور ان میں سے اکثر کی حیثیت تبرکات کی سی ہے۔ ممکن ہے کہ ان بلوری چیزوں کو جن چیزوں پر جڑا گیا ہے ان سے ان کی تاریخ صنعت کا تعین کیا جا سکے؛ ان کی قدیم ترین تاریخ ۹۷۳ اور ۹۸۲ء کے درمیان قرار دی جا سکتی ہے۔ ان ۱۶۵ نوادر میں سے (جن میں شطرنج کے سہرے اور دیگر چھوٹی اشیا شامل ہیں) کسی پر بھی کوئی تاریخ درج نہیں، لیکن ان میں سے دو پر کچھ حروف کندہ ہیں، جن میں ایک بادشاہ کا نام شامل ہے جو ہر دو صورتوں میں کوئی فاطمی خلیفہ ہے۔ ان میں سے ایک پانی پینے کا برتن ہے جو وینس میں سینٹ مرقس (Mark) کے خزانے

آگ جلانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کی قلمی (crystalline) ساخت کے متعلق Pliny نے جو کچھ لکھا ہے، عرب مؤرخوں کے یہاں اس کا کچھ حال نہیں ملتا اور نہ انہیں اس کا علم ہے کہ گار پتھر (quartz) کہاں ملتا ہے۔ التیفاشی کا بیان ہے کہ کاشغر سے تیرہ دن کی مسافت پر دو پہاڑ ہیں جن کے تمام اندرونی حصے بلور کے ہیں۔ ان چٹانوں اور پہاڑوں پر رات کے وقت کام کیا جاتا ہے اس لیے کہ دن کے وقت سورج کی شعاعوں کی چکاچوند میں کام کرنا ممکن نہیں۔ الاکفانی (در المشرق، ۱۹۰۸ء) نے ان تمام مقامات کی تفصیل دی ہے جہاں بلور ملتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق یہ مشرقی افریقہ (زنج)، بدخشان، آرمینیا، لنکا، فرنگستان اور مغرب الاقصی سے آتا ہے۔

البیرونی (م ۵۳۳۰ / ۱۰۳۸ء) کے بیان کے مطابق نہایت اعلیٰ قسم کا بلور مشرقی افریقہ کے جزائر زنج اور ہندوستان کے مغرب میں واقع جزائر دیبجات سے بصرے لایا جاتا تھا، جہاں اس سے برتن اور دوسری چیزیں بنائی جاتی تھیں۔ بلور سازی کی صنعت کا حال کسی قدر تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ایسے نقائص کو جو کبھی کبھی اس بلور میں بھی موجود ہوتے تھے جسے کشمیر کی کانوں سے برآمد ہونے والے بلور سے بھی بہتر بتایا گیا ہے نقش و نگار اور کندہ حروف سے چھپا دیا جاتا تھا۔

ناصر خسرو نے جو ۵۳۳۹ / ۱۰۴۷ء اور ۵۳۴۱ / ۱۰۵۰ء کے درمیان دو مرتبہ مصر گیا، مصر کے بازاروں میں بکنے والے بلوری مصنوعات کا حال لکھا ہے۔ اس کے زمانے تک خام مال مغرب سے لایا جاتا تھا، لیکن اسے بتایا گیا تھا کہ تھوڑی ہی مدت پہلے بحر احمر سے بلور درآمد کیا گیا تھا جو مغرب سے آنے والے بلور کی بہ نسبت زیادہ



، *Gläser und Steinschnitarbeiten aus den Nahen Osten*  
 ج ۱ تا ۲، برلن ۱۹۲۹ء تا ۱۹۳۰ء؛ (۹) P. Kahle :  
*Die Schätze der Fatimiden* در ZDMG، ۱۹۳۵ء، ص  
 ۳۲۹ بعد؛ (۱۰) وہی مصنف : *Bergkristall, Glas*  
*und Glasflüsse nach dem Steinbuch von el-Berūni*  
 در ZDMG، ۱۹۳۶ء، ص ۳۲۲ بعد؛ (۱۱) K.  
 Erdmann : *Islamische Bergkristallarbeiten*، در  
*Jahrb. der Preussischen Kunstsammlungen*، ۱۹۳۰ء،  
 ص ۱۲۷ بعد؛ (۱۲) وہی مصنف : *"Fatimid" Rock*  
*Crystals*، در *Oriental Art*، ۱۹۵۱ء، ص ۳ بعد؛ (۱۳)  
 وہی مصنف : *The 'Sacred Blood' of Weissenau*، در  
*The Burlington Magazine*، ۱۹۵۳ء، ص ۲۹۹ بعد؛  
 (۱۴) وہی مصنف : *Die fatimidischen Bergkristall-*  
*Forschungen zur Kunstgeschichte und können*  
*christlichen Archäologie*، ۱۹۵۳ء، ص ۱۸۹ بعد؛  
 (۱۵) D. S. Rice : *A Datable Islamic Rock Crystal*  
 در *Oriental Art*، ۱۹۵۶ء، ص ۳ بعد۔

(C.J. LAMM و J. RUSKA)

- **بلور کوشک** : بلورین محل، یہ ایک ترکی  
 عوامی کہانی کا عنوان ہے اور اسی کے نام پر اسی قسم  
 کی ترکی کہانیوں کے ایک قدیم ترین مجموعے کا نام پڑا۔  
 یہ کہانی مختلف صورتوں میں نقی تیزل Naki Tezel :  
 استانبول مثلثی (مطبوعات Eminönü Halkevi،  
 عدد ۱۰)، استانبول ۱۹۳۸ء، ص ۲۰۲ بعد،  
*Proben der Volksliteratur der türkischen* : W. Radloff  
*Stämme*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۸۵ء و مابعد، ج ۸  
 (ستون مرتبہ از I. Kunos، ۱۸۹۹ء)، حصہ سوم، عدد  
 ۱۹)، اور Ignác Kúnos : *Materialien Zur Kenntnis*  
*des rumelischen Türkisch*، حصہ اول  
*Volksmärchen aus Adakale*، لائپزگ و نیویارک ۱۹۰۷ء، ص ۲۵۵  
 تا ۲۶۱، عدد ۵۰، میں موجود ہے۔ بلور کوشک  
 یا زیادہ صحت کے ساتھ کہا جائے تو اس کہانی کی

میں محفوظ ہے اور [فاطمی] خلیفہ العزیز (۵۳۶۵ /  
 ۹۷۵ء تا ۵۳۸۶ / ۹۹۶ء) کے لیے بنایا گیا تھا،  
 دوسری چیز جو نیورم برگ میں ہے ایک ہلال نما  
 شے ہے، اور شاید گھوڑے کے سازک سرپوش  
 تھا جو اس کے پوتے الظاهر (۵۳۱۱ / ۱۰۲۱ء تا  
 ۵۳۲۷ / ۱۰۳۶ء) کے لیے بنایا گیا تھا۔ فلورنس  
 میں ایک آفتابہ ہے جو یقیناً ۵۳۹۰ / ۱۰۰۰ء اور  
 ۵۳۰۱ / ۱۰۱۱ء کے مابین الحاکم کے عہد میں  
 الحسین بن جوہر کے لیے بنایا گیا ہوگا۔

بلوری شیشے کی یہ تمام مصنوعات اکثر  
 "فاطمی" کہلاتی ہیں، لیکن قیاس ہے کہ ان  
 میں ایک خاصی تعداد فاطمی دور سے پہلے کی ہے  
 اور ممکن ہے کہ یہ بصرے میں بنی ہوں۔

جن چیزوں کا ذکر ابھی ہوا وہ سب کی سب  
 "منقوش" نوعیت کی ہیں۔ "مجرود" چیزوں کا  
 کوئی نمونہ ہمارے پاس موجود نہیں، الا یہ کہ ہم  
 ان کٹاؤدار آفتابوں کو "مجرود" تسلیم کر لیں  
 جنہیں بعض محققین نے فاطمی دور کا کہا ہے اور  
 بعض کے خیال میں یورپ (برگنڈی، بوہیمیا، صقلیہ،  
 اسپین) کے بنے ہوئے ہیں۔

مآخذ: (۱) *Essai sur la min* : Clement-Mullet

*arabe*، در *Journ. As.*، سلسلہ ۶، ۱۱ : ۲۳۰ : (۲)  
 التیناشی : *آزھار الآفکار* (ترجمہ از Raineri Biscia) بار  
 دوم، ص ۱۱۸ : (۳) التزوینی : (طبع وشتنفلٹ Wüstenfeld)،  
 ۱ : ۲۱۲ : (۴) وہی مصنف (ترجمہ از رسکا Ruska)،  
 ص ۹ : (۵) المسرق، ۱۱ : ۷۶۲ : (۶) K.A.C. Creswell :  
*A Bibliography of Glass and Rock Crystal in Islam*  
 در *Bull. of the Faculty of Arts, Fuad I University*  
 ۱۹۵۲ء، بعد؛ (۷) R. Schmidt : *Die Hedwigsgläser*  
*und die verwandten fatimidischen Glas-und-Kristal-*  
*arbeiten*، در *Schlesien Vorzeit in Bild und Schrift*  
 ۱۹۱۲ء، بعد؛ (۸) C. J. Lamm : *Mittelalterliche*

(۳) *türkische Volksliterature* برلن ۱۹۰۱ء؛  
*Türkische Volksmärchen aus Stanbul : I. Kunos*  
 لاڈن ۱۹۰۵ء؛ *Anmerkungen zu : Bolte-Polivka (۴)*  
*den Kinder-und Hausmärchen der Brüder Grimm*  
 لائپزگ ۱۹۱۳ / ۱۹۳۲ء، ۲ : ۲۲۹ تا ۲۷۳ : (۵)  
*Billur Köşk : P. N. Boratav*، در *IA*، ۲ : (۱۹۳۳ء)،  
 ص ۶۱۳ : (۶) *Typen : P. N. Boratav و W. Eberhard*  
*türkischer Volksmärchen* Wiesbaden ۱۹۵۳ء.  
 (H.W. DUDA)

بلھے شاہ : [یا میر بہلی شاہ (خزینۃ الاصفیا) ]  
 یا میاں بلہ شاہ] اصل نام سید محمد عبداللہ شاہ؛  
 پنجابی زبان کے مشہور شاعر اور صوفی بزرگ؛  
 اورنگ زیب عالمگیر کے دور حکومت [۱۰۶۹ھ /  
 ۱۶۵۹ء تا ۱۱۱۸ھ / ۱۷۰۷ء] میں پیدا ہوئے۔  
 ان کی تاریخ پیدائش یا وفات کے بارے میں وثوق  
 سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اوسبورن C.F. Usborne  
 (ص ۲) نے لکھا ہے کہ وہ ۱۶۸۰ء / ۱۰۹۱ھ  
 میں پیدا ہوئے اور اکثر سوانح نگاروں نے اسے درست  
 تسلیم کیا ہے [بقول اوسبورن انہوں نے ۱۷۵۳ء /  
 ۱۱۶۷-۱۱۶۸ھ میں وفات پائی، لیکن خزینۃ  
 الاصفیا کی رو سے ان کی تاریخ وفات ۱۱۷۱ھ /  
 ۱۷۵۷ء ہے؛ چنانچہ ان کے قطعہ تاریخ وفات کے  
 دونوں مادوں سے یہی سال برآمد ہوتا ہے :  
 چو بلھے شاہ شیخ ہر دو عالم  
 مقام خویش اندر خلد ورزید  
 رقم کن ”شیخ اکرم“ ارتحالش  
 دگر ”ہادی اکبر مست توحید“  
 اس سلسلے میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کا  
 ایک مضمون میر بہلی شاہ قادری شطاری قصوری  
 (ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۳۹ء)  
 بھی قابل ذکر ہے۔ اس میں انھوں نے اوراد و  
 وظائف کے ایک قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے، جس

ایک دوسری شکل انجی لی چادر [= موتیوں کی چادر]  
 کے آٹھ مخطوطے انقرہ میں *Dil ve Tarik-Coğrafya*  
 Fakültesi کے عوامی کہانیوں کے خزانے میں  
 موجود ہیں۔

اس مجموعے میں بلور کوشک نام کی کہانی  
 سمیت تیرہ کہانیاں ہیں (I. Kunos کی طبع، قب  
*Türkische Volksmärchen*، ج ۵، حاشیہ ۲، میں  
 ایک اور کہانی خزینۃ ایلہ یعنی جی اور مزاحیہ  
 تمثیل خزینۃ ایلہ یا نکسہ جی (چور اور جیب کترا)  
 بھی شامل ہے۔ یہ سب کہانیاں عموماً لوگوں کو  
 زبانی یاد چلی آتی ہیں اور تھوڑی ہی مدت ہوئی  
 کہ انہیں کسی قدر جدید انداز دے کر ایک کتاب  
 کی صورت دے دی گئی ہے؛ لیکن اس نئے ادبی اسلوب  
 کے باوجود کہانیوں کی اصلی لذت اور لطف میں  
 کوئی فرق نہیں آیا۔ پچھلے سو برس میں عوامی  
 کہانیوں کے اس مجموعے کے متعدد نسخے ترکی میں  
 شائع ہو چکے ہیں اور ۱۹۲۸ء کی اصلاح رسم الخط  
 کے بعد کچھ نسخے لاطینی رسم الخط میں بھی شائع  
 ہوئے ہیں۔

نسخے : بلور کوشک حکایہ سی، مطبوعہ  
 امنیت کتب خانہ سی، استانبول ۱۹۳۹ء؛ بلور کوشک  
 حکایہ سی، استانبول ۱۹۲۸ء؛ سلامی منیر یزداتاب :  
 رسم لی بلور کوشک حکایہ سی، استانبول ۱۹۴۰ء۔  
 تراجم : *Türkische Märchen : T. Menzel*،  
 ۱ : *Billur köschk*، چودہ ترکی کہانیاں جنہیں اس  
 مجموعے کے دو استانبول والے نسخوں سے پہلی مرتبہ  
 جرمن میں ترجمہ کیا گیا (*Beiträge zur Märchenkunde*  
*des Morgenlandes*، طبع G. Jacob : و T. Menzel، ج ۲،  
 Hannover ۱۹۲۳ء)۔

مآخذ : مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ : (۱)  
*Oszman-Török Népköltési Gyűjtemény : I. Kúnos*  
 بوڈاپسٹ ۱۸۸۷ تا ۱۸۸۹ء؛ (۲) *Die : G. Jacob*



میں فتنہ و فساد برپا ہونے لگا اور مغلوں کی مستحکم سلطنت پر زوال آ گیا۔ اس کے اثرات دوسرے علاقوں کی بہ نسبت پنجاب میں کہیں زیادہ محسوس کیے گئے۔ بندہ بیراگی اور سکھوں کی مچائی ہوئی تباہی و بربادی سے پنجاب کے طول و عرض میں زیان جان و ناموس کی ایسی ارزانی ہوئی کہ دنیا کی بے ثباتی کا نقش ہر دل پر بیٹھ گیا۔ بلھے شاہ کا مزاج بچپن ہی سے تصوف کی طرف مائل تھا۔ اس صورت حال نے ان کی حساس طبیعت میں اور بھی اضطراب پیدا کر دیا اور وہ مرشد کامل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ بالآخر پیر عنایت شاہ قادری شطاری کے آستانے پر انہیں سکون قلب نصیب ہوا جہاں انہوں نے تیس برس اپنے مرشد کی خدمت میں گزار دیے۔ [پیر عنایت شاہ کے بارے میں صاحب خزینۃ الاصفیا نے لکھا ہے کہ وہ شاہ رضا قادری کے خلفا میں سے تھے اور ان کی نسبت چند واسطوں سے شاہ غوث گوالیاری تک پہنچتی تھی۔ وہ قصور میں ہدایت خلق پر مامور ہوئے۔ حاکم قصور نواب حسین خان نے ناراض ہو کر انہیں قصور چھوڑنے پر مجبور کیا اور وہ لاہور میں جا بسے، جہاں ۱۱۳۱ھ / ۱۷۲۸ - ۱۷۲۹ء میں انہوں نے وفات پائی]۔ بلھے شاہ سید تھے اور عنایت شاہ ارائیں کے اس زمانے میں ہندوؤں کے زیر اثر اکثر ہندی مسلمان بنی ذات پات کی تمیز کا شکار ہو چکے تھے، چنانچہ بعض لوگوں نے بلھے شاہ کو ایک ارائیں کا مرید ہو جانے پر طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا، جس کا ذکر ان کی بعض کافیوں میں بھی ملتا ہے۔ [معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مرشد کی وفات کے بعد بلھے شاہ قصور چلے آئے اور یہیں انہوں نے وفات پائی۔ قصور میں ان کے مزار پر ہر سال عرس ہوتا ہے۔ اوسبورن نے لکھا ہے کہ بلھے شاہ کی ساری زندگی زہد و تقشف میں بسر ہوئی اور انہوں نے

پر ”بلھا شاہ قادری ۱۱۸۱ھ“ کی مہر لگی ہے۔ اگر اسے درست مان لیا جائے کہ بلھے شاہ ۱۱۸۱ھ میں زندہ تھے تو ان کی تاریخ وفات ۱۱۷۱ھ نہیں ہو سکتی]۔

بلھے شاہ کا جدی وطن علاقہ بہاولپور [مغربی پاکستان] کا مشہور گاؤں آج گیلانیاں [رک بہ آج] تھا اور ان کا سلسلہ نسب چودہ واسطوں سے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے ملتا ہے [تاریخ الاصفیا، حوالہ در کلیات بلھے شاہ، مقدمہ]۔ یہ معلوم نہیں ہوا کہ ان کے بزرگ آج میں کب پہنچے، البتہ نافع السالکین سے پتا چلتا ہے کہ بلھے شاہ کی پیدائش اسی گاؤں میں ہوئی اور جب وہ چھ برس کے ہوئے تو ان کے والد سخی شاہ محمد درویش نامساعد حالات سے مجبور ہو کر ضلع ساہیوال کے ایک گاؤں ملک وال میں آئے اور چند روز بعد چودھری پانڈو بھٹی کی درخواست پر اس کے گاؤں پانڈو کے میں جا کر آباد ہو گئے۔ انہوں نے وہاں کی مسجد کی امامت اور درس کی ذمہ داری سنبھالی اور اپنے بیٹے کو لکھانے پڑھانے کے ساتھ ساتھ گاؤں کے مویشی چرانے کا کام بھی اس کے سپرد کیا۔ [بلھے شاہ کی تعلیم کے بارے میں کوئی مستند بیان نہیں ملتا، البتہ ان کے اساتذہ میں ان کے والد کے علاوہ قصور کے دو علما مخدوم غلام محی الدین اور خواجہ غلام مرتضیٰ کے نام بھی لیے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ مسجد کوٹ قصور کے ان طلبہ میں سے تھے جنہوں نے عالم کا درجہ حاصل کیا (مقدمہ کلیات)۔ ان کے کلام سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عربی اور فارسی زبان و ادب سے بخوبی واقف تھے، لہذا کافی ہائے حضرت بلھے شاہ قصوری کے مراتب بھائی پریم سنگھ کا یہ بیان درست نہیں کہ وہ ان پڑھ تھے]۔

اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد ملک بھر

انور علی رھتکی، لاہور ۵۱۳۰۹ و ۱۹۵۲ء و ۱۹۵۹ء؛ (۲) کافی ہائے حضرت بلھے شاہ قصوری، طبع بھائی پریم سنگھ زرگر قصوری، قصور ۱۹۵۳ بکرسی؛ (۳) کافیاں میان بلھے شاہ، لاہور ۵۱۳۲۸؛ (۴) کافیاں بلھے شاہ، لاہور ۱۹۵۰ء۔ ان تمام نسخوں اور کافی ہائے بلھا شاہ کے قلمی نسخے (مملوکہ میان احمد دین، موضع لوران، ضلع گجرات) کی مدد سے ڈاکٹر فقیر محمد نے کلیات بلھے شاہ (لاہور ۱۹۶۰ء) مرتب کی ہے، جس میں ان کا تقریباً تمام مستند کلام آ گیا ہے۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے : ۱۵۶ ”کافیاں“، ایک ”اٹھوارہ“، ایک ”باراں ماہ“، ۹ ”دو پیرے“، ۳ ”سہ حرفیاں“ اور ۴ ”گنڈھاں“۔

مآخذ: (۱) Bullah Shah : C.F. Usborne، لاہور ۱۹۰۵ء؛ (۲) ڈاکٹر لاجوتی رام کشن : پنجابی کے صوفی شاعر؛ (۳) عبدالغفور: پنجابی زبان اور ادب کی تاریخ؛ (۴) نجم حسین سید : پنجابی شاعری کے اسلوب؛ (۵) مفتی غلام سرور لاہور: خزینۃ الاصفیا، مطبوعہ نولکشور، کانپور ۱۹۱۴ء (بذیل شاہ رضا لاہوری، شاہ عنایت قادری، میر بہلی شاہ قصوری)؛ (۶) کلیات بلھے شاہ، مرتبہ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، مطبوعہ پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور ۱۹۶۰ء، [۷] مولوی محمد شفیع : میر بہلی شاہ قادری شطاری قصوری، در ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین، مئی ۱۹۳۹ء۔

(عبدالله ملک [و ادارہ])

بلھے : (عربی)، (Tedaga میں Toge یا Tzigei) کوار Kawar کے ان نخلستانوں کا خاص مرکز جو بحر متوسط سے سوڈان کو جانے والی شاہراہ عام پر فزان اور شاد (Chad) کے درمیان واقع ہیں۔ کھجور کے یہ نخلستان شمالاً جنوباً انای (Anay) سے بلھے تک نوے کیلومیٹر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی چوڑائی کسی جگہ بھی دو میٹر سے

عمر بھر شادی نہ کی۔ ان کی بہن بھی ان کی مثال پر عمل پیرا رہیں (ص ۲)۔ خزینۃ الاصفیا میں لکھا ہے : ”وہ شاہ عنایت کے عظمائے خلفا میں سے تھے، عابد و زاہد تھے، صاحب جذب و سکر و عشق و محبت و وجد و سماع تھے اور توحید میں بلند مرتبہ کلام پیش کرتے تھے۔ ان کے پنجابی اشعار کہ معارف و توحید سے پر ہیں، خاص و عام کی زبان پر ہیں۔ ان کی قوالیوں کو قوال اصفیا کی مجلسوں میں گاتے ہیں۔ ان کے خوارق اور کرامتیں زبان زدِ خلائق ہیں“۔

بلھے شاہ کی صوفیانہ زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے : پہلا دور وہ ہے جب وہ مرشد کی تلاش میں سرگردان تھے اور تصوف کے مختلف مکاتب فکر کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ دوسرا دور ”فنا فی المرشد“ ہونے کا زمانہ ہے جب وہ مرشد کو وسیلہ نجات سمجھتے اور اس کی صورت میں خدا کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ اس دور میں انہوں نے ہندو فلسفے سے بھی آگاہی حاصل کی۔ تیسرا دور وہ ہے جب ان کا جذبہ بے پناہ اور عشق بیکراں ہو جاتا ہے اور وہ رسمی مذہب اور سطحی عقائد کی دیواریں توڑتے نظر آتے ہیں۔ اس دور میں ان کی شاعری نقطہ عروج پر پہنچ گئی ہے۔

[بلھے شاہ ایک مقبول عام صوفی شاعر تھے۔ ان کے سارے کلام میں صوفیانہ شاعری کی آزاد خیالی اور توکل و غنا کا رنگ جھلکتا ہے۔ توحید باری تعالیٰ اور عشق حقیقی ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہے اور اس موضوع کو انہوں نے متنوع انداز سے پیش کیا ہے۔

بلھے شاہ کا کلام کئی بار مرتب اور شائع ہو چکا ہے۔ بعض قابل ذکر مطبوعہ نسخے یہ ہیں : (۱) قانون عشق، حصہ اول و دوم، طبع مولوی



زیادہ نہیں۔ بلعہ ایک چوٹی کے دامن میں واقع ہے جس کا رخ مغرب کی طرف ہے۔ اس کی زیریں سطح بالائی Cretaceous کے سمندری طبقات سے بنی ہے اور اس کی چوٹی کی ساخت براعظمی ریتلے پتھر کی ہے۔

گو پہلی صدی ہجری / چھٹی صدی عیسوی میں عربوں نے اسے فتح کر لیا تھا (ابن عبدالحکم کے بیان کے مطابق عقبہ بن نافع کی مہم کے دوران میں)، لیکن کوار Kawar کے کچھ لوگ انیسویں صدی کے شروع تک بت پرست تھے۔ یہاں کی آبادی میں جس کی تعداد ۱۵۰۰ کے قریب ہے، نو آباد حبشیوں پر مشتمل ہے، جن میں کنوری (Kanuri) اور گیوزیدہ (Guezebida) قبیلوں اور کنوری اور تده (Teda) کی مخلوط نسل شامل ہے۔ یہ مقامی باشندے ہمیشہ سے ان خانہ بدوشوں کے غلام رہے ہیں جو آس پاس کے علاقوں میں آباد ہیں۔ پہلے یہ آئر Air [رک بان] کے طوارق (Touareg) کے غلام رہے اور اس کے بعد تده Teda کے۔ یہ لوگ کھجور کے درخت لگاتے ہیں، جن کی کھجوریں تیستی Tibesti اور ہوزہ (Hausa) بویجی جاتی ہیں، لیکن ان کی گذر اوقات کا سب سے بڑا ذریعہ نمک کے وہ کارخانے ہیں جو بلعہ کے شمال مغرب میں دو کیلومیٹر کے فاصلے پر کلالہ Kalala کے مقام پر واقع ہیں۔ نمک کے ان کارخانوں میں ایک ہزار کے قریب گڑھے ہیں جو پندرہ ہیکٹر hectares سے کچھ زیادہ رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تبخیر کے باعث نمک عام طور پر گرم موسم میں، یعنی اپریل سے نومبر تک، نکالا جاتا ہے۔

گڑھے زیر زمین پانی کی سطح تک (دو میٹر) کنودے جاتے ہیں۔ پانی کو بخارات میں تبدیل ہونے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے اور یوں ایک سخت تہ جم جاتی ہے، جسے کھجور کی چھڑیوں سے توڑا

جاتا ہے۔ اور نمک ته میں اکٹھا ہو جاتا ہے۔ عام طور سے نمک کی دو قسمیں ہوتی ہیں: بیڑہ beza جو قلموں (crystals) کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس نمک پر کوئی کیمیائی عمل نہیں کیا جاتا اور یہ اسی حالت میں انسانوں کے کھانے کے کام میں آتا ہے۔ نمک کی دوسری قسم ہنتو (hantu) ہے، جسے کھجور کے کھوکھلے تنوں میں ڈال کر کوزوں کی شکل دے لیتے ہیں۔ یہ نمک زیادہ تر سویسی کھاتے ہیں۔ نمک کے یہ کارخانے سب سے پہلے کوہوم Koyom نامی ایک کنوری Kanuri قبیلے کے لوگوں کی ملکیت تھے جنہیں دھکیل کر کوار کے جنوب مشرق کی طرف Kouaka اور Goure کے درمیان آباد کر دیا گیا۔ اس کے بعد سولہویں صدی سے یہ کام الکیل جرس (Kel Gress) نامی ایک طوارق قبیلے کے ہاتھ میں آ گیا۔ فرانسیسیوں کی آمد سے یہ کام اب بلعہ کے عوام کرتے ہیں۔ کنودنے کی اجازت گاؤں کے سردار سے لی جاتی ہے، جو زمین کا مالک ہوتا ہے۔ اس کام سے اہل بلعہ ہی پورا نفع حاصل کرتے ہیں اور کسی دوسرے کو کوئی حق ملکیت نہیں دیتے۔ تمام کاروباری سرگرمی خزاں اور بہار میں آزلے Azalay (رک بان) کے دوران میں عمل میں آتی ہے جب طوارق قافلے باجرہ، مکھن، خشک گوشت، کپڑے اور اخروٹ لاتے ہیں، اور ان کے بدلے نمک لے جاتے ہیں۔ جوں جوں حالات زیادہ محفوظ اور پر امن ہوتے گئے ان بڑے بڑے قافلوں کی جگہ جن میں ہزاروں اونٹ ہوتے تھے، چھوٹے قافلوں کا رواج ہوتا جا رہا ہے۔ نائجیریا میں جوں جوں سمندری نمک اور یورپی نمک کی درآمد آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے یہ قافلے اور بھی چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں۔ تاہم گھریلو مبادلہ اجناس کا نظام اب بھی پہلے کی طرح جاری ہے، گو سال بہ سال شرح مبادلہ گھٹتی

بلکہ کسی پہیلی کو حل کرنے کے لیے پہلے اسے ان اصطلاحات کا مفہوم سمجھنا لازم ہے جو ہائروغلیفی (= تصویری تحریر؛ رسزی) نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان خصوصیتوں میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو محض ترکی عوامی پہیلیوں میں پائی جاتی ہو، بلکہ ایک قوم کی پہیلیاں کسی دوسری قوم کی پہیلیوں سے صرف جزئیات، عموماً لفظی، میں مختلف ہوتی ہیں۔ بلمجہ کا خاص ترکی کردار دراصل جغرافیائی محل وقوع اور ترک عوام کی زندگی سے وابستہ ہے۔ بحیثیت مجموعی ان کا اسلامی رنگ محض ثانوی اور غیر اہم ہے۔

موجودہ زمانے میں پہیلیاں زیادہ تر ترکی کی اس شاخ کی تشکیل کرتی ہیں جو بچوں کے لیے مخصوص ہے، لیکن بہت سے قرائن اس امر پر دال ہیں کہ کسی زمانے میں ان کو زیادہ قابل اعتنا سمجھا جاتا تھا اور وہ عوامی فلسفے کا ایک جزو تھیں، چنانچہ کئی ایسی کہانیاں موجود ہیں جن میں چستانی مقابلوں کا ذکر ہے، یعنی اس طرح کہ ایک شخص کوئی ایک مصرع پڑھتا ہے اور اس کا مد مقابل اس کے جواب میں دوسرا مصرع پڑھتا ہے، جس کے نتائج بعض اوقات حزیمت خیزہ جماعت کے لیے بہت سنگین ہوتے ہیں۔ نیز اسی طرح علم کائنات و جنس سے متعلق پہیلیوں کی موجودگی سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ دراصل بچوں کے لیے نہیں بنائی گئی تھیں۔ اپنے معاشری کردار کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ پہیلیوں میں بہت کچھ رد و بدل ہوتا رہا اور ان کا مفہوم بھی نیا ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہیلیوں کی بجاہارت ان کا ایک متبادل اور غیر معین عنصر ہے۔

پہیلیاں عام طور پر ایک چھوٹے سے جملے کی شکل میں ہوتی ہیں، مثلاً دیکھیے یہ پہیلی جس کے بارے میں معلوم ہے کہ چودھویں

بڑھتی رہتی ہے۔

مآخذ: (۱) *Reisen : Barth*، ج ۴، باب ۶؛ (۲) *Quer durch Africa : Rohlf's*، ج ۱؛ (۳) *Nachtigal*؛ *De St. Louis : Monteil*، ج ۱؛ (۴) *Suhara und Sudan Notes : Gabel*، باب ۱۳؛ (۵) *à Tripoli par le Tchad*، در *Revue Coloniale*، *sur Bilma et les oasis environnantes*؛ (۶) *Cne. Grandin*، ص ۳۶۱ تا ۳۸۶؛ (۷) *Notes sur l'industrie et le commerce du sel au Kowar, et en Agram*، در *Bul. IFAN*، ۱۳ / ۲، ۱۹۵۱، ص ۳۸۸ تا ۵۳۳؛ (۸) *Nomades noirs : J. Chapelle*، ص ۳۸۸ تا ۵۳۳؛ (۹) *du Sahara*۔

(R. CAPOT-REY)

\* بلمجہ: (بلمک بہ معنی جاننا، آگاہی دینا، کے مادے سے) عثمانی ترکوں میں مقبول عام چیستانوں کا سب سے عام نام۔ مشرقی اور شمالی ترکوں میں مادہ تاپ (ڈھونڈھ نکالنا) سے مشتق الفاظ جیسے تاپشوق، تاپمجہ، تاپتیش، تاپشوق، تابوشتورمق (اسی معنی ہیں) مستعمل ہیں۔

حقیقی عوامی پہیلیوں کو مصنوعی چیستانوں، جیسے لغز یا معما (رک بان) سے عموماً ان کی سادہ شکل، ان کے ضلع جگت اور ایہام، اور ان کے بظاہر غیر معقول اور غیر منطقی ہونے کی بنا پر ممیز کیا جا سکتا ہے۔ پہیلیوں کی یہ آخری خصوصیت، یعنی ان کی غیر معقولیت، اس طرح ظاہر ہوتی ہے: ان میں جب مختلف چیزوں اور واقعات کا ذکر ہوتا ہے تو بعض ایسی روایتی تعبیرات سے کام لیا جاتا ہے جن کا ان چیزوں کو معمولی اور فطری طریقے پر دیکھنے سے ایک مبہم ہی سا تعلق ہوتا ہے اور مفہوم سمجھنے سے پہلے ان تعبیرات کا جاننا ضروری ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ عموماً یہ ممکن نہیں ہوتا کہ انسان منطقی دلیل سے کسی پہیلی کی بجاہارت معلوم کر لے،



*Cumanicus*، بوداپست، ۱۸۸۰ء، ص ۱۳۳ تا ۱۵۷، ۲۳۶-۱۵۷  
 بعد: *Das Türkische Sprachmaterial* : W. Rudloff  
 'des C.C. در *Mém. de l' Acad. de St. Petersburg*  
 ج ۶/۳۵ (۱۸۸۷ء) : ۲ : *Über die* : W. Bang  
*Rätsel des C.C.*، در *SBPr. Ak. W.* (۱۹۱۲ء)، ج  
 ۲۱ : ۳۳۳ تا ۳۵۳ : *Die Rätsel des* : J. Németh  
*C.C.*، در *ZDMG*، ج ۶۷ (۱۹۱۳ء) : ص ۵۷۷ تا  
 ۶۰۸ : *Kistorii i kritike C.C.* : S.E. Malov، در *Izv.*  
*Akad. Nauk. SSSR*، حصہ ادبیات، ۱۹۱۳ء : ص ۳۳۸ تا  
 ۳۷۵ : *Zu den Rätseln des C.C.* : J. Németh، در  
*KCA*، ۲ : ۳۶۶ تا ۳۶۸.

پہیلیوں کے بہت سے مجموعے ایسے بھی ہیں جنہیں اس زمانے کے علمائے مرتب کیا، لیکن ان سے بھی ترکی عوامی پہیلیوں کا قیمتی ذخیرہ ابھی ختم نہیں ہوا۔

مآخذ : *A. N. Samoylovich*، در *Zagadki*  
*zakaspiyskikh Turkmenov* (Zivaya Starina)  
 (۱۹۰۹ء) : ص ۲۸ تا ۳۰ - اس نے ان سب مطالعات کی جو ترکی اقوام کی پہیلیوں کے بارے میں ۱۹۳۲ء تک کیے گئے تھے ایک فہرست شائع کی ہے۔ اسے (RO) : ۳ : بعد، ۱۹۲۶ء تک Malov نے مکمل کر دیا ہے۔ ترکی پہیلیوں کی فہرست مآخذ کے لیے دیکھیے Kowalski کا مقالہ : *Türkische Volksrätsel aus Nordbulgarien* (*Festschrift für G. Jacob*)، ص ۱۳۰، بعد، ۱۹۳۲ء تک۔ ترکی پہیلیوں کے اہم مجموعے یہ ہیں : J. Kúnos : *Oszmantörök népköltési gyujtemény*  
*Zagadki* : T. Kowalski : ۱-۱ تا ۱۷۷ : ۱۸۸۹ء  
 Krakow، *ludowe turckie*، ۱۹۱۹ء : سعالمین نرغب و احمد فرید : قونیہ ولایتی خلیت نو حریات، قونیہ ۱۹۲۶ء، ص ۲۲۵ تا ۲۳۳ : حمادی زادہ احسان : بلمجہ لڑ (ترکی عوامی قصوں پر مقالات، ج ۳، استانبول

صدی میں بھی موجود تھی اور جو آج تک بہت عام ہے : "یرآلتندہ یاغلی قایش" (زیر زمین چکنی پوسن)، یعنی سانپ - زیادہ تر عوامی پہیلیوں کے دو حصے ہوتے ہیں جو ہم صوت یا تقریباً ہم قافیہ ہوتے ہیں کیونکہ ان میں رعایت لفظی پائی جاتی ہے (مثلاً) "اللہ یاپار یاپیسنی، بیچاق آچار قاپیسی" (خدا اس کی ساخت بناتا ہے اور چاقو اس کا دروازہ کھولتا ہے)، یعنی ترپوز - اس نمونے کی پہیلیوں کو اکثر طول دے کر باقاعدہ رباعیوں (= مانی) کی شکل دے دی جاتی ہے، جو ترکی عوامی شاعری کی ایک مخصوص شکل ہے۔ متضاد مفہوم کے ہم شکل الفاظ اور صوتی نام کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

اب تک جو مواد جمع ہوا ہے اس کے مطالعے و مقابلے سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ سب اصناف جن میں پہیلیوں کو تقسیم کیا جا سکتا ہے بعض قدیم نمونوں کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ان تبدیلیوں کی وجہ سے جو زبانی روایت کے عمل کے ضمن میں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ پہیلیوں کو نئی بچھارتوں کے مطابق بنانے کے لیے شعوری طور پر بھی بدلتے رہتے ہیں، پہیلیوں میں مسلسل تبدیلی ہوتی ہی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی مختلف شکلوں کی تعداد میں تقریباً لامحدود اضافہ ہو جاتا ہے۔ تاہم بعض ایسی پہیلیاں بھی ہیں کہ جن کی شکل اور بچھارت صدیوں سے نہیں بدلی۔

محمود کاشغری کی دیوان لغات الترک کے زمانے (گیارہویں صدی) سے ہمیں تابوزخوننگ، تابوزخوق اور تابزوغ کے ناموں سے بعض پہیلیاں ملتی ہیں، لیکن ترکی عوامی پہیلیوں کی قدیم ترین معروف مثالیں *Codex Cumanicus* میں ملتی ہیں اور متعدد اشاعت کا موضوع رہی ہیں - (*Codex* : G. Kuun)

کمی ہو گئی۔ اور دوسری عرب خزر جنگ (۵۱۱۹/۵۲۳۷) کے بعد سے تو اس کا ذکر شاید ہی کہیں ملتا ہو۔

مآخذ: (۱) حدود العالم، ص ۳۵۲ تا ۳۵۴؛ (۲) اے۔ زکی ولیدی طوغان: *Ibn Fadlān's Reisebericht*، در *AKM*، XXIV، لائپزگ ۱۹۳۹ء، ۱۳: ۱۹۱ تا ۱۹۳، ۲۹۸ تا ۲۹۹ حواشی: (۳) *The History of the Jewish Khazars*، پرنسٹن ۱۹۵۳ء، اشاریہ بذیل مادہ بلنجر: (۴) *Ocherki: M. Artamonov*، *drevneishei istorii Khazar*، ص ۹۳۔

(D.M. DUNLOP)

\* بلنڈ شہر: (= برن)، ہندوستان کا ایک قدیم شہر، ۲۸۵-۱۵' شمال اور ۷۷-۵۲' مشرق میں آگرے اور علیگڑھ سے میرٹھ جانے والی بڑی سڑک پر واقع ہے، آبادی (۱۹۵۱ء) چونتیس ہزار چار سو چھیانوے تھی۔ اس کا قدیم نام اس کے فرضی بانی آہی برن کے نام پر برن تھا (جس سے اب بھی اسے بعض اوقات موسوم کیا جاتا ہے، لیکن محض نسبت برنی میں): اس کی قدامت پانچویں صدی عیسوی کی تانبے کی منقوش لوحوں اور اس سے بھی زیادہ قدیم زمانوں کے سکوں کی دریافت سے ثابت ہوتی ہے۔ اسے بلند شہر (یعنی اونچا شہر) اس لیے کہا جانے لگا کہ یہ کالی ندی کے کنارے جو شہر کے پاس سے بہتی ہوئی گذرتی ہے، ایک اونچی جگہ پر واقع ہے۔ یہ نام صاف طور پر اسلامی ہے اور بظاہر مغلیہ دور کے کسی زمانے میں اس شہر کو اس نام سے موسوم کیا گیا، اگرچہ سجان رائے کی خلاصہ التوازیخ میں (جو ۱۱۰۷/۱۶۹۵-۱۶۹۶ء کے مؤخر زمانے میں تالیف کی گئی) اس کا ذکر حسب سابق برن کے نام سے کیا گیا ہے۔ ۱۸/۵۳۰۹ء میں اسے سلطان محمود غزنوی نے فتح کیا اور یہاں کے ہندو راجا ہردت نے اطاعت کی پیش کش کی اور اپنے

*Türkische Volksrätsel*: T. Kowalski؛ (۱۹۳۰ء) *aus Kleinasien*، در *Archiv Orientalni*، ج ۱۷، ۱۹۳۲ء، ص ۲۹۵ تا ۳۲۳۔

(T. KOWALSKI)

\* بلنجر: خزر کا ایک اہم شہر جو اسی نام کے دریا پر، درۃ در بند، یعنی باب الأبواب (رک بان) کے شمال میں کوہ قفقاز کے مشرقی سرے پر واقع ہے۔ اس کا محل وقوع غالباً وہی ہے جہاں اندرییوا Andreyeva کے نزدیک اندرہ Endere کے کھنڈر ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلنجر اصل میں یہاں کے باشندوں کا اجتماعی نام تھا (قب الطبری، ۱: ۸۹۳ تا ۸۹۶ اور مادہ "برنجر")۔ المسعودی (التبیه، ص ۶۲) کے نزدیک بلنجر، والگا پر واقع اٹل (رک بان) سے پہلے، خزر کا دارالحکومت تھا، لیکن جو معلومات ہمارے پاس ہیں ان سے اس بات کی شہادت نہیں ملتی۔ عربوں اور خزر کے مابین پہلی جنگ میں بلنجر عربوں کے پیہم حملوں کا آماج گہ رہا اور ۵۳۲/۶۵۲ء میں اس کا باقاعدہ محاصرہ کر لیا گیا جو محاصرین کی تباہی پر ختم ہوا۔ عربوں نے دوسری مرتبہ جراح بن عبداللہ الحکمی کے زیر قیادت ۵۱۰م/۷۲۲-۷۲۳ء میں اس کا محاصرہ کیا اور اس مرتبہ اسے تسخیر کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ زیادہ تر باشندے یہاں سے ہجرت کر گئے۔ یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ ان میں سے بہت سے شمال کی طرف گئے ہوں گے۔ اس واقعے کے دو سو سال بعد سیح ابن الفضلان (۵۳۱/۹۴۲ء) کو وانگ کے بلغاریوں میں ہزاروں برنجر [بلنجر] ملے۔ ابن الاثیر نے جو اعداد و شمار اس مال غنیمت کے دیے ہیں جو محاصرے کے بعد محاصرین میں تقسیم کیا گیا (تیس ہزار کی فوج میں ہر سوار کو ۳۰۰ دینار) ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تسخیر کے وقت بلنجر میں بڑی دولت تھی۔ بظاہر اس پہلو سے اس کی اہمیت میں



میں بد امنی پھیلی ہوئی تھی، مرہٹوں نے بلند شہر کو ہمال کیا اور اس پر قابض ہو گئے۔ وہ اس کا نظم و نسق کوئل (علی گڑھ) سے کرتے تھے، علی گڑھ کے قلعے کی تسخیر سے ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء میں بلند شہر انگریزوں کے تصرف میں آ گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران میں یہ شہر بہت ہیجان کی حالت میں رہا، چنانچہ مالا گڑھ کے ولی داد خان نے انگریزی محافظ فوج کو نکال دیا اور حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ وہ اور اس کے ساتھی، گجر (گوجر) اور مسلمان راجپوت، انگریزوں کے سخت دشمن ثابت ہوئے اور کہیں پانچ ماہ کی مزاحمت کے بعد جا کر انہوں نے شہر کو حوالے کیا۔

تاریخ پاک و ہند کا مطالعہ کرنے والے اس شہر سے نویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے دانشور مؤرخ ضیاء الدین برنی [رک بہ برنی] کی جائے ولادت کے طور پر بخوبی واقف ہیں۔ یہاں بعض بہت قدیم مسجدیں اور مقبرے ہیں جن میں درگہ خواجہ لال برنی بھی شامل ہے، جو ۱۱۹۳ھ / ۱۷۸۰ء میں اسلامی فتح کی یادگار میں تعمیر کی گئی تھی۔ انگریزی عہد کے شروع میں ایک چھوٹا سا شہر ہوتے ہوئے اب یہ اندرونی و بیرونی تجارت کا ایک رو بہ ترقی مرکز ہے۔

مآخذ: (۱) طبقاتِ ناصری (طبع عبدالحی حبیبی)،

۱، کوئلہ ۱۹۴۹ء: ۵۱۹؛ (۲) سجان رائے بھنداری:

خلاصۃ التواریخ (طبع ظفر حسن)، دہلی ۱۹۱۸ء، بمدد

اشاریہ؛ (۳) مقبول احمد صمدنی: حیات جلیل بلگرامی،

الہ آباد ۱۹۲۹ء، ۱: ۱۱۹؛ حاشیہ؛ (۴) مہدی حسین:

*The Rise and Fall of Muhammad bin Tughlaq*

لندن ۱۹۳۹ء، ص ۱۵۳ تا ۱۵۴ و اشاریہ؛ (۵) F. S.

*Bulandshahr: Growse*، بنارس ۱۸۸۴ء؛ (۶) *Buland-*

*shahr District Gazetteer* (طبع H. R. Nevill)، الہ آباد

دس ہزار آدمیوں کے ساتھ مشرف بہ اسلام ہوا۔ شہر ہردت کو واپس دے دیا گیا لیکن اس کے اخلاف نے اسلام ترک کر دیا اور اس خاندان کا آخری راجا چندراسین ۱۱۹۳ھ / ۱۷۸۰ء میں غوری سلطان محمد ابن سام کے سپاہ سالار قطب الدین ایبک کے خلاف شہر کی محافظت کرتا ہوا مارا گیا۔ قطب الدین نے اسے بطور جاگیر اپنے داماد اور جانشین التیش [رک باں] کو عطا کر دیا۔ چندرا سین کے ایک رشتہ دار جیپال نے اسلام قبول کر لیا اور شہر کو حملہ آوروں کے حوالے کر دینے کے صلے میں اسے شہر کی سرداری دے دی گئی۔ اس کے اخلاف اب تک بلند شہر میں خوش حالی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں یہ شہر کسانوں کی ایک بغاوت کا مرکز رہا۔ اس بغاوت کو بادشاہ نے سختی سے فرو کرتے ہوئے اردگرد کا تمام علاقہ ویران کر دیا اور برن کے باشندوں پر خوفناک مظالم ڈھائے۔ ۱۳۹۹ھ / ۱۸۰۲ء میں باغی امیر اقبال خان (فضل اللہ بلخی) نے یہاں پناہ لی۔ اس نے سلطان ناصر الدین محمود (۱۲۳۶ھ / ۱۸۱۰ء تا ۱۲۶۶ھ / ۱۸۱۰ء) کے خلاف بغاوت کی تھی۔ ۱۳۰۷ء میں جونپور [رک باں] کے سلطان ابراہیم شاہ شرتی نے اس شہر پر قبضہ کیا، لیکن یہ سن کر کہ گجرات کا مظفر شاہ اول جونپور پر حملہ کرنے کو اس نے اسے بعجلت خالی کر دیا۔

اس کے بعد اس شہر کا کوئی ذکر سننے میں نہیں آتا کیونکہ مغلیہ عہد میں وہاں برابر امن و امان کا دور دورہ رہا۔ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے تبلیغی ذوق و شوق کی بدولت بہت سے لوگ اسلام کی آغوش میں آ گئے، جن میں سے بیشتر بلند شہر کے اندر اور اس کے گرد و نواح میں رہنے والے راجپوت تھے۔ بارہویں صدی ہجری / اٹھارہویں صدی عیسوی کے دوران میں، جبکہ پورے ملک

تھے۔ آگے چل کر یہاں کے باشندوں نے سرٹوریوس Sertorius کا ساتھ دیا اور ۷۰ ق۔ م میں پاسی Pompey نے اسے جزئی طور پر تباہ کر دیا۔ آگسٹس Augustus کے عہد میں اس کی خوش حالی پھر شروع ہوئی۔ ۳۱۳ء میں اس پر غری قوطیوں Visigoths نے قبضہ کر لیا اور ۷۱۴ء میں جب طارق نے اس پر اور ساگون ثم Saguntum، شاطبہ Jativa اور دانیہ Denia پر قبضہ کیا تو اس شہر نے اسلام قبول کر لیا۔

عہد امویہ میں ہسپانیہ کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بلنسیہ ایک معمولی اہمیت کا مقام تھا۔ جس علاقے کا یہ صدر مقام تھا وہ قیسی نوآبادیوں کے قائم ہو جانے سے عربوں کے رنگ میں رنگا گیا۔ اسی وجہ سے یہ شرق الاندلس (Levant) کا دارالحکومت اور اسلامی حکومت کے سارے دور میں عرب ثقافت کے سرگرم ترین مراکز میں شمار ہوتا رہا، دوسرے جانب بلنسیہ کے ساحلی علاقے کے ساتھ ساتھ پہاڑوں میں بربر نسل کے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی الگ تہلگ نوآبادیاں تھیں، جیسا کہ ہمیں مشرقی مصنف المقدسی اور ہسپانوی مصنف الرازی (در یاقوت: معجم البلدان، بذیل مادہ) سے پتا چلتا ہے۔ اس زمانے میں بلنسیہ ایک صوبے یا کوزہ کا صدر مقام تھا اور وہاں قرطبہ کے خلیفہ کا مقرر کردہ والی رہا کرتا تھا۔ گیارہویں صدی میں جا کر جب خلافت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تو یہ ایک خود مختار اسلامی ریاست کا دارالحکومت قرار پایا۔ اور بہت جلد ان عیسائیوں کا مطمح نظر بن گیا جو ہسپانیہ کو دوبارہ فتح کرنا چاہتے تھے اور اس وقت سے بلنسیہ کو ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ اندلس کے ان ہسپانوی و عربی وقائع میں جو ہم تک پہنچے ہیں زیادہ سے زیادہ اہمیت مانے لگی۔

بلنسیہ کی اسلامی ریاست کی بنیاد ۱۵۰۱ء

۱۹۰۳ء؛ (۷) Settlement Report : T. Stoker (۱۸۹۱ء)؛  
(۸) Imperial Gazetteer of India، آکسفورڈ ۱۹۰۸ء،  
۹: ۵۰ تا ۵۹؛ (۹) برنی: تاریخ فیروز شاہی، علی گڑھ  
۱۹۵۸ء، بمدد اشاریہ؛ (۱۰) العتبی: کتاب الیمینی،  
لاہور ۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء، ص ۳۰۷۔  
(بزمی انصاری)

بلنسیہ: (Valencia)، ہسپانیہ کا ایک شہر، جس کی آبادی پانچ لاکھ سے اوپر ہے اور اس اعتبار سے وہاں کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ یہ جزیرہ نما کے مشرقی حصے میں بحیرہ روم اور اس کی بندرگاہ الغراو el Grao سے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے اور تین سو چالیس میل لمبی ریلوے لائن کے ذریعے میڈرڈ سے ملا ہوا ہے، لیکن بخط مستقیم دونوں شہروں کا درمیانی فاصلہ صرف ایک سو اٹھاسی میل ہے۔ بلنسیہ اسی نام کے ایک صوبے کا صدر مقام ہے اور ایک اسقف اعظم کا حلقہ ہے۔ بلنسیہ سرسبز و شاداب Huerta de Valencia کے مرکز میں واقع ہے، جسے وادی الایض (Turia یا Guadalaviar) سیراب کرتا ہے، اس وجہ سے اس کا محل وقوع بہت دلکش ہے۔ قرطبہ اور طلیطلہ کے برخلاف بلنسیہ کے اس قدیم صدر مقام کی اہمیت میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا ہے اور یہ مشرقی ہسپانیہ یا عہد اسلامی کے شرق الاندلس کا دارالحکومت چلا آتا ہے۔ سرکاری کاغذات میں اس کا نام بلنسیہ السید Valencia del Cid درج ہے تاکہ قشتالہ کے اس مشہور جانباز کی یاد قائم رہے جس نے یہاں کی تاریخ میں اہم کردار انجام دیا تھا۔ بلنسیہ کی بنیاد رومیوں نے ۱۳۸ ق۔ م میں رکھی تھی۔ باغی وریاتھوس Viriathus کے مرنے کے بعد روما کے ایک حاکم اعلیٰ جونیس بروٹس D. Junius Brutus نے یہاں ان قدیم جنگ آزماؤں کی آبادی قائم کی جو حکومت روما کے وفادار رہے



بول دیا۔ عبدالملک نے شاہ طلیطلہ، المامون بن ذوالنون [آرک باں] سے اعانت طلب کی، لیکن اس نے ہنسیہ آ کر نو عمر بادشاہ کو بہت جلد تخت سے اتار دیا (۵۳۵/۶۱۰ء)۔ اس کے بعد ہنسیہ کی ریاست کا سلطنت طلیطلہ سے الحاق ہو گیا اور المؤمن حکومت کرنے کے لیے وزیر ابوبکر بن عبدالعزیز کو وہاں چھوڑ گیا۔ جب ۵۳۶/۶۱۰ء میں المامون نے انتقال کیا تو اس کا بیٹا یحییٰ القادر جانشین ہوا، لیکن تھوڑے ہی دن میں ظاہر ہو گیا کہ وہ بڑا نااہل ہے، ہنسیہ نے آہستہ آہستہ اپنی خود مختاری دوبارہ حاصل کر لی۔ القادر نے الفانسو ششم، شاہ قشتالہ سے اس قبضے پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے مدد مانگی، لیکن اس کا انجام یہ ہوا کہ ۵۳۸/۶۱۰ء میں اسے خود اپنا دارالحکومت الفانسو کے حوالے کرنا پڑا۔ ان واقعات میں قشتالہ کے بہادر راڈرک دیاز دی ووار Radrigo Diaz de Vivar نے، جس کا نام تاریخ اور داستانوں میں السید (Cid) آیا ہے، جو کارنامے دکھائے ان کے بارے میں قب مادہ السید۔

المرابطون نے ہسپانیہ پہنچ کر پھر سلطنت ہنسیہ کو اسلامی حکومت کے تحت لانے کی کوشش کی، لیکن السید کے مقابلے میں ان کی تمام کوششیں ناکام رہیں، جب وہ ۵۳۹/۶۱۰ء میں مر گیا تو اس کی بیوہ شمینہ Ximena المرابطون کے حملوں کا، جو وہ مزدالی کے زیر قیادت کرتے رہے، مقابلہ کرتی رہی، لیکن بالآخر اس نے ہنسیہ کو نذر آتش کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا اور ۱۵ رجب ۵۲۹/۵/۱۱۰۲ء کو مسلمان اس میں داخل ہو گئے۔

المرابطون کی طرف سے یکے بعد دیگرے متعدد والی بارہویں صدی کے وسط تک ہنسیہ پر حکومت کرتے رہے۔ اس کے بعد الموحدون کے

۱۰۱۰ - ۱۰۱۱ء میں دو آزاد شدہ عامریوں، یعنی مبارک اور مظفر نے رکھی۔ یہ دونوں اس ضلع میں آب ہاشمی کے نظام کے نگران تھے۔ پھر انہوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور دونوں مل کر حکومت کرنے لگے۔ بہت تھوڑی مدت حکومت کرنے کے بعد مبارک فوت ہو گیا اور مظفر کو ہنسیہ سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد اس قبضے کے باشندوں نے ایک اور 'صقلی' ('Slav') [آرک بہ الصقالبة] کو حکومت کرنے کے لیے چن لیا، جس کا نام لیبب تھا۔ اس نے اپنے آپ کو برشلونہ Barcelona کے عیسائی کاؤنٹ کی سیادت کے تحت دے دیا۔ کچھ عرصے بعد ریاست ہنسیہ المنصور ابن ابی عامر کے ہوتے عبدالعزیز بن عبدالرحمن کے قبضے میں آ گئی، اس نے اپنے دادا کے نام پر المنصور کا لقب اختیار کیا۔ بیشتر ازیں وہ سرقسطہ (Saragossa) کے امیر المنذر بن یحییٰ التجیبی کے دربار میں ایک پناہ گزین کی حیثیت سے رہتا تھا۔ عبدالعزیز ۵۴۲/۶۱۰ء، یعنی اپنی وفات تک بر سر حکومت رہا۔ اس کے عہد میں ہنسیہ میں امن و خوش حالی کا دور آ گیا۔ اس نے خلیفہ قرطبہ القاسم بن حمود کی سیادت قبول کی، جس نے اسے المؤمن اور ذوالسابقین کے القاب استعمال کرنے کا اختیار دیا۔ اس نے ہسپانیہ کی عیسائی حکومتوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھے۔ اس کا بیٹا عبدالملک اس کا جانشین ہوا اور المظفر کا لقب اختیار کیا۔ تخت نشینی کے وقت وہ کم سن ہی تھا، چنانچہ اس کا وزیر ابن عبدالعزیز نگران کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا۔ اس کے کچھ ہی دن بعد قشتالہ (Castile) کے فرڈیننڈ اول اور لیون Leon نے ہنسیہ پر حملہ کیا۔ انہوں نے اہل ہنسیہ کو شکست دی اور شہر پر تقریباً قبضہ کر لیا، لیکن اہل ہنسیہ نے محاصرین کو مار بھگانے کے لیے محاصرے سے نکل کر دھاوا

لائڈن و پیرس ۱۹۳۱ء؛ (۱۳) وہی مصنف: *L'Espagne Musulmane du X<sup>eme</sup> Siècle*، پیرس ۱۹۳۲ء؛ (۱۴) *La España del Cid*: R. Menéndez Pidal، میڈرڈ ۱۹۲۹ء (بہت اہم)؛ (۱۵) *Los Reyes de taifas*، میڈرڈ ۱۹۲۶ء؛ (۱۶) *E. Tormo*: *(Guias Calpe) Levante*، میڈرڈ ۱۹۲۳ء۔

(E. LÉVI - PROVENÇAL)

بلوچ : (۱) شورای جمہوریہ وفاقیہ روس \*

(USSR) کے وہ باشندے جو انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں خراسان سے ترک وطن کر کے آئے اور جن کی نقل مکان کا یہ سلسلہ درحقیقت ۱۹۱۸ء کے بعد تک جاری رہا۔ کبھی کبھی غلطی سے انہیں اور وسط ایشیا کے خانہ بدوشوں (gypsies) کو ایک ہی سمجھ لیا جاتا ہے [رک بہ لوی]۔ ۱۹۲۶ء کی سرشماری میں ان کی تعداد نو سو چھتیس بتائی گئی تھی، لیکن یہ عدد ان کی صحیح تعداد سے کم ہے، اس لیے کہ ان میں سے بعض کو ترکمانوں کے ساتھ شمار کر لیا گیا اور بعض کو چنگائیوں کے ساتھ۔ اس کے مقابلے میں *Spisok narodnostey SSSR) Grandé*، در *Revolyutsiya i Natsional' nosti*، شماره ۴، ۱۹۳۶ء: ص ۷ تا ۸۵) کا اندازہ، جو ۱۹۳۳ء میں ان کی تعداد دس ہزار بتاتا ہے، زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ بلوچ روسی جمہوریہ کے صوبہ ترکمنستان کے علاقے ماری Mari میں رہتے ہیں۔ وہ عقیدے کے لحاظ سے سنی حنفی ہیں اور بلوچی (مکرانی) بولی بولتے ہیں، لیکن یہ بولی آہستہ آہستہ ختم ہوتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ تاجیکی ترکمانی لے رہی ہے، جو یہاں ادبی زبان کے طور پر مستعمل ہے۔ ۱۹۲۸ء تک بلوچ خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے تھے، لیکن ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیان انہیں ایک جگہ بسا دیا گیا اور ہوشی پالنے والے کولخزوں

ہسپانیہ میں داخل ہونے سے قبل شورشوں کا جو دور شروع ہوا اس میں یہ قصبہ بتدریج خود مختاری حاصل کرنے لگا۔ اس نے اپنے سیاسی حالات کو مرسیہ Murcia کے ساتھ وابستہ کر لیا اور وہاں کے متعدد چند روزہ بادشاہوں کی حکومت کو تسلیم کرتا رہا۔ ۱۱۴۷/۵۵۴۲ء میں بلنسیہ میں ابن مردنیش کی بادشاہت کا اعلان ہوا، لیکن چار سال بعد رعایا نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ الموحدون کے برائے نام زیر اقتدار بلنسیہ پر وہاں کے مقامی فرمانروا حکومت کرتے رہے تاآنکہ زوال قرطبہ کے دو سال بعد بالآخر اس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا، اور اسے ۲۸ ستمبر ۱۲۳۸ء کو ارغون Aragon کے جیمز اول نے فتح کر لیا۔

مآخذ: جن عرب جغرافیہ نگاروں نے اسلامی ہسپانیہ کے بارے میں قلم اٹھایا ہے انہوں نے بلنسیہ کے متعلق بھی تھوڑا بہت ضرور لکھا ہے: دیکھیے (۱) الإدریسی: *صفة الأندلس*، طبع ڈوزی و ڈخویہ، متن ص ۱۹۱، ترجمہ ص ۱۳۲؛ (۲) یاقوت: *معجم البلدان*، طبع *Wusten-feld*، ۱: ۷۳۰ تا ۷۳۲؛ (۳) ابوالفداء: *تقویم البلدان*، طبع Reinaud و de Slane، متن ص ۱۷۸، ترجمہ ص ۲۵۸؛ (۴) ابن عبدالمؤمن الحمیری: *الروض المعطار*، بذیل مادہ: بلنسیہ کی اسلامی تاریخ کے بارے میں دیکھیے: (۵) ابن عذاری: *البيان المغرب*، ۲: ۱۱۱؛ (۶) ابن خلدون: *Historie des Berbères* و العبر، ج ۴: (۷) ابن ابی زرع: *روض القرطاس*؛ (۸) *Bibliotheca Arabico-Hispana* کے سوانح نگار، نیز *Decadencia y desaparición de*: F. Codera (۹) *los Almoravides en España*، سرقسطہ ۱۸۹۹ء؛ (۱۰) *Histoire des Musulmans d'Espagne*: R. Dozy بمدد اشاریہ؛ (۱۱) *Historia de*: González Palencia (۱۲) *la España musulmana*، برشلونہ ۱۹۲۵ء؛ (۱۳) *Inscriptions arabes d'Espagne*: E. Lévi-Provençal



ہیں۔ یہ وادی شام میں حلب کے قریب ایران کی سرحد کے ساتھ واقع ہے۔

وادی بلوچ ایک اجاڑ وادی تھی۔ عرب و شام کے کئی قبائل یہاں آباد ہوئے، لیکن روم کے مستبد حکمرانوں کی درازدستیوں کے باعث نقل مکانی کرتے رہے۔ جب اسلامی تعلیم اور حکومت کا غلبہ ہوا تو حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح نے اپنے ایک سردار حبیب بن مسلمہ کی سرکردگی میں ایک لشکر وادی بلوچ کی طرف روانہ کیا۔ اس لشکر کے ہمراہ عربوں کی ایک ایسی جماعت بھی تھی جو ایک عرصے سے شام میں آباد تھی۔ وادی بلوچ کی فتح کے بعد یہ جماعت اسی وادی میں آباد ہو گئی۔ اس اثنا میں قبیلہ قیس بھی صحرا نوردی چھوڑ کر اس وادی میں آباد ہو گیا یہی لوگ بلوچ اور بعد میں بلوچ کہلائے۔

بلوچ نسل کے متعلق بعض اہل قلم کی رائے یہ ہے کہ بلوچ قوم دو حصوں میں منقسم ہے: بلوچ اور براہوئی [رک باں]۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ دونوں قومیں حسباً نسباً سامی الاصل ہیں۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ بلوچ اور براہوئی نسباً الگ ہیں اور براہوئی دراوڑ نسل سے ہیں۔ جن تاریخ نویسوں نے براہویوں کو بلوچ کہا ہے ان کا کہنا ہے کہ براہوئی بلوچوں کا طائفہ اول ہے جو بلوچوں کی عام ہجرت سے کم و بیش سات آٹھ صدیاں پیشتر ایرانی حکومت کی تاخت و تاراج سے نقل مکانی کر کے یہاں وارد ہوا تھا۔

خاص بلوچوں کے نسب کے بارے میں بھی بڑا اختلاف ہے۔ ہونگر اور خانیکوف کا خیال ہے کہ یہ ترکمان نسل سے ہیں۔ برٹن، لیسن، اسپگل اور ڈیمز کا خیال ہے کہ یہ ایرانی نسل سے ہیں۔ سرٹی ہولڈج کا خیال ہے کہ یہ نسل عرب ہیں۔ ڈاکٹر ییلو نے انہیں راجپوت لکھا ہے۔

Kolkhoza میں منظم کر دیا گیا۔ ان کے قالین اپنی چند خصوصیات کی بنا پر بجا طور پر مشہور ہیں۔ (A. BENNIGSEN)

[۲]: لفظ بلوچ کے ماخذ: لفظ بلوچ کو مختلف ادوار میں مختلف اقوام نے بل، بلوچ، بلووس، بلوش، بلوش، بلوٹ، بلوٹ، بلوٹ، بلوٹ اور بلووس لکھا اور استعمال کیا ہے۔ اہل بابل اپنے قومی دیوتا کو بال [یا بل] (عظیم) کہا کرتے تھے۔ یونانیوں نے اسے ییلوس کہا۔ عہد قدیم میں لفظ بلوچ کو بلوٹ اور ییلوٹ لکھا جاتا تھا۔ زان بعد یہ لفظ ییلوس اور بلووس کے طور پر تحریر و بیان میں آتا رہا۔ عرب اسے بروج، بلووس اور بلوش ادا کرتے ہیں اور ایرانی اسے بلوچ لکھتے اور بولتے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں ایرانی لفظ بلوچ رائج ہے۔

اصل لفظ بلووس ہے، جسے عربوں نے بلوش اور ایرانیوں نے بلوچ لکھا۔ اہل ایران "ص" ادا نہیں کر سکتے اس لیے انہوں نے بلووس کی "ص" کو "ج" سے بدل کر اسے بلوچ کی صورت عطا کی اور عربوں نے ص کوش سے بدلا۔

لفظ بلوچ کی وجہ تسمیہ نسبی اور سکنی اعتبار سے بھی کی جا سکتی ہے، نسبی اعتبار سے بلووس نمرود کا لقب ہے۔ نمرود بابل سلطنت کا پہلا بادشاہ تھا اور اسے احتراماً بلووس، یعنی 'سورج دیوتا' پکارا جاتا تھا۔ یہ وہی نمرود تھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ کا الاؤ تیار کیا تھا۔ سردار محمد خان گشکوری کی تحقیق کے مطابق بلووس نمرود کے بعد سلطنت بابل کا دوسرا بڑا شہنشاہ تھا۔

رائسن Rawlinson کی تحقیق کے مطابق لفظ بلوچ کا مخرج لفظ بلووس ہے۔

سکنی اعتبار سے بلوچ وادی بلووس کے رہنے والے

پروفیسر کین کا خیال ہے کہ ان کا نسب تاجک نسل سے ملتا ہے۔ ماکلر نے ثابت کیا ہے کہ بلوچ مکران کے قدیم باشندوں کے باقیات ہیں۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ ”زند“ بلوچ نہیں ہیں، بلکہ نسلًا عرب ہیں اور الحارث العلافی کی اولاد ہیں۔ سردار محمد خان نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ بلوچ کلدانی اور بابلی ہیں اور مشہور حکمران نمرود کی نسل سے ہیں۔ آج کے تاریخی انکشافات یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ بلوچ آریہ ہیں۔ خود بلوچوں کے پاس ایک نظم کے سوا کوئی قدیم مواد موجود نہیں۔ اس نظم میں آیا ہے کہ وہ امیر حمزہ کی اولاد ہیں اور حاب سے آئے ہیں یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ اس میں مزید یہ بیان ہوا ہے کہ انہوں نے امام حسینؑ کا ساتھ دیا تھا۔ حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد وہ بامپور پہنچے اور وہاں سے سیستان آئے۔

فردوسی کے شاہنامہ میں بلوچوں کا ذکر آیا ہے۔ اس میں ان کا ذکر کیکاؤس اور کیخسرو کی افواج کے سپاہیوں کی حیثیت سے ملتا ہے۔ اردشیر اور نوشیروان کے زمانے میں بھی وہ ان کا ذکر کرتا ہے۔ فردوسی نے ان کی انفرادی خصوصیات بھی بیان کی ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ قوم ایرانی بلوچستان اور مکران میں قدیم زمانے سے اپنی انفرادی خصوصیت کے ساتھ رہتی چلی آ رہی ہے۔ ادھر بعض مؤرخوں کا خیال ہے کہ انہوں نے ہجرت کی ہے۔ نور احمد خان فریدی کی تحقیق کے مطابق بلوچ قوم ساسی النسل ہے۔ ان کا اصل وطن بحیرہ خزر اور بحیرہ اسود کا درمیانی اور ساحلی علاقہ ہے۔ اس وقت تمام قبائل بلوچ کہلاتے تھے اور جس وادی میں رہتے تھے وہ بھی بلوچ کہلاتی۔ یہاں سے وہ دشت لوط اور کرمان کی طرف منتقل ہوئے اور پھر مختلف اوقات میں اس عظیم قوم کے

قافلے کیچ مکران کی طرف ہجرت کرتے رہے۔ یہاں آ کر اس قوم نے متعدد مقامی قبائل کو اپنے اندر جذب کر لیا اور وہ بھی بلوچ کہلانے لگے۔ میر جلال خان کی اولاد، یعنی زند، کورائی، لاشار، هوت، جتوئی اور بلیدی وغیرہ خالص عربی النسل ہے۔ محمد بن ہارون النمری اور محمد بن الحارث العلافی جیسے بہت سے عرب سردار سابقہ بلوچستان اور سندھ میں آئے اور بلوچ اقوام میں شمار ہونے لگے۔ اب عربی اور عجمی قبائل کی تمیز نہیں ہو سکتی اور جو لوگ بلوچ کو ڈراوڑی ظاہر کرتے ہیں وہ بھی کچھ غلط نہیں ہیں، کیونکہ بلوچوں کی آمد سے پہلے یہاں کی مقامی آبادی کلی طور پر تو ہجرت نہ کر سکی ہوگی۔ یقیناً پھنور، بھٹو، لنگاہ، کھوڑو، سومرو، کھوکھر، آستا وغیرہ کے ماسوا متعدد قبائل، جو اپنے نسب کی حفاظت نہیں کر سکے، آج وہ بھی بلوچ کہلاتے ہیں۔

امرت لال عشرت کی تحقیق کے مطابق، قدیم فارسی ادبیات میں بہت سے ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ قوم شروع میں دریائے ماژندران (بحر خزر) کے کنارے اقامت گزیر تھی، وہاں سے جنوب کی طرف مہاجرت کر کے پہلے کرمان اور بعد میں گیارہویں صدی کے لگ بھگ سیستان اور مکران کے علاقوں میں آ کر آباد ہوئی۔ تیرہویں صدی کے اوائل میں چنگیزی حملے کی قیامت برپا ہوئی تو بلوچی بھی! اتان و خیزان مشرق میں مشرقی مکران اور سندھ کی سرحد تک منتشر ہو گئے اور کچھ عرصے کے بعد بڑھنیر کی شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ کوہ سلیمان کے سلسلے پر قابض ہو گئے۔ پندرہویں اور سولہویں صدی میں کچھ بلوچ دستے پنجاب اور سندھ میں بھی مقیم نظر آتے ہیں، لیکن ان کی اہم ترین ہجرت تیمور کے حملے سے باہر کے حملے تک کے وقفے میں



نہیں کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ بلوچ ۱۳۲۶ء میں سلطان محمد تغلق کے سپہ سالار کشور خان صوبیدار سندھ کی فوج میں کثیر تعداد میں بھرتی ہو چکے تھے اور جب کشور خان نے سلطان محمد تغلق کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو بلوچ کشور خان کی طرف سے لڑے تھے۔ تزک بابری کے مطابق بلوچوں کی شہنشاہ بابر سے ۱۵۱۹ء میں بھیرے [ضلع شاہ پور] میں مذ بھیڑ ہوئی تھی۔

حقیقت یہ ہے ان صاحبوں نے ایک بلوچی نظم سے یہ اندازہ لگایا ہے کہ بلوچوں نے ہجرت کی ہے۔ حالانکہ تاریخی حقائق سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ بلوچی نظم کی یہ روایت صحیح معلوم ہوتی ہے کہ پندرہویں صدی میں میر چاکر رند بلوچی قبائل کے ساتھ آگے بڑھا اور سبی پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد یہ بلوچی قبائل قلات پر بھی قابض ہو گئے۔ اس سے پہلے اس سرزمین میں براہوئی اور سندھی آباد تھے، جو حارث بن مرہ العبدی، عبداللہ بن سوار العبدی، مہلب بن ابی صفہ، ابوالاشعث المنذر بن جارود العبدی، ابن حری الباہلی اور سعید بن اسلم الکلابی کی کوششوں سے مسلمان ہو گئے تھے۔ اس کے بعد رندوں اور لاشاربنوں کی باہم لڑائی شروع ہوئی، جو تیس سال تک جاری رہی۔ اس کی وجہ سے بلوچوں کی طاقت کمزور ہو گئی اور سبی پر شاہ بیگ ارغون نے قبضہ کیا اور میر چاکر خان پنجاب کی طرف چلا گیا۔ [مزید تاریخی تفصیل کے لیے رک بہ بلوچستان]۔

بلوچ معاشرت: بلوچ شہری اور قصباتی بھی ہیں اور خانہ بدوش بھی۔ خواہ وہ شہروں اور قصبوں میں اقامت گزریں ہوں یا صحراؤں اور جنگلوں میں بسر اوقات کریں، ان کی اپنے قبیلے سے محبت اور شیفتگی بے مثال ہے۔ غالباً بلوچ عربوں سے بھی

واقع ہوئی۔ مکران میں آگے بڑھتے ہوئے یہ لوگ قلات کے ان بے آب و گیاہ پہاڑی ٹیلوں پر قابض ہو گئے جن پر آج کل براہوئیوں کا عمل دخل ہے۔ غالباً بعض تاریخی عوامل نے بلوچوں کو قلات سے پھر ہجرت پر آمادہ کیا اور وہ بر صغیر کے میدانوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ بعض قبیلوں نے قلات پر قابض ہو کر بلوچوں کو سندھ اور پنجاب کے میدانی علاقوں کی طرف بھگا دیا۔ یہ واقعہ بلوچی قوم کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہے۔ اس حادثے کے بعد سے یہ قوم دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی اور اب مغربی اور مشرقی بلوچوں کے درمیان قلات کے براہوئی بھی نظر آتے ہیں۔

محمد سردار خان بلوچ نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ بلوچ روایت کے مطابق امیر جلال خان ان بلوچ قبائل کا سردار تھا جو گیارہویں صدی عیسوی میں کرمان کے پہاڑوں اور لوط کے ریگستان میں رہتے تھے۔ بلوچوں کا روایتی عہد اسی سردار سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے چار بیٹے رند، کورائی، لاشار اور هوت تھے۔ رند ان سب سے بہادر، دلیر اور شجاع تھا۔ آگے چل کر رند کی اولاد سے امیر چاکر خان بن امیر مشہک پیدا ہوا، جو بلوچ نسل کا عظیم ترین سپوت کہلاتا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں بلوچوں نے کرمان کے پہاڑوں اور دشت لوط سے سیستان کی طرف کوچ کیا۔ سیستان سے بلوچ بامپور اور موجودہ ایرانی بلوچستان میں آئے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں بلوچوں نے مشرق کا سفر کیا اور مکران اور قلات کے مرکزی علاقوں میں پہنچے۔ سولہویں صدی عیسوی کے آغاز میں بلوچ قبائل بلوچستان اور سندھ میں چھا گئے۔ سندھ میں بلوچوں کا وود جام نظام الدین عرف جام نندو (تخت نشینی ۲۹ نومبر ۱۴۶۹ء؛ وفات ۱۵۱۷ء) کے عہد میں ہوا۔ یہ بلوچ روایت اس لیے قابل قبول

زیادہ قبائلی نظام کے قائل ہیں۔

ہر قبیلہ (= تمن) ذیلی اور تحتانی قبیلوں میں تقسیم ہوتا ہے جسے پاڑہ کہا جاتا ہے۔ ہر پاڑہ شاخوں میں مزید تقسیم ہوتا ہے جسے پھلی کہا جاتا ہے۔ مثلاً:

قبیلہ پاڑہ پھلی

گورچانی ۱ - شہکانی - جلبانی - بکرانی - منکانی

۲ - هوت وانی - دودانی - شیخانی - سنجانی

۳ - خلیلانی - بابولانی - چٹانی - منکانی

۴ - بازگیر - دلانی - برایمانی - پیوانی

ہر قبیلے کا ایک سردار ہوتا ہے اور سردار کے حکم کی پاسداری قبیلے کے ہر فرد کا فرضِ اولین ہے۔ جنگ ہو یا صلح، سردار کا حکم حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیاست ہو یا اقتصاد، معاشرت ہو یا ثقافت، ہر شعبہ زندگی میں قبیلے کے افراد اپنے سردار کی خوشنودی کی روشنی میں اپنا طرزِ عمل طے کرتے ہیں۔ جس قبیلے کا سردار نہ ہو اسے عزت و وقار کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

بلوچوں میں خون کی پاکیزگی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ جس طرح عربوں میں خون اور خاندان کی طہارت اور تقدس کے لیے نسب ناموں پر بہت زور دیا جاتا ہے اسی طرح بلوچوں میں نسب ناموں کو بے حد اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ہر خاندانی بلوچ کو اپنا شجرہ یا نسب نامہ یاد ہونا چاہیے۔

دولت اور اختیارات کے اعتبار سے بلوچ قبائل کو تین طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) سردار قبائل؛ (۲) متوسط قبائل؛ (۳) زیر دست قبائل۔

سردار قبائل وہ ہیں جن کے پاس زمینوں کی وجہ سے یا صنعت و حرفت کی وجہ سے خاصی دولت ہے اور یوں وہ اثر و رسوخ میں دوسرے قبائل کے پیش رو ہیں۔ متوسط قبائل میں وہ قبائل شامل ہیں

جن کے پاس نہ تو زمینیں زیادہ ہیں اور نہ آمد ہی کے دوسرے ذرائع وافر مقدار میں ہیں۔ وہ کاشتکاری اور گلہ بانی سے اپنا پیٹ پالنے کے ساتھ ساتھ سردار قبائل کی ملازمتیں بھی کرتے ہیں۔ تیسرے قبائل میں جاٹ، گولا، لوڑی اور ایسے دوسرے قبیلے شامل ہیں۔ ان قبائل کا اولین فرض سردار کی خدمت ہے۔ معاشرتی سطح پر ان کی حیثیت باقی دو قسم کے قبیلوں کے مقابلے میں کمتر ہے۔ تاہم بنیادی جمہوریت کے نظام کے اجرا اور تعلیم کے فروغ کی وجہ سے یہ طبقاتی تقسیم سرعت سے مٹ رہی ہے۔ تعمیر و ترقی کے نئے دور نے خاندان کے بجائے ذاتی اہلیت پر زیادہ زور دیا ہے، چنانچہ قبائلی نظام کی برائیوں کی شدت میں کمی ہو رہی ہے، تاہم اس کی خوبیوں کو جمہوری دور کے تقاضوں کے مطابق سلیقے سے اپنایا گیا ہے۔ بلوچوں میں عورت کو بے حد عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر دو قبیلوں میں لڑائی چھڑ جائے تو ایک متحارب قبیلہ اپنے مخالف قبیلے کی عورتوں کو ہرگز کوئی گزند نہیں پہنچاتا۔ عورتوں کی بے حرمتی یا ان پر ظلم روا رکھنا کمینگی اور بزدلی کے مترادف ہے۔ اگر دو قبیلے لڑ رہے ہوں تو عورت کے دخل دینے پر لڑائی بند کر دی جاتی ہے۔

بلوچ عورتیں بلند کردار، بے حد دلیر اور جفاکش ہوتی ہیں۔ گھر کا سارا کام کاج کرتی ہیں۔ سینا پرونا ان کا مقبول مشغلہ ہے۔ وہ گلہ بانی بھی کرتی ہیں۔ مرد کی عدم موجودگی میں کوئی اجنبی یا مہمان آ جائے تو بساط بھر خدمت کرتی ہیں۔ بلوچ خواتین مہمان نوازی میں بے مثال شہرت رکھتی ہیں۔ مہمانوں کو خواہ وہ اجنبی ہوں یا دشمن خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہا جاتا ہے۔

بلوچ عورتوں کا لباس شائستگی کا عمدہ نمونہ ہے، وہ تنگ یا چست لباس سے نفرت کرتی ہیں



کے معاملے میں وہ بڑے حریص ہیں اور دستر خوان پر خوب دراز دستی کرتے ہیں۔ وہ فخریہ کہتے ہیں کہ ہمارا پیٹ بھیڑیے کی انتڑیوں سے تیار کیا گیا ہے۔

بلوچ سیر و شکار کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ وہ بڑے شوق سے شکاری کتے، باز اور شکرے پالتے ہیں اور ان سے شکار کرتے ہیں۔ شہسواری میں ان کی ہمسری پر حد مشکل ہے؛ وہ نہایت محنت اور شوق سے گھوڑے پالتے ہیں، جنہیں مقابلوں میں لاتے اور انعام حاصل کرتے ہیں۔ شہسواری کے بغیر بلوچ جرات اور بہادری کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام قومی ہیرو اپنے زمانے کے بہترین شہسوار تھے۔

بلوچ شہسواری کے علاوہ گشتی کے شوقین اور گیتوں کے رسیا ہیں۔ کہیت ہو یا کہلیان، صحرا ہو یا نخلستان، شہر ہو یا جنگل، بلوچ اپنے مخصوص انداز میں غزل کا شعر یا لوک گیت کا بند گنگناتا نظر آئے گا، بشرطیکہ وہ شگفتگی کے عالم میں ہو۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں میں غالباً بلوچی ایک ایسی زبان ہے جس میں سب سے زیادہ لوک گیت ہیں اور ان رزمیہ، رومانی المیہ اور اصلاحی گیتوں کو گانے کے لیے بلوچوں نے کئی اسلوب اپنا رکھے ہیں، جنہیں وہ طنبورہ، رباب، ڈھول، ڈھولک، نرے اور چنگ کے ساتھ گاتے ہیں۔

بلوچ رقص میں حرب و ضرب کے عناصر بدرجہ اتم ملتے ہیں، مثلاً بہنگڑہ طرز کا بلوچی لوک رقص، 'چاپ' ایک اجتماعی رقص ہے، جو دائرے کی شکل میں پیا ہوتا ہے اور جس کے ساتھ ڈھول کی گت لازم ہے۔ 'جھمر' یا 'دریس' بھی ایک بلوچی رقص ہے جسے اہل پنجاب نے اپنایا ہے۔ یہ رقص بھی تالیوں کے ساتھ دائرہ بنا کر کیا جاتا ہے؛ اس رقص

ان کے دوپٹے اور چادریں لمبی چوڑی ہوتی ہیں اور قمیض کھلی ڈھیلی۔ بلوچی کشیدہ کاری دنیا بھر میں نام پیدا کر چکی ہے اور اس امر کا ثبوت ہے کہ بلوچ عورتیں صاحب ذوق اور چابک دست ہیں۔ بلوچ مرد پگڑیوں، کرتوں اور شلواروں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے لباس پر زیادہ کپڑا خرچ کریں۔ بلوچ بالوں کو بھی بہت پسند کرتے ہیں وہ باقاعدہ پٹے رکھتے ہیں اور تیل سے ان کی پرورش کرتے ہیں۔ ڈاڑھی کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر بلوچ ڈاڑھی کی قسم کھا کر وعدہ کرے تو یقین جانیے وہ اپنے وعدہ کو پورا کرنے کے لیے جان تک قربان کر دے گا۔ ترض اور ادھار کے سلسلے میں ڈاڑھی یا سر کے چند بال بہترین ضمانت تصور کیے جاتے ہیں۔

بلوچ مرد بندوق، تلوار، خنجر، تیر، کمان، گھوڑا اور چپل کے شیدائی ہیں۔ تیر کمان اور گھوڑے کی جگہ تو اب ہستول اور کار اور جیب نے لے لی ہے، تاہم وہ بالاج حسن گور گھیر کے مشہور گیت کے الفاظ میں اب بھی ان اشیا کے شیدائی ہیں:

”پہاڑ ہمارے قلعے ہیں، پہاڑوں کی چوٹیاں ہماری محافظ ہیں، تنگ درے ہمارے دوست ہیں، ہم چشموں کا پانی پیتے ہیں، کوتاہ قد کھجور کے پتے ہمارے پیانے ہیں، خاردار جھاڑی ہمارا بستر ہے، زمین ہمارا تکیہ ہے، میرے سفید چہل میرے رھوار ہیں، آبدار خنجر میرا عزیز ترین رشتہ دار ہے، چوڑی ڈھال میرا بھائی ہے اور گھرا گھاؤ لگانے والی تلوار میرا باپ“۔

بلوچوں کی غذا سادہ ہوتی ہے۔ وہ گوشت بہت پسند کرتے اور اسے خاص طریقے سے بھوتے ہیں جسے سبھی کھا جاتا ہے۔ کھانے پینے

کے ساتھ بھی ڈھول کا ہونا ضروری ہے۔ تیسرا رقص رزمیہ ہے۔ اس میں تالیوں کے بجائے برہنہ شمشیر کی حرکت و جنبش یعنی وار کر کے واپسی کا سماں باندھا جاتا ہے۔ نیز ڈھول بجانے والے دو ہوتے ہیں اور کبھی کبھی شہنائی کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ رقص دائرے کی صورت میں ہوتا ہے اور منہ سے صدائے الست ایک خاص آہنگ کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نکالی جاتی ہے۔

بلوچی موسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔ ان کے سازوں میں رباب، ہژدہ، چنگ، سرندہ، چارتارہ، بربط، دنبورا، دہل یا ڈھول اور نر (نر) مشہور ہیں۔

بلوچی موسیقی اور لوک گیت کا ذخیرہ میراثیوں کی وساطت سے اب تک محفوظ ہے۔ ڈوم یا میراثی کو بلوچی میں لوڑی کہا جاتا ہے۔ اس کا فرض ہوتا ہے کہ وہ نسبی شجرے یاد کرنے کے ساتھ ساتھ بلوچ قبائل کا ادبی و تہذیبی ورثہ بھی حفظ کرے اور بوقت ضرورت تقریبوں میں گا کر سنائے۔

بلوچوں میں شادی بیاہ کی تقریبات عموماً موسم بہار میں منعقد ہوتی ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ فصل کاٹنے کے بعد موسم خزاں میں بھی بعض شادیاں ہوتی ہیں۔ شادی عموماً قبیلے سے باہر نہیں کی جاتی۔ اگر اپنے قبیلے میں سوزوں رشتہ نہ ملے تو لڑکیاں ساری عمر والدین کے گھر رہتی ہیں۔ سب سے اچھا رشتہ وہ تصور کیا جاتا ہے جو اپنے قریبی رشتہ داروں میں ہو۔ جب کہیں رشتہ معلوم ہوتا ہے تو لڑکے کا والد اپنی طرف سے کسی سیانے آدمی کو، جسے وکیل کہنا چاہیے، لڑکی کے والد کے گھر اس التجا کے ساتھ بھیجتا ہے کہ رشتے کی بات شروع کرے۔ اگر لڑکی کے والدین یا لواحقین مان جائیں تو پھر لڑکی اور لڑکا دیکھا جاتا ہے۔ یہ مرحلہ بہت کم پیش آتا ہے، کیونکہ لڑکی کے والدین لڑکے والوں سے اور لڑکے کے والدین

لڑکی والوں سے عموماً پہلے سے متعارف ہوتے ہیں۔ ازاں بعد لڑکے کے والدین اور چند قریبی رشتے دار لڑکی کے گھر جاتے ہیں اور لڑکی کے رشتے کا سوال اٹھاتے ہیں۔ جب بامی بھر لی جاتی ہے تو لڑکے کے والدین اپنے گھر آ جاتے ہیں اور چند دنوں کے بعد باقاعدہ نسبت ہو جاتی ہے۔ نسبت کے موقع پر لڑکے کے والدین حسب استطاعت لڑکی کو تحائف از قسم ملبوسات وغیرہ پیش کر سکتے ہیں۔ اس وقت دعا بھی مانگی جاتی ہے کہ خدا لڑکی اور لڑکے کو طویل زندگی عطا فرمائے اور وہ خوش و خرم رہیں۔ شادی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے۔ بعض اوقات ساری برات ڈھول کی گت پر ناچتی ہوئی دلہن کے گھر جاتی ہے۔ اور نکاح خوانی کے بعد ناچتی ہوئی واپس آتی ہے۔ شادی والدین کی مرضی کے مطابق ہوتی ہے۔ لڑکی یا لڑکے کی مرضی والدین کی مرضی کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ بعض قبیلوں میں تو نسبت سے پہلے لڑکی کی رائے معلوم کرنا گالی سمجھا جاتا ہے تاہم تعلیم یافتہ اور خوش حال شہری خاندانوں میں چوری چھپے رائے معلوم کرنا معیوب خیال نہیں کیا جاتا۔

بلوچوں میں طلاق کو نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ طلاق بے عزتی کا دوسرا نام ہے۔ عورتوں کی تکریم بلوچوں کا جزو ایمان ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ایک ایسی عورت جو ان کی زندگی میں کسی حد تک یا کچھ مدت تک شامل رہی ہے اب ان سے قطع تعلق کر کے بدنامی کا باعث ہو۔ اس طرز عمل کا ایک پہلو یہ ہے کہ بلوچوں میں زنا کی سزا موت ہے۔ اگر معلوم ہو جائے کہ یہ رسوائے عالم جرم سرزد ہوا ہے تو عورت اور مرد دونوں کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

بلوچ ”خون کا بدہ خون“ کے قائل ہیں۔ جو بلوچ قتل کا بدلہ نہ لے سکے اسے ”نامرد“ اور



(۱۹۶۱ء) [۱۵] سلیم خان گمی: بلوچی ادب، اردو اکادمی، بہاولپور ۱۹۶۱ء؛ (۱۶) آر۔ سی ٹیبل: میر چاکر کے کارنامے، حکایات پنجاب، حصہ دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور ۱۹۶۲ء؛ (۱۷) سلویا میتھیس: *The Geographical Magazine*، لندن ستمبر ۱۹۶۲ء؛ (۱۸) میر خدا بخش بھجرائی: قدیم بلوچی شاعری، بزم ثقافت، کوئٹہ ۱۹۶۳ء؛ (۱۹) امرت لال عشرت: ادب و زبان، مقالہ در ماہ نو، کراچی ۱۹۶۵ء؛ (۲۰) خالد کلیم: اہل بلوچستان، مقالہ در روزنامہ نوائے وقت، لاہور ۱۵ اپریل ۱۹۶۷ء؛ (۲۱) فیض محمد سومرو: بلوچستان، در *The Illustrated Weekly of Pakistan*، کراچی ۳ جون ۱۹۶۸ء؛ (۲۲) عطاشاد: بلوچی نامہ، مرکزی اردو بورڈ، لاہور ۱۹۶۸ء؛ (۲۳) سردار محمد خان گشکوری: *The Great Balouch* (مطبوعہ) ۱۹۶۸ء؛ (۲۴) انور رومان: آئینہ بلوچ، جگو والا ضلع ملتان، تاریخ اشاعت ندارد۔

(سلیم خان گمی)

### ۵. بلوچستان: بلوچوں کی سر زمین۔

الف۔ جغرافیہ:

بلوچستان کی حدود صحیح طور پر معین نہیں ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا محل وقوع ایرانی سطح مرتفع کا جنوب مشرقی حصہ ہے جو مشرق میں دشتِ کیرمان اور کوہستانِ باشگرد سے سندھ اور پنجاب کی جنوبی حدوں تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ خشک اور کوہستانی ملک، جس کے باشندے زیادہ تر خانہ بدوش ہیں۔ پاکستان اور ایران کے درمیان بنا ہوا ہے۔ آج کل کچھ بلوچی سندھ اور پنجاب نیز سیستان میں اور کچھ خانہ بدوش روس میں مرو کے قریب بھی ملتے ہیں (رکھ بہ بلوچ (۱))۔

بلوچستان کے دریا چھوٹے چھوٹے اور غیر اہم ہیں۔ اس ملک کو ایک سطح مرتفع سمجھنا چاہیے، جس کے مشرق میں کوہ سلیمان کے اونچے

بزدل خیال کیا جاتا ہے۔

اگر بلوچ کسی کو پناہ دیں تو اس کی حفاظت کے لیے اپنی جان تک داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ یہ خوبی بھی بلوچوں کو عربوں کے خون سے وراثت میں ملی ہے۔ وہ پناہ لینے والے کو کبھی دھوکا نہ دیں گے۔ اگر زر و سیم کے ڈھیر ان کے سامنے رکھ دیے جائیں یا تختہ دار پر ان کو کھینچا جائے تو بھی وہ پناہ لینے والے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔

مآخذ: (۱) ہتورام رائے بہادر: تواریخ بلوچستان، لاہور ۱۹۰۷ء؛ (۲) ش۔ ضحیٰ: ہمارا بلوچستان، مقالہ در ماہ نو، کراچی اپریل ۱۹۵۱ء؛ (۳) ڈاکٹر نی بخش خان بلوچ: بلوچی ادب، مقالہ در *Cultural Heritage of Pakistan*، مطبوعہ اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی ۱۹۵۵ء؛ (۴) خیابان پاک، ادارہ مطبوعات پاکستان، کراچی ۱۹۵۶ء؛ (۵) ایم لانگ ورتھ ڈیمز: *Popular Poetry of the Balouch*، مطبوعہ رائل ایشیائی سوسائٹی، لندن ۱۹۵۷ء؛ (۶) سردار محمد خان گشکوری: *History of the Baluchis and Baluchistan*، کراچی ۱۹۵۸ء؛ (۷) سلیم خان گمی: بلوچی لوک گیت، مقالہ در *Pakistan Quarterly*، کراچی ۱۹۵۹ء؛ (۸) ماہنامہ بلوچی دنیا، جگو والا، ملتان، ثقافت نمبر، جنوری۔ فروری ۱۹۶۰ء؛ (۹) میر محمد حسین عنقا: بلوچ نسل کی تاریخ، مقالہ در بلوچی دنیا، مارچ ۱۹۶۰ء؛ (۱۰) سلیم خان گمی: بلوچی رزمیہ شاعری، مقالہ در روزنامہ امروز، لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء؛ (۱۱) عبدالصمد امیری: بلوچ نسل کی تاریخ، مقالہ در ماہنامہ بلوچی دنیا، جون ۱۹۶۰ء؛ (۱۲) محمد حسین عنقا: بلوچی نسل کی تاریخ و طرز نوشت، مقالات در ماہنامہ بلوچی دنیا، ضلع ملتان، اگست، ستمبر ۱۹۶۰ء؛ (۱۳) سلیم خان گمی: جدید بلوچی شاعر، در روزنامہ امروز، لاہور ۲ اکتوبر ۱۹۶۰ء؛ (۱۴) لانگ ورتھ ڈیمز: *Baloch Race*، اردو ترجمہ بلوچی قبائل از سید کامل القادری، جگو والا

[ (۲) (ب) قدیم تاریخ : نادر شاہ افشار پہلا شخص تھا جس نے کوئٹہ و قلات کے موجودہ انتظامی ڈویژنوں کو بلوچستان کا نام دیا۔ اوستا میں بلوچستان کو وادی پشین کہا گیا ہے۔ یونانی مؤرخ نے بلوچستان کو ماکا کا تحریر کیا۔ بیہستون کے کتبوں میں بھی بلوچستان کے لیے یہی لفظ (ماکا) استعمال ہوا۔ ایرانی حکمران داراے اعظم کی سلطنت ایک سو ستائیس صوبوں پر مشتمل تھی، ان میں سے ایک صوبہ یہی ماکا تھا۔ بعد ازاں ماکا کو مکران کا نام دیا گیا۔ بعض مؤرخوں نے اسے میکیا بھی لکھا۔ بعض یونانی مؤرخوں نے بلوچستان کو گدروشیا بھی لکھا۔ چینی سیاح بلوچستان کو زنگلا پکارتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایران میں ماد و فارس کی سلطنت کا بانی خورس (سائیرس) ایک بار اپنا لشکر بلوچستان کی طرف لے کر آیا تھا۔

۳۲۵ ق م میں سکندر اعظم ہندوستان کی فتح کے بعد بلوچستان کی راہ ایران کو لوٹا۔ اس نے ایران میں شرقاً غرباً سفر کیا۔ اس کا امیر البحر منیرچس بحری بیڑے کو لے کر بلوچستان کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا اور خلیج فارس پہنچا۔ ہاتھیوں اور زخمیوں کو کریٹیرس کے سپرد کیا گیا تھا، اس نے وادی سندھ سے سفر کا آغاز کیا اور کوئٹہ میں سے گزرتا ہوا سکندر اعظم کو حلیل رود کی وادی میں ملا۔ اسی جگہ منیرچس نے سکندر اعظم کو اطلاع دی کہ بحری بیڑا بہ حفاظت ہرمز پہنچ گیا ہے۔ یہ مقام موجودہ بندر عباس کے مشرق میں تھا۔ سکندر اعظم کی موت کے بعد بلوچستان سلطنت باختریہ کا ایک حصہ بن گیا۔ سکندر اعظم کی موت کے بعد اس کے ایک سپہ سالار سیلوکس نے اول الذکر کے بعض مفتوحہ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ سیلوکس نے بابل فتح کیا اور ۳۰۵ ق م میں ہندوستان پر چڑھائی کی۔ اس نے بلوچستان کو فتح کرنے کے بعد سندھ

نیچے پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں اور چند پہاڑی سلسلے مغرب کی طرف بھی ہیں، جن میں سب سے شاندار چوٹی آتش نشان کوہ تافتان (۱۳۵۰۰ فٹ) کی ہے۔ ایرانی بلوچستان کا صدر مقام ایرانشہر ہے (جو پہلے فہرج کہلاتا تھا) اور مشرق میں اس کا سب سے اہم مرکز قلات ہے۔ اس کی بندرگاہیں تیز، پسنی اور گوادرز، پہلے بہت رواں تھیں، لیکن اب ان کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔

اس رقبے کی آبادی جس میں براہوئی [رک باں] بھی شامل ہیں معین طور پر نہیں بتائی جا سکتی، لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مشکل سے بیس لاکھ ہو گی۔ آبادی میں اکثریت بلوچوں کی ہے اور سب سے بڑی اقلیت براہوئیوں کی ہے۔ ان کے علاوہ مشرقی کنارے پر جاٹ اور دوسری ہندی قومیں بھی آباد ہیں۔ بندرگاہوں میں اور خصوصاً ایرانی بلوچستان میں کچھ حبشی بھی آباد ہیں۔ بلوچ دو بڑے گروہوں میں منقسم ہیں، جن کے درمیان وہ براہوئی جز قلات کے علاقے میں رہتے ہیں حد فاصل کا کام دیتے ہیں، اور یہاں دو بڑی بولیاں رائج ہونے کی یہی وجہ ہے [قب صالح محمد لہڑی : بلوچستان]۔

سب سے پہلے اس علاقے کا ذکر، جس کا نام ماکا (Maka) تھا، بیہستون اور اِصطَخر (Persepolis) میں دارا کے خط مسماری میں لکھے ہوئے کتبے میں ملتا ہے۔ کلاسیکی ماخذ میں اس کے اور نام بھی مذکور ہیں، لیکن اس ملک کے عہدِ اسلامی سے پہلے کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ گمان غالب یہ ہے کہ فارسی بولنے والے بلوچستان میں بہت بعد میں آئے اور بلوچستان کے جنوبی اور مشرقی حصوں میں اسلامی فتوحات کے بہت مدت بعد تک بھی غلبہ غیر ایرانیوں کا رہا۔ بلوچی مکران (مغربی بلوچستان) میں غالباً اس زمانے کے لگ بھگ داخل ہوئے جب سلجوقیوں نے کرمان پر حملہ کیا۔



پر حملہ کیا۔ جب اس نے دریائے سندھ کو پار کیا تو اس کا مقابلہ مگدھ کے چندر گپت موریہ کی فوجوں سے ہوا۔ سیلوکس کو شکست ہوئی اور چندر گپت کی فوجوں نے اسے بلوچستان چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔

بلوچستان ساسانی خاندان کے چودھویں حکمران بہرام گور (۴۰۳ تا ۴۳۷ء) کی سلطنت کا بھی ایک حصہ تھا۔ ایک روایت کے مطابق بلوچستان (مکران) اسے ہندوستان کے بادشاہ شیر ماہ کی بیٹی سے شادی کرنے پر جہیز میں ملا تھا۔

مشہور مؤرخ ایلٹ کے مطابق بلوچستان ایرانی شہنشاہ خسرو پرویز (۵۹۱ تا ۶۲۸ء) کی سلطنت کا ایک حصہ تھا کیونکہ اس کی سلطنت کی حدود وادی سندھ تک تھیں۔

۶۲۵ء میں سندھ کے برہمن حکمران خاندان کے راجہ چچ نے بلوچستان پر قبضہ کیا اور بلوچستان کی حدود متعین کیں اور بلوچستان کے دفاع کے لیے قلعے تعمیر کیے۔

بلوچستان میں براہمن راج زیادہ دیرپا ثابت نہ ہوا کیونکہ کرمان عرب سپہ سالاروں کی یورشوں کی زد میں تھا، مسلمانوں کے لشکر بلوچستان کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ آخر یہی یلغار کچھ عرصہ بعد راجہ داہر کی شکست کا باعث بنی۔

جب حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں کرمان کا علاقہ فتح ہوا تھا (۵۲۳/۵۶۳ء) تو عربوں نے کرمان کے پہاڑوں کے آس پاس کوف (کوچ) اور بلوص (بلوچ) نامی لوگ پائے تھے۔ اس وقت مکران میں ہندوستان کی جاٹ اور دوسری قومیں آباد تھیں، بلوچ یا براہوئی نہیں تھے، پھر حضرت عثمانؓ کے زمانے میں حکیم بن جبیلہ العبدی حال معلوم کرنے کی غرض سے سندھ اور بلوچستان کی طرف آئے تو انہوں نے حکومت کو

ایک رپورٹ پیش کی جس میں لکھا:

”وہاں کا پانی کھاری ہے، کھجور ردی قسم کی ہے اور چور بڑے دلیر ہیں۔ اگر کوئی تھوڑا لشکر لے کر جائے تو نیست و نابود ہو جائے گا، اور اگر زیادہ لشکر لے کے جائے تو بھوک سے مر جائے گا“۔

چوتھے خلیفہ امیر المؤمنین حضرت علیؓ کے زمانے میں ۵۳۹ء میں حضرت حارث بن مرہ العبدی بلوچستان آئے اور جہاد شروع کیا اور کچھ علاقے بھی فتح کیے لیکن ۵۴۴ء میں قلات میں بہت سے ساتھیوں سمیت لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

۵۴۴ء میں امیر معاویہؓ کے زمانے میں مکران فتح ہوا، یہاں عربوں نے اپنا فوجی اڈا بنالیا اور ارد گرد کے علاقوں پر حملے شروع کیے۔ ازاں بعد مکران کی جنگ کے لیے عبداللہ بن سوار العبدی آئے۔ انہوں نے قلات کے کچھ علاقے فتح کیے اور پھر قلاتی گھوڑے تحفے کے طور پر امیر معاویہؓ کو پیش کیے، مگر جب دمشق سے واپس مکران لوٹے تو حالات بدل چکے تھے، چنانچہ انہیں شہید کر دیا گیا۔ عبداللہ کے بعد حضرت سینان بن سلمہ سپہ سالار مقرر ہوئے۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر سارا مکران فتح کیا اور شہر کو نئے سرے سے آباد کیا۔

اسی زمانے میں مشہور مسلمان سپہ سالار مہلب ابن ابی صفیرہ سیستان کی طرف سے ایک درے کے راستے وارد ہوا اور بنوں کے راستے لاہور پہنچ گیا؛ پھر ملتان سے ہو کر بلوچستان میں داخل ہوا اور جگہ جگہ جنگ لڑی۔ قلات میں ایک جگہ اٹھارہ ترک سواروں سے سامنا ہوا [جو دم کٹے گھوڑوں پر سوار تھے۔ وہ سوار تو لڑائی میں سب مارے گئے لیکن مہلب کو ان کے دم کٹے گھوڑے اتنے پسند آئے کہ اس نے بھی اپنے گھوڑوں کو دم کٹا بنا دیا]۔ مہلب کے بعد عبداللہ بن سوار العبدی، سینان بن سلمہ اور

کے خلاف چڑھائی کی تو اس وقت مکران یعنی بلوچستان مسلمانوں کے زیرِ نگیں تھا، راستے محفوظ تھے، مسجدیں آباد تھیں اور کوهستانی علاقوں میں کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔

موجودہ بلوچستان میں بلوچوں کی آمد کا عہد گیارہویں صدی عیسوی کے آخری دس سال ہیں۔ بلوچوں کی رومانی داستانوں کے مطابق بلوچ اپنے سردار جلال خان کی سرکردگی میں کرمان کے مختلف اضلاع میں رہتے تھے کہ سیاسی انتشار کی وجہ سے وہ قافلہ در قافلہ کرمان چھوڑ کر سیستان چلے آئے۔ یہاں بھی انہیں چین نہ ملا تو وہ اپنے سردار امیر جلال خان کی قیادت میں واپس کرمان آ گئے اور ضلع جام پور میں آباد ہوئے، لیکن سکون ان کی قسمت میں نہ تھا۔ سردار امیر جلال خان اپنے چوالیس قبیلوں (پاڑوں) کو لے کر مکران کی طرف بڑھا اور یوں مکران کو بلوچستان کا نام دیا۔ امیر جلال خان کی آمد سے پہلے مکران پر مغول حکومت کرتے تھے۔ بلوچ سردار نے انہیں شکست دی، جس سے مقامی آبادی کی وفاداریاں بھی انہیں آسانی سے میسر آ گئیں، کیونکہ مقامی لوگ مغول کے ظلم و ستم سے تنگ آ چکے تھے۔

یہ مسئلہ امر ہے کہ امیر جلال خان کی آمد سے پہلے مکران میں بلوچ آباد تھے، جو خانہ بدوش تھے اور کچھ بھیڑ بکریاں پال کر گزارہ کرتے۔ امیر جلال خان کے ہمراہ جو بلوچ کرمان کے ضلع بامپور سے مکران پہنچے وہ شہسوار بھی تھے اور منظم بھی۔ امیر جلال خان نے انہیں احساسِ قومیت عطا کیا اور بلوچوں کے قبائلی نظام کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔ یہ کہنا درست نہیں کہ امیر جلال خان سب سے پہلے مکران میں آیا، البتہ یہ درست ہے کہ امیر جلال خان کے بعد ایران سے بلوچوں کا کوئی قافلہ پاکستان بلوچستان کی طرف

راشد بن عمرو الجدیدی مکران کے حاکم مقرر ہوئے۔ پھر حضرت ابوالاشعث [المنذر] بن جارود العبدی مکران کے حاکم بن کر آئے۔ انہوں نے قلات بھی فتح کیا اور بولان کے درے تک سارا علاقہ ان کے زیرِ نگیں آ گیا۔ اسی زمانے میں خضدار (قصدار) کے لوگوں نے بغاوت کی۔ یہ جگہ ملتان شہر سے بیس پڑاؤ اور مکران کی بندرگاہ سے بارہ پڑاؤ کے فاصلے پر ہے۔ ابوالاشعث نے باغیوں پر حملہ کیا اور زبردست جنگ کے بعد خضدار کو فتح کر لیا۔

ابوالاشعث کے بعد ابن حری الباہلی مکران کے حاکم ہوئے۔ انہیں بھی کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں اور سارے علاقے کو قابو میں کر لیا۔ ان کے عہد میں بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔ پھر جب خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانے میں حجاج بن یوسف عراق کا حاکم مقرر ہوا تو سعید بن اسلم الکلابی کو مکران کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اس وقت ایک عرب سردار حارث العلافی اپنے قبیلے کے ساتھ بھاگ کر عمان کے راستے مکران پہنچا اور سندھ کے راجہ داہر کا مقرب ہو گیا۔ اسے مکران کی سرحد پر ایک بہت بڑی جاگیر بھی ملی۔ یہاں اس کی سعید بن اسلم الکلابی کے ساتھ کسی بات پر ناراضی ہو گئی اور اس نے سعید کو اپنے بیٹوں معاویہ اور محمد کے ہاتھوں قتل کروانے کے بعد مکران پر قبضہ کر لیا۔

حجاج بن یوسف کو جب خبر ہوئی تو مجاعہ بن سمر التیمی کو اس کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ علاقوں کو جب اس کا علم ہوا تو اپنا انجام سامنے نظر آیا۔ انہوں نے مکران چھوڑ دیا اور سندھ کے راجہ داہر کے پاس چلے آئے، مگر حجاج بن یوسف کے سپہ سالاروں نے ان باغیوں کا تعاقب کیا اور راجہ داہر سمیت ان کو قرار واقعی سزائیں دیں۔

جب ۵۸۹ء میں محمد بن قاسم نے راجہ داہر



نہیں آیا .

امیر جلال خان کی اولاد کم و بیش ساڑھے تین سو سال تک مکران میں کیچ، بامپور اور پنجگور کی وادیوں پر قابض رہی۔ وسطی بلوچستان میں جھلاوان اور سراوان کے علاقے ابھی بلوچ شہسواروں کے گھوڑوں کے سموں سے نا آشنا تھے لیکن پندرہویں صدی عیسوی میں بلوچوں کے دو قبیلے رند اور لاشاری شانہ بشانہ وسطی بلوچستان کی طرف بڑھے۔ بلوچ شہسواروں کا مقابلہ جن لوگوں سے تھا وہ یا تو قتل کر دیے گئے یا انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ آخر امیر چاکر خان رند کے عہد میں سارا بلوچستان بلوچوں کے زیر نگیں آ گیا اور انہوں نے وہاں اپنی حکومت قائم کر لی۔

میر چاکر خان رند وہ عظیم بلوچ سردار تھا جس کی عظمت کے پرستاروں میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ میر چاکر خان رند امیر جلال خان کی اولاد میں سے تھا۔ اس کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے : میر چاکر خان بن رند امیر شہک بن امیر اسحاق بن امیر کالو بن امیر رند بن امیر جلال خان۔ امیر چاکر خان رند کے عہد کے بڑے بڑے واقعات حسب ذیل ہیں : اس نے خضدار کو فتح کیا؛ درہ مولا پر قبضہ کیا؛ کچھی کے میدانوں کو فتح کیا؛ گندھاوا فتح کیا؛ درہ بولان پر قبضہ کیا؛ ڈھاڈر پر قبضہ کرنے کے بعد سبی کو فتح کیا۔ میر چاکر خان رند کا ستارہ اقبال نصف النہار پر تھا کہ قبائلی حسد کی وجہ سے رندوں اور لاشاریوں میں جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ تیس سال تک جاری رہی، جس سے رندوں اور لاشاریوں کے ہزاروں بہادر تہ تیغ ہو گئے اور بلوچستان جو شجاعت و شہامت کا گہوارہ تھا مرگ آسا سکوت میں منتقل ہو گیا۔ آخر ۱۵۱۲ء میں میر چاکر رند بلوچستان چھوڑ کر پنجاب کی طرف چلا آیا اور اوکاڑہ (ضلع ساہیوال) کے

قریب ایک موضع ست گرہ میں سکونت پذیر ہوا۔

بلوچ اور مغل : شہنشاہ بابر اپنی خود نوشت ”تذکرہ بابر“ میں ۲۳ فروری ۱۵۱۹ء کو لکھتا ہے: ”میں نے حیدر علمدار کو بلوچوں کی طرف بھیجا۔ بھیرے اور خوشاب سے دوسرے دن بلوچ گھوڑے کی ڈالی لے کر آئے اور اطاعت کا وعدہ کیا“۔

۱۵۳۹ء میں شہنشاہ ہمایوں نے چونسہ کے مقام پر شیر شاہ سوری سے شکست کھائی اور دشت نوردی کے عالم میں اوکاڑے کے قریب ست گرہ پہنچا جہاں میر چاکر خان رند کے ایک امیر بخشو بلوچ نے شہنشاہ کو غلے کی سو کشتیاں امداد کے طور پر دیں۔ شہنشاہ کی ہمشرہ شہزادی گلبدن بیگم بھی اپنے بھائی کے ساتھ تھیں۔ شہزادی نے ہمایوں نامہ میں بخشو بلوچ کی امداد کا شکریہ ادا کیا ہے۔

ایران جاتے ہوئے شہنشاہ ہمایوں بلوچستان سے گزرا۔ جب وہ نوشکی پہنچا تو ایک بلوچ سردار ملک خطی نے اسے پناہ دی اور دوسرے دن اسے ایران کی سرحد پر چھوڑ کر آئے۔ شہنشاہ نے ملک خطی کو انعام کے طور پر ایک انمول ہیرا عطا کیا۔ جب جولائی ۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے تخت دہلی کے لیے دوبارہ ہندوستان پر چڑھائی کی تو اس کے لشکر میں چالیس ہزار بلوچ جوان تھے، جن کا سالار امیر چاکر خان رند کا بیٹا میر شاہ داد خان تھا۔ اکبر کے زمانے میں بلوچوں نے ملتان میں بغاوت کی، جسے فرو کرنے کے لیے اکبر نے اسمعیل خان کی کمان میں لشکر بھیجا۔ بلوچوں کی طرف سے غازی خان اور ابراہیم خان مقابلے میں آئے مگر شکست کھائی اور گرفتار کیے گئے۔ تاہم اکبر نے انہیں معاف کر دیا اور ان کے علاقے انہیں واپس کر دیے۔

شاہجہان نے بلوچوں کی شورش سے تنگ آ کر ملتان کا صوبہ اورنگ زیب کو دے دیا، جس نے

سے سنہری دور کہلاتا ہے۔  
 نصیر خان نے جون ۱۷۹۵ء میں انتقال کیا  
 اور اس کا بیٹا محمود خان چودہ سال کی عمر میں  
 بلوچستان کی مسند حکومت پر بیٹھا اور نا اہل ثابت  
 ہوا۔ بلوچستان کے مختلف علاقوں میں شورشیں  
 اٹھیں جن سے انتظام میں خلل واقع ہوا۔ آخر  
 ۱۸۲۱ء میں اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا معراب  
 خان تخت پر بیٹھا۔ یہ دور بے حد پر آشوب تھا۔  
 ہندوستان پر انگریز مسلط تھے اور پنجاب پر سہارا  
 رنجیت سنگھ قابض تھا۔ سارے ملک میں انتشار اور  
 فوضویت کا دور دورہ تھا۔

معراب خان [دوم] کو ۱۴ نومبر ۱۸۳۹ء میں  
 قتل کیا گیا۔ انگریز فوج کا سالار جنرل ول شائر  
 تھا۔ انگریزوں نے معراب خان کے بعد شاہ نواز خان  
 کو مسند حکومت پر بٹھایا جس سے قبائلی سرداروں میں  
 ہل چل مچ گئی۔ ۱۸۴۰ء میں بغاوت ہوئی۔ باغیوں  
 نے قلات کے قلعے پر حملہ کیا۔ انگریز فوجیوں کو  
 قتل کیا اور ان کے سپہ سالار کو گرفتار کر لیا۔ یہی  
 کچھ ڈھاڈر میں ہوا۔ اسی دوران میں نصیر خان ثانی  
 نے باغی لشکر کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور اسی اثنا  
 میں انگریزوں نے اپنی فوجی طاقت اکٹھی کی۔  
 انگریز فوج نے لفٹننٹ کرنل مارشل کی سرکردگی میں  
 کوٹرا کے مقام پر بلوچوں کو شکست دی۔ دسمبر  
 ۱۸۴۰ء میں نصیر خان ثانی اور انگریزوں کے  
 درمیان ایک سمجھوتا طے پایا۔ اول الذکر کو  
 انگریزوں نے قلات کا خان تسلیم کر لیا۔ مئی ۱۸۵۷ء  
 میں نصیر خان کی وفات ہوئی اور اس کی جگہ خداداد  
 خان نے لی، لیکن خداداد خان کے تعلقات انگریزوں  
 سے بگڑنے لگے اور اسے نومبر ۱۸۹۳ء میں بلوچستان  
 کی فرمانروائی سے الگ کر دیا گیا اور اس کی جگہ  
 اس کے بیٹے محمود خان ثانی کو مسند پر بٹھایا گیا۔  
 اس دور میں سارا انتظام حکومت انگریز ایجنٹوں اور

۱۱۰۶/۱۶۹۳ء کو باغی بلوچوں کی سرکوبی کی۔  
 میر چاکر رند کے بعد سب سے کچھ عرصہ رندوں  
 کا سیاسی غلبہ رہا لیکن رند سردار مہندا ایک کمزور  
 حکمران ثابت ہوا اور میروانی اور کنبرانی بلوچوں  
 نے مہندا کو قتل کر دیا اور قلات پر قابض ہو گئے  
 اور یوں بلوچستان پر براہوئیوں کا قبضہ ہو گیا۔  
 کچھ عرصے تک بلوچستان میں سیاسی افراتفری  
 کا سماں رہا۔ اسی افراتفری میں ایک براہوئی سردار  
 میر احمد ثانی بلوچستان کے سیاسی افق پر نمودار  
 ہوا۔ وہ براہوئی قبیلے کی کنبرانی شاخ سے تھا۔  
 میر احمد ثانی کے بعد براہوئی کی احمد زئی  
 شاخ سے پانچ سردار یکے بعد دیگرے قلات بلوچستان  
 پر قابض ہوئے، لیکن وہ بلوچستان کو سیاسی استحکام  
 نہ دے سکے۔

۱۷۱۳ء میں میر احمد ثانی کے بعد عبداللہ  
 خان نے قلات پر قبضہ کیا۔ ۱۷۳۰ء میں سندھ  
 کے کلہواڑہ حکمران میاں نور محمد کی فوجوں نے  
 عبداللہ خان کی فوجوں کو شکست دی اور اسے قتل  
 کر کے بلوچستان پر قبضہ کر لیا لیکن ۱۷۳۲ء میں  
 نادر شاہ نے بلوچستان کا صوبہ عبداللہ خان کے وارث  
 محبت خان کو دے دیا۔ مارچ ۱۷۴۰ء میں نادر شاہ  
 لاڑکانہ (سندھ) سے قندھار جاتے ہوئے بلوچستان سے گزرا۔  
 وہ ڈھاڈر، سب سے اور کوٹھے کے راستے قندھار پہنچا۔

عبداللہ خان کے بعد اس کا بیٹا نصیر خان  
 ۱۷۴۱ء میں بلوچستان پر قابض ہوا۔ وہ ایک  
 باتدیر اور بہادر سپہ سالار تھا۔ وہ اہل علم کا قدردان  
 تھا۔ اس نے بلوچستان کو استحکام بخشا۔ احمد شاہ  
 درانی سے اس کے مراسم ہمیشہ دوستانہ رہے۔  
 جب ۱۷۶۱ء میں احمد شاہ درانی نے پانی پت کے  
 میدان میں مرہٹوں کو شکست دی تو نصیر خان کا  
 بلوچ لشکر میدان کارزار میں پیش پیش تھا۔ نصیر  
 خان کا دور بلوچستان میں انتظامی اور سیاسی اعتبار



کا رقبہ چوالیس ہزار تین سو پینتالیس مربع میل تھا۔ (۳) تیسرے انتظامی حصے میں قلات، فاران، مکران اور لس بیلہ کی ریاستیں شامل تھیں، جن پر نواب اور خان حکمران تھے۔ ان ریاستوں کا رقبہ اٹھتر ہزار چونتیس مربع میل تھا۔

سارے بلوچستان کا کل رقبہ ایک لاکھ اکتیس ہزار آٹھ سو پچپن مربع میل ہے۔ وحدت مغربی پاکستان کے بعد بلوچستان کوٹھے اور قلات ڈویژنوں میں تقسیم ہے۔ ایجنسی مقبوضات اور ریاستیں ختم ہو چکی ہیں۔ سابق بلوچستان کا رقبہ مغربی پاکستان کے کل رقبے کا تینتالیس فی صد ہے اور پاکستان کے کل رقبے کا چھتیس فی صد۔ رقبے میں برطانیہ جزائر برطانیہ سے بڑا ہے، بلکہ یونان، سوئٹزرلینڈ، بلجیم اور ہالینڈ کے مشترکہ رقبے سے بھی زیادہ ہے۔

درہ بولان اور درہ مولا بلوچستان کے دو مشہور درے ہیں اور ان دروں سے مقدونی، ایرانی، عرب، غزنوی، غوری، مغل اور درانی لشکر برصغیر پاک و ہند میں وارد ہوتے رہے ہیں۔

بلوچستان کا صدر مقام کوٹھے ہے جو وادی شال کے وسط میں ہے۔ وادی شال کے شمال مشرق میں وادی ژوب اور لورالائی ہے۔ شمال میں پشین ہے، جنوب مشرق میں لس بیلہ اور مغرب میں چاغی، فاران، پنجگور اور دوسری وادیاں ہیں۔ کوہ سلیمان کے علاوہ چند دوسرے پہاڑ کوہ سیاہان، کوہ مالک سیاہ، کوہ کھیرتھر، کوہ پب، کوہ چاغی اور راس کوہ ہیں۔ مشہور دریا دریائے گومل، دریائے ہب، دریائے ہنگول، دریائے سوراب، دریائے پورالی، دریائے رخشان، دریائے لورالائی ہیں۔

کوٹھے، چمن، قلات، سبی، لورالائی، پشین، خضدار اور مستونگ کوٹھے و قلات ڈویژنوں کے مشہور شہر ہیں۔ بلوچستان کے اس وقت سات

ریجنٹوں کے ہاتھ میں تھا۔ تیس سال برائے نام حکومت کرنے کے بعد محمود خان ۱۹۲۳ء میں انتقال کر گیا تو اس کی جگہ اس کا وارث اعظم خان بلوچستان کا خان بنایا گیا۔ اعظم خان نے ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا؛ اس کی جگہ ۱۹۳۳ء سے ۱۹۵۵ء تک احمد یار خان نے بلوچستان پر حکومت کی۔ ۱۹۵۵ء میں وحدت مغربی پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور خان قلات کو حکومت پاکستان نے اعزازی طور پر کابینہ کے وزیر کا عہدہ دیا۔

مآخذ: سیاحوں کے سفرناموں کے لیے دیکھیے وہ

فہرست مآخذ جو (۱) A. Gabriel کی *Die Erforschung Persiens*، ویانا ۱۹۵۲ء، ص ۱۳۷ تا ۱۴۰، ۱۷۵ اور مقامات کثیرہ میں دی گئی ہے۔ نسلی تحقیقات کی بابت قب (۲) *The Baloch : M. Longworth Dames*، Race، لندن ۱۹۵۳ء؛ اور (۳) *The Origin of the Baloch*، در *JRASB*، ۱۸۹۵ء، تاریخ میں کچھ زیادہ نہیں ملتا۔ قرون قدیمہ کی بابت ہمارے مآخذ صرف وہ پراگندہ اور منتشر ملاحظات ہیں جو عربی کی مستند تاریخ اور جغرافیے کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ قرون مابعد کے لیے دیکھیے: (۴) *Elliot*، لندن ۱۸۶۷ء، *The History of India : and Dowson*، لندن ۱۸۷۷ء، خصوصاً ج ۱، ۲ اور ۵؛ (۵) *H. Raverty*، طبقات ناصری، ترجمہ اور حواشی، لندن ۱۸۸۱ء؛ (۶) *Life of Sir Sandeman : Thornton*، لندن ۱۸۹۰ء۔

(R. N. FRYE و [سلیم خان گئی])

(ج) رقبہ: قیام پاکستان سے پہلے بلوچستان تین انتظامی حصوں میں تقسیم تھا۔

(۱) برطانوی بلوچستان: براہ راست حکومت برطانیہ کے ماتحت تھا اور اس کا رقبہ نو ہزار چار سو چھتر مربع میل تھا۔ (۲) ایجنسی مقبوضہ: بلاواسطہ حکومت برطانیہ کے ماتحت تھا اور ان مقبوضات میں انگریز ایجنٹ متعین تھے۔ ان مقبوضات

یہاں ریگستان بھی ملتے ہیں اور نخلستان بھی۔ پہاڑی سلسلے بھی ہیں اور خوبصورت وادیاں بھی، دریا بھی ہیں اور میدان بھی۔ یہ خطہ گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سخت سرد ہوتا ہے۔ بلوچستان میں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ گرمیوں میں ایک ہوا چلتی ہے جسے لوار کہا جاتا ہے۔ سردیوں میں یخ آلود ہوا چلتی ہے جسے مقامی لوگ قندھاری ہوا یا گوریچ کہتے ہیں۔ لوگوں کا عام پیشہ کھیتی باڑی یا گلہ بانی ہے؛ اکثر لوگ خانہ بدوش ہیں اور موسم کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ گھر بدلتے رہتے ہیں۔

بلوچستان میں کئی بار زلزلے آچکے ہیں، ایک زلزلہ ۱۸۶۲ء میں اور دوسرا ۱۹۳۵ء میں آیا۔ آخری زلزلہ تمام زلزلوں سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوا۔

زرعی اور معدنی ترقی : مرکزی اور صوبائی حکومتیں اس وقت بلوچستان کے لوگوں کی خوش حالی کے لیے کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ کر رہی ہیں۔ پھلوں کی صنعت کی ترقی کے لیے سرکاری سطح پر کام ہو رہا ہے۔ جانوروں کی افزائش نسل کے لیے کئی منصوبے زیر عمل ہیں۔ بلوچستان میں معدنیات کی بھی کمی نہیں۔ حکومت معدنی دولت میں اضافے کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہی ہے۔ کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی معاشرتی بہبود کے لیے بھی کام ہو رہا ہے۔

مآخذ : متن میں آگئے ہیں۔

(سلیم خان گمی)

بلوچی : (زبان) : بعض مصنفوں کے نزدیک ⊗ بلوچی فارسی کی مسخ شدہ صورت ہے، مگر یہ غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچی فارسی سے زیادہ قدیم زبان ہے۔ موضع سریاب نزد کوئٹہ سے جتنا کتبے ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن کا رسم خط فارسی کے

ضلعے ہیں۔ مارا بلوچستان کوہستانی ہے، جس میں خوبصورت وادیاں اور نخلستان ہیں۔ صوبائی اور مرکزی حکومت بلوچستان کی ہر جہتی ترقی کے لیے کروڑوں روپیہ سالانہ صرف کر رہی ہے جس کی بدولت بلوچستان کا معیار زندگی بڑی سرعت سے بلند ہو رہا ہے۔

آبادی : آبادی کے اعتبار سے سب سے زیادہ بلوچ ایران میں ہیں، جہاں ان کی آبادی تیس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ روس میں بلوچوں کی آبادی دس لاکھ ہے۔ بلوچستان (پاکستان) میں ان کی آبادی بارہ لاکھ ہے۔ اس کے علاوہ سابق صوبہ سندھ میں آبادی کا پچاس فیصد بلوچ ہیں۔ بلوچ سابق صوبہ سرحد اور پنجاب میں بھی کثیر تعداد میں ہیں۔ حدود اربعہ : بلوچستان کے شمال میں افغانستان ہے، جنوب میں بحیرہ عرب، مشرق میں سابق صوبہ سرحد، سابق پنجاب اور سابق سندھ اور مغرب میں ایران ہے۔ بلوچستان اور وزیرستان کے درمیان بھی چالیس میل لمبی سرحد ہے۔ بلوچستان اور افغانستان کی سرحد سات سو بیس میل لمبی ہے۔ بحیرہ عرب کے ساتھ بلوچستان کی سرحد چار سو ستر میل ہے۔ سندھ، پنجاب اور صوبہ سرحد کے ساتھ بلوچستان کا سرحدی فاصلہ نو سو میل ہے۔ بلوچستان اور ایران کی مشترکہ سرحد پانچ سو بیس میل ہے۔

بلوچستان ایرانی سطح مرتفع کا جنوب مشرقی حصہ ہے، جو مشرق میں دشت کرمان اور کوہستان باشگرد سے سندھ و پنجاب کی حدوں تک پھیلا ہوا ہے۔ درہ بولان کوہ سلیمان اور مکران کے پہاڑی سلسلوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا ہے۔ چاغی کی پہاڑیاں بلوچستان اور افغانستان کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں۔

(۵) طبیعی حالات : بلوچستان عہد قدیم سے لے کر اب تک جغرافیائی نیرنگیوں کا خطہ رہا ہے۔



بلوچی نامہ چھپوائی - ۱۹۰۷ء میں لانگ ورتھ ڈیمز نے بلوچی زبان کے قدیم ادب پر مشتمل کتاب بہ عنوان "بلوچوں کی عوامی شاعری" لندن سے شائع کی جسے بلوچی کے کلاسیکی ادب میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس کی کتاب کا اردو ترجمہ مع حواشی جناب میر خدا بخش بھارانی مری بلوچ بارایٹ لاء نے بزم ثقافت کوئٹہ کے زیر اہتمام ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ ۱۹۱۰ء میں انگریزی بلوچی لغات کلکتے سے شائع ہوئی جو اب نایاب ہے۔ بلوچی ادب پر اردو زبان میں سب سے پہلی کتاب سلیم خان گمی نے بلوچی ادب کے عنوان سے لکھی، جو اردو اکیڈمی بہاول پور نے ۱۹۶۱ء میں شائع کی۔ انجم تزلباش اور عطا شاہ نے بھی بیرونی دنیا کو بلوچی زبان کے قدیم لوک ادب سے روشناس کرانے کے لیے قابل قدر کوششیں کی ہیں، ۱۹۶۹ء میں اردو ڈیولپمنٹ بورڈ نے عطا شاہ کی کتاب بلوچی نامہ شائع کی۔ کراچی کے بلوچ اسٹوڈنٹس، بلوچی ادب، ثقافت اور تاریخ کو متعارف کرانے کے لیے ہر سال پیما نامی مخزن اردو بلوچی میں نکالتے ہیں۔ بلوچی زبان کے قدیم رومان: ذیل میں بلوچی زبان کے چند قدیم رومانوں کے عنوان دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے اکثر رومان تاریخی ہیں اور ان کے کردار بلوچ تاریخ کے جیتے جاگتے سپوت ہیں۔ یہ لوک داستانیں بلوچی زبان کے شہری ادب کا انمول خزانہ ہیں۔

- ۱۔ خانی وشہ مرید؛ ۲۔ بی برگ و گران ناز؛
- ۳۔ ماہناز و شاہداد؛ ۴۔ محبت خان سومری؛
- ۵۔ دوستین و شیرین؛ ۶۔ سمو و توکلی مست۔

بلوچ جس خطے میں رہتے ہیں وہ جغرافیائی اور طبعی بوقلمونی کے لیے مشہور ہے۔ کہیں چٹیل اور برف آلود پہاڑ ہیں تو کہیں گہری گھاٹیاں، کہیں سپاٹ میدان ہیں تو کہیں ہنستی مسکراتی

بجائے روسی سے ملتا جلتا ہے اور ان میں بلوچی زبان کے الفاظ بھی ہیں۔ بلوچی ایک آزاد اور قائم بالذات زبان ہے اور موجودہ فارسی سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں۔ صوتی اعتبار سے بلوچی قدیم پہلوی کے بہت قریب ہے۔ عرب سیاحوں اور مؤرخوں نے لکھا ہے کہ مکران والے فارسی اور مکرانی زبان بولتے ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ مکرانی (بلوچی) فارسی سے الگ زبان ہے۔ لسانیات کے بعض ماہرین کے خیال میں بلوچی قدیم یاختریہ کی زبان ژند سے بے حد مماثلت رکھتی ہے۔ پاکستانی بلوچی زبان کے مختلف لہجے (dialects) ہیں، لیکن بڑے دو گروہ ہیں: مشرقی بلوچی، مغربی بلوچی۔ مشرقی بلوچی مشرقی بلوچستان کی زبان ہے اور مغربی بلوچی مکران کی زبان ہے۔ ان میں تھوڑا سا صوتی اختلاف ہے، مثلاً مشرقی زبان میں درع (= کھانا) کہا جاتا ہے۔ تو مغربی میں "درگ" کہا جاتا ہے۔ انگریزوں کے آنے کے بعد عملداروں نے بلوچی زبان پر بھی کچھ تحقیقی کام کیا۔ ٹرمپ نے بلوچی کے قواعد مرتب کیے۔ میجر ماکلر مکرانی بلوچی کے قواعد ضبط تحریر میں لایا۔ (۱۸۳۰ء) میں ایک انگریز فوجی لفٹننٹ لیچ نے بلوچی کی نظمیں ترجمہ کر کے کتابی صورت میں رائل ایشیائی سوسائٹی آف بنگال کے رسالے میں چھپوائیں۔ ۱۸۷۷ء میں برٹن کی کتاب *Sind Revisited* شائع ہوئی، جس میں تین بلوچی نظموں کا ترجمہ ہے۔ ۱۸۸۰ء میں ڈیمز نے کچھ بلوچی اشعار مع ترجمہ ایشیائی سوسائٹی آف بنگال کے رسالے میں شائع کروائے۔ ۱۸۹۱ء میں ڈیمز کی کتاب بلوچی ٹیکسٹ بک شائع ہوئی۔ اس میں بھی بلوچی اشعار ہیں۔ ٹی۔ ایم۔ میٹرنے بھی *Balochi Classics* شائع کی، جس میں اس نے بلوچی اشعار مع ترجمہ دیے ہیں۔ رائے بہادر ہیتو رام نے ۱۸۸۱ء میں لاہور سے اپنی کتاب

لیلی سور: یہ خاص طور پر جدائی کا گیت ہے اور اسے چاہنے والا گاتا ہے، لیکن اس میں ہر قسم کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اسے عموماً مرد گاتے ہیں۔

ڈیہی: یہ گلہ بانوں اور شتربانوں کا طریقہ گیت ہے جو موسم بہار میں گایا جاتا ہے اور پنجابی گیت ”بولی“ سے بہت حد تک ملتا جلتا ہے۔ ڈیہی مری اور بگٹی قبیلوں کے جوانوں میں بہت مقبول ہے۔ اس میں ”ڈیہی“ لفظ کی تکرار بھی ہوتی ہے۔

لیکو: شتربانوں کا جدائی کا گیت ہے۔ جب شتربان اپنے اونٹ لے کر تاریک راتوں میں طویل سفر پر روانہ ہوتے ہیں تو انہیں گھر کا آرام اور محبوبہ کا دلنواز چہرہ یاد آ جاتا ہے، چنانچہ جدائی اور دوری کی کسک دور کرنے کے لیے لیکو گاتے ہیں اور یوں ان کا سفر آسان ہو جاتا ہے، اسے ”لیکو“ یا ”ڈلیکو“ بھی کہا جاتا ہے۔

داستانک: اسے داستانہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی فنی ساخت ”ڈوھیڑو“ سے مشابہ ہے اور مشہور بلوچ ساز نثر (نر) کے ساتھ گایا جاتا ہے۔ داستانک گانے والا نثر بجانے والے کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر دونوں مل کر محفل گرماتے ہیں۔ داستانک بلوچ چرواہوں میں بہت مقبول ہے۔ مضمون کے لحاظ سے اس میں محبوب کی تعریف ہوتی ہے اس کے علاوہ کسی بہادر کی تعریف بھی کی جاتی ہے۔

سپت: یہ اصل میں حمد و نعت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی تعریف کی جاتی ہے اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیا جاتا ہے۔ لفظ ”صفت“ کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ یہ گیت بنگالی گیت مرشدی و معرفتی اور سندھی ”مداح“ سے کسی حد تک مماثلت رکھتا ہے۔

وادیوں، کہیں گنگناتے چشمے ہیں تو کہیں تپتے ریگستان۔ اگر قندھاری ہوا برف ساتھ لاتی ہے تو ریگستان کی تیز آندھی آگ برساتی آتی ہے۔ ان حالات میں گیت ان کی روح کی آواز بن جاتے ہیں۔ ذیل میں ان گیتوں کا خاکہ پیش کیا جاتا ہے، جو عورتوں، مردوں اور بچوں میں یکساں مقبول ہیں۔

لاڈوگ: یہ طریقہ گیت ہے جسے بہت سی عورتیں مل کر ڈھولک پر گاتی ہیں۔ عموماً شادی بیاہ کے موقع پر گایا جاتا ہے۔ یہ گیت بیٹے کی پیدائش پر بھی گائے جاتے ہیں۔ قدیم زمانے میں جب ایک قبیلہ دوسرے قبیلے پر فتح پا لیتا تھا تو بھی لاڈوگ گایا جاتا تھا، ان میں ”لڑے“، ”لاڑے“، ”لاڑو“ وغیرہ الفاظ کی برابر تکرار رہتی ہے، اس لیے اس پر ”لاڈو“ یا ”لاڈوگ“ کا نام پڑا ہے۔

زہیروک: یہ المیہ گیت ہے اور بغیر کسی ساز کی سنگت کے گایا جاتا ہے۔ محبوبہ محبوب سے بچھڑ جائے تو گاتی ہے۔ اور اگر شوہر کہیں دور نوکری پر چلا جائے تو وفاشعار بیوی اس کی یاد میں زہیروک گاتی ہے۔

سوت: یہ طریقہ گیت ہے جو شادی بیاہ کے موقع پر بہت سے دیہاتی مل کر گاتے ہیں۔ جب فصل پک جاتی ہے تو کسان اور کاشتکار فصل پکنے کی خوشی میں کھیتوں اور باغوں میں گاتے ہیں۔ بنیادی طور پر ’سوت‘ اور ’لاڈو‘ میں کوئی خاص فرق نہیں۔

حالو: یہ طریقہ گیت بھی ہے اور رقص بھی۔ جب کسی سردار کے گھر بیٹا پیدا ہوتا ہے تو قبیلے کے لوگ حالو گ کر اور ناچ کر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی گایا جاتا ہے۔ اس میں ”حالو حالو“ کی مسلسل تکرار ہوتی ہے۔



ہوں“، ”مورو گا رہی ہوں“۔

گیتار: بلوچی میں کسی شاعر کے عشقیہ کلام کو گیتار کہتے ہیں۔ ہم اسے اردو میں غزل کہیں گے۔

بلوچی ادب میر چاکر رند کے عہد میں : اس دور کے پہلے کا بلوچی ادب نہیں ملتا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس سے پہلے کوئی شاعر گزرا ہی نہ ہوگا، لیکن کلام دستیاب نہیں ہوا۔ اس عہد کا جو کلام ملا ہے اس کا تعلق رزمیہ سے ہے۔ اس ادب کا محور بلوچوں کی تیس سال جنگ ہے، جو رند اور لاشار قبیلوں کے درمیان

۱۳۹۰ء سے ۱۵۲۰ء تک لڑی گئی۔ اس لڑائی کے بعد بلوچوں کی طاقت کمزور ہوگئی۔ شاہ بیگ ارغون نے سبی پر قبضہ کیا اور میر چاکر رند نے بلوچستان سے نکل کر پنجاب پر دھاوے کیے اور

ملتان میں اقامت گزریں ہوا۔ جب شہنشاہ ہمایوں نے ۱۵۵۵ء میں دوبارہ تخت دہلی پر قبضہ کیا تو میر چاکر رند کا بیٹا میر شہداد خان شہنشاہ ہمایوں کے ہمراہ تھا۔ دہلی پر حملے کے وقت جو

رزمیہ نظمیں کہی گئیں وہ بلوچی ادب کا سرمایہ ہیں۔ جن رزمیہ نظموں کو بعض لوگ میر جلال خان کے عہد کی نظمیں بتاتے ہیں وہ دراصل میر چاکر رند کے عہد میں تخلیق ہوئیں۔ ان کے

تخلیق کرنے والے اس دور کے بلوچ شاعر یا بلوچوں کے لوڑی تھے۔ انہوں نے مکالماتی انداز میں نظمیں کہی ہیں، جیسے میر چاکر خان کہہ رہا ہے یا

میر گہرام خان کہہ رہا ہے۔ اس سے غلط فہمی ہوئی ہے اور میر چاکر خان وغیرہ کو شاعر سمجھا گیا ہے۔ رزمیہ نظمیں اور رومانوی داستانیں مغربی پاکستان کی ہر زبان میں ملتی ہیں۔

وہاں کسی نے یہ نہیں سمجھا کہ سب مرکزی کردار شاعر ہیں؛ حالانکہ وہاں بھی مکالمے ہوتے ہیں، اس دور کی نظموں کے حقیقی شعرا کے نام بہت

لوی : بلوچی میں لوری کو لوی کہا جاتا ہے۔ یہ گیت مائیں اوز بہنیں، بیٹوں اور بھائیوں کو ملانے کے لیے گاتی ہیں۔ لوی میں بلوچ بچوں کو بہادری، شجاعت، غیرت اور مہمانداری کا درس دیا جاتا ہے۔ مکرانی بلوچ اسے ”لیلو“ کہتے ہیں۔

موتک: [= مرثیہ] اس میں مرنے والے پر رنج اور غم کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کا ہیبتی آہنگ بڑی حد تک زہیروک سے مماثلت رکھتا ہے۔ اسے مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے، مثلاً موتیک، موتک، مودگ وغیرہ۔

شیر: طویل رزمیہ نظم کو شیر کہتے ہیں۔ شیر میں کسی قبائلی سردار کی بہادری کا واقعہ ہوتا ہے۔ شیر میں عموماً تاریخی واقعات پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

نازک: یہ گیت عورتیں خوشی کے موقع پر مل کر گاتی ہیں۔ شادی کے موقع پر جو نازک گائے جاتے ہیں ان میں دولہا کے حسن و جمال کی بھی تعریف ہوتی ہے اور بہادری کی بھی۔

لیلڑی: پنجابی ماہیا کی طرح لیلڑی عشقیہ گیت ہے، جسے دیہاتی نوجوان موسم بہار میں گتے ہیں۔ اس میں لفظ ”لیلڑی“ کی تکرار ہوتی ہے۔ الگ الگ مصرعوں کا مطلب تو واضح ہوتا ہے، لیکن پورا گیت اکثر غیر مربوط ہو جاتا ہے۔

سندھی میں بھی اس کا رواج ہے۔ مورو: دیہات میں ایک لڑکا مرد بن جاتا ہے اور دوسرا عورت اور پھر وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ کر باری باری گاتے ہیں۔ یہ اصل میں دوگانا ہے، جس میں پیار اور محبت کی زبان سے ایک دوسرے

پر ہلکی ہلکی چوٹیں کی جاتی ہیں۔ شوخی و طراری اس گیت کی جان ہے۔ اس میں ہر بند کے بعد سندرجہ ذیل فوروں میں ایک کی تکرار ہوتی

ہے: ”مورو ڈھولیا مورو“، ”مورو دے رہا

اس دور کا عظیم شاعر جام درک ہے، جو ڈوبکی قبیلے سے تھا۔ اس کا تعلق قلات کے خان نصیر خان نوری کے دربار سے تھا، جو ۱۷۵۰ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ آفتاب بن کر بلوچی ادب کے افق پر چمکا۔ اسے ملک الشعرا کہا جاتا ہے۔ عشق کی وجہ سے اس کے کلام میں درد اور سوز ہے۔ وہ تمام بلوچی شعرا سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ اس کی زبان صاف اور شستہ ہے۔ اس کے کلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس نے امیر طبقے کی خواتین کا سراپا کھینچا ہے، جو ڈھاڈھر کے بازار میں سودا خریدنے آتی تھیں۔ اس سے پہلے کسی بھی بلوچی شعر میں ایسی چیز نہیں ملتی۔ بلوچی میں وہ تغزل کا شہزادہ کہلاتا ہے، کیونکہ اس نے حسن و جمال کی تصویر بڑے عمدہ انداز میں پیش کی ہے۔

اس عہد کے دوسرے شاعر حسب ذیل ہیں: ۱۔ شاعرہ 'بانک سیمک'؛ ۲۔ شاعرہ 'رانی'؛ ۳۔ شاعرہ 'حانی'؛ ۴۔ شہ عیسیٰ؛ ۵۔ شہ یار؛ ۶۔ بیمار مری؛ ۷۔ میر اشرف؛ ۸۔ سوہندہ سورهیانی؛ ۹۔ کوئل جت؛ ۱۰۔ ملا ابراہیم۔

خوانین قلات کی درباری زبان فارسی تھی، اس وجہ سے فارسی شاعری کا بھی عام رواج ہوا۔ اس دور کے مندرجہ ذیل فارسی شعرا کے نام قابل ذکر ہیں: ۱۔ قاضی نور محمد؛ ۲۔ گل محمد ناطق مکرانی؛ ۳۔ مرزا احمد علی؛ ۴۔ سید محمد تقی شاہ؛ ۵۔ گل محمد زیب؛ ۶۔ ملا محمد حسن براہوئی؛ ۷۔ مولا داد؛ ۸۔ علیم اللہ علیم؛ ۹۔ رسول بخش رہی۔

اس زمانے میں مکران میں ذکری فرقے کے بہت سے فارسی شعرا ملتے ہیں۔ ان میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں:-

(۱) شے محمد درخشان؛ (۲) میر عبد اللہ جنگی؛ (۳) شے سلیمان؛ (۴) شے جلال؛ (۵) شے نصیر الدین؛

کم ملتے ہیں۔ ایک نظم کے لیے ڈیمز نے لکھا ہے کہ کسی ڈوبکی شاعر کی ہے، دوسری کے لیے لکھا ہے کہ کسی رند شاعر کی ہے۔ اس دور کے حسب ذیل شعرا کے نام ملتے ہیں: ۱۔ قلاتی بن حبیب؛ ۲۔ نودہ بن بہرام؛ ۳۔ چاکر خان رند؛ ۴۔ بی برگ؛ ۵۔ شہداد؛ ۶۔ ریحان؛ ۷۔ ماہناز۔

خوانین قلات کا عہد: میر چاکر رند کے انتقال کے بعد بلوچوں کا ادبی مرکز ختم ہو گیا اور رزمیہ شاعری کا بھی زوال شروع ہوا۔ اس کے بعد بلوچی شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ رزمیہ شاعری کے ساتھ خالص عشقیہ شاعری بھی ہونے لگی؛ بلکہ عشقیہ شاعری زیادہ ترقی کرتی رہی۔ عشقیہ شاعری کے سلسلے میں نہ صرف عوام کی زندگی کی ترجمانی کی گئی بلکہ امیر طبقے کی زندگی کی عکاسی بھی کی گئی۔ اس دور کی رزمیہ نظمیں بلوچ قبائل کے درمیان چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے متعلق ہیں۔ سترھویں صدی عیسوی کی ایک نظم ملتی ہے جو مکران کے کلمتوں اور برفتوں کی جنگ کے متعلق ہے۔ اس دور کی رومانوی داستان "لہ و گراناز" ہے۔ یہ واقعہ سترھویں صدی میں ہوا اور مکران کی سرزمین سے تعلق رکھتا ہے۔ اس دور میں اس رومانوی داستان اور دوسری رومانوی داستانوں پر نظمیں کہی گئیں۔ سترھویں صدی کا شاعر عثمان کلمتے ہے، جو مکران کا رہنے والا ہے۔ اس کا رزمیہ کلام کلمتی بلوچوں اور پرتگیزوں کی بحری جنگوں کے متعلق ہے۔ لوگوں نے اس کا کلام غلط فہمی سے "حمل جینو کلمتی" سے منسوب کیا ہے، جو اس لڑائی میں لڑتا ہوا شہید ہوا۔ ایک حمل رند مشرقی بلوچستان میں بھی ہوا ہے۔ وہ بھی مشہور بہادر تھا اور اس نے شیر سے بھی مقابلہ کیا تھا۔ اس کے متعلق ایک نظم ملتی ہے جو اٹھارھویں صدی کی ہے، اسے حمل رند کی کہی ہوئی نظم سمجھا گیا ہے۔



(۶) میر علی شیر جنگی؛ (۷) خوش قدم جنگی؛ (۸) شے گل محمد؛ (۹) نور محمد؛ (۱۰) ملا ابوبکر؛ (۱۱) ملا مددی خان۔

انگریزی عہد: ۱۸۳۹ء میں انگریزی فوج کوٹھے پہنچی اور خان سے ایک معاہدہ کیا گیا۔ اس کے باوجود انگریزوں نے ۱۸۳۹ء میں قلات پر حملہ کر دیا اور ۱۸۴۵ء میں بلوچستان پر پورے طور پر قابض ہو گئے۔ یہ دور جاہلیت کا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بلوچوں کا سیاسی اور معاشرتی انحطاط اپنی تمام خرابیوں سمیت کالے بادل کی طرح بلوچستان کے افق پر چھا چکا تھا۔ انگریزوں نے ہندوؤں کے زور سے ۱۹۴۷ء تک بلوچستان پر حکومت کی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ بلوچی شعرا کا میلان تصوف اور اخلاقیات کی طرف ہوا۔ اس وجہ سے اس دور کی شاعری زیادہ تر مذہبی ہے۔ نعتوں، معجزوں کے بیان اور مدحوں کا بڑا ذخیرہ ملتا ہے۔ اس دور میں بلوچی شاعری پر سندھی اور سرائیکی شاعری کا اثر پڑا، جس کی وجہ سے اس میں زیادہ رنگینی اور دلکشی پیدا ہوئی۔ مکرانی بلوچی پر فارسی کا اثر ہوا۔ بہر حال اس دور میں بلوچی شاعری نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ اس دور میں شعری نظریات کے پیش نظر دو مکاتب فکر نظر آتے ہیں: مشرقی اور مغربی۔ مشرقی مکتب فکر پر سرائیکی اور سندھی کا اثر ہے۔ اس میں فطری جذبات اور احساسات کی عکاسی کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔ اس مکتب فکر کا عظیم شاعر مست توکلی (م ۱۸۹۶ء) ہے۔ وہ حسن اور عشق کا شاعر ہے۔ اس کا انداز بیان شگفتہ اور دل آویز ہے۔ اس مکتب فکر کے دوسرے شعرا حسب ذیل ہیں:-

(۱) ابراہیم شهبانی؛ (۲) لشکر خان جسکانی؛ (۳) جیوا کرد؛ (۴) حیدر بالاچانی؛ (۵) رحم علی مری؛ (۶) ملا عمر مری؛ (۷) خدا بخش مری؛

(۸) پنجو بنگلانی؛ (۹) پہلوان فقیر؛ (۱۰) احمد ولد شوران؛ (۱۱) غلام محمد بالاچانی؛ (۱۲) چکھا بزدار؛ (۱۳) سنگت؛ (۱۴) مندو کھیری؛ (۱۵) جوانسال۔

مغربی مکتب فکر کے شعرا میں مکران کے شعرا آتے ہیں جو انیسویں صدی میں گزرے ہیں۔ ان میں زیادہ تر عالم تھے اور انہیں ملا کہا جاتا تھا۔ اس لیے ان کو ملاؤں کا مکتب فکر بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے علم عروض کے مطابق شعر کہے ہیں اور ان کے کلام میں فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ وہ نظم کے شروع میں حمد اور نعت لاتے ہیں، اس کے بعد مقصد پر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں عقاب یا کبوتر سے خطاب بھی اکثر ملتا ہے۔ اس مکتب فکر کا بلند پایہ شاعر ملا فاضل (م ۱۸۸۵ء) ہے۔ اس کے کلام میں بڑی رنگینی اور دلکشی ہے۔ عزت پنجگوری بھی اس مکتب فکر کا بہت بڑا شاعر ہے۔ اس نے غزلیں بڑی اچھی کہی ہیں۔ اس مکتب فکر کے دوسرے شعرا حسب ذیل ہیں:

(۱) ملا قاسم؛ (۲) ملا نور محمد بمپشتی؛ (۳) ملا اسماعیل؛ (۴) رگم وشی؛ (۵) ملا بوہیر؛ (۶) ملا بہادر مراستانی؛ (۷) سید نور شاہ؛ (۸) ملا رحیم۔

قیام پاکستان کے بعد: ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم کے بعد سب سے پہلے ریڈیو پاکستان کراچی نے بلوچی نشریات کا ایک مخصوص پروگرام مرتب کیا، جس میں ہر قسم کے مضامین کو بلوچی میں نشر کرنے کی کوشش کی گئی۔ جن لوگوں کو کراچی ریڈیو کے بلوچی پروگراموں میں مقبولیت حاصل ہوئی وہ پہلے ایک دوسرے سے ملے، بعد ازاں بلوچی زبان سے دلچسپی رکھنے والے عوام سے مل کر انہوں نے ایک ادبی انجمن کی بنیاد ڈالی اور تھوڑے ہی دنوں میں دو ادبی مجلے بلوچی اور اومان منظر عام پر آ گئے۔ یہ نقشب اولین تھا۔ پھر ان کی جگہ ماہنامہ اولس اور ہفت روزہ نوکین دور نے لے لی۔

نظم ہے: ۵۔ عبدالرحیم صابر: اس کی غزلیں سادگی اور روانی کی وجہ سے مقبول ہیں۔ عام طور پر چھوٹی بحروں میں طبع آزمائی کرتا ہے: ۶۔ ظہور شاہ ہاشمی: اس کی غزلوں میں جمالیاتی عنصر نمایاں ہے۔ [اس کے کلام کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں: (۱) انگرہ ترونگل، ۱۹۶۱ء؛ (۲) برتکگین بیر، ۱۹۶۲ء؛ (۳) تراپکین ترسپ، ۱۹۶۲ اور ۱۹۶۵ء؛ ۷۔ احمد زہیر: اس کی غزلوں میں آنسو ہیں، تڑپ ہے اور ایک مسلسل تلاش ہے: ۸۔ محمد حسین عنقا: آج کل زیادہ تر غزل لکھتا ہے۔ اس کی غزلیں داخلیت اور خارجیت دونوں پہلو لیے ہوئے ہیں: ۹۔ مراد ساحر: داخلیت کم اور خارجی ماحول کا اثر زیادہ ہے۔ اس کی قومی شاعری میں رچاؤ اور ولولہ ہے: ۱۰۔ احمد جگر: غزل گو شاعر ہے: ۱۱۔ عاجز: حمد و نعمت لکھتا ہے: ۱۲۔ یکس: بھی حمد و نعمت لکھتا ہے: ۱۳۔ احمد حقانی: قومی نظمیں لکھتا ہے: ۱۴۔ میر عیسیٰ قومی: پرانا شاعر ہے۔ اس کے کلام میں قومی رنگ ملتا ہے۔

[نثری ادب: آزادی سے پہلے درخوانی علما نے بلوچی میں مذہبی کتابیں شائع کی تھیں۔ بائبل کے ایک حصے کا بلوچی ترجمہ بھی شائع ہوا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بلوچی نثر ترقی کر رہی ہے۔ میر گل خان نصیر، محمد حسین عنقا، قاضی عبدالرحیم صابر، خیر محمد ندوی اور ظہور شاہ سید نے بلوچی نثر کا آغاز کیا ہے۔ اب بلوچی نثر لکھنے والے خاصی تعداد میں ملتے ہیں۔ مندرجہ ذیل کے نام قابل ذکر ہیں: عبدالرحمن غور، میر مٹھا خان، ملک محمد رمضان بلوچ، عبدالغفار ندیم گچکی، عبداللہ جمال دینی، میر شیر محمد مری، سردار خان گشکوری، پیر محمد زبیرانی، اکبر بارکزئی، م۔ طاہر، ایم بیگ، عبدالحکیم شاہ بیگ رند، مہر علی، میر عبدالملک، احمد علی، غوث بخش صابر، محمد بخش

ان رسائل و جرائد نے سب سے بڑی خدمت یہ انجام دی ہے کہ بلوچی نثر میں مضامین اور افسانے لکھے جا رہے ہیں اس سے پہلے بلوچی نثر کی حالت قطعی طور پر ناگفتہ بہ تھی۔

اسی اثنا میں ریڈیو پاکستان کوئٹہ کا قیام عمل میں آیا جہاں سے بلوچی نشریات کا آغاز ہوا۔ اور یوں بلوچی ادب و ثقافت کی زلف پریشان سنورنے لگی۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک جو شعرا نامور ہوئے ان کے نام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ گل خان نصیر: [اس نے ہیئت کے نئے نئے تجربے کیے ہیں اور بلوچی شعر کی پرانی ہیئت کو بھی نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کا مشاہدہ گہرا اور وسیع ہے۔] نظم گو شاعر ہے۔ رزمیہ شاعری بھی کی ہے۔ ”شیطان“، ”خواب میں جام درک سے ایک ملاقات“، ”کوہ چہلتن“ سے خطاب [اچھی نظمیں ہیں۔ ”جنگ، گوک پرورش“ رزمیہ شاعری کا اچھا نمونہ ہے۔] اس کے کلام کے تین مجموعے چھپ چکے ہیں: (الف) گلبانگ؛ (ب) شب گروک؛ (ج) شیریں دوستیں؛ ۲۔ آزاد جمال دینی: اپنی نظم کی سادگی اور روانی کی وجہ سے ممتاز ہے۔ جاگیرداری اور سرداریت کے خلاف، ترقی پسند۔ [اس کے کلام کا ایک مجموعہ مست؛ توار اردو ترجمے کے ساتھ شائع ہوا ہے؛ ۳۔ عطا شاد: اس کی نظموں میں سوز و گداز کے ساتھ ترنم کا عنصر نمایاں ہے۔ ہمیشہ نئی راہیں تلاش کرتا ہے۔ نئے موضوعات ڈھونڈتا ہے، جو انسان کی داخلیت سے وابستہ ہوتے ہیں۔ زہرانی رازہ (گریہ آرزو) مشہور نظم ہے۔ جمالیاتی حظ کو غزل کا اہم ترین عنصر سمجھتا ہے۔ وہی سوز و گداز جو اس کی نظموں میں نمایاں ہے غزلوں میں بھی کارفرما نظر آتا ہے؛ ۴۔ اسحق شمیم: فارسی آمیز زبان استعمال کرتا ہے۔ دلہن اس کی مشہور



بلوچی دنیا، مارچ ۱۹۶۰ء؛ (۱۱) عبدالصمد امیری :  
 بلوچ نسل کی تاریخ، درماہنامہ بلوچی دنیا، جون ۱۹۶۰ء؛  
 (۱۲) سلیم خان گمی : بلوچی لوک گیت، مقالہ  
 بہ زبان انگریزی در *Pakistan Quarterly*، کراچی  
 ۱۹۵۹ء؛ (۱۳) وہی مصنف : بلوچی رزمیہ شاعری،  
 در روزنامہ امروز، لاہور، ۲۳ مارچ ۱۹۶۰ء؛ (۱۴) وہی  
 مصنف : بلوچی ادب، مطبوعہ اردو اکادمی، بہاولپور  
 ۱۹۶۱ء؛ (۱۵) وہی مصنف : جدید بلوچی شاعر،  
 روزنامہ امروز، لاہور ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۰ء؛ (۱۶) آر۔  
 سی۔ ٹمپل Temple : میر چاکر کے کارنامے، بشمول  
 حکایات پنجاب، حصہ دوم، مجلس ترقی ادب لاہور  
 ۱۹۶۲ء؛ (۱۷) انور رومان : آئینہ بلوچ، قصر الادب،  
 جکو والا (شجاع آباد، ضلع ملتان)؛ (۱۸) خیابان پاک،  
 ادارہ مطبوعات پاکستان، کراچی ۱۹۵۶ء؛ (۱۹) میمن  
 عبدالمجید سندھی : تاریخ بلوچی ادب، مقالہ ”تاریخ  
 ادبیات پاک و ہند“، زیر ترتیب شعبہ تاریخ ادبیات،  
 پنجاب یونیورسٹی]۔

(سلیم خان گمی [و ادارہ])

بَلَوْدِن : [ = بَلَوَادِن ] رَک بُولَوَادِن .

بَلَوُغ : رَک بہ بِالِغ .

بَلَوُک : رَک بہ بُولَوُک .

بَلَوُک بَاشِی : رَک بہ بُولَوُک بَاشِی .

بَلَوِيہ : رَک بہ پَلَوِيہ .

بَلَوُہر و یوداسف : ایک عربی کتاب بلوہر

و یوداسف (= یوداسف) کے دو بڑے کردار۔ یہ کتاب  
 دراصل گوتم بدھ کے روایتی حالات زندگی پر مبنی  
 ہے اور بعد میں مسیحی قصہ *Balaman* و *Josaphat*  
 بھی اسی کے نمونے پر لکھا گیا۔

داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان میں  
 سولابٹ (یعنی کپل وستو) کے ایک عرصے تک  
 بے اولاد ہندو راجا جانائیسر [سدودھن] کے گھر

لہڑی۔ ذیل میں ان نوجوانوں کے نام دیے جاتے  
 ہیں جو انسانے اور ڈرامے لکھتے ہیں : نعمت اللہ  
 گچکی، قرۃ العین طاہر، صورت خان مری، نسیم دشتی،  
 مومن بزدار، رحیم صادق، عطا شاد، غوث بخش صابر  
 اور عصمت جمال دینی۔ مندرجہ ذیل کتابیں بھی  
 شائع ہو چکی ہیں : (۱) میر شیر محمد مری :  
 کہنیں بلوچی شاعری، کاردار بلوچی اکیڈمی،  
 کراچی؛ (۲) بلوچی زہگ بلو؛ (۳) مستاک؛  
 (۴) بلوچی زبان و ادب تاریک۔ یہ تینوں کتابیں  
 بلوچی اکیڈمی، کراچی کی طرف سے شائع ہوئی ہیں؛  
 (۵) میجر ماکلر : بلوچی گرامر مترجمہ ایم بیگ  
 بلوچ، بلوچی اکیڈمی، کراچی؛ (۶) بشیر احمد :  
 جام درک، بوچی اکیڈمی، کوئٹہ؛ (۷) سبتگین  
 دستونک، کراچی سے شائع ہوئی؛ ۹۔ بلوچی  
 سیاہگ، کراچی؛ ۱۰۔ بلوچی بنگیچی؛ کراچی]۔

مآخذ : (الف) زبان : (۱) ڈاکٹر نبی بخش خان

بلوچ : بلوچی ادب، در *Cultural Heritage of Pakistan*،  
 کراچی ۱۹۵۵ء؛ (۲) امرت لال عشرت : ادب و زبان،  
 در ماہ نو، کراچی، ستمبر ۱۹۶۵ء؛ (۳) محمد حسین عنقا :  
 بلوچی زبان کی تاریخ و طرز نوشت، در ماہنامہ بلوچی دنیا،  
 ضلع ملتان، اگست۔ ستمبر ۱۹۶۰ء؛ (۴) میر خدا بخش  
 بھارانی : قدیم بلوچی شاعری، بزم ثقافت، کوئٹہ ۱۹۶۳ء؛  
 (ب) ادب : (۵) سردار محمد خان گشکوری :  
*History of the Baluchis and Baluchistan*، کراچی  
 ۱۹۵۸ء؛ (۶) ایم لونگ ورتھ ڈیمز : *Popular*  
*History of the Balochs*، مطبوعہ رائل ایشیائی  
 سوسائٹی، لندن ۱۹۰۷ء؛ (۷) ہتورام، رامے بہادر :  
 تواریخ بلوچستان، لاہور ۱۹۰۷ء؛ (۸) خالد کلیم :  
 اہل بلوچستان، در روزنامہ نوائے وقت، لاہور ۱۵  
 اپریل ۱۹۶۷ء؛ (۹) ماہنامہ بلوچی دنیا، جکو والا، ضلع  
 ملتان کا ثقافت نمبر جنوری۔ فروری ۱۹۶۰ء؛ (۱۰) میر  
 محمد حسین عنقا : بلوچ نسل کی تاریخ، در ماہنامہ

مندرجہ ذیل فہرست میں یہ دکھایا گیا ہے کہ عربی کے تین باقی ماندہ نسخوں اور گرجی اور عیسائی یونانی نسخوں میں جو انہیں سے ماخوذ ہیں زیادہ اہم تمثیلی حکایتیں اور قصے کتنی کتنی دفعہ آتے ہیں :

جدول نمبر ۱

داستان یونانی گرجی بمبئی ابن ہالے Halle (یروشلم) عربی بابویہ تلخیص

۱	۱	۱	۱	۲	موت کا ڈھول
۲	۲	۲	۲	۳	چار صندوقچے
۳	۳	۳	۳	۱	کاشت کار ہاتھی اور گڑھے
۴	۴	۵	۴	۵	میں گرا ہوا ادبی
۵	۵	۶	۵	۶	تین دوست ایک سال کی
۶	۶	۷	۶	۷	بادشاہت
۷	۷	۸	۷	-	گتے اور مردار
۸	۸	۹	۸	-	معالج اور مریض
۹	۹	۹	۹	۸	آفتاب عقل بادشاہ، وزیر اور خوش و خورم
۱۰	۱۰	۱۰	۱۰	۹	میاں غریب بیوی دولت مند نوجوان اور
-	۱۱	۱۱	۱۱	۱۰	بھکاری کی بیٹی
۱۱	۱۲	۱۲	۱۲	۱۱	چڑی مار اور بلبیل
-	-	۱۳	۱۳	۱۲	پالتو ہرن
-	-	۱۴	۱۴	۱۱	دشمنوں کا لباس
-	-	۱۵	۱۵	-	عاشق مزاج بیوی
-	-	۱۶	۱۶	۱۳	چڑیل عورتیں

کتاب بلوہر و یوداسف کسی ہندوستانی بدھ تصنیف کا براہ راست ترجمہ نہیں ہے، بلکہ مختلف ماخذ سے مرتب کی گئی ہے اور بدھ کی اسطوری

محیر العقول طریقے سے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ راجا اس کا نام یوداسف (بہتر قرات = یوداسف = بودھ ستوا) رکھتا ہے۔ ایک نجومی پیش گوئی کرتا ہے کہ اس راج کمار کو دنیوی عظمت حاصل نہ ہوگی، لہذا راجا اس بچے کو انسانی دکھ درد سے بے خبر رکھنے کے لیے ایک علیحدہ شہر میں بھیج دیتا ہے۔ بڑا ہو کر یوداسف اپنی اس نظر بندی سے گھبرا جاتا ہے اور اصرار کرتا ہے کہ اسے باہر نکلنے کی اجازت دی جائے، چنانچہ وہ سوار ہو کر باہر نکلتا ہے تو اسے دو بیمار و کمزور آدمی اور پھر ایک اباہج انسان نظر آتا ہے، اور اس طرح اسے انسانی کمزوری اور موت کا علم ہو جاتا ہے۔ بعد ازاں سرانندیب (لنکا) کا مقدس راہب بلوہر بھیس بدل کر اس کے سامنے آتا ہے اور یوداسف کو نصیحت آموز فرضی کہانیاں سنا کر اسے وجود انسانی کی بے ثباتی اور راہبانہ زندگی کی برتری کا یقین دلاتا ہے۔ بلوہر شہرت و دولت، خور و نوش میں الہماک، شہوانی لذات اور تمام مسرات جسمانی کا ذکر تحقیر سے کرتا ہے۔ وہ ایک مبہم قسم کی خدا پرستی اور عقیدہ بقائے دوام کی تلقین کرتا ہے۔

راجا جانانیسر [سدودھن] بلوہر سے ناراض ہوتا ہے اور یوداسف کے تبدیلی عقائد کی مخالفت کرتا ہے۔ نجومی راکس اور ہندو سادھو البھون کی کوششوں کے باوجود راجا عقیدہ مذہبی کے بارے میں ایک فرضی مباحثے میں ہار جاتا ہے اور خود بھی بلوہر کا معتقد بن جاتا ہے۔ یوداسف اپنی شاہانہ شان و شوکت کو خیر باد کہتا ہے اور اپنے مسلک کا پرچار کرنے کے لیے ادھر ادھر سفر کرتا ہے۔ بہت سے حادثات سے دو چار ہونے کے بعد وہ کشمیر (کسنارا) پہنچتا ہے۔ یہاں آ کر وہ اپنے مذہب کی آئندہ تبلیغ و اشاعت کا کام اپنے چیلے آباد (یعنی آئند) کے سپرد کر دیتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔



زندگی کے واقعات پر مبنی ہے۔ اس میں کئی غیر ہندی الاصل تشیلی کہانیاں پائی جاتی ہیں جن میں عہد نامہ جدید کی کاشت کار والی کہانی بھی شامل ہے۔ اس کے حکایتی ڈھانچے کے بعض حصے ایسے ہیں جو بدھ چریتا *Budhacarita*، مہاوستو، للیتاویستارا، اور جائگ قصوں سے مشابہ ہیں۔ تاہم ملحوظ رہے کہ مستند روایت میں بدھ کے کسی گرو کا ذکر نہیں، البتہ چوتھے شگون (Omen) میں واعظ راہب بلوہر کا ذکر اشارۃً آتا ہے، جہاں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہونے والے بدھ کی کپل وستو میں ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوتی ہے جو ضبط نفس، سکون خاطر اور مکمل نجات کے حاصل کرنے کی خاطر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔

مرکزی ایشیائی بدھ: سغدی متون سے، جن میں بودھ ستوا کو *Pwtysp*، یعنی بودی سف، کی شکل میں مخفف کر دیا گیا ہے، اور ان نامکمل مانوی نسخوں سے جو چینی ترکستان میں ترخان کے مقام پر دستیاب ہوئے ہیں، یہ پتا چلتا ہے کہ یہ کہانی مغربی ممالک میں کب اور کس طرح پہنچی۔ Le Coq نے (*SBPr. Ak. W.*)، ۱۹۰۹ء، ص ۱۲۰۲ تا ۱۲۱۸) نے ایک مانوی ترکی نامکمل نسخہ شائع کیا ہے، جس میں بودی سف راج کمار کی اہاج بوڑھے سے ملاقات کا ذکر ہے۔ اسی فاضل نے (*Türkische Manichaica aus Chotscho*)، ۱: ۵ تا ۷، در (*Abh. Pr. Ak. W.*)، ۱۹۱۱ء، Anhang) ایک اور ایسا ہی نسخہ شائع کیا جس کی شرح رادلوف Radlov اور اولڈن برگ Oldenburg نے لکھی (*Izv. Imp. Akad. Nauk.*)، سلسلہ ششم، ۱۹۱۲ء، ص ۵۰۱ تا ۵۰۳، ۵۰۹ تا ۵۸۲، جس میں اس شرابی شہزادے کی کہانی بیان کی گئی ہے جو غلطی سے ایک لاش کو لڑکی سمجھ لیتا ہے۔ یہ کہانی بعد میں ابن بابویہ کے نسخے میں شامل کر لی گئی۔ برلن کے ترخان مجموعہ

کتب میں ایک حصے کی دریافت خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اس دریافت کی اطلاع W.B. Henning نے ۱۹۵۷ء میں مستشرقین کی میونخ میں منعقدہ چوبیسویں کانگریس کو دی تھی۔ اس میں ایک قدیم فارسی منظوم ترجمے کے ستائیس اشعار ہیں جن میں داستان کے بڑے کرداروں کے نام *Bylwhr* اور *Bwdysf* کی صورتوں میں دیے ہیں۔ یہ نکڑا، جس میں بلوہر کی بودی سف کو پند و نصیحت اور بلوہر کی عمر سے متعلق ایک مکالمے کا کچھ حصہ شامل ہے، ایک ایسے مخطوطے کا جزو ہے جو دسویں صدی کے نصف اول سے زیادہ مؤخر زمانے کا لکھا ہوا نہیں۔ عربی نام *یوداسف* (الف کے ساتھ) کے برعکس نام کی ایرانی شکل بودسف سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نسخہ نقل کے اولین سلسلے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نسخے کو قیاساً رودکی [رک باں] یا اس کے دبستان سے منسوب کیا گیا ہے۔ ان علامات کی تائید، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بلوہر و بوداسف کے قصے کی ابتدائی نشو و نما وسطی ایشیا میں اور ایک درمیانی ایرانی زبان میں ہوئی ہوگی، اس سے بھی ہوتی ہے کہ عبدالقادر بن طاہر البغدادی کی تصنیف الفرق بین الفرق (طبع محمد بدر، قاہرہ ۱۳۲۸ھ، ص ۳۳۳، حصہ دوم ترجمہ از A.S. Halkin، تل ایب ۱۹۳۵ء، ص ۲۰۰ تا ۲۰۱) میں جن جھوٹے پیغمبروں کی مذمت کی گئی ہے ان کی فہرست میں مانی، بردیعیمان، مزدک وغیرہ کے ساتھ بلوہر کا نام بھی شامل ہے۔ البیرونی جیسے بعض مستند مصنفین نے (*Chronology of Ancient Nations*)، مترجمہ زخاؤ، ص ۱۸۶ تا ۱۸۹) بوداسف کا تعلق سبائیوں سے بتایا ہے جن کے ہاں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ *Enoch* اور *Hermes Tris-* *megistus* دونوں کا مرادف تھا۔ بوداسف کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ایرانی حروف ہجا کا

یوداسف (یوداسف) کی اصلی کہانی کا بیشتر حصہ از سر نو مرتب کیا جا سکتا ہے۔ مجموعہ تیموریہ کے شعبہ اخلاق (برا کلمان، ۱: ۱۵۸) میں بلوہر و یوداسف کا جو ذرا طویل نسخہ ہے اس کے بارے میں Stern نے تحقیق کر کے یہ بتا چلایا ہے کہ وہ اسی نئی تالیف سے ہے جس سے Halle کی تلخیص۔ اس میں متن کے بعض وہ حصے مل جاتے ہیں جو اس تلخیص کے ناقص واحد نسخے میں موجود نہیں ہیں (S. M. Stern کے فراہم کردہ حواشی)۔ الفہرست میں جس منظوم نسخے کا ذکر ہے کہ اسے آبان [بن عبدالحمید] اللاحقی [رک باں] نے مرتب کیا تھا وہ ضائع ہو چکا ہے۔

قلمی نسخوں میں یوداسف کا نام بہت مختلف طرح لکھا گیا ہے۔ اصلی نام یوداسف یا یوداسف کو ایک قطعے کے اضافے سے بگاڑ کر یوداسف یا یوداسف بنا دیا گیا ہے اور پھر اس سے گرجی یوداسف Iodasap بنا، جس سے یونانی یواسف Toasaph اور پھر لاطینی یوسافت Josaphat بن گیا۔

داستان کی وسیع اشاعت: اپنی دو ہم جنس تصنیفوں کلیلہ و دمنہ اور قصہ سند باد [رک باں] کے ساتھ ساتھ کتاب بلوہر و یوداسف بھی ابتدائی عربی ادب میں وسیع پیمانے پر پھیل گئی، مثلاً دیکھیے وہ اشارہ جو رسائل اخوان الصفا (قاہرہ، ۴: ۱۲۰) تا ۲۲۳) میں عقیدہ حیات جاوید کے سلسلے میں بلوہر کی کہانی، ”بادشاہ“، ”منصف مزاج وزیر“ اور ”خوش باش نادار جوڑے“ کی شکل میں موجود ہے۔

مغرب کی داستان بارلام Barlaam و یواسف Ioasaph (Josaphat) طویل تر گرجی (یروشلم) تالیف نو کے ذریعے کتاب بلوہر و یوداسف سے ماخوذ ہے، جس میں اہم کرداروں کے نام بلہور Balahvar اور یوداسف Iodasap ہیں۔ ایتھنز کے St. Euthymius اور اس کے مکتب نے آخر ۱۰۰۰ء میں اس گرجی

موجد تھا۔

کتاب کے مختلف نسخے: ان کتابوں میں سے جن کا ترجمہ عباسیوں کے ابتدائی دور میں ابن المقفع [رک باں] اور اس کے دبستان نے پہلوی سے عربی زبان میں کیا تھا (الفہرست، ص ۳۰۵) کتاب البد، کتاب بلوہر و یوداسف (یوداسف) اور کتاب یوداسف مفرد کو شمار کیا گیا ہے۔ آخر الذکر کتاب نہایۃ الارب فی اخبار الفرس و العرب کے ایک باب کے طور پر باقی ہے (براؤن در JRAS، ۱۹۰۰ء، ص ۲۱۶ تا ۲۱۷؛ Rosen، در Zap. Vost. Otd. Imp. Russk. Arkh. Obshchestva، ۱۹۰۱-۱۹۰۲ء، ص ۷۷ تا ۱۱۸)۔ پہلی دو کتابیں بلوہر و یوداسف مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸-۱۸۸۹ء (روسی ترجمہ از روزن Rosen طبع کراچکووسکی، Povest' O Varlaame pustinnike i losafe tsarevice indijskom، ۱۹۳۷ء، میں جمع کر دی گئی ہیں۔ بمبئی والا یہ نسخہ موجودہ تمام نسخوں میں سب سے زیادہ مفصل و مکمل ہے۔ اگر ان کہانیوں کو جو کتاب البد سے لی گئی ہیں اس نسخے کے باقی حصوں سے الگ کر دیا جائے تو ہالے Halle کی تلخیص کے (طبع Hommel، در Verh. des VII. Int. Orient. Cong., Semit. Sect.، ۱۸۸۸ء: ۱۱۵ تا ۱۶۵، ترجمہ Rehatsek در JRAS، ۱۸۹۰ء، ص ۱۱۹، ۱۵۵)، اس تبدیل شدہ قصے کے جو ابن بابویہ [رک باں] کی شیعہ تصنیف کتاب اکمال الدین و اتمام النعمۃ، یروشلم میں دریافت شدہ زیادہ طویل گرجی نسیمی نسخے (Greek Patriarchal Library) گرجی مخطوطہ، عدد ۱۴: مرتبہ Balavarianis: Abuladze، K'art'uli redak'tsiebi، تفلس ۱۹۵۷ء) نیز تیرھویں صدی کے ابتدائی دور کے عبرانی ترجمے از ابراہام بن حسدای (یا چسدای) (Chisdai) (دیکھیے Die hebr. Übersetzungen des Mittelalters، ۸۶۳ تا ۸۶۷) کے حوالے سے بلوہر اور



اسی طرح یہ احمدی عقیدہ بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ بزرگ یوزاسف (جن کے مزار، واقع سری نگر (کشمیر) کی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے) اور حضرت عیسیٰؑ دونوں ایک ہی تھے۔ احمدیوں کے مذکورہ یوزاسف سے متعلق بہت سی داستانیں محض اقتباسات ہیں جو کتاب بلوہر و یوداسف سے لیے گئے ہیں اور جن میں ”کسینارا“، بودہ کے روایتی مقام وفات کی جگہ کشمیر کا نام رکھ دیا گیا ہے۔

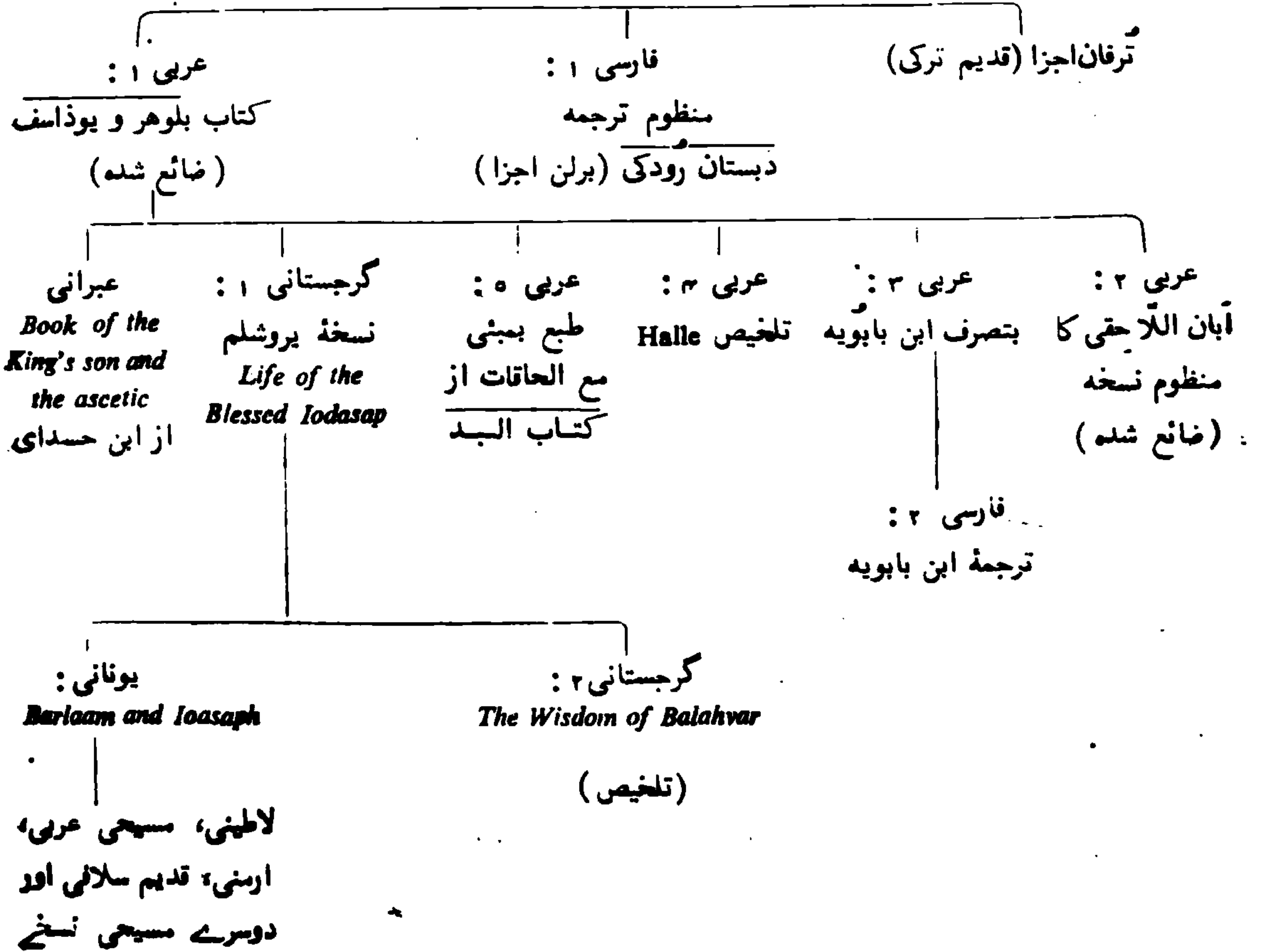
تالیف کو ترمیم و تبدیل کے بعد یونانی میں منتقل کیا۔ قرون وسطیٰ میں جو یونانی قصہ بارلام سینٹ جان دمشقی (St. John Damascene) سے منسوب کیا جاتا تھا اور جس کا اعادہ بعد میں *Der griechische Barlaam-Roman, ein) F. Dölger Ettal, Werk des H. Johannes von Damaskos* (۱۹۵۳ء) نے بھی کیا ہے، اس میں متن کی شہادت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے؛ لہذا یہ قابل اعتنا نہیں۔

## جدول نمبر ۲

کتاب بلوہر و یوداسف کا دوسری زبانوں میں ترجمہ:

بدھ سنسکرت اصل (متعلق بہ بدھ چریتا، للیتا و ستارا وغیرہ)

مانوی نسخہ (وسطی ایرانی)



زمانہ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی تھا۔ وہ عرب کے قبیلہ [بنو] بلی سے تھا جو قضاۃ کی ایک شاخ ہے اور جس کے افراد حجاز، شام اور مصر کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے تھے۔

اس کا حال سب سے پہلے الفہرست میں ملتا ہے جس میں اس کی چند تصنیفات کے نام لیے گئے ہیں۔ یہ سب کتابیں ناپید ہیں، لیکن محمد نورد علی نے تقریباً ۱۹۲۵ء میں البلوی کی سیرۃ ابن طولون کا پتا لگایا، اور اسے ایک طویل مقدمے اور مفید شرح و حواشی کے ساتھ طبع کرایا (دمشق ۱۹۳۹ء)۔ نورد علی نے البلوی کو ایک اسمعیلی مصنف بتایا ہے، لیکن اس خیال کو Ivanow، ابو عبد اللہ الزنجانی اور عبدالحمید العبادی نے غلط ثابت کیا ہے۔

البلوی کی زندگی کے مختصر حالات مؤخر زمانے کی کتب سیر میں ملتے ہیں، مثلاً الطوسی کی الفہرست، النجاشی کی کتاب الرجال، الذہبی کی میزان الاعتدال اور ابن حجر کی لسان المیزان میں۔ ان سب کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ کذاب ہے اور چونکہ حدیث وضع کرتا ہے اس لیے ثقہ نہیں۔ ابن حجر نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ رحلۃ الشافعی کا مصنف ہے، جس میں اس نے مبالغے اور عبارت آرائی سے کام لیا ہے اور اس کے اکثر واقعات اس کی اختراع ہیں۔

اس کی کتاب سیرۃ ابن طولون کو نہ صرف اس عظیم فرمانروا کی سیرت کے مطالعے کے لیے بلکہ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کے نصف آخر کی تاریخ مصر، خلافت عباسیہ اور عموماً سارے مشرق ادنیٰ کی تاریخ کے لیے بھی آج کل نہایت اہم مآخذ سمجھا جاتا ہے۔ اس موضوع پر اور جتنی کتابیں ہیں، مثلاً سیرۃ ابن طولون، از ابن دایہ (جس کا ابن سعید نے المغرب میں اختصار کیا ہے) اور اسی مصنف کی کتاب الکفاۃ، اخبار سیبویہ

مآخذ: متن مادہ میں دیے ہوئے مآخذ کے علاوہ

- دیکھیے: (۱) P. Alfarcic *Les écretures mani-chéennes*، جلدیں، پیرس ۱۹۱۸ تا ۱۹۱۹ء؛ (۲) وہی مصنف: *La vie chrétienne du Bouddha*، در JA، ۱۹۱۷ء، ص ۲۶۹ تا ۲۸۸؛ (۳) H. W. Bailey *The word "But" in Iranian*، در BSOS، ۲/۶ (۱۹۳۱ء)؛ (۴) W. Bang *Mahichäische Erzähler*، در Le Muséon، ۱۹۳۱ء، ص ۱ تا ۳۶؛ (۵) Sir E. A. Wallis Budge *Baralâm and Yêwâsêf*، جلدیں، کیمبرج ۱۹۲۳ء؛ (۶) Chauvin *Bibliographie*، ۱۱۲ تا ۸۳؛ (۷) G. Graf *Gesch. der christ. arab.*، Lit.، ۱: ۵۳۶ تا ۵۳۸؛ (۸) A. E. Krîmskiy *Aban*، *al-Lahiki* (بزبان روسی)، ماسکو ۱۹۱۳ء؛ (۹) E. Kuhn *Barlaam und Joasaph*، در *Abh. Bayr. Ak., Philos.-philol. Klasse*، ج ۲۰، ۱۸۹۳ء؛ (۱۰) D. M. Lang *The Wisdom of Balahvar: A Christian Legend of the Buddha*، لنڈن، نیویارک ۱۹۵۷ء؛ (۱۱) N. Ya. Marr *Zap. Vost. Otd. Imp. Russk. Arkh. Obshchestva*، ۱۸۸۹ء، ص ۲۲۳ تا ۲۶۰ و ۱۸۹۷ - ۱۸۹۸ء، ص ۳۹ تا ۷۸؛ (۱۲) S. von Oldenburg *Persidskiy izvod povesti o Varlaame i Ioasafe*، در *Zap. Vost. Otd. Imp. Russk. Arkh. Obshchestva*، ۱۸۹۰ء، ص ۲۲۹ تا ۲۶۵؛ (۱۳) P. Peeters *Analecta Bollan*، در *diana*، ۱۹۳۱ء، ص ۲۷۶ تا ۳۱۲؛ (۱۴) K.h. Nazeer *[Jesus in Heaven on Earth: Ahmad*

(D. M. LANG)

\* البلوی: ابو محمد عبد اللہ بن محمد المدینی، مصری مؤرخ؛ اس کی ولادت اور وفات کی تاریخیں معلوم نہیں، لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ اس کا



البَلْوَى کی سیرت مصر کی ان قدیم ترین تاریخوں میں ہے جو مسلمانوں نے لکھی اور اس سے مختلف اداروں، مثلاً [دیوان] الخراج، [دیوان] الشرطة، [دیوان] العدل، [دیوان] العیون، [دیوان] البرید، وغیرہ کی تاریخ پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ اس میں اس زمانے سے متعلق سرکاری دستاویزات کی بھی خاصی تعداد موجود ہے۔

مآخذ: (۱) ابن سعید الاندلسی: المغرب فی حلی المغرب، مصر سے متعلق حصے کی پہلی جلد، طبع زکی محمد حسن، شوقی ضیف و سیدہ اسمعیل کاشف، قاہرہ ۱۹۳۵ء؛ (۲) ابن الندیم: الفہرست، قاہرہ (بلا تاریخ)؛ (۳) الطوسی: فہرست کتب الشیعہ، کلکتہ ۱۸۵۳ء؛ (۴) النجاشی: کتاب الرجال، بمبئی ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء۔ (۵) الذہبی: بیران الاعتدال فی تقد الرجال، لکھنؤ ۱۸۸۳ء؛ (۶) ابن حجر: لسان المیزان، حیدرآباد ۱۳۲۹ء - ۱۳۳۱ھ؛ (۷) عبدالحمید العبادی: سیرة احمد ابن طولون لابی محمد عبداللہ . . . البَلْوَى، (تقریباً، در *Bulletin of the Faculty of Arts*، اسکندریہ یونیورسٹی، ۱۹۳۳ء) : ۱ تا ۹)۔

(جمال الدین الشیال)

بلہرا: (البہرے یا بلہرا؛ مأخوذ از بلمہرہ، "ولہ راجا" کی پراکرت شکل، جس کے معنی "محبوب بادشاہ" کے ہیں) ان راجاؤں کا لقب جو دکن کے راشٹرکوٹ خاندان سے تعلق رکھتے تھے (تقریباً ۷۵۳ء تا ۹۷۵ء) اور جن کا دارالسلطنت گلبرگہ (میسور) کے جنوب میں مانیا کہنت تھا، جسے اب مل کہید (عربی = مانکیر) کہتے ہیں۔ ابن خردادبہ اور ابن رستہ کا یہ کہنا درست نہیں کہ بلہرا کے معنی شاہ شاہاں یا شہنشاہ ہند تھے۔ ابن خردادبہ کے بلہرا کا اطلاق تقریباً یقینی طور پر گووند سوم (۷۹۳ء تا ۸۱۳ء) پر ہو سکتا ہے؛ سلیمان نے بھی یہ لفظ اسی کے با اس کے بیٹے سرو

المصری، از ابن زولاق اور کتاب الولاة و القضاة، از الکندی، یہ ان سب سے زیادہ مفصل ہے۔

البَلْوَى اپنی کتاب کے مقدمے میں لکھتا ہے کہ اس سے کہا گیا تھا کہ وہ آل طولون کی ایک تاریخ لکھے جو اس سے پہلے احمد بن یوسف ابن دایہ کی لکھی ہوئی تاریخ سے زیادہ مفصل ہو، لیکن اس نے اس شخص کا نام نہیں بتایا جس نے اس سے یہ کتاب لکھنے کو کہا تھا۔ تاہم بعض قرائن سے پتا چلتا ہے کہ یہ اخشیدیوں کے زمانے کا کوئی سرکاری عہدے دار یا ادیب ہوگا۔ البَلْوَى اپنی کتاب میں عباسی خلیفہ المقتدر کا ذکر کرتا ہے جو ۵۳۲ / ۹۳۲ء میں قتل ہوا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے یہ کتاب اس سنہ کے بعد لکھی تھی (الاکشید نے مصر پر ۵۳۳ / ۹۳۳ - ۹۳۵ء میں حکومت شروع کی)۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ البَلْوَى نے اپنی کتاب ابن دایہ کی وفات کے بعد لکھی، جس کی وفات ۵۳۳ / ۹۳۱ء - ۹۳۲ء کے بعد ہوئی۔ کرد علی کے دریافت کیے ہوئے مخطوطے پر کتاب کا نام تو کتاب سیرة آل طولون لکھا ہے، لیکن اس میں فقط احمد بن طولون کی زندگی کے حالات ہیں۔

البَلْوَى اور ابن دایہ کی کتابوں میں باہم بہت زیادہ مشابہت ہے، اگرچہ البَلْوَى کی کتاب زیادہ مفصل ہے۔ کرد علی کہتا ہے کہ البَلْوَى نے جو کچھ لکھا ہے وہ ابن دایہ کی نقل ہے، لیکن زیادہ امکان اس کا ہے کہ دونوں نے اپنا اپنا مواد ایک ہی ماخذ سے حاصل کیا، اور یہ ماخذ وہ سرکاری کاغذات ہیں جو اس پہلے سرکاری معافظ خانے (دیوان الانشاء) میں محفوظ تھے، جو خود احمد بن طولون نے مصر میں قائم کیا تھا (دیکھیے البَلْوَى: سیرت، ص ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۱۱، ۱۲۲، ۲۲۳، ۲۲۸ - ۲۲۹)۔

کے گورجرپرتی ہار (الجزز) اور بنگال کے پالا (D. hmy) راجاؤں کے درمیان ہوا کرتی تھیں۔ راشٹرکوٹ خاندان کی عرب دوستی اور اسلام کے ساتھ ان کا فیاضانہ برتاؤ اور دوسری طرف عربوں کا راشٹرکوٹ کی تعریفوں میں رطب اللسان ہونا غالباً اسی بنا پر ہوگا کہ راشٹرکوٹ مسلمانوں کو گورجرپرتی ہار کے خلاف جو سندھ کے عربوں کے دشمن تھے، اپنا حمایتی سمجھتے تھے، نیز اس لیے بھی کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد راشٹرکوٹوں کی مملکت میں رہتی تھی۔

مآخذ: (۱) ابن خردادبہ، ص ۱۶، ۶۷: (۲)

سلیمان التاجر: اخبار الصين و الهند، فرانسیسی ترجمہ

Jean Sauvaget، Relations de la Chine et de l'Inde، طبع

پرس ۱۹۳۸ء، ص ۱۲، ۲۳: (۳)

المسعودی: مروج، ۱: ۱۷۷ تا ۱۷۸، ۳۸۲ تا ۳۸۳، ۲۵۳

تا ۲۵۴، ۲: ۸۵ تا ۸۶: (۴) ابن حوقل، ص ۳۲۰: (۵)

ابن رستہ، ص ۱۳۴ تا ۱۳۵: (۶) حدود العالم، ص ۲۳۸: (۷)

The Age of Imperial Kanauj، از آر۔ سی۔ مآجمدار

(مدیر عام)، بھارتیہ ودیا بھون، بمبئی ۱۹۵۵ء، ص ۱۶

تا ۱۷: (۸) سر آر۔ جی۔ بھنڈارکر: Collected Works،

طبع این۔ بی۔ آنگی کر، ہونا ۱۹۲۷ء، ۱۰۶ تا ۱۰۷۔

(ایس۔ مقبول احمد)

### بَلِيدَة : (بَلِيدَة) [بلدہ بمعنی شہر کی تصغیر]

الجزائر کا ایک قصبہ، جو [شہر] الجزائر سے جنوب مغرب کی جانب ۵۱ کیلومیٹر کے فاصلے پر، نتیجہ Mitldja کے میدان کے جنوبی سرے پر واقع ہے۔ قدیم زمانے میں اس جگہ کوئی بستی نہ تھی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ قصبہ نتیجہ یہی ہے جو قرون وسطیٰ میں معروف تھا اور جو بنو غانیہ کی سہمات کے وقت (ساتویں صدی ہجری / تیرھویں صدی عیسوی کے آغاز میں) تباہ و برباد ہو گیا تھا۔ روایت کی رو سے جو جگہ ۹۳۲ھ / ۱۵۳۵ء میں بلیدہ (= چھوٹا قصبہ) کے

Sarva یا آموگ ورش (۸۱۳ تا ۸۷۸ء) کے لیے استعمال کیا ہے۔ المسعودی کا بلہرا اندر سوم (۹۱۳ تا ۹۲۲ء) ہے اور ابن حوقل کے ہاں بھی یہ آموگ ورش ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ بعد کے مصنفین کے ہاں جو حوالے ملتے ہیں ان کی بنیاد انہیں قدیم مآخذ پر ہے۔ عرب مصنفین نے عام طور سے ان بادشاہوں کو "ہندوستان کے سب سے بڑے بادشاہ" یا "سب سے زیادہ نامور" کہا ہے اور "بادشاہوں کا بادشاہ" یا "شہنشاہ ہند" کی صفات میں گووند سوم یا اندر سوم جیسے حکمرانوں کی عظمت اور سیاسی اقتدار کی جھلک پائی جاتی ہے۔ بہر حال بعض مصنفوں نے مملکت راشٹرکوٹ کی وسعت بیان کرنے میں مبالغے سے کام لیا ہے (مثلاً اخبار الصين: "سمندر کے ساحل کم کم (کونکن) سے شروع ہو کر خشکی میں چین تک")۔ کچھ لوگوں نے سلیمان کے بیان (اخبار الصين) کو سمجھنے میں غلطی کی ہے اور کہا ہے کہ کم کم بلہرا کی سر زمین کا نام تھا (دیکھیے حدود العالم، ص ۲۳۸، عدد ۲)، لیکن عموماً بیانات میں اس سلطنت کو بمبئی کے ساحلی شہروں تک محدود رکھا گیا ہے جس سے مسلم تاجر اور سیاح واقف تھے اور جہاں مسلمان بڑی تعداد میں آباد ہو گئے تھے۔ تمام عرب مصنف بالاتفاق یہ بات لکھتے ہیں کہ بلہرا خاندان کے راجا عربوں کو ہندوستان کے تمام راجاؤں سے زیادہ دوست رکھتے تھے، ان کے راج میں اسلام کی حفاظت سب سے زیادہ ہوتی تھی اور مسلمان اپنے شعائر دین آزادی سے ادا کرتے تھے۔ یہ راجا اپنی مملکت میں مسلمانوں کو عامل اور جن علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہو وہاں سردار بھی مقرر کرتے تھے۔ ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب ان خونخوار لڑائیوں سے واقف تھے، گو پورے طور پر نہیں، جو شمالی علاقے



مکانات تعمیر کرا رکھے تھے۔ ریجنسی Regency کے جن عہدے داروں کو یہاں نظر بند کیا گیا تھا انہیں اپنی جلاوطنی خاصی گوارا محسوس ہوتی تھی۔ یہ مقام بہت سے زلزلوں کا نشانہ بنتا رہا ہے، جن میں سے شدید ترین ۱۸۲۷ء میں آیا جس سے شہر تقریباً بالکل تباہ ہو گیا۔ ۱۸۶۵ء میں ایک بار پھر بھونچال نے اسے ہلا ڈالا تھا۔

الجزائر پر فرانسیسیوں کے قبضے کے بعد بلیدہ کچھ مدت تک اپنے حاکموں کے ماتحت خود مختار رہا۔ ۱۸۳۹ء میں اس پر پوری طرح قبضہ ہو گیا۔

مآخذ: (۱) *Blida : Trumelet*، جلد ۲، الجزائر

۱۸۸۷ء؛ (۲) *J. Desparmet : Ethnographie tradi-*

*tionnel de la Mitidja*، در *RAfr.*، ۱۹۱۸ تا ۱۹۲۸ء۔

(G. MARÇAIS و G. YVER)

• بلیغی جزائر : رک بہ میورقہ۔

• بلیغ : اسمعیل برسوی، ترکی شاعر اور سیرت نگار۔ اس کی زندگی کے حالات بہت کم معلوم ہیں۔ اپنے باپ اور دادا کی طرح وہ بھی برسہ کی ایک چھوٹی سی مسجد کا امام تھا۔ اسی شہر میں اس نے ادنیٰ درجے کے سرکاری ملازم کی حیثیت سے مختلف محکموں میں کام بھی کیا، اگرچہ کچھ دنوں کے لیے اس کا تقرر توقاد کے دارالقضاء میں بھی ہو گیا تھا۔ اس نے ۱۱۴۲ھ / ۱۷۲۹ء میں برسہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔ صفائی : تذکرہ کے مطابق بلیغ نے ایک دیوان نظم کیا تھا جو ابھی تک ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔ اس کی جو منظوم تالیفات ہمیں معلوم ہیں وہ ان معدودے چند نظموں پر مشتمل ہیں جو عہد حاضر کے مجموعوں اور تذکروں میں منقول ہیں۔ اس کی دو مثنویاں ہیں: (۱) سرگزشت نامہ، جس میں اس کے سفر توقاد کے حالات اور ذاتی کارناموں کا ذکر ہے۔ اس میں ان لوگوں کے حالات بھی درج ہیں جو دارالقضاء

نام سے مشہور ہوئی، اس کی بنیاد ایک مذہبی بزرگ مسمیٰ سیدی احمد الکبیر نے رکھی تھی۔ بزرگ موصوف طویل سیر و سیاحت کے بعد وادی الرمان میں آ کر مقیم ہو گئے تھے، جو آجکل وادی الکبیر Oued el-Kabir کے نام سے مشہور ہے۔ ان کے مرید بھی ان کے ساتھ آملے اور بعد ازاں شنوہ Chenoua کے قبائل کے حملوں کے باعث تپسہ [= تیزہ] سے بھاگے ہوئے اندلسی بھی ان کے پاس پہنچ گئے۔ نوواردوں کے مکانات کی تعمیر کے لیے ضروری اراضی سیدی احمد الکبیر نے اولاد سلطان سے حاصل کی، جو ان دنوں اس علاقے پر قابض تھا۔ الجزائر کے یلر بے خیرالدین نے یہاں ایک مسجد، حمام اور عوامی مطبخ تعمیر کرا کے اس آبادی کو پوری طرح شہر کی صورت دے دی۔ بلیدہ جلد ہی پھولنے پھلنے لگا اور یہ سب اندلسیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھا جنہوں نے اس کے گرد نارنگیوں کے باغ لگائے اور آبپاشی کے ان طریقوں سے کام لیا جو ان کے اپنے ملک میں رائج تھے۔

ترکی حکومت کے زمانے میں بلیدہ "دارالسلطان"، یعنی اس علاقے کا ایک حصہ تھا جس کا نظم و نسق براہ راست الجزائر کے بے کے ماتحت ہوتا تھا اور جس کا ایک ترکی النسل "حاکم" نمائندے کے طور پر وہاں رہتا تھا۔ بنی چریوں کی حفاظتی فوج کا ایک دستہ وہاں متعین تھا۔ یہاں کی آبادی اندلسیوں، مغاربہ، یہودیوں اور بنو مزاب کی اولاد پر مشتمل اور اپنی تہذیب و شائستگی اور تفریح پسندی کے لیے مشہور تھی۔ سیدی احمد بن یوسف سے ایک قول منسوب ہے جس میں اس شہر کی تعریف کی گئی ہے اور اسے وریدۃ (= ننھا گلاب) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ یہ قصبہ الجزائر کے طبقہ اعلیٰ کے افراد کے لیے ایک دل خوش کن تفریحی مقام کا کام دیتا تھا، جنہوں نے یہاں اپنے دیہاتی

اس کی اپنی تحریروں کے مطابق اس کی زندگی سختیوں ہی میں گزری۔ اس کا مختصر سا دیوان استانبول میں ۱۲۵۸ھ / ۱۸۳۲ء میں طبع ہوا۔ اس کے قصائد معمولی درجے کے ہیں، البتہ بعض غزلوں سے ایک خاص قسم کی قوتِ بیانیہ ظاہر ہوتی ہے؛ مگر اس کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ وہ چار جدید نظمیں ہیں جو اس نے ترجیع بند کی شکل میں لکھی ہیں: کفش گر نامہ، حمام نامہ، پرپر نامہ، خیاط نامہ۔ یہ نہایت رواں اور سادہ زبان میں لکھی گئی ہیں اور ان میں کاریگروں اور ان کے پیشوں کا ذکر بہت خوبی سے کیا گیا ہے۔

مآخذ: (۱) رامز: تذکرہ، بذیل مادہ؛ (۲)

قطین: تذکرہ، ص ۲۸؛ (۳) Ottoman Poetry: Gibb، ص ۱۱۷ تا ۱۳۳؛ (۴) تذکرہ، بذیل مادہ (از F. A. Tansal)؛ (۵) سعد الدین نژت ارغون: ترک شاعر لری، استانبول ۱۹۳۶ء، ص ۸۱۷ تا ۸۲۰۔

(FAHIR İZ)

بلیغوس: سلوستر د ساسی Silvestre de Sacy پہلا شخص ہے جس نے لکھا ہے کہ یہ نام اپلونوس Apollonius [بطلمیوس فیلوپیٹر کے عہد کا ایک ریاضی دان] کا مرادف ہے۔ بلیغوس یا دوسری شکل بلیناس ہی زیادہ تر مستعمل ہے۔ اس کی دوسری شکلیں یہ ہیں: ابلونوس (الفہرست، ص ۲۶۶؛ ابن القفطی، ص ۶۱)، ابولونیوس (صاعد: طبقات الأمم، شیخو کا ذاتی مخطوطہ، مؤرخہ ۱۹۱۲ء، ص ۲۸، سطر ۱۶)، افلونوس (وہی کتاب، ص ۲۹، س ۱)، افولونیوس (Barhebraeus، طبع Salhani، ص ۱۱۸)، ابلینس (الفہرست، محلّ مذکور)، علوسوس (وہی کتاب، ص ۲۶۳، س ۲۱؛ قب Plessner: Der Oikonomixos des Neupythagoreers 'Bryson'، ص ۱۹۲۸، بعد: P. Kraus، Jabir ibn Hayyan، Contribution، ص ۲: ۲۷۳، حاشیہ ۳)، ابولوس (الیعقوبی، ۱:

اور اس صوبائی شہر میں اس کے شریک کار تھے؛ (۲) شہر مانگیز [= شہر آشوب]، جس میں برسہ کے حسینوں کا ذکر ہے۔ بلیغ کی سب سے زیادہ اہم تصنیف اس کی مشہور کتاب السیر ہے، جس کا نام گلدستہ ریاض عرفان و وفیات دانشوران نادرہ دہان (بروسہ ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء) ہے۔ گلدستہ کے پانچ حصے ہیں، جن میں ترک سلاطین و شاہزادگان، وزرا اور دیگر شاہیر برسہ، مثلاً شعراء، فضلا، موسیقاران، قصہ گوین وغیرہ کے حالات زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ بلیغ نے قاف زادہ فائضی کے تذکرے زبده الأشعار کا ایک ضمیمہ بھی لکھا اور اس کا نام نخبة الآثار لذیل زبده الأشعار رکھا۔ اس میں ۱۶۲۰ء سے لے کر ۱۷۲۶ء تک کا زمانہ آجاتا ہے (خود نوشتہ مخطوطہ در جامعہ [استانبول؟]، عدد ۱۱۸۲)۔ دو اور منظوم تالیفات جو ہم تک نہیں پہنچیں یہ ہیں: گل صد برگ، جو ایک سوا حدیث کی شرح ہے اور سبع سیارہ، جو سات "توحیدوں" (حمدیہ قصائد) کا مجموعہ ہے۔

مآخذ: (۱) صفائی: تذکرہ، بذیل مادہ، (۲) قطین:

تذکرہ، ص ۲۸؛ (۳) Ottoman Poetry: Gibb، ص ۱۱۷ تا ۱۳۳؛ (۴) سعد الدین نژت ارغون: ترک شاعر لری، استانبول ۱۹۳۶ء، ص ۸۰۹ تا ۸۱۷؛ (۵) تذکرہ، بذیل مادہ (از F.A. Tansal)۔

(FAHIR İZ)

بلیغ: محمد امین، بلیغ شاعر۔ اس کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں۔ وہ علما کے طبقے میں شامل تھا۔ بلقان کے مختلف شہروں میں اس نے قاضی کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہم عصر اس کی چنداں قدر نہیں کرتے تھے، کیونکہ بہت سے تذکروں میں اس کا نام مذکور نہیں۔ اس کی وفات بمقام اسکی زغرہ ۱۱۷۳ھ / ۱۷۶۰ء میں ہوئی اور



مخروطیات یا اشکال مخروطی، اور اس کی دوسری تصانیف کے عربی ترجمے سے متعلق تفصیلی بحثیں M. Steinschneider نے ZDMG، ۱۸۹۶ء، ۱: ۱۸۰ تا ۱۸۷ میں دی ہیں؛ نیز قسب G. Sarton، در IHS، ۱: ۱۷۳ تا ۱۷۵ اور تینوں جلدوں کے اشاریات؛ براکلمان، اشاریہ بذیل مادہ Apollonios v. Perga (۸۵۲ کی جگہ ۸۵۶ پڑھیے)، Stambuler: M. Krause، Handschriften islamischer Mathematiker، ۱۹۴۶ء۔ طوانہ کے اہلونیوس کے متعلق مختلف ماخذ میں بہت سے متناقض بیانات درج ہیں اور اسے (الحکیم کے علاوہ) عموماً صاحب الطلسمات بھی کہا جاتا ہے، جس سے کسی حد تک پرغہ کے اہلونیوس سے متعلق معلومیت بھی متاثر ہوئی ہیں۔ ہمارا قدیم ترین ماخذ الیعقوبی (۱: ۱۳۶/۱۶۵) کہتا ہے کہ اہلونیوس دومیٹیانوس Domitian کے عہد حکومت (۸۱ تا ۹۶ء) میں تھا۔ یہی بات ابن ابی اصیبعہ (۱: ۷۳) اور بارہیریس (ابن العبری)، محل مذکور نے بھی کہی ہے، لیکن یہی الیعقوبی ص ۱۳۴ پر کہتا ہے: ”بالینوس النجار جسے یتیم کہا جاتا ہے اور اسی کو صاحب الطلسمات کہتے ہیں وغیرہ“۔ یہاں التباس محض اسی سے نہیں پیدا ہوتا کہ ہر دو اہلونیوس کے القاب ایک ہی شخص کے لیے استعمال کر لیے گئے ہیں، بلکہ اس کے ساتھ الیتیم کے لفظ کے اضافے سے بھی سر الخلیقہ (دیکھیے نیچے) کے دیباچے میں بالینوس اپنے آپ کو ”ایک یتیم جو طوانہ کا باشندہ ہے“ لکھتا ہے (قسب Kraus: کتاب مذکور، ص ۲۷۳ حاشیہ ۳)۔ ذخیرۃ الاسکندر (دیکھیے نیچے) میں ارسطاطالیس اسکندر کو بتاتا ہے کہ اسے یہ کتاب اہلونیوس سے ملی تھی (اصل متن، در Tabula Samaragdina: J. Ruska، ۱۹۲۶ء، ص ۷۲)۔ اس بیان نے اہلونیوس کو فلپ Philip اور اس کے بیٹے اسکندر کا ہم عصر بنا دیا ہے اور یہی

اہلونیوس (۱۳۶/۱۶۵)، اہلوس (منسوب بہ التجریطی: غایۃ الحکیم، طبع H. Ritter، ۱۹۳۳ء، ص ۱۰۷ بعد؛ اس کا اہلونیوس کا مرادف ہونا Cod. Adler، ۱۹۴۰ء کے عبرانی ترجمے کے ایک ٹکڑے سے ثابت ہوتا ہے؛ مزید شکلوں کے لیے دیکھیے Kraus: کتاب مذکور، ص ۲۷۰، حاشیہ ۶)۔

مسلمانوں کے ہاں اہلونیوس Apollonios کے نام کے دو شخص معروف ہیں: ایک پرغہ Perga، واقع پامفیلیا Pamphelia، کا مشہور ریاضی دان Apollonios (تقریباً ۲۰۰ ق م) اور دوسرا فلسفی جس کی شخصیت کی بنیاد اس یونانی روایت پر ہے جو طوانہ Tyana، واقع کپادوشیا Cappadocia، کے اہلونیوس کے متعلق چلی آتی ہے (پہلی صدی عیسوی)۔

پرغہ کے اہلونیوس کا نام (اس کی تصانیف کے مخطوطات میں نہیں بلکہ) کتب سیر میں تقریباً ہر جگہ النجار (= بڑھئی) کے لاحقے کے ساتھ ملتا ہے، جس کا اب تک کوئی تسلی بخش سبب معلوم نہیں ہو سکا۔ فلوگل G. Flügel کی تصنیف al-Kindi (۱۸۵۷ء، ص ۵۳) کے بعد سے یہ بات عام ہو گئی کہ النجار سے المهندس (The Geometer) کے معنی لیے جانے لگے اور حقیقت میں اہلونیوس زمانہ قدیم ہی سے المهندس الاعظم مشہور ہو چکا تھا۔ اقلیدس Euclid کو بھی مهندس کہا جاتا تھا اور ابن القطی، ص ۶۲ (E. Kapp نے Isis، ج ۲۲، ۱۹۳۰ء، ص ۱۶۱، حاشیہ ۲، میں جو لفظ المهندس لکھا ہے وہ غلط ہے) اسے بھی اپنے مقالے کے عنوان میں النجار لکھتا ہے، لیکن آگے چل کر یوں تصریح کر دیتا ہے کہ اقلیدس کا پیشہ نجاری تھا۔ بہر حال اور کوئی جگہ ایسی نہیں ملتی جس میں النجار کا ترجمہ المهندس کیا گیا ہو اور نہ کسی لغت میں النجار کا یہ ترجمہ ملتا ہے۔

اہلونیوس کی مشہور تصنیف Conica (= علم

بات البتیمی کے الطبری کے فارسی ترجمے سے ظاہر ہوتی ہے (قب Zotenberg کا فرانسیسی ترجمہ، ۱ : ۱۰۰ بعد؛ الطبری کے عربی متن میں یہ ساری کی ساری عبارت موجود نہیں) اور نظامی کے سکندر نامہ میں بھی یہی ہے (قب Nizami's Leben und : W. Bacher Werke، ۱۸۷۱ء، ص ۶۷ بعد و فارسی متن : ص ۲۸ : ۱۹۰۰ء، Gesammelte Abhandlungen : W. Hertz ص ۴۰)۔ اپلونیس کو صاحب الطلسمات کہنے کا اثر یہ ہوا کہ ابن القفطی نے پرغہ کے اپلونیس کی تاریخ کی تعیین میں غلطی کی۔ اس اپلونیس سے متعلق اس کا مقالہ یوں شروع ہوتا ہے (ص ۶۱) : ”ابلونیس التجار، زمانہ قدیم کا سہندس، اقلیدس سے بہت پہلے تھا۔ اسی نے کتاب المخروطات (Conica) لکھی“۔ اقلیدس پر مقالے میں وہ لکھتا ہے (ص ۶۳) ”اقلیدس نے، جو صور (Tyre) کا ایک بڑھئی تھا، یونان کے ایک بادشاہ کے لیے، جس کا نام مذکور نہیں، اپلونیس کی دو کتابوں کی تشریح و تکمیل کی، جن کا موضوع بے قاعدہ polyeders ہیں (در حقیقت اقلیدس کی Elementa [ کتاب الارکان = کتاب الاصول = کتاب الاستقصات ] کا موضوع بھی یہی ہے)۔ اس کے برخلاف ص ۶۵ پر وہ اقلیدس کے دسویں مقالے [المقالة العاشرة] کی شرح کا ذکر کرتا ہے جو ایک قدیم یونانی شخص نے، جس کا نام بلیس تھا، لکھی تھی (مختلف عبارتوں کے پڑھنے سے تقریباً کامل وثوق کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپلونیس کا ذکر کر رہا ہے)۔ واقعہ یہ ہے کہ پرغہ کا اپلونیس اقلیدس کے اسی تا سو سال کے بعد ہوا ہے (Kapp : کتاب مذکور، ص ۱۶۳ تا ۱۶۸، اس التباس کی طرف اشارہ تک نہیں کرتا)۔

حنین بن اسحاق کی آداب الفلاسفہ میں اپلونیس کا ذکر دو جگہ آتا ہے : حصہ اول کے باب پنجم میں وہ مقولہ مذکور ہے جو اس کی سہر پر کندہ تھا۔

دوسرے حصے کا سترہواں باب پورا اس کے اقوال کے لیے وقف ہے۔ ان باتوں میں سے ایک بھی ایسی نہیں جو دونوں میں سے کسی اپلونیس کی خصوصیات میں داخل ہو؛ لیکن ابو سلیمان المنطقی نے دوسرے حصے کے سترہویں باب کے پہلے فقرے (”قلم سب سے زبردست ساحر ہے“) میں ’ساحر‘ کی جگہ لفظ ’طلسم‘ لکھ کر طوانہ کے اپلونیس کی طرف اشارہ کر دیا ہے؛ نیز Turba Philosophorum کے چھ مواعظ (Sermones)، جنہیں Steinschneider (Europ.) Wien، Uebers. aus dem Arab.، ج ۲، در SBAK، Wien، ۱۹۰۰ء، ص ۶۷ بعد) اور Ruska در T. Ph.، ۱۹۳۱ء، ص ۲۳ بعد) نے طوانہ کے اپلونیس کی طرف منسوب کیا ہے، وہ اس کی خصوصیت کے اسی حد تک مظہر ہیں جتنے دوسرے الکیماوی مواعظ (Sermones) اپنے اپنے خطیبوں کی خصوصیات کے۔

طوانہ کے اپلونیس کی طرف جو عربی کتابیں منسوب ہیں ان میں سے مندرجہ ذیل مکمل یا ناقص صورت میں یا قدرے طویل اقتباسات کی شکل میں اس زبان میں محفوظ ہیں :

(۱) کتاب العلیل یا سر الخلیقہ، جس کے بعض حصوں کو سلوستر داسی (Notices et) Silvestre de Sacy، Extraits، ۱۷۹۸-۱۷۹۹ء، ص ۱۰۸ بعد) اور J. Ruska (Tab. Sm.)، ص ۱۲۳ تا ۱۶۳) نے طبع اور ترجمہ کیا ہے۔ مؤخر الذکر نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ الکیما کی مشہور کتاب Tabula Smaragdina کا مقام اصل میں اس کتاب کا آخری حصہ ہے اور P. Kraus (کتاب مذکور، ص ۳۰۳) نے یہ ثابت کیا ہے کہ ساری کتاب اسی متن کی شرح ہے۔ Hugo Sanctalliensis کے لاطینی ترجمے کے لیے قب Ruska، ص ۱۷۷ بعد-Kraus نے اس کتاب کا جو تجزیہ کیا ہے (ص ۲۷۰ تا ۳۰۳) اس سے اس کا زمانہ خلیفہ المأمون کا عہد ثابت ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ الراجا



طلاسم بلیناس الاکبر لولید عبدالرحمن، پیرس  
مخطوطہ، عدد ۲۲۵۰، ورق ۸۳ تا ۱۳۳۔ یہ  
کتاب بعینہ کتاب بلیناس لابنہ فی الطلسمات  
(Berol. Pet.) عدد ۱ : ۶۶ ورق ۳۱ ب تا ۷۲  
(ب) ہے (Ahlwardt، عدد ۵۹۰۸)؛ (۵) کتاب ابلوس  
(تلفظ غیر یقینی) الحکیم، نگینوں پر کندہ کرنے  
کی سیاروں کی تصاویر کی فہرستوں کے ماخذ میں  
سے ایک ہے، غایۃ الحکیم، ص ۱۰۷ تا ۱۲۳۔  
یہ بات کہ کتاب مذکور وہی *Liber de imaginibus*  
ہے جس کے اقتباسات *Albertus Magnus De libris*  
*licitis* میں دیے گئے ہیں (قَب F. J. Carmody  
*Arabic astronomical and astrological Sciences in*  
*Latin translation*؛ ص ۵۸ بعد) ابھی تک  
موضوع بحث ہے؛ (۶) علم الکیماہ کی کتاب ذخیرۃ  
الاسکندر پر Ruska نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے  
اور اس کے ایک حصے کا تحقیق و تدوین کے بعد  
ترجمہ بھی کیا (Tah. Sm.)، ص ۶۸ تا ۱۰۷۔ یہ  
وہی کتاب ہے جو ارسطو کو اپلونیس سے ملی تھی  
اور اس نے اسکندر کی خدمت میں بطور تحفہ  
پیش کی تھی۔ اس میں بعض وہ طلسمات بھی  
ہیں جن کا رواج اپلونیس نے مختلف شہروں میں  
معین کیا ہے۔ Plessner (*Studia Islamica*)، ص ۲،  
۱۹۵۳ء؛ ص ۵۲ بعد) نے اس کے پیش لفظ اور طونان  
[نوح] کے متعلق بابل کی اطلاعات میں تعلق ظاہر  
کیا ہے۔

(کتاب عدد (۱) تا (۶) کے عربی متون کے  
لیے، جو Ruska نے طبع کیے ہیں، قَب Plessner،  
در *Studia Islamica*، ص ۱۶، ۱۹۲۷ء؛ ص ۸۳ بعد)۔

(۷) مصنف نے عدد (۳) میں کئی بار اپنے  
رسالۃ السحر کا حوالہ دیا ہے جس کے عربی نسخے  
کا ابھی تک پتا نہیں چلا، لیکن ہو سکتا ہے کہ عبرانی  
(Hebr. Übers : Steinschneider) Mleket muskelet

(Edessa) کے ایوب (Job) (تقریباً ۷۱۷ء) کی  
سریانی کتاب *Book of Treasures* سے اس کا گہرا  
تعلق ہے، جسے Mingana نے ۱۹۳۵ء میں طبع  
کیا۔ اسی طرح اماسیہ (Emesa) کے Nemesius  
(پانچویں صدی عیسوی) کی یونانی کتاب  
*περι φύσεως ανθρώπου* کے ساتھ بھی اس کا قریبی  
تعلق ظاہر ہوتا ہے؛ نیز قَب L. Massignon، در  
*La Revelations d'Hermès Tris-* : A. J. Festugière  
*mégiste*، ۱۹۳۳ء، ص ۱ : ۳۹۵ بعد، اور بار دوم  
۱۹۵۰ء کے اضافات A. E. Affifi : در *BSOAS*،  
۱۹۳۹-۱۹۵۱ء، ص ۱۳ : ۸۳۷ بعد - Kraus نے یہ بھی  
ثابت کیا ہے کہ جابر بن حیّان [رک باں] اس کتاب  
سے بے حد متاثر ہوا ہے؛ مؤخر الذکر نے بلیناس  
کے انداز فکر میں (علیٰ رأی بلیناس) مختلف موضوعات  
پر متعدد کتابیں لکھی ہیں (قَب Kraus، ج ۱، بعد  
اشارہ، بذیل مادہ بلیناس؛ J. W. Füek : *Ambix*،  
ج ۳، ۱۹۵۱ء، فصل ۱۲ اور اس کی شرح)؛ ان کے  
بعض حصے Kraus نے طبع کیے : *Jābir Ibn Ḥayyān*،  
*Textes choisis*، ۱۹۳۵ء۔

(۲) رسالۃ فی تأثیر الروحانیات فی المركبات،  
مخطوطہ استانبول، اسعد [افندی کتب خانہ] عدد  
۱۹۸۷ (Plessner، در *Islamic*، ۱۹۳۱ء، ص ۵۵۱  
بعد)، وہی (افندی کتب خانہ)، عدد ۸۹۲ (H. Ritter  
کے شکریے کے ساتھ)، Chester Beatty (قَب J. Bowman :  
*Glasgow Univ. Or. Social Transactions*، ج ۱۳، ۱۹۵۰-  
۱۹۵۲ء)؛ مزید مخطوطات کے لیے دیکھیے Kraus،  
ص ۲ : ۲۹۳، حاشیہ ۵؛ (۳) المدخل الکبیر الی علم افعال  
الروحانیات، عدد ۲ کے بعد تمام مخطوطات میں؛  
عبرانی ترجمہ پیرس کے مخطوطہ عبرانی عدد ۱۰۱۶،  
اور Steinschneider کے مخطوطہ عدد ۲۹ میں (قَب  
*Heb. Übersetzungen des Mittelalters* : Steinschneider  
ص ۸۳۶ بعد و Plessner، محلّ مذکور)؛ (۴) کتاب

Cat. : F. Boll و بعد ۱۳۶۳، ۲/۱، ۱۹۰۷ء  
 Codicum astrologorum Graecorum، ۱۹۰۸ء، ۷ :  
 ۱۷۵ بعد، نے طبع کیا ہے، ایسی عبارتیں موجود ہیں  
 جن کا عربی سے لاطینی ترجمہ موزہ بریطانیہ کے مخطوطے  
 Royal 12 C XVIII (Carmody، ۷۳) میں دیکھا جا سکتا  
 ہے اور انگریزی ترجمہ بھی (در Sloane، عدد ۳۸۲۶)۔  
 اسی طرح کے لاطینی (Vatican) زبان کے ایک اور  
 مخطوطے کے لیے قَب Carmody، محلّ مذکور، در Sloane،  
 عدد ۳۸۳۸۔ اپلونیوس کا وہ شاگرد جس کے نام سے  
 یونانی متن کو معنون کیا گیا ہے وہی شخص ثابت ہوا  
 ہے جو اس کتاب کا مصنف ہے جسے سریانی اور عربی  
 دونوں میں G. Levi Della Vida نے طبع کیا ہے : La  
 Dottrina e i Dodici Legati di Stomathalassa, Atti  
 Acc. Naz. Lin., Cl. Sci. mor. stor. Fil. ج ۸/۳،  
 کراسہ ۸، روم ۱۹۵۱ء۔

اپلونیوس کا دوسرا شاگرد مشہور و معروف  
 Atrifius (Arletius) نہیں، جیسا کہ برا کلمان، نکلہ،  
 ۱ : ۳۲۹ء، میں بتایا گیا ہے اور نہ Atrefius، جیسا کہ  
 ۳ : ۱۲۰۸ کے احسانوں میں کہا گیا ہے) تھا، جو  
 Clavis sapientiae کا مصنف ہے، جس کی عربی اصل  
 بفتح الحکمة Levi Della Vida نے دریافت کی ہے اور  
 جس کا حال Speculum، ۱۹۳۸ء، ۱۳ : ۸۰ تا ۸۵،  
 میں بیان کیا گیا ہے، قَب Kraus، ص ۲۹۸ بعد۔  
 مآخذ : پرغہ Perge کے اپلونیوس کی بابت یہ

کتابیں بھی دیکھیے : (۱) Die Mathe-  
 matiker und Astronomen der Araber und ihre  
 Stambler Handschriften : M. Krause (۲) : Werke  
 : M. Steinschneider (۳) : islamischer Mathematiker  
 Euklid bei den Arabern (Zeitschrift für Mathematik  
 und Physik, Historisch - Literarische Abteilung  
 جلد ۳۱، ۱۸۸۶ء)۔

(M. PLESSNER)

ص ۸۳۸؛ قَب نیز ZDMG، ج ۳۵، ۱۸۹۱ء، ص  
 ۳۳۳) کا اس سے کچھ تعلق ہو؛ (۸) القزویٰ بہت  
 سے مقامات پر اپنی کتاب عجائب المخلوقات میں  
 (دیکھیے فہرست در Bacher : کتاب مذکور، ص  
 ۷، حاشیہ ۲۶) بلیناس کی کتاب الخواص سے عبارتیں  
 نقل کرتا ہے، لیکن اس کتاب کا ابھی تک پتا  
 نہیں چلا۔ Steinschneider اس نام کو خیالی  
 سمجھتا ہے (Hebr. Übers.، ص ۸۳۵، حاشیہ ۷)۔

قرون وسطیٰ کی لاطینی اور مقامی زبانوں کی  
 کتابوں کی بڑی تعداد کا، جو بلینوس (Belenus) اور  
 اس سے ملتے جلتے نام) کی طرف منسوب ہیں،  
 یہاں ذکر نہیں کیا جا سکتا، قَب Steinschneider :  
 Europ. Übers.، بمدد اشاریہ، نیز Carmody : کتاب  
 مذکور، بمدد اشاریہ؛ لیکن اس میں کچھ شک  
 نہیں کہ بعض مصنفین جن کی کتابوں کی اشاعت یا  
 تجزیہ Lapidario del rey D. Alfonso X میں کیا گیا  
 ہے اور جنہیں J. F. Montaña نے ۱۸۸۱ء میں دوبارہ  
 چھاپا اور کسی حد تک مرتب بھی کیا، وہ ان  
 عربی کتابوں کے ترجمے ہیں جنہیں اپلونیوس کی  
 طرف منسوب کیا گیا ہے؛ قَب پوری فہرست،  
 در Sarton، ۲ : ۸۳۷۔ ایسے مصنفین میں سے  
 بعض یہ ہیں :

۱۔ Abolais (جسے کبھی ٹھیک پڑھا نہیں  
 گیا، قَب G. O. S. Darby، در Osiris، ۱۹۳۶ء،  
 ۱ : ۲۵۱ بعد)، ۴۔ Ylus، ۵۔ Belyenus اور  
 ۶۔ Plinius اور Hermuz (Hermes)۔ ان ناموں  
 کا مقابلہ اگر اپلونیوس کے عربی ناموں کی ان  
 صورتوں سے کیا جائے جو اس مقالے کے شروع  
 میں دی گئی ہیں تو اس بات کی خاصی شہادت مہیا  
 ہو سکتی ہے۔

یونانی کتاب Apotelesmata Apollonii Tyanensis

میں، جسے بہ یک وقت F. Nau : Patrologia, Syriaca



(۷) : *Altrabisches Beduinenleben*، ص ۱۳۱؛  
*L'arabie occidentale avant l'hégire* : H. Lammens  
 بیروت ۱۹۲۸ء، ص ۱۷۶؛ (۸) وہی مصنف : *Moawia*  
 ص ۳۳۱؛ (۹) *Le Sacrifice chez les Arabes* : J. Chelhod  
 پیرس ۱۹۵۰ء، ص ۱۱۷۔  
 (CH. PELLAT و J. HELL)

ہلیہ بدرا : [= ہلیا بدرہ] (Baliabadra)، Patras  
 یا Pátrai کا ترکی نام (سر زمین یونان کا چوتھا اور  
 جزیرہ نماے سوریہ کا سب سے بڑا شہر)، جو اسی نام  
 کی خلیج پر، خلیج کوردوس [رک باں] (Cornith) کے  
 دہانے کے مغرب میں واقع ہے، اور Nomos Achaia کا  
 دارالحکومت ہے، جو ایک بشارت کی جاے قیام ہے۔  
 ۱۹۵۱ء میں اس کی آبادی تقریباً پچاس ہزار تھی۔  
 ہلیہ بدرا کا نام یونانی، Παλαιὰ Πάτρα یا زیادہ صحیح  
 طور پر Παλαιά Πάτρα سے بنا ہے (عوامی بولی میں  
 اس شہر کا نام آج کل بھی پاترا Pátra ہے)،  
 یعنی قدیم Pátra(i)، غالباً اس وجہ سے کہ  
 چودھویں صدی سے جدید Pátra(i) اس قلعے کو  
 کہتے تھے جس کے زیرِ حفاظت قدیم آبادی تھی۔  
 Nikiphoros Gregorás (۴ : ۹، ص ۴) اسے بالتصریح  
 اس طرح بیان کرتا ہے : φρούριον τὸ τῶν Νέων  
 Πατρῶν ἐπιχειρημένον۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ  
 صفت کا اضافہ اس لیے نہیں ہوا کہ قدیم Patra(i) کو  
 Ηεαί Πάτρα، سے ممتاز کیا جائے، جو لامیا Lamia کے  
 قریب ایک مقام ہے (ترکی میں زیتون، جسے ترکوں  
 نے ۱۳۹۳ء میں فتح کیا اور جو خود عموماً زیادہ تر  
 Patratzik کے نام سے مشہور تھا (Πατρατζίκ)،  
 جو ترکی بدرجق سے بنا ہے)، اگرچہ آج کل  
 بھی قدیم زمانے کی طرح اسے پھر Hypati کہنے  
 لگے ہیں۔ قدیم Pátra(i) مغرب میں Patras کے  
 نام سے مشہور ہے (یونانی، τὰς Πάτρας سے، قب  
 اطالوی Patrasso)۔

ہلیہ : (ع : جمع : ہلایا) اسلام سے پہلے عرب  
 میں یہ نام اس اونٹنی کا (اور کبھی گھوڑی کا)  
 رکھا جاتا تھا جسے لوگ رواج کے تحت اس کے  
 مالک کی قبر کے قریب باندھ دیا کرتے تھے اور اس  
 کا منہ پیچھے کی طرف موڑ دیتے تھے اور اس کو  
 زین پوش سے ڈھک دیتے تھے (دیکھیے الجاحظ :  
 تریب، طبع Pellat، بمدد اشاریہ) اور اسے یونہی  
 چھوڑ دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ فاقوں سے  
 مر جاتی تھی؛ اس کے بعد کبھی تو اس کو جلا دیا  
 کرتے تھے اور کبھی اس کی کھال میں تمام گھاس  
 بھر دیا کرتے تھے (ابن ابی الحدید : شرح نہج  
 البلاغۃ، ۴ : ۳۶)۔ مسلم روایات میں کہا گیا  
 ہے کہ یہ رواج اس کا ثبوت ہے کہ عہد جاہلیت کے  
 عرب بعث بعد الموت کے قائل تھے، کیونکہ اس  
 طرح قربان کیے ہوئے جانور کے متعلق یہ سمجھا جاتا  
 تھا کہ وہ قیامت کے دن اپنے مالک کی سواری بنے گا  
 اور جو لوگ بغیر ہلیہ کے قبر سے اٹھیں گے ان کا  
 درجہ کمتر ہوگا اور انہیں پیدل چلنا پڑے گا۔ ایک  
 اور روایت کے مطابق یہ نام اس گے، اونٹنی یا ذبی  
 کو بھی دیا جاتا تھا جو مرنے والے کی قبر پر اس کی  
 کونچیں کاٹ کر ڈال دی جاتی تھی اور وہیں  
 بھوک سے مر جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے  
 کہ قیامت کے اعتقاد کی یہ سب ابتدائی علامتیں  
 زمانہ جاہلیت ہی میں آگے چل کر مردے کے لیے قربانی  
 کرنے کی شکل میں تبدیل ہو گئیں اور اس سے  
 مردے کے لیے "وضیہ" (کھانا) کرنے کی رسم  
 قائم ہوئی۔

مآخذ : (۱) لسان العرب، بذیل مادہ : (۲)

الشہرستانی، ۲ : ۳۹۹ بعد : (۳) آلوسی : بلوغ الأرب

۲ : ۳۰۷ بعد : (۴) G. W. Freytag : Einleitung in das

Studium der arab. Sprach، ص ۲۶۸؛ (۵) Wellhausen :

Reste، بار دوم، ص ۱۸۰ بعد : (۶) G. Jacob :

بخارست ۱۹۵۸ء، ص ۲۷۸، س ۱۲) کہ ۱۳۳۶ - ۱۳۳۷ء کی سردیوں میں وہ Pátrai اور کلرنزا Klarentza (آج کل کا Kyllini) تک بڑھ آیا۔ اس موقع پر ممکن ہے کہ وہ اچانک حملہ کر کے شہر کے غیر مستحکم حصے کو لے لینے میں کامیاب ہو گیا ہو، لیکن یہ بات ہرگز قرین قیاس نہیں کہ اس نے مذکورہ بالا قلعے کو بھی فتح کر لیا ہو جو تقریباً ناقابلِ تسخیر تھا (تاہم قبہ Hammer-Purgstall، ۱: ۳۷۳)۔ اس موقع پر آس پاس کا سارا علاقہ تباہ و برباد کر دیا گیا اور تقریباً ساٹھ ہزار آدمیوں کو غلام بنا لیا گیا۔ جب ۱۳۳۸ء میں جابر قسطنطین بوزنطہ کا شہنشاہ ہو گیا تو اس کے بھائی ٹامس Thomas نے شمال مغربی موریا پر قبضہ کر لیا، گویا وہ پورے Achaia پر قابض ہو گیا جس میں Pátrai اور Klarentza بھی شامل تھے، اور جہاں اس نے شاید دربار بھی کیا ہو (قبہ Zakythinos، ۱: ۲۳۲)۔ محمد ثانی فاتح ۱۳۵۸ء کے موسمِ گرما میں موشلی Mouchli سے آتے ہوئے بذاتِ خود Pátrai گیا (قبہ E. Darko، در Πρακτικά of the Academy of Athens، ایتھنز، ۱۹۳۱ء، ۴: ۲۲ تا ۲۹)۔ اس نے اسے ویران اور غیر آباد پایا۔ باشندے سارے کے سارے جزیرہ نماے موریا کے ان مقامات کو چلے گئے تھے جو وینس کے مقبوضات میں سے تھے۔ اس مرتبہ قلعے نے تھوڑی سی مقاومت کے بعد اطاعت قبول کر لی (قبہ Kritoboulos، در طبع C. Müller، F.H. Græc، پیرس ۱۸۷۰ء، ۵: ۱۲۳؛ نیز Mehmed der : F. Babinger، Eroberer und seine Zeit، میونخ ۱۹۵۳ء، ص ۱۷۶ بعد (فرانسیسی ایڈیشن ۱۹۵۴ء، اطالوی ایڈیشن ۱۹۵۷ء)۔ سلطان محمد ثانی Patrai کو مغرب سے تجارت کے لیے ایک موزوں مقام سمجھتا تھا، اس لیے اس نے وہاں کے باشندوں کو واپس

بلیہ بدرا کے ترکی عہد سے پہلے کی تاریخ سے متعلق مزید معلومات Wm. E. Gerland، A. Bon Miller اور D.A. Zakythinos کی تصانیف سے حاصل ہو سکتی ہیں، قبہ ماخذ جو اس مقالے کے آخر میں دیے گئے ہیں۔ یہاں فقط ذیل کے واقعات کا ذکر ضروری ہے: ۱۲۰۴ء میں جب بوزنطی مملکت کئی حصوں میں بٹ گئی تو بلیہ بدرا لاطینی ریاست Achaia کا صدر مقام نیز ایک اسقف اعظم کی جاے قیام ہو گیا۔ ۱۳۰۸ء میں یہ وینس کا جزو بنا۔ یکم جولائی ۱۳۲۸ء کو اس شہر کو قدیم ملوک الطوائف کی طرف سے حملے کا خطرہ ہو گیا، اگرچہ وہ اس پر قبضہ نہیں کر سکے۔ وہ آپس ہی میں لڑتے جھگڑتے رہے۔ ۲۰ مارچ ۱۳۲۹ء کو مطلق العنان قسطنطین نے اس شہر پر دوبارہ حملہ کیا۔ اس حملے کے زمانے میں یہاں کے باشندے لاطینی اسقف اعظم Pandolfo Malatesta سے منحرف ہو گئے اور ان کے زعماء نے جون کو سینٹ انڈریو St. Andrew کے گرجا میں اس مطلق العنان یونانی کی وفاداری کا حلف اٹھا لیا۔ قلعہ برابر مقاومت کرتا رہا اور اس نے مٹی ۱۳۳۰ء تک یونانیوں کے آگے ہتیار نہیں ڈالے (Zakythinos، ۱: ۲۰۶ بعد)۔ اس وقت سلطان مراد ثانی نے Pátrai پر قبضہ کیے جانے پر اعتراض کیا، اور یونانیوں سے کہا کہ اس پر قبضہ کرنے سے باز رہیں، اس لیے کہ وہاں کے باشندے اپنا خراج اسے دینا چاہتے ہیں۔ Sphrantzis نے، جو Pátrai کا پہلا گورنر تھا (اور بعد میں مؤرخ ہو گیا)، اس سلسلے میں باب عالی سے گفت و شنید شروع کی اور آخر کار سلطان کی رضامندی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا (Sphrantzis، ص ۱۵۲ تا ۱۵۳)۔ اس کے سترہ سال بعد بظاہر خاموشی رہی تاآنکہ مراد ثانی نے خود Pátrai پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ Dukas کا بیان ہے (طبع Vas. Grecu،



F. Morosini کی فوجوں کے ہاتھ میں آ گیا (قب) Zinkeisen، ۵ : ۱۳۲)، لیکن اس قبضے کے بعد بھی وینس والے مورہ پر اپنا اقتدار مستقل طور سے قائم نہ کر سکے۔ اپریل ۱۷۷۰ء کے وسط میں یونانیوں کے ایک جتھے نے اچانک حملہ کر کے اس شہر پر قبضہ کر لیا، لیکن تھوڑے ہی دن بعد انہیں البانویوں اور ترکوں نے یا تو قتل کر دیا یا غلام بنا لیا۔ اس زمانے میں پور بلیہ بدرا کو آگ لگائی گئی اور صرف چند خاندان، جو بھاگ کر ایونیا Ionia کے جزیروں میں چلے گئے، اپنی جان اور مال بچا سکے (قب) Zinkeisen، ۵ : ۹۳۱)۔ Pátrai پر ترکوں کی حکومت کے خلاف یونانیوں کی پہلی بڑی بغاوت ۶ اپریل ۱۸۲۱ء کو شروع ہوئی۔ اس موقع پر Pátrai کے اسقف اعظم (از ۱۸۰۶ء) جرمانوس (۱۷۷۱ تا ۱۸۲۶ء) نے جنگ آزادی کی قیادت کی۔ ۱۵ اپریل ۱۸۲۲ء کو ترکوں نے یوسف مخلص پاشا (باشندہ Serres) کی زیر قیادت اس شہر پر آخری بار بزور شمشیر قبضہ کر لیا، جس نے شہر کو بالکل تباہ کر کے خاکستر کر دیا۔ فرانسیسی فوج یونانیوں کی مدد کو پہنچی اور ۱۸۲۸ء میں Pátrai پر قبضہ کر لیا۔ ۱۸۳۳ء میں اہل بویریا (Bavarians) نے یہ شہر ان سے چھین لیا۔ اس وقت سے اس شہر کی ایک تختہ شطرنج کی شکل میں نئے سرے سے باقاعدہ تعمیر ہو رہی ہے، اور یہ ترقی کر کے پھر ایک بارونق اور خوش حال بندرگاہ ہو گیا ہے۔ حال ہی میں اسے پیلوپونیشین ریلوے (Peloponnesian Railway)، ۲۳۰ کیلومیٹر کے ذریعے ایتھنز (قب) آتینہ (Atina) سے ملا دیا گیا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے وسط تک بلیہ بدرا عثمانیوں کے زیر حکومت رہا۔ اس مدت میں صرف ایک دفعہ ایک مغربی سیاح، یعنی ماسٹر ٹامس ڈیلیم Master

آ کر بسنے کی دعوت دی، انہیں خاص رعایتیں دیں اور ان کے محصولات میں کمی کر دی (قب) Kritoboulos، در کتاب مذکورہ بالا، ص ۱۲۳، نیز (قب) Zakythinos، ۱ : ۲۵۸)۔ آگے چل کر، یعنی ۱۴۵۹ء کے شروع میں، یونانی اس شہر کو واپس لینے میں ناکام رہے (قب) Chalkokondyles، طبع l. Bekker، ص ۴۵۷ بعد)۔ Pátrai کا نام اب بلیہ بدرا ہو گیا تھا اور یہ ساڑھے تین سو سال تک ترکی کے قبضے میں رہا، لیکن اسے وہ شاندار حیثیت کبھی حاصل نہ ہوئی جو شاہانِ روم کے شہد میں حاصل تھی، جب کہ اطالیا سے اس کی بڑی اچھی تجارت تھی۔ بلیہ بدرا صوبائی صدر مقام اور انتظامی مرکز بن گیا، لیکن اسے کوئی تجارتی اہمیت حاصل نہ ہوئی۔ وینس نے اس شہر پر قابض ہونے کی جتنی کوششیں کیں وہ ناکام رہیں۔ ۱۴۶۴ء کے موسم گرما میں مورہ Morea کے صوبے دار Iacopo Barbarigo (Provveditore) نے اس شہر پر حملہ کیا اور ناکام رہا۔ تراخان اوغلی عمر بیگ نے کامیابی کے ساتھ اس کی مدافعت کی (قب) بذیل مادہ، نیز H mmer-Purgstail، ۲ : ۸۴ بعد)۔ ستمبر ۱۵۲۲ء میں بوزنطی امیر البحر آندریا دوریا Andrea Doria نے Pátra کو جس کی حفاظت کا عملی انتظام محض برائے نام تھا، بغیر لڑائی کے فتح کر لیا، لیکن یہ قبضہ محض عارضی ثابت ہوا (قب) J. W. Zinkeisen : *Geschichte des Osmanisch Reiches*، ۲ : ۷۳۴ بعد)۔ ۱۶۸۵ء میں وینس کا سپہ سالار سمندر کے راستے Pátrai میں داخل ہوا (اس کے ساتھ ایک فوج تھی، جس میں زیادہ تر جرمن مستاجر سپاہی تھے)۔ وہ چاہتا تھا کہ ترکوں کو مورہ سے نکال دے۔ ۲۴ جولائی ۱۶۸۷ء کو بلیہ بدرا (جسے ترکوں نے خالی کر دیا تھا اور اس کے ایک حصے کو برباد بنی کر دیا تھا) ایک سخت لڑائی کے بعد

بھی تھے۔ اولیا چلبی بلیہ بدرا کے قریب بعض زیارت گاہوں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ ان میں سے ایک میں صاری صالقیق بابا [رك باں]، یعنی سویتی نکولا (Sveti Nikola) کی خانقاہ اور ایک جوانی بابا Jovani Baba کی خانقاہ ہے۔ اولیا چلبی اپنے بیان میں بلیہ بدرا کو ”بال لو (بال لی) بلیہ بدرا“، یعنی ”شہد سے مالا مال بلیہ بدرا“ لکھتا ہے، قب ”بال لو بدرا“ (Anonymus Giese، ص ۱۳۱، س ۸)۔ حاجی خلیفہ (Rumeli und Bosna، ترجمہ J. V. Hammer، ویانا ۱۸۱۲ء، ص ۱۲۳) بلیہ بدرا کی بندرگاہ اور انتظامی معاملات سے متعلق صرف چند جزئیات بیان کرتا ہے۔

بحر زدہ دلدلی میدان، جو اس شہر کے شمال شرقی اور جنوب شرقی اطراف میں تھے (قب R. Pococke کتاب مذکور، ۲/۲: ۱۷۶) مدت ہوئی خشک کر دیے گئے۔ تجارت زیادہ تر سنتی، روغن اور شراب نیز ریشم کی ہوتی ہے (جسے ترکی عہد ہی میں ترقی دے دی گئی تھی، جیسا کہ پوکوک Pococke نے بھی کہا ہے) اور اس چیز نے Pátrai کو ایک بڑا تجارتی مرکز بنا دیا ہے۔ Ludwig Steub: Bilder aus Griechenland، لائپزگ ۱۸۸۵ء، ص ۲۳۰، کے بیان کے مطابق ۱۸۲۲ء میں Pátrai میں پانچ مساجد کے کھنڈروں، گرے ہوئے گرجاؤں، ویران گھروں اور صرف تھوڑے سے مرمت کردہ آباد گھروں کے سوا کچھ نہ تھا۔

مآخذ: (۱) E. Thomopoulos: 'Ιστορία τῆς πόλεως Πατρῶν، ایٹنز ۱۸۸۸ء؛ (۲) E. Gerland: Neue Quellen zur Geschichte des lateinischen Erzbi-stums Patras، لائپزگ، ۱۹۰۳ء؛ (۳) Emile de Borch: Croquis d'Oriens: Patras et l'Achaïe، برساز ۱۹۰۸ء؛ (۴) Wm. Miller: The Latins in the Levant، لندن ۱۹۰۸ء، مواضع کثیرہ، خصوصاً ص ۲۸۹، بعد، ۳۶۳

Thomas Dallam (۱۵۹۹ تا ۱۶۰۰ء) نے اس کا حال بیان کیا ہے، دیکھیے Early Voyages and Travels in the Levant، طبع I. Theod. Bent (لنڈن ۱۸۹۳ء؛ Hakluyt Society، ج ۸۷)، ص ۸۶۔ اس قسم کا سب سے پہلا بیان، جس کی تاریخ ۱۷۴۰ء ہے، Richard Pococke کا ہے (A Description of the East، لنڈن ۱۷۴۵ء، ۲/۲: ۱۷۶)۔ وہ کہتا ہے: یہ شہر ایک دلدلی میدان میں واقع ہے اور بیماریوں کا گھر ہے۔ یہ یونانی اسقف اعظم کا مستقر ہے جس میں بارہ علاقوں (Parishes) کے گرجا ہیں اور ان میں سے ہر علاقے میں اسی عیسائی خاندان رہتے ہیں؛ تقریباً دس یہودیوں کے گھر ہیں اور ترکوں کے تخمیناً اڑھائی سو خاندان ہیں۔ اس زمانے میں ایک انگریز قونصل جنرل اور ایک فرانسیسی نائب قونصل تھا (ان کی قرار گاہ Modon میں تھی)، اور ایک وینس کا قونصل اور ایک ولندیزی قونصل Pátrai میں تھا۔ Dr. Richard Chandler نے ۱۷۶۳ء میں (Travels in Greece، اوکسفرڈ ۱۷۷۶ء) جو بیان دیا ہے وہ بھی بہت حد تک اسی طرح کا ہے۔ ترک سیاح اولیا چلبی نے (سیاحت نامہ، استانبول ۱۹۲۸ء، ۸: ۲۸۸ تا ۲۹۲)، جو ۱۶۶۹/۵۱۰۸۰ء میں اس شہر میں آیا تھا، اس شہر کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ اس نے منڈی (چار سو [یا چار شی]) کے قریب ایک مسجد دیکھی، جو محمد ثانی نے بنوائی تھی۔ اس کے علاوہ اس نے قلعے (ایچ قلعہ) کے اندر بایزید ثانی کی ایک مسجد دیکھی۔ نیز ایک کیایا کی مسجد (کتخدا جامعہ) بھی دیکھی، اور اس کے قریب مسجد شیخ افندی، مسجد ابراہیم چاوش اور آخر میں مسجد دباغ خانہ (چمڑا رنگنے کا کارخانہ) دیکھی۔ ان کے علاوہ اس زمانے میں تین اور چھوٹی چھوٹی مسجدیں، چار درویشوں کی خانقاہیں (جن میں سے ایک شیخ افندی کی خانقاہ تھی) اور تین حمام



سے مشہور رہا ہے۔ یہ قلعہ عرصے تک ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا اور مشرق کی طرف سے حملہ آوروں اور چھاپاماروں کے مقابلے میں اکثر کمین گہ کا کام دیتا رہا ہے۔ ۵۲۶۰ / ۶۸۷۳ء میں جب یعقوب ابن لیث الصفار [رک باں] اور آل طاہر میں جنگ ہو رہی تھی تو اس قلعے کو بطور زندان استعمال کیا گیا [ابن رستہ، ص ۳۰۸]۔ حدود العالم (ص ۱۲۵) میں چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی کے بم کی حالت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: ”بم آب و ہوا کے لحاظ سے ایک صحت بخش مقام ہے۔۔۔ اس کے شہرستان میں ایک مستحکم قلعہ بنا ہوا ہے۔ یہ شہر چیرفت سے بڑا ہے۔ اس میں تین جامع مسجدیں ہیں۔۔۔ جن میں سے ایک خارجیوں کی، ایک سنی مسلمانوں کی ہے اور تیسری قلعے کے اندر ہے۔ یہاں سے سوتی کپڑے (کرباس) عماسے، بمی دستاریں اور کنجوریں باہر جاتی ہیں۔“ اسی طرح کی تفصیلات الاضطحری، ابن حوقل اور المقدسی نے بھی دی ہیں۔ اس زمانے میں قلعے کے اندر بھی، جو شہر کے وسط میں تھا، کچھ بازار تھے۔ مکانات دھوپ میں پکائی ہوئی اینٹوں کے تھے۔ یہاں حمام بھی تھے۔ ان میں سے زیادہ مشہور وہ حمام تھا جو بید کے بازار (زقاق البید) میں واقع تھا۔

۵۱۱۳۱ / ۱۱۱۹ء میں غلزنی سردار محمود نے بم پر قبضہ کر لیا، لیکن قندھار میں ایک بغاوت ہو جانے کی وجہ سے وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ ۵۱۱۳۴ / ۱۱۲۱ء میں اس نے اس شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور ۵۱۱۳۲ / ۱۱۲۹ء تا ۵۱۱۳۳ / ۱۱۳۰ء تک یہ افغانوں ہی کے قبضے میں رہا، تاآنکہ نادر شاہ [رک باں] نے افغانوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا۔ نادر شاہ نے اس شہر کے مدافعانہ نظام کو یقیناً اسی خیال سے مضبوط کیا ہوگا کہ

بعد، ۳۸۸ بعد، ۴۳۴ بعد؛ (۵) وہی مصنف: *Essays on the Latin Orient* کیمرج ۱۹۲۱ء، بمواضع کثیرہ، خصوصاً ص ۴۰ بعد، ۵۳ بعد، ۱۰۰ بعد، ۴۱۸ بعد؛ (۶) *Le Despotat Grec de Morée: D. A. Zakythinos*: Ant. Bon (۷)؛ ۱۹۳۲ / ۱۹۵۳؛ ۲ / ۱ پیرس *Le Peloponnèse Byzantin jusqu'en 1204* پیرس ۱۹۵۳؛ انیسویں صدی میں اس شہر کے بہ کثرت بیانات کے لیے قب (۸) *S. H. Weber Voyages and Travels in the Near East made during the XIX century* پرنسٹن ۱۹۵۲ء، ص ۲۳۵، (۹) *Patras*. L. Steub (دیکھیے متن مقالہ) ص ۲۰۹ تا ۲۴۹ پر *Pátrai* اور اس کے باشندوں کی ۱۸۴۶ء میں بہت واضح تصویر کھینچتا ہے۔

(FR. BABINGER)

بم: (عربی بم)، ایران کے آٹھویں آستان میں ایک ضلع اور شہر۔ قرون وسطیٰ میں یہ ضلع ان پانچ ضلعوں میں سے ایک تھا جن میں صوبہ فارس منقسم تھا۔ یہ شہر ایک نخلستان میں ہے، جو دشت لوط کے بڑے ریگستان کے جنوب مغربی کنارے پر واقع ہے۔ بم کا فاصلہ تہران سے ۱۲۵۷ کیلومیٹر اور کرمان سے ۱۹۳ کیلومیٹر ہے؛ زاہدان، جو دشت لوط کی دوسری طرف واقع ہے، اس سے ۳۲۴ کیلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بم کی بلندی گیارہ سو میٹر ہے۔ گرمیوں میں یہاں گرمی ہوتی ہے، لیکن سردیوں میں موسم معتدل رہتا ہے۔ جنوب مغربی ایران کو جو راستے سیستان، افغانستان اور بلوچستان سے ملاتے ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ آسان ہے اس لیے اس شہر کو اس وقت سے جب آند یہ سامانیوں کے عہد میں بنا خاصا حربی اور نجارتی اہمیت حاصل رہی ہے۔ چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی سے بم اپنے جنگی قلعے کی وجہ

۱۸۱۶ء، ص ۱۹۲ تا ۲۰۳؛ (۱۲) K.E. Abott، در  
*Journal of the Royal Geographical Society*، ۲۵:  
 ۴۲ تا ۴۳؛ (۱۳) Sir F. J. Goldsmith، در  
*Journal of the Royal Geographical Society*، ۲۸۳:  
 ۳۷ تا ۲۸۵؛ (۱۴) O.B. St. John، در *Eastern Persia*،  
 لندن ۱۸۷۶ء، ۱: ۸۵ تا ۸۶؛ (۱۵) E. Smith، در  
*Eastern Persia*، ۱: ۲۳۱ تا ۲۳۳؛ (۱۶) G.N. Curzon،  
*Persia and the Persian Question*، ۲: ۲۵۲ تا  
 ۲۵۳؛ (۱۷) Le Strange، ص ۳۱۲؛ (۱۸) رزم آرا و  
 نوتاش: فرهنگ جغرافیای ایران، ۸: ۵۱ تا ۵۲؛  
 (۱۹) A. Costa و L. Lockhart، لندن ۱۹۵۷ء،  
 ص ۳۸ تا ۳۹ اور اناواح ۷۵ تا ۷۸۔

(L. LOCKHART)

بم پور: ایران کے آٹھویں اُستان میں (جو  
 تقریباً صوبہ کرمان اور ایرانی بلوچستان سے مطابقت  
 رکھتا ہے) ایک ضلع اور چھوٹا سا شہر۔ انتظامی  
 لحاظ سے بم پور اور اس کا ضلع [دونوں] ایران شہر (سابق  
 فہرج) کے تحت آتے ہیں۔ ایران شہر تیس کیلومیٹر  
 کے فاصلے پر مشرق کی طرف واقع ہے۔ بم پور کی  
 آبادی پانچ ہزار ہے اور خصوصیت کے ساتھ اپنے  
 قلعے کی وجہ سے مشہور ہے جو ایک سو فٹ بلند  
 ٹیلے کی چوٹی پر بنا ہوا ہے۔ باشندے سنی مسلمان  
 ہیں اور بلوچی [رک باں] زبان بولتے ہیں۔ ان کا پیشہ  
 زیادہ تر زراعت اور مویشی پالنا ہے۔ آس پاس کا سارا  
 علاقہ خوب سیراب اور زرخیز ہے اور یہاں غلہ اور  
 کھجور پیدا ہوتی ہے۔

۱۱۶۰ھ/۱۷۷۷ء میں جب نادر شاہ نے قتل

کر دیا گیا تو بلوچستان کے گورنر نصیر خان نے  
 افغانستان کے احمد شاہ درانی [رک باں] کی اطاعت  
 قبول کر لی، لیکن کچھ مدت بعد وہ خود مختار  
 ہو گیا۔ یہاں ایرانی اقتدار دوبارہ کہیں ۱۸۳۹ء  
 میں جا کر قائم ہوا۔

مشرق کی طرف سے اس پر حملے کا کوئی امکان  
 نہ رہے۔

بم ہی وہ مقام ہے جہاں ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء  
 میں آغا محمد خان [قاجار] نے قصیر العمر زند خاندان  
 کے آخری بادشاہ لطف علی خان کو گرفتار کیا۔  
 اپنی فتح کی یادگار قائم کرنے کے لیے قاجار نے  
 وہاں ایک مخروطی برج تعمیر کیا، جس میں اپنے  
 حریف کے چہرے سو ساتھیوں کے سر چن دیے  
 (A History of Persia from the begin- : R.G. Watson)  
 ning of the 19th Century to the year 1858 - (ص ۷۵)۔

۱۲۵۶ - ۱۲۵۷ھ/۱۸۳۰ - ۱۸۳۱ء میں جب  
 آغا خان محللاتی نے اپنی بغاوت کے زمانے میں  
 بم پر قبضہ کیا تو اسے پھر ایک نمایاں حیثیت حاصل  
 ہو گئی۔ قدیم بم میں، جو تقریباً سارے کا سارا  
 کھنڈر ہے، شاندار قلعے کے علاوہ صرف ایک اور  
 اہم عمارت امام زید بن علی زین العابدین کا مقبرہ  
 ہے۔ جدید بم میں، جو قدیم شہر کے جنوب مغرب  
 میں تقریباً پانچ سو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے،  
 ساڑھے تین ہزار کی آبادی ہے۔ شہر کے وسط میں  
 سے چوڑی سڑکیں (خیابان) ایک دوسرے کو کٹتی  
 ہوئی گزرتی ہیں اور یوں شہر چار برابر حصوں  
 میں تقسیم ہو گیا ہے۔ پہلے زمانے کی طرح اب بھی  
 بم اور اس کے گرد و نواح کی پیداوار میں کھجوریں  
 اور صنعت میں سوتی کپڑے مشہور ہیں۔

وماخذ: علاوہ ان کے جو متن مقالہ میں مذکور

ہونے: (۱) الأستخری، ص ۱۶۶؛ (۲) ابن حوقل، ص  
 ۲۲۳؛ (۳) المقدسی، ص ۲۶۵؛ (۴) ابن الفقیہ، ص ۲۰۶  
 و ۲۰۸؛ (۵) ابن خردادبہ، ص ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲؛  
 (۶) ابن رستہ، ص ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸؛ (۷) ابن بکر، ص  
 ۱۶۲؛ (۸) یاقوت، بذیل مادہ؛ (۹) ابوالفداء، ص  
 ۳۳۶؛ (۱۰) حمد اللہ المستوفی: نزهة، ص ۷۶؛ (۱۱)

Travels in Beloochistan and Sindh: E. Pottinger، لندن



آئے، جن کے ساتھ اسلام بھی یہاں آیا۔ اس طرح بہ شہر چار حصوں میں تقسیم ہو گیا: نیاریلا Niarela، توریللا Tourela، بزولا Bozola، اور ڈرویللا Dravela اور یہی چار حصے موجودہ شہر کی بنیاد ہیں۔

بما کو، جو دریائے نائجر پر ایک سرحدی مستحکم قلعہ تھا، تھوڑے ہی دن میں فرانسیسیوں کی سیاسی توجہ کا مرکز بن گیا۔ ۱۸۷۰ء کی لڑائی کے بعد اس کی جانب حرکت شروع ہوئی، اور ۱۸۸۳ء میں کرنیل بورگنس دبورڈز - Borgnis Desbords نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے یہ شہر سوڈان میں فرانسیسیوں کی جنگی کارروائیوں کا مرکز بن گیا اور اس کی آبادی سینکالیوں اور سوڈانیوں کی وجہ سے برابر بڑھتی رہی۔ ۱۹۰۴ء میں ریل بھی یہاں تک پہنچ گئی اور ۱۹۰۷ء میں یہ شہر بالائی سینیگال اور نائجر کا خاص شہر ہو گیا۔ ایک عظیم اداری، فوجی اور طبی (جذام اور گرم ممالک کے امراضِ چشم کے ادارے) مرکز کی حیثیت سے ترقی کرنے لگا۔ اور پھر یونیورسٹی (فیڈرل سکول آف پبلک ورکس) اور ثقافتی (فرنچ انسٹیٹیوٹ آف بلیک افریقہ) مرکز بن گیا۔

بما کو ایک اسلامی شہر ہے، لیکن اس کے اسلام پر افریقہ کا رنگ چڑھا ہوا ہے اور اس میں اکثر اوہام پرستی کے قدیم عقیدے کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ شہر اسلامی تہذیب کا مرکز کہی نہیں جاتا بلکہ ہمیشہ سے خطے کے قدیم اسلامی شہروں اور مراکز کے مرکزوں کے زیر اثر رہا۔ یہاں عورتوں اور بچائیہ سسٹم سے قائم ہیں۔ ہمیشہ یہاں عورتوں کی اہمیت تھی، لیکن بعد میں غمزدگی اس پر غالب آگئی۔ دونوں غلامگیر جنگوں کے ذریعے زمانے میں یہاں ہمیت (Hamallism) بھی شروع ہو گئی، لیکن ذرا زیادہ متین نکلے میں۔ آج کل یہاں ایک حارمی

مآخذ: (۱) H. Pottinger *Travels in Blooch-*

*Istan and Sinde*، لندن ۱۸۱۶ء، ص ۳۳۰: (۲)

:Sir F. Goldsmid و E. Smith، B. Lovett، O. St. John

*Eastern Persia*، ۱: ۲۶، ۲۰۶ تا ۲۰۷: (۳) *Le Strange*

ص ۳۳۰: (۴) سرتیپ ایچ۔ اے رزم آرا و سرتیپ

نوتاش: فرہنگ جغرافیای ایران، ۸: ۴۷۔

(L. LOCKHART)

بما کو: [مغربی افریقہ میں جمہوریہ مالی کا دارالحکومت اور] مملکت سوڈان (سابق) فرانسیسی مغربی افریقہ) کا سب سے بڑا شہر، جو دریائے نائجر Niger پر اس جگہ واقع ہے جہاں اس کی جہازرانی کے قابل دو شاخیں باہم ملتی ہیں اور جہاں ڈاکر۔ نائجر ریلوے ختم ہوتی ہے۔ یہاں ہوائی جہازوں کا بڑا اڈا بھی ہے۔ یہ شہر ساحل اور جنوبی حصہ ملک اور سوڈان اور سینیگال Senegal کو ملانے والی سڑکوں پر واقع ہونے کی وجہ سے پہلے ایک تجارتی مرکز تھا اور آج کل [سابق] فرانسیسی جنوبی افریقہ میں ایک مرکزی مقام کی حیثیت رکھتا ہے اور یہی بات اس کی خوش حالی کا سبب ہے۔ اس کی آبادی ۱۸۸۸ء میں آٹھ سو توی: ۱۹۴۰ء تک بڑھ کر سینتیس ہزار ہو گئی اور آج کل (۱۹۵۸ء) ایک لاکھ ہے (جس میں چار ہزار یورپی ہیں) [۱۹۶۷ء میں ڈیڑھ لاکھ کے قریب]۔ اس شہر کی اہمیت اس کی اداری اور سیاسی حیثیتوں کی بنا پر ہے۔

بما کو کو ایک بما Bama شکاری نے بسایا تھا اور اس کے نیاری Niare جانشین نے، جو کارتا Kaarta سے آیا تھا، اس کا نام (بما کے نام پر) بما کو Bama-Ko رکھا (اس کا اشتقاق بمعنی "مگر مچھوں کا دریا" اور درست صحیح نہیں)۔ اصلی گاؤں کی آبادی اس وقت سردی جب اس میں پہلے تو مچھیرے آ کر آباد ہوئے اور اس کے بعد درا Draa کے لوگ (The Dravé) اور توات Touat کے لوگ (The Touré)

ہے۔ اس علاقے کی سب سے بڑی منڈی بما کو ہی ہے۔ یہاں ایک چیمبر آف کامرس بھی ہے۔ بما کو سے پیرس تک بے تاریقی کا سلسلہ قائم ہے۔ یہاں ایک بہت بڑی جامع مسجد بھی ہے۔

[مآخذ: (۱) محمود بریلوی: *Islam in Africa*,

لاہور ۱۹۶۳ء، ص ۳۳۹؛ (۲) *Encyclopaedia of*

*Britannica*، ۱۹۵۰ء، ۳: ۱۳؛ (۳) *World Muslim Gazetteer*،

اول، ۳: ۳۹۵-۳۹۷؛ (۴) *Statesman's Year Book*

۱۹۶۷ء؛ (۵) *Whitaker's Almanack*، ۱۹۶۷ء؛ (۶)

*World Muslim Gazetteer*، مطبوعہ کراچی؛ (۷)

گلزار احمد: تذکرہ افریقہ، کراچی ۱۹۶۳ء، بذیل مادہ

بما کو، بمدد اشاریہ.]

M. CHAILLEY [و ادارہ]

بمبار: رگ بہ منڈے و سوڈان.

بمبئی: (صوبہ)، بھارت کے صوبوں میں سے ایک،

جس میں کچھ (ایک حصہ)، سوراشر، گجرات، مہاراشٹر،

مراٹھہ واڈا، اور وڈربھ کے علاقے شامل ہیں۔ [برطانوی

زمانے میں اسے 'احاطہ بمبئی' کے نام سے یاد کیا

جاتا تھا۔] اس صوبے کی موجودہ حدود کا فیصلہ

بھارت کی ریاستوں کی تنظیم نو کے مطابق ۱۹۵۶ء

میں ہوا۔ اس صوبے کی ترکیب بھارت کے دیگر

صوبوں سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ یہ ان

علاقوں پر مشتمل ہے جن میں دو مختلف زبانیں

بولی جاتی ہیں، یعنی مرہٹی اور گجراتی۔ اس

صوبے کا مجموعی رقبہ ایک لاکھ نوے ہزار سات

سو بہتر مربع میل ہے اور کل آبادی چار کروڑ

بیاسی لاکھ چوسٹھ ہزار چھ سو بائیس ہے۔ آبادی

کے یہ اعداد ۱۹۵۱ء کی سرشماری پر مبنی ہیں۔

کسی وقت کل صوبے پر مسلمانوں کی حکومت تھی،

اور اب بھی سرشماری کے اعداد و شمار سے متعدد

اہم مرکزوں میں مسلمانوں کے بہت معقول تناسب

کی موجودگی ظاہر ہوتی ہے۔ مسلمان اس صوبے

جماعت پیدا ہو گئی ہے جس کا مقصد مقامی اسلام کو حشو و زوائد سے پاک کرنا ہے۔ آج کل کے رجحانات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ احیائے اسلام کے کام میں یہ شہر قیادت کے فرائض انجام دے گا۔ آخر میں اس کا ذکر بھی ضروری ہے کہ بما کو میں ایک چھوٹی سی عیسائی جماعت بھی ہے اور ایک مطران (رئیس الاساقفہ) یہاں رہتا ہے۔

[اس شہر کی ابتدا کچے گھروں سے ہوئی،

اس لیے یہاں کوئی قدیم تاریخی یادگار باقی نہیں۔

۱۹۲۳ء میں ریلوے لائن کی توسیع بحر اوقیانوس

کے ساحل تک ہو گئی تھی۔ اپنے محل وقوع کی بنا

پر ممکن ہے کہ بما کو زمانہ قدیم میں بھی مختلف

سوڈانی سلطنتوں کا دارالحکومت رہا ہو۔ ۱۸۸۳ء

میں فرانسیسیوں نے مقامی فرمانرواؤں کو شکست

دے کر یہاں اپنا تسلط قائم کر لیا۔ ۱۹۰۳ء میں

بما کو فرانسیسی سوڈان کی نو آبادی کا صدر مقام بنایا

گیا۔ شہر تین مختلف حصوں میں منقسم ہے:

سرکاری عمارتیں اور دفاتر، کولوبہ Koulouba کی

کی صحت افزا سطح مرتفع پر واقع ہیں۔ اس کے اور

افریقیوں کی بستی کے درمیان "شامیوں" کے مکانات

اور دکانیں ہیں۔ تجارتی علاقہ ریلوے سٹیشن کے

گرد واقع ہے۔ آبادی اور دریا کے درمیانی علاقے میں

باغات ہیں۔ بڑے بڑے گلی کوچوں کے کناروں

پر گہری خندقیں کھدی ہوئی ہیں تاکہ برسات میں

بارش کا پانی سڑکوں پر جمع نہ ہونے پائے۔ بعض

خندقیں دس دس فٹ گہری ہیں۔ شہر کی اکثر

عمارتوں میں کولوبہ کا سرخ پتھر استعمال کیا گیا

ہے۔ ان کی چھتیں مسطح اور سوڈانی طرز تعمیر کی

غماز ہیں۔ ۱۹۲۹ء میں اسی مقام پر دریا سے نہر

ستوبہ Sotuba نکالی گئی تھی، جس سے آب پاشی

کر کے وسطی نائجر کا بنجر علاقہ زیر کاشت لایا گیا



[رک بہ خوجہ] کی ایک اچھی خاصی تعداد پائی جاتی ہے۔ تجارت اور کاروبار میں ان لوگوں کی ہمت و استعدادی مشہور ہے اور وہ شمالی افریقہ، خلیج فارس، ملایا، سنگاپور اور دوسرے مقامات سے تجارتی تعلقات میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس شہر کی تاریخ دلچسپ ہے۔ موجودہ بڑی بڑی منڈیاں سات منفصل جزیروں پر جن کے مابین دلدلیں تھیں، رفتہ رفتہ بڑھ کر تیار ہوئی ہیں۔ پرتگیزیوں کے آنے سے پہلے وہاں مسلم حکمران تھے، اور ایک ممتاز یادگار شیخ علی پارو کا مقبرہ ہے جو تقریباً ۵۸۳۵/۱۳۳۱-۱۳۳۲ء میں تعمیر ہوا تھا پھر ۱۶۷۳ء میں اس کی مرمت ہوئی۔ یہاں ہر سال ایک عرس ہوتا ہے، جس میں زائرین اچھی خاصی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔ شہر میں ایک جامع مسجد بھی ہے جس کی تاریخ تعمیر ۱۹۰۲ء ہے۔

مآخذ: (۱) سر شماری کی اطلاعات (Census)

(Reports) ۱۸۸۱، ۱۸۸۱ اور ۱۹۰۱ء؛ (۲) *Handbook of Statistics of the Reorganised Bombay State*؛ Sir J. M. Campbell (۳)؛ ۱۹۰۶ء *towards a Statistical Account of the town and S. M. (۴)؛ ۱۸۹۳ء؛ Island of Bombay*؛ Edwardes (۵)؛ *The Rise of Bombay*؛ ۱۹۰۲ء؛ *Guide to Bombay*؛ J. M. Maclean (۶)؛ جدید معیونہ کے لیے رک بہ بھارت]۔

(A.A.A. FYZEE)

- **بناہ:** تعمیر، راج یا معمار کا فن۔ تعمیری ترکیبوں کا انحصار جزوی طور پر اس سائے پر ہوتا ہے جسے استعمال میں لایا جائے۔ ہم بلاد اسلامیہ میں، بہت زیادہ مختلف قسم کا مسالا استعمال ہوتا دیکھتے ہیں، یعنی کئی ہونی مٹی

میں دوسری اہم ترین مذہبی جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں، گو تقسیم ہند کے بعد بعض مسلمانوں کے یہاں سے پاکستان کی طرف ہجرت کر جانے کے سبب [اور بعض دیگر وجوہ سے] ان کی تعداد زمانہ حال میں کم ہو گئی ہے۔ ۱۹۵۱ء میں آخری سر شماری کے وقت کل آبادی کے ۵۰۳۳ حصے کی مادری زبان اردو تھی۔ شہر بمبئی کو چھوڑ کر مسلم آبادی کے بڑے بڑے مرکز احمد آباد، مشرقی خاندیش اور سورت ہیں۔ یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت سنی ہے۔

مآخذ: (۱) اطلاعات سر شماری؛ (۲) *Handbook*

*of Statistics of the Reorganised Bombay State*

۱۹۰۶ء، ۱۸۸۲ء، ۱۸۸۱ء، ۱۸۹۱ء اور ۱۹۰۱ء

کی مردم شماری کی اطلاعات؛ (۳) Sir J. M. Campbell

*Bombay District Gazetteers*؛ بمبئی ۱۸۸۷-۱۹۰۱ء؛

*Imperial Gazetteer of India*؛ صوبائی سلسلہ

*Bombay Presidency*؛ کلکتہ ۱۹۰۹ء؛ [(۵) نیز رک بہ

بھارت]۔

(A. A. A. FYZEE)

• **بمبئی:** (شہر) صوبہ بمبئی کا دارالحکومت؛ بھارت کی بڑی بندرگاہوں میں سے ایک اور تجارت اور صنعت و حرفت کی بڑی منڈی ہے۔ اس کا رقبہ ایک سو گیارہ مربع میل ہے اور ۱۹۵۱ء کی سر شماری میں اس کی آبادی اٹھائیس لاکھ انتالیس ہزار دو سو ستر تھی۔ ان میں سے دو لاکھ اکیس ہزار نو سو پچھتر کی مادری زبان اردو، چھ ہزار پانچ سو اٹھائیس کی فارسی، چھ ہزار تین سو کی پشتو، دو ہزار پانچ سو چھتیس کی عربی تھی اور یہ اعداد اس شہر کے مسلمانوں کی تعداد کو ظاہر کرتے ہیں اور ان اعداد میں ان مختلف نسلوں کے افراد شامل ہیں جو مشرف بہ اسلام ہو گئیں، یعنی عرب، ایرانی، ترک، افغان وغیرہ۔ تجارت کی اہم جماعتوں میں میمنوں، بوہروں، خوجوں

جس سے نیچے کے بھاری ردوں کے جوڑ نمایاں ہو جائیں۔ بلاستر گر جاتا ہے تو شہتیروں کے بیچ بیچ میں برابر فاصلوں کے سوراخ دکھائی دینے لگتے ہیں۔ مغربی بلادِ اسلامیہ میں طایہ کا طریقہ پانچویں اور چھٹی صدی ہجری/ گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں عام ہو گیا، خصوصاً عسکری عمارتوں میں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ المغرب [مراکش] میں اسے اندلس سے لایا گیا تھا جہاں اس کا بہت عرصے سے علم تھا۔

کچی اینٹ (طوب)، جو کبھی کبھی طایہ کی روکار کا کام دیتی ہے، مٹی اور کٹے ہوئے بھس کو ملا کر بناتے ہیں، جنہیں لکڑی کے سانچے میں ٹھوک کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ صحراے اعظم کی بستیوں میں اس کا ابھی تک رواج ہے، اور یہ خشک خطوں میں، خصوصاً عراق اور عرب میں بہت پہلے سے استعمال ہوتی تھی۔ مدینہ منورہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کی دیواریں غالباً اسی سالے کی بنی ہوئی تھیں اور اسی طرح سامرا کی عباسی مسجد کی دیواریں بھی۔ تقریباً اسی زمانے میں ہم اسے افریقیہ [تونس] میں بھی استعمال ہوتے دیکھتے ہیں۔ عباسیہ کی کھدائیوں سے، جو قیروان کے بنو اُغلب کا صدر مقام تھا، احتیاط سے سانچے میں ڈھالی ہوئی طوب کے نمونے ہاتھ لگے ہیں۔ یہ طوب یا کچی اینٹ بیالیس سینٹی میٹر (قریب سولہ انچ) لمبی اس کے نصف کے برابر چوڑی اور اس کے چوتھائی کے برابر موٹی ہے، اور اس سے مترشح ہے کہ معماروں کا سانچہ بیالیس سینٹی میٹر کا تھا۔

پختہ اینٹ (آجر) جس کا ایران میں عام رواج تھا اور جسے اہل روم بھی خصوصاً عام حماسوں میں استعمال کرتے تھے، تمام بلادِ اسلامیہ میں پائی جاتی ہے، لیکن ایران کا تو ہمیشہ سے بہترین تعمیری مسالا یہی رہی۔ یہ اینٹ مختلف عرض و

سے لے کر چوکور تراشیدہ پتھر تک جن کے درمیان کے مدارج خشت پختہ و ناپختہ، روڑی اور بے سلیقہ گہڑے ہوئے پتھر تھے۔ ان میں سے کسی ایک مسالے کا انتخاب بلاشبہ زیر بحث ملک کے وسائل یا ان کے فقدان پر منحصر ہوتا ہے اور اسی طرح مقامی رواج پر یا ان روایات پر جنہیں بیرونی معمار اپنے ساتھ لے آئے، اور جو وقتی طور پر مقامی روایات کی جگہ لے لیتی ہیں؛ چنانچہ شام، جو ایک مدت سے فن سنگتراشی سے واقف تھا، پتھر میں سٹرنس (= Stalactites) کی پیچیدہ اوضاع تیار کرنے لگا، جنہیں ایران سے مستعار لیا گیا اور جو غالباً خشتی عمارات سے اخذ کی گئی تھیں۔ اس کے برخلاف مصری، جن کی کانوں سے عمدہ صاف پتھر نکلتا تھا، بنو طولون کے عہد تک اینٹ ہی استعمال کرتے رہے، کیونکہ ان کے تعمیری نمونے اور بڑے بڑے معمار بلاشبہ عراق سے لائے گئے تھے، جہاں اینٹ ایک عام مسالا تھا۔ . . . چھٹی صدی ہجری/ بارہویں صدی عیسوی کے تین عظیم اندلسی مراکش میناروں میں سے جنہیں (بلاشبہ غلطی سے) ایک ہی معمار سے منسوب کیا جاتا ہے، اشبیلیہ [رک بان] کا جرالده Giralda مینار اینٹوں کا، رباط کا حسان مینار چوکور تراشیدہ پتھروں کا، اور مراکش میں کٹیہ کا مینار روڑی کا بنا ہوا ہے۔

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ طایہ (cobwork) بنانے کی ترکیب کو ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں بالتفصیل بیان کیا ہے، جس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ اس فنی ترکیب کے دستور کو مسلمانوں کی خصوصیت سمجھتا تھا۔ مٹی کو اکثر کھریا اور پسی ہوئی پختہ مٹی یا سنگریزوں کے ساتھ ملا کر دو تختوں کے درمیان کوٹ دیا جاتا ہے، جنہیں شہتیروں کے ذریعے متوازی رکھتے ہیں۔ دیوار پر بلاستر کر دیا جاتا ہے، اکثر ایسے طریقے سے کہ



سے ہوئی، جہاں چوکور پتھر ہمارے زمانے تک عام تعمیری مسالہ رہ چکا ہے۔ مصر میں اس کی جگہ عارضی طور پر اینٹ نے لے لی تھی، لیکن فاطمی دور (چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی تا چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی) میں اس کا استعمال پھر ہونے لگا، خصوصاً ارسنی بدر الجمالی کے بنائے ہوئے قلعوں میں۔ افریقہ میں یہ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کی مذہبی اور عسکری عمارات میں استعمال ہوا اور ساتویں صدی ہجری / تیرہویں صدی عیسوی سے تعمیر کے تونسہ ماہروں میں دوبارہ مقبول ہو گیا۔ ہسپانیہ میں یہ اموی عمارتوں کی بنیادوں میں باقاعدہ استعمال ہوتا تھا، جہاں شامی اثرات نے مقامی روایت کو اور مستحکم بنا دیا تھا۔ المغرب نے اسے چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں الموحّدوں کی عمارات میں اختیار کر لیا۔

جیسا کہ بوزنطی عہد میں ہوا کرتا تھا، روڑی کی بنی ہوئی دیواروں پر اکثر و بیشتر چوکور پتھر کا سہرا بنایا جاتا ہے۔ کونوں کی بندش رومی بندشوں کی طرح بھاری اور ضخیم نہیں ہوتی۔ اس میں بظاہر چوکوں اور کنگر (headers) کے پتھروں کو ملا کر کام لیا گیا ہے۔ اس ترکیب کی سنہ وار تاریخ کو Velazquez Bosco نے قرطبہ کے لیے کسی نہ کسی طرح متعین کر دیا ہے (Velazquez ۱۹۱۲ء) (شکل ب، ب، ب)۔ الموحّدوں کے عہد کی بندش میں باری باری ایک موٹا اور ایک پتلا ردا لگاتے تھے۔ یہ طریقہ مراکش سے ہو کر تونس آیا ہے۔

مذکورہ بالا مسالوں میں ہمیں لکڑی کا اضافہ کرنا ہوگا۔ شہتیروں کو کبھی کبھی دیواروں کے اندر عمود وار چن دیا جاتا ہے۔ القیروان میں

جسامت کی ہوتی ہے اور کبھی کبھی اسے زاویہ نما یا جزوی طور پر گول بنایا جاتا ہے۔ اسے عمارت کے ان حصوں میں جہاں خط کی صحت ضروری ہوتی ہے (ستونوں، ستون کی کرسیوں، زینوں، محرابوں، ڈائون وغیرہ میں)، تنہا یا روڑی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ آپس میں جوڑنے والے افقی مسالے کی حیثیت سے روڑی کے ردوں کے درمیان یا سیدھی بندش کے لیے تعمیر کی باقاعدگی کو خصوصاً کونوں پر قائم رکھنے کا کام کرتی ہے (شکل الف)۔ اینٹ عام طور پر پلاسٹر سے ڈھکی ہوتی ہے، لیکن یہ نظر بھی آسکتی ہے اور رنگ کے عنصر کا بھی اضافہ کر سکتی ہے، چاہے یہ پختہ اینٹ کا گلابی رنگ ہو یا اس کے کنارے پر لگی ہوئی کسی مینا کا۔

روڑی یا بھٹی گھڑائی کا پتھر ساسانی عمارات میں استعمال ہوتا تھا، اور ابھی تک یہ اسلامی عراق میں مستعمل ہے، جیسا کہ اخیڈر کے قلعے میں، جو دوسری صدی ہجری / آٹھویں صدی عیسوی کے وسط کا ہے۔ بظاہر پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں شمالی افریقہ کے بربری معمار سب سے زیادہ اسی مسالے سے واقف تھے۔ بالخصوص طایبہ کے رواج سے پہلے شہروں کی فصیلوں نیز آبی تعمیرات بنانے میں یہی مسالہ استعمال ہوتا تھا (کارے کی دیواروں کی بنیاد عموماً روڑی کی ہوتی ہے)۔ جڑائی کا گارا اور حفاظتی استر کوریا، ریت، پسے ہوئے چوکوں کے ٹکڑوں اور لکڑی کے کوئلے کے ہوتے ہیں۔ ان کی ساخت کا تجزیہ ایک ارتقائی روش کا انکشاف کرتا ہے جس کا مطالعہ M. Solignac نے کیا ہے (Recherches sur les installations hydrauliques de Kairouan، الجزائر ۱۹۵۲-۱۹۵۳ء) اور جس سے ہمیں ان عمارات کا زمانہ متعین کرنے کا موقع ملتا ہے۔

چوکنور تراشیدہ پتھر کا استعمال ایک رومی اور بوزنطی روایت رہی ہے۔ اس کی ابتدا شام

کے بعد انہیں عموماً اطالیہ سے شمالی افریقہ میں درآمد کیا جاتا تھا۔

ایسے بڑے کمرے میں جس کی چھت ستونوں پر قائم ہو دلنشین اثر پیدا کرنے کی غرض سے محدود قاست کے مزید ستونوں کو اوپر نصب کرنے کی ضرورت پیش آئی تو سہاروں کو بنی لامحالہ زیادہ اونچا رکھا جانے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ القیروان کے معماروں نے مصر (مسجد عمرو بن العاص) ہی سے ستونوں کے بالائی اجزا کو جمانے کی ترکیب مستعملی اور اسی طرح قدیم یونانی طرز کا گردنا، جس میں مرغول، پٹیاں اور کنگر کے ساتھ شہتیر کی وہ قینچی بھی شامل ہے جسے سرستون کے اوپر گندے کے اندر جا دیتے تھے (شکل ج)۔ مسجد قرطبہ کے ماہران تعمیر... نے محرابوں کی دو قطاریں اور بنا کے اس ساری چٹائی کو، جسے ستون اٹھائے ہوئے تھے، باہم مربوط کر دیا (شکل د)۔

رباط میں حسان کی الموحدی مسجد (چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی) ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے ڈھولنوں (tambours) سے تشکیل کیے ہوئے ستونوں کی ایک نادر مثال پیش کرتی ہے۔

عمود یا پایہ، جو مربع، مستطیل، چلیپائی یا مخلوط ساخت کا ہو یا اس کے ستون نما بازو ہوں، ایرانی فن تعمیر میں عام مستعمل ہے۔ چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی سے وہ المغرب میں مسجد کے دالانوں کے ستونوں کی جگہ لے لیتا ہے۔ تونسسی مسجدوں میں ستون باقی رہتے ہیں۔ یہ صورت گھروں کے اندرونی صحنوں میں بھی پائی جاتی ہے۔

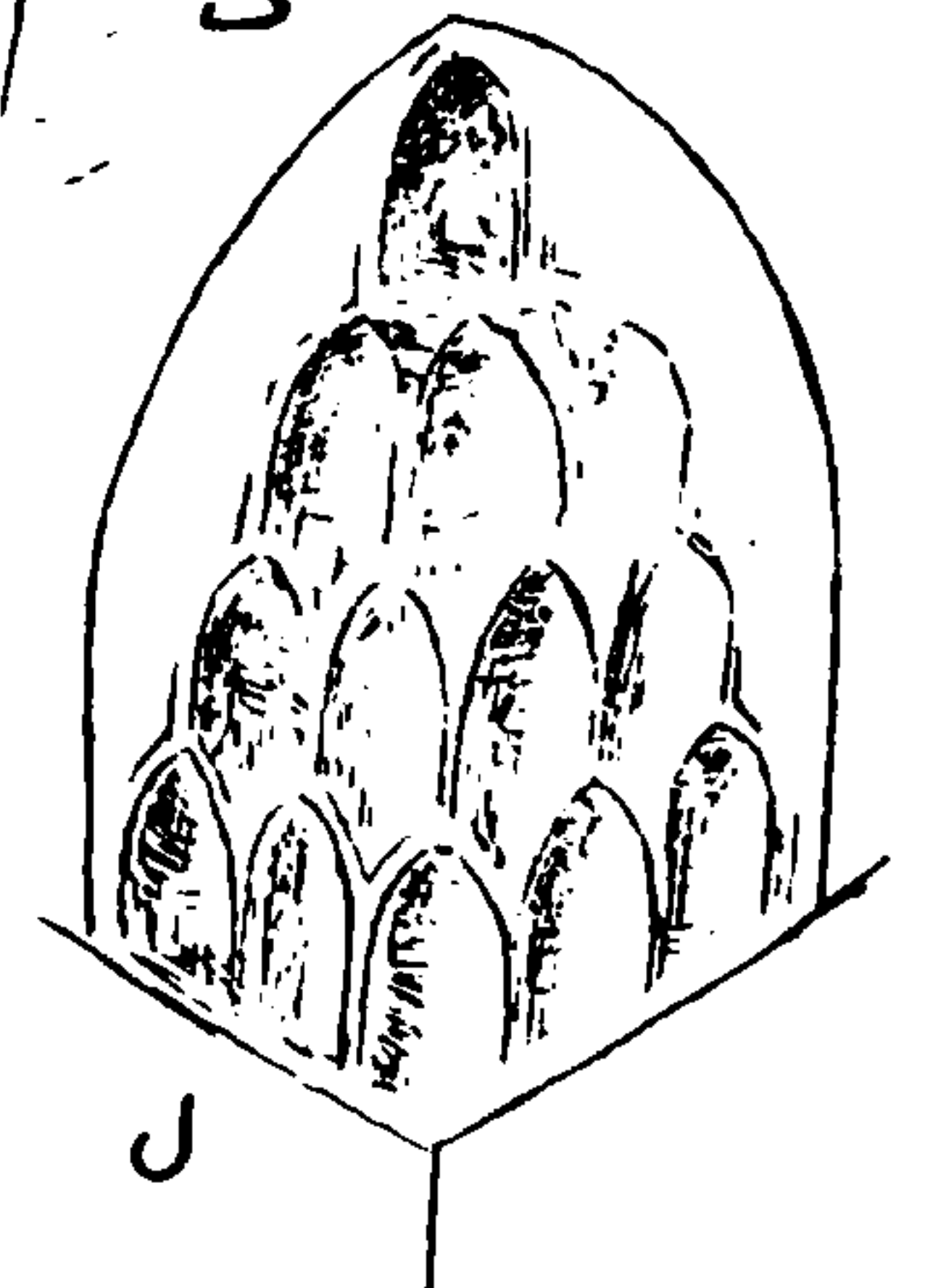
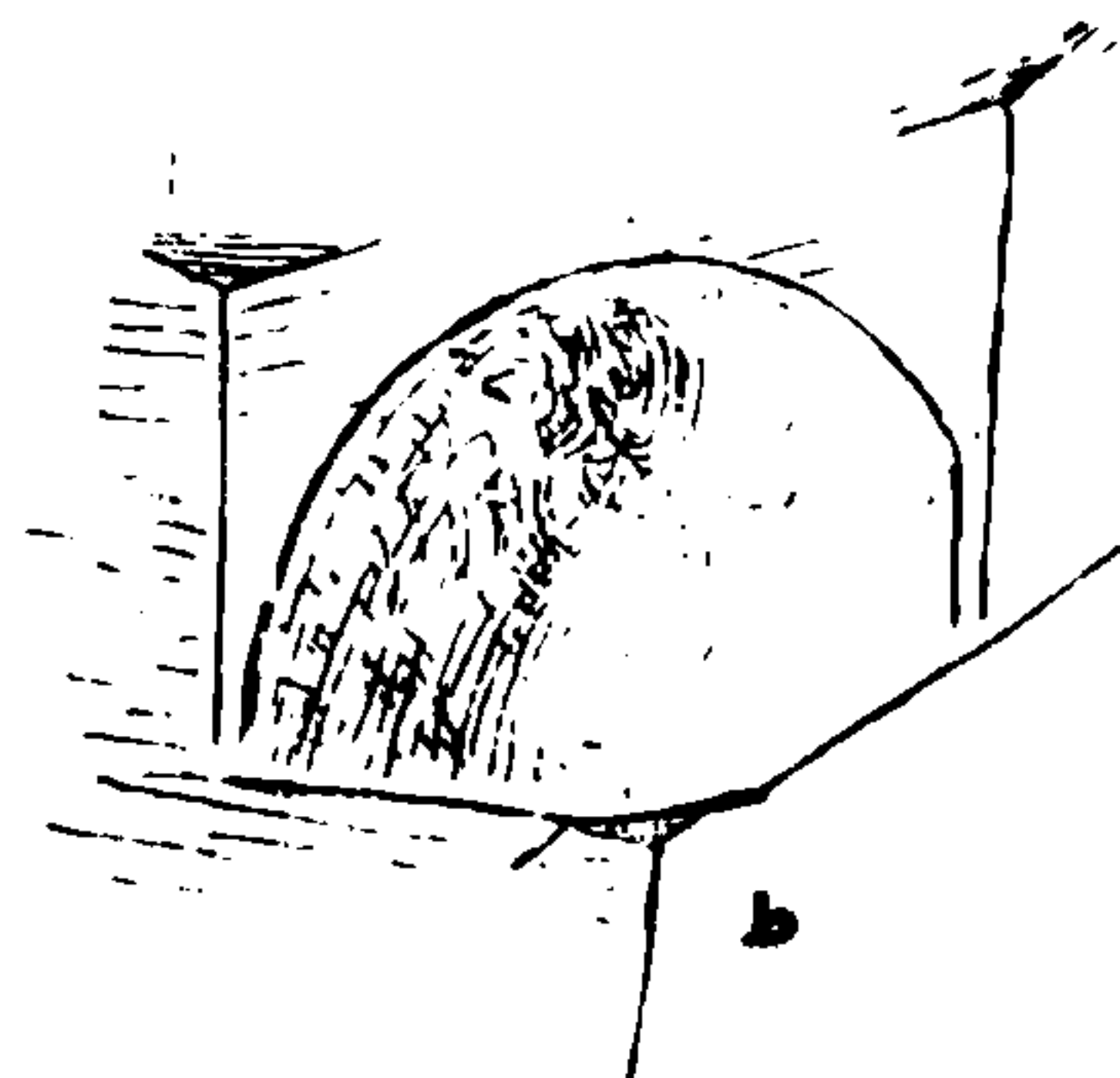
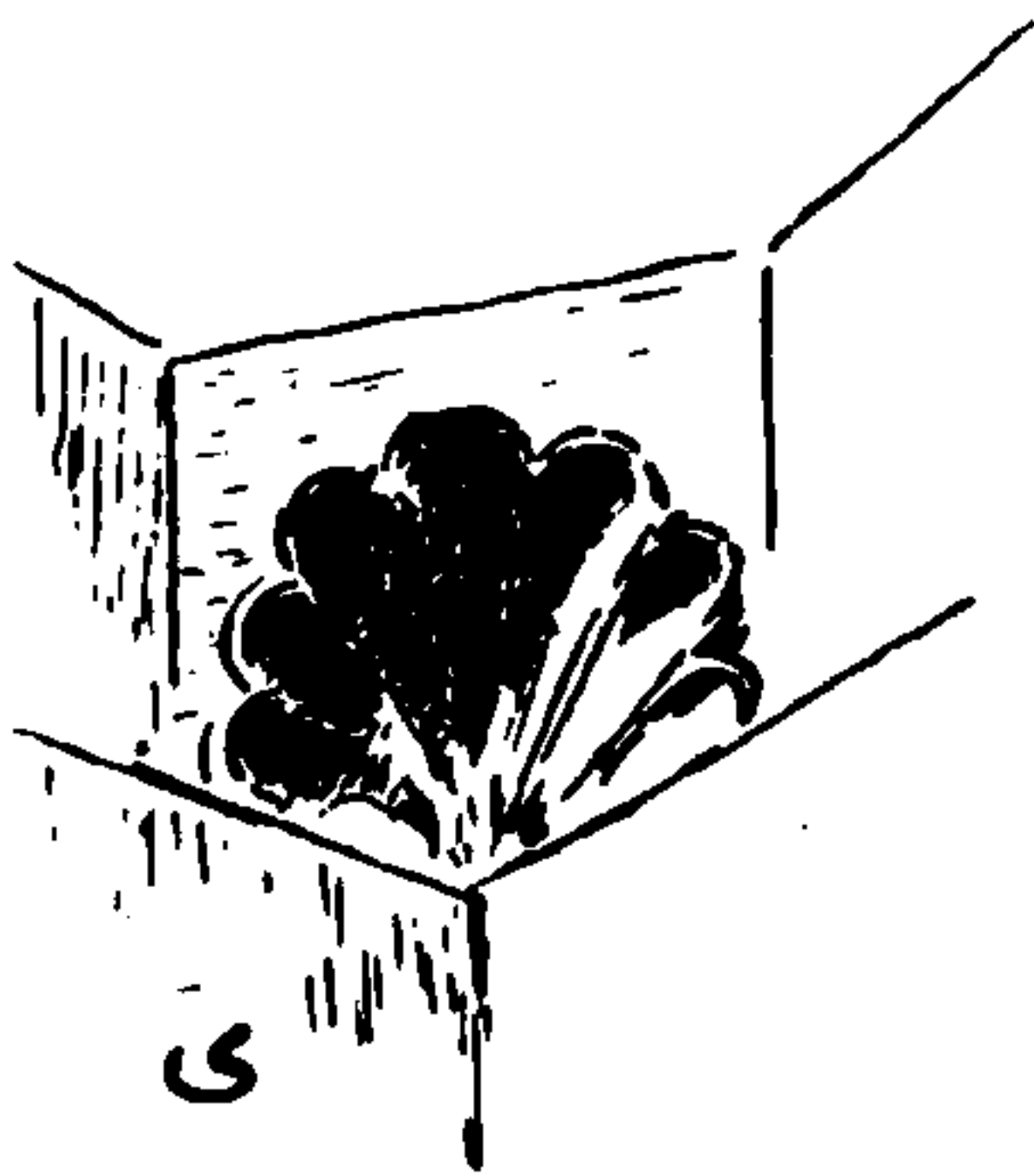
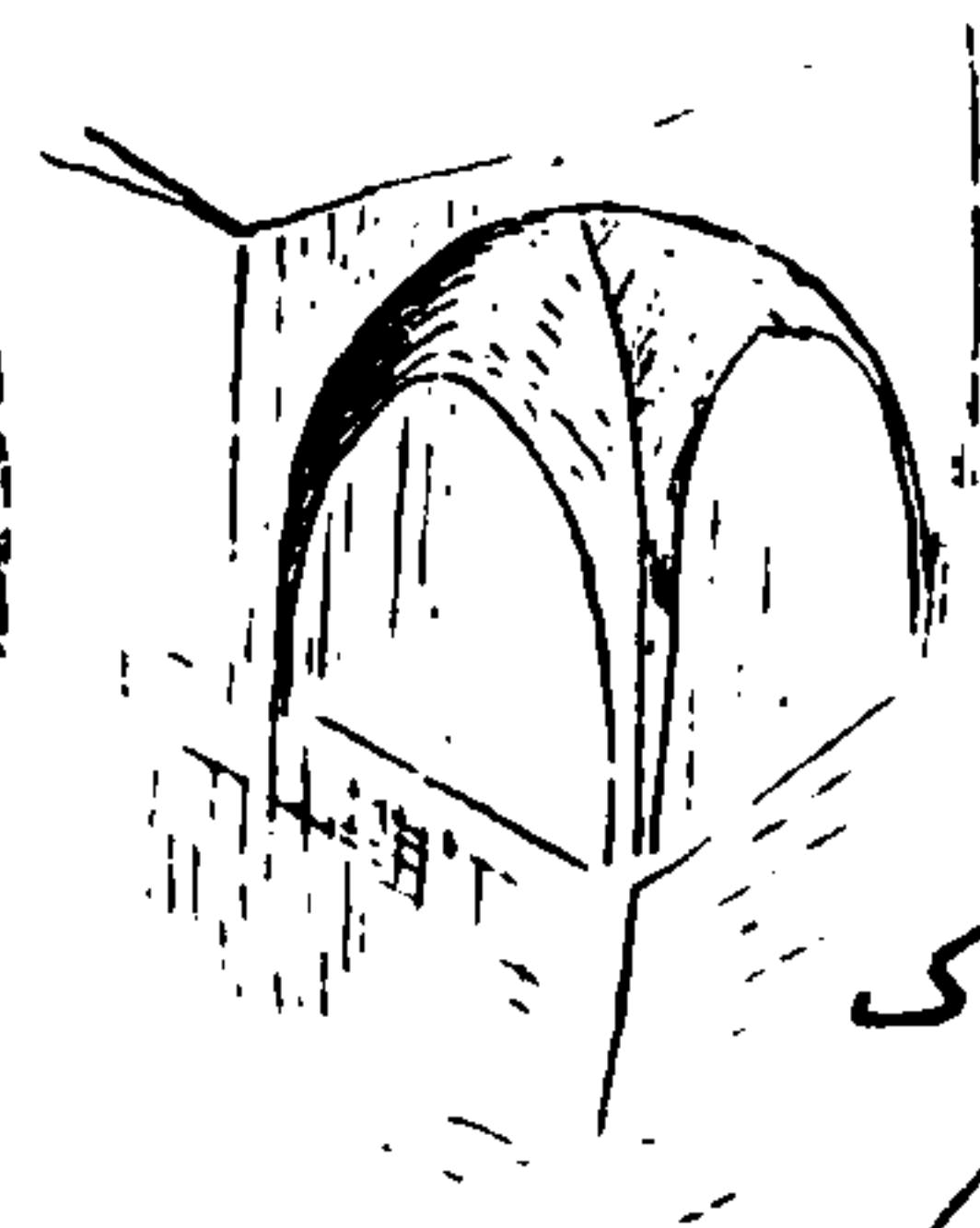
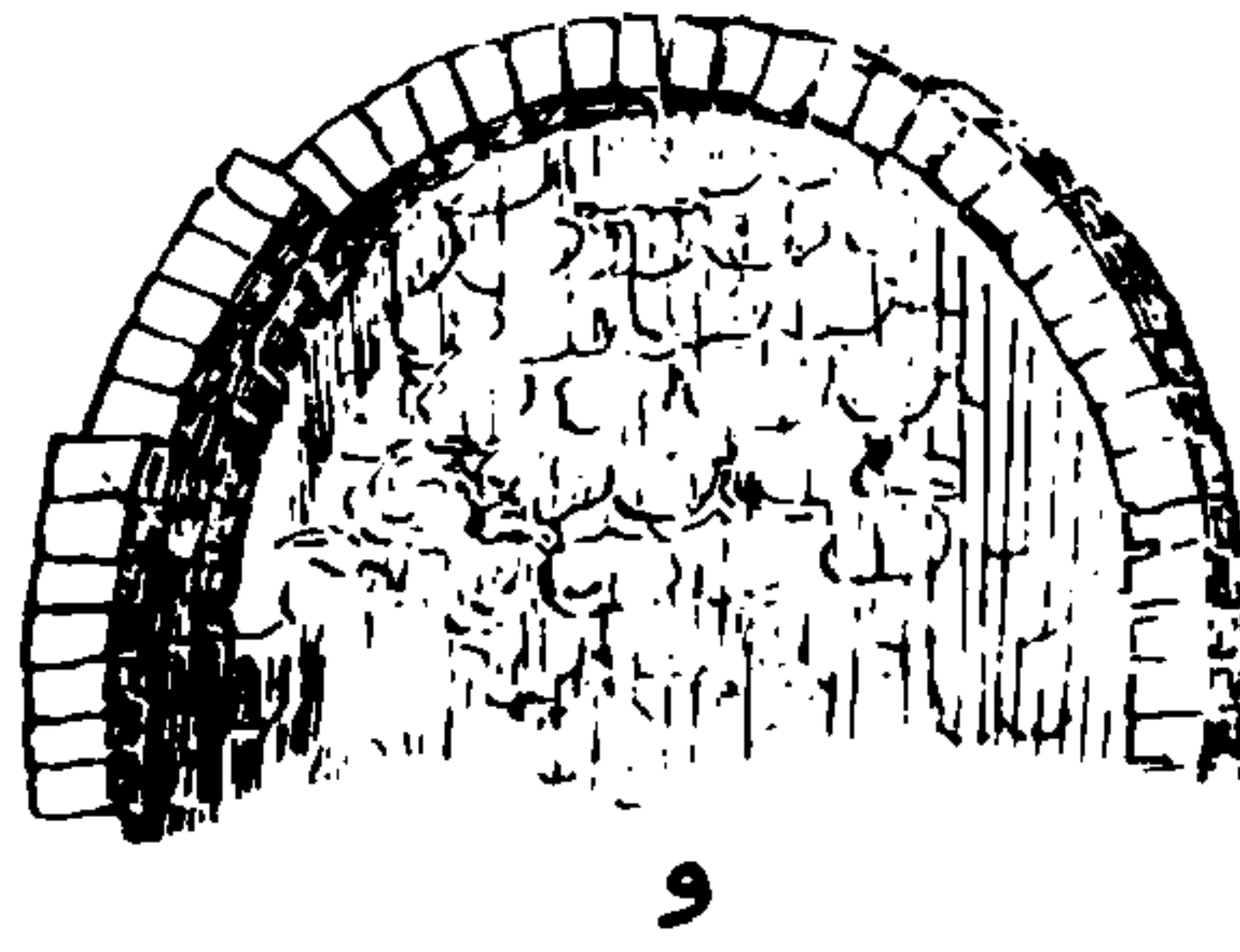
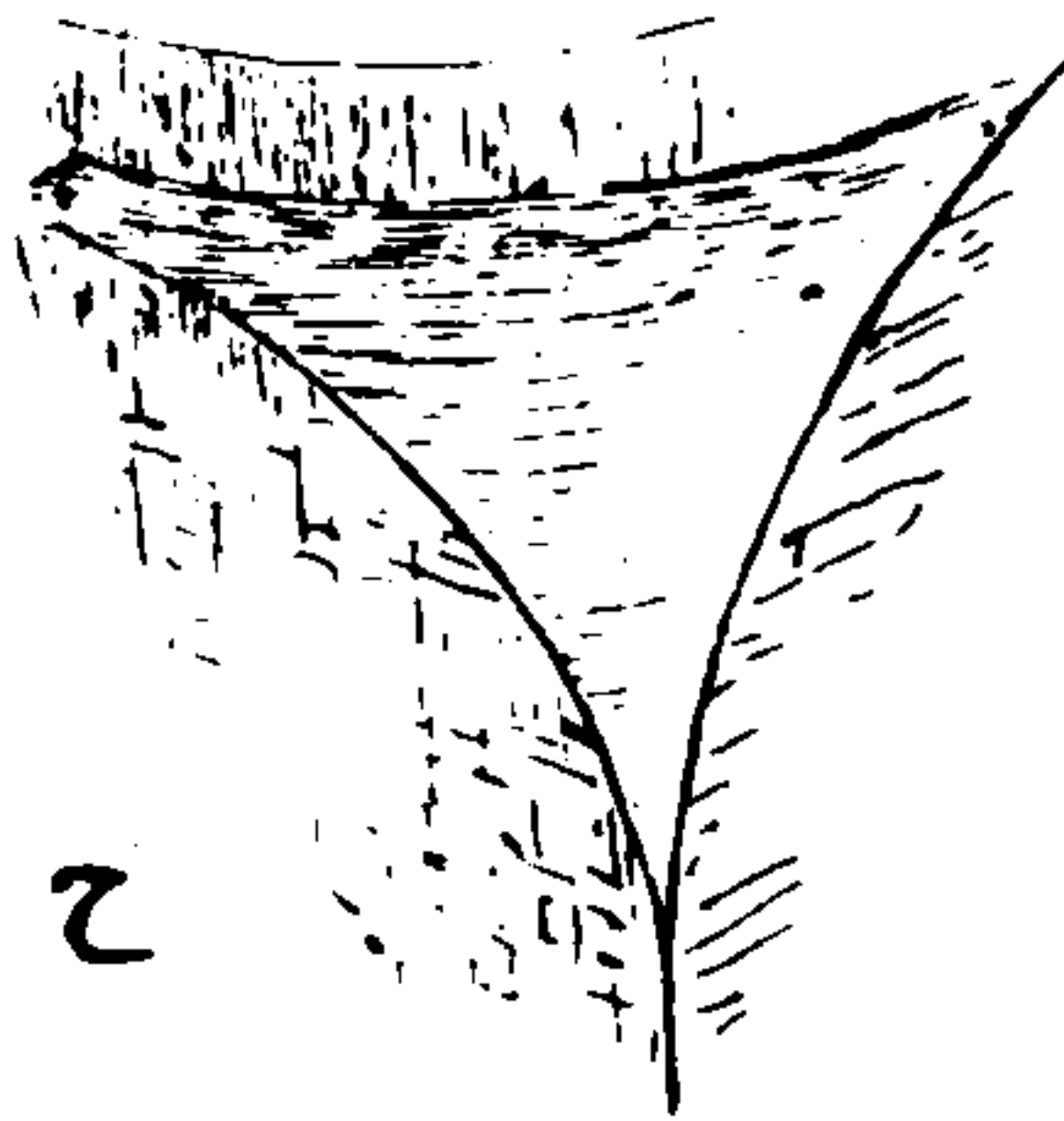
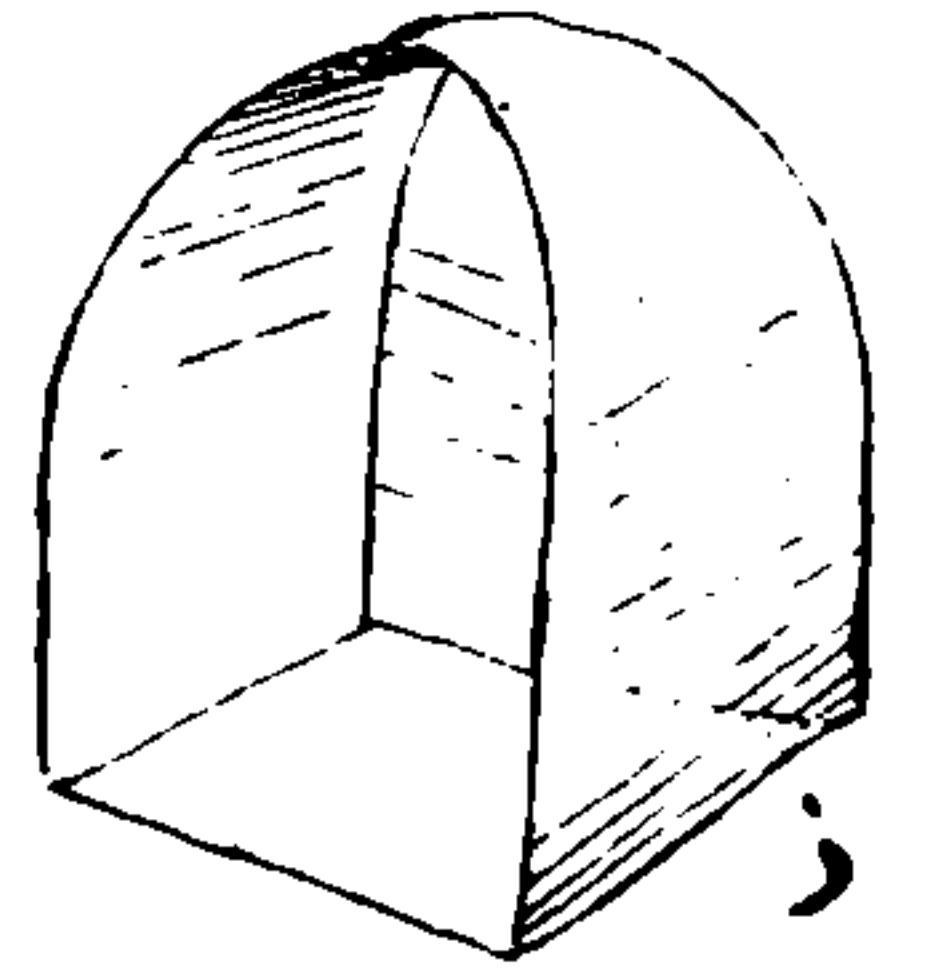
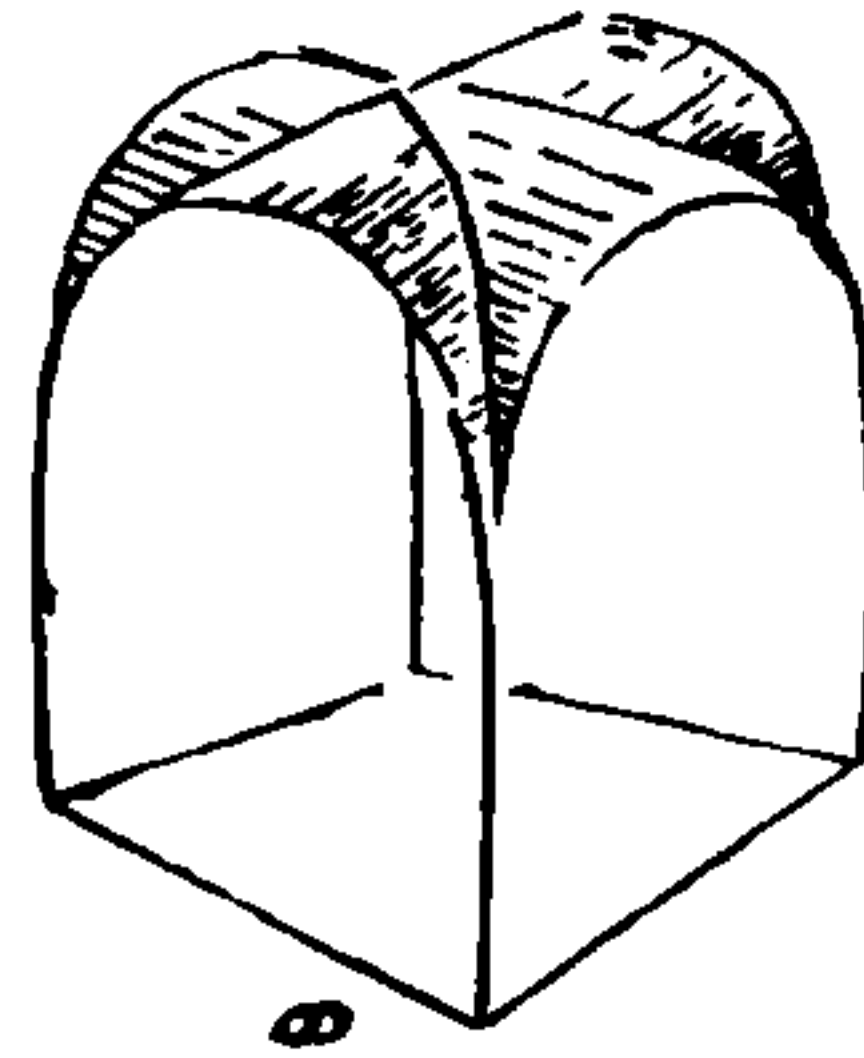
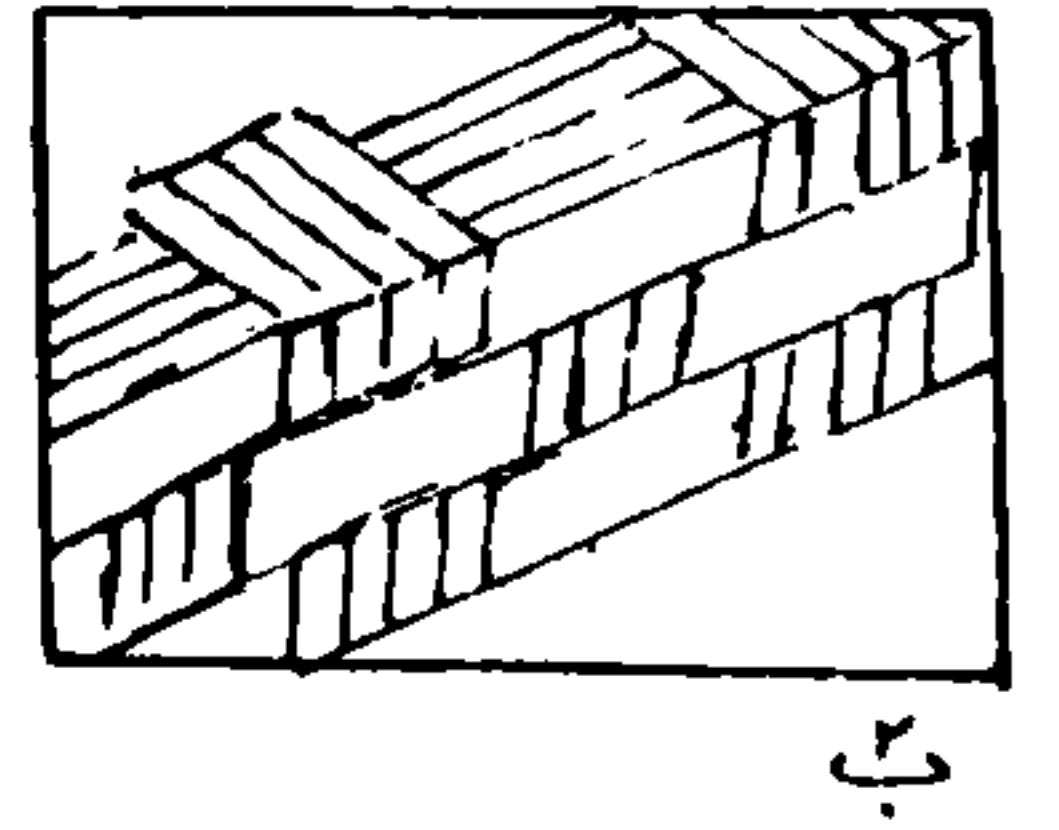
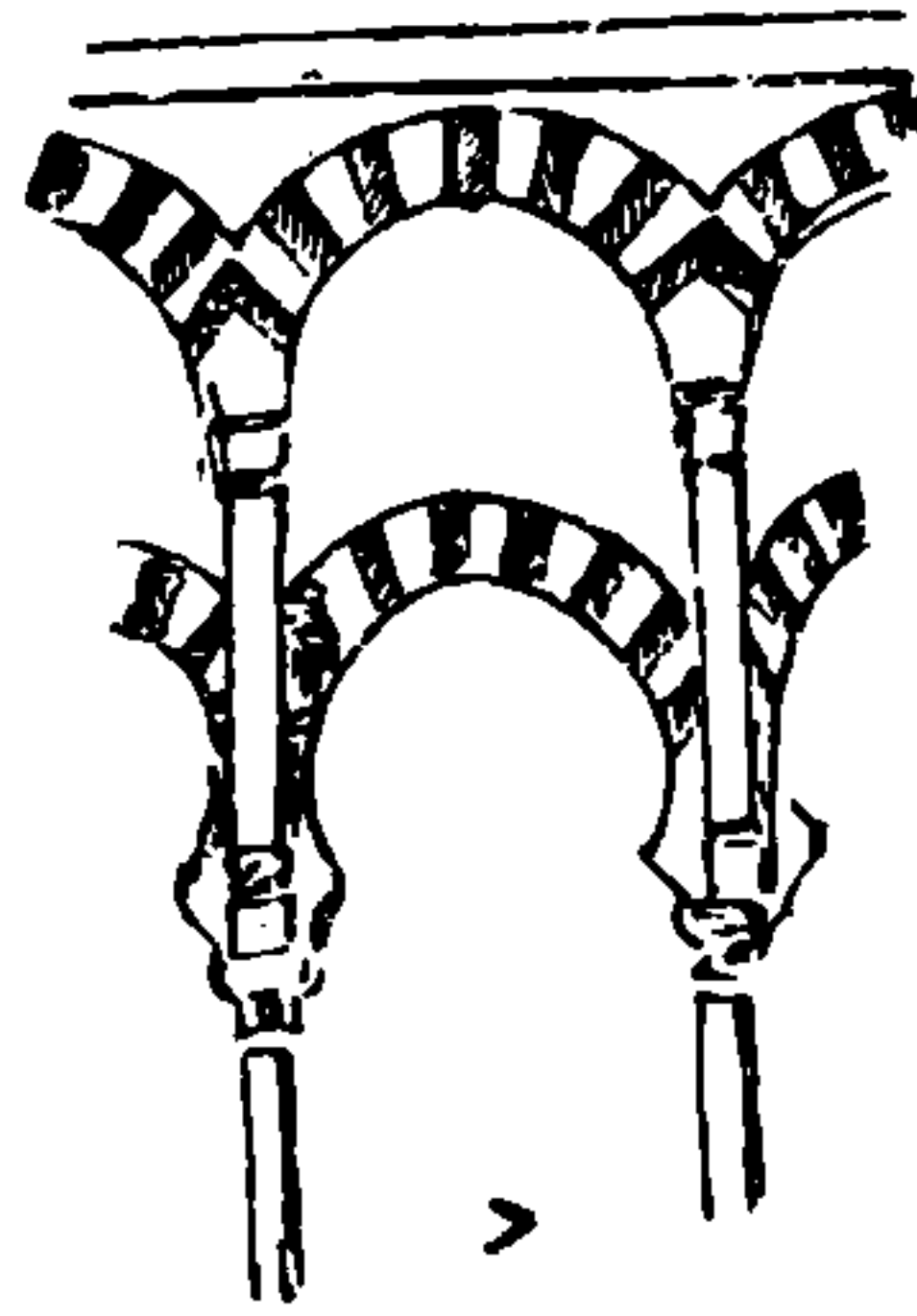
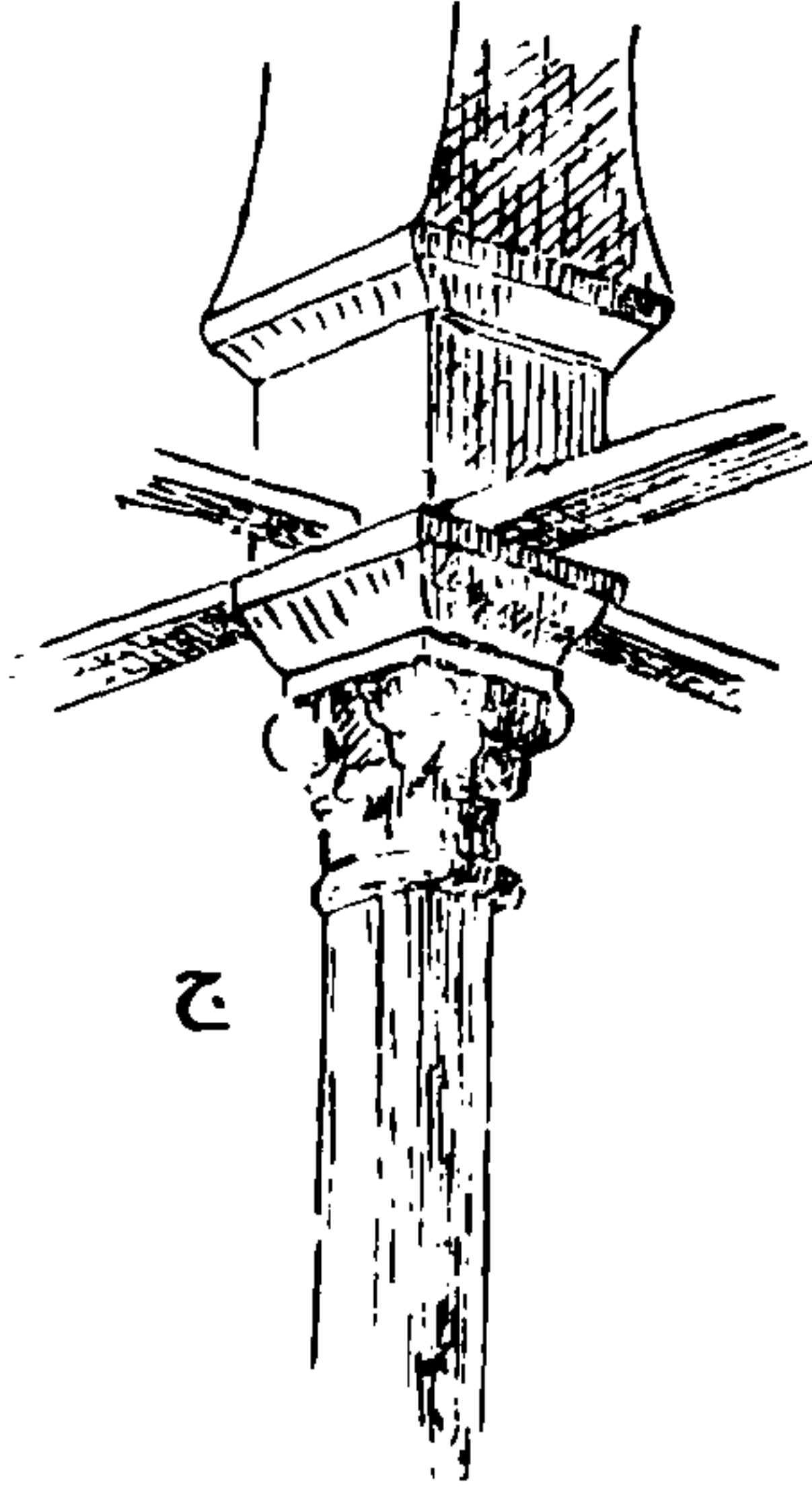
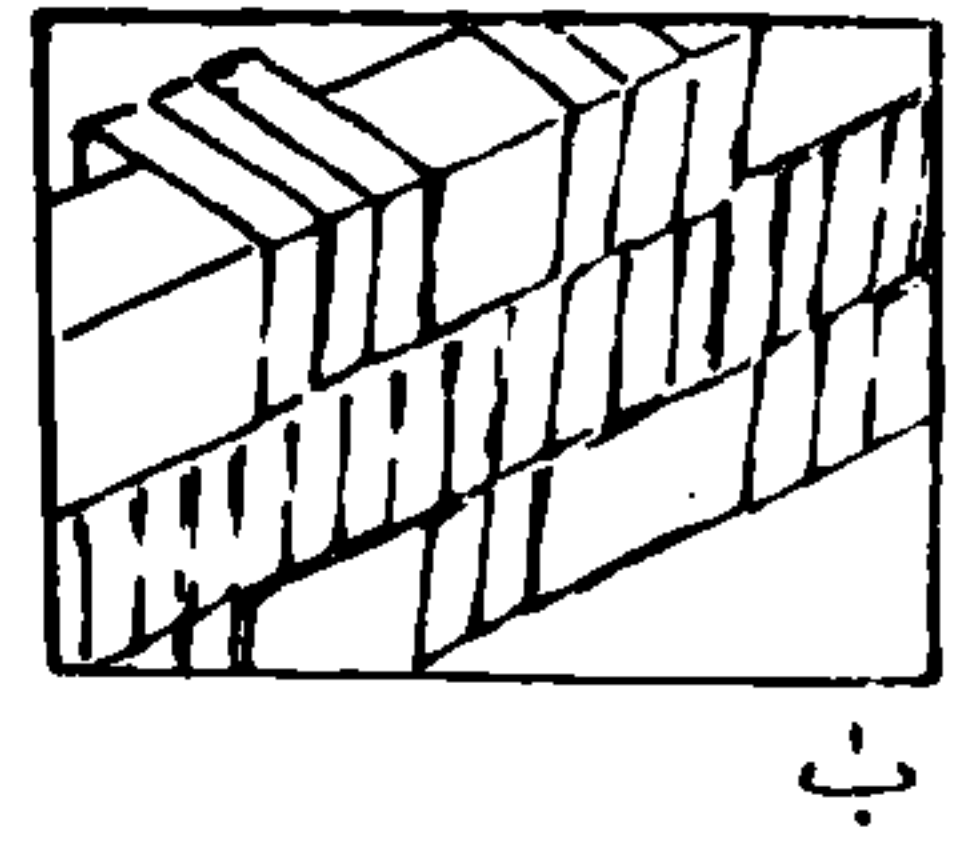
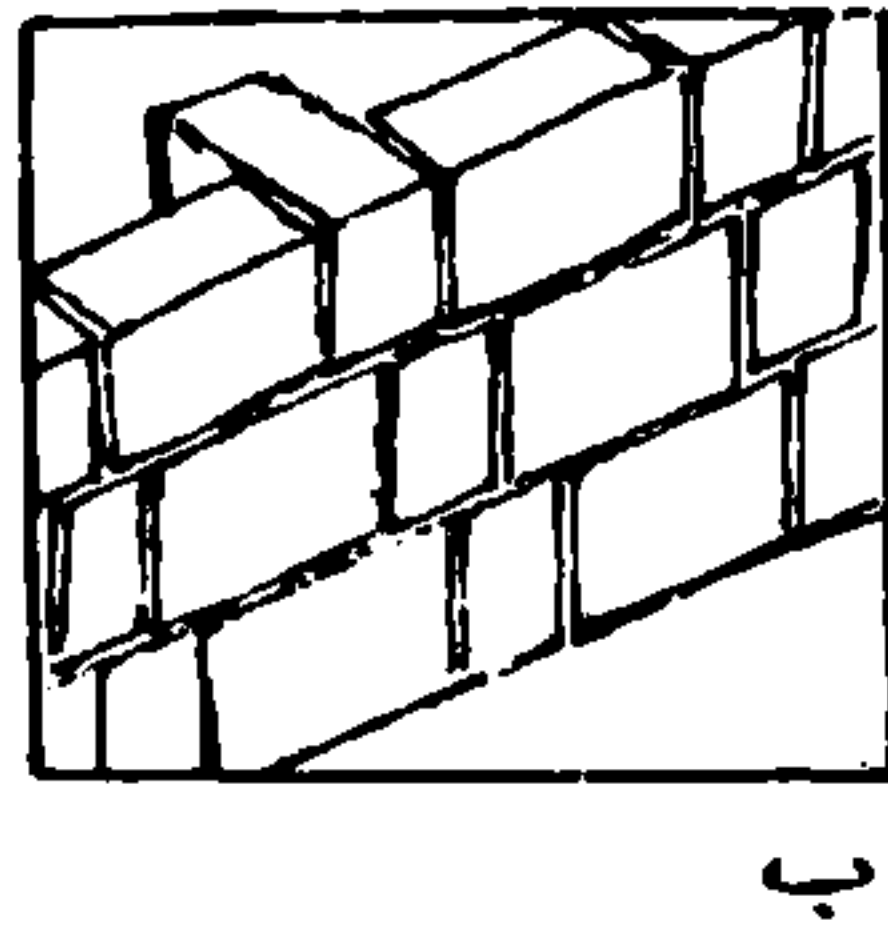
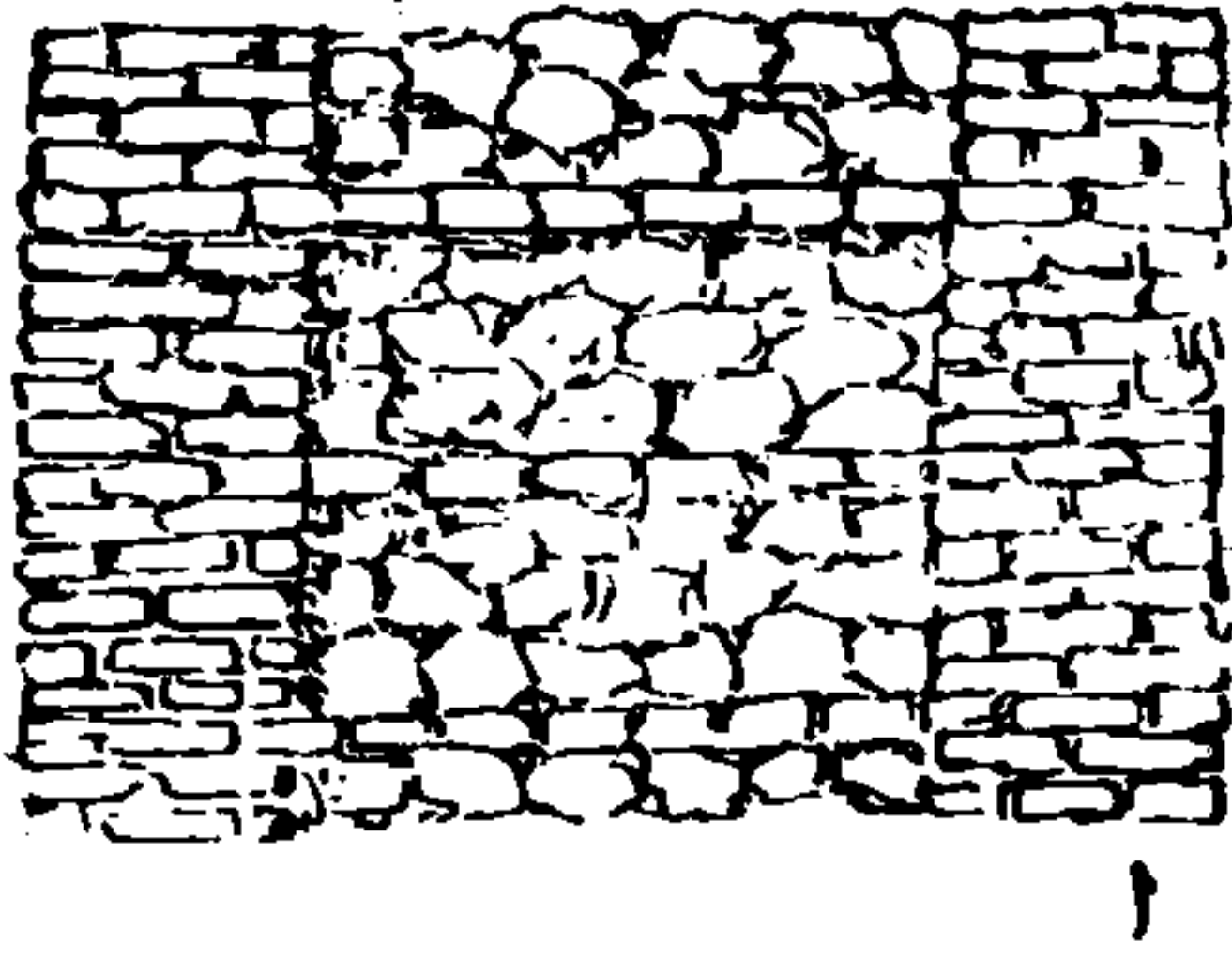
سیدھے سردل کے علاوہ، جو ایک ہی سل یا ایسے ترچھے محرابی پتھروں سے بنا ہوتا ہے جن پر ایک

بھاری تختے گلدستوں کے اوپر مرغول (architraves) بناتے ہیں۔ چھوٹے شہتیروں سے اندرونی چھتیں اور کبھی کبھی سردلیں بنائی گئی ہیں، مگر یہ طریق کار عمارت متعلقہ کی مضبوطی کے لیے خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔

دیواروں کو، جن کی ساخت کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا، عموماً بازووں میں پشتوں کا سہارا دیا جاتا ہے۔ قدیم عراقی طرز کے نصف استوانی پشتوں کا شام کے اموی حصاروں کی پتھر کی بیرونی فصیٹوں میں اور سامرا کی مساجد کی خشتی دیواروں میں اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ تونس کی بڑی مسجد (تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی) کے چاروں کونوں میں۔ اور پتھر لگے ہوئے ہیں اور بظاہر ان کی اصل بھی یہی (عراقی) تھی۔ علاوہ ازیں یہ بنو حماد (پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی) تا چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی) کے قلعے کی ایک عمارت میں پائے جاتے ہیں۔ القیروان کی بڑی مسجد میں بڑے اور بھاری مستطیل پشتے لگا دیے گئے تھے جن میں سے بعض کی تکمیل اصل عمارت کے بننے کے بعد ہوئی۔ قرطبہ کی مسجد میں اسی قسم کے پشتے باقاعدہ فصل دے کر اس کی چار دیواری کے گرد بنائے گئے ہیں۔

سہارا دینے والے تعمیری اجزا میں، جو بیشتر مساجد کے دالانوں میں پائے جاتے ہیں، ستونوں کا ذکر اولیت کا مستحق ہے، جو ابتدائی صدیوں میں شام، مصر، افریقیہ اور ہسپانیہ جیسے خطوں میں قرب و جوار کی شکستہ عمارات سے لیے گئے۔ جب ستونوں اور سرستونوں کے یہ ذخیرے ختم ہو گئے تو مسلمان سنگتراشوں نے انہیں خود بنانا شروع کیا۔ ستون عموماً اسطوانی ہیں اور بیچ میں سے پھولے ہوئے نہیں ہوتے۔ دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی میں اور اس





کا ڈھانچہ درکار ہوتا ہے، جس پر محراب کے پتھر سلسلہ وار رکھے جاتے ہیں۔ اینٹوں کے استعمال نے ان کے ہلکا ہونے اور اس حقیقت کی وجہ سے کہ انہیں آپس میں مسالے سے جوڑا جا سکتا ہے ایک اور طریق کار کی گنجائش پیدا کر دی، جس سے اول الذکر طریقہ ناگزیر نہیں رہا۔ یہ قوسی لداؤ کی چنائی تھی۔ ساسانی فن تعمیر میں اس کا عام رواج ہے اور اس کا سب سے معقول استعمال ایران کے مختص نمونے ایوان میں ہوا ہے (ایوان، جس کا اسلامی ایران میں پیہم رواج رہا ہے، تین دیواروں کا ایک کمرہ ہوتا ہے اور چوتھی جانب سے ایک ہموار عقبی دیوار والے بڑے طاق کی طرح کھلا رہتا ہے)۔ معمار اینٹوں کی پہلی قطار کو عقبی دیوار پر چنتا ہے اور ان سے ڈاٹ کا خم بناتا جاتا ہے پھر دوسری قطار کو پہلی خشتی قطار کے ساتھ اور تیسری کو دوسری کے ساتھ جوڑتا جاتا ہے۔ اس طرح قطار در قطار ڈاٹ یا قوسی چہت اس پورے رقبے پر پھیلا دی جاتی ہے جسے مسقف کرنا ہوتا ہے (شکل و)۔

اسطوانی شکل کی قوسی چہتوں کے علاوہ اسلامی فن تعمیر میں مقاطع محرابوں کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ ... اس میں دو نصف اسطوانے ایک دوسرے کو زاویہ قائمہ پر قطع کرتے ہیں (شکل ۵) اور ان سے بھی شاذ موقعوں پر سرنگ کی ڈاٹ (Cloister-arch vault) سے کام لیا گیا ہے، جس میں چاروں دیواریں ہی اوپر گولائی دے کر کمان کی شکل بن جاتی ہیں (شکل ز)۔ اسے کبھی کبھی ڈاٹ کی چہت کے آخر میں سرا نمایاں کرنے کے لیے بتاتے تھے۔

رہا گنبد تو بوزنطی عہد میں اس کے جو عمدہ نمونے تیار ہوئے وہی ترکی گنبدوں کے نقشِ اول تھے؛ لیکن عمارت کے اس ممتاز رکن کے بنانے میں تبدیلیاں کی گئیں، جن کے لیے یہ فن کار ایران

سہارے کی ڈاٹ ہو (مصر و شام)، اب محرابوں کی شکلیں طرح طرح کی بننے لگیں (نصف کروی، نعل نما، ایرانی محراب سیدھے خط کے حصوں کے ساتھ وغیرہ)۔ یہ شکلیں تعمیری ضروریات کے تحت نہیں بنائی جاتیں بلکہ معمار کی من کی موج کے مطابق آرائش کا کام دیتی ہیں۔ ان میں جو محرابی پتھر ہوتے ہیں وہ اکثر محض تزئین کا کام دیتے ہیں۔

اسوی دور کے شام اور ہسپانیہ میں مساجد کے دالانوں کی چہت کے لیے — بلاشبہ ہسپانیہ کی نقل میں — المغرب کے اسلامی ممالک لکڑی استعمال کرنے لگے تھے، جس کا تحفظ کھپرل کی بنی ہوئی زین پشت چہتوں سے کیا جاتا تھا۔ مربع عمارتوں کی چہتیں شامیانے کی شکل کی ہوتی تھیں، یعنی چار ڈھلانوں کی۔ مصر اور افریقیہ میں کھلی چہتیں رہنے دی گئیں اور الجزائر کے ساحلی شہروں میں رہنے والے الجزائر کے ترکی حکام بھی انہیں ترجیح دیتے تھے۔ مطلوبہ طول کے شہتیروں کی کمیابی کے باعث معماروں نے ان دیواروں کو جن پر شہتیر دھرے جاتے تھے آپس میں قریب قریب کر دیا اور مسقف حصے (وسطی دالان، کمرے، وغیرہ) تنگ اور طویل تناسب کے بنانے لگے۔ اسطوانی ڈاٹ یا چھوٹے چھوٹے گنبدوں کو قریب قریب بنانے کا رواج بھی اسی ضرورت کی بنا پر تھا۔

ڈاٹ کی چہت اور گنبد کے مسئلے کو ساسانی اور بوزنطی روایات میں کئی طریقوں سے حل کیا گیا تھا، لیکن یہ ایرانی ذہانت تھی جس نے ان میں قابل لحاظ تغیرات کا اضافہ کیا۔

موزوں شہتیروں، بلکہ ان کی کمیابی کا محولہ بالا مسئلہ، ڈاٹ کی چہتوں کے بنانے میں، چاہے نیم اسطوانی ہوں یا بیضوی، فیصلہ کن عنصر ہے۔ پتھر کی محراب یا ڈاٹ کھڑی کرنے میں لکڑی



جن کے بیچ بیچ کے خلاؤں کو جوائی قوسوں سے پر کر دیا جاتا ہے۔ اس طرز کا گنبد، جو عہد ساسانی سے معروف تھا (گودار A. Godard : *Voûtes iraniennes*، در آثار ایران، ۱۹۴۹ء)، ایران سے ہسپانیہ آیا (تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی)، پھر قرطبہ اور طلیطلہ سے یہ چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں المغرب میں، اور تقریباً اسی زمانے میں سارے جنوب مغربی فرانس میں معروف ہو گیا (نیز رک بہ فن تعمیر)۔

(G. MARÇAIS)

- \* بنات : ہنگری کا ایک سرحدی صوبہ، جس کا یہ نام صرف Peace of Passarowitz (۱۷۱۸ء) کے نام پر پڑا، حالانکہ اس پر کسی بن Ban کی کبھی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ اس کا زیادہ صحیح نام تمسرنات Temesar Banāt ہے؛ یہ شہر تمسوار Temesvár کے نام پر رکھا گیا ہے، جو ۱۵۵۲ء سے ۱۷۱۶ء تک ترکی حکومت کے زیر نگیں رہا۔ (ادارہ ۱۱)

- \* بنات الذعش : رک بہ علم نجوم؛ [نیز نذیر احمد (شمس العلماء)]۔

- \* بنارس : جو کاشی بھی کہلاتا ہے۔ اس کا نام دو چھوٹی چھوٹی برساتی ندیوں ورونہ Varūna اور آسی Assi سے لیا گیا ہے، جو اس شہر کے شمالی اور جنوبی حصوں میں بہتی ہوئی گزرتی ہیں۔ گنگا کے بائیں کنارے پر واقع یہ قدیم شہر، جس کی بنیاد کہا جاتا ہے کہ سہوترا Suhotra کے بیٹے کاشیا Kāshyā نے ۱۲۰۰ قبل مسیح میں رکھی تھی، ہندو مذہب کا مرکز ہے اور بدھ بھی اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ اس کی آبادی ۱۹۵۱ء میں تین لاکھ اکتالیس ہزار آٹھ سو گیارہ تھی۔

بنارس پر معزالدین محمد بن سام نے ۵۹۰ھ /

کے مرہون منت ہیں۔

ایک نصف کروی یا ہشت پہلو لداؤ یا گنبد کو چوکور کرسی پر کیسے قائم کیا جائے؟ اس مسئلے کو حل کرنے کی اصولی صورتیں دو ہیں: گوشوں میں مقرنس (pendentives) (شکل ح)، جن کا بوزنطی علاقوں میں عام رواج تھا (قب ایاصوفیہ، استانبول) یا پورے آثار کی قطری کمائیں (squinch)، جو زیادہ تر ایران سے مخصوص ہیں۔ یہ قطری کمان ایک ربع مدور، جس کی راسی محراب اس چوکور کے گوشے سے جس پر اسے قائم کیا جاتا ہے آگے کو نکلی ہوئی ہوتی ہے، اپنی آرائشی شعاعی پنالیوں اور دندانے دار کنارے سے بعض اوقات سمندری سیبی کی سی خوش نمائی حاصل کر لیتی ہے (شکل ی)۔ دمشق اور قرطبہ کی جامع مسجدوں میں بھی یہ ایک چھوٹے سے طاق کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ شمالی افریقہ اور صقلیہ کا فن تعمیر پورے آثار کی ڈاٹ سے نصف متقاطع کمان کی صورت میں واقف تھا (یعنی جسے ترجیحا قطع کیا گیا ہو) (شکل ک)۔ آخر میں ایران نے خانہ نما طاقچوں کے طبق بر طبق بنانے کا طریقہ نکالا، جو غالباً قنبر کاری (stalactites) کا مبداء ہے (شکل ل)۔

اس حصے کے اوپر جہاں مربع اور دائرے ملتے ہیں اکثر و بیشتر ایک مدور حصہ نمودار ہوتا ہے، جس میں روشنی آنے کے لیے کھڑکیاں بنی ہوتی ہیں اور اس کے اوپر اصلی گنبد قائم ہوتا ہے۔

تعمیر کے ایرانی ماہروں نے ان سہولتوں سے جو اہنت کے طفیل انہیں میسر آئیں استفادہ کرتے ہوئے مختلف قسم کے گنبدوں کی تعمیر میں بڑی ایج دہنائی۔ انہیں میں وہ قوس دار (ribbed) گنبد ہے جس کی ہنکی قوسیں مسقف کیے جانے والی جگہ کے اوپر ایک دوسری کو قطع کرتی ہیں اور

مقیم رہا۔ وہ اس کی تعریف میں کہتا ہے :  
از بنارس نروم معبد عام است اینجا  
هر برہمن ہسرے لچھمن و رام است اینجا۔  
مشہور اردو ڈراما نگار آغا حشر کی جائے پیدائش  
بھی یہی شہر ہے۔ بنارس اپنے ریشمی لپیڑوں اور  
کارچوبی کام کی بدولت مشہور ہے، جس کو مسلمان  
جلاہے تیار کرتے ہیں۔ اردو شاعری میں "صبح بنارس"  
بھی "شام اودھ" کی طرح ضرب المثل ہو گئی ہے۔

مآخذ: (۱) بابر نامہ (انگریزی ترجمہ از A. S.

Beveridge) ص ۵۰۲، ۵۰۳ تا ۶۵۲، ۶۵۳؛ (۲) M. A. Sherring  
The Sacred City of the Hindus، لندن

۱۸۶۸ء؛ (۳) Benares: E. B. Havell، کلکتہ ۱۹۰۶ء؛

(۴) Imp. Gaz. of Ind.، بذیل مادہ بنارس؛ (۵) Benares

Gazetteer، الہ آباد ۱۹۰۹ء؛ (۶) غلام حسین خان؛

تاریخ زمینداران بنارس (مخطوطہ بانکی پور)؛ (۷) خیر الدین

محمد: تحفہ تازہ (انگریزی ترجمہ)، الہ آباد ۱۸۷۵ء؛

(۸) Storey، ۲/۱: ۱۸۸۵-۱۳۲۷؛ (۹) مائر خان کبیری

(Bib. Ind.)، بعد اشارہ؛ (۱۰) صفات نصیری، ص ۱۰۸

عبدالحمید حبیبی، کوئٹہ ۱۹۰۹ء؛ (۱۱) A. D. Frederickson،

۱۱۰۱: ۱۱۵۲، A. D. Frederickson،

لندن ۱۸۸۹ء، ص ۸۵ تا ۹۰؛ (۱۲) سیدراز خان خٹک؛

شیخ محمد علی حزیں، لاہور ۱۹۰۰ء، ص ۱۰۵، ۱۰۶ و

بمواقع کثیرہ؛ (۱۳) غلام حسین آفاق؛ تذکرہ حزیں،

لکھنؤ (بلا تاریخ)، بمواقع کثیرہ؛ (۱۴) مشہور حزیں؛

تاریخ بنارس، بنارس ۱۹۰۰ء؛ (۱۵) محمد رفیع نصیری؛

معجم الامکنہ، حیدرآباد ۱۹۰۰ء، ص ۱۱۶؛ (۱۶)

History of the Freedom Movement، ح ۱۰، کراچی

۱۹۰۰ء، ص ۱۱۶؛ (۱۷) محمد رفیع نصیری؛

تاریخ بنارس، لاہور ۱۹۰۰ء؛ (۱۸) محمد رفیع نصیری؛

معجم الامکنہ، حیدرآباد ۱۹۰۰ء، ص ۱۱۶؛ (۱۹) محمد رفیع نصیری؛

معجم الامکنہ، حیدرآباد ۱۹۰۰ء، ص ۱۱۶؛ (۲۰) محمد رفیع نصیری؛

معجم الامکنہ، حیدرآباد ۱۹۰۰ء، ص ۱۱۶؛ (۲۱) محمد رفیع نصیری؛

۱۱۹۳ء میں قبضہ کیا۔ ۱۳۵۶/۵۷۷ء میں  
فیروز شاہ تغلق نے بنگال کے سفر سے واپس آنے وقت  
فرمانروائے بنارس سے جنگ کی اور اسے اپنی اطاعت  
پر مجبور کر دیا۔ ۱۳۹۳/۵۷۷ء میں اس شہر  
اور اس کے پرگنے کو محمد [تغلق ثالث] بن [فیروز]  
تغلق نے اپنے وزیر خواجہ جہاں کے سپرد کر دیا۔  
۱۵۲۹/۵۹۳۶ء میں اس پر بابر نے قبضہ کیا۔ اکبر  
کے عہد سلطنت میں راجہ جے سنگھ سوائی نے وہاں  
کئی مندر بنائے اور ایک رصدگاہ [جنٹلمن] تعمیر کی۔  
یہ رصدگاہ آج کل کونڈر ہو چکی ہے۔ شاہجہاں  
نے اپنے سب سے بڑے بیٹے دارا شکوہ کو اس شہر  
کا حاکم مقرر کیا۔ یہاں اس کے ہندو برہمنوں سے  
قربی تعلقات قائم ہوئے اور اس نے ہندو علوم سے  
واقفیت حاصل کی۔ اورنگ زیب نے اس بات سے ناراض  
ہو کر کہ مسلم طبیب اور بیہ برہمن [اپنی] تعلیم  
دیو، شہر کے بعض مدرسوں کو اس لیے بند کرنے  
کا حکم دے دیا کہ وہ ایک پر خطر سازش کا  
سرگزین بن گئے تھے۔ اس نے شہر کا نام بھی بدل کر  
محمد آباد رکھ دیا، جو ان سکنوں پر موجود ہے جو  
وہاں ضرب نیچے گئے۔ محمد شاہ (۱۱۳۰-۱۱۹۷ء)  
تا ۱۱۶۲/۱۷۳۸ء نے پرگنہ بنارس ایک راجپوت  
زمیندار منسارام کو عطا کر دیا تھا، جس کا بیٹا  
بیونت سنگھ بکر کی لڑائی (۱۷۶۳ء) میں انگریزوں  
کے ساتھ مل گیا اور اس کے بعد وہ اودھ کے نواب  
سے خود مختار ہو گیا۔ ۱۱۸۹/۱۷۷۵ء میں  
بنارس انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ [قیام  
پاکستان کے بعد اب یہ ہندوستان (= بھارت) کے  
صوبہ اتر پردیش میں شامل ہے]۔

ہندوستان کے صوفی شاعر کبیر اسی شہر کے  
ایک جلاہے کے گھرانے کا فرد تھا۔ فارسی شاعر  
عفی حریر [اس شہر کا بہت گرویدہ تھا] اور اس کا  
مدثر بھی یہی ہے۔ [وہ غرضے تک اس شہر میں



(شرف الدین علی یزدی : ظفرنامہ، طبع الہ داد، کلکتہ ۱۸۸۵ تا ۱۸۸۸ء، ۲: ۶۳۶) - پندرہویں اور سترہویں صدی کے دوران میں اسی مقام کا ذکر ایک مستحکم قلعے کے طور پر ملتا ہے، لیکن بعد ازاں وہ پھر زوال پذیر ہو گیا۔ اس کے کھنڈر (جو اب شرقیہ کے نام سے مشہور ہیں) اب بھی موجود ہیں اور ۱۸۷۶ء میں پہلی بار ایک روسی سہم نے ان کی جانچ پڑتال کی۔

مآخذ: (۱) *Turkestan* : Barthold، ص ۱۶۹؛ (۲) *Le Strange*، ص ۴۸۲ (جس میں شہر کی تعمیر نو کے متعلق غلط تاریخ درج ہے)؛ (۳) *Die Mongolen in Iran*، بار دوم، برلن ۱۹۰۵ء، ص ۲۸؛ (۴) *Wehröt und Arang*، لائڈن ۱۹۳۸ء، ص ۱۶۲ تا ۱۶۳، حاشیہ و (۵) *V. Minorsky*، در *BSOAS*، ۲/۱۷ (۱۹۰۵ء) : ۲۶۲۔

(B. SPULER)

بناکتی : (تلفظ کے لیے دیکھیے سابقہ مقالہ)، فخرالدین ابوسلیمان داؤد ابن ابی الفضل محمد، ایک ایرانی شاعر اور مؤرخ (م ۵۷۳۰/۱۳۲۹ - ۱۳۳۰ء)۔ اس کے اپنے بیان کے مطابق ۵۷۰۱/۱۳۰۱ - ۱۳۰۲ء میں ایران کے مغول بادشاہ غازان خان نے اسے ملک الشعراء کا خطاب دیا تھا۔ دولت شاہ (تذکرہ، طبع براؤن، ص ۲۲۷) نے اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے۔ اس کی تاریخی تصنیف *موسوم بہ روضة اولی الالباب فی تواریخ الاکابر والانساب*، ۵۷۱۷/۱۳۱۷-۱۳۱۸ء میں ایلخان ابوسعید کے عہد میں لکھی گئی۔ اس کے دیباچے میں تاریخ تحریر ۲۵ شوال ۵۷۱۷ (۳۱ دسمبر ۱۳۱۷ء) لکھی ہوئی ہے۔ قریب کے سالوں کے واقعات پر چند مختصر ملاحظیات کے علاوہ یہ کتاب رشید الدین کی جامع التواریخ کا خلاصہ ہے، اگرچہ بعض مضامین کی ترتیب مختلف ہے۔ براؤن *E. G. Browne* (۱۰: ۳)۔

*Narrative of the Insurrection at Benares*، رڈکی

۱۸۵۰ء

(بزمی انصاری)

بناکت : زیادہ صحیح شکل بناکت یا پناکت (کذا در المقدسی، ص ۲۷۷، سطر ۱؛ سغدی میں: پنیکت یا بنیکت، بمعنی مرکزی شہر، صدر مقام)، لیکن جوینی، ۱: ۴۷، میں فناک (ن) ت: ایک چھوٹا سا شہر، جو دائیں سمت سے آنے والے دریائے الک (موجودہ آہنگران یا آنگرن) اور دریائے جیحون (Jaxartes) (ایرانی نام: خشت، قب حدود العالم، ص ۱۱۸، نیز وہی کتاب، ص ۷۲، جہاں اسے اوزگند لکھا ہے) کے سنگم پر واقع ہے۔ اس کا محل وقوع تاشکنت [رک باں] (چاچ یا شاش) کے تقریباً جنوب مشرق میں ہے۔ کسی زمانے میں یہ ایک پر رونق مقام تھا (حدود العالم، ص ۱۱۸)، اگرچہ اس کے گرد کوئی فصیل نہیں تھی اور اس کی مسجد بازار میر واقع تھی (المقدسی، ص ۲۷۷، قب نیز الخوارزمی، در *al Huwārizmī e il suo rifacimento* : C. A. Malliuc *della geografia di Tolomeo*، روم ۱۸۹۵ء، ص ۳۶؛ یاقوت، ۱: ۷۴۰)۔ اس شہر کو ۵۶۱۶/۱۲۱۹ء میں ایک مغول لشکر نے فتح کیا، جو ماخذ کی بنا پر پانچ ہزار سپاہیوں پر مشتمل اور آغ نیون اور سوکتور کے زیر کمان تھا۔ شہر کے باشندے یا تو قتل کر دیے گئے یا آئندہ مہموں میں حملہ آور دستوں کے طور پر استعمال کرنے کے لیے انہیں اپنے ہمراہ لے گئے۔ شہر کی عمارتوں کو تباہ کر دینے کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا (جوینی، ۱: ۷۰ تا ۷۴؛ میر خواند، طبع Jaubert، ص ۱۴۰)۔

یہ امر واضح ہے کہ بعد کے صدیوں کے دوران میں بناکت زوال پذیر رہا، کیونکہ ۵۷۹۴/۱۳۹۱-۱۳۹۲ء میں تیمور نے اسے از سر نو تعمیر کیا اور اس کا نام اپنے بیٹے کے نام پر شاہ رخیاہ رکھا

**مآخذ :** (۱) *Histoire des : Quaternère*  
*Mongols de la Perse . . . Par Rashid al-Din*  
 ۱۸۳۶ء، ص LXXXVI, LXXXV و ۳۲۵؛ (۲)  
*The History of India as told by its : H. M. Elliot*  
*Cat. : Rieu* (۳) بعد: ۵۵ : ۳ *own Historians*  
*Pers. MSS.*، ۱ : ۲۹ بعد: دیگر حوالے، در (۴)  
 Storey : حصہ ۲/ کراسہ ۱ : ص ۸۰ تا ۸۱ .

(H. MASSE و W. BARTHOLD)

**بنالوقہ :** (Banjaluka، متبادل املا: بانہلوقہ

(Banja Luka)، یوگوسلاویا میں بوسنہ Bosnia کے  
 شمال مشرقی حصے میں ایک شہر، جو دریائے  
 Vrbas کے دونوں کناروں پر واقع ہے اور  
 اس ضلع میں ثقافت اور تجارت کا اچھا خاصا اہم  
 مرکز ہے۔ ۱۸۷۶ء سے ایک ریلوے لائن یہاں  
 سے گزرتی ہے۔ [۱۹۵۶ء میں اس کی آبادی  
 ۳۲۲۳۳ تھی]، جس میں سے تقریباً ایک تہائی  
 مسلم تھے (۱۹۴۸ء میں باشندوں کی تعداد  
 ۳۱۲۲۳ تھی، جن میں سے ۹۹۵۱ کی کوئی  
 مخصوص قومیت نہ تھی، یعنی سربو-  
 کروٹ Serbo-Croat زبان بولنے والے مسلم،  
 جو اپنے آپ کو نہ سرب کہتے تھے نہ کروٹ)۔  
 اس حصے کو چھوڑ کر جو Novoselija کہلاتا ہے  
 اور جو بارہویں صدی ہجری / اٹھارویں صدی  
 عیسوی میں آباد ہوا، نیز ان حصوں سے قطع نظر  
 کر کے جو زیادہ قریب کے زمانے کی پیداوار ہیں  
 (بمعنی Varoš اور Predgradje)، اس شہر کے  
 دو حصے ہیں: بالائی شہر (Gornji Šeher)،  
 جس میں ایک بستی یا آبادی ترکوں کی فتح سے  
 پہلے بائی جاتی تھی (۱۵۲۷ یا ۱۵۲۸ء) اور ایک  
 زیریں شہر (Donji Šeher)، جو دسویں صدی ہجری/  
 سولہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں تعمیر کیا گیا۔  
 ان دونوں حصوں میں حکومت عثمانی کے بقیہ آثار

کی رائے ہے کہ کتاب کے نصف آخر کے  
 مطالعے سے نہ صرف تاریخ کے متعلق مصنف کے  
 وسیع تر تصور کا پتا چلتا ہے (غالباً رشید الدین کے  
 اثر کے تحت) بلکہ اس سے غیر مسلموں کے معاملے  
 میں حقیقی تحمل اور رواداری کی روح بھی جھلکتی  
 ہے۔ ان کے متعلق اس کا علم بھی صحیح ہے،  
 جو بلاشبہ اس بات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ  
 مصنف ایلخان کے دربار میں ایک معزز عہدے دار  
 تھا۔ بلوشہ Blochet ( : *Introduction à l'Historie des*  
*Mongols...*، سلسلہ یادگار گب، ۱۲ : ۹۸) کو اس  
 بات پر اصرار معلوم ہوتا ہے کہ جامع التواریخ  
 کے چینی مآخذ کا حوالہ صرف بناکتی ہی نے دیا  
 ہے، رشید الدین نے نہیں دیا؛ لیکن رشید الدین کی  
 کتاب کا متن جس میں ان مآخذ کا ذکر موجود  
 ہے روزن V. Rosen ۱۸۸۶ء میں چھپوا چکا تھا  
 (*Collections Scientifiques de l'Institut des langues*  
*orient. du Ministère des Aff. Étrang; iii MSS-*  
*persans*، سینٹ پیٹرزبرگ ۱۸۸۶ء، ص ۱۰۶ تا ۱۰۷)۔  
 روضۂ ۹ حصوں میں منقسم ہے: (۱) انبیا  
 اور بزرگ: (۲) قدیم شاہان ایران: (۳) حضرت محمد  
 صلی اللہ علیہ وسلم اور خنفا: (۴) خلفائے عباسیہ کے  
 ہمعصر ایران کے شاہی خاندان: (۵) یہود: (۶)  
 عیسائی اور فرنگی: (۷) ہندوستانی: (۸) چینی: (۹)  
 مغول۔ آٹھواں حصہ (چین) ۱۶۷۷ء میں برلن سے  
 (اور بعد ازاں جینا Jena ۱۶۷۹ء) A. Müller نے  
 فارسی اور لاطینی میں شائع کیا، اور اس کا نام  
 غلطی سے *Abdullae Beidawaei Historia Sinensis* رکھا  
 (بعد ازاں S. Weston نے اس کا انگریزی میں ترجمہ  
 کیا اور اس کا نام *A Chinese Chronicle by Abdullah*  
*of Beyza* رکھا، لندن ۱۸۲۰ء)، لیکن Quaternère  
 نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ بناکتی کی کتاب روضۂ  
 کا حصہ ہے۔



گورنری نبال سرور اور آواز نیرہ کی  
مرکشکاتون اشدی برداخی بانٹری۔

۱۸۶۳ء میں جب حکومت بوسنہ پر زوال  
آ گیا تو ہنگری نے Jajce کو سارا علاقہ لے لیا۔  
خیال غالب یہ ہے کہ بنالوقہ اسی زمانے میں  
تعمیر ہوا (اس کا ذکر سب سے پہلے ۱۸۶۳ء میں  
دیکھنے میں آتا ہے) تاکہ اس سے نو تعمیر [شہر]  
Jajce-Banates کے قلعے کا کام لیا جائے۔ Jajce  
کے زوال پذیر ہوتے ہی ترکوں نے فوراً بنالوقہ  
پر قبضہ کر لیا (۱۵۲۷ء یا ۱۵۲۸ء میں)۔  
ترکی حکومت میں شامل ہو کر بنالوقہ کی اہمیت  
بڑھ گئی، خصوصاً جب کہ دسویں صدی ہجری/  
سولہویں صدی عیسوی میں بوسنہ کے سنجاق کے  
گورنر کی قیام گاہ سراجیوو Sarajevo سے بنالوقہ  
منتقل کر دی گئی۔ اس شہر کی جلد ترقی بہت  
کچھ ان ابتدائی گورنروں کی لیاقت اور فضیلت پر  
موقوف تھی جنہوں نے یہاں سکونت اختیار کی، خصوصاً  
فرہاد صوقلی، جو وزیر اعظم محمد پاشا صوقلی  
(سوکولووچ Sokolovic) کا چچازاد بھائی تھا۔  
فرہاد صوقلی ۱۵۷۳ء سے بوسنہ کا گورنر رہا اور  
۱۵۸۰ء میں بوسنہ کی نوساختہ پشالک کا یگلریک  
ہو گیا۔ بنالوقہ برابری بوسنہ کے یگلریک کی  
قیام گاہ رہا، یہاں تک کہ ۱۶۳۸ء میں وہ سراجیوو  
میں منتقل ہو گئی۔

۱۶۹۹ء میں اوپا چلی بنالوقہ پہنچا۔  
اس وقت یہ ایک رونق پذیر شہر تھا، جس میں دو  
قلعے، یٹالیہ محلے، یٹالیہ مسجدیں، متعدد  
سرخ اور حصہ تھے۔ اس میں تین موہنگلیں اور  
ایک پوسٹا [سٹف بازار] تھا۔ اس زمانے میں خود  
شہر جو بی گھروں کی تعداد تیس ہزار تھی  
وزیر بوسنہ کے قانہ عقد کی حد سے حکومت تھا۔  
۱۷۱۱ء میں خلیفہ کو آشوبہ لایا۔

ہائے جان میں۔ شہر کی ستائیس مسجدوں میں  
سے دو خصوصیت کے ساتھ ذکر ہونا چاہیے: ان  
میں سے مدیم نہیں، جو ترکوں کی فتح کے فوراً بعد  
بنائی گئی، بالائی شہر میں ہے اور مسجد سلطانی (خٹکریہ  
Huakarija یا چریوہ جامی Carovadžamija) کہلاتی  
ہے۔ بعد کے زمانے میں اس کی تین بار مرمت  
ہو چکی ہے (اس کی جو عمارت اس وقت موجود ہے  
۱۵۲۳ - ۱۵۲۵ء کی تعمیر شدہ بتایا جاتا ہے)۔  
دوسری مسجد میں سب سے خوبصورت مسجد فرہادیہ  
جامی Ferhadija džamija ۱۵۷۶ء میں فرہاد صوقلی  
Ferhad Sokolovic نے تعمیر کی جو اس وقت بوسنہ کا  
گورنر تھا۔ بالائی شہر کے محلوں گرونجی تابہ جی  
Donji Tabaci [بالائی محلہ چرم گران] اور دونجی  
Donji Tabaci [زیریں محلہ چرم گران] میں  
رہائے۔ چوڑا رنگے کا کام ہوتا تھا اور یہ پیشہ  
سورہری / سولہویں صدی عیسوی اور  
گرونجی / سولہویں صدی عیسوی میں  
رہائے۔ ۱۶۹۹ء میں عام تھا۔ زیریں شہر میں  
Kastel کے بازاروں پر ایک قلعہ (Kastel) ہے،  
جس کے قلعے ۱۵۹۵ء تا ۱۶۰۳ء میں شہر  
کے قلعے کے قریب سے تعمیر ہوا تھا۔

۱۶۹۹ء میں سو سہ ہزار آوی چلی کے ہاں  
میں سے بنالوقہ کا پہلا حصہ  
بنالوقہ کے قلعے کے قریب (Banja - حمام)  
میں سے بنالوقہ کے قلعے کے قریب  
بنالوقہ کے قلعے کے قریب  
بنالوقہ کے قلعے کے قریب  
بنالوقہ کے قلعے کے قریب  
بنالوقہ کے قلعے کے قریب  
بنالوقہ کے قلعے کے قریب  
بنالوقہ کے قلعے کے قریب  
بنالوقہ کے قلعے کے قریب  
بنالوقہ کے قلعے کے قریب

مارگریو آو باڈن Margrave of Baden کی زیر قیادت کچھ مدت کے لیے فتح کر لیا اور لوٹتے وقت انہوں نے شہر کا کچھ حصہ جلا بھی دیا۔ ۱۷۳۷ء کی جنگ کے دوران میں ہلڈیر گھاسن Hildburghausen کے شہزادے نے بنالوقہ کا محاصرہ کر لیا۔ ۳ اگست کی فتح کے بعد بوسنہ کے وزیر علی پاشا حکیم اوغلو نے اسے اس سے چھڑا لیا۔ اس لڑائی کا حال نووی Novi کے عمر افندی نے بیان کیا ہے (Babinger، ص ۲۷۶ تا ۲۷۷)۔ اس وقت سے بنالوقہ کم و بیش بلا کسی رکاوٹ کے ترقی کرتا چلا آ رہا ہے۔ ۱۸۵۱ء میں بنالوقہ میں سینتیس محلے تھے اور گیارہ سو چھبیس گھر ٹیکس لگانے جانے کے قابل تھے۔ اس وقت سے لے کر یہ بوسنہ کی چھ سنجاقوں میں سے ایک سنجاق (ضلع) رہا ہے۔

۱۸۷۸ء میں جب آسٹریا نے بوسنہ پر قبضہ کیا تو بنالوقہ نے (بلا مقاوت) ۳۱ جولائی ہی کو اطاعت قبول کر لی تھی اس کے باوجود ۱۳ اگست کو بوسنہ کے مسلمانوں سے ایک جنگ ہوئی۔ یہ شہر ۱۹۱۸ء تک آسٹریا والوں کے زیر حکومت رہا۔ اس کے بعد وہ یوگوسلاویا کا ایک حصہ ہو گیا۔

ماخذ: (۱) H. Kreševljaković: *Stari Bosanski gradovi* (قدیم بوسنہ کے قلعے)، در *Naše Starine I*، سراجیوو ۱۹۵۳ء، ص ۲۶ تا ۲۷؛ (۲) A. Bejtić: *Banja Luka pod turskom vlašću* (بنالوقہ ترکی حکومت میں)، در *Naše Starine I*، سراجیوو ۱۹۵۳ء، ص ۹۱ تا ۱۱۶؛ (۳) مقالہ بنالوقہ در *Enciklopedija Jugoslavije I*، Zagreb ۱۹۵۶ء، (جغرافیہ کا حصہ از S. Šiniković اور تاریخی حصہ از H. Kreševljaković)۔

(B. DJURDJEV)

بناونت: (الادریسی میں بن بن بن ت؛ بنونتو Benevento؛ اٹلی کا ایک شہر اور اسی نام

کے صوبے کا دارالحکومت، جہاں بہت سے رومن آثار باقی ہیں)۔ یہ شہر مسلمانوں کے قبضے میں ایک دن کے لیے بھی نہیں آیا، جیسے کہ باری Bari اور تارنتو Taranto آگئے تھے۔ بائیں ہمہ تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی اور چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں مسلمان اس شہر اور اس نام کی ریاست کی تاریخ میں دخیل ہوتے رہے اور بارہا اس کے والیان ریاست کی خاندانی آویزشوں میں کبھی دشمن کی اور کبھی حلیف کی حیثیت سے شریک ہوئے، نیز اس کے ساتھ ہی اکثر اس علاقے کو تاراج اور خوفزدہ بھی کرتے رہے۔ وہ زمانہ جس کی بابت ہمیں لاطینی ماخذ کی بدولت بہترین معلومات حاصل ہیں تیسری صدی ہجری / نویں صدی عیسوی کا وسطی زمانہ ہے (عربی ماخذ اس بارے میں یا تو خاموش ہیں یا بہت ہی مبہم اطلاعات دیتے ہیں)۔

ہمیں معلوم ہے کہ ۵۲۲۸ / ۸۳۲ - ۵۸۳۳ میں ایک مسلم عرب امیر ابو جعفر (Apolaffar یا Apoiaffar)، جو تارنتو سے آیا تھا، یہاں کے رئیس Siconulph کا اس کے حریف Radelchis کے مقابلے میں حلیف ہو گیا، لیکن انجام کار اس کی Siconulph سے ناچاقی ہو گئی اور وہ بناونت کی مدافعت کرتے ہوئے مارا گیا۔ ۵۲۳۷ / ۸۵۱ء میں کوئی شخص ابو معشر (Massar) عربوں کے ایک دستے کے ساتھ اسی Radelchis کا حلیف ہو گیا۔ آگے چل کر ابو معشر Massar کو Radelchis ہی نے دغا بازی سے گرفتار کر لیا اور اسے مع اس کے اہل و عیال کے قتل کرا دیا۔ کچھ سال بعد بناونت کو باری کے امیر سودان کی طرف سے دوبارہ خطرہ لاحق ہوا۔ صرف چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی طرف سے خطرہ گھٹنا شروع ہوا اور پانچویں صدی ہجری / گیارہویں صدی عیسوی میں جب نارمنوں نے صقلیہ کو فتح کر لیا تو بالکل ختم



زمانہ جنگ میں اس کی تنخواہ دو ہزار قرش (Piastre) تھی اور اس کے علاوہ اپنے سپاہیوں کی تنخواہ کا ایک عشر بھی اسے ملتا تھا (Tableau Général de l'Empire Othoman : D'Ohsson) پیرس ۱۸۲۳ء، ۷ : ۳۸۱ تا ۳۸۲؛ قِب رِسی افندی : خلاصۃ الاعتبار، استانبول ۱۲۸۶ء، ص ۱۲ بعد)۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اختتام سے (جودت : تاریخ، ۶ : ۳۶۷) بن باشی مغربی طرز کی نئی افواج میں ایک پلٹن کے کمانڈر کا باقاعدہ عہدہ بن گیا۔ عبدالعزیز کی تخت نشینی کے بعد بن باشی کی تنخواہ ایک ہزار پانچ سو قرش ماہوار یا چار ہزار ایک سو چالیس فرانک سالانہ مقرر ہوئی (Lettres sur la Turquie : Ubi، شماره ۱۹)۔ مصر میں بن باشی کا لقب، دوسری ترکی مصطلحات اور منصوبوں کے نام کے ساتھ محمد علی پاشا کی فوج میں استعمال ہوتا تھا اور بعد کی حکومتوں میں بھی اس کا استعمال جاری رہا۔ بلاد عرب میں اس کا تلفظ بعض اوقات بکباشی کیا جاتا ہے، قیاساً ترکی صاغرنون (نون غنہ = گ) کو غلط پڑھنے کی وجہ سے۔

(B. LEWIS)

**بَنْبَلُونَه** : (Pampeluna؛ ہسپانوی : Pamplona) شمالی اندلس میں ایک شہر جو صوبہ نبرہ Navarre کا صدر مقام ہے، اس کی موجودہ آبادی تقریباً اسی ہزار ہے۔ کسی عرب جغرافیہ نگار نے متأخر قرون وسطیٰ میں بنبلونہ کا کوئی صحیح حال نہیں لکھا۔ روض المعطار میں، جس میں اسے سب سے زیادہ جگہ دی گئی ہے، اس شہر کو Basques (Vascones، عربی : بَشْکِش) [رَکْ بَاں] کے ملک کا دارالسلطنت بتایا گیا ہے [کیونکہ پہلے یہ اسی علاقے میں شمار ہونا تھا]۔ یہ نوگ [اڑی قبائل کا ایک گروہ تھے جو سمندر سے قریب جبل البرانس

ہو گیا۔ الاڈریسی کے کہنے کے مطابق بناونت شہر بہت ہی قدیم (ازلیہ) تھا اور اس کی بڑی آبادی تھی۔ مآخذ : (۱) M. Amari، Storia dei Musulmani، Catania، ۱۹۳۳ء، ۱ : ۵۰۲ تا ۵۰۳، ۵۰۹ تا ۵۱۱؛ (۲) الاڈریسی، طبع Amari و Schiaparelli، L'Italia nel libro del Re Ruggero، روما ۱۸۸۳ء، ص ۸۲۔

(F. GABREILI)

**بِن بَاشِی** : (بک ہزاری یا ایک ہزار سپاہیوں کا سردار)، ایک ترکی عسکری منصب۔ یہ لفظ مغربی ترکوں میں قدیم زمانے سے نظر آتا ہے اور اس عسکری تنظیم نو کے سلسلے میں بھی استعمال کیا جاتا تھا جو کہا جاتا ہے کہ اورخان [رَکْ بَاں] نے ۱۰۲۹ء/ ۱۳۲۸-۱۳۲۹ء میں کی تھی (مثلاً سعد الدین : تاج التواریخ، ۱ : ۳۰، "ان کے لیے اون باشی، یوز باشی، بن باشی مقرر کیے گئے۔۔۔۔")۔ مَن [= مَنگ] باشی کی شکل میں یہ اصطلاح مشرقی ترکوں میں بھی ملتی ہے اور مثال کے طور پر، ایران میں صفوی فوج کے ایک منصب کے لیے استعمال ہوئی ہے (تذکرۃ الملوک، طبع منورسکی Minorsky، لندن ۱۹۳۳ء، ص ۳۶، ۳۷، ۱۵۵)۔ مَنگ بیگی کا لقب انہیں سے مماثل معنوں میں بابرنامہ میں بھی آیا ہے، تاہم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بن باشی کی اصطلاح عہد قدیم کی باقاعدہ ترکی افواج میں زیادہ مستعمل نہ تھی؛ لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی میں یہ دوبارہ نظر آتی ہے، یعنی "میری عسکریوں" کی جو سوار و پیادہ فوج نئی تیار کی گئی تھی اور جس کی تنخواہ خزانے سے دی جاتی تھی، اس کے سرداروں کو یہی خطاب دیا گیا تھا۔ ۱۷۶۹ء کی لڑائی میں میری عسکریوں کی ستانوںے رجمنٹیں [طابوریا آلائی] بن چکی تھیں اور ہر رجمنٹ کی کمان ایک بن باشی کرتا تھا۔

عبدالمنعیم الحِمْیری: الرَّؤُفُ المِعْطَار، اندلس، عدد ۵۱؛  
 (۴) ابن عذاری: "البیان المَغْرِب، ج ۲، بمدد اشاریہ؛  
 (۵) ڈوزی: *Histoire des Musulmans d'Espagne*،  
 طبع جدید، لائڈن ۱۹۳۲ء، بمدد اشاریہ؛ (۶)  
*Du nouveau sur le royaume de*: Lévi-Provençal  
*Pampalune au LX<sup>e</sup> siècle*، در *Bulletin hispanique*  
 ج ۵۵، عدد ۱، ۱۹۵۳ء۔

(A. HUICI MIRANDA و E. LÉVI PROVENÇAL)

- البننت: ہسپانوی Alpuente، ایک چھوٹا سا بلدیہ (municipio)، جو صوبہ بَلَنسیَا Valencia کے شمال مغرب میں ان پہاڑوں کی مشرقی ڈھلانوں پر واقع ہے جن سے دریائے توربہ اور دریائے وادی الکبیر کی وادی بنتی ہے۔ یہ شِلُوہ (Chelva) کے علاقہ عدلیہ (Partido - Judicial) میں شامل ہے اور صدر مقام سے ستاسی کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ البننت دو پہاڑوں، یعنی کوہ قشتالیہ (Monte del Castillo) اور کوہ سان کرسٹابل (loma de San Cristobal)، کے مقام اتصال پر آباد ہے۔ جس جگہ اس کا قلعہ بنا ہوا ہے وہاں چاروں طرف عمودی ڈھلانیں ہیں۔ قلعے تک پہنچنے کا واحد راستہ ایک تنگ چڑھائی ہے، جسے مسقف کر دیا گیا ہے اور جس کا دفاع تراشیدہ پتھروں سے بنے ہوئے ایک برج سے کیا جاتا تھا۔ اس کے کھنڈروں میں رومی اور عربی معماری کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہاں پہنچنے کے لیے ایک اوپر اٹھ جانے والے پل (drawbridge) پر سے گزرنا پڑتا تھا جو تقریباً چالیس میٹر لمبا تھا اور غالباً اسی کے نام پر اس مقام کا یہ نام پڑا۔

اس کی اس زمانے سے پہلے کی تاریخ مفقود ہے جب کہ اس بغاوت کا آغاز ہوا جس سے خلافت امیہ کا خاتمہ ہوا اور یوں بنو قاسم، کتامة بربر، جو مدتوں سے عرب قبیلہ فہر کے حلیف چلے آ رہے تھے، اپنے چھوٹے سے سیدھی چٹانوں والے اس علاقے میں

کی جنوبی ڈھلانوں اور مغربی سرے پر آباد تھے۔ مغرب میں ان کے علاقے کی سرحد اس خطے سے ملحق تھی جو الآبۃ والقلاع [رک باں]، یعنی Alava اور قلعوں (Castles) کا علاقہ (قشتالیہ قدیم یا old Castille) کہلاتا تھا۔ مشرق میں یہ ان پہاڑی علاقوں تک پہنچتا تھا جہاں Gascons (عربی: جلاشکیوں) آباد تھے اور ان کے ساتھ Cerretania یا Cerdagne کے لوگ۔ ہنبلونہ پر ۱۲۱/۵۲۹ء میں گورنر عقبہ بن العجاج نے قبضہ کر لیا؛ اس نے قرطبہ کے خلاف بغاوت کی اور ۱۶۱/۵۷۸ء میں شارلمان کی مہم کے دوران میں اس پر افرنجی (Franks) قابض ہو گئے۔ کئی سال تک یہ افرنجی جلاشکیوں کے زیر نگین رہا اور ۸۲۵ء کے بعد سے ایک آزاد ریاست کا دارالحکومت بن گیا جو اینیگو Iñigo ثانی کے تصرف میں تھی جس کا موسی بن موسی سے قریبی تعلق تھا کیونکہ وہ اس کا ماموں بھی تھا اور خسر بھی۔ ۲۲۷/۸۴۲ء میں عبدالرحمن ثانی اموی فوجوں کو ہنبلونہ تک لے گیا اور اسے تاخت و تاراج کیا گیا۔ ۲۴۵/۸۵۹ء میں سکندے نیویا کے بحری ڈاکو، یعنی Norsemen، ہنبلونہ تک جا پہنچے اور یہاں کے بادشاہ García Iñiguez کو قید کر لیا۔ اپنی نبرہ کی مہم کے دوران میں عبدالرحمن ثالث نے ۳۱۲/۹۲۴ء میں اس شہر پر کچھ عرصے کے لیے قبضہ کر لیا اور اسے مسمار کر دیا۔ مسلم افواج نے ۳۲۲/۹۳۴ء اور پھر حاجب المنصور العامری [رک باں] اور حاجب المظفر العامری کے عہدِ آمریت میں ہنبلونہ کے خلاف حملے کیے۔

مآخذ: (۱) الإدریسی، طبع و ہسپانوی ترجمہ از *La España de Edrisi*: Saavedra، ص ۵۹ تا ۷۳؛ (۲) ابوالفدا: *تَقْوِیمُ البُلْدَان*، طبع Reinaud و de Slane، ۲: ۱۸۰/۲۵۹ تا ۲۶۰؛ (۳) ابن



تک، اپنے پڑوسی ملگ الطائفة (reyes de taifas) سے بہت اچھے تعلقات قائم رکھے۔ اس کے بعد البنّت پہلے البرابٹون اور اس کے بعد الموحّدون کے قبضے میں رہا۔ جب الموحّدون اندلس سے نکال دیے گئے تو ابو سعید زید سید، جو بننسیہ کا عامل اور عبدالمؤمن کا پوتا تھا، فاتح جیمز James اول کا حلیف بن گیا اور البنّت اس کی نذر کر دیا۔ بعد ازاں جب اس نے جیمز اول کے دربار میں پناہ لی اور عیسائی ہو گیا تو اس نے البنّت کو سگوربه Segorbe کے اسقف Don Guillen کی عملداری میں شامل کر دیا۔

ایک البنّت اور بھی ہے۔ یہ غرناطہ کے قریب زرعی اراضی کا ایک قطعہ ہے، جہاں ۱۵۴۸/۱۰۳۶-۱۰۳۷ء میں حبوس کے جانشین بادس اور اس کے بھائی بلقین نے عسری نوجوان زہیر کو، جو العریة (Almeria) کا حاکم تھا، دھوکے سے قتل کر ڈالا تھا۔

مآخذ: (۱) ابن عذاری: البیان المغرب، ۳:

۱۲۷، ۱۳۵ تا ۱۳۶، ۲۱۵؛ (۲) ابن حزم: جمہرۃ الأنساب،

ص ۳۳۶؛ (۳) ابن الخطیب: أعمال الأعلام، ص ۲۳۹

تا ۲۴۰؛ (۴) Hist. de l'Espagne: Lévi-Provençal

Diccionario: P. Madoz (۵): ۳۳۸؛ (۶) musulmane

geográfico، ۲: ۱۹۷ تا ۱۹۸۔

(A. HUICI MIRANDA)

\* بنّتم: یا بتن رک بہ جاوا۔

\* بنج: یہ لفظ فارسی [بنگ] سے عرب ہے اور

در اصل سنسکرت سے لیا گیا ہے، جس کے معنی دوائے مخدر کے ہیں اور خاص طور پر اس کا اطلاق السیکران (Henbane، لاطینی: Hyoscyamus) کے پودے پر ہوتا ہے۔ سنسکرت لفظ بہنگا کے اصل معنی قنب ہندی یا سن (لاطینی cannabis sativa) کے ہیں، یعنی اس کی وہ صنف جو جنوبی آب و

خود مختار ہو گئے جو کورہ شنت بریہ Santiberia کا حصہ تھا۔

یہاں جن چار چھوٹے چھوٹے بادشاہوں نے حکومت کی ان میں سے پہلا عبداللہ بن قاسم الفہری تھا۔ وہ ایک عسری مولیٰ تھا، جس نے حاجب کا لقب اختیار کر کے ایک خود مختار بادشاہ کی طرح یہاں حکومت کی۔ جب خلیفہ المرتضیٰ نے غرناطہ کی شہر پناہ کے سامنے شکست کھائی اور قادیس Cadiz کے مقام پر مارا گیا تو اس کا بھائی ابوبکر ہشام البنّت میں پناہ گزین ہوا۔ اواخر ربیع الآخر ۳۱۸ھ / جون ۱۰۲۷ء میں اہل قرطبہ نے اس کی خلافت کا اعلان کر دیا اور اس نے ڈھائی سال سے کچھ زائد مدت تک اس غیر معروف علاقے میں چین سے اپنے دن گزارے۔ یہاں عسری مولیٰ نے، جو اس کے باوجود کہ خاندان بنی مروان کے آخری فرمانرواؤں نے اس کے پیش روؤں کو بہت نقصان پہنچایا تھا اس خاندان کا حاسی تھا، اس کا خیر مقدم کیا اور اس سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ جب ہشام نے بالآخر قرطبہ میں باقاعدہ داخل ہونے کا فیصلہ کیا تو اس کے جلو میں صرف تھوڑے سے دیبقتانی رفقا تھے جو اسے اس مقام سے مل سکے جہاں وہ مقیم رہا تھا۔ ہشام کو جلد ہی معزول کر دیا گیا اور اس طرح اموی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔

عبداللہ بن قاسم نے نظام الدولہ کا لقب اختیار کر کے بادشاہت کی اور ۳۲۱ھ / ۱۰۳۰-۱۰۳۱ء میں فوت ہوا۔ اس کا بیٹا محمد بن عبداللہ یمن الدولہ اس کا جانشین ہوا۔ یہ ۳۴۰ھ / ۱۰۴۸ء میں دفعۃً فوت ہو گیا اور اس کا چھ سال کا بیٹا اس کا وارث ہوا۔ اس بچے کو اس کے چچا عبداللہ بن محمد نے تخت سے اتار کر اس کی ماں سے شادی کر لی۔ اس نے اپنی وفات، یعنی ۳۸۵ھ / ۱۰۹۲ء

استعمال کیا ہے جسے کہا کر انسان پاگل ہو جاتا ہے، نیز ایک اور قسم کی مخدر سنی دوا hemlock (Cicuta) کے لیے بھی یہی لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ زمانہ حال میں لفظ بنج (مصر میں عام بول چال کی زبان میں (بنگ) ہر ایک مخدر چیز کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اسی سے فعل بنج (دوا سے بے حس یا بے ہوش کر دینا، نیز سلا دینا) اور مصدر تبنيج وغيره الفاظ بنے ہیں۔

مأخذ: (۱) ابن سيدة: المخصص، ۱۱: ۱۶۲؛  
(۲) تاج العروس، ۲: ۱۰؛ (۳) ابن سینا: قانون، بولاق، ۱: ۲۷۳؛ (۴) ابن الیطار: الجامع لمفردات الادویہ، بولاق، ۱: ۱۱۷؛ (۵) Traité des simples: L. Leclerc؛ (۶) par Ibn el-Beithar، پیرس ۱۸۷۷ء، ۱: ۲۷۱؛ (۷) Lane: القاموس، ۱: ۲۵۸؛ (۸) Lane: Flora der Juden، ۳: ۳۵۹؛ (۹) Meyerhof و Sobhy: The Abridged Version of "the book of Simple Drugs" by Ahmad ibn Muhammad al-Ghāfiqī، گراسہ ۲، قاہرہ ۱۹۳۳ء، ص ۳۲۴ بعد؛ (۱۰) Renaud و Colin: تحفة الأحباب، پیرس ۱۹۳۴ء، ص ۳۵؛ (۱۱) Dymock و Warden و Hooper: Pharmacographia Indica، لنڈن۔ بمبئی۔ کلکتہ ۱۸۹۰ تا ۱۸۹۳ء، ۲: ۶۲۶ اور ۲: ۳۱۸ بعد؛ (۱۲) E.G. Browne: A chapter from the History of Cannabis Indica در St. Bartholomew's Hospital Journal، مارچ ۱۸۹۷ء۔

(M. MEYERHOF)

- بنجر مسن: کالی مانتان Kalimantan (بورنیو، انڈونیشیا) کے جنوبی ساحل پر ایک شہر جو ۳ درجہ ۱۸ دقیقہ عرض بلد جنوبی اور ۱۱۴ درجہ ۳۵ دقیقہ طول بلد مشرقی پر واقع ہے اور چودھویں صدی عیسوی کے بعد سے بین الجزائر تجارت کے مرکز اور ایک چھوٹے سے ضلع کے صدر مقام کی حیثیت سے

ہوا میں نشو و نما پاتی ہے اور جس کے پتوں کے سرے پر ایک نشہ آور صمغی مادہ ہوتا ہے (عربی: حشیش)۔ زبان زند کا لفظ 'بنہہ' (Banha) اسی سے مأخوذ ہے، جس کے معنی 'مخمریت' کے ہیں۔ فارسی میں لفظ مستعار بنگ کا اطلاق السیکران (henbane) پر ہوتا تھا اور حنین بن اسحق نے دیوسکوریدس Dioscorides کی 'مخزنی ادویہ' کے اپنے عربی ترجمے (تقریباً ۵۲۳۵ / ۶۸۵۰) میں اسے یونانی ὕσσυαμος کا مرادف قرار دیا ہے۔ ان معنوں میں عربی لفظ بنج ابتدائی ایرانی مؤلفین طب کی کتابوں میں ملتا ہے، جو اس زمانے کے دستور کے مطابق عربی میں لکھتے تھے (الرازی، ابن سینا) اور جدیدتر ایرانی طب میں ابو منصور موفق بن علی (چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی) کے ہاں موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم عربی شاعری میں یہ لفظ موجود نہیں تھا کیونکہ البیرونی [رک باں] اپنی کتاب الصيدلہ (Pharmacology) میں بذیل مادہ بنج (مخطوطہ در کتبخانہ برسہ Bursa) کسی شاعر کے اشعار نقل نہیں کرتا، جو بصورت دیگر وہ ضرور نقل کرتا۔ قدیم مغربی اسلامی اطبا (اسحق بن عمران، اسحق بن سلیمان، ابن الجزار اور دیگر اطبا) نے بھی بنج کو henbane کا ہم معنی بتایا ہے جس کو عربی میں السیکران کہتے ہیں، اگرچہ احمد الغافی (اندلس کا ایک عرب طبیب، جو چھٹی صدی ہجری / بارہویں عیسوی میں ہوا ہے) اپنی کتاب الصيدلہ (Pharmacology) میں اس کو غلط قرار دیتا ہے، لیکن سریانی میں henbane کے لیے لفظ شغرونہ موجود ہے اور عربی سیکران، سیکران، شوکران وغیرہ اسی سے مأخوذ ہیں۔ بعد کے عرب علمائے نباتات نے یہ نام ایک اور قسم کی henbane نبات مخدر (hyoscyamus muticus) کے لیے



مشہور رہا ہے۔ ولندیزیوں کے عہد حکومت (۱۸۵۹ تا ۱۹۳۲ء) اور جاپانی قبضے کے دوران میں یہ ایک ریڈیڈنسی کا صدر مقام تھا۔ یہاں کی آبادی تقریباً تین لاکھ ہے اور مسلمان ہے، اگرچہ جاوی تہذیب کے اثرات بالخصوص شرفا کے خاندانوں میں خاصے موجود ہیں۔

(C. C. BERG)

\* بَنْجَلَاکَہ : (Banjaluka) ، رَکْ بہ بنالوقہ۔

\* بَنْجَمَن : رَکْ بہ بنیامین۔

\* اَلْبُوْنْت : (Alpuente) ، رَکْ بہ البنت۔

\* بَنْد : فارسی لفظ، جو لفظاً و مجازاً ہر اُس چیز کے لیے بولا جاتا ہے جو باندھنے، منسلک کرنے، بند کرنے یا محدود کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہو (مثلاً افسردگی، انہماک یا محویت)۔ یہ لفظ عربی اور ترکی زبانوں میں بھی پہنچ گیا ہے۔ فارسی مرکبات میں یہ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے، مثلاً بند انگشت = پور؛ بند پا = ٹخنے کی ہٹی؛ در بند = درہ، کھاڑی یا اندر جانے کا راستہ؛ دست بند = بازو بند یا کنگن؛ رو بند = نقاب؛ بند شہریار = موسیقی کی ایک دھن۔ یہ خاص طور پر ان بندوں (بند آب) کے لیے بولا جاتا ہے جو آب پاشی کی غرض سے بنائے جاتے ہیں، مثلاً بند قیصر، جو ساسانی پادشاہ شاپور اول (تیسری صدی عیسوی) کے حکم سے شستر کے مقام پر دریائے کارون کے اوپر بنایا گیا تھا اور جس کی بہت سی محرابیں ۱۸۸۰ء کے طوفانوں سے بہہ گئیں؛ شستر کی دوسری جانب اہواز سے آنے والی سڑک پر بند گرگر (عرب جغرافیہ نگاروں کا مشرقان) کارون کے بغلی نالے پر، جو ساسانی دور میں کھودا گیا تھا؛ بند میان (وسطی بند) جو اسی دوز میں تعمیر کیا گیا اور بعد میں متعدد مرتبہ اس کی مرمت ہوئی، بالخصوص فتح علی شاہ [قاجار] کے ایک بیٹے کے ہاتھوں انیسویں

صدی میں (اسی لیے اس کا دوسرا نام بند محمد علی میرزا ہے)۔ شستر سے قریب ۴۰ میل دریا کے نیچے کی جانب بند قیر (کولتار کا بند) کے قریب اسی عہد کے ایک بہت بڑے بند کے کنڈر ہیں (ان بندوں کے متعلق دیکھیے ۱۱ انگریزی، بار اول، بذیل مادہ کارون، ص ۸۲۵ ب تا ۸۲۶ اور Guide Bleu, Moyen-Orient، ۱۹۵۶ء، ص ۷۱۸ تا ۷۲۱)۔ مزید برآں دریائے گھر (سابق نام Cyrus؛ Dictionnaire de la Perse : Barbier de Meynard ص ۴۷۷، خاشیہ ۲) پر بند امیر (یا بند عضدی)، جو شیراز سے تقریباً ۸۰ کلومیٹر شمال کی طرف ہے اور چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں آل بویہ کے امیر عضد الدولہ کے حکم سے تعمیر کیا گیا۔ اسی دریا پر بند رام جزد اور بند قنار (دھویوں کا بند) تعمیر کیے گئے تھے، جنہیں فارس کے اتابک فخر الدولہ چاولی نے سلجوقیوں کے عہد میں دوبارہ بنوایا (ان تین بندوں کے متعلق قَب ابن البتخی : فارس نامہ کی دلچسپ عبارت، Gibb. Mem. Series، ص ۱۵۱-۱۵۲)۔ کاشان کے نواح میں ایک پہاڑی گھاٹی کے اندر بند قہرود ہے، جو صفویوں کے عہد میں تعمیر ہوا تھا (حمد اللہ المستوفی : نزہۃ القلوب)، ص ۷۲؛ d e Sercey : La Perse en 1839، ص ۲۳۰)۔ ترکی میں نو بندوں کے ذریعے استانبول کے لیے پانی مہیا کیا جاتا ہے : ان پہاڑیوں پر جو بویوک درہ کے اوپر ہیں (آبنائے باسفورس یورپی ساحل پر) باغچہ کوئی کے شمال میں محمود اول کا بند (محمود بندی) ہے، جو ۱۷۳۲ء میں تعمیر ہوا تھا؛ دوسرا بند سلیم ثالث کی والدہ کا بند (والدہ بندی) ہے، جو ۱۷۹۶ء میں تعمیر ہوا تھا؛ اس سے تقریباً ۶ کلومیٹر آگے بلغراد کے جنگل کے نواح میں چار اور بند ہیں، جن میں سے ضرورت کے مطابق پانی 'باش حوض' یا

کر کے اسے ۵۶۲۳ / ۱۲۲۶ء میں المعظم الایوبی کے نام معنون کیا (طبع M. Th. Houtsma، در *Recueil de Textes relatifs à l'histoire des Seljoucides* ج ۲)۔ البنداری کا بیان ہے کہ اس نے اس سے پہلے اسی مصنف کی ایک کتاب *البرق الشابی* پر بھی، جو صلاح الدین ایوبی کی تاریخ ہے، اسی طرح نظر ثانی کی تھی۔ اس نے الخطیب البغدادی کی کتاب *تاریخ* کی ذیل بھی تصنیف کی (مصنف کا دستخطی مخطوطہ، محررہ ۵۶۳۹ / ۱۲۴۱ تا ۱۲۴۲ء، در کتاب خانہ ملیہ، پیرس، عدد ۶۱۵۲)۔ علاوہ ازیں اس نے *شاهنامہ* فردوسی کا عربی میں ترجمہ بھی کیا ہے؛ اسے بھی اس نے ۵۶۲۴ / ۱۲۲۷ء میں المعظم کے نام معنون کیا تھا (طبع عبدالوہاب العزام، قاہرہ ۱۳۵۰ھ)۔ اس کی زندگی کے متعلق اس سے زیادہ کچھ معلومات ہم تک نہیں پہنچ سکیں، البتہ یہ اندازہ ممکن ہے کہ اس نے اپنی زندگی مختلف اوقات میں شام اور عراق میں بسر کی۔ اس کی تاریخ وفات بھی معلوم نہیں [قب الزرکلی: الاعلام، ۵: ۳۳۲]۔

مآخذ: (۱) Houtsma، کتاب *تاریخ سلاجقہ* کا دیباچہ؛ (۲) ہراکلمان، ۱: ۳۲۱ و تکملہ، ۱: ۵۵۴ (جہاں مصنف نے ایک تاریخ بغداد کو خطیب کی تاریخ بغداد کی ذیل سے متمیز کرنے میں غلطی کا ارتکاب کیا ہے، قب وہی کتاب، ص ۵۶۳)۔

(M. TH. HOUTSMA و [CL. CAHEN])

بندر: (Bender) ایک فارسی لفظ، جو ترکی میں بھی استعمال ہونے لگا اور جس کے معنی سمندری بندرگاہ یا کسی بڑے دریا کی بندرگاہ کے ہیں۔ شام اور مصر کی عربی زبان میں جا کر اس لفظ نے بازار، منڈی، مبادلے کے بنک (Bocthor, Vollers) کے اور بعض اوقات کارخانے (Cuhe) کے معنی اختیار کر لیے۔ فارسی میں "شاہ بندر" کا لفظ کسٹم افسر یا محاصل

Pyrgos کے تالاب میں گرتا ہے؛ پھر وہاں سے دو پختہ نالیوں کے ذریعے شہر تک جاتا ہے۔ ان بندوں میں سب سے بڑا بند بویوک بند (بڑا بند) ہے، جسے چھٹی صدی ہجری / بارہویں صدی عیسوی میں اندرونیکوس Andronicus اول نے تعمیر کیا تھا اور بعد میں کئی سلطانوں نے درست کرایا تھا۔ اس کے علاوہ پاشا درہ سی بندی ہے، جو اسی بوزنطی شہنشاہ کی یادگار ہے (ان بندوں سے متعلقہ تفصیلات، در *Guide bleu: Turquie*، ۱۹۵۸ء، ص ۱۷۱ تا ۱۷۲)۔ [یہ مقالہ قدیم تاریخی بندوں سے متعلق ہے۔ اس میں دنیا کے نئے بندوں کا ذکر بالقصد نظر انداز ہے۔ پاکستان کے جدید ترین بندوں، مثلاً منگلا، تربیلا وغیرہ کے لیے رٹ بہ پاکستان]۔

مآخذ: (۱) Dieulafoy، *L'art antique de le Perse*، ص ۱۰۵ تا ۱۱۲، شکل ۹۷ و ۹۸ (شستر، دژقول)؛ (۲) *Survey of Persian Art*، ۱: ۵۷۰ (پل) و ۲: ۱۲۲۶ (وہی موضوع)؛ (۳) *Persien: Polak*، ۱: ۱۶۱؛ (۴) *A year among the Persians: E. G. Browne*، ص ۱۸۶؛ (۵) *A Journal of ... Travel: Binning*، ص ۲: ۳۶۵ تا ۳۶۶؛ (۶) *R. Walsh*؛ (۷) *Voyage en Turquie Constantinople et le Bosphore de: Andréossy*، ص ۱۶ (تالابوں کا نقشہ)؛ (۸) *Le Thrace: P. de Tchihatchef*، ص ۴۱۶؛ (۹) *Bosphore et Constantinople*، ص ۴۹۔

([H. MASSÉ] و CL. HUART)

البنداری: قوام الدین [ابو ابراہیم] الفتح بن علی بن محمد الاصفہانی، ایک مؤرخ، جس نے عربی زبان میں کتابیں لکھیں، مگر اس کی شہرت کا اصل سبب یہ ہے کہ اس نے اپنے ہم وطن عماد الدین الاصفہانی کی لکھی ہوئی تاریخ سلاجقہ [نصرۃ الفترہ] پر نظر ثانی کی [اور اس کا نام زبندۃ النصرۃ رکھا] اور اس میں طرز بیان کے جو تکلفات تھے انہیں دور



وصول کرنے والے کے لیے بولتے ہیں؛ ترکی زبان میں اس سے قونھل مراد لیتے ہیں اور سابقہ زمانے میں اس کے معنی تجار کی شرکت کے رئیس (Syndic) کے تھے۔ مرکبات کی شکل میں یہ ایران کے جغرافیائی ناموں میں ملتا ہے؛ بحیرہ خزر (جنوبی ساحل) پر بندر پہلوی (سابق انزلی Enzeli)؛ بندر گز، اپنے علاقے کی محفوظ ترین بندرگاہ؛ قریب قریب ۵۰ کیلومیٹر شمال کی جانب بندر شاہ، ماورائے ایران ریلوے کا آخری سٹیشن؛ دوسرا انتہائی سٹیشن خلیج فارس پر بندر شاہ پور ہے۔ خلیج مذکور کے کنارے پر دوسری بندرگاہوں کے نام یہ ہیں: بندر دیلیم، بندر ریگ، بندر بوشیر (رک بہ بوشہر)، بندر مقام، بندر لنگا، بندر عباس (رک باں)۔

مآخذ (۱): *Iran in Mittelalter* : P. Schwarz

(اشارہ: بندر)؛ مذکورہ بالا مقامات کے لیے دیکھیے (۲)

(۳): *Moyen-Orient*، *Guide bleu* (اشارہ: بندر)؛ (۳)

*Le golfe Persique* : R. Vadala، پیرس ۱۹۲۰ء، بمواضع

کثیرہ۔

(H. MASS'É و CL. HUART)

بندر: بجاق [رک باں] (Bessarabia) کا ایک شہر، اس کا نام منگلی گرای Mengli gery کے ۱۳۹۹-۱۵۰۰ء کے ایک سگے پر ملتا ہے۔ تاتاری دستاویزات میں اس کا نام بندر کرمان پایا گیا ہے (*Materiaux* : V. Žernov، ص ۱۶)۔ بندر، جو فارسی "بندر" سے بنا ہے، پہلے تگین (Tigina یا Tighinea) کہلاتا تھا، جو ہو سکتا ہے کہ گمنی اصل کا لفظ ہو۔ یہ روایت کہ سب سے پہلے اس شہر کو جنوا Genoa والوں نے بسایا تھا محض ایک افسانہ ہے (*Chronique d'Ureche*، طبع Giurescu)۔ اس کے ایک تجارتی شہر کے طور پر عروج اور بہت معقول محصول درآمد کی وجہ یہ تھی کہ یہ "شاہراہ تاتار" پر واقع تھا، جس کے ذریعے چودھویں

صدی عیسوی میں لوانو Lvov اور قریب (Crimea) اور آق کرمان (رک باں) کے درمیان تجارت کی گرم بازاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۰۰ء کے قریب یہ مقام تاتاریوں کے قبضے سے نکل کر مولداویا کے رئیسوں کے ہاتھ آ گیا۔ تاتاریوں نے اس کو دوبارہ فتح کرنے کی کوشش کی (الغ محمد نے ۱۳۲۸ء میں اور ایبیک میرزا نے ۱۳۲۶ء میں) اور آخر کار منگلی گرای نے عثمانی ترکوں کے ساتھ مل کر ۱۳۸۴ء میں اسے کاوشان Kavshan اور اور تمبسر Tombasar سمیت فتح کر لیا۔ جب ۱۳۹۵ء/ ۱۵۳۸ء میں سلیمان ثانی نے مولداویا پر حملہ کیا اور جنوبی بجاق کو اس کے ساتھ شامل کر کے آق کرمان کی نئی سنجاق قائم کی تو اس نے اس جدید سرحد پر بمقام بندر ایک مضبوط قلعہ بنانے کا حکم دیا۔ ۱۵۶۷ء/ ۱۶۵۷ء میں اولیا چلبی (۵: ۱۱۶ تا ۱۲۰) نے اس قلعے کی بہت اچھی کیفیت بیان کی ہے۔ ۱۵۷۰ء کے قریب یہ ایک سنجاق بیگ کا مستقر بنا اور اس کے بعد اس کو نوساختہ ایالت اوزو Özi کے ساتھ ملحق کر دیا گیا۔ بندر کے قاضی کے زیر انتظام حلقے میں چالیس ناحیے (رک باں) تھے اور محصول خانہ، جس میں ہمیشہ کام ہوتا رہتا تھا، ایک ایبیک (رک باں) کی زیر نگرانی تھا۔ اولیا چلبی کا بیان ہے کہ اس کی وروش [= نواحی بستی] جو قلعے کے مغربی اور جنوبی جانب واقع تھی سات مسلم اور سات غیر مسلم اضلاع [محلوں] پر مشتمل تھی۔ اس میں ۱۷۰۰ گھر اور کوئی ۲۰۰ دکانیں تھیں۔ اولیا چلبی یہ بھی کہتا ہے کہ شہر بندر شمال میں "کلید سلطنت" اور خصوصاً دریائے نیپر Dnieper کے کاسکوں کی روک تھام کے لیے ایک مستحکم قلعہ تھا۔

بندر اس لیے بھی مشہور تھا کہ وہاں ۳ اگست ۱۷۰۹ء اور ۱۷ فروری ۱۷۱۳ء کے

تجارتی شہر ہے۔ اس کے آگے یہ سڑک تہران تک چلی جاتی ہے اور یوں یہ کل ۳۶۴ کیلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے۔

انیسویں صدی کے اوائل میں اس مقام پر چند سو گھر تھے اور اس کی آبادی صرف ۹۰۰۰ تھی۔ اس کی موجودہ آبادی ۴۸۵۰۰ ہے۔ یہاں فارسی، گیلکی (ایک مقامی بولی) اور ترکی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ باشندے شیعہ ہیں۔ بندر پہلوی اور غازیان میں کوئی ایسی عمارت نہیں جو دلچسپی یا قدامت کے لحاظ سے قابل ذکر ہو۔

موجودہ صدی کے دوسرے ربع میں مذکورہ بالا خلیج کو ترقی دے کر ایک پایاب، لیکن محفوظ بندرگاہ کی شکل دے دی گئی ہے۔ مارچ ۱۹۵۱ء سے مارچ ۱۹۵۲ء کے دوران میں اس بندرگاہ میں بہ حیثیت مجموعی ۲۰۸ جہاز آئے گئے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیان بندر پہلوی سے روس کے راستے بہت سا مال اور مسافر یورپ گئے، لیکن پچھلے چند برسوں میں یہاں کی قریب قریب پوری تجارت روس ہی سے رہی ہے۔

روس سے قریب ہونے کی وجہ سے یہ بندرگاہ بین الاقوامی حوادث کی آماجگاہ رہی ہے۔ ۱۷۲۲ء میں روسی فوجیں مرداب کے جنوبی جانب اتر پڑیں، اور پھر ۱۸۰۴ء میں ایک دوسرا دستہ انزلی میں اتر۔ مارچ ۱۹۲۰ء میں روسی فوجیں ایک برطانوی فوج کا پیچھا کرتے ہوئے، جو باکو سے واپس جا رہی تھی، انزلی میں اتریں اور آگے چل کر گیلان کی قلیل العمر سوویت جمہوریہ کے قیام میں مدد دی۔ ایران پر انگریزی اور روسی قبضے کے دوران میں بندر پہلوی نے ۱۹۴۱ء سے مئی ۱۹۴۶ء تک ایک سوویت محافظ فوج کو پناہ دی۔

مآخذ: (۱) *Erdkunde* : Ritter، ۸ : ۶۵۲ بعد؛

(۲) مسعود گنہان: جغرافیای مفصل ایران، تہران

درمیان سویڈن کے چارلس دوازدہم نے پناہ لی تھی اور پھر ۱۷۶۸ء میں Potocki نے بھی لی۔ روسیوں نے پہلی مرتبہ اسے ۲۷ ستمبر ۱۷۷۰ء کو فتح کیا، پھر ۱۷۸۹ء اور ۸ نومبر ۱۸۰۶ء میں، اور یہ شہر مستقل طور پر ان کے قبضے میں صرف معاہدہ بخارست کی رو سے رہا جو مئی ۱۸۱۲ء میں طے پایا۔

مآخذ: (۱) *Gesch. des rumäni-* : N. Jorga  
(۲) *G. I. schen volkes*، گوٹھا Gotha ۱۹۰۵ء؛  
(۳) *Recherches sur Vicina et Cetatea A ba* : Brătianu  
(۴) بخارست ۱۹۳۵ء؛ *I. Nistor*  
(۵) *Cernăuți*، ۱۹۲۳ء؛ (۶) پیچوی، ۱ : ۲۰۹ تا ۲۱۳؛  
(۷) جلال زادہ مصطفیٰ : *طبقات الممالک* . . . : (۶)  
(۸) *Un "Fetih-nāme-i Karaboğdan (1538)* : A. Decei  
*de Nasuh Matrakci*، در فؤاد کوپرولو ارمنی،  
استانبول ۱۹۵۳ء؛ (۹) *A.N. Kurat* : ۱۲ کارلک ترکیہ  
دہ قالسی، استانبول ۱۹۴۳ء؛ (۱۰) *A. Decei* : مقالات  
بغدان، بجاج، در *الترکی* .

(HALIL İNALÇIK)

بندر پہلوی، بحیرہ خزر پر ایران کی سب سے بڑی بندرگاہ، جو ۳۷ درجے ۲۸ دقیقے شمال اور ۴۹ درجے ۲۷ دقیقے مشرق میں واقع ہے۔ پہلے اس کا نام انزلی [رک باں] تھا، لیکن پہلوی خاندان کے پانی رضا شاہ نے جو ۱۹۲۶ء میں تخت نشین ہوا اپنے خاندان کے اعزاز میں اس کا نام بدل کر بندر پہلوی رکھ دیا۔ بندر پہلوی بحیرہ خزر اور تازہ پانی کی جھیل مرداب کے درمیان ایک خلیج کے مغرب میں زمین کے آگے نکلے ہوئے ایک ٹکڑے پر واقع ہے۔ اس خلیج کے مشرق میں غازیان کی قدیم بستی واقع ہے۔ بندر پہلوی سے ایک موٹر کی سڑک پل پر ہوتی ہوئی خلیج کے پار غازیان تک جاتی ہے اور وہاں سے رشت تک چلی جاتی ہے، جو بحیرہ خزر کے ساحلی علاقے کا سب سے بڑا



مرکز بن گیا تو جزیرے اور اصل ملک کے درمیان آنے جانے والے سامان کو ایک طرف سے اتار کر دوسری طرف چڑھانے کے مرکز کی حیثیت سے جرون کی اہمیت بتدریج بڑھتی گئی۔ دسویں صدی ہجری / سولہویں صدی عیسوی کے شروع میں جب پرتگیزیوں نے ہرمز میں اور بعد ازاں ساحل ملک کے قریبی علاقے میں بھی اپنے قدم جمالیے تو جرون (یا گمرو، جیسا کہ اسے بعد میں کہنے لگے) بھی پرتگیزیوں کے قبضے میں چلا گیا۔ ۱۶۱۵ء میں ایرانیوں نے گمرو کو پرتگیزیوں سے چھین لیا اور سات سال بعد برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کے بحری بیڑے کی مدد سے پرتگیزیوں کو ہرمز سے بھی نکال باہر کیا۔ کمپنی کی خدمات کے صلے میں شاہ عباس اول نے انہیں گمرو (یا گمبرون Gombroon، جیسا کہ انگریز اسے عموماً کہتے تھے) میں ایک کارخانہ قائم کرنے کی اجازت دی اور نہ صرف انہیں محاصل کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دیا بلکہ انہیں محاصل کا نصف خود وصول کر لینے کی اجازت دے دی۔ ان مراعات کے دینے کی ایک مزید وجہ یہ بھی تھی کہ شاہ چاہتا تھا کہ یہ شہر اس کی سلطنت کی سب سے بڑی بندرگاہ بن جائے۔ اسی خواہش کی علامت کے طور پر اس نے بندرگاہ کا نام اپنے نام پر بندر عباس رکھا۔ شاہ کی آرزو بہت جلد پوری ہو گئی۔ نہ صرف برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی بلکہ ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی اور فرانسیسیوں کے آجانے سے یہ شہر واقعی ایران کی سب سے بڑی بندرگاہ بن گیا۔ ۱۶۷۳ء میں شاردان Chardin وہاں موجود تھا۔ اس نے لکھا ہے کہ اس وقت شہر میں ۱۳۰۰ سے ۱۵۰۰ تک مکانات ہیں۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اس کی آب و ہوا نہایت خراب ہے اور اس کا یورپی باشندوں پر بہت برا اثر پڑتا ہے (Voyages، پیرس ۱۸۱۱ء، ۸: ۵۰۸، ۵۱۱ تا ۵۱۲)۔

۱۹۳۲ء، ۲: ۲۷۶ تا ۲۷۷؛ (۳) راہنمای ایران، دائرۃ جغرافیای ستاد ارتش، تہران ۱۹۵۱ء، ۳: ۵۰؛ Annual Account of Trade between Iran (۳) and Foreign Countries. Year 1330/1951، تہران ۱۹۵۲ء۔

(D. N. WILBER)

بندر عباس: ایک ایرانی بندرگاہ جو آٹھویں آستان Ustān میں، جو فارس اور کرمان کا ایک حصہ ہے، واقع ہے۔ شہر سرزمین ایران کے ساحل پر جزیرہ ہرمز (رک بان) سے ۱۶ کیلومیٹر شمال مغرب کی طرف واقع ہے اور چٹیل ریتلی زمین پر آباد ہے جو شمال کی طرف بتدریج اٹھتی چلی گئی ہے۔ اس کا سامنے کا حصہ ساحل کے برابر برابر دو کیلومیٹر تک چلا گیا ہے۔ خلیج فارس کے عین دہانے پر اس کے محل وقوع کے علاوہ اس چیز نے بھی اس کی تجارتی اور جنگی اہمیت بڑھا دی ہے کہ یہ شمال میں یزد و کرمان کی طرف اور شمال مغرب میں لار، شیراز اور اصفہان کی جانب جانے والے تجارتی راستوں کا نقطہ اختتام ہے۔ یہاں سمندر کے پایاب ہونے کے باعث بڑے بڑے جہاز گودی پر نہیں لگ سکتے، اور اس لیے انہیں کنارے سے کچھ فاصلے پر لنگر انداز ہونا پڑتا ہے اور اپنا اسباب ہلکی کشتیوں کے ذریعے لادنا یا اتارنا پڑتا ہے۔

اس بات کے یقین کے لیے قرائن موجود ہیں کہ یہ شہر ماہی گیروں کے چھوٹے سے گاؤں شہرو (دیکھیے الاضطخری، ص ۶۷) یا شہروا (دیکھیے حدود العالم، ص ۱۲۳، ۳۷۵) کے محل وقوع پر یا اس کے قریب واقع ہے۔ جب اس کے قریبی جزیرے جرون (= جرون) کو آٹھویں صدی ہجری / چودھویں صدی عیسوی کے شروع میں ہرمز کہنے لگے تو پہلا نام شہرو کو دے دیا گیا۔ جب ہرمز ایک بہت بڑا تجارتی

سہنے کی سہولت بہت بڑھ گئی ہے۔ شہر کی خاص سڑک خیابانِ رضا شاہ کبیر ساحل کے تقریباً متوازی اور دو سو میٹر کے فاصلے پر شہر کے بیچ میں سے گزرتی ہے۔ سرکاری اور بلدیہ کی زیادہ تر عمارتیں اسی سڑک کے وسطی حصے میں واقع ہیں۔ بڑی مساجد دو ہیں: مسجد جامع (شیعوں کے لیے) اور مسجد گلہ داری (سنیوں کے لیے)۔ یہاں مچھلی کو ڈبوں میں بند کرنے کا ایک بڑا کارخانہ جدید صنعت کی نشانی ہے۔

مآخذ: جن کتابوں کا ذکر متن مقالہ میں آچکا

ہے ان کے علاوہ (۱) *Oud en Nieuw* : F. Valentijn

*Oost - Indiën*، اسٹردم ۱۷۲۵ء، ۵ : ۲۰۲؛ (۲)

*Travels into Muscovy, Persia and* : C. de Bruyn

*Parts of the East Indies*، لندن ۱۷۳۷ء، ۲ : ۷۳

تا ۱۷۵۰ء، ۱۳۲ تا ۱۳۳؛ (۳) *English East India Co.*

*the Gombroon Diary* (ایران اور خلیج فارس سے متعلق

دستاویزات، انڈیا آفس لائبریری، ج ۱ تا ۶)؛ (۴)

*Dictionnaire Universelle* : F. Savary des Bruslons

*de Commerce*، پیرس ۱۷۳۱ء، ۱ : ۳۰۵؛ (۵) *E. Ives*

*A Voyage from England to India ... also a Journey*

*from Persia to England*، لندن ۱۷۷۳ء، ص ۱۹۷

تا ۲۰۲؛ (۶) *Erdkunde* : C. Ritter، ۳ : ۷۳۹ تا

۷۳۹؛ (۷) *Nouvelle Géographie Uni-* : E. Reclus

*verselle*، پیرس ۱۸۸۳ء، ۹ : ۲۷۶ تا ۲۷۷، ۲۸۶؛ (۸)

*W. Tomaschek*، در *SBAK Wien*، ج ۱۲، جز ۸،

۱۸۹۰ء؛ (۹) *Persia and the Persian* : Curzon

*Question*، لندن ۱۸۹۲ء، ۲ : ۳۱۸ تا ۳۲۶؛ (۱۰)

*Mission Scientif. en Perse* : J. de Morgan، پیرس

۱۸۹۵ء، ص ۲۹۰ تا ۲۹۱، ۲۹۵؛ (۱۱) *Le Strange*

ص ۲۹۲، ۲۹۵، ۳۱۹؛ (۱۲) *Sir A. T. Wilson*

*The Persian Gulf*، اوکسفورڈ ۱۹۳۸ء، ص ۱۱، ۱۳۰،

۱۳۶، ۱۵۱ تا ۱۵۲، ۱۶۰ تا ۱۶۷، ۱۷۳ تا ۱۷۹،

۱۷۲۲ء میں غلزنئی افغانوں کے ہاتھوں جب

صفوی خاندان کا زوال ہوا اور اس کے بعد

روسی اور ترکی حملوں اور ملک کی متعدد اندرونی

شورشوں اور بغاوتوں نے ملک کی تجارت کو بالکل

مفلوج کر دیا تو بندرِ عباس کی رونق ختم ہو گئی۔

افغانوں کے چلے جانے کے بعد عارضی طور پر یہاں

پھر خوش حالی آئی، لیکن جلد ہی نادر [شاہ] کے

سخت گیر محصلین کے ہاتھوں خوش حالی کا یہ

دور بھی ختم ہو گیا۔ مزید برآں اس کے بوشہر

(رک باں) میں ایک بحری اڈا بنا دینے کی وجہ سے

بھی بندرِ عباس کے تفوق پر ایک اور کاری ضرب لگی

اور بہت جلد بوشہر ملک کی سب سے بڑی

بندرگاہ بن گیا۔ ۱۷۵۰ء میں جب *Plaisted* بندرِ عباس

گیا تو اس نے دیکھا کہ ہر دس گھروں میں

سے نو گھر غیر آباد اور ویران ہو چکے ہیں (*Journey*

*from Calcutta . . . . to Aleppo in the year 1750*، لندن

۱۷۵۸ء، ص ۱۱)۔ چند ہی سال بعد ولندیزی اور

انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنیوں نے بندرِ عباس کو

چھوڑ دیا اور یہ چیز اس کے مزید زوال کا سبب بنی۔

۱۷۹۳ء میں یہ شہر اپنے ڈیڑھ سو کیلومیٹر

لمبے ساحلی علاقے سمیت سلطانِ عمان کو پٹے پر دے

دیا گیا۔ اس وقت سے یہ برابر سلطان اور اس کے

جانشینوں کے ہاتھوں میں رہا تاآنکہ ۱۸۶۵ء میں

یہ پھر ایرانیوں کے قبضے میں آیا۔

زمانہ حال میں بندرِ عباس کو اس کی سابقہ

خوش حالی حاصل ہو گئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے

کہ کرمان اور یزد، نیز شیراز سے یہاں تک

موٹر کی سڑکیں بن گئی ہیں۔ موجودہ شہر کی

آبادی کوئی ۱۱۵۰۰ ہے (اس تعداد میں موسموں

کے لحاظ سے خاصا تغیر ہوتا رہتا ہے)۔ عیسین سے،

جو اس کے ۱۶ کیلومیٹر شمال مغرب میں واقع ہے،

پائپ کے ذریعے پانی آجانے کی وجہ سے یہاں رہنے



Zur historischen : W. Tamaschek (۴) : ۱۸۳ ص  
 Topographie von Kleinasien im Mittelalter' (SBak,  
 Wien, phil.-hist. Classe ۱۲۹ (۱۸۹۱) : ۱۳ :  
 La Turquie d'Asie : V. Cuinet (۵) پیرس ۱۸۹۵ء  
 Aus Klein- : R. Fitzner (۶) : ۲۸۵ تا ۲۹۵ :  
 Rostock 'asien und Syrien' ۱۹۰۴ء ص ۷۰ تا ۷۲ :  
 Cyzicus : F.W. Hasluck (۷) کیمبرج ۱۹۱۰ء ص ۵۰  
 تا ۵۱، نیز ۳۱۰ تا ۳۲۱ (حصہ مآخذ و مصادر) و بمواضع  
 کثیرہ؛ (۸) علی جواد : تاریخ و جغرافیہ لغاتی، جزء اول،  
 استانبول ۱۳۱۳ھ، ص ۱۵۱ تا ۱۵۲ .

(V. J. PARRY)

- \* بَنَدِق : رَکْ بہ بارود.
- \* بَنَدِق دَار : رَکْ بہ بیبرس.
- \* بَنَدِقِی : رَکْ بہ سگہ.
- \* بَنَدِقِیہ : رَکْ بہ بارود.
- \* بَنَدَہ (جزائر) : [= بانده] انڈونیشیا میں  
 چھوٹے چھوٹے [دس] جزیروں کا ایک مجموعہ، جن کا  
 محل وقوع ۱۳۰ درجے طول بلد مشرقی اور ۳۲ درجے  
 ۴ دقیقے عرض بلد جنوبی ہے۔ آبادی دس ہزار سے کم  
 ہے۔ باشندے مختلف نسلوں کے ہیں اور ان میں سے  
 بعض مسلمان ہیں۔ اداروں [دستور، رواج، یا قوانین و  
 آئین] کے اعتبار سے وہ انڈونیشیا (رَکْ بَاں) کے دوسرے  
 حصوں کے مسلمانوں سے مختلف نہیں ہیں، لیکن جب  
 پرتگیزیوں نے وہاں کے جائفل کے درختوں کی بنا پر  
 ادھر کا رخ کیا تو ان جزیروں نے اسلام اور مسیحیت  
 کی باہمی کش مکش میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔  
 پرتگیزی ۱۵۱۱ء میں ملکا پہنچے، جہاں سے وہ  
 ایک سال میں بحری کشتیوں کے ذریعے جزائر بندہ میں  
 پہنچ گئے۔ یوں گویا انہوں نے آئی بیریا کی لڑائی  
 کو، جو چند ہی سال ہوئے ختم ہوئی تھی، جنوبی  
 اور جنوب مشرقی ایشیا میں منتقل کر دیا۔ ۱۵۹۹ء  
 میں ولندیزی بھی میدان میں آ گئے۔ ۱۶۱۹ء سے

۱۸۸ تا ۱۸۹، ۲۳۲، ۲۵۹، ۲۸۳؛ (۱۳) رزم آرا و  
 نوشتاش : فرهنگ جغرافیای ایران، ۸ : ۵۶ تا ۵۷؛ (۱۴)  
 The fall of the Safavi Dynasty and : L. Lockhart  
 the Afghan Occupation of Persia، کیمبرج ۱۹۵۸ء  
 ص ۳۷۲ تا ۳۷۹، ۴۰۳ تا ۴۰۶ .

(L. LOCKHART)

\* بَنَدِرْمَہ : بحیرہ مارمورا پر ایک بندرگاہ، قدیم  
 Cyzicus کے محل وقوع کے قریب۔ قرون وسطیٰ میں  
 اس شہر کا یونانی نام پنورموس Panormos تھا۔  
 ول ہارڈون Villehardouin پلورمہ Palorme نامی ایک  
 قلعے کا ذکر کرتا ہے جسے لاطینی صلیبیوں نے  
 ۱۲۰۴ء میں مستحکم کیا تھا اور اس کے بعد وہ  
 اسے شمال مغربی ایشیائے کوچک میں یونانیوں کے  
 خلاف اپنی جنگی کارروائیوں کے مرکز کے طور پر  
 استعمال کرتے رہے۔ عثمانی ترکوں کے عہد میں  
 بَنَدِرْمَہ کو قرہ سی (رَکْ بَاں) کی سنجاق میں شامل  
 کر دیا گیا۔ جن سیاحوں نے اس شہر کو  
 سولہویں اور سترہویں صدیوں میں دیکھا ان کی  
 شہادت کے مطابق اس شہر کی آبادی کی اکثریت  
 ترک نہیں تھی بلکہ یونانی یا ارمن نسل سے تعلق  
 رکھتی تھی۔ بَنَدِرْمَہ کا بہت سا حصہ ۱۸۷۴ء میں  
 جل کر خاکستر ہو گیا۔ اب یہ بالیکسر Balıkesir  
 کے صوبے میں شامل ہے اور ایک سرگرم تجارتی شہر  
 ہے جہاں سے تمام عقبی علاقے کی مختلف چیزیں،  
 اناج، بیڑیں، مویشی، سہاگے کے مرکبات، تیل  
 برآمد کی جاتی ہیں۔ بَنَدِرْمَہ کی آبادی  
 ۱۹۵۰ء میں ۱۹۰۰۰ سے کچھ کم تھی۔

مآخذ : (۱) Voyage du : P. du Fresne-Canaye

Levant، طبع M. Hauser، پیرس ۱۸۹۷ء، ص ۱۵۳  
 تا ۱۵۴؛ (۲) Tagebuch : S. Gerlach، Frankfurt-  
 am-Main، ۱۶۷۴ء، ص ۴۳، ۲۵۵ تا ۲۵۶؛ (۳)  
 Voyage du Levant : V. de Stochove، برسلز ۱۶۵۰ء

خانہ بدوش بنو ہلال کے حملے اور زبیری سلطان المعز کے تغلیہ قیروان کے بعد بنزرت تقریباً بالکل خود مختار ہو گیا، لیکن دیہاتوں پر متصرف عربوں کی یورشوں سے محفوظ رہنے کی ضمانت کے طور پر وہ جلد ہی انہیں خراج دینے پر مجبور ہو گئے۔ مقامی لوگوں کی باہمی عداوتوں اور دشمنیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عرب سردار الورد اللخمی بنزرت میں داخل ہوا اور وہاں حکمران بن بیٹھا۔ اس نے اپنے صدر مقام میں مختلف ضروری ادارے قائم کیے اور شہر کو نسبتاً زیادہ خوش حال بنا دیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہوا اور بنو الورد خاندان بنزرت میں الموحدون کے حملے (۵۵۴/۱۱۵۹ء) تک قائم رہا۔ اس خاندان کے ساتویں حکمران امیر عیسیٰ نے عبدالمؤمن کی اطاعت قبول کر لی۔

ساتویں صدی ہجری/تیرھویں صدی عیسوی میں بنزرت پر بنو غانیۃ المرابطون نے قبضہ جما لیا اور اس وقت سے گویا اس کے زوال کا آغاز ہوا جس کی تصدیق سولھویں صدی عیسوی کے آغاز میں حسن بن محمد الوزان (Leo Africanus) نے کی ہے، لیکن ہسپانیہ سے کچھ مسلمان سہاجر آ کر یہاں بس گئے، جنہوں نے الریض الاندلسی کی بنیاد رکھی اور بربری سواحل تمام دوسری بندرگاہوں کی طرح اس نے بھی اپنی توجہ تجارتی جہازوں کو لوٹنے پر مرکوز کر دی۔ ۵۹۴/۱۱۵۳ء میں تونس کے بنو حفص کے اقتدار سے آزاد ہو کر اس نے الجزائر کے فرمانروا خیرالدین کی اطاعت اختیار کر لی۔ اگلے سال چارلس پنجم نے اس پر قبضہ کر لیا اور یہ ۵۹۸/۱۱۵۷ء (?) تک ہسپانیہ والوں کے قبضے میں رہا۔ بنزرت ایک مرتبہ پھر ترکی شہر ہو گیا اور اس کے بحری قزاق ایک روز افزوں خطرے کا سامان بن گئے۔ ان کی غارتگریوں

۱۹۳۲ء تک یہ جزائر ولندیزیوں ہی کے قبضے میں رہے، اور ان سے جاپانیوں نے چھین کر ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک ان پر قبضہ رکھا [رک بہ اندونیشیا ۳: ۳۷۳]۔

(C. C. BERG)

- بندہ : رک بہ عبد۔
- بندہ نواز : سید محمد گیسودراز، رک بہ گیسودراز۔
- بنزرت : (بیزرت Bizerta) تونس کے شمالی ساحل پر ایک شہر جو قدیم شہر ہپو دیاریتس Hippo Diarrytus کے محل وقوع پر واقع ہے۔ یہ شہر یکے بعد دیگرے فینیقی، قرطاجنی، رومی اور بوزنطی حکومتوں کے ماتحت رہا اور بالآخر ۵۴۱/۶۶۱ء میں معاویہ بن حدیج نے اسے فتح کر کے اس پر قبضہ کر لیا اور چوتھی صدی ہجری/دسویں صدی عیسوی میں حسن بن نعمان نے قرطاجنہ کے ساتھ ہی اس پر قبضہ کر لیا۔ چوتھی/دسویں صدی میں ابن حوقل اسے صوبہ سطفورہ (تونس کے شمال میں) کا دارالسلطنت بتاتا ہے حالانکہ اس وقت یہ شہر بالکل ویران اور کنخندروں کا ڈھیر تھا۔ آگے چل کر اس کے اچھے دن آئے۔ البکری کے بیان کے مطابق پانچویں صدی ہجری/گیارھویں صدی عیسوی میں اس شہر کے گرد ایک پتھر کی فصیل تھی اور اس کے اندر ایک بڑی مسجد، کئی بازار، حمام اور باغ تھے۔ مچھالی یہاں دوسری جگہوں سے زیادہ سستی بکتی ہے۔ جنیل (بحیرۃ) مچھلیوں کی بہت اچھی شکارگاہ ہے جہاں مختلف اوقات میں مختلف قسم کی مچھلیاں ملتی ہیں۔ بندرگاہ مرسى القبة اور شہر سے قریب ہی چند قلعے (قلاع بنزرت) تھے جو ایک رباط [نکیہ، زاویہ] کا کام دیتے تھے اور اہل زہد و تقویٰ کے لیے خلوت گاہ کا، اور جب عیسائیوں کے حملے کا اندیشہ ہوتا تو مقامی آدمیوں کے لیے پناہ گاہ کا کام دیتے تھے۔



سے عیسائی طاقتوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی جس نے مالٹا کے سورماؤں (knights) کی بحری مہموں اور شہر پر گولہ باریوں کی شکل اختیار کر لی، جن میں سے اہل وینس کی ۱۱۹۹ء/۱۷۸۵ء کی گولہ باری نے شہر کو بالکل تباہ و برباد کر دیا۔ تجارتی جہازوں کی لوٹ مار کو ختم کر دینے اور بندرگاہ کے اندر مٹی کے جم جانے کی وجہ سے بنزرت بالکل ویران ہو گیا۔ اب اس کی حیثیت ایک معمولی گاؤں سے زیادہ نہیں رہی اور اسی حالت میں ۱۸۸۱ء میں اس پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو گیا۔ تعمیر کا کام خاصے بڑے پیمانے پر شروع ہونے کے باعث یہ ایک بڑی بندرگاہ بن گیا، جس میں بڑے سے بڑے جہاز داخل ہو سکتے ہیں اور جس میں ایک فوجی اسلحہ خانے کے علاوہ جدید طرز کے دفاعی قلعے موجود ہیں۔

مآخذ: (۱) البکری: *Descript. de l'Afrique septentrionale*

الجزائر ۱۹۱۳ء، ص ۱۲۱ تا ۱۲۳؛ (۲) الإدربسی:

المغرب، ص ۱۱۴؛ ترجمہ ص ۱۳۳ تا ۱۳۵؛ (۳)

ابن خلدون: *Hist. des Berbères*، ۱: ۲۱۸، ترجمہ

۲: ۳۹ تا ۴۰؛ (۴) *Descript. de: Leo Africanus*

*l'Afrique*، ترجمہ *Épaulard*، ۲: ۳۵۰ تا ۳۷۶؛

*La Berbérie orientale sous des: Brunschvig* (۵)

*Les Arabes: G. Marçais* (۶): ۲۹۹؛ ۱:

*en Berbérie*، ص ۱۲۱ تا ۱۲۲؛ (۷) *Hannezo*:

*Bizerte*، در *R.Afr.*، ۱۹۰۴-۱۹۰۵ء.

(G. MARÇAIS)

بنغازی: سرنیکا *Cyrenaica*، سابق ضلع برقة

(رک بان) کا بڑا قصبہ جو مغربی میدان میں ایک

ساحلی پٹی پر واقع ہے جسے ساحلی جھیلوں (lagoons)

نے جزوی طور پر خشکی سے منقطع کر دیا ہے۔

اس کا محل وقوع اچھا نہیں کیونکہ اس کی بندرگاہ

شمالی اور مغربی ہواؤں کی زد میں ہے، آس پاس کے علاقے خشک اور بنجر ہیں اور سطح مرتفع المرج اور جبل الاخضر کے زرخیز اضلاع قدرے فاصلے پر واقع ہیں۔ یہ قصبہ قدم یوہس پریڈس *Euhesperides* کے مقام پر آباد کیا گیا ہے، مؤخر الذکر ایک نوآبادی تھی جس کی بنیاد یونانیوں نے پانچویں صدی قبل مسیح میں رکھی تھی۔ مصری بادشاہ بطلمیوس ثالث یورجیٹس (*Ptolemy III Euergetes*) کے عہد میں یہ آبادی اس کی بیوی برہنیکہ *Berenike* کے نام پر موسوم ہو گئی اور قرون وسطیٰ میں اس کا یہی نام برنیک کی صورت میں برقرار رہا۔ اس شہر کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہی اور قرون وسطیٰ میں اس پر ایسا زوال آیا کہ شاید یہ بالکل ہی مٹ گیا۔

موجودہ شہر کی تاریخ کا آغاز پندرھویں

صدی کے اواخر میں طرابلسیوں کی زلتن *Zliten* اور

مسرته *Mesrata* سے نقل مکانی کر کے یہاں آ جانے

سے ہوتا ہے۔ ان کے درنہ سے تجارتی روابط

قائم تھے۔ درنہ ایک اندلسی آبادی تھی جو کچھ

مدت قبل برقہ کے مشرقی ساحل کے علاقے میں

بسائی گئی تھی۔ بنغازی کا نام سیدی غازی کے

نام پر ہے۔ یہ ایک ولی اللہ تھے جو یہاں مدفون

ہوئے، لیکن ان کے بارے میں ہماری معلومات نہ

ہونے کے برابر ہیں۔ سلطنت عثمانی کے دیگر

ممالک سے نقل مکانی کرنے والوں کی آمد سے

طرابلسیوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ ان

میں اقریطشی *Cretans* بالخصوص قابل ذکر ہیں

جو یونانیوں کے ہاتھوں اپنے جزیرے کی فتح

(۱۸۹۷ء) سے قبل اور بعد جوق جوق یہاں پہنچے۔

یہاں آنے والے دوسرے لوگوں میں طرابلس کے

یہودی اور برقہ کے مختلف حصوں کے قبائلی

اور نخلستانوں کے باشندے تھے، اور تھوڑی سی

رکھنے کا کام، یونانی اور اطالوی سریتہ کلان میں مچھلیاں پکڑتے تھے۔ ماہی گیری اور سمندر سے نمک بنانے کی وجہ سے لوگوں کو روزگار کے مزید مواقع حاصل ہو گئے تھے۔

بنغازی کو ۱۹۴۲ء کے اواخر کی بمباری اور اطالوی آبادی کے اخراج سے بڑا نقصان پہنچا۔ برطانیہ کی آٹھویں فوج کے پہنچنے پر اطالوی اسے اور سارے سیرینیکا کو خالی کر گئے۔ بنغازی سیرینیکا کا بڑا شہر اور وفاق متحدہ لیبیا کے سلطان کا دارالحکومت اور قیام گاہ ہو گیا (۱۹۵۱ء)، لیکن یہاں کی صنعتیں ماند پڑ گئیں اور بندرگاہ کی حیثیت سے اس کی اہمیت جاتی رہی۔ اس کے ہوائی اڈے کی اہمیت زیادہ تر فوجی نقطہ نظر ہی سے ہے۔ ۱۹۵۴ء میں اس کی آبادی ۶۳۰۰۰ کے قریب تھی جو یہودیوں اور یورپیوں کی ایک قلیل تعداد کے سوا تمام تر مسلمان تھی۔

مآخذ: رگ بہ مادہ برقة و لیبیا۔

(J. DESPOIS)

بنقی: (Banqui)، سابق فرانسیسی نوآبادی ⓧ اوبنگھی۔ شاری Ubanghi Shari اور موجودہ جمہوریہ وسطی افریقہ کا صدر مقام، جو جمہوریہ کانگو کی سرحد کے قریب واقع ہے۔ پچھلی صدی میں جو فرانسیسیوں نے فرانسیسی کانگو کی حدود میں توسیع کرنے کی مہم شروع کی تو مفتوحہ علاقے میں ان کی سب سے پہلی فوجی چوکی بنقی ہی میں بنائی گئی تھی۔ ۱۳ اگست ۱۹۶۰ء کو جب اوبنگھی۔ شاری کو مکمل آزادی ملی اور جمہوریہ وسطی افریقہ ظہور میں آئی تو بنقی اس کا صدر مقام قرار پایا۔ یکم جنوری ۱۹۶۶ء کو کرنل Jean Bedel Bocassa نے فوجی بغاوت کر دی جس میں قصر صدارت، ریڈیو سٹیشن اور دوسرے سرکاری مراکز کا محاصرہ کر کے صدر ڈیوڈ نیکو David

تعداد یورپ کے باشندوں کی تھی، انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں اس قصبے کی آبادی پانچ ہزار تھی جو ۱۹۰۰ء کے قریب پندرہ ہزار ہو گئی جس میں ایک ہزار اطالیہ، مالٹا اور یونان کے باشندے اور ۲۵۰۰ یہودی بھی شامل تھے۔ جب ۱۹۱۱ء میں اطالوی بنغازی میں اترے تو یہاں کی آبادی بڑھ کر ۱۹ ہزار ہو چکی تھی۔ شروع میں یہ ایک ترکی ولایت کا مرکز تھا۔ اب لیبیا کی نوآبادی کے مشرقی حصے کا صدر مقام بنا جہاں ۱۹۳۱ء میں جا کر امن و امان قائم ہو سکا۔ یہ ریل کے ذریعے جنوب کی جانب سلوک (Soluk) (۳۵ میل) اور مشرق کی جانب المرج (۶۸ میل) سے ملا ہوا ہے اور سریتہ کلان ندی کے کنارے کنارے جانے والی سڑک نیز شمالی سطح مرتفع، یعنی ملک کے قاب سے ادھر ادھر جانے والی سڑکیں یہیں آ کر ختم ہوتی ہیں۔ یہاں ایک نئی بندرگاہ تیار کی گئی جسے پشتوں کے ذریعے محفوظ بنایا گیا۔ علاوہ ازیں یورپی شہروں کی طرح اس قصبے کے لیے یلدیاتی سہولتیں مہیا کی گئیں۔ پرانا قصبہ ۷۰۰ میٹر لمبے اور ۳۰۰ میٹر چوڑے ایک چوکور قطعہ زمین کے اندر آباد ہوا تھا اور اس کا نقشہ خاصا باقاعدہ تھا۔ جامع مسجد جو سولہویں صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی تھی پھر بحال ہوئی۔ ایک نیا مضافاتی قصبہ بڑے پیمانے پر قدیم بنغازی کے جنوب میں سابقہ نواحی بستی البرکة کی جانب بسایا گیا۔ البرکة ایک مضافاتی قصبہ تھا جو ترکی چھاؤنی کی بارکوں کے گرد بس گیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں بنغازی کی آبادی ۶۶۸۰۰ ہو گئی جن میں ۲۲۰۰۰ اطالوی تھے۔ اس کی بندرگاہ سیرینیکا میں سب سے زیادہ مصروف کاروباری جگہ تھی جہاں کئی صنعتیں قائم ہوئیں مثلاً چمڑا رنگنا اور جوتے بنانا لکڑی کا سامان، تعمیرات اور ٹنی tunny مچھلی کے محفوظ



بارہویں صدی عیسوی کے اختتام تک بنگالہ کا نام مشرقی اور جنوبی حصے کے لیے مخصوص تھا۔ ابتدائی مسلمان مصنفین نے بھی بنگ یا بنگا مشرقی اور جنوبی بنگال کے لیے استعمال کیا ("بختیار خلجی لکھنوتی، بہار، بنگ اور کمروڈ (کامروپ) جیسی مختلف جگہوں کے لوگوں کو اپنے زیر تسلط لایا" طبقات ناصری، ص ۱۴۸)۔

لفظ بنگالہ پہلے پہل بلبن (وَلْک بآن) کے زمانے میں استعمال ہوا، جسے ضیاء الدین برنی نے "فاتح اقلیم لکھنوتی و عرصہ بنگالہ" لکھا ہے۔ بنگال کے یہ دو مختلف حصے (لکھنوتی اور بنگالہ) سلطان الیاس شاہ کے عہد میں متحد ہوئے اور دونوں حصوں کا نام بنگالہ ہوا؛ چنانچہ سلطان الیاس شاہ نے شاہ بنگالہ (اور شاہ بنگالیاں) کا لقب اختیار کیا (عقیف، ص ۱۱۴ تا ۱۱۸، فرشتہ؛ ۲: ۲۹۶)۔ اس زمانے سے بنگالہ سے وہ وسیع جغرافیائی خطہ مراد لیا جانے لگا جو تلیا گڑھی سے چائنگاؤں تک ہمالیہ کی ترائی سے خلیج بنگال تک پھیلا ہوا ہے اور یہاں کے لوگ فارسی ادب اور چینی اور ترکی کتابوں میں بنگالی کے نام سے موسوم ہوئے۔

آئین اکبری اور توزک جہانگیری میں بنگالہ کی تقریباً وہی حدود ملتی ہیں جو برطانوی ہند کے صوبہ بنگال کی تھیں، یعنی شمال میں ہمالیہ کی ترائی سے خلیج بنگال تک اور مغرب میں راج محل کی پہاڑیوں سے مشرق میں گارو، کھاسی اور چائنگاؤں تک۔ اس کی طبعی سرحد نے اسے تبت، چین اور برما سے علیحدہ کیا ہے اور بر صغیر پاک و ہند کے ساتھ صرف درہ تلیا گڑھی، درہ بھنگہ اور جہار کھنڈ کے دشوار گزار راستے سے ملحق ہے۔

علم طبقات کی رو سے بنگالہ کی زمین زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اس کی آب پاشی متعدد دریاؤں اور بے شمار ندی نالوں سے ہوتی ہے۔ گنگا، برہم پتر،

Dacko کو برطرف کر دیا اور نئی حکومت قائم ہو گئی۔

بنقی میں ہوائی اڈا بھی موجود ہے اور اس کے قریب بوکو کو Bokoku کے مقام پر زرعی تحقیقات کا مرکز قائم ہے۔ بنقی کی آبادی ۸۲۳۰۰ ہے۔

مآخذ: (۱) World Muslim Gazetteer، کراچی ۱۹۶۵ء؛ (۲) Statesman's Year Book, 1967؛ (۳)

The World Almanac, 1967؛ (۴) Whitaker's Almanack, 1967

(سید امجد الطاف)

\* بنگ : رَکْ بہ بَیج۔

\* بنگال : رَکْ بہ بنگالہ۔

⊗ بنگالہ : یا بنگال، برطانوی ہند کا ایک صوبہ، جو بر صغیر پاک و ہند کی آزادی کے بعد تقسیم ہو کر بھارت کی ریاست مغربی بنگال اور پاکستان کے صوبہ مشرقی پاکستان میں شامل ہو چکا ہے۔

نام اور جغرافیہ : بنگال یا بنگالہ کا نام بنگ یا ونگا سے نکلا ہے۔ یہ ایک غیر آریائی قوم تھی۔ جس کا ذکر سنسکرت کی قدیم رزیہ کتابوں اور دھرم شاستروں، نیز بدھی ادب ("میلندا پنہو") میں ملتا ہے۔ آگے چل کر یہ نام بنگال کے اس علاقے کے لیے استعمال ہونے لگا، جہاں یہ قوم آباد تھی۔ پال اور سین راجاؤں کے عہد کا بنگا جنوبی بنگال میں دریائے گنگا کے ڈیلٹا کے مشرقی حصے میں واقع ایک چھوٹے سے علاقے پر مشتمل تھا۔ مغربی بنگال کو رادھا اور شمالی بنگال کو پوندراوردھن کہتے تھے۔ ان کے علاوہ وربندرا اور لکھنوتی کے علاقے بھی تھے۔ شمالی اور مغربی بنگال کے کچھ حصے کو گور کہا جاتا تھا، لیکن یہ نام بعض اوقات پورے بنگال کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔ سین راجاؤں کی سلطنت میں بنگال کا ایک بڑا حصہ شامل تھا، لیکن وہ ہمیشہ گوری سور (= گور کا راجا) ہی کہلائے۔

سمندر گپت کے کتبت سے مشرقی بنگال کی ایک ریاست سمائانا یا ونگا کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح مغربی بنگال میں یوشکرنا کی ریاست تھی، جس کے راجا چندرورمن نے اپنی حدود فریدپور تک بڑھا لی تھیں اور ایک قلعہ چندروپما کوٹ بنوایا تھا۔ ان دونوں ریاستوں کا خاتمہ سمندر گپت کے ہاتھوں ہوا۔

خاندان گپتا کی حکومت چھٹی صدی عیسوی تک رہی۔ اس عہد کے کتبوں میں ونگا کے تین راجاؤں کے نام ملتے ہیں: گوپ چندر، دھرم دت اور سماچار دیو، جو بردوان اور فرید پور کے علاقے پر ۵۲۵ سے ۵۷۵ء تک حکمران رہے، تاآنکہ چالوکیہ کے راجا کرتیورمن نے اس ریاست پر قبضہ کر لیا۔

۶۰۶ء سے کچھ قبل گپتا خاندان کے ایک باجگزار مہاسانت ساسنکا نے آپوندرا یا ورندری (شمالی بنگال) اور رادھا یا سوہما (مغربی بنگال) پر مشتمل ریاست گوڈا (گور، گور) کی بنیاد رکھی۔ جس کا صدر مقام کرنا سورنا (رانگامائی) تھا۔ اس نے بدھ راجا ہرشنوردھن اور کامروپ کے راجا بھاسکرورمن کو پے درپے شکستیں دے کر مگدھ (بہار)، چلکا جھبا (اڑیسہ) اور بنارس تک کا علاقہ فتح کر لیا۔ اس نے بدھوں پر بڑے ظلم کیے اور گیا کے مندر سے مہاتما بدھ کا بت نکال پھینکا۔ اس کی موت کے بعد بھاسکرورمن اور ہرشنوردھن نے اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لے لیا۔ آٹھویں صدی عیسوی کی ابتدا میں قنوج کے راجا یاسورمن نے گوڈا اور ونگا پر قبضہ کر لیا اور ۷۳۶ء کے بعد کشمیر کا راجا لالتیہ دتیہ گوڈا پر قابض ہو گیا۔

ساتویں صدی کے نصف آخر میں مشرقی اور جنوبی بنگال پر ایک بدھ خاندان کھڈگا حکمران تھا۔ آٹھویں صدی کا نصف اول ابتری کا زمانہ تھا، جس سے فائدہ اٹھا کر ۷۳۳ء میں ایک اور بدھ خاندان ہال

میگھنا، کروٹیا، مہاندا، کوسی اور ان کی معاون ندیوں کا بنگالیوں کی زندگی بنانے اور بگاڑنے میں ایک خاص حصہ ہے۔ بنگالہ کی تمدنی و معاشی ترقی کا انحصار انہیں کے رحم و کرم پر ہے اور بہت سے شہروں اور دیہات کو بسانے اور اجاڑنے میں ان کا بڑا حصہ رہا ہے۔ ان کے قرب و جوار کی زمینیں زیادہ اونچی نہ ہونے کے باعث برسات میں تقریباً چار ماہ تک زیر آب رہتی ہیں، جس سے زراعت کو خاصا نقصان پہنچتا ہے۔ علاوہ ازیں باد و باراں کے شدید طوفان بھی اکثر اس علاقے کو اپنا نشانہ بناتے رہتے ہیں۔ سیاحوں اور مؤرخوں نے اپنی کتابوں میں اس کی تفصیلات دی ہیں۔

تاریخ:

ہندو دور: اس علاقے میں آریاؤں کی آمد کا آغاز تقریباً ۱۰۰۰ ق م میں ہوا، لیکن ان کے قدیم ادب میں اس زمانے کے بنگالہ کی سیاسی حالت کے بارے میں اس کے سوا کسی طرح کی معلومات نہیں ملتیں کہ یہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھا اور آبادی مختلف اقوام، مثلاً ونگا، سوہما، پوندرا اور لادھا وغیرہ پر مشتمل تھی۔ قدیم رزمیہ نظموں میں ان کے بعض سرداروں کے نام ملتے ہیں، مثلاً پوندرا کا حاکم واسودیو۔

تاریخی دور کی ابتدا چوتھی صدی ق م کے اواخر سے ہوتی ہے۔ بقول بطلمیوس (Ptolemy) مشرقی علاقے میں گنگاریدائی یا گنداریدائی حکومت کرتے تھے۔ ہگلی کے قریب ان کی راجدھانی گنگے تجارت کی بڑی منڈی تھی۔ یہاں بہت اچھی ملل تیار ہوتی تھی اور اس کے نزدیک ایک سونے کی کان تھی۔ سکندر اعظم کے حملے کے وقت انہوں نے پائی پتر کے براسیوٹی حکمرانوں سے متحد ہو کر ایک بہت بڑا لشکر مشرقی ہند کے دفاع کے لیے تیار کیا تھا۔



نے مغربی بنگال میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ پال خاندان کا بانی گوپال تھا جس نے نالندا اور دوسرے مقامات پر مٹھ اور مذہبی مدرسے قائم کیے۔ اس کے بیٹے دھرم پال کے زمانے (۷۷۰ء تا ۸۱۰ء) میں یہ سلطنت اس قدر وسیع ہو گئی کہ اس میں ہمالیہ کی ترائی، کیدرا، مشرقی راجپوتانہ، مالوہ اور برار تک کے علاقے شامل تھے۔ اس کے بیٹے دیوپال نے اڑیسہ اور آسام تک اپنی ریاست بڑھا لی اور ہمالیہ سے وندھیاچل اور خلیج بنگال سے بحیرہ عرب تک کے راجاؤں سے خراج لیا۔ اس کی شہرت جاوا، سماترا اور ملایا تک پہنچی اور وہاں سے سفارتیں آئیں۔ عرب سیاح سلیمان اور جغرافیہ دان المسعودی نے اس کی ریاست کا حال قلمبند کیا ہے۔ اس کے درباری شاعر ابھی نند نے ایک کتاب چرتیا لکھی۔

دیوپال کے بعد اس خاندان پر زوال آ گیا۔ ۹۸۸ء تک چھے راجا ہوئے جو مذہب کے پابند، لیکن سپہگری سے بے بہر تھے۔ ماہی پال (۹۸۸ تا ۱۰۳۸ء) کے زمانے میں اس خاندان نے پھر سنبھالا لیا۔ اس نے شمالی اور مشرقی بنگال پر دوبارہ قبضہ کر کے بنارس تک اپنی سلطنت کی توسیع کی۔ اس کے عہد میں مذہب اور تہذیب کو بھی ترقی ہوئی۔

آخر تقریباً چار سو سال کے بعد پال خاندان اور اس کے ساتھ بدھوں کے دور حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ آخری حکمران گووندپال شکست کھا کر بہار کی طرف بھاگ گیا اور ایک طویل عرصے کے لیے سین خاندان کے ہندو راجا برسر اقتدار آ گئے۔

گیارہویں صدی کے اواخر میں ہیمنت سین نے رادھا میں ایک خودمختار حکومت قائم کی۔ اس کے بیٹے وجے سین (۱۰۹۵ تا ۱۱۵۸ء) نے گوڈا کے کچھ حصے اور ونکا کو اپنی ریاست میں شامل

کیا؛ پھر کامروپ اور کالنگا کے علاقے بھی فتح کر لیے۔ اس کے جانشین ولاسین کی حدود سلطنت مشرقی بنگال سے شمالی بہار تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ عالم تھا اور علموں کی قدر کرتا تھا۔ دان پساگر اور بھوٹا ساگر اسی زمانے میں لکھی گئیں۔ ۱۱۷۹ء میں اس کا بیٹا لکشمین سین تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنا آبائی شو دھرم چھوڑ کر ویشنو دھرم اختیار کیا۔ وہ خود بھی شاعر تھا اور اس کے دربار میں بھی کئی ممتاز شعرا موجود تھے۔ اس نے کاسی، کالنگا، کامروپ اور گوڈا کے راجاؤں پر فتح حاصل کی اور پوری، بنارس اور الہ آباد میں فتح کے ستون نصب کیے۔ اس کی عمر کا آخری حصہ بڑی پریشانی میں بسر ہوا۔ ملک کے مختلف حصوں میں شورشیں اور بغاوتیں ہونے لگیں اور چاروں طرف انتشار اور بدامنی پھیل گئی تاآنکہ وہ مسلمانوں سے شکست کھا کر بھاگا اور ۱۲۰۶ء میں ڈھا کے قریب بمقام وکرم پور فوت ہو گیا۔ سین راجا کٹر ہندو تھے اور بدھ مت کے پیرو ہمیشہ ان سے نالان رہے۔

اسلامی دور: ۱۱۹۹ء میں قطب الدین ایبک کے ایک ترک سپہ سالار اختیارالدین محمد بن بختیار خلجی نے جنوبی بہار میں مسلم سلطنت کی توسیع کرنے کے بعد بنگالہ کی طرف کوچ کیا اور اپنی فوج کو پیچھے چھوڑ کر صرف اٹھارہ سو اوروں کے ساتھ ۱۲۰۱ء میں سین راجا کے دارالحکومت ندیا میں داخل ہوا۔ لکشمین سین کو خبر ملی تو وہ کھانا چھوڑ کر محل کے پچھلے دروازے سے بھاگ نکلا اور ندیا پر بغیر جنگ و جدال کے مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ جلد ہی وریندرا اور گور بھی مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا۔ اس کی قائم کردہ حکومت لکھنوتی کی وسعت شمال میں پورنیا سے دیوٹوٹ اور رنگپور تک، مشرق میں ٹیٹا اور کروٹیا تک، جنوب میں گنگا تک اور مغرب میں کوسی سے راج

اور وکرم پور کے راجا خراج دینے لگے اور دارالحکومت دیو کوٹ سے گور (لکھنوتی) میں منتقل ہو گیا۔ ۱۲۱۹ء میں اس نے جہازوں کا ایک بڑا بیڑا بنایا۔ ۱۲۲۵ء میں سلطان التمش بہار و بنگال پر حملہ آور ہوا تو اس نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی، لیکن اس کے واپس ہوتے ہی بہار کے صوبیدار علاؤالدین جانی کو مار بھگایا۔ اس پر التمش کے لڑکے ناصرالدین نے لکھنوتی پر چڑھائی کی، غیاث الدین گرفتار ہوا اور مارا گیا۔ اس طرح بنگال کی پہلی آزاد بادشاہی کا خاتمہ ہو گیا (۱۲۲۷ء)۔

بنگال ۱۲۲۷ء سے ۱۲۸۷ء تک دہلی سلطنت کا ایک حصہ رہا اور اس دوران میں یہاں یکے بعد دیگرے متعدد صوبیدار مقرر ہوئے جو بوجہ کم و بیش خود مختار رہے۔

بلبن [رک باں] کے عہد حکومت (۱۲۶۵ تا ۱۲۸۷ء) میں یہاں کا صوبیدار اس کا معتمد غلام مغیث الدین طغرل تھا۔ ۱۲۷۹ء میں بادشاہ ایسا بیمار ہوا کہ بعض علاقوں میں اس کی وفات کی افواہ پھیل گئی۔ طغرل نے ان دنوں شمالی اڑیسہ اور گونڈوانہ میں بہت سی فتوحات حاصل کی تھیں۔ اس نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ شاہی دربار میں بھیجنے کے بجائے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور یکے بعد دیگرے دو شاہی لشکروں کو، جو اسے سزا دینے کے لیے بھیجے گئے تھے، شکست دی۔ اب سلطان غیاث الدین بلبن خود بنگال پر حملہ آور ہوا (۱۲۸۰ء)۔ یہ سن کر طغرل جاج نگر کی طرف فرار ہو گیا اور بلاد بنگال شاہی قبضے میں آ گئے۔ طغرل کا پیچھا کیا گیا اور بالآخر وہ مارا گیا (۱۲۸۳ء)۔ بلبن نے اپنے لڑکے بفر خان کو اقلیم لکھنوتی اور عرصہ بنگالہ کا حاکم بنایا اور دہلی واپس چلا گیا (۱۲۸۲ء)۔ بفر خان کے وقت سے بنگال کی صوبہ داری موروثی ہو گئی۔ یہ بلبنی

محل کی پہاڑیوں تک تھی۔ وندھیا چل سے راج محل کی پہاڑیوں تک جنوبی بہار اور گنڈک کے دھانے سے کوسی تک کے علاقے بھی لکھنوتی حکومت میں شامل کر لیے گئے۔ یہ چھوٹی سی سلطنت بعد میں گور کی ایک بڑی خود مختار حکومت بنی۔ کچھ عرصے بعد محمد بن بختیار خلجی دس ہزار فوج لے کر تبت پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوا، لیکن پہاڑی راستوں کی دشواری اور نیم وحشی قبائل کی لڑائیوں نے فوج کو بددل کر دیا اور وہ مراجعت پر مجبور ہو گیا۔ جب وہ اپنی حدود میں پہنچا تو تین چونہائی فوج ضائع ہو چکی تھی اور وہ خود ایسا علیل تھا کہ لکھنوتی کے راستے ہی میں دیو کوٹ کے مقام پر فوت ہو گیا (۱۲۰۵ء)۔ ایک سردار علی بن مردان خلجی پر شبہ کیا گیا کہ اس نے بیماری میں محمد بن بختیار خلجی کو ہلاک کر دیا ہے؛ چنانچہ اسے گرفتار کر کے عزالدین محمد شیران کو لکھنوتی کا حاکم بنایا گیا جو شاہی لقب اختیار کیے بغیر خود مختارانہ حکومت کرنے لگا۔ علی بن مردان کچھ ہی دنوں بعد فرار ہو کر دہلی پہنچا اور اپنی صفائی پیش کر کے ایک سے ولایت بنگال کی سند لے کر لکھنوتی آیا۔ شیران شکست کھا کر بھاگ گیا اور ایک کے گورنر کی حیثیت سے علی بن مردان حکومت کرنے لگا۔ بنگال کا پہلا مسلمان بادشاہ یہی ہے۔

نومبر ۱۲۱۰ء میں قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد علی بن مردان نے بنگال میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، مگر اس نے جبر و تعدی اور خود پسندی کا ایسا مظاہرہ کیا کہ خلجی امرا نے عاجز آ کر اسے قتل کر دیا (۱۲۱۱ء)، اور حسام الدین خلجی سلطان غیاث الدین کے لقب سے بادشاہ بن گیا۔ اس کے زمانے میں بنگال نے بڑی ترقی کی۔ حدود سلطنت میں توسیع ہوئی، اڑیسہ، کامروپ



غضب کر لی۔ مملکت بنگالہ کو مسلمانوں نے یہ وسعت دی کہ مغربی آسام (= کامروپ)، کوچ بہار اور جاجنگر (اڑیسہ) کے اقطاع اور شمالی و جنوبی بہار کا علاقہ پٹنہ تک ان کے زیر حکومت رہا۔ اسلامی فوجوں نے دریائے میگھنا عبور کیا، جو پہلے ان کی پیشقدمی میں سد سکندری بنتا رہا تھا اور سلہٹ، مغربی پٹنہ اور نواکھلی (بشمول چائنگاؤں) تک مسلط ہو گئیں۔ اس مملکت کے مرکزی شہر تین تھے: (۱) غور یا گور، جو قدیم لکھنوتی کا نیا نام تھا اور وسط بنگال (موجودہ ضلع مالده) میں گنگا کے کنارے واقع اور چند وقفوں کے ساتھ بہت عرصے تک پایہ تخت رہا۔ اس کے قریب پنڈوہ اور اکدالہ کے شاندار قلعے کی تعمیر ہوئی؛ (۲) مشرق میں سنار گاؤں، موجودہ ڈھا کے سے قریب ایک وسیع شہر تھا، جب ڈھا کہ بسا تو اجڑ گیا؛ (۳) ساتگاؤں، دریائے ہگلی پر تجارتی اور انتظامی مرکز تھا۔ جب ندی کے اٹ جانے سے آمد و رفت مشکل ہو گئی تو اس کی جگہ ہگلی بندرنے لے لی (ریاض السلاطین، انگریزی ترجمہ، حاشیہ ترجمہ، ص ۹۰؛ ہاشمی فرید آبادی: تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، ۱: ۳۶۳)۔

۱۳۳۹ء میں بہرام کے قتل کے بعد اس کے مشیر کار فخرالدین نے بغاوت کی اور سلطان فخرالدین مبارک شاہ کے نام سے خطبہ پڑھا اور ۱۳۴۹ء تک حکومت کی۔ اس کے بعد مشرقی بنگال تین سال اور خودمختار رہا اور اس کے لڑکے اختیار الدین غازی شاہ نے حکومت کی۔ ۱۳۵۳ء میں سنار گاؤں مغربی بنگال کی الیاس شاہی سلطنت کا ایک حصہ ہو گیا۔ الیاس شاہی سلطنت: ۱۳۴۲ء میں حاجی (ملک) الیاس مغربی بنگال کے حاکم علی مبارک کو قتل کر کے تخت پر قابض ہوا اور سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔ اس نے مغرب میں اپنی

حکمران سلطنت دہلی کی سیادت کو تسلیم تو کرتے تھے، لیکن اپنے صوبے کے معاملات میں وہ تقریباً آزاد و خود مختار تھے۔

۱۳۸۷ء میں خاندانِ غلامان کے ہاتھ سے دہلی کی سلطنت جاتی رہی اور ۱۳۹۰ء میں خلجیوں اور پھر ۱۳۲۰ء میں تغلقوں کا اس پر قبضہ ہوا، تاہم بنگال میں بلبنی خاندان بدستور حاکم رہا اور سلاطین دہلی نے بھی ان پر کسی طرح کا جبر کرنا پسند نہیں کیا۔ غیاث الدین تغلق کے عہد میں حاکم بنگالہ شہاب الدین بغرا شاہ کو اس کے بھائی ادر شاہ نے اس قدر زچ کیا کہ اس نے بادشاہ سے مدد مانگی، چنانچہ سپہ سالار بہرام خان بنگال بھیجا گیا۔ بہادر شاہ نے شکست کھائی اور شہاب الدین حکومت پر بحال ہوا۔ آئندہ تیس پینتیس برس تک بنگالہ کے مختلف حصے سلاطین دہلی کی سیادت کو ماتھے رہے۔ ۱۳۲۴ء سے ۱۳۳۰ء تک مشرقی بنگال پر بہادر شاہ اور بہرام خان کی مشترکہ طور پر اور ۱۳۳۰ء سے ۱۳۳۸ء تک صرف مؤخر الذکر کی حکومت رہی۔ ۱۳۲۵ء سے ۱۳۳۹ء تک لکھنوتی کا حاکم قدرخان تھا اور ۱۳۲۳ء سے ۱۳۳۹ء تک ساتگاؤں کا حاکم عزالدین اعظم الملک۔ محمد تغلق کے آخری ایام حکومت میں والیان بنگال علانیہ منحرف ہو گئے اور فیروز تغلق کو طوعاً و کرہاً ان کی آزادی ماننا پڑی۔

آزاد مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں بنگال نے بڑی آسودگی پائی۔ ملک کے گوشے گوشے میں سرکاری عمارات، قلعے، مسجدیں، مدرسے، اقامت خانے، سرائیں اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں، تالاب کھودے گئے اور سڑکیں تیار ہوئیں۔ اس عہد میں دو شاہی خاندان حکمران رہے: ایک حاجی الیاس کا اور دوسرا علاء الدین حسین کا، درمیان میں راجا کنس اور اور اس کے جانشینوں نے کچھ عرصے کے لیے حکومت

کمزوری کے باعث درباری بہت خود سر ہو گئے۔ امیروں میں سے ایک راجہ کنس بھی تھا، جس نے غیاث الدین اعظم کے پوتے شمس الدین ثانی کو ۱۴۰۹ء میں قتل کرا کے بایزید کو برائے نام تخت پر بٹھایا اور خود حکومت کی باگ ڈور سنبھال لی؛ لیکن کچھ عرصے بعد امرا کی مخالفت کی تاب نہ لا کر سطنٹ اپنے لڑکے جدو کے حوالے کر دی (۱۴۱۴ء)۔ نیا حکمران مسلمان ہو گیا اور جلال الدین محمد شاہ کے نام سے موسوم ہوا۔ اس کی وفات (۱۴۳۱ء) کے بعد شمس الدین احمد شاہ تخت پر بیٹھا۔ ۱۴۴۲ء میں اسے قتل کر دیا گیا اور حکومت ایک بار پھر الیاس شاہیوں کے ہاتھ میں آ گئی۔

۱۴۴۲ سے ۱۴۵۹ء تک ناصر الدین محمود شاہ نے بھاگلپور، ساتگاؤں، باگرھاٹ، فریدپور اور نصرت آباد سے اپنے سگے جاری کیے۔ اس کے لڑکے رکن الدین باریک شاہ (۱۴۵۹ تا ۱۴۷۴ء) نے اڑیسہ کے راجا سے جنگ کی اور قلعہ مندارن پر دوبارہ قبضہ کیا۔ اس کے فوجی انسر اسمعیل غازی نے کامروپ کے راجا کو ماہی ستوش (ضلع دیناچپور) کے نزدیک شکست دے کر اپنی سرحد دریائے کروٹیا تک بڑھا لی۔ باریک اور اراکان کے راجا کے درمیان چانگاؤں کے لیے عرصے تک جنگ ہوتی رہی۔ جیسور اور کھلنا کا علاقہ جنوب میں فتح کیا گیا۔ باریک گوریسور کھلاتا تھا۔ اس نے بنگلہ زبان کی بھی سرپرستی کی۔

جس طرح عباسیوں کے زمانے میں ترکوں کی سرپرستی ہوئی تھی اسی طرح بنگال کے آخری الیاس شاہی سلطانوں نے حبشیوں کی سرپرستی کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جن امیروں کی وجہ سے سلطنت چلتی تھی ان کا زور کم ہو گیا اور سلطنت کو نقصان پہنچا۔ محمود کے بیٹے جلال الدین فتح شاہ (۱۴۸۱ تا ۱۴۸۶ء) نے حبشیوں کی قوت توڑنا چاہی

سلطنت ترہٹ سے آگے چمپارن، گورکھپور اور بیڑائیچ تک بڑھا لی، ادھر مشرق میں اختیارالدین کی وفات کے بعد ۱۴۵۲ء میں سنارگاؤں کو اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ ۱۴۵۳ء میں بنگلہ پر فیروز تغلق نے حملہ کیا جس کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا کہ لکھنوتی کے مغرب کا سارا حصہ دہلی کی سلطنت میں ملا لیا گیا۔ تاہم الیاس شاہ نے اپنی سلطنت کی وسعت کامروپ، ناگرا، اور ورنندرا (راجشاہی اور دیناچپور کے اضلاع) تک بڑھا لی۔ اس نے ۱۴۵۸ء تک حکومت کی، لیکن اس کے سگے صرف ۱۴۵۷ء تک کے پائے جاتے ہیں۔ اس کے زمانے میں علم کا چرچا ہوا اور عالموں کی قدر کی گئی۔ اخی سراج الدین المعروف بہ آئینہ ہند اور شیخ بیابانی (م ۱۴۵۴ء) اس کے درباری تھے۔

الیاس شاہ کی وفات کے بعد اس کا لڑکا سکندر شاہ اول (۱۴۵۸ تا ۱۴۸۹ء) تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں بھی فیروز تغلق نے حملہ کیا، لیکن جلد ہی صلح ہو گئی اور وہ دہلی واپس چلا گیا (۱۴۵۹ء)۔ پینتیس سال کی حکومت کے دوران میں سکندر شاہ نے بہت سی عمارات تعمیر کروائیں۔ ۱۴۸۸ء میں اس کے بیٹے غیاث الدین نے بغاوت کر کے سنارگاؤں، ساتگاؤں اور فیروز آباد کو فتح کر لیا۔ گوالپاڑہ میں باپ بیٹے کے درمیان جنگ ہوئی۔ سکندر شاہ مارا گیا اور غیاث الدین ۱۴۸۹ء میں تخت پر بیٹھا۔

یہی وہ غیاث الدین اعظم شاہ (۱۴۸۹ تا ۱۴۹۶ء) ہے جس نے ایران کے شاعر حافظ سے خط و کتابت کی اور جونپور کے حاکم خواجہ جہاں اور چین کے شہنشاہ سے دوستی پیدا کی۔ ایک چینی سیاح ماہوان اسی کے زمانے میں بنگالہ آیا اور اس نے یہاں کی تمدنی و معاشرتی حالت قلمبند کی۔

الیاس شاہی خاندان کے آخری سلاطین کی



کے دور کا آغاز ہوا۔

حسین شاہ سے مسلمان اور ہندو دونوں خوش تھے۔ پنڈیا (فیروز آباد) میں اس نے قطب عالم کے مقبرے کے لیے خاصی جاگیر مقرر کی۔ اس کے قائم کردہ متعدد مدارس میں سے ایک مدرسے کا ذکر مالذہ کے کتبے (مورخہ ۱۵۰۲ء) میں ملتا ہے۔ ہندو اسے کرشن کا اوتار کہتے تھے، چنانچہ بہت سے ہندو مصنفین اور شعرا نے اسے نیک نام سے یاد کیا ہے۔ ۱۵۱۹ء میں حسین شاہ کی وفات کے بعد اس کا بڑا بیٹا ناصرالدین ابوالمظفر نصرت شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں رامائن اور مہابھارت کا بنگلہ میں ترجمہ ہوا اور سونا مسجد اور قدم رسول کی عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ اسی زمانے میں بابر نے ابراہیم لودھی کو شکست دے کر مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی۔ چندیری کی لڑائی کے بعد بابر کو بہار میں پٹھان سرداروں کی یورش کا سامنا کرنا پڑا، جن کا سرخندہ نصرت کا برادر نسبتی محمود لودھی تھا۔ گھاگھرا اور گنگا کے سنگم پر لڑائی ہوئی، جس میں نصرت کے توپ خانے نے لودھیوں کی بڑی مدد کی۔ بالآخر میدان بابر کے ہاتھ رہا اور نصرت کو اطاعت اور سالانہ خراج ادا کرنے کا اقرار کرنا پڑا۔ ۱۵۳۲ء میں نصرت کو اس کے ایک غلام نے قتل کر دیا تو اس کا بیٹا علاءالدین فیروز شاہ تخت پر بیٹھا، لیکن چند ہی روز بعد نصرت کے چھوٹے بھائی غیاث الدین محمود نے اسے ہلاک کر کے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے عہد میں شیرخان سور نے بنگالے پر حملہ کیا۔ ان دنوں عمایوں مغربی ہند کی شورشیں فرو کرنے میں مصروف تھا اور شیرخان نے موقع سے فائدہ اٹھا کر بہار میں اپنی قوت مستحکم کر لی تھی۔ درۂ تلیا گڑھی میں محمود نے اس کا مقابلہ کیا، لیکن پسپا ہو کر گور کی طرف ہٹ آیا اور عمایوں سے مدد طلب کی۔ اس

تو ہنگامہ برپا ہو گیا، جس میں فتح شاہ کام آیا اور الیاس شاہی حکومت ختم ہو گئی۔ اس خاندان کے عہد میں بنگالہ کو معاشرتی اور معاشی ترقی نصیب ہوئی اور اس کے سلاطین بنگالی نہ ہونے کے باوجود ہر دل عزیز رہے۔

حبشی سلطنت : ۱۳۸۶ء میں باریک خواجہ سرا حبشیوں کی سازش سے فتح شاہ کو قتل کر کے تخت پر بیٹھا، لیکن چند ماہ بعد ایک خیر خواہ حبشی سردار ملک اندیل کے ہاتھوں مارا گیا۔ ملک اندیل وزیر خان جہاں اور فتح شاہ کی بیوی کی رضامندی سے تخت پر بیٹھا اور سیف الدین کا لقب اختیار کیا۔ قلعہ گور کے قریب فیروز مینار بنا کر جشن منایا اور انعام تقسیم کیا۔ وہ لائق حکمران تھا، لیکن تین سال کے بعد وہ بھی مارا گیا۔ اب فتح شاہ کے نابالغ لڑکے ناصرالدین محمود کو تخت پر بٹھایا گیا، لیکن ۱۳۹۰ء میں وہ بھی موت کے گھاٹ اتر گیا اور شمس الدین مظفر کے لقب سے سیدی بدر تخت نشین ہوا۔ اس نے فوج کی تنخواہ کم کر دی، جس کی وجہ سے بلوہ ہو گیا وزیر سید حسین کی سرکردگی میں محل کا محاصرہ کر لیا گیا۔ مظفر مارا گیا اور حبشی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ یہ بنگال کی تاریخ کا تاریک دور ہے، جس میں فوجی طاقت کمزور اور ملک کی معاشی اور تہذیبی حالت اتر ہوئی۔

حسین شاہی خاندان : (۱۳۹۳ء تا ۱۵۰۳ء) چونکہ الیاس شاہی خاندان کا کوئی وارث باقی نہ رہا تھا لہذا سید حسین نے علاءالدین حسین شاہ کا لقب اختیار کر کے تخت سنبھالا۔ ۱۳۹۵ء میں اس نے اپنے خلیفہ اللہ ہونے کا اعلان کیا، حبشی امیروں کے بدلے پرانے مسلم اور ہندو امیروں کو بحال کیا اور دارالحکومت گور سے ایکڈالا لے گیا۔ وہ خود عرب تھا، لیکن اس نے بنگالیوں کی زبان اور تہذیب کی سرپرستی کی اور فتوحات و تعمیرات

اسے گرفتار کر کے شیر شاہ نے ملک کے نظم و نسق کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا اور قاضی فضیلت کو سربراہ مقرر کیا۔

شیر شاہ کے بیٹے اسلام شاہ کے عہد میں محمد خان بنگال کا گورنر تھا۔ اسلام شاہ کی وفات (۲۲ نومبر ۱۵۵۴ء) کے بعد اس نے بنگال میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور اپنا لقب شمس الدین محمد شاہ غازی اختیار کیا۔ اس نے ایک طرف اراکان پر حملہ کیا اور دوسری طرف جونپور پر قبضہ کیا۔ وہ بمقام چوہر گھاٹ (چھپراؤ) ہیمو کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کے بیٹے خضر خان غیاث الدین نے ۱۵۶۰ء تک حکومت کی۔ اس کے مرنے کے بعد سوریوں میں خانہ جنگی ہوئی اور ۱۵۶۳ء میں کررانی افغان بنگال میں بر سر اقتدار آئے، جن کا سربراہ سلیمان خان تھا۔

سلیمان خان نے مغربی بنگال اور جنوب مشرقی بہار پر قبضہ کر لیا اور کوچ بہار سے پوری (اڑیسہ) اور دریائے سون سے برہمپتر تک اپنی سلطنت کی توسیع کر لی۔ اگرچہ سلیمان کررانی نے اپنی بادشاہت کا اعلان نہیں کیا، تاہم اس نے ایک بادشاہ کی طرح آٹھ سال تک (۱۵۶۵ء تا ۱۵۷۲ء) حکومت کی اور اکبر کے نام کا خطبہ پڑھ کر اپنا اقتدار برقرار رکھا۔ ۱۱ اکتوبر ۱۵۷۰ء کو سلیمان کررانی نے وفات پائی، اس کا لڑکا بایزید تخت سے اتارا گیا اور اس کا چھوٹا بھائی داؤد تخت پر بیٹھا۔ داؤد کررانی نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، لیکن وہ اکبر کے تجربہ کار سپہ سالار منعم خان کے سامنے نہ ٹھیر سکا اور پٹنہ میں قلعہ بند ہو گیا، جہاں خود اکبر کے زیر نگرانی سخت معرکہ ہوا (۱۵۷۵ء)۔ داؤد نے شکست کھائی اور بنگال پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔

دور مغلیہ: اکبر مشرقی ممالک منعم خان

سے قبل کہ ہمایوں اس کی اعانت کے لیے پہنچتا افغان لشکر نے گور پر قبضہ کر لیا۔ محمود فرار ہو کر زخمی حالت میں ہمایوں کے لشکر میں پہنچا، جو اس وقت سون اور گنگا کے سنگم پر اترا ہوا تھا (۱۵۳۸ء)۔ افغانوں کو کچلنے کے لیے شاہی لشکر آگے بڑھا تو کھل گاؤں میں شیر خان کے بیٹے جلال خان نے اس کا راستہ روکا تاآنکہ شیر خان اپنے خزانے سمیت بحفاظت جنوبی بہار میں پہنچ گیا۔ اسی دوران میں محمود کو اپنے دو بیٹوں کی ہلاکت کی خبر ملی، جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی (۱۵۳۷ء) اور اس کے مرنے کے ساتھ ہی بنگالے کی اس خود مختار مسلمان بادشاہت کا خاتمہ ہو گیا۔

افغانوں کی حکومت: ۱۵۳۸ء ہی میں ہمایوں کا گور پر قبضہ ہو گیا۔ اس نے بنگال کو جزو سلطنت بنانے کا اعلان کیا، گور کا نام جنت آباد رکھا اور ہفتوں اپنی کاسیابی کا جشن منایا، تاہم اسے بہاں چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ آگرے اور دواب سے اطلاعات آ رہی تھیں کہ اس کے بھائی تخت شاہی پر قابض ہونے کی فکر میں ہیں، چنانچہ وہ جہانگیر قلی بیگ کو بنگالے کا گورنر مقرر کر کے آگرے کی طرف روانہ ہوا۔ دوسری طرف شیر خان بہار سے قنوج تک تمام قلعوں میں اپنی فوجیں بٹھا چکا تھا۔ چوسا کے مقام پر ہمایوں نے شکست کھائی اور وہ بمشکل جان بچا کر دارالسلطنت پہنچ سکا (۲۶ جون ۱۵۳۹ء)۔ اب شیر خان نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے بنگال کا رخ کیا۔ جہانگیر قلی بیگ میدان جنگ میں مارا گیا اور گور پر افغانوں کا قبضہ ہو گیا۔

شیر شاہ نے خضر خان ترک کو بنگال کا گورنر مقرر کیا تھا (۱۵۳۱ء)، لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ وہ سابق شاہ بنگالہ محمود کی بیٹی سے شادی کر کے خود مختاری کے خواب دیکھ رہا ہے تو



کے حوالے کر کے واپس چلا گیا؛ لیکن منعم خان جلد ہی وفات پا گیا۔ اس کے جانشین حسین قلی بیگ کے دورِ نظامت میں داؤد خان نے پھر حکومت حاصل کرنے کی کوشش کی اور میدان جنگ میں مارا گیا (۱۵۷۶ء)۔ ۱۵۸۰ء میں بنگال کا نیا ناظم مظفر خان تربتی کررائیوں کی بغاوت میں مارا گیا۔ پھر انہوں نے اکبر کی جگہ اس کے سوتیلے بھائی مرزا حکیم کی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور مجنون خان قشقال بنگالے کا حاکم ہو گیا۔ قشقال کی وفات اور کابل میں مرزا حکیم کی شکست کے بعد بغاوت کا زور خود بخود ختم ہو گیا اور اپریل ۱۵۸۲ء میں خان اعظم بنگال کا مغل گورنر مقرر ہوا۔

افغان اکبر کے دور حکومت میں بنگال، بہار اور اڑیسہ میں اپنی کھوئی ہوئی حکومت حاصل کرنے کی کوششوں میں برابر مصروف رہے۔ جہانگیر کے عہد میں پہلے مان سنگھ اور پھر اسلام خان بنگالے کا ناظم مقرر ہوا۔ اسلام خان کے زمانے میں جدید بنگال کی نشوونما ہوئی اور بحری تجارت کو فروغ ہوا۔ پرانے بیرونی تاجروں، یعنی چینی، ملائی، عرب اور پرتگیز سوداگروں کی جگہ ولندیزیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں نے اپنی اپنی کمپنیاں قائم کیں اور در آمد کی تجارت کو منظم کیا۔ ملک کی آمدنی بڑھ گئی۔ اس کے عہد میں حدود سلطنت میں بھی توسیع ہوئی۔ کوچ بہار پر قبضہ ۱۶۱۹ء میں اور کمروپ پر تین سال کے بعد ہوا۔ اس کے علاوہ ضلع نواکھالی کا جنوب مشرقی حصہ اور مدنا پور کا جنوب مشرقی علاقہ مغل بنگال میں ملا لیا گیا۔ ۱۶۱۱ء میں سنار گاؤں پر مغلوں کا قبضہ ہوا اور بارہ بھوٹیاں کے سردار موسیٰ خان نے جولائی میں مغلوں کی حکومت تسلیم کر لی۔ جنوری ۱۶۱۲ء میں جیسور کے راجا نے سرکشی کی۔ وہ مقید ہوا اور اس کی ریاست کا الحاق کر لیا گیا۔ اسی سال

دولمباپور کی جنگ میں خواجہ عثمان زخمی ہوا (اور ۱۲ مارچ کو وفات پا گیا) اور اس کا مددگار بایزید کررائی گرفتار ہوا۔ اپریل ۱۶۱۲ء میں صدر مقام راج محل کے بجائے ڈھا کہ مقرر ہوا اور اس کا نام جہانگیر نگر رکھا گیا۔ مئی ۱۶۱۲ء میں کاجار اور کامروپ کے راجاؤں نے بھی مغل حکومت کی ماتحتی قبول کی۔ اگست میں اسلام خان نے وفات پائی۔ بنگال میں مغل حکومت قائم کرنے کا سہرا اسی کے سر ہے۔

اسلام خان کے بعد بیس سال کے عرصے میں یہاں یکے بعد دیگرے متعدد گورنر آئے لیکن ناکام ثابت ہوئے۔ بہت سی جنگیں سرحدوں پر لڑی گئیں (جیسے کاجار، آسام، چانگاؤں میں)۔ جہانگیر کے خلاف جب خرم (شاہجہاں) نے بغاوت کی تو وہ دکن سے اڑیسہ ہوتا ہوا مدناپور آیا اور بردوان پر قبضہ کر لیا۔ بنگال کا گورنر نورجہاں کا بھائی ابراہیم خان تھا، جو ۱۶۲۴ء میں لڑتا ہوا مارا گیا اور جہانگیر نگر خرم کے ہاتھ آیا۔ اس نے خان خانان کے لڑکے داراب خان کو بنگال کا گورنر بنایا۔ ۱۶۲۴ء میں خرم نے شاہی فوج سے شکست کھائی اور پھر دکن میں جا پناہ لی۔ بنگال کا گورنر مہابت خان مقرر ہوا اور داراب خان مارا گیا، لیکن نورجہاں کی سازش کی وجہ سے مہابت خان نے بغاوت کر دی اور جون ۱۶۲۶ء میں خرم سے مل گیا۔

اب جہانگیر نے فدائی خان کو بنگال کا گورنر مقرر کیا جس نے پانچ لاکھ روپیہ سالانہ جہانگیر کو اور اتنی ہی رقم نورجہاں کو بھیجنا شروع کی۔ جہانگیر کے زمانے میں بنگال میں سیاسی اور جغرافیائی اتحاد اور اس کا مرکزی سلطنت کے ساتھ براہ راست تعلق پیدا ہوا۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب کے عہد میں اسی سال تک مغل بنگال میں امن و امان قائم رہا اور آسام اور اڑیسہ کی طرف بنگال کی

کی نظامت ملی اور ڈھاکہ ایک بار پھر صدر مقام بنا۔ اگلے برس اس نے مشرق کی جانب فوج کشی کی اور کوچ بہار پر قبضہ کرنے کے علاوہ ملک آسام کو باج گزار بنایا۔ وہ اسی راستے چین کی طرف بڑھنا چاہتا تھا، لیکن آسام کی بارش نے اس کا عزم ناکام بنا دیا۔ وہ واپس جہانگیر نگر آ رہا تھا کہ مہم کی ماندگی کے باعث وفات پا گیا (۱۶۶۳ء)۔

میر جملہ کے بعد شائستہ خان ولایات بنگالہ پر بادشاہ کا نائب مقرر ہوا۔ اس کے طویل دور میں سینکڑوں مدرسے، مسجدیں، پل، سڑکیں اور سرائیں تعمیر ہوئیں۔ مشرقی پاکستان میں مغل تہذیب کا فروغ ہوا اور حسن انتظام کے باعث ملک میں بے حد خوش حالی اور ارزانی ہو گئی۔ ۱۶۶۶ء میں کوچ بہار کے راجا کے مرنے پر بداسنی پھیلی تو اسے جزو سلطنت بنا لیا گیا۔ علاوہ ازیں رنگ پور اور کامروپ کے علاقے بھی بنگال میں شامل کیے گئے۔ ۱۶۶۶ء ہی میں چائنگاؤں پر قبضہ ہوا اور اس کا نام اسلام آباد رکھا گیا۔

اس زمانے میں انگریزوں کی ایک تجارتی کوٹھی ہگلی میں قائم تھی اور انگریز گماشتے بلا محصول مال لانے لے جانے میں بدنام تھے۔ انہوں نے کوٹھی کو قلعہ بند کرنا چاہا تو مغل عمال نے انہیں جبراً روک دیا۔ انگریزوں نے چند جنگی جہازوں کی مدد سے چائنگاؤں پر چھاپا مار کر قابض ہونے کی کوشش کی، مگر اسے ناکام بنا دیا گیا۔ انگریزوں سے ۲۰ دسمبر ۱۶۸۶ء کو ہگلی اور ۱۶۸۷ء کے اوائل میں بالاسور چھین لیا گیا۔ اگست ۱۶۸۷ء میں مصالحت ہو جانے پر کلکتے کے نزدیک الوبیریا میں انگریزوں کو قلعہ بنانے اور ہگلی میں دوبارہ تجارت کرنے کی اجازت مل گئی، لیکن انہیں دنوں مغل جہازوں پر انگریزوں نے بمبئی کے نزدیک حملہ کیا تو شائستہ خان نے یہ مراعات

سرحد بڑھی۔ شاہزادہ محمد شجاع، شائستہ خان اور شاہزادہ عظیم الشان نے یکے بعد دیگرے ۲۱ سال، ۲۳ سال اور ۱۰ سال تک حکومت کی۔ اراکان میں آباد پرتگیز، جو ہگلی پر بھی قابض ہو چکے تھے، بحری قزاقی اور لوٹ مار کرنے کے علاوہ اکثر مغلوں کے خلاف اراکان کے مگھ راجاؤں کی مدد کرتے رہتے تھے، چنانچہ ان کی سرگرمیوں سے تجارت اور استحکام سلطنت کو بہت نقصان پہنچ رہا تھا۔ تین ماہ کے محاصرے کے بعد ستمبر ۱۶۳۲ء میں ہگلی پر قبضہ کر لیا۔ ۱۶۳۷-۱۶۳۸ء میں کامروپ پر بھی قبضہ ہو گیا۔

اپریل ۱۶۳۹ء سے اپریل ۱۶۶۰ء تک شاہزادہ شجاع نے بنگال پر حکومت کی۔ اس نے اپنا صدر مقام راج محل قرار دیا۔ اس کے عہد میں ولندیزیوں اور انگریزوں کو تجارت کی اجازت ملی۔ شاہجہاں کی علالت کے وقت دہلی کی سلطنت کے لیے جو خانہ جنگی ہوئی اس میں شاہ شجاع نے اورنگ زیب عالمگیر کے سپہ سالار میر جملہ اور شاہزادہ محمد سلطان سے کھجوا کے مقام پر شکست کھائی (۳۰ دسمبر ۱۶۵۸ء) اور وہ مونگیر اور رانگامائی ہونے ہوئے راج محل اور وہاں سے ٹانڈے پہنچا۔ اس موقع پر شجاع کو پرتگیزوں نے مدد دی، اور شاہزادہ محمد سلطان بھی شجاع سے جا ملا۔ موسم برسات میں شجاع کی بحری طاقت مضبوط ہو جانے کی وجہ سے میر جملہ کو کافی نقصان ہوا اور اس نے اپنی فوج پیچھے ہٹا لی، لیکن ۱۶۶۰ء میں بہار سے کمک آتے ہی اس نے شجاع کو گنگا کے پار مار بھگایا۔ شجاع رھا پور سے ٹانڈے، ڈھاکے ہوتا ہوا مئی ۱۶۶۱ء میں اراکان چلا گیا۔ میر جملہ ڈھاکے میں داخل ہوا اور بنگال پر اورنگ زیب کا قبضہ ہو گیا۔

میر جملہ کو ہفت ہزاری منصب اور بنگال



تجارت کو فروغ دیا۔ فرنگی تاجروں پر کڑی نگرانی رکھی اور رشوتستانی اور ریشہ دوانی کے راستے بند کیے۔ اس کے عہد کی خوش حالی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ چند سال بعد کلاٹو نے مرشد آباد کے بارے میں لکھا کہ یہ شہر لنڈن کے برابر وسیع ہے، لیکن لنڈن میں اتنے لکھ پتی نہیں جتنے مرشد آباد میں ہیں۔ کتابوں میں مرشد قلی خان کے عہد کی خیر و برکت کے لیے کئی قصے ملتے ہیں۔ ان دنوں روپے میں پانچ من چاول مل جاتا تھا۔ ۳۰ جون ۱۷۲۷ء کو مرشد قلی خان نے وفات پائی اور اس کا داماد شجاع الدولہ جو اڑیسہ کا ناظم تھا، بنگال کا صوبیدار مقرر ہوا۔

بنگال کے نیم آزاد صوبیدار: اس زمانے میں مشرقی علاقوں نے بادشاہ دہلی سے علانیہ سرکشی نہیں کی، لیکن محمد شاہی دور میں مرکزی حکومت اتنی کمزور ہو گئی کہ اس کا اقتدار بنگال اور دکن جیسے بڑے صوبوں پر قائم نہ رہا اور صوبیداری میں وراثت کا اصول چلنے لگا، لہذا اس زمانے سے بنگالے کو نیم آزاد سمجھنا غلط نہ ہوگا۔

شجاع الدولہ (۱۷۲۷ء تا ۱۷۳۹ء) ایک عاقل اور رعایا پرور حاکم تھا۔ اس نے اپنی فوج کی طاقت پچاس ہزار تک بڑھا لی۔ اس کی مفید تجویزوں کے باعث ملک کی ترقی ہوئی اور چیزوں کی قیمت اتنی گر گئی جتنی شائستہ خان کے زمانے میں تھی، یعنی ایک روپے میں آٹھ من چاول۔ محمد شاہ نے ۱۷۳۳ء میں بہار کو صوبہ بنگال و اڑیسہ کے ساتھ منحق کر دیا۔ شجاع الدولہ نے پورے صوبے کو تین حصوں، یعنی ڈھاکہ، اڑیسہ اور بہار میں تقسیم کیا۔ اس نے خود نظامت کا کام انجام دیا اور ڈھاکہ، بہار اور اڑیسہ میں مرشد قلی دوم، علی وردی اور محمد تقی خان کو نائب ناظم مقرر کیا۔ ۱۳ مارچ ۱۷۳۹ء کو شجاع الدولہ نے وفات پائی اور اس کا

واپس لے لیں۔ شاہی فرمان سے بنگالے کے علاوہ سورت وغیرہ کی کوٹھیاں ضبط اور تمام انگریز تاجر اور گماشتے، جو فرار نہ ہو سکے، گرفتار کر لیے گئے (۱۶۸۵ تا ۱۶۸۸ء)۔ انگریزوں کو اس نیم سرکاری جنگ میں نقصان اور ذلت کے علاوہ کچھ ہاتھ نہ آیا اور انہوں نے مغل امیروں و وزیروں کی سپینوں منت خوشامد کے بعد بمشکل معافی اور سخت تر شرائط پر تجارت کی اجازت حاصل کی۔ ۱۶۹۰ء میں کلکتے کی بنیاد پڑی اور اسی سال فرانسیسیوں نے چندر نگر آباد کیا۔ شائستہ خان کے بعد ابراہیم خان اور عظیم الدین یکے بعد دیگرے صوبیدار ہوئے۔ اس غائب ہوا اور ملکی انتظام درہم برہم ہونے لگا۔

اورنگ زیب کے آخری زمانے میں اس کا پوتا عظیم الشان بنگال کا صوبیدار تھا۔ دسمبر ۱۷۰۰ء میں مرشد قلی خان یہاں کا دیوان ہو کر آیا۔ اس نے انتظام درست کرنے کے ساتھ ملکی آمدنی میں اضافہ بھی کیا۔ ۱۷۰۳ء میں اس نے ڈھاکے سے ڈیڑھ سو میل مشرق میں مقصود آباد کو اپنا مستقر بنایا جو اس کے نام سے مرشد آباد کہلانے لگا اور اس کے صوبیدار ہونے پر بنگالے کا دارالحکومت ہو گیا۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد وہ بے روزگار ہو گیا، لیکن ۱۷۱۰ء میں بہادر شاہ نے اسے پھر دیوان مقرر کر دیا اور اگست ۱۷۱۷ء میں فرخ سیر نے بنگال کا صوبیدار بنا دیا۔

مرشد قلی خان ایک کامیاب گورنر ثابت ہوا۔ اس نے محصول کی ادائیگی کم کر دی۔ اندرونی امن قائم رکھنے کے لیے جو فوج تھی اس کی تعداد گھٹا دی۔ عمال کی جاگیروں کو خالصہ زمین قرار دے کر ان کے عوض ان کی تنخواہ مقرر کی۔ زمینداروں سے لگان الگ الگ اکٹھا کرنے کے بجائے اجارہ داری کا دستور قائم کیا جس کی رو سے ٹھیکیدار ایک مقررہ رقم پیشگی ادا کر دیتے تھے۔ بیرونی

یٹا سرفراز، علاء الدولہ حیدر جنگ کے نام سے جنگالہ کی مسند پر بیٹھا، لیکن علی وردی خان سے مات کہا گیا۔ ایک طرف تو سرفراز کے مشیروں نے علی وردی کو جنگالہ پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور دوسری طرف علی وردی نے بادشاہ دہلی سے گران بہا پیشکش کے معاوضے میں جنگالہ کی سند نظامت حاصل کر لی۔ تلیا گڑھی کے نزدیک جنگ ہوئی۔ سرفراز خان مارا گیا اور ۱۰ اپریل ۱۷۷۴ء علی وردی خان جنگالہ کی گدی پر قابض ہو گیا۔ مرشد آباد کے چہل ستون محل میں مسند نشین ہوتے ہی علی وردی خان نے اپنی آزادی کا اعلان کیا اور اڑیسہ کے نائب ناظم مرشد قلی خان دوم (رستم جنگ) کو دکن مار بھگایا۔

اڑیسہ پر قبضہ کرنے کی وجہ سے علی وردی خان کو مرہٹوں سے ٹکر لینی پڑی، جو گیارہ سال تک حملے کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی علی وردی کو اپنے پٹھان سپاہیوں کی شورش کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ میر حبیب، مرتضیٰ خان اور شمشیر خان وغیرہ پٹھان سردار مرہٹہ غارتگروں کو دعوت دیتے اور ان سے مل کر جگہ جگہ فتنہ و فساد کھڑا کرتے رہے، لیکن وہ علی وردی کا کچھ زیادہ نہ بگاڑ سکے۔ یہ تجربہ کار حاکم فرنگی سودا گروں کی طرف سے بھی بہت چوکنا رہتا تھا اور اپنے ملک میں انہیں تجارتی کوٹھیوں کے گرد فصیل اور دلدھے نہیں بنانے دیتا تھا۔ اپریل ۱۷۵۶ء میں اس نے وفات پائی اور اس کا نواسا سراج الدولہ مسند نشین ہوا۔

سراج الدولہ کو روز اول سے اپنے جاہ طلب رشتہ داروں اور امیروں و وزیروں کا مقابلہ کرنا پڑا، جن میں اس کا چچا زاد بھائی شوکت جنگ (حاکم پورنیا) اور اس کا سوتیلا بھپا میر جعفر (بخشی فوج) بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ ان مخالفین کے ساتھ انگریز بھی جوڑ توڑ میں لگے ہوئے تھے۔ سراج الدولہ

نے بڑی ہمت اور جرات کا ثبوت دیا۔ اس نے گھسیٹی پیگم کے موتی جھیل محل پر قبضہ کیا۔ پھر انگریزوں کی طرف پلٹ کر پہلے قاسم بازار اور پھر کلکتے میں فاتحانہ داخل ہوا (جون ۱۷۵۶ء)۔ میر جعفر شوکت جنگ کو برسر اقتدار لانا چاہتا تھا تا کہ ایک کمزور اور نا اہل شخص کو تخت پر بٹھا کر زمام حکومت خود سنبھال لے، لیکن سراج الدولہ نے پورنیا پر فوج کشی کر کے یہ سازش ناکام بنا دی اور شوکت جنگ میدان میں کام آیا (اکتوبر ۱۷۵۶ء)۔ اس کے بعد اس نے کلکتے پر حملہ کر کے انگریزوں کو نکال باہر کیا (فروری ۱۷۵۷ء)۔ انگریزوں نے اپنی ہزیمت کا داغ دھونے کے لیے بااثر ہندو سیٹھوں اور اہلکاروں اور میر جعفر جیسے غدار مسلمانوں کو ساتھ ملا کر سراج الدولہ کی حکومت کا تختہ الٹنے کا منصوبہ تیار کیا۔ ۲۲ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی میں انگریزی فوجیں صف آرا ہوئیں اور اگلے روز میر جعفر اور اس کے رفقا کی غداری کے باعث میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ سراج الدولہ پلاسی سے مرشد آباد اور وہاں سے عظیم آباد کی طرف روانہ ہوا، لیکن راستے میں گرفتار ہو کر مرشد آباد لایا گیا، جہاں میر جعفر کے بیٹے میرن کے حکم سے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور میر جعفر نواب بنا دیا گیا (۲۹ جون ۱۷۵۷ء)۔

میر جعفر کی حکومت کا دارومدار سراسر انگریزوں کی خوشنودی پر تھا۔ اس نے انہیں فرانسیسی مقبوضات پر قبضہ کر لینے کی اجازت دے دی۔ اس کے علاوہ سراج الدولہ کے حملے کی وجہ سے انگریزوں کو جو نقصان ہوا تھا اس کے بدلے ایک کروڑ بائیس لاکھ روپیہ اور چوبیس ہرگنہ کا ضلع کمپنی کو اور سوا کروڑ روپیہ کمپنی کے ملازمین کو ادا کرنا پڑا۔ اس میں سے صرف کلاٹو کا حصہ



شکست دی (۱۷۶۳ء)۔ شاہ عالم انگریزی لشکر میں آ گیا اور بنگال کے تینوں صوبوں کی سند دیوانی ان کے نام لکھ دی۔ جنوری ۱۷۶۵ء میں میر جعفر کی موت کے بعد اس کا بیٹا نجم الدولہ گدی پر بیٹھا، لیکن وہ انگریزوں کا محض وظیفہ خوار تھا، جس کا حکومت میں کوئی عمل دخل نہ تھا۔ بنگال پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہو گیا۔

مسلمانوں کے دور حکومت میں بنگال کی زمین کی زرخیزی، پیداوار کی افراط اور چیزوں کی فراوانی اور ارزانی اتنی تھی کہ اسے باغِ جنت سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ ہندوؤں کے زمانے میں جو کوڑی رائج تھی، مسلمانوں کے زمانے میں چاندی اور سونے کے سکوں میں بدلنے لگی۔ بقول ابوالفضل ڈھا کہ اور سیمن سنگھ کے علاقے میں لوہے کی اور ہگلی اور بردوان کے علاقے میں ہیرے جواہر کی کان تھی۔ بیرونی سیاحوں نے لوہے، جواہرات، کاغذ اور قالین کے کارخانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ڈھا کے کی ململ کا دنیا بھر میں شہرہ تھا۔ شمالی اور مغربی بنگال میں ریشمی کپڑے بنے جاتے تھے۔ سولہویں صدی عیسوی کے اطالوی تاجر ورتھیمہ نے لکھا ہے کہ یہاں سفید چینی بنائی جاتی تھی۔ نمک بنانا عام پیشہ تھا۔ چھوٹے بڑے جہاز مقامی طور پر تیار کیے جاتے تھے۔ ماہوان، باربروسہ اور ورتھیمہ وغیرہ بیرونی سیاحوں اور تاجروں نے چائنگاؤن، ساتگاؤن اور سنارگاؤن کی بندرگاہوں کی تعریف کی ہے۔ تیرہویں صدی میں مارکوپولو نے یہاں کی برآمدی پیداوار بالخصوص کپڑے کا تذکرہ کیا ہے۔ ابن بطوطہ ۱۳۳۵ء میں بنگال آیا۔ اس نے لکھا ہے کہ ایک چھوٹا کنبہ سال بھر کے لیے اپنے کھانے پینے کا سامان سات روپے میں خرید سکتا تھا۔ چینی سیاح ماہوان (۱۳۰۶ء) کے کہنے کے مطابق یہاں کوڑی اور چاندی کے سکے رائج تھے اور ترکی حمام موجود تھے۔

۲۳ لاکھ ۴۰ ہزار روپیہ تھا۔ چونکہ خزانے میں اس کے صرف آدھا روپیہ تھا، لہذا باقی رقم سامان بیچ کر اور سیٹھوں سے قرضہ لے کر دینی پڑی۔ الغرض میر جعفر نے کمپنی کی طمع ہر طرح پوری کرنے کی کوشش کی، ”کلائو کا گدھا“ کہلایا، لیکن جب ڈیڑھ دو سال بعد انگریزوں کو شہزادہ علی گوہر اور مرختوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مزید رقم کی ضرورت ہوئی اور میر جعفر ان کی توقع پوری نہ کر سکا تو انہوں نے اسے معزول کر کے اس کے داماد میر قاسم کو اس کی جگہ بٹھا دیا (۱۷۶۰ء)، جس نے ان کے اخراجات کے لیے بردوان، مدناپور اور چائنگاؤں کے پرگنے ان کے سپرد کیے۔

میر قاسم ایک قابل حکمران تھا۔ وہ ملک میں امن و امان اور نظم و نسق کی بحالی کا خواہاں تھا اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوا، لیکن انگریز اپنے آپ کو ہر قاعدے قانون سے آزاد سمجھتے تھے۔ کمپنی کا ہر ملازم اپنے مال کو محصول سے مستثنیٰ سمجھتا تھا اور اس سے ملک اور مقامی تاجروں کی مالی حالت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ میر قاسم حتی الامکان لڑائی سے بچنا چاہتا تھا، اسی لیے اس نے مرشد آباد چھوڑ کر سونگیر (سنگھیر) کو اپنا مستقر بنا لیا۔ آخر اس نے انگریزوں کو محصول معاف کر دیا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ رعایت مقامی تاجروں کو بھی دے دی۔ یہ اقدام ان کی اجارہ داری کے حق میں مہلک تھا، چنانچہ انہوں نے لڑائی چھیڑ دی اور دوبارہ میر جعفر کی نوابی کا اعلان کر دیا (۱۷۶۳ء)۔ میر قاسم بہار سے ہوتا ہوا اودھ پہنچا، جہاں شاہ عالم اور نواب شجاع الدولہ اس کی اعانت پر آمادہ ہو گئے، لیکن مؤخر الذکر نے بے وفائی کی، میر قاسم کو نظر بند کر دیا اور اس کی فوج اور بادشاہ کو لے کر انگریزوں سے لڑنے چلا۔ بکسر کے مقام پر انگریزوں نے اسے

ٹھیکے پر دی جانے لگی، اودھ کے نواب وزیر سے پچاس لاکھ روپیہ لے کر کڑا اور الہ آباد واپس کر دیا گیا، اس طرح کمپنی کا خرچ انتیس لاکھ سے گھٹ کر تقریباً تیرہ لاکھ روپیہ ہو گیا۔ ریگولیشن ایکٹ کی رو سے وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل مقرر ہوا تو اس نے بھی روپیہ کمانا شروع کیا۔ صرف میر جعفر کی بیوہ سنی بیگم سے ساڑھے تین لاکھ روپیہ وصول کیا۔ ۱۷۸۴ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے پش انڈیا ایکٹ منظور کیا، جس کی رو سے کمپنی ہندوستان کے سیاسی اور تجارتی حقوق کی مالک ہو گئی اور اس کے لیے بورڈ آف کنٹرول قائم ہوا۔

وارن ہیسٹنگز کے بعد میکفرسن ڈیڑھ سال گورنر جنرل رہا۔ اس کے زمانے میں رشوت ستانی اور دوسری بدعنوانیاں بڑھ گئیں، اس لیے لارڈ کارنوالس گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف مقرر ہوا، جو نہ تو کمپنی کی ملازمت میں تھا اور نہ کمپنی کی بدعنوانیوں سے آشنا تھا۔

وارن ہیسٹنگز کا پنج سالہ ٹھیکے کا نظام کامیاب نہ ہوا اس لیے ٹھیکیداروں کو زمین اور مزارعین سے کوئی دلچسپی اور ہمدردی نہیں ہوتی تھی اور وہ اس عرصے میں زیادہ سے زیادہ محصول وصول کرنے کی کوشش میں رعیت کا خون چوستے رہتے۔ ۱۷۸۹ء میں لارڈ کارنوالس نے دہ سالہ نظام جاری کیا جو ۱۷۹۳ء میں بندوبست استمراری میں تبدیل ہو گیا۔ اس سے زمینداروں کو تو فائدہ ہوا، لیکن رعایا کی حالت بدستور گرتی رہی کیونکہ چیزوں کے نرخ بڑھتے گئے، چونکہ کسانوں سے مالگذاری وصول کرنے والوں میں ہندوؤں کی اکثریت تھی، لہذا رفتہ رفتہ وہ مسلمان زمینداروں کو بے دخل کر کے ان کی جگہ لینے لگے۔ اسی زمانے میں مسلم قانون کی جگہ انگریزی قانون نافذ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا مزید نقصان ہوا کیونکہ

رالف فنیچ (۱۷۸۶ء) اور برنیر نے لکھا ہے کہ سوتی اور ریشمی کپڑے، چینی، مرچ، چاول، مکھن، نمک اور پھل برآمد کیے جاتے تھے۔ بیرونی تجارت کے فروغ سے ملک کو بڑا فائدہ ہوا۔ برآمدی چیزوں کے بدلے میں سونا چاندی اور ہیرے جواہرات درآمد ہوئے، جس سے ملک کی معاشرتی اور معاشی ترقی ہوئی۔ عوام کو ارزانی کے باعث اچھا کپڑا اور اچھا کھانا میسر ہونے لگا۔ ملک کی یہ خوش حالی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اجارہ داری کی وجہ سے ختم ہو گئی۔

انگریزی دور حکومت: میر جعفر کی موت کے بعد نوآبی ختم ہو گئی۔ کلاٹو نے کمپنی کے لیے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی حاصل کی، محمد رضا خان کو بنگال کا اور راجا شتاب رائے کو بہار کا نائب دیوان مقرر کیا گیا اور فوج کا اختیار کمپنی نے اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اب انگریزوں پر بھی کمپنی کی جانب سے محصول عائد کر دیا گیا، لیکن کمپنی کے ملازمین حسب عادت محصول کی ادائیگی غصب کرنے لگے، رشوت کا بازار گرم ہوا، مقامی حکومت خرابیوں کو روکنے سے قاصر رہی اور کلاٹو کی دو عمر کے باعث صوبے کی خوش حالی جاتی رہی۔ ۱۷۶۹-۱۷۷۰ء میں سخت قحط پڑا، جس میں ایک تباہی آبادی ختم ہو گئی۔ کمپنی کا خزانہ خالی ہو گیا، لیکن اس کے ملازمین امیر ہوتے چلے گئے۔ ۱۷۷۳ء میں کلاٹو پر غبن کا مقدمہ چلا اور ۱۷۷۴ء میں اس نے خود کشی کر لی۔

کلاٹو کی جگہ وارن ہیسٹنگز بنگال کا گورنر مقرر ہوا۔ اس نے کمپنی کی حالت سدھارنے کے لیے بنگال اور بہار کے دیوانوں کو برخاست کر کے بورڈ آف ریونیو مقرر کیا، مرشد آباد سے خزانہ نکلتے لایا گیا، نواب کی پنشن بتیس لاکھ روپے سے سولہ لاکھ کر دی گئی، زمین پانچ سال کے



دفتروں میں فارسی کی جگہ انگریزی رائج کر دی گئی۔ انگریزی تعلیم کے اداروں میں چونکہ مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں نے کہیں زیادہ دلچسپی کا ثبوت دیا لہذا وہ انگریزی پڑھ کر سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے اور مسلمانوں سے سبقت لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔

یوں بنی پلاسی کی جنگ میں ہندو سیٹھوں اور انگریزوں کی مٹی بھگت نے اسلامی حکومت کا خاتمہ کیا تھا لہذا انگریزی حکومت کے قیام کے بعد انگریزوں نے ہندوؤں کی خاص طور پر سرپرستی کی۔ ہندوہست استمراری نے ہندو بنیوں کو زمینوں کا مالک بنا دیا۔ مسلمان کاشتکاروں کو روٹی کے لالے پڑ گئے، چنانچہ تیتوہیر نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور سخت لڑائی کے بعد نارکل ڈانگا (کلکتہ) میں شہید ہو گئے (۱۸۳۱ء)۔ بنگال میں زمیندار کے خلاف کشتکاروں کی یہ پہلی بغاوت تھی۔ دوسری بغاوت فریدپور کے حاجی شریعت اللہ کی فرائضی تحریک کی شکل میں شروع ہوئی، جس میں بنگال کے کشتکار خاص تعداد میں شریک تھے۔ ان کے لڑکے دودو میاں نے یہ اعلان کر کے کہ زمین اللہ کی ہے مالگداری دینے سے انکار کر دیا، لیکن یہ تحریک بڑی بڑی سختی سے کچل دی گئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا اثر دکن اور بنگال پر زیادہ نہیں ہوا۔ صرف ڈھاکے میں بنگالی سپاہیوں کی ایک بغاوت ہوئی، لیکن وہ توپ سے اڑا دیے گئے اور بنگال رجمنٹ توڑ دی گئی۔

ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ رین نے لوکل اور میونسپل حکومت میں دیسی لوگوں کو زیادہ حصہ دیا۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی طرز حکومت کی بدولت معاشرے میں متوسط طبقہ اور قومیت کا شعور پیدا ہوا۔ قومیت کا یہ تصور اصلاً مغربی تھا۔ اسلامی تصور قومیت میں مذہب کو

فوقیت دی گئی ہے اور ملک اور زبان کا کوئی خاص لحاظ نہیں رکھا گیا، لیکن قومیت کے مغربی تصور میں ملک اور زبان کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ اس کی رو سے عالم انسانی متعدد اور متخاصم ٹکڑوں میں بٹ کر رہ جاتا ہے، لیکن اسلامی قومیت دنیا کے سب مسلمانوں کو یکجا اور متحد کرتی ہے۔ اسی مغربی تصور نے ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کو جنم دیا، چونکہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں بنگالی ہندو انگریزی تعلیم میں آگے تھے لہذا اس جماعت کے ابتدائی رہنماؤں میں بھی ان کی اکثریت رہی۔ اس زمانے میں سر سید احمد خان کی علی گڑھ تحریک کا آغاز ہو چکا تھا، انہوں نے مسلمانان ہند کو ایک علیحدہ قوم قرار دیا۔ ڈھاکے کے نواب سر سلیم اللہ نے سر سید کا ساتھ دیا اور بنگال کے مسلمانوں نے انہیں اپنا قائد تسلیم کیا۔

انگریزوں نے نیل کی کھیتی اور چائے کے باغوں میں اپنا رویہ لگایا اور مزدوروں سے زبردستی مزدوری کروائی جس سے بدظنی پیدا ہوئی اور تعلیم یافتہ طبقوں میں کھلبلی مچی۔ گورنمنٹ نے ۱۸۷۹ء میں لنکا شائر کے کپڑوں پر محصول معاف، لیکن ہندوستانی روٹی کے کپڑوں پر پانچ فی صد محصول عائد کر دیا۔ اس سے بھی لوگوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔

حکومت کے نظم و نسق کو مضبوط بنانے کے لیے لارڈ کرزن نے بنگال کے بڑے صوبے کو تقسیم کر کے آسام اور مشرقی بنگال کو ملا کر ایک انگ صوبہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہو جاتی تھی اور مغربی بنگال میں بہار اور اڑیسہ کے رہنے والوں کی، لہذا نواب سلیم اللہ اور دوسرے مسلمان تعلقدار اور شرفا اس تقسیم کے حق میں تھے، لیکن بنگالی ہندو کا اس تقسیم سے سراسر

نے کی، لیکن جنگ عظیم چھڑ جانے سے اس کا کام آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ جماعت مخلوط انتخاب کی قائل تھی، لیکن ۱۹۱۶ء میں لیگ اور کانگریس کے درمیان جداگانہ انتخاب کے مسئلے پر سمجھوتا ہو گیا۔

۱۹۲۰ء تک ہندوستان کے مسلمان خاصے بینار ہو چکے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں گاندھی نے تحریک عدم تعاون کا آغاز کیا۔ یہ تحریک اگرچہ ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی لیکن بہت سے مسلمانوں نے بنی اس میں حصہ لیا۔ مونٹیگو چیسفورڈ اصلاحات کے اعلان پر یہ تحریک ختم کر دی گئی۔ ۱۹۲۳ء میں سی۔ آر۔ داس نے سوراچیہ پارٹی بنائی اور مسلم لیڈروں، مثلاً فضل الحق اور سہروردی نے ان کا اس شرط پر ساتھ دینے کا وعدہ کیا کہ نمائندگی میں ہر جگہ مساوات کا خیال رکھا جائے گا اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں زیادہ ملازمتیں دی جائیں گی تاآنکہ دونوں کی تعداد برابر ہو جائے۔ ۱۹۲۵ء میں سی۔ آر۔ داس کی وفات کے بعد یہ ہندو مسلم اتحاد ختم ہو گیا۔ اور دونوں قوموں کی تمدنی ناموافقت اور ہندو لیڈروں کی کشتکاروں کی طرف سے بے رخی کے باعث باہمی کشیدگی بڑھتی گئی حتیٰ کہ ۱۹۲۶ء میں کلکتے میں زبردست ہندو مسلم فساد ہوا۔ نومبر ۱۹۲۷ء میں سائمن کمیشن آئین میں تبدیلیوں پر غور کرنے کے لیے پہنچا، جس کا کانگریس نے بائیکاٹ کیا۔ اسی سال محمد علی جناح نے مسلمانوں کے مطالبات چودہ نکات کی صورت میں پیش کیے، لیکن انہیں گاندھی اور موتی لال نہرو نے نامنظور کر دیا۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں نہرو رپورٹ شائع ہوئی جسے مسلمانوں نے نامنظور کر دیا، کیونکہ اس میں جداگانہ انتخاب کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ ۱۹۳۰ء میں مسلمانوں کا اجماع حاصل کیے بغیر گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک چلائی۔ دہشت پسندوں کی سرگرمیاں بڑھ گئیں اور سوہاش چندر بوس

نقصان تھا۔ کلکتے کی سیاسی اور تجارتی وقعت کم ہو جانے سے ان کی تجارت پر برا اثر پڑتا تھا، دوسرے ان کی زمینداری مشرقی بنگال میں تھی، لیکن وہ رہتے کلکتے میں تھے، لہذا انہوں نے بنگال کی تقسیم کے خلاف احتجاج کیا اور بنگالی قوم، زبان اور روش کے نام سے ایک تحریک شروع کر دی۔ اس میں کانگریسی رہنما سریندر ناتھ بینرجی، سی۔ آر۔ داس، گوکھلے اور تلک پیش پیش تھے۔ برطانوی چیزوں کا بائیکاٹ کیا گیا اور دہشت انگیز کارروائیاں بھی شروع ہوئیں۔ اس کے باوجود ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم ہوئی اور ڈھاکہ نئے صوبے کا صدر مقام قرار پایا۔ اسی سال جاپان نے روس کو شکست دی تو ایشیا کے ملکوں میں بیداری کی نئی لہر پیدا ہوئی اور کانگریس نے آزادی ہند کی تحریک کا آغاز کیا۔ بنگال اس میں پیش پیش رہا۔ سر سلیم اللہ نے ڈھاکے میں ہندوستانی مسلمانوں کی ایک کانفرنس دسمبر ۱۹۰۶ء بلائی، جہاں ہند کے مسلمانوں کی ایک جماعت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہی بعد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس دوران میں انتہا پسند ہندوؤں کی دہشت انگیز اور تشدد آمیز سرگرمیاں بہت بڑھ گئیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ جارج پنجم نے ۱۹۱۱ء بنگال کی تقسیم منسوخ کر دی۔ آسام کو ایک چیف کمشنر کا صوبہ قرار دیا اور ہندوستان کا دارالحکومت کلکتے سے دہلی تبدیل کر دیا گیا۔

فروری ۱۹۱۵ء میں سر سلیم اللہ کے انتقال کے بعد بنگال میں کوئی بڑا مسلمان رہنما نہ رہا، اس لیے مسلمانوں میں ایک اجتماعی قیادت کی ابتدا ہوئی۔ چونکہ زمیندار زیادہ تر ہندو تھے اور کاشتکار زیادہ تر مسلمان، لہذا مسلمانوں نے پرچا پارٹی بنائی اس کی رہنمائی سر عبدالرحیم، خان بہادر عبدالعزیز، اے۔ کے۔ فضل الحق اور مولانا محمد اکرم خان



نے کتکتے میں دہشت پسندوں کی ایک نئی جماعت بنائی۔ ۱۹۳۱-۱۹۳۲ء میں گول میز کانفرنس ہوئی، ۱۹۳۳ء میں قرطاس ایض شائع ہوا اور ۱۹۳۴ء میں جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ اور بالآخر ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی رو سے آئین ساز اسمبلیوں کے لیے نئے انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔

ڈھا کے نواب نے بنگال یونائیٹڈ مسلم پارٹی بنائی اور کلکتے کے مسلم تجار نے اصفہانی کی قیادت میں ۱۹۳۶ء کے آخر میں محمد علی جناح کو مدعو کیا اور ان کے مشورے سے بنگال یونائیٹڈ مسلم پارٹی، جس کے خاص لیڈر حسین شہید سہروردی تھے، مسلم لیگ میں ضم ہو گئی۔ مسلم لیگ کے صوبائی پارلیمنٹری بورڈ کے سکرٹری سہروردی مقرر ہوئے۔ فروری ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے اڑتیس اور فضل الحق کی کرشک پر جا پارٹی نے انتالیس نشستیں حاصل کیں۔ سینتیس آزاد ارکان منتخب ہونے جن میں سے اکیس مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور سونہ کریشک پر جا پارٹی میں، چنانچہ مسلم لیگ نے ایک مخلوط وزارت بنائی، جس کے وزیراعظم فضل الحق ہوئے اور وہ مسلم لیگ میں بحیثیت صدر بنگال مسلم لیگ شامل ہو گئے۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے جنگ عالمگیر دوم میں شرکت کا اعلان کیا۔ اکتوبر میں کانگریس وزارتیں ہندو اکثریت کے صوبوں میں مستعفی ہو گئیں اور ۲۲ دسمبر ۱۹۳۹ء کو مسلم لیگ نے سارے ہندوستان میں یوم نجات منایا، کیونکہ کانگریسی وزارتوں کے دور میں ان صوبوں کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ بنگال کی مسلم نیکی وزارت (۱۹۳۷-۱۹۴۱ء) نے عوام کی حالت سدھارنے کے لیے انتہک کوشش کی۔ متعدد مفید قوانین منظور کیے گئے، لیکن کابینہ میں زمینداروں کی موجودگی کے باعث زمینداری ختم نہ ہو سکی۔

اسی دوران میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں ایک قرارداد منظور کی گئی (۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء) جو بعد میں قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی۔ اس میں مسلمانوں کے لیے ایک ریاست کا مطالبہ کیا گیا۔ بہت جلد اس مطالبے نے ایک زبردست تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ یہ ایک سیاسی جمہوری تحریک تھی جس کی بنیاد دین اسلام اور اسلامی تہذیب پر تھی۔ بنگال کے مسلمان رہنماؤں نے اس میں زور شور سے حصہ لیا۔ اس تحریک کو دبانے کے لیے کانگریس نے ”ہندوستان خالی کرو“ کی تحریک چلائی۔ اس کا، نیز عالمگیر جنگ میں جاپان کی شرکت کا برطانوی حکومت پر بڑا گہرا اثر پڑا، چنانچہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی دینے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

مارچ ۱۹۴۱ء میں کرپس مشن آیا، لیکن ناکام رہا۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں فضل الحق مسلم لیگ سے علیحدہ ہو گئے اور سہاسبھا کے لیڈر شیاما پرشاد مکرگی کے ساتھ مل کر ایک مخلوط وزارت بنائی۔ اس دور کا سب سے المناک واقعہ قحط بنگال ہے۔ ہندو تاجر غلہ جمع کرنے لگے اور حکومت بہار و اڑیسہ نے بنگال کو غلہ دینے سے انکار کر دیا۔ لاکھوں بنگالی اس قحط کا شکار ہوئے۔

ہندوستان چھوڑو (Quit India) تحریک میں تمام مقتدر کانگریسی رہنما قید کر لیے گئے تھے، جنہیں ۱۹۴۴ء کے آخر میں رہا کیا گیا۔ راجکوپال اچاریہ نے ہندوستان کی تقسیم کی ایک تجویز پیش کی، جسے سر سٹورڈ کرپس نے تسلیم کر لیا، لیکن مسلم لیگ کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح نے نامنظور کیا۔ ۱۹۴۵ء میں قائداعظم اور گاندھی جی میں متعدد ملاقاتیں ہوئیں، لیکن کوئی خاطرخواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ کو زبردست فتح نصیب ہوئی۔

۱۴ اگست کو پاکستان کے قیام کا اعلان کیا گیا اور اس روز متحدہ بنگال کے وزیر اعظم سہروردی نے مشرقی بنگال خواجہ ناظم الدین کے اور دوسرے روز مغربی بنگال پی۔سی۔گھوش کے حوالے کر دیا۔ اس طرح دو سو سال کی غلامی کے بعد اس سر زمین پر ایک بار پھر مسلمانوں کی حکومت قائم ہو گئی (اس دور کے حالات کی مزید تفصیلات، نیز قیام پاکستان کے بعد کے واقعات کے لیے راکہ بہ پاکستان)۔

اسلام کی اشاعت: بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی متعدد وجوہات ہیں: (۱) بیرونی ممالک سے مسلمانوں کی آمد؛ (۲) مسلمانوں کی نسل میں ترقی؛ اور (۳) مقامی باشندوں کا قبول اسلام۔

مختلف ادوار میں عرب، ایرانی، ترک اور حبشی مسلمان یہاں آ کر آباد ہوتے رہے۔ محمد بن بختیار خلجی کے حملے سے قبل بھی چانگام کے نواح میں عرب تاجروں کی آبادی کا سراغ ملتا ہے۔ پہاڑ پور اور سینامتی سے ملنے والے سکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں مسلمان ہارون الرشید کے عہد میں بھی آباد تھے۔ محمد بن بختیار خلجی کے زمانے میں بیرونی مسلمانوں کی آبادی پندرہ بیس ہزار تھی، لیکن خلجیوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد مزید افغان، ترک اور ایرانی کثیر تعداد میں شمالی ہند سے یہاں پہنچے۔ ان میں صرف افغانوں کی تعداد دو لاکھ سے کم نہ تھی۔ خود مختار سلاطین بنگالہ کے دور میں ان کی آمد میں کمی واقع ہو گئی، لیکن عہد مغلیہ میں ایک بار پھر مسلمان، ہندوستان کے شمالی صوبوں بلکہ ترکستان اور حبشہ جیسے دور دراز ممالک سے بغرض ملازمت و تجارت، یہاں آ کر بسنے لگے۔ صفوی حکومت کے زوال پر، خصوصاً مرشد قلی خان کے زمانے میں ایرانیوں کی ایک بڑی تعداد یہاں آئی۔ ان میں تاجر بھی تھے، معلم اور طبیب

اسی سہینے میں برطانیہ کے لیبر پارٹی کے وزیر اعظم ایٹلی نے کینیٹیشن بیجا - ۹ اپریل ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ نے قرارداد لاہور کے مطابق قرارداد پاکستان منظور کی۔ مشن نے پاکستان کا مطالبہ نامنظور کیا اور اس کے بجائے ہندو اور مسلم ریاستوں کی یونین کی تجویز پیش کی، جسے کانگریس اور مسلم لیگ نے مان لیا اور دونوں عارضی حکومت میں شرکت پر تیار ہو گئیں۔ اس نظام کے تحت ایک گروپ آسام اور بنگال کا بنایا گیا تھا، دوسرا پنجاب اور اس کے ملحقات کا اور تیسرا باقی بھارت کا۔ بعد میں کانگریس کی مجلس عاملہ کمیشن کے منصوبے اور گروپنگ سسٹم کی مختلف تشریحات پیش کرنے لگی۔ اس سے قائد اعظم کو اختلاف ہوا، مسلم لیگ نے بطور احتجاج اپنی منظوری واپس لے لی اور یوم راست اقدام منانے کا اعلان کر دیا۔ ۱۲ اگست ۱۹۴۶ء کو کانگریس نے گورنمنٹ بنائی اور مسلم لیگ نے اس میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ ۱۶ اگست کو یوم راست اقدام منایا گیا، جس کے دوران میں کلکتے اور نواکھالی میں زبردست ہندو مسلم فساد ہوا۔ پھر فسادات نے بھارت کو بھی اپنی لیٹ میں لے لیا اور بھاگلپور، مونگیر، پٹنہ اور گیا میں مسلمان بڑی تعداد میں ہلاک کر دیے گئے۔ لارڈ ویول، وائسرائے ہند، کی بتین دہانی پر ۱۵ اکتوبر کو قائد اعظم نے عارضی حکومت میں شرکت منظور کر لی، لیکن حالت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ برطانیہ نے جون ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کو چھوڑ دینے کا اعلان کر دیا۔ لارڈ ویول کو واپس بلا لیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ مونٹ بیٹن کو بھیجا گیا۔ کانگریس نے ہندوستان کی تقسیم منظور کر لی، لیکن پاکستان کو ہمیشہ کے لیے کمزور کرنے کے لیے بنگال اور پنجاب کو بھی تقسیم کر دیا گیا۔



بڑا روادارانہ تھا اور ان سے ساری رعایا بلا امتیاز مذہب و ملت فیضیاب ہوتی تھی۔ ان کے درباروں میں غیر مسلم اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتے اور ان کی زندگی سے متاثر ہوتے تھے۔

علماء نے نہ صرف سلاطین کو وقتاً فوقتاً اسلامی اصولوں پر اپنی حکومت قائم کرنے کی تلقین کی بلکہ اشاعتِ علم و دین کے لیے متعدد مدرسے قائم کیے، لوگوں کو فارسی اور بنگلہ میں دینی و دنیوی تعلیم دی، برہمنوں کے ساتھ مذہبی مناظرے کیے اور اکثر ایسا ہوا کہ علماء سے شکست کھانے کے بعد ان برہمنوں نے اپنے اہل خاندان اور عقیدت مندوں سمیت اسلام قبول کر لیا۔ اشاعتِ دین میں صوفیہ ان سے بھی سبقت لے گئے۔ انہوں نے اپنے حسن سلوک اور حسن اخلاق سے لوگوں کو اپنا اس طرح گرویدہ بنا لیا کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے ہندو اور بدھ عوام سے براہِ راست رابطہ قائم کیا اور جگہ جگہ، حتیٰ کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں بھی اپنی خانقاہیں بنائیں۔ علاوہ ازیں ان میں سے بعض بزرگ بڑے خداریسیدہ اور صاحبِ کرامت تھے اور ان کے آستانے سے عوام لاکھوں کی تعداد میں فیض حاصل کرتے تھے۔

یہ سچ ہے کہ ہندوؤں نے اپنے دھرم کو بچانے کے لیے اسلام کا سخت مقابلہ کیا، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ برہمن اور کایستہ اسلامی معاشرے اور دینِ اسلام کی خوبیوں کو اپنی تعلیم اور اعلیٰ ذہنی صلاحیت کے باعث دوسروں کی بہ نسبت زیادہ سمجھتے اور اس سے متاثر ہو سکتے تھے۔ امرت کنڈ میں لکھا ہے کہ ایک بھوجار پنڈت نے قاضی رکن الدین سمرقندی سے فلسفے پر بحث کی اور قائل ہو کر مسلمان ہو گیا۔ راجا کنس کے بیٹے جدو نے اسلام قبول کیا اور جلال الدین کے نام سے بنگال پر حکومت کی۔ کررانی افغانوں کے دور

بھی تھے اور سپاہی پیشہ بھی۔ اس دوران میں لاکھوں مقامی باشندوں نے بھی اسلام قبول کیا، چنانچہ ۱۷۷۰ء میں ایک تہائی بنگالی مسلمانوں کے آبا و اجداد بیرونی مسلمان تھے اور دو تہائی کے مقامی نو مسلم۔

بنگال میں مسلمانوں کی آبادی بڑھنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کے ہاں کثرت ازدواج کا عام رواج رہا ہے اور ہندوؤں کے برعکس بیوہ یا مطلقہ عورت کی شادی پر کوئی پابندی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ہندوؤں کی بہ نسبت شرح پیدائش بہت زیادہ رہی ہے۔ ۱۸۷۲ء میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں سے پچاس لاکھ کم تھی، لیکن ۱۸۹۱ء میں ان سے پندرہ لاکھ زیادہ ہو گئی۔ ۱۸۷۲ء میں مسلمانوں کی آبادی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ تھی، جو ۱۹۳۱ء میں تین کروڑ اسی لاکھ ہو گئی۔ اس کے برعکس اس عرصے میں ہندوؤں کی آبادی ایک کروڑ ستر لاکھ سے صرف تین کروڑ بیس لاکھ ہو سکی۔ اس کا باعث مسلمانوں میں زیادہ شرح پیدائش اور ہندوؤں کا قبول اسلام ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اشاعتِ اسلام میں سلاطین، علماء اور صوفیہ کا بڑا حصہ ہے۔ سلاطین نے حکومت قائم کر کے علماء کی سرپرستی اور صوفیہ کی اعانت کی۔ پھر انہوں نے مدارس جاری کیے، مسجدیں تعمیر کیں، خانقاہیں بنوائیں اور ایک خالص مسلم معاشرے کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے ملک میں امن و امان بحال کیا، زراعت اور تجارت کو ترقی دی، چیزیں ارزاں ہوئیں اور رعایا خوش حال۔ اس سے ایک طرف تو ان کی حکومت کو استحکام ملا اور دوسری طرف وہ دین بھی رعایا میں مقبول ہوا جس کے وہ پیرو تھے۔ یوں تبلیغ اسلام کی صورت پیدا ہو گئی۔ سلاطین اور ان کے مسلمان امرا کا سلوک ہندوؤں اور بدھوں سے

اسلام کا اثر ہنگالی تمدن پر : بیرون ملک سے جو مسلمان ہنگال آئے وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے نومسلموں کے ساتھ ازدواجی تعلقات استوار کیے اور اس طرح ہنگالی مسلمانوں کی جو نئی نسل پیدا ہوئی اس کی معاشرت اسلامی اقدار کے مطابق ڈھل گئی۔ اگرچہ بعض مقامی رسوم و رواج کی پابندی بدستور جاری رہی تاہم عقائد کے اعتبار سے یہ لوگ بیرونی مسلمانوں سے بھی زیادہ کٹر تھے۔ وہ اپنے تمام معاملات میں قرآن و حدیث کی پابندی پر زور دیتے اور سولہویں صدی کے ایک ہندو شاعر وجے گپت کے بیان کے مطابق ہر مسئلے پر سید، ملا اور قاضی سے ہدایت حاصل کرتے تھے۔ صوفیہ، علما اور مبلغین دین نے نہ صرف اصول اسلام کی تلقین کی بلکہ اپنے مدرسوں اور خانقاہوں میں ان کے مطابق زندگی بسر کرنے کا طریقہ عملی طور پر پیش کیا۔ اس سلسلے میں حکومت کی اعانت بھی شامل حال رہی، جس کی طرف سے قوانین شریعت کے نفاذ کی بدولت سب مسلمان ایک مشترکہ ثقافتی، اخلاقی اور آئینی سانچے میں ڈھل گئے۔

دور اول کے صوفیہ کرام، مثلاً شیخ جلال الدین تبریزی (م ۱۲۲۵ء)، شیخ جلال مجرد بھٹی (م ۱۳۴۷ء)، شیخ سراج الدین (۱۲۳۶ تا ۱۳۲۵ء)، مولانا عطا دیناج پوری (۱۳۰۰ تا ۱۳۵۰ء)، شیخ علاء الحق (م ۱۳۹۸ء) اور حضرت نور قطب عالم (م ۱۴۱۰ء) وغیرہ انتہائی راسخ العقیدہ، پابند شریعت اور خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ ان کی خانقاہیں، نیز سنارگڑوں، پنڈود، گور، چانگڑوں اور دیناج پور میں ممتاز علما کے مدارس دین حق کی توسیع و اشاعت کے بڑے مرکز تھے، جن کی بدولت نومسلموں کی زندگی اور ان کے اخلاق و اطوار میں ایسا انقلاب رونما ہوا جس کی کٹر سے

کا مشہور سپہ سالار کالا پہاڑ کایستہ تھا اور مسلمان ہو گیا تھا۔ ایک اور مسلمان سپہ سالار عیسیٰ خان کا باپ ایک نومسلم راجپوت تھا۔ باگرھاٹ کا وزیر محمود ظاہر برہمن خاندان سے تھا۔ اسلام خان سور کے زمانے میں پنہ کے زمیندار رکھو رائے نے اسلام قبول کیا۔ بہت سے برہمن اور کایستہ مسلمان حکمرانوں سے میل جول رکھنے کی وجہ سے ذات سے خارج کر دیے جاتے تھے۔ اس ذلت سے بچنے کے لیے وہ اکثر اپنے خاندان سمیت مسلمان ہو جاتے تھے۔ سینکھٹیا کے برہمن زمینداروں کو برادری سے نکالا گیا تو انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان امور کے پیش نظر یہ کہنا غلط ہوگا کہ اونچے طبقے کے ہندوؤں نے ہنگال میں اسلام قبول نہیں کیا۔

مسلمان فرمانرواؤں کی رواداری اور رعیت پروری اور علما و صوفیہ کی دینداری اور پاکیزہ اخلاق و اطوار کے علاوہ اشاعت اسلام کا حلقہ وسیع ہونے کا سب سے بڑا سبب خود اسلام کی تعلیمات اور اسلامی معاشرے کی یہ خوبی تھی کہ اس میں شامل ہو کر محمود و ایاز ایک ہو جاتے تھے۔ ہندوؤں میں ذات پات کا جو نظام قائم تھا اس نے نیچی ذات کے ہندوؤں پر عرصہ حیات تنگ اور ترقی کی تمام راہیں مسدود کر رکھی تھیں۔ قبول اسلام سے انہیں معاشرتی مساوات اور ترقی کے دروازے کھلتے نظر آئے تو وہ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے۔ مشرقی ہنگال کے تانترک ہندو اس سلسلے میں بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح بدھ مت کے پیرو سین راجاؤں کے عہد سے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے چلے آ رہے تھے، انہیں بھی اپنی نجات کی صورت قبول اسلام ہی میں نظر آئی اور یوں ہنگال میں دین حق کی اشاعت کا دائرہ پھیلتا چلا گیا۔

(ایس۔ امام الدین [و ادارہ])



قلندروں کا وجود میں آیا جس کے عقائد میں بھگتی، یوگا اور مسلمان قلندروں کے نظریات شامل تھے۔ داراشکوہ کی مجمع البحرین اسی تحریک کی مظہر ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں اخلاقی زوال اور مذہبی انحطاط نے ستیہ پر جیسے فرقے پیدا کر دیے جن کے عقائد دینِ حق کے سراسر خلاف اور اطوار انتہائی کج روی کے حامل تھے۔

عہد مغلیہ میں راسخ العقیدگی کو خاصا ضعف پہنچا۔ اعلیٰ طبقے کی طرز زندگی کا اثر عوام پر بھی پڑا اور ہندو مسلمان ایک دوسرے کے رسوم و عقائد کو اپنانے لگے۔ بھر کیف اس سے ایک مشترکہ ہندو مسلم ثقافت ہرگز پیدا نہ ہو سکی۔ کیونکہ قوانین شریعت کے نفاذ، جگہ جگہ دینی مدارس اور خاتقاہوں کے وجود اور علما و شیوخ کے اثر و نفوذ کے باعث عام مسلمان اپنے عقائد سے روگرداں نہ ہو سکے اور ستیہ پیروں، فقیروں اور قلندروں وغیرہ کا حلقہ بے حد محدود رہا۔ اس سلسلے میں حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کی مساعی نے بھی بڑا کام کیا۔ انہوں نے اپنے ایک خلیفہ مولانا حمید دانشمند کو بردوان بھیجا، جہاں ان کا جاری کیا ہوا مدرسہ اصلاح عقائد اور تجدید دین کا مرکز بن گیا۔ شاہ عبدالرحیم (م ۱۷۴۵ء) اور سید محمد دائم عظیم پوری (م ۱۷۹۱ء) نے ڈھا کے میں اور دوسرے بزرگوں نے بنگال کے مختلف حصوں میں یہ اہم کام جاری رکھا۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے سرزمین بنگال بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ان کے خلیفہ مولانا کرامت علی اور ان کے جانشینوں نے شمالی اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی بیش قرار خدمات سر انجام دیں۔ اس طرح فرائضی تحریک نے بھی انہیں دینی اور سیاسی اعتبار سے بیدار رکھنے میں کچھ کم حصہ نہیں لیا۔

کٹر ہندو بھی تعریف و توصیف کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ چنانچہ ایک ہندو مصنف مکند رام چکرورتی نے لکھا ہے کہ ایک عام بنگالی مسلمان کی زندگی میں ایمان و تقویٰ بدرجہ اتم نظر آتا ہے۔

ہندووں نے اسلام کی روزافزون توسیع و اشاعت کو روکنے کے لیے مختلف تحریکیں شروع کیں۔ "سمرتی ساستر" کی تجدید کی کوششیں تو محض مغربی بنگال کے برہمنوں تک محدود رہیں، لیکن ویشنومت اور بھگتی تحریکیں خاصی مقبول ہوئیں۔ ان تحریکوں کے ذریعے ہندو معاشرے میں اسلامی اصول رائج کرنے کی کوشش کی گئی، مثلاً مساوات، سادگی اور توحیدِ الہی۔ شری چیتنیہ کا نام اس سلسلے میں سرفہرست نظر آتا ہے۔ اس کا عقیدہ بڑی حد تک نظریہ وحدت الوجود سے ملتا جلتا ہے۔ فرق یہ تھا کہ مؤخرالذکر نظریے میں تمام مخلوق کو صفاتِ الہی کا پرتو سمجھا جاتا ہے اور اس کے عقیدے کی رو سے ہر شے ذاتِ الہی کی مظہر ہے؛ لیکن عوام نے عموماً اس امتیاز کو سمجھنے کی کوشش نہ کی اور رفتہ رفتہ اس تحریک کے اثرات مسلمانوں میں بھی پھیلنے لگے۔ بظاہر ان تحریکوں کا مقصد یہ تھا کہ ہندووں اور مسلمانوں کے مشترکہ مذہبی عقائد کو اجاگر کر کے دونوں قوموں میں اتحاد و اتفاق پیدا کیا جائے، لیکن درحقیقت اس سے ایک طرف تو ہندو معاشرے کی اصلاح مقصود تھی تاکہ عام ہندو اپنی معاشرتی خرابیوں کی باعث اسلام کی طرف راغب نہ ہوں اور دوسری طرف اپنے مذہبی عقائد کو مسلمانوں میں رائج کرنا مطلوب تھا۔ سولہویں صدی میں سری نواس اچاریہ (۱۵۲۲ تا ۱۶۰۸ء)، نروتم ٹھاکر (۱۵۳۱ تا ۱۶۳۱ء) اور شیاماند (۱۵۳۵ تا ۱۶۳۰ء) کی رہنمائی میں ان سے بنگال میں مروجہ اسلامی نصوص بے حد متاثر ہوا، چنانچہ ایک نیا فرقہ یوگی

انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہو گئے تھے اور اپنے جائز حقوق حاصل کرنے کی جد و جہد میں مصروف تھے۔ آہستہ آہستہ ان میں سیاسی شعور بھی پیدا ہونے لگا تھا اور ان پر یہ واضح ہو رہا تھا کہ ان کی ثقافت ہندوؤں سے بالکل مختلف ہے۔ اسلامی مدارس کا قدیم نظام جاری رہنے کے باعث ان میں ملی جذبہ برقرار رہا اور وہ مسلمانان ہند کے مجموعی مفاد اور ان کی مشترکہ ثقافت کے علمبردار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان کا مطالبہ پیش کیا گیا تو انہوں نے اس کے حصول میں کسی قربانی سے دریغ نہ کیا۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو مغربی پاکستان کے ساتھ مسابقت کے جذبے اور مروجہ نظام تعلیم کے اثرات کے تحت بنگالی مسلمانوں نے اپنی جداگانہ ثقافت کا سراغ لگانے کی سعی کا آغاز کیا جو ابھی تک جاری ہے۔ بنگلہ زبان خود مختار سلاطین بنگلہ کے دور میں بھی دینی زبان عربی اور سرکاری زبان فارسی کے مساوی درجہ حاصل نہ کر سکی تھی برطانوی حکومت کے ابتدائی دور میں بھی مسلمانوں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دی، البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد اشاعت دین اور سیاسی بیداری پھیلانے کے سلسلے میں بنگلہ زبان سے بڑا کام لیا گیا۔ ۱۹۴۷ء تک اردو مسلمانان ہند کی مشترکہ قومی زبان تصور کی جاتی تھی، لیکن آزادی کے بعد اپنی قومی انفرادیت اور جداگانہ ثقافت کو برقرار رکھنے کے لیے مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے بنگلہ کو بھی قومی زبان کا درجہ دلا دیا۔

دیہات میں آج بھی زندگی اپنی ڈگر پر روانہ دوان ہے، البتہ شہروں میں بڑی تیزی سے انقلاب آ رہا ہے اور وہاں ایک ایسا طبقہ ابھر رہا ہے جو بنگالی ثقافت کا علمبردار ہے

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہوئی تو مسلمانان بنگال نے اس سے بڑی حد تک عدم تعاون کیا۔ مغربی تہذیب کا مقابلہ کرنے کے لیے انہوں نے جو مدافعانہ اقدام کیے ان میں انگریزی تعلیم کا بائیکاٹ بھی شامل تھا۔ ادھر انگریزوں نے مسلمانوں کی معاشی خوش حالی کو ختم کرنے کا ایک منصوبہ تیار کیا۔ نظام قضاہ کے خاتمے، سرکاری زبان میں تبدیلی اور بندوبست استمراری وغیرہ سے مسلمانوں کی زمینداریاں ختم ہو گئیں اور ان پر معاش کے دروازے بند کر دیے گئے۔

۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کا دور مسلمانان بنگال کی تاریخ کا ایک المناک دور ہے۔ ان پر معاشرتی اور معاشی اعتبار سے ایسا زوال آیا کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں پسماندہ نظر آنے لگے۔ دوسری طرف ہندوؤں نے برطانوی حکومت کا ابتدا ہی سے ساتھ دیا۔ انگریزی تعلیم کے حصول میں وہ پیش پیش رہے، چنانچہ ملازمتوں کے علاوہ تجارت و صنعت پر بھی ان کی اجارہ داری قائم ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ معاشی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ ذہنی صلاحیت اور سیاسی شعور کے لحاظ سے بھی مسلمانوں سے بہت آگے نکل گئے۔ اسلامی حکومت کے دور میں بھی انہوں نے اسلامی ثقافت کو تباہ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے رسوم و عقائد پر سختی سے جمے رہے تھے۔ خدا اور بندے کے بارے میں ان کے تصورات مسلمانوں سے بالکل مختلف تھے۔ برطانوی تعلیم نے ان کے اندر اپنی علیحدہ قومیت کا شعور پیدا کیا۔ راجہ رام موہن رائے اور وویکانند کی کوششوں سے ان میں ایک طرف تو آزاد خیالی پیدا ہوئی اور دوسری طرف وہ ہندو راج کے خواب دیکھنے لگے۔ دیانند سرسوتی کی تحریک آریہ سماج نے اس سنگ کو اور بھی جلا دی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد مسلمان



کلکتہ ۱۹۳۸ء؛ (۱۹) جے۔ این۔ سرکار : Bengal  
 Nawabs، کلکتہ ۱۹۳۸ء؛ (۲۰) وہی مصنف : Life of  
 Mir Jumla، کلکتہ ۱۹۵۱ء؛ (۲۱) وہی مصنف :  
 History of Bengal، ج ۲، کلکتہ ۱۹۵۲ء؛ (۲۲)  
 کے۔ ایم۔ اشرف : Life and condition of people of  
 Hindustan، دہلی ۱۹۵۹ء؛ (۲۳) ابوانکلام آزاد :  
 India Wins Freedom، مطبوعہ Orient Longmans،  
 ۱۹۵۹ء؛ (۲۴) H. Feldman : Pakistan  
 اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۶۰ء؛ (۲۵) عزیز الرحمن  
 ملک : British Policy and the Muslims of Bengal  
 (1757-1856)، ڈھاکہ ۱۹۶۱ء؛ (۲۶) Rushbrook  
 Williams : The State of Pakistan، ۱۹۶۲ء؛ (۲۷)  
 عبدالکریم : Murshid Quli Khan and his times  
 ڈھاکہ ۱۹۶۳ء؛ (۲۸) وہی مصنف : Social History of  
 (1538) the Muslims in Bengal، ڈھاکہ ۱۹۶۸ء؛  
 (۲۹) C. H. Philips : The East India Company،  
 1784-1834، مانچسٹر ۱۹۶۱ء؛ (۳۰) ایم۔ اے۔ رحیم :  
 Social and Cultural History of Bengal، کراچی  
 ۱۹۶۳ء؛ (۳۱) کے۔ کے۔ عزیز : Britain and Muslim  
 India، مطبوعہ Heinemann، ۱۹۶۳ء؛ (۳۲)  
 صلاح الدین احمد : Social Ideas and Social Changes  
 in Bengal (1818-35)، لائڈن ۱۹۶۵ء؛ (۳۲) چودھری  
 خلیق الزمان : Pathway to Pakistan، M. R. (۳۳)  
 Tarafdar : Hussain Shahi Bengal، ڈھاکہ ۱۹۶۵ء؛  
 (۳۴) A. H. Halim : East Pakistan in the History  
 of Freedom Movement، ج ۲، مطبوعہ کراچی؛ (۳۵)  
 قمرالدین احمد : The Social History of East Pakistan  
 ڈھاکہ ۱۹۶۷ء؛ (۳۶) Report on the administration  
 of Bengal, 1873-1936، مطبوعہ کلکتہ؛ (۳۷) JASB  
 ڈھاکہ؛ (۳۸) Journal of Pakistan Historical  
 Society، کراچی؛ (۳۹) ابن خردادبہ : کتاب المسالك؛  
 (۴۰) ابن فضل اللہ العمری : مسالك الابصار (مترجمہ

تہذیبی اعتبار سے بنگال کے سب باشندوں کو  
 ایک سمجھتا ہے۔ اس سے تعلیم یافتہ مسلمانوں  
 کی معاشرت بھی متاثر ہو رہی ہے اور ان کے ہاں  
 لادینی رجحانات فروغ پا رہے ہیں۔ بایں ہمہ اگر  
 مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو مذہب سے  
 شیفتگی ابھی تک برقرار ہے اور عوام ابھی تک  
 دینی جذبے سے سرشار ہیں۔

(علی اشرف [و ادارہ])

مآخذ : (۱) Charles Stewart : History of

Bengal، لندن ۱۸۴۷ء؛ (۲) H. Beverly : Census of

Bengal، ۱۸۷۲ء؛ (۳) H. Blochmann : Contri-

bution to the Geography and History of Bengal

JASB، ۱۸۷۳ء؛ (۴) Runnell : Maps of Bihar and

Bengal، ۱۸۷۳ء؛ (۵) J. A. Bourdillon : Census

of Bengal، ۱۸۸۱ء؛ (۶) H. H. Risley : The Tribes

and Castes of Bengal، کلکتہ ۱۸۹۱ء؛ (۷) Elliot و

Dowson : History of India as told by its own

Historians، جے۔ این۔ داس گپتا : Bengal in the

Sixteenth Century، کلکتہ ۱۹۱۳ء؛ (۹) ٹی۔ سی۔

داس گپتا : Some Social Aspects of Bengal، (۱۰)

N. K. Bhattasali : Chronology of the Early

Independent Sultans of Bengal، ڈھاکہ - کیمبرج

۱۹۲۲ء؛ (۱۱) ایس۔ کے۔ چٹرجی : The origin and

development of Bengali Language، کلکتہ ۱۹۲۶ء؛

(۱۲) آر۔ ڈی۔ بینر جی : History of Orissa، کلکتہ

۱۹۳۰ء؛ (۱۳) عابد علی خان : Memoirs of Gaur

and Pandua، طبع H. E. Stapleton، کلکتہ ۱۹۳۰ء؛

(۱۴) جے۔ سی۔ سنہا : Economic Annals of Bengal

(۱۵) The Cambridge History of India، ج ۳ و ۵؛

(۱۶) آر۔ سی۔ سوجمدار : History of Bengal، ج ۱،

ڈھاکہ ۱۹۳۳ء؛ (۱۷) J. Stephens : Pakistan

لنڈن ۱۹۳۷ء؛ (۱۸) James Runnell : Bengal Atlas

درجہ مشرق میں واقع ہے۔ اس کی شہرت اس کی ٹین کی کانوں اور ٹین کی تجارت کی وجہ سے ہے جو قدیم زمانے سے بیرونی ممالک کے تاجروں کے لیے کشش کا باعث رہی ہے۔ اقتصادی لحاظ سے آبادی کا کمزور حصہ انڈونیشی ہیں نیز عام انڈونیشی وضع قطع کے مسلمان۔ آبادی کا سب سے اہم حصہ وہ چینی ہیں جو ترک وطن کر کے یہاں آباد ہو گئے۔

(C. C. Berg)

⊗ بنگلہ: [پاکستان کی دو قومی زبانوں میں

سے ایک زبان؛ آج کل مشرقی پاکستان اور مغربی بنگال (بھارت) کے باشندوں کی غالب اکثریت کی زبان یہی ہے] لیکن ۱۲۰۱ء میں جب مسلمانوں نے سر زمین بنگال پر قدم رکھا تو ایک ادبی اور تہذیبی زبان کے طور پر بنگلہ کا کوئی مقام نہ تھا۔ ان دنوں جس طرح مسلمانوں کی مذہبی زبان عربی اور تہذیبی و ادبی زبان فارسی تھی اسی طرح ہندوؤں کی مذہبی، تہذیبی اور ادبی زبان سنسکرت تھی۔ بنگلہ صرف بول چال کی زبان تھی اور متعدد بولیوں پر مشتمل تھی۔ جب تک مسلمانوں نے بنگلہ کی سرپرستی اور اس میں تراجم کی حوصلہ افزائی نہیں کی، اس کی یہی حیثیت رہی۔

اس زبان کا اصل سرچشمہ قدیم پراکرت ہے اور اس کے ارتقائی مراحل پراکرت اور اپ بھرنش ہیں۔ قدیم پراکرت عوام کی بول چال کی زبان تھی در آنجائیکہ سنسکرت کو آریہ ورت کی اونچی جاتیوں کی متبرک اور مہذب زبان کا درجہ حاصل تھا۔ بنگلہ کی ابتدائی شکل گوڑا پ بھرنش تھی، جو بقول ڈاکٹر شہید اللہ گوڑا پراکرت سے نکلی اور مگدھی پراکرت کی بہن تھی، جس سے بہاری، پوری اور اڑیا زبانیں نکلی ہیں۔ یہی گوڑا۔ کامروپ اپ بھرنش آسانی اور بنگلہ زبانوں کی ماں ہے۔

عبدالرشید؛ (۴۱) ابن بطوطہ : تحفة النظار فی غرائب الامصار (انگریزی ترجمہ از مہدی حسین، پڑودہ ۱۹۵۳ء)؛ (۴۲) ابوالفضل : آئین اکبری، مترجمہ Jarret، ج ۱ و ۲، ۱۹۳۸-۱۹۳۹ء؛ (۴۳) فرشتہ : تاریخ فرشتہ، لکھنؤ ۱۸۶۷ء؛ (۴۴) عبدالحق دہلوی : اخبار الاخیار، دہلی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۳ء؛ (۴۵) غلام حسین سلیم : ریاض السلاطین، کلکتہ ۱۸۹۸ء (انگریزی ترجمہ از عبدالسلام، کلکتہ ۱۹۰۲-۱۹۰۳ء)؛ (۴۶) منہاج سراج : طبقات ناصری، انگریزی ترجمہ از Raverty؛ (۴۷) مکتوبات حضرت نور قطب عالم، اقتباسات در حسن عسکری : Bengal Past and Present، کلکتہ ۱۹۳۸ء؛ (۴۸) مکتوبات جہانگیر سنائی، اقتباسات در حسن عسکری : کتاب مذکور؛ (۴۹) غلام سرور : خزینة الاصفیا، مطبوعہ لکھنؤ؛ (۵۰) مرزا نٹھو : بہارستان غیبی، طبع و ترجمہ از Borah؛ (۵۱) سلیم اللہ : تاریخ بنگالہ (انگریزی ترجمہ از Gladwin)؛ (۵۲) سید ہاشمی فرید آبادی : تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت، مطبوعہ کراچی؛ (۵۳) آر۔ ڈی۔ بینرجی : Banglar Itihasi، کلکتہ ۱۳۲۱-۱۳۲۳ B. S.؛ (۵۴) عبدالکریم : Banglia Prachina Pathic Vivarana، در Bangiya Sahitya Preshad Palrika، کلکتہ ۱۳۳۹-۱۳۴۳ B. S.؛ (۵۵) شیخ چاند : Rasul Viyaya، در Kavya، کلکتہ؛ (۵۶) شمشیر غای پریوتھی، در بنگیہ ساہتیہ پریچینہ؛ (۵۷) این۔ آر۔ رائے : بنگلر اتھاس؛ (۵۸) این۔ باسو : بنگلر سماجک اتھاس، ج ۲؛ (۵۹) ای۔ حق : Bangi Sufi Prabhava، کلکتہ ۱۹۳۵ء۔

(ایس۔ امام الدین [و ادارہ])

• بنگالی : (زبان) رك به بنگلہ۔

• بنگلہ : انڈونیشیا میں جنوبی سمائرا کے مشرقی ساحل کے قریب ایک جزیرہ جو عرض البلد ایک درجے اور ۴ درجے کے درمیان اور طول البلد ۱۰۶



۱۲۰۰ سے ۱۳۵۰ء تک رونما ہونے والے حالات کا ہمیں اچھی طرح علم نہیں، لیکن اتنا واضح ہے کہ اس زمانے میں ایک تہذیبی زبان گوڑ کے گرد و نواح میں ابھر رہی تھی اور شعرا وہاں کی بولی کو آلائشوں سے پاک کر کے نئے الفاظ کی آمیزش کے ساتھ اپنے استعمال میں لا رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی کے اوائل میں کیرتی واس Krittivas کی رامائن اور شاہ محمد صغیر کی نگارشات میں جو زبان نظر آتی ہے وہ اس حد تک ترقی یافتہ ہو چکی تھی کہ اس میں مختلف النوع احساسات و افکار کا اظہار کیا جا سکے۔

مسلمانوں نے اس ملک کو جو سیاسی اتحاد عطا کیا تھا یہ اسی کی بدولت تھا کہ بنگالے کے دوسرے علاقوں نے بھی اس منزہ گوڑ بولی کو بنگلہ کے ایک معیاری تہذیبی نمونے کے طور پر تسلیم کر کے اس کی ہیئت، اسلوب اور لغت کو قبول کر لیا۔

مسلمانوں نے بنگلہ کو کثیرالتعداد عربی، فارسی اور ترکی الفاظ سے آشنا کیا۔ ملک پر حکمران امرا کی اسلامی تہذیب کے تسلط اور مقامی نو مسلموں کی زندگی اور عادات و اطوار پر اسلام اور باہر سے آ کر یہاں بس جانے والوں کی تہذیب کے اثرات کی بدولت یہ الفاظ دیہاتی عوام کی بول چال تک میں شامل ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد علاقائی استعمال اور مقامی تلفظ کے باعث ان کی اصل شکل برقرار نہ رہ سکی۔ ۱۵۷۵ء میں مغلوں نے بنگالہ فتح کیا تو بنگلہ میں فارسی الفاظ کی مزید آمیزش ہوئی۔

سلطنت مغلیہ کے زوال تک یہ اثرات اتنے وسیع پیمانے پر پھیل چکے تھے کہ ڈھا کہ، مرشد آباد اور بردوان جیسے شہروں میں، جو اسلامی عسا کر اور امرا کے مراکز تھے، عوام، بالخصوص لسانی

معلومات کی کمی کے باعث ہمارے لیے بنگلہ کی پیدائش اور اس کے ابتدائی ارتقا کی تاریخ پورے وثوق سے بیان کرنا ممکن نہیں۔ چریہ Charva کے مخطوطے سے پتا چلتا ہے کہ ۶۵۰ اور ۱۲۰۰ء کے مابین، یعنی مسلمانوں کی آمد سے قبل، یہ ادب کی کسی نہ کسی نوع میں مستعمل تھی، لیکن سنسکرت کی اہمیت کے باعث اسے ایک مکمل اور ترقی یافتہ ادبی تہذیبی زبان کا درجہ حاصل نہ ہو سکا۔ بہر حال عام استعمال کی زبان ہونے کی بنا پر اس میں بعض کول دراوڑی اور سنڈا عناصر دخل پا گئے۔ صوتی الفاظ کے عام استعمال اور اسمائے اماکن میں دراوڑی لاحقوں کی موجودگی انہیں اثرات کا پتا دیتی ہے۔ سنڈا زبان کا اثر بنگلہ کے مرکب حروف علت (diphthongs) میں بالخصوص نظر آتا ہے اور اس سے ان دونوں زبانوں میں گہرے روابط کا پتا چلتا ہے۔

دیسی الفاظ کے علاوہ، جنہیں قدیم ہندی لسانیات میں تَد بھو، یعنی کلاری، دراوڑی اور سنگول اصل کے الفاظ، بھی کہا جاتا ہے، اپنی ارتقا کے ابتدائی مراحل میں سنسکرت اصل کے کثیرالتعداد الفاظ بھی بنگلہ میں شامل ہو گئے، جو تَت سَم کہلاتے ہیں، چونکہ سنسکرت سرکاری زبان ہونے کے علاوہ تعلیم یافتہ لوگوں کی تہذیبی زبان بھی تھی لہذا ان لوگوں کی بنگلہ زبان میں متعدد سنسکرت الفاظ اور تراکیب بھی شامل تھیں۔ یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ قدیم آریا یہاں سنسکرت زبان لے کر آئے تھے، جس سے مقامی بولیاں گہرے اثرات قبول کرتی رہی تھیں۔

۱۳۵۰ء تک مسلمانوں نے یہاں کے مختلف اقطاع کو ایک انتظامی مرکز کے تحت لا کر متحدہ بنگالے کی تشکیل کی، جس سے بنگلہ کو ایک تہذیبی زبان کے طور پر نمایاں ہونے کا موقع ملا۔

کیا تو انہوں نے دیکھا کہ یہ ایسے بے شمار الفاظ سے محروم ہو چکی ہے جو ان کے معاشرے میں مستعمل ہیں اور ان کی جگہ اس میں سنسکرت سے ماخوذ ان گنت الفاظ شامل ہو چکے ہیں، چنانچہ اب انہیں طوعاً و کرہاً یہی ”سادھو بھاشا“ استعمال کرنا پڑی۔

فورٹ ولیم کالج کے پنڈتوں نے انتہا پسندی سے کام لیتے ہوئے زبان کی جس طرح اصلاح کی تھی اسے بعد میں آنے والے مصنفین نے تسلیم نہیں کیا، تاہم اس نام نہاد اصلاح کے اثرات سادھو بھاشا سے محو نہ ہو سکے۔ علاوہ بریں علما نے اس بات پر زور دیا کہ ہنگلہ پر سنسکرت صرف و نحو کا اطلاق کیا جائے، حالانکہ ہنگلہ کی صرف و نحو سنسکرت سے بالکل مختلف تھی۔ ابھی حال ہی میں علما نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نہ صرف و نحو اور اس کے جملوں کی نحوی ساخت سنسکرت سے قطعاً مختلف ہے بلکہ دونوں کی لغات اور صوتیات بھی ایک نہیں۔

اس دوران میں ہنگلہ نے عام بول چال اور غیر ملکی زبانوں خصوصاً انگریزی سے الفاظ، ترکیبیں حتیٰ کہ محاورے بھی قبول کیے۔ بیسویں صدی میں ”کتھیا بھاشا“ یا بول چال کی ہنگلہ کا، یا یوں کہیے کہ کسی علاقے کی زبان کے الفاظ کا اپنی صوتی، صوری اور نحوی خصوصیات کے ساتھ ادب میں استعمال ہونے لگا۔ یہ تبدیلی فعل اور حاصل مصدر میں بالخصوص نظر آتی ہے۔

شاعری کے میدان میں نذراالاسلام کے قدم رکھتے ہی لغوی اور نحوی اعتبار سے زبان کے مروجہ سانچوں میں انقلاب آ گیا۔ اس نے عربی اور فارسی کے کثیر التعداد الفاظ، بلکہ بعض اوقات فارسی ساخت کے جملے بھی استعمال کیے، لیکن یہ الفاظ عام بول چال سے نہیں لیے گئے تھے اور صوتی لحاظ سے یہ ہنگالی نہیں، غیر ملکی تھے،

اعتبار سے۔ فارسی کا رنگ پوری طرح قبول کر چکے تھے، چنانچہ اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہنگلہ شعرا کا ایک پورا دبستان منظر عام پر آیا، جس نے فارسی محاورے کو اپنا اسلوب خاص قرار دیا، اسی لیے یہ ”دو بھاشی“ اسلوب کہلاتا ہے۔

اسلامی عہد حکومت ہی میں پرتگیزیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں نے یہاں قدم رکھا۔ ہنگلہ کے ذخیرہ الفاظ میں ان کے اثرات کا بھی پتا چلتا ہے۔ جب مسلمانوں کے تسلط کا خاتمہ ہوا اور ان کی جگہ انگریزوں نے لی تو ہنگلہ تیز رفتاری سے ترقی کرنے لگی۔ فورٹ ولیم کالج کے پنڈتوں اور مارش من Marshman اور کیری Kerry جیسے مسیحی مبلغوں نے طے کیا کہ تطہیر زبان کے لیے ہنگلہ لغت سے اسلامی اثرات کو خارج کر دینا ضروری ہے۔ مسلمانوں نے اپنے سیاسی اقتدار، تہذیبی تسلط اور معاشی تفوق سے محروم ہو کر مغربی حکومت کے خلاف شدید رد عمل کا اظہار کیا تھا اور انگریزوں نے بھی جان بوجھ کر انہیں مغربی علوم کی تعلیم دینے سے احتراز کیا۔ مسلمانوں میں ہنگلہ کو اہمیت دینے کا جذبہ بھی مفقود تھا۔ پورے اسلامی دور حکومت میں اسے ایک ثانوی اہمیت کی زبان کا مرتبہ حاصل رہا تھا اور حسین شاہ یا پرگل شاہ کی انتہائی سرپرستی کے باوجود انہوں نے یا امرانے ہمیشہ فارسی کو مسلمانوں کی تہذیبی اور عربی کو ان کی مذہبی زبان کا درجہ دیا۔ اب اس احساس میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہنگلہ کی ترقی و اصلاح، اسے نئے نئے سانچوں میں ڈھالنے اور اسے زندگی کے جملہ شعبوں میں کام آنے والی نثر کی ایک مؤثر زبان بنانے کا بیڑا ہندو علما اور مصنفین نے اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ آگے چل کر جب مسلمانوں نے اسے اپنانے اور اس میں جدید ادب تخلیق کرنے کا فیصلہ



قائم کر لیے تھے۔ سرکار دربار میں بھی کسی حد تک اس کا عمل دخل ہو چلا تھا؛ صوفیہ بھی اپنی سماع کی محفلوں میں بنگلہ گیتوں کو روا رکھنے لگے تھے، البتہ قدامت پسند علما اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مسلمان شعرا اکثر بنگلہ میں شعر کہنے پر اظہار معذرت کیا کرتے تھے۔ بہر حال پندرہویں صدی عیسوی کے آتے آتے ان شعرا نے عذر خواہی کا یہ سلسلہ ختم کر دیا۔

بنگلہ زبان و ادب میں مسلمانوں نے جو حصہ لیا اسے تاریخی اعتبار سے دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: پہلا دور ۱۲۰۱ء سے ۱۸۵۷ء تک اور دوسرا ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک۔ ایک تیسرا دور اس ادب سے مخصوص کیا جا سکتا ہے جو آزادی کے بعد پاکستان میں پیدا ہوا۔ پہلے دور کو دور متوسط، دوسرے کو دور جدید اور تیسرے کو پاکستانی دور کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں چند امور لائق توجہ ہیں:

(۱) دور متوسط کی نگارشات میں زبان و بیان کے دو طرز ملتے ہیں، روایتی اور دو بھاشی۔ اگرچہ کسی قوم کی زندگی میں ۶۵۷ برس کا عرصہ خاصا طویل ہوتا ہے، تاہم اس دوران میں ہیبتی، لسانی اور موضوعاتی روایات میں ایک ایسا تسلسل نظر آتا ہے کہ اس کا مطالعہ ایک واحد دور کے طور پر کیے بغیر چارہ نہیں۔ اس دور میں روایتی ادب اور دو بھاشی ہوتھی ادب کے درمیان نمایاں اختلاف نظر آتا ہے۔ روایتی ادب کی ابتدا چودھویں صدی عیسوی میں ہوئی اور پورے دور متوسط میں اس کی تخلیق جاری رہی۔ اس کے برعکس ہوتھی ادب کا آغاز اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہوا اور یہاں کی ثقافت کو انیسویں صدی کے وسط تک متاثر کرتا رہا۔ مؤخر الذکر میں وہ عجیب و غریب ادب بھی شامل

چنانچہ ان کا استعمال محض ادبی تجربے کے طور پر ہوتا رہا۔

چند شعرا سے قطع نظر، آزادی کے بعد سے یہ اسلوب ترک کر دیا گیا اور اس کی جگہ ایک نسبتاً فطری اور قدرتی اسلوب نگارش نے لے لی ہے۔ مشرقی پاکستان کی زبان بتدریج ادبی زبان بن رہی ہے اور اس کے ذخیرہ الفاظ میں تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ علما اور مصنفین ادب میں علاقائی بولیوں کے استعمال پر زور دے رہے ہیں۔ بنگلہ بول چال کی مہذب زبان کا معیاری نمونہ کتھیا بھاشا ہے اور یہی ادبی زبان بھی ہے۔

بنگلہ ادب پر مسلمانوں کے اثرات

تاریخی پس منظر: جب مسلمانوں نے بنگال فتح کیا تو بنگلہ ادب کا کوئی وجود نہیں تھا۔ تعلیم یافتہ طبقے نے اس زبان کو اپنے ادب کے لیے ذریعہ اظہار کے طور پر کبھی استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہندو دور حکومت میں بھی بنگلہ کے بجائے سنسکرت ہی سرکاری اور تہذیبی زبان رہی، البتہ ادبی زبانوں میں ہتھلی ایک مؤثر و مقبول زبان تھی۔ ۱۳۵۰ء تک مسلمانوں نے بنگال کو متحد کرنے کے بعد بنگلہ زبان و ادب کی سرپرستی اور اس میں نئی نئی تخلیقات کی حوصلہ افزائی کی۔ حسین شاہ نے کرتی واس کو رامائن لکھنے کی ترغیب دی۔ اگرچہ فارسی سرکاری زبان تھی، تاہم اس حوصلہ افزائی سے چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں مسلمان بھی بنگلہ ادب کی تخلیق کی طرف متوجہ ہو گئے۔ جو لوگ باہر سے آ کر یہاں آباد ہوئے تھے ان کی عام زبان بھی ۱۳۵۰ء تک بنگلہ ہو چکی تھی، جس کا سبب ایک تو یہ تھا کہ انہوں نے اسی ملک کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور دوسرے یہ کہ انہوں نے مقامی باشندوں سے معاشرتی بلکہ ازدواجی تعلقات بھی

مسلمانوں کی ادبی مساعی اور ان کی روایات کا صحیح اندازہ اس تاریخی پس منظر کے ساتھ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انفرادی تخلیقات کے بجائے روایات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے، کیونکہ مختصر الفاظ میں ادبی کارناموں کا مکمل جائزہ اسی طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔

دور متوسط: اس دور میں مسلمانوں کے ادبی کارنامے پانچ اصناف میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں:

(۱) فارسی زبان سے رومانی داستانوں کے ترجمے کیے گئے یا انہیں بہ تصرف بنگلہ میں منتقل کیا گیا؛ (۲) رومانی داستانیں، جن کا سرچشمہ مقامی یا ہندی الاصل روایات اور لوک کہانیاں تھیں؛ (۳) رزمیہ نظمیں، جن میں تاریخ کو اساطیری روایات میں ڈھالا گیا؛ (۴) مذہبی اور اخلاقی شاعری؛ اور (۵) گیت، غنائی نظمیں اور لوک ادب۔ ان میں سے پہلی دو اصناف کا مطالعہ ایک ساتھ کرنا چاہیے، کیونکہ تراجم میں بھی اصل فارسی کا اندازہ باقی نہیں رہا بلکہ بنگالی ہو گیا ہے۔

جہاں تک بیانیہ نظموں کی پہلی چار اصناف کا تعلق ہے، مسلمانوں نے ان کی مروجہ ہیئت میں نمایاں تبدیلی کی۔ اکثر صورتوں میں مسلمانوں نے رائج الوقت سانچوں کو بعد از ترمیم و اضافہ اختیار کیا تا کہ ان میں مخصوص ہندو عناصر یا تو خارج ہو جائیں یا نمایاں نہ رہیں۔ منگل گویاؤں کے آغاز میں شاعری اور فنون لطیفہ کی دیوی سرسوتی اور دوسرے دیوی دیوتاؤں کی ثنا کی جاتی تھی، لیکن مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے بجائے انہوں نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں حمد و نعت کو اختیار کیا۔ رزمیہ اور طویل بیانیہ نظموں میں مسلمانوں کا مسلسل یہی دستور رہا، حتیٰ کہ جب آلاول نے ایک ہندو راجکماری کی کہانی

ہے جو ہندو وجے گویاؤں کے رد عمل کے طور پر مقبول رزمیہ شاعری کی صورت میں منظر عام پر آیا اور جس میں رومان کے ڈانڈے کرامات اور مافوق الامکن واقعات سے ملا دیے گئے۔ اسلوب زبان کے اعتبار سے بھی ان دونوں میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۲) ۱۵۷۶ء میں مغلوں نے بنگالہ فتح کیا تو ایرانیوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہاں آ کر آباد ہو گئی۔ ان کے زیر اثر ادب میں نئے موضوعات، مثلاً سانحہ کربلا کا اضافہ ہوا اور اس میں ایک گہرا المیہ لہجہ در آیا۔ مغلوں کی فتوحات کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ بنگالہ ایک ایسے مرکز سے محروم ہو گیا جہاں تخلیقی سرگرمیاں جاری تھیں۔ مغلوں کے صدر مقام کو تخلیقی مرکز کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی اور بنگلہ ادب ان ریاستوں میں پھلنے پھولنے لگا جو مغلیہ حدود سے باہر واقع تھیں، مثلاً چٹاگانگ، اراکان، تپرہ اور کوچ بہار۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب بعض قدیم تر مصنفین کے مقابلے میں فارسی سے کم متاثر ہے۔

(۳) موجودہ بنگلہ ادب نے اس ادب کی کوکھ سے جنم لیا جو ۱۸۰۰ء کے بعد ہندو مصنفین کی کاوش کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے شاعری، ناول، ڈراما وغیرہ کی جو ہیئت متعین کی تھی اور ان کے جو سانچے بنائے تھے، مسلمانوں کو تخلیق ادب میں انہیں کو ملحوظ رکھنا پڑا، بعینہ جیسے انہیں ہندوؤں کی ساختہ و پرداختہ سادھو بھاشا کو اپنانا پڑا تھا۔

(۴) آزادی کے بعد جو ماحول پیدا ہوا اس کے تقاضوں کے ماتحت بنگلہ میں مسلمانوں کی ادبی روایت کا دوبارہ جائزہ لیا گیا اور اپنے حال و مستقبل کو از سر نو جانچنے کے ایک نئے اسلوب کی نشوونما ہوئی۔



پدمساوتی لکھی یا دولت قاضی نے ایک اور راجکماری ستی مینا کی، تو انہوں نے اپنی نظموں کی ابتدا حمد باری تعالیٰ اور نعتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے کی۔ ہندو شعرا نے دیوی دیوتاؤں کی کہانیوں میں منگل کو یہ Mangal Kavya انداز کے رومانی قصے بھی شامل کر لیے تھے۔ اس کی ایک مثال بھارت چندر کی انند منگل ہے، جو اس اعتبار سے ایک بے جوڑ سی کہانی ہے کہ اس میں ایک خالص مذہبی نوعیت کی داستان میں ایک انتہائی ہوس انگیز قصہ بھی بڑھا دیا گیا ہے۔ مسلمانوں نے اس صنف کو ایسے بے جوڑ عناصر سے پاک کیا اور اسے انسانی زندگی میں پیش آنے والے رومانی واقعات کے بیان کا ایک سوزوں ذریعہ بنایا۔ بعض اوقات مسلمان مصنفین نے ہنگلہ میں مخصوص فارسی اصناف کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی۔ شیخ فیض اللہ نے جینالیر چوتیشا ایک نئی روایت پیدا کرنے کے لیے لکھی۔ بد قسمتی سے یہ اسلوب لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف نہ کر سکا اور اپنی موت آپ ہی مر گیا۔

ان تمام روایتی تصانیف کی انسانی روایت کو نئے سرے سے جانچنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ دوہنہاشی ادب میں اس روایت کا مطالعہ کیا جائے تا کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں اس نے جو اہمیت اختیار کر لی تھی اس کا عام ہو سکے۔ انسانی روایت کی اہمیت ہیئت کی روایت سے زیادہ لیکن موضوع کی روایت سے کم ہے۔ بایں ہمہ اس میں اتنی صلاحیت موجود تھی کہ یہ موضوع کی روایت کے مقابلے میں برقرار رہی، چنانچہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مخصوص اسلامی معاشرت کے بیان میں عربی اور فارسی الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کی اشرافی شاعری میں یہ دستور باقی نہیں رہا تھا، لیکن

موہت لال ماجمدار اور نذر الاسلام نے اس کا احیا کیا۔ یہ ایک شعوری احیا تھا، لیکن بھارت چندر نے غیر شعوری طور پر اسے اختیار کیا۔ اسے ایک طرح کے آداب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جن کا ایک مخصوص ماحول مقتضی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی اسلامی دربار کا بیان مقصود ہوتا تھا، کسی مسلمان بادشاہ سے خطاب کیا جاتا تھا، اسلامی عقائد و افکار اور قرآن مجید یا دوسری کتب مقدسہ کا حوالہ دیا جاتا تھا یا صوفیہ اور علما کا مذکور ہوتا تھا تو عربی اور فارسی الفاظ سے کام لیا جاتا تھا۔ اس دستور کی پابندی ہندو شعرا بھی کرتے تھے اور مسلمان شعرا تو قدیم سے اس پر عمل پیرا تھے، مثلاً غیاث الدین اعظم شاہ کے عہد (۱۳۸۹ تا ۱۴۰۹ء) کے شاعر شاہ محمد صغیر نے کتب مقدسہ کے لیے، 'کتاب' اور علما کے لیے 'عالمان' کا لفظ لکھا ہے۔ امتداد زمانہ سے اس کا رواج عام ہوتا گیا اور اس کی پابندی سختی سے کی جانے لگی۔ پندرہویں صدی میں زین الدین نے رسول وجے میں حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو لباس زیب تن فرماتے ہوئے بیان کیا ہے اور مخصوص اسلامی الفاظ و تراکیب استعمال کی ہیں (مثلاً مکٹ کے بجائے تاج)۔ آگے چل کر سید سلطان (۱۵۵۵ تا ۱۶۳۸ء؟) کے ہاں یہ خصوصیت اور بھی نمایاں ہو گئی ہے۔ وہ اپنے شاہکار نوی ونگشن میں غیر شعوری طور پر ایسے اسما (نیز افعال اور حاصل مصدر) کثرت سے استعمال کرتا نظر آتا ہے جو یقیناً اس زمانے کے مسلمانوں کی بول چال کا حصہ بن چکے تھے، مثلاً اللہ، رسول خدا، نور محمدی، اسوہ، پیر، پیغمبر۔ آداب زبان و بیان کی اس سے برعکس صورت ہمیں وہاں نظر آتی ہے جہاں ہندو دیومالا یا پوران یا ہندوؤں کے عقائد اور نظریہ حیات سے متعلق کوئی کہانی بیان کی جاتی ہے۔ یہاں

اور عربی کو ختم کر کے انگریزی کو رائج کرنے کا آغاز ہو چکا تھا اور ہندو ہندوتوں نے مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے ہنگلہ زبان سے تمام عربی فارسی الفاظ نکال باہر کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ انگریزوں نے اس بے رحمانہ کارروائی کی ہمت افزائی کی کیونکہ وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ اس سر زمین پر مسلمانوں کے غلبے کا کوئی نشان نہ رہنے پائے۔ جبر و تشدد کے مارے ہوئے مسلمان، خصوصاً مسلمان عوام، عشق اور شجاعت کی داسوں میں پناہ لینے لگے۔ یہ داستانیں اس زبان میں ہونی تھیں جو وہ سہذب مجلسوں میں روزمرہ بول چال میں استعمال کرتے تھے اور اس میں فارسی ادب سے مأخوذ الفاظ و تراکیب اور استعارات و تشبیہات کی کثرت تھی۔ دوہنہاشی پوتھی ادب کے لیے یہ دور تخلیقی اعتبار سے بڑا بار آور ثابت ہوا۔ ڈاکٹر انعام الحق نے 'مسلمانوں کے ہنگلی ادب کی تاریخ' (History of Muslim Bengali Literature) میں لکھا ہے کہ یہ لسانی عمل اپنے ماحول سے شعوری گریز کا نتیجہ تھا اور اسی لیے غیر فطری تھا، لیکن یہ رائے درست نہیں۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہ عمل درحقیقت اس روایت کا نتیجہ تھا جو اسلامی ہنگلہ ادب میں قدیم سے چلی آ رہی تھی۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے کے ماحول نے اس عمل کے لیے سہمیز کام دیا اور عربی و فارسی الفاظ کے ذخیرے میں مزید اضافہ ہو گیا۔ یاد رہے کہ دوہنہاشی پوتھی ادب زیادہ تر ضلع ہنگلی میں پیدا ہوا، جس کی زبان پر وہاں مغلیہ فوج کی چھاؤنی اور سپاہ و عوام کے باہمی ارتباط کے باعث فارسی کا رنگ غالب آ چکا تھا۔ مصنفین اپنی نگارشات میں اسلامیت کو نمایاں کرنا چاہتے تھے، لہذا انہوں نے مروجہ اسلوب اور مقامی بول چال کے الفاظ سے احتراز کیا۔ یہی وجہ ہے کہ

ہندوانہ الفاظ و تراکیب کے استعمال پر زور دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پدماوتی اور ستی مینا کی کہانیوں میں آلاول اور دونت قاضی ایسے الفاظ شاذ و نادر ہی لکھتے ہیں جن کا تعلق اسلامی معاشرے سے ہے بلکہ ان کی زبان میں سنسکرت الفاظ اور ہندوانہ تشبیہات و استعارات کی بھرمار نظر آتی ہے۔ اگرچہ انہیں ہندو دیومالا سے مذہبی اعتبار سے کوئی وابستگی نہ تھی، لیکن یہ اس قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے اپنی قوتِ متخیلہ کو کام میں لاتے ہوئے ان موضوعات کے بیان کا حق ادا کر دیا۔ اس سے نہ صرف ان کی آزاد خیالی اور وسیع القلبی بلکہ اعلیٰ فنی صلاحیت کا بھی پتا چلتا ہے۔ خالص فنی تقاضوں کے ماتحت مسلمانوں نے ہندووں کی اساطیری روایات سے جس طرح فائدہ اٹھایا اس کی شہادت ایسی منظومات میں بھی ملتی ہے جن کا موضوع سراسر اسلامی ہے۔ زین الدین رسول وجے میں جب حضرت علیؑ کی شجاعت کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ذہن میں معاً بنیم وارجن کی بہادری کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، لیکن یہاں یہ امر خاص طور پر لائق توجہ ہے کہ اس تقابلی سے اس کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کی عظمت مزید نمایاں ہو جائے۔

عربی اور فارسی کے الفاظ، تراکیب اور استعارات و تشبیہات کو اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں اور بھی اہمیت حاصل ہو گئی۔ یہ مسلمانوں کا دور انحطاط تھا۔ سلطنت آہستہ آہستہ ان کے قبضے سے نکل کر غیر ملکیوں کے قبضے میں جا رہی تھی، اسلامی رسوم و آداب رفتہ رفتہ اس وقار و احترام سے محروم ہو رہے تھے جو عہدِ اسلامی میں ان سے وابستہ رہا تھا۔ مسلمان روز بروز منس ہوتے جا رہے تھے اور ان کی زمینداریاں ان کے ہندو مختاروں کے زیر تصرف آ رہی تھیں۔ فارسی



انہوں نے نہ تو عربی اور فارسی کے نئے الفاظ داخل کیے، نہ اصل زبان کے تلفظ کو برقرار رکھنے کے لیے مروجہ الفاظ کے ہجے درست کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بجائے انہوں نے یہ الفاظ ان کے اصل تلفظ سے قطع نظر اسی شکل میں استعمال کیے جس طرح یہ عام مسلمانوں کی زبان پر چڑھ چکے تھے۔ نذراالاسلام اور فرخ احمد نے جب اس زبان کا احیا کیا تو وہ کسی مرتی ہوئی یا مردہ روایت کی تقلید نہیں کر رہے تھے۔ یہ روایت ہر اعتبار سے زندہ تھی کیونکہ یہ ان اشراف کی روایت تھی جو اپنی روزمرہ بنگلہ بول چال میں عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت استعمال کرنے اور غیر شعوری طور پر عربی اور فارسی ادب کے حوالے دینے کے عادی تھے۔ اس روایت پر کہیں انیسویں صدی میں جا کر زوال آیا۔ مارشمن اور کیری نے بنگلہ زبان سے عربی فارسی الفاظ نکال دینے کا فیصلہ کیا۔ ہندو پنڈتوں نے اسے غیر فطری طور پر سنسکرت آمیز کرنے کی کوشش کی۔ ودیا ساگر، مرتینجے وغیرہ مصنفین نے اس نئی لسانی روایت کو ایک قابل قبول شکل دی۔ یہی وجہ ہے کہ جب نذراالاسلام اور موہت لال نے پوتھی ادب کی روایت کے احیا کا بیڑا اٹھایا تو انہیں اس بات کا پورا شعور تھا کہ وہ عربی و فارسی الفاظ کو ان کی اصل شکل میں استعمال کر رہے ہیں اور ایسا کرنا ضروری بھی ہے۔ مختصر یہ کہ دو بھاشی ادب کی روایت اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی ایک باقاعدہ، فطری اور مقبول عام روایت تھی۔

رومانی داستانیں: اس لسانی روایت سے بھی زیادہ اہم وہ موضوعات ہیں جو خاص طور پر بیانیہ منظومات میں نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے بڑے بڑے موضوعات تین قسم کے تھے۔ بنا برین بیانیہ نظموں کی بھی تین اقسام ٹھہرائی جا سکتی ہیں:

(۱) رومانی؛ (۲) سورمائی اور تاریخی؛ (۳) مذہبی۔ ان میں سے اہم ترین رومانی بیانیہ نظمیں ہیں، جن میں عشق مجازی کی کہانیاں بیان کی گئی ہیں۔ اس صنف کے قابل ذکر شعرا تاریخی ترتیب سے (جو ڈاکٹر انعام الحق اور ڈاکٹر شہید اللہ نے متعین کی ہے) حسب ذیل ہیں: (۱) شاہ محمد صغیر: یوسف زلیخا، جو جاسی کی اسی نام کی مثنوی سے ماخوذ ہے؛ (۲) دولت، وزیر بہرام خان: لیلیٰ مجنون؛ (۳) دولت، قاضی اراکان (۱۶۰۰ تا ۱۶۳۸ء): لور چندرانی یا ستی مینا؛ (۴) آلاول (۱۶۰۷ تا ۱۶۸۰ء): پدماونی، سیف المنوک بدیع الزمال [= بدیع الجمال]، ہفت پیکر اور سکندر نامہ؛ (۵) عبدالحکیم (۱۶۲۰ تا ۱۶۸۰ء): یوسف زلیخا؛ (۶) قریشی مگن: مرگ وتی؛ (۷) عبدالنبی: امیر حمزہ؛ (۸) حیات محمد (۱۶۹۳ تا ۱۷۶۰ء): جنگ نامہ؛ (۹) محمد مقیم: مرگ وتی۔ دو بھاشی پوتھی ادب کے جن مصنفین نے اس روایت کی پیروی کی ان میں زیادہ مشہور غریب اللہ، مصنف یوسف زلیخا و امیر حمزہ (حصہ اول) اور سید حمزہ، مصنف امیر حمزہ و حاتم طائی ہیں۔

اگرچہ ان میں سے ہر تصنیف نثری خصوصیات کی حامل ہے لیکن بحیثیت مجموعی ان میں چند مشترک خصائص بھی پائے جاتے ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ بنگلہ ادب کی موضوعاتی روایت کے ارتقا میں مسلمانوں کا کتنا حصہ تھا۔ پہلی خاص بات تو یہ ہے کہ سنگل کویاؤں میں، جو تمام ہندو مصنفین کی مخصوص روایت تھی، کوئی مسلمان نظر نہیں آتا، نوآباد کاروں اور نومسلموں کی ثقافت اور معاشرتی ماحول کا یہ ایک طبعی نتیجہ تھا۔ اس کے باوجود وہ ہندوانہ طرز زندگی اور موضوعات کو اپنے لیے شجر منوعہ مرکز نہیں سمجھتے تھے، چنانچہ اپنی بیانیہ منظومات میں

اسی انداز سے اظہارِ الم کرتی نظر آتی ہے جو ہنگلہ شاعری کا خاصہ ہے۔ یہاں مجنوں اور لیلیٰ فارسی کردار نہیں رہتے، ہنگلہ کردار بن جاتے ہیں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کے رومانی پہلووں پر زور دیا گیا۔ ہندو ادب پر مذہب کا غلبہ اس قدر تھا کہ کسی ہندو مصنف کے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ دیوی دیوتاؤں کو بیچ میں لائے بغیر کوئی عشقیہ کہانی بیان کر سکے۔ علاوہ ازیں ان کی یہ بھی کوشش تھی کہ ہندوؤں میں قومی احساس ابھارا جائے۔ اس غرض سے انہوں نے ہندوؤں کو اپنی دیوی دیوتاؤں کی روحانی طاقت کا شعور دلایا اور اپنی شکست خوردہ قوم کے دل میں اپنے خداؤں کی قوت پر اعتماد بحال کیا۔ مسلمانوں کے سامنے اس قسم کی کوئی نفسیاتی رکاوٹ نہ تھی۔ پھر ان کے سامنے نظامی اور جاسی کی مثال بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذہبیت کا سہارا لیے بغیر عشقیہ حکایت سنانے پر قادر تھے۔ انہیں صرف اتنا ملحوظ رکھنا پڑتا تھا کہ ان کی کہانی اسلام کی بنیادی اقدار کے منافی نہ ہو۔ ہاں شروع شروع میں انہیں اپنی رومانی کہانیوں میں ایک مذہبی پہلو ضرور پیدا کرنا پڑا: بصورت دیگر انہیں قدامت پسند مسلمانوں کی مذمت کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسی لیے شاہ محمد صغیر کو یوسف زلیخا میں یہ امر واضح کرنا پڑا کہ حین و عشق کی یہ حکایت قرآن مجید میں بھی بیان کی گئی ہے اور اس میں متقی مسلمانوں کے لیے سامانِ نصیحت موجود ہے۔ بہر حال شعراے متاخرین کو اس قسم کے اعتبار کی حاجت نہیں رہی، مثلاً انیسویں صدی میں ابنِ اربلہ کے مترجمین روشن علی، سید علی، حبیب الحسن اور عزالدین کسی طرح کی عذر خواہی نہیں کرتے اور مذہبی خوف و اندیشہ کا اظہار کیے بغیر کہانی شروع کر دیتے ہیں۔ بہر حال ان تمام تصانیف میں، حتیٰ کہ

انہوں نے جمالیاتی ضرورتوں یا کہانی کے تقاضوں کے تحت ہندوانہ نوازمات کو پیش کرنے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ دولت قاضی اور آلاول نے ہندوؤں کی زندگی کے مخصوص آداب و رسوم کو بڑی خوش اسلوبی، صحت اور مؤثر انداز سے پیش کیا، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ ہندو عقائد یا تہذیب کو مانتے تھے۔ اس سے تو صرف ان کی وسیع القلبی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ کسی ہندوانہ موضوع پر قلم اٹھاتے وقت ہندوؤں کی طرز زندگی کو صحت، خصوص اور دیانتداری سے پیش کرتے تھے، البتہ انہوں نے منگل کویوں کی اس روایت کو قطعاً نظر انداز کر دیا جس کی رو سے دیوی دیوتاؤں پر اظہار اعتقاد ضروری تھا۔

دوسری خصوصیت کا سراغ ان کے متعدد موضوعات اور قصوں میں ملتا ہے جو صرف مسلمانوں میں مقبول و مشہور تھے۔ اس دور کے کسی ہندو مصنف نے نہ تو اسلامی زندگی کو اپنا موضوع بنایا نہ اسلامی تاریخ اور قصے کہانیوں، مثلاً حاتم طائی، لیلیٰ مجنوں یا کربلا سے کام لیا۔ مسلمانوں نے فارسی حکایات کے ترجمے یا انہیں آزادانہ ہنگلہ میں منتقل کر دینے کا کام شروع کر دیا۔ اس زبان کا پہلا مشہور شاعر شاہ محمد صغیر ہے، جس نے جامی کی یوسف زلیخا کا آزاد ترجمہ کر کے اسے ہنگلہ میں ڈھالا۔ اسی طرح آلاول نے ترجمے کے ذریعے نظامی کے سکندر نامہ اور ہفت پیکر کو ہنگلہ کا جامہ پہنایا۔ ان کہانیوں کو اپنی زبان میں منتقل کرتے وقت شعرا تخلیقی صلاحیت سے کام لیتے تھے اور یوں فارسی کی شعری شبیہ اور تشبیہات وغیرہ ہنگلہ ماحول سے مطابقت اختیار کر لیتی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ نئے موضوعات اپنی خصوصیات اور احساسات و جذبات کے اعتبار سے ہنگلہ ہو گئے۔ دولت وزیر کی لیلیٰ مجنوں میں لیلیٰ



اپنے غم کو ایک برتر عشق میں ڈبو دیتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عشق کو ہمیشہ ایک مرض یا جانگداز جذبے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کا روایتی مقام آنکھیں ہیں، جو بلاشبہ ایک قدیم تصور ہے۔ یہاں لائق توجہ یہ چیز ہے کہ عملی طور پر عشق کا تصور سبھی شعرا کے ہاں یکساں ہے۔ صابر د (؟) خاں کی حنیفہ و خیرا پری ہو یا محمد کبیر کی مدھو مالتی یا نوجیش خاں کی گل بکاولی، ان تمام داستانوں میں عاشق اپنے عشق کے ہاتھوں مجنون ہو جاتا ہے اور ہر حالت میں اپنے معشوق کا جویا نظر آتا ہے۔

محبت میں یہ استقلال اور پامردی ان کہانیوں کے مرکزی نسوانی کردار کا بھی خاصہ ہے۔ دولت وزیر کی لیلیٰ، دولت قاضی کی ستی مینا، آلاول کی پدماوتی، سب کا کردار نہایت پاکیزہ ہے اور وہ اپنے ناموس کی خاطر جان کی بازی بھی لگا دیتی ہیں۔ رومانی داستانوں کی یہی وہ روایت ہے جس کی بدولت اس دور کا بنگلہ ادب لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور یوسف زلیخا کے قصوں سے آشنا ہو کر مالا مال ہوا۔ یہی وہ معیاری نمونے ہیں جنہیں پیش نظر رکھتے ہوئے مسلمان مصنفین اپنے ہیرو یا ہیروئن کے عشق کی شدت اور جوش کو جانچتے ہیں۔ یہی نہیں، مذہبی تصانیف میں بھی مسلمان ان حکایات کو صوفی اور خدا کے درمیان روحانی رشتے کی علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ شاہ محمد صغیر نے حکایت یوسف و زلیخا کی اور جامی نے اپنی مشہور مثنوی میں حکایت لیلیٰ مجنوں کی تشریح اسی طرح کی ہے۔ بنگلہ ادب میں یہ روایت خوب پھلی پھولی اور مختلف شعرا کی تصانیف میں اس نے نئی نئی اہمیت اختیار کی۔

رومان اور فراریت: اٹھارہویں صدی عیسوی

کے اوائل میں حیات انسانی پر حقیقت پسندانہ انداز

الف لیلہ میں بھی، مصنفین اسلام کی اخلاقی اقدار کی پابندی کرتے ہیں۔ ہمیں ایسی ایک مثال بھی نہیں ملتی جہاں جنسی بے راہروی کو جائز قرار دیا گیا ہو۔ پاکدامنی کا شمار بنیادی نیکیوں میں ہوتا ہے، لہذا ان کے نزدیک واردات عشق کا انجام شادی پر ہونا لازم تھا، حتیٰ کہ پریوں اور انسانوں کی بھی شادی کرا دی جاتی تھی۔ شادی کے بغیر جنسی تعلقات قائم کرنا ایک ناقابل معافی جرم تھا۔ لیلیٰ مجنوں کی حکایت میں عشق پر روحانیت اس قدر غالب آجاتی ہے کہ وہاں انسانی تعلق کا سوال ہی باقی نہیں رہتا۔

روایتی عشقیہ کہانی میں اس عام اخلاقی رنگ کے علاوہ چند اور مشترک خصائص بھی ملتے ہیں۔ عشق میں استقلال ایک ایسی نیکی ہے جو عاشق اور معشوق دونوں کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح عاشق میں شجاعت اور جوانمردی کی صفات بھی لازمی ہیں۔ بعض صورتوں میں جوانمردی کی صفت نظر انداز کر دی جاتی ہے، مثلاً حاتم طائی میں حسن بانو کا عاشق منیر شامی ایک ایسا محبت کا مارا نوجوان ہے جو روتا دھوتا سرگرداں ہے، لیکن جو سوالات اس سے کیے گئے ہیں ان کے جواب ڈھونڈنے کی ایک لمحظے کے لیے بھی کوشش نہیں کرتا، بلکہ حاتم طائی کا دست اعانت بخوشی تمام لیتا ہے اور شادی کے بعد پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔ اپنی سیاحت کے دوران میں حاتم طائی کی ملاقات اسی قسم کے کئی اور عشق زدگان سے ہوتی ہے اور ان میں سے ہر ایک منیر شامی ہی کے کردار کا حامل ہے۔ بہرام خان کی لیلیٰ مجنوں میں مجنوں اس سے بھی ایک قدم آگے نظر آتا ہے۔ اس پر عشق اس حد تک غالب آجاتا ہے کہ وہ خود عشق پر عاشق ہو جاتا ہے۔ منیر شامی کے مانند اس کی حالت بھی قابل رحم ہے، لیکن وہ اپنی قسمت پر آنسو بہانے کے بجائے

سیف الملوک بدیع الزمال (= الجمال): شیخ ایزد الدین: گل اندام: محمد خاطر: مرگ وتی اور شاہ نامہ: جناب علی: شہید کربلا - الف لیلہ کو بنگلہ کے لسانی اور موضوعاتی سانچے میں ڈھالا جانا بھی قابل ذکر ہے۔ یہ کوشش تین بار کی گئی، یعنی منیض الدین: کچہ الف لیلہ: روشن علی: الف لیلہ اور پھر سید نصیر علی، حبیب الحسین اور عزالدین کی تصنیف، جو مقبول ترین اور مؤثر ترین ہے اور ۱۸۵۰ء کے بعد شائع ہوئی۔

کئی اور لوگوں نے بھی یہ اسلوب اختیار کیا، چونکہ ان کی تصانیف رومانی بیانیہ نگارشات کے ذیل میں نہیں آتیں اس لیے ان کا ذکر مقالہ زیر نظر میں کہیں اور کیا گیا ہے۔

ان نظموں میں رومان اور محیرالعقول کارناموں کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔ ان واقعات میں قسمت کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ عشاق کے وصال یا فراق کی ذمے دار ہمیشہ کوئی نہ کوئی خارجی قوت ہوا کرتی ہے۔ مسلمانوں نے مقدر کے آلہ کار کے طور پر پریوں کو تخلیق کیا۔ مدھومالتی اور منوہر کو پریاں یکجا کرتی ہیں کیونکہ وہ دیکھنا چاہتی ہیں کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ حسین و جمیل ہے۔ پریاں یہ خطرناک کھیل بار بار کھیلتی ہیں۔ بعض اوقات پریاں بھی اپنی لغزش کے باعث اس انسانی جذبے کا شکار ہو جاتی ہیں۔ حاتم طائی اور الف لیلہ میں یہ انسانی جذبہ بجائے خود مقدر کے ہاتھ میں ایک خطرناک ہتھیار بن جاتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کو اس پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ تمام کارناموں کا سرچشمہ یہی جذبہ ہوتا ہے۔ اس طرح رومان کے پورے عمل کا دار و مدار محبت کے اسی پہلے واقعے یا حادثے پر ہوتا ہے۔

بسا اوقات انہیں کارناموں سے پوری کہانی کا تار و پود تیار ہوتا ہے۔ رومان تو محض ایک چوکھٹے

سے قلم اٹھانے کی اس روایت میں وجہ کوئی روایت کی آسائش ہو گئی، جس میں ابطال کے افسانوی کارناموں کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ یوں دوبھاشی ادب کی اکثر بیانیہ تصانیف میں اس کی جگہ ایک نئی روایت کا عمل دخل ہونے لگا جو فراریت، جنوں پریوں کے قصوں، رومان اور محیرالعقول کارناموں سے عبارت تھی۔ بنگالی مسلمانوں کے طبقہ اشراف پر جو زوال آیا تھا اس کے آخری ایام میں عام لوگ شجاعت اور دلاوری کے خیالی کارناموں میں آسودگی تلاش کرنے لگے تھے۔ جنگ پلاسی کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوبھاشی پوتھیاں گویا از رہ انتقام ایسی کہانیوں کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئیں۔ مصنفین کا خیال تھا کہ وہ اپنے اور اپنی گری ہوئی قوم کے ذہنوں کو جوانمردی کے ایسے خواب دکھا کر جن جن میں مناظر عیش و عشرت بھی شامل ہوں سکون پہنچا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان نظموں میں ایک طرف تو خود اعتمادی کا فقدان جھلکتا ہے اور دوسری طرف مسلمانوں کو کامل انتشار سے بچانے کے لیے ان کے شاندار ماضی کو افسانہ و حکایت کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش نظر آتی ہے؛ گویا اس طرح تاریخ کو ایک نئے انداز سے بیان کیا گیا۔

اس روایت کا پہلا شاعر غریب اللہ ہے جس کی یوسف زلیخا اور امیر حمزہ (حصہ اول) میں شاعری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ دوسرا اہم شاعر سید حمزہ ہے، جس نے پہلے تو روایتی لسانی اسلوب میں مدھومالتی لکھی، لیکن پھر امیر حمزہ (حصہ دوم) میں فارسی آمیز دوبھاشی اسلوب اختیار کیا۔ جیگونیر پوتھی اور حاتم طائی اس کی دوسری مشہور کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ حسب ذیل بھی قابل ذکر ہیں: عارف: لیلیٰ مجنوں: میل محمد:



وجہ کونہ یا رزمیہ نظمیں (جنگ نامے): اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ متاخر دور کے رومانوں میں جو محیرالعقول عناصر نظر آتے ہیں ان کا سرچشمہ وہ وجہ کوہیاں ہیں جن میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ کرام اور دوسرے مسلمان ابطال کے کارناموں کو رومانی، تخیلی اور اعجازی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ ان نظموں کی تخلیق میں تبلیغ اسلام اور کفار پر مسلمانوں کی فوقیت ثابت کرنے کا جذبہ کارفرما ہے۔ لہذا ان میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے کافر دشمنوں پر 'وجہ' یا فتوحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جو کتاب سب سے پہلے ہمارے سامنے آتی ہے وہ زین الدین کی رسول وجہ ہے۔ زین الدین کے اسلوب و انداز کی تقلید صابرد خان (Sabirid Khan) نے رسول وجہ اور حنیفلیر دگ وجہ میں کی اور یہی بات سدرجہ ذیل کتابوں میں بھی ملتی ہے: سید سلطان: رسول وجہ؛ محمد خان: حنیفلیر لڑائی؛ غریب اللہ: جنگ نامہ؛ حیات محمد: جنگ نامہ اور سید حمزہ: امیر حمزہ۔ ان میں سے اکثر کتابوں میں جن کافروں کو دشمن کے طور پر دکھایا گیا ہے ان کا کوئی تاریخی وجود نہیں، لیکن ان نظموں کے لکھنے والے شعرا اور انہیں پڑھنے والے عوام ان کی تاریخی شخصیت پر یقین رکھتے تھے۔ رسول وجہ کے اولین مصنف زین الدین کا دعویٰ ہے کہ اس نے بیشتر واقعات کسی اصل کتاب سے اخذ کیے ہیں، لیکن اپنی نظم میں اس نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ سراسر خیالی ہے۔ اس نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور کافروں کے بادشاہ جیگم کی لڑائی کا حال لکھا ہے۔ اسی جیگم کا کردار صابرد خان کی رسول وجہ اور سید سلطان کی رسول وجہ میں بھی موجود ہے۔ رسول وجہ کے اس موضوع کے علاوہ

کا کام دیتا ہے۔ عشق ان مصنفین کے ہاتھ میں ایک ایسا حربہ ہے جس کی مدد سے وہ انجانے ملکوں میں رومانی سہمت کی کہانیاں بتتے ہیں۔ حاتم طائی کی مہموں میں جو وحدت پائی جاتی ہے وہ، بلکہ اس پوری کہانی کا چوکھٹا، منیر شامی اور حسن بانو کے عشق کے مرکزی موضوع کا سرہون منت ہے۔ یہ اس مسئلے کی ایک انتہائی صورت ہے۔ حاتم طائی اور لیلیٰ مجنوں جیسی خالص عشقیہ کہانی کے بین بین مسلمان مصنفین کی لکھی ہوئی بیشتر داستانیں ایسی ہیں جن میں کہانی عاشق کی جستجوئے معشوق سے جنم لیتی ہے یا شادی کے شرائط پوری کرنے کے لیے عاشق کی مساعی مرکزی موضوع قرار پاتی ہیں، کہانی کا یہ سانچہ دراصل الف لیلہ سے مستعار ہے۔ یہ روایات شاہ محمد صغیر سے شروع ہو کر اس روایت کے آخری اہم شاعر سید حمزہ تک چلتی ہیں۔

اس رومانیت کا ایک اور پہلو وہ شوق تھا جو مصنفین کے دل میں اپنی دنیا سے دور پریوں کے ایک غیر حقیقی دیس کے لیے پایا جاتا تھا۔ تقریباً ہر نظم میں جادو اعجاز کا بڑا حصہ ہوتا ہے اور کثیرالتعداد جادوگر ہمیشہ ہیرو اور ہیروئن کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے نظر آتے ہیں؛ تاہم بعض اوقات جادو ہیرو کو مشکلات سے رہائی دلانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ان نظموں میں پریوں کے دیس عام ہیں اور جنوں و پریوں سے مردوں و عورتوں کے تعلقات کو ایک مسلمہ حقیقت سمجھا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے پرستان درحقیقت اسی دنیا کا ایک رومانی، زیادہ دلکش اور زیادہ مجلیٰ روپ ہے۔ یہ ہماری دنیا ہی کا ایک ملک ہے، لیکن زیادہ رومانی، زیادہ حسین اور سحرانگیز۔ یوں پرستان کی صورت میں ہمارے مصنف اپنے خوابوں کی تعبیر پاتے ہیں۔

کی صف میں جگہ دی، چونکہ وہ اپنی تصنیف کو مکمل نہ کر پایا تھا لہذا یہ کام اس کے شاگرد محمد خان (۱۵۸۰ تا ۱۶۵۰ء) نے انجام دیا۔ اس زمانے میں ملک پر شیعہ اثرات غالب آنے لگے تھے اور دولت وزیر مقتول حسین کے نام سے واقعہ کربلا پر ایک نظم لکھ چکا تھا۔

یہاں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ سولہویں صدی اور سترہویں صدی عیسوی میں وشنومت کا احیا ہو رہا تھا اور مسلمانوں کو ”فتح ناموں“ سے زیادہ جاذب نظر ادب کی ضرورت تھی، کیونکہ یہ صرف نوجوان اور مہم جو نسل ہی کے لیے موزوں ہو سکتے تھے۔ ان کے برعکس المیہ داستانوں میں زیادہ گہرائی ہوتی ہے اور ان سے پتا چلتا ہے کہ قارئین میں اتنی بالغ نظری پیدا ہو چکی ہے کہ زندگی کے زیادہ گہرے مسائل پر غور و فکر کر سکیں۔ ان منظومات کا مرکزی واقعہ شہادت امام حسینؑ ہے۔ ساری کہانی کا نقطہ عروج یہی حادثہ عظیم ہے، لیکن اس پر یہ ختم نہیں ہوتی۔ اس روایت کی اولین نظم، یعنی دولت قاضی کی مقتول حسینؑ سے کعباد کے محرم نامے تک ہر نظم میں امام حسینؑ کی شہادت کے بعد ایک طویل مرثیہ ملتا ہے۔ اس مرثیے کی ممتاز ترین خصوصیت یہ ہے کہ شعرا کے تخیل پر کوئی پابندی نظر نہیں آتی اور وہ عرش سے فرش تک ہر شے، شجر و حجر، آسمان، حتیٰ کہ ملائکہ اور ارواح کو بھی اس ماتم میں شریک کر لیتے ہیں۔ بایں ہمہ دور متوسط کے مصنفوں نے انسانی بہاؤ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ عبدالحکیم کی کربلا، غریب اللہ اور یعقوب کی مقتول حسینؑ اور حیات محمود کی محرم پروا میں امام مظلوم اور آپ کے خاندان کے مصائب و آلام اور اس المیے کے بعد پیش آنے والے واقعات کو بھی پیش کیا

اصحاب رسول کی فتوحات کو بھی موضوع بنایا گیا۔ یہاں بھی تاریخی صداقتوں سے انحراف اور تخیل پر انحصار نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں تاریخی واقعات بھی شامل کر لیے جاتے ہیں، لیکن یہاں بھی یہی رجحان ملتا ہے کہ بزرگان اسلام کی خیالی فتوحات کو بڑھا چڑھا کر دکھایا جائے۔ حنیفہ کی جیکم سے جنگ (محمد خان: حنیفیر لڑائی) اور امیر حمزہ کی جام شہادت نوش کرنے تک ہر قسم کی لڑائیاں (سید حمزہ: امیر حمزہ)، ان سب کے بیان سے مقصود تفریح، جمالیاتی مسرت اور جذبہ رومان کی آسودگی تھی۔ سید حمزہ کا انداز نسبتاً بے باکانہ ہے۔ اس کا بیان ہے کہ اس نے ان کارناموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے قلم اٹھایا جنہیں غریب اللہ نے لکھنا شروع کیا تھا، لیکن معلومات کی کمیابی کے باعث ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے انہیں نئے واقعات کی دستیابی کی بنا پر نہیں بلکہ اس لیے مکمل کیا کہ لوگوں کا عام تقاضا یہ تھا کہ امیر حمزہ کے کارناموں کو انجام تک پہنچایا جائے۔

تاریخی داستانیں: تاریخ کی ان رومانی تعبیرات سے ملتی جلتی وہ تصانیف ہیں جن میں تاریخ کو زیادہ حقیقت پسندانہ انداز سے پیش کیا گیا، یا جن میں یہ تاثر پیدا کیا گیا کہ مبینہ واقعات حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس روایات کا سب سے پہلا اہم شاعر سید سلطان (۱۵۵۵ تا ۱۶۳۸ء) چانگاؤں کا رہنے والا تھا اور اعلیٰ شاعرانہ صلاحیت کا مالک تھا۔ اس نے نوی ہنگش میں سیرت نبویؐ کو اپنا موضوع بنایا اور تکوین عالم سے اپنی نظم کا آغاز کر کے کربلا میں سبط رسول امام حسینؑ کی شہادت کے واقعے تک تاریخ بیان کی ہے۔ اس نے ہندوؤں کی بعض اساطیری شخصیتوں، مثلاً وشنو اور کرشن کو انبیائے کرام



حوا<sup>۴</sup>، ان کی باہمی محبت، ان کی لغزش اور نافرمانی، خلد سے اخراج، مفارقت، پھر انبیا<sup>۵</sup> کا طویل سلسلہ، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ، آپ<sup>۶</sup> کی وفات، شہادتِ امام حسین<sup>۷</sup> اور روزِ قیامت کا قصہ، یہ سب احوال بیان کرتا ہے۔ اس کے برعکس مزمل (۱۴۳ تا ۱۴۴) نے، جس کا شمار اس صنف کے متقدمین میں ہوتا ہے، نیتی شاستر ورت میں احکامِ دین میدھے سادھے انداز میں لکھ دیے ہیں۔ افضل علی نے نصیحت نامہ میں احکامِ شریعت کی تلقین جس طریق سے کی ہے وہ منگل کو یہ سے ملتا ہے۔ اس میں دیوی دیوتا کے بجائے اس کا پیر رستم شاہ خواب میں آ کر اسے تعلیم دیتا ہے اور شاعر اپنا خواب تفصیل سے بیان کر دیتا ہے۔ نصر اللہ خان (۱۵۶ تا ۱۶۲۵ء) نے شریعت نامہ میں یہی پیر لاگ انداز اختیار کیا ہے۔ وہ آغازِ نظم ہی میں یہ واضح کر دیتا ہے کہ مسلمانوں کو اوامر کی تلقین اور نواہی سے متنبہ کرنا اس کا مقصد ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نصر اللہ کی یہ تصنیف غیر مسلموں کے لیے نہیں تھی بلکہ وہ مسلمانوں میں اپنے دین کے احکام کا شعور پیدا کرنا چاہتا تھا۔ یہی مقصد شیخ مطّلب کے پیش نظر تھا، جس کی کفایت المسلمین میں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور اسلام کے دیگر بنیادی ارکان کے احکام درج ہیں۔ نصر اللہ کا شریعت نامہ اور شیخ مطّلب کی کفایت المسلمین دونوں بڑی مقبول کتابیں تھیں، جس کی تصدیق یوں ہوتی ہے کہ ان نے قلمی نسخے کثیر تعداد میں ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں عبدالحکیم کے شہادت نامہ کو بھی ایک قابلِ قدر اضافہ کہہ سکتے ہیں۔ سید سلطان اور نصر اللہ خان کے لہجے میں عذر خواہی جھلکتی ہے کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ بنگلہ میں اشاعتِ اسلام کی یہ کوشش ہدفِ ملامت بنے گی۔ عبدالحکیم کے

کیا ہے۔  
مذہبی داستانیں: تاریخی اور الہیاتی:  
اس زمانے میں قدامت پسند علما مذہبی تصنیفات میں بنگلہ کو ذریعہ اظہار بنانے کے مخالف تھے، لہذا مصنفین پر یہ ثابت کرنا لازم ہو گیا کہ تبلیغِ دین بنگلہ میں کامیابی اور مؤثر انداز سے کی جاسکتی ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ دور متوسط اسلامی تہذیب کی توسیع کا دور بھی تھا۔ شاعری کے لیے خدمتِ قوم کا ذریعہ بننا لازم تھا، ورنہ وہ مردود و مطعون ٹھیرتی۔ اس خدمت کے دو راستے تھے۔ سید سلطان اور محمد خان جیسے شعرا نے اپنی منظومات میں تاریخِ مذاہب پیش کی، جس کا خاتمہ روزِ حساب پر کیا۔ سید سلطان کی نوی بنکش، شبِ معراج اور اوقاتِ رسول [=وفاتِ رسول] اور محمد خان کی مقتولِ حسین اور قیامت نامہ میں زمین کی ابتدا، ارتقا اور خاتمے، نیز قیامت کے روز نیک و بد ارواح کی جزا و سزا کے بارے میں اسلامی عقائد کا بیان ہے۔ منگل کو یاؤں میں عموماً تکوینِ عالم کا ہندو نظریہ بیان کیا جاتا تھا۔ ان دونوں شعرا نے دنیا کی پیدائش اور فنا کی یہ تصویر ہندو نظریے کے متبادل کے طور پر پیش کی۔ بقول سید سلطان اس سے غرض یہ تھی کہ عربی سے نا آشنا ان پڑھ بنگالیوں کو اس سے واقف کرایا جائے اور یوں ان کی روح پاک ہو جائے۔ اس بنا پر یہ منظومات تاریخی ہونے کے باوصف مذہبی شاعری کے ذیل میں شمار ہوتی ہیں۔

جاہل اور ناخواندہ بنگالیوں کے باطن کی صفائی کے لیے سید سلطان کی یہ کوشش زیادہ جمالیاتی انداز کی تھی۔ اس کے مقابلے میں دوسرے شعرا نے خالص اخلاقی شاعری کے ذریعے براہِ راست تبلیغ کا انداز اختیار کیا۔ سید سلطان کا اسلوب بیانیہ ہے۔ وہ ہمیں تخلیق کائنات، پیدائشِ آدم<sup>۸</sup> و

دور متوسط کے مسلمانوں کے دینی جذبے کا اظہار متصوفانہ ادب اور گیتوں میں بھی ہوا جو پسندیدہ عوام اور اعلیٰ ادبی معیار کے حامل تھے۔ اس ملک میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت بڑی حد تک صوفیہ کی مرہون منت تھی۔ یہ صوفیہ تصوف کے مختلف سلسلوں سے تعلق رکھتے تھے، جن میں سے قلندری فرقے کے لوگوں کی تعداد دور متوسط کے آخری دنوں میں سب سے زیادہ تھی۔ ایک زمانے میں قلندر اور مسلمان ولی مترادف الفاظ سمجھے جاتے تھے۔

تصوف کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ اس کا اطلاق مذاہب کے اس معجون مرکب پر بھی ہوتا رہا ہے جسے داراشکوہ نے مجمع البحرین میں پیش کیا اور ان عقائد صحیحہ پر بھی جن کی تبلیغ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے عظیم ترین مصلح حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی نے کی۔ ان کے علاوہ تصوف کی بعض مسخ شدہ صورتیں بھی ہیں جن میں عوام کی خوش اعتدادی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خانقاہی کاروبار کو چمکانے کی کوشش کی گئی۔ بہر حال تصوف کی اثرپذیری اور ہردلعزیزی نے بنگلہ ادب کو کئی روایات سے آشنا کیا جو ادبی بھی ہیں اور عوامی بھی۔

ادبی روایات دو قسم کی ہیں: (۱) نظریاتی اور عملی تصوف کی فلسفیانہ تشریح اور (۲) گیت، بالخصوص پداولی۔ مؤخر الذکر زیادہ تر بھائوں اور مرشدی گیتوں کی روایت ہے جس میں مختلف استعارات کی مدد سے ان مختلف مراحل کو بیان کیا جاتا ہے جن سے ایک سالک کو فناے ذات اور عرفان کی منزل تک پہنچنے کے لیے گزرنا پڑتا ہے۔ اول الذکر روایت کی فلسفیانہ نظمیں شعری معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ ان سے غرض محض یہ تھی کہ تصوف کے طریق عمل کی تعلیم دی

کے لہجے میں بے باکی ہے۔ وہ بنگلہ میں اشاعت اسلام کی مخالفت کرنے والوں کی مذمت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ [بنگلہ میں] عربی اور فارسی کے بعد اسلام کی زبان بنگلہ ہے۔ جو لوگ عربی اور فارسی نہیں جانتے انہیں اسلامی ادب کا مطالعہ بنگلہ میں کرنا چاہیے ورنہ وہ کبھی ایمان سے واقف نہیں ہو سکیں گے اور بدستور تاریکی میں رہیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے زمانے میں بنگلہ میں اشاعت اسلام کی روایت ایک مسلم حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ ڈاکٹر انعام الحق کے اندازے کے مطابق وہ ۱۶۲۰ سے ۱۶۹۰ء تک زندہ رہا۔ اس قیاس کی صحت و عدم صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، البتہ یہ واضح ہے کہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں متعدد مصنفین اسلامی ادب کی مختلف اصناف کی تخلیق میں مصروف تھے۔ یہی وہ دور ہے جب اس ملک میں اسلامی بنگلہ کے قدم جم گئے اور مسلمان مصنفین اسی کے انداز میں لکھنے لگے؛ چنانچہ ہمیں ایسی کئی کتابیں ملتی ہیں جن میں سید سلطان اور محمد خان کی روایت کی تقلید کی گئی ہے، مثلاً حیات محمد: انبیا وانی (۱۷۸۵ء)؛ عزیز الرحمن (۱۷۱۵ء تا ۱۷۸۵ء)؛ قصص الانبیاء؛ ۱۸۶۲ء میں رضاء اللہ، امیرالدین اور اشرف علی نے دوبارہ اسی موضوع پر کتاب لکھی۔ اسی طرح نصر اللہ خان اور شیخ مطاب کی قائم کی ہوئی روایت ہمیں محمد جان: نماز مہبتہ (Namaz Mahattya)، حیات محمد: ہتجن وانی، بدیع الدین: چیت ایمان [= سنت ایمان] اور میل محمد: احکام الجامع میں ملتی ہے۔ یہ دونوں روایتیں بیسویں صدی کے آغاز تک چلتی رہیں۔ مثال کے طور پر قصص الانبیاء (۳ حصے) سمت ۱۲۶۸ بنگالی میں شائع ہوئی۔

متصوفانہ ادب: ان دو اصناف کے علاوہ



جائے اور چونکہ ہنگلہ میں نثر کا وجود نہیں تھا، اس لیے مصنفین نے نظم کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ ان میں وہی اسلوب نظر آتا ہے جو احکام اسلام سے متعلقہ نظموں میں اپنایا گیا ہے، البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ایک میں اسلام کے ظاہر کو اور دوسری میں اسلام کے باطن کو، یا یوں کہیے کہ ایک میں شریعت کو اور دوسری میں طریقت کو موضوع شعر بنایا گیا ہے۔ گویا یہ نظمیں سلسلہ تصوف کے مبتدیوں کے لیے لکھی گئیں۔ بہر حال جیسا کہ سید سلطان نے جنن پردیپ میں واضح کیا ہے، علم باطن کا حصول مرشد کی باقاعدہ ہدایت کے بغیر ناممکن ہے، لہذا ان کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو مرشد سے ہدایت پانے کے بعد باطن سے آگاہ رہنا چاہتے ہیں۔ سید سلطان کی جنن پردیپ کے مقابلے میں حاجی محمد کی نور جمال زیادہ فلسفیانہ تصنیف ہے۔ حاجی محمد نے اپنی کتاب کے پہلے حصے میں شریعت کی تفصیل کے علاوہ توحید باری تعالیٰ کے بارے میں مختلف نظریات کی بڑی گہری فلسفیانہ تشریح بھی پیش کی ہے جن میں ابن العربی اور مجدد الف ثانی کے نظریات بالخصوص قابل ذکر ہیں۔ مذہبی نظموں کی روایت کی طرح اس روایت کو بھی جدید ہنگلہ نثر میں اپنایا گیا۔

اور وجود باری تعالیٰ کی علامت ہیں، اور بنسری کی دہن سے مراد پیغام الہی ہے۔ اس صنف کی زبان پر تصنع ہے اور ان نظموں کی ایمانی خصوصیت کے باعث ان کے لیے موزوں بھی ہے۔ گوڑ پد ترنگنی اور پدکل پترو جیسے وشنو پد کے مجموعوں میں پانچ مسلمان شعرا کی نظمیں منتخب کی گئی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں: شاہ اکبر، ناصر محمود، کبیر، سالباگ (؟ Salbag) اور سید مرتضیٰ۔ اس صنف میں اسلامی تصوف، خصوصاً اس کے اس پہلو کو جو وشنوت کے تصور عشق سے ملتا ہے، بڑے مؤثر انداز سے پیش کیا گیا ہے اور اس تاثر کی گہرائی شاعر کی متصوفانہ واردات اور اس کی قدرت بیان پر موقوف ہے۔ چونکہ ان گیتوں میں فلسفیانہ توجیہات پر زور دینے کے بجائے ایک جذباتی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، لہذا ان کی کاسیابی یا ناکامی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ شاعر نے اپنے احساسات کو کس خوبی سے مرتب و منظم کیا ہے۔ اس اعتبار سے ان میں ایک صحیح جمالیاتی لطف پیدا ہو گیا ہے۔

مرشدی گیتوں اور آگے چل کر بھائوں یا گویا شاعروں کی منظومات کی مقبول عوامی روایت میں گہری فلسفیانہ تشریحات پر زور دیا گیا ہے۔ مرشدی گیت آج بھی دیہات میں بہت مقبول ہیں۔ ہیئت کے لحاظ سے مرشدی گیت ایک ایسے دائرے یا دور سے مشابہ ہیں جو ایک ہی سلسلے کے متعدد گیتوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کا آغاز جسم اور اس کے مختلف حواس کے بیان سے ہوتا ہے اور انجام روح پر، جو پیر یا مرشد کے زیر ہدایت فناے ذات یا ذات الہی سے وصال کی منزل پا لیتی ہے۔ ان میں سے بعض گیتوں کی نوعیت اتنی فلسفیانہ ہے کہ وہ ناقابل فہم ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان میں مختلف علامات اور استعارات

معرفتی یا عارفانہ گیتوں کی مؤثر ترین ادبی روایت پداولی گیتوں کی ہے۔ ان میں وہ پداولیاں بھی شامل ہیں جن میں مسلمانوں نے حقیقت اولیٰ کے ادراک کے سلسلے میں اپنی روحانی واردات بیان کیں۔ سید سلطان سے علاوہ تک مسلم شعرا کی بڑی تعداد نے پداولی کی صنف کو اس لیے اختیار کیا کہ اس کی ادبی حیثیت مسلم ہو چکی تھی۔ ان میں رادھا اور کرشن کو نہ تو انسانوں کا درجہ دیا گیا ہے نہ دیوی دیوتا کا، بلکہ وہ روح انسانی

علی رضا (۱۶۹۵ تا ۱۷۸۰ء) کی یوگ قلندر ہے۔ گویا دورِ متوسط کے بنگلہ ادب میں بہت سی نئی روایات مسلمانوں کی مرہونِ منت ہیں۔ انہوں نے نہ صرف حیاتِ انسانی کو اس کے شایانِ شان وقار کے ساتھ پیش کیا بلکہ اخذ و ترجمہ کے ذریعے عالمِ سلام کے تصورات بنگلہ میں منتقل کیے اور اپنی تاریخی اور مذہبی شاعری سے بنگلہ بولنے والوں کے احساس کی حدود وسیع کیں۔ مسلمانوں نے اس ادب کی محض سرپرستی، پرورش اور حوصلہ افزائی ہی نہیں کی ہے، بلکہ اس دور کی بعض بہترین منظومات بھی تخلیق کی ہیں۔

#### دورِ جدید

برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ہندوؤں کو ایک نیا معاشری و سیاسی مقام نصیب ہوا اور انہوں نے تعلیم حاصل کر کے ادب میں نئی نئی روایات قائم کیں۔ ان کے مقابلے میں مسلمان انیسویں صدی کے اواخر تک دورِ متوسط کی روایت ہی پر عمل پیرا رہے، تاہم ۱۸۵۷ء کے بعد چند ایک کے علاوہ سبھی مسلمان مصنفین کو یہ روایات اختیار کرنا پڑیں۔ نئے نظامِ تعلیم کی نوعیت ایسی تھی کہ مسلمان انگریزی تعلیم سے محروم رہے۔ معاشی اور سیاسی اعتبار سے ان کی زیوں حالی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ان کا نظامِ قضاۃ لارڈ ہینشک کی حکمتِ عملی کی بھینٹ چڑھ چکا تھا اور حکومت کی طرف سے مقامی مدارس کی مالی اعانت بند کر دی گئی تھی، جس کی بدولت بہت سے مسلمان گھرانے بالکل تباہ ہو چکے تھے۔ ہینشک سے بھی بہت پہلے بندوبست اراضی اور اس کے ذیلی قانون کے تحت مدتِ معینہ کے اندر لگان کی عدم ادائیگی کی بنا پر اراضی کی نیلامی کے قاعدے نے ناواقف اور قانون سے بے بہرہ زمینداروں کی بہت بڑی تعداد کو تلاش کر کے رکھ دیا تھا۔ اکثر زمینداریاں ان کے

سے کام لیا جاتا ہے، مثلاً کشتی، کسی پر خطر یا طوفان زدہ دریا میں اس کا سفر، منڈی، دروازے، کھڑکیاں، وغیرہ، یہ سب علامتیں ہیں جس سے جسدِ انسانی یا عالمِ فانی اور اس میں روح کا مقام اور کیفیت سے مراد لی جاتی ہے۔ یہ تمام علامات روزمرہ زندگی سے لی جاتی ہیں، لہذا انہیں اختیار کرنے میں شاعر کوئی پابندی محسوس نہیں کرتا اور یہ مؤثر بھی ہوتی ہیں۔ یہ عوامی روایت ابھی تک زندہ ہے اور آج کل بھی دیہاتی شعرا ایسی نظموں کی تخلیق کر رہے ہیں جن میں شعری حسن بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔

ادب میں ہندو اور مسلم تہذیبوں کا امتزاج: شروع شروع میں مسلمان آباد کار اور مقامی نومسلم اپنے مذہب میں تولاً اور فعلاً راسخ العقیدہ اور کٹر تھے، لیکن آہستہ آہستہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسم و رواج میں ایک امتزاج ہونے لگا، جسے وشنومت سے خاص طور پر تقویت ملی۔ تہذیب کی عوامی سطح پر مقامی ہندو باشندوں کے اوہام نومسلموں میں باقی رہ گئے تھے۔ پھر ناتھ فرقے کی بدولت اس امتزاج باہمی کی مزید حوصلہ افزائی ہوئی، چنانچہ گورو اور پیر کو یکساں طور پر قابلِ احترام سمجھا جاتا تھا۔ اس رجحان کا قدیم ترین نمونہ فیض اللہ کی گورکش وچے یا میناچٹن گورکش وچے اور ستیہ پیریر پنچلی میں ملتا ہے جن میں ہندو دیوی دیوتاؤں اور مسلمان پیروں سے یکساں عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے سید سلطان جیسے شاعر نے بھی وشنو، شو اور کرشن کو انبیا میں شمار کیا ہے۔ یوگ قلندر گیت بھی اسی سلسلے کی کڑی ہیں، جنہیں ایسے صوفیہ اور ان کے مریدوں نے لکھا جن کے نزدیک حقیقتِ مطلق کا باطنی تصور سب کے یہاں ایک سا ہے۔ اس کی ایک مثال



تمدن کا تمام تر اثر ہندوؤں نے قبول کیا۔ انہوں نے وقت کے تقاضوں کو سمجھا اور اپنے آپ کو ان کے لیے بخوبی تیار کر لیا۔ ان میں اپنی اصلاح اور نشاۃ ثانیہ کا جذبہ بھی پیدا ہوا۔ ہنگلہ نثر وجود میں آئی، نئی نئی رزمیہ غنائی اصناف شعر میں سخن آرائی ہونے لگی، ناول منظر عام پر آیا اور اس نے بہت جلد ادب میں ایک مستقل مقام پا لیا۔ ادب میں نئی نئی اصناف کا سگہ چلنے لگا اور رومانی اور پوتھی ادب صرف گاؤں کی چوپال تک محدود ہو کر رہ گیا۔ یہ تینوں نئی اصناف، یعنی نظم، نثر اور ناول، نو تعلیم یافتہ ہندو معاشرے کے تقاضوں کو بڑی حد تک پورا کرنے لگیں۔ ہندو مصنفین نے مسلم معاشرے کو درخور اعتنا ہی نہ سمجھا، کیونکہ اول تو وہ اس کے بارے میں کچھ لکھ ہی نہیں سکتے تھے اور دوسرے یہ بات ان کے مقصد، یعنی ہندو تہذیب کے احیاء کے بھی خلاف جاتی تھی۔ اس کے برعکس بعض مصنفین، مثلاً بنکم چندر چٹرجی، کے ہاں تو اسلامی حکومت کے خلاف سخت بغض و عناد کا پتا چلتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب مسلمان مصنفین نے قلم اٹھایا تو انہوں نے دیکھا کہ اس دوران میں ایک ایسی نثر ترقی کر گئی ہے جس کی زبان ان کی روزمرہ بول چال سے بالکل مختلف ہے، مغرب سے درآسہ ناول کی روایت روز افزوں مقبول ہو رہی ہے اور نئے طرز کی شاعری پوتھی روایت کو کہیں پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گئی ہے۔ پھر ان اصناف میں جو اقدار جاری و ساری تھیں ان کا تعلق ہندو معاشرے سے تھا۔ ادب کی ہیئت، زبان اور مضامین کی اسلامی روایات فرسودہ، ناکارہ اور ناقابل قبول قرار پا چکی تھیں۔ پوتھی ادب اب صرف دیہات کی چیز تھی۔ کلکتے کا تعلیم یافتہ معاشرہ بائرن، شیلے، کیٹس، بلٹن اور شیکسپیر کو اپنا

ہاتھ سے نکل کر خود انہیں کے ہندو مختاروں کے قبضے میں جا چکی تھیں جو جدید قوانین سے بخوبی واقف تھے۔ ان کی یہی معاشی بدحالی انگریزی تعلیم کے حصول میں سب سے زیادہ مانع رہی کیونکہ صرف امیر لوگ ہی اپنے بچوں کو یہ تعلیم دلا سکتے تھے۔ اگر یہ صورت حال نہ ہوتی تو مسلمان یقیناً بہت عرصہ پہلے ترقی کر جاتے۔ مزید برآں خود حکومت کی پالیسی بھی یہ تھی کہ مسلمانوں کی کسی طرح اعانت نہ کی جائے، بلکہ ہندوؤں کو ہر طرح سے ابھارا جائے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ مقامی باشندوں کو عیسائی بنانے کی غرض سے جگہ جگہ مشن سکول کھولے جا رہے تھے۔ قدرتی طور پر مسلمان ایسے اداروں سے دور رہے جن سے انہیں اپنے مذہب پر آنچ آنے کا اندیشہ تھا۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اسی زمانے میں تاجروں اور کاروباری لوگوں پر مشتمل امرا کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا۔ دارالحکومت بننے کے بعد کلکتے نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور وہ مغربی تہذیب کا مرکز بن گیا جسے اختیار کرنے کے لیے یہ نیا طبقہ بری طرح بے تاب تھا۔ مسلمانوں کا طبقہ امرا زمینداروں پر مشتمل تھا لہذا وہ کلکتے کی ترقی پذیر زندگی سے کوئی رابطہ پیدا نہ کر سکا۔ پھر انیسویں صدی کے آخر تک ملک تیز رفتار ذرائع حمل و نقل سے بھی نا آشنا تھا، چنانچہ دیہات اور شہروں کے مابین فاصلے کم نہ ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان عوام نے نئے تصورات سے کوئی اثر قبول نہیں کیا بلکہ انہیں یہ بھی احساس نہ ہوا کہ تہذیبی قیادت اب بڑی تیزی سے ان کے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ یہی وہ معاشی اسباب تھے جن کی بنا پر ”مسیحی“ تعلیم کو حرام ٹھیرانے والے فتوے اتنے مؤثر ثابت ہوئے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مغربی تہذیب و

نظمیں تنقید کے معیار پر پوری نہیں اترتیں۔ ماضی کی تعریف، حال کا ماتم اور مستقبل کے لیے پند و نصیحت اس روایت کا حصہ ہے جو فرخ احمد تک تمام مسلمان شعرا کے ہاں ملتی ہے۔ بیسویں صدی میں اس روایت کا سب سے بڑا علمبردار نذراالاسلام ہے۔ خالد، زغلول پاشا، کمال پاشا، انور پاشا، محرم، شط العرب، اس کی بہت مشہور نظمیں ہیں جن میں اسمعیل حسین شیرازی کی نظم انال پر بہو کی مخصوص روایت کی تقلید کی گئی ہے۔ کیقباد: محرم شریف؛ فرخ احمد: سات ساگریر ماجھی اور علی احسن: مکہ معظمیر پاتھے بھی اسی انداز کی حامل ہیں۔

اس شعری رجحان کے تحت ایک اور اہم اور قابل ذکر روایت ابھری، یعنی سوانح، تاریخ اور تاریخی قصوں کے ذریعے ماضی کا احیا۔ کیقباد: سہاشابن کویہ، شومندر اور محرم شریف؛ معظم الحق: حضرت محمدؐ؛ اسمعیل حسین شیرازی: سپین وخبے کویہ؛ حمید علی: قاسم بادہ کویہ، جینال ادھار کویہ اور سہراب بادہ کویہ تاریخی قصے ہیں، جن سے ان مصنفین کے قول کے مطابق دو مقاصد پورے ہوتے ہیں: اول مسلمانوں کی عظمت اجاگر کرنا اور دوم فنی مسرت بہم پہنچانا۔ میر مشرف حسین کی وشاد شندھو، حضرت عمریر دھرم جیون لاپو، حضرت بلالیر جیونی، حضرت ابیر حمزار دھرم جیون لاپو، مدینار گوراو، مسلم یرت، اسلامیر جے اسی ذیل میں آتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں سے بعض تواریخ ہیں، لیکن بعض، مثلاً وشاد شندھو، خیالی قصوں پر مشتمل ہیں۔ بہر حال ان کا تعلق ایک ہی روایت سے ہے، یعنی ماضی کو بطور مطمح نظر پیش کرنے کی کوشش اور قارئین کے دل میں ایام گزشتہ کے لیے ایک جذباتی تڑپ پیدا کرنا۔

کیقباد: محرم شریف اور سید منطمان:

مطمح نظر بنا چکا تھا۔ لہذا مسلمانوں کو اس روایت کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا پڑا اور اپنی سی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔

اس سلسلے میں ان کی مساعی نے جو شکل اختیار کی وہ یہ تھی: اول تو انہوں نے ماضی قریب کے بجائے ماضی بعید، یعنی اسلامی زندگی کی انتہائی عظمت و شان کے زمانے کو اپنا موضوع بنایا۔ مقصد یہ تھا کہ اقتدار کا ایک ایسا پیمانہ تلاش کیا جائے جو ایک طرف تو مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہو اور دوسری طرف اس کی روشنی میں ان کے لیے ایک ایسا اعلیٰ نصب العین متعین ہو جائے، جو ہندوؤں کے آدرش رام راج کا مقابل ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کی سوانح عمریاں لکھی اور شائع کی گئیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ دور طنزیہ ادب کا نہیں تھا، کیونکہ معاشرے میں اس قدر کھچاؤ تھا کہ وہ طنز کی اہمیت اور مفہوم کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ یہ دور جذباتی انداز فکر اور انداز بیان کا تھا۔

اس انتہائی جذباتی اور غیر تنقیدی اسلوب کا لہجہ ناصحانہ تھا اور طرز بیان میں تہیثیرین تھا۔ الاسلام میں مولانا منیر الزمان اسلام آبادی کا سلسلہ مضامین ہو یا اسمعیل حسین شیرازی کا انال پر بہو، سب میں یہی مصلحانہ طرز، یہی ناصحانہ انداز اور یہی جذباتی لہجہ نمایاں ہے، حتیٰ کہ لطف الرحمن اور یعقوب علی چودھری کے مضامین سے بھی یہ لہجہ اور مزاج جھلکتا ہے۔ جہاں تک معاشرے کی خرابیوں کا جائزہ لینے کا تعلق ہے یہ مضامین تنقیدی ہیں، لیکن ان میں جہاں بھی ماضی کی عظمت اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں انداز تحریر جذباتی ہو گیا ہے۔ حسن ترتیب اور فنی سہارت کے فقدان کے باعث اکثر ابتدائی



تڑپ کے ساتھ ساتھ ابھر رہا ہے۔ میر مشرف کی زمیندار درپن ہو یا اسمعیل حسین شیرازی کی ستری شگھا، سید واجد علی کی بنگالیر بھوشوت ہو یا بیگم رقیہ سخاوت حسین کی مائی چور، ان سب کی غرض محض یہ ہے کہ معاشرے کو اس طرح آئینہ دکھایا جائے کہ وہ اپنے نقائص سے آگہ ہو کر انہیں دور کرنے پر مجبور ہو جائے۔ نذراالاسلام اور فرخ احمد کے مطمح نظر کو بھی خالص جمالیاتی نہیں کہا جا سکتا۔ اپنی ایک نظم میں نذراالاسلام نے اس کی وضاحت کر دی ہے:

مجھے اس کی پروا نہیں کہ جب موجودہ دور کا جوش و خروش ختم ہو جائے گا تو کوئی بھے یاد بھی کرے گا یا نہیں؛ میرے لیے یہی کافی ہے کہ میرے سر پر سورج چمک رہا ہے اور سینکڑوں سنہری لڑکے لڑکیاں میرے گرد چل پھر رہے ہیں۔

وہ آزادی اور اصلاح کا خواہاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شروع دن سے آزادی ملنے تک تقریباً سبھی مسلمان مصنفین نے عینیت کے باوصف حقیقت پسندی کا ثبوت دینے کی کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں ان کی حقیقت پسندی نے طنز کی شکل اختیار کر لی ہے، جیسے زمیندار درپن میں۔ بعض اوقات انہوں نے لکھنے والوں کو انتہائی رومانی بنا کر جاگنے کے خواب دیکھنے پر مجبور کر دیا ہے اور کبھی وہ خالص حقیقت نگار ہو کر رہ گئے ہیں، مثلاً قاضی امداد الحق: عبدالله اور اکرام الدین: ناتن ما۔ معجب الرحمن کا انور پہلا ناول ہے جو کسی مسلمان کے قلم سے نکلا۔ اس میں رومان اور حقیقت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ مسلمان مصنفین اپنے مطمح نظر کے اعتبار سے زیادہ تر رومانی تھے، لیکن معاشری مسائل کو پیش کرتے وقت حقیقت پسندی سے

نوی ونگش میں جو فرق پایا جاتا ہے اس سے یہ صاف طرز پر پتا چل جاتا ہے کہ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی کے مقابلے میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی یہ اقدار مذہب میں سخت احتیاط کی متقاضی ہیں۔ تحریک خلافت نے اس مذہبی احتیاط کو اور بھی ہوا دی اور تحریک پاکستان میں اس نے اپنا حقیقی نصب العین پا لیا۔ سید سلطان کی مذہبیت صوفیانہ نوعیت کی تھی، لیکن اس رجحان کا انداز محاربانہ ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں کو ایسی قیادت نہ ملی جس میں دین و سیاست کا امتزاج ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے بعد مذہب کے بارے میں اس احتیاط پسندانہ رجحان سے صحیح کام نہ لیا جاسکا۔ مزید برآں مسلمانوں میں یہ مذہبی احساس ایک حد تک ان کی ہندوؤں کے خلاف جد و جہد کا نتیجہ بھی تھا، لہذا آزادی کے بعد جب یہ منفی نوعیت کا محرک باقی نہ رہا تو اس احساس کی شدت میں بھی کمی آگئی اور اس کا رخ داخلی مسائل کی طرف ہو گیا۔ بایں ہمہ اس مذہبی اور سیاسی جوش نے فرخ احمد اور بیسویں صدی عیسوی کے چوتھے عشرے کے نوجوان شعرا کی ایک جماعت کی شاعری پر اور محمد واجد علی اور معجب الرحمن خان کے نیم مذہبی مضامین پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔ اس کے علاوہ اسی کی بدولت مسلمانوں کی توجہ پمفلٹ نویسی اور صحافت کی طرف بھی سبذول ہوئی۔ اس طرح اس نے نہ صرف مسلمانوں کو ایک نئی طرز فکر دی، بلکہ نئی نئی اصناف کو ترقی بھی دی اور زبان کی حدود میں توسیع کی۔

ان اصناف میں کتنی جان ہے اور ان کا ذخیرہ الفاظ کہاں سے آیا؟ اسے سمجھنے کے لیے ہمیں عصر حاضر کے مسائل کے بارے میں اس تنقیدی رویے کو ملحوظ رکھنا ہوگا جو ماضی کے لیے جذباتی

دروست میں کلاسیکیت اور روایات کی پابندی ٹیگور کی نظموں کے مقابلے میں کہیں کم ہے۔ بہر حال وڈروہی، نیز ہجارتی اور سندھو میں فنی اعتبار سے اس نے ٹیگور کی تقلید کی ہے، لیکن ان میں جو موسیقیت پائی جاتی ہے وہ قطعی طور پر اس کی اپنی ہے۔ ان نظموں میں قوت، جوش اور روانی کے علاوہ الفاظ ایک تیز دھارے کی طرح اٹڈے چلے آتے ہیں، جس کے باعث ان میں ایک ایسی تیز حرکت کا احساس ہوتا ہے جو ٹیگور کی شاعری میں نظر نہیں آتی۔ نذراالاسلام کی جن خطیبانہ نظموں میں گزشتہ زمانے کے مسلمان ابطال کے جذبے اور عظمت کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان کی بحر ”ماتراورثہ“ قسم کی ہے اور ستین دت سے مستعار ہے، لیکن نذراالاسلام نے اسے اس کثرت سے استعمال کیا ہے کہ اب وہ اسی کے نام سے وابستہ ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری میں ہم جہاں بھی اس قسم کی خطابت دیکھتے ہیں تو ذہن میں فوراً اس کا نام آ جاتا ہے۔ شاعری میں نذراالاسلام کی اپج اس تعلق کی مرہون منت ہے جو اسے فارسی شاعری سے رہا ہے۔ نذراالاسلام ہی وہ شاعر ہے جس نے بنگلہ میں اس تعلق کو از سر نو زندہ کیا اور غزل کو ایک وقیع صنفِ سخن کا درجہ بخشا۔ اس کی غزلیات نے اپنی شیریں بحروں، لطیف و دلکش انداز، سریع الفہم بیان اور حسن ترنم سے بنگالی عوام کو مسحور کر دیا۔ علاوہ ازیں اس نے دیوانِ حافظ کی چند غزلیات اور قرآن مجید کی کچھ آیات کا ترجمہ بھی کیا۔ یوں اس کی مساعی سے نشاۃ الثانیہ کی ایک نئی تحریک کا آغاز ہو گیا۔ فارسی شاعری سے رابطہ پیدا ہوا تو مسلمانوں کو سخن آرائی کے لیے ایک وسیع میدان مل گیا، حتیٰ کہ اس سے ستیندرناتہ اور موہت لال ماجمدار بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔

کام لیتے تھے۔ اکثر اوقات ایک ہی مصنف میں عینیت اور حقیقت پسندی بیک وقت ملتی ہے، چنانچہ میر مشرف اور اسمعیل حسین شیرازی کو بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی پیچیدہ انداز نظر کی بدولت اصناف ادب کی ہیئت متعین ہوتی ہے اور مصنفین ایک مخصوص زبان کا انتخاب کرتے ہیں۔

نظم: مسلمان مصنفین نے تمام مروجہ اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، تاہم اس دور میں انہوں نے کوئی نئی صنف یا ہیئت دریافت نہیں کی۔ شاعری میں کعباد نے اس سنسکرت رزبے کی تقلید کی جس کی تجدید و اصلاح مدھو سودن کے ہاتھوں ہوئی تھی اور آگے چل کر ہیم چند اور نویں سین بھی اسی کے نقش قدم پر چلے تھے۔ ان سب نے مدھو سودن کی اختراع کردہ نظم معرا کو اختیار کیا اور اسی میں سخن آرائی کی۔ نذراالاسلام کے منظر عام پر آنے سے قبل مسلمانوں میں سب سے کامیاب شاعر کعباد تھا، جس کی رزبہ منظومات شعری اعتبار سے واقعی بلند پایہ ہیں۔ اپنے عہد کے ہندو مصنفین کی طرح وہ مہاشاشن کوپہ میں مغلیہ عظمت کو یاد کرتا، مسلمانوں کی موجودہ محرومی پر آنسو بہاتا اور اس کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم مفاہمت کی دعوت دیتا نظر آتا ہے۔ محرم شریف، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اس کی ایک اور رزبہ نظم ہے، جس کا موضوع عہدِ گزشتہ کا ایک المیہ ہے۔ غنائی شاعری میں اس نے اور اسداد علی نے بہاری لال اور اس کے ہم عصر شعرا کی پیروی کی۔ اسمعیل حسین شیرازی کی انال پر بہو میں وہی خطابت نمایاں ہے جو نویں سین کی پلاشیر جڈھا میں دکھائی دیتی ہے۔ ہیئت میں جڈت اور اپج کا سراغ ہمیں پہلی بار نذراالاسلام اور جسیم الدین کے ہاں ملتا ہے۔ نذراالاسلام کی وڈروہی نظم آزاد میں ہے اور اس کے



ایسا دور بھی آیا کہ اشتراکیت اور آزادی کی تحریکوں نے اس سے غربا، غربت، مساوات، اخوت اور حریت جیسے موضوعات پر نظمیں لکھوائیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے وہ ٹیگور کے مقابلے میں کہیں زیادہ رواداری اور وسیع الخیالی کا ثبوت دیتا ہے۔ ٹیگور نے مغرب سے تو اکثر خیالات و تصورات اخذ کیے، لیکن اسلامی معاشرے، روایات اور تصورات کو نظر انداز کر دیا۔ ایسا اس نے عمداً نہیں کیا، بلکہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایات و تصورات اس کے اندر کسی طرح کی جذباتی تحریک پیدا کرنے سے قاصر تھے۔ نذراالاسلام پہلا شاعر ہے جس نے فارسی اور عربی الفاظ بکثرت استعمال کر کے یہ تقاضا پورا کیا۔ عربی و فارسی الفاظ کے استعمال کے سلسلے میں نذراالاسلام اور پوتھی ادب کے مصنفین میں یہ فرق ہے کہ مؤخرالذکر ان کی وہ اشکال استعمال کرتے تھے جو بنگلہ زبان میں مسخ ہو کر رواج پا گئی تھیں، لیکن نذراالاسلام نے انہیں ان کی اصل شکل میں اختیار کیا۔ گویا پوتھی لکھنے والے تو صرف وہی الفاظ استعمال کر رہے تھے جو روزمرہ زندگی میں عام طور پر مروج تھے، مگر نذراالاسلام نے شعوری طور پر ان کے احیا کی کوشش کی۔ عربی اور فارسی الفاظ کو ان کی اصل شکل میں استعمال کرنے سے اس امر کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ نذراالاسلام انہیں ان کی عامیانه اور بازاری شکل میں استعمال کر کے تعلیم یافتہ لوگوں کی تضحیک کا نشانہ بننا نہیں چاہتا، تاہم دیہاتی زندگی کے موضوع پر اس کی بعض نظموں میں یہی عامیانه اشکال ملتی ہیں۔ نذراالاسلام سے قبل ستیندر ناتھ دت اور موہت لال ماجمدار کی چند نظموں (مثلاً ستیندر ناتھ: نور جہاں) میں عربی و فارسی الفاظ کا استعمال ہوا ہے، لیکن یہاں در حقیقت انہوں نے بھارت چندر کی پیروی کی ہے جو کردار اور موقع

نذراالاسلام کی شاعری کا مطالعہ اس بنگلہ شاعری کی روشنی میں کرنا چاہیے جس کا ارتقا ٹیگور کے زیر اثر ہوا تھا، بالکل اسی طرح جیسے کیتباد کی رزمیہ منظومات کا مطالعہ اس کلام کے حوالے سے کرنا ضروری ہے جس کا ارتقا سدھوسودن کی تخلیقات کا مرہون بنتا تھا۔ نذراالاسلام سے قبل ٹیگور زبان کی اصلاح کا کام ختم کر چکا تھا اور اس کی کوشش سے بنگلہ میں لطافت، لچک، تاثیر اور جامعیت پیدا ہو چکی تھی۔ اس نے احساس و ادراک کی حدود کو وسیع کیا، عالمگیر انسانی موضوعات پر زور دیا اور مذہبی شاعری کے علاوہ کئی اور اصناف سخن کو آزمایا۔ ان میں قدرتی شاعری بھی شامل تھی۔ یہ انگریزی کی ان رومانی منظومات سے مشابہ تھی جو انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں ورڈزورتھ کی قدرتی شاعری کے زیر اثر تخلیق ہوئیں، لیکن ٹیگور نے اپنے جذبات و تجربات کو جن الفاظ میں ڈھال کر پیش کیا ان کا تعلق ہندو معاشرے کی زندگی، روایات اور زبان سے تھا۔ نذراالاسلام نے ٹیگور کی رومانیت کو قبول کر لیا، لیکن اس نے ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں کی روایات کو بھی اپنا کر اپنے موضوع کو وسعت دی اور اسلامی معاشرے میں مروجہ الفاظ و تراکیب اور محاورات کے استعمال سے اپنی لغت شعری میں معتدبہ اضافہ کیا۔ جہاں تک رومانیت کا تعلق ہے نذراالاسلام نے اس بات پر زور دیا کہ ایک طرف تو جمالیات کو ترک کر دیا جائے اور دوسری طرف اپنے دور میں پیش آنے والے واقعات کو فراموش نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانے میں تو تحریک خلافت کے زیر اثر اس کے اندر مسلمانوں کے ماضی کا شعور بیدار ہوا، جس کی بدولت اس کی شاعری پر مذہبی رنگ غالب آ گیا اور اس نے مسلمانوں کے ابطال کی مدح میں نظمیں لکھیں، لیکن آگے چل کر

ہنگال کی عوامی روایت سے عالمانہ دلچسپی کے اظہار کا آغاز اس کے استاد دینش سین سے ہو چکا تھا، لیکن جدید شعرا میں جسیم الدین نے پہلی بار زمانہ حال کے دیہاتی معاشرے کی عکسی کی اور اسے کردار پیش کیے جو ماضی قریب میں جیتے جاگتے ہمارے دینہات میں موجود تھے۔

جسیم الدین کے ہاتھوں منظوم لوک کہانیوں کی ہیئت کا جو احیا ہوا تھا اس سے قطع نظر ہمیں باعتبار ہیئت کسی جدت یا اختراع کا نشان نہیں ملتا۔ بہر حال تحریک پاکستان کی بدولت اظہار کی نئی نئی صورتیں اور تخلیق کے نئے نئے بالخصوص اسلامی سرچشمے دریافت کرنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ اسی زمانے میں دو انجمنیں وجود میں آئیں: (۱) ۱۹۴۲ء میں انجمن احیائے پاکستان، کلکتہ اور (۲) اسی سال انجمن ادب پاکستان، ڈھاکہ۔ ان دونوں انجمنوں نے تخلیق ادب کے نئے نئے محرکات تلاش کرنے اور پرانے مسلمان مصنفین کے مخطوطات کو منظر عام پر لانے پر زور دیا۔ اسی کے ساتھ انہوں نے پوتھی ادب کی اہمیت اور پوتھی مصنفین کی روایت پر بھی زور دیا۔ اگرچہ بعض علما بہت عرصہ قبل مسلمانوں کے پوتھی ادب کے مخطوطات کو جمع کرنے کا کام شروع کر چکے تھے، لیکن حصول آزادی کے بعد یہ پوتھیاں پہلی بار علمی مطالعے کا مرکز بنیں۔ بایں ہمہ پوتھی کی ہیئت اور رومانی بیانیہ نظموں کی روایت دوبارہ زندہ نہ ہو سکی، البتہ ان سے افکار و تصورات ضرور اخذ کر لیے گئے۔ علی احسن: چہار درویش ایک قدیم پوتھی کہانی ہے، جسے جدید انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح حال ہی میں فرخ کی حاتم طائی ہمارے سامنے آئی ہے، جو قدیم کہانیوں کی ایک نئی شکل ہے اور جس میں Decameron طرز کے قدیم دیہاتی قصے بیان

کی مناسبت سے عربی اور فارسی الفاظ سے کام لیا کرتا تھا۔ بھارت چندر نے ماحول اور فضا کے پیش نظر اپنے مسلمان کرداروں کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرائے ہیں، یا صرف نواب کے دربار میں انہیں استعمال کیا ہے۔ نذرالاسلام کے ہاں صورت حال مختلف ہے۔ اس نے انہیں سنسکرت اصل کے الفاظ کی جگہ استعمال کیا، مثلاً خون بجائے رکت، بمعنی لہو۔ ٹیگور کو اس پر اعتراض تھا۔ اس کے نزدیک اس طرح خواہ مخواہ غلط معنی پیدا ہو جاتے ہیں، کیونکہ خون سے قتل بھی مراد لیتے ہیں۔ بہر حال نذرالاسلام نے اسے استعمال کیا تو اس لیے کہ مسلمان اس لفظ کے دونوں معنوں سے بخوبی واقف تھے۔

غلام مصطفیٰ کا نام صف اول کے ان مسلمان شعرا میں لیا جا سکتا ہے جن کے تخلیقی کارنامے قابل قدر ہیں۔ اس نے مسلمانوں کی بیداری کو بڑی کامیابی سے موضوع سخن بنایا۔ شہادت حسین ایک اور شاعر ہے جس نے گزشتہ عظمت کو ایک رومانی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی۔

اس میدان میں جسیم الدین نے جو کارنامہ سر انجام دیا ہے وہ بھی کچھ کم قابل قدر نہیں۔ وہ پہلا شاعر ہے جس نے منظوم لوک کہانی (ballad) کی ہیئت کو جدید انداز میں پیش کیا، جیسا کہ کتلول یوگا میں آچنتیہ سین گھٹا نے تصدیق کی ہے جسیم الدین کی کور فی الفور مقبول ہو گئی۔ اس کی نظمیں نکشی کاٹھار مٹھ اور سوجان و دیار گھاٹ ہیئت اور اسلوب کے اعتبار سے یکتا ہیں۔ انہیں نہ تو رزمیہ قرار دیا جا سکتا ہے نہ صحیح معنوں میں قدیم منظوم لوک کہانیاں کہہ سکتے ہیں۔ یہ طویل بیانیہ نظمیں ہیں جن میں عوامی روایت کو اس کی تمام تر سادگی اور شدت کے ساتھ ڈرامائی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مشرقی



کیے گئے ہیں۔

ان میں سے فرخ احمد سب سے کامیاب شاعر ہے۔ اس نے نذراالاسلام کی روایت کو آگے بڑھایا۔ چونکہ اس نے تحریک پاکستان کے دنوں ہی میں لکھنا شروع کیا تھا، لہذا اس نے شعوری طور پر عربی اور فارسی الفاظ کا اس کثرت سے استعمال کیا جو بعض لوگوں کے قول کے مطابق خبط کی حد تک پہنچ گیا۔ بہر حال فرخ احمد کا سب سے بڑا کارنامہ سندباد کی کہانی ہے جو اس نے تمثیلی انداز میں لکھی۔ نذراالاسلام کا اسلوب تمثیلی ہے نہ علامتی۔ اس کے تخیلی پیکر اس کی ذاتی واردات اور علم سے ماخوذ ہیں۔ اس کے برعکس فرخ احمد اپنی داستان ہمیشہ علامتی طور پر بیان کرتا ہے۔ سندباد مسلمانوں کے معاشرے، شعور، جمود، عظمت اور اولوالعزمی کی علامت ہے۔ کوہ حرا تخلیقی تحریک کے سرچشمے، پاکیزگی اور نزہت و نفاست کی مثالی سر زمین اور جنت الفردوس کی علامت ہونے کے علاوہ وہ مقام ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر وحی نازل ہوئی تھی۔ اس طرح فرخ احمد پہلا شاعر ہے جس نے بنگلہ شاعری کو وہ موضوع دیے جو اقبال نے اردو شاعری میں پیش کیے تھے اور یوں مسلمانوں کے ماضی اور اسلامی روایات کو بڑی کامیابی سے شعر کے پردے میں بیان کیا۔ سات ساگریر ماجھی میں فرخ احمد امید اور امنگ کے شاعر کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اپنے رجحان اور ہیئت و خیال کے اعتبار سے وہ حقیقت پسند نہیں، لہذا اس کے ہاں روایات میں بعد زمانی و مکانی کی خصوصیت برقرار رہتی ہے۔

اسی اثنا میں بنگلہ شاعری نے ایک نئی راہ اختیار کی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلٹ اور بیسویں صدی عیسوی کے تیسرے عشرے کے نوجوان انگریزی شعرا کے زیر اثر اسی زمانے میں بنگال کے اندر ایک نئی شاعری نے جنم

لیا جو حقیقت پسند، تنقیدی، تجزیاتی، تعریض آمیز، طنزیہ اور معاشرتی شعور کی حامل تھی۔ جن نوجوان مسلمان شعرا نے اس ڈگر کو اپنایا ان میں غلام قدوس، احسن حبیب اور عبدالحسین قابل ذکر ہیں۔ غلام قدوس اشتراکیت کی طرف مائل ہے۔ احسن حبیب نے اپنی رومانیت کو قائم رکھا ہے۔ عبدالحسین ایک ایسا جدید شاعر ہے جس کے ہاں تنقیدی انداز نمایاں ہے۔ علی احسن بنیادی طور پر رومانی تھا، لیکن اس نے اپنے رومانی جذبات کا اظہار جدید اسلامی شعور کے حوالے سے کیا۔

مختصر یہ کہ قیام پاکستان سے قبل کی جدید شاعری میں دو رجحانات واضح طور پر سامنے آچکے تھے: (۱) مسلمانوں کے جدید شعور کی تلاش کا رجحان، جسے پہلی بار فرخ احمد نے پیش کیا اور جس کی نمائندگی علی احسن کے علاوہ تعلیم [طالب؟] حسین، مفکرالاسلام اور علی اشرف جیسے نوجوان شعرا کرتے ہیں؛ (۲) مسلمانوں اور ہندوؤں کے معاشرتی خد و خال کو ملحوظ رکھے بغیر، بلکہ انہیں نظر انداز کرتے ہوئے جدید ذہن اور معاشرتی مسائل کی تلاش کا رجحان، جس کے نمائندہ شاعر غلام قدوس، احسن حبیب اور عبدالحسین ہیں۔

نثر و افسانہ: سادھو بھاشا کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہ زبان فورٹ ولیم کالج کے پنڈتوں نے سنسکرت سے الفاظ اور نحوی تراکیب مستعار لے کر اور حتی الامکان عربی اور فارسی اصل کے الفاظ بنگلہ سے خارج کر کے تیار کی تھی۔ یہ ایک بے ڈھنگی، لنگڑی، مغلج اور کتابی زبان تھی۔ عربی و فارسی الفاظ کی جگہ قدیم سنسکرت کی ثقیل اصطلاحات اور متعلقہ تراکیب قبول کر کے ایک ایسی مصنوعی زبان اختراع کی گئی جو ہر اعتبار سے غیر فطری تھی۔ متأخر مصنفین نے اسے فطرت سے قریب تر لانے اور اس میں لچک اور روانی

کتاب میں، جو اس صدی کے دوسرے عشرے میں شائع ہوئی تھی، نقطہ عروج پر پہنچا دیا۔ اس کی کاسیابی کا راز یہ ہے کہ اس نے صنعت سر حرفی، داخلی قافیہ آرائی، تجنیس صوتی اور ہم آہنگ عربی و فارسی الفاظ سے کام لینے میں انتہائی خوش اسلوبی کا ثبوت دیا۔ بدقسمتی سے متاخر مسلمان ادیبوں میں یہ روایت آگے نہ بڑھ سکی اور صرف عربی و فارسی کتابوں کے تراجم اور خصوصاً مذہبی تصانیف ہی میں اسے برقرار رکھا گیا۔ مولوی شمس الحق کے ترجمہ تذکرۃ الاولیاء کا گریش سین کے ترجمے سے مقابلہ کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ شمس الحق کا اسلوب کتنا بامحاورہ، مطابق فطرت اور مناسب و موزوں ہے اور گریش سین کے ہاں کس قدر تکلف و تصنع پایا جاتا ہے۔ شمس الحق نے اپنی تحریر کی بنیاد مسلمانوں کے روزمرہ پر رکھی، اس کے برعکس گریش سین نے ان تمام عربی و فارسی الفاظ سے احتراز کرنے کی کوشش کی جن کا چلن مسلمانوں میں عام ہے۔ ابھی تک مسلمان ادیبوں نے بامحاورہ زبان کو اپنانے اور اسے ترقی دینے کی کوشش نہیں کی، چنانچہ نذرا لاسلام کی روایت ہنوز ان کی توجہ کی منتظر ہے۔

نئے معاشرتی اور تہذیبی حالات اس امر کے متقاضی تھے کہ مسلم معاشرے کے احساسات کے اظہار و ابلاغ کے لیے کوئی نیا اسلوب وضع کیا جائے۔ نو تعلیم یافتہ افراد میں ایک نیا تنقیدی شعور پیدار ہو رہا تھا۔ مزید برآں نشاۃ ثانیہ کی تحریک سے نئی نسل کو اپنے حالات کا از سر نو جائزہ لینے اور اپنی تہذیبی روایات کی بقا و تحفظ کا احساس ہو چلا تھا، لہذا نثر میں باعتبار موضوع تین رجحانات سامنے آئے۔

(۱) بنگلہ نثر میں مذہبی ادب پیدا کرنے کا رجحان: اسے دراصل اسی رجحان کے تسلسل کے

پیدا کرنے کے لیے انگریزی نثر کا سہارا لیا اور اس میں چلت بھاشا (= بول چال کی زبان) کی خصوصیات شامل کیں۔ پہلے مسلمان نثر نگار میر شرف حسین نے قلم سنبھالا تو اس وقت یہ نیا اسلوب وجود میں آنے کے بعد پوری طرح نشوونما پا چکا تھا۔ ایشور چندر ودیا ساگر نے بے ساختہ اور روان دوان بنگلہ بول چال کی مدد سے بنگلہ نثر کو اس کی موجودہ ہیئت و ساخت دے دی تھی اور وہ اس کی ترتیب و تنظیم مکمل طور پر سرانجام دے چکا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے چلت بھاشا کے بے تکلف انداز اور سادہ بھاشا کے علمی اسلوب کی آمیزش سے ایک ایسی نثر پیش کر دی تھی جو روزمرہ زندگی سے قریب ہونے کے باوصف ایک ادبی زبان کے وقار و استحکام کی بھی حامل تھی۔ اس نثر میں کوئی کمی تھی تو محض یہ کہ اس میں ان الفاظ و محاورات کو کوئی جگہ نہ دی گئی جو مسلم معاشرے میں مستعمل تھے۔ ٹیک چندر ٹھاکر، پیارے چند مترا، بنکم چندر چیٹرجی اور بنگلہ صحافیوں کی مساعی سے اس نثر کو مزید توسیع و ترقی نصیب ہوئی۔

نثر کا یہ معیاری نمونہ پوری طرح رواج پا چکا تھا، چنانچہ مسلمان ادیبوں کو بھی اسے اختیار کرنا پڑا۔ اس میں ان کا اضافہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک بار پھر عربی اور فارسی الفاظ داخل کیے جن کا استعمال مسلمانوں کی معاشرت و ثقافت اور مذہبی زندگی اور رسوم کے بیان میں ناگزیر تھا۔ شروع شروع میں وہ ان سے کام لینے میں ہچکچاتے رہے کیونکہ انہیں اپنی تضحیک کا خوف تھا، لیکن بعد ازاں وہ آزادی سے ان کا استعمال کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں انورا اور عبد اللہ جیسے ناولوں میں بھی لسانی روایت نظر آتی ہے۔ نذرا لاسلام نے اس روایت کو ویاتھر دان جیسی



منیرالزمان اسلام آبادی، ابراہیم خان، شیخ فضل الکریم، محمد واجد علی اور ڈاکٹر شہید اللہ کی بدولت یہ روایت زندہ رہی۔

(۴) زبان موضوع اور ہیئت کی مندرجہ بالا روایات کے علاوہ، جو اپنی اصل اور خصوصیات کے اعتبار سے خالصتاً اسلامی تھیں، مسلمان مصنفین نے ان روایات کو بھی قبول کیا جو جدید ہنگلہ ادب میں اس وقت تک نشو و نما پا چکی تھیں، چنانچہ انہوں نے اس ضمن میں اپنی سی مساعی کا آغاز کیا، جن کے باعث ہنگلہ ادب کو نئی حدود ملیں اور اس میں ایک نئی گہرائی پیدا ہوئی۔ بنکم چندر چیٹرجی، سرت چندر اور رابندر ناتھ جیسے نامور مصنف ہنگلہ ادب پر چھائے ہوئے تھے۔ مسلمان ادیبوں نے ہیئت میں کوئی خاص اختراع تو نہیں کی البتہ مروجہ ہیئت کو اپنے احساسات کے اظہار کے لیے بخوبی استعمال کیا۔

مسلمانوں کی سب سے زیادہ قابل ذکر مساعی ہنگلہ افسانے میں ہیں۔ ابتدا میں مسلمانوں نے اپنی توجہ خالص افسانے کے بجائے معاشرتی ناولوں پر مرکوز رکھی اور یہی مسلمانوں کا خاص میدان رہا ہے۔ نجیب الرحمن : انورا اور قاضی امداد الحق : عبداللہ میں مسلم معاشرے کی حقیقت پسندانہ اور ناقدانہ عکسی ملتی ہے۔ مسلمانوں کے ماضی کے بارے میں تاریخی افسانے معظم الحق اور اسمعیل حسین شیرازی نے لکھے اور اس سلسلے میں بنکم چندر چیٹرجی کے تاریخی ناولوں نے نمونے کا کام دیا۔ نذراالاسلام کی کوہیلکا اور مرتو خدا کے بعد یہ روایت طاق پر دھر دی گئی۔ بعد ازاں ابوالفضل : چوچیر اور قاضی عبدالودود کے ناول کے علاوہ سید ولی اللہ، ابو رشید اور شوکت عہان کے ناول ہمارے سامنے آئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تیسرے عشرے کے ختم ہوتے ہوتے افسانہ نگاری نے

طور پر شمار کرنا چاہیے جس کے تحت قبل ازیں مذہبی افکار و عقائد کو منظوم شکل میں پیش کیا جاتا رہا تھا۔ فرق یہ ہے کہ مؤخر روایت علمی اور معروضی تھی اور اس میں صحت کا بے حد خیال رکھا جاتا تھا، لیکن مقدم الذکر روایت جذبات انگیز اور عقلی تھی۔ گریٹ سین سے ڈاکٹر شہید اللہ تک کے تراجم قرآن مجید، یوسف علی خان اور دوسرے مصنفین کے تراجم تذکرۃ الاولیاء اور عربی و فارسی کتابوں کے دیگر تراجم سے ہنگلہ زبان کے وسیلے سے تبلیغ اسلام کی اس نئی کوشش کا سراغ ملتا ہے۔ ادنیٰ طبقے کے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی کوششیں جاری تھیں۔ ان کے پیش نظر شیخ عبدالرحمن نے کئی کتابچے شائع کیے اور بعد ازاں ہنگلہ زبان کی پہلی سیرت نبویؐ تحریر کی۔ مر سید کی طرح وہ بھی عقلیت پسند تھا۔ اس روایت کو مولانا اکرم نے برقرار رکھا۔ سیرت نبویؐ کے ذریعے مسلمانوں کے جذبات ابھار کر انہیں صحیح عقائد کی طرف راغب کرنے کی روایات یعقوب علی چودھری : نور نبی اور غلام مصطفیٰ : وشونوی کے ہاں ملتی ہے۔

(۲) عربی و فارسی ادب عالیہ کا ترجمہ و تلخیص : معظم الحق اور شیخ حبیب الرحمن ستیارتھ جیسے مصنفین عربی اور فارسی کی کلاسیکی کتابوں کو تلخیص کر کے یا ان کے بعض حصوں کو حذف کر کے ہنگلہ میں پیش کرنے لگے۔ اس طرح شاہنامہ، گلستان اور بوستان کو ہنگلہ کا جامہ پہنایا گیا۔ نذراالاسلام کا ترجمہ حافظ و عمر خیام اور ڈاکٹر شہید اللہ کے مختلف تراجم اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں۔

(۳) عربی و فارسی ادب عالیہ پر نقد و تبصرہ کی روایت : مثلاً برکت اللہ : پارسی پرتو۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دنیاے اسلام کے عظیم ادب کا خلاصہ عام قارئین سے متعارف کرایا جائے۔

مؤثر اور افسردہ شاعری کا، جس میں ماضی کے لیے ایک عجیب و غریب تڑپ پائی جاتی تھی۔

خلاصہ: بنگلہ ادب پر مسلمانوں کے اثرات کا جو جائزہ پیش کیا گیا ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں کی تمام تر ادبی کاوشیں ان کے معاشرتی احساسات سے وابستہ رہی ہیں۔ جب اس احساس میں تبدیلی پیدا ہوئی تو ان کی تخلیقی سرگرمیوں نے اپنے لیے ایک واضح اور مخصوص سمت اختیار کر لی۔ چونکہ یہ احساس ہندو معاشرے کے احساس سے ہر زمانے میں بنیادی طور مختلف رہا ہے، لہذا موضوع، ہیئت اور زبان کے اعتبار سے مسلمانوں کی ادبی روایات ہمیشہ اپنے مخصوص رنگ کی حامل رہیں۔ یہ امر قابل توجہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں اگرچہ زبان اور ہیئت کی بہ نسبت موضوع کا اختلاف کہیں زیادہ نمایاں تھا، تاہم مسلمانوں کے ہاں ہیئت کے اعتبار سے بھی ایک بنیادی فرق موجود رہا، جس کا ثبوت مسلمانوں کی بیانیہ منظومات اور ہندوؤں کی منگل گویاؤں کے تقابلی مطالعے سے ملتا ہے۔ لسانی اختلافات کا اظہار دراصل مسلمانوں کے زوال کے بعد ہوا۔ گویا یہ بھی مسلمانوں کی اپنی تہذیب کے مخصوص عناصر کو برقرار رکھنے کی ایک کوشش تھی، مگر یہ ایک ایسی کوشش تھی جو عموماً شکست خوردہ اقوام کی طرف سے عمل میں آتی ہے۔ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں ہندو دیومالا کو اپنا موضوع سخن بنانے سے قطعاً پرہیز نہیں کیا تھا، چنانچہ علاول جیسے انتہائی مذہبی قسم کے شاعر کے ہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے برعکس ہندو شعرا میں کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا جسے کسی اسلامی روایت کو موضوع بنانے کی توفیق ہوئی ہو۔ یہ وسیع القلبی مسلمانوں ہی کا خاصہ تھی۔ بد قسمتی سے اس آزاد خیالی کی بدولت ادب

بلا واسطہ تبلیغ اور سیاسی، معاشرتی و تہذیبی مقاصد ادب سے اپنا دامن چھڑا لیا تھا۔ ٹیگور کا نظریہ تھا کہ فن اپنے وجود و بقا کے لیے کسی اور چیز پر منحصر نہیں، چنانچہ مسلمان مصنفین نے خالص افسانہ لکھا جس کا اولین مقصد یہ تھا کہ فن کے ذریعے وارداتِ انسانی کا اس طرح ابلاغ کیا جائے کہ پڑھنے والوں میں جمالیاتی رد عمل پیدا ہو۔

بائیں ہمہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ادیب فن برائے فن کے نظریے پر ایمان لے آئے تھے۔ یہ ادیب روایتی معاشرے پر سختی سے معترض تھے اور انہیں محض اس بات سے کوئی آسودگی حاصل نہیں ہوتی تھی کہ اظہارِ حسن سے احساسِ مسرت پیدا کر دیا جائے۔ روس کے مارکسی انقلاب اور جدید تعلیم نے نئے افسانہ نگاروں کو نئے مسائل سے آگاہی بخشی اور جدید افسانے کی روایت کو متاثر کیا، چنانچہ ادب کی ایک نئی روایت ظہور میں آئی جو بیک وقت تنقیدی بھی تھی اور ہجویہ و طنزیہ بھی۔ اس سلسلے میں سید ولی اللہ کی تصنیف لال سالو پہلی کامیاب کوشش تھی جس سے اس روایت کا آغاز ہوا۔ شوکت عثمان کی نگارشات میں بھی یہی نیا رجحان نظر آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گزشتہ دور کے رومانی، معاشرتی ناولوں کی روایت کی جگہ تنقیدی، طنزیہ، معنی خیز اور زیادہ نفسیاتی قسم کے معاشرتی ناولوں کی موجودہ روایت نے لے لی۔

مختصر یہ کہ دورِ جدید میں سب سے پہلے تو قدیم و جدید روایات کا امتزاج ہوا، پھر ماضی کے سرمائے کا از سر نو جائزہ لے کر زمانہ حال کے تقاضوں کو پہچانا گیا اور بالآخر نفسیاتی، تنقیدی اور طنزیہ نگارشات کا جدید اسلوب پیدا ہوا۔ اسی زمانے میں شاعری میں بھی دو متصادم رجحانات ابھرے: ایک رجحان تو انتہائی جدید، شہری اور رومان دشمن تنقیدی شاعری کا تھا اور دوسرا نورومانی،



میں ہندو مسلم مخلوط تمدن کا ایک رنگ پیدا ہو گیا جو سراسر مصنوعی تھا۔ اس کا سراغ ہمیں ایسے مصنفین کے ہاں بھی ملتا ہے جو صوفی تھے یا صوفی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض نام نہاد مذاہب وجود میں آ گئے۔ یہ درست ہے کہ جب دونوں قوموں میں نشاۃ ثانیہ کی تحریکیں ابھریں تو یہ مذاہب بھی مٹ گئے، لیکن ان کے کچھ آثار بعض فرقوں (مثلاً وشنومت اور باول) میں باقی رہ گئے۔ بہر حال معاشرے کے مہذب، مقتدر اور تعلیم یافتہ طبقوں نے انہیں کبھی تسلیم نہیں کیا اور اس تہذیبی اختلاط و امتزاج کی بدولت جو کچھ لکھا گیا اس سے ادب بحیثیت مجموعی زیادہ متاثر نہیں ہوا اور آج اگر ادب میں ان کے کچھ آثار ملتے بھی ہیں تو انہیں ادنیٰ طبقے کے خصائص سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کی ادبی تخلیقات بطور مجموعی اگر ہندوؤں سے زیادہ نہیں تو ان کے مساوی ضرور تھیں، لیکن ہندوؤں کو مسلمانوں پر ایک اعتبار سے فوقیت رہی۔ اگرچہ مسلمان فرمانرواؤں ہی نے پہلی بار بنگلہ ادب کی سرپرستی کی تھی، تاہم مسلمانوں کے حکمران طبقے اور تعلیم یافتہ افراد نے بنگلہ کو اپنی تہذیب کی اشاعت اور اپنے احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنانے کے قابل کبھی نہ سمجھا۔ ان کے برعکس ہندوؤں نے یہ بخوبی سمجھ لیا تھا کہ اپنے مذہبی اور معاشرتی تصورات کی اشاعت کے لیے اس زبان کو اختیار کر لینا ضروری ہے۔ چونکہ مسلمان حکمران باہر سے آ کر بنگال میں آباد ہوئے تھے اور ساری مہذب دنیا پر عربی اور فارسی کا سگہ رواں تھا، لہذا تعلیم یافتہ مسلمان بدستور عربی اور فارسی ہی کو اہمیت دیتے رہے۔ بہر کیف مسلمانوں نے بنگلہ ادب کی سرپرستی کی

اور کچھ زمانہ گزر جانے کے بعد انہوں نے بنگلہ کو اپنی مادری زبان کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ عربی اور فارسی کے حق میں ہندوؤں کے ذہن پر اول تو اس قسم کا کوئی خیال مسلط نہیں تھا، دوسرے وشنومت کے پھیلنے ہی بنگلہ زبان کو ایک نئی اہمیت حاصل ہو گئی، کیونکہ سنسکرت کو ”دیو بانی“ ماننے والے کٹر ہندوؤں کے مقابلے میں وشنومت کے پیرووں نے بنگلہ ہی کو اپنی مذہبی زبان کا درجہ دے دیا تھا۔ عہد مغلیہ میں پٹھانوں نے بھی بنگلہ کو تسلیم کر لیا اور مصنفین نے اسے استعمال کرنے پر اظہار معذرت ترک کر دیا۔

دور حاضر میں اس مسئلے نے کوئی سنگین صورت اختیار نہیں کی۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اپنی قوم کو غلط تصورات کا شکار ہونے سے بچانے اور اپنے جائز معاشرتی اور سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ بنگلہ کو ذریعہ ابلاغ بنایا جائے۔ انہیں افسوس تھا کہ ماضی میں وہ کئی موقعوں سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ مذہبی خیالات رکھنے والے افراد نے بھی محسوس کیا کہ اگر بنگلہ کو موقع دیا جاتا تو وہ بھی مذہبی اقدار کی نشر و اشاعت میں فارسی اور اردو کا مقابلہ کر سکتی تھی۔ بہر حال اب وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے بنگلہ میں بنیادی مذہبی کتابوں کا ترجمہ کیا اور اسلام اور تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھیں۔ آج بنگلہ بھی مذہبی افکار کی نشر و اشاعت میں ویسی ہی کامیاب ثابت ہو رہی ہے جیسی کہ اردو، البتہ ابھی اس میں اردو کے برابر سرمایہ پیدا نہیں ہو سکا۔

جہاں تک جدید ادب کا تعلق ہے مسلمانوں کو ہندو مصنفین کی پیروی کرنا پڑی، کیونکہ وہ ان سے بہت پہلے اپنی مساعی کا آغاز کر چکے تھے۔

میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو ہمیں اسلامی زندگی اور تہذیب کے بارے میں اسمعیل حسین شیرازی، نذراالاسلام اوز فرخ احمد کی شاعری نظر آتی ہے اور دوسری طرف ابوالفضل اور شوکت حسین کے ناول اور احسن حبیب اور ابوالحسین کی منظومات ملتی ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کی مملکت وجود میں آئی تو یہی اظہارِ اسلامی بنگلہ ادب میں جاری و ساری تھا۔ [بنگلہ ادب کے پاکستانی دور کے لیے رَکَ بہ پاکستان؛ مآخذ کے لیے رَکَ بہ بنگالی، در (لا، لائڈن، بار دوم)۔ (سید علی اشرف)

• **بنگن پلے**: ۱۹۴۸ء میں ریاستِ مدراس میں ضم ہو جانے سے پہلے جنوبی ہند میں ایک چھوٹی سی ریاست۔ اس ریاست کا یہ خصوصی امتیاز تھا کہ تنگابھدرا کے جنوب میں یہ اکیلی ایسی ریاست تھی جس کا فرمانروا مسلمان تھا اور شیعہ عقائد رکھتا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں اس کا رقبہ ۲۷۵ مربع میل اور اس کی آبادی ۴۴۶۳۱ تھی۔ ریاست مذکور ۱۵ درجے ۳ دقیقے اور ۱۵ درجے ۲۹ دقیقے عرض بلد شمالی اور ۷۷ درجے ۵۹ دقیقے اور ۷۸ درجے ۲۲ دقیقے طول البلد مشرقی کے درمیان واقع تھی۔

بنگن پلے کی تاریخ بڑی بوقلموں رہی ہے۔ اس کا فرمانروا خاندان اپنا سلسلہ نسب باپ کی طرف سے شاہ ایران شاہ عباس ثانی کے ایک وزیر اور ماں کی طرف سے شہنشاہ عالمگیر سے ملاتا ہے۔ خاندان کے جدِ اعلیٰ میر طاہر علی ترک وطن کر کے ایران سے بیجاپور آئے۔ یہاں کچھ خاندانی جھگڑے پیدا ہوئے اور وہ انہیں میں مارے گئے۔ میر طاہر علی کی بیوہ اور چار لڑکوں نے ارکاٹ کے مغل فوجدار سے پناہ طلب کی۔ اس کے بیٹوں میں سے ایک نے بنگن پلے کے جاگیردار کی ہوتی سے شادی کر لی اور یوں گویا اس کا تعلق اس ماحول

قرونِ وسطیٰ میں تو مسلمانوں نے پانچہ نظمیوں لکھنے میں صحیح فنی رہنمائی کے فرائض سر انجام دیے تھے، لیکن انیسویں صدی عیسوی میں یہ امتیاز مدھو سوڈن جیسے نامور مصنفین کے حصے میں آیا۔ انیسویں صدی کے بیشتر ہندو اور مسلمان مصنفین کی نگارشات پر فرقہ دارانہ رنگ غالب رہا۔ آگے چل کر ٹیگور اور نذراالاسلام نے اس بات پر زور دیا کہ ایک صحیح فن پارے کو تمام حدود سے ماورا ہو کر جماعتی تعصبات کے بجائے انسانی اقدار کی ترجمانی کرنا چاہیے۔ نذراالاسلام اپنے زمانے کے سیاسی و معاشرتی حالات کے زیر اثر اکثر یہ بھول جاتا ہے کہ ایک سچے فن کار کے سامنے زندگی ہمیشہ اپنی مجموعی صورت میں آتی ہے۔ چنانچہ وہ زندگی کے ایسے پہلوؤں اور ایسے انسانی تجربات و اقدار کو اپنا موضوع قرار دیتا ہے، جو عالمگیر اور کلی نہیں، بلکہ ہنگامی اور جزئی ہیں اور اس طرح ہم عصر زندگی اور اس کے متعلقات کو عالمگیر احساسات و خیالات اور جذبات کا ذریعہ اظہار بنا لیتا ہے۔

مسلمانوں کے ادب کا ایک اور پہلو بھی ہے، جسے اختلافی ادب کہنا چاہیے۔ جدید تعلیم نے انہیں ایک نیا احساس دیا۔ ماضی کی روایات کو اب ایک عقیدے کی حیثیت حاصل نہ رہی۔ ہندوؤں کی طرح انہوں نے بھی بعض اصناف ترک کر کے ایسی نئی اصناف اختیار کر لیں جو یا تو مغرب سے آئی تھیں یا مغربی اور مشرقی روایات کے امتزاج سے پیدا ہوئی تھیں۔ اپنے معاشرتی احساسات کو ملحوظ رکھنے کے باوجود مسلمان مصنفین کے ادب میں موضوع اور ہیئت دونوں کے اعتبار سے اظہارِ اختلاف کا سراغ ملتا ہے۔ اس سے مسلمان ادیبوں کی تخلیقی روایت میں ایک ثنویت در آئی ہے، لیکن یہ ثنویت فی الحقیقت اس ثنویت اور تضادم کا عکس ہے جو خود معاشرے



*The Indian Year Book and (۳) : Gazetteer of India  
Bangnapalle State, its (۴) : ۱۹۳۸ : Who is Who  
. Ruler and Method of Administration*

(ہارون خان شروانی)

- **بنگول :** [= ہزار جھیل] قدیم ترکی ارمینیہ میں ایک شہر جسے پہلے چپاقچور کہتے تھے، ایک ولایت کا صدر مقام جس کا ایک حصہ بنگول طاغ کے سلسلہ کوہ سے گھرا ہوا ہے۔ یہ گونگ صو کے کنارے جو دریائے مراد صو (Aracani-Arsanas) کی معاون ندی ہے اس شاہراہ پر واقع ہے جو ایلازگ کو موش سے ملاتی ہے اور پالو سے گزرتی ہے۔

(M. CANARD)

- **بنگول طاغ:** ایک سلسلہ کوہ جو سطح مرتفع تو ہے مگر آتش فشان نہیں ہے، شہر ارز روم کے جنوب میں ہے اور ارز روم، موش اور بنگول (چپاقچور) کی ولایتوں کے آر پار پھیلا ہوا ہے۔ مشرق میں اس کی بلند ترین چوٹی دیمیر یا تمرقلعہ (= آہنی قلعہ) ہے جس کی بلندی کے متعلق مختلف مصنفوں میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے : ۳۶۹۰ میٹر بقول ایچ، آر کیپرٹ Kiepert : *Formae orbis antiqui*، لوح ۱۰، ۱۹۱۰، Abos Mons، قب محولہ بالا، ص ۶۵۵ : ۳۶۵۰ میٹر بمطابق ورق متعلقہ ارز روم بندرجہ خریطہ گنل ڈائر کتور لغو Harta Genel Direktörlüğü، ۱۹۳۶ : ۳۲۵۰ میٹر بمطابق نقشہ شوارع، ۱۹۵۱، از قرۃ یوللری گنل مدیر لغو Karayollari Genel Müdürlüğü : ۳۷۰۰ میٹر بقول Banse : اور ۲۹۷۷ میٹر بقول Blanchard—یہ پہاڑ وارتو (سابق گم گم) کے بلند میدان پر چھایا ہوا ہے۔ مغربی چوٹی بنگول یا طوپراق قلعہ ("مٹی کا قلعہ") بھی تقریباً اتنی ہی اونچی ہے۔ اس پہاڑ کا شمالی حصہ دو مستدیر نشیبوں نے کاٹ دیا ہے جن کو ایک، سلامی دار

سے ہو گیا جو آئندہ اس خاندان کا مسکن و مستقر بننے والا تھا۔

بنگن پلے مختلف فرمانرواؤں کے زیر نگیں رہا۔ ۱۶۳۳ء میں وجیانگر کی ریاست کے ایک بڑے حصے کے ساتھ وہ بیجاپور کے زیر اقتدار آ گیا، لیکن جلد ہی بیجاپور پر مغلوں کا اقتدار قائم ہو گیا اور یہاں آصف جاہی حکومت قائم ہو گئی۔ جاگیردار حسین علی نے میسور کے سلطان حیدر علی کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے زیر سایہ کئی جنگیں لڑیں۔ لیکن جب سلطان ٹیپو اپنے باپ کی جگہ تخت پر بیٹھا تو اس نے محض کسی بہانے سے جاگیر اس سے واپس لے لی۔ حسین کی وفات پر اس کی بیوہ نے نظام حیدر آباد کے یہاں جا کر پناہ لی، اور کہا جاتا ہے کہ خاندان کے کسی ایک شخص نے ۱۷۹۰ء میں سلطان ٹیپو کے فوجدار کو شکست دے کر شہر پر قبضہ کر لیا۔ سیرنگاپٹم کے معاہدے کی رو سے جاگیر مذکور ۱۸۰۰ء میں برطانیہ کے زیر اقتدار آ گئی۔ ۱۸۳۹ء تک یہ احاطہ مدراس کے ماتحت رہی اور اس سال اسے حکومت ہند نے براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

۱۸۶۲ء کی سند کی رو سے کسی فرمانروا کے بے اولاد مر جانے کی صورت میں برطانوی حکومت نے اسلامی قانون کے مطابق حق توریث تسلیم کر لیا۔ ۱۸۶۷ء میں جاگیردار کو نواب کا خاندانی لقب دے دیا گیا۔ ۱۸۹۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کی تقریبن جوبلی کے موقع پر نواب مذکور کو ہزہائی نس کا خطاب دیا گیا۔ آخری نواب میر فضل علی خان ریاست کے سدغم ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد فوت ہو گیا۔ اس کے بعد یہ خطاب اس کے بڑے بیٹے غلام علی خان کو مل گیا تھا۔

مآخذ : A. Vadivelu : *The Aristocracy of*

*Southern India*، مدراس ۱۹۰۳ء : (۲) *Imperial*

*Petermann's Mitteilungen*، ۱۳۵، ۱۹۰۷ء بعد (تبصرہ از  
 '(A Treatise on the Geology of Armenia : J. Oswald  
 'Armenia, Travels and Studies : H.F.B. Lynch (۷)  
 لندن ۱۹۰۱ء، ۲ : ۳۶۳ تا ۳۷۷ : (۸) Hubschmann  
 'Die altarmenischen Ortsnamen'، در *Indogerm.*  
 'Forschungen'، ۱۶، ۱۹۰۳ء : ۳۷۰ : ۳۷۷ : (۹)  
 'Die Türkei : Barse'، برلن - ہمبرگ ۱۹۱۹ء، ص ۲۰۷  
 ۲۱۲ تا ۲۱۵، ۲۱۹ : (۱۰) Vidal de La Blache و  
 'Géographie Universelle : Gallois'، جلد ۸ :  
 Occidentale از R. Blanchard، ص ۱۱۸ : (۱۱)  
 'Südarmenien und die Tigrisquellen : Markwart  
 Die Ostgrenze : Hönigmann (۱۲) ، ۴۹۳ تا ۴۹۲  
 'des Byz. Reiches'، ۱۹۳۵ء، ص ۷۹ تا ۸۰، ۱۹۴ تا  
 ۱۹۵، ۱۹۷ و نقشہ ۳ : (۱۳) M. Canard  
 'Hist. de la : M. Canard (۱۳) : ۱۹۷ : ۱۹۵  
 'dynastie des H'amdânides'، ۱ : ۲۳۶ : ۲۳۵ : (۱۴)  
 تری، کراسہ ۱۸، ص ۶۲۷ تا ۶۲۸ : عہد قدیم کے لیے  
 دیکھیے : (۱۵) Pauly-Wissowa : 'Realenzyklopedie'  
 ۱ : ۱۰۸ : ۶ : ۱۱۹۷ تا ۱۱۹۸ .

(M. CANARD)

بَن : رَكَ بَہ قَهْوہ .

بِنَاء : رَكَ بَہ بِنَاء .

الْبِنَاء : احمد بن محمد رَكَ بَہ الدِّيَابِي .

الْبِنَاء، حَسَن : الْاِخْوَانُ الْمُسْلِمُونَ (مصر) کے بانی

اور ناظم اعلیٰ، ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد  
 کا نام احمد بن عبدالرحمن بن محمد البناء الساعاتی  
 ہے۔ والد کا پیشہ تو گھڑی سازی تھا لیکن اس کے  
 ساتھ ہی وہ مروجہ علوم اسلامیہ بالخصوص علوم  
 حدیث کے عالم کی حیثیت سے سرگرم عمل رہے اور  
 امام احمد ابن حنبلہ کی مسند [نیز ابو داؤد  
 الطیالسی کی مسند کی تبویب کی۔ اول الذکر مسند  
 کی یہ تبویب جدید کئی جلدیں شائع ہو چکی ہیں  
 اہر مؤخر الذکر مکمل چھپ گئی ہے]۔

خرپشتہ کوہ ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔  
 بنگول طاغ ایک حقیقی فاصل آب (water-shed)  
 ہے۔ اس میں متعدد چھوٹی چھوٹی جھیلیں  
 ہیں، جن کی وجہ سے اسے "ایک ہزار (پن، بگ)  
 جھیلوں (گول) کا پہاڑ (طاغ) کا نام ملا۔ آرس  
 یا الرّس (Araxes) شمال میں، توزلہ صو (دریائے فرات  
 شمالی کی معاون) اور بنگول صو مغرب میں،  
 گونک صو جنوب مغرب میں، چار بغار صو جنوب میں  
 اور خینس صو (مراد صو کی آخری چار معاون ندیاں)  
 مشرق اور شمال مشرق میں، یہ سب یہیں سے  
 نکلتی ہیں۔ ارمنی اساطیر میں اسے "جنت ارضی"  
 قرار دیا گیا ہے۔ قدیم جغرافیے میں اس کا نام  
 ابوس مونس Abos Mons ہے۔ ارمنی میں اس کا  
 نام Srmanc (یونانی : Σερμάντου) ہے۔ عرب  
 جغرافیہ نگار اور مؤرخ اس کا حوالہ نہیں دیتے،  
 گو چوتھی صدی ہجری / دسویں صدی عیسوی  
 میں بنو حمدان اور بوزنطیوں کے درمیان جنگوں  
 میں ہفجج (ارمنی : Havcič) نام ایک جگہ کا  
 ذکر آتا ہے جو قالیقلا۔ ارز روم کے جنوب کی  
 طرف اور بنگول طاغ میں رود آرس کے منبع پر  
 واقع تھی۔ مغربی سیاحوں میں ٹیورنیر Tavernier  
 پہلا شخص ہے جس نے اسے بنگول طاغ کا نام دیا  
 ہے۔ قزلباش [رَكَ بَا] اسی خطے میں رہتے تھے۔

مآخذ : (۱) Erdkunde : K. Ritter، ۱۰ : ۷۹،

۸۱، ۳۸۵ تا ۳۸۶ : (۲) Reise : M. Wagner،

nach dem Ararat، شٹٹگارٹ ۱۸۵۸ء، ص ۲۷۲ :

(۳) Zur Geogr. von Hocharmenien : Streckner،

در Zeitschr. d. Ges. Für Erdkunde، برلن ۱۸۶۹ء،

جلد ۳ : (۴) G. Radde، در Petermann's Geogr.

Mittellungen، ۱۸۷۷ء، ص ۳۱۱ تا ۳۲۲ : (۵)

Vom goldenen Horn zu den Quellen : E. Naumann

des Euphrat، میونخ ۱۸۹۳ء، ص ۳۲۱ تا ۳۳۲ : (۶)



قائم کردہ انجمن کی تنظیم اور ترقی کے کام میں منہمک رہے، اس مدت میں وہ نہر سویز کے ارد گرد کے علاقوں میں برابر سفر کرتے رہے۔ اور اسماعیلیہ کے مرکز کی شاخیں پورٹ سعید اور سویز کے درمیانی علاقے میں سرعت کے ساتھ قائم ہو گئیں۔

جب استاد کی حیثیت سے ان کا تبادلہ قاہرہ ہوا تو انہوں نے اپنی تحریک کو بڑی تندہی کے ساتھ پھیلانا شروع کیا اور بہت جلد اس تحریک نے سارے مصر میں جڑ پکڑ لی۔ ۱۹۳۶ء کے بعد جب انہوں نے فلسطین کے عربوں کے مفاد کی حمایت شروع کی تو وہ روز بروز سیاسی مسائل سے دو چار ہوتے گئے اور یکے بعد دیگرے مختلف وزراء اعظم کو عمل اور اصلاح کی طرف مائل کرتے رہے۔ دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں حسن البناء کے ساتھ حکومت کا رویہ سخت ہو گیا۔ سری پاشا اور پھر نقراشی پاشا کی وزارت کے زمانوں میں وہ تھوڑی تھوڑی مدت قید میں بھی رہے، اس زمانے میں الاخوان المسلمون کی سرگرمیوں کو سختی کے ساتھ دبایا گیا۔ لڑائی کے فوراً بعد کے زمانے میں الاخوان اور حکومت کی باہمی کشمکش بڑھ گئی۔ جب دسمبر ۱۹۳۸ء میں نقراشی قتل ہوا تو اس تحریک کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور اس کے چند ماہ بعد فروری ۱۹۳۹ء میں خود حسن البناء بھی شہید کر دیے گئے۔

مآخذ: (۱) اسحاق موسیٰ حسینی: الاخوان المسلمون،

بیروت ۱۹۵۲ء (انگریزی ترجمہ کچھ اضافے کے ساتھ،

بیروت ۱۹۵۶ء)؛ (۲) J. Heyworth-Dunne: Religious

and Political trends in modern Egypt، واشنگٹن

۱۹۵۰ء؛ (۳) Jean اور Simonne Lacoutur: Egypt in

Transition، لندن ۱۹۵۸ء؛ مزید حوالوں کے لیے دیکھیے [۱]،

لندن] مقالہ الاخوان المسلمون نیز رگ بہ قطب شہید۔

(J. M. B. JONES)

حسن البناء کی ذہنی تعمیر و تشکیل میں ان کے والد ہی کا اثر سب سے زیادہ اور اہم ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اسی نہج پر ہوئی جس پر علمائے دین کے بچوں کی ہوتی تھی۔ یعنی پہلے قرآن مجید کا حفظ کرنا اور پھر حدیث، فقہ اور لغت کا مطالعہ۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی پرورش اور تعلیم قدیم مذہبی طریقے کے مطابق ہوئی، ان کا فطری رجحان بھی روحانیت کی جانب تھا۔ وہ بچپن ہی سے تصوف کی طرف مائل تھے اور ابھی صرف چودہ سال کے تھے کہ سلسلہ حصابیہ میں باقاعدہ طور پر شامل کر لیے گئے۔

دمنہور کے ایک ابتدائی مدرسۃ المعلمین میں کچھ وقت گزارنے کے بعد وہ قاہرہ کے دارالعلوم میں داخل ہو گئے، جو اس زمانے میں معلموں کے لیے ایک آزاد تربیتی ادارہ تھا۔ دمنہور ہی میں ان کی قابل قدر تنظیمی قابلیت اور لوگوں کو دین کی طرف مائل کرنے کا شوق اس وقت نمایاں ہوا جب انہوں نے الجمعیۃ الحصابیۃ الخیریۃ یعنی رفاہی انجمن حصابیہ قائم کی۔ دارالعلوم کے قیام کے زمانے ہی میں انہوں نے اپنے اس نظریے کو زیادہ واضح اور ترقی یافتہ شکل میں پیش کیا کہ اسلامی معاشرے کے امراض کا واحد علاج یہ ہے کہ ملت اسلامیہ قرآن مجید، حدیث اور سیرۃ النبی ﷺ کے زندگی بخش چشموں کی طرف دوبارہ رجوع کرے۔ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر انہوں نے اپنا اسلامی پیغام قاہرہ کی مسجدوں اور وعظ و تلقین کے ذریعے پہنچانا شروع کر دیا۔

۱۹۲۷ء میں دارالعلوم کا تربیتی نصاب ختم کرنے کے بعد انہیں اسماعیلیہ کے سرکاری سکول میں استاد مقرر کر دیا گیا۔ اگلے سال انہوں نے الاخوان المسلمون کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۳۴ء تک اسماعیلیہ ہی میں رہے اور وعظ و تبلیغ اور رسالوں کے ذریعے اپنی

۱۵۱۳/۵۹۱۸ء میں نجم الدین یار احمد اصفہانی المعروف بہ نجم ثانی نے شاہ اسمعیل صفوی کے حکم سے برپا کیا تھا۔ بنائی نے ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کی۔ پہلے وہ حالی تخلص کرتا تھا۔ علاوہ ایک دیوان کے، جو اب تک طبع نہیں ہوا (جس میں اس نے برابر حافظ کے تتبع کی کوشش کی ہے)، اس نے دو رزیہ نظمیں بھی لکھی ہیں: (۱) شیبانی نامہ اپنے سرپرست کی جنگی مہموں سے متعلق؛ (۲) باغ ارم یا بہرام و بہروز جسے غلطی سے کئی بار عظیم صوفی شاعر سنائی کی طرف منسوب کیا گیا ہے (بنائی کے لفظ کو مسخ کر کے سنائی پڑھے جانے کے سبب) اور جو ایک مجموعے میں جس میں افضل التذکار ذکر الشعراء والاشعار اور تذکرہ نوائی شامل ہیں ۱۳۳۶/۱۹۱۸ء میں تاشکنت میں طبع ہوئی۔ وہ ماہر موسیقی بھی تھا۔ اس نے موسیقی پر دو چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ بہت اچھا خوش نویس بھی تھا۔

مآخذ: (۱) میر علی شیرنوائی: مجالس النفايس، سولہویں صدی کے دو فارسی ترجمے، طبع علی اصغر حکمت، جن کے ساتھ ایک مقدمہ اور حواشی وغیرہ بھی شامل ہیں، تہران ۱۹۳۵ء، ص ۶۰، ۲۳۲ تا ۲۳۳؛ (۲) سام میرزا صفوی: تحفہ ساسی (فصل ۵)، طبع اصل فارسی مع اشاریہ، فارسی اور انگریزی مقدمے، اختلاف نسخ اور حواشی از مولوی اقبال حسین، پٹنہ ۱۹۳۴ء، ص ۲۷ تا ۳۰؛ (۳) وہی کتاب: طبع مکمل، تہران ۱۳۱۴ھ/۱۹۳۶ء، ص ۹۸ تا ۱۰۰؛ (۴) سعید نفیسی: تاریخچہ مختصر ادبیات ایران، در سالنامہ پارس، ۱۳۲۶ء، ص ۱۲ تا ۱۳۔ (سعید نفیسی)

بناک: جسے نویں صدی ہجری/بندرہویں صدی عیسوی میں بناک بھی کہتے تھے، سلطنت عثمانیہ کا ایک عرفی محصول تھا، جو ایسے شادی شدہ کاشتکاروں

بنائی: کمال الدین شیر علی بنائی قروی، فارسی شاعر، ہرات کے ایک معمار کا بیٹا تھا اور اسی بنا پر اس نے بنائی تخلص اختیار کیا۔ اس کا بچپن علی شیر نوائی [رک بان] کی صحبت میں گزرا، جو مشہور شاعر اور اپنے وقت کا Maecenas [مشہور رومی مرثی علم و حکمت جو شہنشاہ آگستوس کے عہد میں تھا اور Horace اور Vitgil کا سر پرست تھا، ۸ ق م] تھا، لیکن اپنی تلخ ظرافت گوئی کی وجہ سے وہ معتوب ہوا اور اسے تبریز جا کر آق قویونلو [رک بان] شہزادہ سلطان یعقوب (۵۸۸۴/۱۴۷۹ء تا ۵۸۹۶/۱۴۹۰-۱۴۹۱ء) کے دربار میں پناہ لینا پڑی۔ علی شیر سے مصالحت ہو جانے کے بعد وہ ہرات واپس آ گیا، لیکن دوبارہ اسے چھوڑ کر تیموری شہزادہ سلطان علی (۹۰۲/۱۴۹۷ء تا ۹۵۳/۱۵۴۶ء) بن سلطان احمد (۵۸۷۳/۱۴۶۸ء تا ۵۸۹۹ء) بن سلطان ابو سعید (۵۸۵۵/۱۴۵۱ء تا ۵۸۷۳/۱۴۶۸ء) کے پاس سمرقند چلا گیا، جو ماوراء النہر پر حکمران تھا۔ اس نے مرو کی مقامی بولی میں اس کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ لکھا اور اس کا نام مجمع الغرائب رکھا۔ وہ سلطان محمود کا درباری شاعر بھی رہا، جس نے ۵۸۹۹/۱۴۹۳ء-۵۹۰۰/۱۴۸۵ء کے درمیان اس خطے پر حکومت کی۔ ۵۹۰۶/۱۵۰۰-۱۵۰۱ء میں جب ابوالفتح محمد شیبانی خان [رک بان] (شیبک خان: شاہی بیگ از بگ) نے سمرقند پر قبضہ کیا تو وہ کچھ زمانے تک قید خانے میں رہا، لیکن بعد ازاں اسی کے دربار میں سرکاری شاعر اور قاضی عسکر ہو گیا اور ساتھ ہی اس کے بیٹے محمد تیمور کے مقربین میں شامل ہو گیا۔ ۳۰ شعبان ۵۹۱۶/۲ دسمبر ۱۵۱۰ء کو شیبانی خان کی وفات پر وہ اپنے وطن ہرات واپس چلا آیا لیکن قرشی کے قتل عام کے ہنگامے میں قتل ہو گیا جو



عثمانی امپرا طور لغندہ زراعی ایکونومی نگ حقوقی و مالی  
اساسلری، استانبول ۱۹۴۳ء۔

(HALIL İNALCIK)

- **بنانی** : (نیز البنائی) فاس کے ایک خاندان کا نام، جس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور جس میں بارہویں صدی ہجری/اٹھارویں صدی عیسوی کے بعد سے کئی نامور علمائے دین پیدا ہوئے اور اس خاندان کو آج تک دوسرے ایسے ہی چند خاندانوں کی طرح، جو یہودیوں سے مسلمان ہوئے، فاس میں علوم اسلامیہ کے علم برداروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس خاندان کے زیادہ مشہور و نامور افراد یہ ہیں:-
- (۱) ابو عبدالله محمد بن عبدالسلام بن حمدون (م ۱۱۶۳ھ / ۱۷۵۰ء)۔ یہ فاس کے قدیم تر مسلک کا سب سے بڑا اور آخری نمائندہ مانا جاتا ہے اور اس سلسلے میں اس کی حیثیت بنیادی سمجھی جاتی ہے۔ اس کی ذات ایک طرف تو مغرب میں مذہب مالکی کے علوم و معارف کی خاص روایات کا مرکز سمجھی جاتی تھی (قب J. Berque، در *Revue Historique de droit français et étranger*، ۱۹۴۹ء، ۸۸) اور دوسری طرف مشرق میں مروجہ مالکی روایت کا عالم بھی تھا جہاں اس نے تعلیم پائی تھی۔ اس کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس کی تصنیف *الفہرہ [رک باں]* اس کے زمانے کے فاس کے فقہی اور قانونی مطالعے کا ایک اہم ماخذ ہے۔ *الشاذلی [رک باں]* کی کتاب *العزب الکبیر* کی اس نے جو شرح لکھی ہے اس سے شاذلی طریقے سے اس کے خاندان کے مستقل تعلق کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی خاص تصنیف *الکلاعی* کی کتاب *الاکتفاء* کی شرح ہے، جس کا موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور پہلے تین خلفاء کے غزوات ہیں۔ اس کے فرزند عبدالکریم نے اس کی سیرت لکھی۔
- ماخذ: (۱) محمد بن الطیب القادری: نشر المثنی،

(مزوج رعایا) پر عائد ہوتا تھا جن کے پاس نصف چنت [رک باں] سے کم اراضی ہوتی تھی یا قطعاً کوئی زمین نہیں ہوتی تھی۔ اول الذکر کو *اکنلو بناک* یا محض بناک اور مؤخر الذکر کو *جبا بناک* یا جبا کہا جاتا تھا۔ لفظ بناک ممکن ہے کہ عربی فعل "بنک" سے مشتق ہو۔

در حقیقت بناک رسمی، چنت رسمی [رک باں] نظام کا حصہ تھا اور اصلاً اسے چنت رسمی کی مشمولہ سات ملازمتوں (قوللق خدمت) میں سے دو یا تین پر مشتمل سمجھا جا سکتا ہے۔ محمد ثانی کے قانون نامہ میں بناک کی شرح چھے یا نو آچہ [رک باں] تھی لیکن بعض علاقوں (تیکہ، ۵۸۵۹/۱۴۵۴-۱۴۵۵ء) میں یہ صرف پانچ آچہ تھی۔ آگے چل کر یہ عام طور پر جبا بناک کے لیے نو اور اکنلو بناک کے لیے بارہ آچہ ہو گئی اور جب ۱۵۴۰ء میں چنت رسمی نظام کی توسیع مشرقی آناطولی تک کی گئی تو وہاں اس کی شرح اکنلو کے لیے اٹھارہ اور جبا بناک کے لیے بارہ یا تیرہ آچہ رکھی گئی۔

مسلمان کاشتکار اصولاً بناک رسمی ان تیمارداروں کو براہ راست ادا کرتے تھے جنہیں دفتر [رک باں] میں ان کی رعیت درج کیا جاتا تھا۔

دفتروں میں اصطلاح بناک سے مراد خود وہ کاشتکار ہوتے تھے جو بناک رسمی ادا کرتے تھے۔ اگر کسی کنوارے کی شادی ہو جاتی تو فوراً یہ محصول اس پر عائد ہو جاتا تھا۔ اگر وہ طلاق دے دیتا تھا تو وہ صرف مجردوں کا محصول (مجرد رسمی) ادا کرتا تھا۔ شادی شدہ ہونے کی صورت میں ایسی خانہ بدوش رعایا بھی جس کے پاس مویشی نہیں ہوتے تھے بناک ادا کرتی تھی۔ اسی طرح یہ محصول در اصل سر محصول (polltax) تھا اور اسی لیے رعیت رسمی بھی کہلاتا تھا۔

ماخذ: (۱) Ö.L. Barkan : ۱۵ و ۱۶ عصر لرندہ

عبدالسلام بن حمدون (م ۵۱۲۳۵ / ۱۸۲۹ - ۶۱۸۳۰: یہ نمبر (۱) کا پرپوتا ہے اور مکے میں میں مالکی منتی بھی رہا۔ [اس کی تصانیف میں شرح صحیح البخاری بھی ہے]۔

مآخذ: (۱) محمد عبدالحی الکتانی: فہرِس الفہارس،

۱: ۱۶۳ بعد؛ [(۲) الاعلام، ۷: ۲۹۹]۔

(۵) محمد (م ۱۲۸۱ - ۵۱۲۸۲ / ۶۱۸۶۵) المعروف بہ فرعون: کتاب الوثائق کا مصنف ہے، جو کئی بار چھپ چکی ہے؛ نیز عبدالسلام بن محمد السہواری (م ۵۱۳۲۸ / ۶۱۹۱۰) کی شرح کے ساتھ بھی چھپی ہے۔

مآخذ: (۱) Berque، در *Revue historique de droit*

*français et étranger*، ۶۱۹۳۹، ص ۱۰۲؛ (۲) سرکیس،

۵۹۰: ۱

(۶) بنانی خاندان کے دوسرے افراد کے لیے دیکھیے

(۱) محمد بن شنب و Lévi-Provençal: *Essai de*

*répertoire chronologique des éditions de Fés*، در

*R.Afr.*، ۱۹۲۱ و ۱۹۲۲ (اشاریہ از H. Pérès و

A. Sempéré، در *Bull. Études Arabes*، عدد ۳۲،

۶۱۹۳۷، بذیل مادہ بنانی)؛ (۲) سرکیس: معجم

المطبوعات، ۱: ۵۸۹ تا ۵۹۱؛ (۳) محمد بن مخلوف:

شجرة النور، ۱: ۳۳۱؛ (۴) عبدالحفیظ الفاسی:

ریاض الجنة، ۲: ۲۰ بعد، ۱۰۰ بعد؛ [(۵) الزرکلی:

الاعلام، بذیل مادہ]۔

(۷) عبدالرحمن جاد اللہ البنّانی [المغربی]

(م ۵۱۱۹۸ / ۶۱۷۸۳) کا بنانی خاندان سے تعلق نہیں۔

ان کی نسبت ایک گاؤں کی طرف ہے جو سنتر کے

قریب ہے [تصانیف میں جلال الدین المعلی:

شرح جمع الجوامع پر حاشیہ قابل ذکر ہے]۔

(محمد بن محمد مخلوف: شجرة النور، ۱: ۳۳۲؛

سرکیس، ۱: ۵۹۱؛ براکلمان، ۲: ۱۰۹ و تکملہ، ۲:

۱۰۵)۔ ابوالقاسم ابراہیم الوراق (قبل از ۵۹۰ /

۲: ۲۵۷؛ (۲) محمد بن جعفر الکتانی: سلوة الأنفاس، ۱:

۱۳۶ تا ۱۳۸؛ (۳) محمد عبدالحی الکتانی: فہرِس الفہارس،

۱: ۱۶۰ تا ۱۶۲؛ (۴) محمد بن محمد مخلوف: شجرة النور

الزکیّة، ۱: ۳۵۳؛ (۵) *Hist. Chorfa: Lévi-Provençal*،

ص ۳۱۲ بعد؛ (۶) براکلمان: تکملہ، ۲: ۶۸۶؛ [(۷)

الزرکلی: الاعلام، ۷: ۷۷]۔

(۲) ابو عبدالله محمد بن حسن بن مسعود (م

۵۱۱۹۳ / ۶۱۷۸۰)، [فاس میں مزار ادریسی کا مالکی

فتیہ، خطیب اور امام]۔ اس کی تصنیفات یہ ہیں:

الفتح الربانی، یعنی [الزرقانی (رک باں) کی مختصر خلیل

بن اسحق پر تعلیقات (جو ۵۱۱۷۳ / ۱۷۵۹ تا ۶۱۷۶۰

میں مکمل ہوئی)؛ السنوسی (رک باں) کی شرح مختصر

المنطق پر حاشیہ؛ الاخضری (رک باں) کی سلم کی شرح

جو کئی بار چھپی؛ نیز اس کی مشہور کتاب الفہرسة۔

مآخذ: (۱) القادری: نشر الثانی، ۲: ۲۵۷؛ (۲)

محمد بن جعفر الکتانی: سلوة الأنفاس، ۱: ۱۶۱ تا ۱۶۳؛

(۳) محمد عبدالحی الکتانی: فہرِس الفہارس، ۱: ۱۶۲ بعد؛

(۴) الشیرازی السلاوی: الانتقاء، ۳: ۱۲۹؛ (۵)

محمد بن محمد مخلوف: شجرة النور، ۱: ۳۵۷؛ (۶) سرکیس،

۱: [۵۸۹]، ۵۹۰؛ (۷) *Historiens: Lévi-Provençal*،

ص ۶۱۵، حاشیہ ۷؛ (۸) براکلمان، ۲: ۳۲۵، ۶۱۵

و تکمید، ۳: ۳۵۵، ۳۵۶، ۷۰۶؛ [(۹) الاعلام، ۶: ۳۲۳]۔

(۳) مصطفیٰ بن محمد بن عبدالمخالف: اس نے

۵۱۲۱۱ / ۶۱۷۹۶ میں [التجربید علی مختصر السعد علی

التلخیص کے نام سے] التنازانی (رک باں) کی مختصر

المعانی پر تعلیقات لکھیں۔ یہ کتاب کئی بار چھپ

چکی ہے اور محمد بن محمد الانبائی (م ۵۱۳۱۳ /

۶۱۸۹۵) کے حواشی کے ساتھ بھی چھپی ہے۔

مآخذ: (۱) سرکیس، ۱: ۵۹۰؛ (۲) فہرسة الكتب

العریبة بانقاهرة، بار دوم، ۲: ۱۸۱؛ (۳) براکلمان، ۱:

۳۵۵ و تکملہ، ۱: ۵۱۸؛ [(۴) الاعلام، ۸: ۳۳۱]۔

(۴) محمد بن محمد بن محمد العربی بن



کے نمائندے کی حیثیت سے جنرل وان کارٹ لینڈ (Gen. van Cortland) کے زیر کمان ایک بہت بڑی فوج کی معیت میں اس وادی پر حملہ کیا۔ ۱۸۳۹ء میں پنجاب کے الحاق کے وقت بنوں بھی انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ توقعات کے بالکل برخلاف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس مقام پر مکمل امن وامان رہا۔

اس وادی سے بعض ایسی چیزیں برآمد ہوئی ہیں جو آثار قدیمہ کے نقطہ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان میں ایسے سگے شامل ہیں جن پر تحریریں یونانی ہیں یا یونانی سمجھی جاتی ہیں۔ شہر کے قریب اکرہ نام کا ایک ٹیلہ ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ بہت قدیم ہے۔

۱۸۳۸ء میں جب بنوں کا قلعہ بنا تو مہاراجا رنجیت سنگھ کے پوتے دلپ سنگھ کے نام پر اس کا نام دلپ گڈھ رکھا گیا اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے اس قلعے کے ارد گرد ایک شہر آباد ہو گیا۔ آج کل یہ خاصا بڑا تجارتی مرکز ہے۔ شہر بڑی تیزی سے بڑھ رہا ہے اور حکومت نے حال ہی میں اس رقبے کی اقتصادی ترقی کے لیے بڑی بڑی رقبے منظور کی ہیں۔

مآخذ: (۱) *Bannu or Our* : S. S. Thorburn

*Afghan Frontier*، لندن ۱۸۷۶ء؛ (۲) *Imperial*

*Gazetteer of India*، اوکسفورڈ ۱۹۰۸ء، ص ۳۹۲ تا ۴۰۲؛

(۳) *Bannu Gazetteer*، پشاور ۱۹۰۷ء؛ (۴) T.L. Pennell

*Among the Wild Tribes of the Afghan Frontier*

(۵) *Punjab and the Frontier* : E. Herberts، جلد ۲،

لندن ۱۸۵۱ء؛ (۶) H. L. Nevill *Campaigns on the*

*North-West Frontier*، لندن ۱۹۱۲ء، بحد اشاریہ؛

(۷) *Frontier* : George Dunbar، لندن ۱۹۱۲ء، ص

۳۹ تا ۶۹؛ (۸) بارنامہ (مترجمہ A. S. Beveridge)،

بحد اشاریہ؛ (۹) یسین خان نیازی: بنوں کی تاریخی

بھی خاندان بنانی سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس کی نسبت کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا (برا کلمان: تکلمہ، ۱: ۵۸۵۰)۔

(J. SCHACHT [و ادارہ])

بنوں: (Bannu) ایک شہر، جو مغربی پاکستان کے ضلع بنوں کا صدر مقام ہے اور ۳۳ درجے شمال اور ۷۰ درجے ۳۶ دقیقے مشرق میں واقع ہے۔ ۱۹۵۱ء میں شہر کی آبادی ۲۷۵۱۶ اور ضلع کی ۳۹۳۳۰۷ تھی۔ [ضلع کی آبادی ۱۹۶۱ء میں ۴۲۸۰۶۱ ہو چکی تھی]۔ موجودہ شہر کی بنیاد ۱۸۳۸ء میں لفٹیننٹ

ایڈورڈز ہربرٹ نے ایک ایسے مقام پر رکھی تھی جو جنگی نقطہ نظر سے اہمیت رکھتا تھا اور شہر کا نام ایڈورڈز آباد رکھا؛ لیکن اس نام کو مقبولیت حاصل نہ ہوئی اور اس کا نام بنوں پڑ گیا جو اس وادی کا قدیم نام تھا اور بنوچیون، یعنی ایک مخاوط النسل افغانی قبیلے کے نام سے بنا ہے۔ اس وادی کو، جس میں بڑے پرانے زمانے کے بے شمار کھنڈر جا بجا موجود ہیں، مقامی روایت کے مطابق محمود غزنوی کی فوجوں نے پامال کیا اور تمام ہندو استحکامات مسمار کر دیے۔ ایک صدی بعد اس وادی میں آس پاس کی پہاڑی قومیں بنوچی، مروت اور نیازائی آباد ہو گئیں۔ اس کے بعد دو صدی تک اس پر مغلوں کا برائے نام تسلط رہا۔ ۱۷۳۸ء میں اسے نادر شاہ افشار نے فتح کر لیا اور آگے چل کر احمد شاہ درانی نے اسے پامال کیا۔ ۱۸۲۳ء میں لاہور کے سکھ راجا رنجیت سنگھ نے اس وادی پر قبضہ کر لیا، لیکن افغان اس پر برابر یورشیں کرتے رہے۔ بہر حال ۱۸۳۸ء میں اسے باضابطہ طور پر سکھوں کے حوالے کر دیا گیا۔ پہلی سکھ جنگ (۱۸۳۵ - ۱۸۳۶ء) کے بعد یہ علاقہ برطانیہ کے زیر اثر آ گیا۔ ۱۸۳۷ - ۱۸۳۸ء میں لفٹیننٹ ایڈورڈز نے لاہور کے سکھ دربار

اہمیت، در اورینٹل کالج میگزین، اگست ۱۹۳۳ء۔  
(بزمی انصاری)

بنو: [= بیٹے؛ اصل میں بنون (مفرد ابن) ہے، مضاف ہونے کی صورت میں ن حذف ہو کر بنو رہ جاتا ہے]، جس کے بعد کسی قبیلے کے جدِ امجد کا نام [بطور مضاف الیہ] آتا ہے، دیکھیے اسی جد کے نام کے تحت۔

⊗ بنو اسرائیل: (= اسرائیل کی اولاد)، اسرائیل حضرت یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم علیہم السلام کا لقب ہے، جس کے معنی ہیں اللہ کا برگزیدہ بندہ (اَلْ یا اِبْلَ عبرانی میں اسمائے باری تعالیٰ میں سے ہے اور اسر کے معنی عبد یا برگزیدہ کے ہیں؛ قَب لسان العرب و تاج العروس بذیل مادہ؛ سیوہاروی ۱ : ۲۵۷؛ الکشاف، ۱ : ۱۳۰؛ البیضاوی، ۱ : ۵۵)۔ حضرت ابراہیمؑ کا وہ خاندان جو ان کے پوتے یعقوب بن اسحاق سے تھا، بنو اسرائیل کہلاتا ہے؛ اسی لیے نسلی یہودی اور نصاریٰ کے قدیم ترین خاندان اسرائیلی کہلاتے ہیں، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنو اسرائیل ہی کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے؛ ان میں سے ایک گروہ ایمان لایا (اور یہ لوگ نصاریٰ یا حواری کہلائے) اور ایک گروہ نے انہیں رسول ماننے سے انکار کیا اور یہودیت پر قائم رہا (۶۱ [الصف] : ۶ و ۱۴؛ الکشاف، ۴ : ۵۲۴؛ سیوہاروی، ۱ : ۲۵۷)۔ قرآن مجید میں ہر جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اولین مخاطب بنو اسرائیل ہی ہیں (۳ [آل عمران] : ۴۹؛ ۵ [المائدہ] : ۲۲) اور جس طرح حضرت داؤد علیہ السلام کی زبان پر یہود میں سے اصحاب السبّ (= ہفتے والوں) کو لعنت کی گئی ہے اسی طرح خوانِ نعمت (ماندہ) کہا کر پھر کفر کرنے والے پیروکارانِ عیسیٰؑ بھی ان کی زبان پر ملعون ٹھہرائے گئے ہیں (۵ [المائدہ] : ۷۸؛ نیز دیکھیے الکشاف، ۱ : ۶۶۶)۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنو اسرائیل کی طرف ہی مبعوث ہوئے تھے اور ان کے اولین مخاطب اور ان پر سب سے پہلے ایمان لانے والے (حواری = نصاریٰ) بھی انہیں میں سے تھے، مگر جس طرح آج اسرائیلی سے بالعموم یہود مراد ہوتے ہیں اسی طرح قرآن مجید میں جن بنو اسرائیل کا ذکر ہے اور جن سے بار بار قرآن نے خطاب کیا ہے وہ یہود یا اولادِ یعقوبؑ ہی ہیں جو اولادِ انبیاءؑ اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کے اتباع کے دعویٰ دار تھے اور جنہیں قرآن کریم نے بارہا اولادِ اسرائیل کہہ کر پکارا اور خدا کے انعامات انہیں یاد دلا کر حق کی طرف دعوت دی ہے (تفہیم القرآن، ۱ : ۷۰؛ قصص الانبیاء، ص ۱۹۰؛ بعد؛ قصص القرآن، ۱ : ۳۴۰؛ بعد)۔

قرآن کریم میں بارہا اس کا اعادہ کیا گیا ہے کہ بنو اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص انعام فرمایا تھا اور انہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت عطا کی تھی: ”اے بنو اسرائیل! یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور اس بات کو کہ میں نے تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر فضیلت دی تھی“ (۲ [البقرہ] : ۴۷، ۱۲۲)؛ لیکن یہ فضیلت ایک خاص زمانے تک محدود تھی اور یہ اس وقت کی طرف اشارہ ہے جب تمام دنیا کی قوموں میں بنو اسرائیل ہی ایک ایسی قوم تھی جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا علم حق موجود تھا اور اسے اقوامِ عالم کا رہنما بنا کر سب پر فضیلت عطا کر دی گئی تھی (تفہیم القرآن، ۱ : ۷۴؛ بیان القرآن، ۱ : ۵۹؛ الکشاف، ۱ : ۱۳۵)۔ اس فضیلت کے علاوہ قرآن کریم نے بنو اسرائیل پر مندرجہ ذیل انعامات کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے : (۱) بنو اسرائیل مصر میں فرعونوں (آل فرعون) کی غلامی میں مبتلا تھے اور بڑی ذلت و اذیت کی



زندگی گزار رہے تھے۔ وہ ان کے لڑکوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں انہیں اس سے نجات دلائی (۲ [البقرہ]: ۴۹)؛ (۲) بنو اسرائیل جب فوعون کی غلامی سے نجات پانے کے لیے بھاگ نکلے تو وہ بھی اپنا لاؤ لشکر لے کر ان کے تعاقب میں نکل پڑا۔ بحیرۃ قلزم کے کنارے بنو اسرائیل گھبراہٹ کے عالم میں فرعون کی فوج اور سمندر کی موجوں کے درمیان گھرے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے عصاے موسوی کے ذریعے سمندر نے راستہ دے دیا۔ بنو اسرائیل صحیح و سلامت یار ہو گئے، مگر ان کا دشمن فرعون ان کی نظروں کے سامنے اپنے لشکر سمیت غرق ہو گیا (۲ [البقرہ]: ۵۰)؛ نیز قبّ بیان القرآن، ۱: ۶۱؛ الکشاف، ۱: ۱۳۸)؛ (۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام اعتکاف کے لیے چالیس راتوں کے لیے کوہ طور پر گئے تو بنو اسرائیل نے ان کی غیر حاضری میں گوسالہ پرستی شروع کر دی، مگر جب وہ اس صریح شرک پر پشیمان ہو کر تائب ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے انہیں معاف فرما دیا (۲ [البقرہ]: ۵۱ تا ۵۲؛ ۲ [طہ]: ۸۷ تا ۹۷)؛ (۴) چونکہ انعام اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل پر یہ کیا کہ ہدایت کا سرچشمہ توراہ نازل کر کے ان کی رہنمائی کا سامان کر دیا: ”اور یاد کرو کہ ہم نے (تمہاری رہنمائی کے لیے) موسیٰ پر کتاب اور فرقان (حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والی) نازل کی تاکہ تم اس کے ذریعے سیدھا راستہ پا سکو“ (۲ [البقرہ]: ۵۳)؛ (۵) بنو اسرائیل کی ضد تھی کہ وہ (یہ یقین کرنے کے لیے کہ واقعی توراہ اللہ کا قانون ہے) خدا کو اپنی آنکھوں سے علانیہ دیکھنا چاہتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے تمام اسباط (خاندان) میں سے ستر سرداروں کا انتخاب کیا اور انہیں طور سینا پر لے گئے۔ ایک سپید بادل کی طرح نور نے حضرت موسیٰؑ

کو گھیر لیا اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی شروع ہو گئی۔ ستر سرداروں نے کلام سننے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ بے حجاب خدا کو دیکھنے پر اصرار کیا۔ تب خدا نے اس احمقانہ ضد پر انہیں سزا دی اور بجلی کے ایک کڑکے نے انہیں آلیا اور وہ بے جان ہو کر گر پڑے، مگر اللہ نے انہیں دوبارہ جلا اٹھایا۔ خدا نے اس نعمت کا مفصل تذکرہ کیا ہے (۲ [البقرہ]: ۵۵ تا ۵۶؛ ۷ [اعراف]: ۴۲ بعد؛ نیز قبّ قصص الانبیاء، ص ۲۱۷؛ قصص القرآن، ۱: ۴۶۹ بعد؛ (۶) اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کو جزیرہ نماے سینا کے ایک شہر میں فاتحانہ داخلہ نصیب فرمایا اور حکم دیا کہ اس میں عاجزانہ طور پر داخل ہو جاؤ اور یہاں کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو (۲ [البقرہ]: ۵۹)؛ (۷) بنو اسرائیل نے جزیرہ نماے سینا میں پہنچ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی کا مطالبہ کیا تو ”انہوں نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی، ہم نے کہا فلاں چٹان پر اپنا عصا مارو، چنانچہ اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے“ (۲ [البقرہ]: ۶۰)۔ یہ چٹان اب تک جزیرہ نماے سینا میں موجود ہے۔ سیاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اس میں اب بھی پائے جاتے ہیں (تفہیم القرآن، ۱: ۷۹؛ نیز قبّ قصص القرآن، ۱: ۴۴۶)؛ (۸) اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کی سہولت کے لیے بادل بھیجے جو انہیں دھوپ سے محفوظ رکھتے تھے اور اس کے علاوہ ان کی خوراک کے لیے من و سلویٰ بھی نازل فرمایا تھا (۲ [البقرہ]: ۵۷؛ [الاعراف]: ۱۶؛ قصص القرآن، ۱: ۴۴۳ بعد)۔ بنو اسرائیل پر اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل و انعام کیا تھا، مگر وہ اس کا شکر بجا لانے کے بجائے کفرانِ نعمت اور احسان فراموشی پر اتر آئے۔ اس کے علاوہ عجیب طرح کا تلون، سرکشی، فساد اور بغض و حسد بنو اسرائیل کا ایک قومی مزاج بن گیا، جو غالباً صدیوں کی غلامی کا نتیجہ تھا (قصص

کرنا؛ (۳) نوگوں سے اچھی بات کہنا؛ (۴) نماز قائم کرنا؛ (۵) زکوٰۃ ادا کرنا؛ مگر قرآن مجید کہتا ہے کہ بنو اسرائیل کے خمیر میں عہد سے پھرنا داخل تھا اس لیے وہ ان پانچ باتوں پر بھی قائم نہ رہ سکے (۲ [البقرہ]: ۸۳)۔

قرآن مجید نے بنو اسرائیل کی عہد شکنیوں کی جو طویل فہرست پیش کی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ نے انہیں باہم خون ریزی، دوسروں کو گھر چھوڑنے پر مجبور کرنے اور اسیروں کو فدایے کے ذریعے رہا کرانے سے منع کیا تھا، مگر وہ اس سے باز نہ آئے (۲ [البقرہ]: ۸۳ تا ۸۶)۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں رسولوں پر ایمان لانے اور ان کی نصرت و امداد کا حکم دیا تھا (۵ [المائدہ]: ۱۲ تا ۱۳)، مگر انہوں نے انبیاء کو اذیتیں دیں، جھٹلایا اور قتل کیا (۲ [البقرہ]: ۸۷) اور کتاب اللہ میں تحریف کی اور وہ سنگدل بن گئے، جس کی وجہ سے وہ خدا کی لعنت کے مستحق ٹھہرے (۵ [المائدہ]: ۱۳؛ ۲ [البقرہ]: ۵۵، ۸۸)۔ وہ انبیاء کرام اور کتاب اللہ کی پیروی کے بجائے سامری، ہاروت، ماروت اور دیگر جادوگروں کا اتباع کرتے تھے (۲۰ [طہ]: ۸۵ تا ۹۷؛ ۲ [البقرہ]: ۱۰۲)۔ ان عہد شکنیوں کی سزا قرآن مجید کے نزدیک انہیں دنیا کی ذلت و رسوائی (جو حَبْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَاجُلُّ مِّنَ النَّاسِ، یعنی اللہ سے گناہوں کی معافی مانگ کر اور اسلام قبول کر کے یا دوسروں کے سپارے رہ کر ہی ٹل سکتی ہے) اور آخرت کا درد ناک عذاب ہے (۲ [البقرہ]: ۸۵ تا ۸۶؛ ۳ [آل عمران]: ۱۱۲)۔

بنو اسرائیل کی تاریخ کا ایک دلچسپ باب وہ واقعہ ہے جو حضرت موسیٰ کی دعوتِ جہاد کے سلسلے میں پیش آیا اور جو قرآن کریم کی سورۃ المائدہ (۵: ۱ تا ۲) میں بیان ہوا ہے۔ ریگستان سینا میں حضرت موسیٰ نے بنو اسرائیل کے بارہ قبائل کے بارہ سردار (نقباء، واحد نقیب) جنے اور انہیں ملک شام میں (جس پر

القرآن، ۱: ۵۱۶)؛ چنانچہ قرآن کریم نے ان کی بدعہدیوں اور احسان فراموشیوں کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرائی ہے، مثلاً فرعون سے نجات پانے اور بحیرۃ قلزم عبور کرنے کے بعد انہوں نے حضرت موسیٰ سے سب سے پہلا مطالبہ یہ کیا کہ جزیرہ نماے سینا کے بت پرستوں کی طرح ان کے بھی بت ہونے چاہئیں جن کی وہ پرستش کر سکیں: ”اور ہم نے بنو اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا پھر ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں کے سامنے سادہ لگائے بیٹھی تھی تو کہنے لگے: موسیٰ! جیسے ان کے معبود بت ہیں ایسے ہی ہمارے لیے بھی بنا دے۔ موسیٰ نے کہا: افسوس تم پر، تم جاہل قوم ہو، بلاشبہ ان لوگوں کا طریقہ تو ہلاکت کا طریقہ ہے اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں باطل ہے۔ اور کہا کہ باوجود اس کے کہ تمہیں خدا نے تمام لوگوں پر فضیلت دی ہے پھر بھی میں تمہارے لیے خدائے واحد کے سوا اور کوئی معبود تلاش کروں“ (۲ [الاعراف]: ۱۳۴؛ قصص القرآن، ۱: ۳۳۱ بعد)۔ اللہ تعالیٰ نے بنو اسرائیل کے ستر سرداروں کو توراہ پر سختی کے ساتھ کاربند ہونے کا عہد لیتے وقت انہیں ڈرانے کے لیے طور ان کے سروں پر لا کھڑا کیا تھا، مگر ایسی خوفناک حالت میں کیے ہوئے عہد سے بھی یہ قوم پھر گئی (۲ [البقرہ]: ۶۳ تا ۶۴)۔ دولت کے لالچ میں بعض اسرائیلیوں نے ایک بے گناہ کو قتل کر دیا تھا اور قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ اللہ نے ایک گامے ذبح کرنے کا حکم دیا، جس پر وہ حضرت موسیٰ کا مذاق اڑانے اور ہیر پھیر کرنے لگے (۲ [البقرہ]: ۶۷ تا ۷۳)۔

بنو اسرائیل سے اللہ تعالیٰ نے پانچ باتوں کا عہد لیا تھا: (۱) عبادت صرف اللہ ہی کی کرنا؛ (۲) والدین، رشتے داروں، یتیموں اور مسکینوں سے حسن سلوک



هو گئی (روح المعانی، ۱۹ : ۱۸۲ بعد؛ الطبری : تاریخ، ۱ : ۵۳۷ بعد).

مآخذ : (۱) لسان العرب، بذیل مادہ؛ (۲) تاج العروس، بذیل مادہ؛ (۳) الآلوسی: روح المعانی، مطبوعہ قاہرہ، بلا تاریخ؛ (۴) البیضاوی (۲ جلد)، طبع لائپزگ، بلا تاریخ؛ (۵) صحیح البخاری، قاہرہ ۵۱۳۵۱؛ (۶) صحیح المسلم، قاہرہ ۶۱۹۵۶؛ (۷) محمد فؤاد عبدالباقی : مفتاح کنوز السنہ، قاہرہ ۶۱۹۳۳؛ (۸) القرطبی : الجامع لاحکام القرآن، قاہرہ ۵۱۳۵۳؛ (۹) فواد عبدالباقی : المعجم المفہرس؛ (۱۰) الزمخشری : الکشاف، قاہرہ ۶۱۹۳۶؛ (۱۱) الطبری : تاریخ، قاہرہ ۶۱۹۶۶؛ (۱۲) مودودی : تفہیم القرآن، لاہور ۶۱۹۶۶.

(ظہور احمد اظہر)

بنو بوری : رك به بوریه .

بنو عامر : ("بنی امر") مغربی آریٹریا اور ملحقہ سوڈانی علاقے کا ایک خانہ بدوش قبیلہ، جو اونٹ اور مویشی پالتا ہے۔ آبادی ساٹھ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ یہ قبیلہ سترہ شاخوں میں بٹا ہوا ہے۔ بعض کی زبان پچہ (ایک حامی زبان) ہے اور بعض کی تگرے Tigre (جوسامی ہے)، حالانکہ ان کا نسب ایک ہے اور اس بارے میں ایک محکم روایت موجود ہے جس کی تحقیق دسویں پشت میں ان کے مورث اعلیٰ عامر تک خاصی تفصیل کے ساتھ کی جا چکی ہے۔ لیکن اس کا تعلق صرف ان کے قلیل التعداد حکمران طبقے (نبتاب) سے ہے، نہ کہ ان مخلوط النسل اور کثیر التعداد کاشت کار غلاموں (Serf) کی آبادی (ہدیب یا تگرے) سے جو مختلف اوقات میں مفتوح ہو کر یا رضامندانہ اطاعت قبول کر کے بنو عامر کے زیر اقتدار آ گئی۔ ان کے چند ایک گروہ صرف رئیس اعلیٰ کے ماتحت ہیں ورنہ اکثریت خاص خاص نبتاب خاندانوں کی موروثی غلام ہے اور انہیں کو خراج ادا کرتی اور ان کے لیے ہر قسم کی ادنیٰ خدمات،

عمالقہ قابض تھے) معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا۔ انہوں نے واپس آ کر ملک کی خوبیاں تو بہت بیان کیں مگر قوم عمالقہ کی قوت و ہیبت کو بنی بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ حضرت موسیٰؑ نے انہیں اللہ پر توکل کرنے اور جہاد کے لیے تیار ہونے کا حکم دیا، مگر وہ یہ کہہ کر مصر واپس جانے کی فکر کرنے لگے کہ اے ہوسیؑ! جب تک اس سر زمین میں یہ قوم جبارین ہے اس وقت تک ہم تو اس میں داخل ہوں گے نہیں، اب تو اور تیرا رب چاہے تو ان سے جہاد کرے، ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی یہ سزا دی کہ وہ چالیس سال تک میدان تیبہ میں سر مارتے پھرے اور سر زمین مقدس کی فتح میں چالیس سال کی تاخیر ہو گئی (الکشاف، ۱ : ۶۱۹ بعد؛ روح المعانی، ۶ : ۱۰۵ بعد؛ قصص القرآن، ۱ : ۳۸۰ بعد).

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد بنو اسرائیل پھر عزت و اقتدار سے محروم ہو گئے اور اپنے نبی سے درخواست کی کہ آپ ہمارا بادشاہ نامزد کیجیے تاکہ اس کی قیادت میں ہم جہاد فی سبیل اللہ کریں اور ظالم بادشاہ جالوت سے اپنا حق واپس لے سکیں۔ اللہ کے نبی نے طالوت کو، جو عام و جسامت کے لحاظ سے فوقیت رکھتے تھے، بادشاہ نامزد کیا اور ان کی قیادت میں بنو اسرائیل جالوت کے مقابلے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح نصیب کی اور حضرت داؤدؑ کے ہاتھوں جالوت قتل ہو گیا۔ سورۃ البقرۃ (۲ : ۲۴۶ تا ۲۵۱) میں اس قصے کو مفصل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ پھر حضرت داؤدؑ اور ان کے بیٹے حضرت سیمانؑ کے عہد میں بنو اسرائیل کو بڑی شان و شوکت حاصل ہوئی اور انہوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی، جو کئی نسلوں تک قائم رہنے کے بعد بخت نصر [رک باں] کے ہاتھوں تباہ

بہت کم ہو گئی ہے حتیٰ کہ ان کے کاشت کار غلاموں (Serfs) میں بھی بے چینی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں، جس کا اظہار کبھی کبھی کی قانون شکنی اور 'مقاومت مجہول' کی شکل میں ہوتا رہتا ہے۔

مآخذ : (۱) C. C. Rossini *Principi di* ; (۲) *Diritto Consuetudinario dell' Eritrea*؛ ۱۹۱۶ء؛ (۳) *Le Popolazioni indigene dell' Eritrea* : A. Pollera بولونا ۱۹۳۵ء؛ (۴) *Races and Tribes of Eritrea* ; (۵) *Short History* : S. H. Longrigg ; (۶) *of Eritrea* : C. G. and B. Z.؛ ۱۹۳۵ء؛ (۷) *Notes on the History and present condition of the Beni Amer Sudan, Notes and* ; (۸) *Records* : S. F. Nadel؛ ۱۹۳۰ء؛ (۹) *Amer Society*، در کتاب مذکور، ۱۹۳۵ء، ص ۵۱ تا ۹۳؛ (۱۰) *Aspects of Mohammedanism* : S. Hillelson ; (۱۱) *JRAS*، ۱۹۳۷ء؛ (۱۲) *Islam in Ethiopia* : J. S. Trimmingham، ۱۹۵۲ء، ص ۱۵۵ تا ۱۵۸ و اشارہ۔

(S. F. NADEL)

بنور : ایک قدیم شہر (مشرقی پنجاب، بھارت)، ۳۰ درجہ ۳۴ دقیقہ شمال اور ۷۶ درجہ ۳۷ دقیقہ مشرق میں، انبالہ سے نویس اور سرہند سے بیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ قدیم سنسکرت نام وھنی پور (Vahnipur) ہے، جو مرور ایام کے ساتھ بنی پور اور بالآخر بنور ہو گیا۔ بنور کے کھنڈر چاٹ Chat [رك باں] تک چلے گئے ہیں۔ یہ ایک اور قدیم اور ویران شہر ہے، جو اس سے چار میل دور ہے۔ بنور کا ذکر سب سے پہلے بابر نے اس سلسلے میں کیا ہے کہ یہ مقام سفید چنبیلی کے پھولوں اور ان کے عطر کے لیے مشہور تھا؛ چنانچہ یہی صورت اب بھی ہے۔

روایت کے مطابق بنور کا دوسرا قدیم نام

بالخصوص مویشی چرانا یا دودھ دھنا، سر انجام دیتی ہے، جس کے معاوضے میں ان کے آقا اپنے غلاموں کی حفاظت کرتے اور ان کے سود و بہبود کا خیال رکھتے ہیں۔ طبقات کی اس تقسیم میں ان کی ذاتی وفاداریاں اگرچہ اکثر خلل انداز ہو جاتی ہیں بایں ہمہ ایک دوسرے کے یہاں شادی کی ممانعت اور بعض دوسری تحریمات (Taboos) کے ذریعے جو ان پر عائد ہیں اس کی سختی قائم رکھی جاتی ہے۔ ابتداءً ان میں غلاموں کا ایک طبقہ موجود تھا جن کو سرتا سر اپنے آقاؤں کی ملکیت تصور کیا جاتا تھا۔ یہ سارا قبیلہ مسلمان ہے۔ البتہ صحت اعتقاد اور بعض شعائر کی بجا آوری میں نہ صرف افراد بلکہ گروہوں اور فرقوں کے درمیان بہت زیادہ اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ان کا سیاسی اتحاد بڑا کمزور ہے اور ایک ایسے ڈھیلے ڈھالے وفاق پر قائم جو بعض گروہوں کی علیحدگی سے اکثر خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ قبائلی حکومت کی زمام رئیس اعلیٰ (دگل) اور چودھریوں (شرف) کی ایک مجلس کے ہاتھ میں ہے، جسے مختلف شاخیں منتخب کرتی ہیں۔ شروع شروع میں رئیس اعلیٰ کا بھتیجا منتخب ہوا کرتا تھا، لیکن ۱۸۲۹ء سے یہ عہدہ موروثی ہو گیا ہے۔ ۱۸۹۷ء سے اس قبیلے کی ارتیریانی اور سوڈانی علاقوں کی شاخوں پر انگ رئیس حکومت کر رہے ہیں حالانکہ وہ ایک دوسرے کے قریبی رشتے دار ہیں۔

جہاں تک آس پاس کے گروہوں کا تعلق ہے ان کے اور اس قبیلے کے درمیان اکثر لوٹ مار اور خونی جنگوں کے واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔ اندرونی طور پر اگرچہ ان میں نزاع و جدال جاری رہتا ہے لیکن اس نے طبقاتی فرقہ بندی کا رنگ کبھی اختیار نہیں کیا۔ عصر حاضر کی سیاسی اور معاشی تبدیلیوں سے نبتاب (حکمران طبقے) کی ساکن



● **البنوری**: **أَبُو عَبْدِ اللَّهِ مِعْزُ الدِّينِ آدَمُ بْنُ سَيْدِ اسْمَعِيلَ**، جو حضرت شیخ احمد سرہندی **[رَکَ بَانَ]** کے اکابر خلفا میں سے تھے اور بنور **[رَکَ بَانَ]** کے رہنے والے تھے۔ وہ اپنا سلسلہ نسب امام موسیٰ الکاظم **[رَکَ بَانَ]** سے ملاتے تھے مگر لوگ اس سے اس بنا پر انکار کرتے تھے کہ ان کی والدہ افغانوں کے مشوانی قبیلے سے تھیں اور وہ اپنی زندگی افغانوں ہی کی طرح بسر کرتے تھے؛ چنانچہ ۱۰۵۲ھ / ۱۶۴۲ء میں جب وہ اپنے دس ہزار مریدوں کے ساتھ لاہور آئے تو شاہجہان بادشاہ کے وزیر اعظم علامہ سعد اللہ خان اور مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی **[رَکَ بَانَ]** کی طرف سے بھی یہی اعتراض اٹھایا گیا تھا۔ انہیں شاہنشاہ ہند نے یہ دریافت کرنے پر مامور کیا تھا کہ وہ اتنی بڑی جمیعت کے ساتھ لاہور کیوں آئے ہیں۔ بادشاہ شیخ کے جواب سے مطمئن نہیں ہوا، لہذا انہیں فوراً لاہور سے بنور اور بنور سے بغرض حج مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جانے کا حکم دیا۔

اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں **البنوری** فوج کے صیغہ خبر رسانی میں ملازم تھے، لیکن زہد و تقویٰ کی زندگی کے شوق میں چند ہی سال کے اندر یہ ملازمت ترک کر دی۔ ابتدا میں وہ حاجی خضر روغانی بہلول پوری کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے اور پھر انہیں کے مشورے سے حضرت شیخ احمد سرہندی **[رَکَ بَانَ]** کی بیعت کی۔ اس دوران میں انہوں نے صوفیہ اور فقرا کی تلاش میں مختلف شہروں کا سفر کیا جن میں ملتان، انبالہ، پانی پت، شاہ آباد، سرہند، لاہور اور سامانہ شامل ہیں۔ نکات الاسرار ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے اور مناقب الحضرات میں، جو ان کا مستند تذکرہ ہے، ان کی علمی لیاقت اور حیثیت کے متعلق متضاد قسم کے بیانات ملتے ہیں۔ نکات نے تو انہیں "امی

پشپا نگری یا پشپاوتی (لغوی معنی = پھولوں کا شہر) ہے، لیکن اس نام کو اس کے موجودہ نام سے کوئی مشابہت نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خاندان سادات کے عہد حکومت (۵۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء تا ۵۸۵۵ھ / ۱۴۵۱ء) میں اس شہر کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی؛ چنانچہ پاکستان کے قیام (۱۹۴۷ء) سے عین پہلے یہاں زیادہ تر سادات ہی کی آبادی تھی، جو سادات بلگرام کی طرح اپنا نسب ابوالفرج واسطی سے ملاتے ہیں اور جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہلاکو کے ہاتھوں بغداد کی تباہی (۶۵۶ھ / ۱۲۵۸ء) کے بعد ہجرت کر کے ہندوستان چلے آئے تھے۔ سید فرمانروا خضر خان (۵۸۱۷ھ / ۱۴۱۴ء تا ۵۸۲۴ھ / ۱۴۲۱ء) کے والد ملک سلیمان خان کا مزار ۱۹۴۷ء تک یہاں موجود تھا۔ سید آدم البنوری **[رَکَ بَانَ]** (المتوفی مدینہ منورہ ۱۰۵۳ھ / ۱۶۴۳ء)، جو حضرت شیخ احمد سرہندی **[رَکَ بَانَ]** کے خاص خلفا میں سے تھے اسی شہر کے رہنے والے تھے۔ بارہویں صدی ہجری اٹھارہویں صدی عیسوی میں جب سکھ حملہ آور بندہ بیراگی نے بنور کو تباہ کر دیا تو اس پر سنگھار پوریا سکھ قابض ہو گئے۔ ۱۱۷۷ھ / ۱۷۶۳ء میں اسے آلا سنگھ رئیس پٹیالہ نے فتح کر لیا، جو ۱۹۵۶ء تک برابر اس کے جانشینوں کے قبضے میں رہا حتیٰ کہ ریاست پٹیالہ مشرقی پنجاب کے نئے صوبے میں مدغم کر دی گئی۔ بنور کے استحکام کے لیے مغلوں اور سکھوں نے علی الترتیب دو قلعے بھی تعمیر کیے تھے، جن کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔

مآخذ: *Memoirs of Babar*، مترجمہ Leyden و

Erskine، ص ۳۰۱؛ (۲) *Imp. Gaz. of India*، ۱۹۰۹ء،

۶: ۱۴۱۴؛ (۳) علامہ راز حسین واسطی: *حدیقہ واسطیہ*

(مخطوطہ رام پور سینٹ لائبریری)؛ (۴) آئین اکبری

(مترجمہ H. Blochmann)، ۱: ۳۹۳ تا ۳۹۴۔

(بزمی انصاری)

سفرِ حجاز کے دوران میں تصنیف کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا سن ولادت ۱۰۰۵-۱۰۰۶ھ/ ۱۵۰۶-۱۵۰۷ء کے قریب قریب ہے۔ ان کا سب سے چھوٹا صاحبزادہ محمد محسن گوالیار میں ۱۰۵۲ھ/ ۱۶۴۲ء میں پیدا ہوا جب کہ وہ مکہ معظمہ کا سفر کر رہے تھے۔ اس واقعے سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ انہوں نے زیادہ عمر نہیں پائی۔

البنوری مندرجہ ذیل کتابوں کے مصنف ہیں: (۱) نِکَاتُ الْأَسْرَارِ، جس میں تصوف کے دقیق مسائل سے بحث کے ساتھ ساتھ ان کی شرح تصوف کے نقطہ نظر سے کی گئی ہے۔ اس بحث میں البنوری نے عالمِ روحانی کے بعض ذاتی تجربات اور کہیں کہیں اپنی زندگی کے واقعات کی طرف بھی اشارے کیے ہیں؛ (۲) خَلَاصَةُ الْمَعَارِفِ (دو جلدوں میں) فارسی میں تصنیف ہوئی۔ یہ کم و بیش مذکورہ بالا کتاب کا لاحقہ ہے اور ابھی تک بشکل مخطوطہ محفوظ ہے۔ البنوری نے سورۃ الْفَاتِحَةِ کی ایک تفسیر بھی لکھی، جو محمد امین بدخشی کی تالیف نَتَائِجِ الْحَرَمِینِ کے ابتدائی حصے میں شامل ہے۔ محمد امین بدخشی کا بیان ہے کہ وہ ارض مقدس میں پچاس سال تک سکونت پذیر رہا اور مقاماتِ مقدسہ کے سفر میں آدم البنوری کا رفیق سفر تھا۔

مآخذ: (۱) بدرالدین سرہندی: حَضْرَاتُ الْقُدْسِ (فارسی میں، ہنوز مخطوطے کی صورت میں ہے)، اردو ترجمہ، لاہور ۱۹۲۳ء؛ (۲) محمد امین بدخشی: مَنَائِبُ الْحَضْرَاتِ (یہ نَتَائِجِ الْحَرَمِینِ کا تیسرا جزو ہے) (مخطوطہ فارسی زبان میں اور شیخ یوسف البنوری کراچی کی ملکیت میں ہے)؛ (۳) آدم البنوری: نِکَاتُ الْأَسْرَارِ، (مخطوطہ یوسف البنوری کے ہاں)؛ (۴) مظہر الدین الفاروقی: مَنَائِبُ الْأَخْطَبِیَّةِ وَ مَقَامَاتِ السُّعْدِیَّةِ، دہلی ۱۸۴۷ء؛ (۵) گلزار اسرار الصوفیہ (۱۹۰۱ء)؛ (۶) وجیہ الدین اشرف:

عامی“ کہا ہے۔ ”مَنَائِبُ“ کا بیان اس کے برعکس یہ ہے کہ البنوری نے ملا طاهر لاہوری سے جن کا شمار اس زمانے کے معروف فضلا میں ہوتا ہے میزان الصرف اور منشعب جیسی ابتدائی کتابوں کا درس لیا۔ البتہ فوج میں جو منصب ان کے سپرد تھا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اچھی خاصی تعلیم پائی تھی۔

البنوری نے ۱۳ شوال ۱۰۵۳ھ/ ۲۵ دسمبر ۱۶۴۳ء کو جمعے کے روز مدینہ منورہ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں حضرت عثمانؓ بن عفان کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ البنوری کا حلقہ اثر بڑا وسیع تھا، چنانچہ ان کا انتقال ہوا تو چار لاکھ سے زیادہ انسان ان کے ارادت مندوں میں شامل تھے۔ مذہب میں ان کی تعلیم معمولی تھی وہ اپنے رویے میں متشدد اور حکام سلطنت سے بڑی نفرت کرتے تھے، لہذا وہ ہمیشہ تنقید و اعتراض کا ہدف بنتے رہے، مگر انہوں نے اپنا مقصد اور مسلک نہیں چھوڑا اور مستقل مزاجی سے اس پر قائم رہے۔ عوام کے علاوہ علما کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا جن میں محمد امین بدخشی، عبدالخالق قصوری، شیخ ابونصر انبالوی، ان کے اپنے بھائی مسعود اور شیخ محمد انبالوی جیسے علما شامل تھے۔ ان کے خلفا میں ایک سو سے زیادہ اشخاص کے نام لیے جاتے ہیں۔ ان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ (رک بان) کے والد ماجد شاہ عبدالرحیم کے روحانی پیشوا حافظ عبداللہ اکبر آبادی اور سید علم اللہ بھی شامل ہیں جو حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (رک بان) کے بزرگوں میں سے تھے۔

نکات الاسرار کے ایک بالکل ضمنی حوالے سے پتا چلتا ہے البنوری نے یہ کتاب ۴۶ سال کی عمر میں ۱۰۵۲-۱۰۵۳ھ/ ۱۶۴۲-۱۶۴۳ء میں





محل وقوع، یعنی دمشق اور مملکت یروشلم کی سلطنت کے درمیان صور (Tyre) سے تھوڑے ہی فاصلے پر آباد ہونے کے سبب جنگی اہمیت حاصل ہو گئی تو اس کی تاریخ میں بھی ایک کے بعد دوسرا واقعہ پیش آنے لگا اور بنیاس میں جن لوگوں نے یکے بعد دیگرے حکومت کی انہوں نے قلعہ الصبیہ کے استحکام اور مضبوطی پر برابر توجہ کی۔ اس قلعے کے کھنڈر آج بھی شہر میں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

۵۰۲/۱۱۲۶ء میں اتابک دمشق طفتکین

نے اسے اسماعیلیوں کے سردار بہرام کے حوالے کر دیا جو اس وقت شام میں بڑی سرگرمی دکھا رہے تھے۔ بہرام کی وفات (۵۲۴ء) کے بعد اور پھر اس لیے کہ دمشق میں فرقہ مذکور کے پیروں کے خلاف جارحانہ اقدام کیے جا رہے تھے ۵۲۴/۱۱۳۰ء میں یہ اسے افرنجیوں کے سپرد کر دیا گیا، مگر ۵۲۷/۱۱۳۲ء میں بوزی نے اسے بزور شمشیر فتح کیا اور سلطان [نورالدین] زنگی کے قبضے میں دے دیا جس کے بعد افرنجیوں نے پھر اس کا محاصرہ کر لیا اور اہل دمشق کی مدد سے ۵۳۴/۱۱۴۰ء میں اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا۔ نورالدین زنگی نے اگرچہ بے دریغ دو بار شکست کھائی، اس لیے کہ دونوں بار بالڈون Baldwin ثالث محصورین کی مدد کو آ پہنچا۔ بالآخر سلطان زنگی ۵۵۹/۱۱۶۴ء میں بنیاس اور قلعہ بنیاس پر قابض ہو گیا، پھر اس کے دشمن باوجود کوشش کے دوبارہ اس میں قدم نہ رکھ سکے۔

اس فتح کے بعد بنیاس کی حیثیت بلاد اسلامیہ اور افرنجی علاقے کے درمیان ہمیشہ ایک مضبوط سرحدی قلعے کی رہی۔ ابن جبیر کے عہد (۵۸۰/۱۱۸۴ء) میں افرنجی بھی اس کے ارد گرد کے میدان سے بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے فائدہ اٹھاتے رہے۔

بنیاس : [بنیاس]، قدیم بنیاس Paneas؛ اس کا یہ نام اس لیے ہوا کہ وہ اس درگاہ کے نواح میں واقع ہے جس کا نام پان Pan ہے اور جو ایک غار میں قائم ہوئی، لہذا اس سے دریائے اردن کے بڑے بڑے منابع میں سے ایک کو درجہ تقدیس حاصل ہوا۔ بحالت موجودہ یہ مقام القنطرہ سے ۲۴ کیلومیٹر کے فاصلے پر شمال مغربی سمت میں اس سڑک پر واقع ہے جو جمہوریہ شام کی جنوبی سرحد کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ محل وقوع بڑا خوشگوار ہے۔ جس کا تعلق کوہ ہرمن کی دل کشا وادی سے ہے اور جہاں پانی کی افراط اور نباتات کی کثرت ہے، عرب جغرافیہ دانوں نے اس کے آس پاس کے علاقے کی زرخیزی اور شادابی کی ہمیشہ تعریف کی ہے بالخصوص اس کے لیموں، کپاس اور چاول کی کاشت کے لیے۔ بنیاس کی تاریخ گو بلاشبہ بڑی قدیم ہے، لیکن اس کا ذکر ہیلینیکی عہد سے پہلے نہیں ملتا۔ اس شہر کو ہیرودوس الکبیر اور بالخصوص اس کے بیٹے فلپ Phil p نے بڑی رونق دی۔ فلپ نے آگسٹس کے اعزاز میں اس کا نام قیصریہ (Caesarea) رکھا، لیکن (اس غرض سے کہ اس میں اور فلسطین میں واقع قیصریہ سے امتیاز کیا جا سکے) اسے قیصریہ غلیی اور آگے چل کر قیصریہ بنیاس Paneas کہنے لگے تا آنکہ اس نام کا صرف دوسرا حصہ باقی رہ گیا۔ چوتھی صدی عیسوی میں یہ ایک اسقفیت کا مرکز بنا۔ جو صوبہ فینیقیہ کے ماتحت تھا۔ عربی فتوحات کے بعد جب یہ معلوم ہوا کہ معرکہ یرموک میں بھی شہر ہرقل کی فوج کا مستقر تھا تو اسے ضلع جولان کا صدر مقام بنا دیا گیا۔ اس سے کچھ دنوں کے بعد المقلسی نے بنیاس اور اس کے گرد و نواح کے دیہات کی خوش حالی کا ذکر کیا ہے، جہاں سرحدوں (ثغور) کے باشندے ترک وطن کر کے آباد ہو گئے تھے، لیکن صلیبی جنگوں کے وقت جب بنیاس کو اپنے



à l'époque des Mameloucks، پیرس ۱۹۲۳ء، بالخصوص  
۱۷۹، ۶۵: (۱۵) ابن الأثیر، جلد ۱، ۱۱، ۱۲، بمدد اشاریہ؛  
(۱۶) ابن القلانسی، طبع Amedroz، بمدد اشاریہ؛ (۱۷)  
ابن العَدِیم: زبَدَةُ [العَلَب] طبع الدهان، بمدد اشاریہ.  
(THOMINE و J. SOURDEL)

\* بنی اسرائیل: رَكْ به بنو اسرائیل.

⊗ بنی اسرائیل (سورۃ): قرآن مجید کی سترھویں  
سورت کا نام، اس نام کی وجہ یہ ہے کہ اس میں  
بنی اسرائیل سے متعلق واقعات کا ذکر ہے۔ اس کو  
سورۃ الأسراء اور سورۃ سبحان بھی کہتے ہیں۔  
اسے اسراء [رَكْ بَانَ] کے ذکر سے شروع کیا گیا  
ہے اور اسراء ہی اس کا اہم اور محوری مضمون ہے۔  
اس میں بتایا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ  
وسلم کو ان تمام برکات کا وارث کیا جائے گا جو  
انبیاء بنی اسرائیل کو دی گئی تھیں۔

اس سورت میں بارہ رکوع اور ایک سو گیارہ  
آیات ہیں۔ یہ آخری مکی دور میں نازل ہوئی۔  
حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سورۃ بنی  
اسرائیل اور سورۃ الزمر کو ہر رات تلاوت فرمایا  
کرتے تھے۔

اس سے پچھلی سورۃ النحل میں مسلمانوں  
کی ترقی کی خبر دی گئی تھی۔ اب اس سورت میں  
آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے مکہ مکرمہ  
سے بیت المقدس تک اسراء (رَكْ بَانَ) کا ذکر کر کے  
غلبہ اسلام کی خاص انداز میں پیش گوئی کی گئی ہے۔  
پھر فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں  
توراة سرچشمہ ہدایت تھی، لیکن نزول قرآن مجید کے  
بعد سرچشمہ ہدایت قرآن مجید قرار دیا گیا ہے،  
دنیا و آخرت کی بہتری قرآن مجید کی فرمان برداری  
اور اطاعت میں ہے۔ ایمان لانے کے بعد قرآن مجید  
پر عمل کرنے سے بڑا اجر ملتا ہے۔ ساتھ ہی یہود  
کے عروج و زوال کے واقعات سنا کر امت اسلامیہ

[سلطان] صلاح الدین نے اپنے عہد حکومت میں یہ  
شہر اپنے لڑکے افضل کو دے دیا، بعد ازاں  
اس کی ملکیت متعدد ایوبی شاہزادوں کے درمیان  
منتقل ہوتی رہی۔ انہوں نے بھی جیسا کہ متعدد  
ایسے کتبوں سے جواب تک باقی ہیں ظاہر ہوتا ہے  
اس کے استحکامات کا ہمیشہ خیال رکھا۔ آگے چل کر  
[سلطان] یبرس نے اس قلعے کو از سر نو تعمیر  
کرایا۔ مملوک مصنفین نے، جن کے نزدیک یہ قلعہ  
ایک امیر کی قیام گاہ تھا اور یہ امیر مقامی عامل  
کے اختیارات سے بھی آزاد تھا، اس کی اہمیت پر برابر  
زور دیا ہے۔ اس زمانے میں بنیاس ایک "ولایت"  
کا صدر مقام تھا جو صوبہ دمشق کے جنوب میں  
عجلون کی نیابت کا ایک حصہ تھی، لیکن تھوڑے ہی  
دنوں میں اس کا زوال شروع ہو گیا اور اس کی حیثیت  
ایک معمولی سے شہر کی رہ گئی جیسی کہ اب ہے۔

مآخذ: R. Dussuad: Topographie historique

de la Syrie، پیرس ۱۹۲۷ء، بالخصوص ورق ۳۹۰: (۲)  
Pauly-Wissowa، بذیل مادہ Paneas؛ (۳) F.M. Abel:  
Géographie de la Palestine، پیرس ۱۹۳۳ تا ۱۹۳۸ء،  
۱: ۱۶۱ تا ۱۶۲، ۳۷۶ تا ۳۷۸، ۲: ۲۹۷ تا ۲۹۸؛  
Le château de Bâniyâs et ses: M. van Berchem (۴)  
inscriptions، در JA، ۱۸۸۸ء، ۳۳۰ ورق؛ (۵)  
The Order of the Assassins: M.G. Hodgson  
Palestine: G. Le Strange (۶): ۱۰۷ تا ۱۰۸؛  
under the Moslems، لندن ۱۸۹۰ء، بالخصوص ۳۱۸ تا  
۳۱۹؛ (۷) A.S. Marmardji: Textes géographiques،  
پیرس ۱۹۵۱ء، ۱۳ تا ۱۴؛ (۸) K.M. Setton: A. History  
of the Crusades، Pennsylvania، ۱۹۵۵ء، بمدد اشاریہ؛  
(۹) L. Caetani: Chronographia Islamica، ۱۷۹؛ (۱۰)  
BGA، بمدد اشاریہ؛ (۱۱) ابن جبیر: رحلۃ، طبع ڈخویہ،  
۳۰۰؛ (۱۲) ابن الفداء: تقویم، ۲۳۹؛ (۱۳) دیشقی طبع Mehren،  
۲۰۰؛ (۱۴) M. Gaudetroy-Demombynes: Le Syrie

کے لیے عبرت کا سامان مہیا کر دیا تاکہ مسلمان ان اعمال بد سے احتراز کریں جو یہودیوں کے زوال کا باعث بنے۔

یہ بھی فرمایا کہ زمین و آسمان کی ہر مخلوق اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتی ہے، بعث بعد الموت کے عقیدے کی صداقت و حقانیت پر دلائل و براہین بھی پیش کیے۔ اس سورت میں یہ بھی فرمایا کہ ایمانداروں کے لیے قرآن مجید میں روحانی و جسمانی امراض کی شفا اور رحمت کا سامان وافر موجود ہے: **وَ نَزَّلَ بَيْنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ** (آیت ۸۲)۔ اس سورت میں تنبیہ، تنہیم اور تعلیم تینوں باتیں بڑے بلیغ اور موزوں انداز میں جمع ہیں اور دلائل سے حقیقت کا عینی مشاہدہ کروایا گیا ہے۔

اس سورت کے پہلے رکوع میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے چند عبرت ناک شواہد پیش کیے گئے ہیں، یہود کی دوسر کشیوں اور فسادوں اور اس کے نتیجے میں دوسراؤں کا ذکر ہے جن کا تذکرہ زبور اور توراہ میں بھی ہے۔

اسی رکوع کے آخر میں فرمایا کہ تم دو ہلاکتوں کا شکار ہو چکے ہو۔ اب ظہور اسلام سے تمہیں تیسری سہلت ملی ہے۔ اگر انکار و سرکشی سے باز آ جاؤ تو تمہارے لیے سعادت و کامرانی کے دروازے کھلے ہیں، لیکن اگر تم پہلی شرارتوں کی طرف لوٹو گے تو اللہ تعالیٰ کا قانون مکافات موجود ہے (آیت ۸)۔ تمہاری ہدایت کے لیے ایسی کتاب بھیجی گئی ہے کہ زندگی کے ہر پہلو کے لیے اسی کی رہبری اقوام و بہترین ہے۔ اس میں کسی طرح کی کجی، کسی طرح کا بیچ و خم، کسی طرح کا الجھاؤ، کسی طرح کی افراط و تفریط نہیں: **يَهْدِي لِيَتَّبِعِيَ هِيَ اَقْوَمُ** (آیت ۹)۔ پہلی آیت میں مسجد الحرام سے بیت اللہ مراد ہے اور مسجد اقصیٰ

سے بیت المقدس۔ دوسرے رکوع میں انسان کی اس کمزوری کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بادی النظر میں خیر و شر اور بھلائی و برائی کے درمیان امتیاز نہیں کرتا۔ اور بسا اوقات برائی اور شر کا اس طرح طالب ہو جاتا ہے جس طرح اسے خیر کا خواستگار ہونا چاہیے اور یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت میں جلد بازی ہے (وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُولًا)، لیکن اسے سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنے اعمال کے نتائج سے بندھا ہوا ہے اور جو برائی بھی اسے پیش آتی ہے خود اس کے اعمال کی پیداوار ہے، پس اسے غفلت اور مایوسی سے بچنا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ ہر انسان کی نیک بختی اور بد بختی اور اس کے انجام کی بھلائی اور برائی کے اسباب و وجوہ خود اس کی اپنی ذات میں موجود ہیں اور اس کی قسمت کے شگون خارج میں نہیں بلکہ ان کا ہر دانہ خیر و شر ان کے اپنے گلے کا ہار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیسرے چوتھے اور پانچویں رکوع میں وہ بڑے بڑے بنیادی اصول پیش کیے ہیں جن پر اسلام پوری انسانی زندگی کے نظام کی عمارت قائم کرنا چاہتا ہے اور جس کی طرف بنی اسرائیل اور دوسرے انبیا کو بلایا گیا ہے اور اس نئے اسلامی معاشرے اور نئی ریاست کے فکری، اخلاقی، تمدنی، معاشی اور قانونی اصول بنائے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی طرف توجہ دلائی ہے اور دنیا و آخرت کی کامرانیوں کے راستے دکھائے ہیں۔ چھٹے اور ساتویں رکوع میں اصول دعوت اسلام بیان ہوئے ہیں اور بتایا ہے کہ اصول اسلام سے روگردانی نہیں مورد ہلاکت بنا دے گی اور اس سلسلے میں بعض آیات و علامات کا ذکر کیا ہے جو ظہور عذاب کا مقدمہ تھیں اور عبرت دلانے کے لیے بعض گزشتہ تاریخی واقعات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس سلسلہ میں انبیا کی



بھائی کا ذکر تو کیا ہے، لیکن ان کا نام نہیں لیا (۱۲) [یوسف: ۸ و ۹ تا ۷۹]، البتہ تفاسیر و تواریخ میں تھوڑے سے رد و بدل کے ساتھ اسرائیلی روایات کو ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ (یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بنیامین کی ولادت اس کی ماں کی جان لیوا ثابت ہوئی)۔ اس میں (بائبل کے) تفسیری و توضیحی اضافوں نے بھی (جن کی قابل ذکر تلخیص *Encyclopaedia Judaica*، ۴ : ۱۱۲ تا ۱۱۳ میں موجود ہے) رواج پا لیا ہے [رک بہ یوسف (نبی)]۔

[سبط بنیامین کا شمار بنو اسرائیل کے بارہ اسباط میں ہوتا تھا، اگرچہ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اسی طرح بنیامین کی اولاد میں ملوک (یا اسرائیلی سردار) بھی ہو گزرے ہیں جن میں طالوت بن قیس الدباغ اور یشبوش بن طالوت قابل ذکر ہیں (ابن حزم: *جمہرۃ انساب العرب*، ص ۵۰۴، ۵۰۹)۔

مآخذ: (۱) *الطبری* ۱ : ۲۶۰، ۲۹۳، ۳۹۷ تا ۴۰۴؛ (۲) وہی مصنف: *تفسیر*، ۱۲ : ۸۷، ۱۳ : ۶ ب بعد؛ (۳) *الثعلبی*: *عرائس المجالس*، ص ۸۲، ۸۵؛ (۴) *Le Coran*: R. Blachère، ص ۴۷۳ ب بعد؛ (۵) *Was hat Mohammed...*: A. Geiger، ص ۱۳۸ ب بعد؛ (۶) *Die haggadischen Elemente*: I. Schapiro، ص ۵۷ تا ۶۵، ۸۰ تا ۸۱؛ (۷) *Les origines des légendes*: D. Sidersky، ص ۸۷؛ (۸) *musulmanes...*: H. Ritter، ص ۲۵۵؛ (۹) *قصص الانبیاء*: (۱۰) *Meer der Seele*، ص ۲۵۵؛ (۱۱) قاضی محمد سلیمان: *الجمال و الکمال*؛ (۱۲) ابن حزم: *جمہرۃ انساب العرب*، ص ۵۰۴، ۵۰۹]۔

(A. J. WENSINCK و G. VAJDA) [و ادارہ]

- **بنیر**: جنوبی عرب کے قبائل کا ایک وفاق جس میں بنو عامر، بنو یوب (ایوب)، آل عزان اور آل عمر جو کور عوذہ (قب مقالہ عوذلی) کے شمالی جانب

غفلت و گمراہی کے تذکرے پر متوجہ ہو گیا ہے۔ آٹھویں رکوع میں ہجرت مدینہ کی تمہید کا مضمون ہے اور ان مشکل حالات کی طرف اشارہ ہے جو پچھلے بارہ سال سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو مکے میں پیش آرہے تھے۔ نویں رکوع میں مشکلات سے بچنے اور مقام محمود کے حصول کے ذرائع بیان ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں پنجگانہ نماز اور تہجد کی طرف توجہ دلائی ہے اور ہجرت کے وقت کی دعا تلقین کی گئی ہے۔ دسویں رکوع میں الہام اور اس کی ضرورت و اہمیت پر روشنی ڈالی ہے اور قرآن مجید کے کلام الہی اور منزل من اللہ ہونے کے دلائل دیے ہیں۔ گیارہویں رکوع سے آخر تک اس صداقت کو قبول کرنے کی راہ کی دشواریوں کو دور کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور کبریائی کے اعلان پر سورت کو ختم کر دیا ہے۔

مآخذ: (۱) *الطبری*: *تفسیر*، بذیل مادہ؛ (۲) ابن کثیر: *تفسیر*، بذیل مادہ؛ (۳) *الزمخشری*: *الکشاف*، بذیل مادہ؛ (۴) *الغازن*: *تفسیر*، بذیل مادہ؛ (۵) محمد جمال الدین القاسمی: *تفسیر القاسمی*، مصر ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۹ء، جلد ۱۰؛ (۶) احمد مصطفیٰ المراغی: *تفسیر المراغی*، مصر ۱۳۶۵ھ / ۱۸۴۶ء، جلد ۱۰؛ (۷) امیر علی: *تفسیر مواہب الرحمن*، لکھنؤ ۱۹۴۰ء، پارہ (جز) ۱۰؛ (۸) *جامع الترمذی*، ابواب *تفسیر القرآن*، باب *تفسیر سورۃ بنی اسرائیل*، اردو ترجمہ از بدیع الزمان: *جائزۃ الشعوذی*، دہلی ۱۳۹۹ھ، ۲ : ۳۵۳ ب بعد؛ (۹) *ابوالکلام آزاد*: *ترجمان القرآن*، جلد دوم؛ (۱۰) *ابوالاعلیٰ مودودی*: *تفہیم القرآن*، بذیل مادہ۔

(ادارہ)

- **بنیامین**: بائبل کا Benjamin - قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام (رک بان) کے بیان میں ان کے اس اخیافی [بقول بعض اعیانی]

(مرکز) شامل ہیں اور جس کی وجہ سے اس صوبے کا نام بھی بنی سوئیف ہو گیا ہے۔ بنی سوئیف جس کی آبادی آج کل ستراسی ہزار ہے ایک اہم زراعتی مرکز ہے جس میں تھوڑی بہت تجارتی اور صنعتی سرگرمی بھی جاری ہے اور وہ اس ریلوے اور شاہراہ پر واقع ہے جو دریائے نیل کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے۔ بحیرہ احمر کے قبطی دوائر اور اس کے درمیان ایک ہگڈنڈی موجود ہے اور مقام الشیخہ حوریہ جو قدیم ترین مسجد جامع البحر میں واقع ہے مقامی لوگوں کی نظر میں بڑا متبرک ہے۔

مآخذ (۱): علی ہاشم مبارک: الخطط الجدیدہ، ۹:

۹۲ ورق؛ (۲) Dict. géog de l'Egypte: A. Boinet Bey

قاہرہ ۱۸۹۹ء، ص ۱۲۰؛ Guides Bleus, Egyptie

۱۹۵۶ء، ۲۵۱

(C. H. BECKER)

بنیقہ: (جمع بنائق)، ایک عربی لفظ جس کے

معنی و مفہوم میں خاصا ارتقا ہوا ہے۔

قدیم عربی زبان میں اس کے معنی کی بابت لغت نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے (قب) ابن سیدہ: المخصص، ۴: ۸۴ تا ۸۵؛ تاج العروس، بذیل مادہ)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے قدیم معنی قمیص یا ڈول (دلو) میں وسعت پیدا کرنے کے لیے لگائے ہوئے پیوند (زقعة) کے تھے۔ لغت نویسوں کے مطابق قمیص کی صورت میں بنائق (پیوند) طویل تکونوں کی شکل میں کپڑے کی کتریں ہوتی تھیں جنہیں بغلوں کے نیچے، لباس کی بگلی سیونوں کے ساتھ عموداً لگایا جاتا تھا تاکہ قمیص زیادہ مکمل بن جائے۔ بعض کے نزدیک یہ بنائق (کپڑے کے) ٹکڑے ہوتے تھے جن کو کالر (طوق) کے سامنے کے حصے میں بٹنوں اور بٹنوں کے سوراخوں کے لیے لگایا جاتا تھا۔ لغت کی کتابوں میں لبنہ، دخریص اور جربان، بنیقہ کے مترادف الفاظ بتائے گئے ہیں۔

الضاهر، مرخہ اور وادی مغربی (جسے وادی بنیر بھی کہتے ہیں) میں بسنے والے بالخصوص شامل ہیں۔ ایک زمانے میں بنیر مسورہ کی سلطنت الرصاص کے قبضے میں تھا۔ ان کا صدر مقام البیضاء ہے (قب مقالہ یحان)، یہیں جملہ بنیری قبائل کے مشترکہ رئیس (عائل) کا قیام رہتا ہے۔ البتہ شمال کے بنویوب کا الفرشہ میں اپنا ایک الگ عائل ہے۔ بنیر کا علاقہ کم و بیش کتبات کے لحاظ سے مضعی MDHY سے ملتا جلتا ہے (قب مقالہ مذہج)۔

مآخذ: (۱) C. Landberg، در Arabica، ۳: ۵،

۳۳، ۵۸؛ (۲) مصنف مذکور: Etudes، ۲: ۲۶۲، ۵۹۷،

۱۳۵۱، ۱۸۱۷، ۱۸۳۳؛ (۳) H. von Wissmann و

Zur historischen Geographie des vorislam. : Höfner

'Sudarabien'، Wiesbaden، ۱۹۵۲ - ۱۹۵۳، ۳۸

۵۸، ۶۲؛ اوراق: ۵۸، ۸۳

(L. LÖFGREN)

بنی سوئیف: (Beni Suaf, Bani Souef)

دریائے نیل کے مغربی کنارے پر مصر کا ایک شہر جو قاہرہ سے ۷۵ میل (۱۲۰ کیلومیٹر) کے فاصلے پر واقع ہے۔ السخاوی (۵۹۰۲ / ۱۳۹۷ء) کا بیان ہے کہ اس شہر کا قدیم نام بنمسویہ (Binum suwayh) تھا جو بہ رواج عام "بنی سوئیف" ہو گیا (ابن الجیمان: التحفة السنیة، ص ۱۷۲، میں بنمسویہ اور ابن دقاق کی الانتصار، ۵: ۱۰ میں بنمسویہ کو شاید بنمسویہ پڑھنا چاہیے۔ ایام گزشتہ میں اور آگے بڑھیے تو اس علاقے کا صدر مقام ہرا کلیوپولس مگنا (Heracleopolis Magna) تھا جو بنی سوئیف سے ۱۰ میل (۱۶ کیلومیٹر) کے فاصلے پر واقع تھا اور جسے صرف محمد علی کے زمانے میں اہمیت حاصل ہوئی۔

جب سے مصر کی تقسیم صوبوں (مدیریات) میں کی گئی ہے بنی سوئیف بالائی مصر کے دوسرے صوبے کا صدر مقام ہے۔ جس میں تین اور اضلاع





ہے۔ دفتر پنجم میں رنجیت سنگھ (متوفی ۱۸۳۹ء) کے تسلط اور انگریزوں کی فتوحات (تا ۱۸۴۰ء) کی سرگزشت بیان کی ہے۔ دیباچے میں مؤلف نے دعویٰ کیا ہے کہ اس سے پہلے پنجاب کے حالات و واقعات اتنی شرح و بسط سے کسی نے نہیں لکھے۔ پنجاب پبلک لائبریری کے محفوظہ تاریخ پنجاب کے صفحات ۳۲۴، تقطیع  $10\frac{3}{4} \times 8\frac{3}{4}$  اور ہر صفحے پر ۲۲ سطور ہیں۔

تاریخ پنجاب کے مآخذ: بھگوتا، سہابھارتا، پدما پوران، حبیب السیر، تاریخ ہند میاں احمد شاہ پٹائی، جنم ساکھی (گور مکھی)، تاریخ مہاراجہ رنجیت سنگھ (فارسی)، مؤلفہ سوہن لعل، [نیز ریو: فہرست مخطوطات فارسی درموزہ بریطانیہ، ۳: ۹۵۳]۔

(مقبول یگ بدخشانی)

- بوجی: رَک بہ بجایہ۔
- بُو حمارہ: مراکش کا ایک فتنہ انگیز جس نے ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک اپنے آپ کو شمال مشرقی مراکش میں سلطان تسلیم کرایا۔ اس کا اصل نام جلالی بن ادریس الزرہونی الیوسفی تھا۔ ۱۸۶۵ء کے قریب کوہستان زرہون میں پیدا ہوا۔ وہ مہنسی (انجینٹری) کے طلبہ کی اس جماعت کا فرد تھا جسے مولائی حسن نے قائم کرنے کی کوشش کی تھی، بعد میں وہ حکومت کے ایک انتظامی شعبے میں معمولی درجے کا ملازم ہو گیا جہاں اس پر خیانت کا مقدمہ چلا اور قید کر دیا گیا۔ پھر وطن چھوڑ کر الجزائر چلا گیا۔ ۱۹۰۲ء کے موسم گرما میں الجزائر سے واپس چلا آیا اور پھر دغا فریب اور نام نہاد کرامات کی بدولت اس نے "شریف" ہونے کا دعویٰ کیا حتیٰ کہ محمد بن الحسن نام سے مولائی عبدالعزیز [رَک بان] کا جو مکناس میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا تھا بڑا بھائی مان لیا گیا۔ یہ

نہیں ہوئے۔  
 مآخذ: (۱) ابن خردادبہ، ص ۹۴؛ (۲) ابن حوقل (طبع ڈخوبہ)، ۱۶۹ حاشیہ (g)؛ (۳) البکری، ۱۸۳؛ (۴) یاقوت، بذیل مادہ؛ (۵) G. Hoffmann: *Syrische Akten*؛ (۶) قَب اس کا حاشیہ *Persischer Märtyrer*، ص ۱۸۹؛ (۷) متعلقہ ڈخوبہ، ابن خردادبہ، ترجمہ، ۶۸؛ (۸) *Untersuchungen zur historischen Topographic etc.*، ج ۱، ۱۹۰۷؛ (۹) *Archaeologische*؛ E. Herzfeld اور F. Sarre (۸)؛ *Reise im Euphrat und Tigris-Gebiet* (۱۹۱۰)؛ (۱۰) *LeStrange*، ص ۹۱ اور ۹۸۔  
 (E. HERZFELD)

• بو بَسترو: [ = بَسترو ]، رَک بہ بَسترو۔

• بو بَتلخ: رَک بہ آندی۔

• بوٹی شاہ: غلام محی الدین نام، بوٹی [= بوٹی] شاہ لقب اور لدھیانہ وطن۔ سلسلہ قادریہ سے نسبت تھی۔ تیرھویں صدی ہجری کے اواخر/انیسویں صدی عیسوی کے وسط میں تاریخ نویسی کی بدولت شہرت پائی۔ تاریخ پنجاب ۱۲۶۴ھ / ۱۸۴۷ء میں تالیف کی۔ یہ تاریخ مقدمہ، پانچ دفاتر (ابواب) اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں پنجاب کی وجہ تسمیہ اور جغرافیائی حالات بیان کیے ہیں۔ دفتر اول میں سدومن سے رائے پتھورا تک ہندو راجاؤں کے حالات درج ہیں۔ دفتر دوم سلطان محمود غزنوی سے شاہان مغلیہ تک کی تاریخ ہے۔ اس میں ضمنا احمد شاہ ابدالی (متوفی ۱۱۸۳ھ / ۱۷۶۹ء) اور سکھوں کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ دفتر سوم میں سکھوں کے گورؤوں یعنی گورو نانک سے لے کر گورو گوہندسنگھ اور اس کے اخلاف کے حالات قلمبند کیے ہیں۔ دفتر چہارم میں سلطنت مغلیہ کے زوال پر برسر اقتدار آنے والے سکھ سرداروں اور راجاؤں کے حالات و فتوحات کا ذکر



جو ملیلہ کے قریب واقع ہے پناہ لی اور وہیں اہل ہسپانیہ سے بات چیت شروع کر دی اور یہ ظاہر کیا کہ اس علاقے میں انہیں کان کنی کے لیے مراعات مل سکتی ہیں، مگر یوں آس پاس کے قبائل میں اپنا اعتبار کھو بیٹھا۔ جون ۱۹۰۸ء میں اس نے تازا پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور مولائی عبد الحافظ [الحفیظ؟] کی تخت نشینی کے موقع پر جو ہل چل ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ ایک دفعہ پھر فاس پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ نئے سلطان نے اس کے خلاف کئی بار فوجیں بھیجیں۔ بالآخر سلطان کی ایک فوج ۲۲ اگست ۱۹۰۹ء کو فاس کے شمال میں ۱۰۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہوئی۔ بو حمارہ کو ایک پنجرے میں جو اس مقصد کے لیے پہلے ہی سے تیار کر لیا گیا تھا بند کر کے فاس کے کوچہ و بازار میں پھرایا گیا تا کہ لوگوں کی طعن و تشنیع کا نشانہ بنے، لیکن چند دنوں کے بعد سلطان نے جو اس کی شیخیوں سے تنگ آ گیا تھا اور اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں یورپ والے اس کے بچانے کے لیے مداخلت نہ کریں، ۱۵ ستمبر ۱۹۰۹ء کو اسے گولی مار کر ہلاک کرا دیا۔ اس کی لاش کچھ جلی اور کچھ ان جلی رہ گئی۔

مآخذ: (۱) Dr. Louis Arnaud : *Au temps des*

*Mehallas*، دارالبیضاء، (Casablanca) (۱۹۰۲ء، ۱۹۰۳ء تا

۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۵ء، اہم مآخذ ہے۔ اس کے بعد (۲)

*Le Maroc d'aujourd'hui*: E. Aubin، پیرس ۱۹۰۳ء، ۱۰۸

تا ۱۳۱ اور ۱۹۰۲ء تا ۱۹۱۹ء؛ (۳) G. Saint-René Tailandier

*Les origines du Maroc Français*، پیرس ۱۹۳۰ء، ۱۰۳

اور ۱۳۰؛ (۴) Dr. F. Weisgerber : *Au seuil du Maroc*

*moderne*، رباط ۱۹۱۳ء، ۱۳۱ تا ۱۳۳ اور ۱۹۰۵ء تا ۱۹۸

؛ (۵) W. Harris : *Morroco thc. vas*، لندن ۱۹۲۱ء؛

آخر میں (۶) M. Le Glay : *La mort du Rogui*، (ناول)

ہوا تو علاقہ تازا [رک بان] کے قبیلہ غیاطہ کی بہت سی شاخوں نے اس کو سلطان تسلیم کر لیا اور تھوڑے ہی دن میں آس پاس کے اور قبیلے بھی ان کے ہمنوا ہو گئے۔ ۱۹۰۲ء کے موسم خزان میں بمقام تازا تخت پر بٹھایا گیا اور یہی شہر اس کا دارالحکومت قرار پایا۔ عام طور پر وہ بو حمارہ (ابو حمارہ) کے نام سے مشہور ہے کیونکہ معمولاً گدھی پر سوار ہوا کرتا تھا۔ اسے "الروگی" بھی کہتے تھے جو اصل میں رواگہ قبیلے کے ایک سابق مدعی حکومت کا نام تھا جس نے ۱۸۶۲ء میں علم بغاوت بلند کیا، مگر بہت جلد گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے سلطان کے خلاف بغاوت کو اس لیے ہوا دی تھی کہ سلطان نے اہل یورپ سے کیوں تعلقات قائم کیے۔

مولائی عبدالعزیز نے بو حمارہ کے خلاف تادیبی مہمات روانہ کیں، لیکن ۱۹۰۲ء کے آخری ہفتوں میں انہیں یکے بعد دیگرے شکست ہوئی بلکہ فاس (Fez) کا شہر بھی خطرے میں آ گیا۔ انجام کار ۲۹ جنوری ۱۹۰۳ء کو شریفی عساکن نے اسے فاس کے قریب شکست دی اور ۷ جولائی کو چند دنوں کے لیے تازا پر بھی وقتی طور پر قبضہ کر لیا، مگر بو حمارہ نے باوجودیکہ زخمی اور ذلیل ہو چکا تھا، دوبارہ اپنی فوجیں منظم کیں اور نومبر میں پھر تازا میں آدھمکا۔ اب وہاں بیٹھ کر اس نے دو اور شورش پسندوں سے راہ و رسم پیدا کی، ایک ریسولی جو علاقہ طنجه میں شورش پھیلا رہا تھا اور دوسرے بو عمائمہ الجزائر سے جو اوران Oran کے فرانسیسی ضلع کے جنوب میں فرانسیسیوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ اس نے بو عمائمہ سے مل کر اوجہ Oudjda کا محاصرہ کیا جو ۱۹۰۴ء کے آخر سے ۱۹۰۵ء تک جاری رہا، مگر کامیابی نہ ہوئی، لہذا شکست کھا کر اس نے قصبہ سلوان میں

موجود تھے (قبّ ترکی بودرم: ایک زمین دوز مدور چھت والا راستہ، سرداب)، یا اس کا یہ نام نئے قلعے کے لاطینی نام Sanctum Petrum کی وجہ سے ہوا۔ بودرم کے ساحلی علاقے کو جو ترکوں کے قبضے میں تھا اکثر تاخت و تاراج کیا گیا۔ ۱۵۸۵ء / ۱۴۸۰ء میں جب آل عثمان جزیرہ روڈس Rhodes کے ناکام محاصرے سے استانبول واپس جا رہے تھے تو انہوں نے سینٹ پیٹر کے قلعے پر حملہ کیا تا کہ اس پر قبضہ کر لیں، مگر اس سے کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوا۔ عثمانی حکومت میں بودرم ۱۵۲۹ء / ۱۵۲۲ء میں شامل ہوا اور یہ اس وقت جب سینٹ جان کے جانبازوں کو ایک طویل اور متہورانہ مقاومت کے بعد روڈس Rhodes اور اس سے ملحقہ مقبوضات کو سلطان سلیمان قانونی کے حوالے کرنا پڑا۔ اولیا چلبی کا بیان ہے کہ بودرم کی بندرگاہ پر عثمانیوں اور اہل وینس کے درمیان ۱۵۵۰ء / ۱۶۳۵ء تا ۱۵۸۰ء / ۱۶۶۹ء میں ایک بحری معرکہ ہوا۔ پھر ۱۱۸۲ء / ۱۷۶۸ء تا ۱۱۸۸ء / ۱۷۷۳ء کی عثمانیوں اور روسیوں کی جنگ میں بھی روسی بحری بیڑے کی گولہ باری سے جو مشرقی بحر متوسط میں مصروف پیکار تھا بودرم کو نقصان پہنچا۔ ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۸ء کی جنگ عظیم میں بودرم پر پھر گولہ باری ہوئی اور اس مرتبہ قلعے کو کافی نقصان پہنچا، لیکن ۱۹۱۹ء - ۱۹۲۰ء میں جب اٹلی کی فوجوں نے اس پر قبضہ کیا تو اس کی مرمت بھی کر دی گئی۔ عثمانی عہد میں بودرم آناتولی (Anadolu) کی ایالت اور منتشا (Menteshe) کے سنجاق میں شامل تھا۔ اس کے بعد اسے "قضاء" کا درجہ مل گیا اور یہ اس وقت جب یہ سنجاق ۱۸۶۳ء میں آبدین Aydin (سمرنا) کی نئی ولایت کے ماتحت آ گیا۔ آج کل یہ شہر ترکی کے صوبہ مگلہ

پیرس ۱۹۲۹ء، جس کی بنیاد واقعات کے مضبوط اور ٹھوس معلومات پر رکھی گئی ہے۔

(R. LE TOURNEAU)

\* بوخاریسٹ: راک بہ بخاریسٹ۔

\* بوڈرم (Bodrum)، ایک چھوٹا سا شہر جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر جزیرہ استن کوی (Kos Istan Koy) کے بالکل مقابل واقع ہے اور اس جگہ کے بالکل قریب جہاں کاریا Caria میں زمانہ ماضی کا شہر ہیلی کارنسس Halicarnassus آباد تھا۔ ۱۳۰۰ء کے قریب قریب جب ترک مغربی ایشیائے کوچک پر چھا گئے تو یہ علاقہ منتشا Menteshe [راک بان] کے بیگوں کی حکومت میں آ گیا۔ عثمانیوں نے منتشا کی ریاست پر ۱۳۹۰ء / ۱۳۹۲ء میں قبضہ کیا، لیکن ۱۴۰۳ء / ۱۴۰۲ء میں جب تیمور لنگ نے انقرہ کی جنگ میں انہیں شکست دی تو یہ ریاست ان کے ہاتھ سے نکل گئی اور پھر ۱۴۲۹ء / ۱۴۲۵ء - ۱۴۲۶ء تک اس پر ان کا پورا اور بلا واسطہ قبضہ نہ ہو سکا۔ پھر جب اس ریاست کا دوسری دفعہ قطعی طور پر الحاق کر لیا گیا تو اس وقت اس میں قدیم ہیلی کارنسس Halicarnassus شامل نہ تھا، کیونکہ اس اثنا میں سینٹ جان کے جانباز جن کا قیام روڈس Rhodes میں تھا، اپنے رئیس اعظم فلیبرٹ ڈی نیلک Philibert de Naillac کی زیر قیادت نہ صرف اس پر قابض ہو چکے تھے بلکہ اس میں سکونت بھی اختیار کر لی تھی حتیٰ کہ اس شہر کے بالکل متصل انہوں نے ایک قلعہ بھی تعمیر کر لیا تھا جسے Castellum Sancti Petri (یونانی Πετρόνιον) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ لہذا ایک خیال یہ ہے کہ بودرم کا نام یا تو ان ٹوٹے بھوٹے گنبد نما سردابوں سے ماخوذ ہے جو ہیلی کارنسس Halicarnassus کے کھنڈروں میں



(23)، لائیوزگ ۱۹۲۶ء، ۲: ۴۰ اور ۶۱؛ (۱۳) *Il Castello Clara Rhodos dei Cavalieri di Rodi a Budrum*، در *Istituto Storico-Archeologico di Rodi*، جلد ۱، برگیمو ۱۹۲۸ء، ۱۲۸-۱۸۱؛ (۱۴) *Das Fürstentum Mentese (Istanbul Mitteilungen)*، جلد ۲، استانبول ۱۹۳۴ء، ص ۹۸، ۱۰۸، ۱۶۷، ۱۷۰، ۱۷۲؛ (۱۵) حافظ قدری، در *TOEM*، شماره ۲۶ (۱۳۳۰ء)؛ ۱۲۷ تا ۱۲۸؛ (۱۶) *A. Galanti Bodrumlu Bodrum Tarihi*، استانبول ۱۹۴۵ء؛ (۱۷) وہی مصنف؛ *Bodrum Tarihinin Ek*، انقرہ ۱۹۴۶ء؛ (۱۸) سامی؛ *قاموس الأعلام*، جلد ۲، استانبول ۱۳۰۶ھ، ص ۱۳۶۹ تا ۱۳۷۰؛ (۱۹) علی جواد؛ *تاریخ و جغرافیای لغاتی*، استانبول ۱۳۱۳-۱۳۱۴ھ، ۲۰۴ بعد؛ (۲۰) *Pauly-Wissowa*؛ ۲/۷ (۱۹۱۲ء)، بذیل مادہ ہیلی کارنسس *Halikarnassos*، کالم ۲۲۵۳ تا ۲۲۶۴؛ (۲۱) *La Turquie d'Asie*؛ V. Cuinet، جلد ۳، پیرس ۱۸۹۴ء، ص ۶۶۲ تا ۶۶۵۔

(V. J. PARRY)

بوداپست: Budapest، ہنگری کا سب سے بڑا شہر اور دارالحکومت، جو دریائے ڈینیوب کے دونوں کناروں پر آباد قدیم بستیوں پر مشتمل ہے، یعنی دائیں کنارے پر بودا (O-Buda) (و ابودہ) اور بائیں کنارے پر پست (و کوبانیہ Kobanya)۔ بودا ایک سطح مرتفع پر آباد ہے اور پست نشیبی میدان میں۔ ان دونوں کے درمیان دریائے ڈینیوب چٹانوں سے ٹکراتا ہوا بہتا ہے اور اس کے بیچ میں جزیرہ مارگریٹ واقع ہے، جو سنگ بستہ راستوں کے ذریعے بودا اور پست سے ملا ہوا ہے۔ دریا کے آر پار جانے کے لیے چھ پل موجود ہیں، جن میں سے ایک کا شمار یورپ کے سب سے بڑے معلق پلوں میں ہوتا ہے۔ اس پل کے ایک سرے پر ۳۸۳ گز لمبی سرنگ "محل کی پہاڑی" تک جاتی ہے۔

(Muğla) میں شامل ہے۔ ۱۹۵۰ء میں اس کی آبادی ۴۸۰۰ نفوس پر مشتمل تھی۔  
 مآخذ: (۱) پیری رئیس: کتاب بحریہ (Turk Tarihi Arastirma Kurumu Yayinlarindan)؛ عدد ۲، استانبول ۱۹۳۵ء، ۲۲۰، ۲۲۳، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۲۹؛ (۲) پچوی: تاریخ، استانبول ۱۲۸۳ھ، ۱: ۷۶؛ (۳) اولیا چلبی: سیاحت نامہ، ج ۹، استانبول ۱۹۳۵ء، ۲۱۱ بعد؛ (۴) C. Cippico، Bonn، Dukás، ۱۸۳۴ء، ۱۱۵ بعد؛ (۵) V. Coronelli اور *L'Isola di Rodi*؛ A. Parisotti، وینس ۱۶۸۸ء، ۳۷۰ بعد؛ (۶) Hammer-Purgstall، ۷: ۳۳۸؛ (۷) *A History of Discoveries at Halicarnassus, Cnidus and Branchidae*؛ C. T. Newton، لنڈن ۱۸۶۲ تا ۱۸۶۳ء، ۱: ۷۲ بعد مقامات متفرقہ اور؛ (۸) R. P. Pullan: Appendix I (=) ۶۶۶ تا ۶۶۷؛ (۹) *Description of the castle of St. Peter at Budrum Zur historischen Topographie*؛ W. Tomaschek، SBak. Wien، در *von Kleinasien im Mittelalter* (Phil.-Hist. Cl.)، شماره ۱۲۴، ویانا ۱۸۹۱ء، ص ۳۹؛ (۱۰) *Les Hospitaliers à Rhodes...*؛ J. Delaville le Roux، پیرس ۱۹۱۳ء، ۲۸۸ بعد؛ (۱۱) *Il Castello di S. Pietro in Anatolia ed i suoi stemmi dei Cavalieri di Rodi*؛ در *Rivista del Collegio Araldico*، جلد ۱۳، روم (Rome) ۱۹۱۵ء، ۱ تا ۱۱، ۶۷ تا ۷۸، ۲۱۶ تا ۲۲۷؛ (۱۲) *I Castelli dei Cavalieri di Rodi a Budrum (Alicarnasso)*؛ در *Annuario della R. Scuola Archeologica di Atene*، جلد ۴ تا ۵ (۱۹۲۱-۱۹۲۲ء)، برگیمو (Bergamo) ۱۹۲۴ء، ص ۲۹۰ تا ۳۳۳؛ (۱۳) *Das anatolische Wegenetz nach Turkische Bibliothek, Bd.) osmanischen Quellen*

- بودین: رَکْ بہ بدین.
- بوذاسف: رَکْ بہ بلوہر و بوداسف.
- بُور: رَکْ بہ بعل.
- بُوران: عباسی خلیفہ المأمون کی زوجہ اور اس کے ایرانی وزیر حسن بن سہل (رَکْ بآن) کی بیٹی۔ بعض کے نزدیک اس کا اصلی نام خدیجہ تھا اور بوران لقب۔ صفر ۵۱۹۲/ دسمبر ۶۸۰ء میں پیدا ہوئی اور دس سال ہی کی عمر میں اس کا نکاح المأمون سے ہو گیا۔ حسن بن سہل خلیفہ کے ابتدائی عہد حکومت میں بڑی وفاداری سے اس کی خدمت کر چکا تھا۔ رسوم شادی کہیں رمضان ۵۲۱/ دسمبر ۶۸۲ء۔ جنوری ۶۸۲۶ء میں حسن بن سہل کی اپنی جاگیر میں فم الصلح کے مقام پر جو واسط کے قریب واقع ہے ادا کی گئیں۔ اس وقت حسن بن سہل اگرچہ وزارت سے الگ ہو کر امور سلطنت میں کوئی حصہ نہیں لے رہا تھا، لیکن خلیفہ کی جب بھی خواہش تھی کہ اس کے خاندان سے اپنی وابستگی کا اظہار کرے۔ یہ شادی جس شان و شوکت سے ہوئی اس کا حال بہت سے مصنفین نے بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پھر جیسا کہ روایت ہے بوران نے اسی موقع پر ابراہیم بن المہدی (رَکْ بآن) کی سفارش کی تھی۔ بوران کی وفات ربیع الاول ۵۲۱/ ستمبر ۶۸۸ء میں ۸۰ سال کی عمر کے لگ بھگ ہوئی۔ اس کا قیام اس محل میں رہتا تھا جو کبھی جعفر البرمکی کی ملکیت تھا اور جو آگے چل کر قصر الحسن کے نام سے مشہور ہوا۔ حسن نے یہ محل بوران کو جہیز میں دے دیا تھا۔ بوران کا انتقال ہوا تو یہ محل خلفا کو منتقل ہو گیا۔
- مآخذ: (۱) المَعْقُوبِي: (۲) طَبْرِي، بَدَن: اِشَارِيه: (۳) ابن مَنُور: كِتَاب بَغْدَاد، طَبْع قَاهِرَه، ص ۱۰۲، ۱۱۳ تا ۱۱۸؛ (۴) ابن خَلِّكَان، عَدَد ۱۱، اور قَاهِرَه ۱۹۳۸ء، ص ۲۵۸ تا ۲۶۱؛ (۵) الثَعَالِي: لَطَائِف المَعَارِف، طَبْع de Jong، ص ۲۳ تا ۲۴۔

بودا کی بستی پست کی بہ نسبت قدیم ہے، لیکن پست کی طرح یہاں بھی کوئی ایسی قابل ذکر عمارت نہیں جسے تاریخی آثار قدیمہ میں شمار کیا جا سکے، البتہ بودا کا ماحول نسبتاً پر سکون ہے اور پست کی گہما گہمی کے مقابلے میں پرانے دنوں کی یاد تازہ کرتا ہے۔ پہاڑی پر اٹھارہویں صدی عیسوی کا بنا ہوا محل یہاں کی سب سے مشہور عمارت ہے۔ اس میں ۸۶۰ کمرے ہیں جن میں سے کئی ایک کی آرائش و تزئین دیدنی ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر کلیسائے تاج پوشی ہے، جسے تیرہویں صدی عیسوی میں شاہ ییلہ Bola چہارہ نے رومی طرز تعمیر میں شروع کیا اور پندرہویں صدی عیسوی میں شاہ متھیاس Mathias نے گتھک Gothic طرز میں پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اس کے عقب میں بادشاہ سینٹ سٹیفن Stephan the Saint کا ایک کانسی کا مجسمہ نصب ہے۔ پست کا قدیم شہر ذرا بلندی پر بسایا گیا تھا تاکہ دریا کے سیلاب سے محفوظ رہے۔ جدید شہر اس کے گردا گرد آباد ہوا ہے۔ یہاں کی مشہورترین عمارت کلیسائے یسیلیکا Basilica ہے۔ یہ ایک رومی طرز تعمیر کی عمارت ہے جس کا گنبد ۳۱۵ فٹ بلند ہے۔ اوپیرا ہاؤس، یونیورسٹی، عجائب گھر اور عدلیہ کی عمارتیں جدید زمانے سے تعلق رکھتی ہیں۔

۱۹۶۳ء میں بودا پست کی آبادی اٹھارہ لاکھ پچھتر ہزار تھی۔ ایک صحت افزا اور تفریحی مقام کے اعتبار سے اس کی یورپ میں بڑی شہرت ہے (نیز دیکھیے مادہ بدین)۔

- مآخذ: (۱) انسائیکلو پیڈیا بریٹینیکا، ۱۹۵۰ء، ص ۳۲۲ بجد: (۲) F.B. Smith: Budapest, the city of the Magyars، مطبوعہ ۱۹۰۳ء؛ (۳) R. Millot: Budapest et les Hongrois، مطبوعہ ۱۹۱۳ء۔ (سید امجد الطاف)



کے اس سلسلے کو جو تیبستی [= تیبستی] اور انڈی کے پہاڑی جھرمٹوں کے درمیان کے نشیبی خطے کے جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔ یہ نشیبی خطہ بحر الغزال کے راستے بحیرہ شاد (Lake Chad) تک پھیلا ہوا ہے۔ اس روایتی بورقو میں فرانسیسیوں نے ”بودیلہ جوراب کورو تورو“ (Bodélé-Djourab-Koro-Toro) کی چراگاہوں اور مرشہ (Mortcha) کے شمالی علاقے کا اضافہ کر دیا ہے، جس کی پیداوار نخلستانوں کی معیشت کا تکملہ کرتی ہے، اور دوسری طرف اس میں تیبستی کے جنوب مشرق کا علاقہ کوہ امی کوسی (Emi Koussi) (۱۱۲۰۰ فٹ) بھی اس میں ملا دیا ہے، کیونکہ یہ پہاڑ خطہ بورقو کا قلعہ سمجھا جاتا ہے۔ پورے علاقے کی شکل مربع منحرف ہے جس کا قاعدہ جنوب میں ۱۵ درجے اور ۲۱ درجے سمت الرأس کے سولہویں متوازی خط کے ساتھ ساتھ پانچ سو کیلومیٹر لمبا ہے اور جس کی چوٹی لیبیا کی سرحد کے ساتھ، ۱۹ درجے اور ۲۰ درجے ۲۰ دقیقے سمت الرأس کے درمیان، مطابقت رکھتی ہے۔ اس کا کل رقبہ ۲۳۰۰۰۰ مربع کیلومیٹر ہے۔

باستثنائے تیبستی زمین کا ابھار تدریجی ہے۔ امی کوسی کے دامن سے ریتلے پتھر کی سطح مرتفع جنوب اور جنوب مغرب کی جانب ۲۳۰۰ سے لے کر ۹۵۰ فٹ تک ڈھلواں ہے، جہاں وہ جوراب (Djourab) اور بودیلہ (Bodélé) کے وسیع و عریض ریتلے نشیب میں مدغم ہو جاتی ہے۔ اٹھارہویں متوازی خط پر طاسوں کا ایک سلسلہ شمال مغرب سے جنوب مشرق، یعنی نگلگہ N'Galakka سے لارگیو Largeau کی طرف جانے والے خط پر مسلسل چلا گیا ہے اور سطح کو دو حصوں میں قطع کرتا ہے۔ نشیبی میدان کے شمال میں سطح زمین کو ندیاں کاٹی ہوئی جاتی ہیں۔ یہ امی کوسی Emi Koussi

Baghdad during the Abbasid : G. Le Strange (۶) Caliphate، اوکسنڈ ۱۹۰۰ء، ص ۲۳۳ تا ۲۳۶؛ [۷] الزرکلی: الأعلام، بذیل مادہ؛ (۸) (ع)، بذیل مادہ۔

(D. SOURDELL)

• بوران: (یا بوران دخت)، خسرو پرویز کی بیٹی، ایک ساسانی ملکہ جس نے ۶۳۰ء میں ایک مختصر عرصہ حکومت کی۔

مأخذ: (۱) Geschichte der Perser : Noldeke

und Araber zur Zeit der Sasaniden، ص ۳۹۰ بعد۔

(ادارہ ۱۱ قدیم)

• بورق: بورق، بورق یعنی سہاگہ، قزوینی کی تفصیلات سے پتا چلتا ہے کہ بورق کے عام نام کے تحت بہت ہی مختلف نوعیت کے نمکوں کو خلط ملط کر دیا جاتا تھا، وہ خام شورہ (نظرون = natron) کو سہاگے کی ایک قسم لکھتا ہے، یعنی اربنی سہاگہ، دھات سازوں کا سہاگہ، تنکار (سہاگہ)، جسے برصغیر پاک و ہند سے درآمد کیا جاتا تھا، سیٹھا سوڈا، زراوند اور کرمان کا سہاگہ۔ ارسطو کی Petrology میں بھی اس کی خاصیت یہ لکھی ہے کہ یہ کل اجسام کو پگھلا دیتا، سودھنے کے عمل کو تیز کرتا اور ڈھلائی کے کام میں سہولت پیدا کرتا ہے۔ خام شورہ (نظرون) کو خاص طور پر اس سلسلے میں بورق کی ایک قسم کے طور پر بیان کیا گیا ہے، تنکار کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سونے کے سودھنے میں خاص طور پر کارآمد ہے۔ طب میں اسے متعدد طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔

مأخذ: (۱) القزوینی (طبع Wüstenfeld)، ص

۲۱۲؛ (۲) وہی کتاب (ترجمہ Ruska)، ص ۹۰۔

(J. RUSKA)

• بورقو: [= برکو، نیز بورکو] (Borkou)، وہ نام جس سے یہاں کے باشندے نخلستانوں

جو چشموں کے ارد گرد بالکل منقطعہ حارہ کی باافراط روئیدگی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ دراصل یہاں پانی کثرت سے ہے: اسی کوسی Emi Kousi کے دامن میں نمک کی جھیلیں، وسطی نشیب کے خالص یا شور آمیز پانی کے چشمے، وادیوں کی ریت کو تر کرنے والی یا جنوبی طاسوں کی سطح پر ظاہر ہونے والی آبی تہیں اور آخر میں اونینگا (Ounianga) کی جھیلیں۔ ان پانی کے ذخیروں کا منبع بظاہر اسی کوسی کے ندی نالوں کی کثرت ہے، جو آتش فشانی چٹانوں کی تہوں کے درمیان جذب ہو جاتے اور ریتلے پتھر میں سے رس کر نشیبوں میں دوبارہ نمودار ہو جاتے ہیں۔

اس نیم صحرائی زمین steppe کے خصائص شمال سے جنوب کی طرف جاتے ہوئے بدلتے جاتے ہیں۔ شمال میں ”ہد“ جو چند قسم کے گیاہی پودوں کی پرورش کرتی ہے، کثرت سے پائی جاتی ہے، لیکن سترھویں خطِ عرض البلد میں اس کی جگہ ایک قسم کی چتکبری پھول دار گھاس (cram cram) (cenchrus biflorus) لے لیتی ہے۔ اس کے بعد وہ ساحلی قسمیں آتی ہیں جو جھاڑیوں (savannah) کی پیش رو ہیں۔ یہاں سے اریل غزالوں (ariels) اور شتر مرغوں کی سر زمین شروع ہوتی ہے۔ شمالی وادیوں اور خصوصاً وسطی نشیب میں ”دوم“، یعنی مصری کھجوروں اور خاص کر خوبصورت بیول کے چھوٹے چھوٹے جنگل، جزیروں کی طرح ادھر ادھر موجود ہیں اور گویا اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ کسی زمانے میں وہاں زیادہ وسیع اور گہنے جنگل ہوں گے۔

دسویں صدی عیسوی سے نخلستانوں اور چراگاہوں کی کشش نواحی پہاڑوں کی آبادی کو ادھر کھینچ لائی ہے۔ مشرقی اور مرکزی تہستی کے خانہ بدوش قبائل (توہو بیلے کی دو شاخیں: تده

کی چوٹی سے نکلتی ہیں اور شاخ در شاخ ہو کر سطح مرتفع کو کٹی پھٹی زمین کی پٹیوں میں تقسیم کرتی ہیں جنہیں جگہ جگہ ”برخانے“، یعنی ہلال نما ٹیلے گھیرے ہوئے ہیں۔ جنوب میں یہ سطح مرتفع کٹی پھٹی نہیں ہے اور اس کی ڈھلان تدریجی ہے۔ طاسوں کے تین سلسلے جنوب مغرب سے شمال مشرق کی طرف اس ڈھلان کو کاٹتے یا اس کی حد بندی کرتے ہیں۔ جنوب سے شروع کریں تو پہلے بودیلہ (Bodélé) اور جوراب (Djourab) کے نشیب ہیں، جن میں یکے بعد دیگرے لمبے لمبے پہاڑی ٹیکرے اور چوڑے چوڑے اتھلے تلاؤ آتے ہیں۔ ٹیکروں پر بھی ”برخانے“ داخل ہو گئے ہیں۔ پھر وسطی نشیب میں کھجور کے درختوں کا ایک سلسلہ ہے جسے برخانے اور چھوٹے تگونے ٹیلے (= نیکہ) عرضاً قطع کرتے ہیں۔ اور اخیر میں اونینگا (Ounianga) کا دھنسا ہوا منطقہ اور اس کی جھیلیں ہیں جو گورو (Gouro) ندی کے ساتھ اسی کوسی کے بائیں بازو تک چلا گیا ہے۔

اسی علاقے کی آب و ہوا صحرا کی سی ہے جس میں اپریل سے ستمبر تک کے گرم ترین مہینوں اور [ان کے بعد کے] سرد ترین مہینوں میں درجہ حرارت کا بڑا تفاوت پایا جاتا ہے۔ سرد ترین مہینوں کی سردی میں شمال مشرقی ہواؤں سے اور اضافہ ہو جاتا ہے جو ان دنوں عموماً مسلسل چلتی رہتی ہیں اور ریت سے پر ہوتی ہیں۔ موسم کی خشکی کا اوسط مقام تانزروفت Tanezrouft کے اوسط سے مشابہ ہے، لیکن یہ ملک وسطی صحرا سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں خشک سالی کے طویل سلسلے نہیں ہوتے۔ بارش گو بہت کم، مگر کم از کم مئی سے ستمبر تک ہر سال ہوتی ہے۔ یہ باقاعدگی بذات خود اس امر کی توجیہ نہیں کہ اس میں کثرت سے سبزی کیوں ہے



وسائل پر ہے، خواہ انہیں نخلستانوں پر یہ حقوق ملکیت جو انہوں نے ماضی میں حاصل کیے تھے، ابھی تک حاصل ہیں اور خواہ ان کے لیے باغوں کی کاشت وہاں مستقل سکونت رکھنے والے ”کماجہ“ کرتے ہیں جن کی اصلیت کا حال اچھی طرح معلوم نہیں، اگرچہ وہ ضرور غلامانہ ہوگی۔ ان کماجوں نے جو فصل میں ان بدویوں کے شریک بن گئے تھے، فرانسیسی حکومت کی مدد سے اپنے آپ کو انہیں خراج ادا کرنے کی پابندی سے بتدریج آزاد کرا لیا ہے۔ ان کھجور کے باغوں میں آج کل تقریباً دس لاکھ بار آور نخل ہیں جن میں سے نوے فیصد وسطی نشیب میں ہیں۔ ان کی پیداوار تیس ہزار قنطال quintals [= تقریباً اسی ہزار من] کھجور سالانہ ہے۔ باغوں میں آبپاشی کی نالیوں کو پانی ڈھینکلی والے کنوؤں سے ملتا ہے اور ان کی اوسط پیداوار ۱۲۰ ٹن گندم اور ۲۰۰ ٹن باجرہ سالانہ ہے۔ سبزیاں (پیاز، ٹماٹر، شکر قند اور فلفل شیریں) بھی پیدا ہوتی ہیں۔ نمک کے حوض جہاں سے نمک بذریعہ تبخیر حاصل کیا جاتا ہے، شمالی وادیوں میں کثیر تعداد میں ہیں، اور ان کی اور انڈی کی پیداوار مل کر (۱۹۵۰ء میں) پورے صحرائے اعظم کی پیداوار کے نصف کے برابر تھی۔ جنوبی نیم صحرائی میدانوں کے خانہ بدوش نخلستانوں میں ان کی پیداوار مبادلہ کرنے کے لیے گوشت، مکھن اور دباغت شدہ کھالیں لاتے ہیں۔ مقیم اور خانہ بدوش سبھی لوگ اپنے اوزار اور ہتھیار لہاروں سے حاصل کرتے ہیں، جنہیں نیچ قوم سے سمجھا جاتا ہے۔ یہ لہار توہو علاقے میں ”ازا“ کہلاتے ہیں۔ مقامی لوہا جو اب ختم ہو چکا ہے انہیں میسر نہیں آتا، لہذا لوہے کی ٹوٹی پھوٹی چیزوں یا خام لوہے کی چادروں سے جو بورنو میں خریدی جاتی ہیں اوزار وغیرہ بنانے

[= تیدا] اور دزا) نے پہلے ”گورو“ کے نخلستانوں پر پھر وسطی نخلستانوں (”وون“) پر قبضہ جما لیا اور دزہ Donza کو جو یہاں کے اصلی باشندے معلوم ہوتے ہیں، اسی کوسی کے جنوبی کھجور کے جینڈوں کی طرف دھکیل دیا جو اب ان کی سکونت گاہ ہے۔ وہ خانہ بدوش جو قبیلے کے سب سے بست طبقے سے تعلق رکھتے تھے اب مستقل بس گئے ہیں، گو بعض اوقات صرف جزئی طور پر۔ صحرائی گھاس ”ہد“ اور شورہ آمیز پانی پاس ہی ہونے کے باعث وہ اونٹوں کی پرورش کر سکتے ہیں۔ دوسرے قبائل جنوب کے نیم صحرائی میدانوں کی طرف چلے گئے ہیں جن میں چراگاہوں کی بہتات ہے۔ کچھ قبائل تو جھیل شاد (Chad) کے نشیبی علاقوں تک پہنچ گئے ہیں جہاں وہ اونٹوں کے بدلے مویشی پالنے لگے ہیں۔

آبادی کے بعض اور گروہ انڈی اور وداہ Wadaہ سے اتر کر ٹوبو سے گھل مل گئے ہیں۔ آنگرہ جو بورقو میں بہت اہم گروہ ہے اسی طرح بنا تھا، جب کہ گیدہ (Gaeda) کانم (Kanem) کے کھجور قبیلے کی نسل سے معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح بورقو ایک کٹھالی کا کام دیتا رہا ہے اگرچہ ٹوبو کا اثر غالب رہا ہے۔ ان گروہوں کی اکثریت دزا زبان بولتی ہے، ان کے رسم و رواج وہی ہیں جو ٹوبو کے اور جسمانی ساخت بھی ٹوبو کی سی، یعنی غیر حبشی سیاہ فام، بہت ہی عام ہے۔ یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ عربوں نے بورقو کے تمام باشندوں کو کیوں ”قرعان“ کے واحد نام کے تحت ایک ہی زمرے میں رکھ دیا تھا۔ سرکاری اعداد و شمار کی رو سے ان بورقوئیوں کی موجودہ تعداد تقریباً بیس ہزار ہے۔

ان کے خانہ بدوشوں کی معیشت کا انحصار مویشیوں کی پرورش نیز نخلستانوں کے امدادی

بھراغزال پر قابض ہوئے تھے۔ غرض سنوسیوں کے حملوں نے اقتصادی زندگی کو درہم برہم کر کے تباہ کر دیا۔ سنوسیوں کو ترکوں کی حمایت حاصل تھی، جنہوں نے ۱۹۱۱ء میں اس ملک میں اپنی محافظ فوجیں متعین کر دی تھیں، لیکن اطالیہ۔ ترکیہ کی جنگ کے سبب ۱۹۱۲ء میں ترکوں نے ان متعینہ فوجوں کو واپس بلا لیا اور ۱۹۱۳ء میں فرانس نے سارے ہورقو پر قبضہ جمالیا [نیز رک بہ تبو]۔

مآخذ: (۱) *Sahara et Soudan : Nachtigal*  
 (ترجمہ Gourdault)، ۱۸۸۱ء؛ (۲) *La région du Tchaï et du Ouadai*؛ (۳) *Le Centre Africain Français : Ferrandi*؛ (۴) *Le Borkou et ses habitants, vie et moeurs* در *Revue Militaire de l' A.E.F.* جلد ۱۶، ۱۹۳۹ء؛ (۵) *R. Capot-Rey*؛ *Introduction à une géographie humaine du Borkou* در *Travaux de l'Institute de Recherches Sahariennes*، ۱۹۵۷ء، ۱۶ : ۳۱ تا ۷۱۔

(M. CH. LECOEUR)

- ہورک (Börk) : رک بہ لباس۔
- ہورکلوجہ مصطفیٰ : رک بہ بدرالدین بن قاضی سناونہ۔
- ہورکو : (= برکو)، رک بہ ہورقو۔
- ہورنو : (= برنو)، یہ نام جس کی اصل مشکوک ہے لیکن جس کا مادہ "بری بری" (بری بری) میں بھی موجود ہے، یعنی اس نام میں جو ان کے ہمسایے کنوری Kanuri کو دیتے ہیں، مغربی افریقہ کے عقبی علاقے کے ایک خطے کو دیا جاتا ہے اور مندرجہ ذیل علاقوں کے لیے استعمال ہوتا ہے :-  
 (الف) غیر معینہ طور پر اس علاقے کے لیے جس کی جغرافیائی لحاظ سے کبھی واضح تعین نہیں ہوئی اور جہاں مغربی سوڈان کے علاقے کی ایک ریاست قائم ہو گئی تھی۔ دیکھیے نیچے پیرا ۶۔

کا کام لیتے ہیں۔ انیا کے ان مبادلوں سے مقامی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ کفرہ کے اقتصادی نقطہ نظر سے غیر اہم راستے سے ہورقو ساحل بحیرہ روم سے بارہ سو میل دور ہے، چونکہ وہ ان دوسرے تجارتی راستوں سے جو سوڈان کو بحیرہ روم سے ملاتے ہیں (جو تبستی اور وہاں کے قزاقوں سے بچ کر گئے ہیں) نیز ان راستوں سے جو وداہی Wadai کے جنوب سے ہو کر بلاد نیل کو جاتے ہیں ہٹا ہوا ہے اس لیے ہورقو اپنی معیشت کا ہمیشہ آپ ہی کفیل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نخلستانی لوگوں کی زندگی کے پرانے طور طریقے اس زمانے تک قائم ہیں، اور انہوں نے انیسویں صدی عیسوی تک اسلام قبول کرنے سے پہلے اپنے جاہلی مذہب کو ترک نہیں کیا تھا۔ ان کی یہ علیحدگی قریبی زمانے میں دو دفعہ ٹوٹ چکی ہے۔ ۱۸۳۲ء سے نصف صدی بعد تک اولاد سلیمان، فزان سے ترکوں کے مقابلے سے بھاگ بھاگ کر موج در موج یہاں اسٹڈتے رہے اور انہوں نے اس ملک کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ پھر ۱۹۰۰ء کے قریب سنوسی کانم اور منگہ سے ہسپا ہو کر وسطی نشیب کے دونوں کناروں پر نکلکے N'Galakka [= آنگتکھ] اور وون [= ووا] (المعروف بہ فایہ، بعد میں لارگیو Largeau) میں مستقلاً جم گئے۔ انہوں نے اپنے زاویوں کو، خصوصاً گورو میں، زراعتی نیز ذہنی اور دینی مراکز بنا لیا، جہاں سے اسلام کی تبلیغ کی جاتی تھی، لیکن وہ تاختیں بھی کرنے لگے جن کی وجہ سے یہاں کے خانہ بدوشوں کو فیصلہ کرنا پڑا کہ یا تو انہیں نخلستانوں میں رہیں جن پر سنوسیوں کا قبضہ تھا، یا جنوب کی طرف چراگھوں میں چلے جائیں جو اس وقت سے فرانسیسیوں کی نگرانی میں آ گئی تھیں جب سے وہ وداہی اور



ابن خلدون (م ۱۴۰۶ء)، المقریزی (م ۱۴۴۲ء) اور دوسروں نے کیا ہے۔ الحسن بن محمد الوزان الزیاتی (Leo Africanus، م تقریباً ۱۵۵۲ء) نے اس خطے کی سیاحت کی اور اس کا حال بھی بیان کیا تھا (کتاب ہفتم)۔

(۳) نقل و حمل و تجارت: موٹو کار جدید شاہراہ (کانو - میدوگری فورٹ لاسی Kano-Mai - dugari-Fort Lamy سابقہ کاروانی راستے (کانو، ککوہ، بلیمہ) کی طرح مغرب سے مشرق کی طرف پورے علاقے سے گزرتی ہے اور اس میں شمال و جنوب سے معاون راستے آ ملتے ہیں۔ میدوگری Maidugari میں ایک مستقل ہوائی مستقر ہے اور ناگہانی ضرورت کے تحت اترنے کے لیے دوسرے میدان بھی ہیں۔ زائہ قدیم میں سب سے بڑی تجارت برآمد غلاموں اور ہاتھی دانت کی تھی، اور اب ان کی جگہ مونگ پھلی، کھالوں، گوند، روئی اور بہت سی دوسری چھوٹی موٹی اشیا نے لے لی ہے۔ درآمد مصنوعات پر مشتمل ہے، خصوصاً سوتی اشیا پر۔ اندرونی علاقوں میں خشک مچھلی کی، جو بحیرہ شاد کے علاقوں سے آتی ہے، نمک اور تخم کولا (Kola nuts) کی اچھی خاصی تجارت ہوتی ہے۔

(۴) معیشت: یہ خطہ صنعتی نہیں اور اس میں شہر بھی نہیں ہیں۔ جہاں تک مابحتاج زندگی کا تعلق ہے یہ خود کفیل ہے اور اس کی آبادی زیادہ تر زراعت پیشہ ہے۔ ۱۹۵۲ء کی سرشماری میں ۲۹۰۳۶۱ مردوں میں سے ۳۷۶۵۶۱ کو دکھایا گیا ہے کہ وہ زراعتی اور ماہی گیری کے کام کرتے ہیں۔ اس کا سرمایہ مویشی، بھیڑوں، بکریوں کے کثیر التعداد گلوں نیز بحیرہ شاد کی ماہی گاہوں پر مشتمل ہے۔

۵۔ نسلیں: اس خطے کی آبادی، جس کا حال اوپر پیرا ۱ (ب) میں بیان کیا گیا ہے، کنوری، فلانی [=فلنی]، الحوصہ [رک باں]، شوہ عرب اور کچھ

(ب) ایک صوبے کے لیے؛ رقبہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رو سے پینتالیس ہزار نو سو مربع میل، اور جائے وقوع ۱۰ درجے اور ۱۳۰۵ درجے عرض بلد شمالی کے اور ۱۰ درجے اور ۱۴ درجے طول بلد مشرقی کے درمیان اور جو شمالی ناٹجیریا میں واقع ہے اور ان علاقوں پر مشتمل ہے جو انگریزوں اور جرمنوں کی مغربی اور انگریزوں اور فرانسیسیوں کی جنوبی اصلی بین الاقوامی سرحدوں کا حصہ ہیں اور جن میں جرمنی کے سابق کیمرونز Kameruns کی مشرقی سرحد سے ملی ہوئی ایک پتلی پٹی بھی شامل ہے۔ یہ جرمن مقبوضہ ۱۹۱۴ تا ۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد عارضی طور پر برطانیہ عظمیٰ کی حفاظت میں دے دیا گیا تھا۔ پھر اسی صوبے میں بورنو اور دیکوہ Dikwa کے شیخوں کی ریاستیں اور کچھ دوسرے انتظامی حلقے بھی داخل کر دیے گئے۔

(۲) جغرافیہ: بورنو زیادہ تر ایک وسیع ریتلے میدان پر مشتمل ہے، جس کا پانی دو ندیوں میں بہتا ہے۔ یوب Yobe جو شمال میں مغرب سے مشرق کی طرف اور یدسیرم Yedseram جو جنوب میں جنوب سے شمال کی طرف بہتے ہوئے جھیل شاد کے دلدلی کناروں میں جا ملی ہیں۔ یہ جھیل اس علاقے کے شمال مشرقی کونے میں واقع ہے۔ پہاڑی خد و خال فقط اس صوبے کے انتہائے جنوب اور جنوب مشرق میں پائے جاتے ہیں۔ عہد قدیم میں دریائے شری shari بھی، جو جنوب سے شمال کی طرف بہتا ہوا بحیرہ شاد میں گرتا ہے، بورنو کی مشرقی سرحد تصور کیا جاتا تھا اور بلاد بگرمی [رک باں] [= باجرمی] سے بورنو کو جدا کرتا تھا۔ عہد وسطیٰ کے ابتدائی جغرافیہ دان اور مؤرخ اس نام کے خطے سے واقف تھے، چنانچہ وہ چارلس پنجم (۱۳۷۵ء) کی قتلونی اٹلس (Catalan Atlas) میں پایا جاتا ہے اور اس کا ذکر العمری (م ۱۳۳۸ء)،

بھی خاصا اقتدار حاصل ہے۔ اس امر کی بڑی قوی روایاتی اور بعض تحریری شہادتیں موجود ہیں کہ یہ حکمران جماعت ”سفید چمڑی“ والی تھی۔ ایک معقول مفروضہ یہ ہے کہ شروع میں مادری نسب کی پابند تھی اور غالباً اس کی اصل کا تعلق طوارق (جمع، جس کا واحد ”ترقی“ ہے۔ عوامی زبان میں ”تھورگی“ Tuareg سے) ہے۔ سیفواہ Saifawa خانہ بدوش لوگ تھے، جنہوں نے اپنے شمال کی قبو قوم کو اپنے اندر ضم یا مغلوب کر لیا اور سلطنت کانم کی داغ بیل ڈالی، جس کا پایہ تخت نجمی Njimi تھا۔ کہتے ہیں کہ ان کے حکمرانوں نے ”سلطان پری پری Beriberi“ کو آباد ہونے کی اجازت دی تھی اور ایک روایت میں مسلمان پری پری کے ایک حملے کا ذکر ملتا ہے جو ۶۸۰ء میں یمن کی طرف سے براہِ فزان و کور ہوا تھا۔ سلطنت کانم اگر پہلے نہیں تو گیارہویں صدی عیسوی تک مشرف بہ اسلام ہو چکی تھی اور تیرہویں صدی عیسوی تک اتنی طاقتور ہو گئی تھی کہ اس کا اثر شمال مشرق میں مصر اور جنوب میں دیکوہ تک پہنچ گیا۔ ابن خلدون ”شاہ کانم اور مالک بورنو“ کا ذکر کرتا ہے۔ اور بورنو سے یہاں بظاہر سلطنت کانم کا جنوبی حصہ، یعنی بحیرہ شاد سے دیکوہ تک کا علاقہ مراد ہے، لیکن ۱۳۸۹ء کے قریب خاندان سیف کو کانم سے اس کے ایک رشتہ دار قبیلے نے مار بھگایا، اور بعد کی قبائلی نقل و حرکت کا نتیجہ یہ نکلا کہ کنوری قوم بحیرہ شاد کے مغرب میں آگے بڑھی اور بالآخر اس نے ۱۴۷۰ء کے قریب دریائے یثو [یو] Yo پر برنی نگر گمو Birni N'gazargamu کی بنا رکھی جو بورنو کی مملکت اور کنوری قوم کا دارالحکومت بنا۔ یہ تین صدیوں تک ان کا دارالحکومت رہا، گو ۱۵۰۷ء کے قریب ان کنوریوں نے خود نجمی

دوسرے قبائل پر مشتمل ہے۔ ۱۹۵۲ء کی سرشماری میں نائجیریا کے صوبے بورنو کے نمایاں اعداد و شمار یہ تھے: کنوری ۲۵۲۶۸۳، فلانی ۱۶۸۹۳۳، الحوصہ ۸۳۷۲۹، شوہ عرب ۹۸۹۰۹، برہ ۸۹۸۲۶۔ کل تعداد جس میں دوسرے کم تعداد کے بیشتر لامذہب قبائل بھی شامل ہیں، جو صوبے کے جنوبی اور جنوب مشرقی پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں، ۱۵۹۵۷۰۸ ہے۔ اس کے مقابلے میں ۱۹۳۱ء کی سرشماری میں مجموعی تعداد ۱۱۱۸۳۶۰ تھی۔

(ب) زبانیں: کنوری [رک باں] اس خطے کی بڑی زبان ہے، لیکن وہ عوامی عربی بولی جو شوہ عرب بولتے ہیں اور ففولہ Fuffulde بھی جو فلانی [رک باں] بولتے ہیں، اہمیت رکھتی ہیں۔ الحوصہ Hausa قصبات کے تجارت پیشہ لوگوں کے سوا بہت کم لوگ بولتے ہیں۔ بے دین قبائل کی اپنی بولیاں ہیں۔ وہ لوگ جو زیادہ ترقی یافتہ مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں انگریزی زبان بھی استعمال کرتے ہیں۔

۶۔ تاریخ: بورنو کی قدیم تاریخ سلطنت کانم Kanem کی تاریخ سے وابستہ ہے۔ ۶۶۶ء میں عقبہ بن نافع مشرقی مرکزی صحرا کے علاقہ تبو میں بحیرہ شاد کے اوپر تپستی تک در آئے، جہاں کے باشندے اساطیری روایت کے مطابق ”سو“ So تھے، ایک دیو پیکر نسل، جس کی ابتدا فزان سے ہوئی تھی۔ ایک روایت کی رو سے اس خطے میں کانم کا پہلا بادشاہ سیف نامی ایک شخص تھا، جس کا دعویٰ تھا کہ وہ بنو حمیر کے سیف بن ذی یزن کی اولاد میں سے ہے۔ عہد قدیم میں اس علاقے کی حکمران جماعت مغبی Maghumi کہلاتی تھی اور اس کا مادہ کنوری زبان کے الفاظ سے Mai (حکمران) اور مغیرہ میں نظر آتا ہے جو بورنو کی مادر ملکہ کا خطاب تھا، جسے پہلے کی طرح اب



الحوصہ کی ان ریاستوں پر جو بورنو اور سکوٹو Sokoto کے درمیان واقع تھیں بورنو کی سیادت کو خطرہ لاحق ہو گیا۔ ۱۸۰۸ء میں بورنو کے فلانی گجہ میں جمع ہوئے۔ مے احمد بن علی کو شکست دی اور اس کے پائے تخت نگرگمو کو تاخت و تاراج کر ڈالا (اس سہم کے کاسیاب فلانی سرداروں میں سے ایک نے آگے چل کر ”سرکن بورنو“ کا لقب اختیار کیا اور کتکم شہر اور امارت کی طرح ڈالی)۔ مے احمد کانم کی طرف بھاگ گیا، جہاں اس نے وہاں کے ایک سرکردہ رئیس محمد الامین الکانمی سے امداد کی التجا کی۔ اس سردار نے اسلامی دنیا میں دور دور تک سیاحت کی تھی اور اس کے علم و تقویٰ کی شہرت تھی۔ اس نے مے احمد کو دوبارہ بحال کر دیا اور فلانیوں کو باہر نکال دیا، مگر مے احمد کی وفات کے بعد وہ اس کے جانشین دونمہ بن احمد کو شکست دینے کے لیے بہت جلد پھر آ موجود ہوئے۔ مؤخر الذکر بھی باپ کی طرح الکانمی سے امداد کا طلبگار ہوا۔ اس نقطے پر پہنچ کر کہا جا سکتا ہے بورنو کی تاریخ جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ الکانمی نے بنو فلانی اور بغرمی [= بگرمی] پر پھر فتح پائی اور سیف کے قدیم حکمران خاندان کو رسمی بادشاہوں کے طور پر بحال کر دیا، لیکن خود گتکوہ میں قدم جما لیے۔ یہیں ۱۸۲۲ء میں Denham نے اس سے پس پردہ مالک اقتدار ہونے کی حیثیت سے ملاقات کی۔ ۱۸۲۶ء کے قریب اس نے سلطنت بورنو کو ریاستہائے الحوصہ پر دوبارہ مسلط کرنے کی جو مزید کوششیں کیں وہ کچھ زیادہ کاسیاب نہ ہوئیں اور شکست کھا جانے کے بعد ۱۸۳۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا عمر اس کا جانشین ہوا، جس نے بنو فلانی سے صلح کر لی۔ اس گفت و شنید کے سلسلے میں عمر کی غیر موجودگی کے دوران میں سیف

کو دوبارہ فتح کر لیا اور اپنے سابقہ ملک کانم کو بھی بورنو کی نئی سلطنت کا ایک صوبہ بنا لیا۔ سولہویں صدی عیسوی میں اور قابل ”میون“ یا حکمرانوں کے ایک سلسلے کے تحت (محمد، ۱۵۲۶ تا ۱۵۴۵ء، دونمہ ۱۵۴۶ تا ۱۵۶۳ء، عبداللہ جس کے عہد میں بورنو میں آ بسنے والے فلانیوں کا پہلی مرتبہ ذکر آتا ہے، ۱۵۶۴ تا ۱۵۷۰ء)، سلطنت بورنو ہر طرف بہت وسیع ہو گئی اور وسعت پذیری کے اس عمل کو بلاشبہ ۱۵۹۲ء میں مراکش کے ہاتھوں بورنو کی حریف مغربی صحرائے اعظم کی سلطنت سنغے [= سنغوی] Songhay کے فتح ہو جانے سے تقویت پہنچی۔ بورنو کے ان حکمرانوں میں غالباً سب سے بڑا مے ادریس آئمہ (م ۱۶۰۲ء) تھا، جس نے کانو Kano ایسے دور دراز علاقے تک کاسیابی سے لشکر کشی کی اور آیر [رک باں] اور تبو [رک باں] کے قبائل کو بھی اپنا مطیع بنا لیا۔ مے ادریس نے مکہ مکرمہ کا فریضہ حج بھی ادا کیا۔ وہ میدگری کے نزدیک بحیرہ آلو Alo میں مدفون ہے۔ بورنو اس عروج کو پہنچنے کے بعد دو صدیوں تک خاموش و پرسکون رہا (مے علی ۱۶۴۵ تا ۱۶۸۳ء نے تین حج کیے)، مگر اس مدت میں، کم از کم بعض اوقات، معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت بورنو کو اپنی مدافعت کرنا پڑی، کیونکہ علی کو خود اس کے اپنے دارالحکومت میں بنو طوارق اور بنو کوارفہ نے محاصرے میں لے لیا تھا، گو وہ ناکام رہے۔ اس کمزوری کے مدد و معاون اسباب کئی مسلسل سخت قحط سالی کے دور ہو سکتے ہیں۔ ایک قحط کی مدت تو سات برس مرقوم ہے۔ نیز وہ عام ابتری بھی جو اہل مراکش کی فتح سنغے کے بعد پھیل گئی تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں فلانیوں نے مغرب میں آور آگے تک جہاد کیا تو اس کے اثرات بھی بورنو تک پہنچے کیونکہ

کے لشکر کو ابتدا میں کچھ کامیابی بھی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے رباح کی خیمہ گاہ پر قبضہ بھی کر لیا، لیکن انجام کار رباح کی افواج نے اسے مار بھگایا۔ کیاری خود پکڑا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ اس طرح بورنو میں رباح کی مزاحمت ختم ہو گئی۔ رباح نے دیکوہ میں فوجی حکومت قائم کر لی اور اپنے لشکر غارت گری کے لیے بھیجا کرتا تھا۔ اس کی حکومت کاملاً تخریبی تھی اور ایک وسیع رقبے میں اس نے بے حساب نقصان پہنچایا اور ابتری پھیلائی۔ ۱۹۰۰ء میں رباح نے فرانسیسی فوج کے ہاتھوں جو سپہ سالار لاسی Lamy کے ماتحت تھی شکست کھائی اور مارا گیا۔ رباح کا بیٹا فضل اللہ فرانسیسیوں کے سامنے سے مغرب کی جانب فرار ہو گیا۔ انہوں نے اس کا تعاقب کیا اور انجام کار ۳ اگست ۱۹۰۱ء کو Captain Dangeville کے تحت اسے نائجیریا میں گجیہ کے مقام پر ایک معرکے میں ہلاک کر ڈالا (گجیہ اینگلو فرانسیسی سرحد پر ۱۵۰ میل اندر برطانیہ کے علاقے میں ہے۔ یہ سرحد کاغذ پر تو تسلیم کر لی گئی تھی، لیکن سرحدی کمشنوں نے اس کی ارضی حد بندی اس وقت تک نہیں کی تھی جس کے باعث وہاں کے اس درجہ غیر یقینی حالات میں خاصی پریشانی پھیلی رہی)۔ فرانسیسی حکام نے مرحوم شہو کے بیٹے سنہ Sanda کوریاست میں بحال کر دینے کی پیشکش کی تھی، لیکن وہ ان کی شرائط کو پورا نہیں کر سکا۔ آخر کار برطانوی حکام نے اس کے بھائی شہو بکر جربای (جربی) کو لا کر خاندان کانسی کو بحال کر دیا۔ شہو بکر پہلے منگنو Mongunu میں متمکن ہوا، پھر ککوہ میں منتقل ہو گیا اور انجام کار ۱۹۰۷ء میں میدگری کے قریب یروہ میں مقیم ہو گیا، جو اب تک بورنو کا دارالحکومت چلا آ رہا ہے۔ دیکوہ جرمن کمپرونز Kameruns کا حصہ ہو گیا تھا جسے ۱۹۱۴-۱۹۱۸ء کی

کے شاہی خاندان نے ودای (وادای) کے حکمران کو طلب کیا۔ کہ وہ الکانم کے خاندان کو باہر نکالنے میں اس کی مدد کرے۔ یہ سازش ناکام ہو گئی۔ ابراہیم جو اس وقت ”مے“، یعنی سردار تھا، ۱۸۴۶ء میں قتل کر دیا گیا اور اس کا لڑکا علی جو خاندان سیف کا آخری وارث تھا، لڑائی میں مارا گیا۔ عمر اب بورنو کا حقیقی اور قانونی حکمران بن گیا، اور اس نے ”مے“ کے بجائے ”شہو“ (شیخ) کا لقب اختیار کیا اور اس طرح نئے حکمران خاندان ”کانم بو“ کی بنیاد ڈالی۔ اس نے ککوہ کو جو ودای کے لوگوں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا تھا، دوبارہ تعمیر کرایا۔ اسی مقام پر ڈاکٹر بارتھ Dr. Barth نے اس سے ۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۵ء میں ملاقات کی۔ ودای کے ساتھ جنگ تقریباً مسلسل ہوتی رہی جس نے بورنو کو بہت کمزور کر دیا اور زندر Zinder کا دور دست مغربی خطہ قریب قریب آزاد ہو گیا۔ ۱۸۹۳ء میں رباح (رک بان) کوئی دو ہزار کا خوب مسلح اور تربیت یافتہ لشکر لے کر ودای سے بورنو میں داخل ہوا۔ یہ لشکر اتنا طاقتور تھا کہ (بورنو کی) کوئی فوج بھی اپنے قدیم ہتھیاروں کے ساتھ اس کے سامنے میدان میں نہیں نکل سکتی تھی۔ اس نے اس وقت کے شہو، ہاشم کے ایک سپہ سالار کو آئجہ اور پھر خود ہاشم کو ننگہ کے مقام پر شکست دی۔ اس کے بعد اس نے ککوہ کو فتح کر کے لوٹ لیا، بعد ازیں دیکوہ آ کر اسی کو اپنا صدر مقام بنا لیا اور وہاں کا وہ قلعہ تعمیر کروایا جو آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ شہو ہاشم کے ایک چچرے بھائی محمد الامین المعروف بہ کیاری (کیری) نے ہاشم کو جو اب پناہ گزین تھا، چمکے سے قتل کروا ڈالا اور خود گیدم Geidum سے رباح کے خلاف بڑھا۔ دونوں فوجوں کا گیشگر کے مقام پر سامنا ہوا اور کیاری



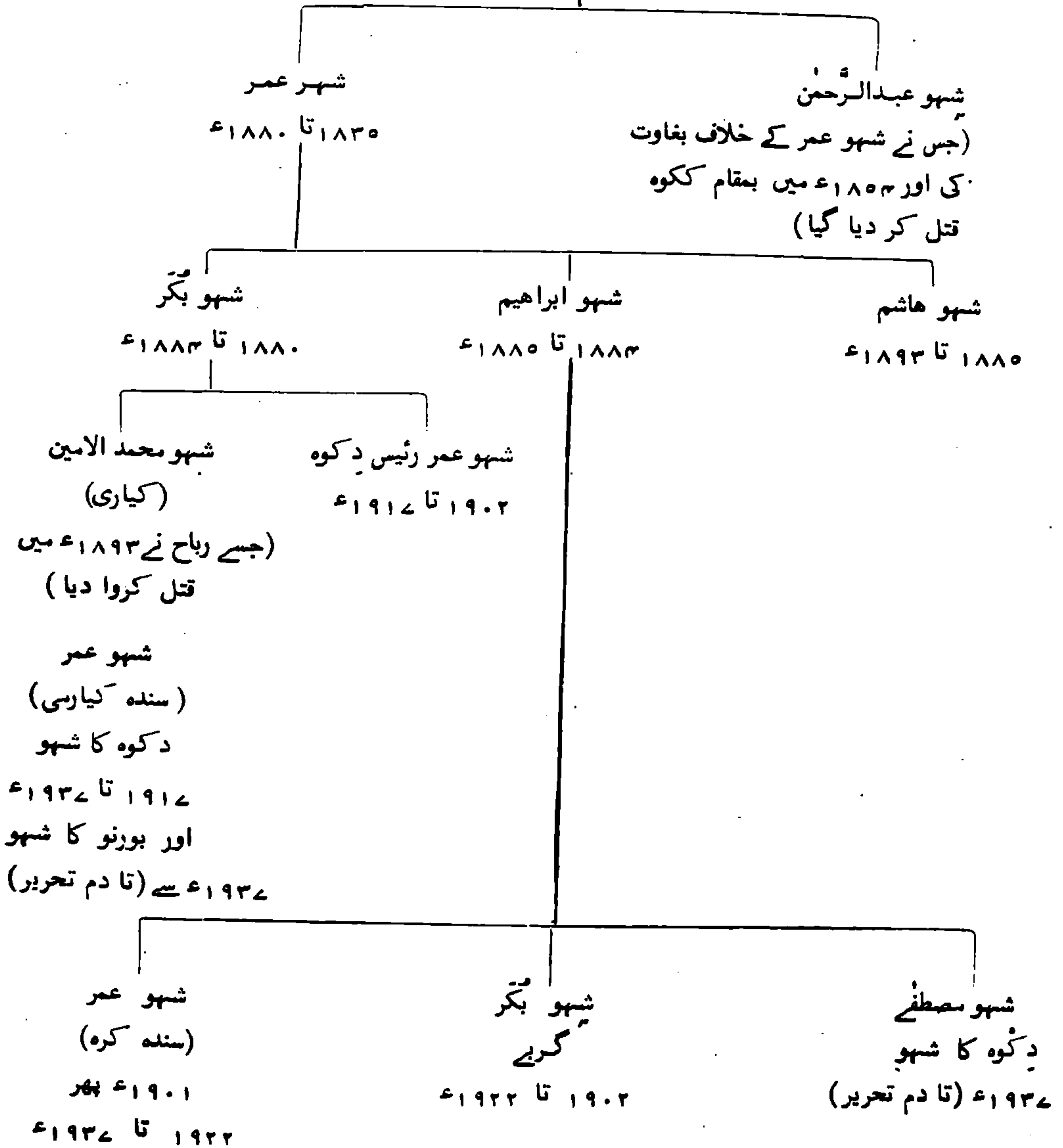
بورنو کی تاریخ کی تفصیلات حکومت نائجیریا کی رودادوں میں ملیں گی۔

جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کے بعد انجمن اقوام نے برطانیہ اور فرانس کی تحویل میں دے دیا، دیکوہ برطانیہ کے علاقے میں آیا۔ موجودہ صدی میں

بورنو اور دیکوہ کے شہو (= شیوخ)

شہو محمد الامین الکانمی

(وفات بمقام گکوہ ۱۸۳۵ء)



- **بورنیو : Borneo** برنیے Brunai کی ہگڑی ہوئی شکل ہے (جو برطانوی شمالی بورنیو کا ایک شہر ہے اور ۵ درجے عرض بلد شمالی اور ۱۱۰ درجے طول بلد مشرقی پر واقع ہے)، جس کا اطلاق انڈونیشیا کے عظیم جزائر سنہ میں سے سب سے بڑے جزیرے پر، غالباً چودھویں صدی عیسوی سے اور بھر حال سولہویں صدی سے پرتگیزیوں کی جانب سے کیا جانے لگا۔ اس جزیرے کا بڑا حصہ اب کالیمنٹن Kalimantan کہلاتا ہے اور انڈونیشی جمہوریہ کا ایک صوبہ ہے۔ اسلامی مطالعات کے نقطہ نظر سے اس جزیرے کی اہمیت بہت کم ہے، کیونکہ بورنیو کے اندرونی علاقے کی تقریباً کل آبادی بے دین ہے۔ اسلام اور عیسائیت کا نفوذ ساحلی علاقوں میں ہو گیا ہے جہاں سے وہ آہستہ آہستہ اندرونی علاقوں کی طرف پھیل رہے ہیں۔ ۱۹۴۲ء سے سیاسی حالات عیسائی مذاہب کی بجائے اسلامی تبلیغ کے لیے سازگار ہو گئے ہیں۔ مقامی اسلام کی نوعیت وہی ہے جو ہم انڈونیشیا [رک باں] کے دوسرے مقامات میں دیکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی سرگرمی کا اہم مرکز فقط مغربی ساحل پر پون تیانگ Pontianak (رک باں) ہے۔

(C. C. BERG)

- **بوری : تاج الملوک رک بہ بوری (بنو)۔**
- **بوری برس : بن آلپ آرسلان جسے سلجوقی برکیاروق نے آرسلان آرغون کے مقابلے میں بھیجا تھا جو آلپ آرسلان کا ایک اور بیٹا تھا اور خراسان میں خود مختار ہو جانے کی کوشش کر رہا تھا۔** دونوں بھائیوں کی اس نبرد آزمائی میں پہلے بوری برس کو کامیابی ہوئی، لیکن ۵۴۸۸ / ۱۹۰۰ء میں جب دوسرا مقابلہ ہوا تو اس کے دستے تتر بتر ہو گئے، وہ خود گرفتار ہوا اور اس کے بھائی کے حکم

۷۔ مذہب : کٹری، فلانی، شوہ عربوں اور العوصہ کا دین اسلام اور ان کا فقہی مذہب مالکی ہے۔ طریقت میں قادریہ (رک باں) اور تجانیہ (رک باں) کے حاسی سب سے زیادہ ہیں، اگرچہ سنوسیہ اور شاذلیہ (رک باں) سمیت دوسرے طریقوں کے نمائندے بھی پائے جاتے ہیں۔ کلیسائے اخوان (Church of Brethren، امریکن پروٹسٹینٹ) کی تبلیغی جماعت صوبے کے جنوبی علاقے کے برہ قبیلے میں سرگرم عمل ہے۔ یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ حالات حاضرہ میں جاہلی قبائل کی مظاہرپرستی رفتہ رفتہ مفقود ہو جائے گی۔

۸۔ متفرقات : قابل ذکر یورپی مستکشف جو بورنو گئے، یہ ہیں: ڈنہم Denham، اوڈنے Oudney اور کلیپرٹن Clapperton (۱۸۲۳ء)، بارتھ Barth جس نے ککوه میں ۱۸۵۱ سے ۱۸۵۵ء تک طویل قیام کیا اور اس خطے کے حالات اور تاریخ کے متعلق بہت سی معلومات جمع کیں، Vogel (۱۸۵۴ تا ۱۸۵۶ء)، یورمان Beurmann (۱۸۶۰ء)، رولفس Rohlf's (۱۸۶۶ء)، ناخٹی گل Nachtigal (۱۸۷۰ تا ۱۸۷۲ء)، اور مساری Massari (۱۸۸۰ تا ۱۸۸۱ء)، مونٹائل Monteil (۱۹۸۲ء)۔

مآخذ: (۱) S.J. Hogben: *The Muhammeden*

(۲) *Emirates of Nigeria*، اوکسفرڈ، ۱۹۳۰ء؛ (۳) *Caravans of the Old Sahara*: E.W. Bovill، اوکسفرڈ (ان دو کتابوں کے مآخذ میں حوالجات کے جو ذرائع مندرج ہیں، انہیں دوبارہ یہاں درج نہیں کیا جا رہا ہے)؛ (۴) *The Bornu*: H. R. Palmer (۵) *Sahara and Sudan*، لندن ۱۹۳۶ء؛ (۶) *Infaku'l Maisuri*: Witting، لندن ۱۹۵۱ء؛ (۷) حکومت نايجیریا کی مطبوعات از ۱۹۰۰ء۔

(C. E. J. WITTING)



غلاموں کے ہاتھوں خود اپنی ماں کے حکم سے  
۱۴ ربیع الآخر ۵۲۹ھ / ۳۰ جنوری ۱۱۳۵ء  
کو قتل کر دیا گیا۔ اب اس کا بھائی شہاب الدین  
محمود تحت نشین ہوا، جسے ۲۳ شوال ۵۳۳ھ /  
۲۳ جون ۱۱۳۹ء کو اسی کے تین نوکروں نے  
موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی جگہ لینے کے لیے  
اس کے بھائی جمال الدین محمد والی بعلبک،  
کو طلب کیا گیا، لیکن وہ بیمار ہو کر ۸ شعبان  
۵۳۴ھ / ۲۹ مارچ ۱۱۴۰ء کو فوت ہو گیا۔ اب  
فوجی سرداروں نے جمال الدین کے بیٹے عبدالدولہ  
ابوسعید اَبی الملقب بہ مجیر الدین کو تختِ حکومت  
پر بٹھایا، جس نے نظم و نسق کی تمام تر ذمے داریاں  
اپنے آتابک معین الدین اَنر [= اَنز] کو سونپ دیں  
تا آنکہ مؤخر الذکر نے ۲۳ ربیع الآخر ۵۴۴ھ /  
۳۰ اگست ۱۱۴۹ء کو وفات پائی۔ اس کے بعد اس  
نے زمامِ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لے لی، لیکن  
جلد ہی اسے نور الدین زنگی کی سیادت قبول کرنا  
پڑی، جس نے ۱۱۵۴ء میں اسے دمشق سے  
نکال دیا۔

یہ خاندان پچاس برس تک برسرِ حکومت رہا۔  
اس دوران میں بوری فرمانروا سندِ حکومت خلیفہ  
اور سلطانِ بغداد سے حاصل کرتے رہے۔ مؤخر الذکر  
معقول تحفے تعائف کے معاوضے میں اس ریاست کے  
داخلی مسائل میں کوئی دخل نہ دیتے تھے۔  
اس سارے عرصے میں بوری فرمانروا ایسے  
حالات سے دو چار رہے جو اکثر و بیشتر ان کے  
لیے بہت دشوار تھے۔ جب تغتکین نے زمامِ اقتدار  
سنبھالی تو دمشق کا علاقہ انطاکیہ، طرابلس اور  
بیت المقدس کی افرنجی (Frankish) ریاستوں سے  
ملا ہوا تھا۔ بیت المقدس کے افرنجی اُن علاقوں  
میں تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے جہاں سے  
دمشق کو سامانِ خوراک فراہم ہوتا تھا، یعنی

سے اسے گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔  
مآخذ: (۱) ابن الاثیر، ۱۰: ۱۷۹؛ (۲)  
Recueil: Houtsma، ۲: ۲۵۷۔

(ادارہٴ اَدبِ جدید)

\* بوری بن ایوب: رَک بہ ایوبیہ۔

\* بوری بن تکین: رَک بہ قرہ خانیہ۔

\* بوری (بنو): ایک ترکی النسل خانوادہ جس

نے ۵۴۹ھ/۱۱۰۳-۱۱۰۴ء سے ۵۴۹ھ/۱۱۵۴ء تک  
دمشق میں حکومت کی۔ اس کا بانی سلجوقی سلطان،  
تَشش (رَک بہ سلجوقیہ) کے بیٹے شمس الملوک دُقاق  
کا آتابک (رَک بان) تھا۔ یہ آتابک جس کا نام  
تَغتکین تھا اور لقب ظہیر الدین تھا، سلطان تَشش  
کا معتمد علیہ تھا اور اس شہزادے نے کئی سال  
پہلے، یعنی ۵۴۸ھ/۱۰۹۵ء میں اسے دمشق کے  
نظم و نسق کی نگرانی پر مامور کر دیا تھا۔ دُقاق  
کی وفات (۱۲ رمضان ۵۴۹ھ / ۱۸ جون ۱۱۰۴ء)  
کے بعد تغتکین متوفی شہزادے کے کسمن بیٹے تَشش  
کے نام پر بدستور حکومت کرتا رہا، لیکن تَشش نے  
بہی اپنے باپ کے بعد جلد ہی داعی اجل کو لبیک  
کہا اور اسی وقت سے تغتکین دمشق کا مالک و  
مختار بن گیا۔ اس کے خانوادہ حکومت کی بنا پڑ گئی  
اور یہ اس وقت تک قائم رہا جب تک امیر  
نور الدین زنگی نے ۱۰ صفر ۵۴۹ھ / ۲۵ اپریل  
۱۱۵۴ء کو دمشق فتح کر لیا۔ تغتکین ۸ صفر  
۵۴۲ھ / ۱۱ فروری ۱۱۴۸ء میں اپنی وفات تک  
حکومت کرتا رہا اور اس کا بیٹا تاج الملوک بوری  
اس کا جانشین ہوا۔ تاج الملوک کو مار ڈالنے کا  
ایک اقدام کیا گیا، جس کے نتیجے کے طور پر اس  
نے ۲۱ رجب ۵۴۶ھ / ۶ جون ۱۱۴۲ء کو وفات  
پائی۔ اپنی وفات سے ذرا قبل تاج الملوک نے اپنے  
بیٹے ابوالفضل اسمعیل المعروف بہ شمس الملوک کو  
اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا، لیکن وہ بھی اپنے

حوران ہے، اور بالائی آردن اور یرموک کے میدانوں سے۔ یہ علاقے ان کے لیے ناگزیر تھے اور انہیں ہوری طرح کھودینے کے خطرے کو دور کرنے اور دمشق اور مصر و عرب کے درمیان آمد و رفت برقرار رکھنے کے لیے ہوری فرمانرواؤں کو کئی بار افرنجیوں سے گنت و شنید کرنا پڑی بلکہ ان سے اتحاد اور دوستی کے عہدنامے بھی کیے۔ ہوری اس پر اس لیے بھی آسانی سے آمادہ ہو گئے کہ ان کے مسلمان ہمسایے ان عہدناموں کو ہمیشہ اندیشے کی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ تفتکین نے مصری فوجوں سے بھی تعاون کی کوشش کی جو ابھی تک کئی ساحلی مقامات، مثلاً صور پر قابض تھیں، لیکن یہ کوشش ناکام رہی اور اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ دوسری طرف فرمانروایان دمشق کی پیچ در پیچ سیاست سے بغداد کے فرمانروا ایسے بدظن رہے کہ والیان دمشق کو بارہا سلطان اور خلیفہ کے رویرو حاضر ہو کر اپنے اقدامات کی صفائی پیش کرنا پڑی۔ بالآخر ۵۲۴/۱۱۳۰ء سے جب زنگی امیر عمادالدین اور اس کا بیٹا نورالدین، حلب کے مالک ہو گئے تو وہ روز بروز دمشق کے لیے خطرناک بنتے چلے گئے۔ شمس الملوک کے سوا جو اپنی ہلاکت کے وقت شہر کو عمادالدین کے حوالے کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا، ہوری فرمانروا حلب کے حاکموں کی جوع الارض سے بچنے کے لیے افرنجیوں کی اعانت حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھتے تھے، مگر دوسری صلیبی جنگ کے دوران (جولائی ۱۱۴۸ء) میں دمشق پر افرنجیوں کے لاحق حملے سے اس حکمت عملی کا خاتمہ ہو گیا اور نورالدین کو دمشق پر جلدی سے قبضہ کر لینے کا بہانہ مل گیا۔

ہوری عہد حکومت میں شہر کی داخلی حالت

بھی کچھ کم پر آشوب نہیں رہی۔ شہر کے ادنیٰ طبقے کے لوگ بعض اوقات نہایت مفسدہ پرداز بے قاعدہ فوج (آحداث) کی شکل میں منظم ہو جاتے تھے اور اکثر ان منچلے افراد کے زیر قیادت، جنہیں ”رئیس“ کہا جاتا تھا، شہر کی سیاسی زندگی میں حصہ لینے لگتے تھے۔ اس بے قاعدہ فوج کے مقابلے میں دیہی طبقہ تھا جس نے کم از کم ایک بار ان کی عملاً مخالفت کی۔ اس فریق نے بھی اسمعیلیوں [رک باں] یا باطنیوں کے زیر قیادت بالخصوص ۵۲۲/۱۱۲۸ء میں بہت اہم حصہ لیا، جبکہ بعض اعلیٰ مناصب پر فائز افراد بھی خفیہ طریقے پر ان سے مل گئے تھے، یہ پہلی بار نہ تھی کہ اسمعیلیوں نے دمشق کو اپنی سرگرمیوں کا اکھاڑا بنایا؛ انہوں نے یہاں کئی سیاسی قتل کرائے۔ ۱۸ ربیع الثانی ۵۰۷/۲ اکتوبر ۱۱۱۳ء کو امیر مودود، والی موصل کا قتل اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ۱۱۳۲ء میں امیر تاج الملوک بھی انہیں کا شکار ہوا۔

اپنی حکومت کے خاتمے، یا خاتمے سے ذرا قبل تک ہوری حکمران یا تو اپنے ترکی دستوں کی حمایت پر اعتماد کر سکتے تھے جن کی وفاداری میں کبھی کمی نہ آئی یا متوسط طبقے کے شہریوں کی غیرجانبداری پر، گو ان کی مالی امداد روز بروز کم ہوتی گئی۔ مؤخر الذکر اس خاندان کے مخالف نہ تھے بشرطیکہ نظم و نسق قائم رہے اور جہاں تک ہو سکے تجارتی لین دین میں حفاظت کی حکومت ضامن ہو، لیکن جب تاج الملوک ہوری کی وفات کے بعد صورت حال ابتر ہوئی تو متوسط طبقے کے لوگ نورالدین کے رعب داب سے روز بروز متاثر ہوتے چلے گئے اور انہوں نے اسے دمشق میں داخل ہونے کی آسانیاں بہم پہنچائیں۔

غرض جب تک خانوادہ ہوریہ کی حکومت



الصفوری، ایک عرب مورخ اور شاعر، وسط رمضان ۵۹۶۳ / جولائی ۱۰۵۶ء میں جلیل (Galilea) کے علاقے میں صفوریہ کے مقام پر پیدا ہوا۔ وہ دس برس کے سن میں اپنے باپ کے ہمراہ دمشق آیا جہاں اس نے مدرسة الصالحیہ میں تعلیم پائی۔ ۵۹۷۴ / ۱۰۶۶ - ۱۰۶۷ء میں قحط کے باعث چار برس اسے بیت المقدس میں رہنا پڑا تو تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ اس کے بعد تکمیل کر کے اس نے کئی مدارس میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔ ۱۰۲۰ / ۱۶۱۱ء میں اس نے شام کے قافلہ حجاج میں قاضی کے فرائض انجام دیے۔ ۱۳ جمادی الاولیٰ ۱۰۲۴ / ۱۱ جون ۱۶۱۵ء کو وفات پائی۔ اس کی اہم ترین تصنیف تراجم الأعیان من أبناء الزمان کے نام سے ایک مجموعہ سوانح ہے جس میں ۲۰۵ افراد کے احوال درج ہیں۔ یہ حالات اس نے طویل وقفوں کے ساتھ جمع کیے اور ۱۰۲۳ / ۱۶۱۴ء میں کتاب مکمل کی۔ ۱۰۷۸ / ۱۶۶۷ء میں فضل اللہ بن محب اللہ نے اسے مرتب کر کے مع ایک تکرار کے شائع کیا (قب Ahlwardt : Verzeichnis der arab., Hdss... Berlin شماره ۹۸۸۹ : Flügel Die : arab., pers. und türk. Hdss... Wien شماره ۱۱۹۰ : فہرست المكتبة الخدیویہ، ۵ : ۳۳)؛ اس کا دیوان، استانبول (کوپرولو، شماره ۱۲۸۷) میں محفوظ ہے۔ اس کی چند نظمیوں برلن (مراثی بر صوفی محمد بن انی البرکات القادری، دیکھیے Ahlwardt، کتاب مذکور، شماره ۷۸۵۸، ۳)، گوتھا (مکتوب منظوم بنام اسعد بن معین الدین تبریزی دمشقی، مع جواب از اسعد قب Pertsch : Die arab. Hdss. der herzogl. Bibl. شماره ۴۴، ۲۳) اور لندن (Catalogues Codd. Or. Mus. Brit. ج ۲، شماره ۶۳، ۲) میں موجود ہے۔ علاوہ بریں اس نے دیوان عمر بن الفارض کی ایک شرح بھی لکھی تھی (چاپ سنگی،

تفتکین اور اس کے بیٹے جیسے قابل افراد کے ہاتھوں میں رہی، اسے دمشق میں اپنا اقتدار قائم رکھنے میں کسی طرح کی دشواری پیش نہ آئی، لیکن معین الدین انر کے نظم و نسق سے قطع نظر آخری بیس سال کی خصوصیت یا تو خونریز رقابتیں رہیں اور یا روز افزوں اقتصادی مشکلات۔ پھر دمشق کی آبادی، بالخصوص یہاں کے خوشحال طبقے نے کبھی تہ دل سے خانوادہ بوریہ کی حمایت نہیں کی تھی، اسے اب اپنا مقدر اس خاندان کے ساتھ وابستہ رکھنے میں کوئی فائدہ نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ جب اس کا آخری فرمانروا مجیر الدین شہر سے رخصت ہوا تو لوگوں نے اگر مخالفت نہیں، تو بے اعتنائی دکھائی۔

مآخذ : (۱) - *Recueil des Historiens des Croisa-*

*des Hist. Occ.* ج ۱، ۳، ۴، ۵ و ۶، *Hist. Or.* ج ۱ (ابن الاثیر: *الکامل فی التاریخ* سے اقتباسات) و ۲ (*Histoire des Atabecs de Mossoul*)، اسی مصنف کے قلم سے)؛ (۲) ابن القلانسی: *ذیل تاریخ دمشق*، طبع Amedroz، زیر عنوان *History of Damascus*، ص ۳۶۳ تا ۵۰۵، لندن ۱۹۰۸ء، جزوی ترجمہ از H.A.R. Gibb: *The Damascus Chronicle of the Crusades*، لندن ۱۹۳۲ء و R. Le Tourneau: *Dames de 1075 à 1154*؛ دمشق ۱۹۵۲ء؛ (۳) Cl. Cahen: *La Syrie du Nord à l'époque des Croisades et la principauté franque d'Antioche*، پیرس ۱۹۴۰ء؛ (۴) R. Grousset: *Histoire des Croisades et du royaume franc de Jérusalem*، پیرس ۱۹۳۴ء، ج ۱ و ۲؛ (۵) S. Runciman: *A. History of the Crusades*، کیبرج ۱۹۵۱ء، ج ۱ و ۲؛ (۶) *A. History of the Crusades*، ج ۱، پنسلونیا ۱۹۵۵ء۔

(R. LE TOURNEAU)

البوری: بدرالدین الحسن بن محمد الدمشقی

فارس پر چڑھائی کی اور سلجوقی شاہزادہ سلجوق شاہ کو وہاں متمکن کر دیا، لیکن قرہ سنقر اپنی فوج سمیت بمشکل ہی واپس ہوا تھا کہ بوزابہ جو اس اثنا میں سفیددیز (القلعة البيضاء) کی طرف پسپا ہو گیا تھا، دوبارہ آ نمودار ہوا اور اس نے سلجوق شاہ کو جس کے پاس کوئی سامانِ مدافعت نہ تھا شکست دی (۵۵۳۴ / ۱۱۳۹ - ۱۱۴۰ء)۔ سلطان مسعود مجبور ہو گیا کہ ولایت فارس اس کے حوالے کر دے۔ پھر بوزابہ کو موقع مل گیا کہ وہ اپنی اس کامیابی کی دوسرے دو امیروں عباس حاکم ری اور عبدالرحمن طغایرک سے اتحاد کر کے مزید توثیق کر لے۔ سلطان نے کچھ دن تو ان لوگوں سے دب کر گزر کی، لیکن آخر کار وہ مؤخر الذکر دو امیروں کو قتل کرا دینے میں کامیاب ہوا اور ان کے تسلط سے آزادی حاصل کر لی۔ بوزابہ نے سلطان پر چڑھائی کر دی، مگر مرج قرہ تکین کی جنگ (۵۵۴۲ / ۱۱۴۷ء) میں گرفتار ہوا اور مارا گیا۔ مرج قرہ تکین ہمدان سے ایک دن کی مسافت پر ہے۔ معلوم ہوتا ہے بوزابہ نے شیراز میں اپنے حسن انتظام کا اچھا نقش چھوڑا تھا۔ ان تمام سپہ سالاروں کے قدم بہ قدم چلتے ہوئے جن کی تعلیم و تربیت سلجوقی روایات کے مطابق ہوئی تھی اس نے ایک مدرسہ قائم کیا جس کے استخراجات کے لیے بہت سی جائداد وقف کر دی۔ پہلے یہ مدرسہ حنفی تھا، مگر آگے چل کر شافعی ہو گیا۔

مآخذ: (۱) ابن الاثیر: الکامل، ۱۱: ۶۰  
 بعد: (۲) عماد الدین الاصفہانی، در بنداری، طبع  
 Recueil: Houtsma، جلد ۲ ہمدد اشاریہ: (۳) ظہیر الدین  
 نیشاپوری: سلجوق نامہ، طبع Gelaleh khawār: (۴)  
 احمد زرنگوب: شیراز نامہ، طبع بہمن کریمی۔ تہران  
 ۱۹۳۸ء، ص ۴۵ تا ۴۶۔

(CL. CAHEN)

قاہرہ (۵۱۲۷۹) - ۵۱۰۰۲ / ۱۰۹۳ء میں اس نے  
 التائیة الصغریٰ کی شرح مکمل کی، قسب Derenbourg:  
 Les Mas. Or. de l'Escorial، شماره ۴۲، ص ۴۰۰۔  
 مآخذ: (۱) النعمانی: الروض العاطر (طبع  
 Wetstein)، ۲: ۲۸۹؛ (۲) Ahlwardt، کتاب مذکور،  
 شماره ۹۸۸۶، ورق ۱۱۲ ب؛ (۳) المعینی: خلاصة الآثار،  
 ۲: ۵۱؛ (۴) الحقاہی: ریحانة الألباء، قاہرہ ۱۲۹۴ء،  
 ص ۱۷ تا ۲۲؛ (۵) Die Geschichts - Wüstenfeld  
 schreiber der Araber، شماره ۵۵۱؛ (۶) محمد گرد علی،  
 در MMA، ۳: ۱۹۳ تا ۲۰۲؛ (۷) براکلمان، ۲: ۳۷۴،  
 تکملہ، ۲: ۴۰۱؛ (۸) زیدان: آداب اللغة، ۳: ۳۰۸۔  
 (C. BROCKELMANN)

بوزابہ: سلجوقوں کے تحت ولایت فارس  
 کا والی۔ اصل میں وہ اس ولایت کے امیر  
 منگوبرس [= منکبرس] کی طرف سے خوزستان کے  
 صوبے میں نائب تھا۔ جب اس کے بالا دست  
 [منگوبرس] نے اپنے امیروں کو ساتھ لے کر  
 سلطان مسعود سلجوقی پر فوج کشی کی تو بوزابہ  
 بھی اس کے لشکر میں شامل تھا۔ جنگ کُرشنبہ  
 میں منگوبرس گرفتار ہو گیا (دیگر مآخذ اس جنگ کا  
 مقام پنج انگشت [= بنجن کشت] بتاتے ہیں) اور کچھ  
 دن بعد مار ڈالا گیا (۵۵۳۲ / ۱۱۳۷ - ۱۱۳۸ء)۔  
 فتح کے بعد سلطان کی فوج نے دشمن (منگوبرس) کے  
 فوجی ہڑاؤ کو لوٹنا شروع کر دیا تو بوزابہ نے  
 اس پر حملہ کر کے اسے تتر پتر کر دیا۔ سلطانی  
 حشم و خدم کے بہت سے سر بر آوردہ امیر گرفتار  
 کر لیے گئے۔ خود سلطان نے بڑی مشکل سے اپنے  
 آتابک قرہ سنقر کے ہمراہ بھاگ کر جان بچائی۔  
 اپنے آقا (منگوبرس) کے مار ڈالے جانے پر غضبناک  
 ہو کر بوزابہ نے سارے قیدیوں کو قتل کر ڈالا  
 جن میں قرہ سنقر کا لڑکا بھی تھا۔ آتابک قرہ سنقر  
 نے اپنے فرزند کا انتقام لینے کے لیے دوسرے سال



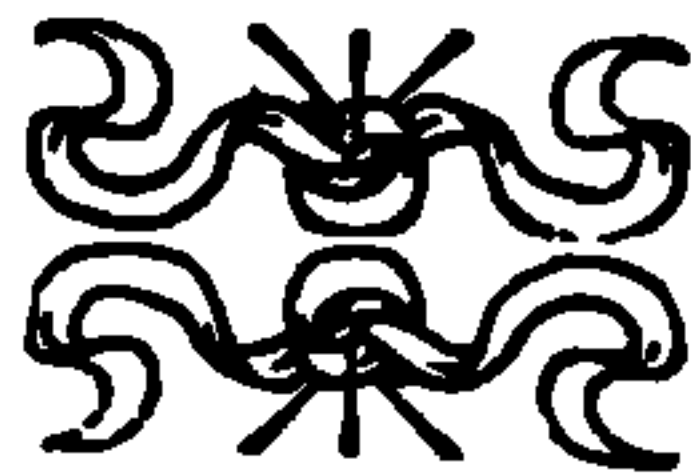
تسلط میں رکھا۔ معاہدہ سیورے (Sèvres) کی رو سے بوزجہ ادہ اور امبروز (Imbros) یونان کو دے دیے گئے (دفعہ ۸۳)، لیکن غیر عسکری بنا دیے گئے (دفعہ ۱۷۸)۔ معاہدہ لوزان (Lausanne) کی رو سے وہ ترکی کو واپس مل گئے، مگر ان میں ”مقامی آبادی سے مرتب خاص قسم کا نظم و نسق“ قائم کیا گیا۔ یہ بھی شرط تھی کہ پولیس میں مقامی لوگ بھرتی کیے جائیں اور یہ جزیرے ایسے ترکی۔ یونانی معاہدوں سے مستثنیٰ رہیں جو باہم آبادی کے مبادلے کی بابت کیے جائیں۔

مآخذ : بوزجہ ادہ کا اتفاقہ تذکرہ ان وقائع اور مختصر تذکروں کے ضمن میں بہت سی جگہ آیا ہے جو ذیل کے مصنفین نے اپنی مکتوبات و مقالات میں درج کیے ہیں۔ کلاویژو Clavijo، بوئڈل مونٹی Buondelmonti، طاہور Tafur، اولیا چلبی Evliya Çelebi، سپون Spon، کویل Covel، گریلوٹ Grelot اور ٹورنہ فورٹ Tournefort.

(C.F. BECKINGHAM)

- البوزجانی : رَکْ بہ ابوالوفاء.
- بوزوق : (رَکْ بہ یوزغاد [ = یوزگت ]).
- بوزنطی : رَکْ بہ روم.

\* بوزجہ ادہ : [ = بوزجہ آطہ ] Tenedos کا ترکی نام۔ یہ ایک جزیرہ ہے جس میں زیادہ تر یونانی آباد ہیں اور آبنائے (درہ دانیال) کے راستے اس کی زد میں ہیں۔ معاہدہ تورین (Turin) کی رو سے وینس اور جنوا اس پر رضامند ہو گئے کہ بوزجہ ادہ کو غیر عسکری بنا دیا جائے۔ وینس والوں نے آبادی کو اقریطش (کریٹ) میں منتقل کر دیا اور یہ جزیرہ کلاویژو Clavijo کے زمانے تک غیر آباد ہی تھا۔ [سلطان] محمد ثانی نے بوزجہ ادہ میں ایک حصار تعمیر کیا جسے اولیا [چلبی] نے ”متین“ یعنی مضبوط و مستحکم لکھا ہے۔ آبنائے میں داخل ہونے کے لیے موافق موسم کا انتظار کرنے والے جہاز اس جزیرے کی پناہ میں ٹھہرا کرتے تھے۔ اس کا نام بحری مہمات کے تذکروں میں اکثر آیا ہے۔ وینس والوں نے اس پر رمضان ۱۰۶۶ھ / جولائی ۱۶۵۶ء میں قبضہ کیا اور یہ ایک سال سے زائد مدت تک انہیں کے قبضے میں رہا۔ ۱۹۱۲ء میں یونانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا۔ لنڈن کے ۱۹۱۳ء کے تصفیے میں جرمنی کے اصرار پر قرار پایا کہ بوزجہ ادہ ترکی کو واپس مل جانا چاہیے، لیکن جنگ شروع ہو جانے کی وجہ سے یونان نے اسے اپنے ہی



## زیادات و تصحیحات

### جلد ۱

#### تصحیحات

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
۶۲۷	۱	۲۰	ابن فارس	ابن الفارض

### جلد ۲

#### زیادات

صفحہ	عمود	سطر	زیادات
۲۳۷	۲	۱۷	”حج ہوا“ کے بعد (قَب طبقات اکبری، ”بارادہ سیر“؛ فرشتہ : ”بقصد سیر عالم“)
۲۳۷	۲	۲۳	”گیا“ کے بعد (جس نے امیر تیمور کی وفات کے بعد سمرقند سے بھاگ کر پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا)
۲۳۷	۲	۲۸	”جون ۱۴۲۰ء“ کے بعد اور مؤخرالذکر نے پیچھا کر کے اسے کشمیر سے باہر نکال دیا
۲۳۸	۲	۹	”جاری کیا“ کے بعد (یعنی جس علاقے میں چوری ہو جاتی تھی وہاں کے امرا کو تاوان دینا پڑتا تھا)
۲۳۸	۲	۱۳	”کرائے۔“ کے بعد اس نے عوام سے تحائف اور نذرانے وصول کرنے کا سلسلہ بند کر دیا۔
۲۳۸	۲	۲۰	”مقرر کیا۔“ کے بعد فرشتہ لکھتا ہے کہ بادشاہ زمین کی آبادکاری کی طرف اس قدر متوجہ ہوا کہ سارے کشمیر میں زمین کا کوئی رقبہ بے آب یا غیر مزروعہ نہ رہا۔
۲۳۸	۲	۳۲	”دعوت دی۔“ کے بعد اس کی مجالس میں ہندو اور مسلمان اہل دانش موجود رہتے تھے



(ب)

## تصحیحات

صفحہ	عمود	سطر	خطا	صواب
ب	۱	۱۶	شذارت = شذارت الذهب	شذرات = شذرات الذهب
۱	۲	۲۵	جزء	جزء
۱۳	۱	۲۰	اخوند	اخوند
۲۳	۲	۱۸	البغا	البغا
۲۳	۲	۲۵	البغا	البغا
۲۸	۱	۱۶	صور	صور
۶۳	۱	۱۳	حديقة المرام	حديقة المرام
۸۹	۲	۲۹	زامل	زامل
۹۸	۲	۲۰	هـ كه	كه
۱۰۹	۱	۱۳	بنائے	بنایا
۱۳۰	۲	۶	مصعب	مصعب
۲۵۱	۱	۲۶	معجزات	كرامات
۲۹۶	۲	۳۲	وغیره	وغیره كا
۳۵۷	۱	۵	خمیه	خمیه
۳۶۰	۱	۴	كے سوراخدار	سوراخدار
۳۱۳	۲	۲۳	برغش	برغش
۳۱۷	۲	۱۳	كى	كا
۳۲۳	۱	۳	مشقات	مشقات
۳۶۸	۱	۲۵	اشاعت	اشاعت
۵۱۲	۱	۵	تصويروں	تصويریں
۵۳۲	۱	۳۰	بردار	برادر
۶۷۱	۱	۱۶	ڈالے دیے تھے	ڈالے ہوئے تھے
۶۹۷	۲	۲۹	كا رس	اس كا رس
۷۲۷	۲	۸	ايغور	اويغور
۷۹۷	۱	۲۶	لكنه	لكنه
۸۰۷	۱	۲۸	تواريخ	تواريخ
۸۵۳	۱	۳۲	بجھارت	بوجه
۸۵۹	۱	۱۳	قضية	قبضے
۸۶۹	۱	۳۱	العبدى	العبدی
۸۸۱	۲	۱۱	مجلس	مجلس

(ج)

تصحیحات

صواب	خطا	سطر	عمود	صفحہ
صواب	خطا	سطر	عمود	صفحہ
چاہیے	پاہیے	۲	۱	۹۷۲
جس	بس	۲۵	۱	۹۰۸
جس	بس	۲۳	۱	۹۱۷
تقویٰ	تقویٰ	۳۰	۱	۹۲۵
نے	ذ	۲۶	۲	۹۳۲
علاول	آلاول	۳۲	۲	۹۵۵
علاول	آلاول	۳	۱	۹۵۷
علاول	آلاول	۲۳	۱	۹۵۹
چاہیے	پاہیے	۲	۱	۹۷۲
بوزجہ آدہ	بوزجہ آدہ	۱	۱	۱۰۲۰



طبع : اول  
سال طباعت : ۱۳۸۹ھ / ۱۹۶۹ء  
مقام اشاعت : لاہور  
ناشر : سید شمشاد حیدر، ایم اے، مسجل، دانش گاہ پنجاب، لاہور  
طابع : مسٹر امجد رشید منہاس، ایم پی ڈی (لیڈز)، مفوض مطبع  
مطبع : پنجاب یونیورسٹی پریس، لاہور  
صفحات : ۱۰۲۰ + و تاج

**Urdū**  
**Encyclopædia of Islām**

*Under the Auspices*  
*of*  
**THE UNIVERSITY OF THE PANJĀB**  
**LĀHORE**



**Vol. IV**

**( Bāy — Bozanti )**

1389 / 1969  
marfat.com